اردو
انسائیکلوپیڈیا

اردو انسائیکلوپیڈیا

جلد اوّل

مُدیرِاعلیٰ

پروفیسر فضل الرحمٰن

سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

قومی کونسل برائے ترقی اُردو، نئی دہلی

سنہ اشاعت : 1996

پہلا ایڈیشن : 3000
قیمت : -/300 روپے
سلسلہ مطبوعات : 756
کتابت : ـــــــــــ ضرار احمد خان، انور علی و محمد سالم

نگراں
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈائریکٹر

اشاعتی ٹیم : ـــــــــــ ایس۔ اے۔ ایس۔ انوار رضوی
(ریسرچ آفیسر (پروڈکشن)

محمد عصیم : ـــــ ریسرچ اسسٹنٹ (پروڈکشن)
افتخار عالم ـــــــ مصحح

URDU ENCYCLOPAEDIA VOL. I

ISBN 81-7587-000-7-I
Rs.300/-

ناشر : ڈاکٹر گنگا پرساد ومل، ڈائریکٹر قومی کونسل برائے ترقی اردو، ویسٹ بلاک I آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی 110066
طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی

ترتیب

الف۔ آثارقدیمہ

ب۔ ادبیات

ج۔ ارضیات

د۔ انجینیرنگ

ہ۔ تاریخ اسلام

و۔ تاریخ عالم

ز۔ تاریخ ھند

پیش لفظ

قومی کونسل برائے ترقی اردو بڑے فخر کے ساتھ اردو انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد پیش کر رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو دراصل قومی کونسل کا ہی اولین روپ تھا جو پورے تسلسل کے ساتھ اب ایک خود مختار ادارہ قومی کونسل برائے ترقی اردو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ترقی اردو بیورو نے اردو انسائیکلو پیڈیا کا پروجیکٹ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد کے سپرد کیا۔ اس کے سکریٹری خواجہ محمد احمد صاحب تھے جنہوں نے بڑے ذوق و شوق سے پروجیکٹ قبول کیا اور محنت و جانفشانی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا۔

ترقی اردو بورڈ نے پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم کو اس کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا اور ان کو ایڈیٹوریل اسٹاف تفویض کیا جس کی فہرست اولین صفحات میں دے دی گئی ہے۔ پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم ہمہ جہت عالم اور عالم با عمل تھے۔ نہ صرف سائنس پر ان کی گرفت مضبوط تھی بلکہ تاریخ اور ادبیات میں بھی عملی دلچسپی رکھتے تھے اس کے علاوہ دیگر بہت سے علوم بھی ان کے دائرۂ مطالعہ اور احاطۂ بصیرت میں آتے تھے۔ پروفیسر مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پرووائس چانسلر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اس پروجیکٹ کو انھوں نے حرز جاں بنا لیا تھا۔

چیف ایڈیٹر کی معاونت کو ایڈیٹوریل اسٹاف کے علاوہ مضمون مدیران بھی متعین کیے گئے۔

ہر ایک مضمون کے دو یا دو سے زیادہ مدیران تھے۔ یہ تمام حضرات اپنے اپنے مضمون کے ماہر تھے اور حتی الامکان یہ سعی کی گئی کہ یہ اردو زبان کے ماہر اور مزاج شناس بھی ہوں۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کے لئے کولمبیا یونیورسٹی انسائیکلو پیڈیا کا طرز پسند کیا گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کولمبیا یونیورسٹی انسائیکلو پیڈیا میں محض مختصر نوشتے ہیں جو حروف تہجی کے حساب سے مرتب کیے گئے ہیں اور تمام علوم کے نوشتے خلط ملط ہیں جو کہ عام طور پر ایک انسائیکلو پیڈیا کا طرز ہوتا ہے۔ تجویز کیا گیا اور ایک رائے ہو کر مان لیا گیا کہ اول تو انسائیکلو پیڈیا ایک جلد کے بجائے بارہ جلدوں پر محیط ہو گی' دوم یہ کہ مختصر نوشتوں کے علاوہ کلیدی مضامین بھی ہوں گے' سوم یہ کہ علوم الگ الگ مرتب کیے جائیں گے' چہارم یہ کہ پہلی چار جلدوں میں کلیدی مضامین شائع کیے جائیں گے اور بعد کی آٹھ جلدوں میں مختصر نوشتے شائع ہوں گے۔

اس منصوبہ بندی کے بعد مضمون مدیران سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے مضمون کے لیے کلیدی مضامین اور مختصر نوشتوں کا منصوبہ بنائیں۔ چیف ایڈیٹر کی منظوری کے بعد یہ کلیدی مضامین اور مختصر نوشتے ایسے لائق ماہرین کے سپرد کیے گئے جو مخصوص مضمون اور اردو زبان دونوں کے ماہر تھے تاکہ مضمون پر پوری گرفت رکھتے ہوئے وہ اپنی بات با آسانی اردو زبان میں قلم بند کر سکیں۔

اس مضمون نگاری میں مضمون مدیران نے بڑی دیدہ ریزی اور مشقت سے کام کیا، تجویز کردہ اصحاب علم و قلم نے کلیدی مضامین اور مختصر نوشتے لکھے اور مضمون مدیران نے ان کو لفظاً لفظاً پڑھا۔ زبان و بیان درست کیا۔ کہیں کہیں ایسا بھی تھا کہ دونوں شرائط پوری کرنے والا مضمون نگار میسر نہیں تھا تو موضوع کی مہارت کو اولیت دی گئی اور مضمون انگریزی زبان میں حاصل کر لیا گیا جس کا بعد میں اردو میں ترجمہ کیا گیا اور یہ کام مضمون مدیر نے کیا۔ انسائیکلو پیڈیا پر کام بڑی دل جمعی سے ہوا۔ اس تمام کام میں ہر ایک نے جی جان سے تعاون دیا۔ پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم کی ذات منارۂ نور تھی۔ ہر قدم پر وہ ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود رہتے تھے یقیناً پروفیسر صاحب کے بغیر اردو انسائیکلو پیڈیا کی تالیف و ترتیب کا عظیم کارنامہ سر انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس پروجیکٹ کے ناظم خواجہ محمد احمد مرحوم تھے۔ ان کی زیر نگرانی یہ تمام کام ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد میں انجام پذیر ہوا۔

طریقہ یہ تھا کہ مضمون مدیران اپنے مضمون کے کلیدی مضامین اور مختصر نوشتوں کا منصوبہ پیش کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ منصوبہ قسطوں میں بھی آتا تھا خاص طور پر مختصر نوشتوں کے منصوبے میں اضافے ہوتے رہتے تھے۔ اس منصوبے کے ساتھ ہی مضمون مدیران ممکنہ ماہرین کے نام اور پتے مہیا کرتے تھے۔ ان میں سے چیف ایڈیٹر انتخاب کرتا تھا اور ماہر مخصوص کو بات چیت خط و کتابت سے مطلع و راضی کیا جاتا تھا کہ وہ اس کار عظیم میں ساجھی دار بنے۔ مضمون جب لکھ کر آتا تو مضمون مدیران اس پر خود نظر ثانی کرتے یا نظر ثانی کے لیے ماہر تجویز کرتے تھے۔ نظر ثانی کے بعد مضمون ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ آتا تھا جو انسائیکلو پیڈیا پروجیکٹ کا دفتر تھا۔ یہاں ایڈیٹوریل اسٹاف اس کو نکھارتا اور آخر کار چیف ایڈیٹر اس پر صاد کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وصول شدہ مضمون انگریزی میں تھا تو ایڈیٹوریل اسٹاف نے یا مجوزہ مترجم نے اس کا ترجمہ کیا اور تب اس پر نظر ثانی کی گئی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وصول شدہ مضمون غیر معیاری پایا گیا تو وہ دوبارہ کسی اور سے لکھوایا گیا یا ایڈیٹوریل اسٹاف نے مختلف انسائیکلو پیڈیا کو سامنے رکھ کر خود ہی مضمون تیار کیا۔ اسی لیے ایڈیٹوریل اسٹاف میں سائنس، سماجی علوم اور ادبیات کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں کیونکہ ہر حالت میں آخری نظر ثانی بہر حال ایڈیٹوریل اسٹاف ہی کو کرنا ہوتی تھی اور سب سے آخر میں چیف ایڈیٹر کی منظوری۔ اس طرح ہر کلیدی مضمون اور مختصر نوشتہ فائنل کر کے ہی ترقی اردو بیورو کو بھیجا جاتا تھا۔

کام جب ایک بار شروع ہو گیا تو رفتہ رفتہ گرمی کار بھی پیدا ہو گئی اور ماحول ایسا بنا کہ تیزی آگئی اور آخر کار انسائیکلو پیڈیا کی بارہ جلدیں تکمیل کو پہنچ گئیں اور ترقی اردو بیورو کے نمائندوں کو تمام بچے کھچے مسودات حوالے کر دیے گئے

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی ڈائریکٹر شپ کے زمانے میں اردو انسائیکلو پیڈیا کو شائع کرانا چاہا تھا اور پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر کلیم الدین مرحوم، پروفیسر رعایت علی خاں اور پروفیسر نیر مسعود کی نظر ثانی کے لیے خدمات حاصل کیں مگر وہ دور بہت مختصر تھا اور طباعت شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ترقی اردو بیورو چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے ڈائریکٹر ہونے کے بعد انسائیکلو پیڈیا کی طباعت کے کام کو شروع کرنا چاہا لیکن ترقی اردو بورڈ کی ہدایت کے مطابق اول کی چار جلدوں کی نظر ثانی ہونا تھی۔ اس کام کو پورا کرنے کے لیے جناب سید حامد اور پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی کا تعاون حاصل کیا گیا۔ پروفیسر قدوائی نے اپنا قیمتی وقت سائنسی مسودات کی نظر ثانی میں لگایا۔ جناب سید حامد نے ادبیات اور سماجی علوم کی جس عرق ریزی سے نظر ثانی کی وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ ان کے تبحر علمی اور ریاضت کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم آخر کار اس عظیم مسودے کی کتابت کا آغاز کر سکے۔

اول کی چار جلدیں ۳۲ علوم سے متعلق کلیدی مضامین پر مشتمل تھیں۔ ضخامت کے زاویہ کو سامنے رکھتے ہوئے ان چار جلدوں کو تین پر تقسیم کر دیا گیا

ہے جن کی ترتیب حسب ذیل طریقے پر ہے۔

جلد اوّل

ا۔ آثار قدیمہ
۲۔ ادبیات
۳۔ ارضیات
۴۔ انجینیرنگ
۵۔ تاریخ اسلام
۶۔ تاریخ عالم
۷۔ تاریخ ہند

جلد دوم

۸۔ تعلیم
۹۔ جغرافیہ
۱۰۔ جنگلات
۱۱۔ حیاتیات
۱۲۔ حیوانیات
۱۳۔ ریاضیات
۱۴۔ زراعت
۱۵۔ سائنس
۱۶۔ سماجیات
۱۷۔ سیاسیات
۱۸۔ طب مع طب یونانی
۱۹۔ طبعیات

جلد سوم

۲۰۔ علاج حیوانات
۲۱۔ فلسفہ ونفسیات
۲۲۔ فلکیات
۲۳۔ فنون لطیفہ
۲۴۔ فلم
۲۵۔ قانون
۲۶۔ کیمیا
۲۷۔ لائبریری سائنس
۲۸۔ مذاہب
۲۹۔ معاشیات
۳۰۔ معدنیات
۳۱۔ نشرواشاعت
۳۲۔ نظم ونسق

یہی وہ تمام علوم ہیں جن پر مختصر نوشتے بقیہ آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔ان علوم کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور ہر علم کے اندر مختصر نوشتے حروف تہجی کے حساب سے آئیں گے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کے مسودے کی تکمیل اور طباعت واشاعت میں گوناگوں ناگزیر وجوہات کی بناپر بعد زمانی حائل ہو گیا ہے۔اسکا بیشتر کام باہر کے ماہرین نے انجام دیا ہے۔اس تمام کام کی نگرانی محدود وسائل اور گنے چنے افراد کے باوجود احسن طریقہ پر انجام دی گئی ہے۔پھر بھی کہیں نہ کہیں فرد گذاشتوں کا در آنا خارج از امکان نہیں ہے۔قومی کونسل ان کی نشاندہی کا خیر مقدم کرے گی اور آئندہ اشاعت میں ان کے تدارک کی سعی کرے گی۔

انسائیکلو پیڈیا کی طباعت کی تمام ذمہ داری جناب ایس۔اے۔ایس انوار رضوی کے سپرد رہی ہے۔ان کی نگرانی میں جناب محمد عصیم ریسرچ اسسٹنٹ اور جناب افتخار عالم پروف ریڈر نے حد درجہ دیدہ ریزی سے کام کیا ہے۔ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کے بغیر یہ عظیم کام طباعت کی منزل سے نہ گزر پاتا۔

میں اس انسائیکلو پیڈیا کے تمام مصنفین، مضمون مدیران، ادارتی بورڈ اور نظر ثانی کرنے والے اصحاب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ وہ اس کی تیاری میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔میں تمام کاتبوں اور خاص طور سے ضرار خاں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس کی تیاری میں انتھک کام کیا ہے۔

خداوند تعالیٰ پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں مقامات اعلیٰ سے نوازے۔یہ ان ہی کا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک کے اردو خواں خواتین وحضرات اس سے استفادہ کریں گے۔اور یہی ہمارا انعام بھی ہوگا۔

ڈاکٹر گنگا پرساد ومل
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی

تمہید

اُردو زبان کی ہمہ گیری اور اہمیت کے متعلق کچھ کہنے کی چنداں حاجت نہیں۔ البتہ متبدلہ حالات میں اس کی ضرورت تھی کہ اس کو ترقی دینے کے طریقوں اور تدابیر پر غور کیا جائے۔ اس کی ضرورت زیادہ اور شدید ہوگئی اس لیے کہ کوئی ایک اسٹیٹ ہندوستان میں ایسا نہیں رہا تھا جہاں سرکاری زبان اردو ہو۔ ان تمام امور کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد حکومت ہند نے زیر قیادت محترمہ مسز اندرا گاندھی یہ طے کیا کہ اردو ترقی بورڈ قایم کیا جائے جو اس ذمہ داری کو سنبھالے۔ دیگر ہندوستانی زبانوں کی حد تک ہر اسٹیٹ نے اپنی ذمہ داری قبول کی ہے۔ حکومت ہند نے اپنے روایتی اصولوں اور دوربینی کے تحت یہ تصفیہ کیا کہ ہر زبان کی ترقی کے لیے پنج سالہ منصوبوں میں رقم مخصوص کی جائے۔ چنانچہ اردو کی ترقی کے لیے یہ رقم اردو ترقی بورڈ کو دی گئی جو زیر نگرانی وزیر تعلیم حکومت ہند اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔

اُردو زبان کی حفاظت اور پیش رفت میں منجملہ اور تدابیر کے یہ بھی تصفیہ کیا گیا کہ اردو زبان کی ایک بسیط انسائیکلوپیڈیا (مخزن العلوم) تیار کی جائے چنانچہ مختلف ادارے اور جامعات پیش نظر تھے جن کے ذریعہ اس کی تکمیل کی جائے حسن اتفاق سے میں پارلیمنٹ میں موجود تھا۔ چنانچہ میں نے درخواست کی کہ یہ ذمہ داری مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے سپرد کی جائے۔ اس سلسلہ میں پس و پیش رہا لیکن بالآخر یکم مئی ۱۹۷۳ء کو حکومت ہند نے یہ ذمہ داری مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ کے حوالہ کردی یہ حسن اتفاق ہے کہ حضرت مولانا آزاد مرحوم نے اپنے پرچہ "لسان الصدق" بابت ۱۹۰۴ء میں یہ ہدایت فرمائی تھی کہ اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جانا مناسب ہے۔ میں خداوند کریم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ یہ پراجکٹ باحسن وجوہ تکمیل پا گیا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا منصوبہ کے مطابق کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین جلدوں میں تمام سماجی، سائنسی علوم، عالمی ادبیات، مذہب وغیرہ پر ۲۶۹ تفصیلی کلیدی مضامین لکھے گئے ہیں۔ بقیہ جلدوں میں مختصر معلوماتی نوشتے ۳۲ علوم سے متعلق تقریباً بارہ ہزار اندراجات کی تکمیل گئی۔

حکومت ہند اور اردو ترقی بورڈ کا میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس اہم کام کو ہمارے سپرد کیا۔ اور میری معلومات کی حد تک یہ پہلی اردو انسائیکلوپیڈیا ہے جو ذیلی براعظم میں مکمل طور سے تیار کی گئی ہے۔ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ نے باتفاق آرا یہ طے کیا کہ محترمہ وزیر اعظم

شریمتی اندرا گاندھی کو محسن اردو قرار دیا جائے۔ اور باتوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محترمہ ہی کے زمانے میں اردو ترقی بورڈ قایم ہوا اور انسائیکلو پیڈیا پراجکٹ منظور ہوا۔ اور آپ ہی کی قیادت میں مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ کے سپرد کیا گیا جس نے یہ کام بہ حسن وخوبی مکمل کرلیا اس لیے اردو سے دلچسپی رکھنے والے اور مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ اظہار تشکر کے طور پر مخزن العلوم کو محترمہ اندرا گاندھی کا اردو دنیا کے لیے ایک شاندار اور لازوال علمی تحفہ تصور کرتا ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری وقت کا اہم تقاضا تھا جس پر لگ بھگ دس لاکھ کا صرفہ ہوا۔ ہمارے ملک کے تقریباً تین سو اسکالرس نے اس کی تحریر میں حصہ لیا ہے میرا فرض ہے کہ میں ان تمام دانشوروں کا شکریہ ادا کروں اور بالخصوص جناب فضل الرحمن چیف ایڈیٹر اور مرتضیٰ صاحب اور ان کے شرکاءکار اور نیز جناب ڈاکٹر تاراچند صاحب، جناب ایل۔ این۔ گپتا صاحب (معتمد فینانس حکومت آندھرا پردیش)، جناب حامد علی عباسی صاحب، جناب ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ صاحب اور جناب خواجہ محمد احمد صاحب اور دوسرے احباب سے اظہار ممنونیت کروں۔ اگر ان کا تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو اس کام کی تکمیل دشوار تھی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کام اردو کی خدمت گزاری کے سلسلے میں ایک موثر قدم ثابت ہوگا اور ایسے بہت سے کام کیے جائیں گے جن سے اردو زبان کی مقبولیت اور ترویج میں مدد ملے گی۔ ہندوستان میں ابتدا ہی سے ہر مذہب اور ہر زبان کی اشاعت میں امکانی سہولتیں پائی جاتی ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ یہ اعلیٰ روایات اور وسیع النظری جو ہمارے ملک کا طرۂ امتیاز ہے قایم رہیں گے اور پروان چڑھیں گے۔

فقط

میر اکبر علی خان

اِدارتی بورڈ

نظرثانی کنندگان

پروفیسر کلیم الدّین احمد

پروفیسر رعایت خاں

پروفیسر نیّر مسعود

پروفیسر آل احمد سرور

جناب سیّد حامد

پروفیسر اخلاق الرّحمٰن قدوائی

فہرست مضمون مدیران

مضمون	مدیران
آثار قدیمہ و فنون لطیفہ	ڈاکٹر اے. ایم. خسرو جناب ایم. اے. وحید خاں جناب جگدیش متل
اسلامی تاریخ و تمدن	ڈاکٹر سید عابد حسین پروفیسر خلیق احمد نظامی
تاریخ	پروفیسر این. کے. شیروانی ڈاکٹر عرفان حبیب
تکنالوجی بشمول کیمیائی تکنالوجی اور انجینیرنگ وغیرہ	پروفیسر عابد علی پروفیسر عبد علی
حیوانیات	پروفیسر ایس. این. سنگھ پروفیسر شمس الدین قادری پروفیسر اختر صدیقی

ریاضی اور شماریات	پروفیسر افضال احمد پروفیسر اظہار حسین
زبان و ادب (اردو)	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی پروفیسر رفیعہ سلطانہ پروفیسر مسعود حسین خاں
زبانیں اور ادب (ہندوستانی)	ڈاکٹر اے. شرما جناب ڈی. رامانج راؤ
زبانیں اور ادب (بیرونی)	ڈاکٹر شری رام شرما جناب کے. ایم. جاج ڈاکٹر معید خان ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی ڈاکٹر کمار پروفیسر اسلوب احمد انصاری
زمینی علوم	پروفیسر احمد الدین ڈاکٹر منظور عالم
سماجیات بشمول بشریات و نفسیات	ڈاکٹر حسن عسکری ڈاکٹر حسن ڈاکٹر رام نرائن سکسینہ
طبیعیات	پروفیسر سمیع اللہ ڈاکٹر سدرشن ڈاکٹر شری راج پرساد ڈاکٹر رئیس احمد ڈاکٹر ایچ. آر. دسارے
قانون	جسٹس کمار ایّن ڈاکٹر مرتضیٰ ڈاکٹر طاہر محمود

کیمیا اور حیاتی کیمیا	پروفیسر نوین راؤ پروفیسر تقی خان
لائبریری سائنس	ڈاکٹر عبدالمحمود جناب بشیرالدین
مشرقی مطالعات بمع خصوصی حوالہ علم الہند	جناب رمیش تھاپر جناب عبدالوحید خاں
مذہب اور فلسفہ	پروفیسر شیو موہن لال
معاشیات اور دیہی سائنس	ڈاکٹر گوتم ماتھر پروفیسر رشیدالدین خاں
نباتیات	ڈاکٹر ایم. آر. سکسینہ پروفیسر جعفر نظام پروفیسر رعایت خاں پروفیسر وی. پوری

فہرست مضمون نگاران

احسان اللہ خان
احمدالدین ایس۔ ایم۔
اختر صدیقی
ارشد احمد
اسرار احمد
اعجاز اختر
افضال احمد
افضل ایم۔ این۔
افضل محمد
اکبر الدین صدیقی
اُمّت العزیز
امتیاز احمد
امجد خلیل الرحمٰن (مسز)
انصاری جے۔ ایس
انصاری، ایس۔ ایم۔ آر۔
انصاری، ظ
انعام اللہ، ایم۔
انصاری ایم۔ وائی
باقر حسین، ایم۔ اے۔
بدر تقی خاں (مسز)
بلیغ الدین حسین
بھارگوا، بی۔ این
پون کمار
تقی خاں، ایم۔ ایم
تقی علی مرزا
ثناء اللہ خاں
جعفر نظام
جمال خواجہ
جنید احمد
چندن جی۔ ڈی
حسن الدین احمد
حفیظ الکبیر رحمٰن
حقانی، ایم۔ ایم

حق، ایچ۔ ایچ
حمید، ایس۔ اے
حیدر رضا زیدی
خاں، ایم۔ اے۔ آر
خطیب، ایم۔ ایچ
خلیق احمد نظامی
خلیل احمد
خلیل الرحمٰن
خواجہ احمد فاروقی
خواجہ حمید احمد
خواجہ محمد احمد
خواجہ محمد واسع
دھرمیندر پرساد
دیسائی، زیڈ۔ اے
رام ریڈی، کے
رام شرما
رائے محبوب نارائن
رحمٰن، ایم۔ اے
رحمت علی
رشید، ایم۔ اے
رفاقت علی صدیقی
رئیس احمد
زاہدہ زیدی
زبیدہ بیگم
سانول، ایم۔ بی
سداشیو راج
سدرشن راج
سراج الدین، ایس
سریندر ریڈی، کے
سعید احمد اکبرآبادی
سکینہ، ایچ۔ سی

سلامت اللہ خاں
سلیم، ایس۔ اے
سلیم شفیع
سیّد حمایت علی
سیّد شاہ محمد
سیّد صباح اللہ عبدالرحمٰن
سیّد علی اکبر
سیّد محمود
شیدا، ایس۔ اے
شیو موہن لال
صالح محمد علاءالدین
صفی احمد
صفیہ بانو
ضمیر اشرف
ضیاءالدین اصلاحی
ضیاءالدین انصاری
طارق احمد
ظل الرحمٰن، ایم
ظل الرحمٰن خان
ظہیر الدین ملک
عبدالحمید صدیقی
عبدالرحمٰن، ایس
عبدالرحمٰن خاں
عبدالسلام
عبد علی
عتیق احمد صدیقی
عصمت، این رنگٹ لال
علی احمد جلیلی
عمادی، اے۔ کے
غفار شکیل، اے۔ جی
فاطمہ شجاعت

فخرالدین
قادری، ایس. ایس
کبیر احمد، ایس
کلیم اللہ، ایم
کمار، وائی
کرامت علی کرامت
لکشمن ریڈی
مجید خاں، ایم. اے
محبوب علی
محسن، ایس. ایم
محفوظ علی صدیقی
محمد ابراہیم
محمد احسن
محمد امین
محمد حکیم الدین
محمد شاہ علی
محمد شہاب الدین
محمد عبدالرحمٰن خاں
محمد عنایت الرحمٰن خاں
محمد منیرالدین
محمد نعیم صدیقی ندوی
محمود علی خاں
مرتضیٰ، ایس. ایم
مرزا صغیر احمد بیگ

مقبول فاطمہ
مقصود احمد
مقصود شاہ خاں
منظور عالم
میر حامد علی
میر لیاقت علی
ندوی، اے. ایچ
نزہت جمیل (مسز)
نسیم انصاری
نعیم الدین، ایس.
نسیمہ انصاری
نقوی، ٹی. ایچ
نواب حسن خاں
والسیدیا، ایل. ایس
وٹھل ریڈی
وحیدالدین، ایس
درما، اے. آر
ویدیا، ایل. ایس
ہاشم، ایم
ہاشم قدوائی
ہنومنت راؤ، ڈی
یاسین مظہر صدیقی
یادو، آر. ایس
یوسف کمال

آثار قدیمہ

آثارِ قدیمہ

آثارِ قدیمہ

تمہید

انگریزی میں آرکیالوجی (Archaeology) کی اصطلاح یونانی الفاظ آرکیاس (Archaious) بہ معنی قدیم اور لوگاس (Logas) بہ معنی "علم" سے بنائی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے لفظی معنی ہیں "آثارِ قدیمہ یا قدیم باقیات کی صحیح واقفیت اور علم"۔ تاہم اس اصطلاح کا مطلب کسی قدر بدل گیا ہے اور اس میں وہ شعبۂ علم بھی شامل کر لیا گیا ہے جو "قدیم انسانی سرگرمیوں کے آثار" سے بحث کرتا ہے۔ جہاں انسانی سرگرمی کے بارے میں اساطیر اور قدیم قصوں سے بھی معلومات حاصل ہوتی ہوں وہاں بھی یہ اس وقت تک آثاریات کا جزو تصور نہیں کیے جاتے جب تک کہ ان کی تائید شہادت سے نہ ہوتی ہو یعنی قدیم انسان کی سرگرمیوں کے مادی آثار کا کسی نہ کسی شکل میں زمین سے برآمد ہونا ضروری ہے۔ اس علم کے ذریعہ کھدائی اور دوسرے طریقوں سے حاصل کی گئی قدیم اشیاء، آثار اور باقیات کی تفتیش کی جاتی ہے اور ان کے باقاعدہ مشاہدے اور مطالعے سے بنی نوع انسان کی زندگی اور تاریخ کے ارتقائی مرحلوں اور مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس علم کا واحد مقصد انسانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ارتقائی مدارج کے تعین میں تفتیش و تحقیق کرنا اور اپنی تحقیق و نتائج کو باثبوت منظم، مستنبط اور مرتب طریقے پر محققین اور عوام کے سامنے پیش کرنا اور ہر عہد کی انسانی زندگی اور اس کے معاشرے کی تاریخ سے ان کو روشناس کرانا ہے۔

اس سلسلہ میں "زمین سے برآمد ہونے" کی اصطلاح بھی ایک خاص مفہوم رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آثاریات زیادہ تر زمین میں مدفون ماضی کی باقیات کو کھود کر نکالنے ہی کا نام ہے۔ تاہم یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ آثاریات کا کام قدیم مساکن یا بستیوں، سِکّوں اور ماضی کی دوسری باقیات کو کھود کر نکالنے سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ آثاریات میں اور بھی سرگرمیاں شامل ہیں۔ ماہر آثاریات کا پہلا کام تو یقیناً یہ ہوتا ہے کہ قدیم آثار مثلاً اوزار اور ہتھیار، برتن اور عمارتوں کو زمین سے برآمد کرے لیکن سائنٹفک اصولوں کے مطابق ایک مرتبہ ان آثار کو برآمد کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کس طرح محفوظ اور باقی رکھا جائے۔ اور دریافت شدہ اشیاء سے متعلق صرف معلومات شائع کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان کی تشریح و توضیح کا فرض بھی انجام دیا جائے۔ تشریح و توضیح سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ آثار کا رشتہ ان کے پیدا کرنے والوں کے حالات سے بھی جوڑا جائے۔

اس بنا پر آثارِ قدیمہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ "علم آثارِ قدیمہ عتیقیات کا ایسا باقاعدہ مطالعہ ہے جس میں قدیم قوموں اور باشندوں کی تاریخ اور بود و باش کے تانے بانے، ان کی عمارات، قبرستان یا آخری آرام گاہوں، اوزار و ہتھیار اور برتن اور زیورات کی ان باقیات سے تیار کیے جاتے ہیں جو ایسے دور سے تعلق رکھتی ہیں جن کا کوئی تحریری مواد نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو بہت کم"۔

تاریخ صحیح معنی میں اپنا تحریری ریکارڈ رکھتی ہے۔ لیکن انسانی سرگرمیاں یا یوں کہیے کہ انسانی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جبکہ تحریر کا رواج نہیں تھا۔ انسان اس کرۂ ارض پر تقریباً پانچ لاکھ سال سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تحریر کو ایجاد ہوئے صرف چند ہزار سال گزرے ہیں پس تاریخی ریکارڈ کی عدم موجودگی میں علم آثاریات نے ہی زمین میں مدفون انسان کی مادی باقیات کے مطالعہ کے ذریعہ تاریخ کے مفہوم کو بڑی وسعت دی ہے۔

آثاریات سائنس بھی ہے اور آرٹ بھی۔ سائنس کی حیثیت سے وہ ایک ضابطۂ فکر ہے اور اس لحاظ سے وہ فن ہے کہ ایک محقق آثاریات کو ہر ہر قدم پر کھدائی کے دوران قدیم آثار اور یادگاروں کی حفاظت کے سلسلہ میں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو پیش کرنے میں بڑی فن کارانہ مہارت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ دوسرے معنی میں ایک ماہر آثاریات بیک وقت عالم اور مورخ بھی ہوتا ہے اور میدان میں کھدائی کے کام میں عملی حصہ بھی لیتا ہے۔ تاہم کام کی وسعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ہی شخص یہ سب فرائض انجام نہیں دے سکتا اور نہ ہی یہ سب صلاحیتیں ایک ہی شخص میں موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے آثارِ قدیمہ میں قدم قدم پر مختلف ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ماہر علم کتبات، پتھروں، مجسموں اور سکوں وغیرہ کی تحریر کا مطالعہ کرتا ہے۔

اسی طرح آثاریات کے باضابطہ اور باقاعدہ مطالعہ اور صحیح تعبیر و تعیّن کے لیے دوسرے علوم کی مہارت بھی لازمی ہے جن میں علم لسانیات، علم کیمیا، علم طبقات الارض، علمِ عکاسی (فوٹوگرافی)، علم ہندسی (انجینیری) یہاں تک کہ کوزہ گری کے فن سے واقفیت بھی شامل ہے۔

مندرجہ بالا تشریح سے ظاہر ہے کہ آثاریات کا تعلق دوسرے موضوعات سے بھی کافی گہرا ہے۔ تاریخ سے تو اس کا رشتہ بہت ہی قریبی ہے۔ جو مورخ تاریخ کو انسانی ارتقاء کا ایک عمل قرار دیتا ہے وہ آثارِ قدیمہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آثارِ قدیمہ میں علم الانسان سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ تہذیبوں کے علم کے بغیر قدیم تہذیبوں کو ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح فن تعمیر کا علم رکھے بغیر ہم قدیم عمارات کے صحیح نقشے تیار نہیں کر سکتے۔

پانچ ادوار — ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے نزدیک انسانی سرگرمیوں اور اس کے آثار میں منقسم ہوتے ہیں؛ اس نہج پر:

۱۔ ما قبل تاریخ دور کے آثار
۲۔ اصل تاریخ دور کے آثار
۳۔ ابتدائی وسطی دور کے آثار
۴۔ قرون وسطیٰ اور اس کا آخری زمانہ
۵۔ ابتدائی تاریخ دور کے آثار

ان تمام حصوں میں آثارِ قدیمہ کا، عالمی پس منظر میں، سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ البتہ ہندوستانی آثار کا اور بالخصوص اس کے اصل تاریخ دور کے آثاریات کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ذیلی براعظم ہند، پاکستان و بنگلہ دیش کا اصل تاریخ دور کا تمدن بھی اپنی مخصوص نوعیت کی وجہ سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

ماقبل تاریخ دور کے آثار

تحریر کی ایجاد سے پہلے کے انسانی حالات علم آثار قدیمہ کے ذریعہ معلوم کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے محقق کو ارضیاتی ماضی کی صبر آزما گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ یوں بھی ماضی کا کوئی بھی مطالعہ کسی نہ کسی طرح مطالعۂ تاریخ ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ماقبل تاریخ کی حد تک اس مطالعہ کے ماخذ اور ذرائع تحریری نہیں ہوتے اس لیے تحریر سے ہٹ کر دوسرے ذرائع سے ان معلومات کو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ان ہی دیگر اشاروں کی مدد سے ہم ماضی کو زندہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانی نسل کی تاریخ اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ترتیب پاتی ہے۔

اس دور و دراز زمانے کو ہم جن وسائل سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں ان میں تراشیدہ پتھر، چقماق، سنگ مردہ یا سخت چونے کا پتھر، ہڈیوں سے بنے ہوئے نوک دار اوزار، پائیدار زیورات، یادگار کے طور پر نصب شدہ بڑی بڑی سلیں، تصاویر، غاروں کی دیواروں پر بنائے ہوئے نقش و نگار، مٹی کی مورتیاں اور برتن شامل ہیں۔ البتہ یہ چیزیں وہ تفصیلی معلومات نہیں فراہم کر سکتیں جو ہمیں کسی تحریر یا مخطوطے سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مخطوطہ کی بہ نسبت زیادہ پائیدار ہوتی ہیں یہ تمام چیزیں مادی تمدن کی ہو بہو تصویر پیش کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا سلسلہ دنیا میں انسانی زندگی کے آغاز تک پہنچتا ہے۔ اس لیے ماقبل تاریخ دور کے محقق کے لیے بیس لاکھ سال پہلے کے حالات کا کھوج لگانا کوئی بہت زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ دراصل ماقبل تاریخ دور کا محقق ہی نوع انسانی کے اس ابتدائی زمانہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے تاہم اس میں ایک قباحت بھی ہے۔ ان اشیاء کی تشریح و توضیح انتہائی مشکل کام ہے۔ چقماق کے تراشیدہ اوزار، غاروں کی رنگ برنگی تصویریں اور جلی ہوئی ہڈیاں اظہار حال کی وہ صلاحیت نہیں رکھتیں جو انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں مٹی کی تختیوں پر تحریر کردہ ریکارڈ میں پائی جاتی ہے۔ جیسے کہ ضابطہ حمورابی (Code of Hamurabi) یا بحر مردہ کے مرغول - Dead Sea Scroll - ہیں۔ اسی لیے ایک محقق آثار قدیمہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات اور اشاروں کو جوڑ کر اپنی کہانی تیار کرتا ہے۔ پھر بھی یہ کافی نہیں ہوتا۔ اس دور کا صحیح ماحول پیدا کرنے کے لیے سارے مواد کا پورا پورا تجزیہ ضروری ہے۔

دستیاب شدہ ہڈی کے آلات سے ایک محقق یہ قیاس کر سکتا ہے کہ ماقبل تاریخ دور میں خور و نوش کا انتظام کس قسم کا ہوگا۔ یہاں پائے جانے والے جانوروں اور مچھلیوں کی ہڈیوں سے وہ یہ اندازہ لگائے گا کہ اس وقت کے شکاریوں کی غذا کیا تھی۔ اسی طرح زمین پر پڑی ہوئی تلچھٹ کا تجزیہ آتش نشان سے متاثرہ مٹی پر پودوں کے باقی نشانات کا مطالعہ اور معجزانہ زرگل کی مہین لکیروں کا مشاہدہ جن کا اب تک محفوظ رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اس علاقہ کی آب و ہوا اور وہاں کے نباتات پر روشنی ڈالتے ہیں اس کے علاوہ ایک محقق قدیم جغرافیائی ماحول کا بھی پتہ چلا سکتا ہے اور قدیم آثار کی بنا پر انسانوں کے علاوہ دیگر انواعِ حیوانات کے ارتقا کا خاکہ بھی تیار کر سکتا ہے۔

خوش قسمتی سے ایسا بہت سارا مواد ہماری دسترس میں ہے۔ کچھ سال پہلے تک ایک محقق آثار کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس مواد کو تاریخی ترتیب سے کس طرح تقسیم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اب تک زیادہ تر یات ہی کی مدد سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ یعنی زمین کی مختلف پرتوں کی گہرائی اور ان میں سے جو مختلف اوزار اور انسانی و حیوانی باقیات دستیاب ہوتی ہوں ان کے باقاعدہ مطالعہ سے سنین کا تعین کیا گیا ہے۔

ان حالات میں واقعات کا تسلسل ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد حجری کا یا موسٹیرین (Mousterian) سنگ تراش یا نینڈرتھل Neanderthal کا آدمی غاروں میں بسیرا کرنے والے ریچھوں کا ہم عصر تھا۔ اس طرح آخری سنگ تراش دور حجری کے آخری زمانے یا میگڈلینین Magdalenian تہذیب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دور کو رینڈیر دور Reindeer بھی کہا گیا ہے۔ واضح رہے کہ سنہ وار یا واقعات کے تاریخی سلسلہ کے تعین میں ایٹمی طبیعیات کی ترقی سے بے انتہا مدد ملتی ہے۔ چنانچہ اب ریڈیو کاربن ۱۴ طریقہ یعنی نامیاتی مادہ میں کاربن کی شرح انتشار کی صحیح پیمائش کے ذریعہ پچاس ہزار سال تک کے دور کے سنین معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں غلطی کا امکان صرف چند صدیوں بلکہ بعض اوقات چند دہوں تک ہی محدود رہتا ہے۔ ریڈیائی پوٹاشیم کی ارگون میں تبدیلی کے ذریعہ ہم مزید کئی لاکھ سال اور آگے تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور اسٹرونشیم کی مدد سے ہم دنیا کے قدیم ترین پہاڑ کی عمر معلوم کر سکتے ہیں۔ اس طرح تاریخی دور کے صحیح سنین اور ماقبل تاریخ دور کے غیر یقینی سنین کے درمیان فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

قدیم حجری دور کی سنگریزی تہذیبیں

انسان کی سب سے قدیم دست کاری کی ابتدا کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ زمانہ کے اس وسیع فاصلہ کی وجہ سے گنتی کے اعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سال کے ہوتے ہیں۔ مشرقی افریقہ میں جھیل وکٹوریہ کے جنوب مشرق میں اولڈ وائی گارج (Olduvai Gorge). ایک ایسا مقام ہے جہاں چار گوشی اشیاء (Quaternary) کثیر تعداد میں بکھری پڑی ہیں۔ یہ غالباً انسانی سرگرمی کی پہلی مثال ہے جو اب تک دریافت ہوئی ہے۔ اور اس کا زمانہ دس لاکھ سال پہلے سے شروع ہو کر زیادہ نہیں تو بیس لاکھ سال تک ضرور چلا جاتا ہے۔ یہاں کھدائی کے دوران ڈاکٹر ایل۔ ایس۔ بی۔ لیکے اور ان کے ساتھیوں کو جانوروں کے ڈھانچوں کا ملبہ کچھوا اور مچھلی جیسے ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی باقیات اور دودھ پلانے والے جانوروں (پستانیہ) کے آثار بڑی مقدار میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اناج اور

کھردرے لا وائی پتھر اور سنگ مردہ کے بنے ہوئے اوزار بھی ملے ہیں۔ یہ آلات پتھروں کو توڑکر یا ان کے پرت نکال کر یا پھر انہیں دوسرے سنگ ریزوں سے رگڑکر بنائے گئے ہیں لیکن یہاں ایسے اوزار بھی دستیاب ہوئے ہیں جنہیں باقاعدہ تراش کر مختلف شکلیں دی گئی تھیں۔

اسی تہذیب کے اوزار جیسے چاڈ (Chad) کے شمالی صحرائے اعظم اور جنوبی افریقہ و بچوانالینڈ میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ فرنچ ریویرا میں بھی اسی تہذیب کی نشانیاں ملی ہیں۔ اس زمانے کے انسانی ڈھانچوں کے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان آلات کے بنانے والے موجودہ انسان کی طرح اپنے پیروں پر سید ھے نہیں کھڑے ہو سکتے تھے۔ بلکہ کھڑے ہونے کی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نوع کے انسان کو اصطلاحی زبان میں حیوان (Homo-Habitis) سے موسوم کیا گیا ہے۔

دورخی اوزار

پتھروں کے بنے ہوئے چھرے اور اوزار جو انتہائی بھدے قسم کے ہوتے تھے ایک طویل عرصے بلکہ ہزاروں سال تک قایم رہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعد کے آثار میں ان ابتدائی اوزاروں کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ شکلیں بھی ملتی ہیں۔

فرانس کے مقام ابرویل کی سوم وادی میں ابتدائی حجری دور کی سنگریزی تہذیب (The Pebble Cultures) کے بعد کی دست کاری کے آثار دریافت کیے گئے ہیں۔ یہ دورخی اوزار آتش فشانی پتھروں سے پتھر کے ہتھوڑوں کے ذریعہ تراشے گئے ہوں گے۔ ان کے سرے نوک دار ہیں۔ ان کو دریافت کرنے کے بعد انہیں دستی کلہاڑی کا نام دیا گیا تھا لیکن اب انہیں دورخی اوزار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ماقبل تاریخ کا انسان ان اوزاروں سے چھیلنے سوراخ کرنے، کوٹنے اور کاٹنے کے علاوہ طرح طرح کے کام لیا کرتا تھا۔ بعد میں پتھروں کے ہتھوڑوں کی بجائے لکڑی کے ہتھوڑے استعمال ہونے لگے اس کی وجہ سے اوزاروں میں اور صفائی پیدا ہو گئی۔ ان اوزاروں کو ایشیولی (Acheulian) تہذیب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ نام سینٹ ایشیویل کی مناسبت سے دیا گیا ہے جو امینیز کے نواح میں واقع ہے۔ وسطی دور یعنی بعد کے ایشیولی دور میں ان اوزاروں کی تراش خراش میں اور نفاست پیدا ہوئی۔ یہ اوزار اعلیٰ پائے کے علاوہ وزن میں بھی ہلکے ہوتے تھے بعض دورخی اوزار پتھر کی بڑی پرتوں سے بھی بنائے گئے اور انہیں مخصوص کاموں کے لیے، جن کی اب تک وضاحت نہیں ہو سکی ہے، مختلف شکلیں دی گئیں۔

سنگریزی تہذیب (Pebble Culture) کی طرح ایشیولی تہذیب کے آثار بھی اس قدیم براعظم کے اکثر حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں برفانی دور کے سرد موسم میں رہنے والے جانور موجود ہیں اور ایلیفاس اینٹیکس (Elephas Antiques). جیسے گرم موسم کے جانور بھی اس تہذیب کی انواع انسانی کو جرمنی میں ماؤر مان. (Mauer Mann). پیکنگ سے قریب چو کو تیان (Chou-Kou-Tien) .... میں سنان تھروپس (Sinan-thropus)— اور جاوا میں پیتھیکنتھروپس (Pithecanthropus) .. کا نام دیا گیا ہے۔

پرت دار تہذیب

دورخی اوزاروں کی دست کاری کے آخری دور میں کام کرنے کا ایک نیا طریقہ معلوم کر لیا گیا۔ اس سے قبل چقماق پتھروں کو بہت ہی بھونڈے طریقے سے تراشا جاتا تھا لیکن اب یہ کام زیادہ مہارت سے اور باقاعدہ طریقہ پر ہونے لگا۔ یہ آلات و اوزار دس تا پندرہ سینٹی میٹر لابنے بیضوی شکل کے ہوتے تھے۔ یہ نوک دار اوزار لیوالوازین (Levalloisian) اوزار کہلاتے ہیں۔

فرانس کے ایک مقام موسیٹر (Moustier) میں ایسے متعدد اوزار ملے ہیں جو لیوالوازین (Levalloisian) اوزاروں سے مشابہ ہیں۔ تاہم ان میں زیادہ صفائی نہیں ہے۔ شاید یہ خام مال کی عدم دستیابی یا فنی مہارت کی کمی کا نتیجہ ہو۔ مقام کی مناسبت سے اس تہذیب کو موسٹیری (Mousti-erian) — تہذیب کا نام دیا گیا۔ انسان کی جس نوع نے موسٹیری یا اس قسم کی تہذیب کو جنم دیا ہے اسے نیندرتھل آدمی (Neanderthal Man) کہا جاتا ہے۔ اس تہذیب کی نمائندگی کرنے والے انسانوں کی کھوپڑیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں مثلاً اسٹائن ہایم (Steinheim) کی کھوپڑی سوانسکومبے (Swanscombe) کی کھوپڑی فونٹشوا (Fontechvade) کی کھوپڑی وغیرہ۔ نیندرتھل آدمی غارنشین ریچھوں کے ساتھ آخری برفانی دور کے انتہائی سرد زمانے میں تھا۔ اس سردی میں زندہ رہنے والے دوسرے جانوروں میں دودھ پلانے والے جانور، نیلی لومڑی۔ ایک خاص قسم کی گلہری اور برفانی چوہے شامل ہیں۔ انتہائی سردی کی وجہ سے اس دور میں غذائی اشیا کا زمین سے حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے صرف شکار سے حاصل شدہ خوراک ہی پر گزارا کیا جاتا تھا۔ عام طور سے رینڈیر، جنگلی گھوڑے اور بیل کا شکار ہوتا تھا۔ شکار کے لیے سخت پتھر کے نوک دار اوزاروں کو لکڑی کے دستوں میں پیوست کرکے بھالوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ماقبل تاریخ کا آدمی ان ہتھیاروں کو اسی چابکدستی سے استعمال کرتا تھا۔ جیسے آج کا قصاب اپنے لوہے کے چھرے کا وہ جانوروں کو مارتا، ان کا گوشت پوست علاحدہ کرتا اور ان کے ٹکڑے کرتا تھا۔

نیندرتھل آدمی آج کے انسان کی طرح روح کا بھی ایک تصور رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی زندگی کے بعد کوئی زندگی ضرور ہو گی۔ تب ہی تو وہ اپنے مردوں کو خندقوں میں دفن کرکے محفوظ کرتا تھا جو خاص اسی مقصد کے لیے کھودی جاتی تھیں۔ فرانس کے مقام لافیراسی (La Ferrassie) اور فلسطین کے کارمل پہاڑی علاقے میں ایسی قبریں ملی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ نیندرتھل آدمی کے ساتھ ہتھیار اور غذا بھی دفن کی جاتی تھی۔

رینڈیر دور کی تہذیب

تیس ہزار سے دس ہزار سال قبل کا دور اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ابتدائی زمانے کے مقابلہ میں نسبتاً کم وزن اور مختلف اقسام کے اوزار استعمال ہونے لگے تھے۔ اس زمانے کا موسم بھی زیادہ تر سرد ہی رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا انسان بھی غاروں میں بود و باش رکھتا تھا۔ اس دور کو آریگنےسین (Aurignacian) . میگڈلینین (Magdalenian) اور سولیوٹرین (Solutrian). زمانوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان مختلف ناموں یا اوزاروں کی مختلف نوعیت کے باوجود یہ سارا دور ایک ہی ہے۔

غاری آرٹ کی ابتدا پہلے پہل اسی زمانہ میں ہوئی۔ یہ آرٹ زیادہ تر

جانوروں کی شبیہوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ کوئی عجیب سی بات بھی نہیں۔ کیوں کہ اس ابتدائی دور میں انسانی زندگی جانوروں سے بڑی مشابہت اور مناسبت رکھتی تھی اور انسان کی خود اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بڑی حد تک جانوروں ہی سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس، اسپین، ناروے، اطلاس کی پہاڑیوں اور الجزائر، صحرائے اعظم اور ہندوستان کے ماقبلِ تاریخ دور کے آرٹ کے بڑے حصہ کا موضوع روز مرّہ کی شکاری زندگی ہی سے متعلق ہے۔ بعض محققین کے نزدیک ساحری، مذہبی رسوم پرستی اور جنسی جذبات جیسے عوامل بھی اس آرٹ کے محرکات میں شامل رہے ہیں۔

قدیم حجری دور کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترقی کی رفتار انتہائی سست رہی۔ نہ معلوم اوّلین انسان کے ابتدائی حجری اوزار استعمال کرنے سے پہلے کتنے لاکھ سال کا زمانہ گزرا تھا۔ تراشیدہ سنگریزوں سے دورخی اوزار بنانے تک ہی کوئی دس لاکھ سال گزر گئے البتہ نوک دار اور چھیلنے کاٹنے والے ہتھیار بنانے میں ممکن ہے اس سے کم عرصہ لگا ہو۔ حیوان (Homo-Habitis) کے آغاز سے لے کر شکاری تہذیب کے عروج کے درمیانی 20 لاکھ سال کے دوران بے شمار تجربے کیے گئے گو ان تجربات کی رفتار بھی بہت سست تھی۔ اس دور میں آبادی بھی کم تھی۔ دورخی اوزار کی تہذیب کے زمانے میں سارے مغربی ممالک کی آبادی چند ہزار نفوس تک محدود رہی ہوگی۔ افریقہ میں دورخی اوزار کی جو کثیر تعداد دریافت ہوئی ہے اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہاں کی آبادی زیادہ ہوگی، کیوں کہ یہ سارا ذخیرہ دس لاکھ سال سے زیادہ عرصہ کے دوران جمع ہوتا رہا۔ ترقی کی سست رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان راہ و رسم پیدا کرنا انتہائی دشوار تھا۔

وسطی حجری دور

رینڈیر دور کے بعد نویں اور پانچویں ہزار سالہ عرصہ میں ہرن کا زمانہ آیا۔ اس وسطی حجری دور میں رینڈیر کا علاقہ شمالی یورپ تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ تبدیلی اس لیے آئی کہ اسی دوران میں موسمی حالات قابل برداشت ہوگئے اور مغرب میں تقریباً پانچ ہزار سال پہلے بڑے گھنے جنگلات اُگ آئے۔

وسطی حجری دور کی معیشت میں بھی تبدیلی اور تنوع پیدا ہوتا گیا۔ شکار کے ساتھ ساتھ جنگلی پھل اور خول دار مچھلی اور گھونگے بھی اکٹھا کیے جانے لگے۔ غذا حاصل کرنے کا یہ طریقہ تقریباً ساری دنیا میں رائج رہا۔

چوں کہ اب انسانی زندگی کا دار و مدار تمام تر شکار پر نہیں تھا۔ اور غذا یابی کے دوسرے وسائل بھی پیدا ہوگئے تھے۔ اس لیے اب نوعِ انسانی کی بقا یقینی ہوگئی۔ اس کے بعد اناج جمع کرنے کا کام، دوسرا اہم قدم تھا جسے ساری دنیا نے تقریباً ایک ساتھ اٹھایا۔ ایران اور فلسطین میں درانتی کا رواج شروع ہوا۔ اس کا قبضہ ہرن کے سینگ سے بنتا تھا اور اس میں نوک دار پتھر استعمال ہوتے تھے۔ تقریباً سات ہزار سال ق۔م میں ایسی درانتیاں موجود تھیں۔ مغربی ممالک میں اسی مقصد کے لیے پالش کیے ہوئے پتھر کے چاقو استعمال ہوتے تھے۔ لگ بھگ اسی زمانہ میں جنوبی امریکہ میں واقع پیرو میں مکئی کی پیداوار ہوتی تھی۔

وسطی حجری دور کے انسان نے اوزار سازی میں مگدلینی روایات کو باقی رکھا اور پتھر کی چیپوں اور کوچیوں سے مختلف قسم کے بھالے اور برچھوں کے نوک دار سرے تیار کیے۔ اس نے ایک پتھر سے کئی مقصدوں میں کام آنے والے اوزار بنا کر ایک بڑا قدم آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ اب ان اوزاروں کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوا۔

غرض اس طرح وسطی حجری دور نے اپنے گوناگوں وسائل اور پھیلی ہوئی معیشت کے ذریعہ جدید حجری دور کے عظیم معاشی انقلاب کی راہیں ہموار کردیں۔

جدید حجری دور

جدید حجری یا نیولیتھک دور (Neolithic) میں انسان نے ترقی کرکے گلہ بانی اور کھیتی باڑی شروع کردی اور وہ اناج پیدا کرنے لگا۔ اب یہ چیز بہت معمولی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت ماقبلِ تاریخ کے تہذیبی ارتقا کا یہ بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔ اور یہ انقلاب چھٹے اور پانچویں ہزار سالہ دور کے اندر ساری دنیا میں رونما ہوا۔ نوعِ انسان کی زرعی زندگی کا اصل وطن اور گہوارہ مغربی ایشیا کو قرار دیا جاتا ہے۔

اناج کی پیداوار کا جو سلسلہ چلا اس میں ہل کے ذریعہ زمین جوتنا، پہلے سوراخوں میں پھر قطار در قطار تخم ریزی کرنا، سخت دندانے دار درانتی سے فصل کاٹنا اور چکی کے پاٹوں میں اسے پیسنا یہ سب ہی شامل ہے۔ کھیتی باڑی کے روایتی طریقوں کے مطالعہ سے ماقبلِ تاریخ دور کی آخری منزل پر کافی روشنی پڑتی ہے کیوں کہ نسبتاً یہ منزل ہمارے زمانے سے بہت قریب ہے۔

پہلے پالتو جانور یعنی، کتا اور بکری تقریباً پہلی فصلوں کے ساتھ ہی نمودار ہوگئے شکار پر بسر کرنے والے ابتدائی خانہ بدوشوں کو چرواہوں میں تبدیل کرنے کا سہرا ایرانی اور صحرائے اعظم کے سطح مرتفع کے گلہ بانوں کے سر ہے۔ پانچویں اور چوتھے ہزار سالہ دور میں منطقہ حارّہ کے قریبی علاقوں کا موسم خشک ہوچکا تھا۔ لہٰذا دریاؤں سے سینچی جانے والی زمینوں کی قدر ہونے لگی نتیجتاً مغربی ایشیا کے ہلالی شکل کے زرخیز علاقے (Fertile Crescent) بشمول وادئ دجلہ و فرات، اور سندھ اور نیل کے نشیبی علاقوں اور وادیوں میں جہاں پانی وافر مقدار میں دستیاب ہوتا تھا آبادی بڑھنے لگی۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں پہلے پہل زمین کو جوتنے اور جانوروں کو سدھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دریاؤں کے کناروں کی مٹی سے برتن بنائے جانے لگے اور جانوروں کے چمڑے سے بنی ہوئی اشیا، کا زمانہ ختم ہوگیا جنہیں ابتدائی دور کے شکاری برتنوں کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ اینٹیں بننے لگیں جنہیں دھوپ میں خشک کیا جاتا تھا۔ مغربی ممالک میں زرعی ارتقا کی رفتار نسبتاً سست رہی حالاں کہ عوامل اور واقعات کے رونما ہونے کا سلسلہ ایک ہی تھا۔ بہرحال اب ساری دنیا میں دیہی معیشت کی منزل آپہنچی۔ امریکہ میں چکولواپن (Chicoloapan) نامی مقام پر چھ ہزار سے تین ہزار ق۔م کے جدید حجری دور کی نشانیاں ملی ہیں۔ جن میں مکانات، چولہے، چکیاں اور رفلہ شامل ہیں۔ لیکن برتن سازی سے واقفیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

یورپ میں کتا، چھٹے ہزار سالہ دور میں میگلی موس (Maglemose) کی شمالی دلدلی تہذیب کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ پہلا پالتو جانور تھا اس کے

بعد سانڈ، سور اور دوسرے جانور سدھائے اور پالے گئے۔

جدید حجری دور کے انسان کی سب سے بڑی مصروفیت جنگلوں کو کاٹ کر زمین ہموار کرنا تھی۔ اس مقصد کے لیے شکار کے روایتی ہتھیار کی بجائے ایک نیا مضبوط اور طاقت ور اوزار درکار تھا چنانچہ سارے یورپ میں اس دور کے لکڑہاروں نے آرے، کلہاڑی، کدال اور بیلچے سے اپنے آپ کو لیس کرلیا۔

عراق عرب (میسوپوٹامیہ) ایشیائے کوچک اور مشرقی بحیرہ روم سے جدید حجری دور کی ایک دوسری رَو نکلی اور ڈینیوب کی وادی تک پھیل گئی یہاں کے باشندے اپنے کرہ نما تھیلوں اور لمبے ظروف کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ تقریباً ۲۵۰۰ ق۔م کا ہے۔

جدید حجری دور کی ایک تیسری رو مصر سے بحر متوسط اور اس کے جزائر کے ذریعہ یورپ پہنچی۔ یہ تہذیب خوش نما برتنوں اور چیندے دار آرائشی ظروف کے لیے مشہور تھی۔ اس طرح کی مخصوص برتن سازی شمالی افریقہ کے ساحل مراقش، اسپین اور فرانس میں رائج تھی۔ بحر متوسط کی اس تہذیبی رو سے مغرب کے جدید حجری دور کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس دور میں بھیڑوں اور بکریوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کو بھی سدھایا گیا۔ نیز سخت پتھر کو تراش کر کلہاڑی بنانے کے فن میں مہارت حاصل کی گئی۔ غرض تیسرے ہزار سالہ دور کے ختم تک یورپ میں زراعت اور دست کاری کی روایات قائم ہوچکی تھیں اور ان کی خصوصیات نے واضح شکل اختیار کر لی۔ زرعی نظام کے تحت اس وقت کی تقریباً ساری قابل کاشت زمین پر کھیتی باڑی کا آغاز ہوچکا تھا۔ اور انسان نے غاروں میں پناہ لینے کی بجائے ہموار زمین پر بود و باش اختیار کی اور وہ کھیتوں کے قریب جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگا۔

ہندوستان ماقبل تاریخ دور میں

ہندوستان کے ماقبل تاریخ دور کو پاکستان سے الگ کر کے پیش کرنا انتہائی دشوار ہے اسی لیے اس مطالعہ میں برصغیر ہند و پاکستان کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

قدیم حجری دور میں اوزار بنانے والے انسان کا سراغ غالباً دوسرے برفانی (Glaciation) دور کی آخری منزل میں ملتا ہے۔ پوٹھوار (راول پنڈی) کے علاقہ اور شمالی نربدا کی وادی ہوشنگ آباد (مدھیہ پردیش) میں پتھروں کے ایسے کھردرے اوزار ملے ہیں جو اس زمانے کی حجریاتی پرتوں میں دبے ہوئے تھے۔ غالباً یہ اوزار اس دور کے اوزاروں کے مماثل ہوں گے جو جاوا والے آدمی کا دور کہلاتا ہے۔ مغربی اور وسطی یورپ کے اس زمانہ کے بنے ہوئے پرتی اوزار اور پرت نکال کر بچے ہوئے پتھر کے اندرونی حصہ (Core) کے بنے ہوئے اوزاروں میں صاف تمیز کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی پرتی دست کاری (Flake Industry). کو ماقبل سوہن دستکاری سے موسوم کیا گیا ہے تاکہ سوہن وادی کی ابتدائی حجری تہذیبوں کے مقابلہ میں اس کے زمانے کا تعین ہوسکے۔ سوہن ندی دریائے سندھ کی معاون ہے اور پوٹھوار کے علاقے سے گزرتی ہے۔ ایسے پرتی اوزار ایشیا کے کسی اور حصہ میں نہیں ملے۔

ہمالیہ کے دوسرے بین برفانی (Inter-Glacial) دور میں سوہن اور سندھ کی وادی میں اور جہلم سے قریب پونچھ کے علاقے میں مزید اوزار تیار کیے گئے۔ ان اوزاروں کو سوہن تہذیب کے اوزار کا نام دیا گیا ہے۔ اس تہذیب کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ابتدائی سوہن اوزار بعض اوقات گول سنگریزوں سے اور بعض وقت اصل پتھر سے توڑے ہوئے ٹکڑوں سے بنائے جاتے تھے۔ اس کا زمانہ چار لاکھ سے دو لاکھ سال پہلے کا ہے۔ دوسرے دو مرحلوں میں اوزار کی بناوٹ میں کسی قدر ترقی ضرور ہوئی لیکن پھر بھی ان میں کوئی خاص بہتری پیدا نہ ہوسکی۔

سوہن تہذیب کے علاوہ ایک اور اہم تہذیب مدراسی دست کاری یا دستی کلہاڑی (Hand-axe) کی صنعت کہلاتی ہے۔ یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ مدراس کے علاقے میں اس قسم کی دست کاری بکثرت پائی جاتی تھی۔ اس کا تعلق دوسرے بین برفانی دور سے ہے۔ اس طرح کے اوزار افریقہ اور فرانس میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان، جنوبی افریقہ مغربی یورپ اور جنوبی انگلستان میں پائے جانے والے بعض اوزاروں میں اس قدر مشابہت ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے بمشکل تمیز کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے قدیم حجری دور کے ابتدائی اوزاروں سے ان کے بنانے والے کی زندگی پر بہت ہی کم روشنی پڑتی ہے۔ ہم یہ محض قیاس سے کہہ سکتے ہیں کہ ان اوزار کے بنانے والے خانہ بدوش شکاری دوسری چیزیں مثلاً لکڑی، ریشہ، گھاس، پتوں یا چمڑے کی بنی ہوئی اشیاء بھی استعمال کرتے ہوں گے۔ اس طرح سوہن کے چھرے یا مدراسی کلہاڑی کے استعمال کے بارے میں بھی صحیح علم نہیں ہے۔ صرف قیاس آرائی ہی سے کام لے کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے ان سے گوشت یا لکڑی کاٹنے یا جڑیں کھودنے کا کام لیا جاتا ہو۔ بہرحال اس ابتدائی حجری دور کی سب سے اہم خصوصیت اس کی طویل مدت ہے جو آج سے تقریباً چار لاکھ سال قبل سے شروع ہوکر آخری برفانی دور بلکہ دس ہزار سال پہلے تک پر محیط ہے اس طویل عرصہ میں، موجودہ معلومات اور دریافتوں کی روشنی میں، انسان نے فنی اعتبار سے بہت کم ترقی کی ہے۔

وسطی حجری دور میں جو اوزار ہندوستان میں رائج تھے وہ مایکرولتھ (Microliths) یا چھوٹے پتھر کے اوزاروں پر مشتمل تھے۔ یہ اوزار پتھر کے ٹکڑوں سے بنائے جاتے تھے۔ اور اکثر لمبائی میں ایک انچ سے بھی کم ہوتے تھے ان میں سے بعض تکونی اور مربع شکلوں کے ہوتے تھے۔ کسی دستہ یا قبضہ میں جوڑے بغیر انہیں استعمال کرنا ممکن نہ تھا۔ ان میں سے بعض تیر کی نوک یا پھل کا کام دیتے اور بعض ہڈی یا لکڑی وغیرہ کی نالی دار موٹھوں کے سروں پر پیوست کیے جاتے تھے۔ ہندوستانی مایکرولتھ گاؤدم دندانے دار اور ہلالی شکل میں ہوتے اور یشپ (Jasper) عقیق (Agate) چقماق (Flint) اور سنگ مردہ (Quartz) سے تیار کیے جاتے تھے۔ وہ مقامات جہاں سے یہ اوزار نکلے ہیں سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تامل ناڈو ریاست کے تنے ویلی، کرناٹک میں برہمگیری، مہاراشٹر میں کھنڈیولی اور دیگر ساحلی مقامات، دریائے گوداوری کے نشیبی علاقے، دریائے نربدا کی وادی، گجرات میں دریائے سابرمتی کی وادی اور مغربی بنگال میں ضلع بردوان، اور وادیٔ کشمیر جیسے دور و دراز مقامات میں یہ اوزار بکثرت دستیاب ہوئے ہیں۔ ان دستیاب شدہ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ وسطی حجری دور میں ہندوستان میں

بھی انسان اپنے پیش رو قدیم حجری دور کے انسان کی طرح دریاؤں کے کنارے یا آبشاروں سے قریب غاروں میں رہنا پسند کرتا تھا۔

قدیم حجری دور میں انسان کو جگہ جگہ پھر کر اپنی غذا فراہم کرنی پڑتی تھی۔ لیکن جدید حجری دور کا باشندہ اناج اگانا سیکھ چکا تھا اس کے ساتھ ہی مستقل سکونت کا رواج بھی بڑھنے لگا۔ اس کے نتیجے میں مادی وسائل میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور لین دین کا طریقہ بھی رائج ہو گیا۔ اناج کی افراط کی وجہ سے آبادی بھی بڑھتی گئی اور نئے نئے کام اور مخصوص پیشے نکل آئے۔ یہ ساری تبدیلیاں دنیا کے دوسرے مقامات کی طرح بلاشبہ ہندوستان میں بھی واقع ہوئیں۔ جدید حجری دور کے بعد ہندوستان میں آہنی دور شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جدید حجری دور کے اوزار سب سے پہلے دی ترّا (De Terra) نے اس صدی کے تیسرے دہے میں، کشمیر میں بہ مقام برزہوم (Burzabom) اور شمال مغربی ہند کے دیگر علاقوں میں دریافت کیے۔ یہاں بعد میں کی گئی کھدائی کے دوران تین تہذیبی ادوار کے آثار دستیاب ہوئے۔ جو یکے بعد دیگرے بارہ فٹ دبیز تہوں میں دبے ہوئے تھے۔ اس میں سے سب سے اوپر کی تہ کا تعلق تاریخی دور اور مابعد ہڑپا تہذیب سے ہے اور سب سے نچلی تہ جدید حجری دور کی نمائندگی کرتی ہے۔

جدید حجری دور کے تراشیدہ اور پالش کیے ہوئے ہتھیار مثلاً کلہاڑے اور تیشے وغیرہ اتر پردیش کے اضلاع ہمیر پور، باندہ، الٰہ آباد، مدھیہ پردیش کے چھتر پور اور پنا، گڑھی مورپلا اور بھوتے رائی نیز بہار کے ہزاری باغ، پٹنہ، رانچی، سنتھال پرگنہ اور سنگ بھوم، مغربی بنگال کے اضلاع دارجیلنگ اور ندیا۔ اروناچل پردیش کے گاروا اور آندھرا پردیش کے کرنول اور ورنگل اور کرناٹک کے علاقہ بنگلور اور چتلدرگ کے علاوہ تمل ناڈو کے کئی مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان میں ماقبل تاریخ دور کی حد تک آثار قدیمہ کی تحقیقات واقعی قابل قدر ہیں۔ ان دریافتوں کی وجہ سے نہ صرف سندھ کی تہذیب چالکولیتھیک (Chalcolithic) سے ہم روشناس ہوئے جہاں حجری اور دھاتی اوزار بیک وقت استعمال کیے جاتے تھے، بلکہ اس سے بھی پہلے کے تین حجری دور (قدیم حجری وسطی اور جدید حجری دور) پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ چالکولیتھیک (Chalcolithic) کے بعد کی بڑی سلوں (Megalithic) والی تہذیب کے آثار بھی دستیاب ہوئے ہیں جو ہندوستان کے جنوبی حصہ میں خاص طور سے زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود تھی۔

اصل تاریخ دور کے آثار

وادی سندھ کی تہذیب

"تاریخ" سے بالعموم مراد ماضی کا وہ بیان ہے جو تحریری اسناد سے حاصل کیا گیا ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسا بیان دوسرے ماخذ خصوصاً آثاریات پر بھی مبنی ہو اسی لیے تحریر کی ایجاد سے پہلے انسانی ارتقا کی سرگزشت، ماقبل تاریخ کہلاتی ہے۔ اس کے بعد ابتدائی تاریخ (Proto History) کا دور آتا ہے جس کا ہمیں کچھ تحریری مواد تو مل جاتا ہے لیکن اپنے بیان کو مربوط شکل دینے کے لیے ہمیں زیادہ تر آثار شہادت ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

برصغیر ہند و پاکستان میں واقع وادی سندھ کا تمدن جسے ہڑپا تہذیب کہتے ہیں، تحریر سے ناآشنا نہیں تھا۔ اس کا اپنا ایک رسم الخط بھی تھا جس کے نمونے اس تمدن سے متعلق متعدد مہروں پر دستیاب ہوئے ہیں لیکن اس تحریر کو آج تک پڑھا نہیں جا سکا ہے اور اس لیے ہمیں اس قدیم تمدن کے تانے بانے قدیم آثار ہی سے تیار کرنے پڑتے ہیں۔

یہ تمدن یقیناً ویسا شاندار نہیں تھا جیسا مصر یا عراق عرب (Mesopotamia) کا تمدن تھا۔ تاہم وہ مقامات جہاں اس کا نشو و نما ہوا شہری منصوبہ بندی کی غیر معمولی مہارت کی وجہ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ تحقیق و تفتیش میں اضافے اور وسعت کے ساتھ ساتھ اس تمدن کا علاقہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو اس کا مرکز وادی سندھ کا علاقہ تھا تاہم اس کے آثار بلوچستان، افغانستان اور ہندوستان میں بحیرہ عرب سے لے کر ہمالیہ کے دامن اور دریائے جمنا کے شرقی علاقے میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

یہ بات یقیناً تعجب خیز ہے کہ اس وسیع تمدن کا پتہ ابھی حال ہی میں چلا ہے یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے جب کہ راکھال داس بنرجی اور دیا رام ساہنی کو موہن جودڑو (سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں) اور پنجاب کے منٹگمری ضلع میں ہڑپا کے مقامات پر بعض مہریں اتفاقاً مل گئیں۔ اس وقت ان مہروں کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ حالاں کہ کوئی پچاس سال قبل ان ہی مقامات سے اسی طرح کی بعض مہریں سر آرتھر کننگھم کو بھی دستیاب ہوئی تھیں۔ بعد میں جب ان مقامات پر باقاعدہ کھدائی کا کام شروع ہوا تو پتہ چلا کہ یہ علاقہ کسی زمانہ میں کانسے کے دور کے نہایت ہی ترقی یافتہ تمدن کا مرکز رہا ہے۔

۱۹۲۱ء میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے سر جان مارشل کی رہنمائی میں ہڑپا اور موہن جودڑو دونوں مقامات پر کھدائی شروع کی۔ ہڑپا دریائے راوی کے شمال میں واقع ہے اور اس کے تقریباً ۶۵۰ کیلو میٹر جنوب میں، موہن جودڑو دریائے سندھ پر واقع ہے۔ کھدائی کے نتیجے میں کانسے کے دور کے دو شہر برآمد ہوئے جہاں کانسے اور تانبے کے ساتھ ساتھ حجری اوزار بھی مستعمل تھے۔ تاہم کوئی آہنی شے اس کھدائی میں دستیاب نہیں ہوئی۔

یہ عظیم شہر خالص منصوبہ بندی کے اصولوں کے مطابق تعمیر کیے گئے تھے۔ جن میں نہایت ہی اچھے ڈیزائن کے مکانات ہندسی شکلوں پر بنی ہوئی سڑکوں کے کنارے واقع تھے۔ اکثر مکانات کشادہ تھے۔ بعض میں حمام بھی موجود تھے۔ جن کے پانی کا نکاس باقاعدہ موریوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ یہ موریاں مکانات کی طرح نہایت ہی عمدہ پختہ یا جلی ہوئی اینٹوں سے تیار کی جاتی تھیں۔ گھروں میں حوض اور بیت الخلا بھی موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان باشندوں کے نزدیک حفظان صحت اور صفائی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

سر جان مارشل کی رہنمائی میں اور پھر ۱۹۴۴ء کے بعد سر مارٹیمر وہیلر کی سرکردگی میں جو کھدائیاں ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ اصل شہر کے باہر قلعے بھی تعمیر

وادیٔ سندھ کی تہذیب کا شاہکار نمونہ
کانسے کی بنی ہوئی رقاصہ
۲۵۰۰ ق-م

ابوالہول کا ایک منظر

کیے گئے تھے، جو برج دار فصیلوں سے محصور ہوا کرتے تھے۔ نیز وہاں جا بجا اونچے چبوتروں پر بعض یادگاریں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ نہیں ہوئی، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چبوترے غالباً سیلاب سے حفاظت کی غرض سے بنائے جاتے تھے۔ موہن جودڑو میں دریافت شدہ ایسی ایک عمارت کے بارے میں سر مارٹیمر وہیلر کا خیال ہے کہ وہ اناج کے ذخیرے کے لیے بنائی گئی ہوگی اور اونچے چبوترے والی تعمیر بھی غالباً اناج ہی کا گودام ہوگی۔ اسی طرح کی ایک عمارت ہڑپا میں بھی دریافت ہوئی ہے لیکن اس کی جائے وقوع قلعہ سے باہر ہے۔

اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے حیات بعد الموت کے قائل تھے۔ ان کے مُردے لیٹی ہوئی شکل ہی میں دفنائے جاتے تھے اور ان کے سر جانب مغرب ہوتے۔ نعش کے اطراف میں روزمرہ استعمال کی اشیاء اور تحائف بھی رکھے جاتے تھے۔ پکائی ہوئی مٹی سے بنی دھرتی ماتا کی بے شمار مورتیاں ان دونوں مقامات پر دستیاب ہوئی ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کے ساتھ دیوتاؤں کے چھوٹے مجسمے بھی ملے ہیں۔ تاہم مندر قسم کی کسی عمارت کا سراغ نہیں ملا۔ موہن جودڑو میں نہانے کا ایک بہت بڑا حوض بھی دریافت ہوا جس کے اطراف چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں سب ہی لوگ نہلاتے ہوں گے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ جگہ مذہبی اہمیت بھی رکھتی ہو۔ دھرتی ماتا کی مورتیوں کا ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہاں کے باشندوں میں بارودری کا عقیدہ (Fertility Cult) کسی نہ کسی شکل میں رائج تھا۔ ایک مہر پر تصویر میں ایک سینگدار آدمی آلتی پالتی مارے یوگا کے آسن میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کے اطراف کئی جانور ہیں بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ حیوانات کے دیوتا شیو ہی کی پرانی شکل ہے۔

وادیٔ سندھ کا آرٹ بھی نہایت ترقی یافتہ شکل میں ملتا ہے۔ موہن جودڑو اور ہڑپا کی انسانی اور حیوانی مورتیاں کانسے میں اس مہارت اور چابکدستی سے ڈھالی گئی ہیں کہ وہاں کا آرٹ دنیا کے قدیم تمدنوں کے انتہائی ترقی یافتہ آرٹ کے مماثل معلوم ہوتا ہے۔

وادیٔ سندھ کے بچوں کے ہر قسم کے کھلونے ملتے ہیں۔ ان میں پہیہ دار چڑیاں اور لکڑی پر اچھلنے کو دنے والے بندر اور تاگے کو جنبش دینے پر حرکت کرنے والے جانور بھی ہیں جو اپنا سر ہلا کر بچوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ سونے کے زیورات اور نیم قیمتی پتھروں کے منکوں پر جس قسم کی کاریگری ہے اس سے وہاں کے دستکاروں کی مہارت کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ غرض یہ کہ اس تہذیب نے ایسے بے شمار فنکار پیدا کیے جو حرکت کو گرفت میں لانے، حسین نقوش کو ابھارنے، یہاں تک کہ ہنسانے والی حرکتوں کو پیش کرنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔

دیگر فنون میں ظروف سازی سب سے اہم فن تھا۔ چاک پر مخصوص شکلوں کے مٹی کے برتن بنائے جاتے تھے جو زیادہ تر گلابی رنگ کے ہوتے اور ان پر سرخ اور سیاہ روغن میں جانوروں اور درختوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ سب سے مقبول درخت پیپل کا تھا۔ فنکار ہندسی شکلوں کا بھی بکثرت استعمال کرتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ برتن سازی اور خاص طور سے جنوبی عراق (میسوپوٹیمیا) کی برتن سازی سے تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ میں بڑی مدد ملی ہے۔

وادیٔ سندھ کے تجارتی تعلقات جنوبی عراق سے بھی تھے مثلاً سمیریا اور اکاد میں ہڑپا کی سی مہریں اور دیگر اشیاء دستیاب ہوئی ہیں۔

ہڑپا تہذیب کے عہد کے بارے میں مذکورہ بالا آثار کے تقابل سے پہلا اندازہ یہ لگایا گیا تھا کہ یہ تہذیب ۲۵۰۰ ق۔م سے لے کر ۱۵۰۰ ق۔م کے دور پر حاوی رہی ہوگی لیکن ۱۹۴۹ء سے یہاں کی برآمد شدہ نامیاتی اشیاء پر کاربن ۱۴ کے جو تجربے کیے جا رہے ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ کسی قدر مختصر یعنی ۲۳۰۰ ق۔م سے لے کر ۱۵۰۰ ق م تک تھا۔ ان تجربوں کے باوجود سر مارٹیمر وہیلر جیسے محقق کی یہی رائے ہے کہ ہڑپا تہذیب کے ان دو شہروں کا زمانہ حقیقتاً اس سے کہیں زیادہ طویل رہا ہوگا۔

حالیہ تحقیقات کے باوجود تہذیب کی ابتدا کا صحیح طور پر کوئی سراغ نہیں ملتا اگرچہ ان کے ذریعہ ہڑپا تہذیب سے بھی زیادہ قدیم تہذیبوں مثلاً پاکستان میں امری اور کوٹ دی جی اور ہندوستان کے صوبہ راجستھان میں کالی بنگان جیسے مختلف مقامات کی تہذیبوں پر کئی محققین نے روشنی ڈالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہڑپا تہذیب کا ان پیش رو تمدنوں سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ زیر زمین پانی کی نشیبی سطح اور خندقوں کے سیلاب زدہ ہونے کی وجہ سے موہن جودڑو کی آخری تہ کی اب تک کھدائی نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو کچھ کوششیں کی گئی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی تہذیبی آثار موجود ہیں۔

جہاں تک اس تہذیب کے پھیلاؤ اور نشو و نما کا تعلق ہے، یہ مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک کے قریب بارہ تیرہ سو کیلومیٹر کے طول و عرض میں رائج رہی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ایسے بے شمار شہروں اور دیہاتوں کے آثار ملے ہیں جنہیں ہڑپائی تہذیب کی نشانیاں کہا جا سکتا ہے مثلاً گجرات کے ضلع احمد آباد میں واقع لوتھل کا شہر اسی قسم کا ہے۔ اگرچہ یہ شہر بہت چھوٹے ہیں تاہم یہ ہڑپا تہذیب کی بنیادی خصوصیات کے حامل ہیں مثلاً شہری منصوبہ بندی پکائی ہوئی اینٹوں کے مکانات جن میں حمام، موریاں اور اینٹوں سے بنے ہوئے کنویں ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے الگ تھلگ برج دار فصیلوں سے محصور قلعے سنگ جراحت کی مہریں جن پر عبارت اور جانوروں کی شبیہیں کندہ ہوتی تھیں۔ مخصوص ہڑپائی ظروف یا برتن وغیرہ، نیز مُردوں کو دفنانے کے طریقے بھی یکساں ہیں۔ لوتھل جو کسی زمانے میں سمندر سے قریب تھا تنہا وہ مقام ہے جہاں بندرگاہی تنصیبات کے آثار ملتے ہیں یہ بندرگاہ مستطیل نما تھی جس میں پانی کو روکنے اور چھوڑنے کے دروازے بھی موجود تھے۔

موہن جودڑو اور ہڑپا اور اس تہذیب کے دیگر چھوٹے شہر صفحۂ ہستی سے کیوں مٹ گئے اس کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ایک زمانہ میں آریائی حملوں کو اس کی وجہ قرار دیا جاتا تھا کیوں کہ موہن جودڑو میں کئی ایسے انسانی ڈھانچے دستیاب ہوئے ہیں جو زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ لیکن آج کے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ایسا کوئی حملہ ہوا بھی تھا تو وہ ہڑپا تہذیب کے زمانہ عروج کے گزرنے کے بعد دور زوال میں وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ زوال کا سبب دریائے سندھ کے لگاتار سیلاب بھی ہو سکتے ہیں یا پھر اینٹوں کی بھٹیوں میں جلانے کے لیے درختوں کی کٹائی یا آب پاشی کے نظام سے لاپرواہی کو بھی اس کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ سوال اب تک قطعی طور پر حل نہیں ہو سکا ہے، اسی طرح ہڑپا تہذیب کے خاتمے کے بارے میں بھی ہماری معلومات تشنہ ہیں۔

ابتدائی وسطی دور کے آثار

مصر

مصر اور مشرق کے دوسرے علاقوں میں یونان کے عہدِ قدیم (ہیلینی دور) سے

متعلق واحد شہر جس کے باقیات میں کھدائی باضابطہ طور پر عمل میں آئی وہ دورا یوروپس (Daura Europos) ہے۔ وسطی فرات کے کنارے واقع یہ مقام ایک لشکر گاہ تھا اس کی تعمیر میں معمولی قسم کے پتھر، روڑے اور کچی اینٹ استعمال ہوئی ہے۔ ہیلینی دور میں یہ کوئی اہم مقام نہیں تھا۔ اس کا نقشہ ہپوڈامی (Hippodamian) طرز کا ہے اور وسط شہر میں مستطیل شکل کے بازار کے آثار ہیں۔ غالباً یہ علاقہ شام کے شہر لاوڈیسیہ (Laodicea) یا لتاکیہ (Latakia) جنوبی ترکی انطاکیہ (Antioch) بغداد کے قریب دریائے دجلہ پر واقع سیلوسیہ (Euleus) اور خزستان (ایران) میں ایولیس (Seleucia) پر واقع شوش (Susa) جیسے بڑے بڑے سیلوکسی شہر بھی اسی طرح کے تھے لیکن ان شہروں میں ہیلینی عہد کے کوئی آثار برآمد نہیں ہوئے ہیں۔

یہی نقشہ مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ شہر دریائے نیل کے ڈیلٹا (Delta) کے مغرب میں ساحل پر ایسی جگہ تعمیر کیا گیا تھا جہاں ایک جزیرے اور اس تک پہنچنے والے سنگ بستہ راستے کی وجہ سے دوہری بندرگاہ بن گئی تھی۔ اس جزیرے پر روشنی کا ایک مینار یا لائٹ ہاؤس تعمیر کیا گیا تھا۔ شہر لمبائی میں بسا ہوا تھا۔ اس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ اس میں یونانی، مصری اور یہودی باشندوں کے مکانات تھے اور ایک قصر شاہی بھی تھا جہاں اب میوزیم اور کتب خانہ ہے۔ شہر کے جنوبی حصے میں پاپے مینار نامی مقام پر سیراپیوم (Serapeum) یا سیراپس (Serapis) دیوتا کے مندر کے آثار بھی برآمد ہوئے جس کے صرف تہ خانے اور محراب باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ٹالمی اوّل (۳۲۳ ق م ۲۸۵ ق م) نے اپنی یونانی اور مصری رعایا کے لیے بنوایا تھا لیکن کھدائی میں دریافت شدہ ایک زریں لوح سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مندر ٹالمی ثالث (۲۲۱ تا ۲۴۶ ق م) کے دور میں تعمیر ہوا تھا۔ مصر کے دوسرے مقامات پر ٹالمی خاندان کے حکمرانوں نے روایتی مصری طرز کے مندروں کی بھی تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا ان میں سے ایک مندر بالائی مصر میں بہ مقام ادفو (Edfu) ہے جو دست برد زمانہ سے تقریباً پوری طرح محفوظ رہ گیا ہے۔ اس کی دیواروں پر مندر کی رسوم کی صراحت تصویری رسم الخط میں درج ہے۔ یونان سے ترک وطن کر کے یہاں بسنے والوں کے لیے جو شہر اور دیہات بنائے گیے تھے ان کے آثار قاہرہ کے قریب نخلستان فایوم (Fayum) کے سوا کہیں اور نہیں ملے ہیں۔ اس مقام پر کئی ایسی آبادیوں کے نامکمل آثار برآمد ہوئے ہیں جن میں سنگی مندر بنے ہوئے تھے اور کچی اینٹ کے متعدد مکانات ایک دوسرے سے بہت ہی قریب اور بے ترتیب بنائے گئے تھے۔

مشرق میں یونان کے عہد قدیم (ہیلینی دور) سے متعلق معلومات زیادہ تر اس کے آثار قدیمہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ اور بڑی حد تک یہ معلومات چٹانوں پر کندہ کتبوں سے ملی ہیں۔ ان کتبوں میں شہروں کے قوانین اور احکام، بادشاہوں کے مکتوب، شاہی فرامین، عدالتی فیصلے اور ہر قسم کی سرکاری تحریریں اور اس کے علاوہ خانگی خطوط، بہی کھاتے معاہدات اور یادداشتیں درج ہیں۔ متعدد منتشر یونانی ادب پارے بھی گرم آب و ہوا کی وجہ سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

ہیلینی حکمرانوں نے کثیر تعداد میں نہایت نفیس قسم کے چاندی کے سکے جاری کیے تھے جن سے بڑی مفید تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں بعض سکوں اور خصوصاً باختر کے (Bactrian) بادشاہوں کے جاری کردہ سکوں پر حکمرانوں کی شبیہیں بڑی حسن کاری کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ اس دور کی کوزہ گری یا ظروف سازی میں کوئی خاص بات نہیں سوائے سرخ رنگ کے سیمائی (Samian) اور میگاری (Megarian) پیالوں کے جن پر نقش کاری کے ذریعہ طرح طرح کے عجیب و غریب مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ اسی زمانہ میں اسی ڈھب کا دھات کا کام بھی ہوتا تھا لیکن اس کے آثار بڑی حد تک ناپید ہیں۔ گوہر تراشی اور رنگارنگ زیورات سازی کو مقبولیت حاصل تھی۔ اس زمانہ میں بڑے پانچ گیلن (۲۲۰۷ لیٹر) کے دو دستہ سفالی برتن اشیا کی مقدار کے پیمانے کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے جن کے دستے پر عام طور سے مقام اور تاریخ ساخت کی چھاپ ہوتی تھی۔ ان سے غلے شراب اور زیتون کے تیل کی تجارت کی گرم بازاری کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ ہیلینی دور میں شیشہ سازی کا آغاز ہو چکا تھا اور شام اور مصر میں اعلیٰ قسم کی بوتلیں اور پیالے کثیر تعداد میں بنتے تھے۔

روما

مشرق میں سلطنت روما (۲۷ ق م تا ۶ ۷ ۴ء) نے پہلے اپنے اقتدار کو بحال کیا اور اس کے بعد حدود سلطنت کو وسعت دی۔ بعد ازاں سیاسی جمود طاری ہو گیا اور بالآخر سلطنت زوال پذیر ہونے لگی پہلی صدی قبل مسیح میں روما میں خانہ جنگی کی وجہ سے مشرق میں اس کے زیر نگیں علاقوں میں زبردست تباہی آئی۔ اور ۳۰ ق م میں بہ مقام اسکندریہ اکیٹوین (Octavian) کی مکمل اور فیصلہ کن فتح یابی کے بعد مشرق میں واقع یونان قدیم کی سلطنت کے علاقے کمزور اور بے بس ہو گئے۔ پارتھیا کی ایرانی سلطنت نے سیلوکسی ریاست کی شکست و ریخت سے فائدہ اٹھا کر اپنی سرحدوں کو مغرب کی جانب دریائے فرات تک پہنچا دیا تھا مغرب میں روما کے علاقہ اور مشرق میں ایران کے علاقے کے درمیان چھوٹی چھوٹی بادشاہی ریاستیں قایم ہو گئی تھیں مثلاً کوہ امانوس کے علاقے کی ریاست کوماجین (Commagene) جو شاہ انتیوخوس (Antiochus) کی تدفین کی یادگار کی وجہ سے مشہور ہے یا یہودا (Judea) جس پر ادومائی (Idumea) کی حکومت تھی جس کا تذکرہ انجیل کے علاوہ فلاویس جوزیفوس (Flavius Josephus) کی تحریروں اور بحیرہ مردار (Dead Sea) کے غاروں میں (۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۲ء) دریافت شدہ جعلی اور قدیم کاغذ (Papyri) پر لکھی ہوئی تحریروں میں ملتا ہے یا عربستان (Arabia) کے زیر اقتدار نباطی عرب (Nabataean) جن کا شاندار پایۂ تخت رقیم (Petra) تھا اور اس علاقے میں واقع تھا جہاں اب اُردن کی شاہی ریاست ہے یا پامیرا (Palmyra) کا کارواں شہر جو شام کے ریگستان میں واقع تھا۔

۲۰ ق م میں آگسٹس نے پارتھیا سے صلح کرلی تو تقریباً ۲۵۰ سال تک سلطنت روما اور ایران کے مابین امن قایم رہا گو اس دوران چھوٹی موٹی سرحدی لڑائیاں نیرو (Nero) ٹراجن (Trajan) مارکس آریلیس (Marcus Arelius) اور سیپٹیمس سیویروس (Sepimus Severus) کے زمانے میں ہوتی رہیں ۱۰۶ ء میں ٹراجن نے صوبہ عرب (موجودہ اردن) کو اپنی سلطنت کی حدود میں شامل کرلیا۔ آرمینیہ کی ریاست کبھی روما کے زیر اقتدار آ جاتی تھی تو کبھی پارتھیا کی زیر نگیں رہتی تھی۔ تخمیناً ۲۲۴ء میں جب ...کے داماد اور پارتھیائی خانوادے کی جگہ جب فارس کے کٹر ایرانی ایرانیوں نے لے لی تو روما سے لڑائیوں میں شدت آگئی۔ تیسری صدی کے اواسط میں ساسانی ایک سے زیادہ دفعہ انطاکیہ میں داخل ہوئے اور تخمیناً ۲۶۰ ء میں انہوں نے شہنشاہ ویلیرین (Valerian) کو گرفتار کرلیا۔ تاہم یہ معمولی جنگیں تھیں جن سے ایشیائے کوچک لاوندیا (لیوانٹ) اور مصر کی آبادی زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ صنعت و تجارت کی بدولت ان علاقوں کی خوش حالی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ البتہ روما کی جانب سے عائد کردہ محاصل اور رومی دفتریت ان کے لیے تکلیف دہ ہوگئی تھی۔ ۲۶۷ ء میں ایشیائے کوچک پر گاتھی حملہ ہوا لیکن اس سے ان علاقوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ بازنطین سے انطاکیہ جانے والی مصروف فوجی شاہراہ جزیرہ نما کے وسطی علاقے کے لیے منفعت بخش ثابت ہوئی۔ مشرق کے ان صوبوں میں بہت سے تعمیری کام ہوئے۔ شہر زیادہ وسیع ہوگئے اور خصوصاً وسطی اور جنوبی ایشیائے کوچک، عراق، میسوپیٹیمیہ، اردن اور جنوبی فلسطین میں نئے شہر تعمیر کیے گئے چنانچہ مشرق کے سارے علاقے میں عمارتوں، دیواروں، پُلوں اور نہروں کے آثار ملے ہیں۔ جن کی تعمیر روڑے پتھر اور پکی اینٹ سے کی گئی تھی۔ ان تمام آثار سے پتہ چلتا ہے کہ روما والوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا شوق تھا جن میں کمانوں اور محرابوں کو بڑا دخل تھا۔ سرحدی علاقوں میں عام طور پر سنگ بستہ رومن سڑکوں اور سرحدی فوجی چوکیوں کے آثار بھی ملے ہیں۔

روما کے سکے حسن کاری کے اعتبار سے قدیم ہیلینی شاہی ریاستوں کے سکوں کے مقابلے میں گھٹیا تھے۔ دوسری صدی عیسوی کے دوران سکے میں چاندی کی مقدار گھٹا دی گئی تو (۲۷۰ ء) چیزوں کے دام غیر معمولی حد تک بڑھ گئے۔ فن مجسمہ سازی (Plastic Arts) کی تخلیقات مصر، شام اور ایران کے مذاہب سے متعلق تھیں۔ یہ فن اب مغرب میں بھی پھیل گیا تھا۔ مشرقی دیوتاؤں اور خصوصاً مصر کے آئسس (Isis) اوسیرس (Osiris) اور سیراپس (Serapis) کی چھوٹی مورتیاں اور مجسمے بنائے جاتے تھے۔ ان میں قبول عام ہارپوکرائٹس (Harpocrates) لیوانٹی بعل (Baal) اسٹراٹے (Astrate) اڈونس (Adonis) دوساریس (Dusares) بل (Bel) جوپیٹر ہیلیوپالیٹانوس (Heliopoltanus) اور جوپیٹر ڈالیکینوس (Dolioptanus) ایرانی متھرا (Mithras) اور اناطولی بڑی ماں (Great Mother) اور اٹیس (Attis) کے مجسموں کو حاصل ہوا ان کی ساخت میں ملے جلے مصری ہیلینی تصورات بروئے کار نظر آتے ہیں۔

مشرق کے دور دراز علاقوں میں قدیم ہیلینی تخلیقی اوصاف ایرانی لباس شاہی ساسانی آثار کی حجری منبت کاری، اور ہندوستان میں مقامی مذہبی تصورات کی صورت گری میں نظر آتے ہیں۔ پیکر تراشی کا یہ طرز گاندھارا آرٹ کے نام سے موسوم ہے۔ بدھ کے وہ قدیم مجسمے جو گاندھارا آرٹ کے زیر اثر تراشے گئے تھے صدیوں تک قابل تقلید رہے۔

دورا یوروپس (Doura Europos) میں منبت کاری کے جن نمونوں کا پتہ چلا ہے وہ متذکرۂ بالا آثار سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے نقش و نگار ایک یہودی عبادت گاہ میں ملے ہیں۔ یہ دونوں آثار تخمیناً ۲۵۰ ء کے ہیں۔

مشرق کی جو سرزمینیں روما کی سلطنت میں شامل تھیں ان کے بہترین آثار ریگستانی علاقوں میں برآمد ہوئے ہیں جیسے ہاترا (Hatra) جو ایران میں واقع ہے اور جہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں یا جیسے پامیرا جو "عروس ریگ زار" کہلاتا ہے دمشق اور فرات کے مابین شاہراہ پر واقع ہے۔ اس مقام پر قابل قدر آثار برآمد ہوئے ہیں۔ یہاں مندروں کے پس منظر میں مسقف راستوں تھیٹر، کونسل چیمبر، عدالت کارواں سرائے، اور بعل دیوتا کے عظیم الشان مندروں کے رنگا رنگ ماحول دیکھنے والے کے حافظے میں گھر کر لیتے ہیں۔

چین

منقش ظروف سازی کے ارتقا کے جن مراحل کا اب تک پتہ چلا ہے ان کے نام کانسو (Kansu) میں دستیاب شدہ ظروف کی مختلف اقسام کے مطابق رکھے گئے ہیں۔ اور صرف کانسو ہی وہ مقام ہے جہاں انواع و اقسام کے ظروف ملے ہیں۔ ان میں حسب ذیل وضع کا یکے بعد دیگرے سلسلہ نمایاں نظر آتا ہے۔ پان۔شان (Pan-Shan) ما۔چانگ (Ma-Ch'ang) سین تین (Hsien-Tien) اور شا۔چینگ (Sha-Ching) اس تسلسل کی طبقات الارضی شہادت کسی جگہ پر بھی نہیں ملتی لیکن سین۔تین (Hsien-Tien) کے ایک مقام پر کھدائی میں زمین کا ایک پرت ایسا ملا ہے جو یانگ شاؤ (Yang-Shao) پرتوں کے اوپر ہے۔ پان۔شان اور ما۔چانگ کی کھدائیوں میں دھات کی کوئی چیز نہیں ملی مگر سن۔تین اور شا چینگ میں کانسے کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔

سی۔این۔سون (Hsi-Yin-Ts'un) ایک وسیع رہائشی علاقہ تھا۔ وہاں جب پی ایل یوان (P.L. Yuan) اور لی چی (Lichi) نے ۱۹۲۶ء میں چھوٹے پیمانے پر کھدائی کی تو جا بجا سرخ، سیاہ خاکستری رنگ کی چیزیں زمین کے طبقات میں ایک کے نیچے ایک ملیں خاکستری رنگ کا پرت عام طور پر شانگ خانوادے کے عہد سے متعلق سمجھا گیا ہے۔ انتہائی مشرقی صوبوں (شانتنگ، انہوائی کیانگ، سوچیکیانگ) میں صرف سیاہ رنگ کے ظروف برآمد ہوئے ہیں رنگوں کی یہ ترتیب بڑی معنی خیز ہے۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ کانسو چین میں منقش سفال گری کا واحد مرکز تھا جہاں سے یہ فن دوسرے علاقوں میں پھیلا۔

انتہائی جنوبی علاقے میں سیاہ رنگ کی ظروف سازی کے ایک مرکز کا پتہ چلا ہے جو لیانگ چو (Liangchu) (چیکیانگ) میں تھا۔ اس مقام پر کھدائی میں پتھر کے اوزار نکلے ہیں جو جنوبی وضع (ماہی پشت نما کلہاڑی) کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے ظروف ملے ہیں جو ساخت میں مغربی ایشیا کے ظروف سے ملتے جلتے (پایہ دار پیالے) ہیں۔ اسی بناوٹ کے برتن چین میں نہ صرف لنگشان (Lungshan) میں بلکہ صوبہ زیچوان (Szechwan) میں بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے بڑی الجھن پیدا ہوگئی ہے اور ماہرین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے لمبے کھوکھلے دستے والے پیالے کانسو کی کھدائی میں کیوں نہیں ملے

اگرچہ ننگشان کی کھدائی میں رسم الخط کی موجودگی کا کوئی پتہ نہیں چلا لیکن بہت سی خصوصیات یہاں کے آثار میں ایسی ہیں جن کی بنا پر اس کلچر کا رشتہ شانگ خانوادے سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خاکستری رنگ کے شانگ ظروف اور کانسے کے بنے ہوئے قدیم وضع کے شانگ مجسمے، کوبا کی ہوئی مٹی کی تعیرات اوران میں تقدس کے لیے جانوروں کی ہڈیوں اورخصوصاً مونڈھے کی ہڈیوں کا استعمال سیاؤتون (Hsiaot'un) اور ہوچیاؤچوانگ (Hou-Chia -Chuang) میں شانگ بادشاہوں اور امرا کی سازوسامان سے لیس قبروں میں کانسہ، سفال، مرمرِیشب، مونگا ہڈی اور بارہ سنگھے کے سینگ سے بنی ہوئی اعلیٰ درجے کی نفیس اشیا دریافت ہوئی ہیں جن سے مدفون افراد کی افتادِ طبیعت کے بعض گوشوں اور ان کی عیش و آرام کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف ان کی جنگجویانہ ذہنیت کا سراغ کھدائیوں میں برآمد شدہ جنگی رتھوں، سازوسامان سے لیس گھوڑوں اور بھینٹ چڑھائے گئے قیدیوں کے جسم کے ڈھانچوں اور تلواروں کے علاوہ دیگر ہتھیاروں سے ملتا ہے۔ استخارے میں استعمال کی ہڈیاں اور کچھوؤں کے ڈھانچے بھی برآمد ہوئے ہیں جو تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔ اس لیے کہ ان پر فنِ حرب اور شکار سے متعلق عبارتیں شاہی اجداد کے لیے دی جانے والی قربانیوں فصلوں، مویشیوں کے گلوں کی تفصیلات اور موسم اور روزمرہ کے واقعات درج ہیں۔ یہ عبارتیں ایک ایسے رسم الخط میں لکھی گئی ہیں جو اس دور کی مروجہ چینی تصویری تحریر سے مختلف اور ایک مکمل لپی ہے جس کے آغاز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا ہے۔ شانگ آرٹ چین کے جوہرِ قابل کا ایک اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے اس کے آغاز اور ارتقاء کا بھی اب تک سراغ نہیں لگ سکا۔

ظروف سازی کے نمونے دھاری دار ظروف پر مشتمل ہیں جو ہند چینی کے ظروف سے مشابہ ہیں۔ ان برتنوں کی ساخت ہموار ہے اور ان کی گردن کے اطراف ہندسی نقوش نقش کاری اور کندہ کاری کے ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے پایہ دار ظروف پر سرخی اور سپیدی کے کچھ نشان اب بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تمدن جس سے ملتا جلتا تمدن شمالی علاقوں اور سمندر پار جزائر فلپائن میں دریافت ہوا ہے غالباً ایک دریا نورد قوم سے متعلق تھا اور شاید یہ لوگ وہی تھے جو یویہ (Yueh) کے نام سے موسوم ہیں۔ خام دھات کے مصرف سے دھیرے دھیرے واقفیت ہوئی تو اس فن میں کچھ تبدیلیاں آئیں اور یہ تمدن تیسری صدی قبل مسیح میں جنوبی چین پر ہان وتی (Han Wuti) فوجوں کی فتح یابی تک قایم رہا۔

جاپان

ابتدائی جومون (Jomon) عہد میں ریشے اور مٹی کے ریختے سے ظروف بنائے جاتے تھے۔ ظروف کے پیندے جو اس سے پہلے نکیلے ہوتے تھے اب چوڑے بنائے جانے لگے اور صیقل دار کلہاڑیاں بھی بننے لگیں۔ ایک خاص وضع کی ظروف سازی جس کا نام موراسو (Moroiso) تھا۔ دور دور تک عام ہو گئی تھی؛ اس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ظروف پر نقش کاری کی جاتی تھی۔ بعد کے دور میں دوسری قسم کے ظروف بننے لگے مگر کچھ عرصے تک موراسو کا بھی ساتھ ہی ساتھ رواج رہا۔ جومون عہد کے وسط میں جو برتن بنائے گئے ان پر نقوش زیادہ ابھرے ہوئے ہیں۔ ان ظروف کو مرغولہ دار نقش و نگار (Otamada; Katsuzaka) سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس دور کے دوسرے آثار میں عورتوں کی عجیب ڈھنگ کی سفالی مورتیاں اور پتھر کے عصا جو شاید لنگ کی علامت ہیں ملے ہیں۔ اس کے علاوہ صیقل دار اسطوانی شکل کی کلہاڑیاں بھی کھدائیوں میں دستیاب ہوئی ہیں؛ شمال مشرقی علاقے میں چار پہلو دار کلہاڑیاں برآمد ہوئی ہیں۔ جومون عہد کے نصفِ آخر میں نفیس قسم کے پتلے دل کے ظروف کا زیادہ رواج تھا۔ دھاری دار اور صاف سطح کا تضاد اور کندہ کاری سے آرائش ان ظروف کا ایک خاص ڈھنگ (Ubayama, Horinouch, Omori) تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہوریںوچی (Horinouchi) طرز ظروف سازی کے نمونے سارے جاپان میں دستیاب ہیں۔ اور اسی طرح بعد کے اور آخری جومون عہد کی کامیگاؤکا (Kamegaoka) طرز کی نہایت نفیس کوزہ گری کے آثار جاپان کے تمام علاقوں میں ملے ہیں۔

اس دور کی ظروف سازی میں نقش و نگار کے درمیان سادہ جگہ چھوڑ کر ظروف کو زیادہ دیدہ زیب بنایا گیا ہے اور استادے پر پیالہ بنانے کا طریقہ بھی شروع کیا گیا۔ شمال مشرقی جاپان میں عرصہ دراز تک رائج رہنے کے بعد جومون کلچر یکایک اس وقت ختم ہو گیا جب پہلی صدی قبل مسیح میں جنوب مغربی جاپان میں اسے ایک ایسے بڑھیا کلچر سے سابقہ پڑا جو دھات چاول اور گھوڑے کے استعمال سے واقف تھا۔

یایوئی عہد (Yayoi Period) نفیس سطح کاری کے سرخی مائل خاکستری رنگ کے ظروف جو وضع کے اعتبار سے کمہار کے چاک پر بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں پہلی بار ٹوکیو کی یاڈی نامی ایک سڑک پر دریافت ہوئے۔ یہ ظروف ان لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں جو جاپان میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے اور جنہوں نے یہاں ایک سلطنت کی بنیاد رکھی، جن آثار سے ظروف سازی میں تغیرات کا پتہ چلتا ہے ان میں سے یہ آثار بھی ہیں سفال سے بنی ہوئی سپاہیوں، عورتوں اور جانوروں کی مورتیاں اور مکانوں، جہازوں کے نمونے جو جومون دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں سے نمایاں طور پر بہتر ساخت کے معلوم ہوتے ہیں اسی سازوسامان میں ملے ہیں جو نعش کے ساتھ قبر میں رکھا جاتا تھا اسی طرح لوہے کے بنے ہوئے ہتھیار، زرہ بکتر، خود اور پنجہ نما زیورات (Magatama) بھی کھدائیوں میں برآمد ہوئے ہیں۔ جومون نسل کی اس آبادی نے جو یاماٹو (Yamato) آبادی کے ساتھ گھل مل نہ سکی۔ ۴۰۰ء سے چین کے دریاؤں سے مسلسل ربط قایم رکھا تھا۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ شمال مشرق کی جانب دھکیل دئے گئے۔

قرونِ وسطیٰ اور اس کا آخری زمانہ

الجیریا میں حمادی (Hammadites) خانوادے کے بارہویں اور تیرہویں صدی کے پایہ تخت قلات بنی حماد (Qal'at Bani Hammad) میں پی بلانشٹ (P. Blanchet) نے کھدائی شروع کی تھی اور ۱۹۰۸ء میں ایل ڈی بیلی (L.D. Beylic) نے اس کھدائی کا سلسلہ دوبارہ جاری کیا۔ اگرچہ یہ مقام محض ایک صوبہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس دریافت کی جب تفصیلات شائع ہوئیں تو شمالی

افریقہ کی تعمیر کاری اور خصوصاً سیکولر تعمیر کاری پر کافی روشنی پڑی نیز ظروف سازی اور دیوار کی آرائش کے بارے میں بھی قابل قدر معلومات حاصل ہوئیں مغرب میں اسلامی دور کے قصر دیوان کے آثار میں مدینۃ الزہرا شامل ہے جو دسویں صدی عیسوی میں قرطبہ کے خلفائے بنی امیہ کی قیام گاہ تھا۔ اس تعمیر کے کئی حصوں کی صفائی کی گئی اور دیواروں کی اندرونی سطح پر دیدہ ریزی سے بنائے ہوئے منبت کاری کے نمونوں کی درستگی کا کام کیا گیا۔ یہاں ایک میوزیم بھی ہے جس کے دیکھنے سے کھدائی میں برآمد شدہ تہذیب کے مساوی پہلوؤں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

غالباً سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ باضابطگی کے ساتھ کھدائیاں جرمن ماہر ایف ہرٹزفلڈ (F. Herizfeld) نے دریائے دجلہ کے کنارے سارہ میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان کی تھیں۔ اس مہم میں خلفائے عباسیہ کے نویں صدی کے پایہ تخت کے صرف ایک حصے کی کھدائی ہو سکی لیکن اس کے باوجود مسلم دنیا کے ایک مرکز میں حسن کاری کے اعتبار سے اس کے سب سے زیادہ اہم تعمیری دور (ہارون رشید کے دور کے چند ہی دہے بعد) میں مروجہ فنون لطیفہ اور طرز زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ شہر سامرہ بہت کم عرصہ تک آباد رہا اس لیے وہاں سے برآمد شدہ چیزوں کی مدد سے ان آثار کے زمانے کا تعین کرنے میں سہولت ہوئی جو دوسرے مقامات پر برآمد ہوئے مگر سامرہ کے آثار سے ملتے جلتے ہیں۔

ظروف سازی، شیشہ سازی، دیواری آرائش کاری، نقاشی اور اس کے علاوہ اس علاقے کی تاریخ سے متعلق کئی کتابچے شائع کیے گئے لیکن جن ماہرین نے کھدائی کی تھی ان کے انتقال کر جانے کی وجہ سے وہ جلدیں نہیں چھپ سکیں جو تعمیر کاری سے متعلق تھیں۔ اگر یہ جلدیں بھی چھپ جاتیں تو اس عہد کے مزید اہم گوشوں پر روشنی پڑتی۔

ازمنہ وسطیٰ کے ایران کے شاندار آثاری ماضی کی چھان بین زیادہ وسیع پیمانے پر صرف دو مقامات پر کی گئی۔ جے۔ ڈی۔ مارگن (J.D. Morgan) نے انیسویں صدی کے اواخر میں کھدائی شروع کی تھی لیکن وہ اور اس کے جانشین کھدائی کے صرف زمانہ قبل از تاریخ کے ہخامنشی (Achaemend) دور سے متعلقہ طبقات زمین سے دلچسپی رکھتے تھے تیرہویں صدی سے شروع کر کے اسلام سے قبل کے زمانے کے شہری علاقے تک کے برتنوں کی باضابطہ چھان بین کی گئی ان کھدائیوں میں حجری منبت کاری کے بہت سے نمونے، شیشے کی اشیا، حجری کندہ کاری کے نمونے دھات کی چیزیں اور دیواری نقاشی کے بعض نمونے بھی ملے ہیں۔ تمیز یعنی شہر ترمیز اور خوارزم (Khorezm Khiva) کے نظام جاگیرداری کے دور کے قلعوں میں ایران کے آثاری ماضی کے دوسرے گوشوں کی سوویت ماہرین اور خصوصاً ایس پی ٹالسٹوف (S.P. Tolstov) نے چھان بین کی۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان کے زمانے میں شام اور فلسطین میں آثار قدیمہ کے بہت سے کام ہوئے۔ اور خصوصاً اسلام کے اولین دور یعنی خلافت بنی امیہ اور اس کے بعد کی یادگاروں کی تلاش کی گئی جن کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کے نصف سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کامیابی اس مہم میں ہوئی جو پالمیرا کے قریب ریگستان میں واقع قصر الحیر الغربی (Qasr-al-Heir-al-Gharbi) سے متعلق تھی۔ فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ ڈانیل شلمبرگر (Daniel Schlumberger) نے یہاں پیکری نقش و نگار آرائشی منبت کاری اور نقاشی کے آثار حیرت انگیز حد تک بڑی تعداد میں دریافت کیے۔

دوسری بڑی جنگ کے اسی ماہر نے آثار قدیمہ کی ایک جماعت کے سرگروہ کی حیثیت سے افغانستان میں قندہار سے جنوب میں ۱۲۰ کیلومیٹر دور دریائے ہلمند کے کنارے واقع لشکر گاہ میں غزنوی حکمرانوں کے سرمائی پایہ تخت کے وسیع محلات کا پتہ چلایا۔ ان کھدائیوں کی بدولت خصوصاً گیارہویں اور بارہویں صدی کی سیکولر تعمیر کاری، دیواری آرائش اور نقاشی پر بڑی بصیرت افروز روشنی پڑی۔

مصر کے ابتدائی مسلم دارالخلافہ فسطاط (Fostat) ایران میں پیری پلس (Peresipolis) کے قریب اصطخر کے ابتدائی مسلم مرکز اور ازمنہ وسطیٰ کے ایک اہم ترین مرکز رے (موجودہ تہران کے نواح میں) شام کے شہر بالس (Balis) نیز ہندوستان میں پرانی دلی اور متعدد دیگر شہروں اور تاریخی مقامات میں چھوٹے پیمانے پر کھدائیاں ہوئیں۔ دوسرے مقامات میں کھدائی کا اصل مقصد قدیم تر تہذیبوں کا پتہ چلانا تھا۔ لیکن وہاں پہنچنے کے لیے اسلامی دور کے طبقات سے گزرنا ضروری تھا۔ ان پرتوں میں جو آثار ملے ہیں ان کی تفصیل مالیتوس (Meletus) بالبک (Baalbek) حماح (Hamah) انطاکیہ علی سار (Alisar) اور ہویوک (Huyuk) وغیرہ سے متعلقہ اصل رپورٹوں میں درج ہے۔

دور آہن

افریقہ میں دور آہن چھٹی صدی قبل مسیح میں بہ مقام میرو شروع ہوا جہاں ایک طرح کی مصری تہذیب ۵۵۰ ق م تا ۳۵۰ء تقریباً ایک ہزار سال کے عرصہ تک روبہ زوال رہی لیکن آہن گدازی کا فن صدیوں تک راز بنا رہا اور افریقہ میں اس کی جانکاری کی اشاعت کا آغاز دوسری صدی عیسوی کے اختتام سے قبل نہ ہو سکا جھیل چاڈ (Chad) غالباً آہن گدازی کا ایک ثانوی مرکز تھا جہاں سے یہ فن مغربی جنوب مغربی اور جنوب مشرقی علاقوں میں پھیلا۔ غالباً اس کے ساتھ ہی کم از کم مغربی افریقہ میں مرے ہوئے افراد کی شبیہ پتھر میں کندہ کرنے کا رواج شروع ہوا۔ اور اسی لیے نائیجیریا کے بنے ہوئے نوک (Nok) مجسمے، فن آہنگری سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جھیل چاڈ (Chad) کے قریب جو کھدائیاں ہوئیں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ابتدائی وضع کے کوزے بنتے تھے۔ جن کی تیاری میں فن آہن گری کی معلومات اور طریق کار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں عقیق کے مہرے اور ایسی چھوٹی مورتیاں بنائی جاتی تھیں جو قرطجینہ کی فن کاری سے فیض یاب معلوم ہوتی ہیں یونان اور روما کے عہد عتیق میں غالباً تہذیب کے اثرات مغربی افریقہ کے صحرائے اعظم کے شمال میں واقع علاقے میں فیضان (Fezzan) کے راستے پہنچے جو گارامانٹیس (Garamantes) کا وطن تھا۔ ایفی (Ifi) کے مشہور عالم کانسے کے بنے ہوئے سر کی ساخت کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس مجسمے کی ساخت میں پہلی صدی عیسوی کے کانسے کے بنے ہوئے کسی رومی مجسمے کا تاثر کارفرما رہا ہو۔ تمدنی اثرات افریقہ میں بحیرۂ احمر کے جنوب میں واقع دور افتادہ علاقوں تک بھی پہنچ گئے تھے۔ جس کا حال یونان کے پہلی صدی عیسوی کے ایک کپتان نے پیری پلس میرس ایریتھرائی (Periplus - Maris Erytbrae) میں لکھا ہے کہ۔ اندرونی علاقہ مردم بیزار قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس لیے خشکی کے ذریعہ صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع

اندرونی حصے تک بیرونی اثرات مدتوں نہیں پہنچ سکے۔ مشرقی ساحل کے علاقے میں یونانی اثرات کے بعد جنوبی عربستان کے اثرات آئے اور چوتھی صدی عیسوی میں میرو کی افریقی تجارت کا مرکز اکسوم (Axum) میں منتقل ہوگیا۔ اکسوم کی خوش حالی کا دارومدار ہندوستان اور روم کے مابین تجارت پر تھا اس لیے فطری طور پر افریقہ میں ہندوستانی اثرات اکسوم کے راستے داخل ہوئے جن کی بدولت مقامی باشندے علاوہ اور چیزوں کے بارش کے پانی کو روک کر تالاب بنانے کا فن سیکھ سکے ممکن ہے کہ روم کو افریقہ سے جو سونا براہ اکسوم جاتا تھا اس کا کچھ حصہ سینیگل سے آتا ہو۔ اور اس کی نقل و حمل افریقہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے والے اس راستے سے عمل میں آتی تھی جو ریگستان اور مغربی افریقہ کو بحیرۂ احمر سے ملانے والے جنگل سے ہوکر گزرتا تھا۔ مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جو علاقہ چلا گیا ہے اس کے چند مقامات پر سنگ بستہ تعمیرات اور کئی کمروں والے مکانات اور غالباً اکسومی (Axumite) اثرات کی یادگاریں ہیں۔ مصر کی سرحد پر واقع ایدہاب (Aidhab) اور زنجبار کے مابین چھوٹے چھوٹے تجارتی مرکزوں کے آثار ملے ہیں۔ یہاں چھوٹی چھوٹی مسجدیں بھی تھیں جن کی تعمیر میں بید مجنوں اور مرجانی کنکر استعمال ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کندہ کاری سے آراستہ ظروف، شیشہ سازی کے نمونے اور نادر سکے بھی برآمد ہوئے ہیں جو گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے ہیں۔ تیرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں یہاں کئی تجارتی قصبات تھے جن کے کھنڈروں میں ایک خاص قسم کے شیشے اور بید مجنوں کے ٹکڑے پائے گئے ہیں جنوب کی جانب سومالی لینڈ کے علاقے کا ربط مصر سے تھا اور اس سے زیادہ جنوبی علاقے اسلامی ہند سے متعلق تھے۔ مشرقی ساحل پر اس کے بعد کے دور میں جو آبادیاں انیسویں صدی تک قائم ہوئیں ان کی تاریخ کا تعین چینی ظروف اور دوسری درآمدہ اشیاء سے کیا جاتا ہے۔

بندرہویں صدی سے بعض ساحلی مقامات پر یورپی اثرات بھی ملتے ہیں۔

کئی مقامات پر جن کی تاریخ کا تعین آسانی سے کیا جاسکتا ہے کسی درآمدہ چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ اس بناء پر ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس علاقے کے ماضی کی بازیافت چٹانوں پر کی گئی نقاشی، گھریلو جانور تھیلوں کی چھاپ ملکیت، جائداد کی علامات، تعمیر کاری کے اسلوب، طریق تدفین، وسائل آبپاشی اور ہتھیار، مہروں، آویزں وغیرہ کی مدد سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابتدائی تاریخ دور کے آثار

ہندوستان

ہندوستان کے تاریخی آثار یات کا دور صحیح معنوں میں تیسری صدی ق - م سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل دو یا تین صدیوں کی بعض باقیات بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ٹیکسلا (پاکستان) اور راج گیر میں تاریخی مقامات کی کھدائی کے بعد جو آثار ملے ہیں ان سے تیسری صدی ق۔م کی تاریخ ہند پر روشنی پڑتی ہے۔ جن مقامات پر کھدائی کی گئی ہے ان میں منجملہ اور مقامات کے شمال مغرب کے علاقہ میں ٹیکسلا اور گاندھارا کے مقامات شمالی ہند میں صوبہ بہار میں نالندہ اور راج گیر، پاٹلی پترا (پٹنہ) لوریہ نندن گڑھ (چپارن) اور بسارھ (ویسالی ضلع مظفر پور)، صوبہ اتر پردیش میں راج گھاٹ اور سارناتھ (بنارس) اہی چھترا (بریلی)، بھیٹہ اور کوسامبی (الہ آباد) ساہیٹھ ماہیٹھ (شراوستی ضلع بہرائچ) کسیا یا کشینگر (دیوریا) اور متھرا صوبہ مغربی بنگال میں بانگڑھ (دیناج پور) بنگلہ دیش میں پہاڑپور (راج شاہی) اڑیسہ میں ششوپال گڑھ (پوری)، آندھرا پردیش میں ناگرجونا کنڈا (گنٹور) اور کونڈاپور (میدک)، پانڈیچری میں اریکامیڈو، صوبہ کرناٹک میں برہمگیری (چتل درگ) وغیرہ۔ مندروں اور خانقاہوں کے کھنڈر، بدھ کی مورتیاں، استوپوں کے آثار، مجسمے، زیورات، سکے اور دیگر مختلف اشیاء شامل ہیں۔ جن سے ملک کے مختلف ادوار کی سماجی، تہذیبی سیاسی اور معاشی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ٹیکسلا میں یکے بعد دیگرے تین شہروں کے کھنڈر دستیاب ہوئے ہیں۔ یعنی بھیر کا ٹیلہ سرکپ اور سرسکھ۔ کھدائی کے دوران پہلے دو مقامات میں بودھی استوپ اور خانقاہیں، سونے اور چاندی کے زیورات اور سکّے وغیرہ ملے ہیں۔ دستیاب شدہ اشیاء سے بھیر کی تاریخ کی بعض گم شدہ کڑیاں ملتی ہیں۔ یہ شہر غالباً پانچویں صدی ق۔م میں بسایا گیا تھا اور تین صدیوں تک باقی رہا۔ مگر وہ کسی نقشہ یا منصوبے کے مطابق بسایا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ مکانات بھی ٹوٹے پھوٹے پتھروں سے بڑے ہی بے ڈھنگے طریقے پر بنائے گئے تھے۔ غیر مسطح اور ناہموار پتھروں کے ستونوں سے کمروں کی چھتوں کو سہارا دیا جاتا تھا۔ کچی باؤلیاں بکثرت تھیں۔ اس مقام پر قیمتی پتھر زیورات اور سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ بعض سکے سکندر اعظم کے بھی ملے ہیں۔

بھیر ہی کے قریب سرکپ شہر کے آثار ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ شہر دوسری صدی ق۔م میں ایک خاکہ کے مطابق بسایا گیا تھا اور ہند یونانی حکمرانوں کی عمل داری میں شامل تھا۔ شہر کے اطراف ایک مٹی کی فصیل تھی۔ اور شہر کے بیچوں بیچ ایک لمبی سڑک تھی جس کے دونوں جانب رہائشی مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔ پہلی صدی ق۔م میں یہ شہر جانب جنوب ہتھیال کی بلندیوں تک پھیل گیا تھا۔ یہیں پر مختلف اقسام کے متعدد سکے دریافت ہوئے ہیں جن سے تاریخ کی بعض گتھیوں کو سلجھانے میں مدد ملی ہے۔ ان سکوں کی دریافت تک مورخین کے نزدیک یہ مسئلہ مابہ النزاع تھا کہ آیا کدفیس (Kadphises) خاندان کے کشان بادشاہوں کا دور پہلے رہا ہے یا کنشک خاندان کا۔

سرکپ (Sirkap) کے شمالی باب الداخلہ کے قریب کھدائی کے دوران ایک مندر کا پتہ چلا جو غالباً زرتشتی مذہب کا ہے۔ یہ مندر یونانی طرز تعمیر سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ ٹیکسلا اور گاندھارا کے علاقوں میں عیسوی دور سے پہلے کے بے شمار بودھی آثار ملے ہیں۔ ٹیکسلا ہر دیسی شہر (Cosmopolitan) تھا۔ جس کے تجارتی تعلقات دور دور کے علاقوں سے تھے۔

شمال میں کئی مقامات پر قدیم آثار دریافت ہوئے ہیں جن سے ان تاریخی واقعات کی بڑی حد تک توثیق ہوتی ہے جو اس زمانے کے سفر ناموں میں ملتے ہیں کھدائی کے لیے خود ان مقامات کے انتخاب میں فاہیان اور ہیون سانگ کے سفر ناموں سے بڑی مدد ملی ہے۔ راج گیر، پاٹلی پترا اور نالندہ کے آثار بھی ان ہی شہادتوں کی بناء پر دریافت ہوئے ہیں۔

راج گیر کے کھنڈر وادی کے ایک وسیع علاقہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ راجگیر کسی زمانے میں راجہ بمبی سارا اور راجہ اجات شترو کا پایہ تخت تھا۔ یہاں کے آثار سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں شہر کی مدافعت اور قلعہ بندی کس طریقے پر کی جاتی تھی۔ چینی سیاحوں کے سفرناموں کی مدد سے وادی کی کئی بودھی یادگاروں کی شناخت بھی کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ قلعہ آثار قدیمہ سے بھرا پڑا ہے اور جب اس سارے علاقہ کی کھوج مکمل ہو جائے گی تو یقیناً بہت سے دل چسپ انکشافات ہوں گے۔

اجات شترو کی وفات کے بعد پاٹلی پترا (جدید پٹنہ) کو راجدھانی بنایا گیا۔ اس شہر کا حال ہمیں میگاستھنیز کے بیان سے ملتا ہے۔ اس علاقے کے بعض مقامات کی کھدائی نہایت دشوار ہے کیوں کہ زیر زمین پانی کی سطح اونچی ہے اور قدیم آثار زیادہ تر زمین کی اندرونی تہ میں دبے ہوئے ہیں۔ تاہم مختلف اوقات میں دو مقامات کی کھدائی سے بعض دل چسپ آثار برآمد ہوئے ہیں۔ ایک مقام پر اینٹ کی بنی ہوئی دیواروں کے کھنڈر ہیں جن کا تعلق متاخر گپتا دور سے ہے اور تراشیدہ، پالش شدہ پتھروں کے ڈھیر بھی جو موریا دور کی یاد دلاتے ہیں یہ سب ایک دوسرے کے قریب قریب دریافت ہوئے ہیں ایک اور کھنڈر کے متعلق جو آٹھ سے زائد ستونوں پر مشتمل ہے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ غالباً موریائی دور کا کوئی بڑا دالان ہوگا۔ اس مقام پر کوئلہ اور راکھ کی جو مقدار دستیاب ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمارت کا ڈھانچہ شاید لکڑی سے تعمیر کیا گیا تھا جو کسی آگ میں جل کر خاکستر ہو گیا۔

سارناتھ میں بھی، جو کہ بدھ مت کے چار مقدس مقامات میں سے ایک ہے بڑے پیمانے پر کھدائی کی گئی اور متعدد استوپ، مندر اور خانقاہیں برآمد کی گئیں ان میں اینٹوں سے بنا ہوا وہ مندر بھی شامل ہے جسے ہیون سانگ نے دیکھا تھا اس کے علاوہ ایک اور غیر معمولی عمارت کے آثار بھی دستیاب ہوئے۔ یہ دراصل دھمک استوپ ہے جو خالص مخروطی شکل میں بنا ہوا ہے۔ یہ اینٹ اور پتھر دونوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی کوسی ۲۲،۳۵ میٹر پر محیط ہے اور یہ ۴۳،۵۸ میٹر اونچا ہے۔ استوپ کے سنگ بستہ حصہ پر گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ یہاں پتھر کی کئی مورتیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں شیر کا وہ مشہور سر بھی ہے جو کبھی اشوک کی لاٹ کی زینت تھا۔ یہ لاٹ ٹوٹی پھوٹی حالت میں ایک جگہ پڑی ہوئی ملی ہے۔

نالندا میں بھی کھدائی کا کام ہوا ہے جہاں سے اینٹ کی بندش کے کئی مندر اور خانقاہیں برآمد ہوئی ہیں۔ ایک خانقاہ میں ایک تانبے کا کتبہ بھی دستیاب ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خانقاہ کی نگہداشت کے لیے راجہ دیو پال نے پانچ گاؤں وقف کر دیے تھے۔ استوپ، مندر وغیرہ کے علاوہ یہاں پتھر اور کانسے کی کئی مورتیاں، پکی ہوئی مٹی کی مہریں اور تختیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک خانقاہ کے اندر سے بعض شاہی مہریں بھی برآمد ہوئی ہیں جن سے گپتا خاندان کے سلسلہ کو جوڑنے میں مدد ملی ہے۔

مشرقی بنگال کے مقام پہاڑپور، اڑیسہ کے شیشوپال گڑھ اور اترپردیش کے اہی چھترا میں بھی کھدائیاں کی گئیں جن سے مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں آخرالذکر مقام سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے شہر میں بسنے والے مختلف طبقات کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور تیسری صدی ق۔م سے لے کر دسویں صدی عیسوی کے اواخر تک کے حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ ریاست راجستھان کے بعض مقامات پر بھی کھدائی کا کام ہوا ہے اس طرح جنوب میں بھی کئی مقامات پر یہ سلسلہ جاری ہے۔

ہڑپہ کے عظیم اناج گودام کا مغربی بلاک

نالندہ خانقاہ کا منظر

صدر استوپ کا عام منظر مقام نمبر ۳ نالندہ

ابیات

ادبیات

ادبیات

آسامی زبان وادب

زبان

آسامی زبان کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے اور وہ اس خاندان کے مشرق بعید کی نمائندگی کرتی ہے۔ گرامر کے ڈھانچے اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے یہ ایک مکمل آریائی زبان ہے۔ اُڑیا اور بنگالی کی طرح آسامی کی اصل بھی پراچیہ اپبھرنش ہے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ آسامی کی پہلی کتابیں کب لکھی گئیں، البتہ شواہد بتاتے ہیں کہ آسامی حکمرانوں کی قدردانی اور علم دوستی نے مختلف مقامات کے دانشوروں اور پنڈتوں کو آسام میں اکٹھا کر لیا تھا۔ قدیم آسام میں کتابوں کا لکھا جانا اس تاریخی واقعہ سے ثابت ہے کہ یہاں کے حکمران بھاسکر ورمانے آسامی تصنیفات کا ایک سیٹ قنوج کے راجا ہرش وردھن کو نذر کیا تھا۔ قدیم ریکارڈ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ آسام کے لوگ موسیقی کے بڑے شائق تھے چنانچہ اس زمانے کے ان پڑھ بھاٹوں کے لکھے ہوئے مقبول لوک گیت آج بھی ہر سوسائٹی میں بڑے شوق سے گائے جاتے ہیں۔ آسام کے اس دور جہالت کی ایک اہم شخصیت فلاسفر ڈاک کی ہے جس کے زریں اقوال آج تک زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ آٹھویں اور نویں صدی کے درمیان تانترک بدھوں کے لکھے ہوئے گیتوں کا پتہ نیپال کے پنڈت ہرپرشاد شاستری نے چلایا جو بَدھاگن اودھا کے نام سے شائع کیے جا چکے ہیں۔

ادب کا ابتدائی دور

آسامی ادب کے اولین نمونے جو دستیاب ہوئے ہیں ان کا زمانہ تیرہویں صدی عیسوی کا ہے جب کہ کامروپ کی قدیم ہندو سلطنت وجود میں آچکی تھی۔ اس ابتدائی دور کے تین شاعر جن کا ریکارڈ ملتا ہے۔ ہیما سرسوتی، ہری ہر بپرا اور کوی رتن سرسوتی تھے جنہیں کامتا کے راجہ دُرلبھ نارائن کی سرپرستی حاصل تھی۔ آسامی ادب کے خط وخال چودھویں صدی عیسوی میں وشنومت تحریک کے ساتھ ابھرے جس کا مبلغ شنکر دیو تھا۔ اس کی تعلیمات بھگوت پوران کے آدھار پر تھیں۔ شنکر دیو آسامیوں کی نظر میں بہت بلند ہے۔ وہ آسام کی کلچرل اور روحانی زندگی کا عظیم پیشوا مانا جاتا ہے۔ شنکر دیو اور اس کے پیروؤں کے اثر ونفوذ کے تحت آسامی زندگی، ادب، ذہانت اور تعلیم کو فروغ ہوا۔ آسامی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ اس کی تبلیغ وتحریک کا نتیجہ ہے۔ اس عہد کی آسامی شاعری کی نمایاں شخصیت مادھو کنڈلی کی ہے جس نے رامائن کے پانچ ابواب کا ترجمہ کیا۔ مہابھارت، بھگوت گیتا اور پرانوں کے ترجمے اور مذہبی ڈراموں کی تخلیق اسی دور کے بڑے کارنامے ہیں۔

سترہویں صدی عیسوی میں آسامی ادب کو اہوم بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوئی جنہوں نے ہندو مت اختیار کر لیا تھا۔ آسامی ادب نے اس زمانے میں جو ترقی کی اس کا تفصیلی حال اہوم دربار کی تاریخی دستاویزوں بالخصوص بورنجیس میں ملتا ہے جو آسام کا سب سے اہم علمی وتاریخی ماخذ ہے۔ درباری سرپرستی کے اس دور میں مذہبی کتابوں کے علاوہ آسامی نظم ونثر کے اور بہت سے کارنامے تخلیق وترتیب کے مراحل سے گزرے۔ درباری شاعر کوی راج چکرورتی نے برہما وریتا پوران اور کالی داس کی شکنتلا کو آسامی لباس پہنایا۔ اٹھارویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا پہلا حصہ آسامی تاریخ کا تاریک دور ہے جبکہ خانہ جنگیوں مذہبی جھگڑوں اور برمیوں کے حملوں نے آسام کو تہس نہس کر رکھا تھا۔ بالآخر ۱۸۲۷ء میں آسام انگریزی راج میں ضم ہو گیا۔ انگریزی راج کے آغاز ہی میں آسامی کا چلن اسکولوں اور دربار سے ختم کر دیا گیا۔ بعد ازاں جب یہاں امریکن مشنوں کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے تبلیغی مقصد کے لیے آسامی زبان میں ایک رسالہ ارونودائی جاری کیا اور مذہبی کتابچوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر درسی کتب بھی چھاپیں انہیں مقامی لیڈروں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ جس نے آسامی کو پھر اس کے پچھلے مقام پر لا کھڑا کیا۔

آسامی ادب کا وہ ذخیرہ جو فی الحقیقت قابل ذکر ہے، اس کی تخلیق کا زمانہ بیسویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس وقت جن فن کاروں نے قلم اٹھایا انہوں نے آسامی ادب کو صحت مند روایات سے روشناس کیا۔ نئے موضوعات کے دروازے کھولے اور نئی ادبی وسعتوں کے امکانات کی نشاندہی کی۔ چندر کمار اگروال، لکشمی ناتھ بج بروا، ہیم چند رگوسوامی اور پدمناتھ کی کوششوں سے قومی بیداری پیدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس کارواں میں اور بہت سے لکھنے والے شامل ہوئے۔ ان مصنفین نے رومانی قسم کی شاعری بھی کی، حبِ وطن پر مشتمل جوشیلی نظمیں بھی لکھیں، مضامین اور انشائیے بھی تحریر کیے۔ مختصر افسانے اور ڈرامے بھی منظر عام پر آئے۔ تاریخی اور ادبی میدان میں ریسرچ کا کام بھی ہوا۔

جنگ عظیم سے پہلے اور بعد کی شاعری

آخری جنگ عظیم تک آسامی شاعری پر عشق ومحبت، فطرت نگاری اور حبِ وطن کی چھاپ لگی رہی۔ اس سے قبل کے شاعروں نے اپنی تخلیقات کو جمالیاتی معنویت

عطا کی۔ ان میں لکشمی ناتھ بیج بروا کو معمار اوّل کی حیثیت حاصل ہے، جس نے رومانی روایت کو تازہ کر کے چوٹ کھائے ہوئے دلوں کے تاروں کو چھیڑا۔ پرانی اقدار کو توڑ کر نیا اسلوب اختیار کیا۔ اس کی تخلیقات مور دیشا، آسام سنگیت بن براگی آسامی کلچر اور سماج کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں۔ دوسرا محب وطن شاعر کملا کانت بھٹا چاریہ ہے۔ اس کی وطن دوستی سے بھرپور نظمیں قدیم کلچر کی شاندار روایات تک ہی محدود نہیں بلکہ ملک میں جمہوری نظم و نسق کے قیام کی وکالت بھی کرتی ہیں۔ اس کے دو اہم مجموعے "چنتنال" اور "چنتا ترنگا" ہیں۔ چندر کمار اگروال کی شاعرانہ حسن کاری اس کی تصنیفات "پرتما" اور "بن دیراگی" میں جھلکتی ہے۔ اسی دور کے دو اور اہم شاعر درگیشور شرما اور نیل منی پھوکان صوفیانہ مسلک کے پرچارک ہیں۔ نیل منی کی کتاب "مناسی" میں حسن کی بے پناہ تشنگی کا بیان ہے۔ اور "سادھنی" میں حسن و صداقت کی تلاش ہے۔ ممتاز شاعر رگھوناتھ چودھری جو "بھاگی کوی" کے نام سے معروف ہے، اس کی نظموں کے مجموعہ کا نام "سادری" ہے جتیندر ناتھ نے اپنی کتاب "دَوارا" کے ذریعہ ارضی حسن اور تخیل کی زرخیزی سے آسامی شاعری کو بہت دلآویز بنایا۔ دوسری تصنیف "اومر تیرتھ" میں خیام کی خمریات کا رس نچوڑا ہے۔

آسامی ادب کے فروغ میں عورتوں کا حصہ بھی کم نہیں۔ "نلنی بالا دیوی" نہایت ذہین شاعرہ ہے۔ اس کے تین شعری مجموعے "سندھیا سور" "اسپوناسور" اور "یار روشمائی" نکل چکے ہیں۔ "دھرمیشوری دیوی بردانی" دو مجموعوں "پھولار سرائے" اور "پرانار براش" کی خالق ہے۔ دوسری خواتین میں "سوپربھا گوسوانی" "پریتی بروا" نرملا بار دولوئی، لکشا ہیرا داس اور رچیرتا رائے چودھری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد آسام کی نئی نسل سوشلزم اور مارکسزم تحریکات سے متعارف ہوئی اور اس نے یورپی شاعری کے رجحانات بھی قبول کیے۔ ان آسامی مصنفوں کی ایک بڑی تعداد کلکتہ کالج سے پڑھ کر نکلی تھی اور بنگالی شاعری کا بھی اثر ان پر بہت گہرا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں عصری میلانات، سیاسی انتشار، استحصال، بالجبر سماجی اصلاحات، جنسی موضوعات اور وہ سب کچھ ہے جسے نئے زمانے کی دین کہنا چاہیے۔ ہیتشور باربروا کا انگریزی مطالعہ گہرا ہے۔ وہ شیکسپیئر، ورڈسورتھ اور ملٹن سے متاثر ہے۔ اس نے آسامی شاعری کو روایتی ہیت سے آزاد کر کے انگریزی فارم یعنی نظم معریٰ اور سانیٹ کو رواج دیا۔ اسی ذہن کا ایک اور دلچسپ شاعر "امبیکا گیری رائے چودھری" ہے۔ جس کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ گایک اور گیت کار بھی ہے، جرنلسٹ اور سیاسی قائد بھی اور وطن پرست بھی۔ اس کی علامتی شاعری کا پہلا مجموعہ "تومی" ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں ہیما بروا نے علامتی اور تجریدی اظہار کو بڑی کامیابی سے برتا۔ اس کا لہجہ اور اسلوب اس کا اپنا ہے جو اسے انفرادیت بخشتا ہے۔ "ہی ارانیہ ہی جہانگر" اس کا شاہکار ہے جس میں اس نے جدید شاعری کی تکنیک استعمال کی ہے۔ باقی نئی نسل کے شاعر ابھی تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں۔ جدید شاعری اگرچہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے پھر بھی عصر حاضر کے شاعروں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی شاعری میں اپنے عہد کا مکمل شعور ملتا ہے۔ نیا انسان آج جن مسائل سے دوچار ہے اور نئی اقدار کی تلاش میں جس تخلیقی کرب سے گزر رہا ہے اس کی جھلک ان کے یہاں صاف نظر آتی ہے۔

ڈرامہ

آسامی زبان کے تھیٹر اور اس کی ڈرامائی روایات کافی مضبوط ہیں۔ دورِ وسطیٰ کا لکھا ہوا ڈراما "انکیا ناٹ" آج بھی دیہاتوں میں بہت مقبول ہے۔ بعد کے دور کے ڈرامے مغرب کی درآمد ہیں۔ یورپی ڈراموں کی تقلید میں لکھنے والے جدید ڈراما نگاروں میں گن ابھرام بروا، ہیم چندر بروا اور ردرام باردولوئی کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن ڈرامے کے نئے فن اور جدید تکنیک کو جنہوں نے عروج کمال تک پہنچایا وہ لکشمی ناتھ بیج بروا اور پدم ناتھ گوہین بروا ہیں۔ جنہوں نے اپنے کرداروں کے پیکر میں فطرت انسانی کے رموز کو بے نقاب کیا۔ ان کے شہرت یافتہ تاریخی ڈراموں کی تعداد بہت زیادہ ہے مثلاً جیامتی، گدادھر، سادھنی اور لاجٹ پھوکان وغیرہ۔ گوہین بروا کے ڈراموں "گاربورہ" اور "نیلا درپن" میں سوسائٹی کے عام کرداروں کی بہت ہی معنی خیز نفسیاتی اور موثر تصویریں ملتی ہیں۔

چندرادھر بروا کا شمار بھی اچھے ڈراما نویسوں میں ہوتا ہے۔ اس کے دو پورانی ڈرامے "میگھ نادودھ" اور "تلوتما سمبھو" نظم معریٰ میں لکھے گئے ہیں ایک اور ڈرامہ "بھاگیہ پریکھا" میں وہ قسمت اور دولت کے تعلق کو محض دیہاتی سطح پر بڑے دلفریب انداز میں پیش کرتا ہے۔ متراد یومہنت کا "بیا پیار یاما" اور "رکوکوری کنارکا" انھا مثلاً اپنے دلچسپ پلاٹ نیچرل ڈائیلاگ اور موثر کردار نگاری کے سبب خاص مقام رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی تحریک اور آزادی کی جد وجہد نے بھی بے شمار تاریخی و نیم تاریخی ڈراموں کو موضوعات فراہم کیے۔ نکل چند بھوپان کا ڈرامہ بدن بار پھوکان، پرسنما لال چودھری کا "نیل امبر" سیلا دھر راج کھوڈ اکا "شورگ دیو پرتاب سنگھ" اور دیپو چند تعلقدار کا "بھاسکر ورمن" وہ چند شاہکار تاریخی ڈرامے ہیں جو اس صدی کی پہلی دہائیوں میں تصنیف کیے گئے۔ انقلابی ڈراموں میں چندر کانت پھوکان کا "پیالی پھوکان" اور پروین پھوکان کا "منی رام دیوان" انیسویں صدی کے ان دو سرفروشوں کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں جو آزادیٔ وطن کی خاطر بالآخر پھانسی کے تختے پر چڑھا دیے گئے۔ اسی موضوع پر سربندر ناتھ سائکیا کے ڈرامے "کوشل کادار" کو بھی غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ رومانی قسم کے ڈرامہ نگاروں میں کملا نند بھٹاچاریہ اور جیوتی پرساد اگروال اس اعتبار سے اپنا مقام رکھتے ہیں کہ ان کے کردار بے حد حقیقی اور جیتے جاگتے انسانوں کی انفرادی اور طبقاتی شخصیتوں اور ان کے کربناک سماجی اور جذباتی رشتوں کی بے مثال مصوری کرتے ہیں۔ اگروال تو جدید آسامی ڈرامہ اور اسٹیج کی تاریخ میں سب سے زیادہ بلند قامت ہے۔

ناول

بیسویں صدی سے قبل آسامی ادب گنتی کے صرف چند ناول رکھتا تھا۔ بعد میں جن آسامی ناول نگاروں کے ہاتھوں یہ صنف پروان چڑھی ان کا مقصد تفریح اور محفل آرائی نہیں تھا۔ انہوں نے وطنیت و سیاست کو بھی موضوع بنایا۔ ابتدائی نشو و نما میں سب سے بڑا حصہ رجنی کانتا باردولوئی کا ہے۔ جس کے بیشتر ناولوں کا پس منظر تاریخی واقعات ہیں۔ اس کی شہرت کا آغاز پہلے ہی ناول "میری جیاری" سے ہوا۔ اسی مصنف کے دوسرے اہم ناول "نانوحتی" اور "راہا دائی لی گری" ہیں جو خالص رومانی ہیں۔ البتہ "دھنو وادروہ" کا موضوع سیاسی ہے پدم ناتھ گوہین بروا کے ناول "بھاری" اور "بھانومتی" بھی رومانی ہیں۔ دیس چندر تعلق دار اور دان دی ناتھ کالیتا نے اپنے ناولوں میں عورت مرد کے

تعلقات کو موضوع بنایا ہے اور تحلیل نفسی کے ذریعہ کرداروں کو ابھارا ہے۔ رومانی ناول گزشتہ صدی کے اواخر تک بلوغیت کو نہیں پہنچ سکے تھے اب کہیں جاکر بلحاظ کیفیت وکمیت ان کا معیار اونچا ہوا ہے۔ جن میں عصری حسیت ہے اور بناوٹ کے بجائے فطری سادگی ہے۔ یہ ناول اپنے دور کے اور روایت کے آئینہ دار ہیں۔ آسام کی دیہی زندگی کی تصویر کشی میں جیوناربھٹ ہمہ گیر شہرت کا حامل ہے۔

دوسرے صف اول کے ناول نگاروں میں "تیش دے سکئے" اجیرمالو اور ادے ناتھ شرما کا "جیونار تین ادھیائے" غیر معمولی قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ چندرکانت گوگی اپنے ناول "سونارنگل" میں اور گووند مہاست اپنے ناول "کرشناکونٹی" میں ان دھاراؤں کو لے کر آگے بڑھے ہیں جو سیاسی سماجی نظام کے اندرونی تہوں میں بھی نظر آتی ہیں۔ دور حاضرہ کے دوسرے قابل ذکر ناول دریندر رکمار بھٹاچاریہ کا "راج پتھ رنگیالے" "پربھی دناگوسوامی کا "لنگا پتر کیانی" اور رادھیکا موہن گوسوامی کا "چکنا ٹیا" ہیں جن میں زندگی کے عام "بے ترتیب اور منتشر مواد کو سماجی" نفسیاتی" سیاسی اور افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کے مطالعہ سے ناول نگار کی تخلیقی، ذہنی "فنی بصیرت اور ذوق سلیم کا پتہ چلتا ہے مجموعی طور پر یہ تخلیقات آسامی ناول کے سرمائے کو بہت دقیع ثابت کرتی ہیں۔

مختصر افسانہ

ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح آسامی میں بھی مختصر افسانے کی نشوونما مغربی اثرات، کے تحت ہوئی لکشمی کانت بج بروا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے مختصر افسانہ کے معیار کو بلند کیا۔ اس کے افسانوں کے تین مجموعے "سادھوکتھارکوکی" "جان بیری" اور "سربھی" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جن میں مقامی رنگ کے کینوس پر انسانی زندگی کے تجربات اور لمحاتی تاثرات سمونے کی کوشش کی گئی ہے تری لوکیا ناتھ گوسوامی اور نگندر نارائن چودھری کے افسانے دیہی وشہری زندگی کے سماجی مسائل کے تعلق سے بہت خوب ہیں جن میں افسانہ نگاروں نے اپنے دور کی روح کو جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوسوامی کے دو مجموعے "اردنا" اور "مری چکا" ایسی کہانیاں ہیں جو ہمارے ماحول کے گرد چکر لگاتی ہیں۔ یہ کہانیاں مطالعہ فطرت، انداز بیان کی سادگی "حقیقت پسندی اور سچی کردار نگاری کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ماہی بورا اور لکشمی ناتھ پھوکن کے افسانوں میں آسامی مزاج خوب جھلکتا ہے۔ ان میں گہرائی بھی ہے تاثر بھی اور رشتریت بھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد شاعری اور ناول نگاری کی طرح آسامی مختصر افسانے میں بھی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ جدید قسم کے افسانوں کی بنیاد ڈالنے والوں میں پہلا نام لکشمی دھر شرما کا ہے جس کا آرٹ ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے مقلدوں کی ایک بڑی جماعت ہے۔ بینا بروا کا مجموعہ "پٹ پریورتن" ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جن میں زیادہ تر کالج گرلس اور ان کے معاملات عشق ومحبت پر روشنی ڈالی گئی ہے رام داس کی نظر افسانہ کی ٹیکنک پر زیادہ رہتی ہے۔ دینا ناتھ شرما کے افسانے ان کے "ناولوں کے مقابلہ میں زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اس کے افسانوں کے مجموعے "دولال اکال سا ریا۔ کووابھاٹوریا" اور "کلپنا اروبسا" زیادہ تر محبت کے موضوعات پر ہیں جو ہمارے جذبات کو آسودگی اور روح کو شادابی عطا کرتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں میں سب کے سب فرائڈ اور اس کے نظریہ جنس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جنسی اختلاط اور عورت اور مرد کے درمیان ناجائز تعلقات اخلاقی قدروں کے منافی نہیں ہیں۔ یہ حقیقت نگاری کے نام پر جنس کو کھلی آزادی دیتے ہیں۔ ان میں عبدالملک اور اس کے گروپ کا خاص مقام ہے ان کے علاوہ جوگیش داس "درندر کمار بھٹاچاریہ" ہیمن بارگوہین "بھابندر ناتھ سائکیا" اور دوسرے جدید افسانہ نگار مختصر افسانہ کو عصری اور علامتی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

مضامین اور انشائیے

آسامی زبان کی نثر انیسویں صدی عیسوی تک آتی زرخیز ہوگئی کہ اس میں مضمون اور انشائیے لکھے جانے لگے۔ یوں تو بہتوں نے اس صنف پر توجہ کی لیکن لکشمی ناتھ بج بروا نے انفرادی اسلوب اختیار کیا۔ اس نے ایک ایسی صنف ایجاد کی جس کو مختصر افسانہ اور انشائیہ کی درمیانی چیز سمجھنا چاہیئے لکشمی ناتھ کے انشائیوں کے دو مجموعے "باربردورلوبوربورانی" آسامی ادب میں خراج عقیدت حاصل کر چکے ہیں ستیا ناتھ بورا اس کا معاصر ادیب ہے جس کے مضامین "سارتھی" اور "چنا کلی" ایک ذہین دماغ کی پیداوار ہیں۔ بانی کنٹا اپنے انشائیوں کی بدولت آسامی نثر پر چھایا ہوا ہے۔ دوسرے قابل ذکر نثر نگار جن کے مضامین نثر کے جامع شعور کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان کے نام یہ ہیں ہری نارائن دتا بروا، کالی رام سیدھی، سنگی کمار بروا، اوپندر چندر لکھارو مہیشور نیوگ اور ستیندر ناتھ بروا وغیرہ۔

گزشتہ پچاس سال کے اندر آسامی کے مختلف اصناف ادب میں جو تنوع اور اضافہ ہوا ہے اور جو تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں ان کا مطالعہ آسامی ادب کی نئی جہتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

اردو زبان وادب

اردو، ترکی زبان کا لفظ ہے اس کے لفظی معنی "خیمہ" یا چھاؤنی (لشکرگاہ) کے ہیں اس لفظ کا استعمال شہنشاہ اکبر کے زمانے کے سکوں پر پایا جاتا ہے۔ اکبر سے پہلے امیر علاؤالدین جوینی کی "تاریخ جہاں کشا" اور فضل اللہ کی "جامع التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ، چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے خیموں کو اردو کہا کرتے تھے چنگیز خاں کے فرزند جوجی خاں کے زمانے میں، اس کے نائب اور امراء جب کسی مہم پر مستقر سے روانہ ہوتے تھے تو زرّیں خیموں میں قیام کرتے تھے جس کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے مطلّا (Golden Hord) کہلاتی تھیں۔

لفظ اردو کے مابعد معنی "دربار" ہوگئے۔ اس کے بہت عرصہ بعد سترہویں صدی میں درباری زبان بھی اردوئے معلّٰی کہلانے لگی۔ جب مغل بادشاہوں نے فارسی کے مقابلے میں اردو کی سرپرستی کی اور خود بھی اس میں لکھنے پڑھنے لگے تو رفتہ رفتہ اردو زبان کے لیے اس طویل ترکیب زبان اردوئے معلّٰی کے بجائے صرف لفظ "اردو" باقی رہ گیا۔

زبان کے معنوں میں اردو کا استعمال سترہویں صدی میں ہونے لگا

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زبان کا آغاز سترھویں صدی میں ہوا۔
یوں تو اردو کی ابتدا ۱۱۹۳ء میں یعنی اس وقت ہوئی جب مسلمان پونے دوسو برس تک لاہور میں متمکن رہنے کے بعد ترکوں اور افغانوں کی قیادت میں دہلی اور نواحِ دہلی میں داخل ہوئے۔ ابتدا میں دہلی تہذیبی مرکز ہونے کی بجائے فوجی چھاؤنی کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ”اردو ایک مخلوط زبان ہے“ کیونکہ مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے بعد ہندو مسلم قوموں میں اختلاط شروع ہوا اس اختلاط کے نتیجہ میں اس زبان کا آغاز ہوا یعنی شعوری طور پر جب دو لسانی گروہ سمجھوتہ کرتے ہیں اور کچھ اپنی زبان کے اور کچھ دوسری زبان کے الفاظ ملا کر کام چلانے لگتے ہیں تو ایک مخلوط زبان کا آغاز ہوتا ہے اردو کو مخلوط زبان کہنا درست نہیں کیوں کہ اس زبان کی نشو و نما کا عمل ترکیبی ہے۔ یہ آریائی زبان ہے جس کا تعلق زبانوں کے سب سے اہم اور سب سے بڑے خاندان یعنی 'ہند یورپی' کی شاخ 'ہند آریائی' سے ہے۔ ہند آریائی کی سب سے حیرت انگیز اور قابلِ ذکر خصوصیت اس کا طویل اور مسلسل ارتقا ہے جو ۱۵۰۰ ق م (قبل مسیح) سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے۔ اردو کے ارتقا کا تعلق جدید ہند آریائی سے ہے۔ ہند آریائی کے تین ادوار ہیں قدیم دور متوسط دور۔ جدید دور۔ ہند آریائی کا جدید دور اپ بھرنشوں کا دور ہے۔ اردو وسطی ہندوستان کی زبان شورسینی اپ بھرنش کی بولیوں میں سے ایک بولی کھڑی بولی کا نشو و نما پایا ہوا روپ ہے لیکن اس پر شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ مغربی ہندی کی دیگر بولیوں ہریانی، برج اور پنجابی کے بھی اثرات مسلم ہیں۔

مسلم حملہ آوروں کے ہندوستان میں داخلے کے وقت شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ مغربی ہندی کی بولیاں۔ کھڑی۔ ہریانی۔ برج بندیلی۔ قنوجی دوآبہ گنگ وجمن میں رائج تھیں۔ اصل میں مغربی ہندی دو شاخوں میں بٹی ہوئی ہے ایک وہ شاخ جس میں افعال کا خاتمہ علامت ”اَو“ (و) پر ہوتا ہے۔ دوسری وہ شاخ جس میں افعال کا خاتمہ علامت ”ا“ (ہ) پر ہوتا ہے۔ اس شاخ میں کھڑی بولی اور ہریانی شامل ہیں۔ کھڑی بولی مغربی روہیل کھنڈ۔ دوآبہ گنگ وجمن اور مشرقی پنجاب یعنی انبالہ میں بولی جاتی ہے۔ اردو جیسا کہ سابق میں بیان کیا جاچکا ہے اپنے ڈول اور کینڈے کے اعتبار سے مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کی بہ نسبت کھڑی بولی سے زیادہ قریب ہے اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ اردو کا ماخذ کھڑی بولی ہے۔
اردو کی اہمیت کے مدنظر اکثر علما نے اس کے ماخذ اور اس کے آغاز کے بارے میں غور کیا اور الگ الگ نتیجوں پر پہنچے ہیں۔ محمد حسین آزاد اردو کو برج بھاشا سے مشتق بتاتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا قیاس ہے کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا ہوگا لیکن چونکہ اس زمانے کے تحریری آثار موجود نہیں اس وجہ سے اس رائے کو مستند نہیں مانا جاتا۔ نصیر الدین ہاشمی اردو کی پیدائش مدراس کے سواحل پر بتاتے ہیں جب عرب تاجروں کا اہلِ ہند سے میل جول شروع ہوا لیکن یہ نظریہ قابلِ قبول نہیں۔ کیونکہ عربی زبانوں کے دوسرے خاندان سامی سے تعلق رکھتی ہے جب کہ اردو کا تعلق ہند آریائی سے ہے۔ حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، مولوی عبدالحق حکیم شمس اللہ قادری اور کسی حد تک پروفیسر عبدالقادر سروری اردو کا ماخذ پنجابی کو مانتے ہیں۔ محمود شیرانی نے اپنے خیال کی تائید میں تاریخی و لسانی حقائق پیش کیے ہیں کہ غوریوں کے غزنہ پر قبضہ کرنے کے بعد محمود غزنوی کی اولاد پنجاب میں منتقل ہوگئیں جہاں پونے دوسو برس تک پنجاب پر ان کی حکومت رہی۔
جدید ماہرین لسانیات، جن میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی۔ جولیس بلاک بیمز ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ شامل ہیں، اردو کا ماخذ کھڑی بولی بتاتے ہیں۔
زبان اردو کی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کو ادوار میں تقسیم کرنا مناسب ہے یہ ادوار حسب ذیل ہیں۔

دورِ موجدین: (۱۱۹۳ء — ۱۳۲۷ء) (یعنی کھڑی بولی کا ادب) کھڑی بولی مسلمانوں کی آمد سے پہلے لسانی اعتبار سے پس ماندہ زبان تھی مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مدت تک وہ صرف روزانہ کاروبار اور عام بول چال کی زبان رہی۔

دورِ متقدمین: (۱۳۲۷ء — ۱۷۵۰ء) دکن کا اردو ادب۔ جن کو ادبی نظم و نثر کے نمونے پیش کرنے میں اولیت حاصل ہے۔

دورِ متوسطین: (۱۷۵۰ء — ۱۸۰۰ء) ولی کے بعد شمالی ہند میں اردو ادب و شاعری کی ترقی۔

دورِ متاخرین: ۱۸۰۰ء — ۱۸۵۷ء

دورِ جدید: ۱۸۵۷ء — ۱۹۳۵ء

دورِ حاضر: ۱۹۳۵ء — ۱۹۷۶ء

کھڑی بولی کا ادب مسلمانوں کی فتح دہلی سے فوراً قبل اور بعد ملتا ہے چنانچہ راسو (رزمیہ نظمیں) جو مسلمان حملہ آوروں کے خلاف ہندوستانی دیروں وسورماؤں کو جوش دلانے کے لیے لکھی گئی ہیں ان میں بھی کھڑی بولی کا پُٹ ملتا ہے۔ تاہم فتح دہلی کے نوے برس بعد امیر خسرو سامنے آتے ہیں۔ جن کو بعض اشخاص نے اردو کا پہلا شاعر کہا ہے۔ مگر یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔
امیر خسرو کے ساتھ دوسرے سنت اور صوفی شاعر ایسے ملتے ہیں جو، گو اردو کے شاعر نہیں لیکن انھوں نے اپنی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی میں بھی لکھا۔ ان میں نام دیو۔ گرو نانک۔ گیانیشور اور کبیر اہم ہیں۔
امیر خسرو اپنی ایک مثنوی کے دیباچے میں بتاتے ہیں کہ انھوں نے اردو میں بھی بہت کچھ کہا ہے اور آج بھی ان کے نام سے کثیر تعداد میں گیت، دوہے، پہیلیاں وغیرہ مشہور ہیں لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب خسرو کی تخلیقات ہیں اور ان میں خسرو کی زبان کسی رد و بدل کے بغیر محفوظ رہ گئی ہے۔ بہر حال امیر خسرو سے اردو کی جو چیزیں منسوب کی جاتی ہیں۔ اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو ان میں زبان کے تین روپ ملتے ہیں۔
ایک روپ ٹھیٹھ کھڑی بولی، جو اکثر پہیلیوں کہہ مکرنیوں اور دو سخنوں میں ملتا ہے دوسرا گیتوں وغیرہ میں جو عام فہم برج بھاشا میں ہیں۔

تیسرا روپ کھڑی اور برج کا آمیزہ۔

گرونانک اور کبیر داس کے یہاں بھی کھڑی بولی کے ایسے نمونے ملتے ہیں جنھیں اردو کا ابتدائی روپ کہا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کے علاوہ صوفیا نے بھی اس نوزائیدہ زبان یعنی اردو کو اپنے مذہب کے افہام وتفہیم کا ذریعہ بنایا چنانچہ صوفیا کے فارسی ملفوظات میں اردو جملے بھی بکثرت ملتے ہیں۔

چودھویں صدی تک اردو صرف بول چال کی زبان تھی اس میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ فخرالدین نظامی کی مثنوی "کدم راو پدم راؤ" اور اشرف کی مثنوی "نوسرہار" اس وقت تک اردو شاعری میں سب سے قدیم ہیں۔ شیخ عین الدین گنج العلم کے رسائل کا شمس اللہ قادری نے ذکر کیا ہے۔ مگر ابھی تک ان کا سراغ نہیں ملا ہے۔ ان کے علاوہ بہاؤالدین باجن اور علی جیو گام دھنی کی تصانیف سے اردو کے قدیم روپ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں باقاعدہ تحریر واشاعت کا آغاز دکن سے ہوا۔ دکن ہی میں اردو نے چودھویں صدی کے لگ بھگ نظم اور نثر کے لیے ایک معیاری زبان کا درجہ پایا۔ دکن اور گجرات میں "دکنی" کے نام سے دہلی کی زبان کو قلم بند کیا گیا۔ اس کے حروف، ہجا اور رسم خط کو مرتب کیا گیا۔ ہندی کی آوازیں ٹ۔ ڈ۔ ڑ شامل کی گئیں۔ ساتھ ہی عربی فارسی کی نئی آوازوں ز۔ خ۔ غ۔ ف۔ ق کا اضافہ کیا گیا۔ اس عہد کے مخطوطات میں عام طور پر خطِ ثلث استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ بہمنی دور کے ختم ہونے کے بعد قطب شاہی عادل شاہی۔ نظام شاہی۔ عماد شاہی اور برید شاہی سلطنتوں نے اس نوزائیدہ زبان کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، علی عادل شاہ شاہی، عبداللہ قطب شاہ، ابن نشاطی، ملک خوشنود فیروز محمود کمال خاں رستمی، برہان الدین جانم، غواصی، امین الدین اعلیٰ شمس العشاق میراں جی اور دکنی کے سیکڑوں مصنفین کے ادبی کارناموں میں اس زبان کے مستند نقوش ملتے ہیں۔ دکنی نے اپنی پڑوسی زبانوں سے بھی تاثر قبول کیا۔

بعض علما یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ "دکنی" قدیم اردو کا روپ نہیں اس کا ارتقا اپنے طور پر علاحدہ ہوا۔ اوّل تو یہ مفروضہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ شمالی ہند کی اردو زبان کی قدیم مستند ومعتبر کتابوں جیسے افضل کی 'بکٹ کہانی'، فضلی کی 'کربل کتھا' عیسوی خان کی 'قصہ مہر افروز ودلبر' وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "قدیم اردو" کی خصوصیات ہر جگہ یکساں ہیں مثلاً شمالی ہند کی بھی اس دور کی کتابوں میں دکنی کی طرح جمع "اں" کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔

البتہ سترھویں صدی میں حاتم، اور مظہر جان جاناں نے اصلاحِ زبان کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو کو دوسری زبانوں بالخصوص برج، کھڑی، ہریانی کے اثرات سے پاک کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ فارسی عربی الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ مخصوص دکنی الفاظ ومحاورات کو متروک قرار دیا گیا ہے۔

دکن میں ۱۷۰۰ء تک، اردو (دکنی) شعر وادب کی کئی منزلیں طے کرچکی تھی۔ شمالی ہند میں فارسی کے تہذیبی تسلط کی وجہ سے اردو کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی اکبر اور جہانگیر کے عہد میں برج بھاشا کی خاصی سرپرستی ہوتی رہی۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ ۱۶۴۸ء تک آگرہ دارالسلطنت رہا جو برج کے علاقے میں ہے۔

چنانچہ ولی کی آمدِ دہلی تک شمالی ہند میں متفرق اشعار۔ چند منظوم لغات اور محمد افضل کی "بکٹ کہانی" کے سوا اردو زبان میں زیادہ ادب نہیں ملتا۔ ولی کے سفرِ دہلی اور اورنگ زیب عالم گیر کی فتحِ دکن کے بعد دہلی میں اردو شاعری کا چرچا ہوا۔ فائز (صدرالدین خاں) یک رنگ۔ حاتم۔ آبرو اور اُن کے متبعین کا ایک قافلہ سا نکل آیا جنھوں نے فارسی کی اجارہ داری کو ختم کرکے اردو شاعری (ریختہ) کو فروغ دیا۔ حاتم نے اپنے "دیوان زادہ" (۱۷۵۵ء) میں روزمرہ دہلی کو ایک طرف فارسی کے تسلط سے آزاد کیا تو دوسری طرف عربی فارسی الفاظ اور صحتِ تلفظ واملا پر زور دیا اور پہلی تحریکِ اصلاحِ زبان کا آغاز کیا۔ ان شاعروں نے اردو کو فارسی اور زبان دکنی دونوں کے اثرات سے صاف کرکے سودا اور میر کے ہاتھوں میں اس کا ٹکسالی روپ دے دیا۔ اس طرح ۱۸۰۰ء تک ادبی اردو کا معیار متعین ہوگیا۔ میر وسودا کی شاعری نے اردو کے اصنافِ شعر متعین کردیئے دہلی کی ادبی زبان اس کے بعد اردو کے مختلف مرکزوں مثلاً دکن، فیض آباد، لکھنؤ عظیم آباد وغیرہ میں پھیلتی پھولتی رہی۔ دہلی کے ساتھ لکھنؤ نے بھی اردو ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس طرح دہلی اور لکھنؤ اردو زبان وادب کے بڑے مرکز بن گئے۔ لکھنؤ والوں نے فارسی عربی الفاظ کو ٹھیٹھ بول چال کے لفظوں پر ترجیح دی۔ ناسخ نے بہت سے الفاظ متروک قرار دیئے اور اردو کو کتابی اور خواص پسند بنادیا۔ شمال میں ۱۸۳۵ء تک اردو نے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کرلی اور شمالی ہند کی سب سے وسیع اور اہم زبان بن گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کرنے کی خاطر اردو کی تحصیل کو لازمی قرار دیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قایم ہوا جہاں انگریزوں کو اردو سکھانے کا انتظام تھا۔ اس زمانے میں لاہور تا کلکتہ اور دہلی تا میسور اردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی اہم علمی ادبی اور تعلیمی زبان بن گئی۔ یہ زمانہ اردو کی عام مقبولیت کا نقطۂ عروج تھا۔ اسی زمانہ میں اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی گئی۔

۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۵ء تک علوم وفنون کی کئی کتابوں کے تراجم ہوتے۔ لیکن اردو کی ترقی کا یہ باب کھلا ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا جس کے بعد انگریزوں کے دورِ حکومت میں بہار سے جدید ہندی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ادھر انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اور اردو کی سرپرستی کم ہوگئی۔ لیکن سرسید

احمد خاں اور ان کے ساتھیوں حالی۔ شبلی۔ محمد حسین آزاد اور نذیر احمد نے اپنی تخلیقات سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ سر سید احمد خاں کے زمانے سے اردو زبان وادب میں نمایاں انقلاب شروع ہوا۔ سر سید کی تصانیف نیز سائینٹفک سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ تہذیب الاخلاق اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ذریعے سے تعلیم اور وسائل تعلیم بھی وسیع ہوئے اور ان کے زیر اثر بہترین مصنف پیدا ہونے لگے، جن کی اختراعاتِ ادبی نے اردو ادب کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ علمی سطح پر اردو زبان کی توسیع ہوئی اور تاریخ۔ فلسفہ۔ سیاسیات۔ تنقید ادب کی نئی اصطلاحات سے اردو پہلی بار آشنا ہوئی۔

۱۹۰۰ء تک اردو زبان کی ہمہ گیریت مسلم ہوگئی لیکن اس دور میں لسانی کشمکش بھی شروع ہوئی۔ ۱۹۰۰ء میں بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا اور ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد اردو ہندی تنازعے نے ایک واضح شکل اختیار کرلی تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد اردو سیاست کا شکار ہو گئی۔ مہاتما گاندھی کے نظریۂ ہندوستانی کو نہ تو ہندی والوں نے مانا نہ اردو والوں نے۔ ادھر کانگریس میں بعض عناصر ہندی اور سنسکرت کے احیا کو ہندی قومیت کا جزو لاینفک سمجھنے لگے چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی کانگریسی وزارتیں صوبوں میں برسر اقتدار آئی تھیں تو ان کے تعلیمی پروگرام نے اس مقصد کی وضاحت کردی کہ ہندوستانی قومیت اب ہندی اور سنسکرت کی مدد سے ترقی کرے گی۔ ادھر مسلم لیگ نے اردو کی عام حمایت کا اعلان کرکے ہندوستان میں اردو کی ترقی کی راہوں میں رکاوٹ پیدا کردی رفتہ رفتہ تعصب اور تنگ نظری کم ہوئی، ریاستوں کی تنظیم نو کے لیے جو کمیشن بنا تھا اس نے لسانی اقلیتوں کے ساتھ انصاف پر زور دیا۔ اور ۱۹۶۹ء کے بعد مرکزی حکومت نے ایک بار پھر اردو کی اہمیت تسلیم کرلی اور تمام بڑی بڑی ریاستوں جیسے اتر پردیش۔ مہاراشٹر۔ آندھرا پردیش بہار میں اردو اکیڈیمیاں قائم کیں۔ آزاد ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد یوپی۔ دہلی۔ بہار اور آندھرا پردیش کے علاقہ تلنگانہ میں ہے شہری اور قصباتی سطح پر اس کے جاننے والے پنجاب۔ مدھیہ پردیش اور راجستھان میں بھی ہیں۔ گجرات، میسور، تامل ناڈو کے مسلمانوں میں یہ زبان خاص طور پر پڑھی جاتی ہے اور کرناٹک میں کافی مسلمان اردو بولتے بھی ہیں۔

اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد دوآبہ کے بالائی حصہ روہیل کھنڈ۔ خاص طور پر میرٹھ، سہارن پور، مظفر نگر، مراد آباد، بجنور، بریلی، رامپور، لکھنؤ، بارہ بنکی، حیدر آباد میں آباد ہے۔ اردو کا ایک اور مرکز سری نگر ہے۔ ریاست جموں کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اردو دستور ہند کی آٹھویں جدول میں شامل ہے جس میں ان قومی زبانوں کے نام درج کیے گئے ہیں جن سے مرکزی زبان کو مدد لینی ہے۔ اردو رسم الخط عربی سے لیا گیا لیکن جس میں فارسی کے چار حروف پ۔ چ۔ گ۔ ژ کا اضافہ پہلے ہی ہو چکا تھا اردو کے لیے اس میں ہندی کی آوازیں بھی شامل کی گئیں۔

ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ کھ۔ گھ۔
اردو رسم الخط میں ۵۴ حروف بھی ہیں جن میں ۸ ۲ حروف عربی کے ہیں اردو کا تقریباً ۳/۴ سرمایہ ہندوستانی ہے۔ چنانچہ فرہنگ آصفیہ کے اندراجات کے مطابق اردو کے ۲۵ ½ فی صد الفاظ سامی، فارسی، ترکی ایک فی صد یورپی اور ۳ ½ فی صد الفاظ ہندوستانی ہیں اور ان ہندوستانی الفاظ کے ذخیرے میں ہی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو ادب

دکن میں اردو کا آغاز و ارتقاء

اردو دہلی اور اس کے نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی اور علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کے حملوں کی وجہ سے دکن پہونچی۔ جہاں اس کو مختلف نام دیے گئے، مثلاً "ہندی"، "ہندوی"، "گوجری"، "گجری"، "دکنی"، "مسلمانی"، "ریختہ"، "زبان اہل ہند"، "زبان دہلوی"، "زبان ہندوستان" وغیرہ۔

دکنی اسی اردو کا وہ قدیم روپ ہے جو تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں جب دہلی میں "ریختہ" کے نام سے اردو شاعری کا احیا ہوا تو دہلی کی زبان دکنی سے بہ اعتبار صوتیات وصرف ونحو وغیرہ کسی قدر مختلف ہوگئی اور معیاری اردو کہلائی اور اس کی وہ شکل جو دکن میں تھی اسے دکنی کہا جانے لگا۔ دکن میں دکنی کے بولنے والے زیادہ تر گجرات اور دولت آباد تھے۔ چنانچہ دکنی زبان "گوجری" اور "گجری" بھی کہلائی۔

ڈاکٹر چٹرجی گجری کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

دکنی کا نام گجری، اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنھوں نے پنجاب کے شہر وں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کرکے دکن گئے تو انھوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لئے زندہ رکھا۔

شوکت سبزواری کے خیال میں:۔

"دکنی، گجری، گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دہلی سے ان علاقوں میں پہونچی البتہ ان میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں شامل ہوگئیں"

دکنی اور گجراتی کے اس اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ "دکنی" کا

دکنی کا علاقہ

لسانی خطہ جنوب کی مختلف ریاستوں یعنی گجرات، مہاراشٹر، آندھرا، میسور۔ تامل ناڈو کے موجودہ علاقوں پر مشتمل تھا جہاں اردو زبان کا یہ روپ دکنی کی شکل میں ترقی کرتا رہا۔ جو بہ اعتبار صوتیات صرف ونحو، لغت اور عروض معیاری اردو سے مختلف تھا۔ اس کی وجہ سے بعض علما دکنی کو اردو سے علیحدہ

زبان تسلیم کرنے لگے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جنھوں نے "دکنی" کی بازیافت میں نمایاں حصہ لیا اور محمود شیرانی، جنھوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلے قلم اٹھایا "دکنی اور پنجابی" کی جزوی مماثلتوں کی بنا پر دکنی کا ماخذ پنجابی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات میں معیاری اردو کو کھڑی بولی سے مشتق اور "دکنی" کو "پنجابی" سے مشتق بناتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر چٹرجی، ڈاکٹر ژول بلاک اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیقات کی رو سے :

"دکنی، معیاری اردو کا قدیم روپ ہے جس کا ہیولیٰ، نواح دہلی کی بولیوں، کھڑی، ہریانی اور میواتی سے تیار ہوا ۔"

دکن کا علاقہ ایک آریائی زبان مراٹھی سے بھی گھرا ہوا ہے اس لئے "دکنی" نے مراٹھی اور اس سے قبل مہاراشٹری پراکرت کا خاصا اثر قبول کیا۔ اس کے علاوہ دراوڑی خاندان کی زبانوں، تامل، تلنگی۔ ملیالم، کنڑی سے گھری ہونے کی وجہ سے تلنگی، کنڑی اور تامل کے بعض الفاظ بھی دکنی میں شامل ہوگئے۔ لیکن ان زبانوں کے اثرات سے اردو قواعد محفوظ رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ

(۱) دکنی بہ استثنائے چند الفاظ اور اختلافاتِ تلفظ، سلاطین دہلی کے عہد کی اردوئے قدیم کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۲) "دکنی" کی فرہنگ اور خصوصیات صرف ونحو کی توجیہہ نواح دہلی کی بولیوں، بالخصوص ہریانی اور کھڑی سے مکمل طور پر کی جاسکتی ہے۔

(۳) دکنی " نہ تو برج بھاشا سے نکلی نہ پنجابی سے۔ اس کا مولد و منبع نواح دہلی کی بولیاں ہیں۔ دکنی "صوتی تغیر" کے زیر اثر معیاری اردو بنی۔ "دکنی" یا اردوئے قدیم کی لسانیات کی مندرجہ ذیل خصوصیات ایسی ہیں جو بعد کے مرحلہ میں نہیں ملتیں۔ مثلاً :

صوتی خصوصیات

مصوتوں کی سطح پر اردوئے قدیم یا دکنی کی سب سے بڑی خصوصیت تخفیف صوت ہے یعنی :-

(۱) اسمان بجائے آسمان

(۲) ہائے ہوز کی تخفیف جیسے یہاں کے بجائے یاں

(۳) دکنی میں بعض اوقات "ھ" زاید کر دی جاتی ہے جیسے مٹی کے بجائے مِٹھی۔

(۴) "ق" اور "کھ" کی جگہ "خ" کی آواز جیسے "صندوخ" بجائے "صندوق" "راخ" بجائے "راکھ"۔

(۵) "گ" کی جگہ "غ" کی آواز مثلاً "اغال دان" بجائے "اگال دان"۔

(۶) "دکنی کا" میلان تشدید حرف کی طرف ہے جیسے چونا کے بجائے چُنّا۔ پھیکا کے بجائے پھکّا۔

صرفی خصوصیات

جمع بنانے کے لئے "اں" کا استعمال جیسے کھیت کی جمع "کھیتاں"۔ صرفی سطح پر دکنی زبان کی ایک خاص کلید "چ" تاکید کا استعمال ہے۔ "چ" تاکیدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مراٹھی سے مستعار لی گئی ہے۔ دکنی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ دکنی لکھنے والوں نے عربی فارسی الفاظ کی بھی "تاریخ" کی نیز اپنا رشتہ کھڑی بولی اور شَورسینی اپ بھرنش سے استوار رکھا۔ جس کے توسط سے وہ سنسکرت کے بھی قریب رہا چنانچہ دکنی لفظیات پر سنسکرت کے "تت سم" الفاظ کا چلن رہا "تدبھو" الفاظ دکنی نے قبول کئے۔ جیسے صنم کے بجائے "پیو" یا "پیا" محبت کے لئے پریم۔ دکنی کی ایک اور خصوصیت ہکار حروف کی تخفیف بھی ہے جیسے سمدھی بجائے سمدی۔ باندھنا کے بجائے باندنا۔

دکنی میں نیم مصوتے عام ہیں جیسے بیٹا۔ ڈِبیا وغیرہ۔

دکنی میں جملوں کی ساخت میں فعل کو فاعل کے مطابق لایا جاتا ہے مثال کے طور پر لڑکی لڈو کھائی۔ لڑکیاں کاماں کرتیاں۔ دکنی نے اپنی ہمسایہ زبانوں تلنگی، کنڑی سے بھی الفاظ مستعار لئے جیسے کنڑی کا پچا بہ معنی دیوانہ۔ تلنگی کے الفاظ بونتا، دھیڑا، گھٹرسی، راوتی، بندھی۔

واو عطف جو شمالی ہند کی اردو میں، صرف فارسی عربی الفاظ کے درمیان لایا جاتا ہے دکنی میں ہند آریائی اور عربی فارسی الفاظ کے درمیان بھی مروج ہے جیسے : گھر و دولت = دولت (فارسی) + گھر (ہندی) اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ دکن و گجرات کی اردو نے پنجابی کے علاوہ راجستھانی، گجراتی، برج زبانوں کے اثرات بھی قبول کئے تھے۔ مثلاً ہمنا، تمنا، راجستھانی زبانوں کے ضمائر دکنی والوں نے اپنائے

اس وجہ سے "دکنی" اور "معیاری اردو" دو الگ الگ دھارے بن گئے تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک دکنی ادب کے کئی اہم کارنامے منظر عام پر آئے۔

دکنی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۸۶۷ء تک برقرار رہا چنانچہ ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کے ایک صوفی فقیر اللہ شاہ حیدر نے نہال چند لاہوری کی تصنیف "بکاولی" کے مقابل میں اپنی تصنیف "تناولی" پیش کی۔

باقر آگاہ اپنی مثنوی "گلزار عشق" کے دیباچے میں جو ۱۷۹۱ء میں لکھی گئی" دکنی پہ کئے ہوئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان و ہرزہ سرایاں زبان دکنی بہ اعتراض اور "گلشن عشق" و "علی نامہ" کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کی قایم تھی زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج تھی اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے ابن نشاطی، فراقی، شوقی، خوشنود، غواصی، ایاغی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہ ہم نے اپنی زبان میں بے حساب قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات رقم کئے اور داد سخنوری کا دئے"

دکنی کے ادوار

دکنی" کی ترقی کا اندازہ لگانے کے لئے دکنی ادب کی تاریخ کو ان چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔

پہلا دور :- گجرات میں دکنی یا قدیم اردو کا چلن۔

دوسرا دور :- ۱۳۴۷ء سے ۱۶۸۶ء تک علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے حملوں کے بعد بہمنیہ سلطنت کے قیام اور بہمنیہ سلطنت کے سقوط کے بعد گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کے شمالی ہند میں انضمام تک۔

تیسرا دور :- اورنگ زیب کے عہد میں دکنی کا اہم مرکز اورنگ آباد تھا۔

چوتھا دور :- دور آصفی۔

مرکز گجرات

گجرات میں اس زبان کی سرپرستی حضرت عین الدین گنج العلم، شاہ علی جیو گام دھنی، بہاء الدین باجن، شیخ خوب محمد چشتی، جیسے علما و صوفیا نے کی۔ شاہ علی جیو گام دھنی نے اپنی یادگار ایک اردو دیوان "جواہر اسرار اللہ" چھوڑا۔ شیخ خوب محمد نے اپنے مرشد بہاء الدین باجن کے کلام کی شرح "خوب ترنگ" کے نام سے لکھی۔ مابعد کے زمانے میں محمد امین

گجراتی کی تصنیف "یوسف زلیخا" قدیم اردو کی اہم تصنیف ہے۔

سید علی جیوگام دھنی کے کلام کو اُن کے ایک شاگرد نے ترتیب دیا اس میں ان کی شاعری کے متعلق لکھتا ہے۔

"دربیان توحید و اسرار باالفاظ گجری بطریق فرمودہ"

یہ نام گجری اور گوجری دکنی کے لئے اس دور میں خاصہ مقبول رہا۔ چنانچہ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم اپنی تصانیف "کلمۃ الحقائق" اور "حجۃ البقاء" میں دکنی کو گجری کے ہی نام سے یاد کرتے ہیں۔

گجرات کے ساتھ دکنی کی سرپرستی دکن کی جن سلطنتوں نے کی ان میں سلطنت بہمنیہ اور اس کے انقراض کے بعد عادل شاہی۔ قطب شاہی۔ نظام شاہی۔ عماد شاہی۔ برید شاہی وغیرہ مشہور ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زمانے میں دکنی کی ترقی

علاءالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے ۱۳۱۰ء تک دکن کا کچھ حصہ فتح کرلیا تھا ۱۳۲۴ء میں محمد تغلق نے دیوگرھی دولت آباد کو ہندوستان کا پایہ تخت بنایا اور دہلی سے کثیر پیمانے پر آبادی کا انتقال عمل میں آیا۔ اس طرح "دکنی" (قدیم اردو) خاص طور سے مہاراشٹر (دولت آباد) کے اطراف کے علاقہ میں تیزی سے پھیلنے لگی۔ کیونکہ دکن میں مراٹھی، کنڑی، تلنگی اور تامل زبانیں بولی جاتیں تھیں۔ اس لئے اردو یا دکنی ہی مشترک زبان کے طور پر حاکم و محکوم کے مابین ارتباط کا ذریعہ بنی۔ دکنی کی اشاعت و ترویج دو محاذوں سے ہوئی "خانقاہ" اور "دربار" خانقاہوں میں صوفیا نے عقائد و مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ اس مشترک زبان کو بنایا جو دکن میں مقبولیت حاصل کررہی تھی۔

اس لئے جب محمد تغلق کے خلاف دکنی امرا نے علم بغاوت بلند کرکے علاءالدین حسن بہمنی کو اپنا فرماں روا تسلیم کیا تو دربار میں بھی اس زبان کی سرپرستی کی گئی۔ بہمنی خاندان کے حکمرانوں نے جہاں مقامی زبانوں کی سرپرستی کی وہیں عربی، فارسی، اردو (دکنی) کو بھی فروغ دیا۔ بہمنی دور کے اکثر حکمراں علم دوست اور ادب پرور تھے۔ احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز دکن تشریف لائے آپ نے عربی، فارسی کی تصانیف کے علاوہ چند رسائل "دکنی" میں تصنیف فرمائے، اور بعض رسائل کو غلط طور پر آپ سے منسوب کردیا گیا۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ اس زمانے تک دکنی زبان میں اتنی سکت آگئی تھی کہ وہ اظہار خیال کا ذریعہ بن سکے۔ خواجہ بندہ نواز کے خلفاء اور تلامذہ میں بھی کئی نے اس زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ بہمنی دور کے مشہور شعرا اور ادبا جنکے کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت عین الدین گنج العلم گجرات سے دکن تشریف لائے۔
۲۔ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز
۳۔ حضرت اکبر حسینی
۴۔ حضرت عبداللہ حسینی
۵۔ نظامی۔ مصنف کدم راو پدم راو
۶۔ امیرالدین شاہ میراں جی شمس العشاق۔
۷۔ فیروز مصنف پرت نامہ یا توصیف نامہ میراں محی الدین
۸۔ اشرف مصنف نوسرہار

ان کے علاوہ احمد، محمود، آذری، خیالی وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔

۹۲۲ھ (مطابق ۱۵۲۶ء) میں بہمنی حکومت کمزور ہوگئی اور اس کے پانچ صوبوں، یعنی بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، برار اور بیدر کے صوبہ داروں نے بغاوت کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ بیجاپور میں عادل شاہی گولکنڈہ میں قطب شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی اور بیدر میں برید شاہی سلطنتوں کی بنیاد پڑی جس میں سے برید شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں کمزور ہونے کے باعث عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی میں ضم ہوگئیں بیدر کی برید شاہی کو عادل شاہی سلطنت نے برار کی عماد شاہی کو احمد نگر کی نظام شاہی حکومتوں نے ختم کردیا۔ بقیہ تین سلطنتوں کے حکمرانوں یعنی عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں نے نہ صرف شعر و ادب کی سرپرستی کی بلکہ خود بھی اس زبان کو ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا۔

سلطنت قطب شاہی

قطب شاہی خاندان کے پانچویں فرمانروا محمد قلی قطب شاہ جس نے پچاس ہزار کے قریب شعر کہے یہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔

اس خاندان کے دوسرے فرماں رواؤں سلطان محمد، سلطان عبداللہ، اور ابوالحسن تانا شاہ نے بھی اس زبان میں شاعری کی۔

لیکن قل اللہ کو زور صاحب نے سلطان محمد قطب شاہ کا تخلص بتایا ہے

وجہی اس عہد کا مشہور شاعر اور نثر نگار ہے جس نے نظم میں "قطب مشتری" لکھنے کے علاوہ نثر میں "سب رس" لکھ کر دکنی نثر کو ادبی رنگ دیا۔ ابھی تک دکنی نثر صرف مذہبی اور فلسفیانہ موضوعات کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ وجہی پہلا شخص تھا جس نے اس زبان کے لئے "دکنی" کا لفظ استعمال کیا اگرچہ سب رس میں ہی اپنی زبان کو "زبان ہندوستان" کہتا ہے۔

وجہی کے علاوہ اس عہد کے دوسرے اہم شاعر غواصی اور ابن نشاطی ہیں غواصی (مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، میناست ونتی ——— ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن، جو ایک فارسی مثنوی بساتین کا ترجمہ ہے، شاعرانہ صنعت گری کا کمال ہے جن میں مصنف نے انتالیس صنعتیں استعمال کی ہیں۔ اس دور کے دوسرے مشہور شاعر اور ادیب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حسن شوقی ۲۔ جنیدی (مثنوی ماہ پیکر) ۳۔ قطبی (تحفۃ النصائح) ۴۔ سلطان (دیوان) ۵۔ سید بلاقی (معراج نامہ) ۶۔ شاہ راجو میراں جی خدانما (تمہیدات عین القضاۃ) ۷۔ طبعی (بہرام وگل اندام) ۸۔ سیوک (مرثیے) ۹۔ خواص (مرثیے) ۱۰۔ غلام علی خان لطیف (ظفر نامہ محمد حنیف) ۱۱۔ غلام علی (مصنف پدماوت) ۱۲۔ احمد (مصنف لیلیٰ مجنوں) ۱۳۔ افضل قصیدہ گو۔

ان مصنفین کی زبان قدیم اردو یا دکنی کے مستند نمونے پیش کرتی ہے یہ اپنی زبان کو "دکنی" کہتے ہیں۔ ابن نشاطی کہتا ہے ہسے ہر کسی کے تئیں سمجھا کو توں بول ——— دکن کی بات سوں سترباں کو کہہ کھول۔

ایک گمنام شاعر کہتا ہے:

دکنی میں مجکوں مہارت ایتی کہ النصر منکم کہے نصرتی

شاہ نامہ فردوسی کا مصور صفحہ ابتدائی سولھویں صدی کا قلمی نسخہ عہد اکبری

شاہ نامہ فردوسی کا مصور صفحہ ۱۴۲۸ء (لودھی عہد)

بہادر شاہ ظفر کے تعمیر کردہ ایک کنویں کا سنگی کتبہ

[illegible]

لوریا نندن گڑھ — اشوک کی پہلی لاٹ پر کندہ
ایک عبارت کا متن برہمی رسم الخط (۲۴۲ قبل مسیح)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۱)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۲)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۳)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۴)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۵)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۶)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۷)

(۱) خط معقلی (۲) خط کوفی (بہ دورِ عروج) (۳) خط کوفی مزیّن (۴) خط کوفی (۵) خط ثلث (۶) خط نسخ (۷) خط رقعہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۸

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۹

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۱۰

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۱۱

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۱۲

۸ خط دیوانی ۹ خط شکستہ ۱۰ خط نستعلیق ۱۱ خط گلزار ۱۲ خط غبار

خطاط : انیس صدیقی، (نیشنل ایوارڈ یافتہ)، نئی دہلی

عادل شاہی

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت نے بھی قطب شاہیوں کی طرح دکنی کی سرپرستی کی۔ اس خاندان کے دو فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی نے دکنی میں شاعری بھی کی۔

ابراہیم عادل شاہ نے نورس میں برج بھاشا کے علاوہ بعض گیت دکنی میں بھی لکھے تھے اگرچہ ان گیتوں پر برج بھاشا کا اثر زیادہ غالب ہے تاہم اس کے درباری شاعر عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ" شمالی ہند کی دہلوی اور جنوبی ہند کی دکنی کا بڑا اچھا امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس شاعر نے اپنے آپ کو دہلوی ظاہر کرتے ہوئے دکنی میں لکھنے پر فخر کیا ہے۔

علی عادل شاہ شاہی کا دیوان محمد قلی کے دیوان کی طرح تمام اصناف پر محیط ہے۔ ان بادشاہوں کے علاوہ بیجاپور کے صوفیا نے بھی اردو نثر و نظم کو مالا مال کیا۔ ان میں شمس العشاق میراں جی، ان کے بیٹے برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ و نیز ان کے خلفا و تلامذہ شامل ہیں۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف لسانی اہمیت کے حامل ہیں مثنوی شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، مغز مرغوب کے مخطوطات مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف میں کلمۃ الحقائق (نثر) سکھ سہیلا، مثنوی ارشاد نامہ، مثنوی بشارت الذکر وغیرہ دستیاب ہیں شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔ گفتار شاہ امین، محب نامہ اور گنج مخفی وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ عادل شاہی دور کے جن شعراء و ادبا کے کارنامے دستیاب ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

مثنوی ابراہیم نامہ از عبدل، مثنوی چندر بدن و ماہ از مقیمی، مثنوی کشف الوجود مثنوی کشف الانوار از شاہ داول، مثنوی بہرام وحسن بانو از امین و دولت، مثنوی فتح نامہ از نظام شاہ، مثنوی میزبانی نامہ از حسن شوقی جن شوقی کا تعلق دکن کے تینوں درباروں سے رہا، مثنوی قصۂ بے نظیر اور گلدستہ از صنعتی، مثنوی نجات نامہ از ایاغی، مثنوی جنت سنگار از ملک خوشنود، مثنوی خاور نامہ از رستمی (۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل رزمیہ مثنوی لکھی جو اردو کی سب سے ضخیم مثنوی مانی جاتی ہے)

مثنوی علی نامہ، گلشن عشق و تاریخ اسکندری از ملک شعرا بیجاپور ملا نصرتی مثنوی یوسف زلیخا از ہاشمی، دیوان ہاشمی (ریختی) بھی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی قصص الانبیاء از قدرتی، مثنوی اسرار عشق از مومن مثنوی گنج مخفی، شجرۃ الاتقیا، نظم سی حرفی، دیوان شاہ معظم از معظم، روضۃ الشہدا از سیوا وغیرہ

مغل عہد ۱۶۸۶ — ۱۷۵۰ء

سترہویں صدی عیسوی میں دکن کی سلطنتوں عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی کا مغل سلطنت میں انضمام عمل میں آیا۔ اس دور میں مرثیہ گوئی کی کافی ترقی ہوئی۔ ڈاکٹر زور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اورنگ زیب اور اس کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے دکنی ادیب اور شاعر اپنے جذبات و خیالات کو صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مرثیے کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ اس دور میں جن شاعروں اور ادیبوں نے دکنی میں اپنے کارنامے چھوڑے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

قاضی محمود بحری (من لگن و بنگاب نامہ اور دیوان)۔ پیرزادہ روحی ہاشم علی، مرزا، ضعیفی (ہدایات ہندی)، شاہ عنایت (نور نامہ)، شاہ عبدالرحمٰن قادری (مصنف باغ حسینی)، سید محمد خان عشرتی (مصنف دیپک پتنگ و چت لگن، عشرتی کے فرزند سید احمد خان ہنر بھی صاحب تصنیف تھے ان کی مثنوی "نیم درین"، جو پھول بن کے جواب میں لکھی گئی خاصی اہم ہے۔ یہ مثنوی اس زمانے کی دکنی تہذیب کی عکاس ہے۔ ہنر نے اس زمانے کی سجاوٹ اور زیبائش، کھانوں، سالنوں، میٹھوں وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

شاہ حسین ذوقی کی تصانیف بحر العرفان، وصال العاشقین، وفات نامہ، ماں باپ نامہ، غوث نامہ مذہبی رنگ کی ہیں۔ اس دور کا ایک اور مشہور شاعر وجیہہ الدین وجدی ہے جس کی تصنیف "پنچھی باچھا" ہے۔ یہ منطق الطیر کا ترجمہ ہے اور باغ جاں فزا اور تحفۂ عاشقاں بھی فارسی صوفیانہ مثنویوں کے تراجم ہیں۔ لیکن ولی اورنگ آبادی اس پورے دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو بجا طور پر عہد آفریں اور عہد ساز کہا جاسکتا ہے

اورنگ زیب نے بیجاپور، احمد نگر اور حیدرآباد کی رونق تو کم کر دی وہاں کی محفلیں اجڑ گئیں اور چہل پہل ختم ہوئی لیکن اس کی وجہ سے اورنگ آباد شعر و ادب، علم و فن اور تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا مرکز بن گیا جس کی اہمیت اورنگ زیب کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد تک قائم رہی۔

بیجاپور اور حیدرآباد کے باقی ماندہ شعرا وہاں جمع ہوگئے۔ ولی کے علاوہ اس عہد کے دکھنی شعرا میں سراج اور عزلت دوسرے اہم شاعر ہیں جنھوں نے دکنی بالخصوص قدیم غزل کو نئی آب و تاب دی۔ لیکن ولی کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ولی نے دلی کا سفر کیا اور وہاں کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر وہاں کے شاعروں کو اردو کی طرف مائل کیا۔ یہ گویا مفتوح کی فاتح پر فتح تھی۔ کیونکہ شمالی ہند کی فوجوں نے دکن پر سیاسی فتح حاصل کی تھی۔ لیکن دکن کے اسی شاعر نے شمال پر ادبی فتح حاصل کرلی۔ اور اس زبان کا ڈنکا دلی کے مشاعروں اور محفلوں میں اس طرح بجوایا کہ "دکنی" وہاں کی محفلوں کی جان بن گئی اور دلی کے شعرا نے اسے ریختہ کا نام دیکر شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ چنانچہ شمالی ہند کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے ولی ہی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھ لیا۔

ولی کے علاوہ جن دکنی شعرا نے دلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی مشہور ہیں۔ لیکن دہلی میں "دکنی" نے بہت جلد اپنی ہیئت تبدیل کرلی۔ مرزا مظہر جان جاناں اور حاتم نے "اصلاح زبان" کی تحریک شروع کی جسکے تحت دکنی کی لفظیات کو تبدیل کیا۔ دکنی سے برج، راجستھانی، پنجابی اور کھڑی کی آمیزش ختم کرکے اسے عربی اور فارسی کے قریب کر دیا۔ اس کا ثبوت دیوان زادہ حاتم کا فارسی پیش لفظ ہے جس میں حاتم نے وضاحت کر دی کہ "ملک کی زبان اور ہندوی کہ اس کو بھاکا کہتے ہیں موقوف کرکے فقط روزمرہ کہ عام فہم اور خاص پسند تھا اختیار کیا"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

" اس انتخاب میں قدیم (دکنی) طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے "

اس طرح اٹھارہویں صدی کے اوائل تک دکنی، صوتی تغیرات کے زیر اثر شمال میں "اردوے معلیٰ" بن گئی۔ لیکن جنوبی ریاستوں، جیسے مدراس، کرناٹک اور حیدرآباد میں سنہ ۱۸۶۶ء تک اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب مدراس میں اپنے قدم جمالئے تو انھوں نے فورٹ سینٹ جارج کالج کے معلمین سے دکنی میں کتابیں لکھوائیں۔ جسکا نمونہ انوار

سہیلی" مصنفہ محمد ابراہیم ہے۔
لیکن سترہویں صدی کا اواخر اور اٹھارہویں صدی کا اوائل اردو شعر و ادب کے لئے بڑا سازگار رہا۔ کیونکہ اسی زمانے میں اردو نے مغل دربار میں بار پایا۔ شاہان اودھ نے اس کی سرپرستی کی اور پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز نوواردین نے زبان ہندوستان یا ہندوستانی کی ترویج و اشاعت کے لئے سینٹ جارج کالج مدراس، فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلی کالج قائم کئے۔ اس دوران بھی دکنی کا تسلسل قائم رہا۔ گو نظم کا رواج کم ہو گیا لیکن نثر میں یہ روایت برقرار رہی۔ بالآخر سرسید تحریک نے دکنی کے چلن کو بالکل موقوف کر دیا۔
جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد تو یہ داستان پاستاں صرف 'بولی' کے روپ میں رہ گئی۔ اور صرف و نحو و محاورہ و زبان کے اعتبار سے معیاری اردو دکنی سے اس حد تک مختلف ہو گئی کہ "دکنی" کو اردو کا بگڑا ہوا روپ سمجھا جانے لگا۔

اردو ادب

(سقوط دکن سے ۱۸۵۷ء تک)

ہندوستان میں ترکوں کی حکومت قایم ہو جانے کے بعد گجرات میں گجراتی، بنگال میں بنگالی، سندھ میں سندھی، دہلی میں کھڑی بولی، متھرا میں برج بھاشا، اودھ میں اودھی اور دکن میں دکنی یا قدیم اردو کو فروغ حاصل ہوا اور ان کے لکھنے کے لیے ابتدا میں بالعموم فارسی رسم خط ہی استعمال کیا گیا۔ سکندر لودی ۱۴۸۸-۱۵۱۸ء کے زمانے میں تو فارسی رسم خط میں ہندوستانی آوازیں مثلاً ٹ، ڈ، ڑ بھی شامل ہو گئی تھیں۔ دکنی یا ہندوی کا لفظ جس کی روداد ہم آگے بیان کریں گے کبھی کبھی فارسی ادب سے ممیز کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں دکنی ریاستوں کی بدولت قابلِ توجہ ادب کا اضافہ ہو چکا ہے۔
اورنگ زیب نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور اس کے ایک سال بعد گول کنڈہ پر قبضہ کر لیا اب کابل سے کاویری تک مغلوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ واقعہ سیاسی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تہذیبی اور لسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو اپنا دوسرا دار الخلافہ بنایا۔ جو محمد بن تغلق کے انتظامیہ کے مرکز یعنی دولت آباد سے صرف چند میل پر واقع ہے۔ اس لیے اورنگ آباد کی زبان دکن کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں دہلی سے قریب ہے۔
دکن کا دہلی کے رشتے میں منسلک ہو جانا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ فوج کشی ۱۶۸۱ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۹۰ء میں پورا دکن اورنگ زیب کے قبضہ اختیار میں تھا۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئیں اور اورنگ آباد مغلوں کا دکنی دار السلطنت بن گیا۔ مغلوں کے تسلط نے اس علاقے کا رشتہ نواح دہلی کی زبان سے، جو اردو کا مولد و مصدر تھا، پھر قایم کر دیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ شعرا اور نثر نگار جو نئے حالات سے مقابلہ یا مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ جنوب بعید، یعنی مدراس، ارکاٹ، میسور اور ویلور کے علاقے میں جا بسے۔ اس سے بھی اردو شعر و ادب کی نشر و اشاعت ہوئی اور ان علاقوں میں اردو اپنی تمام پرانی ادبی روایات کے ساتھ ایک صدی تک رائج رہی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ویلور مدراس اور میسور میں قدیم دکنی اردو فروغ پاتی رہی، اورنگ آباد اور حیدر آباد کے علاقوں میں وہ تازہ زبان دہلی جو شمالی ہند میں بہت سے تشکیلی مراحل سے گذر چکی تھی پھولتی پھلتی رہی۔ اس لیے کہ مغلوں کے ساتھ دہلی کے بہت سے باشندے آکر دکن میں بس گئے تھے۔ اسی لسانی رجحان کا نمائندہ ولی دکنی ہے۔
گول کنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ ایک عہد اور ایک تہذیب کا خاتمہ ہے۔ اس تہذیب کے تانے بانے شیعی عقائد نے بُنے تھے۔ انضمام سلطنت کے بعد دکنی شعرا نے مرثیے کی طرف خاص توجہ کی۔ اس سے نہ صرف ایک اہم صنفِ سخن کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان شعرا کا تزکیۂ نفس بھی ہوا۔ وہ محض شہدائے کربلا کے غموں ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس پیرائے میں گول کنڈہ اور بیجاپور کے زوال کا بھی ماتم کرتے ہیں۔ روحی، قادر اور مرزا اس عہد کے معروف مرثیہ نگار ہیں اور ان کا ذکر جستہ جستہ "اردو کے شہ پارے" کے علاوہ بعض تذکروں اور فہرستوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ اسی زمانے میں شیخ داؤد نے عام رجحان کے خلاف اورنگ زیب کی تعریف میں اشعار لکھے۔ ان کا "ہدایت نامہ ہندی" (۱۶۸۸) خاص طور پر مشہور ہے۔ اسی طرح شاہ عنایت کی مثنوی "نور نامہ" (۱۶۹۹) حضور رسالت مآب کی نعت میں لائق ذکر ہے۔
دور مغلیہ کے شاعروں میں محمود بحری کا نام سرفہرست ہے۔ جو بیجاپور کے زوال کے بعد حیدر آباد میں رہنے لگے تھے۔ یہیں انھوں نے اپنی صوفیانہ مثنوی "من لگن" لکھی جو مضامین تصوف و معرفت سے مملو ہے۔ بحری کی زبان قدیم دکنی محاوروں سے معمور ہے۔ انھوں نے ہندی الفاظ اور دیسی خیالات و افکار سے بھی استفادہ کیا ہے۔
دکنی اردو میں ایک دوسرا اہم رجحان ولی دکنی ۱۶۶۷-۱۷۴۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے آخری زمانے کا کلام دہلی کے تازہ اور فارسی آمیز محاورے سے قریب تر ہے۔ اردو میں یہ بحث ایک عرصے سے چلی آرہی ہے کہ ولی گجراتی تھے یا اورنگ آبادی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گجراتی اور اورنگ آبادی اردو میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان کا دہلی جانا اور سعد اللہ گلشن سے ملنا اور ان کی نصیحت پر عمل کرنا تذکروں سے ثابت ہے۔ اسی وجہ سے ابتدائی کلام دکن کے محاورے سے قریب ہے اور آخری کلام محاورہ دہلی سے اثر پذیر ہے۔ ولی کے ادبیات میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ بخشا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ خانقاہوں، مراختوں اور ادبی محفلوں کو گرما سکے۔
اس عہد کے لکھنے والوں میں سید شاہ محمد قادری، شاہ ولی اللہ قادری مترجم "طوطی نامہ" ابو الفضل خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ اس کے بعد محمد باقر آگاہ، مولانا عزلت اور قاضی بدر الدولہ نے اردو کے مذہبی، ادب میں اضافہ کیا لیکن ان کی زبان قدامت آمیز ہے اور شمال کے مقابلہ میں ادبی محاسن سے عاری ہے۔ جن لوگوں نے دکن کے قدیم محاورے کی پیروی کی اور اورنگ آباد سے متاثر نہیں ہوتے ان میں عشرتی اور وجدی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ عشرتی کا مقابلہ بیجاپور کے مشہور شاعر نصرتی سے کیا جاتا

ہے۔ ان کی مثنویاں "دیپک پتنگ" اور "چت لگن" ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں لیکن "منطق الطیر" کا منظوم ترجمہ "پنچھی باچھا" شائع ہوچکا ہے۔

دکن پر مغلوں کا تسلط ۱۶۸۷ء سے ۱۷۲۴ء تک یعنی ۳۷ برس رہا۔ یہ مدت اتنی کم ہے اور اس زمانے میں رسل و رسائل کی دشواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ نئے رجحانات زیادہ نہیں ابھر سکے۔ اور اردو کا قافلہ کم و بیش ان ہی معنوی خطوط پر چلتا رہا، جو سلاطین گول کنڈہ اور بیجاپور کے زمانے میں مرتب ہوتے تھے۔ دکنی اردو کا قدیم رجحان میسور اور ویلور میں قایم رہا۔ لیکن اورنگ آباد اور حیدرآباد میں دہلی کے تتبع پر فخر کیا جانے لگا۔ بعض شعرا دکن کو چھوڑ کر شمالی ہندوستان چلے آئے اور طرزِ دہلی کی پیروی کرنے لگے۔ دکن میں مغلوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد اردو کا مرکز پھر شمالی ہندوستان میں منتقل ہوگیا۔ ولی اور مظہر جانِ جاناں کی زبان درحقیقت وہ زبان ہے جس کو تاریخ عرصہ سے سنوار رہی تھی دکنی ادب کے ذریعہ اردو میں جو ہندوستانی رنگ آیا تھا وہ پھیکا پڑگیا اور اب وہ فارسی کے قالب میں ڈھلنے لگی۔

۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ کا حملہ اور دہلی میں قتلِ عام ہوا تو ہندوستانیوں میں نہ صرف نادر شاہ کے خلاف نفرت پیدا ہوئی بلکہ اس کی زبان کے خلاف بھی ردِ عمل ہوا۔ اسی زمانے میں غلام قادر روہیلہ نے شاہی خاندان پر طرح طرح کے مظالم کیے اور بادشاہ (شاہ عالم) کی آنکھیں نکال لیں۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش نے بھی دہلی کا امن و امان برہم کیا۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں کوئی بھی آسودہ حال نہ تھا۔ یہ صورتِ حال صوفیانہ فکر کے فروغ کا سبب بنی۔ یہ تصوف جس کا اظہار اردو شاعری میں گوناگوں طریقے سے ہوا ہے اس نے ان نامساعد حالات میں جینے کا ایک طریقہ سکھایا۔ صوفی شعرا نے دربار کی زوال آمادہ روایات کے خلاف خاموش احتجاج کیا۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا۔ جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ ذاتِ واحد، یعنی ابدی سچائی اور انسانی دردمندی ہے۔

یہ دور جو ۱۸۵۷ء پر ختم ہوتا ہے عظیم الشان مغل تہذیب کا بھی اختتامی دور ہے۔ اسی زمانہ میں بہت سے شاعر دہلی کی مصیبتوں سے تنگ آکر لکھنؤ چلے گئے اور اس عدن آباد کی خزاں سے لکھنؤ کی چمن بندی کی گئی۔ جب لکھنؤ کی سیاسی آزادی مستحکم ہوگئی تو ادب میں بھی دہلی کا تسلط ہوگیا۔ یہ مہاجرت تو آسان تھی لیکن دہلی سے سب رشتوں کا منقطع کرنا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا تھا۔ اس لیے کہ اصلاً دونوں تہذیبیں ایک ہی تھیں۔ مہاجر شاعر لکھنؤ میں بھی یہ کہتے تھے "از خاکِ پاکِ دہلی ہستم" اور ابتدا میں دہلی ہی کی روایات کو سند سمجھتے تھے۔ مگر مرثیے کا عروج اور مثنوی کی ترقی بہرحال لکھنؤ کی مرہونِ منت ہے۔

مغلیہ سلطنت کا یہ آخری دور سیاسی اعتبار سے ضرور زوال و انحطاط کا دور تھا لیکن فکری اعتبار سے اس کو ارتقائی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کے اہلِ علم زمانے کے نبض شناس تھے اور اہلِ تصوف نے ان روادارانہ رجحانات کو تقویت دی جو دارا شکوہ سے شروع ہوتے تھے۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ ہندو موحدین اور مسلمان صوفیا ایک ہی حقیقت کی تلاش کرتے ہیں اور ان کا اختلاف لفظی زیادہ ہے، حقیقی کم۔ حضرت شاہ عبدالعزیز بھگوت گیتا کو اور مرزا مظہر جان جاناں ویدوں کو مقدس کتاب سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہندو توحید سے خالی نہیں ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندو اور مسلم تہذیبیں شیر و شکر ہوگئی تھیں۔ ان کے رسم و رواج اور آدابِ زندگی اور میزان افکار میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

انیسویں صدی میں وہابی تحریک بھی ابھری جس کو دراصل ولی اللّٰہی تحریک کہنا چاہیے۔ یہ حضرات مذہبی اصلاح کے ذریعہ ایک ایسا فعال معاشرہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو انگریزوں کا مقابلہ کرسکے۔ اسی وجہ سے حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کے اردو میں ترجمے کیے تاکہ لوگ اسلام کی اصلی خوبیوں کی طرف رجوع کرسکیں۔ وہابی تحریک ہندوؤں کے خلاف نہیں تھی، انگریزوں کے خلاف تھی۔ وہابی علما نے کوئی فتویٰ مرہٹوں یا سکھوں کے خلاف شائع نہیں کیا۔ انگریزوں کے خلاف شائع کیا۔ ان کا سارا لٹریچر ان کا روپیہ ان کے سپاہی ہندو ریاستوں میں سے ہوکر گزرتے تھے۔ اور ہندو راجاؤں اور تحصیلداروں کی مدد سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے تھے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے ہندو مذہب کی مخالفت نہیں کی۔ چند ہندو رسوم کے اختیار کرنے کی مخالفت کی ہے۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ دونوں مذہب کے معاملے میں کشادہ دل تھے اور موخرالذکر کرشن جی کو بہت بڑا درجہ دیتے تھے۔

وہابی تحریک میں جو لوگ شامل تھے وہ زیادہ تر غریب اور نچلے طبقہ کے لوگ تھے۔ جن کی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ ان لوگوں نے آسان نثر میں کتابیں لکھیں اور اپنے چھاپہ خانہ میں چھپوائیں تاکہ عوام تک پہنچ سکیں۔ اس سے اُردو نثر کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس میں آسان اور سلیس اسلوب کا رواج ہوگیا۔ وہابی تحریک پشاور سے پٹنہ تک اور ہگلی سے کرنول تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے وہابی علما نے آسان نثر کو چھاپے کے حروف میں پورے ملک تک پھیلا دیا۔ بغیر ان کی کوششوں کے دہلی کالج اور سرسید کی کوششیں بارآور نہیں ہوسکتی تھیں۔ وہابی ادب نے ان کے لیے راستہ کھول دیا اور جدید اردو نثر کی شاہراہ متعین کردی۔

دلی کالج اور وہابی مصنفین کی کوششیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ وہ اس نظریئے کی قطعی تردید کرتی ہیں کہ میرامن اور سرسید کا درمیانی زمانہ ادبی سرگرمیوں سے خالی ہے۔ اس زمانے میں فارسی سرکاری زبان تھی اور بنگال کی دیوانی تفویض کرتے وقت بھی اس کے تحفظ کا پورا سر و سامان کیا گیا تھا۔ اردو کئی اعتبار سے تہی دامن تھی۔ وہ نرم و نازک بیل کی طرح فارسی کے درخت سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس لیے اردو نثر و نظم پر فارسی کا اثر ایسا حیرت انگیز نہیں ہے۔ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ وہابی مصنفین نے سرسید کی تحریک سے پہلے آسان نثر لکھنے کی کوشش کی اور اس کو عوامی ضروریات کا تابع کردیا۔

فورٹ ولیم کالج لارڈ ویلزلی کے زمانے میں فتح میسور کی خوشی میں قایم کیا گیا تھا۔ ویلزلی اس کو مشرق کا دانش کدہ بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعہ ایشیائی علوم اور ہندوستانی زبانوں پر تحقیق ہوسکے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر ایک ایسے اقامتی کالج کے لیے بھی تیار نہیں تھے جس میں اردو کے بتیس لڑکے، فارسی کے چھتیس لڑکے، عربی کے آٹھ لڑکے اور بنگالی کے چھ لڑکے زیرِ تعلیم ہوں۔ چنانچہ ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو یہ حکم صادر کیا گیا کہ کالج کو فوراً بند کردیا جائے۔ لیکن ویلزلی اپنی بات پر اڑا رہا اور اس نے لکھا کہ اگر اس چھوٹے سے کالج کو بھی بند کردیا گیا تو برطانوی حکومت ختم ہوجائے گی اور اس کے اقتدار کا جنازہ نکل جائے گا۔ بالآخر ۱۸۰۳ء میں کمپنی کے ڈائرکٹر کالج کو چلانے پر آمادہ ہوگئے لیکن لارڈ ولیم بینٹنک کے زمانے میں انگریزی زبان کے ہم نوا غالب

آگئے اور گورنر جنرل نے ۱۸۳۱ء میں کالج کی کونسل کو برطرف کر دیا۔ لیکن یہ کالج پورے طور پر لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں ۲۴ جنوری ۱۸۵۴ء کو بند ہوا۔

فورٹ ولیم کالج سے اردو کو بالواسطہ فائدہ پہنچا لارڈ ویلزلی کا خیال تھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ہمیں ہندوستان کو جاننا چاہیے۔ اور اس ملک کو جاننے کے لیے لوگوں سے گفتگو کرنا چاہیے اور گفتگو کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی زبان کی واقفیت ہو۔ چنانچہ اس کالج کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو اردو پڑھائی جائے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ نئے طرز کی کتابیں تیار نہ کرائی جائیں۔ چنانچہ اس کالج کے منشیوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ تکلفات سے الگ ہو کر روزمرہ کی زبان میں ایسی کتاب لکھیں جو ہندوستانی ذہن اور ہندوستانی معاشرت کو سمجھنے میں مدد دیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب "باغ و بہار" ہے جس کے ایک سو سے زیادہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ نے اس کو شائستہ زبان قرار نہیں دیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کالج کے مصنفین کی کسی کتاب کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج ایک جزیرہ تھا جو مروجہ میلانات سے الگ تھلگ تھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش کے ماحول پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا اور اس کی کتابیں باہر درس میں شامل نہیں ہوئیں۔ البتہ برطانوی اقتدار قایم ہو جانے کے بعد اس رجحان کو مزید تقویت حاصل ہوئی جو دہلی مصنفین اور فورٹ ولیم کالج کی بدولت شروع ہوا تھا۔

برطانوی اثر انیسویں صدی کی دوسری دہائی سے نمایاں ہوتا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں (قدیم) دلی کالج قایم ہوا جس کی بدولت اردو میں نئے اور سائنسی خیالات داخل ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں اس کالج نے ایک ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی قایم کی۔ جس کے ذریعے اردو میں سائنسی کتابوں کا اضافہ ہوا۔

کالج کے استاد رام چندر نے دو اخبارات "محب وطن" اور "مفید الناظرین" شائع کیے۔ جن کے ذریعے اہل اردو مغربی خیالات اور ایک نئے طرز فکر سے روشناس ہوئے اور ایک پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر کی کوششوں سے ایک اخبار "قران السعدین" شائع ہونا شروع ہوا۔ جس کا مقصد مشرق اور مغرب کو ملانا تھا۔ جب ہم ان کوششوں کو یکجا کرتے ہیں اور ان افکار تازہ کا جائزہ لیتے ہیں جو اس وقت اردو کے حلقے میں پیدا ہوتے تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ دہلی میں ایک سائنسی نشاۃ ثانیہ قایم ہو گئی تھی۔ اور غدر سے پہلے مغربی علوم و فنون کی چونچوں نے ذہن اور ضمیر میں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ ۱۸۶۴ء میں دہلی سوسائٹی قایم ہوئی جس کا مقصد ادبی مسائل پر بحث کرنا تھا۔ مرزا غالب جن کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی اس سوسائٹی سے وابستہ تھے۔ انھوں نے اردو نثر میں ایک نیا طرز نکالا اور بقول خود مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔

اردو کی تاریخ میں قدیم دلی کالج کی بھی نمایاں حیثیت ہے۔ اس کے مخاطب فورٹ ولیم کالج کے برخلاف انگریز نہیں بلکہ ہندوستانی تھے۔ اس کو قدیم سے بھی محبت تھی اور جدید سے بھی۔ اس نے اردو کو بھی فروغ دیا اور نئے خیالات کو بھی رائج کیا۔ اس میں سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی تمام علوم اردو کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے یہ سیکولر ادارہ تھا۔ اس میں رام چندر بھی تھے مولانا صہبائی بھی۔ پیارے لال آشوب بھی اور منشی ذکاء اللہ بھی۔ بنگال میں جو نشاۃ ثانیہ آئی تھی اس کی حیثیت تمام تر ادبی تھی لیکن دہلی میں اس کی حیثیت سائنسی فکری اور عقلی تھی۔ مولوی نذیر احمد نے لکھا ہے کہ اگر میں دلی کالج میں نہ پڑھتا تو اندھا بہرا گونگا رہتا۔

دلی کالج کی شخصیتوں میں ماسٹر رام چندر کی حیثیت بہت ممتاز ہے انھوں نے سترہ کتابیں مرتب کیں جو سائنس، تاریخ، ریاضی اور جغرافیہ سے متعلق ہیں انھوں نے عقلی فکر اور سادہ اسلوب پر زور دیا۔ وطن دوستی اور سائنسی اور غیر جذباتی طرز فکر کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ سماجی شعور سائنسی اور سادہ اسلوب میں وہ بلاشبہ سرسید اور حالی کے پیش رو ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کا ایک بڑا کارنامہ اردو پریس کا قیام ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور کالج کے منشیوں کی ساری تصانیف اسی پریس میں چھپتی تھیں۔ اودھ کے فرماں روا غازی الدین حیدر نے لکھنؤ میں ٹائپ کا چھاپہ خانہ قایم کیا۔ اور سب سے پہلے مشہور لغت "ہفت قلزم" شائع کی۔ دوسری قابل ذکر کتاب "لارڈ بروگ ہین" (Broogban) کی انگریزی کتاب پلیزر آف سائنس (Pleasure of Science) کا ترجمہ ہے۔ کالج میں چھاپے کی جو سہولتیں تھیں وہ صرف مصنفین کالج کے لیے محدود تھیں۔ بیرون کالج کے مصنفین پریس کی سہولتوں سے ۱۸۳۷ء کے بعد ہی استفادہ کر سکے۔ حکیم شریف خاں نے قرآن پاک کا ۱۷۷۰ء میں اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ اشاعت سے محروم رہا اور اس لیے مشہور نہیں ہوا۔ ۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا جس کی سنگ میل کی سی حیثیت ہے۔ بیرون کالج کے مصنفین میں انشاء اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور "دریائے لطافت" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ موخر الذکر مرزا محمد حسن قتیل کے اشتراک سے مرتب کی گئی اور اردو قواعد پر پہلی کتاب ہے۔ انشا کی تصانیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں انگریزی الفاظ بھی داخل ہونے لگے تھے۔ "رانی کیتکی کی کہانی" ایک چھوٹی سی داستان ہے جس میں صرف ہندوستانی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ انشا نے "سلک گوہر" کے نام سے بھی ایک قصہ لکھا جس میں کوئی نقطہ دار حرف استعمال نہیں ہوا ہے۔

صاحب فسانہ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور کا نام غیر معمولی شہرت کا حامل ہے اس فسانہ کا قصہ طبع زاد نہیں ہے لیکن اس کی رنگین نثر اس تاریخی دور کی یادگار ہے۔

اس زمانے کی اردو نثر صرف داستانوں اور قصوں تک محدود نہیں ہے۔ اردو میں سائنسی لٹریچر بھی ۱۷۹۸ء سے مسلسل ملتا ہے اردو زبان میں سائنس کی سب سے قدیم کتاب "بحر حکمت" ہے جو ۱۷۹۸ء میں لکھنؤ کے مطبع مسیحائی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد نواب محمد فخر الدین خان امیر کبیر شمس الامراء ثانی کی کوششوں سے اردو میں انگریزی اور فرانسیسی کی سائنسی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور ۱۸۳۴ء میں انھوں نے ایک دار الترجمہ کی بنیاد رکھی۔ اس دار الترجمہ میں غلام محی الدین خان متین حیدر آبادی، میر امان علی دہلوی، میر شجاعت علی، رتن لال اور مسٹر جونس کام کرتے تھے۔ شمس الامراء نے دار الترجمہ کے ساتھ ایک سنگی چھاپہ خانہ بھی قایم کیا جس میں سائنسی آلات کے نقشے بھی چھپتے تھے۔

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں اسی سال

سدا سکھ لال نے "ہدایت نامہ مال گزاری" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ انھوں نے ایک کتاب زراعت پر "گنگا کی نہر" کے نام سے بھی لکھی ہے۔ ۱۸۲۱ء میں اردو میں مغربی طب پر ایک کتاب شائع ہوئی جس پر کیپٹن جون ڈیلیم شیلیر نے نظرثانی کی۔ یہ کتاب دراصل (Materia Medica) کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی زمانے میں زراعت، معدنیات، میکانیات، طبیعیات، علم ہیئت کیمیا، ریاضی، فوجی علوم اور سیر و سیاحت اور فن لغت پر کتابیں شائع ہوئیں۔

اسی زمانے کے مورخوں نے اردو میں فارسی کے طرز پر تاریخی کتابیں لکھیں۔ بعض کتابیں فارسی سے ترجمہ ہیں۔ میر بہادر علی حسینی کی "تاریخ آسام"، حیدر بخش حیدری کی "تاریخ نادری" اور میر شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" فارسی کے تراجم ہیں۔ ان میں آخری کتاب سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کی تلخیص ہے۔ ۱۸۴۷ء میں سرسید احمد خاں نے صہبائی کی مدد سے مرصع نثر میں "آثار الصنادید" لکھی۔ اور ابو الفضل کی "طبقات اکبری" کی تقلید میں شاعروں، صوفیوں اور فنکاروں کا بھی ذکر کیا۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا جو نسبتاً صاف اور سادہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا اور اسی کی بنیاد پر سرسید رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو مقرر ہوتے۔

اس زمانے کی اردو نثر کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر سیاحت ناموں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یوسف خاں کمبل پوش پہلے سیاح تھے جو انگلستان گئے اور جنھوں نے اپنا سفر نامہ اردو میں لکھا۔ وہ ۱۸۳۷ء میں روانہ ہوتے اور ۲۵ر جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس آئے۔ یوسف خاں کمبل پوش حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ انگریزی سے واقف تھے۔ انھوں نے شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی ملازمت کے زمانے میں انگلستان جانے کا قصد کیا اور "عجائبات فرنگ" نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر کے رسالے "محب ہند" میں قسط وار شائع ہوئی۔ بعد میں یہ سفر نامہ کتابی صورت میں نول کشور سے شائع ہوا۔

اس زمانے کی اردو نثر میں ضخیم داستانیں بھی لکھی گئی ہیں ان میں جنوں اور پریوں، بھوت پریت، جادوگر اور درویش، بادشاہ اور وزیر کی داستانیں ہیں۔ ان میں عشق و عاشقی بھی ہے اور مہم جوئی بھی۔ زیادہ تر داستانیں فارسی یا سنسکرت کی تلخیص یا چربہ ہیں۔ ان کی ضخامت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" اور داستان "طلسم ہوش ربا" ستر ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ "بوستان خیال" میں چار ہزار صفحات ہیں۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج نے بھی بہت سے قصے شائع کیے جن سے اس زمانے کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں میر امن کی "باغ و بہار" حیدر بخش حیدری کی "طوطا کہانی" اور "آرائش محفل" اور خلیل خاں اشک کی "داستان امیر حمزہ" خاص امتیاز کی مالک ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں اردو ڈرامے کا بھی آغاز ہوا۔ اس کی ابتدائی تاریخ ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ ڈرامہ پرتگالیوں کی بدولت ہندوستان میں داخل ہوا اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خالص ہندوستانی چیز ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جب اردو ڈرامہ کا آغاز ہوا اس وقت سنسکرت ڈرامہ تھا اور اس کی حیثیت زندہ روایت کی باقی نہیں رہی تھی۔ البتہ اس کے کچھ آثار عوامی میلوں، رہس اور سوانگ میں نظر آتے تھے۔ اب تک جو ڈرامے دریافت ہوتے ہیں ان میں مرزا محمد علی اور جانی بیگم کا ڈرامہ سب سے پہلا ہے۔ یہ ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان لکھا گیا اور پہلی دفعہ دہلی یونیورسٹی کے "اردوئے معلیٰ" قدیم اردو نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں واجد علی شاہ کی تصنیف "رادھا کنہیا" کے قصے کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو ایک قسم کا اوپیرا ہے اور ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان لکھا گیا۔ سید آغا حسن امانت کی "اندر سبھا" ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک طربیہ ہے جو موسیقی کی مدد سے مرتب کی گئی ہے اور جس کے بعض اجزا میر حسن کی "سحر البیان" سے ملتے جلتے ہیں۔

اردو کا پہلا اخبار "فوجی اخبار" تھا جو ٹیپو سلطان کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ یہ انگریزوں کا سخت مخالف تھا اور صرف میسور کے فوجیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ سری رنگا پٹم کے سقوط کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے "جام جہاں نما" شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ سدا سکھ اور پیرس (W.E. Pearce) تھے۔ ۱۸۳۵ء میں چارلس مٹکاف (Charles Metcalfe) نے دیسی اخبارات کو آزادی دے دی اور اس کے ایک سال بعد ۱۸۳۶ء میں اردو کو عدالتی زبان قرار دے دیا گیا۔ ان دو وجوہ سے اردو اخبارات کو بڑی ترقی ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں آغا محمد باقر نے "دہلی اردو اخبار" شائع کیا۔ اس کے اگلے سال سید احمد خاں کے بھائی سید محمد نے "سید الاخبار" نکالا۔ ۱۸۴۵ء میں دہلی کا ہفتہ وار اخبار "قران السعدین" شائع ہوا۔ اس پرچے کو ڈاکٹر اسپرانگر نے سائنس کے فروغ کے لیے نکالا تھا۔ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۷ء سے ماسٹر رام چندر کے دو ماہوار رسالے "فوائد الناظرین" اور "محب ہند" شائع ہونا شروع ہوتے۔ ان کا بھی مقصد سائنسی خیالات کو رائج کرنا تھا۔ ان کی بدولت اردو میں آسان نثر اور فکر و نظر کے نئے پیمانے آئے۔ ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج کے مولوی کریم الدین نے اپنا اخبار نکالنا شروع کیا۔ ۱۸۵۰ء میں لاہور سے "کوہ نور" شائع ہوا اور ۱۸۵۴ء میں سید جمیل الدین نے دہلی سے "صادق" اخبار نکالا جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں گھر گھر مقبول ہوگیا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں شمالی مغربی صوبے میں اردو کے ۲۳ر اخبار اور ۲۳ر پریس تھے۔ ان اخباروں کی تنقید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے فضا ہموار کردی اور وطن دوستی کا ایک نیا احساس پیدا کردیا۔

۱۸۰۰ء کے درمیان جو شعری تخلیقات پیش کی گئیں ان کے مصنف ہندوستانیوں کے علاوہ ہندوستان میں بسے ہوتے یورپی باشندے یا مخلوط نسل کے (Indo — European) بھی تھے ایسے اردو شاعروں کی لمبی فہرست تیار کی جاسکتی ہے جو ہند پرتگالی، ہند فرانسیسی، ہند جرمن، ہند اطالوی اور ہند برطانوی تھے۔ شعری اعتبار سے ان کی تخلیقات کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتیں لیکن اس سے اردو کی وسعت اور مقبولیت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۷۹۰ء اور ۱۸۰۷ء کے درمیان سر ولیم جونس (Sir William Jones) نے کالی داس کی شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد برطانیہ نے مشرق کو سمجھنے کی کوشش کی، چاسر (Chaucer) ہندوستانی قصوں سے روشناس تھا۔ ڈرائڈن نے اورنگ زیب کی زندگی کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ ٹنی سن (Tennyson) غزلوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ عجیب زمانہ تھا۔ کمپنی کے افسران بالا دست بے ایمانی سے روپیہ جمع کرنے کے درپے تھے۔ ان کا سارا وقت بوالہوسی اور رقص و

سرور کی محفل میں گزرتا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں کچھ ایسے انگریز بھی تھے جو ہندوستانی تہذیب اور اردو فارسی کے سرمائے سے باخبر ہونا چاہتے تھے اور اس تہذیب کے قدردان تھے لیکن ویلزلی (Wellesly) کے زمانے میں کالے اور گورے کا فرق اور ان کی باہمی منافرت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس افتراق کو بڑھانے میں عیسائی مشنریوں نے خاص حصہ لیا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگریز فارسی، اردو شعر کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی کرنا بڑا شرف تھا۔ ہندوستانی لباس پہننا فیشن میں داخل تھا لیکن ۱۸۲۷ء کے قریب یہ صورتِ حال بدل گئی اور انگریزوں نے اپنا آشیانہ ہندوستانی عوام سے بہت دور بسایا اور ہندوستانیوں کی قسمت میں بھی صرف دور کا جلوہ رہ گیا۔ تاہم الگزنڈر (Alexander) آزاد، جیمس اسکنر (James Skeiner) اور گارڈنر فنا کی شاعری دلچسپی سے خالی نہیں۔

انیسویں صدی میں اہل یورپ نے اردو کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے قواعد و لغات کو مرتب کیا اس سلسلے میں جوزف ٹیلر (Joseph Taylor) ڈاکٹر گل کرسٹ، ڈاکٹر اشپرنگر، جان شیکسپیئر (John Shakespear) فیلن (Fallon) اور ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسی زمانے میں انجیل کے تراجم ہوئے۔ مرزا محمد فطرت اور ہنری مارٹن کے ترجمے بہت مشہور ہیں۔

اس زمانے کی نثری تخلیقات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی اثرات خاموشی کے ساتھ اردو میں سرایت کر رہے تھے۔ عالمی ادب کی مشہور کتابوں کے اردو میں تراجم بھی ہوئے۔ اور فلسفے، سیاسیات، اقتصادیات، تعلیم اور سائنس پر اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ گارساں دتاسی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ انیسویں صدی میں اردو کی وہی حیثیت ہے جو فرانسیسی کی یورپ میں ہے۔

اس دور کی خصوصیت شاعروں کی کثرت ہے۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۷۷ء کے لیکچر میں لکھا ہے کہ اردو میں تین ہزار شاعر ہیں۔ لیکن اس نے اپنی تاریخ ادب میں صرف ۸۰۰ شاعروں کو انتخاب کیا ہے۔ اس وقت قریب قریب ہر طبقے کے لوگ شعر کہتے اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ مشاعرے یا مراختے یا جلسے ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو منعقد ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی ان مشاعروں کی روداددوں کو گلدستے کی شکل میں شائع کیا جاتا تھا۔ مثلاً مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں "گل رعنا" کے نام سے مشاعرہ کی روداد شائع کی۔ ان مشاعروں کے ذریعے شعر کے معیار مقرر ہوتے تھے اصلاحِ سخن کی کوشش کی جاتی تھیں۔ بیاضیں اور تذکرے جمع اور شائع ہوتے تھے۔ بعض رقابتوں کو ہوا دی گئی، بعض شاعروں کو بڑھایا اور بعض کو گھٹایا گیا۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان بہت سے تذکرے لکھے گئے جو اس زمانے کے ادبی رجحانات اور معاشرتی زندگی کی غمازی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی حیثیت بیاض کی ہے اور ان کی تنقید نے فہرست سے آگے قدم نہیں اٹھایا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو شاعروں کے تذکرے عام طور پر فارسی میں لکھے گئے۔ اس کی وجہ ہے کہ اس زمانے میں فارسی کا بول بالا تھا اور علمی مطالب اسی زبان میں ادا کیے جاتے تھے۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ "گلشنِ ہند" پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں لکھا گیا۔

آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ انیسویں صدی میں تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، مناظرہ اور تصوف کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہوگیا جو اردو کے علاوہ کسی ہندوستانی زبان میں اتنا وافر موجود نہیں ہے۔

اردو نظم

۱۸۰۰ء — ۱۸۵۷ء

شمالی ہندوستان میں شاعری کی باقاعدہ ابتدا اٹھارویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے۔ ولی کا دیوان جو ۱۷۲۰ء میں دہلی آیا اس نے شاعروں کو بہت متاثر کیا۔ اس دیوان کو دیکھ کر شاعروں کو حیرت ہوئی کہ وہ زبان جس کو ہم گھر میں بولتے اور جس میں سودا سلف بیچنے خریدنے کی گفتگو کرتے ہیں اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ وہ جذبات کی نزاکتوں کو پیش کر سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت سعد اللہ گلشن نے ولی کو یہ نصیحت کی تھی کہ آپ فارسی سے مضامین کو ریختے میں منتقل کریں۔ اس وقت یوں بھی فارسی زبان زوال پذیر تھی اور فارسی کے مشہور شعرا بھی تفنن کے طور پر اردو میں شعر کہنے لگے تھے۔

اٹھارویں، انیسویں صدی سیاسی اعتبار سے بہت پُرآشوب تھی۔ ہر طرف بے چینی اور بدامنی تھی۔ لیکن اس سیاسی ابتری کے باوجود اردو ترقی کرتی رہی۔ آبرو (ف ۱۷۳۴ء)، حاتم (ف ۱۷۹۱ء)، ناجی (ف ۱۷۴۵ء) مضمون (ف تقریباً ۱۷۴۵ء) اور مرزا مظہر (ف ۱۷۸۱ء) اور دیگر معاصرینِ ولی نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ انھیں بزرگوں نے اردو زبان کو مضامینِ عالی کے لائق بنادیا۔

لیکن ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک جن دو شاعروں کا طوطی بولتا رہا اور جنھوں نے اردو کے اسالیب پر بے انتہا اثر ڈالا وہ سودا اور میر ہیں۔

سودا کا انتقال ۱۷۸۰ء میں اور میر کا ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ یہ شعرا اس دور میں باقی تو نہیں تھے لیکن ان کے کارنامے زندہ تھے اور شعرا ان کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ اس دور کے سب سے معروف شاعر اور خدائے سخن میر تقی میر ہیں۔ جن کا لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ جرأت، نظیر اکبرآبادی اور مصحفی وغیرہ نے اس دور کی اقتصادی بے چینی اور سماجی بدحالی کو اپنی آشوبیہ نظموں کے ذریعہ شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ ان شہرآشوبوں میں انتظامیہ کی بدنظمی، رشوت ستانی، بے جا تکلفات، مبالغہ آمیزیوں اور بے ہودہ رسموں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان نظموں میں اخلاقی پستی، اقتصادی بدحالی، نودولتوں کے چھچھورپن اور شاعروں کی مصیبتوں کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کی گئی ہے۔ سودا کی مثنوی شیدی فولاد خاں پر محض ایک شخص کی تضحیک ہی نہیں ہے بلکہ پورے دور کی بدانتظامی پر طنز ہے۔

میر کی شہرت کا انحصار ان کی غزلوں اور مثنویوں پر ہے۔ مفلسی اور گداگری سے لے کر عشق کی ناکامی تک کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو میر نے نہ جھیلی ہو۔ میر کے یہاں جو دردمندی اور انسان دوستی ہے وہ اردو شاعری کی بڑی دولت ہے۔ اسی دور کے ایک ممتاز صوفی شاعر خواجہ میر درد ہیں جن کا انتقال

۱۷۸۵ء میں ہوا لیکن اردو کی متصوفانہ شاعری کا قافلہ ان کے بتائے ہوئے خطوط پر چلتا رہا۔ خواجہ میر درد سارے انقلابات کے باوجود دہلی ہی میں مقیم رہے۔ لیکن سودا، میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، انشا اور جرأت سب دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ بعض شاعر فرخ آباد، ٹانڈا، عظیم آباد اور حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن لکھنؤ میں اس وقت اہلِ کمال کی سب سے زیادہ قدر اور دولت کی ریل پیل تھی اس لیے شاعروں کی سب سے بڑی تعداد لکھنؤ منتقل ہوگئی۔

لکھنؤ میں بہار دہلی کی پت جھڑ کے بعد آئی۔ جیسے جیسے لکھنؤ سیاسی اعتبار سے آزاد ہوتا گیا اس نے ادب و شعر میں بھی اپنے سکے رائج کئے۔ لیکن اودھ کا علاقہ کھڑی بولی سے دور ہے۔ اس لیے وہاں کی زبان میں ٹھیٹ اردو کا مزہ کم ہے۔ تکلف اور تصنع زیادہ ہے۔ لکھنؤ میں آکر اردو کا تعلق دربار سے زیادہ گہرا ہوگیا اور درباروں کا معیار اخلاقی اعتبار سے بہت گرا ہوا تھا۔ شاعر قربِ سلطانی حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔ ہجویہ نظمیں لکھتے تھے۔ اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے سوقیت اور ابتذال سے بھی نہ چوکتے تھے۔ انشا (ف ۱۸۱۷ء) اور مصحفی (ف ۱۸۲۴ء) کے معرکے دل چسپ بھی ہیں اور عبرت آمیز بھی۔ اسی زمانے میں ایسی شاعری کا رواج ہوا جس میں لفظی صنعت گری پر زیادہ زور دیا گیا اسی زمانے میں ریختی کا بھی چلن ہوا جس نے شوقین عورتوں اور طوائفوں کی زبان کو محفوظ کرلیا۔

لکھنؤ اسکول کا سب سے ممتاز شاعر ناسخ ہے جس نے زبان کے قواعد مرتب کیے اور اس کو مانجھ کر آئینہ بنا دیا لیکن وہ اس مواخذے سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے زمانے میں شاعری رعایات و تکلفات کا مجموعہ بھی بن گئی اور اس کی سادگی اور فطری پن کو نقصان پہنچا۔

مصحفی کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا۔ ان کا شمار اساتذۂ سخن میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے میر اور سودا کے طرز کو قایم رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ان کے سب سے دل کش اشعار وہی ہیں جہاں انھوں نے مختلف اساتذہ سخن کے رنگ کو ملا کر اپنا رنگ بنایا ہے۔

انھوں نے اردو کے دو تذکرے بھی لکھے جو ہماری ادبی تاریخ میں اہم ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشا کا انتقال ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ - ۱۸۱۸ء) میں ہوا۔ فن پر پوری قدرت رکھتے تھے اور بے مثل صلاحیتوں کے حامل تھے۔ لیکن ان کے بارے میں بے تاب کا یہ فقرہ اہمیت رکھتا ہے کہ انشا کو شاعری نے اور ان کی شاعری کو سعادت علی خاں نے تباہ کیا۔ انشا کے کلیاتِ نظم میں تقریباً تمام اصناف کے نمونے موجود ہیں۔

جرأت (ف ۱۸۱۰ء) نے میر کی تقلید کی لیکن ان کے یہاں نہ میر کا سوز وگداز ہے نہ ان کی دردمندی نہ ان کا تجربہ۔ ان کا نظریۂ عشق ابتذال سے خالی نہیں ہے۔ اسی زمانے کا ایک شاعر سعادت یار خاں رنگین (ف ۱۸۰۲ء) ہے جو اپنی ریختی کی وجہ سے مشہور ہے۔ ریختی کا نقطۂ عروج جان صاحب کے یہاں ملتا ہے جو عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر شعر سناتے تھے۔

اس وقت جب لکھنؤ میں پُرتصنع شاعری رواج پذیر ہوگئی تھی اردو کے افق پر نظیر اکبرآبادی نمودار ہوا جس نے شاعری کا رشتہ دوبارہ عوام سے جوڑا اور اس کو پھر انسانی قدروں کا آئینہ دار بنا دیا۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں وہ گنگا جمنی تہذیب بھی پوری طرح نمایاں ہے جس پر اردو کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور ان میں میر سے لے کر ناسخ تک کے رنگ کو برتا۔ مگر ان کا بہت بڑا کارنامہ نظم ہی ہے جس میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے تمام نقوش جلوہ گر ہیں۔

ناسخ نے جو خدمت صحتِ زبان اور فن شعر کی کی ہے وہ قابلِ قدر ہے لیکن اصولِ شعر پر اتنا زور دیا گیا کہ اس میں شاعری اور جذبات دونوں دب کر رہ گئے۔ ان کے اشعار میں جذبات کی گرمی نہیں ہے محض لفظوں کی تراش خراش ہے ان کے مقابلے پر خواجہ حیدر علی آتش (ف ۱۸۴۶ء) کے یہاں جذبے کی گرمی اور شعر کی لطافت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں بھی لفظی آرایش اور مرصع سازی ہے لیکن تصوف کی چاشنی اور جذبے کی گرمی بھی ہے۔ اس دور کے مشہور مثنوی نگار دیا شنکر نسیم ہیں، جن کا انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ ان کے یہاں اختصار سے تشبیہات اور استعارات ہیں بڑی تراش خراش ہیں اور لفظوں کی صناعی ہے لیکن لکھنؤ اسکول کا سب سے بڑا کمال مرثیے میں نظر آتا ہے۔ اس لفظی صنعت گری کی تلافی اگر قدرت کی طرف سے ہوئی تو وہ یہ کہ میر انیس (ف ۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر (ف ۱۸۷۵ء) کو پیدا کر دیا۔ میر انیس نے فصاحت اور بلاغت کا ایک بلند معیار قایم کر دیا۔ ان کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے بعض نمونے دنیا ئے ادب میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

اسی زمانے میں اردو ڈرامے، اوپیرا کی شکل میں ملتے ہیں۔ اس کی سب سے خوبصورت مثال امانت (ف ۱۸۵۸ء) کی اندر سبھا ہے۔ اسی زمانے میں مرزا شوق نے اپنی مثنویاں، "بہارِ عشق" اور "زہرِ عشق" لکھیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے بے مثل ہیں یہ شاعرانہ رفعتوں سے نا آشنا ہیں اور ان میں کوئی بے کراں جذبہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان میں زبان و بیان کی ایسی قدرت ہے جو اور جگہ نہیں ملتی۔

۱۸۵۶ء میں تمام معاہدوں کو توڑ کر انگریزوں نے اودھ کو برطانوی ہند میں شامل کرلیا اور واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ یہ واقعہ سیاسی اعتبار سے ہی اہم نہیں بلکہ تہذیبی سانحہ بھی ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ کی رونق ختم ہوگئی اور بیسیوں شاعر سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ شعر و ادب کے سرپرست اور خود بھی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور عبدالحلیم شرر نے ان کو ابوالفضل کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ اودھ پر انگریزی تسلط قایم ہو جانے اور واجد علی شاہ کے معزول ہو کر کلکتہ چلے جانے کے بعد لکھنؤ کی شعری فضا پر افسردگی چھا گئی۔

انگریزوں کے داخلۂ دہلی کے بعد اوائل ۱۸۵۷ء تک دہلی میں امن و امان قایم رہا۔ مغلیہ سلطنت کی شمع جھلملاتی رہی لیکن گل نہیں ہوئی۔ ادب اور فن کے بہت سے چراغ اسی کی بدولت روشن تھے۔ اس زمانے میں دہلی کے افق پر بعض ایسے شاعر ابھرے جن کو ادبی تاریخ میں دوامی شہرت حاصل ہے۔ اس فہرست میں مومن (ف ۱۸۵۱ء) ذوق (ف ۱۸۵۴ء)، نسیم دہلوی (ف ۱۸۶۴ء)، صدرالدین آزردہ (ف ۱۸۶۸ء) اور شیفتہ (ف ۱۸۵۹ء) کا نام بہت مشہور ہے۔ لیکن اس فہرست میں سب سے اونچا نام مرزا غالب کا ہے۔ غالب کی آواز اردو میں بالکل نئی آواز ہے۔

ان کے یہاں جو انسانی دردمندی، رواداری، فلسفیانہ بے نیازی اور خوش طبعی ہے وہ ادب کی دولت ہے۔ غالب سے پہلے زبان و بیان کے کرشمے تو نظر آتے ہیں لیکن فکر و نظر نہیں ہے۔ غالب نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ بخشا اور اپنے تخیل کی لالہ کاری اور جذبے اور فکر کی حسین آمیزش سے غزل میں بڑی وسعت پیدا کر دی اور اس کی معنویت کے دائرے کو بڑھا دیا۔

غالب کی بڑائی ان کی دردمندی، انسان دوستی اور سنجیدہ ظرافت میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ شعرائے مابعد پر بھی اثر ڈالا۔ اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔

غالب کے معاصرین میں ذوق جو بادشاہ کے استاد بھی تھے بہت مشہور ہیں لیکن ان کے یہاں وہ بصیرت نہیں جو ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے۔

حکیم مومن خاں مومن (۱۸۵۱ء) کی غزلوں میں معنی آفرینی، تراکیب کی چستی اور لب و لہجے کی دل رُبائی تو ہے لیکن ان کا اسلوب پُرپیچ ہے۔ فارسی کا اثر بھی ان کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت، جاگیردارانہ نظام کی آخری کوشش تھی کہ وہ پرانی اقدار قایم رہیں اور وہ عظمتِ رفتہ پھر لوٹ آئے لیکن انگریزوں کے نوآبادیاتی نظام نے جو ہندوستانی اقتصادیات کو نقصان پہنچایا تھا اور جس طرح لوگ نان و نمک سے محروم ہو گئے تھے اس نے اس بغاوت کو مہمیز کیا۔ اس زمانے کے اخبارات، اس زمانے کے گیت، اس زمانے کے شہر آشوب اور اس زمانے کی غزلیں اس درد و کرب کو ظاہر کرتی ہیں جن سے اہلِ ملک گزر رہے تھے۔ اور جن کی وجہ سے غدر برپا تھا بہادر شاہ ظفر (ولادت ۱۷۷۵ء۔ ف ۱۸۶۲ء) کے کلام میں وہ درد و سوز پوری طرح موجود ہے جو ان حالات نے پیدا کر دیا تھا۔ ان کی یہ ہمت قابلِ داد ہے کہ بیاسی برس کی عمر میں اور مئی اور جون کی تپتی ہوئی دھوپ میں انھوں نے انگریزوں سے لڑنا پسند کیا لیکن ہتھیار ڈالنا منظور نہیں کیا۔ بہادر شاہ ظفر کا رنگون میں انتقال ہوا اور ان کے ساتھ ہی ہماری ادبی تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔

اردو ادب

(۱۸۵۷ء — ۱۹۱۴ء)

اُردو ادب پر مغربی اثرات انیسویں صدی کے آغاز سے ہی پڑنے لگے تھے۔ مگر ان کا فیصلہ کن اثر ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی سادہ نثر دہلی کالج میں درسی کتابوں کے لیے مفید مطلب اور واضح انداز بیان، ماسٹر رام چندر کے مضامین اور غالب کے خطوط میں یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاعری کا تعلق روایت سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری میں صرف غالب کے یہاں تشکیک، ارضیت، اور انفرادیت کے نقوش ایک ایسے ذہن کے آئینہ دار ہیں جو روایت کے ساتھ نئے امکانات اور میلانات پر بھی نظر رکھتا ہے۔ ادب سیاسی تبدیلیوں کا یکسر تابع نہیں ہوتا۔ نہ ادبی ارتقا کی منزلیں سیاسی بنیاد پر متعین کی جا سکتی ہیں۔ مگر زمانے اور مزاج کی تبدیلیوں کا اثر ادب پر بہر حال پڑتا ہے۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء سے جب انگریزوں کے الفاظ میں غدر ہوا اور ہندوستانی مورخوں کے الفاظ میں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی لڑی گئی، اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کے ادب کو سہولت کے لیے کلاسیکی اور اس کے بعد کے ادب کو جدید کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں لینا چاہئیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کلاسیکی اثرات ختم ہو گئے۔ کلاسیکی یا روایتی ادب کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر جدید فکر و فن جو پہلے تجربے کے طور پر شروع ہوا، رفتہ رفتہ اپنی جگہ بناتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے میلانات حاوی ہو گئے۔

ہمارا کلاسیکی ادب مجموعی طور پر ازمنۂ وسطیٰ کی قدروں کا نمایندہ ہے۔ اس کی بنیاد ہندوستانی ہے مگر اس میں عجم کے حسنِ طبیعت کے بہت سے رنگ شامل ہیں۔ اس میں نمایاں فکر تصوف سے آئی ہے۔ اور اس کے نقش و نگار اس مشترک تہذیب سے لیے گئے ہیں جو تاریخی اسباب کی بنا پر پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کی شاعری میں تخیل کی پرواز ملتی ہے اور فطرت، تہذیب اور سماج کی مصوری بھی صوفیوں کے اثر سے اس میں ایک انسان دوستی آئی اور دربار نے اسے ایک رنگینی اور صناعی سکھائی۔ اس دور میں نثر پر توجہ کم ہوئی اور زیادہ تر یہ راہِ نجات یا داستان سرائی کے لیے ہی استعمال ہوئی اور شاعری سے آرائش کے لیے زیور لیتی رہی۔ فورٹ ولیم کی جدید نثر تفریحًا نہیں، فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس میں قصے کہانیوں کا سرمایہ زیادہ تھا۔ دہلی کالج میں درسی ضروریات کے لیے علمی نثر بھی وجود میں آئی صحافت رفتہ رفتہ قدیم اسلوب سے آزاد ہوئی اور کارآمد اور عام فہم ہونے لگی مغرب کے معلم، مشنری اور منتظم سب یورپ کے اٹھارویں صدی کے ادب سے متاثر تھے۔ اسی لیے مغربی اثرات شروع شروع میں وہاں کے نو کلاسیکی ادب کی قدروں کے مظہر تھے۔ انہیں کی رہ نمائی میں ہمارے یہاں جدید ادب حقیقت نگاری کا علم بردار بن کر سامنے آیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑی علمی ادبی شخصیت جو عہد آفریں ثابت ہوئی سرسید کی ہے (پیدائش ۱۸۱۷ء۔ وفات ۱۸۹۸ء) سرسید کی تحریک کا اثر سب سے زیادہ اردو نثر پر پڑا جس نے ہر لحاظ سے ترقی کی۔ مگر شاعری میں بھی اس کے ذریعے سے نئے میلانات آئے۔ سرسید غدر سے پہلے "آثار الصنادید" اور "آئین اکبری" کے ذریعے سے اپنے علمی ذوق کا ثبوت دے چکے تھے۔ غدر کے بعد انہوں نے "اسبابِ بغاوت ہند" لکھی جس میں انگریزوں کے ہندوستانی حالات اور مزاج سے ناواقفیت اور بے نیازی پر زور دیا گیا تھا۔ انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قایم کی جس نے مغربی علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے دہلی کالج کے کام کو آگے بڑھایا۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے اس سوسائٹی کی طرف سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا جو ان کے مرتے دم تک جاری رہا۔ گزٹ نے اردو صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ۱۸۷۰ء کے آخر میں انگلستان کے سفر سے واپسی پر انہوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس کا مقصد روشن خیالی کو فروغ دینا اور مذہبی اصلاح اور عقلیت کے لیے فضا ہموار کرنا تھا۔ اس میں ایڈیسن کے "اسپکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" کا اثر واضح ہے۔ سرسید کے علاوہ محسن الملک اور چراغ علی نے بھی اس

میں مضامین لکھے۔ بقول مولانا ابو الکلام آزاد "اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔" جب سرسید ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے اپنا سارا وقت ایم۔ اے۔ او۔ کالج، گزٹ اور تفسیر القرآن کی نذر کر دیا۔ تفسیر کی چھ جلدیں ان کی زندگی میں اور ساتویں ان کے مرنے کے بعد چھپی۔ گزٹ کے ذریعہ سے صحافت کی زبان بدلی، اس کی نظر وسیع ہوئی اور اس کا معیار بلند ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے تہذیب کے نئے تصور کو عام کیا گیا معاشرت کی خرابیوں اور رسم و رواج کی غلامی پر وار ہوا اور نیچر یعنی عالم فطرت اور عالم انسانی کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ تفسیر القرآن میں خدا کے قول اور خدا کے فعل میں مطابقت دکھائی گئی۔ سرسید کی مذہبی اصلاح اور تعلیمی و تہذیبی ترقی کی کوششیں، روح عصر کے مطابق تھیں اور ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے پس منظر میں انہیں دیکھنا چاہیے۔ ان کی جامع شخصیت کے اثر سے مصلحوں مفکروں اور مصنفوں کی ایک صف تیار ہو گئی جس نے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کی ذہنی قیادت کی اور نثر کا ایک ایسا اسلوب رائج ہو گیا جس میں مغز بھی ہے اور استدلال بھی اور الفاظ کی رنگینی کے بجائے خلوص اور دل سوزی کی پیدا کردہ سادگی بھی ہے۔ سرسید کے مخالفوں نے بھی ان کی تقلید میں عام فہم اسلوب اختیار کرنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے نثر ہر طرح کے مضامین اور مطالب کے اظہار پر قادر ہو گئی۔

اس دور کی ایک اور اہم شخصیت محمد حسین آزاد کی ہے (پیدائش ۱۸۳۲ء وفات ۱۹۱۰ء) یہ مشہور شاعر ذوق کے دوست محمد باقر کے بیٹے تھے۔ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ اور ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر کے ہنگامے میں دہلی سے نکلے اور گھومتے پھرتے لاہور پہنچے۔ وہاں انجمن پنجاب کے سکریٹری مقرر ہو گئے اور ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائیڈ سے رابطہ شروع ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں قصص ہند کے علاوہ لیکچر، نظم اردو اور نیرنگ خیال کے دوسرے مضامین لکھے گئے۔ محمد صادق نے اپنی تاریخ ادب اردو میں واضح کر دیا ہے کہ یہ مضامین انگریزی سے ترجمہ ہیں مگر اسلوب آزاد کا اپنا ہے۔ مئی ۱۸۷۴ء میں "انجمن پنجاب" کے مشاعروں کی بنیاد رکھی گئی جس کے افتتاحیہ جلسے میں آزاد نے اردو شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی تجویز پیش کی پہلے مشاعرے میں آزاد نے "شب قدر" اور حالی نے "برکھا رت" کے عنوان پر اپنی اپنی نظمیں سنائیں۔ جدید شاعری میں آزاد کی حیثیت پیش رو کی ضرور ہے مگر شب قدر اور خواب امن کے علاوہ ان کی شاعری کی زیادہ اہمیت نہیں۔ ہاں نثر میں ان کا کارنامہ کئی پہلوؤں سے قابل قدر ہے اور مہدی افادی نے انہیں بجا طور پر اردوئے معلیٰ کا ہیرو کہا ہے۔ نیرنگ خیال کے مشمولات خصوصاً سیر زندگی، علمیت اور ذکاوت کا مقابلہ اور شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں انہوں نے تمثیل (Allegory) کو کامیابی سے برتا ہے۔ قصص ہند حصہ دوم میں انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کے بعض مشاہیر کی بڑی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "آب حیات" منظر عام پر آیا۔ یہ اردو شاعری کا عہد بہ عہد تذکرہ پانچ دوروں میں ہے۔ پہلے حصے میں اردو زبان کی تاریخ ہے۔ جو موجودہ معلومات کی روشنی میں بڑی حد تک ناقص ہے پھر بھی اس کی اولیت اور تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ آزاد نے جس طرح شعرا کی زندگی اور شخصیت کے مرقعے پیش کیے ہیں اور جس طرح جا بجا ان کی شاعرانہ خصوصیات کی طرف چند بلیغ جملوں میں اشارے کیے ہیں، ان کی وجہ سے یہ کتاب ایک نگار خانہ بن گئی ہے۔ بقول شبلی "آزاد تحقیق کے مرد میدان نہیں مگر وہ دو چار گپیں بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔" آزاد کا اسلوب علمی مضامین کے لیے موزوں نہیں مگر افسانۂ پارینہ کہنے میں، جیسی کہ "آب حیات" ہے، یہ اپنی بہار دکھاتا ہے۔ "دربار اکبری" میں اکبر کی عظیم شخصیت اور اس کے کارناموں کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا، گو فیضی، ابو الفضل، خان خاناں اور ملّا عبد القادر بدایونی کے تذکرے میں آزاد نے لطف پیدا کر دیا ہے۔ یہاں آزاد اپنے ہی اسلوب کے شہید ہیں۔

نظم اور نثر دونوں کے لحاظ سے اس دور میں الطاف حسین حالی کا کارنامہ سب سے وقیع ہے (پیدائش ۱۸۳۷ء — وفات ۱۹۱۴ء) حالی غالب کے شاگرد تھے۔ شیفتہ کی صحبت سے ان کے ذوق کو جلا ہوئی۔ شروع میں انہوں نے غزلیں کہیں مگر نظر زمانہ شناس تھی۔ اس لیے لاہور کے قیام کے زمانے میں نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ "مجموعۂ نظم حالی" اس دور کی یادگار ہے۔ اس میں سادگی اور حقیقت نگاری کے ساتھ ایک اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر بھی ہے۔ اس کے بعد سرسید کی تحریک سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا اور انہیں کے کہنے پر اپنی مشہور نظم "مدس مد و جزر اسلام" لکھی۔ جس میں شاعری حدیث دلبری نہیں صحیفۂ کائنات ہے اس میں اسلام کے عروج و زوال کی تصویر بڑی سادگی، روانی اور سوز و گداز کی حامل ہے۔ نظم کے آخر میں اگرچہ حزنیہ لے غالب ہو گئی ہے مگر مضیے میں امید کا دامن تھاما ہے۔ مدس کے علاوہ حالی کی مشہور نظمیں "شکوۂ ہند" "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" ہیں۔ "دیوان حالی" میں ان کی جدید رنگ کی غزلیں غالب اور حکیم محمود خاں کے مرثیے ان کی عظمت کی دلیل ہیں۔ اب تک مرثیے بزرگوں، خصوصاً شہدائے کربلا کے ہوتے تھے، حالی نے غالب کے مرثیے میں غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں کا لازوال مرقع پیش کیا ہے۔ حکیم محمود خاں کے مرثیے میں دہلی کی تہذیبی اور علمی زندگی کی بڑی جاندار تصویر ہے۔ نظم جدید کو حالی نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ سے خاص بلندی اور وسعت عطا کی۔ مگر نثر میں ان کا کارنامہ اس سے بھی زیادہ اہمیت کا مالک ہے۔ جدید نثر کا آغاز اگرچہ سرسید سے ہوتا ہے مگر حالی نے اسے اور زیادہ ہموار حسین اور مدلل بنایا۔ عقلیت اور استدلال، توازن اور اعتدال اس کی خصوصیات ہیں۔ جدید اصولوں کے مطابق سوانح نگاری میں حالی سر فہرست ہیں "حیات سعدی"، "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" تینوں ان کے اہم کارنامے ہیں اور بعد کی کوششوں کے لیے شمع راہ ثابت ہوئے۔ "یادگار غالب" کے پہلے حصے میں غالب کی دل کش اور جامع شخصیت کا بڑا کامیاب مرقع ہے اور دوسرے میں ان کی اردو اور فارسی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غالب کا اعتراف اور عرفان دراصل یادگار غالب سے شروع ہوا۔ حیات جاوید میں انہوں نے سرسید کی زندگی اور کارنامے پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ بقول عبد الحق "اس میں صرف سید احمد خاں کی سیرت، ان کے حالات اور کارناموں ہی کا ذکر نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ بھی ہے۔" آزاد نے حالی سے پہلے "لیکچر نظم اردو" اور "آب حیات" میں، اردو شاعری کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے تھے، ان کی اولیت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں پہلے نقاد حالی ہیں جنہوں نے مجموعۂ نظم حالی اور مسدس کے دیباچوں میں اور پھر مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت، حیات و معاشرے سے اس کے تعلق، اس کے لوازم، زبان کے بعض اہم مسائل اردو کی اصناف شعری اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر بڑی مدلل بحث کی ہے نیچرل شاعری اور سادگی، اصلیت اور جوش پر حالی نے خاص طور سے بڑی خیال انگیز اور بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر کی وجہ سے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں ان کے مشورے آج اگرچہ قابل قبول نہیں سمجھے جاتے، مگر اس میں کلام نہیں کہ مقدمۂ شعر و شاعری کی وجہ سے شاعری پر عموماً اور غزل پر خصوصاً اثر ہوا اور اس میں خیالی مضامین اور قافیہ پیمائی کی لے کم ہوئی۔ حالی، اردو تنقید کے امام ہیں اور بعد کی تنقید پر ان کا اثر بہت گہرا ہوا ہے۔ ان کے مضامین اور مقالات میں بھی ان کا پُر مغز، مدلل اور ہموار اسلوب اپنی بہار دکھاتا ہے۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ نہ صرف انھوں نے شاعری میں سادگی اصلیت اور جوش کے اعلیٰ نمونے پیش کیے بلکہ نثر میں سوانح نگاری اور تنقید کے ساتھ ہی ایک ایسا معیاری اسلوب دیا جو آج تک اپنے امکانات کی وجہ سے شمع ہدایت اور مشعل راہ ہے۔

نذیر احمد (پیدائش ۱۸۳۱ء۔ وفات ۱۹۱۲ء) نے پہلے ایک قدیم طرز کے مدرسے میں پڑھا اور پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہ عربی کے عالم، قرآن کے مترجم اور تعزیرات ہند اور دوسرے قوانین کے مترجم ہیں مذہبی تصانیف میں "الحقوق والفرائض" اور "اجتہاد" ان کی یادگار ہیں۔ یہ اپنے زمانے کے بہت مشہور خطیب تھے اور قومی کانفرنسوں اور جلسوں میں ان کی تقریریں بہت مقبول ہوتی تھیں۔ مگر اردو ادب میں ان کی اہمیت ان مقصدی قصوں کی وجہ سے ہے جو ناول نگاری کے اولین نمونے ہیں اور اپنے تمثیلی رنگ کے باوجود معاشرے کی مصوری، حقیقت نگاری، جاندار اور بامحاورہ زبان کی وجہ سے بے مثل ہیں۔ ان میں "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح" "فسانۂ مبتلا" اور "ابن الوقت" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نذیر احمد کی تحریروں میں ایک خاص ظرافت ہے اور ان کی بامحاورہ زبان، ناولوں اور لیکچروں میں لطف دیتی ہے مگر سنجیدہ مذہبی تصانیف میں وہ اس متانت کے خلاف ہے جو ان تحریروں میں ضروری ہے۔ نذیر احمد کی نثر محمد حسین آزاد کے مقابلے میں جدید ہے۔ ان کے ناولوں میں اگرچہ مقصدیت اور اصلاحی نقطۂ نظر کی وجہ سے کہیں کہیں موعظت کا رنگ آگیا ہے مگر قصے کی ترتیب، کرداروں کی ساخت، مکالمے کے انداز اور جزئیات کی مصوری میں بڑی بے تکلفی، چستی اور روانی ہے۔ ان کے کرداروں میں اکبری، اصغری، محمودہ، حسن آرا، نصوح، کلیم، مرزا ظاہردار بیگ، مبتلا، ابن الوقت نوبل اور شارپ قابل ذکر ہیں اور ان میں اکبری، حسن آرا، کلیم، ظاہردار بیگ اور ابن الوقت تو ایسی زندگی رکھتے ہیں کہ ان کا حوالہ آج تک دیا جاتا ہے۔ یہاں فن، فن کار کے مقصد کے شکنجے سے آزاد ہو کر اپنی الگ زندگی اور دل کشی حاصل کر لیتا ہے۔ چوں کہ وہ عربی کے عالم تھے اس لیے تحریروں میں عربی کے مقولے بے تکلف استعمال کرتے ہیں لیکن محاورہ کا تناسب زیادہ ہے۔ وہ سرسید کی تحریک کے ایک اہم ستون ہیں۔ مگر مذہبی اصلاح کے سلسلے میں سرسید کے خیالات سے متفق نہیں۔ ہاں سرسید کی تعلیمی اور تہذیبی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج اور سرسید کے تعلیمی مشن کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے بڑی کوشش کی۔

اردو کے عناصر خمسہ میں سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد کے علاوہ شبلی نعمانی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ (پیدائش ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۹۱۴ء) مولوی شبلی کو علامہ شبلی سرسید نے بنایا۔ شبلی بڑے جامع حیثیات ہیں۔ علم کلام، تاریخ، سوانح نگاری، تنقید، مقالہ نگاری، صحافت، شاعری ان سب میں ان کا کارنامہ اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم تعلیم میں امتیاز حاصل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آئے اور سرسید کے علاوہ پروفیسر آرنلڈ سے بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی مثنوی "صبح امید" میں سرسید کی بڑی تعریف کی ہے مگر سرسید کے آخری زمانے میں سرسید کی سیاست سے انہیں اختلاف ہو گیا تھا۔ شبلی کی سوانح عمریوں میں "سیرت النعمان"، "المامون"، "الفاروق" اور "سیرت النبی" کی اہمیت ہے۔ علم کلام میں "الغزالی"، "علم الکلام" اور "الکلام" کی ادبی تنقید کے لحاظ سے "شعر العجم" ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اس میں مشاہیر پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مگر شبلی چوں کہ ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اس لیے فردوسی، سعدی، حافظ خیام کی خصوصیات کو انہوں نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ "شعر العجم" کے چوتھے حصے میں انہوں نے "مقدمۂ شعر و شاعری" کی طرح، شاعری کی ماہیت اور اس کے بنیادی عناصر پر بڑی خوبی سے بحث کی ہے اور تخیل اور محاکات کے علاوہ طرز ادا کو بجا طور پر اہمیت دی ہے۔ ان کے تاریخی مقالات میں الجزیہ اور نگ زیب عالمگیر اور کتب خانہ سکندریہ قابل ذکر ہیں شبلی نے اسلام کے دور زریں کی عظمت کو روشن کرنے پر خاص توجہ کی۔ جس طرح حالی کی "یادگار غالب" سے غالب شناسی کا آغاز ہوا اسی طرح شبلی کے "موازنہ انیس و دبیر" سے انیس کی عظمت کا مناسب اعتراف شروع ہوا۔ شبلی کو مہدی افادی نے تاریخ کا معلم اول کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے عقلیت پسندوں کے لیے شبلی نے تاریخ نویسی کا ایک اچھا معیار قایم کیا۔ انھوں نے مشاہیر کے کارناموں کے علاوہ تہذیب اور معاشرت پر بھی توجہ کی اس کے ساتھ ماخذ کی چھان بین میں خاصی عرق ریزی کا ثبوت دیا مگر ان کی جذباتیت ان کی تحقیق پر اکثر غالب آجاتی ہے۔ صادق نے کہا ہے کہ شبلی کو صداقت سے لگاؤ تھا مگر اسلام سے زیادہ تھا۔ سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے یہاں مواد کی فراہمی میں بہت کاوش ملتی ہے۔ الفاروق کے لیے مواد تلاش کرنے کے لیے انہوں نے روم و مصر و شام کا سفر کیا۔ مگر ہیرو پرستی ان کے یہاں بہرحال نمایاں رہتی ہے۔ ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے حالی کے خیالات سے فائدہ اٹھایا، مگر اپنی ایک الگ راہ بھی نکالی جس میں ادب کے جمالیاتی پہلو پر زور زیادہ ہے۔ "شعر العجم" میں شاعری کے متعلق ان کے خیالات اور "موازنہ انیس و دبیر" میں انیس کی جذبات نگاری واقعہ نگاری۔ فصاحت و بلاغت پر ان کے خیالات آج بھی مشعل راہ ہیں۔
انہوں نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کی۔ ان کی نظمیں یا تو تاریخ اسلام کے کسی واقعے یا ہیرو سے متعلق ہیں یا اپنے دور کے سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ان کی نظموں میں "عدل جہانگیری"، ان کے فن کی بڑی

اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ شبلی سرسید کی سیاست کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے حامی۔ جب وہ ندوۃ العلما سے متعلق ہوئے تو انہوں نے وہاں حریت پسند اور حالات حاضرہ سے باخبر علما پیدا کرنے چاہے۔ مگر مولویوں نے ان کی مخالفت کی اور آخر عمر میں انہوں نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کی بنیاد ڈالی۔ ندوہ سے تعلق کے زمانے میں انہوں نے رسالہ "الندوہ" جاری کیا۔ جو تاریخی اور مذہبی اور ادبی مضامین شائع کرتا تھا۔ شبلی کی نثر حالی کی طرح جدید ہے مگر اس میں رنگینی کا التزام بھی ہے۔ ایک نقاد نے لکھا ہے کہ شبلی کے یہاں حکیمانہ نکتہ سنجی اور شاعرانہ شوخی کا امتزاج ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ایم۔ اے۔ او کالج سے جو دانشور نکلے وہ سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر رہے۔

سرسید کی تحریک میں محسن الملک (۱۸۳۷ء — ۱۹۰۷ء) چراغ علی (۱۸۴۴ء — ۱۸۹۵ء) اور ذکاء اللہ کی بھی اہمیت ہے۔ محسن الملک نے تہذیب الاخلاق میں متعدد مضمون لکھے۔ چراغ علی نے انگریزی اور اردو دونوں میں بہت کچھ لکھا۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ سرسید کی طرح انہوں نے بھی عیسائی علما کے اسلام پر اعتراضات کا جواب دیا۔ علمی و ادبی نقطۂ نظر سے ان دونوں سے زیادہ ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء — ۱۹۱۰ء) کی خدمات ممتاز ہیں۔ پی۔ سی۔ ایف اینڈ ریوز نے "ذکاء اللہ آف دہلی" کے نام سے ان کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ انہوں نے سائنس اور ریاضی کی کئی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، اخلاقیات اور ادب پر بہت سی درسی کتابیں لکھیں۔ ان کی "تاریخ ہند" جو دس جلدوں میں ہے۔ بہر حال ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ ذکاء اللہ آزاد اور نذیر احمد کی طرح دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ پھر وہ سرسید کے زیرِ اثر آئے۔ ان کے طرزِ تحریر میں مغز بھی ہے۔ اور وضاحت بھی، مگر ادبی حسن بہت کم ہے۔ لیکن ایک مترجم کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ذکاء اللہ نے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ کتابیں لکھیں۔ حالی نے کہا تھا کہ "ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے"۔

اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ نذیر احمد سے اردو ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ ناول کی تاریخ میں نذیر احمد کے بعد رتن ناتھ سرشار کی اہمیت ہے (۱۸۴۶ء — ۱۹۰۲ء) سرشار کے یہاں رجب علی سرور کے فسانۂ عجائب کا رنگ بھی ہے اور مکالمات میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کی بے تکلفی بھی۔ سرشار کا فسانۂ آزاد سب سے پہلے قسط وار منشی نول کشور کے اودھ اخبار میں نکلا، بعد میں یہ کتابی صورت میں چھپا۔ فسانۂ آزاد میں اصل قصہ گویا ایک کھونٹی ہے جس پر ہزاروں واقعات ٹنگے ہوئے ہیں۔ سرشار ہندوستانی نشاۃ الثانیہ سے متاثر تھے اور نئے خیالات کے حامی تھے مگر لکھنؤ کی تہذیب کے عاشق۔ پہلی جلد کے آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ "میاں آزاد کا ہر شہر و دیار میں جانا اور وہاں کی بری رسموں پر جھلانا" ناول کا عمدہ پلاٹ ہے انہوں نے پرانے خیالات اور رسم و رواج پر اپنی شوخی و ظرافت سے خوب خوب وار کیے ہیں۔ ان کا ہیرو آزاد ایک مثالی کردار ہے جو مردانہ حسن کے ساتھ سپہ گری میں بھی طاق ہے اور علم و ادب کا رسیا بھی مگر ان کے طنزیہ کردار خوجی کی اپیل زیادہ ہے جس پر ڈان کخوٹے (Don Quixote) کا اثر صاف نمایاں ہے۔ "فسانۂ آزاد" چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ مگر آج اس کی اپیل زیادہ تر بیگمات کے مکالموں یا خوجی کے کردار کی وجہ سے ہے۔ "فسانۂ آزاد" کے علاوہ سرشار کا "سیر کہسار" بھی لکھنؤ کی نوابی معاشرت پر گہرا طنز ہے۔ سرشار کے دوسرے ناول چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ انہوں نے "خدائی فوجدار" کے نام سے ڈان کخوٹے کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ سرشار کے یہاں ناہمواری ہے اور ضبط و تنظیم کی کمی ہے مگر ان کی خلاقی، ان کی مرقع نگاری، کرداروں اور کارٹونوں کی ایک دنیا ایک تندرست اور کہیں کہیں بے رحم ظرافت اور زبان پر قدرت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر نے ناول کو آگے بڑھایا۔ (۱۸۶۰ء — ۱۹۲۶ء) شرر کے والد مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے ساتھ تھے۔ وہاں انہوں نے سترہ سال کی عمر تک آخری تاجدار لکھنؤ کا فنون لطیفہ سے شغف دیکھا وہ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوئے اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ عرصے "اودھ پنچ" سے وابستہ رہے۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے اپنا مشہور رسالہ "دل گداز" نکالا جس میں زیادہ تر تاریخی یا عاشقانہ اور شاعرانہ مضامین ہوتے تھے۔ "دل گداز" ادب میں تجربات کو فروغ دینا چاہتا تھا اس لیے اس میں انگریزی نظموں کے ترجمے اور غیر مقفیٰ نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ سال بھر بعد انہوں نے ضمیمے کے طور پر تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ "ملک العزیز ورجینا" پر والٹر اسکاٹ کا اثر ظاہر ہے۔ ان تاریخی ناولوں کے ذریعے سے انہوں نے اسلامی تاریخ کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ تاریخی ناولوں میں سب سے اہم "فردوس بریں" ہے جس میں باطنیوں کی جنت کی بربادی کا قصہ بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے معاشرت کی خرابیوں پر بھی ناول لکھے۔ ان میں "بدرالنسا کی مصیبت" اور "آغا صادق کی شادی" قابل ذکر ہیں۔ شرر کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی اور انہوں نے تاریخ سندھ بھی لکھی۔ شرر کے وہ عاشقانہ اور شاعرانہ مضامین جو اوّل اوّل "دل گداز" میں شائع ہوئے تھے اپنی دلکشی اور جدید نثر کی وجہ سے خاصے مقبول ہوئے۔ مگر ان کی شہرت ان کے تاریخی ناولوں، ان کے رسالہ "دل گداز" اور لکھنؤ کے تہذیب و تمدن پر ان کے مضامین کے اس سلسلے کی وجہ سے ہے جو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے عنوان سے پہلے "دل گداز" میں اور بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ حال ہی میں اس کا انگریزی ترجمہ سید فاخر حسین نے یونیسکو پروگرام کے تحت شائع کیا ہے۔ اس کا دوسرا نام گزشتہ لکھنؤ بھی ہے۔ اس کتاب میں اس تمدن کی بڑی روشن اور دلکش تصویر ملتی ہے جو لکھنؤ میں پروان چڑھا اور جو ہماری مشترک تہذیب کی تمام رعنائی و زیبائی لیے ہوئے ہے۔ شرر نے اس میں لکھنؤ اور اودھ کے حکمرانوں کی تاریخ کے علاوہ، یہاں کے شعر و ادب، فنون لطیفہ، رسم و رواج، آداب معاشرت، گھریلو صنعتوں، تفریحات، کھانوں، لباس، سب کا بڑی جامعیت سے ذکر کیا ہے۔

شرر کے ناولوں میں پلاٹ کی چستی اور واقعات کی دلچسپی کے ساتھ صاف ستھری منظر نگاری ہے۔ مگر ان کے کردار سوائے "فردوس بریں" کی زمرد کے جاندار نہیں ہیں۔ شرر کے ساتھ محمد علی طبیب نے بھی کچھ تاریخی ناول لکھے

لیکن شرر کے بعد جس نے اس صنف کو ترقی دی وہ مرزا محمد ہادی رسوا کے نام سے مشہور ہوئے تھے (۱۸۵۷ – ۱۹۳۱ء) یوں تو انہوں نے بہت سے ناول لکھے مگر ادبی حیثیت سے "امراؤ جان ادا" اور "شریف زادہ" ہی قابل ذکر ہیں۔ "امراؤ جان ادا" اپنے قصے کی تنظیم، کرداروں کی پیش کش، زبان کے استعمال اور فنی پختگی کے لحاظ سے یقیناً ہمارا پہلا بڑا ناول ہے اور اُردو کے بہترین ناولوں میں سے ایک۔ اس میں لکھنؤ کی ایک پڑھی لکھی طوائف امراؤ جان ادا کے ذریعہ سے انہوں نے لکھنؤ کے زوال آمادہ مگر رنگینی اور دلکشی سے معمور تمدن کی بڑی حسین اور جاندار تصویر پیش کی ہے۔ "شریف زادہ" میں محمود نوشت کی جھلک ہے۔ دونوں کی زبان جدید، رواں اور موزوں ہے۔ رسوا کو شعر و ادب، فلسفہ اور متعلقہ علوم پر ہی عبور نہ تھا بلکہ ریاضی نجوم اور ٹکنالوجی میں بھی خاص نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے فلسفے کی کئی اہم کتابوں کے ترجمے کیے جو دارالترجمہ حیدر آباد سے شائع ہوئے۔ رسالہ "زمانہ" کان پور میں پانچ تنقیدی مقالات لکھے تھے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ ان مقالات میں علم النفس کی جدید معلومات کی روشنی ملتی ہے۔ رسوا کے نزدیک محاکات سے زیادہ اختراع، فن کے لیے لازم ہے۔ اس طرح وہ فن کو نقل قرار دینے کے بجائے تخلیق مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن کی قدر اوّل، جمالیاتی ہے اور قدر دوم، افادی۔ تشبیہ استعارے سے بحث ان مقالات کی جان ہے۔

کچھ لوگ راشد الخیری کو نذیر احمد کا جانشین کہتے ہیں۔ مگر راشد الخیری جنہیں مصورِ غم بھی کہا گیا ہے، صرف متوسط طبقے کی مسلمان عورتوں کی مظلومیت کا رونا روتے ہیں ان کو زبان پر ضرور قدرت ہے اور ان کا اثر عصمت چغتائی تک کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر راشد الخیری بہرحال ایک دوسرے درجے کے فن کار ہیں جنہیں اصلاح نسواں کا مقصد بہت عزیز ہے۔ اور جذباتیت کے دائرے سے نہیں نکل سکتے۔ ان کے ناولوں میں "صبح زندگی"، "شام زندگی" اور "شب زندگی" قابل ذکر ہیں۔

اُردو صحافت نے اس دور میں بڑی ترقی کی۔ ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے اودھ اخبار جاری کیا اور اس نے بہت جلد شمالی ہند میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید کا "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور ۱۸۷۰ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکلا۔ اور ان دونوں نے نہ صرف صحافت بلکہ ادب اور تہذیب کا تصور بھی بدلا۔ ۱۸۷۷ء میں انگریزی "پنچ" کے نمونے پر منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" جاری کیا۔ یہ پرچہ سرسید، حالی اور نئے خیالات کے خلاف تھا اور مغربی تہذیب پر برابر طنز کرتا تھا، مگر سیاسی عقاید میں قوم پرست تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں کئی کہنہ مشق لکھنے والے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے طنز و ظرافت کی وادی میں اس اخبار کے ذریعہ سے قدم رکھا۔ ۱۸۸۷ء میں شرر کا "دلگداز" جاری ہوا۔ اس پرچے میں تاریخی معلومات کے علاوہ نئی شاعری کی ضرورت خصوصاً ردیف، قافیے سے آزاد ہونے کی اہمیت پر زور دیا جاتا تھا۔ غیر مقفّیٰ نظم کو اس نے مقبول بنایا۔ اس کی بے قاعدہ اشاعت کی وجہ سے اس کا اثر پیہم اور مسلسل نہ ہو سکا۔ پھر بھی اس رسالے کے ذریعے سے نئے ادبی اور تہذیبی نقطۂ نظر کو فروغ ہوا۔ مگر اس سلسلے میں سب سے اہم خدمات "مخزن" لاہور اور "زمانہ" کان پور نے انجام دیں۔ "مخزن" ۱۹۰۱ء سے اور "زمانہ" ۱۹۰۳ء سے منظر عام پر آیا۔ "مخزن" کے ایڈیٹر شیخ عبد القادر نے بہت جلد اپنے گرد نئی نسل کے اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ بنا لیا جس میں سرِ فہرست اقبال تھے۔ دیا نراین نگم کے رسالے نے بھی بہت جلد اپنی جگہ بنا لی۔ "مخزن" میں نئی شاعری پر زیادہ توجہ تھی لیکن اس نے سجاد حیدر اور نیاز فتحپوری جیسے ادیبوں کی تربیت کی۔ "زمانہ" ایک طرف ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانی ادبیات سے اُردو داں طبقے کو واقف کراتا رہا، دوسری طرف اس نے قدیم و جدید دونوں طرز کے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے پہلے ایک رسالہ "خدنگِ نظر" نکالا اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا جو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ "گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کے بعد یہ ٹائپ میں سب سے اہم صحیفہ ہے۔ "ادیب" الہ آباد، "دکن ریویو" اور "اردوئے معلیٰ" جس کے ایڈیٹر حسرت موہانی تھے اس دور کے ممتاز رسالے ہیں۔

اسی دور میں اُردو کی پہلی جامع لغت "فرہنگ آصفیہ" کے نام سے لکھی گئی۔ مولوی سید احمد دہلوی (۱۸۴۶ء – ۱۹۲۰ء) نے چوبیس سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں چار جلدوں میں یہ لغت شائع کی جس میں اردو کی لغات کے معنی اُردو میں دیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ "ارمغان دہلی" کے نام سے اس کا ایک حصہ شائع کر چکے تھے۔ اس لغت کی تیاری میں انہیں ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن کے ساتھ کچھ عرصہ کام کرنے کی وجہ سے خاصی مدد ملی۔ ڈاکٹر فیلن کی "ہندوستانی انگریزی لغت" ۱۸۷۹ء میں شائع ہوگئی تھی۔ فرہنگ آصفیہ میں اگرچہ جا بجا مولف نے غیر ضروری باتیں بیان کی ہیں اور بعض غیر مصدقہ روایات پر تکیہ کیا ہے، پھر بھی یہ لغت اور بعد کی مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی "نور اللغات" اب تک اردو کی سب سے اچھی لغات سمجھی جاتی ہیں گو لغت نویسی Lexicography کے جدید معیار کے لحاظ سے دونوں میں خامیاں ہیں۔ امیر مینائی کی "امیر اللغات" اگرچہ صرف الف مقصورہ تک ہی ہے مگر قابلِ قدر ہے۔

اس دور میں جس ادارے نے اُردو کی معیاری کتابوں کی طباعت پر خاص توجہ کی وہ نول کشور پریس ہے۔ منشی نول کشور نے نہ صرف لکھنؤ سے اودھ اخبار نکالا بلکہ وہاں "جلسۂ تہذیب" کے نام سے ایک انجمن کی بھی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد انہوں نے اُردو، عربی، فارسی، ہندی کی بہت سی کتابوں کے سستے ایڈیشن شائع کیے۔ میر، سودا، میر حسن، انیس، دبیر، حاتم، آتش اور دوسرے بہت سے شعرا کے دواوین اور کلیات سب سے پہلے اس ادارے سے شائع ہوئے۔ نول کشور ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۵ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت تک ہزاروں کتابیں ان کے مطبع نول کشور سے شائع ہو چکی تھیں۔ "طلسم ہوش ربا" کی پہلی چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ نے اور آخری تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر نے کیا۔ "بوستانِ خیال" کی نو جلدیں ہیں۔ پانچ کا ترجمہ خواجہ بدر الدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے، دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظرِ ثانی کی۔ "طلسم ہوش ربا" اور "بوستانِ خیال" کے علاوہ نول کشور پریس سے داستانوں کے اور بھی مجموعے شائع ہوئے۔ داستانوں میں تخیل کے حیرت انگیز کرشمے ملتے ہیں اور ایک

خیالی دنیا کی آرائش و زیبائش میں حقیقت کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں زبان پر قدرت، جزئیات کی مصوری اور تخیل کی کرشمہ سازی کے لحاظ سے یہ داستانیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء — ۱۹۱۷ء) نے سرسید اور حالی سے گہرے اثرات قبول کیے۔ ان کا تعلق محکمہ تعلیم سے تھا۔ بچوں کے لیے انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں اخلاقی پس منظر کے ساتھ شاعرانہ کیفیت بھی ہے مناظر قدرت، خصوصاً ہندوستان کے مناظر اور موسموں پر انہوں نے ایسی جاندار نظمیں لکھیں کہ نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔ ان کی نظموں میں مثنوی "ابر مراد" بارش کا پہلا قطرہ "جریدۂ عبرت" "قلعہ اکبر آباد" ان کے اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر کی بڑی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔ انہوں نے کئی اصناف شعر کو کامیابی سے برتا مگر مثنوی میں بڑی روانی اور شعریت پیدا کی۔ شبلی ان کو حالی کے بعد سب سے اچھا اُردو شاعر کہتے تھے۔ انہوں نے ایسپ کے قصوں اور انگریزی نظموں کو بڑی خوبی سے اُردو کے قالب میں ڈھالا اور ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں، صبح، شام، برسات اور گرمی کی بڑی جاندار مصوری کی جس میں حقیقت نگاری بھی ہے اور رنگینی بھی انہوں نے غیر مقفیٰ نظموں کے تجربے بھی کیے۔ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے جو کتابیں تیار کی تھیں وہ بہت مقبول ہوئیں اور آج تک شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کا کلیات ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ آزاد کے قصص ہند کے بعد تاریخ ہند کے بعض گوشوں پر ان کے مرقعے بڑے جاندار ہیں اور ان کی درسی کتابیں ان کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس دور کے ان شعرا میں جنہوں نے نئی شاعری کو وقعت اور بلندی عطا کی نادر کاکوروی اور درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ نادر کاکوروی (۱۸۵۷ء — ۱۹۱۲ء) اپنے ہم عصر ادیبوں میں انگریزی ادب سے زیادہ واقف تھے۔ انہوں نے آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری کی لے کو آگے بڑھایا۔ سادگی اور واقعیت ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ ان کا کلام "جذبات نادر" کے نام سے دو حصوں میں شائع ہوا۔ انہوں نے کئی انگریزی نظموں کے کامیاب ترجمے کیے اور ان کی طبع زاد نظموں میں بھی انگریزی شاعری کا اثر جھلکتا ہے۔ ان کا کارنامہ ٹامس مور کی نظم "لالہ رخ" کے ایک قصے کا ترجمہ ہے۔ ان کی نظموں میں دھرتی ماتا، بہارِ ہند اور شاعری اہمیت رکھتی ہیں۔ "مخزن" میں ان کا کلام برابر چھپتا تھا اور اقبال نے ان کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

سرور جہان آبادی (۱۸۷۳ء — ۱۹۱۰ء) بھی "مخزن" کے ذریعہ سے مشہور ہوئے۔ نادر کے یہاں سادگی زیادہ ہے اور سرور کے یہاں جذبہ زیادہ۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "خم خانہ سرور" اور "جام سرور" کے نام سے شائع ہوئے۔ حب الوطنی اور جذبات نگاری ان کی خصوصیات ہیں۔ انہوں نے تاریخی اور مذہبی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ "گنگا" "جمنا" اور "سیتا جی" پر ان کی نظمیں بڑی دلکش ہیں۔ انہوں نے بعض انگریزی نظموں کے بھی کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ اگر وہ اور زندہ رہتے تو یقیناً بہت ترقی کرتے مگر ۳۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس دور کے ایک بڑے شاعر اکبر الہ آبادی ہیں۔ (۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱ء) جنہیں قوم نے لسان العصر کا خطاب دیا تھا۔ اکبر غلام حسین وحید کے شاگرد تھے جو آتش کے سلسلے کے شاعر تھے۔ ان کا ابتدائی کلام لکھنؤ کی فن کاری اور رندی کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری کے پانچ دور کیے گئے ہیں۔ پہلا ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک دوسرا ۱۸۸۴ء تک تیسرا ۱۹۰۸ء تک چوتھا ۱۹۱۲ء تک اور پانچواں ۱۹۲۱ء تک۔ جب "اودھ پنچ" جاری ہوا تو نظم اور نثر دونوں میں اکبر کی تحریریں اس میں چھپیں۔ اکبر پنچ کے اثر سے مغربی تہذیب اور نئے اصلاحی رجحان پر طنز کرنے لگے۔ دوسرے دور کے آخر میں ان کے کلام میں ظرافت کا رنگ ابھرتا ہے اور تیسرے اور چوتھے میں یہ اپنے شباب پر ہے۔ پانچویں دور میں اخلاقی اور صوفیانہ میلان غالب آگیا ہے۔ اکبر کے یہاں خالص تغزل میں بھی رنگینی اور دل کشی ہے مگر ان کے جوہر طنز و ظرافت ہی میں کھلتے ہیں۔ انہوں نے سرسید کی تحریک کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا مگر سرسید کی ذاتی خوبیوں کا انہیں اعتراف تھا۔ اکبر کے یہاں خالص مزاح یا ظرافت بھی ہے۔ مگر دراصل وہ طنز کے بادشاہ ہیں۔ ان کی طنز میں اکثر صنعت لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے۔ اکبر کا قلم صنعت لفظی میں ہے کامل۔ انہوں نے شیخ۔ سید۔ جمن۔ کلو۔ بدھو۔ بابو۔ دفاتی جیسے کرداروں کے ذریعہ سے بڑا بلیغ طنز کیا ہے۔ وہ قوافی کے بادشاہ تھے۔ اگرچہ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کے خلاف تھے مگر انگریزی تعلیم کے خلاف نہ تھے اور ان کے یہاں بہت سے انگریزی الفاظ بڑی چابکدستی سے اُردو میں شامل کر لیے گئے ہیں اکبر نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی لکھے ہیں۔ ان کی نظموں میں برق، کلیسا، خدا حافظ مسلمانوں کا، اکبر، دہلی دربار، کانفرنس، ممتاز ہیں۔ ان کا کلیات چار حصوں میں ان کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ مگر مرنے کے پچیس سال بعد ایک اور مجموعہ "گاندھی نامہ" منظر عام پر آیا جس میں گاندھی جی اور ترک موالات کی تحریک پر پرلطف ہمدردانہ اظہار خیال ہے۔ وہ پردے کے زبردست حامی تھے اور عورتوں کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ خاتون خانہ ہوں، سبھا کی پری نہ ہوں۔ سرسید کی تحریک کے اثر سے مغرب کی ذہنی غلامی بہت بڑھ گئی تھی۔ اکبر کے طنز نے اس سیلاب پر بند باندھے اور مشرقیت کی خوبیوں کا بھی احساس دلایا۔ اکبر کے خطوط کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں کے ہر اہم واقعے، تحریک اور سیاسی سماجی، تعلیمی اور ادبی مسئلے کی طرف اشارہ یا اس پر اظہار خیال پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹائپ اور پائپ پر بھی۔ اُردو، ہندی کے قضیے پر بھی انہوں نے بڑے پرلطف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اکبر کی تیز نظر چونکہ ہر دیوار میں رخنہ اور ہر دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھ لیتی تھی، اس لیے ان کی ظرافت مجموعی طور پر توازن اور ذہنی صحت کی علم بردار ہے۔ وہ اگرچہ قدامت پسند تھے مگر یہ بھی جانتے تھے کہ شعر اکبر یادگارِ انقلاب ہے اور آئی ہوئی ٹلتی نہیں۔

اس دور میں کچھ ایسے شعرا بھی تھے جو قدیم یا کلاسیکی رنگ میں شعر کہتے رہے۔ دہلی میں نواب مرزا خان داغ اور لکھنؤ میں امیر مینائی ان میں سب سے ممتاز تھے۔ داغ (۱۸۳۱ء – ۱۹۰۵ء) ذوق کے شاگرد تھے اور ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ان کی غزلیں مشاعروں میں مقبول ہونے لگی تھیں۔ غدر کے بعد وہ خاصی مدت تک رام پور میں رہے جہاں نواب کلب علی خاں کے دربار میں اس زمانے کے کئی ممتاز شاعر اور ادیب جمع ہو گئے تھے آخر عمر میں داغ حیدر آباد آگئے اور نظام حیدر آباد کے استاد مقرر ہوئے۔ داغ کے چار دیوان، گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ اور ایک مثنوی فریاد داغ یادگار ہیں۔ ذوق کے کلام میں بھی محاورہ کا لطف ہوتا تھا۔ مگر داغ کی شوخی نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ داغ کا دائرہ محدود ہے۔ وہ حسن، عشق، معاملات اور چھیڑ چھاڑ کے شاعر ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اس دائرے میں ان کا جواب نہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ داغ کی مقبولیت کا اثر ان کے تمام معاصرین پر پڑا اور امیر مینائی نے جو داغ کی طرح رند شاہد باز نہ تھے، ان کے رنگ میں بہت کچھ کہا۔ داغ کی غزلوں کی وجہ سے اردو زبان کی مقبولیت بڑھی۔ داغ فارسی تراکیب سے کم کام لیتے ہیں۔ ان کی فصاحت اور ان کا روزمرہ، دل پر براہ راست اثر کرتا ہے۔ امیر مینائی (۱۸۲۲ء – ۱۹۰۰ء) عالم بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے دیوانوں میں "مراۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ استاد فن تھے اور جلیل مانک پوری، محسن کاکوروی اور ریاض خیر آبادی جیسے اہم شاعر اور صاحب فن ان کے شاگرد تھے۔ انہوں نے "امیر اللغات" کے نام سے ایک لغت بھی لکھی مگر یہ صرف الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی حد تک ہے مگر اس کی افادیت اور اہمیت میں کلام نہیں ایک تذکرہ شعرا "انتخاب یادگار" بھی ان کی یادگار ہے ان کے مکاتیب میں بھی فن شاعری کے رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امیر مینائی کے یہاں داغ کی شوخی اور بے تکلفی نہیں۔ مگر ان کی پختگی اور استادی میں کلام نہیں۔ ضامن علی جلال (۱۸۳۴ء – ۱۹۰۹ء) بھی اس دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے چار دیوانوں کے علاوہ "سرمایۂ زبان اردو" کی بھی اہمیت ہے جس میں الفاظ و محاورات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ جلال کے فن میں ایک تیکھا پن ہے اور امیر و داغ سے الگ وہ ایک روش نکالنے میں کامیاب ہیں الفاظ کی صحت کا انہیں بہت خیال رہتا تھا۔

"مخزن" کے اثر سے جو شاعر ابھرے ان میں سرفہرست اقبال ہیں۔ (۱۸۷۷ء – ۱۹۳۸ء) اقبال کی نظم "ہمالیہ" مخزن کے پہلے شمارے میں چھپی۔ اور اس نے فوراً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس سے پہلے اقبال مشاعروں میں اپنی غزلیں سنا چکے تھے اور ان کی پہلی طویل نظم "نالۂ یتیم" مقبول ہو چکی تھی۔ ۱۹۱۴ء تک اقبال کی بہت سی اچھی نظمیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان میں "ہمالیہ" کے علاوہ تصویر درد، غالب، مرثیہ داغ، نیا شوالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، سرگزشت آدم عقل و دل ۱۹۰۵ء سے پہلے لکھی جا چکی تھیں۔ قیام یورپ کے زمانے میں انہوں نے "محبت" اور "عاشق ہرجائی" جیسی نظمیں لکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ سے واپسی کے بعد ان کی توجہ فلسفۂ خودی اور اسلام کی طرف ہوگئی۔ ۱۹۱۴ء تک ان کی اہم نظموں میں شکوہ، جواب شکوہ اور شمع و شاعر قابل ذکر ہیں۔ وطنیت پر ان کی نظم بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال سرسید کی تحریک کے پروردہ ہیں۔ مگر مغرب کے اثرات نے ان کو مشرق کی نئے سرے سے دریافت میں مدد دی۔ اقبال کے یہاں غالب کا ذہن اور حالی کی نظر دونوں مل کر قدر اول کی شے بن گئے ہیں۔ پہلے دور کی شاعری میں جو ۱۹۰۵ء تک کی ہے، اقبال کے یہاں ایک رومانی اضطراب اور جستجو ملتی ہے جو کبھی حب وطن کے ترانے گاتی ہے اور کبھی مناظر فطرت میں سکون تلاش کرتی ہے۔ یورپ کے قیام کے زمانے میں انہوں نے مغربی فلسفے اور مغربی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے نتیجے میں وہ خودی، ارتقا، حرکت، عمل اور تخلیق کے ذریعہ سے شخصیت کی تکمیل کے نظریے تک پہنچے۔ اقبال نے اردو شاعری کو جو بڑی حد تک حدیث دلبری تھی صحیفۂ کائنات بنا دیا۔ اقبال کے ساتھ مخزن میں غلام بھیک نیرنگ، نادر کاکوروی، خوش محمد ناظر، شوق قدوائی اور شاد عظیم آبادی کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ مخزن کے نثر نگاروں میں اس کے اڈیٹر شیخ عبد القادر، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ مگر ان سے پہلے سجاد حیدر اور راشد الخیری کئی افسانے لکھ چکے تھے۔ سجاد حیدر نے ترکی ادب کے تراجم بھی کیے۔ "دل گداز" اور "مخزن" کے اثر سے اردو میں رومانیت کی وہ رو چلی جس کے اولین نقوش شرر کے عاشقانہ اور شاعرانہ مضامین میں اور سجاد حیدر کے ان مضامین اور افسانوں میں ملتے ہیں جو بعد میں "خیالستان" میں شائع ہوئے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے لکھنے والوں کی وہ نسل سامنے آئی ہے جو موضوع اور ہیئت دونوں میں تجربے کرتی ہے اور جو اول تو اپنے قدیم سرمائے سے آزاد اور حالی کی طرح بیزار نہیں ہے۔ گو اس سے غیر مطمئن ضرور ہے اور دوسری طرف وہ انگریزی ادب خصوصاً رومانی دور کے ادب سے متاثر ہے اور اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کے علاوہ تمثیلی اور فنی پہلوؤں پر بھی زور دیتی ہے۔ یہ اثر لکھنؤ کی بساط سخن پر بھی پڑا۔ چنانچہ صفی لکھنوی کی قومی شاعری کے ساتھ عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی کی غالب کے خیال کو نثر کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش شروع ہوئیں اس کے ساتھ حسرت موہانی (۱۸۷۵ء – ۱۹۵۱ء) نے اپنے رسالہ "اردوئے معلیٰ" میں سیاست اور ادب کا امتزاج پیش کیا۔ اس رسالے میں حسرت نے اردو کے قدیم شعرا کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور آزاد اور حالی کی انتہا پسندی کی اصلاح کی۔ چنانچہ حسرت کی وجہ سے جرأت، مصحفی، قائم کی اہمیت کا احساس بڑھا۔ خود حسرت کی شاعری جس میں تمام کلاسیکی رنگوں کا ایک حسین امتزاج ہے اور زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود، اردو غزل کے احیا کی نشاندہی کرتی ہے۔ شوق قدوائی نے نئے خیالات سے متاثر ہو کر مثنوی "عالم خیال" لکھی جس میں فارسی کی اضافتوں سے قطعی اجتناب کیا گیا ہے اور بارہ ماسہ کی روایت کی پیروی کی گئی ہے۔ اس رنگ کو بعد میں انور حسین آرزو نے اپنی "سریلی بانسری" میں اور آگے بڑھایا اور یہ ثابت کر دیا کہ فارسی کی اضافتوں

کے بغیر شعریت ممکن ہے بشرطیکہ جذبہ سچا اور نظر گہری ہو۔ شوق کی کچھ مثنویاں بھی اہم ہیں۔

اردو میں ڈرامے کی ابتدا واجد علی شاہ کے "رہس" اور امانت کی "اندر سبھا" سے ہوئی۔ لکھنؤ کے بعد ڈھاکے اور بمبئی میں اردو اسٹیج کا رواج ہوا۔ بمبئی میں ۱۸۵۴ء میں ناٹک "گوپی چند" دکھایا گیا۔ اندر کے بعد پارسی سرمایہ داروں نے اس فن کی سرپرستی کی۔ ۱۸۷۱ء میں بہرام جی فریدوں جی مرزبان نے ڈرامہ "خورشید" پیش کیا۔ اس دور میں اردو ڈراموں کا عام معیار خاصا پست تھا۔ مقفیٰ زبان گانوں کی کثرت اور عامیانہ مذاق ہوتا تھا۔ "بلبل بیمار" پہلا نثری ڈراما ہے "بلبل ونہار" ادبی حیثیت سے اس سے کچھ بہتر ہے۔ احسن لکھنوی، طالب بنارسی بے تاب بنارسی اس دور کے اہم ڈراما نویس ہیں۔ اس کے بعد آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹-۱۹۳۵ء) اس بساط پر ابھرے۔ آغا حشر اچھے شاعر تھے اور انہیں ڈراما لکھنے کا فن آتا تھا۔ اس زمانہ میں ڈراموں کے پلاٹ یا تو شیکسپیئر سے یا ہندوستانی قصوں سے ماخوذ ہوتے تھے مگر ان میں عام مذاق کا اتنا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ قوافی کی رعایت یا شاندار مکالمے ضرور ہوتے تھے۔ آغا حشر کے ڈراموں میں سفید خون، صید ہوس، خواب ہستی، خوبصورت بلا، یہودی کی لڑکی، بلوا منگل ۱۹۱۴ء تک ڈرامے کے ارتقا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ عمر کے ساتھ آغا حشر کا فن بھی ترقی کرتا رہا اور آخر میں شاعری اور خطابت کم ہوتی گئی۔ اس دور میں کچھ ادیبوں نے ڈرامے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس صنف میں تجربے کیے۔ مگر اسٹیج کے فن سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کی صرف تاریخی اور ادبی اہمیت ہے۔ شرر نے "شہید وفا" اور "میوۂ تلخ" ۔ رسوا نے "مرقع لیلیٰ مجنوں" (منظوم) احمد علی شوق قدوائی نے "قاسم و زہرہ" (منظوم)، ظفر علی خاں نے "جنگ روس و جاپان" (۱۹۰۵ء) لکھے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے نثری ڈراموں کا رواج بڑھا لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد تک اردو ڈراموں پر آغا حشر کی آواز حاوی رہی۔ گو اسٹیج کی گہری روایت نہ ہونے کی وجہ سے اردو ڈراما زیادہ ترقی نہ کرسکا۔

(۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) تک کا دور ہر لحاظ سے اردو ادب کا زریں دور ہے۔ کلاسیکی طرز کی شاعری کے علاوہ اس دور میں نظم جدید کا آغاز ہوا اور اس نے نمایاں ترقی کی اور موضوعات اور ہیئت دونوں کے لحاظ سے اردو شاعری کا دامن وسیع ہوا مگر دراصل یہ دور نثر کی ترقی اور وسعت کا دور ہے۔ سرسید کی تحریک کے اثر سے نثر علمی مضامین کے اظہار پر قادر ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی نئی اصناف، ناول، سوانح عمری، مضمون نگاری (انشائیہ)، مختصر افسانہ، تنقید کا آغاز ہوا اور ہر صنف میں قابل قدر نمونے سامنے آئے۔ ادب میں مقصد کی اپج اور اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر کی تب و تاب آئی۔ مغربی شاہکاروں کے تراجم ہونے لگے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جب انگریزی تعلیم پھیلنے لگی تو مقصدی ادب کے علاوہ رومانی نے بھی شروع ہوئی جس نے بعد میں ادب لطیف کے میلان کی شکل اختیار کرلی۔ ادبی رسالوں نے معلوماتی ادب کے ساتھ تخلیقی ادب بھی پیش کیا اور پڑھنے والوں کے مذاق کو متاثر کیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب حالی اور شبلی کا انتقال ہوا تو شاعری کی بساط پر حسرت موہانی کے ساتھ اقبال کا نام لیا جانے لگا تھا اور پریم چند نے اپنے افسانے لکھنا شروع کردیے تھے۔ ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افق صحافت پر طلوع ہوچکا تھا۔ سجاد حیدر کے ساتھ لطیف الدین احمد اکبرآبادی اور نیاز فتح پوری، ادب لطیف کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے۔ اردو ادب اب اپنے پیروں پر کھڑا تھا اور اسے مذہبی یا سیاسی بیساکھیوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ وہ مذہب اور سیاست سے کام لیتا تھا مگر ان کا غلام نہ رہا تھا۔

اردو ادب

(۱۹۱۴ء-۱۹۳۵ء)

ادبی روایتیں، تاریخی واقعات، سماجی اسباب اور اقتصادی حالات کے ماتحت بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس لیے جو تبدیلیاں جنگ عظیم اور اس کے بعد ہندوستان میں ہوئیں ان کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔ ۱۹۱۴ء تک ترقی یافتہ مغربی ممالک کا تسلط تقریباً ساری دنیا پر قائم ہوچکا تھا۔ اصل میں یہ جنگ ان یورپی ممالک میں ان ہی کے مقبوضات کو دوبارہ تقسیم کرنے کے لیے لڑی گئی تھی لیکن اس جنگ نے ساری دنیا کے سامراجی نظام کو جڑوں سے ہلا دیا۔ ایک طرف یہ ممالک جنگ کے زبردست اخراجات اور معیشت کی تباہی کی وجہ سے سخت مشکلوں میں مبتلا ہوگئے۔ دوسری طرف روس میں مزدوروں اور کسانوں نے زارشاہی کا تختہ الٹ کر پورے سامراجی نظام میں زبردست رخنہ ڈال دیا۔ ان حالات نے ایک طرف سارے یورپ میں سخت ہیجانی کیفیت پیدا کردی جگہ جگہ مزدوروں اور محنت کشوں نے بغاوت کردی اور دوسری طرف چین، ہندوستان، مصر اور دوسرے بہت سارے محکوم ملکوں میں آزادی کی لہر تیز ہونے لگی۔

ہندوستان میں گاندھی جی کی سرکردگی میں جدوجہد آزادی نے ایک نیا موڑ لیا۔ پہلی مرتبہ لاکھوں عوام جن میں درمیانی طبقہ کے صرف پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں تھے۔ بلکہ غریب عوام خاص طور پر مزدور اور کسان بھی بڑی تعداد میں شامل ہونے لگے۔ ترک موالات، عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں لاکھوں ہندوستانیوں نے جیل کی سزائیں بھگتیں بعض پھانسی پر چڑھے اور بڑی بڑی قربانیاں دیں اور انگریز حاکموں کے ظلم و تشدد کا جم کر مقابلہ کیا۔

جنگ کے بعد کے اس ابھار نے یورپ کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا اور ادب میں بھی بالکل نئی تحریکیں، رومانیت، حقیقت پسندی اور پھر فاشزم کے عروج کے ساتھ ترقی پسندی کی تحریکیں پروان چڑھنے لگیں۔ ان سب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ یہاں بھی حب الوطنی اور قوم پرستی نے ادب کے میدان میں راہ پائی۔ ادب کی مختلف اصناف نے بڑے پیمانے پر مغرب کا اثر قبول کیا۔ سرسید، حالی اور ان کے ساتھیوں نے جو کام شروع کیا تھا وہ اب ایک نئی سطح پر آگے بڑھنے لگا ناول، افسانہ، ڈراما، تحقیق

وتنقید میں نئے نئے زاویے سامنے آئے۔

ان کے ساتھ سرسید کی خشک کلاسیکیت کے ردِّ عمل کے طور پر اُردو ادب میں لطافت اور جمال پرستی کے رویہ کا اظہار رہوا۔ اس کے علمبردار سجاد حیدر یلدرم تھے۔ نیاز فتح پوری نے اُردو نثر کو لطیف انشائیہ نگاری سے ہم آہنگ کیا۔ یہ رجحان جسے رومانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس دور کی نظم ونثر میں پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ اسی درمیان ۱۹۱۷ء کے روسی اشتراکی انقلاب کے اثرات نوجوان نسل تک پہنچے تو اس رجحان کو روکنے کے لیے بعض اہلِ قلم نے اسلام کے سیاسی وفکری نظام کو سمجھانے کی ضرورت محسوس کی جس کے نتیجے میں کافی مذہبی ودینی لٹریچر وجود میں آیا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ نے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ دلی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ان میں صرف عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے ممکن ہوسکا کہ اس نے جامعی سطح پر اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ انگریزی علوم کے اُردو ترجمہ کے لیے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ مجموعی طور پر بیسویں صدی کا ذہن انیسویں صدی کے ذہن سے قدرتی طور پر زیادہ رسا تھا جس سے فکرِ انسانی کی وسعتوں میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا۔

اس دور کی نظم اپنے عروضی رشتے اور روایات کو برقرار رکھنے کے ساتھ موضوعات واسباب کے اعتبار سے ایک نئے ڈھنگ میں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اقبال اور ظفر علی خاں نے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی پس منظر کو پیش نظر رکھا۔ حفیظ جالندھری نے مسدس حالی کی فکری روایات کو مستحکم کیا اختر شیرانی نے اپنا رشتہ حسن ومحبت سے جوڑا۔ جن شاعروں نے زندگی کے مسائل کو سمجھنے میں فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے کام لیا اور زندگی کے گہرائیوں میں اتر کر اندرونی کش مکش کا پتہ لگانے کی کوشش کی ان میں اس جستجو کا سب سے خوبصورت اور دل کش بیان ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں ملتا ہے۔

اقبال (۱۸۷۷ء – ۱۹۳۸ء) کی شاعری اپنے زمانے کے اجتماعی رجحانات وجذبات کا آئینہ ہے۔ عصری میلانات کا اثر ان کے ہر دور کی شاعری میں موجود ہے۔ یوں تو اقبال کی شاعری کا آغاز بیسویں صدی سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن ۱۹۱۴ء کے بعد کا دور ہی درحقیقت اپنی زرخیزی کے اعتبار سے اقبال کی شاعری کا اہم دور ہے جس میں ان کے نظریات وتصورات کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری ہندو مسلم اتحاد، حبِ وطن اور غلامی سے نفرت کی ترجمان ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد وطن پرستی کی جگہ انسان دوستی اور اسلام دوستی نے لے لی تھی۔ اس وقت تک اقبال "شمع وشاعر" اور "شکوہ جواب شکوہ" سے اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں "خضر راہ" اور پھر "طلوع اسلام" شائع ہوئی جن کا تعلق مسئلۂ خلافت ترکی اور اتحاد اسلام سے ہے۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک اقبال نے فارسی میں لکھا "پیام مشرق" "زبور عجم" اور "جاوید نامہ" اسی دور کا ماحصل ہیں۔ ۱۹۳۸ء یعنی سال وفات تک اُردو کے تین مجموعے "بال جبریل" "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" چھپ کر منظر عام پر آچکے تھے۔ اقبال نے اپنی ان تخلیقات میں یورپ کے نظریہ قومیت کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور ایک عالم گیر نظام کے امکانات پر بھی غور کیا۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود اقبال کی فکر کا مستقل عنصر اسلامی تہذیب وتاریخ کا احساس ہے۔ اسی سے ان کا نظریہ خودی ابھرا جس کی مزید تشریح وتفسیر اسی آخری دور میں ہوئی۔ انہوں نے عالمی وملکی سیاست پر بہت کچھ لکھا اور لادینی سیاست کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ اس دور کی نظموں، ساقی نامہ، "مسجد قرطبہ" اور "ذوق وشوق" وغیرہ میں ان کا فن نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ اقبال اُردو کے عظیم شاعر، حکیم، مجددِ فن اور مجتہدِ فکر تھے۔ ان کا کلام عالم گیر مقبولیت کا حامل ہے۔

ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء – ۱۹۵۶ء) کی شاعری کا زیادہ حصہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہے جب ہندوستان کی سیاست تیزی سے بدل رہی تھی انہوں نے لاہور سے زمیندار جاری کیا تو اپنی نظم ونثر کو صرف قومی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا۔ برطانوی استعماری قوتوں کے خلاف انہوں نے جس طنز وہجو کے رویہ سے کام لیا اس سے ان کی جرأتِ گفتار کا پتہ چلتا ہے۔ قومی جذبات کی ترجمانی کے علاوہ انہوں نے مذہبی عنوانات پر بھی نظمیں لکھیں جو اس دور کی فکری فضا میں اسلامی روایات کی مدلل تفسیریں ہیں۔ "سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو" جذبات نگاری کی ایک قابلِ قدر مثال ہے۔ ان کی نعتیں اور منظوم ترجمے بھی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ چکبست (۱۸۸۲ء – ۱۹۲۶ء) کی شاعری ۱۹۱۴ء سے پہلے شروع ہوتی ہے لیکن اس کا دائرہ بیسویں صدی کی دو دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست میں جو ہلچل مچی ہوئی تھی ان کے کلام میں اس کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔ چکبست کا کلام بالخصوص اپنے دور کے اس نئے تجربے کا واضح اظہار ہے جسے ہوم رول کا نام دیا گیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد، حب وطن اور اصلاحی، مذہبی واخلاقی موضوعات پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ایک مسدس "رامائن کا ایک سین" نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ چکبست کی نظموں کا مجموعہ "صبح وطن" ان کی وفات کے بعد نکلا۔ محمد عظمت اللہ خاں (۱۸۸۷ء – ۱۹۲۷ء) نے اپنی شاعری کی راہ الگ نکالی۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مروجہ اسالیب شاعری کو ناکافی سمجھ کر نئے سانچے اختیار کیے اور ہندی عروض کو اُردو شاعری میں برتنے کا خیال پیش کیا۔ ان کی شاعری سے زیادہ ان کے شعری نقطۂ نظر کی اہمیت ہے۔ انہوں نے عورت کی محبت ہی کو زندگی کی اہم ترین حقیقت سمجھا اور عورت سے متعلق اپنے جذبات کے اظہار کو مقصدِ شاعری بنایا۔ عظمت کی زبان جس میں اُردو کے ساتھ ہندی الفاظ کی آمیزش ہے اس دور کی شعری زبان سے مختلف ہے۔ اس کے استعمال سے انہوں نے اپنی نظموں میں لوک گیتوں کی سی فضا پیدا کی ان کی نظموں کا مجموعہ "سریلے بول" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

علی حیدر طباطبائی (۱۸۵۲ء – ۱۹۳۲ء) کا ایک بڑا کارنامہ ان کی شاہکار نظم "گورِ غریباں" ہے جو برطانوی شاعر گرے کی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اس پر طبعزاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس نظم کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔ طباطبائی نے اور بہت سی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے اور ان میں خصوصیت کے ساتھ انگریزی نظم کا فارم ہی استعمال کیا۔

تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء – ۱۹۶۶ء) کی شاعری اپنے اکثر ہم

عنصروں کے برخلاف مذہبی اور سیاسی قسم کے موضوعات سے دور بڑے پرسکون ماحول میں سانس لیتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی اور زمانے دونوں سے فرار ملتا ہے۔ محروم کے کلام میں منظر نگاری کے ساتھ ادبی، اخلاقی اور نیچرل مضامین کا بھی وافر ذخیرہ ہے۔ ان کی نظمیں خواب جہانگیر، نور جہاں کا مزار، مہاتما گاندھی قابل ذکر ہیں۔ بقول سر عبدالقادر، بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء – ۱۹۴۸ء) اردو ادب کے بڑے رومانی شاعر مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور مذہبی موضوعات سے گریز کر کے رومانی شاعری کو اپنی فکر کا محور بنایا اور اسے ایک نیا لہجہ دیا۔ ان کے نزدیک عورت، حسن اور محبت کا نام ہی زندگی ہے۔ انہوں نے محبوب عورت کا تصور واضح طور پر متعین کیا۔ اس طرح ان کی شاعری میں محبت بازاروں سے ہٹ کر حرم سراؤں میں جا پہنچی اور پردہ داری کے بجائے براہِ راست تخاطب شاعری میں داخل ہوا۔ اختر کو شاعرِ رومان اور شاعرِ شباب کہا جاتا ہے۔ انہوں نے مناظرِ فطرت کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص قسم کا والہانہ پن ہے جس میں ان کی زندگی کا رندانہ انداز شامل نظر آتا ہے۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی جذباتی اور رومانی شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں اس دور کے محرکات کی واضح تصویریں بھی ملتی ہیں۔ ابتدا میں ان کی نظموں میں تخیلیت و جذباتیت کا رنگ زیادہ تھا۔ پھر بھی عصری رجحانات کے زیر اثر ہندوستان کی سیاسی و معاشی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر انہوں نے طبع آزمائی نہیں کی۔ ان کی شاعری میں قومیت، جمہوریت، جاگیر دارانہ نظام کی لعنت اور کسانوں، مزدوروں کی مظلومی سبھی کچھ ہے۔ جوش شاعرِ انقلاب بھی کہلاتے ہیں اور شاعرِ شباب بھی لیکن بنیادی طور پر وہ رومانی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ایک طرف غنائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں تو دوسری طرف انقلابی اور ایک حد تک اشتراکی عنصر کی آب و تاب بھی ہے۔ ان کے الفاظ کی شان و شوکت تشبیہوں کا خوبصورت استعمال اور گھن گرج بے مثال ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں آتشِ سیال کا جوش اور ابال ہے۔ ان کے اس دور کے مجموعے نقش و نگار، شعلہ و شبنم اور فکر و نشاط ہیں۔

حفیظ جالندھری رومانی گیت نما نظموں اور نظم نما گیتوں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاہکار تخلیق "شاہنامہ اسلام" کی بدولت نام پیدا کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو نظم کو انہوں نے اور بہت کچھ دیا اور اس صنف کو ایک نئی آواز کے طور پر استعمال کیا۔ وہ رومانی تحریک سے متاثر ہیں لیکن انہوں نے منظر نگاری اور رومانیت کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں اور وقتی موضوعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ۱۹۲۶ء میں حفیظ نے ہندوستان کے تاریخی واقعات کو منظوم کیا۔ ان کی نظموں میں غنائیت کا عنصر بہت ہوتا ہے جس کے لیے وہ مترنم بحریں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ ان کا "سلام" اُردو نظم میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ان کے اس دور کے مجموعے "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" ہیں۔ اس عہد کے دیگر شاعروں میں سے بیشتر نے اس دور کی خصوصیات کو قائم رکھا۔ کچھ نے اس سے انحراف بھی کیا۔ ان میں شوق قدوائی، روش صدیقی، امجد حیدر آبادی، تاجور نجیب آبادی، شاد عارفی، ساغر نظامی اور احسان دانش کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔

اُردو غزل پر اگرچہ تنقید کا سلسلہ پہلی جنگِ عظیم سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اس بادِ مخالف میں بھی غزل کی شمع برابر جلتی رہی۔ یہ سلسلہ امیر و داغ اور پھر جلیل مانک پوری تک چلتا رہا۔ تاہم غزل گو شاعروں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اپنی فکر کا انداز بدل رہا تھا۔ پرانے روایتی شاعروں کے مقابلہ میں ان کی فکر اور ان کے اسلوب میں نیا پن تھا مثلاً عزیز لکھنوی، یگانہ، اصغر، فانی، حسرت اور جگر وغیرہ کا دور کم و بیش ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کا ہے ان کے یہاں بیسویں صدی کا ذہن بھی ہے اور کائنات و حیات کی پوری وسعتیں بھی موجود ہیں۔ اس طرح اس دور میں غزل کو غیر متوقع طور پر پھر عروج نصیب ہوا۔ غزل داخلیت سے نکل کر اجتماعی زندگی کے قریب آ گئی۔

اقبال غزل کے میدان میں بھی اپنی مشعل جلائے سب کے آگے چلے انہوں نے اپنے پیغام کے لیے صنفِ غزل کو اس کامیابی سے برتا کہ اس میں گیرائی اور گہرائی آ گئی۔ اقبال کی غزل کا انداز نیا ہے۔ انہوں نے غزل میں فکری حقائق کو بھی جذب کیا اور شعر کی دلکشی و تازگی کو بھی قایم رکھا۔ غزلیں اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھی ہیں مگر ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء – ۱۹۳۶ء) کے پاس روایت وہی ہے جسے میر درد کی روایت کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں تفکر کا عنصر زیادہ ہے انہوں نے محبت کے مضامین کے علاوہ کائنات کی حقیقتوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ لکھنوی طرز کے پس منظر میں ان کے لہجہ میں ایک تھما ہوا جوش ہے جس میں ایک روحانی لے بھی ملتی ہے۔ ان کے تصوف میں پژمردگی و افسردگی کی جگہ رقص و وجد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نغمۂ روح، اور سرودِ زندگی ان کی غزلوں کے مجموعے ہیں۔

حسرت موہانی کی عمر سیاسی اور سماجی زندگی کے طوفان میں گزری ملک کی تحریک آزادی، عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں انہوں نے اہم حصہ لیا باوجود اس کے حسرت ان اردو شاعروں کے میر کارواں ہیں جنہوں نے نظم جدید کے مقابلہ میں اُردو غزل کی ساکھ دوبارہ قایم کی۔ چنانچہ حسرت رئیس المتغزلین کہلائے۔ خلوص، بے باکی اور حق گوئی ان کی شاعری کے اہم عناصر ہیں اور انہیں کی ترجمانی سے انہوں نے غزل کو نئی لذت سے آشنا کیا۔ حسرت نے بلاشبہ اردو غزل کو ایک ایسی لطافت بخشی جو روایتی رنگینی و رعنائی کے باوجود اتنی پاکیزہ ہے کہ اس کی مثال ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ملتی۔

فانی (۱۸۷۹ء – ۱۹۴۱ء) اس دور کے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے بہت دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ فانی بدایونی غم کی ترجمانی کا مخصوص لہجہ رکھتے ہیں یہی ان کی انفرادیت ہے۔ انہوں نے غم کے مضمون کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے۔ جو میر کے غم سے مختلف ہے اور جمالی اقدار کا رتبہ رکھتا ہے۔ فانی کے اس غم میں جو خلوص ہے اس سے انکار ممکن نہیں لیکن آرٹ کے ذریعہ اجتماعی حیات میں غم کی زیادتی جماعت کی عملی صلاحیت پر جو منفی اثرات ڈالتی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

فانی کے یہاں غم کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے یعنی انہوں نے معاملاتِ حسن و عشق کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں زندگی کے اسرار بھی بیان کیے ہیں۔ باقیاتِ فانی اُن کی یادگار ہے۔

جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ء — ۱۹۶۱ء) معاملاتِ حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ رنگِ تغزل بہت گہرا ہے۔ ان کی شاعری کی ساری دل کشی و جاذبیت ان کے اشعار کی وہ سرمستی ہے جس میں بادۂ گلفام کی خوشبو ہے۔ ابتدائی کلام اسی رندی و بادہ آشامی سے عبارت ہے لیکن وہ اپنے مجموعہ "شعلہ طور" سے دوسرے مجموعے "آتش گل" تک کا فاصلہ طے کرنے تک زیادہ متین و سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں جگر کا عشق نہایت شائستہ و مہذب ہے جس میں صوفیانہ خیالات کی بھی آمیزش ہے سماجی شعور کے چھینٹے بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کا وہی حصہ زیادہ خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ جو حسن و محبت اور جوشِ زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ جگر کی مقبولیت میں ان کی شخصیت اور ان کے کلام کی نغمگی کا بھرپور حصہ ہے۔ آخری دور میں جگر نے حسن و عشق کے علاوہ زندگی کے اور موضوعات کو بھی اپنے کلام میں جگہ دینے کی کوشش کی۔

لکھنؤ کے شاعروں میں عزیز لکھنوی ان کلاسیکی انداز کے علم برداروں میں تھے جنہوں نے دورِ جدید کی غزل کو سنوارا۔ ان کے کلام پر میر و غالب کا اثر ہے۔ فکرِ غالب کی گہرائی اور میر کے سوز و گداز دونوں سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجہ کی تشکیل کی ہے۔ تصوف کی بازگشت ان کے یہاں بھی ہے۔ غزل کے علاوہ قصیدہ نگاری میں بھی عزیز کا مقام اونچا ہے۔ ان کے دو مجموعے 'گل کدہ' اور 'صحیفہ ولا' شائع ہو چکے ہیں۔

صفی لکھنوی ۱۸۶۲ء — ۱۹۵۰ء نے غزل کی روایت کے احترام کے ساتھ غزل میں کچھ تجربے کیے۔ عام انداز وہی رسمی و روایتی ہے لیکن اردو شاعری میں اس وقت جو نئے عناصر داخل ہو رہے تھے ان سے وہ اچھی طرح باخبر تھے۔ صفی کی شہرت میں ان کی نظموں کا حصہ زیادہ ہے۔

سید انور حسین آرزو کو لکھنؤ کے دورِ آخر کے شعرا میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا بھی ابتدائی رنگ وہی لکھنؤ دبستان کا تھا لیکن بعد کی عمر میں انہوں نے رنگِ قدیم ترک کر کے جدید میلانات قبول کر لیے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ان کا جو مجموعہ شائع ہوا اس کی غزلیں کلاسیکی غزل کا رس اور رچاؤ رکھنے کے باوجود نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ انہوں نے اُردو میں فارسی و عربی استعمال نہ کرنے کی تحریک بھی چلائی تھی۔ اس رنگ کے اشعار ان کے آخری مجموعے "سریلی بانسری" میں ملتے ہیں۔ واجد حسین یاس (یگانہ) اپنے معاصرین سے بالکل الگ ہیں۔ وہ پہلے لکھنوی رنگ کے پرستار رہے پھر اس رنگ سے بغاوت کی اور بڑا جوشیلا انداز اختیار کیا۔ غالب شکنی کے جنون نے ان کی شاعری پر اثر ڈالا جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پوری طرح ابھرنے کا موقع نہ ملا تاہم ان کی ذہانت و انفرادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یگانہ کے پاس جذبہ اور فکر کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جو توانائی، اسلوب کا بانکپن اور جراتِ گفتار ہے وہ ان کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ان کی غزلوں کا مجموعہ "آیاتِ وجدانی" شائع ہو چکا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر کو زبان اور بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ میر کی شاعری کا ان پر بہت گہرا اثر ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں گہرے صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ لیکن ان کے وہی اشعار زیادہ مؤثر ہیں جن میں وارداتِ محبت کا بیان کیا گیا ہے۔ نظموں میں انہوں نے عصری میلانات کو جگہ دی ہے۔

داغ کے شاگردوں میں سیماب اکبر آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ غزل میں فنِ زبان اور محاورہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ جدید میلانات ان کے کلام میں نہیں ملتے۔ سیماب نے ایک مرکز "آگرہ اسکول" چلانے کی بھی کوشش کی تھی۔

دبستانِ لکھنؤ کے سلسلہ میں اثر اور امیر سے تعلق رکھنے والے دو شاعروں ریاض خیر آبادی اور جلیل مانکپوری کا ذکر اس دور کے شاعروں میں ضروری ہے جنہوں نے اپنی غزل کو روایتی مفہوم تک محدود رکھا۔ ریاض خیر آبادی نے اردو خمریات میں بڑا نام پیدا کیا۔ جو رندانہ بانکپن، شوخی اور سرمستی ان کے کلام میں ہے وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ ان کے کلام کا ایک اور خصوصی وصف شوخی ہے انہیں دو عناصر سے ان کی شاعری کا خمیر بنا ہے۔ اس طرز کے وہ آپ موجد تھے۔ یہ طرز انہی پر ختم ہو گیا۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں جلیل مانکپوری کے مقام کا تعین اس سے کیا جا سکتا ہے کہ استاد کی وفات کے بعد ان کے سینکڑوں نامور شاگردوں کی موجودگی میں جلیل کو بلا کسی اختلاف کے امیر مینائی کی جانشینی ملی۔ بقول قاضی عبد الغفار جلیل نے انیسویں صدی کے نصف آخر کے دو مکاتب کی خصوصیات یکجا کر لی تھیں۔ وہ امیر مینائی کے جانشین تھے اور داغ کے بھی۔ داغ کی زبان کی بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جلیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حصہ حاصل کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جلیل غزل کے روایتی آہنگ کے استاد تھے۔ نکھری ہوئی زبان اور نرم رچی ہوئی موسیقیت ان کے کلام کی ممتاز خصوصیت ہے۔ دربارِ دکن سے انہیں فصاحت جنگ کا خطاب ملا تھا۔ وہ قدیم سلسلۂ تلمذ کے آخری استاد تھے۔ بیسویں صدی کے اس دور سے تعلق رکھنے والے اور کچھ شاعر ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں مثلاً مضطر خیر آبادی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، سائل دہلوی، اسد حیدر آبادی، ساغر نظامی، روش صدیقی اور وحشت کلکتوی وغیرہ۔

اردو ناول اور افسانہ دونوں انگریزی اثرات کی پیداوار ہیں۔ سرشار و شرر کی ناول نگاری کی روایت کو راشد الخیری اور محمد علی طبیب وغیرہ نے آگے بڑھایا پھر اس قافلے میں نئے لکھنے والے آ گئے۔ مختصر افسانہ ابتدائی دور میں داستان کی روایت لیے ہوئے تھا بعد میں پریم چند، یلدرم اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کے ہاتھوں جمال دوستی، فن پرستی، مقصدیت اور اصلاحی محرکات ایک دوسرے سے متصادم رہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد افسانویت و تخیلیت کا زور ٹوٹا اور مثالیت کی جگہ حقیقت نے لی۔ سماجی اور معاشرتی اصلاح نے اس احساس کو تقویت دی کہ نچلے طبقہ کے افراد اور کسانوں اور مزدوروں کے مسائل پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ چنانچہ شہری زندگی کے بجائے دیہاتی زندگی کی تصویر کشی ناول و افسانہ کا موضوع بن گئی۔

راشد الخیری کے زیادہ ناول ۱۹۱۴ء سے پہلے کے ہیں۔ انہوں نے معاشرہ کی ان مذموم رسوم پر کڑی تنقید کی جن کی بدولت عورت مظلوم ہو کر رہ گئی تھی ان کے تمام ناول نذیر احمد کی قائم کردہ روایت کی توسیع ہیں جس میں درد و کسک کے عنصر کا اضافہ کیا گیا ہے۔

پریم چند (۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء) اردو ناول و افسانہ میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری ایک پورے عہد کی عکاسی کرتی ہے ان کے ناول "بیوہ"، "بازارِ حسن" اور "پردہ مجاز" وغیرہ اگرچہ بیسویں صدی سے پہلے مقبول ہو گئے تھے لیکن ان کے فن کی تکمیل اس آخری دور میں ہوتی ہے۔ جو ۱۹۳۶ء میں ان کی وفات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں ان کی تحریر کا بنیادی مقصد ہند و معاشرہ کی اصلاح اور ہند و قوم کی بیداری رہا۔ گویا اردو ناول نگاری میں جو کام نذیر احمد نے مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لیے شروع کیا تھا وہ پریم چند نے ہند و معاشرہ کے لیے کیا۔ بعد میں ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی ان کے دائرہ تحریر میں آگئے۔ دیہاتی زندگی کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اس لیے دیہاتی زندگی کی جو زندہ تصویر ان کے یہاں ملتی ہے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ پریم چند کے اس دور کے ناولوں میں "گوشہ عافیت" اردو ادب ہی میں نہیں ہندوستانی ادب میں پہلا ناول ہے جس میں نچلے طبقے کے مسائل اور گاؤں کے معاشرہ کو مرکزی خیال بنایا گیا ہے "چوگانِ ہستی" ہندوستان کی سیاسی جد و جہد کا مکمل اشارہ ہے اور گاندھی جی کے عدم تشدد کی بھرپور تفسیر ہے۔ "میدانِ عمل" میں ہندوستان کے شہر و دیہات کے وہ تمام مسائل آگئے ہیں جو بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں شروع ہوئے تھے۔ "گئو دان" پریم چند کا آخری اور سب سے بہتر ناول ہے جو ان کی زندگی کے تمام تجربات کا نچوڑ ہے۔ زندگی کی جیسی جیتی جاگتی تصویریں ان کے ناولوں اور افسانوں میں نظر آتی ہیں کسی مصنف کے پاس اس کامیابی کے ساتھ نہیں ملتیں۔ پریم چند کے ناول اور افسانے اردو کائنات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ پریم چند ناول نگار ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے افسانوں کے کئی مجموعے چھوڑے ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ناولوں کی طرح اصلاحی رنگ غالب تھا آخری دور کے افسانے تکنیک میں بھی بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی کہانی "کفن" کو تو کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔

پریم چند کی چھوڑی ہوئی روایت تھوڑے ہی وقت میں اتنی مقبول ہوئی کہ بہت سے لکھنے والے، جو تھوڑا بہت دیہاتی زندگی کا تجربہ رکھتے تھے اسی راہ پر گامزن ہو گئے علی عباس حسینی، سدرشن، اعظم کریوی اور اپندر ناتھ اشک پر ان کا نمایاں اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ علی عباس حسینی شروع میں رومانیت کے دلدادہ تھے بعد میں مقصدی اصلاحی کہانیاں لکھنے لگے۔ قومیت اور عوام کی اقتصادی حالت بھی ان کے افسانوں میں جگہ پا گئی۔ ان کی سوچ کا انداز پریم چند کی طرح سیاسی نہیں تھا۔ ان کی رومانیت صرف حسن و عشق کی باتوں کو ایک تخئیلی ماحول میں پیش کر دینے کی حد تک ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے "باسی پھول"، "کچھ ہنسی نہیں ہے" اور "میلا گھومنی" مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ پریم چند کی روش کو اپنانے والوں میں ایک سدرشن بھی ہیں جو اُردو کے کامیاب افسانہ نگار ہیں پریم چند اور سدرشن کا اندازِ نظر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی مختلف ہے۔ سدرشن نے شہری ہندوؤں کے متوسط گھرانوں کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ اگرچہ دیہاتی معاشرت بھی ان کے بعض افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن ان میں کوئی اپج یا گہرائی نہیں۔ سلطان حیدر جوش نے اُردو افسانوں کی پیش رفت میں اہم حصہ لیا۔ ان کے افسانے زیادہ تر سیاسی نوعیت کے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح ان کا محبوب موضوع ہے لیکن ان کا تبلیغی مقصد اتنا غیر معتدل ہے کہ فن پر غالب آگیا ہے۔ انہوں نے مغرب اور مشرق کی تہذیبوں اور معاشرتوں کے تصادم کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر اصلاح کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "فسانۂ جوش" اور "جوشِ فکر" شائع ہو چکے ہیں۔ نیاز فتح پوری (۱۸۸۷ء - ۱۹۶۶ء) افسانہ نویس بھی تھے اور ناول نگار بھی۔ اپنے ہم عصروں کے برخلاف ان کے ناول اور افسانے دونوں مقصدی نہیں۔ ان کا پسندیدہ موضوع حسن و عشق کی داستان اور محبت و عورت کا ذکر ہے۔ انہوں نے فن کو فن کی اولین غایت قرار دیا۔ نیاز کے پاس فلسفہ طرازی کا فن نرالا ہے رومانیت اور مخصوص طرزِ بیان ان کا امتیازی وصف ہے۔ شعریت و فلسفیت کا امتزاج جس حسن سے ان کے یہاں ہے کسی مصنف کے پاس نہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا انشا پردازی غالب رہی۔ ان کی جدت پسندی انہیں عام رستوں سے الگ لے جاتی ہے۔ نیاز نے صرف دو ہی ناول لکھے۔ "شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" آخری ناول ان کی نمائندہ تصنیف ہے جس میں تحلیل نفسی کے اصول کو برتا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی رومانی بغاوت سے آنے والے ناول نگاروں کے انقلابی رجحانات کے لیے راستہ ہموار کیا۔

سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ء - ۱۹۴۳ء) بھی رومانی تحریک کے علم بردار تھے۔ غیر ملکی افسانوں کے مترجم کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کیا۔ یلدرم نے طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں جن میں حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تحلیل سے کام لیا گیا ہے ان کے نزدیک محبت ہی ایسا عنصر ہے جو ادب اور افسانے جیسی لطیف صنف کا عنوان بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کافی مقبول ہوا جس کے افسانے انشائے لطیف کا بہترین نمونہ ہیں۔

قاضی عبدالغفار بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں وہ صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ ترقی پسند ادب سے انھوں نے اپنا ناتا جوڑ لیا تھا وہ یورپی ناولوں کی تکنیک سے واقف تھے۔ انہی کے طرز پر دو مختصر ناول "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" لکھے۔ اس طرزِ نو سے پہلی بار اُردو ناول متعارف ہوا جس میں خطوط کی ترتیب کے ذریعہ ناول آگے بڑھتا ہے۔ ناول "لیلیٰ کے خطوط" اپنے دور میں بہت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کا راز قاضی صاحب کی داخلی حقیقت نگاری اور ان کی مسلّم انشا پردازی ہے۔ "مجنوں کی ڈائری" ناول سے زیادہ روزنامچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا محمد سعید نے دو کامیاب ناول "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" لکھے۔ ان ناولوں میں سماجی حالات کے تغیرات اور فرد کی کشمکش کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اُردو ناولوں کی ترقی میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ منشی فیاض علی نے بھی دو اچھے ناول "شمیم" اور "انور" اُردو ادب کو دیے جن میں معاشرتِ حاضرہ کی ماہرانہ مصوری کی ہے ان کے تمام ناولوں کا موضوع ایک ہی ہے یعنی طوائف اور طوائف کی زندگی۔ فضل حق قریشی کے ناولوں میں زندگی، حقیقت اور افسانویت کا بہت عمدہ امتزاج ہے۔ ان کے ناولوں میں "شاہدِ رعنا" سب سے بہتر ہے۔ اس سلسلے کے دوسرے قابلِ ذکر نام مجنوں گورکھپوری، افسر میرٹھی اور ظفر عمر وغیرہ ہیں۔ اس دور میں اپنے ناولوں، افسانوں اور انشائیوں کو جن ادیبوں نے اپنا مقصدِ تحریر بنایا ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جنہوں نے

مزاح کی چاشنی سے اُردو ادب کو روشناس کرایا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء – ۱۹۴۷ء) کی شہرت ان کے مزاحیہ خاکوں کی بدولت ہے۔ "نذیر احمد کی کہانی" اور "دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ" ان کے شاہکار ہیں۔ محمد حسین آزاد کی مرقع کشی اور شخصیت نگاری کا پرتو ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ مرزا صاحب کردار سے نہیں بلکہ اسلوب کی شگفتگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں واقعہ اور کردار کے مضحکہ خیز پہلوؤں سے بھی کام لیا ہے۔ مرزا الم نشرح کے نام سے بھی لکھتے رہے۔ عظیم بیگ چغتائی (۱۸۹۵ء – ۱۹۴۱ء) نے طویل ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ ان کے کردار زندگی کے عام واقعات اور حالات کے گرد گھومتے ہیں۔ اصلاح رسوم کا مقصد بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ شوخی اور بذلہ سنجی ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

چغتائی کی تصانیف میں طنزیہ عناصر بھی ملتے ہیں۔ لیکن مزاح نگاری اس قدر شوخ ہے کہ طنز کے جوہر نہیں ابھرتے۔ عظیم بیگ کے ناولوں میں "خانم"، "چمکی"، "کولتار" اور "شریر بیوی" کو بہت شہرت ملی۔ احمد شاہ بخاری پطرس کی تحریرات پر انگریزی مضامین کا پرتو ہے جس کو معاشرہ کے پس منظر میں انہوں نے دیا رکھا ہے۔ ان کی ظرافت میں عمومیت ہے۔ وہ لفظوں سے زیادہ واقعات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری ان کے مزاح کا بنیادی وصف ہے۔ رشید احمد صدیقی طنز کے واحد لکھنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے رنگ میں انفرادیت پیدا کی۔ وہ علی گڑھ کی فضا کی پیداوار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موضوعات کو زیادہ تر مقامی ماحول یعنی علی گڑھ کی اقامتی زندگی تک محدود رکھا۔ ان کا طنز، مزاح میں ملفوف ہوتا ہے۔ انہوں نے "طنزیات و مضحکات" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے وہ اردو میں طنز و ظرافت پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ملا رموزی نے اپنے مزاحیہ انشائیوں کی بدولت خاصی مقبولیت حاصل کی۔ وہ "گلابی اردو" کے موجد خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کی مضمون نگاری کا راز ان کی حقیقت نگاری میں ہے۔ امتیاز علی تاج اچھے ڈرامہ نگار تھے لیکن انہوں نے مزاح نگاری میں بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اُردو مزاح نگاری کو ان کی سب سے بڑی دین "چچا چھکن" کا مزاحیہ کردار ہے۔ ان کی اس تخلیق میں قاری پہلی بار اُردو ادب کے ایک دل کش اور مکمل مزاحیہ کردار سے متعارف ہوتا ہے۔

جہاں تک ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے اس دور میں کچھ ڈرامانگار تو وہی ہیں جنہوں نے اپنا کیریر ۱۹۱۴ء سے پہلے بنا لیا تھا۔ کچھ نئے لکھنے والے بھی اس میدان میں آئے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ڈرامہ نگاری ادنیٰ درجہ کے نثر نگاروں کے ہاتھ میں رہی پھر نامور ادیبوں نے بھی ادھر توجہ کی۔ آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹ء – ۱۹۳۵ء) عظیم ڈرامہ نگار تھے۔ جو چوتھائی صدی تک اردو اسٹیج پر چھائے رہے۔ انہوں نے اردو تھیٹر کی روایت کو فنی لوازم و تدبیر کاری سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ۱۹۱۴ء تک وہ ۱۲ ڈرامے لکھ چکے تھے جن میں ترجمے زیادہ تھے۔ ان ڈراموں میں قدیم روایتی انداز اور عبارت آرائی کے نقائص موجود تھے بعد کے دور کے ڈراموں میں انہوں نے ڈرامے کو محض عوامی تفریح کے مقصد سے آزاد کر کے فنی لطافتوں سے معتبر بنایا۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ قدیم اور جدید ڈرامہ نگاری کے درمیان ایک اہم کڑی بن گئے۔ اس دور کے حشر کے قابل ذکر ڈرامے "رستم و سہراب"، "ترکی حور"، "پہلا پیار"، "سیتا بن باس" اور "آنکھ کا نشہ" وغیرہ ہیں۔

پنڈت نرائن پرشاد بیتاب کی شہرت کا آغاز ان کے کامیاب ڈرامے "مہا بھارت" سے ہوا۔ وہ ہندی، سنسکرت اور ہندو دیو مالا سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے ہندی ڈراموں کو زیادہ خراج تحسین ملا۔ "زہری سانپ"، "امرت"، "رامائن"، "شکنتلا" اور "کرشن سداما" ان کے مقبول ڈرامے ہیں۔ حکیم احمد شجاع نے آغا حشر کی روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے ڈراموں میں قدیم روایات اور جدت کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ حکیم صاحب کے قابل ذکر ڈراموں میں "باپ کا گناہ"، "آخری فرعون"، "بھیشم پرتگیہ" اور "بھارت کا لال" ہیں۔

امتیاز علی تاج نے اسی دور میں اپنا تاریخی ڈرامہ "انارکلی" لکھا جو عام طور پر جدید اُردو ڈرامہ نگاری کا نقش اوّل سمجھا جاتا ہے۔ انارکلی اپنی دل کش ادبیت اور فنی نگہداشت کی بنا پر بہت مقبول ہوا۔ مکالموں کی برجستگی اور کامیاب کردار نگاری اس کی خصوصیات تھیں۔ اشتیاق حسین قریشی طرز جدید کے لکھنے والوں میں ہیں۔ وہ جدید ڈرامہ کی تکنیک سے بخوبی واقف تھے اس لیے ان کے ڈرامے فنی شعور کی تمثیل کا بہترین نمونہ ہیں۔ محمد مجیب مغربی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ انہوں نے اُردو ڈرامہ نگاری کو بہت کچھ دیا۔ ان کے ڈراموں میں "خانہ جنگی"، "کھیتی"، "حبہ خاتم" اور "آزمائش" بہت ممتاز ہیں جن میں جدید اسلوب کے تمام فنی لوازمات پائے جاتے ہیں۔ اس عہد کے دوسرے ڈرامہ نویسوں میں میر غلام عباس، مخلص حیدرآبادی، نازاں، محشر انبالوی، شاہد احمد، فضل حق قریشی، کیفی، آرزو لکھنوی اور نشتر لکھنوی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اصناف کے مقابلہ میں ڈرامے کی صنعت کم پائدار رہی۔

اس دور کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اس درمیانی مدت میں ادبی تاریخ اور تنقید و تحقیق سے متعلق کافی سرمایہ وجود میں آیا۔ مولوی عبدالحق اس دور کے اہم محقق ہیں۔ انہوں نے حالی کے ادبی کام کو واضح تر صورت میں پیش کیا۔ "مکاتیب حالی" اور "مقالات حالی" اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکنی ادب کے پرانے قلمی نسخوں کو برآمد کر کے بسیط مقدموں کے ساتھ مرتب و شائع کیا۔ ان کے مقدمات مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی زیر ادارت نکلنے والے اُردو رسائل کے ذریعہ بھی اردو میں تحقیقی و تنقیدی مقالات کا بڑا ذخیرہ فراہم ہوا۔ عبدالرحمٰن بجنوری ذہنی تربیت کے لحاظ سے مغرب سے متاثر تھے۔ ان کا کارنامہ "محاسن کلام غالب" ہے۔ بجنوری اُردو کے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے یورپی فنکاروں کے نقطۂ نظر سے غالب کی شاعری کا مطالعہ کیا اور ان کو نفسیاتی تنقید کی روشنی میں جانچا۔ بجنوری کی اس انتہا پسندی کے جواب میں دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب کی زندگی اور شاعری کا تنقیدی جائزہ انگریزی میں لیا جس کا اُردو ترجمہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں حبیب الرحمٰن شیروانی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین "مقالات شیروانی" کے نام سے شائع ہوئے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی بھی اچھے محقق اور تنقید نگار تھے۔ ان کے تنقیدی تصورات میں مشرقی اور مغربی تنقیدی تصورات کا امتزاج ملتا ہے۔ "کیفیہ" اور "منشورات" ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ وحید الدین سلیم نے اپنی مشہور تصنیف "اصطلاحات علمیہ" کے علاوہ جو تنقیدی مقالات

تحریریں ہیں وہ بڑے کام کی چیز ہیں۔ مہدی افادی اگرچہ رومانی رنگ کے لکھنے والوں میں تھے لیکن ان کے مضامین محض انشائیے نہیں ان میں ہمیں تاریخ بھی ملتی ہے اور تنقید بھی۔ "افادات مہدی" کے بیشتر مضامین بڑی تنقیدی نوعیت کے حامل ہیں۔ شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالہ "مخزن" کے ذریعہ اردو ادب میں تنقیدی شعور پیدا کیا۔ خود انہوں نے اپنی تنقیدات میں ادب کی معنوی اور صوری دونوں صورتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ چکبست جنہوں نے شاعری میں بڑا نام پیدا کیا ان کی تنقیدی صلاحیتیں "معرکہ چکبست و شرر" سے منظر عام پر آئیں ان کی مزید تنقیدی تحریریں "مضامین چکبست" میں شامل ہیں۔ سلیمان ندوی اپنے وقت کے بہترین مورخ، سوانح نگار، نقاد اور محقق تھے۔ تحقیق و تنقید کا جوہر ان کی ہر تصنیف میں ملتا ہے۔ ان کی تنقیدات پر شبلی کا گہرا اثر ہے۔ اپنی کتاب "خیام" میں انہوں نے خیام سے متعلق جو غلط تصورات تھے، ان کی تحقیقی طور پر تردید کی ہے۔ "نقوش سلیمانی" کے مضامین اردو کے عہد بعہد ترقی کی مکمل تاریخ ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی تنقیدی صلاحیت اس وقت سامنے آئی جب انہوں نے اردو شاعری کو محض قافیہ پیمائی قرار دے کر قافیہ اور بحر کی پابندیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اردو میں ہندی بحروں کی شمولیت کی وکالت کی۔ حامد حسن قادری بھی اچھے مورخ و نقاد تھے۔ "داستان تاریخ اردو" ان کی قابل قدر تصنیف ہے جس میں اردو کی نشو و نما اور ترقی کے مدارج کا جائزہ تحقیقی انداز میں لیا گیا ہے ان کی دیگر تنقیدات میں تاریخ و تنقید اور ماثر عجم قابل ذکر ہیں۔ محمود شیرانی نے تحقیق و تنقید کے میدان میں اہم کام انجام دیے۔ انہوں نے اپنے دلائل کی روشنی میں پچھلی کئی تحقیقات و نظریات کو غلط ثابت کیا۔ نیاز فتح پوری بحیثیت تنقید نگار بہت اونچا قدر رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں تاثراتی، ہیتی اور تشریحی ہوتی ہیں جس کی بنیاد ان کے ذاتی نظریات ہوتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مجموعوں "انتقادیات"، "نقشہائے رنگ رنگ اور مالہ وما علیہ" نے ادب کی چاشنی میں بڑا اضافہ کیا۔

دکن کے محققین اور تنقید نگاروں میں ڈاکٹر زور کا نام پہلا ہے۔ ان کی سرگرمیوں کا جائزہ زیادہ تر دکنی ادب و ثقافت تک محدود رہا پھر بھی ان کی تصانیف سے ادبی تاریخ کے بہت سے خلا پُر ہوئے۔ ان کی ریسرچ سے کئی دکنی مخطوطات منظر عام پر آئے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے "اُردو شہ پارے" "روح تنقید" اور "سلطان محمد قلی قطب شاہ" وغیرہ ہیں۔ دکن کے شمس الدین قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" ان اہم تصنیفات میں سے ہے جو دکن میں اُردو ادب کا خاصا مواد فراہم کرتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا شمار بھی دکنی ادب کے محققین میں ہوتا ہے۔ ان کی تحقیقی تخلیقات "دکن میں اُردو" "مدراس میں اُردو" اور "یورپ میں دکنی مخطوطات" ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی اپنے دور کے منفرد نقاد تھے۔ ان کی تنقیدات کا انداز خالص مشرقی ہے۔ ان کی تنقیدیں اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے مزاحیہ نگاری کے ساتھ تنقیدی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ کیا جس کا اندازہ ان کی تصنیفات "گنج ہائے گراں مایہ" "ترقی پسند ادب" اور "زبان اردو پر ایک نظر" سے کیا جاسکتا ہے۔ "طنزیات و مضحکات" ان کا بڑا وسیع کام ہے۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد کے ہنگامہ خیز دور میں جب سیاست عوامی زندگی میں اپنا گھر بنا رہی تھی۔ اُردو صحافت نئے جذبات و آہنگ سے متاثر ہوئی۔ اس وقت کا مرینڈ، "الہلال" اور "زمیندار" بند ہو چکے تھے۔ اس سے جو خلا پیدا ہوا اس کی جگہ نئے اخباروں اور رسالوں نے لی جنہوں نے صحافت میں ادب کا عنصر بڑھایا۔ ادارتی کالموں میں سنجیدگی آئی۔ صحافت کے اس زرخیز عہد کی آبیاری کرنے والوں میں ظفر علی خاں کا نام بہت نمایاں ہے جنہوں نے اپنے زور قلم سے صحافت کے معیار کو بہت بلند کیا۔ ان کا "زمیندار" جو جنگ عظیم میں بند ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں پھر جاری ہوا۔ کئی بار ضمانتیں ضبط ہو لیں۔ لیکن انہوں نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ اس آندھی میں بھی اس مشعل کو جلائے رکھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کئی اور اخبار پرتاپ، کیسری، ملاپ اور تیج جاری ہوئے۔ مولانا محمد علی کا "ہمدرد" نکلنے تک عوام کا جوش و خروش دب چکا تھا۔ نظریات میں بھی پہلی سی شدت نہ رہی۔ "ہمدرد" اعلیٰ درجہ کا روزنامچہ تھا جس نے اپنی سنجیدہ اور متین روش برقرار رکھی۔ ۱۹۲۷ء میں "الہلال" بھی دوبارہ جاری ہوا لیکن جس تیزی سے اس نے مقبولیت حاصل کی اسی تیزی سے بند بھی ہو گیا۔ مولانا غلام رسول نے اسی سال لاہور سے "انقلاب" نکالا جو بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کا ترجمان تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ملک نور الٰہی نے لاہور سے "احسان" کا اجرا کیا جو مجلس احرار کی تحریک کا آرگن تھا اور فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا اخبار تھا۔ اسی دوران چراغ حسن حسرت کا "احرار" لاہور سے، ابوالاعلیٰ مودودی کا "الجمعیۃ" دہلی سے اور قاضی عبدالغفار کا "پیام" حیدرآباد دکن سے نکلا۔ لکھنؤ سے ہمدم، حقیقت اور سرفراز جاری ہوئے۔ ۱۹۲۱ء کے بعد بہت سے ادبی رسائل وجرائد بھی طبع ہونے شروع ہوئے جنہوں نے اُردو صحافتی ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں عبدالحق کا رسالہ "اُردو"، نیاز فتح پوری کا "نگار"، تاجور نجیب آبادی کا "ادبی دنیا"، بشیر احمد کا "ہمایوں" برکت علی کا "ادب لطیف" شاہد احمد کا "ساقی" حکیم یوسف حسین کا "نیرنگ خیال"، ڈاکٹر تاراچند کا "ہندوستانی"، ڈاکٹر زور کا "سب رس" اور اعظم گڑھ سے نکلنے والا "معارف" قابل ذکر ہیں۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کا یہ دور ہر لحاظ سے ادبی زرخیزی کا دور ہے۔ ایک نئے نظام زندگی کی نوید اور ایک نئے دور کی تلاش اس دور کے ہر صنف ادب کے نمونوں میں ملتی ہے پچھلا دور نثر کی ترقی اور وسعت کا دور تھا لیکن اس دور میں نظم و نثر دونوں کا دامن یکساں دراز ہوا۔ سرسید کی مقصدیت و کلاسیکیت کی جگہ جمال پرستی اور لذتیت کے رویہ کا اظہار جو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اس دور میں اس نے ایک مستقل میلان کی صورت اختیار کر لی۔ سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ احساس جمال و بزم خیال کے فانوس روشن نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس دور کی نظم پر اقبال و جوش اور نثر کے اسلوب پر ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور نیاز فتح پوری کے انشائے لطیف کا گہرا اثر ہے۔ اس زمانے میں غیر متوقع طور پر غزل کو پھر عروج نصیب ہوا اور شدید مخالفتوں کے باوجود نہ صرف زندہ بلکہ تابندہ رہی۔ اس عہد کے اکثر شاعروں نے اگرچہ اقبال کی طرح صنف نظم کو نہیں برتا لیکن ان کی نفسیات ان کے طرز احساس اور ان کے رویہ میں قابل لحاظ تبدیلی آئی۔ اس درمیانی مدت میں عمدہ ناول لکھے گئے اور یہی زمانہ مختصر افسانہ کی ترقی کا بھی ہے۔

پریم چند، سدرشن اور نیاز نے نئی راہیں نکالیں۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں طنز و مزاح کا فروغ اور تحقیق و تنقید کا شعور بھی ایک غالب رجحان ہے۔ جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے سابقہ دور کے مقابلہ میں اسٹیج کے ڈرامے اس دور میں زیادہ پھلے پھولے نہیں اور نہ ہی انہوں نے اردو ادب کی رفتارِ ترقی کا ساتھ دیا۔ صحافت کا معیار بھی اس زمانہ میں خاصا بلند ہوا۔ معیاری اخبار، بلند پایہ رسائل اور اردو ادارے اس دور کے یادگار ہیں۔

اردو ادب

(۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۶ء)

۱۹۳۵ء کے لگ بھگ اردو ادب کی رومانیت سماجی معنویت کی نئی جہت سے آشنا ہونے لگی۔ تخیلیت، جذباتیت، انفرادی دردمندی پر پلنے والی رومانیت کی سرحدیں محض ذات تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ انفرادیت کا جوش و خروش اپنی خوشی اور سماج کو خوش حال دیکھنے کی تمنا میں ان تمام سماجی اداروں سے ٹکرانے لگا جو اس کی تمناؤں کی تکمیل میں حائل تھے۔ سب سے پہلی یلغار جنس اور مذہب کے مسلمہ اداروں پر ہوئی اور اس کے بعد سیاست پر۔ مگر ہر صورت میں اس یلغار کی بنیادی حیثیت انفرادی اور رومانی تھی اور اس کے ہتھیار جذبے کا وفور اور تخیل کی بے پناہ قوت ہی کے ذریعے فراہم کیے گئے تھے۔

اس امتزاج کی سب سے واضح مثالیں — اقبال، اختر شیرانی اور جوش کی شاعری سے اور قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری اور ابوالکلام آزاد کی نثر سے فراہم کی جا سکتی ہیں جو ذات ہی کے راستے سے ایک بت شکن رومانی انانیت تک پہنچے تھے اور یہ رومانی انانیت محض حجاب امتیاز علی کے صنوبر کے سائے، خلیق دہلوی کے 'ادبستان' اور سجاد حیدر یلدرم کے 'خیالستان' تک محدود نہ تھی بلکہ کبھی لیلیٰ کے خطوط میں طوائف کے بدنام کردار کو موضوعِ سخن بنا کر سماج سے انتقام لیتی تھی کبھی اختر شیرانی کے لفظوں میں 'اٹھ ساقی' اٹھ تلوار اٹھا کا راگ الاپتی تھی، کبھی جوش کی طرح مذہب کے سکہ بند ادارے کو للکارتی تھی، کبھی ابوالکلام آزاد کی نثر کا رجزیہ اسلوب بن کر سیاست کے رموز کھولتی تھی اور کبھی اقبال کے تصورِ خودی کی شکل اختیار کر کے مردِ کامل کے عشق کو عقل پر فوقیت دے کر تخیل اور جذبے کے رومانی آدرشوں کا پرچم بلند کرتی تھی۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا ۱۹۳۶ء کی کل ہند کانفرنس سے ہوئی جو لکھنؤ میں منشی پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ گو پریم چند عام طور پر رومانی جذباتیت، تخیل پرستی اور گھن گرج سے بہت کچھ دامن بچائے ہوئے تھے اور ان کی کہانیاں اور ناول جذبے اور تخیل کی رومانی دھند سے دور رہ کر دیہاتوں میں بکھری ہوئی سماجی حقیقتوں کو بیان کر رہی تھیں اور انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں حسن کا نیا معیار تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور ایسے ادب کو مہلک بتایا جو قوم کو سلا دے اور اسے بیدار کرنے سے قاصر رہے لیکن ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر پیدا ہونے والا ادب بہت دنوں تک جذبے اور تخیل کی اس انفرادی اور نراجی گھن گرج سے نہ نکل سکا۔

'انگارے' اسی رومانی بت شکنی کی ایک مثال تھی سا توں افسانہ نگاروں نے انفرادی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بننے والے سماجی اداروں سے ٹکر لی تھی اور مذہب، جنس اور سیاست کے موضوعات پر پوری جرأت اور بے باکی سے لکھا تھا اور اسی انفرادی بت شکنی کی گھن گرج میں افسانے کی روایتی ہیئت کو بھی توڑ مروڑ کر نئے تجربات کیے تھے۔ (مثلاً سجاد ظہیر کی کہانی "نیند نہیں آتی" میں شعور کی رو کی تکنیک کا آزادانہ استعمال) یہی کیفیت اس دور کی اکثر اصناف کی تھی جن میں انفرادی رومانیت کی بت شکنی اور اس رومانی بت شکنی میں اجتماعی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کے درمیان ٹکراؤ موجود تھا۔

کچھ دنوں تک یہ ٹکراؤ واضح نہیں ہوا اور ترقی پسند تحریک کے اردگرد راشد، میراجی، حسن عسکری وغیرہ ایسے فن کار جمع رہے جو محض انفرادی رومانیت کی بت شکنی میں دلچسپی رکھتے تھے اور یورپ کے ان رومانی ادیبوں کی طرح جو اپنی ذات کے آزادانہ اظہار کی تلاش میں سماجی اداروں سے ٹکراتے تھے مگر ان کا یہ ٹکراؤ کوئی واضح سماجی سمت دینے کو تیار نہیں تھا اور اپنے کو محض ہیئت کے کلاسیکی سانچوں کی توڑ پھوڑ اور اپنی انفرادیت کے لیے نئے پیرایہ اظہار ڈھونڈھنے کی کش مکش ہی کو فن اور حیات کا ماحصل جانتے تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ ان سب کو جنسی موضوعات سے زیادہ لگاؤ تھا کہ یہ موضوعات سماجی اداروں کے مسلمات کو سب سے زیادہ آسانی سے اور زیادہ شدت سے للکار سکتے تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک پر زیادہ تر اعتراضات جنسی بے راہ روی، فحاشی اور پرانے ادبی سانچوں سے بغاوت ہی کے سلسلے میں لگائے گئے (فرقت کاکوروی کی 'مداوا' اور جعفر علی خاں اثر کے مضامین) لیکن تھوڑی ہی مدت میں انفرادی نراج پسندی اور اجتماعی معنویت کو اولیت دینے والوں کے راستے الگ الگ ہو گئے اور انفرادیت پسند حلقہ اربابِ ذوق کے گرد جمع ہونے لگے۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر اجتماعی معنویت پر زور دینے والے ادب میں جنسی اور ہیئتی تجربوں کے بجائے سیاست پر زور دیا جانے لگا اور یہ زور اتنا بڑھا کہ بعد میں عصری حقیقت کا وسیع مفہوم سکڑ کر ہنگامی سیاست تک محدود ہونے لگا پھر بھی یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر ادب کو سماجی وابستگی کا ایک نیا تصور ملا اور ادب نے اپنا رشتہ کم سے کم ذہنی طور پر سماج کے دبے کچلے طبقوں سے جوڑنا چاہا اور اس کوشش میں اپنے کو سیاسی آزادی کی اس تحریک

سے وابستہ کر لیا جو اس وقت ملک بھر میں انگریز حکمرانوں کے خلاف جاری تھی۔ شاعری میں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، ساغر نظامی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، افسانوی ادب میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، علی عباس حسینی، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ، اختر انصاری سب سے زیادہ سعادت حسن منٹو نے اس نئے لب و لہجے کو نکھارا۔

تنقید میں اختر حسین رائے پوری کی "ادب اور انقلاب" اور احمد علی کی "نیا ادب کیا ہے" کے انتہا پسندانہ اور کلاسیکیت دشمن رویوں کے بعد مجنوں گورکھ پوری کی "ادب اور زندگی" اور احتشام حسین کی "تنقیدی جائزے" اور ڈاکٹر عبد العلیم اور سجاد ظہیر کی تحریروں سے ترقی پسند ادب کو تنقیدی توازن ملا جس میں ترقی پسند عناصر کی وسیع تر تعریف کر کے کلاسیکی ادب میں بھی ایسے عناصر کی تلاش کی گئی۔

اس دور کے تخلیقی فن پاروں میں بنیادی فنی آویزش تغزل اور باطنی تجربے کی توسیع ہے۔ جن شاعروں نے اس کوشش میں کامیابی حاصل کی وہ خارج کے تجربے سے حاصل ہونے والی سماجی بصیرت کو بھی تجربے کی واقفیت اور شعریت کی رنگینی دے سکے باقی مانگے کے خیالات پر شاعرانہ انداز بیان کی ملمع کاری میں لگے رہے اس ضمن میں نظم میں سب سے اہم تجربے فیض، مجاز اور مخدوم نے کیے اور اپنی شاعری کو ذاتی تجربے کی واقعیت اور کلاسیکی دروبست کو سرشار شعریت سے پیوند کیا۔ فیض نے اپنے دور کے دکھ درد کو اپنی ذات کا حصہ بنا کر اسی کرب امروز کو نشاطِ فردا کی عظمت اور کج کلاہی کا ضامن بنا کر سطوتِ غم سے معمور چیٹیل شعریت سے نئے آہنگ میں ڈھالا۔ مجاز کے سرشار لب و لہجے اور مخدوم کی رنگین غنائیت میں ڈوبے رجزیوں نے شعریت کو ایک نئی جہت دے دی۔ غزل میں فراق نئے دور کے کائنات آشنا انسان کی ربودگی کی آپ بیتی لکھ رہے تھے جبکہ جذبی کلاسیکی دروبست کے ساتھ غزلیہ رمز و ایما میں اور مجروح سلطانپوری بھرپور رومانی سرمستی سے سیاسی حالات کو غزل کی علامتوں میں سمونے کا تجربہ کر رہے تھے۔

اس کے پہلو بہ پہلو شعری سانچوں میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ راشد نے سب سے پہلے موثر طریقے پر آزاد نظم کو پرانے عروضی سانچوں سے آزاد کر کے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا۔ (گو تصدق حسین خالد اس قسم کی کوششوں کا آغاز کر چکے تھے) اور نظم کو براہِ راست بیانیہ اظہار کے بجائے متنوع اور مختلف جہات کے پیرایہ بیان کے لیے اختیار کیا جس میں کرداری پیرایہ بھی تھا اور ڈرامائی صورتحال سے نظم کے تاثر پیدا کرنے کی کوشش بھی تھی (دریچے کے قریب) میرا جی نے آزاد نظم کو لاشعور کی پہنائیوں میں بکھیر کر اسے نجی اظہار کا پیرایہ بنایا اور ذاتی علامتیں ڈھال کر اسے ابہام اور اہمال کے قریب لے گئے جب کہ سلام مچھلی شہری نے عروضی تجربوں میں رقص اور مصوری کے طرز کو آزاد نظم کے لیے برتنے کی کوشش کی اور مختار صدیقی نے موسیقی کے طرز کو اپنایا۔

اس کے پہلو بہ پہلو قدیم طرز شاعری بھی پروان چڑھتا رہا گو اس طرز میں بھی مذاقِ عصر کے مطابق تبدیلیاں آنے لگیں۔ جگر مراد آبادی کے تغزل کی رنگینی اور سرمستی اب بھی مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی مگر وہ بھی اب اپنی غزلوں میں سیاسی رمزیت کو جگہ دینے لگے۔ یگانہ کا آخری زمانہ تھا مگر اس زمانے میں بھی غزل میں خودداری اور بانکپن ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

افسانوی ادب میں کرشن چندر کے ناول "شکست" اور افسانے "زندگی کے موڑ پر" اور "بالکونی" میں جس رنگین اور سرشار رومانی نثر کو اس دور کے بے بس نوجوانوں کی تصویر کشی کے لیے استعمال کیا گیا اس نے ایک طلسماتی فضا پیدا کر دی تھی۔ کرشن چندر اسی اسلوبیاتی طلسمات کے جادوگر تھے لیکن جیسے جیسے وہ رومانیت کی اس امتیازی فضا سے نکل کر سیاسی حقیقت پسندی سے قریب ہوتے گئے ان کی رنگینی ابھری ہوتی چلی گئی اور اس دور کی بہترین کہانیاں "مہالکشمی کا پل" اور "کالو بھنگی" بھی کرشن چندر کی اس امتیازی سحر کاری سے محروم ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے اسلوب کے بجائے کرداروں کی دروں بینی اور فرد کی سماج سے مطابقت کے مسئلے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا اور انھیں چھوٹے چھوٹے اشاروں سے انسانی شخصیت اور بصیرت کی داستانیں بیان کی ہیں۔ عصمت مسلم گھرانوں کی دبی کچلی جوانیوں کی بے جھجک فریاد بیان کرتی ہیں اور غلام عباس کی "آنندی" اور حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" دونوں کہانیاں اردو مختصر افسانے کو سماجیاتی سطح پر اقدار کی آبادکاری اور انسانی خواہشات کی چوکھٹ پر اقدار کی شکست و ریخت کی رزمیہ کہی جا سکتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے سماج کے معیاروں سے گرے ہوئے کرداروں کی تصویر کشی کر کے فرد کی تکمیل ذات کے نئے مطالبوں اور سماجی اقدار کے ازکار رفتہ شکنجے کی کش مکش کو بے نقاب کر کے انسان کی بنیادی سچائی اور معصومیت کی کہانی بیان کی اور تکنیک کے اعتبار سے رومانی طرز احساس کو حقیقت پسندانہ سادگی میں بے محابا ادا کیا۔

اس دور میں انڈین پیپلز تھیٹر کے عروج کی بنا پر اسٹیج ڈراموں پر بھی توجہ کی گئی اور پھر پرتھوی تھیٹر کے قیام سے ڈرامہ نگاری کو اور بھی فروغ ملا۔ پرتھوی راج نے "غدار" "پیسہ" "پٹھان" اور "دیوار" جیسے ڈرامے کامیابی سے اسٹیج کیے۔ احمد عباس نے پہلی حقیقت پسندانہ فلم قحط بنگال کے موضوع پر "دھرتی کے لال" کے عنوان سے بنائی۔ ریڈیائی ڈراموں کا بھی فروغ ہوا اور کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، انصار ناصری کے ریڈیائی ڈراموں نے اس صنف کو ادبی معنویت اور اہمیت بخشی۔

طنز و مزاح میں رشید احمد صدیقی نے نئی ادبی اور فکری تہ داری پیدا کی اور شوکت تھانوی نے اسے سماجی طنز کے طور پر برتا۔ کنہیا لال کپور کے ہلکے پھلکے مزاح نے سماجی ناہمواری اور ذات کے غیر متوازن ردِ عمل

کو موضوع بنایا۔

تقسیم ہندوستان کے بعد اردو کی ادبی قلم رو بھی دو ملکوں میں تقسیم ہوگئی اور ہندوستان میں اردو کو نئی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ناشروں کا کاروبار سرد پڑا اور رسالے بند ہونے لگے یا ان کی اشاعت میں زبردست کمی ہوئی۔ ریڈیو اور دوسرے سرکاری محکموں میں بھی اردو والوں کی ملازمت کی گنجائشیں کم ہونے لگیں پھر تقسیم ہندوستان کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات کی لہر آئی، زمینداری کا خاتمہ ہوا اور ان دونوں موضوعات نے اردو ادب کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ رامانند ساگر، کرشن چندر نے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا اور ناول اور افسانے لکھے اور پھر قرۃ العین حیدر سے قاضی عبدالستار اور جیلانی بانو تک تقسیم اور جاگیرداری نظام کے زوال کا موضوع اردو کے افسانوی ادب میں زیریں لہر کی طرح موجود رہا۔ پاکستان میں 'اداس نسلیں' سے لے کر 'خدا کی بستی' 'آنگن' اور 'چاند گہن' تک اور پھر تمام ناسٹلجیائی افسانوی ادب میں فسادات، تقسیم اور جاگیرداری ثقافت کا زوال موضوع بنا رہا گو وہاں کے رویے مختلف تھے۔

صنعتی دور کی طرف بڑھنے والے سماج کا اعصابی تشنج، احساس تنہائی اور بکھرے ہوئے شعور نے فکر اور فن دونوں میں عہد آفریں تبدیلیاں پیدا کیں۔ شاعری میں ایک طرف سردار جعفری کی گھن گرج کی شاعری ابھری جس نے "نئی دنیا کو سلام" سے لے کر "پیراہن شرر" تک شعری تمثیل اور آزاد نظم کی اصناف میں مثبت سماجی مقصدیت کو سمویا اور دوسری طرف اخترالایمان کا شعری آہنگ ابھرا جس میں براہ راست اظہار کے بجائے نظم کے مختلف پیرایوں (مثلاً ڈرامائی یک کرداری تمثیل اور طنزیہ قصوں اور تاثر پاروں) کو پہلی بار اردو میں ہمہ جہتی اور تہہ داری کے ساتھ برتا کہ نظم محض سادہ تسلسل ہی کی نہیں پیچیدہ ارتقا کی مظہر بن گئی اور سماج میں ابھرنے والی منافقت اور مصلحت پرستی پر گہرے طنز کی حیثیت اختیار کر گئی۔

نظم و نثر دونوں میں بکھرے تاثر پاروں سے وحدت تاثر کی مرکزیت حاصل کرنے کا تجربہ عام ہونے لگا جس کی مثالیں نظم میں اخترالایمان کی نظم "ایک لڑکا" اور "سبزہ بیگانہ" سے عمیق حنفی کی "سند باد" تک بکھری ہوئی ہیں اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ناولوں "میرے بھی صنم خانے" اور "آگ کا دریا" میں یہی ریزہ کاری مرکزی تاثر کی تشکیل کرتی ہے۔ غزل میں بلند آہنگی کے بجائے نرمی اور آہستگی کے رواج نے میر کی تقلید کی طرف متوجہ کیا اور پاکستان میں ابن انشا اور ناصر کاظمی کی غزل میں نئے آہنگ نے رواج پایا۔ ہندوستان میں غزل کے نرم اور تہہ دار لہجے میں فکری صلابت اور ریزہ کاری سمونے کی کوشش نے پرویز شاہدی، مخدوم اور جاں نثار اختر کے یہاں نیا آہنگ پیدا کیا اور خورشید احمد جامی کی غزل میں نیا رنگ بھر دیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں فکری اور فنی تقاضے نیا روپ اختیار کرنے لگے۔ رومانیت، سماجی معنویت کے راستے سے مڑ کر پھر ایک بار فرد کی طرف متوجہ ہوئی اور اس نئی رومانیت نے فلسفہ وجودیت اور خود اجنبیت کے تصورات کا سہارا لے کر باطن اور تلاش ذات کو فن کا موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ فنی سطح پر علامت کے استعمال پر زور دیا گیا اور شاعری اور افسانوی ادب دونوں میں علامتی پیرایۂ اظہار نے قبول عام پایا۔ مقصد، ادب میں کسی جہات کی معنویت پیدا کرنا تھا جس کی بیک وقت باطنی معنویت کے اعتبار سے تعبیر کی جاسکے اور سماجی معنویت کے اعتبار سے بھی۔ جہاں اس کوشش نے کیفی، پرویز شاہدی، عمیق حنفی، شہریار کی نظموں رتن سنگھ، اقبال مجید، رام لعل اور سلام بن رزاق، بلراج مین را اور سریندر پرکاش کے بعض کامیاب شہ پاروں کو جنم دیا وہاں نئی نسل کے بہت سے لکھنے والوں کی تخلیقات کو نہ بوجھی جانے والی پہیلی بھی بنایا۔ مجموعی طور پر یہ دور فکر اور ہیئت کے تجربات کا دور ہے جس نے ابھی تک اپنا یادگار کارنامہ اور نمائندہ فن کار پیدا نہیں کیا ہے۔ البتہ تجربات کے دوران فنی اور فکری معنویت سے بھرپور ٹکڑے ضرور اس دور کی تخلیقات میں بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔

اردو ادب
پاکستان میں

پاکستان کی جغرافیائی حدود میں اردو ادب کی روایت بہت قدیم ہے۔ اردو زبان کو یہاں ہر جگہ عام رابطے اور بول چال کی زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اردو اور یہاں کی علاقائی زبانوں میں ہمیشہ اثر اندازی اور اثر پذیری کا ایک فطری رشتہ قائم ہے۔ وقتاً فوقتاً علاقائی زبانوں کی ادبیات کے اعلیٰ نمونے اردو میں منتقل کرنے کا کام ہوتا رہا ہے اور قیام پاکستان کے بعد مختلف علاقائی ادبیات کی انجمنوں کی تشکیل سے اس مد میں خاصا مفید اور نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل پاکستانی علاقوں میں مشرق میں ڈھاکہ (حالیہ بنگلہ دیش) اور مغرب میں لاہور کو ادبی مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان شہروں کو بدستور مرکزیت حاصل رہی اور پھر بھارت سے ایک بڑی تعداد میں ادیبوں و شاعروں کے ہجرت کرکے پاکستان آنے اور ان کی ایک خاصی تعداد کے کراچی میں بس جانے کے سبب کراچی کو بھی ایک بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان بڑے مراکز کے علاوہ سرگودھا، راولپنڈی اور حیدرآباد بھی ثانوی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیگر شہروں میں پشاور، ملتان اور بھاولپور کو بھی ادبی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔

آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں، مختلف الخیال گروہ اور افراد ایک خاص حد تک، ایک

مشترکہ اجتماعی مقصد رکھتے تھے جس نے ادب کی ایک خاص سمت کا تعین کر دیا تھا۔ مگر بعد کے حادثات اور واقعات سے مقصد کی یہ یکجہتی مجروح ہوئی اور پھر آزادی ملنے کے بعد ذہنی دنیا میں ایک طرح کا انتشار پیدا ہوا اور اندرونی اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ دلوں میں خلیجیں حائل ہوئیں، پوری پوری آبادیاں فسادات کا شکار ہوئیں یا ہجرت کے دوران لوٹ لی گئیں اور جو بچے وہ نئی جگہوں پر اجنبی بن کر رہنے کے لیے پہنچے۔ مہاجر ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ثابت ہوئے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس ہجرت میں اپنے بچپن اور جوانی کے ماحول کو چھوڑا۔ جب لکھنے بیٹھے تو ان کا روحانی کرب اور قلبی انتشار تحریروں میں بھی جھلکا۔ چناں چہ ادب کی تمام اصناف میں یہ کرب اور المیہ، فسادات کے ایک عام موضوع کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان افراد میں نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں نے اسی زمانے میں کالجوں اور جامعات کی فضا میں ادبی ہوش سنبھالا تھا اور وہ ترقی پسندی کے رجحانات سے ذہنی طور پر متاثر بھی ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیشرو ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت سے بھی اثرات قبول کیے۔ اب تنگ نظری اور انتہاپسندی کے اس دور میں انھیں اپنا ادبی مقام بنانے میں بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ان کے جان دار اور صحت مند عناصر کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ انھیں ذہنی طور پر جذب کر کے اپنے مزاج میں شامل کر لیا۔ ان میں بہت سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہے، کچھ ذہنی سفر میں حلقہ ارباب ذوق کے ہمراہ چلے، کچھ حسن عسکری کی انفرادیت سے متاثر رہے مگر ان سب کے مزاج کی انفرادیت ۱۹۰۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں تشکیل پائی۔ اس کے بعد کے عرصے میں ان کا میلان جدیدیت کی صورت میں بڑی شد و مد کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ میلان دراصل اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا اور تنہا نہیں تھا۔ مغرب کی متعدد ادبی و فکری تحریکوں کے زیر اثر یہاں بھی مختلف میلانات و رجحانات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چناں چہ قیام پاکستان کے بعد کے چند سالوں میں فکری سطح پر جو انتشار کی کیفیت طاری تھی اس میں ادیب مغرب کے زیر اثر کبھی "وجودیت" کبھی "لاشعور" کبھی شعور کی رو اور کبھی سائنسی نظریہ ادب کو رواج دیتے۔ جدیدیت کا میلان اسی طرز فکر کے نتیجے میں کچھ مدت کے لیے ایک زیادہ واضح رویے کی صورت اختیار کر گیا اور ادب میں عصری رجحانات اور جدید تقاضوں کی ضرورت کے جواز میں زیر بحث رہا۔

اسی عہد میں ان تمام اقدار سے انحراف کا بھی ایک مخصوص رجحان سامنے آیا۔ یہ اسلامی ادب کی تحریک تھی۔ بنیادی طور پر اس کا پس منظر نظریاتی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ملک میں دو متصادم رجحانات ایک دوسرے کے متوازی رونما ہوئے تھے۔ ایک رجحان پاکستان کے آئین کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کا تھا اور دوسرا پاکستان کو ایک سیکولر مملکت بنانے کا تھا۔ ادب میں یہ صورت حال اس طور پر ظاہر ہوئی کہ وہ ادیب و شاعر جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ یا متاثر تھے، پاکستان کو سیکولر مملکت دیکھنا چاہتے تھے اور جو افراد آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے حق میں تھے، ان کی ایک تعداد اسلامی ادب کی محرک بنی۔

اس دور کے ادب میں قومی تہذیب کے تعلق سے ادیبوں کے نقطۂ نظر میں ایک تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کے زمانے میں روایت شکنی کے جوش میں بہہ کر عام ادیب قومی تہذیب کے بارے میں بیگانگی بلکہ گریز کا رویہ اختیار کرنے لگے تھے۔ وہ تہذیبی و قومی روایات کو رجعت پسندی اور انحطاط پسندی کہہ کر ٹھکرا دیتے تھے اور اس طرز فکر میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند برابر کے شریک تھے۔ آزادی کے بعد بیگانگی کی وہ روش باقی نہ رہی۔ روایت پسندی کی مخالفت سب سے زیادہ ترقی پسندوں نے ہی کی مگر اب ان میں بھی مخالفت کا وہ انداز موجود نہیں رہا۔ اس رجحان کی زیادہ بدلی ہوئی، بلکہ ایک حد تک ردعمل میں، ایک صورت دوسرے تصور کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ وہ پاکستانی ادب یا قومی ادب کی تحریک ہے۔ اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں تخلیق کیا جانے والا ادب ان اقدار کی ترجمانی کرے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھیں۔ اسی بحث کے ذیل میں قومیت، تہذیب اور نظریے کے مسائل بھی ضمنی طور پر گفتگو کا موضوع بنے۔

پاکستانی ادب میں قومی احساس اور ملی شعور کا مسئلہ ایسا ہے جس پر پاکستان کی ابتدا ہی سے سنجیدہ ادیب توجہ دلاتے آئے ہیں۔ ابتداً گو اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستان کے قیام کے بعد اب اس کے استحکام، ترقی اور تعمیر کا سوال ہے، اس نوزائیدہ ملک میں نئے مسائل اور نئے تقاضے پیدا ہو رہے ہیں اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ لکھنے والے ان کی طرف توجہ دیں۔ قوم کے مزاج کو پہچانیں اور اس کے عزائم کا ساتھ دیں، اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستانی ادب صرف وہی نہیں ہے جو پاکستان کی سرزمین میں تخلیق ہو بلکہ وہ ہے جو یہاں کے نئے تقاضوں، نئے حالات اور نئے ماحول کی عکاسی کرے۔

اس سے زیادہ موثر آواز اسلامی ادب کے لیے تھی۔ اس کے ترجمان اسلام کے مخصوص تصورات کے مطابق ایک ایسے ادب کی تخلیق کے داعی تھے جو اسلامی اقدار حیات کی ترجمانی کرے اور ان کی ترویج بھی کرے۔ یہ بحث کافی دیر تک جاری رہی جس میں کئی اہل فکر نے حصہ لیا۔

یہ نقطۂ نظر دراصل اس غیر معتدل نظریے کا ردعمل تھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں ادب اور مذہب و اخلاق کے مابین ایک فاصلہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اسی کا سبب تھا کہ قیام پاکستان کے بعد ادب کو اسلامی اور غیر اسلامی دو شعبوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔

دیگر حالیہ مسائل میں، جو ان دنوں زیر بحث رہتے ہیں، بین الاقوامیت اور وابستگی زیادہ عام ہیں۔ بین الاقوامیت کے حامی

سمجھتے ہیں کہ آج دنیا اس قدر وسیع ہے کہ فرد صرف اپنی مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر خود کو محصور نہیں کر سکتا۔ اسے بین الاقوامی سطح پر سوچنا چاہیے اور اس طرح ادبی اثرات اور فکری اثر پذیری بھی بین الاقوامی ہو، جب کہ اس نقطۂ نظر کے برعکس، وابستگی کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ادیب زندگی اور معاشرے کے حوادث اور نظریات سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا، اسے کسی نہ کسی نظریے یا فریق سے وابستگی ضرور رکھنا چاہیے۔

ادبی سرمائے کا جائزہ

پاکستان کے ادب میں، ہر صنف کے لحاظ سے خاصا نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ یہ دور بالخصوص ناول، افسانے اور شاعری کی توسیع و ترقی کا ہے۔ اس میں ڈرامے اور طویل منظومات کی نمائندگی بھی نمایاں ہے۔ تنقید میں اصولی تنقید کے پہلو بہ پہلو عملی اطلاق کی کوششیں بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوئی ہیں۔ تحقیق میں متنی اور سوانحی دونوں پہلوؤں سے قابلِ قدر اضافے ہوئے اور قدیم ادب کا قیمتی سرمایہ سامنے آیا۔ نثر نے ترقی کی ہے، چناں چہ انشائیہ نگاری، ادبی رپورتاژ اور سفرناموں کے شعبے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی۔ فلسفہ، تاریخ اور تہذیب کے متعدد موضوعات بھی لکھنے والوں کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ نئے مسائل اور نئے تقاضوں کے مد[illegible] اصنافِ ادب میں قابلِ توجہ تجربات اور اضافے ہوئے۔ اس اعتبار سے بعض نئی اصناف وجود میں آئیں اور اسی طرح نئے نئے موضوعات اور مباحث نے جگہ پائی۔

غزل

شاعری میں میلانات کی وہی کیفیتیں رونما ہوئیں جن کا عام ادب کے سلسلے میں تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں اہم کیفیت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ذہن و احساس کا رُخ انتہا پسند اجتماعیت سے ہٹ کر فرد کے احترام کی طرف پھر جاتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے حالات و واقعات شاعری میں داخلی تجربات بن کر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ فسادات کے احساس و تاثر پر کئی اچھی غزلیں اور نظمیں لکھی گئیں۔ فسادات نے جو جذباتی اور ذہنی خلفشار پیدا کیا، اس سے شاعری بھی متاثر ہوئی اور اس کا ایک حصہ انسانیت کے ماتم کے لیے وقف رہا۔ ترقی پسندی کے زوال کے بعد شاعری کا یہ دور بڑا خاموش اور پُرسکون رہا۔ شعرا نے زیادہ تر اپنی ذات اور داخلیت ہی کو موضوع بنایا۔ اس دور میں ان کے کلام میں تنہائی، افسردگی، مایوسی، خود کلامی اور ابہام بہت زیادہ ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ماحول کا انتشار اور بیشتر شعرا کے یہاں کسی واضح نصب العین یا مقصدِ حیات کا فقدان ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں انقلاب کی دعوت پہلے سے کم ہے۔ سیاست اور شاعری کے روابط کمزور معلوم ہوتے ہیں اور معاشی عوامل اپنی اہمیت کم کر لیتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں غزل پھر مقبول ہونے لگتی ہے۔ نئے شعرا قدیم روایاتِ شعری سے پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

مصالحت کا رویہ اس دور کا غالب رجحان بن جاتا ہے۔ نئے اسالیب اور ہیئت کے تجربات بھی اگرچہ برابر جاری رہتے ہیں، مگر پرانے اسالیب سے استفادے کا رجحان پھر زیادہ ہو جاتا ہے۔ غزل کے اسلوب میں اگرچہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر اس کی بنیادی حیثیت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس رجحان کے سلسلے میں یہ امر خاص توجہ کے لائق ہے کہ اس دور میں غزل کے پرانے اسالیب کے مطالعے سے نئی روشیں ڈھونڈھنے کی خاص کوشش ہوئی۔ گویا غزل کی پوری روایت شاعروں کے پیشِ نظر رہی، جس کی بنیادوں پر نئی غزل کی خصوصیات استوار ہوئیں۔ اس رجحان کی ایک مثال تقلیدِ میر ہے۔ اس طرز کو سب سے زیادہ جن شاعروں نے اختیار کیا ان میں ناصر کاظمی اور ابن انشا کو امتیاز حاصل ہوا۔ اس میں ان کے ساتھ ساتھ قیوم نظر اور سیف الدین سیف چلتے رہے، لیکن پھر انھوں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ ان کے علاوہ اس طرز میں اور بھی متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی، مگر ان میں سے بیشتر نے محض میر کی داخلیت کی سطحی نقالی کی۔ اسی طرح غالب کے انداز کو نئی زبان اور نئے تجربات میں جذب کر لینے کا میلان بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ایسے شعرا میں باقی صدیقی اور فضل احمد کریم فضلی قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کے ایک بڑے حصے میں متغزلین کا پرانا گروہ بھی بدستور غزل گوئی میں مصروف رہا۔ ان میں جوش، حفیظ جالندھری، احسان دانش، فیض، ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری اور عبدالحمید عدم نے اپنے اپنے انداز میں بعض عمدہ غزلیں لکھیں، مگر ان پرانے اور نئے شعرا میں جن لوگوں کی غزل میں بالکل نئی وسعتوں کی طرف بڑھنے کا رجحان ملتا ہے، ان کو صرف چند ناموں تک محدود کیا جا سکتا ہے، وہ فیض، ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیارپوری، ندیم قاسمی اور صوفی تبسم شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جو نام بعد میں اضافہ کیے جا سکتے ہیں، ان میں باقی صدیقی، عزیز حامد مدنی، مصطفےٰ زیدی، شان الحق حقی، ادا جعفری، احمد راہی، شہرت بخاری، قابل اجمیری، رئیس امروہوی، قتیل شفائی، ظہور نظر، یوسف ظفر، ماہر القادری، وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں بیشتر شعرا نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اچھی غزلوں کا اضافہ کیا۔

فیض اپنے معاصرین میں دوسروں سے بجا طور پر آگے رہے ہیں۔ فیض، ناصر کاظمی اور حفیظ ہوشیارپوری کی غزلوں کو ابتدائی پاکستانی دور کی بہترین غزلوں میں نمائندگی دی جا سکتی ہے۔ ان شعرا نے غزل کی روایت اور اس کے حسن میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ ناصر کاظمی ابن انشا اور باقی صدیقی نے اس کے لہجے میں ایک نئی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان شاعروں نے غزل کو لفاظی، بلند آہنگی، وضاحت اور تکرار سے حتی الامکان نجات دلا کر اسے داخلی آہنگ، سادگی، تاثیر اور تہ داری سے آشنا کیا۔ اظہارِ بیان کے لیے ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق انفرادی اسلوب کی تلاش کی۔ انھیں اپنے اظہارِ بیان کے لیے نت نئے موضوعات کی بھی جستجو تھی۔ نئی قدروں کی تلاش کے اس دور میں، جب کہ پرانی قدریں زوال پذیر تھیں اور نئی قدریں

آہستہ آہستہ واضح صورت اختیار کر رہی تھیں، ایک اہم بات یہ ہوئی کہ غزل جو کچھ عرصہ پہلے اپنی جگہ نظم کو دے رہی تھی، اب پھر مقبول ہوئی۔ فیض، ناصر کاظمی اور حفیظ ہوشیار پوری نے غزل میں جو روایتیں قائم کیں، ان پر چل کر کئی اور ذہین شاعروں نے اپنے خیالات اور تجربات سے نئی اردو شاعری میں اچھے اضافے کیے۔ انھوں نے جدید عہد کے تقاضوں کو اپنی غزلوں میں بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ جذبے و احساس کو نیا روپ دیا، نئے نئے خیالات بیان کیے اور پھر نئے استعارے استعمال کیے اور نئی علامتوں کی جستجو کی۔ ان شاعروں میں احمد فراز، حمایت علی شاعر، مشفق خواجہ، شہزاد احمد، ساغر صدیقی، محسن احسان، شکیب جلالی، ظفر اقبال، سلیم احمد اور اظہر نفیس وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک غزل نظم پر حاوی رہی ہے۔ اس کی مقبولیت میں ماحول کے عام حالات کا بڑا دخل رہا ہے۔ چناں چہ اس صورتِ حال میں غزل کا اشاراتی اور علامتی اظہار زیادہ موثر ہو سکتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب میں رجحانات کے لحاظ سے جو تحریکیں رونما ہوئیں، علامت نگاری کی تحریک ان میں بہت نمایاں ہے۔ یہ تحریک ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ لاہور کے نئے شاعروں نے شروع کی اور اسے نئی شاعری کا نام دیا۔ یہ علامت نگار بالعموم حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھتے تھے اور اس حلقے کی علامت نگاری کی سابقہ روایت کا اثر ان پر قائم تھا۔ ان شاعروں نے فرد کی ذات کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور ذاتی علامتیں استعمال کیں۔ یہ رجحان اور یہ تحریک دراصل کئی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کے ردعمل میں تھی۔ ترقی پسند شاعر اجتماعی علامتوں کو اختیار کرتے تھے اور اجتماع کو اہمیت دیتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ دو رویوں کا شعری تصادم تھا۔ یہ صورتِ حال ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک نمایاں رہی۔ پھر اس تصادم کے نتیجے میں ایک نئی صورت ابھر کر سامنے آئی۔ علامت نگاری اور ترقی پسندی کے رجحانات باہم خلط ملط ہو گئے۔ ذات کی جگہ معاشرے کی اہمیت پھر واضح ہوئی۔

غزل کی حد تک علامتوں کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ غزل شروع سے ہی اپنے علامتی اسلوب کا تحفظ کرتی آئی ہے۔ بعض نئے شاعروں نے نئی علامتوں کی جستجو کی، مگر غزل میں عموماً پرانی تلمیحات اور پرانے اشارے ہی تاثر پیدا کرتے رہے۔ زبان میں سادگی اور بیان میں اجمال کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں، مگر بڑے شاعروں سے قطع نظر، اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل ان بلاغتوں سے محروم ہوتی جاتی ہے، جو پرانی غزل کا امتیاز تھا۔ بیان کے جملہ سانچے ڈھیلے ہوتے گئے اور مناسب لفظ و تراکیب شاعر کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتی گئیں۔ الفاظ کی شیرینی اور روزمرہ محاورے، جن سے غزل کی ایمائیت میں حسن پیدا ہوتا تھا، اب کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ علامتوں کے رشتے سے بیشتر شاعروں نے اپنے ماحول کی اشیاء مظاہر اور ثقافت سے اپنا تعلق قائم کیا اور یوں اپنے ماحول سے علامتیں اخذ کرنے کا ایک واضح رجحان عام ہوا۔ نئے شعرا غزل کے علامتی انداز کو مزید مستحکم کر رہے ہیں۔ وہ مانوس اور غیر مانوس اشیا کے علامتی امکانات کو بروئے کار لاتے ہیں اور یہ عمل برابر فروغ پا رہا ہے۔ چناں چہ اس اعتبار سے دورِ حاضر کی غزل میں ارد گرد کے ماحول کی عکاسی پوری طرح موجود ہے اور یہ نئے تقاضوں اور شعور کی ترجمان ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شعرا کی ایک پوری جماعت نے اپنے احساسات کو ارد گرد کی اشیا اور مظاہر کو علائم کی زبان میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں جن نئے شعرا نے غزل کے علامتی اسلوب کو نئے رنگوں سے آشنا کیا ہے ان میں وزیر آغا، جیلانی کامران، افتخار جالب، منیر نیازی، ظفر اقبال، ناصر شہزاد، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض نئے شاعر ایسے بھی ہیں جو نئے تجربے کرنے میں مصروف ہیں لیکن کسی نے بھی اب تک کوئی خاص امتیازی یا انفرادی راہ تلاش نہیں کی۔ محض چند نام ہیں جو دورِ حاضر میں غزل کے میدان میں نت نئے تجربات اور پُر کیف خیالات اور قدیم و جدید دونوں روایات سے مناسب استفادہ کرتے ہوئے اس صنف میں اچھی کوششیں کر رہے ہیں۔ انور شعور، پروین شاکر، ثروت حسین، سلیم کوثر وغیرہ ایسے نوجوان اور نمائندہ شاعر ہیں، جن کی غزلیں نئے امکانات کا پتہ دیتی ہیں۔

غزل میں لہجے کے اعتبار سے بھی بعض خوشگوار اضافے ہوئے۔ ناصر کاظمی اور باقی صدیقی نے بہت مختصر بحریں استعمال کر کے اپنی غزلوں کو خاصا دل نشیں بنایا۔ ابن انشا اور ناصر شہزاد نے ہندی کے سبک اور مترنم لہجے سے غزل میں بڑی شیرینی پیدا کی۔ غزل میں ایسے تجربات جو الفاظ سے تعلق رکھتے ہیں، بہت اہم ہیں۔ موجودہ شاعروں نے اظہار و بیان اور اسالیب میں نئے نئے اور برمحل الفاظ کے شاعرانہ استعمال سے اسلوب کے امکانات میں مزید اضافہ کیا ہے۔ بعض جدید غزل گو شاعر، غزل کو آج کے طرزِ احساس سے ہم آہنگ کرنے کے لیے الفاظ کے ضمن میں ہر طرح کے مناسب اور نامناسب تجربات سے کام لے رہے ہیں۔ اس ضمن میں منیر نیازی اور بشیر افضل جعفری خاص طور پر نمایاں ہیں۔

نظم

قیام پاکستان کے وقت جو نظم نگار شاعر نامور اور مقبول تھے ان میں حفیظ جالندھری، احسان دانش اور فیض امتیاز رکھتے تھے۔ بعد میں جوش گو پاکستان آ گئے تھے لیکن نظم کے پاکستانی دور کو انھوں نے کوئی قابلِ ذکر اور خاص تخلیق نہیں دی۔ ترقی پسند شاعروں میں جو نظم نگار شاعر پاکستان کے حصے میں آئے، ان میں فیض، ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، احمد ریاض، عارف عبدالمتین بہت معروف تھے۔ اس دور میں بعض شاعر ایسے بھی تھے جو کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ احسان دانش، مجید امجد، شور علیگ، فضل احمد کریم فضلی، صوفی تبسم اور بعض نئے نام اس سلسلے میں شامل تھے۔ ن۔ م۔ راشد اپنے طور پر خود اپنے مخصوص رجحان کے حامل تھے۔ بعض ایسے شاعر بھی تھے جو ایک اور راہ کے متلاشی تھے۔ ان

میں نعیم صدیقی، امین حزیں، عبدالکریم ثمر اور ماہرالقادری تھے، جو اسلامی ادب کی تحریک کے داعی بنے۔

نظم کو ورثے میں غزل کی طرح ویسے ہی موضوعات اور مسائل سے سابقہ پڑا جو اس وقت بالعموم تمام اصناف ادب میں مشترک تھے۔ رجحان کے اعتبار سے قیام پاکستان کے بعد جو نمایاں طرز وجود میں آیا وہ بنیادی طور پر داخلیت اور خارجیت کے اظہار کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ نظم نگار جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے ان میں سے بیشتر نے خود کو بڑی سختی سے اپنے ملک کے ساتھ منسلک رکھا اور بعض نے اپنی وابستگی کو نرم کر لیا۔ ان کے ساتھ ساتھ شاعروں کا ایک اور طبقہ ابھرا، جس نے زیادہ تر خارجی موضوعات کو جگہ دی۔ تاہم ان کے یہاں ترقی پسند شعرا کی طرح کسی خاص مقصد کا تصور پیدا نہیں ہوا، ویسے انھوں نے بھی انقلاب کے نعرے لگائے، حب الوطنی کے تحت نظمیں لکھیں، اسلاف کے کارناموں کو سراہا اور تاریخ و ثقافت سے بھی اپنے لیے موضوعات تلاش کیے۔ دوسرا رجحان داخلیت کا تھا جس کے تحت شاعروں نے نفسی کیفیات، جنسی جذبات، یاس، محرومی اور شکست خوردگی کے موضوعات بیان کیے۔ قیام پاکستان کے بعد جو معاشرہ وجود میں آیا اس میں یہ دونوں رجحانات تمام مسائل اور ان کے تمام پہلوؤں کے اظہار کا سبب بنے۔

تقسیم ہند کے وقت کے واقعات و حوادث کو جن اکثر شاعروں نے پیش کیا ان میں خصوصیت کے ساتھ شریف کنجاہی، عارف عبدالمتین، مجید امجد، ضیا جالندھری وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں ان شاعروں کے یہاں جس فکری لہر کا اظہار ہوا، وہ انسانی رشتوں کی بے حرمتی اور ان سے تغافل کے المیے کو جذبے کی سطح پر پیش کرنے کا رجحان تھا۔ اس موضوع کے علاوہ اس وقت جو دوسرا نمایاں پہلو اس رجحان کا تھا وہ آزادی کے مقصد اور اس کے مدعا سے تعلق رکھتا ہے۔ آزادی کے بارے میں متعدد ترقی پسند شاعروں نے مایوسی کے تاثرات کا اظہار کیا۔ ان کی نظموں میں، اس آزادی سے قطع نظر، غیر طبقاتی سماج کی منزل تک پہنچنے کی آرزو شدت سے ابھرتی نظر آتی ہے۔ فیض، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری نے اس آرزو کا بڑی شد و مد سے اظہار کیا۔ ان کے برعکس حفیظ جالندھری، احسان دانش، نعیم صدیقی، یوسف ظفر کی نظموں میں تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا گہرا احساس موجزن رہا۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام اور مادیت پرست تہذیب کی یلغار نے اخلاقی سطح پر جو انتشار اور خلفشار پیدا کیا ہے، اس کا احساس بھی ان کے یہاں بکثرت ملتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ دینی رجحان کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا، جس میں حمد، نعت اور منقبت دیکھی جاسکتی ہیں۔ نعت پاکستانی شاعری کا مستقل موضوع بن گئی ہے۔ عبدالعزیز خالد، جعفر طاہر، ماہرالقادری، مختار صدیقی، یوسف ظفر کے کلام کا ایک خاص حصہ اس دینی رجحان کا ایک نمایاں مظہر ہے۔ اب یہ ایک عام رجحان ہے اور متعدد شعرا بالخصوص نعت بھی کہنے لگے ہیں۔ اسی رجحان کا ایک پہلو حب الوطنی اور پاکستانی قومیت کی صورت میں نمودار ہوا۔ اسے قومی شاعری سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس کا آغاز حمید نسیم کے غنائیے "ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا" شان الحق حقی نے کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد" ش صہبائی کے "ساقی نامہ" سے ہوا۔ اس کا ایک اور رخ یوسف ظفر کے مجموعے "حریم وطن" مختار صدیقی کے "سہ حرفی" ایس۔ اے رحمٰن کے سفر اور جعفر طاہر کے 'ہفت کشور' کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ قومی نظموں کے دیگر متعدد مجموعے بھی مرتب ہوئے جو انفرادی یا مختلف شعرا کی لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل ہیں۔

مقصدی اور اخلاقی موضوعات پر جن شاعروں نے خاص طور پر نظمیں لکھیں اور مقبولیت حاصل کی، ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ اس موضوع کو تحریک دینے میں خود پاکستان ایک محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری میں اس طرح نئی راہیں پیدا ہوئیں اور نئے انداز کی نظمیں لکھی گئیں۔ خواجہ دل محمد نے اخلاقی اور عارفانہ رنگ میں امتیاز پیدا کیا۔ ملی شاعری میں اقبال کے بعد جس روایت کو اثر صہبائی، امین حزیں، محمود اسرائیلی اور اسد ملتانی نے آگے بڑھایا تھا۔ پاکستان میں شاعروں کے ایک طبقے نے اس کو اختیار کیا اور مزید آگے بڑھایا ان میں نعیم صدیقی اور ماہرالقادری کا نام سب سے ممتاز ہے۔ نعیم صدیقی کی شاعری میں قومی و ملی مسائل ہنگامی موضوعات اور پاکستان میں تحریک اسلامی کے نشیب و فراز نظم ہوئے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں ایک تحریکی اور رجزیہ انداز ملتا ہے۔ ماہرالقادری نے گو زیادہ تر روایتی موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن شہرت ایک ملی شاعر کی حیثیت میں حاصل کی اور اپنی نظموں میں زیادہ تر ملی اقدار کی ترجمانی کی۔ اس گروہ میں فروغ احمد، عبدالکریم ثمر، نصراللہ خاں عزیز نامور ہیں۔ اس سلسلے کے دیگر شاعروں میں نوجوان نسل کے شاعر بھی شامل ہیں مظفر وارثی، رحمان کیانی، مسٹر دہلوی، اعجاز رحمانی، شہرت اور مقبولیت کے حامل ہیں۔

قومی و ملی شاعری کو پاکستان میں رونما ہونے والے بعض اہم اور دوررس سیاسی واقعات و انقلابات بھی بہت متاثر کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً سیاسی نشیب و فراز اور واقعات و حوادث شورش کاشمیری اور رئیس امروہوی کی نظموں اور قطعات میں تسلسل کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی صورت حال میں انتشار، عدم تحفظ، خوف و ہراس اور اندیشوں کی فضا نے نظم میں تجریدی اور علامتی رویوں کی افزائش کی۔ اس رویے نے نظم کو زوال اور انتشار کا مرثیہ تو نہ بنایا لیکن کئی مسائل اور موضوعات سے آشنا کیا جنھوں نے شکست و ریخت، انتشار تنہائی کا المیہ اور ذات کی ٹوٹ پھوٹ جیسے منفی رویوں کو بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیا کہ پورے معاشرے میں ناامیدی اور کھوکھلے پن کا اظہار زیادہ نظر آتا ہے۔

پاکستان میں نظم نگاری کے تعلق سے جن شاعروں نے ایک خاص امتیاز اور اہمیت کا ثبوت دیا ان میں بہرحال فیض کا نام نمایاں ہے۔ غزل کی طرح نظم بھی یوں لگتا ہے جیسے فیض کی طبیعت اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ فیض بنیادی طور پر ترقی پسند نظریات کے حامل شاعر ہیں، لیکن جس کامیابی سے انھوں نے اپنے کلام کو نعرہ بازی سے محفوظ رکھا ہے اس کی مثال ترقی پسند شاعروں میں بہت شاذ ہے۔ انھوں نے نظم کو بھی غزل کی روایت اور زبان سے آشنا کیا ہے اور اس میں کسی ہیئتی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کی کامیابی اس میں ہے کہ انھوں نے پرانے استعاروں اور علامتوں کو نئے معنی دیے۔ فیض کے علاوہ ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین میں خطابت سے گریز کی ایک واضح کوشش ملتی ہے۔ ندیم کے کلام میں موضوعات کا تنوع فیض سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے کلام میں کلاسیکی اور رومانی انداز نظر کا ایک خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ عارف، ظہیر کاشمیری اور احمد ریاض کی تقریباً ساری شاعری میں اس توازن کی کمی ہے جو اعلیٰ سطح کی شاعری کے لیے ضروری ہے۔ جمیل ملک، حمایت علی شاعر، احمد فراز اور حبیب جالب کے یہاں سیاسی اور سماجی شعور برابر کار فرما ہے۔ ان میں سے بعض شاعروں کے یہاں جنگ کا خوف بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بکثرت نظمیں لکھی ہیں۔

جن شاعروں نے معاصر ترقی پسند تحریک کے متوازی بلکہ مخالف خطوط پر خود اپنی ایک دنیا تعمیر کی ان میں ایک نام ن۔م راشد کا بھی ہے۔ راشد نے ہیئت میں آزاد نظم کا وہ کامیاب تجربہ کیا کہ آزاد شاعری ایک مقبول صنف سخن بن گئی۔ فیض کی طرح ان کی زبان غزل کی روایت سے وابستہ ہے۔ بنیادی طور پر ان کی شاعری بغاوت اور فرار کی مظہر رہی ہے۔ راشد نے پاکستانی دور میں بھی بعض بہت نمائندہ نظمیں تخلیق کیں اور جدید فارسی شاعری کی چند نمائندہ تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا۔ میراجی کا اثر حلقۂ ارباب ذوق کے شاعروں پر خاص طور پر مرتسم ہوا ہے۔ قیوم نظر، یوسف ظفر، وزیر آغا، مختار صدیقی، منیر نیازی، ضیا جالندھری، شاد امرتسری حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان سب میں ابھی کوئی یکسانیت نہیں جیسی ترقی پسندوں میں رہی۔ میراجی کے بعد قیوم نظر حلقے کے سب سے اہم اور مرکزی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں ابہام اور ذو معنویت بہت ہے۔ یوسف ظفر نے آزاد نظم کو بہت زیادہ استعمال کیا اور متنوع موضوعات نظم کیے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے تنوع کی مثالیں مختار صدیقی اور وزیر آغا کے کلام میں بھی ہیں۔ مختار صدیقی نے شاعری، کلاسیکی موسیقی کے اصولوں پر کی ہے۔ اپنے موضوع اور انداز بیان سے وہ تصوف کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں اظہار کی شگفتگی اور نکھار ہے۔ وزیر آغا پر میراجی کا اثر زیادہ ہے۔ ان کے کلام میں ابہام موجود ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ غیاث جالندھری، شاد امرتسری اور مجید امجد بھی حلقے کے قابل ذکر شعرا میں ہیں۔ علامت کاری ان کے یہاں زیادہ ہے پھر بھی مجید امجد میں معاشرتی حالات کا شعور حلقے کے تمام شاعروں سے بہت زیادہ ہے اور یہی بات منیر نیازی کے یہاں بھی نظر آتی ہے وہ اپنے ہر تجربے اور احساس کو فنکارانہ سادگی سے پیش کرتے ہیں۔

ترقی پسندوں اور حلقۂ ارباب ذوق کے متوازی چند اور ایسے شاعر بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت کو پیش کیا۔ ان میں احسان دانش اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ترقی پسندوں کے روایتی اصولوں سے بچ کر محنت و مزدور کو موضوع بنایا۔ ایک خاص انفرادیت ابن انشا اور جعفر طاہر کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ان شاعروں نے طویل نظمیں لکھنے میں خاص مہارت کا ثبوت دیا۔ ابن انشا اپنی نظموں میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا کی تشکیل میں بہت کامیاب رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے مناسب استعارات کو استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ جدید شاعری میں ایک نئے لب و لہجہ کی تشکیل میں ان کا ایک منفرد حصہ ہے۔ جدید رومانی انداز کو عام کرنے اور ایک نئی روایت شعری کو رواج دینے میں انھیں امتیاز حاصل ہے۔ جعفر طاہر نے کینٹوز کو اظہار کے لیے نہایت کامیابی سے اختیار کیا ہے۔ طویل نظمیں تاثر کے لیے جس پھیلاؤ کی متقاضی ہوتی ہیں، وہ جعفر طاہر کی نظموں میں خصوصیت سے نظر آتا ہے۔ انھوں نے قادر الکلامی، شعریت اور ندرتِ ادا کی بدولت شاعری کو نئے الفاظ سے بھی مالا مال کیا ہے۔ مصطفٰی زیدی، حمایت علی شاعر، عزیز حامد مدنی، ظہور نظر اپنے اپنے طور پر زندگی کے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور گرد و پیش کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے فطری طور پر وابستہ، بعد کے عرصے میں، نمایاں ہونے والے شاعروں میں سے قتیل شفائی، حبیب جالب، فارغ بخاری، خاطر غزنوی اور ظہور نظر وغیرہ معاشرتی جبر اور استحصال کے خلاف نظمیں لکھنے والوں میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے کلام میں نعرہ زنی کا عنصر کم ہے پھر بھی معاشرے اور سیاست پر کڑی تنقید ان کے یہاں موجود ہے۔ ان کے ہم عصر شاعروں میں متوازی طور پر بعض نئے نئے میلانات کی پرورش ہو رہی تھی۔ احساس اور موضوع کے اعتبار سے ان کے دور میں، جن شاعروں نے علیحدہ راہ اختیار کی وہ جدید کہلائے۔ ان میں جیلانی کامران، شہزاد احمد، وزیر آغا، ظفر اقبال، اعجاز فاروقی، کشور ناہید، سیف الدین سیف وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ آج کے جدید اور نوجوان شاعر نظم میں بڑی نئی اور چونکا دینے والی باتیں کہہ رہے ہیں۔ اس نسل کے شاعروں کی تعداد بہت وسیع ہے۔ یہ نسل حالات حاضرہ اور تازہ تر مسائل سے واقف ہے اور انھیں اپنے شعری تجربات میں مناسب جگہ دے رہی ہے لیکن اس کے باوجود موجودہ عہد کی شاعری میں براہِ راست اظہار بہت کم ہے۔ موضوعاتی شاعری کا رواج بھی اب کم ہو رہا ہے فرد

اور ماحول دونوں اپنے متعدد پہلوؤں کے ساتھ شاعری میں جدید طرزِ احساس کا اظہار کرتے ہیں البتہ اس کے پس پشت داخلی تجربات کی روشنی موجود ہے۔ تجربے کی حد تک موجودہ شاعروں کے یہاں تنوع کم ہے اور ان کی یہ دنیا محدود ہے۔ موجودہ شاعری میں احساس کی گہرائی اور جذبے کا خلوص تو نظر آتا ہے لیکن فکری گہرائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تصوریت، آزاد تلازمہ اور علامت نگاری موجودہ شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔ افتخار جالب، سلیم الرحمٰن، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔

نظم میں اقسام، ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے بھی بعض قابلِ توجہ اضافے ہوئے ہیں۔ بعض شعرا نے طویل نظمیں خصوصیت سے لکھیں۔ تاثیر کی ید بیضا، ابن انشا کی "بغداد کی ایک رات" اور دوسری چند نظمیں۔ عزیز حامد مدنی کی "صلیبوں کی اوٹ" اپنی موضوعاتی اور فنی دل کشی کے سبب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مختار صدیقی، مصطفیٰ زیدی، نعیم صدیقی، حمایت علی شاعر، راشد وغیرہ نے بھی بعض کامیاب طویل نظمیں تخلیق کیں۔ طویل منظوم ڈرامے بھی شاعروں کی توجہ کا مرکز بنے اور نظم میں ڈرامائی عنصر کی اہمیت پر بھی توجہ ہوئی۔ عبدالعزیز خالد، اور جعفر طاہر کے متعدد منظوم ڈرامے۔ سیف الدین سیف کا ساربان اور جمیل الدین عالی کا "انسان" (نامکمل) اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ بعض شاعروں نے بہت مختصر نظموں کی تخلیق میں بھی دلچسپی لی۔ منیر نیازی، حمایت علی شاعر اور عظیم قریشی نے اس سلسلے میں بعض کامیاب تجربے کیے۔ دیگر زبانوں کے ادب بالخصوص مغربی ادب کے نمائندہ شاعروں کی تخلیقات کے منظوم اردو تراجم کی طرف بھی شاعروں نے توجہ دی۔ شان الحق حقی، مختار صدیقی، عزیز حامد مدنی، عبدالعزیز خالد، ابن انشا، اور کشور ناہید وغیرہ نے بعض نمائندہ تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا۔ ہادی حسین نے رلکے کے نوحوں جیسی ادق تخلیق کا اچھا ترجمہ کیا۔ یہ سب ترجمے کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ ان سے شاعری میں وسعت اور تنوع پیدا ہوا اور اسالیب کی نئی شکلیں سامنے آئیں۔

گیت نگار شاعروں میں کوئی بہت بڑا نام پیدا نہیں ہوا جس نے اختر شیرانی یا حفیظ جالندھری کے مرتبے کو چھوا ہو۔ خود حفیظ جالندھری پاکستانی دور کے ایک عرصے میں گیت لکھتے رہے لیکن ان میں اپنی ہی قائم کی ہوئی روایات کو برقرار رکھنے کی خصوصیت کم رہی۔ بعد میں جن شاعروں نے گیت نگاری میں شہرت حاصل کی اور جن میں سے چند اب تک اس حیثیت سے مشہور ہیں ان میں قتیل شفائی، تنویر نقوی، نگار صہبائی، سیف الدین سیف، جمیل الدین عالی اور ناصر شہزاد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

رجحانات اور موضوعات کے علاوہ بعض نئے فنی مسائل بھی شعروں کا مرکز بنے۔ ان میں سے بیشتر مسائل کا تعلق دراصل ابتدا میں فن برائے فن یا فن برائے زندگی کی اسی بحث سے تھا جو قیامِ پاکستان سے بہت پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس دور میں بھی یہ بحث ہیئت کی اہمیت کے داعیوں اور علم برداروں میں چلتی رہی۔ ان میں حلقہ اربابِ ذوق کے ادیب تو فطری طور پر ایک عرصے تک مضامین لکھتے رہے۔ اس بحث میں ان کے علاوہ احمد ریاض، ن۔ م۔ راشد نے سرگرم حصہ لیا۔

کچھ عرصے سے نظم میں علامت کے ساتھ ساتھ انقلابی تبدیلی یہ کی گئی کہ آہنگ کے لیے بحر کے رکن کے بجائے لفظ پر زور دیا جا رہا ہے۔ یوں شعر کی اکائی رکن کے بجائے لفظ قرار پائی۔ چناں چہ نظموں میں خوب صورت تراکیب اور خوش آہنگ لفظوں کے باوجود آہنگ پر ضرب پڑی اور بیشتر نظمیں نثر کی صورت اختیار کر گئیں۔ مصرعوں کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے تو خوب صورت ہوتے ہیں مگر تاثر اور مجموعی آہنگ عنقا ہوتا ہے۔ افتخار جالب، سلیم الرحمٰن، عباس اطہر، انیس ناگی، قمر جمیل وغیرہ نے اس صورت کو اختیار کیا۔ کچھ عرصے سے یہی صورت نثری نظم کی شکل میں چند معروف شاعروں کے علاوہ بیشتر ناپختہ کار اور کم آموز شاعروں کا ذریعہ اظہار بنی ہوئی ہے۔

ناول

اردو ناول کا پاکستانی دور بلاشبہ اس کی بہتات، مقبولیت اور عظمت کا دور ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یقیناً یہی ہے کہ ماحول کا انتشار پڑھنے والے کو کسی مستقل اور لمبی مدت کی حامل تفریح میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔ ناول میں اس کے لیے زندگی بھی ہے اور رومان بھی اور ایک حد تک ماضی کا پُرشکوہ اور دلاویز ماحول بھی اس کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ یہی مطلب اور یہی تقاضا تھا کہ پاکستان میں، بالخصوص ابتدائی عہد کے ناولوں میں موضوع کے لحاظ سے بڑا تنوع ہے مگر دو موضوعات مقبول نظر آتے ہیں۔ ایک فسادات دوسرا تاریخ۔ فسادات کے ناول تو تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں اور تاریخی ناول ان احساسات کا نتیجہ ہیں جن کے زیرِ اثر پاکستان وجود میں آیا اور اس کے ساتھ اسلامی ناول بھی شاندار ماضی کو زندہ کرنے کے رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔

دوسرے موضوع میں وہ ناول آتے ہیں جن میں قیامِ پاکستان کو ایک نئے دور کا آغاز سمجھ کر ایک واضح اور بلند نصب العین کے حصول اور تکمیل کے لیے مختلف راستے دکھائے گئے ہیں اور اپنے زمانے کے انتشار اور اضطراب کو دور کرنے اور ایک جہانِ نو کی تعمیر کا خاکہ مرتب کرنے میں رہنمائی کی گئی ہے۔ ایم۔ اسلم، قیسی رام پوری اور رئیس احمد جعفری کے متعدد ناول اس ذیل میں آتے ہیں۔ بعض ناول محض اس مقصد کے لیے لکھے گئے کہ پاکستانی معاشرے کی اخلاقی اور معاشرتی بدحالی کی تصویریں پیش کر کے ایک ایسے معاشرے کی تصویر دکھائی جائے جو صالح اور اسلامی اقدار کے مطابق ہو۔ خصوصاً قیسی رام پوری کا "رضوان" "ہارون الرشید"

کا "آبپے لہو کی آگ میں" اور ایم۔ اسلم کے "فرنگن" "انجام" "چراغِ محفل" "سیدھی لکیر" اور "ریحانہ" وغیرہ اسی مقصد کے اظہار میں ہیں ان اخلاقی و اصلاحی ناولوں کے موضوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان سب لکھنے والوں کے مشاہدے، تخیل اور تصور نے واقعات کو ایسی صورت دی ہے کہ وہ دلچسپ کہانی کی بنیادیں بن سکیں لیکن فن کے نقطۂ نظر سے یہ ناول نگار فن کی روایت میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ ان ناول نگاروں نے بالعموم قاری کو خوش کرنے کی خاطر فنی تقاضوں کا زیادہ لحاظ نہ رکھا اور پھر ان ناولوں میں پیش آنے والے واقعات زندگی سے بہت دور کسی تخیئل دنیا کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کا انداز ان سے قدرے بہتر ہے۔ اسلامی تاریخی ناولوں کا محرک یہ جذبہ رہا ہے کہ اسلامی بنیادوں پر ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے ذہنی فضا تیار کی جائے۔ اس موضوع کے لیے ابتدائی عہد کا ماحول بڑا ساز گار تھا۔ اس کے زیر اثر اسلامی و تاریخی ناول کثرت سے لکھے گئے۔ اس دور میں نسیم حجازی، ایم۔ اسلم، قیسی رام پوری، رئیس احمد جعفری اور احمد شجاع پاشا نے نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ان ناول نگاروں نے تاریخ اسلام کے ایسے واقعات منتخب کیے ہیں جن میں جرأت، شجاعت، صداقت اور حق پرستی کے مظاہر موجود ہیں۔ تاریخ اور رومان کی آمیزش سے بھی ان ناول نگاروں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مقبولیت حاصل کی۔ تاریخی ناولوں میں نسیم حجازی کے "شاہین"، "معظم علی" اور "تلوار ٹوٹ گئی"، "یوسف بن تاشفین"، "محمد بن قاسم"، "داستانِ مجاہد" رئیس احمد جعفری کا "بالاکوٹ" ایم۔ اسلم کا "زوال الحمرا" احمد شجاع پاشا کا "پلاسی" دلچسپ بھی ہیں اور پر تاثیر بھی۔

اخلاقی، اصلاحی اور تاریخی ناولوں کے یہ موضوعات تقریباً دس برس کے عرصے میں بہت حاوی اور مقبول رہے۔ پھر یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور بعد میں بکثرت معاشرتی اور نفسیاتی ناول لکھے گئے۔ ان ناولوں کے ساتھ ساتھ ایسے ناول بھی منظرِ عام پر آئے جو محض تفریحی تھے۔ اس قسم کے ناولوں میں رومانی اور مزاحیہ ناول ایک بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ ہلکے پھلکے موضوعات پر اور مزاحیہ ناول نگاروں میں شوکت تھانوی کا نام نمایاں ہے۔ رومانی ناول نگاروں میں اے۔ حمید، قیسی رام پوری، رئیس احمد جعفری، ایم اسلم احمد شجاع پاشا کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ معاشرتی و رومانی ناول زیادہ تر خواتین ناول نگاروں نے تصنیف کیے۔ اے۔ آر۔ خاتون، فاطمہ مبین، رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول نے نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

ان ناول نگاروں کے علاوہ دیگر کئی معروف اور مقبول ناول نگار، جنھوں نے مختلف معاشرتی اور نفسیاتی موضوعات پر ناول لکھے ہیں اور اس کو موضوع بنایا اور اسلوب کے لحاظ سے حقیقت پسندانہ، ادبی اور فنی حیثیت دی اور اس کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، احسن فاروقی، اے۔ حمید، فضل احمد کریم فضلی، ممتاز مفتی، انتظار حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حسین، نثار عزیز بٹ، خاص مقام اور اہمیت رکھتے ہیں۔ عزیز احمد ناول نگار کی حیثیت سے پہلے ہی ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" ان کے پاکستانی دور کے ناول ہیں۔ انھوں نے "گریز" اور "آگ" میں فن کی جس روایت کو تشکیل دیا تھا "ایسی بلندی ایسی پستی" کے ذریعے اس کو مزید آگے بڑھایا۔ یہ ناول ان کی فنی پختگی کا زیادہ بہتر نمونہ ہے۔ اس میں ایک بہت وسیع موضوع کو زندگی کی تبدیلیوں کی روشنی میں دکھایا گیا ہے اور اس اعتبار سے مصنف نے زندگی کو اس ناول کے متعلق زیادہ بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "شبنم" بنیادی طور پر ایک رومانی ناول ہے جس میں معاشرتی پس منظر میں افراد کی الجھنیں اور مسائل پیش کیے گئے ہیں لیکن یہ ناول عزیز احمد کے دیگر ناولوں کے مقابلے میں فنی کوتاہیوں کی وجہ سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر کا نام اس اعتبار سے اہم ہے کہ ان کے ناولوں میں فن کے جدید میلانات اور نئے اسالیب نظر آتے ہیں۔

اگرچہ ان میں مغرب کے بعض تجربات اور مغربی ناول نگاروں کے خیالات اور نمونوں کی تقلید ہے لیکن انھوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر اردو ناول کے ادبی معیار کو بڑھانے میں خاصا اہم حصہ لیا ہے۔ "میرے بھی صنم خانے"، "سفینۂ غمِ دل" اور "آگ کا دریا" ان کے بہت معروف اور بہت معیاری ناول ہیں۔ یہ ایک نئے انداز سے لکھے گئے ہیں۔ ان تینوں ناولوں میں جس زندگی کو پیش کیا گیا ہے وہ ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ "آگ کا دریا" بظاہر بہت وسیع تناظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس کا بھی خاص پہلو اس کا آخری حصہ ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ اس کا پس منظر لگتی ہے۔ یہ ناول پاکستان میں بہت متنازعہ اور اختلافی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں پیش کردہ اسلامی دور کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔

عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر یقیناً فنی اور تکنیکی لحاظ سے اس دور میں سب سے ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ جن ناول نگاروں کے نام اہم ہیں ان میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے ناولوں میں فن اور اصول کو بہت زیادہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اردو ناول میں ایک نیا تجربہ کیا ہے اور پانچ ناولوں پر مشتمل ایک سلسلہ تحریر کیا ہے جس میں ہر ناول اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور دوسرے ناولوں سے متعلق بھی۔ یہ ناول ڈرامے کی تکنیک کے مشابہ ہیں۔ ڈرامے کے پانچ ایکٹ کی طرح ہر ناول پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ناول میں پانچ اہم کردار ہیں۔ اس سلسلے کے ناولوں میں "شامِ اودھ" فنی طور پر بہت کامیاب اور عمدہ ناول ہے۔ "سنگم"، "سنگِ گراں"، "رہ و رسمِ آشنائی"، "آبلہ دل کا" بھی ان کے اہم اور معیاری ناول ہیں۔ ان کے یہ ناول جاگیردارانہ ماحول

کے انحطاط اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کی اچھی علامتیں ہیں۔ فضل احمد کریم فضلی کا ناول "خونِ جگر ہونے تک" چند اہم اور ممتاز ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس میں فنی خصوصیات اپنے درجہ کمال پر نظر آتی ہیں۔ پلاٹ اور کرداروں پر مصنف کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اس میں بنگال کے دیہات کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پلاٹ اور واقعات میں منطقی ربط ہر جگہ موجود ہے۔ مکالمات کرداروں کے جذبات و تاثرات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور کرداروں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے یہ اردو کے چند اہم ناولوں میں جگہ پاتا ہے۔

دیگر ناول نگاروں میں اے۔ حمید نے رومانیت کا ایک بہت دل کش اسلوب اختیار کر کے مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ "ڈربے" کے علاوہ "جھیل اور کنول" "جنگل روتے ہیں" قابلِ ذکر ناول ہیں۔ شوکت صدیقی کے ناولوں میں "خدا کی بستی" نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ یہ فرد اور معاشرے کے ربط باہمی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں حقیقت بھی ہے اور تخیل بھی۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" زندگی کے رومانی احساسات پر مبنی ہے۔ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" بظاہر ایک خاندان کی سرگزشت ہے لیکن دراصل اسے ایک معاشرے کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا اور یہ انسانی کرداروں کی نفسیات کو بڑے بھرپور انداز میں نمایاں کرتا ہے۔ تاریخی شعور، فنی بالیدگی اور فکری صلابت کے اعتبار سے اسے خاصی اہمیت حاصل ہوئی۔ ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" ایک فرد کے نفسیاتی ارتقاء پر مشتمل مبسوط داستان ہے۔ یہ ناول بے جا طوالت کے سبب فنی سقم کا شکار ہو گیا ہے۔ اگر اس میں ترتیب و انتخاب سے کام لیا جاتا تو یہ اپنی موجودہ حالت سے بہتر ہوتا۔ پھر بھی کردار نگاری اور معاشرتی حقائق کی عکاسی اور چست مکالموں کے سبب اسے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" تجرباتی اسلوب کے تحت لکھا گیا ہے۔ یہ ذہنی الجھنوں اور زندگی کے تصادم کو ایک وسیع ماحول میں جو نصف صدی تک کے واقعات پر مشتمل ہے دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ نثار عزیز بٹ کا ناول "نے چراغے نے گلے" بھی ایک وسیع تناظر میں لکھا گیا ہے اور اس میں تحریک آزادی کے حالات و افکار کو کرداروں کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا پہلا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" بھی بہت مقبول ہوا۔

ان کے علاوہ متعدد دیگر ناول نگاروں نے مقبولیت اور شہرت حاصل کی جیسے اے۔ آر خاتون، فاطمہ مبین، سلمیٰ کنول، حمیدہ جبین، شوکت تھانوی، بانو قدسیہ اور رضیہ بٹ وغیرہ ان میں سے بعض ناول نگار جدید فنی تقاضوں سے واقف تو ہیں لیکن دلچسپی کے عنصر کو زیادہ نمایاں رکھتے ہیں۔ بہت سی فنی کوتاہیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ ان ناول نگاروں کا کوئی ایک ناول اچھے معیار کی طرف بڑھنے کا رجحان ظاہر کرتا ہے۔

غیر زبانوں کے بعض شاہکار ناول بھی اردو میں منتقل کیے گئے۔ جان سٹین بک کا ناول "دی پرل" ممتاز شیریں نے "درِ شہوار" کے نام سے ترجمہ کیا۔ قرۃ العین حیدر نے ہنری جیمز کے ناول "اے پورٹریٹ آف اے لیڈی" کا ترجمہ "ہمیں چراغ ہمیں پروانے" کے نام سے کیا۔ حسن عسکری کا نام اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے فلابیر گستاؤ کے معروف ناول "مادام بواری" ہرمن میلون کے "موبی ڈک" اور اشروڈ کر سٹوفر اور ستان دان کے ناول ترجمہ کیے۔ افضل اقبال نے البیر کامیو کا نوبل انعام یافتہ معروف ناول کا "اجنبی" کے نام سے ترجمہ کیا۔

بعض ناول نگاروں نے ناولٹ بھی تحریر کیے۔ گزشتہ ربع صدی میں کئی اچھے اور معیاری ناولٹ تخلیق کیے گئے۔ خصوصاً قرۃ العین حیدر کا "فصلِ گل آئی یا اجل آئی" اشفاق احمد کا "مہمانِ بہار" جمیلہ ہاشمی کا "آتش رفتہ" انور عنایت اللہ کا "حویلی" ابوالفضل صدیقی کے ناولٹ کا مجموعہ "چار ناولٹ" خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ غلام عباس کا ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ اس میں پنجاب کے دیہاتی تمدن کی بہت خوب صورت تصویر ملتی ہے۔

افسانہ

تقسیم ہند کے وقت تک اردو افسانہ فنی اعتبار سے اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا لیکن اس وقت معروف افسانہ نگاروں کی نسل میں سے بعض نے لکھنا تقریباً بند کر دیا تھا جیسے احمد علی اور حسن عسکری۔ عسکری کے محض ایک دو افسانے اس دور میں شائع ہوئے۔ عزیز احمد نے بہت کم افسانے لکھے۔ تقسیم سے پہلے جو افسانہ نگار شہرت حاصل کر چکے تھے ان میں سے منٹو اور ندیم قاسمی نے نسبتاً زیادہ لکھا۔ منٹو نے بڑی تعداد میں افسانے تخلیق کیے اور ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان سب میں ان کا فن اور ان کی شخصیت نمایاں ہے۔ بیشتر افسانوں میں ان کے تخیل اور تصور کی انفرادیت، تازگی، اور تنوع موجود ہے۔ خصوصاً یزید (مجموعہ) کے بیشتر افسانے ان کے فن کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ تقسیم کے بعد منٹو پاکستان کا سب سے ممتاز افسانہ نگار ثابت ہوا۔ اس کے افسانے فن کی اعلیٰ اقدار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں منٹو کے فن میں ایک نمایاں تغیر اور ارتقا پایا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب اس کو فن پر زیادہ عبور حاصل ہوا اور اسلوب میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ ندیم قاسمی نے فن کے استقلال اور ٹھہراؤ کا مظاہرہ اس دور میں سب سے زیادہ کیا اور اس لحاظ سے پرانے اور جدید افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت منفرد اور ممتاز ہے۔ ان کے افسانے جہاں ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیت کے صحیح مصور اور ترجمان ہیں۔ وہیں مصنف کے ذہنی اور جذباتی رجحانات کا گہرا نقش بھی ثبت کرتے ہیں۔ "سناٹا" "آنچل" "برگِ حنا" اور "طلوع و غروب" (مجموعے) کے بیشتر افسانے، مشاہدے، احساس اور فکر کی مکمل ہم آہنگی کے مظہر ہیں۔ ان کے بعض افسانے جیسے "گنڈاسا"

نمونہ" "ریشمی خانہ" اور "آتش گل" فنی لحاظ سے بہت مکمل اور بیان کی بھرپور خوبیوں کے حامل ہیں۔

معاشرتی ذمہ داری کے احساس نے قیام پاکستان کے بعد افسانہ نگاروں کو متعدد موضوعات دیے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے ماحول کے انتشار اور اضطراب پر نظر رکھی۔ اس وقت کا بہت ہیجان خیز اور ہنگامی موضوع فسادات ہے۔ متعدد افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو اپنایا ہے۔ ایسے افسانے یا تو براہِ راست فسادات کے پس منظر اور واقعات سے تعلق رکھتے ہیں یا بعد کے اثرات سے جنھوں نے زندگی اور انسانی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔

ایسے افسانہ نگار جنھوں نے تقسیم سے قبل اپنے لیے مقام پیدا کر لیا تھا ان میں غلام عباس، ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ابراہیم جلیس، قدرت اللہ شہاب، احسن فاروقی، قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمٰن شامل ہیں۔ تقسیم کے بعد ان افسانہ نگاروں کے یہاں موضوع اور اسلوب میں تنوع اور ندرت پیدا ہوئی۔ غلام عباس کے افسانوں کی خصوصیت ان کے موضوع کا نیاپن اور اسلوب کا سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ان کے متعدد افسانے ان کے اس مخصوص رنگ کو پیش کرتے ہیں۔ "سایہ" "اس کی بیوی" "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" اور "کوٹ اور حمام" میں فکر، تخیل، مشاہدہ اور اسلوب سب ایک تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ "جاڑے کی چاندنی" ان کے ایسے ہی نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے نفسیاتی، جنسی تجربے اور احساس سے بعد کے افسانوں میں بھی کام لیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے اس تجربے اور احساس پر مبنی ہونے کے باوجود موضوع کے تنوع اور افسانہ نگار کی فنی گرفت کے مظہر ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کو زبان و بیان اور جزئیات پر بڑا عبور حاصل ہے اور وہ افسانہ نگاری کا ایک مخصوص اسلوب رکھتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام اور اس کے انحطاط کے وہ سب سے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات پر ان کی گرفت بہت مضبوط رہتی ہے۔ "سورج"، "میراث" اور "ستاروں کی چال" ان کے فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے افسانوں میں اپنے عہد کے رجحانات اور زندگی کے عام موضوعات کی عکاسی ہے۔ ابراہیم جلیس نے بعض بڑے متنوع موضوعات پر دلچسپ اور تحیّر خیز افسانے تحریر کیے۔ سیاست اور معاشرے پر طنز ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنے افسانوں میں بیان کی تازگی اور نکھار کو خاص اہمیت دی۔ ان کی نظر زندگی کے متنوع موضوعات پر رہتی ہے "ماں جی" (مجموعہ) میں شامل ان کے افسانے ان کے فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شفیق الرحمٰن کے افسانوں میں ہلکے پھلکے موضوعات اور شگفتہ اندازِ بیان ہر جگہ نظر آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے ماحول اور کردار ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں اور ان پر ہر وقت ایک رومانیت اور شاعرانہ بے فکری اور بے نیازی چھائی رہتی ہے۔ "وہی زمانہ وہی فسانہ" "میں نے لاکھوں کے بول سہے" اور "شیشے کے گھر" (مجموعہ) کے دیگر افسانے اس کی مثالیں ہیں۔ اس دور میں انھوں نے کئی کامیاب اور فنی لحاظ سے مکمل افسانے تحریر کیے۔

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ کئی اور اچھے افسانہ نگار سامنے آئے اور انھوں نے اپنے لیے بہت جلد جگہ بنالی۔ ان میں انتظار حسین، میرزا ادیب، اے۔ حمید، شوکت صدیقی، اشفاق احمد اور ممتاز شیریں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں ہر ایک اپنے مخصوص مزاج کا حامل ہے اور ان میں بعض نے نہایت عمدہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے پیش رو افسانہ نگاروں سے کہیں زیادہ مختلف راہ اختیار کی ہے۔ فسادات ان کے ہاں نہ ایک مستقل موضوع بن سکے اور نہ انھوں نے جنس کو دل کشی پیدا کرنے کا وسیلہ بنایا۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں زندگی محض تلخیوں کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک زندگی کی لذتیں اور حسن فطرت بھی مناسب اہمیت اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر انھوں نے اسلوب کو بھی نئے نئے انداز دیے۔ تفصیل کو زیادہ تر نظر انداز کر کے ایمائیت اور اشاریت سے کام لیا اور علامتیں استعمال کیں۔ انتظار حسین نے ماحول، روایات اور کرداروں کے باہمی ربط کو پیش نظر رکھ کر افسانے تخلیق کیے۔ انھوں نے ایک مخصوص معاشرے اور اس کے کرداروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں انھوں نے قدرے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ فنی پختگی کا حامل ہے۔ میرزا ادیب نے بھی چند کامیاب افسانے لکھے ہیں لیکن پھر بہت جلد انھوں نے اپنے لیے ڈرامہ نگاری کا انتخاب کر لیا۔ شوکت صدیقی کے افسانے زندگی کی تلخیوں اور مجبوریوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر کردار جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ ان کا افسانہ "تیسرا آدمی" فن کے اعتبار سے کامیاب ہے۔ "ڈھلتی رات" اور "بیمار" ان کے مخصوص کرداروں کے افسانے ہیں۔ زندگی کے حسین تصورات دل کش مناظر فطرت اور پُرکیف رومانی جذبات کو افسانوں میں جس حد تک اے۔ حمید نے پیش کیا ہے کسی اور افسانہ نگار نے اور اتنے دل نشیں اسلوب کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ ان کے اکثر افسانے فطرت کی حسین اور رومانی دنیا کو تخلیق کرتے ہیں: "منزل منزل"، "کچھ یادیں کچھ آنسو"، "خزاں کا گیت" ان کے ایسے ہی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک نام اشفاق احمد کا ہے جن کے افسانوں کا مخصوص موضوع محبت ہے۔ ان کے بیشتر افسانے اسی جذبہ کے آئینہ دار ہیں "ایک محبت سو افسانے" ان کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہے اور ان کے افسانے "گڈریا" اور "امی" فن کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ممتاز شیریں نے بھی بعض بہت اچھے افسانے تخلیق کیے اور فن پر اپنی گرفت

کا ثبوت دیا۔ انھوں نے تکنیک میں بعض اچھے تجربات کے ساتھ ساتھ ہندی اور یونانی اساطیر کو استعارے کے طور پر استعمال کیا اور ان سے اپنے ماحول کے لیے نئے معانی تلاش کیے۔

ان سب افسانہ نگاروں نے فن کے وہ سارے محاسن یک جا کیے ہیں جن سے اچھے افسانے کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے موضوع کے انتخاب میں وسعت نظر کا ثبوت دیا ہے اور اسلوب کو دلچسپ اور جاذب توجہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اہمیت اختیار کی ان میں مسعود مفتی، غلام الثقلین نقوی، اختر جمال، نوید انجم، الطاف فاطمہ، محمود فاروقی، حمید کاشمیری، صادق حسین، آغا بابر، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، سید قاسم محمود وغیرہ نے مختلف معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی و جنسی مسائل پر کامیاب افسانے لکھے۔ ان افسانہ نگاروں نے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط اور ان سے پیدا شدہ ہمہ گیر مسائل کو اپنا موضوع بنایا، یا فرد پر انفرادی و اجتماعی مسائل کی اثر اندازی و اثر پذیری کا مطالعہ کیا۔ غلام الثقلین نقوی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہات، سادگی اور پرکاری کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ مسعود مفتی نے نچلے متوسط طبقے کو اپنے افسانوں میں بہت اہمیت دی ہے اور وہ کرداری قباحتوں اور منافقتوں کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ نوید انجم اور آغا بابر نے زیادہ تر جنسی اور سنسنی خیز افسانے لکھے۔ مرزا ریاض نے جذبات نگاری کی طرف خاص توجہ دی۔ حمید کاشمیری اور صادق حسین واقعات اور ماحول سے کہانی کو دل کش بناتے ہیں۔ قاسم محمود نے فرد اور معاشرے کی کش مکش کے تناظر میں عصری مسائل کا تجزیہ کیا۔ ان کے افسانے فکر و احساس کی توانائی اور تازگی کے حامل ہوتے ہیں۔ محمود فاروقی اور حفیظ احسن معاشرتی اور اخلاقی قدروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اختر جمال، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، فرخندہ لودھی اور خالد شفیع نے معاشرتی اور نفسیاتی موضوعات پر کئی کامیاب افسانے لکھے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں تازگی ہے اور زندگی کے مسائل سے ان کا رشتہ جذباتی اور تاثراتی ہونے کے بجائے حقیقت پسندانہ ہے۔

ان افسانہ نگاروں نے موضوع کے نقطۂ نظر سے حقائق کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے حسن بیان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اسی سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان کے برعکس موجودہ افسانہ نگار جن کی فہرست خاصی طویل ہے افسانے میں نت نئے تجربات اور نئے نئے موضوعات کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے بیک وقت عصری مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی بھرپور عکاسی کی ہے اور انسانی فطرت سے اپنی واقفیت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ان لکھنے والوں میں گو مطالعہ، مشاہدہ اور براہِ راست تجربے کا عکس موجود ہے۔ لیکن یہ اسلوب میں بسا اوقات ایمائیت اور اشاریت کو اختیار کرتے ہیں۔ بعض مشترک خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ ان سب لکھنے والوں کا اپنا اپنا خاص رنگ ہے۔ اس خاص رنگ میں ہر اہم لکھنے والے کی انفرادیت کا عکس موجود ہے۔ موضوع، ماہیت اور اسلوب کے لحاظ سے افسانہ نگاری میں آج کی تازہ لہر افسانے کو تجریدی اور علامتی افسانے کے مرحلے میں داخل کر رہی ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں یہ روش افسانوں میں دراصل شاعری کی معاصر تحریکوں اور رویوں کے زیر اثر آئی ہے۔ یہاں بھی دراصل ٹھوس حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کا ردعمل ہے۔ اپنی موجودہ حالت میں علامتی اور تجریدی افسانے کو خارجیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ محض چند نئے افسانہ نگار معاصر رویوں سے ہٹ کر افسانے کی مثبت روایات پر عمل پیرا ہیں۔ ان میں سے ایک نقی حسین خسرو کا نام شائستگی کا حامل ہے۔ خسرو نے اپنے افسانوں کے لیے موضوع تلاش کرتے وقت خلوص اور جستجو سے کام لیا ہے اور پھر اسے پیش کرنے کے انداز میں عموماً فن کے لوازم کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ افسانے کے موجودہ دور میں اس قسم کی مثالیں بہت کم ہیں۔ تجریدی اور علامتی افسانہ نگاروں نے عموماً پلاٹ کی منطقی ترتیب اور کردار نگاری سے گریز کیا ہے۔ اور بالعموم فنی تقاضوں سے انحراف کی راہ تلاش کی ہے۔ افسانے میں ابہام اور تجرید کی روش بہت سے نئے افسانہ نگاروں کو جنم دے رہی ہے۔ کیوں کہ اب اس طرح افسانہ لکھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ علامتی افسانہ لکھنے والوں میں انور سجاد اور رشید امجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں خالدہ اصغر اور مظہر الاسلام کے علاوہ مسعود اشعر کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ گو مسعود اشعر نے اسلوب کو بھی اہمیت دی ہے۔ ان کے افسانے لاشعور کے خوابیدہ نفسی تجربات سے تخلیق ہوتے ہیں۔ رشید امجد کے اظہار و اسلوب کے تجربات بھی ان کی انفرادیت کا سبب ہیں۔ لیکن تجریدی و علامتی افسانے کے ضمن میں ابھی تک کوئی ایسا افسانہ نگار سامنے نہیں آیا جسے اس حیثیت کا حامل قرار دیا جا سکے جو فن کی نئی اقدار کو تشکیل دے اور ان سے دوسروں کو بھی متاثر کر سکے۔

ڈرامہ پاکستان میں جس ڈرامے کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ یک بابی ڈراما ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ریڈیو اور اب ٹیلی ویژن کی ترویج ہے۔ تقسیم کے بعد کے مسائل میں اسٹیج ڈرامے کے امکانات بڑے کم تھے۔ پھر اردو میں ویسے بھی ڈرامہ زیادہ نہ رہا۔ اب حال ہی میں پاکستان میں اسٹیج ڈراموں کا قدرے رواج ہو رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ڈرامہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ ڈرامے نے مصنوعی رنگ و روپ کی جگہ تفریحی اور سماجی مسائل کی عکاسی کو اختیار کر لیا ہے۔ پرانے ڈرامہ نگاروں میں سے امتیاز علی تاج، عابد علی عابد، حکیم احمد شجاع، انصار ناصری وغیرہ نے اس طرف توجہ نہ دی۔ شاہد احمد دہلوی نے چند ڈرامے

معیاری تخلیق کیے۔ منٹو نے ریڈیو سے وابستہ رہنے کی وجہ سے بہت کثرت سے ڈرامے لکھے اور کئی کامیاب اور عمدہ کوششیں کیں۔ ابتدا میں ناصر شمسی کے ڈرامے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہت اچھا اظہار ہیں۔ ان کا ڈرامہ "تیرے کوچے سے ہم نکلے" فسادات کے پس منظر میں لکھا جانے والا بہت موثر اور کامیاب ڈرامہ ہے۔ ان کے علاوہ ہاجرہ مسرور، انور سجاد، آغا بابر اور رضیہ بٹ نے کئی اچھے ڈرامے تخلیق کیے۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر تفریحی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ڈرامہ نگاروں نے بعض اہم سماجی مسائل کو موضوع بنایا اور کچھ ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈرامے داخلی جذبات کی بنیادوں پر مرکوز رکھے۔ اس ضمن میں میرزا ادیب کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ڈرامہ نگاری کی طرف خاص توجہ دی اور متعدد مختصر ڈرامے تخلیق کیے۔ ان کے ڈراموں کا موضوع زیادہ تر نفسیاتی یا سماجی مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ ان میں جامعیت اور اختصار ہے۔ یک بابی ڈرامے کی مقبولیت میں آج ان کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اصغر بٹ اور شوکت تھانوی نے بکثرت تفریحی اور دلچسپ ڈرامے لکھے۔ ابراہیم جلیس نے ڈراموں میں طنز و مزاح کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ ان کے علاوہ انتظار حسین، ابوسعید قریشی، انور عنایت اللہ، سلیم احمد، اشفاق احمد اور حسینہ معین نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے دلچسپ اور مقبول ڈرامے لکھے، لیکن ان میں سے بہت کم نے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔

اسٹیج ڈراموں میں جو شہرت اور مقبولیت خواجہ معین الدین کے ڈراموں بالخصوص "تعلیمِ بالغان" "مرزا غالب بندر روڈ پر" "لال قلعے سے لالو کھیت تک" کو حاصل ہوئی وہ مثالی ہے۔ ان کے ڈرامے مقصدی ہوتے ہیں اور طنز کے شگفتہ اسلوب کو ہر جگہ نمایاں رکھتے ہیں۔ خادم محی الدین، علی احمد اور کمال احمد رضوی نے بھی اسٹیج ڈرامے تحریر کیے۔

طنز و مزاح

جو مزاح نگار تقسیم سے قبل ہی مقبول ہو چکے تھے ان میں شوکت تھانوی، منٹو، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، چراغ حسن حسرت عبدالمجید سالک وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ منٹو نے ہلکے پھلکے طنزیہ مضامین تحریر کیے۔ سالک صحافیانہ فکاہی کالم تک محدود رہے۔ حسرت بھی صحافت سے وابستہ تھے، لیکن انھوں نے مستقل اہمیت کی بعض چیزیں بھی لکھیں۔ شوکت تھانوی نے کئی اصنافِ ادب، ناول، ڈرامہ، مضامین، شخصی خاکے اور خطوط وغیرہ میں مزاح تخلیق کیا۔ شفیق الرحمٰن نے شگفتہ اسلوب اور لطیفہ گوئی میں متعدد افسانے لکھے، جو مخصوص ماحول میں خاص کرداروں اور لطافت کی بنیاد پر مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ابراہیم جلیس نے تقسیم سے قبل چند اچھے مزاحیہ افسانے تحریر کیے تھے، پاکستان میں ان کی مزاح نگاری نے تیکھے اور چبھتے ہوئے طنز کا انداز اختیار کیا ان کی تحریروں میں بالعموم ادبی عنصر کی کمی نہیں۔ بعد میں جن مزاح نگاروں نے اچھے معیار کو پیش کیا، ان میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، ایم۔ آر۔ کیانی اور محمد خالد اختر وغیرہ نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابن انشا نے مزاح نگاری میں بڑے تنوع کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تنوع ان کے موضوعات اور اسلوب دونوں ہی میں موجود ہے۔ نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی ان کی خاص خوبیاں ہیں۔ مختصر مضامین، صحافیانہ کالم اور سفرنامے، وہ ہر جگہ ایک کامیاب مزاح نگار کے طور پر ابھرے۔ کیانی نے پہلی مرتبہ اپنی تقاریر کو ادب میں بطور صنف متعارف کرایا۔ ان کی تقاریر کا مجموعہ "افکار پریشاں" بہت پر لطف مزاح اور مقصدی طنز کی ایک مقبول عام مثال ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں طنز اور مزاح کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی یوسفی کے مضامین بڑی شگفتگی اور توازن کے حامل ہیں۔ کرنل محمد خان نے پہلی مرتبہ فوجی زندگی میں جنم لینے والے واقعات سے مزاح کا پہلو اجاگر کیا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے ان کی تحریریں شگفتگی اور تازگی کی حامل ہیں۔ خالد اختر نے اپنی تحریروں میں تنوع کے لحاظ سے خاصی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

مزاحیہ شاعری میں سید محمد جعفری کی ایک علیحدہ اور ممتاز حیثیت رہی ہے۔ ان کے علاوہ ظریف دہلوی، ضمیر جعفری اور مسٹر دہلوی نے بھی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

صحافت میں کامیاب اور دلچسپ فکاہی کالم نگاری کے لحاظ سے مجید لاہوری اور طفیل احمد جمالی نے بڑا نام پیدا کیا۔ مزاحیہ نظم و نثر میں مجید لاہوری کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا جریدہ "نمک دان" ایسی ہی تحریروں کی وجہ سے بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ بعد میں جو فکاہی کالم نگار مقبول ہوئے، ان میں ابن انشا (روزنامہ جنگ، کراچی) غریب شہر (مشفق خواجہ روزنامہ جسارت، کراچی) نصر اللہ خان (روزنامہ حریت، کراچی) اور احمد ندیم قاسمی (روزنامہ امروز لاہور) اہمیت رکھتے ہیں۔

انشائیہ

ابتدائی دور کے ہلکے پھلکے اور لطیف مضامین لکھنے والوں میں میاں عبدالعزیز فلک پیما اور میاں بشیر احمد خصوصیت رکھتے ہیں ان کے علاوہ داؤد رہبر اور امجد حسین کی تحریریں اور وزیر آغا کے بعض مضامین اس صنف کے اچھے معیار کی جستجو میں ہیں۔ ان کے زیر اثر اس روایت میں خاص تجربات ہوئے اور ہلکے پھلکے موضوعات پر تاثراتی مضامین کی ایک نئی صنف کو بعض نئے لکھنے والوں نے رواج دیا۔ اسے انشائیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ادبی رسائل میں پہلے ادبی دنیا (لاہور) اور پھر بعد میں 'اوراق' (لاہور) میں انشائیہ نگاری کے اصولوں اور اس کے فروغ کے لیے باقاعدہ تحریک شروع ہوئی۔ نظیر صدیقی نے بعض اچھے انشائیے تحریر کیے۔ ان کے علاوہ مشتاق قمر اور مشکور حسین یاد کے نام اس صنف کے لکھنے والوں

میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

سفر نامہ اور رپورتاژ

بعض سفرنامے بھی اپنی تخلیقی خوبیوں کے سبب ادب کا حصّہ بن چکے ہیں۔ محمود نظامی کا "نظر نامہ" اس سلسلے کی ایک اچھی مثال ہے۔ لیکن اس صنف میں بیگم اختر ریاض الدین نے بڑا نکھار، شگفتگی اور دلچسپی پیدا کی۔ ان کے مختصر سفرناموں کے دو مجموعے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" بہت مقبول ہیں۔ ابن انشا کے سفرنامے بھی اپنی دلچسپی اور شگفتہ اسلوب کے سبب بہت مقبول ہیں۔ خاص طور پر "دنیا گول ہے" "آوارہ گرد کی ڈائری" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں"۔ ابراہیم جلیس کا سفرنامہ "بنگال میں اجنبی" افسانے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی کے سفرنامے "دنیا میرے آگے" اور "تماشا میرے آگے" بھی دلچسپ اور شگفتہ ہیں۔ حالیہ سفرناموں میں مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے "اندلس میں اجنبی" اور "نکلے تیری تلاش میں" اور حمزہ فاروقی کا سفرنامہ "زمان و مکاں اور بھی ہیں" اس صنف میں اچھے اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حجاز کے سفرناموں میں نسیم حجازی کا "پاکستان سے دیارِ حرم تک" شورش کاشمیری کا "شب جائے کہ من بودم" اور ممتاز مفتی کا "لبیک" خاص ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔

رپورتاژ کے ضمن میں بھی بعض بہت اچھے ادب پارے تخلیق ہوئے۔ شاہد احمد دہلوی کے رپورتاژ "دلی کی بپتا" اور "دلی آٹھ مہینے بعد" ادبی حقیقت نگاری کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ محمود ہاشمی کا رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" پختہ فنی شعور کا حامل ہے اور حقیقت نگاری کا ایک مرقع ہے۔ ان کے علاوہ انتظار حسین کا "سانجھ بھئی پردیس" ابراہیم جلیس کا "جیل کے دن جیل کی راتیں" "دو ملک ایک کہانی" انور عنایت اللہ کا "قلعہ مضبوط تھا"، شفیق الرحمٰن کا "برساتی"، اے۔ حمید کا "یروشلم"، قرۃ العین حیدر کا "ستمبر کا چاند"، اشفاق احمد کا "ایلورا"، قدرت اللہ شہاب کے "اے بنی اسرائیل" اور "تو ابھی رہ گزر میں ہے" اور محمد طفیل کا "محترم" قابل ذکر رپورتاژ ہیں۔

خود نوشت سوانح عمری

خود نوشت سوانح عمریوں کا رواج بھی اب عام ہو رہا ہے عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" مصنف کی سوانح عمری سے زیادہ گرد و پیش کے حالات اور احباب کا تذکرہ تھی۔ جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی "یادوں کی برات" خود نوشت سوانح عمریوں کے ذخیرے میں اچھا اضافہ ہے۔ لیکن حد سے زیادہ خود نمائی اور خود ستائی کے عیب سے مبرا نہیں رہ سکی۔ اس سلسلے کی ایک اچھی اور معیاری تخلیق احسان دانش کی "جہانِ دانش" ہے۔ مصنف نے بڑی دیانت داری سے اپنی زندگی اور اس کے تمام نشیب و فراز کی بڑی بھرپور اور حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ یہ اس ضمن میں ایک معیاری اور اہم اضافہ ہے۔

دیگر خود نوشت سوانح عمریوں میں کوئی تصنیف حالاتِ زندگی کو فنی لحاظ سے مستقل اور مربوط صورت میں پیش نہیں کرتی۔ پھر بھی بعض مصنفین نے اپنی زندگی کے غیر مربوط حالات تحریر کیے یا چیدہ چیدہ واقعات کسی اور منصوبہ کے تحت ضمنی طور پر بیان کیے اور زندگی کے کسی خاص دور کو قلمبند کیا۔ اسی قسم کی مثالوں میں شوکت تھانوی، ذوالفقار علی بخاری، سبطِ حسن، مرزا ظفر الحسن اور شورش کاشمیری کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ شوکت تھانوی کی تصانیف "مابدولت" اور "کچھ یادیں کچھ باتیں" ان کی زندگی کے ایک خاص دور کا احاطہ کرتی ہیں۔ سبطِ حسن کی تصنیف "شہر نگاراں" ان کی زندگی کے اس دور پر مشتمل ہے جو انھوں نے حیدر آباد میں گزارا تھا۔ مرزا ظفر الحسن کی تصانیف "ذکر یار چلے" اور "دکن اداس ہے یارو" بھی حیدر آباد دکن کی یادوں پر مشتمل ہے۔ ایسی بہت کم مثالیں ہیں کہ کسی نے ایک عمر گزارنے کے بعد ادب کی طرف دوبارہ توجہ دی اور ایک عمدہ دل نشین اسلوب اختیار کیا ہے۔ مرزا ظفر الحسن کی نثر اس قسم کی ایک بہتر مثال ہے۔ فیض احمد اور مخدوم کے تقابلی مطالعے پر مبنی ان کی ایک اور تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" بھی مصنف کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کو سامنے لاتی ہے۔ شورش کاشمیری کی خود نوشت "بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل" قیام پاکستان تک ان کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "پسِ دیوارِ زنداں" ایام قید کے حالات کا خود نوشت تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ مختار مسعود کی تصنیف "آوازِ دوست" مشکور حسین یاد کی "آزادی کے چراغ" وزیر آغا کی "شامِ دوستاں آباد" میں بھی ضمنی طور پر مصنفین نے اپنی زندگی کے حالات تحریر کیے ہیں۔ بعض رسائل نے بھی مختصر آپ بیتیاں بالخصوص شائع کی ہیں۔ "نقوش" (لاہور) نے ایک بہت ضخیم آپ بیتی نمبر مرتب کیا جس میں متعدد ادیبوں اور شاعروں نے آپ بیتیاں تحریر کیں۔ بعض رسائل وقتاً فوقتاً مختصر آپ بیتیاں شائع کرتے رہے ہیں۔

شخصی خاکہ نگاری

پاکستان میں شخصی خاکہ نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مشہور ادیبوں نے اپنے معاصرین کے شخصی اور سوانحی خاکے خاصی تعداد میں تحریر کیے۔ ابتداً منٹو نے شخصی خاکوں پر مشتمل ایک مجموعہ "گنجے فرشتے" ترتیب دیا اور پھر دیگر خاکے "لاؤڈ اسپیکر" (مجموعہ) میں شامل کیے۔ منٹو کے بعد دیگر کئی شخصیت نگاروں کے لکھے ہوئے خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ضیاء الدین احمد برنی کا "عظمتِ رفتہ" عبدالمجید سالک کا "یارانِ کہن" چراغ حسن حسرت کا "مردم دیدہ" رئیس احمد جعفری کا "دید و شنید" شورش کاشمیری کا "نورتن" اور "چہرے" شوکت تھانوی کے "شیش محل" اور "قاعدے بے قاعدے" جلیل قدوائی کا

"چند اکابر چند معاصر" شاہد احمد دہلوی کا "گنجینۂ گوہر" محمد سرور کا "شخصیات" فقیر سید وحید الدین کا "انجمن" الطاف علی بریلوی کا "راہی اور راہنما" ابراہیم جلیس کا "آسمان کے باشندے" عاشق بٹالوی کا "چند یادیں چند تصورات" عبدالسلام خورشید کا "وہ صورتیں الٰہی" مقصود زاہدی کا "یادوں کے سائے" فارغ بخاری کا "البم" محمد طفیل کے "آپ" "جناب"، "صاحب"، "مکرم" اور "معظم"۔ یہ مجموعے خاکہ نگاری کے تعلق سے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ پھر بھی ان میں منٹو، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل نے اس ضمن میں خاصا معیاری اضافہ کیا۔ محمد طفیل کو دیگر خاکہ نگاروں کے مقابلے میں اس طرح سے برتری حاصل ہے کہ انھوں نے محض اس صنف کو اپنی کاوشوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ اور اس ضمن میں اپنے ایک علیحدہ اسلوب نگارش کی تشکیل کی ہے۔

بعض شخصیت نگاروں کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے مرتب نہیں ہوئے لیکن فن کے لحاظ سے انھوں نے اپنے چند خاکوں کے ذریعے اس صنف کے عمدہ نمونے تخلیق کیے ہیں۔ اس ضمن میں ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی، مرزا ظفر الحسن، مسعود اشعر، نصراللہ خاں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصًا ممتاز مفتی کے تحریر کردہ، قدرت اللہ شہاب اور ابن انشا کے خاکے، ابوالفضل صدیقی کے، جمیل جالبی، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر عندلیب شادانی پر، مرزا ظفر الحسن کا "ذوالفقار علی بخاری" اور مسعود اشعر کے "شاد عارفی" اور "مصطفٰے زیدی"۔ نصراللہ خاں نے اپنے صحافیانہ کالم (روزنامہ "حریت" کراچی) میں اپنے کئی معاصرین کے خاکے تحریر کیے جو اس ضمن میں اچھی مثالیں ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد شخصیت نگار اس ضمن کے ارتقا میں حصّہ لے رہے ہیں۔ ان میں مشفق خواجہ اور احمد بشیر کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ "نقوش" (لاہور) کا شخصیات نمبر جو متعدد شخصی و سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے اس سلسلے میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

تنقید

تنقید کو پاکستان میں خاصا فروغ حاصل ہوا اور یہ نئے رجحانات اور نئی وسعتوں سے ہم کنار ہوئی، یہاں کے نقادوں نے مختلف رجحانات کو اپنایا اور انھیں عملی تنقید میں ڈھالا۔ ادب اور معاشرتی عوامل کے رشتے پر زور دیا گیا نفسیاتی تنقید کی طرف توجہ دی گئی اور اس میں نئی گہرائی پیدا ہوئی۔ خالص ادبی اقدار پر بعض نقادوں نے اس حد تک زور دیا کہ زندگی بھی فن کا ایک پہلو بن گئی۔ پرانے ادب کا جدید انداز اور جدید تقاضوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا اور نئے مسائل اور عصری تقاضوں کو بھی اہمیت دی گئی۔ اس گہرائی اور وسعت میں پرانے نقادوں کا بھی اتنا ہی حصّہ ہے جتنا نئے نقادوں کا۔

قیام پاکستان کے بعد بہت سے معروف اور صفِ اول کے نقاد پاکستان آئے ان میں مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، حامد حسن قادری، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، حسن عسکری، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ممتاز حسین کے نام نمایاں ہیں اور پہلے سے جو نقاد یہاں تھے ان میں شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، حمید احمد خاں، مولانا صلاح الدین احمد، سید عبداللہ اور عابد علی عابد ممتاز ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان نقادوں کے سامنے کئی مسائل اور کئی سوال تھے۔ ابتداً جو مضامین لکھے گئے، ان کا بیشتر حصّہ نظریاتی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں ادبی مباحث کے علاوہ بعض دوسرے ایسے مسائل اور سوال اٹھائے گئے جو بالواسطہ ہمارے ادب پر اثر انداز ہوئے۔ اس وقت فسادات بحث کا ایک اہم موضوع بنے رہے۔ کئی ادیبوں نے فسادات کے ضمن میں ادیبوں کے رویے اور ادب میں اس موضوع کی گنجائش یا عدم گنجائش پر اظہارِ خیال کیا (اس قسم کے مقالات کا ایک مجموعہ "نیا دور" (کراچی) "فسادات نمبر" ہے) اس وقت ایک اہم سوال ادیب کی ریاست سے وفاداری کا تھا۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا تھا کہ بعض لکھنے والوں نے، جن کی اکثریت ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی، ذہنی طور پر تقسیم اور قیام پاکستان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے اس وقت نقادوں کے پیش نظر ادیب اور ذہنی آزادی اور ادب اور سیاست کا تعلق اس دور کے بڑے اہم مسائل تھے۔ وقار عظیم کے مقالے "آزاد مملکت میں ادیب" (مشمولہ "نیا دور" (کراچی) فسادات نمبر) اور "ادب اور پاکستانی ادیب" (مشمولہ "ادبِ لطیف" (لاہور) سالنامہ ۱۹۴۸ء) حسن عسکری کا مقالہ "انسان اور آدمی" اور ممتاز شیریں کا مقالہ "سیاست ادیب اور ذہنی آزادی" (مشمولہ "نیا دور" (کراچی) شمارہ ۱۸) اس دور کی یادگار ہیں۔

اس زمانے میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ تہذیب کا کون سا نظام آزادی کے اس عہد میں ہمارے لیے قابلِ قبول ہے۔ اس سوال کے جواب میں فکر کے کئی مکتب سامنے آئے اور پہلی مرتبہ قیامِ پاکستان کے بعد نقادوں نے اپنے تہذیبی رشتوں کی تلاش اور وضاحت شروع کی۔ نقادوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ تہذیبی زندگی کی اساس وہ نظام اخلاق ہے جو پاکستانیوں کو اپنے مذہب کے وسیلے سے ملا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو تحریک کی صورت دینے والوں میں نعیم صدیقی، ماہر القادری اور فروغ احمد شامل ہیں لیکن ان سب کے سوچنے کے انداز میں جذباتیت کا پہلو نمایاں رہا ہے۔ اس جذباتی وابستگی میں فکر کا عنصر شامل کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر احسن فاروقی اور حسن عسکری کا ہے۔ تہذیب کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش میں بعض ادیبوں نے پاکستان کے علاقوں کی تاریخ

اور ان کے تہذیبی آثار کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس گروہ کے نقادوں کو ارضیت کا داعی کہا جاتا ہے۔ ارضیت کی اس تحریک کی بنیاد محض خطۂ زمین پر منحصر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس تحریک کے فکری اور عملی نمائندے ہیں نقادوں کا ایک اور گروہ مادی زندگی کے تقاضوں میں اخلاقی اور روحانی اقدار کی آمیزش کا خواہش مند ہے اور ایسے ادب کی تخلیق کا تقاضا کرتا ہے جس میں انسان کی مادی زندگی کی مصوری اور ترجمانی اور انسانی عمل کی جانچ اخلاقی اور روحانی پیمانوں سے کی جائے۔ نقادوں کے اس گروہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، حسن عسکری، ممتاز شیریں شامل ہیں اور ان کے علاوہ جیلانی کامران اور سجاد باقر رضوی بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک گروہ ایسے نقادوں کا بھی ہے جو اب بلاضرورت روایت سے بغاوت پر اصرار کر رہا ہے اور اپنے خیال کے لیے ایسی علامتوں اور اظہار کی ہیئتوں کی جستجو میں ہے جو پڑھنے والوں کو محض اپنے نئے پن کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس سے بڑھ کر گزشتہ چھ سالوں سے تنقید میں کچھ زیادہ ہی جدید رجحانات کا دخل ہوگیا ہے، اظہاریت، اشاریت، ماورائیت (Surrealism) فیوچرازم (Futurism) اینٹی پوئٹری (Anti Poetry) کونکریٹ پوئٹری (Concrete Poetry) اور ابلاغ شکنی کی وہ بیشتر تحریکیں جو آج کل مغرب کے ادب میں جاری ہیں کسی نہ کسی پہلو سے داخل ہوگئی ہیں۔ اس قسم کی مغرب پرستی اور مرعوبیت کا شکار ہو کر بعض نئے نقاد ادب، فلسفیانہ مباحث، سماجی اقدار اور انسان کے معاشی اور سیاسی رشتوں کے بارے میں واضح تصورات نہ ہونے کے سبب اپنی مختلف تحریروں میں تضادات کا شکار نظر آتے ہیں۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے پاکستان میں تنقید کا رنگ ترقی پسند تنقید کے برعکس، سیاسی ہونے کے بجائے تہذیبی، علمی و ادبی ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے کا ذوق بھی پہلے کے مقابلے میں ترقی پذیر ہوا۔ میر اور غالب کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ اقبال کو بھی بطورِ موضوع خاص طور سے توجہ کا مرکز بنایا گیا۔ اصناف ادب کی تنقید و مطالعے نے بھی پہلے کے مقابلے میں بہت وسعت اختیار کی۔ اردو تنقید کی تاریخ اور تنقیدی دبستانوں کے جائزے بھی موضوع بنے۔ جن نقادوں نے اہم مباحث اور مسائل پر اظہار خیال کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے نئے اور فکر انگیز خیالات پیش کیے یا مطالعے کی پرخلوص کوشش کی، ان میں کئی نام اہم ہیں۔ مولوی عبدالحق، حامد حسن قادری، نیاز فتح پوری، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ یہ سب تحقیق و تنقید کے امتزاج کے حامل ہیں۔ ان بزرگوں کی نگارشات نے تنقید کی جہات میں ہمہ گیر اضافہ کیا یہ فنی محاسن اور زبان کی صحت کے ساتھ ساتھ موضوع، طریقۂ اظہار اور عنوانی نظریات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اکابر شعر و ادب کے جو تنقیدی جائزے لیے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ان کی تنقید میں تجزیے کے پہلو بہ پہلو تشریحی اور توضیحی انداز بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو تنقید میں نئے رجحانات کی ترویج کی ہے۔ غزل تنقید اور متقدمین اور معاصرین پر انھوں نے کئی مضامین لکھے۔ وقار عظیم نے ویسے تو کئی اصناف پر مضامین لکھے، لیکن افسانوی ادب ان کا خاص موضوع ہے اور اس پر ان کی نظر گہری اور مطالعہ وسیع ہے، نئی تحریکات، تجربے اور تکنیک کے تغیرات کا جائزہ ان کی تنقیدوں میں ملتا ہے۔ ناول کے ضمن میں ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتابیں بھی اہم ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی تنوع پسند نقاد ہیں۔ اسی لیے تنقیدی آرا کے اظہار میں جارحیت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ عابد علی خاں عابد نے جملہ اصنافِ ادب کی تنقید کے اصولوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کی تصنیف "اصولِ ادبیات انتقادیات" اپنے موضوع پر اردو میں پہلی جامع کتاب ہے۔ عصری رجحانات اور رویوں پر ان کے متعدد مقالات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے متعدد مقالات سے تنقید میں ان کی گہرائی اور منفرد اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب اور محمد حسین آزاد پر ان کی تنقیدیں خاص اہمیت کی حامل ہیں، حمید احمد خاں اور ڈاکٹر تاثیر کے مقالات سے ان کے ادبی ذوق کی پختگی اور تنقیدی بصیرت جھلکتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال اور غالب کے فکر کے بعض گوشوں پر فارسی ادب کے رچے ہوئے مذاق اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کے ساتھ نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے نظریۂ فن پر عزیز احمد کے مضامین پر مغز ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ اور میرزا محمد منور نے اقبال کے نظریۂ فن اور فکر و شاعری پر بہت ٹھوس کام کیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر ریاض اور بشیر احمد ڈار نے بھی اقبال کو مستقل موضوع بنایا، غالب پر غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر وحید قریشی اور قدرت نقوی نے امتیازی حیثیت کا حامل کام کیا۔ میر کے مزاج اور شاعری کا مطالعہ ڈاکٹر عبداللہ نے بڑی عالمانہ سطح پر کیا۔ ڈاکٹر عبداللہ کی نگارشات میں تحقیق اور تنقید کا جو توازن ہے، وہ آج کل کسی اور جگہ شاذ ہی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے تنقیدی فیصلوں اور استدلال کے لیے بہت غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور اسی لیے وہ اکثر نئی بات کہتے ہیں۔ حالی پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں اور ڈاکٹر وحید قریشی کی کاوشیں فکر انگیز ہیں۔

اہم ترقی پسند نقادوں میں محض دو نام نمایاں رہے، ایک اختر حسین رائے پوری اور دوسرے ممتاز حسین، گو احمد علی اور مجنوں گورکھپوری بھی پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان دونوں نے اپنے پاکستانی دور میں تنقید میں کوئی بلند پایہ اور قابل ذکر تحریر پیش نہیں کی۔ ممتاز حسین اس دبستان کے مقابلتہً اہم نقاد ہیں اور انھوں نے یہاں ترقی پسند تنقید کو آگے بڑھایا، مگر یہ روایت اب انھیں پر

ختم ہے۔

تنقید میں حسن عسکری بڑی متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان کے دور میں اور اس کے آس پاس ادب میں نظریاتی بحثیں اکثر ہوئیں، لیکن عسکری نے نئے نئے مسائل دریافت کیے اور ان پر فکر انگیز مقالے لکھے۔ ادب میں "پاکستانیت" اور "فن برائے فن" ان کے ادبی نظریے ہیں۔ وہ زیادہ تر بحث انگیز مضامین ہی لکھتے رہے ہیں، لیکن ان سب کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ ادب اور ادبی مسائل ہی سے ہے۔ ان کے کئی مضامین ادبی اقدار کے از سرِ نو تعین کی نمایاں کوششیں ہیں۔ عسکری کے حلقہ اثر میں آنے والے نقادوں میں، جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، ممتاز شیریں اور اسلوب میں سلیم احمد ان سے بہت قریب ہیں۔ سجاد باقر رضوی اور انتظار حسین نے بھی بہت سے مسائل میں عسکری کی پیروی کی اور یہ اس اعتبار سے عسکری کے دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدید ادب اور افسانے پر ممتاز شیریں کی تنقیدیں بہت پُر مغز، فکر انگیز اور جدید رجحانات کی حامل ہیں۔ ان کی تنقید کی اہم خصوصیات ان کا وسیع مطالعہ اور تجزیے کی گہرائی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو دیگر نقاد نمایاں ہوئے اور انھوں نے تنقید نگاری میں بہتر مثالیں قائم کیں، ان میں ریاض احمد، منظر علی سید، ڈاکٹر وحید قریشی، نظیر صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، شمیم احمد، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سلیم اختر اور جیلانی کامران کے نام معروف اور ممتاز ہیں۔ اردو تنقید اس نسل کے توسط سے بعض نئے معیاروں سے آشنا ہوئی ہے۔ یہ نسل آج کی ادبی اقدار، مسائل اور مباحث کی تنقیدی ترجمانی اور پشت پناہی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ ان نقادوں نے زیادہ تر عصری مسائل اور بالعموم معاصر شخصیات اور رجحانات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ انھوں نے کلاسیکی ادب پر بالخصوص توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تحریروں میں تحقیق و تنقید کے اچھے امتزاج کا مظاہرہ کیا۔ وسعتِ مطالعہ اور تجزیاتی انداز ان کی اہم خصوصیات ہیں۔ اردو تذکرہ نگاری میں جس مطالعہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے شروع کیا تھا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اسے بہت آگے تک بڑھایا۔ اس کے علاوہ متفرق ادبی موضوعات اور عصری مباحث بھی ان کی تنقید کا موضوع ہیں۔ شمیم احمد نے عصری مسائل کے مناظر میں موجودہ ادب اور ادیب و شاعر کے مطالعے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جمیل جالبی نے تجزیے کی اچھی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ مغرب کے منتخب تنقیدی خیالات اور بالخصوص ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا۔ نظیر صدیقی اور مجتبیٰ حسین نے اچھے اسلوب کو پیش کیا ہے اور عموماً فکری مباحث سے گریز کیا ہے۔ ریاض احمد اور سلیم اختر کی تحریروں میں نفسیاتی تنقید کا انداز ملتا ہے۔ وزیر آغا اور جیلانی کامران نے عصری مسائل پر زیادہ لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں ادب کے تہذیبی رشتوں کی تلاش اور ان کا ادراک زیادہ نمایاں ہے۔ انور سدید نے ادبی جائزے بڑی کامیابی سے لکھے ہیں۔ ابوالخیر کشفی نے وسیع مطالعے اور تجزیاتی انداز کا خوب استعمال کیا ہے۔ مختصر اور چونکا دینے والے جملے ان کی تحریروں کی خصوصیات ہیں۔

لسانیات کے ضمن میں جن افراد نے خاص طور پر تنقیدی مطالعے کیے ان میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی خصوصیت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ انھوں نے لسانیات کے ضمن میں اردو کے صوتی نظام کے تجزیے و تحلیل میں مشینوں اور یورپ کی جدید تکنیک سے مدد لی۔ ان کے متعدد مقالات میں لسانی مسائل پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری، قدرت نقوی اور نجیب الحق فرید کوٹی نے زبان کے ارتقا کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا۔ شوکت سبزواری نے لسانی مسائل پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر ان کی تحقیق نے بعض نئے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ قواعدِ زبان اور دیگر لسانی مسائل پر ان کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ خلیل صدیقی نے لسانیات کے بنیادی مباحث اور اصولوں سے بحث کی۔ قواعد کے ضمن میں صرف پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور نحو پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل تصانیف اس علم میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اڑیہ زبان و ادب

اڑیہ کا علاقہ اور اس کے بولنے والوں کی تعداد

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست اڑیسہ کا کل رقبہ (۶۰۱۷۱٫۷۹) مربع میل اور آبادی (۲۱۶۹۴۸۱۹) ہے۔ اس کے منجملہ (۱۸۴۵۷۹۵۸) افراد نے جو کہ کل آبادی کا ۸۴٫۱۱ فیصد ہوتے ہیں اپنے نام اڑیہ بولنے والوں کی حیثیت سے درج کروائے ہیں۔ موجودہ ریاستِ اڑیسہ ۱۹۳۶ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کی تقسیم کے بعد قائم ہوئی پھر ۱۹۴۸-۴۹ء میں سابقہ دیسی ریاستوں کے علاقے بھی اس میں شامل کر دیئے گئے۔

لسانی نقطۂ نظر سے سمبل پور، گنجام اور کوراپٹ کے علاقوں کی اڑیہ میں باہم تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ان مقامی خصوصیات اور بولیوں نے زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہی کیا ہے۔

دوسری زبانوں سے اڑیہ کا تعلق

اڑیہ اپنی بہنوں بنگالی اور آسامی کی طرح انڈو جرمن زبانوں کے ذیلی گروہ مگدھی میں شمار کی جاتی ہے۔ شمال میں اس کا علاقہ بھوج پوری اور جنوب میں تلگو زبان کے علاقہ سے متصل ہے۔ ایل۔ ایس۔ ایس۔ اومالی (L.S.S. O'Mally) نے "پوری ڈسٹرکٹ گزیٹیر" میں اڑیہ زبان اور لپی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اڑیہ اور بنگالی کی مماثلت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ بنگالی کے برخلاف اڑیہ زبان جس طرح بولی جاتی ہے اسی طرح لکھی بھی جاتی ہے۔ بہر حال علمائے لسانیات و تاریخ کا خیال ہے کہ اڑیہ، بنگالی اور آسامی کا ماخذ کسی دور دراز زمانہ میں ایک ہی رہا ہوگا۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اس صدی کی ابتدا میں ہرپرشاد شاستری کو نیپال اسٹیٹ لائبریری سے بعض بدھی نظمیں دستیاب ہوئیں۔ جو "بدھ گیان اودھان" (Buddha Gaan O'Dohan) کے نام سے شائع کی گئیں۔ اس کے دیباچہ میں شاستری جی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان نظموں کا خالق یا تو کوئی بنگالی ہو سکتا ہے یا پھر بنگال سے ملحقہ کسی ریاست کا باشندہ۔ انھوں نے ایک نظم بھی پیش کی ہے جو تمام تر اڑیہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس اہم قلمی دستاویز سے مشرقی ہندوستان کی زبانوں کے ارتقا اور اس علاقہ کے مذہبی عقائد پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان نظموں کی لسانی ساخت جدید اڑیہ سے اسی قدر قربت یا دوری رکھتی ہے جتنی کہ بنگالی یا آسامی سے۔ بہرحال ان بدھی نظموں سے اس بات کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ اڑیہ، بنگالی اور آسامی کا مبدا ایک ہی رہا ہے۔

اڑیا زبان کے امکانی ماخذ سے متعلق سب سے پہلا اشارہ "ڈھاؤلی" (Dhauli) اور "جوگدا" (Jaugada) اشوکی فرامین اور کھنڈگری کے "ہتی گمپھا" (Hati Gumpha) میں "کھراولی" (Kharavels) کتبوں کی لکھاوٹ میں ملتا ہے ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اڑیسہ کی زبان شاید پالی رہی ہو لیکن اس کا تنہا ثبوت صرف ہتی گمپھا کے حجری کتبات ہی میں ہے جو کہ پالی زبان میں ہیں۔ شاید اس لیے مشہور جرمن ماہر لسانیات پروفیسر اولڈن برگ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پالی ہی اڑیسہ کی اصل زبان تھی۔

ادبی تاریخ کے مختلف دور

کسی قوم کے ادب کو تاریخی ادوار میں بانٹنے کی تمام کوششیں ایک حد تک مصنوعی ہی ہوتی ہیں۔ ہنٹر نے "اڑیسہ" (حصہ دوم) میں اڑیہ ادب کا بھی ایک ضمیمہ شامل کیا ہے۔ من موہن چکرورتی نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء کے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی میں اڑیہ زبان و ادب سے بحث کی ہے۔ اور سارے اڑیہ ادب کے ارتقا کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں پریہ رنجن سین کی کتاب "جدید اڑیہ ادب" کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ ان کے علاوہ تریبنی چرن، اپرنا پانڈہ پنڈت، بنایک مشرا، جگناتھ سنگھ اور پنڈت سوریہ نارائن داس نے بھی اڑیہ ادب کے مختلف تاریخی ادوار پر روشنی ڈالی ہے۔

تریبنی چرن نے اڑیہ ادب کو حسب ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ دورِ سرولا (Sarola)
۱۰۰۰ء سے ۱۵۰۰ کا زمانہ

۲۔ جگناتھ داس یا وشناب (Vishnab) کا دور
۱۵۰۰ – ۱۷۰۰ء

۳۔ اوپندریا کاویہ کا دور ۱۷۰۰ – ۱۸۵۰ء اور

۴۔ رادھناتھ یا جدید دور ۱۸۵۰ء سے آگے

یہ تقسیم جیسا کہ ظاہر ہے ہر دور کے ایک اہم مصنف کی اساس پر کی گئی ہے یعنی سرولا داس۔ جگناتھ داس اوپندر بھانج اور رادھناتھ رے۔

پنڈت سوریہ نارائن داس نے اڑیہ ادب کے تاریخی ادوار کو تین مختلف طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اولاً کسی مخصوص دور کے نمائندہ مصنفین کی بنیاد پر۔ اس اساس پر انھوں نے اڑیہ ادب کو دورِ سرولا، دورِ پنج ساکھا (Panch Saka)، دورِ اوپندر اور دورِ جدید میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی اور ادبی قدروں کی بنا پر نارائن داس نے پھر اس کے چار دور قرار دیتے ہیں۔ ابتدائی دور کو وہ سرولا دور کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد دورِ وسطیٰ ہے جسے وہ بھگتی عقیدہ یا مذہبی ادب کا دور کہتے ہیں۔ تیسرا دور عہدِ وسطیٰ کے بعد کا ہے جس میں اوپندر بھانج کی مرصع نظموں اور کاویوں کا غلبہ رہا ہے۔ اور آخر میں جدید دور ہے۔ تیسری تقسیم انھوں نے سیاسی تاریخ کی بنا پر کی ہے جس کے لحاظ سے اڑیہ ادب پانچ حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یعنی گنگا کا دور، سورج بنسی دور، مغل دور، مراہٹہ دور اور آخر میں برطانوی دور۔

قدیم دور کے اہم رجحانات اور لکھنے والے

سرولا داس کی "مہابھارت" کس زمانہ میں لکھی گئی تھی یہ امر ابھی نزاعی ہے۔ عام طور پر اسے چودھویں صدی کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ممتاز ناول نگار سری گوپی ناتھ موہانتی سرولا کا زمانہ نویں صدی کا قرار دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ نویں صدی سے لے کر تیرھویں یا چودھویں صدی کے درمیان کا کوئی قابلِ ذکر ادبی کارنامہ ہمیں نہیں ملتا۔ کلچر اور ادب کے مورخ اس نمایاں انحطاط کی وجہ برہمی تہذیب کے غلبہ کو قرار دیتے ہیں۔ جس نے بدھ مت اور اس کے مقبول عام ادب کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ برہمنی خیالات و تصورات عام آدمی کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے۔

اڑیہ زبان اپنے موجودہ روپ میں غالباً چودھویں صدی میں سنوری ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں سرکنڈہ داس کی نظموں کیسبا کوئلی (Kesabo Koeli) سرولا داس کی "مہابھارت" اور ابھودوت نارائن کی نثری رزمیہ "ردراسدھانِدھی" (Rudra sudhanidhi) سے ملتا ہے۔ ناتھ سنیاسیوں کی لکھی ہوئی سیشو وید (Sishuveda) اور سپت تنگ (Saptang) اڑیہ زبان کی قدیم ترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہ دونوں حال تک

مخطوطات ہی کی شکل میں تھیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک غیر اڑیائی باشندہ گورکھ ناتھ نے شیو وید لکھی تھی۔ ان دونوں تصانیف کا تعلق ادب سے اتنا نہیں ہے جتنا غیر ادبی مسائل مثلاً تانترکی عملیات اور دیگر مختلف سماجی رسومات سے ہے۔ رودراسدھاندھی جو کہ نثر میں پہلی اہم رزمیہ ہے۔ تیرھویں یا چودھویں صدی کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس رزمیہ میں راجہ اننگ پدماکر کی کہانی کے ذریعہ جو لاولد تھا سینا (Saina) عقیدہ کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں تو یہ نثر میں ہے لیکن نثر اور نظم کا یہ ایک عجیب سا آمیزہ ہے جس میں نثر نظم کی خصوصیات رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ رودراسدھاندھی موجودہ شعری زبان سے بہت کچھ مناسبت رکھتی ہے۔ دوسری اہم نثری تصنیف مادلہ پانجی (Madala Panji) ہے جو پوری کے جگناتھ مندر کی سرگذشت بھی جاتی ہے اس میں واقعات کا بیان لگ بھگ بارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ تاہم اس تصنیف کی تاریخی حیثیت اور صداقت نزاعی ہے۔

مختصراً حسب ذیل تصانیف کو قدیم اڑیہ ادب کی (تقریباً سولہویں صدی تک) نمائندہ تصانیف قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ رودراسدھاندھی از ابہ دھتہ ناراتن سوامی
۲۔ مہابھارت از سرولا
۳۔ راماتن بالارام داس
۴۔ گیتا از اچھوتا نند اور
۵۔ بھاگوت از جگناتھ داس

سرولا داس اڑیہ زبان کا پہلا اہم شاعر ہے اور اس کی "مہابھارت" نہ صرف ایک ضخیم طبع زاد ادبی تصنیف ہے بلکہ اپنے اثر کے لحاظ سے اڑیہ ادب کے ارتقا میں سب سے بلند مقام رکھتی ہے۔ یہ نہ تو سنسکرت کی عظیم رزمیہ "مہابھارت" کا ترجمہ ہے اور نہ اس کی تلخیص۔ البتہ اس میں سنسکرت "مہابھارت" کی کہانی کے بنیادی عناصر کے ساتھ ساتھ کئی دیگر موضوعات اور مضامین شامل ہیں۔ اس کے اسٹائل اور آہنگ میں ایک خاص کشش ہے اور اڑیہ زبان کے جدید شعرا نہ صرف اس کے موضوعات کی رنگارنگی کے قائل ہیں بلکہ اس کے داخلی ترنم کے اتار چڑھاؤ اور مرصع اور شستہ تحریری زبان کے ساتھ مقامی بولیوں کی آویزش سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ اظہار بیان میں کم سے کم الفاظ کا استعمال اور سادگی و پرکاری اس عظیم فن پارہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کے اشعار کا وزن اور ترنم اور خاص طور سے ڈنڈی مالا دریا (ایک خاص قسم کی بحر) کا آہنگ جس کا سرولا داس موجد ہے۔ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور بقول گوپی ناتھ مہانتی "قاری کے جذبات کے زیر و بم کا وہ پوری طرح ساتھ دیتا ہے۔ اس کا آہنگ داخلی ہے اور اس کی موسیقی ایک جذبات انگیز دل کی پکار کی طرح بے شمار نغمے چھیڑ دیتی ہے"۔

یہاں کویلی (Koilis) اور چوتیسی (Chautisa) کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ ان کا مقابلہ انگریزی ادب کے غنائی نغموں (Lyrics) اور حکایتی نظموں (Ballads) سے کیا جاسکتا ہے۔ کویلیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ چوتیسی اور کویلی میں قریبی مشابہت ہے۔ ممکن ہے کہ چوتیسی سنسکرت سے اڑیہ ادب میں داخل ہوئی ہو۔ لیکن اڑیہ میں اس کی مقبولیت اور تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چوتیسی سانیٹ (Sonnet) کی طرح شاعر کو ایک خاص جذباتی جوکھنے میں طبع آزمائی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ سانیٹ ہی کی طرح تغزلانہ رنگ رکھتی ہے۔ لیکن وہ سانیٹ کے مقابلہ میں تین یا چار گنا زیادہ طویل ہوتی ہے۔ محبوب کی جدائی اور فراق کی داستان اکثر اس کا موضوع ہوتا ہے۔ بیشتر یہ رادھا اور کرشنا کی محبت اور جدائی کے اطراف میں گھومتی ہے اور اس میں جذبات کا مخفی پہلو مذہبی پہلو سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ بعض چوتیسیاں خالص مناجات یا بھجن کی شکل میں ہیں۔ منو بودھ چوتیسیاں (Manobodha Chautisa) زندگی کی بے مائیگی اور لایعنیت سے بحث کرتی ہے گیان دایہ کویلی (Gyanadaya Koili) میں یوگا کے نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ بوآ چوتیسی (Boa Chautisi) میں سماجی اور سیاسی واقعات کی پیش قیاسی کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی چوتیسی کا موضوع، اسٹائل اور زبان روایتی ہے لیکن عشق و محبت کی جذبات نگاری میں بعض چوتیسیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

سرولا کی "مہابھارت" کے علاوہ جن دو تصانیف نے اڑیہ ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہیں بالارام داس کی "راماتن" اور جگناتھ داس کی "بھاگوت"۔ بالارام ان پانچ ممتاز شاعروں میں سے ایک ہے جنھیں پنچ ساکھا کہا جاتا ہے بقیہ چار کے نام یہ ہیں جگناتھ، اننتا، جشوبنتا (Jasbo Banta) اور اچوت۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا ان پانچوں شاعروں کا تعلق ایک ہی زمانہ سے تھا۔ تاہم انھیں اس بنا پر ہم عصر قرار دیا جاتا ہے کہ ان سبھوں نے عوام کی روزمرہ زبان میں شاعری کی اور یہ کہ وہ مذہبی درجہ بندی اور بت پرستی کے خلاف تھے۔ سرولا داس کی مہابھارت کی طرح بالارام داس کی "راماتن" کا طرز بیان بہت ہی واضح اور بھرپور ہے اور زبان بڑی جاندار اور پُراثر ہے۔ "راماتن" کے علاوہ بالارام داس نے "ویدانت سراگتا" (Vedant Sara Genta) "سپتنگ جوگسر ٹکا" (Saptang Jogasra Tuka) اور مختصر لیکن بہت ہی اہم "بھابہ سمدرا" (Bhaba Samudra) لکھی۔ جگناتھ داس کی "بھاگوت" اڑیہ ادب کی غالباً سب سے زیادہ مقبول اور مشہور تصنیف ہے۔ اڑیہ ادب اور کلچر میں اس کا وہی مقام ہے جو انگریزی ادب اور کلچر میں انجیل کا ہے۔ یہ نظم دیہات کی اڑیہ زندگی اور تہذیب کے بڑے ہی گہرے نقوش پیش کرتی ہے۔ اس میں الٰہیات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مسائل اور خیالات کو سادہ ترین زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ جذبات کا بھرپور ادراک اور اظہار بیان کی سادگی بھاگوت کی شعری خصوصیات کی جان ہے۔ پنچ ساکھاؤں کی دوسری تحریروں میں اچوت نندا کی "ملکہ انکار سینبتہ" (Malika Anankar Senbita) اور "گرو بھگتی گیتا" زیادہ مشہور ہیں۔ اس دور کے کئی اور مذہبی گیت ہیں جو بھجن "جنن" (Janan) "استوتی" (Stuti)

"گوہاری۔ الی" (Ali) "پرارتھنا اُدز کیرتن" جیسے مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔

دورِ وسطیٰ کے اہم رجحانات اور لکھنے والے

دورِ وسطیٰ کی اڑیہ ادب کی سب سے اہم خصوصیات اس کی غنائی شاعری ہے جس میں شخصی محبت، ذاتی کرب اور حقیقی سکون وطمانیت کی تلاش، نمایاں پہلو رکھتی ہیں۔ ان سب کا اظہار عام طور سے رادھا اور کرشنا جیسے محبت کے موضوع کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ گوپال کرشنا۔ ابھیمانیو (Abhiman Yu) اور باناملی (Banamali) جیسے شاعروں کا موضوع یہی ہے۔ لیکن سوائے چند مقامات کے ایسی شاعری جذباتی اعتبار سے بے اثر اور بے رنگ ہے۔ اس دور کا ایک اور ممتاز شاعر کوی سوریہ بلدیو ناتھ ہے جس نے "چمپو" (Champno) شاعری کی ہے۔ چمپو روایتی اڑیہ گیتوں کی ایک اہم صنف ہے اور آج بھی بے حد مقبول ہے۔ اس میں ہر گیت کی پہلی سطر کا پہلا لفظ اڑیہ کے ایک حرف تہجی سے شروع ہوتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دورِ وسطیٰ کا ادب اپنے اندر کوئی اپج اور نیاپن نہیں رکھتا۔ اس وقت کی شاعری بے انتہا آرائشی، تصنع آمیز اور روایتی تھی۔ چنانچہ دینا کرشنا ابھیمانیو۔ بھکتہ چرن۔ جادومنی۔ دیب درلاؤ بھوپتی پنڈت اور کوی سوریہ بلدیو بھانا ملی اور گوپال کرشنا کے ویشنوی گیتوں میں بھی یہی خصوصیات شریک ہیں۔

دورِ وسطیٰ کے ادب کا دوسرا اہم میدان پُران نگاری کا ہے۔ اس دور میں متعدد پران نگار گزرے ہیں۔ لیکن ان میں سے تین اہم شخصیتیں مہادیو داس پتمبر داس اور کرشنا چندر پٹنائک کی ہیں۔ پرانوں (Puranas) میں ہمیں لوک ادب کی روایات ملتی ہیں۔ اس میں کہانی کا عنصر مہابھارت یا رامائن یا پھر کسی مقامی تاریخی واقعہ یا قصہ سے لے کر اسے شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ صنف شاعری بے حد مقبول رہی ہے۔ اس میں مختلف محیر العقول واقعات کے ذریعہ نہایت ہی سادہ اور غیر مرصع زبان میں دیوتاؤں اور دیویوں کی قدرت اور برتری کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لڑائی سماجی رسوم ورواج اور عقائد کی بھی دلچسپ تفصیلات اس میں ملتی ہیں۔ اس دور کی سب سے اہم پران پتمبر داس ۱۷۲۷ء کی "نرسنگھ پران" (Narusbinch Purana) ہے۔

وسطی دور کے ادب کی تیسری اہم دھارا وہ ہے جسے عام طور سے روایتی رزمیہ شاعری یا "ریتی کاویہ" (Riti Kavya) کا نام دیا جاتا ہے۔ مرصع اور آرائشی زبان کا قصداً استعمال اور الفاظ کی بازی گری اس نوع کی شاعری کا بنیادی مقصد تھا۔ ان کے نزدیک الفاظ کا جذباتی پہلو کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ پیچ در پیچ دار انداز میں ان کی تکرار کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔ اس صنف شاعری کی ممتاز شخصیت اوپندر بھانج (۱۶۷۰ء - ۱۷۲۸ء) کی ہے۔ شاہی جوڑوں، شہزادوں اور شہزادیوں اور امیر طبقہ کی داستانِ عشق اس کی شاعری کا موضوع ہے۔ جس میں مشکل ہی سے کوئی جدت یا ندرت پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوپندر بھانج کا اکثر کلام اپنے پرپیچ اندازِ بیان اور ذکتی الفاظ کی تکرار کی وجہ سے بڑی حد تک ناقابل فہم ہے تاہم اس کی بعض نظمیں اپنے ترنم اور موسیقیت کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول رہی ہیں۔ موجودہ دور کے نقادوں کے نزدیک اس کی شخصیت نزاعی بن گئی ہے۔ فحش نگاری، اوہام پرستی اور الفاظ کی بازی گری کے لیے اسے موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن ان سب خامیوں کے باوجود اس کی تحریر کا آہنگ اور اس کے کلام کا زور کچھ ایسا ہے کہ وہ عہدِ وسطیٰ کا ایک اہم شاعر قرار پاتا ہے۔

اس دور کے چوتھے اہم رجحان کا اظہار بھیما بھوئی (Bhima Bhoi) اور ارکیتھا داس (Arkitha Das) کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ بھیما بھوئی جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک نابینا کنڈھ نگار (Kondh Writer) تھا یہاں ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جو ذات کی الجھنوں میں کھویا ہوا زندگی کا مفہوم تلاش کرنے میں سرگرداں اور حیات وموت کے مسائل سے دوچار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی مفلوک الحال بلکہ سماج سے باہر تھا۔ لیکن اس باغی شاعر کا کلام عرفانی شاعری کے بلند ترین معیار کا حامل ہے۔ وہ اس تحریک کا علم بردار تھا۔ جسے عرف عام میں الکھ دھرم (Alekh Dharam) کہا جاتا ہے۔ اس عقیدہ نے ہندو دیوتاؤں اور مقدس کتابوں کے علاوہ برہمنی مذہب کے بناتے ہوتے سماجی ڈھانچے کو بھی یکسر رد کردیا تھا۔ بھیما خلا کی ایک ایسی تابناک اور غیر مرئی ہستی کو جو اپنیشد کے تصورِ برہما اور بودھی عدمِ مطلق (Pure Void) سے مشابہت رکھتی ہے وجود اور حقیقت کی علامت سمجھتا تھا۔ اس کی غنائی شاعری میں الہیاتی موضوعات پر بعض بہترین شعر ملتے ہیں جن میں ایک ایسا کرب ہے جو بیک وقت ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی۔

وسطی دور کے ادب کا آخری اہم رجحان ہمیں برجناتھ بدجینا (Brajnath Badjina) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس کی "چتورِ بنود" (Chatura Binod) اور "سمر ترنگ" نے بہ حیثیت شاعر اور نثر نگار اس کی اہمیت کا سکہ جمایا۔ ان تصانیف میں ایک ایسی تازگی جوش اور ولولہ ملتا ہے جو اس زمانہ میں کمیاب تھا۔

دورِ جدید

جدید اڑیہ ادب کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں تین ادیبوں سے ہوتا ہے۔ ان میں ایک فقیر موہن سیناپتی ناولسٹ اور بقیہ دو رادھاناتھ رائے اور مدھوسودن راؤ شاعر ہیں۔ فقیر موہن پہلا کہنہ مشق اور منجھا ہوا نثر نگار اور ناولسٹ ہے جس نے سماجی موضوعات کا استعمال کیا۔ اس کے پاس ہمیں حالات و واقعات کی

صحیح جانکاری کے ساتھ ساتھ ایک ایسی زبان ملتی ہے جو اصلیت سے قریب ہے جس میں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے اور عدالتوں میں استعمال ہونے والے فقرے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ اس میں ایک طرح کی لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی ہے۔ "مامو" اور "چمن اٹھ گنٹھ" میں اس کے کردار معمولی مرد اور عورتیں ہیں۔ اس کی آپ بیتی بھی نثر نگاری کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔ جو کام فقیر موہن نے نثر میں انجام دیا وہ ایک اسکول انسپکٹر رادھا ناتھ نے شاعری میں پورا کیا۔ اس کے پاس مقامی پس منظر اور جغرافیائی حدود ملتے ہیں۔ اڑیسہ کا شاید ہی کوئی پہاڑ، جھیل، جنگل یا دیوتا ہوگا جس کے وہ گن نہ گاتا ہو۔ الفاظ کا استعمال روایتی ہونے کے باوجود کاویوں کے ذریعہ قصہ گوئی کا اس کا انداز واقعی بہت پر اثر ہے "دربار" میں ہمیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے اس کے برخلاف مدھوسودن راؤ ایک صوفی منش فلسفی تھا۔ جس کے لہجہ سے مذہبی عقیدت مندی جھلکتی ہے۔ اس کی بعض نظمیں بے مثال غنائی حسن اور مذہبی جوش و خروش کی حامل ہیں۔ یہاں ادیبوں کے اس گروہ کا مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو اپنے آپ کو "سبزہ" لقب سے موسوم کرتا تھا اس گروہ میں آنند شنکر میکنٹھ کالندی اور سرت مکرجی شامل تھے۔ ان کا لہجہ عارفانہ غیر واضح اور خالص نظری ہوتا تھا۔ ان میں ٹیگور کی کافی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد گوپ بندھو اور نیل کنٹھ کے "ستیہ وادی (Satyavadi) اسکول" کو شہرت حاصل ہوئی۔ گوپ بندھو کی "دھرم پد" اور "کاراکویتہ" وغیرہ میں غنائیت کے ساتھ ساتھ وطن پرستی کا جوش و خروش بھی ملتا ہے۔ اور وہ بہت زیادہ مقبول رہی ہیں۔ نیل کنٹھ کی "کاویہ کونارک" اپنی نوعیت کی ایک ہی چیز ہے۔ گوداورش مشرا کے چار بیتی گیت "مایا دھر مان سنگھا" کی رومانٹک غنائیہ نظمیں اور کالندی چرن کا ناول "میترا منیش" (Matira manish) اور ان کی کہانیاں اور نظمیں تیسرے اور چوتھے دہے کی اہم تحریرات ہیں۔ یہاں کنتالہ کاری براکشور داس اور بنچھاندی داس کی وطن پرستانہ نظموں کا بھی تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپیندر کشور اور چندرامنی داس کے ناول گوداورش مہاپترا اور "مہاگوتی پانی گرہی" وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

شاعری

"سبزہ" اور "ستیہ وادی" دبستانوں کے تذکرہ کے بعد جن کے نمائندہ ادیب کالندی چرن پانی گرہی۔ نیل کنٹھ داس اور گوپ بندھو داس، آنجہانی ڈاکٹر مایادھر مان سنگھ، رادھا موہن گارنائک، اننت پٹنائک، چنتامنی، بیہرا، بنود ہراوت اور کنج بھاری داس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مان سنگھ کا رومانٹک کلام، رادھا موہن کے چار بیتی گیت اور اننت پٹنائک کا عوامی مسائل کو دیکھنے کا انقلابی انداز انھیں اڑیہ شاعری میں ایک ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔ خاتون ادیبوں میں نرملا دیوی، بدیوت پربھا اور برہمو تری موہانتی اور پہتیوا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ساچی روترے کی پنڈولپی (Pandulipi) کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ تصنیف اپنے ادعائے مارکسزم کے باوجود مارکسیت اور رومانیت کا ایک عجیب و غریب آمیزہ ہے۔ سواگت ۱۹۵۴ء اور کویتہ ۱۹۶۲ء میں روترے کی شاعری ایک نیا موڑ اختیار کرتی ہے جس میں موجودہ حقیقت کے مقابل فرد کی ذات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس کی جدید ترین نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر پورا چکر کاٹ کر پھر ترقی پسند موضوعات کی طرف رجوع ہوگیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں مہانوجی راؤ اور گرو پرشاد موہانتی نے اپنے مشترکہ مجموعہ کلام "نوتن کویتہ" کے نام سے شایع کیا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جدید شاعری کا غالباً اہم ترین انتخاب تھا۔ جس سے نئی نسل کی بالغ نظری اور فریب زمانہ سے نجات پانے کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔

ایک اور پرگو اور انقلابی شاعر ربی سنگ ہے جو اپنے رنگ کا ایک منفرد اور مقبول شاعر ہے۔ اس نے سماجی ناانصافی کے خلاف اور پچھڑے ہوتے ناآسودہ طبقہ کی تائید میں انتقامانہ جوش و جذبہ کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔

جدید اڑیہ شاعری کے دیگر اہم شعرا کے متعلق ڈاکٹر دیبی پرسنا پٹنائک کے ایک مضمون کے کچھ اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

"دو شاعر سری سیتا کانت مہاپترا اور سری رماکانت رتھ جدید لکھنے والوں کے جھرمٹ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں نے ابھی اپنی عمر کی تیسری دھائی ہی میں قدم رکھا ہے۔ دونوں ہی شاعری کے میدان میں مسلسل تجربے کر رہے ہیں۔ اور دونوں نے مختصر غنائی شاعری اور طویل نظموں میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ سری سیتا کانت مہاپترا کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جدید حالات کے چوکھٹے میں قدیم دیومالائی قصوں کا احیا کیا ہے اور ان میں روح پھونکی ہے۔"

"رماکانت نے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ مختصر اور طویل دونوں طرح کی شاعری کے تجربے کیے ہیں۔ ان کے کلام کی ذہنی سطح کافی بلند ہے ان کی بعض ابتدائی نظموں میں اگرچہ ترتیب و تنظیم کا سقم ہے تاہم ان کا شعری تصیم قابو سے باہر نہیں ہو پاتا۔"

جدید اڑیہ کی تمام اصناف ادب میں غالباً شاعری ہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور جس نے متعدد لکھنے والے پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے چند شاعروں کے نام یہ ہیں جو میدان شاعری میں مختلف نوع کے تجربے کر رہے ہیں۔ دیپک مشرا۔ سبھاگیہ کمار مشرا۔ بیبک جنا۔ ہری ہر مشرا۔ ہرپرشاد داس۔ دیوی داس چھوترے۔ اور پھر سنا پٹانی وغیرہ۔

ڈرامہ

جدید اڑیہ ڈرامہ کا آغاز انیسویں صدی کے آخری دہائی میں غیر پیشہ ور شوقیہ تھیٹر سے ہوا۔ اولین اڑیہ ڈرامہ "باباجی" جسے جگموہن لال نے لکھا تھا چار ایکٹ پر مشتمل تھا۔ رام شنکر رے کا "کانچی کاویری" ۱۸۸۰ء ایک اہم تاریخی اور سماجی ڈرامہ تھا۔ رام شنکر نے تاریخی دیومالائی اور سماجی غرض ہر طرح کے ڈرامے لکھے اشونی کمار گھوش نے اڑیسہ میں پیشہ ورانہ اسٹیج کی بنیاد رکھی اور خود بھی کئی نثری ڈرامے لکھے۔ لیکن اڑیہ ڈرامہ

کو آزادی سے قبل جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس کا سہرا کالی چرن کے سر ہے۔ کالی چرن کے علاوہ گوپال چھوترے، رام چندر مشرا، بھنج کشور پٹنائک، پرنا بند ھوکار، اور جادونا تھ داس مہا پترا بھی سماجی موضوعات کی پیش کش میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے بعد قابلِ ذکر ڈرامہ نگار یہ ہیں: منورنجن داس، بسوا جیت داس، بجے مشرا، اور کارتک رتھ۔ ان سب میں منورنجن سب سے زیادہ اہم ہیں ان کے ڈرامہ "ارنیار فصلا" کو ساہتیہ اکیڈمی کا اوارڈ بھی مل چکا ہے۔ بسوا جیت کا "مرو گایہ" بجے مشرا کا "سبا باہک مانے" (تابوت بردار) اور کارتک رتھ کا "سورگ دوار" غالباً سب سے زیادہ معنی خیز ڈرامے ہیں۔

ناول اور افسانہ

گوپی ناتھ موہانتی اور ان کے بھائی کانھو چرن اڑیہ کے دو ممتاز ناول نگار ہیں۔ گوپی ناتھ نے قبائلی فرقوں کے ساتھ رہ بس کر ان ہی کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی "امرترسنتان" "پرجا" اور "ہریجن" میں ان ہی پچھڑے ہوتے لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے پاس محض سماجی حقیقت نگاری نہیں ہے بلکہ جو چیز ان کے فکشن کو ممتاز کرتی ہے وہ ان کا انسان کے ناگفتہ بہ بنیادی مسائل سے گہرا تعلق خاطر ہے وہ ایک اقراری (Committed) ادیب ہیں۔ ان کی وفاداری محض سماجی نہیں بلکہ وجودی (Existe-ntial) نوعیت کی ہے۔ ان کی زبان بے حد عام پسند اثر انگیز اور شاعرانہ ہے۔ شری موہانتی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی اسی قدر مشہور ہیں۔ ان کی "امرترسنتان" پہلی اڑیہ تصنیف ہے جسے ۱۹۵۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی کا اوارڈ ملا ہے۔ ان کے بڑے بھائی کانھو چرن غالباً اڑیہ کے سب سے زیادہ لکھنے والے اور سب سے زیادہ مقبول ناول نگار ہیں۔ وہ بہت ہی سیدھے سادے موضوعات اور واقعات کا استعمال کرتے ہیں اور ان کا اسلوب بہت ہی پُرکشش اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں گاؤں کا ماحول اور وہاں کے عوام اپنی پوری مسرتوں اور دکھوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے ناول "کا" (Kaa) کو ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ بعض دیگر ممتاز ناول نگار یہ ہیں۔ سریندر موہانتی، نتیانند مہاپترا، راج کشور پٹنائک، بسنت کماری پٹنائک، گوبند داس، ببھوتی پٹنائک، سنتانو اچاریہ، مہاپترا نیلامنی، چندر شیکھر رتھ، فتورانند، بھاگیرتی نیپک وغیرہ۔ سریندر موہانتی نے اپنے ناول "اندھا دیگانتہ" میں موجودہ دور کی سیاسی حقیقت اور اس کے چڑچڑے پن اور اس کی نفرت پرستی و کلیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے دوسرے ناول "نیل سیلا" میں جسے ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ مل چکا ہے انھوں نے بھگوان جگنا تھ کے سارے مذہبی رسوم تاریخی چوکھٹے میں پیش کیے ہیں۔ راج کشور پٹنائک ایک اور ناول نگار ہیں جن کا اپنا ایک خاص ڈھنگ ہے۔ بسنت کماری پٹنائک کے ناول "امداباتہ" اور "چورابالی" بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں ناول کے کرداروں کی نگاہ سے موجودہ حقائق کا بہت ہی خاموش لیکن بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ کالندی چرن پانی گرہی کا "متریامانس" ایک جاندار اور مقبول ناول ہے انگریزی کے ترجمے کے علاوہ وہ اب کئی ہندوستانی زبانوں میں بھی دستیاب ہوتا ہے "متریامانس" کی ساری خوبی اس کی بھرپور سماجی عکاسی اور اس کی قوت بیان میں ہے آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں میں سنتانو اچاریہ اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے ایسے موضوعات کو اپنایا ہے جن سے اب تک تغافل برتا جاتا تھا۔ ان کے پہلے ہی ناول "ناراکنارہ" نے اڑیہ فکشن میں ایک نئی روایت کی بنا ڈالی لیکن ان کے دوسرے ناولوں "ست بر برا ابھی کیتا" اور "تنوتی راتیسرا سکالہ" میں موضوع کی شدت کا وہ معیار قایم نہیں رہا جو پہلے ناول میں تھا "ناراکنارہ" ایک جدید ناول ہے جس میں محض سماجی حقائق کی بجائے فرد کی ذات سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلہ کے دو اور خوبصورت اور اثر انگیز ناول گوبند داس کا "امدبسیارہ چندرا" اور چندر شیکھر ناتھ کا "جنترردہ" ہیں جہاں "امدبسیارہ چندرا" کا ہیرو عملاً ایک اینٹی ہیرو ہے جو نہ تو کسی قسم کے ذہنی التباسات میں مبتلا ہے اور نہ ہی خیالی پلاؤ پکاتا ہے وہیں "جنترردہ" برہمالی کا اہم کردار دیہات کا ایک اینٹی ہیرو ہے۔ ببھوتی پٹنائک افسانوی ادب کا ایک بسیار نویس قلم کار ہے اور اسی قدر مقبول بھی ہے

جدید اڑیہ افسانہ کا تنوع اور پھیلاؤ کا اندازہ گوداورش مشرا، بھاگ بتی پانی گرہی، راج کشور رے، کالندی چرن پانی گرہی، کانھو چرن موہانتی اور دیگر کئی ادیبوں کی نگارشات سے کیا جاسکتا ہے۔ آزادی کے بعد گوپی ناتھ موہانتی، سریندر موہانتی، باما چرن مترا، اکھیل موہن پٹنائک، نندی ستپتی، منوج داس، کشوری داس، مہاپترا نیلامنی، سنتانو آچاریہ، کرشنا پرشاد موہانتی، پنیا پنت موہانتی، ربی پٹنائک کے علاوہ اور کئی لکھنے والوں نے اڑیہ ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی بعض تحریریں بڑی ہی خیال انگیز ہیں جن میں اصلیت کی تلاش اور زندگی کے حقیقی مفہوم کی جستجو کا ایک بے پایاں جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں سریندر موہانتی اور گوپی ناتھ موہانتی اپنے قوتِ بیان کی وجہ سے سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ سریندر موہانتی کی کہانیاں اپنے اندر تازگی رکھتی ہیں اور ان کے تیکھے اور تیز الفاظ ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑتے ہیں۔ گوپی ناتھ کی تحریریں زیادہ موثر ہیں۔ وہ عام زبان اور روزمرّہ کا زیادہ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ منوج، سنتانو، کرشنا پرشاد اور اکھیل موہن نے بھی اڑیہ افسانہ نگاری میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔

ادبی تنقید

آزادی سے قبل ادبی تنقید کا سرمایہ بہت ہی کم تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس کی نوعیت "بے کیف لیکن فاضلانہ" تھی۔ عہد وسطیٰ کے بعض غیر اہم اڑیہ شاعروں پر پروفیسر ارتہ بابو موہانتی کے دیباچے اور پنڈت نیل کنٹھ داس اور چتامبر آچاریہ وغیرہ کی بعض متفرق تحریریں اس قبیل کی ہیں۔ سریندر موہن پہلے نقاد ہیں جن کی "فقیر موہن سمکشا" نے تنقید نگاری کی طرح ڈالی۔ اور اس میدان میں کئی تصانیف کے لیے جن میں نٹا با سامنت راے

اوپیندر مشرا اور منشی دھرم جہانتی کی تصانیف بھی شامل ہیں راستہ صاف کیا۔ یہاں پنڈت گوپی ناتھ نندا کی "بھارت درپن" کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس میں "مہا بھارت" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دیگر اسکالروں میں میتھاتی پٹنا نک، جانکی موہانتی، گوری بہیرا، کنج بہاری داس اور اشیت کوی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر مایا دھر مان سنگ کی "تاریخ اڑیہ ادب" نے اپنے نزاعی ریمارکس اور غیر فیاضانہ تبصروں کی وجہ سے اڑیہ کے ادبی حلقوں میں ایک ہل چل مچا دی۔ جتندر موہن موہانتی نے جدید اڑیہ شاعری کو مغربی اصول تنقید نگاری پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری زبانوں کے ادب کے اثرات

ایک تقابلی جائزہ

ادب میں دوسری زبانوں کے اثرات کی بحث کسی قدر بے معنی ہوتی ہے۔ علم کی بڑھتی ہوئی آفاقیت کے دور میں جب کہ تہذیب، زبان اور ادب کے حدود ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اس قسم کا سوال ایک حد تک بے سود معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اڑیہ ادب کے نشو و نما میں ہم بعض گہرے اثرات کی جانب اشارہ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک دور وسطی کے غنائیہ کلام کا تعلق ہے ہم اس وقت کے شاعروں میں جے دیو کی "گیتا گووند" اور سنسکرت کاریہ" کے اثرات نمایاں طور پر پاتے ہیں۔ آنے والے دور پر اوپندر بھانج کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں راد ھا ناتھ رے کی نظموں مثلاً "پاروتی" اور "اوشا" وغیرہ میں ہم مغربی کہانیوں قصوں اور رجاریتی گیتوں کے اثرات دیکھتے ہیں۔ اس ادبی گروہ پر جو اپنے آپ کو "سبزہ" کے نام سے موسوم کرتا تھا ٹیگور کے کافی اثرات پڑے ہیں۔ بحیثیت مجموعی دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب کی طرح اڑیہ ادب پر بھی مغربی ادبی روایات خاص طور سے رومانٹک اور مارکسی اثرات اور آخر میں وجودیت کی تحریک کے اثرات کافی نمایاں رہے ہیں۔ ساچی روترے اور اننت پٹنائک کی ابتدائی تحریروں پر مایاکووسکی کا اثر بھی موجود ہے۔ موجودہ دور کی آگہی اور اس کی اصلیت کو ایک مخصوص پیرایہ بیان عطا کرنے میں ہم ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے "شعور کی رو" "منفی صلاحیت" "تفریق حسیت" اور "شخصیت سے فرار" جیسی ادبی اصطلاحات کا استعمال نہ صرف ادبی تنقید میں کیا جاتا ہے بلکہ اڑیہ زبان کی دوسری اصناف ادب میں بھی ہم ان کے اثرات محسوس کرتے ہیں۔ تاہم ایسے اثرات خواہ وہ مغربی ہوں یا مشرقی استادان سخن کے نزدیک ایک خارجی محرک ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس سے وہ اپنی ادبی روایات تہذیبی علاقوں اور تجربوں کو ایک نئی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بضرورت مدد لیتے ہیں۔ بعض ایسے ادیب بھی ہیں جو شعوری طور پر ماضی کی طرف دیکھتے ہیں اور قدیم روایات کے معنی موجودہ دور کی قدروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تراجم

جہاں تک دوسری زبانوں سے اڑیہ میں تراجم کا تعلق ہے اس سلسلہ میں قابل لحاظ کام ہو چکا ہے۔ نہ صرف انگریزی زبان سے ترجمے ہوتے ہیں بلکہ روسی، فرانسیسی، جرمن اطالوی۔ جاپانی اور دیگر بیرونی زبانوں سے بھی ترجمے کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ تراجم زیادہ تر اصل زبان کے انگریزی نسخوں ہی پر مبنی ہیں۔ ان کا نقص یہ ہے کہ وہ اکثر جگہ انگریزی کے لفظی ترجمے ہو کر رہ گئے ہیں اور اس طرح اصل سے بہت ہٹ گئے ہیں۔ البرٹ کامو، رومے رولاں، بینٹ جان پرس، ہرمن ہیس، کافکا، گراز یہ دلیدا، ٹالسٹائی، گورکی، مایاکووسکی اور داستووسکی کے ترجمے اڑیہ میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد اینگلو امریکن مصنفوں کے بھی ترجمے ہوتے ہیں۔ سندر ورما نے ایلیٹ، پونڈ اور ویٹمین کے ترجمے کیے ہیں لیکن اکثر ترجموں میں اصل متن یا کہانی کا صرف خاکہ ہی ہوتا ہے اور اصل تصنیف کے اسٹائل یا مخصوص خوبیوں کا مشکل سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم گوپی ناتھ مہانتی کا گورکی کی "میری تعلیم گاہیں" کا ترجمہ۔ اننت پٹنائک کا گورکی کی "ماں" کا ترجمہ اور رحیبا نانند پانی کا لورکا کی بعض نظموں کا ترجمہ اس سے مستثنیٰ ہے اڑیہ سے ہندوستان کی دوسری زبان میں اور ان زبانوں سے اڑیہ میں کافی ترجمے ہوتے ہیں۔ یہ کام مرکزی ساہتیہ اکیڈمی کی سرپرستی اور نیشنل بک ٹرسٹ کی "آدان پردان" اسکیم کے تحت انجام پایا ہے۔ ایسے ترجموں کی فہرست کتابیات بھی دستیاب ہوتی ہے۔

اڑیہ سے انگریزی میں ترجموں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ فقیر موہن سیناپتی کی "گھامن اتھ گنتھ" کے دو انگریزی ترجمے ہوتے ہیں۔ سی۔ وی ۔ این داس کے ترجمے میں اصل کی اسپرٹ شاید ہی باقی رہی ہے۔ دوسرا ترجمہ دراصل تلخیص ہے اور اس میں بھی اصل کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ کوئی پندرہ سال پہلے ہرندر ناتھ چٹرجی نے ساچی روترے کی نظموں کا ترجمہ "کھنلتی رانی اور دیگر نظمیں" کے عنوان سے کیا تھا لیکن یہ ترجمہ بھی اچھا نہیں ہے۔ حال ہی میں سیتا کانت مہاپترا کی نظموں کے تین مجموعوں کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ان کے نام ہیں "پرسکون تشدد" "بوڑھا گرمیوں میں" اور "سکوت دیگر"۔ سوبھاگیہ مشرا کی نظموں کا بھی ایک مجموعہ "جوابی کارروائی" کے عنوان سے انگریزی میں شائع ہوا ہے۔

بچوں کا ادب

رسالہ جات اور حوالے کی کتابیں

ادب کے ارتقا میں رسائل کی اہمیت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکتا ہے۔ پہلا مطبع اڑیسہ میں ۱۹۳۷ء میں قایم ہوا اور پہلا اڑیہ میگزین "گیان اروِن" یعنی طلوع علم ۱۸۴۹ء میں شایع ہوا۔ ریورنڈ لیسی اس کے مدیر تھے "گیان اروِن" سے پہلے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک رسالہ "کوکی بارہ پترا" نکلتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے رسالے اڑیہ ادب کے حق میں آب حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان میں سے چند مشہور رسائل یہ ہیں "اتکل دیپک" ۱۸۶۶ء "بالاسور سمید بجیکہ" ۱۸۶۸ء "اتکل ہیتسی" (۱۸۶۹ء) "اتکل درپن" اور بجلی ۱۸۹۳ء۔ اور "اتکل مدھوپہ" (۱۸۷۸ء) "اتکل پربھا" ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ جس نے ایک ادبی فضا تیار کی اور اڑیسہ میں پہلی مرتبہ ممتاز ادیبوں کو معاوضہ بھی دینا شروع کیا۔ اتکل ساہتیہ ۱۸۹۷ء نے بھی ادب کی رہبری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

اس صدی کے دوسرے دہشک میں "مکرا" "سپتہ بدی" "ساہکار" اور "جگ بینا" نے پڑھنے والوں کا ایک نیا طبقہ اور ادبی قدردں کا ایک نیا معیار قایم کیا۔ آزادی کے بعد کے بیس تیس سال میں وقتاً فوقتاً کئی چھوٹے چھوٹے رسالے نکلتے اور بند ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض جو اب بھی نکل رہے ہیں یا جو اپنے اثر و نفوذ کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں: "جھنکار" "دغارو" "دیگانتہ" "پراجیہ" "جبن رنگا" "بنولی" "اسنتہ کالی" "دگانس" وغیرہ۔ نیان کھنٹ جسے ابتداً شاعرگو داورشس مہاپترا ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ سماجی طنز نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے "اڑیسہ ساہتیہ اکیڈمی" بھی ایک ادبی رسالہ "کونارک" کے نام سے نکالتی ہے لیکن اس کی اشاعت باقاعدہ نہیں ہے۔ چیندر موہن موہانتی اور سیتاکانت مہاپترا کی ادارت میں "بھونیشور ریویو" کے نام سے انگریزی میں ایک بہت ہی اہم جرنل نکلتا ہے۔ اس میں تراجم اور مباحث کے ذریعہ اڑیہ زبان و کلچر کے بہت ہی اچھے نقوش پیش کیے جاتے ہیں۔

سنتانو آچاریہ، جن کی موہانتی، جگناتھ موہانتی آننت پٹنائک اور کئی دوسرے ادیبوں کا بچوں کے ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ "من پاہن" "موویش" "جھاماسق" "براچھ" وغیرہ جیسے رسائل کہانیوں اور مختلف مضامین کے ذریعہ علم کی روشنی بچوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اڑیہ روزنامہ "پرجاتنتر" میں بچوں کا حصہ جو "مینابازار" کہلاتا ہے قابلِ داد ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے بھی بچوں سے متعلق اپنی کتابوں کے اڑیہ ترجمہ نکالے ہیں۔

حوالے کی کتابوں کی تدوین کے لیے عالمانہ صلاحیتیں درکار ہیں۔ ایسی کتابیں کسی زبان اور اس کے ادب کی ترقی میں اہم مقام رکھتی ہیں یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں تخلیقی فن کار مشکل ہی سے دلچسپی لیتے ہیں بھانومنوج کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ تقریباً تن تنہا گیان منڈل کے نام سے اڑیہ انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں یکے بعد دیگرے نکالتے جا رہے ہیں۔ اتکل یونیورسٹی کے پاس بھی اڑیہ انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کی ایک تجویز ہے جس کی ذمہ داری آنجہانی ڈاکٹر مایادھر مان سنگ کو سونپی گئی تھی۔ یہ کام ابھی نامکمل ہی ہے۔

کئی ناولوں کو ڈراموں اور فلمی اسکرپٹ میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کانھوں چرن کے "کا" "نسوت گوری پٹنائک کے "امداد بانا" کالندی چرن پانی گرہی کے "مستر بانش" اور منسرابلا پانیز ادپندر کشورداس کے "ملاجنہا" وغیرہ کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

اطالوی زبان وادب

اطالیہ کی سرکاری تعلیمی ادبی اور قومی زبان اطالوی ہے۔ لیکن زندگی کے معمولی کاروبار اور روزمرہ کی بول چال میں یہ زبان بہت کم برتی جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے اطالوی اپنے ملک کی متعدد مقامی بولیوں یا قومی زبان کی مقامی شکلوں کا استعمال کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو قومی زبان بول ہی نہیں سکتے اور صرف مقامی بولی ہی جانتے ہیں۔ اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ اطالوی کم و بیش پانچ کروڑ انسانوں کی زبان ہے اور اطالیہ کے علاوہ سوئٹزرلینڈ ضلع ٹی چی نو (Ticino) اور جزیرہ کارسیکا میں بولی جاتی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ اور ارجنٹینا (Argentina) میں آبسنے والے اطالوی مہاجرین ایک عرصے تک اطالوی زبان بولتے رہے لیکن اب انہوں نے انگریزی اور ہسپانوی زبانیں اپنالی ہیں اور اطالوی ترک کر دی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اطالیہ نے اپنی افریقی نوآبادیاں کھو دیں تو وہاں بھی اطالوی زبان کا چلن آہستہ آہستہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اطالیہ کی مقامی بولیوں کا اپنا اپنا ادب اور بعض صورتوں میں بہت اچھا ادب موجود ہے۔

فرانسیسی ہسپانوی پروونسال (Provencale) رومانیائی (Roumanian) پرتگیزی اور کتلانی (Catalon) کے ساتھ اطالوی ان زبانوں میں سے ہے جو لاطینی سے براہ راست نکلی ہیں اور رومانی (Romance) نو لاطینی (Neo-Latin) زبانیں کہلاتی ہیں۔ فلارنس کی بولی فیورنیتی (Florentine) چند آمیزشوں اور اضافوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اطالیہ کی قومی زبان کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ اطالوی دیس کی متعدد بولیاں (Dialects) بول چال کی لاطینی کے بطن سے اسی طرح وجود میں آئیں جیسے ہندوستان میں سنسکرت سے مختلف پراکرتیں۔ رومہ کی شہنشاہی میں (جو اطالیہ پر محیط تھی) لاطینی کی دو شکلیں رائج تھیں۔ ایک عامی (Plebius) جو بعد میں عامیانہ یا بازاری لاطینی (Vulgaris) کہلانے لگی اور دوسری شستہ یا ادبی لاطینی، عامیانہ لاطینی اطالیہ کے مختلف علاقوں میں بول چال اور تحریر دونوں میں مستعمل تھی۔ گو اس کی تحریری دستاویزات کا سراغ دسویں صدی عیسوی سے بیشتر مشکل ہی سے ملتا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ عامیانہ لاطینی میں مقامی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اس کی کئی علاقائی شکلیں اطالوی بولیوں کے روپ میں نمودار ہوئیں۔ ان میں فیورنیتی یا تسکانوی (Tascano= Tuscan) جو لاطینی سے زیادہ قریب تھی آہستہ آہستہ دوسری بولیوں پر غالب آتی گئی۔

دانتے نے جب چودھویں صدی میں اپنی کتاب "کچھ عوامی زبان کے بارے میں" (De Vusgris Eloquentia) لاطینی میں تصنیف کی تو یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملک کی ادبی زبان ایسی ہونی چاہیے جو اطالیہ کی ساری بولیوں سے مرکب ہو لیکن جب اس نے اپنی لافانی شاعری کے لیے اپنے وطن

فلارنس کی بولی کو منتخب کیا تو گویا آئندہ ملک کی ادبی زبان بننا اس بولی کا مقدر ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء میں اطالوی اکاڈمی نے جو لغت تیار کی اس میں یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ اطالوی کا تنا تو فلارنس ہے لیکن اسے ملک کی ساری بولیوں سے رس حاصل ہوتا رہا ہے۔ اس لغت میں رومہ کے تلفظ اور محاورے کو (جو ۱۸۷۱ء سے اطالیہ کا پایۂ تخت ہے) کافی اہمیت دی گئی ہے۔ گویا اطالوی زبان کے محور کے دو نقاط فلارنس اور رومہ ہیں چنانچہ بعض لوگ " رومی ذہنوں میں تسکانوی زبان میں بات کرتے ہیں اور لسانی نصب العین سمجھتے ہیں۔"

اگر ان تھوڑے سے عربی، یونانی، فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی مشتقات سے قطع نظر کیا جائے جو اطالوی میں پائے جاتے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ زبان دراصل لاطینی ہی ہے۔ اس کے حروف بھی لاطینی ہیں۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ صرف و نحو اور عروض سب زیادہ تر لاطینی ہی سے لیے گئے ہیں۔ وحشی جرمن قبائل کے متعدد حملوں اور ملک کے مختلف علاقوں میں گاہ بہ گاہ فرانسیسی، ہسپانوی اور عربی تسلط کے باوجود اس زبان پر بیرونی اثرات کم مرتب ہوئے اور اس کی اصلیت اور لاطینیت ہمیشہ برقرار رہی۔ بہت کم لفظ اس کی لغت میں بدیسی ہیں (یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ جن لفظوں میں اے ال (Al) یعنی "ال" کا سابقہ پایا جاتا ہے وہ عربی الاصل ہیں۔ اس لحاظ سے عموماً اور صوتی اعتبار سے خصوصاً اطالوی ایک با اصول اور قاعدہ پرست زبان ہے۔ اس میں ہر آواز کے لیے ایک ہی حرف استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے اگر کوئی نو آموز حروف کی آوازوں سے واقف ہو جائے تو اس کا بولنا اور لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ البتہ صوتی تاکید (Accent) کا صحیح استعمال ایسا سہل نہیں ہے۔

اطالوی ادب

اطالیہ میں لاطینی لسانی روایت اتنی ہمہ گیر تھی کہ یہاں مقامی ادب کو جنم لینے میں یورپ کے بعض دوسرے دیسوں، جیسے فرانس اور ہسپانیہ، کے مقابلے میں زیادہ دیر لگی۔ تیرہویں صدی سے پہلے اس کے آثار نظر نہیں آتے پہلے پہل اطالوی دیسوں میں جو نیا لاطینی ادب مقبول ہوا وہ پرووناں گیت تھے ان گیتوں کے لکھنے اور گانے والے فرانس کے ایک صوبے پرووانس (Provence) کے مغنی تھے جنہیں فرانسیسی میں تروبدور (Troubadour) کہا جاتا تھا۔ شروع میں اطالوی شاعروں نے بھی جو شعر کہے وہ انہیں گیتوں کی کچی پکی فرانسیسی میں لکھی ہوئی نقلیں تھیں۔ ۱۲۵۰ء کے بعد سے سارے اطالیہ میں مقامی ادب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن پہلے اہم لکھنے والے جزیرہ سسلی کی راجدھانی پلیرمو (Palermo) میں فریڈرک دوم (۱۱۹۴ء - ۱۲۵۰ء) کے دربار میں ملتے ہیں۔ جیسے چولو (Ciul Lo) دلکانو (d' Alcano) جاکومو داسنتی نی (Giacomo — Da Sentini —) اور خود فریڈرک کا بیٹا مانفریڈ (Manfred) ان لوگوں نے سسلی کی بولی میں شعر کہے اور ایک مخصوص درباری طبقے کی کسی قدر تصنع آمیز زبان برتی۔ ان کی شاعری پر تروبدور مغنیوں کی طرز کی گہری چھاپ ہے۔ کچھ اسی طرح کا ادب نیپلز اور رومہ میں بھی پیدا ہوا۔

تیرہویں اور چودہویں صدی

تیرہویں صدی کے مذہبی احیا نے جو طاقت ور زاہدانہ تحریکیں پیدا کیں ان میں سینٹ فرانسس کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سینٹ فرانسس نے امبریا (Umbria) کی مقامی بولی میں ایک بہت سادہ لیکن پرتاثیر نظم "بھائی سورج کا گیت" یا "مخلوق کا گیت" ۱۲۲۵ء میں کہی تھی جسے ایک طرح کی متوازن نثر کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح کی پرجوش و پرتاثیر لیکن فنی طور پر ناپختہ مذہبی شاعری ہمیں تودی (Todi) کے یاکومو دے ای بنے وتی (Jacomo Dei Benedetti) کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اسے عام طور پر یاکوپو نے داتودی (Jacoponeda Todi) کہا جاتا ہے اور جس کی وفات ۱۳۰۶ء میں ہوئی۔

لیکن اطالیہ کا اعلیٰ ادب اطالوی زبان کی طرح تمکادہ کے صدر مقام فلارنس میں نمودار ہوا۔ یہاں شروع میں تودی تروبدوری طرز کی شاعری کی گئی لیکن گوید و گوینی چیلی (Guido Guinicelli) نے اس عشقیہ شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ گوید وگوینی چلی اور اس کے زیر اثر لاپو جانی (Lapo Gianni) دینو فریسکو بالدی (Dino Frescobaldi) جینو داپستویا (Gino Da Pistoia) اور گوید و کو لکانتی (Guido Cauaccanti —) نے ایسے سانیٹ اور گیت لکھے جن کا محور ایک محبوبۂ دلنواز کی ذات تھی۔ ان لوگوں نے عورت کی محبت کو پاکیزہ خیالی اور شرافت کا سرچشمہ قرار دیا۔ دانتے نے جب اپنی "حیات نو" (Vita Nova) تصنیف کی تو اس میں اسی کتب خیال کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ پاکیزگی عشق جو افلاطونی تصور ان شاعروں میں دکھائی دیتا ہے وہ وہی ہے، جس کی روایت فارسی اور پھر اردو شاعری میں اس قدر گہری نظر آتی ہے۔

"جب عشق مجھ میں سانس لیتا ہے تو میں شعر کہتا ہوں اور اس طرح کہ وہ کہتا جاتا ہے اور میں لکھتا جاتا ہوں" (دانتے)۔ اس گروہ میں دانتے کو چھوڑ کر سب سے بڑی شخصیت گوید و کو لکانتی کی ہے جس کے گیتوں سانیٹوں اور بلاتون (Balla-to-Ballads) میں فلسفیانہ، ماورائی اور صوفیانہ عناصر گھل مل گئے ہیں اور جس کی سادہ، ہائکی، دلگیر و دل سوز عشقیہ نظموں سے بہتر اشعار سوائے دانتے کے اور کہیں نہیں ملتے۔ اس کی شاعری میں عشق و حرماں نصیبی کی نفسیات گویا نقطۂ عروج پر ہے۔

دانتے۔ پترارک۔ بوکاچو

دانتے (Dante) پترارک (Petrarch) اور بوکاچو (Boccaccio) اطالوی ادب کے بزرگان ثلاثہ ہیں۔

دانتے الی گی ایری (۱۲۶۵ء - ۱۳۲۱ء) (Dante Alighieri) اطالیہ کا سب سے بڑا شاعر اور دنیا کے گنے چنے چوٹی کے شاعروں میں سے ایک ہے۔ اس کی نظم "آسمانی کامیڈی" (ڈِواٹن کامیڈی) (Divine Co-medy) یا ڈیوینا کمیدیا عالمی ادب کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ کامیڈی کے لفظ کا ترجمہ ناٹک یا طربیہ کرنا صحیح نہیں کیوں کہ دانتے نے اس لفظ کو ایک ایسی تصنیف کے معنوں میں استعمال

کیا ہے جو کلاسیکی رزمیہ شاعری کے پُرشوکت اسلوب کے مقابلے میں ایک درمیانی اسلوب کی حامل ہے اور دانتے نے بطور انکسار اپنی نظم کو کامیڈی کہا ہے۔ اس نظم میں جو تین حصوں جہنم، اعراف اور جنت پر مشتمل ہے دانتے عالم بالا کی سیر کرتا اور روحوں کو عذاب سہتے یا ثواب کی برکتوں سے محظوظ ہوتے دیکھتا ہے۔

چوں کہ آسمانوں پر بھی اسی انسانیت سے سابقہ ہے جو کبھی زمین پر بستی تھی۔ اور جس کی نسل اب بھی یہاں آباد ہے اس لیے اس نظم میں گویا آسمان کے ڈانڈے زمین سے ملے ہوئے ہیں اور یہ نہ صرف عیسائیت کا سب سے اعلیٰ ادبی اظہار ہے بلکہ اس میں مسیحی یورپ کے دور وسطیٰ کی پوری زندگی اپنے سارے پہلوؤں اور اپنی ساری اخلاقی اور مذہبی قدروں کے ساتھ سمٹ آتی ہے۔ "آسمانی کامیڈی" میں مسیحیت کی حدیں افلاطونی تصور عشق سے ملتی نظر آتی ہیں کیونکہ دانتے جب دوزخ اور اعراف کی سیر کرتا ہے تو اس کا مرشد و راہبر رومہ کا مشہور شاعر ورجل ہے لیکن جب وہ جنت کے دروازے پر پہنچتا ہے تو ورجل اس سے رخصت ہوتا ہے اور اس کی محبوبہ بی ایٹرس (Beatrice) اسے عالم انوار کی سیر کراتی ہے اس طرح گویا عشق مجازی کو عرش بریں کا تقرب حاصل ہوگیا۔ اس نظم کے علاوہ دانتے نے بہت سے سانیٹ، گیت، بلانتے اور کنائی نظمیں (Allegories) لکھیں جن کا مجموعہ "اشعار" (Le Rinee) کہلاتا ہے۔ لاطینی نثر میں دانتے نے اپنے عہد کی سیاست فلسفے اور لسانیات پر بہت سے رسالے اور اطالوی میں اپنی سوانح "حیات نو" تصنیف کی۔ فرانچسکو پترارکا (Franscesco Petrarca) یا پٹرارک (Petrarch) (۱۳۰۴ — ۱۳۷۴ء) اپنے سانیٹوں کے لیے مشہور ہے جنھیں کچھ مزید گیتوں اور عاشقانہ نظموں کے ساتھ اس نے "گیتوں کی کتاب" (Canzoiere) کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان سانیٹوں میں اس نے اپنی محبوبہ لارا (اطالوی لاورا) (Laura) کے ساتھ اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ پٹرارک کے عشق میں افلاطونیت کم ہے اور اس کی معشوقہ لارا بی ایٹرس کی طرح ایک علامت نہیں بلکہ ایک ایسی عورت ہے جس کی رگوں میں انسانی خون کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ پٹرارک کی شاعری نے سارے یورپ کو متاثر کیا اور سانیٹ کی صنف کو خاص و عام میں مقبول بنا دیا۔ بوکاچو (Boccaccio) (۱۳۱۳ — ۱۳۷۵ء) کا شمار دنیا کے محبوب ترین کہانی لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اس کی دلچسپ ظرافت اور ٹھٹھول سے بھری ہوئی کہانیوں کا مجموعہ دے کامیرون (Decameron) الف لیلہ طرز کی کتاب ہے۔ بوکاچو اور پٹرارک نے اپنی آخری عمر میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا اور کئی مضامین اور کتابیں لاطینی میں تصنیف کیں۔ یہ اور ان کی طرح دوسری کلاسیکی زبانوں کے عالموں نے یورپ میں اس تحریک کی بنیاد ڈالی جسے مسلک انسانیت (Humanism) کہتے ہیں اور اس کے فروغ کے لیے کئی اکاڈمیاں قائم کیں۔ جیسے فلارنس کی "اکادمیا پلاتونیکا" (Academia Platonica) اور نیپلز کی "اکادمیا پونتانیانا" (Academia - Pontaniana) وغیرہ۔

نشاۃ ثانیہ کا دور

وہ یورپی تحریک جسے "احیائے علوم" یا "نشاۃ ثانیہ" کا نام دیا گیا ہے سب سے پہلے اطالیہ میں نمودار ہوئی۔ اس عہد میں بہت سی نئی ادبی صنفوں نے جنم لیا۔ اس دور کی اہم تصنیفات یہ ہیں۔ لے او بتستا البرتی (Leo Battista Alberti) (۱۴۰۶ — ۱۴۷۲ء) کا رسالہ "خاندان" (On the Family) پی ایترو کاردی نالے بمبو (۱۴۷۰ — ۱۵۴۷ء) (Pietro Cardinale Bembo) کا مقالہ "عوامی زبان کی نثر میں" جس میں لاطینی کے مقابلے میں اطالوی کے استعمال کی تائید کی گئی ہے لوئی جی پلچی (Luigi Pulci) (۱۴۳۲ — ۱۴۸۴ء) کی نظم "مورگانتے" (Morgante) اور متے او بویاردو (Matteo Boiardo) (۱۴۴۱ — ۱۴۹۴ء) کی نظم "عاشق اورلاندو" جن سے یورپ کی اس دلیرانہ عشقیہ شاعری کی ابتدا ہوئی جس کا مبدا دَور وسطیٰ کے دلیروں (Knights) کا نظام تھا۔ اس نظام میں کسی محبوب خاتون کی چاہت جیتنے کے لیے شرافت اور بہادری کے کارنامے انجام دیے جاتے تھے۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر لُدوویکو آری استو (Ludovico Ariosto) اور توُرکواتو تاسو (Taroua to Tasso) ہیں جن کی طویل نظمیں "عاشق اورلاندو" اور "یروشلم کی فتح" اطالوی رزمیہ شاعری کا نقطۂ عروج مانی جاتی ہیں۔ آری استو نے اپنی نظم شرفا کی تفریح طبع کی خاطر لکھی تھی اور اس کا تانا بانا رزمیہ شاعری داستان گوئی رومانی عشق و محبت تفنن وظرافت سے مربوط ہے۔ آری استو جذبات انسانی کے رازدانوں میں شمار ہوتا ہے۔ "تاسو" بے حد بڑا شاعر تھا اور اس کی شعر گوئی کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ خود "یروشلم کی فتح" ایک وسیع اور جامع الصفات نظم ہے۔ تخیل کے زور اور پرواز میں کم نظمیں اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

طبیعاتی سائنس، سیاست اور فلسفے کے ادب میں بھی اس دور میں اہم اضافے ہوئے۔ نکولو مکیاولی (Niccolo Machiavelli) (۱۴۶۹ — ۱۵۲۷ء) کی تصنیف "بادشاہ" (The Prince) کا شمار اپنی دانائی، نکتہ سنجی اور جچی تلی بے تکلف نثر کے باعث حکمرانی کے موضوع پر یورپ کی سب سے مشہور اور اونچی کتاب کے بطور ہوتا تھا۔ ایک عرصے تک اس کتاب کو گویا سیاست کی صرف و نحو کا مقام حاصل رہا۔ بالدازار کاستیلیو نے (Baldasar Castiglione) (۱۴۷۸ — ۱۵۲۹ء) نے مجلسی آداب پر ایک کتاب "مصاحب" (The Courtier) کے نام سے لکھی جو بہت دنوں تک یورپ کے سارے دیسوں میں اپنے موضوع پر سب سے زیادہ مستند تصنیف مانی جاتی تھی۔ گلی لے او گلی لے ای (Galileo Galilei) (۱۵۶۴ — ۱۶۴۲ء) جیسے سائنس دان و عالم فلکیات اور "جوردانو برونو" جیسے فلسفی کی تصانیف اسی دَور کی یادگار ہیں۔

اس صدی کا سب سے بڑا شاعر جووانی بتستا مرینو یا جام بتستا رینو (Giouanni Battismarino, Giam - Battistamarino) (۱۵۶۹ — ۱۶۲۵ء) ہے۔ جس نے اپنے عشقیہ اور دوسرے عام اشعار کے مجموعے کو "لی را" (Lira) کا نام دیا اور ایک طویل جذباتی نظم "ادونے" (Adone) تصنیف کی۔ مرینو کی شاعری کے موضوعات عشق و محبت، بے ثباتی دنیا، انسانی زندگی

کا اختصار و زود دروی وغیرہ ہیں۔ اس کی شاعری سطحی غنائی بحروں اور ادبی صناعی سے پُر ہے۔ مرینو اس طرز کا استاد ہے جسے آرائشی طرز (Baroque) کا نام دیا گیا ہے اور جو سترہویں صدی کی محبوب ترین طرز تھی۔

اٹھارہویں صدی یہ ادب کی تجدید و احیا کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ہمیں پی ایر وترا پاس المعروف بہ میتیس تازی او (۱۶۹۸ — ۱۷۸۲ء) (Pietro Trapass/Metast-asio) کے ہیجان انگیز ناٹک (Melo Dramas) ، کارلو گولڈونی (Carlo Goldoni) (۱۷۰۷ — ۱۷۹۳ء) کے شرفا کے نچلے طبقے اور عوام کے اوسط طبقے سے متعلق مقبول عام خوش انجام ڈرامے جز پے پری نی (۱۷۲۷ — ۱۷۹۳ء) کا منظوم طنزیہ روزال جورنو (Giorno) اور وتوریو الفیے ری (Vittorio Alfieri) (۱۷۴۹ — ۱۸۰۳ء) کے المیاتی ناٹک ملتے ہیں۔ الفیے ری اطالوی المیاتی ڈرامے کا موسس ہے اور اس کے ناٹک جیسے "سال" (Saul) انٹی گونی (Antigone) اگامنن (Agamemnon) وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس دور کے دو اور قابل ذکر لکھنے والے ونچنزو مونتی (Vincenzo Monti) ۱۷۵۴ء — ۱۸۲۸ء) اور اوگو فوسکولو (Ugo Foscolo) (۱۷۷۸ء - ۱۸۲۷ء) ہیں۔

انیسویں صدی یہ رومانی تحریک کا دور ہے اور اس دور میں ہمیں بہت سے بڑے نام ملتے ہیں۔ جاکوموے اوپاردی (Giacomo Leopardi) ۱۷۹۸ — ۱۸۳۷ء) اس عہد کی تغزلی (Lyrical) شاعری میں سب سے اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کا کلام جس کا مجموعہ "گیت" (کانتی) کہلاتا ہے اپنے گہرے خلوص، کسک اور تاثیر کی بنا پر اطالوی شاعری اور یورپ کی رومانی شاعری کے بلند پایہ نمونوں میں شمار ہوتا ہے اس دور کی دوسری اہم شخصیتوں میں اسالندرو منزونی (Alessandro Manzoni) (۱۷۸۵ء — ۱۸۷۳ء) کا نام نمایاں ہے۔ وہ کثیر التصانیف ہے۔ شعر میں اس کا مجموعہ "مناجات" (انی ساکری) (Inni-Sacri) اور نثر میں اس کا ناول "دو منگیتر" (ای پرومیسی سپوزی) بہت مشہور ہیں۔ زبان کے مسئلے پر بھی منزونی نے بہت کچھ لکھا۔ ملاحظہ ہو "اطالوی زبان" جزوے کاروچی (Giusue Carducci) (۱۸۳۵ — ۱۹۰۷ء) پہلا اطالوی شاعر ہے جس کو ۱۹۰۶ء میں نوبل انعام عطا ہوا۔ اس کے علاوہ جووانی پاسکولی (Giovanni Pascoli) (۱۸۵۵ — ۱۹۱۲ء) جس نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی فرومایہ چیزوں پر شعر لکھے اور گیبرلے دنیسیو (Gabriele Dannuzio) (۱۸۶۳ — ۱۹۳۸ء) جو اپنی شاعری کے تشبیہاتی حسن اور غنائی آہنگ کی وجہ سے اپنی طرز کا استاد مانا جاتا ہے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اس دور کی تغزلی شاعری کو تونگر و توانا بنا دیا ہے۔ ان کا شعری کارنامہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے احاطے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لوئی جی پیراندلو (Luigi Pirandello) (۱۸۶۷ — ۱۹۳۶ء) جس کی کہانیاں ناول اور ناٹک یورپی شہرت کے حامل ہیں ۱۹۳۴ء میں نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

موجودہ دور ہمارے اپنے دور کے لکھنے والے ان سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل سے دوچار ہیں جو یا تو ماضی کا ورثہ یا حال کی پیداوار ہیں۔ اس عہد کے کہانی اور ناول لکھنے والوں میں گراتسیہ دلدا (Grazia Dalledda) (۱۸۷۱ء — ۱۹۳۶ء) جووانی ویرگا (Giovanni Verga) انتونیو فوگسارو (Antonio Fo-gazzaro) سلوا تورے دی جاکدمو (Salvatore DiGiacodme) الدو پلاتریسکی (Aldo Palazzeschi) (جو شاعر بھی ہے) جووانی پاپی نی (Giovanni Papini) ایلیو وتورینی (Elio Vittorini) واسکو پراتو لی نی (Vasco Pratolini) کارلو لیوی (Carlo Levi) رکاردو بچلی (Riccardo Bacchelli) اینیاتیو سلونے (Ignazio Silone) چے زرے پاویسے (Cesare Pa vese) البیرتو موراویا (Alberto Moravia) وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ سسلی کے شاہی خاندان کے ایک فرد جوزپے دی لامپدوسا (Giuseppe Di Lampedusa) (متوفی ۱۹۰۷ء) کے ناول "چیتا" (Leopard) کو کلاسیکی امتیاز حاصل ہوا۔

نئے دور کے شاعر گرفتہ دلی اور مایوسی کا شکار نظر آتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بے تکلفی اور زندگی سے نزدیکی کے بھی قائل ہیں۔ دینو کمپانا (Dino Campana) گوید وگوتسانو (Guido Goz-zano) فلیپو تومازو مری نیتی (Filipo Tommaso Marinetti) جوزپے انگاریتی (Guiseppe Ungaretti) یوجینیو مونتالے (Eugenio Nontale) امبر توصبا (Umberto Saba) اور سلواتورے کوازی مودو (SALVATORE QUASIMODO) شعری ادب کے مشہور نام ہیں۔

امریکی ادبی اور ثقافتی میراث نے تین مختلف لیکن باہمی تعلق رکھنے والے عناصر سے ترکیب پائی ہے اوّل تو وہ لوگ تھے جو عیسائیت کے عالم دین اور مفسرین تھے جو امریکہ کی "نئی دنیا" میں عیسائی تہذیب قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان سب کا تعلق پروٹیسٹنٹ فرقے سے تھا جنہوں نے دینی مسائل کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ کاٹن میتھر (Cotton Mathor) کی کتاب "نیو انگلینڈ کی کلیسائی تاریخ" (The Ecclesiastical -

(History of New England) سترہویں صدی کے امریکہ کے بارے میں آج بھی معلومات کا مخزن سمجھی جاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے عیسائیت کے ممتاز عالم جوناتھن ایڈورڈس (Jonathan Edwards) (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۵۸ء) ان کے خیال کے مطابق سچے دین کی روح عشق حقیقی ہے۔ ان کو خدا کے قادر مطلق ہونے اور انسان کی ازلی معصیت اور سیاہ کاری پر کامل یقین تھا۔

امریکی ادبی اور ثقافتی میراث کا دوسرا عنصر روشن خیالی اور عقلیت ہے جس کے مطابق رب کریم ہر انسان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنی راہ متعین کر سکے۔ اس نقطۂ نظر کو ماننے والے یہ سمجھتے تھے کہ جو چیز کارگر اور کامیاب ہے وہ درست اور صحیح ہے کیوں کہ اس سے قانونِ قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) نے کی۔ جو عہدِ عقل کے ستون مانے جاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کا مظہر انجیل نہیں بلکہ قدرت ہے۔ انسان تعلیم سے اپنی ذہنی و روحانی تکمیل کر سکتا ہے اور خدمتِ خلق خدا کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ زندگی میں وہ کفایت شعاری جفاکشی اور ہر صورت حال میں سچائی اور راست گوئی کو مقدم سمجھتے تھے۔

فرینکلن کی خود نوشت سوانح حیات محض ایک فرد کی ذاتی سرگزشت نہیں ہے بلکہ امریکی قوم کے ایک نمائندے کی داستان ہے۔ جس سادگی سے اپنی کمزوریوں پر طنز کرتے ہیں وہ دراصل پوری امریکی قوم کا مزاج اور تہذیبی ورثہ ہے۔

امریکہ کی جنگِ آزادی 'برطانوی نوآبادیات' اور برطانیہ کے درمیان لڑی گئی جس میں دونوں حریف طاقتوں کی افواج کا سرچشمہ ایک ہی قوم تھی۔ اعلان آزادی سے بہت پہلے "مے فلاور معاہدہ" (۱۶۲۰ء) میں یہ اصول تسلیم کیا گیا تھا کہ حکومت میں محکوم کی رضامندی شامل ہونی چاہیے۔

انسان کے قدرتی حقوق کا یہ بنیادی اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ انسان کو آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے، جائیداد کے حصول و تصرف اور اپنی خوشی و تحفظ کا حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس ایک متضاد روایت کالوینی دین کی تھی جس میں خدا کے نام پر قائم کی گئی حکومت کسی دنیاوی اصول کی پابند نہیں تھی۔ اس طرح امریکی سیاست میں دائیں اور بائیں بازو کے نظریات کی ابتدا ہوئی۔ ٹامس جیفرسن (Thomas Jefferson) بائیں بازو کے سیاست دانوں میں تھے۔ ان کی تصنیف "اعلانِ آزادی" امریکی ذہن کے نشو و نما میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ تحریر نہایت پر وقار اور بلند سطح پر عام انسانی آزادی کے نظریات کا اظہار ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

ان کا کہنا ہے کہ سب انسان برابر پیدا کیے گئے ہیں اور خدا کی طرف سے ان کو انتقال ناپذیر حقوق ودیعت ہوئے ہیں جن میں زندگی، آزادی اور حصولِ خوشی کے حقوق ہیں۔ جب کوئی حکومت ان مقاصد کی نفی کرے تو عوام کو اس کا حق ہے کہ اس کو تبدیل یا موقوف کر دے۔ شاہ انگلینڈ نے ناانصافیوں اور مظالم سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ امریکہ کے عوام پر حکومت کرنے کے نااہل ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ امریکہ اپنی سیاسی آزادی کا اعلان کرے۔

جیفرسن کے خیالات کی اساس تھی ان کا فرد کی دیانت داری پر یقین، اس یقین کی بنیاد پر انہوں نے حکومت اور معاشرے کا ایسا ڈھانچہ تیار کیا تھا جس کا اصل مقصد فرد کی فلاح آزادی اور ترقی تھا نہ کہ اس کا استحصال۔

جیفرسن کے تصورات امریکی ثقافت کا تیسرا اہم عنصر ہے۔

امریکی ادبی اور ثقافتی میراث کے ان تینوں عناصر کی بازگشت تمام تر امریکی ادب میں سنائی پڑتی ہے۔ وہ امریکی معیار زندگی کا تہذیبی ڈھانچہ ہیں جن سے امریکی زندگی کی قدریں وابستہ ہیں۔ ایڈورڈس نے بدی اور گناہ کا جو سیر حاصل تجزیہ کیا ہے اس کا دور رس اور گہرا اثر امریکی ادب پر پڑا۔ ایڈگر ایلن پو، ہاتھورن، میلویل کی کہانیوں اور ناولوں میں گناہ اور شر کی فتنہ انگیزی کا سایہ منڈلاتا نظر آتا ہے۔ ولیم فاکنر کے ناولوں اور یوجین اونیل کے ڈراموں میں انسانی ارادے کی فصیلیں منہدم ہوتی نظر آتی ہیں اور بدی اور معصیت کے گرداب میں پھنسے ہوئے انسان اس سے بچ نکلنے کی ناکام اور المناک جد و جہد میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ فرینکلن کا ترقی کرنے یا ترقی کے لیے جد وجہد کرنے کی صلاحیت پر اعتماد امریکی کردار کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی خوش بیانی اور زندہ دلی امریکی ادب کی روایت کا جز بن چکی ہے۔ مارک ٹوین کے طرز بیان کی شگفتگی، ولیم ڈین ہولس کی حقیقت نگاری اور تھیوڈور ڈرائزر کی جزئیات نگاری اسی روایت کی تجدید ہے جیفرسن کے اعلان آزادی میں نئے سماج کی تشکیل اور اس کا حوصلہ لافانی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ادبی شاہکاروں میں آزادی کی جستجو اور برادرانہ مساوات کی امنگ کا اظہار نت نئے زاویۂ نظر سے ہوا۔

(۲)

اٹھارہویں صدی میں حصول آزادی کے بعد امریکہ میں ایسے ادب کی تخلیق کا مطالبہ ہوا جو قومی ہو۔ مغربی تہذیب کی ابتدا سے انسان نے گم شدہ جنت کے خواب دیکھے تھے، ایک ایسے سنہرے زمانے کے خواب جس میں فراوانی ہو اور جس میں آفات ارضی و سماوی کا گزر نہ ہو اور جہاں جنگ اور قحط کی دہشت ناک تباہی اور غارت گری نہ ہو۔ اس خواب کے پس پشت اس خیال کی بھی کارفرمائی تھی کہ انسان کے غم و تکلیف کی وجہ سماج کا غلط اور ناقص نظام ہے۔ امریکہ جب آزاد ہوا تو یہ احساس ناگزیر ہو گیا کہ یہی وہ گم شدہ جنت ہے جس کی صدیوں سے آرزو تھی اس خواب کی تائید "نئی دنیا" کے حالات سے بھی ہوتی تھی جہاں ایک نئے سماج کی تشکیل ممکن تھی۔ قومی ادب کے مطالبے میں ایک تضاد کا پہلو بھی تھا۔ یہ درست ہے کہ امریکہ ایسا ملک تھا جہاں فطرت شاداب و تر و تازہ تھی اور جہاں کے لوگ لہو و لعب میں ملوث نہیں تھے۔ ایسی فطرت حسنِ بیان کو دعوت دیتی تھی اور ایسے اصلاح یافتہ انسان کے خیالات اظہار کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ قومی اور نئی ادبی ہیئت آسانی سے وضع نہیں کی جا سکتی تھی۔ امریکی ادیب کے لیے مروجہ برطانوی ادبی ہیئت سے مکمل انحراف ممکن نہیں تھا غالباً یہی وجہ تھی کہ آزادی کے بعد آنے والی پہلی پیڑھی کے ادیب خالص قومی ادب کی تخلیق میں ناکام رہے۔

اس پہلی پیڑھی کے شاعروں میں تین نام قابل ذکر ہیں۔
جون ٹرم بل بقیہ دونوں شاعروں کی طرح طنز نگار تھے۔ ان کی پہلی طنزیہ نظم "کند ذہنیت کا ارتقا" ایک کند ذہن دینیات کے طالب علم کی سرگزشت تھی جس کی آڑ میں اس زمانے کے نظام تعلیم پر طنز کیا گیا تھا۔ ان کی دوسری نظم "زمانۂ حال کا مرثیہ" برطانوی اقتصادی پالیسی کے خلاف تھی۔ "ایم فنگل" میں ہدفِ ملامت آزادی مخالف ٹوری پارٹی تھی دوسرے شاعر فلپ فرینو (Philip Freneau) کی ابتدائی شہرت طنز نگاری سے ہوئی۔ وہ برطانوی حکومت کے نہایت سخت نقاد تھے لیکن طنز نگاری سے زیادہ ان میں غنائی شاعری کی صلاحیت تھی۔ ان کی نظم "قوتِ تخیل" (The Power of fancy) ان کے نظریۂ شاعری کا اظہار ہے۔ "سانتا کروز کا حسن" بھی خوبصورت غنائی نظم ہے جو فطرت سے حاصل کردہ امیجری سے مملو ہے۔ "جنگلی ہنی سکل" (To A wild Honeysuckle) میں عالم امکاں میں رونما ہونے والے تغیرات کا نہایت حسین بیان ہے۔ تیسرے شاعر جویل بارلو Joel Barlow نے "کولمبس کا خواب" یا کولمبیڈ (Columbiad) میں جمہوریت، امن اور امریکی قوم کی عظمت کا بیان نو حصوں میں کیا ہے۔ بقیہ دو نظمیں فرانسیسی ہیں۔ ایک بات جوان تینوں شاعروں میں مشترک ہے وہ ان کی طنز نگاری ہے جس میں پوپ کی تقلید میں بلند بیت یا ہیروئیک کپلیٹ (Heroic Couplet) کا استعمال کیا گیا ہے۔
برطانیہ میں اٹھارہویں صدی کے آخری نصف میں تین قسم کے ناول رائج تھے :۔ اول جذباتی (یا گھریلو) ناول، دوسرے طنزیہ ناول اور تیسرے گاتھک (Gothic) ناول۔ امریکہ میں پہلے جذباتی ناول کو فروغ ملا جس میں ترغیبِ گناہ اور اس کے المناک نتائج خصوصی موضوعات تھے۔ مثال کے طور پر ولیم ہل براؤن کے ناول "قوت ہمدردی" سوزان روسن کے "شارلیٹ ٹمپل" اور حنا فاسٹر کے "عشوہ طراز" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ ان کے قصے یا ان کے کچھ حصے اغوا کے اصل واقعات پر مبنی تھے۔ طنزیہ ناول میں ہیو ہنری بریکن ریج کا ناول "جدید شجاعت" سروانٹیز کے ناول "دان کیہوتے" (Don Quixote) کا چربہ ہے جس میں امریکہ کی نئی جمہوریت کی کارکردگی پر طنز کیا گیا ہے۔ گاتھک ناول کے علم بردار چارلس براکڈن براؤن (Charles Brockden Brown) کے ناولوں کی اہم خصوصیت ان کے نئے پلاٹ اور بدیع کردار نگاری تھی وہ اپنے ناولوں میں ہولناک فضا پیدا کرنے کے لیے گاتھک ناول کی تمام فنی ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔ ان کے ناول "وائی لینڈ" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی جس میں انہوں نے ایک کٹر اور تشدد پسند مذہبی آدمی کا چربہ پیش کیا ہے۔ ان کے ناول آرمنڈ میں فلسفیانہ انارکی "آرتھر میرون" میں انسان دوستانہ اصلاح اور بقیہ چار ناولوں (الکوئن، کلارا ہوورڈ، ایڈگر ہنٹلے اور جین ٹالباٹ) میں شادی کی اصلاح کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیاسی اور سماجی فلسفے میں براؤن ولیم گاڈون کے پیرو تھے۔ ان کے مداحوں میں برطانوی شاعر شیلے، کیٹس اور ٹامس ہڈ بھی تھے۔

اٹھارہویں صدی میں ناول پر ڈرامے کے مقابلے میں نسبتاً کم پابندیاں تھیں اس زمانے کے اخلاقیات کے علم بردار تھیٹر کو "شیطان کا گھر" سمجھتے تھے اور قانون ساز اس کو عوام کے لیے انتہائی مضر تصور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جنگِ آزادی کی افراتفری، پیلے بخار کی تباہی اور حق اشاعت کی بے ضابطگی ڈرامے کے فروغ میں حائل ہوئیں۔ امریکی اسٹیج پر پیش کیا جانے والا پہلا ڈرامہ ٹامس گاڈفرے کا پارتھیا کا شہزادہ تھا۔ ایلیز بیتھن طرز کا یہ المیہ ۱۷۶۵ء میں شائع ہوا۔ ٹامس گاڈفرے کے طنزیہ ڈراموں کے مقابلے میں روائل ٹائلر کے طنزیہ تقابل کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں ایک امریکی دہقان کا کردار نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے اور امریکی طرز زندگی کا نہایت حقیقت پسندانہ خاکہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ طربیہ لکھے گئے۔ جن میں نیلسن بارکر کے "آنسو اور مسکراہٹیں"، "انڈین شہزادی" اور "وہم" قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان تمام ڈراموں میں فنی ناپختگی اور مکالمے میں کچا پن ہے۔

(۳)

سیاسی آزادی کے ساتھ امریکی ادب میں رومانیت داخل ہوئی۔ یہ دور ایک طرف امریکی جنگ آزادی کی ولولہ انگیزی سے وابستہ ہے دوسری طرف اس نے جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کی رومانیت کی تحریک سے فیض حاصل کیا۔ فرانسیسی انقلاب کا پرچم آزادی، مساوات اور انسانی برادری کے نعروں سے لہرایا تھا اور انہیں تصورات کے زیر اثر امریکہ نے آزادی حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ امریکہ نے بربری سمندری قزاقوں کے خاتمے میں دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ برطانیہ کے خواب خرگوش کو ۱۸۱۲ء کی جنگ نے توڑا تھا۔ "منرو اصول" (Monroe Doctrine) نے دنیا کے مغربی حصے میں امریکہ کی بالادستی قایم کر دی تھی۔ میکسیکن جنگ (۱۸۴۸ء) سے جنوب مغرب کا وسیع علاقہ فتح ہوا۔ یہ تمام واقعات ولولہ انگیز تھے۔ رومانی مزاج نے معلوم کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے نامعلوم کی دریافت کی کوشش کی اور یہ تجسس اسے مافوق الفطرت اور ماورائی دنیا کی سمت لے گیا۔ زمانہ حال کو سمجھنے کے لیے عہد ماضی کی کرید کی گئی۔ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ ماضی کی رزمیہ شاعری، چاربیت، لوک گیت اور کتھائیں، دیو مالا اور اسطور سے دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ رومانی تحریک کی ایک بہت توانا لہر انسان دوستی تھی۔ اس لیے عام انسان کی عظمت پر زور دیا گیا فطرت کی خیر و برکت کے ساتھ انسان کی فطری اچھائی پر اعتماد کا اظہار ہوا رومانیت کی تحریک کی ان خصوصیات کو امریکہ کے انیسویں صدی کے ادیبوں نے کسی نہ کسی ادبی ہیئت میں ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ان ادیبوں میں واشنگٹن ارونگ، جیمس فینی مور کوپر اور ولیم کلن برائنٹ کا نام سر فہرست ہے۔
واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) نے انیس سال کی عمر میں اپنے بھائی کے اخبار میں جوناتھن اولڈ اسٹائیل کے خطوط ۱۸۰۲ء میں شائع کیے جو نیویارک کی سماجی زندگی اور ڈرامے کی تنقید تھی۔ ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۰ء میں ان کی کتاب "خاکے" قسطوں میں، پھر کتابی شکل میں لندن سے شائع ہوئی جس سے ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ۱۸۲۲ء

میں تیرلیں برج ہال اور ۱۸۲۲ء میں ایک مسافر کی کہانیاں کی اشاعت ہوئی ان کی کہانیوں اور خاکوں کا مجموعہ الحمرا ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا۔ ہسپانیہ کے قیام کے زمانے میں انہوں نے ہسپانوی تاریخ میں تحقیق کی اور کرسٹفر کی زندگی اور بحری سفر کی تاریخ غرناطہ کی تاریخ اور کرئین مجموعۂ مضامین اسی زمانے کی یادگار تصانیف ہیں۔ ۱۸۴۰ء میں انہوں نے اولیور گولڈ اسمتھ کی سوانح حیات اور ۱۸۵۰ء میں محمدؐ اور ان کی کامیابیاں کے عنوان سے ایک مختصر سوانح حیات لکھی جس سے نبی کریمؐ سے ان کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ جارج واشنگٹن کی حیات کی پانچویں اور آخری جلد ان کے انتقال سے کچھ پہلے ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔

ارونگ اپنی ابتدائی تخلیقات میں ایڈیسن اور گولڈ اسمتھ کی نثری طرز تحریر سے بہت متاثر تھے۔ ان کے طنز، نقل اور استہزا سے اس مزاح نگاری کی ابتدا ہوئی جو مارک ٹوین کی تخلیقات میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی اور جو رسالہ "نیویارکر" میں آج بھی موجود ہے۔ ان کی خاکے کی کتاب میں امریکی ادب کے جدید افسانہ کی ابتدا ہوئی اور "رپ وان ونکل" (Rip Van Winkle) کی کہانی اسطور سازی کی پہلی مثال ہے۔ "رپ وان ونکل" کی غالباً غیر شعوری اور غیر ارادی اشاریت اس کو بے حد معنی خیز بنا دیتی ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ارونگ کی شہرت ان تخلیقات پر مبنی ہے جن کو وہ ادنیٰ خیال کرتے تھے۔ ان کے مداحوں میں بائرن، کولرج اور اسکاٹ بھی تھے۔ امریکہ میں میلویل، ہاتھورن اور پو ان کی شگفتہ طرز تحریر کے دلدادہ تھے۔

جیمس فینی مور کوپر (James Fenimore Cooper) غیر معمولی تخلیقی قوت کے مالک تھے اور بسیار نویسی اور تاریخی رومان کو پروان چڑھانے میں وہ سر والٹر اسکاٹ کے امریکن حریف تھے۔ پہلے دو ناولوں احتیاط اور جاسوس کی ناکامیابی سے کوپر پر یہ واضح ہو گیا کہ جذباتی اور گھریلو ناول ان کا صحیح میدان نہیں ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ملک کے ماضی قریب کے تاریخی واقعات پر ناول لکھیں گے۔ یہ فیصلہ ان کی ادبی زندگی کے لیے اہم تھا کیوں کہ اس سے ان کو تین موضوعات، امریکی انقلاب، سرحد (Frontier) اور بحری زندگی، مل گئے جن پر وہ تمام عمر لکھتے رہے۔ ان کی طرز تحریر اکثر ثقیل اور مکالمے مصنوعی ہیں۔ ان کے بہت سے کردار بے جان اور بے محل ہیں اور ان کے ناولوں میں مزاح اور خوش طبعی کا یکسر فقدان ہے۔ لیکن اپنے ناول "مہم جو" (The Pioneers) میں انہوں نے اس لافانی کردار "نیٹی بمپو" (Natty Bumppo) کی تخلیق کی جو ایک طرح سے امریکہ کی نئی جمہوریت کا آئیڈیل انسان ہے۔ بیسویں صدی میں وہ "چرمی موزے والی داستانیں" — (Leather Stocking Tales) کے لیے مقبول ہیں۔ کوپر کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے امریکی ناول کو قومی نصب العین سے قریب تر کر دیا۔ تاریخی ناول کے بہت سے گر انہوں نے سر والٹر اسکاٹ سے سیکھے لیکن ان کے ناولوں کے کردار خالص امریکی ہیں۔

ولیم کلن برائنٹ۔ رومانی شعرا میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ برائنٹ نے امریکہ کے دیہی علاقوں میں بکھرے ہوئے فطرت کے حسن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حالاں کہ انہوں نے شاعری کی ابتدا لارڈ بائرن کی تقلید میں طنز نگاری سے کی لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے اصل موضوع کو دریافت کر لی۔ ان کے نانا جی کے فارم پر ان کا بچپن گزرا۔ سیاست میں وفاقیت اور مذہب میں کالوینی طبقے کے حامی تھے لیکن ان کے والد جمہوریت پسند اور توحید پرست (Unitarian) تھے برائنٹ نے ان دونوں متضاد عقائد کا اثر قبول کیا۔ ان کے نانا کے فارم سے ملا ہوا ہمپ شائر کے خوبصورت پہاڑ اور چراگاہیں تھیں جہاں وہ گھومتے پھرتے اور فطرت کے حسن کا مشاہدہ کرتے تھے۔ برائنٹ شاعری کی معنی آفرینی پر زور دیتے اور سمبل یا علامت کے استعمال کی حمایت کرتے تھے کیوں کہ اس سے پڑھنے والے کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ شاعری اور فطرت کا جو تجزیہ برائنٹ نے اپنے مضامین میں کیا وہ انیسویں صدی کے امریکہ میں شاعری کا معیار بن گیا جس پر پورا اترنے کی کوشش لوویل اور رلانگ فیلو کے علاوہ دوسرے شاعروں نے بھی کی۔ برائنٹ نے امریکی شاعری کو برطانوی شاعری کی پیروی سے آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا جس کے بغیر بدیع امریکی شاعری ممکن نہیں تھی۔

امریکی موضوعیت (Transcendentalism) رومانیت کی توسیع ہی کی ایک شکل ہے۔ اس تحریک نے جو اثرات قبول کیے ان میں برطانوی شاعر ورڈز ورتھ، کولرج اور کارلائل کی تخلیقات ہیں۔ فلسفے میں جرمن فلسفی ہیگل، کانٹ، لطشے اور شیلنگ اور جرمن ادیب گوئٹے، رشٹر اور ہرڈر وغیرہ کی تصانیف کا بھی گہرا اثر ہے۔ یونانی فلسفی افلاطون اور ہندو دھرم کے ویدا اور بھگوت گیتا سے بھی اس تحریک نے فیض حاصل کیا عیسائی تصرف اور توحید پرستی بھی اس پر اثر انداز ہوئی لیکن یہاں الوہیت کا تصور تثلیثی کی بجائے وجدانی تھا اور اس الوہیت کا نور ہر انسان میں موجود تھا۔ اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا کہ حقیقت تک پہونچنے کے لیے عقل کی بجائے وجدان کی رہنمائی اہم ہے۔ اور انسانی ذہن کی کائنات اصغر اور عالم اکبر میں مطابقت ہے۔ اس لیے انسان کی آزادی مسلم ہے اور اسے اپنے وجدانی علم پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

موضوعیت کے علم برداروں میں اسکاٹ، مارگریٹ فلر، چینگ اور براؤن سن بھی تھے لیکن اس تحریک کے اہم مفسرین رالف والڈو ایمرسن اور ہنری ڈیوڈ تھورو تھے۔ ایمرسن کا نظریہ خود اعتمادی انسانی زندگی کی قدروں کا پیمانہ بن گیا۔ وجدانی اور فطری اصولوں کی مطابقت پر ایمرسن نے فطرت، امریکن اسکالر اور دینیات کے اسکول کا خطبہ لکھا اور اس طرح فلسفہ موضوعیت کے بنیادی مفروضوں کی تشریح کی۔ فطرت ایمرسن کا عہد نامہ ہے جس کے خیالات اور عقائد کے خاکے میں وہ اپنے مضامین اور نظموں سے رنگ آمیزی کرتے رہے۔ مضامین، نمائندہ انسان، برطانوی خصوصیات اور زندگی کا طرز عمل ان کے مضامین کے مجموعے ہیں جو ان کی تقاریر اور لیکچروں پر مبنی ہیں۔ وہ نظمیں بھی لکھتے تھے اور بالعموم یہ گمان ہوتا ہے کہ شاعری ان کی ضمنی تخلیق ہے۔ ان کی شاعری کو ان کے زمانے میں اہمیت نہیں دی گئی کیوں کہ مروجہ شاعری کے برعکس ایمرسن کی شاعری میں موسیقیت نہیں تھی اور قافیے کے معاملے میں ان کی نظمیں ناہموار اور بے ضابطہ سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے

نظلیں، یوم مئی اور دوسری نظلیں اور منتخب نظلیں شائع ہوئے۔ وہ برطانوی شاعروں سے متاثر نہیں تھے اور شاعر کو حسن کا نمایندہ مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر دور اپنے تجربات کے بیان کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے شاعری ہی پورا کرسکتی ہے۔

ہنری ڈیوڈ تھورو (Henry David Thoreau) تحریک موضوعیت کے دوسرے اہم ترجمان تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنا روزنامچہ باقاعدگی کے ساتھ لکھتے تھے جو ان کی آئندہ تصنیفات کا مخزن ثابت ہوا۔ کینیڈا کی مختصر سیاحت کے علاوہ ان کو ملک سے باہر جانے کا موقع نہیں ملا۔ مزاج کے اعتبار سے وہ ایمرسن سے مختلف تھے لیکن دونوں کے خیالات میں غیرمعمولی یکسانیت تھی۔ ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی اور کارلائل کی نثری طرز تحریر کے وہ بہت دلدادہ تھے۔ ۱۸۴۵ء میں وہ والڈن جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے لکڑی کے مکان میں رہنے لگے جو انہوں نے خود بنایا تھا۔ ان کی کتاب "والڈن" فطرت کے حسن پر نثر میں لکھی ہوئی حمد ہے جس میں لازوال حسن سے حاصل کردہ روحانی مسرت اور شادمانی کا نہایت خوبصورت اظہار ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی مسائل سے بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ غلامی کے سخت خلاف تھے اور نیگرو لوگوں پر کیے جانے والے مظالم کے مخالف تھے وہ سرکاری ٹیکس کے بھی خلاف تھے اور ٹیکس کی عدم ادائیگی کے جرم میں جیل بھی جاچکے تھے۔ والڈن جھیل کے تجربے کا ایک مقصد خودشناسی تھا جس کے بغیر خداشناسی ممکن نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو سادگی اور غربت میں زندگی گزارنی چاہیے۔

(۴)

انیسویں صدی کے امریکی ادب میں رومانیت کا ایک پہلو حزن و یاس بھی ہے جو رومانیت کے بحران سے پیدا ہوتا ہے۔ امریکی انقلاب سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں اور "امریکی خواب" بکھرنے لگا۔ علاقے کی توسیع سے سماجی انتشار وجود میں آیا جو حساس دلوں میں مغموم تفکر بن کر اتر گیا۔ رجائیت اور موضوعیت کا کھوکھلا پن عیاں ہوگیا شبہات و تشکیک نے سر اٹھایا اور خود انسان کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا اور اس کی حقیقت ذہن و روح کے ان خفیہ گوشوں میں ڈھونڈی جانے لگی جو انسانی کردار اور اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہیں۔ امریکی ادب میں اس تجسس اور تشکیک کا اظہار مختلف طریقوں سے ایڈگر ایلن پو، نتھانیل ہاتھورن اور ہرمان میلویل نے کی۔ پو نے ایمرسن اور لانگ فیلو پر بے لاگ تنقید کی اور ان کی رجائیت اور خود اعتمادی کو کھوکھلا ثابت کیا وہ موضوعیت پسندوں کو تالابی مینڈک (Frog Pondian) کہتے تھے اس طنزیہ اصلاح کا ماخذ کنکارڈ کا وہ تالاب تھا جس کے کنارے تھورو تجربے کے طور پر رہے تھے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی تھا کہ موضوعیت پسندوں کا نظریۂ زندگی سادہ اور سطحی تھا جو امریکی سماجی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل نہیں تھا۔

ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe) نے رومانیت سے انحراف بھی کیا اور اس کی تصدیق بھی۔ انہوں نے موضوعیت کی نفی کی لیکن مافوق الفطرت اور ماورائی دنیا سے ان کی دل چسپی اور ان کی ذہنی ناآسودگی اور افسردگی رومانیت ہی کا اظہار ہیں۔ پو کی نظموں میں "الاعراف" اور "اسرافیل" نظموں کے عنوانات قرآن پاک سے ماخوذ ہیں۔ ان میں غیرارضی حسن کا غیرواضح بیان ہے۔ اپنی نظموں کے تیسرے ایڈیشن میں پو نے تمہید میں لکھا کہ شاعری کا مقصد حقیقت کی دریافت نہیں بلکہ حسن و انبساط ہے بعد میں انھوں نے شاعری کی تعریف میں کہا کہ وہ حسن کی غنائی تخلیق ہے۔ پو کے نزدیک شاعر کا سمبل اسرافیل ہیں جن کے صور کی موسیقی سے قیامت برپا ہوگی۔ ان کے نزدیک شاعری اور موسیقی میں گہرا تعلق تھا اور ان کی نظموں "یولالیوم" "انابیل لی (Anable Lee) اور ریون" سے ان کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ پو نے تنقید اور کہانیاں نہایت کامیابی سے لکھیں شاعری میں وہ اشاریت نگاری کے موجد ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے فرانسیسی شاعر بودالیر نے حس ادراک کا راز سمجھا جس کو رامبو نے ترقی دی۔ انسانی مقدر کو پو نے ہی سب سے پہلے ایک شکستہ کشتی کے استعارے میں پیش کیا جو رامبو اور ملارمے نے بار بار استعمال کیا ہے۔ تنقید میں پو نے فنی تجزیہ رائج کیا اور تنقید کو نقاد کی رائے کی عمومیت سے آزاد کیا۔

نتھانیل ہاتھورن (Nathaniel Hawthorne) نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاکر اپنی اشاریت کا اظہار اس کش مکش سے کیا جو انسان اور اس کے عہد ماضی کے درمیان اخلاقی اور روحانی سطح پر ہوتی ہے اور معصیت کے ان مہلک اثرات کا تجزیہ کیا جو ذات کے انتشار کے محرک ہیں۔ لیکن گناہ کی طرف ہاتھورن کا رویہ خالص مذہبی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں اس کا نفسیاتی تجزیہ ہے جو اشاریت کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں ان کا ناول "سرخ حرف" شائع ہوا جس سے ان کو شہرت حاصل ہوئی۔ اگلے تین سال میں ان کے دو ناول "سات چھجوں والا گھر" (House of The Seven Gables) اور "بلیدیڈیل کا رومان" Blithedale Romance ایک کہانیوں کا مجموعہ "اسنو امیج" (Snow Image) "ڈو بچوں کی کہانیوں کے مجموعے" اور "دہرائی گئی داستانیں" (Twice Told Tales) شائع ہوئیں۔ اٹلی کے پس منظر میں ایک ناول بھی تحریر کیا جو "ماربل فان" کے عنوان سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا۔ ہاتھورن نے اشاریت نگاری کی ابتدا اپنی کہانیوں سے ہی کردی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ گنہگار شخص کو انسانی برادری سے خارج نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ گناہ اسے دنیا اور انسان کی مشترک اقدار سے وابستہ کرتا ہے۔ ان کو اس کی فکر نہیں تھی کہ حیات بعد از مرگ میں انسان پر کیا گزرے گی۔ اپنے ناول "سرخ حرف" میں انہیں خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس کا موضوع جرم زنا ہے جو ہسٹر پرن اور آرتھر ڈمس ڈیل سے سرزد ہوا تھا۔ اس قسم کے گنہگار کو سرخ حرف کو کفارے کے طور پر پہننا لازمی تھا لیکن ہسٹر ہرین مسلسل اعتراف گناہ سے پاکیزگی اور کردار میں پختگی حاصل کرلیتی ہے جو پیوریٹین نقطۂ نظر کے منافی ہے۔ سات چھجوں والا گھر کا موضوع ایک بددعا ہے جس کا اثر کئی پشتوں تک ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار کوئی شخص نہیں ہے بلکہ ایک گھر

ہے جس کے ذریعے ہاتھورن سالیم کے ماضی کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ سترھویں صدی میں ریڈ انڈین میتھومالے نے کرنل پنچن کو بد دعا دی تھی کہ "تم خون پیوگے" وہ بد دعا انیسویں صدی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہاتھورن کے بقیہ دو ناولوں میں انسانی ضمیر کا تجزیہ ہے۔ بلیدیڈیل کا رومان ان کے بروک فارم کے تجربات پر مبنی ہے۔ "تھرکا نان" کا موضوع بھی گناہ، اس کی پاداشں اور نجات ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ پیورٹن عقائد کے نقاد تھے۔ ان کی نظر میں ایسی دنیا نہیں تھی جو گناہ سے یکسر خالی ہو بلکہ ایسی دنیا تھی جس میں احساس معصیت کی اذیت اور تلخی نہ ہو۔

ہرمان میلویل (Herman Melville) نے بھی موضوعیت اور اس کی رجائیت سے انحراف کیا۔ ان کے تصور کائنات میں اگر کوئی چیز یقینی تھی تو وہ شر اور اس کی فتنہ سامانی تھی۔ ان کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن موجود شر کا وجود تھا۔ کائنات اصغر اور عالم اکبر کی تخلیق اس ذات پاک نے کی تھی جو مجسم خیر اور مجسم حسن وانصاف تھا۔ اس لیے انہوں نے اس مسئلے کو از سر نو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔ ان کے دو ناول ٹیپی (Typee) ۱۸۴۶ء اور اومو (Omoo) ۱۸۴۷ء میں شائع ہو چکے تھے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۲ء کے سات سال کے عرصے میں ان کے سات ناول شائع ہوئے "موبی ڈک" میلویل کا شاہکار ہے۔ معنویت کی پہلی سطح پر وہیل مچھلی کے شکاری جہاز کے کپتان اہاب اور ایک خوفناک سفید وہیل کے درمیان معرکۂ جنگ کا بیان ہے۔ ایک گذشتہ رزم آرائی میں اہاب کو شکست ہوئی تھی۔ انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ دوسرے معرکے میں مکمل فتح یا شکست چاہتا ہے۔ اس میں اہاب ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جاتا ہے صرف ایک اشمیل باقی بچتا ہے جو اس رزم کا راوی ہے۔ معنویت کی ثانوی سطح پر اہاب اس آزاد انسان کا نمائندہ ہے جو مجسم بدی موبی ڈک کے خلاف نبرد آزما ہے۔ یہ ہی بدی انسانی زندگی کے غم واندوہ کا سرچشمہ ہے۔ اہاب اس جنگ میں خدا اور فطرت کے خلاف بھی بغاوت کرتا ہے کیوں کہ ان کی رضا کے بغیر بدی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ معنویت کی اس دوسری سطح سے ہی ناول کا اصل موضوع بنتا ہے۔ "پیرا اور بلی بڈ" میں میلویل نے انسان کے اخلاقی معمے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ میلویل کے ناولوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور انہوں نے زندگی کے آخری ۳۵ سال گمنامی میں بسر کیے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ان کی عظمت کی دریافت ہوئی۔

(۵)

موضوعیت کے مخالفین کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے امریکی ذہن پر موضوعیت کا گہرا اثر تھا والٹ وٹمین نے اس سے فیض حاصل کیا۔ جس زمانے میں وہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ اس وقت تک پو کا انتقال ہو چکا تھا اور ہاتھورن اور میلویل اپنے شاہکار لکھ چکے تھے۔ ان کی شاعری میں ایمرسن کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے موضوعیت کو فلسفے کے دوسرے رجحانات سے ملا کر ایک نئے اور ذاتی فلسفے کی تشکیل کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انسان خدا کا مظہر ہے تو اس کی الوہیت کا اظہار اس کے جسم اور روح دونوں سے ہوتا ہے۔ ایسے سماج میں جہاں جمہوریت اور مساوات ہو حواس خمسہ کی ترویج اور ترقی در اصل روح کی ترقی ہے۔ اس خیال سے انہوں نے موضوعیت کی توسیع کی اور خداشناسی کے وجدانی علم کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچایا۔ بدیع خیالات اور فن میں جدت ان کا ثانوی مزاج تھا اور نظم معریٰ لکھنے میں انہوں نے نئی مثال قایم کی۔ انہوں نے شاعری کے ارتقا کو نئی راہیں دکھائیں۔ وہ جیفرسن کے اعلان آزادی کے اصولوں کو اپنی شاعری اور ذاتی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جمہوریت کے دلدادہ اور انسان کے مساوی حقوق کے حامی تھے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر امریکی شاعری میں ان کو منفرد مقام حاصل ہے ان کے ذہن میں ایک ایسی نظم تخلیق کرنے کا منصوبہ تھا جس میں امریکی جمہوریت کی عینیت کی وضاحت ہو سکے۔ بالآخر ان کی یہ تمنا پوری ہوئی اور ان کی نظموں کا مجموعہ برگ سبز (Leaves of Grass) ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی شاعری میں جو صاف گوئی ہے اور طرز بیان میں جو جدت ہے اس کی وجہ سے ان کی شاعری کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف ایمرسن نے ان کو لکھا "میں آپ کی عظیم شاعرانہ زندگی پر آپ کا پر جوش خیر مقدم کرتا ہوں۔" وٹمین نے اپنی نظم "نغمہ ذات" میں یہ اعلان کیا کہ ان کی آواز جمہوریت کی آواز ہے، صدر لنکن کے قتل پر انہوں نے اپنی مشہور نظم "جب صحن میں لالہ کے پھول کھلے" لکھی کیوں کہ وہ آں جہانی صدر کو جمہوری مساوات ومحبت کی تابندہ مثال سمجھتے تھے۔ وہ بدی اور شر کے وجود کے منکر نہیں تھے لیکن ان کی رجائیت اتنی توانا تھی کہ وہ اس کی حدود سے آگے نکل کر انسان کی عظمت کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ عوام اور جمہوری نظام کے مغنی تھے اور عوام کی بالا دستی کے متمنی تھے۔ اس اعتبار سے وہ جدید ذہن سے بہت قریب تھے۔

ملک کی غیر معمولی توسیع کے ردعمل میں امریکہ کے کچھ ادیب یورپ کی ثقافت کی طرف رجوع ہوئے اور انہوں نے ایک رئیسانہ (Genteel) رجعت پسندی کی بنیاد ڈالی۔ ان رجعت پسندوں میں لانگ فیلو، لوویل، اور ہومس تھے جنہوں نے رومانی موضوعات اور ہیئت کا استعمال جاری رکھا لیکن ادب میں جن کا رویہ رسمی، تقلیدی اور رجعت پسندانہ تھا۔ یہ تینوں کیمبرج اور بوسٹن میں عمر بھر رہے اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ یہ لوگ بوسٹن کے "سنیچر کلب" (Saturday Club) کے ممبر تھے جس کو ہومس مذاق میں "انجمن ستائش باہمی" کہتے تھے۔ ان کا تعلق نیو انگلینڈ کے پرانے اور امیر خاندانوں سے تھا اور ان کی زندگی پناہ یافتہ اور محفوظ تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ملک کے ثقافتی تصادم سے بے تعلق رہے۔ ملک کی خانہ جنگی بھی ان کو متاثر نہ کر سکی اور اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھے یہ خیالی رومان کی تخلیق کرتے رہے۔ یہ سب منجھے ہوئے فن کار تھے اور نظم ونثر یکساں روانی کے ساتھ لکھتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر میں پرسکون رجائیت تھی۔ ان لوگوں کی وطن پرستی میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن یہ یورپ کی ثقافت کے دلدادہ تھے۔ عام فہم زبان استعمال کرنے سے ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی پہلے شاعر ہنری وڈزورتھ لانگ فیلو اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔ یوں تو وہ مضامین بھی لکھتے تھے اور انہوں نے ۱۸۳۹ء میں ایک رومان "ہائپیرین" (Hyperian) بھی لکھا تھا لیکن ان کی اصل شہرت ان کی شاعری سے ہوئی۔ وہ ایک طرح سے شاعری کے تاجر تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ

پڑھنے والے کس قسم کی چیزیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا بیان واضح اور عام فہم تھا۔ اپنی نظموں کی کامیابی کے پیشِ نظر وہ ۱۸۵۳ء میں پروفیسری سے سبکدوش ہو گئے اور تصنیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے لانگ فیلو کی نظموں کے مجموعوں کی فروخت کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے جس سے ان کی غیر معمولی شہرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اولیور وینڈل ہومس معالج اور اناٹمی کے پروفیسر ہونے کے علاوہ مضمون نگار، شاعر اور ناول نگار بھی تھے۔ ان کی نظموں اور مضامین میں مزاح کی چاشنی ہے۔ اور انہوں نے ہلکے پھلکے طنزیہ انداز میں اپنے زمانے کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی نظموں میں۔ The Old Ironside, Gra-nd Mother's Story اور Battle کافی مشہور ہیں۔ مزاحیہ نظموں میں Contentment of an Insect اور The Deacon's Master Piece بے حد مقبول ہیں۔ انشائیہ میں بھی انہوں نے اپنا ہلکا پھلکا طنزیہ انداز قایم رکھا جس کی مثال Autocrat of the Breakfast Table ہے۔ ناول میں انہوں نے طب سے حاصل کی ہوئی معلومات اور نفسیات کا استعمال کیا جو اس زمانے میں نئی بات تھی۔ ریئسانہ گروپ کے تیسرے شاعر، نقاد اور نثر نگار جیمس رسل لوویل تھے ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ "ایک سالہ زندگی" (A Year's Life) ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں دوسرا مجموعہ "نظمیں" اور ۱۸۴۵ء میں ان کی تنقید کی پہلی کتاب چند پرانے شعرا پر گفتگو شائع ہوئی سر لان فال کا خواب بادشاہ آرتھر کے قصے کی جدید شکل ہے اور بگلو پیپرس میں علاقائی زبان کی شاعری میں دورِ حاضر کے امور پر تبصرہ ہے۔ ریئسانہ رجعت پسندی کی روایت کو قایم کرنے والے یہ تینوں شعرا امریکی ادب پر کوئی گہرا اثر نہ چھوڑ سکے۔ یہ لوگ ہر دل عزیز تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی تخلیقات سے ادب کی کوئی نئی راہ نہیں کھولی۔

(٦)

انیسویں صدی کے آخری تیس سال پُر امن گزرے۔ بڑی منتیں قایم ہو رہی تھیں۔ معدنیات کی دریافت ہوئی۔ ریل بچھائی جا رہی تھی۔ بحری مال بردار جہاز تعمیر ہوئے۔ تجارت کے رابطے قایم ہو رہے تھے۔ ہر طرف تعمیر اور ترقی کی گہما گہمی تھی اور امریکہ صنعتی ترقی کے اس شاندار مستقبل کی طرف رواں دواں تھا جس کی پیشن گوئی والٹ وہٹمین نے کی تھی۔ اس سے پہلے ملک کی داخلی اور علاقائی زندگی کو نظر انداز کیا گیا تھا لیکن اب اسے ادب میں پیش کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے تخیل کاری اور رومانیت کی جگہ حقیقت پسندی اور علاقائیت نے لے لی اور شاعری اور ڈرامہ کی بجائے ناول ذریعہ اظہار بنا۔ ۱۸۷۱ء میں ولیم ڈین ہوولس نے "اٹلانٹک منتھلی" کی ادارت سنبھالی اور اس میں شعوری ادبی پالیسی کے تحت علاقائی ادب کی اشاعت شروع ہوئی۔ چنانچہ انڈیانا، میزوری، کیلی فورنیا، مین اور نیو انگلینڈ کی خصوصی زندگی کی مرقع نگاری ناولوں اور کہانیوں میں ہونے لگی اور مقامی زندگی کی عکاسی کی گئی۔ ان لکھنے والوں میں ایڈورڈ ایگلسٹن، جون ہے، برٹ ہارٹ، ہیریٹ بیچر اسٹو، سارہ ارنی جیوٹ، جوئل چینڈلر ہیرس اور جارج کیبل وغیرہ تھے۔ لیکن ان ادیبوں کے رہنما ولیم ڈین ہوولس (William D.ean Howells) تھے جنہوں نے علاقائی ناول لکھنے والوں کے علاوہ علاقائیت کا تنقیدی جواز بھی پیش کیا۔ انہوں نے شعوری طور پر ناول کے فن کو سنوارنے کا تاریخی کردار ادا کیا۔ ادب میں سچائی اور توازن پر زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ غیر معمولی واقعات کی بجائے روزمرہ کے معمولی حقائق اور کردار پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ شر اور بدصورتی کے مقابلے میں حُسن اور خیر و برکت زیادہ نمائندہ حقیقتیں ہیں اور "زندگی کی ہر شادماں و فرحاں متبسم حقیقت امریکی ہے۔" ہارپرس میگزین سے وابستہ ہونے کے بعد انہوں نے افسانوی ادب پر تنقیدی مضامین لکھے۔ وہ بہت زود نویس تھے۔ بیسویں صدی میں ان کی شہرت کی بنیاد چار سماجی ناولوں پر ہے جو "جدید مثال" ۱۸۸۱ء "سائلس لیپ ہم کا عروج" ۱۸۸۵ء "نئے مواقع کے خطرات" (A Hazard of New Fortunes) ۱۸۹۱ء اور "الٹروریا سے مسافر" ۱۸۹۴ء ہیں۔ ان ناولوں میں انہوں نے ہم عصر سماجی مسائل کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا ہے اور اس طرح امریکی ناول کے لیے نیا میدان عمل ہموار کیا۔

ایک نئے علاقے کی آبادکاری میں جہاں اتنا بہت کام کرنے کو تھا امریکہ میں لوگوں کو مغموم ہونے کی فرصت نہیں تھی۔ اس لیے نئی لوک کتھاؤں اور جھل قصوں (Tall Tale) اور ان کے کھردرے اور ناہموار مزاح کا وجود ہوا۔ جھل قصے لکھنے والوں میں ارٹیمس وارڈ، جی۔ ڈبلیو ہیرس اور مارک ٹوین (Mark Twain) تھے۔ اس قسم کے قصے اس زمانے کے مشہور رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کا جھل قصہ "کالاویراس کاؤنٹی کا مشہور کودنے والا مینڈک" Calaveras Country ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا جس سے ان کی شہرت اور مقبولیت کی ابتدا ہوئی۔ یورپ کی سیاحت کے مشاہدات "معصوم پردیس میں" (The Innocent Abroad) پوری مزاحیہ صلاحیتوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے ان کو غیر معمولی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ "ٹام سائر" (Tom Sawyer) ۱۸۷۶ء اور "ہکلبری فن کی اولوالعزمی" (Huckleberry Finn) ۱۸۸۵ء دونوں ناول ان کی نوجوانی کی یادوں سے وابستہ ہیں۔ ان کے فن کی بنیاد سچائی پر ہے۔ جو سادگی اور ظریفانہ مبالغے کے ساتھ مارک ٹوین کی طرز تحریر کی خصوصیت ہے یہ امریکہ کی سماجی اور اخلاقی قدروں پر تنقید اور تبصرہ بھی ہے۔ اس تنقید کا سرچشمہ ایک لڑکے کا بیدار ذہن ہے۔ ہک فن مظالم سے بچ کر بھاگ نکلتا ہے لیکن نیگرو غلام جم کو غلامی سے نجات دلانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کا شعور ایک آئینہ ہے جس پر ڈیوک اور شاہ کی ریاکاری اور گرینجر فورڈ کی خاندانی عداوت کا المیہ منعکس ہو کر الفاظ میں اظہار پاتا ہے۔ ان دونوں ناولوں کے بعد ٹوین نے نسبتاً کم ادبی قدر و قیمت والے کئی ناول لکھے جن میں "امریکی دعویدار" (American Claimant) ۱۸۹۲ء "دس لاکھ پونڈ کا نوٹ" ۱۸۹۳ء "پڈن ہیڈ ولسن کا المیہ" ۱۸۹۴ء (Tragedy of Head Wilson) قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح "خطِ استوا کے ساتھ ساتھ" (Following the Equator) ۱۸۹۷ء ان کا آخری سفر نامہ تھا جس میں آسٹریلیا اور ہندوستان میں ان کے لیکچری دورے کے تجربات کا بیان ہے۔ انہوں نے امریکی زندگی کے عیوب پر خصوصاً ریاکاری، حرص و طمع اور سیاسی پراگندگی کو اپنے طنز کا

کا نشانہ بنایا ہے۔ مارک ٹوین کے یہاں امریکی خواب اور اس کی تکمیل کے درمیانی فاصلے اور اس کے تضاد کا احساس تھا جواب بیسویں صدی کے امریکی ادب میں ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخری تیس سال میں امریکی ادب میں ایک مکتب خیال وجود میں آیا جس کی تمام تر توجہ داخلی زندگی پر تھی اور اس نے انسانی فطرت اور شعور کا تجزیہ کیا اور اپنی ذہنی و روحانی کشمکش سے داخلی دنیا دریافت کی۔ اس مکتب خیال کی نمائندگی ہنری جیمس اور ایملی ڈکنسن سے ہوتی ہے۔ حالاں کہ اس قسم کی ادھوری کوشش ان سے پہلے پو، ہارتھورن اور لوویل کر چکے تھے۔ ہنری جیمس بچپن ہی سے یورپ اور وہاں کی زبانوں سے واقف تھے۔ ان کو فرانسیسی زبان پر غیر معمولی عبور تھا۔ وہ امریکہ کو نارسیدہ روایت اور دولت کی وجہ سے ادب کی تخلیق کے لیے ناساز گار سمجھتے تھے۔ ان کے ناولوں میں امریکہ (نئی دنیا) کی ثقافت اور تہذیب کا تقابل مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ثقافتی تصادم کو وہ " عالمی صورت حال " کہتے تھے جو ان کے بیشتر ناولوں کا موضوع ہے جیمس اس نتیجے پر بہت جلد پہنچ گئے کہ امریکی اخلاقی راست بازی اور یورپ کے جمالیاتی نقطہ نظر کا باہمی تصادم ناول کا بہت موثر موضوع بن سکتا ہے۔ ان کے چار ناولوں "روڈرک ہڈسن" ۱۸۷۶ء "امریکن" ۱۸۷۷ء "ڈیوی ملر" ۱۸۷۹ء اور "ایک خاتون کی تمثیل تصویر" (The Portrait of a Lady ـ) ۱۸۸۱ء میں امریکی لوگوں کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں جو یورپ کی قدیم تہذیب کے فریب کا شکار ہو کر غمگین و دل شکستہ ہوتے ہیں۔ لیکن یورپ کی ثقافت کا یہ افسوسناک اثر سب ناولوں میں یکساں نہیں ہے۔ دوسرے دور میں جیمس نے ایسے ناول لکھے جن کا پس منظر اور کردار برطانوی تھے۔ آخری دور کے تین ضخیم ناولوں "فاختہ کے پر و بازو" (The Wings of the Dove) ۱۹۰۲ء "سفیران" ۱۹۰۳ء اور "سنہرا پیالہ" (The Golden Bowl) ۱۹۰۴ء میں انہوں نے پھر عالمی صورت حال کو موضوع بنایا لیکن ان کے نقطہ نظر میں کافی نرمی آگئی تھی۔ ان ناولوں میں یورپ کی ثقافت کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا بلکہ امریکیوں کی مایوسی خود ان کے کردار کی خامیوں سے ظاہر کی۔ جیمس نے فن کار کے شعور کو مرکز اور پیمانہ بنا کر حقیقت نگاری کو خارجی دنیا سے ہٹا کر داخلی دنیا پر مرکوز کیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ انفرادی شعور اور داخلی زندگی کی دریافت اور تجزیے سے بھی حقیقت کا نہایت موثر اظہار ہو سکتا ہے۔

ایملی ڈکنسن نے ذات اور شعور کے تہ در تہ گوشوں کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا اور تمام عمر ایسی نظمیں لکھتی رہیں، جو اپنے موضوعات، طرز فکر اور شعری بندش میں ان کے معاصرین کی نظموں سے مختلف ہیں۔ انہوں نے کالونی دین کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ کسی گرجا گھر کی باقاعدہ ممبر ہوئیں۔ لیکن ان کی پرورش پیورٹین روایت میں ہوئی تھی اس لیے اس کی قدروں سے منحرف نہیں ہوئیں انہوں نے خدا، بائبل اور حیات ابدی پر نظمیں لکھیں جن میں بعض بہت بے باکانہ ہیں۔ ان کے دور حیات میں موضوعیت کا بڑا زور تھا لیکن انہوں نے ایمرسن کی رومانیت اور موضوعیت کے نظریات کو قبول نہیں کیا ایمرسن کی فطرت پرستی کو بھی مسترد کر دیا اور فطرت کو ایک مصور کی نظر سے دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کی طرح فطرت بھی ایک سربستہ راز ہے جس سے واقفیت کا دعوی احمقانہ جسارت کے مترادف ہے۔ موت کے بارے میں بھی ان کا رویہ نیا اور مختلف تھا۔ انیسویں صدی میں بیشتر مرثیے لکھے گئے جن میں غم کی تفسیر ہے۔ ایملی ڈکنسن نے خود موت کے راز کو پانے کے لیے اس کا تجزیہ کیا موت کے بارے میں ان کی نظموں میں سب سے بدیع اور نئی بات موت کو کردار کی شکل میں پیش کرنا تھا۔ ایک ایسے زمانے میں جب خطابت اور لفاظی کی دھوم تھی انہوں نے اختصار اور جامع کلمہ کو اختیار کیا۔ وہ لفظ کی قوت سے واقف تھیں اور اس کو اشاریتاً "تلوار" کہتی تھیں۔ الہیاتی شاعر جون ڈون کی طرح اکثر وہ لفظوں کے پیچیدہ اور نازک معنی کا شعوری استعمال کرتی تھیں۔ لفظوں کے میل سے انہوں نے حسی سانچے بنائے جو اپنی معنویت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ مرکزی خیال کو وہ قاری کے فہم و ادراک پر چھوڑ دیتی تھیں اور محیط پر توجہ کرتی تھیں، "میرا سروکار محیط سے ہے۔" ان کا موسیقی کا شعور ایسا تھا کہ وہ ہم آہنگی اور غیر آہنگی کا یکساں طور سے فن کارانہ استعمال کرتی تھیں۔ انہوں نے نئے قسم کے قوافی ایجاد کیے اور حمد کے میٹر میں نئی تبدیلیاں کیں۔ وہ اپنے طرز خیال اور انداز فکر میں جدید شاعری کی پیش رو ہیں۔

(۷)

۱۸۹۲ء تک رومانیت اور موضوعیت کے علم بردار ایک ایک کر کے اس جہاں سے کوچ کر چکے تھے اور بیسویں صدی کی ابتدا میں امریکہ کی ادبی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا جس کو پُر کرنے کے لیے نیچریت (Naturalism) کی ادبی تحریک وجود میں آئی جس کی جڑیں علاقائیت اور حقیقت نگاری میں تھیں لیکن جس کی آبیاری ارتقائی سائنس ابتدائی علم نفسیات اور صنعتی نظام کے نظریات سے ہوئی۔ اس تحریک پر ہم عصر فرانسیسی، روسی اور جرمن ادب کا عمومی اثر پڑا نیچریت کی تنقیدی اصطلاح کا اطلاق ان ادبی تخلیقات پر ہوتا ہے جن میں جبلی یا فطری انسان کو سائنسی معروضیت سے پیش کیا گیا ہو۔ حقیقت پسندی کے معاملے میں یہ زیادہ محتوی ہے اور فلسفے کے اعتبار سے عقیدۂ جبر سے وابستہ ہے عقیدۂ جبر قنوطیت پسند ہے اور اس میں ایمان رکھنے والا ادیب قنوطی ہوتا ہے جو انسان کو حیوان سے بالاتر نہیں سمجھتا اور اس کے حوصلوں اور امنگوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ڈارون کے حیاتیاتی ارتقا اور مارکس کے فلسفہ اقتصادیات کا اس تحریک پر گہرا اثر پڑا نیچریت انسان کا غیر رومانی تصور پیش کرتی ہے اور حقیقت کے کریہہ اور سنگدلانہ پہلو پر روشنی ڈال کر انسان کی محروری اور شکست خوردگی پر زور دیتی ہے۔ نیچریت نے بالواسطہ سماجی اصلاح کو بھی فروغ دیا۔ کیوں کہ اس نے انسان کو رومانیت اور موضوعیت کی کہر آلود فضا سے نکال کر حیاتیاتی، معاشی اور سماجی حدود میں اس طرح لا کھڑا کیا جیسا کہ وہ واقعتاً تھا۔ ہملن گارلینڈ (Hamlin Garland) نیچریت کے پہلے مفسر تھے۔ حالانکہ انہوں نے اپنی طرز تحریر کو کبھی نیچریت کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو Veritism (راست گوئی) کہتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انہوں نے خصوصی شاہراہیں[4] (Main Travelled Roads) شائع کیا جس میں مغربی سرحد کے کسانوں کی سخت اور المناک زندگی کا نہایت دردناک چہرہ پیش کیا گیا تھا۔ اسی

موضوع کو انہوں نے "درمیانی سرحد کے بیٹے" (A Son of Middle Border —) میں دہرایا۔ اس کے ادبی مقصد کی وضاحت انہوں نے "شکستہ اصنام" میں کی تھی۔ اس طرح امریکی افسانوی ادب حقیقت نگاری کی ایسی سطح پر آگیا جہاں ادب زندگی کا مطالعہ بھی تھا اور نئی ادبی طرز تحریر بھی۔

ان کے علاوہ تین ناول نگار اور تھے جن کی تخلیقات میں حقیقت نگاری اور نیچریت کی حدیں مل جاتی ہیں۔ ان کے نام فرینک نورس (— Frank Norris —) اسٹیفن کرین اور جیک لنڈن ہیں یہ لوگ غیر معمولی ادبی صلاحیت کے مالک تھے اور انہوں نے نہایت کارگر اور فکر انگیز ناول اور کہانیاں لکھی ہیں لیکن کم عمری میں انتقال ہو جانے کی وجہ سے نیچریت کو بہ طور فن یہ لوگ پوری طرح بروئے کار نہ لاسکے اور ان کو وہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی جس کی ان کو توقع تھی۔ "امریکی خواب" میں انسان کی عظمت پر زور تھا اور بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ خواب آسانی سے ٹوٹنے والا نہ تھا۔ اس لیے نیچریت کو جس میں انسان اپنی حیاتیاتی اور معاشرتی حد بندیوں میں مقید تھا شبہ کی نظر سے دیکھا گیا اور اس کے ادب کے خلاف احتجاج کیا گیا فرینک نورس ناول میں بڑے معرکوں کے قائل تھے اور اقتصادی جبریت نے ان کو ایسے ناولوں کا مواد فراہم کیا جس کے بیان میں رزمیہ جیسا انداز پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے پہلے ناول "میکٹیگ" (Macteague) کی اشاعت کے بعد برہمی کی لہر ادبی حلقوں میں دوڑ گئی کیوں کہ اس میں انہوں نے گندی بستی کے حالات اور اس کے بدنما پہلو کی عکاسی کی تھی۔ نورس کا شاہکار "آکٹوپس" ہے جو "جو گندم کے رزمیہ" کا پہلا حصہ ہے اور جو گندم کی کاشت کرنے والوں اور جنوبی ریلوے کے مالکوں کی باہمی کش مکش کا المیہ ہے۔ گندم قوت نمو کی علامت ہے اور ریلوے غیر خلقی قوت کی نمائندہ ہے۔ جو قوت حیات کی تباہی پر تلی ہوئی ہے۔ دوسرا ناول "خندق" شکاگو کی گیہوں کی منڈی کے سٹہ باز اور اس کی حسین بیوی کی داستان ہے۔

اسٹیفن کرین کا پہلا ناول "میگی" (Maggie) ہے جس کی ہیروئن حالات سے مجبور ہو کر عصمت فروشی کرتی ہے اور دردناک موت مر جاتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ناول سماجی حالات کا مطالعہ ہے جس کے ہاتھوں میں انسان کٹھ پتلی کی طرح بے بس ہے اور جن کی تاریک قوت کے سامنے انسان کا ارادہ کمزور اور غیر اہم ہے "تمغۂ احمرین" (Red Badge of Courage) اتحادی سپاہی کی جاں بازی اور اس کے تجربات و سانحات کا بیان ہے۔ واقعات کے سیدھے سادے بیان میں کرین کی اشاریت پوشیدہ ہے۔ ایک طرف جنگ کا سرخ آتش بار اور بے ترتیب ہنگامہ ہے اور دوسری طرف فطرت کا پرسکون حسن ہے جو رزم آرائی سے بے پروا الگ اپنا وجود رکھتا ہے۔ کرین تاثراتی مصوری (Impressionism) اور اس کے چمک دار رنگوں سے واقف تھے۔ ان کی لفظی مصوری بھی بہت حد تک تاثراتی ہے۔ ان کی مشہور کہانی "کھلی کشتی" (Open Boat) کا شمار کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے جو خود اصل واقعہ پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ کرین نے گندی بستی، عصمت فروشی الکحلیت اور دیگر ناخوشگوار موضوعات پر لکھا۔ ان کے اسٹائل کی امیجری، اشاریت اور اسطوری خصوصیات آیندہ آنے والے امریکی افسانوی ادب

کی پیش گوئی کرتے ہیں خصوصاً ہیمنگوے پر ان کا گہرا اثر پڑا۔

جیک لنڈن (Jack London) کا شمار نیچریت پسندوں میں ہوتا ہے۔ حالاں کہ وہ خود کو نطشے کا پیرو مادہ پرست کہتے تھے۔ انہوں نے نطشے، اسپنسر (Spencer) برگساں اور مارکس کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے فطرت کے بے رحم اور جماعتی پہلو کو تصوراتی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں کے پس منظر غیر معمولی اور اکثر عجیب و غریب ہیں۔ مارکس کے مطالعہ سے وہ سماجی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور اقتصادی جبریت کے قائل ہوئے۔ نطشے اور مارکس کے نقطۂ ہائے نظر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن لنڈن کی تخلیقات انہیں دونوں مخالف سروں کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ ان کا ناول "صحرا کی پکار" (Call of the Wild) ۱۹۰۳ء میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ اس کا ایک ہیرو بک نام کا کتا ہے جس کا انسانی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں اور جو اپنی فطری اور جبلّی قوت کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ وہ کئی مالکوں کے ہاتھ بکتا ہے۔ اپنے آخری مالک کو موت سے بچاتا ہے اور اس کے انتقال پر بالآخر جنگلی بھیڑیوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کا ناول "بحری بھیڑیا" (SeaWolf) ۱۹۰۴ء میں ہمفرے وان ویڈن کے بحری سفر کی داستان ہے۔ "کھیل" (The Game) ۱۹۰۵ء میں ایک کے باز" اور "سفید زہریلے دانت" (White Fang —) ۱۹۰۶ء میں "صحرا کی پکار" کی طرح کتے کی کہانی ہے۔ "مارٹن ایڈن" (Martin Eaden) خود نوشت سوانح نگارانہ ناول ہے۔ ان ناولوں پر نطشے کا گہرا اثر ہے۔ لنڈن نے اپنی اشتراکیت پسندی کا اظہار اپنے ناول "فولادی ایڑی" (The Iron Heel) ۱۹۰۷ء میں کیا ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدا کے شاعروں میں دو نام قابل ذکر ہیں۔ ولیم وان موڈی (William Vaughn Moody) نے انیسویں صدی کی شاعری کے مروجہ سانچوں کو توڑنے میں مدد دی۔ ان کی نظم Gloucester Moors میں سماجی مسائل کا بیان ہے۔ ڈارون کے نظریات سے جو ذہنی الجھن پیدا ہوئی اس کو ہلکے مزاحیہ انداز میں انہوں نے اپنی مشہور نظم "مینجری" (The Menagerie) میں بیان کیا ہے۔ اور انہوں نے اپنی شاعری میں اسطور اور علم الانسان کا بھی استعمال کیا ہے جس کی مثال ان کی نظم Thammuz ہے۔ An Ode In Time Of Hesitation ان کی اعلیٰ طنز نگاری کا نمونہ ہے۔ موڈی نے قدیم قہار خدا کے تصور کی مخالفت کی اور یہ بھی ثابت کیا کہ فطری معصیت کا نظریہ جدید انسان کی شخصیت اور علم سے میل نہیں کھاتا۔

ایڈوین ارلنگٹن رابنسن (Edwin Arlington Robinson) کی شاعری کا "ٹلبری ٹاون" ان کے لیے ایک چھوٹی سی کائنات تھا جہاں زندگی کے تجربات کا نچوڑ موجود تھا۔ ان کی مختصر نظموں میں ٹلبری قصبے کی ناکامیوں اور محرومیوں کو نہایت اختصار کے ساتھ ڈرامائی خود کلامی میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں کی حقیقت نگاری اور ان کا نقطۂ نظر سائنسی ہے۔ ان نظموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں غم ایک ٹھوس حقیقت ہے اور خوشی محض ایک آرزو ہے۔ ان کی علامتیت میں عالم گیر سچائیوں کا اظہار ہوا ہے جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہیں۔ ان کے کرداروں کا تجزیہ نازک اور باریک

یعنی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے مفسر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے زمانے کے سائنسی طرز فکر کے اداشناس بھی تھے۔

(۸)

نیچریت کی تحریک نے جس سائنسی انداز فکر اور طرز بیان کو رائج کیا وہ کم وبیش نصف بیسویں صدی کے ادب کی امتیازی خصوصیت ثابت ہوئی گارلینڈ، کرین اور نورس وغیرہ نے ناول اور موڈی اور رابنسن نے امریکی شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا۔ ناول نگاروں میں ایک مکتب خیال ذاتی مسائل پر لکھنے والوں کا تھا۔ ان لوگوں نے ہنری جیمس کی تقلید کی، پو اور ہاتھورن کے نفسیاتی افسانوی ادب کی روایات کو زندہ رکھا اور خارجی واقعات کی بجائے اپنے کرداروں کی داخلی دنیا اور اس کے ہیجان اور کشمکش کی عکاسی پر زور دیا۔

اس قسم کے ناول نگاروں میں تین خواتین ایڈتھ وہارٹن، ایلن گلاسگو اور ولا کیتھر قابل ذکر ہیں۔

ایڈتھ وہارٹن (Edith Wharton) نے ہنری جیمس کی طرح جن کی وہ دوست اور مداح تھیں اپنی کہانیوں کی بنیاد فرد کی اخلاقی جرأت اور حوصلے پر رکھی خواہ وہ "شادمانی کا گھر" (House of Mirth)(۱۹۰۵ء) کی للی بارٹ ہوں جنہوں نے غیر رسمی طرز عمل سے زندگی میں خوشی کی تلاش کی یا "عہد معصومیت" (The Age of Innocence) (۱۹۲۰ء) کے نیو لینڈ آرچر ہوں۔ عالمی جنگ کے بارے میں ان کے زمانے کا مقبول ناول "محاذ پر ایک بیٹا" (A Son At The Front) ہے۔ جس میں ملا جلا سیاسی اور سائنسی انداز فکر ہے۔ ایلن گلاسگو (Ellen Glasgow) کے ناولوں کی واقعات کی بنیاد معاشرتی تبدیلیوں اور درمیانی طبقے کے لوگوں کی جدوجہد پر ہے۔ ان کے دو پسندیدہ موضوعات ہیں۔ امریکہ کی نئی عورت کا تصور اور تغیر پذیر "جنوب" جس میں شجر کاری کے اقتصادی زوال کے ساتھ امیرانہ طرز زندگی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان کے ناولوں کا "جنوب" بنجر اور اجاڑ علاقہ ہے۔ ان کے ناولوں میں قابل ذکر "اجڑی دھرتی" (Barren Ground)(۱۹۲۵ء) "ورجینیا" (۱۹۱۳ء) "زندگی اور گبریلا" (۱۹۱۶ء) "فولاد کی رگ" (Vein Of Iron)(۱۹۳۵ء) ہیں۔ ولا کیتھر (Willa Cather) کے ناولوں کے سربرآوردہ لوگ وہ مہاجر ہیں جو بیرون ملک سے آکر نبراسکا کے گیاہستان میں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ یورپی ثقافت کی روائتیں اور ہنر ولیاقت ساتھ لائے تھے اور تعمیر ملک میں لگے ہوئے تھے۔ ایڈتھ وہارٹن کی طرح وہ بھی ہنری جیمس سے متاثر تھیں اور ان کی سی ہی نفاست اور شائستہ بیانی سے کام لیتی تھیں جیمس نے عالمی صورتحال کے ناولوں میں امریکی لوگوں کو یورپ کے پس منظر میں پیش کیا تھا۔ ولا کیتھر نے یورپ کے لوگوں کو امریکی سرحدی زندگی کی جدوجہد میں دکھایا ہے اور یہ ہی ان کی فن کارانہ جدت ہے۔ ان کے تین ناول O"Pioneers (۱۹۱۳ء) My Antonia (۱۹۱۵ء) اور The Sons of the Lark (۱۹۱۸ء) نبراسکا کی سرحدی زندگی کے بارے میں ہیں۔ انہوں نے تاریخ کا بھی باقاعدہ استعمال تین ناولوں میں کیا ہے۔

بیسویں صدی میں سماجی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اور نئی سماجی الجھنیں اور نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے جو حقیقت نگارانہ بیان چاہتے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے والے سنکلیر لیوس (Sinclair Lewis) تھے جنہوں نے نہایت سرد مہری سے ہم عصر امریکی زندگی کو دیکھا اور اس کی ابتری کو طنز کا نشانہ بنایا۔ لیوس کی سماجی تنقید میں فن کارانہ خلوص اور سچائی ہے۔ انہوں نے ولا کیتھر کی طرح ماضی میں پناہ نہیں لی بلکہ اپنے زمانے کی ابتری سے اعلان جنگ کیا اور کسی قسم کی مفاہمت پر رضامند نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے طنز کا مرکز ریاکاری، مادیت، قصباتی زندگی کی یکسانیت، تعصب، عامیانہ پن اور تنگ نظری کو بنایا ہے۔

۱۹۲۰ء میں مادیت (Babbitt)، ۱۹۲۲ء میں قصباتی زندگی (Arrowsmith)، ۱۹۲۵ء میں طبابت (Elmer Gantry)، ۱۹۲۷ء میں مذہب Dodsworth، ۱۹۲۹ء میں تجارت، ۱۹۳۳ء میں سماجی اصلاح، ۱۹۴۵ء میں شادی اور King Blood Royal، ۱۹۴۷ء میں نیگرو مسائل ان کے اہم موضوعات ہیں۔ اسی طرح منظم انسان دوستی، تھیٹر اور It Can't happen Here ۱۹۳۵ء میں فاشزم ان کے طنز کے موضوعات ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں نیچریت کی آب وتاب عارضی طور سے ماند پڑ گئی تھی لیکن اس تحریک میں بڑی جان تھی اور اسے دوبارہ زندہ ہونا تھا۔ اس ثقافتی ضرورت کو تھیوڈور ڈرائزر (Theodore Dreiser) نے پورا کیا۔ "بہن کیری" (Sister Carrie) (۱۹۰۰ء) ان کا پہلا ناول ہے۔ ڈرائزر کا مرکزی موضوع امریکی سماج کے امیر وغریب سوفسطائی اور کمزور طبقوں کا فرق اور تضاد تھا۔ سماجی قوانین صرف ایک خاص طبقے کے مفاد میں تھے جو دوسرے طبقوں کا استحصال کر رہا تھا۔ ڈرائزر کے خیال کے مطابق اس استحصال کو اشتراکیت اور سماجی اصلاح کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا تھا۔ "بہن کیری" کی طرح ان کا دوسرا ناول "جینی گرہارڈ" (۱۹۱۱ء) ان کی دو بہنوں کی زندگیوں کے واقعات پر مبنی ہے جنہوں نے خاندان کی حدود سے نکل کر قسمت آزمائی کی اور دونوں کو صدمات اٹھانے پڑے۔ ان کا نمائندہ ناول اور ان کا شاہکار "امریکن المیہ" (American Traged) ۱۹۲۵ء ہے۔ "امریکن المیہ" ایک امر واقعہ پر مبنی ہے جس کے مقدمے کی مفصل رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ ناول کا ہیرو کلائڈ پہلے رابرٹا سے جنسی تعلقات پیدا کرتا ہے۔ اسے حاملہ پاکر وہ اپنی شادی اور ترقی میں حائل سمجھتا ہے اور اسے ایک جھیل میں ڈبو کر مار ڈالتا ہے۔ اسے موت کی سزا سنائی جاتی ہے اور موت کا انتظار کرتے ہوئے اسے اپنے اخلاقی جرم کا احساس ہوتا ہے۔ اس ناول میں دوستوفسکی کے ناول "جرم وسزا" کی طرح انسانی ذمہ داری کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ مجرم کون ہے وہ فرد جو جبلی خواہشات کے ہاتھوں میں بے بس ہے یا وہ سماج جس کے سماجی ماحول سے ارتکاب جرم کی تحریک ہوتی ہے۔ اس تضاد کا المیہ پورے امریکی سماج کا المیہ بن جاتا ہے جس کا بیان ڈرائزر نے اپنی پوری فن کارانہ صلاحیتوں کے ساتھ کیا ہے۔

(۹)

افسانوی ادب کی طرح شاعری کو بھی نیچریت کی تحریک نے متاثر کیا مصنوعی اور نفاست پسند شعری بندش کو ترک کر مقامی بولی۔ اس کے محاورے اور آہنگ کو بروئے کار لا کر علاقائی خصوصیت کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کی گئی۔ اس قسم کی شاعری نئی شاعری قرار دی گئی اور اس کی نشر و اشاعت میں چھوٹے رسالوں خصوصاً ہیریٹ منرو کے قایم کردہ میگزین "پوئٹری" (Poetry) نے اہم رول ادا کیا اور ہر قسم کی تجرباتی شاعری کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان شاعروں میں وچل لنڈسے (Vachel Lindsay) امریکہ کے مغرب اور جنوب مغرب میں اپنے گیت بیچتے پھرتے تھے اور ان کو گیت برائے روٹی کہا کرتے تھے۔ لوگ ان کے گیت کو گیتوں کی دھنوں میں گایا کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے "کانگو اینڈ آدھر پوئمس" (The Congo & Orther Poems) (۱۹۱۴ء) میں گیا ہستانی آہنگ، شہروں کا شور و غل اور افریقی جنگلوں کی بازگشت سنائی پڑتی تھی جو وہ جاز Jazz موسیقی کے ساتھ سناتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد لوک کتھاؤں پر تھی۔ اور ان کا سب سے اہم موضوع امریکہ تھا۔ ایڈگر لی ماسٹرس (Edgar Lee Masters) کی شہرت کا دار و مدار ان کے مجموعۂ کلام (اسپون ریور انتھولوجی) Spoon River Anthology (۱۹۱۵ء) پر ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں طنزیہ انداز میں لکھی گئی ہیں جو اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے نئی ہیں۔ ان میں قصباتی زندگی کی ریاکاری سطحی شرافت، جنسی بے راہ روی اور مایوسی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کارل سنڈبرگ (Carl Sandburg) نے امریکی لوک کتھاؤں کی میراث کو اپنایا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان کی نظموں کے مجموعے Chicago Poems (۱۹۱۶ء) سے ہوا جس پر ان کو پولیٹزر انعام ملا لیکن اس کے خلاف مباحثے کا طوفان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض لوگوں نے اس کو شاعر ماننے سے انکار کیا۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں روایتی شاعری کے برعکس ہیں اور ان میں شکاگو شہر کی کھردری، بھدی اور بے رحم زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے گیا ہستانی زندگی کے تجربات کو اپنی شاعری کے دامن میں سمیٹا اور Slabs of the Sun - Burnt West - کے عنوان سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ انہوں نے ہر نسل کے لوگوں کے لوک گیت اور غنائیہ نظمیں Ballads جمع کیں اور انہیں شائع کیا۔ The People ان کا آخری شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے امریکی جمہوریت کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ امریکی عوام اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود زندہ اور پائندہ رہیں گے۔ یہ تینوں شعرا شکاگو شعرا کے نام سے مشہور ہیں۔

رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) نے امریکی شاعری کی روایت میں رہ کر علاقائی موضوعات اور زبان و بیان میں نئے تجربے کیے اور امریکی شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا۔ فارم پر خود کام کرتے ہوئے انہوں نے نیو انگلینڈ کے کسانوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان کی شاعری کی اپیل عالم گیر ہے کیوں کہ اس میں علاقائی جزئیات کی سطح کے نیچے لازوال سچائیاں ہیں۔ جو رنگ و نسل اور جغرافیہ کی حدود سے بالاتر ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت پر ختم ہوتی ہے۔ فراسٹ کی ظاہری سادگی سے اکثر پڑھنے والے اس کی معنوی گہرائی کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ فراسٹ کی شاعری میں پیکر اور استعارے طنز کا محور ہیں جن کے ذریعہ وہ کائناتی اور انسانی حقوق کا ادراک و بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ توجہ کا مرکز انسان اور اس کے دل و دماغ یا اس کے ماحول میں چھپی ہوئی سچائیاں ہیں جن کا وہ انکشاف کرتے ہیں۔ چوں کہ فراسٹ نے امریکی دیہات سے اپنی شاعری کا مواد حاصل کیا ہے۔ یا ان کا ادبی طرزِ عمل ہے جس سے وہ جدید انسان کی برگشتگی، بیگانگی اور تنہائی کا اظہار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں An Old Man's Winter Night, The Black Cottage Snow, A Servant to Servants وغیرہ انسانی صورت حال کی بنیادی تنہائی اور المناکی کا اظہار ہیں فطرت کی طرف فراسٹ کا رویہ غیر رومانی ہے اور وہ ان معنوں میں ورڈز ورتھ کی ضد ہیں۔ علاقائیت سے فراسٹ نے نیچریت کی تحریک کو فروغ دیا لیکن وہ جبریت کے قائل نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ انسان کی اولو العزمی اور خاموش شجاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا سے ان کا جھگڑا عاشق و معشوق کا سا ہے اور اس دنیا سے بہتر نہ کوئی اور جگہ رہنے کی ہے اور نہ اس زندگی سے زیادہ خوشگوار کوئی زندگی ہے۔

بیسویں صدی میں کسی ایک ادبی تحریک کو مرکزی حیثیت نہیں دی جا سکتی ایک طرف ایسے شعرا تھے جنہوں نے علاقائیت اور مقامی بولی سے نیا شاعرانہ آہنگ وضع کیا جس نے شاعری کو عوام میں مقبول اور ہر دل عزیز بنایا۔ دوسری طرف ایسے شعرا بھی تھے جنہوں نے پیکر نگاری اور فرانسیسی اشاریت کی تحریک سے استفادہ کیا اور اپنے عالمانہ تبحر سے ایسی دقیق شاعری کی تخلیق کی جس کو سمجھنے والے بہت کم لوگ تھے۔ اس قسم کے شاعر ایزرا پاونڈ (Ezra Pound) اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Eliot) تھے جو نقاد بھی تھے اور جن کی تنقید نے ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ بہ حیثیتِ شاعر پاونڈ کا اولین کام انگریزی زبان کو عمومیت سے پاک کرنا تھا۔ اس کام میں اکثر انہوں نے اپنے مغلق اور دور از کار تبحر علمی سے کام لیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے کینٹوز (Cantos) کا موضوع ماضی سے متعلق زمانۂ حال ہے۔ Presentness of the Past جس کا مطلب یہ تھا کہ شاعر کو ماضی کے ادب کی مدد سے نئی شاعری کی تخلیق کرنا چاہیے۔ دوسرے معاملات کی طرح، اس معاملے میں ان کے ممتاز ہم عصر شاعر ایلیٹ ان سے متفق تھے۔ پاونڈ کی شاعرانہ شہرت میں گھن لگنے کی وجہ ان کی سیاسی سرگرمی تھی جس کو ان کے ہم وطنوں نے معاف نہیں کیا۔ اکثر ان کو خبطی یا پاگل تصور کرتے تھے اور کینٹوز کی مشکل پسندی کو ان کی ذہنی الجھن سے منسوب کرتے تھے۔ اس میں یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، پراونسل، چینی اور جاپانی زبانوں کے حوالے اور اقتباسات ہیں جو عام قاری کے لیے ناقابل فہم ہیں۔ پاؤنڈ کی عدم مقبولیت کی دوسری وجہ سرمایہ داری کے خلاف ان کا جارحانہ ردِ عمل تھا۔ ان کے خیال کے مطابق سود (Usury) اور اس کے لوازم سرمایہ کاری بنک اور اقتصادیات سماج کی ابتری کی بنیاد ہیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب اور ثقافت پر زوال

سودخور اقتصادیات سے آیا۔ ان کا یہ نظریہ امریکہ اور انگلینڈ میں نہایت ناپسندیدگی سے دیکھا گیا کیوں کہ ان ممالک کے سماج کی بنیاد سرمایہ داری پر ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ پاؤنڈ کی شاعری فنی حسن سے یکسر خالی ہے۔ کینٹوز میں جوان کی سب سے دقیق نظم ہے ہمیں ایسے ٹکڑے ملتے ہیں جن میں غزلیہ شاعری کا لازوال حسن اور لطافت ہے اور ایسے حصے بھی ہیں جن میں پاؤنڈ کی لطیف بذلہ سنجی نمایاں ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے پہلے مجموعے *Prufrock & Other Observations* میں ریاست اور مذہب کے انحطاط سے پیدا ہونے والے انسانی کردار کی کمزوری پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ خیال دوسرے مجموعے میں بھی دہرایا گیا ہے۔ مضامین کے پہلے مجموعے۔ *The Sacred Wood* ۱۹۲۰ء میں ایلیٹ نے تنقیدی شعور کا بنیادی مسئلہ پیش کیا کہ روایت اور انفرادی ذہنی استعداد میں کیا رشتہ ہے۔ حال کا ماضی اور ماضی کا حال اور مستقبل سے کیا رابطہ ہے۔ شاعر کا تخلیق سے پہلے اور اس کے بعد نظم سے کیا رشتہ ہے یہ مسائل تنقید کے علاوہ ان کی شاعری کے موضوعات بھی ہیں۔

ایلیٹ کو نظام کائنات میں حسن ترتیب اور انضباط کی تلاش تھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ سیاست میں وہ شاہ پرست، ادب میں کلاسیکیت پسند اور مذہب میں اینگلوکیتھولک ہیں کیونکہ ان تینوں اداروں میں ان کو استحکام نظر آیا۔ ایلیٹ قدامت پسند اور رجعت پرست تھے حالاں کہ آخری زمانے میں ان کی قدامت پرستی میں سخت گیری باقی نہیں رہی۔ ایلیٹ کی شاعری کا مزاج اور طریقۂ کار فرانسیسی اشاریت پسند شعرا اور سترہویں صدی کے مابعد الطبیعیاتی شعرا سے متاثر ہے۔

The Love Song Of Prufrock کا مدعا (*Motif*) انسانی نااہلیت اور بے بسی ہے جو دوسری نظموں میں بھی دہرایا گیا" ویرانہ" (*The Wastland*) میں مغربی تہذیب کی ناکامی اور اس کے بکھرے ہوئے شیرازے کا بیان ہے۔ نظم کی بنیاد میں چاروں عناصر خاک، باد، آتش اور آب ہیں اور پیش منظر زرخیزی اور افزائش کے اساطیر ہیں جو نظم کے مختلف حصوں میں باہمی رابطہ قائم کرتے ہیں اور واردات، محبت اور موت کے موضوعات کو دہراتے ہیں۔ *Four Quartets* (۱۹۴۳ء) میں عیسائی اعتقاد کی بنیادوں پر فلسفیانہ سطح پر بحث ہے۔ وقت کی نوعیت، تاریخ کا مفہوم و اہمیت، مذہبی نفسیات اور تجربات کی ماہیت اس کے موضوعات ہیں مذہبی عقائد کی وضاحت دوسری نظموں اور شعری ڈرامہ *Murder in the Cathederal* میں بھی کی گئی ہے۔ ان کے دوسرے شعری ڈرامے تجرباتی ہیں۔ ایلیٹ کم از کم ذہنی طور پر قدامت پرست تھے اور جمہوریت کے خلاف تھے لیکن انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے بعد کے بحران کی نمائندگی کی ہے اور اس مایوس اور کھوکھلے انسان کی ترجمانی کی ہے جو جنگ کے بعد زندگی کی تاریک شاہراہوں پر ہراساں اور تنہا کھڑا تھا۔

امریکی ادیبوں کی وہ نسل جو انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئی تھی ایسے زمانے میں جوان ہوئی جب امریکہ اپنی صنعتی ترقی اور وسائل کی بنا پر ایک عالم گیر قوت بن چکا تھا جہاں ہر شخص کی مالی خوش حالی اور کامیابی یقینی سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو اس نسل کے لوگ جمہوریت کی بقا کے لیے اس جنگ میں کود پڑے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگ انسانی آزادی کی جنگ ہے لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد جب یہ واپس وطن پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں فی الواقعہ جنگ کی صعوبتیں نہیں تھیں بلکہ امریکہ نے جنگی صنعتوں سے بہت نفع کمایا تھا اور جنگ ان کے لیے باعث برکت ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انسانی آزادی کے تمام نعرے کھوکھلے تھے۔ اس لیے وہ اپنی میراث سے منحرف ہوگئے اور ان تمام قدروں کا شیرازہ بکھر گیا جن کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگائی تھی۔ یہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور اس بغاوت کی ابتدا اخلاق اور فن میں راست گوئی سے ہوئی۔ یہ لوگ پیرس میں تارک وطن ہوکر دریائے سین کے بائیں کنارے پر سکونت پذیر ہوئے جہاں وہ اپنے مایوس جسم و ذہن کی تسکین کے لیے کثرت سے شراب پیتے تھے اور اکثر غیر روائتی اور بے قاعدہ زندگی گزارتے تھے۔ جس میں جنسی بے راہ روی بھی شامل تھی۔ گرٹروڈ اسٹین (*Gertrude Stein*) نے اس نسل کو ہزیمت خوردہ یا مایوس نسل کا لقب دیا۔ وہ خود کو اس نسل میں شامل نہیں سمجھتی تھیں حالانکہ وہ بھی ایک طرح کی باغی تھیں انہوں نے افسانوی ادب کی مروجہ طرز تحریر سے بغاوت کی تھی۔ اس نسل کی بغاوت کی ابتدا حقیقتاً ایف اسکاٹ فٹز جیرالڈ (*F. Scott -Fitzgerald*) کے ناول "جنت کے اس طرف" (*This Side Of Paradise*; ۱۹۲۰ء) سے ہوئی جو نیم خود نوشت سوانح حیات ہے اور جو پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک نوجوان طالب علم کی زندگی کا بیان ہے۔ محبت اور ادب کی کامرانیوں کے بعد وہ بھی عالمی جنگ سے دوچار ہوتا ہے اور تمام اخلاقی قدروں کی دیوار مسمار ہو جاتی ہے۔ ناول کے اختتام پر وہ اداس اور تنہا کھڑا نظر آتا ہے فٹز جیرالڈ نے اپنے دوسرے ناول " دی گریٹ گیٹسبی " (*The great gatsby*) میں ایک شخص کی کہانی لکھی ہے جو دولت کمانے میں تو کامیاب رہتا ہے لیکن اس دولت سے اپنی کھوئی ہوئی محبت نہیں حاصل کر سکتا۔ زندگی میں خوشی اور اطمینان کا سرچشمہ دولت مندی نہیں ہے اور یہ موضوع ان کے ناول " ٹنڈر از دی نائٹ " اور " دی لاسٹ ٹائی کون" (*The Last Tycoon*) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

جون ڈوس پیوس (*John Dos Passos*) نے فرد کی مایوسی اور ہزیمت خوردگی کو امریکی سماج کی شکست بنا کر پیش کیا۔ اس سماج پر تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے اور کسی وقت بھی اس کا تہذیبی ڈھانچہ ٹوٹ کر بکھر سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے پہلے ناول تین سپاہی (*Three Soldiers*) (۱۹۲۱ء) میں جنگ بہ حیثیت ایک منظم ادارے پر سخت تنقید کی اور اسے انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا۔ " مین ہٹن ٹرانسفر " (۱۹۲۵ء) میں نیویارک کی زندگی اور اس میں رہنے والے افراد کی بے دلی اور لامقصدیت کا اظہار ہوا ہے۔ اس طرح ان کا مشہور سہ المیہ " یو۔ ایس۔ اے" جدید صنعتی سماج کی ناکامی کی داستان ہے اور اخلاقی ابتری اور حرص کی عکاس ہے۔ اس میں ہر شخص تباہی اور بربادی کا نشانہ بنتا ہے اور وہ شخص بھی شکست خوردہ ہے جو بظاہر کامیاب معلوم ہوتا ہے۔ ناول کے خاتمے پر ایک آوارہ گرد اور خانماں برباد شخص ایک ہوائی جہاز کو گزرتے ہوئے دیکھتا ہے جس میں دولت مند لوگ سوار ہیں اور اس خواب خرگوش میں مبتلا ہیں کہ وہ ایک

عظیم ملک میں شاندار زندگی گزار رہے ہیں ۔

ہزیمت خوردہ نسل کے سب سے اہم اور نمائندہ ناول نگار ارنیسٹ ہیمنگوے (Ernest Hemingway) ہیں جن کے افسانوی ادب میں اس نسل کے فنی اور سماجی تصورات اپنے انتہائی عروج کو پہنچے اور جن کا مرکزی خیال جنگ اور اس کے تشدد، خون ریزی اور موت سے حاصل کیا گیا ہے۔ انہوں نے زبان کے معاملے میں بھی انقلابی تبدیلی پیدا کی جس نے اگلی نسلوں کے طرز بیان اور مکالمہ نویسی کو متاثر کیا۔ ان کی کہانیوں اور خاکوں کا مجموعہ "ہمارے دور میں" کا امریکی ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا جس کی تمام کہانیاں تشدد اور خون ریزی کے واقعات سے پُر ہیں۔ ان کہانیوں کا مرکزی کردار نک ایڈمس جنگ میں زخمی ہو کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سماج سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور وہ علاحدہ امن کا نظریہ اپناتا ہے۔ یہ نظریہ ان کے دو ناولوں "سورج بھی نکلتا ہے" (The Sun Also rises) اور "ہتھیاروں کو الوداع" (Farewell to Arms) میں دہرایا گیا ہے "سورج بھی نکلتا ہے" ایک عالمی تارکِ وطن حلقے کے بارے میں ہے۔ ان کی زندگی میں کوئی مقصد نہیں اور یہ اپنا وقت مے نوشی، مچھلی کے شکار، سانڈوں کی لڑائی اور آزادانہ جنسی تعلقات میں گزارتے ہیں۔ لیکن اس ازالۂ سحر کی منزل پہلے ان لوگوں نے "ہتھیاروں کو الوداع" کے ہیرو ہنری کی طرح جنگ کی ناقابل بیان اذیتیں جھیلی تھیں۔ ہنری کو جنگ سے فرار ہونا پڑتا ہے اور اس کی محبوبہ بچے کی ولادت میں مر جاتی ہے اور وہ ایک اجنبی ملک میں تنہا رہ جاتا ہے۔ جہاں لاشوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ ان دونوں ناولوں میں ہیمنگوے کی تیمریت اور جبریت صاف نمایاں ہے؛ زندگی ایک اندھی جدوجہد ہے جس میں بالآخر شکست انسان کو ہوتی ہے۔ ان کے ناول "امیر و نادار" میں ہیری مارگن یہ سبق سیکھتا ہے کہ انسان اپنی بقا کو تنہا قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس نقطۂ نظر کا مکمل اظہار ان کے مشہور ناول "گھنٹیاں کس کے لیے بجتی ہیں" (For Whom the Bell Tolls) (۱۹۴۰ء) میں ہوا ہے۔ منظم سماج انسانی بقا کے لیے ضروری ہے اور انفرادی طور پر ہر شخص کو اپنی سماجی ذمہ داری پوری کرنا ہے۔ اس لیے ناول کا ہیرو رابرٹ جورڈن سماج سے بے تعلق نہیں ہے اور ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں جمہوریت پسند طاقتوں کے ساتھ ہے جو رجعت پسندی کے خلاف صف آرا ہیں۔ ہیمنگوے کا شاہکار ناول "بوڑھا انسان اور سمندر" (The Old Man and the Sea) ہے۔ جس کا ہیرو سنٹیاگو اپنی بقا کے لیے فطرت سے برسرِ پیکار ہے۔ اس جدوجہد میں اسے ان قوتوں پر فتح ہوتی ہے جن کی تسخیر ممکن ہے لیکن کچھ قوتیں ایسی بھی ہیں جو ناقابل تسخیر ہیں۔ جن کے خلاف وہ ممکن حد تک لڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان ہلاک ہو سکتا ہے لیکن شکست نہیں کھا سکتا۔ ہیمنگوے کا یہ نقطۂ نظر اس مایوسی اور ہزیمت خوردگی کے مقابلے میں صحت مند ہے جو انہوں نے پہلے دو ناولوں میں پیش کیا تھا۔

(۱۰)

بیسویں صدی کے تین ناول نگار ایسے بھی ہیں جن کا شمار مایوس یا ہزیمت خوردہ نسل میں نہیں ہوتا اور جن میں سے دو کو نوبل انعام ملا۔ ان کے نام ولیم فاکنر (William Faulkner) ٹامس وولف (Thomas Wolfe) اور جون اسٹائن بیک (John Steinbeck) ہیں۔ دراصل یہ تینوں ناول نگار انفرادیت پسند ہیں اور نسلی حافظے کی مدد سے حقیقت کی پیش کش ایک خود ساختہ تخیلی دنیا میں کرتے ہیں، جو حقیقی دنیا سے مختلف ہے۔ فاکنر نے ایک ایسا ہی اسطوری علاقہ اپنے ناولوں کے لیے تخلیق کیا جس کا نام انھوں نے "یوکناپٹافا" (Yoknapatawpha) رکھا۔ اس علاقے میں غلاموں کی محنت سے امرا کی خوشحالی قائم تھی۔ اپنے ناولوں میں امرا کا نام فاکنر نے (Sartoris) اور Compson خاندان رکھے۔ خانہ جنگی میں امرا کی شکست کے بعد ان کا زوال شروع ہوا۔ ان کو مات دینے والے سفید فام تجارتی اور مادہ پرست لوگ تھے۔

"دی ساؤنڈ اینڈ دی فیوری" کے بعد لکھے گئے ناولوں میں اشاریت کی بھی آمیزش ہے اور ان کے طرز بیان میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ ان کا ناول "دی فیبل" ایک تمثیل ہے۔ فاکنر کی توجہ واقعات سے زیادہ کرداروں کے پیچیدہ ذہنی ردعمل پر ہے اور وہ نفسیاتی ناول کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے مشہور ناول — The Sound and the fury — کا ایک اہم حصہ واقعتاً ایک فاتر العقل کا بیان کیا ہوا ہے جو بظاہر بے معنی ہے۔ یہ ناول اور "لائٹ ان آگسٹ" صرف ایک دن کے واقعات پر مبنی ہے لیکن ماضی کے واقعات حافظے اور یادداشت سے بیان ہوتے ہیں۔ غلامی کے خلاف اپنی طویل کہانی The Bear میں وہ جنوبی خطہ "ساؤتھ" کے زوال کی وجہ غلامی بتاتے ہیں جس کا ان کے نزدیک اخلاقی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے کوئی جواز نہیں تھا۔

ٹامس وولف نے بھی امریکہ کے ایک علاقے کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنایا یہ علاقہ شمالی کیرولینا کا تھا جس کے ایک شہر میں وہ خود پیدا ہوئے تھے اپنے ناولوں میں انہوں نے اس کا نام اولڈ کٹا بار رکھا۔ اس اعتبار سے وولف علاقائی ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے پانچ ناولوں میں جن میں سے تین بعد مرگ شائع ہوئے، اپنی زندگی کے تجربات کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ وہ بے پناہ تخلیقی قوت کے مالک تھے اور ان کے ناولوں میں الفاظ کا آبشار امڈتا ہے اور یہ خصوصیت ان کی خوبی ہے اور خامی بھی۔ خامی ان معنوں میں کہ ان کے ناول بہت طویل ہو گئے ہیں۔ اپنے ناولوں کے ہیرو وولف خود تھے ان کی اصل زندگی کی طرح ان کے ناول Look Homeward Angel کا ہیرو یوجین ایک سنگ تراش کے گھر پیدا ہوتا ہے۔ یوجین پہلے تعلیم کی غرض سے باہر نکلتا ہے اور بالآخر مصنف بننے کی خواہش میں گھر کو خیرباد کہتا ہے سب ناولوں میں زندگی کی تلخیوں سے فرار کی کوشش اور "گھر لوٹنے" کی خواہش کا اظہار بار بار ہوا ہے۔

جون اسٹائن بیک نے اپنی توجہ کا مرکز وسطی کیلی فورنیا کی وادی سیلناس کو بنایا اور یہ وادی اتنی ہی ان کے تخیل کی پیداوار ہے جتنے فاکنر کا یوکناپٹافا اور وولف کا اولڈ کیٹاڈا ہیں۔ وادی سیلناس میں آباد ہونے والے لوگ میکسیکو سے آئے ہوئے کسان، اٹلی سے آئے ہوئے ماہی گیر، بوہیمیا سے آئے ہوئے کاریگر اور فن کار ہیں انہیں لوگوں کی زندگی کا المیہ۔ ان کے نسلی خصوصیات، ان کی جدوجہد، ان کی ناکامیاں اور مایوسیاں اسٹائن بیک

کے ناولوں اور کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ اسٹائن بیک سادہ، زرعی اور قدیم تہذیب کی سادگی کے دلدادہ تھے جو ایک طرح سے امریکی شہری معاشرے کے خلاف ردعمل تھا۔ اس لیے ان کے ہیرو بالعموم غریب، ناکام اور سماج کے ناموزوں اور ستائے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے ناول "چوہے اور انسان" (Of Mice and Man) (۱۹۳۷ء) کی اشاعت کے بعد ان کی شہرت مستحکم ہوگئی۔ وہ مارکس کے سیاسی نظریات سے متاثر سمجھے جاتے تھے حالاں کہ ان کا نقطۂ نظر کمیونسٹ پارٹی کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ In Dubious Battle (۱۹۳۶ء) میں سیب توڑنے والے عارضی مزدوروں کی ہڑتال کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی طرح — The Grapes of Wrath (۱۹۳۹ء) اوکلا ہوما کے کسانوں کی داستان ہے جو بڑھتی ہوئی صنعت سے اپنے علاقے سے بے گھر ہو کر کیلی فورنیا کام کی تلاش میں آتے ہیں۔ اس ناول کا آخری منظر مشہور ہے جس میں روز بھوک سے قریب المرگ ایک آدمی کو اپنا دودھ پلاتی ہے۔ ان کا آخری ناول "ایسٹ آف ایڈن" بائبل کے کین اور ایبل کی تمثیلی کہانی وادی سینلاس کے پس منظر میں دہرائی گئی ہے اسی طرح تمثیلیں (The Pearl (۱۹۴۸ء) اور Burning Bright (۱۹۵۰ء) بھی ہیں۔

شاعری اور افسانوی ادب کے مقابلے میں امریکی ڈرامے کی نشوونما اور ترقی بہت سست رفتار تھی اور وہ نسبتاً بہت دیر سے پختہ ہوا۔ بیسویں صدی میں یورپ میں متعدد نئے تجربات ڈرامے کی تکنیک میں کیے گئے اور ان کا اثر امریکی ڈرامے پر بھی پڑا لیکن "یوجین اونیل" (Eugene O'Nell) سے قبل امریکی ڈرامہ محض تفریح کے لیے لکھا جاتا تھا جس میں جذباتی اور میلو ڈرامائی عناصر نمایاں تھے۔ "یوجین اونیل" سے جدید امریکی ڈرامے کی ابتدا ہوئی حالاں کہ نئے اور ملکی امریکی ڈرامے کی تشکیل میں پلمر رائس اور میکسویل انڈرسن کا ہاتھ بھی تھا۔ امریکہ میں جرمنی کی تقلید میں چھوٹے تھیٹر (— Little Theatre —) کی تحریک شروع ہوئی جس سے بالآخر تھیٹر گلڈ کی بنیاد پڑی جس نے یورپی ڈرامے کے ترجمے پیش کیے اور رالمس اور اونیل کے ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے۔ اونیل نے ڈرامے کی ایلیزبتھین روایت سے بغاوت کی اور نفسیات خصوصاً شعور اور لاشعور کے محرکات کی بنیاد پر امریکی ڈرامے میں نئی جہت، گہرائی اور سنجیدگی پیدا کی۔ وہ براہ راست ادبی اثر اور تقلید سے آزاد تھے۔ ان کا ہر ڈرامہ منفرد ہے۔ ادر کرداروں کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی تناؤ سے تشکیل پاتا ہے انھوں نے باطن نگاری (Expressionism) کا استعمال کیا ہے جس کی ابتدا انیسویں صدی کی مصوری میں ہوئی تھی۔ اونیل کا ڈرامہ The Hairy Ape کے بیشتر مناظر خصوصاً آخری مسخ شدہ حقائق باطن نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ اونیل نے کئی طرز کے ڈرامے لکھے ہیں۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان ان کے نو ڈرامے اسٹیج ہوئے جو سبھی ایسے ہیں اور جن میں اختلاط نسل، تزویج محرمات اور جرائم کو پیش کیا گیا ہے ان ڈراموں میں All God's Chilhin Got Wings (۱۹۲۴ء) Desire Under the Elms (۱۹۲۴ء) The Great God Brown (۱۹۲۶ء) اور Strange Interlude (۱۹۲۸ء) ہیں۔ ان کے ڈرامے — Morning — Becomes Electra (۱۹۳۱ء) میں یونانی المیے کی کلیٹمنسٹرا اور اگامیمنن کی کہانی کو نیو انگلینڈ کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ The Iceman Cometh (۱۹۴۶ء) ڈرامائی تمثیل ہے جس میں عام انسان موجودہ دور کی مایوسی اور معنویت سے بھاگ کر اپنے خواب میں پناہ لیتا ہے۔ ان کا آخری ڈرامہ Long Day's Journey Into Night (۱۹۵۶ء) محبت، جنون اور موت کے ڈرامے کو پیش کرتا ہے جو والدین کھیلتے ہیں۔ یہ ڈرامہ اونیل کے والدین کے بارے میں ہے، یہ ایک طرح کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ موضوعات کے تنوع اور تجربات کی بنا پر اونیل کا شمار امریکہ کے سب سے بڑے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

II

دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا مختلف کیمپوں میں بٹ گئی اور باہمی تناؤ نے سرد جنگ کی شکل اختیار کر لی جس سے دنیا کا کوئی ملک محفوظ نہ رہ سکا۔ کوریا اور ویت نام میں محدود جنگ ہوئی جس میں امریکی سپاہی لڑ رہا تھا۔ حالاں کہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے لڑ رہا ہے ایٹم اور ہائڈروجن بم نے انسانی تہذیب کا مستقبل غیر یقینی بنا دیا اور فرد کے وجود میں لامعنویت پیدا کر دی۔ یورپ کی طرح امریکہ میں بھی سیاسی اور معاشرتی بے اطمینانی پھیلی جس کا اظہار امریکی ادب میں ہو رہا ہے۔ انسانی تہذیب کی تباہی کے امکانات اور خوف نے حساس فرد کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اندر اس ذات Self کی دریافت کرے جو سماج سے برگشتہ اور تنہا تھی۔ منظم سماج بے معنی ہو چکا تھا اور اس سے ناوابستگی اور لامقصدیت زندگی کا قابلِ فہم راستہ تھا۔ اس لیے ذات غیر ذات ہو گئی جس نے ایسی شاعری کی تخلیق کی جو غیر شاعری (Anti-Poetry) تھی یا ایسی کہانی لکھی جو غیر کہانی (Anti-Story) تھی اور جس کا ہیرو غیر ہیرو (Anti-Hero) تھا یا ایسا ڈرامہ اسٹیج کیا جو غیر ڈرامہ اور مہمل تھیٹر (Theatre of the Absurd) تھا۔ امریکی شاعری میں دو متضاد گروپ وجود میں آئے۔ پہلا گروپ اکیڈمک شعرا کا تھا جس کے دو حلقے درباری شعرا (Court Poets) اور اقبالی شعرا (Confessional Poets) کے تھے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان جدید شاعری کے چار مجموعوں میں اس قسم کے شعرا کی تعداد اکتالیس ہے، دوسرے گروپ کے شعرا کو بیٹ نکس (Beat Niks) اور غیر اکیڈمک شعرا کہا جاتا ہے پہلے گروپ کی نمائندگی تھیوڈور روتھے، رچرڈ ولبور، رابرٹ لوویل اور اسنوڈگراس سے ہوتی ہے۔ دوسرے گروپ میں تین حلقے بیٹ نک، بلیک ماؤنٹین گروپ اور نیویارک گروپ ہیں اور ان کی نمائندگی کرنے والوں میں ایلن گنسبرگ، گریگری کارسو، اور چارلس اولسن ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک شاعر ہیں جن کا جدید شاعری کے نشوونما میں نمایاں ہاتھ ہے جن میں پولیٹزر انعام یافتہ ایلیزبیتھ بشپ اور اسٹینلے کونٹز، میوریل روکیسر اور کارل شپیرو ہیں جنھوں نے جنگ اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

تھیوڈور روتھکے اکثر مزاحیہ مہمل نظمیں لکھتے ہیں اور ایسی بھی جن میں مزاح اور دہشت انگیزی کا ملا جلا تاثر ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں ان کے شعری مجموعے

I Am I,Say the Lamb (۱۹۶۱ء) میں ہیں۔ وہ انسانی نفس کے محرکات، ذہنی عمل، اس کی سرخوشی اور شکن کا تجزیہ اور بیان کرتے ہیں۔ رچرڈ ولبور کو درباری شاعر کہا جاتا ہے جس سے مراد ان کی شاعرانہ استادی کا اعتراف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح جن بوتل کی قید سے طاقت حاصل کرتا ہے اسی طرح شاعر قواعد اور ضوابط سے فنی کمال حاصل کرتا ہے انہوں نے شاعری میں پہیلیاں، رباعیاں اور بیلڈ یکساں مہارت سے لکھے ہیں۔ انہوں نے مشکل پسندی کبھی اختیار نہیں کی اور انسانی روح کے تاریک پہلوؤں سے گریز کیا ہے۔ Ceremony And Other Poems (۱۹۵۰ء) اور Things of This World (۱۹۵۶ء) میں عام چیزوں کے بارے میں شاعرانہ حسن کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ آخر الذکر مجموعے پر ان کو پولیٹزر اور بک ایوارڈ کے دو انعامات ملے۔ Advice To A Prophet (۱۹۶۱ء) میں کلاسیکی ادب کی تلمیحات کا نہایت روانی اور سلاست سے استعمال کیا ہے۔ رابرٹ لوویل اور اسنوڈگراس اعترافی حلقے کے شاعر ہیں۔ لوویل جنگ کی پرزور مخالفت میں پانچ ماہ کی سزا بھی کاٹ چکے ہیں۔ وہ نہایت دلیری سے جدید کھوکھلی تہذیب پر تنقید کرتے ہیں جس میں اب تک جنگ ہوتی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جنگ سے امن قائم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایسی پابند اور عروضی نظمیں لکھتے ہیں جو فنی حدود میں رہ کر بیان میں آزاد ہیں۔ ان کے مجموعے Lord Wrary's Castle (۱۹۴۶ء) پر ان کو پولٹزر انعام ملا۔ ان کے دو مجموعے Life Studies اور Imitations (۱۹۶۰-۱۹۶۱ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسنوڈگراس کے مجموعے Heart's - Needle - (۱۹۶۰ء) میں اعترافی رویّہ نمایاں ہے جس میں انہوں نے روایتی قدروں سے اعلانیہ بغاوت کی ہے۔ ان کا موضوع زندگی ہے جو اپنی اذیتوں کے ساتھ بالکل برہنہ ہے۔ اعترافی شعرا میں سلویا پلاتھ اور برلو رانشوئیٹس بھی ہیں۔

بیٹ نک تحریک کے علم بردار ایلن گنسبرگ کی نظم 'ہاؤل' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور ضبط کر لی گئی تھی نظم اس مشہور مصرعے سے شروع ہوتی ہے: "میں نے دیکھا کہ میرے عہد کے بہترین ذہن جنون، بھوک اور ہسٹیریا سے تباہ ہو چکے ہیں۔" یہ مصرع ان کے خیالات میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری انسانی تجربات کی شعلہ فشانی سے عبارت ہے جس میں وہ جدید دنیا کی دہشت انگیز حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں اور اس کی تباہی کی آگاہی دیتے ہیں۔ وہ ہر مستحکم ادارے کے خلاف ہیں اور اپنی ذات کے ماسوا کسی اور کے وفادار نہیں ان کا دوسرا مجموعہ Kadpish انسانی ادراک کو تجربات کی آخری حدود تک لے جاتا ہے۔ ان کے مصرعوں میں وہٹمین کے مصرعوں کا پھیلاؤ اور تعاؤ ہے۔ یہ بات گریگری کارسو کے متعلق بھی صحیح ہے جن کے تین مجموعے The Vestal Lady On Brattle Gasoline اور The Happy Birthday of Death شائع ہو چکے ہیں اور جن کا موضوع بھی انسانی وجود کی برہنگی ہے۔ بیان منفرد اور بغیر کسی مماثلت کے بدیع اور نیا ہے۔ چارلس اولسن بلیک ماؤنٹین گروپ کے رکن ہیں۔ ان کا نظریہ Projective Verse بہت مشہور ہے جس کے مطابق ہیئت موضوع کی توسیع ہے۔ ان کے مجموعے In Cold Hell - In Thicket - (۱۹۵۳ء) میں ثقافتی اداروں کے ذریعہ جدید تہذیب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ نیویارک گروپ کے رکن ڈینس لیور ٹوفی رواتے، ٹیر جونس اور فرینک او ہارا وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ لطیفہ نما نظمیں لکھتے ہیں۔ جو Shock Poems بھی ہوتی ہیں۔ بیٹ تحریک کے بیشتر شعرا نیگرو ہیں اور ان پر نسلی تعصب کا الزام لگایا جاتا ہے۔ جو غلط ہے۔ یہ لوگ انسانی وجود کے نقاد و مبصر ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد متعدد طرز کے ناول لکھے گئے جن میں پکارڈ گاتھی، مزاحیہ، اسطوری، سیاسی تمثیلی اور وجودیت پسند ناول ہیں۔ اگر ان تمام اقسام کے ناولوں میں کوئی مرکزی خصوصیت مشترک ہے تو پکارو ناول کی رومانیت ہے جس کا ہیرو شریر آوارہ گرد ہے جو ایک طرح کا غیر ہیرو (Anti-Hero) ہے۔ ان ناول نگاروں میں جیک کرویک، نارمن میلر، جے ڈی سیلنجر، سال بیلو، جیمس پرڈی اور رلیف ایلیسن نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ جیک کرویک کے ناول 'سڑک پر' (On The Road) (۱۹۵۷ء) کے جوان مرد اور عورتیں نیویارک سے سان فرانسسکو تک ہیجانی کیفیت و اضطراب میں سفر کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں ان کا سفر اس کے کوئی مقصد نہیں کہ چلتے رہیں اور حرکت میں رہیں۔ کیوں کہ یہی موجودہ عہد کا عمل ہے۔ اس کا راوی اپنے بلیغ انداز میں پوچھتا ہے" رات میں اپنی چمکدار کار میں، امریکہ تو کہاں جا رہا ہے"۔ اپنے دوسرے ناولوں The Subterraneans اور The Dharma Bums (۱۹۵۸ء) میں بھی وہ امریکی زندگی کی لامقصدیت پر طنز کرتے ہیں۔ نارمن میلر کا نقطۂ نظر ان کے اہم ناولوں The Naked And The Dead) (۱۹۴۸ء) Barbary Shore (۱۹۵۱ء) Dear Park (۱۹۵۵ء) سے ظاہر ہے۔ ان کی خود نوشتہ سوانح حیات Advertisement For Myself (۱۹۵۹ء) میں بھی طنز موجود ہے۔ جے۔ ڈی۔ سیلنجر کے مشہور ناول The Catcher in The Rye کا ہیرو بھی تین راتیں نیویارک کے سفر میں گزارتا ہے اور مہم جویانہ واقعات سے دو چار ہوتا ہے۔ وہ عنفوان شباب کے محاوروں اور عامیانہ زبان کا استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ چٹان کے ڈھلوان پر کھڑا ہے جہاں بہت سے بچے کھیل رہے ہیں اور ان کی نگہبانی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ ان کو ڈھلوان پر پھسل کر گرنے سے بچائے گا۔ یہ بیان بہت بلیغ ہے اور یہ جذبہ ان کے مختصر ناولوں Franney & Zooey (۱۹۶۱ء) اور Raise High The Roof Beam Carpenter Seymour (۱۹۶۳ء) میں بھی موجود ہے۔ ان کے ناولوں کے طنز و مزاح اور زندگی کے سوقیانہ پن کے بیان میں وہ ہمہ گیر ہمدردی اور انسان دوستی شامل ہے جو جدید امریکی افسانوی ادب میں نایاب ہے۔

سال بیلو، جو ۱۹۷۶ء کے نوبل انعام یافتہ ہیں، امریکی ادبی روایت کے ساتھ یہودی لوک کتھاؤں کی آمیزش بھی کرتے ہیں۔ ان کے ناول Augie March - (۱۹۵۳ء) کا ہیرو تمسخر آمیز مہم جوئی کا مزاحیہ شکار ہے۔ سب اسے فریب دے کر اس پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ بچ کر نکل جاتا ہے وہ ہر اعتبار سے غیر ہیرو ہے اور ناول کی کہانی غیر کہانی ہے۔ اس قسم کے ہیرو

اورکہانی کو انہوں نے اپنے دوسرے مشہور ناولوں Seize The Day (۱۹۵۶ء) The Rain King Henderson ۱۹۵۸ء Humboldt's Gift (۱۹۷۳ء) وغیرہ میں بھی دہرایا ہے۔ اس سے مراد مغربی تہذیب کے اس کھوکھلے پن کو بھی ظاہر کرنا ہے جس میں کوئی سورمائی اور اولوالعزمی کا کارنامہ ممکن نہیں ہے۔ جیمس پرڈی کے ناول Malcolm (۱۹۵۹ء) میں تمثیلی بھی ہے اور اس کے کردار فن، دولت، مذہب، جنس، قسمت اور موت کے سمبل ہیں۔ اسی طرح رلیف ایلیسن کے ناول Invisible Man (۱۹۵۲ء) میں راوی سیاسی جد وجہد سے سماجی اصلاح کی آرزو ترک کرکے ایک نسلی فساد میں سڑک کی بند نالی میں گھس جاتا ہے اور زیر زمین رہ کر اپنے اشتراکی عزائم کی مضحکہ خیز کوشش کرتا ہے۔ یہ ناول بھی تمثیلی ہے۔ ان تمام ناولوں کے کردار بے ہنگم زندگی کے تمسخر اور عجز کا بیان ضرور کرتے ہیں لیکن وہ محض آوارہ گرد نہیں ہیں۔ بلکہ ایک طرح سے وہ زائر (Pilgrims) ہیں جو زندگی کی ابتری اور الجھن کے باوجود صحت مند عقیدے اور قدروں کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ مثبت پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ بنیادی طور پر وہ انتہائی معصوم لوگ ہیں۔ یہ بات خصوصاً سلینجر اور سال بیلو کے کرداروں کے متعلق صحیح ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی ڈرامے نے سماجی یا سیاسی مسائل سے مکمل کنارہ کشی کی اور اس کی توجہ انسان کی ذات یا نفس اور اس کے پوشیدہ پہلوؤں کی عکاسی پر مرکوز ہوگئی۔ امریکی چھوٹے تھیٹر نے یونسکا، بیکٹ، جینٹ اور اڈاموف کے ڈراموں سے روشناس کرایا۔ اسٹیج کی ساخت میں تجربے ہوئے اور دائرے یا نصف دائرے والے اسٹیج بنائے گئے جس میں ناظرین چاروں طرف بیٹھے ہوتے تھے۔ "مہمل تھیٹر" Theater Of the Absurd کی ایجاد ہوئی جس میں کوئی کہانی یا مرکزی کردار نہیں ہوتا ہے اور جس میں ناظرین بھی حصہ لیتے ہیں۔ ان تمام تجربات میں فوکس انسان کے نفس پر ہوتا ہے۔ ان ڈرامہ نگاروں میں ٹینیسی ولیمس آرتھر ملر، ایڈورڈ البی اور جیک گیلبر نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یوں تو ولیمس جنوبی علاقے (ساؤتھ) کے زمیندار طبقے کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی توجہ کا مرکز انسانی ذات اور نفس ہے۔ ان کا ایک اہم موضوع درمیانی طبقہ کی اخلاقی قدروں کی تردید بھی ہے۔ جس کی عمدہ مثال ان کا ڈرامہ The Glass Menagerie (۱۹۴۵ء) ہے۔ دوسرے ڈرامے A Street Car Named Desire (۱۹۴۷ء) کی ہیروئن اپنے بہنوئی کو ترغیب اور اشتعال سے زنا بالجبر کرنے پر اکساتی ہے اور خود ذہنی مریض ہوکر دماغی اسپتال کا رخ کرتی ہے۔ TwentySevenWagonsFullOfCotton میں سسلی سے آیا ہوا روئی کا تاجر، ساؤتھ کے ایک رئیس کو شکست دیتا ہے اور اس کی بیوی کو اپنا لیتا ہے۔ ان کے متعدد ڈراموں میں جنسی ہیجان اور پوشیدہ خواہشات کی صحت مند تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے جو ذہنی بیماریاں ہوسکتی ہیں ان کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ قتل، جنسی بے راہ روی، آدم خوری اور زنا بالجبر کو اس طرح اپنے ڈراموں میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے میں دہشت اور نفرت کی لہر دوڑ جائے۔

آرتھر ملر مقابلتاً بہت حد تک قدامت پرست ہیں اور بنیادی طور پر حقیقت نگار ہیں۔ وہ امریکی زندگی کے نارمل واقعات اور کردار کے بارے میں لکھتے ہیں اور فصیح زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کردار مثالی امریکی کاروباری لوگ اور شوہر ہیں اور ان کا المیہ عام اور اوسط امریکی زندگی کا ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں ان کے ڈرامے All My sons ۱۹۴۷ء اور Death of A Salesman (۱۹۴۹ء) ہیں۔ یہ دونوں ڈرامے باپ اور بیٹے کے تعلقات کے گرد لکھے گئے ہیں۔ View From The Bridge (۱۹۵۵ء) باپ اور سوتیلی بیٹی کے تعلقات کے تناؤ اور پیچیدگی پر مبنی ہے۔ یہ خاندان نارمل تو نہیں ہے لیکن مثالی ضرور ہے۔ دبائی گئی جنسی خواہش، غیر فطری امرد پرستی اور ترویج محرمات کا رجحان پیدا کرتی ہے جو اس کے ہیرو کو تباہ کر دیتا ہے۔ ولیمس اور ملر کی پیچیدہ حقیقت نگاری جس میں اشاریت اور واہمہ بھی شامل ہے، بیسویں صدی کے دوسرے ہونہار ڈرامہ نگاروں میں بھی موجود ہے۔ ایڈورڈ ایلبی نے The Zoo Story (۱۹۵۸ء) میں ایک اتفاقیہ ملاقات سے یہ دکھایا ہے کہ امید مایوسی کا دوسرا رخ ہے اور آزادی، پابندی کی دوسری شکل ہے۔ The American Dream (۱۹۶۰ء) اولاد کی تلاش کا ایک بھیانک طربیہ ہے۔ ان ڈراموں میں ان کا انداز حقیقت نگارانہ ہے لیکن Who is Afraid of Virginia Woolfe (۱۹۶۲ء) کا گھریلو ماحول ایک طرح کا اذیت خانہ بن جاتا ہے جہاں کے درد و کرب کے بیان میں حقیقت اور واہمہ دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور نسبتاً کم عمر ڈرامہ نگار جیک گیلبر ہیں جنہوں نے The Connection (۱۹۵۹ء) میں نشہ کے عادی لوگوں کو پیش کیا ہے جو فراہم کار یعنی وہ شخص جو نشہ آور چیزیں مہیا کرتا ہے اُکے انتظار میں بے قرار ہیں لیکن سماجی موضوع کے باوجود اس کی اشاریت اس ڈرامے کو عالم گیر سطح پر لے آتی ہے کیونکہ نجات کی تلاش میں ہر شخص کسی نہ کسی ذریعے یا Connection کا منتظر ہے جس سے اس کی مراد پوری ہوسکتی ہے۔ ان ڈراموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روایتی حقیقت نگاری کی دیواریں گرچکی ہیں یا گر رہی ہیں اور اس کی جگہ جو ڈرامہ ابھرا ہے یا ابھر رہا ہے اس میں فوکس انسان کی ذات یا نفس پر ہے اور انسان، مایوس، ہزیمت خوردہ اور تنہا ہے۔

انگریزی زبان و ادب

انگریزی زبان

انگریزی زبان کی درجہ بندی ایک ٹیوٹنی (Teutonic) زبان کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ اور اس کا تعلق ہند یورپین زبانوں

کے اس خاندان سے ہے جس میں جرمن، ڈچ، فلیمش (Flemish) سوڈِش اور ناروے کی زبانیں شامل ہیں۔ یہ تعلق زبان کی ساخت اور ذخیرہ الفاظ دونوں لحاظ سے ہے۔ ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے اس کا رشتہ یورپ کی ان زبانوں سے بھی ہے جو کسی نہ کسی طرح لاطینی سے ماخوذ ہیں۔ جیسے فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں۔ انگلستان کی سرزمین پر نازل ہونے والوں میں سب سے اوّل اہل روما تھے۔ جولیس سیزر نے ۵۵ قبل مسیح میں "گال" (Gaul) قوم پر فتح حاصل کر چکنے کے بعد یہاں کے باشندوں کلٹس (Celts) کی طرف اس سبب سے توجہ کی۔ مبادا وہ اہل روما کے خلاف گال سے ساز باز نہ کریں۔ جولیس سیزر کو اپنے پہلے حملے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ۴۳ء بعد مسیح میں شہنشاہ کلاڈیس نے مقامی باشندوں کو پوری طرح زیر کر کے اپنے قدم یہاں جمالیے۔ انگلستان کے اصل رہنے والوں یعنی کلٹس نے ٹیوٹن نسل کے نو واردوں کے لیے "سیکسنز" (Saxons) کا لفظ استعمال کیا۔ اس طرح گو انفرادی طور پر "اینگلز" (Angles) کا لفظ بھی استعمال ہوتا رہا۔ لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کا اطلاق بھی "ٹیوٹنز" (Teutons) ہی پر ہوا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں انگریزی ٹیوٹن زبان کے نچلے مغربی (Low-West) پرت ہی کی ایک شکل تھی۔ انگریزی زبان کے نشوو ارتقا میں تین دور ممیز کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا قدیم انگریزی کا دور جس کا زمانہ ۷۰۰ سے ۱۱۵۰عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا درمیانی انگریزی کا دور، جس کا زمانہ ۱۱۵۰ سے ۱۵۰۰ء تک شمار کیا جاتا ہے اور تیسرا جدید انگریزی کا دَور جو ۱۵۰۰ء سے اب تک کا دور متصور کیا جاتا ہے۔ زبان کی عام طور سے دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ یعنی مرکباتی (Synthetic) زبان اور تجزیاتی (Analytical) زبان قدیم انگریزی پہلی قسم کے ذیل میں آتی ہے اور جدید انگریزی دوسری قسم کے ضمن میں۔ اول الذکر میں جملے کے اجزائے ترکیبی بذات خود اتنے اہم نہیں ہیں۔ جتنا ان کا باہمی رشتہ۔ دراصل ان روابط میں سے ہر ایک کا مقام متعین اور مقرر ہوتا ہے۔ موخر الذکر یعنی تجزیاتی زبان میں حروفِ جار (Prepositions) اور امدادی افعال (Auxiliary Verbs) کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے اور جملے کے اجزا کا آپس میں ربط و تعلق مرکباتی زبان کے برعکس ان کی اپنی شکلوں کے آخر میں حروف کا اضافہ کرنے سے مقرر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ان کے اپنے مقام سے۔ ان زاید حروف کو جو الفاظ کے آخر میں لائے جاتے تھے اور جن کے پیش نظر ہی جملے کے اجزائے ترکیبی کے ربط کی پہچان ممکن تھی، تصریف (Inflexions) کا نام دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے قدیم انگریزی کے لیے ما بہ الامتیاز وصف ان زاید حروف کا بھرپور استعمال ہے۔ درمیانی انگریزی کی خصوصیات ان میں تقصیر یا کمی اور جدید انگریزی کی خاص علامت ان کا یکسر غائب ہو جانا ہے۔ قدیم انگریزی جو اینگلو سیکسن کہلاتی ہے، بعض وجوہات کی بنا پر مختص ہے۔ اول یہ کہ اس کا دامن لاطینی اور فرانسیسی زبانوں سے ماخوذ الفاظ سے تقریباً خالی ہے۔ دوسرے اس میں الفاظ کے شروع یا آخر میں چند حروف کے اضافے سے، جنھیں سابقہ اور لاحقہ کہا جاتا ہے، لاتعداد نئے الفاظ اختراع کیے جا سکتے ہیں۔ تیسرے اس میں اسم، قائم مقام اسم، فعل، صفت، تجنیس، تعداد اور حالت (Cases) کی نشان دہی آخری حروف کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ چوتھے اس میں فعل اور صفت وغیرہ کی گردان کے ضابطے متعین ہیں۔ پانچویں یہ کہ اس میں قواعدی تجنیس کا استعمال ہوتا ہے جس کا انحصار کسی شے کی تذکیر و تانیث پر نہیں بلکہ لفظ یا معمول کی شکل پر ہوتا ہے۔ بعد میں اسے قدرتی تجنیس (Natural Gender) سے بدل دیا گیا اور چھٹے یہ کہ اس میں 'خ' کی آوازیں جرمن زبان کے زیر اثر پائی جاتی تھیں۔ بادشاہ الفریڈ کو قدیم انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایک جلیل القدر فوجی افسر اور مدبر ہونے کے علاوہ اسے انگریزی نثر کا معمار اوّل تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے "بیڈ" (Bede) کی کتاب The Ecclesiastical — History of the English People اور "بیتھیز" (Boethius) کی کتاب The Consolation of — Philosophy کے تراجم انگریزی زبان میں کرائے۔ اس کے زمانے میں انگریزی تاریخ کے اہم واقعات یک جا کرائے گئے اور "اینگلو سیکسن کرانیکل" (Anglo-Saxon Chronicle) ضبط تحریر میں آیا۔

انگریزی زبان کی تاریخ میں پہلا اہم موڑ "نارمن فتح" کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سو سال تک الفاظ میں آخری حروف کی اہمیت کم ہوتی رہی۔ اور زبان نے مرکباتی سے تجزیاتی حیثیت کی طرف قدم آگے بڑھایا۔ بارھویں صدی کے وسط سے درمیانی انگریزی کا دور شروع ہوا اور اب زبان پر جرمن اور اسکینڈی نیویائی زبانوں کے مقابلے میں لاطینی اور خاص طور سے فرانسیسی غلبہ شروع ہوا۔ باہمی روابط اور طور طریقوں سے واقفیت کی بنا پر جو انگریزی اور دوسری یورپین قوموں کے مابین ظہور پذیر ہوئی۔ سماجی زندگی کے مظاہر میں بہت سی تبدیلیاں سامنے آئیں اور ان تبدیلیوں کا لازمی اثر زبان کے ارتقا پر پڑا۔ بارھویں صدی کے آخر آخر میں ایک اہم نظم "آلو اور بلبل" (The Owl and Nightingale) (۱۱۹۵ء) لکھی گئی اور تیرھویں صدی کے آغاز میں مذہبی نثر کا ایک نمونہ — Ancrene Riwle — (۱۲۰۰ء) سامنے آیا۔ چاسر کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یعنی چودھویں صدی کے درمیانی برسوں اور اس صدی کے خاتمے تک انگریزی زبان کے خدوخال پوری طرح تشکیل پا چکے تھے اس کے بعد اس کے بنیادی کینڈے یعنی قواعد کی حد تک اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ذخیرہ الفاظ میں ردو بدل ہوتا رہا؛ چودھویں صدی میں ہر شعبۂ زندگی میں فرانسیسی الفاظ براہِ راست بھی داخل ہوئے اور اپنے اصلی مخزن یعنی لاطینی کے واسطے سے بھی،

اس سے زبان میں بے اندازہ وسعت پیدا ہوئی۔ دراصل اس عہد میں انگلستان سہ لسانی تھا۔ عوام کی زبان انگریزی تھی، مہذب اور اعلیٰ (Sophisticated) طبقے کی زبان فرانسیسی تھی اور علمی اور مذہبی امور کے سلسلے میں لاطینی کو تفوق حاصل تھا۔ چناں چہ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ ایک ہی خیال عمل یا تجربے کے ابلاغ کے لیے الفاظ تین مختلف سطحوں پر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ خالص مقامی زبان کے الفاظ یعنی اینگلو سیکسن بنیاد رکھنے والے، فرانسیسی سے مستعار الفاظ اور لاطینی الاصل الفاظ۔ اسی زمانے میں معیاری انگریزی کا وجود عمل میں آیا جس کی بنیاد مشرقی مڈلینڈ بولی پر رکھی گئی تھی۔ اس کی ترویج و اشاعت میں اس پریس سے بڑی مدد ملی، جسے کیکسٹن (Caxton) نے ۱۴۷۶ء میں قائم کیا تھا۔ سو سالہ جنگ (The Hundred Years' War) کو ان عناصر میں شمار کیا جا سکتا ہے، جن کی وجہ سے فرانسیسی زبان کے استعمال میں کمی آنا شروع ہوئی۔ مجموعی طور پر ہنری پنجم (۱۴۱۳ — ۱۴۲۲ء) کے دور کو انگریزی زبان کے استعمال میں ایک اہم نقطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دور کے بعد جسے انفرادی مصنفین کا دور کہا جاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے نشاۃ ثانیہ کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ تفتیش اور تجربے کی طرف میلان، نئی دنیا یعنی امریکا کی دریافت، کلیسا کی اصلاح، کوپرنیکس کا انقلابی سائنسی نظریہ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں خیال کی جرأت اور جولانی۔ آکسفورڈ لغت کی بنیاد پر قیاس کیا گیا ہے کہ اس دور میں انگریزی زبان میں بارہ ہزار سے زیادہ الفاظ کا اضافہ ہوا۔ اور ان میں فوجی اصطلاحوں کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ گو درمیانی انگریزی کے دور میں فرانسیسی زبان کو تہذیب اور ثقافت کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن عوام کی زبان برابر انگریزی رہی۔ نشاۃ ثانیہ میں ہم ایک خاص ذہنی میلان اور تحریک سے دوچار ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ قومی اور مقامی زبان کو ہر یورپین ملک میں اپنے طور پر عام استعمال کے قابل بنایا جائے اور اس طرح لاطینی کی بالادستی اور اجارہ داری کو ختم کیا جائے۔ چناں چہ اٹلی میں البرٹی (Albert i) اسپیرونی (Speroni) اور کارڈینل بمبو (Cadinal — Bombo) — فرانس میں دوبلے (Du Bellay) اور انگلستان میں ایلیاٹ، پٹن ہیم، ولسن، ایشم (Elyot, Puttenham, Wilson, Ascham) اور شاعر اسپنسر کے استاد رچرڈ مل کاسٹر Richard Mul Caster نے جو مرچنٹ ٹیلرز اسکول (Merchant Taylor's School) کے ہیڈ ماسٹر تھے یہ تحریک اٹھائی کہ مقامی زبانوں کو وسیلہ اظہار کے قابل بنانے اور ان کی اندرونی توانائیوں کو بروئے کار لانے کے لیے ان کے برابر استعمال پر زور دیا جانا چاہیے۔ لیکن اس سے الفاظ کی درآمد کے سلسلے کو بند کرنا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ مقامی زبانوں کو فروغ دینا تھا اور انھیں لاطینی اور دوسری کلاسیکی زبانوں کے مقابلے میں آراستہ کرنا اور ان کے دوش بدوش لاکھڑا کرنا۔ اسپنسر کی کوششیں اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور تنہا شیکسپیئر کا کارنامہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ جس نے انفرادی طور پر کسی بھی دوسرے انگریزی مصنف کی نسبت سب سے زیادہ الفاظ انتہائی معنویت کے ساتھ استعمال کیے ہیں اور زبان کے وقار، اس کی وسعت اور ثروت میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعض اختراعات یہ ہیں:

(Agile, Demonstrate, Critical, Catastrophe, Antipathy, Emphasis, Dire, Submerge, Obescene, Premed, Tate, Pedant, Prompture, Pathetical— Vast.)

وغیرہ وغیرہ۔ الزبتھن دور میں لاطینیت (Latinizing) کی طرف واضح رجحان پایا جاتا ہے۔ سترھویں صدی میں بھی یہ میلان برقرار رہا اور جو الفاظ اور تراکیب اس دور کی انگریزی میں مستعار لی گئیں، وہ زیادہ تر ادبی، ثقافتی اور کاروباری قسم کی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر انگریزی زبان ہی کے توسط سے ہوتا رہا لیکن پھر بھی لاطینی سے مشتق الفاظ کے ذخیرے میں کافی اضافہ ہوا۔ اس سلسلے میں ملٹن، سر ٹامس براؤن اور جیفری ٹائلر (Jefremy Tylor) کے نام قابل ذکر ہیں۔ براؤن نے خاص طور پر اپنی نثر میں لاطینی اور اینگلو سیکسن دونوں سرچشموں سے فیض حاصل کیا۔ اور دونوں طرح کے الفاظ کو باہم دگر آمیز کرنے کی سعی کی۔

تیسرا اہم سنگ میل اٹھارھویں صدی کا دور ہے۔ جب انقلاب (Revolution) اور احیا (Restoration) کے زمانے کا تجربہ حاصل کر چکنے کے بعد شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی کہ زبان کے پھیلنے کا ایک معیار متعین کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعقل، فہم عامہ اور اعتدال و میانہ روی کی قدریں عام بھی تھیں اور زندگی کے تمام مظاہر میں ان کا انعکاس دیکھنے کی خواہش بھی پائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جانسن کا کارنامہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس نے انگریزی لغت کی تدوین کی اور اسے ۱۷۵۵ء میں شائع کیا۔ جانسن اور دوسرے ادیبوں کی کوشش اس ضمن میں ان فرانسیسی مصنفین کی مساعی کے مشابہ ہیں۔ جنھوں نے فرانس میں اکادمی کی بنیاد ڈالی تھی اور ان کا منشا یہ تھا کہ ادبی مشاغل کی ترویج بھی ہوتی رہے اور ہر قسم کی بے راہ روی اور لامرکزیت کو ختم کر کے زبان کو ایک مستحکم اور تسلیم شدہ معیار تک بھی لے آیا جائے۔ یہی مقصد ڈاکٹر جانسن کے بھی پیش نظر تھا۔ اس دور میں مختلف زبانوں سے آئے ہوئے جو مستعار الفاظ انگریزی میں داخل ہوئے ان کی چند مثالیں یہ ہیں:

امریکہ میں ریڈ انڈین لوگوں سے ربط کی وجہ سے یہ الفاظ

میکسیکن الفاظ جیسے Skunk, Toten,Hickory, Wigwam کیوبا اور ویسٹ انڈیز Tomato, Chocolate, Chili, Tobacco, Potato, Maize, Canoe, - سے یہ الفاظ جیسے Alpaca, Jerkey سے۔ (Peru) پیرو سے Cannibal ہندوستان سے Brahman, Bangle, Pundit, Coolie, ڈچ اور پرتگال تاجروں سے Verandah اور Banglow. اور آسٹریلیا سے Boorish, Chimpanzee, Banana جیسے الفاظ انگریزی زبان کے Boomerang, Kangaroo جزو لاینفک بن گئے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں بہت سی تبدیلیاں زندگی کے عام نقشے میں نمودار ہوئیں۔ نپولینی جنگوں کے دوران انگریزی بحری عظمت کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی۔ ٹرافالگر (Trafalgar) میں نیلسن کی مشہور بحری فتح ۱۸۰۵ء میں سامنے آئی۔ روس کے خلاف انگریزوں کی جنگ کریمیا (Crimea) ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان لڑی گئیں۔ اس سال ہنگامہ غدر کے بعد غیر منقسم ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط مکمل طور پر قائم ہوگیا۔ بہت سے مصلحانہ اقدامات بھی اسی زمانے میں سامنے آئے۔ مثلاً پارلیمنٹ کی تنظیم نو سزا کے قانون پر نظر ثانی، غربت کے خلاف قانون کا اجرا، بچوں کی محنت مزدوری پر پابندیاں اور صنعتی اصلاحات وغیرہ۔ ان سب کے نتیجے کے طور پر سماج کی جمہوری بنیادیں پختہ ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کا چلن انگلستان کے علاوہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ہندوستان اور دوسری برطانوی نوآبادیات میں پھیل گیا۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ایک حد تک مقامی زبانوں کے الفاظ بھی راہ پا گئے۔ بیسویں صدی کے شروع میں یعنی ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ سے سابقہ پڑا۔ اور اس طرح جنگ سے متعلق بہت سے نئے الفاظ خاص طور پر جرمن زبان سے اخذ کیے ہوئے الفاظ انگریزی زبان کا جزو بن گئے انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو زبردست فروغ نصیب ہوا اور صحافت بھی روزمرہ کی زندگی میں ایک زبردست قوت بن گئی۔ ان تینوں کی وجہ سے نئے نئے الفاظ اور تراکیب انگریزی زبان میں استعمال ہونا شروع ہوگئیں۔ جن کا وجود پہلے اس زبان میں نہیں تھا۔ پھر فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے زندگی میں غلبہ پانے سے بھی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ذخیرہ الفاظ میں اضافے کے پہلو بہ پہلو مقامی طور پر تلفظ اور املا کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہے۔ تلفظ کا فرق تو ہر اس جگہ، جہاں انگریزی بولی جاتی ہے لازمی طور پر پایا جاتا ہے۔ گو اس میں بحث کا پہلو یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان کی لکھاوٹ صوتی (Phonetic) اصول کے تابع نہیں ہے بلکہ Ideographic ہے۔ امریکی انگریزی میں املا کا فرق محض ضمنی طور پر پایا جاتا ہے۔ البتہ بعض محاورے اور مرکبات ضرور انگلستانی انگریزی سے اس میں مختلف ہیں۔ آئندہ انگریزی زبان کیا نہج اختیار کرے گی اس کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ زبان کی کائنات میں بھی موت و حیات اور رد و قبول کا عمل انسانی دنیا کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ زبان کے سانچے میں تو ایک مرتبہ اس کی تشکیل دیے جانے کے بعد تبدیلی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ البتہ ذخیرہ الفاظ میں ترمیم و اضافہ برابر ہوتا رہتا ہے

انگریزی ادب

انگریزی ادب کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے شمار کیا جاتا ہے انگریزی کے اولین ادب کو اینگلو سیکسن Anglosaxon ادب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح اس مخلوط قوم کے لیے استعمال میں آئی تھی۔ جو جرمنی سے آئے ہوئے حملہ آور قبیلوں Saxons, Angles اور مقامی کیلٹز (Celts) سے مل کر بنی تھی۔ بعد میں یہی لوگ انگریز کہلانے لگے۔

قدیم ادب کسی طرح بھی اُن گھڑ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لہجہ میں بلند آہنگی اعلیٰ سنجیدگی اور باوقار حزن پایا جاتا ہے۔ شروع میں انگریزی زبان پر جرمن اور Scandinavian زبانوں کا گہرا اثر تھا۔ قدیم ادب میں Beowulf سب سے اعلیٰ کارنامہ مانا جاتا ہے۔ یہ پہلا رزمیہ ہے جو ضبطِ تحریر میں آیا۔ یہ ایک گراں ڈیل اژدہے کی کہانی ہے جسے اپنا حق حاصل کرنے پر اصرار ہے۔ یہ دراصل شر اور ظلمت کی ان قوتوں کا اشاریہ ہے جو انسانی زندگی کو اپنے نرغے میں لیے رہتی ہیں۔ اس نظم کے لسانی تجمل کے علاوہ اس کے پس منظر میں وہ مہیب قوتیں بھی اپنا حصہ رکھتی ہیں جو طوفانی سمندروں، برف پوش پہاڑوں اور شمالی خطوں کی ہلاکت خیزی اور تہلکہ انگیزی سے عبارت ہیں۔ سمندر کے تغیرات حرکت کا احساس اور اس کے محاکات قدیم شاعری میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ اس خاص پہلو سے دو اور نظمیں The Seafarer اور The Wanderer بھی قابل ذکر ہیں۔ ایک اور معرکے کی نظم The Dream of the Rood ہے جس میں صلیب کے سلسلے میں جذبات میں گداز اور اہتزاز کا اظہار رہتا ہے گو مجموعی طور پر اس دور کی شاعری میں مزاح اور رنج دونوں کی کمی ہے۔ تین اور نظمیں وڈستھ ڈیور اور بیٹل آف میڈان (Widsith Deor & The Battle-of Maldon) بھی قابل ذکر ہیں۔

بادشاہ الفریڈ کی نگرانی میں جسے انگریزی نثر کا معمار اول تسلیم کیا جاتا ہے Anglo Saxon Chronicle وجود میں آیا۔ اس کے زمانے میں Bede کی کتاب اور بوئے تھیس (Boethius) کی کتاب Consolation of Philospby کے انگریزی تراجم بھی سامنے آئے۔ Alfred کے بعد Aelfric کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس سے ایک لاطینی قواعد کی تالیف منسوب ہے اور جس کے طرز نگارش میں Alfred کے بہ نسبت زیادہ صفائی برجستگی اور نکھار پایا جاتا ہے۔

درمیانی انگریزی کے پہلے دور میں ایک گمنام شاعر کی معرکۃ الآرا نظم Sir Gawain and the Green Knight ہے جو

Arthurian موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں لادینی (Pagan) زندگی کے پس منظر میں بنیادی انسانی محرکات اور مہم جوئی کے جذبے کو خاص دخل ہے اور Pagan اور مسیحی رسموں اور معتقدات کی باہمی آویزش اور آمیزش کو انتہائی فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں کردار نگاری، واقعات، نفسیات اور فطری کائنات کی عکاسی بڑی خوبی سے پیش کی گئی ہے۔ اس شاعر کی تین اور نظمیں جن میں مجازیہ رنگ جھلکتا ہے Pearl، Patience اور Cleanness ہیں دو اور معروف نظمیں جن کے مصنفین کا حال معلوم نہیں The Parliament of Ages اور Morter Aurther ہیں۔ موخرالذکر میلرائے (Malroy) کی مشہور نثری تصنیف کا ماخذ ہے ایک اور خوبصورت نظم جس میں مکالمے کا رخ اختیار کیا گیا ہے "(The Owl and the Nightingale)۔ ۱۱۹۰ء" ہے اس دور میں شعری رومانوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے لیے مواد انگلستان، فرانس اور روم تینوں سے ملا۔ اصلاً یہ ایسی کہانیاں ہیں جن میں مہم جوئی مرکزی موضوع ہے اور اس میں چاشنی عشق و محبت کی پائی جاتی ہے۔ اس میں مواقع اور اس کے اجزائے ترکیبی بندھے ٹکے ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور Emare, Laupal, Ywain and Gawain, Sirorfeo Mavelock, King Hore ہیں۔

اس زمانے کے ادب میں Lyrics کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ جن میں سچی نغمگی پائی جاتی ہے۔ ان پر فرانسیسی ادب کا اثر نمایاں ہے۔ اس زمانے میں ان عوامی گیتوں یعنی Ballads کا بھی پتہ چلتا ہے، جو رزمیہ کی ضد ہیں اور جو غالباً گیارہویں سے تیرہویں صدی کے درمیان وجود میں آئیں۔ ان گیتوں کی اپنی ایک فنی اہمیت ہے۔ اور ان کے کئی کئی مسرتع (Versions) ملتے ہیں۔ ان میں انسان کے بنیادی جذبات، محبت، رقابت، ہمدردی، ایثار، انتقام، نفرت، خوف اور غصہ سب کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے مصنفین کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اس دور کے ادب کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اور سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آرٹ کی تخلیق کو ایک اجتماعی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا یعنی ادیب اور شاعر نے ابھی ادب کو اظہار ذات کے لیے استعمال کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا وظیفہ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے انسانی جذبات اور ڈرامائی مواقع کی مرقع کشی ہے۔ کمال یافتہ فنی کارنامہ دراصل سماج کی ملکیت ہے۔ اور اس لیے اسے اپنا نام ظاہر کرنے یا اسے اپنے آپ سے منسوب اور منسلک کر کے اس پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے چند ایک عنوانات یہ ہیں:۔

Kempowyne, The Corbles, Clerk Saunders, Child Waters, Patric Spens, A Fair Margaret and Sweet William etc.

اور Robin Hood سے متعلق گیت۔

نثر میں ایک ہی کارنامہ قابل ذکر ہے۔ یعنی Ancrene Riwle جو ان خواتین کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لیے لکھا گیا تھا جو اپنے آپ کو راہبانہ زندگی کے لیے وقف کر دیں۔

چودھویں صدی کے شروع ہوتے ہی انگریزی شاعری کا ایک نیا رنگ روپ سامنے آیا۔ اس دور میں تین شاعر سرفہرست ہیں یعنی چاسر (Chaucer) لینگ لینڈ (Langland) اور گوور (Gower)۔

چاسر (۱۳۴۰ء - ۱۴۰۰ء) کی ابتدائی نظموں The Book of Duchess، The House of Fame اور The Parliament of Fowls — میں مجازیہ (Allegorcal) رنگ جھلکتا ہے جسے اس نے جلد ہی ترک کر دیا اور اپنے مشہور کارنامے Canterbury Tales میں اس نے بے جھجک مشاہدے اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا، جو اس کی طبیعت سے میل کھاتا تھا۔ اس نظم میں واقعاتی بیانیہ کے ساتھ جو کردار نگاری جھلکتی ہے ڈرامائی عنصر اور مزاح کی کارفرمائی خاص طور پر جاذب نظر ہیں۔ اس نظم کے ڈھانچے اور کرداروں کے لیے وہ ایک حد تک Puilastrato اور Boccacio کا رہین منت تھا۔

گو اس کی نادر کاری بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس کی طویل مرصع نظم Troilus — کی بنیاد پر اسے پہلا ناول نگار بھی مانا گیا۔ لینگ لینڈ (۱۳۹۲ء — ۱۲۹۵ء) کی شہرۂ آفاق نظم Visions of Piers — The Plowman — جس میں چاسر کی اولیں نظموں کی جیسی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ چاسر کی نظم سے زیادہ گہری طنز اور ایک عارف کی بصیرت کا آئینہ ہے۔ نظم کا اصل موضوع صداقت کی تلاش اور اس کا مرکزی کردار Piers ہے۔ صداقت کی اس تلاش کے دوران زندگی کے تین مدارج Do Wel و Do-Bet اور Do Best سے گزرنا یا انہیں برتنا ضروری ہے۔ ہم عصری معاشی سیاسی اور سماجی حالات کو اس نظم میں ہدف ملامت ضرور بنایا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد دراصل ایک روحانی زندگی یا نصب العین کا حصول ہے۔ گوور (Gower) کی انگریزی نظم Confessio Amantis — اس کی لاطینی اور فرانسیسی نظموں کے بعد لکھی گئی اور بے حد طویل ہے۔ اس میں نیکیوں اور گناہوں کی تعبیر کہانیوں کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعض حصوں میں سادگی اور قدرتی پن پایا جاتا ہے۔ اور بعض خاصے بے کیف اور سپاٹ ہیں گوور (Gower) نے کوئی قابل ذکر کردار تخلیق نہیں کیا لیکن بعض کیفیتوں کی کامیاب ترجمانی ضرور کی ہے۔

ڈرامے کی ابتدا بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ یہ ڈرامے جنہیں Miracles, Mysteries, Moralities کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یا تو حضرت مسیح کی زندگی سے متعلق ہوتے تھے یا بائبل کے واقعات پر مبنی یا مجرد تصورات اور گناہوں اور نیکیوں کی تعبیر و تفسیر سے منسلک۔ ان کے مصنفین کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ کردار اپنے نام نہیں رکھتے نیز ان میں انفرادیت نمایاں ہے۔ اس سلسلے کے دو ڈرامے بہت معروف ہیں — 'Every Man' 'Second Shepherd's Play' آخرالذکر میں خود کلامی (Soliloquy) کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس میں مکالمے بھی ہیں اور تناؤ یا کشمکش کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔ جن ڈراموں کا ابھی ذکر کیا گیا وہ ایک چلتی پھرتی اسٹیج پر دکھائے جاتے تھے۔ جنہیں Wagons کہتے تھے۔ ان کے اہتمام کرنے والوں میں کاریگروں کی ان انجمنوں کا تمام تر ہاتھ ہوتا تھا جنہیں (Worker's Guilds) کا نام دیا گیا ہے۔ نثر کے سلسلے میں ایک ہی کارنامہ اہم ہے یعنی Malory کی کتاب Morte D. Arthur — جو درمیانی دور کے انگریزی ادب کی اس عنوان پر نظم اور

ایک فرانسیسی تصنیف کے ترجمے پر مبنی ہے۔ یہ ۱۴۷۰ء میں لکھی گئی اور اسے اس پریس نے شائع کیا جسے Caxton نے ۱۴۷۶ء میں قایم کیا تھا۔ یہ ان مہمات پر مشتمل ہے جن سے ازمنۂ وسطیٰ کے بانکے گزرتے تھے۔ اور وہ صعوبتیں اپنی محبوباؤں کی رضاجوئی کی خاطر گوارا کیا کرتے تھے۔ ان داستانوں میں زندگی کے بہت سے رنگ سامنے آتے ہیں اور رومانوں کی اس فراوانی میں ہی زندگی کی گریز پائی اور بے حقیقتی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ میلرائے کی نثر کا انداز اپنے اندر ایک یاس انگیز کشش رکھتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے خاتمے پر جب ہم الیزبیتھن دور میں قدم رکھتے ہیں تو یکایک ایک گہری تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور میں جو ادب تخلیق کیا گیا گو اس کے پس منظر میں زمانہ ماقبل کی تہذیب و ثقافت کے بہت سے عناصر ذہنی ورثے کے طور پر موجود ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ دور نشاۃ ثانیہ اور تجدید مذہب کی تحریکوں کے درمیان واقع تھا اس لیے اس دور اور دورِ ماقبل کی تخلیقات کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ اس دور میں نثر کو خالص علمی اور مذہبی تالیفات اور ترجموں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ادبی نثر میں لہجے میں غیر آہنگی، عبارت میں ابہام و انصرام اور ساخت کے اعتبار سے پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ انگریزی تاریخ کی یادداشتیں یعنی Chronicles بھی اس دور کی یادگار ہیں۔ Raphael Holinshed نے اس زمانہ میں وہ Chronicles لکھے جن سے شیکسپیر نے استفادہ کیا اور جو ۱۵۷۷ء میں شائع ہوئیں۔ زیادہ باقاعدہ نثر کی مثال John Lyly کی Eupmues ہے جس کی تاریخ ۱۵۷۸ء ہے یہ نثر کی ایک خاص نوع کی نمائندگی کرتی ہے جس میں نمایاں تکلف اور شعوری دروبست پایا جاتا ہے۔ Sir Philip Sidney کی مشہور کتاب Arcadia ۱۱۵۹ء میں شائع ہوئی۔ Bacon کے مضامین ۱۵۹۷ء میں اور اس کی The Advancement of Learning ۱۶۰۵ء میں سامنے آئی بیکن نے اس طریق فکر کی بنیاد ڈالنے میں مدد کی جسے سائنٹفک کہا جاتا ہے۔ Robert Burton کی Anatomy of Melancholy ۱۶۲۱ء میں شائع ہوئی۔

نئی شاعری کی آواز کو متعین کرنے والوں میں سرفہرست Wyatt اور Surrey کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ دونوں ہنری ہشتم کے دور سے متعلق ہیں اور دونوں کی تخلیقات ایک مشہور شعری انتخاب Totel's Miscellany-۱۵۵۷ء میں شامل ہیں۔ دونوں نے Sonnet کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس صنف کو فروغ دینے والوں میں معروف نام Sidney و Spenser اور Shakespear ہی کے ہیں۔ اس دور کی روح کو اسیر کرنے والوں میں نمایاں نام اسپنسر ہے۔ جس پر مجازیہ شاعری کا تکملہ ہو جاتا ہے۔ وہ کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ اپنی مشہور نظم The Shepherd's Calender-۱۵۷۹ء کے ذریعہ جو بارہ Eclogues کا مجموعہ ہے۔ اس نے Pastoral شاعری کی روایت کو تازہ کیا۔

ان نظموں میں اسپنسر نے روایتی پس منظر کے ساتھ چرواہوں کی زبان سے شاعری، مذہب اور محبت کے موضوعات پر اظہار رائے کیا۔ اس نے سانیٹ کی روایت کو ایک دوسرے مجموعے Amoretti میں برتا۔ انگریزی زبان کی اندرونی توانائیوں کو بروئے کار لانے پر زور رہا۔ تاکہ وہ لاطینی کی بالادستی سے آزاد ہو جائے۔ اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم The Farrie Queene میں بہت وسیع کینوس پر رومانی رزمیہ کا تجربہ کیا جس کے لیے اسے تحریک اور حوصلہ کلاسیکی شاعروں خصوصاً اطالوی زبان کے دو بڑے شاعروں Ariosto اور Tasso سے ملا تھا۔ اس کے مجازیہ کردار اپنی مہمات اور کشمکش میں تمام تر اسیر ہونے کے باوجود ایک اخلاقی عنایت کے پابند ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نظم میں گہری حسیت اور نقش گری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ جو اسپنسر کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ نغمگی اس دور کی روح میں ایک طور سے حلول کر گئی تھی۔ مترنم بحروں کی مختلف اقسام مستعمل تھیں۔ غنائی شاعروں میں Hero and Leander کے شاعر بن جانسن (Ben Jonson) ڈرے ٹن (Drayton) اور ڈینیل (Daniel) کے نام بھی قابل ذکر ہیں لیکن رفتہ رفتہ غنائی شاعری کا یہ وفور سادگی اور سرشاری ایک طرح کے تصنع میں بدلنے لگی۔ اور بارہویں صدی کی انگریزی اور فرانسیسی شاعری میں وہ محرکات جو درباری عشقیہ شاعری (Courtly Love Poetry) سے لیے گئے تھے، میکانکی انداز سے مستعمل ہونے لگے۔ ان سب کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار ہمیں اس نئی شاعری میں ملتا ہے۔ جسے مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) شاعری کہا جاتا ہے۔ اس میں زور جذبے سے زیادہ منطق اور عقل پسندی سے زیادہ اعصاب پر ہے۔ اس میں ایک طرح کی حقیقت پسندی اور برملا پن ہے۔ یہ شاعری اس دور میں ابھری جب سائنس نے حیرت انگیز طور پر ترقی کر لی تھی اور انسانی علم و عرفان کی حدود بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ جن شاعروں نے Petrarchan شاعری کی رسمیات (Conventions) کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ان میں John Donne کا نام سرفہرست ہے۔ جس کے عشقیہ سانیٹ ایک نئی آواز کا اعلان تھے۔ یہی شیوۂ گفتار اس کی مذہبی یا الٰہیاتی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ اس گروہ کے دوسرے شاعروں میں Andrew Marvel، George Herbert، Vaughan Crashaw وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کے یہاں جو فنی تدبیر مشترک ہے وہ رمز بلیغ کا استعمال ہے۔ جو تشبیہ و استعارہ کی ایک توسیع یافتہ شکل ہے۔ جذبے اور تعقل کے درمیان اشتراک اور ان کی آمیزش جو اس شاعری کی پہچان ہے پڑھنے والے سے سریع ردعمل اور انتقال ذہنی کا مطالبہ کرتی ہے۔

جس طرح مجازیہ ازمنۂ وسطیٰ کی غالب ادبی صنف ہے اسی طرح ڈرامے کی صنف سولہویں صدی یا الیزبیتھن دور سے مختص ہے۔ اس عہد میں طربیہ (Comedy) کے پہلے نمونے لاطینی زبان میں Terence، Plautus سے ملے اور المیہ (Tragedy) کے لیے Seneca کے یہاں شیکسپیر کے پیش روؤں میں John Lyly، Robert Green، George کا نام لینا ضروری ہے۔ کیونکہ اس نے ان سب سے اپنے ڈراموں کے لیے خام مواد حاصل کیا۔ مشہور المیہ کارنامہ Gurbuduc جس کے مصنفین Thomas Sackville اور Thomas Norton سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۵۶۲ء میں سامنے آیا اور دوسرا معروف المیہ The Spansish Tragedy ۱۵۹۴ء

ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم ڈرامہ نگار Christopher Marlowe ہے۔ جس کے مشہور ڈراموں میں Tamburlaine کے دو حصوں، The Jew of Malta، ڈاکٹر فاسٹس اور ایڈورڈ دوئم کا ذکر ضروری ہے۔ مارلو نشاۃ ثانیہ کی روح کا نمائندہ ان معنوں میں ہے کہ اس کے کردار میں دولت، طاقت اور علم حاصل کرنے کی بے پایاں امنگ اور بیکراں ہو جانے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ سب کسی نہ کسی حیثیت سے ابدیت کے طلب گار ہیں۔ مارلو کا اصل کارنامہ بلینک ورس (Blank-Verse) کا استعمال ہے اور وہ اپنے منفرد مصرعوں کے لیے مشہور ہے۔

لیکن دراصل یہ دور شیکسپیئر کا دور ہے جس کی فطانت بے مثل ہے اور مظاہر فطرت کی طرح اپنی وسعت ایجاز اور ناقابل تسخیر توانائیوں کے اعتبار سے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ انسانی فطرت کا وہ جیسا رمز شناس ہے۔ کردار نگاری کے جو نمونے اس نے پیش کیے ہیں، اور انداز بیان کے جیسے شیوۂ صد ہزار اس کے یہاں ملتے ہیں وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں مل سکیں۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز معمولی حیثیت سے کیا لیکن ڈرامہ کمپنیوں سے اس کا ربط برابر رہا۔ اس نے اپنے ڈرامے عام دیکھنے والوں کے لیے لکھے۔ اور یہ اکثر Globe Theatre میں اسٹیج کیے گئے۔ ابتدائی ڈراموں میں The Taming of the Shrew، The Comedy — of Errors، The Two Gentlemen of Verona کے نام لیے جاسکتے ہیں ان میں سے بعض میں کہیں کوئی چونکا دینے والی بات ملتی ہے۔ اس کے بعد کے طربیہ ڈراموں میں خاص طور پر A Mid Summer Night's Dream میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے یہاں زرخیز اور وافر تخیل کی پرچھائیاں اور ڈرامائی مواقع میں بصیرت کا ثبوت ملتا ہے یہ احساس The Merchant of Venice اور Much Ado About Nothing میں زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اول الذکر میں خاص طور پر یہودی تاجر Shylock کے کردار پر المیہ وجدان کا سایہ پڑا ہے۔ As You Like It (۱۵۹۹ء—۱۶۰۰ء) اور خاص طور پر Twelfth Night حیرت انگیز کارنامے ہیں۔ تاریخی ڈراموں میں رچرڈ سوم (۱۵۹۲ - ۱۵۹۳ء) میں بظاہر ایک طرح کی ناپختگی کا احساس ہوتا ہے لیکن بعض اعتبار سے یہ ڈرامہ بہت اہم ہے۔ رچرڈ دوئم (۱۵۹۵ء-۱۵۹۶ء) ہنری چہارم اول و دوم (۱۵۹۷ء-۱۵۹۸ء) اور ہنری پنجم (۱۵۹۸-۱۵۹۹ء) کے ذریعے انگلستان کی تاریخ کا عطر امن و صلح اور لاقانونیت کے درمیان کش مکش اور خود فرد کے اندر متضاد عناصر کا تناؤ بڑی چابکدستی کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ ہنری چہارم کے دو حصوں میں Falstaff کا لافانی کردار ملتا ہے۔ رومن تاریخ سے جو ڈرامے ماخوذ ہیں ان میں Julius Ceasar، Antony and cleopatra، Coriolanus کا ذکر ضروری ہے۔ فالسٹاف کی طرح کلیوپیٹرا کا کردار بھی ایک انوکھی تخلیق ہے ۱۵۰۴-۱۵۰۵ء "Romeo and Juliet" میں المیہ کردار کی اولین جھلکیاں ملتی ہیں۔ جو ڈرامے مسائلی ڈراموں (Problem Plays) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں All Is Well That Ends Well، Troilus and Cressida، Measure for Measure بہت معروف ہیں۔ ان سب میں ایک طرح کا ابہام پایا جاتا ہے یعنی کرداروں اور ڈرامائی عمل کے سلسلے میں پڑھنے والے کے تاثرات غیر متعین رہتے ہیں۔ ایک اور ڈرامہ Trinor of Anthens — ۱۶۰۷-۱۶۰۸ء جس میں نفرت اور غصے کے تاثرات شدت کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیکسپیئر کی شہرت کا دار و مدار بڑی حد تک اس کے المیہ ڈراموں پر ہے۔ جن میں Hamlet میں تشکیک کی روح پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے پورا ڈرامہ دراصل ایک استفہامیہ ہے زندگی کی تعبیر و تفسیر کے سلسلہ میں اور اس کا مرکزی کردار شیکسپیر کے چار لافانی کرداروں میں سے ایک ہے۔ اوتھیلو ایک طرح کا خانگی المیہ ہے۔ اس میں ایاگو کا کردار ایک ایسا معمہ ہے جس کی خاطر خواہ تشریح اب تک نہیں کی جاسکی۔ اس کے عمل کے محرکات ایک معمہ ہیں۔ Macbeth کی تعبیر محبت اور نفرت کے جذبات کے مرکب (Love-Hate Complex) ہوتی ہے اور لعنت (Damnation) اور سعادت (Grace) کی متضاد کیفیات سے King Lear — ۱۶۰۵-۱۶۰۶ء کی آفاقیت اور داخلی سوز و گداز کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ آخری دور کے طربیہ ڈرامے چار ہیں یعنی ۱۶۰۸- ۱۶۰۹ء Pericles، ۱۶۰۹- ۱۶۱۰ء The Cymbeline، Winter's Tales، The Tempest (۱۶۱۱-۱۶۱۲ء) ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں یعنی طوفان، جدائی، سوز و گداز اور خیر و شر کی کش مکش سے گزر چکنے کے بعد دوبارہ سعادت کا حصول۔ ان طربیہ ڈراموں کو Romances کہنا خاصی غلط سی بات ہے۔ نہ انہیں المیہ و طربیہ (Tragi-Comedy) کا ایسا امتزاج کہا جاسکتا ہے جس کا تجربہ دو ڈرامہ نگاروں Beumont اور Fletcher نے کیا تھا کیوں کہ ان سب کے قلب میں کچھ اخلاقی اقدار پیوست ہیں۔ خیر و شر کے درمیان ازلی اور ابدی کش مکش اور تناؤ کے باوجود انسان یہ کوشش کرتا ہے کہ ان پر قابو پاکر پرسکون اور ہموار زندگی کی طرف جادہ پیما ہو سکے۔ شیکسپیئر کے یہاں شدید المیہ احساس کے باوجود ایک گہری رومانی اور اخلاقی حس کا اظہار ملتا ہے۔ ایسی حس جو زندگی کے پیچ و خم، پستی اور بلندی اور خوب و زشت کے اعتباروں کے درمیان نقطۂ توازن کے حصول کے ہم معنی قرار دی جاسکتی ہے۔

یہاں ایک اور ڈرامہ نگار Ben Jonson کا ذکر ضروری ہے۔ جسے شیکسپیئر کے رومانی مزاج کے برعکس کلاسیکی نقطۂ نظر کا علمبردار کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعض ڈراموں کے پس پشت جنہیں Comedy of Humours کہا جاتا ہے۔ یہ مفروضہ پایا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت کا غالب رجحان اور اس سے ماخوذ عمل ان چار عناصر میں سے کسی ایک کے غلبہ پر منحصر ہے جس سے بنیادی طور پر اس کی تخلیق کی گئی ہے۔ اس کے دو ڈرامے Every Man In His Humour اور ۱۵۹۸ء "Every Man out of His Humour" اسی مفروضے پر مبنی ہیں۔ اس کے دوسرے معروف ڈرامے Volpone، The Silent Women (۱۶۰۷ء)، Bartholomew Fair، Alchemist (۱۶۱۲ء) ہیں۔ اس کے یہاں طنز اور حقیقت پسندی دونوں نمایاں

ہیں۔ بین جانسن کے یہاں وہ تحیر آمیز فضا اور انسانی فطرت میں وہ بصیرت تو نہیں ملتی جو صرف شیکسپیئر کا حصہ ہے۔ لیکن اس کی نظر ان تمام لبادوں کو چیرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ جو سماجی زندگی کی ہر سطح پر مختلف طبقوں کے نمائندوں نے اوڑھ رکھے ہیں۔ بین جانسن کے یہاں جو حقیقت پسندی کا عنصر ہے وہ تھامس ڈکر (Thomas Dekker) کے ڈرامے The Shoemaker's Holiday میں بھی نظر آتا ہے۔ اور ہے دوڈ (Heywood) کے ڈرامے۔ A Woman Killed with Kindness – میں بھی۔ چیپ مین (Chapman) نے تین تاریخی المیے لکھے۔ یعنی ۱۶۰۴ء میں Bussy D' Ambois، The revenge of Bussy D'Ambois، Duke of Byron.

ان ڈرامہ نگاروں میں Webster کا نام بہت اہم ہے جس کے دو ڈرامے The White Devil اور The Duchess of Malfi – زندگی کے اضطراب بے رحمی اور اتھل پتھل کا آئینہ ہیں۔ یہاں موت کا گہرا سایہ زندگی کا تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔ اور اس گہرے اور تند جذبے کی عکاسی ملتی ہے جو انسانی شخصیت کو اندر اندر گھلاتا رہتا ہے۔ Journer کے دو ڈرامے معروف ہیں یعنی The Revenger's Tragedy (۱۶۰۷ء) اور The Atheists' Tragedy (۱۶۱۱ء) مڈلٹن (Middleton) نے رومانی المیے لکھے جن میں دو قابل ذکر ہیں یعنی The Changling (۱۶۲۴ء) اور – Womon Beware، Philip Massinger کا ایک ہی ڈرامہ قابل ذکر ہے یعنی ۱۶۳۳ء – A New Way to Pay Old Debts" البتہ John Ford نے کئی ڈرامے لکھے اور ان میں ایک نفیس اور کڑھے ہوئے جذبے کا انعکاس ملتا ہے۔ ان میں 'Tis Pity She's a Whore اور The Broken Heart جو ۱۶۳۳ء میں لکھے گئے۔ خاص طور سے پرکشش ہیں۔ ان میں سے اکثر ڈرامہ نگاروں کے یہاں رومن مفکروں کے افکار کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

اس دور کے آخر میں ہم ایک بڑے شاعر John Milton سے دوچار ہوتے ہیں جس کا مطالعہ وسیع وعمیق اور جس کی نظر بڑی دور رس تھی۔ اس کی ابتدائی نظموں، L' 'Allegro، Il Penseroso اور On the Morning of Christs' Nativity میں جو ۱۶۴۵ء میں شائع ہوئیں نوفلاطونیت اور مسیحیت کے عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کی نظم "Coitus –۱۶۲۵" پر الزبتھین دور کی لسانی فراوانی کا بھی اثر ہے اور اسپنسر کے مماثل شعری محرکات (Motifs) کا بھی اپنے دوست Edward King کے ساتحانۂ ارتحال پر ملٹن کا مرثیہ Lycidas کے عنوان سے ایک پیچیدہ نظم ہے جو موت اور زندگی، شاعری اور شہرت جیسے موضوعات پر ایک اہم شعری تخلیق کا درجہ رکھتی ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ "فردوس گم گشتہ" (Paradise Lost) ۱۶۶۷ء ہے جس میں خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت اور آدم اور حوا کے واقعہ اخراج کو رزمیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شیطان جو بیک وقت جرأت، ہمہ جوئی اور شر کی قوتوں کا اشاریہ ہے ایک عظیم تخلیق کا درجہ رکھتا ہے سقوط سے پہلے آدم وحوا کی زندگی کی وہ تصویریں۔ کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں جو ہمیں انسانیت کے بچپن کے دور کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ نظم ملٹن کے تبحر علمی اور فلسفیانہ چھان بین کے علاوہ خدا اور شیطان اور آدم کے درمیان ربط کے تصور سے ملٹن کی شخصیت میں جو شعوری اور غیر شعوری اثرات مرتب کیے ان کو سامنے لاتی ہے۔ اس میں روشنی اور تاریکی کے شعری پیکر زماں ومکاں کی وسعتوں کا احساس باغ ارم سے وابستہ شجر زندگی اور شجر ممنوعہ کے تصورات کی اساطیری اہمیت اور معرکۂ خیر وشر کی نزاکتیں بڑی ہی صناعی اور دیدہ وری کے ساتھ متشکل کی گئی ہیں۔ ملٹن کی دوسری نظم Paradise Regained اور اس کا ڈرامہ Samson Agonistes دونوں ۱۶۷۱ء میں سامنے آئے۔

فردوس گم گشتہ اور اس ڈرامے میں گناہ کی طرف ترغیب ایک مشترک محرک کے طور پر موجود ہے ملٹن کا تعلق نہ صرف Puritanism کی مذہبی تحریک سے تھا بلکہ اپنے سامنے کی سیاست سے بھی۔ وہ بڑی حد تک جمہوری ہمدردیاں رکھتا تھا۔ اور اس لیے احیاء (Restoration) کے تاریخی واقعے کے بعد اسے عرصے تک قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں اس طرح وہ پریس کی آزادی، عورتوں کے حقوق اور طلاق کے مسائل سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور تعلیمی امور سے بھی اسے گہرا شغف تھا۔ انہی تمام سرگرمیوں کا اظہار ہمیں اس کی بلند آہنگ اور مرصع نثر میں بھی ملتا ہے۔ جو اس کی شاعری کے پس منظر میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۶۶۰ء انگریزی ادب کی تاریخ میں ایک اہم تاریخ ہے۔ اسی کی نسبت سے یعنی چارلس دوئم کی واپسی کے واقعے سے ادب کے ایک نئے موڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ پریس کی آزادی کے سلسلے میں ملٹن کا معرکہ آرا مقدمہ اس کی تصنیف Areopagitica ۱۶۴۴ء میں سامنے آچکا تھا۔ اس دور میں ایک اہم نثر نگار Sir Thomes Browne ہے اس کے یہاں سترھویں صدی کی عقلیت اور قدیم توہمات میں یقین باہم گروابستہ نظر آتے ہیں۔ اور اس کی نثر میں ایک نیا دروبست جلال اور شکوہ ملتا ہے اس کی مشہور تصانیف میں "۱۶۵۸ء- Urn-Burial" اور ۱۶۶۰ء– "Religio Medici" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد معتقدات کو عقل اور سائنس کی روشنی میں قابل فہم بنانا تھا۔ اپنے نثری اسلوب میں براؤن نے لاطینی عنصر اور اینگلو سیکسن محاورے کو باہم تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ جرمی ٹیلر (Jeremy Taylor) کے بیان بھی لاطینی مشتقات کے استعمال کے زیر اثر زبان میں گراں باری ثقالت اور جملوں کی ساخت میں غیر ضروری پیچیدگی ملتی ہے۔ جس کے سبب ان کا مفہوم متعین کرنے کے لیے دور کی کوڑی لانے کی ضرورت ہوتی ہے ٹیلر کی دو کتابیں Holy Dying اور Holy Living قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں Royal Society کی بڑی اہمیت ہے اسی کے زیر اثر زبان میں سادگی صفائی اور استدلال کی طرف رجحان بڑھا John Dryden کو جدید انگریزی کا معمار کہا جا سکتا ہے۔ اس نے انگریزی زبان کو لاطینی کے غلبے سے آزاد کر کے اس میں لچک تنک روی اور قطعیت کے عناصر کو ابھارا۔ اس کی دو تصانیف کا ذکر ضروری ہے

یعنی "Essay of Dramatic Poetry — ۱۶۶۸ء" اور "۱۷۰۰ء — Preface to Fables"۔ ناول نگاروں میں ہماری ملاقات جان بنیان (John Bunyan) سے ہوتی ہے جس کی تین کتابیں History of Mr Badman ، The Grace Abounding اور "Holy war — ۱۶۸۲ء" نسبتاً کم معروف ہیں۔ اس کا لازوال کارنامہ "The Pilgrim's Progress — ۱۶۷۸ء — ۱۶۸۴ء" سمجھا جاتا ہے۔ جو مجازیہ رنگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے دو حصوں میں ایک عام مذہبی انسان کی تلاش حق کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے دوران ذہن اور روح کے مدوجزر کا نقشہ بڑی خوبی کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو ڈائری لکھنے والوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا یعنی Samuel Pepys اور John Evelyn اول الذکر نے انتہائی دل کش انداز میں اپنی نجی زندگی کے خاکے میں بڑی شوخ رنگوں کی گل کاری کی ہے اور موخر الذکر نے ایک پورے عہد کو بے نقاب کیا ہے۔

سترہویں صدی کے اواخر میں دو شاعر تذکرہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اول Samuel Butler جس نے Hudibras میں Puritanism تحریک کی نارسائیوں کو اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے۔ اور دوسرے ڈرائیڈن۔ اس کی مشہور نظم "۱۶۶۶ء، Annus Mirabi Lis" پر متقدمانی اثر غالب ہے۔ خالص ذاتی سطح پر استہزا کی ایک بہت دلکش اور پرملامت کوشش "۱۶۷۸ء Mac Flecknoe" میں ملتی ہے۔ ہم عصری سیاست پر بلیغ اور پر تاثیر کردار نگاری کے ذریعے طنزیہ مرقعوں کی ایک وسیع کائنات ہے "۱۶۸۱ء - ۱۶۸۲ء Absolom and Achitophel" دو حصوں میں ملتی ہے۔ مذہبی موضوع پر دو اور نظمیں یعنی "۱۶۸۲ء — Religio Laici" اور The Hind and the Panther — اور اس دور کا ایک پرکشش غنائی کارنامہ 'Ode to St. Cecilias' Day — بھی قابل ذکر ہے۔

ڈرائیڈن قدیم ہجو نگاروں میں Juvenal سے متاثر تھا۔ ڈرائیڈن پر فارسی شاعر فردوسی کا یہ مصرع صادق آتا ہے ؎

من وگرز و میدان و افراسیاب

مگر گرز سے کام لینے کے باوصف اس کے یہاں ایک طرح کا ٹھہراؤ، محکمی اور وقار پایا جاتا ہے۔ جو اس کے قد آور ہونے کی دلیل ہے۔

احیا (Restoration) کے دور کے ڈرامے کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس دور کے طربیہ ڈراموں کو Comedy of Manners — کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے لکھنے والوں میں سرفہرست نام (Etherege) کا ہے اس کا ڈرامہ — Man of Mode or Sir Fopling Flutter ۱۶۷۶ء میں سامنے آیا۔ پھر Wycherley ہے جس کا ڈرامہ Plain Dealer ۱۶۷۷ء میں لکھا گیا۔ سب سے زیادہ امتیاز کانگریو (Congreve) کو حاصل ہوا جس کا مشہور کارنامہ "۱۷۰۰ء — The Way of the World" شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد George Farquar اور John Van Brugh کا نام بھی قابل ذکر ہے ان سب کے یہاں اس اخلاقی انتشار اور بے راہ روی کا احساس ملتا ہے جو اس دور سے مخصوص ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان ڈرامہ نگاروں کا مقصد محض سطحی جذبات کی آسودگی کے لیے ایک راستہ دکھانا تھا۔ شاید ان کا مقصد اس کے خلاف ردعمل کو ابھارنا رہا ہوگا۔ جو تصویر کو اس کی ساری عریانیت کے ساتھ پیش کرنے کے ذریعہ ہی ممکن تھا ڈرائیڈن نے ایک اور انداز کے ڈرامے لکھے جنہیں Heroic Plays کا نام دیا گیا ہے۔ اور جن میں حمیت یا Honour کو ایک محرک (Motif) کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں دو قابل ذکر ہیں یعنی "۱۶۷۵ء - Aurangzebe" اور "۱۶۷۸ء - All for Love"

احیا کے دور کی جھلکیاں ان مضامین میں بھی نظر آتی ہیں جو Steele اور Addison نے اپنے پرچوں اسپکٹیٹر (Spectator) اور Tatler میں لکھے اور شائع کیے۔ ان دونوں کا مقصد ڈرامہ نگاروں کے برعکس اصلاحی تھا۔ ان کا دل اخلاقی اقدار کے انحطاط اور پامال کیے جانے پر کڑھتا تھا۔ اور وہ طنز و مزاح کے ذریعے پڑھنے والوں پر انکشاف حقیقت کے خواہاں تھے۔ ان مضامین کو Periodical Essays کا نام دیا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی کا دور جو ملکہ این (Queen Anne) کے نام سے منسوب ہے عام طور پر نثر کا دور کہلاتا ہے۔ نثر نگاروں میں سب سے اہم نام جاناتھن سوئفٹ (Jonathan Swift) کا ہے۔ اس کے ابتدائی آثار میں سب سے اہم "۱۶۹۵ء — A Tale of a Tub" ہے جس میں اس نے اٹھارویں صدی کی علمیت، مذہبی عقائد بلکہ توہمات اور سائنسی اکتشافات کا بے باکی اور سفاکی کے ساتھ مذاق اڑایا ہے۔ دوسری معروف تصنیف "۱۷۰۴ء — The Battle of Books" ہے۔ اگر اس کے "۱۷۱۱ء — Journal to Stella" کا مشہور "۱۷۲۴ء — Drapier's Letter" سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے انداز بیان کے تنوع کا اندازہ ہو سکے گا۔ سوئفٹ کا بے مثل کارنامہ "۱۷۲۶ء — Gulliver's Travels" ہے جس کے پہلے دو حصوں میں انگلستان کے سیاسی اور سماجی اداروں اور شخصیتوں اور انگریزی ثقافت، تیسرے میں سائنسی اقدامات اور چوتھے اور آخری حصے میں دو بنیادی انسانی محرکات یعنی خود پسندی اور پندار اور عقل کے فقدان یعنی Unreason کو انتہائی فنی کاری کے ساتھ بے محابا طنزیہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اچھی اور کھری نثر کے معماروں میں ڈرائیڈن کے ساتھ سوئفٹ کا نام لینا بھی ضروری ہے جس نے اول الذکر کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے چار چاند لگائے۔ Gibbon نے "۱۷۷۶ء - ۱۷۸۰ء The Decline and Fall of the Roman Empire" میں نثر کا ایک نیا انداز پیش کیا۔ اس کے یہاں طنز اور خوش بیانی (Eloquence) کا مظاہرہ بیک وقت ملتا ہے Dr. Johnson کے مضامین کا مجموعہ Rambler کے نام سے ۱۷۵۰ء—۱۷۵۲ء میں چھپا۔ اور ایک فلسفیانہ ناول Rasselas ۱۷۵۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کا ایک اہم کارنامہ انگریزی لغت کی تدوین

تھی جو ۱۷۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں الفاظ کے مفہوم کی تشریح بڑے دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔ جانسن کا ایک اور اہم کارنامہ "۱۷۷۹ء-۱۷۸۱ء — The Lever of Poets" ہے جس کے دو حصوں میں سوانح عمری اور تنقید نگاری دونوں کا حق ادا کیا گیا ہے۔ جانسن کی شخصیت ایک ادارے کی سی تھی۔ اس میں برجستہ جملہ بازی اور دلچسپ گفتگو کرنے کا ایک خاص ملکہ تھا۔ اس پہلو کو اس کے مرید جیمس باسول (James Boswell) نے جو اس کے ساتھ آسیب کی طرح چپٹا رہتا تھا ۱۷۹۱ء میں "Life of — Dr. Samuel Johnson" لکھ کر بے نقاب کیا۔

برک (Burke) کی مشہور تصنیف — Reflecions On — Revolution in France ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی اور خالص ادبی لحاظ سے اس کا مضمون "۱۷۵۶ء — On Sublime and Beautiful —" بہت معروف ہے۔ Goldsmith بھی اسی حلقے کا ایک فرد ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ — Citizen of the World — (۱۷۶۲ء) معروف ہے۔ اس کے طربیہ "۱۷۷۳ء — She Stoops to Conquer" سے ہر ایک کے کان آشنا ہیں۔ اس کی مشہور نظمیں "۱۷۶۴ء — The Traveller" اور "۱۷۷۰ء — The Deserted Village" ہیں۔ Gray اور Couper اپنے خطوط کے لیے جو اتفاق سے محفوظ کیے جا سکے ہیں مشہور ہیں۔ اول الذکر کے یہاں حلاوت اور گرمی اور موخر الذکر کے یہاں احساس کی تازگی اور نیرنگی نمایاں ہیں۔ اسی طرح Horace Walpole کے خطوط میں جو اٹھارویں صدی کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ ماضی سے دلچسپی کا اظہار ایک کئی مجموعے یعنی Thomas Percy کے Reliques of — Ancient English Poetry سے بخوبی ہوتا ہے۔

اس صدی ہی میں ناول کا آغاز بھی باضابطہ طور پر ہوا۔ اس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں سب سے پہلا نام Daniel Defoe کا ہے جس کا مشہور ترین ناول "۱۷۱۹ء — Robinson Crusoe" ہے۔ اس کے دو اور ناول "۱۷۲۲ء — Moll Flanders" اور "۱۷۲۴ء — Roxans" ہیں۔ اس سے زیادہ اہم نام Richardson اور Henry — Fielding — کے ہیں۔ اول الذکر کا ناول جو خطوط کی شکل میں ہے، — Clarissa — Harlowe ہے رچرڈسن گو بیانیہ اور مواقع کو پیش کرنے پر قدرت نہیں ہے لیکن جذبے کی تہوں تک پہنچنے اور انہیں کھولنے کا اسے بڑا سلیقہ ہے۔ فیلڈنگ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے کیا۔ لیکن اس نے جلد ہی ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ اولین ناولوں میں Amelia کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔
"۱۷۴۲ء — Joseph Andrews" میں اس نے رچرڈسن کا خاکہ اڑایا ہے۔ اس کا نمایاں کارنامہ Tom Jones ہے۔
Joseph Andrews کا شمار شہ پاروں میں پیش کیے گئے "طربیہ رزمیہ" (Comic Epic) میں کیا جاتا ہے۔ اور Tom Jones میں اٹھارویں صدی کے انگلستان کی نمائندگی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔
Smolett کے دو ناول "۱۷۴۸ء — Roderick Random" اور "۱۷۵۱ء — Peregrine Pickle" قابل ذکر ہیں۔

Laurence Sterne کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مشہور ناول — Life and Opinions of Tristram — Shandy (۱۷۶۲-۶۷ء) میں پہلے پہل اس "طربیہ تراج" (Cosmic Indiscipline) کے مظاہر ملتے ہیں۔ جو خود زندگی کی سرشت میں داخل ہے۔ اس میں جس لامرکزیت اور غیر سلسلہ واری کو کردار نگاری اور واقعات کے پیش کرنے میں برتا گیا ہے اس میں بیسویں صدی میں ناول نگاری میں مستقل شعور کے بہاؤ (— Stream of Consciousness) کی تکنیک کی اولین جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔
یہاں ناول کی اس صنف کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جس میں پراسرار سراسیمگی (Horror) کے عناصر ملتے ہیں۔ اس کی مثال ہوریس والپول (Horace Walpole) کا ناول The Castle of Otranto ہے۔ William Beckford نے بھی "۱۷۸۶ء — Vetbeck" میں مشرقی داستان کے اس پہلو کو انتہائی مبالغے کے ساتھ پیش کیا۔ عام سطح پر اس مذاق کو پیش کرنے والوں میں Mrs. Ann Radcliffe بھی ہے اس کا ناول Mysteries of Udolpho ۱۷۹۴ء میں شائع ہوا۔

شاعروں میں سب سے اہم نام Alexander Pope کا ہے۔ جس کے یہاں ڈرائیڈن کا وقار اور بھاری بھرکم پن بے حد شوخ اور تیکھے انداز میں بدل گیا ہے۔ Juvenal کے مقابلے میں جس سے ڈرائیڈن متاثر تھا، پوپ نے Horace سے شعری فیضان قبول کیا۔ ڈرائیڈن کی ضربیں گرز اور بھالے کی ضربیں ہیں۔ پوپ کی تیر انگنی میں لطافت نکیلے پن اور اندرونی چبھن اور جلن بہت واضح ہیں اس نے اپنی شاعری کا آغاز "۱۷۰۹ء — Pastorals" اور Windsor Forest جیسی نظموں سے کیا۔ نیوکلاسیکی انداز میں ایک فلسفیانہ نظم — Essay on Man — لکھی۔ Essay on Criticism میں تنقید کے ان اصولوں کو پیش کیا جو نیوکلاسیکیت کے ساتھ مخصوص تھے۔ لیکن اس کا اصل کارنامہ "۱۷۱۴ء — The Rape of the Lock" ہے۔ جس میں رزمیہ کی رسمیات کا خاکہ ایک معمولی سے واقعے پر منطبق کر کے اڑایا گیا ہے۔ پوپ کے یہاں جو صفائی ستھرائی اور روشن ضمیری ہے۔ وہ دوسروں کے یہاں مشکل سے ملے گی اس نے Blank Verse کی جگہ ہم قافیہ مصرعوں (Rhymed Couplets) کا استعمال کیا اور اس میں بلاغت کی حدوں کو چھو لیا۔ اپنی بڑی گراں قدر نظم "۱۷۲۸-۴۲ء — The Dunciad" میں جذبے کی انتہائی شدت کے ساتھ علمیت اور فنون لطیفہ کے پایان کار نیست و نابود ہو جانے کے اندیشے کا اظہار کیا۔
پوپ کے پہلو بہ پہلو ڈاکٹر جانسن کا نام بھی آتا ہے اس کی دو نظمیں "۱۷۳۸ء — London" اور "۱۷۴۹ء — Vanity of Human Wishes" قابل ذکر ہیں۔ پوپ کا سروکار شاعری میں مدنی زندگی اور اس کے کوائف سے تھا۔ — James Thomson نے اپنی مشہور اور طویل نظم "۱۷۲۶-۳۰ء — The Seasons" میں فطرت کے ساز پر انگلیاں رکھیں۔ یہاں چند اور شاعروں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ ان میں Crabbe ہے۔

جس میں نظم The Village میں بیان (Description) اور تامل (Reflection) کو باہم آمیز کیا گیا ہے۔ (Cowper) کی بے حد طویل نظم "The Task ۱۷۸۵ء" میں زندگی کی بہت سی پرچھائیاں نظر کے سامنے سے گزرتی ہیں۔ اور اس میں ایک طرح کی حلاوت اور گرمی پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک مختصر اور مفید نظم The Receipt of My Mother's Picture سے کون واقف نہ ہوگا۔ پھر اس کی مذہبی نظمیں ہیں جو Olney Hymns کے عنوان سے معروف ہیں۔ اور جن میں جذبے کی کڑواہٹ اور صداقت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے تھامس گرے (Thomas Gray) کا مرثیہ (۱۷۵۱ء) ایک دیہاتی کلیسا کے احاطے میں لکھا ہوا مرثیہ — Elegy Written in a Country Church Yard۔ ہر دلعزیز ہے اس کی ایک اور نظم بارڈ یا شاعر (Bard) بھی ہے کولنز (Collins) کا قصیدہ "Ode To Evening ۱۷۴۶ء" شام کی شان میں اچھی شاعری کا ایک قابلِ قدر نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ گرے اور کولنز نے خاص طور پر قصیدے (Ode) کی صنف کو رواج دیا اور کامیابی کے ساتھ برتا کرسٹوفر شارٹ (Christoper Shart) کی ایک ہی نظم ۱۷۶۳ء "داؤد کی شان میں گیت" (Song To David) زیادہ معروف ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوراہے پر ہم ایک عظیم شاعر ولیم بلیک (William Blake). سے متعارف ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت اپنے زمانے سے منسلک بھی ہے اور اس سے ماورا بھی۔ اس کے یہاں اس ذہنی آب و ہوا کی عکاسی بھی ملتی ہے جس کے خد و خال کو نیوٹن، بیکن اور لاک (Locke , Newton ' Bacon) کے نظریات نے متعین کیا تھا۔ اور اس مزاج کی نمائندگی بھی جس کے خلاف اس نے بغاوت کی۔ اس کے اولین دَور کی نظموں میں معروف ترین معصومیت کے گیت (Songs of Innocence) (۱۷۸۹ء) اور تجربے کے گیت (Songs of Experience) (۱۷۹۴ء) ہیں۔ ان میں اس زمانے کی سیاست اور معیشت پر اشارتی انداز میں زبردست تنقید بھی ملتی ہے اور اس کے اپنی مابعد الطبیعیات اساطیری نظام کے ہلکے سے نقوش بھی۔ اس کے بعد اس کے نثری کارنامے "جنت اور جہنم کی شادی" (The Marriage of Heaven and Hell —) میں اس کے باغی فلسفیانہ اور بت شکن مزاج کا برملا اظہار اور اعلان ملتا ہے۔ بعد کے کارناموں جیسے "یوریزن کی کتاب" (The Book of Urizen)، "لوس اہانیا کی کتاب" (The Book of Los-Abania —) میں انقلاب فرانس امریکہ افریقہ اور یورپ وغیرہ میں سماجی اداروں پر گہری تنقید اور اس کے اپنے اساطیری نظام کا خاکہ ملتا ہے۔ اس کی تین بڑی نظموں یعنی The Four Zoas ملٹن (Milton) اور یروشلم (Jerusalem) میں جنہیں پیش گوئیوں (Prophecies) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ سب موضوعات انتہائی پیچیدہ اور ناقابلِ فہم انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ بلیک کی شاعری کی افہام و تفہیم کا کام زیادہ دشوار اسلیے ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنا نظام علایم خود وضع کیا ہے۔ اس نے جن سرچشموں سے فیض حاصل کیا ان میں خاص طور پر سویڈن بورگ، بائبل، بوہیم، پارسیلس (Sweden Borg, Bible, Boheme Paracelsus) قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اسے جہاں سے جو کچھ مفیدِ مطلب نظر آیا اس کے کیمیا وی تخیل نے اس کی صورت گری اپنے طور پر کر لی۔

ڈرامے کے سلسلے میں دو نام یعنی گیرک (Garrick) اور مسز سڈنس (Mrs. Siddons) قابل ذکر ہیں جنہوں نے اسٹیج پر اداکاری کے فن میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اسٹیل (Steels) نے جذباتی (Sentimental) ڈرامے لکھے۔ مشہور بیکا اوپیرا (The Becca Opera) ۱۷۲۸ء میں سامنے آیا۔ گولڈ اسمتھ کا ڈرامہ —— 'وہ تسخیر کرنے کے لیے جھکتی ہے' (She Stoops to Conquer) بھی قابل ذکر اس لیے ہے کہ اس نے جذباتیت (Sentimentalism) کی تحریک کو اپنے تیر ملامت کا ہدف بنایا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام Richard Sheridan کا ہے جس کے تین ڈرامے بہت معروف ہیں یعنی "رقیب" (The Rivals) (۱۷۷۵ء) اسکنڈل کا اسکول (The School For Scandal) (۱۷۷۷ء) اور نقاد (The Critic) (۱۷۷۹ء) شیریڈن کے یہاں بذلہ سنجی بھی ہے اور تیکھا پن بھی اس نے معاشرے کے عیب اور سطحی پن کو بڑی بے رحم واقفیت کے ساتھ بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی دلچسپی تین موضوعات سے تھی اول گوتھک (Gothic) کی طرف رغبت دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کی کشش اور تیسرے مظاہرِ فطرت کا حسن۔ انیسویں صدی میں جسے رومانیت (Romanticism) کی تحریک کی صدی کہا جاتا ہے۔ ہم ادب اور شاعری میں تخیل کی ایک نئی پرواز سے آشنا ہوتے ہیں۔ فلسفی روسو (Rousseau) کے نظریات اور انقلاب فرانس کا بھی گہرا اثر ادب پر پڑا۔ اولین دور کے شاعروں میں ورڈزورتھ (Wordsworth) اور کولرج (Coleridge) کے نام سرفہرست ہیں۔ اول الذکر نے شاعری کی ابتدا اٹھارویں صدی کے آخری دور کے روایتی انداز سے کی تھی لیکن انقلابِ فرانس کے تہلکے کے زیرِ اثر جو شاعری معرضِ وجود میں آئی وہ صحیح معنوں میں اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس میں مفہوم کی اکائیوں اور لسانی ترسیل کے درمیان بہت کم بُعد ملتا ہے۔ ۱۷۹۸ء میں ان دونوں شاعروں نے متفقہ طور پر ایک شعری منشور شائع کر جس کے مطابق اول الذکر یعنی ورڈزورتھ نے عام تجربے میں آنے والے واقعات اور اشیا کی روح پر سے پردہ اٹھانے اور ان کے غیر معمولی پہلو کو نمایاں کرنے کے کام کو اپنے لیے منتخب کیا اور کولرج نے مافوق الفطرت واقعات کے نفسیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کا جتن کیا۔ ان سب کو جو بیک وقت شائع کی گئیں غنائیہ عوامی گیتوں (Lyrical Ballads) کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں ورڈزورتھ کی تمام مختصر نظمیں جن میں زیادہ اہم Lucy سے متعلق نظمیں ہیں "جونک کا جویا" (Leech Gatherer) اور "میکائل" (Michael) ہیں۔ اور کولرج کی "قدیم ملاح" "کبلا خاں"

(Kubla Khan) ، (The Ancient Mariner) اور "کرسٹابیل" (Christabel) شامل ہیں۔ ورڈز ورتھ کا ایک اور قابل ذکر بلکہ بہترین کارنامہ اس کی طویل نظم "۱۸۰۵ء The Prelude" ہے جس میں اس نے اپنی روح کے عمل ارتقا کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور یہ پیش خیمہ ہے اس کی دوسری نظم The Excursion کا۔ اس کے علاوہ اس کا شعری ڈرامہ The Borderers بھی قابل تذکرہ ہے۔ شاعری کرنے کے علاوہ اس نے فن شعر سے متعلق بھی ایک سے زیادہ پیش لفظ میں اظہار خیال کیا۔ کولرج نے ادبی سوانح ۱۸۱۷ء — (Biographia Literaria) — کے نام سے ایک معرکہ آرا تصنیف پیش کی جو فنی تنقید میں ایک بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس نے Hartley کی میکانکیت کے خلاف اور عضویت (Organicism) کے فلسفے کے حق میں آواز بلند کی۔

دوسرے دور کے شاعروں میں کیٹس (Keats)، شیلی (Shelley) اور بائرن (Byron) کے نام آتے ہیں۔ کیٹس حیات اور تفکر دونوں کا شاعر ہے۔ اس نے یونانی اساطیری نظام سے اپنی شاعری کے لیے قوت نمو اور قوت تحریک حاصل کی۔ اس کی ابتدائی نظموں میں Endymion، The Pot of Basil اور زیادہ پختہ دور کی شاعری میں اس کے چھ قصائد (Odes) اور ہائی پیریئن (Hyperion) کے دو روپ شامل ہیں۔ کیٹس کے نثری خطوط بھی جو اس نے اپنے دوستوں اور اپنی محبوبہ Fanny Braune کے نام لکھے تھے خاصے کی چیزیں ہیں اور ان سے اس کی بعض نظموں کی وجہ تخلیق پر بھی بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

شیلے فضا کی وسعتوں اور تخیل کی ان تھک پرواز کا شاعر ہے۔ اس کی مشہور نظموں میں غنائی نظموں اور قصیدوں (Odes) کے علاوہ اس کی ابتدائی نظم "۱۸۱۳ء Queen Mab" ، "اسلام کی بغاوت" (The Revolt of Islam) اس کا ڈرامہ سینسی (Cenci)، کیٹس پر اس کا مرثیہ Adonais شامل ہیں۔ اس کے شعری ڈرامے Prometheus Unbound — (۱۸۲۰ء) میں جو اس کا بہترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ فکر تخیل اور حیات کا بہترین امتزاج اعلیٰ سطح پر نظر آتا ہے۔

بائرن کی شہرت زیادہ تر اس کی شخصیت کی دل کشی کی وجہ سے ہے۔ اس کے انقلابی جذبے کے سبب اور اس رومان کی بنا پر جو ہمیں اس کی طویل نظم Child Harold's Pilgrimage (۱۸۱۲ء-۱۸۱۸ء) میں ملتا ہے دو اور نظمیں Beppo (۱۸۱۸ء) اور Don Juan (۱۸۱۹ء-۱۸۲۱ء) بھی قابل تذکرہ ہیں۔ اس کی ایک اور نظم خصوصیت کے ساتھ قابل اعتنا ہے یعنی "وژن آف جججمنٹ" (The Vision of Judgement) اس میں کلاسیکی ضبط کی کارفرمائی اور طنز کی چبھن استادانہ انداز سے نظر آتی ہے اس سلسلے میں Thomas Moor کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ جس کی آئرش نغمات" (Irish Melodies) اور "لالہ رخ" (Lala Rookh) ۱۸۱۷ء میں سامنے آئیں۔

نثر کی صنف بھی اس دور میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے چارلس لیمب (Charles Lamb) کے "ایلیا کے انشایئے" (— of Elia — Essay) اور "آخری انشایئے" (Last Essays) کا ذکر ضروری ہے۔ لیمب کے انداز نگارش میں جملوں کی ساخت میں پیچیدگی کے باوصف ایک دلکشی ہے۔ اس کے مضامین میں ایک ذہنی اور جذباتی ترفع ملتا ہے۔ ان میں ماضی کی یادوں سے ایک حلاوت پیدا ہوگئی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نجی زندگی کے المیہ کے قلب ماہیت کی خاطر اور اسے گوارا بنانے کے لیے مزاح کی چاشنی اور ذہن کی بیداری سے کام لیا گیا ہے۔ ڈی کوینسی (De Quincey) کی کتاب "ایک انگریز افیمچی کے اعترافات" (Confessions of An English Opium Eater) ۱۸۲۲ء میں شائع ہوئی۔ ہیزلٹ (Hazlitt) کے مضامین بھی اپنی علمیت کے باوجود زندگی کے وسیع تجربات سے کام لینے اور نثر کی صلابت اور فنی پختگی کی وجہ سے خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک اور کتاب روح عصر (The Spirit of The age) ہے۔ اسی ضمن میں Savage Landor کی کتاب "خیالی گفتگو" (Imaginary Conversations) کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے۔ لیمب ہیزلٹ اور ڈی کوینسی نے "مضمون" یا انشائیہ (Essay) کی صنف میں اہم اضافے کیے۔ ان تینوں اور کولرج نے شیکسپیئر کے سلسلے میں بھی اہم تنقیدی خیالات کا اظہار کیا، اور اٹھارویں صدی کے تنقیدی نقطۂ نظر کے برعکس ایک نئی فکر کا آغاز کیا۔ خاص طور پر کولرج نے تفصیل کے ساتھ نہ صرف انفرادی طور پر اس کے ڈراموں پر تنقید کی بلکہ شیکسپیئر پر تنقید کے لیے بعض اصول بنیادی بھی فراہم کر دیں۔ عام تنقیدی فکر کی رفتار متعین کرنے کے سلسلے میں تین رسالوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یعنی "رسالۂ اشراف" (Gentleman's Magazine) (۱۷۳۱ء-۱۸۶۸ء) ایڈنبرا ریویو (Edinburgh Review) (۱۸۰۲ء-۱۹۲۹ء) اور "سہ ماہی رسالہ" (The Quarterly —) (۱۸۰۹ء)۔

دو ناول نگار خاص طور پر ہماری توجہ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ جین آسٹن (Jane Austin) نے اپنے ناول "ناردینجر ایبے" (Northanger Abbey —) (۱۸۱۱ء) میں "گاتھک" (Gothic) کی ناول کی روایت کو اپنے لطیف طنز کا ہدف بنایا۔ اس نے ایک مخصوص خطے اور سماج میں ایک اہم طبقے کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے دو بار بار پڑھے جانے والے ناولوں میں "شعور اور حس" (Sense And Sensibility) (۱۸۱۱ء) اور "غرور اور بدگمانی" (Pride and Prejudice) (۱۸۱۳ء) ہیں۔ اس کا آرٹ صیقل شدہ ہے۔ اور وہ اپنے محدود کینوس پر ماہرانہ میناکاری، ڈرامائی احساس کے پیش کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔ یہ دونوں خصوصیات "مینس فیلڈ پارک" (Mansfield Park) (۱۸۱۴ء) اور "پرسویشن" (Persuasion) (۱۸۱۸ء) میں بخوبی جھلکتی ہیں۔

سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) کو تاریخی ناول نگاری کا موجد کہا جاتا ہے۔ Waverley ناولوں کا آغاز ۱۸۱۴ء میں ہوا۔ آئی۔ وَن۔ ہو (Ivonboe) (۱۸۲۰ء) اور "کینل ورتھ" (Kenniworth —) ۱۸۲۱ء میں لکھے گئے۔ اس کا سب سے اچھا ناول The Heart of Midlothian سمجھا جاتا ہے۔ اسکاٹ

کو کردار نگاری میں چاہے ژرف نگاہی حاصل نہ ہو لیکن بیانیہ (Narrative) پر اسے جو قدرت ہے وہ ناقابل انکار ہے۔

انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں جسے ملکہ وکٹوریہ کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم مظہر تشکیک ہے، جو سائنس اور مذہب کے درمیان آویزش سے پیدا ہوئی مشہور سائنس داں چارلس ڈارون (Charles Darwin) نے ۱۸۵۹ء میں اوریجن آف اسپیشیز (Origin of Species) اور ۱۸۷۱ء میں انسان کا ہبوط (The Descent of Man) شائع کیں اور اعداد و شمار اور انواع پر مبنی مصدقہ شواہد کی بنیاد پر یہ بات ثابت کر دی کہ صفحۂ ہستی پر زندگی کا آغاز نہایت معمولی قسم کے آبی مظاہر سے شروع ہو کر نباتات اور حیوانات کی منزلوں سے گزرتا ہوا انسان کی صورت میں مکمل ہوا۔ انسان نہ یکایک پیدا کیا گیا اور نہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اس سائنسی نتیجے نے مروجہ مفروضات پر کاری ضرب لگائی اور علم اور عقیدے کی دنیا میں ایک ہلچل بپا کر دی۔ وکٹورین عہد کا سب سے نمائندہ شاعر ٹینی سن (Tennyson) ہے۔ مجموعی طور پر اس کی فنی ہنرمندی فکر اور جذبے پر غالب ہے۔ ٹینی سن کی ابتدائی نظموں میں فطرت سے گہرے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے دو مجموعے ۱۸۳۰ء- ۱۸۳۳ء میں منظر عام پر آئے۔ اس کے یہاں یقین اور شک کے درمیان کش مکش اس کی ایک نظم The Two Voices میں بخوبی جھلکتی ہے۔ یہ اس کی شاہکار نظم "اِن میموریم" (In Memoriam) (۱۸۵۰ء) میں اور نمایاں ہوگئی ہے۔ اس میں حد درجے کا حزن اور دل گرفتگی ملتی ہے لیکن پایانِ کار یقین شک پر غالب آجاتا ہے ۱۸۵۹ء- ۱۸۸۵ء آئڈلس آف دی کنگ (The Idylls of the King) میں اس نے بادشاہ آرتھر (King Arthur) کے سلسلے میں داستانوں کے مواد سے کام لیا ہے۔ دوسرا اہم شاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Brouming) ہے وہ رجائیت کا شاعر ہے۔ اور حیاتِ مابعد کے تصور میں پختہ یقین رکھتا ہے۔ براؤننگ نے زیادہ تر اطالوی نشاۃ ثانیہ کے نمائندوں کو اپنی شاعری میں کرداروں کی حیثیت سے پیش کیا۔ ابتدائی نظموں میں سے سارڈیلو ۱۸۴۸ء (Sordello) پر مغلق ہونے کا الزام عائد کیا گیا۔ اس کی نظموں کا ایک اہم مجموعہ مرد اور عورتیں (Men and Women) کے عنوان سے ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کا خاص شعری مقصد روح کے اندرونی نقطے کو اس وقت روشنی میں لانا ہے جب وہ کسی بحران سے دوچار ہو۔ براؤننگ نے بطور ڈرامے نہیں لکھے لیکن ایسی غنائیہ نظمیں جن میں ڈرامائی عنصر بطور خاص موجود ہے اس کی طبیعت سے بڑا میل کھاتی تھیں۔ اس کی مشہور نظموں میں "آخری بار ہم رکاب" "آخری ڈچیس" (The Last Ride Together) "ربی بن عزرا" (The Last Dutchess) (Rabbi Ben Azra) اور "اینڈریا دیل سارتو" (Andrea Del Sarto) قابل ذکر ہیں۔ اپنی شاہکار طویل نظم "انگشتری اور کتاب" (The Ring and the Book) (۱۸۶۸ء- ۱۸۶۹ء) میں اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شر کی پھیلی ہوئی قوتوں سے بخوبی باخبر ہے اور اس کی رجائیت محض اوپری سطحی اور بآسانی حاصل الحصول نہیں ہے۔ اس کے یہاں کرداروں کا تنوع شیکسپیئر کا سا ہے لیکن وہ معروضیت (Objectivity) اور آفاقیت (Universality) نہیں ہے۔ تیسرا اہم شاعر Mathew Arnold ہے۔ رومانیت کی جھلکیاں اس کی نظم "فارسیکن مرمین" (Forsaken Merman) (۱۸۴۹ء) میں ملتی ہیں۔ اس کے یہاں ٹینی سن کی نسبت شک زیادہ گہرا اور اس کے ذہن اور روح پر زیادہ مرتسم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آرنلڈ کے یہاں دو دنیاؤں کا آشوب ملتا ہے۔ ایک وہ جو دم توڑ رہی ہے اور دوسری وہ جس نے ابھی جنم نہیں لیا ہے۔ وہ اپنے دور کی روح سے ناآسودہ ہے اور اس لیے ایک روحانی اضطراب اور بے چینی کا شکار ہے۔ اس کی تین نظمیں ڈوور بیچ (Dover Beach) تھرسس (Thyrsis) اور اسکالر جپسی (The Scholar gipsy) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں میں وہ متحیر نظر آتا ہے اور اس تلاش میں سرگرداں کہ اپنے دور کے اضمحلال اور انتشار کا کوئی حل تلاش کرے۔ یہی ذہنی خلش اور جذباتی ناآسودگی ہمیں اس کے دوست کے اچ کلا K.H. Clough کی نظموں میں ملتی ہے۔ اسی سلسلے میں وہ شاعر بھی قابل ذکر ہیں جنہیں ماقبل رفیل (Pre-Rapaelite) شاعروں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب شاعری میں تفکر سے زیادہ حسیت (Sensuousness) اور جمالیاتی ذوق کو اہمیت دیتے ہیں اور شدید اور مرتعش جذبے کے شاعر ہیں۔ دانتے گیبرل روزیٹی (Dante Gabriel Rossetti) کے سانیٹوں کا مجموعہ خانۂ حیات (The House of Life) بھی بہت معروف ہے۔ ڈی۔ جی۔ روزیٹی کی بہن کرسچین روزیٹی (Christiana Rossetti) کا ذکر بھی اس سلسلے میں ناگزیر ہے۔ دو اور شاعر بھی اس حلقے سے منسلک ہیں یعنی سوئن برن (Swinburne) اور ولیم موریس (William Morris) ان سب کے یہاں مبہم احساس رنگ اور ترنم کا شعور اور جمالیاتی ذوق کے آسودگی نمایاں قدریں ہیں۔

وکٹورین عہد کی شاعری میں تشکیک کا ذکر کیا جا چکا۔ لیکن اسی عہد میں بعض شاعر ایسے بھی ہیں جن کے یہاں مذہبی ایقان اور گہرے روحانی تجربات کو شاعری میں برتا گیا ہے۔ ان میں رومن کیتھولک (Roman Catholic) شاعر کوینٹری پیٹ مور (Coventory Patmore) کا نام لیا جاسکتا ہے جو اپنے قصائد کے مجموعے "نامعلوم ایروس" (The Unknown Eros) (۱۸۷۷ء) کے لیے مشہور ہے۔ اس دور کا سب سے اہم شاعر جو اپنے شعور کے شفاف پن کی وجہ سے بہت آگے دیکھتا ہے۔ ہاپکنس (Hopkins) ہے جس کا انتقال ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ اس کے ترنم میں اینگلو سیکسن شعرا کی موسیقی کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ اس کی مشہور نظموں میں (The Windhover (The Wreck "ڈیوش لینڈ کی بربادی" — Felis Randal) — of Deutschland) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ہرچند ہاپکنس کے مصرعوں کی ترتیب اور ساخت بظاہر گنجلک ہے تاہم اس کی شاعری میں ایک کس بل، ذہنی چوکنا پن اور اندرونی اضطراب کے نقوش بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس نے دورِ جدید کے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا تھا اس بار ڈی (Thomas Hardy) نے البتہ اپنے شعری ڈرامے "ڈائی ناسٹس" (The Dynasts) (۱۹۰۳ء- ۱۹۰۸ء) میں اپنے قنوطی فلسفۂ زندگی

کا انعکاس پیش کیا۔ یہاں نبی اور شاعروں کی طرف اشارہ کرنا شاید بے محل نہ ہو یعنی لیونل جانسن (Lionel Jonson) (۱۸۶۷ء – ۱۹۰۲ء) ارنیسٹ ڈاؤسن (Ernest Dowson) (۱۸۶۷ء – ۱۹۰۰ء) اور جان ڈیوڈسن (John Davidson) (۱۸۵۷ء – ۱۹۰۹ء) جو قدیم و جدید فرانسیسی ادب سے کافی متاثر ہوئے اور اس کا اتباع کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔

وکٹورین عہد نثر کے کارناموں سے بھی خالی نہیں میتھیو آرنلڈ کے تنقیدی مضامین کئی حصوں میں ہیں۔ اس کے یہاں یہ اہم خیال ملتا ہے کہ ادب زندگی کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی تنقید بھی پیش کرتا ہے۔ تہذیبی امور پر اس کے خیالات اس کی کتاب "کلچر اور انارکی" (Culture And Anarchy) میں ملتے ہیں جس میں متوسط طبقے کی ذہنی پر اگندگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ رسکن (Ruskin) نے اپنی منفرد نثر میں آرٹ کے بارے میں اظہار خیال کیا اور اپنے دور کی خرابیوں کا علاج معاشیات کے ایک حرکی تصور کی روشنی میں "انٹو دس لاسٹ" (Unoto This Last) میں پیش کیا۔ میکالے (Macauly) نے گبن (Gibbon) کا تتبع کیا۔

فلسفیوں میں جن کا تعلق افادیت پسندی (Utilitarians) کے ملقہ سے ہے اور بنتھم (Benthem) اور جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ آخر الذکر کی خود نوشتہ سوانح عمری "آٹو بایو گرافی" (Autobiography) (۱۸۴۴ء) قابل مطالعہ ہے۔ کارلائل (Carlyle) کی تحریر میں بلند آہنگی اور دیدہ زیبی (Picturesqueness) ملتی ہے۔ اس کی کتاب "ہیرو اور ہیرو ورشپ" (Hero and Hero Worship) کلاسیکی شان رکھتی ہے۔ پیٹر (Pater) کو نشاۃ ثانیہ کے تصورات کا مبلغ اور جمالیاتی تنقید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اول الذکر موضوع پر اس کی کتاب نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کے مطالعے (Studies in The History of Rennaissance) ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور مشہور کتاب "ایپری سی ایشنس" (Appreciations) ہے۔ مذہبی نثر لکھنے والوں میں کارڈنل نیومن (Cardinal Newman) کا ذکر ضروری ہے جس کی کتاب "اپولوجیا پرو وٹیا سوا" (Apologia Provita Sua) ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔

اس دور میں ناول نگاری کے فن میں حیرت انگیز ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ سب سے اہم دو ناول نگار ہیں ڈکنس (Dickens) اور تھیکرے (Thackeray) ہیں۔

اول الذکر نے صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کو خام مواد کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے کردار بظاہر سپاٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان کی تخلیق میں کیمیا گری کو کام میں لایا گیا ہے۔

ڈکنس کے یہاں طوالت اور جذباتیت خاصی پھیلی ہیں۔ ویسے وہ فطرت انسانی کا بڑا نباض ہے۔ اس کے ناولوں میں حقیقت پسندی اور مزاح کی چاشنی اہم عناصر ہیں۔ اس کے ناولوں میں خصوصیت کے ساتھ (David Copperfield, Hard Times, Great Expectations, A Tale of Two Cities, Oliver Twist) وغیرہ کے مستحق ہیں۔ اس کے کردار یا تمام تر سیاہ ہیں یا تمام تر سفید ان کے بالمقابل تھیکرے کے یہاں زیادہ ٹھہراؤ ملتا ہے۔ گو اس کے یہاں ڈکنس جیسی آفاقیت کی کمی ہے مگر وہ اپنے ملک کے حالات اور کرداروں کی ذہنی کیفیات کو خوب سمجھتا ہے۔ اس کا سب سے مشہور ناول "وینٹی فیر" (Vanity Fair) (۱۸۴۷ء) ہے وہ ہمیں فیلڈنگ کی یاد دلاتا ہے۔ تاریخی ناول کی طرف کوشش اس کے یہاں ہنری ایسمنڈ (Henry Esmond) (۱۸۵۲ء) میں نظر آتی ہے۔ اس کے یہاں طنز کے چھینٹے پائے جاتے ہیں اور وہ ایسا ناول نگار ہے جو اکثر جگہ اور وقتاً فوقتاً ناول کی رفتار اور حرکت کو اپنی دخل اندازی کے ذریعہ اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ ان دونوں کا اتباع کرنے والوں میں بولر لیٹن (Bulwer Lytton) کا نام لیا جاسکتا ہے جس کا ناول "پومپیائی کے آخری شب و روز" (The Last Days of Pompeii) کافی مشہور ہے اور چارلس ریڈ (Charles Read) کا جس نے "اصلاح کا در کبھی بند نہیں ہوتا" (It is Never Too Late To Mend) (۱۸۵۶ء) میں قید خانوں کی فضا کی عکاسی کی اور "کلوایسٹر اور ہارتھ" (The Cloister And The Hearth) (۱۸۶۱ء) میں ازمنۂ وسطیٰ کی جھلک دکھائی۔ ڈزریلی (Disraeli) نے ٹوری جمہوریت کے تصور کی عکاسی کی۔ ان کے تین ناول اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ یعنی کوننگسبی (Coningsby) (۱۸۴۴ء) سبل (Sybil) (۱۸۴۵ء) اور Tancred (۱۸۴۷ء)۔ مسز ہمفری وارڈ (Mrs. Humphrey Ward) نے رابرٹ ایلزمیر (Robert Elsmere) (۱۹۶۶ء) میں ایقان کے تلف ہو جانے کا اظہار کیا۔ انتھونی ٹرالوپ (Anthony Trollope) کے ناول بھی اسی ضمن میں قابل تذکرہ ہیں۔ اس منزل پر تینوں برانٹے بہنوں (Bronte Sisters) کا نام لینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ یعنی ایملی (Emily) شارلٹ (Charlotte) این (Anne) اول الذکر کا حیرت انگیز کارنامہ Wuthering Heights – ۱۸۴۷ء شدت تاثر کا نمونہ ہے۔ اس میں مرکزی کردار ہیتھ کلف (Heathcliff) کا ہے اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر شعوری جبلی محرکات اپنی نکاسی کے لیے راستہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اس ناول میں بیرونی فضا اور پس منظر اور نفسیاتی تبدیلیوں کے درمیان ایک گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ شارلٹ کا بہترین اور مشہور ناول "جین آیر" (Jane Eyre) (۱۸۴۷ء) ہے اور دوسرا ناول "ویلیٹ" (Villette) (۱۸۵۳ء) ہے۔ ڈکنس ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ قد آور ناول نگاروں میں جارج ایلیٹ (George Eliot) کا شمار کیا جاتا ہے۔ ایف۔ آر لیوس (F.R. Leavis) نے اسے ناول کی تاریخ کے روایت سازوں میں گنا ہے "آدم بیڈ" "ملّ آن دی فلاس" (Mill on ibe Floss) (۱۸۵۹ء – ۱۸۶۰ء) اس کی ابتدائی کوششوں میں ہیں اور ان کی تاریخی اہمیت ہے۔ لیکن اس کے شاہکار "مڈل مارچ" (Middle March) (۱۸۷۱ء – ۱۸۷۲ء) میں ناول کے تخلیقی فن میں جدید شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس میں ایک دہرا پلاٹ ہے۔ اور

اس کے کرداروں میں نفسیاتی ارتقا ملتا ہے۔ مسز گیسکیل (Mrs. Gaskell) محنت کشوں کے سماجی حالات کی تصویر کشی "میری بارٹن" (Mary Barton) (۱۸۴۸ء) میں پیش کی۔ اور "کرین فورڈ" (Cran ford) (۱۸۵۲ء) میں طبقاتی زندگی کے مسائل سے بحث کی۔ جارج ایلیٹ کے ساتھ میریڈتھ (Meredith) کا نام بھی لیا جانا چاہیے جس نے فلسفیانہ کردار نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کا یہ ناول "آرڈیل آف فیورے رل" (The Ordeal of Feveral) (۱۸۵۹ء) میں اور سب سے مشہور ناول "ایگویسٹ" یا خود پسند (The Egoist) (۱۸۷۹ء) میں شائع ہوا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں اسٹی وینسن (Stevenson) کی بھی اپنی ایک جگہ ہے۔ اس کی شہرت کا زیادہ مدار "ڈاکٹر جیکیل اور مسٹر ہائڈ" (Dr. Jykell And Mr. Hyde) پر ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ناول "ماسٹر آف بیلنٹرے" (The Master of Ballantrae) ہے۔ کپلنگ (Kipling) کا شمار بھی دلچسپ ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ "جنگل" (The Jungle) کے دونوں حصے لائق مطالعہ ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر تھامس ہارڈی (Thomas Hardy) ہے۔ اس کے یہاں شروع سے ایک طرح کی گھلا دینے والی قنوطیت ملتی ہے۔ اور تشکیک کی طرف میلان بھی۔ اس کا مشہور ناول "نیلگوں آنکھیں" (A Pair of Blue Eyes) اس کی اولین کوشش ہے۔ اس کے علاوہ "ٹرمپیٹ" یا نقارہ (The Trumpet) "کاسٹر برج کا میئر" (The Mayor of Casterbridge) "تھار فرم دی میڈنگ کراؤڈ" — (Far From Madding Crowd) اور (Jude The Obscure) قابل ذکر ہیں۔ اس کا سب سے مشہور ناول اور ایک لحاظ سے اس کا بہترین کارنامہ "ٹیس آف دی ڈربرویلز" (Tess of the D' Urbervilles) سمجھا جاتا ہے ہارڈی کی فکر پر ارتقا کے نظریات کا بھی اثر پڑا تھا۔ اور شوپنہاور (Schopenhauer) کے فلسفہ یاسیت یا ایک بے بصر عظیم قوت ارادی میں یقین کا۔ اس کے یہاں تقدیر اور اتفاق (Chance) کے درمیان گہرے تعلق پر کرداروں کی پوری حیات وکائنات کا انحصار ہے۔ آخر میں ہنری جیمس (Henry James) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اس کا مختصر ناول "ٹرن آف دی اسکرو" یا پیچ کی گردش (The Turn of the Screw) بہت متاثر کن ہے۔ اس کے ناولوں میں "سفیر" (The Ambassadors) "سنہری پیالہ" (The Golden Bowl) اور "ایک خاتون کی تصویر" (The Portrait of A Lady) امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکہ اور یورپ دو مختلف تہذیبوں کے ناول کے مرکزی کردار کی شخصیت کے نشو و نما پر کیسے متضاد اثرات پڑتے ہیں۔ اس ناول کے پس پشت جو فلسفیانہ تصور ہے وہ آزاد قوت ارادی اور حریت کے درمیان تصادم ہے۔ بیسویں صدی کے شاعروں میں کلاسیکی روایات کی نمائندگی کرنے والوں میں رابرٹ برجس (Robert Bridges) اور اے ای ہاؤس مین (A.E. Houseman) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر کی مشہور فلسفیانہ نظم "عہد نامہ جمال" (The Testament of Beauty) ۱۹۲۷ء - ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی۔ والٹر ڈی لامیئر (Walter D' la Mare) کے یہاں خواب ناکی اور رومانیت کی فضا پائی جاتی ہے۔ جان مینس فیلڈ (JohnMansfield) کو بیانیہ مہارت (Narrative Skill) کی بنا پر یاد رکھا جاتا ہے۔ روپرٹ بروک (Rupert Brook) کی شاعری میں وہ امیدیں جھلکتی ہیں جو جنگ کے ابتدائی ایام میں باندھی جا رہی تھیں اور ماضی کی طرف حسرت سے دیکھنے کا جذبہ اور انگریزوں کی انگریزیت پر زور دینے کا رجحان ملتا ہے۔ ایڈورڈ تھامس (Edward Thomas) کی شاعری میں ایک طرح کا مبہم احساس شعریت پیدا کرنے کی کوشش اور ڈھیلے پن کا تاثر ابھرتا ہے۔ ولفریڈ اووین (Wilfred Owen) آئزک روزن برگ (Issac Rosenberg) اور سیسون (Sassoon) تینوں کے یہاں جنگ سے پیدا ہونے والی تلخی اور اس سے اکتاہٹ اور اس کے خلاف جھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ جدید انگریزی شاعری کے معماروں میں دو نام سرفہرست ہیں یعنی ڈبلیو بی ییٹس (W.B. Yeats) اور ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot)۔ ییٹس کی اولین دور کی شاعری پر تخیل پرستی رومانیت اور ایک طرح کی نصب العینیت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ عوامی گیتوں اور روایتوں سے بھی وہ بغایت متاثر تھا۔ "سلیگو" (Sligo) کا خوبصورت فطری ماحول اس کی شاعری کے پس منظر میں موجود ہے۔ "نیستاں میں نسیم" (The Wind Among The Reeds) کی نظمیں اولین دور کی شاعری کی عکاسی کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ییٹس ان کے اثر سے آزاد ہوا۔ اور زیادہ کس بل رکھنے والی شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا مجموعہ "ذمہ داریاں" (Responsibilities) اس کی وضاحت کرتا ہے۔ زندگی کی ٹھوس اور تلخ حقیقتوں نے اسے آہستہ آہستہ رومان کی فضا سے نکال کر واقعاتی مسائل سے آنکھیں چار کرنے کی ترغیب دی۔ اپنے دور کی آئرستانی سیاست سے بھی وہ دست و گریباں رہا درمیانی اور آخری دور کی بیشتر نظمیں اشاراتی ہیں۔ وہ سوفسطائی (Sophisticated) طبقے کا شاعر ہے۔ اس کا اپنا ایک اساطیری نظام ہے۔ جسے اس نے سائنٹفک اور مادی زندگی کی معروضیت کے مقابلے میں تخلیق کیا۔ اس میں روحانیت جادو اور اعداد (Numbers) کی معنویت کو خاصا دخل ہے اس کے علائم (Symbols) گہرے اور پیچیدہ معانی کے حامل ہیں۔ اس کی بہترین شاعری کے نمائندے اس کے دو مجموعے "مینار"، "پرپیچ و خم زینہ" (The Tower , The Winding Stair) کہے جا سکتے ہیں۔

ایلیٹ شاعری کے افق پر ایک چمکدار ستارے کی طرح ابھرا۔ وہ سترہویں صدی کے مابعد الطبیعاتی شاعروں، فرانس کے اشاراتی شاعروں اور ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) سے بے حد متاثر ہوا۔ مؤخر الذکر سے اس نے عالمی کلچر کو شاعری میں سمونے کا گر سیکھا اور انگریزی اور فرانسیسی شاعروں سے وحدت پسند ادراک کی اہمیت، علائم کا استعمال، اور شاعری میں ایسے ابلاغ کے خلاف بغاوت جو سلسلہ واری نظم و ضبط کا پابند ہو۔ اپنی پیکر نگاری کے وضع کرنے میں اس نے جن سرچشموں سے فیضان حاصل کیا وہ ہیں انجیل (Bible) دانتے اور موجودہ علم الانسان کے بارے

یں نظریات۔ اس کی پہلے دور کی نظموں میں "انفریڈ پروفروک کا نغمۂ عشق" (The Love Song of Alfred Prufroch) (۱۹۱۷ء) "تمہیدات" (Preludes) (۱۹۱۷ء) "گیڈ ون شی اَن" (Gedontian) (۱۹۲۰ء) "کھوکھلے انسان" (The Hollow Men) (۱۹۲۵ء) بہت معروف ہیں۔ اس کا بہترین کارنامہ "ویرانہ" (The Waste Land) (۱۹۲۲ء) کو قرار دیا گیا ہے جو نئے اندازِ شاعری کا بہترین مرقع اور یورپین تہذیب کی میکانکی روح پر گہرا طنز ہے۔ ایلیٹ کے فنی طریقہ کار میں کراس ریفرنس (Cross-Reference) کی تکنیک کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے دھیمے لہجہ (Understatement) کے باوجود معنویت کے وسائل میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے ایک اہم نظم "ایش وینسس ڈے" (Ash Wednesday) کے عنوان سے شائع کی۔ اس کا آخری شعری کارنامہ وہ چار نظمیں ہیں جن کے مجموعے کا نام چار کوارٹلس (Four Quartlets) (۱۹۳۶ء-۴۲ء۱۹) ہے۔ یہاں اندازِ بیان زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ سلجھا ہوا ہے یعنی یہاں تلمیحاتی انداز (Allusiveness) گنجینۂ معنی ضرور ہے مگر چیستان کی حد تک نہیں پیکر نگاری اور ترنم کے اعتبار سے اس میں ایک گہرائی تہ داری اور معنوی زرخیزی پائی جاتی ہے۔ ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ جو اپنے Cantos کے لیے مشہور ہیں پیکر نگاری یا امیجری (Imagery) کی تحریک سے بہت متاثر تھے جس کا منشور رسالہ "شاعری" ۱۹۱۲ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اور جس میں نئی شاعری کے طریقۂ کار اور خدوخال کی وضاحت کی گئی تھی۔ ییٹس اور ایلیٹ کے ساتھ ہی ڈی۔ ایچ۔ لارنس رابرٹ گریوز (D. H. Lawrence ، Robert Graves) اور ایڈتھ سٹویل (Edith Sitwell) کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ گریوز کے یہاں مابعد الطبیعاتی شاعروں کی نکتہ سنجی اور فرائڈ (Frued) کے زمانہ مابعد کا عدمِ حفظِ مراتب (Irreverence) ملتا ہے لارنس کے یہاں بحروں کے استعمال میں روانی اور آزادی اور تحت الشعوری کیفیات کی مصوری خاص طور سے اہم ہیں۔ اس کی دو مشہور نظمیں Snake اور Bavarian Gentians ہیں۔ ایڈتھ سٹ ویل کے یہاں مرصع کاری اور اپنے اردگرد کی زندگی میں غم و اندوہ کا گہرا مرتسم احساس نظر آتا ہے۔ Edwin Muir کے یہاں گریوز کی نسبت زیادہ ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے۔ ایلیٹ سے ذرا بعد کے زمانے میں شاعروں کا جو گروہ ابھرا اور جنہیں ۱۹۳۰ء کے شاعر کہا جاتا ہے ان میں Spender ، Auden ، Macneice اور C.D. Lewis قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں۔ آڈن کے یہاں شاعری کی بساط وسیع ہے۔ اس کے شعری کارناموں کے پس پشت نئی نفسیات معاشیات اور علم الانسان سے آگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان پر مستزاد حقیقت پسندی طنز و مزاح بے رحم تصویر کشی، جرات اور براہِ راست اندازِ بیان ملتا ہے۔ اسپنڈر کے یہاں احساس کی نرمی، رومانیت اور دروں بینی (introspection) خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ وہ کسی پارٹی پروگرام کو قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرسکتا اس کے یہاں شدید قسم کی حسیت (Sensuousness) پائی جاتی ہے۔ نوئیس ہمیں ورڈزورتھ اور پوپ دونوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے یہاں پیکر نگاری پر صنعتی دور کا اثر صاف نمایاں ہے۔ اور وہ فطرت کی کشش بھی محسوس کرتا ہے بیکنس کی تخلیقات تجربے پر غور وفکر کا پتہ دیتی ہیں اور ان میں شعری مراسلے (Verse Epistle) کا تاثر ملتا ہے۔ اس کے یہاں ایک طرح کی آزاد روی ہے۔ دو اور شاعر قابلِ ذکر ہیں جیمس ریوز (James Reeves) اور ولیم ایمپسن (William Empson) ان کے ساتھ ڈائی لین تھامس (Dylan Thomas) کا نام خصوصیت سے لائقِ توجہ ہے۔ اس کے یہاں کس بل ہے اور ایک وجدانی (Visionary) احساس اور نظموں کے دروبست میں علامت اور موسیقی کی ایسی آمیزش جسے تحلیل نہیں کیا جاسکتا وہ ہمیں بے اختیار وکٹورین دور کے شاعر ہاپکنس (Hopkins) کی یاد دلاتا ہے۔ جدید ترین دور رومانیت کے خلاف ایک احتجاج کر رہا ہے۔ ان شاعروں میں ایک اہم نام فلپ لارکن (Phillip Larkin) کا ہے۔ جو مجموعی تجربے پر نظر میں جاتا تھا۔ اعصاب پر اس کے اثرات کو متعین کرتا اور چابکدستی کے ساتھ ان کی رہ نمائی کرتا ہے۔ وہ بھی مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی کی یاد دلاتا ہے۔ جان وین، ڈی۔ جی۔ این۔ رائٹ (John Wain, D.G. Enright) کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے علاوہ دو اور شاعر بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ یعنی ٹیڈ ہیوز، ٹام گن (Ted Hughes ، Tom Gunn) دونوں نے بہت خوب صورت نظمیں لکھی ہیں اور وہ دونوں جبلت (Instinct) کے عمل توانائی اور غیر شعوری محرکات پر زور دیتے ہیں۔ لارکن ہیوز اور گن ان تینوں کے شعری مجموعے فیبر اینڈ فیبر (Faber and Faber) سے چھپ چکے ہیں۔

اس دور کے انگریزی ڈرامے کے معماروں میں سرفہرست نام برنارڈ شا (Bernard Shaw) کا ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب شا نے ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا۔ آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) نے "المیہ-طربیہ" ڈرامے لکھنے کی روایت کی تجدید کی تھی۔ اور اپنی تیزی، برجستگی اور ذکاوت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی تھی۔ ان کے مشہور طربیہ ڈراموں میں "لیڈی ونڈمیئر کا پنکھا" (Lady Windmere's Fan) (۱۸۹۲ء) "ایک عورت جس کی کوئی اہمیت ہی نہیں" (A Woman of No Importance) (۱۸۹۳ء) "ایک مثالی شوہر" (An Ideal Husband) (۱۸۹۰ء) اور "سنجیدہ ہونے کی اہمیت" (Importance of Being Earnest) (۱۸۹۵ء) شامل ہیں۔

شا فن برائے فن کا قائل نہیں۔ اس خاص معاملے میں وہ ابسن سے متاثر ہوا۔ اور اس نے عصری مسائل کو اپنے ڈراموں میں مرکزِ توجہ بنایا۔ شادی طلاق، عصمت فروشی، رومانی محبت جنگ، سرمایہ و محنت کے درمیان آویزش بھی سب اس کے ڈراموں کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں۔ شیکسپیئر کے بارے میں اس کی رائے اوروں سے مختلف تھی۔ اس کا مقصد تھا ہر نوع کی رسمیات پر کاری ضرب لگانا اور ہر طرح کے رومانی اوہام کی شکست۔ وہ ایک

بے رحم قسم کی معروضیت اور نشتر زنی سے کام لیتا ہے اس نے اپنے ڈراموں کے لیے بے حد طویل مقدمے لکھے۔ اس کے کردار اس لحاظ سے کمزور ہیں۔ کہ ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خالق کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نظر آتے ہیں۔ شا کے یہاں کردار نگاری اتنی اہم نہیں جتنا نقطۂ نظر اور طنز و مزاح کے چھینٹے، قول محال کی محو بہ زالی اور برجستہ رواں دواں برق انگنی جملے بازی۔

اس کے اہم ڈراموں میں "ہتھیار اور آدمی"، "رنڈوے کا مکان"، "مسز وارین کا پیشہ"، "ڈاکٹر کی گتھی"، "شیطان کا شاگرد"، "سینٹ جون"، "واپس میتھو سالے کی طرف"، "بشر اور فوق البشر"، "ایپل کارٹ"

(Arms And the Man, Widower's House, Mrs. Warren's Profession, The Doctor's Dilemma, The Devil's Disciple, St. Joan, Back to Methusaleh, Man and Superman, The Apple'S' Cart)

کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ برنارڈ شا ہی کی طرح گالزوردی (Galsworthy) بھی اپنے ڈراموں میں افراد سے زیادہ تہذیبی اور سماجی مسائل سے سروکار رکھتا ہے۔ اس کے یہاں شا جیسی شوخی اور برجستگی تو نہیں ہے۔ لیکن اجتماعی احساس گہرا ہے۔ اس کے ڈراموں میں "کش مکش" (Strife) (۱۹۰۶ء) "نقرئی صندوقچی" (The Silver Box) (۱۹۱۰ء) "انصاف" (Justice) (۱۹۲۳ء) اور "وفاداریاں" (Loyalties) کافی مشہور ہیں۔ ان دونوں کے ڈرامے مسائلی ڈراموں (Problem – Plays) کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسی ضمن میں جی۔ ایم۔ بیری (G.M.Berrie) کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مشہور ڈرامے "قابل تحسین کرسچن" (The Admirable Crichton) (۱۹۰۲ء) میں سماجی تنقید کی ایک لہر نظر آتی ہے۔ شعری ڈرامہ لکھنے والوں میں ڈبلیو۔ بی۔ یٹس (W.B. Yeats) اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Edliot) کا ذکر ضروری ہے۔ اول الذکر کے ڈرامے اشاراتی ہیں۔ ان میں زیادہ معروف "کاؤنٹیس کیتھلین" (The Countless Cathleen) (۱۸۹۲ء) "ارمانوں کا ملک" (The Land of Heart's Desire) (۱۸۹۲ء) "بادشاہ کی دہلیز" (The King's Threshold) "کوشولین کی موت" (The Death of Cuchulain) ہیں۔ جاپان کے "نوہ ڈراموں" (Noh Plays) سے متاثر ہو کر بھی یٹس نے بعض ڈرامے لکھے۔ شاعری اور ڈرامہ دونوں میں یٹس نے آئرلینڈ کی عوامی کہانیوں اور توہمات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح سنج (Synge) نے جو آئرستانی ڈرامہ کی تحریک کا سب سے زیادہ باشعور نمائندہ ہے۔ اپنی توجہ دیہاتی زندگی (Rural Life) پر مرکوز کی۔ اس کا المیہ "شہسواران بہ قلزم" (The Riders To The Sea) (۱۹۰۴ء) اور اس کا طربیہ "مغربی دنیا کا رنگیلا" (The Play Boy of The Western – World) (۱۹۰۷ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اوکیسی (O' Casey) کا ڈرامہ "جونو اور طاؤس" (Juno And The Peacoak) ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اسی ضمن میں لیڈی گریگری (Lady Gregory) کا نام لینا بھی ضروری ہے جو اس تحریک کی روح رواں تھی۔ ڈبلیو۔ بی۔ یٹس

سے اس کا گہرا ربط تھا۔ اس کے ڈرامے صاف ستھرے اور زندگی کی مسرتوں سے لبریز ہیں۔ سمرسیٹ مام (Somerset Maugham) نے ناولوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ڈرامہ نگاری کا آغاز "کلیسا میں قتل" (Murder in The Cathedral) (۱۹۳۵ء) سے کیا جس میں شہادت (Martyrdom) کے تصور کو بنیاد بنا کر ریاست اور گرجا (Church) کے درمیان کش مکش کو نمایاں کیا۔ اس نے ڈرامے میں یونانی ڈرامے کے کورس (Chorus) کی رسم کی تجدید کی۔ اس کے دوسرے مشہور ڈرامے "خاندان کا یکجا ہونا" ۔ (The Family Reunion) (۱۹۳۹ء) "کاک ٹیل پارٹی" (The Cocktail Party) "خفیہ بابو" (The Confidential Clerk) (۱۹۵۰ء) اور "بزرگ سیاست داں" (The Elder Statesman) (۱۹۰۸ء) ہیں۔ ان سب میں اس نے یہ کوشش کی کہ ادبی زبان اور بول چال کی زبان کے درمیان فرق کو کم سے کم کیا جائے۔ شعری ڈرامے کی بنیاد ڈالنے اور اسے رائج کرنے والوں میں ایلیٹ کا نام قابل ذکر ہے۔ ایلیٹ ہی کی طرح بیکٹ (Becket) نے بھی عصری ڈرامے کو بے حد متاثر کیا۔ اور اپنی توجہ زندگی کے لایعنی ہونے پر مرکوز کی۔ اس کا سب سے مشہور ڈرامہ "گوڈوٹ کے انتظار میں" (Waiting for Godot) ہے کرسٹوفر فرائی (Cristopher Fry) کے یہاں ایلیٹ کے برعکس زندگی کی فراوانی اور شور و شغب کا احساس ملتا ہے۔ اس کے یہاں الفاظ کے شان و شکوہ طمطراق اور رموز بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے مشہور ڈراموں میں "زہرہ زیر نظر" (Venus Observed) اور "خاتون جلانے کے لیے نہیں" (The Lady's Not For Burning) (۱۹۴۸ء) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

جان اوسبورن (John Osborne) کا ڈرامہ "غصہ سے مڑ کر دیکھنا" (Look Back in Anger) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اور ہیرولڈ پنٹر (Harold Pinter) کے دو ڈرامے قابل توجہ ہیں "سالگرہ کی پارٹی" (The Birthday Party) (۱۹۵۸ء) اور "زمام دار نگراں" (The Care Taker) (۱۹۶۰ء) وکٹورین عہد کے ناول نگاروں کی سماجی تنقید کی روایت کو جن لوگوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں زندہ رکھا ان میں سیموئیل بٹلر (Samuel Butler) کے ناول The Way Of Flesh کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ایچ۔ جی۔ ویلس (H.G. Wells) کا ناول "ٹائم مشین" (Time Machine) ۱۸۹۵ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اور یہ سائنسی رومان ہونے کے علاوہ طبقاتی امتیازات کے ابھرنے کے بارے میں ایک طرح کی قیاس آرائی ہے۔ ممتاز ناول نگاروں میں جوزیف کانرڈ (Joseph Conrad) ہیں۔ اس کی طویل مختصر کہانی "تاریکی کا قلب" (Heart of Darkness) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابتدائی ناولوں میں "ال میئرس فولی" (Almayer's Folly) (۱۸۹۸ء) "نیگر آف نارسی سس" (The Niger of Nareissus) اور "لارڈ جم" (Lord Jim) (۱۹۰۰ء) ہیں۔ سیاسی ناولوں میں "مغربی آنکھوں کے تلے" ۔ (Under

(The Secret Agent) (۱۹۱۱ء) "خفیہ کار پرداز" The Western Eyes)
ہیں۔ اس کا شاہکار "نسٹروم" (Nostrom) (۱۹۰۴ء) ہے کانریڈ
کے بیشتر ناولوں کا پس منظر بحری زندگی ہے۔ جہاں انسان قدرت کی سفاکی
سے براہ راست متصادم ہوتا ہے۔ اور مہم جوئی کے جذبے کی تشفی بھی ہوتی
ہے۔ اور اس کی آزمائش بھی۔ کانریڈ کو اس زندگی کا براہ راست تجربہ تھا۔
اس کے ناولوں کی تکنیک کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں علت و معلول کی
ترتیب و تسلسل ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں کہانی کا آغاز عمل یعنی
(Action) کے درمیان سے ہوتا ہے۔ اور آگے بڑھنے اور پیچھے لوٹ آنے
اور پھر آگے بڑھنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے کیوں کہ زندگی ایک خط مستقیم
نہیں ہے بلکہ پر پیچ راہوں سے عبارت ہے۔

گالزورذی (Galsworthy) کے عظیم الشان ناول "فورسائٹ ساگا"
(The Forsyte Saga) (۱۹۲۲ء) کی اولین جھلکیاں "صاحب جائیداد
انسان" (Man of Property) (۱۹۰۶ء) میں ملتی ہیں۔ ای۔ ایم۔ فارسٹر
(E.M. Fo i ster) کا تعلق دانشوروں کے اس حلقے سے تھا جسے
"بلومسبری گروپ" (Bloomsbury Group) کا نام دیا گیا ہے
ان کی شہرت کا دارومدار اس کے پانچ مختصر ناولوں پر ہے۔ ان میں زیادہ معروف
"ہاورڈز کا خاتمہ" (Howards End) (۱۹۱۰ء) اور "ہندوستان کی
جانب سفر" (A Passage to India) ہیں۔ فنی اعتبار
سے اول الذکر کو موخر الذکر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ گو موخر الذکر اس لحاظ
سے اہم ہے کہ اس میں ہندوستانی مزاج کے بارے میں فارسٹر کی بصیرت کا ثبوت
ملتا ہے فارسٹر کے سارے ناولوں کی بنیاد ایک طرح کے تضاد پر ہے جو انگریزی
تہذیب اور دوسری تہذیبوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ تر انسانی
رشتوں اور وابستگیوں کا ناول نگار ہے۔ دراصل جدید انسان کی محرومی
یہ ہے کہ وہ اشیا کے درمیان باہمی ربط نہیں قائم کر سکا ہے۔ ڈی۔ ایچ۔
لارنس (D.H. Lawrence) نے سلسلہ واری پلاٹ کے خلاف تو کوئی
بغاوت نہیں کی لیکن اس نے واقعات کے بیان کو تحت الشعور کی لہروں
سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ضرور کی۔ اس نے عورت اور مرد کے درمیان
آزاد جنسی تعلقات کو اپنا موضوع بنایا اور صنعتی زندگی سے پیدا ہونے والی
میکانکیت کے خلاف جس نے بنیادی انسانی محرکات کو بری طرح مجروح کر دیا
تھا بہت شدید احتجاج کیا۔ اس کے نزدیک عقل اور منطق کے برعکس گوشت اور
خون کے ذریعہ حقیقت کی تفہیم زیادہ آسان ہے اس کے یہاں علایم کی بڑی اہمیت
ہے۔ اس کے اولین دور کے ناولوں میں "سفید مور" (The White
Peacock) - (۱۹۱۳ء) "بیٹے اور عاشق" (Sons and Lovers)
درمیانی دور میں "قوس قزح" (The Rainbow) "محبت میں گرفتار
عورتیں" (Women In Love) اور آخری دور میں "پر دار سانپ"
(Plumed Serpent) "ایرون کا راڈ" (Aron's Rod)
اور "لیڈی چیٹرلے کا یار" (Lady Chatterley's Lover) (۱۹۲۸ء)
قابل ذکر ہیں۔ اس کی طویل کہانیوں میں "ٹریس پاسر" (The Tresspasser)
کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آلڈوس ہکسلے (Aldous Huxley)
نے اپنے دور کی روح کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے اولین ناولوں
میں "کروم یلو" (Crome Yellow) (۱۹۲۱ء) اور "اینٹک ہے"
(Antic Hay) (۱۹۲۳ء) ہیں۔ "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" (Point-
Counter-Point) اور "غازا میں بے بصر" (Eyeless in Gaza)
بھی اہم ناول ہیں۔ دو اور ناول "نئی بہادر دنیا" (Brave New World)
"لنگور اور اصل" (Ape And Essence) بالترتیب ۱۹۳۲ء اور
۱۹۴۹ء میں سامنے آئے۔ شعور کے بہاؤ (Stream of Consc-
iousness) کی تکنیک کو رواج دینے والوں میں سر فہرست نام
جیمس جوائس (James Joyce) کا ہے۔ جن کی کہانیوں کا مجموعہ
"ڈبلن والے" (Dubliners) ۱۹۱۴ء میں اور جس کا مشہور ناول
"فنکار کی عالم نوجوانی کی تصویر" (A Portrait of the Artist
As A Young Man) (۱۹۱۶ء) میں شائع ہوا۔ اس کا سب
سے مشہور ناول "یولیسز" (Ulysses) اس طریقۂ کار کی ایک تھکا
دینے والی مثال ہے۔ ڈورتھی رچرڈسن (Dorothy Richardson)
کو اس تکنیک کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ناول "نوکیلی چھتیں" (Pointed
Roofs) (۱۹۱۵ء) میں سامنے آچکا تھا۔ ورجینیا وولف (Virginia
Woolf) کا نام بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان
سب نے ریاضیاتی تصور زماں کے خلاف بغاوت کی۔ اور ناول میں سلسلے
وار پلاٹ کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کیا۔ دونوں کے یہاں زور خارجی واقعات
پر نہیں بلکہ تحت الشعور کے مدوجزر اور حافظے کی نشان دہی پر ہے۔ ورجینیا
وولف کے دو ناول "بحری سفر" (Voyage Out) ۱۹۱۵ء میں اور "شب
و روز" (Night and Day) ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئے پھر "یعقوب کا
کمرہ" (Jacob's Room) ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس سے زیادہ
دو اور ناول اہم ہیں یعنی "مسز ڈیلووے" (Mrs. Dalloway)
(۱۹۲۵ء) اور "لائٹ ہاؤس کو" (To The Light House)
(۱۹۲۷ء) یہاں بیان سے کہیں زیادہ علایم کے بالمقابل رکھے جانے کی اہمیت
ہے۔ آخری ناولوں میں "لیل و نہار" (The Years) "ارلینڈو" "لہریں"
(The Waves Orlando) (۱۹۲۸ء) ہیں۔ جوائس کیری (From
Joyce Carey) کے رموز اور زندہ دلی کو دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوتا ہے
کہ ان کا بیسویں صدی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس کے یہاں کرداروں کی
بہتات ملتی ہے۔ اس کا سب سے مشہور ناول "گھوڑے کے منہ سے"
(From The Horse's Mouth) ہے جس میں ایک مخصوص فنی مزاج
کی عکاسی کی گئی ہے۔ گراہم گرین (Grabam Greene) کی رومن کیتھولک
مذہب (Roman Catholicism) کی طرف مراجعت اس کے
ناولوں میں جھلکتی ہے۔ جن میں دو زیادہ مشہور ہیں یعنی "طاقت اور شان"
(The Power and Glory) اور "اصل بات کی تہ" (The Heart
of the Matter) آئی وی کامپٹن برنٹ (Ivy Comptom Burnett)
کی فنی مہارت قابل توجہ ہے۔ اس نے بول چال کی زبان اور کم سے کم بیانیہ
کے استعمال کے ذریعے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ایولین وا (Evelyn
Waugh) کا تعلق بھی گراہم گرین کی طرح کیتھولک مذہب (Roman
Catholicism) سے ہے۔ اس نے اوپری طبقوں کو بھرپور طنز کا نشانہ بنایا ہے

اس کے دو ناول "گھناؤنے بدن" (Vile Bodies) ۱۹۳۰ء میں اور "مٹھی بھر خاک" (A Handful of Dust) ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے۔ اس کا سب سے مشہور ناول Brideshead Revistied ہے۔ جان وین (John Wain) کا ناول ہری آن ڈاؤن (Hurry On Down) ۱۹۵۳ء میں کنگ لے ایمس (Kingley Amis) کا ناول "لکی جم" (Lucky Jim) ۱۹۵۴ء میں اور آنگس ولسن (Angus Wilson) کا ناول "اینگلو سیکسن رخ" (Anglo-Saxon Attitudes) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ انتھونی پاول (Anthony Powell) کے یہاں بیسویں صدی پر تنقید ذرا نیچے سروں میں ملتی ہے۔ اس کا مشہور ناول "وقت کا نغمہ" (The Music Of Time) ہے اور آخر میں "گولڈنگ" (Golding) ہے جس کا مشہور ناول "مکھیوں کا پروردگار" (Lord Of The flies) کافی مقبول ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی کی نثر میں روایتی قسم کے ہلکے پھلکے اور ذاتی قسم کے مضامین (Essays) کا احیا نظر آتا ہے۔ ان لکھنے والوں میں ہلیر بیلو، جی۔ کے چیسٹرٹن، ای۔ وی لیوکاس، رابرٹ لنڈ (Hilaire Bello, G.K. Chesterton, E.V. Lucas, Robert Lynd) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ زیادہ وزنی قسم کے مضامین میں جارج اورویل (George Orwell) کے مضامین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

لیٹن اسٹریچی (Lytton Strachey) نے سوانح عمری لکھنے کے ایک نئے انداز کا آغاز کیا۔ جس میں ذکاوت اور طنز کے استعمال سے غیر رسمی طور پر مستحکم شہرتوں کے انہدام کا قصد کیا گیا تھا۔ لیکن یہ رجحان زیادہ فروغ نہیں پا سکا اور سوانح نگاری کے فن میں ہمدردی حزم و احتیاط اور رواداری کو زیادہ دخل دیا گیا۔ جدید تنقید میں سب سے منفرد آواز ایلیٹ کی تھی۔ وہ میتھو آرنلڈ کے حامل اور اس سے متاثر تھا۔ شاعری کی تنقید میں بھی اس نے رومانیت کے حصار میں رخنے پیدا کیے۔ اس نے ماضی کی ماضیت پر زور دیا، روایت کی اہمیت واضح کی۔ فن کار کی شخصیت اور اس کے تخلیقی عمل کے درمیان امتیاز قایم کیا۔ اور فنی کارنامے کو شخصیت کے اظہار وانعکاس سے زیادہ اقدار (Values) کی ترسیل کا ذریعہ ٹھہرایا۔ مابعد الطبیعاتی شاعروں کی نئی تعبیر و تفسیر پیش کی سب سے بڑھ کر یہ کہ تنقید کی زبان کے لیے متعدد اصطلاحات وضع کیں۔ اس کے مضامین کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس (W.B. Yeats) نے شیکسپیئر پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا۔ آئی۔ اے۔ رچرڈس (I.A. Richards) نے عام زبان اور شاعری کی زبان کے فرق کو واضح کیا۔ اور عملی تنقید (Practical Criticism) کی بنیاد ڈالی۔ مڈلٹن مرے (Middleton Murry) نے تنقید کو اپنے مابعد الطبیعاتی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) نے نفسیاتی تنقید کے نمونے پیش کیے۔ بیٹسن (Bateson) نے یہ نیا تصور پیش کیا کہ دراصل ادب زبان میں تبدیلیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور زبان میں تبدیلیاں معاشرے کے ارتقا اور سماجی رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ تنقید میں ایف۔ آر۔ لیوس (F. R. Leavis) کا کارنامہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے متنی (Textual) اور عملی تنقید کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ مس سُپرسی آن، ولسن نائٹ (Miss Superceon, Wilson Knight) اور ٹرےورسی (Traversi) نے پیکر نگاری کے عمل کا مطالعہ کر کے شیکسپیئر کی تنقید میں حیرت انگیز اضافے کیے ادبی تنقید میں سماجی محرکات پر زور دینے کے سلسلے میں ایل۔ سی۔ نائٹس (L.C. Knights) کا نام قابل ذکر ہے جن ادبی جرائد نے تنقیدی آب و ہوا کی سمت متعین کرنے میں اہم رول ادا کیا ان میں ٹی۔ ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) کا رسالہ کرائی ٹیرین (The Criterion)۔

ایف۔ آر۔ لیوس (F.R. Leavis) کا رسالہ اسکروٹنی (Scrutiny) اور ایف۔ ڈبلیو بیٹسن (F.W. Bateson) کا رسالہ تبصرے اور مضامین (Essays on Criticism) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بنگالی زبان و ادب

زبان بنگالی بنگال میں رہنے والوں کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں میں سکونت پذیر بنگالی النسل باشندوں کی زبان ہے جن کی جملہ تعداد حالیہ مردم شماری کے اعتبار سے ساڑھے چار کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ یہ "بنگلہ دیش" کے سات کروڑ باشندوں کی قومی زبان ہے۔

بنگالی کا تعلق انڈو یوروپین خاندان کی ایک شاخ انڈو۔ ایرانی کی ذیلی شاخ انڈو۔ آرین سے ہے۔ بنگالی کا جنم مشرقی حصہ کی ایک وسطی انڈو۔ آرین بولی کی حیثیت سے غالباً دسویں صدی میں یا اس سے کچھ پیشتر ہوا۔ تین یا چار صدیوں یعنی ۱۲۵۰ء تک یہ زبان اپنی ابتدائی یا تشکیلی حالت ہی میں رہی۔ تقریباً ۱۳۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک کا دور بنگالی کا درمیانی دور ہے جس میں اس نے بال و پر نکالے۔ اس مرحلہ پر اس کی ترقی میں فارسی کے اثرات کا بڑا حصہ رہا ہے اس دور میں اس کے الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا اور اس کی قواعد کی ترتیب میں مدد ملی۔ بنگالی کا تیسرا یا جدید دور اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انگریزی کے اثر کی وجہ سے نثری طرز نگارش کا نشو و نما ہوا اور اس کی حرکت پذیری اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

وسطی دور میں میتھلی سے اشارہ پا کر اس نے اپنی ساری توجہ شاعری ہی پر مرکوز کر دی تھی۔ اور یہ طرز تحریر جسے "براج بولی" کہا جاتا ہے پچھلی صدی تک مقبول رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ہند

میں نیپال سے آسام تک براج بولی کو مقبول بنانے میں میتھلی شاعر ودیاپتی (پندرھویں صدی) کا بڑا حصہ رہا ہے۔

ادب

بنگالی کے ابتدائی ادبی نمونوں کا تعلق اس کے عہد طفلی یا قدیم دور سے ہے۔ ایسے تقریباً پچاس گیت ملتے ہیں جو مہایانا بدھ مت اور دیگر تانترک اور یوگی مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھگتوں کے لکھے ہوئے ہیں یہ گیت عام طور سے ذو معنی ہیں اس لیے انھیں "کاریہ" (یعنی اداکار کا پارٹ یا اس کا لباس) کہا جاتا ہے۔ ان گیتوں کی زبان کو اپنے دوہرے مفہوم کی وجہ سے "سندھا بھاشا" (جڑی ہوئی زبان) بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم دور کے آخری زمانہ میں بنگال کے یوگی بھکشا لینے کی غرض سے گیت گاتے ہوئے دور دراز مقامات تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح یہ روایت نیپالی، ہندی، پنجابی اور مراٹھی کے علاوہ کئی زبانوں میں داخل ہو گئی۔ ان زبانوں کے ادب میں ابتدائی بنگالی اثرات بھی تھوڑے بہت پائے جاتے ہیں۔

عہد وسطیٰ کی بنگالی

۱۲۵۰ء سے ۱۴۵۰ء کے بنگالی ادب کی تاریخ پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ پندرھویں صدی کے آخری تیس سالوں میں تین بیانیہ نظمیں لکھی گئی تھیں۔ یہ ہیں ملادھر واسو کی سری کرشنا وجے (۱۴۷۳–۱۴۸۰ء) وپرا داس کی منش وجے (۱۴۹۵ء) اور غالباً کرتی داس کی راماین۔ کرتی داس کی نظم راماین سے متعلق بنگالی کی قدیم ترین نظم ہے۔ ۱۸۰۱ء میں پہلی مرتبہ وہ سرامپور مشن پریس سے شائع کی گئی اور اس وقت سے وہ عوام میں بے حد مقبول رہی ہے۔

چیتنیہ (Caitanya) کی پیدائش (۱۴۸۶ء) کے وقت ہندوؤں میں رسم و رواج کی چمک دمک کی تہ میں عقیدت مندانہ قلوب کا فقدان تھا۔ چیتنیہ کے گرو کے گرو مادھو وندر پوری نے اس سلسلہ میں بڑا اجتہادی قدم اٹھایا اور بنگال میں "بھاگوت پران" کو متعارف کر کے وشنوی طبقہ میں بھگتی کا جذبہ پیدا کیا۔

ملادھر واسو مادھو ندر پوری کی رائج کردہ بھاگوتی وشنویت کے ابتدائی پیروؤں میں سے تھا۔ اس نے بھاگوت پران میں بیان کردہ کرشنا کتھا لیلا کو منظوم بنگالی میں پیش کیا۔ (۱۴۷۳–۱۴۸۰ء) ملادھر شاہان بنگال کے تحت مال گزاری وصول کرنے پر مامور تھا۔ اس کی قابلِ قدر خدمات کے صلہ میں سلطان رکن الدین باربک شاہ نے اسے "گن راج خاں" کے خطاب سے نوازا تھا۔

سولھویں صدی میں اور اس کے بعد کرشنا کتھا پر متعدد بیانیہ نظمیں لکھی گئیں ان میں سے دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بارو چندیداس کی "سری کرشنا کرتان" اور بھاؤ نندا کی "ہری ومیس" براج کی گوپیوں سے سری کرشنا کی داستان عشق کو پیش کرتی ہیں۔ شاعر کی پروازِ تخیل اور قوتِ بیان قابلِ تحسین ہے خصوصاً رادھا کا کردار بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔

بنگالی میں "مہابھارت" پر پہلی نظم پرمیشور داس نے لکھی جو ملادھر واسو کی طرح ایک کائستھ اور اسی کی طرح مسلم دربار سے منسلک تھا۔ یہ نظم غالباً سولھویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھی گئی تھی۔

چیتنیہ: بنگال کی عظیم ترین شخصیت چیتنیہ کا جنم ۱۴۸۶ء میں مغربی بنگال میں گنگا کے کنارے ندیا (یا نواد دیپا) کے مقام پر ہوا اور ۱۵۳۳ء میں پوری (اڑیسہ) میں ان کی وفات ہوئی۔ ۴۸ سالوں کے مختصر عرصہ میں انھوں نے ہندوستان کے باشندوں اور خاص کر بنگالیوں کے ایک بڑے طبقہ کے قلب و ذہن کو بدل کر رکھ دیا۔ اپنی پرکشش شخصیت، حسنِ نظر اور حسنِ سلوک کی وجہ سے وہ خاص و عام میں بے حد مقبول ہوئے۔ چوبیس سال کی عمر میں انھوں نے گھر بار چھوڑ دیا اور راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس سے بہت پہلے ہی وہ پریم بھگتی کے ایک پرچارک کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔

سنیاس لینے کے بعد چیتنیہ نے اپنی بقیہ زندگی پوری ہی میں بسر کی صرف ابتدائی چھ سال انھوں نے سارے ہندوستان کا سفر کرنے میں گزار دیئے۔ اپنے طویل سفر کے دوران وہ پریم بھگتی کا پرچار کرتے رہے۔

چیتنیہ ہی کی غیر معمولی شخصیت اور مذہبی جوش و استغراق کی وجہ سے وہ بندھن ٹوٹے جو مختلف مذاہب اور فرقوں کے طریقۂ عبادت میں پائے جاتے تھے۔ انھوں نے اونچ نیچ کو مٹا کر مساوات قایم کی۔ اس کا اثر تخلیقی صلاحیتوں، ادب و سنگیت اور گھریلو آرٹ پر بھی پڑا۔ چیتنیہ کی زندگی اور ان کے مسلک نے بنگالی شاعری کو امرا کے دربار سے نکال کر دیہات کے گھروں تک پہنچا دیا۔

بعد کی نسل کے غنائی شاعروں کی اکثریت چیتنیہ کے مقلدوں کی پیرو تھی۔ انھوں نے بنگال میں ویشنوی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ ممتاز شاعروں میں جن داس، دونوں گووند داس، بالا رام داس اور نروتم داس قابلِ ذکر ہیں۔ آخر الذکر شاعر نے جو ایک متقی بھگت تھا۔ ویشنوی گیتوں کو سنگیت کے ایک خاص طرز کا روپ دیا جو اس وقت کیرتن کہلاتا ہے۔ بعد کی صدیوں میں کیرتن سنگیت کی ترقی بنگالی تہذیب کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے کیرتن سنگیت کے نوک و پلک سنوارنے میں غالباً آخری قلم چلایا۔

بنگالی ادب کو چیتنیہ کی سب سے بڑی دین یہ تھی کہ دیوی اور دیوتا اب مرکز توجہ نہیں رہے۔ چیتنیہ کی سب سے مستند سوانح حیات "چیتنیہ کاری تمرتا" ہے جسے کرشنا داس کوی راج نے سولھویں صدی کے اواخر میں لکھا تھا۔ یہ صرف سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ پریم بھگتی کے فلسفہ اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کی تفسیر بھی ہے یہ فکر انگیز ادب کا ایک شاہکار بھی ہے۔

'پنچالکا' یا منگلا شاعری

کرشن کے قصہ یا دیگر مذہبی یا غیر مذہبی موضوعات پر تحریر

کرده خال خال گیتوں سے ہٹ کر بنگال (یا اور دوسرے ہند۔آریائی علاقوں) کے باشندوں کی پسندیدہ صنف ادب میں وہ طویل بیانیہ نظمیں تھیں جنھیں کوئی ٹولی مسلسل کئی کئی دنوں تک ڈھولک یا ڈفلی پر گاکر پیش کیا کرتی تھی۔ انھیں دیوی کے سامنے پوجا کی تفصیلی رسومات کے ایک جزو کے طور پر گایا جاتا یا کٹھ پتلیوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ شاعری منگلا کہلاتی تھی۔ منگلا کی وجہ تسمیہ یہ عقیدہ تھا کہ ایسا تماشہ تماش بینوں کے چین اور آسودگی کا موجب بنتا ہے۔ بعض مرتبہ منگلا کی بجائے " وجے " بھی کہا جاتا تھا۔ اس سے دیوی کی فتوحات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ بنگالی زبان میں "پنچالی" یا " منگلا " شاعری کو خاص طور سے بڑھاوا ملا۔ یہ شاعری۔ ڈرامہ اور سنگیت کی پیاس کو بیک وقت بجھاتی تھی۔

ابتدائی بنگالی طویل نظموں کی دو قسمیں ہیں (۱) کرشن کے قصہ پر نظمیں جو " بھاگوت پران " سے لی گئی ہیں یا پھر بالک پن کی عاشقانہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ اور (۲) منسا اور چنڈی دیوی پر لکھی ہوئی نظمیں جو تمام تر مقامی قصوں پر مبنی ہیں۔ (پہلی قسم کی نظموں میں " شری کرشنا وجے ، سری کرشنا کرتن ، ہری ومس " اور کوی شیکھر کی " گوپال وجے " شامل ہیں۔ دوسرے زمرے میں "منش وجے" اور مکندرا کوی کنکنا کی " چنڈی منگلا " اس نوع کی شاعری کے مثالی نمونے ہیں۔

" منگلا " شاعری میں کوی کنکنا کی " چنڈی منگلا " کو سب سے زیادہ ممتاز حیثیت حاصل ہے بلاشبہ یہی وہ نظم ہے جس میں وسط انیسویں صدی کی نئی شاعری سے قبل کی بنگالی شاعری بامِ عروج پر نظر آتی ہے۔

خود مصنف نے اپنی نظم کے تتمہ پر دعویٰ کیا ہے کہ اس کی نظم " منگلا " شاعری میں بالکل انوکھی ہے۔ غرض یہ نظم منظرِ عام پر آتے ہی مقبول ہوگئی اور اس کی مقبولیت آج تک برابر قایم ہے۔ اس وقت کے سماج کے سب ہی لوگ اعلیٰ وادنیٰ ہندو اور مسلمان مکندرام کوی کنکنا کی ہمدردی اور توجہ کے مرکز رہے۔

" منگلا " شاعری کا ایک تیسرا گروہ سترہویں صدی کے وسط میں نمودار ہوا۔ اس کی نظموں کا موضوع خالقِ اعظم دھرما کی رفعت وعظمت ہے۔

ابن بطوطہ کی شہادت پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چودہویں صدی میں سلہٹ مشرقی بنگال میں مسلم تہذیبی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت سے اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے بعد کی صدی میں چٹاگانگ ہندو اور مسلمان دونوں کا تہذیبی مرکز بن گیا۔ چیتنیہ کے بعض قریبی ساتھی اور چیلے چٹاگانگ ہی سے آئے تھے اور ان میں سے کچھ تو اچھے شاعر بھی تھے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں بعض مسلم شاعر فارسی کی بجائے اپنی مادری زبان بنگالی میں لکھا کرتے تھے۔ اراکان جو لسانی نسلی اور تہذیبی اعتبار سے برما کا حصہ تھا۔ بنگال کے چٹاگانگ ، سلہٹ علاقہ کا پڑوسی تھا۔ اور ابتدا ہی سے اس کا بنگال سے ربط ہے۔ کبھی تصادم کی شکل میں اور کبھی اتحاد کی صورت میں پندرہویں صدی بلکہ اس سے بھی قبل سے اراکان دربار بنگال کے عالموں اور موسیقاروں کا قدرشناس رہا ہے۔ چنانچہ سترہویں صدی کے وسط میں اراکان دربار سے دو ایسے مسلمان عالم وابستہ تھے جن کا شمار اس صدی کے ممتاز ترین بنگالی شعرا میں ہوتا تھا۔ یہ تھے دولت قاضی (سن وفات اغلباً ۱۶۵۰ء) اور سید علاول (Alaol) (سن وفات اغلباً ۱۶۷۵ء)۔ دولت قاضی نے لورا اور چندرانی کے رزمیہ کو سادھن کے قدیم راجستھانی اور ملا داؤد کے قدیم اودھی متن سے بنگالی میں منظوم کیا تھا۔ لیکن نظم کو مکمل کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا۔ علاول نے ۱۶۵۹ء میں اسے مکمل کیا۔

علاول نے بہت زیادہ لکھا۔ نظامی کی دو مثنویوں کو فارسی سے بنگالی میں منتقل کرنے کے علاوہ ملک جائسی کی قدیم اودھی نظم " پدماوت " کو بھی اس نے بنگالی کا جامہ پہنایا۔ یہ نظم اس کا شاہکار ہے۔ قاضی اور علاول نے بعض بہت عمدہ گیت بھی لکھے ہیں جو قاضی کی " لورا۔ چندرانی " (ستی مایتہ) اور علاول کی "پدماوت" میں شامل ہیں۔

سترہویں صدی میں مختصر " منگلا " نظموں کا بھی رواج چل پڑا یہ نظمیں مختلف مقامی دیوتاؤں اور نیم دیوتاؤں نیز مسلم پیر اور بزرگوں سے متعلق ہوا کرتی تھیں (موخر الذکر ہندو مسلم فرقوں کو قریب لانے کی ایک غیر شعوری کوشش تھی) مختصر منگلا نویسی میں سب سے زیادہ شہرت کلکتہ سے قریب کے ایک گاؤں میں رہنے والے کرشنا رام داس کو حاصل ہوئی۔

پرتگالی اثر

ہم پیشہ پرتگالی تاجر سولھویں صدی کے ابتدا میں بنگال آئے اور سترھویں صدی کے وسط تک جنوبی بنگال کے نظم و نسق کے لیے دردِ سر بن گئے۔ پرتگالی پادریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے کتابیں اور پمفلیٹ بھی لکھے۔ ایسی صرف دو کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کتابوں میں بنگالی نثر کے قدیم ترین نمونے ملتے ہیں۔ ایک کتاب کسی رومن کیتھولک پادری اور ایک بنگالی برہمن کے مکالموں پر مشتمل ہے۔ جن میں اپنے اپنے مذاہب کے محاسن اور معائب سے بحث کی گئی ہے۔

اٹھارہویں صدی کا سب سے ممتاز شاعر بھرت چندر رائے ہے۔ بھرت کو سنسکرت پر پورا عبور تھا اور وہ فارسی اور ہندوستانی سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس کا شاہکار ایک سہ موضوعاتی بیانیہ نظم ہے جس کے الگ الگ حصوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا حصہ شیو اور درگا سے متعلق ہے۔ دوسری نظم تاریخی نوعیت کی ہے جس میں باغی سردار پرتاپ دتیہ کی مغل فوج کے سپہ سالار مان سنگھ کے ہاتھوں شکست کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسری نظم کا موضوع ودیہ

اور سُندر کی داستانِ محبت ہے۔ بھرت نے ہندوستانی اور فارسی میں بھی بعض مختصر غزلیں لکھی ہیں۔ ایسی ہی بعض غزلوں میں ہفت زبانی طریقۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے۔

جدید بنگالی

اٹھارہویں صدی کا نصف آخر بنگالی ادب کے لیے زیادہ سازگار نہیں رہا۔ بنگال پر انگریزوں کے قبضہ کے باوجود ملک کی تہذیبی فضا کچھ عرصہ تک جوں کی توں رہی۔ فارسی سرکار زبان کی حیثیت سے برقرار رہی۔ لیکن ہر جگہ بنگالی ہی بولی جاتی تھی۔ تجارت اور کاروبار میں بھی اسی کا استعمال جاری رہا اس لیے انگریز حکام کو مقامی زبان سیکھنا ضروری ہو گیا۔ این۔ بی۔ ہال ہیڈ نے بنگالی زبان کی ایک گرامر مرتب کی جو ہگلی سے ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ بنگال میں پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ بنگالی، ہندی اور بعض دیگر ہندوستانی زبان کے الفاظ کو ٹائپ میں ڈھالنے کا سہرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک عہدہ دار سر چارلس ولکنس کے سر ہے جو بعد میں یورپ میں سنسکرت کے ایک ممتاز ترین اسکالر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ سر ولیم جونس نے ۱۷۸۴ء میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ ایشیائی اور یورپی تہذیبوں اور روایات کو سمجھنے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے سلسلہ میں یہ پہلا قدم ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نئے نئے آئے ہوئے اہل کاروں کو مقامی زبانوں کی تعلیم دینے کی غرض سے حکومت نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنا ڈالی (۱۸۰۱ء)۔ اس سے کچھ سال قبل ولیم کیری (۱۷۶۱-۱۸۳۴ء) اور اس کے شریک کار ڈبلیو وارڈ اور جے۔ مارش من بنگال آکر کلکتہ سے قریب سیرام پور میں کرسچین مشن کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ کیری نے وہاں ایک مطبع قائم کیا جہاں اولاً بنگالی میں، اور پھر بہ شمول سنسکرت ہندوستان کی دوسری زبانوں میں انجیل کے ترجمے چھاپے جاتے تھے۔ انجیل کا بنگالی ترجمہ کیری نے اپنے دو ساتھیوں کے علاوہ ایک بنگالی پنڈت رام رام باسو کی مدد سے کیا تھا۔ جو اس کے استاد بھی تھے۔ کیری کو بہ حیثیت استاد فورٹ ولیم کالج میں مامور کرکے بنگالی کے شعبہ کا صدر بنا دیا گیا۔ اور کیری نے اپنے مددگاروں کی حیثیت سے بنگالی، فارسی اور سنسکرت پر عبور رکھنے والے افراد کا تقرر کیا۔ ان ہی میں سے رام رام باسو اور مرتنجے ودیالنکار بھی تھے۔ اوّل الذکر فارسی کے عالم تھے اور "منشی" کہلاتے تھے۔ اور آخر الذکر سنسکرت کے پنڈت تھے۔ منشی کا اسلوب سہل اور کھڑی بولی سے قریب تھا۔ برخلاف اس کے پنڈت کی تحریر میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ اور محاوروں کی بھرمار ہوتی تھی باسو نے "پرتاپدتیہ" (Pratapa Ditya) کے نام سے ایک مختصر تاریخ لکھی (۱۸۰۱ء) جو ایک بنگالی کی لکھی ہوئی پہلی نثری تصنیف ہے اس کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر انشائی مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو "لپی مالا" کہلاتا ہے ودیالنکار نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے بہتر "پربھودچندریکا" ہے جو مصنف کی موت کے بعد شائع ہوئی (۱۸۳۳ء)۔ یہ کتابیں کالج کے نصاب میں شامل تھیں۔ لیکن زیادہ تر کتابیں فارسی اور سنسکرت کے ترجموں ہی پر مشتمل تھیں۔

۱۸۱۸ء میں سیرام پور کے بپٹسٹ مشن نے "سماچار درشن" کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس کے بعد اخباروں اور رسالوں کا تانتا بندھ گیا اور دیکھتے دیکھتے بنگالی نثر عوام میں مقبول ہو گئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں بنگالی صحافت کے فروغ پانے کی وجہ سے نئے بنگالی ادب کے پھلنے پھولنے کی راہیں نکل آئیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں بنگال میں ایک یکتائے زمانہ شخصیت نمودار ہوئی، رام موہن رائے (۱۷۷۲-۱۸۳۳ء) جنھیں مغل شہنشاہ نے "راجہ" کا خطاب دے کر برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اپنے مقدمہ کی پیروی کی غرض سے انگلستان روانہ کیا تھا۔ مغربی بنگال میں کلکتہ کے قریب ایک خوش حال راسخ العقیدہ برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کے عام رواج کے مطابق ان کی تعلیم سنسکرت کے علاوہ فارسی میں بھی ہوئی تھی۔ خود رائے کا دیہاتی مکان ایسے علاقہ میں واقع تھا جو مسلم تہذیب کا مرکز تھا۔ جب وہ بڑے ہوئے تو اکثر کلکتہ آیا جایا کرتے تھے جہاں کاروبار کے سلسلہ میں ان کی ملاقات نوجوان انگریز افسروں سے ہوتی جن سے وہ انگریزوں کے طور طریق اور زبان سیکھنے کی کوشش کیا کرتے مذہب کے کٹرپن کو وہ کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اب انھوں نے بت پرستی کی بجائے ایک وحدت پرست عقیدہ کا پرچار شروع کرنے اور ہندومت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اس سلسلہ میں ان کی پہلی کوشش وہ فارسی رسالہ ہے جو عربی دیباچہ کے ساتھ "تحفۃ الموحدین" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے چند دنوں بعد انھوں نے اپنشد کی تعلیمات کے مطابق "برہما" (قادر مطلق) کی عبادت پر زور دینا شروع کیا۔ کٹر عقیدہ پرست ہندو سماج اور مسیحی مبلغین کو ان کا رویہ پسند نہ آیا۔ ہندو پنڈتوں نے گمنام طریقہ پر ان پر ناشائستہ حملے کیے۔ رائے نے ان کا جواب اپنے پمفلٹوں کے ذریعہ دیا جن میں ستی اور دوسری مذموم رسوم کے خاتمہ پر زور دیا جاتا تھا۔ ان پمفلٹوں میں رائے نے بنگالی کو پنڈتوں کی مشکل زبان سے نکال کر روزمرہ سے توانائی بخشی۔ رائے نے بنگالی کے علاوہ انگریزی اور فارسی میں بھی رسالے نکالے۔

۱۸۱۷ء میں بعض ممتاز ہندوستانیوں اور برطانوی

افسروں کی مشترکہ کوشش سے کلکتہ میں "ہندو کالج" قایم کیا گیا۔
اس کے ذہین طلبہ سماجی نا انصافی کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔
انھوں نے بالآخر عیسائیت میں پناہ لی۔ کاشی پرشاد گھوش اور
کرشنا موہن بنرجی ایسے آتش نوا شاعر اور ادیب تھے۔

انیسویں صدی کی چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائی میں رسائل کے
ذریعہ ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ "وِدھرتھا سم گرہ" (Vidhartba Sangraba) رسالہ ۱۸۵۱ء میں
جاری ہوا جسے راجندر لال مترا جیسے عظیم مستشرق نکالا کرتے تھے
بنگالی میں تنقید کو انھوں نے پہلی دفعہ اسی رسالہ کے ذریعہ رائج
کیا تھا۔ "تاتوا بودھینی پتریکا" اسی دور کا ایک اہم رسالہ تھا۔ اس
کے پہلے اڈیٹروں میں ایشور چندر ودیا ساگر، اکشے کمار دت
جیسے دانشور شامل تھے۔ دت ایک صاحب طرز ادیب تھے
جنھوں نے سائنس کے مضامین کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

انیسویں صدی کا نصف اوّل بنگالی ادب کی حد تک ترجموں
اور نصابی کتابوں کا دور رہا ہے۔ بجز رام موہن رائے کے اس وقت
کے سارے اچھے ادیب ایسی کتابیں پیش کر رہے تھے جن سے بنگالی
سیکھنے میں مدد ملتی تھی۔ ایشور چندر ودیا ساگر (۱۸۲۰ - ۱۸۹۱ء)
کے منظر ادب پر نمودار ہونے کے بعد یہ دور اختتام کو پہنچا۔ ایشور
چندر نے بنگالی نثر کو ایک منجھا ہوا اسلوب اور آہنگ عطا کیا۔
اور ہر شعبۂ ادب میں اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا۔ وہ بلاشبہ
جدید بنگالی کے اعلیٰ نثری اسٹائل (سادھو بھاشا) کے بانی تھے۔
ودیا ساگر سنسکرت کے ایک متبحر عالم، ایک قابل استاد، صاحبِ
اسلوب ادیب اور سماجی مصلح تھے۔

ڈراما

انیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے پہلے بنگالی میں ڈراما نہیں تھا
بلکہ سازوں کے ساتھ (یاترا) ایک طرح کی نقالی کی جاتی تھی
جس کا تعلق مذہبی اور غیر مذہبی دونوں موضوعات سے ہوتا تھا جیسے
ودیا سندر کا قصہ یا کرشن کی کہانیاں وغیرہ۔ مغرب کی طرح
ابھی اسٹیج یا اسٹیج کا فن وجود میں نہیں آیا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں ایک
انگریزی ڈراما اسٹیج کیا گیا جس میں بنگالیوں نے حصہ لیا۔ اس کے بعد
ہندو کالج کے طلبا کی جانب سے شیکسپیر کے کئی ڈرامے پیش کیے
گئے اور اب محبان ادب نے بنگالی میں ڈراموں کی ضرورت محسوس
کرنی شروع کی۔ ۱۸۵۲ء میں ہوتے ڈرامے شائع ہوئے جنھیں
بنگالی کے طبعزاد ڈرامے کہا جا سکتا ہے۔

رام نارائن تارکہ رتنا (۱۸۲۲ - ۱۸۸۶ء) کے ڈراموں کی
کامیابی سے متاثر ہو کر مائیکل مدھوسودن دت نے بنگالی میں ڈرامے
لکھنے شروع کیے۔ ان کا ڈراما "سرمستھا" (Sarmistba)
ایک کامیڈی ہے جس کا موضوع "مہابھارت" کی پہلی کتاب سے
لیا گیا ہے یہ ڈراما ۱۸۵۹ء میں اسٹیج کیا گیا اور بہت کامیاب
رہا۔ مصنف نے اس موقعہ پر اس کا انگریزی ترجمہ بھی پیش کیا
تھا۔ "سرمستھا" کی کامیابی نے بنگالی ڈرامائی ادب کی رفتار تیز
کر دی۔ اس کے بعد اس وقت کی نئی تہذیب یافتہ اور قدامت
پرست سوسائٹی پر دو مزاحیہ طنزیہ ڈرامے پیش کیے گئے۔
"کرشنا کماری" (۱۸۶۱ء) اس کا سب سے اچھا ڈراما ہے۔
یہ ایک ٹریجڈی ہے جس کا موضوع "کرنل ٹاڈ" کے "وقائع راجستھان"
(Annals of Rajasthan) سے لیا گیا ہے۔

دت اور دینا بندھو مترا (۱۸۲۹-۱۸۷۴ء) کے ڈراموں
کی مقبولیت ایک عرصہ تک قایم رہی اور پبلک اسٹیج (۱۸۷۲ء)
کے قیام کے بعد بھی کئی سال تک تماشائی ان کے ڈراموں سے محظوظ
ہوتے رہے۔ مترا کا پہلا ڈراما "نیل درپن" (۱۸۶۰ء) بہ حیثیت
ڈراما بہت اچھا نہیں ہے تاہم اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ نیل
کے کھیتوں کے انگریز مالکوں نے مقامی باشندوں پر جو مظالم ڈھائے
تھے ڈراما ان کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ اس کا گمنام طور پر
انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا تھا اور یہ انگلستان میں بڑے شوق سے
پڑھا جاتا تھا۔

اس کے بعد کی بنگالی ڈرامے کی تاریخ میں چار نام ممتاز ہیں۔
گریش چندر گھوش (۱۸۴۴ - ۱۹۱۱ء) راج کرشنا رے (۱۸۵۲ء-
۱۸۹۱ء) اوپندر ناتھ داس اور امرت لال بوس (۱۸۵۳-۱۹۲۹ء)
گوش چندر کا سب سے مشہور ڈراما "پرفلا" (Prabbulla)
ہے جو ایک سماجی ڈراما ہے۔ اوپندر ناتھ داس نے اپنے
میلو ڈراما میں انگریز مخالف جذبات پیش کیے۔

شاعری

مائیکل مدھوسودن دت (۱۸۲۴-۱۸۷۳ء) ہندو کالج کے
ذہین ترین طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے عیسائی مذہب
قبول کر لیا تھا۔ وہ پہلے پہل انگریزی میں لکھتا تھا۔ اس چیلنج کا
مقابلہ کرنے کے لیے کہ بنگالی میں بلینک ورس یا بے قافیہ
شاعری ممکن نہیں ہے دت نے بنگالی میں شاعری شروع کی۔
اس کی عظیم رزمیہ "میگھ ناتھ ودھ" میں رام کی تسخیر لنکا کی ایک
نئی تعبیر ہے۔ دت کا شمار بہترین بنگالی شاعروں میں ہوتا ہے۔
اس کی کاوش سے بنگالی میں بے قافیہ نظم یا بلینک ورس نے
قدم جمالیے اور نئی شاعری کا راستہ متعین ہو گیا۔ اس کی نظموں
کے دیگر مجموعوں میں "چتر داس پدی کویتا ولی" (Chaturdasa Padi Kavitavali)
کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ اس
نے سانیٹ کو پہلی مرتبہ کسی ہندوستانی زبان میں متعارف کیا۔

دت نے جس "رزمیہ" شاعری کی ابتدا کی تھی اس کو مقبول
بنانے میں بعد کے دو شاعروں ہیم چندر بنرجی (۱۸۳۸ - ۱۹۰۳ء)
اور نوین چندر سین (۱۸۴۶ - ۱۹۰۹ء) کا بڑا حصہ رہا ہے۔ بنرجی
کو ہمہ اقسام کی بحروں میں مزاحیہ نظمیں لکھنے میں کمال حاصل تھا۔
سین نے مہابھارت کے قصہ میں ایک سہ موضوعاتی
نظم لکھی، بنرجی کی شاہکار نظم "ورتر سمہار" دیومالائی موضوع
پر ہے۔

افسانوی ادب اور متفرق اصناف نثر

افسانوی ادب کے رواج پانے سے پہلے کی دو تصانیف جنھوں نے بنگالی افسانے کے لیے زمین ہموار کی قابلِ ذکر ہیں۔ ہندو کالج کے ایک فارغ التحصیل پیارے چند مترا" ٹیک چند ٹھاکر" کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ ان کی "الالر گھاریر دلال" (بڑے گھرانے کا لاڈلا بیٹا) میں کلکتہ کے قرب وجوار میں رہنے والے ایک متوسط طبقہ کی گھریلو اور سماجی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

بنگالی میں افسانوی ادب کو سب سے پہلے بنکم چندر چٹرجی (۱۸۳۸-۱۸۹۴ء) نے پیش کیا۔ جو مدھو سودن دت کے بعد بنگالی ادب میں پہلا بڑا نام ہے۔ چٹرجی کا پُر لطف رومانس " درگیش نندنی" ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مصنف کو شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کے دیگر ناول اور کہانیاں جن کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے بڑے شوق سے پڑھے جانے لگے اور بعد ازاں دوسری زبانوں میں ترجموں کی وجہ سے وہاں بھی افسانوی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ چٹرجی نے بنگالی میں ادبی اور انشائی مضمون نگاری بھی رائج کی۔ چٹرجی نے ادب کے طور طریق متعین کیے۔ ان کے تقریباً سب ہی ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

افسانوی ادب کے میدان میں چٹرجی کے بعض معاصرین اور مقلدین بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ تارک ناتھ گنگولی کی "سورنالتا" (۱۸۷۳ء) میں عام آدمیوں کی زندگی کو بڑی ایمانداری اور ہمدردی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رمیش چندر دت آئی۔ سی۔ ایس (۱۸۴۷- ۱۹۰۹ء) ہمہ گیر قابلیت کا عالم تھا۔ اس نے چار تاریخی ناول اور گھریلو رومانس لکھے ہیں۔

"برہمو سماج" کی داغ بیل گو رام موہن رائے نے ڈالی تھی لیکن اس کو پروان چڑھانے میں دوارکا ناتھ ٹیگور کے بڑے لڑکے دیبندر ناتھ ٹیگور (۱۸۱۷- ۱۹۰۵ء) کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک ترقی پسند تحریک کی حیثیت سے بنگالیوں کے قومی کردار کی تشکیل میں برہمو سماج نے اہم رول ادا کیا ہے۔ دوبندر ناتھ بڑی ہی دلآویز شخصیت کا مالک تھا۔ قومی ترقی اور یکجہتی اسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ حافظ اس کا دل پسند شاعر تھا۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی تک ٹیگور گھرانہ علم و ادب آرٹ اور کلچر کے ایک مرکز کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ ان کے خاندان کی کئی نسلوں کا بنگال کی نشاۃ ثانیہ میں زبردست حصہ رہا ہے۔

مہارشی کا بڑا لڑکا دوجیندر ناتھ ٹیگور (۱۸۴۰ - ۱۹۲۶ء) ایک فلسفی ریاضی داں اور بنگالی نثر و نظم کا صاحبِ طرز انشا پرداز تھا۔ اس کی رمزیہ نظم "سوپنا پریان" (خواب کی یورش (۱۸۷۵ء) بنگالی ادب میں یکتا مقام رکھتی ہے۔ "گیتا اور اپنشدوں" پر اس کے خطبات بہت ہی واضح پر مغز اور بصیرت افروز ہیں۔ بنگالی میں شارٹ ہینڈ اس کی ایجاد ہے۔ دیویندر ناتھ کا دوسرا لڑکا ستیندر ناتھ ٹیگور (۱۸۴۲ - ۱۹۲۳ء) پہلا ہندوستانی تھا جسے انڈین سول سروس میں داخلہ ملا۔ اس نے تکارام کی نظموں کا مراٹھی سے بنگالی میں ترجمہ کیا۔ پانچویں لڑکے جیوتر ندر ناتھ (۱۸۴۸- ۱۹۲۵ء) نے ایک ڈرامہ نگار، آرٹسٹ اور سنگیت کار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس نے اپنے بڑے بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اپنے گھر پر ایک خانگی اسٹیج قایم کیا تھا جہاں بعض نئے ڈرامے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے۔

دوبندر ناتھ کی تیسری صاحبزادی سورنہ کماری دیوی (۱۸۵۵ - ۱۹۳۲ء) ایک ممتاز ناول نگار، شاعرہ، غنائیہ نویس اور گیت کار تھیں۔

جیوتر ندر ناتھ ہی کی دلچسپی سے ۱۸۷۲ء میں "بھارتی" نامی میگزین نکالا گیا یہ ایک طرح سے اہل خاندان ہی کا رسالہ تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر دوی جندر ناتھ تھے۔ ان کے بعد ایک عرصہ تک ان کی بہن سورنہ کماری ادارت کے فرائض انجام دیتی رہیں (اور پھر بعد میں موخر الذکر کی صاحبزادی نے یہ فرائض انجام دیئے) یہ رسالہ بنکم چندر کے "بنگ درشن" سے بھی زیادہ مقبول ہوا۔

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ - ۱۹۴۱ء) دوبیندر ناتھ کے ساتویں اور سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ رابندر ناتھ کو کالی داس کے بعد ہندوستانی ادب کی عظیم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ادبی، تہذیبی اور دیگر تخلیقی سرگرمیاں پندرہ سال کی عمر سے شروع ہو کر مسلسل پینسٹھ سال یعنی ان کے آخری سانس تک برابر جاری رہیں۔ ایک ایسے نوجوان کی جس نے ہائی اسکول کی تعلیم بھی نہیں ختم کی تھی یہ پختہ کاری حیران کن تھی۔ ۱۸۸۲ء میں ان کے تیسرے مجموعہ کلام "سندھیہ سنگیت" کی اشاعت کے ساتھ ہی انھیں ایک نئے طرز کے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن اس سے قبل ہی ادبی اور تہذیبی موضوعات پر اپنے مضامین کی وجہ سے وہ دنیائے ادب میں متعارف ہو چکے تھے۔ "مانسی" (۱۸۹۰ء) اور اس کے بعد کے شعری مجموعے تازگی، ندرت اور قادر الکلامی کے بہترین نمونے ہیں۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۹ء میں انھوں نے اپنے پہلے دو تاریخی ناول لکھے لیکن ان کا تیسرا ناول "چوکھ بالی" تقریباً بیس سال کے وقفہ کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس ناول نے بنگال کے ناول نگاروں کو ایک نیا افق دیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے دو ڈرامے بھی لکھے

جو "راجہ ورانی" (۱۸۸۹ء) اور "وسارجن" (۱۸۹۰ء) کہلاتے ہیں۔ اول الذکر کو بنگالی زبان کی پہلی ٹریجڈی کہا جاسکتا ہے۔ ان ڈراموں سے بہت پہلے ٹیگور نے دو غنائی تمثیلیں بھی لکھیں، پہلی تمثیل بڑی کامیابی سے پبلک تھیٹر میں پیش کی گئی اور دوسرا آپرا گھر ہی پر اسٹیج کیا گیا جس میں خود ٹیگور اور ان کے دیگر رشتہ داروں نے بہ حیثیت اداکار حصہ لیا۔
ان کی غنائی شاعری کی طرح ان کی کہانیاں بھی آج تک بنگالی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں ٹیگور کی ادبی حیثیت نہ صرف مسلّم ہوچکی تھی بلکہ انھیں وہ مقام حاصل ہوچکا تھا جو اس سے پہلے ملک کے کسی ادیب کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سودیشی تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ تاہم کچھ عرصہ کے بعد وہ پبلک زندگی سے کنارہ کش ہو گئے انھوں نے کلکتہ چھوڑکر شانتی نکیتن میں سکونت اختیار کرلی اور وہاں ایک نئے طرز کے اسکول کی بنیاد رکھی (۱۹۰۱ء)۔

یہاں سے ٹیگور کی فکر اور شاعری میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا ان کے نغموں میں ایک اندرونی کشمکش اور روحانی کرب کا اظہار ہونے لگا۔ ان کے یہ جدید نغمے دراصل ان کی مناجاتیں ہیں گو ہیئت کے اعتبار سے ایسے نہ ہوں۔ ٹیگور نے انھیں ساز کی دھنوں پر پیش کیا۔ "گیتانجلی" (نذر نغمہ) ان کے ایسے ہی نغموں پر مشتمل ہے۔ اس کے انگریزی ترجمہ پر انھیں نوبل انعام دیا گیا (۱۹۱۳ء)۔ ٹیگور پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں ادب میں یہ عالم گیر اعزاز حاصل ہوا۔

اسی اثنا میں ان کے شاہکار ناول "گورا" کی اشاعت عمل میں آئی (۱۹۱۰ء) اس ناول کے کینوس پر ہندوستانی عوام کی قومی تحریک کے سارے پہلو منقش ہو گئے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں ان کی نئی نظموں کا مجموعہ "بالَک" شائع ہوا۔ ٹیگور کی بعض غنائی تمثیلیں صوفیانہ اور علامتی رنگ کی بھی ہیں جن میں سب سے اہم "ڈاک گھر" (۱۹۱۲ء) اور "پھالگنی" (۱۹۱۵ء) ہیں۔ یہ ڈرامے شانتی نکیتن اور کلکتہ میں اسٹیج کیے گئے اور بے انتہا کامیاب رہے۔ رمزیاتی اور علامتی ڈرامہ نگاری سے ٹیگور ناٹیہ (یا رقص پر مبنی) ڈرامہ کی جانب متوجہ ہوئے اور "نٹر پوجا" جیسا ڈرامہ پیش کیا جو سنگیت اور ناٹیہ ڈرامہ (Dance Drama) کی تاریخ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ٹیگور کی تخلیقات سے قطع نظر، سودیشی دور میں اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بنگالی ادب میں تاریخی ڈرامے بہت مقبول ہوئے یہ سودیشی تحریک ہی کی دین تھی کہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کو مغل شہنشاہ اور سلاطینِ بنگال اچانک تحسین و توصیف کے مستحق نظر آنے لگے۔ راجپوت سرداروں کی طرح مسلم بادشاہوں کو بھی اب سراہا جانے لگا۔ تاریخ شناسی کا یہ احساس پچھلی نسل میں نہیں تھا۔ گریش چندر گھوش نے "سراج الدولہ" (۱۹۰۶ء) اور "میر قاسم" (۱۹۰۷ء) جیسے تاریخی ڈرامے لکھے۔ دوِجی چندر لال رائے نے "نور جہاں" اور "شاہجہاں" (۱۹۰۹ء) پیش کیے اور "علی بابا" (۱۸۹۷ء) جیسے نشاط انگیز اور سدا بہار آپیرا کے مصنف کشیرود پرشاد ودیا ونود (۱۸۶۳-۱۹۲۷ء) نے "پلاسیر پرایش چت" (پلاسی کا کفارہ۔ ۱۹۰۶ء)۔ بنگلار مسند (مسندِ بنگال۔ ۱۹۱۰ء) اور "عالم گیر" (۱۹۲۱ء) وغیرہ جیسے ڈرامے لکھے۔

افسانوی ادب میں بھی تاریخ کے کئی موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی۔ اس صنفِ ادب کے ممتاز ترین ادیب نامور ماہرِ آثارِ قدیمہ و مورخ رکھل داس بنرجی (۱۸۸۵-۱۹۳۰ء) تھے ان کے ناول "کردنہ" (۱۹۱۷ء) "ساسن کہ" (۱۹۱۴ء) "دھرم پال" (۱۹۱۵ء) اور "سیوک" (۱۹۱۷ء) دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مستند تاریخ کے اچھے نمونے پیش کرتے ہیں جو عام نوعیت کی نصابی کتب میں نہیں ملتے۔

رابندر ناتھ کی شاعری کی تقلید تو ممکن نہیں تھی تاہم بنگال کے کئی نوجوان شاعروں نے ان کے وزن و بحر کے فنی ذخیرہ اور خلوص شعر سے استفادہ کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن ان ہی میں سے ایک نوجوان شاعر ستیندر ناتھ دت (۱۸۸۲-۱۹۲۲ء) نے ٹیگور کے فن اور اسلوب سے گریز کیا۔ بنگالی نظم کے عام وزن و بحر کی بنیاد پر اس نے طرز تحریر کا ایک منفرد راستہ اختیار کیا۔ دت نے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مختلف زبانوں کی نظموں کے کثیر تعداد میں ترجمے کیے جو پڑھنے میں اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے دو مجموعے "تیرتھ سلیل" (آبِ مقدس ۱۹۰۸ء) اور "تیرتھ رینو" (خاک مقدس ۱۹۱۰ء) کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ دت ایک چابکدست نثر نگار بھی تھا۔

پربھات کمار مکرجی (۱۸۷۳-۱۹۳۲ء) ایک کامیاب افسانہ نگار تھا جس نے ٹیگور کی تقلید کی۔ اس کے متعدد افسانوں اور ناولوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بعض کا تو انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔

اس صدی کے دوسرے دہے میں ہم بنگالی افسانوی ادب کی مقبول ترین شخصیت سے متعارف ہوتے ہیں۔ سرت چندر چیٹرجی (۱۸۷۶-۱۹۳۸ء) کی تصانیف کا تقریباً ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ اور وہ غالباً ٹیگور کے بعد بنگال کے سب سے زیادہ جانے پہچانے ادیب ہیں۔ جو ٹیگور کی افسانوی نگارشات سے پوری طرح واقف تھے لیکن گھریلو موضوعات کو انھوں نے سیدھے سادے اسلوب میں پیش کیا۔ ان کی کہانیوں کی جذباتی اپیل بھی راست اور غیر گنجلک ہے۔ سماج کے پچھڑے ہوئے طبقہ خاص کر بیواؤں اور بے بس و لاچار لوگوں سے ان کی روحانی ہمدردیوں کی وجہ سے ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ چیٹرجی نے متعدد کہانیاں لکھیں جن میں سے مخصوص یہ ہیں۔ "بندور چھیلے" "پنڈت

مسائل ' پرینیتا'' سماجی موضوع پر ان کی سب سے اچھی کہانی
پلی سماج " (دیہاتی معاشرہ - ۱۹۱۶ء) ہے - " شریکانتہ "
ان کا پہلا ناول ہے - یہ مصنف کی اپنی زندگی پر مبنی ہے - چٹر جی
کی بعض کہانیوں کو ڈراموں کی شکل میں بھی منتقل کیا گیا ہے -

آونندرا ناتھ ٹیگور (۱۸۷۱ - ۱۹۵۱ء) کا جو رابندر ناتھ
کے بھتیجے تھے جدید ہندوستانی آرٹ کے احیا میں بڑا حصہ
رہا ہے - وہ اپنے منفرد اسٹائل میں خاموشی کے ساتھ ایک عرصہ
تک لکھتے رہے ان کی بعض راجپوت کہانیاں اور خیالی پیکر
" الف لیلیٰ " کی یاد دلاتے ہیں وہ ایک عرصہ تک کلکتہ یونیورسٹی
میں فنون لطیفہ کے پروفیسر بھی رہے ہیں اور ان کے لیکچر بنگالی
ادب کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد نوجوان ادیبوں میں ایک نئی لہر پیدا
ہوئی - دبے دبے انداز میں اب جنس ان کا موضوع بننے لگی -
نریش چندر سین گپتا (۱۸۸۲ - ۱۹۶۴ء) کی تصنیف " پاپیر چھاپ "
میں جرائم اور جنس دونوں کو موضوع بنایا گیا ہے - یہ بنگال کا پہلا
ناول ہے جس میں جنسی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے -

جنگ کے کچھ ہی سال بعد ایک نوجوان شاعر شہاب ثاقب
کی طرح آسمانِ ادب پر نمودار ہوا جس کی خیرہ کن روشنی سے ادبی دنیا
دنیا دم بخود رہ گئی - قاضی نذر الاسلام (پیدائش ۱۸۹۹ء)
ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوئے لیکن انھیں میدانِ
جنگ میں لڑنے کا موقعہ نہیں ملا - ان کی نوجوانی کی بعض نثری
تحریریں ایک غیر معروف رسالہ میں شائع ہوئی تھیں ان کی نظموں
کا پہلا مجموعہ " اگنی وینا " (بربطِ آتش نوا - ۱۹۲۲ء) سماجی
قیود اور سیاسی غلامی کے خلاف سیماب صفت نوجوانی کے
اضطراب انگیز جذبات کی ترجمانی کرتا ہے - ان نظموں کی اشاعت
کے ساتھ ہی شاعر کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی ، گو بعد
میں ان کی شاعری کا آہنگ اور لہجہ بدل گیا تاہم ان کی مقبولیت
میں کوئی کمی نہیں ہوئی - ان کے گیت تو خاص طور سے پسند کیے
جاتے ہیں -

قاضی نذر الاسلام کے اسکول کے ایک دوست سیلاج نند
مکرجی (پیدائش ۱۹۰۰ء) ایک بے مثال حقیقت پسند افسانہ نگار
کی حیثیت سے مشہور ہوئے - انھوں نے مغربی بنگال کے کوئلہ
کے کانوں میں کام کرنے والے خستہ حال لوگوں کی زندگی کو پہلی
مرتبہ ادب میں پیش کیا - اس کے بعد مکرجی کو حقیقت پسند
ادیبوں کے گروہ میں سب سے اونچا مقام حاصل ہو گیا - یہ گروہ
" کلول " (۱۹۲۳ء) " کالی کلوم " (۱۹۲۷ء) اور " پرگتی "
(ڈھاکہ - ۱۹۲۸ء) نامی ماہناموں میں اپنی حقیقت پسندانہ
کہانیاں پیش کیا کرتا تھا - نوجوان اور باصلاحیت ادیبوں کے
ایک گروہ نے ، جس میں سرفہرست بدھ دیو باسو (۱۹۰۸ء -
۱۹۷۴ء) کا نام تھا - جنسی شعور کے ایک نئے مسلک کو اپنی نثری
اور شعری تخلیقات میں پیش کیا - اس گروہ کے لکھنے والوں میں
پریمیندر مترا ، اچنتیہ کمار سین گپتا ، اجیت دت ، موہیت لال
مجمدار اور جتندر ناتھ سین گپتا خاص طور سے قابل ذکر ہیں
بعض شاعر کمیونزم کے زیرِ اثر مزدور طبقہ سے ہمدردی کا
اظہار کرنے لگے -

ادب میں ٹیگور کی پیروی کا ایک عام رجحان تو موجود تھا
لیکن ان کے آرٹ کی صوری خصوصیات کو اپنانے اور جذب
کرنے میں کافی عرصہ لگا - صنف افسانہ نگاری میں ان کے
فن کو اپنانا سب سے آسان تھا - اسی لیے اس صنف میں
سب سے پہلے ترقی ہوئی اور اس کا سلسلہ آج تک جاری
ہے - بنگالی ناول دراصل طویل افسانے ہی ہیں - سرت چندر چیٹرجی
کے بعد منندر لال بوس اور بھوتی بھوشن بنرجی جیسے نوجوان
ادیبوں نے بعض نہایت کامیاب ناول تحریر کیے - بنرجی کا
ناول " پاتھیر پنچلی " (۱۹۲۹ء) جو قریب قریب مصنف کی آپ
بیتی ہے بنگالی افسانوی ادب میں ایک کلاسک کی حیثیت رکھتا
ہے - ان کے ناول اور افسانے آج بھی مقبول ہیں - بنرجی
(۱۸۹۸ - ۱۹۵۰ء) ایک رومان پرست ادیب تھے جن کا
دل دیہاتوں ، جنگلوں اور دریاؤں کے حسن میں ہمیشہ کھویا
ہوا رہتا تھا -

چوتھے دہے کے آغاز پر شاعری میں ایک نیا رجحان ظاہر
ہونے لگا - سدھندر ناتھ دت (۱۹۰۱ - ۱۹۶۱ء) نے " پریچے "
کے نام سے ایک پرچہ نکالا جس میں ان کے علاوہ دیگر شعرا کی
نظمیں جدید انگریزی شاعری کے طرز پر پیش کی جانے لگیں -
جیوانانند داس (۱۸۹۹ - ۱۹۵۴ء) ایسے ہی ایک شاعر تھے جنھیں
ٹیگور کی وفات کے بعد کافی شہرت حاصل ہوئی - ان کی شاعری
بنگالی علامتی پیکر نگاری کی بہترین مثال ہے - اس نوع کے
دوسرے ممتاز شعرا میں بشنو دے (پیدائش ۱۹۰۹ء) اور
آمیہ چکرورتی (پیدائش ۱۹۰۱ء) قابلِ ذکر ہیں دونوں اعلیٰ پایہ
کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں - چکرورتی بہ حیثیت سکریٹری ایک
طویل عرصہ تک ٹیگور کے ساتھ رہ چکے ہیں - ایک اور نوعمر ترقی
پسند شاعر سکنت بھٹہ چاری (۱۹۲۶ - ۱۹۴۷ء) تھا جو اپنی
غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اپنی مختصر زندگی ہی میں مشہور
ہو چکا تھا -

چوتھے دہے میں افسانوی ادب کے چند مشہور نام یہ ہیں
سردندو بنرجی ، تاراشنکر بنرجی ، بولائی چند مکرجی ، انوداشنکر
رائے اور مانک بنرجی - انوداشنکر رائے نے ایک ناول " ستیہ
ستیہ " (Satya Satya) لکھا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے -
مانک بنرجی کا اپنا ایک منفرد نقطۂ نظر ہے جو حقیقت پسندانہ
بھی ہے اور نفسیاتی بھی - ان کی تحریر بائیں بازو کے سیاسی
اندازِ فکر سے زیادہ فلسفیانہ زاویۂ حیات کی ترجمان ہے -

ٹیگور کے بعد انھیں بنگالی افسانہ نگاری کا سب سے ممتاز ادیب قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز پر ٹیگور دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان آزاد ہو گیا تاہم اس دوران ادبی رجحانات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ادب کا جھکاؤ بائیں بازو کی جانب کچھ زیادہ ہو گیا۔ اسلوب نظم میں ٹیگور کی بے قافیہ منثور شاعری کا رواج برقرار رہا۔ ادب میں مانک بنرجی بائیں بازو کے رجحانات کے نقیب ہیں، تاراشنکر بنرجی دائیں بازو کے خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ٹیگور کی بدولت بنگالی زبان ہر صنفِ ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر چکی ہے پانچویں اور چھٹے دہے میں بھی اس کے ادبی کارنامے کمیاتی اور کیفیاتی ہر دو لحاظ سے قابلِ اعتنا ہیں۔ تنوع کے اعتبار سے بھی اس کا معیار اگر بہت بلند نہیں تو اوسط ضرور ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے قافیہ اور وزن کو عام طور سے نظر انداز کیا جاتا ہے، شاعری کی زبان اور نثر کی زبان کا فرق تقریباً مٹ چکا ہے۔ نئی نسل کے بعض شاعروں کی نگارشات یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ شکتی چٹرجی ایسے ہی ایک ممتاز شاعر ہیں۔ تاہم ان نوجوان شاعروں کا کلام کسی حد تک ناپختہ اور اکثر ناقابلِ فہم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہ صرف زندگی سے گریز کرتی ہے بلکہ تعلیم یافتہ قاری کے ذہن کو بھی متاثر کرنے سے عاجز ہے۔

افسانوی ادب میں البتہ یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سے جو نوجوان ادیب سامنے آئے ہیں ان کی تحریروں سے عام قاری کے ذوق کو بڑی حد تک تسکین ہوتی ہے۔ ان میں صحافتی نمک مرچ ہے اور جنسی موضوعات کا انعکاس بھی۔ لیکن آزادی کے بعد کے کامیاب ترین ناول نگار ستی ناتھ بھادری جن کا قبل از وقت انتقال ہو گیا ان سب سے الگ تھے۔ وہ "جاگری" کے علاوہ کئی اور کتابوں کے مصنف تھے۔ بھادری فکر اور عمل میں گاندھی وادی تھے۔ نتیجتاً انھیں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ ان کا مذکورہ ناول جیل کے زمانے کے تجربات ہی پر لکھا گیا تھا۔

بنگالی زبان و ادب

(بنگلہ دیش)

بنگالی، نوخیز عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کے سات کروڑ سے زائد باشندوں کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ بنگلہ دیش سے باہر یہ زبان اس کے پڑوسی علاقہ بنگال میں بولی جاتی ہے جو جمہوریۂ ہند کا ایک صوبہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل آج کے بنگلہ دیش اور مغربی بنگال کے علاقے ایک ہی وحدت تھے اور برطانوی ہند کے ایک صوبہ کی حیثیت سے بنگال کہلاتے تھے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے، سوائے چند مستثنیات کے، بنگلہ دیش کے رہنے والوں کی زندگی اور طور طریق کو بنگالی ادب میں کوئی خاص نمائندگی حاصل نہ تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں کمیاتی اور کیفیاتی ہر دو لحاظ سے معتد بہ اضافہ ہوا۔ کئی مسلمان ادیب جو غیر منقسم بنگال کے زمانے سے لکھ رہے تھے اس علاقے میں چلے آئے اور اپنی نظموں، کہانیوں، ناول اور ڈراموں میں مقامی مناظر اور مقامی باشندوں کی زندگی کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان کے علاوہ کئی نوجوان اہل علم بھی پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے۔ اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر بنگلہ دیش کے ادیبوں کے ذہنوں میں مذہب اور قومیت کے جذبات باہم دگر ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ یہ ادیب اکثر مسلم ادبی روایات سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں بنگالی ادب کے عام دھارے سے، جس میں زیادہ تر ہندو قلم کاروں ہی کا حصہ رہا ہے، الگ اور منفرد تصور کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر کوشش یہ ہوتی ہے کہ موجودہ منظر کی ایک ایسی تصویر پیش کی جائے جس میں اسلام کے شاندار ماضی کے تمام نقوش ابھر کر آ جائیں۔ چنانچہ ان ادیبوں نے نہ صرف تشبیہ و استعارات، علامات اور اساطیری روایات کو بلکہ فارسی اور عربی الفاظ کے وافر استعمال کے ذریعہ ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو اپنی نوعیت میں احیا پرستی کا راستہ تھا۔ اس طرح کے لکھنے والوں میں جنھیں بعض اوقات "مسلم روایت پرست" سے موسوم کیا جاتا ہے، فرخ احمد (۱۹۱۶ء-۱۹۷۴ء) کی شخصیت سب سے اہم مقام رکھتی ہے۔

تاہم ان سے پہلے کے لکھنے والے ادیب بھی موجود ہیں جن کا اس علاقے کی بنگالی زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم المرتبت ہستی قاضی نذرالاسلام (۱۸۹۹ء - ۱۹۷۶ء) کی ہے۔ جنھوں نے اپنی نظموں میں عربی، فارسی اور اردو کے مقبول اور دلکش الفاظ استعمال کر کے بنگالی زبان کو وسعت عطا کی ہے۔ نذرالاسلام ایک پُر جوش انقلابی غزیبوں کے مجاہد اور اس برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے نقیب رہے ہیں۔ انسان دوستی اور آزاد منشی ان کا مسلک ہے۔ انھوں نے ایک ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جو ٹیگور کی روایات میں ڈوبا ہوا تھا۔ نذرالاسلام نے بنگالی ادب کو نہ صرف نئے نئے الفاظ دیے بلکہ اپنی ایک مشہور روایت قائم کی۔ بنگالی ادب کی ساری تاریخ میں ایسی ایک بھی تصنیف کی مثال نہیں ملتی جو ان کی طویل اور پُر جوش نظم "ودروھی" (باغی) کی طرح ولولہ انگیز ثابت ہوئی اور جس نے اس سرعت سے دوامی شہرت حاصل کی ہو۔ ان کی تخلیقی اپج کا سب سے زیادہ اظہار ان کی نظموں اور گیتوں ہی میں ہوتا ہے تاہم ناول نویسی، افسانہ نگاری اور صحافتی

میدان میں بھی ان کے کارنامے قابل لحاظ ہیں۔ بدقسمتی سے ان کا قلم اس وقت رک گیا جب کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ ۱۹۴۱ء میں ایک ناقابل علاج مرض کے شکار ہوگئے اور دنیا ومافیہا سے بےخبر موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ آخر اسی حالت میں بنگلہ دیش میں ان کی وفات ہوگئی۔

پرانے گروہ سے تعلق رکھنے والے دیگر شعرا میں لکھا در ہی ہیں جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شہادت حسین (۱۸۹۳ - ۱۹۵۳ء) کے کلام کے چونکا دینے والے اسلوب اور تخیلات کی اڑان اور ہیجان انگیزی قابل توجہ ہے۔ غلام مصطفیٰ (۱۸۹۷ - ۱۹۶۴ء) اور رحیم الدین (۱۹۰۲ء) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آخر الذکر نے اپنی نظموں میں لوک کویتائی روایات کی پیروی کرتے ہوئے دیہی بنگال کی زندگی کے بھرپور نقش پیش کیے ہیں۔ یہ ایسا بنگال ہے جو جدید شہری زندگی کی الجھنوں اور اس کی ناقابل فہم حسیت سے ابھی آلودہ نہیں ہوا ہے۔ عبدالقادر (۱۹۰۶ء) شاعر کے علاوہ نقاد بھی ہیں۔ علم عروض اور فن شاعری پر ان کی تحریریں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

فرخ احمد ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ حسیت اور موثر اسلوب کے مالک ہیں ان کے یہاں روایت کے سرچشمے دو ہیں۔ ایک تو اسلام اور اس کے انبیا و اولیا۔ دوسرے وہ قصّے اور اساطیر جن کے نقوش ذہنوں میں اکثر مسلم ماحول اور مسلم پس منظر کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ ان سرچشموں کی تلاش میں شاعر نے ایران اور عربستان کے نامانوس اور دور دراز مقامات کا کئی مرتبہ سفر بھی کیا ہے۔ اپنی رومانٹک اساطیری نظموں میں فرخ نے سندباد اور حاتم طائی جیسے کرداروں کے ذریعہ ماضی کی شاندار روایات سے نیا مفہوم اور نئی علامتیں تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام پر قدرت، الفاظ کے آہنگ اور دل کش اسلوب بیان کی وجہ سے فرخ کی کوششیں اکثر کامیاب رہی ہیں۔ تاہم ماضی سے ان کا غیر معمولی انہماک اور ایک مثالی مذہبی نظام حیات کا احساس ان میں اس قدر زیادہ پایا جاتا ہے کہ بعض اوقات بنیادی حقیقتیں اور علاقائی تقاضے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے شعری پیکر اور علامتوں کی تخلیق کے لیے ایسا مال مسالہ استعمال کرتے ہیں جس کا مقامی سرزمین اور ماحول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کی شاعری بعض اوقات مبالغہ آمیز خطیبانہ رنگ اختیار کر جاتی ہے۔ ان نقائص کے باوجود فرخ احمد بلاشبہ موثر شاعر ہیں۔ ان کی نظم "سات سمندروں کا ملاح" (۱۹۴۴ء) دلدادگان شاعری کو ہمیشہ عزیز رہے گی۔

فرخ احمد اور ان کے متبعین کے علاوہ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو اسلامی روایات کی پابندی میں غلو نہیں کرتے۔ پانچویں دہے سے ہمیں ایسے شاعر ملتے ہیں جن کا احساس خودی اور شعور آزادی جاگ چکا تھا۔ اس وقت تک ایک بات بالکل واضح ہوگئی تھی اور اس علاقے کے ادیبوں کو اس کا پورا احساس ہو چلا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں بنگلہ دیش نے جو آزادی حاصل کی تھی وہ بڑی حد تک فریب تھا۔ سامراجی استحصال ایک قصۂ پارینہ نہیں تھا بلکہ ایک دوسری شکل میں اب بھی موجود تھا۔ صرف حاکم بدل چکے تھے۔ انگریز حکمرانوں کی بجائے اب بنگلہ دیش کے عوام مغربی پاکستان کے فرمانرواؤں کے دست نگر تھے۔

ان تمام حقائق کے شعور نے ادیبوں میں ایک نیا احساس اور نیا جوش پیدا کر دیا اب وہ مذہب پرستی کے چکر سے نکل چکے تھے اور ان کی بجائے اپنی تخلیقی کوششوں میں سارے بنگالی ادب کی روایات سے چاہے وہ ہندو روایات ہوں کہ مسلم نیز تمام دنیا کے ادبی سرمایے سے فیضان حاصل کرنے لگے تھے۔ اب وہ اس ماضی کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے تھے جو عوام کو پرانی دنیا کی طرف لوٹانا چاہتا تھا۔ اب ان کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز ان کا اپنا ملک اور موجودہ دنیا تھی۔ آج بھی یہی رجحان برقرار ہے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس مکتب کے بعض ممتاز لکھنے والے یہ ہیں: احسن حبیب (۱۹۱۷ء) سکندر ابوجعفر (۱۹۱۸ء)، ابوالحسن (۱۹۲۱ء)، سید علی احسن (۱۹۲۲ء)، ثنار السحق (۱۹۲۲ء)، آل محمود (۱۹۳۶ء)، فضل شہاب الدین (۱۹۳۶ء) محمد منیر الزماں (۱۹۳۶ء)، ضیار حیدر (۱۹۳۶ء)، دلاور (۱۹۳۶ء)، عمر علی (۱۹۳۸ء)، شہید قادری (۱۹۴۲ء) اور عبدالمنان سید (۱۹۴۳ء)۔

احسان حبیب جو ایک خوش ذوق اور قادر الکلام صاحب قلم ہیں۔ دنیا کا ایک تلخ اور طنز آمیز تصوّر رکھنے کے باوجود جو ان کی بعض متاخر نظموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ایک رومان پرست شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ بصیرت اور جذب پذیری کا لہجہ بڑا ہی پرشکوہ اور باوقار ہوتا ہے جس میں بسا اوقات خون انگیزی اور دل گیری کی ایک موہوم سی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔

شمس الرحمٰن بنگلہ دیش کے ایک نہایت ہی ذی اثر شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں اپنی بھرپور رمز آمیزی، جدّت پسندی اور انفرادیت کے علاوہ ایجاز و باقاعدگی اور خیالات کی شدّت کے لیے مشہور ہیں۔ وہ شہروں کی ملمع ساز اور شائستہ زندگی کے شاعر ہیں۔ انتہائی انفرادیت پسند اور شخصی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ساری دنیا کی جدیدیت اور آفاقیت سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم انھیں ان حقائق کا بھی پورا شعور ہے جو قومی چوکھٹے میں خود ان کے اطراف کارفرما ہیں۔ وہ اکثر جدید اور عصری مسائل پر لکھتے ہیں (۱۹۵۲ء) کی بنگالی زبان کی تحریک ۱۹۶۹ء میں بنگلہ دیش کی عوامی جدوجہد، ۱۹۷۰ء کے طوفان و سیلاب اور ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی پر انھوں نے متعدد جذبات انگیز اور پرجوش نظمیں لکھی ہیں۔ وہ اپنے دل کش شعروں کی پراسرار تصویر کشی اور تشبیہوں کی مدد سے حالات حاضرہ سے ابھرنے والے تمام جذبات و احساسات کو اپنے قاری تک پہنچاتے ہیں۔

عبدالمنان سید کو عصری دنیا کے حقائق سے کم دلچسپی ہے۔ کم سے کم بہ ظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے ان کا طریقہ اظہار عام طور سے تجریدی (Abstract) اور ماورائے حقیقت (Surrealism) ہوتا ہے۔ وہ اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ایک رومان پرست

ہیں اور ملارمے وربین اور ریمبوؔ جیسے فرانسیسی اشاریت پسندوں سے یقیناً متاثر ہیں۔ وہ پوری طرح ایک باشعور آرٹسٹ ہیں اور اپنے الفاظ اور پیکروں کو بالکل ہی غیر روایتی طور پر ایک نئے اور فرحت بخش مفہوم میں پیش کرتے ہیں۔

چھٹی اور ساتویں دہائی کے نوجوان شعرا میں رفیق آزاد (۱۹۴۳ء) مہادیو سہا (۱۹۴۴ء) نیوانلیندو گون (Nivanalendu Goon)... (۱۹۴۵ء) ابوالحسن (۱۹۴۷ء) اور داؤد حیدر (۱۹۵۲ء) کو پہلے ہی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ اور دیگر ابھرتے ہوئے نوجوان بنگالی شاعر اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں شاید زیادہ برہم، بے رحمانہ حد تک صاف گو اور تشکیک پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ملائم اور ریاکارانہ جذباتیت اور الفاظ کے ترنم محض سے اپنے آپ کو باز رکھیں جو پچھلی شاعری کے ایک بڑے حصّہ کی خصوصیت رہی ہے۔

افسانوی ادب کے میدان میں حقیقت پسندی کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ ابوالمنصور احمد (۱۸۹۸ء) ابوالفضل (۱۹۰۵ء) ابوجعفر شمس الدّین (۱۹۱۱ء) شوکت عثمان (۱۹۱۷ء)، سید وحید اللہ (۱۹۲۲ء)، سردار زین الدین (۱۹۲۳ء)، رشید کریم (۱۹۲۵ء) شید اللہ قیصر (۱۹۲۶ - ۱۹۷۱ء)، ابواسحٰق (۱۹۲۶ء) شمس الدین ابوالکلام (۱۹۲۶ء) اور علاءالدین الآزاد (۱۹۳۲ء) جیسے ادیبوں نے بنگلہ دیش کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی ایمان داری سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کے موجودہ حقائق ہی اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ سیلاب اور قحط کے مصائب، ظالم زمین داروں اور بڑے جاگیر داروں یا مہاجنوں کے ہاتھوں غریب کسانوں کا استحصال اور ہر طرح کی ناانصافی سے پاک ایک نئی زندگی سے متعلق کسانوں اور مزدوروں کی آرزو دیکھیں اور امنگیں نیز لوٹ کھسوٹ کے خلاف ان کی منظم مقاومت اور کھلا احتجاج —— یہی وہ موضوعات ہیں جو ان ناول نگاروں کو زیادہ عزیز ہیں۔ زین الدّین کا ناول " امید بیٹھوں کی " (۱۹۶۶ء) ابوالفضل کا "سرخ سویرا" (۱۹۵۷ء) علاءالدین آلآزاد کا " بھوک اور امید" (۱۹۶۴ء) اور ابواسحٰق کا " آفت زدہ گھر" (۱۹۶۱ء) اس کی اچھی کتابیں ہیں۔ بنگلہ دیش کے ناولوں اور کہانیوں میں جہاں حقیقت پسندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہیں علامتی اور ڈرامائی رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔

شوکت عثمان بنگلہ دیش کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے ہیں۔ وہ ناآسودہ طبقہ کے بارے میں گہرے احساس کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ان کا قلم اس سماجی نظام کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے، جس کی تباہ کاریاں ہر دفعہ نیا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ سماج کی برائیوں کے بے نقاب کرنے میں وہ طعن و طنز کے چبھتے ہوئے نشتر چلاتے ہیں۔ ان کی تحریر کا رنگ، گو عموماً حقیقت پسندانہ ہوتا ہے تاہم وہ بڑی چابک دستی سے علامتوں اور اشاروں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کا مشہور انعام یافتہ ناول "غلام کی ہستی" (۱۹۶۲ء) اس کی بہترین مثال ہے۔

سید ولی اللہ کئی لحاظ سے ایک انفرادیت پسند ادیب ہیں۔ " للاشالو" (درخت جس کی جڑیں نہیں ہیں) میں وہ حقیقت نگاری کے لفظی مفہوم کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ کرداروں کے نفسیاتی مطالعہ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس ناول میں توہمات اور جہالت سے پیدا ہونے والی برائیوں کا احساس اور اقدار کے بے جا استعمال کا خوف برابر پیچھا کرتا رہتا ہے۔ اس کے مرکزی کرداروں کی پر اسرار داخلی دنیا کے نفسیاتی مسائل سطحی نہیں بڑے ہی گہرے ہیں اور ایک ایسی فضا جو موضوع کے حسب حال ہے بڑی کامیابی سے پیش کی گئی ہے۔ اسی لیے ناول کی اشاریت اور علامتی مضمرات بڑے معنی خیز بن جاتے ہیں۔ اپنے بعد کے ناولوں —— " چاند کی تاریکی " (۱۹۶۴ء) اور " رو دیا، رو" (۱۹۶۸ء) —— میں ولی اللہ نے رمز و اشاریت کے اسی طریق کو مزید آزمایا ہے اور " شعور کی رو" اور " وجودیت پرست " (Existentialist) ناولوں کی تکنیک سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ (۱۹۷۴ء) میں ان کی موت نے بنگالی ادب کو ایک عظیم ناول نگار سے محروم کر دیا۔

علاءالدین آزاد بھی زیادہ تر غریب اور ناآسودہ طبقہ کے مسائل ہی کو موضوع بناتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا تعلق شوکت عثمان ہی کے اسکول سے ہے۔ سماجی تنقید اور عصری مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی ان کی تحریر کی خصوصیت ہے تاہم ان کا کارگر حربہ طنز نہیں ہے۔ آزاد کی ہمدردیاں ہمیشہ جوشیلے انقلابی کے ساتھ رہی ہیں۔ سماجی برائیوں سے متعلق ان کی برہمی بعض اوقات آرٹ کے دائرے سے گزر کر پروپگنڈے کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے لیکن ان کی بہترین کہانیوں میں یہ نقائص نہیں پائے جاتے بلکہ ایک اچھے حسن کار اور باشعور مفسر حیات کی تمام خوبیاں ان سے اجاگر ہوتی ہیں۔

" ملاح کی بیوی " اور " وہ آخری سانس تک لڑنے والا مجاہد " (۱۹۶۵ء) کا مصنف شاہد اللہ قیصر انتہائی فعال اور متحرک ادیب ہے جس کے ناولوں میں ایک رزمیہ کی سی وسعت پائی جاتی ہے۔ بنگلہ دیش میں بہت کم ناول اس پیمانے، پھیلاؤ اور گہرائی کے لکھے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے شاہد اللہ کی زندگی کا دسمبر (۱۹۷۱ء) میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران خاتمہ ہو گیا۔ دیگر ناولوں میں جن کا کینوس بہت وسیع و عریض ہے ابوجعفر شمس الدین کا " پدما میگھنا جمنا " (۱۹۷۴ء) اور سردار جمیع الدین کا "محبوس روشنی" قابلِ ذکر ہیں۔

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے تجربوں سے کئی کہانیاں اور ناول نکلے ہیں ان میں مرحوم انور پاشا (۱۹۲۱ - ۱۹۷۱ء) کا ناول " بندوق، روٹی اور عورت " (۱۹۷۳ء) اور شوکت عثمان

کا " ننگا جنگل " اور " دوسپاہی " (۱۹۷۳ء) قابلِ ذکر ہیں ۔ ان ناولوں میں پاکستانی فوج کے ہاتھوں بنگالیوں کے قتلِ عام، کنٹمنٹ کے قید خانوں اور قحبہ خانوں میں محبوس جوان بنگالی عورتوں کی حالت زار اور آزادی کے متوالوں کی شاندار لڑائیوں کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

بنگلہ دیش کے افسانہ نگاروں میں حسن عزیز الحق (۱۹۳۱ء) اور برہان الدین خان جہانگیر (۱۹۳۶ء) خاص طور سے تذکرہ کے مستحق ہیں ۔ ان کی بعض کہانیاں گہرے شعور، شدتِ احساس قدرتِ بیان اور جزئیات کو فن کارانہ طور پر استعمال کرنے کی اچھی مثالیں ہیں خاص طور سے حسن عزیز الحق کو دیہات کی بولی پر بڑا عبور حاصل ہے ۔ ان کے دیہاتی کردار جو قسمت کے کسی نہ کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں بڑے ہی جاندار ہیں، ان کا پیچ دار لیکن انتہائی پر اثر طرزِ بیان قارئین کے ایک بڑے طبقہ سے دادِ تحسین پا چکا ہے ۔

پرانے ڈرامہ نگاروں میں جو مسلم نشاۃ ثانیہ اور "پان ——— اسلامیت" کے تصورات سے متاثر تھے ۔ ابراہیم خان (۱۸۹۴ء) اور شہادت حسین (۱۸۹۳ - ۱۹۵۳ء) ممتاز مقام رکھتے ہیں، تاہم فنِ ڈرامہ کے لحاظ سے ان کے کارنامے زیادہ توجہ کے مستحق نہیں قرار پاتے کیوں کہ انھوں نے پیامِ اسلام کو محض ایک پیام کی طرح پیش کیا ہے ۔ ان کی پیش کشی میں حسن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں ہوتا ۔

پانچویں اور چھٹے دہے کے ممتاز تمثیل نگار نورالمومن (۱۹۰۸ء) منیر چودھری (۱۹۲۵ - ۱۹۷۱ء)، شوکت عثمان اور انیس چودھری (۱۹۲۹ء) ہیں ۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر گرد و پیش کے حالات اور حقیقت پسندانہ موضوعات پر مبنی ہیں ۔ اکثر ڈراموں میں سماجی احتجاج کا پہلو بہت نمایاں ہے اور قارئین تک اپنے پیام کو پہنچانے میں طنز کا سہارا لیا گیا ہے ۔ نورالمومن ایک باشعور فن کار ہیں ان کے ضلع جگت اور لطیفوں میں گو بعض اوقات سطحیت پائی جاتی ہے تاہم ان کے بیشتر لطیفے اپنی ضو فشانی اور جگمگاہٹ سے ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی ۔

جب بنگلہ دیش نے جنگِ آزادی کے دوران پاکستان کی قبضہ گیر فاشسٹ فوجوں کے ہاتھوں منیر چودھری کو کھو دیا تو واقعی وہ ایک غیر معمولی صلاحیتوں کے ڈرامہ نگار سے محروم ہو گیا ۔ چودھری کے ڈرامے بہت ہی مربوط ہیں، مکالمے شگفتہ اور موضوع و مضمون کے اعتبار سے بہت ہی آزاد خیال، وسیع المشرب اور انسانیت نواز ہوتے ہیں ۔ ان میں مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے کبھی تو تیز و تند لہجے میں اور کبھی طنزیہ انداز میں اور کبھی قہقہہ کی شکل میں ۔ اپنے عظیم الشان یک ایکٹی ڈرامہ " قبر " میں جو (۱۹۵۲ء) کی بنگالی زبان کی تحریک کے پس منظر میں لکھا گیا تھا انھوں نے اس قولِ محال کو ظاہر کرنے کے لیے کہ موجودہ ناکارہ سوسائٹی میں بعض زندہ افراد مُردوں سے زیادہ مردہ ہوتے ہیں ۔ اظہاریت (Expressionism) کی تکنیک کا جا بجا بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے ۔

چھٹے اور ساتویں دہے کی عوامی تحریک ۱۹۷۱ء کی جنگِ آزادی اور پھر ملک کی سیاسی آزادی نے بنگلہ دیش کے ادیبوں کو یہ سبق سکھایا ہے کہ ادب کے میدان میں مذہب اور قومیت کے مسائل پیش کرنا ایک ایسا عمل ہے جس میں زیادہ بالغ نظری اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اب وہ سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم کے تصورات اور ان کے مضمرات سے بھی آشنا ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض گوشوں سے، کبھی کبھی باغیانہ اور طنز آمیز انداز میں ایک بھیانک تصور پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم آج کے بنگلہ ادب کا غالب رجحان زندگی کی تردید نہیں توثیق ہے ۔ ایک انکاری رویہ اور رجعت پسند مایوسی کے بجائے زندگی کو قبول کر کے اس کے مسائل کو نپٹنے کا ایک محتاط رجائی جذبہ پایا جاتا ہے ۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد صنف ڈرامہ کے علاوہ دوسرے اصنافِ ادب میں بھی ایک نئی قوت اور توانائی پیدا ہوئی ہے ۔ فکر و فن، اظہار و معانی اور مواد و ہیئت میں ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ ابھر رہا ہے ۔ سلیم الدین، عبداللہ المامون، رشید حیدر اور علی ذاکر صنف ڈرامہ نگاری میں اسی نوع ادب کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

پراکرت اور سنسکرت زبان و ادب

پراکرت

پراکرت کا لفظ " پرکرتی " یعنی فطرت سے مشتق ہے ۔ بہت سے علما سمجھتے ہیں کہ پراکرت زبان شمالی ہندوستانیوں کا اصلی طرزِ بیان ہے ۔ اور سادگی کو مٹانے والی سنسکرت زبان بعد میں آئی جو حقیقی معنی میں نفیس ہے اور تہذیب کا رنگ و روغن رکھتی ہے ۔ مگر دونوں زبان اور ادب کے مشترکہ اجزا پر غور کرنے کے بعد دوسرے علما یہ خیال کرتے ہیں کہ پراکرت، سنسکرت زبان سے حاصل کی ہوئی یا اس کی عام طور پر رائج صورت ہے ۔ چنانچہ پراکرت کا ایک بہت بڑا اجینی ماہرِ صرف و نحو ہیم چندر اس نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے ۔ اس کے باوجود بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پراکرت

اور سنسکرت دونوں زبانوں کی صورتیں برابر ایک ساتھ بولی جاتی رہی ہیں۔ البتہ ایک عام لوگوں کی بولی تھی اور دوسری اونچی ذات کے چند منتخب لوگوں کی بولی تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں سنسکرت ڈراموں سے ملتا ہے جہاں خواتین اداکار ناچ سیکھنے والی ناخواندہ طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور نوکر چاکر تو کسی تخصیص کے بغیر پراکرت ہی بولتے تھے۔ مہاتما بدھ اور مہابیر نے اپنی تعلیمات کو مقبولِ عام بنانے کے لیے اردھ ماگدھی اور پالی میں پیش کیا ہے۔ لیکن برہمنوں کی تمام تصانیف سنسکرت میں ہیں۔ یہ بات ہمیں نویں صدی میں سنسکرت ڈرامہ نگار اور ناقد راج شیکھر سے معلوم ہوتی ہے۔ سنسکرت اور پراکرت مذکر اور مونث کی طرح ہیں کہ ایک میں مردانگی ہے اور دوسرے میں نزاکت۔

نیمی سادھو کا خیال ہے کہ سنسکرت اور پراکرت میں اگرچہ ۹۵ فی صد الفاظ اپنی اصل میں مشترک ہیں۔ اور صرف و نحو کے لحاظ سے ان کا استعمال بھی وہی ہے۔ اس کے باوجود پراکرت عام لوگوں کی ابتدائی زبان ہے۔ یہاں تک کہ سب سے قدیم ادب یعنی ویدوں میں بھی پراکرت کے الفاظ اور ان کی شکلیں موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سنسکرت کی اصطلاح کا ذکر پانینی کی تصنیف "شکشا" میں کیا گیا ہے۔ یہ تو بہت بعد کی تصنیف ہے جس میں متعدد پراکرت الفاظ کا اندراج ہے۔ ہندوستانی زبان میں آج کل جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے لفظ پراکرت سے حاصل کیے ہوتے ہیں۔ مثلاً پانی، گھور، چھری، پتھر، کتا، بیل، باڑی وغیرہ۔ دراصل بہت سے علما نے پراکرت پر سنسکرت کا اثر واضح کرنے کے لیے بے شمار مضامین تحریر کیے ہیں۔ لیکن سنسکرت کو پراکرت سے کس قدر امداد ملی ہے اس کی وضاحت کے لیے ابھی کافی تحقیق کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ہرٹل کا خیال ہے کہ "پنچ تنتر" ابتداً پراکرت میں لکھی گئی تھی۔ کہانیوں کے سمندر کا ایک حصہ "برہت کتھا" بھی پشاچی پراکرت میں لکھا گیا تھا۔

عام طور پر پراکرت زبان کو تین عہد میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پالی جس کا زمانہ بدھ کے زمانہ سے شروع ہو کر اوائلِ سن عیسوی تک ہے پراکرت کا زمانہ سن ایک عیسوی سے ۶۰۰ تک ہے۔ اپ بھرنش (مخلوط) کا زمانہ ۱۱۰۰ تک ہے۔ بھارت کے مطابق اس کی سات قسمیں شمار کی گئی ہیں۔ شور سینی، ماگدھی، اردھ ماگدھی، داکشی ناتیہ، داہ لیکی، اونتی، پرچیہ صرف و نحو کے ماہر چاندا نے اس میں مہاراشٹری، پشاچی اور اپ بھرنش کا اضافہ کیا ہے۔ وررو چی نے مہاراشٹری صرف و نحو پر (۹) باب لکھے ہیں اور تین باب پشاچی، ماگدھی اور شور سینی کے لیے مختص کیے ہیں۔ ساہتیہ درپن میں بارہ قسم کی پراکرت کا ذکر ہے جس میں مذکورہ بالا کے سوا شاکری، ڈراویڈی، ابھیری اور چانڈالی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لیکن بعد کی تصانیف میں یہ تعداد مزید توسیع میں (۱۶) سے (۲۷) تک ہو گئی ہے۔ لیکن زبان کی ان تمام شاخوں میں پانچ پراکرت زبانیں اچھے ادب سے مالا مال ہیں۔ اور دوسری شاخوں کے متعلق بھارت میں کہا گیا ہے کہ چالاک اور مکار لوگ اونتی، داہ لیکی وغیرہ کو استعمال کرتے تھے۔

مہاراشٹری یہ بہت ہی معیاری پراکرت تھی۔ ڈنڈن نے اس کو بہترین پراکرت کہا ہے۔ ادبی پراکرت کی (۸۰) فیصد کتابیں اس زبان میں ہیں۔ پانچویں اور چھٹی صدی میں یہ پراکرت بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس پراکرت کے ایک نمونے کو ہرمن جیکوبی نے جین مہاراشٹری کہا ہے۔ پہلی صدی کی اس کی سب سے قدیم صورت ایک کتاب "واسدیو ہنڈی" میں ملتی ہے ("واسدیو ہنڈی" میں ایک اصلی متن ہے جو ہمبرگ میں موجود ہے جس کو حال ہی میں بمبئی کے ڈاکٹر جگدیش چندر نے شائع کیا ہے) آٹھویں صدی کی رزمیہ نظم "پ اُم چرِ اُ" میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ مہاراشٹری پراکرت میں، نظم میں اور دوسری کتابیں بھی ہیں۔ مثلاً سیتو بندھ، گتھا سپت شتی، وج جالگا اور راون واہو وغیرہ۔

شور سینی متھرا کے نزدیک شتروگھن کی سلطنت میں یہ زبان بولی جاتی تھی جو برج بھاشا کا ماخذ ہے۔ جس سے جدید ہندی حاصل ہوئی ہے۔ جغرافیہ کی رو سے مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کو یہ فوقیت حاصل ہوئی ہے کہ اس نے ازمنہ وسطیٰ کے آرین کی وراثت حاصل کی ہے اب تو یہ زبان بہت کم بولی جاتی ہے۔ صرف چند ڈراموں میں استعمال ہوئی ہے وہ بھی نثر میں۔ ڈگمبر جینی ادب بھی اس زبان میں موجود ہے۔ اس لیے اس کو ڈگمبری کہتے ہیں۔ شور سینی زبان سنسکرت سے بہت نزدیک ہے۔ مثال کے طور پر چند مشترک الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔

سنسکرت	شور سینی	مہاراشٹری
پیشن	پسن	پہن
آریا	ایا۔ اجا	اج
سوریا	سوتیا۔ سوجا	سوجا
اتما	اتا	اپا
ناتھ	نادہ	ناہ

ماگدھی یہ زبان مشرقی بہار میں بولی جاتی تھی اور جدید "ماگدھی" اس سے حاصل ہوئی ہے۔ بدھ نے اپنی تعلیم کی اشاعت کے لیے اس زبان سے مدد لی تھی۔ اس کی قدیم شکل کو پالی کہا جاتا ہے۔ اشوک کی سلطنت میں تمام ریاست کی یہی زبان تھی۔ اس کے نشانات شمالی اور مشرقی فرمانِ حکومت کے پتھروں پر پائے جاتے ہیں۔ سنسکرت ڈراموں میں یہ زبان محلات میں ملازمین سے کہلائی جاتی ہے۔ شراب کی دکان والے اسے بولتے ہیں، گھوڑوں کی حفاظت کرنے والے بولتے ہیں، اسلحہ ساز بولتے ہیں اور دو جُوا کھیلنے والوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے جس کو دھکی کہتے ہیں۔ "مرچھ کٹک" ناٹک سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بعض لوگ شاکری اور چانڈالی بلکہ شاکری کو بھی اس کی ذیلی شکلیں سمجھتے ہیں۔

اردھ مگدھی اس میں شورسینی اور ماگدھی کی صرف ونحو کی خصوصیات ہیں۔ اس لیے اس کو آدھی مگدھی کہتے ہیں۔ اودھ اور بھوج پور میں یہی قدیم زبان بولی جاتی تھی۔ مہابیر کی تعلیمات کی ترتیب اور تدوین اسی زبان میں کی گئی ہے۔ اس ادب کو اچرنگ سوتر یا اگم کہتے ہیں۔ یہ جینی اردھ ماگدھی کی قدیم شکل ہے۔ لیکن اس کی جدید شکل ڈراموں میں استعمال کی جاتی ہے۔ نظم اور نثر میں استعمال ہونے والی اردھ ماگدھی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ابھی دہان راجیندر ایک یادگاری قاموسی کتاب لغت ہے جس کو راجیندر سوری نے سات جلدوں میں تصنیف کیا ہے۔

پشاچی اس کی اصلی صورت کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ ۸، ۶ میں گن دیہہ، شالی واہن یا ستواہا نل کے دربار میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے اصلی برہت کتھا کی تصنیف کی تھی۔ اس کے بعد کے زمانہ میں آنے والے سنسکرت شعرا مثلاً بان، سوبندھو، ڈنڈن وغیرہ نے اس کا ذکر بڑی عزت سے کیا ہے۔ مختلف مصنفوں نے اس ناپید زبان کے مختلف بیانات دیئے ہیں۔ بودھوں کی بعض ستھاویروادی کتابیں اس زبان میں تھیں۔ "ڈش رویک" کہتا ہے کہ یہ زبان نیچی ذات کے لوگوں میں بولی جاتی تھی۔ واگ بھٹ کہتا ہے کہ یہ تین قسم کی تھی جیسی کہ بلوچستان میں بولی جاتی تھی (پنچال) پنجاب میں بولی جاتی تھی اور مغربی اترپردیش میں بولی جاتی تھی۔ ہارنل کا خیال ہے کہ پشاچی تو دراوڑی زبان ہے۔ مترم ہیرس بھی دراوڑی (تامل) اور براہوئی (بروہی) میں مماثلت کی تائید کرتے ہیں۔ اس زبان کی چند مثالیں فرمان حکومت کے پتھروں پر چینی ترکستان میں، کفرستان اور گندھار (کندھار) میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دنگل میں اس کا بچا کچا حصہ ہو۔ اس لیے کہ پرتھوی راج راسو (قدیم راجستھان) کے قبضہ میں کچھ پشاچی حصے تھے۔ اسی طرح ہندی مہاراج کے قبیلے سے متعلق نظم میں لکھی ہوئی تاریخ کے کئی ایک باب ہیں۔ اس زبان میں دراوڑی حرف صحیح (ळ) "لا" یا "ڑا" (ड़) کا استعمال ہوتا ہے جو ہندی زبان میں نہیں ہے۔ البتہ مرہٹی، اڑیہ، قدیم راجستھانی اور ابتدائی سنسکرت میں ہے۔

پراکرت کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں بہت سی دیسی زبانیں اس قدیم دلچسپ زبان کی خاص خاص شاخوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ ذیل میں دی ہوئی پراکرت زبانیں تاریخی طور پر ان تمام زبانوں کا سرچشمہ ہیں۔ جن کا ذکر ان کے کالم کے تحت کیا گیا ہے۔

ماگدھی	اردھ ماگدھی	شورسینی	مہاراشٹری
بنگالی	مغربی بہاری	مغربی ہندی	
اڑیہ	اور	(برج بھاشا،	مرہٹی
آسامی	مشرقی ہندی	کھڑی بولی)	گجراتی
مشرقی بہاری	(بھوج پوری،	راجستھانی	(بعض لوگ
مگہی و	اودھی،	پنجابی	اس کو گوجری
میتھلی۔	چھتیس گڑھی)	پہاڑی۔	پراکرت سے منسوب
		شورسینی اور	کرتے ہیں)۔
			بعض لوگ مالوی
		پشاچی مل کر	کو آونتی پراکرت سے
			منسوب کرتے ہیں۔
		لہندا	
		سندھی	
		(بعض لوگ سندھی	
		کو وراچڑ سے	
		منسوب کرتے ہیں)۔	

پراکرت کے مطالعہ سے ہمیں ہزار سال کے ابتدائی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ، مذہب، سماجی نظام، سیاسیات، فن اور ثقافت کے مسائل کا حال معلوم ہو جاتا ہے اس عہد کے بہت سے قصے اور روایات، درباروں کے حالات، بادشاہوں کا شمار اور فرمان حکومت وغیرہ سب پراکرت زبان میں ہیں۔ یہ کشمیر سے لے کر سری لنکا تک پھیلے ہوتے ہیں اور اشوک کے تاریخی دور سے بارھویں صدی عیسوی تک استفادہ کے لائق ہیں۔ ان سے لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور عام لوگوں کی تہذیب پر روشنی پڑتی ہے۔ بہت سی پراکرت مذہبی کتابیں بودھوں اور جینیوں کے مذہبی قواعد کے متعلق ہیں اور اس طرح غیر برہمنی فکر کا بیش قیمتی تاریخی دستاویز ہیں غیر مذہبی پراکرت ادب کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

فن شعر نظم میں لکھی ہوئی غیر مذہبی احکام کی جینی کتابوں میں زیادہ تر فلسفیانہ تفسیروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بھدر باہو کی "نج جکتی"۔ (۳۶۵ ق۔م) اشیلانک کی "ورتی" (۸۶۲ عیسوی) اور جن پربھا شوری کی "تیرتھ کلپ" (۱۳۳۱ عیسوی) ان کتابوں کی تفسیریں نثر میں بھی موجود ہیں۔ جینی مصنفوں نے نظم میں کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں بے حد دلچسپ "پ اُم چریا" (پدم چرت) اس کی اساس جینی رامائن پر ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رام کی ۸۰۰ رانیاں تھیں اور لچھمن کی ۱۳۰۰ رانیاں۔ اور راون کی ۶۰۰ رانیاں تھیں۔ ہنومان نے راون کی بھتیجی اننگ کسما سے شادی کی تھی۔ یہاں سیتا آگ میں سخت آزمایش کے بعد جینی راہبہ بن جاتی ہیں۔ رامائن کی اساس پر "سیتو بندھ" ایک بہترین رزمیہ نظم ہے۔ لیکن اس کے مصنف کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ڈاکٹر ایس۔ کے۔ ڈے خیال کرتے ہیں کہ یہ پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہوگی۔ "گوڈوہو" دسویں صدی عیسوی کی ایک تاریخی رزمیہ نظم ہے "گتھا سپت شتی" (۶۹ عیسوی) منتخب کلام کے طور پر بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا مصنف ہال ہے۔ لیکن اس میں اور بھی شاعروں کے کلام موجود ہیں "وجالگ" بھی ۷۰۰ اشعار کا مجموعہ ہے۔

ڈرامہ علما کا خیال ہے کہ پراکرت میں چند ڈرامے اور ایک ایکٹ کے ناٹک ابتدائی طور پر موجود تھے اور بعد میں اس کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بعض

جو پشلے لوگ بہت مشہور مرہٹی اور بنگالی ڈراموں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے ہیں۔ اشوگھوش کے زمانہ ۱۰۰ ء میں "ساری پتر ہرکرن" کے ناٹک میں نہایت ابتدائی اور دستیاب شکل کی پراکرت استعمال کی گئی ہے۔ بھاس کے دو ڈراموں میں بہت زیادہ پراکرت استعمال کی گئی ہے۔ کالی داس کے ڈراموں میں مچھیرے، پولیس کے حکام، نقال، بچے اور عورتیں پراکرت زبان استعمال کرتے ہیں۔ سری ہرش کے ناٹکوں میں بھی بہت پراکرت ہے۔ ناگانند کے کھیلوں میں تقریباً نصف اداکار پراکرت استعمال کرتے ہیں۔ سٹک کے ڈرامے تو پراکرت میں خاص طور پر عوام کے کھیل کہلاتے ہیں۔ ان میں سب سے بہتر "کرپور منجری" ہے۔

افسانہ اور مختلف نثر

پنچ تنت اور کنو کناد چاریہ یہ دونوں مشہور جینی فلسفی ہیں۔ اخلاقیات پر ان کی تصانیف مستند سمجھی جاتی ہیں۔ جینی علما نے فکشن اور سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں ادیوتم سوری کی "کوالیہ مالا کتھا" آٹھویں صدی میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب سے ان دونوں کی سماجی زندگی کا حال اچھی طرح اخذ کیا جا سکتا ہے۔ سدھ رسی (۹۰۶ عیسوی) اور ادیوتم (۷۷۹ عیسوی) یہ دونوں ہری بھدر سوری (۷۰۰ - ۸۰۰ عیسوی) کی لکھی ہوئی راجہ سمرادتیہ کی ۹ سوانح حیات "سمرائچھا کتھا" کی موثر قوت کا ذکر کرتے ہیں۔ اس مصنف کی لکھی ہوئی ایک ظریفانہ کتاب "دھورتا کھیان" ہے۔ "کتھا کوشس" (۳۶ کہانیاں ۱۰۵۰ء) مصنفہ چنے سار اور "کتھا مہودھی" (۵۷ کہانیاں) مصنفہ سوم چندر دونوں بہت دلچسپ ناصحانہ کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ایک نیم مذہبی ناول "ترنگاوتی" مصنفہ پلت سوری (اس کتاب کے جزو کے طور پر (اب ۱۶۴۳ اشعار محفوظ ہیں) یہ پانچویں صدی کی پیداوار ہے۔ "ستررسندری چرت" کو دھنے سر ۱۰۶۸ء میں تصنیف کیا ہے۔ "کالکا چاریہ کتھانک" ایک چھوٹا ناول ہے۔ آدھی نظم اور آدھی نثر ہے۔ اس کی اساس دسویں صدی کے تاریخی واقعات ہیں۔

پراکرت کا استعمال چودھویں سے اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔ سنسکرت میں طویل کہانیاں یا ناول بہت کم ہیں۔ لیکن پراکرت میں بہت زیادہ ہیں۔ علما خیال کرتے ہیں کہ "برہت کتھا" تامل "پیردم کتھائی" اور "پنچ تنتر" کا ماخذ ہے۔ ہندی میں صوفی مجازی رزمیہ نظموں کی اساس پراکرت کے افسانوں پر ہے۔ جدید علم عروض اور نظم کی شکلوں میں پراکرت کا حصہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

سنسکرت

اگرچہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی مردم شماری میں ۵۵۵ اشخاص نے اپنی مادری زبان سنسکرت درج کروائی تھی۔ لیکن یہ تعداد ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے وقت ۲۴۵۵ ہو گئی۔ سنسکرت ہندوستان کی قدیم زبان ہے جس میں ہندوؤں کا بہت سا مذہبی اور فلسفیانہ ادب تصنیف کیا گیا ہے۔ آج بھی یہ مستند زبان ہے اور ہر سال اس زبان میں مختلف رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ گزشتہ ۲۲ سال میں دس سے زیادہ فاضل عالموں کو ساہتیہ اکیڈمی نے ان کے قابل قدر ادبی تصنیف کی بنا پر خاص عزت عطا کی ہے۔ ان علما میں ایسے بزرگوں کے نام داخل ہیں، جیسے پی۔ وی کانے، اگر دھر شرما چترویدی۔ گوپی ناتھ کوی راج۔ وی راگھون۔ ستیہ ورک شاستری ایم ایس آنے وغیرہ؟

حکومت ہند نے وزارت تعلیمات کے تحت سنسکرت کے ایک مرکزی بورڈ کی تشکیل کی ہے جس سے تصنیف و تالیف کی اشاعت اور روایتی علوم کے مدارس کو امداد دی جاتی ہے۔ سنسکرت کی جامعات وارانسی اور دربھنگہ میں ہیں، اور پونا و شانتی نکیتن میں اعلیٰ تعلیم کے مخصوص مرکز قایم ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ جواہرلال نہرو نے بالکل صحیح کہا تھا "اگر مجھ سے دریافت کیا جاتا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی دولت کیا ہے اور ہندوستان کی وراثت میں ہمیں کیا ملا ہے تو میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ یہ وراثت سنسکرت زبان اور سنسکرت کا ادب ہے اور تمام دولت اس کے اندر ہے"۔

ذیل کے صفحات میں اس وسیع سمندر کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جس کو نہ مکمل کہا جا سکتا ہے نہ جامع نہ محتوی؛ قدیم تصنیفوں اور ان کے مصنفوں کے معین زمانہ کے متعلق علما کی ایک رائے نہیں ہے۔ قدیم علم و فضل اور شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ زبانی روایات پر چلتا رہا۔ اگرچہ سنسکرت کی رزمیہ نظموں اور صرف و نحو کے ماہرین کی تصانیف بلکہ بودھوں کے کتابوں میں بھی حوالے پاتے جاتے ہیں لیکن سب سے قدیم کتبہ جو کرنل پیپ کو پیپراوا میں ملا ہے وہ برہمن رسم الخط میں ہے اور پہلی صدی ق۔م میں پایا گیا ہے۔ پہلا دیوناگری کتبہ تو آئی ہول کا ہے۔ چند علما سمجھتے ہیں کہ پہلا سنسکرت کتبہ شاہ نہپان (۱۱۹ء) کے غار نمبر ۱۰ میں ہے۔ اور دوسرے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ردم دمن کا جوناگڑھ والا کتبہ سب سے زیادہ قدیم ہے۔ تمام شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی سنسکرت کا زمانہ ۱۸۰۰ سال سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔

عام طور پر سنسکرت زبان دو منزلوں میں بیان کی جاتی ہے۔ ویدک اور غیر ویدک (یہ بھی مستند ہے) ابتدائی سنسکرت بعد کی سنسکرت سے اپنے طریقہ تلفظ صرف و نحو کی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہے، حتیٰ کہ اسم کی گردان بھی مختلف ہے اور سابقہ اور لاحقہ کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ ابتدائی سنسکرت کی صرف و نحو سادہ اور لچکدار ہے۔ بعد کی سنسکرت ثقیل ہو کر مرکب الفاظ سے بھر گئی ہے۔ یہاں تک کہ نظم کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ ویدوں میں شاعری کی شکلیں صرف سات ہیں (گایتری، اُشنِک، انش تبھ، برہتی، پنکتی، ترشٹبھ، جگتی) بعد کی سنسکرت نے شعر کے اصلی نمونوں کے علم عروض کے لحاظ سے ارتقا پایا ہے، جس کی اساس الفاظ اور ان کے حرف علت ہیں۔ علما اس امر کے متعلق متفق نہیں ہیں کہ سنسکرت گفتگو کی زبان ہے یا نہیں اور کس زمانہ میں یہ ادبی زبان ہو گئی یا صرف مذہبی رسوم کی ادائیگی کی زبان بن پائی۔ والمیکی رامائن کے سندر کانڈ میں یہ ذکر

آیا ہے کہ برہمن یا " دوجاتی" لوگ سنسکرت بولتے تھے ۔ یاسک
اور صرف ونحو کے ماہر پانینی نے غیر مذہبی رسوم کی سنسکرت کو " بھاشا "
کہا ہے (جو بولی جاتی ہے) کاتیاین نے مشرقی اور شمالی گفتگو کے طریقوں
کی خصوصیات کو بیان کیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہابھارت کی
تصنیف کے زمانہ میں بلکہ پانینی کے زمانہ تک ہندو سماج ایک بالکل
کھلا ہوا سماج تھا اور برہمن اور غیر برہمن ایک مشترک زبان استعمال
کرتے تھے ورنہ ترسیل اور میل جول ناممکن ہوجاتا۔ لیکن منو کی ایسی قانون
سازی کے بعد کہ شودروں اور عورتوں کو سنسکرت نہیں سیکھنا
چاہیئے ۔ سماج نے آہستہ آہستہ ایک دوسری خصوصیت اختیار کرلی اور
ہرش وردھن (نویں صدی) کے زمانہ تک جب کہ سنسکرت بہت
پیچیدہ اور مزین ہوگئی تھی اور دوسری ملکی زبانیں ترقی پارہی تھیں
توسنسکرت بتدریج "چند منتخب" افراد کی زبان ہوکر رہ گئی اور ابھی
تک یہ اسی طرح ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ملک میں (..) فی صد
ناخواندہ لوگوں کے ساتھ انگریزی جاننے والے زیادہ ہیں یا سنسکرت
جاننے والے ۔ دراصل سنسکرت جاننے والے لوگ بہت کم ہیں۔

وید

سب سے زیادہ قدیم اور ابتدائی ادب وید ہے ۔
وید "ود" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں " علم "
ان میں منتر ہیں جن کو پڑھ کر مذہبی رسوم میں دیوتاؤں کو بلایا جاتا
ہے جن کتابوں میں ایسی قربانیوں یا (یگیوں) کے قواعد و ضوابط بیان
کیے گئے ہیں ان کو " برہمن " کہتے ہیں ۔ ان کے مزید تین حصے ہیں ۔ برہمن
ارنیک اور اپنشد' آرنیکوں میں ان گوشہ نشین اشخاص کے روزانہ
فرائض کا ذکر ہے جو جنگلوں میں خاموشی اور خلوت پسندی کے
طلبگار ہوتے ہیں ۔ اپنشد تو بلند تر نظری اور فلسفیانہ منتروں اور
مابعدالطبیعیاتی مکالموں سے بھرے ہوتے ہیں ۔ ان سب میں خدا
(برہمہ) کے لیے انسان کی تلاش کی تشریح اور رہبری کی گئی ہے ۔
اس کے علاوہ "کلپ سوتر" میں جو یگیہ اور مذہبی رسوم میں کرنے
اور نہ کرنے کے احکام کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔ اس کی بھی چار
قسمیں ہیں (شراوت، گیری ہیہ، دھرم، شلب)۔
وید چار ہیں ۔ رگ، یجر، سام، اتھروے رچا یا منظوم منتر سے رگ
حاصل کیا گیا ہے اور یجن یا آگ کے ساتھ قربانی سے یجر حاصل ہوا ہے ۔
سام کا مطلب ہے موسیقی ان کے علاوہ چوتھے کو اتھر وید کہتے ہیں
اتھرون آگ کے پروہت کا خطاب ہے ۔ اس وید میں کالے جادو
کے منتر ہیں اور دنیاوی فوائد کے عقیدے سے بیان کیے گئے ہیں ۔ ویدوں
کی مزید متعدد شاخیں ہیں ۔ سب سے قدیم موجودہ رگ وید کے متن
میں ۱۰ منڈل یا باب ہیں اور ۱۰۱۷ "باب" "سوکت" یا نظمیں
ہیں ۔ دوسرے سے ساتویں منڈل تک کا حصہ سب سے قدیم ہے ۔
ہر ایک باب ایک خاص رشی سے متعلق کیا گیا ہے ۔ پہلا اور دسواں
منڈل بعد کے معلوم ہوتے ہیں ۔ آریہ سماج کے عقیدہ کے مطابق
وید ہی آخری سند ہے اور یہی ہندوؤں کی الہٰی کتاب ہے ۔ مذہبی
قدر و قیمت کے علاوہ ویدوں میں بے حد نفیس شاعری ہے جو مختلف
دیوتاؤں مثلاً روشنی کے دیوتا، آگ کے دیوتا اور بارش کے دیوتا وغیرہ
کی شان میں کی گئی ہے۔ اسی طرح منڈل ۱۰-۱۰ میں یم اور یمی کے
درمیان ۱۰-۹۵ میں پرورو اور اروشی کے درمیان اور ۱۰-
۱۴۵ میں تقریر کی دیوی کی پکار بہت مشہور اور بے حد دلچسپ
اور عجیب و غریب مکالمے ہیں ۔ تخلیق کا سوکت (ناسدیہ سوکت)
۱۰-۱۲۱ بہت مستند ہے ۔ پرش سوکت ۱۰-۱۰ میں یہ حوالہ
دیا جاتا ہے کہ چار ذات بھی اس ذاتِ الہٰی کے چار اجزا ہیں۔

اپنشد

کتب خانہ اڈیار مدراس سے اپنشدوں کی اشاعت
ہوئی ہے جن میں ۱۹۸ اپنشد ہیں ۔ ان میں سے
ایک "اللہ اپنشد" بھی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب بعد کے زمانہ کی ہے ۔
ایک گجراتی مجموعہ میں ایسے ۲۲۳ اپنشد ہیں ۔ لیکن دس اپنشد
سب سے قدیم اور مستند مانے جاتے ہیں اور شنکر آچاریہ نے ان
کی تفسیر لکھی ہے ۔ ان کے نام ہیں ۔ ایشں، کین، کٹھ، پرشن، منڈک،
مانڈوکیہ، تیتریہ، ایتریہ، چھاندوگیہ، برہدارنیہ ۔ ان میں زیادہ تر
فلسفیانہ مباحث ہیں ۔ اخلاقی ضرب الامثال ہیں کچھ تمثیلات اور
مجازیہ قصے وغیرہ ہیں ۔ بعض جگہ اساسی سوالات دریافت کیے
گئے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی چھوٹی سے چھوٹی بات کی بھی وضاحت
کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک گرو اپنے چیلے کو ایک پھل چن کر لانے
کو کہتا ہے اس کو پھوڑنے کے لیے کہتا ہے اور دوبارہ توڑنے کے لیے
کہتا ہے اس میں بیج کے سوائے اور کچھ نہیں رہتا گرو اس بیج کو بھی توڑ
پھوڑ ڈالنے کے لیے کہتا ہے ۔ اس کے بعد اس میں کچھ بھی دکھائی نہیں
دیتا ۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ برہمہ سب میں پھیلا ہوا ہر جگہ
موجود ہے اور ہر ایک شے سے ماورا ہے جیسے کہ بیج ہی ہر ایک پہلو
سے درخت کا سب کچھ ہے ۔ یہاں صرف مذہبی رسوم ہی نہیں بلکہ
زیادہ تر تجزیہ فکر موجود ہے ۔
ان کتابوں کو مختلف رشیوں سے متعلق کیا جاتا ہے ۔ ان میں سے
بعض خواتین بھی ہیں مثلاً گارگی، کاتیاینی اور میترینی وغیرہ ان میں
خاص حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان میں چند گہری اور خالص صداقتوں کا اظہار
بہت ہی راست اور سادہ زبان میں ہوا ہے ۔ چنانچہ اس اپنشد کے
فقرے ہیں " صداقت کا چہرہ ایک سنہری نقاب سے چھپا ہوا ہے ۔
براہ کرم اس کو ہٹا دیجیے اور مجھے صداقت کا درشن کرا دیجیے "۔
" جو لوگ صرف مادی دولت کی جستجو کرتے ہیں وہ اندھی گلی
میں جاتے ہیں اور جو اپنے کو بالکل سپرد کر دیتے ہیں وہ اس سے بھی
زیادہ اندھی گلی میں جاتے ہیں " حکومت ہند کا اصول عمل " ستیہ میو
جیتے تے " (صداقت کی فتح ہوتی ہے) یہ بھی اپنشد سے لیا گیا ہے ۔ مہاتما
گاندھی کی روزانہ پرارتھنا میں ایش اپنشد داخل ہے ۔ ٹیگور نے اپنے
شانتی نکیتن کے اصول عمل کے لیے اپنشد سے ایک فقرہ لیا ہے " جہاں
کہ کائنات ایک آشیانہ کے مانند ہے " عام انسانوں کو پڑھنے کے
لیے سب سے بہترین کتاب آلڈس ہکسلے کا " دائمی فلسفہ " اور کرسٹوفر
ایشروڈ کا ترجمہ اپنشد ہے ۔ ہندوستانی مصنفوں میں سی راج گوپال

آچاریؔ اور ونوبا بھادے کی شایع کی ہوئی ایش اُپنشد کی تفسیر اور رادھاکرشنن کی خاص دس اُپنشد انگریزی زبان میں قابلِ قدر کتابیں ہیں ۔ ڈاکٹر رانا ڈے کی تصنیف تمام ہندی نظاماتِ فلسفہ کو اُپنشد کے اصل ماخذ سے ڈھونڈ نکالتی ہے ۔

سنسکرت ادب میں اُپنشد سے ہٹ کر دوسری اہم منزلیں والمیکی کی "راماین" اور ویاس کی "مہابھارت" ہیں ۔ ان دونوں میں سے کونسی کتاب ایک دوسرے سے پہلے لکھی گئی ہے اس کے متعلق علما متفق نہیں ہیں ۔ صدیوں تک ان دونوں کتابوں نے سینکڑوں شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کو بے حد نفیس مواد فراہم کیا ہے ۔ بھبھوتی کا صرف ایک المیہ ناٹک "اُتررام چرتر" اپنی بنیاد رام کے ضمنی قصّہ پر رکھتا ہے ۔

"مہابھارت" نے "شکنتلا" کے قصہ در قصہ کو استعمال کرکے کالیداس نے اپنے زندۂ جاوید ناٹک کی تصنیف کی ہے ۔ اور بھی ایسی کئی ایک مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ ویدک زمانہ کی ازلی حور اُروشی کے قصے سے کالیداس کو (وکرم اُروشی کے ناٹک) شاعرانہ وجدان حاصل ہوا ۔ ٹیگور نے بھی اس نام پر اپنی ایک نظم کی بنیاد رکھی تھی ۔ سری اروبندو نے انگریزی میں، دنکر نے اپنی رزمیہ نظم ہندی میں اور وی ایس کھانڈیکر کا مرہٹی ناول "یئیاتی" بھی پرانوں کے بزرگانِ دین کی سوانح پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں ۔ کل اٹھارہ پران اس وقت دستیاب ہیں ۔ ۶۶۰۰ کے بعد کے قبیلوں کا ذکر پرانوں میں نہیں پایا جاتا ۔ آخری بادشاہ جس کا ذکر آیا ہے وہ ہرش ہے ۔ اس طرح ان سب پرانوں کی تصنیف کے زمانہ کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے ۔ لوک مانیہ تلک کا خیال ہے کہ وہ دوسری صدی عیسوی کے قبل لکھے گئے ہیں ۔ پرگیتر سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے ۔ ڈاکٹر ہزرا نے ذیل کی تاریخیں مقرر کی ہیں ۔ وشنو پران (۶۴۰۰) وایو پران (۶۵۰۰) بھاگوت پران (۶۷۰۰ — ۷۰۰) کورم پران (۷۰۰) اگنی پران (۶۸۰۰) ڈاکٹر ایس کے ۔ ڈے اور بی ۔ وی ۔ کانے اگنی پران کے منظوم حصوں کی تصنیف کو (۹۰۰) صدی عیسوی کا بتاتے ہیں ۔ ان کتابوں سے کائنات کی ابتدا اور دیوتاؤں اور ان کی ترتیب و تنظیم کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ یہ سب اوتاروں کی کتھاؤں سے بھرپور ہیں ۔ ہندوستانی رزمیہ نظم کا تصور ارسطا طالیسی تصور سے مختلف ہے ۔ سنسکرت کے مطالعۂ شاعری کے مطابق رزمیہ نظم میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ۔ مثلاً (۱) آغاز میں شاعری کی دیوی سے طالبِ فیضان ہونا (۲) اس کو کئی ایک باب میں تقسیم کرنا چاہیے ۔ جنھیں "سرگ" کہا جاتا ہے (۳) ایسے باب ۴ سے ۳۰ تک ہو سکتے ہیں ۔ (۴) ہر ایک باب میں ۳۰ سے ۲۰۰ تک شلوک (اشعار) ہونے ضروری ہیں (۵) اس میں طلوعِ آفتاب، غروبِ آفتاب، ندی نالے، محبت سے پیار کرنے کی باتیں، مسرت سے سیر کرنے کے افکار اور چھ موسموں کا حال اور ایسی ہی باتیں ہونی چاہئیں (۶) قصہ میں پانچ سندھیوں کے فطری طور پر کھلنے کا ذکر ہونا چاہیے (۷) اس میں تمام خاص "رسوں" کو موجود ہونا چاہیے (۸) اس میں شعر کے مختلف وزن یا بحر کی ضرورت ہوتی ہے ۔

اشوگھوش کی لکھی ہوئی سب سے قدیم رزمیہ نظمیں "بدھ چرت" اور "سندر آنند" میں بدھ چرت کا ترجمہ ایڈون آرنولڈ نے کیا ہے اور اس کا نام "نورِ ایشیا" رکھا ہے ۔ دوسری اہم اور مستند رزمیہ نظمیں ان شاعروں کی ہیں جن کے نام ذیل میں درج کیے گئے ہیں ۔

کالیداس : میگھ دوت، رگھونش، کمار سمبھو، رتو سمہار ۔

بھاروی :	کیرات ارجنیہ
بھٹی :	راون ودھ
کمار داس :	جانکی ہرن ۔
ماگھ :	شِشوپال وَدھ ۔
سری ہرش :	نَیشدھ ۔

یوں تو اور بھی دوسری چھوٹی رزمیہ نظمیں ہیں ۔ لیکن کالی داس ان سب میں اپنی شاعرانہ بصیرتِ فن، موزوں تمثیلات، تخیلِ انسانی فطرت کی عکاسی اور قوتِ بیان کے باعث سب سے اعلیٰ درجہ کا ہے ۔ افسوس ہے کہ اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں ۔ علما نے اس کو پہلی صدی سے (سر ولیم جونس، ڈاکٹر پیٹرسن، ایس ۔ رائے بال سبرامنیم، ڈاکٹر بی ایس اپادھیائے) لے کر چوتھی صدی بلکہ پانچویں صدی یعنی گپتا کے عہد تک رکھا ہے ۔ (ڈاکٹر وی ۔ وی مراشی، ڈاکٹر سوریہ کانت وغیرہ ۔)

انگریزی میں کالی داس پر دو تصنیفیں مصنفہ ڈاکٹر وی ۔ وی مراشی اور ڈاکٹر بھگوت شرن اپادھیائے علم و فضل کے بہت اچھے نمونے ہیں ۔

تنتر اور بودھوں کی سنسکرت تصانیف

ہم جب رزمیہ نظموں، پرانوں اور تاریخ کی بحث کرتے ہیں تو سنسکرت کے علما ان تینوں کو کاویہ، اتہاس پران ایک سانس میں بیان کرتے ہیں ۔

ہمیں سنسکرت تصانیف کی ایک بہت اہم شاخ کو بھولنا نہ چاہیے جس سے آستک خیال کے لوگ احتراز کرتے ہیں ۔ لیکن مغربی علما نے اس کی طرف توجہ دی ہے ۔ اس لیے کہ اس میں فنِ لطیفہ کی جدید نفسیات کی بصیرت اور مذہب اور جنسیت کے متعلق فرائڈ کے بعد کے تصورات موجود ہیں ۔ اس کو تنتر کہتے ہیں ۔ جس کے معنی ایسے لفظ سے نکالے گئے ہیں جس کے معنی طریقِ عمل اور اصول ہیں ۔ گیان (علم) یوگ، کریا یا مشق یا اصولِ فن اور "چریا" یا روزمرہ کی مصروفیت یہ سب اس کی قسمیں ہیں جہاں تک کہ تانترک علم کے تصوف کے پہلو کا تعلق ہے ۔ اس کی مطابقت شنکر کے ادویت یا وحدت الوجود سے ہوتی ہے ۔ اس تصوف کے علاوہ ایک تقدیس اس سے متعلق کی جاتی ہے اور مذکر و مونث کے اتحاد کے اصول کی اچھی بنیاد کا اشارہ ملتا ہے ۔ یوگ تو زیادہ

تریکسوئی قلب کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ "تج" مادہ سے مشتق ہے۔ یعنی جذب ہوجانا۔ اس زبردست قوت کو حاصل کرنا گویا جادوگری کی حد تک شجاعت یعنی معجزہ، ادراک اور آٹھ سدّھیاں یا شان امتیاز حاصل کرنا ہے۔ اس لیے تنتر کو "مایا یوگ" بھی کہتے ہیں۔ "کریا" یا عمل میں مندروں کی تعمیر کے طریقے، مجسموں کو تراشنے کا کام اور دوسری مذہبی رسوم کی ادائے گی اور عبادت داخل ہیں، اور آخر میں تہواروں کے دستور اور بعض سماجی بلکہ غیر سماجی سلوک پر عقلیت کا رنگ چڑھا کر حق بجانب ثابت کیا جاتا ہے۔ بعض علما خیال کرتے ہیں کہ تانترک تحریک برہمنوں کے خلاف ایک کارروائی ہے۔ دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ابتدائی قبیلوں کی عبادت اور بودھوں کے وجریان کا اتحاد ہے۔ تانترک عملیات نہ صرف بنگال، آسام اور متھلا میں مقبول ہوئیں بلکہ ہندوستان سے آگے نیپال اور تبت میں بھی پہنچ گئیں۔ ان مقامات میں بھی تنتر کا بہت عمل ہوتا ہے۔ سنسکرت میں لکھی ہوئی چند کتابیں بہت قدیم ہیں۔ سب سے قدیم قلمی مسودے ساتویں سے آٹھویں صدی کے معلوم ہوتے ہیں۔ تنتر کا ذکر کہیں بھی مہابھارت میں یا کسی ابتدائی چینی مسافروں کے بیان میں نہیں پایا جاتا۔ آٹھویں صدی میں بودھوں کے تنتر کا ترجمہ چینی زبان میں کیا گیا۔ اور نویں صدی میں تبتی زبان میں درگا ماتا کی پوجا کا ذکر دیدوں میں ہے۔ لیکن بعد میں اس میں غیر آریائی اور عوام کے مذہبی پوجا پاٹھ کی بہت آمیزش ہوگئی ہے۔

آگم ادب عام طور سے کشمیر سے نکلا ہے اور تانترک ادب بنگال سے۔ چند کتابیں جنوب میں بلکہ دور کے سیام میں بھی تصنیف کی گئی ہیں۔ آگم تنتر تو فلسفیانہ ہیں ان کو "پرتیا بھگیا درشن" کہا جاتا ہے۔
اس کی بنیاد ثنویاتی شیو فلسفہ پر ہے جس میں شیو اور شکتی کو مساوی اہمیت اور مقام حاصل ہے۔ سوما نند ناتھ (۸۵۰ - ۹۰۰ء) اور اس کے شاگرد اتپل (۹۰۰ - ۹۵۰ء) اور ابھنو گپت (۹۹۳ - ۱۰۱۵ء) کی لکھی ہوئی تنتر لوک بہت ہی مشہور تصنیف ہے۔ پانچویں صدی کی "اہیر بدھنیہ سمہتا" جو کشمیر میں تصنیف کی گئی تھی اور شنکر آچاریہ کا "مہانروان اور کلپ آرنو"۔ بھاسکر کی "کلی ولاس" اور کرشنن ڈنڈ کا "تنتر سار" کافی بڑی کتابیں ہیں۔ بودھی سنسکرت مصنفوں میں ایک تو مہایانی ہیں۔ اشو گھوش (۱۰۰ء) بہت مشہور اور عقلیت پسند مصنف ہے جس نے "وجر سیوہی" لکھی ہے۔ "للت وستر" بودھوں کے پران کی ایک قسم ہے۔ اس کا ترجمہ تبتی زبان میں پانچویں صدی میں اور ۳۰۰ء میں چینی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس سے ایک اشارہ لے کر اشو گھوش نے "بدھ چرت" لکھی۔ بعض علما خیال کرتے ہیں کہ کالی داس پر اشو گھوش کا اثر تھا لیکن بہت سی چیزیں شک کرنے کے لیے بھی موجود ہیں۔ آریہ شور نے سنسکرت میں "جاتک مالا" لکھی۔ مہایانیوں کی دوسری بہت سی بودھی کتابیں سنسکرت میں دستیاب ہیں جیسے "سد دھرم پنڈریک"۔

ڈرامہ

سنسکرت ڈراما بہت ہی قدر و قیمت کا ادبی توشہ ہے۔ بھرت کا ناٹیہ شاستر (فن ڈرامہ) تیسری صدی کا ہے۔ یہ بڑی محنت سے تیار کیا ہوا رسالہ ہے جس میں اسٹیج اداکار، اداکاری کا ہنر، تقریر اور اس کا زور، شاعرانہ اسالیب، موسیقی کے طریق اور ناچ کے موزوں مصنوعی انداز (مُدرا) کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ سنسکرت کتابوں کے مطابق ڈراما کی دس قسمیں ہوتی ہیں۔ اور ذیلی ڈراما ۱۸ قسم کے ہوتے ہیں۔ کالی داس کا "شکنتلا" ایک ناٹک ہے۔ بھبھوتی کا "مالتی مادھو" ایک پرکرن یعنی قصہ ہے۔ مند روکرم وامن کا "مالتی ولاس" ایک پرہسن یعنی مزاحیہ ڈراما ہے۔

اس وقت تقریباً سنسکرت کے ۶۵۰ قدیم ڈرامے دستیاب ہیں۔ سب سے قدیم ڈراما نویس بھاس ہے جس کا پتہ ٹی۔ گنپتی نے ۱۹۱۲ء میں ٹراونکور کے نزدیک لگایا تھا۔ بھاس کا عہد ۱۵۰ء سے ۲۵۰ء تک ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ پانچویں صدی کا ہوگا۔ گنپتی اس کو تیسری صدی ق۔م میں شمار کرتا ہے۔ اس کے ڈراموں کی بنیاد رامائن اور مہابھارت پر ہے۔ اس کے علاوہ دو ناٹک اُدین کے قصہ پر مبنی ہیں اور دو اُس کے تخیل پر۔ پُرمغز مکالموں کے در و بست۔ اور نفسیاتی بصیرت اور حقیقی سیرت نگاری کے لحاظ سے بھاس جدید ڈراما کے بہت قریب ہے۔ بھاس ناٹک سے متعلق تمثیلی سِتم طریقی کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کرتا ہے۔

اس کے بعد کالی داس آتے ہیں جس کے تین ڈراموں نے ساری دنیا میں شہرت حاصل کی ہے۔ گیٹے نے اپنے "فاوسٹ" کی تمہید کی بنیاد شکنتلا پر رکھی ہے اور شلر اس پر فریفتہ تھا۔ کالی داس بحیثیت شاعر بعض اوقات ڈرامہ نویس کی حیثیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نظر آتا ہے لیکن رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے مضمون میں شکنتلا اور میراندا کو ہیروئن کی حیثیت سے مقابلہ کرتے ہوئے شیکسپیر سے بھی اعلےٰ درجہ کا تسلیم کیا ہے۔ جناب حکمت نے شکنتلا کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے اور ساغر نظامی نے اردو میں۔

دوسرے ڈرامے اور ڈرامہ نویس جن کا ہمیں بخوبی علم ہے حسب ذیل ہیں۔

(پانچویں صدی عیسوی) "شودرک مریچھ کٹک" (مٹی کی چھوٹی گاڑی) بہترین حقیقی ڈراما ہے جس کا ترجمہ اردو زبان میں حبیب تنویر نے کیا ہے)

۷۰۰ عیسوی۔ بھبھوتی، اتررام چرتر

۶۰۶ - ۶۴۸ عیسوی۔ سری ہرش، ناگ نند

چھٹی صدی عیسوی۔ وشاکھادت۔ مدرا راکشس۔

۱۰۰۰ عیسوی۔ دنگ ناگ۔ کند مالا۔

اے۔ جی۔ ویلس اور پی لال کے چھ سنسکرت ڈراموں کے انگریزی ترجمے اصل ڈرامہ سے بہت قریب ہیں۔

گیارھویں صدی کے آخر میں کرشنا مسرا نے ایک تمثیلی اخلاقی ڈرامہ "پربودھ چندرا دے" لکھا ہے جو دوسرے ڈراموں سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں ذہنی کیفیتوں کو اداکاروں کے طور پر اشاری طرز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے نام ہیں کام، کرودھ، لوبھ، موہ

بخلاف دویک، سنتوس، شانتی، کرونا وغیرہ۔

تغزل کے رنگ کی شاعری اور نظم میں لکھی ہوئی تاریخ

کالی داس کا "میگھ دوت" (سفیر ابر) شاعرانہ تخیل کا اعلےٰ ترین شہکار ہے۔ جس کا ترجمہ چینی زبان میں پانچویں صدی میں ہوا تھا اور جس کے ایک سو سے زیادہ ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں موجود ہیں۔ بھرتری ہری کی تین شتک (۱۰۰) شلوک یا اشعار ہیں جن کے نام شرنگار شتک، نیتی شتک اور ویراگیہ شتک ہیں۔ یہ دنیاوی لذات کی ناپائیداری کی بہت دلچسپ تشریحیں ہیں۔ اس کا انتقال ۶۵۱ء میں ہوا تھا۔ اسی طرز کی ایک ابتدائی تصنیف "تھی لوکرل" ہے جس کی تین جلدیں، محبت، سیاست اور عبادت سے متعلق ہیں۔ اے۔ شولیٹ زر، اس کو جنوبی ہند کی بہت اہم تصنیف خیال کرتا ہے بلکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پانچواں وید ہے ۸۰۰ء کے قبل امرو نے "امرو شتک" کے نام سے ایک سو شلوک لکھے۔ یہ عاشقانہ انداز کی نظم ہے جو زیادہ تر اس خمسہ سے متعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر واتسیاین مصنف "کام سوتر" یعنی فن محبت (۴۰۰ صدی عیسوی) کا کافی اثر تھا۔ غزلیہ شاعروں میں بہترین ایک تو جے دیو تھا (۱۱۶۸ء) اس کی لازوال تصنیف "گیت گووند" ہے رادھا اور کرشن کی پاک محبت کی یہ نظم نہ صرف موسیقار اور مصور کی منظور نظر ہے بلکہ شاعر نہ مضمون نگاری کا ایک جوہر ہے اور ہمیشہ کے لیے تازہ اور درخشاں ہے۔ اور شاہجہاں کے دربار کا ایک شاعر پنڈت راج جگناتھ ہے۔ جس کو مغل شہنشاہ نے پنڈت راج کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس نے "بھامنی ولاس اور گنگا لہری" تصنیف کیں۔ اس کو ایک مسلمان خاتون سے پیار ہو گیا تھا اور کہاوت ہے کہ اس نے گنگا جی کی شان میں ایک ایک شلوک کہتے ہوئے اسی ندی میں خودکشی کرلی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے دامودر گپتا نے کٹنیوں کے مسائل پر ایک کتاب "کٹنی متم" لکھی۔ کئی ایک غزلیہ نظمیں مذہبی اغراض کے لیے لکھی گئی ہیں "ستوتر رتناکر" (منتروں کا سمندر) میں ایسی ہی نظمیں ہیں۔ بان بھٹ کی تصنیف "ہرش چرت" میں شاہ ہرش (۶۰۶-۶۴۸ء) کی زندگی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ایک تاریخی رزمیہ نظم ہے۔ واک پتی راجا کی تصنیف "گوڈوہو" کا حوالہ پراکرت میں آیا ہے۔ کشمیر کے دو شاعر نظمیہ تاریخ لکھنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں، بلہن نے ۱۰۸۵ء "وکرمانکا دیو چرت" اور کلہن نے (۱۱۵۸-۱۱۵۹ء) "راج ترنگنی" (بادشاہوں کی ندی) تصنیف کی۔ جس میں کشمیری بادشاہوں کے سلسلہ شاہی کا ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بڑی قابلیت سے مرحوم آر ایس پنڈت نے کیا ہے۔

نثر میں لکھی ہوئی کتابیں اور افسانے

نثر کا استعمال "اتھر وید" کے زمانہ سے ہے۔ "یاسک" کا زبانوں کے تقابلی مطالعہ پر لکھا ہوا رسالہ "نروکت" (۷۰۰ ق۔م) بھی نثر میں ہے۔ سنسکرت نثر میں لکھنے والے بڑے بڑے مصنف اور انکی تصنیفیں حسب ذیل ہیں۔

مصنف	کتابوں کا نام	نوعیت انداز
سوبندھو	واسو درت	نثر۔ نظم
(ساتویں صدی عیسوی)		
بان بھٹ	کادمبری	ناول
(ساتویں صدی عیسوی)	ہرش چرت	سوانح عمری
ڈنڈن	کادیہ آدرش	مطالعہ شاعری پر رسالہ
(۸۰۰ عیسوی کے قبل)	دس کمار چرت	کہانیوں کا سلسلہ

نثر کے مشہور مصنفوں میں دھن پال مصنف "تلک منجری" (۱۰۰۰ عیسوی) اور ودیا سنگھ مصنف "گدیہ چنتامنی" شامل ہیں۔ امبکا دت ویاس (۱۸۵۸-۱۹۰۰ء) نے "شیوو جے" تصنیف کی، جو شیواجی کی زندگی کا ناول ہے۔ ہری کیش بھٹاچاریہ (۱۸۵۰-۱۹۱۳ء) نے سنسکرت مضامین لکھنا شروع کیا تھا۔ پنڈت کشما راؤ (۱۸۹۰-۱۹۵۴ء) کی کتھا مکتا ولی بھی کافی مشہور ہے۔ یہ بھی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں تخیلی نثر کی کتابوں کے مقابلہ میں نظم کی کتابیں زیادہ ہیں۔

قصہ کہانیوں کی نوعیت کی بہت سی کتابیں ہیں۔ "پنچ تنتر" سب سے قدیم ہے۔ اس کا پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں چھٹی صدی عیسوی میں کیا گیا تھا۔ اس کی سریانی اور عربی شکلیں "کالی لاگ" اور "دم ناگ" (۵۷۰ عیسوی) اور "کلیلہ و دمنہ" (۷۵۰ عیسوی) ابھی تک دستیاب ہیں۔ "پنچ تنتر" کی تصنیف تقریباً (۳۰۰ عیسوی) میں ہوئی تھی۔ اس میں کئی ایک فرضی قصے اور جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ ہر ایک کہانی کے آخر میں اس کا اخلاقی نتیجہ نظم میں دیا گیا ہے۔ "ہت اپدیش" (لغوی معنی "بھلائی کے لیے نصیحت") میں ۴۳ کہانیاں ہیں۔ جن میں سے (۲۵) "پنچ تنتر" کی ہیں۔ ان ہی کہانیوں کے نمونوں پر بودھوں کے "جاتک" اور جینیوں کے "اُپ متی بھاوپر پنچ کتھا" (۹۰۶ عیسوی) تیار ہوئے ہیں۔ گنادھیہ کا "کتھا سرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) شیو داس کی "بیتال پچیسی" اور اسی طرح "سنگھاسن بتیسی" عوام کی کہانیاں ہیں۔ چودھویں صدی میں ودیاپتی ایک میتھلی شاعر نے "پرش پریکشا" تصنیف کی۔ یہ بھی ایک کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

چمپو سنسکرت ادب میں ایک اور دلچسپ صنف ہے۔ جس میں ملی جلی نثر، نظم اور ڈراما کی آمیزش ہوتی ہے۔ ایسی تصنیفوں کو "چمپو" کہتے ہیں۔ یہ دسویں صدی سے دستیاب ہوتی ہیں تری وکرم بھٹ (۹۱۵ عیسوی) کی لکھی ہوئی "نل چمپو" سب سے قدیم ہے۔ جینی شاعروں میں سے دیوسوری نے یشس تلک پر لکھا اور ہرش چندر نے جیون دھارا پر لکھا۔ دھارا کے مشہور بادشاہ بھوج (۱۰۱۸-۱۰۶۳ء عیسوی) نے سولھویں صدی میں ایک چمپو

لکھی تھی تری مالبہ کی تصنیف" وردامبکا پری نیے " ہے ان چمپوؤں کے مضامین زیادہ تر بڑے سورماؤں اور بادشاہوں کے کارنامے اور رزمیہ نظموں کی فرضی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں اپنے پسند کے دیوتا کے سامنے نام لے کر دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں کرشنا کوی نے مختلف بحر وغیرہ کو مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کے لیے ایک چمپو لکھا ہے جس کا نام " مندر مرنڈ چمپو" ہے۔

سنسکرت میں تقریباً تمام اغراض کے لیے نظم کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ بظاہر ناقابلِ یقین بات ہے کہ خشک سائنس کی کتابیں بھی مثلاً صرف ونحو، منطق، علم ہیئت اور علم طب بھی نظم میں لکھی گئی ہیں سنسکرت نظم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہزارہا پُر معنی مقولے مختصر اور سادہ گیت اور جامع کلمات کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان کو "سبھاشت" کہتے ہیں۔ جو نامعلوم شاعروں کی تصنیفیں ہیں تاہم ہردل عزیزی کی بنا پر عام طور پر ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

فن شعر وسخن پر مقالے اور جمالیات کی کتابیں

ڈراما نویسی کے اصول پر بھرت کا مقالہ "ناٹیہ شاستر" سنسکرت میں سب سے قدیم جمالیات کی تصنیف ہے۔ پروفیسر میک ڈونل اس کو چھٹی صدی عیسوی کا سمجھتا ہے اور ایس۔ کے۔ ڈے پانچویں صدی کا۔ اس کی مختلف تفسیریں ہیں۔

اس کے بعد بھاما آتا ہے جس نے "کاویہ النکار" لکھا ہے۔ اُدبھٹ نے آٹھویں صدی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ نویں صدی میں آنند وردھن نے "دھونیہ لوک" لکھی۔ اگر بھاما غیر مستقیم اظہار (وکروکتی) پر زیادہ زور دیتا ہے تو اُدبھٹ پوشیدہ معنی یا عمل توجیہ (دھونی) کی زیادہ اہمیت سمجھتا ہے۔ ابھنواگپتا (۱۰۰۰ عیسوی) نے "دھونیہ لوک" کی تفسیر لکھی۔ اس کا تعلق شیو فرقے سے تھا۔ اس نے نظم کی تعبیر میں فلسفیانہ معنی کا رواج دیا ہے۔

بھٹالولٹ (۸۰۰ ـ ۸۰۰ عیسوی) شنکوک (۸۴۰ عیسوی) بھٹانایک (۹۰۰ عیسوی) اور ابھنواگپتا۔ ان سب نے شعریات کا رُخ "رس" کے نظریہ کی طرف پھیر دیا۔ اگرچہ کنتلا (۱۰۰۰ عیسوی) نے اپنی تصنیف "وکروکتی جیوت" میں دھونی کی تردید کی ہے۔ لیکن مہم بھٹا نے اپنی کتاب "دیکتی وویک" (۱۰۵۰ء) میں اس نظریہ کو ثابت کیا ہے اور رودرت (۸۰۰ ـ ۸۵۰ عیسوی) نے ایک نیا مذہب قایم کیا جس میں استعارہ وغیرہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح راج شیکھر (۹۰۰ عیسوی) نے اپنی تصنیف "کاویہ میمانسا" میں فنِ شاعری کے لیے لازمی مادی، خارجی، معروضی شرائط کے مقولے ترتیب دیئے ہیں۔

دسویں صدی میں دھننجے نے "ناٹیہ شاستر" پر ایک تفسیر لکھی جس کا نام "دشں روپک" ہے۔ دھار کے بادشاہ بھوج نے ایک تصنیف کی جس میں فن شاعری کے اچھے اور بُرے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام "سرسوتی کنٹھا بھرن" ہے۔ کشیم یندر (گیارھویں صدی عیسوی) نے کشمیری شاعری کی تنقید کی ایک اور بہت اہم صورت "حسن اسلوب" کو رواج دیا۔ اس کی کتاب کا نام ہے "آوچتیہ وچار چرچا" وہ اسلوب بیان اور انشا پردازی کے طرز سے بھی بحث کرتا ہے۔

ممٹ نے گیارھویں صدی میں "کاویہ پرکاش" تصنیف کی جس کی اب تک ۷۰ تفسیریں کی گئی ہیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں۔ کشمیری راجانک روپک (بارھویں صدی عیسوی) نے "النکار سروسو" تصنیف کی جس میں اس نے دوبارہ کنایہ واستعارہ کی اہمیت کو رائج کیا۔ اسی صدی میں جینی علما مثلاً واگ بھٹ اور ہیم چندر نے فن شاعری پر کتابیں لکھیں۔

چودھویں صدی میں جینی شارح واگ بھٹ ولد نیمی کمار نے ضابطہ شاعری پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کاویہ انوشاسن" ہے۔ چودھویں صدی میں وشوناتھ نے "ساہتیہ درپن" لکھی جس کو ایک معیاری کتاب ہونے کی حیثیت سے وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو ممٹ کی تصنیف کو حاصل تھی۔ ۱۳۲۰ء میں آندھرا کے ایک ریڈی شہزادہ وِیا بھوپال نے "ساہتیہ چنتامنی" لکھی۔ ۱۶۰۰ء میں تامل ناڈ کے اپیا دکشت نے اپنی کتاب "ورتی وارتک" میں لفظ کی قوت پر خوب خیال آرائی کی ہے۔ سترھویں صدی میں تلنگانہ کے پنڈت جگناتھ نے "رس" کی اہمیت پر "رس گنگا دھر" لکھی۔ یہ ایک معیاری تصنیف ہے۔ اٹھارھویں صدی میں وشویشور نے "النکار کوستوبھا" لکھی۔ اس کے بعد سنسکرت میں جمالیات کے علما کا سلسلہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔

عہدِ جدید میں متعدد علما نے ان نظریوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جو جدید فن شاعری میں ممد ومعاون ہیں۔ کرشن چیتنیہ نے اپنی انگریزی تصنیف "سنسکرت فن شاعری" میں ان پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر جی۔ ٹی۔ دیش پانڈے نے "بھارتیہ ساہتیہ شاستر" تصنیف کرکے مراٹھی ساہتیہ اکاڈمی سے انعام حاصل کیا تھا۔ اس میں ان تمام جمالیاتی نظریوں پر چھ ہندی نظاماتِ فلسفہ کے اثر سے بحث کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سنسکرت فن شاعری کے پانچ مذاہب ہیں۔

		پیش کرنے والا	
(۱)	"رس"		نندی کشور بھرت
(۲)	"النکار"	"	بھاما، اُدبھٹ، رودرت
(۳)	"رتی"	"	ڈنڈن، وامن
(۴)	"وکروکتی"	"	کنتک "
(۵)	"دھونی"	"	آنند وردھن

یہاں ان تمام نظریوں کے موافق اور مخالف دلیلوں کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ سنسکرت میں ایسے سیکڑوں موضوع مطالعہ دستیاب ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی تائید اور تردید میں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مصنفین نے مناسب مثالوں کو پیش کرنے کے لیے معیاری تصانیف کا استعمال کیا ہے اور چند صرف

اپنی ہی تصنیفوں سے کام لیتے ہیں۔
ایک بات تو یقینی ہے کہ ساتویں یا نویں صدی کے بھی قبل سے سنسکرت میں علما نے شاعرانہ تخلیق، شاعرانہ بنیادی خصوصیت یا خیال وغیرہ کے مختلف ادبی مسائل کی چھان بین شروع کر دی تھی۔ ان کے بعض نظریے اب بھی ایسے ہی صحیح سمجھے جاتے ہیں جس طرح کہ اس زمانہ میں تھے۔ البتہ بعض مباحث جدید نفسیاتی تحقیقات کے باعث اب فضول نظر آتے ہیں۔ ان کو صرف مقولوں میں ڈھالنے کا طریقہ تبدیل ہوا ہوگا لیکن ان کی باطنی کیفیت بغیر کسی تبدیلی کے جیسی تھی ویسی باقی ہے۔

تصنیفات فلسفہ و دیگر علوم وفنون

یہاں سنسکرت میں تصانیف فلسفہ کے متعلق تو کوئی مکمل علم پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن عام طور پر ان کو دو گروہوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ آستک اور ناستک۔ پہلی قسم میں چھ نظامات فلسفہ ہیں۔ (۱) گوتم کے نیائے سوتر (تیسری صدی ق۔م سے قبل) ایک جدید مذہب منطق یا نیائے بھی موجود ہے جس کو بارہویں صدی میں گنگیش اپادھیائے نے اپنی تصنیف "تتوچنتامنی" میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ (۲) "ویشیشک" مصنفہ کناد (تیسری صدی ق۔م کے دور کے بعد) کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں جو دونوں کو ایک ساتھ پیش کرتی ہیں (۳) "سانکھیہ" جس کو کپل نے معلوم کیا۔ اس کے بعد ایشور کرشن نے تیسری صدی میں "سانکھیہ کاریکا" لکھی۔ (۴) "یوگ" جس کو پتنجلی نے دوسری صدی ق۔م میں لکھا تھا۔ اس مضمون پر بعد میں واچسپتی اور وگیان بھکشو تک بہت سی تصنیفیں لکھی گئی ہیں (۵) ۶۰۰ عیسوی میں جیمنی نے "میمامسا" لکھی۔ جو کرم میمامسا اور "پورو میمامسا" کہلاتی ہے۔ بعد میں کماریلا اور پربھاکر اس نظام کے دو زبردست شارح ہوتے ہیں۔ (۶) "ویدانت" کو لکھنے والے بادرائن ہیں اور گوڈپار بھی ہیں۔ نویں صدی میں شنکراچاریہ نے اس پر بہترین تفسیر کی ہے۔ ویدانت کے کئی ایک ذیلی مکتب ہیں۔ ان کے شارحوں میں بھاسکر، رامانج، نمبارک، مادھوا، ولبھاچاریہ، سری کانت اور روپ گوسوامی شامل ہیں۔

ناستک مکتبوں میں چارواک ہے اس کی تصنیف "لوکایت" اب دستیاب نہیں ہو سکتی۔ بودھوں میں ہنیان اور مہایان ہیں۔ مہایانیوں کے بھی کئی ایک مکتب ہیں۔ مثلاً مادھیہ میک (ناگارجن) یوگاچار (اسنگ)، وگیان واد (ڈِگ ناگ) ہنیان کے دو مکتب ہیں وائے بھاشک (واسومترا) ساوترانتک (کمارل بدھ) ناستکوں کے چارواک، بدھ اور جین یہ تین خاص مذہب ہیں۔ ان تمام مذاہب کی سنسکرت میں کئی ایک کتابیں ہیں۔ کم از کم ۵۰۰ اہم تصانیف ہیں۔ جن میں ان تمام نظامات اور ان کی شاخوں کے فلسفہ پر زبردست مباحث پیش کیے گئے ہیں۔
فلسفہ کے بعد سنسکرت میں مختلف علوم وفنون پر ماہرین کی بہت دلچسپ تصانیف ہیں۔ جیسے ریاضی (لیلاوتی) کیمیا اور دواسازی (ناگارجن، چرک، سشرت) فلکیات (آریہ بھٹ، وراہ مہر) علم اصلاح نسلیات (واتسائن کا کام سوتر) صرف ونحو (پتنجلی، پانِنی، بھرتری ہری) تالیفِ لغت (کاتیاین امر سنگھ) معاشیات اور سیاسیات (کوتلیہ) فن تیر اندازی (شارنگ دت) گھوڑوں اور ہاتھیوں کی شناخت کا علم (پال کپیہ، شالی ہوترا) علم تعمیر و فنِ عمارت اور سنگ تراشی (بھوج، منڈن اور شلپ شاستر اور من سار کے مانند تصانیف) فن جواہرات (برہت سمہتا، بدھ بھٹ کی رتن پریکشا) یہاں تک کہ طباخی اور چوری کے فن پر بھی کتابیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا شمار (۶۴) کلاؤں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پربھاکر مچوے کی ایک تصنیف "ہندو مت" ہے۔ اس طرح انگریزی زبان میں تمام علوم اور فنون میں تفصیلات بیان کرنے والی کتابیں موجود ہیں۔
سنسکرت میں فنونِ لطیفہ پر بہترین کتابیں ہیں۔ مثلاً شارنگ دھر کی تصنیف "سنگیت رتناکر" (موسیقی کے مضمون پر) نندی کشور کی "ابھی نئے درپن" (ناچ سیکھنے پر) وشنو دھرموتار کی کتابیں سنگ تراشی اور مصوری وغیرہ پر ہیں۔ ہندو قانون پر بھی کتابیں ہیں۔ مثلاً پی۔ وی کانے کی تصنیف "دھرم شاستر" جو انگریزی زبان میں بڑی محنت سے چار جلدوں میں لکھی گئی ہے اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ منو کا قانون "منوسمرتی" غالباً پہلی صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا۔ یاجنیا ولکیہ اور نارد کی سمرتیاں اور مذہبی رسوم کی ادائگی کے متعلق مختلف تصنیفیں ہندو مذہب اور سماجی رسوم کی بنیاد ہیں۔
اس طرح سنسکرت زبان میں انسانی زندگی کے چاروں پہلوؤں پر کتابیں موجود ہیں۔ مثلاً "دھرم" (قانون) "ارتھ" (معاشی مسائل اور دولت) "کام" (محبت اور ازدواجی زندگی)۔ اور "موکش" (نجات) سنسکرت ہرش وردھن کی سلطنت تک تو تخلیقی زبان کے طور پر رائج تھی۔ بعد میں یہ ایک ضابطہ کی زبان بن کر رہ گئی۔ یعنی چالو زبان نہیں رہی۔ اگرچہ گزشتہ ایک ہزار سال سے ہر ایک میدانِ علم میں مصنفین گزرے ہیں۔ لیکن گپتا کے عہد تک اس کے جو غیر معمولی اور مشہور کارنامے تھے وہ پھر کبھی حاصل نہ ہو سکے۔

جدید سنسکرت تصنیفیں

ڈاکٹر ایس۔ بی۔ وارنیکر نے بیسویں صدی میں چھ سو صفحات کا ایک مقالہ "ہندوستان میں سنسکرت تصانیف" کے عنوان سے ناگ پور سے شائع کرایا ہے۔ ڈاکٹر وی۔ راگھون نے جدید سنسکرت تصنیف کے عنوان سے دو بہت علمی اور مفصل مضامین ساہتیہ اکاڈمی کی دو اشاعتوں میں شائع کرائے ہیں۔ جن کا نام "ہم عصر ہندوستانی ادب" اور "آزادی کے بعد کا ہندوستانی ادب" رکھا ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے اور کہنے کے باوجود ہمارے جدید اور موجودہ ہندوستانی مصنفین ماضی کے ان زبردست اساتذہ کے قریب نہیں آسکتے۔ کئی لوگوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ کشمارا نے "ستیہ گرہ گیتا" لکھی اور سی۔ ڈی دیش مکھ نے "گاندھی سوکتی مکتاولی" لکھی اور بہت سے نقاد اور نکتہ رس لوگوں نے ان کی کافی تعریف کی ہے۔ لیکن تمام جدید سنسکرت تصنیفیں کم و

بیش دماغی ورزشیں ہیں۔ وہ ان بے ساختہ غزلیہ شاعری کے مصنفین کالی داس یا جے دیو کے کسی طرح نزدیک بھی نہیں آسکتے۔

جدید سنسکرت تصانیف بہت سی قسم کی ہیں۔ دیسی اور بدیسی زبانوں سے جو ترجمے کیے گئے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اس وقت سنسکرت میں شیکسپئر کی "ٹمپیسٹ" اور "ہیملٹ" گولڈسمتھ کی نظموں کے اور جی۔ بی۔ شا کی "سیب گاڑی" کے ترجمے دستیاب ہوتے ہیں۔ ٹالسٹائی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور رومین رولاں اور چرچل کے عنوانات سے سنسکرت میں مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ دوسری ہندوستانی زبانوں سے بھی سنسکرت میں ترجمے کیے گئے ہیں۔ چنانچہ تامل کورل کا ترجمہ، کمب راماین کا ترجمہ، سبرامنیم بھارتی کی نظموں کا ترجمہ اور راجہ جی کی کہانیوں کا ترجمہ بھی سنسکرت میں موجود ہے۔ کنڑی وچن اور پٹ تپ پاکی نظمیں۔ ٹیلوگو شتک اور پوتن ناکی "بھاگوت" اور تینالی رام کی مزاحیہ کہانیاں، مرہٹی سنت تکارام اور رام داس کی نظمیں اور گیت۔ ماماوارے کرکا ناٹک "بھومی کنیا سیتا" ہندی سنت کبیر کے کلام، تلسی داس کی "رام چرت مانس" بہاری ست سیئی اور پرسادی کی "کامائنی" آسامی زبان میں رگھوناتھ چودھری کی نظم "کیتکی"۔ بنگالی زبان میں نظم میں لکھا ہوا ناٹک "ناٹر پوجا" مصنفہ ٹیگور اور اس کی چند منتخب نظمیں۔

غالب کی اردو غزلیں پی سین پشپ نے سنسکرت میں ترجمہ کی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں "سنسکرت سوریہ اُدے" میں ایل بایس۔ تیلنگ کے لکھے ہوئے "الف لیلا" کے کچھ حصے شائع ہوتے ہیں۔

اب بھی کتنی ایک پنڈت سنسکرت میں علم و فضل اور اہم تحقیق کی تحریر میں مصروف ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت تفسیروں یا حاشیوں جیسی ہے۔

پنجابی زبان و ادب

پنجابی زبان و ادب کا آغاز گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز پر محمود غزنوی کی فتح پنجاب ہی کے ساتھ ہوا۔ پنجابی میں اولین مستند ادبی تصنیف جواب تک دریافت ہوئی ہے چشتیہ طریق کے مشہور صوفی شیخ فرید (۱۱۷۳ — ۱۲۶۵ء) کی تخلیق ہے۔ یہ سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ میں شامل ہے جو ۱۶۰۴ء میں مرتب ہوئی تھی۔

شیخ فرید کے کلام کے ایک سو بارہ اسلوک (تقریباً دو سو پچاس اشعار) اور تین مناجاتیں جو گرو گرنتھ کی مستند جلد میں ملتی ہیں ہر معیار سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ شیخ فرید کی زبان اعلیٰ اور خوبصورت ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ان کے عہد کے ذہین طبقے کے معیار پر اترتی ہے۔ اس کتاب کے جذبۂ ترک خودی اور نفس کشی نے اس زمانہ کے کچلے ہوئے اور مجروح لوگوں میں انھیں مقبول بنایا۔ ان کا پیام بڑا شخصی ہے۔ وہ دلکش، درد انگیز اور نغماتی ہے۔ اس میں انسان کی اندوہ ناک حالت کا نقشہ کھینچا ہے جس میں اسے صرف خدا کی بندگی ہی میسر تھی۔

اس کے بعد کی دو صدیوں میں بہت کچھ ادب تخلیق ہوا ہوگا۔ لیکن اب یہ ناپید ہے۔ سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں پنجابی کے غیر معمولی فروغ کی شہادت سکھ عقیدے کے بانی گرونانک (۱۴۶۹ء — ۱۵۳۹ء) اور ان کے چار پیروؤں کی نظموں سے ملتی ہے۔ ان گروؤں کی نظمیں گرو گرنتھ کا جوہر خاص بن جاتی ہیں جن کے قابل لحاظ حصہ کو پنجابی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس شاعری میں فلسفہ مذہب اور عناصر موجود ہیں۔ گرونانک کی نظموں میں سماجی آہنگی زیادہ بلند ہے تیسرے سے لے کر چوتھے گرو کے ہمعصر ایک سکھ بزرگ بھائی گرو داس (۱۵۳۶ء — ۱۶۳۷ء) نے خالص پنجابی زبان میں بہت سی طویل نظمیں لکھیں جو "ورس" کہلاتی ہیں۔ اس کا موضوع سکھ عقیدہ اور مذہبی جذبہ ہے۔

پنجابی زبان کے نثری ادب کا آغاز بھی سکھ روایات سے ہوتا ہے۔ گرونانک کے چیلوں کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ان کے واقعات زندگی کو ان کے پیروؤں کے مفاد کے لئے مدوّن کیا جائے۔ ان واقعات کا طرز بیان زیادہ تر عیسائی مذہبی کہانیوں کی مانند ہے۔ یہ واقعات جو جنم ساکھیاں یا جنم کہانیاں کہلاتے ہیں ان میں زیادہ تر مافوق الفطرت واقعات یا کرامات کی چاشنی ملتی ہے یہ اس پرانے جاگیرداری زمانہ کے عقائد کے عین مطابق تھی خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں قدیم ترین نظمیں ۱۶۲۳ء میں گرونانک کی وفات کے چوراسی سال بعد لکھی گئیں۔

شاہ حسین (۱۵۸۳ — ۱۶۰۰ء) اپنے عہد کے اولین صوفی شعرا میں سے ہیں۔ سلطان باہو (۱۶۳۱ — ۱۶۹۱ء) بُلّھے شاہ (۱۶۸۰ — ۱۷۵۸ء) اور ہدایت اللہ وغیرہ نے ان کی پیروی کی۔ ان کی تصانیف پنجابی صوفی شاعری کا نمونہ ہیں۔ یہ "کافیوں" کے نام سے لکھی اور گائی جاتی تھیں۔ کافی انتہائی غنائی صنف سخن ہے لیکن اس میں سماجی عنصر بھی ہے جیسا کہ بُلّھے شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وہ زندگی کی کشمکش اور خواہشات نفسانی سے کنارہ کشی اور کلیتہً عبادت الٰہی کی ترغیب دیتی ہیں۔ زبان عوامی محاورے سے بہت قریب ہے اور ان کی تشبیہیں اور استعارے دیہاتی دستکاروں کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ ان میں جذبات کی انتہائی شدت ملتی ہے۔

پنجابی ادب میں صوفیانہ غنائی شاعری کے متوازی ایک قسم کی رومانی شاعری نے بھی ترقی کی ہے۔ اس کا قدیم ترین شاعر دامودر گلاٹی ہے جو شاہ حسین کے معاصرین میں تھا۔ وہ سکھ مذہب کے عقائد کے ساتھ ساتھ صوفیانہ خیالات سے بھی متاثر تھا۔ اسی کی وساطت سے اس نے اپنے وطن جھنگ کی ہیر اور رانجھا کی پریم کہانی کی کلاسکی ترجمانی کی جس میں شادی میں ماں باپ کی پسند کی پابندی اور اس کے خلاف ایک ردعمل اور بغاوت کا اظہار کیا ہے۔ اس نے یہ کہانی جھنگ کی بولی میں لکھی ہے جو بہرحال مستند ادبی زبان نہ بن سکی۔

یہ رومانی کہانی بالآخر پنجابی کلاسک بن گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے مشرق وسطیٰ کے رومانی قصے یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد اور چند مقامی رنگ کی کہانیاں سوہنی مہینوال اور سسی پنو ہیں۔

ہیر رانجھا کی کہانی کو آخر کار جن شعرا نے اپنے خاص رنگ میں نظم کیا۔ ان میں سب سے مشہور وارث شاہ (۱۷۳۵ — ۱۷۸۱ء) ہیں۔

ملک سندھ کی مشہور پریم کہانی سسی پنو کو ہاشم شاہ (۱۷۵۳ء — ۱۸۲۳ء) نے اور احمد یار (۱۷۶۸ء) نے یوسف زلیخا اور حاتم طائی کے قصّوں کو رومانی اشعار

میں بیان کرکے بڑی شہرت حاصل کی۔ احمدیار نے بے شمار دیگر رومان یا قصے لکھے اور پنجابی طرز شاعری خصوصاً مغربی پنجاب کے طرز کی بنیاد رکھی۔ لیکن انگریزی حکومت کے آنے کے بعد یہ ادبی رنگ بالکل بدل گیا۔ پنجابی ادب میں سکھوں کی دلچسپی ہو گئی۔ اس سے پنجابی ادبی زبان پر سنسکرت کا اثر بڑھنے لگا اور ادبی اصناف میں مغرب کی پیروی شروع ہو گئی۔

شاہ محمد بجا طور پر قابل تحسین شاعر تصور کیا جاتا ہے جس نے پہلی انگریز سکھ جنگ کے متعلق حب وطن سے سرشار طویل بیانیہ نظمیں لکھیں۔ فضل شاہ (۱۹۰۰ء) اپنی رومانی نظم سوہنی مہینوال کے باعث مشہور ہوا۔ اس سے پنجابی میں فارسی ادبی طرز کا آغاز ہوا جس میں تکرار لفظی اور ایک ہی بحر میں طویل بندوں کا رواج ہوا۔

سنگھ سبھا تحریک کی سب سے ممتاز شخصیت بھائی ویر سنگھ ۱۸۷۲-۱۹۵۰ء) کی ہے اس تحریک نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنجابی زبان و ادب کو سکھوں کی قومی خصوصیات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس نے اس مقصد کی ترویج کے لئے اپنے ہفتہ وار اخبار "خالصہ سماچار" میں بے شمار مضامین لکھے۔ اور مختصر رسالے بھی شائع کئے۔ لیکن اس کو ادب میں نمایاں امتیاز د تاریخی نثری رومانوں کی بدولت حاصل ہوا۔ ایک "سندری" ۱۸۹۸ء دوسرا "بجے سنگھ" (۱۸۹۸ء)۔ اسی کے بعد "ستونت کور" دو حصوں میں لکھی۔ پہلا حصہ ۱۸۹۹ء میں اور دوسرا حصہ بہت بعد ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ ان تینوں میں اٹھارویں صدی کی مغلیہ حکومت کے خلاف سکھوں کی جد وجہد کو جذباتی اور رومانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے اس کے بعد کی تصنیف بابا کنور سنگھ کے موضوعات اپنے دور کا دیہاتی منظر معاشی اور سماجی مسائل، دیہاتی زندگی میں تبدیلی کے اثرات، آزاد پیشے وکالت اور ڈاکٹری اختیار کرنے کی ترغیب اور مختلف مذہبی گروہوں میں مسابقت وغیرہ ہیں۔

بھائی ویر سنگھ جدید پنجابی شاعری کے بھی سالار ہیں۔ شاعری میں ان کی پہلی اہم تصنیف رزمیہ نظم ہے جو عام طور پر "رانا سورت سنگھ" کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں جدید نقادوں کی رائے میں رانی راج کور کی شکل میں سکھ حاکم طبقہ کی حکومت سے محرومی کو پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ اقتدار سے محرومی پر، جس کی نمائندگی اسکا شوہر سورت سنگھ کرتا ہے، ماتم کرتی ہے۔ اسے دعا اور عبادت میں راحت پاتے اور رضائے الٰہی کے سامنے سر خم کرتے دکھایا گیا ہے لیکن نظم "رانا سورت سنگھ" میں اصلی جدیدیت، اس کے عروض، بحر، فن خطابت اور تصورات میں ہے۔

مختصر نظم کا رواج بھی (مذہبی مناجات سے قطع نظر) کر بھائی ویر سنگھ ہی کے مجموعے کلام سے شروع ہوتا ہے جو تین جلدوں میں 'ٹنک ہلارے' (لہراتی لہریں) 'لہراں دے ہار' (لہروں کے ہار) 'بجلیں دے ہار' (بجلیوں کے ہار) کے نام سے شائع ہوئے۔ ان مختصر نظموں اور غنائیوں کے لب ولہجہ میں مذہبی روحانیت ہے لیکن ان میں سے بعض نظموں میں تمثیل اور انسانی حسن خاص کر کشمیری حسن کو پیش کیا گیا ہے۔

اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں پنجابی زبان وادب کے ساتھ لگاؤ ایک حب وطن کے جذبہ کے ماتحت بھی بڑھا تھا۔ بہاری لال پوری اور اسکے لڑکے بشن داس پوری نے قواعد کی اور نصابی کتب لکھ کر اہم خدمت انجام دی ہے۔ برج لال شاستری (۱۸۹۴ء) نے سنسکرت روایات کے مطابق ڈرامے

ساوتری سوکنیا" پرتگیا، واسوارتا، اور پورن بھگت لکھے۔ لیکن نمایاں ادبی مقبولیت دھنی رام مہترک (۱۸۷۶ - ۱۹۵۴ء) کے حصے میں آئی جس نے ہندو کلاسیکی روایات اور اپنے عصر کی قوم پرستی پر نظمیں لکھیں جن میں مذہب اور پاکیزہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس کے بعد چندن واری (صندل باغ)، "کیسر کیاری" (زعفرانی کیاری)، "صوفی خانہ"، اور نور جہاں میں کسی قدر جدید زبان استعمال کی گئی ہے۔ کرپا ساگر (۱۸۷۵ - ۱۹۳۹ء) کی نظم لکشمی دیوی سوالٹر اسکاٹ کی نظم "لیڈی آف دی لیک" کے انداز میں ایک طویل بیانیہ نظم ہے۔ جس کا موضوع رنجیت سنگھ کا جموں اور ڈوگرا ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا ہے۔ کرپا ساگر کا تین جلدوں پر مشتمل ڈرامہ 'مہاراجہ رنجیت سنگھ' جسکی تیسری جلد کا نام دید وجماول (اپنے بہادر مخالف کے بعد) ہے مستقل قدر وقیمت کا حامل ہے جو ابتدائی بیسویں صدی کے آغا حشر کے مرتبہ کئے ڈرامہ نگاروں کے اردو اور ہندی ڈراموں کی طرز پر ہے۔

ڈرامہ کا آغاز اصل میں ایشور چندر نندا (۱۸۹۲ - ۱۹۶۷ء) کے ڈرامہ سبھدرا (مطبوعہ ۱۹۲۴ء) سے ہوا۔ نندا نے ابتدائی بیسویں صدی کے انگریزی ڈرامہ کے طرز کا اتباع کرتے ہوئے قدیم وجدید کی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ شیکسپیر اور پنجابی لوک آرٹ کی تکنک کی بھی اس پر چھاپ ہے۔

پنجابی ناول کا آغاز نانک سنگھ (۱۸۹۷ - ۱۹۷۲ء) سے ہوا جس نے چند ابتدائی کوششوں کے بعد اپنے ڈرامہ چٹا لہو (سفید خون ۱۹۳۲ء) میں ایک معیار قائم کیا۔ اس کا موضوع ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت ہے خاص کر جب وہ بیوہ ہو جاتی ہے اور مایوسی کا شکار ہو کر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے اور بیسوا بن کر اپنا بدلہ لیتی ہے۔ نانک سنگھ نے اس موضوع کے اور بھی پہلو اپنے ناولوں "فولادی پھول" (۱۹۳۴ء) "ٹٹی وینا" (ٹوٹی بینا) اور گنگا جلی وچ شراب، (گنگا جل میں شراب) میں پیش کئے ہیں۔ اس کے بعض ناولوں میں بیوہ بیسوا کے موضوع کو ترک کیا گیا ہے لیکن ایک صابر عورت، ایک عیاش شوہر، ایک دوسری عورت کا خوشی یا ناخوشی سے اس کا شکار ہونا اور انجام کار عیاش کی اصلاح، کے موضوع برقرار ہیں۔ اس کے ناولوں کاغذاں دی بیڑی (کاغذ کی ناؤ) "دھندلے پرچھاواں" (دھندلا سایہ) "جیون سنگرام" (کشمکش حیات) کے یہی موضوع ہیں۔ نانک سنگھ کے ناول جو تقریباً ہر سال نکلتے تھے۔ ان میں سماجی موضوعات پر ایک تنگ دائرے میں باغیانہ جذبہ دکھایا گیا ہے۔ اس نے ایک سماجی مصلح کے انداز میں پرچار کرنے کی کوشش بھی کی اور اس کے ساتھ کچھ سوشلزم بھی داخل کی جیسا کہ "غریب دی دنیا" (غریب کی دنیا) اور پیار کی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بعض ناولوں میں تقسیم ہند کے سخت ہنگامے، تباہی، لوٹ کھسوٹ زنا اور قتل وخون کے واقعات پیش کئے ہیں جیسا کہ آگ دے کھیڈ (آگ کے کھیل)۔

آزادی ہند کے بعد سے نانک سنگھ کے یہاں سماجی وسیاسی معاملات سے گہری دلچسپی کا اظہار ملتا ہے۔ نوکر شاہی کی بد اطواری، مذہبی اور سماجی ریاکاری بیوپاری اور زمیندار طبقہ کے ہاتھوں کسانوں اور مزدوروں کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ 'آدم خور' اور 'چترکار' سے ظاہر ہے۔

نانک سنگھ نے اپنے ناول ایک میان دو تلوار (۱۹۶۰ء) میں غدر تحریک ۱۹۱۳-۱۹۱۵ء کے ہر دلعزیز نوجوان رہنما کرتار سنگھ کو ہیرو کی شکل میں پیش

کرکے بے باک بہادری اور جنگجو قوموں کو خراج پیش کیا ہے۔

گربخش سنگھ (۱۸۹۵ء) پنجابی ادب کے میدان میں ۱۹۲۵ء کے قریب ایک آزاد خیال انسان دوست مصنف کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ایک ماہنامہ پریت لڑی نکالتے رہے وہ مذہب، سماجی تعلقات اور گھریلو زندگی، غرض کہ ہر شعبہ حیات میں آزادی خیال کی حمایت کرتے رہے۔ گربخش سنگھ کی تصانیف جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں پنجابی نثر میں بڑے اضافہ کا باعث ہوئیں۔ ان کے ناول "ساڈی ہماری زندگی" "زندگی ایک دنیا دے تیرہ پسنے پرم منش" سکھنوی سدھری زندگی" "زندگی دی رس" "نوہاں شیوالہ" وغیرہ ہیں۔ منجملہ ان کے مختصر کہانیوں میں بھابی مینا، پریتاں پہرہ دار، انوکھے لے اکلے وغیرہ ہیں۔ گربخش سنگھ نے اپنے نظریے "سماج پریتی" (مساوی محبت) کو اس محاورے کے تحت کہ محبت جائیداد نہیں ہے مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔

پنجابی ادیبوں کی بعد کی پود نے ترقی پسند مقاصد سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

موہن سنگھ (۱۹۰۵ء) کی تصنیفات سیو پتر (۱۹۳۶ء) کسم بھرا (۱۹۴۱ء) ادھاٹے تے (۱۹۴۵ء) اور کچ پیچ (۱۹۵۰ء) ہیں اور امرتا پریتم (۱۹۱۹ء) کی پتھر گیتے (۱۹۴۶ء) لمیاں وطن (۱۹۴۸ء) سرکھی دیلا (۱۹۴۹ء) اور سنہیے (۱۹۵۲ء) ہیں دونوں ترقی پسند روایات کے لیڈر ہیں اس کے بعد سنتوش سنگھ دھیر (۱۹۲۰ء) اور پربھجوت کور (۱۹۲۴ء) ایک دہے کے وقفے سے آتے ہیں۔ ان میں وقت جذبہ اور خوبی کا تفاوت پایا جاتا ہے ہربھجن سنگھ نے جدید پنجابی شاعری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرلی ہے۔ وہ بیک وقت ایک صاحب ذوق ہیئت پرست اور وجودی ہے۔ لیکن اس نسل میں جو شخص بلندی پر پہنچا وہ آنجہانی شیو کمار (۱۹۴۵ء-۱۹۷۵ء) ہے جس کی تجرباتی شاعری اعلیٰ بھی ہے اور عام پسند بھی اعلیٰ پایہ کی بھی ہے اور روایتی بھی۔ مختصر کہانیوں میں سجن سنگھ (۱۹۰۹ء) کی کہانیاں دکھ سکھ، پشوتے دیوتے وغیرہ ہیں۔

سنت سنگھ سیکھوں (۱۹۰۸ء) کی کہانیوں کا مجموعہ سماچار کے تے یودھے، ادھی وت، تیجا ہو ہیں اور سنتوکھ سنگھ دھیر کے سنجھی کندھ سویرہون تک مسلمہ ترقی پسند ہیں۔ کرتار سنگھ دگل (۱۹۱۷ء) نے سویر سار (۱۹۴۱ء) تو پہرے (۱۹۷۲ء) کے مصنف نے نیچری حقیقت پسندی سے آغاز کیا اور ابھی تک اس پر قائم ہیں۔ کلونت سنگھ ورک (۱۹۱۹ء) ناوابستہ انسان دوست ہیں۔ ان کی تصنیفات ہیں چاہ ویلا، دھرتی لئے آکاش، نویں لوک، وہ اپنی شروع کی دیہاتی زندگی اور بعد کے دور کی شہری زندگی کے متعلق لکھتے ہیں مواد اور طرز ادا دونوں میں پختگی ہے۔ ان کا انداز بیان سہل اور غیر خطیبانہ ہے۔ لیکن اسی میں طنز کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ناول میں سریندر سنگھ نرولا (۱۹۱۷ء) اور جسونت سنگھ کنول (۱۹۲۱ء) کے یہاں ترقی پسند رجحانات ملتے ہیں جبکہ نوریندر پال سنگھ (۱۹۲۶ء) اور سوہن سنگھ سیتل (۱۹۱۳ء) کوئی پکا رجحانات نہیں رکھتے۔ لیکن ان کے یہاں حقیقت پسندی کافی نمایاں ہے۔ سریندر سنگھ نرولا اپنے ناول پیو پتر، رنگ محل وغیرہ میں اس شہر کی طرز زندگی کی بڑی نکھری ہوئی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا جھکاؤ بائیں جانب ہے۔ انکے دیگر ناول لاہور، دلی اور شملہ کے مقامی ماحول سے متعلق ہیں۔ ان میں بھی یہی رجحان ہے۔ جسونت سنگھ کنول نے ستلج کے جنوب میں اضلاع مالوہ کی دیہاتی زندگی کی عکاسی کی ہے ان کے ناول کسانوں کی جدوجہد اور بائیں بازو کی دوسری ترقی پسند تحریکوں کے بارے میں ہیں۔ ان کے ناول ہیں پورن ماشی، روپ دھارا اور رات باقی ہے وغیرہ۔ نریندر پال سنگھ نے پنجابی عورتوں کی زندگی کی بہت پُر اثر عکاسی کی ہے۔ جس میں جاگیرداری تصورات اور تعصبات کے اثر سے خود اپنی آپ قسمت بن جاتی ہیں۔ ان کے ناول ہیں شکتی، تو پاجال۔ انھوں نے سکھوں کی تاریخ پر چار ناولوں کا ایک مجموعہ بھی لکھا ہے۔ حال ہی میں انھوں نے تجرباتی ناول "منیا کی ماسیا" "تاپو" "وکیندرت" بھی لکھے ہیں۔ سوہن سنگھ سیتل نے تقسیم ہند سے پہلے کے لاہور اور امرتسر کے وسطی اضلاع کی دیہاتی زندگی کی سچی عکاسی کی ہے۔ دلیپ کور ٹوانہ (۱۹۳۳ء) ایک اور مشہور افسانہ نگار و ناول نگار ہیں۔ ان کے تازہ ترین ناول لہو ہمارا جیونا، "سورج تے سمندر" وات ہماری کو واقعی بہت پسند کیا گیا گردیال سنگھ ایک ہونہار ناول نگار کی طرح سامنے آئے ہیں۔ گذشتہ دس سال میں انھوں نے آدھے درجن ناول لکھے جن میں ادھ چنانی رات، موہی وادیوا، اور انتھن اگن ہیں۔ جن میں پنجاب کے مالوہ علاقہ کی دیہاتی زندگی کی پُر اثر تصویر پیش کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے قصبہ کی تعمیر و ترقی کا موثر نقشہ کھینچا ہے۔ ڈرامہ کی قیادت آئی۔ سی۔ نندا نے کی اور ان کے قدم پر چل کر ہرچرن سنگھ (۱۹۱۴ء) نے ۱۹۴۰ء میں ایک ون ایکٹ کا ڈرامہ "جیون لیلا" سے آغاز کیا اور اس سلسلہ کو بڑی پختگی سے برقرار رکھ کر شوبھا شکتی اور کل آج تے بھلک لکھا۔ کچھ دنوں سے ہرچرن سنگھ مذہبی ڈرامے لکھ رہے ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے سکھ سماج کو اوپر اٹھانے کا کام کریں۔ اس سلسلے کے دو اچھے ڈرامے چمکور دی گڑھی، اور ہند دی چادر ہیں۔

سنت سنگھ سیکھوں (۱۹۰۸ء) نے زیادہ پختہ اور پاکیزہ ڈرامے لکھے ان میں بھی وہی مارکسی نقطۂ نظر ہے جو ان کی مختصر کہانیوں میں ہے۔ ان کے ڈراموں کلاکار، نوکی، موہان سار، ناگنی، وارث، دمینتی، متر پیارا میں پنجابی تاریخ اور ہندوستانی زندگی کو مارکسی زاویہ نگاہ سے پیش کیا گیا ہے۔

بلونت سنگھ گارگی (۱۹۱۹ء) کے ڈراموں میں کافی تنوع ملتا ہے۔ ان کے اولین ڈرامے لوہاکٹ، سیل پتھر، کنک دی بالی، بائیں بازو کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ دھونی دی اگ، میں تجرباتی نقطۂ نظر اپنایا گیا اور آخر میں سلطانہ رضیہ میں تاریخی پہلو پیش کیا گیا ہے۔

نوجوان پود میں ہرچرن سنگھ (۱۹۲۹ء) کی تصنیفوں جگارا، لمے سمے دی نرک، اداس لوک، میں سادگی اور مقصدیت غیر معمولی طور پر نمایاں ہے اسی طرح سرجیت سنگھ سیٹھی کے ڈرامے "مرد مرد نہیں" "تیویں تیویں نہیں" "کنگ، موزلے سپیرا" "ننگی رات"، سڑک دا الماس جرات آمیز، جدید تجربائیت کا نمونہ ہیں۔ کپور سنگھ گھمن (۱۹۲۷ء) بھی ایک بڑے اور تجرباتی قسم کے مخصوص ڈرامہ نگار ہیں اور ان کے ڈرامے پتلی گھر۔ جیوندی لاش۔ مک سنسار وغیرہ ہیں۔

تامل زبان وادب

تامل زبان کا علاقہ اور اس کے بولنے والے

تامل دستور ہند کے آٹھویں ضمیمہ میں درج قومی زبانوں میں سے ایک ہے ۔ اس کا تعلق دراوڑی قبیلہ کی زبانوں کی جنوبی شاخ سے ہے کوریر (Courier) جس کی اشاعت یونیسکو کی جانب سے صرف بین الاقوامی زبانوں میں ہوتی ہے تامل میں بھی شائع ہوتا ہے ۔ یہ زبان تامل ناڈو کے رہنے والوں کی علاقائی زبان ہے اگرچہ اس کے بولنے والے کرناٹک ' کیرالا اور آندھرا کے علاوہ بمبئی ' کلکتہ ' احمد آباد اور دلی میں بھی موجود ہیں یہ سیلون کی دو اور سنگاپور و ملیشیا کی تین زبانوں میں سے ایک ہے اس کے علاوہ برما ' تھائی لینڈ ' ہانگ کانگ ' ماریشس ' گیانا ' مشرقی اور جنوبی افریقہ اور فیجی میں بھی تامل بولنے والے مختلف گروہ آباد ہیں ۔

دوسری زبانوں سے تامل کا تعلق

تامل جو جنوبی ہندکی ایک دراوڑی زبان ہے ۔ سب سے زیادہ ملیالم سے قریب ہے پھر کنڑی سے اور اس کے بعد کسی قدر فاصلہ پر اس کا رشتہ تلگو سے ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ اصل پرد لوٹو دراوڑی زبان کے ذریعہ اس کا تعلق گونڈ وغیرہ جیسی وسطی دراوڑی سے اور اس سے کسی قدر آگے کورکھ اور مالنڈ یہاں تک کہ براہی جیسی زبانوں سے بھی رہا ہے ۔

ہندوستان کئی لسانی خطوں کا ملک ہے اس لیے اس کی تقریباً ساری زبانوں میں بعض مشترک خصوصیات ملتی ہیں ان میں سے بعض کا سرچشمہ تو یقیناً دراوڑی ہے مثلاً تمی (Cerebral) آوازیں صوریاتی (Morphological) خصوصیات اور اس سے بڑھ کر (Syntanctical) ڈھانچہ جس میں مسند جزء (Predicate) کا استعمال جملہ کے آخر میں ہوتا ہے ۔

ہندوستانی تہذیب کے باہمی اختلاط کی وجہ سے پراکرت اور سنسکرت کے کئی الفاظ خاص طور سے فنی اصطلاحیں تامل میں داخل ہوگئیں حالاں کہ تامل میں دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لینے کا رجحان بہت کم پایا جاتا ہے ۔ سیاسی اور دیگر روابط کی وجہ سے مرہٹی ' تلگو ' کنڑی اور بعد میں پرتگالی ' ولندیزی ' فرانسیسی اور انگریزی الفاظ بھی اس میں شامل ہوگئے ۔ اسلام کی وجہ سے عربی الفاظ اور ایک طرح کی " عربی آمیز تامل زبان " کا اضافہ ہوا ۔ مغل اقتدار گو برائے نام ہی رہا تاہم اس کی وجہ سے نظم ونسق کی کئی اردو اصطلاحیں جن کی اصل فارسی ہی تھی تامل میں استعمال ہونے لگیں ۔ واضح رہے کہ تامل ناڈو کے بعض مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہی ہے ۔

ادبی تاریخ کے مختلف دور ——— تامل ادب کے اہم دور حسب ذیل ہیں : ۔

۱۔ قدیم دور جس کی ذیلی تقسیم اس طرح کی جاسکتی ہے : (الف) سنگم دور (ب) ابتدائی اخلاقی شاعری کا دور اور (ج) دونوں رزمیوں (مقامی) کا دور ۔

۲ ۔ وسطی دور جسے یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے : (الف) بھگتی شاعری کا دور (ب) رزمیوں کا دور (ج) اخلاقی شاعری کا متاخر دور اور (د) درباری شاعری کا دور ۔

۳۔ جدید دور : جو مغرب سے روابط کی وجہ سے وجود میں آیا لیکن جس کے اثرات بتدریج دور میں ظاہر ہوئے ۔ اس لیے ابتدائی " جدید دور " کو وسطی یا انحطاطی دور ہی شمار کرنا چاہیئے ۔ صرف بعد کا " جدید دور " ہی حقیقی معنوں میں جدید کہلایا جاسکتا ہے ۔

قدیم دور کے رجحانات اور لکھنے والے

تامل کا قدیم ترین ادب سنگم ادب کہلاتا ہے ۔ سنگم کے معنی دانش گاہ کے ہیں ۔ روایت ہے کہ قدیم زمانے میں یہیں سے تامل کی ابتدا ہوئی تھی یہ ادب جو اب تک محفوظ ہے مختصر نظموں کے آٹھ مجموعوں اور طویل نظموں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہے ۔ اس میں بیانیہ شاعری کا دخل نہیں ہے بلکہ یہ خود کلامی کے ڈرامائی اشعار ہیں جن میں ابتدائی رزمیہ شاعری کے جو شاید زباں زد ہوگئی تھی آثار پائے جاتے ہیں ۔ اس وقت کے سماج کی طرح لکھنے والوں میں یہی بڑا تنوع ہے ۔ شاعر آزادانہ طور پر اپنے سرپرستوں کو مشورے دیتے تھے یا اثر عورتیں ' راجا اور سردار بھی شعر کہتے تھے ۔

سنگم شاعری دو طرح کی ہے ایک اکم یعنی داخلی شاعری جو زیادہ تر عشقیہ ہے ۔ دوسرے پورم یعنی خارجی شاعری جس کا موضوع جنگ اور دیگر مظاہر حیات ہیں ۔ پھر عشقیہ شاعری کے بھی پانچ پہلو ہیں یعنی (۱) چاہنے والوں کی پہلی ملاقات ۔ (۲) دو محبت بھرے دلوں کی ایک دوسرے سے توقعات یا گھریلو مسرت (۳) خلوت ۔ (۴) مایوسی اور (۵) جدائی ۔ واضح رہے کہ اس میں ہر پہلو کے علیحدہ علیحدہ علاقے بھی ہیں یعنی پہاڑی علاقہ ' شادابی علاقہ ' شہری علاقہ ' سمندری علاقہ اور ریگستانی علاقہ ۔ اس کے علاوہ اس کا موسم ۔ وقت ' دن ولوازمات بھی معین ہیں جن کا انحصار مختلف مردوں اور عورتوں ' ان کے پیشوں اور ان کی عبادت نیز ہر علاقہ کے نباتات وحیوانات پر ہوتا ہے ۔ یہ بہ ظاہر ایک رسمی بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہ دراصل مختلف علاقوں کے دیومالائی قصے ہیں جو ایک داستان محبت میں اپنی تلمیحات واشاروں اور ایجاز واختصار کی وجہ سے اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ اس روایت کے مطابق خارجی شاعری کے موضوعات میں ان علاقوں کو مماثل حیثیت حاصل ہے یعنی ۱ ۔ جنگ کی ابتدائی جھڑپیں ' جیسے مویشیوں کی چوری وغیرہ ۲ ۔ حملہ ۔ ۳ ۔ محاصرہ ۔ ۴ ۔ گھمسان کی لڑائی ۔ ۵ ۔ فتحیابی اور اس کے بعد فاتح ومفتوح کی ایک دوسرے سے علیحدگی ' علامتی طور پر

ان کا اطلاق زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ کامیابی صرف جنگ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ہر شعبہ جات میں کامرانی اور سرخروئی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے طرفین کی مثالی محبت سے قطع نظر ایک طرفہ محبت کا پہلو بھی ہوتا ہے اور ایسی صورت بھی ہوتی ہے جہاں ابتدائی مرحلہ پر کسی فریق میں محبت کا جذبہ نہ پایا جاتا ہو لیکن بالآخر دونوں فریق اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی مماثل صورتیں خارجی شاعری میں بھی پائی جاتی ہیں جہاں ۱۔ شاعر سرپرستی اور نوازشوں کا طالب ہوتا ہے اور سرپرست تعریف و توصیف کا ۔ ۲۔ زندگی کی فنا پذیری کے صرف منفی پہلو ہی کو نہیں بلکہ فرائض کی انجام دہی کے مثبت پہلو کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔

اس دور کے عظیم شاعروں میں کپیلار، پرنار، نکیرار اور آوبار قابلِ ذکر ہیں اس دور کا اختتام غالبؔ ابتدائی اخلاقی شاعری کا آغاز ہے۔ اس زمانہ کی بہترین تصنیف "تروولوزی" تروکورال" ہے۔ یہ تصنیف دو ہوں پر مشتمل ہے جس میں دھرم ملکش دھرم اور ارتھ شاستر کو دھارمک نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ شہریوں کو ریاست کی سرگرمیوں کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور کام (محبت) کو سنگم روایات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف ہر زمانے کے تاملوں کے لیے بائبل کی حیثیت رکھتی رہی ہے۔

ایک چیرا شہزادہ الانگو (کہا جاتا ہے کہ اس شہزادہ نے دنیا ترک کر دی تھی) کی مشہور تصنیف "سلپاڈی کرم" کے ساتھ مقامی رزمیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ انتہائی تہذیب یافتہ دور تھا جو اپنی شائستہ داسیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ ایک قصہ کے مطابق ایک معمولی گھرانہ کی باعصمت شادی شدہ عورت نے اپنے پاکیزہ کردار کی وجہ سے وہ عزت پائی کہ اسے دیوی کا درجہ دے دیا گیا۔ اور اس کی مناسبت سے ایک پتنی عقیدہ رائج ہو گیا جس کے ماننے والے سیلون جیسے دور دراز مقام پر بھی پیدا ہو گئے۔ سنگم روایت کے مطابق یہ رزمیہ ڈرامائی خود کلامی کے تیس حصوں پر مشتمل ہے۔

اس کہانی کی بنیاد پر دوسرا رزمیہ قصہ وجود میں آیا۔ اس کا تعلق منی میکلائی سے ہے۔ جو ایک پاک دامن نرتکی کی بیٹی تھی۔ منی میکلائی نے بالآخر بدھ مت قبول کر لیا اور زندگی بھر دوسروں کے لیے شمع ہدایت بنی رہی۔ یہ ایک بودھی رزمیہ ہے گو اس میں اتنی وسعت عیاں نہیں پائی جاتی جو پہلی رزمیہ میں موجود ہے۔ یہ بجائے خود ایک مکمل رزمیہ ہے اس کا مصنف عظیم شاعر کاٹانار ہے۔

دورِ وسطیٰ کے اہم رجحانات اور لکھنے والے

غالباً قدیم رزمیہ دور کا آخری حصہ یعنی پانچ سو عیسوی کے بعد کا زمانہ بھگتی دور ہے جو نویں صدی عیسوی کے آخر تک چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں شیو کے پیرو یا مار اور وشنو کے پیرو الوار گاؤں گاؤں پھر کر خدا کے رحم و کرم اور انسان سے اس کے گہرے تعلق خاطر کا پرچار کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد تشریح و تفسیر اور شاعرانہ اظہار بیان کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس دور کی شاعری کے ارتقا میں موسیقی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بت سازی، مجسمہ سازی، مندروں میں عبادت کے فروغ اور فن تعمیر کے ساتھ ساتھ خدمت کا جذبہ جو بھگتی عقیدہ کے آفاقی تصورات کا ایک جزو تھا اور جس میں عورتوں اور بچوں کے لیے ایک کشش تھی اور جو اکثر و بیشتر لوک گیتوں کا پیرایہ اختیار کرتا تھا اس دور کی شاعری کا امتیازی نشان تھا۔

اور اس دور کے شیو کے پیرو شاعروں میں تین نام بہت مشہور ہیں بھجن کار سامبانتھار، معتبر صوفی شاعر اپتر اور سندرار جس نے ان دونوں کی پیروی کی۔ وشنوائی شاعروں میں پیری یلوار جیسا نو عمر الہامی شاعر، نمال وار جیسا صوفی منش جس کے وجدانی گیتوں میں اس کی روحانی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے اور ترومنگی الور (Tirumangaialwar) جیسا جلیل القدر شاعر نیز اندال جیسی شاعرہ جس نے میرا بائی کی طرح عشق حقیقی کے گیت گائے ہیں قابلِ ذکر ہیں۔

نویں صدی میں بھگتی دور کے آخری زمانہ میں تامل ناڈو کے عظیم ترین شاعر کم بن نے "اراماوادارم" (Iramaavadaaram) (رام کا نزدل) تصنیف کی۔ اس میں شاعر نے ہندو رزمیہ رامائن کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ کم بن نے رام کو خدائی صفات سے متعین نہیں کیا ہے بلکہ ایک عام انسان کی طرح پیش کیا ہے جو محض اپنے اعمال اور کردار کی بنا پر مکمل انسان بنتا ہے۔ اس رزمیہ کا پس منظر بالکل مقامی ہے اور کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس کے کردار سنگم اور تروک کورال عہد کے تصورات محبت، انسانی عظمت اور عالمی بھائی چارگی کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری رزمیوں میں سے اکثر جینی تلخیصات ہیں۔ اودیان کی کہانی جو پرن کتائی نے بیان کی ہے گنان ڈیا کی "پیسا کا" (Paisaca) رزمیہ پر مبنی ہے۔ ساتھ ہی اس میں اودیان کے لڑکے نروانن کے قصہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے چند ہی حصے دستیاب ہیں تاہم ان سے اس تصنیف کی عظمت کا پورا اندازہ ہوتا ہے تیرو تکا توار نے اپنی قابلِ قدر تصنیف "جیو کا چنتا منی" میں راجہ جیوا کی زندگی کے حالات، اس کی تعلیم، اس کی متعدد شادیوں فتوحات، حکمرانی اور ترکِ دنیا پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ واضح رہے کہ یہ راجہ جین مت کی ۶۳ عظیم ہستیوں میں سے ایک ہے۔ اور یہ دلچسپ بات ہے کہ راجہ جیوا کا قصہ جنوبی ہند میں بہت مقبول ہے۔ چولاامانی (Chulaamani) ایک اور جینی رزمیہ ہے قصہ گوئی کے اعتبار سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے تاہم شاعرانہ قدرتِ بیان کے لحاظ سے وہ ایک عظیم تصنیف ہے۔ بھگتی دور کے آخری زمانہ کا ایک شاہکار "پریا پورانم" (Periyapuranam) کہلاتا ہے۔ یہ رزمیہ شیو بھگت نائن ماروں سے متعلق

ہے جسے بارھویں صدی میں ایک چولا وزیر سیکی لار نے لکھا تھا۔ یہ
رزمیہ اپنی سادگی بیان اور بھگتی کے پاکیزہ جذبات کے لیے مشہور
ہے۔ اس کے بعد پندرھویں صدی میں ہر مندر سے متعلق کئی پرائن
لکھی گئیں جو ستھلا پرائن کہلاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر تال پر سنگیت
کے ساتھ گائی جاتی ہیں اور مندروں میں بہت مقبول ہیں۔

پالوا دور میں اور خاص طور سے چولا راجاؤں کے تحت مختلف
قسم کی درباری شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ متاخر دور کی اخلاقی
شاعری بھی پالوا دور کے ختم تک جاری رہی۔ اس دور کی بہترین تصنیف
"نالا دیار" ہے تاہم روایت یہ ہے کہ اس دور کی بشمول تروکورال
اٹھارہ اخلاقی تصانیف ہیں۔ لطیفوں کے انداز میں اخلاقی شاعری کا
رواج آج بھی ہے۔

تامل راجاؤں کے زوال کے بعد مٹھ تہذیب اور مذہب کے
مرکز بن گئے۔ اب شاعری دھارمک روپ اختیار کرنے لگی۔ اور
درباری شاعری نیز لوک کویتا مندروں اور دیوی دیوتاؤں کے زیر
اثر آگئی۔

جدید دور

جدید دور مغرب سے نئے روابط اور مغلوں کے بڑھتے ہوئے
اثرات کے ساتھ ۱۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ بعض اثرات
تو غالباً اس سے بھی پہلے سے کارفرما رہے ہیں تاہم ان کا نتیجہ ایک
طویل عرصے کے بعد ہی ظاہر ہوا۔ نوجوان اور پچھڑے ہوئے طبقہ
کی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ریورنڈ بیسچی (Beschi)
اٹھارھویں صدی کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے جس نے گرو اور
اس کے بیوقوف چیلوں کے قصّے کو ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں
پیش کیا تھا۔ متعدد شرحوں کے علاوہ منڈلا پرودو تامار کی لکھی
ہوئی "سری پران" نثر کی ایک جینی تصنیف ہے جو مخلوط زبان میں
لکھی گئی ہے۔ یہ کرشنا دیوا رایا کے دور کی تصنیف ہے۔ اس زمانہ میں
ایک تحریک جو اگرچہ نئی نہیں تھی رسوم پرستی اور ذات پات کے خلاف
جاری تھی۔ مختلف نقاط نظر میں ہم آہنگی پیدا کرنا ویدانتی طرز کی
رمز شناسی بھگتی وچار کو فروغ دینا نیز تانترک اور یوگا عقیدہ کا
پرچار کرنا اس تحریک کے مقاصد تھے۔ اس کا ادب سدھا ادب
کہلاتا ہے۔

امانیس (Ammanais) شکل میں عوامی ادب
کو بھی اس دور میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ خانہ بدوش کراتی
(Kurratties) اور گاؤں کے پجاری پرانوں
کے تصوف اور مقامی دیوی دیوتاؤں کی روایات کو دیہاتی عوام اور
عورتوں کے سامنے گا کر بیان کرتے اور ان سے داد سخن پاتے تھے۔
اس نوع کی شاعری میں سورماؤں کے کارناموں سے لے کر پاک دامن
عورتوں کے قصّے، جنگوں کے ہولناک واقعات، کامیاب مہمات کی
تفصیلات اور قحط و خوش حالی کی المناک داستانیں غرض سب ہی
کچھ ہوتا تھا۔

قصّوں اور ناٹکوں کا یہ سلسلہ مختلف مندروں کے اطراف رواج
پاتا رہا۔ چناں چہ " نندی ناٹکم " اس طرح کا ایک ناٹک ہے جس میں
ایک عیّاش آدمی کی زندگی کے عبرت ناک واقعات بیان کیے گئے ہیں جو
اپنے کرتوتوں کی بنا پر اپاہج ہو جاتا اور پھر خدا کی مہربانی سے اچھا
ہو جاتا ہے ایک اور مشہور ناٹک "پلا ناٹکم" ہے جس میں کھیت
مزدوروں کی محنت و مشقت اور ان کی کثیر الازدواجی کے حالات ایک
طنز ملیح کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں جس کا نشانہ اعلیٰ ذات کے
ہندو ہیں۔ کرداینجی ایک طرح کا اُپیرا (غنائیہ) ہے جس میں دو پرانے
قصّے یک جا کر دئے گئے ہیں۔ ایک قصّے کے مطابق ایک حسین عورت،
ایک کنواری لڑکی کا ہاتھ دیکھتی ہے جو عشق حقیقی میں گرفتار ہے۔
دوسرا قصہ ایک خانہ بدوش جوڑے کے ملاپ اور جدائی کی کہانی ہے۔

قدیم رزمیہ اسلوب کو جن نئے عناصر نے قوت اور گہرائی بخشی
ہے ان میں سینٹ جوزف حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر محمدؐ کی داستانیں
قابل ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر ریورنڈ میسی کی " تی مباوانی "
(Te: Mbavani) اور عمرو پی. پلاوار کی "سیرۃ پی پرانم" جو حضرت محمدؐ
کی سیرت پر ہے اسی طرح کی تصانیف ہیں۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں تامل ادب کا صنف واری ارتقا

شاعری

اس دور میں قدیم روایتی شاعری کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن
اب اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہ رہی تھی البتہ غلام قادر
جیسے مسلم اور رہری کرشنا پلے جیسے عیسائی شاعر قابل ذکر ہیں جنھوں نے
اسلامی اور عیسائی نقاط نظر کو تاملی روایات میں ڈھالا اور اسے ایک نیا
رخ اور زرخیز زمین عطا کی۔ اس کے علاوہ ناٹکہ کیرتین کی شکل میں
نئی اصناف شاعری کو اس دور میں فروغ حاصل ہوا جس میں
موسیقی کے ساتھ ساتھ مقامی بول چال کے الفاظ کے استعمال پر زور دیا
جاتا تھا اور درمیان میں نثر کے ٹکڑے بھی شامل کر دیے جاتے تھے۔
جیسا کہ عام طور سے سنگیت کار کلا کشیم یا مقبول عام مذہبی قصّوں
میں کیا کرتے ہیں۔

سنت شاعر رام لنگا کے جاندار لیکن سادہ کلام میں جو آج
بھی بہت مقبول ہے؛ بھگتی شاعری کو ایک نیا موڑ ملا۔ رام لنگا نے
ذات پات کے تمام مصنوعی امتیازات، رسومات اور تعصبات کی
شدت سے مذمت کی اور زندگی کے احترام بھائی چارے اور ہم آہنگی
پر زور دیا۔

۱۸۲۴ء میں دیسی تصانیف کی طباعت و اشاعت پر سے
پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ تعلیم کے فروغ اور قدیم کلاسکی ادب
و مخطوطات کی اشاعت نیز سائنٹفک خیالات کی ترویج کی وجہ

سے لوگ ماضی کے شاندار ورثے سے واقف ہوئے اور آزاد ہندوستان کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ تامل کے قومی شاعر سبرامنیم بھارتی نے عام آدمی کی زبان اور لوک گیتا کے رنگ میں آزادی، اخوت اور مساوات کے گیت گائے اور ہندوستانی اور تاملی روایات کے شاندار ماضی کی جانب توجہ دلائی۔ اس نے اشارتاً یہ بھی بتلایا کہ ہندوستان کس طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور کس طرح آزادی حاصل کرنے کی جدو جہد میں سرگرداں ہے۔ وہ انسانی تعلقات کے ہر پہلو میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔

بھارتی داسن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بھارتی کا چیلہ تھا۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعہ ذات پات اور توہمات کے خلاف سماجی آزادی کی تلقین کی وہ ایک شدت پسند تامل شاعر ہے، وہ ایک مثالی ریاست کا خواب دیکھتا ہے۔ اس نے فطرت کی نیرنگیوں اور ایک عام قناعت پسند تامل گھرانے کے بہت ہی خوب صورت نقوش پیش کیے ہیں۔ دوسرے شاعر بھی نئے آہنگ اور نئے مغربی رجحانات کے ساتھ ان ہی دو شاعروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

اس دوران دو طرح کے رجحانات کو فروغ ہوا۔ ایک تو شاعرانہ جلسے جن کی نوعیت مشاعروں کی سی ہوتی ہے اور جن میں سامعین کے ذوق اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی نظمیں سنائی جاتی ہیں جو مزاح اور طنز سے مملو ہوتی ہیں، جو اکتاہٹ پیدا نہیں کرتیں، جن میں عصری زندگی کے اشارے ملتے ہیں اور جو گوش گزار ہوتے ہی سامعین کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ دوسرا رجحان آزاد نظم کا ہے جس میں بعض شاعر پرانے وزن و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے نثری اسلوب میں لکھ رہے ہیں۔ لیکن بعض پرانے ڈھب سے قطعی انحراف کرتے ہوئے ایک ایسی نظم نما نثر میں شعر کہنا چاہتے ہیں جو ان کے خیالات سے ہم آہنگ ہو۔

ڈراما

قدیم عوامی ناٹک "تر دکاکٹو" جس میں ہر کردار روایتی آرائش و لباس زیب تن کیے۔ گاتا، ناچتا اور ایکٹنگ کے جوہر دکھاتا ہے، دور دراز کے دیہاتوں میں اور خاص طور سے میلوں کے موقعہ پر اب بھی بہت مقبول ہے۔ ان ناٹکوں کے قصے زیادہ تر الہامی اور پرانوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ کنڑی کے "یاکش گانم" اور تلگو کے "یکشاگن" سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ ناٹک انیسویں صدی میں چھپے بھی ہیں۔

اس کے بعد بتدریج اسٹیج کے فن میں ترقی ہوئی اور شیکسپیئر کے ڈراموں کا اثر شروع ہوا۔ سندرم پلے کا "منون مانی"، جو آزاد نظم کے ناول اسٹائل میں ہے پڑھنے میں تو اچھا لگتا تھا لیکن اسٹیج پر کامیاب نہ ہوسکا۔ سام بنتڑ امد لیار ایڈوکیٹ نے (جو بعد میں جج ہو گئے تھے)۔ شوقین اداکاروں کا ایک کلب ق[illegible]یا اور ہر طرح کے ڈرامے لکھ کر جن میں شیکسپیئر کے ڈراموں کی تلخیصات بھی شامل تھیں اور بذات خود ان ڈراموں میں حصہ لے کر اداکاری کے مرتبہ کو بلند کیا۔ بعد میں شنکر داس سوامی گل جیسے ڈراما نگاروں نے پیشہ ورانہ اسٹیج کے لیے بھی ڈرامے لکھے۔ قومی تحریک کے ساتھ ایک نیا جذبہ ابھر آیا۔ اور ٹی۔ کے پلار نے "کھدر کی جے" اور "گورنر کا پیالہ" وغیرہ جیسے ڈرامے لکھے اور نوجوان لڑکوں کی ناٹک منڈلیوں نے انھیں اسٹیج پر پیش کیا۔ ان ڈراموں میں زیادہ تر گاندھی جی کے تعمیری پروگرام کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ بعد میں "راجہ راجن" "اوا یار" "کٹابومن" وغیرہ جیسے ڈراموں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ جن میں ماضی کے تاریخی یا ادبی ورثہ یا آزادی کی جدو جہد پر اظہار فخر کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں سینما نے اسٹیج کو تقریباً میدان سے ہٹا دیا ہے، تاہم "سیوا اسٹیج" کے ذریعہ ڈرامہ کے احیا کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ناول اور افسانہ

تامل زبان میں یوں تو کئی طرح کے قصے کہانیاں مقبول تھیں۔ لیکن پہلا ناول جو انگریزی کے زیر اثر لکھا گیا، وید نایگم پلے کا ایک رومانس ہے تاہم پہلی تصنیف جسے صحیح معنوں میں ناول کہا جاسکتا ہے راجم ایر نے لکھی۔ یہ ایک سماجی ناول ہے جس میں مدورائی ضلع کے ایک برہمن گھرانہ اور یہاں کے تہواروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز جرائم اور پُراسرار واقعات کی چاشنی کے ساتھ کرداروں کے نفسیاتی پیچ و خم اور رومانی اتار چڑھاؤ کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ مادا وایا نے اپنے ناولوں میں سماجی اصلاح کے پہلو پر زور دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہم بیسویں صدی میں قدم رکھتے ہیں۔ اس دور میں تعلیم کی اشاعت کی وجہ سے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور رسائل نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی چناں چہ کئی ناولوں کے ترجمے اور تلخیصات شائع ہوئیں۔ کالکی نے جس کا کلاکش پم اسلوب اس کی ابتدائی تصانیف میں نمایاں ہے، متعدد ناول اور افسانے لکھے۔ اس کے تاریخی ناول جو بڑی حد تک آدرشی رنگ میں ہیں۔ ماضی پر فخر کرنے والے تاملیوں کو بہت پسند آئے۔ اپنے اسلوب ظرافت اور جذبۂ قومیت کی وجہ سے اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی ادیبوں نے اس کا راستہ اختیار کرلیا۔

نئی تکنیک پر مبنی مکمل افسانے وی۔ وی۔ ایس آئر نے لکھے۔ نئے لکھنے والوں نے ایک نئی تحریک شروع کی۔ یہ لوگ افسانہ نگاری کی عام روش سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے نئی راہیں اور نئی تکنیک تلاش کی اور "منی کوڑی" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں نئے لکھنے والوں کی کہانیاں اور ناول چھپنے لگے۔ پوڈومائی پی پٹن کو اس دور کا بہترین افسانہ نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ تامل زبان کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ایم وردا راجن کے ناولوں اور کہانیوں کی وجہ سے اس نوع کا ادب دانشوروں کے حلقوں میں بھی مقبول ہوا اور خود ان کے طالب علم ان کے اتباع میں لکھنے لگے۔ یکے بعد دیگرے کئی رسائل جاری ہوئے جن میں ادب کے نئے رجحانات کی ہمت افزائی کی گئی۔

اکیلن نے متعدد تاریخی اور سماجی ناول لکھے جن میں موخر الذکر خود ان کی رائے کے بموجب گاندھیائی حقیقت پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس دور کے ادیب اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے، جناں چہ راجہ جی کالکی وغیرہ کانگریس سے وابستہ رہے تو انادورائے اور دیگر ادیبوں نے ڈی، ایم ، کے کی تائید کی اور کچھ ادیب جیسے رگھوناتھن وغیرہ کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہوگئے۔ اس دور میں ایسے متعدد ناول لکھے گئے، ہیں جن میں نئی تکنیک کو بلا پس و پیش استعمال کیا گیا ہے ۔ افسانہ نگاری کے میدان میں جیا کنتھن کے کارنامے خاص طور سے قابل ستائش ہیں ۔ بعد میں جیا کنتھن ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ کچھ علاقائی ناول بھی لکھے گئے، ہیں جن میں مقامی بولیوں کو بھی جگہ دی گئی ہے جو رسائل پہلے مذہب اور فلسفہ کے مضامین پر زور دیا کرتے تھے اب ادبی نگارشات شائع کرنے میں پیش پیش ہیں ۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ سیاسی اور سماجی اصلاح اور جدید خیالات کی ترویج میں آرموگا نوالار اور رام لنگا (انیسویں صدی) اور مرائے ملائی آڈیگل، یتھرودیکا انادورائے آر۔ بی ۔ سیتھو پلے اور ای ۔ وی راما سوامی (بیسویں صدی) کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔

ادبی تنقید ابتدا میں سنگم دور کی ادبی نگارشات پر زیادہ توجہ کی گئی اور ان پر کئی تفسیریں اور شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ٹی ۔ کے ۔ سی نے کمبن کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی اور اس کے اعلیٰ ادبی کارناموں سے متعارف کیا ۔ اسی طرح سلاپادی کرم سے متاثر ہوکر کئی نقادوں نے اس پر مضامین لکھے ۔ اس کے بعد مغربی اصول تنقید رواج پانے لگے اور اب تو جدید ناولوں اور افسانوں پر مختلف زاویوں سے تنقید لکھی جانے لگی ہے ۔ بعض نقادوں کی ادبی تنقیدوں سے سیاسی، سماجی اور مذہبی رجحانات کا رنگ بھی جھلکتا ہے ۔

موجودہ دور موجودہ دور کے تامل ادب میں مذہبی اور پرانک قصوں کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو کسی زمانہ میں حاصل تھی اس کی جگہ آج کل کے اہم مسائل نے لے لی ہے ۔ حصول آزادی تک یہ رجحانات کافی تقویت پاچکے تھے اور ان کی جڑیں مضبوط ہوچکی تھیں ۔ آزادی کے بعد پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا ۔ اب سیاسی رجحانات نمایاں حیثیت اختیار کرنے لگے ۔ ادب میں کمیاتی اضافہ کے ساتھ اب کیفیاتی پہلوؤں پر بھی زور دیا جانے لگا ۔ تامل کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دینے کی وجہ سے سائنٹفک اور جدید خیالات کو فروغ ہوا۔ اس کے علاوہ ادبی کاوشوں میں زیادہ آزادی محسوس کی جانے لگی ۔ عام اور غریب آدمی کے مسائل سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جانے لگا اور آزاد اور بے قافیہ شاعری کی تحریک شروع ہوئی ۔

تامل ادب میں مسلمانوں کا حصہ ہر بڑے مذہب کے اہل قلم نے تامل ادب کو متاثر کیا ہے۔ اپنی تہذیب اور تامل کی روایتی تہذیب میں ایک دائمی ہم آہنگی پیدا کرنے کے سلسلہ میں ان حضرات کے کارناموں پر بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سترھویں صدی کا عمروپلاور تامل زبان کا پہلا مسلم شاعر ہے جس کے ادبی کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔ اس کی تصنیف " سیرۃ پی پرانم " میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ یہ تامل میں اس طرح کی پہلی کوشش ہے اور تامل رزمیہ کے روایتی انداز میں لکھی گئی ہے ۔ تامل کے ساتھ عربی الفاظ کی آمیزش کے باوجود شعروں کی روانی اور آہنگ میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا ۔ اس میں مقامی تہذیب کے بھرپور نقوش کے ساتھ ساتھ اسلام کے آفاقی نقطۂ نظر کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے ۔ خود تصنیف کا عنوان دونوں تہذیبوں کی یکجہتی اور ہم آہنگی کی علامت ہے ۔ یہ تصنیف ہجرت تک کے واقعات پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد کے حالات ایک اور مسلم شاعر احمد ومرائی کیار نے اپنی تصنیف " چنا سیرۃ " (سیرۃ صغیرہ) میں بیان کیے ہیں ۔

ان کے علاوہ تامل میں کئی اور اسلامی موضوعات پر نظمیں موجود ہیں، مثلاً وائنگ کلانجی یاپ نے حضرت سلیمان کے واقعات نظم کیے ہیں ۔ تامل زبان کے ایک کہنہ مشق شاعر پلاور نے " راجنا یاگم " کے نام سے ایک رزمیہ لکھی ہے ۔

جلال الدین رومی پر " محی الدین پرانم " کے نام سے تامل میں ایک طویل نظم ہے جو کئی مثنویوں میں لکھی گئی ہے ۔ تامل کے مسلمان اس کا بڑے احترام سے ورد کرتے ہیں ۔ علاقہ ناگا پٹنم کے مقام ناگور میں رومی کے ایک مرید کی درگاہ ہے جہاں ہندو اور مسلمان دونوں بڑی عقیدت سے زیارت کو جاتے ہیں ۔ بیسویں صدی کے ایک عالم اور شاعر غلام قادر نوالار کی " ناگائی پی پرانم " ان ہی بزرگ سے متعلق ہے ۔ مسلم شاعروں نے تامل کی تقریباً تمام ہی اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کے کلام نے تامل شاعری کو نیا موضوع، تازگی، ندرت اور قوت عطا کی ہے ۔ مسلمانوں نے تامل میں عربی اور فارسی کے اثرات کے تحت بعض مخصوص اصناف سخن کا بھی اضافہ کیا ہے ۔ مثلاً (۱) پدائی ۔ پی ۔ پور (Padai-P-Po r) یعنی اسلامی غزوات سے متعلق رزمیے جو تامل کی مقبول عام بحر امانائی میں گائی جاتی ہیں اور جس میں مفہوم کے ساتھ ساتھ بحر تبدیل ہوتی ہے ۔ (۲) مناجات (۳) قصہ جس میں اسلامی تاریخ کا کوئی واقعہ بیان کیا جاتا ہے ۔ (۴) مسئلہ ۔ جس میں سوالات، مسئلے یا پہیلیاں اور ان کے حل پیش کیے جاتے ہیں ۔ اور (۵) نامہ جس میں واقعات نگاری ہوتی ہے ۔

تامل زبان کو مسلمانوں کی سب سے بڑی دین وہ تامل گیت اور نظمیں ہیں جو مسلم صوفیا سے منسوب ہیں ۔ کنن گڈی نامی ایک مقام کے رہنے والے انیسویں صدی کے صوفی شاعر مستان کے ترانے ہندو اور مسلمان بڑی عقیدت سے گاتے ہیں ۔ یہ ترانے ایک تامل صوفی تایو مانوار (Ta; Yuma Navar) کے گیتوں کی نہ صرف یاد دلاتے ہیں بلکہ صوفیانہ اور ویدانتی تعلیمات کا ایک خوش گوار مرکب بھی ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی

ہے۔ تن کاسی کے پیر محمد نے بھی جن کی درگاہ کیرالا کے مقام تکالی میں واقع ہے۔ تامل ناڈ کے سدھا طرز میں متعدد لوک گیت لکھے تھے اور یہ بات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ ان کا کلام بھی ہندو رشیوں کے گیتوں کے مجموعہ میں شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی مقبول عام نظم "پسول گورم" مثنوی مولانا روم سے متاثر ہو کر لکھی تھی جس کا ترجمہ مولوی صادق اللہ عالم نے ان کی خاطر تامل میں کیا تھا۔ ان کے علاوہ کئی اور مسلم صوفیا گزرے ہیں جن کا کلام تامل میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ تقریباً بیس سے زائد تامل مسلم شاعروں کی شعری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں لیکن وہ سب کی سب عربی رسم الخط ہی میں ہیں۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ تامل کے مسلم ادیبوں کی تصانیف کا صحیح متن ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن اب حال ہی میں ان کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ہوا ہے اور بعض تصانیف کے صحیح ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ترکی زبان وادب

ترکی زبان

ترکی زبان التائی یورال زبانوں کے گروہ سے متعلق التصاقی (Agglutinative) زبان ہے۔ چنانچہ کلمے کی اصل کو یکے بعد دیگرے لاحقے لگا کر جو لفظ تشکیل پاتا ہے وہ اکثر دیگر زبانوں سے ایک فقرے یا بعض اوقات پورے جملے کے مساوی ہوتا ہے مثلاً "سیومک" (محبت کرنا) کو لیجیے۔ اصل "سیو" پر "اش" لگایا تو "سیوشمک" بنا جس کے معنی "باہم محبت کرنا" ہے۔ اس میں "تر" کا اضافہ کیا تو "سیوش ترمک" بنا (بمعنی باہم محبت کرانا) مزید "ال" بڑھانے سے "سیوش ترل مک" وجود میں آیا جس کے معنی "آپس میں محبت کرا دیئے جانے" کے ہیں۔ منفی شکل دینے کے لیے "م" (مے) لایا جاتا ہے جیسے "سیومک" سے "سیومیمک" (محبت نہ کرنا)۔ اقتداری فعل کی علامت "بل" ہے مثلاً "سیوے بیلمک" (محبت کرسکنا) التزامی شکل "میلی" کی اضافت سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے سیومیلی ہنرالھیں (محبت کرنی چاہیے) فعل سے اسم اور اسم سے فعل با آسانی اور بکثرت بنتے ہیں اور یہ زبان خواص فعل کی حامل صفات اور حالیہ فقروں سے مالا مال ہے۔ فعل کا ماضی، حال اور مستقبل تو ہوتا ہی ہے مگر ماضی کی دو قسمیں ہیں ایک ماضی مطلق تو ایک "مش" والا ماضی۔ موخر الذکر کے ذریعے اکثر سنی سنائی بات کا ذکر مقصود ہوتا ہے۔

اسم کی پانچ حالتیں ہوتی ہیں۔ (۱) مفعولی (مفعول بہ) (Accusative)—(۲) اضافی (مضاف الیہ) (Genitive) (۳) ظرفی (مفعول الیہ) (Dative) (۴) مکانی (Locative) (۵)۔ اخراجی (مجرور) (Ablative)۔

ترکی میں تذکیر و تانیث کا جھمیلا نہیں۔ صوتیاتی لحاظ سے ترکی کا امتیازی وصف مصوتوں کی باہمی ہم آہنگی ہے یعنی ایک کلمے میں ایک ہی قسم کے مصوتے آتے ہیں یعنی عقبی مصوتوں (Back Vowels) ı' a, (Dotless ı غیر منقوط آئی)، u' o. کے بعد عقبی مصوتے اور اگلے مصوتوں (Front Vowels) u' o' i, e, کے بعد اگلے مصوتے آتے ہیں۔ اسی مناسبت سے جمع بنانے والا لاحقہ استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی "لو" آتا ہے تو کبھی "لار" مثلاً آدمی کو آدم کہتے ہیں یہ عقبی مصوتہ ہے اس لیے اس کی جمع "آدم لار" ہوتی ہے "ایو" (گھر) کی جمع "ایولر" ہے۔ متوازی مصوتوں کے استعمال نے پوری زبان کو بہت باضابطہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ اسے سیکھنے میں خاص لطف آتا ہے۔ اس زبان کی ایک قابلِ ذکر نحوی خصوصیت یہ ہے کہ جملے کا خاص حصہ آخر میں آتا ہے۔

قدیم ترین ترکی کتبے رونی حروف میں ہیں۔ بعد میں اویغور رسم الخط کا استعمال ہوا۔ ترکوں نے قبول اسلام کے بعد عربی رسم الخط اختیار کیا جو اعلان جمہوریت کے بعد ۱۹۲۸ء میں ترک کر دیا گیا۔ اب ترکی لاطینی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں ۲۹ حروف ہیں جن میں ۸ مصوتے ہیں۔ لاطینی کے کچھ حروف کو تبدیل کر کے لیا گیا ہے مثلاً 'c' سے 'ج' مراد لیا جاتا ہے اور 'چ' کے لیے اس حرف (c) کے نیچے 'و' جیسا نشان لگایا جاتا ہے (ç)۔

اسلامی دور میں ترکی زبان پر عربی فارسی کا غلبہ رہا۔ جمہوری دور میں عربی فارسی الفاظ بالخصوص عربی فارسی ترکیبیں کم کر دی گئیں اور خالص ترکی الفاظ کے استعمال پر زور دیا گیا۔ بعض حالتوں میں عربی الفاظ کے بجائے فرانسیسی الفاظ کو ترجیح دی گئی۔ مثلاً بین الملل کی جگہ Enternasyonel اقتباس کی جگہ Adaptasyon

ہندوستان کی بیشتر زبانوں پر فارسی کے علاوہ ترکی نے بھی اثر ڈالا۔ چاقو، چقماق اور قلی کی قبیل کے الفاظ اردو کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور بعض دیگر ہندوستانی زبانوں میں آج بھی مستعمل ہیں۔

ترکی ادب

عہد ماقبل اسلام: ترکی میں سب سے قدیم آثار وہ کتبے ہیں جو ساتویں آٹھویں صدی عیسوی میں مشرقی گوک ترک شہزادوں کے اعزاز میں لکھے گئے۔ یہ سائبیریا اور منگولیا میں ملتے ہیں بعد ازاں اویغور رسم الخط میں کچھ چیزیں لکھی گئیں محمود کاشغری کی 'دیوان لغات الترک' (۱۰۷۱ء) میں ماقبل اسلام تحریروں کے نمونے دستیاب ہیں اور اسلامی عہد کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں۔

اسلامی عہد: دسویں گیارہویں صدی عیسوی سے ترک دائرۂ اسلام میں آنے لگے۔ گیارہویں صدی عیسوی ہی سے عربی اور فارسی کے زیر اثر ادبی اہمیت کی حامل تصانیف منظر عام پر آئیں۔ اس سلسلے کی قدیم ترین تصنیف 'قوتادغوبلیگ' ۱۰۶۹ء ہے جسے یوسف خاص حاجب نے مشرقی ترکستان کی ادبی زبان میں لکھا۔ اس عہد کی دوسری اہم کتاب ادیب احمد کی 'عتبۃ الحقائق' ہے۔ بعد ازاں ترکی کی تینوں شاخوں

چغتائیؔ، آذری اور عثمانی میں ہمیں ادب ملنے لگتا ہے۔

چغتائی ادب

چغتائیؔ کو تیرہویں صدی کے اواخر سے وسط ایشیا کے ترکوں میں فروغ ہوا۔ وہ زبان جسے خاقانیہ ترکی کہا جاتا ہے اس پر مبنی ہے۔ ہرات اور سمرقند اس کے خاص مرکز رہے ہیں۔ کچھ مدت کے لیے دہلی بھی اس کا مرکز رہا ہے۔ علی شیر نوائیؔ (انتقال ۱۵۰۱ء) اس ادب کا سب سے ممتاز نمائندہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھا اور نثار بھی۔ اس نے خسرو جامی اور دیگر فارسی شعرا کے زیر اثر لکھا مگر غزل اور مثنوی میں اس نے اپنی اختراعی صلاحیتوں کا بھی ثبوت دیا۔ ندیم اور شیخ غالب جیسے بزرگ عثمانی شعرا نے اس کا تتبع کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی زبان کا سچا عاشق تھا۔ اس نے اپنی تصنیف 'محاکمۃ اللغتین' میں بتایا ہے کہ ترکی کسی طرح فارسی سے کمتر نہیں۔ سترہویں صدی میں خیوا کا والی ابو الغازی بہادر خان (انتقال ۱۶۶۴ء) بھی اپنی ترکیت پر نازاں تھا۔ اس نے 'شجرہ تراکمہ' جیسی اہم تاریخی کتاب لکھی۔ چغتائیؔ کو کچھ عرصہ ہندوستان میں بھی فروغ ہوا۔ بابر (انتقال ۱۵۳۰ء) کو نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار کے مجموعے ڈینی سن راس (کلکتہ ۱۹۱۰ء)، سموی لووتیچ (پیٹرو گراڈ ۱۹۱۷ء) اور فواد کوپرولو (استنبول ۱۹۱۳ء) نے مرتب کیے۔ اس کی زبان سادہ اور دل کش ہے اور وہ نوائیؔ کے بعد چغتائیؔ ترکی کا بہترین نمائندہ مانا جاتا ہے۔ نثر میں اس کی مشہور عالم تصنیف 'تزکِ بابری' ہے جس سے اس کی معلومات کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائیؔ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ اے۔ ایس بیوریج نے کیا (لندن ۱۹۲۲ء)۔

حاکم کشمیر حیدر مرزا دوغلات (انتقال ۱۵۵۱ء) نے بھی ترکی میں شاعری کی۔ شہزادوں اور امرائے دربار کو بھی ترکی سے شغف تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کامران (انتقال ۱۵۵۷ء) اور بیرم خاں (انتقال ۱۵۶۱ء) فارسی کے علاوہ ترکی کے بھی شاعر تھے۔ کامران کی شاعری کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بخارا کے ایک حکمراں عزیزی نے اس کی ترکی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ کامران کا ترکی دیوان رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ بیرم خاں کا دیوان ڈینی سن راس نے کلکتے سے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔

ترکی گرامر اور ترکی فارسی فرہنگیں بھی ہندوستان میں لکھی گئیں۔ فرہنگوں میں اظفری (انتقال ۱۸۱۸ء) کی فرہنگ کاما انسٹی ٹیوٹ لائبریری (بمبئی) میں محفوظ ہے۔ انیسویں صدی تک ہندوستان میں ترکی داں موجود تھے۔ اردو کے مشہور شاعر انشا (انتقال ۱۸۱۷ء) نے ترکی میں روزنامچہ کے علاوہ کچھ اشعار بھی لکھے ہیں۔ ادھر وسط ایشیا میں بھی سترہویں صدی سے انیسویں صدی تک خیوا وغیرہ میں نوائیؔ اور فضولی کی تقلید میں چغتائیؔ میں اشعار لکھنے والے موجود تھے۔ بیسویں صدی میں مقیمی (انتقال ۱۹۰۵ء) اور محیی (انتقال ۱۹۰۸ء) شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے زیر نگیں چغتائیؔ نے ازبک کا روپ دھارن کیا ۱۹۲۷ء میں لاطینی الفبا اور ۱۹۴۰-۱۹۴۱ء سے سی ری لک رسم الخط اختیار کیا گیا۔ ازبکی ادب نئی شاہراہوں پر چل پڑا۔ چنانچہ حمزہ حکیم زادہ، نیازی موسی ایبک، میر تیمیر، شاہ محمدوف، عبداللہ قہار اور غفور غلام نے ادب کو سیاسی و معاشرتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میر تیمیر کے ہاں فطرت اور اجتماعی حیات دونوں کی دل کش عکاسی ملتی ہے۔ مگر ازبکی شاعری کو اجتماعی اور انقلابی قدروں سے آشنا کرنے میں سب سے زیادہ سرگرمی غفور غلام (انتقال ۱۹۶۶ء) نے دکھائیؔ۔ حمید عالم جان کا کلام بھی نئے ازبکستان کی امنگوں کا ترجمان ہے۔ اس کی بیوی زلفیہ خانم نے بھی کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ نئی نسل کے شعرا میں ارکن واحدوف، برات بائیے، قابوف اور سعیدہ وغیرہ نے شاعری کو نیا رنگ و آہنگ بخشا۔

آذری ادب

آذری آذربائجان اور جنوبی کاکیشیا میں نمو پذیر ہوئیؔ۔ تقریباً چھ صدیوں تک اس میں ادب پیدا ہوتا رہا۔ حسن اوغلو اور قاضی برہان الدین (چودہویں صدی) اس کے قدیم ترین اہم نمائندے ہیں۔ برہان الدین کے دیوان میں تیوغ بھی، ملتے ہیں، جو ترکی کی مقامی صنفِ سخن ہے۔ آذری کا سب سے عمدہ شاعر نسیمی (المتوفی ۱۴۰۳ء) ہے۔ جس کا تعلق طریقتِ حروفیہ سے تھا۔ اس کے کلام میں اس کی حساس طبیعت کا اظہار بڑے دل آویز انداز میں ہوا ہے۔ پندرہویں صدی کا اہم شاعر حبیبی ہے۔ شاہِ ایران اسمٰعیل صفوی (المتوفی ۱۵۲۴ء) نے بھی آذری میں اشعار لکھے ہیں۔ سترہویں صدی کے فارسی شاعر صائب تبریزی نے بھی سترہ غزلیں اس لہجے میں لکھیں۔ ہندوستان کے مشہور مغل امیر عبدالرحیم خان خاناں کے دربار میں بھی کچھ شاعر تھے جنھوں نے آذری میں شاعری کی مثلاً سیانی وغیرہ۔

ماثرِ رحیمی کی روایت ہے کہ محمد نامی اور محمد بیگ نے 'ترکو' اور 'ورساقی' بھی لکھی جو عوامی اصنافِ سخن سے تعلق رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عثمانی اور چغتائیؔ کے مقابلے میں آذری عوامی ادب کے لیے مشہور ہے۔ اس زبان میں کہانیوں کا منثور مجموعہ کتاب "ددہ قورقوت" کی بڑی شہرت ہے۔ کلاسیکی دور کے مقبول ترین شاعر فضولی نے بھی اسی لہجے میں اشعار لکھے جو پورے ترکی ادب کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ان کا ذکر عثمانی ادب کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں وِدادی اور واقف نے عام پسند نظمیں اور بلا پناہ واقف (انتقال ۱۷۹۷ء) نے حقیقت پسندانہ اشعار لکھ کر شہرت حاصل کی۔ انیسویں صدی میں ذاکر (انتقال ۱۸۵۷ء) اپنی مزاحیہ شاعری کی بنا پر مشہور ہوا۔

اس صدی کے اوائل ہی سے شمالی آذربائجان روس کے زیر اثر آ گیا۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں بیداری کی لہر دوڑ گئیؔ۔ مرزا فتح علی اخوندزادہ (انتقال ۱۸۷۸ء) اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے عام بول چال کی زبان میں تصنیف کردہ طنزیہ ڈراموں کے طفیل آذری ادب میں ایک نئی روش کی داغ بیل پڑی۔ ان کا جرمن اور فرانسیسی زبانوں سے

علاوہ فارسی میں ترجمہ ہوا (مثلاً حکیم نباتات وکلاتے مرافعہ وغیرہ)۔ ایران میں ڈرامہ نگاری کا آغاز انھیں کے زیرِ اثر ہوا۔ ان ڈراموں میں بڑے شگفتہ انداز میں معاشرتی خرابیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اسی اسلوب کے پیشِ نظر مرزا فتح علی کو قفقاز کا گوگول اور مشرق کا مولیئر کہا گیا ہے۔ اس کے متبعین میں نجف بے، سلطان مجید غنی زادہ، نریمانوف وغیرہ نے ڈرامانگاری کو فروغ دیا۔ اسی عصر میں حسن بیگ زردابی (انتقال، ۱۹۰۷ء) نے ۱۸۷۵ء میں "اکینچی" کے عنوان سے پہلا آذری اخبار نکالا جو ترقی پسندی کا مبلغ تھا۔ سید عظیم جیسے شاعر نے اس کے ذریعے قومی بے داری میں حصہ لیا۔ طفلی سے بھی 'ضیائے قفقاز' اور 'کشکول' کی قبیل کے اخبار شائع ہوتے۔ ان میں بھی جدید تعلیم اور آزادیٔ نسواں پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸-۱۹۰۵ء کے انقلابِ روس نے زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب کو بھی ایک نیا رخ دیا۔

جلیل محمد قلی زادہ اور صابر (انتقال ۱۹۱۱ء) جیسے مزاح نگاروں نے ادب کو قومی بے داری کا آلہ بنایا۔ اس سلسلے میں صابر کی ظرافت بڑا موثر حربہ ثابت ہوئی۔ "ہوپ ہوپ" کے نام سے اس کا مزاحیہ کلام باکو میں تین بار شائع ہوا (۱۹۱۲ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۲۲ء)۔ قلی زادہ کا مزاحیہ رسالہ 'ملّا نصرالدین' بھی بے حد مشہور و مقبول ہوا۔ اس نے اہلِ وطن کی جہالت اور تعصب کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ محمد امین رسول زادہ نے 'اچیق سوز' (باکو ۱۹۱۵ء) کے عنوان سے اخبار نکالا جس نے قومیت کے احساس کو مزید ترقی دی۔ اسی زمانے میں حسین جاوید نے فکرت اور عبدالحق حامد جیسے جدید ترکی شعرا کے زیرِ اثر اشعار لکھے۔ اس کا منظوم ڈرامہ 'ابلیس' بہت مشہور ہوا۔ اس کے دونوں شعری مجموعے 'قوشمہ' اور 'دالغا' شعریت اور قومیت کے حسین سنگم ہیں۔ اسی عصر میں علی بے حسین زادہ (انتقال ۱۹۴۰ء) نے اپنے رسالہ 'فیوضات' سے آذری ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی زندگی میں ۱۹۳۹ء سے سی ری لک رسم الخط کا چلن ہوا اور آذری ادب نے حقیقت نگاری کی نئی سمتیں اختیار کیں۔ نئی نسل کے شعرا میں سلیمان رستم، میرودی دل بازی اور نگار نے آذری ادب کو نیا آہنگ عطا کیا۔

ترکی ادب کو سب سے زیادہ فروغ

عثمانی ادب (دیوان ادبیاتی)

ایشیائے کوچک یعنی آج کی ترکی میں ہوا جہاں سلجوقیوں نے حکومت کی اور جہاں بعد میں آلِ عثمان تیرہویں صدی کے اواخر سے تقریباً چھ سو سال تک فرماں روا رہے۔ یہیں ایرانی اثرات کے تحت اوغوز زبان عثمانی (عثمانلی) ترکی کے روپ میں نمو پذیر ہوئی اور کلاسیکی ادب رونما ہوا جو ترکی تاریخ میں 'دیوان ادبیاتی' کے نام سے مشہور ہے۔ مذہب کی زبان عربی رہی۔ ادب و ثقافت کی زبان پر فارسی کو غلبہ حاصل تھا۔ دینی، علمی اور ادبی کتابیں فارسی سے ترجمہ ہوئیں۔ عثمانی بادشاہوں نے معماری و موسیقی کے ساتھ ساتھ ترکی زبان و ادب کو بھی ترقی دی مگر ایرانی ادب حاوی رہا اور ترکی ادب اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھا۔ چنانچہ اصنافِ سخن اور بحریں بھی فارسی سے اخذ کی گئیں۔ مثنوی میں فردوسی و نظامی، قصیدے میں انوری و خاقانی اور غزل میں حافظ وغیرہ کا تتبع کیا گیا۔ فارسی لفظوں، ترکیبوں اور تخیلی پیکروں کی بھی بھرمار ہوگئی۔ سلاطینِ عثمانیہ خود فارسی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ سلطان محمد ثانی نے فرمائش کی تھی کہ آلِ عثمان کا شاہنامہ فارسی میں لکھا جائے۔ بعض ترکی بادشاہ فارسی میں شعر و شاعری کرتے تھے۔ ان کے دربار علم و ادب کے بہت بڑے مرکز تھے۔ دربار کے علاوہ خانقاہیں بھی ادبی سرگرمیوں کی مرکز بنیں اور ان کے پہلو بہ پہلو عوامی ادب کو بھی فروغ ہوا۔ چنانچہ ایک زمانے میں استنبول کے باغوں اور قہوہ خانوں میں ادبی چرچے ہوتے رہے۔ استنبول کے علاوہ قونیہ، بورسہ، بغداد اور ادرنہ بھی ثقافت و ادب کے مرکز تھے۔

ترکی ادب کے اولین نقوش تیرہویں صدی عیسوی سے ملنے لگتے ہیں۔ چنانچہ مشہور صوفی و بزرگ مولانا رومی (المتوفی ۱۲۷۳ء) کے فارسی دیوان میں ترکی اشعار بھی دستیاب ہیں۔ ان کے فرزند سلطان ولد (انتقال ۱۳۱۲ء) نے بھی ترکی میں شاعری کی۔ شیاد حمزہ کا صوفیانہ کلام بھی اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ چودھویں صدی میں دہانی اور یونس امرے (۱۳۲۰-۱۳۲۱ء) دو مشہور شاعر گزرے ہیں۔ دہانی غیر مذہبی لٹریچر میں تو یونس امرے مذہبی (صوفیانہ) ادب میں۔ یونس امرے نے عوام کا لہجہ اختیار کیا۔ اپنے خلوص اور سادگی کی بنیاد پر وہ آج بھی مقبولِ عام و خاص ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی کا بول بالا تھا تاہم قونیہ، قسطاموتو، بورسہ اور دوسرے مقامات پر ترکی خوب پروان چڑھی۔ بعض مقامی شہزادے عربی فارسی میں خاص مہارت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی ترکی ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ عربی فارسی سے ترجمے بھی ہوتے۔ ایک گم نام ادیب نے "پنج تنتر" کے فارسی نسخے کو ترکی کے قالب میں ڈھالا۔ گلشہری نے ۱۳۱۷ء میں منطق الطیر کا آزاد ترجمہ کیا۔ آگاہ سرّی لوند نے اس کا عکسی ایڈیشن انقرہ سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

عاشق پاشا (المتوفی ۱۳۳۳ء) کو عروض پر اس قدر قدرت نہیں تھی جتنی کہ ان کے معاصرین دہانی اور گلشہری کو تھی۔ بہرحال وہ اپنی مثنوی "غریب نامہ" (۱۳۳۰ء) کے لیے مشہور رہے۔ یہ رومی کی تقلید میں بحرِ رمل میں لکھی گئی ہے مگر یہ مولانا کے جوش و ولولہ سے معرّیٰ ہے۔ اس کے دس ابواب ہیں۔ ہر باب کی مناسبت سے مضمون بھی آیا ہے۔ مثلاً چوتھے باب میں چہار عناصر کا ذکر ہے۔ عاشق پاشا نے ایک مختصر مثنوی "فقرنامہ" بھی لکھی ہے۔ اس کی مذہبی نظمیں بھی ملتی ہیں جنھیں "الٰہیا" کہا جاتا ہے۔

عاشق پاشا کے مقابلے میں احمدی (۱۴۱۳ء) ایک ماہرِ فن شاعر گزرا ہے۔ اس کے ہاں یہ شکایت نہیں ملتی کہ ترکی میں شعر لکھنا دشوار ہے جیسا کہ چودھویں صدی بلکہ پندرہویں صدی تک کے بعض شعرا نے کہا ہے۔ فی الحقیقت وہ اس دور کا عظیم ترین شاعر ہے۔ اس کی مثنوی 'اسکندر نامہ'، نظامی کے اسکندر نامہ کی طرز میں لکھی گئی ہے اور

بے حد اہم اور مشہور ہے ۔ اس کے آخر میں آل عثمان کی بھی تاریخ ہے ۔ یہ کم و بیش خالص ترکی زبان اور ترکی سے مخصوص بحر (پرماق حسابی) میں ہے ۔ یہ ایک زمانے میں ایران اور ترکستان میں بھی مقبول رہی ۔ دوسری مثنوی 'جمشید و خورشید' سلمان ساوجی کے تتبع میں ہے ۔ بایزید اول کے فرزند سلیمان چلپی کی شان میں اس نے کئی زوردار قصیدے بھی لکھے ۔ اس کے دیوان میں دل کش پختہ اسلوب میں لکھی ہوئی غزلیں بھی دستیاب ہیں ۔ اسے بجا طور پر نظامی، انوری اور سلمان ساوجی کی برابری کا دعویٰ ہے ۔ ناقدین نے بھی اسے خوب خوب داد دی ہے ۔ ابن عرب شاہ نے اس کا مقابلہ عربی ادیبوں سے کیا ہے ۔ البتہ پندرھویں صدی کے مشہور شاعر شیخی کی شہرت کے بعد سوائے 'سکندر نامہ' کے احمدی کی ساری تخلیقات ماند پڑ گئیں ۔

شیخی ۱۴۲۹ء نے تمام ایرانی اصنافِ سخن کو مع ان کی روایات کے ترکی میں مستحکم کر دیا ۔ اس کے قصائد اور غزلیات کیل کانٹے سے درست ہیں ۔ ایک مثنوی 'خسرو شیریں' اور ایک طنزیہ نظم 'خر نامہ' بھی اس کی یادگار ہے ۔ وہ نظامی، عطار، مولانا روم اور حافظ سے متاثر ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت بھی ظاہر کر سکا ۔ چنانچہ احمد پاشا سے لیکر فضولی تک کم و بیش سب متاثر شعرا نے اس کی قدر کی ۔ شاہانِ عثمانیہ میں اس کے قدرداں سلطان محمد اول اور سلطان مراد ثانی تھے ۔

شیخی کے علاوہ پندرھویں صدی کے مشہور شاعر احمد پاشا (۱۴۹۷ء) اور نجاتی (۱۵۰۸ء) ہیں ۔ احمد پاشا محمد ثانی فاتح استنبول کا ندیم رہا اور روم کے سلطان الشعرا کی حیثیت سے مشہور ہوا ۔ وہ بورسا کا گورنر بھی تھا جہاں اس کا دربار مجمع شعرا و ادبا بن گیا تھا ۔ ایرانی شعرا میں اس کے محبوب شاعر سلمان، حافظ، کمال خجندی اور کاتبی تھے ۔ ایک زمانے میں جب وہ سلطان کا معتوب ہوا تو اس نے ایسا بلیغ قصیدہ (کرم ردیف والا) پیش کیا جس نے فاتح کے دل کو متاثر کیا اور شاعر دوبارہ 'موردِ الطاف' قرار پایا ۔ بایزید ثانی نے بھی اس کی قدر کی ۔ اسی کے ایما پر احمد پاشا کا دیوان مرتب ہوا جس میں ہر متداول صنفِ سخن میں کلام موجود ہے بالخصوص اس کے مربعات بڑی دل کشی کے حامل ہیں ۔ وہ بلا کا حسن پرست تھا ۔ اپنی بعض غزلوں میں اس نے حسینوں کے نام لے کر شعر بھی لکھے ہیں ۔ وہ اپنے عہد کا عظیم ترین سخن ور تھا ۔ نجاتی اور باقی جیسے اساتذہ نے اس کی غزلوں پر غزلیں لکھیں جنھیں ترکی میں 'نظیرے' کہا جاتا ہے وہ شیخی اور نجاتی کے درمیان سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے ۔

نجاتی (انتقال ۱۵۰۸ء) کے کلام میں قدرتِ بیان کے علاوہ ایک خاص قسم کی سادگی اور دل آویزی ملتی ہے ۔ چنانچہ اُسے خسروِ رومی کہا گیا ہے ۔ ایک شاعرہ مہری خاتون نے اس کے نظیرے لکھے ہیں ۔ نجاتی کی دو غزلیں (۱) دونہ دونہ اور (۲) سویلتمیدی لو، ایتمیدی لو ردیف والی غزلیں آج بھی ہر کلاسیکی انتخاب میں جگہ پاتی ہیں ۔ نجاتی کا معاصر مسیحی اپنی غزلوں کے علاوہ شہر انگیز (شہر آشوب) کے لیے مشہور رہے ۔

اس عصر میں نئی صوفی طریقتیں وجود میں آئیں جن کے زیر اثر نہ صرف ترکی سے مخصوص مناقب اولیا کا ظہور ہوا بلکہ ارکانِ طریقت پر منثور و منظوم کتابیں لکھی گئیں اور دینی و صوفیانہ عقائد کی ترویج و تبلیغ کے لیے شاعری بھی موثر ذریعہ بن گئی ۔ دینی ادب کا سب سے مقبول کارنامہ سلیمان چلپی (المتوفی ۱۴۲۲ء) کا مولد (مولود) ہے جو بورسہ میں ۱۴۰۹ء میں تصنیف ہوا ۔ یہ آج بھی فاتحہ خوانی کی مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے ۔ بازیجی زادہ محمد کی 'محمدیہ' (۱۴۴۹ء) دوسری مشہور دینی نظم ہے جو ثقیل زبان میں ہونے کے باوجود ایک زمانے میں وسط ایشیا تک مشہور رہی ۔

نسیمی کے شاگرد رفیعی نے حروفی ادب کا سلسلہ جاری رکھا ۔ اسی طرح طریقتِ گلشنیہ کے بانی گلشنی (المتوفی ۱۵۳۴ء) سے بھی ترکی میں ایک دیوان یادگار ہے ۔ گلشنی ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود سے متاثر تھا ۔ چنانچہ اسے اور اس کے مریدوں کو از راہِ طنز خصوصی کہا جاتا تھا ۔ مشہور شاعر احمد داعی (انتقال ۱۴۴۴ء سے پہلے) کی مثنوی "چنگ نامہ" (تاریخ تصنیف ۱۴۰۵ء) بھی صوفیانہ شاعری میں بڑی اہمیت کی مالک ہے ۔ اس میں روح کو تمثیلاً چنگ قرار دیا گیا ہے ۔

اس عہد میں سادہ ترکی (ترکی بسیط) کا بھی رجحان رونما ہوا ۔ وہ [illegible] اس کا [illegible] نمائندہ ہے ۔ عوامی شعرا (جنھیں ترکی میں اوزان اور عاشق بھی کہا جاتا ہے) قیغوسز ابدال (انتقال ۱۴۴۴ء کے بعد)، کمال امی، حاجی بیرم ولی (انتقال ۱۴۲۹ء) اور اشرف اوغلو (انتقال ۱۴۶۹ء) نے شہرت حاصل کی ۔ حاجی بیرم ولی کے ساتھ امیر سید نے 'ہجہ وزنی' میں الٰہیات لکھ کر علامیہ بیرمیہ ادب کا سلسلہ قایم کیا ۔ اس عہد میں قصہ خوان اور قراغوز کے تماشے بھی مقبول تھے ۔ پندرھویں صدی میں نثر نے بھی ترقی کی ۔ اور دوج بیگ اور عاشق پاشازادے کی لکھی ہوئی تاریخیں بہت مشہور ہوئیں ۔ عاشق پاشازادے نے اپنی تاریخ سادہ زبان میں لکھی ۔ اسی طرح ذیلی لطفی کی مزاحیہ تصنیف "قرق وزیر حکایہ لری" بھی سادہ نثر میں ہے ۔ سنان پاشا اور ترسون بیگ نے البتہ بڑی بوجھل ترکی لکھی ۔

سولھویں صدی سیاسی شان و شوکت کے علاوہ علم و ادب کے لیے بھی ممتاز تھی ۔ سلیمان محتشم (وفات ۱۵۶۶ء) اور سلطان سلیم (انتقال ۱۵۲۰ء) جیسے مشہور بادشاہ اسی عصر میں گزرے ہیں ۔ یہ خود شعر لکھتے تھے اور شعر و ادب کے مربی تھے ۔ ایرانی کلچر سے مرعوب سارا کمال نے اس عصر میں فارسی کے مقابلے میں اپنی زبان کو ذرا حقیر سمجھا ۔ بات یہ تھی کہ اس عصر میں بھی حسبِ سابق فارسی ادب ذہنوں پر حاوی تھا ۔ اسی کے تتبع میں تصنیفات پیش کرنے کا شوق رہا مثلاً حافظ کے خیالات اور ترکیبیں تک فضولی اور بعد میں نفعی وغیرہ نے استعمال کیں ۔ نظامی، سعدی، حافظ اور جامی کے علاوہ فتحی جیسے شعرا بھی مقبول ہوتے ۔

آہی (انتقال ۱۵۱۷ء) نے فتحی کی 'حسن و دل' کو ترکی میں منتقل کیا اور لامعی نے جامی سے ترجمے کیے اور جامیِ روم کہلایا ۔ نوائی کے زیر اثر جمالی وغیرہ نے چغتائی میں شعر کہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ذاتی (وفات ۱۵۴۶ء)، فضولی (انتقال ۱۵۵۶ء)، خیالی (انتقال ۱۵۵۶ء) اور باقی (انتقال ۱۶۰۰ء) جیسے شعرا میں زبردست انفرادیت تھی ۔ انھوں نے

تخلیقی شاہکاروں کے ذریعے ترکی میں ایسے مثالی نمونے پیش کیے جو فارسی کے بالکل ہم پایہ تھے اور جو خود متاخرین کے لیے قابل تقلید نمونہ بن گئے۔ ذاتی اور خیالی کلاسیکی ادب کے استاد مانے جاتے ہیں

تذکرہ نویس عہدی نے خیالی کو حافظ روم کہا ہے مگر صحیح معنوں میں ترکی کا حافظ فضولی بغدادی ہے۔ وہ عراق میں پیدا ہوا جو اس عہد میں شاہ اسماعیل صفوی کے زیر نگیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی مثنوی "بنگ و بادہ" شاہ اسماعیل صفوی کے نام معنون کی اور والئ بغداد کی شان میں قصیدے لکھے۔ سلیمان محتشم کی فتح عراق (۱۵۳۴ء) پر فضولی نے اس کی شان میں قصیدے پیش کیے۔ مگر حکام وقت سے اسے پنشن نہ مل سکی اور وہ مایوس و غمزدہ رہا۔ چنانچہ اس کی زندگی کی طرح اس کا کلام بھی یاس و حرماں سے لبریز ہے۔ وہ جاناں اور دوراں دونوں سے نالاں ہے۔ ایک شعر میں کہتا ہے کہ درد بہت (چوق) ہے اور کوئی ہمدرد (یوق) نہیں۔ بہرحال ایک عاشق صادق کی طرح وہ وقف محبت ہے اور اس کا قول ہے کہ "کاش مجھ دل شکستہ کی ہزار جانیں ہوتیں تو ہر بار یار پر ایک ایک جان قربان کرتا رہتا" فضولی کو اس کے خلوص و سوز و گداز کی بنا پر ترکی کا میر تقی میر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عشق کی ناکامیوں کے اظہار میں جیسی کامیابی اس کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی شاعر کے حصے میں آئی ہو۔ اس نے اپنی مشہور مثنوی "لیلی مجنوں" میں عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی کا اظہار بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ اپنے اس شاہکار کی وجہ سے وہ نظامی اور خسرو کی طرح اعلیٰ مثنوی نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ فضولی نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں شعر لکھے۔ ترکی میں "دیوان" اور مثنوی "لیلی مجنوں" کے علاوہ اس کی حسب ذیل تصانیف یادگار ہیں۔

> بنگ و بادہ، قرق حدیث ترجمہ سی، شاہ و گدا، حدیقۃ السعدا، مکتوبات۔ صوفی حوری نے لیلی مجنوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ (استنبول ۱۹۵۹ء)۔ ترکی دیوان کی نئے لاطینی حروف میں انقرہ میں اشاعت ہوئی (۱۹۵۸ء)

باقی بھی مثل فضولی کے مسلّم الثبوت استاد ہے۔ وہ خاص طور پر اپنی مرصع غزلوں کے لیے مشہور ہے۔ وہ سلیمان محتشم کے دربار سے متعلق تھا جس کی موت پر اس نے پرسوز مرثیہ لکھا ویسے سوز و گداز سے زیادہ اس کا کلام بندش کی چستی اور روانی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے اپنے اشعار میں اپنے عہد کی شان و شوکت کو زندہ کر دیا۔ اگرچہ جیسا کہ اس نے ایک شعر میں کہا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ "گنبد عالم میں ایک دلآویز سُریلی آواز کی گونج کے سوا بھلا کیا باقی رہتا ہے" اس نے مذہب پر بھی کچھ رسالے لکھے۔ باقی کے ہم عصر یحیٰی بیگ تاشلی جالی (انتقال ۱۵۸۲ء) نے خمسہ لکھ کر مثنوی کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ اس کی مثنویوں میں مقامی رنگ بھی نمایاں ہے۔

عزیزی (انتقال ۱۵۸۵ء) اپنے شہر انگیز کے لیے مشہور ہے جس میں اس نے بڑے شوخ انداز میں ۴۹ حسیناؤں کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔ بورسہ کے حالات میں بھی شہر انگیز لکھے گئے ہیں جن میں ادبیت کا سہرا لامعی کے سر ہے۔

اس عصر میں قریم کے والی غازی گرائی (انتقال ۱۶۰۷ء) نے بھی شاعری کی۔ اس نے ایک غزل میں بڑے دلچسپ اور نئے انداز میں "رایتہ میل ایلدر ز قامت دلجو پیرینہ" کہا یعنی یہ کہ ہم قامت دلجو کی بجائے علم و روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ روحی بغدادی (انتقال ۱۶۰۵ء) نے ایک ترکیب بند کی بنا پر اور قرا فضلی نے طرز خیام میں رباعیاں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ اس صدی میں منظوم تاریخیں اور سادہ ترکی میں نظمیں بھی لکھی گئیں۔ ادرنہ کا نظمی (انتقال ۱۵۵۴ء) اپنی سادہ ترکی میں لکھی ہوئی نظموں کے لیے مشہور ہے۔ اس کے دیوان میں اس طرز (یعنی ترکی بسیط) میں لکھی ہوئی ۲۸۵ نظمیں ہیں جن میں قصیدہ، غزل، ترجیع بند ہر صنف سخن ملتی ہے۔ ترکی بسیط کا دوسرا نمائندہ محرمی (انتقال ۱۵۳۵ء) ہے۔ عوامی شعرا میں پیر سلطان ابدال اور مغنی شعرا (سازشاعر لوی) میں قل محمد اور کور اوغلو مشہور ہیں۔

عوام میں مداح (قصہ خواں) بھی موجود تھے اور ترکی سے مخصوص ابتدائی شکل کے ڈرامے (تماشے) بھی مقبول تھے جن کی مخصوص اصناف قرا گوز اور کشادہ میدان کے کھیل ہیں۔

اس عصر میں نثر نے بھی ترقی کی۔ اگرچہ یہ بیشتر فارسی زدہ تھی مورخوں نے بھی بیان واقعہ کے ساتھ ساتھ قدرت زبان اور اظہار فن پر زور دیا۔ سعد الدین افندی کی 'تاج التواریخ'، اسی رجحان کی مظہر ہے۔ ابن کمال اور جلال زادہ جیسے علما نے بھی تاریخ نویسی کی طرف توجہ دی۔ مصطفےٰ علی (انتقال ۱۶۰۶ء) کی "کنہ الاخبار" اس عہد کی سب سے اہم تاریخ ہے۔ یہ ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جو اس زمانے کے لحاظ سے سادہ سمجھی جا سکتی ہے۔ اسلامی تمدن میں ترکوں نے کیا کردار ادا کیا یہ اس موضوع پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ مصنف نے پرانے ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نہ صرف عثمانی تاریخ بلکہ اسلامی اور مغل تاریخ بھی اس میں ملتی ہے۔ اسی مصنف کی دوسری تاریخی تصنیف 'مناقب ہنروران' ہے جس میں خوشنویسوں اور جلد سازوں کا ذکر ہے (اشاعت استنبول ۱۹۲۶ء)

پیری رئیس اور سید علی رئیس کی سیاحتوں پر مشتمل جغرافیائی تصانیف بھی اس دور کی اہم تصانیف میں سے ہیں۔ عثمانی ادب کا قدیم ترین تذکرہ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ یہ سہی (انتقال ۱۸۸۶ء) کا کارنامہ ہے بعد کے تذکرہ نگاروں میں عہدی، لطیفی اور عاشق چلپی نے شہرت حاصل کی۔

سترھویں صدی میں بھی ایران اور ترکی میں ادبی تعلقات کا سلسلہ بدستور قایم رہا۔ انوری، عرفی و صائب جیسے ایرانی شعرا اور خسرو و فیضی جیسے ہندوستانی فارسی گو شعرا ترکی میں مقبول ہوتے مثلاً اس صدی کے مشہور شاعر نفعی (انتقال ۱۶۳۶ء) نے ایک قصیدے میں انوری کے تتبع میں بادشاہ کے دل و دست کو بحر و کان بتایا۔ اس

نے طرزِ انوری و خاقانی ہی سے نہیں سبک ہندی سے بھی استفادہ کیا۔ وہ ایک شعر میں خود کو ترکی کا فیضی بھی قرار دیتا ہے۔ ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کی قدردانیوں کا حال سن کر اس کا بھی ہندوستان آنے کو جی چاہا جیسا کہ اس کے ایک فارسی قصیدے سے پتہ چلتا ہے بہرحال اس کے کلام سے اس کی اجتہادی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے پرشکوہ قصائد کی بنا پر وہ ترکی کا بہترین قصیدہ گو مانا جاتا ہے۔

اس عصر کے دیگر اساتذہ سخن میں نائلی (انتقال ۱۶۶۶ء) نابی (انتقال ۱۷۱۲ء) بالخصوص شیخ الاسلام یحییٰ آفندی (انتقال ۱۶۴۴ء) نے بڑی رواں اور استادانہ غزلیں لکھیں۔ عطائیؔ (وفات ۱۶۳۴ء) کا کمال مثنوی میں ظاہر ہوا تو حالتی کا رباعی میں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس عصر میں صائب اور شوکت جیسے ایرانی شعرا بے حد مقبول ہوئے۔ نائلی شوکت کا مقلد تھا تو نابی صائب کا۔ ظہوری کی تقلید میں ریاضی، عطائیؔ اور حالتی نے ساقی نامے لکھے اس زمانے میں تاریخ گوئی، مدح اور ہجو بھی مقبول ہوئی۔

عوامی شعرا میں قراجہ اوغلان (انتقال ۱۶۷۹-۱۶۸۰ء) اور عاشق عمر (وفات ۱۷۰۷ء) مقبول ہوئے۔ نثر میں ویسی اور نرگسی نے اپنی فنکارانہ قوت کے جوہر دکھائے۔ مورخین میں کاتب چلیبی، نعیما قوچی بیگ اور پیچوی ممتاز ہیں۔ کاتب چلیبی (حاجی خلیفہ) اپنی عربی تصنیف 'کشف الظنون' کی وجہ سے عالمی شہرت کا مالک ہے۔ ترکی میں کاتب چلیبی نے تاریخ اور جغرافیہ پر اہم کتابیں لکھیں۔ جہاں تک معاشرتی ماحول کا تعلق ہے وہ اولیا چلیبی کے سیاحت نامہ میں جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کی ترکی اپنی رنگینیوں کے لیے مشہور ہے بسلطان احمد ثالث (انتقال ۱۷۳۶ء) اور دیگر امرا کو لالے کی کاشت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ یہ دور ترکی میں لالہ دوری کہلاتا ہے۔ اس دور کے رنگ و نکہت ندیم (انتقال ۱۷۳۰ء) کی شاعری میں منعکس نظر آتے ہیں۔ اس پر مستزاد اس کا نکھرا ہوا شیوۂ استنبول ہے۔ وہ استنبول کے حسن ہزار شیوہ کو ترکی شاعری میں زندۂ جاوید کرنے والا پہلا شاعر ہے۔ اس نے ترکی سے مخصوص صنفِ سخن ترکو میں بھی ایک نظم اور کئی شوقیاں لکھیں۔

کلاسیکی دور کا آخری شاعر شیخ غالب (۱۷۹۸ء) ہے جو مولانا رومی کے ارادت مندوں میں سے تھا اور جس کی غزل اور مثنوی (حسن و عشق) دونوں میں فنی حسن نمایاں ہے۔ ایسے زمانے میں جب ایک طرف دیوانِ ادبیاتی کے اساتذہ اور دوسری طرف ایرانی بالخصوص سبک ہندی کے نمائندوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی، شیخ غالب اپنا مخصوص آہنگ برقرار رکھ سکے جو انکی انفرادیت کی دلیل ہے۔ ان کی مثنوی 'حسن و عشق'، ترکی زبان کی بہترین مثنویوں میں سے ہے۔ اس میں تمثیلی انداز میں حسن و عشق کی صوفیانہ تعبیر ملتی ہے۔ انھوں نے ہجائی وزن میں ترکو بھی لکھے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں اہم تذکرے بھی لکھے گئے۔ فرقۂ مولویہ سے منسوب شعرا کا تذکرہ اسرار زادہ نے مرتب کیا۔ صفائیؔ اور سالم نے بھی تذکرے ترتیب دئیے۔ ترکی اور اسلامی خطاطوں کا اہم تذکرہ 'تحفۂ خطاطین' بھی اس صدی میں لکھا گیا۔ یورپ میں مقیم ترکی ایلچیوں کے تحریر کردہ سفارت نامے بھی دلچسپ اور فکر انگیز ثابت ہوئے۔ ان میں سب سے مشہور 'یرمی سکز چلیبی محمد آفندی کا فرانسہ سفارت نامہ سی' ہے۔ ترکوں کو ان کی پس ماندگی محسوس کرانے میں اس قسم کے سفارت ناموں کا بھی حصہ رہا ہے۔ یہ احساس بتدریج بڑھتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اوائل میں یہ جذبہ ان اصلاحات کی شکل میں رُونما ہوا جنھیں تنظیمات کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ادب بے جان بن کر رہ گیا۔

انیسویں صدی میں ترکی میں سیاسی و معاشرتی بیداری کی لہریں اٹھیں۔ دانشورانِ ترکی کی فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور ترکی ادب تنگ کوچوں سے نکل کر نئی کشادہ راہوں پر چل نکلا۔

دورِ جدید

شاعری یورپ بالخصوص فرانسیسی اثرات کے تحت ترکی ادب کو روایتی مضامین و اسالیب سے نجات دلانے والوں میں اولیت کا سہرا شناسی (انتقال ۱۸۷۱ء) کے سر ہے۔ اس نے فرانسیسی زبان سے منظوم تراجم کیے اور ترجمان احوال اور تصویرِ افکار جیسے جدید اخبارات شائع کر کے ترکی میں مغربی تصورات کی تبلیغ کی۔ اس کے ہم عصر ضیا پاشا (انتقال ۱۸۸۰ء) نے بھی اپنے مقالات و منظومات سے اہلِ وطن کی بیداری میں حصہ لیا۔ مگر اس باب میں سب سے زیادہ جسارت نامق کمال (المتوفی ۱۸۸۸ء) نے دکھائیؔ جس کا منتہائے مقصود صریحاً بادشاہ کی مطلق العنانی ختم کر کے قومیت کا نیا احساس بیدار کرنا تھا۔ اس کی قومی نظموں میں سب سے مشہور 'حریت قصیدہ سی' ہے۔ کلام نامق میں نئے احساس کے باوجود لفظیات کے لحاظ سے قدیم شعرا بالخصوص نفیسی کے گہرے مطالعے کی چھاپ نمایاں ہے۔

نامق کمال کی طرح رجائیؔ زادہ اکرم (انتقال ۱۹۱۴ء) اور عبدالحق حامد (انتقال ۱۹۳۷ء) نے بھی جدید ادب کی راہیں ہموار کیں۔ اکرم کا یہ قول بہت مشہور ہوا کہ "قافیہ سامعہ کے لیے ہے نہ کہ باصرہ کے لیے" حامد نے بھی مذاقِ شعری کی تبدیلی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ وہ بمبئی میں بھی کچھ عرصہ رہا جہاں کے حسن سے متاثر ہو کر اس نے ایک نظم "زہرہ ہندی" لکھی۔ "مقبرہ" اس کا شاہکار ہے جو اس نے ۱۸۸۵ء میں بیوی کے انتقال پر لکھی۔ اس میں لمارتین اور ملارمے کے علاوہ فضولی اور شیخ غالب کا بھی کہیں کہیں اثر جھلکتا ہے جیسا کہ پروفیسر گوندوز نے اپنے تحقیقی مقالے 'عبدالحق حامد' (انقرہ ۱۹۵۴ء) میں مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ حامد نے منظوم ڈرامے عبداللہ الصغیر، اشہر اور نسترن بھی لکھے۔ حامد کی زندگی ہی میں یعنی ۱۸۹۱ء میں مشہور ادبی

رسالہ ثروتِ فنون شائع ہوا جس کے گرد توفیق فکرت (وفات ۱۹۱۵ء) اور جناب شہاب الدین (انتقال ۱۹۳۴ء) جیسے جدید شعرا کا گروہ جمع ہوگیا۔ انھوں نے ترکی ادب کو یورپین ادب کے قریب لانے میں مزید کوشش کی۔ جناب شہاب الدین نے فرانسیسی "پارنی سِنس" کا تتبع کیا۔ محبت اور فطرت اس کے دو محبوب موضوع تھے۔ ثروتِ فنون گروپ کا سب سے بڑا شاعر توفیق فکرت ہے جو ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۱ء تک اس رسالے کا نگراں بھی رہا۔ توفیق کا ۱۹۰۰ء تک کا کلام 'رباب شکستہ' میں اور بعد کا کلام 'خلوقین دفتری' (۱۹۱۱ء) میں ملتا ہے۔ توفیق فکرت نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو موضوعِ سخن بنایا۔ اس کے پہلے عروض ترکی پر حاکم تھی۔ اس نے اسے ترکی کا محکوم بنایا۔ توفیق کی شاعری میں اس عہد کی سیاسی و معاشرتی جھلک بھی نظر آتی ہے چنانچہ اس کی مشہور نظم 'سیس' (۱۹۰۲ء) استبداد کے خلاف پرزور نعرۂ بغاوت ہے۔ اسی طرح اس نے مذہب سے بھی بغاوت کی۔ اس کے برخلاف توفیق کا ہم عصر عاکف حکمت (انتقال ۱۹۳۶ء) اسلامی اقدار کا دلدادہ ہے۔ اسے ترکی کا اقبال کہا جاسکتا ہے۔ اس نے بزرگانِ دین پر منظوم حکایتیں لکھیں۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے اشعار سے لوگوں کو جنگ آزادی کے لیے ابھارا۔ ترکی کا ترانۂ ملّی بھی اسی کی تصنیف ہے۔

اسی زمانے میں ضیا گوک الپ (انتقال ۱۹۲۴ء) نے نثر و نظم دونوں میں ترکی قومیت کا راگ الاپا۔ اس عصر میں ایک ادبی گروپ فجر آتی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے ممتاز نمائندے احمد ہاشم (انتقال ۱۹۳۳ء) نے اشاریت سے کام لیا۔ اسی عہد میں محمد امین (انتقال ۱۹۴۴ء) اور رضا توفیق (انتقال ۱۹۴۹ء) نے مخصوص دیسی اصنافِ سخن کے استعمال میں شہرت حاصل کی۔ یحییٰ کمال نے ہجائی وزن کے مقابلے میں غزل اور رباعی جیسے کلاسیکی فارم کو ترجیح دی اور عروض کی رگوں میں نیا خون دوڑایا۔ وہ اپنے پُرعظمت ماضی کا عاشق تھا۔ اس کی مصطفےٰ پاشا، عطری اور شرف آباد جیسی نظمیں دورِ عثمانیہ کے جلال و جمال کی یاد دلاتی ہیں۔

ترکی جمہوریت کے قیام کے بعد ہجائی وزن کو مزید مقبولیت نصیب ہوئی اور خازن سیفی اور خان، فاروق نافذ، انیس بہیج، خالد فخری اور یوسف ضیا اور تاج اس وزن پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان میں فاروق نافذ سب سے ممتاز ہے۔ 'بیر عمر بوبلے گیچتی' (۱۹۳۲ء) میں اس کی بالغ شاعری کے بلیغ نمونے ملتے ہیں۔ نجیب فاضل، بہجت نجاتی گل، محب درانا س، احمد حمدی تارپنار، جاہد صدقی تارنجی نے بھی صفِ اول کے شعرا میں مقام پیدا کیا۔ کمیونسٹ شاعر ناظم حکمت نے آزاد نظم کو رواج دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بدری رحمی، ایوب اوغلو اور خان ولی کانیک، اوکتائے رفعت اور جاہد کلیبی سامنے آتے۔ بدری رحمی نے روزمرہ کی زبان استعمال کی۔ اورخان ولی، اوکتائے رفعت اور ملیح جودت نے مل کر 'غریب' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں ایک مجموعہ شائع کیا جس نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ اس لحاظ سے کہ اس میں ہر اعتبار سے رائج الوقت طرزِ سخن کے خلاف بغاوت تھی۔ دیگر یہ کہ اورخان اور اس کے رفقا کا سماجی شعور بھی بیدار تھا۔ ان کی وجہ سے عوامی گیت کے موتف اور روزمرہ کی بول چال بھی بزمِ شاعری میں دلیری سے در آئی۔

اسی عہد میں صلاح بیرسل نے نئے ڈھنگ سے نظمیں لکھیں اور فاضل حسنو داغلو جہ فکر و فن کے حسین امتزاج کی بنا پر اس دور کا بہترین شاعر مانا گیا۔ اس کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ اس کے کلام میں ہم قدم قدم پر نادر پیکروں سے دوچار ہوتے ہیں اور اس میں عالم گیر اپیل ہے۔ فاضل حسنو کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔

۱۹۵۵ء سے نئی ترکی شاعری کا آغاز ہوا۔ الہان برک، اتیلا الحان، ادیب جان سیور اور جمال ثریا نئی شاعری کے خاص نمائندے ہیں۔

نثر نظم کے ساتھ یورپ کے زیر اثر نثر میں ناول اور ڈراما جیسی نئی مغربی اصناف ترکی ادب میں داخل ہوئیں۔ ترکی میں قدیم زمانے سے قراغوز اور اُرتا اویونو کی قبیل کے تھیٹر موجود تھے۔ جدید مذاق کے مطابق شناسی نے پہلا ڈراما لکھا جس کا نام 'شاعر اولینمے سی' ہے۔

مشہور شاعر نامق کمال بے نے دو ڈرامے 'وطن' اور 'جلال الدین خوارزم شاہ' لکھے۔ ۱۸۷۳ء میں جب 'وطن' اسٹیج ہوا تو اہلِ وطن کے دلوں میں قومی محبت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ 'جلال الدین خوارزم شاہ' بھی جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ اس کا اردو میں عمدہ ترجمہ (۱۹۲۵ء) سجاد حیدر یلدرم کے قلم کا رہینِ منت ہے۔

ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر سے ہوئی۔ یوسف کامل پاشا نے فرانسیسی سے تیلے ماق کا ۱۸۵۹ء میں ترجمہ کرکے اس کا آغاز کیا۔ نامق کمال نے بھی ناول لکھے۔ اس کا ناول 'انتباہ' پہلا ادبی ناول مانا جاتا ہے۔

۱۸۶۰ء اور پھر ۱۸۶۲ء میں شناسی نے جن رسالوں کا اجرا کیا اس سے نئے طرز کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ شناسی اور نامق کمال کے بعد ترکی ادب کو جدید شاہراہوں کی سیر کرانے والوں میں رجائی زادہ اکرم اور عبدالحق حامد پیش پیش رہے۔ اکرم نے ۱۸۹۹ء میں ایک ناول کے ذریعہ سماجی خرابیوں کو طنزیہ انداز میں بے نقاب کیا۔ عبدالحق حامد کے ڈراموں میں 'دخترِ ہندو' مشہور ہے جس میں اس نے اہلِ ہند پر برٹش راج کے مظالم کو طشت از بام کیا ہے۔ اس کے شیکسپیئر کے زیر اثر لکھے ہوئے ڈرامے 'مقبر' سے اس کی نفسیات دانی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ڈرامے 'طارق' کو سجاد حیدر یلدرم نے اردو میں منتقل کیا۔ یلدرم ہی نے ابتدائی دور کے مشہور افسانہ نویس احمد حکمت (انتقال ۱۹۲۷ء) کی 'ثالث بالخیر' اور 'خارستان و گلستان' کو اپنے مخصوص رنگین اسلوب میں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

'سید بطال غازی' اور 'عاشق غریب' جیسی قدیم طرز کی داستانوں کے عاشقوں کو جدید مذاق سے روشناس کرانے والوں میں احمد مدحت آفندی (انتقال ۱۹۱۲ء) کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا ناول 'حسن ملّاح' (تصنیف ۱۸۷۴ء) الیگزنڈر ڈوما کے ماوّنٹی کرسٹو کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ احمد مدحت نے اس قسم کے یورپین طرز کے کئی ناول لکھے۔ اسی طرز کو ترقی دے کر ناول کو مغربی معیار تک پہنچانے والوں میں خالد ضیا (انتقال ۱۹۴۵ء) کی مساعی کو بڑا دخل ہے جیسا کہ اس کے مشہور ناولوں "مائی وسیاہ" اور "عشق ممنوع" سے ظاہر ہے۔ اس کی نثر نہایت فنکارانہ ہے۔ جدید قوم پرست ادیبوں کی نکتہ چینی سے مجبور ہو کر آخر میں اس نے اپنے ناولوں کو عام فہم زبان میں ڈھال کر دوبارہ شائع کیا۔ عام فہم زبان کی حمایت سب سے زیادہ یوسف الدین نے کی اور اس پر عمل بھی کیا۔ ناولوں کے علاوہ ماضی کی تاریخ سے متاثر ہو کر اس نے قومی جذبات سے معمور کامیاب افسانے بھی لکھے۔ حسین جاہد یال چیں (انتقال ۱۹۵۷ء) نے بھی اپنے ناولوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ اس کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ اس کے عہد کے ادبی سین کو سمجھنے کے لیے اس کی 'غو غالرم' (تصنیف ۱۹۱۰ء) اور 'ادبی خاطرہ' (تصنیف ۱۹۳۵ء) نہایت اہم ہیں۔ یعقوب قدری اور خالدہ ادیب خانم (انتقال ۱۹۶۴ء) نے اناطولیا کی زندگی کی مصوری کی۔ یعقوب قدری کا سب سے کامیاب ناول 'ببان' (تصنیف ۱۹۳۲ء) ہے جس میں اس نے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے اسے نمایاں کیا ہے۔

خالدہ ادیب نے شروع میں تعلیم یافتہ عورتوں کے مسائل اور قومی تحریک کو موضوع بنایا۔ بعد میں انھوں نے کردار نگاری پر زور دیا۔ ان کا ناول 'دو نو آئینہ' (تصنیف ۱۹۵۳ء) اس باب میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ انھیں انگریزی پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا ایک ناول 'دی کلاؤن اینڈ ہز ڈاٹر' (لندن ۱۹۳۵ء) سب سے پہلے انگریزی میں لکھا۔ وہ ہندوستان بھی آئیں۔ یہاں کے تاثرات ان کی کتاب 'اندرون ہند' میں ملتے ہیں۔

رشاد نوری نے بھی معیاری ناول لکھے جن میں سے دو کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

(1) (The Autobiography of a Turkish Girl (1949)

(۲) (The After noon Sun)

ان کے معاصرین میں صباح الدین علی اور سید فائق نے افسانے کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ فائق کی نثر بڑی شاعرانہ ہے۔ ترکی میں بغیر پلاٹ کے افسانے لکھنے میں اسے اولیت حاصل ہے۔ سید فائق کے افسانوں کے چار مجموعے بہت مشہور ہیں (۱) "لزوم سز آدم" (۱۹۴۸ء) (۲) "کمپنیہ" (۱۹۵۱ء) (۳) "حوض باشی" (۱۹۵۲ء) (۴) "الم داغندہ وار بیر یلان" (۱۹۵۳ء)۔

حسین رحمی (انتقال ۱۹۴۴ء) نے تقریباً چالیس ناول اور ستّر افسانے لکھے۔ اس نے زولا اور موپساں کی تکنیک اپنائی۔ اس کے ناول اجتماعی بھی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ وہ اکثر ازدواجی تعلقات اور فرنگی ماحول کے انسانوں کو نشانۂ طعن و طنز بناتا ہے۔ عبدالحق شناسی حصار (انتقال ۱۹۶۳ء) نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک قابل قدر کرداری ناول پیش کیے۔

جدید تر ناول لکھنے والے میں الہان تارس، کمال طاہر اور خان کمال (انتقال ۱۹۷۰ء)، شمیم کوجہ گوز، جنگیز داغچی، یشار کمال طالب اپ آیدین، فقیر بائے کورت اور محمود کمال شامل ہیں۔ شمیم نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ طالب اپ آیدین اور فقیر بائے کورت کی طرح اس نے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ محمود کمال کے ناول 'برہم کوے' (تصنیف ۱۹۴۹ء) کا بھی موضوع دیہاتی زندگی ہے۔ جب یہ ناول شائع ہوا تو پورے ملک میں سنسنی پھیل گئی اس لیے کہ اس میں اہل دیہات کی بے بسی کا نقشہ بڑے دل دوز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ یشار کمال نے 'انجے محمد' (تصنیف ۱۹۵۶ء) میں زمین داروں کے مظالم کی روداد بیان کی ہے۔ کمال طاہر انسانی تعلقات و نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور زمانۂ حال کے چوٹی کے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ انشائیہ نگاروں میں صباح الدین ایوب اوغلو اور صلاح بیرسل وغیرہ شامل ہیں روشن اشرف رپورتاژ میں اور نور اللہ تاج نے تنقید نگاری میں شہرت حاصل کی۔ ادبی تحقیقات میں اولیت کا سہرا فواد کوپرولو کے سر ہے۔ ارجمند اکرم اور عزیز نے سین نے مزاح و ظرافت میں نئے نئے گل کھلاتے ہیں۔ نجاتی جمالی، رفیق اندرون اور خالدون تے نر نے ڈرامہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ خاتون ادیبوں میں سب سے معروف نزیہ مے رج ہے۔

تلگو زبان و ادب

لفظ آندھرا، تلگو یا تنوگو ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ملک اور زبان دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قدیم لفظ آندھرا ہے جو رِگ وید میں سب سے پہلے استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد آندھرا کے لوگ بھی ہیں۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ آندھرا کے ہم معنی الفاظ تلگو اور تنوگو کب پہلی مرتبہ استعمال ہوئے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی بدلی ہوئی شکل ہیں۔ تلگو زبان کے ماخذ اور ابتدا کے بارے میں دو مختلف نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سنسکرت اور پراکرت سے ماخوذ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ زبانوں کے دراویڈی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کئی جدید علما اور ماہرین لسانیات اسی نظریے کے قائل ہیں۔

عام طور پر تلگو ادب کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ماقبل ننایا Nannaya دور

اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ تلگو زبان پہلی صدی عیسوی ہی سے رائج تھی۔ چناں چہ تلگو دیہاتوں کے نام، بخشش دینے والوں کے نام، اسناد، خطوط، اوقاف اور حروف وغیرہ چھٹی صدی سے پہلے کے کتبات میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلگو ان علاقوں میں رائج تھی اور لوگ اس سے مانوس تھے۔ ان کتبات میں اکثر کا مقصد ان انعامات اور اوقاف کو بیان کرنا ہے جو راجاؤں، ان کے وزیروں اور سپہ سالاروں کی طرف سے دیے گئے۔ ان کتبات کی ادبی اہمیت زیادہ نہیں۔

پورانوں کا دور

یہ دور ترجموں کا دور کہلاتا ہے اور اس دور کی کتابیں سنسکرت تصانیف کا ترجمہ ہیں۔ ننایا تلگو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے راجا نریندر کی خواہش پر ویاس کی سنسکرت بھارتا کا تلگو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ تقریباً ڈیڑھ صدی بعد تِکّنّا (Tikkanna) نے مہابھارت کے ترجمہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جس کا آغاز ننایا نے کیا تھا پھر یرا پرگڈا (Yerrapragada) نے چودھویں صدی عیسوی میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ تین شاعر عام طور پر کوترایا (Kavitraya) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس دور کے بعد آنے والے شاعروں میں ایک کیٹنا (Ketana) ہے جس نے ڈنڈی (Dandi) کی دسا کمار چرتر کا ترجمہ چمپو کی شکل میں کیا ہے اس نے گنا نیشورم، نامی کتاب بھی تصنیف کی جو دھرم شاستر سے بحث کرتی ہے۔ اس کی دوسری تصنیف آندھرا بھاشا بھوشن ہے جس کا موضوع تلگو زبان کی گرامر ہے۔ مَرنا (Marana) تکّنّا کا ایک شاگرد تھا۔ اس نے مارکنڈیا (Markandeya) پوران کا ترجمہ کیا۔ گونا بدھا ریڈی نے رامائن کو "دوی پد" میں لکھا۔ بھاسکر رامائن جو اب ملتی ہے، ہُلکّی بھاسکرا (Hulakki Bhaskara)، اس کے بیٹے ایک شاگرد اور ایک دوست کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ وِنّا کوٹا پیڈنا نے کاویہ النکار چوڑامنی نامی کتاب لکھی۔ اس کا موضوع بلاغت اور عروض ہے۔ ناچنا سومناتھ اس دور کا ایک اور بڑا شاعر تھا۔ جس کی واحد قابل ذکر کتاب اُترا ہری ومسم (Uttara Harivamsam) ہے اس دور کا دوسرا فاضل شاعر ادھرونا ہے جس نے تلگو زبان کی قواعد سنسکرت میں لکھی۔ تیرھویں صدی کے راجا بددھنا (Baddena) نے نیتی سارا مکتاولی (Neeti Sara Muktavali) تصنیف کی۔ کوی جن سرایم (Kavijana Srayam) پہلی کتاب ہے جو تلگو عروض پر ویمولا وادا بھیما کوی (Vemula VadaBbeema Kavi) نے لکھی۔ منّا چنا کی کیورا بہو چرترم (Keyurababu Charitram) اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے جس کا ماخذ راجا شیکھر کا سنسکرت ڈراما ہے۔

بارھویں صدی عیسوی میں تلگو علاقے نے مذہبی اور سماجی حالات میں بڑی تبدیلیاں دیکھیں۔ بسویسورا (Basaves wara) نے، جو راجا بجلا (Bijjala) کا مشہور وزیر تھا ویرا شیو مذہب کی بنیاد رکھی۔ کئی تلگو اشخاص نے یہ مت قبول کیا۔ ان میں بڑے پنڈت اور شعرا شریک تھے۔ ننی چوڈا (Nanne Choda) کو سیوا شاعروں میں اولین مقام حاصل ہے۔ یہ درباری شاعر "کویراج سکھامنی" کے خطاب سے معزز تھا۔ اس نے ایک نظم "کمار شمبھو" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں کالی داس کی نظم کمار شمبھو کے مضامین پائے جاتے ہیں پھر بھی بحیثیت مجموعی اس کو نئی نظم کہا جا سکتا ہے۔ پنڈت رادھیا اور پال کوریکی سومناتھ (Palkuriki Somanatha) جیسے شاعروں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جن سے شیومت کی اشاعت اور تبلیغ میں مدد ملے۔ پنڈت رادھیا کی جو واحد کتاب ملتی ہے وہ سیوا تتوا سارام (Siva tatwa Saram) ہے جس میں وحدت الوجود کے صوفیانہ مسلک پر تنقید کی گئی ہے۔ پالکریکی سومناتھ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت تلگو اور کنڑی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ اس کی وریشادھپا ستکام (Vrishadhipa Satakam) پہلی باقاعدہ ستکا نظم ہے جو تلگو زبان میں لکھی گئی ہے۔

سری نادھا دور

اس دور کو "کاویہ" کا عہد بھی کہتے ہیں۔ سری نادھا کو "کوی سارو بھوم" کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ اس کی کتابیں سرنگارنئی ششدھم (Sringaranai — Shadham) اور کاسی مکنڈمو زیادہ مشہور و مقبول ہیں۔ بمّرا پوتانا (Bammera Pot ana) سری نادھا کا نوجوان ہم عصر ہے۔ اس نے مہا بھگوت کا تلگو میں ترجمہ کیا ہے۔ جک کانا (Jakkana) نے وکرما کار چرت (Vikramakar Chrita) لکھی ہے۔ یہ ایک بیانیہ نظم ہے جس میں عجائبات اور شجاعت کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اننتا ماتیہ (Anantamatya) چلکنا کا ہم عصر ہے جس کی کتابیں بھوج راجیہ (منظوم افسانہ)، رسابھرن (Rasabharan) چندو درپانم (ChandodarPanam) اور اننتونی چنداسو (Anantuni Chandassu) قابل ذکر ہیں۔ گورانا (Gow Rana) نے لکشنا دیپکا لکھی ہے جس کا موضوع سنسکرت بلاغت ہے۔ اس کی دو اور تلگو نظمیں ہرش چندر چرتر اور نونادھا چرتر بھی قابل ذکر ہیں۔ مدیکی سنگنا (Madiki Singana) نے سنسکرت بھگوتا کا ترجمہ کیا ہے۔ اس نے وسشٹ رامائن اور پدما پوران کا آخری حصہ منظوم کیا۔

دوباگنٹا نارائنا کوی (Dubaganta Narayana) نے سنسکرت پنچ تنتر کا ترجمہ تلگو کے چمپو کاویہ کے طرز میں کیا ہے۔ پلالمری پنا ویرا بھدر (Pillalamari Pina Veera Bhadra) نے سرنگا رسا کنتلم (SringaraSak untalam) اور جے منی بھارتم لکھی۔ اول الذکر میں دشینت اور شکنتلا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ نندی یلیا اور گھنٹا سنگنا (Ghanta Singana) نے ورھا پوران اور فلسفیانہ ڈرامے پربودھ چندرودیا کا سنسکرت سے تلگو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ ونیلا کانتی سورن نے وشنو پوران کا

تلگو میں ترجمہ کیا ہے۔

پربندھا دور یہ تلگو کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کئی پربندھ اس دور میں لکھے گئے۔ کرشنا دیورائے وجیانگر کا مشہور راجا تھا وہ خود بھی ایک بڑا شاعر تھا جس نے تلگو میں امکتا ملیدا (Amukta Malyada) منظوم کتاب لکھی۔ اس کی کئی سنسکرت کتابیں بھی ہیں۔ اس نے اپنے دربار میں کئی بڑے شاعروں کو عزت دی۔ اس کا دربار "بھون وجیا" کہلاتا تھا۔ آٹھ بڑے شاعر جن کا وہ سرپرست تھا۔ اشٹ ڈگاجاس (Ashta Digga Jas) کہلائے جاتے ہیں۔ ان آٹھ شاعروں میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ الاّ ثانی پدتا ہے جو مشہور "منو چرتر" کا مصنف ہے۔ دوسرے آٹھ بڑے شاعروں میں دھورجتی (Dhurjati) کی نظمیں سری کالا ہستی مہاتمیم (Kala h asti Mahatmayam) اور سری کالا ہستیسوراستکا (Kala Hastees wara) تلگو کی بہترین عقیدت مندانہ نظموں میں سے ہیں۔ ایالا راجو راما بھدرا نے راما بھیودیم کے نام سے راماین لکھی۔ پنگلی بھٹو مورتی نے راگھویا پانڈویا کے عنوان سے ذو معنی نظم لکھی جس کا ایک پہلو سری رام کی تعریف سے متعلق ہے اور دوسرا پانڈوؤں کی تحسین کرتا ہے۔

تنالی رام کرشنا اپنے مزاح اور نکتہ سنجی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے دو منظوم کتابیں "ادبھٹارادھیا چرتر" (Udbhata Nadhya charitra) اور "پانڈورنگا مہاتمیا" لکھی ہیں۔ ان نظموں میں دریائے بھیمی کے کنارے بسے ہوئے پنڈریکا کشیتر کی شان و شوکت کو نمایاں کیا ہے اس عہد کا دوسرا شاعر سنکوسالا نرسمہا (Sankusala Narsimba) "کوی ماندھاتا۔ چرترا" (Mandhata Charitra) کا مصنف ہے۔ اس کے بعض اشعار میں شاعر بیان کرتا ہے کہ اس نظم کا سننے والا کوئی یوگی بھی ہو تو محبت کا شکار ہو جائے اور کوئی مست الفت اس کے انقطاع کا پہلو پڑھ لے تو ایک عارف اور یوگی ہو جائے تلگو کی پہلی مشہور شاعرہ آتوکوری مُلّا (Atukuri Molla) ہے اس کی شاعری واقعہ نگاری، فصاحت و بلاغت و لفظی اور معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ دوسری شاعرہ تلاپکا ترمکّا (Tallapaka Timakka) نے شبھدا کلیانم لکھی۔

تلاپکا (Tallapaka) شعرا تروپتی کے دیوتا وینکٹیشور کے پجاری تھے۔ ان کا زمانہ پندرھویں اور سولھویں صدی کا ہے۔ انھوں نے کئی بھکتی گیت لکھے جو موسیقیت اور فنی حسن کے حامل ہیں تلاپکا انّاچاریہ (Annamacharya) کی نظمیں دیوتا وینکٹیشور کی عقیدت سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ پدا کویتا پتامہا خطاب کا بھی حامل ہے۔ اس کے لڑکے پدا ترو ملاچاریہ نے بھی کئی معیاری کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے بڑے بھائی چھنا ترو ملاچاریہ نے "ادھیاتما سیکنرتنالو" سپرد قلم کی اور "سنکیرتنا لکشنا" کا تلگو ترجمہ کیا۔ اس کے لڑکے تروونگلپا (Tiruven galappa) نے "کاویہ پرکاشیکا" اور "اماراانگھا نتوؤ" (Amara Nighantuvu) کی شرحیں لکھیں۔ ایک اور شاعر ولگاپودی وینگیامتیا (Velgapudi Vengaya ma tya) نے فصیح تلگو نظم میں سنسکرت کی کتاب "کرشنا کرن امرتا" کا ترجمہ کیا۔

مذکورہ بالا دور میں کچھ تاریخی کتابیں اور نظمیں بھی لکھی گئیں۔ کاسی سروپا کی "پرتاپ چرتر"۔ اندوگولا وینکیا (Andugula — Venkayya) کی "نرپتی وجییم" (Narepativijayam) کمار دھورجتی کی "کرشنا رائے وجیا" اہم ترین کتابیں ہیں۔ سولھویں صدی کے ایک شاعر کندوکوری ردر کوی نے ایک نظم "سگریوا وجییم" (Sugreeva Vijayam) لکھی اور انعام میں ابراہیم قطب شاہ سے چنتلا پالم گاؤں پایا۔ سولھویں صدی کے نصف اول کے ایک اور شاعر چری گونڈا دھرمانا (Chari g onda Dharmana) نے چتر بھارتم تصنیف کی۔ بری بھٹو کی متعدد تصنیفوں میں صرف "متسیا" (Matsya) اور "ھاپوران" شائع ہوئیں۔ پونی کانتی تلگنا (Ponaikanti Tilaganna) نے اچچا (Achcha) تلگو میں "یاتی چرترا" (Yayati Charitra) نامی کتاب لکھی ہے۔ اددانکی (Addanaky) گنگا دھر نے اپنی نامی کتاب "سموارنو پکھیانا" (Samvaranopakhyana) کو ابراہیم قطب شاہ سے منسوب کیا۔ میدک کا شاعر ملا ریڈی سنسکرت اور تلگو دونوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی تین نظمیں "شٹ چکرورتی" "شیوا دھر موترمو" اور "پدما پورنمو" بہت مشہور ہیں۔

جنوبی دور اس عہد کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ تنجور، مدورا، پدوکوٹا اور میسور میں جنوبی ہند کے نایک راجاؤں کی حکومت تھی۔ ان میں ایسے بھی افراد تھے جنھوں نے نہ صرف تلگو شاعروں کی سرپرستی کی بلکہ وہ خود بھی اس عہد کے ممتاز شاعر تھے۔ اہم ادبی اصناف جو اس دور میں اختیار کی گئیں۔ نثر پربندھ اور یکشاگنا (Yakshagna) ہیں۔

تنجور جب تنجور نایک حکومت کا نام لیا جاتا ہے تو بے اختیار رگھوناتھ بھوپالا کی یاد آجاتی ہے اس نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف "والمیکی چرتر"، "سری رنگا ساوتری راماین" کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ، "پری جتا پہارنا" (Parijata Paharana) "اچیوتا بھیودیم" (Achayuta b hyudayam) اور "کمپنی پرنیا" قابل ذکر ہیں۔ اس کے دربار کی ایک شاعرہ مدھوراونی تھی جس نے اس کی تلگو راماین کو سنسکرت کا جامہ پہنایا تھا۔ اس کے دربار کا ایک شاعر کرشنا دھوری تھا جس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب "رگھوناتھ بھوپالیہ" فن بلاغت پر ہے۔ ایک اور نامور شاعر جو رگھوناتھ کے دربار کی زینت تھا اس نے "راج گوپالا ولاسا" تصنیف کی ہے۔ رگھوناتھ کے لڑکے وجیا راگھو نے پچاس تصانیف چھوڑی ہیں۔ خواتین شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز رنگا جما تھی جو رگھوناتھ کے دربار کی زینت تھی۔ اس نے "راماین بھارتا" اور "بھگوتا" کے خلاصے ترتیب دیے۔ تنجور کا نایک راج مدورا کے نایک راجاؤں کے

ہاتھوں میں منتقل ہوا اس کے بعد مہاراشٹر کے راجاؤں نے اس پر قبضہ کیا۔ ان مرہٹہ راجاؤں نے تلگو زبان سیکھی اور تلگو شعرا کی سرپرستی کے علاوہ خود بھی کئی ڈرامے اور نظمیں لکھی ہیں۔

مدورا تنجور کے نایک راجاؤں کے بعد مدورا کے نائکوں اور میسور کے راجاؤں نے تلگو کے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی۔ مدورا کے نایک دربار میں جو شعرا پھلے پھولے انھوں نے نہ صرف شعر و شاعری کی بلکہ کئی نثر کی کتابیں لکھیں۔ کامیشور کوی نے "ستیا بھاما سنتوانا" (Satyabhama Santwana) کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور دو نثر کی کتابیں "اچاریہ وجیا" اور "دھینوکا مہاتما یم" (Dhenuka Mahatmyam) تصنیف کی ہیں۔ سموکھم وینکٹا کرشنیا نایکا نے "جے منی بھارتا" اور "رادھیکا شنتوانا" یادگار ادبی کارنامے چھوڑے ہیں۔ کندوری وینکٹا چلپتی نے "متراوندا پرینایم" (Mitravinda Parinayam) کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے اور بھاگوتا اور بھارتا کو نثر کا لباس پہنایا ہے۔ مدورا نائکوں کے درباروں میں چند اور نثر کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ان کے دربار کے فاضل شعرا میں گناپوا راپو وینکٹاکوی (Ganap — avarapu Venkata) — شاستروں کا بڑا ماہر تھا۔ اسے کئی بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے کئی کتابیں فن عروض شاعری اور قواعد پر لکھی ہیں۔ اس دور کی نثر میں تاریخی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں رایا واچکو سب سے ممتاز ہے۔

پدوکوٹا اگرچہ پدوکوٹا کے نایک حکمراں آندھرا کے رہنے والے نہ تھے، لیکن انھوں نے تلگو زبان خود سیکھی اور پنڈتوں اور شعرا کی سرپرستی کی۔ ان کی سرپرستی اور ہمت افزائی حاصل کرنے والے شعرا میں ندوروپتی وینکنا (Nudurupati Venkanna) اولین تذکرہ کا مستحق ہے۔ اس نے نظم میں ایک لغت ترتیب دی ہے جس کا نام "آندھرا بھاشا رنوم" (Andhra Bhasharnavam) ہے اس کے علاوہ اس نے "منو پرانا" "رگھونادھیا" اور "راجا ومسا پرستی" (Raja — Vamsa Prasasti) بھی سپرد قلم کی۔ پدوکوٹا کے نائکوں میں ایک راجا رایا رگھوناتھا بھی ہے۔ وہ ایک عالم شاعر تھا۔ اس کی تصنیف "پاروتی پری نایا" ایک پربندھ نظم ہے۔ اس کے بیٹے اور پوتے نے بھی شعرا اور پنڈتوں کی حوصلہ افزائی کی۔

میسور وہ تلگو شعرا جو میسور کے دربار میں پھلے پھولے، اہم نظم و نثر کے کارناموں سے متصف ہیں۔ ان میں سوکاسپتی پلویکری کدیری پتی (Palavekari Kadiri Pati) کی اہم تصنیف ہے۔ اس میں ستر کہانیاں ہیں۔ جن میں سے بعض عریانی اور فحش نگاری کی مثالیں ہیں۔ کدری پتی ماہر افسانہ نگار ہے۔ اس کی کہانیاں عصری زندگی کی تصویر بڑی خوبی سے کھینچتی ہیں۔ اس کتاب کا فارسی میں اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس دور اور دربار کے نثری کارناموں میں ویراراجو کی "بھارتا" قابل ذکر ہے۔ یہ سنسکرت کی "بھارتا" کا تلگو ترجمہ ہے۔ ویراراجو کے بیٹے سنگاراجہ نے کنڑی اور تلگو دونوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔

آندھرا پردیش جنوبی دور میں کئی تلگو شاعروں اور اہل قلم نے نظم و نثر کی کثیر کتابیں آندھرا اور تلنگانہ علاقوں میں لکھی ہیں۔ آندھرا علاقہ کے شاعروں میں دامرلا وینگلا نایکا (Damerla Vengalanayaka) نے "کرشنا چرتر" اور "بھولا چرتر" کتابیں تصنیف کیں۔ کچی منچی تِمّا کوی (KuchimanchiTimma) نے کئی کتابیں تخلیق کیں اور "کوی سرو بھوما" کا لقب پایا۔ اس کی تصانیف میں "رکمنی پرینا یمو"، "راجا سیکھر ولاسمو"، "رسیکا جننو بھرامم" (Rasikajana Manobhiramam) اور "شیوا لیلا ولاسمو" مشہور ہیں۔ دوسری اقسام یعنی اچا (Achcha) تلگو نظموں میں "نیلا سندری پرنایمو"، "راما یمو"، "ککو ٹیشورا ستکم" (Kukuteshwara Satakam) اور "سرو لکشمنا سرا سنگرہم" قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کتاب بلاغت اور قواعد پر لکھی گئی ہے۔ ایتوگو لکشما کوی، تِمّا کوی کا ہم عصر تھا۔ اس نے "وشوامتر چرتر"، "وسویشور ودھرنا" اور "سبھاشتا رتناولی" (Subbashita Ratnavali) لکھی۔ اس کی ایک اور کتاب سنسکرت کی کتاب "سبھاشتا ترسیتی" (SubbashitaTrisati) کا ترجمہ ہے جسے بھرتا ہری نے لکھا تھا۔ الاکچی بالا سرسوتی (Elakuchi Bala Saraswati) اور پیدا گری تِمّا نے بھی 'بھرتا ہری' کی تصنیف کا ترجمہ تلگو میں کیا ہے۔ ادیدم سورا کوی وجیانگر کا باشندہ ہے۔ اس کی یادگار تصانیف میں "جنرن جنمو" (Janaran Janamu) "راما لنگیشورا ستکمو" اور "کوی سمسیا وچھے دمو" (Samasya Vichche Damu) ہیں۔ آخری کتاب بلاغت اور گرامر پر لکھی گئی ہے اس کے علاوہ اس نے ایک لغت "آندھرا چندرا کوکمو" کے نام سے ترتیب دی۔

کنکتی پاپا راجو ضلع نیلور کے ایک قصبہ کا رہنے والا تھا اس نے "اترا راما چرتر" چمپو فارم میں لکھی۔ اس نظم میں راون کی کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب رام چندر جی کی سیتا سے علیحدگی کی تفصیلات بھی بیان کرتی ہے۔ دِتّا کوی نارائنا کوی نے ایک تاریخی نظم "رنگا رایا چرتر" لکھی ہے۔ اس میں بوبلی کی جنگ کا بیان ہے۔ جو بوبلی کے راجا اور وجیانگرم کے وجیا راما راجو کے درمیان ہوئی تھی۔ اس زمانے کے مستعمل اردو الفاظ اس کتاب میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ویمنا (Vemana) ایک اور بڑا یوگی شاعر اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں تھا۔ اس نے ہزاروں شعر لکھے۔ اس سے آندھرا کا ہر پڑھا لکھا مانوس ہے۔ پنڈی پرولو لکشمنا (Pindiprolu Lakshmana) کوی نے راونا دمی یم (Ravana-dammeeyam) لکھی ہے۔ یہ ایک ذومعنی نظم ہے ایک معنی راون پر منطبق ہوتے ہیں اور دوسرے دھرمارایا (Dharmaraya) پر صادق آتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے پہلے حصہ کے شاعروں میں صرف چند نام قابل ذکر ہیں جیسے ستو کرشنا مورتی۔ منڈیکا پروت ایشور شاستری، گوپی ناتھم وینکٹا کوی اور ترگونڈا ویکاما (Tarigonda

(Venkamamba — وغیرہ۔

علاقہ تلنگانہ کے ادیب

مذکورہ بالا عہد میں علاقہ تلنگانہ میں بھی بعض بڑے تلگو شاعر گزرے ہیں۔ سُرابھی مادھورائے یالو (Surabhi Madhava Rayalu) ریاست جٹاپولو کا حکمران تھا۔ اس نے ایک پربندھ نظم چندریکا پری ینا" لکھی۔ پرسورام پنتو لنگا مورتی ورنگل کا باشندہ تھا۔ اس نے ایک پربندھ نظم رتی من مادھوی لاس (Ratimanmadba Vilasam) اپنی جوانی میں لکھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی شاعری کا رخ فلسفیانہ موضوعات کی طرف موڑ دیا۔ اس کی فلسفیانہ تصنیف کا نام "سیتارامانجیا سموادم" (Seetanamanajaneya Samavadam) ہے۔ اس میں آتما اور برھما کی عینیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لنگا مورتی کے بیٹے راما مورتی نے بھی ایک فلسفیانہ نظم "سوکا چرتر" کے عنوان سے لکھی ہے۔ دیور کونڈا کے مری گنگنتی خاندان کے قابل ذکر شعرا میں مری گنگتی سنگرا چاریہ (Maringanti Singaracharya) ایک ہے جس نے دسرتھ راجا نندنا چرتر لکھی ہے۔

۱۷۵۰ء سے ۱۸۵۰ء تک کا دور عام طور پر تلگو ادب میں انحطاط اور زوال کا عہد سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس دور میں اہل قلم لفظی بھول بھلیوں اور بعید از کار استعاروں کا شکار ہوگئے۔ ان میں شاعری کی روح باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا فطری حسن جاتا رہا۔ اس کا ایک مصنوعی چہرہ نمایاں ہوگیا۔ اس دور میں انگریزی ادب سے واقف کار ادیبوں نے ان کمزوریوں کو محسوس کرکے شاعری کی نئی قسمیں اور شکلیں ایجاد کیں۔

دورِ جدید

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی میدانوں میں زبردست انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ٹھیک، تاریخ کے اس موڑ پر چنیا سوری (Chinnaya Suri) نے تلگو زبان کی ایک قواعد ترتیب دی۔ اس نے نثر میں ایک کتاب 'نیتی چندریکا'، سپرد قلم کی جو اس قواعد کی ترجمانی کرتی ہے۔ ٹھیک اسی زمانے میں ایک انگریز سویلین عہدہ دار چارلس فلپ براؤن نے تلگو علاقہ کی انتظامی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے تلگو زبان و ادب کی قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ کئی اہل قلم کی مدد سے تلگو، انگریزی اور انگریزی۔ تلگو لغات بھی مرتب کیں۔ چنیا سوری کی قواعد نے تھوڑی ہی مدت میں اہل علم کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور کئی عالموں نے اس قواعد کے معیار کی پابندی کو اپنا علمی شعار بنایا مثلاً سری پدکرشنا مورتی شاستری نے ان قواعد کو پیش نظر رکھ کر بھاگوتا اور راماننہ لکھی اور آندھرا کے ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔

دوسرے شاعروں میں ملادی سوریا نارائن شاستری نے آندھرا بھوشیہ پروم" (Andhra Bhavishya Parvam) تصنیف کی جس کو قبول عام حاصل ہوا۔ کندوکوری ویریش لنگم پنتلو نے پہلے تو مروجہ طرز شاعری شروع کی لیکن بعد میں اپنا نقطۂ نظر بدل دیا اور نثر کی کئی کتابیں اس نئے ڈھنگ سے لکھیں جن کے باعث وہ گدیا تکننا (Gadya Tikanna) کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ ڈی تروپتی شاستری اور چلا پلا وینکٹا شاستری دونوں نے آسان اور رواں تلگو میں کئی نظمیں لکھیں اور تلگو شاعری میں کئی نئے اسالیب کا اضافہ کیا۔

قدامت پسند شعرا تو اپنے پرانے طرز پر شعر کہتے رہے لیکن انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان شاعروں نے انگریزی شاعروں مثلاً کیٹس، شیلے اور ورڈسورتھ کی شاعری سے متاثر ہوکر تلگو زبان میں ایک نئی ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کو رومانی تحریک کہا جائے تو موزوں ہوگا۔ اس تحریک نے پانچ طریقوں سے خود کو روشناس کیا۔

لگھو کاویہ یعنی چھوٹی نظمیں، کھنڈ کاویہ یعنی واقعہ نگاری، جذباتی ترجمانی، منظر نگاری، صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری۔

۱۹۱۰ء یا اس سے قریب گروجاڈا اپاراؤ پنتلو نے ایک نئی قسم کی شاعری شروع کی۔ اس کی بحریں بھی نئی تھیں، زبان زیادہ عام فہم استعمال کی گئی۔ اس کو نئی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں سری رایا پرولو نے ایک چھوٹی نظم " للیتا" کے عنوان سے لکھی جس کی تقلید ترینا کننم (Trinakan Kanam) نے کی۔ رودرا نامی جاسوا اور دوسرے شعرا نے بھی اس طرز کو اختیار کیا۔ حب وطن اور سچی محبت اس کا موضوع ہیں۔

۱۹۱۷ء میں سری شیوا شنکرا شاستری اور اس کے ساتھیوں نے ایک ادبی انجمن "ساہتیہ سمیتی" کی بنیاد ڈالی۔ اسی سنہ میں جدید شاعرانہ رجحانات کی اشاعت کے لیے ایک ادبی رسالہ "ساہتی" (Sahiti) نکالا گیا۔ اس رسالہ اور اسی دور کے دوسرے رسالوں میں نئی قسم کی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ بسوا راجو اپاراؤ پہلا ممتاز غزل گو تلگو کا ہے۔ اس کی غزلیں خاص و عام میں پسندیدہ ہیں۔ سری دیو ولا پلی کرشنا شاستری نظموں اور گیتوں دونوں میں بڑا فن کار ہے۔ وہ تلگو جذباتی شاعری کا بہترین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی نظمیں کرشنا پکشم (Krishna paksham) اور اروشی اور سری نیتی سباراؤ کی نظمیں ترجمانی جذبات کی بہترین مثالیں ہیں۔ سری پنگلی لکشمی کانتم اور کنٹوری وینکٹیشور راؤ نے مناظر قدرت پر جو نظمیں لکھیں ان کا مجموعہ "تھولاکری" (Tholakari) کے نام سے شائع ہوا۔ دووری رامی ریڈی (Duvvuri Rami Reddy) نے کسانوں کی زندگی پر نظمیں لکھیں۔ اڈدی باپوراجو اور کوی کونڈلا وینکٹ راؤ نے عوامی گیت لکھے۔ نوجوان شعرا جنھوں نے صوفیانہ نظمیں لکھنے کی کوشش کی اس گروپ میں دووری رامی ریڈی، کوپلا جناردھن راؤ، ملاذر پو وسویشور راؤ اور چند دوسرے شعرا شریک ہیں۔ ان کی نظموں میں ٹیگور کی شاعری کا اثر نمایاں ہے۔

جدید شاعری کئی دوسری تحریکات سے متاثر ہوئی جو اس دور کی پیداوار ہیں۔ ویریش لنگم پنتلو نے سماجی اور اصلاح نسواں کی

بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اسی دور میں ہندوستان کی تحریک آزادی نے زور پکڑا جس نے شاعروں اور ادیبوں کی ادبی زندگی پر اثر ڈالا۔ پنگلی اور کتوری شاعروں نے اس اثر سے نئے خیالات، نئے نصب العین اور نئے اسالیب اختیار کیے۔

اس دور کی مختلف تحریکات میں جڈوگو رامامورتی پنتلو (Gidugu Ramamurthy) کی تحریکات ویاوھاریکا آدیاما (Vyavabarika Udyama) نے، نوجوانوں کے ذہنوں پر بڑا اثر کیا۔ سری گروجڈا اولین شاعر ہے جس نے نظم کے لیے بھی بول چال کی زبان اختیار کی۔ بعد کے لکھنے والوں نے اس کی تقلید کی۔ نندوری وینکٹا سبا راؤ کی کتاب "اِنکی پٹالو" (Enki Patalu) کے باعث اس تحریک کو زیادہ تقویت ہوئی۔ اس کے بعد کے لکھے ہوئے ناول، مضامین اور ڈرامے اسی قسم کی زبان کی قبولیت عام پر قوی دلیل ہیں۔

آزادی کی تحریک کے ساتھ آندھرا پردیش کے باشندوں میں ایک الگ صوبے کی تشکیل کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ جن شعرا کی نظمیں اس تمنا کی ترجمانی کرتی ہیں ان میں رایا پرولو، سری وشوناتھ ستیا نارائن، سری ٹی۔ سیتا رامامورتی اور کوڈالی سبا راؤ قابلِ ذکر ہیں۔ سری مدھونا پنتلو ست نارائن شاستری کی "آندھرا پورانم" آندھرا باشندوں کی شان و شوکت کو بیان کرتی ہے۔ اس سلسلے میں سری داسرتھی اور دوسرے شعرا کی نظمیں حبِ وطن اور تلنگانہ کی ترقی کے جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کا اثر

دوسری جنگ عظیم کے بعد تلگو شاعر ایک سپاہی معلوم ہوتا ہے جو راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کر کے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری خارجی اور باطنی حسن سے محروم ہوگئی اور کئی ترقی پسند تصورات ظہور میں آئے۔ دور جدید میں چند ایسے اچھے شاعر بھی ہیں جنھوں نے اظہار خیال کے لیے نئی اور پرانی شاعری کی خوبیوں کو ایک دوسرے میں سمو دیا۔ وہ شاعری کے قدیم استادوں کا بھی احترام کرتے ہیں۔ اور جدید شاعروں کے ساتھ بھی ہمدردی رکھتے ہیں مثلاً وشوناتھ، تم ملا (Tummala)، گدی یارام (Gadiyaram) رایا پرولو (Rayaprolu)، جندھیالہ (Jandbyala) اور راج سیکھر ست اودھانی وغیرہ۔ ان میں وشوناتھ نوجوان ذہنوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے۔ اس نے تلگو ادب کے سارے اصناف میں اپنی جست دکھائی ہے۔

آزادی کے اثرات

جواں سال شاعر آزادی کے بعد جس ڈھنگ سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسے ہم ایک قسم کی نثری شاعری کہہ سکتے ہیں۔ وہ وزن اور بحر کو بھی اظہار خیال کے راستے میں رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ وہ خیالات کے دھارے پر الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ شاعری کے قیود و رسوم سے آزادی کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

سری سری نے اپنی کئی جدید نظمیں اسی طرز میں قلم بند کی ہیں۔ بال گنگا دھر تلک آنجہانی اسی ڈھنگ کے زوردار شاعر تھے۔ دسرتی، اوودرا (Arudra)، دیوگانند (Deveganand)، سوماسندر، بوئی بھیمنو کالوجی اور ڈاکٹر نارائن ریڈی بڑی کامیابی سے اس طرز کو برت رہے ہیں۔ سری کندورتی انجانیلو (Kundurti — Anjaneyulu) — اسی نثری شاعری کے ماہر استاد مانے جاتے ہیں۔ مثلاً ایس۔ ویرا راجو، کرشنا راؤ، رنیتالا (Rentala)، نرلا (Narla) بیراگی، تروپا ریڈی، ملا ریڈی، ڈاکٹر وشوم، ڈاکٹر رنگا راؤ اور گوپال شاستری وغیرہ نے اسی ضمن میں شاعری کی ہے اور اسی طرز شاعری کو مالا مال کر دیا ہے۔ موجودہ سوسائٹی کے حالات سے بے اطمینانی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ملال اور مایوسی اور نثری اسلوب ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان تجربوں کے علاوہ روایتی شاعری بھی جاری ہے۔

تلگو ڈرامہ

کئی عوامی طرز کے ڈرامے جنھیں "یکشگان" کہا جاتا ہے جنوبی دور میں لکھے گئے ہیں۔ حقیقی ڈرامے جن کی بنا سنسکرت ڈراموں کے سانچوں پر رکھی گئی ہے بہت عرصہ بعد تلگو میں ظہور پاتے ہیں۔ کرادا رام چندر شاستری نے ۱۸۶۰ء میں ایک ڈرامہ "منجری مدھوکاریو" نامی لکھا۔ اسے تلگو زبان کا پہلا ڈرامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشہور اہل قلم کنددکوری، وددادی تروپتی وینکٹا کولو، ویدم وینکٹا رایا شاستری اور چند دیگر مصنفین نے سنسکرت اور انگریزی ڈراموں کا تلگو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ تلگو میں ابتدائی ڈرامے لکھنے کا سہرا آندھرا ناٹکا پتا مہا دھرما درم، رام کرشنا چاریہ اور کولاچلم سری نواس کے سر ہے۔ یہ دونوں بلاری کے باشندے تھے۔ انھوں نے ٹریجڈی، کامیڈی، تاریخی، پورانی اور سوشل ڈرامے لکھے۔ تلگو کے مشہور ڈراما نویسوں میں چلکا موری لکشمی نرسمہم، پرو گنتی لکشمی نرسمہا راؤ، تروپتی وینکٹا کولو، بالاجی پتی لکشمی کانتم اور وشوناتھ ستیا نارائنا وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ مہاموپادھیائے (Mabamabopadbyaya) ویدم وینکٹا شاستری نے تین جدید ڈرامے لکھے۔ ان میں "پرتاپ ردرایم" سب سے زیادہ ممتاز تلگو ڈرامہ سمجھا جاتا ہے۔ گروجڈا اپاراؤ پنتلو کی تصنیف "کنیا سلکم" (Kanya Sulkam) تلگو میں بہترین سوشل ڈرامہ ہے۔ ایک ایکٹ ڈراموں میں آتریا کا ڈرامہ "پٹاماری مگادو" (Pettamari — Magadu)۔ بوچی بابا کا "آتما دچن" راما سوامی چودھری کا "شمبوکا ودھا" (Sambukavadba) اور چلم کا "چترانگی" بہت مشہور و مقبول ہیں۔

بتدریج مفصل ڈراموں کی جگہ ایک ایکٹ کے ڈراموں نے لے لی۔ تلاوجھولو سیوشنکرا شاستری، ڈاکٹر نارائن ریڈی، رجمی کانتا راؤ اور کرشنا شاستری نے کئی دلچسپ گایاناٹکا (Gayanatika) لکھے۔ جدید دور میں ایک ایکٹ والے ریڈیو ڈرامے بہت مقبول عام ہوئے ہیں۔

تلگو ناول

اصناف ادب میں تلگو ناول انگریزی ادب کے اثر کا ایک نتیجہ ہے۔ ۱۸۷۳ء میں کھنڈاولی رام چندر نے ایک ناول بعنوان "دھرماوتی ولاسمو" لکھی۔ اس کے بعد دو اور ناول "مالاتر اگمادمو" اور "لکشمی سندرا وجیئے" شائع ہوئے۔ کندوکوری نے "راجا سکھارا چرتر" کے نام سے ایک ناول شائع کیا۔ یہ ناول تلگو کا پہلا اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اسی دور میں کئی ناول سماجی، تاریخی اور پوران کی کہانیوں کے موضوع پر لکھے گئے جن میں طبعزاد بھی ہیں اور ترجمے بھی شامل ہیں مثلاً چلکا مورتی لکشمی نرسمہم کی "رام چندراوجیم" اور "گنپتی" (Ganapati) کٹاورپا وینکٹ شاستری (Kettavarapu Venkat Shastri) کی "بابلی متادی" (Bobbili Muttadi) اور "اگرابرم" (Agrabaram) وینکٹا پاروتی کی "پرماداونم" (Pramadavanam) بھوگاراجو نارائن مورتی کی "وملادیوی" اور "آندھرا راشٹرم"، وشنو نادھا ستیا نرائن کا "ایکا ویرا" (E kaveera) اور "ویئی پداگلو"، سری پد سبرومنی شاستری کی "آتما بولی"، گوپی چند کی "اسمردھی جیویا ترا" اور ڈاکٹر جی۔ وی۔ کرشنا راؤ کی "کیلو بوملو" وغیرہ۔

مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ آنجہانی لکشمی نارائن کا لکھا ہوا ناول "ملاپلی" تلگو ناولوں میں بہت معیاری ناول سمجھا جاتا ہے۔ مزاحیہ طرز کے ناولوں میں موکاپتی (Mokapatti) نرسمہا شاستری کا ناول "برشٹر پاروتیسم" Barishtar Parvateesam اور منی مانکیم نرسمہا راؤ کا ناول "تروما لنگا" (Tirumalinga) اور چند دوسرے مزاحیہ ناول ہیں جو حالیہ دور میں غیر معمولی طور پر مقبول عام ہوئے ہیں۔

تلگو خواتین نے بھی ناول نویسی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان میں قابل ذکر ہیں جیوتی سورما کا ناول "سودکشنا چریتم"، پلوگروتا لکشمی نرسمہا کا "یوگیشوری" اور سبھدرا سبھدرمبا (Subbdramba) کا "جگیلم" (Jagilam)، کے درو لکشما (Varalakshmamma) کا "وسومتی"، کے کوسلیا دیوی کا "پریم نگر"، کے راما لکشمی کا "آنی متیم" (Animuyam) اور وائی سلوچنا روی کا "سکریٹری" وغیرہ۔

اکثر بنگالی اور ہندی زبانوں کے ناولوں کا بھی تلگو میں ترجمہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر بنگال کے ٹیگور، بنکم چندر، سرت چندر اور ہندی کے پریم چند اور دیگر ادیبوں کے ناول تلگو میں ترجمہ کیے جاچکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی، روسی اور دیگر مغربی زبانوں کے ناول تلگو میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں چند قابلِ ذکر فاؤسٹ، وار اینڈ پیس، اناکرینینا، میری رانی اور سمبیوی وغیرہ ہیں۔ اکثر تلگو قصہ نویسوں نے موپساں سامرسٹ مام اور او ہنری وغیرہ کے انداز بیان کا تتبع کیا ہے۔ ممتاز افسانہ نگاروں میں دیلوی سیوا راما شاستری، سیوا لنکلا شاستری، اڈوی باپی راجو (Adavi Bapi Raju) منی مانکیم، گوپی چند اور بچی باپو (Buchi Bapu) وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ چلم مختصر افسانہ نویسی کے فن میں استاد مانا جاتا ہے۔ پالاگمی پدماراجو (Pala gummi Padma raju) نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "گلی وانا" (Galivana) پر عالمی مختصر نویسی کے مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔ کرونا کمار، بھردواج، دھونی کنڈا، مکاپتی، اندرا کانتی، رنگا سوامی، ہیرالال موریا اور دیگر افسانہ نویسوں نے پسندیدہ کہانیاں لکھی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں سیتا دیوی، سرسوتی دیوی، مالتی چندور، سری دیوی، بھانومتی، بینا دیوی اور اے۔ سارا دیوی قابل ذکر ہیں۔

سوانح نگاری اور آپ بیتی

ویریش لنگم پنتلو نے تلگو میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کی لکھی ہوئی کتاب حیاتِ عیسیٰ اور کوئن وکٹوریہ کی زندگی تلگو کی پہلی سوانح حیات ہیں۔ دگنا نا چندریکا گندھاملا نے لنکولو (Lincolu) اشوکا اور چندرگپت کی سیرت پر کتابیں لکھیں۔ چلکا مورتی اور جگگنا شاستری نے بھی کئی سوانح حیات سپرد قلم کی ہیں۔ کے۔ وی لکشمن راؤ نے شیواجی کی زندگی پر، چرنتا نانندا سوامی۔ (Chiranta-nananda Swami) نے رام کرشنا اور وویکانند کی سیرت پر، جی وینکٹیا سبیا نے سروجنی دیوی اور سرت کی زندگی پر اور بی وینکٹیشورلو نے سوامی رام تیرتھ کی حیات پر معیاری کتابیں لکھی ہیں۔ تلگو کے دیگر ممتاز سوانح نگار وادل مودی وینکٹ رتنم کے ستھاکو پاچاریہ ویر بھدرا راؤ، ادیدا (Edida) کامیشور راؤ، دلوری پربھاکر شاستری اور آر۔ اننتا کرشنا شرما وغیرہ ہیں۔ چند کتابیں سیرت پر نظم میں بھی لکھی ہیں۔ ان میں تروپتی وینکٹا کودلو کی کتاب بدھا چرتر، جی۔ وی شاستری کی سیوا بھارتم راجا سیکھر ستوادھنی کی رانا پرتاپ سمہا چرتر اور وینکٹا کوی کی نہرو چریتم مشہور و مقبول ہیں۔

خودنوشت سوانح عمریاں

تلگو میں خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسی چند کتابیں نظم میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں تروپتی وینکٹا کودلو کی "جولکا چاریہ" (Jolaka Charya) جشوا (Jashwa) کی "ناکتھا" (Nakatha) سری ناگما کوی کی "سوویا چرتر"۔ (Sweeya — Charitra) اور سری تملا سیتارا ما مورتی چودھری کی گاندھی جی کی آپ بیتی "بہترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ آنجہانی کندوکری (Kandukuri) چلکا مارتی (Chilkamarti) دلوری سوریا نارائن راؤ، پربھاکر شاستری، اچھنتا لکشمی پتی اور اے کوٹیشور راؤ نے اپنی سوانح عمریاں نثر کے پیرایے میں لکھی ہیں۔ ٹی۔ پرکاشم پنتلو نے اپنی سوانح حیات کو "ناجی وِتا یاترا" (Najeevita Yatra) کا نام دیا ہے۔ سیوا راما شاستری نے گاندھی جی کی سوانح حیات کا ترجمہ "آتما کتھا" کے نام سے کیا ہے۔

مضمون نگاری تنقید اور تحقیق

ویریش لنگم پنتلو تلگو میں پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے جدید رنگ کی مضمون نگاری شروع کی۔ پنوگنتی لکشمی نرسمہا راؤ (Panuganti Lakshmi Narsimha Rao) کا مجموعہ مضامین بنام "ساکشی" (Sakshi) بلند ادب کا نمونہ ہے۔

اننت پور کے ایک نوجوان اہل قلم کا مجموعہ "وڈارو بوتو" (Vadaru Botu) اور منسوری کرشنا راؤ کے اداریوں کا مجموعہ "سمیکشا" (Sameeksha) کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ کے۔ وی لکشمن راؤ پنتلو نے تلگو انسائکلوپیڈیا لکھنے کی ابتدا کی۔ دیگر مضمون نگاروں میں سیپی لکشمی کانتم۔ پربھوکرا شاستری، ملاپلی سوما سیکھرا سرما (Mallampalli Somasekhara Sarma) اور کے۔ رام کرشنا ممتاز ہیں۔

ادبی تنقید نگاری کے میدان میں سب سے پہلے آں جہانی ویریش لنگم پنتلو نے قدم رکھا۔ ان کی کتاب "آندھرا کاولا چرتر" (Andhra Kavula Charitra) تلگو کی تنقیدی کتابوں کی پیش رو ہے۔ گردیدا سری رام مورتی پنتلو نے شاعروں کے حالات پر ایک کتاب "کوی جی دیتاملو" (Kavijeevitamulu) لکھی۔ شیشیا نے آندھرا کوی ترنگینی کے نام سے بارہ جلدوں میں تلگو شعرا کے حالات پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ اہم نقادوں کو یتوادیدی پروفیسر کے۔ لکشمی رنجنم، کے۔ ناگیشور راؤ پنتلو، این وینکٹ راؤ، ڈاکٹر ڈی۔ وی اودھانی، ایس رام کرشنا شاستری، ٹی۔ اچھوت راؤ اور ڈاکٹر بین۔ وینکٹ رامیا کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تلگو ادب کی مفصل تاریخ پندرہ جلدوں میں "ارُدرا" (Arudra) نے لکھی۔ اس تصنیف کا نام "سمگرا آندھرا سہاتیم" ہے۔

مغربی تنقید کے انداز پر تلگو ادب سے متعلق جن ادیبوں نے تنقید نگاری کی ان میں سی۔ آر۔ ریڈی کو اولیت حاصل ہے۔ ان کی تصنیف "کوتوا تتوا وچارم" (Kavitva Tatva Vicharam) معیاری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ حیدر آباد کی تلگو اکیڈمی آندھرا سرسوتا پریشد نے کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں جن میں آندھرولو، سنگھیا چرتر، سوراورم پرتاپ ریڈی کی وہ تصنیف ہے جس پر انھیں قومی انعام ملا ہے۔ اس کے علاوہ سرومنی ایس سوریا نارائن شاستری کی کتاب "کاریہ لنگرا سنگرہا" بطور خاص قابل ذکر ہے۔ آندھرا پردیش کی جامعات میں فارغ التحصیل طلبا نے تلگو کے مختلف موضوعات پر ریسرچ کرکے قابل قدر مقالات پیش کیے ہیں۔ کئی اور صاحبانِ علم وفضل سری کوراڈا (Korada) پروفیسر جی۔ جے۔ سومیاجی، سری وی۔ سیتارا ما سوامی شاستری اور ڈاکٹر چلاکوری نارائن راؤ نے بھی تلگو زبان پر قابلِ قدر کتابیں شائع کی ہیں۔

لوک گیت دوسری زبانوں کی ادبیات کی طرح تلگو میں بھی بکثرت عوامی گیت پائے جاتے ہیں۔ ان کی شعریت خالص اور فطری ہے۔ اس عوامی ادب میں مختصر نظمیں بھی ہیں اور طویل منظوم کہانیاں بھی۔ تلگو کے لوک گیتوں کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً پورانی گیت کی کہانیاں، تاریخی رزمیہ نظمیں اور فلسفیانہ نظمیں وغیرہ۔ اس نوع کی نظموں میں بھکتی، گیان اور کرما کے موضوعات شامل ہیں۔ ان کا تعلق شیومت، وشنومت وغیرہ مختلف مذاہب سے ہے۔ عورتوں کے گیت، بچوں کے گیت، محبت کے نغمے، مرثیے اور مزاحیہ نظمیں ان کے علاوہ ہیں۔

ستکاس تلگو شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں تقریباً ایک سو مکتا شعر ہوتے ہیں اور ہر بند کے آخر میں ایک مصرعہ دہرایا جاتا ہے۔ ان میں اکثر خدا سے مناجات کی جاتی ہے۔ بعض ستکاس میں زمانے کے سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض کا موضوع مہابھارت اور بھوگتا کے قصے ہیں۔ تلگو زبان میں ستکاس نظموں کی تعداد چھ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ستکاس چار اقسام میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ۱۔ نیتی ستکاس، ۲۔ بھکتی ستکاس، ۳۔ ویا جستوتی ستکاس، ۴۔ ویدانتا ستکاس۔

یوگی ویمنا کی شاعری میں تینوں قسم کے "ستکا" پائے جاتے ہیں۔ تلگو کی فلسفیانہ ستکاس بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ستکاس نظموں میں علم وفضل کے مقابلہ میں معاشرت زیادہ جھلکتی ہے۔

مشرقی علوم اور ادبیات کے تراجم

مشرقی علوم اور ادبیات کے متعدد شاہکاروں اور مفید عام تصانیف کے ترجمے تلگو زبان میں کیے گئے ہیں۔ ان سے تلگو ادب کی وسعت اور اہمیت میں اضافہ ہوا۔ آں جہانی مادھے پی ہنمنت راؤ نے علامہ شبلی کی "شعر العجم" کا ترجمہ تلگو زبان میں کیا۔ سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش پی۔ رام کشن راؤ نے شیخ سعدی کی "گلستاں" اور "بوستاں" کے ترجمے تلگو زبان میں کیے۔ آندھرا کے اہل قلم قاسم خاں نے جو محکمہ اطلاعات میں مترجم تھے قرآن مجید کے ایک بڑے حصہ کا فصیح وبامحاورہ ترجمہ تلگو میں کیا۔ مولانا عبدالغفور کرنولی نے مکمل قرآن کا ترجمہ عربی متن کے ساتھ تلگو میں شائع کیا اور شبلی مرحوم کی "سیرت النبی" کی دونوں جلدوں کا تلنگی زبان میں ترجمہ کیا۔ مشہور اسلامی تاریخ "خلفائے راشدین" کو بھی تلگو ترجمے کا جامہ پہنایا۔ انت پور کے پیران نظامی نے مولانا ابوالکلام کے "ترجمان القرآن" اٹھارہ پاروں کے ترجمے اور تفسیر کو مکمل طور پر تلگو میں منتقل کیا۔ انھوں نے حسن نظامی کی کتاب "بیگمات کے آنسو" اور سلیمان ندوی کے "خطباتِ مدراس" کا ترجمہ بھی تلگو میں کیا۔

مولانا سید نوراللہ قادری کرنولی لکچرار عثمانیہ کالج کرنول نے کثیر روحانی واخلاقی تصانیف اور صوفیانہ رسائل کا ترجمہ تلگو زبان میں کیا ہے۔ حضرت ابوالحسن شاذلیؒ کی کتاب "حزب البحر" یٰسین شریف کے فضائل، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی "القول الجمیل" سید صدیق رمز محمودی کے رسائل "چراغِ ہدایت" انھیں کے ترجمہ کے مرہونِ منت ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ مولانا نے دینی موضوعات پر بہت سے رسالے تلگو میں تالیف کیے۔ تلگو کے صوفیانہ ادب میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے سابق پروفیسر سید نبی مرحوم نے عربی درسی کتابوں کا ایک سلسلہ "منہاج العربیۃ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ نے بچوں کی تربیت وتعلیم کے لیے "اسوۂ حسنہ" کے نام سے ایک رسالہ تالیف

کیا۔ سہارن پور کے مولانا سید زکریا مدنی نے فضائل رمضان، فضائل قرآن، فضائل درود شریف اور فضائل ذکر وغیرہ تلنگی میں لکھے۔ شیخ داؤد استاد عثمانیہ کالج کرنول نے "معراج شریف" پر تلگو میں ایک کتاب لکھی ہے۔

جاپانی زبان و ادب

وسعت اور معیار دونوں کے اعتبار سے جاپان کا ادب دنیا کے دوسرے ملکوں کے اعلیٰ ترین ادب کے ہم پلہ ہے۔ جاپانی ادب کی کوئی طویل تاریخ نہیں لیکن اس کا ذخیرہ مختلف اصنافِ نظم و نثر سے مالا مال اور قابلِ قدر ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے کسی ادب پارے کا پتہ نہیں چلا ہے لیکن اس کے بعد سے زمانۂ حال تک ادبی ارتقا کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ جاپانی لوک گیت اور قصص و حکایات البتہ کافی قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاپانی زبان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ادب کے ذخیرے میں دنیا کے بعض طویل ترین ناول اور ڈرامے شامل ہیں۔ لیکن جاپانی ذہن کے جوہرِ قابل کی امتیازی طور پر مظہر ادب کی وہ اصناف ہیں جن میں ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ ان میں ادیبوں کی یاد داشتیں، سفرنامے اور زندگی کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں سے متعلق کسی ربط و ترتیب سے بے نیاز، اظہارِ خیال کے مجموعے ہیں۔ جاپان کے بیشتر اہلِ قلم شہنشاہی دربار سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لیے درباری روایات میں پلی ہوئی نازک خیالی، اظہار کی شائستگی اور محوش اسلوبی اس صنف کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک جاپانی زبان تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد کے زمانے میں کوریائی علما نے چینی زبان و ادب سے اس ملک کو روشناس کرایا۔ اور ابتدائی جاپانی ادب کی تخلیق چینی زبان و ادب کے زیرِ اثر عمل میں آئی۔ اہلِ جاپان صدیوں تہذیب و تمدن سے بے گانہ ابتدائی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی چار صدیوں میں تہذیب کے اثرات رفتہ رفتہ جاپان میں داخل ہوتے۔ جاپانی سماج نے چینی تہذیب کو جلد اپنا لیا۔ جاپانی زبان کو تحریر میں لانے کے لیے کوئی رسم خط نہیں تھی۔ اس لیے چینی حروفِ تہجی استعمال کیے جانے لگے۔ چین کے تصویری رسم الخط کے رواج نے طریقِ اظہار کو متاثر کیا۔ اس کے علاوہ ادبی تخلیق اور تصویری خطاطی میں ایک ربط باہمی پیدا ہو گیا جو اب تک قائم ہے۔ جاپانی زبان کی اولین تحریریں چینی رسم الخط ہی میں ملتی ہیں۔ جاپانی الفاظ کا تلفظ چینی رسم الخط میں صحت کے ساتھ قلم بند کیا جا سکتا تھا اس لیے صوتی اغراض کے تحت چینی حروفِ ابجد کا رواج ہو گیا۔ ابتدائی دور کا تقریباً تمام جاپانی ادب ناپید ہے۔ اوّلین دستیاب تالیفات کوجیکی (Kojiki) اور نیہونگی (Nibongi) ہیں جن کا زمانہ ۷۱۲ء تا ۷۲۰ء کا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں ہیں جو حکومت کی جانب سے لکھوائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ۷۱۳ء اور اس کے بعد کے فودوکی گزٹیر (Fudoki gazetteer) دستیاب ہیں۔ ان تالیفات میں دو سو سے زیادہ لوک گیت شامل ہیں جو تخمیناً پانچویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ابتدائی نظموں میں بحر یا وزن کا لزوم نہیں تھا۔ قافیہ ردیف کا اہتمام بھی نظر نہیں آتا۔ ساتویں صدی عیسوی تک جاپانی شاعری کا یہی ڈھنگ رہا۔ لیکن اس کے بعد شعر کے ارکان کا التزام کیا گیا۔ اور ہر مصرعے میں ارکان کی تعداد کیا ہو اس کا تعین عمل میں آیا۔ اس بدلے ہوئے طرز میں کتنی باکمال سخنوروں نے طبع آزمائی کی جن کی شاہکار نظمیں ۷۵۹ء میں "مینیوشو" (Manyosbu) نامی مجموعے میں شامل کی گئیں۔ یہ ۴۵۰ شاعروں کی ۴۵۰۰ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان شعرا نے جاپانی زبان استعمال کی۔ چینی الفاظ کو ترک کرنے کا رجحان اس زمانے میں عام ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے آغاز تک مؤثر طور پر بروئے کار رہا۔

۱۱۸۵ء – ۱۶۰۰ء جاپان کا ازمنۂ وسطیٰ مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں شاہی دربار کی فرمائش پر نظم کے پندرہ اور مجموعے مرتب کیے گئے۔ بیشتر شعرا نے جاپان کی خوشحالی کے دور کی روایتی روش کو اپنا شعار بنایا لیکن "شن کوکنشو" (Shin kokinsbu) نامی مجموعے میں جس کا معیار اعلیٰ ہے زندگی سے بیزاری، یاس اور موت کی خواہش کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ اس مسلک کے حامی شعرا نے اپنے پیش رو شاعروں کے تصنع اور لفظی بازی گری سے احتراز کر کے رمز و کنایہ اور علامات سے اپنے کلام کو معنی خیز بنایا۔ ان کی نظم کا ماحول بالکل مختلف ہے۔ یہاں فطری مناظر میں رنگا رنگ سرخ و سبز پھلواریوں اور سبزہ زاروں کی جگہ ایک ہموار یک رنگی نظر آتی ہے۔ اور شعرا نے سطحی حسن میں محو ہو کر کھو جانے کی بجائے خزاں کی سنسان شام کے افق کو ایک خاص معنویت کے ستاروں سے سجایا ہے۔ "شن کوکنشو" مسلک کے اثرات کو عرصہ دراز تک جاپان کے شاعرانہ مزاج میں دخل رہا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں نظم کی مشترک تخلیق کا ایک خاص طریقہ رائج ہوا جو اس دور کے سربرآوردہ شاعروں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ مل کر لکھی جانے والی نظم کی تخلیق میں عام طور پر تین یا اس سے زیادہ شعرا حصے لیتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ شعرا ایک کے بعد ایک اپنے حصے کے مصرعے کہتے تھے۔ ایک شاعر سات اور پانچ ارکان کے تین مصرعے کہہ کر نظم شروع کرتا تو دوسرا سات سات ارکان کے دو مصرعے لگا کر نظم کو آگے بڑھاتا تھا۔ اس طرح نظم کے بند عروض کے اعتبار سے دو قسم کے ہوتے تھے اور اس قسم کی نظم کے بند کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یکے بعد دیگرے شعرا طبع آزمائی کرتے اور نظم کا سلسلہ آگے ہی بڑھتا جاتا تھا۔ نقاد اور قاری پوری نظم کی ترتیب و تشکیل کا مجموعی طور پر جائزہ لینے کی بجائے یہ دیکھتے تھے کہ ایک بند کا دوسرے بند کے ساتھ ربط کس طرح قایم کیا گیا اور سلسلۂ بیان کو کس طرح آگے بڑھایا گیا ہے۔ مشترک تخلیق کی ایسی نظم کے ہر بند کے پہلے تین مصرعوں کا سلسلہ ایک علاحدہ

اور مستقل نظم کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ نظم ہو کو یا ہائیکو کہلاتی تھی۔

اس دور میں جاپانی شاعری میں خیال، جذبے اور خلوص کی اہمیت نہیں تھی بلکہ شعر گوئی کا مقصد فنی مہارت اور استادی کا مظاہرہ تھا۔ اعلیٰ ترین معیار کی شاعری کے نمونے اس دور کے 'نو' ڈراموں ("No" Drama) میں ملتے ہیں۔ خصوصاً ان ڈراموں میں جو کانامی کیوتسوگو (Kanami Kiyotsugu) (۱۳۳۳ء–۱۳۸۴ء) اور اس کے بیٹے زیامی موتوکیو (Zeami Motokiyo) (۱۳۶۳ء–۱۴۴۳ء) کے لکھے ہوتے ہیں۔ جاپانی ڈرامہ سادہ، سیدھا رقص و موسیقی پر مشتمل بالکل ابتدائی قسم کا اور مختصر ہوتا تھا۔ ان دونوں نے جدت طرازی اور اپج سے کام لے کر ڈرامے کے خد و خال کو درست کیا اور ظاہری اور معنوی اعتبار سے اسے اس قدر اونچے مقام پر پہنچا دیا کہ جاپانی ڈراموں کا شمار دنیا کے معیاری ادب میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں کی زبان پیچیدہ، مبہم اور ادق ہے لیکن یہ جو درجہ اسلوب بے وجہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اہلِ بصیرت کو اس کی گہرائیوں میں بدھ مت کے عرفان کی روشنی نظر آتی ہے۔ تقریباً یہ سارے ڈرامے شروع سے آخر تک حزن آمیز ہیں اس لیے تماشبینوں کی تفریح کے لیے بیچ بیچ میں مزاحیہ خاکے پیش کیے جاتے تھے۔ اگرچہ 'نو' ڈرامے کا آغاز عوام کی تفریح کے لیے ہوا تھا لیکن اپنی مقبولیت کی بدولت اس کی رسائی بہت جلد شاہی دربار میں ہو گئی۔ یہ وابستگی سم قاتل ثابت ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے 'نو' ڈرامے کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا اور اس کے فروغ کے راستے بند ہو گئے۔

نثر پہلے خالص جاپانی زبان میں لکھی جاتی تھی لیکن اس دور میں چینی الفاظ بھی استعمال کیے جانے لگے۔ افسانوی ادب کا موضوع زیادہ تر وہ جنگیں تھیں جو "ہائن" (Heian) دور کے اواخر میں لڑی گئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور تالیف "ہائکے منوگاتاری" (Heike monogatari) ہے یہ کہانی تیرھویں صدی کی تالیف ہے جس سے بعد کے دور کے ڈرامہ نگاروں اور ناول نویسوں نے استفادہ کیا ہے۔ ہائکے منوگاتاری بدھ مت کی اس تلقین سے شروع ہوتی ہے کہ یہ کائنات اور ساری موجودات آنی اور فانی ہیں۔ یہ الفاظ جب شاہی دربار کے مصاحب اور مقرب دہراتے تو اور بھی زیادہ معنی خیز ہو جاتے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کامونو چومی (Kamo no chomei) کی تصنیف "میری کٹیا" (۱۲۱۶ء) میں بھی ملتا ہے۔ اس میں چومی نے ایک راہب کا حال بیان کیا ہے جسے علائق دنیوی سے منہ موڑنے کے بعد بستیوں سے دور اپنی کٹیا کی تنہائیوں میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ یہی فضا اس دور کی دوسری ادبی تخلیقات کی بھی ہے لیکن ان میں کہیں کہیں دنیا اور اس کی رنگینیوں کے تذکرے بھی آ جاتے ہیں۔

۱۸۵۸ء میں جاپان کے دروازے مغربی اقوام کے لیے کھل گئے تو آہستہ آہستہ مغربی میلان و رجحانات جاپانی سماج میں ابھرنے لگے جس کے اثرات جاپانی ادب میں بھی رونما ہوتے۔ مغربی فلسفۂ حیات، رہن سہن کے طریقوں اور شعر و ادب نے بعض جاپانی اہلِ قلم کو اس درجہ گرویدہ کر لیا کہ انھوں نے دل و جان سے مغربی شعار کا خیر مقدم کیا۔ لیکن بعض لکھنے والے ایسے بھی تھے جو بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے حسبِ سابق پرانی ڈگر پر چلتے رہے۔ ان دو انتہا پسند گروہوں کے درمیان دانشوروں کا ایک اعتدال پسند گروہ تھا جس نے میانہ روی کو ترجیح دی۔ یہ تھی وہ صورتِ حال جس سے جاپانی سماج، جاپانی سیاست اور جاپانی ادب دوچار تھے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ مغربی طرز نے جاپان کے قومی مزاج میں اپنے لیے جگہ بنا لی اور یورپ کی بدلتی ہوئی ادبی تحریکیں بھی جاپانی زبان کے ادب کے اسلوب، جہت اور مواد پر اثر انداز ہونے لگیں۔

تنکا (Tanka) اور ہائیکو (Haiku) کی روایتی اصناف میں نئے خیالات اور اسالیبِ بیان جگہ پانے لگے جن کے لیے نئی نئی ترکیبیں استعمال کی گئیں۔ اور نئے الفاظ صرف میں آئے۔ نئی بات نئے انداز سے کہنے کی دھن سوار ہوئی تو کئی ایسے شعرا منظرِ عام پر آئے جو اپنے کلام میں کہیں پھولوں کا ذکر کرتے تو جاپان کے پھولوں جیسے چیری بلاسم کو پیش پا افتادہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور یورپ اور امریکہ کے سنے سنائے پھولوں جیسے لیلیک اور اکاسیا کی پھلواری سے اپنی نظم کی روشوں کو سجاتے تھے۔ ان کی نظموں میں بادِ خزاں کی افسردہ کن سرسراہٹ کی جگہ ٹرین کی گھڑ گھڑاہٹ نے لے لی تھی۔ یوسانو ایکیو (Yosano Akiko) (۱۸۷۸ء–۱۹۴۲ء) اشی کاوا تاکو بوکو (Isbikawa Takuboku) (۱۸۸۵–۱۹۱۲ء) اور سائتو موکیچی (Saito Mokichi) (۱۸۸۲–۱۹۵۳ء) نے جدید تنکا میں کمال حاصل کیا۔ ان شعرا نے عشق و محبت کی واردات، سماجی شعور اور جدید نفسیاتی الجھن کو ایک دوسرے میں بڑے موثر انداز میں سمو دیا ہے۔ اس زمانے میں آزاد نظم بھی مقبول ہوئی اگرچہ اس قسم کی بعض تخلیقات میں پانچ اور سات رکن کا التزام رکھا جانے لگا۔ اس طرز کے شاعروں میں سب سے پہلے شمازاکی (Shimazaki) نے شہرت اور اہمیت حاصل کی۔ اس کی مشہور نظم مرمر کا گیت (۱۸۹۶ء) انگریز شاعر شیلی کی آواز بازگشت ہے۔ لیکن اس بازگشت میں جاپانی نازک خیالی اور اندازِ سخن طرازی نے ایک نیا افسوں بھر دیا ہے۔ ماساؤکا شیکی (Masaoka Shiki) (۱۸۶۷ء–۱۹۰۲ء) اپنے دور کے "تنکا" اور "ہائیکو" دونوں اصناف کا مسلّم استاد تھا لیکن اب بحیثیت شاعر وہ زیادہ مقبول نہیں رہا۔ تاہم ایک ادبی نقاد اور رہنما کی حیثیت سے بیسویں صدی میں روایتی طرزِ شعر گوئی کی پیش رفت میں اس کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے۔ ایک شاگرد جس کا نام تکاہاما کیوشی (Takahama Kyoshi) (۱۸۷۴ء–۱۹۵۹ء) تھا۔ اس نے ہائیکو گویوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا جنھوں نے تنقید و تعریض کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور اعلان کیا کہ شعر کے موجودہ سانچوں میں جدید زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل کے اظہار کی گنجائش نہیں ہے۔ تکاہاما کیوشی نے بالآخر تسلیم کر لیا کہ ہائیکو کی اصل غایت روایتی انداز میں مظاہرِ فطرت کے حسن کارانہ پہلو کی وجدانی تعبیر و تفسیر ہے جس کے لیے روایتی اندازِ بیان زیادہ موزوں ہے۔ لیکن دوسرے شعرا نے اس صنف کو انتہائی

جدید اور روایتی ڈگر سے ہٹے ہوئے موضوعات کے لیے استعمال کیا۔ ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی جنھوں نے تنکا اور ہائیکو کے بے کلاسیکی اسلوب اختیار کیا اس لیے کہ جدید انداز کے مقابلے میں اس میں ایجاز واختصار کے ساتھ اظہار خیال کی زیادہ گنجائش نظر آئی'، نئی نظم' کے کہنے والے بول چال کی زبان بے تکلف استعمال کرنے لگے۔ باگیا وارا سکوتارو (Hagiwara sakutaro) بیسویں صدی کے جاپان کا سب سے زیادہ خوش بیان، قادر الکلام شاعر مانا جاتا ہے جس نے جدید جاپانی زبان کے غنائی اور اظہاری امکانات کو بروئے کار لانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہوری گوچی ڈائیگاکو (Hori guchi Daigaku) — (تاریخ پیدائش ۱۸۹۲ء) جیسے دوسرے شعرا نے زیادہ تر یورپی شعرا کی نظموں کے ترجمے کیے اور اس میں اس درجہ کامیاب ہوئے کہ ان کے منظوم ترجمے جاپانی ادب کا ایک قابلِ قدر حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

جاپان میں جدید ڈرامہ کا آغاز مغربی ڈراموں کے ترجمے اور تصرف سے ہوا۔ اور یہ ڈرامے اسٹیج پر پیش بھی بڑی حد تک مغربی طریقوں سے کیے جانے لگے۔ نیا تھیٹر انیسویں صدی کے اواخر میں وجود میں آیا لیکن عوام روایتی کابوکی ناٹک (Kabuki) ہی کے دلدادہ رہے وہ کاواتاکے موکوامی (۱۸۱۶–۱۸۹۳ء) جیسے روایتی طرز کے ڈرامہ نگاروں کے ناٹک کو ترجیح دیتے تھے۔ جن لکھنے والوں نے شیکسپیئر یا شلے کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنا شعار بنایا وہ مقبول نہ ہو سکے۔ نئے تھیٹر کے لیے لکھنے والے کامیاب ڈرامہ نگاروں کے موضوعات عموماً تاریخی ہوتے تھے۔ اور وہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اسٹیج کی روایتی زبان بھی استعمال کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے یورپی ڈرامہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان ڈرامہ نویسوں میں سب سے زیادہ کامیاب مایاما سائیکا (Mayama Seika) — (۱۸۷۸ء–۱۹۴۸ء) رہا۔ سینما کی بڑھتی ہوئی مقبولیت جدید تھیٹر کے فروغ کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ بن گئی۔ یوں تو کئی اہلِ قلم نے ڈرامے لکھے لیکن عام طور پر ادیبوں کی دلچسپی زیادہ تر افسانوی ادب سے وابستہ رہی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ڈرامے کا معیار بلند ہوگیا اور بعض ایسے جدید ڈرامے لکھے اور اسٹیج پر پیش کیے گئے جو عالمی اعتبار سے دلچسپی اور اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ مائجی دور (Meiji Period) (۱۸۶۸ء–۱۹۱۲ء) کے افسانوی ادب میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت سبوچی شویو (Tsubouchi Shoyo) (۱۸۵۹–۱۹۳۵ء) کی تھی جس نے حقیقت پسندانہ اور معقول طرز نگارش کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے علاوہ فوٹاباتائی شیمائی (Futabatei Shimei) (۱۸۶۴ء–۱۹۰۹ء) ایک نہایت ممتاز مقام کا حامل ہے کیونکہ اس نے اپنی تصنیف 'بھٹکتے بادل' میں ادق ادبی زبان کی جگہ روزمرہ بول چال کی بے تکلف، آسان اور سلیس زبان استعمال کی اور اس طرح ادب کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانے کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ جدید جاپانی ناول کا آغاز اس کی اسی تخلیق سے شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فوٹاباتائی نے اپنی نگارشات سے ثابت کر دکھایا تھا کہ ہم عصر جاپان سے متعلق لکھنے میں بول چال کی زبان کس قدر موثر ہو سکتی ہے' اس کے باوجود بیشتر ادیب اور شاعر اپنی روش پر قایم رہے اور مشکل اور بوجھل کتابی زبان ہی استعمال کرتے رہے۔ ہیگوچی اچیو (Higuchi Ichiyo) (۱۸۷۲ء–۱۸۹۶ء) اس دور کی سب سے زیادہ ممتاز خاتون ادیب تھی. جس کے اسلوب کا میلان سائیکاکو کی جانب تھا۔ یہ ایک فطری بات بھی تھی کیونکہ سائیکاکو ہی کی طرح اس نے بھی زیادہ تر شہری عشرت کاہوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس کا ناولٹ تکیکوراب (Takekurabe) "سن بلوغ" ایک نادر شاہکار ہے جس میں اس نے ضلع یوشیوارا میں بچیوں کے پل کر جوان ہونے کے حالات اور ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔

۱۹۰۵ء میں روس سے جاپان کی جنگ ختم ہوئی تو تخلیقی ادب سرعت کے ساتھ پیدا ہونے لگا۔ غالباً جاپان کی تاریخ کے کسی اور دور میں اتنی بڑی تعداد میں لکھنے والے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ چند ناول نگار جو قابلِ ذکر ہیں ان میں ناگائی کافو (Nagai Kafu) (۱۸۷۹–۱۹۵۹ء) تانی زاکی جن اچیرو (Tanizaki jun Ichiro) (۱۸۸۶–۱۹۶۵ء) اور اکوتاگاوا ریونوسکے (Akutagava Ryunoseke) — (۱۸۹۲–۱۹۲۷ء) شامل تھے۔ ان کی تحریروں میں جاپان کے ماضی سے محبت کا پہلو نمایاں تھا لیکن اسلوب اور اندازِ فکر میں مغربیت کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ناگائی کافو نے زیادہ تر شہر کے اربابِ نشاط کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور عیشِ رفتہ کے مرقعے بڑے ہی حسن کارانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ اس نے اپنے بعض ناولوں میں قدیم و جدید کی آویزش دکھائی ہے۔ جاپان میں سماجی ناانصافی کا شعور بیدار ہوا تو پرولتاری ادب پیدا ہونے لگا جس کا مقصد نظامِ حکومت اور سماج میں انقلابی تبدیلیاں لانا تھا۔ اس پرزور تحریک کا سربراہ کوبایاشی تاکیجی (Kobayashi Takiji) — (۱۹۰۳ء–۱۹۳۳ء) تھا۔ دوسرے لکھنے والوں کے نزدیک ادب بھی ایک آرٹ ہے جس کا مقصد حسن کی تخلیق کے سوا کچھ اور نہیں۔ ادب برائے ادب کے اس مسلک کے حامیوں نے "نئی حسیت" کی تحریک کے پرچار کے لیے مختلف انجمنیں بنائیں جن کے اراکین میں اس دور کے بہترین ناول نگار یوکومتسو ریچی (Yakomitsu Ruchi) (۱۸۹۸ء–۱۹۴۷ء) اور کاواباتا یاسوناری (Kawabata Yasunari) — (۱۸۹۹ء) شامل تھے۔

۱۹۴۱ء تک جو افسانوی ادب جاپان میں پیدا ہوا اس کو نقادوں نے مختلف مسالک میں تقسیم کیا ہے ان میں سے ہر ایک مسلک کا ایک سربراہ ہے جس کے گرد شاگردوں کا ایک حلقہ بنا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول اور ذی اثر مصنف شیگا ناویا (Shiga Naoya) (۱۸۸۳ء) ہے جس کے آپ بیتی کے طرز پر لکھے ہوئے ناول بہت

مقبول ہوتے۔ انگریزی میں اس قسم کے ناول "دی آئی ناول" (The I Novel) کہلاتے ہیں۔

۱۹۳۰ء—۱۹۴۰ء کی جنگوں کے دوران اور فاشزم کے تسلط کے دور میں ادبی تخلیق کی رفتار سست ہوگئی تھی لیکن جب یہ دہائی ختم ہوگئی تو ایک نئے دَور کا زور شور سے آغاز ہوا۔ اس زمانے کے مشہور اہل قلم میں پرانے لکھنے والوں کے علاوہ دازائی اوسامو (Dazai Osamu) (۱۹۰۹ء—۱۹۴۸ء) شامل ہیں جن کی تصنیفات بہت مقبول ہیں۔ اس دور میں بے شمار نئے ادیب پیدا ہوئے ہیں جو اپنے دور کی انقلابی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

جرمن زبان و ادب

کسی زبان اور اس کے ادب کی داستان کو سماجی و تاریخی ارتقا کے وسیع تر چوکھٹے میں دیکھنا چاہیے ورنہ وہ چند ناموں، چند عنوانوں اور ان کی تشریحوں کا ایک مجموعہ ہو کے رہ جائے گی۔ جرمن زبان کی سب سے پہلی تحریر آٹھویں صدی عیسوی میں ملتی ہے۔ گویا اس طرح اس کی تاریخ لکھتے ہوئے ہمیں پچھلے بارہ سو برس کا احاطہ کرنا پڑے گا۔ وسطی یورپ میں اس زبان و ادب کو اہم منصب حاصل رہا ہے۔ جو اس وجہ سے کسی قدر پیچیدہ نظر آتا ہے کہ جرمن زبان کی لسانی حدیں اور جرمن دیس کی سیاسی حدیں ایک نہیں رہی ہیں جیسا کہ انگریزی اور فرانسیسی کے معاملے میں ہوا۔ آج جرمن زبان جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک، فیڈرل ری پبلک آف جرمنی اور آسٹریا میں بولی جاتی ہے اور سوئٹزرلینڈ کی تین سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی یورپ (مثلاً پولینڈ اور رومانیہ) کے بعض چھوٹے چھوٹے حصوں میں یہ عوام کی مادری زبان ہے اور السازر (فرانس) کے دولسانی صوبوں میں فرانسیسی کے ساتھ ساتھ برتی جاتی ہے۔ ان سارے دیسوں اور علاقوں نے کسی نہ کسی زمانے میں جرمن زبان کی آبیاری اور پرداخت میں حصہ لیا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قومیت کا تصور وسطی یورپ میں انیسویں صدی کے آخر آخر میں نمودار ہوا (جرمنی کے معاملے میں سنہ ۱۸۷۱ء کی بات ہے) اس سے پہلے ایک طرح کی سیاسی طوائف الملوکی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ جرمن بولنے والوں کی سرزمین ہمیں مختلف چھوٹی بڑی ریاستوں، بادشاہتوں (مثلاً پرشیا) سلطنتوں (جیسے آسٹرو ہنگیرین) میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے ان ساری سیاسی اکائیوں نے جرمن زبان کی نشوونما میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ فرانس اور انگلستان کے برخلاف جرمن بولنے والے علاقوں میں پیرس اور لندن کی طرح کوئی ایسی راجدھانی نہیں رہی جہاں ایسے لسانی اور تہذیبی معیارات نمو پا سکیں، جو باقی سارے علاقے کے لیے نمونہ مانے جائیں۔ چنانچہ وی آنا، زیورچ، برلن، میونخ اور ہامبرگ ان بڑے شہروں میں سے چند ہیں جن کا اہم ادبی کردار رہا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے چھوٹے صوبائی مستقر ایسے ملتے ہیں جن کی ادبی حیثیت اہم ہے کیوں کہ ہر علاقہ ایک تہذیبی خودمختاری کا متمنی اور مدعی رہا ہے۔ یہ بات بھی دل چسپ ہے کہ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ یورپ کا ادبی مستقر کوئی بڑا شہر نہیں بلکہ "وائی مار" کا چھوٹا سا شہر تھا جہاں گوئٹے نے وہ تصنیفیں موزوں کیں جو جرمن ادب ہی کے نہیں بلکہ عالمی ادب کے شاہکاروں میں گنی جاتی ہیں۔

آج تک بھی صورت حال کچھ بدلی نہیں ہے اور جرمن دیس اور جرمن لسانی علاقے کے سارے بڑے شہر اب بھی اہم ادبی اور تہذیبی مرکزوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس مضمون میں جرمن سے مراد جرمن زبان ہے۔ کوئی خاص ملک یا علاقہ نہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب شارلیمان کی سلطنت درہم برہم ہوئی تو اس کے مشرقی علاقوں میں مقامی جرمن بولیوں کے میل جول سے جرمن زبان کی تشکیل ہوئی جو لاطینی کے مقابلہ میں عوام کی زبان بن گئی۔ لاطینی کلیسا کی زبان یا علمی اور سائنسی زبان کی حیثیت سے باقی رہی۔

جرمن زبان کی یہ صورت گری کوئی آٹھ سو سال تک جاری رہی تب جا کر موجودہ جرمن کے خدوخال نمودار ہوئے۔ آج جرمن زبان بولنے والے صرف پچھلے چار سو سال کی تحریری زبان (لگ بھگ ۱۶۵۰ء کے بعد کی زبان) کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے زمانے کی جرمن سمجھنے کے لیے ان کو خاص مطالعے اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ بعض ظاہری صوری مشابہتوں کے تلے گہرے لغوی اختلافات چھپے ہوئے ہیں۔

روایت کی بنیاد اور صوری و نحوی تجزیے کی بنا پر قدیم جرمن زبان کی حسب ذیل تقسیم مروج ہے:-

(قدیم ہائی جرمن) ۷۵۰ء — ۱۰۵۰ء
(وسطی ہائی جرمن) ۱۰۵۰ء — ۱۳۵۰ء
ابتدائی جدید جرمن) ۱۳۵۰ء — ۱۶۵۰ء
(جدید جرمن) ۱۶۵۰ء اور اس سے آگے۔

قدیم ہائی جرمن کا خاص ادبی شہ پارہ "ہلڈے براںڈ زلیڈ" (ہلڈے براںڈ کا گیت) مانا جاتا ہے۔ جس سے رزمیہ شاعری کی ایک مخصوص المانوی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس روایت کا سب سے اہم کارنامہ وسطی ہائی جرمن کی "نی بل اُن گن لیڈ" ہے۔ یہ نظم جس کا مواد قبائلی مناقشے فراہم کرتے ہیں، غالباً اپنی تحریری شکلوں میں بارہویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہ نظم ادبی فیضان کا ایک مستقل مخزن بن گئی اور انیسویں صدی میں کئی تصانیف اس کی مرہون منت ہیں۔ ان میں اہم غالباً رچرڈ واگنر کی چار ناٹکی "دیر رنگ دے نی بل اُن گن" اور فریڈرش ہبل کا سہ ناٹکی ڈرامہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ بعد میں بدقسمتی سے یہی نظم ایک جنگ جو قوم پرستی کی بنیاد بن گئی اور بیسویں صدی کے فاشسٹوں نے اسے اپنے اغراض کے لیے خوب استعمال کیا۔

اس سورمائی رزمیہ روایت کے علاوہ اس درباری رزمیہ

شاعری کا بھی ذکر ضروری ہے جو شاہ آرتھر اور اس کے راؤنڈ ٹیبل کے دلیروں کی داستان پر مشتمل ہے۔ آرتھر کے اس کیلٹی افسانے کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی مصنف کرے تیاں ڈترائیے نے ادبی شکل دی تھی اور بارہویں صدی میں ان قصے نے یورپی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے جرمن ترجمانوں میں ہارٹمان فان آیٔے (۱۱۶۰ء — ۱۲۱۰ء) وولفرام فان اےشن باخ (۱۱۷۰ء تا لگ بھگ ۱۲۲۱ء) گاٹفریڈ فان اسٹراسبرگ (۱۲ ویں صدی) اہم ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ نقطہ نظر سے اس زمانے کے ادب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جسے جرمن زبان میں "منے سانگ" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی رسوماتی تغزلی یا غنائی تصنیف تھی جس میں کسی اونچے طبقے کی عورت کی مدح اور ایک ایسے عشق کا اقرار ہوتا تھا جو خواہش وصل سے معرا ہو۔ سماجیات اور نفسیات کے ماہروں کے لیے اس صنف کو جذباتی تحلیص کی ایک مثال سمجھنا کچھ مشکل بات نہیں۔ ایک ایسے وقت جب سماج کے بہت سے تنومند افراد صلیبی جنگوں میں منہمک تھے یہ صنف درباری سوسائٹی کے لیے ایک طرح کی رسمیاتی تفریح کا سامان فراہم کرتی تھی۔ اس پر فرانس کی پرووِنسائی غنائیہ شاعری کی گہری چھاپ تھی۔ اس صنف کا سب سے اہم نمائندہ غالبًا والٹر فان دیر فوگیلوائی ڈے (متوفی مابعد ۱۲۲۸ء) کو کہا جا سکتا ہے۔ اس شاعر کی نظموں میں غیر معمولی سیاسی آگاہی اور ایک تقریبًا جدید معیار فکر کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی شاعری میں پہلی دفعہ ہم کو روایاتی روش سے احتراز اور روایاتی تقاضوں اور شخصی تجربوں کے درمیان ایک توازن ملتا ہے۔ والٹر کے اکثر اشعار کو آج کل کے عہد کے شاعر پیٹر ریومکارف نے بڑی نزاکت سے جدید جرمن میں ڈھالا ہے۔ ریومکارف کے خیال میں والٹر اسی وجہ سے آج کی دنیا کے لیے بامعنی ہے کہ اس کا دور ایک ایسا دور تھا جب جاگیرداری نظام کو تاریخ کے دھارے میں اپنی ناؤ کے ڈگ مگ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔

دورِ وسطیٰ کی تہذیب کے بارے میں ہماری معلومات ان تاریخی سرگزشتوں اور قانونی رسالوں پر مبنی ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں صوفیانہ نگارشات کی اہم روایت بھی، جس نے بڑے بے باک خیالی پیکر تراشے اسی دور میں شروع ہوئی۔ ایک ہارٹ مائن رِش مائزے اور یوہانس ٹاؤلر تیرہویں اور چودھویں صدی کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے جرمن زبان میں تحریری علایم و اصطلاحات کی نشو و نما پر اثر ڈالا۔ صوفیانہ روایت کو سولہویں اور سترہویں صدی میں یاکوب بیمے اور آنجیلس سلے سیوز نے جاری کیا۔ ان لوگوں کی رمزیاتی یا مجازیاتی (Allegorical) اور خیالی تحریروں کا انیسویں صدی کے رومانی لکھنے والوں کے ہاتھ احیا عمل میں آیا۔

چودھویں اور پندرہویں صدی کا مطالعہ یورپی نشاۃ ثانیہ اور مسلک انسانیت (Humanism) کی ان تحریکوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جو جرمنی میں بڑی حد تک مذہبی کش مکش اور رومن کلیسا اور سیکولر سیاست کی آویزش کے آوردہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں شہروں کی اہمیت میں اضافہ ہوا اور بڑی جرمن یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا (پراگ کی جامعہ سب سے زیادہ قدیم ۱۳۴۸ء ہے) بلاشبہ اس عہد کا سب سے بڑا کام بائبل کا جرمن ترجمہ ہے جو مارٹن لوتھر نے اصلی یونانی اور عبرانی نسخوں سے کیا جرمن زبان کے ارتقا پر اس ترجمے کا زبردست اثر پڑا۔ اسی سے گویا جرمن زبان کے جدید محاورے اور تحریروں میں بجائے لاطینی کے جرمن کے استعمال کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ بھاشا معتبر سمجھی جانے لگی۔

جرمن باشندوں کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے پندرہویں صدی ایک کلیدی دور ہے۔ ۱۵۲۵ء جرمنی میں کسانوں کی بغاوت کا سال ہے جس سے گویا طبقاتی کش مکش کی ابتدا ہوتی ہے اور جس کے بڑے گہرے نتائج آگے چل کر مرتب ہوئے۔ اس بغاوت کو جرمنی میں سختی سے کچل دیا گیا۔ بعض یورپی ممالک مثلاً فرانس میں اس بغاوت کے بعد سے تاریخ نے ایک ترقی پذیر موڑ اختیار کیا اور ریاست مطلق العنان بادشاہت تک پہنچی جو قومی اتحاد کا باعث بنی۔ لیکن جرمنی میں جاگیردار امیروں کی فتح نے ملک کو بے شمار چھوٹی چھوٹی خود مختار طاقتوں میں تقسیم کر دیا جو قومی اتحاد اور یکساں قومی تہذیب کے راستے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئیں آخر بسمارک نے پرشیا کی غیر معمولی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۷۱ء میں جرمنی کو سیاسی طور پر متحد کیا۔ کسانوں کی بغاوت کا زمانہ ادبی حیثیت سے بڑا زرخیز دور ثابت ہوا اس عہد میں شورش انگیز تحریروں کی بےشمار مثالیں ملتی ہیں جن کا اب بھی خاطر خواہ تجزیہ ہونا باقی ہے۔ کسانوں کی جنگ کی ناکامی ترقی پسند جرمن مصنفوں کے لیے ایک اہم موضوع بن گئی جس کا بار بار استعمال ہوا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں گوئٹے اور لاسالے اور بیسویں صدی میں گرہارٹ ہارپتمان، فریڈرش وولف اور یاک کارسنکے نے اس تحریک سے متاثر ہو کر ڈرامے لکھے ہیں۔

لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک بہت جلد اس تضاد کا ایک حصہ بن گئی۔ جو ایک طرف پوپ اور رومن کلیسا کے مفادات اور دوسری طرف جرمن ریاستوں کے علاقائی سیکولر مفادات میں پایا جاتا تھا۔ اس تضاد نے اس یورپی دھماکے کو جنم دیا جسے تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ء - ۱۶۴۸ء) کا نام دیا گیا ہے۔ اس لڑائی نے سارے وسطی یورپ کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح جرمن تہذیبی ارتقا کو ایک صدی پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ سولہویں صدی درمیانی طبقے کی مرفہ الحالی اور نتیجتًا شہری تہذیب کی ترقی کی صدی تھی۔ اس زمانے میں عوامی قسم کے ادب کو فروغ ہوا جس کا اہم ترین نمائندہ ہانس ساخص (۱۴۹۴ء-۱۵۷۶ء) تھا جو اس زمانے کے سب سے زیادہ خوش حال شہر نیورمبرگ کا باشندہ تھا۔ اس نے کثیر تعداد میں ڈرامے تصنیف کیے۔ عام پسند مختصر کہانیوں کی بھی ایک کثیر تعداد ان دنوں تصنیف کی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چھاپے کی مشین ایجاد ہو چکی تھی اور اس نے ادب کے زبانی ورثے کو تحریری ورثے میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ صوفیانہ روایت کی طرح اس لوک تہذیب کی روایت کا بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بڑا کامیاب احیا عمل میں آیا۔ لوک کہانیوں کی بنیاد پر کئی شاہکار لکھے گئے جن میں

سب سے مشہور گوئٹے کا منظوم ڈرامہ "فاؤسٹ" ہے جس کی بنیاد ایک عام پسند کہانی "ڈاکٹر فاؤسٹ کی کہانی" تھی۔

سترھویں صدی پر چوں کہ جنگ و جدل کا رنگ چڑھا ہوا تھا اس لیے اس صدی کے لکھنے والوں میں راست یا بالواسطہ اسی رنگ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ گرم ملسہاوزن (۱۶۲۲ء-۱۶۷۶ء) کے ناولوں نے ہسپانوی پکارسک ناول کو ایک جرمن صنف بلڈنگز رومان کی شکل دی۔ جو فرد اور سماج کی آویزش کا مرقع پیش کرتی تھی۔ گرم ملسہاوزن کے ناولوں میں واقعیت، ترک دنیا اور وسیع المشربی کی آمیزش ملتی ہے اس عہد کا ادب ترک ماورائیت اور نفس پرستی کے درمیان ایک مسلسل اہتزاز کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس ادب کے ان دو پہلوؤں کے نمونے ہم کو کوئی رینس کو لمان (۱۶۵۱ء- ۱۶۸۹ء) کی مذہبی (کیلین یعنی اس عقیدے پر مبنی کہ حضرت عیسیٰ کا ایک ہزار سال تک دنیا میں جسمانی طور پر راج رہے گا) تصور پرست شاعری، آندرے آس گری فیوز (۱۶۱۶ء- ۱۶۶۴ء) کے حزنیہ اشعار اور ڈراموں، ہاف مان فان ہاف مانز والڈ آؤ (۱۶۱۶ء- ۱۶۷۹ء) کی عاشقانہ اور سورمائی شاعری وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ اس ادب کے ایک بڑے حصے کا انیسویں صدی کے رومانٹک مصنفوں نے احیا کیا۔

جرمن زبان کو جو توانائی لوتھر کے "بائبل" کے ترجمے سے ملی اس میں اضافہ ان لسانی انجمنوں کی وجہ سے ہوا جو جرمن کو بیرونی اثرات (زیادہ تر فرانسیسی اطالوی اور ہسپانوی اثرات) سے پاک کرنے اور اس کی تحریری اشکال کے معیار بنانے کے لیے قایم ہوئیں۔ اس کام کو بہت سی نظریاتی اور تنقیدی تحریروں سے سہارا ملا جن میں سب سے اہم مارٹن اوپٹز کی شعریات (Poetics) ہے۔ اوپٹز نے اس تصنیف میں قدیم روایتی ماخذ وں خصوصاً ہارس کی ان تصنیفات کی بنیاد پر ادبی اور تنقیدی اصولوں کی تشکیل کی ہے جو سترھویں صدی کے لیے ایک معیار کی حیثیت رکھتی تھیں اور جن کا زبردست اثر تھا۔ اس کتاب سے شعری نظریے کی ایک پوری روایت ہی شروع ہوئی جس میں شاعر و نقاد ان اصولوں کی جستجو کرتے تھے جن کو پیش نظر رکھ کر اچھا اور قابل قبول شعر کہا جاسکتا تھا۔ اس روایت کے دوسرے اہم نمائندے یوہان کرسٹوف گاٹشڈ (۱۷۰۰ء- ۱۷۶۶ء) یوہان یاکوب برائی ٹنگر (۱۷۰۱ء - ۱۷۷۶ء) اور یوہان یاکوب بود میر (۱۶۹۸ء-۱۷۸۳ء) سمجھے جاتے ہیں۔ اس روایت کا زور انیسویں صدی کے آخری برسوں تک باقی رہا۔

جرمن ادب کے مخصوص خد و خال اپنے یورپی سیاق میں اسی وقت ابھرتے ہیں جب ہم فریڈرش گاٹلیب کلاپسٹاک (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۳ء) یا گاٹھولڈ ایفرایم لیسنگ (۱۷۲۹-۱۷۸۱ء) اور ہاٹن رش بالسن نے (۱۷۹۷ء— ۱۸۵۶ء) کی درمیانی صدی کے سارے ادب کو طرز واسلوب کی بنا پر مختلف حصوں میں بانٹنے کی بجائے، جیسا کہ عام قاعدہ ہے ایک تسلسل اور اکائی کی حیثیت سے جانچیں۔ اس طرح دیکھیے تو یہ ادب جاگیردار طبقے کے علی الرغم، درمیانی طبقے کے عروج و نجات اور بالآخر شکست کی داستان ہے۔ جہاں فرانس میں آزادی اور مساوات کے نظریوں نے ریاست کی ترکیب میں ٹھوس شکلیں اختیار کیں وہاں جرمنی میں یہ نظریے علاقائی انتشار و طوائف الملوکی سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ بورژوا طبقے کی اس ناکامی کی وجہ جرمنی کی صورت حال میں، بقول مارکس، یہ مخصوص زمانی اجنبہ پایا جاتا ہے کہ جرمن باشندے فکری طور پر تو دوسرے یوروپیوں کے ہم عصر ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے ان کے ہم عصر نہیں۔ اسی وجہ سے جرمنی میں جو انقلاب برپا ہوئے وہ ذہنی انقلاب تھے اور ان کی کارفرمائی فلسفے، ادب اور تنقید کے میدانوں میں تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہی حقیقت ان کو آفاقی طور پر بامعنی بھی بناتی ہے کیوں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خیالات مادی قوت بن سکتے ہیں تو پھر جرمن ادب کی یہ اہمیت ہے کہ اس نے موجودہ انسانی زندگی کے اہم مسائل کی صورت گری کی ہے، وہ مسائل جو فرد و سماج، تاریخ اور ترقی سے متعلق ہیں۔ کلاپسٹاک اور لیسنگ اس ادب کے اولین نمایندے ہیں جن کی تصنیفوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کاوش اور کوشش مطلق العنانی اور استبداد کی مردنی طاری کرنے والی بندشوں کے خلاف ہے۔ کلاپسٹاک نہ صرف استحصال کا دشمن اور حریت کا حامی تھا بلکہ ان اولین پیشہ ور مصنفوں میں سے تھا جو جاگیردارانہ سرپرستی پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ اس نے انشا کے پیشے کی تنظیم اور اس کے گروہی مفادات کے تحفظ کے مسائل پر اپنی بہت کچھ توجہ اور توانائی صرف کی۔

کلاپسٹاک ان جرمنوں میں سے تھا جنھوں نے پہلے پہل نہ صرف انقلاب فرانس کی مدح کی بلکہ اس کے بعد کے دہشت پسند دور کی مذمت بھی کی۔ اس انقلاب نے جرمن ذہن پر جو مخصوص اثر ڈالا اس کے بنیادی خطوط ہم کو کلاپسٹاک میں نظر آتے ہیں۔ غالباً ہولڈرلن (Holderlin) (۱۷۷۰ء— ۱۸۴۳ء) اور ژاں پاول (Jean Paul) (۱۷۶۳ء- ۱۸۲۵ء) ہی دو ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اس ولولے کو آخر تک برقرار رکھا جو اپنے ابتدائی دنوں میں انقلاب فرانس نے پیدا کیا تھا۔ ہولڈرلن کی خیال پرست شاعری اور ژاں پاول کے بے حد جدید ناول ایسی چیزیں ہیں جن کی قدر حال ہی میں پہچانی گئی ہے۔ غالباً یہ جرمنی کے مخصوص حالات کا نتیجہ تھا کہ جرمنوں نے انسانی مسائل کا حل انسانی کردار کی تربیت کو قرار دیا۔ یہ ایک اشانی قسم کا تصور ہے جس میں یہ بات یاد نہیں رکھی گئی تھی کہ اخلاقی اور ذہنی تبدیلیوں کے لیے سماجی ڈھانچے کو بدلنا ضروری ہے۔ درمیانی طبقے کے دانشوروں نے اپنے ترقی پسند تصورات کی تشہیر کے لیے تھیٹر کا انتخاب کیا۔ جیسا کہ شلر نے بعد میں کہا یہ بات ایک اصول کے طور پر تسلیم کی گئی کہ نسل انسانی کی تعلیم کے عظیم الشان پروگرام میں تھیٹر کو ایک تربیتِ اخلاق کے ادارے کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔ لیسنگ نے اس نئے بورژوا شعور کی صورت گری کرتے ہوئے بہت سے ڈرامے لکھے اس کے علاوہ اس نے ہامبرگ کے تھیٹر کی نئی تنظیم کی اور تنقید، جمالیات اور فن ڈرامہ نویسی پر بہت سی اہم تحریریں تصنیف کیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہی وہ دور ہے جب جرمن زبان تحریری اور نظریاتی مقاصد کے لیے مستقلاً استعمال ہونے لگی اور اس کا بین الاقوامی موقف مستحکم ہوگیا۔ فلسفی لائب نیز (Leibniz) نے اپنی تحریروں میں

فرانسیسی اور لاطینی استعمال کی تھی لیکن اب یہ بدیسی زبانیں متروک ہوگئیں۔ کانٹ (Kant (۱۷۲۴ء-۱۸۰۴ء) فشٹے Fichte (۱۷۶۲ء-۱۸۱۴ء) شلنگ (Schelling) (۱۷۷۵ء-۱۸۵۴ء) اور ہیگل (Hegel) (۱۷۷۰ - ۱۸۳۱ء) جیسے فلسفیوں کے نام اسی دور سے متعلق ہیں۔ ان لوگوں نے ان بہت سے مسائل کی دریافت اور عکاسی کی جن کو اپنی اصلی اہمیت اور روپ میں مارکس اور اینگلز نے بعد میں پیش کیا صرف فریڈرش نطشے (Friedrich Nietzsche) (۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء) اور سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) (۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) کے نام ایسے ہیں جن کا عالمی فکر پر وہ اثر پڑا جس کا مقابلہ مارکس کے اثر سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں لگ بھگ تنقید، لسانیات اور تاریخ کے میدانوں میں زبردست کام شروع ہوا جس کی ابتدائی جھلکیاں یوہان گاٹفریڈ ہرڈر (JohannGottfried Herder) (۱۷۴۴ء-۱۸۰۳ء) کی تصنیفات میں نظر آتی ہیں۔ ہرڈر پہلا نہیں تو شیکسپیئر کے ان پہلے اہم مداحوں میں سے ایک ضرور ہے، جنہوں نے ایک طرح کی شیکسپیئر پرستی کی روایت کو جنم دیا جس کے نتیجے میں لوڈوگ ٹی ایک (Ludwig Tieck) اور اگست ولہلم شلیگل (August - Wilbelm Schlegel) جیسے رومانٹک شاعروں کے عظیم شیکسپیئری ترجمے نمودار ہوئے۔ ان ترجموں نے شیکسپیئر کو جرمن ادبی روایت کا جزو بنانے میں مدد کی اور غالباً تاریخ میں اور کوئی مثال ایسی موجود نہیں ہے کہ کسی غیر زبان کے شاعر کو کسی ادب نے اس طرح اپنایا ہو۔ بلاشبہ اس دور کی دو سب سے اہم شخصیتیں فریڈرش شلر (Friedrich Schiller) (۱۷۵۹ء-۱۸۰۵ء) اور یوہان وولف گانگ گوئٹے (Johann Wolfgang Von Goethe) کی ہیں۔ ان کی اہمیت نہ صرف ان کی تحریروں کے اعلیٰ جوہر بلکہ ان کی آئندہ مسلم الثبوت استادی میں مضمر ہے۔ ان دونوں کا یہ زبردست مقام اور اثر ایک مدت کے ان کے مشترکہ ادبی لائحہ عمل اور تعاون کا بھی نتیجہ ہے۔ شلر کی تحریریں اپنی گہری سیاسی نوعیت کی وجہ سے اہم ہیں۔ اس کے اہم ڈراموں کے موضوعات آزادی، ریاست اور تکمیل انفرادیت ہیں۔ اس نے جمالیات پر اہم نظریاتی کتابیں بھی لکھیں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کے عظیم تعلیم نسل انسانی کے پروگرام کا ایک حصہ بن گئیں ان تحریروں کا مقصد انسانی ذہن کی پختگی کی طرف رہنمائی کرنا تھا جو ایک آزاد زندگی کے لیے ضروری ہے۔ گوئٹے کی طویل زندگی اس سارے دور کا کم و بیش احاطہ کرتی ہے جسے اکثر اوقات گوئٹے کا دور کہا جاتا ہے۔ گوئٹے نے تغزلی شاعری، ناول نویسی، ڈرامہ و تنقید نگاری کے شاہکار تصنیف کیے۔ علاوہ ازیں وہ ایک مصور اور سائنس داں اور دنیا کی تاریخ کا غالباً آخری ہمہ گیر جینیس تھا۔ عالمی ادب کی اصطلاح میں (اور خود اسی نے یہ اصطلاح اختراع کی تھی) اس کی سب سے اہم تصنیف "فاوسٹ" کا منظوم ڈرامہ ہے جسے مکمل کرنے میں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ "فاوسٹ" کا پہلا حصہ ۱۸۰۸ء اور اس کا دوسرا حصہ ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا۔ بایں ہمہ گوئٹے کی ادبی اہمیت خود اس کی زندگی میں اس کے ابتدائی ناول "نوجوان ورتھر کے مصائب" (۱۷۷۴ء) پر مبنی تھی۔ اس کہانی نے، جو جاگیردارانہ مطلق العنانی اور بورژوا عروج کی کش مکش کے دور میں ایک ناکام عشق کی داستان ہے یورپ کے تخیل کو مسخر کر لیا اور اسے تاریخ ادب جدید کی پہلی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب سمجھنا چاہیے۔ گوئٹے کا ایک اور ناول جس کے دو حصے "ولہلم مائسٹرس لیر یارے" (Wilhelm Meisters Lehrjahre) اور "ولہلم مائسٹرس وانڈر یارے" (Wilhelm Meisters Wanderjahre) کہلاتے ہیں۔ اس جرمن نوع کی پیداوار ہے۔ جسے "بلڈنگز رومان" (Bildungsroman) کہتے ہیں۔ اور جو فرد کی تعلیم و تشکیل سے متعلق ہے اور جس کا موضوع سماج کی آویزش اور اشتراک داجتماعیت کا ارتقا ہے

کلاپسٹاک کے برخلاف گوئٹے اور شلر دونوں ہی بڑی حد تک جاگیردارانہ سرپرستی کے مرہون منت تھے لیکن درمیانی طبقے کی ترقی اور کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنے والے بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں آزاد و خود مکتفی ہوتے گئے ہیں۔ یہ بات ہمیں رومانی ادیبوں کے کارنامے کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت جو انیسویں صدی کے پہلے ربع میں یورپ کی ادبی بساط پر چھائے ہوئے تھے یاد رکھنی چاہیے۔ یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جرمن میں رومانیت ایک گہری ذہنی تحریک کی شکل رکھتی تھی جس کا محض بے محابا جذباتیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس تحریک کے بڑے بڑے لکھنے والوں نووالس (Novalis) لڈوگ ٹی ایک (Ludwig Tieck) ولہلم واکن روڈر (Wilhelm Wackenroder) فریڈرش شلیگل (Friedrich Schlegel) اور اس کا بھائی اگست ولہلم شلیگل ای۔ ٹی۔ اے ہاف مان، آشم فان ارنیم (Achim Von-Arnim)، کلیمنز برنتانو (Clemens Brentano) جوزف فان آئشن ڈارف (Josef Von Eichendorff) اور غالباً ہائنرش فان کلائسٹ (Heinrich Von Kleist) نے درمیانی طبقے میں اک فکری عینیت کے پنپنے میں مدد دی۔ جس کی ایک خصوصیت اس تضاد کا احساس تھا جو اس طبقے کی اقتصادی ترقی اور اس کی سیاسی بے بسی کے درمیان پایا جاتا تھا۔ غالباً یہی احساس ہے جس نے اس طرز کو جنم دیا جو رومانی انشا پردازوں میں اس قدر ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے یہ طرز واقعات حیات پر ایک ذریعہ تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک گہرا تاریخی شعور ان لکھنے والوں کی تحریروں میں نمایاں ہے (یہ شعور بھی رومانی دور کی پیداوار ہے اور اوپر ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح رومان پسندوں نے دور وسطیٰ اور سترہویں صدی کے ادیبوں کو پھر سے زندہ کیا تھا) لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ تاریخ کی پچھلی صدیوں کو کسی مصنوعی طریقے سے زندہ نہیں کیا جا سکتا ایک بنیادی خیال جو ان کی تصنیفوں کے رگ و ریشے میں دوڑا ہوا نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے جنت کھو دی ہے اور وہاں دوبارہ پہنچنے کے لیے اسے تاریخ کے ارتقائی عمل سے گزرنا ضروری ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے موضوعات مثلاً بچپن کے پرسکون دور میں پناہ لینے کی

نسلی آرزو اور انسان و فطرت کا باہمی ربط جسے تاریخ نے شکست و ریخت کر دیا ہے، ایسے موضوع ہیں جنہیں خیال پرستی کی انتہائی پرواز سمجھنا چاہیے۔

جرمن زبان کو اس زمانے میں زبردست بڑھاوا ملا۔ آرنم اور برنتانو نے بھولی بسری پرانی شاعری کے نمونے اور لوک گیت اپنی "ڈس کنا بن وُنڈر ہارن" (۱۸۰۶ء۔ ۱۸۰۸ء) میں جمع کیے اور گرم بھائیوں یاکوب اور ولہلم نے جو لسانیات کے ماہر تھے اپنے مشہور پریوں کے قصے شائع کیے (۱۸۱۲ء۔ ۱۸۲۲ء) یوں اس طرح ادب کی زبانی اور تحریری روایتوں کی ایک تازہ آمیزش ہمیں اس دور میں دکھائی دیتی ہے۔ گرم بھائیوں نے اس لسانی ترقی کو اپنی نحوی نگارشات کے ذریعہ مزید تقویت پہنچائی اور ایک اہم لغت کی تیاری کی بنیادیں استوار کیں۔

مشرقی ادبیات کے مطالعے کی روایت بھی انہی دنوں شروع ہوئی۔ سرمایہ داری اور نو آبادی تسلط کے فروغ نے ایشیائی ادب سے ربط ضبط میں اضافہ کیا۔ کالیداس کی "شکنتلا" اور حافظ کے دیوان سے گوئٹے کی پرتحسین دلچسپی کو سبھی جانتے ہیں۔ بہت سے رومانی مصنفوں کے لیے مشرق اور خصوصاً ہندوستان ایک انسانوی پیکر کا روپ رکھتا تھا۔ مشرق سے یہ دلچسپی آج تک بھی باقی ہے۔ اور ایک قدامت پسند یادِ ماضی اور خواہش فرار کی پناہ گاہ ہے۔ اس کا پرتو بیسویں صدی میں ہرمان ہسے (Hermann Hesse) — (۱۸۷۷ء-۱۹۶۲ء) کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ رومانی انقلاب کا علاقہ ماورائے تاریخ ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہائنرش ہائنے (Heinrich Heine) (۱۷۹۷ء- ۱۸۵۶ء) کا کارنامہ اس تصور کی ٹھوس نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہائنے کی تحریروں میں تاریخ کا رومانی شعور تو اجاگر ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا سیاسی شعور دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ گہرا ہے۔ اس کی شاعری جس میں ہجو اور بذلہ سنجی کا عنصر نمایاں ہے، ایک تلخ لہجے میں رومانیت کے اختتام اور سیاسی و ذہنی عقیدہ پرستی کے آغاز کا اعلان ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے دانشور اپنے عصری مسائل کے ساتھ دست و گریباں ہیں۔ ہائنے نے جو پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اور جہاں اس کی ملاقات مارکس سے ہوئی تھی ان پہلے ادیبوں میں سے ایک ہے جنہوں نے اشتراکیت کی ضرورت کا ادراک کیا۔ اس معاملے میں جیارگ بشنر (George Buchner) اس کا ہمنوا ہے۔ بشنر بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جلاوطنی پر مجبور رہا اور قبل از وقت موت کا شکار رہا۔ انقلاب فرانس پر ایک اہم ڈراما "ڈانٹونس ٹاڈ" (Dantons Tod) ڈانٹون کی موت سے (۱۹۳۴ء- ۱۹۳۵ء) ایک سیاسی تھیٹر کی بنا پڑتی ہے۔

صنعتی ترقی کے مسائل اور جاگیردارانہ ریاستوں کی طرف سے جمہوری طریقوں کی مخالفت نے سماجی مسئلے کو ادبی میدان میں دھکیل دیا۔ رومانیت کے بعد کے لکھنے والوں مثلاً پلاٹن کرسچین ڈی ایٹرش (Christian Dietrich) گرابے (Grabbe) اور نکولاؤ لیناؤ (Nikolau Lenau) میں ہمیں اس صورت حال کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس کو آگے بڑھانے والے مصنف اس تحریک سے وابستہ ہیں جسے "نوجوان جرمنی" کی تحریک کہا جاتا ہے ان میں جارج ہیرویگ Georg Herwegh (۱۸۱۷ء-۱۸۷۵ء) یا فرڈی نانڈ فرائی لی گراتھ (Ferdinand Freiligrath) (۱۸۱۰ء-۱۸۷۶ء) شامل ہیں۔

ہائنے کی موت (۱۸۵۶ء) کے بعد کا جرمن ادب خاص طور پر جرمنی کی چھوٹی ریاستوں میں ایک شورہ پشت کردار کا حامل تھا۔ لیکن ۱۸۴۸ء کے جرمن بورژوا جمہوری انقلاب کی ناکامی کے بعد جن مصنفوں کو عروج ہوا ان کے ہاں ہمیں کھلے سیاسی مسائل سے دلچسپی کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ اس انقلاب کی پشت پر جو قوتیں تھیں وہ بہر حال کسی وقت بھی زیادہ توانا نہیں تھیں خصوصاً آسٹریا جیسے بڑے علاقوں میں جہاں فرانز گرل پارزر (Franz Grillparzer) (۱۷۹۱ء- ۱۸۷۲ء) کی تصنیفوں میں ہمیں کلاسیکی ڈرامے کا عروج نظر آتا ہے اور دوسری طرف یوہان نیپومک نسٹرائے (Johan — Nepomuk Nestroy) (۱۸۰۲-۱۸۶۲ء) کے ناٹکوں میں پرمزاح عوامی کامیڈی کا فروغ دکھائی دیتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا ایسے علاقے ہیں جہاں ناولوں اور کہانیوں میں ایک شاعرانہ واقعیت پسندی کا رجحان ملتا ہے اس طرز کے اہم نمائندے اڈالبرٹ اسٹیفٹر (Adalbert Stifter) (۱۸۰۵ء-۱۸۶۸ء) گاڈفریڈ کلر (Gottfried Killer) (۱۸۱۹ء - ۱۸۹۰ء) کانراڈ فرڈی نانڈ میئر (Conrad Ferdinand Meyer) (۱۸۲۵ء-۱۸۹۸ء) تھیوڈور اسٹارم (Theodor Storm) ہیں۔ لیکن دراصل تھیوڈور فونتانے (Theodor Fontane) (۱۸۹۸ء- ۱۹۱۹ء) کے ناولوں میں پہنچ کر اس تحریک کو یورپی گیرائی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اس قابل بنتی ہے کہ فرانسیسی اور انگریزی واقعیت پسندوں سے آنکھ ملا سکے۔ فونتانے کے پرشیائی سوسائٹی کے بعض مرقعے ان مسائل کا عکس دکھاتے ہیں جو ایک ابھرتے ہوئے درمیانی طبقے اور ایک قدیم و قلعہ بند امرا کے طبقے کی باہمی آویزش کا نتیجہ ہیں۔

لیکن ان واقعیت پسند لکھنے والوں نے فکر کے بڑے بڑے میدانوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آخر جب فطرت پسند تحریک (Naturalistic Movement) کو فروغ ہوا تب جا کر ادیبوں نے صنعتی تمدن کے پیدا کردہ مسائل اور مفلسی کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ گرہارٹ ہارپٹمان (۱۸۶۲-۱۹۴۶ء) کا ڈراما "ڈی ویبر" یعنی "جولاہے" سائلیشیا کے جولاہوں کے مصائب کی تصویر پیش کرتا ہے۔

ہاوپٹمان نے بعد میں تسلیم و رضا اور کنارہ کشی کا جو رویہ اختیار کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جرمن دانشور کن مسائل سے دوچار تھے۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے باہمی تصادم میں وہ کس فریق کا ساتھ دیں۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل کا زمانہ متضاد طرز عمل کا زمانہ ہے۔ ایک طرف سٹیفان جیارگ

(۱۸٦۸ء – ۱۹۳۳ء) اور اس کے حلقے کی خواص پسند کنائیت اور رِلکے (۱۸۷۵ء – ۱۹۲٦ء) یا ہیوگو فان ہافمانسنتھال (۱۸۷۴ء – ۱۹۲۹ء) کی شاعری تھی اور دوسری طرف تھامس مان اور اس کے ہمسر بھائی ہائن رِش مان (۱۸۷۱ء – ۱۹۵۰ء) کے ناول اکسپرشنسٹ گروپ کی پرزور تجرباتی شاعری اور رابرٹ مُسل (۱۸۸۰ء – ۱۹۴۲ء) یا فرانز کافکا (۱۸۸۳ء – ۱۹۲۴ء) کے ناول تھے جن سے بورژوا تہذیب کی بنیادی انسان دوستی اور مثبت روش اور اس کی سیاسی بے اعتنائی اور تذبذب یعنی اس تحریک کی طاقت اور کمزوری دونوں ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں عالم گیر جنگوں کا درمیانی زمانہ جسے وائی مار دور کہا جاتا ہے ان رجحانوں کے کھلے ٹکراؤ کا زمانہ ہے۔

یہاں سے ادب میں ایک بڑھتی ہوئی واضح تفریق کا آغاز ہوتا ہے جس میں ایک طرف سامراجیت اور نو آبادیت ہے اور دوسری طرف وہ طاقت ور مزدور تحریکیں جو روس کے اکتوبر والے انقلاب کے بعد بہت قوی ہو چلی ہیں۔ مستند لکھنے والے اب بھی درمیانی طبقے سے ابھرتے ہیں لیکن انہیں روز بروز اس دورِ تضاد میں اپنے مقام کے تعین کا مسئلہ درپیش ہے۔ اسی سیاق میں برٹالٹ بریخت (۱۸۹۸ء – ۱۹۵٦ء) کی تصنیفات غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ بریخت کے ڈراموں، اشعار اور تنقیدوں میں ذہنی اور سیاسی وابستگی نمایاں ہے۔

جرمنی میں جمہوریت کی شکست اور فاشستی عناصر کے عروج نے تقریباً سارے اہم لکھنے والوں کو جلاوطنی سے دوچار کر دیا۔ اکسپرشنسٹ ور انسان دوست مفکر جوہانس بیشر نے سوویت روس کا رخ کیا۔ عظیم آسٹرین ناول نگار ہرمان بروش (۱۸۸٦ء – ۱۹۵۱ء) تھامس مان اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں نے ممالک متحدہ امریکہ میں پناہ لی مارکسی ناول نگار آنا سیگھرس (پیدائش ..۱۹ء) نے میکسیکو کی راہ لی اور غالباً اکسپرشنسٹ مصنف گاٹفریڈ بین (۱۸۸٦ء – ۱۹۵٦ء) کے سوا جرمنی میں کوئی قابلِ ذکر دانشور اس دور میں باقی نہیں رہا۔ گاٹفریڈ بین نے کچھ دن فاشسٹوں کا ساتھ دینے کی کوشش کی اور پھر ایک ایسی ذہنی گوشہ نشینی اختیار کر لی جسے ہجرت کی ایک شکل کہنا چاہیے۔ اس زمانے کے بہت سے فاشزم کے مخالفوں نے جو ترکِ وطن نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے اسی ذہنی ہجرت کا وطیرہ اختیار کیا۔ جلاوطنی جرمنی کی ادبی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں تھی جب سے ہائنے اور مارکس نے جلاوطنی کو کسی جرمن ریاست میں بود و باش اختیار کرنے پر ترجیح دی تھی۔ اس وقت سے ہجرت جرمن دانشوروں کی سوانحِ حیات کی ایک امتیازی صفت بن چکی تھی۔ بعض لکھنے والوں پر اس جلاوطنی نے مثبت اثر ڈالا۔ چنانچہ تھامس مان جس نے پہلی جنگ عظیم سے پہلے قوم پرستانہ رویہ اختیار کیا تھا بہت جلد مخالف فاشستی نقطہ نظر سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد کا سارا اہم جرمن ادب جلاوطنی کی پیداوار ہے اور ان مسائل کو منعکس کرتا ہے جو فاشزم نے پیدا کر دیے تھے۔ اس کی مثالیں ہم کو بریخت کے ناٹکوں اور نظموں اور تھامس مان کے ناول "ڈاکٹر فاؤسٹس" میں جس سے فاؤسٹ کے اہم موضوع کی تجدید ہوتی ہے) میں ملتی ہیں۔

جس طرح انیسویں صدی کی اہمیت علاوہ اور باتوں کے بہت کچھ اس صدی کی عینیت پرست تحریروں اور مارکس اور اینگلز کی تصنیفوں پر مبنی ہے اسی طرح وائی مار دور کی اہمیت اس بات پر بھی قائم ہے کہ اس عہد میں فلسفیانہ مباحث میں اہم اضافے ہوئے جارج لوکاکس، والٹر بنجامن اور ارنسٹ بلوخ جیسے فلسفیوں نے ادبی بحثوں میں حصہ لے کر ان کے وسیع تر سماجی مفہوم کی طرف رہنمائی کی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد کا جرمن ادب ایک نیا منظر پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طرف مغرب کی فیڈرل ری پبلک آف جرمنی اور اس کا سرمایہ دارانہ نظام ہے اور دوسری طرف مشرق کی جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک اور اس کا اشتراکی نظام۔ ان کے علاوہ بحال شدہ غیر جانبدار آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ، جرمنی کی ذہنی حیات کے احیا میں دونوں جرمنیوں کے شریک ہیں۔ جنگ کے دوران کی ذہنی علیحدگی کے سبب لڑائی کے بعد کی نسل کے لیے ایک طرف اپنے ہم عصر یورپیوں کو جا لینا ضروری تھا۔ اور دوسری طرف اپنی اس فراموش شدہ روایت سے رشتے جوڑنا تھا۔ جسے جلاوطن جرمن دانشوروں نے پردیس میں زندہ رکھا تھا۔ اس بازیافت کی پیش رفت میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں مسلکِ انسانیت کے نمائندے (تھامس اور ہائن رِش مان، ایلیاس کینتی، بروشس) مارکسی مصنفین (بریخت، انا سیگرس، جوہانس بیشر اور فلسفی مثلاً ارنسٹ بلوخ، والٹر بنجامن، جیارگ لوکاکس) اور وائی مار عہد کے تجربہ پسند لکھنے والے شامل ہیں۔

جنگ کے بعد کی ابتدائی تحریریں جنگ کی ہولناکیوں کے تلخ مرقعوں پر مشتمل ہیں۔ جیسے وولفگانگ بوشرٹ کی تحریریں آہستہ آہستہ ان کی جگہ فاشستی ماضی کو مغربی سیاست کے سیاق میں دیکھنے اور سمجھنے کی پرعزم کوششوں نے لے لی۔ اس کی وجہ سے مصنفوں کی ایک سیاسی تفریق عمل میں آئی جس نے گیونتر گراس اور ہائن رش بول جیسے آزاد خیالوں (Liberals) کو ہالس میگنس انزنس برگر، پیٹر لو مکارف مارٹن والزر، اور پیٹر والس جیسے بائیں بازو کے میلانات رکھنے والوں سے علیحدہ کر دیا۔ مزدور طبقے کی توانا زندگی نے (میکس فان دیرگیون) وائی مار روایت کے ایک اہم حصے کو زندہ رکھا۔

چینی زبان و ادب

چینی زبان چین میں کئی نسلیں یا قومیں آباد ہیں۔ اکثریت جس نسل کی ہے اس کا نام ہان ہے۔ چین کی ۹۴ فی صد آبادی اسی نسل کی ہے۔ اور چینی زبان سے مراد اسی اکثریت کی زبان ہے۔ چین میں آباد دوسری قوموں مثلاً منگول، منچو، تبتی، یوئیگر (Uighurs) وغیرہ کی اپنی الگ الگ زبانیں ہیں۔

بول چال کی چینی زبان نہ صرف ہر صوبے کی بلکہ ہر ضلع کی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مشہور چینی ماہر لسانیات و ماہر صرف و نحو پروفیسر وانگ لی کا بیان ہے کہ یوں تو چین کے لوگ مختلف بولیاں بولتے ہیں لیکن ان بولیوں کی پانچ بڑی قسمیں نمایاں نظر آتی ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) کوان ہوا (Kuan-Hua) (۲) وو یو (Wu-Yo) (۳) من یو (Min-Yo) (۴) آو یو (Ao-Yu) اور (۵) کے چی ہوا (Ke-Chia-Hua) یا ہاکا۔

کوان ہوا جو مغربی زبانوں میں مینڈرین کہلاتی ہے۔ چین کے سرکاری افسروں کی زبان ہے جو رفتہ رفتہ اس ملک کے شمالی صوبوں میں بسنے والے ہان عوام میں رائج ہو گئی۔ اس کے علاوہ یہ زبان دریائے یانگسی کے جنوب میں واقع چند صوبوں میں بھی بولی جاتی ہے۔

کوان ہوا یا مینڈرین کی ترکیب نحوی بنیادی طور پر شمالی چین کی بولی پر مبنی ہے اور اس کا تلفظ پیکنگ کی بول چال کے مطابق ہوتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں منچو شاہی خاندان کے زوال کے بعد جمہوریہ چین کی حکومت نے ایک اعلان کے ذریعہ کوان ہوا کو "کویو" (Kuo-Yu) یا قومی زبان قرار دیا۔ ۴ رمئی ۱۹۱۹ء کی تحریک کے دوران کویو نے ہان آبادی کی مختلف بولیوں کے الفاظ، اصوات اور فقرے اپنے اندر جذب کر لیے۔ چین کی موجودہ حکومت نے اُسے "پوتھنگ ہوا" (Pu-Tung Hua) یا ملک کی عام زبان قرار دیا ہے۔ اور اس زبان کو ملک کی غیر کویو گو آبادی میں مقبول بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔

چینی جب کوئی لفظ ادا کرتا ہے تو اس کی آواز یا تو پنچم سر میں ہوگی یا مدھم سُر میں۔ یا پھر آواز پہلے دھیمی ہوگی اور اس کے بعد اونچی ہو جائیگی کسی لفظ کے تلفظ کی ادائیگی میں آواز کے اس اتار چڑھاؤ سے لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ بول چال کی چینی زبان ایک ہم صوت (Homophonic) زبان ہے مطلب یہ کہ لفظ کی صوتی شکل تو ایک ہی رہتی ہے لیکن لہجے اور آواز کے زیر و بم سے معنی بدل جاتے ہیں۔

بول چال کی چینی زبان میں چار سُر رائج ہیں۔ جدید چینی ایک رکنی زبان ہے یعنی پورا لفظ ایک بار میں ادا ہوتا ہے۔ اس کے ٹکڑے نہیں ہوتے۔

چینی زبان اولاً اٹھارویں صدی قبل مسیح میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھی اور آج بھی اس کا رسم الخط تصویری ہے۔ کانگ سی نامی منچو شہنشاہ کے عہد میں ۱۷۱۶ء میں ایک لغت مرتب کی گئی تھی جو ۴۷۰۳۵ تصویری اور تصوراتی علامات پر مشتمل ہے لیکن آج اس قسم کی جو علامتیں اور حروفِ تہجی عام طور پر مستعمل ہیں ان کی جملہ تعداد تخمیناً ۸۰۰۰ ہے۔ چینی رسم الخط کی پیچیدگیوں کو دور کرنے کی غرض سے عوامی چین کی کانگریس نے ۱۹۵۸ء میں "چینی زبان کے صوتیاتی ہجے" کا منصوبہ نافذ کیا۔ صوتیاتی املا کے اس منصوبے کے مطابق چینی زبان میں اب جملہ ۲۷ رومن حروفِ تہجی، ۶ حروفِ علت اور ۲۱ حروفِ صحیح رائج ہیں۔ حکومت چین نے رومن رسم الخط کے رواج کے ساتھ ہی ساتھ روایتی پیچیدہ تحریری علامتوں کی اصلاح کا کام بھی شروع کیا اور اس وقت تک ۲۲۳۸ علامتوں پر اصلاح کا عمل ہو چکا ہے۔

چینی ادب قدیم ترین دور کے جو آثار کانسے کے برتن وغیرہ کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں ان سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چینی ادب کا آغاز گیارہویں صدی قبل مسیح سے پہلے ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ اس دور میں تحریری چینی زبان ابھی من و عن وہی ہو کیوں کہ اس کی شکل نہایت سادہ تھی اور تحریر میں لگ بھگ صرف ایک سو علامتیں مستعمل تھیں۔

اوّلین دور کے ادب میں عوام کے سادہ طرز زندگی اور مظاہر فطرت سے متعلق ان کے جذبات میں خوف یا حیرت کا عکس نظر آتا ہے۔ چینی ادب کے ارتقا کا دوسرا دور گیارہویں صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر تیسری صدی قبل مسیح تک جاری رہا۔ تین قدیم تصانیف ایسی ملی ہیں جن میں اس دور کی چند ادبی تخلیقات محفوظ ہیں۔ ان تصانیف کے نام ہیں شیہ چنگ (Shih ching) یا مجموعہ نظم شوچنگ (Shu-ching) یا تاریخ چین اور ای چنگ (Yi Ching) یا تغیرات نامہ۔ ان قدیم ادب پاروں کی تالیف و ترتیب کا کام کنفیوشس (۵۵۱ - ۴۷۹ ق م) نے کیا تھا۔

متذکرہ بالا مجموعہ نظم چوں کہ اپنی نوعیت کی قدیم ترین تالیف ہے اس لیے اس کا شمار چین کے سب سے زیادہ بیش بہا ورثے میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ۳۰۶ نظمیں شامل ہیں جن کا انتخاب ۳۰۰۰ سے زیادہ نظموں کے اپنے ذاتی ذخیرے سے خود کنفیوشس نے کیا تھا۔

اسلوب اور طرز ادا کو پیش نظر رکھ کر ان نظموں کو تین علاحدہ علاحدہ اقسام میں بانٹا گیا ہے۔ پہلی قسم کی نظمیں فنگ لوک گیت کہلاتیں۔ دوسری قسم گیتوں پر مشتمل ہے اور تیسری قسم میں قصائد درج ہیں۔ دوسری قسم کے دو ذیلی حصے ہیں۔ ایک سیا ڈیا یا مختصر غنائی گیت دوسرا تایا یا عظیم غنائی گیت۔

جنگ و جدال کے زمانے (۴۱۴ - ۲۲۱ ق م) کی ممتاز ترین تصنیف چوزو (Chu Tz'u) یا چو کی شاہی سلطنت سے متعلق مجموعہ نظم ہے۔ چو خانوادے کا ایک رئیس جس کا نام چو یوان (Chu-Yuan) تھا اس دور کا عظیم ترین شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کا شاہکار "لی ساؤ" نامی ستر مصرعوں سے زیادہ کی نظم ہے جس میں شاعر نے اہل ملک کی حالتِ زار سے متعلق اپنے تعلقِ خاطر کا اظہار کیا ہے اور بادشاہ کی بیہودگیوں اور بدنفس وزیروں کی سازشوں کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ چو یوان نے ایک اور نظم بھی لکھی تھی جس کا عنوان تی ان ون (Tien Wen) یا قدرت سے خطاب ہے۔ اس نظم سے اس قدیم ترین عہد کی بعض روایات کا پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے کے دوسرے مشہور شعرا تنگ لیہ (Ta ngleh) چنگ چائی اور سنگ یو (Sung-Yu) تھے۔ اس دور میں چین میں کئی نثر نگار بھی پیدا ہوتے جن کی تحریریں زیادہ تر تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں یا پھر ایسی تصانیف ہیں جن میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار

کیا گیا ہے۔

چین کا چن شاہی خاندان (Chin) ۲۲۱ ق.م سے صرف بارہ سال تک برسر اقتدار رہا۔ اس عہد کا سب سے بڑا اہل قلم لی زو (Li Szu) تھا۔ ادب کی بعض اصناف کا رواج پہلی بار ہان خانوادے (۲۲۰ - ۲۰۶ ق م) کے عہد میں ہوا۔ زسے۔ ماشیان - (Sze-ma Chiens) "شی چی" یا تاریخی دستاویز اور پان کو کی ہان شو تاریخ ہان خاندان جیسی ادبی اہمیت کی حامل تالیفات کے علاوہ دو مشہور اصناف جو فو (Fu) اور یوے فو (Yueh-Fu) کہلاتی ہیں، اختراع کی گئیں۔ وی (Wei) اور چن شاہی خاندانوں (۲۲۰ - ۴۱۹ ء) کے دور میں چینی ادب میں بہ اعتبار موضوع و ہیئت کئی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کے حامل افسانوی ادب کی تخلیق کی رفتار نسبتاً زیادہ تیز ہو گئی، بدھ متی صحائف اور مذہبی ادب کے چینی میں ترجمے ہوئے جن کے اثرات چینی ادبیات کے ارتقا پر نمایاں ہونے لگے۔ جنوب اور شمال کے شاہی خاندانوں (۴۲۰ء تا زوال خاندان سوئی (۶۱۸ء) کے عہد میں جنوبی چین میں جو گیت لکھے گئے وہ زیادہ تر جذبات عشق و محبت سے متعلق ہیں۔ اس کے برخلاف شمالی چین کے شعرا نے جنگ اور اس کی دہشت انگیزی کو اپنا موضوع بنایا۔

تانگ (Tang) نامی شاہی خاندان کا عہد حکومت (۶۱۸ء - ۹۰۷ء) عام طور پر چینی شاعری کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کے سربرآوردہ شعرا میں لی پو (Lipo) (۷۰۵ء - ۷۶۲ء) تو فو (Tu Fu) (۷۱۲ء - ۷۷۰ء) وانگ وی (Wang Wei) (۷۰۷ء - ۷۶۱ء) پو چو ای (Po-Chu-Yi) (۷۷۲ء - ۸۴۶ء) اور منگ ہاؤ - ران (Meng Hao-Ran) (۶۸۹ء - ۷۴۰ء) شامل ہیں۔ ان میں لی پو سب سے زیادہ ممتاز اور جامع کمالات سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کا اسلوب موضوع سے ہم آہنگ موثر اور دلکش ہوتا ہے۔ اس کی بیشتر نظمیں نشاطیہ اور رومانی ہیں۔ تو فو فطرت انسانی اور سماج کے مسائل سے متعلق گہری بصیرت رکھتا تھا اس کی شعری تخلیقات اس کے تمام ہم عصروں کی تصانیف کی بہ نسبت زیادہ فکر انگیز ہیں۔ اس نے نہ صرف سماجی خرابیوں کی مذمت کی ہے بلکہ بہتر اور خوش حال زندگی سے متعلق اہل ملک کے تقاضوں اور تمناؤں کی ترجمانی کا اہم فرض بھی ادا کیا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے چینی ادب میں نئی نئی اصناف کا اضافہ ہونے لگا۔ زسے (Tz'e) نامی صنف کی نظموں کے مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔ چوان چی (Chuan-Chi) ایک خاص قسم کا مختصر افسانہ ہے۔ یہ اور اسی قسم کی نئی اصناف ادب ۹۰۰ء - ۱۳۰۰ء کے دور میں مقبول ہوئیں۔

چنگ پین تنگ - شوشیا شاؤ (Ching-Pen Tung - Chu Hsiasbou) یا راجدھانی کی مشہور و مقبول کہانیاں اور وو - تائی - شیہ پنگ - ہوا (Wu-Tai-Shib P'ing-Hua) یا پانچ شاہی خاندانوں کی مقبول عام تاریخ اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ گیارہویں صدی کے تین ممتاز ادیب او - یانگ سیو، (Ou-Yang Hsiu) وانگ آن شیہ (Wang An-Shib) اور سو شش (Su Shish) یا سو تنگ پو (Su Tung-P'o) تھے۔

چین کا ڈرامائی ادب منگول یا یوان خاندان (۱۲۸۰ء - ۱۳۶۸ء) کے دور میں معراج کمال کو پہنچ گیا۔ رقص و موسیقی سے آراستہ ڈراموں میں مکمل کہانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ اور ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے یہ ڈرامے موزوں اور موثر ہوتے تھے جو سامان تفریح کا بھی کام دیتے تھے۔ اس دور کے ڈرامے چینی ادب کے شہ پاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کوان ہان چنگ (Kuan Han-Ching) اور وانگ شیہ - فو، (Wang Shib-fu) چین کے بے مثال ڈرامہ نگار مانے جاتے ہیں۔

منگ شاہی خاندان کے دور حکومت (۱۳۶۸ء - ۱۶۴۴ء) کے اوائل میں افسانوی ادب کی بنیادیں سُنگ اور یوان خانوادوں کے دَور کی داستانوں کے متن پر رکھی گئی تھیں۔ اس زمانے کی اہم ترین تصانیف چن پن می (Chin Pin Mei) یا سنہری کنول، شوای ہو چوان (Shu Hu Chuan) یا کنار دریا، سان کوین ای (San-Kuo Yen-Yi) یا تین شاہی خاندانوں کے رومان - زی یو چی (Hsi You Chi) یا پچھم کی یاترا مصنفہ وو چنگ این (Wu Chang-en) میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (Hsuan Tsang) کے سفر ہندوستان کا حال درج ہے۔ اس داستان میں بندر کا جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ رامائن کے ہنومان سے ملتا جلتا ہے۔

چنگ یا منچو خانوادوں (۱۶۴۴ء - ۱۹۱۱ء) کے دور حکومت میں جو اعلیٰ ترین افسانوی ادب پیدا ہوا اس میں چینگ شینگ تی این (Ch'ang Shang Tien) (قصر شباب ابدی) مصنفہ ہنگ شینگ، (Hung Sheng) تاؤ ہوا شان (Tao Hua shan) یا پیچ بلاسم فیان (Peach Blossom fan) مصنفہ کنگ شنگ رین، (King shangren) لیاؤ چاؤ چی ای (Lio Chai Chib Yi) یا قصص حیرت افزا، لیاؤ چائی مصنفہ پو سنگ لنگ (Pu Sung-Ling) اور رولن وائی شیہ (Rulin Wai Shib) دانشور مصنفہ وو چنگ زر (Wu Ching Tzo) شامل ہیں۔ ایک اور مشہور ناول ہنگ لو منگ (Hung Lou Ming) یا خواب قصر سرخ مصنفہ زاؤ شوئے چی (Ts'ao Hsuch-Chin) تھا جس کے بارے ۱۹۵۵ - ۱۹۵۷ء میں بڑی بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ اس ناول میں نظام جاگیرداری کی شکست و ریخت کے زمانے میں ایک دولت مند اور امیرانہ ٹھاٹھ کے زمیں دار کے خاندان کا حال بیان کیا گیا ہے۔

مغربی ملکوں کے ادب سے چین کا ادب ۱۸۴۰ء کی جنگ افیون کے بعد متاثر ہوا۔ اس جنگ اور ۴ مئی ۱۹۱۹ کی تحریک کے درمیانی دور کے مشہور و معروف شعرا میں کنگ زے چن، (Kung Tze-Chen) وی یوان (Wei Yuan) چنگ وی پنگ (Chang Wei-Ping) اور ہوانگ ہیان شامل ہیں۔

لن زے ز و (Lin Tse Hsu) نے نظم ونثر دونوں میں شہرت پائی۔ دوسرے ممتاز نثر نگار کانگ یو وِی (Kang You-Wei)، چانگ پنگ لن (Chang Ping-lin)، تان زے تنگ (Ten-Sze-tung) اور لیانگ چی چاؤ (Liang Chi-Chao) تھے۔ لی پاؤچیا، وو یاؤ یاؤ (Wu Yao-Yao) اور لیو او (Liuo) اس دَور کے مشہور ناول نویس مانے جاتے ہیں۔

چینی ادب کا جدید دور ۴ مئی ۱۹۱۹ء کی تحریک سے شروع ہوا۔ اس زمانے میں ادب کی زبان عوامی بول چال کی زبان سے قریب آگئی۔ لوسن (Lu Hsun) چن تو زیو (Ch'en Tu-Hsiu) اور ہو شی نے ادبی تحریکات کی پیش رفت میں نمایاں حصہ لیا۔ ادب جدید کی تخلیق کے لیے تین ادبی ادارے قایم کیے گئے۔ ان اداروں کے نام یہ ہیں: ادارۂ تحقیق ادب، ادارۂ تخلیق ادب اور ادارۂ ماہ نو۔ ان کے اراکین میں یہ بحثیں ہوتی تھیں کہ آیا ادب برائے ادب ہونا چاہیے یا یہ کہ اسے انقلاب کے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

لو سن (چو شو رین کا فرضی نام) جدید چینی ادب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنی تصانیف میں ہم عصر چینی سماج کے خدوخال پیش کیے اور پرانے اور بیمار سماج کی خرابیوں کا پول کھولا، کنفیوشس کے مقرر کردہ طریقوں اور رسوم کی وجہ سے پیدا شدہ سماجی ناانصافیوں پر روشنی ڈالی اور سماج کے پچھڑے ہوئے اور لوٹ کے شکار طبقات کی زندگی، ان کے جذبات اور خیالات کی موثر انداز میں ترجمانی کی لوسن کے مشہور افسانے "پاگل کی ڈائری" "آہ کیو کی سچی کہانی" "کنگ ای چی (King Yi Chi) طلب، "طلاق" وغیرہ ہیں۔ لو سن نے مختصر افسانوں کے علاوہ سینکڑوں مضامین بھی لکھے جن میں خالص ادبی دل چسپی کے مقالے بھی شامل ہیں۔

اس دور کے ممتاز ناول نویسوں میں شین ین پنگ (Shen - Yen-Ping) ماؤتن (Mao Tun)، یے شنگ تاؤ (Yeb - Sheng-Tao) پوتا فو، چیانگ کوانگ زے یاچن، لاؤ شز، ٹنگ لنگ اور چیانگ ٹین ای شامل ہیں۔ مشہور شاعروں میں کوموروہ یوان شوی پو، شیوچی مو، تسنگ کے چیا، شی اے پنگ کشن، وین ای تو، آ ئی چھنگ قابلِ ذکر ہیں۔ نیا ڈرامائی ادب بھی پیدا ہوا جو مغرب سے بڑی حد تک متاثر معلوم ہوتا ہے۔ چین کے مشہور ڈرامہ نگار تھین ہا ن، ہنگ شین، تساو یوشاین اور چھین پائی چن ہیں۔

آرٹ اور ادب سے متعلق ایک اجتماع میں جو ۱۹۴۲ء میں بہ مقام ینان ہوا تھا چیرمین ماوزے تنگ نے آرٹ اور لٹریچر کی بابت مارکسی نقطۂ نظر کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔ انھوں نے کہا آرٹ اور ادب کو محنت کشوں، کسانوں اور سپاہیوں کا خدمت گزار ہونا چاہیے۔ نئے چین میں آرٹ اور ادب کی تخلیق ۱۹۴۹ء کے بعد سے انھی اصولوں کی پابند ہے۔ عوامی چین کے قابلِ ذکر افسانہ نویس ناول نگار اور شعرا لیوپای ای، چو لی پو، اوپانگ شان، کانگ چو، زاو منگ چاو شولی، لی چی، اور یوان چانگ چنگ کے علاوہ چند اور اہلِ قلم ہیں۔

کلچرل انقلاب کے دور میں ادبی تخلیق زیادہ تر غنائیہ یا اوپیرا تک محدود رہی۔ ہاوران چین کا سب سے زیادہ سربرآوردہ افسانہ نگار اور ناول نویس ہے۔ اس کے دو مشہور ناول "روشن آسمان" اور "راہ روشن" ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کوئی ۱۵۰ مختصر افسانوں کا مصنف ہے۔ اس کی مشہور کہانیاں "بہار کے گیت" "گود بالٹی پانی" "نخلستان" وغیرہ ہیں۔ کلچرل انقلاب سے قبل اور اس کے بعد کے دور میں جو ادب پیدا ہوا اس کا موضوع زیادہ تر دیہی علاقوں کی ترقی، عوام کی جدوجہد، قومی تعمیر نو میں عوام کا حصہ اور پرانے اور از کار رفتہ خیالات اور طور طریق کو ترک کر لینے سے متعلق ہے۔

روسی زبان وادب

روسی زبان

روسی زبان بھی روسی نسل کی طرح کئی یورپی اور ایشیائی نسلوں کا مرکب ہے۔ اور سلاف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پچھلے دو ہزار برسوں کے دوران بحیرۂ بالٹک کے شمالی ساحل والے "فن" پھر وسطی روس کے "جرمن" اور بعد میں منگولیا سے لے کر اسٹیپی تک کے "منگول تاتار" قبیلوں کا خون سلافوں میں سرایت کر گیا ہے جو خاص روس میں آباد ہیں اور روسی زبان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں اور ترقیوں کے جائز وارث ہیں۔ اگر تحقیق اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ "فن" باشندے حتمی طور پر چین اور منگولیا کی طرف سے چلے تھے تو روسی زبان کا ایشیا سے دوہرا رشتہ ثابت ہو جائے گا۔

زبانوں کے ہند یورپی خاندان کی تین بڑی شاخیں سلاف سے تعلق رکھتی ہیں۔ مغربی سلافی، جنوبی سلافی اور مشرقی سلافی۔ ان ہی مشرقی سلافی زبانوں میں یوکرینی بیلو (سفید) روسی اور روسی زبانیں شامل ہیں۔ شمال میں بالٹک سے لے کر جنوب میں اوڈیسہ کی بندرگاہ تک اور مغرب میں پولینڈ کی سرحدوں سے لے کر جاپان کی طرف جزائر کیورائل اور سخالین تک گیارہ کروڑ سے زیادہ روسی آبادی اس زبان کو اپنی مادری زبان شمار کرتی ہے یوکرینی اور بیلو روسی ٹھیک اسی طرح سمجھ لیتے ہیں جیسے پنجاب ہماچل اور راجستھان کے شہری لوگ اردو کو۔ سوویت یونین کے وہ باشندے جن کی مادری زبان روسی نہیں اسے اپنی تعلیمی اور ملکی کڑی (لنگوا فرانکا) کی حیثیت دیتے ہیں۔ مشرقی یورپ کے کئی ملکوں میں اسے کم وبیش وہی سرکاری درجہ میسر آگیا ہے۔ جو کامن ویلتھ کے ملکوں میں انگریزی کو۔ یواین او (اقوام متحدہ کی انجمن) میں اسے دنیا کی پانچ بڑی زبانوں میں گنا جاتا ہے۔ رسائل اور کتابوں کی تعداد اشاعت کے لحاظ سے دنیا

میں روسی زبان کا نمبر دوسرا ہے۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں نے اس کی تعلیم اپنے نصاب میں شامل کرلی ہے۔ سوویت یونین سے باہر روسی زبان کی تعلیم واشاعت امریکا(U.S.A) میں سب سے زیادہ ہے۔

روسی زبان کے ارتقا میں شروع سے ہمواری نہیں رہی سیاسی تاریخ کے بے ہنگم جھٹکوں کا مادّی قوتوں اور وسیلوں کی بدنظمی کا بھی اس زبان کی جڑ بنیاد اور اٹھان پر گہرا اثر پڑا ہے۔ مسیحی سن کے شروع ۹۰۰ برس میں قدیم روسی زبان کی شکل صورت کیا تھی اور کیوں کر اس کی تین بڑی شاخیں ہوگئیں، علمائے لسانیات میں اس پر اختلاف ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ زبان کی صرف و نحو لہجے اور تلفظ کے اعتبار سے یوگوسلاویہ اور بلغاریہ سے لے کر یورال تک کی مشرقی سلافی زبانوں ہیں موجود یگانگی اور یک رنگی قدیمی رشتے کا پتہ دیتی ہے۔ زبان کی ساخت اور داستانوں۔ سفرناموں اور وقائع (Annals & Letopisi) کی پرداخت سے یہ ضرور ثابت ہوچکا ہے کہ قدیم روسی ریاست ماسکو راج قایم ہونے سے بہت پہلے جب روس کا سیاسی اور تہذیبی پایۂ تخت شہر کیف تھا۔ نویں کے آخر اور دسویں صدی عیسوی میں قدیم روسی زبان رنگ روپ نکال رہی تھی۔ جوں جوں مرکز ہٹتے بٹتے اور بدلتے گئے زبان پر مقامی لہجوں لفظوں اور بولیوں کا اثر بڑھتا گیا۔ مقامی بولیوں نے خاص وہیں کے معاشی اور تہذیبی رشتوں کے سائے میں جیسے چلنا سکھا دیا زبان ویسے چلی اور یوں ایک طرف تو وہ رنگا رنگی کی بدولت مالامال اور تازہ دم ہوتی گئی دوسری طرف سے مرکزی حالت نے اس کی شاخیں الگ الگ کردیں۔

بولی کی سطح سے اٹھ کر اور پھیل کر روسی زبان کو تحریری حروف (تہجی) کب ملے غالباً دسویں صدی کے آغاز میں کیف میں جہاں کیف راج اور یونانیوں کے درمیان عہد نامہ لکھا گیا (۹۱۱ - ۹۴۵ء) اینٹوں پتھروں پتروں اور برتنوں پر کیف اور اس کے بعد شہر نووگرد میں جو عہد نامے یا تاریخیں درج ہوئی ہیں (اور حال میں ہی ملی ہیں) یہ بتلانے کو کافی ہیں کہ دسویں صدی کے دوران کارندوں کاری گروں اور امرا میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہوچلا تھا۔ کیف شہر یورپ اور ایشیائی خطوں کے درمیان ایک تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی بدولت تہذیبی اور سیاسی مرکز بن کر اٹھا تو یونان کے علم، روم کے مذہب، بازنطینی مرکز مسیحیت سے گہرے رشتے استوار ہونے کے ساتھ ترکوں عربوں اور ایرانیوں کے مذہب اور تہذیب سے بھی سابقہ پڑا۔ ان کے پختہ اور منجھے ہوتے زبان وبیان کا اثر قبول کرنا لازم تھا۔ روسی زبان کے ارتقا کی یہ بھی ایک اہم کڑی ہے۔

دسویں صدی ختم ہوتے ہوتے شاہ روس ولادیمیر نے قسطنطنیہ کے "سچے مذہب مسیح" کو خود بھی اختیار کیا اور اس کی عام تبلیغ بھی شروع کردی۔ تبلیغ کے جوش میں یونانی حروف اور مذہبی کتب کو روسی تحریر کے لیے نمونہ قرار دیا گیا۔ پادری مبلغ تعلیم یافتہ تھے انھوں نے روسی زبان کو آغوش تربیت میں لیا تو قدیم رنگ کو جدید لہجہ ملا۔ عبادتوں، مذہبی داستانوں، ادب آداب کے بیانوں میں انجیل کے الفاظ واستعارات دخیل ہوتے گئے یہاں تک کہ لکھت کی زبان بولی سے دور اور زیادہ شائستہ بنتی گئی۔

گیارہویں صدی کے وسط تک روسی زبان بولنے والی آبادی قدیم بے میل سچے مسیحی مذہب میں داخل اور انجیل قصص الانبیا کی زبان سے پیچیدہ مگر شاندار تراکیب سے محتاط اور رچے دار لب و لہجہ سے (براہِ راست ترجموں کے ذریعے) مانوس بلکہ مالامال ہوچلی تھی۔ آج تک روسی زبان پر اس کے باقیات. کا اثر ملتا ہے حروف تہجی اور تراکیب کے تشکیلی زمانے میں (۱۱۰۶ سے ۱۱۰۸ء) کے درمیان سولہ مہینے پرائر ڈینیل (Daniel) نے صلیبی فاتحانِ یورپ کے ساتھ فلسطین میں گزارے اور "مقاماتِ مقدسہ کا سفرنامہ" لکھا۔ یہ سفرنامہ روسی زبان کی اولین تحریر میں شمار ہوتا ہے۔ شاہ کیف ولادیمیر مونوماخ نے جو تمام روس کا بادشاہ مانا گیا، اولاد کو نصیحت اور اخلاق کی تلقین کے لیے نیم مذہبی نیم ادبی دستاویز لکھی۔ یہ بھی ایک نمونہ ہے اس ابتدائی دور کی تحریری روسی زبان کا مگر وہ مکمل اور معتبر تصنیف جس سے گویا روسی ادب کی تاریخ شروع ہوتی ہے " ایگور کے حملے کا بیان (Curbo Onocky Vrapebe) ہے یہ رزمیہ داستان جو شیخ سعدی کی گلستاں سے نصف صدی پہلے (بارہویں صدی کے آخر میں) تصنیف ہوئی۔ (روسی شہزادے کی فوجی شکست کے اس نثر و نظم ملے پرجوش بیان میں روسی زبان کی اولین فتوحات کا اشارہ ملتا ہے)۔ ادبی شان دکھانے کے باوجود مصنف (جو اپنے ہم عصر ہندوستانی بھاٹ چندربردائی کی طرح) شاعرانہ مبالغے اور نثر کے تسلسل دونوں سے بیک وقت کام لیتا ہے۔ مذہبی احتیاط سے بے پروا ہوکر عوامی رسموں، عقیدوں، دیوی دیوتاؤں، راہبوں، داہموں اور موسم کی دل فریبیوں میں گم ہوجاتا ہے۔ یوں ہمیں روسی زبان کی ابتدائی ترقی کے تینوں رنگ یکجا مل جاتے ہیں۔ روزمرہ کے واقعات اور معاملات کی زبان ادبی چاشنی والی جس میں شاعر یا مصنف اپنے تخیل سے کام لے اور مذہبی خیالات اور اخلاقی تعلیمات کی نجی تلی زبان جو قدیم سلاف زبان پر روسی بولی کے غلبے کی نشاندہی کرتی ہے۔ مذہبی مبلغوں اور درس گاہوں نے عوام کو وہم پرستی جنگ وجدل اور بداخلاقی سے نکالنے کے لیے ان کی عام زبان کو وسیلہ بنایا تھا۔ اصلاحی کوششیں اور میدانوں میں کامیاب ہوئیں یا ناکام مگر ایک بکھری ہوئی بولی ضرورتاً "ریختہ" ہوتے ہوتے اتنی ادبی توانائی اختیار کرگئی کہ نظم کے ساتھ ساتھ نثر کا بار اٹھا کر قدم بڑھا سکے۔

سورماؤں اور رجواڑوں کے باہمی اختلاف نے کیف کی مرکزیت توڑ دی طوائف الملوکی میں نووگرد ابھرا، ریاستیں ابھریں، ایشیائی خانہ بدوش پولوتسی بت پرست جنگ آزما قبیلوں کی یلغار بڑھ گئی یہاں تک کہ ۱۲۲۳ء میں ہولناک منگول حملہ آوروں نے دریائے کالکا کے کنارے روسیوں کو تباہ کن شکست دیکر مرکزی ریاست ترقی یافتہ مذہبی سماج اور ترقی پذیر زبان کی ساری امنگوں پر پانی پھیر دیا۔ اور آج اس ہمت شکن دور سے پہلے کی صرف دو تین تحریری شہادتیں باقی رہ گئی ہیں۔ منگول تاتار شہسواروں نے وسط

ایشیا سے گھن گھور آندھی کی طرح اٹھ کر ملتان سے صرف بغداد تک ہی بربادی نہیں پھیلائی، نوخیز روسی ریاست اور زبان و ادب کو بھی مسل ڈالا۔

ہر محاذ پر پسپائی اور بالآخر تاتاری زرّیں خیل (Golden Hordes) کی غلامی قبول کیے ابھی سو سال نہ گزرے تھے کہ روسیوں میں سر اٹھانے اور اپنا سیاسی فوجی اور تہذیبی بچاؤ کرنے کا جذبہ شدّت سے ابھرا اس جذبے کو صحیح رُخ دینے والی شخصیتیں بھی ابھر آئیں۔ نووگرد کے پرنس (راجہ) الیگزینڈر نے شمال میں دریائے نیوا کے کنارے سویڈن کے زبردست لشکر کو شکست دے کر شمالی حملوں کا سلسلہ بند کر دیا اور نووگرد کو ہوشیار سیاست کی بدولت تاتاری یلغار سے صاف بچا لیا۔ کیف کی جگہ ماسکو، نووگرد، تولا اور ریازان گڑھ بننے لگے۔ ماسکو ریاست کا بنیادی پتھر پرنس دنیل نے تیرہویں صدی کے آخر میں رکھا اور ۱۳۶۷ء میں ماسکو قلعے (کریملن) کی سنگین فصیل بن کر تیار ہو گئی۔ اسقفِ اعظم نے ماسکو کو "سچے سلاف کلیسا" کا مرکز مقرر کر کے یہیں ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ ۱۳۸۰ء میں تاتاری سپہ سالار مامائی کے زبردست لشکر نے کولی کووا کے میدانِ جنگ میں روسیوں کے ہاتھ پہلی شکست کھائی۔ روسی سپہ سالار دیمتری (جو دانسکوئے (Danckou) کے لقب سے مشہور ہے) اس میدان کا فاتح سورما تھا اور اس کی داستان عوامی گیتوں اور داستانوں کا رنگ لیے ہوتے گاؤں گاؤں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ "ایگور کے حملے" والی داستان کی طرح اس کی بھی نثر و نظم میں ملی جلی داستان تصنیف ہوئی۔

زدون شچینا جو ریازان کے پادری سفونیا نے ایک نسل بعد تاریخی واقعے پر لکھی تھی۔ لیکن روسی زبان و ادب میں اسے فتح کی یادگار کی حیثیت ملی۔ اور جب نیا روس تاتاریوں کی پورے ڈھائی سو برس کی غلامی کا جوا اتار کر اٹھا تو اس نے اپنی ادبی زبان کی نئی اٹھان کے لیے نمونے یہیں سے لیے۔ البتہ اب اس زبان میں تاتاری دربار اور میدانِ کارزار کے الفاظ، اصطلاحات اور بعض جملے بھی شامل ہو گئے تھے جن میں سے کئی سو اب تک زندہ ہیں۔ ماسکو کے اختیار، اعتبار اور مدار بڑھنے میں اس کی جغرافیائی مرکزیت کو ہی نہیں لسانی مرکزیت کو بھی دخل تھا۔ کئی بولیاں ولادیمیر، رستوف، سوزدل اور توویر علاقوں کا مقامی رنگ لیے ہوئے ماسکو تک پہنچتی اور ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ ریاست کا دائرۂ عمل جتنا بڑھتا گیا ماسکو اس ابھرتی اور نکھرتی ہوئی زبان کی ٹکسال بنتا گیا۔

شکست خوردہ یا فاتح سورماؤں کے گن گان کی رزمیہ منظوم داستانیں لکھیں تو کم گئیں، اکتارے یا پرانی وضع کی سارنگی پر گاؤں گاؤں سنائی گئیں بہت۔ ہندوستانی بھاٹوں اور قصہ خوانوں یا داستان گویوں کے یہ روسی ہمزاد کیف کے ڈیوک ولادیمیر دوم کو ایک بنا کر رستم کی زور آوری کے اڑتے ہوئے واقعات کو ایلیا مورمز سے جوڑ کر یونانی دیو مالا کے قصوں کو اپنے ممدوح سے نسبت دے کر کچھ حکایات کچھ تخیل اور زبان دانی کی گوٹ لگا کر "مقدس روس" کے کافر تاتاری دشمنوں کے خلاف جذبات جگاتے اور گیتوں کی دھن پر زبان و ادب کی سوکھی کھیتی کو پانی دیتے پھرتے ہو نگے کہ آخر ان کی داستانوں کا نام ہی "بیلینی" پڑ گیا یعنی بیتی باتیں جو تیوہاروں یا شادی بیاہ کی تقریبوں میں ٹولکی (یا برہ کتھا) کے طور پر سنائی جاتی تھیں۔

ان کے علاوہ منظوم میلادِ مسیح کی محفلیں جمتی تھیں۔ روحانی کلام بھی "بیلینی" کی طرح اکثر زبانی اور کسی قدر تحریری پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ مذہب نے جس زبان کو پال پوس کر کسی قابل کیا تھا اب وہ شوخ ہو گئی تھی اور مذہبی اخلاقی قصوں گیتوں اور نصیحتوں کے درمیان روسی عادتوں کی چھوٹ، ساقی نامہ، تیوہار نامہ اور شادی نامہ بھی چپکا دیتی تھی۔ کہیں کہیں اس میں مفلس اور تباہ حال روس کا شکوہ اور جاگیرداروں اور کارندوں پر چوٹ بھی کی جانے لگی۔ رزمیہ، بزمیہ اور اخلاقی روحانی تینوں قسم کی "بیلینی" کم و بیش تین صدی تک سینہ بہ سینہ چلتی اور گھٹتی بڑھتی رہیں کہا جا سکتا ہے کہ پندرہویں صدی کے خاتمے تک روسی زبان کے ارتقائی درجوں کا نشان کہیں ملتا ہے تو ان شاعرانہ داستانوں اور اخلاقی قصوں میں جن کے موضوع رزمیہ بزمیہ (تفریح، تیوہار) اور مذہبی یا روحانی رہے اور جو سینہ بہ سینہ تھوڑی بہت مقامی یا لسانی بیانی تبدیلیوں کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتے گئے۔ دیوی دیوتاؤں تاتاریوں اور سویڈن والوں سے جنگ کے مبالغہ آمیز رجزیہ بیان کے علاوہ ان میں تثلیث (ماں۔ بیٹا۔ روح القدس) کی دیسی تعلیم بھی پائی جاتی ہے جیسی گیتوں میں رچ کر زبان زد ہو سکے۔ سترہویں صدی کے وسط سے جب چھاپے کی مشین غیر ملکی زبانوں خصوصاً لاطینی و یونانی زبانوں سے تراجم لغات اور سوانح و واقعات کی ترتیب کا کام سرکاری اور کلیسائی مخلوط سرپرستی میں آکر پھیلنے لگا تو روسی زبان اور روسی ادب کی تاریخ کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ اس سے پیشتر کی نثر و نظم ملی داستانوں اور مذہبی تحریروں کو یکجا کر کے یہ نتیجے نکالنا غلط نہیں کہ

(۲) روسی زبان کے ارتقا میں مذہبی لٹریچر کا اور اس کے عالموں کا بڑا ہاتھ رہا۔ چودھویں صدی تک کے ۸۰۰ عنوانات میں صرف ۲ قطعی غیر مذہبی ہیں۔

(ب) روسیوں کے طبعی اور سیاسی حالات نے ان میں مظلومیت، محرومی، جبر اور فطرت پرستی کا جو مزاج پیدا کر رکھا تھا زبان و ادب کو (بلکہ آرٹ کو بھی) فطرت یا ارضی حقیقت پسندی کے نزدیک رکھا۔

(ج) زبان و ادب اور دینیات کے کئی عالم آزاد خیالی کے کارن "بدعتی" ہونے کے الزام میں سزایاب ہوتے مثلاً یونان سے یہ عالم کتب دینی میکسم یا پادری اوا کوم نے جنھوں نے روسی زبان کی پہلی آپ بیتی لکھی پہلے کئی برس سزا کاٹی اور پھر ۱۶۸۲ء میں انھیں زندہ جلا دیا گیا۔

(د) سترہویں صدی کے وسط سے (جب سرفڈم یا نیم غلام کسان رکھنے کا قانونی حق جاگیرداروں کو ملا) پیٹر اعظم تک روسی زبان میں نثر کا رواج برائے نام تھا۔ چند نثری قصے "یرودستی" اور "یرسکازی" جن پری اور سورما کے خیالی بیان میں بھی عوامی گیتوں اور تک بندیوں کا اثر لیے ہوتے ہیں نثر کے منطقی ربط اور تسلسل کی ادھوری کامیابی کا پتہ دیتے ہیں۔ یونانی شاعروں اور نثر کے ترجموں نے ہمسایہ ممالک خصوصاً سویڈن، پولینڈ کے ادب اور تہذیبی اثرات نے روسی دانش مندوں میں گیت اور دھن کی شاعری سے آزاد ہو کر نثر لکھنے کی امنگ پیدا کر دی تھی۔ کلیسائی سلاؤنیائی گرامر

اور سلافیائی یوکرینی لغت کی اشاعت کے علاوہ (۱۶۷۲ء میں قایم ہونے والے) پہلے روسی تھیٹر کا قیام بھی مددگار ثابت ہوا۔ تھیٹر اگرچہ شاہی خاندان کے لیے تیار ہوا تھا ڈرامے بھی جرمن زبان میں اور جرمن ایکٹروں نے پیش کیے مگر فی الجملہ روسی نثر کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوئے۔

پیوتر اول (یا پیٹر اعظم) نے یورپ کے تاریخی سفر سے (جہاں اس نے جہاز رانی اور جہاز سازی کی تربیت حاصل کی) واپسی پر جمود کی شکار روسی زندگی کو نیا چولا بدلوایا۔ حوصلہ مند اور بے دریغ بادشاہ نے نہ صرف کلیسا پر سے پیٹر یارک (اسقفِ اعظم) کا اقتدار ہٹا کر قدیم امرا کی داڑھیاں اور چوغے اتروا کر بلکہ یورپ کے شمالی سمندر کی طرف روس کا پھاٹک کھول کر (۱۷۰۳ء میں سینٹ پیٹرز برگ کی بنیاد رکھی گئی اور دس سال مسلسل روم اور وینس کے طرز پر اٹھایا ہوا یہ شہر روس کا پایۂ تخت قرار دیا گیا) معاشرتی اصلاحات کے ذریعے موڈرن روس اور اس کے جدید زبان و ادب کے لیے ٹھوس سماجی بنیاد مہیا کردی۔ "پولش یورپی لہر سے ہو کر یوکرینی زبان میں دخیل بین الاقوامی اصطلاحات و تراکیب نے روسی ادب' زبان کی لغت کا سرمایہ بڑھا دیا۔ روس کی علمی اصطلاحات میں لاطینی زبان کا تعلیمی تہذیبی رول بڑھتا گیا۔ اور یوں روس کی سائنسی تکنیکی اصطلاحوں کا مغربی یورپ کی انٹرنیشنل علمی اصطلاحوں اور زبان سے قریبی رشتہ بننے کی زمین ہموار ہو گئی۔ پیٹر اعظم کے دورِ آخر (۱۷۰۳ – ۱۷۲۵ء) تک جرمن سویڈن اور فرانسیسی اہلِ علم و فن خصوصاً ڈاکٹروں' بیوپاریوں' مستریوں' کارخانہ داروں اور فنکاروں کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی بدولت یہ تعلق اور بڑھا روسی رہن سہن پر اور زبان و ادب پر اس کا اثر بڑھا اور نئے روس میں وہ تعلیم یافتہ طبقہ بڑھتا چلا گیا۔ جس کی پشت ایشیا سے لگی ہوئی اور رُمنہ یورپ کی طرف تھا۔ پچھلے ڈھائی سو سال روسی زبان کی تاریخ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

اٹھارویں صدی روسی زبان میں نظم و نثر کے نئے اٹھان کا قدیم و جدید الفاظ و انداز بیان کے درمیان آویزش اور آمیزش کا زبان میں فصاحت کے نئے معیار قایم کرنے کا زمانہ ہے اور اسی دور میں یہ تحریک بھی چلی کہ زبان کو عوامی اور اشرافی کے مابین ایک معتدل قومی رنگ دیا جائے۔ ثقیل بے لطف لغات اور بازاری الفاظ و تراکیب خارج کر کے اس میں غیر ملکی خصوصاً ایسے فرانسیسی الفاظ و استعارے استعمال کیے جائیں جو روسی لب و لہجہ سے قربت یا ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اردو میں سراج الدین علی خان آرزو کے ہم عصر اے۔ پی سومارکوف نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ یہ تحریک چلائی۔ یہ زبان کو صاف کرنے کی تحریک تھی۔ اے۔ ڈ۔ کانتمر کی بسانی تحریک اس سے مختلف سمت میں اور فرانسیسی علم و ادب کے ماہر و۔ ل۔ تردیاکوف کی تحریک علمی ضابطہ بندی کی جانب تھی مگر وہ ادبی شخصیت جس نے نظم و نثر' تجزیہ اور منطقی ادبی اور افسانوی تمام شعبوں کا احاطہ کر لیا جس کی واحد شخصیت پوری ایک اکادمی تھی آزاد خیال سائنسی اور فنکارانہ کمالات کا سنگم وہ میخائیل لومونوسف ہے۔ اس نے فرنچ اور جرمن الفاظ اپنانے کے اصول بھی مرتب کیے' سائنسی ترقی کی راہ میں ان کی اہمیت بھی جتائی اور خود اپنے سائنسی اور ادبی کارناموں کے ذریعے ان کے علمی نمونے بھی پیش کر دیے۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوّل کے دانشور اہلِ قلم میں چند نام ایسے ہیں جو بیک وقت کئی زبانوں ادبوں اور علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور انھوں نے روسی زبان و ادب کو علمی تکنیکی اور تخلیقی تینوں سمتوں میں عوامی اشرافی اور قومی یا معتدل تینوں رنگوں میں اور نثر عاری' نثر مرصّع اور بیانیہ' فصاحت آمیز نثر' تینوں طرزوں میں تیزی سے آگے بڑھایا اور یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو میں پہنچا دیا۔ یہ نام ہیں۔ اے این رادیشچیف' د۔ ای۔ فون ویزن' ن۔ ای۔ نووی کوف' گ۔ ز۔ درژاوین' ای۔ اے۔ کری لوف۔ ان روشن ستاروں کو علم و فن کی قدر داں ملکہ کیتھرائن کا زمانہ ملا' خوش حالی کی فضا اور شاہی سرپرستی کی چھاؤں میسر آئی ملکہ اور صاحب اقتدار طبقے نے قومیت کی ترقی کے جوش میں آزاد خیالی اور ہنرمندی' فلسفیانہ نکتہ طرازی اور بے ضرر طنز گوئی کو تو بڑھاوا دیا آزاد خیالوں کی سرگرمی اور اہلِ قلم کی بے باکی کو "حد سے گزرنے" نہیں دیا۔ طنز نگار صحافی اور ادیب نووی کوف قید ہوا۔ ڈرامے کا بانی فون ویزن اپنے اثر و رسوخ کی بدولت بچ گیا۔ درژاوین قصائد لکھنے کے صلے میں ملک الشعرا قرار دیا گیا۔ لومونوسف نے تمام تر کوششیں ماسکو یونیورسٹی قایم کرنے پر لگادیں۔ نووی کوف نے روسی زبان کے اہلِ قلم کا جو پہلا روسی تذکرہ لکھا ہے اس میں ۳۱۰ نام ہیں اور ان میں تاریخ ادب نے جنھیں آج تک نوازا وہ سب کے سب اپنے عہد کے بہترین ترجمان تھے' تاہم روشن خیال دربار ان سے ہمیشہ بدگمان رہا۔

شیکسپیئر کے ڈرامے بڑے اہتمام سے ترجمہ کیے گئے۔ لومونوسف اور تردیاکوفسکی کو ملک کی اکادمی علوم کا پہلا روسی ممبر چنا گیا جہاں جرمن راج کرتے تھے۔ سومارکوف نے پہلا روسی تھیٹر پائے تخت میں قائم کیا۔ ملکہ نے بڑے شوق سے دارالترجمہ کھلوایا۔ غیر ملکی ماہرین بلوائے جو غیر زبانوں سے اپنی نگرانی میں علمی ادبی فنی کتابوں کے ترجمے کراتیں۔ اہلِ دربار کی تفریح کے لیے مزاحیہ رسالہ نکلوایا۔ شعرا کو انعام و اکرام سے نوازا۔ ان سرگرمیوں کی بدولت شہری تہذیبی مرکزوں میں ادبی رسائل و کتب خرید کر پڑھنے والے ہزاروں خاندان سامنے آئے اور قصباتی جاگیروں میں خادموں اور مصاحبوں' ہنرمندوں اور غیر ملکی اتالیقوں کے دم سے جابجا تھیٹری شوق کو فروغ ہوا۔ اوپیرا ٹریجڈی اسٹیج کرنے کا رواج گویا پائے تخت کے ذوق کی تائید یا تقلید محسوب ہونے لگا اور قصباتی امرا نے اسے اپنالیا۔ روس میں کلاسیکی اسٹیج کی ترقی تکی اور عام مقبولیت کا یہی ایک سبب ہے۔ اس میں جاگیرداری نظام بالواسطہ شریک تھا۔ قصبات اور شہروں میں بکھری ہوئی صلاحیتوں نے تمثیل کے اسٹیج اور کتب بینی کے بڑھتے ہوئے شوق کے ذریعے ایک نیا ماحول پیدا کردیا۔ اسی ماحول میں ادیب اور ادب کو سماجی اعتراف میسر آیا جس کے نتیجہ میں اہلِ قلم نے خود کو اس کام کے لیے وقف کردیا۔ تاتاری نسل اور روسی تربیت میں پلنے والا شاعر میر کا ہم عصر انھیں کی طرح نازک مزاج صاحب طرز اور اپنے وقت کا ناخدائے سخن درژاوین نے انیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوتے روسی زبان و ادب کو وہ مقام عطا کردیا کہ یورپ کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں روسی کتابوں کے ترجمے شائع ہونے لگے۔

لومونوسف کی نثر و نظم' رادیشچیف کا سفرنامہ "پیٹرسبورگ تا ماسکو"

درژاوین کی فلسفیانہ نظمیں "فے لیت سا" اور "خدا" فون ویزن کے سماجی طنزیہ ڈرامے صرف روسی زبان وادب کے ہی اہم طرزوں کے ارتقا کا نمونہ ہی نہیں ہیں بلکہ اس دور کے سماجی مسائل احتجاج اور مباحثوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ مگر وہ شخص جس نے اس دور کی تمام ترامنگوں، ترقیوں، مباحث اور لسانی ادبی ارتقا کو اپنی تحریروں میں سمیٹ لیا روس کا پہلا معتبر مورخ کرافزین ہے جس نے شیکسپیئر کے لفظ بہ لفظ ترجمے سے ادبی زندگی شروع کی۔ ماہنامہ ماسکو نکالا (۱۷۹۱ء) اور موت سے چند گھنٹے پہلے تک (۱۸۲۶ء) "تاریخ ریاست روس" کی بارہ جلدیں مکمل کر دیں ۱۸۱۸ء میں اس کی آٹھ جلدیں چھپ کر روسی زبان وادب اور سماجی مسائل کا اہم مبحث بن چکی تھیں۔

کرافزین نے اپنے ماہنامے مضامین ناولٹ "غریب لیزا" اور پھر تاریخ کی اولین جلدوں میں اس نکتے پر زور دیا کہ روسی زبان کو ایسی قومی شائستہ زبان بنایا جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے اور اس طرح کتابی اور روزمرہ کی زبان کا فاصلہ ختم ہو جائے "جیسے بولتے ہیں ویسے لکھیں، جیسے لکھتے ہیں ویسے بولیں"۔

مگر خود کرافزین نے جرمن پروفیسر سے تعلیم لی تھی مغربی یورپ کا طالب علمانہ سفر کیا تھا فرنچ پر عبور پایا تھا، اپنی تاریخ اور تصانیف میں جو غیر معمولی موڈرن زبان اختیار کی اس نے قدیم ثقیل الفاظ ترک کر دیئے فصاحت کو غیر ملکی سانچوں میں ڈھالا تو انیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے روسی تہذیبی دنیا دو حلقوں میں بٹ گئی۔ سلافی چلن کے حامی جدید حیثیت والے ترقی پسند۔ دربار دار اشراف بیشتر اول حلقے میں شامل ہو گئے۔ درژاوین بھی ان کے حامی تھے۔ زوکوفکی دوسرے کے۔

انیسویں صدی کے اول چالیس سال روسی زبان وادب کے نہایت اہم اور فیصلہ کن سال ہیں۔ ان میں اگرچہ اخبارات و رسائل اشاعت گھروں۔ ادبی حلقوں، بحثوں بحثیوں کی دھوم رہی تاہم نثر پر نظم حاوی ہو گئی۔ اس دور میں روسی شاعری نے یورپ کو جا لیا اور اپنے استاد فرانسیسی اور انگریز رومانی شاعروں سے آگے نہیں نکلی تو پیچھے بھی نہیں رہی۔ اور پھر یہ ہماہمی سو سال نصیب نہ ہوتی۔ ۱۸۰۳ء-۱۸۴۴ء کا یہ مختصر زمانہ دو بادشاہوں، دو سازشوں دو بغاوتوں اور دو نسلوں کے ساتھ مستقبل کے روس کی نشان دہی کرنے والا زمانہ ہے۔ شاعر زوکوفکی نے انگریزی، فارسی، جرمن اور فرنچ شعرا کے بے مثال ترجموں سے نسلِ حاضر کے سامنے نئی کائنات کھول کر رکھ دی۔ اس عاشق مزاج شاہی اتالیق اور خوش کلام شاعر نے منظوم ترجموں کو روسی ادبیات کی ایک مستقل صنف کا مرتبہ دلوایا تب سے یہ رواج اب تک چلا آ رہا ہے۔

زوکوفکی نے گرے، سودی، گوئٹے اور بائرن کے منظوم ترجموں کو اصل کی پوری کیفیت بخش کر اپنے جوہر کا اضافہ کر دیا۔ تبھی سے روس کا ہر ایک پختہ کار شاعر اس خوش گوار رسم کی پابندی میں طبع آزمائی ضرور کرتا ہے۔

"سلاف دوست" اور "یورپ دوست" حلقے رفتہ رفتہ وسیع اور احاطہ دار ہوتے گئے۔ لیکن جدید سماجی سیاسی تصورات نے دانشوروں اور فوجیوں کے خفیہ حلقوں کی نئی نسل کو بلند بانگ بنا دیا۔ جس طرح سائنسی تکنیکی عبارتوں پر جرمن جدید کا اثر ہو رہا تھا شاعرانہ ادبی روسی زبان پر نوک پلک والی منجھی ہوئی فرنچ کا اثر پڑا اور آرٹ کی زبان پر اطالوی سرو سامان کا اخباری کاروباری عدالتی زبان کے فروغ میں انگریزی شریک ہونے لگی۔ نسلِ حاضر کی آگاہی میں سارا یورپ آن ملا۔

جن دنوں زوکوفکی جدید روسی شاعری کے علم بردار کی حیثیت سے سامنے آ رہا تھا تبھی دانائے روس ایوان کری لوف کھردری دیہاتی زبان پر ہلکی سی ادبی پالش کر کے قصے کہانیاں لکھ رہا تھا۔ گاؤں گاؤں پھر کر ارضی حقیقت اور جدید حسیت کو یکجا کر کے اس نے ٹھیٹھ روسی کو ادب عالیہ کی صف میں پہنچا دیا۔ درباری نشین دیمتریئیف بھی جس نے کری لوف کا حوصلہ بڑھایا حکایتیں لکھتا تھا مگر سعدی کی سی اخلاقی ادبی جرأت کرنے کو کری لوف نے پر پھیلائے اس کی کوششیں آج تک روسی ادب کے لیے قابلِ تقلید پرواز کی مثال ہیں۔

اس دور میں ڈیلونگ (Delving) اور بے لینسکی جیسے ناقد یزی کوف، چیوچیف، باتیوشکوف، براتینسکی، ویازیمسکی، ونے ویتی نف، کوتسوف الکسئے تالستائے، لیرمنتوف جیسے بے قرار پیش قدم، ندرت پسند حقیقی شعرا، گری بائیدف اور ارتیروف جیسے شاعر ڈرامہ نویس کری لوف جیسے شاعر مزاج حکایت نویس اور چادائیف جیسا فلسفیانہ بصیرت رکھنے والا مضمون نگار منظر پر دمک رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن خاص میں یکتا ہے۔ ہر ایک نے ٹریڈیشن کا درجہ پا لیا ہے۔ لیکن وہ شخص جو اپنے شعر، نثر، ناول، افسانے، منظوم ڈرامے، حکایات، تنقید، تاریخ، انشائیے، چٹکلے اور سیاسی یا ذاتی ہجو نگاری سے تمام ہم عصروں میں ممتاز اور تمام رنگوں پر حاوی اور اپنے عہد کا سب سے شوخ رنگ اور گہرا ترجمان ہے وہ الیگزینڈر سرگے ئیچ پشکن جس کا نام دراصل روس کے قومی ادب میں وہی مقام رکھتا ہے جو فردوسی اور حافظ ایران میں اس کا ہم عصر گوئٹے جرمنی میں اور غالب اردو میں۔

پشکن کے ہاتھ روسی شاعری نے گویا انیسویں صدی کے تمام مراحل طے کر لیے۔

پشکن اور اس کے ہم عصروں نے روسی زبان و ادب کے تیز رفتار ارتقا میں ادب کے سماجی شعور اور شہری فریضے کو اتنا اہم مقام دیا کہ شاعری کی قوت نثر کی جانب بہہ نکلی۔ خود پشکن نے زندگی کے آخری دور میں نثر ہی زیادہ لکھی اور اس کے روحانی شاگردوں (مثلاً گوگول) نے نثر کے ارتقا اور نکھار پر اپنی تمام صلاحیت صرف کر دی۔ طنز، تنقید، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور سیاسی فلسفیانہ مضامین کا گویا ایک سیلاب انیسویں صدی کے وسط میں روس کے وسیع میدانوں پر اتر پڑا۔ نثری تحریروں کے اس سیلاب کا ایک بڑا سبب "سلاف دوست" اور "یورپ دوست" دانشوروں کے مباحث اور مقالات تو تھے ہی "منکروں" (Nihilist) کی وہ سیاسی تحریک بھی تھی جو تمام قدیم قدروں سے عملی نجات پانے کے لیے دہشت پسندی، بغاوت اور قتل پر اتر آئی تھی۔ اس تحریک نے جس کی رہنمائی باکونن جیسی شہرۂ آفاق ہستی کے ہاتھ میں تھی جدید ادبی قدروں کے تعین کی راہ ہموار کی۔ وہ خود یا اس کے ہمنوا تو بڑا ادب نہ دے سکے لیکن ہرزن جیسے انقلابی بیلنسکی جیسے ناقد لافروف جیسے شیفکی اور پساروف جیسے مفکر اہلِ قلم روسی ادب کو بخشے۔ پچاس برس کے دوران شاعری کا علم بلند رکھنے میں افاناسی فیت، تیوچیف اور نکراسوف کا ہاتھ ہے ادب میں افادیت اور سماجی مقصد پر اس قدر زور دیا جانے لگا تھا کہ الکسئے تالستائے نے

فنی براتے فنِ شعر براتے تاثر موسیقی وسخنوری براتے لطافت اظہار کا نعرہ بھی لگایا اور اپنی شعری تخلیق سے اس کا ثبوت بھی مہیا کیا۔ نکراسوف بالکل دوسری سمت میں سرگرم تھا۔ اس نے قصباتی زندگی، کاشت کار طبقے کی مظلومیت روس کی دکھی روح کو اعلیٰ درجے کے شاعرانہ اسلوب سے بے نیاز ہوکر گیتوں کہانیوں، قصوں کا شاعرانہ رنگ دے دیا۔ پشکن کی ٹریڈیشن کو نئی زندگی عطا کرکے تو دنکراسوف نے اپنے لیے حیات جاوداں خریدلی۔ وہ آج بھی اس دور کا نمائندہ اور عوامی شاعر شمار ہوتا ہے۔ نکولائی گوگول (۱۸۰۹ - ۱۸۵۲ء) جس نے طنزیہ افسانوں اور ناولوں کے ذریعے عالمی شہرت پائی۔ معاصر روسی سماج کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ اسی کے دور میں دستوئیفسکی جیسے عالمی شہرت وعظمت کے ناول نگار نے روسی زبان وادب میں پہلا نادر تجربہ (نچلے لوگ) پیش کیا۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے تک دونوں محاذوں یا حلقوں نے اپنے بہترین اہلِ قلم آگے بڑھا دیئے۔ روسی قوم کے نقاد گری گورووچ (دیمتری) پی سسکی، گنچاروف، تورگنیف اور سالتی کوف ہیں اور اس کے وکیل اکساکوف دستوئیفسکی، لسکوف اور ٹالسٹائے دونوں طرز کے ناول نویس حقیقت نگار اور نکتہ چیں تھے لیکن "یورپ دوست" اپنی قوم اور اس کے طرز معاشرت وخیالات کی خامیاں اور برائیاں دکھا کر رہ جاتے ہیں "سلاف دوست" اپنے مشاہدے سے نتیجے نکالتے ہیں اپنی قوم کی تمام خامیوں کو تسلیم کرکے ان کی توجیہہ کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ایک فلسفۂ حیات تعمیر کریں ایک قومی نصب العین قائم کریں جو روسی فطرت سے مناسبت رکھتا ہو۔ وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ روسی قوم اپنی زندگی کی تشکیل اور اعلیٰ اصولوں کی پیروی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے

تورگنیف، گوگول، گنچاروف اور دستوئیفسکی نے ڈرامے کو اپنا ادبی ہتھیار نہیں بنایا تھا لیکن ان کے ہم عصر الیگزینڈر استروفسکی (۱۸۲۳ - ۱۸۸۶ء) نے ڈرامے پر خاص توجہ کی، ۴۴ ڈرامے لکھے اور ایکٹروں، ڈائرکٹروں کی نئی نسل پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ روس میں کلاسیکی اصولوں سے ہٹ کر نئے قسم کے تھیٹر کی داغ بیل پڑ گئی۔ ماسکو آرٹ تھیٹر، پی سیمسکی، پوتے خن، تورگنیف اور گوگول نے اولین کامیاب طرز جدید کے ڈرامے اسی جدید اسٹیج پر پیش کیے۔ انیسویں صدی کے اکثر روسی افسانہ وناول نگاروں کو اسٹیج کے ذریعے زبان زد اور موثر بنانے کی سرگرمی اس تھیٹر نے نہ صرف جاری رکھی بلکہ اوروں کے لیے مثال قائم کردی۔

روسی ادب میں حقیقت نگاری کی جڑیں زندہ رکھنے والی زبردست تصانیف میں دستوئیفسکی، تورگنیف، سچدرین (طنز نگار) اور لیوٹالسٹائے کا نام انیسویں صدی کا نمائندہ ہے۔ لیوٹالسٹائے نے تین جلدوں میں اپنی سوانح حیات (۱۸۵۲ - ۱۸۵۷ء) لکھ کر ادب کی اس صنف کی آبیاری کی۔ سوانح میں حقیقت وافسانہ کی آمیزش نثر کے علاوہ نظم پر اثر انداز ہوئی۔

صدی ختم ہوتے ہوتے روسی ادب، تورگنیف، ٹالسٹائے، استروفسکی، لیکوف، دستوئیفسکی اور کرولینکو کے جدا جدا فلسفہ حیات اور طرز انشا سے مالا مال اور رنگا رنگ ہوچکا تھا۔ حقیقت نگاری پر زور دے چکا تھا عالمی ادب میں باعزت مقام پاچکا تھا تب انتون چیخوف کے مضامین اور افسانے اور شاعری میں سمبولزم (علامت نگاری) کی تحریک نمودار ہوئی۔ صحافت سے ابتدا کرکے چھوٹے بڑے افسانوں اور بالآخر ڈراموں اور جدید تر ڈرامے کی بنیاد رکھنے والا انتون چیخوف سماجی مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنانے سے منکر اور انسانی فطرت کا گہرا نباض تھا۔ صفِ اول کے روسی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے درمیان ابھرنے والے چیخوف نے کسی ایک معمولی سی صورتِ حال، کسی غیر معمولی واقعے، معمولی سے آدمی اور کسی ایک موڈ کی سوانح عمری لکھ کر اپنی راہ الگ نکال لی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں وہ اور ٹالسٹائے روسی زبان وادب کے ارتقا میں سب سے بلند رتبہ اور قبولِ عام حاصل کرچکے تھے۔ ٹالسٹائے اپنے فلسفہ "اہنسا" اور پُرامن عدم تعاون کو ادبی نقش دینے کی بدولت (اس فلسفے اور طرزِ حیات نے گاندھی جی کو راہ دکھائی) چیخوف اپنے مشاہدہ فرد اور خلوت میں انجمن تلاش کرلینے کے سبب، دستوئیفسکی مشاہدۂ نفس اور سماجی حقیقت کے شعور میں پلاٹ کی پیچیدار بناوٹ اور بیان کی تہ دار سادگی میں ان دونوں کا پیش رو بلکہ رہنما ثابت ہوا۔

کہا جاسکتا ہے کہ روسی زبان وادب نے انیسویں صدی کے آخر میں اپنے ماقبلِ انقلاب عروج کا دور گزارا۔ اس دورِ عروج میں روسی اہلِ قلم میں یہ توقع سرایت کرچکی تھی کہ فرنچ اور انگریزی ادب وتہذیب اپنے آخری معیاروں کو پہنچ چکے ہیں نئے معیار تلاش اور پیش کرنا اب روسیوں کو مقدر ہوگا۔ اس کے آثار شعر ونثر میں ظاہر ہورہے تھے کہ ۱۹۰۵ء کا انقلاب ۱۸۲۵ء کی دسمبری بغاوت کی طرح ناکام ہوگیا اور کئی اہلِ قلم کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

سمبولزم کی تحریک نے فرانسیسی فنکاروں اور شاعروں کے اثر سے روسی شاعری کو (اور اصناف کے مقابلے میں) زیادہ اپنی گرفت میں لیا۔ شاعر بریوسف، وسلویوف، ایوانوف، مرزکوفسکی، زنائیدا ہپیس، بالمونت اینسکی اور الیگزینڈر بلوک کے ناموں اور کارناموں نے روسی شاعری کو پھر ایک بار اپنے یورپی ہم زبانوں کا ہم قدم کردیا۔ اس تحریک کو جو مذہب، تصوف، علامت، استعارہ اور خوش گوار بامعنی آوازوں کو اپنا کر اٹھی تھی بریوسف اور بالمونت نے علی الاعلان نئی اور تازہ دم تحریک کہہ کر پیش کیا مگر اس کا سب سے بڑا اور خاموش اثر انداز ترجمان الیگزینڈر بلوک ہے جس نے اپنے ہم عصر شاعر آندرے بیلی کی طرح انقلاب ۱۹۱۷ء میں مسیح موعود کی واپسی دیکھی اور جب وہ ہاتھ نہ آئی تو اداس اور مطعون ہوگیا

علامت نگاروں کی اس کہکشاں سے منہ پھیرنے کی وجہ کچھ انقلابی حالات تھے اور کچھ بلوک کی اداس پروقار، فکرمند شاعرانہ فضا اور ادبی، فنی، تحریک۔ ایک مضمون بعنوان "وضاحت بیانی کی شانِ حسن" چھپا اور "شاعر برادری" قائم ہوئی۔ یہ لوگ اپنے سے پہلے تمام استعاراتی رمزیہ مبہم فکری طرزوں کے خلاف لفظوں کو ان کے دوٹوک اور بے باک معانی دینے کے قائل اور موسیقی کے سوتیلے رشتے سے انکاری تھے۔ ۸، ۱۰ برس ان کا اثر رہا تاہم "پوئٹ گلڈ" میں شریک ہونے والے درجنوں شاعروں میں سے صرف تین نام اور ان کے جداگانہ طرز کا نمونہ ہائے کلام ابتک اس تحریک کی اہمیت جتاتے ہیں اور وہ ہیں :

نکولائی گومیلیوف اس کی پہلی بیوی آننا اخمتووا اور اوسپ منڈل سٹام۔

اس عبوری دور کے نثر نگاروں میں تین عبوری مگر اثر انگیز فکر خیز ادیبوں کا نام لیے بغیر روسی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ الیگزانڈر کوپرن، آندریئف اور ایوان بونین جو مختلف ادبی تحریکوں اور سماجی موجوں کے درمیان جھکولے

کھاتے ہوتے وزنی ادبی کارنامے اچھالتے رہے

۱۹۱۱ - ۱۹۱۲ء نوجوان شعرا اور اہلِ قلم نے ایک سانس میں تمام گذشتہ "ہیرا پھیری" اور "خوش ذوقی" کو قلم زد کرنے کا اعلان کیا۔ چار اہلِ قلم "خلیب نیکوف، مایاکوفسکی ایل کروچینیخ اور دوید بورلیوک نے اپنے دستخطوں سے مینی فیسٹو نکالا عنوان تھا "طمانچہ بر رخسارِ ذوقِ سخن" انھوں نے شاعر کو للکارا کہ بادلوں سے اتر کر زمین پر قدم رکھے، دھندلکے سے بچ کر کھُردری صنعتی و سیاسی حقیقتوں کی آنکھ میں آنکھ ڈالے، پرانی تشبیہات و استعارات سے دامن بچا کر، موسیقی کے اثرات سے پاک رہ کر، نئے دُرست اور جاندار الفاظ کی پوشیدہ موسیقی کو ابھارے۔ لفظوں کے لغوی معنی سے قطع نظر کرکے اور کسی لفظ سے شرمائے نہیں۔ یہ ادبی تحریک مستقبل پسندی (Futurism) کہلائی۔ اس ہجوم میں جسے زمانے کی سازگاری نصیب ہوئی سب سے قدآور شخصیت شاعر مایاکوفسکی کی ہے۔ خودرو اور مقبولِ عام قصباتی شاعر سرگئے ئی ییسے نِن بھی اس تحریک سے متاثر ہوا لیکن وہ اپنی نرم گفتار غنائی شاعری سے آزاد نہ ہو سکا۔ مایاکوفسکی نے اپنی وہ روش ترک کردی۔ روسی ادب کو متاثر کیا اس نے ہر طرح کے الفاظ اور رجزیہ انداز کو قبولِ عام بخشا اور بالآخر اس تحریک کا رنگ اڑنے سے پہلے دونوں نے خودکشی کرلی۔

۱۹۱۸ - ۱۹۲۰ء کا زمانہ خانہ جنگی میں گزرا ہنگامی ادب کے شور میں دمیان بیدنی جیسے نیم ادبی شعرا اور بگدانوف جیسے ایجی ٹیٹر قلم کار منظر پر چھا گئے۔ پرولتاری تہذیب (پرولت کلت) کا غلغلہ بلند رہا جس کی دین یہ ہے کہ جن لوگوں نے کبھی قلم نہیں پکڑا تھا وہ بھی انقلابی اور تعمیری جوش میں روسی زبان و ادب میں اپنے اچھوتے مشاہدات اور اپنا دیسی بیان لے کر آگئے۔ یہ سلسلہ دوسری جنگ کے خاتمے تک چلا اور اس کی تنظیمی شکل کُل روسی انجمن مصنفین (R.A.P.P.) کہلائی۔

عین اسی زمانے میں شاعری کے تقاضوں کی آڑ میں ایک ادبی رجحان پل رہا تھا۔ تصور و تمثیل نگاری کا Imaginism کے نام سے جس کے اکثر حامی آگے چل کر یا خاموش ہوگئے یا نکالے گئے۔ ورنہ سرکاری اجازت نامے لے کر ہجرت کر گئے۔ ییسے نِن کو اسی تحریک سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شاعر پاسترناک بھی اسی تحریک سے متاثر رہا ہے۔ بلکہ اس کا صحیح نمائندہ ہے۔

خانہ جنگی کا دور ختم ہوتے ہوتے تعمیر پسند مصنفین کا آہنگ نثر و نظم میں ابھرتا ہے، اور تیسرے عشرے میں وہ تعمیریت (Constructionism) کے نام سے حاوی رہتا ہے۔ اس نے شاعری کو ایلیا سلوینسکی اور باگرا تیسکی اور کسی حد تک زابولیتسکی دیے۔ مگر ادبی پسند اختیار کرنے اور ادب کا ذوق رکھنے والوں کی روز افزوں اور بے اندازہ تعداد میں ایزا کیبل اور میکسم گورکی سب سے نمایاں ہیں۔ اول نے حقیقت کے ہیجان انگیز روپ کو اپنی سادہ بیانیہ نثر اور غنائی نظموں میں اسیر کیا اور آخر الذکر نے بیان کی تمام قوتوں کو انقلاب اور اشتراکیت کے تعمیری پروگرام کے سپرد کردیا۔ دونوں عوامی نکتہ چینی کا شکار ہوتے ببیل خفیہ پولیس کی حوالات میں مرگیا گورکی نے لینن کے مشورے سے انجمن سازی کے مضامین لکھے اور بالآخر اشتراکی حقیقت پسندی کا نعرہ بلند کیا (۱۹۳۲ - ۱۹۳۴ء)۔ فرمانوف اور پلنیاک نے خانہ جنگی کے کرداروں کی زندگی معرکے سفرنامے رزم نامے اور رپورتاژ لکھ کر اس نعرے کی عملی تفسیر پیش کی۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۴ء تک کے بیس سال روسی زبان و ادب میں ایک جانب خلفشار اور زبان بندی کے دوسری جانب نئے تجربات اور بیباک فنی امنگوں کے سال ہیں۔ ادب نے اگرچہ کسی سمت قدم نہیں بڑھایا تاہم زبان دوہری مشق کی بدولت عوامی اور زیادہ علمی بن گئی۔ ایک تو پرانے الفاظ کی سکّہ بندی اور صیقل سے، دوسرے غیر ملکی اصطلاحوں کی یلغار اور بیانیہ گنجائشوں کے اختیار کرنے سے۔

اس زمانے کا ادب اور ادیب حقیقت پسندی کے مختلف ہلکے ہلکے گہرے غنائی اور جارحانہ رنگوں کے ساتھ الگ سے تفصیل طلب ہے اور اس نے خود کو بیشتر نثری کارناموں میں ظاہر کیا ہے۔

سراپیمی (Serapion) بھائیوں یعنی اہلِ قلم کی وہ ٹولی جو سرکاری لائن کی پابندی قبول نہیں کرتی تھی۔ زمیاتن وایوانوف "م" زوشچنکو اور سلانیمسکی کے سرکش قلم کے دم سے اپنا اثر ظاہر کرتی رہی پھر بھی اشتراکی حقیقت پسندوں یا انقلابی حقیقت نگاروں کا اثر مذاقِ عام پر طاری ہوگیا۔ ناول نگار فدئیف پلنیاک، لوالیوشا اور لیونڈ لیونف زندگی اور فن کے نشیب و فراز کے باوجود اس دور کے "مستند ادبی رجحان" کی ترجمانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کئی لاکھ چھپنے والے ناول "ملادایا گواردیا" (قافلہ شہیدوں کا) کے مصنف فدئیف نے ۱۹۵۶ء میں خودکشی کرلی۔

گورکی کے انتقال (۱۹۳۶ء) کے بعد معتوب یا مشکوک ادیبوں کا کوئی وکیل صفائی نہ رہا جو ادب و سیاست کے حلقوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اور احتساب بڑھ گیا۔ اس احتسابی شدت سے الگ تھلگ روسی زبان میں "شبہ سے بالاتر" غیر ملکی کلاسیکوں کا ترجمہ ہوتا رہا اور بعض اہم شخصیتوں نے ادب کی لَو اونچی رکھی۔ ان میں میخائیل شولوخف، الکسئے ٹالسٹائے، پاوستوفسکی، پاسترناک، ایلیا اہرن بورگ، پرشی وین اور شاعروں میں زبولوتسکی، تواردفسکی، انتاکولسکی، سلوخن۔ اپنے سائے میں شاعرانہ صداقت کے ان جواہر پاروں کو بچاتے رہے جن سے ۱۹۵۴ء کے بعد روسی زبان و ادب کو روشنی اور قدر و قیمت ملتی تھی۔ روسی ادب کے ہاتھ سے کسی وقت بھی کلاسیکی وضع کی جبری حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوٹا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۵۳ء کو اسٹالین کے انتقال کے بعد روسی ادب کی نئی آوازوں نے باہر کی دنیا کو یہ تاثر دینا شروع کیا گویا روس کے نوجوان دانشور اور اہلِ قلم اس نظام سے بے زار ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ دل کا غبار نکالنے میں مصروف تھے۔

بیسویں پارٹی کانگریس (مارچ ۱۹۵۶ء) کے ساتھ ہی نہ صرف جدید (۱۹۲۴ء کے بعد ولادت کے) شعرا نے کھلے مجمعوں میں اپنا طنزیہ فریادی یا غنائی کلام سنانا شروع کیا بلکہ جن شعرا کو سرکاری طور پر رد کیا جاچکا تھا ان کا کلام بھی منظرِ عام پر لایا جانے لگا مثلاً آننا اخمتووا، زوشچنکو، پاسترناک یونین مارینا سوتیتایوا اور گیورگی ایوانوف۔ عوامی شہ ملی تو شاعری کی آواز نثر سے اونچی ہوگئی۔

دودینتسیف (V. Dudintsev) کا ناول "صرف روٹی سے نہیں"، ایلیا اہرن بورگ کا ناول "پگھلاؤ" (The Thaw)، لشوگرا ئین پنفیورف کے ناول اور بالآخر ڈاکٹر ژواگو نے ادبی دنیا میں ہلچل

بھادی۔

سرکاری ادبی پالیسی کی تائید یا تعبیر میں لکھنے والے نکولائی تی خنوف کیجے توف، سفرانوف وغیرہ شاعر صحافی اور ڈرامہ نگار اپنی عام مقبولیت کھونے لگے۔

روسی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور انیسویں صدی کے کلاسیکی شعرا اور جدید شاعرانہ کارناموں سے رنگ و آہنگ لے کر تقریباً بے لاگ و بے باک شاعری کو یہاں تک قبولِ عام بخشا کہ مشرق سے زیادہ مغرب میں اس کا چرچا ہوا۔ آندرے وزنے سینسکی، ایو توشیلکو، رابرٹ رزدیست وینسکی، بیلا احمد اللینا، وناکوروف کا تازہ کلام روس کے نوجوانوں میں بھی اسی قدر مقبول ہے جتنا ملک کی مغربی سرحدوں کے پار ان کے ہاں جدید مغربی طرزِ سخن کی جھلک ایشیائی شاعری کی دیواروں سے دور اور فن کی جدید ترین لہروں پر رقص کرتی نظر آتی ہے۔ جدید تر روسی ادب تقلید سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے یہ بات، وزنے سینسکی اور رژ دیست وینسکی کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے نثر نے سائنسی رنگ پکڑا ہے۔ سا ترے نتسن اور ابرام توز وغیرہ کے ناول معتوب ہونے کے باوجود روس کے تازہ ترین ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

عربی زبان و ادب

عرب قوم سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ ان قوموں میں بابلی، سریانی فینیقی، آرمینی، حبشی، سبتی اور عربوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ مؤرخین نے عرب اقوام کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) **عرب بائدہ**: یہ وہ عربی اقوام ہیں جن کے حالات کا نہ تو تاریخ سے پتہ چلتا ہے اور نہ ہی آثار قدیمہ سے البتہ ان کی زبان کا نمونہ ان کتبوں اور تحریروں میں ہے جو حال کی کھدائیوں میں ملے ہیں۔

(۲) **عرب عاربہ یا قحطانی عرب**: یہ یمن کے وہ باشندے ہیں جو نسلاً یعرب بن قحطان کی اولاد میں سے ہیں۔ عربی زبان کے اصلی بانی یمن کے یہی باشندے تھے۔

(۳) **عرب مستعربہ یا عدنانی عرب**: یہ حجاز کے وہ عرب ہیں جو عدنان کی نسل سے تھے یہ لوگ انیسویں صدی قبل مسیح حجاز میں آکر ٹھہرے اور یہیں بس گئے۔

مذکورہ بالا تمام اقوام عربی زبان بولتی تھیں۔

عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشوونما

ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے کہ سامی اقوام اپنی بستیوں میں جو زبانیں بولتی تھیں ان ہی کی ایک شاخ عربی زبان بھی ہے۔ اور اس طرح عربی زبان کا آرلی یا حامی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی زبان دنیا کی ان وسیع ترین سلیس اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ زبان دائیں سے بائیں طرف کو لکھی جاتی ہے۔ اس میں ۲۸ حروف تہجی ہیں۔ اس زبان میں بعض حروف جیسے (ض) ایسے ہیں جو دوسری زبانوں میں نہیں ملتے اور نہ دوسری قومیں ان کا صحیح تلفظ کر سکتی ہیں اسی لیے عرب فخریہ کہتے ہیں کہ "نحن الناطقون بالضاد" یعنی دنیا میں صرف ہم ہی ضاد کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں۔ اس زبان میں الفاظ کی آخری آواز کو مخصوص نشانوں (اعراب) کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ حروف کے ذریعہ لکھ کر نہیں، جیسا کہ آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اسی زبان میں مسلمانوں کی مقدس مذہبی کتاب قرآن شریف نازل ہوئی ہے اور اسی زبان میں اسلام کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باتیں کہی ہیں اور مذہبی تعلیم دی ہے۔

۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس زبان کو جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ بلال حبیب شمالی افریقہ اور دوسرے ملکوں کے ایک کروڑ سے زائد اشخاص بولتے ہیں۔ اور چوں کہ اس زبان میں قرآن اور حدیث کے علاوہ تمام اسلامی علوم و فنون بھی لکھے گئے ہیں اس لیے ساری دنیا کے مسلمان اسے اپنی مقدس مذہبی زبان مانتے ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ نے دوسری چار زبانوں کے ساتھ اسے بھی اپنی کارروائیوں کے لیے تسلیم کر کے اس کی بین الاقوامی حیثیت کو سندِ اعتبار عطا کی ہے۔

عربی زبان کے مختلف لہجے

عربی زبان اپنی اصلی شکل میں کس طرح وجود میں آئی اس کا یقینی پتہ لگانا بہت مشکل کام ہے کیوں کہ جس وقت اس کی واضح شکل ہمارے سامنے آئی ہے وہ اسلامی زمانہ تھا اور اس وقت عربی زبان اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔

مگر اب مختلف عرب ممالک میں کھدائیاں کرنے کے بعد جو آثار قدیمہ ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان تین مختلف لہجوں میں بولی جاتی تھی لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں عرب قبائل میں تجارت، میلوں ٹھیلوں، حج کعبہ اور دوسرے ذرائع سے آپس میں میل جول بڑھا تو لہجوں کا یہ اختلاف رفتہ رفتہ مٹ گیا اور ایک نئی اور خوبصورت زبان تشکل آئی جو "لہجہ قریش" میں تھی۔ اور جب اس لہجہ میں قرآن شریف بھی نازل ہو گیا تو اس زبان کو عمر جاوداں مل گئی! اور یہی وہ زبان ہے جو آج بھی علمی، ادبی، سیاسی، تاریخی، فنی، تکنیکی اور دیگر ضرورتوں میں عرب ملکوں میں استعمال ہوتی ہے۔

عربی رسم خط

جس طرح عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشوونما کے متعلق اب تک کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی تھی اسی طرح عربی زبان کے رسم خط کے بارے میں بھی علما اور ماہرین لسانیات کی معلومات محدود تھیں۔ تقریباً نوے سال ہوتے مستشرقین (اسلامی علوم و فنون اور عربی کے ماہر یوروپین علما) نے مختلف عرب ممالک میں کھدائیاں کر کے جو تحریریں اور کتبے نکالے ہیں ان کی بنیاد پر ان علما کا خیال ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے حجری عہد کے دوسرے دور میں بحر روم کے ساحلوں پر بسنے والی قوموں میں جب تہذیب و تمدن کا نشوونما ہوا تو انہوں نے اس وقت تک رائج نقوش کی زبان کو پہلی مرتبہ رسم خط میں تبدیل کیا۔ بعد میں جب ان کے یہاں تہذیب و تمدن نے مزید ترقی کی، صنعت و حرفت بڑھی اور تجارت میں مزید توسیع ہوئی تو ۳۶۰۰ ق م بلکہ غالباً اس سے بہت پہلے ایلام سومیریا اور مصر میں ایک ایسا رسم خط ایجاد ہوا
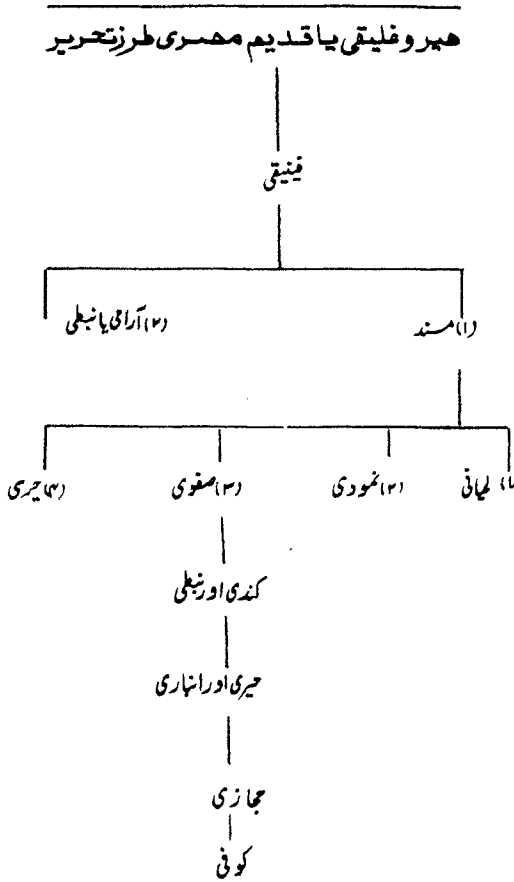
جس میں دل کی بات تصویروں کے ذریعہ ادا کی جاتی تھی اس رسم خط کا نام "ہیرو غلیفی" یا قدیم مصری طرز تحریر تھا۔ اس رسم خط کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پورے جملے کی ترجمانی ایک تصویر کرتی تھی۔

فینیقی قوم نے جو ان دنوں کنعان میں بحر روم کے ساحل پر آباد اور تجارت پیشہ تھی مصر میں ایجاد شدہ حروف تہجی کو ٹائر (Tyre) ۔ سِڈون (Sidon) بِبلوس (Byblos) کے علاقوں کے علاوہ بحر روم کے ساحل پر آباد تمام شہروں میں پہونچایا اور انہیں شہروں میں قدیم سامی قوم آرامی بھی رہتی تھی جس نے اس رسم خط کو ان کے ذریعہ سیکھا۔

فینیقیوں کے رواج دیے ہوئے اس رسم خط سے جس کا سلسلہ ہیرو غلیقی سے جا ملتا ہے، بعد میں دو رسم خط نکلے ایک جنوبی عرب یعنی یمن میں جس کا نام "خط مسند" تھا یہ خط قبل مسیح پورے جزیرہ نمائے عرب میں استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا خط "آرامی یا نبطی خط" تھا اس کا رواج شمالی عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کے واسطے سے ہوا جو اس وقت بنی ارم کی زبان میں لکھتے تھے۔ بعد میں خطِ مسند کی کئی اور شاخیں ہو گئیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصہ میں رسم خط صفوی، ثمودی اور لحیانی کا رواج رہا اور جنوبی حصہ میں حمیری کا۔ عربوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنا حجازی رسم خط حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لیا اور انہوں نے نبطیوں اور کندیوں سے اور ان لوگوں نے خط مسند سے اس طرح عربی رسم خط کا سلسلہ مسند یعنی یمن میں رائج شدہ خط سے جا ملتا ہے۔

عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ قبیلہ طے کے تین افراد نے عربی رسم خط ایجاد کیا تھا جن کے نام مرار بن مرۃ، اسلم بن سدرۃ اور عامر بن جدرۃ ہیں۔ انہوں نے سریانی زبان کے قاعدوں کے مطابق عربی زبان کے رسم خط کو ڈھالا اور انبار کے بعض لوگوں نے اس کی تعلیم دی انباریوں نے اس خط کو حیرہ کے لوگوں کو سکھایا اور بشر بن عبد الملک نے جو دومۃ الجندل کے والی اکیدر بن عبد الملک بن عبد الجن الکندی کا بھائی اور مذہباً عیسائی تھا حیرہ میں اپنے قیام کے زمانے میں اس رسم خط کو سیکھا اور مکہ میں جب ایک مرتبہ ٹھہرا تو اس نے سفیان بن امیہ اور ابو قیس بن عبد مناف کو لکھنے کا طریقہ بتایا اور اس طرح مکہ میں لکھنے کا رواج ہوا۔ لیکن مکہ اور مدینہ دونوں شہروں میں اسلام سے پہلے لکھنا جاننے والے بہت کم تھے مکہ کی بہ نسبت مدینہ کے یہودی زیادہ تعداد میں لکھنا جانتے تھے۔ غزوہ بدر میں مکے کے جو لوگ قید ہوئے ان میں سے پڑھے لکھے قیدیوں کا فدیہ رسول اللہ صلعم نے یہ مقرر کیا کہ وہ مدینہ کے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس طرح مدینہ کے اندر لکھنے پڑھنے کا رواج پڑا بعد میں جب تعلیم کا رواج بڑھا تو نئی نسل پوری تعلیم یافتہ ہو گئی۔ ذیل میں عربی رسم خط کا شجرہ نسب دیا جاتا ہے۔

عربی ادب کی تاریخ کو عام طور سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ جاہلی زمانہ۔ یہ زمانہ پانچویں صدی سے شروع ہو کر اسلام کے ظاہر ہونے پر ۶۲۲ء ۳ ۶۲۲ء میں ختم ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی زمانہ۔ اسلام کے ظاہر ہونے سے شروع ہوتا ہے اور بنی امیہ کی حکومت کے خاتمہ پر ۷۹۸ ۱ء میں ختم ہوتا ہے۔

۳۔ عباسی زمانہ۔ عباسی سلطنت کے قیام سے شروع ہو کر زوال بغداد سنہ ۱۲۵۸ء میں ختم ہوتا ہے۔

۴۔ انحطاط کا زمانہ۔ بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) سے شروع ہو کر نپولین کے حملہ مصر پر ۱۷۹۸ء میں ختم ہوتا ہے۔

۵۔ موجودہ زمانہ۔ نپولین کے مصر پر حملہ اور محمد علی پاشا کی حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اب تک جاری ہے (۱۷۹۸ء تا حال) اس زمانہ کے دو دور ہیں۔ ایک نشاۃ ثانیہ کا پہلا دور اور دوسرا "نشاۃ ثانیہ کا دوسرا دور" جو چل رہا ہے۔

عربی رسم الخط کا شجرہ نسب

ہیرو غلیقی یا قدیم مصری طرز تحریر

فینیقی

(۱) مسند — (۲) آرامی یا نبطی

(۱) لحیانی — (۲) ثمودی — (۳) صفوی — (۴) حمیری

کندی او رنبطی

حیری اور انباری

حجازی

کوفی

جاہلی زمانہ ۴۵۰ء — ۶۲۲ء

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ادب کی دونوں قسمیں نظم و نثر پائی جاتی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے

زمانۂ جاہلیت میں عرب ادبا اور شعرا بعض خاص میلوں میں سال میں ایک دفعہ جمع ہوکر خرید و فروخت کے علاوہ شعروشاعری اور خطابت میں مقابلہ اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو گنا کر ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے۔ ان میلوں میں قابل ذکر عکاظ مجنتہ اور ذوالمجاز ہیں۔ ان میلوں کی وجہ سے شعر وادب کا پورے جزیرہ میں سال بھر تک چرچا رہتا تھا۔

زمانہ جاہلیت کی نثر : عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اسلام سے پہلے کا اکثر ادبی سرمایہ ضائع ہوگیا پھر بھی جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کی بنیاد پر نثر جاہلی کو تین قسموں میں بانٹا جاتا ہے (۱) تقریر (۲) کہاوتیں (۳) نصیحتیں اور حکیمانہ جملے۔

تقریر نثر کی وہ قسم ہے جس میں عربوں نے اپنی زبان کے جوہر دکھلائے ہیں۔ یہ تقریریں عام طور پر کسی اونچی جگہ سے یا اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھے ہوتے کی جاتی تھیں مقصد ہوتا تھا جنگوں میں جوش دلانا، اپنے قبیلہ اور اپنے آبا و اجداد کے کارنامے گنانا۔ اپنی اور قبیلہ کی مدافعت کرنا، صلح وصفائی کرانا، بادشاہوں اور امرا کی تعریف کرنا اور اعلٰے اخلاق کی تلقین کرنا۔

زمانۂ جاہلیت میں بہت سے ممتاز مقررین گزرے ہیں ان میں دو قابل ذکر ہیں۔

قیس بن ساعدہ الایادی یہ نجران کا پادری تھا اور ملکۂ خطابت کے علاوہ شعروشاعری اور حکمت و فلسفہ میں بھی بہت مشہور تھا۔ اسے عکاظ کے میلہ میں اکثر جج مقرر کیا جاتا تھا۔

عمرو بن معدی کرب الزبیدی ۶۴۲ھ

قیس بن ساعدہ کے بعد فن خطابت میں سارے عرب میں مشہور تھا۔ اس کی تقریر کا موضوع عام طور پر بہادری اور "مرواۃ" یعنی شرافت نفس اور اعلٰے اخلاق کی تلقین ہوتا تھا۔

کہاوتیں عربی میں کہاوتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک "حقیقی" جنہیں انسانوں نے کہا ہے اور دوسری "فرضی" جو جانوروں کے منہ سے ادا کرائی گئی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں چھوٹے چھوٹے لیکن حکمت و فلسفہ اور عقل مندی کی باتوں سے بھرے ہوئے جملوں کا جو کوئی شخص اپنے کسی عزیز دوست یا جاننے والے سے کسی نقصان سے بچانے یا کوئی فائدہ پہنچانے کی غرض سے کہتا تھا بہت رواج تھا۔ اس زمانہ میں زہیر بن جناب الکلبی اور ذوالاصبع العدوانی نے اس صنف میں بڑا امتیاز حاصل کیا۔

قصے کہانیاں نثر کے ان اصناف کے علاوہ زمانۂ جاہلی میں قصے کہانیوں کا بھی بہت رواج تھا۔ یہ کہانیاں دو قسم کی ہوتی تھیں ایک "لوک کتھا" تھی جس کا موضوع جنگ اور بہادروں کی شجاعت اور جنگی کارناموں کا ذکر تھا، جیسے عنترہ یا الزیر سالم بن ہلال وغیرہ کے قصے دوسری قسم ان کہانیوں کی ہے جسے عربوں نے دوسری قوموں سے لے کر عربی رنگ میں ڈھال کر بیان کیا ہے جیسے شریک نامی ایک شخص کا قصہ کہ دراصل یہ کہانی ایک یونانی کہانی ہے جسے عربوں نے اپنے رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بالکل عربی کہانی لگتی ہے۔

جاہلی زمانہ کی شعروشاعری (نظم) عربوں کو من حیث القوم شاعری کا ذوق فطری طور پر ملا ہے۔ یہ قوم بدوی زندگی گزارتی تھی۔ ان کی نسل ہر طرح کی آزادی کے ساتھ آغوش فطرت میں پروان چڑھتی تھی۔ حد نگاہ تک پھیلا ہوا صحرا، تیز اور جھلسا دینے والا سورج سخت اور تند صحرائی آندھیاں، چمکتا دمکتا چاند، ہنستے مسکراتے ستارے، نیلی صبحیں اور پرکیف شامیں ان کا سرمایہ فکر و نظر تھیں چنانچہ عرب شاعر اپنے فطری ماحول میں ڈوب کر اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار شعر میں کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلی کا جو شعری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ بہت مؤثر اور وقیع ہے اور زبان وبیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ بدوی زندگی کا مرقع بھی۔

چوں کہ جاہلی زمانہ میں شاعر اپنے قبیلہ کی مدح اس کے کارنامے گنا کر فخر کرنے کے علاوہ اس کی طرف سے دوسرے قبیلوں کے شاعروں کا جواب دیتا تھا اپنے قبیلہ کی عزت اور ناموس کی حفاظت کرتا تھا، اس لیے عربوں کے یہاں شاعروں کی بڑی قدر تھی، چنانچہ جب کسی قبیلہ میں کوئی لڑکا شاعر بن کر چمکتا تو لوگ اس قبیلہ کو مبارکباد دیتے تھے، خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے۔ اور وہ قبیلہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنا سر اونچا کر کے چلتا تھا۔ زمانہ جاہلی میں ایک سو بیس سے زائد شعرا نے نام پیدا کیا لیکن ان میں سے اکثر کا کلام ضائع ہوگیا۔

عام جاہلی شعرا کے کلام میں اس زمانہ کے اعتبار سے اعلیٰ بدوی اخلاق کی تعلیم عمدہ اور پاکیزہ مضامین و معانی اور بلند پایہ اغراض و مقاصد ملتے ہیں۔ اگرچہ عام طور سے عرب شعرا انعام واکرام کے لالچ سے بادشاہوں، امرا اور رئیسوں کی شان میں مدحیہ قصیدے نہیں کہتے تھے۔ پھر بھی دو ایک شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جیسے النابغہ الذبیانی اور حسان بن ثابت جنہوں نے بادشاہوں کی شان میں مدحیہ قصائد کہے ہیں۔

جاہلی شعرا اپنے کلام میں بھاری بھرکم اور پرشکوہ الفاظ استعمال کرتے تھے ان کے یہاں خیالات میں گہرائی یا افکار میں ندرت اور بلندی نہیں ملتی۔ سیدھے سادے خیالات کو حسین مگر پرشکوہ الفاظ کا جامہ پہنا کر کلام کے اثر کو دوبالا کر دیتے تھے مبالغہ، استعارہ، باریک تشبیہات یا فلسفیانہ مضامین ان کے کلام میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ البتہ وصف اور منظر کشی، جیسے اونٹ گھوڑے اور بھیانک رات کے وصف میں انھوں نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا ہے۔ عام طور سے جاہلی شعرا نے حسب ذیل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

(۱) فخر و حماسہ (۲) وصف (۳) مدح (۴) ہجو (۵) مرثیہ (۶) غزل (۷) معذرت او حکم و امثال۔

معلقات۔ یوں تو جاہلی زمانہ میں بہت سے نامور شعرا پیدا ہوئے جن کا کلام عربی شاعری میں زبان و بیان اور اغراض و مقاصد کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے مگر ان میں ایک خاص طبقہ سب سے زیادہ ممتاز رہا ہے جن کو "اصحاب معلقات" کہتے ہیں یعنی وہ شاعر جن کے قصیدے خانۂ کعبہ میں لٹکائے گئے۔

زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ عکاظ کے میلے میں عرب کے تمام شعرا جمع ہوتے تھے (النابغہ الذبیانی) مشہور جاہلی شاعر کی صدارت میں محفل مشاعرہ گرم ہوتی تھی جس میں تمام شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ آخر میں میر مشاعرہ فیصلہ سناتا تھا کہ اس سال کس شاعر کا قصیدہ سب سے زیادہ اچھا رہا چنانچہ اس شاعر کے قصیدے کو سونے

کے پانی سے لکھ کر خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ایسے قصیدہ کو "معلقہ" یعنی خانۂ کعبہ میں لٹکا یا ہوا قصیدہ کہتے تھے چنانچہ ان بے شمار شاعروں میں جو زمانہ جاہلی میں نامور سمجھے جاتے تھے آٹھ شعرا کا کلام عکاظ کے میلے میں اول آنے پر خانۂ کعبہ میں لٹکایا گیا۔ اور یہی معلقات جاہلی شاعری کی جان اور اس کا صحیح اور اصل نمونہ ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱ ۔ امرؤالقیس م ۵۳۹ ء
۲ ۔ النابغہ الذبیانی م ۶۰۴ ء
۳ ۔ زہیر بن ابی سلمٰی۔ سنہ ۹ ھ مطابق ۶۳۱ ء
۴ ۔ عنترہ بن شداد العبسی م ۶۱۵ ء
۵ ۔ الاعشیٰ قیس م ۶۲۹ ء
۶ ۔ طرفہ بن العبد م ۵۵۲ ء
۷ ۔ عمرو بن کلثوم م ۵۷۱ ء
۸ ۔ لبید بن ربیعہ م ۴۱ ھ مطابق ۶۸۰ ء

مذکورہ بالا شعرا میں سے امرؤالقیس دورِ جاہلیت کی شاعری کا نمائندہ شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کو "بجڑا نواب" (الملک الضلیل) کہتے ہیں کیوں کہ یہ شراب وکباب اور حسن وشباب کا رسیا تھا۔ امرؤالقیس نے سب سے پہلے عربی شاعری میں محبوبہ کے دیار پر کھڑے ہوکر رونے کی رسم نکالی۔ اس نے اپنے معلقہ میں گھوڑے اور محبوبہ کا سراپا کھینچنے تاریک اور دہشتناک رات اور اس کی درازی اور پانی برس کر کھل جانے کی منظرکشی میں بڑی فنی مہارت اور قدرتِ زبان، قوتِ تخیل اور ندرتِ بیان دکھائی ہے۔ اسی لیے عربی ادب میں اس کا معلقہ اول نمبر پر رکھا جاتا ہے اصحاب معلقات میں دوسرا شاعر جسے امتیازی حاصل حیثیت حاصل ہے وہ النابغہ الذبیانی ہے اس کے کلام میں جذبات انسانی کی بڑی صحیح اور سچی تصویر ہوتی ہے اور خاص طور سے صدق وصفا کے نغمے اس نے بڑے مؤثر انداز میں گائے ہیں۔ اس کی امتیازی خصوصیت معذرت خواہی ہے۔ اصحاب معلقات میں تیسرے نمبر پر زہیر بن ابی سلمٰی کا نام ہے یہ بڑا پاکباز انسان دوست، صلح پسند اور صلح جو شاعر تھا۔ اس کے گھر کے تمام افراد شاعر تھے۔ جاہلی معاشرہ میں یہ پہلا شخص ہے جس نے صلح وآشتی، میل جول اور محبت وخلوص کے لافانی نغمے گائے ہیں اور جنگ وجدال کے برے نتیجوں کو دکھا کر ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ وہ ایک قصیدہ کہنے کے بعد سال بھر تک اس کی نوک پلک درست کرتا تھا۔ اور ہر طرح سے جب مطمئن ہو جاتا تھا، تب ہی اسے سناتا تھا۔ اس نے اپنے معلقہ میں عرب کے ان دو امرا کی دل کھول کر تعریف کی ہے جنہوں نے جنگ داحس وغبرا کے مقتولین کا خوں بہا اپنی جیب سے دے کر اس منحوس لڑائی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کرایا۔

معلقات کا چوتھا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم ہے۔ اسے فخر ومباہات میں امتیازی شان حاصل تھی عزتِ نفس، خودی وخود داری میں اس کا جواب نہیں اس نے اپنے علاقہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کو صرف اس وجہ سے بھری محفل میں قتل کر دیا کہ عمرو کی ماں نے شاعر کی ماں سے ایک دعوت میں پلیٹ اٹھا کر دینے کو کہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے اپنا معلقہ کہا جس میں اپنی اور اپنے قبیلہ اور خاندان کی ایسی تعریف وتوصیف کی ہے جس کا جواب پوری عربی شاعری میں نہیں ملتا۔

عنترہ بن شداد العبسی جو لونڈی زادہ تھا، فن سپہ گری میں ممتاز اور معرکہ کارزار کا ہیرو تھا۔ حرب داحس وغبرا میں اس نے وہ دادِ شجاعت دی تھی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی شاعری جنگ کے میدان کا نقشہ کھینچنے بہادری اور بے جگری سے لڑنے پر اکسانے اور "جان جاتے پر آن نہ جاتے" کی زندہ مثال ہے۔

ان خاص شعرا کے علاوہ جاہلی زمانے میں چند ممتاز شعرا اور بھی ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض نامور شعرا کے نام یہ ہیں۔

مہلہل بن ربیعہ (م ۵۰۰ ء) کہتے ہیں کہ یہ عربوں کا پہلا شاعر تھا شراب وکباب اور رندی وہوسناکی کا رسیا تھا شراب وشباب کی تعریف اور معرکۂ کارزار کی منظرکشی اس کا خاص موضوع تھی۔

عمرو بن مالک الازدی جس کا لقب **شنفری** تھا۔ یہ طبقہ "صعالیک الشعرا" یعنی خانماں برباد منچلے نوجوان شعرا کا ہیرو تھا جو گھر بار چھوڑ جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے شنفری کا کلام بڑا مؤثر، الفاظ بڑے پرشکوہ ثقیل اور بھاری بھرکم ہیں اس کا قصیدہ لامیۃ العرب عرب بدوی نوجوان کی زندگی اس کی تکالیف اور گھربار دوست واحباب سے دوری اور مجبوری کی دل خراش داستان ہے اور صحرا کی زندگی کی صحیح تصویر۔

ان کے علاوہ اس عہد کے شعرا میں المتلمس (م ۵۵۰ ء) السموأل بن عادیہ (م ۵۶۰ ء) اوس بن حجر (م ۶۱۱ ء) امیہ بن ابی الصلت (م ۶۲۴ء) حاتم طائی (م ۶۹۰ ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اسلامی زمانہ

(۶۲۲ ء سے ۷۵۰ ء مطابق ۱ ھ سے ۱۳۲ ھ "رسول اللہ صلعم خلفائے راشدین اور بنو امیہ کا زمانہ)

رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کا زمانہ

زمانہ جاہلیت کے آخری دور میں اور اسلام کے آنے سے تھوڑے پہلے تک عرب قوم بدستور اپنی فطری بدوی زندگی گزارتی تھی چنانچہ ان کے معاشرہ میں نہ علوم وفنون کا رواج تھا اور نہ کوئی بند معاشرے کا ملکی اور سماجی قانون تھا قبیلہ کے دستور اور رواج قانون تھے اور شیخ قبیلہ حاکم مطلق۔ نہ صنعت تھی نہ حرفت نہ تجارت تھی اور نہ زراعت انتقام اور بدمعاملگی اور لاقانونیت نے ایک طرف تراج کا سا عالم طاری کر رکھا تھا تو دوسری طرف علمی وادبی افلاس کا دور دورہ تھا۔

اس حالت میں اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں عربوں کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے اور نیز اسلامی تعلیمات پر عمل کرکے انہوں نے ایک ایسا صالح اور پاک سماج تعمیر کیا جس میں روحانی فضا کے ساتھ مادی وسائل کی بھی حیرت ناک فراوانی ہوتی اور علم وفضل نے بے مثال پیش رفت کی سیاسی اور سماجی اعتبار سے اسلام نے ساری قوم کو ایک جھنڈے، ایک رہبر، ایک نظامِ حکومت، ایک زبان اور ایک ایسی بامعنی زندگی کے قالب میں ڈھال دیا جس کی بنیاد قرآن اور سنتِ رسول پر تھی۔

قرآن کریم

قرآن مجید میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ان میں سے ۹۱ مکہ میں نازل ہوئیں اور ۲۳ مدینہ میں۔

مکی سورتوں میں اسلام کی دعوت دی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا بلا شرکت غیرے ایک ہے، وہ قادرِ مطلق ہے، زمینوں اور آسمانوں میں اسی کے حکم کی کارفرمائی

ہے۔ اس لیے صرف وہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے وہی پیدا کرتا اور وہی مارتا ہے ہر آدمی کو مرکر دوبارہ زندہ ہوکر اس کے سامنے جانا ہے اور دنیا میں جو کچھ کیا ہے۔ اس کا حساب وکتاب دینا ہے اور اس کے مطابق اچھے کام کا انعام اور برے کام کی سزا پانی ہے۔

مدینہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اسلام کے ارکان دینی مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ اور ان کے ادا کرنے کے طریقوں کا بیان ہے۔ اور چوں کہ یہاں سے ایک نئے معاشرہ اور نئی مملکت کی ابتدا ہو رہی تھی اس لیے معاشرہ کی تعلیمات اور ملکی دسیاسی قواعد وضوابط کے اصول اور بنیادی باتیں بھی یہیں نازل ہونا شروع ہوئیں۔

قرآن کریم کا ایک ایسا دل نشین، معجزنما مؤثر انداز بیان ہے جس کی مثال وہ خود آپ ہے۔ عرب شعرا وادبا میں سے کوئی بھی باوجود کوشش کے اس جیسی ایک آیت بھی نہ لکھ سکا۔ قرآن کریم اپنی انہی امتیازی خصوصیات کی بنا پر عربی زبان و ادب کی کسوٹی بن گیا اور آج تک اس کا یہ امتیاز باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا قرآن کریم کی بدولت عربی زبان میں بہت سے نئے معانی نئی تعبیریں اور نئے الفاظ کے ساتھ بہت سے نئے علوم وفنون پیدا ہوئے اور بعض پرانے الفاظ کے معانی نئے سرے سے متعین ہوئے۔ اس کے لکھے جانے کی وجہ سے فن کتابت کو بڑا فروغ ہوا اور اس نے تاریخ کے بہت سے بھولے بسرے ابواب سے دنیا کو روشناس کرایا۔ قرآن کی بدولت تمام ممالک اسلامیہ میں عربی زبان مسلمانوں کی واحد مذہبی زبان کی حیثیت سے مانی جاتی ہے۔

قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے کا رواج شروع سے چلا آرہا ہے اور آج بھی دنیا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو پورا قرآن زبانی یاد ہے اور ہر سال رمضان کے مہینہ میں پورا قرآن تراویح میں سنایا جاتا ہے۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو حدیث کہتے ہیں۔ قرآن کے بعد عربی زبان میں فصاحت وبلاغت اور زبان دانی میں آپ امام تھے آپ کی حدیثیں اور تقریریں عربی ادب کے شہ پارے سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کی حدیثوں اور تقریروں نے بھی عربی زبان وادب کو نئے الفاظ نئی تعبیریں اور اچھوتا انداز بیان دے کر مالا مال کیا۔

رسول صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں چوں کہ مسلمان ایک طرف نیا دین سیکھنے اور اس کے دشمنوں سے جنگوں میں مشغول رہے۔ اس لیے نثر میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ البتہ خطابت کو رسول اللہ صلعم کے خطبات کی وجہ سے جو آپ خاص طور پر جمعہ اور عیدین کے موقعوں پر دیتے تھے۔ بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ قادر الکلام اور معجز بیان مقرر تھے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین خلفائے راشدین میں بھی ملکہ خطابت پوری طرح موجود تھا۔

حضرت علی کو اس صنف میں امتیاز حاصل تھا۔ قرآن کی تلاوت اور رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت نے آپ کی زبان وبیان کو نکھار دیا تھا۔ چنانچہ آپ بہت قادر الکلام فصیح وبلیغ ادیب ومقرر بن گئے۔ آپ نے اپنے عہد خلافت میں جو تقریریں کی تھیں وہ خطابت کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادب وفن کا بھی بہترین نمونہ ہیں جو اب تک داخل درس ہیں۔

رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں شعروشاعری

رسول صلعم ایک خاص دعوت لے کر تشریف لائے تھے۔ اس دعوت کے اصول اور احکامات عرب جاہلی معاشرے کے معتقدات، رسم ورواج اور عادات کے بڑی حد تک مخالف تھے شعروشاعری جو عربوں کی گھٹی میں داخل تھی جس نہج پر زمانۂ جاہلی میں چل رہی تھی نئی دعوت اور اس نئے معاشرہ کے متقضیات کے منافی تھی اسی لیے رسول اللہ صلعم نے شعروشاعری کی ہمت افزائی نہیں کی۔ دوسری طرف نئے مسلمانوں کو دین سیکھنے اور اس کو پھیلانے سے ہی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسری طرف دل ودماغ لگاتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ میں سرزمین عرب سے نئے شعرا نہ ابھر سکے۔ زمانہ جاہلی کے شعرا میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں سے بعض نے شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا تھا جیسے لبید بن ربیعہ اور مشہور جاہلی مرثیہ گو شاعرہ خنسا۔ البتہ جن شعرا نے مشق سخن جاری رکھی انہوں نے پرانی ریت کو چھوڑ کر اسلامی تعلیمات اور ارشادات نبوی کے دائرہ میں رہ کر رسول اللہ صلعم کی مدافعت یا آپ کی مدح اور کفار مکہ کی ہجو اور اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لیے شعر کہے۔ شعرا کے اس طبقہ کو جو زمانہ جاہلی میں ابھرا اور بعد میں مسلمان ہوا "مخضرمین" یعنی دو زمانے پائے ہوئے (جاہلیت اور اسلام) شعرا کہتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت حسان بن ثابت ہیں جو رسول اللہ صلعم کے خاص شاعر تھے اور آپ کی طرف سے مکہ والوں کو جواب دیتے تھے۔ اور دوسرے کعب بن زہیر ہیں۔ مخضرمین میں ایک اور شاعر الحطیئہ بھی ہے جس نے جاہلی رنگ میں ہجوگوئی میں کمال پیدا کیا تھا۔ اور جس نے شرفا کے علاوہ اپنے ماں باپ اور حد تو یہ ہے کہ خود اپنی ہجو لکھی ہے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی شعروشاعری کی یہی کیفیت رہی۔ البتہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد دینی اور سیاسی فرقوں کے پیدا ہونے اور ان کی آپس کی کشاکش سے فن خطابت کے علاوہ شعروشاعری کو بھی ترقی ہوئی جس کے اثرات کھل کر عہد بنی امیہ میں سامنے آئے اور نظم میں نت نئی تعبیریں آئیں اور نئی راہیں کھلیں۔

عہد بنوامیہ

نثر خطابت: مملکت اسلامی کے عام حالات اور عہد بنوامیہ میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے فن تقریر کی بڑی گرم بازاری ہوئی کیوں کہ بنوامیہ کو اپنی حکومت کو جمانے کے لیے قلم کے زور کے علاوہ زبان کے زور کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ بنوامیہ کو چند ایسے اولوالعزم اور خداداد صلاحیتوں کے مالک نوجوان مل گئے جنہوں نے انتظام وانصرام میں کمال مہارت اور چابک دستی دکھانے کے ساتھ خطابت میں بھی ایسے کمال فن کا مظاہرہ کیا کہ آج بھی ان کی تقریریں ادبی جواہر پاروں کی شکل میں داخل درس ہیں۔ بنوامیہ کے اس قسم کے مقررین میں حجاج بن یوسف الثقفی اور زیاد بن ابیہ بہت مشہور ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان دونوں کے تلوار اور زبان نے بنوامیہ کے پاؤں عراق میں جما دیئے۔ بنوامیہ کے مخالفین میں قطری بن الفجا، عبداللہ بن الزبیر اور عمران بن حطان مشہور ہیں۔

نثر فنی ظہور اسلام کے وقت قبائل مضر میں چند ہی افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لے آئے تھے ان سے آنحضرت قرآن لکھوانے کا کام لیتے تھے چنانچہ ان کا نام "کاتبین وحی" یا "وحی لکھنے والے" پڑ گیا تھا۔ آپ کو جب بادشاہوں اور امرا کو دعوت اسلام کی غرض سے خطوط لکھنے کی ضرورت پڑی تو آپ نے انہی لوگوں سے کام لیا۔ بعد میں صلح نامے اور معاہدے

بھی آپ نے انہیں لوگوں سے لکھوائے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں حضرت عمر نے معاہدوں، صلح ناموں اور خطوط کے علاوہ ایک نیا تحریری کام فوج کے رجسٹر بنانے کا کرایا۔

اموی زمانہ میں حضرت معاویہ نے اس کام کو اور آگے بڑھایا اور چند نئے شعبے کھولے جن میں "محکمہ خراج" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا کہ سرکاری خطوط اور فرامین لکھنے کے لیے ایک الگ محکمہ "دیوان الرسائل" کے نام سے کھولا جس کا نگراں عبیداللہ بن اوس الغانی تھا۔ ان محکموں کے نگراں شروع میں رومی اور فارسی زبان میں اپنے دفتری کام کرتے تھے لیکن بعد میں ولید بن عبدالملک (۸۶ - ۹۶ھ) کے زمانے میں سارے محکموں کی زبان عربی ہو گئی۔ اور ایک نئی قسم کا طرز تحریر وجود میں آیا جس کا نام "خطوط اور یادداشت نویسی" پڑا اور یہیں سے عربی میں نثر کا وجود ہوا۔

اس وقت تک عام طور سے خلفائے اور امرا اپنے خطوط املا کرتے تھے لیکن جب اس قسم کے کاموں کا دائرہ بڑھا اور اس میں شام، عراق اور مصر کے عربوں اور ایرانی، رومی اور مصری قبطیوں کی اولاد آگے بڑھی جس نے عربی زبان پر پورا عبور حاصل کر لیا تھا تو انہوں نے نہ صرف خود اس قسم کے خطوط اور فرامین لکھنے شروع کیے بلکہ دوسری زبانوں کے محاسن اور فنی خوبیوں کو لے کر خود انہوں نے بھی اس میں جدت اور تنوع پیدا کیا۔ اس فن میں ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ - ۱۲۵ھ) کے آزاد کردہ غلام ابوالعلا سالم نے بڑا کام کیا اس سے اس کے شاگرد عبدالحمید بن یحییٰ نے یہ فن سیکھا۔ اور اسے اتنی ترقی دی کہ اب "فن کتابۃ الرسائل یعنی فن خطوط نویسی" ایک مستقل فن بن گیا۔ اور اسی وجہ سے عبدالحمید عربی ادب میں "الکاتب" کے لقب سے مشہور ہوا۔ عبدالحمید الکاتب نے جس کام کی ابتدا اس زمانے میں کی تھی آگے اس نے ترقی کی انتہائی منزلیں عبدالحمید الکاتب کے زمانے میں طے کیں اور اس کے بعد ترقی معکوس کی شکل اختیار کر لی۔ اور آخر کار محض پر شکوہ الفاظ گنجلک پیرایۂ بیان کا گورکھ دھندا بن کر رہ گیا چنانچہ عربی میں ایک مقولہ رائج ہو گیا کہ "بدأت الکتابۃ بعبدالحمید وانتہت بعبد الحمید" یعنی دفتری خطوط نویسی کی ابتدا عبدالحمید سے ہوئی اور انتہا عبدالحمید پر۔"

عہد اموی میں دیگر علوم و فنون کی تدوین

عرب زمانہ جاہلی سے اپنی ادبی و علمی تخلیقات کو لکھ کر رکھنے کے عادی نہ تھے بلکہ سب کچھ اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے اور حسب ضرورت زبانی بیان کرتے۔ عہد عثمانی میں پہلی دفعہ قرآن لکھ کر ممالک اسلامیہ میں تقسیم کیا گیا۔ رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کو بھی سینوں میں ہی محفوظ رکھا گیا تھا۔ مگر اموی عہد میں سیاسی اغراض کے لیے بعض لوگوں نے حدیثیں گڑھنی شروع کیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے صحیح حدیثوں کو یکجا کتابی شکل میں جمع کیا گیا۔ یہ ایک مختصر سی کتاب تھی جو عہد عباسی میں جب حدیث کی بڑی کتابیں لکھی گئیں تو ان میں ہل مل گئی۔ باقی علوم مثلاً تفسیر، حدیث وغیرہ کو علما بدستور زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس عہد میں البتہ دو بہت اہم کام انجام پائے: ایک تو قرآن پر اعراب لگانے کا کام تاکہ غیر عرب قرآن کو صحیح پڑھ سکیں اس کام کو حجاج بن یوسف ثقفی نے کرایا۔ دوسرا کام نحو میں ایک رسالے کے لکھنے کا ہے جسے ابوالاسود الدؤلی نے انجام دیا۔

یونانی کتابوں کے ترجمے

عہد اموی میں خراج کا حساب کتاب مغربی صوبوں میں رومی زبان میں اور مشرقی صوبوں کا فارسی زبان میں رکھا جاتا تھا اس کام میں عجمیوں کی اجارہ داری کو دیکھ کر حجاج بن یوسف نے ایک نومسلم ایرانی نوجوان صالح بن عبدالرحمٰن کے ذریعہ دفتر خراج کو فارسی سے عربی میں منتقل کرایا۔ شام میں خراج کا حساب رومی زبان میں ہوتا تھا جس کا سربراہ سرجون بن منصور النصرانی تھا۔ عبدالملک بن مروان نے ابوثابت سلمان بن سعد الخشنی سے کہہ کر رومی زبان سے عربی میں خراج کے رجسٹر کو منتقل کرایا۔ یونانی اور دیگر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کا کام پہلی مرتبہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں (۶۵ - ۸۶ھ) امیر معاویہ کے پوتے خالد بن یزید کے ایما سے ہوا۔ اس نے فن کیمیا سازی کی وہ کتابیں جو یونانی اور قبطی زبانوں میں تھیں عربی میں ترجمہ کرائیں۔ علم طب میں سب سے پہلی کتاب جو عربی میں ترجمہ ہوئی۔ وہ "کناش اہرون ابن اعین الطبیب" ہے جسے سرجویہ یہودی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے عربی میں منتقل کیا۔ حضرت معاویہ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے صنعاء سے ایک شخص عبید بن شریہ کو بلا کر اس سے "کتاب الملوک والاخبار الماضیہ" عربی میں لکھوائی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ عہد اموی میں تصنیف و تالیف کا کام باقاعدہ اور فنی طریقے سے نہ ہو سکا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عہد میں علوم و فنون کے مدوّن اور ترجمہ کرنے کے جس کام کی شروعات ہوئی اس کی بنیاد پر عہد عباسی میں علم و فن تالیف و تصنیف اور ترجمہ کا وہ قصر زرین تعمیر ہوا جس سے بعد میں سارے عالم نے کسب فیض کیا۔

نظم

سلطنت کی توسیع کے ساتھ اسباب تعیش کی فراوانی، ناز و نعم کی زندگی، فکر فردا سے بے پرواہی اور سماج میں احساس برتری کے زیر اثر لطیف احساسات کو جلا، ذوق حسن و جمال کو نکھار اور جذبات و خیالات کو رنگینی و رعنائی ملی۔

چنانچہ عربی زبان میں پہلی مرتبہ حقیقی غزل کا ظہور ہوا۔ اس صنف کا بانی قریش کا ایک بانکا اور طرح دار نوجوان "عمر بن ابی ربیعہ" تھا جس نے بقول فرزدق شاعری کی ابتدا تو ہذیان گوئی سے کی تھی لیکن اس صنف میں اس نے زبان و بیان، وصف و منظر کشی، مکالمہ و معاملہ بندی اور حدیث دیدہ و دل بیان کرنے کا ایسا اچھوتا، دل نشین اور سحر طراز انداز ایجاد کیا کہ اس طرز کی غزلوں کو شریف گھرانے کے لڑکے، لڑکیاں چھپ چھپ کر پڑھتے اور منچلے نوجوان گلی کوچوں میں اور گانے بجانے والے بزم ہائے طرب میں گاتے بجاتے اور ایک عالم کو سرمست و بے خود بناتے تھے۔ مکّہ سے نکل کر مدینہ میں بھی اس غزل کی صدائے بازگشت وہاں کے شعراء کی زبانوں سے سنائی دی جن کا سردار محمد بن الاحوص الانصاری تھا۔ غزل کا بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم "یہ حقیقی رنگ" اس قدر رہا اور اس کی تانیں اتنی بلند ہوئیں کہ عباسی دور تک جاتے جاتے "غزل اباحی" ہی نہیں بلکہ "غزل عریاں" بن گیا جس نے موالی شعراء کے ہاتھوں فروغ پایا۔

بادیہ میں رہنے والے غریب بدوی عربوں کا معاملہ مکہ اور مدینہ کے امیر عربوں سے ذرا مختلف تھا۔ یہاں کے باشندے اپنی بدوی خصوصیات پر نازاں اور اپنے رسم و رواج کو سینوں سے لگائے ہوتے تھے۔ ان کو اس عہد سے پہلے بھی کوئی سیاسی اہمیت نہیں حاصل تھی اور اب بھی نہیں ہوئی۔ بڑے بوڑھوں کو اس سے سکون مل

جاتا تھا کہ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کر دیا اور ان کی تلواروں کی بدولت آج قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ مگر نئی نسل کو جو اپنے شعور کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بھی حامل تھی، بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ امویوں نے دار الخلافہ کو مدینہ سے شام منتقل کر کے اور سیاسی پارٹیوں نے اپنی تگ و دو کا مرکز عراق کو بنا کر ان کے علاقے کی اہمیت یکسر گھٹا دی۔ چنانچہ مایوسی اور حالات کے تقاضوں نے ان میں ایک خاص قسم کا زاہدانہ انداز فکر پیدا کر دیا۔ دوسری طرف ان کی عزتِ نفس بدوی نخوت اور عربی مروت نے ان کے اندر ایسی ذہنی کیفیت پیدا کر دی کہ نہ وہ اپنی بات برملا کہہ سکتے تھے اور نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل کی بات دل ہی میں رہی اور وہ اپنی سوزش پنہاں سے آپ ہی جلتے رہے۔ احساسِ مایوسی اور سوزِ دروں کا زخم جب ان کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تھا تو اس کی جھنکار غزل کے ان اشعار میں سنائی دیتی تھی جن میں پاک اور لاہوتی قسم کی محبت کے نغمے گائے گئے تھے جنہیں عاشق محبوب کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا کر پوجتا ہے، چھوتا نہیں، ہجر و فراق میں صحراؤں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا ہے مگر محبوب مل جائے تو اس سے ملتا نہیں اس لیے کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ؎

"عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق"

غزل کی اس قسم کو "الغزل العذری" (قبیلہ عذرہ کی طرف نسبت ہے جو اخلاق کریمانہ اور عفت و پاک دامنی میں مشہور قبیلہ تھا) یا پاک غزل کہتے ہیں۔ اس صنف غزل میں طبع آزمائی کرنے والے وہ شعرا ہیں جن کے عشق و محبت کے افسانے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر لیلیٰ کا عاشق مجنوں، بثینہ کا عاشق جمیل اور عزہ کا عاشق کثیر ہیں۔ اس وضع غزل گوئی کو مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے بدویوں کی نسبت سے مدنی غزل کہا جاتا ہے۔

بادیہ کے ان نوجوانوں میں ایک گروہ اور بھی تھا جو صاحبِ سیف ہونے کے ساتھ صاحبِ قلم بھی تھا۔ یہ لوگ امویوں کے خلاف معرکۂ کارزار میں تلوار کے جوہر دکھلانے کے ساتھ ساتھ ان کے خلاف شعلہ بار اشعار بھی کہتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر الکمیت بن زید (م ۱۲۰ھ مطابق ۷۳۸ء) ہے جس نے بنو ہاشم کی مدح میں ایسے شاندار قصیدے کہے ہیں جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے "ہاشمیات" کے نام سے عربی ادب میں مشہور ہیں۔ اور جنہیں سن کر فرزدق جیسے شاعر نے کہا تھا کہ "خدا کی قسم تم گزشتہ اور موجودہ تمام شعرا میں سب سے بڑے شاعر ہو"۔ اس کے علاوہ اس گروہ میں الطرماح بن حکیم (م ۱۰۰ھ مطابق ۷۱۹ء) اور عمران بن حطان (م ۸۹ھ مطابق ۷۱۴ء) بھی نامور شعرا گزرے ہیں۔

حضرت معاویہ کے انتقال کے بعد یزید، مروان اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں ہر قسم کے قبائلی، دینی اور سیاسی ہنگامے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن بنو امیہ نے بھی جم کر اس صورت حال کا مقابلہ کیا اور مال و زر کے علاوہ شعرا، ادبا اور خطبا کو اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ اس صورت حال سے زبان و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا اور پہلی مرتبہ عربی زبان میں ایک طرف سیاسی شاعری کا وجود اور عروج ہوا۔ اور دوسری طرف میدانِ خطابت میں بھی ایسے قادر الکلام فصیح و بلیغ اور شعلہ بار مقرر پیدا ہوتے جن کی مثال عربی ادب میں نہیں ملتی۔ سیاسی شاعری میں جن شعرا نے کمال حاصل کیا ان میں ممتاز مسکین الدارمی، اخطل، جریر، فرزدق، ابو العباس الاعمیٰ، اعشیٰ ربیعہ اور عدی بن الرقاع ہیں۔ ان شعرا کو قرآن و حدیث کا معجزنما اسلوب بیان ورثہ میں ملا تھا خداداد صلاحیت اور فہم و ذکا قدرت سے اور ان سب کو بروئے کار لانے کا داعیہ سیاسی حالات اور مادی منفعت سے، چنانچہ انہوں نے بنو امیہ کی مدافعت میں اپنا زورِ طبع اور فطری صلاحیتیں لگا دیں جس کی وجہ سے عربی ادب میں نئے نئے مضامین، اچھوتے خیالات اور منجھا ہوا ایک خاص اسلوب بیان پیدا ہوا جو بے حد پسندیدہ اور مقبول تھا۔ پھر ان شعرا کی آپس کی ادبی چھیڑ چھاڑ سے بھی شاعری میں نت نئی راہیں کھلیں جریر، فرزدق اور اخطل کی شاعرانہ چشمکیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ ان شعرا میں اکثر نے دوسرے اصناف مثلاً غزل، مدح، ہجو اور مرثیہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عباسی زمانہ

۱۔ ترقی و عروج کا زمانہ ۷۵۰ء سے ۹۴۶ء مطابق ۱۳۲ھ سے ۳۳۲ھ تک۔

۲۔ طوائف الملوکی کا زمانہ ۹۴۶ء سے ۱۲۵۸ء مطابق ۳۳۲ھ سے ۶۵۶ھ تک (زوال بغداد)

علم سیاسی و ملکی حالت

بنی امیہ کی حکومت لگ بھگ ایک صدی تک رہی۔ اس زمانہ میں پورے معاشرہ اور حکومت میں صرف عربوں کی عملداری تھی۔ اس اثنا میں دنیا کی مہذب ترین قومیں اپنے علم و ادب اور فن و فلسفہ کے ساتھ اس نئے اسلامی سماج میں شامل ہونے لگیں۔ اس کے نتیجہ میں بنو عباس نے ان عجمیوں کی مدد سے جن میں اکثر ایرانی تھے وہ حکومت قائم کی جس کے علمی و ادبی، تہذیبی و تمدنی اور فنی و صنعتی کارنامے تاریخ اسلام میں سنہری حرفوں سے لکھے گئے۔ خلفائے بنی عباس نے عجمیوں کے ساتھ اپنائیت اور برابری کا سلوک روا رکھا۔ اس رویہ کو اس دور کی ہمہ جہت ترقی میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں قصرِ سلطانی کے ادنیٰ ملازم سے لے کر فوج کے سپہ سالار اور سلطنت کے وزرا کی بڑی تعداد عجمی اور بالخصوص ایرانی تھی۔ اور یہیں سے عربوں کا سیاسی اثر و رسوخ ختم ہونا شروع ہوا اور ان کی بڑائی اور فضیلت کی ہوا اکھڑنے لگی۔ اب مجبوراً عربوں کو عجمیوں کے ساتھ گھلنا ملنا پڑا اور اس میل جول سے ایک نیا اور اچھوتا معاشرہ وجود میں آیا جس کی بنیاد تو تھی اسلامی عقائد و عبادات پر مگر جن کی سیاست و معیشت میں ایرانی اثر اور علمی و فکری کاموں میں یونانی رنگ پوری طرح نمایاں تھا۔

علم و فن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے مراکز بھی بڑھے۔ چنانچہ اس عہد میں سب سے بڑا مرکز بغداد تھا۔ یہیں مامون نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے مشہور اکادمی "بیت الحکمت" قائم کی تھی۔ اور یہیں ایک حد تک علوم و فنون پروان چڑھے۔ دوسرا مرکز کوفہ تھا جہاں دین اور زبان سے متعلق علوم کو فروغ ہوا۔ یہیں کی خاک سے لغت ابن الاعرابی، فرا اور ثعلب اٹھے اور یہیں امام ابو حنیفہ نے مسلک حنفی کی ابتدا کی۔ تیسرا مرکز بصرہ تھا جس نے عربی نحو و لغت کے اکابر علما جیسے الخلیل، سیبویہ، اور ابن درید پیدا کیے۔ حجاز میں مدینہ حدیث و فقہ کا مرکز رہا جہاں کی خاک سے مشہور محدث اور فقیہ حضرت مالک بن انس اٹھے جنہوں نے فقہ میں مسلک مالکی کی بنیاد رکھی۔ مصر میں فسطاط (قاہرہ) دینی علوم اور زبان کا مرکز بنا جہاں حضرت امام شافعی نے مذہب شافعی کی مسندِ درس بچھائی۔ اندلس میں جہاں قرطبہ امویوں کا مرکز تھا مختلف مدارس اور مکاتب کھلے یہاں کی خاک سے مشہور ادیب اور نحوی ابن عبد ربہ

العقد الفرید کے مصنف اُٹھے عروج و ترقی کا یہ دور ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے لے کر ۲۳۲ھ ۸۴۷ء تک چلا۔ اس کے بعد یعنی ۲۳۲ھ سے ۶۵۶ھ مطابق ۸۴۷ء سے ۱۲۵۸ء کا زمانہ ہے جس میں ترکوں کا عمل دخل رہا اور ان کی سرکشی کے نتیجہ میں یہ عظیم الشان عباسی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور اقالیم اور صوبوں کے والیوں اور گورنروں نے اپنے قبیلوں کی خود مختار سلطنتیں قایم کرلیں۔ اگرچہ مرکز خلافت اب بھی بغداد رہا لیکن حکومت اور علم و ادب کے مراکز شام و عراق سے منتقل ہوکر بخارا، جرجان، غزنہ، حلب، قاہرہ اور قرطبہ پہنچ گئے۔ اور علم و ادب تاریخ و فلسفہ اور دیگر علوم میں عرب و عجم کی مشترکہ کوششوں سے جو ترقیاں ہوئی تھیں۔ اس زمانہ طوائف الملوکی میں ماند پڑنے لگیں اور مشرق میں انحطاط و تنزل کا دور شروع ہوا جس کی انتہا ہلاکو کے ہاتھوں زوال بغداد پر ہوئی۔ البتہ مصر و شام میں فاطمیوں اور ایوبیوں کے سایۂ عاطفت میں اندلس میں امویوں کی سرپرستی میں علم و ادب کے سرچشمے جاری رہے۔

عہد عباسی کا پہلا دور

نثر: اس عہد میں اصناف نثر میں ایک نئی صنف نکلی جس کو "مقامہ" کہا جاتا ہے۔ مقامہ ایک خیالی قصہ ہوتا ہے جو ایک راوی بیان کرتا ہے اور ایک مرکزی کردار کے اردگرد گھومتا ہے جو مختلف بھیس بدل کر مختلف مزاحیہ مضحکہ خیز اور کبھی سنجیدہ رول ادا کرکے لوگوں کو لوٹتا کھسوٹتا ہے۔ مقامہ کی عبارت مقفیٰ مسجع اور اس میں بھاری بھرکم شاذ اور متروک الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ رنگ بہت دنوں تک نہ چلا البتہ اس نے ڈرامہ کے لیے راہ ہموار ہوئی مقامات کو لکھنے والوں میں بدیع الزمان الہمدانی اور حریری نے نام پیدا کیا بیسویں صدی میں ابراہیم مویلحی نے "حدیث عیسیٰ بن ہشام" لکھی جو مقامہ اور ڈرامہ کی بیچ کی چیز تھی۔

علوم دینیہ میں اس زمانہ میں بہت کام ہوا۔ سب سے پہلے تفسیر و حدیث کی جمع و تدوین ہوئی تفسیر میں سفیان بن عیینہ وکیع بن الجراح، شعبہ بن الحجاج اسحٰق بن راہویہ، مقاتل بن سلیمان اور النصراء نے چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ اس طبقہ کے بعد فن تفسیر میں مکمل اور جامع کتاب جریر الطبری نے لکھی ان کے بعد ابراہیم الثعلبی النیشاپوری نے پھر محمد الواحدی نے کتابیں مرتب کیں۔ اس زمانے میں اس علم کو باقاعدہ فن کی حیثیت دی گئی۔

تفسیر کے بعد تدوین حدیث کا کام ہوا۔ حدیث میں سب سے پہلی کتاب مؤطا امام مالک ہے اس کے بعد امام بخاری نے "صحیح بخاری" پھر ان کے شاگرد مسلم النیشاپوری نے "صحیح مسلم" پھر عیسیٰ الترمذی پھر ابوداؤد سجستانی ان کے بعد احمد بن شعیب النسائی اور محمد بن ماجہ نے اپنی اپنی کتابیں ترتیب دیں۔ ان ہی چھ کتابوں کو "صحاح ستہ" یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں کہتے ہیں۔

اسی زمانہ میں فقہ کی بھی تکمیل ہوئی اور اس میں چار مسلک پیدا ہوئے۔

(۱) مسلک حنفی۔ اس کے بانی امام ابوحنیفہ تھے (۲) مسلک مالکی۔ اس کے بانی حضرت امام مالک بن انس تھے (۳) مسلک شافعی۔ اس کے بانی محمد ادریس بن شافع تھے (۴) مسلک حنبلی۔ اس کی بنا احمد بن محمد بن حنبل نے ڈالی تھی۔

علوم کلام میں بھی اس زمانہ میں خاصا کام ہوا۔ آخر میں ابوالحسن الاشعری نے کلام کے تمام مکاتب فکر کو ملا کر بیچ کا راستہ نکالا جسے اہل سنت والجماعت کا مسلک کہتے ہیں۔

ادبی تصنیف و تالیف میں اسی زمانے میں ابن المقفع اور الجاحظ نے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ ابن المقفع کی مشہور کتاب "کلیلہ و دمنہ" ہے جو سنسکرت کی کتاب پنچ تنتر کا عربی میں ترجمہ ہے۔ جاحظ نے مختلف علوم و فنون میں معیاری کتابیں لکھیں جن میں قابل ذکر البیان و التبیین، کتاب الحیوان اور کتاب البخلاء ہیں۔ احمد بن طیفور نے نظم و نثر پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ۱۳ جلدوں میں لکھی۔ اس کے بعد محمد المبرد، ابوحنیفہ الدینوری، ابوبکر محمد الصولی ابن قتیبہ ابن عبد ربہ ابوعلی القالی اور آخر میں ابوالفرج الاصفہانی نے اپنی مشہور کتاب "الاغانی" مرتب کی۔

زبان سے متعلق علوم میں نحو میں سیبویہ نے سب سے پہلی کتاب "کتاب النحو" لکھی اور اس علم کو علیحدہ فن کی حیثیت دی۔ اس کے بعد نحو میں اختلافات بڑھے اور کوفہ مکتب فکر" اور بصرہ مکتب فکر" پیدا ہوگئے جو بعد میں مل کر "مکتب فکر بغداد" کے نام سے مشہور ہوئے۔ بصرہ کے علمائے نحو میں ابوعمر بن العلاء خلیل بن احمد، سیبویہ اخفش مشہور ہیں اور کوفہ کے مکتب فکر میں معاذ اسرار (اس نے علم صرف ایجاد کیا) الرواسی اور الکسائی و النصراء قابل ذکر ہیں۔

علم عروض کو خلیل ابن احمد نے ایجاد کیا۔ اور ۱۵ بحریں نکالیں بعد میں الاخفش نے "متدارک" بحر ایجاد کی۔ فن لغت میں الخلیل بن احمد نے اپنی مشہور کتاب "کتاب العین" ترتیب دی۔ اس کے بعد ابوبکر بن درید نے "الجمرہ" الازہری نے "کتاب التہذیب" پھر حماد الجوہری نے "کتاب الصحاح" ابن سیدہ الاندلسی نے "کتاب المحکم" ابن فارسی نے "کتاب المجمل" اور صاحب بن عباد نے "کتاب المحیط" لکھی۔

علم معانی و بیان میں خلیل کے شاگرد عبیدہ نے "مجاز القرآن" علم بیان جاحظ نے "اعجاز القرآن" علم معانی میں اور ابن المعتز اور قدامہ بن جعفر نے علم بدیع میں کتابیں لکھیں۔ آخر میں امام عبدالقاہر الجرجانی نے علم معانی میں "دلائل الاعجاز" اور علم بیان میں "اسرار البلاغہ" لکھ کر ان علوم کو مکمل کر دیا۔ اس سلسلہ کی مبسوط کتاب السکاکی کی "مفتاح العلوم" ہے جو مسک ختام ہے۔

فن سیرت و غزوات میں سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے کتاب لکھی فتوحات اسلامیہ پر واقدی مدائنی اور لوط بن یحییٰ نے کام کیا۔ فن انساب پر الکلبی، ایام عرب پر ابوعبیدہ اور الاصمعی نے بادشاہوں کی تاریخ پر سب سے پہلے ابن قتیبہ نے پھر الہیثم بن عدی ابن واضح الیعقوبی نے کتابیں لکھیں۔ آخر میں محمد بن جریر الطبری نے سن ہجری کے مطابق سن وار اپنی کتاب مرتب کی۔ اور ابن الاثیر نے "تاریخ الکامل" لکھ کر اس فن کو مکمل کر دیا۔ علم جغرافیہ میں محمد بن الفزاری نے کتاب السندہند کو ہندی سے عربی میں منتقل کیا۔ پھر بطلیموس کی کتاب "المجسطی" کو حجاج بن مطر نے عربی کا جامہ پہنایا۔ پھر احمد بن خرداذبہ نے کتاب المسالک والممالک لکھی۔ اس فن میں بعد میں علما نے بڑی پیش رفت دکھائی چنانچہ عہد عباسی کے دوسرے دور میں بڑے نامور جغرافیہ داں ہوئے جیسے ابن الحائک جس نے "صفتہ جزیرۃ العرب" لکھی اور یعقوبی جس نے "کتاب البلدان" تصنیف کی۔

غیر ملکی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کا باقاعدہ کام منصور کے زمانہ میں شروع ہوا۔ ہارون الرشید نے ترجمہ کی طرف توجہ دی اور اس کے بعد مامون نے اپنی قایم کردہ اکادمی "بیت الحکمت" کے ذریعہ ترجمہ کا بہت کام کرایا چنانچہ یونانی سریانی ایرانی اور ہندوستانی زبانوں سے فلسفہ طبیعات اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ ان ترجموں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی باکمال اور قابل ذکر فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے عہد عباسی کے دوسرے دور میں اپنی فلسفیانہ تصنیفات اور آرا سے

عربی کو مالامال کر دیا۔ اس زمانے کے قابلِ ذکر فلاسفہ میں ابو نصر فارابی، یعقوب الکندی، ابو جعفر الخوارزمی، ابوبکر رازی، موسیٰ بن شاکر ہیں جنہوں نے فلسفہ، منطق، سیاسیات، ادب، حساب، جیومیٹری اور طب وغیرہ میں اہم کتابیں لکھیں۔

عباسی زمانے کے دوسرے دور میں نثر

عہد عباسی کے دور اوّل میں علم و فن شعر و ادب تاریخ و سیرت ترجمہ و نقل کا کام عروج کو پہنچ چکا تھا۔ دوسرے دور میں علما، ادبا، فقہا اور محدثین نے اس سلسلہ کی کمیوں کو پورا کیا۔ چنانچہ ادب و زبان میں ابن العمید، الصاحب بن عباد، ابوبکر الخوارزمی، الصابی، القاضی، الفاضل، ابن شہید، ابو المطرف بن عمیرہ، ابن زیدون، اور لسان الدین الخطیب نے اپنی تخلیقات سے عربی ادب کے دامن کو بھر دیا۔ علمِ فقہ میں ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" برہان الدین المرغینانی نے "الہدایہ" اور محمد الغزالی نے اپنی مشہور کتاب "احیاء علوم الدین" تصنیف کی۔ فن تفسیر میں الثعلبی نے "الکشف والبیان فی تفسیر القرآن"، محمود الزمخشری نے "الکشاف" اور فخر الدین الرازی نے "مفاتیح الغیب" لکھی۔ فن حدیث میں الحاکم نیشاپوری، سلیم الرازی اور الحافظ بیہقی نے نام پیدا کیا۔ فن تاریخ میں اس عہد کی ممتاز کتابیں یہ ہیں:۔ ابو نصر العتبی کی کتاب "الیمینی" الفتح بن خاقان کی کتاب "قلائد العقیان" المسعودی کی "مروج الذہب" ابن مسکویہ کی "تجارب الامم" ابن الندیم کی "الفہرست" اور ابن الاثیر کی کتاب "الکامل"۔ فن جغرافیہ میں اس زمانے میں الاصطخری نے "کتاب الاقالیم" ابن حوقل نے "المسالک والممالک" الادریسی نے "نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق" لکھی، یاقوت الحموی نے "معجم البلدان" جغرافیہ میں "ارشاد الادیب" ادب میں "کتاب المبدا والمآل" تاریخ میں لکھی۔ علوم، فلسفہ، منطق، طب، ریاضی، الٰہیات وغیرہ میں جو ترقی ہوئی اس کا تفصیلی تذکرہ اسلامی فلسفہ و کلام کے تحت یا اسلامی تصوف کے ضمن میں درج ہے جہاں مشرق و مغرب کے مشہور فلسفی اور مفکرین جیسے کندی، فارابی، ابن سینا، امام غزالی یا ابن رشد اور ابن طفیل کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عباسی زمانہ میں شعر و شاعری

(دور اوّل)

اموی زمانہ تک شعر و شاعری کے مرکز حجاز، نجد، عراق اور آس پاس کے علاقے تھے۔ مگر عراق میں بنو عباس کی اور اندلس میں امویوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد بغداد اور قرطبہ میں بزمِ سخن گرم ہونے لگی۔ ان دونوں مرکزوں کو ابھی سو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ہر طرف سے شعرا کھنچ کر یہاں پہنچنے لگے اور انہوں نے شاعری میں نئی راہیں اور نئی اصناف بھی ایجاد کیں مگر پیرایہ بیان اور انداز جاہلی رہا۔ عباسی دور کے وسط تک یہ رنگ اتنا بدلا کہ اب بجائے دیارِ محبوب اور اس کے کھنڈرات سے اظہارِ تشبیب کرنے کے محلات اور کوٹھیوں، عیش و عشرت کے ساز و سامان، مے نوشی، مطرب کی دلنوازی اور ممدوح کے دربار میں بذریعہ کشتی جانے کے ذکر ہونے لگے۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ شاعری کی پرانی ریت کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ درباری شعرا نے مدحیہ قصائد میں چاپلوسی اور مبالغہ آرائی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کہیں کہیں اخلاقی پستی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات شاعری، شہد این ابتذال اور جنسی و اخلاقی جرائم کی حکایت عریاں بن گئی اور حالت یہاں تک گری کہ تغزل بالمذکر کی نئی اور مذموم صنف ایجاد کی گئی۔ اور بیشتر نئی باتیں کرنے والے وہ موالی اور نوجوان شعرا تھے جو اکثر عجمی اور خاص طور سے ایرانی النسل تھے جن کا نام "شعراء المجون والخلاعہ" یعنی اوباش اور اباحی شعرا پڑ گیا تھا۔ اباحی شعرا کے طبقہ میں بہت سے شعرا گزرے ہیں، لیکن ان میں کلام کی جملہ خصوصیات کے اعتبار سے مشہور اور ان کا نمائندہ اور امام بشار بن برد (۹۵ھ - ۱۶۷ھ = ۷۱۴ - ۷۸۴ء) تھا۔ اور اس کا ساتھی ابو نواس (۱۴۵ - ۱۹۸ھ = ۷۶۲ - ۸۱۳ء) ان دونوں کے ہمنواؤں میں "صریع الغوانی" یعنی کشتہ نازنیناں مسلم بن الولید (م۔ ۲۰۸ھ) اور ابن الضحاک خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اباحی شعرا کے ساتھ ساتھ روایت پسند شعرا کا بھی ایک طبقہ اسی زمانے میں دادِ سخن دے رہا تھا جن میں سے اکثر عربی النسل تھے لیکن اس نے اپنی بزم بغداد کی فضا سے دور شام میں سجا رکھی تھی۔ اس طبقے میں ایسے قادر الکلام، منجھے ہوئے اور یکتائے روزگار شاعر تھے جن کا لوہا ہر ایک مانتا تھا۔ انہوں نے ان شعرا کے مقابلہ میں پرانے جاہلی رنگ اور آہنگ کو بنیاد بنا کر شعر و شاعری کا وہ معجز نما ڈھنگ نکالا جس میں تمام مروّجہ انداز بلائے نگارش کے ساتھ زہد و تقویٰ، پاکیزہ خیالات، اخلاقی اقدار، مروت، اور شرافت کے ابدی نغمے گائے گئے۔ ان شعرا کا یہ اثر ہوا کہ اباحی شعرا کے خاتمہ کے ساتھ اباحی انداز کا رواج بھی ختم ہو گیا۔ ان شعرا میں ابو تمام (ن ۱۹۰ - ۲۳۱ھ) البحتری (۲۰۶ - ۲۸۴ھ) ابن الرومی (۲۲۱ - ۲۸۳ھ) ابن المعتز (۲۴۵ - ۲۹۶ھ) اور ابو الطیب المتنبی (۳۰۳ - ۳۵۴ھ) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

عہد عباسی کے دوسرے دور میں شعر و شاعری

اس دور میں ایران اور خراسان کے علاقوں میں جہاں عربوں اور عربی زبان کا اثر کم ہوتا جا رہا تھا۔ فارسی ادب نے زور پکڑا اور اس کے ساتھ ادبا اور شعرا کی زبان میں عجمیت کا اثر بڑھنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی شاعری کی سابقہ روایات اور انداز بیان کے گرنے کے ساتھ اس کی قدر و منزلت بھی گر گئی۔ البتہ عراق میں ممالک عربیہ کی قربت کی وجہ سے عربی شعر و شاعری کا بازار گرم رہا۔ تاتاریوں کے ہاتھوں جب بغداد کی تباہی ہوئی تو یہاں کے شعرا اور ادبا نے مصر و شام میں پناہ لی اور وہاں علم و ادب کی محفل سجائی جس کے نتیجہ میں بہت سے نامور شعرا ابھرے جنہوں نے تمام قدیم اصنافِ سخن میں زبان کے جوہر دکھائے اور بعض نے مضامین باندھے جیسے فاطمی تہذیب و معاشرت کی تعریف، علوی عقائد و نظریات کی تحسین و توصیف۔

شام میں اس عہد کے شعرا میں المتنبیؔ (۳۰۳ - ۳۵۴ھ = ۹۱۸ - ۹۶۸ء) ابو الفراس الحمدانی (۳۲۰ - ۳۵۷ھ = ۹۳۴ - ۹۷۰ء) ابو العلا المعرّی (۳۶۳ - ۴۴۹ھ = ۹۷۶ - ۱۰۶۰ء) اور مصر میں ابن الفارض (۵۷۶ - ۶۶۳ھ = ۱۱۸۰ - ۱۲۶۵ء) اور بہاء الدین زہیر (۵۸۱ - ۶۵۶ھ = ۱۱۸۵ - ۱۲۵۸ء) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اسی زمانہ میں عربی میں صوفیانہ شاعری کی داغ بیل پڑی۔

اندلس میں جہاں امویوں کی حکومت تھی ادباء اور شعراء جب آ کر جمع ہوتے تو یہاں شعر و ادب نے بڑی ترقی کی۔ جب اس سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تب بھی حکمراں طبقہ نے ادبا و شعرا کی توقیر و عزت میں کوئی کمی نہ کی

جس کی وجہ سے شعر و ادب کی محفلیں جوں کی توں سجی رہیں۔ یہاں کے شعراء فنی اعتبار سے شعرائے مشرق کی ہی پیروی کرتے رہے البتہ مناظر قدرت کی تصویرکشی میں ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس کے علاوہ بزم یاراں و مجالس شراب و کباب کے وصف میں انہوں نے نیا انداز اور نیا اسلوب بیان ایجاد کیا۔

اندلس کے شعرا میں خاص طور سے قابل ذکر ابن ہانی، ابن خفاجہ ہیں۔ ان کے علاوہ ابن سعید ابن الخطیب اور مشہور رحل نگار ابن فرمان نے بڑا نام پیدا کیا۔

مشرق کے علاقہ عراق، فارس اور خراسان میں جن شعرا نے شہرت حاصل کی ان میں الشریف الرضی مہیار الدیلمی اور الطغرائی کے علاوہ ابن نباتہ السعدی اسری الرفاء اور سبط التعاویذی ہیں۔

تنزل کا زمانہ ۱۲۵۸ء–۱۷۹۸ء (۶۵۶ھ–۱۲۲۰ھ)

ہلاکو کے حملہ بغداد اور اس کی تباہی کے بعد ایک جمود و تعطل کا سا عالم طاری ہوگیا۔ چنانچہ اس عہد میں ادبی علمی اور تاریخی تخلیقات کم ہوئیں البتہ اسلاف کے علمی سرمایہ میں ان کے ادبی و فنی دیگر کارناموں کو چند علما نے بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں جمع کیا۔ یہ علماء وہ تھے جنہوں نے تباہی بغداد کے بعد مصر و شام کے علاقوں میں پناہ لی تھی اور یہیں انہوں نے اپنی بزم علم و فن سجائی۔ اسی لیے اس عہد کو عہد موسوعات یعنی انسائیکلوپیڈیا کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل علماء نے نمایاں خدمات انجام دیں: شہاب الدین النویری نے "نہایت الادب فی فنون الادب" سولہ ضخیم جلدوں میں لکھی جو زبان و ادب کی انسائیکلوپیڈیا تھی ابن فضل اللہ العمری نے "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" جغرافیہ اور تاریخ پر ترتیب دی جس کی بیس سے زیادہ جلدیں تھیں۔ ابن منظور نے "لسان العرب" کے نام سے لغت کی تمام کتابوں کو یکجا جمع کر دیا اور القلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" ترتیب دے کر فن کتابت اور تاریخ کو یکجا کر دیا۔

ترکی زمانہ میں جو دور انحطاط ہے، مختلف سرگرمیوں اور جنگوں کی وجہ سے علم و ادب کے میدان میں کوئی اہم تخلیقی کام نہ ہو سکا۔ تصنیف و تالیف اور سرکاری کاغذات کے لکھنے میں اس زمانے میں القاضی الفاضل کی پیروی کی گئی۔ مختلف ممالک اسلامیہ میں جن علماء نے اس زمانے میں مختلف علمی و ادبی کام کیے ان میں قابل ذکر لسان الدین الخطیب، ابن البصری، ابن خلکان، ابو الفداء، المقریزی، الدجی، ابن بطوطہ ابن خلدون اور المقری ہیں۔

ہندوستان کے ایک نامور عالم محمد بن محمد المرتضیٰ بلگرامی نے جو "الزبیدی" کے نام سے مشہور ہیں فیروزآبادی کی مشہور لغت "القاموس المحیط" کی عربی میں شرح "تاج العروس" کے نام سے دس جلدوں میں لکھی۔

دور انحطاط میں شعر و شاعری

اسی زمانہ میں مشرقی علاقوں اور مصر و شام میں بادشاہ اور ارباب حکومت عام طور سے غیر عرب تھے اس لیے عربی شعر و شاعری کی طرف نہ ان کا رجحان تھا اور نہ وہ شعراء کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا میں عربی شعر و شاعری کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔ البتہ عراق اور قرب و جوار میں اس کی کچھ رمق باقی رہی۔ شام، مصر، اندلس اور مغرب اقصیٰ میں بہر حال عربی شعر و شاعری کی حالت اچھی رہی مگر یہاں کے شعرا نے پرانی ریت اور پرانے مضامین کو چھوڑ کر خلفا اور امرا کی مدح کے بعد جن امور پر طبع آزمائی کی وہ ایک حد تک نئے تھے جیسے نعت رسول، تصوف اور صوفیا کی تعریف اور زہد و تقویٰ کے مضامین، غزل میں تغزل بالمذکر کی ریت کو ان شعرا نے دوبارہ زندہ کیا۔ یہ شعرا بعض اوقات توریہ اور جناس کو استعمال کر کے شعر کو پہیلی بنا دیتے تھے۔ ابتذال، معاملہ بندی اور فحش گوئی کا رواج بڑھ گیا۔ علمی زبان کی شاعری کے اصناف مثلاً موشحات، مواليا، زجل اور قوما کا اضافہ ہوا۔ ان اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا میں سے قابل ذکر یہ ہیں۔

۱۔ شرف الدین الانصاری (م ۶۶۲ھ)
۲۔ جمال الدین ابن نباتہ المصری (م ۷۶۸ھ)
۳۔ شہاب الدین التلعفری (م ۶۷۵ھ)
۴۔ الشاب الظریف (م ۶۸۷ھ)
۵۔ الامام البوصیری (م ۶۹۵ھ)
۶۔ ابن الوردی (م ۷۴۹ھ)
۷۔ ابو بکر بن حجہ (م ۸۳۷ھ)
۸۔ صفی الدین الحلی (م ۷۵۰ھ)
۹۔ فخر الدین بن مکانس (م ۸۶۴ھ)
۱۰۔ ابن معتوق الموسوی (م ۱۰۲۵ھ)

نشأۃ ثانیہ کا پہلا دور

(۱۸۰۵ء–۱۹۱۹ء)

مصر پر نپولین کے حملہ کا اثر

نپولین نے مصر کو ۱۷۹۸ء میں فتح کیا تو پہلی بار مشرق کو مغرب اور اس کی تہذیب و تمدن سے براہ راست سابقہ پڑا۔ نپولین اپنے ساتھ علماء، انجینیروں، کاریگروں اور صنعت و حرفت کے ماہرین کی ایک ٹیم لے کر آیا تھا۔ جن کی مدد سے اس نے مصر میں مکاتب اور مدارس کھولے اور کارخانے قائم کیے اور مشرق میں پہلی بار ایک پریس کھولا اور پہلی بار یہاں سے ایک اخبار نکالا۔ اس کا سب سے اہم علمی و ادبی کام "المجمع العلمی المصری" (مصری علمی اکادمی) کا قیام ہے اس اکادمی کے ۴۸ ممبر تھے جو مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے۔ یہ ماہرین اپنے علمی اور تحقیقی کارناموں کو ہر تیسرے مہینے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کرتے تھے انہوں نے پہلی بار یہاں ایک اسٹیج بھی بنایا جس پر فرانسیسی زبان کے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے یہ سب کام مصر اور مشرق کے لوگوں کے لیے بالکل نئے تھے۔ فرانسیسیوں نے اپنی تین سالہ مدت حکومت میں جو کارنامے انجام دیے بعد میں محمد علی پاشا کے زمانے میں وہی ملک و قوم کی ہر جہت ترقی کی بنیاد بنے۔

محمد علی پاشا

محمد علی پاشا نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ایک فوجی کالج قائم کیا۔ اس کے بعد بہت سے مدرسے اور اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولے۔ ذہین اور محنتی طلبہ اور حکومت کے کارندوں کو فرانس بھیج کر تربیت دلائی اور چھاپے خانے اور نشر و اشاعت کے مرکز قائم کیے۔ بولاق کے پہلے پریس میں سب سے پہلے ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ" چھپی، اس کے بعد بغدادی کی "خزانۃ الادب الکبریٰ" ابن خلدون کا مقدمہ، حریری کے مقامات، رازی کی تفسیر اصفہانی کی الاغانی اور لغت میں "القاموس" شائع ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں مصر میں سب سے پہلا اخبار "الوقائع المصریہ" کے نام سے ترکی زبان میں چھپا۔ شام میں سب

سے پہلا اخبار ۱۸۵۸ء میں "حدیقۃ الاخبار" کے نام سے نکلا۔ اور قسطنطنیہ میں پہلا عربی اخبار ۱۸۶۰ء میں "الجوائب" کے نام سے نکلا۔ محمد علی پاشا نے عربی کو مصر کی سرکاری زبان بنا دیا تھا۔ محمد علی کے پوتے اسمٰعیل پاشا نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چل کر ہر قسم کے علمی، ادبی اور فنی کاموں کی ہمت افزائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانے میں مصری علماء و فضلا اب ترجمہ کرنے کی منزل سے نکل کر خود مختلف موضوعات پر عربی زبان میں معیاری فنی کتابیں لکھنے لگے۔ علم و فن کی جو شمع یہاں روشن ہوئی اس کی شعاعیں شام اور لبنان میں بھی پہنچیں۔ یہاں بھی بہت سے مدرسے اور تعلیمی ادارے کھلے۔ پریس قائم ہوئے۔ اخبارات نکلے اور ارباب حکومت کی سرپرستی میں یہاں کے علماء نے بھی علم و ادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اور یہیں سے عربی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل ادبا، شعرا و مصنفین نے حصہ لیا اور جن کی کوششوں سے اگلی منزل کی راہ ہموار ہوئی۔

مصر میں شعرا

۱۔ السید اسمٰعیل الخشاب (م ۱۸۱۵ء) (۲) الشیخ حسن العطار (م ۱۸۳۴ء) (۳) ابراہیم بک مرزوق (م ۱۸۶۶ء) (۴) الشیخ علی ابو النصر (م ۱۸۸۰ء) (۵) عبداللہ پاشا فکری (م ۱۸۸۹ء) (۶) محمد شہاب الدین (م ۱۸۵۷ء) (۷) عبد القادر الجزائری (م ۱۸۸۸ء) (۸) الشیخ علی اللیثی (م ۱۸۹۶ء) (۹) محمود سامی البارودی (م ۱۹۰۴ء) (۱۰) اسمٰعیل صبری پاشا (م ۱۹۲۳ء)۔

ادبا اور مصنفین

۱۔ رفاعہ بک رافع (م ۱۸۷۳ء) ۲۔ الشیخ حسین المرصفی (م ۱۸۸۹ء) علی مبارک پاشا (م ۱۸۹۳ء) (۴) امین فکری پاشا (م ۱۸۹۹ء) (۵) محمود پاشا الفلکی (م ۱۹۰۳ء) (۶) الشیخ محمد عبدہ (م ۱۹۰۵ء) (۷) ابراہیم بک المویلحی (م ۱۹۰۶ء) (۸) قاسم بک امین (م ۱۹۰۸ء) (۹) جرجی زیدان (م ۱۹۱۴ء) (۱۰) احمد فتحی زغلول (م ۱۹۱۴ء) (۱۱) حمزہ فتح اللہ (م ۱۹۱۸ء) (۱۲) ملک حفنی ناصف (م ۱۹۱۸ء)۔

مقررین

(۱) جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۶ء) (۲) مصطفےٰ پاشا (م ۱۹۱۸ء)۔

اخبار نویس

(۱) سلیم تقلا اور بشارہ تقلا ایڈیٹر الاہرام (۲) الشیخ علی یوسف ایڈیٹر المؤید (۳) فارس نمر و داود یعقوب صروف ایڈیٹر المقطم (۴) جمال الدین افغانی ایڈیٹر اللواء لبنان کے شعرا میں اس زمانے میں نقولا الترک (م ۱۸۲۸ء) بطرس کرامۃ (م ۱۸۵۱ء) اور ناصف الیازجی (م ۱۸۷۱ء) اور ادبا و مصنفین میں یہ لوگ مشہور ہوئے۔

۱۔ مارون النقاش (ڈرامہ کے موجد اور فن کار) (۱۸۵۵ء) بطرس البستانی (م ۱۸۸۳ء) اور فارعہ الشدیاق (م ۱۸۸۷ء) کے علاوہ ابراہیم الیازجی (م ۱۹۰۶ء) اور المطران الدبس (م ۱۹۰۷ء) نے شہرت حاصل کی۔

شام کی ممتاز ہستیوں میں حسین جنبہ، محمد عابدین، ادیب اسحٰق، اور میخائیل شاقہ اور ابراہیم الحورانی کے نام ہیں۔ عراق میں ابو الثناء الشہاب الالوسی محمود شکری الالوسی السید حیدر الحلی، ابراہیم طباطبائی اور جعفر الحلی نے نام پیدا کیا۔

نثر

اس زمانے کے شروع تک نثر نگار القاضی الفاضل کے طریقہ پر مسجع و مقفیٰ عبارتیں لکھتے رہے تھے مگر جب اس زمانے میں پریسوں کی کثرت، اخبارات و رسائل کے اجراء اور علمی و ادبی کتابوں کے شائع ہونے کا رواج عام ہوا تو ادبا اور فن کاروں کا انداز تحریر بھی بدلنا شروع ہوا۔ اور عام طور سے ادبا نے جاحظ کا طرز تحریر اختیار کیا۔ مغربی ادب کے اثر سے بیان میں سادگی اور پرکاری آئی اور الفاظ کے مقابلہ میں معانی و مطالب پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

فن خطابت جو اس سے پہلے ماند پڑنے لگا تھا ملکی و ملی ضروریات کی وجہ سے پھر چمک اٹھا اور اس کے ممتاز فن کار پیدا ہوئے جیسے عبداللہ ندیم، جمال الدین افغانی شیخ محمد عبدہ، مصطفےٰ کامل اور بطرس البستانی۔ ان تمام خوش آئند تبدیلیوں کی وجہ سے نثر کی جملہ اقسام میں بڑی ترقی ہوئی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ نشاۃ ثانیہ کے دوسرے دور یعنی ۱۹۱۹ء کے بعد عربی نثر دنیا کی ممتاز اور ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ ہو گئی۔

شعر و شاعری

اس زمانے کے نصف اوّل تک شعر و شاعری زمانۂ انحطاط و تنزل کی ڈگر پر چلتی رہی مگر اس زمانہ میں جوں جوں علمی و ادبی ترقیاں ہوتی گئیں شعر و شاعری کا انداز بھی بدلتا گیا۔ چنانچہ مغربی ادب و تہذیب کے میل جول سے نئے خیالات اور نیا اسلوب بیان ابھرنے لگا۔ انداز نگارش اور الفاظ کے انتخاب میں ان شعرا نے جاہلی شعرا کی پیروی کی معانی و مطالب میں حکمت و فلسفہ کی آمیزش سے کلام کو خوبصورت بنانے کی ادا مولدین سے لی۔ حقیقت پسندی، رفعت خیال اور نزاکت بیانی مغربی ادب سے لیں گروہ میں جو ممتاز شعرا گزرے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ الشیخ علی ابو النصر، عبداللہ پاشا فکری، ناصف الیازجی، سامی البارودی وغیرہ۔

دوسرے علوم و فنون

دیگر علوم و فنون میں اس زمانے میں جو کام ہوا اور جن ادبا و فضلا نے نام پیدا کیا وہ ہیں: رفاعہ رافع کے ترجمے، مطران دبس کی تاریخی کتابیں۔ جرجی زیدان کی تاریخ ادب اور تہذیب و تمدن اور فلسفہ لغت۔ شہاب الدین الالوسی کے سفرنامے زبان لغت میں شیخ حمزہ فتح اللہ، حفنی ناصف بک، فارس الشدیاق، الشیخ محمد عبدہ وغیرہ نے جو کام کیے وہ کاروان علم و ادب کے لیے شمع راہ ثابت ہوئے۔

مہجری ادب

"مہجری ادب" سے مراد عربی نظم و نثر کی وہ قسم ہے جو دیار عرب سے دور پردیس میں امریکہ کے مختلف شہروں میں پروان چڑھی انیسویں صدی کے وسط میں لبنان اور شام کے بعض عرب عیسائی خاندانوں نے ہجرت کر کے امریکہ کے بعض شہروں جیسے بوسٹن وغیرہ میں سکونت اختیار کر لی اور جب جم گئے تو وہاں علمی و ادبی سرگرمیاں شروع کیں۔ ان سرگرمیوں کی ابتدا ۱۹۱۳ء سے ہوتی ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد عروج کو پہنچ گئیں۔ ان سرگرمیوں کے روح رواں جبران خلیل جبران اور ان کے ہم نوا میخائل نعیمہ اور ایلیا ابو ماضی تھے۔ یہاں شعر و شاعری کی محفلیں بھی گرم ہوتیں اور ادب و فن کی مجالس بھی۔ مغربی ادب کے اثر اور امریکی زندگی کی چھاپ کے نتیجہ میں یہاں نظم و نثر میں نئے اور اچھوتے تجربے کیے گئے۔ ان لوگوں نے یہاں ادبی انجمنیں جیسے "الرابطۃ العلمیہ"

اور "الوصبہ الاندلسیہ" قائم کیں۔ یہاں سے پہلا اخبار "کوکب امریکہ" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں نکلا۔ مہجری شعرا میں قابل ذکر جبران خلیل جبران امین الریحانی، نسیب عریضہ، ایلیا ابو ماضی، فرحات اور القروی ہیں۔ نثر میں جبران خلیل کے علاوہ میخائیل نعیمہ شکراللہ الجر، یوسف الغریب، بلبہ فارس رشید الخوری وغیرہ نے یہاں نام پیدا کیا۔

نشاۃ ثانیہ کا دوسرا دور

(۱۹۲۰ء سے لے کر آج تک)

بیسویں صدی کے شروع میں عرب دنیا ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ایک طرف ترک پوری عثمانی سلطنت کو ترکی کے رنگ میں رنگنے میں لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف عرب ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دھن میں تھے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس میں ترکی نے جرمنوں کا ساتھ دیا اور عربوں نے حلیفوں کا، اس امید میں کہ مغربی طاقتیں انہیں آزادی دلا کر ان کی خود مختار ریاستیں قائم کر دیں گی مگر جنگ کے خاتمہ پر ہوا یہ کہ مغربی طاقتوں نے عرب ریاستوں کو آپس میں بانٹ لیا اور فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ عالم عرب تڑپ اٹھا اور انقلاب و شورش کی ایک شدید لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت شدید ضرورت اس کی تھی کہ سارے عربوں کو متحد اور متفق کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا جائے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ادبا، شعرا اور اخبار نویسوں نے اپنی ساری قوتیں اور ساری فکری، ذہنی اور تخلیقی طاقتیں صرف کر دیں اسی لیے اس زمانے کے ادب کو "ادب الثورہ و التجمع" یعنی انقلابی اور اتحادی ادب کہتے ہیں۔ اس معرکہ میں جن ادبا و شعرا نے قلم کے جوہر دکھائے ان میں قابل ذکر عراق کے الرہاوی، الرصافی اور الکاظمی مصر کے بارودی، حافظ ابراہیم شوقی، محرم، نسیم اور ادیب اسحٰق، حلب کے الکواکبی، تیونس کے الشابی اور محمد بیرم الخامس، الجزائر کے عبدالحمید بن بادیس، لبنان کے بستانی۔ شام کے عبدالقادر مغربی اور ابراہیم یازجی، طرابلس کے نوفل اور مراکش کے سلاوی ہیں۔

ابھی یہ کوششیں جاری تھیں کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اس میں عربوں نے پھر اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اور آخر اتحادی اس جنگ سے کامیاب ہو کر نکلے جنگ کے خاتمہ کے بعد جب اقوام متحدہ نے آزادی اقوام کا اعلان کیا تو عربوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ۱۹۵۰ء سے جبکہ ممالک عربیہ رفتہ رفتہ آزاد و خود مختار ہونے لگے اور قلم و زبان پر عاید پابندیاں ہٹنے لگیں تو عربی ادب میں بھی ایک انقلاب آفریں دور شروع ہوا۔ اس دور میں ادب کی مُرَوّج اصناف میں عظیم الشان ترقی کے علاوہ چند ایسی اصناف داخل ہوئیں جن سے عربی ادب اب تک ناآشنا تھا۔

مصر اپنی دیرینہ روایات اور فطری توانائیوں کے سہارے حسب سابق اس زمانہ میں بھی مرکز علم و فن رہا۔ اور اس سرزمین سے ایسے فن کار اور ادیب اٹھے جنہوں نے عربی ادب کو گلہائے رنگا رنگ سے سجا کر ایک گلدستہ بنا دیا۔

قاہرہ کے بعد شام و لبنان کا نمبر آتا ہے۔ شام علمی تحقیق و تدقیق کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے اس نے اپنے اس امتیاز کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے بہت ترقی دی۔ لبنان میں بیروت کو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہاں نوجوان ادیبوں نے ہلکے پھلکے ادب کو بڑا فروغ دیا۔ مختصر افسانہ نویسی، آزاد نظم اور ادب لطیف یہاں کا خاص رنگ بن گیا۔ عراق نے مختلف خونی ڈرامے دیکھنے کے بعد اب علم و ادب کی محفل پھر سے سجانی شروع کی ہے مغرب کے ملکوں میں بھی ادبی و علمی سرگرمیاں پوری توانائیوں کے ساتھ جاری ہیں۔

نثر

خطابت: اس زمانہ میں خطابت کو بڑی ترقی ہوئی۔ ابتدا میں السید عبداللہ ندیم الشیخ محمد عبدہ، مصطفےٰ کامل نے سیاسی اور دینی خطابت میں، احمد فتحی زغلول، عبدالخالق ثروت پاشا نے قانونی اور عدالتی تقریروں میں اور سعد زغلول نے سیاسی اور عام ملکی مسائل میں خطابت کے جوہر دکھائے۔ پانچویں دہے میں ارباب حکومت اور مملکتوں کے صدور میں بھی بعض اچھے مقرر پیدا ہوئے۔ ان سب میں جمال عبدالناصر مرحوم کو امتیاز حاصل ہے۔

تصنیف و تالیف: اس زمانے میں ادبا نے تقریباً نثر کی ہر صنف میں داد تحقیق دی اور معیاری کتابیں لکھیں فنون میں سیاسیات، معاشیات، تاریخ جغرافیہ اور سائنس کے اکثر موضوعات پر ماہرین نے کتابیں شائع کی ہیں۔ نیز تاریخ ادب عربی قبل اسلام اور بعد اسلام پر بہت کام ہوا۔ جرجی زیدان نے جس کام کی ابتدا کی تھی عصر حاضر کے ادبا نے اسے کمال تک پہنچایا۔ اس فن میں محمود مصطفےٰ، احمد حسن الزیات، حنا الفاخوری، احمد الاسکندری، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ڈاکٹر شوقی ضیف، ڈاکٹر سہیر القلماوی اور بنت الشاطی نے جو کام کیے ہیں ان سے عربی ادب کے تمام گوشے روشن ہو گئے ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں اور عربی زبان کی تاریخ پر ڈاکٹر جواد علی عراقی نے تاریخ العرب قبل الاسلام کی متعدد جلدیں لکھ کر اس موضوع میں بیش بہا اضافہ کیا ہے عربوں کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر احمد امین مصطفےٰ، صادق الرافعی اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے معیاری کتابیں لکھ کر اس کو مکمل کر دیا۔

علوم دینیہ: اس زمانہ میں دینی علوم مثلاً ترجمہ و تفسیر قرآن، احادیث کی تشریح و توضیح، فقہی مسائل میں حالات و اقتضائے زمانہ کے پیش نظر دینی نقطہ نظر کی توضیح و تفسیر کی گئی۔ ان مسائل اور معاملات میں سید قطب شہید الشیخ ابو زہرہ نے بہت نمایاں کام کیے ہیں۔

افسانہ ناول اور ڈرامہ: عربی ادب میں افسانہ فن کی حیثیت سے پہلی جنگ عظیم کے بعد وجود میں آیا۔ اس صنف میں مصطفےٰ لطفی منفلوطی اور جبران خلیل جبران نے کچھ طبع زاد اور کچھ ترجمہ شدہ کہانیوں کے ذریعہ پہل کی لطفی کی مثالی کہانیاں "العبرات" اور "النظرات" ہیں اور جبران کی "الارواح المتمردہ" اور "الاجنحۃ المتکسرۃ" میں ملتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد افسانہ نگاری میں بڑی ترقی ہوئی۔ اور اس کے تین مکتب فکر وجود میں آئے

ایک رومان پسند مکتب فکر جس کے رہبر اور امام لطفی اور جبران تھے۔ دوسرا حقیقت پسند مکتب فکر جس میں آزمودہ کار منجھے ہوئے اور نامور ادبا تھے جیسے افسانہ کے باوا آدم محمود تیمور اور ان کے بعد یحیٰی حقی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ابراہیم المازنی، عباس محمود العقاد، میخائیل نعیمہ، توفیق عواد، سید تقی الدین، خواد الشائب وغیرہ۔ تیسرا مکتب فکر ان نوجوان ادیبوں کا ہے جن کی نگارشات میں زمانہ حال کے فنی میلانات اور ترقی پسند خیالات کا عکس نظر آتا ہے ان کے خاص موضوع سماجی پسماندگی اور مزدور طبقہ کے مسائل اور مشکلات کی تصویر کشی ہے۔ ان میں قابل ذکر یوسف ادریس، محمود بدوی، یوسف السباعی، اور احسان عبدالقدوس وغیرہ ہیں۔

اس عہد میں افسانہ نگاری کو ترقی دینے میں اخبارات و رسائل کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے نہ صرف مغربی افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کرا کے چھاپے بلکہ مختصر

ترین افسانے لکھنے کی ریت بھی نکالی جنہیں آپ ٹرام میں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیں یا چند سطروں میں ایک قصہ۔

ناول اس عہد کی ایک دین ناول بھی ہے اس صنف میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نجیب محفوظ، احسان عبدالقدوس اور یوسف السباعی نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ نجیب محفوظ نے اپنی چار ناولوں (زقاق المدق، السکریۃ قصر الشوق اور بدایہ بلا نہایہ) کے ذریعہ مصر کی گزشتہ سے لے کر آج تک کی تہذیبی، معاشرتی اور عام ملکی وسیاسی حالت کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ احسان عبدالقدوس اور یوسف السباعی کے ناولوں اور کہانیوں میں ادب مکشوب یا اباحی رنگ جھلکتا ہے۔

ڈرامہ اسٹیج ڈرامہ کی ابتدا سب سے پہلے بیروت میں مارون انقاش نے کی۔ انہوں نے سب سے پہلا ڈرامہ "البخیل" ۱۸۴۸ء میں اسٹیج کیا۔ ۱۸۵۵ء میں مارون کے انتقال کے بعد اسٹیج ڈرامہ مصر میں آیا۔ ۱۸۶۸ء میں قاہرہ میں "دار الاوپرا" بنا تو اسٹیج ڈرامہ کو بہت ترقی ہوئی۔ اور زمانے کے نشیب وفراز سے گزرتا ہوا کبھی رکتا کبھی آگے بڑھتا ہوا عربی ڈرامہ آج ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں فنی اعتبار سے پختگی آچکی ہے۔

اس زمانہ میں ڈرامہ نویسی میں کئی ادیب ابھرے، لیکن اس کو کمال بخشا توفیق الحکیم نے جو عربی میں ڈرامہ کے باوا آدم ہیں۔ توفیق نے نہ صرف یونانی کلاسیکی ڈراموں مثلاً "ایڈیپس دی کنگ" یا "پگمیلین" کو عربی کا جامہ پہنایا بلکہ بعض ان قصوں کو بھی جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے جیسے "اصحاب کہف" ڈرامہ کے قالب میں بکمال مہارت ڈھال دیا۔ اسی طرح بعض فرعونی کلاسیکی کہانیوں کو بھی ڈرامہ کا روپ دے کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس قسم کے ڈراموں کے علاوہ توفیق نے مختلف موضوعات پر فصیح عربی اور عامی زبان میں بیسوں ڈرامے لکھے جن میں بعض مزاحیہ بھی ہیں۔ توفیق کے ڈرامے قاہرہ کے اسٹیجوں پر اور گاؤں میں بھی اسٹیج ہوتے ہیں۔

عربی میں منظوم ڈرامہ کا ظہور بھی اسی زمانے کی دین ہے اس کی ابتدا شوقی نے کی۔ بعض کلاسیکل کہانیوں کو نظم کر کے۔

صحافت اس زمانے میں صحافت کی بڑی گرم بازاری ہوئی عرب صحافیوں نے ملکی یونیورسٹیوں میں جرنلزم کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ مغربی ممالک کی درسگاہوں سے بھی فیض اٹھایا۔ صحافت میں ایک جدت "طنزیہ ومزاحیہ" پرچوں کا اجرا ہے جس میں اولیت مصر کے مشہور پرچہ "روزالیوسف" کو حاصل ہے۔ دوسری جدت اخباری تصویر کشی اور کارٹون کا رواج ہے۔ آج اخبارات اور رسائل تقریباً تمام ممالک عربیہ سے نکل رہے ہیں۔

علم وفن کی ہمہ جہت ترقی اور یورپی زبانوں میں وضع شدہ سائنسی اور ٹکنیکل اصطلاحات کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے ادارے مجالس اور انجمنیں عرب دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہیں جنہیں ان ملکوں کی اور عرب لیگ کی سرپرستی حاصل ہے ان میں المجمع العلمی اللغوی مجلس التقریب فی الوطن العربی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے دوسرے دور میں شعر وشاعری

پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک شعر وشاعری بھی نثری ادب کی طرح "ادب انقلاب واتحاد" بن کر رہ گئی تھی، مگر محمود سامی البارودی نے جو صور پھونکا اور اس کی صدائے بازگشت لبنان کے پہاڑوں سے ابراہیم الیازجی کی آواز میں گونجی تو ارض فراعنہ نے حافظ وشوقی کی صورت میں اس آواز پر لبیک کہا جنہوں نے شعر وشاعری کی خوابیدہ دنیا میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ چنانچہ اس زمانے میں نئی نسل نے پھر سے اپنے آبا واجداد کے کلام سے کسب فیض کرنا شروع کر دیا۔ گزشتہ عہود کی فنی خصوصیات کے تانے سے نئے ماحول نئے حالات اور افکار وخیالات کے بانے کو ملا کر میدان شعر وشاعری میں زبان وبیان میں قادر الکلامی کی شان دکھائی قدما کا وقار اور گمبھیرپن ان کی اثر انگیزی اور گہرائی کے ساتھ انہوں نے عصر حاضر کی روانی ادا اور خیالات کی رفعت اور تنوع اور موضوعات ومسائل کی ہمہ گیری اور وضاحت کو جوڑ دیا ہے۔ اس طرح سے ان شعراء نے شراب کہنہ کو ساغر نو میں ڈال کر عربی شاعری کو اچھوتی اور انوکھی تخلیقات سے مالامال کر دیا۔ موجودہ دور کے شعراء میں قابل ذکر عمر ابوریشہ، الاخطل الصغیر، طٰہٰ محمود علی محمود، ایلیا ابو ماضی فرحات اور القروی وغیرہ ہیں۔

اس زمانے میں شاعری کی بعض نئی اصناف کا بھی تجربہ کیا گیا چنانچہ پہلی بار عربی میں آزاد نظم کا تجربہ غالباً لبنان میں ہوا اس کے بعد مصر میں بھی اس کے تجربے ہوئے لبنانی مکتب فکر میں ندوی طوفان ہیں، موسیٰ الصابغ اور ان کے ہمنواؤں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی مصری مکتب فکر میں اس کے علم بردار نزار قبانی اور عزیز اباظہ ہیں۔

چوں کہ آزاد نظم عربی ذوق پر گراں اور مزاج کے خلاف ہے اس لیے اس صنف کو فروغ نہ حاصل ہو سکا۔ البتہ مہجری ادب میں یورپی اور امریکی ادب کے اثر سے اس صنف میں جبران امین الریحانی اور نسیب عریضہ نے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔

ہندوستان ہندوستان میں عربی زبان کی درس وتدریس کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سے جاری ہے۔ اور یہاں کے علما نے بھی اس میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (بارہویں صدی ہجری) نے علوم وفنون کی اصطلاحات میں کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" اور علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی معروف بزبیدی (م ۱۲۰۵ھ) نے مجد الدین فیروز آبادی کی لغت "القاموس المحیط" کی عربی شرح "تاج العروس" کے نام سے دس جلدوں میں لکھی۔ مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی اور میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بلاغت وبدائع اور فن عروض میں اضافے کیے اور عربی شاعری میں ہندستانی موزونیت طبع کے جوہر دکھائے جسٹس کرامت حسین اور مولانا سلیمان اشرف بہاری نے فقہ اللسان اور البین کے ذریعہ عربی زبان کے فلسفہ لغت اور نحو پر معرکہ آرا کام کیا۔

عربی درس گاہوں میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے حلقہ سے عربی زبان وادب کے گوہر نایاب پیدا ہوئے۔ اس کے سابق ناظم مولانا عبدالحئی مرحوم نے الثقافۃ الہندیہ کے علاوہ ہندوستانی علما وفضلا کے تذکرہ میں ایک مبسوط کتاب عربی میں "نزہۃ الخواطر" کے نام سے لکھی جس کی آٹھ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ندوہ کے فارغین میں کئی ادیب محقق اور شاعر پیدا ہوئے جن میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور شاعر عبدالرحمٰن کاشغری ندوی مشہور ہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی علمی ادبی اور دینی عربی کتابوں کی وجہ سے عالم اسلام اور عرب میں جانی پہچانی شخصیت بن چکے ہیں۔ مولانا کو عربی خطابت میں حیرت ناک ملکہ ہے۔

عربی صحافت میں بھی ندوہ نے پہل کی تھی اور اس وقت بھی یہاں سے عربی

کا ایک ماہوار رسالہ "البعث الاسلامی" کے نام سے اور ایک پندرہ روزہ "الرائد" کے نام سے نکل رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے بھی عربی کا ایک رسالہ "الداعی" کے نام سے نکلتا ہے۔

عہدِ قدیم کا ادب

(مغرب و مشرقِ وسطیٰ میں)

عہدِ قدیم کے ادب کا ایک بہت بڑا حصہ یا تو تباہ ہو چکا ہے یا طریقۂ تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی فراموش ہو گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ اور فنِ کتبہ خوانی کے ماہروں کی کاوش سے جو معلومات اس بارے میں فراہم ہوئی ہیں وہ بہت تشنہ اور ناکافی ہیں۔

مغرب اور مشرقِ قریب یا مغربی ایشیا کی قدیم تہذیبیں اسیریا، بابل، مصر، یونان اور رومہ کی تہذیبوں اور فلسطین کی اسرائیلی تہذیب پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دوسری کسی ایک یا ایک سے زیادہ تہذیبوں سے ربط ضبط تھا۔ ان میں سب سے زیادہ پرانی تہذیبیں اسیریا اور بابل کی تھیں جن کے متعلق بہت سی ٹوٹی پھوٹی مٹی کی سختیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ قدیم مصر کے سڑے گلے پے پی رس (Papyrus) پارچے ملے ہیں جو ہماری دنیا کے لیے کچھ زیادہ بامعنی نہیں ہیں۔ بابل نے البتہ دنیا کا پہلا ضابطۂ قوانین چھوڑا اور اولین اساطیری نمونے (Arcbelypalmyth) پر مبنی دو ایسی نظمیں تخلیق کیں جن کی گونج دور دراز علاقوں میں بھی سنائی دی۔ مصر کے باطنی اور مابعد الطبیعی تصورات اور ایک عالمِ ماورا کے عرفان نے یونان و رومہ کے ذہن کو متاثر کیا۔ مغربی دنیا کی ذہنی اور تہذیبی روایت یونان و رومہ کے افکار اور عبرانی تہذیب کی گہری روحانیت سے مستعار ہے۔ عبرانی اثرات کے ماخذ توریت (Old Testament) اور انجیل ہیں جو مغرب میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں رہی ہیں۔ مغربی انسان کا تخیل اس کے اخلاقی اقدار اور ادبی اصناف یونان و رومہ کے رہینِ منت ہیں۔ یونانی اور لاطینی مصنفوں نے جو اخلاقی اور بشری نصب العین (Human Ideal) پیدا کیا وہ عہدِ قدیم کے ختم ہوتے ہوتے یہود و نصرانی روحانی نصب العین میں جذب ہو کر دورِ وسطیٰ کے ادب کا پیش رَو ثابت ہوا۔

اسیریا اور بابل کا ادب

قدیم اسیریا اور بابل کی زبان اکےڈین (Akkadian) وہ پہلی سامی زبان ہے جس کے کچھ آثار ہم تک پہنچے ہیں اور اس لحاظ سے تقابلی لسانیات میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا نظامِ تحریر سُمیری (Sumerian) سے ماخوذ ہے۔ جو دنیا کی قدیم ترین تحریری زبان مانی جاتی ہے۔ دجلہ و فرات کے کناروں پر جو اسیریائی و بابلی تہذیب پائی جاتی تھی اس میں بحیثیت بول چال کی زبان کے اکےڈین نے سمیری کی جگہ لے لی تھی۔ یہ قبلِ مسیح کے اَلفِ ثالث کی بات ہے۔ ویسے تحریری زبان کی شکل میں سمیری پہلی صدی عیسوی تک اکےڈین کے شانہ بہ شانہ باقی رہی۔

اس تہذیب کے بہت سے آثار ادبی سے زیادہ لسانی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ عام لفظوں اور خداؤں کے ناموں کی فہرستیں ملتی ہیں جو الفاظ اور تصوّرات کے باضابطہ مجموعوں کی شکل رکھتی ہیں اور جن کا مقصد انسائیکلو پیڈیائی معلوم ہوتا ہے۔ بعض ایسی فہرستیں ہیں جن میں سمیری تلفظ کے ساتھ الفاظ اور ان کے اکےڈین مترادفات دو مختلف کالموں میں دیے گئے ہیں۔ یہ لغات کا کام دیتی ہوں گی۔ ان کے علاوہ بہت سے کتبے ملے ہیں جن کی اہمیت تاریخی ہے۔

اسیریائی اور بابلی تحریریں مٹی کی تختیوں پر ملی ہیں جن میں سے بعض ۲۵۰۰ ق م کی ہیں۔ ان تختیوں پر اساطیری عبارتیں ابتدائی حکمرانوں کے کارناموں کے بارے میں رزمیے، دعائیں اور کہاوتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ادبی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم اینوما ایلیش (Enuma elish) یعنی تخلیق کا رزمیہ اور گل گامیش کا رزمیہ (Epic Of Gilgamesh) نامی دو نظمیں ہیں۔ پہلی نظم میں شہر بابل کے خدا مارڈوک (Marduk) کی کہانی ہے جس نے تیامت (Tiamat) نامی ایک مہیب عجیب الخلقت مونث مخلوق کو تہ تیغ کر کے اس کے جسم سے دنیا کو جنم دیا اور اس کے کارنامے کے صلے میں دوسرے خداؤں نے اسے کائناتی بالادستی عطا کر دی۔ دوسری نظم جو اکےڈین زبان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ ہے ایک سمیری ہیرو گل گامیش اور اس کے ساتھی اِنکی ڈو (Enkidu) کی داستان ہے۔ اس کا پورا متن نینوا میں شاہ اسیریا آشور بنی پال (Asburbanipal) (۶۶۸ - ۶۲۷ ق م) کے کتب خانے سے دستیاب ہونے والی تختیوں پر موجود ہے۔ یہ نظم بابل کی تخلیق ہے اور اس میں بہت سی سمیری کہانیوں کو یکجا کر کے ایک نیا خیال داخل کیا گیا ہے یعنی گل گامیش کی اپنے ساتھی اِنکی ڈوک کی موت کے بعد لافانیت کی تلاش۔ ایک اور دلچسپ چیز اس میں طوفانِ نوح کی ایک بابلی روایت ہے جس کا قصہ اس سیلاب سے بچنے والا ایک شخص اتنا پشتن (Utnapishtin) گل گامیش کو سناتا ہے۔ یہ داستان ایشیائے کوچک میں اکےڈین کے علاوہ اور زبانوں میں بھی موجود تھی اور امکان ہے کہ یونانی اوڈیسی (Odyssey) پر اس کا اثر پڑا ہو۔

قدیم مصری ادب

جو مصری ادب ہم تک پہنچا ہے وہ زیادہ تر پے پی رس (Papyrus) پر لکھی پیرواتی (Pieratic) تحریروں پر یا پھر مکتبوں میں استعمال

ہونے والی تختیوں، ٹھیکروں اور چونے کے پتھر کے ٹکڑوں پر نوشتہ درسی نسخوں پر مشتمل ہے۔ کوئی ستر (۷۰) تصنیفوں کا پتہ چلا ہے لیکن یہ زیادہ تر ادھوری ہیں اور مصر کے ادبی کارنامے کا ایک بہت نامکمل نمونہ۔ نوع کے اعتبار سے یہ تحریریں تاریخ اساطیری پر مبنی مقبولِ عام داستانوں یا مثنویوں سیکولر (Secular) یا غیر مذہبی نظموں، خط نویسی کے نمونوں اور اخلاقی اصولوں یا پند و مواعظ کے مجموعوں پر مشتمل ہیں۔

مقبولِ عام کہانیوں میں یہ قابلِ ذکر ہیں "شاخوغو اور جادوگر" "تباہ شدہ جہاز کا ملاح" (جس میں ایک ویران جزیرے پر افتادہ ملاح کی کہانی ہے جسے ایک عفریت نما سانپ پناہ دیتا ہے) "دو بھائیوں کی کہانی" یہ آخری کہانی پاتال کے دیو مالائی دیوتا آسی رِس (Osiris) کے قصّے پر مبنی اور خیر و شر کی کش مکش کے موضوع سے متعلق ہے۔ دوسری عام کہانیاں ایسی ہیں جو فوق الفطرت عناصر سے عاری ہیں مثلاً "چرب زبان دہقان کی کہانی" جس میں ایک کسان اپنی فصیح البیانی کے زور پر انصاف پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

ناصحانہ اور پند آموز ادب بعض عقل مندوں کے اقوال کی شکل میں ہے۔ جس میں کوئی مردِ سال خوردہ اپنے بیٹے کو یا کوئی بادشاہ اپنے جانشین کو نصیحتیں کرتا ہے۔ یہ عبرانی خردمندانہ ادب (Wisdom Literature) سے مماثل ہے۔

ان کے مماثل لیکن قنوطی رنگ لیے ہوئے وہ نغمے ہیں جنھیں "بربط نوازن کے گیت" (Song Of the Harpers) کا نام دیا گیا ہے اور جو مقبروں کی دیواروں پر کندہ ملتے ہیں۔ معبدوں کی دیواروں پر بھی کچھ طویل عباداتی تحریریں ملی ہیں۔ ایتھنز میں "مُردوں کی کتاب" (Book of the Dead) شامل ہے جو جادوئی اور اساطیری قصوں کا مجموعہ ہے اور دیوتاؤں کے ذکر سے پُر ہے۔ یونانی اور لاطینی مصنف مصر کی قدامت اور رنگا رنگی سے بہت متاثر تھے اور ان کی تحریروں میں بہت سی مصری حکایتوں کا سراغ ملتا ہے۔

قدیم عبرانی ادب

عبرانی ادب کی روایت بارھویں صدی ق م سے قایم ہے۔ ۱۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ء تک عبرانی فلسطین میں بول چال کی زبان رہی پہلے توراتی عبرانی (Biblical Hebrew) کی صورت میں اور پھر مشنائی عبرانی (Mishnaic Hebrew) کی شکل میں۔ (یہودی فقہی اصولوں اور موسوی قوانین (Mosaic Law) کے مجموعے کو مِشنا کہا جاتا تھا) مِشنائی عبرانی ایک بعد کی بولی ہے جس کا توراتی عبرانی سے راست تعلق نہیں۔ دوسری صدی ق م میں جب فریسیوں (Phariseas) نے اس بولی کو اپنی تعلیم و تعلّم کا ذریعہ بنایا تو اسے ادبی درجہ حاصل ہوگیا۔ عبرانی زبان نے ہمیشہ بدلتے ہوئے ادبی ذوق کے تقاضوں کا ساتھ دیا۔ چناں چہ مختلف زمانوں میں وہ کبھی باریک مذہبی فکر، کبھی صحتِ علمی (Scientific Precision) اور کبھی تصوّف کی سرمستی کا گہوارہ بنی رہی۔ توراۃ کے وسیع حلقۂ اثر کے سبب عبرانی نے براہِ راست یا ترجموں کی وساطت سے مغربی ادب پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

(۱۲۰۰ — ۵۸۷ ق م) کا دور

توراۃ کے تقریباً بیس پارے اس دور کے ہیں۔ امکانِ غالب یہ ہے کہ نظم کو نثر پر سبقت حاصل تھی۔ توراتی نظم کی بنیاد ایک طرح کی معنوی قافیہ بندی تھی یعنی ایک مصرعے کے دو حصے ہوتے جن میں یا تو ایک ہی مطلب کو دو طرح سے ادا کیا جاتا یا دوسرے حصّے میں پہلے کے بعض پہلوؤں پر زور دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بہت سے لوک گیت (مثلاً سلیمان کا گیت (Song of Solomon) نوحے (Dirges) رزمیہ نغمے (Epic Chants) اور حمد اس دور کی پیداوار ہیں۔

ابتدائی نثر بہت کچھ نظم کا رنگ رکھتی تھی۔ ابتدائی نثر کے نمونے وہ ضوابط ہیں جو توراۃ کے پہلے پانچ پاروں (Briks) میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

(۵۳۸ — ۷۰ ق م) کا دور

اس دور میں کثیر ادب پیدا ہوا جس کا صرف ایک حصّہ موسوی شریعت (Biblical Commandments) سے متعلق کہا جاسکتا ہے توراتی عبرانی، اب بول چال کی زبان نہیں رہی تھی اور اس دور کے شروع میں اس کی جگہ آرامی (Aramaic) نے لے لی جو ایک متعلقہ سامی زبان تھی۔ اس کے علاوہ مشنائی عبرانی Mishnaic Hebrew بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔ ایک نئی صنف جس کا آغاز اس عہد میں ہوا وہ تھی مدراش (Midrash) یعنی تلاش (Searching) جو توراۃ کی ایک طرح سے تفسیر تھی۔

تالمدی ادب

یہودیوں کے مدنی اور مذہبی ضوابط کے مجموعوں کو تالمدی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کی دو قسمیں تھیں۔ وہ مجموعے جن کی ترتیب میں توراۃ کے پاروں کی پیروی کی جاتی ہے۔ مِدراش (Midrash) کہلاتے تھے۔ ان کے برخلاف مِشنا (Mishna) میں ترتیب بلحاظِ موضوع ہوتی تھی۔ مِشنا یعنی یہودی شریعت (مذہبی قوانین و رسوم) کی ترتیب کا زمانہ ۱۰۰ ق م — ۲۰۰ء تک کا ہے۔ ۲۰۰ء سے ۵۰۰ء کے دور میں دو نئے ادبی واقعات رونما ہوئے۔ ایک یہ کہ بابل (جنوبی عراق) میں جہاں یہودیوں کی معاشی اور ذہنی زندگی فلسطین کے مقابلے میں جو رومی و بازنطینی دائرۂ تسلط میں تھا زیادہ آزاد تھی۔ ایک نئے ادبی مرکز کا آغاز ہوا۔ دوسرے یہ کہ عبرانی کے ساتھ ساتھ آرامی بھی ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال ہونے لگی۔ اس عہد میں بابل اور فلسطین میں جو تالمدی (یہودی شریعت کے مجموعے) لکھے گئے ان میں اخلاقی اور شرعی مسائل کو سمجھانے کے لیے حکایتوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان حکایتوں کے سائے آئندہ زمانے میں مغرب کے دورِ وسطیٰ اور

دورِ جدید کی داستانوں اور ناولوں پر پڑتے نظر آتے ہیں۔

فارسی زبان وادب

ایران ایک قدیم ملک ہے۔ جو ملک تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہو وہاں زبان وادب کا فروغ پانا ایک بدیہی اَمر ہے۔ قدیم ایران کا اپنا رسمِ خط اور ادب تھا۔ اس کا بیشتر حصہ مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہوگیا۔ لیکن یونانی، یہودی، اسلامی اور خود بعض قدیم ایرانی مآخذ اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ایرانیوں نے حضرت عیسیٰ سے قبل ماد بادشاہوں کے دورِ اقتدار (۷۰۸ - ۵۵۰ قبل مسیح) میں بابل کا میخی خط (مٹی کی تختیوں پر لوہے یا لکڑی کی کیلوں سے لکھنے کا طریقہ) اپنایا۔ یہ خط ابھی اپنی ابتدائی منزل میں تھا؛ ایرانیوں نے اپنی ذکاوت وذہانت سے اس کے لیے حروفِ ہجا ترتیب دیے۔ ایرانی میخی خط دوسرے تمام میخی خطوط، مثلاً بابلی میخی خط' سے زیادہ سادہ اور متوازن ہے۔ ایرانی علما نے نہ صرف بابل کے میخی خط کو ابجدی حروف میں تبدیل کیا بلکہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اس میں سادگی پیدا کی اور صرف عمودی اور افقی میخوں کو اختیار کیا۔ ہخامنشی دور (۵۵۰ - ۳۳۰ قبل مسیح) کے کتبے اسی خطِ میخی میں ملتے ہیں جس کے حروف ابجد کی تعداد چھتیس ہے۔ اس زبان کو جو خطِ میخی میں لکھی جاتی تھی پارسی باستان یا قدیم فارسی کا نام دیا جاتا ہے۔

تقریباً اسی زمانہ میں جب کہ میخی خط کا دُور دورہ تھا ایران میں ایک دوسرا خط اور زبان بھی رائج تھی جس کو اَوِستائی کہا جاتا ہے۔ یہ رسم خط صرف زرتشتی مذہب کی کتابوں کے لیے مخصوص تھا۔ لسانی اعتبار سے اُوستائی زبان پارسی باستان سے ملتی جلتی تھی جس وقت خطِ میخی پتھروں اور دوسری سخت سطحوں پر عبارات کندہ کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا تھا، غالباً اسی عہد میں نرم سطحوں پر لکھنے کے لیے اُوِستائی خط کا رواج تھا۔ زرتشتی مذہب کی دینی کتاب "اُوستا" اسی خط اور زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کے آثار اب ناپید ہیں، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اوستائی خط آرامی پہلوی رسمِ خط سے ایک حد تک مشابہ تھا اور اس میں ۴۴ حروف تھے۔

پہلوی سے وہ رسم خط اور زبان مراد ہے جو اشکانی دور (۲۴۸-۲۲۴ قبل مسیح) اور خاص طور پر ساسانی دور (۲۲۴ ق م ۶۵۱ء) میں ایران میں مستعمل تھے۔ پہلوی لفظ کی اصل "پَرتَو" ہے۔ اس لفظ میں پہلے (ر) بدل کر (ل) ہوگیا۔ اس طرح یہ لفظ "پلثو" بنا۔ اس کے بعد (ث) تبدیل ہوکر (ھ) ہوگئی اور "پلثو" سے "پلھو" بن گیا۔ یہ تبدیلی اسی جگہ ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ عرصے بعد لفظ "پلھو"، "پہلو" میں بدل گیا۔ جب اس میں یائے نسبتی کا اضافہ کیا گیا تو "پہلوی" بنا۔

پہلوی خط کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک قدیم خط یا خطِ کلدہ کہلاتا ہے جو کتبوں کے سوا کہیں اور پایا نہیں۔ دوسرے خط کو کتابی ساسانی یا پہلوی خط کہتے ہیں۔ ساسانی دور کی باقی ماندہ تحریریں اور کتابیں اسی خط میں لکھی گئی ہیں۔

قدیم ایران کی ان تمام زبانوں کا واسطہ زبانوں کے ہند یورپی گروہ سے ہے۔ اس طرح قدرتی طور پر ایران کی زبانوں کا متمدن دنیا کی مشہور زبانوں جیسے سنسکرت، یونانی، لاطینی، اسکینڈینیائی وغیرہ سے گہرا تعلق ہے۔ اس امر کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ ہخامنشی دور کی زبان (پارسی باستان یہ قدیم پارسی) میں بادشاہوں کے کتبے ملتے ہیں۔ اُوستائی زبان میں زرتشتی مذہب کی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ گویا یہ زبان مذہبی پیشواؤں کی تحریروں تک محدود تھی۔ اس کے برخلاف پہلوی زبان میں نہ صرف زرتشتی مذہب کی کتابیں مثلاً زند اوستا، دینکرد، بندھشن وغیرہ لکھی گئیں بلکہ معدودے چند ایسی کتابیں بھی ملی ہیں جنہیں اخلاقیات اور داستانوں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے، مثلاً اندرزنامہ جم یا جمشید و یادگار زریر و کارنامہ اردشیر بابکان۔ قدیم ایرانی اور عربی منابع میں بعض ایسی پہلوی کتابوں کا ذکر موجود ہے جن کا اب سراغ نہیں ملتا ان میں سے بعض علمی اور فلسفیانہ تخلیقات خسرو نوشیرواں کے دورِ حکومت (۵۳۱ - ۵۷۸ء) میں موجود تھیں اور یونانی یا سنسکرت زبان سے پہلوی میں منتقل کی گئی تھیں۔ بہر حال پہلوی زبان کے ادب کا بیشتر حصہ ایران پر عربوں کے تسلط، پہلوی رسم خط کے متروک ہوجانے اور ایران میں عظیم الشان دینی تخلیقات کے زیر اثر نظر انداز کردیا گیا اور رفتہ رفتہ ناپید ہوگیا۔

دستیاب پہلوی کتابوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زبان میں منظوم کلام موجود تھا۔ اس کے ثبوت میں "درخت آسوریک" نام کی نظم پیش کی جاسکتی ہے جو ایک درخت اور بکری کے درمیان منظوم مناظرہ ہے۔ علاوہ ازیں حاجی آباد میں ساسانی دور کے ایسے کتبے موجود ہیں جن میں موزوں کلام کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اس دعوے کی دوسری دلیل ساسانی بادشاہوں کے دربار سے باربد اور دیگر موسیقی دانوں کی وابستگی ہے۔ یہ موسیقار چنگ اور بربط کی مدھر دھنوں پر منظوم کلام گایا کرتے تھے۔ پہلوی زبان کا یہ منظوم کلام عروضی اوزان کے مطابق نہیں تھا بلکہ ہجائی وزن پر مبنی تھا۔ اسی طرح پہلوی زبان کے جو تھوڑے بہت آثار ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی نظم ونثر دونوں نہایت سادہ اور رواں تھے۔ سیدھے سادے جملوں میں مطالب ادا کیے جاتے تھے۔

ایران میں اسلام کی آمد سے پہلے کی ادبی تاریخ کا خلاصہ اس طرح چند جملوں میں کیا جاسکتا ہے کہ قدیم دور میں ایرانی ادب کا دامن بہت وسیع نہیں تھا۔ ادب صرف درباریوں اور مذہبی رہنماؤں تک محدود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ساسانی دورِ حکومت سے شاندار روایات منسوب کی جاتی ہیں۔ اس دور کے آخری ایام میں درباریوں اور مذہبی طبقوں میں اخلاقی تنزل سرایت کرگیا اور اس بنا پر دربار فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن گیا۔ نئے نئے مذہبی فرقے تشکیل پاگئے۔ عام زندگی بھی زوال کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران میں اسلام کی آمد کے وقت ایرانی ادب کی حیثیت قابلِ ذکر نہیں تھی۔ بلکہ روبزوال معاشرے نے خود ادبی روایات کو بھی متاثر کیا تھا اور ادب میں انحطاط کے آثار نمایاں تھے۔

عربوں نے جو اسلام کا پرچم لے کر اٹھے تھے نہاوند کے مقام پر ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کو آخری شکست دی اور اس طرح ۲۱ھ/ ۶۴۲ء میں ساسانی حکومت ختم ہوگئی۔ انہوں نے ایران پر اپنی اس فتح کو فتح الفتوح کا نام دیا۔ اس فتح کے بعد عرب خلفاء تقریباً دوسو (۲۰۰) برس تک ایران پر حکومت کرتے رہے۔ ایران پر عربوں کا یہ تسلط ہر لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

ایرانی سماج، زبان وادب غرض زندگی کے ہر شعبے نے اسلام کے زیر اثر ایک نئی شکل وصورت اپنائی۔ یہ تبدیلی کیفیت وکمیت ہر لحاظ سے قابل توجہ اور دیرپا ثابت ہوئی۔ جس فارسی ادب کی ایک اجمالی تاریخ اس وقت پیش خدمت ہے، اس کا آغاز ایران میں اسلام کے ظہور کے بعد سے ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

عربوں کے حملے کے وقت ایران کی عام زبان پہلوی تھی۔ عربوں کے دو سو سالہ تسلط کے دوران خود پہلوی زبان میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خود ساسانی دور میں ایران کے مختلف حصوں میں مختلف مقامی بولیوں کا چلن تھا جو کسی نہ کسی شکل میں اسلام کے بعد بھی باقی رہا۔ ان بولیوں میں خوزلی، دیلمی طبری، کوچی، کردی اور آذری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ایران کے شمال مشرق میں سمرقند (سغد) کے علاقہ میں سغدی زبان مستعمل تھی اور ختن و کاشغر کے علاقے میں ختنی زبان، ان دونوں زبانوں میں بعض نوشتے دستیاب ہوتے ہیں۔

اسلامی دور کے ایران میں ایک نئی بولی نے جنم لیا۔ یہ تیسری صدی ہجری کے وسط (نویں صدی عیسوی کے نصف دوم) کی بات ہے اس بولی یا لہجے کو دری، پارسی دری یا صرف پارسی یا فارسی کا نام دیا گیا ہے۔ اس بولی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صرف پہلوی زبان سے نکلی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک عام ادبی لہجہ تھا جو ساسانی عہد کے اواخر اور اسلامی دور کے اوائل میں ایران میں رائج ہوا۔ ایران کی دوسری بولیوں کے زیر اثر رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھتا گیا اور اس نے ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کرلی۔ اس لہجے (بولی) کی ترقی اور تکامل کا یہ ایک واضح ثبوت ہے اور سبب بھی کہ ایرانیوں نے اپنے افکار وخیالات کو صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرنے کے لیے اسی کا انتخاب کیا۔ یہی وہ بولی تھی جو اب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں سیستان، خراسان، ماوراء النہر، گرگان، رے اور دوسرے مراکز میں شعرا وادبا نے اسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ یہی وہ زبان تھی جس پر عہد اسلامی میں سب سے پہلی بار درباروں اور مشرقی ایران کے گرد ونواح میں شاعروں اور نثر نگاروں کی نظر انتخاب پڑی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی دری کا سب سے پہلا ادبی ظہور مشرقی ایران میں ہوا۔ اس وجہ سے مشرقی ایران میں متداول دیگر بولیوں کے صرفی ونحوی اثرات اس پر واضح طور سے نظر آتے ہیں۔

اس زبان کو دری کا نام کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب مقدسی کی کتاب "احسن التقاسیم" میں یہ دیا گیا ہے کہ: اسے دری اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ زبان ہے کہ جس میں بادشاہ کی طرف سے خط وکتابت کی جاتی تھی اور جس میں شاہ کو عریضے لکھے جاتے تھے۔ "دری" در سے مشتق ہے جسے عربی میں باب (دروازہ، درگاہ) کہتے ہیں یعنی یہ وہ زبان ہے جس میں شاہی دربار میں گفتگو کی جاتی تھی۔

مختصر یہ کہ اسلامی دور کے ایران میں اسی دری، فارسی دری اور فارسی کا ادبی اور علمی حلقوں میں بول بالا ہوا۔ اسلامی دور کے اوائل سے آج تک یہی زبان ایران کی متداول علمی اور ادبی زبان ہے۔ یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ گزشتہ گیارہ بارہ صدیوں کے طول طویل سفر کے باوجود فارسی زبان میں کوئی ایسا واضح فرق نہیں آیا جو عام طور پر کسی زبان میں طویل سفر کرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ فارسی ادب کے ابتدائی نمونے آج بھی اسی قدر سہولت سے پڑھے اور سمجھے جاتے ہیں جیسے خود آج کے ادبی شاہکار۔ مثلاً چاسر کو تقریباً چھ سو سال ہوئے لیکن اس کی انگریزی کو سمجھنے میں تکلف ہوتا ہے اور کاوش درکار ہوتی ہے، درآں حالاں کہ ایک ہزار سال قدیم فارسی کو ہم روانی اور بے تکلفی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ لسانیات کے مورخ کے لیے یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔

فارسی کا پہلا شاعر کون ہے؟ تاریخ اور تذکروں کی قدیم کتابیں اس سوال کا قطعی جواب دینے سے قاصر ہیں۔ "تاریخ سیستان" کی روایت کے مطابق یعقوب بن لیث صفاری کا دبیر (سکریٹری) محمد بن وصیف فارسی کا پہلا شاعر ہے جو تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر تک زندہ تھا۔ محمد بن وصیف کے علاوہ اس کے معاصرین بسام کورد (کرد) اور محمد بن مخلد سگزی کا شمار بھی فارسی کے اولین شعرا میں کیا جاتا ہے۔ البتہ تذکرہ نویسوں نے ایسے دو اور شعرا کا نام اور ان کے چند اشعار نقل کیے ہیں جنہیں ایران پر عربوں کے تسلط کے دور کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ یہ دو شاعر ابوحفص سغدی اور عباس مروزی ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا شمار فارسی کے اولین شعرا میں کیا ہے۔ اس بات کی البتہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ وہ دوسری صدی کے شاعر ہیں یا تیسری کے۔ ذیل میں فارسی ادب کے مختلف ادوار کی مختصر تاریخ پیش کی جاتی ہے۔

طاہری دور

(۲۰۵ھ – ۲۵۹ھ/ ۸۲۰ء – ۸۷۲ء)

ذکر آچکا ہے کہ فتح نہاوند کے بعد ایران پر تقریباً دو سو برس تک عربوں کا تسلط رہا۔ عباسی خلیفہ مامون کے حکم سے طاہر ذوالیمینین نے مامون کے بھائی امین کے خلاف نبرد آزمائی کی اور اسے شکست دے دی۔ اس خدمت کے بدلے میں طاہر کو خراسان کی امارت عطا ہوئی۔ اس کے ساتھ ایرانیوں میں قومی عصبیت کے اظہار کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ عربوں کے خلاف ایرانیوں کی بیشتر قومی تحریکوں کا مرکز یہی خراسان کا علاقہ قرار پایا۔ یہی علاقہ آنے والی کئی صدیوں تک فارسی زبان وادب کی ترویج وتوسیع کا مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حنظلہ بادغیسی (متوفی: ۲۲۰ھ/ ۸۳۵ء) اور محمود وراق ہروی (متوفی: ۲۲۱ھ/ ۸۳۶ء) اس دور کے شاعر ہیں لیکن دونوں کی طرف منسوب اشعار اور ان کی وفات کی تاریخیں مشتبہ ہیں۔

صفاری دور

(۲۴۸ھ – ۲۸۷ھ/ ۸۶۲ء – ۹۰۰ء)

یعقوب بن لیث صفار وہ پہلا ایرانی شخص ہے جس نے مکمل طور

پرآزاد اور مستقل حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بھائی عمرو بن لیث اور اس کے لڑکے طاہر نے سیستان، کرمان، ہرات، بلخ، خراسان اور فارس کے علاقوں پر حکومت کی۔

طاہری حکمرانوں کے مقابلے میں صفاری سربراہ فارسی زبان وادب سے زیادہ تعلق خاطر رکھتے تھے یعقوب عربی سے تقریباً نابلد تھا۔ اس کی مدح میں جو قصائد عربی میں لکھے اور پڑھے گئے وہ انہیں سمجھ نہیں سکا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس دور کے شعرا وادبا نے فارسی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ یعقوب کے دبیر محمد بن وصیف سگزی کو تاریخ سیستان کا مؤلف فارسی کا اولین شاعر مانتا ہے۔ اس دور کے معروف شعرا میں فیروز مشرقی (متوفی: ۲۸۳ھ/ ۸۹۶ء) اور ابو سلیک گرگانی شامل ہیں۔ یہ دونوں عمرو بن لیث (۲۶۵ - ۲۸۷ھ) کے معاصر بتلائے جاتے ہیں۔

سامانی دور

(۲۸۷ھ - ۳۸۹ھ/ ۹۰۰ء - ۹۹۸ء)

سامانی بادشاہوں کا دور حکومت فارسی ادب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ ان کا پایہ تخت بخارا تھا مگر ماوراء النہر، سیستان اور خراسان سے لے کر ایران کے مشرقی صحرائی علاقے اور رَے تک اس خاندان کی حکومت تھی۔ ان بادشاہوں نے ایران کی تہذیبی روایات کا احیا کیا اور ایرانی رسم ورواج کو فروغ دیا۔ انہوں نے عربی زبان وادب کے مقابلے میں ایرانی زبان وادب کی ترقی اور ترویج کی زیادہ کوشش کی شعرا، ادبا اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے والوں کی سرپرستی کی۔ اپنی انہی کوششوں کی وجہ سے سامانی بادشاہ اور ان کے دانش پرور وزرا فارسی ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوئے۔ سامانی دور کو بہر حال یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے فارسی زبان وادب کی ترقی اور ترویج کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے مشہور شعرا میں مسعود مروزی، رودکی، شہید بلخی (م ۳۲۵ھ/ ۹۳۶ء) ابو طیب مصعبی، ابو العباس ربنجی، شاکر بخاری، ابو المؤید بلخی، ابو شکور بلخی اور دقیقی ہیں۔

ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی (متوفی: ۳۲۹ھ/ ۹۴۰ء) ایران میں اسلام کی آمد کے اوائل کا سب سے عظیم صاحب دیوان شاعر ہے۔ آنکھوں کی روشنی سے محروم اس شاعر کے بارے میں سامانی دور کے علم پرور اور معارف دوست وزیر ابو الفضل بلعمی کا قول ہے کہ عرب وعجم میں رودکی کا جواب نہیں، رودکی نے قصائد، رباعیات، قطعے، غزلیات وغیرہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ شاعری کے علاوہ اسے موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس سے منسوب یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس نے ایک مرتبہ اپنا ایک قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے۔

بوی جوی مولیاں آید ہمی   یاد یار مہرباں آید ہمی

چنگ پر اس قدر پر اثر انداز میں نصر بن احمد سامانی (متوفی: ۳۳۱ھ/ ۹۴۲ء) کے حضور میں گا کر سنایا کہ بادشاہ فوراً اپنے پایہ تخت بخارا کے لیے روانہ ہو گیا جسے وہ اپنے عزائم کشور ستانی میں بھولے ہوئے تھا۔ اور اس طرح ایک مدت سے گھر لوٹنے کے لیے بے تاب افواج اور امرا کی مُراد بر آئی۔ رودکی کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس نے چند مثنویاں بھی کہی ہیں۔ جن میں کلیلہ ودمنہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ رودکی نے اپنی طویل عمر میں قصائد پر نسبتاً زیادہ توجہ دی۔ مدح سرائی میں وہ تکلف وتصنع کا قائل نہیں۔ سادگی الفاظ ومعنی، متانت وسنجیدگی ایسے اوصاف ہیں جن کی وجہ سے رودکی آج بھی فارسی شاعری کا مسلّم الثبوت استاد سمجھا جاتا ہے رودکی کی غزل میں ایسی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر عنصری اس کی غزل پر رشک کا اظہار کرتا ہے۔

ابو منصور محمد بن احمد دقیقی (متوفی: ۳۶۸ھ/ ۹۷۸ء) اس دور کا دوسرا عظیم شاعر ہے۔ اس کے قصائد اور قطعات میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ دقیقی کی اصل شہرت کا سبب اس کا شاہنامہ ہے جو اس نے فردوسی سے قبل امیر نوح بن منصور سامانی (متوفی: ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء) کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ وہ ابھی اس شاہنامہ کا ایک حصہ بھی مکمل نہیں کر سکا تھا کہ بدقسمتی سے اپنے ہی ایک غلام کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا اس کی وفات کے بعد اس کے شاہنامے کے ایک ہزار اشعار فردوسی نے اپنے شاہنامے میں شامل کر لیے۔ یہ اشعار گشتاسپ کی سلطنت زردشت کی بعثت اور گشتاسپ وارجاسپ کی جنگ سے متعلق ہیں۔

سامانی دور میں جہاں بڑی تعداد میں شعرا نے فارسی شاعری کے بنیادوں کو مستحکم کیا اور اسے ترقی دی، وہاں اس دور میں نثر کی بعض اہم کتابیں بھی تالیف کی گئیں۔ اس دور کے تمام نثری آثار آج دستیاب نہیں ہیں لیکن نثر کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں ان میں شاہنامہ کا ایک مقدمہ ہے۔ یہ شاہنامہ طوس کے حاکم ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی (متوفی: ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) کے حکم سے لکھا گیا تھا لیکن اس عہد میں لکھے گئے دو اور منثور شاہناموں کی طرح یہ شاہنامہ بھی اب دستیاب نہیں صرف اس کا مقدمہ باقی ہے جو "مقدمۂ قدیم شاہنامہ" کے نام سے معروف ہے۔ تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے ابو علی محمد بلعمی (م ۳۶۳ھ/ ۹۷۱ء) عبدالملک بن نوح (۳۴۳ - ۳۵۰ھ/ ۹۵۴ - ۹۶۱ء) اور ابو صالح منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۶ھ/ ۹۶۱ - ۹۷۶ء) کا وزیر تھا۔ اس نے امیر منصور کے حکم سے محمد بن جریر کی تاریخ طبری کو اضافوں کے ساتھ عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔ ماوراء النہر کے چند عالموں نے منصور بن نوح ہی کے حکم سے تفسیر طبری کو اسی دور میں فارسی نثر کا جامہ پہنایا۔ علاوہ ازیں رسالہ در احکام فقہ حنفی تالیف حکیم ابو القاسم محمد بن سمرقندی (م ۳۴۳ھ)، عجائب البلدان، حدود العالم اور قرآن کی چند تفسیریں (کیمبرج یونیورسٹی) بھی سامانی دور کے منثور آثار ہیں۔ فارسی نثر کے ان نمونوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کی نثر سادہ اور رواں تھی۔ زبان وبیان میں تکلف اور تصنع نہیں تھا۔

غزنوی دور

(۳۶۶ھ - ۴۳۱ھ/ ۹۷۶ء - ۱۰۳۹ء)

غزنوی دور فارسی ادب کے لیے زبردست ترقی، توسیع اور ترویج کا زمانہ تھا۔ غزنوی بادشاہوں نے فارسی زبان و ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ شعرا و ادبا کی ہمت افزائی کی۔ غزنوی خاندان کے سب سے معروف اور عظیم فرمانروا سلطان محمود غزنوی (متوفی: ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء) کی ادب دوستی اور علم پروری کی وجہ سے ایک روایت کے مطابق اس کے دربار سے چار سو سے زیادہ شعرا وابستہ تھے۔ غزنوی سلاطین کے امرا و وزرا بھی ادب نواز تھے۔ اس دور میں غزنہ، بخارا، سمرقند، طبرستان، رے، اصفہان وغیرہ علم و ادب کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

غزنوی دور کی فارسی شاعری کا بیشتر حصہ قصائد پر مشتمل ہے۔ یہ قصائد تاریخی، سماجی اور خود ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری بلخی (متوفی: ۴۳۱ھ/ ۱۰۳۹ء) سلطان محمود کے دربار کا ملک الشعرا ہے۔ اس کے بیشتر قصیدے سلطان محمود غزنوی، اس کے بھائی امیر نصر (متوفی: ۴۱۲ھ/ ۱۰۲۱ء) اور سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود اور امیر یوسف کی مدح میں ہیں۔ سلطان محمود سے قربت کی بنا پر عنصری سفر اور حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا حتیٰ کہ وہ سلطان کے جنگی معرکوں میں بھی اس کا ہم رکاب رہا ہے۔ اس کے قصیدے سلطان محمود کی فتوحات اور شجاعت کے بیان سے پُر ہیں۔ عنصری کے قصائد میں دقت معانی، جدت فکر، منطقی اسلوب اور مترنم انداز بیان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے دیوان میں قصیدہ، غزل اور رباعی کے سوا چند مثنویوں مثلاً وامق و عذرا، خنگ بت و سرخ بت اور شاد بہر و عین الحیوٰۃ کے اشعار بھی موجود ہیں۔ اس نے قصیدے کے سوا کسی دوسری صنف سخن میں کوئی خاص کمال پیدا نہیں کیا، لیکن قصیدے کا وہ مسلم الثبوت استاد سمجھا جاتا ہے۔

ابوالحسن علی بن جولوغ فرخی سیستانی (متوفی: ۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷ء) بھی سلطان محمود کے دربار کا عظیم شاعر ہے۔ سیستان کا یہ کسان شاعر مترنم آواز کا مالک اور چنگ بجانے میں ماہر تھا۔ فرخی کے دیوان میں قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں۔ فرخی کا کلام نکتہ آفرینی، نزاکت خیال اور ندرت تشبیہ کا عکاس ہے۔ اس کی شاعری پختہ، رواں، شیریں اور سادہ ہے اور فلسفیانہ خیالات، دقیق علمی مطالب اور دیریاب استعاروں سے مبرا ہے۔ اپنی لطیف و دلنواز موسیقیت کے باعث اس کا کلام ہمیشہ امتیازی شان کا حامل رہا ہے۔ اس کے قصائد میں سلطان محمود کی جنگوں اور فتوحات سے متعلق تاریخی اشارے موجود ہیں جو اس دور کی تاریخ کی تفسیر میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

ابونصر عبدالعزیز بن منصور مروزی متخلص بہ عسجدی (متوفی: ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۰ء) سلطان محمود کے دربار کا ایک دوسرا معروف شاعر ہے۔ حالانکہ اس کے کلام کا زیادہ حصہ آج دستیاب نہیں، اس کے باوجود اس کے چند قصائد، قطعات اور ایک مثنوی کے چند اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں، عسجدی کی فنی مہارت پر دلالت کرتے ہیں۔

ابوالنجم احمد منوچہری دامغانی (متوفی: ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۱ء) سلطان محمود کے جانشین اور لڑکے سلطان مسعود (۴۲۱-۴۳۲ھ/ ۱۰۳۰-۱۰۴۰ء) کے دربار کا شاعر ہے۔ اس کا دستیاب دیوان تین ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ منوچہری عرب شعرا سے بہت متاثر ہے۔ اس نے اپنے کلام میں کثرت سے عربی الفاظ اور تراکیب استعمال کی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی زبان کہیں کہیں مشکل اور ناہموار نظر آتی ہے۔ اس کے بیشتر قصائد کی تشبیب شیریں تغزل سے بھرپور ہے اور ان میں فطرت کے گوناگوں مظاہر کی بڑے دل کش انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منوچہری کو شاعرِ فطرت کہا جاتا ہے۔

شاہنامے کا خالق ابوالقاسم منصور بن حسن فردوسی (متوفی: ۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء) ایرانیوں کا ملی شاعر ہے۔ شاہنامہ نہ صرف سامانی اور غزنوی عہد کا ایک بیش بہا اور عظیم شعری کارنامہ ہے بلکہ درحقیقت وہ فارسی کی عظمت کی ایک اہم سند ہے اور قدیم ایران کی شاندار تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ فردوسی نے ۳۶۵ھ/ ۹۷۵ء یا ۳۷۰ھ/ ۹۸۰ء میں شاہنامہ لکھنا شروع کیا اور ۴۰۰ھ/ ۱۰۰۹ء یا اس کے کچھ بعد اسے مکمل کیا۔ شاہنامے کا بنیادی مقصد قدیم زمانے سے اسلام کی آمد تک ایران کی تاریخ نظم کرنا تھا۔ فردوسی نے تاریخی، نیم تاریخی اور اساطیری مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ابومنصور محمد بن عبدالرزاق کا منثور شاہنامہ تھا جو ۳۴۶ھ/ ۹۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ شاہنامۂ فردوسی میں دقیقی کے ایک ہزار اشعار بھی شامل ہیں۔ شاہنامہ میں کل پچاس فرمانرواؤں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ ذکر ایران کے اولین افسانوی بادشاہ کیومرث سے شروع ہوتا ہے اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کی عربوں کے ہاتھوں شکست اور ایران پر عربوں کی فتح کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔ کیکاؤس کے دور حکومت کا بیان شاہنامے کا طویل ترین اور اہم حصہ ہے۔ رستم نے اسی دور میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ رستم کا اپنے لڑکے سہراب سے جنگ کرنا اور بالآخر سہراب کا اپنے باپ رستم کے ہاتھوں مارا جانا اسی دور کا دردناک واقعہ ہے۔ اسی دور میں ایران و توران کے درمیان جنگوں نے شدت اختیار کی۔ شاہنامے میں ساسانیوں کے حالات حقیقی تاریخ سے بہت حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

شاہنامے کے ادبی کمال کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شاہنامہ محض ایک رزمیہ مثنوی نہیں بلکہ اس کی داستانوں کے ضمن میں لطیف معانی، فلسفیانہ خیالات، اجتماعی اور اخلاقی مطالب بھی نہایت دلکش اور موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ فردوسی اس قدر تفصیل اور جزئیات کے ساتھ جنگی مناظر کا بیان کرتا ہے گویا وہ بارہا جنگوں میں شریک ہوا ہو۔ سادہ زبان، داستان سرائی، ضرب الامثال، دینی و اخلاقی اشارے، منظر کشی، انسانی احساسات کی عکاسی، فکر و بیان کی پاکیزگی یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے شاہنامہ آج تک مختلف و متضاد ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہنامہ فارسی شاعری میں اپنی مثال آپ ہے، اس کے تتبع میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں لیکن کوئی رزمیہ نگار فردوسی کی

عظمت کو نہیں پہنچ سکا۔ تحقیقی طور پر اب یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ مثنوی یوسف و زلیخا کو فردوسی سے منسوب کیا جاتا ہے بنیاد ہے اور اسی طرح فردوسی سے بعض قطعات و غزلیات کا انتساب بھی محل نظر ہے۔

ان اہم اور عظیم شعرا کے علاوہ غزنوی دور کے اور متعدد شعرا کا نام تذکروں میں ملتا ہے۔ جن میں لبیبی، زینتی، مسعودی غزنوی، بہرامی، غضایری اور عیوقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غزنوی دور میں ایرانی علما و ادبا نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عموماً عربی کو فارسی پر ترجیح دی ہے۔ اس کے باوجود اس دور میں چند اہم کتابیں فارسی نثر میں بھی لکھی گئی ہیں۔

شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ ابن سینا (متوفی: ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۶ء) کا شمار دنیا کے معروف علما اور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ منطق، ہیئت، ریاضی اور طب کی تکمیل کے بعد اس نے الہیات اور طبیعیات پر خاص توجہ دی۔ اس کی طرف سو سے زیادہ کتابیں منسوب ہیں، جن میں حکمت، منطق، طبیعیات، الٰہیات اور ریاضیات کے موضوعات پر اس کی کتاب 'شفا' اور اسی طرح منطق اور حکمت پر اس کی کتاب 'اشارات' اور طب پر 'قانون' کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ ابن سینا کی اکثر کتابیں عربی میں ہیں، لیکن فارسی میں بھی اس کی چند کتابیں ہیں۔ ان میں دانشنامۂ علائی فارسی زبان میں فلسفے کی بنیادی کتاب شمار ہوتی ہے۔ تذکروں میں ابن سینا کے متفرق فارسی اشعار بھی ملتے ہیں۔

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی (متوفی: ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) غزنوی دور کا ایک عظیم دانشور اور منجم ہے۔ اس کی بیشتر کتابیں عربی میں ہیں۔ ریاضی و نجوم پر اس کی کتاب 'التفہیم لاوایل صناعۃ التنجیم' فارسی میں اپنی نوعیت کی پہلی تالیف ہے۔ البیرونی نے ۴۲۰ھ/ ۱۰۲۹ء میں اس کتاب کو پہلے فارسی میں تالیف کیا اور بعد میں اسے عربی میں منتقل کیا۔ مصنف نے تا حد امکان ریاضی و نجوم کے لیے فارسی اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان میں سے بیشتر اصطلاحات عیناً وہی ہیں جو سامانی دور کے اواخر سے ایران میں رائج تھیں۔ تصوف کی دو کتابیں اسی دور سے مربوط ہیں۔

ایک شیخ ابوالحسن خرقانی (م۔ ۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) کی 'نورالعلوم' اور دوسری امام ابو ابراہیم اسمٰعیل بن محمد بخاری کی (م۔ ۴۳۴ھ/ ۱۰۴۲ء) کی شرح تعرف ہے جو ابوبکر بخاری کلاباذ (م۔ ۳۸۰ھ/ ۹۹۰ء) کی عربی کتاب کی فارسی شرح ہے۔

اسی طرح طب کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ بھی غالباً اسی دور میں تالیف ہوئی جس کا واحد نسخہ موجود ہے اور جس کی کتابت مشہور شاعر اسدی طوسی نے ۴۴۷ھ/ ۱۰۵۵ء) میں کی تھی۔

مندرجہ بالا ادوار میں فارسی ادب عربی زبان و ادب سے متاثر ہونے کے باوجود خود اپنی خصوصیات کا حامل ہے۔ ان ادوار کی نظم و نثر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اظہار و بیان ہے۔ عبارت آرائی، مضامین کی تکرار، طول طویل جملے اور حقیقت سے دور مطالب ان ادوار کے ادب میں کم نظر آتے ہیں۔ ادب کا بیشتر حصہ قصائد پر مشتمل ہے۔ جو فرمانرواؤں اور ان سے متعلق اشخاص کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے منظوم سرمائے پر نظر ڈالنے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شاعر اپنے ہی احساسات و واردات کی ترجمانی کر رہا ہے اور چوں کہ اپنے ہی جذبات پیش کر رہا ہے، اس لیے ان میں خلوص، حقیقت اور دلکشی کا رنگ غالب ہے۔ شاعری کے اسی اسلوب کو سبک خراسانی یا سبک ترکستانی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اسلوب شاعری سلجوقی دور کے وسط تک جاری رہا۔

سلجوقی دور

(۴۳۱-۶۲۸ھ/ ۱۰۳۹ء - ۱۲۳۰ء)

غز ترکوں کے ایک سردار سلجوق نے ایران میں سلجوقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے دو پوتوں چغری اور طغرل نے خراسان میں غزنویوں کو شکست دی۔ اس کے بعد یہ خاندان بتدریج اپنی سلطنت کی حدود میں اضافہ کرتا رہا، یہاں تک کہ سلجوقی سلطنت پچھلی ایرانی سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ قدرت مند، وسیع اور با اختیار ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس خاندان کی سلطنت میں پہلے کے مقابلے میں فارسی ادب کی زیادہ سرپرستی کی گئی اور اس کی ترقی و ترویج میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ ملک شاہ (متوفی: ۴۸۵ھ/ ۱۰۹۲ء) اور سنجر (متوفی: ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء) جیسے سلجوقی بادشاہوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی میں مثالی جد و جہد کی۔ ان کے وزرا و امرا نے بھی علم نوازی اور ادب پروری کا حق ادا کیا۔ ان صاحبان منصب میں عمیدالملک کندری اور نظام الملک طوسی کی ادبی و علمی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

سلجوقی دور عظیم شعرا، ادبا، مورخین، علما، فقہا اور مشائخ کا دور ہے۔ اس دور میں فارسی ادب میں عارفانہ عقاید بھی عام ہوتے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ جس دور کو سلجوقی دور سے تعبیر کیا جا رہا ہے اسی زمانے میں غوریوں، خوارزمشاہوں، غزنویوں اور اتابکوں کے علاوہ متعدد مقامی حکومتیں بھی موجود تھیں۔ یہ تمام حاکم خاندان سلجوقیوں کے تقریباً ہم عصر تھے جو اپنے اپنے طور پر فارسی زبان و ادب کی سرپرستی میں کوشاں رہے۔

سلجوقی دور میں چند معروف صوفی شعرا کے وجود نے اس دور کی شاعری کو ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ ان شعرا کی وجہ سے اس دور میں فارسی غزل توجہ کا مرکز بنی اور قصیدہ نگاری کی اہمیت نسبتاً کم ہو گئی۔ شیخ ابوسعید ابی الخیر (متوفی: ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) خواجہ عبداللہ انصاری ہروی (متوفی: ۴۸۱ھ/ ۱۰۸۸ء) ابوالمجید مجدود بن آدم سنائی (متوفی: ۵۴۵ھ/ ۱۱۵۰ء) اور شیخ فریدالدین عطار (شہید: ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ء) اس دور کے نامور صوفی شعرا اور ادیب ہیں۔

بابا طاہر عریاں (متوفی: ۴۱۰ھ/ ۱۰۱۹ء) کی دوبیتیاں جو رباعی کے مخصوص وزن سے کسی قدر مختلف وزن رکھتی ہیں،

ان کے عارفانہ سوز وگداز کی ترجمان ہیں۔ ان دوبیتیوں کو قدیم کتب میں فہلویات کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی زبان میں ہیں جو لُڑی بولی سے مشابہ ہے ان دوبیتیوں میں باباطاہر نے دنیا کی بے ثباتی، انسان کی سرگردانی، بے چینی اور تنہائی کا ذکر نہایت دردناک انداز میں کیا ہے۔ باباطاہر کے عربی و فارسی میں چند رسائل بھی ہیں جن میں علم و معرفت ذکر و عبادت، وجد و محبت جیسے مطالب کو عارفانہ انداز میں موثر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ابوالحسن خرقانی (متوفی: ۴۲۵ھ/ ۱۰۳۲ء) کے جانشین خواجہ عبداللہ انصاری کا شمار ایران کے عظیم المرتبت مشائخ میں ہوتا ہے۔ یہ ایک زبردست محدث بھی تھے۔ آپ نے فارسی شاعری کو ایک مخصوص لحن و انداز عطا کیا اور نثر کو فصاحت و بلاغت بخشی۔ آپ کی زاد العارفین قلندر نامہ اور کتاب اسرار وغیرہ فارسی کے صوفیانہ ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کی منثور مناجات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی نے بھی ایسی شاعرانہ، سیدھی سادی، موثر اور شیریں فارسی نثر نہیں لکھی ہے۔ ان کی رباعیات رواں اور عشق حقیقی کے گوناگوں مطالب کی حامل ہیں۔

سنائیؔ کو ایران کا عظیم صوفی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ان سے پہلے کسی نے تصوف میں اس قدر پختگی، سلاست اور صراحت کے ساتھ شعر نہیں کہے تھے۔ یہ اوائل میں غزنوی دربار سے وابستہ رہے، لیکن سیاحت کے دوران درویشوں اور عارفوں کے فیضِ صحبت نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انھوں نے درباری زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور گوشہ گیر ہوگئے۔ یہاں سے ان کی عارفانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ دستیاب دیوان سنائیؔ میں تقریباً بارہ ہزار اشعار قصائد، غزلیات، رباعیات اور قطعات کی شکل میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ سنائیؔ نے چند مثنویاں بھی نظم کی ہیں جیسے حدیقۃ الحقیقۃ، طریق التحقیق سیر العباد الی المعاد یا کنوز الرموز وغیرہ۔ ان کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ عارفانہ افکار کا بلیغ اندازِ بیان، اسلوب کی پختگی اور اظہار خیال میں صراحت کی وجہ سے حدیقۃ الحقیقۃ کو سنائیؔ کا شاہکار اور تصوف و عرفان کا دائرۃ المعارف سمجھا جاتا ہے جسے شاعری کا لباس عطا کر دیا گیا ہے۔ سنائیؔ نے اپنے کلام میں تصوف کے گوناگوں موضوعات سے بحث کی ہے۔ ظاہر پرستی، ریاکاری، مردم آزاری اور بے وفائی سے اجتناب کی دعوت، صفائے قلب، خدمتِ خلق، پیروی حق، حصول دانش و حکمت، ایمان و عرفان کی ترغیب وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو بلیغ انداز میں سنائیؔ کے کلام میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنائیؔ نے اخلاقی اور نصیحت آمیز افکار کو عارفانہ نکات کے ساتھ اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ ان دونوں میں تمیز مشکل ہوگئی ہے۔ سنائیؔ نے طویل عمر پائی اور اپنے عارفانہ افکار و خیالات سے یہ ظاہر کر دیا کہ انہیں باطن کی سیر اور تزکیہ نفس کا موقع ملا تھا۔ عشق حقیقی نے ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ انہیں وصال حق نصیب ہوچکا تھا۔ اسی وجہ سے ایران کے معروف و محبوب صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی نے عرفانی دنیا میں سنائیؔ کی عظمت کا اعتراف ان اشعار میں کیا ہے:

عطار روح بود وسنائی دو چشم او ما از پی سنائی و عطار آمدیم

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام از حکیم غزنوی بشنو تمام

شیخ فرید الدین محمد متخلص بہ عطار (شہید: ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ء) سلجوقی دور کے دوسرے اہم صوفی شاعر ہیں۔ درج بالا بیت میں مولانا روم نے سنائیؔ کے ساتھ عطار کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عطار کو سنائیؔ کی طرح نسبتاً طویل مدت تک زندہ رہنے اور عرفان و تصوف کے جہان بیکراں میں جستجو کا موقع ملا تھا۔ حصول علم کے بعد عطار نے اپنا وقت مشائخ کی خدمت میں گزارا اور ان سے کسبِ فیض کیا، سفر بھی کیے۔ طبابت ان کا پیشہ تھا۔ بیماروں کا علاج کرتے اور ساتھ ہی عرفانی امور کو سمجھنے اور سمجھانے میں لگے رہتے۔ یہ روحانی اور جسمانی طبیب پُرگو شاعر بھی تھا۔ ان کی تمام تصانیف آج موجود نہیں ہیں اور جو کتابیں ان سے منسوب ہیں ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ قصائد و غزلیات پر مشتمل عطار کے دیوان میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی مثنویاں مصیبت نامہ، الٰہی نامہ، خسرو نامہ اور خاص طور پر منطق الطیر معروف ہیں۔ عطار کا تیسرا شاہکار ان کا تذکرۃ الاولیا ہے۔ عطار نے کبھی مدح سرائی نہیں کی۔ ان کی تمام تصانیف عرفان و تصوف سے متعلق ہیں۔ عطار نے قصائد میں بھی حمد و نعت اور پند و عرفان کے موضوعات بیان کیے ہیں۔ عطار کی غزلیات میں عشق حقیقی، اثر و وجد اور سوز و ساز موجزن ہیں۔ عطار کا بیشتر کلام مثنویات پر مشتمل ہے۔ منطق الطیر ان کی اہم ترین مثنوی ہے۔ اس تمثیلی مثنوی میں تیس پرندے (سالک) سیمرغ (محبوب حقیقی) سے ملنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنا سفر شروع کرتے ہیں اور مختلف منازل سے گزرتے ہیں۔ عطار نے پرندوں کے اس سفر کو سلوک و معرفت کے مقامات کی توضیح و تشریح کے لیے بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ یہ پرندے یعنی راہ حقیقت کے سالک اپنے سردار سیمرغ (محبوب حقیقی) تک پہنچنے کے لیے جستجو، طلب، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت اور فنائی منازل سے گزرتے ہیں اور سیمرغ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر انہیں اس حقیقت کا عرفان ہوتا ہے کہ عالم ظاہر بے معنی اور اپنے آپ سے ماورا میں خدا کی تلاش سعی لاحاصل ہے سیمرغ درحقیقت وہی سی مرغ (تیس پرندے) ہیں۔ عطار نے عام طور پر اپنے عارفانہ افکار کی توضیح کے لیے حکایات و تمثیلات کو صرف کیا ہے۔ کلام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والے معروف اور عظیم صوفی شعرا نے عطار کی پیروی کو طرۂ امتیاز سمجھا۔

صوفی شعرا کے علاوہ سلجوقی دور میں قصیدہ نگار بڑی تعداد میں گزرے ہیں جن میں سے بعض اہم اور معروف قصیدہ نگاروں کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا۔

ابونصر علی بن احمد اسدی طوسی (متوفی: ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء) اس دور کا اہم شاعر ہے۔ اس نے فردوسی کی پیروی میں

ایران کی ایک قدیم داستان "گرشاسپ نامہ" نظم کی جس میں تقریباً نو ہزار اشعار ہیں۔ استعارہ، مجاز اور کنایے کی فراوانی، نادر تشبیہات کی کثرت بیان کی دلکشی اور اسلوب کی لطافت کی وجہ سے گرشاسپ نامہ کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ اسدی نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ اس کے چار مناظرے بھی فارسی شاعری کی تاریخ میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لغت فرس یا لغات فرس نام کی ایک لغت بھی اس سے منسوب ہے، جسے فارسی کی قدیم ترین موجود لغت کہا جا سکتا ہے۔

حکیم ناصر بن خسرو بن حارث قبادیانی (متوفی: ۴۸۱ھ/ ۱۰۸۸ء) فارسی شاعری کی تاریخ میں امتیازی مقام کا حامل ہے۔ اس نے سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی کے درباروں کی شان و شکوہ اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ سلجوقی دور میں وہ دیوانی اور دبیری کی خدمات پر مامور رہا۔ طول طویل سفر بھی کیے جن کا حال اس کے سفر نامے میں درج ہے۔ مصر میں باطنی یا اسماعیلی شیعہ فرقے سے اس کا تعلق پیدا ہوا۔ اس فرقے کے عقاید کا ناصر خسرو نے دلچسپی اور توجہ سے مطالعہ کیا اور یہ عقائد اپنا لیے۔ ان عقائد کی تبلیغ کے لیے ناصر خسرو ایران لوٹ آیا۔ اسے مصر کے باطنی خلیفہ کی طرف سے حجت کا لقب دیا گیا اس کے مخصوص عقاید نے علما کے ایک بڑے طبقے کو اس کے خلاف کھڑا کر دیا اور اسے روپوش ہونا پڑا۔ اس روپوشی کے دوران اس نے بے پناہ مشکلات کا سامنا کیا۔ ناصر خسرو نے نثری آثار کے علاوہ قصاید اور دو مثنویاں یادگار چھوڑیں۔ وہ صاحبان اقتدار کی مدح سرائی کو گناہ اور غزل میں محبوب کی دلنوازیوں کے ذکر کو لغو سمجھتا ہے۔ ناصر خسرو اپنے کلام کے آئینے میں ایک سخت اور تند خو معلم کی طرح جلوہ گر ہے۔ اس کا لہجہ شکایت سے لبریز ہے اور یہی اس کے کلام کو قوت اور اثر عطا کرتا ہے اس تصوف، اخلاق اور وعظ و حکمت کے امتزاج نے اس کے کلام کو انفرادیت بخشی ہے۔ ناصر خسرو نے شاعری کو تبلیغ مذہب کا وسیلہ بنایا، شاعری میں الفاظ سے زیادہ معنی پر زور دیا۔ اس کے خیال میں لفظ مُشک ہے اور مفہوم و معانی اس کی خوشبو۔ ناصر خسرو کا سفر نامہ تاریخی اور ثقافتی اطلاعات اور اپنے خوبصورت اسلوب کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اسماعیلی مسلک پر نثر میں اس کی دو کتابیں زاد المسافرین اور وجہ دین خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔

سلجوقی دور کے شعرا میں ابو منصور قطران تبریزی (متوفی: ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء) ایک اہم نام ہے۔ ناصر خسرو نے اپنے سفر کے دوران تبریز میں اس سے ملاقات کی تھی۔ قطران نے اپنے معاصر آذربائیجان کے سلاطین کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے قصیدے متانت کلام کے لیے معروف ہیں۔ اس نے صنایع لفظی سے بہت کام لیا ہے۔ وقایع اور منظر نگاری میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ اشعار کے سوا قطران سے، دیگر تصانیف بھی منسوب ہیں۔ جن میں ایک کتاب لغت پر ہے۔ دیوان قطران میں رودکی کے بہت سے اشعار شامل ہو گئے ہیں۔

اس دور کا ایک اہم شاعر مسعود سعد سلمان (متوفی: ۵۱۵ھ/ ۱۱۲۱ء) ہے۔ اس کا خاندان ہمدان کا رہنے والا تھا۔ لیکن مسعود سعد سلمان لاہور میں پیدا ہوا۔ اسے ہندوستان کے اولین فارسی شعرا میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس نے زندگی کے ابتدائی ایام عزت کے ساتھ گزارے۔ مسعود تقریباً چالیس سال کا تھا کہ اس پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ سلطان ابراہیم غزنوی (۴۵۰-۴۹۲ھ/ ۱۰۵۸-۱۰۹۸ء) نے اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود سے ناراض ہونے کی وجہ سے اسے اس کے دوسرے متعلقین کے ساتھ ۴۸۰ھ/ ۱۰۸۷ء میں قید میں ڈال دیا۔ قید و بند کی آزمایش نے مسعود کو کبھی قلعہ دھک اور قلعہ سو اور کبھی قلعہ نای اور مرنج کی تاریک اور اذیت ناک فضا میں انیس برس تک اسیر رکھا۔ جیل کی وحشت ناک زندگی سے جب نجات ملی تو وہ ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کمزوری اور نقاہت اس پر غالب آ چکی تھی۔ رہائی کے بعد وہ پندرہ سال تک زندہ رہا لیکن اس مدت میں بھی اسے کوئی خاص آسایش و سکون میسر نہیں آیا۔

قصیدہ نگاری میں مسعود کا شمار اس فن کے اساتذہ میں ہوتا ہے اس کے قصائد پاکیزہ ہیں اور تغزل سے لبریز ہیں۔ مسعود کی اصل شہرت اس کی حبسیات پر مبنی ہے۔ اس پر قید و بند کے دوران مشکلات اور مصیبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹے اس کا دردناک ذکر ان حبسیات میں ملتا ہے۔ اس کا قید خانہ تنگ و تاریک کوٹھری تھی۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ سنگ دل دربان اسے آزار پہنچاتے رہتے تھے۔ ہفتے میں کسی دن کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ دوست و احباب کی یاد مضطرب رکھتی تھی، قرض خواہ قید خانے تک پہنچ جاتے اور اس کی وحشت ناکی میں اضافہ کرتے تھے۔ قید کے دوران ہی اسے اپنے والد اور ایک بیٹے کی رحلت کی دلخراش خبریں ملیں۔ یہ وہ دہلا دینے والے حالات ہیں۔ جن کے بیان نے مسعود سعد سلمان کی حبسیات کو دل دوز لحن و آہنگ عطا کیا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی، صاحب چہار مقالہ کا بیان ہے کہ: "جب میں اس کے اشعار پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" مسعود نے متقدمین کے اسلوب کو سامنے رکھا، با ایں ہمہ اس کے کلام میں دور از ذہن معانی اور مطالب کے بجائے جدید تعبیرات نظر آتی ہیں۔ اپنے وقت کے استاد شاعر خاقانی شیروانی نے اس کے کلام پر اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے کہ: " اس کے کلام میں جو روح اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے وہ مثالی شاعر عنصری کے کلام میں مفقود ہے"۔

محمد بن عبد الملک متخلص بہ معزّی نیشاپوری (متوفی ۵۲۱ھ/ ۱۱۲۷ء) سلطان ملک شاہ سلجوقی کے دربار کا شاعر تھا اور سلطان کے لقب 'معز الدنیا' والدین کی مناسبت سے اس نے معزّی تخلص اختیار کیا۔ معزّی کو ملک شاہ کے مقرب بارگاہ ہونے کی بنا پر شہرت اور شان و شوکت حاصل تھی۔ ملک شاہ کے انتقال (۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے بعد ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ پھر سلطان سنجر کے دربار سے وابستہ ہوا جہاں اسے ملک الشعراء کے منصب پر فائز کیا گیا۔ ایک روز تیر اندازی

کی مشق کے دوران سنجر کا تیر خطا ہوا اور معزی کے جا لگا۔ اسی تیر کی ضرب سے معزی فوت ہوگیا۔

معزی نے قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ایک دیوان چھوڑا ہے۔ وہ اپنے پیشرو شعرا کا سچا مقلد ہے۔ عنصری، فرخی، منوچہری اور عسجدی وغیرہ کے قصائد کا رنگ اس کے قصائد میں نمایاں ہے۔ قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں اسے بلند مقام حاصل ہے۔ معزی کے قصائد عام طور پر طویل ہیں اور ان میں صنایع لفظی و معنوی کی بھرمار ہے۔ وہ مبالغہ آرائی کا شاعر ہے لیکن اس کے قصائد میں سلجوقی عہد کے تاریخی واقعات کی طرف اشارات بھی ملتے ہیں۔ ملک شاہ اور سنجر کے اخلاق و عادات، ان کی معرکہ آرائیوں کی روئیداد، ان کے وزرا و امرا اور خاص طور پر خواجہ نظام الملک طوسی (متوفی: ۴۸۵ ھ/ ۱۰۹۲ ء) وغیرہ کے حالات زندگی سے متعلق بیانات نے معزی کے قصائد کو تاریخی اہمیت بخشی ہے۔

اوحدالدین محمد انوری (متوفی: ۵۸۳ ھ/ ۱۱۸۷ ء)

سلطان سنجر کے دربار سے وابستہ مدح سراؤں کا سرتاج ہے۔ انوری کے بقول سنجر کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے، اس کے لیے قرب سلطانی کا باعث ہوا:

گر دل و دست بحر و کان باشد   دل و دست خدایگان باشد

غز ترکوں کے ہاتھوں سلطان سنجر کی شکست کے بعد انوری ایک مدت تک بلخ میں مقیم رہا۔ بلخ میں اس کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انوری کے مخالفین نے بلخ کی ہجو کہی اور اسے انوری سے منسوب کر دیا۔ اہل بلخ برہم ہو گئے اور انہوں نے انوری کو اذیتیں پہنچائیں۔ انوری نے اس رسوائی و پریشانی کا ذکر اپنے قصیدے میں کیا ہے۔ اسی طرح ایک بار جب وہ مرو میں تھا تو عام لوگوں کے تیر ملامت کا نشانہ بنا۔ انوری کو نجوم میں درک تھا اور اسی بنیاد پر اس نے حکم لگایا کہ فلاں وقت آسمانی قہر ٹوٹے گا، آندھیاں چلیں گی اور بڑی بڑی عمارتیں زمین پر آ رہیں گی۔ لوگوں میں دہشت پھیل گئی مگر انوری کا معینہ وقت کسی غیر معمولی واقعہ کے رونما ہوئے بغیر گذر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انوری کو اتنا ذلیل کیا کہ اسے مرو چھوڑنا پڑا۔ کہا جاتا ہے اس واقعہ کے بعد انوری شاعری اور دنیا دونوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔

انوری کے عہد تک فارسی قصیدے میں بڑی وسعت اور پختگی پیدا ہو چکی تھی لیکن اس نے مدح سرائی میں ایسے کمال کا مظاہرہ کیا کہ متقدم اساتذہ مثلاً عنصری اور فرخی وغیرہ سے آگے نکل گیا۔ بعد کے دور میں مثنوی، قصیدہ اور غزل میں فردوسی، انوری اور سعدی کو بالترتیب پیغمبری کا لقب عطا ہوا۔ انوری نے توانائی و بحور میں تنوع اور صنعت گری میں اعتدال کی راہ اپنائی۔ اس نے اپنے قصائد میں عام نوعیت کے افکار کو بھی ایک مخصوص کیفیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیز قرآنی آیات، ضرب الامثال اور عربی اشعار سے اپنے کلام کو سجایا ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اس کے قصائد غور و فکر کے طالب ہیں۔ ان میں جا بجا ریاضی، ہیئت، نجوم، موسیقی اور فلسفے کی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ انوری کو حکمت سے خاص دلچسپی تھی اور اسی حکمت آمیز رویے نے بعض موقعوں پر اس کے اشعار کو مشکل اور محتاج شرح بنا دیا ہے۔ بہر حال انوری جیسی فکری وسعت اور الفاظ کا ستھرا انتخاب دوسرے قصیدہ گو شعرا کے کلام میں کم نظر آتا ہے۔ قصائد کے سوا انوری نے غزلیات، ہجو اور چند اخلاقی قطعات بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

افضل الدین بدیل بن علی خاقانی شروانی (متوفی: ۵۹۵ ھ/ ۱۱۹۸ ء) کا شمار اس دور کے نہایت معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کے والد ایک نجار تھے اور ماں ایک نسطوری عیسائی، جس نے اپنے بیٹے کو حضرت عیسیٰ مسیح کے دین و عقاید سے اچھی طرح واقف کرا دیا تھا۔ خاقانی کی سرپرستی اس کے چچا کافی الدین عمر بن عثمان نے کی جو فلسفہ اور حکمت کا ماہر تھا۔ ابوالعلا گنجوی کے توسط سے وہ شروان کے حاکم خاقان اکبر منوچہر بن فریدون کے دربار سے منسلک ہوا۔ اس کے باوجود اس کی زندگی آسودگی کو ترستی رہی۔ اس نے اپنے وطن شروان کی مذمت کی اور اپنے استاد ابوالعلا گنجوی کی ہجو لکھی، بغداد اور اہل بغداد سے کبیدہ خاطر ہونے کی وجہ سے عباسی خلیفہ المقتفی لأمر اللہ کی دبیری سے انکار کر دیا۔ ایک موقع پر خاقان اکبر نے کسی بدگمانی کی وجہ سے خاقانی کو قید میں ڈال دیا۔ اس حالت میں مسعود سعد سلمان کی طرح خاقانی نے بھی حبسیات لکھی ہیں جو نہایت موثر اور دردناک ہیں۔ حج سے واپسی کے دوران اس کا گذر دریائے دجلہ کے کنارے واقع مدائن پر ہوا۔ جہاں ساسانی عہد کی عمارتوں کے کھنڈر دیکھ کر اس کے دل میں دنیا کی بے ثباتی اور ایران کی گزشتہ عظمت کا احساس جاگ اٹھا جس کا اظہار ایک قصیدے میں ہوا۔ یہ اثر آفریں قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے

"ہان ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان
ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان"

خاقانی کے قصائد میں مدح و ستائش کے علاوہ اہل ہنر کی ناقدری، دنیا والوں کی تنگ نظری، محبت و وفا کی محرومی اور خلوص و حمیت کی کمیابی کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ خاقانی کو فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کی شاعری الفاظ و معانی کے لحاظ سے غیر معمولی اور بلند و لطیف ہے۔ اس نے اپنے کلام میں نئے نئے الفاظ، نت نئی تراکیب اور اچھوتے معانی و مطالب سے کام لیا ہے۔ اس کا کلام آیات قرآنی، ضرب الامثال، اشارات و کنایات، تجنیس و ایہام، تاریخی، ادبی اور مذہبی تلمیحات جیسے صنایع لفظی و معنوی سے بھرا ہوا ہے۔ خاقانی کو مروجہ علوم معقول و منقول سے گہری واقفیت اور دلچسپی تھی۔ وہ روزمرہ کے عام مضامین کے بیان میں بھی ایک مخصوص تنوع پیدا کر دیتا ہے۔ ان خصوصیات نے خاقانی کے کلام کو مشکل بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دیوان میں پانچ سو سے زیادہ ایسے اشعار ہیں جن کے معنی واضح نہیں ہیں۔ خاقانی کے وہ قصائد جن میں حمد و نعت نظم کی گئی ہے بہت موثر ہیں اور شاعر کے اخلاص کی غمازی کرتے ہیں۔

خاقانی کے کلیات میں قصائد کے علاوہ غزلیات بھی ہیں، اس کی غزلیات کسی حد تک ناہمواری کے باوجود حقیقی جذبات سے مملو ہیں۔ ان کا بنیادی وصف سادگی اور سلاست ہے۔ خاقانی کو سنائی سے گہری عقیدت تھی۔ اس وجہ

سے درویشی اور معنویت کا بھرپور نقش اس کی غزلیات میں موجود ہے۔ اسی معرفت وحقیقت کی بنا پر اس کا شمار بھی اہل باطن میں ہونے لگا۔

خاقانی کی مثنوی تحفة العراقین، اس کے سفرِ حج عراق عرب و عجم کی یادگار ہے۔ اس میں شاعر نے خاص خاص شہروں اور وہاں کے مشہور لوگوں کا ذکر کیا ہے اس بنا پر اس مثنوی کی تاریخی اہمیت ہے۔ خاقانی کے چند خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں۔

عہد سلجوقی کے دیگر معروف قصیدہ نویسوں میں ابوبکر زین الدین ازرقی، ابو الفرج رونی (جس نے لاہور میں زندگی گزاری)، مختاری غزنوی، عمعق بخارائی، سید حسن غزنوی، خوارزم شاہیوں کا ملک الشعرا رشید وطواط، ادیب صابر، اثیر اخسیکتی، جمال الدین اسماعیل اور اس کا لڑکا کمال اسماعیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر شاعر کا فارسی قصیدہ نویسی میں اپنا مخصوص مقام ہے۔ اسی دور کا ایک شاعر ظہیر فاریابی قصیدہ نگاری میں انوری کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔

سلجوقی دور میں رباعی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ فارسی کا سب سے عظیم رباعی گو خیام اسی عہد کا شاعر ہے۔ ابو الفتح عمر بن ابراہیم نیشاپوری (متوفی: ۵۱۷ھ/ ۱۱۲۳ء) سلجوقی دور کا وہ عظیم دانشمند، عالم اور شاعر ہے جو عمر خیام کے نام سے دنیائے ادب میں معروف ہے۔ اپنے دور کے بادشاہوں، وزیروں اور عالموں سے اس کے تعلقات تھے اور ادبی محافل میں اسے اہم مقام حاصل تھا۔ عمر خیام کو جو نجوم، حکمت اور ہیئت میں ماہر تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے تقویم (کیلنڈر) کی اصلاح پر مامور کیا لیکن فارسی ادب میں اس کی شہرت کا اہم سبب اس کی رباعیات ہیں۔ رباعی فارسی شاعری کی ایک قدیم صنفِ سخن ہے۔ خاص وعام اس کے دلدادہ اور عالم وعامی اس کے شیدائی۔ خیام کی رباعیات کا مستند، مکمل اور جامع مجموعہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ جو رباعیاں آج خیام کے نام سے ملتی ہیں، ان میں سے بعض کے انتساب میں شبہ کی گنجایش ہے خیام کی رباعیات تعداد کے لحاظ سے کم ہیں، لیکن ان میں معانی اور افکار کا ایک سمندر موجزن ہے۔ ان رباعیات کی خصوصیات میں سادگی اور روانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ رباعیات خیام قصیدے کی پر تکلف زبان اور استعارات ومبالغہ سے گراں بار نہیں ہیں۔ اس میں سچائی اور خلوص جلوہ گر ہے۔ شدتِ احساس نے رنگ آمیزی کی گنجایش ہی نہیں رکھی۔ خیام اپنی رباعیات میں دروں بینی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن یہ شک وشبہ اس کے فکر واحساس کا ترجمان ہے۔ اس پر قنوطیت بھی طاری ہوتی ہے، وہ زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی محرومی اور بدبختی پر کڑھتا ہے اور مستی ومدہوشی کو آلام ومصائب سے نجات کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ خیام کی رباعیات کو قبول عام نصیب ہوا، ان کا ترجمہ دنیا کی بہت زبانوں میں کیا جا چکا ہے اور انہیں آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے خیام کی بین الاقوامی شہرت کا ذمہ دار اس کی رباعیوں کا وہ معرکہ آرا ترجمہ ہے جو ایڈورڈ فٹز جیرلڈ نے انگریزی زبان میں کیا اور جسے طبعزاد تخلیقات کے پہلو میں رکھا جاتا ہے۔

سلجوقی عہد میں عشقیہ مثنوی نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کا پہلا عشقیہ مثنوی نگار فخر الدین اسعد گرگانی (متوفی: ۴۴۶ھ/ ۱۰۵۴ء) ہے جو سلطان ابوطالب طغرل (۴۲۹-۴۵۵ھ/ ۱۰۳۷-۱۰۶۳ء) کا درباری شاعر تھا۔ اس نے قصائد بھی لکھے لیکن اس کی شہرت کا دار ومدار اس کی مشہور منظوم داستان "ویس ورامین" پر ہے۔ اس کے کلام میں یہی ایک مثنوی ہم تک پہنچی ہے۔ یہ داستان پہلوی زبان سے ماخوذ ہے۔ مثنوی حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتی ہے۔ "ویس ورامین" کی داستان عشق سادہ، شیریں اور رواں فارسی میں نظم کی گئی ہے۔ اور اسی بنا پر وہ عشقیہ مثنوی نویسوں کے لیے عرصے تک سرمشق بنی رہی۔ نظامی گنجوی نے اپنی مثنوی خسرو وشیریں میں ویس ورامین کا اثر قبول کیا ہے۔ فخر الدین اسعد گرگانی کے فن داستان سرائی کی عظمت کا اس سے بہتر اعتراف کیا ہو سکتا تھا۔

حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف بن زکی بن موید نظامی گنجوی (متوفی: ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء) فارسی کا پہلا خمسہ نگار ہے۔ نظامی کی عظمت کا راز اس کی ماہرانہ مثنوی نویسی میں مضمر ہے۔ گنجہ کے اس مایۂ ناز شاعر نے بزمیہ داستان سرائی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس فن کو اپنے مخصوص اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ وہ دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بن گیا نظامی کے خمسے یا پنج گنج کو ایسا قبول عام نصیب ہوا کہ آنے والے متعدد نامور شعرا نے اس کی تقلید میں خمسے نظم کیے۔ یہ پانچ مثنویاں پانچ مختلف اوزان میں لکھی گئی ہیں اور ان کی تکمیل میں نظامی نے اپنی عمر کے تقریباً تیس سال صرف کیے۔ خمسے کی پہلی مثنوی مخزن الاسرار ہے۔ اس کا موضوع زہد وتقویٰ اور عرفان ومعنویت ہے۔ شاعر نے مختصر اور سبق آموز حکایات سے پند ونصیحت کا کام لیا ہے۔

پنج گنج کی دوسری مثنوی "خسرو وشیریں" ہے۔ یہ ساسانی دور کی ایک عشقیہ داستان ہے جس میں ایران کے شاہزادے خسرو پرویز اور آرمینیا کی شہزادی شیریں کے عشق کی سرگذشت بیان کی گئی ہے لیکن داستان کا اصل ہیرو فرہاد ہے جو کوہ بے ستوں کاٹ کر شیریں کے لیے جوئے شیر لاتا ہے۔ اس مثنوی میں عشق کی نازک کیفیات کو جس لطافت اور مہارت سے بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر فارسی کی عشقیہ مثنویوں میں کم ہی ملے گی۔ خمسے کی تیسری مثنوی "لیلی ومجنوں" ہے۔ درد ومحرومی کی یہ عاشقانہ داستان سرزمین عرب سے متعلق ہے جہاں کے مجنوں (قیس) اور لیلی رہنے والے تھے۔

ہفت پیکر یا ہفت گنبد یا بہرام نامہ پنج گنج نظامی کی چوتھی مثنوی ہے اس میں ساسانی بادشاہ بہرام گور کی سرمستیوں اور سرشاریوں کی داستان ہے بہرام دلیری اور شجاعت میں بے نظیر تھا لیکن تخت شاہی پر جلوس کے بعد وہ عیش وعشرت میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے محل میں مختلف رنگوں کے سات گنبد بنوائے اور ہر گنبد میں سات الگ ملکوں کی ایک ایک حسینہ کو رکھا۔ ہفت پیکر میں یہ ساتوں خواتین عشق وسرمستی کی داستانیں سناتی ہیں۔ بہرام شکار کا شوقین تھا، یہاں تک کہ ایک دن گورخر کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

خمسے کی پانچویں اور آخری مثنوی "اسکندر نامہ" ہے۔ اس مثنوی کے دو مختلف حصے ہیں۔ پہلا شرف نامہ ہے اور دوسرا اقبال نامہ یا اسکندر نامہ بحری اور اسکندر نامہ بعد اس منظومے میں نظامی نے سکندر کے حالات کو شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظامی کا سکندر محض ایک عظیم فاتح نہیں بلکہ ذوالقرنین

پیغمبر بھی ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک تجربہ کار حکمراں، جہاں دیدہ فاتح اور حقیقت میں حکیم کی تمام صفات موجود ہیں۔ نظامی کی مثنویات کے مطالعے سے یہ دلچسپ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس نے فردوسی کی رزمیہ اور سنائی کی صوفیانہ ابیات سے الگ اپنی راہ بنائی اور کوشش کی کہ جن مطالب کو دوسرے شعرا بیان کر چکے ہیں، ان سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔ نظامی کا کلام متین و شیریں اور اس کا انداز بیان زیادہ تر رواں اور سلیس ہے۔ اس نے داستانوں کے ضمن میں نصیحت آمیز مضامین بیان کیے ہیں اور حکایات سے عبرت آمیز نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس کی شاعری میں جذبات واحساسات اور مناظر قدرت کی سچی اور ماہرانہ تصویر کشی ملتی ہے۔ مخزن الاسرار اخلاقی مثنویوں میں اور خسرو و شیریں عشقیہ منظومات میں آج بھی بے نظیر مانی جاتی ہیں۔ مثنویات کے علاوہ نظامی سے قصائد، غزلیات، قطعات ورباعیات بھی منسوب ہیں۔

سلجوقی دور میں فارسی نثر کو بھی قابل قدر ترقی ہوئی۔ اس دور میں جو اہم نثری آثار وجود میں آئے وہ موضوع ومطالب کے لحاظ سے مختلف النوع اور تصوف، تاریخ، اخلاق، طب اور ادب وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس دور کے متعدد علماء نے عربی میں بھی تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا۔ اس دور میں تصوف وعرفان پر چند بنیادی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ترجمہ رسالہ قشیریہ، علی بن عثمان ہجویری کی کشف المحجوب، شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ملفوظات پر مشتمل اسرار التوحید اور شیخ عطار کی تذکرۃ الاولیا اور احمد غزالی کی سوانح العشاق تصوف کی اساسی کتب میں شمار کی جاتی ہیں۔ خواجہ عبداللہ انصاری کے رسائل شعر منثور اور جذب وکیفیت کے بے مثال نمونے ہیں۔

علاوہ ازیں عین القضاۃ ہمدانی کے مکاتیب اور تمہیدات، شیخ شہاب الدین سہروردی کی تالیفات، شیخ نجم الدین کبری اور شیخ مجد الدین بغدادی کے رسائل کا شمار بھی اس دور کے اہم عرفانی آثار میں ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کا مقصد عوام کی ہدایت ورہنمائی تھی۔ اس وجہ سے ان کی مجالس اور تالیفات میں سادہ اور رواں فارسی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں اس عہد کے لوگوں کے آداب وعادات اور افکار وزندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ صوفیانہ نثر میں سادگی کے علاوہ جذب وشوق کی کیفیت جلوہ گر ہے۔

کشف المحجوب حضرت ابوالحسن غزنوی جلابی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش (متوفی: ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء) کی تالیف ہے جس میں مشائخ کرام کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ فارسی میں یہ اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے اور پانچویں صدی ہجری کی فارسی نثر کا اہم نمونہ بھی ہے۔ محمد ابن منور (متوفی: اواخر چھٹی صدی ہجری) نے اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید میں شیخ ابوسعید ابوالخیر (متوفی: ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) کے حالات وکرامات اور عقائد نقل کیے ہیں۔ اس میں ضمنی طور پر بعض معاصر علما ومشائخ کے حالات زندگی بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اسرار التوحید شیریں، رواں اور موزوں نثر کا اہم نمونہ ہے۔ فرید الدین عطار نے بھی اسی دور میں صوفیا ومشائخ کے حالات ومقامات وافعال پر مشتمل اپنی اہم تالیف، تذکرۃ الاولیاء، مکمل کی۔ عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں کشف المحجوب سے بڑی حد تک اقتباس کیا ہے بعد کے دور میں صوفیائے کرام کے جو تذکرے لکھے گئے ان میں اکثر نے تذکرۃ الاولیاء کی خوشہ چینی کی ہے۔

اس دور میں تاریخ کی چند بنیادی کتابیں تالیف کی گئیں۔ درحقیقت فارسی میں تاریخ نویسی کی روایت کا باقاعدہ آغاز سلجوقی دور ہی سے ہوتا ہے۔ یہ کتابیں بنیادی اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔

ابوسعید عبدالحی ابن ضحاک گردیزی غزنوی (متوفی: پانچویں صدی ہجری) کی زین الاخبار فارسی کی اولین تاریخی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ سامانیوں اور غزنویوں کی تاریخ کے لیے یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ ان کے دور حکومت سے نزدیک کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ اس تاریخ میں ابتدائے آفرینش سے مودود بن مسعود غزنوی کے دور حکومت (۴۳۲ - ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۰ - ۱۰۴۸ء) تک کے واقعات شامل ہیں۔ اس کی نثر رواں اور سادہ ہے۔

ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی (م ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء) غزنوی سلاطین کے دربار میں دبیر تھا۔ اس نے ۴۵۱ھ/ ۱۰۵۹ء میں تیس جلدوں میں تاریخ بیہقی مکمل کی جو غزنویوں کے آغاز سلطنت سے لے کر سلطان ابراہیم بن مسعود کے اوائل سلطنت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ لیکن اب اس اہم تاریخ کا جو حصہ دستیاب ہے اس میں صرف مسعود بن محمود غزنوی اور خوارزم کے سلاطین آل مامون کی تاریخ درج ہے۔ تاریخ بیہقی کا شمار فارسی کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اپنی بلیغ اور شیریں فارسی کے لیے معروف ہے بلکہ مصنف کی صداقت نگاری اور حقیقت بیانی اسے فارسی مورخوں میں بڑی حد تک امتیاز عطا کرتی ہے۔

ایران کے قدیم دور اور اسلامی عہد کے سلاطین کی تاریخ پر ایک معتبر کتاب مجمل التواریخ والقصص ہے۔ اس کے مصنف کا علم نہیں۔ البتہ یہ کتاب ۵۲۰ھ/ ۱۱۲۶ء میں سلطان سنجر محمود بن ملک شاہ سلجوقی کے عہد سلطنت میں لکھی گئی۔ مجمل التواریخ اپنی خالص اور کسی حد تک قدیم فارسی عبارت اور ترکیبات کے لیے مشہور ہے۔

ابوبکر محمد راوندی کی راحۃ الصدور اس دور کی دوسری اہم تاریخ ہے جس میں سلجوقی دور حکومت کی ابتدا سے خوارزم شاہیوں کے ہاتھوں اس دور کے خاتمے تک کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ یہ کتاب اپنی تاریخی اطلاعات اور مخصوص اسلوب نگارش کے لحاظ سے منفرد ہے۔ راحۃ الصدور ۵۹۹ھ/ ۱۲۰۲ء میں مکمل ہوئی۔ اس کا انتساب ایشیائے کوچک کے فرمانروا کیخسرو بن قلیج ارسلان کے نام ہے۔ اس دور میں تاریخ کی بعض کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں ایک تاریخ بخارا یا مزارات بخارا ہے۔ یہ فارسی ترجمہ محمد بن زفر بن عمر نے ۵۷۴ھ میں ۱۱۷۸ء میں مکمل کیا۔ دوسری قابل ذکر کتاب ترجمہ تاریخ یمینی ہے جو تاریخ یمینی کا فارسی ترجمہ ہے اس کتاب کا ترجمہ ابوالشرف ناصح بن ظفر جرباذقانی نے ۶۰۳ھ میں مکمل کیا۔ تیسری کتاب فتوح ابن اعثم کا فارسی ترجمہ ہے جو عربی میں خلافت راشدہ اور امویوں کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کا مترجم احمد بن محمد ہروی ہے۔ اس نے اس ترجمہ کو ۵۹۶ھ/ ۱۱۹۹ء میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

ابوالحسن علی بن زید بیہقی معروف بہ ابن فندق اس دور کا زبردست عربی عالم تھا جس کی کتاب تاریخ بیہق میں بیہق اور اس کے نواح کے علما وفضلا وغیرہ کا حال درج ہے۔ تاریخ بیہق مذکورہ بالا خواجہ ابوالفضل محمد بیہقی کی تاریخ بیہقی سے مختلف کتاب ہے۔

ایران کی علاقائی تاریخوں میں فارس نامہ (تالیف قبل از ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء) اور تاریخ طبرستان (تالیف ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء) خاص اہم ہیں۔ اوّل الذکر میں قبل اسلام کی تاریخ فارس بیان کی گئی ہے۔ اور اس کا مولف ابن البلخی ہے۔ دوسری کتاب طبرستان کی تاریخ اور بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب کی تالیف ہے۔

سلجوقی دور میں اخلاقیات، عمرانیات، ادبیات، انشا اور مذہبیات وغیرہ پر بعض انتہائی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اخلاقی، ادبی، اور طبّی کتابوں میں سیاست نامہ، قابوس نامہ، کیمیائے سعادت، کلیلہ و دمنہ، چہار مقالہ، حدائق السحر، مقامات حمیدی، ذخیرۂ خوارزم شاہی اور مرزبان نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم خواجہ ابو علی حسن بن علی نظام الملک طوسی (متوفی: ۱۰ رمضان ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے آداب معاشرت، اخلاق اور ریاست پر سیاست نامہ لکھا، جس میں آداب حکمرانی کے علاوہ مختلف سیاسی اور مذہبی فرقوں کا ذکر بھی ہے۔ یہ کتاب سادہ اور رواں فارسی نثر میں لکھی گئی ہے۔ اسی موضوع پر نظام الملک کا ایک خط بھی ملا ہے جو وصایائے نظام الملک یا دستور الوزارۃ کے نام سے معروف ہے۔ امیر کیکاؤس ابن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لیے قابوس نامہ تالیف کیا۔ مؤلف زیاری خاندان کا فرد ہے جو سلجوقیوں سے پہلے طبرستان اور گرگان وغیرہ پر حکمراں تھا۔ اس کتاب میں وہ اپنے بیٹے کو کسب فضائل اور آداب زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا اسلوب نگارش نثر مرسل کا نمونہ ہے۔ حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد غزالی (متوفی: ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) نے اپنی تالیف احیاء العلوم کے بہترین مطالب کا کیمیائے سعادت کے نام سے فارسی میں خلاصہ کیا۔ اس کتاب میں نفس، حق تعالیٰ، دنیا اور آخرت کی شناخت کے اصول اور طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ کیمیائے سعادت اخلاقیات میں فارسی کی سب سے اہم کتاب ہے۔ غزالی کی دوسری اہم کتاب نصیحۃ الملوک ہے۔ غزالی کے بعض خطوط بھی ہم تک پہنچے ہیں۔ ابو المعالی نصر اللہ بن عبد الحمید نے کلیلہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ بھی اسی دور میں کیا تھا۔ یہ وہی ہندی الاصل کتاب پنچ تنتر ہے جو سب سے پہلے ساسانی دور میں پہلوی میں منتقل کی گئی پھر عبد اللہ بن مقفع نے اسے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا اور بہرام شاہ غزنوی (۵۱۱ھ - ۵۵۲ھ/ ۱۱۱۷ - ۱۱۵۷ء) کے دور میں نصر اللہ نے اس کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا۔ کلیلہ و دمنہ دراصل محض ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق ہے اور فارسی نثر میں اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر ممتاز ہے۔ اسی دور میں دو اور کتابیں بھی لکھی گئیں: روضۃ العقول اور مرزبان نامہ جن میں کلیلہ و دمنہ کی طرح جانوروں کی زبان سے قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان داستانوں کو پہلے طبرستان کے حاکم مرزبان بن رستم نے طبری زبان میں لکھا تھا جسے چھٹی صدی کے اواخر یا ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں پہلے محمد بن غازی ملیطوی نے روضۃ العقول کے نام سے اور بعد میں سعد الدین وراوینی نے مرزبان نامہ کے عنوان سے فارسی نثر میں منتقل کیا۔ موخر الذکر کتاب، سیاست نامہ، قابوس نامہ اور کلیلہ و دمنہ کی طرح فارسی نثر کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

نظامی عروضی سمرقندی نے ۵۵۱ - ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۶ - ۱۱۵۷ء میں اپنی معروف کتاب چہار مقالہ مرتب کی جس میں دبیری، شاعری، نجوم اور طب پر چار مقالے ہیں۔ یہ کتاب اپنی تاریخی اور ادبی اطلاعات نیز اپنے منفرد اسلوب نگارش کی بنا پر قبول عام کا درجہ رکھتی ہے۔

قاضی حمید الدین بلخی کی مقامات حمیدی بھی اسی دور کی تخلیق ہے جو عربی کی مشہور کتاب مقامات حریری کے طرز پر لکھی گئی۔ انوری مقامات حمیدی کو فصاحت و بلاغت کا سب سے اعلیٰ نمونہ سمجھتا تھا۔ اس دور میں انشا کے دو مجموعے عتبۃ الکتبہ اور التوسل الی الترسل ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ اوّل الذکر سلطان سنجر سلجوقی کے منشی (سکریٹری) منتجب الدین بدیع کے منشآت کا مجموعہ ہے اور دوسرا علاء الدین تکش خوارزم شاہ (۵۶۸ - ۵۹۶ھ/ ۱۱۷۲ - ۱۱۹۹ء) کے منشی بہاء الدین محمد بغدادی کے منشآت کا۔ فارسی میں انشا کی جو اہمیت رہی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ دونوں کتابیں بعد کے ادوار میں نمونہ کا کام کرتی رہیں۔

فصاحت و بلاغت، علم بیان و بدیع اور شعریات پر اس دور کی تین کتابیں اہم ہیں۔ پہلی محمد بن عمر رادویانی کی ترجمان البلاغہ، دوسری رشید وطواط کی حدائق السحر اور تیسری شمس الدین محمد بن قیس رازی کی المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے ان تینوں کتابوں میں سیکڑوں شعرا کے اشعار مثال کے طور پر درج کیے گئے ہیں جن کا ذکر کم ملتا ہے۔

سلجوقی دور میں نجوم، ہیئت وغیرہ پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں جن سے فارسی نثر کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ایلخانی اور تیموری دور

(۶۲۸ھ - ۹۱۱ھ/ ۱۲۳۰ء - ۱۵۰۵ء)

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) اپنے دامن میں قیامت لے کر آئی۔ اس صدی کے آغاز میں چنگیز خاں نے جہان اسلام پر حملہ کیا، خوارزم شاہیوں کو فنا کے گھاٹ اتارا اور ایران اور اس کے ہمسایوں کو تہ تیغ کر دیا۔ آگے چل کر عباسی خلافت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ چنگیز اور ہلاکو کی اولاد کا ایران پر ایلخانیوں کے نام سے تسلط رہا۔ اس سلسلے کا ایک فرمانروا غازان خاں ہے جس نے اسلام قبول کیا۔ ایلخانی ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء تک حکومت کرتے رہے۔ ان کی حکومت کے خاتمے کے تقریباً پچاس سال بعد ایران کو تیمور نے تسخیر کیا، جس کی اولاد دسویں صدی ہجری کے اوائل (سولھویں صدی عیسوی) تک ایران کے تخت پر متمکن رہی۔

ایران پر منگولوں اور تیموریوں کے وحشتناک حملوں نے آبادیوں کی آبادیاں ویران کر دیں اور بے شمار علما، فضلا، شاعر اور ادیب قتل کر دیے گئے۔ مدارس اور مساجد و معابد نیست و نابود ہو گئے۔ وحشت و بربریت نے زندگی کے ہر شعبے پر موت کا سناٹا طاری کر دیا، لیکن جب منگول مشرف بہ اسلام ہوتے اور ملک میں امن و امان کی فضا پیدا ہوئی تو علما، ادبا اور شعرا کے ہاتھوں علم و ادب کی بازیابی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

منگولوں کے حملے کی وجہ سے متعدد ایرانی دانشور، ادیب، شاعر اور صوفی

اپنے وطن سے ہجرت کرکے آس پاس کے ممالک میں پناہ گزیں ہوگئے۔ اس مہاجرت سے فارسی زبان وادب کی دنیا وسیع ہوئی۔ ایران سے باہر کے ان فارسی مراکز میں ہندوستان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں عمید لونکی، امیر خسرو دہلوی، امیر حسن سنجری دہلوی وغیرہ نے فارسی زبان وادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

سلجوقی دور کے وسط سے فارسی نظم ونثر میں عربی کے مغلق الفاظ وتراکیب اور علمی اصطلاحات راہ پانے لگے نثر میں پیچیدہ اور طویل جملے داخل ہوتے اس اسلوب نگارش نے سب سے زیادہ نقصان تاریخ نویسی کو پہنچایا جس سے منگولوں اور تیموریوں دونوں کو لگاؤ تھا۔ لیکن تاریخ کا یہ عجیب طنز ہے کہ فارسی کے تین عظیم ترین شاعر مولانا جلال الدین رومی، شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اسی دور سے متعلق ہیں، اور یہ بھی اتفاق ہے کہ فارسی کی عظیم کلاسیکی شاعری اسی دور میں جامی پر ختم ہوتی ہے۔

ایلخانی اور تیموری دور میں فارسی زبان وادب کو جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے۔ غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ علماء، شعراء اور ادباء کی ایک بہت بڑی تعداد اس دور میں نظر آتی ہے۔

مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی (متوفی: ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء) اس دور کا مایۂ ناز شاعر اور ادیب ہے۔ سعدی نے اپنے کلام میں فصاحت وبلاغت کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ اس کی پیروی تقریباً ناممکن ہے۔ مبدۂ فیاض نے سعدی کو دیدۂ بینا اور قلب حساس عطا کیا تھا جس کی بدولت وہ ذات وکائنات کے اسرار کو سمجھ سکے۔ سونے پر سہاگہ ان کی طویل سیاحتوں سے ہوگیا۔ سعدی نے گلستاں اور بوستاں کے علاوہ قصائد، غزلیات، ترجیع بند، رباعیات اور قطعات وغیرہ کا اہم ذخیرہ چھوڑا ہے ان کے قصائد میں محض مدح سرائی نہیں بلکہ نہایت شگفتہ اور دل پذیر انداز میں ممدوح کو عدل وانصاف، نیکی اور حسن عمل کی دعوت ہے۔ اس طرح شیخ سعدی نے قصیدہ سرائی کو ایک نئی جہت بخشی۔ عروس غزل کی آرائش بھی سعدی کا غیر معمولی کارنامہ ہے اور انہیں بجا طور پر اس صنف لطیف کا پیغمبر کہا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق وسرمستی، سوز وگداز، ذوق وشوق تخیل کی بلند پروازی، نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کا کمال ہے۔ سعدی نے غزل کو جو فارسی شاعری میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی، صف اوّل میں لاکھڑا کیا اور اس کے بعد فارسی شاعری کی تمام اصناف میں سرداری کا تاج ہمیشہ غزل کے سر پر رہا۔ سعدی کا کلام اعجاز کی حد تک سہل ممتنع ہے۔

بوستاں (تصنیف ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء) سعدی کی مشہور مثنوی ہے۔ اس کا موضوع اخلاقی تربیت اور انسانیت کی تکمیل ہے۔ سعدی نے اپنے شیریں انداز بیان اور لطیف حکایات کی پیوند کاری سے بوستاں میں وہ حسن پیدا کیا کہ چھوٹے بڑے سبھی اس کے شیدائی ہیں اور صدیوں سے یہ کتاب درس میں شامل ہے۔

سعدی فارسی کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں۔ ان کی تخلیق "گلستاں" (تصنیف: ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء) فارسی نثر کا لاجواب شاہکار ہے۔ نہ جانے کتنے باکمال ادیبوں نے گلستاں کی تقلید میں کتابیں لکھیں مگر وہ سب گلستاں کی نقل سے زیادہ نہیں۔ "بوستاں" دس باب پر مشتمل ہے مگر گلستاں میں کل آٹھ ابواب ہیں لیکن دونوں کتابوں کے موضوعات اجتماعی، اخلاقی اور انسانی تربیت سے متعلق اور بڑی حد تک ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ گلستاں ایک ایسی دنیا کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں سعدی نے خود زندگی گزاری ہے، بڑا کمال یہ ہے کہ صاحب کتاب نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو آفاقیت عطا کردی ہے گلستاں کی نثر بڑی حد تک موزوں ہے۔ سجع آرائش نے اسے شعر منثور بنا دیا ہے اور جگہ جگہ اشعار کی پیوند کاری نے گلستاں کی شعریت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ جامی نے اسی لیے گلستاں کے بارے میں کہا ہے کہ یہ گلستاں نہیں بلکہ باغ بہشت ہے۔

مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) فارسی کے سب سے عظیم صوفی شاعر ہیں۔ منگولوں کے حملے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ بلخ سے ہجرت کرکے ترکی چلے گئے اور وہاں کے شہر قونیہ میں اپنے والد کی طرح درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ حسن اتفاق ہے کہ قونیہ میں ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی جو شمس تبریزی کے لقب سے معروف ہیں۔ اس ملاقات نے مولانا کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا اور وہ درس وتدریس چھوڑ کر طریقت اور معرفت کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ مولانا روم کا شاہکار مثنوی معنوی ہے جو ۶ دفتروں پر مشتمل ہے اور جسے 'ہست قرآن در زبان پہلوی' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس کے سوا مولانا کی غزلیات کا ایک مجموعہ ہے جو دیوان شمس تبریز کے عنوان سے معروف ہے ان کے ملفوظات کو مولانا کے شاگرد معین الدین پروانہ نے 'فیہ ما فیہ' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ مثنوی مولانا روم روحانی تعلیم وتربیت کی ایک بنیادی کتاب ہے اور فارسی کے ہر صوفی شاعر وادیب نے اس کا اثر قبول کیا ہے۔ مولانا نے عرفان ومعنویت کے دقیق اسرار کو استدلال کے ذریعہ نہیں بلکہ استعارہ وکنایہ اور تشبیہ وتمثیل کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دلچسپ حکایات وامثال سے کام لیا ہے۔ درحقیقت حدیث دیگراں کے پردے میں انھوں نے سِرِّ دلبراں کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں بعض نار وا حکایتیں بھی آگئی ہیں لیکن مولانا کا مقصد حقیقت تک رہنمائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مولانا کے غزلیات میں بھی مثنوی کی طرح شرابِ معرفت کے جام چھلکتے ہیں۔ یہ غزلیات جذب وکیفیت اور ذوق وشوق سے تابندہ ہیں۔ دور حاضر کے عظیم فارسی شاعر علامہ اقبال، مولانا روم ہی کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔

مثنوی مولانا روم کے علاوہ بھی اس دور میں تصوف پر چند اہم مثنویاں نظم کی گئیں جن میں فخر الدین ابراہیم عراقی (متوفی ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء) کی مثنوی عشاق نامہ (دہ نامہ) شامل ہے عراقی نے اس مثنوی میں جگہ جگہ غزل کی پیوند کاری کی ہے، درحقیقت عراقی کا اصل کمال اس کی پرسوز غزلوں میں ہے جو اس نے جذب وکیفیت کے عالم میں کہی ہیں۔ عراقی نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں سیر وسلوک کی منزلیں طے کی تھیں اور شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔

شیخ سعد الدین محمود بن عبدالکریم شبستری (متوفی: ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء) کی مثنوی گلشن راز صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید اور صوفی شاعر سید امیر حسینی ہروی نے شیخ شبستری سے عرفان وتصوف سے متعلق سترہ سوالات کیے تھے۔ مثنوی گلشن راز انہی سوالات کے جواب میں نظم کی گئی ہے اور اس طرح اس میں نظری تصوف کے بنیادی مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے، غالباً اسی بنا پر یہ کتاب ہر دور میں مقبول رہی اور اس کی مختلف شرحیں لکھی

گئیں۔ علامہ اقبال نے بھی ایک مثنوی کا نام گلشن راز جدید رکھا ہے۔ شبستری کی دوسری مثنوی سعادت نامہ ہے۔ نثر میں بھی ان کی چند کتابیں ہیں جن میں حق الیقین فی معرفۃ رب العالمین اہم ہے۔ خود امیر حسینی نے تصوف میں تین مثنویاں نظم کیں۔ زاد المسافرین، کنز الرموز اور سی نامہ، ان کے قصائد اور غزلیات بھی تصوف سے مملو ہیں۔

اوحدی مراغی (م ۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء) کی جام جم اور مثنوی دہ نامہ بھی عرفان و تصوف کی مشہور مثنویاں ہیں، بعض لوگ جام جم کو حدیقۂ سنائی پر ترجیح دیتے ہیں۔

خواجو کرمانی (م ۷۵۰ھ / ۱۳۴۹ء) نے جن کی طرز غزل کے حافظ شیدائی تھے، فردوسی اور نظامی کے تتبع میں چھ مثنویاں لکھیں جن کے نام: سام نامہ، ہمائے و ہمایون، گل و نوروز، روضۃ الانوار، کمال نامہ اور گوہر نامہ ہیں۔ ان میں سام نامہ رزمیہ، ہمائے و ہمایون اور گل و نوروز عشقیہ، روضۃ الانوار اخلاقی اور کمال نامہ عرفانی مثنویاں ہیں۔ گوہر نامہ میں نظام الملک طوسی اور ان کے اخلاف کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔

منگول عہد کے شعرا میں ابن یمین فریومدی (م ۷۶۹ھ / ۱۳۶۸ء) اپنے پر مغز قطعات کے لیے معروف ہے جس میں وہ اخلاق و تربیت کی دعوت دیتا ہے، اس کی بے تکلف شاعری عہد غزنوی کے خراسانی سبک کی یاد تازہ کراتی ہے۔

ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ قدیم بھی ہے اور غنی بھی، جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر کے اسے اپنی قلمرو کا حصہ بنایا تو اس خطے میں بڑی تعداد میں ایرانی اور ترک سکونت پذیر ہو گئے۔ پنجاب کا مرکزی شہر لاہور تھا اس لیے یہی شہر سب سے پہلے فارسی زبان و ادب کا مرکز قرار پایا۔ غزنویوں کے بعد پنجاب اور تقریباً تمام شمالی ہند پر غوریوں کا قبضہ ہو گیا۔ غوریوں کی طرف سے سلطان قطب الدین ایبک (متوفی: ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء) ہندوستانی قلمرو کا فرمانروا مقرر ہوا۔ اس نے دہلی کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس دور کے چند ہندوستانی فارسی شعرا کے نام تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں محفوظ ہیں جن کے کلام کے جستہ جستہ نمونے شاعری میں ان کی عظمت کے شاہد ہیں۔

امیر خسرو سے پہلے کے ہندوستانی شعرا میں مسعود سعد سلمان اور ابو الفرج رونی کا ذکر ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں عثمٰی لاہوری، عمید الدین سنامی لوئکی (ایلتتمش کے جانشین سلطان ناصر الدین محمود کا معاصر)، سراج الدین سراجی یا سراج (مقتول: ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء) تاج الدین ریزہ (متوفی: ۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء) جمال الدین ہانسوی (متوفی: ۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء) اور شہاب الدین مہمرہ بدایونی (متوفی قبل از: ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امیر خسرو دہلوی (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) ہندوستان میں فارسی کے سب سے عظیم سخنور ہیں۔ ان کے لقب طوطی ہند سے ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خسرو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب، انشا پرداز اور مورخ بھی تھے ہندوی اور موسیقی میں ان کی مہارت کے چرچے عام ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں پانچ دیوان مرتب کیے: تحفۃ الصغر، وسط الحیوۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال۔ یہ دواوین قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہیں اور ان میں سولہ سال سے آخری عمر تک کا کلام شامل ہے۔ علاوہ ازیں خسرو نے نظامی گنجوی کی تقلید میں مثنویوں کا خمسہ بھی نظم کیا جو مطلع الانوار، شیرین و خسرو، مجنون و لیلی، آئینۂ سکندری اور ہشت بہشت پر مشتمل ہے۔ جامی نے انصاف کی بات کہی ہے کہ نظامی کے خمسے کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ ان پانچ مثنویوں کے علاوہ خسرو نے چند تاریخی مثنویاں بھی نظم کیں جن میں دول رانی و خضر خاں، نہ سپہر، تغلق نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خزائن الفتوح اور اعجاز خسروی ان کی منثور تصانیف ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (متوفی: ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) کے ملفوظات پر مشتمل افضل الفوائد بھی ان سے منسوب ہے۔ خسرو کے کلام میں فارسی کے عظیم ترین شعرا کے اسلوب کی حسین آمیزش ہے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی، حکمت و موعظت میں سنائی و خاقانی اور قصائد میں رضی الدین نیشاپوری اور خلاق المعانی کمال الدین اسماعیل سے متاثر ہیں لیکن قصیدے میں خسرو کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ خسرو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات میں عشق کا سچا تجربہ اور حقیقی واردات کی جھلک موجود ہے یہی واقعہ گوئی خسرو کی غزل کو امتیازی رنگ بخشتی ہے۔ بحروں کی موزونی، اسلوب کی ندرت، معاملہ بندی، مضمون آفرینی اور سلاست زبان اور نغمگی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے خسرو کو فارسی غزل گو شعرا میں وقار و اعتبار حاصل ہے۔ خسرو کی ایک امتیازی شان یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی منظوم و منثور تصانیف میں ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انہیں اس ملک کی تاریخ، زبان، تہذیب و تمدن، رسم و رواج، پھول پودے اور دستکاری وغیرہ سے عشق ہے۔ فارسی ادب میں خسرو کی عظمت کا اندازہ کسی قدر مبالغہ کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی کے اس حقیقت افروز بیان سے ہوتا ہے کہ: "ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی اور نظامی مثنوی میں، انوری اور کمال قصائد میں، سعدی اور حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے تھے تو پھیکے پڑ جاتے تھے۔ بخلاف اس کے امیر قصائد، مثنوی، غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے تھے۔"

خسرو کے یار غار امیر حسن سجزی (م ۷۳۷ھ / ۱۳۳۶ء) غزل میں خسرو سے ٹکر لیتے تھے، بعض نقادان کی غزل کو خسرو پر ترجیح دیتے ہیں، بہر حال ان کا لقب "سعدی ہند" غزل گوئی میں امیر حسن کی عظمت کی شہادت دیتا ہے۔ ان کی تالیف "فوائد الفواد" ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔

لسان الغیب اور ترجمان الاسرار خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (متوفی: ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء) غزل کے وہ مایہ ناز شاعر ہیں جن کا بدل آج تک فارسی شاعری فراہم نہیں کر سکی۔ انہوں نے متداول علوم کی تحصیل کے علاوہ مختلف قراءتوں کے ساتھ قرآن حفظ کیا اور اسی مناسبت سے حافظ تخلص اختیار کیا۔ حافظ کا دور سیاسی انقلابات اور خونریزی کا دور تھا۔ منگولوں کی قدرت مند سلطنت ختم ہو چکی تھی اور پورے ایران میں چھوٹی چھوٹی علاقائی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ شیراز میں بھی ابو اسحاق اینجو برسر اقتدار آیا لیکن ۷۵۸ھ / ۱۳۵۷ء میں اس کو قتل کر کے امیر مبارز الدین نے آل مظفر کی حکومت قائم کر لی مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کے بیٹوں نے اسے قید کر کے اندھا کر دیا۔ آل مظفر کے دو بادشاہ شاہ شجاع (م ۷۸۶ھ / ۱۳۸۴ء) اور شاہ منصور (م ۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء) حافظ کے معاصر ہیں لیکن اسی دوران تیمور کے حملوں نے شیراز

کا سکون درہم برہم کر دیا اور آخر کار ۷۹۵ھ / ۱۳۹۲ء میں آلِ مظفر کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔ حافظ کی شاعری کا شہرہ ان کی زندگی میں دور دور تک پھیل گیا تھا۔ ہندوستان میں ان کے قدردانوں کی کمی نہیں تھی، چنانچہ بہمنی سلطان محمود دوم کے وزیر فضل اللہ انجو نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی۔ اسی طرح بنگال کے فرمانروا سلطان غیاث الدین نے بھی انہیں بنگال آنے کی دعوت دی، مگر حافظ ہندوستان نہیں آسکے اور انہوں نے معذرت میں اپنی بعض غزلیں بھیج دیں۔

حافظ کے انتقال کے بعد ان کے دیوان کو ایک ہم عصر محمد گلندام نے مرتب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا جس سے حافظ کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ دیوان حافظ میں پانچ قصیدے، غزلیات، چند مختصر مثنویاں، قطعات اور رباعیات شامل ہیں لیکن دیوان کا غالب حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور حافظ کے فن کی معراج بھی غزل گوئی ہے۔

حافظ نے بنظرِ غائر متقدمین اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا اور ان کی غزلوں کے تتبع میں غزلیں کہیں۔ ان اساتذہ میں مولانا روم، سعدی، ہمام تبریزی، کمال اسماعیل، اوحدی مراغہ ای، خواجو اور سلمان ساوجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواجو کو حافظ غزل میں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ سلمان ساوجی حافظ کے معاصر اور عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن دونوں کے کلام میں بعض جگہ ایسی مماثلت ملتی ہے کہ بعد میں سلمان کی متعدد غزلیں دیوان حافظ میں شامل ہو گئیں۔

حافظ کو یہ انوکھا امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کے دیوان سے اہل حاجت فال نکالتے ہیں۔ دیوان حافظ سے فال نکالنے کے بہت سے واقعات کتابوں میں درج ہیں اور اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اسی بنا پر حافظ کو "لسان الغیب" کہا جاتا ہے۔

حافظ کی غزل میں جو لطافت، شیرینی، تہ داری اور گہرائی ہے فارسی غزل کی طویل تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ غزلیں درحقیقت سہل ممتنع کا اعجاز ہیں اور ان پر ترقی کا تصور تقریباً ناممکن ہے۔ حافظ کی غزلوں میں ایسی معنویت اور جامعیت ہے کہ رند و صوفی، عالم و عامی، شیخ و برہمن سبھی ان کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ فارسی غزل گوئی حافظ پر ختم ہو گئی، اس کے بعد غزل کی جو روایت باقی رہی وہ حافظ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں بالترتیب سعدی اور حافظ فوت ہوئے اور نویں صدی ہجری ختم ہونے کو آئی تو کلاسیکی فارسی شاعری کے آخری عظیم سخنور نور الدین عبدالرحمٰن جامی نے داعی اجل کو لبیک کہا (۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء) جامی کے بعد ایران و افغانستان کی سرزمین سے اس مرتبہ کا کوئی شاعر نہیں اٹھا۔ اسی وجہ سے ان کو خاتم الشعرا کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ نقشبندی سلسلہ کے مرشدوں میں سے تھے، اس لیے عوام و خواص، سبھی ان کی عزت کرتے تھے سلطان حسین بایقرا (متوفی: ۹۱۲ھ / ۱۵۰۷ء) اور اس کا دانشمند وزیر امیر علی شیر نوائی (متوفی: ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء) کو جامی سے گہرا لگاؤ تھا اور جب ان کا انتقال ہوا تو حافظ کی طرح جامی کے قدرداں بھی سارے جہان اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ بہمنی سلاطین کا مشہور وزیر محمود گاواں (م۔ ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء) بھی ان کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔

جامی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انہوں نے عمر کے لحاظ سے اپنے دیوان کے تین مجموعے فاتحۃ الشباب، واسطۃ العقد اور خاتمۃ الحیات کے عنوان سے مرتب کیے۔ اس ترتیب میں ان کے سامنے امیر خسرو کی مثال موجود تھی، ان دواوین میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات وغیرہ ہیں۔ جامی کے قصائد متین اور اساتذۂ سلف کے رنگ میں ہیں۔ ان کی غزلیات عارفانہ نوعیت کی ہیں۔ عارفانہ غزل درحقیقت جامی پر تمام ہوتی ہے۔ جامی نے خمسۂ نظامی کے جواب میں سات مثنویاں نظم کیں جو ہفت اورنگ کہلاتی ہیں۔ ان میں سلسلۃ الذہب، سبحۃ الابرار، اور تحفۃ الاحرار عرفانی اور اخلاقی مثنویاں ہیں۔ سلامان و ابسال، یوسف و زلیخا اور لیلی و مجنون عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہیں اور خرد نامۂ اسکندری یونانی فلسفہ و حکمت کے موضوع پر ہے ان منظوم تخلیقات کے علاوہ جامی نے تصوف، اسلامیات، نحو، عروض، قافیہ اور معما وغیرہ پر متعدد چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ گلستان سعدی کے جواب میں لکھی گئی کتابوں میں جامی کی بہارستان اہم ہے۔ نفحات الانس صوفیا اور مشائخ کا معتبر تذکرہ ہے لوایح میں نظری تصوف کے نکات بیان کیے گئے ہیں اور اشعۃ اللمعات اسی موضوع پر عراقی کی لمعات کی شرح ہے۔

منگول اور تیموری دور میں جو کم و بیش تین صدیوں (ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی ہجری) پر مشتمل ہے ان عظیم شعرا کے علاوہ بہت سے سخنور اور بھی تھے جنہوں نے اپنے قلم سے فارسی شاعری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے بعض اہم شعرا درج ذیل ہیں:

نجیب جرباذقانی، افضل الدین کاشانی، مجد ہمگر، امامی ہروی، بدر جاجرمی، سیف فرغانی، ہمام تبریزی، بدر چاچی، عصامی (فتوح السلاطین کا شاعر) رکن صائن شیرازی، عبید زاکانی، کمال خجندی، مغربی، نعمت اللہ ولی (احمد شاہ بہمنی کے مرشد معنوی)، ابو اسحاق اطعمہ، قاسم انوار، آذری، آصفی، بنائی وغیرہ۔

ایلخانی اور تیموری دور میں نثر میں مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تالیف کی گئیں جن میں سے بعض بہت اہم ہیں۔ تاریخ نویسی کے لحاظ سے اس دور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ منگول اور تیموری فرمانرواؤں کو اپنی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی اور اس بنا پر انہوں نے تاریخ نویسی کی سرپرستی کی۔ اس دور کی اہم ترین تاریخی کتب میں علاء الدین عطا ملک جوینی (متوفی: ۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء) کی تاریخ جہاں گشائے ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چنگیز کی فتوحات اور ایران کے منگول حکمرانوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں نیز خوارزم شاہیوں اور اسماعیلیوں کے حالات بھی درج ہیں۔ منگولوں کی دوسری اہم تاریخ 'جامع التواریخ' ہے جس کا مصنف منگول فرمانرواؤں کا وزیر رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہے، جسے ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء میں منگول فرمانروا ابو سعید بہادر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ رشید الدین نے اپنے خطوط اور فرامین کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا ہے شہاب الدین عبداللہ شیرازی ملقب بہ وصاف حضرت نے ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی فتح (۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء) سے لے کر ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء تک کے واقعات اپنی کتاب تاریخ میں بیان کیے ہیں لیکن غیر ضروری طول کلام، پیچیدہ اور انتہائی مغلق عبارت اور بے حد پر تکلف انداز بیان کی وجہ سے یہ کتاب عام فارسی دانوں کی سمجھ سے بالا ہے، اسی بنا پر اس کی تاریخی اطلاعات سے کم استفادہ کیا گیا ہے۔ منگولوں کی مخصوص تاریخ کے علاوہ اس دور میں تاریخ کی اور متعدد کتابیں بھی تالیف ہوئیں۔

شہاب الدین محمد زیدری (م ۶۴۷ھ / ۱۲۴۹ء) نے آخری خوارزم

شاہ جلال الدین منکبرنی کی تاریخ عربی میں لکھی اور بعد میں اسی موضوع پر نفثۃ المصدور تالیف کی۔ ہندو شاہ بن سنجر نے عباسی خلافت کے خاتمہ تک کی تاریخ اسلام تجارب السلف کے نام سے ۷۲۳-۷۲۴ھ/۱۳۲۳-۱۳۲۴ء میں مرتب کی۔ فخر الدین داؤد بناکتی کی تاریخ بناکتی (تالیف شوال ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء) دنیا کی عمومی تاریخ ہے جس میں خاص طور پر منگول فرمانرواؤں کا ذکر ہے۔ عمومی تاریخ کی کتابوں میں حمداللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ (تالیف ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء) بھی خاصی اہم ہے۔ مستوفی کی دوسری اہم کتاب نزہت القلوب ہے اس کا موضوع جہان اسلام کا جغرافیہ ہے۔

تیموری دور کی اہم تاریخی کتب میں معین الدین یزدی کی تالیف مواہب الٰہی ہے جو شیراز کے آل مظفر کی تاریخ ہے (تالیف ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء) شیراز اور وہاں کے علما اور دانشوروں کی انتہائی اہم تاریخ شیراز نامہ ہے جس کا مؤلف ابن ابی الخیر زرکوب ہے۔ یہ کتاب ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء میں مکمل ہوئی اور اس کا انتساب حافظ کے سرپرست حاجی قوام کے نام ہے۔ خود تیمور کے حالات اور فتوحات پر دو کتابیں لکھی گئیں اور دونوں کا نام ظفر نامہ ہے۔ ایک کی تالیف نظام الدین شامی نے کی اس میں ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء تک کے واقعات درج ہیں اور دوسری کا مؤلف شرف الدین علی یزدی ہے۔ اس نے شیراز میں ۸۲۸ھ/۱۴۲۴ء میں اس تاریخ کو مکمل کیا۔ حافظ ابرو اس دور کا ایک اور اہم مورخ ہے جس کی مجمع التواریخ اور زبدۃ التواریخ میں ۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء تک مغلوں اور تیموریوں کی تاریخ درج ہے۔ تیموریوں کی ایک اور اہم تاریخ کمال الدین عبدالرزاق کی "مطلع سعدین" ہے جس میں آخری منگول بادشاہ ابوسعید سے لے کر آخری قدرت مند تیموری فرمانروا ابوسعید کے دور تک کی تاریخ درج ہے۔ تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ میرخواند کی روضۃ الصفا اور خواند میر کی حبیب السیر پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں عمومی تاریخیں ہیں لیکن اسلام اور ایران کی تاریخ خاص طور پر ان کا موضوع ہے۔

اس پورے دور میں یعنی عہد سلطنت کے آغاز سے لے کر مغل حکومت کے قیام تک ہندوستان میں تاریخ کی متعدد معروف کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں صدر الدین حسن نیشاپوری کی تاج المآثر ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ علی بن حامد کی چچ نامہ فارسی میں سندھ کی پہلی تاریخ ہے (تالیف قبل از ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء) عمر منہاج سراج جوزجانی کی طبقات ناصری عہد سلطنت کی تاریخوں میں انتہائی اہم ہے۔ ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف دونوں نے فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ/۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) کے حالات کو تاریخ فیروز شاہی کے عنوان سے قلم بند کیا۔

تاریخ کی یہ سبھی کتابیں تاریخی معلومات کے علاوہ اپنے مخصوص اسلوب کے لیے مشہور ہیں کیوں کہ ہر مورخ یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی تالیف صرف تاریخی اطلاعات تک محدود نہ رہے بلکہ انشاء اور اسلوب کے لحاظ سے بھی اس میں ندرت ہو۔ ہندوستان کے لیے یہ بھی فخر کی بات ہے کہ اسی دور میں فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ "لباب الالباب" یہاں لکھا گیا۔ اس کا مولف محمد عوفی سلطان ناصر الدین قباچہ (متوفی ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء) کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس کی پہلی جلد میں شعر کہنے والے سلاطین، وزرا، امرا اور حکما کے حالات اور کلام کے نمونے نقل کیے گئے ہیں دوسری جلد عام شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے۔ عوفی نے کئی جلدوں میں جوامع الحکایات مرتب کی جس میں تاریخی اور نیم تاریخی حکایتیں درج ہیں۔ فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعرا ہے (تالیف: ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء) لیکن لباب الالباب کے مقابلے میں اس کی اطلاعات مشکوک ہیں۔ اسی دور میں تصوف پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں محقق ترمذی کی معارف، مقالات شمس تبریزی، بابا افضل کاشی کی تالیفات، ترجمہ احیاء العلوم، نجم الدین رازی دایہ (م ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء) کی مرصاد العباد، سیف الدین باخرزی کے پوتے ابو المفاخر یحییٰ کی اوراد الاحباب، شمس الدین احمد افلاکی کی مناقب العارفین (مولینا روم کے بارے میں مستند کتاب) اور خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء) کی فصل الخطاب اور انیس الطالبین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں ہندوستان میں بھی تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں تحریر ہوئیں جن میں حضرت سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کے رسائل، حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات فوائد الفواد اور افضل الفوائد، حضرت نصیر الدین محمد چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس اور امیر خورد کرمانی کی سیر الاولیا، حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے آثار، حضرت یحییٰ منیری کے مکتوبات اور شیخ جمالی دہلوی کی سیر العارفین حامل اہمیت ہیں۔ ہندوستان کے متعدد صوفیائے کرام کی تالیفات اور ملفوظات بھی موجود ہیں مگر محققین کو ان سبھی کے مصدقہ ہونے میں شک ہے۔

اسی دور میں اخلاق پر تین اہم کتابیں تالیف ہوئیں جو عرصہ تک ہمارے درس میں شامل رہی ہیں۔ یہ ہیں نصیر الدین محقق طوسی (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کی اخلاق ناصری، جلال الدین دوّانی کی اخلاق جلالی اور ملا واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی، مؤخر الذکر کتاب کا اردو ترجمہ میر امن دہلوی نے گنج خوبی کے نام سے کیا۔ کاشفی نے کلیلہ دمنہ کے قصوں کو انوار سہیلی کے عنوان سے لکھا اور اسی کو بعد میں ابو الفضل نے عیار دانش کی شکل میں پیش کیا۔ داستانوں کی تین اہم کتابیں بساتین الانس، طوطی نامہ اور گلریز ہیں جو عہد تغلق میں لکھی گئیں بساتین کا مصنف محمد صدر علاء احمد افتسان ہے اور مؤخر الذکر دو کتابیں عہد تغلق کے مشہور ادیب اور شاعر ضیاء الدین نخشبی (م ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) کی تالیف ہیں۔ اسی عہد کی ایک اور اہم کتاب انشائے ماہرو ہے جو تغلق عہد کے مشہور امیر عین الملک ملتانی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ بہمنی سلاطین کے وزیر خواجہ محمود گاواں نے بھی اپنے خطوط کو ریاض الانشا کے نام سے مرتب کیا اور فن انشا پر مناظر الانشا لکھی۔

صفوی اور قاچاری دور

(۹۰۷ھ-۱۳۲۴ھ/۱۵۰۱ء-۱۹۰۶ء)

ایران میں تیموری سلطنت کے بعد صفوی بادشاہوں کا دور شروع ہوا شیخ صفی الدین اردبیلی کی اولاد میں سے ایک شخص اسماعیل حیدر نے صفوی سلطنت کی بنیاد ڈالی (۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء) اس خاندان نے ایران پر دو سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ صفویوں کی حکومت کو نادر شاہ افشار نے ختم کر دیا اور کریم خاں زند نے افشاریوں کی فرمانروائی کا خاتمہ کیا اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء

میں خود زند حکومت آقا محمد خان قاچار کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے قاچاریوں کی سلطنت بھی ڈانوا ڈول ہونے لگی اور آخر کار رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

صفوی بادشاہ مذہب میں کٹر تھے۔ انہوں نے شعر و ادب کی بجائے مذہب کی طرف زیادہ توجہ دی چنانچہ اس دور میں علما کو عروج حاصل ہوا۔ فقہ، تفسیر اور اسلامیات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ محمد باقر مجلسی (متوفی: 1111ھ/1700ء) نے دینی موضوعات پر فارسی میں لگ بھگ پچاس کتابیں تالیف کیں۔ علما اور فقہا کے عروج نے شاعروں کی رونق کو بہت بڑی حد تک کم کر دیا چنانچہ بہت سے شاعر، ادیب اور دانشور ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے اور مغل بادشاہوں کے زیر سایہ شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے؛ پھر بھی صفوی دور میں ایران میں چند معروف شعرا نظر آتے ہیں ان میں محتشم کاشانی (متوفی: 992ھ/1588ء) کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے متعلق تھا۔ اس نے شروع میں غزلیات و قصائد لکھے لیکن صفوی دربار سے وابستگی کے بعد اس نے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ محتشم فارسی میں سب سے اہم مرثیہ گو شاعر ہے اور اس کے مرثیے عام لوگوں میں بھی مقبول ہیں۔

بابا فغانی (متوفی: 925ھ/1519ء) کو غزل کے ایک نئے مکتب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ مکتب ہے جسے ہندوستان میں فارسی شعرا نے عروج پر پہنچایا اور جسے فارسی شاعری کی تاریخ میں سبک ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔ صفوی دور کے دیگر اہم شعرا میں مولانا جامی کے پوتے عبداللہ ہاتفی خرجردی (متوفی: 927ھ/1520ء)، امیدی تہرانی (م۔ 925ھ/1519ء)، اہلی ترشیزی (م 934ھ/1527ء)، ہلالی چغتائی (متوفی: 935ھ/1528ء)، لسانی شیرازی (940ھ/1533ء) فضولی بغدادی (970ھ/1562ء) اور زلالی خوانساری (1025ھ/1616ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید احمد ہاتف (متوفی: 1198ھ/1783ء) زند دور کا واحد اہم شاعر ہے جس کا خوبصورت ترجیع بند "وحدہٗ لا الٰہ الا ھو" اس دور کی ایرانی فارسی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا بیٹا سید محمد سحاب (متوفی: 1222ھ/1807ء) بھی ایک خوش گو شاعر تھا۔ رشحات کے نام سے ایک تذکرہ شعرا بھی اس سے منسوب ہے۔

عہد قاچار کے شعرا نے سبک ہندی کی پیچیدہ خیالی اور ایہام گوئی ترک کر کے قدیم سبک خراسانی کی طرف رجوع کیا۔ اسی بنا پر اس دور کو شاعری کے لحاظ سے "دورۂ باز گشت" کہا جاتا ہے۔ اس دور کے معروف سخنوروں میں مجمر (م 1225ھ/1810ء) ملک الشعرا فتح علی خاں صبا (م۔ 1238ھ/1822ء) میرزا عبدالوہاب نشاط (م۔ 1244ھ/1828ء) میرزا ابوالقاسم قائم مقام (م۔ 1251ھ/1835ء)، وصال شیرازی (م۔ 1262ھ/1846ء) اور میرزا حبیب قاآنی (م۔ 1270ھ/1853ء) کے نام شامل ہیں۔ قاآنی کو فارسی کا آخری قصیدہ گو سمجھا جاتا ہے۔

اس دور میں تاریخ، تذکرے، سیر، سوانح، مذہب، فلسفہ اور لغت پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ درحقیقت یہ دور مذہبی کتابوں کی تالیف و تصنیف کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مذہبیات کے علاوہ متعدد علما نے معقولات پر بھی کتابیں لکھیں بلکہ اس موضوع پر فارسی میں لکھی جانے والی کتابوں کا یہ آخری دور ہے، اس کے بعد قدیم منطق اور فلسفہ پر بہت کم کسی نے قلم اٹھایا۔

تاریخ اور تذکرے کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں رضا قلی خان ہدایت کی مجمع الفصحا اور ریاض العارفین ایرانی دانشوروں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نثر میں قائم مقام وغیرہ نے سادہ اور سلیس اسلوب کو رائج کیا اور اس طرح فارسی نثر کو ایک نئی زندگی بخشی۔

مغل دور

(932ھ - 1274ھ/1526ء - 1857ء)

ایران کے صفوی بادشاہ اور ہندوستان کے مغل فرمانروا تقریباً معاصر ہیں لیکن صفویوں نے فارسی شعر و ادب کا دامن چھوڑ کر مذہبیات کی سرپرستی شروع کی تو شاعروں اور ادیبوں نے مغل دربار میں پناہ لینی شروع کی۔ فارسی ادب کی تاریخ میں یہ دور اس لیے بیحد اہم ہے کہ اس عہد میں فارسی شعر و ادب کا مرکز ایران سے ہندوستان منتقل ہو گیا۔ دہلی اور آگرے نے شیراز اور اصفہان کی جگہ لے لی۔ ہندوستان کا فارسی ادب خصوصاً عہد مغل کا اپنی مخصوص روایات کے لیے ممتاز ہے۔ ہمارے ملک میں فلسفے کی روایت بہت قدیم ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں فارسی شاعری میں ایک خاص اسلوب ابھرا جو اپنی فلسفیانہ زبان اور پیچیدہ انداز بیان کے لیے معروف ہے۔ علاوہ ازیں فارسی شاعری میں ہندوستانی روایات داخل ہو گئیں۔ بہت سے فارسی کلمات نے اپنی معنوی وضع بدلی اور بہت سے نئے الفاظ وجود میں آئے۔ نئی نئی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ اس اسلوب کو سبک ہندی کا نام دیا گیا اس کے اجزائے ترکیبی میں تشبیہ و استعارہ و کنایہ کی ندرت، لفظی اور معنوی موشگافیاں زبان و بیان کی نزاکت اور مضمون آفرینی شامل ہیں۔ ان عوامل کی وجہ سے شاعری میں گہرائی آئی اور غور و فکر کا پرچم لہرایا، کہیں کہیں ندرت اور عمق کی کوشش میں شعر چیستاں بن گیا۔

مغل دور کے شعرا کا کمال غزل اور قصیدے میں ہے۔ قصیدہ نگاری درباری زندگی کا لازمی جز و تھی۔ یہ قصائد مغل دور کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کے غماز ہیں۔ مغل سلطنت کا بانی بابر خود صاحب ذوق اور شعر و ادب کا زبردست سرپرست تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح بابر نامہ (توزک بابری) ترکی زبان میں لاثانی ہے، اس کتاب کا فارسی ترجمہ عہد اکبر کے مشہور امیر عبدالرحیم خانخاناں نے کیا۔ ہمایوں اور کامران کے دیوان موجود ہیں۔ جہانگیر کی توزک فارسی نثر کا بہترین نمونہ ہے اور اورنگزیب عالمگیر کے خطوط اپنی دلکشی اور رعنائی میں بے نظیر ہیں۔ مغل بادشاہوں نے اپنے دربار میں ملک الشعرا مقرر کیے، شعرا کو زر و جواہر میں تولا اور سماج میں انہیں قابل رشک مقام عطا کیا۔ غرض شعرا کی جو قدر دانی مغل دربار میں کی گئی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ مغلوں کے امیر اور وزیر بھی فارسی زبان و ادب کے سرپرست اور شیدائی تھے یہی وجہ تھی کہ ایرانی شاعر اور ادیب کھنچ کھنچ کر ہندوستان آ رہے تھے۔ ہر ایرانی شاعر اور ادیب کے سر میں ہندوستان کے سفر کا سودا سمایا ہوا تھا۔ یہ صورت حال تقریباً دو صدی کے عرصے تک برقرار رہی۔

مغل دور فارسی غزل کے لیے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ امیر خسرو کے بعد فیضی، عرفی، نظیری، بیدل اور غالب نے اپنے خون جگر سے شمع غزل کو روشن رکھا۔ مغل دور میں

بے شمار شاعروں اور ادیبوں نے فارسی ادب کی ترقی میں حصہ لیا۔ ان میں سے صرف چند نمائندہ شعرا کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

غزالی مشہدی (متوفی: ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء) اکبر کا ملک الشعرا تھا بلکہ مغل دور میں سب سے پہلا ملک الشعرا ہونے کا افتخار اسی کو حاصل ہوا۔ وہ اس منصب پر فائز ہونے سے پہلے کچھ دن گولکنڈہ میں ابراہیم قطب شاہ کے دربار سے وابستہ رہا تھا۔ غزالی نے قصائد اور غزلیات پر مشتمل ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے اس کو نادرۂ زمان اور جامع کمالات صوری و معنوی کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ابوالفضل نے غزالی کو ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اس کے کلام میں رمز و کنایے کی دلکشی اور فکر انگیز معنویت ہے۔ غزالی مشہدی کے انتقال کے بعد ملک الشعرا کے منصب کے لیے اکبر کی چشم انتخاب فیضی فیاضی (متوفی: ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) پر پڑی۔ فیضی اور اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل نہ صرف اکبری دور کی دو اہم تاریخی اور ادبی شخصیتیں ہیں، بلکہ فارسی ادب کی تاریخ میں بھی ان کا ایک اہم مقام ہے۔ فیضی کی شاعری میں حکمت اور سوز تغزل کا امتزاج ہے اور یہی اس کی غزلیہ شاعری کی دل کشی کا راز ہے۔ کلیات فیضی میں غزل، قصائد، مثنویات وغیرہ ہیں۔ اس کے قصائد زیادہ تر پند و اخلاق یا فلسفہ و مابعد الطبیعیات کے مسائل کو قلمبند کرتے ہیں۔ 'مرکز ادوار' اور 'نل دمن'، فیضی کی دو مثنویاں ہیں۔ اول الذکر نظامی کی مخزن الاسرار کی پیروی میں لکھی گئی ہے اور دوسری میں نل اور دمن کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ نل دمن کے بعد بہت سے شعرا نے ہندوستان کی عشقیہ داستانوں کو نظم کیا جس میں ہیر رانجھا کی داستان خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

جمال الدین محمد عرفی (متوفی: ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء) اکبری دور کا دوسرا اہم شاعر ہے۔ عرفی کی شخصیت اور شاعری بڑی حد تک منفرد ہے۔ اس نے مدحیہ قصیدے لکھے، لیکن اس اعلان حق کے ساتھ کہ مدح سرائی اس کا شیوہ نہیں۔ وہ صرف ایک ممدوح کا ستایشگر ہے اور اس کا ممدوح اس کا معشوق بھی ہے۔ غالب اور اقبال دونوں عرفی سے متاثر ہیں۔ عرفی کی غزلیہ شاعری جذباتیت، سرمستی و سرشاری کے لیے ممتاز ہے۔ وہ صرف چھتیس برس کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا پھر بھی اپنے معاصرین میں اس نے ایک محترم مقام حاصل کر لیا تھا۔

نظیری نیشاپوری (متوفی: ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء) کو مغل عہد کا رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔ اس کی غزل عشق کی تمام کیفیات اور محبت کے جملہ رموز کی آئینہ دار ہے۔ نظیری نے عبدالرحیم خانخاناں کے زیر سرپرستی احمد آباد گجرات میں اپنی زندگی گزاری اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ خانخاناں کا دربار بھی اکبر کے دربار سے کچھ کم نہیں تھا۔ اس دور کے بہت سے اہم شعرا منجملہ عرفی اور نظیری خانخاناں سے وابستہ تھے۔

شیدا فتحپوری (متوفی: ۱۰۸۰ھ / ۱۶۷۰ء) اپنی بے پناہ ذہانت اور بے باک ہزل گوئی کی وجہ سے عہد اکبر کے شعرا میں قابل توجہ ہے۔ اکبر کا دور ہندوستان کی فارسی شاعری کا زریں دور ہے، لیکن شاعری کی شاندار روایت اس کے بعد بھی جاری رہی۔

جہانگیر کے ملک الشعرا طالب آملی کے مطبوعہ دیوان میں بیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں اور اس کا غالب حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ طالب کے کلام میں نئی اور انوکھی ترکیبات کی فراوانی ہے۔ اس کی غزل میں بڑی حد تک نئی زبان اور نئی فضا ملتی ہے۔

ابوطالب کلیم ہمدانی (متوفی: ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۰ء) ایران سے پہلے بیجاپور پہنچا اور ترقی کے منازل طے کرتا ہوا بالآخر شاہ جہاں کے دربار کا ملک الشعرا منتخب ہوا۔ کلیم کا عقیدہ تھا کہ شاعری ہنر آفرینی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو خلاق المعانی ثانی کہا جاتا ہے۔ شاہ جہاں نے ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء میں جب تخت طاؤس پر جلوس کیا تو کلیم نے منظوم تہنیت پیش کی جس کے صلے میں اسے چاندی میں تولا گیا۔ اس کی غزلیات میں درد و سوز کا ایک موثر امتزاج ہے۔ کلیم کی مثنویوں میں شاہ نامہ سب سے طویل ہے۔ اس مثنوی میں اس نے عہد شاہ جہاں کے ابتدائی دس سال کے واقعات نظم کیے ہیں۔

مُلّا طغرا مشہدی (متوفی: ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء)، قدسی مشہدی (متوفی: ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء)، فانی کشمیری (متوفی: ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء) وغیرہ شاہ جہانی دور کے دوسرے معروف شعرا ہیں۔ اس دور کا ایک قابل ذکر شاعر چندر بھان برہمن (متوفی: بعد از ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء) ہے جس کو شاہ جہاں ہندوی فارسی داں کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ برہمن نے فارسی میں متعدد کتابیں تالیف کی ہیں۔ اس کا کلام شستہ اور صاف ہے۔ برہمن کے اشعار کو صائب نے اپنی بیاض میں شامل کیا تھا۔

صائب (متوفی: ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء) ایران سے ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے امیر ظفر خاں احسن کے دربار سے وابستہ رہا۔ کچھ دن تک اسے شاہ جہاں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا۔ اس طرح وہ چھ برس ہندوستان میں مقیم رہنے کے بعد ایران لوٹ گیا جہاں شاہ عباس دوم (متوفی: ۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۸ء) نے اسے ملک الشعرا کا لقب عطا کیا۔ صائب کے اشعار کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے جس میں دو مثنویاں قندھار نامہ اور محمود و ایاز کے علاوہ غزلیات اور قصائد خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ صائب کی شہرت کا انحصار اس کی غزلیات پر ہے جس میں سبک ہندی کی تمام رعنائیاں موجود ہیں۔ ہندوستان اور ایران میں متاخرین شعرا پر صائب کا بہت اثر ہے۔

اس دور میں مُلّا محسن فانی اور محمد طاہر غنی کشمیری کشمیر کے سب سے اہم اور عظیم فارسی شاعر ہیں۔ محسن فانی کی مثنویات اور غنی کی غزلیات ہمیشہ قابل توجہ رہی ہیں کشمیر میں فارسی شاعری کی یہ روایت بعد کے دور میں بھی قایم رہی اور وہاں فارسی کے بہت سے نامور شعرا پیدا ہوئے۔

مرزا عبدالقادر بیدل (متوفی: ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء) عہد اورنگ زیب عالمگیر کا سب سے عظیم شاعر ہے جس کی شاعری نے سبک ہندی کو عروج پر پہنچایا۔ بیدل کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ آٹھ ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس کی کلیات میں قصائد، غزلیات، قطعات و رباعیات کے علاوہ مندرجہ ذیل مثنویاں ہیں: محیط اعظم، طلسم حیرت، طور معرفت اور عرفان۔ بیدل غزل کے شہنشاہ ہیں۔ ان کی زبان، خیال، استعارے، کنایے، تشبیہ و تمثیل، تراکیب و بندش الفاظ سب پر تکلف، تصنع اور وقار کی چادر پڑی ہوئی ہے۔ انہیں پیچیدگی اظہار و بیان پسند ہے۔ ان کا فن طویل اور انتھک دماغی کاوش و ریاض کا ثمرہ ہے۔ فلسفے اور عرفان کے امتزاج نے ان کی غزلیات کو بے حد گہرائی عطا کی ہے۔ بیدل افغانستان اور تاجیکستان میں سبک ہندی کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا ہے، ان کی خودنوشت سوانح

"چہار عنصر" تاریخی واقعات اور فلسفیانہ افکار کا حسین مرقع ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کے اور بھی کئی ایک شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں ناصر علی سرہندی، راسخ سرہندی، فطرت موسوی قمی، عاقل خاں رازی بینش کشمیری، نعمت خاں عالی، اشرف مازندرانی، ارادت خاں واضح اور میر عبدالجلیل بلگرامی اہم ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے بہادر شاہ ظفر تک فارسی کے عظیم شاعروں کی تعداد انگشت شمار ہے، بہرحال ان میں شیخ علی حزیں اور ان کے حریف سراج الدین علی خاں آرزو (م ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء) سرفہرست ہیں آرزو نے شاعری کے علاوہ فارسی لغت میں بھی اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اب شمالی ہندوستان میں اردو شاعری رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ لے رہی تھی، البتہ ابھی فارسی شاعری کے آسمان پر دو اور ستارے طلوع ہونے والے تھے یعنی غالب اور اقبال۔

مرزا اسداللہ خاں غالب (متوفی : ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) مغل دور کے آخری فارسی شاعر ہیں۔ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی لیکن انھیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ غالب پہلے فارسی شاعر ہیں جن کا کلیات ان کی زندگی میں طبع ہوگیا۔ ان کے فارسی کلیات میں قصائد، غزلیات، قطعات اور مثنویاں شامل ہیں۔ ان تمام اصناف سخن پر نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کا حوصلہ اور استعداد رکھتے تھے۔ لیکن ان کا کمال فن ان کی غزلوں میں جلوہ گر ہے۔ غالب نے سبک ہندی کے پیشرو شعرا مثلاً ظہوری، نظیری اور عرفی وغیرہ سے گہرا اثر قبول کیا مگر ان کی شاعری سراسر ابداع ہے تقلید نہیں۔

غالب کے قصائد فارسی کے معروف قصیدہ گو شعرا کے اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی گیارہ فارسی مثنویوں میں غالباً سب سے خوبصورت "چراغ دیر" ہے۔ غالب کی فارسی نثر بھی اپنے دور میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ خالص فارسی کے شیدائی تھے مہر نیم روز اور دستنبو خالص فارسی اسلوب کے لحاظ سے اہم تالیفات ہیں۔ انھوں نے قاطع برہان لکھ کر ہندوستان کے ادب کی تاریخ میں سب سے دلچسپ ادبی معرکہ آرائی کا مواد فراہم کیا۔

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) مغل دور کے بعد ہندوستان کے آخری عظیم فارسی شاعر ہیں۔ فارسی شاعری کی طویل تاریخ میں اقبال کئی اعتبار سے منفرد ہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کے مجموعے اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ اور ارمغان حجاز پر مشتمل ہیں۔ ان میں پہلے دو مجموعے مثنوی کی شکل میں ہیں۔ ارمغان حجاز میں قطعات ہیں اور دیگر مجموعوں میں مختلف اصناف سخن ہیں۔ اقبال نے روایتی اصناف سخن کے ساتھ ساتھ جدید نظم میں بھی اپنے افکار کا اظہار کیا اور اس میں جگہ جگہ ہیئت کے خوبصورت تجربے کیے۔ اقبال کی زبان کے بامحاورہ ہونے کے بارے میں بعض اہل زبان کو کہیں کہیں تامل ہوتا ہے مگر ان کے افکار و خیالات کی ندرت اور تازگی اور ان کے اشعار کی دلکشی اور ان کی وسعت نگاہ انتخابیت اور نظام فکر، تاریخی شعور اور ماورائی کیفیت کا سب کو اعتراف ہے ایران کے موجودہ انقلاب میں جس فارسی شاعر کا کلام سب سے زیادہ استعمال کیا گیا وہ علامہ اقبال ہیں۔

مغلوں نے جس طرح فارسی شاعری کی سرپرستی کی، اسی طرح فارسی نثر نگاری بھی ان کی سرپرستی کی مرہون منت ہے۔ اس دور میں مختلف موضوعات پر بہت سی قابل قدر کتابیں لکھی گئیں جنھیں آج فارسی نثر کا اہم سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مغل بادشاہ خاص طور پر فن تاریخ کے شیدائی تھے۔ ان کے دور میں تاریخ کی متعدد اور اہم کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی بابر کی تزک بابری یا واقعات بابری ہے جو بنیادی طور پر بابر کی سوانح ہے، لیکن اس میں ہندوستان کی سیاسی سماجی اور ادبی تاریخ بھی آگئی ہے۔ ابراہیم بن جریر کی تاریخ ہمایونی، جوہر آفتابچی کی تذکرۃ الواقعات ہمایوں، ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ وغیرہ وہ تواریخ ہیں جو ہمایوں کے دور میں تالیف کی گئیں۔ اکبر نے تاریخ نویسی کے لیے درباری مورخ مقرر کیا۔ اکبری عہد کی تاریخی کتب میں عارف قندھاری کی تاریخ اکبری، ملا احمد ٹھٹھوی وغیرہ کی تاریخ الفی، خواجہ نظام الدین احمد ہروی کی طبقات اکبری اور ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ اکبری عہد کی اہم تاریخی کتابیں ہیں۔ شیخ ابوالفضل (متوفی : ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء) نے اکبر نامہ لکھ کر تاریخ نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ابوالفضل ایک باتدبیر وزیر اور بے مثال ادیب تھا۔ اکبر نامہ اس کی ان دونوں خصوصیات کا ترجمان ہے۔ اکبر نامہ کی تیسری جلد آئین اکبری ہے جو اکبر کے آئین فرمانروائی کی انسائیکلو پیڈیا اور پورے فارسی ادب میں بے نظیر ہے۔ جہانگیر کی توزک جہانگیری یا جہانگیر نامہ میں سیاسی، سماجی اور ادبی نوعیت کی ایسی اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں کہ عہد جہانگیری کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ معتمد خاں اور محمد ہادی نے جہانگیر نامے کی تکمیل کی ہے معتمد خاں کی اقبال نامۂ جہانگیری اس دور کی دوسری اہم تاریخ ہے۔ شاہ جہاں کے دور کی تاریخ کو کئی مورخوں نے قلم بند کیا، ان میں عبدالحمید لاہوری، محمد وارث لاہوری اور محمد صالح کنبو خاص طور پر اہم ہیں۔ عہد اورنگ زیب کی تاریخی کتب میں عاقل خاں خوافی کی واقعات عالمگیری، محمد کاظم کی عالمگیر نامہ، بختاور خاں کی مراۃ العالم اور ایشورداس ناگر کی فتوحات عالمگیری قابل قدر تواریخ ہیں۔ تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک جاری رہا جن کے حکم سے میرزا غالب نے مہر نیم روز کے عنوان سے ہمایوں کے عہد تک مغلوں کی تاریخ ترتیب دی۔

ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کی روایت قدیم ہے چنانچہ مغل دور میں فارسی لغت کی بنیادی کتابیں لکھی گئیں جن میں مولانا محمود کی **تحفۃ السعادۃ** یا فرہنگ سکندری، محمد لاد کی مؤید الفضلا، الہ داد فیضی سرہندی کی مدار الافاضل جمال الدین حسین انجو (م ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) کی فرہنگ جہانگیری، محمد قاسم کاشانی کی فرہنگ سروری یا مجمع الفرس، محمد حسین بن خلف تبریزی کی برہان قاطع، عبدالرشید ٹھٹھوی کی فرہنگ رشیدی، سراج الدین علی خاں آرزو کے سراج اللغت، مثمر اور چراغ ہدایت بہت اہم ہیں۔ یہ سلسلہ غالب کی قاطع برہان اور اس کے جواب اور جواب الجواب میں لکھی گئی کتابوں پر ختم ہوتا ہے۔

مغل دور میں فارسی شعرا کے چند نہایت اہم تذکرے بھی ترتیب دیے گئے ملا صوفی مازندرانی (متوفی : ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) نے تذکرۂ بت خانہ یا خلاصۃ الشعرا، امین احمد رازی نے تذکرۂ ہفت اقلیم "تقی الدین اوحدی نے عرفات العاشقین، محمد افضل سرخوش نے کلمات الشعرا، بندرابن داس خوشگو نے سفینۂ خوشگو، سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس، حاکم لاہوری نے مردم دیدہ اور قاضی محمد صادق اختر (متوفی : ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء) نے آفتاب عالمتاب جیسے اہم تذکرے مرتب کیے۔ شعرا کے ان تذکروں کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی : ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) نے ہندوستان کے مشاہیر صوفیا، مشائخ اور علما کا ایک تذکرہ اخبار الاخیار مرتب کیا جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد تذکرہ ہے۔ ابوالفضل نے فارسی انشا کا ایسا بلیغ نمونہ پیش کیا کہ

اس کی پیروی میں بہت سے ادیبوں نے انشا کے مجموعے ترتیب دیے۔ اس اسلوب کے کشمیر و ہندوستان میں ظہوری ہیں جن کی سہ نثر عرصہ تک درس میں شامل رہی۔ سہ نثر کے ساتھ ہی مینا بازار اور پنج رقعہ کا نام لیا جاتا ہے جو ارادت خاں واضح (م ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۶ء) کی طرف منسوب ہیں۔ انشا مادھورام، انشائے حسینی اور پنج آہنگ وغیرہ بھی انشا کی معیاری کتابیں ہیں۔

دورۂ بازگشت و مشروطیت

اٹھارہویں صدی عیسوی تک فارسی نظم و نثر کا ایک بڑا حصہ تکلف اور آورد کی وجہ سے تقریباً ایک معمّا بن گیا تھا۔ چنانچہ ایران میں قاچاری دور کے شاعروں اور ادیبوں نے باقاعدہ ایک تحریک چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ سبک مصنوعی اور پرتکلف اسلوب کے بجائے اسی قدیم طرز کا احیا کیا جائے جسے سبک خراسانی کہا جاتا ہے۔ اسی ادبی تحریک کو دورۂ بازگشت کا نام دیا گیا ہے۔ اس تحریک کا مرکز اصفہان تھا۔ درحقیقت یہی تحریک جدید فارسی ادب کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں شاعروں نے فردوسی، عنصری، فرخی، منوچہری، سعدی و حافظ وغیرہ اساتذۂ سخن کی پیروی کو اپنا شعار بنایا۔ ایران میں تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی سے سیاسی اور سماجی بے اطمینانی کا آغاز ہوتا ہے۔ یورپ کے ساتھ تعلقات بڑھے اور ایرانیوں کو یورپ کی جمہوری اقدار کا علم ہوا تو انہوں نے بھی آئینی حکومت مشروطہ کی مانگ شروع کر دی تاکہ پارلیمنٹ (مجلس) کے ذریعہ بادشاہ کی آمریت پر روک لگائی جا سکے۔ اس تحریک میں دن بدن شدت آتی گئی یہاں تک کہ مظفر الدین شاہ قاچار نے جمادی الثانی ۱۳۲۴ھ / ۵ اگست ۱۹۰۶ء کو مشروطہ کی تجویز منظور کی اور ایران میں آئینی دور شروع ہوا۔ اس دور میں ایرانی شاعری میں جو تحول رونما ہوا وہ محض نئے افکار و خیالات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ زندگی کے ہر میدان میں تبدیلی آئی تھی، اس کا انعکاس کر رہا تھا اس انقلاب کے پیش آہنگ سب سے زیادہ شاعر اور ادیب تھے جو اپنے قلم سے قوم کا ضمیر بیدار کر رہے تھے۔ چھاپے خانے کی ایجاد اور اخبارات و رسائل کی اشاعت نے انقلاب کی لے اور تیز کی اور ساتھ ہی فارسی شاعری اور ادب نے سماجی بیداری اور فطری اسلوب کی راہ اپنائی۔ روایتی فارسی شاعری سب سے زیادہ تنقید اور اعتراض کا نشانہ بنی۔ کیوں کہ اس شاعری نے اب تک صرف دربار اور اعلیٰ طبقے کی خدمت کی تھی۔ فارسی شاعری پر اس قسم کی تنقید کرنے والوں میں میرزا آقا خاں کرمانی (متوفی: ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء)، میرزا ملکم خاں (متوفی: ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) حاجی زین العابدین مراغہ ای (متوفی: ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)، آخوندزادہ (متوفی: ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) وغیرہ پیش پیش تھے۔ فارسی شاعری کے یہ نقاد خود صاحب ذوق شاعر تھے۔ انہوں نے فارسی شاعری کی نئی سمتوں کا تعین کیا اور اسے انسان سازی اور سماجی بیداری کا وسیلہ قرار دیا۔ ظاہر ہے شاعری کا دامن وسیع ہوا تو سادہ زبان اور عام فہم انداز بیان پر زور دیا گیا۔

مظفر الدین شاہ قاچار نے ۵ اگست ۱۹۰۶ء کو مشروطیت کا اعلان کیا تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۹۰۸ء میں اس کے جانشین محمد علی شاہ نے مجلس (پارلیمنٹ) برخاست کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ایران میں آئینی حکومت کی برقراری کے لیے از سر نو جد و جہد شروع ہو گئی۔ اس جد و جہد میں فارسی شعرا نے پورا حصہ لیا۔ انہوں نے عوام کی بیداری اور وطن پرستی کی خاطر شعر کہے آخرکار حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ۲۲ فروری ۱۹۲۱ء کو فوجی انقلاب کے بعد رضا خاں برسر اقتدار آیا اور اس طرح ایران میں پہلوی دور سلطنت کا آغاز ہوا۔

دور مشروطیت کی شاعری کا مخاطب عام ایرانی ہے اس لیے آسان اور عام فہم زبان کے ساتھ ساتھ ایسے شعری قالب انتخاب کیے گئے مثلاً مستزاد، مسمط اور ترجیع بند وغیرہ جو عوام پسند تھے۔ تصنیف (گیت) اور سرود (انقلابی نغمے) نے بھی اس دور کے شعرا کی توجہ جلب کی۔ یورپ کی زبانوں خاص طور پر فرانسیسی زبان و ادب سے ایرانیوں کا سابقہ اسی دور میں پڑا۔ ایرانیوں نے یورپ کے مختلف ممالک کے سفر کیے اور اس طرح وہاں کی زبان، ادب اور رسم و رواج سے آشنائی حاصل کی۔ ادب کی نئی اصناف یعنی افسانے، ناول اور ڈرامے نے فارسی ادب کو وسعت بخشی۔ بہت سی غیر ملکی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے گئے۔ ان عوامل نے فارسی شعر و ادب کو نئی روشنی اور نئی جہت عطا کی۔ ۱۹۱۶ء میں تہران میں ایک ادبی انجمن تشکیل پائی، اس کے روح رواں ملک الشعرا محمد تقی بہار (متوفی: ۱۹۵۱ء) تھے۔ اس انجمن نے ایک رسالہ جاری کیا جس کا مقصد نئے دور کی ضروریات کی رعایت سے جدید اسلوب کی تبلیغ تھا۔ لیکن بہت سے شاعر اور ادیب قدیم روایات کے حامی تھے۔ اس طرح ایران میں دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ادب میں قدیم و جدید کی لایعنی بحث چھڑ گئی۔ بہر حال اس قسم کا بحث و مباحثہ مستقل چلتا رہا۔ ملک الشعرا بہار، دہخدا (متوفی: ۱۹۵۶ء)، عشقی (متوفی: ۱۹۲۴ء)، عارف (متوفی: ۱۹۳۳ء)، ایرج میرزا (متوفی: ۱۹۲۵ء) وغیرہ وہ شعرا ہیں جنہوں نے فارسی شاعری کے قدیم قالبوں کو ترک نہیں کیا بلکہ انہی قالبوں میں نئے نئے افکار و خیالات پیش کیے۔ فارسی شاعری میں اس دور کے بعد آنے والی زبردست تبدیلی کو سمجھنے کے لیے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ جدید فارسی شاعری میں ابھی تک صرف نئے مضامین، جدید اسلوب اور سادہ زبان پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی تھی۔ ابھی اس کی شکل و ہیئت میں تبدیلی کی کوئی سنجیدہ کوشش عمل میں نہیں آئی تھی۔ یہ قدم فارسی شعر نو کے بانی علی اسفندیاری نیما یوشیج (م۔ ۱۹۵۹ء) نے اٹھایا۔ دوسرے شعرا نے بھی شاعری کے موضوع اور اس کی ہیئت کے سلسلے میں نئے نئے تجربات کیے جعفر خامنہ ای نے غالباً پہلی بار چہار پارہ کی شکل میں شعر کہے جو اپنی شکل و صورت اور زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے منفرد تھے۔ محمد ضیا ہشترودی، میرزادہ عشقی اور خانم شمس کسائی (متوفی: ۱۹۶۱ء) نے ہیئت کے نئے تجربے کیے۔ ۱۹۲۲ء میں نیما نے اپنی جدید نظم 'افسانہ' لکھی۔ اس نظم کے شائع ہوتے ہی فارسی شاعری کو انقلاب اور تجدد کے میدان میں حقیقی راہنمائی میسر آ گئی۔ شعرا نے اس کی تقلید میں نظمیں لکھیں۔ ناقدین نے اس انقلاب پر دو متضاد قسم کے ردعمل کا اظہار کیا۔ قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی۔ دوسرے گروہ نے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ اگر شعر کا موضوع تبدیل ہوا ہے تو قالب شعر میں بھی لازمی طور پر ترمیم کی جانی چاہیے بہر حال نیما یوشیج شعر نو کا حقیقی بانی اور مروج ہے۔ نیما نے عروضی ارکان کو بڑی حد تک باقی رکھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ تمام مصرعوں کے ارکان برابر ہوں اور

اس نے فارسی شاعری کو مصنوعی قافیے کی قید سے آزاد کر لیا۔ نیما کی قابل ذکر نظموں میں "قصہ رنگ پریدہ" اور "قو" وغیرہ شامل ہیں۔

منوچہر شیبانی، احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث، منوچہر آتشی، خانم فروغ فرخزاد، محمود آزاد، سہراب سپہری، ید اللہ رویائی وغیرہ وہ چند معروف شعرا ہیں جنہوں نے مکتب نیما کی پیروی اور اسے مکمل کرنے کی کوشش کی۔

مکتب نیما کا جدید شعرا پر قابل لحاظ اثر پڑا، لیکن بعض شعرا نیما کی صحیح پیروی نہ کر سکے، انہوں نے جدت کے جنون میں ہر اصول سے عمداً انحراف کو شعر نو قرار دیا اس رویے سے ان کی شاعری مہمل گوئی اور چیستاں کے قریب آگئی ان شعرا نے مکتب شعر نو سے اپنی شاعری کو ممتاز کرنے کے لیے اسے "شعر موج نو" کا عنوان دیا۔ شعر موج نو کا اہم شاعر احمد رضا احمدی ہے۔ اس طرح کی افراط و تفریط کے ردعمل کے طور پر اعتدال پسندوں کا ایک گروہ وجود میں آیا جس کی سربراہی کا سہرا ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری کے سر ہے، جن کی نظم "عقاب" جدید فارسی شاعری میں اپنی علامتیت کے لیے ممتاز ہے۔ اعتدال پسند شعرا کا خیال ہے کہ فارسی شاعری کی مختلف بحریں اس قدر زیادہ اور متنوع ہیں کہ ان بحروں کا توڑنا، انہیں کسی مصرعے میں مختصر اور کسی میں مکمل استعمال کرنا، یا ان سے مکمل طور پر فرار لازمی نہیں۔ اعتدال پسند شعرا میں گلچیں گیلانی، شہریار، فریدون توللی، مسعود فرزاد، نادر نادر پور، مصطفی رحیمی، ہوشنگ، ابتہاج سایہ، نصرت رحمانی، مہدی حمیدی، بشرن ترقی اور خانم سیمیں بہبہانی خاص طور پر سرفہرست ہیں۔

۱۹۰۶ء میں مشروطیت کے اعلان کے بعد ایران میں نثری ادب کا اہم سرمایہ وجود میں آیا جو موضوع و مطالب کے لحاظ سے بہت وسیع و متنوع ہے۔

دوسری زبانوں سے بہت بڑی تعداد میں کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ادب کی نئی اصناف نے فارسی نثر کا دامن مالا مال کیا۔ تحقیق اور تنقید پر کتابیں لکھی گئیں۔ مؤخر الذکر موضوع پر لکھنے والوں میں محمد بن عبد الوہاب قزوینی، پرویز ناتل خانلری بدیع الزماں فروزانفر، سعید نفیسی، مجتبیٰ مینوی، جلال متینی، غلام حسین یوسفی، سعیدی سیرجانی محمد علی اسلامی ندوشن اور محمد استعلامی اہم ہیں۔ ان دانشوروں نے فارسی زبان و ادب کی تحقیق و تنقید کو جدید اصولوں کی روشنی میں پیش کر کے فارسی ادب کے طالب علم کو نئی جہات سے متعارف کرایا۔

فارسی میں داستان کی روایت بہت قدیم ہے۔ اُردو میں یہ روایت فارسی سے آئی ہے، لیکن ایران میں داستان کوتاہ یعنی مختصر افسانہ کی تاریخ بیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ مختصر افسانہ نگاروں میں سب سے اہم نام صادق ہدایت کا ہے۔ "سہ قطرہ خون" اور "سگ ولگرد" صادق ہدایت کے بہترین افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اس کے ہم نام صادق چوبک نے بھی افسانے کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔ محمد حجازی، غلام حسین ساعدی (جنہوں نے گوہر مراد کے نام سے فارسی میں چند انتہائی عمدہ ڈرامے لکھے ہیں)، جمال میر صادقی اور جلال آل احمد وغیرہ نے فارسی مختصر افسانے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فارسی میں نئے اور اچھے ناولوں کی بہت کمی ہے۔ صادق ہدایت کا بوف کور ایک طرح کا ناولٹ ہے۔ صادق چوبک کا ناول تنگسیر جنوبی ایران کی فضا پر مشتمل ہے۔ موجودہ ایران میں سب سے مشہور ناول نگار علی محمد افغانی ہے جس کا ناول "شوہر آہو خانم" فارسی کا سب سے ضخیم اور سب سے اہم ناول ہے۔ جلال آل احمد کی بیوی سیمیں دانشور کا ناول "سوو شون"، اپنی معنوی اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے بڑی حد تک منفرد ہے۔

انقلاب اسلامی کے بعد ایران نے مادی طور پر بہت ترقی کی۔ ملک میں تعلیم بھی عام ہوئی لیکن رضا شاہ اور اس کے بیٹے محمد رضا نے بڑی حد تک دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کو اظہار خیال سے محروم رکھا۔ چنانچہ پہلوی آمریت کے خلاف وقتاً فوقتاً آواز بلند ہوتی رہی یہاں تک کہ امام آیۃ اللہ روح اللہ خمینی اور دوسرے رہنماؤں کی قیادت نے پہلوی سلطنت کا ۱۹۷۹ء میں خاتمہ کر دیا۔ محمد رضا شاہ اپنے باپ کی طرح ایران چھوڑ کر چلے گئے اور جلا وطنی میں مصر میں فوت ہوئے۔ امام خمینی کی سرپرستی میں جمہوری اسلامی ایران کی تشکیل ہوئی۔ اس انقلاب میں علما نے اہم کردار ادا کیا۔ پہلوی سلطنت کے خلاف ایرانی شعرا و ادبا نے بھی جوش و خروش سے حصہ لیا۔ انہوں نے پہلوی سلطنت کے ظلم و تشدد کے خلاف نظمیں، ڈرامے، کہانیاں اور مقالات وغیرہ لکھے ان نگارشات کا لب و لہجہ نہایت تند و تلخ ہے۔ ان نگارشات میں خاص طور پر انقلابی اشعار کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انقلابی شعرا میں موسوی گرما رودی اور طاہرہ صفار زادہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انقلاب کے دوران اور اس کے بعد قدیم شعری قالب مثلاً سرود و تصنیف، دوبیتی، رباعی، غزل، قصیدہ مثنوی وغیرہ بھی استعمال کیے گئے لیکن کچھ شعرا نے شعری ہیئت میں بھی نئے نئے تجربے کیے۔ البتہ سرود و تصنیف کی طرف زیادہ توجہ کی جا رہی ہے کہ یہ عوام پسند اصناف سخن ہیں۔ علی معلم، حمید سبزواری، مہرداد اوستا، غلام رضا قدسی، محمود شاہرخی، محمد حسین رزم جو، نصر اللہ مردانی، حسن حسینی معاصر، محمد جواد محبت، محمد خلیل جمالی، محمد حسن بہجتی متخلص بہ شفق، سپیدہ کاشانی، سیمین دخت وحیدی وغیرہ اس دور کے چند اہم شعرا ہیں۔

انقلاب کے بعد کے فارسی ادب کی اب تک کوئی مستقل حیثیت نہیں بن سکی ہے کیوں کہ اس ادب کا بیشتر حصہ وقتی حوادث اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ بہر حال یہ دور فارسی ادب کی تاریخ میں عبوری دور ہی مگر اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

فرانسیسی زبان و ادب

فرانسیسی کا تعلق زبانوں کے ہند آریائی خاندان سے ہے۔ یورپ کے جو علاقے اب فرانس کی حدود میں داخل ہیں وہ پہلے سلطنت روما میں شامل تھے۔ اور وہاں کی زبان لاطینی تھی۔ رومی حکمرانوں کی لاطینی اُن علاقوں میں رفتہ رفتہ مسخ ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کا حلیہ ہی بدل گیا اور ایک الگ زبان بن گئی جو فرانسیسی کہلائی۔

اپنی فطری خوبیوں اور اس کے علاوہ سیاسی حالات کی بنا پر فرانسیسی کو تدبّر و تفکّر کی زبان کا ممتاز مقام مل گیا۔ اور تاریخ کے بعض ادوار میں یورپی سماج کے اونچے طبقوں کی تہذیبی زبان بھی یہی تھی۔

فرانسیسی زبان کی بنیاد اس بولی پر قائم ہوئی جو شمالی فرانس کے
بعض علاقوں اور خصوصاً پیرس کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے ۔
اپنے ارتقا کے سفر میں اس نے جنوبی فرانس کی بولیوں سے تیرھویں تا
سولھویں صدی میں، اطالوی زبان سے چودھویں تا سترھویں صدی
میں، ہسپانوی زبان سے سولھویں اور سترھویں صدی میں الفاظ مستعار
لیے ۔ اور اس کے علاوہ ولندیزی، عربی اور انگریزی سے بھی اپنے
ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا۔ جدید فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں سب
سے زیادہ اضافہ انگریزی الفاظ کی وجہ سے ہوا ہے اور انگریزی کا
اثر اس درجہ حاوی نظر آتا ہے کہ اہل فرانس بطور استہزا اس اندیشے
کا اظہار کرتے ہیں کہ کہیں ان کی زبان بگڑ کر فرانگ لے (Franglais)
یعنی فرانسے (Francais) اور آنگ لے (Anglais) سے مرکب
دو غلی زبان بن کر نہ رہ جائے ۔

فرانسیسی زبان نے دوسری قوموں کی زبانوں کے اثرات بڑی
حد تک قبول کیے ہیں ۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ فرانسیسی کو زندہ رکھنے
کے لیے وقتاً فوقتاً سرکاری اقدامات کیے گئے یا اس مقصد سے متعلق
غیر سرکاری تحریکات کو حکومت کی حمایت حاصل رہی ۔ نتیجہ اس
احتیاط کا یہ ہے کہ جدید فرانسیسی میں اور اس فرانسیسی میں جو آج سے
چار پانچ سو سال پہلے بولی جاتی تھی بہت کم فرق پایا جاتا ہے ۔ بیشتر
دوسری زبانوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی ۔

جغرافیائی تقسیم

فرانسیسی نہ صرف پانچ کروڑ اہل فرانس
کی زبان ہے بلکہ یہ دنیا کے مختلف حصوں
میں مزید پندرہ کروڑ افراد کی بھی یا تو مادری زبان یا سرکاری یا علمی
زبان ہے ۔ یورپ میں بلجیم کے ۵۲ لاکھ باشندے فرانسیسی بولتے
ہیں ۔ سوئزرلینڈ میں فرانسیسی بولنے والی آبادی کی تعداد دس لاکھ
ہے ۔ کینیڈا میں اس زبان کے بولنے والوں کی آبادی ۵۵ لاکھ
یا اس سے زیادہ ہے اور اس لیے یہ ایک دو لسانی ملک بن گیا ہے ۔
اس ملک میں سرکاری زبان کا درجہ دو زبانوں کو حاصل ہے ۔ ان میں
سے ایک فرانسیسی ہے اور دوسری انگریزی ۔

افریقہ کی ساڑھے پانچ کروڑ آبادی کے لیے فرانسیسی سرکاری زبان
ہے اور اس کے علاوہ نظم و نسق اور سیاست کی زبان بھی یہی ہے ۔ ان
میں معتدبہ آبادی کا تعلق سابق فرانسیسی نوآبادیوں یا زیر حمایت
علاقوں سے ہے، جیسے عرب مغرب، سابق فرانسیسی مغربی افریقہ، سابق
فرانسیسی استوائی افریقہ، سابق فرانسیسی شمالی لینڈ اور جمہوریہ میلاگاشی
(Malgache) جو پہلے مدغاسکر کہلاتا تھا ۔ ان کے علاوہ وہ افراد
بھی ہیں جو سابق بلجین کانگو سے تعلق رکھتے ہیں جس کا موجودہ نام جمہوریہ
زیرے ہے ۔

ہند چینی میں جو پہلے ایک فرانسیسی نوآبادی تھا فرانسیسی پہلے کی
طرح اب بھی تہذیب و شائستگی کی زبان ہے اگر چہ سال بہ سال اس
کے مقابلے میں انگریزی زبان اور ویٹ نام، کمبوڈیہ اور لاؤس کی قومی
زبانوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے ۔ مغربی ایشیا کے دو ملک لبنان اور
شام، پہلے فرانس کے زیر حمایت تھے، فرانسیسی ان کی پسندیدہ زبان
ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیروت کی کم و بیش ۴۰ فی صد آبادی ذو
لسانی ہے ۔

سمندر پار بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے فرانسیسی علاقوں اور
مقبوضات میں بھی فرانسیسی سرکاری اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے
رائج ہے ۔

آغاز

عام طور پر فرانسیسی زبان و ادب کی تاریخ میں
"معاہدات اسٹراسبورگ" (Serment de Strasbourg) نقطۂ آغاز مانے جاتے ہیں ۔ یہ وہ
معاہدات ہیں جو ایک مشترکہ دشمن (ایک عجیب
بات یہ ہے کہ جرمن ادب کا آغاز بھی انہی دستاویزات سے ہوا) کے
خلاف مقامی سرداروں نے آپس میں کر لیے تھے ۔ لیکن ادب میں شمار
کیے جانے کے قابل فرانسیسی زبان کی تحریروں کا بارھویں صدی کے
آغاز سے قبل پتہ نہیں چلتا ۔

بارھویں اور چودھویں صدی

شانسوں دی گیسٹ (Chansons de Geste)
وہ رزمیہ نظمیں ہیں جن میں فلسطین میں شارلمان (Charlemagene)
کے زیر قیادت جنگ جو عیسائیت کے صلیبی محاربات (۱۰۹۶)
یا ہسپانیہ کے مسلمانوں کے خلاف فوجی مہمات کے گیت گائے گئے ہیں ۔
اس دور میں فرانس کے جنوبی علاقے لانگ دو (Langue Doc)
میں نغز گو شعرا Troubadours نے اپنے کلام میں
جانباز عاشق کی اپنی محبوبہ سے والہانہ محبت کی واردات بیان کی ہے
جس میں آئین و آداب عشق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ ان گیتوں میں رقیب
کی ریشہ دوانیوں، عاشق کی محرومیوں اور عشق کے تقاضائے صبر و شکیبائی
کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔ کرے تیان دے ترو ا (Cbretien de Troyes)
نے راونڈ ٹیبل کے سورماؤں کے معرکوں کی داستان بیان کی
ہے ۔

چودھویں اور پندرھویں صدی

ان صدیوں کے دوران ادب
کے خدوخال سابقہ ادوار کی
روایات کے مطابق ہی تھے ۔ البتہ ایک نیا عنصر ادب میں داخل ہوا
اور وہ تھا ڈرامہ نگاری کا آغاز ۔ جہاں تک سنجیدہ ڈرامہ نویسی کا
تعلق ہے اس کے موضوعات تو ولادت مسیح اور ان کے مصلوب
ہونے کے واقعات تک محدود رہے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے
تکلف و تصنع سے بری، بے باک مزاحیہ تمثیلیں پہلی بار منظر عام پر آنے
لگیں ۔ اس عہد میں سب سے زیادہ اہم شخصیت بلاشبہ فرانسوا ویون
(Francois Villon) (۱۴۳۱ - ۱۴۶۳ء) کی تھیں ۔ ویون
شاعر بھی تھا اور مہم جو سر فروش بھی ۔ بھی جو
کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا ۔ جہاں تک شاعرانہ پرواز تخیل اور خلوص
اظہار کا تعلق ہے وہ بجا طور پر فرانس کے نغز گو شعرا کا امام مانا
جاتا ہے ۔ اس کا شاہکار ۲۰۰۰ مصرعوں پر مشتمل ایک طو

"لی تست ماں" (Le Testament) ہے۔ اس میں سماج کے ٹھکرائے ہوئے ناکام عاشق کا کردار پیش کیا گیا ہے جو افلاس، فاقہ کشی، جسمانی اذیتوں اور امراض کا شکار رہا ہے لیکن زندگی سے مایوس نہیں ہوا۔ اس کے قلب میں زیست کی چنگاری ابھی کملائی نہیں ہے اور وہ زندگی کی معمولی خوشیوں کو بھی گلے لگاتا اور ہر لمحۂ مسرت کو کمال شوق سے نچوڑ لیتا ہے۔ ویون نے اپنی شاعری میں نغمگی ادبی زیبا تشوں اشارے کنائے کی حدود سے آگے قدم بڑھا کر موت کی وحشت ناک اذیتوں کا بھیانک منظر پیش کیا ہے۔

سولہویں صدی

سولہویں صدی کے نصف اول میں فرانسو اوّل (Francois I) کے مصاحب کلے ماں مارو (Clement Marot) (۱۴۹۶ء - ۱۵۴۴ء) کی درباری اور مذہبی شاعری کا رنگ حاوی رہا۔ لیکن تبدیلی کے آثار بھی نمایاں ہو چکے تھے۔ خود مارو کے بارے میں شبہ ہونے لگا تھا کہ اسے مذہبی اصلاح کی تحریکوں سے ہمدردی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا ذہن ازمنۂ وسطیٰ ہی کی پیداوار تھا۔ اس کے برخلاف ربیلے (Rabelais) (۱۴۹۴ء - ۱۵۵۳ء) نشاۃ ثانیہ کے نئے انسان دوست رجحانات کا زبردست ترجمان تھا۔ اس کے وجدان کا سرچشمہ یونان و روما کا قدیم قبل مسیح دور تھا۔ وہ خود لذیت کا پیرو تھا اور اس نے اپنے ناول "گارگان تیوا اور پاتان گوئیل" (Gargatua and Pantagruel) میں دیو قامت انسانوں کی دو نسلوں کی جو تصویر پیش کی ہے وہ فطرتِ انسانی سے متعلق اس کے نئے فلسفے (جو جی میں آئے کر جاؤ) اور نظریۂ لذیت کے نظام اخلاق و کردار کی ایک انبساط انگیز ترجمانی ہے۔ ربیلے کی تصانیف خیال کی نیرنگی اور رندانہ شوخی کی بدولت نہایت دلچسپ ہیں۔ بقول والٹیر وہ ایک بدمست فلسفی تھا۔ اس کے مطالعے کو صرف تفریح طبع تک محدود سمجھا جائے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ ربیلے نشاۃ ثانیہ کی ایک نہایت زبردست اور نمایاں شخصیت کا حامل تھا جو سائنس طب اور مختلف زبانوں کے علم و عرفان سے سرشار تھی۔ اس نے لاطینی زدہ مدعیان فضل و کمال کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس کے تخلیق کردہ کردار بڑے جاندار ہیں جو ہر قسم کی مبالغہ آمیزی کا بوجھ بہ آسانی سہار سکتے ہیں۔ اور قاری کی رہنمائی ایک ایسی تخیلی دنیا کی سمت کرتے ہیں جہاں تک رسائی صرف اتفاق سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں تھوڑی بہت پرخلوص کوشش کا بھی دخل ہوتا ہے۔

میشل موں تاں (Micbel Montaigen) (۱۵۳۳ء - ۱۵۹۲ء) ایک نہایت ممتاز مضمون نگار (Essayiste) تھا جس نے مسلک انسان دوستی سے تعلق رکھنے والے پیشرو دانشوروں کی گرم گفتاری میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے مقالوں کی نمایاں خصوصیت معقولیت پسندی اور رواداری ہے۔ ربیلے لذت پرست تھا تو موں تاں بالکل اس کی ضد یعنی زاہد خشک تھا۔

تحریر میں جہاں صرف ایک توصیفی لفظ سے کام چل سکتا ہو ربیلے بیسوں الفاظ استعمال کرتا تھا لیکن موں تاں الفاظ کا استعمال بڑی احتیاط سے اور ہاتھ روک کر کرتا تھا۔ اگرچہ موں تاں نے یورپ کے مختلف ملکوں کی سیاحت بھی کی لیکن اس کے ذہن کی تشکیل میں اس کے داخلی سفر اور قلبی وارداتوں کو بڑا دخل تھا۔ اس نے خود اپنے کردار کا مرقع پیش کیا ہے۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ خود کو ایک انوکھی شخصیت سمجھتا تھا بلکہ اس لیے کہ "ہر فرد بجائے خود انسانیت کا ایک مکمل نمونہ ہے" وہ بول چال کی زبان بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس کا قلم لکھتا نہیں بولتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند جملے پیش کیے جا سکتے ہیں "ملائم تکیے کے کیا کہنے، بڑا ہی آرام دہ ہوتا ہے" یا یہ جملہ "یہ ایسا ہی ہے جیسے گدھے کو دُم آگے کی طرف رکھ کر جوتا جائے"۔

اس صدی کے وسط کے لگ بھگ فرانسیسی عشقیہ شاعری کا بھی احیا ہوا جس کے علمبردار پیئر دی راں سار (Pierre de Ronsard) (۱۵۲۴ء - ۱۵۸۵ء) اور جوآکم دیو بیلے (Joachim Dubellay) (۱۵۲۲ء - ۱۵۶۰ء) تھے۔ ان کے علاوہ شعرا کا وہ گروہ بھی تھا جو پلے ای یاد (Pleiade) یعنی سیّارہ کہلاتا ہے۔ دیو بیلے (Dubellay) اس نئی ادبی تحریک کے نظریہ کا ماہر مانا جاتا ہے۔ رونارڈ اس کا سب سے زیادہ باکمال نمائندہ ہے۔

اس نے سانیٹوں (Sonnets) کے ذریعہ اپنی محبوبہ کو امر بنا دیا۔ اس کی یہ نظمیں عشقیہ شاعری کی غیر فانی تخلیقات میں شمار کی جاتی ہیں۔ پلے ای یاد کے مسلک اور رونارڈ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ان کے زیر اثر فرانسیسی شاعری ارتقا کے سفر میں عصر انسان دوستانہ علوم کی ہم قدم بن گئی اور اس کا رشتہ یونانی اور لاطینی نظم کی روایات سے زیادہ راست طور پر جڑ گیا۔ اس مسلک نے نظم میں خارجی تبدیلیاں بھی کیں۔ بعض پرانی صنفوں کو بالکل ترک کر دیا گیا اور سانیٹ کی سدا بہار بارہ رکنی بحر کو مقبولیت کے معراج کمال پر پہنچا دیا گیا۔

سترہویں صدی

اس صدی کے ابتدائی دور میں اہل قلم نے ادب کی مختلف اصناف میں ہیئت اور اسلوب کے تعین کی کوشش کی۔ اور موضوع مواد اور خیال کے تعلق سے بھی اصول اور ضابطے بنائے۔ فرانسو دی مالہب (Francois de Malberbe) (۱۵۵۵ء - ۱۶۲۸ء) کی اگرچہ بہ حیثیت شاعر کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن وہ عقل کل بنا ہوا تھا اور اس کا بڑا اثر تھا۔ اس نے اظہار میں سادگی اور سلاست پر زور دیا۔ یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فرانسیسی شاعری کو ان گھٹیا نظم گویوں کے شکنجے سے جو پلے ای یاد (Pleiade) کے پیرو تھے نجات مل گئی۔ یہ اس درجہ اہم کارنامہ تھا کہ بوالو (Boileau) نے اسے فرانسیسی نظم کا ماوا آدم قرار دیا۔

رینی دیکارت (Rene Descartes) (1596ء-1650ء) نے جو نہ صرف ایک فلسفی بلکہ ماہر ریاضیات و طبیعیات بھی تھا صاف اور واضح طرزِ فکر اور اظہارِ خیال کے اصولوں پر مبنی آفاقی اصول پیش کیے۔ وہ فرانس کی اسپرٹ کے ایک پہلو سے کارتیسی عقلیت کا ترجمان تھا۔ اس نے اپنے طرزِ فکر کی جس تحریر میں وضاحت کی وہ دراصل فلکیات سے متعلق ایک کتاب کا پیش لفظ تھا۔ اس پیش لفظ کے لیے اس نے لاطینی کے مقابلے میں فرانسیسی زبان کو ترجیح دی۔ دیکارت کی یہ تحریر فرانسیسی نثر کی تاریخ کا ایک سنگ میل بن گئی کیوں کہ اس میں ایک مجرد اور خیالی موضوع پر غیر معمولی سادہ اور سلیس انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ دیکارت کا طرزِ فکر ازمنۂ وسطیٰ کی منطق کے بالکل برعکس تھا۔ دیکارت کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں کہ اس نے نہ تو کہیں مسلّمات کا حوالہ دیا اور نہ کسی مذہبی اور برتر عقیدے کا سہارا لیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ جس بات کا اسے مکمل علم ہے اور جو پوری طرح اس کی سمجھ میں آتی ہے فکر کی بنیاد اسی پر رکھے۔ غیر ذات کا وجود حقیقی ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں وجود رکھتا ہوں۔ جو وجود نہیں رکھتا وہ سوچ نہیں سکتا "میں سوچتا ہوں لہٰذا میں وجود رکھتا ہوں" دیکارت کے نظامِ فکر کا بھی معقول اور قابلِ قبول نقطۂ آغاز بن گیا۔ اس کے مطابق تسلیم کرلیا گیا کہ ایک خالق ہے جس نے انسان کو عقل و شعور سے بہرہ ور کیا ہے مخلوق کو نہ تو کوئی فریب دے سکتا ہے اور نہ گمراہ کرسکتا ہے بشرطیکہ انسان اپنی فکر کو معقول تشکیک کی حدود میں رکھے۔ سترہویں صدی کا یہ مفکرِ اعظم اٹھارہویں صدی کی عقلیت کا نقیب مانا جاتا ہے۔ اگرچہ غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا آسان نہیں کہ خود دیکارت عقلیت کے مسلک کا پیرو تھا یا نہیں۔

پی یر کارنیے (Pierre Corneille) (1606ء-1684ء)
اور ژاں راسین (Jean Racine) (1639ء-1699ء)
فرانسیسی المیہ ڈرامے کے خدوخال کی ترتیب و تشکیل میں باضابطگی پیدا کرکے اسے ادبِ عالیہ کے بلند مرتبے پر پہنچا دیا کارنیلی فرانسیسی کلاسک تھیٹر کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس نے ڈرامہ کے جستانی عناصر کو ترک کرکے کردار نگاری پر زور دیا۔ اس کے ہیرو اگرچہ گوشت پوست کے انسان ہی ہیں لیکن روحانی عظمت کے حصول کی دھن میں رہتے ہیں۔ اور ان میں ایک فوق الانسان جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جس کی مدد سے وہ جبرِ تقدیر کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے اولوالعزمی کے ان کارناموں کو نظم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جس کے اشعار چراغِ ہدایت سمجھے جاتے ہیں۔ راسین کے مسلک میں نفسِ امارہ ایک سفلی طاقت ہے جو بالآخر اور بہرحال انسان کو پستی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے راسین کی منزلِ مقصود کلاسیکل المیہ ہے۔ اس کے ڈرامے کا پلاٹ سادہ اور سیدھا ہوتا ہے اور کہانی نمایاں طور پر آگے بڑھتی جاتی ہے۔ پلاٹ کے جھمیلے میں کردار انتہائی جوش و جذبہ سے اپنا رول ادا کرتے ہیں۔

بلیز پاسکال (Blaise Pascal) (1623ء-1662ء) ریاضیات و طبیعیات کا ماہر فلسفی اور مذہبی مناظرہ کار تھا۔ اخلاقی اعتبار سے یہ صدی سب سے زیادہ متاثر اسی سے ہوتی ہے۔ لے پراوینشال (Les Provenciales) اس کے مناظراتی مکاتیب کا نام ہے جو جانسنزم (Iansenism) کٹر عقائد کی تائید میں لکھے گئے ہیں۔ یہ وہ مکاتیب ہیں جن کی نگارش کو یسوعیوں اور ان کے علاوہ بعض کیتھولک پادریوں نے بھی بدعت قرار دیا۔ پاسکل اپنی تصنیف "استعذارِ عیسائیت" کی تکمیل نہ کرسکا۔ اس کے صرف چیدہ چیدہ حصے ہی لے پانسے (LaPensee) کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کی اشاعت فرانسیسی نثر کے اسلوب اور ہیئت پر بہت اثر انداز ہوئی اور سلیس و شستہ انداز میں اظہارِ خیال کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ جہاں تک اخلاقی اثر کا تعلق ہے ان مکاتیب کی اشاعت نے اس صدی کی توجہ کو انسانی طرزِ استدلال کی کوتاہیوں اور گمراہیوں پر غور و خوض کی جانب موڑ دیا۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پاسکل نے فرانسیسی کلاسزم کے لیے راستہ صاف کیا۔ ایک لحاظ سے اسے بیسویں صدی کی تحریک وجودیت کا نقیب بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ تلاشِ حق کی راہ میں ایسی تعقل پسندی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا جسے مذہبی عقائد کی تائید حاصل نہ ہو کیونکہ "دل کی منطق کچھ اور ہے جس سے خرد آشنا نہیں" وہ اپنی جستجو میں نری منطق کے نتائج سے رُوگردانی کرتا ہے، چاہے استدلال بدیہی پر مبنی ہو یا خیر اندیشی پر۔ پاسکل اس دہشت انگیز رازِ سربستہ پر اپنی فکر کو مرکوز کرتا ہے جس سے حیات انسانی جڑی ہوئی ہے۔ پاسکل کا انسان ایک ایسا ملّاح ہے جس کی کشتی سخت طوفانوں میں جھکولے کھا رہی ہے اور ملّاح کشتی کو پار لگانے کے لیے سخت جد و جہد پر مجبور ہے چاہے اس میں کامیابی ہو یا نہ ہو۔ اس اعتبار سے وہ سارتر کے انسان کی خبر دیتا ہے جس نے خود کو ایک نظریے کا پابند کرلیا ہے جو ہر لمحہ جہدِ حیات پر مجبور ہے۔ اور جو اپنے ہر عمل کا خود اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

کلاسیکی نظریات کے مطابق ادب میں حصولِ کمال کے لیے اسلوب سے متعلق مقررہ قاعدوں کی پابندی، ربطِ عبارت، بندش کی ہم آہنگی اور اظہارِ خیال میں اعجاز و اختصار لازمی ہے۔ یہ خوبیاں ژاں دی لافونتین (Jean de La Fontaine) (1621ء-1695ء) کی حکایات۔ نکولا بولو (Nicolas Boileau) (1636ء-1711ء) کے کلام روشِ فوکولڈ (Roche Foucold) کی نگارشات، ڈیوک فرانسوا (1613ء-1680ء) کے حکیمانہ اقوال ژاں دی لا برواییر (Jean de la Bruyère) (1645ء-1696ء) کے مکاتیب ژاک باسیوے (Jacques Bossuet) کے تعزیتی خطبات فرانسو دی سالین (Francois de Salignne) کے سائنسی موضوعات پر مقالات، راسین کے المیہ ڈراموں اور مشہور

عالم ڈرامہ نویس مولیر (۱۶۲۲ء — ۱۶۷۳ء) کے مزاحیہ ڈراموں میں نظر آتی ہیں۔

مولیر کا اصل نام ژاں باپتست پاکلے (Jean Baptiste — Poquelin) تھا وہ صرف ڈرامہ نگار ہی نہیں تھا بلکہ ڈائریکٹر اور اداکار بھی تھا۔ اس نے نہ صرف لوئی چہاردہم سے خراج تحسین حاصل کیا تھا بلکہ پیرس اور اضلاع فرانس کے عوام میں بھی بہت مقبول رہا۔ مولیر نے ڈرامہ نگاری کے بڑے کرتب اور کرشمے دکھائے نہ صرف مضحکہ اور مزاحیہ تماشے لکھے بلکہ انتہائی اعلیٰ اور شائستہ مذاق کے ڈرامے بھی پیش کیے۔ مولیر نے ناظرین کو ہنسانے اور ان کا دل موہ لینے کے تمام امکانات سے کام لیا۔ اس کی بیشتر شاہکار تمثیلیں وہ ہیں جن میں ممتاز شخصیتیں روحانی سطح پر کسی کوتاہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے یہ کردار اس نوع کے آفاقی نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولیر کی رائے میں عقل سلیم اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی معاملے میں بھی غلو سے کام نہ لیا جائے۔ یہاں تک کہ نکوکاری میں بھی غلو سے بچنا چاہیے۔ اچھا آدمی وہ ہے جو فطرت انسانی پر عقل سلیم کی جانب سے عاید کردہ حدود کو پیش نظر رکھتا ہے۔

مولیر کے کئی ڈرامے اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک ڈرامہ "لی تارتیوف" (le Tartuffe) ہے یہ ایک مکار منافق کی کہانی ہے جو زہد و تقویٰ کی آڑ لے کر ایک خوش اعتقاد خدا ترس خاندان کو تباہ و برباد کرنے کی چالیں چلتا ہے۔ دوسرا دل چسپ ڈرامہ "لی مسانتھروپ" (le Misanthrope) ہے، اس میں ایک مردم بے زار کا کردار پیش کیا گیا ہے جو ہر معاملے میں صرف سچائی اور دیانت داری کو اہمیت دیتا اور اس پر مصر رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ شرافت اور نکوکاری ہی اس کی خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔ مولیر کا ڈرامہ "ڈان جوآن" (Don Juan) اس نام کے مشہور و معروف عیاش و اوباش کی بدچلنیوں کا خزینہ ہے۔

اس کا سب سے زیادہ مشہور و مقبول ڈرامہ "لی بورژوا جان تیم" (le Bourgeois Gentilhomme) ہے جس میں ایک بیوپاری دولت مندوں کے شائستہ اور نستعلیق طبقے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیش آتی ہے۔ مولیر بلاشبہ جدید فرانسیسی مزاحیہ ڈرامہ کا بانی تھا۔ اس کی تخلیقات کی مقبولیت کو زوال نہیں۔ فرانس میں اس کی یاد کو برقرار رکھنے کے لیے "لا کامیڈی فرانسیس تھیٹر" بھی قایم کیا گیا ہے۔

اٹھارہویں صدی

اس صدی کے دوران کارتیسی عقلیت پسندی کے زیر اثر تنقیدی اور سائنسی رجحان کو فروغ ہوا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نثر میں اس کی تصانیف کا غلبہ رہا جن کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ نفس مضمون کو جہاں تک ممکن ہو فطری انداز سے سیاسی اور معاشی حالات کی روشنی میں تجزیہ کر کے پیش کیا جائے تاکہ جو بات کہی جائے وہ قاری کے پلے پڑ سکے۔ یہ رجحان اس درجہ حاوی تھا کہ اس صدی میں صرف ایک نغز گو شاعر آندرے شینئے (Andre Chenier) (۱۷۶۲ء — ۱۷۹۴ء) منظر عام پر آیا لیکن وہ بھی کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا اور دور دہشت میں گلوٹین یا سولی کی نذر ہو گیا۔

والٹیر مسلمہ طور پر اس صدی کا سب سے بڑا مصنف تھا۔ اس کا اصل نام فرانسوا ماری آروے (Francois Marie Arouet) (۱۶۹۴ء — ۱۷۷۸ء) تھا۔ والٹیر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی اور ڈرامہ نگاری سے کیا۔ ۱۷۳۴ء میں فلسفیانہ مکاتیب کی اشاعت کے بعد اسے شہر بدر کر دیا گیا۔ بعد میں ادیب کی حیثیت سے اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے چند سال بعد والٹیر نے اپنے پمفلیٹوں اور مکاتیب میں عدالتی ناانصافیوں کے شکار شدہ افراد کی باز آباد کاری کے لیے رائے عامہ کو ہموار کیا شارل دی سکوندا دی مانتیسکیو (Charles ae Secondat de Montesquieu) (۱۶۸۹ء — ۱۷۵۵ء) نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات کے علیحدہ علیحدہ تعین کی تحریک کو بڑی حد تک آگے بڑھایا۔ دور انقلاب کی اولین جمہوریہ کا آئین اسی کے افکار و خیالات پر مبنی تھا۔

دینی دیدرو (DenisDiderot) (۱۷۱۳ء — ۱۷۸۴ء) فرانسیسی مسلک عقلیت پسندی کا سب سے زیادہ سربرآوردہ نمائندہ تھا۔ وہ انسائیکلوپیڈی (Encyclopaedie) کا اہم ترین معمار تھا اور اس نے بے شمار مشکلات کے باوجود یہ کتاب ۱۷۳۱ء میں شائع کر دی۔ دیدرو کے ناول نہایت دل چسپ ہیں۔ اس کے زور قلم کی داد دینی پڑتی ہے۔ ذہنی بے داری کی اس صدی میں وہ تھیٹر سے متعلق نظریات کا ایک عظیم المرتبت ماہر مانا جاتا ہے۔

ژاں ژاک روسو (Jean Jacques Rousseau) (۱۷۱۲ء — ۱۷۷۸ء) ایک گوشہ نشین آدمی تھا۔ اس نے کوئی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی اور جو کچھ سیکھا بخت و اتفاق سے سیکھا۔ روسو کی ایک تحریر پر دیژاں (Di Jon) کی اکیڈمی نے انعام دیا تو وہ یکایک مشہور ہو گیا۔ اس میں نظم و ضبط کا خاص ملکہ تھا۔ اور جب وہ کوئی نظریہ پیش کرتا تو اسے منطق کی آخری حد تک پہنچا دیتا تھا۔ روسو کا خیال تھا کہ انسان فطرتاً نیک سیرت پیدا ہوتا ہے لیکن سماج جس میں وہ رہتا بستا ہے اسے بگاڑ دیتا ہے۔ لہذا نجات اسی میں ہے کہ انسان اپنی ازلی نیکی کی جانب مراجعت کرے۔ وہ بستی کے شور و شغب سے دور تنہائی میں مظاہر فطرت کے درمیان تفکر کا عادی تھا اور اس میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ روسو نے سیاسیات اور تعلیم سے متعلق نئے نئے خیالات پیش کیے جو انقلاب فرانس کے لیے نصب العینی اساس کی تشکیل میں بڑی حد تک مفید ثابت ہوتے۔ انقلاب فرانس کی ناکامی کے بعد کے دور میں فرانسیسی ادب میں رومانیت کی تحریک کا آغاز بھی روسو کی افکار کی بدولت ہوا۔

پی یر کارل دی ماریو (PierreCarleude Marivaux)

(۱۶۸۸ء — ۱۷۶۳ء) نے بلند پایہ، پُرلطف و پُرکار مزاحیہ تمثیلیں لکھیں۔ اس کے تمام ڈرامے عشق و محبت کی نفسیات سے متعلق ہیں۔
پی یر اگستین بارون دی بوماشے (Pierre Augustin Caron de Beaumarchais) — (۱۷۳۲ء — ۱۷۹۹ء) نے جو ایک آزاد رَو، رند مشرب سرفروش تھا دو چونکا دینے والے ڈرامے باربیتے دی سیویل (Barbier de Seville) اور لی مار یاز دی فگارو (le Marriage de Figaro) کے نام سے لکھے ہمعصر فرانسیسی سماج پر یہ ایک تیز و تند اور بے باکانہ تنقید تھی۔ ان ڈراموں کی اشاعت اس زبردست جوش و خروش میں شدت پیدا کر گئی جو بالآخر دھماکہ بن کر ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کی شکل میں پھوٹ پڑا۔ اس نے انقلاب کے لیے بہت کچھ کیا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب انقلاب کا آتش فشاں پھٹ پڑا تو وہ اس کے بارے میں ایک نہایت معمولی جذباتی میلو ڈرامہ کے سوائے کچھ اور نہ لکھ سکا۔ اور زمانے نے بجا طور پر اس کی اس تصنیف کو طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا۔

انیسویں صدی نصف اوّل

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب انقلابِ فرانس کے مقاصد کی پیش رفت کے تعلق سے مایوسی پھیل گئی تو ادب پر داخلیت کا رنگ چڑھنے لگا اور عقلیت پسندی سے بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔ فرانسو رینے وائکومتے دی شاتوبریاں (Francoisrene Vicomte de Chateaubriand) (۱۷۸۶ء — ۱۸۴۸ء) اور مادام دی رسٹال (۱۷۶۶ء — ۱۸۱۷ء) کی تصانیف سے فرانسیسی ادب میں رومانیت کے ایک پُرزور تحریک بن جانے کے امکانات کا پتہ چلتا ہے۔ رومانیت کی تحریک نے کلاسیکل اسلوب کے خلاف سخت ردِعمل کی شکل اختیار کی۔ اس کے زیرِ اثر لکھنے والوں کا طائرِ فکر زماں و مکاں کی بندشوں سے آزاد ہو کر بلند پروازی کرنے لگا اور ان کی تخلیقات میں قومی المیئے کی جانب اشارے بھی ملتے ہیں۔ الفانسے دی لامارتین (Alphonse de Lamartine) — (۱۷۹۰ء — ۱۸۶۹ء) کو رومانیت کے اولین نغز گو ترجمان ہونے کا امتیاز حاصل ہے لیکن اس تحریک کو معراجِ کمال پر پہنچانے کا سہرا وکٹر ہیوگو (۱۸۰۲ء — ۱۸۵۵ء) کے سر ہے۔ وکٹر ہیوگو ایک سربرآوردہ شاعرِ رزم و بزم ہونے کے علاوہ ناول نگار ڈرامہ نویس بھی تھا۔ اور اس صدی کے بیشتر حصے میں اس کا مقام سب سے زیادہ بلند و بالا نظر آتا ہے۔ اس نے کئی ضخیم ناول لکھے۔ لے میزرابل (Les Miserables) نامی ناول ژاں وال ژان نامی ایک مجرم کی بپتا ہے جو قید سے رہا ہونے کے بعد شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے لیکن پولیس کے روپ میں سماج سایہ کی طرح اس کا تعاقب کرتا ہے۔ لا نوترِ دام دی پاری (La Notre Dame de Paris) کی کہانی یہ ہے کہ ایک کبڑا جو گونگا بہرا بھی ہے ایک جپسی حسینہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ سوزِ عشق

کی آگ کبڑے کے سینے میں دہکتی ہے کسی اور کو خبر نہیں ہونے پاتی۔ اپنی مشہور نظم۔ لی لجندی دی سکل (le Legend Dussiecle) میں اس نے پرواز تخیل کا غیر معمولی کرشمہ دکھایا ہے۔ اس نے ڈرامے بھی لکھے جن کے بارے میں بڑی بحثیں چھڑ گئی تھیں اور جو بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ وکٹر ہیوگو نے ڈراموں پر جو پیش لفظ لکھے تھے وہ جدید تھیٹر کی تحریک کے منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے ملک کی سیاسی صورتِ حال سے متعلق پمفلٹ بھی لکھے جو فکر انگیز بحث کا موضوع بن گئے تھے۔ یہ تحریریں زیادہ تر اس زمانے کی ہیں جب وہ شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ ان میں اس نے نپولین اعظم کے بھتیجے نپولین ثالث سے نفرت و حقارت کا اظہار کیا تھا۔ وکٹر ہیوگو کی تصانیف نہ صرف فرانس میں مشہور و مقبول ہیں بلکہ اس جیسی عالمی شہرت کسی اور فرانسیسی مصنف کو نصیب نہ ہو سکی۔

رومانی تحریک سے تعلق رکھنے والے چند اور اہلِ قلم بھی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں الفرے دی وینی (Alfred — de Vigny) (۱۷۹۷ء — ۱۸۶۳ء) الفرے دی میوسے (Alfred de Musset) — (۱۸۱۰ء — ۱۸۵۷ء) نامی شاعر اور ڈرامہ نویس شامل ہیں۔

اس صدی کا نصفِ اوّل اس وجہ سے بھی شاندار ہے کہ اس میں دو عظیم ناول نگار ایسے پیدا ہوئے جنھیں کسی بھی ادبی مسلک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک آنرے دی بالزاک (Honore de Balzac) — (۱۷۹۹ء — ۱۸۵۰ء) ہے جس نے انقلاب فرانس کے بعد کے زمانے کے پیرس کی مسخ شدہ سوسائٹی کی برائیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے تقریباً ایک سو ناول لکھے اور دو ہزار کردار تخلیق کیے اس نے ناولوں کا ایک سلسلہ "کامیڈی ہیومین" (La Comedie — Humain) دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" کی ریس میں شروع کیا۔ اور ان کی ذیلی تقسیم "خانگی زندگی" "دیہی زندگی" "پیرس کی زندگی" کے عنوانات کے تحت کی۔ اس کا ہر ایک ناول بجائے خود مکمل ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایک ناول کے کردار دوسرے ناولوں کے صفحات میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جرائم پیشہ کردار جس کا نام واترین (Vautrin) ہے یا دیہی علاقے کا ایک وجیہہ مگر نودولتیے نوجوان جو بالزاک کے مختلف ناولوں میں ملتا ہے اور جو قلبِ ماہیت کر کے ایک بد دیانت سیاست داں بن جاتا ہے اس دور کا دوسرا ناول نویس آنری بیل (Henri Beyle) جس کا ادبی نام استینداِل (Stendbal) (۱۷۸۳ء — ۱۸۴۲ء) تھا بالزاک ہی کی طرح مشہور ہے۔ وہ ایک بے مثال ناول نویس تھا جس نے نپولین کے دور کے ہنگاموں اور امکانات کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کی غیر فانی شہرت دو ناولوں پر مبنی ہے جن کے نام لی روژ اے لی نوار (Le Rauge et Le Noir) اور ل شارترو دی پم (La Chartrense De Parme) ہیں۔ اگرچہ اس نے ان کے علاوہ بھی کئی ناول لکھے ہیں۔ اول الذکر جولین سارل کی کہانی ہے جو دیہی

علاقے کے لکڑہاروں کے خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ جولین اپنی صورت شکل کے زور سے اعلیٰ سوسائٹی میں اپنے لیے جگہ نکال لیتا ہے جس میں اسے دیہی علاقے کی ایک با اثر خاتون اور پیرس کی ایک لڑکی کی وارفتگی سے مدد ملتی ہے۔ یہ ناول ایک حزنیہ ہے۔ سارل اپنی محبوبہ کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اقدامِ قتل کے الزام میں اسے سولی دی جاتی ہے۔ فبرس دِل دنگو (Fabrice Deldongo) اس کے دوسرے ناول کا ہیرو ہے۔ ناول ایک چھوٹے سے اطالوی قصبے کی زندگی عشق و محبت کی واردات اور سازشوں سے متعلق ہے۔

انیسویں صدی نصف آخر

اس صدی کے نصف آخر میں بعض نئی نئی ادبی تحریکیں ابھریں۔ اس کے بانی اپنے آپ کو رومانیت سے بےتعلق بتاتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ رومانیت ہی کی پیداوار تھے۔ شاعری کی حد تک پارنی سیان (Parnassiens) قابل ذکر ہیں۔ اس گروہ کے ممتاز نمایندے تیوفل گاتئے (Theophile — Gautier) (۱۸۱۱ء-۱۸۷۲ء) اور لیکونت دی الزل (Leconte — Delisle) (۱۸۱۸ء-۱۸۹۴ء) تھے جن کا نظریہ ادب برائے ادب تھا۔

شارلس بودے (۱۸۲۱ء-۱۸۶۷ء) پول وے لین (Paul — Verlaine) (۱۸۴۴ء-۱۸۹۶ء) اور اس کے بدنصیب دوست آرتھیور رمبو (Arthur Rimbaud) (۱۸۵۴ء-۱۸۹۱ء) کے اختراعی ذہن نے اشاریت کی تحریک شروع کی۔ اس نظریہ کا ممتاز ترین ماہر اور بہترین ترجمان بلاشبہ استیفان ملارمے (Stephane-Mallarme) (۱۸۴۲ء-۱۸۹۸ء) تھا۔ بودلیر کی اس کی زندگی میں قدر نہیں ہوئی مگر آج اپنے کلام اور تنقیدی تحریروں کی بدولت اس کا شمار فرانس کے عظیم مصنفین میں کیا جاتا ہے۔ وہ کم گو تھا۔ اس کے کلام کا مختصر مجموعہ فلیر دی یومال (Lés — Fleurs du Mal) جب شائع ہوا تو مخرب اخلاق قرار دیا گیا اور اس کی اشاعت ممنوع کر دی گئی۔ لیکن یہ مجموعہ ممانعت کے باوجود مقبول ہو گیا اور آج بھی مقبول ہے۔ اس نے زیادہ نہیں لکھا لیکن ادبیات کے خد و خال پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ جہاں تک ناول نویسی کا تعلق ہے اس دور میں حقیقت نگاری کا مسلک بہت مقبول ہوا۔ اس مسلک کے سربرآوردہ نمائندے گستاؤ فلوبیر (۱۸۲۱ء-۱۸۸۰ء) اور اس کا مقلد گے دی موپسان (۱۸۵۰ء-۱۸۹۳ء) تھے۔ آخر الذکر کو مختصر افسانہ نویسی میں کمال حاصل تھا۔ فلوبیر کا شاہکار اس کا ناول "مادام بواری" ہے۔ ناشر نے اس ناول کے بہت سے حصے حذف کر دیے تھے اس کے باوجود وہ مخرب اخلاق قرار دیا گیا لیکن مقدمے میں بالآخر مصنف کامیاب رہا۔ ناول کا قصہ یہ ہے کہ ایک کسان کی لڑکی جس کا نام ایما تھا بری صحبت میں پڑ کر یکے بعد دیگرے کئی نوجوانوں سے محبت کرتی ہے اور بالآخر جب سماج کی اخلاقی گرفت میں آجاتی ہے تو زہر پی لیتی ہے۔ موپسان جس کے افسانے ہندوستان میں مقبول ہیں فرانسیسی ادب میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتا۔ وہ فلوبیر کا مقلد تھا۔ ایمل زولا (Emile Zola) (۱۸۴۰ء-۱۹۰۲ء) نیچرلسٹ حقیقت پسندی کا رہنما تھا۔ زولا نے کئی ناول لکھے جن میں اس نے زیادہ تر پیرس کی زندگی کی خرابیوں، کشمکش اور شور و شغب کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ بڑا جرأت والا اور دُھن کا پکا تھا۔ نسلی امتیاز کے جذبے کے تحت ایک یہودی فوجی افسر پر یہ بے سر و پا الزام عاید کیا گیا تھا کہ اس نے جرمنوں کو فوجی راز بتائے تھے۔ زولا نے اس افسر کو رہا کروا کے بحال کروانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ڈرامہ نگاری میں اس دور میں الگزنڈر ڈیوما جونیئر (۱۸۲۴ء-۱۸۹۵ء) کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ الگزنڈر ڈیوما اوّل (۱۸۰۲ء-۱۸۷۰ء) کا بیٹا تھا اسی ڈیوما کا جس نے مشہور مہماتی ناول لکھے تھے جن میں سب سے زیادہ مقبولیت غالباً تین تلنگے (Three Masqueteers) کو حاصل ہوئی۔ ڈیوما جونیئر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول نگاری سے کیا تھا اسے اپنے مشہور باپ کے مساوی شہرت ڈرامہ نگاری کی بدولت حاصل ہوئی۔

بیسویں صدی

اس صدی کی ابتدا سے دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک فرانسیسی ادب پر برگساں (۱۸۶۸ء-۱۹۵۱ء) اور دوسرے عظیم مفکروں کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ نظریہ معدومیت (Nihilism) جو دادائزم (Dadaism) کہلاتا ہے اس کا زور گو زیادہ عرصے تک قایم نہیں رہا لیکن اس کی وجہ سے شاعری کی بساط درہم برہم ہو گئی اور ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ناول کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ پول کلوڈیل (Paul Claudel) (۱۸۶۸ء-۱۹۵۵ء) نے جوہرِ رومانیت کے عرفان کے اظہار کی سعی کی تو شارل پیگی (Charles Peguy) (۱۸۷۳ء-۱۹۱۸ء) نے اپنا زورِ سخن مذہب کی خدمت اور سماجی اصلاح کے لیے صرف کیا۔ گیوم آپولینیر (Guillaume Apollinaire) (۱۸۸۰ء-۱۹۱۸ء) نے جو شاعر اور نقاد تھا ماورائیت (Surrealism) کی راہ دکھائی۔ پی یر لوتی (Pierrelote) (۱۸۵۰ء-۱۹۲۳ء) نے مہماتی ناول موثر انداز میں لکھے۔ رومین رولاں (Romain Rolland) (۱۸۶۶ء-۱۹۴۴ء) نے اپنی تصانیف خصوصاً اپنے شاندار ضخیم ناول ژاں کرسٹوف (Jean — Christophe) کے ذریعہ انسان دوستی کے نصب العین کو ابھارا۔ اس نے جرمن موسیقار بیتھووین، اطالوی مصور مائیکل انجیلو، روسی ناول نویس ٹالسٹائے اور جدید ہندوستان کی تین عظیم شخصیتوں گاندھی جی، راما کرشنا پرماہنس، اور سوامی ویویکانند کی سوانح حیات بھی لکھی ہیں۔ ان تصانیف کا مقصد امن پسندی اور انسانی جذبۂ اخوت کا اعلیٰ ترین سطح پر پرچار تھا۔ وہ امن کا جانباز سپاہی تھا اور اس کے بےلوث جذبۂ بین الاقوامیت کے اہم تشکیلی عناصر میں ہندوستان کے فلسفے اور روس میں سوویت تجربے کو بڑا دخل حاصل تھا۔ اناطول فرانس (۱۸۴۴ء-۱۹۲۴ء) بھی ایک ممتاز مصنف تھا اس کا موثر ترین

حربہ طنز و تعریض تھا۔ اس نے سوشلسٹ طرزِ فکر کو فرانس میں پھیلانے میں بڑا کام کیا۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیان کے زمانے میں فرانسیسی ادب میں تین نمایاں شخصیتیں تھیں۔ مارسل پروست (Marceal — Proust) (۱۸۷۱ء۔ ۱۹۲۲ء) نے ناول کی تشکیل کا ایک نیا انداز اختیار کیا۔ اس کے ناول "یادِ ماضی" کے مشترک عنوان سے شائع ہوتے جن میں اس نے کئی موضوعات اور واقعات کے امتزاج سے نرالا لطف پیدا کیا ہے۔ مثلاً حدیثِ دیگراں کے روپ میں خود مصنف کی آپ بیتی ہے لیکن آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ دراصل ذکر کس کا ہے۔ ایک لاڈلے بیٹے کا احوال جو ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ انیسویں صدی کے آخری دہے اور پہلی جنگِ عظیم کے درمیان کے زمانے میں فرانس کے امرا اور ان کے مصاحبین اور حاشیہ برداروں کے طرزِ زندگی کا ذکر ہے۔ محبت اور جدائی کی صورتِ حال کا نفسیاتی جائزہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی دُوری یا اظہارِ محبت کے جواب میں انکاری ردِ عمل یا یکگونہ بے وفائی طالب و مطلوب کے رشتۂ الفت کی برقراری اور استحکام کے لیے لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ان ناولوں میں غیر ارادی طور پر ماضی کے بھولے بسرے واقعات اور گریزپا لمحات کی مکمل تصویریں بھی آگئی ہیں۔ مارسل پروست کی یہ لطافت آمیز طویل داستان جس کا ماحول خواب سا ہے فنِ ناول نگاری کا ایک غیر فانی کرشمہ ہے۔

آندرے ژید (Andre Gide) (۱۸۶۹ء۔ ۱۹۵۱ء) نے جدید دور پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ انسان دوستی اور کلاسزم سے کیا مراد ہے۔ ژید مضمون نگار (Essayiste) بھی تھا اور نقاد، ناول نگار اور ڈرامہ نویس بھی۔ وہ جدید ادب کی تحریک مطالعۂ نفس (Inter Prospection) خود [illegible] (Self — Confession) اور اخلاقی و مذہبی اضطراب کا سب سے زیادہ ممتاز ترجمان تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان کے زمانے کی نسل کی جمالیاتی اور اخلاقی قدروں پر اس کے نظریات کا بڑا اثر تھا۔

پال والیری (Paul Valery) (۱۸۷۱ء۔ ۱۹۴۵ء) اس خیال کا حامی تھا کہ تخلیق شعر کے عمل پر روح سے متعلقہ قوانین کی حکمرانی ہے۔ ملک کی اخلاقی اور سماجی صورتِ حال سے متاثر ہو کر اس دور کے بعض مشہور و معروف اہلِ قلم نے ناول لکھے۔ جن میں ژیول رومین (Jules Romains) (۱۸۸۵ء) روژے مارتان دیو گار (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۵۸ء) ژارژ دیو آمیل (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۶ء) شامل ہیں۔ اس دور میں متعدد ناول لکھے گئے ژاں ژیرودو (Jean Giraudoux) (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۴۴ء) نے نفسیاتی ناول لکھے۔ ژولیان گرین (۱۹۰۰ء) فرانسوا موریاک (Francois Mauriac) (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۷۰ء) اور ژارژ بیر

نانو (Georges Bernans) (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۴۸ء) کے ناول کچھ مذہبی رنگ لیے ہوتے ہیں۔ لوئی اراگاں (Louis Aragon) (۱۸۹۷ء) نے علمِ بغاوت بلند کیا آندرے مالرو (Andre Malrauy) (۱۹۰۱ء) آن ری دی مانتیرلا (Henri De Montberalant) (۱۸۹۶ء) اور انتواں دی سینٹ ایکسیوپری (Antoine — de Santexupery) (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۴۴ء) نے اپنے ناولوں میں حرکت اور عمل کو اہمیت دی۔

شاعری پر ماورائیت کا (Surrealism) کا غلبہ ہو گیا آندرے بریتاں اس تحریک کا سب سے زیادہ ممتاز نظریہ داں مانا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے روبیر دیس نوس (Robert Disnos) (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۴۵ء) اور خصوصاً پول ایلوار (Paul Eluard) (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۵۲ء) اس کے ممتاز ترین پیرو تھے۔ اور بعد میں ایلوار نے ماورائیت کے مسلک کو خیرباد کر دیا اور مقاومت کی تحریک کے زمانے میں کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو گیا۔ اس کے کلام میں عملی سیاست اور نغز گوئی کا اثر آفریں امتزاج نظر آتا ہے۔

اسٹیج کے لیے گرودو (Giraudouy) نے جو ڈرامے لکھے ہیں ان میں حزن و مزاح کی دھوپ چھاؤں لطف دیتی ہے۔ مارسل پان یول (Marcel Pagnol) (۱۸۹۵ء) طنزیہ ڈرامہ نگار ہے۔ اور ژاں انوی (۱۹۱۰ء) کے ڈراموں کا امتیاز فنکارانہ چابکدستی ہے۔

جرمنی کے قبضے اور اس قبضے کے خلاف جد و جہد کے دوران اراگاں اور ایلوار نے ادب کی خفیہ (Clandestine) اصناف میں تخلیق کے جوہر دکھاتے یہ دونوں اب کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہیں اس دور میں ایسے فلسفیانہ رنگ کو بھی فروغ ہوا جس کا ممتاز ترجمان نظریہ وجودیت کا بانی — ژاں پول سارتر (۱۹۰۵ء) ہے۔

فرانس کی ادبی اور سیاسی زندگی پر آج سب سے زیادہ اور نمایاں اثر سارتر کے طرزِ فکر کا ہے۔ اس کا فلسفیانہ شاہکار "وجود و عدم" (Being & Nothingness) ہے۔ "کراہیت" اور "اشے دل برتے" اس کے اہم ناول ہیں۔ سارتر کے ڈرامے نہ صرف اس کے نظریات کے ترجمان ہیں بلکہ فنی اعتبار سے اعلیٰ پایہ کے ہیں اس لیے اسٹیج پر بہت کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ کامیو (Camus) نے جس کا انتقال موٹر کار کے ایک حادثے میں ہوا دورِ حاضر کے دو نہایت معنی خیز ناول لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک "لی ترانژے" (L'Etranger) ہے جس میں ایک نوجوان جھوٹ بولنے اور دھوکہ بازی سے انکار کر دیتا ہے۔ دوسرا ناول "لی پسٹ" (La Peste) ایک تمثیل (Allegory) ہے جس میں فرانس پر جرمنی کے قبضے کا حال الجیریا کے شہر اوران میں طاعون کی فرضی وبا کے پردے میں پیش کیا گیا ہے۔

اب ہم اس دور تک پہنچ گئے ہیں جو ہم سے اس درجہ قریب ہے

کہ اس کی صحت وسقم کے بارے شاید کہنا آسان نہیں۔ ریماں کینو (Ranand Tuenbeau) (۱۹۰۳ء) کے فینٹیسی (Fantasy) اور ژاک آدی بیرتی (Jacques) (۱۸۹۹ء) کے برلسک (Burlesqie) اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن آئرستانی سیمیول بکٹ (Samuel Beckett) (۱۹۰۶ء) رومانی اجین ایونسکو (Eugene Ionesco) (۱۹۱۲ء) اور اینرک ایڈاماو (Isac Adamou) کا تخلیق کردہ تھیٹر (Theater of the Absurd) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ نسلوں میں بھی صدیوں مقبول رہے گا۔ نتالک سرروت (Nathalie Sarraute) آلین روب گریلے (Alain Robbegrillet) (۱۹۲۲) اور میشل بیوتیر (Michel Butor) کے ناول کائنات کے ایک معروضی تصور کی جستجو کے آئینہ دار ہیں۔ ایسی کائنات کا تصور جس کا عرفان غیبی تائید کے بغیر ممکن نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ناول صدیوں مقبول رہیں اور آنے والی نسلیں ان کو ہمارے موجودہ دور کے نہایت ممتاز اور معنی خیز کارناموں میں شمار کریں۔

فرانسیسی زبان میں بیش بہا ادب سے بھی مالامال ہے جو سابق سلطنت فرانس میں شامل ملکوں کی دین ہے۔ مغربیت کے اہل قلم میں الجیریا کے حطیب لیسین اور دیب قابل ذکر ہیں مراقش کے ادریس شرایبی نے فرانس کے ان محنت کشوں کے مسائل موثر انداز میں پیش کیے ہیں جن کا وطن شمالی افریقہ ہے۔

سیاہ فام افریقہ نے کم از کم ایک ادیب اور شاعر ایسا پیدا کیا ہے جو فرانسیسی ادب میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے۔ وہ ہے لیوپولڈ سیدار سینگھور (Leopold Sedar Sengbor) (۱۹۰۶ء) اس نے نیگرویت (Negritude) کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس کا مقصد اس نسل میں اپنی تاریخ و تمدن کے تعلق سے جذبۂ اعتماد و افتخار کو ابھارنا ہے جسے نوآبادیاتی تسلط نے بُری طرح کچل ڈالا ہے۔ یہ نہایت ضروری تھا اس لیے کہ جب تک خود اعتمادی اور خود شناسی کا جذبہ بیدار نہ ہو قوم آزاد ہو کر ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

فن ادب

ادب کیا ہے اس کی تعریف اسی طرح مشکل ہے جس طرح دوسرے فنون کی خاص طور پر ایسی تعریف جس پر سب کو اتفاق ہو۔ بعض لوگ مثلاً میتھو آرنلڈ ہر اس علم کو جو کتاب کے ذریعہ ہم تک پہنچے ادب قرار دیتے ہیں۔ والٹر پیٹر (Walter Pater) کا خیال ہے کہ ادب واقعات یا حقائق کو صرف پیش کر دینے کا نام نہیں بلکہ ادب کہلانے کے لیے اظہار بیان کا تنوع ضروری ہے۔ ایک تعریف کے مطابق ادب میں الفاظ کی ترتیب افکار اور احساسات کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے میں مسرت کا احساس پیدا ہو۔ اس کے اپنے تجربات کو ادب ایک بلند تر سطح پر پہنچا دیتا ہے۔

ادب صرف کتابوں ہی میں نہیں ہوتا۔ زبانی ادب کو تاریخ میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ قدیم عرب میں بہت سے شاعر گزرے ہیں جو بڑی طویل نظمیں کہتے [illegible] جو بڑے بڑے مجمعوں میں سنائی جاتی تھیں اور ہزاروں کے دل گرماتی تھیں۔ اکثر انھیں لکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ ادب انسانی اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن ہر وہ چیز جس کا اظہار الفاظ میں ہو اور لکھی جائے لازم نہیں کہ ادب کے زمرہ میں شامل ہو سکے۔ وہ تمام تحریریں جو معلوماتی ہوں مثلاً سائنسی علوم، علمی اور صحافتی تحریریں اس وقت تک ادب کے زمرہ میں شامل نہیں ہوتیں جب تک کہ وہ فن لطیف کی حد کو نہ چھو لیں۔ اگرچہ خود فن لطیف کی تعریف بہت مشکل ہے۔ بایں ہمہ گردوپیش کے کسی سائنسی تجربہ کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی فن پارہ بن جائے اس کے برعکس بہت سی نظمیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ادب کے زمرہ میں شامل نہیں کر سکتے ہیں۔ ادب کی سب سے خالص شکل غنائی یا رومانی شاعری ہے۔ اس کے بعد دوسری اصناف سخن آتی ہیں۔ شعر میں جب تک لطافت نہ ہو۔ وہ ذہنی اور جذباتی گہرائیوں کو چھو نہ سکے تب تک وہ شعر نہیں کہلاتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ نثر موزوں کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے ناول اور ڈرامے ادب عالیہ کا حصہ ہیں۔ اگرچہ ہر ڈرامہ اور ناول اس صنف میں نہیں آتا۔ چین میں ڈرامہ کی بڑی قدیم روایت ہے لیکن وہاں ڈراموں کو عام طور پر ادب میں شامل نہیں کیا جاتا۔

یونانیوں کے یہاں فنون لطیفہ کی سات قسمیں ہیں۔ تاریخ اس میں سے ایک ہے۔ انھوں نے اور ان کے بعد کی مورخوں نے صنف تاریخ میں ایسے کارنامے چھوڑے ہیں جنھیں دنیا کے ادب عالیہ میں ہمیشہ اہم مقام حاصل رہے گا لیکن تاریخ کی ہر کتاب ادب نہیں ہوتی اور خاص طور سے موجودہ دور کے مورخین ادبی پہلو پر کچھ زیادہ زور نہیں دیتے۔ ایک زمانہ میں مضمون نگاری (Essay Writing) کو بھی فن سمجھا جاتا تھا۔ مواد سے زیادہ اظہار بیان پر زور دیا جاتا تھا اور بعض فن پاروں نے ادب عالیہ پر مستقل جگہ بنا لی ہے۔ آج کل مضمون نگاری میں مواد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسے مضمون نگار نظر آ جاتے ہیں جن کے مضامین ازلی شان رکھتے ہیں۔

بعض لوگوں نے خود اپنی سوانح عمریاں لکھی ہیں یا اپنے پیچھے ایسی یادداشتیں اور خطوط وغیرہ چھوڑے ہیں جو دنیا کے اعلیٰ ترین ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔

فلسفہ اور دوسرے علوم کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جنھیں ادب عالیہ میں جگہ حاصل ہے مثلاً افلاطون کے مکالمات (Dialogues)

ادبی تنقید

ادبی تنقید کی روایت بہت پرانی ہے۔ اور دوسرے بہت سے علوم کی طرح فن تنقید پر بھی پہلی تحریر قدیم یونان میں ہی ملتی ہے۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو نے اپنی کتاب بوطیقہ (Poetics) میں المیہ ڈرامہ (Tragedy) اور کلاسکی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ بعض لوگ اس کتاب کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو محض المیہ ڈرامے اور شعر لکھنے کے نسخوں کی کتاب ہے یہ سچ ہے کہ ارسطو نے المیہ کی ساخت کا تجزیہ کیا لیکن ایسا کرتے ہوئے اس نے اظہار بیان کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کا یہ انداز تنقید اس کے بعد سے برابر موضوع بحث بنا رہا ہے۔

پہلی صدی عیسوی میں یونان میں ایک اور مقالہ On the Sublime لکھا گیا۔ اس میں اس سوال کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے ارسطو نے ہاتھ نہیں لگایا تھا یعنی وہ کون سی شے ہے جو کسی ادب کو عظیم بناتی ہے۔ اس میں اظہار بیان کو معیار بنایا گیا۔ ارسطو نے محض عام اصول بیان کیے۔ اس مقالہ میں بات مثالوں کے ذریعہ سمجھائی گئی ہے۔

مغرب میں ادبی تنقید کی ابتدا ہی اس مباحثے سے ہوئی کہ آیا ایک فن کار یا ادب ایک انجینئر کی مانند ہے جو ایک مشین کا نقشہ بناتا ہے اور اس کے خطوط پر مشین تیار کرتا ہے۔ اس کا مقصد اپنے پڑھنے والوں کے ذوق کو ادبی تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ یا وہ ایک ایسا فن کار ہے جو اپنے فن کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اور ذات کی اس اظہار میں آتنی گہرائی اور حسن ہوتا ہے کہ پڑھنے والے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس میں اپنے احساسات اور تجربات کی جھلک دیکھتے ہیں۔

مغربی یورپ کی ساری تاریخ اسی بحث سے پُر ہے کبھی یہ صورت اور انسان دوستی کے درمیان ٹکر کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی کلاسیکیت اور رومانیت (Classicism and Romanticism) کے درمیان اور کبھی Cubism اور Expression کے درمیان۔ اگرچہ بعض نقاد یہ بات مانتے ہیں کہ ادب اور فنون میں دونوں پہلو موجود ہیں اور ان کے امتزاج سے اچھا ادب اور آرٹ پیدا ہوتا ہے۔

مشرق میں ادبی تصورات

جہاں تک مشرق کا تعلق ہے یہاں ادب کی نوعیت کے بارے میں کئی قسم کے نظریات ہیں۔ قدیم ہندوستانی ادب میں انتہائی اعلیٰ پایہ کا تنقیدی ادب ملتا ہے۔ لیکن ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح کون سی چیز لکھنی چاہیے۔ کن چیزوں کا احاطہ کرنا چاہیے، کنھیں چھوڑ دینا چاہیے بعض کتابیں فلسفیانہ ہیں اور بعض میں علم اصول بیان کیے گئے ہیں۔ قدیم ہندوستانی یا سنسکرت ادب کے عروج (۳۲۰ – ۴۹۰ء) کے درمیان ادیب اس بات کو مانتے تھے کہ ہیئت یا ادبی ساخت اور مواد یا احساسات و تجربات ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یہی

نقطۂ نظر قدیم چینی ادب میں ملتا ہے البتہ قدیم جاپانی ادب میں اسٹائل اور ادب کے ٹکنیکل پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

قدیم چینی ادب میں طویل اور مختصر نظموں کی بحث بھی چلی ہے لیکن چینی نظمیں زیادہ تر غنائی اور مختصر ہوتی تھیں۔ کوئی نظم سو اشعار سے نہیں بڑھتی۔ قدیم یونان میں تو علم ہیئت، زراعت، ماہی گیری غرض ہر موضوع پر مقالے نظم کیے گئے ہیں۔ اس قسم کی شاعری چین میں مبتذل سمجھی جاتی تھی۔

ایشیا کی دوسری کلاسیکی زبانوں مثلاً سنسکرت عربی اور فارسی میں غنائی، غنائی اور رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ طویل فلسفیانہ اور رزمیہ نظموں اور مثنویوں کا رواج رہا ہے۔ رامائن، شاہ نامہ، مثنوی معنوی (مثنوی مولانا روم) کا شمار ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔

ادب کی زبان

بعض ادب میں (خاص طور پر کلاسیکی چینی، جاپانی اور قدیم آیرش میں) جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ عام لکھنے پڑھنے یا بول چال کی زبان سے بہت مختلف تھی اور اس لیے ادبی کتابوں کے پڑھنے کے لیے خاص تعلیم درکار تھی۔ مغرب میں بھی ثقہ لوگوں کی بول چال کی زبان میں لکھنے کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ شیکسپیئر کے زمانے میں لوگوں کی بول چال کی زبان وہ نہیں تھی جو اس کے ڈراموں کی ہے اور نہ ہی اٹھارویں صدی میں لوگ ویسی نثر بولتے تھے جیسی سیموئل جانسن اور ایڈورڈ گبن لکھتے تھے انگریزی زبان میں ڈینیل ڈیفو (۱۶۶۰ – ۱۷۳۱ء) پہلا ادیب تھا جس نے عام پڑھے لکھے لوگوں کی بول چال کی زبان لکھی۔ اور دلچسپ چیز یہ ہے کہ اس وقت سے اب تک اس زبان میں بہت کم فرق آیا ہے۔

ابہام، مبالغہ آرائی، استعارے اور تشبیہات بھی ادب کے اہم اجزا رہے ہیں۔ پچھلی بیسویں صدی میں دو بڑی لڑائیوں کے درمیان ابہام نے ادب میں بہت ترقی کی خاص طور پر مغربی ادب میں اس کا اثر دنیا کی دوسری زبانوں پر بھی پڑا ہے۔ مشہور شاعر مضمون نگار ٹی۔ ایس ایلیٹ انگریزی زبان میں اس تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں میراجی، ن۔ م۔ راشد اور اس دور کے بہت سے شاعروں پر ایلیٹ کا اثر ہے۔

ادب کی صنعت گری

موسیقی کی طرح ادب وقت کی حدود کا پابند ہے۔ کسی ادبی تخلیق کو پڑھنے یا سننے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس میں بھی خیالات تصورات اور مناظر اسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک کے بعد ایک آتے ہیں جس طرح موسیقی میں کوئی راگ، شاعری میں اکثر ردیف، قافیہ، بحر اور وزن کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اور الفاظ کا چناؤ اس پابندی کا تابع ہوتا ہے۔ ایسی نظمیں بھی ہوتی ہیں جن میں ایک ہی مصرع بار بار دہرایا جاتا ہے۔

ادب کی صنعت گری ان چند اصولوں کی پابندی کے ماورا بھی ہے اس میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر ہوتا ہے۔ اس میں جو واقعات جذبات اور احساسات بیان کیے جاتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں۔ جو پڑھنے والے کی نہ صرف سمجھ میں آئیں بلکہ اس کے اپنے تجربات سے

بھی قرب رکھتے ہوں۔

ارسطو نے ڈرامہ کی ساخت کے بارے میں ایک بنیادی فارمولا پیش کیا ہے۔ وہ ہے پیش کش۔ ارتقا، پیچیدگی، بحران اور حل۔ یعنی کہانی شروع ہوتی ہے۔ آگے بڑھتی ہے۔ اندرونی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جو بحران کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور پھر یہ یا تو بحران حل ہوجاتا ہے یا انجام سخت المیہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ ساخت کا ڈھب ادب کی دوسری صنفوں میں بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔ اس نسخہ سے بہت ساری نئی نئی شکلیں پیدا کی جاتی ہیں۔ ۱۷ویں صدی میں فرانس نے یونانی ڈرامہ کے اصول اتحاد کو اور زیادہ شدت کے ساتھ برتا جس میں وقت، عمل اور مقام تینوں کا اتحاد معرض عمل میں آتا ہے یعنی ڈرامے کی کہانی صرف ایک دن کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے مقام کے لحاظ سے پھیلتی نہیں صرف گھر کے اندر اور باہر تک محدود ہوتی ہے۔ پلاٹ صرف ایک ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ اس میں مزاحیہ چھوٹے پلاٹ جوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ فارمولا ارسطو کے یہاں نہیں ملتا اور نہ یونانی ڈرامہ میں۔ یہ فرانس کے نشاۃ ثانیہ کی دین ہے۔

بعض لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ ڈرامے کا مزاج بھی یکساں رہنا چاہیے یعنی اگر غم کا ماحول ہے تو پورے ڈرامے پر وہی چھایا رہے۔ چنانچہ یہ لوگ شیکسپیئر پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے ہیملٹ اور میکبتھ جیسے غمگین فضا والے ڈراموں میں مزاحیہ کردار داخل کیے۔

ناول مغربی ملکوں میں ۱۹ویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچا۔ دنیا کے اعلیٰ ترین ناول روس، فرانس اور برطانیہ میں اسی دور میں لکھے گئے ان کے مصنفوں نے پلاٹ پر بہت گہرا دھیان دیا۔ اکثر پلاٹ صرف ہیرو یا ہیروئن کی شخصیت اور اس کے ارتقا کے اطراف گھومتا ہے۔ فرانسیسی ناول نگار "اسٹینڈ ہال" (Stendhal) کے ناول اور چارلس ڈکنز کے ناول "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور دوسرے ناول "فلا بیر کے ناول "مادام بویری" (Madam Bovary) کا پلاٹ پیچیدہ ہے اس میں فرانس کے سترہویں صدی کے کلاسیکی ڈرامہ کی پیروی کی گئی ہے۔ دنیا کے قد آور ناول نگاروں مثلاً ٹالسٹائی، بالزک اور دوستووسکی نے حقیقت نگاری کے ایسے نادر نمونے پیش کیے ہیں کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری خود ان کا ایک کردار بن جاتا ہے۔

۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں ناول کے ڈھانچے اور ساخت کے بارے میں نئے نئے تجربے کیے گئے۔ پرانے کلاسیکی اسٹائل کو رد کیا جانے لگا۔ جیمس جوائیس نے ۱۹۲۲ء میں "یولی سس" لکھ کر ناول نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی۔ پورا ناول صرف ایک دن اور ایک رات کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس کا ڈھانچہ بڑا پیچیدہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اصل محنت اسی پر صرف کی گئی ہے۔ اس کے بعد کے ادیبوں نے کہیں تو کہانی کئی کرداروں کی زبانی بیان کی ہے۔ کہیں واقعات زمانی ترتیب بدل کر دکھلائے جاتے ہیں۔ جیسے فلیش بیک (Flash Back) کہا جاتا ہے۔

ادب کا موضوع

ادب کے مواد یا موضوع کی کوئی حد نہیں ہے۔ لاکھوں سال سے انسان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے آئے ہیں۔ اپنے تجربات کا اظہار اور تبادلہ پہلے اشاروں اور پھر زبان سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اس طرح انسان کا علم اور تجربہ ترقی کرتا رہا ہے۔ ہر قسم کے مشاہدات اور تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے ظاہری اور باطنی احساسات ادب کا موضوع بنتے رہے۔ جیسے جیسے انسانی سماج نے ترقی کی ویسے ویسے اس کی تہذیبی زندگی متنوع اور متمول ہوتی چلی گئی۔

شروع میں مذہبی دیوتاؤں کے قصے اور فرضی قصے کہانیاں ادب کا موضوع بنیں جن کے ذریعہ ادیب اپنے اور اپنے ساتھیوں کی خواہشوں، تمناؤں اور تجربوں کا اظہار کرنے لگے۔ سماج کی ترقی کے ساتھ بھی تجربات نئے نئے انداز میں پیش کیے جانے لگے۔ انسان خواہ کہیں ہوں، ترقی کی کسی منزل میں ہوں بنیادی تجربات اور احساسات سب کے یکساں ہوتے ہیں۔ اسی لیے ساری دنیا کا ادب اپنی انتہائی بوقلمونی کے باوجود ایک اکائی ہے۔

سماج کی ترقی کے ابتدائی دور میں ادیب اپنے تجربات کے خارجی عنصر پر زیادہ زور دیتے تھے۔ سماج اور ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ داخلی عنصر کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ اندرونی احساسات اور انسانوں کے آپسی رشتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ناولوں میں اس بات کا تجربہ گہرائی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اطراف کے حالات اور واقعات کا فرد کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے، اور ناول کے کیریکٹر اسی کیفیت کا انعکاس کرتے ہیں۔ ہنری جیمس اور دوستوئیفسکی کے ناول اس طرز کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرے ادیب ہیں جو اطراف کے حالات پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، اندرونی کیفیت کا ذکر ضمنی طور پر ہوتا ہے اور حقیقت نگاری اس چابکدستی اور گہرائی کے ساتھ کی جاتی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری خود اس تجربہ سے گزر رہا ہے۔ اس کی بہترین مثال مشہور فرانسیسی ناول نگار اسٹنڈ ہال یا قدیم چینی ناول نگار ہیں۔

ادب کا تعلق صرف خارجی حقیقت یا انفرادی نفسیاتی کیفیات یا احساسات و جذبات سے نہیں ہوتا۔ بعض لوگ محض مجرد تصورات یا فلسفیانہ خیالات کو ادب کی بنیاد بناتے ہیں۔ لیکن یہ ادب کے درجہ پر اسی وقت پہنچتا ہے جب کہ وہ دماغ کے ساتھ احساسات کی بلندی کو بھی چھولے۔ افلاطون کی مکالمات (Dialogues) کو ادب میں بڑا مقام اس لیے حاصل ہے کہ اس نے فلسفیانہ موضوع کو اس طرح پیش کیا ہے اور انداز بیان میں ایسی لنگی پیدا کی ہے کہ اس پر ڈرامہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح کارل مارکس کی تصنیف "سرمایہ" کے بعض حصوں کو اس کے سخت نقاد بھی ادب عالیہ کا نمونہ ملتے ہیں خاص طور پر ان حصوں کو جن میں اس نے سماجی انصاف پر پیغمبرانہ انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔

اقلیدس کی "عناصر" (Elements) کو بھی بعض لوگ ادبی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ تصور کرتے ہیں اور اس کے سادہ اسلوب نگارش اور انداز بیان پر سر دھنتے ہیں۔ اسی طرح مولانا روم کی مثنوی کا موضوع مذہب اور تصوف ہے اور ساتھ ہی اس کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین ادب میں ہوتا ہے

خود اقبال کی بیشتر شاعری کا موضوع مذہب اور فلسفہ ہی ہے۔ حافظ اور غالب جیسے اعلیٰ پائے کے غزل گو شعرا نے بھی صوفیانہ تصورات کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے اور دنیائے ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔

موضوع اور ہیئت کا رشتہ

ادب یا دوسرے فنون لطیفہ میں موضوع اور ہیئت میں کیا رشتہ ہے۔ یہ بحث بڑی پرانی ہے۔ نقادوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع پر ہیئت کا دار و مدار ہے اور ہیئت پر موضوع کا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جنہیں ادب سے زیادہ سیاست، مذہب یا نظریاتی مسائل سے دلچسپی ہے۔ وہ نظریاتی سچائی کی خاطر ہیئت اور اسلوب کو قربان کر دیتے ہیں۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اچھے ادب میں جس طرح ہیئت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح موضوع کو بھی کم اہم جگہ نہیں دی جا سکتی۔ خراب موضوع اعلیٰ ادب نہیں پیدا کر سکتا۔ جب ہیئت اور موضوع دونوں ادب کے یکساں اور اہم جز ہیں تو کسی ایک کی کمزوری سے ادبی حلقوں کا معیار گر جائے گا۔ دانش وروں کا ایک اور گروہ بھی ہے۔ جو ادب میں موضوع کو پہلی جگہ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادب ایک بہت بڑا سماجی ہتھیار ہے۔ اس سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ذہنی تہذیب کا کام لیا جاتا ہے مضرت رساں، سماج دشمن خیالات اور نظریات کا پرچار ادب برائے ادب کے نام پر بہت بڑی انسان دشمنی ہے ادب میں اسٹائل کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ادیب اپنے خیالات کو الفاظ میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ چونکہ خیالات الفاظ کے ڈھانچے میں پیش کیے جاتے ہیں اس لیے مجرد ادب کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ لوگ بھی جو مجرد آرٹ کے علم بردار ہیں وہ زبان کا استعمال کرتے ہیں اور زبان یا الفاظ بہر حال معنی رکھتے ہیں خواہ وہ ہر کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ ۱۹ ویں صدی میں مشہور ادیب آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر جو "ادب برائے ادب" کے سب سے بڑے علم بردار تھے اپنے ان خیالات کو بڑی رنگین نثر میں پیش کرتے تھے۔ اسٹائل میں نکھار اسی وقت آتا ہے جب ہیئت اور موضوع میں مکمل ہم آہنگی ہو اور ادیب اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر پیش کر سکے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی آدمی کا اندازہ اس کے اسٹائل سے ہوتا ہے۔ ادب ایک فن لطیف ہے لیکن لکھنا ہنر ہے اور ہنر کو سیکھنا پڑتا ہے۔ آدمی خواہ کتنا ہی ذہین ہو اور لکھنے کی طرف کتنا ہی زبردست رجحان ہو کمال پر اس وقت تک سبقت حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اس ہنر کو سیکھے اور مشق نہ کرے۔

ادب اور اس کے قارئین

قدیم زمانے کی بات ہے کہ ابھی لوگوں نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا لیکن ادب وجود میں آنے لگا تھا۔ گیت اور نظمیں لکھی جاتی تھیں جنھیں ہزاروں لوگ سنتے تھے۔ یہ گیت اور نظمیں سینہ بہ سینہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی تھیں۔ یہ سرگرمی لوگوں کی زندگی کا اسی طرح جز تھیں جیسے کھانا، پہننا، پوجا پاٹ وغیرہ۔ کوئی شخص کہیں ایک گیت بناتا تھا۔ لوگوں کو سناتا تھا۔ لوگ سن کر دوسروں کو سناتے اور اضافے اور تبدیلیاں کرتے جاتے۔ اس متحدہ کوشش سے اس کی شکل بدلتی اور نکھرتی جاتی۔ اس طرح یہ عوامی یا لوک گیت ایک بڑی تعداد کی اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہوتے۔

اس کے بعد بربری دور آیا۔ اس دور میں بھاٹ گاؤں گاؤں پھرتے اور لوگوں کو گیت گا گا کر سناتے، قصہ خواں کہانیوں سے لوگوں کے دل بہلاتے تھے۔ ان کی امیدوں تمناؤں اور خوابوں کو اپنے فن کے سانچے میں ڈھال کر ان کا دل موہ لیتے تھے۔ یہ شاعر یا گیت کار چاہے مندر کے پجاری ہوں یا راجہ کے ملازم عوام تک ضرور پہنچتے تھے۔

جب سوسائٹی اور آگے بڑھی۔ اس میں اونچ نیچ امیر غریب کی تفریق آئی تو ادب بھی تقسیم ہو گیا ایک اعلیٰ ادب جو لکھا جاتا اور صرف چند لکھے پڑھے اوپر کے لوگ اس سے مستفید ہوتے۔ باقی جنتا اسی طرح مل کر زبانی لوک گیتوں اور لوک کہانیوں سے مستفید ہوتی۔

سوسائٹی اور آگے بڑھی تو اعلیٰ ادب عوامی ادب کی خوشہ چینی کرنے لگا اور عوامی ادب نے بھی تھوڑا بہت اس اعلیٰ ادب کا اثر قبول کیا اور بعض وقت ایسا ادب بھی ظہور میں آیا جس نے دونوں طبقوں کے دل جیت لیے تلسی داس کی رامائن اس کی بہترین مثال ہے۔

موجودہ دور میں عوامی ادب کو ترقی ہوئی ہے۔ ایسے قصے کہانیاں غزلیں اور گیت لکھے جا رہے ہیں جن سے بے پڑھے عوام بھی خوب لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ان میں اور پرانے عوامی یا لوک ادب میں فرق یہ ہے کہ پرانا لوک ادب عوام سے پیدا ہوتا تھا اور موجودہ عوامی ادب کی تخلیق ایک محدود پڑھا لکھا طبقہ کرتا ہے۔ یہ عوامی ادب ریڈیو اور سینما وغیرہ کی راہ سے عوام تک پہنچتا ہے۔ خود سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن بھی ادب کو متاثر کر رہے ہیں اور تعلقات عامہ کے ان وسائل کو ایسی ادبی تخلیقات کی ضرورت ہوتی ہے جو ان وسائل کے ذریعہ پیش کیے جا سکیں۔ چنانچہ ان کے لیے لکھنے والے ادیبوں کو وہ ساری پابندیاں قبول کرنی ہوتی ہیں جو یہ وسائل مسلط کرتے ہیں۔

ادب اور اس کا ماحول

انسان کی دوسری سرگرمیوں کی طرح ادب اپنے دور کے سماجی اور معاشی دور کی عکاسی کرتا ہے۔ انسانی سماج میں جب طبقاتی تفریق شروع ہوئی تو اس کا اثر ادب میں بھی نظر آنے لگا۔ عہد قدیم میں جب راجاؤں اور بادشاہوں کے درباروں میں ان کے آبا و اجداد کی بہادری کے قصے سنائے جاتے تھے تو اسی دور میں دیہات کے لوک گیت ان سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ جب کالیداس شکنتلا لکھ رہے تھے اس وقت دیہات کے بھاٹ دوسرے ہی گیت گاتے تھے۔

جب سماج چھوٹا اور محدود ہوتا ہے تو یہ طبقاتی حد بندیاں اتنی سخت نہیں ہوتیں۔ ایک کے اثرات دوسرے میں پہنچتے ہیں۔ لیکن جب حد بندیاں سخت ہوتی ہیں۔ تو یہ دیواریں بھی ہیبت ناک فاصلے قائم کر دیتی ہیں۔ اس کی انتہائی مثال سلطنت روم کے کلاسیکی ادب میں ملتی ہے۔ اعلیٰ رومن ادب کا سارا ماخذ یونانی ادب تھا۔ اور یونانی ادب کے اصول و ضوابط کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ حالاں کہ یہ لاطینی زبان سے بالکل مغائر تھی۔ اعلیٰ پایہ کا زیادہ تر ادب سلطنت روما کے عام باشندوں کی فہم سے باہر تھا۔ بالکل یہی صورت قدیم ہندوستان میں تھی۔ اعلیٰ

طبقہ کا سارا ادب سنسکرت میں تھا جو عام آدمی کی فہم و رسائی سے دور تھا۔ عوام کا سارا ادب پراکرتوں میں تھا۔

تعلیم کے پھیلنے اور خاص طور پر طباعت کی ایجاد سے بڑا فرق آیا۔ اس نے خیالات کے پھیلاؤ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ۱۸ ویں صدی کے فرانسیسی ادیبوں والٹیر، روسو، دیدرو وغیرہ کی تصنیفات موضوع کی اہمیت اور سنجیدگی کے لحاظ سے رومن یا سنسکرت کے پنڈتوں سے مختلف نہیں تھیں۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں یہ چند ہی سال میں پوری سوسائٹی میں پھیل گئیں اور انھوں نے انقلاب لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

موجودہ دور میں اس طبقہ واری تفریق کی نوعیت بدل گئی ہے اگرچہ امریکی ادیب ہنری جیمس نے اعلیٰ طبقوں کے بارے میں لکھا ہے اور فرانسیسی ناول نگار ایمل زولا نے محنت کشوں کے بارے میں لیکن دونوں کے پڑھنے والے اوپر کے طبقوں کے لوگ ہیں اور دونوں ادیبوں کا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔ عام لوگ تو سستی کہانیاں پڑھتے ہیں جن میں سیدھے سادے عشق و محبت یا جاسوسی کے قصے ہوتے ہیں۔

بیسویں صدی میں کتابوں کی اشاعت نہ صرف بہت بڑھ گئی ہے بلکہ اب ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا بھی آسان ہو گیا ہے۔ کروڑوں لوگ آج کل دور دراز کے سفر کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں کی سماجی زندگی سے بہت کچھ اپنے اندر جذب کرتے ہیں۔ اس کا اثر بھی نئے ادب پر پڑ رہا ہے۔ ادبی تخلیقات کا ماحول صرف اپنے شہر یا ملک تک محدود نہیں ہوتا اکثر یہ حدیں توڑ رہا ہے۔

ادیب اور سماج

پرانے زمانے میں ایک شاعر یا ادیب سماج کا اور سماج کے اقدار کا حصہ دار ہوتا تھا۔ اکثر ترقی پذیر ملکوں میں اب بھی یہی صورت ہے اس لیے کہ صرف ادب کو پیشہ بنا کر جینا ان ملکوں میں مشکل ہے لیکن صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں ادیب ایک طرح کا ماہر مزدور بنتا جا رہا ہے۔ ایک اشاعت گھر کے مالک یا منیجر کی اقدار اور ان کے یہاں لکھنے کا کام کرنے والے ادیب کی اقدار میں کوئی شے مشترک نہیں ہوتی۔ اس طرح ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کے کارکنوں کا اپنا الگ کلچر ترقی پا رہا ہے۔ ادیب اور فن کار کو پبلشرز کی ضرورتوں اور خواہشوں کا پابند ہونا پڑتا ہے اور اس طرح ہمیشہ دونوں میں تناؤ کا ماحول رہتا ہے۔ ادیبوں اور فنکاروں نے الگ ایک چھوٹی سی دنیا بنا لی ہے اور ان کے لیے صرف اسی کی اہمیت ہے۔ ایسے ادیب سماج کے عام مطالبوں اور دھاروں سے کٹ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو طرح طرح کے خانوں میں بانٹ لیتے ہیں لیکن ایسے ادیبوں کی بھی کمی نہیں جو ان رشتوں کو ٹوٹنے نہیں دیتے اور اچھا ادب پیدا کیے جا رہے ہیں۔

ادب اور دوسرے فنون لطیفہ

ادب اور دوسرے فنون لطیفہ میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک کھیل آپ اسٹیج پر پیش کیجیے تو وہ ڈرامہ ہو جاتا ہے، اسے پڑھیے تو ادب بن جاتا ہے۔ بہت سی اعلیٰ قسم کی فلمیں اچھے ناولوں اور ڈراموں پر بنائی گئی ہیں۔ اس نے فلموں کی ترقی میں مدد دی ہے۔ اسی کے ساتھ فلموں کی ترقی اور اس کے لیے اسکرپٹ کی تیاری نے ناول اور ڈرامہ نگاری پر کافی اثر ڈالا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تو آج کل بہت سے ناول اور ڈرامے نگار اپنی تخلیقات پر فلم بننے کے امکان کو ذہن میں رکھ کر کام کرتے ہیں۔ بہت سی کلاسیکی تصنیفات پر بیلے اور آپرا بنائے گئے ہیں۔ مشہور موسیقی کار اسٹراس نے نطشے کے فلسفیانہ افکار کو موسیقی کا جامہ پہنا دیا۔ مصوری کی نئی نئی ٹکنیک کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ ادب کی صنعت گری میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ادب انسانی سماج میں پیدا ہوا، اس کی ترقی کے ساتھ یہ بھی آگے بڑھتا گیا۔ پچھلی ایک صدی میں سائنس کی ترقی اور حمل و نقل کی آسانی سے ایک طرف انسانی سماج سکڑ گیا ہے۔ دوسری طرف بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس کا اثر دوسرے فنون لطیفہ کی طرح ادب پر بھی پڑنا ضروری تھا اور پڑ رہا ہے۔ سماج آیندہ جو بھی شکل اختیار کرے ادب بہر حال اس کی عکاسی کرتا رہے گا۔

کشمیری زبان و ادب

ریاست جموں و کشمیر تین صوبوں جموں، کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔ کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری اور پہاڑی اور لداخ میں بودھی زبان بولی جاتی ہے۔ بہ استثنائے مقبوضہ کشمیر، پاکستان و چین اس ریاست کا رقبہ ۱۰۰۵۶۹ مربع کلومیٹر ہے۔ صوبہ کشمیر کا رقبہ ۱۶۰۴۲ مربع کلومیٹر ہے۔ کشمیری بولنے والوں کی تعداد ۲۴۰۶۲۷۲ ہے جو آبادی کا ۵۲،۱۷ فیصد ہے۔

کشمیری اپنے ملک کو کشمیر اور زبان کو کٲشُر یا کاشُر کہتے ہیں۔ نسلی تعلق کے بارے میں ابھی تک قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا لیکن عصری تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیری نسل کا تعلق ہند آریائی کی ایک خاص شاخ ڈارڈک یا ہند ایرانی کی ایک خاص شاخ سے ہے (گریرسن) یہ بات واضح ہے کہ کشمیری ایسے کئی خد و خال رکھتی ہے جو اس کو دوسری ہند آریائی زبانوں سے ممیز کرتے ہیں مثلاً کشمیری میں ہکاری مصوتے گھ جھ ڈھ دھ بھ نہیں ہیں اس میں صفیری (Fricative) آواز "ز" ہے اور ایک انوکھی بے آواز و قفیہ جاریہ (Affricate) ts لہٰ بھی ہے اور اس کی ہکاری آواز tsh تھ ہے۔ کشمیری حروف تہجی میں انھیں ژ اور ژھ سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر ان کو فارسی حرف کی آواز سے کوئی نسبت نہیں۔ مزید یہ کہ کشمیری میں کئی مصوتے فونیم ہیں مثلاً ۱۔ أ اَچھ (آنکھ) خفیف۔ لر (مکان) ۲۔ أس (منہ) طویل لأر (کھیرا)

۳۔ اِتر (چیتھڑا) کھیر (پھسل) ۴۔ اِیُ تیر (سردی) کر (تند مزاج والی) ۵۔ سےٚ شےٚ (چھ)۔ ۶۔ اوٗ اوٗن (اندھا) سوٗن (گہرا) ——

۷۔ دٕ د (دودھ) سوٗن (سونا) Wa/dipthongiration

۸۔ یٔ دبل (چھلکا) رٔلو (زبان) ۔ (The Same sound as in – "Dell" English)

جیسے انگریزی میں Dell کی آواز۔

۹۔ گلی (درخت) شُر (بچے) جیسے ہندی میں ए کی اواز۔

(The Same Sound as in ___ Devanagri)

۱۰۔ جزم یا شوشہ۔ مصمتے کے بعد آنے والے حرف کو ملانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ترام (تانبا معنی) Tram بیول بیج معنی Byo

یہ صحیح ہے کہ کشمیری کا نطری تعلق ڈارڈک سے ہے تو وہ ہند آریائی سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہے اور پھر نیتجتاً پراکرت اوراپ بھرنش سے۔ زاید از دو ہزار سال کشمیر ہندو ... کے سنسکرتی تمدن کا حصہ رہا ہے کلہانا کی راج ترنگی نے ابتدائی دسویں صدی کا ایک جملہ نقل کیا ہے اور تیرہویں صدی کے بعد سے مسلسل کشمیری ادب موجود ہے۔

چودھویں صدی کی آخری دہائیوں میں کشمیری فارسی اور عربی سے متاثر ہونے لگی اور اٹھارہویں صدی تک زبان کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کے بعد ڈارڈک اور سنسکرت سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے اور اب بھی اس کی شعری اصناف، تلمیحات، ضمیات اور تشبیہ اور استعارات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ کشمیری شاعری میں تقریباً تمام ہندوستانی بحریں اور اوزان استعمال ہو رہے ہیں۔ رزمیہ بحروں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندو رزمیہ نظم "رام اوتار چیرت" مشہور فارسی بحر بحر ہزج میں ہے۔ ۱۸۸۵ء کے قریب فارسی کی گرفت کمزور ہونے لگی اور اردو کا اثر غالب ہوتا گیا۔ اردو ہندی مطالعے کے منہ ابتدا قرار پاتے۔ کشمیر کے سرکاری مدارس میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ اردو نے سرکاری دفاتر میں بھی فارسی کی جگہ لی البتہ نظم و نسق کے اعلیٰ دفاتر میں انگریزی کا چلن ہو گیا۔ ہماری آزادی کے فوراً بعد حکومت نے کشمیری کے لیے فارسی عربی رسم خط چند حروف و علامات اور امتیازی نشانات کی ترمیم کے بعد قبول کرلیا۔

ابتدائی ادبی دور (۱۲۵۰ء – ۱۴۲۰ء) میں فن شعر میں نمایاں مقام واکھ کو حاصل رہا۔ واکھ میں چار مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے جو معنوی اعتبار سے اپنی جگہ آزاد اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ ایک چست بلیغ پُرمعنی اور حکیمانہ انداز کی نظم ہوتی ہے۔ ناصحانہ اور واعظانہ اظہارِ خیال کے لیے یہ نہایت موزوں اور مناسب صنف ہے۔ اس صنف میں تین شعرا کا کلام دستیاب ہوا ہے۔ شت کنٹھ کے "مہانیہ پرکاش" میں ۹۴ مقفیٰ نظمیں ہیں جو چار مصرعوں کے ایک بند پر مشتمل ہیں۔ اس کی زبان بہت قدیم ہے اور اس دور کی ہے جب کہ پراکرت اپ بھرنش کی سیال حالت سے گزر کر زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی اور جو بعد کو کشمیری کہلائی۔ لل دید (۱۳۱۷ء – ۱۳۸۸ء) پہلی بڑی شاعرہ ہے۔ اس کے واکھ آج بھی سب پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں گہری روحانی جستجو غایر متصوفانہ بصیرت، نادر محاورے اور جامع اور بے ساختہ تشبیہیں ہیں۔ ان خصوصیات نے اس کے کلام کو جاوداں بنا دیا اور کشمیری ادب اور عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ کشمیر کے نگہبان اور اسلام کے بڑے مبلغ حضرت نورالدین ولی (جن کا مزار چرار شریف میں ہے) نے شرکھ لکھے ہیں جو چار مصرعوں کے ایک بند کی شکل میں ہیں۔ ان کا موضوع نصیحت ہے۔ زبان ان کے حکیمانہ اقوال اور ضرب الامثال سے مالا مال ہو گئی ہے۔

ادبی کارناموں کا دوسرا دور (۱۴۲۰ء – ۱۵۵۵ء) سلطانِ اعظم زین العابدین بڈشاہ (۱۴۲۰ء – ۱۴۷۰ء) کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ بھٹ اوتار کی بانا سرودھ جس کا ماخذ اوشا اور انی رودھا کے عشق کا افسانہ ہے پہلی نظم ہے۔ گنک پرشستت کی "تکھ دکھ چرتم" خوش حال زندگی پر ایک ناصحانہ نظم ہے۔ یودھ بھٹ کی تمثیل "زینہ پرکاش" کے حوالے ملتے ہیں یہ زین العابدین پر ایک تمثیل ہے اس کی ایک سوانح ناتھ سوم نے زین چرت نامی لکھی ہے۔

تیسرے دور (۱۵۵۵ء – ۱۷۵۲ء) کا بہترین کارنامہ لول نغمہ (Lol Lyrics) ہے۔ یہ ایک مختصر سی نظم ہے جو نغموں سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں صوفیانہ کلام بیان کیا گیا ہے۔ یہ کشمیری کلاسیکل موسیقی ہے جس میں ہندوستانی راگ مثلاً ملہار، بھیرویں، جنجوٹی اور ایرانی راگ مثلاً درگاہ نوا، راست فارسی اور راست کشمیری شامل ہیں۔ یہ عشقیہ گیت ہیں جو مختلف کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کا لہجہ حسرت آلود، اندوہ گیں اور غم ناک ہے۔ یہ راست طور پر اثر آفریں سیدھے سادے اور دلدوز جذبات سے بھرپور ہیں۔ حبہ خاتون ممتاز شاعرہ ہے اس کی طویل نظمیں جو "وژن" کہلاتی ہیں تین مصرعوں کے ایک بند پر مشتمل ترجیع بند کی شکل میں ہیں یعنی ہر بند کے بعد ایک مصرعہ دوہرایا جاتا ہے اس کو کشمیری میں "ودج" کہتے ہیں۔

خواجہ حبیب (۱۵۵۵ء – ۱۶۱۷ء) اور روپ بھوانی (۱۶۲۰ – ۱۷۲۰ء) نے متصوفانہ واکھ لکھے۔ ایک اور طویل نظم "کرشن اوتار لیلا" ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ نظم "وژن" کے انداز پر لکھی گئی ہے اس سے کشمیری میں ایک نئے موضوع لیلا کا اضافہ ہوا اور انیسویں صدی تک اس صنف کو بہت ترقی ہوئی۔ (۱۷۵۲ء – ۱۸۱۹ء تک) یعنی افغانوں کا دور دھندلا سا ہے۔ اس میں صرف اثر نہ مال نازک اور اثر آفریں لول نغموں سے کچھ روشنی نظر آتی ہے اور شاہ غفور کے صوفیانہ نغمے ملتے ہیں جو ہمہ اوست کے مظہر ہیں۔ یہ نغمے ہندوؤں کی صوفیانہ روایات سے میل کھاتے ہیں اور شاستر کہلاتے ہیں یہ آج بھی مستقلاً موجود ہیں۔

انیسویں صدی کا دوسرا دور (۱۸۱۹ء – ۱۸۸۵ء) موجودہ ابتدائی ربع صدی (۱۸۸۵ء – ۱۹۲۵ء) سے متصل ہے۔ یہ دور کشمیری ادب کے لیے بار آور رہا ہے اس میں ہم ایک نئے ادبی دور کے آغاز کا ادراک کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ادب میں کوئی نئی تحریک کسی بیرونی زبان کے اثر سے پیدا ہوتی اور نشو و نما حاصل کرتی ہے۔ کشمیری شعرا بھی تین صدیوں سے اپنے ادب کو فروغ

دیے رہے تھے۔ کئی نئی ادبی ادر شعری اصناف مثلاً مثنوی غزل مرثیہ، شہر آشوب اور داستانیں فارسی سے اخذ کی گئیں۔ ترجمہ اور اخذ کا یہ سلسلہ اصل فارسی تاریخ اور داستانوں یعنی یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، وامق و عذرا، سہراب و رستم، سام و زیبا وغیرہ سے شروع ہوا۔ چند شعرا نے "ہی مال ناگ رائے" کی فطری داستانیں نظم کیں جس میں ایک آریائی شہزادہ کا ناگا شہزادی سے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور ابراہیم اسحق قسم کی ایک کہانی "اکہ نندن" اور "مہابھارت" اور "رامائن" سے چند دوسرے قصے نظم کیے گئے۔

محی الدین مسکین (م ۱۹۱۵ء) نے آخری ربع صدی میں پنجابی عشقیہ قصے "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہیوال" کو کشمیری زبان میں منتقل کیا کشمیری میں بزمیہ مثنویوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن رزمیہ مثنویاں بھی کم نہیں اگرچہ ان میں کوئی اعلیٰ سطح کی نہیں۔ ہجویہ مثنویوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مثنویوں پر فارسی کا اثر زیادہ ہے الفاظ اور محاورے بھی اسی سے لیے گئے ہیں۔ اکثر شعرا نے حمد سراپا اور معجزات رسول اکرم صلعم کو بھی مثنوی کی شکل میں لکھا ہے۔ شہادتِ حضرت امام حسینؓ سے متعلق روایتی مراثی رواں اور سلیس بحروں میں لکھے گئے یہ بھی فارسی سے متاثر ہیں۔

محمود گامی (م ۱۸۵۵ء) نے اپنی آٹھ مشہور مثنویاں جن میں یوسف زلیخا اور شیریں و خسرو شامل ہیں نئے انداز میں لکھیں جو زیادہ تر نظامی جامی اور دیگر مثنویوں کے ترجمے یا ان سے ماخوذ ہیں۔ وہ کبھی بحر تبدیل کرتا ہے اور کبھی غزل یا وژن شریک کر دیتا ہے اور یہ اسلوب کشمیری مثنویوں میں دوسرے شعرا نے بھی اختیار کیا۔ اس کا اسلوب بہت مرصع اور پرشکوہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب وہ لکھتا ہے تو اس کا فارسی کا علم اس پر غالب آجاتا ہے اور اس کا طرز تحریر مصنوعی اور کشمیریوں کی ذہنیت کے لحاظ سے بے مثال ہو جاتا ہے۔ بہرکیف وہ آج بھی "مرد استاد" کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے دور میں وہ سب پر چھایا رہا۔ کشمیری شاعری مختلف اصناف میں اس کی مرہونِ منت ہے۔ بعد کے کئی شعرا نے اس کی تقلید کی اور چند نے کافی شہرت حاصل کی مثلاً ولی اللہ متو (م ۱۸۵۸ء) جس کی "ہی مال" ایک مقامی کہانی ہے۔ پرکاش رام (م ۱۸۵۵ء) جس نے منظوم رامائن لکھی جس میں غزلیں اور وژن نغمے شامل ہیں یہ مثنوی کی شکل میں لاجواب نظم ہے اور مقبول شاہ کے "گریست نامے" کے سوا اور کوئی نظم اس تک نہیں پہنچتی۔ لکشمن انیا بلبل (۱۸۲۶ء-۱۸۹۸ء) نے "سام نامہ" اور "نل و دمن" لکھی۔ پہلی رزمیہ ہے اور دوسری بزمیہ۔ دونوں میں اثر آفریں اور ربط و اتحاد کے اس قدر شدید جذبات ہیں کہ کشمیری مثنویوں میں شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ یہ مثنویاں صرف ترجمے نہیں بلکہ شاعر نے اکثر مقامات پر غیر متعلق مواد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان میں مقبول شاہ (۱۸۲۰ء-۱۸۷۵ء) کی "گل ریز" مشہور عشقیہ مثنوی ہے۔ جس میں عجب ملک اور نوش لب کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اس میں ۱۲۰۰ اشعار ہیں اور ۲۷ نغمے اور بحیثیت مجموعی اشعار کی تعداد ۲۳۲۷ ہے اس نے عشق و محبت اور فراق کے جذبات کے اظہار میں سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔

مقبول شاہ نے پہلی دفعہ مزاحیہ طنزیہ اور ہجویہ مثنویوں سے کشمیری ادب کو مالا مال کیا ہے۔ اس نے اپنے دور کے کشمیری کسان "گروس" کو اپنی بہترین مثنوی "گریست نامے" میں موضوع بنایا ہے۔ اس کی مثنوی "گل ریز" نہایت مرصع فارسی آمیز ریختہ کے اسلوب میں ہے اس میں فارسی کے ساتھ کشمیری کو مربوط کیا ہے اور اندازِ بیان میں بھی ندرت پیدا کی ہے۔

کچھ اور شعرا بھی ہیں جن میں امیر الدین کریری (۱۸۴۶ء - ۱۹۰۵ء) سب سے اہم ہے اس نے سام نامہ، خاور نامہ اور جنگ علقم مثنویاں لکھیں

گیت لکھنے والوں میں بہترین گیت رسول میر شاہ آباد ڈور (م ۱۸۷۰ء) نے لکھے اس نے غزلیں بھی کہی ہیں وہ بہت حساس ہے۔ آخری دور میں اس نے متصوفانہ شعر کہے۔ اس نے اپنی غیر مذہبی تصورات کی شاعری کو خدا کی محبت پر طنز سے آلودہ نہیں کیا۔ اس نے فارسی کو کشمیری کے ساتھ مربوط کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کی غزلوں اور وژن نغموں میں بلا کی آمد اور جوش ہے۔ ان میں جذبات کی یگانگت ہے اور مرد عورت سے اظہارِ محبت کرتا ہے۔ عورت مرد کے لیے مصیبتیں برداشت نہیں کرتی۔ متعدد شعرا اس صدی میں متصوفانہ نغمے لکھتے رہے ہیں۔ دوسری زبانوں کے گیتوں کی طرح ان کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ان میں اکثر پند و موعظت اور بیش پا افتادہ مضامین سے پُر اور مبہم ہیں۔ لیکن ان میں بعض اہم مستثنیات بھی ہیں جن کی چند خصوصیات بدیہی ہیں جن سے متصوفانہ شاعری کو دوام ملتا ہے۔ مثلاً گہرا خلوص مستند روحانی بصیرت اور وسیع القلبی۔ جیسے کہ عزیز درویش رحمان ڈار (م ۱۸۹۷ء) اور ان میں زیادہ بلند مقام کے حامل شمس فقیر (۱۸۴۳ء-۱۹۰۴ء) کے گیت نظر آتے ہیں۔

کشمیری میں اپنے زمانہ کا مضحکہ اڑانے کی بھی ایک روایت چلی آتی ہے جو گیارہویں صدی کے مشہور سنسکرت شاعر کشمندرا سے اخذ کی گئی ہے۔ کشمیری نے اپنے آپ پر ہنسنے کے فن کو کافی عروج پر پہنچایا ہے حتیٰ کہ اپنی ان شکستوں پر بھی طنز کیا ہے جو شدید دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی قسمت کے خلاف اسی حربہ کو کام میں لاتا ہے اور اسی کو ڈھال سمجھتا ہے یہ بیانیہ نظمیں شہر آشوب کہلاتی ہیں اور مثنوی کی صنف میں لکھی جاتی ہیں۔ اگر یہ چھوٹی بحروں میں وژن نغموں کی شکل میں لکھی جائیں تو "لڑی شاہ" کہلاتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دہے میں کئی شعرا نے طغیانیوں، آتش زدگیوں اور حاکموں کے مظالم کے خلاف اس صنف میں آواز اٹھائی ہے۔ انھوں نے کسانوں کی کمزوریوں اور ملاؤں اور پیروں کو بھی اپنی ہجو کا ہدف بنایا ہے۔ ان میں چند مشہور شعرا حسب ذیل ہیں (۱) پیر عزیز اللہ حقانی (۱۸۵۴ء-۱۹۲۸ء) جس نے سیلاب نامہ، آتش نامہ اور درویش نامہ لکھا۔ اس کے علاوہ اس کی اور کئی مثنویاں مثلاً جوہرِ عشق، جنگ عراق، قصہ ممتاز و بے نظیر وغیرہ ہیں (ب) ملا حبیب اللہ حکیم نے

۱۹۰۳ء کی طغیانی پر سیلاب نامہ اور ساقی نامہ لکھا یہ دونوں مزاحیہ انداز کی مثنویاں ہیں۔ عبدالغفار فارغ (م ۱۹۲۵ء) نے مسدس حالی کا کشمیری میں ترجمہ کیا۔ عبدالاحد نادم بندہ پوری ایک مشہور مصنف ہے جس نے تصوف سے ہٹ کر مقدس نظمیں لکھیں۔ اس کی نعتیہ نظمیں انتہائی محبت و عقیدت کا اظہار ہیں اور اکثر و بیشتر کا تعلق قرآنی آیات و تلمیحات سے ہے۔

صوفی شاعر کی حیثیت سے وہاب کھار، احمد بٹاواری اور وازہ محمود کی شہرت ہے لیکن اس مختصر عہد (۱۸۸۵ء–۱۹۲۵ء) کا پہلا ممتاز شاعر وہاب پارے حاجنی (۱۸۴۵ء–۱۹۱۴ء) ہے جس نے بہت کچھ لکھا اس کا سیلاب نامہ، بے بوج نامۂ سلطانی ۱۱،۵۳ اشعار میں شیخ حمزہ مخدوم کی سوانح، دیوان وہاب جس میں ۸۱، غزلیں اور دوسری نظمیں اور نظموں کے تراجم ہیں مقبول عام ہیں۔ اس نے فردوسی کے شاہنامے کو چار جلدوں میں لکھا جو حقیقت میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اسی صدی میں ہمیں ایک اور ممتاز ادبی صنف وژن کی شکل میں ملتی ہے جس میں تین مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے اور ایک ٹیپ کا مصرع یا ایک مختصر بھجن سری کرشنا اوتار کی مدح میں ہوتا ہے یا طویل بیانیہ نظم جو لیلا تمثیل کے لیے باعث عظمت و تقدیس ہوتی ہے۔ اس صنف میں پرمانند (۱۸۸۵ء–۱۹۱ء) کی تین نظمیں سدام چرت رادھا سوئمبر اور شیولگن ہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ دوسری لیلائیں اپنے اسلوب اور خیالات کی گہرائی کے لیے ممتاز ہیں۔ اس صنف میں پرمانند کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ کشمیری کا بہت ممتاز شاعر ہے۔ دوسرا شاعر کرشنا رازدان (م ۱۹۱۵ء) ہے۔ جس نے شیو پرنیہ لکھی۔ ان لیلاؤں میں دلی جذبات اور استغنا کا اس قدر اظہار ہوتا ہے کہ کوئی دوسری صنف اس کو نہیں پہنچتی۔

عصر حاضر کی روایات کشمیر میں دیر سے پہنچیں۔ مغربی تصورات سے تصادم اس کا ادب سائنسی اور معاشرتی علوم ہندوستان کی اس دور افتادہ ریاست میں دیر سے آئے سب سے پہلے تقریباً ۱۸۸۵ء میں نئے اثرات ظاہر ہوئے۔ وادیٔ کشمیر تک ایک وسیع سڑک تعمیر ہوئی اور راول پنڈی تک ٹیلی گراف کا نظام قایم ہوا۔ تعلیم کا یہ حال تھا کہ ۱۹۱۱ء میں ریاست کے پریمیر کالج سے چار گریجویٹ نکلے۔ اسی عرصہ میں کشمیری نثر کی طرف توجہ کی گئی۔ سر آرل اسٹین نے "حاتم کی کہانیاں" لکھیں جن میں سے چند کہانیوں کا انگریزی ترجمہ ریورنڈ جے ہنٹن نولس نے کیا جس نے کشمیری ضرب الامثال کی لغت بھی ۱۸۸۵ء میں شائع کی ۱۸۸۴ء میں برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی نے نئے عہد نامے کو فارسی عربی رسم خط میں شائع کیا۔ کشمیر میں پہلے مطبع میں پہلی کتاب اقلیدس ۱۸۷۶ء میں طبع ہوئی۔ اسی دور میں مذہبی تعلیم کے لیے سوال و جواب نامے نثر میں لکھے گئے۔ مولوی یحییٰ نے تفسیر قرآن لکھی اور نورالدین قاری نے اسلامی روایات پر "مثل" لکھی۔

۱۹۲۵ء–۱۹۴۷ء میں بعض نئے تصورات نیا انداز نظر غیر مذہبیت کا گہرا احساس اور گہری معاشرتی آگاہی اور غور و فکر کے ساتھ چند عقائد اور خیالات ادب میں جگہ پاتے ہیں۔

یہ روایتی شعرا یعنی دیارام گنجو، شمس الدین حیرت، محی الدین رتن پوری اور ان میں سب سے بہتر بھدرا وہ کے بعد عبدالقدوس رسا جاودانی ہیں۔ یہ سب صوفی شعراء کی طرح روایتی انداز میں لکھتے رہے۔ عصر حاضر کے ممتاز شعرا میں مہجور میر (م ۱۹۵۹ء) عبدالاحد زرگر اور غلام احمد مہجور (۱۸۸۵ء–۱۹۵۲ء) ہیں جنھوں نے نئے ادبی تصورات نظم کیے اور زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی اور نئے موضوع پیش کیے۔ انھوں نے کشمیری دوشیزہ میں کاکیشیا کی پریوں کا حسن نمایاں کیا۔ نئی تحریکات بھی پیش کیں اگرچہ وہ نقاب میں ہیں۔ ان کے نوجوان معاصر عبدالاحد آزاد (م ۱۹۴۹ء) نے ماضی سے رشتہ منقطع کیا اور خصوصاً قرونِ وسطیٰ کے مذہبی نقطۂ نظر سے انحراف کیا۔ اس نے اپنی شاعری میں قطعی انسانیت کا پرچار کیا زندہ کول (۱۸۸۴ء–۱۹۶۵ء) کی ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ حاصل کردہ کتاب "سمون" میں ہمیں فکر و تجربہ کی گہرائی اور گیرائی اور نظم میں بند کا نیا انداز نظر آتا ہے۔ اسی ابتدائی دور میں نند لال کول نے اسٹیج ڈرامے لکھے جو کشمیری نثر کے لیے ایک دین تصور کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں محمد امین نے کشمیری جرنل "گاش" جاری کیا۔

۱۹۴۷ء کے واقعات ادب میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ہوئے۔ پہلے تو حاصل کی ہوئی آزادی کو تقویت دینے اور بیرونی طاقتوں سے مدافعت پر ادیبوں اور شعرا نے قلم اٹھایا اور اپنی تمثیلوں میں راست اظہار خیال کیا مثلاً "شہید شروانی" میں جہاں شروانی کو قبائلی حملہ آوروں نے بے رحمی سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد تمثیلوں، ڈراموں، تہواروں، سالانہ مقابلوں وغیرہ کی کثرت ہوگئی۔ کھلی فضا میں لوک تھیٹر، بانڈ جشن، اوپیرا اور ریڈیو ڈرامے وجود میں آگئے۔ چند ریڈیو ڈراموں نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ ان میں زیادہ کامیابی پشکر بھان کی مزاحیہ "مچایا" تمثیلوں کو ہوئی۔ اوپیرائی تمثیلوں میں دینا ناتھ نادم کی تمثیل "بومبر تہ یمبرزل" نے بہت شہرت حاصل کی۔ کشمیری ڈرامے کو ۱۹۶۶ء اور اس کے بعد ناموری ملی جب کہ سجان بھگت کا "اکن گوم" کا تھیٹر گروپ ٹیگور ہال سری نگر میں اپنے ڈرامے پیش کرنے لگا۔ خصوصاً ۱۹۶۸ء میں اس کے ڈرامے "تقدیر" نے معاشرتی دلچسپیوں کو بیدار کیا۔ یہ ایک مزاحی طنزیہ تھا ۱۹۶۹ء میں موتی لال کیمو نے تین ڈراموں کا ایک شاندار مجموعہ شائع کیا اور کچھ ہی عرصہ ہوا کہ اس کے تاریخی المیہ "ژہاے" نے کشمیری ڈرامائی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ علی محمد لون کے تاریخی ڈرامے "ستیا" کو ۱۹۷۲ء کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔

باضابطہ نثر اصل میں چوتھی دہائی کا عطیہ ہے اور یہ ریڈیو کشمیر کی دین ہے۔ طنزیہ مضامین، افسانے، ڈرامے، فیچر اور خاکے وغیرہ ریڈیو کشمیر نے پیش کیے۔ مزاح، ہجو اور طنز و تعریض ظہور میں آئے۔ بیانیہ، تشریحی، جذباتی نثر، ادبی تنقید اور انشائیے عرصہ سے ادبی پروگرام "سنگرمال" اور "پمپوش" میں شامل ہیں۔ ادبی رسائل مثلاً "کونگ پوش" (۱۹۴۹ء–۱۹۵۶ء) اور دوسرے مختصر زندگی رکھنے والے رسائل مثلاً گل ریز، پمپوش، تعمیر، وطن کو شر ادب اور نئے جاری شدہ "بنب" میں بھی نثری ادب پارے لکھے

گئے۔ جموں وکشمیر اکادمی کے ادبی ترجمان سون ادب اور کشمیری سہ ماہی
نگاشتر شیرازہ میں اس کا سلسلہ جاری ہے۔ چند دوسری اکادمیوں کی
کتابوں میں کشمیری میں عالمانہ مقدمے لکھے گئے۔ پروفیسر محی الدین حاجنی
کے مقالات جن پر ۱۹۷۱ء میں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا اور اختر محی الدین
رہبر کی کاشر ادبچ تاریخ اس کی مثالیں ہیں۔

اس کے علاوہ مختصر افسانوں میں بھی تعمیری نثر ملتی ہے۔ چند
مجموعوں میں اکثر افسانے بہت اونچا معیار پیش کرتے ہیں۔ ان میں یہاں
صرف تین کے نام پیش کرنا کافی ہوگا۔ اختر محی الدین کا "دند وزن" اور
"درے یایہ بیزار" اور امین کامل کا مجموعہ "کوکر جنگ" ان کے علاوہ متعدد
ایسے افسانے ہیں جس میں نفسیاتی گہرائی انسانی کردار اور اس کی گتھیوں
کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تراجم میں گورکی کی "ماں" کا ترجمہ علی محمد لون نے کیا ہے
زین العابدین کے "پیامبر" کا تین جلدوں میں ڈاکٹر شمس الدین احمد نے
"حیات النبی" کے نام سے ترجمہ کیا۔ محی الدین حاجنی نے الف لیلہ کا
راست عربی سے ترجمہ "الف لآل" کیا۔ اس سلسلے میں لون کے سفرنامے
بہ شکل ناول "اسی تہ چھ انسان" اور اختر کے روس کے سفر کی روداد
"سلاو امپر" بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

ناولوں کے تعلق سے بہت کم کہا جا سکتا ہے۔ امین کامل کا "گٹہ
منز گاش" جو قدیم داستانی تکنیک کا حامل ہے ہندو مسلم اتحاد پر لکھا گیا
ہے۔ غلام نبی گوہر کا ناول "مجرم" بھی پڑھنے کے قابل ہے جس میں دولتمند
لڑکے اور غریب لڑکی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ لڑکی خودکشی کر لیتی
ہے اختر محی الدین کے دو ناول "دوگ دگ" اور "زوتہ زولانہ" کامیاب
ناول ہیں اور "ستہ سنگر" ان کے مختصر افسانوں کے مجموعہ کو ۱۹۵۸ء کا ساہتیہ
اکاڈمی اوارڈ دیا گیا۔ کردار نگاری پر مصنف کی گرفت کافی مضبوط ہے
اور موقع بہ موقع بتدریج ظاہر ہوتی ہے۔ کردار اور واقعات ایکدوسرے
پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مزید براں ہمارے معاشرتی اور معاشی نظام کو پورے
طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

عصر حاضر (۱۹۴۷ء-۱۹۵۵ء) کی ابتدائی شاعری، ڈراموں
اور مختصر افسانوں کی طرح جذباتی اور مبالغہ آمیز تھی مگر جذبات کی پاکیزگی
کو اہم مقام حاصل تھا۔ جدت طرازی کا امتیاز دینا ناتھ نادم نے حاصل کیا
جنھوں نے نیا ادب پیش کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو روایتی شاعری سے
غیر محسوس طریقے پر علاحدہ کر لیا اور نئی اصناف مثلاً سانیٹ، اوپرا، مختصر
افسانے، نئی بحروں میں اشعار اور آزاد نظمیں لکھیں اور ان میں ایک نئی توانائی
پیدا کی جس کا پہلے کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ اشارہ ان کی مشہور نظموں "جنگ ہا
خبردار" بوکھو نہ از اور زندہ بادشیام جی کی طرف ہے۔ ان میں اور ان
کے علاوہ دوسری نظموں، غزلوں اور سانیٹ وغیرہ میں پرانے الفاظ
نئے جذبات کے ساتھ نئے قالب میں آتے ہیں اور بلاشبہ ان میں نئی
اصطلاحیں، علایم اور تصورات ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے معاصرین کی رہنمائی
کی ہے جن میں رحمن راہی اور امین کامل (دونوں کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ
مل چکا ہے) شامل ہیں لیکن ان دونوں نے اپنے لیے ایک مخصوص طرز کو اپنا
لیا۔ ۱۹۵۵ء کے قریب ابتدائی ولولہ سرد پڑ گیا اور ہمارے شعرا کے
جذبات کا ہیجان رخصت ہو گیا۔ وہ تصوراتی اور جذباتی دنیا سے نکل
آئے۔ ان کے موضوع برائے عنوان نہ رہے لیکن اپنی نظموں میں انھوں نے
گہری بصیرت پیش کی۔ مزید براں وہ اپنے خیال کے مطابق شخصی تجربے کی
بنا پر اپنے عقیدے میں ثابت قدم رہے۔

کشمیری شعرا نے نہایت اعلیٰ اور گراں قدر شاعری کی تخلیق کی ہے۔
اس کو ٹھوس مواد اور نیا موڑ دیا ہے۔ لفظی تار و پود اور طرز اظہار کے معیار
کو بلند کیا ہے۔ اس سلسلے میں غلام رسول ناز کی "رباعیاتِ غرور"، نادم کے
سانیٹ اور مفکرانہ غنائی شاعری جیسے (نابدنہ ٹھٹھ وین) اور (حارِ سے
ناٹ) کامل کا مجموعہ (لوٹہ پڑ دہ) اور (بیہ سُے پان) اور رحمن راہی کی
کچھ عرصہ ہوا شائع شدہ نظمیں مثلاً تخلیق، اوش تہ اَسُن اور اُڈی کتھ وغیرہ
اس طرح کشمیر کا حالیہ شعری ادب ۱۹۴۷ء کے شعری ادب سے بہت
آگے نکل آیا ہے

کنڑی زبان وادب

رقبہ آبادی اور محل وقوع

کنڑی ہندوستان کے تقریباً۳ تین کروڑ باشندوں
کی مادری زبان ہے اور دستور ہند کی ۱۵ مسلمہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس
کا شمار ملک کی قدیم ترین زبانوں میں ہوتا ہے اور اس کی ادبی تاریخ کا سلسلہ
کم سے کم نویں صدی تک پہنچتا ہے۔ جس علاقہ کی بہت بھاری اکثریت کنڑی
کو بہ حیثیت مادری زبان استعمال کرتی ہے وہ کرناٹک ہے جس کے معنی
اونچا علاقہ یا کالی مٹی کی زمین کے ہیں۔ یہ علاقہ ۱۹۵۶ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ
کے قانون کے ذریعہ ایک مسلمہ ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا۔
نومبر ۱۹۷۳ء تک یہی ریاست میسور کہلاتی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے کرناٹک جزیرہ
نمائے ہند کے جنوب میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی آبادی ڈھائی
کروڑ ہے۔ مزید پچاس لاکھ کرناٹکی باشندے ہندوستان کے دیگر علاقوں
میں پھیلے ہوتے ہیں۔

علاقہ کرناٹک کی زبان

کنڑی زبان اپنے ابتدائی
دور میں جنوبی سطح مرتفع پر
پروان چڑھی اور شمال میں وادیٔ گوداوری تک پھیل گئی۔ مغربی ساحل پر اُس
نے تولو (Tulu) اور دیگر مختلف بولیوں کے مقامی
روپ اختیار کیے اور مشرقی تلنگی اور تامل سے متاثر ہوئی۔ شمال میں اس پر
مرہٹی زبان اور تہذیب کے اثرات پڑے۔ اس کے علاوہ کنڑی زبان فارسی اور
اردو سے بھی متاثر ہوئی۔ یہ اثرات ایک طرف تو حیدر علی اور اس کے لڑکے
ٹیپو سلطان کے دور میں اور دوسری طرف اضلاع رائچور، بیدر اور گلبرگہ
کی حد تک نظام کے زمانے میں نیز بیجاپور کے اطراف واکناف عادل شاہی
دور میں مرتب ہوتے۔ آج بھی اردو الفاظ قلب کرناٹک میں سرکاری طور پر

استعمال ہوتے ہیں۔ ریاست کرناٹک میں تقریباً ۲۵ لاکھ باشندے اُردو بولتے ہیں اور قریب قریب نو فیصدی آبادی تلگو بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً دس لاکھ باشندے مرہٹی بولتے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے دوسو سالہ دور میں مختلف لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کرناٹک میں آکر بس گئی جس میں شمالی ہند کے رہنے والے مسلمان اور مغربی ہندی بولنے والے ہندو اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے باشندے سبھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد شمالی ہند کے باشندوں اور افریقہ کے سیدیوں وغیرہ کا ایک علیحدہ گروہ بن گیا جو دکھنی کہلانے لگا ان کی زبان دکنی تھی جس میں مقامی کنڑی کے الفاظ بھی شامل ہوگئے تھے۔ بعد میں چل کر ادبی زبان کی حیثیت سے اُردو نے اس کی جگہ حاصل کرلی۔

کرناٹک میں ایرانی طرز کے فنونِ لطیفہ، دستکاری اور ایک نئے ادب کو رائج کرنے میں مذہبِ اسلام کا اہم حصّہ رہا ہے۔ اسی کے توسط سے کنڑی زبان پر ایرانی اثرات مرتب ہوئے۔ اور بے شمار فارسی الفاظ کنڑی میں داخل ہوگئے مثلاً جاگیر، انعام، دیوان، قلعہ دار، بخشش، جمعبندی، منصف، قانون، دعویٰ، محضر، دربار، حضور، کمربند، پلاؤ، بریانی، حلوا، برفی، زمانہ، بازار، نمونہ اور فقیر وغیرہ۔

دراوڑی خاندان

کنڑی زبان تامل، تلگو، ملیالم اور تولو کی طرح زبانوں کے دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کو پنچ دراوڑا (PanchaDravida) کہا جاتا ہے۔ دوسری دراوڑی زبانوں کی تعداد ۲۴ تک پہنچتی ہے۔ دنیا کی کسی اور زبان کے خاندان سے اس کا کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔ ادبی دراوڑی زبانوں میں کنڑی اور تامل ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ تلگو اور کنڑی حروف میں بہت زیادہ مشابہت موجود ہے۔ کسی زمانے میں شاید ان کا رسم الخط ایک ہی تھا۔

ابتدائی اسناد

کنڑی زبان کا اولین مستند ریکارڈ ہلمیڈی (Hal midi) کتبہ میں ملتا ہے جس کا زمانہ اس کتبہ میں مندرجہ شاہی خاندانوں کی بنا پر پانچویں صدی عیسوی کا وسط قرار دیا جاتا ہے۔ کنڑی کی جو سب سے پہلی کتاب دستیاب ہوتی ہے وہ "کوی راج مرگا" (Kavi Raj Marga) ہے جس کا مصنف شری وجیا (Sri Vijaya) ہے۔ اس میں کنڑی نظم ونثر کی ابتدائی تصانیف کے حوالے ملتے ہیں۔ ابتدائی کنڑی اور تامل میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے اور اسی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کنڑی اور تامل ابتدا میں ایک زبان کی بولیاں رہی ہوں گی۔

کنڑی ادب کی تاریخ کے لحاظ سے دسویں صدی کا زمانہ کلاسیکی کنڑی ادب کا سنہرا دور ہے۔ پمپا (Pampa) اور رانا (Ranna) جیسے ممتاز شاعر اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ پمپا کو خاص طور پر کنڑی کا آدی کوی (پہلا شاعر) کہا جاتا ہے۔ پونا چھمندریہ (Ponna Chh-amundarya) درگا سنہا، ناگ ورما اول و دوم، سریدھر چاریہ، نیا سینا (Naya sena) اور جنا (Janna) ان چند اہم شاعروں میں ہیں جنھوں نے قدیم کنڑی میں اپنی کلاسیکی تصانیف چھوڑی ہیں۔

ادب میں انقلاب

بارہویں صدی کا وسطی دور مذہبی اور سماجی اعتبار سے بڑا ہی ہیجان انگیز دور تھا جس نے سماج کے مختلف طبقوں اور عوام کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ اس دور کے اثرات زبان پر بھی پڑے۔ بسویسورا الناپربھو، اکا مہادیوی (Akka Mahadevi) سدّاراما (Siddarama) اور چنابسوا جیسے بھگت اور مصلحوں نے واچناؤں کی شکل میں اپنے روحانی تاثرات اور فلسفیانہ خیالات پیش کرنے شروع کیے جس سے کنڑی زبان و ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ نادگو (درمیانی) کنڑی کا دور بھی کہلاتا ہے۔ جیسے ہری ہرا اور راگھوانکا (Raghavanka) جیسے شاعروں نے اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ کنڑی کے مشہور شاعر کمار ویاس نے اسی زبان میں کنڑی کا معرکہ آرا رزمیہ کرناٹک بھارتیہ کتھا منجری منظوم کیا۔

کنڑی کی مختلف بولیاں

انیسویں صدی کے آخر میں کنڑی نادگو (درمیانی) کنڑی سے نکل کر جدید کنڑی کی شکل اختیار کرتی ہے جبکہ ۱۸۳۸ء میں میسور کے ایک عالم کرشنا چاریہ نے اپنی کتاب پوسا گنناڈا نوڈی گنناڈی (Possa Gann-ada Nudigannadi) لکھی تھی۔ کنڑی زبان کا علاقہ وسیع ہونے سے اس میں مقامی بولیوں کے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ جدید کنڑی میں چار اہم علاقائی شکلیں بھی ملتی ہیں جنھیں میسوری کنڑی، دھارواڑی کنڑی، منگلوری کنڑی اور تامل نادگو کنڑی کہا جاتا ہے۔

قدیم ترین تصانیف

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ کنڑی اپنے اصل دراوڑی خاندان سے الگ ہوئی اور سنسکرت کے میل ملاپ سے نمو حاصل کرتی رہی یہاں تک کہ کتبات میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ کوی راج مرگا کنڑی کی اولین تصنیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ کنڑی زبان کی تاریخ میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اس میں وِمالودیہ (Vima Lodaya) ناگارجنا، جیابندھو، دورونیتھا (Duruvineetha) لوک پال، اور کویشورا (Kaveeshwara) جیسے چند متقدمین کا تذکرہ ملتا ہے۔

تمبلوراچاریہ (Tumbulur Acharya) نے اپنی طویل نظم چدامنی ساتویں صدی میں لکھی۔ اس میں تتوارتھ شاستر (Tattavartha Sutra) کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ساتویں صدی جیسے ابتدائی زمانے میں اس قدر عظیم الشان اور ضخیم کتاب کا وجود میں آنا ہی کنڑی زبان اور اس کی پختگی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

ابتدائی تصانیف اور شاعر

پمپا کنڑی ادب کا ایک بہت بڑا شاعر گزرا ہے اس کی پہلی تصنیف آدی پُران ۱۹۴۱ء میں لکھی گئی۔ دوسری تخلیق پمپا بھارت دراصل ویاس منی کے مشہور سنسکرت رزمیہ، مہا بھارت کی تلخیص ہے۔ پمپا اپنے شاعرانہ تاثر اور حسنِ بیان کے لیے مشہور ہے۔ پمپا کا ایک ہم عصر پونا (Ponna) راشٹر کوٹ کے راجا کرشنا سوم کا درباری شاعر تھا۔ اس کی تصنیف شانتی پران میں جین مت کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ راجا رچملا (Rachamalla) گنگا کا وزیر چمن درایا ——

(Chaman d araya) بھی اسی زمانے میں گزرا ہے۔ اس کی صرف ایک تصنیف تری شسٹی لکشا مہاپورنا (Trisbasti Laksh — na Mahapurana) — موجود ہے۔ وڈرادھانی (Vaddara — dhane) — اس دور کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ اس میں انیس کوالیوں (Kevalis) کے حالات زندگی قدیم کنڑی نثر میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ کارتکا رشی (Kartika Rishi) کی انوکھی کہانی یونانی المیہ، اوڈی پس (Odipus) سے مشابہت رکھتی ہے۔ وڈرادھنا کی تمام کہانیاں خالص ویراگ رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔

اس دور کا دوسرا اہم شاعر رنا (Ranna) ہے۔ اسے چالوکیہ شہنشاہ تیلپا (Tailappa) دوم کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے اپنی اجیت پران ۹۹۲ء میں لکھی جس میں جین دوم کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دوسرا کارنامہ سہسا بھیماوجیا (Sahasa Bhima Vijaya) ہے جو کنڑی ادب کی یقیناً ایک عظیم تصنیف ہے۔ اس میں مشہور جنگ کورکشیتر کے واقعات کو پیش کرنے کا طریقہ موجودہ زمانے کی فلموں کے فلیش بیک ٹیکنک سے ملتا جلتا ہے ایک اور ادیب ناگ ورما اوّل ہے اس نے چندم بودھی اور کادمبری لکھیں۔ اوّل الذکر تصنیف علم عروض پر ہے جو کنڑی زبان میں اس موضوع کی اوّلین اور مستند تصنیف مانی جاتی ہے۔ ثانی الذکر سنسکرت کی مشہور کتاب کادمبری کا ترجمہ ہے جو عشق و محبت کے موضوع پر کنڑی ادب کی پہلی نظم ہے۔

اس دور میں اور بھی کئی شاعر گزرے ہیں جن کے ادبی کارناموں کو کنڑی زبان کی "پہلی سنہری فصل" کا نام دیا جاتا ہے۔ چاونڈرایا (Chavun — darava)۔ ثانی کی "لوکوپکارا" (Locopakara) مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ جس میں طب، پکوان، فن تعمیر اور علم نجوم جیسے موضوعات شامل ہیں۔ سری دھر آچاریہ کی تصنیف "جتک تیلکا" (Jatakatilaka) چونکہ فلکیات پر ہے کنڑی میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ چالوکیہ کے شہزادہ کیرتی ورمانے "گوویدیہ" کے نام سے ایک طبی رسالہ لکھا۔ درگا سمہا نے پنچ تنتر کا سنسکرت سے ترجمہ کیا۔ اس نے ایک نئی صنف واچنا کے ذریعہ کنڑی ادب کو مالا مال کیا۔

بارہویں صدی میں ویرسیوائی مسلک (Veerasaivi u m) بسواللا پربھو (Basava Allama- prabhu) اور ان کے معتقدین کے زیر اثر ایک قوت بن کر ابھرا۔ بسویسورا سب سے بڑا واچنا نگار گزرا ہے۔ وہ اپنے واچنا کے ذریعہ بھگوان شیو کے گن گاتا رہا۔ شیو کے ایسے معتقدین اسیوشرن (Siva Sharana) کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مسلک کی تلقین واچناؤں کے موزوں اور مترنم اسٹائل میں عام آدمی کی زبان میں کرتے تھے۔ واچنا ادب کی ایک مخصوص شکل ہے جس کی ایجاد کا شرف کرناٹک کو حاصل ہے۔ چنا بسوا ایک عالم تھا۔ وہ گیان یوگی کے نام سے مشہور تھا۔ سونلگی (Sannaligi) مہاراشٹر کا رہنے والا سدراما کرم یوگی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ "ہر آنکھ سے آنسو پونچھے جاتے"۔ واچنا نگاروں میں مہادیوی بڑی جاذب شخصیت کی مالک تھی۔

اس دور کے دیگر شاعر

ناگاچندر، راجہ ہویاسلا بلّالرایا (HoyasalaBallalaraya) کا درباری شاعر تھا۔ وہ عظیم شاعر آدی پمپا سے اپنی نسبت ظاہر کرنے کے لیے اپنے آپ کو ابھینوا پمپا کہا کرتا تھا ناگاچندر نے رام چندر چرتر پوران لکھی جو ایک جین راماین ہے۔ راج دتیہ ایک ماہر ریاضی داں اور وشنو وردھن کا درباری شاعر تھا۔ یہ راجہ فنون لطیفہ کا شیدائی تھا۔ بیلور (Belur) اور ہالی بیدو (Hale Beedu) کے مشہور مندر اسی نے تعمیر کرائے تھے۔ راد تیہ نے "کیتھرا گنیتا" (Kethra Ganeta) اور "لیلاوتی" لکھی۔ سومنوبانا (Somanubana) ایک استاد شاعر اور ہویاسلہ نرسمہا اول کے دربار کا کرم چاری تھا۔ کنڑی کے دو اور مشہور شاعر جنا (Janna) اور ہری ہرا بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ہری ہرا کی سب سے بڑی دین اس کی "راگھلے" (Ragh l e) ہے۔ اس نے اپنی بے شمار آزاد نظموں میں جنوبی ہند کے سیوا سنتوں اور کرناٹک کی اہم ویرسیوا شخصیتوں کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے راگھاونکا (Raghavanka) کنڑی ادب میں ست پدی (بحری نظم) کا بانی ہے۔ ردرابھٹ (Rudrabhatt) نے اپنی جگناتھ وجے، وشنو پران کی اساس پر کلاسیکل طرز میں لکھی۔ یشودھرا چرتر جنا کی شاہکار تصنیف ہے جس میں جینی اخلاقیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کیسی راج (Kesiraja) قدیم کنڑی کا بہت قابل قواعد نویس ہے۔ نیا سینا (Nayasena) اور اندیا (Andayya) کی تحریروں سے کنڑی ادب کے نئے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ بھاسکر نے ۱۴۲۴ء میں اپنی تصنیف جیون دھارا چرتر پیش کی جو داستان نویسی کی اچھی مثال ہے۔ متاخر دور میں جینی شاعروں میں رتناکر وارنی کو نہیں بھلایا جاسکتا جس نے بھارتیش ویبھو (Bharatesavaibhava) لکھی۔ سلوا (Salva) نے عظیم رزمیہ مہابھارت کو جینی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ دودیہ (Doddiah) منگارس (Mangarasa) کلیان کیرتی اور سروتہ کیرتی (Saruta — Keerty) — اس دور کے کچھ اور ادیب ہیں چام رس (Chamras) ویراکتہ (Virakta) اور ٹنٹا دریا (Tontadarya) وجے نگر کے مشہور ویراسیوا شاعر ہیں۔ کمار ویاس نے اپنی کرناٹکا بھارت کتھامنجری کے ذریعہ عوام کو بے حد متاثر کیا۔ تھوراوی (Thorave) نرہری نے کنڑی میں راماین لکھی۔ نت یاتماسوکا (Nityatmasuka) نے بھگوت گیتا کا ترجمہ کیا۔ سلوا نے فن شاعری پر بھی لکھا۔ ایشورا کی کوی جیو بندھن کنڑی کے علم عروض، قواعد اور مقامی بولیوں سے متعلق ہے۔ مادھو نے ڈانڈی (Dandi) کے کاویہ درس (Kavya d arsa) کا کنڑی میں ترجمہ کیا۔ نن جندا کی کمار رام کتھا تاریخ سے متعلق ہے جس میں رومانس بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

کنڑی ادب کی تاریخ میں ہری داس تحریک ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہری داس بھکتی کے پرچارک تھے۔ ان کے سریلے گیت دیوانام (Devaranamas) حمد و ثنا کے گیت کہلاتے ہیں۔ صوفیوں میں کرناٹک کے ہری داسیوں کا بڑا مقام ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی

کے لکھنے والوں میں لکشمی سا (Lakshmisa) ویروپکش (Viru paksha) ۔ پنڈت، شا داکشری دیوا (Sha dakshari Deva) مشہور ہیں ۔ لکشمی سانے جینی بھارت لکھی۔ ویروپکش پنڈت نے چنا بسوا پران میں چنا بسوا کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔

وجیانگر سلطنت کے زوال کے بعد میسور کے وڈیار راجاؤں نے آرٹ اور ادب کی سرپرستی کی۔ اور اس طرح میسور میں کنڑی کو دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ تھرو ملارایا (Thirumalaraya) چکو پادھیائے (Chikkupadhyaya) سانچی ہونما (Sanchi Honnamma) اور سنگرما (Singaramma) اس کے درباری شاعر تھے۔ راجا کرشنا وڈیار سوم نے بھی ادب کی سرپرستی کی۔ وہ خود بھی صاحب تصنیف تھا۔

انیسویں صدی کے آخری حصّے سے جدید کنڑی ادب کی ہمہ جہت ترقی کا آغاز ہوا۔ ادب کی نئی نئی اصناف مثلاً ناول، مختصر کہانی، غنائیہ شاعری، مضمون نگاری، سوانح نگاری، آپ بیتیاں، ڈرامہ نویسی، تنقید، سفرنامے، ترجمہ اور تحقیقی تصانیف کا کنڑی ادب میں اضافہ ہوا۔ نثر نگاری کا رواج عام ہو گیا۔ اظہار بیان کے نئے اسلوب رائج ہوئے۔ جدید کنڑی ادب کے علم برداروں کے چند مشہور نام یہ ہیں۔ پروفیسر بی۔ایم۔ سری کانتیا، ڈی۔ وی۔ گنڈپا، گووند پائی، مستی وینکٹیش آئنگار، کے۔ ایس۔ کارنتھ، وی سیتا رامیا، جی۔ پی۔ راج رتنم، پی۔ ٹی۔ نرسمہا چاریہ، کے۔ وی۔ پٹپا (K. V. Puttappa)، ڈی۔ آر۔ بندرے (D. R. Bendere) آر۔ ایس۔ مگالی، وی۔ کے۔ گوکاک اور کے۔ ایس۔ نرسمہا چاری وغیرہ۔ جدید کنڑی ادب کی تصانیف کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچتی ہے۔

اسٹیج اور صحافت کے میدان میں بھی کنڑی نے کافی ترقی کی ہے۔ کنڑی میں کئی ایک روزنامچے، ہفتہ وار، پندرہ روزہ رسائل اور ماہنامے نکلتے ہیں۔ کرناٹک میں موسیقی کا سہرا بھکتی تحریک کے سر ہے۔ کرناٹک کو یہ فخر حاصل ہے کہ جنوبی ہند کا سنگیت اسی کے نام سے کرناٹک سنگیت کہلاتا ہے۔

فلم ریڈیو اور عوام کا ادب سے تعلق

ریڈیو اسٹیشنوں سے عوام میں ادب، علم اور تہذیبی اقدار کو پھیلانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کنڑی میں سینکڑوں فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ محکمہ معلومات عامہ کے ذریعہ کئی دستاویزی فلمیں بنائی گئی ہیں جن میں سے بعض مشہور شاعروں کے حالات سے متعلق ہیں۔ کنڑ ساہتیہ اکیڈمی نے کنڑی ادب کی کلاسیکی تصانیف کو جدید کنڑی زبان میں پیش کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے کنڑی ادب کے سرسری جائزہ کے ساتھ اس کی چند اہم شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے۔

پمپا (دسویں صدی عیسوی)

دسویں صدی کو کلاسیکی کنڑی ادب کا سنہرا دور بھی کہا جاتا ہے کنڑی کے قدیم شاعروں میں پمپا سب سے زیادہ ممتاز ہے اس لیے آدی کوی (پہلا شاعر) کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کنڑی کا یہ عظیم شاعر علاقہ تلنگانہ کے ضلع کریم نگر کا رہنے والا تھا۔ ۹۴۱ء میں اس نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ وہ چالوکیہ شہزادہ اری کیسری کا دوست بھی تھا اور رہبر بھی۔ پمپا سپاہی بھی تھا چنانچہ وہ اپنے آپ کو "کوی اور کالی" (شاعر اور سپاہی) کہا کرتا تھا۔ قدیم کنڑی میں اس کی دو اہم تصانیف (۱) آدی پران (۲) وکرم ارجن وجے ہیں۔ پہلی تصنیف جو پہلے تیرتھنکر آدی ناتھ کی کہانی ہے ایک روحانی فلسفیانہ قسم کی تصنیف ہے۔ اسے کنڑی کے جین پران کی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری تصنیف ارجن وجے غیر مذہبی نوعیت کی تصنیف ہے جس میں وہ اپنے سرپرست اری کیسری کو مہابھارت کے ارجن کی طرح ایک سورما کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ پمپا کی کردار نگاری، ڈرامائی صلاحیتوں کا ماہرانہ بیان، فطرت کی عکاسی اور شان و شکوہ کا اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے۔ پمپا بحیثیت شاعر بہت بلند مقام کا حامل ہے۔ پمپا کے بعد کے تمام شاعر اس کی عظمت کا لوہا مانتے ہیں۔

کیسی راج (Kesiraja)

کیسی راج کنڑی زبان کا سب سے اہم قواعد نویس گزرا ہے۔ اس کا تعلق سترہویں صدی کے ہویسلہ دور حکومت سے ہے۔ اس کی تصنیف شبد منی درپن (آئینہ جواہر اللغات) کنڑی زبان کی ایک مستند اور عالمانہ کتاب ہے۔ اور کنڑی زبان و ادب کی تاریخ میں ایک مستقل مقام رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں کیسی راج نے کنڑی زبان کے مخصوص اور نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ قواعد نویس کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ اس نے تحقیق و تفتیش کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

واچنا ساہتیہ

شیوا شرنوں (بھگوان پرمیشور کے بھگت) کے واچنا ساہتیہ کو کنڑی ادب میں بڑا مقام حاصل ہے۔ واچنا کے معنی نثر کے ہیں لیکن یہ واچنائیں کچھ عجیب نوعیت کی ہیں کہ ان میں بحر و قافیہ تو نہیں ہوتا مگر وزن اور ترنم ہوتا ہے اور وہ گائی جا سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیوارا داسیمیا (Devaradasimaiah) پہلا واچنا نگار تھا۔ دوسرے اہم واچنا نگاروں میں بسویسورا، اللا پربھو، سدرامیا، اکّا مہادیوی اور چنا بسوا قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا تعلق بارہویں صدی سے ہے۔ واچنا نگاری کو نثری ساہتیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ مساوات و انصاف، عورتوں کے سماجی حقوق و مراتب اور شرنوں (Sharanas) کی تعلیمات کے اصولوں کا پرچار کیا جاتا ہے۔ شرنوں میں سے اکثر کا تعلق سماج کے پچھڑے ہوئے طبقہ سے تھا۔ اس طبقہ کے لیڈر بسوا منتری تھے۔ جو نٹوا (لومڑکیبوں اور طوائفوں کے) گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ سدّراما گاؤں کا ایک سماجی کارکن تھا۔ داسیمیا جولاہا تھا۔ مدرا چنیا موچی تھا۔ رامی تھنڈے درزی تھا اور بسپا بڑھئی تھا۔ ادبی صنف کی حیثیت سے واچنا نگاری کرناٹک کی دین سمجھی جاتی ہے۔ واچنا نگاروں میں سب سے زیادہ پرکشش شخصیت اکّا مہادیوی کی ہے۔ اسے شمال کی میرا اور جنوب کی اندمال سے مشابہت دی جاتی ہے۔ ۲۱ نے ملک ارجن (سری شیلم والے) کی تلاش میں محلوں کو

عیش و عشرت کو تج دیا اور ایک بیراگن بن گئی۔ اس کا کلام نہایت ہی ترنم ریز ہے۔ دیگر خواتین واچنا نگاروں میں مکتایکا (Muktayakka) اور نیلما (Neelamma) قابل ذکر ہیں۔ کنڑی میں صوفیانہ خیالات اور فلسفہ کا اظہار واچناؤں کے ذریعہ ہوتا رہا۔ ایسی ہزاروں واچنائیں ہیں جنھیں تقریباً دوسو واچنا نگاروں نے لکھا ہے۔

بسویسورا

کنڑی ادب کی تاریخ میں بارھویں صدی کا دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں ویرسیوائی مت اللاپربھو اور بسویسورا جیسی شخصیتوں کی رہنمائی میں یہ ادب ایک قوت بن کر ابھرا بسویسورا کا تعلق بیجاپور ضلع کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ بہت جلد اپنی ذہانت و قابلیت سے کلیان کے حکمراں کلا چوریا بجالا رایا (Kalachurya Bijjalaraya) کا وزیر مالیات بن گیا۔
بسویسورا شیو کا بڑا عقیدت مند تھا۔ وہ ہمیشہ بھگوان شیو ہی کے گن گاتا رہا۔ بسوا کو بلاجھجک سب سے بڑا واچنا نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی واچناؤں میں ترنم، وزن، حسن اور دیگر شعری خوبیاں پائی جاتی ہیں اس کے پیروؤں اور معتقدوں نے بسویسورا کی جائے رہائش کو "مہامانے" (مقدس رہائش گاہ) کا نام دے رکھا تھا۔ ان کی مذہبی محفلیں اللاپربھو کی صدارت میں یہیں منعقد ہوتی تھیں۔ اللاپربھو جو شیو کا اوتار مانا جاتا ہے۔ روحانی علم اور عرفان کے متلاشی لوگوں کے لیے بلاشبہ مینارۂ نور تھا۔

ہری داسی ادب

ہری داسی سے مراد بھگوان سری ہری (وشنو) کا بھکت یا خادم ہے۔ سری نرہری تیرتھ کے لکھے ہوئے بھکتی گیت ۱۳۰۰ء ہی میں ملتے ہیں لیکن ہری داسی تحریک کا اصل بانی سری پدراجا (Sripad Raja) تھا۔ اس نے تحریک... ذریعہ ایک مہم شروع کی۔ اس وقت تک یہ عقیدہ عام تھا کہ مقدس خیالات پراکرت میں ظاہر نہیں کیے جانے چاہئیں۔ سری پد راجا نے بڑی ہی جرأت سے اس کی تردید کی اور اپنے کلام سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہری داسی تحریک کو آگے بڑھانے میں سری پد کے چیلوں سری ویاس، سری پورن داس اور سری کنکا داس کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ہری داسیوں نے مختلف انواع کے گیت نظم کیے۔ ان گیتوں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ مشہور ہلاری (Hilary) گیتوں کا ترتیب کار بھی ایک ہری داسی تھا۔ یہ گیت کرناٹک سنگیت کے نصاب کی بنیاد تصور کیے جاتے ہیں۔ اس دور کے اہم ہری داسیوں میں وادی راج، وجے داس، گوپال داس، موہن داس، جگناتھ داس اور پرسنا وینکٹ داس ہیں۔ کنکا داس کی موہنا ترنگنی، ہری بھکتی سار، نل چرترا اور رام دھن چرتر کنڑی ادب میں کافی مشہور ہیں۔ سری جگناتھ داس کی "ہری کتھامرت سار" کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے اور مادھوی خدا پرستی کی مستند کتاب ہے۔ ہری داسی تحریک نے کنڑی زبان و ادب کی بیش بہا خدمت کی۔ اس کے سادہ گیت عوام کے دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے۔ ان گیتوں میں سنگیت اور شاعری ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

کرناٹک سنگیت کا ادب

سنگیت کرناٹک میں بہت عرصہ سے ترقی کرتا رہا ہے۔ جنوبی ہند میں آج جو گائیکی رائج ہے اسے کرناٹک سنگیت کہا جاتا ہے۔ چودھویں صدی سے اس کا یہ نام چلا آرہا ہے۔ وجیانگر کے ودیارانیا (Vidyaranya) نے جو علم موسیقی کا بہت بڑا عالم تھا سنگیت سار لکھی۔ وجیانگر کے دربار نے بھی سنگیت کی بڑی ہمت افزائی کی۔ سری پدراجہ موسیقی، فلسفہ اور ادب کے میدان میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ کرناٹک سنگیت میں ریسرچ کر کے اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کا سہرا پورن داس کے سر ہے۔ اسے آج بھی کرناٹک سنگیت "پتامہا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نجگونا شیوا یوگی (Nijaguna Shiva Yogi) علم موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے ویرسیوا فلسفہ پر بھی خیال آرائی کی ہے اور اپنی تصنیف ویویکا چنتامنی (Viveka Chintamani) میں سنگیت کے نظریے پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ وجیانگر سلطنت کے وزیر راما اماتیہ (Rama Amatya) نے سنگیت میں سورم لکالاندھی (Swara-melakalanidhi) لکھی جو جنوبی ہند کی اس موضوع پر اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ سنگیتہ شاعر، کنکا رتنا کرداری (Kanaka ratana karavar ni) موسیقی کا ماہر تھا۔ اس نے اپنی کتاب بھارتیسا وکھوا میں سائنٹفک موسیقی کے لازمی اجزا پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی زمانے کا سب سے اہم سنگیت کار سری پورندر داس تھا۔ اس کے پاس موسیقی اور شاعری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس کی تصنیف نے کرناٹک سنگیت کی تثلیثی شخصیتوں تیاگ راج، متھوسوامی اور شیام شاستری کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں بڑا حصہ لیا۔ بنگلور کے پندریکا وٹلا (Pundarika Vittala) نے اپنی تصنیفات شڈراگ چندرادیہ (Shadraga Chandrodaya) راگ مالا اور راگ منجری میں سنگیت پر گہرائی سے لکھا ہے۔ وجیانگر اور میسور کے راجاؤں نے سنگیت کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی۔ بھکتی گیتوں کو رواج دینے میں وجے داس، موہن داس، پرسنا وینکٹ داس، جگناتھ داس اور آنند داس کے نام قابل ذکر ہیں۔ اناودھوت (Annavadhuta) اردو اور کنڑی دونوں کا اسکالر تھا۔ سنگیت کے میدان میں اس کا قیمتی سرمایہ موجود ہے۔ میسور کے سری کرشنا راجہ کا دور حکومت کرناٹک موسیقی کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ سارے ملک کے ہندوستانی اور کرناٹکی سنگیت کے مشہور کلاکاروں مثلاً آری کودی (Ariakudi) ٹائیگر ورداچار، فیاض خاں اور عبدالکریم خاں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

کنڑی ڈرامہ

کنڑی کا اولین ڈرامہ جو دستیاب ہوا ہے وہ میسور راجا کے درباری شاعر سنگارایہ کا متراوندا گووند (Mitravinda Govind) ہے۔ یہ کنڑی میں اپنی نوعیت کا پہلا ڈرامہ ہے جو ہرش کے سنسکرت ناٹک رتناولی کا کنڑی ترجمہ ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ملک میں اسٹیج پر کھیل تماشے کی روایت دسویں صدی سے چلی آرہی ہے۔ لفظ کرناٹک قدیم کنڑی کلاسک میں بھی ملتا ہے۔ بعض کتبات میں بھی ناٹکا سالے (تھیٹر) کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کا رواج شاہی دربار میں بھی تھا۔ عوامی ڈرامے یکشہ گنا (Yakshagana)

کہلاتے تھے۔ چودھویں صدی میں ایسے سینکڑوں ڈرامے ملتے ہیں۔ کنڑی اسٹیج دیگر علاقائی اسٹیج کے مقابلہ میں سب سے زیادہ پرانا ہے جس نے اُس پاس کے علاقوں مہاراشٹر، آندھرا، اور تامل ناڈو تھیٹر کو بھی متاثر کیا ہے۔ آندھرا کے تھیٹر پر کنڑی کے اثرات کو ڈاکٹر۔ سی۔ نارائن راؤ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ آندھرا پردیش کو آنے والا پہلا ڈرامائی گروپ دھارواڑ سے آیا تھا۔ ڈاکٹر کرشنا چاریو نے جنھیں تلگو ڈرامے کا جدِ اعلیٰ کہا جاتا ہے اپنا پہلا ڈرامہ سوپن انی رادھا اسی گروپ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ کنڑی کا پیشہ ورانہ اسٹیج تقریباً ایک سو سال پرانا ہے۔ بسوپاشاستری کندگول ہنمت راؤ، گرودسداسیوراؤ اور بی پٹا سوامیا جیسے مشہور ڈرامہ نگاروں نے اسٹیج کے لیے کئی ڈرامے لکھے۔ کنڑی کے چند مقبول عام ڈرامے تکارام کبیر، سرن بسوا، اکا مہادیوی، ٹیپو سلطان، باباصاحب اور ستیہ ہرش چندر وغیرہ ہیں۔

جدید کنڑی ڈرامے کی تحریک کے بانی کیلاشم، کارنتھ اور سری رنگا ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جدید تکنیک کے ڈرامے کا نیا ادب پیدا ہونے لگا پیشہ ور کمپنیوں نے بھی یہی راہ اختیار کی اور سمسار نوکے (Samsara Nauke) ستیہ سنکلپ، مخملی ٹوپی، ساہوکارہ اور رکلا چکہ جیسے ڈرامے اسٹیج ہونے لگے اس کے ساتھ منظوم ڈراموں اور آپرا کا بھی رواج ہوا۔ جی ایم ایس مستی، کے۔ وی پٹپا اور ایم۔ آر۔ سری نے بلینک ورس ڈرامے تخلیق کیے۔ سمسا (Samsa). نے تاریخی ڈرامے لکھے۔ انگریزی ڈراموں کے ترجمے اور تلخیصات بھی پیش کی گئیں۔

کنڑی صحافت

کنڑی صحافت کی ابتدا میسور اور بمبئی کے کرناٹکی اضلاع دھارواڑ، بیجاپور، بلگام اور کاروار سے ہوئی۔ سب سے پہلے جرمن مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بلاری اور منگلور میں کنڑی رسائل جاری کیے۔ بنگلور ہیرالڈ جو ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا بھاشیم چاری کی ادارت میں نکلنے والا میسور ورتنا (Viritanna) ایک اینگلو کنڑی پرچہ تھا۔ کرناٹک پرکاسیکا (Prakasika) پہلا ہفتہ وار ہے جو ۱۸۶۵ء میں جاری ہوا میسور گزٹ کے نام سے ایک سرکاری پرچہ ۱۸۶۸ء میں نکلنا شروع ہوا۔ ہتا بودھنی (Hita Bodhini) کے نام سے پہلا کنڑی ماہنامہ رامانج آئنگار کی ادارت میں ۱۸۸۱ء میں میسور سے نکلا۔ سوریودیہ۔ (Sur-yodaya)۔ پرکاسیکا پہلا کنڑی روزنامہ ہے جو جی۔ نرسنگ راؤ کی ادارت میں ۱۸۸۸ء میں بمقام میسور جاری ہوا۔ ایم۔ وینکٹ کرشنا کا اخبار سادھوی، سری راما راؤ کا ماہنامہ سبودھ اور پی۔ آر۔ رامیا کا تائی ناڈو جن کو جاری ہوئے عرصہ ہوا آج بھی پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ پرجا ماتھا ہفتہ وار کا تلگو اڈیشن بھی نکلتا ہے۔ بنگلور سے ایک اور روزنامہ پرجاوانی کے نام سے نکل رہا ہے جو کنڑی کا سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ہے۔ بنگلور کا ہفتہ وار سدھا بھی بہت مقبول اور کثیر الاشاعت ہے۔

کنڑا ساہتیہ پریشد کی جانب سے کنڑا نودی (KanndaNudi) اور ساہتیہ پریشد پتریکا شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کرشنا سوکتی سوواسنی، کانتی روا، سوتنتر بھارت، راشٹر ماتا، ستہ گرہی، اور تلک سندیش سوراجیہ وغیرہ کچھ اور رسائل ہیں جو بنگلور سے نکلتے ہیں۔

جدید کنڑی ادب

کنڑی ادب کی نشاۃ الثانیہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے ہوئی۔ عیسائی مشنریوں نے کنڑی زبان وادب کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ آر۔ نرسمہا چار نے اپنی تصنیف کرناٹک کوی چرتر میں تقریباً بارہ سو کنڑی ادیبوں کے مختصر حالاتِ زندگی دیئے ہیں کنڑی ادب جب اپنے گیارہ سو سالہ پس منظر کے ساتھ بیسویں صدی میں داخل ہوا تو اس کے جملہ اصناف میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔

جدید ادبی انقلاب نے کنڑی ادب کو تکنیکی اور موضوعی ہر لحاظ سے متاثر کیا۔ اس انقلاب کے لیڈر پروفیسر بی۔ ایم سری کانتیا ہیں۔ ان کے علاوہ سری نواس، ڈی۔ وی۔ گنڈپا، پانچے، منگیس راؤ اور رام چندر راؤ نے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر کنڑی میں غنائی نظمیں، مضامین اور تنقید لکھنا شروع کیا۔ جدید کنڑی کے دو ممتاز شاعر کویمپو اور کے۔ دی۔ پٹپا (Puttappa) ہیں۔ کویمپو کی رامائن درشنا کنڑی کی واحد رزمیہ نظم ہے۔ ان دونوں کو پدما بھوشن کے علاوہ ہندوستانی ساہتیہ اکیڈمی کا انعام اور گیان پیٹھ کا اعلیٰ ترین ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ تغزلانہ رنگ کے دوسرے اہم شاعر دی سیتا رامیا، جی۔ پی۔ راج رتنم، پوتنا۔ وی کے۔ گوکاک۔ گوپال کرشنا ادی کا، کے ایس۔ نرسمہا سوامی اور ایس۔ آر۔ اکنڈی (Ekkundi) وغیرہ ہیں۔ جدید کنڑی شاعری نے ایک نئی تکنیک، نئی رمز آمیز امیجری پیدا کرنے کی کوشش کی اور الفاظ کو نئے مفہوم ومعنی میں استعمال کیا۔ رام چندر شرما، اے۔ کے رامانج، کے ایس۔ نثار احمد گنگا دھر چٹپال ملین ایس۔ ایل بھٹ اور اکبر علی وغیرہ اسی جدید رجحان کے نمائندہ ہیں۔

ناول نگاری

ناول نگاری کنڑی ادب کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مقبول صنف ہے۔ موجودہ دور کنڑی ادب میں ناول نگاری کا دور ہے۔ جدید ناول میں موجودہ زمانے کی بھرپور عکاسی مختلف شکلوں میں ملتی ہے۔ اچھے ناول نگاروں میں کے۔ ایس۔ کارنتھ، اے۔ این کرشنا راؤ، تاراسا راؤ، مستی، انعام دار، ونایک مگالی، کرشنا مورتی، وی سیتا رامیا اور نرنجن وغیرہ ہیں۔ کئی کنڑی ناولوں کے انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور انگریزی ہندی تامل، تلگو، بنگالی اور روسی زبانوں کے بھی متعدد ناولوں کا کنڑی میں ترجمہ ہوا ہے۔

ڈرامہ

اس وقت ڈراما بھی کنڑی ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ ادبی حیثیت سے اس صنف کو ٹی۔ پی کیلاشم سری رنگا راؤ اور کارنتھ نے ترقی دی اور اس میں نئی تکنیک کا اضافہ کیا۔ کیلاشم کے ڈرامے اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ ان میں انگریزی اور کنڑی دونوں کی آمیزش ہے۔ کارنتھ اور سری رنگا کے پاس طنز زیادہ ہے۔ دیگر ڈرامہ نگاروں

نیں سمپا لکھدی. راگھوا چار، کشیر ساگر، ایس. کے. کلکرنی اور اے ایس مورتی قابلِ ذکر ہیں۔

مختصر افسانہ

افسانہ بھی جدید کنڑی ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ مستی، دینکیش اور آئینگار اس میدان کی ممتاز شخصیتیں ہیں۔ اپنے طرز اور اسٹائل کے لحاظ سے وہ منفرد ہیں۔ کنڑی کے کچھ اور افسانہ نگار کے. گوپال، کرشنا راؤ۔ آنندا، کویمپو (Kuvempu) کارنتھ، اے این. مورتی راؤ ہاین کستوری، دیو و ڈو دانی، شاملا دیوی، جے لکشمی، گیتا دیوی، اننت مورتی کشیر ساگر، کرشنا کمار، راما راؤ اور بھارتی پریا ہیں۔

ادبی تنقید

ادبی تنقید نے بھی جدید کنڑی ادب میں کافی ترقی کی ہے۔ بی ایم ایس، ڈی. وی. جی، اے. آر کرشنا شاستری، دی. سیتا رامیا، ٹی. این. سری کانیتا سنڈرسے۔ ایم. آر. سری، آر. ایس. مگالی، گوکاک، کارنتھ، ایم. ایم. بھٹ، مانوی نرسنگ راؤ، نائک اور ڈی. وی. آر. سجاتا کنڑی کے ممتاز نقاد ہیں۔ آر. ایس. مگالی نے کنڑی ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے جس پر انھیں ڈی. لٹ کی ڈگری اور اکیڈمی ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔

جدید کنڑی میں اچھی سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں بھی ملتی ہیں۔ ڈی. وی. جی، کویمپو، کڈالی چدمبرم (Kudali Chidambaram) دیواکر، کندادے اور کے. وی رتنما نے دلچسپ سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر کے. ایم. کے. راؤ، پربھوشنکر، جی. ایس. ایس، ام. سی. مورتی، جی. وی راؤ، سروجنی اور دنود وغیرہ کے مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

لوک ادب

حال میں لوک ادب اور یکش گنا (Yakshagana) کے کئی نمونے اکٹھا کیے گئے ہیں۔ ایل. گنڈپا، کرشنا مورتی، دیو و ڈو د، مستی، کارنتھ، ناگی، پندیشور، کاراکرو (Ka - Ra Kru) اور جی سمپا وغیرہ اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔

گزشتہ پچاس سال سے کنڑی میں تنقید و تحقیق پر بھی روشنی ڈالی جارہی ہے۔ نامور شاعروں کی قدیم تصانیف کو از سر نو مرتب کرکے ادبی تبصرہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ ان میں مشہور و معروف نام یہ ہیں اسکالر پی. جی ہلاکٹی (Halakatti) سبودھ راما راؤ، کٹل (Kittel) بساونال، راماج آئنگار، کے. ایم کرشنا راؤ، شیومورتی شاستری اور مری اپا بھٹ وغیرہ۔

کنڑی زبان میسور کے وڈیار خاندان کی سرپرستی میں

سولھویں صدی میں وجیانگر کی سلطنت کے زوال کے بعد کنڑی زبان کی سرپرستی کے اعتبار سے میسور کے دیوراج وڈیار کا دورِ حکومت بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خود راجا کی تصانیف گیتا گوپال اور چکھا دیوراج بینپا بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ تھرو ملاریا اس راجا کا درباری شاعر بھی تھا اور وزیر بھی۔ اس کی کتاب ومسادلی (Vamsaveli) کنڑی نثر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ایک اور کتاب فن خطابت پر ہے۔ اسی دور کا ایک وزیر چکوپادھیا دے تیس کتابوں کا مصنف ہے۔ دیویا سوری چرتر (Di vya Suri Charitra) اس کی بہترین تصنیف ہے۔ دیوراجہ عہد کی خاتون ادیبوں میں ایک سانچی ہونما ہے جس نے ہدی بادیا دھرم (Hadibadeya Dharama) لکھ کر اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ ایک اور خاتون سری رنگما نے پدمنی کلیان لکھی۔ ایک اور ادیبہ ہلاد اکٹی گری یما (Halava Katti — Giriyamma) — گزری ہے جس کی اہم تخلیقات میں اُددا کیکا کتھا کا شمار ہے۔

گجراتی زبان و ادب

تمہید

گجراتی، ریاست گجرات کی سرکاری ریاستی زبان ہے۔ یہ علاقہ ہمارے ملک کے مغربی ساحل پر شمال میں راجستھان اور جنوب میں مہاراشٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں جزیرہ نمائے سوراشٹر اور کچھ بھی شامل ہیں۔ لسانی اعتبار سے گجراتی اس علاقہ کی زبان ہے جس کی سرحدیں شمال میں کچھ اور مارواڑ، مغرب میں مہاراشٹر کے ضلع تھانہ، مغرب میں بحیرۂ عرب اور مشرق میں مالوہ اور خاندیش سے ملتی ہیں۔

لفظ گجراتی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ممکن ہے گوجر یا گجار قبیلہ سے آیا ہو جس نے گجرات کے علاقہ میں بسنے کے بعد یہ نام دیا ہو کیوں کہ جو زبان وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ یقیناً گجراتی نہیں تھی۔ شمالی ہند کی اکثر زبانوں ہندی، بنگالی یا مراٹھی کی طرح گجراتی بھی کل ہند آریائی زبانوں کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر گجراتی، سنسکرت، پراکرت اور اپبھرنش کے مرحلوں سے گزر کر اپنا رشتہ قدیم ہند آریائی سے جوڑتی ہے۔ شورسینی پراکرت اور گورجرا اپبھرنش سے اس کا راست تعلق اور قریبی ناطہ ہے۔ یوں تو گجراتی نے ۱۲۰۰ء سے اپنے نمایاں خط و خال ابھارنے شروع کیے لیکن اس مخصوص نام سے وہ سترہویں صدی میں اس وقت موسوم ہوئی جب گجرات صوبہ کی تشکیل عمل میں آئی۔

قدیم گجراتی ادب

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچاریہ ہیم چندرا (۱۰۸۹-۱۱۷۴ء) جو گجرات کے راجہ سدھ راج کا استاد اور مشیر تھا اپبھرنش ادب کا آخری بڑا ادیب تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں ہیم چندرا لکھ کر تو اپنے ذاتی فیضان اور کچھ شاہی سرپرستی کی وجہ سے جینی عالموں اور قلم کاروں کا ایک گروہ پیدا کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ہیم چندرا کے بعد کا قدیم گجراتی ادب صرف جین ادیبوں کے کارناموں سے بھرا پڑا ہے۔

قدیم گجراتی ادب کا دور ۱۸۵۰ء پر ختم ہوتا ہے اور وہیں سے جدید گجراتی ادب کا آغاز ہوتا ہے لیکن بعض مستند علما کا خیال ہے کہ قدیم گجراتی کا دور سترہویں صدی کے اختتام پر ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جو

ادب گجراتی میں پروان چڑھا اسے عہد وسطیٰ کے گجراتی ادب سے موسوم کرنا چاہیے۔ لوگ گجراتی زبان کا استعمال گیارہویں صدی سے کرنے لگے تھے۔ اس کی ابتدائی تصانیف جو دستیاب ہوئی ہیں بارہویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ادب اس سے پہلے بھی موجود تھا۔

اپبھرنش سے قریبی تعلق رکھنے کے باوجود گجراتی اپنی ساخت اور ذخیرہ کے اعتبار سے اپبھرنش سے الگ اور اپنے طور پر نشوونما پاتی رہی۔ مسلم حملوں اور ان کے دورِ حکومت میں بھی اس کا ارتقا صدیوں برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں مغرب سے روشناس ہونے کے بعد اس کی ساخت اور ماہیئت میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ گجرات کے مسلم عمل داری میں آنے کے بعد اس کی سرحدیں متعین ہو گئیں اور اس کے تعلقات ہمسایہ شمالی علاقوں سے ہٹنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان اور کلچر پر مقامی رنگ زیادہ چڑھنے لگا۔ فارسی اور عربی الفاظ کے اضافہ کی وجہ سے بھی اس کے ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ تبدیلیاں گجراتی زبان کو ایک نیا روپ دیتی ہیں جن کی وجہ سے یہ زبان ۱۷۰۵ء کے لگ بھگ اپنی موجودہ شکل اختیار کرتی ہے۔

قدیم گجراتی میں مابعد ہیم چندرا جینی ادب

قدیم گجراتی مابعد ہیم چندرا جینی ادب کی خاص ادبی شکلیں رسا (Rasa) یا رسو، تلے (Tale) پھاگو (Phagu) اور نثر ہیں۔ ان میں رسا نے جس نے بعد میں اکھیان کی شکل اختیار کی غیرمعمولی مقبولیت حاصل کی۔

اس زمانے میں رسا کا رواج اتنا عام تھا کہ یہ سارا دور گجراتی ادب کا رسائی دور کہلاتا ہے۔ رسا سے مراد وہ طویل اور بیانیہ نظمیں ہیں جو دوہے اور چوپائی کے طرز میں رسیلی بحروں میں لکھی جاتی تھیں گجراتی کے ابتدائی زمانے سے ہی اسے قبول عام ملا۔ شالی بھدرا (Shali Bhadra) کی بھارتیشورا بھوبالی (Bharteshwara Babubali) جو ۱۱۸۵ء میں لکھی گئی تھی پہلی رسا ہے جو قدیم گجراتی میں ملتی ہے۔ بھرما سوری (Bharma Suri) کی جمبو سوامے چرتیا (Jambu Swame Charita) طرز بیان کے اعتبار سے رسا ہی ہے دیگر تاریخی رسائیں نلبھا (Nalba) کی دسالدے رس۔ وجے سوری کی ریونتا گری رس (Revanta Giri Ras) مندلیکا کی پل بدا رس (Pelbada Ras) اور امبا دیو سوری کی سمرا سو ہیں۔ آخر الذکر نظم علاالدین خلجی کے گجرات فتح کرنے کے فوراً بعد لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس میں فارسی اور عربی کے بھی بعض الفاظ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ شالی بھدرا کی پنچ پانڈو رس، ونیا پربھا (Venya Prabha) کی گوتم رس اور سریدھر ویاس کی رانا ملا چندرا (۱۳۹۰ء) بھی قابل ذکر ہیں۔ مسلم شاعر عبدالرحمٰن کی سندیش رسک رس پیالی شاعری کی حیثیت سے غیرمعمولی اہمیت رکھتی ہے۔

کہانی کے میدان میں قدیم گجراتی اپنے بے شمار ادیبوں پر فخر کر سکتی ہے ادب کی یہ صنف چودھویں اور پندرھویں صدی میں بہت مقبول رہی ہے۔ وجے بھدرا کی کہانی ہنس راج وچھاراج اشیت نانک کی ہنساولی (Hansavali) دونوں ایک مشہور قدیم قصے کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ برہمن شاعر بھیم کی سدیہ وتس کتھا (Sadaya Vatesukath) پندرھویں صدی کی پہلی اہم منظوم کہانی ہے ہیرانند کی ودیا ولاسہ پواڈو (Vidya Vilasa Pavado) ایک رومانٹک دلاویز اور خوب صورت نظم ہے۔ کیشو داس کائستھ کا وراٹ پوا (Virat Pawa) اور مادھو کی روپ سندر کتھا سے ثابت ہوتا ہے کہ سنسکرت کی بحروں کا رواج قدیم گجراتی ادب میں بھی تھا۔ کادمبری (نثری رومانس) کی صنف میں مانکیہ سندر کی تصنیف پرتھوی چندر چرتر سنسکرت کی کادمبری سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتی ہے۔ طرز بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ نثر کے ہر ٹکڑے کا آخری لفظ قافیہ پر ختم ہوتا ہے۔

سنسکرت کے مجازی یا رمزیہ ادب سے قدیم گجراتی کے جینی ادیب بہت پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے۔ جنا پربھا آچاریہ (Jina Parabha Acharya) کی بھاوبہ چہرتر (تیرھویں صدی) جو دھارمک نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، قدیم ترین جینی رمزیہ ہے۔ جے شیکھر سوری کی "پربندھ چنتامنی" (۱۴۰۶ء) قدیم گجراتی کی بہترین تمثیل سمجھی جاتی ہے۔ بھیم کی پربودھ پرکاش (۱۴۹۰ء) سنسکرت تمثیل "پربودھ چندر ودیا" کا منظوم ترجمہ ہے۔

پھاگو (Phagu) پھاگن یعنی بسنت سے متعلق ایک اہم غنائی نظم ہے۔ قدیم گجراتی کی سب سے پہلی پھاگو جو ہم تک پہنچتی ہے وہ استھولی بھدرا پھاگو ہے۔ بعد کے بہت سے شاعروں نے پھاگو شاعری کے عام عشقیہ انداز کو اپنے مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لیے بدل دیا مثلاً جے شیکھر سوری کی "نیمی ناتھ پھاگو" (Neminath Phagu) اور سریدھر کی "سری نیمی ناتھ پھاگو" میں سنگار کو ویراگیہ کا روپ دیا ہے۔ وسنت ولاس (بسنت رت کی رنگ رلیاں) ایک گمنام شاعر کی بہت دلچسپ خالص مذہبی پھاگو ہے۔

قدیم گجراتی ادب میں غنائی شاعری کی ایک ڈرامائی صنف بھی ہے جسے بارہ ماسا کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ موسمی گیت ہوتے ہیں جن میں ہیرو یا ہیروئن کی حالت فراق سال کے بارہ مہینوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اس صنف شاعری کو بعد میں غیر جینی ادیبوں نے بھی پروان چڑھایا۔ رادھا کرشنا کی جدائی کے مضمون اس نوع کی شاعری میں باندھے گئے۔ اور ایک خاص قسم کی شاعری جسے ککھو (Kakho) کہا جاتا ہے اپنے مقصد کے اعتبار سے خالص مذہبی اور ناصحانہ ہوتی ہے ککھو عام طور پر ہندی دوہے کی بحر میں ہوتی ہے۔ اس صنف کا استعمال بعد کے غیر جینی شاعروں نے طویل اکھیان نظم سے فرار کے طور پر یا ترویج علم کی خاطر کیا۔ ککھو کی طرح وواہلو (Vivahlu) ایسی نظمیں ہیں جنہیں سادھوؤں نے ترکِ دنیا کے پرچار کے لیے استعمال کیا۔ دو اور طرح کی نظمیں جنہیں چچری (Chachari) اور دھولا (Dhavala) کہا جاتا ہے قدیم جینی شاعری میں رائج تھیں۔

اس دور کے نثری ادب کا بڑا حصہ برہمنی یا جینی مذہبی کتابوں کے ترجموں پر مشتمل ہے قدیم گجراتی شاستری تصانیف بالاوبودھ کہلاتی ہیں۔ اس قسم کی تصانیف میں "آرادھنا" ۱۲۷۴ء "ستارہ"

"ایدیش مالا"، "یوگا شاستر" اور "سراوفیک" کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

بھکتی ادب

پندرہویں صدی میں کئی ایسی تصانیف ملتی ہیں جو غیر جینی ادیبوں کی لکھی ہوئی ہیں بھکتی عقیدہ کی چھاپ اس دور کے ادب کی خصوصیت ہے۔ بھکتی کا اثر قدیم گجراتی ادب سے لے کر اٹھارہویں صدی میں دیارام کی وفات تک برابر قایم رہا۔ سوراشٹر کے جوناگڑھ کا ایک برہمن شاعر نرسمہا مہتا قدیم گجراتی ادب میں بھکتی تحریک کا سب سے ممتاز شاعر گزرا ہے۔ نرسمہا کی شاعری اور بھکتی ادب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دونوں میں ہمیں ویدانتی گیان کی پوری بصیرت ملتی ہے۔ اس طرح نرسمہا کے پاس کرشن کا بھگت اور فلسفی سنت دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں گجرات کے لوگ نرسمہا کے "پدیہ" نسل در نسل گاتے چلے آ رہے ہیں۔ ان مشہور پدوں کے نام یہ ہیں۔ سنگار ملا، وسنت فن پد (Vasanman Pad) ہنڈولانن پد (Hindolanan Pad) چتوری شو دشی (Chaturi - Shodoshi) وغیرہ۔ نرسمہا کی شہرت کی اصل وجہ اس کی یہی پدیہ شاعری ہے۔ مہتا کے اسی فلسفہ کو گاندھی جی نے اپنا فلسفۂ حیات بنایا تھا۔ آنے والی نسلوں پر نرسمہا کی شاعری کا سب سے زیادہ اثر ان پدوں کی وجہ سے ہوا جنہیں "پربھاتی" کہا جاتا ہے پہلی اور ابتدائی نمونہ کی اکھیان طرز کی نظم نویسی کے سلسلے میں بھی نرسمہا کا نام لیا جاتا ہے۔

ایک اور مشہور شاعر پدمنابھ ہے۔ اسے جالور کے حکمراں اکھیہ راج کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے اپنی مشہور نظم "کانہاداد ے پربندھ" (Kanhadaday Parabandh) ۱۴۵۶ء میں لکھی اور اس نظم کے ذریعہ رزمیہ شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ویرسمہا پہلا گجراتی شاعر ہے جس نے بھگوت کے قصہ "اوشا" کو ضروری تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا۔ پندرہویں صدی کے شاعروں میں سب سے ممتاز شاعر بھالنہ (Bhalna) ہے جو گجراتی ادب کی پورانک تحریک کے زمانے کا ایک روشن ستارہ ہے بھالنہ تقریباً سولہ تصانیف کا مصنف ہے۔ مثلاً دشما سکندھ (Dashma Sukandh) سپست، نٹ اکھیان، کرشنا دشٹی، مروگی اکھیان (Mrugi Akhyana) دھرو اکھیان اور جالندھر اکھیان وغیرہ بھالنہ کی وہ مشہور اکھیان ہیں جن پر اس کی شہرت کا دارومدار ہے۔ اکھیان شاعری بھالنہ کے ہاتھوں میں ایک نئی اور منفرد ادبی شکل اختیار کرتی ہے۔

اکھیان روایت کو آگے بڑھانے میں بھالنہ کے ایک پیرو بھیم کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس نے ایک خاص نظم کی تخلیق کی جو ہری لیلا سوڈشہ کلا کہلاتی ہے۔ اس کے بعد اکھیان تحریک اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ پھر کئی اور شاعروں نے پرانوں اور رزمیوں پر اکھیان لکھے۔ جنار دھن نے ایک اکھیان، اوشاہرن (۱۴۹۲ء) نام سے لکھی۔ نند نانے "ردرمن گدا کتھا" (Rudraman Gada Katha) اور راماین اکھیان طرز پر تحریر کی۔ واسو کی سانگل شا ونچ ڈنڈا اور نندا بتریسی (Nanda Batrisi) منظوم کہانیاں ہیں۔ دیپل کی پھاگاس (Phagas) رشی وردھن کی نل دمینتی رسا، سادھو کیرتی کی "وکرم چرتر کار رسا"۔ بنائے سندر کی ودیا ولاس چوپائی اور "جنا ہارا" (Janahara) کی وکرم پنچ دندرسا جیسی جینی تخلیقات پندرہویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں۔

قدیم گجراتی شاعری میں بھکتی تحریک کی ایک اور غیر معمولی شخصیت میرا بائی کی ہے۔ ایک شاعرہ کی حیثیت سے بھی اور ایک عقیدت مند بھگت کے ناطے بھی وہ ہندی اور گجراتی دونوں زبانوں کے ادب سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایک سماجی باغی تھی جس نے بھگوان کرشن کی عقیدت میں ساری دنیا سے ٹکر لی۔ میرا جانتی تھی کہ ایک اعلیٰ پایہ کی غنائی شاعری اور یکسر عقیدت مندی کے درمیان کس طرح توازن برقرار رکھا جانا چاہیے۔ میرا کے گیت پدیہ کہلاتے ہیں۔ اس کے گیتوں نے گجراتی ادب کی آنے والی نسلوں پر ایک مستقل اثر چھوڑا ہے۔ کیشوداس ہردے رام کی کرشنا لیلا کاویہ میں کرشن جی کی زندگی کے مشہور واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس نے مہابھارت کے بھی بعض حصّوں کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ دیومالائی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ اس نوع کی شاعری پریم آنند کے پاس انتہائی عروج پر پہنچتی ہے۔ بڑودہ کا یہ شاعر سب سے بڑا گجراتی شاعر ہے۔ اکھیان شاعری کا ایک اور شاعر وشنو داس ہے جس نے ناگر کی روایات کو بہت آگے بڑھایا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں بھی کئی رومانی قصے لکھے گئے۔ ان کے لکھنے والوں میں جینی اور غیر جینی دونوں شامل ہیں۔ چند مشہور قصّے یہ ہیں۔ نرپتی کی پنچ ڈنڈا مدھوسودن ویاس کی ہنس وتی وکرم چرترا اور وچاراج کی راس سنجری وغیرہ۔ مصنفین ونے اودے بھانو، دھرم شیل سدھا سوری اور دوسرے جینی کہانی کاروں نے اپنی کہانیوں کے موضوع وکرم آدتیہ اور پنچ تنترا کے قصّوں سے حاصل کیے۔

پندرہویں اور سولہویں صدی کا زیر تبصرہ قدیم گجراتی ادب حسن اور تنوع کے لحاظ سے کافی مالا مال تھا۔ اس نے وہ میدان تیار کیا جس میں اکھیان شاعری، فلسفیانہ اور رومانٹک ادب کا صحت مند نشوونما ممکن ہو سکا۔ دورِ وسطیٰ کے گجرات کا ایک بہت ہی عظیم فلسفی شاعر اکھو (Akho) تھا۔ اس کی تقریباً تمام تصنیفات صرف ویدانت کے فلسفیانہ نظریہ کی تشریح و تفہیم کے لیے وقف ہیں۔ اس کی مشہور طویل نظمیں "گرو سِشیہ سمواد" "ابو بھو بندو"، "اکھے گیتا"۔ ککھو (Kakho) کنڈلیان اور کائے والیا (Kaivalya) ہیں۔ ان طویل نظموں میں اکھو واضح اور حسین ایمجری کے ذریعہ قابل لحاظ شعری خدمات کا ثبوت دیتا ہے۔

اکھو جیسے شاعروں نے گو فلسفیانہ شاعری کو بہت ہی کامیاب ڈھنگ سے پیش کیا تاہم عوامی ذوق اکھیان طرز کی مسحورکن بیانیہ شاعری کی طرف ہی مائل رہا۔ چنانچہ سترہویں صدی میں متعدد اکھیان نویس پیدا ہوئے۔ گجرات کا سب سے بڑا شاعر اور عہد وسطیٰ کا اکھیان شاعری کا استاد اعظم پریم آنند ہے۔ شاعری پریم آنند کا پیشہ تھی۔ ایک پیشہ ور گاگر بھٹ کی حیثیت سے پرانک واقعات کی قصہ خوانی اور ان کی توضیح و تشریح، تبصرہ اور تفسیر اس کا کام تھا پریم آنند کے اکھیانوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے (۵۷) کتابیں لکھی ہیں۔ نل کھیان (Nala Akhyan) پریم آنند کا بہترین اکھیان ہے جس میں شاعری کا مخصوص آرٹ اور استادانہ رنگ ملتا ہے۔ جو چیز پریم آنند کی شاعری کو ممتاز

کرتی ہے وہ شاعر کے جمالیاتی احساس کو بیدار کرنے کی قوت اور تفصیلات پر اس کی نظر ہے۔

رتنیشور (Ratn_esbwar) نے بھگوت گیتا اور سنسکرت کے چند ایک سوتروں اور دو رزمیوں (مہابھارت اور رامائن) کو گجراتی جامہ پہنایا۔ اس نے "کرماولاس" کے نام سے ایک عشقیہ نظم "آتما و چیار چند رودیہ" اور "ویراگیہ لتا" جیسی فلسفیانہ نظمیں لکھیں۔ پریم کے دوسرے ہمعصر ولبھ بھٹ نے مہاکلی دیوی کی شان میں کئی ایک گربالیں (Garbas) لکھیں جس کی بنا پر اسے مستقل شہرت حاصل ہوئی۔ مہادیو کی "رتی سندر کتھا"، "شیوداس"، "کماوتی اور مہاوتی اور ورجی (Virgi) کی کرم وتینی (Karmavatini) کتھا منظوم جینی کہانیاں ہیں۔ اس دور میں کئی ایک مشہور رسائیں بھی لکھی گئیں۔

اٹھارہویں صدی کا ادب

پریم آنند کے انتقال کے وقت ایک بلند پایہ کہانی کار سامل گجراتی ادب میں اپنا مقام پیدا کر رہا تھا۔ اس نے پرانک موضوعات سے گزر کر قدیم رومانٹک افسانہ کو اپنی جولانی طبع کے لیے اختیار کیا۔ سامل کی افسانوی تصانیف سِمہاسن بتریسی، سدا بھوتین (Sudababuten) پدماوتی، مدن موہن، ودیا ولاستی اور نندا بتریسی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ مشہور پرانک تصنیفات میں سامل کی دو کتابیں انگدوشٹی اور راون مند ودری سمواد ہیں۔ کالیداس بی۔ رام اور گوور دھن بھی اکھانوں کے مصنف ہیں۔ جیورام بھٹ نے بھی ایک دلچسپ رزمیہ لکھی۔ تریکم داس "پردت پچیسی" اور "ڈاکو قلعہ" کا خالق ہے دھیرو (Dhiro) ایک بروٹ (Barot) تھا جو اپنی کافیوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ جو سانٹ کی طرح مختصر نظمیں ہوتی ہیں۔ نرانت بھگت (Niranit - Bhagat) بھی ایک فلسفی شاعر تھا جس نے چپالیں (Chappas) کافی اور مہیناس (Mabinas) لکھے۔

سوامی نارائن نامی ایک کٹر مذہبی فرقہ نے بھی گجراتی کو بعض سندر گیت دیے۔ مکت آنند اور نشکل آنند اسی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی زمانے کے مشہور و معروف کبیر پنتھی شاعروں میں بھان داس، روی داس، روی صاحب، مرار صاحب، تریکم صاحب، ہوتھی اور سنت جیون داس کے بھجن آج بھی گائے جاتے ہیں۔ دیا رام عہد وسطیٰ کی گجراتی شاعری کا سب سے طویل قامت اور آخری ستون ہے جس کی شاعری اپنے عہد کی تمام خصوصیات کی عکاسی کرتی ہے۔ دیارام گجراتی شاعری کا روشن ترین ستارہ ہے۔ اس کی کئی تصنیفات ہیں بعض کا تعلق وشنو تیا عقائد واصول سے ہے۔ باقی پرانک اکھیان، متفرق پدوں اور گربوں پر مشتمل ہے۔ گربہ کی وجہ سے ہی اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ عظیم ادب کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔

گجراتی ادب کا جدید دور

دیا رام کے انتقال کے وقت مغرب سے متعارف ہونے کی بنا پر گجرات کی زندگی میں ایک نئی روح پھونکی جا رہی تھی اور ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب ادب عظیم تغیرات اور کامل انقلاب سے دوچار ہوتا ہے۔ انگریزی تعلیم کے رواج نے نوجوان ذہنوں میں نئی امنگیں اور نئے رجحانات پیدا کیے۔ اس طرح نئے سماجی اور تہذیبی رابطہ نے بالکل ہی نئے گجراتی ادب کو جنم دیا جو ظاہر و باطن اور اسٹائل میں قدیم اور وسطی دور کے گجراتی ادب سے یکسر بے تعلق تھا۔ نظم و نثر میں کئی اصناف پہلی مرتبہ وجود میں آئیں۔

نرمدا شنکر لال شنکر دیو جدید گجراتی ادب کا پہلا شاعر تھا اگرچہ پہلی جدید نظم لکھنے کا شرف نرمدا کے سینئر ہمعصر دلت رام دیا بھائی کو حاصل ہے۔ گجراتی شاعری میں قدیم دھاروں کے درمیان دلت رام کی شاعری ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم نرمدا کا تصور شاعری دلت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جدید ہے۔ اس کی اہم تصانیف فاربس ورہ "فاربس دلاسا" "وین چترا" اور "منگل گیتاولی" پر مشتمل ہیں۔ نرمدا جدید گجراتی نظم و نثر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ گجراتی شاعری کو اس نے تین نئے موضوع فطرت، محبت اور وطن پرستی عطا کیے۔ اس کی شاعری شدت اخلاص اور اصلاحی لگن کی آئینہ دار ہے۔ وطن پرستانہ شاعری میں "جے جے۔ گوری گجرات" اس کی ایک کلاسیکی نظم ہے۔ نرمدا کی تخلیقی صلاحیتوں ہی نے جدیدیت کی اسپرٹ پیدا کی۔ اس کی اہم تصانیف "سو تنترتا" (۱۸۵۹ء) "جگوپی گیا" (۱۸۶۰ء) "ہند دوتی پدتی" (Hiduvati Paditi) "رو یرسبھا" (۱۸۶۷ء) اور "نرما کویتا" ہیں۔

نرمدا نے اصلاحی پرچار کے لیے کئی ایک نثری مضامین بھی لکھے ہیں۔ جدید معنوں میں وہ گجراتی کا پہلا نثر نگار بھی ہے۔ اس نے گجراتی "نرماکوش" کے نام سے ایک لغت بھی مرتب کی۔ "راجیہ رنگ" کے نام سے ایک مجمل تاریخ عالم بھی لکھی۔ اس نے "میری حقیقت" کے عنوان سے اپنی سوانح عمری بھی ترتیب دی۔

ناول رام لکشمی رام پانڈے شاعر ہونے کے علاوہ ڈرامہ نگار بھی تھا لیکن وہ گجراتی ادب کے جدید شاعر کی حیثیت سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ سنسکرت میں اس کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اس کی تحریروں میں ایک خاص معیار اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ مضمون نگار، سوانح نویس، شاعر، مورخ، اڈیٹر اور نقاد تھا۔ اس کی چند مشہور تصانیف "بھٹو بھوپالن" "ویرمتی" "میگھ دوت" "بال گربھاولی" اور "نول گرنتھاولی" ہیں۔ ناول رام جدید گجراتی ادب کا پہلا ممتاز نقاد ہے۔ جس نے ادبی تخلیقات کا باقاعدہ طور پر جائزہ لیا۔ نند شنکر تلجا شنکر مہتا ایک اور ریفارمر تھا جو جدید گجراتی ادب کے پہلے دور میں بحیثیت ادیب مشہور ہوا۔ وہ گجراتی ادب میں پہلے ناول نگار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اسی دور کے بھولا ناتھ سمبھائی نے بنگال کی برہمو سماج تحریک سے متاثر ہو کر گجرات میں پرارتھنا سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس کے گیتوں کا مجموعہ "ایشور پرارتھنا" کہلاتا ہے۔ کرشن داس مولجی بھی ایک ریفارمر اور ماہر تعلیم تھا۔ اس کی سب سے اچھی تصنیف "انگلینڈ میں پرواز" ہے۔ رنچھوڑ بھائی اودے رام دوے کا جدید گجراتی میں بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کے چودہ ڈراموں میں

ے کماری وجیہ"، "دکھ درشک"، "نل دینتی" اور "تارامتی سوئمبر" وغیرہ شامل ہیں۔ ہرگووند داس کانٹا والا عہد وسطیٰ کی ادبی تصانیف کے مرتب کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کی تصانیف میں دو کہانیاں اور سماجی تعلیمی مسائل پر تین کتابیں شامل ہیں۔ من سکھ رام ترپاٹھی کے کئی ایک تراجم، سوانح عمریاں، ڈرامے اور مضامین موجود ہیں۔ ورج لال کالیداس شاستری نے لسانیات، منطق شاعری وغیرہ پر اپنی تحریروں سے گجراتی زبان کی خدمت کی ہے۔

پنڈت یگ (علما کا دور)

نرمدا کی موت کے ساتھ ہی دو بڑے عالم گووردھن، رام مادھو رام ترپاٹھی اور نرسمہا راؤ بھولاناتھ دیوتیہ منظر عام پر نمودار ہوئے۔ یہ دونوں ادیب یونیورسٹی کی پیداوار ہیں۔ ان کی تصانیف صحیح معنوں میں گجراتی ادب کے دور جدید کی اولین تصانیف ہیں چوں کہ یہ جامعاتی تعلیم سے آراستہ تھے اس لیے یہ دور پنڈت یگ کہلاتا ہے۔ ان کی تحریریں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے وسیع مطالعہ کی حامل ہیں۔ گووردھن کا ناول سرسوتی چندرا اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس شہ پارے میں اس نے زندگی کے تجربات کو بڑی ہم آہنگی کے ساتھ سمویا ہے۔ دوسری تصنیفات میں سینہ مدرا (Snehamudra) "شک شار جیون" (Sakshara Geevan) اور "لیلاوتی جیون کتھا" ہیں۔ منی لال متھو بھائی دویدی سنسکرت ادب کے اسکالر تھے۔ ان کے کارناموں میں "آتمانی جمع" (نظموں کا مجموعہ) "کانتا" (ڈرامہ) "گلابنہا" (ناول) اور "بال ولاس" (مضامین کا مجموعہ) شامل ہیں۔

نرسمہا راؤ ایک عہد آفریں شاعر تھا۔ وہ جدید گجراتی ادب میں شاعر اور نثر نگار دونوں حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کی شعری تصانیف میں "کسم ملا" "ہردیہ وینا" اور "سمرن سانہتیہ" ہیں نثری تصانیف میں "وورت لیلا" (Vivarita Leela) "مانو مکورا" (Manomukura) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ نرسمہا راؤ نے پہلی مرتبہ موضوع و اسلوب دونوں لحاظ سے مغرب کے رومانٹک طرز پر نظمیں لکھی ہیں۔ جدید گجراتی ادب کو بھی اس کی بڑی دین ہے۔

بالا شنکر کنتھاریہ کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا جس نے ادب میں غزل نما طرز کی شاعری کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا مجموعۂ کلام "ہری پریم پنج وشی" کہلاتا ہے۔ منی لال اور بالا شنکر بھی گجراتی ادب میں غزل کی صنف اور صوفیانہ خیالات کو داخل کرنے کے بانی تھے۔ دھرو بھائیوں میں سے ایک یعنی ہرپرشاد دھرو نے حب وطن اور فطرت کے موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ کیشولال پرشاد دھرو نے سنسکرت اور قدیم گجراتی کے عالم اور نقاد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ رمن بھائی مہی پت رام نیل کنٹھ جدید رجحانات کا حامل ایک بلند پایہ مزاحیہ نگار اور عظیم نقاد تھا۔ اس کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ اس کی تنقیدی کتاب "کویتا اور ساہتیہ" سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

منی شنکر رتنا جی بھٹ (کانت) گجراتی کی بعض نہایت ہی عمدہ اور حسین نظموں کا خالق ہے۔ کھانڈو کاویہ میں اس کی تخلیقی ذہانت اپنے عروج کو پہنچتی ہے اور اس میں آج تک اس کا کوئی مد مقابل نہیں ہے۔ اس کی نظموں کا مجموعہ "پروالاپ" (Puravalap) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دو ڈراموں "ردمن سوراج"، اور "گرو گوبند سنگھ" نیز عالمانہ تصنیف "شکشا مانو اتہاس" سے اس کی دلکش نثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر بلونت رائے کلیان رائے ٹھاکر جو شاعر اور نقاد تھے جدید گجراتی ادب میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ بھنکر (Bhankar) ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں تغزل پر تفکرانہ عنصر غالب ہے۔ انہوں نے مختلف نئی بحروں کے تجربے بھی کیے ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف "کویتا شکشن" "وودھ ویاکھیان" (Vividh Viyakhyan) نوین کویتا وشے ویاکھیان" اور "پنچو ترنے" ہیں۔

پنڈت یگ کے ایک اور اسکالر اور نقاد آنند شنکر دھرو تھے۔ وہ سنسکرت کے عالم اور سچے ویدانتی تھے۔ ان کی مشہور کتاب "اپنو دھرم" کہلاتی ہے۔ ان کے پاکیزہ نثری اسلوب نے گجراتی ادب کو مالا مال کیا ہے ان کے مضامین کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شاعر کلپی (Kalpi) یا مور سمہ جی گوہل گجرات کا کیٹس کہلاتا ہے۔ اس کا مجموعہ کلام کلپی کیکا رو (Kalapi Kekarava) کہلاتا ہے۔ گجراتی زبان کا پہلا سفر نامہ کشمیر نو پرورس (Kashmir No Proras) اسی کا لکھا ہوا ہے نن لال دلپت رام کوی اپنی ضخیم شعری تصنیف میں محبت اور زندگی کا ایک نیا روپ پیش کرتا ہے۔ نن لال کی شاعری کا تغزل گجراتی ادب میں اب تک بے مثال ہے اس کے کثیر التعداد ادبی کارناموں کا نتیجہ (۸۳) کتابوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ نن لال نے کئی تاریخی ڈرامے "شہنشاہ اکبر شاہ" اور "جہانگیر نورجہاں" بھی تخلیق کیے۔

گاندھیائی دور (گاندھی یگ)

مہاتما گاندھی نے گجراتی ادب کو بے انتہا متاثر کیا۔ ایک تو راست گجراتی تحریروں کے ذریعہ دوسرے اپنے فلسفہ اور سماجی، سیاسی اور اخلاقی نظریات کے توسط سے گاندھی جی کے اثرات کے تحت ہی زندگی کے ہر پہلو کی طرح ادب کے معنی و مفہوم اور اسلوب و ہیئت میں بھی ایک انقلاب بپا ہوا اور ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا جسے گاندھی یگ کہا جاتا ہے۔ خود گاندھی جی گجراتی میں لکھتے تھے انہوں نے ایک سادہ لیکن پر اثر اسلوب پر زور دیا۔ گاندھی جی کی نثری تحریریں "نوجیون" میں شائع شدہ مضامین کے مجموعوں اور ان کی گجراتی میں لکھی ہوئی سوانح عمری کی دو جلدوں اور جنوبی افریقہ نو ستیہ گرہ نو اتہاس پر مشتمل ہیں مہاتما جی کی آپ بیتی گجراتی ادب کی عظیم تصانیف میں سے ایک ہے۔ گاندھی جی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ ان کے کئی ممتاز پیرووں نے جو اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے گجراتی میں لکھنا شروع کر دیا مثلاً مہادیو بھائی دیسائی کشور لال مشرا، کاکا صاحب کالیلکر نرہری پاریکھ اور سوامی آنند وغیرہ۔ اس طرح ایک نیا اسلوب جاری ہوا جو سادہ غیر مرصع، موثر اور عوام پسند تھا۔

گاندھی خیالات کے اثر کی وجہ سے اب شاعری اور افسانے میں حقیقت پسندی آگئی۔ ادب اور زندگی کا پورا تصور بدل گیا۔ نچلے

طبقات کی آزادی اور سرودیہ کے رجحانات شاعروں اور نثر نگاروں کو متاثر کرنے لگے۔ "نوجیون اسکول" کے لکھنے والوں میں دو نام بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو کاکا کالیلکر دوسرا کشور لال مشرو والا۔ کاکا گجراتی ادب کے ممتاز صاحب طرز نثر نگار اور مضمون نگار ہیں۔ "جیونو آنند"، "جیون بھارتی"، "دھرتی دیولو اور جیون وکاس" ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ مشرو والا ایک ممتاز مفکر اور فلسفی تھے۔ انہوں نے سادہ اور راست اسلوب کو اپنے سنجیدہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے "استری پرش سبندھ مریادا" اور "ستسار اور دھرم" میں تعلیمی سوشل مسائل پیش کیے۔ ان کی تصنیف "گاندھی وچار دوہن" گاندھی جی کے خیالات کا مجموعہ ہے۔

سوامی آنند ایک سنیاسی اور گاندھی وادی ہیں جن کا اپنا مخصوص اسٹائل ہے۔ "اشونم بلیدان" ان کی نثری نظم ہے۔ مہادیو بھائی ڈیسائی گاندھی جی کے سکریٹری تھے۔ ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ڈائری گجراتی ادب کا انمول خزانہ ہے۔ انہوں نے گاندھی جی کی مختلف تحریروں کا گجراتی میں ترجمہ کیا۔ لیکن گاندھی یگ کی روشن ترین شخصیت جس نے تخلیقی ادب کو ایک نیا اسلوب دیا تھا، لہجہ اور نئی تکنیک دی وہ کنہیا لال مانک لال منشی کی ہے۔ انہوں نے ادب کے میدان میں ایک انقلابی دور کا آغاز کیا۔ کے ایم منشی نے متعدد ناول کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ناول کے میدان میں ان کا کارنامہ سب سے زیادہ شاندار ہے ان کے مشہور تاریخی ناولوں "راج ادھیراج"، "پرتھوی ولبھ"، "گجرا تنو ناتھ"، "جے سومناتھ" اور "بھگوان پرسو رام" نے ناول نویسی کی صنف میں ایک نیا ادبی معیار قائم کیا ہے۔ گجراتی ادب پر منشی کا بڑا احسان ہے۔ ان کی رفیقۂ حیات لیلاوتی منشی بھی ایک ادیبہ اور سماجی کارکن کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کی جیون مختصی جبدیلی اور ریکھا چتر کہانیوں پر مشتمل ہیں۔

ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے کہانی کا ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ رواج ہوا۔ اس کے پیش کرنے میں ملایانل، کچھن لال واسدیو مہتا کا بڑا حصہ ہے۔ اس کی کہانیوں کا مشہور مجموعہ گوولانی ہے۔ دھن سکھ لال مہتا نے بھی جو ایک مزاح نگار اور ڈرامہ نویس تھے کئی افسانے خاکے اور ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اس ابتدائی دور میں مختصر افسانہ نویسی کو دھوم کیتو یا گوری شنکر گووردھن رام جوشی جیسا قابل افسانہ نگار ملا۔ گوری شنکر نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ دھوم کیتو نے تاریخی سماجی ناول، ڈرامے خود نوشت سوانح اور مضامین بھی لکھے۔ رام نرائن وشوناتھ پاٹھک ایک بلند پایہ اسکالر شاعر مفکر، فلسفی اور نقاد تھا۔ گجراتی فن افسانہ نویسی کی ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے وہ ایک بہترین نقاد بھی تھا۔ "کاویانی شکتی" اور "اروچن کاویہ ساہتیانی واھین" اس کی ناقدانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہیں۔ علم عروض پر بھی اس نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی۔ پاٹھک کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ "شیشانن کاویہ" اور "وشیش کاویہ" سے کیا جا سکتا ہے۔

جس شاعر نے مہاتما گاندھی سے قومی شاعر کا لقب حاصل کیا وہ ہے مہادیر چند کالیداس میگھانی۔ میگھانی کی نظمیں قومی جذبات سے بھری ہوئی اور گیتوں کی شکل میں ہیں۔ میگھانی کو اس کے لوک گیتوں کی وجہ سے گجراتی ادب میں لافانی شہرت حاصل ہے۔ میگھانی پہلا شخص ہے جس نے ادب میں گاندھیائی سوچ وچار کے ساتھ بالشویکی خیالات کا بھی اظہار کیا ہے "چتانا انگارہ" اس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے میگھانی کی دیگر تصنیفات میں ناول تنقیدی تحریریں، تلخیص اور ترجمے ہیں۔ رمن لال وسنت لال ڈیسائی بھی ایک معقول نثر نگار تھا جس نے اپنے ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ گجرات کے نئے ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے اہم ناول "گرام لکشمی"، "بھاریلو اگنی" اور مقبول ڈرامے "شنکت ہردیہ" اور "پرتھوی راج میکنہ" ہیں۔

اچھے تنقید نگاروں میں آر۔ وی۔ پاٹھک کے علاوہ وشنو پرشاد تری ویدی، وجے رائے۔ کے ودیہہ اور وشوناتھ بھٹ ہیں۔ ان میں وشوناتھ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وجے رائے ایک ادیب صحافی اور صاحب طرز تیکنک ہے۔ وشوناتھ کو اس کی "ویر نرباد" اور "ساہتیہ سمیکشا" کی وجہ سے شہرت ملی۔ اس کا پہلا مقبول ڈرامہ "آگ گاڑی" ہے۔ "الاکاویہ" اس کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ "رات چکراو" کہانیاں ہیں۔ اپنے مشہور سفرناموں کی بنا پر وہ گجراتی زبان کا ممتاز نثر نگار قرار پاتا ہے۔ مزاح نگار جیوا اندر کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "رنگ ترنگ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اوما شنکر جوشی اور سندرم یاتری بھون داس گاندھی یگ کے دو عظیم شاعر ہیں۔ اوما شنکر کی نظموں کا پہلا مجموعہ "گنگوتری" ہے۔ "آتیتھیہ" اور "وسنت ورشا" اس کی کامیاب تصانیف ہیں۔ اوما شنکر نے ناول اور منظوم ڈرامے بھی لکھے۔ وہ ایک ممتاز نقاد بھی تھا اس کی تنقیدی کتاب "نرکلیتا" ہے۔ سندرم کا نام بھی گاندھی یگ کے ادب میں اوما شنکر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ نئی شاعری کی صورت گری میں سندرم کا بڑا حصہ ہے۔ اس کی تصانیف "کاویہ منگل" نے گجراتی شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ اس کے مجموعوں میں "وسودھا" اور "یاترا" شامل ہیں۔ سندرم اعلیٰ پایہ کا نقاد بھی ہے۔ اس کے حقیقت پسندانہ افسانوں کے مجموعے "ہیراکنی" "اروچن کویتا" اور "پیاسی" ہیں۔

تیسرے دہے کے دیگر شعرا میں جھینا بھائی رتن جی ڈیسائی نے اپنی نظموں کے دو مجموعے شائع کیے جو "پنگھٹ" اور "ارگمیا" ہیں۔ اس کی شاعری پر گاندھی جی اور ٹیگور کا اثر ہے۔ "گاتا اسوپالو" اور "لوٹیلا تار" اس کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ کرشن داس مانک کی نظمیں "آل بل" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر من سکھ لال اور سندرجی بیتائی کا ادبی سرمایہ قابل لحاظ ہے۔ ان کی نظموں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ دیگر مصنفین میں کرشن لال، شریدھرانی، پرہلاد پاریکھ، بال مکند ودے، وینی بھائی پروہت، درگیش شکلا، ہریش چندر بھٹ، دیوجی مودھا پوجا لال اور بدرانیا قابل ذکر ہیں۔

گاندھی یگ کے دوران ناول نویسوں، مضمون نگاروں، نقادوں اور بالخصوص کہانی کاروں کی وجہ سے نثری ادب تیزی سے ترقی کرتا گیا فن افسانہ نویسی دھوم کیتو اور آر۔ وی۔ پاٹھک کی وجہ سے کافی آگے بڑھا گلاب داس نے بعض اچھے ایک ایکٹ ڈرامے لکھے۔ اس دور کی ناول

نویسی اور نثر نگاری کا ایک ممتاز ادیب پنالال نانا پٹیل ہے۔ اس نے گجراتی کے بعض بہترین ناول "مانونی بھوائی"، "مالیتاجیو" اور "ولا مانو" لکھے ہیں۔ گجراتی ناول نگاری کا ایک اور ممتاز نام درشک یا منو بھائی پنچولی کا ہے اس کے بہترین ناول جھیر تو پیدھن چھگانی جاتی اور دیپ کون ہیں۔ ایک اور اہم نام گنونت رائے آچاریہ کا ہے جس نے کئی اعلیٰ ناول اور کہانیاں لکھیں۔ دوسرے مشہور نثر نگاروں میں چنی لال وردھن شاہ (۱۹۶۶ء) موہن لال، مہتا سوپان، بھوبین مہتا، بھوگی لال گاندھی، نگین داس پاریکھ اور رمن لال سونی وغیرہ ہیں چنی دلال اور چنی لال ماڈیہ دو بڑے اچھے ادیب ہیں۔ گجراتی افسانہ اور ایک ایکٹ ڈراموں میں دلال کا کارنامہ قابل قدر ہے۔ وہ اچھا طنز نگار بھی ہے۔ چنی لال ماڈیہ کے مشہور ناول ویلا ولانی چھن یدی اور لیلودی ہوتی ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

خاتون مصنفین

خاتون قلم کاروں نے بھی گجراتی ادب کے فروغ میں حصہ لیا۔ نثری ادب کے مقابلہ میں ان کا شعری سرمایہ زیادہ ہے بعض نے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان میں ونودنی نیلکنٹھ کا نام بہت نمایاں ہے۔ دیگر خاتون شعراء اور مصنفین میں گوری بائی، دیوالی بائی، کرشنا بائی، پوری بائی اور رادھا کشن بائی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

گجراتی کے پارسی شاعر

پارسیوں نے جو گجرات میں بس گئے تھے گجراتی زبان اپنالی اور گجراتی مصنفین کے دوش بدوش اپنے کارناموں سے گجراتی ادب کی خدمت کی۔ شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ ابتدا میں انھوں نے اپنی مذہبی کتب کا گجراتی میں ترجمہ کیا۔ موبد رستم پستن ہمیار نے طبع زاد نظمیں لکھیں جو "نلمے" کہلاتے ہیں۔ جدید گجراتی ادب میں بھی پارسی شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں۔ جہانگیر اور طالع یار خاں نے "مدرانے کلیکا" اور رتن لکشمی کے نام سے دو ناول لکھے جنہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ کسی ہندو ادیب کی طرح ناول نگار نے نہایت شستہ اور ٹھیٹھ گجراتی زبان استعمال کی ہے۔ بہرام جی ملباری نے بھی خالص گجراتی میں نظمیں کہی ہیں۔ سب سے ممتاز پارسی اردشیر فرام جی خبردار تھا۔ جو پنڈت یگ کے دیگر بڑے شاعروں میں مانا جاتا ہے۔ اس کی کتابیں درشانکا اور کالیکا ناموں سے موسوم ہیں اس کے وطن پرستارانہ گیت اسے گجراتی ادب میں اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں پارسی جرنلزم اور ڈراموں کی پیش کشی کے میدان میں بھی بہت آگے ہیں پہلا گجراتی اخبار بمبئی سماچار ایک پارسی نے نکالا تھا۔ پہلا ڈرامہ بھی شوقیہ پارسی اداکاروں کی ایک جماعت نے اسٹیج کیا تھا۔ انگریزی تصنیفوں کے ترجمے بھی پارسیوں نے کیے۔

آزادی کے بعد کا دور

زندگی کے تلخ حقائق کے باوجود گاندھیائی دور کی شاعری اور نثر کی اہم خصوصیت اس کا آفاقی لہجہ تھی لیکن جنگ، یورپی ادب اور نظریات نے تہذیبی قدروں اور حسن کارانہ رویّہ کو متاثر کیا۔ خالص شاعری کا رجحان پیدا ہوا۔ جینت کھتری اور باکولیش جیسے ادیبوں نے شاعری میں گاندھیائی نظریہ کے حلقۂ اثر کو توڑ دیا اور فن افسانہ نگاری میں نئی زبان اور نئی تکنیک رائج کی۔ گویا اصلاح کی جگہ تخلیقی اور جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ پھر آزادی کے بعد جو مایوس کن حالات پیدا ہوئے اس کے کرب کو بھی ادیب کی حساس طبیعت نے محسوس کیا اس لیے اب وہ اکتاہٹ، صدمہ، درد اور طلسم شکنی جیسے موضوعات پر اپنا زورِ قلم صرف کرنے لگا۔ گاندھیائی دور کا خارج پرست اب داخلی واردات کا ترجمان بن گیا۔ اس گہرے تفکر کے اظہار کے لیے ہئیت اور اظہارِ بیان کے نئے نئے تجربوں کا جذبہ اور اپنی ذات کی تلاش کی خواہش نے نئی تکنیک اور نئے طریقہ کار کو جنم دیا۔

اس دور کی سب سے زیادہ سریلی آواز راجندر شاہ کی ہے جس کی "دھونی" کی اشاعت آزادی کے بعد کے گجراتی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ راجندر کی "اندولن" اور "شانتا کولاہل" سے قاری کو مزید تشفی ہوئی۔ آخر الذکر تصنیف کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا۔ احمد آباد کے پروفیسر نرنجن بھگت بھی اس دور کے جدید شاعر ہیں۔ ان کی چند ولیہ پرولا ددیپ خاص طور سے طبقہ واری تباہ کن اثرات کو بے نقاب کرتی ہے۔ پریہ کانت علامتوں اور پیکروں کا شاعر ہے۔ اس کی "پرتیکا" "اشبد راتری" اور "اسپرشں" سے شاعر کی حسیّت اور گہرے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ اوشن بڑا بسیار گو اور فکر انگیز شاعر ہے۔ جینت پاٹھک کئی غنائی نظموں "اور "مرمر سنکٹ" اور "وسمایہ" وغیرہ کا مصنف ہے۔ پرندر دیو اور سریش دلال دونوں نے اپنے خاص رنگ میں غنائی گیت لکھے ہیں۔ بے جاسم راول اور مکرند دیو نے شاعری میں اپنا علاحدہ راستہ نکالا۔ سریش جوشی ایک عظیم نقاد اور منفرد نثر نگار ہے۔ جس نے متعدد ناول، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔ اس کی تحریروں میں تنوع اور زندگی کی پوری آگہی ملتی ہے۔

اس دور کا سب سے اہم ادیب، شاعر اور نقاد سریش ایم۔ جوشی ہے جوشی کی تخلیقی اور مقصدی تحریروں کی وجہ سے ادب کا سارا تصور ہی بدل گیا ہے۔ اس نے ادب کی متعدد نئی شکلیں اختراع کیں۔ اس کی مشہور تصانیف "گرہا پردیشں" "بی۔ جی۔ تھوڈک۔ ایچھ" "اپ جاتی" اور "اترا" وغیرہ ہیں۔ سریش جوشی کے شعری رجحانات کا عکس مصوّر شاعر غلام محمد شیخ کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے جس کی "اتھوا" چند برس ہوئے شائع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں کندنی کا۔ دھیروبن مادھو رائے چندر کانت بخشی، محمد منکڈ اور رگھو ویر چودھری کا تذکرہ بھی کیا جا سکتا ہے بخشی کے ناول تجرباتی ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ہیں۔ رگھو ویر ناول نگار کے علاوہ ایک اچھا نقاد بھی ہے۔ "پروانہ" اور "آورن" اس کے اہم ناول اور "اکاسک اسپرش" اس کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ نظموں کی کتاب کا نام تماشا ہے محمد منکڈ کے ناول اور افسانے پیچیدہ انسانی محرکات اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بے حد دل کش ہیں۔

ہمعصر شعرا میں سب سے ممتاز اور احمد آباد کی "رے مٹھ" شاعری کا سب سے بڑا معمار لابھ شنکر ٹھاکر ہے جس کی "وہی جاتی" اور "پل راما" گوش نے اسے نئی نسل میں ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ دوسرے شعرا میں چینو مودی، عادل منصوری اور آں جہانی راؤجی پٹیل، ہنس مکھ پاٹھک اور نلن راول قابل ذکر ہیں۔ شاعری کے میدان میں عادل کا سب سے بڑا

کارنامہ یہ ہے کہ اس نے گجراتی غزل کو جدید رجحانات کے سانچے میں ڈھالا۔

ان کے علاوہ جگدیش ترویدی، رمیش جانی، ہنمنت ڈیسائی، رمیش پاریکھ، چندرکانت سیٹھ، انل جوشی، یشونت ترویدی، یوسف کلوان، راجندر شکلا، عبدالکریم شیخ، بھانو پرشاد پانڈے، ہری کشن پاٹھک، درج لال دوے ٹوپی والا، مفت اوزا، پربودھ پاریکھ، میگھنند پران جیون مہندر گوہل، جگدیش جوشی، اندرپوار، وین پاریکھ، سوشیلا زویری، منتن مہتا، سدھیر ڈیسائی، پنا نائک، رام چندر پٹیل اور بین مہیشا وغیرہ موجودہ گجراتی کے ذہین نوجوان شاعر ہیں جن کا کلام اپنے دور کے جدید رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

جدید گجراتی نثر میں بھی کئی ایک قابل ادیب ایسے ہیں جن کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً دیگنتی مہتا، برہما بھٹ، بھولا بھائی پٹیل، رمن لال جوشی، مہیش دوے، ڈاکٹر آر بی شاہ، رادھے شیام شرما، جنیت کوٹھاری، مدھوسودن بخشی، جوگندر ویاس، پرمود پٹیل، سریش پنچال، مکند پاریکھ، سبھاش شاہ، جیوتش جانی، ٹوپی والا، ایشور بھائی دوے، دیپک مہتا، ڈاکٹر چندر کانت مہتا، پرکاش مہتا، چندر کانت سیٹھ، ڈاکٹر رمیش جانی، یشونت دوشی اور مادھو کوٹھاری وغیرہ۔

گجرات میں صحافت نے بھی بالواسطہ گجراتی ادب کی بیش قیمت خدمت انجام دی ہے۔ تقریباً تمام معیاری روزناموں نے ادبی مضامین اور تنقید و تبصرہ کے لیے صفحات معین کر رکھے ہیں۔ پندرہ روزہ اور ہفتہ وار کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ موجودہ معیاری رسالوں میں سنکرتی سب سے بہتر ادبی و ثقافتی ماہنامہ ہے۔ کمار نہ صرف ایک ماہ نامہ ہے بلکہ اپنی جگہ ایک تعلیمی ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مسلسل تیس سال سے گجراتیوں کے ذہن و کردار کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ چند مشہور روزنامے یہ ہیں۔ جنم بھومی، گجرات سماچار، سندیش اور لوک ستا۔

گجرات کے صحافیوں میں حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں:

اوما شنکر جوشی، کرشن داس مانک، سبھدرا گاندھی، سوپن، بچو بھائی راوت، وادی لال، داغلی یشونت دوشی، سریش جوشی، ہرپند ردوے، بھولا بھائی پٹیل، رسک شاہ، مینو ڈیسائی، جیوتش جانی، جسونت پاریکھ، اونتی دوے اور سریش پاریہ۔

گجراتی ادب کا یہ بیان مکمل نہ ہوگا اگر ذیل کے مقبول عام ادیبوں کا تذکرہ نہ کریں۔ سارنگ باروت، دیو شنکر پاٹھک، سریش ہاریہ، جسونت مہتا، وٹھل پانڈیہ، کولک، ہری کشن مہتا، ایم۔ ایم۔ زدیری، نتوار شاہ، ذکر جوشی، ملاراج گنونت بھٹ، روپارل اور ہری لال اپادھیائے۔

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ گجراتی شاعروں اور نثر نگاروں کی موجودہ نسل جدید حسیت اور شعور کی پوری پوری بصیرت رکھتی ہے اور ان کا طریقہ اظہار جمالیاتی قدروں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی آزادی کے بعد کی شاعری نیز دیگر اصناف سخن میں کیے جانے والے نئے نئے تجربے ایسے ہیں کہ ایک ادب کا رسیا ان پر فخر و مسرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لاطینی زبان وادب

لاطینی زبان

لاطینی زبان کا شمار سنسکرت کی طرح ان زبانوں میں ہوتا ہے جو اگرچہ زندہ نہیں ہیں لیکن اپنے شاندار ماضی اپنے ادبی ورثہ اور کئی جدید زبانوں کا سرچشمہ ہونے کے سبب اب بھی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ لاطینی زبان کی تعلیم آج تک یورپ اور امریکہ کی کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے اور کلیسا اور مذہبی رسومات میں اس کا استعمال اب بھی باقی ہے اور پاپائے روم کے علاقہ ویٹیکن (Vatican) میں اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر بھی اسے زندہ زبان نہیں کہہ سکتے۔

لاطینی زبان کا تعلق انڈو یورپی (Indo-European) زبانوں کے خاندان سے ہے اور اس کا نام وسطی اٹلی کے علاقہ لیٹیم (Latium) سے ماخوذ ہے جہاں یہ بولی جاتی تھی اور جہاں سے یہ رومن جمہوریہ اور رومن شہنشاہی کی ترقی کے ساتھ ساتھ پہلے تو جزیرہ نمائے اطالیہ اور پھر سارے مغربی یورپ میں پھیلتی گئی۔ ایک انڈو یورپی زبان کی حیثیت سے لاطینی اور اس خاندان کی دوسری شاخوں مثلاً یونانی سنسکرت، المانوی (Germanic) اور سلاوی (Slavic) میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ نظریہ اب عام طور سے قبول کر لیا گیا ہے کہ یہ رشتہ محض لسانی ہے اور ان زبانوں کی بولنے والی قومیں کسی نسلی رشتہ میں منسلک نہیں ہیں۔ یونانی اور لاطینی زبانوں میں غیر معمولی مماثلت پائے جانے کے سبب حال تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان زبانوں کی بولنے والی قومیں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں لیکن اب اس نظریہ کی تردید ہو چکی ہے۔ لاطینی دراصل کیلٹک (Celtic) زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔

لاطینی زبان ابتدا میں وسطی اٹلی کی کئی بولیوں (Dialect) میں سے ایک تھی۔ یہ اپنی نشو و نما کے شروع ہی میں تحریر کی زبان بن گئی۔ اس کے حروفِ تہجی جنوبی اٹلی میں رائج یونانی زبان سے لیے گئے۔ اس ابتدائی دور کے آثار وہ کتبات ہیں جو ۵۰۰ قبل مسیح اور اس کے بعد کے زمانے سے ملتے ہیں اور ان کتبات کی زبان کلاسیکی دور کے رومیوں کے لیے بھی ناقابل فہم تھی اور آج بھی انھیں مکمل صراحت سے نہیں پڑھا جا سکا ہے اس وقت لاطینی کی حیثیت ایک غیر ترقی یافتہ بولی سے بڑھ کر نہیں تھی اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت محدود تھا جو ایک ترقی پذیر معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے دوران لاطینی ایک دیہقانی بولی سے ترقی کر کے ایک توانا اور مکمل ادبی زبان میں تبدیل ہو گئی۔

اس قلبِ ماہیت کے لیے دو امور کارگر رہے ایک تو رومن اقتدار کی پورے جزیرہ نمائے اطالیہ میں توسیع جس کی وجہ سے لاطینی کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ تجارت، کاروبار اور نظم ونسق کی ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ اس کے الفاظ کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس کے صرف ونحو کی تدوین ہوئی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں جو شہنشاہی کے قیام سے پہلے روم میں جاری وساری تھا فنِ تقریر اور خطابت کی بڑی اہمیت تھی جس سے اس زبان کی نشو ونما میں بڑی مدد ملی۔ دوسری قابلِ لحاظ بات یہ تھی کہ جنوبی اطالیہ کے یونانی نژاد باشندوں سے ربط قایم ہونے کے باعث یونانی زبان کے ادبی شاہکاروں سے لاطینی ادیب اور شاعر روشناس ہوئے۔ اور یونانی ادب کے عظیم الشان ورثہ نے لاطینی ادب پر گہرا اثر ڈالنا شروع کیا اور لاطینی زبان کو نئے الفاظ، نئی ترکیبوں اور نئے طرزِ بیان سے مالا مال کر دیا۔ لاطینی زبان کی بھرپور زندگی کا دَور تقریباً ایک ہزار برس کا ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی تک قایم رہا۔ اس کے بعد مغربی یورپ میں وہ زبانیں وجود میں آئیں جو رومانس (Romance) زبانوں کے نام سے موسوم ہیں اور جو لاطینی ہی کی شاخیں تھیں۔ ان زبانوں میں زیادہ اہم فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور پرتگیزی ہیں۔ لاطینی زبان کے عروج کا زمانہ وہی ہے جو لاطینی ادب کی تاریخ میں دورِ زرّیں (Golden Age) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد اس کا دورِ سیمیں (Silver Age) شروع ہوا۔ جب زبان میں انحطاط پیدا ہوا اور اس میں غیر اجزا شامل ہونے لگے لاطینی اب صرف رومیوں کی زبان نہیں رہی تھی بلکہ دوسرے ممالک اور علاقوں میں بھی رائج ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کا دَور انحطاط اور زوال کا دَور ہے، جب اس زبان نے اپنی فطری توانائی کھو دی اور اس میں اور ان زبانوں میں جو اس کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھیں فاصلہ بڑھتا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں لاطینی بحیثیت علم وحکمت کی زبان کے باقی رہی اور کلیسا نے بھی اسے اپنا لیا لیکن یہ بول چال سے دور ہوگئی اور اس کا استعمال دانش گاہوں اور خانقاہوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

لاطینی ادب

عام معنوں میں لاطینی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو لاطینی زبان میں لکھا گیا لیکن محدود اور زیادہ صحیح معنوں میں اس سے مراد وہ ادب ہے جو رومن دورِ حکومت کی پیداوار ہے۔ اس کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح یعنی رومن جمہوریہ کے قیام سے شروع ہو کر دوسری صدی عیسوی کے ختم تک یعنی رومن شہنشاہی کے زوال تک کا ہے۔ لاطینی ادب کی تاریخ کی ابتدا جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے یونانی ادب کے ترجموں سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا عروج وزوال رومن سلطنت کے عروج وزوال سے وابستہ ہے۔ گو اس کے بعد بھی یعنی قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی مغربی یورپ کے کئی لکھنے والوں نے اپنی ادبی تخلیقات کے لیے اپنی زبان چھوڑ کر لاطینی ہی کا استعمال کیا لیکن ان کی حیثیت اکثر وبیشتر صورتوں میں ایک علمی مشق سے بڑھ کر نہیں تھی۔ لاطینی ادب کی تاریخ کو چار نمایاں اَدوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دورِ اول تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر ۹۰ قبل مسیح تک دورِ زرّیں (Golden Age) ۹۰ قبل مسیح سے ۱۴ عیسوی تک دورِ سیمیں (Silver Age) ۱۴ عیسوی سے ۱۱۷ عیسوی تک اور آخری دور ۱۱۷ عیسوی سے تقریباً ۱۸۰ عیسوی تک۔ یونانیوں سے سیاسی اور سماجی ربط ضبط قایم ہونے سے قبل بھی لاطینی قوم میں ادبی کاوشوں کا فقدان نہیں تھا۔ یہ ادبی کاوشیں زیادہ تر نیم تمثیلی تخلیقات، دعائیہ نظموں اور عوامی قسم کی بیانیہ شاعری پر مشتمل تھیں لیکن جنوبی اٹلی میں رہنے والے یونانی نژاد باشندوں سے ربط قایم ہونے پر یونانی کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا اور یونانی اصنافِ سخن اپنائی جانے لگیں سب سے پہلے جن اصنافِ سخن کی طرف توجہ کی گئی وہ رزمیہ نظم (Epic) اور ڈراما تھیں اور شاید ابتدائی لکھنے والے رومن بھی نہیں تھے۔ لی وی۔ ایس (Livius) جنوبی اٹلی کے ایک یونانی باشندے نے ہومر کی مشہور نظم اوڈے سی (Odyssey) کا ترجمہ لاطینی نظم میں کیا۔ لاطینی ادب کی تاریخ کے پہلے دور بڑے نام تیسری صدی قبل مسیح میں ملتے میں وہ ہیں اینی یوس (Ennius) اور پلاٹس (Plautus) اینی یوس نے کئی یونانی نظموں کا ترجمہ لاطینی میں کیا مگر ساتھ ہی ساتھ لاطینی زبان کی پہلی رزمیہ نظم (Annales) بھی لکھی اور اس نظم کے لیے ایک مخصوص بحر (Hexametre) کے استعمال سے لاطینی رزمیہ نظم کی روایت بھی قایم کر دی۔ اس نے لاطینی نظم کے ارتقا خصوصاً اس کی تشبیہات اور استعارات اور اس کی زبان کی ترویج کے سلسلہ میں بہت اہم کام انجام دیا۔ پلاٹس نے یونانی طربیہ ڈرامہ (Comedy) کو لاطینی جامہ پہنایا۔ اس کے ڈراموں میں ماہرانہ چابکدستی اور عوام کی زبان کو ڈرامے کی ضروریات کے لیے ڈھالنے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ڈرامے رومی عوام میں ٹیرنس (Terence) کے ڈراموں سے زیادہ مقبول تھے۔ ٹیرنس نے اپنے ڈرامے دوسری صدی قبل مسیح کے پہلے نصف میں لکھے اور وہ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ناظرین کے لیے لکھے گئے تھے۔ جیسا کہ ہر ادب کی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہوتا ہے لاطینی زبان میں بھی نثر سے زیادہ نظم کی طرف توجہ دی گئی اور لاطینی نثر کی نشو ونما پہلی صدی قبل مسیح سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ لاطینی ادیب اب یونانی اساتذہ سے تقریر اور خطابت کا فن سیکھ رہے تھے جس کی جمہوری طرزِ حکومت میں بڑی ضرورت بھی تھی۔ کے ٹو (Cato) لاطینی زبان کا پہلا قابلِ لحاظ نثر نگار تھا جس نے لاطینی نثر کو یونانی زبان اور ادب کے غیر معمولی اثر سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس عہد کا سب سے بڑا خطیب اور نثر نگار سی سرو (Cicero) تھا جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس سے بڑا مقرر کسی بھی دور اور کسی بھی زبان نے پیدا نہیں کیا۔ سی سرو کی طرزِ نگارش نہ ہی بہت پیچیدار اور تصنع آمیز ہے اور نہ یونانی نثر کی طرح بے رونقی کی حد تک سادہ۔ اس کے خطبوں میں صورت اور

معنی کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے ۔ اس کے طرز تحریر نے یورپی زبانوں کے نثری اسلوب پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے ۔ اس کی تقریر اور فلسفیانہ تحریر نے لاطینی نثر کے معیار معین کر دیئے جن پر صدیوں عمل ہوتا رہا۔ سی سرو ہی نے مکتوب (Epistle) کو ادبی درجہ دیا۔ لاطینی ادب میں اس صنف کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اسی دور میں تاریخ نویسی کے فن نے بھی ترقی کی اور اس میدان میں مشہور جنرل اور حکمراں جولیس سیزر نے خاص مقام حاصل کیا ۔ لاطینی شاعری نے بھی یونانی شاعروں کی نقالی کے بجائے نئی راہیں اختیار کیں اور اس دور کے دو بڑے شاعر لوکری شیس (Lucretius) اور کے ٹیلس (Catullus) ہیں لوکری شیس کا شاہکار اس کی معرکتہ الآرا نظم " نظم کائنات " (De Razum Natura) ہے جس میں ایپی کیورین (Epicurian) فلسفۂ حیات کو ادبی شکل میں پیش کیا گیا ہے ۔ اسے بجا طور پر مغربی دنیا کی سب سے عظیم فلسفیانہ نظم کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں شاعری اور فکر کا بہت ہی کامیاب امتزاج ملتا ہے لوکری شیس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک غیر شاعرانہ موضوع کو بے حد شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ کے ٹیلس نے یونانی شاعری کی کئی بحروں کو لاطینی نظم میں ڈھالا اور لاطینی شاعری کو ہیئت اور فن دونوں لحاظ سے بہت آگے بڑھایا ۔

لاطینی ادب کے سنہری دور (Golden Age) کی ابتدا خانہ جنگیوں کے طویل سلسلہ کے اختتام کے ساتھ ہوتی ہے ۔ آکٹے ویس سیزر (Octavius Caeser) نے جو آگسٹس (Augustus) کے تاریخی نام سے زیادہ مشہور رہے ۔ خانہ جنگی میں اپنی کامیابی کے بعد اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا جس کے نتیجہ میں مطلق العنانی نے دور جمہوریت کی جگہ لے لی ۔ امن و امان شاندار ماضی کے احساس اور اس سے بھی زیادہ شاندار مستقبل کی امید' توسیع اقتدار مملکت' ان سب باتوں نے ادب کے لیے ایسی سازگار فضا مہیا کی کہ ایک مختصر سی مدت میں کئی ادبی کارنامے انجام پاتے ۔ آگسٹس اور اس کے قریبی رفقا خصوصاً مے سی نس (Maecenas) نے ادب کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی اور ایسے عظیم شاعروں اور ادیبوں کو اپنے اطراف جمع کیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی ۔ ان سب میں پہلا مقام بلاشبہ ورجل (Vergil) یا (Virgil) کو حاصل ہے جسے اپنی رزمیہ نظم اینی ایڈ (The Aeneid) کی بدولت شہرت دوام ملی ۔ اس نے کئی اور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک میں ممتاز مقام حاصل کیا ۔ اس کی پہلی بڑی نظم Eclogues ہے جس میں دہقانی زندگی کی بڑے ہی شاعرانہ پیرایہ میں عکاسی کی گئی ہے ۔ اس صنف کو جسے انگریزی میں Pastoral کہا جاتا ہے رُومی شاعروں نے یونانی سے حاصل کیا اور ورجل کی نظم کی کامیابی نے اسے یورپی شاعری کی مستقل صنف بنا دیا جس میں ہر زبان کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے طبع آزمائی کی ہے ۔ ورجل کی دوسری بڑی نظم Georgics ہے جسے اس نے آگسٹس سیزر کی زرعی اصلاحات کی حمایت میں لکھا تھا بظاہر یہ پروپیگنڈہ کی شاعری ہے لیکن اپنی فنی خوبیوں اور دہقانی زندگی کی خوبصورت نقاشی کے سبب یہ شعری دلکشی اور اہمیت کی حامل ہے ۔ ورجل کی مشہور نظم اینی ایڈ بھی جو اس کی ادبی زندگی کا حاصل ہے ایک لحاظ سے ایک مقصدی نظم ہے کیونکہ یہ بھی شاید شہنشاہ کی ایما پر لکھی گئی تھی اور اس کا اصل منشا یہ تھا کہ رومن قوم کے شاندار ماضی کو حکایتی انداز میں بیان کیا جاتے اور آگسٹس کا سلسلۂ نسب دیوی دیوتاؤں سے ملایا جاتے تاکہ اسے الوہیت کا درجہ ملے ۔ ان مقاصد سے قطع نظر اینی ایڈ (The Aeneid) دنیا کی عظیم ترین نظموں میں سے ایک ہے ۔ ورجل نے ہومر کی دونوں رزمیہ نظموں ای لیاڈ (The Iliad) اور اوڈے سی (The Odyssey) کی خصوصیات کو اپنی نظم میں یکجا کر دیا ہے لیکن ورجل کے کارنامے کی نوعیت اکتسابی نہیں ہے ۔ اس نظم کی فنی خوبیاں اس کے شاعرانہ خدوخال' اس کی جذبات نگاری ' اس کی منظر کشی' اس کی تخیلانہ اڑان اور اس کے فلسفیانہ رنگ نے اسے بجا طور پر اپنی صنف کا شاہکار بنا دیا ہے ۔ اسی وجہ سے ورجل کی شاعری بعد کے شاعروں کے لیے مشعل راہ بن گئی ۔ صحیح تو یہ ہے کہ یورپی رزمیہ (Epic) کی تاریخ میں ورجل کو وہ مقام حاصل ہے جو ہومر کو بھی نہیں دیا جا سکتا ۔ ورجل نے اس نظم پر اپنی ساری توانائی اور قدرت کلام صرف کر دی پھر بھی اپنی موت کے وقت اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ نظم کے مسودہ کو جلا دیا جاتے کیونکہ وہ اس سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھا اور اسے بے عیب بنانا چاہتا تھا ۔ لاطینی ادب میں یہ وہ دور تھا جب کہ فنی عظمت بذات خود ایک نصب العین تھی ۔ اس زمانہ کے دوسرے شاعروں ٹی بی لس (Tibullus) اور پراپرشیس (Propertius) نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا ۔ کئی بحروں میں اختراعات کیں اور تنوع کو راہ دی ۔ اووِڈ (Ovid) نے ان بحروں کا نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی رومانی اور جذباتی شاعری میں استعمال کیا اور ان نظموں میں بھی جو اس نے جلا وطنی کے دور میں لکھی تھیں ۔ اووِڈ کی سب سے مشہور نظم Metomorphoses ہے جس میں اس نے تخیل کی غیر معمولی اڑان اور نئے الفاظ اور محاورات کو ایجاد کرنے کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے ۔ کہانیوں کے اس مجموعہ نے یورپی ادب کو روایتوں اور استعاروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ دیا ہے ۔ مگر بحیثیت شاعر ہوریس (Horace) کا مقام اووڈ سے کہیں بڑھا ہوا ہے ۔ فن کا جو کمال اور جو نزاکت بیان ہمیں ہوریس کی شاعری خصوصاً اس کے Odes میں ملتی ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے ۔ یہ مختصر نظمیں مختلف بحروں میں لکھی گئی ہیں اور ان کے موضوعات میں بہت تنوع پایا جاتا ہے ۔ حب الوطنی شاہ پرستی' محبت و دوستی' رندی و قلندری ' سنجیدگی اور کھلنڈرے پن کی یکجائی پر لکھی ہوئی یہ نظمیں نہ صرف اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ اس میں فن کی پختگی اور اختصار بیان کی خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ رندی مزاج اور افتاد طبع کی اس سے بہتر تصویر ہمیں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ Satires اور Epistles میں ہوریس نے اپنی شخصیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ انسانی خوبیوں اور خامیوں کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے ۔ ہوریس کا ایک اور کارنامہ

اس کی نظم Ars Poetica ہے جو فن تنقید پر نظم میں لکھی جانے والی پہلی تالیف ہے اور جہاں کلاسیکی اصول نقد و نظر یک جا کر دیئے گئے ہیں۔

پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں ادبی ذوق اور معیارات میں تصنع کا عنصر غالب آنے لگا اور اس کا اثر نثر سے زیادہ نظم پر پڑا۔ اس دور کی لاطینی نثر بڑی جاندار اور فصیح ہے اور اس کے بہترین نمائندے لیوی (Livy) کینٹی لین (Quintillian) پلینی (Pliny) اور ٹیسی ٹس (Tacitus) ہیں آخر الذکر مورخ تھا جس کی کتاب Annals تاریخ نویسی کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں فن تقریر کی گھن گرج شامل ہو گئی جس کا سب سے بہتر نمونہ جووے نل (Juvenal) کی طنزیہ شاعری ہے۔ اس شاعر نے طنز نگاری میں بڑا مقام حاصل کیا اور اس صنف میں اس کا درجہ ہوریس سے بھی اونچا سمجھا جاتا ہے۔ یورپی زبانوں کی طنزیہ شاعری زیادہ تر جووے نیل ہی سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں ورجل کے کئی پیرو شاعروں نے اس کے رنگ میں شاعری کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ورجل کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے سینیکا (Seneca) کے المیہ ڈرامے (Tragedies) لاطینی ادب کے دورِ سیمیں کی سب ہی خرابیوں کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان ڈراموں کے چند عنصر یورپی ڈرامہ کا جز و لاینفک بن گئے۔ پلینی (Pliny) کی کتاب Natural History میں کئی ادبی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کتاب کئی صدیوں تک علوم فطری پر ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی رہی، گو کہ اس میں سائنس کم ہے اور داستان طرازی زیادہ۔ جووے نیل کے بعد لاطینی شاعری نے اپنی فطری تازگی کھو دی اور اس میں انحطاط کے پورے آثار پیدا ہو گئے۔ مسیحی مذہب کے عروج نے لاطینی زبان میں ایک بڑا ادیب پیدا کیا وہ تھا سینٹ آگسٹین (St. Augustine) جس کی کتاب Confessions اس زمانہ کی لاطینی نثر کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے اور بحیثیت آپ بیتی اس کا شمار دنیا کی مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔

گو قرونِ وسطی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور اور اس کے بعد بھی تقریباً سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی عیسوی تک یورپی ادیب اور شاعر لاطینی زبان کو اپنی ادبی تخلیقات کے لیے استعمال کرتے رہے لیکن ان میں کوئی بھی صف اول کا شاعر یا ادیب نہیں ہے جس کا مقابلہ دورِ زریں یا دورِ سیمیں کے لکھنے والوں سے کیا جا سکے۔ اور لاطینی زبان کا استعمال بتدریج چند مذہبی اور علمی ضروریات کی تکمیل کی حد تک سمٹ کر رہ گیا۔

لاطینی زبان اور ادب نے مغربی یورپ کی زبانوں اور ان کے ادب پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہاں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ لاطینی ادب کی اکتسابی نوعیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اس کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے کیوں کہ اس ادب کی کئی عظیم خصوصیات ہیں جو اس کی اپنی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ لاطینی ادب نے زیادہ تر یونانی ادب کی پیروی کی ہے اور یونانی اصنافِ سخن کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں بظاہر قوت ایجاد کی کمی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ لاطینی ادیبوں نے ان اصنافِ سخن کو کچھ اس طرح سے اپنا لیا کہ صرف اسے نقالی کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایک نئی شان اور ایک نیا انداز پیدا ہوا۔ لاطینی تہذیب بڑی حد تک (Secular) تھی اور یہی صفت لاطینی ادب کی امتیازی خصوصیت بھی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جو چیز لاطینی ادب کو عظمت بخشتی ہے وہ لاطینی زبان کی دین ہے۔ لاطینی زبان بڑی ہی پُر شکوہ اور باوقار زبان ہے اور اس کی جامعیت اور سلاست نے اسے ادبی مطالب کے اظہار کا نہایت کامیاب ذریعہ بنا دیا ہے۔ لاطینی ادب میں لاطینی قوم کی سیاسی و معاشرتی تہذیب کی بڑی کامیاب عکاسی ملتی ہے۔ مغربی یورپ کی زبانوں اور ادب کے ارتقا میں لاطینی نے یونانی زبان و ادب سے بھی زیادہ کام کیا ہے۔ رومانس (Romance) زبانیں — اطالوی فرانسیسی، پرتگیزی اور ہسپانوی — تو براہ راست لاطینی ہی سے نکلی ہیں۔ انگریزی زبان اور ادب پر بھی لاطینی زبان و ادب کی بڑی گہری چھاپ ہے۔

مراٹھی زبان و ادب

رقبہ اور مراٹھی بولنے والوں کی تعداد

انڈیا بابت ۷۳-۱۹۷۲ میں مہاراشٹر اسٹیٹ کے عنوان کے تحت حسب ذیل اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔

(۱) رقبہ: ۳۰۷،۷۶۲ مربع میل،

(۲) آبادی ۵۰۴۱۲۲۳۵ مراٹھی بولنے والے (۱۰،۸۶، ۳۲، ۳) بموجب مردم شماری بابت ۱۹۶۱ء کونکنی (۳۶۳، ۵۲، ۱۳)

لفظ "مہاراشٹر" کا پہلا حوالہ "وراہہ مہر" کی تصنیف میں ملتا ہے جو اسی نام سے ۵۰۰ء میں لکھی گئی تھی اس سے پہلے "مہادم شو" کے بودھی پرچارکوں کے سنہالی تذکرہ میں "مراہٹہ" کا ذکر آیا ہے۔ بھاجے، بِڈسے اور کرلا کی گپھاؤں میں بعض دانیوں کے نام کندہ ہیں جنھیں مہاراٹھی کہا گیا ہے جس کا مطلب سورما کا بھی ہو سکتا ہے۔ ایہولے کے کتبہ (۶۳۴) میں پلکیشی کو تین مہاراشٹر وں اور ۹۹۰۰۰ گاؤں کا حاکم بتایا گیا ہے ہیون سانگ اسے موہولوش کا نام دیتا ہے۔ "راج شیکھر" میں ودربھا اور مہاراشٹر کو ایک ہی بتلایا گیا ہے۔ تاہم ریاست کا موجودہ نام تاریخ کے مرہٹہ دور کے بعد کی پیداوار ہے۔

مراٹھی۔ اردو اور دوسری زبانیں

مراٹھی زبان ہند، آریائی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مہاراشٹری اپ بھرنش

(مخلوط عامیانہ بولی) ہے جو خود مہاراشٹری پراکرت سے نکلی ہے۔ دھیرے دھیرے پھر سے سنسکرت آمیز زبان کا روپ دھارتی ہے۔ سنسکرت ناٹکوں کی عورتیں اور بعض غیر اہم کردار یہ زبان استعمال کرتے ہیں جسے حقارتاً گری ہوئی زبان سمجھا جاتا تھا۔ مہاراشٹر اپ بھرنش کو جین اپ بھرنش بھی کہا جاتا تھا۔ یہ زبان ۶۴۰۰ میں رائج تھی۔ دوارچی نے اپنی کتاب "پراکرت۔ پرکاشس" میں اس کی قواعد مرتب کی تھی۔ مورخ ڈی۔ کے۔ راجواڑے کی رائے ہے کہ بودھی دور میں "وائی اشٹریکا" اور "راشٹریکا" کے اختلاط سے "ترہی مہاراشٹریکا" کا جنم ہوا۔ ناگ پور کے قرب و جوار میں ناگا قبیلوں کے بہت سے الفاظ اس زبان میں ملتے ہیں۔ سی۔ وی۔ ویدیہ کا خیال ہے کہ مراٹھی زبان کی ابتدا ۶۷۰۰ عیسوی میں ہوئی ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ گنے کے اندازے کے مطابق مراٹھی نے گیارہویں صدی میں معیاری زبان کی شکل اختیار کی۔ پہلا مراٹھی کتبہ ۹۸۳ کا ہے جو میسور کے قریب شراون بلگولا میں ایک عظیم الشان پتھر کے بت کے پائنتی نقش ہے۔ ۱۲۷۰ء تک کے جو چھ مراٹھی کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ خاندیش اور بمبئی کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ مراٹھی ایک وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ گزشتہ سات صدیوں میں مراٹھی کے ذخیرے میں سنسکرت، دراوڑی مقامی، پرتگالی، فرانسیسی، عبرانی، عربی، فارسی، اردو اور دیگر کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔

"مہاراشٹر شبد کوش" (لغت) میں ۱،۱۲،۱۸۹ کے منجملہ (۲۹۰۰) الفاظ فارسی، عربی اور ترکی کے (۱۵۰۰) یورپی زبانوں کے اور (۵۷۰) انگریزی کے اور ۱۵۰۰ دیگر یوروپی زبانوں کے ہیں۔ ڈاکٹر ماہو ترمبک پٹودھن نے فارسی، مراٹھی کوش (۱۹۲۵) اور سر سید جوشی نے اردو، مراٹھی کوش مرتب کی ہے۔ یہ دونوں ڈکشنریاں دیوناگری میں ہیں۔ اردو شاعروں پر کئی کتابیں (مثلاً غالب کی غزلوں اور "ستنبو" پرسیتو مادھو راؤ کی تصانیف) قرآن شریف کے تراجم اور جدید مصنفوں کے نثری مجموعے مراٹھی میں دستیاب ہیں۔ مراٹھی کے ذریعہ اپنے طور پر اردو سیکھنے کے قاعدے (Self-Teacher) بھی موجود ہیں۔

ادبی تاریخ کے مختلف دور

مراٹھی ادب کی تاریخ کو عام طور سے حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے یادھوے دور ۱۱۸۹ – ۱۳۲۰ تک (۲) بہمنی دور (۱۳۲۰ – ۱۶۰۰ تک (۳) مرہٹہ دور ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک) (۴) پیشوا دور ۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک) اور (۵) برطانوی دور ۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک) ساتویں سے گیارہویں صدی تک کے صرف پتھر اور تانبے کے کتبے دستیاب ہیں ان کے سوا کسی اور شکل میں مراٹھی کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ مراٹھی کا پہلا شاعر مکندراج (۱۱۲۸ء سے ۱۱۹۸ء) تھا اس کی تخلیقات اپنی اصلی شکل میں نہیں ملتیں۔ سومیشور ۱۱۹۹ء) کی "ابھیلاشتارتھ چنتامنی" پہلی تصنیف ہے جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کاترے کا خیال ہے کہ ابتدائی مراٹھی ادب میں زبان کی مختلف شکلوں کو ایک ہی تصنیف میں استعمال کیا گیا ہے۔ مراٹھی کی ابتدائی شکلیں مثالی بھدرا کی "بھومیشور بھوبلی" (۱۱۸۵ء) میں ملتی ہیں۔

ابتدائی دور کے اہم رجحانات اور لکھنے والے

مکندراج کی تصنیف "ووِیک سندھو" ۱۸ ابواب اور ۱۶۷۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں یوگا کے عقائد کی تشریح کی گئی ہے۔ مکندراج کا تعلق ناتھ پنتھی فرقہ سے تھا پہلے دور میں ہمادری نے فن تحریر اور ذات پات کے نظام پر کتابیں لکھی ہیں۔ مراٹھی نثر کی بنا ایک مذہبی فرقہ نے ڈالی جو "مہانو بھاؤ" کہلاتا ہے چکرادھر نامی ایک شخص جو گجرات کے ایک منتری کا لڑکا تھا۔ ۱۲۶۷ء میں ترک دنیا کر کے سنیاسی بن گیا تھا۔ اس کی عقیدت میں مہائی بھٹ نے ۱۲۶۸ء میں ایک کتاب لکھی جو "لیلا چرتر" کہلاتی ہے۔ مہانو بھاویوں نے طویل بیانیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جو کرشن جی کے حالات زندگی پر مبنی ہیں۔ مہادیسا یا مود مبا اس فرقہ کی پہلی مراٹھی شاعرہ ہے جس نے "دھوالے" گیت لکھے ہیں۔ اس فرقہ کا بہت سارا ادب خفیہ زبان اور مخصوص اشاروں میں لکھا گیا ہے۔ جس کی گتھیاں ابھی پوری طرح نہیں سلجھائی جا سکی ہیں۔

گیان دیو یا گیانیشور (۱۲۷۵ - ۱۲۹۷ء) جنھوں نے گیتا پر "گیانیشوری" کے نام سے نو ہزار (شعر) کہے ہیں۔ وہ ایک بھگت کوی اور رشی تھے۔ نام دیو ان کے شاگرد تھے جو ۱۲۷۰ء سے ۱۳۵۰ء تک زندہ رہے۔ نام دیو کا کلام ہندی اور پنجابی میں بھی ملتا ہے اور سکھوں کی مقدس کتاب "گرو گرنتھ صاحب" کا جزو بھی ہے۔ ان کے علاوہ ایکناتھ (۱۵۳۳ – ۱۵۹۹ء) ایک اور صاحب علم صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے "بھگوت گیتا" اور "رامائن" کی تفسیر لکھی ہے۔ ان کا تعلق مراٹھی ادب کے پہلے دو دور سے ہے

یہ بزرگ ہستیاں بھگتی یا گیان دھیان کا پرچار کرتیں اور ساری نوع انسانی کی مساوات کا درس دیتی تھیں۔ اس دور میں مختلف ذاتوں اور پیشوں میں کئی بھگت شاعر پیدا ہوئے جو "وارکری" فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور سب کے سب پنڈھرپور (وشنو کا ایک مقدس مندر) کے وٹھل کو مانتے تھے۔ اس میں گورا جیسا کمہار، سوتا جیسا مالی، چھوکھا جیسا نخس مہار، نرہری جیسا سنار سیتا حجام، ایک نرتکی کی بیٹی کنھو پترا ایک وحشی قبیلہ کا رکن جگ مترا ناکا اور ایک مہتر بنکا غرض سبھی شامل تھے۔ بند و مذہبی عقیدت مندی کا یہ جمہوری مظاہرہ اس ابتدائی دور کے شاعروں کا ایک امتیازی کارنامہ ہے۔ گیانیشور اور ایکناتھ کے دور کے ان شاعروں نے سنسکرت کے فلسفیانہ خیالات کو عام آدمی کی بولی میں ظاہر کر کے مراٹھی زبان کو مالا مال کیا ہے۔ اس سلسلے میں گیانیشور کی چھوٹی بہن مکتابائی اور نام دیو کے گھرانہ (تقریباً ۱۲۵۰ء) کی ملازم جنا بائی کے بھجن بھی بہت مشہور ہے۔

دور وسطیٰ کے خاص رجحانات اور لکھنے والے

گیانیشور اور ایکناتھ نے مذہبی اور روحانی شاعری کی جو جوت جلائی تھی اس کو ۱۶۰۰ء کے بعد کے دور میں بھی بعض عظیم شاعروں اور بھگتوں نے روشن رکھا ان میں ممتاز یہ ہیں۔ داسوپنت یہ ایکناتھ کے چیلے تھے انھوں نے گیتا پر سوا لاکھ شعر کہے ہیں۔ مکتیشور، جنھوں نے غالباً ۱۶۳۵ء میں "مہابھارت" کے چار ابواب میں سے ایک باب کا منظوم ترجمہ کیا۔ تکارام (پیدائش ۱۵۸۸ء سے ۱۶۰۸ء کے درمیان وفات ۱۶۴۹ء) جو روایت شکن بھگتی شاعروں

ہیں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ انھوں نے قدامت پرستی اور ڈھکی چھپی باتوں پنڈتوں کے فرسودہ رسوم اور سادھوؤں کی ریاکاری کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ رام داس (۱۶۰۸ء سے ۱۶۸۱ء) سامرتھ جو غالباً شیواجی کے گرو تھے۔ "داس بودھ" کے مصنف ہیں۔ یہ غیر معمولی نظم دنیوی ہوش مندی اور آخرت پرستی کے خوش گوار امتزاج کی مظہر ہے۔ وامن پنڈت (۱۶۰۸ء - ۱۶۹۵ء) جنھوں نے "بھاگوت" پر غنائی نظمیں لکھی ہیں۔ اور بھرتری ہری کے تین شتکون (سو شعری نظم) کا ترجمہ کیا ہے۔ رگھوناتھ پنڈت جن کی "نل دمینتی سویمبرا" کا فیضی ۱۵۹۴ء - ۱۵۹۵ء میں بزبان فارسی ترجمہ کیا تھا۔ شری دھر جو مقبول عام "ہری وجے" (۱۷۱۴ء) کے مصنف ہیں۔ سوہی روبا آمیٹے یہ گوا کے ایک بھگت شاعر تھے (غالباً ۱۷۱۴ء میں) برار کے کرشنا دار دا "جوہری وردا" نامی ضخیم رزمیہ کے مصنف ہیں "مہی پتی" جنھوں نے "بھگت وجے" کے عنوان سے بھگتوں کی منظوم اور مقبول عام سوانح عمریاں لکھی ہیں (۱۷۹۰ء) مورو پنت (۱۷۲۹ - ۱۷۹۴ء) جو قافیہ پیمائی اور صنعت ہم حرفی (Alliteration) کے استاد اور متعدد چترابندوں (منظوم خاکوں) یا انوامی نظموں کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے دو بہت ہی اہم شاعر تکارام اور رام داس تھے۔

تکارام کا تعلق اعلیٰ ذات سے نہیں تھا۔ پونا کے قریب دیہو میں ان کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی لیکن تکارام کا من کاروبار میں نہیں تھا اور وہ بچپن ہی سے ایک فلسفی شاعر کا روپ دھار رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تین ہزار سے بھی زاید ابھنگ (شاعری کی ایک خاص شکل جو ہندی پدوں سے ملتی جلتی ہے) کہے ہیں۔ تکارام کی شاعری ایک ایسی روح کی داخلی کیفیات کی بے پناہ شدت کو ظاہر کرتی ہے جو قادر مطلق سے ہم آغوش ہونے کے لیے (بالکل صوفیوں کی طرح) بے چین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس ریاکاری اور اخلاقی گراوٹ کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بناتی ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھے ساری دنیا کو گمراہ کرتی ہے۔

سوامی رام داس اپنے پراثر اور بے لاگ طرز بیان کی وجہ سے مشہور ہیں وہ نفیس اور شائستہ الفاظ کی تلاش نہیں کرتے۔ اس معاملے میں ان کی ادبی حیثیت جدید شعرا کے مزاج سے بہت قریب ہے لیکن رام داس ایک بت شکن بھی نہیں ہیں۔ وہ دنیوی۔ اور سیاسی معاملات کا بھرپور شعور رکھتے جو عام طور سے ایک صوفی بھگت میں نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ بات نزاعی ہے کہ آیا وہ برہمنیت کے پرچارک تھے یا نہیں البتہ یہ امر یقینی ہے کہ وہ تمام مراٹھی بولنے والے باشندوں کے اتحاد کے دل سے خواہاں تھے اور ان میں وہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے جسے وہ "مہاراشٹر دھرم" کا نام دیتے ہیں ان کی "داس بودھ" (۱۶۵۹ء) ایک دوسری ہی طرح کی رزمیہ ہے یہ معرفت کے مسائل سے بحث نہیں کرتی بلکہ کوٹلیہ کی "ارتھ شاستر" یا شامل کی "تیز و کورال" کی طرح دنیوی معاملات کو پیش کرتی ہے۔

یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس دور کے مراٹھی شاعر تمام ہندو ہی تھے جو روایتی انداز میں بھگتی شاعری کرتے ہوں بلکہ ان میں کئی شاعر ایسے بھی ملتے ہیں جن کا تعلق دوسرے مذاہب سے تھا اور جنھوں نے مراٹھی ادب اور زبان کو مالا مال کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

جین شاعر

(۱) گن داس۔ جو "شرینکا چرتر" کے مصنف ہیں یہ نظم پندرھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ اس کا قلمی نسخہ ۱۶۴۹ء کا موجود ہے۔

(۲) کامراج اسی دور کے شاعر تھے انھوں نے "سدرشن چرتر" لکھی۔ شانتی داس اور گجراتی "راماین راسا" (۱۴۵۱ء) کے مصنف جین داس ان کے گرو تھے

(۳) پنڈت میگھا "جسو دھر درسا" کے مصنف۔

(۴) آچاریہ گنا کرتی جو "پدما پران" کے مصنف ہیں۔ یہ سولھویں صدی کے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی۔ آچاریہ جی ایک نثری کتاب "دھرماموِرت" کے بھی مصنف ہیں۔

(۵) جن داس۔ جو "ہری ونش پران" کے مصنف ہیں یہ نظم سترھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔

جین ساگر جو "جین کتھا" (۱۷۲۰ء) کے مصنف ہیں۔

ویراشیوا یا لنگائت شاعر

(۱) "من منہ سواحی" (۱۶۱۰ء) کے مصنف "ان کے "انوبھا وانند" اور "سویم پرکاش" کے قلمی نسخے خولاپور میں دستیاب ہوئے ہیں۔ (۲) شانتا لنگا دیک "چنتامنی اور کرنا ہستی" کے مصنف۔ یہ دونوں کتابیں علی الترتیب "نجاگونا یوگی اور بسویش ورا کی کنڑی تصانیف کے ترجمے ہیں۔

اس کے علاوہ سرسوتی گنگا دھر جن کی زبان کنڑی تھی مگر انھوں نے ۱۵۸۲ء میں مراٹھی میں "گروچرتر" لکھی۔ ان کا تعلق "دتھ" کی پوجا کرنے والے فرقہ سے تھا اسی طرح میناکشی اما ایک تامل خاتون تھیں جنھوں نے عورتوں کے لیے مراٹھی میں گیت لکھے تھے۔ تنجور کے سرفوجی نے ملی جلی زبان میں ناٹک لکھے ہیں وہ اس علاقے پر حکومت کرنے والے آخری مرہٹہ سردار تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی دور سے پہلے لسانی اختلافات شدید نہیں تھے۔

عیسائی شاعر

(۱) فادر اسٹیفن ایک انگریز پادری تھے جنھوں نے ۱۵۷۹ء میں حضرت عیسیٰ کی زندگی پر ایک نہایت ہی خوبصورت مراٹھی نظم لکھی ہے جو ۱۶۱۶ - ۱۶۵۹ء اور پھر ۱۹۰۷ء میں چھپ چکی ہے۔ اب ۱۹۰۷ء کا رومن رسم خط میں لکھا ہوا نسخہ ہی دستیاب ہے مراٹھی زبان کی تعریف میں ان کے بعض شعر اکثر نقل کیے جاتے ہیں۔

(۲) پادری ییَن دیلاکروا یہ ایلفرانسیسی یسوعی (Jesuit) بلغ تھے جو ۱۶۰۲ء میں گوا آئے تھے انھوں نے پندرہ ہزار اشعار کی "کرستان پران" لکھی ہے۔ اس کا نسخہ لزبن لائبریری میں موجود ہے۔

اسی طرح آر۔ سی۔ ڈھیرے نے اپنی کتاب میں پانچ مسلم صوفیوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے مراٹھی میں شاعری کی تھی ان میں سب سے ممتاز ضلع احمد نگر (گاؤں روئی بجرے) کے شیخ محمد ہیں جن کا مٹھ شری گوندہ میں واقع تھا۔ ان کے باپ کا نام محمد اور ماں کا پھولائی تھا اور ان کے گرو چانگ بودھلا برہمن تھے ان کی نظم "یوگ سنگرام" ۱۶۴۵ء میں لکھی گئی تھی۔ ان کی دوسری تصانیف میں "پون وجے" "نشکالنک پربودھ" اور "گیان ساگر" شامل ہیں۔ ان کا تذکرہ بھاوے نے اپنی کتاب "مہاراشٹرا سارسوت" میں بھی کیا ہے۔ ان کے ابھنگ

مسودہ کی شکل میں مورخ وی ایس۔ بیندرے کے پاس موجود ہیں۔ ان کا انتقال ۱۶۵۰ء اور ۱۶۶۳ء کے درمیان ہوا۔ دوسرے مسلم شاعر جنھوں نے مراٹھی میں لکھا ہے ہیں حسین عنبر جو "حسین عنبری" (۱۶۵۳ء) کے مصنف ہیں "شاہ منی" "سدھانت بودھ" (اٹھارویں صدی) کے مصنف عالم خاں پٹھان اور لگن مشاہیر" ہی بتی کی "بھگت وجے" (باب ۴۱-۴۷) اور اودھواچیت گن کی "سنت مالکہ" میں کئی مسلم صوفی شاعروں کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر وائی۔ ایم پٹھان جو مرہٹہ واڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں مراٹھی کے صدر شعبہ ہیں۔ مراٹھی کے ایک اچھے محقق ہیں۔ انھوں نے عہد وسطیٰ کی مراٹھی شاعری کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے۔ مرہٹہ دور کی تمام تر شاعری لازمی طور پر خالص دھارمک یا روحانی شاعری نہیں تھی بلکہ ولولہ انگیز بیانیہ نظموں کی شکل میں جو مرہٹہ سرداروں کی مشہور جنگوں یا ان کے شاندار کارناموں پر لکھی گئی ہیں، غیر مذہبی شاعری بھی ملتی ہے۔ ان نظموں کو "پواڈا" (Pawada) کہا جاتا تھا۔ ایسی تین سو تاریخی نظمیں موجود ہیں جو مہاراشٹرا کی لوک سنگیت کا مخصوص ذخیرہ ہیں۔ شیواجی سے شاہی دور تک کی سات اور پیشوا دور کی ڈیڑھ سو ایسی کویتائیں موجود ہیں۔ بقیہ ۱۸۰۰ء کے بعد کے دور کی ہیں۔ ابتدائی دور کے پواڑوں میں اگیان داس کا "افضل خان وَدھ" (قتل) (۱۶۴۹ء) اور تلسی داس کا "تاناجی مالوسرے" (۱۶۷۰ء) مشہور ہیں۔ بعد کی نظمیں جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) اور جنگِ کھرڈا سے متعلق ہیں۔

ان رزمیہ نظموں کے ساتھ ساتھ اس دور کی لوک کویتائیں کی ایک اور شکل "لاوئی" (Lawai) کی ہے جو زیادہ تر عاشقانہ اور جنسی موضوعات پر ایسی زبان میں لکھی جاتی جو بے انتہا ہیجان انگیز، فحش اور جذباتی انداز بیان کی حامل ہوتی تھی ایسی نظموں کے کہنے والوں میں رام جوشی (۱۷۶۲-۱۸۱۲ء) کیرتن کارانت پھندی (۱۷۴۴-۱۸۱۹ء) ہوناجی بالاچرواہا، سگن بھوتاشہ والا (۱۷۷۸ء-۱۸۴۰ء)، پربھاکر داتار (۱۷۶۹-۱۸۶۳ء) پرشورام دارجی (درزی) (۱۷۵۴-۱۸۴۴) اور راؤ بروے کے نام سر فہرست ہیں۔ راؤ بروے نے "۱۸۵۷ء پر ایک مخالف برطانیہ پواڈہ لکھا تھا۔

"پواڈہ" اور "لاوئی" کہنے والے لوک کوی مشاہیر (اردو کے شاعر کی بگڑی ہوئی شکل) کہلاتے تھے۔ یہ اپنی کویتا دف اور تنتنے (ایک تارا) جیسے سیدھے سادے سازوں پر ترنم سے سناتے تھے۔ ہر کوی کی ایک ٹولی ہوتی جو گانے میں اس کی سنگت کرتی اور ٹیپ کے بول دہراتی جاتی تھی۔ یہ نہایت ہی اونچے سروں میں اپنے برجستہ جملوں اور دلکش پیرایہ بیان سے شہروں اور دیہاتوں دونوں کے عوام کو گھنٹوں محو تماشہ رکھتی تھی۔

مرہٹہ دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مراٹھی نثر کو بھی عروج حاصل ہوا۔ بکھر (یہ لفظ فارسی کے اخبار سے ماخوذ ہے) کی شکل میں تاریخی واقعات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ ان بکھروں میں ملک عنبر جیسے بادشاہوں کے کارنامے یا وجیا نگر سلطنت کے زوال کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ نہایت ہی فارسی آمیز مراٹھی میں تاریخی خطوط بھی لکھے گئے ہیں۔ وسنت کانتکر کے ڈرامہ "رائے گڑھالا لے جنیوا جاگ رہتے" (جب رائے گڑھ جاگ اٹھا) کا دیباچہ اسی اسٹائل میں لکھا گیا ہے۔ شیواجی کے دور کی مجسمہ سازی کے جمالیاتی پہلوؤں پر آرٹسٹ بی۔ ڈی۔ گوڈسے کی ادبی اور تنقیدی کتاب "شکتی سوشٹھوا" کی بنیاد شیواجی کا ایک خط ہے جو فارسی میں لکھا گیا تھا۔ سب سے پرانا بکھر، واقعہ نویس بکھر ہے۔ جس میں شیواجی کے حالات زندگی پیدائش کیے گئے ہیں۔ یہ "سبھا سدی بکھر" کہلاتا ہے۔

اس دور میں شیواجی کی سرپرستی میں سات زبانوں کی ایک لغت بھی تیار کی تھی۔

پیشواؤں کے دور میں بھی بکھر نویسی کا سلسلہ جاری رہا "شیودگ وجے" ۱۸۱۰ء میں لکھا گیا۔ پانی پت کی لڑائی پر پانچ بکھر تحریر کیے گئے تانا فرنویس کی آپ بیتی بھی اس دور کی نثر کی ایک دلچسپ کتاب ہے۔ ۱۸۲۹ء میں الفنسٹن اور میلکم جیسے ابتدائی برطانوی حکام کی مدد سے پہلی مراٹھی قواعد اور لغت مرتب کی گئی۔ پھر انگریزی اور دیگر ہندستانی زبانوں جیسے بنگالی وغیرہ سے کئی ترجمے کیے گئے۔ ابتدائی رسائل بچوں کے ادب نصابی کتابوں اور سائنٹفک ترجموں کی ترویج میں عیسائی مشنریوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں محاصرہ جھانسی کا آنکھوں دیکھا حال ہمیں گوڈسے بھٹ جی کی دلچسپ کتاب "ماژا پرواز" (میرا سفر) میں ملتا ہے۔

ادب کا صنف واری ارتقا گزشتہ ڈیڑھ صدی میں

شاعری

مراٹھی شاعری جو ابتدائی دور میں خدا اور خدا کے تصورات کے اطراف گھوم رہی تھی کچھ عرصہ بعد دربار کی زینت بنی اور بالآخر انیسویں صدی کے دوران اس کا موضوع یکسر بدل گیا۔ اب انسان اور انسانی مسائل کو ادب میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ وہ صدی ہے جب کہ انگریزی تعلیم کے رواج کی وجہ سے سارے ملک میں مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا آپس میں تصادم ہو رہا تھا۔ اور ہر علاقہ کی سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک دوطرفہ تحریک شروع ہوگئی تھی۔ جہاں تک مراٹھی ادب کا تعلق ہے اس تحریک نے ایک طرف تو ایسا گروہ پیدا کیا جو سنسکرت کی روایات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ وہیں ایسے لوگ بھی سامنے آئے جو "گولڈن ٹریژری" (Golden Treasury) سے انگریز شاعروں کے کلام کا ترجمہ کر کے مراٹھی کو ان سے متعارف کر رہے تھے۔ کرشنا شاستری چپلونکر لے اور پراکھی جیسے پنڈت شاعروں نے مراٹھی قارئین کو کالی داس، بھوابھوتی، شدرک اور دیگر سنسکرت ادیبوں کے شہ پاروں سے روشناس کرایا۔ پرشوتم پنت ناچھیہ گوڑبولے نے "نوانیت" کے نام سے قدیم مراٹھی شاعری کا ایک انتخاب شائع کیا۔ جو بے حد مقبول ہوا۔ دوسری طرف پرادھان نے اسکاٹ کی "لیڈی آف دی لیک" (Lady of the Lake) کا اور کرتیکر نے ٹینی سن کی "پرنسس" (Princess) کا ترجمہ کیا۔ ایم۔ ایم۔ کنٹے نے "راجہ شیواجی" کے نام سے ایک نئی طرز کی رزمیہ لکھی۔ انھوں نے عام آدمی کی زبان استعمال کرنے میں ورڈسورتھ کی پیروی کی۔

لیکن تقلید اور اکتسابی تحریر کا یہ ابتدائی دور زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہا۔ ایک غریب الحال ٹیچر زکرشناجی کیشو داملے (۱۸۶۶ - ۱۹۰۵ء) نے جن کا تخلص "کیشوست" تھا مراٹھی شاعری میں ایک نئی شمع روشن کی۔ ان کا نوجوانی ہی میں انتقال ہوگیا اور ان کی (۱۳۲) نظموں کا مجموعہ بعد از مرگ شائع ہوا۔ وہ جدید تحریک کے بانی تھے۔ انھوں نے انگریزی طرز پر سانیٹ بھی لکھے اور اپنی انقلابی شاعری کے ذریعہ بھو کے مزدوروں یا اچھوتوں کے جذبات کی ترجمانی بھی کی۔ ان کو سماجی نامساوات کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ ایک اور شاعر دتاترے کونڈو گھاٹے (۱۸۷۵ - ۱۸۹۹ء) ہیں ان کو بھی غریبوں سے ویسی ہی ہمدردی تھی۔ وناٹک جنار دھن کرندیکر (۱۸۷۲ - ۱۹۱۹ء) کی تحریروں میں ہمیں قومی جذبات کی پہلی دھڑکن ملتی ہے۔ وناٹک داموذر ساورکر (۱۸۸۳ - ۱۹۶۶ء) کے دل میں مادرِ وطن کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کا شدید جذبہ تھا۔ ان کے علاوہ ریورنڈ نارائن تلک (۱۸۶۵ - ۱۹۱۹ء) نارائن مورلی دھر گپتے (۱۸۷۲ - ۱۹۴۷ء) جن کا قلمی نام "بی" تھا۔ چندر شیکھر شیورام گورہے (۱۸۷۱ - ۱۹۳۷ء) جنھوں نے ملٹن کی دو معرکۃ الآرا نظموں کا ترجمہ کیا۔ بھاسکر رام چندر تامبے (۱۸۷۴ - ۱۹۴۱ء) جو اپنی دل گداز شاعری کے ذریعہ مالوہ اور راجستھان کے قدرتی مناظر میں عشق و محبت میں رنگ آمیزی کرتے ہیں "گنیش گڈکری عرف "گووندگرج" (۱۸۸۵ - ۱۹۱۹ء) اور ترمبک بابوجی ہومیرے بالکوی (۱۸۹۰ - ۱۹۱۸ء) کی شاعری میں ہمیں ٹیگور کی طرح وحدت الوجود کے فلسفہ کی چاشنی کے ساتھ ساتھ رومانی اور عارفانہ رنگ ملتے ہیں۔ تلک کو بحیثیت ایک عیسائی شاعر نہ صرف فطرت اور بچوں کی معصومیت سے پیار ہے بلکہ ذاتِ باری سے بھی شدید عشق ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ سے متعلق ایک رزمیہ بھی لکھی جو نامکمل ہے۔ "بی" کی نظمیں ہندوستانی معرفت کی بلند پروازی سے بھری ہوئی ہیں۔ ان کا انداز غنائی ہے۔ پھر بھی ان کی لطیف امیجری ایک کرب ایک غم کیفیت کا احساس دلاتی ہے چندر شیکھر زیادہ روایتی ہیں۔ تامبے پر ٹیگور کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ تو گڈکری الفاظ کا جادو جگاتے ہیں۔ بال کوی کی شاعری سرعت حس اور لطافت بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ان رومانی شاعروں کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ایک طرف وہ بغاوت کی دیوی سے فیضان حاصل کرتے ہیں کیشوست کی "تتاری" گڈکری کی "دسہرہ" "بی" کی "ڈنکا" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے پواڑے بھی لکھے ہیں۔ جیسے پانی پت پر گڈکری کے اور "باجی پربھو" اور "ماناجی" پر ساورکر کے پواڑے ہیں۔ ساورکر کی "گومانتک" ہندو مجاہدانہ احیا پرستی سے متاثر ہے۔ ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک تقریباً دو نسلوں کا یہی انداز رہا یعنی داخلی اور باغیانہ شاعری جس میں بعضوں نے شیلی (Shelley) اور کیٹس Keats کی پیروی کی تو کچھ براؤننگ (Browning) کے نقش قدم پر چلے۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے بعد سات نوجوان شاعر اور ایک شاعرہ ہر اتوار کو پابندی سے پونا میں ایک محفل سخن سجاتے۔ اپنی نظمیں ایک دوسرے کو سناتے اور شاعری پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہ گروہ "روی کرن منڈل" کے نام سے مشہور ہوا عام لوگوں کی زندگی ان کی نظموں کا موضوع ہوتا تھا۔ ان شاعروں نے عروض اور ہیئت کے نئے تجربے بھی کیے ہیں مثلاً سانیٹ (Sonnet) قصیدہ (Ode) طویل بیانیہ نظم حتیٰ کہ غزل اور تمثیلی غنائی شاعری جیسے اصناف سخن کو بھی آزمایا ہے۔ ان میں سے دو شاعر بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہوئے۔ ایک تو ہیں "یشونت" "ڈنکر پنڈھارکر (۱۸۹۹ء) — جنھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے "ماں" پر ان کی نظم بے حد مقبول ہوئی۔ حال ہی میں شیواجی پر بھی ان کی ایک رزمیہ نظم چھپی ہے۔ دوسری رنگین شخصیت ماہوترمبک پٹوردھن عرف "سادھو جور لٹن" (۱۸۹۴ء - ۱۹۳۹ء) کی ہے۔ ان کی شاعری کی ابتدا عشقیہ کلام سے ہوئی "گجلان جلی" کے نام سے انھوں نے غزلوں کی ایک ضخیم جلد چھوڑی ہے۔ آخری دور میں وہ ساورکر کی طرح ایک روایت پرست اسکالر اور شدھ بھاشا کے زبردست حمایتی بن گئے تھے۔

۱۹۲۵ء میں پی۔ کے۔ اترے نے اس گروہ اور اسی نوع کے دیگر اسلوب پرست شاعروں پر جن کا پیرایۂ اظہار پرتکلف اور غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ اپنی ہجویہ نظمیں شائع کیں۔ یہ کتاب جس کا عنوان "جھنڈوچی پھولیں" (گیندے کے پھول) ہے بہت مقبول ہوئی اور اس نے جذبات پرستی کی ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کو ہمیشہ کے لیے غرق کر دیا۔ انت کانیکر کی "چاندرات" (۱۹۳۳ء) کی اشاعت کے ساتھ حقیقت پسندی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انل۔ اے۔ آر۔ دیشپانڈے نے جو مراٹھی میں آزاد نظم کے بانی ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعہ ایک بامقصد سماجی شعور کو بیدار کیا۔ کساگرج۔ وی۔ وی۔ شروارکر شرت چندر مکتی بودھ مرحوم عمر شیخ اور نارائن سروے نے شاعری کا رشتہ ترقی پسندی اور مارکسیزم سے جوڑ دیا۔ وندا کرندیکر اور وسنت باپٹ کی وجہ سے چوتھے دہے میں سیکولر اور اشتراکی شاعری اس قدر مقبول ہوئی کہ حکومت نے سانے گوجی کی ایک نظم "پتری" کو جو اشتراکی خیالات کی حامل تھی ممنوع الاشاعت قرار دے دیا۔

نئی شاعری کی پہلی پُر اثر شخصیت بال سیتارام مرڈھیکر (۱۹۰۷ء - ۱۹۵۶ء) کی تھی ان کی مختصر کتاب "کاہی کویتا" (چند نظمیں) ۱۹۴۷ء نے ہیئت کے پرانے ڈھانچوں اور تمام پرانی قدروں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا کر کئی نزاعی سوال کھڑے کر دیے۔ ان کی شاعری آج کے انسان کے کرب اور گھٹن کی آئینہ دار ہے۔ ایسا انسان جس پر مشین اور تشدد نے ایک ہیبت طاری کر رکھی ہے۔ گو ان کی امیجری عام فہم نہیں ہے۔ اور تاہم انھوں نے مراٹھی فن شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس طرز کے ایک اور بزرگ شاعر پرشوتم شیورام ریگے ہیں گیٹے نے آرٹ کو "صورت گری اور مکرر صورت گری" کا ایک متواتر عمل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ریگے کے ہاتھوں میں شاعرانہ زبان ایک ایسا حربہ بن جاتی ہے۔ جسے وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ جیسا چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ منگیش پڈگاؤنکر کی شاعری پی۔ پی۔ بورکر کی طرح ہلکے پھلکے اور سرل گیتوں سے شروع ہوتی ہے اور بالآخر طنز نگاری پر ختم ہوتی ہے یہ تینوں نوجوان شاعر یعنی وسنت باپٹ، منگیش پڈگاؤنکر اور وندا کرندیکر پانچویں دہے میں غزل بھی کہتے رہے ہیں۔ "گیت رامائن" کے

مقبول مصنف جی۔ ڈی۔ ماڈگولکر روایتی طرز نگارش میں مہارت رکھتے ہیں۔ مراٹھی زبان کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی تنہا کتاب کا شرف اسی "گیت رامائن" کو حاصل ہے۔ ماڈگولکر کا موضوع چوں کہ دھارمک ہوتا ہے اس لیے لاکھوں عوام کو متاثر کرتا ہے۔ بعض خواتین شعرا بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً بھینہ بائی، سنجیوانی، اندرا اور پدما وغیرہ۔

پچھلے دہے میں شعر گوئی تو زیادہ نہیں ہوئی۔ البتہ شاعری پر مسلسل بحث و مباحث اور تبصرے ہوتے رہے ہیں۔ ایک گروہ توان برہم دل برداشتہ نوجوان اور تجرباتی شاعروں کا ہے جن کے اپنے چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں اور جو بالکل ہی انوکھے اور چونکا دینے والے طرز بیان کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تشدد اور جنس کے موضوع پر بلا روک ٹوک کھلم کھلا اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان میں سے تو بعض سماج کے سب سے نچلے طبقے سے ابھرے ہیں۔ اور یا تو گندی بستیوں میں زندگی گزار چکے ہیں یا ان بستیوں سے نکلنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان جدیدیت پسند شاعروں میں دلیپ چترے، ارون کولٹکر، چندر کانت کھوت، راجہ ڈھالے، دھلکے گرو ناتھ دھوری نامدیو، ڈھسال اور دوسر زیادہ نمایاں ہیں وہ امریکہ کی بٹی ہوئی نسل (Beat Generation)، بنگال کی بھوکی پیڑھی ہندی کے کویتا والوں یا تلگو کے دگمبر گویوں کی طرح لکھنا چاہتے ہیں۔ روایت شکنی، تقلید ناپسندی اور ایک طرح کی غنائیت پسند مزاجیت ان سب کی تقریباً مشترکہ خصوصیات ہیں۔ ان میں سے بعض تو تخریب کاری اور لاقدریت (Valuelessness) کا کھلے بندوں پرچار کرتے ہیں۔ یہ دراصل جدید دور کے "شنوادی" ہیں (جیسے بودھی فلسفے کے لاوجودیت پسند یا صفر پرست)

ڈرامہ ابتدائی مراٹھی ڈرامے دھارمک ہوا کرتے تھے اور دیو مالائی موضوعات پر لکھے جاتے تھے انھیں "لت" اور "دش اوتار" کہا جاتا تھا۔ یہ تامل کے "دڈاو" اور "کوراونجی" سے متاثر تھے اور شیواجی کے الاتی بھائی ونکوجی کی سرپرستی میں تنجور میں اسٹیج کیے جاتے تھے۔ ۱۸۴۳ء میں "بھاگوت منڈلی" نامی ایک سفری تھیٹریکل ٹولی شمالی کرناٹک سے سانگلی آئی اور اس نے پہلے مراٹھی ڈرامہ نگار وشنو داس بھاوے کو متاثر کیا۔ اس کے بعد پی کرلوسکر (۱۸۴۳ء - ۱۹۳۵ء) نے جو بیک وقت پروڈیوسر، ایکٹر اور ڈرامہ نگار تھے، ۱۸۸۲ء میں "سوبھدرا" نام کا ایک ڈرامہ پیش کیا۔ یہ ایک غنائیہ تھا جو نصف صدی تک تماشائیوں کو محظوظ کرتا رہا۔

جی۔ پی۔ دیول (۱۸۵۴ء - ۱۹۱۶ء) نے "شاردا" کے نام سے ایک سماجی ڈرامہ لکھا جس میں ایک بوڑھے شخص کی ایک نوجوان لڑکی کی شادی کی برائیوں کو پیش کیا گیا تھا۔ دیول نے ایسے ڈرامے بھی لکھے جو سنسکرت اور انگریزی کے چربے تھے۔ لیکن مراٹھی ڈرامہ کو ایک اہم اور ممتاز مقام عطا کرنے اور اسے معیاری بنانے کا سہرا کرشنا جی پربھاکر کھاڈلکر (۱۸۷۲ء - ۱۹۴۸ء) کے سر ہے۔ انگریزی حکومت نے ان کے ڈرامہ "کیچک ودھ" (۱۹۱۰ء) کو ممنوع قرار دیا تھا کیوں کہ اس دیو مالائی ڈرامہ میں اسے بغاوت کی جھلک نظر آئی تھی۔ اس ڈرامہ کا ایک کردار کیچک لارڈ کرزن کے لب و لہجہ میں بات کرتا ہے اور کرشنا میں تلک سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ شریپد کرشنا کولہٹکر (۱۸۷۱ - ۱۹۳۴ء) نے لوگوں کی عادات و اطوار اور طرز معاشرت کو رومانی طربیوں میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اسٹیج پر وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے اس کے برعکس گڈکری ہیں جنھوں نے چند ہی ڈرامے لکھے لیکن اپنے موثر شاعرانہ طرز بیان کی وجہ سے وہ زیادہ کامیاب ہوئے۔ اسی زمانے میں شیکسپیر کی بھی ہوا چلی اور ہر طرف اسی کے چرچے ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں اوتھیلو ((Othello)) کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں ٹیمپیسٹ ((Tempest))، اور "جولیس سیزر" کو بھی مراٹھی کا روپ دیا گیا۔ ترجمہ اور تخلیص کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ سنجیدہ (ٹریجڈی) کے بیچ بیچ میں نقلی پلاٹ اور مزاحیہ کرداروں کی آمیزش جو گڈکری کے ڈراموں کی خصوصیت تھی۔ اس کی نقل ایک زمانے تک کی جاتی رہی۔ اس صدی کے دوسرے دہے میں مہاراشٹرا کے اندر ڈرامہ کی مقبولیت اپنے انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن تیسرے دہے میں جب بولتی فلم نے خاموش فلم کی جگہ لی تو اس کے ساتھ ہی ڈرامہ کا زوال شروع ہوا۔ اسٹیج پر موسیقی کا جا و بیجا استعمال، ناقص مکالمہ نویسی اور سفری تھیٹریکل کمپنیوں کی آپس کی رقابتیں بھی اس زوال کا ایک سبب تھیں۔ اب ایکٹر تھیٹر کو خیرباد کہہ کر فلم میں شریک ہونے لگے تھے۔ ایسے نازک وقت پر بھارگو رام (۱۸۸۳ء - ۱۹۶۴ء) جو نانا ویرکر کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس کو سہارا دیا انھوں نے غریب متوسط طبقہ اور مزدوروں کے بارے میں سماجی نوعیت کے ڈرامے لکھے جن میں موسیقی کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ جو سیدھے سادے اسٹیج پر بغیر کسی اہتمام کے پیش کیے جا سکتے تھے۔ اسٹیج پر اس طرح کی جدید حقیقت پسندی کو پیش کرنے میں "من ونشتی" نامی گروپ بھی آگے آگے تھا جو ورتک کی رہنمائی میں کام کر رہا تھا۔ (۱۹۳۳ء) دوسری طرف ایم۔ پی۔ رانگ نیکر نے اپنی "ناٹیہ نکیتن" نامی منڈلی کے ذریعہ عورتوں کے مسائل پر "کل ودھو" جیسے طبع زاد ڈرامے اسٹیج کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس کے بعد اسٹیج پر بیس سال سے زیادہ عرصہ تک آچاریہ پرہلاد کیشو اترے (۱۸۹۸ء - ۱۹۶۹ء) کا طوطی بولتا رہا جو اپنے طنز و مزاح سماجی برائیوں پر بے لاگ تنقید اور گڈکری کی سی الفاظ کی سحر انگیزی کے لیے مشہور ہیں۔

مہاراشٹرا میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک اسٹیج پر ایک سکوت سا طاری رہا جب کہ اسی زمانے میں فلمی صنعت کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ یہ سکوت ۱۹۴۳ء میں اس وقت ٹوٹا جب کہ وی۔ ڈی۔ ساورکر کی صدارت میں بمقام سانگلی مراٹھی ڈرامہ کا صد سالہ جشن منایا گیا پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں بیشتر فن کاروں نے شوقیہ طور پر کئی ایک انگریزی اور یورپی ڈراموں کے ترجمے پیش کیے جن میں آسکر وائلڈ، میٹرلنک، جے۔ ایم۔ کارل کپگ، گالسورڈی، وی۔ پی۔ کنیٹ مولیئر، گوگول، بریخت، پریسلی، مام اور ٹینی سی ولیمس قابل ذکر ہیں۔

ابھی حال میں کئی تمثیل نگار نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ایل دیش پانڈے کو شہرت ان کے یک کرداری ڈراموں یا خود کلامی کے مکالموں کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے وسنت کانیٹکر قہقہہ نواز طربیوں کے ساتھ ساتھ تاریخی ڈراموں میں مہارت رکھتے ہیں۔ وجے تندولکر کی کل ہند شہرت کا باعث ان کے مخصوص ڈرامے ہی ہیں۔ یہ ڈرامے موجودہ دور کی کربناک بے چینی کے اظہار اور تشدد و لغویت (Absurdity) کے پہلوؤں کو تھیٹر کے ذریعہ پیش کرنے کی ایک جراتمندانہ کوشش ہے۔ تندولکر کے انسان جو گِدھوں کی طرح برتاؤ کرتے اور ان کے کردار جو لگتا ہے کہ ابھی ابھی قلم سے نکلے ہیں بجائے خود ایک حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی بہترین مثال ان کا نزاعی ڈرامہ "سکھارام بائینڈر" (جلد ساز) ہے اسی طرح کی سماجی صداقت ہمیں دوسرے نوجوان ڈرامہ نگاروں میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً سی۔ ٹی۔ کھانولکر، وی۔ داروی کر، رتناکر متکری اور نہیش ایل کنجوا وغیرہ۔ ان

آخری دو ڈرامہ نگاروں کو ایک ایکٹ کے ڈراموں میں بھی ممتاز مقام حاصل ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ یہ تمام نوجوان ڈرامہ نگار مغرب کی جدید تمثیل نگاری سے بے حد متاثر ہیں اور موجودہ مراٹھی زندگی میں ان کا مقام تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں سے اکثروں نے ٹکنیک کے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں اور آج کی اذیت زدہ نفس انسانی کے تجزیہ کے لیے لوک تھیٹر کی مخصوص صنف کو بھی آزمایا ہے۔

مراٹھی کی ایک خاص ادبی صنف جسے "ناٹیہ چھٹا" (خود کلامی کے متفرق ڈرامائی تراشے) کہا جاتا ہے دیواکر کی اختراع ہے۔ یہ ادبی تراشے کئی طرح کے ہیں، شاعرانہ طنزیہ، مزاحیہ، جذباتی اور کلبی (Cynical) انداز کے ہیں۔

مہاراشٹر میں "تماشا" کی شکل میں لوک ناٹک کی روایات بہت قدیم ہیں "تماشا" کو مزدور اور کسان سماجی اور سیاسی پروپیگنڈہ، الکشن بازی اور ہجو گوئی کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ کبھی بے ساختہ طور پر ہنساتے اور کبھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سنجیدہ ڈراموں کی ترکیبیں بھی ہوتی ہیں اور بھانڈوں کی نقالی اور مکھوٹے کے گر بھی

ناول اور افسانہ

یوں تو بنین (Bunyan) کے (Pil-grim's Procession) اور سویفٹ کے (Gulliver's Travels) جیسے انگریزی ناولوں کے ابتدائی دور میں ترجمے ہو چکے تھے۔ لیکن پہلا مراٹھی ناول جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا وہ "یمونا پریٹن" ہے اس کے مصنف بابا پدمنجی ایک کرسچن مشنری تھے۔ ہندو بیوہ کی زبوں حالی اس ناول کا موضوع ہے۔ ان کے علاوہ "بختیار نامہ" "حاتم طائی" "گل بکاؤلی" اور "الف لیلیٰ" جیسی فارسی اور عربی داستانوں کے ترجمے بھی مراٹھی میں کئے گئے ہیں۔ ابتدائی رومانی افسانوں میں جو بلیجے کے اور رس ٹر کے لکھے ہوئے ہیں، ان کا اثر ملتا ہے۔ اس کے بعد تاریخی اور سماجی ناول کی باری آئی جو اسکاٹ اور ڈوداس ڈیکنس اور تھیکرے کے تتبع میں لکھے گئے تھے گو پہلا تاریخی ناول آر۔ بی گنجیکر نے سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھا تھا جو شیواجی سے متعلق ہے۔ لیکن یہ ہری نارائن آپٹے (۱۸۶۴ – ۱۹۱۹) ہیں جنہوں نے تاریخی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے جدید مراٹھی ناول کو راستہ دکھایا اور حقیقی معنوں میں اس کی صورت گری کی۔ وہ تقریباً چالیس سال تک برابر لکھتے رہے۔ ان کے ناولوں میں ماضی کی بے پناہ چاہت کے ساتھ ساتھ عام انسان دوستی اور سماجی اصلاح کا جوش و ولولہ بھی ملتا ہے۔ "ناتھ مادھو" (۱۸۸۲ – ۱۹۲۸) نے شیواجی کے دور پر تاریخی ناول بھی لکھے ہیں۔ وامن ملہار جوشی (۱۸۸۲ – ۱۹۴۳) نے ناولوں میں فلسفیانہ مسائل شامل کر کے فن ناول نگاری کو ایک نیا موڑ دیا، وہ اپنے ایک ناول "سوشیلا چا دیو" (۱۹۳۰ء) میں انسانی اخلاق اور انسانی مقدر کے بنیادی مسائل کو خاص طور سے زیر بحث لایا ہے۔ ممتاز ماہر سماجیات اور مراٹھی کے پہلے قاموس نگار (Encyclopaedist) ڈاکٹر شریدھر ونکٹیش کیتکر (۱۸۸۴ – ۱۹۳۷ء) نے بھی سماج کی تبدیلیوں کے موضوع پر بعض ناول لکھے ہیں۔ بھارگو رام وٹھل المعروف بہ ماما وریرکر نے خاص طور سے بنگالی سے بکثرت ترجمے کئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں اور طبقاتی جنگ جیسے موضوعات پر پہلا ناول لکھا۔ ان کے سماجی ناول ایچ۔ این۔ آپٹے کے ناولوں کی طرح ایک اعلیٰ مقصد اور ناصحانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۶ء کے بعد تین ناول نگار جو تقریباً دو دہائیوں تک مہاراشٹر کے ذہن پر چھائے رہے اور جو اب تک برابر لکھ رہے ہیں وہ ہیں وشنو سکھارام کھانڈیکر، نارائن سیتارام پھڑکے اور گجانن تریمبک مدھولکر۔ کھانڈیکر "آرٹ برائے زندگی" کے علمبردار ہیں اور پھڑکے "آرٹ برائے آرٹ" کے شیدائی۔ کھانڈیکر کے ناولوں میں گاندھیائی سوشلزم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کی نثر شاعرانہ اور ان کے مکالمے اثر انگیز اور دلپذیر ہوتے ہیں۔ پھڑکے کا اسلوب تازگی بخش اور جاندار ہے۔ ان کے کردار رومانٹک اور نوخیز عمروں کو زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ مدھولکر نے مزدور لیڈروں کی زندگی سے لے کر ہندوستان کی تقسیم تک ہر موضوع پر سیاسی ناول لکھے ہیں۔ پی۔ وائی۔ دیشپانڈے نے نسبتاً زیادہ جدید موضوعات کو اپنایا ہے۔

جن کا مقصد انسانی تعلقات کے لیے ایک بالکل ہی نئی سمت یعنی چوتھے بعد (Fourth Dimension) کی تلاش ہے فن ناول نگاری میں مالتی بیڈیکر کو جن کا قلمی نام وبھاوری شرورکر ہے۔ ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور متوسط طبقہ کی ٹوٹی ہوئی خاندانی زندگی کے بھرپور نقوش ان کے ناولوں کی خصوصیت ہے۔ وشرام بیڈیکر نے ۱۹۳۹ء میں ایک ناول لکھا جس کا نام "رنانگن" (میدان جنگ) ہے اس ناول کو آزادی کے پہلے دور میں ایک چھوٹے موٹے کلاسک کی حیثیت حاصل تھی۔

اس کے بعد علاقائی موضوعات پر ناول لکھے جانے لگے۔ آر۔ وی۔ دگھے اور ایس این پینڈسے نے کونکن پر، لکشمی راؤ سردیسائی نے گوا پر، شرت چندر مکتی بودھ نے مالوہ پر، سامنے کروجی نے خاندیش پر، ڈانڈیکر نے برار پر، ونکٹیش ماڈگولکر نے جنوبی مہاراشٹر پر اور ای۔ وی۔ جوشی نے مرہٹواڑے سے متعلق ناول لکھے۔ ان علاقوں کے کسانوں اور عام باشندوں کی زندگی کی تصویر کشی کے علاوہ اب ناول نگاری کا رخ نئی حقیقت پسندی (Neo-Realism) کی جانب مڑ گیا ہے۔ چنانچہ جے ونت دلوی اور مدھو منگیش کرنک کے پاس شہروں

میں واقع گندی بستیوں کی زندگی کا کلیدی تجزیہ ہی ادب کا خاص موضوع ہے۔ بھاؤ پادھیہ کو دل پھینک نوجوانوں کے کارناموں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ینمارڈے نے ''کوسلا'' نامی ناول میں کالج کی زندگی کے تاریک پہلو پیش کئے ہیں۔ سی۔ٹی۔ کھانولکر موکاشی اور بعض نئے لکھنے والوں نے وجودیت (Existentialism) کے انداز پر بھی ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔
تحلیل نفسی اور سماجی تنقید جدید افسانہ نویسی کے سب سے اہم ستون ہیں جیسے گنگادھر گاڈگل، پی سی بھاوے، شانتا رام اور ماڈگولیکر نے پروان چڑھایا ہے۔ ابتدا میں ایچ۔ این۔ آپٹے سے لے کر دلوی تک تقریباً سب ہی ناول نگاروں نے جن کا اوپر ذکر آیا ہے مختصر افسانہ نویسی میں بھی طبع آزمائی کی لیکن دلواکر، کرشنا وائی، پی جوشی، وامن چورگھڑے، اروند گوکھلے، جی۔ اے۔ کلکرنی وغیرہ نے صرف افسانے ہی لکھے ہیں۔ جدید افسانہ پر جنسی تشدد، بڑے شہروں میں رہنے والے انسانوں کی اجنبیت اور وہاں کی اکتا دینے والی سپاٹ اور میکانیکی زندگی کے مسائل چھائے ہوئے ہیں۔ جدید افسانہ نزاکت بیانی اور سنجی کے اعتبار سے کافی ترقی کر چکا ہے۔

ناول کا ایک جدید رجحان یہ بھی ہے کہ سوانح عمری کو داستان کی شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ شیواجی پر رنجیت ڈیسائی کا ناول ''شریمان یوگی'' ایس ایچ جوشی کا ''آنندی گوپال'' تلک کی زندگی سے متعلق ''دردمیا'' نامی گنگا دھر گوڈگل کی کتاب ''جیوتسنا'' دیودھر کی ''اتریوگی'' بی۔ ڈی کھیر کا ''امرت پتر'' (جو لال بہادر شاستری پر ہے) اسی قسم کی تحریر کے نمونے ہیں۔ بعض اہم ناولوں میں دیومالائی کردار بھی آتے ہیں جیسے وی۔ پی کھانڈیکر کا ''یاتی'' ''پاکسا گرج کا ''رادھیہ'' (کرنہ) وغیرہ رادھیہ کے نام سے کا گرج کا غالباً ڈرامہ ہے ناول نہیں، البتہ رنجیت دیسائی کا ناول ''رادھیہ'' ہے۔ چلتے چلتے ان ناولوں کا تذکرہ بھی کیا جا سکتا ہے ''ہاپترمالواچا'' جو گاندھی جی پر ہے اور جسے مرنالینی دیسائی نے لکھا ہے۔ پی۔ کے اترے کا ناول جو سنگاپور اور جنوب مشرقی ایشیا میں نیتاجی کے کارناموں سے متعلق ہے۔ یا وسنت ورکیڑ کا ''ستیہ دپنجا سینانی'' جو تاتیا ٹوپے کی زندگی سے متعلق ہے۔

مضمون نویسی اور سوانح عمری

مراٹھی ادب کا سرمایہ اس لحاظ سے بھی شاندار ہے کہ اس میں مقالہ نگاری بھی موجود ہے اور ایسا اسلوب بیانی بھی جس سے خیالات کے تجزیہ، پروپگنڈہ بحث و تمحیص کے علاوہ تاریخی تحقیق، فلسفہ، عمرانی موضوعات، سیاسی مسائل یہاں تک کہ طبی علوم کے اظہار کا کام لیا گیا ہے۔ وشنو شاستری۔ جیلونکر (۱۸۵۰-۱۸۸۲) گوپال گنیش آگرکر (۱۸۵۶-۱۸۹۵) بال گنگا دھر تلک (۱۸۵۶-۱۹۲۰) شیورام مہادیو پرانجپے (۱۸۶۴-۱۹۲۹) اچوت بلونت کولہٹکر (۱۸۷۹-۱۹۳۱) ڈاکٹر شری دھر وینکٹیش کنکر (۱۸۷۹-۱۹۳۱) یہ ایسی نامور ہستیاں ہیں جنہوں نے ہر میدان ادب میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان میں سے بعض سنجیدہ رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں جیسے ''نبندھ مالا'' سدھارک ''کیسری'' کال ''سندیش'' وغیرہ۔ مرہٹی نثر کے ارتقا کے ابتدائی دور میں ان کی مضمون نویسی کے سانچے اسٹیل۔ اڈیسن۔ برک۔ کارلائیل۔ رسکن۔ اور والیٹر سے لئے گئے ہیں میکس مُلر اور میتھو آرنلڈ کے وہ جا بجا حوالے دیتے ہیں۔

طنز و مزاح کے میدان میں بھی مراٹھی ادیب پیش پیش ہیں۔ افسانوی کرداروں میں چنتامن دنائک جوشی کے ''چمن راؤ'' کو کام ننکر کے ''واجی'' اور گنگا دھر گاڈگل کے ''بنڈو'' کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس طرح کی ہلکی پھلکی مضمون نگاری میں شری لیڈ کرشنا کولہٹکر سے لے کر وی۔ اے بوا تک کئی ادیبوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

ہلکی یا شخصی مضمون نویسی جسے پھڑکے نے ''گپ گوشٹی'' (نجی بات چیت یا سرگوشی) کا نام دیا ہے ادب کی ایک ایسی صنف ہے جسے این۔ ایس پھڑکے، وی۔ ایس کھانڈیکر، اننت کانیکر، این۔ ایم سنت، جی۔ آر ڈُدرکے، وندا کرندیکر، وجے تیندولکر، آر۔ بی جوشی اور اراوتی کروے اور درگا بھاگوت نے مالا مال کیا ہے۔ انشائے لطیف میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جنھوں نے سفرنامے، آپ بیتیاں سراپے، خاکے اور سرگزشتیں لکھی ہیں۔

ایک اور صنف یعنی سیرت نگاری میں بھی مراٹھی ادب کا ذخیرہ قابل قدر ہے۔ تقریباً تمام اہم تاریخی، سماجی اور سیاسی لیڈروں کی سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں۔ این۔ سی کیلکر نے تلک پر دھنن جے کیرتے جوتیما پھولے پر، امبیڈکر پھاٹک نے گوکھلے پر کرندیکر نے ساورکر پر اور پرندرے نے شیواجی پر لکھا ہے۔ اٹھارہ سال میں ساہتیہ اکادمی نے مرہٹی کی چند سرگزشتوں پر جن میں آپ بیتی اور خاکے بھی شامل ہیں انعامات دیئے ہیں۔ ابھی حال میں کئی ایسے تذکرے شائع ہوئے ہیں جن کی نوعیت نزاعی ہے ان میں سے بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں یا شاعروں کی نجی زندگی کے بارے میں خود ان کے یا دوسروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ لکشمی بائی تلک کی ''سمرتی چترے'' یا رماہائی رانا ڈے کی ''آمچیا آیوشیاتیل کاہی آٹھونی'' (یادیں) چھوٹے چھوٹے شہ پارے ہیں۔

ادبی تنقید

ایک عرصہ تک بیشتر مراٹھی ادیب تنقید شعر میں سنسکرت کی روایتی اور مروجہ روش ہی کی تقلید کرتے رہے۔ ڈاکٹر ایس۔ وی کیتکر پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ تکارام اور رام داس دو ایسے سنت ہیں جو نہ صرف پرانے ڈگر سے ہٹے ہوئے ہیں بلکہ جی

کے اپنے جمالیاتی نظریے ہیں اور جو ایک سماجی عقیدہ اور مقصد رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں چھاپے خانہ کے قیام اور اخبارات کی اشاعت کے بعد ہی جدید مفہوم میں ادبی تنقید کا ارتقا عمل میں آیا۔ اس کے بانی جنپلا کر ہیں۔ جن کی 'نبندھ مالا' میں پہلی مرتبہ کتابوں کا سیر حاصل اور عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص ادبی قدروں پہ ایس۔ کے کولھٹکر، این۔ سی کیلکر اور بی۔ آر تابے نے زیادہ زور دیا ہے۔ کچھ نقاد ادب اور آرٹ کی خود مختار حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

تیسرے دہشک میں پھڑکے اور کھانڈیکر متضاد نقاطِ نظر رکھتے تھے۔ اول الذکر رومانٹک نظریہ کے حامل ہیں تو آخر الذکر آدرشی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ گزشتہ چالیس سالوں میں سنسکرت شاعری کی از سرِ نو تاویل و تعبیر پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ چناں چہ جی۔ ٹی دیش پانڈے کو اس سلسلہ میں ان کی کتاب پر ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا ہے۔ اس کتاب میں ہندوستانی فلسفہ کے چھ نظاموں اور جمالیات کے مختلف اسکولوں پر ان کے اثرات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ انگریزی اور یورپی ادبی تنقید سے جو نقاد متاثر ہوئے ہیں ان کے دو اسکول ہیں۔ ایک جس کی بنیاد مارکس ازم پر ہے دوسرا جو روایت پرست ہے اور موجودہ سماجی ڈھانچے کو مانتا ہے یا پھر نفسی تحلیل کا قائل ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کے لیے لال جی پنڈسے' پی۔ وائی دیش پانڈے' ڈی۔ کے مبیڈیکر' شرت چندر مکتی بودھ جیسے نقاد زیادہ مشہور ہیں۔ سوشلسٹ حقیقت پسندی ان کا سب سے بڑا حربہ ہے۔

جدید ادبی تنقید نگاری کے دو اسکول ہیں بی۔ ایس مرڈھیکر اور پی۔ ایس ریگے (دونوں شاعر ہیں) یہ کے کیشوساگر' ڈبلیو ایل کلکرنی اور پربھاکر اپادھیائے شامل ہیں۔ کچھ نقاد کلایوبیل اور ابرکرومبی' ٹی۔ ایس ایلیٹ اور کروچے ارتھر کویزلر اور امریکہ کی "جدید تنقید نگاری" سے متاثر ہیں۔ اس وقت تک کوئی مکمل وجودیت پرست نقاد منظرِ عام پر نہیں آیا ہے البتہ کہیں کہیں مضامین میں ایسی تنقید کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔

مراٹھی ادب کی کوئی ایک معیاری تاریخ اب تک نہ تو مرہٹی زبان میں شائع ہوئی ہے اور نہ انگریزی میں تاہم بھاوے پنگھارکر تل پلے پھاٹک کو لتے' اے۔ این دیش پانڈے اور کسماوتی دیش پانڈے کی تصانیف مراٹھی ادبی تاریخ کے مختلف ادوار کے سنہ واری مطالعہ میں بطور حوالے کی کتابوں کے کافی مفید سمجھی جاتی ہیں۔

مراٹھی ادب پر دیگر زبانوں کے اثرات اور ان کا تقابلی جائزہ

مراٹھی کے قدیم ادب کے جائزہ سے واضح ہوگا کہ متقدمین زیادہ تر سنسکرت سے متاثر تھے اور ان کی اکثریت برہمنوں پر مشتمل تھی۔ ان کی تعلیم یا تو سنسکرت میں ہوئی تھی یا سنسکرت روایات میں انھوں نے پرورش پائی تھی۔ جہاں تک غیر برہمن سنتوں کا تعلق ہے ان میں سے بعض جیسے نام دیو مہاراشٹر کے حدود سے باہر گئے تھے اور انھوں نے ہندی اور پنجابی بھکتوں کے اثرات قبول کیے تھے۔ بعضوں نے اپنی کویتا یا گیت اس وقت کی مروجہ ہندوستانی بولی میں بھی کہے ہیں۔

شیواجی کے دور کے پواڑے اور لاونی لکھنے والوں پر اردو اور فارسی کے بلاواسطہ اثرات کا ہم نے جائزہ لیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ کس طرح فارسی' عربی اور ترکی کے بے شمار الفاظ نے ان ادیبوں کے رجزیہ اور عشقیہ گیتوں کو سنوارا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعرانہ امیجری اور خیال آرائی کو عوامی محاوروں اور روزمرہ کے فقروں نے بھی زینت بخشی ہے۔ لوک کویتا مراٹھی کی مختلف بولیوں میں بھی لکھی گئی۔ جیسے اہیرانی' خاندیسی اور کبھی وغیرہ۔

انگریزی تعلیم کے رواج کے بعد انگریزی زبان اور ادب کے سب سے زیادہ اثرات پڑے۔ اور انگریزی کے ذریعہ فرنچ (مولیئر ڈوما اور ہیوگو) جرمن (اے سراجوارڈے نے نیٹشے اور کرانڈیکر نے گوئٹے کا ترجمہ کیا) روسی (سانے گروجی نے ٹالسٹائے اور گورکی کا اور پی۔ ایل دیش پانڈے نے گوگول کا ترجمہ کیا) اور دیگر یورپی زبانوں نے مراٹھی ادب کو متاثر کیا۔

ہندی اور اردو کے علاوہ اگر دیگر ہندوستانی زبانوں کے اثرات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بعض لکھنے والے ایسے گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو بنگالی پر عبور رکھتے ہیں اور جنھوں نے بنگالی سے مراٹھی میں ترجمے کیے ہیں۔ مثلاً واسدیو گووند آپٹے نے دوسرے دہے میں مراٹھی والوں کے لیے ایک بنگالی سلف ٹیچر مرتب کی تھی۔ نانا وریرکر نے سرت چندر بوس کی ساری تصانیف کا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے بھیسے نے بنکم چندر کا ترجمہ کیا تھا۔ یعنی ادیب جیسے دیوسکر نے بنگالی میں بھی لکھا ہے۔ ایک اور زبان جو مراٹھی سے قریب رہی ہے گجراتی ہے۔ جن ادیبوں کا گاندھی جی سے ربط ضبط رہا جو ان کے راستہ پر چلے ان میں سے اکثر گجراتی اچھی طرح جانتے تھے۔ کاکا کالیکر جیسی شخصیت نے تو اس میں کمال حاصل کیا تھا اور خاصی شہرت پائی تھی۔ جہاں تک دوسری ہندوستانی زبانوں اور خاص طور سے دراوڑی زبانوں کا تعلق ہے مراٹھی ادیبوں نے ان سے کوئی خاص واقفیت حاصل نہیں کی اور نہ ہی ان کے ترجموں میں دلچسپی لی۔ اسی طرح اسامی' اڑیہ' پنجابی یا کشمیری کے بہت کم ترجمے ہیں جو مراٹھی میں ملتے ہیں۔

تراجم

جہاں تک دوسری زبانوں سے ترجموں کا تعلق ہے سب سے زیادہ ترجمے انگریزی سے اور انگریزی کے ذریعہ دوسرے عالمی ادب سے کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سنسکرت کے ترجموں کا نمبر ہے جو زیادہ تر مذہبی اور دیومالائی کتابوں پر مشتمل ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے تراجم میں سب سے زیادہ بنگالی کے ہیں۔ بنکم چندر کی تقریباً ساری اہم کتابوں کا مراٹھی میں ترجمہ ہو چکا ہے اس کے علاوہ تارا شنکر بنرجی بھوتی بھوشن بندو پادھیہ اور بیرن باسو کی بعض ناولوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ کئی بنگالی ادیبوں کی کہانیوں کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ ڈی۔ کے رائے اور بادل سرکار کے ڈراموں کے ترجمے مراٹھی میں دستیاب ہیں البتہ جدید ادب کے بہت کم نمونے ملتے ہیں۔ گجراتی کی حد تک گاندھی جی' کے ایم منشی' رمن لال دیسائی' میگھانی اور پنالال پٹیل کی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ہندی سے پریم چند' جے نند کمار' بھگوتی چرن ورما اور بھارتی کے ناول اور بچن اور پنت کی کویتاؤں کے ترجمے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کبیر' میرا اور تلسی داس کی "رام چرت مانس" نیز راہل سنکرتیں' موہن راکیش اور اوپندر ناتھ اشک کی بعض کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ دوسری ہندوستانی زبانوں کے ترجمے بہت کم ملتے ہیں۔ البتہ اردو کے کچھ منتخب کلام تامل کے "کورال" (ترجمہ از سانے گروجی) ملیالم کے "جین" اور کنڑی کے "شانتلا" کے تراجم ہوئے ہیں۔

مراٹھی ادب

آزادی سے پہلے کی صورت حال

آزادی سے پہلے کے دور میں کل ہند ادب اور عالمی ادب کا شعور نسبتاً زیادہ پایا جاتا تھا۔ علاقائی حدود سے باہر کے مفکروں جیسے ٹیگور' گاندھی جی' اروبندو اور وویکانند کا اثر ان کی تصانیف کے ترجموں یا ان پر لکھی گئی کتابوں کے ذریعہ مراٹھی پر برابر پڑتا تھا۔ اپنی ریتوں کے مقابلے میں دوسروں کی اچھی تہذیبی روایات کو اپنانے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ سنسکرت پالی' پراکرت اردہ مگدھی جیسی کلاسکی زبانوں کے علاوہ فارسی اور یورپی زبانوں کے بھی بڑے بڑے اسکالر مہاراشٹر میں موجود تھے۔ ہر ایک کو اپنے ماضی پر فخر تو تھا ہی۔ مگر یہ احساس ساری قوم کی جدوجہد آزادی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد

یوں تو ذرائع رسل و رسائل میں تیزی سے پیش رفت ہوئی ہے۔ اور مختلف علاقوں اور قوموں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ بھی بڑھ گیا ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ علاقہ پرستی اور مقامی وابستگی میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ایس۔ آر۔ سی (ریاستوں کی تنظیم جدید کی کمیٹی) رپورٹ اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سمیکتہ مہاراشٹر کی تحریک نے ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایسے بہت جائزے اور مطالعے شائع ہوئے ہیں جن میں مختلف مذاہب' قومیتوں اور ہمسایہ تہذیبوں کے مشترکہ پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اس کے برخلاف ایک ہی علاقہ میں جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے مختلف گروہوں نے سر اٹھایا ہے اور ہر گروہ اپنی یکتائی اور منفرد حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتا ہے۔ یک جہتی' ارتباط اور مشترکہ قدروں کی لگن جو کبھی سب کا آدرش تھی اب قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج افسانہ میں مقامی بولی اور مقامی رنگ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال آنند یادھو کی کہانیاں ہیں۔ اسی طرح گندی بستیوں سے متعلق جو ڈرامے لکھے جا رہے ہیں ان میں اور دلت (پچھڑے ہوئے خاص کر اچھوت) شاعروں کی کویتاؤں میں یہی رجحان پایا جاتا ہے

ایک دوسرا رجحان جو ابتدائی سیکولر اور انسان دوستی کی روایات کی ضد ہے' ماضی کی روایات اور نامور لوگوں کے شاندار کارناموں یا شخصیت پرستی کے عقیدے کا پرچار کرتا ہے۔ برہمن تلک کا احترام کرتے ہیں تو مراٹھے شیواجی کے اور مہار ڈاکٹر امبیڈکر کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ لسانی علیحدگی پسندی کا شدید جذبہ یا اپنے ہی طرز حیات کی خوبیوں کا مبالغہ آمیز احساس اسی رجحان کی علامتیں ہیں۔ یہ سماجی عوامل ادب کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔

رسائل

۱۸۳۲ء میں بال شاستری جمبھیکر کے "درپن" کی اشاعت کے وقت سے مراٹھی صحافت برابر ترقی کر رہی ہے۔ آج انگریزی اور ہندی کے بعد مراٹھی رسائل ہی سب سے زیادہ چھپتے ہیں۔ ادبی تنقید سے متعلق مخصوص سہ ماہی پرچے اور رسائل نکلتے ہیں مثلاً "مہاراشٹر ساہتیہ پتریکا" "آلوچنا" "نو بھارت" وغیرہ۔ "ستیہ کتھا" "یوگ وانی" "پرتشٹھان" اور "اسمیتہ درش" جیسے خالص ادبی پرچے بھی ہیں۔

حوالے کی کتابیں

ڈاکٹر کیرے نے ۱۸۱۰ء میں پہلی مراٹھی لغت مرتب کی تھی۔ اس سلسلہ میں میجر کینڈی (۱۸۲۴ء) اور مولسورتھ (۱۸۱۳ء) نے بھی بنیادی کام انجام دیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں "شاستری کوش" شائع ہوئی جسے پانچ پنڈتوں نے مرتب کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں دی۔ جی آپٹے نے "شبد رتناکر" شائع کی۔ ۱۹۳۰ء میں وی۔ وی بھیڈے نے "سرسوتی کوش" مرتب کی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء کے عرصے میں داتے' کاروے اور دیگر لوگوں نے مراٹھی کی ایک سات جلدی لغت تیار کی جو "مہاراشٹر شبد کوش" کہلاتی ہے۔ انگریزی' بنگالی (۱۹۲۵ء) ہندی (۱۹۲۸ء) اور فارسی سے مراٹھی میں اچھی ڈکشنریاں موجود ہیں۔ سنسکرت سے مراٹھی کی تو کئی ڈکشنریاں ہیں۔ مراٹھی علم صرف سے متعلق کے۔ پی کلکرنی کی لغت ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ سوانح اور تذکروں پر مبنی ایک سہ جلدی معیاری ڈکشنری بھی موجود ہے جسے چتراو شاستری نے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ وی کیتکر نے انسائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے جو ۲۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مراٹھی کتابیات (Bibliogruphy) کا کام (۱۸۰۰ – ۱۹۳۷ء) ایس۔ جی داتا نے انجام دیا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں کاٹن میونرنگ (Cotton Manuering) نے کہاوتوں' مقولوں اور محاوروں کی ایک ڈکشنری شائع کی۔ سیاجی

راؤ گیکواڈ نے ایک پانچ لسانی ڈکشنری شائع کی ہے جس میں مراٹھی کے ساتھ سنسکرت ، ہندی، اردو، فارسی اور گجراتی کے مترادفات دیئے گئے ہیں۔

حالیہ تحریکیں مراٹھی ادب کی سب سے جدید تحریکیں دلت ، اچھوت طبقہ یا دوسرے پچھڑے ہوئے طبقوں کے ادیبوں کی تخلیقات سے تعلق رکھتی ہیں ان ادیبوں کی تحریریں بہت ہی بے لاگ اور کھری کھری ہوتی ہیں۔ جو ان کے تلخ تجربات کا نتیجہ ہیں۔ اس نئی حقیقت پسندی کے علاوہ ان کے نزدیک سب سے زیادہ بحث طلب مسئلہ مرد ، عورت کے تعلقات کا مسئلہ ہے۔ خاص طور سے مشہور نزاعی ڈرامہ "سکھارام بائنڈر" کی اشاعت اور کچھ عرصہ کے لیے اسے ممنوع قرار دینے کے بعد سے تو یہ بحث اور بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ ایسی تحریروں کے ادبی جواز اور مناسبت پر جو ٹھیٹ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں مختلف نقاطِ نظر سے بحثیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں ادیب کی آزادی اور اظہار خیال کے داخلی حدود کا مسئلہ بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اکثر ادیب فحش نگاری سے متعلق قانون کو مانگے تانگے کا ایک دقیانوسی قانون تصور کرتے ہیں اور نطشے کے ہم زبان ہو کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان سارے امور کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور تمام سماجی قدروں کو اُلٹ پلٹ کر پھر سے متعین کیا جائے۔ سماجی غور و فکر کے یہ تمام دائرے ظاہر ہے ادب کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو یکساں طور پر متاثر کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کوئی بھی تحریک مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کا وجود عارضی ہوتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ فنکارانہ تخلیق کی حیثیت کو متاثر کرتی ہے۔

ملیالم زبان و ادب

ملیالم ہندوستانی جمہوریہ کی ایک ریاست کیرالا کے باشندوں کی زبان ہے سیاسی وحدت کی حیثیت سے کیرالا کا وجود حال حال کا ہے لیکن ایک جغرافیائی خطہ کی حیثیت سے یہ علاقہ زمانہ قدیم سے مشہور ہے۔

عیسوی دور کی ابتدائی صدیوں میں رومن باشندوں کو یہاں کی کالی مرچ بہت پسند تھی۔ "رامائن" اور "مہابھارت" میں بھی کیرالا کا ذکر ملتا ہے۔ اشوک کے کتبہ اوم (۲۵۷ ق م) میں بھی کیرالا کا حوالہ موجود ہے۔ جدید دور میں خاص طور سے پندرھویں صدی میں پرتگالیوں کی آمد کے بعد سے بیرونی ممالک سے کیرالا کے تعلقات نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔

آزادی سے قبل ملیالم بولنے والوں کا علاقہ تین خطوں پر مشتمل تھا یعنی ضلع ملابار جو مدراس پریسیڈنسی کے تحت تھا ٹراونکور اور کوچین کی دیسی ریاستیں۔ ۱۹۵۰ء میں دونوں ریاستوں کو ضم کرکے "ریاست ٹراونکور کوچین" کا نام دیا اور ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد جملہ ملیالم علاقہ کو ایک ہی ریاست کیرالا سے موسوم کیا گیا۔

ملیالم کا تعلق دراوڑی قبیلہ کی زبانوں سے ہے۔ یوں تو اس قبیل میں تقریباً بیس زبانیں شامل ہیں لیکن دستور ہند میں صرف چار زبانوں یعنی تامل، تلگو، کنڑی اور ملیالم ہی کو درج فہرست کیا گیا ہے۔ یہ چاروں زبانیں سب سے اہم زبانیں ہیں اور اپنا شاندار ماضی بھی رکھتی ہیں۔ ان چاروں میں قدامت اور کلاسکی ادبی سرمایہ کے لحاظ سے تامل کو مقبولیت حاصل ہے اور بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے تلگو ممتاز ہے۔ ملیالم کو کیا بلحاظ آبادی اور کیا بلحاظ قدامت چوتھا درجہ حاصل ہے۔ یوں تو کیرالا رقبہ یا آبادی کے اعتبار سے کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تاہم وہ اپنے انقلابی سیاسی اندازِ فکر کی وجہ سے ساری دنیا کے سیاسی مفکرین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ آج بھی جدید ملیالم ادب اپنے ترقی پسندانہ رجحانات اور تخلیقی نگارشات کی وجہ سے باہر والوں کے لیے ایک کشش رکھتا ہے۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ۲۲ر۲ کروڑ باشندے ملیالم بولتے ہیں اور اس لحاظ سے ہندوستانی زبانوں میں اسے ساتواں درجہ حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا ادب مقابلتاً زیادہ قدیم نہیں ہے تاہم ملیالم ایک بولی کی حیثیت سے بہت قدیم زبان ہے۔ لفظ "ملیالم" کی ابتدا اور ساخت کے بارے میں ماہرین لسانیات نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں۔ بعض کے مطابق یہ اصطلاح دو لفظوں سے بنی ہے یعنی "مالا" جس کے معنی پہاڑ کے ہوتے ہیں اور "ازہم (Azham) (گہرا) جس سے مراد سمندر ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ دوسرا لفظ "الم" (Alam) ہے جس کے معنی زمین کے ہوتے ہیں۔ بہر صورت ملیالم زبان کا علاقہ ایک پہاڑی سلسلہ یعنی مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔ تاہم زبان کی ابتدا سے متعلق بحث بہت ہی پرانی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

ملیالم زبان کی ابتدا

ملیالم زبان کی ابتدا کے متعلق ماہرین کی رائے کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ملیالم سنسکرت اور تامل سے قابلِ لحاظ حد تک متاثر ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ وہ اپنی انفرادی خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ ان ہی سب امور کی بنا پر مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں۔

سنسکرت ماخذ کوونی نیدنگادی (Kovunni Nedungadi) نے اپنی گرامر "کیرالا کومودی" (۱۸۷۵) میں سنسکرت اور ملیالم کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک خوب صورت تشبیہ استعمال کی ہے وہ کہتا ہے

ملیالم وہ سرزمین ہے جہاں "سنسکرت گنگا" اور "دراوڑی جمنا" ایک ساتھ بہتے ہیں۔

تامل ماخذ

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر روبرٹ کالڈویل (Robert Caldwell) پہلے عالم ہیں جنھوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ ملیالم کو تامل ہی کی بیٹی تصور کرنا چاہیے۔ اپنی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ میرے خیال میں ملیالم تامل کی ذیلی شاخ ہے جو اس سے اس حد تک مختلف ہے کہ اس میں فعل کے ساتھ شخصی کلمہ آخر کا استعمال نہیں ہوتا اور اس میں سنسکرت مشتقات کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ بعد میں انھوں نے اپنی رائے میں کسی حد تک ترمیم کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس بات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ "ملیالم جیسی کہ وہ آج ہے تامل ہی کی بہن ہے۔ تامل اور ملیالم اسکالروں کی ایک قابل لحاظ تعداد اس خیال کی حامی نظر آتی ہے چناں چہ مشہور ملیالم گرامر "کیرالا پانی نیم" (Kerala Paninyam کے مصنف اے۔ آر راجم راجہ ورما خاص طور سے کالڈویل کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ گنڈرٹ (Gundert) جو پہلی سائنٹیفک ملیالم گرامر کے مصنف ہیں واضح طور پر اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ملیالم تامل کی بہن ہے۔ اتور کرشنا پشاروڈی، الور پر مہیشور ایئر اور ڈاکٹر کے گوڈا ورما جیسے اسکالروں نے بھی عام طور سے اسی خیال کی تائید کی ہے۔

ملے جلے ماخذ

ایک اور خیال کے مطابق ملیالم دو زبانوں یعنی سنسکرت اور تامل کا مرکب ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملیالم میں ایسے بے شمار الفاظ ہیں جو تامل یا سنسکرت میں پائے جاتے ہیں لیکن جو چیز کسی زبان کے دوسری زبانوں سے باہمی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے وہ اس کا ذخیرہ الفاظ نہیں بلکہ اس کی گرامر کی ساخت ہے۔ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں ہے جس نے دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار نہ لیے ہوں لیکن کسی زبان کی صرف و نحو ہی وہ چیز ہے جو اس طرح مستعار نہیں لی جا سکتی اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملیالم کی خود اپنی گرامر موجود ہے تاہم وہ دراوڑی قبیلہ کی زبانوں کی گرامر کے مشترکہ ڈھانچہ ہی میں آتی ہے۔

ملیالم کے تاریخی دور

دوسری زبانوں کے ادب کی طرح ملیالم کے مورخین ادب بھی اسے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ تاہم ایسی تقسیم بڑی حد تک غیر اصولی ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کی مقرر کردہ تواریخ صدفی صد درست نہیں ہوتیں لیکن جہاں بھی کوئی معقول بنیاد موجود ہو ایسی تقسیم کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی دور کے ہم عصر ادیب باوجود انفرادی اختلاف کے اپنی زبان اور موضوع کے استعمال میں کچھ مشترکہ خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جدید دور کی تصانیف میں ہم جدید اسپرٹ اور لہجہ اور جدید زبان کے استعمال کی جھلک نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

اکثر مورخین کے خیال کے مطابق ملیالم کا جدید دور ایزہوتھاچن (Ezhuthachan) سے شروع ہوتا ہے جس کی "رامائن" اور "مہابھارت" (سولھویں صدی) اس زبان کی دو بہت ہی اہم کلاسیکی تصانیف ہیں۔ لیکن بعض ماہرین کی رائے میں جدید دور کا آغاز درحقیقت چروسری (Charuseri) کی کرشنا پاٹو (Kirshnapattu) (کرشنا گاتھا) سے ہوتا ہے جو ایک صدی قبل (پندرھویں صدی میں) منظر عام پر آچکی تھی۔

جہاں تک اس سے قبل کے دور کا تعلق ہے کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے ملیالم کے لیے ایک دور وسطیٰ کے تعین کا زیادہ جواز نظر نہیں آتا۔ تاہم ابتدائی دور میں ہمیں ایسے مختلف دھارے یا رجحانات ملتے ہیں جو بعض اوقات ملیالم کے ادبی دوا رسے بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

مختلف ادوار کی مندرجہ ذیل سادہ تقسیم ہمارے خیال میں کافی ہوگی۔

(۱) ابتدائی ملیالم —— پندرھویں صدی تک اور (۲) جدید ملیالم —— پندرھویں صدی کے بعد۔

ابتدائی دور

جب ہم بغیر کسی صراحت کے ابتدائی ملیالم کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ ملیالم (عام بول چال والی اور ادبی دونوں) ہے جو اپنی پیدائش سے لے کر "کرشنا گاتھا" تک کے دور پر حاوی ہے۔ ملیالم کے ابتدائی دور میں ہمیں تین نمایاں ادبی اسکول یا دھارے ملتے ہیں جن کی بدولت مغربی ساحل پر ایک کلاسیکی زبان نے بال و پر نکالے۔ یہ دھارے ہیں (۱) مقامی (۲) تاملی اور (۳) سنسکرتی۔

قدیم کیرالائی ادب ان ہی تین اور تقریباً متوازی دھاروں سے سیراب ہوا ہے اگرچہ کہ کیفیت اور اثر آفرینی کے لحاظ سے ان کی نوعیت جدا جدا رہی ہے۔ پہلا دھارا جو مقامی سرچشمہ سے نکلا سطحی اور بے رنگ مگر ساتھ ہی بہت ہی شفاف اور تیز رو تھا۔ دوسرا (تامل دھارا) جو پڑوسی ملک سے آیا پُر شور وسیع اور رنگین تو تھا مگر بڑی حد تک غیر آباد علاقوں ہی سے گزرتا گیا۔ تیسرا دھارا (سنسکرت) دور کے پہاڑی علاقہ سے آیا جو گہرا اور چمک دار ہونے کے علاوہ پُر پیچ اور شوریدہ سر تھا۔ یہ دھارا بلند راہوں ہی سے گزرتا گیا۔

جدید دور

"ملیالم ادب کا جدید دور پانچ صدیوں پر محیط ہے یعنی پندرھویں صدی سے لے کر آج تک۔ لیکن خود جدید دور میں ہمیں ایک نشاۃ ثانیہ ملتا ہے جو مغربی ادب اور خاص طور سے انگریزی ادب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ساتھ ہی انگریزی تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا تاہم اس کے ادب نے ہندوستانی زبانوں کے ادب کو گزشتہ ۹۰ اور ۱۰۰ سال ہی کے عرصہ میں زیادہ متاثر کیا۔ ملیالم ادب میں نیا رجحان ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور موجودہ صدی میں تو اس کے اثرات کافی گہرے ہو گئے۔ اسے ہم "معاصر دور"

بھی کہہ سکتے ہیں ۔

ابتدائی دور (مقامی دھارا یا لوک کویتا)

کسی قوم کی اولین شاعری ہمیں اس کے لوک گیتوں میں ملتی ہے۔ قدیم کہاوتوں میں بھی شاعری کے نقوش ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ کئی مقولے اور بلیغ جملے اپنے رموز و حکمت اور بھرپور تجربہ آہنگ اور اعجاز و اختصار کی وجہ سے صدیوں سے جوں کے توں چلے آرہے ہیں۔ انھیں اب تک ادب کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جاتا تھا لیکن آج لوک گیتوں کو بھی ادب کا ایک جزو قرار دیا جاتا ہے۔

ان گیتوں کے زمانہ کا تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ مختلف نسلوں سے گزرنے کی وجہ سے ممکن ہے ان میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہو۔ لوک ساہتیہ کو ہم بہ نظر سہولت دو زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) لوک گیت اور (۲) آلھا (Ballad) مسلمہ تعریف کے مطابق آلھا میں قصہ کا جزو ہونا ضروری ہے۔ ملیالی لوک ساہتیہ کو اکٹھا کرنے اور اس کی تدوین اور ترتیب کے سلسلہ میں کچھ قابل قدر کام ہوا ہے تاہم اس میدان میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ سی۔ پی گوند پلے پہلے محقق ہیں جنھوں نے لوک گیت جمع کیے ہیں۔ ان کے مرتب کردہ مجموعہ "پزہایا پاٹوکل" (Pazhaya Pattukal) سے سب ہی مورخین بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ آلھا کے سلسلہ میں، پرسی میک وین (ملابار کے ایک سابق کلکٹر) ڈاکٹر سی۔ اے مینن اور کوچوکرشنا نادار کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔

لوک ساہتیہ کو جمع کرکے ان کا تنقیدی جائزہ لینے میں آر۔ نارائن پانیکر، ایس پرمیشور آئر اور ڈاکٹر پی۔ ایس تھامس جیسے ادبی مورخین کا بھی گراں قدر حصہ ہے۔

لوریاں

چند مشہور گیت لوریوں کی شکل میں ہیں۔ یہ بہت ہی سادہ زبان میں ہیں۔ ان میں تشبیہ و استعارہ یا حسن کارانہ جھلک نہیں پائی جاتی۔ اور سب کی سب تقریباً ایک ہی رنگ کی ہیں البتہ کرشن جی کے بچپن کی شوخی وشرارت بعض گیتوں کا خاص موضوع ہے۔

شادی کے گیت

شادی کی بعض رسومات پر بھی کئی گیت موجود ہیں۔ مثلاً دولہن کے گلے میں تالی کیٹو (ایک دھاتی ٹکڑا) کا پہنایا جانا اور اسی طرح کی دوسری رسمیں وغیرہ۔

اونام اور ترو واتری کے گیت

"اونام کیرالا کا سب سے اہم تہوار ہے جسے تمام فرقوں کے لوگ موسمی جشن کے طور پر مناتے ہیں۔" ترو واتری ایک دوسرا اہم تہوار ہے جس میں کام دیو (محبت کا دیوتا) کو نذر و نیاز پیش کی جاتی ہے۔ ان دونوں تہواروں سے متعلق بے شمار گیت ہیں

مذہبی گیت

ہمارے بزرگ مظاہر فطرت کا خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے استقبال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ کرشمہ خدائی کی علامتیں تھیں۔ مذہبی آدمی کی عقیدت اور خوف کا یہ سرچشمہ گیتوں کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ جن میں سے بعض تو خالص مذہبی اور بعض نیم مذہبی ہیں بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، طوفان، بلند قامت درخت یہ سب قدیم دراوڑیوں کے دیوتا رہے ہیں۔ اسی طرح سانپ کی پرستش کی جاتی تھی جو کیرلا کے جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ "سرپہ پاٹو" یا سانپ کے گیت بہت مشہور ہیں ایسے ہی ایک گیت کا نمونہ پیش ہے جو ناگ دیوتا کی شان میں ہے۔

میرے دیوتا کے باغیچہ میں
کلی پھول کا روپ دھارتی ہے
میرے دیوتا کے باغیچہ میں
چنبیلی مسکراتی ہے
مسحور کن،
اور اس کی خوشبو سے سرشار ہونے کیلئے
سانپ نیند سے جاگ اٹھتے ہیں

نیم مذہبی گیتوں میں "نویتو پاٹو" (Navetupattu) "ولان پاٹو" (Vallanpattu) اور "کلتو پاٹو" (Kattu Pattu) زیادہ مشہور ہیں۔

دوسرے گیت

لوک گیتوں کی اور بھی اقسام ہیں۔ جو کیرالا میں بہت مقبول ہیں کھیتی باڑی سے متعلقہ گیت "کرشی پاٹوکل" (Krishi Pattukal) کہلاتے ہیں۔ کر دا اور پلایا جیسے پچھڑے ہوئے فرقوں کے بھی مخصوص گیت ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور کشتی رانوں کے گیت ہیں جو "وانچی پاٹو" (Vanchipattu) کہلاتے ہیں۔ ایک بے سروپا تک بندی بھی ہوتی ہے جس میں مہملات کو دلچسپ باتوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ شرابیوں کا "زرد گیت" اپنی نوعیت کا ہوتا ہے۔

آلھا

آلھاؤں کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ (Ballads) رجزیہ، تاریخی اور دھارمک کیرالا کی جتنی بھی آلھائیں دستیاب اور شائع ہوئی ہیں ان میں رجزیہ گیت سب سے زیادہ ہیں۔

رجزیہ آلھائیں

ملیالم کے مشہور رجزیہ گیت "واڈکن پاٹوکل" (Vadakan Puttukal) (شمالی ملابار کے گیت) کہلاتے ہیں ان میں "تھاچولی اوتھے نان" (Thacholi Othenan) "اور ول چیواکر" وغیرہ جیسے سورماؤں کی زندگی اور ان کے سرفروشانہ کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔

ماپلا پاٹوکل (ملاباری مسلمانوں کے گیت)

یہ "واڈکن پاٹوکل" کی طرح مقبول تو نہیں ہیں پھر بھی اپنے اندر بڑا سحر رکھتے ہیں۔ ان میں رجزیہ اور عشقیہ عنصر بھرپور انداز میں ملتا ہے ان کے کردار مسلمان ہیں اور وہ ملیالم اور عربی کی ملی جلی زبان میں ہوتے

ہیں۔ کاسرگوڈ کے ڈی بعید نے ایسے کئی گیت جمع کیے ہیں۔ دھارمک آلھاؤں میں سب سے زیادہ اہم یہ ہیں " بھدرا کالی پاٹو " " تقوتم پاٹو " اور " ایہ پن پاٹو " یہ " ماوارتم پاٹو " " مہابھارت " کے قصہ پر مبنی ہے۔

تاریخی آلھائیں تاریخی آلھاؤں کے کردار تمام تر تاریخی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ اراوی کٹی پلے پر جو آلھا ہے وہ بجا طور پر سب سے زیادہ مشہور ہے " انچو تم پورن پاٹو " کہلاتی ہے۔ یہ پاٹو وسط سولھویں صدی میں ٹراونکور کے شاہی خاندان کے دو حریف گروہوں کے اختلافات سے بحث کرتی ہے۔ اس شعبۂ ادب میں عیسائیوں کے کارنامے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ کیرالا میں سینٹ تھامس کے قصہ کو "مارگم کالی پاٹو" میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ گیت عموماً بارہ آدمی اسٹیج پر ناچتے ہوئے گاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے لوک گیتوں اور آلھاؤں کے زمانہ کا تعین کرنا بڑا مشکل ہے انھیں میں سے بعض تو بہت قدیم ہیں اور ممکن ہے ان کا تعلق بارہویں صدی سے بھی قبل کے زمانہ سے رہا ہو۔ لیکن بعض سولھویں اور سترہویں صدی میں لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اوتھنان کی پیدائش ۱۵۸۴ء ہے اور اس پر جو آلھا ہے وہ یا سولھویں صدی میں لکھی گئی ہوگی یا پھر سترہویں صدی میں۔ ان گیتوں کا حسن اور اپیل ان کی سادگی راست طرزِ تخاطب اور ان کے آہنگ میں مضمر ہے۔

تامل دھارا تقریباً پندرھویں صدی تک کم ترقی یافتہ ملیالم ادب پر تامل کے اثرات پڑتے رہے جس کا کلاسیکی ادب کافی ترقی کر چکا تھا۔ ان کے اثرات کے دو مرحلے قرار دیے جا سکتے ہیں پہلے مرحلہ کا ادب وہ ہے جسے " پاٹو ساہتیم " (گیتوں کا ادب) کہا جاتا ہے۔ اس کے اصول و قواعد بالکل معیّنہ ہیں۔

پاٹو ساہتیم پاٹو کی اصطلاح آج کل گیت کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے یہاں اس سے مراد نظم کی ایک مخصوص ہیئت ہے " لیلا تلا کم " (Lilatilakam) (چودھویں صدی کی ایک تصنیف جو گرامر اور فن خطابت سے متعلق ہے) میں پاٹو کی تعریف اور اس کی مثالیں دی گئی ہیں۔ پاٹو میں صرف ایسے ہی حروف استعمال ہوتے ہیں جو خالص دراوڑی ہوں غرض یہ کہ پاٹو اسکول شعریات، قافیہ بندی اور صوتیات میں تامل روایات پر عمل کرتا ہے۔

رام چریتم پاٹو اسٹائل کی مکمل تصنیف جو اب تک دریافت ہوئی ہے۔ " رام چریتم " ہے یہ بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر گنڈرٹ کی رائے میں "رام چریتم" ملیالم کی قدیم ترین نظم ہے اور یہ کہ وہ زبان کے اولین دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ آلور کرشنا پشار وڈی کا خیال ہے کہ اس نظم کی زبان کی مخصوص خصوصیات اس کی قدامت کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس کے مقام پیدائش کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ غرض ملیالم زبان و ادب کی تاریخ میں " رام چریتم " سے زیادہ کسی اور تصنیف نے اتنے مسائل نہیں کھڑے کیے۔ بعض اسکالر اسے تامل تصنیف قرار دیتے ہیں۔ بعض اسے قدیم ملیالم تصور کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ باور کرتے ہیں کہ یہ تصنیف دو زبانی بولی میں لکھی گئی ہے

رام چریتم کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ یہ نظم تصنع آمیز ملی جلی بولی میں لکھی گئی ہے ملاوٹ صرف الفاظ کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ اس کی صوتیات (Phonology) اور صوریات (Morphology) میں بھی موجود ہے۔ " لیلا تلاکم " میں جن دو بولیوں کو مصنوعی ادبی بولیاں تسلیم کیا گیا ہے وہ مانی پراولم امتزاج ہے۔ " رام چریتم " میں دراوڑی بحریں استعمال کی گئی ہیں اور تامل الفاظ و تراکیب کو فوقیت دی گئی ہے جس میں کہیں کہیں عام ملیالم الفاظ کو بھی تامل کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

" رام چریتم " کے مصنف کے متعلق کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے داخلی شواہد کی بنا پر مصنف کا نام چرامن قرار پاتا ہے جس کے پیش نظر از اول تا آخر والمیکی راماین تھی۔ بعض اسکالرز اس میں کہیں تامل راماین کے اثرات بھی پاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں والمیکی کی عظیم تصنیف کے تلخیصات اور تراجم کا بے شمار مواد موجود ہیں تاہم " رام چریتم " کی شاعرانہ عظمت خود مصنف کے کمال فن کی غمازی کرتی ہے۔ اس نظم کی واقعات نگاری بہت ہی دلکش اور طرز بیان نہایت ہی برجستہ اور تازگی بخش ہے۔

کناسن پاٹوکل یہ گیتوں کا ایک مجموعہ ہے جسے وسطی ٹراونکور کے مقام نرنام کے ایک ہی خاندان کے کئی شعرا نے لکھا تھا اسی لیے وہ نرنام شاعر کہلاتے ہیں نرنام تصانیف اس لحاظ سے اہم ہیں کہ وہ ابتدائی ملیالم شاعری کے ایک مرحلہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ گو انھیں تامل دھارا ہی کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے تاہم ان میں پاٹو طرز کی شاعری سے کافی انحراف پایا جاتا ہے۔ کناسن پاٹوکل صرف تامل (دراوڑی) حروف تہجی تک ہی محدود نہیں ہے۔ قافیہ بندی میں بھی کافی آزادی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان گو تامل اور ملیالم کی ملی جلی شکل میں ہے تاہم ملیالم کا پلّہ بھاری ہے اور سنسکرت کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے۔ نرنام تصانیف میں کناسن پاٹوکل سب سے اہم تصنیف ہے نرنام شاعروں کا زمانہ چودھویں صدی کے نصف آخر سے پندرھویں صدی کے نصف اول پر محیط ہے۔ ان میں کے ایک شاعر مادھو پانیکر کی " بھاگوت گیتا " (جو تقریباً چھ سو سال قبل لکھی گئی تھی) کلاسیکی " بھگوت گیتا " کا غالباً پہلا ترجمہ ہے جو کسی جدید ہندوستانی زبان میں ہوا ہے۔ اس نوع کے پاٹوکل کے زمرہ کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً " بھاگوتم " " بھارتم " اور " سیوراتری مہاتمیم "۔

سنسکرت دھارا سنسکرت نے ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کو متاثر کیا دراوڑی زبانوں کی گو اپنی گرامر موجود ہے جو انڈو آرین زبانوں سے یکسر مختلف ہے تاہم جہاں تک ذخیرۂ الفاظ اور ہیئت کا تعلق ہے سنسکرت نے عام طور سے ان سب زبانوں کو متاثر کیا ہے۔ یہ بات خاص طور پر تلگو، ملیالم اور کنڑی کے متعلق کہی جا سکتی ہے ملیالم کی حد تک سنسکرت کا اثر اتنا زیادہ رہا ہے کہ نتیجتاً ایک خاص ادبی بولی وجود میں آ گئی جو

" مانی پراوالم " (Manipravlam) کہلاتی ہے ۔ اب یہ اصطلاح عموماً ہر ایسے طرزِ تحریر کے لیے استعمال ہوتی ہے جس میں سنسکرت کا عنصر غالب ہو ۔ اس کی دو شکلیں قرار دی جاسکتی ہیں ، ایک تو ابتدائی دوسری بعد کی ۔ ابتدائی " مانی پراوالم " کا مفہوم محدود تھا آریائی ، دراوڑی کلچر کے امتزاج کا پہلا نتیجہ " مانی پراوالم " کی شکل میں ظاہر ہوا ۔

مانی پراوالم پراچین "مانی پراوالم" کی خصوصیات کیا ہیں " لیلا تلاکم " میں " مانی پراوالم " کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کی رو سے ادبی مقاصد کے لیے ملیالم اور سنسکرت الفاظ کا مرکب " مانی پراوالم " کہلاتا ہے ۔ اس میں سنسکرتی الفاظ تحریف شدہ اور ہم مادّہ ہونے چاہئیں جیسا کہ خود سنسکرت زبان میں ہوتا ہے " مانی پراوالم " جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مثل ایک ہار کے ہے جس میں لعل اور مرجان جڑے ہوئے ہیں ۔ لعل (مانی) ملیالم ہے اور مرجان (پراوالم) سنسکرت ، اس میں الفاظ کا انتخاب اس طرح ہونا چاہیے کہ ایک قسم کی ہم آہنگی اور لب ولہجہ کی یکسانیت کا احساس پیدا ہو ۔ ابتدائی " مانی پراوالم " تصانیف اکثر دیشیاؤں کی مدح میں لکھی گئی ہیں ۔ پرانوں اور رزمیوں سے اس وقت تک بطور مواد کوئی مدد نہیں لی جاتی تھی ۔

وسیکہ تنتر اس مشہور "مانی پراوالم" نظم کا موضوع وہ نصیحت ہے جو ماں اپنی دیشیا بیٹی " انگ سینا " کو کرتی ہے ۔

قدیم چمپو نگارشات چمپو ایسے گیت کو کہتے ہیں جو نثر اور نظم دونوں میں لکھا جاتا تھا سنسکرت میں دسویں صدی عیسوی سے چمپو لکھے جانے لگے تھے ۔ ہمیں تیرہویں اور چودہویں صدی کے لکھے ہوئے کئی مانی پراوالم چمپو ملتے ہیں ۔ ان کا موضوع تقریباً یکساں ہوتا ہے ان کی ہیروئن طوائف اور غیر شادی شدہ عورتیں ہیں مانی پراوالم شاعر ان ہی سے وجدان حاصل کیا کرتے تھے ۔ ایک نظم " کونو تھارا " میں عاشق کی حالت زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے ۔

سندیش کاویہ کالی داس کے " میگھ دوت " کے (پیامی شاعری) نمونہ پر لکھی ہوئی پیامی نظمیں ملیالم میں بکثرت موجود ہیں ۔ ابتدائی چمپو شاعری کی طرح یہاں بھی شاعر کی جولانی طبع دیشیاؤں ہی کو موضوع بناتی ہے ۔ اس میں ہیرو ہیروئن اور قاصد تمام کے تمام یا ان میں سے کوئی ایک فرضی ہوتا ہے ۔ نظم میں حقیقی فضا پیدا کرنے کے لیے شاعر تاریخی کرداروں کا بھی استعمال کرتا ہے ۔ سندیش کاویہ بنیادی طور پر عشقیہ کلام ہے لیکن اس سے اپنے عہد کی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے ۔

اُنو نیلی سندیشم یہ ملیالم کا سب سے زیادہ اہم اور مشہور سندیش کاویہ ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ساری مانی پراوالم شاعری میں بھی ممتاز ترین مقام رکھتا ہے ۔ یہ ۱۳۵۰ء اور ۱۳۶۵ء کے درمیان لکھا گیا تھا کہا جاتا ہے کہ ہیروئن انو نیلی الیسرا اور دشی کی اولاد سے تھی ۔

اس قبیل کے دوسرے مشہور کاویہ " کوکا سندیشم " اور " کاکا سندیشم " ہیں ۔ یہاں " چندررت سادم " کا بھی تذکرہ کیا جاسکتا ہے ۔ یہ ایک تخیلی طنزیہ نظم ہے جو پندرہویں یا سولہویں صدی میں لکھی گئی تھی ۔

گاتھا

شاعری کے جن تین دھاروں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ چودہویں اور پندرہویں صدی میں ایک دوسرے کو متاثر کر رہے تھے ۔ اس عمل کی وجہ سے بولی جانے والی زبان کی ایک نئی شکل اور نیا اسلوب پیدا ہوا جس کے آثار ہمیں پہلے تو " کرشنا گاتھا " میں اور بعد از ال ایزہو تھا چن (Ezhuthachen) کی تصانیف میں ملتے ہیں ۔

" کرشنا گاتھا " (جسے کرشنا پاٹو بھی کہا جاتا ہے) ملیالم زبان کی ایک بہت ہی ممتاز کلاسیکی تصنیف ہے ۔ دراوڑی پاٹو کی طرح سنسکرت میں " گاتھا " کا لفظ گیت کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ پاٹو جس طرح محدود معنوں میں مستعمل ہے اسی طرح " گاتھا " بھی ملیالم ادب میں ایک مخصوص مفہوم رکھتا ہے ۔ اس سے مراد ایک خاص طرح کی بحر ہے جیسی " کرشنا گاتھا " میں استعمال ہوئی ہے ۔ رواجاً ایسا گیت یا نظم " گاتھا " کہلانے لگی جو منجری بحر میں لکھی گئی ہو ۔ پندرہویں صدی تک کلاسیکی نظموں کے لیے یا تو سنسکرت کی نہایت ہی مکمل بحریں استعمال ہوتی تھیں یا پھر تامل کی ترقی یافتہ غنائی بحریں " مانی پراوالم یا پاٹو " کے مروجہ اسٹائل کے برعکس " کرشنا گاتھا " کے مصنف نے ایک ایسی طویل نظم لکھنے کا تہیّہ کیا جو خالص مقامی بحر میں ہو ۔ اس کے علاوہ زبان بھی رائج العام سنسکرت الفاظ سے قطع نظر کی گئی ہے مقامی عنصر کے باوجود یہ نظم اپنی داخلی خوبیوں کی وجہ سے کلاسیکی وقار اور اپیل رکھتی ہے ۔ صاحبِ تصنیف کی شخصیت نزاعی ہے اور اب تک یہ بحث جاری ہے تاہم سب سے زیادہ حاوی رائے چردسری نمبودری کو اس کا مصنف قرار دیتی ہے ۔ نظم کی ابتدا ہی میں شاعر نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ کولاتھوناڈو کے راجہ اودے ورمن کی ایما پر یہ نظم لکھ رہا ہے ۔ راجہ کا دورِ حکومت ۱۴۴۶ء سے لے کر ۱۴۷۵ء تک ہے ۔ یہ نظم اس کے ایک درباری شاعر نے پندرہویں صدی میں لکھی ہے ۔

بھگوان کرشن کی پیدائش سے لے کر ان کی رحلت تک کی کہانی اس نظم کا موضوع ہے ۔ مصنف نے " بھاگوتم " کے قصہ کا پورا پورا اتباع کیا ہے ۔ بعض حصے تو راست ترجمہ معلوم ہوتے ہیں اور بعض تلخیصات پر مبنی ہیں ۔ کلاسیکی سنسکرت کے خیالات اور امیجری کا جابجا استعمال کیا گیا ہے ۔ پھر بھی اس میں اپج اور نئے پن کی کمی نہیں ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ تصنیف کئی جگہ اصل سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے ۔

اس میں ۷۴ کہانیاں ہیں۔

بھارتا گاتھا "کرشنا گاتھا" کے علاوہ چند اور نظمیں بھی ہیں جو "گاتھا" کے زمرہ میں آتی ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز "بھارتا گاتھا" ہے یہ طویل نظم مہابھارت پر مبنی ہے۔ اس نظم کے مصنف کی شخصیت غیر معلوم ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی تک "گاتھا" طرز شاعری کی بہت زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ لیکن سب میں "کرشنا گاتھا" ہی کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔

کلی پاٹو (Killipattu) ملیالم کے سارے ادب میں ایز ہو تھاچن جیسا بلند پایہ ادیب کوئی نہیں پیدا ہوا ملیالم کے قارئین پر اس کی بے مثال تصانیف کا واقعی بڑا احسان ہے۔ کلی پاٹو ایک خاص نوع کی شاعری ہے جسے ایز ہو تھاچن نے شہرت عطا کی۔ کلی سے مراد طوطا (یا پرند) ہے اور پاٹو گیت کو کہتے ہیں۔ طوطے کے گیت ملیالی کلاسیکی ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ایسی نظم ایک تمہید سے شروع ہوتی ہے جس میں واضح طور پر اس طائر کا ذکر ہوتا ہے جو گیت گانے والا ہو۔ بعض نظموں میں طوطے کی بجائے ہنس یا شہد کی مکھی کو یہ اعزاز عطا کیا گیا ہے۔ پھر بھی یہ نظمیں کلی پاٹو ہی کہلاتی ہیں۔ ایسی نظمیں ہمیں سولہویں اور سترہویں صدی میں بکثرت ملتی ہیں جو روحانی یا غیر مذہبی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کلی پاٹو کو مقبول بنانے میں ایز ہو تھاچن کا بڑا حصہ ہے لیکن اس سے پہلے بھی ایسے گیت لکھے جاتے رہے ہیں۔

ایز ہو تھاچن ایز ہو تھاچن کوزی کوڈ ضلع میں تردر ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے پہلے عجیب و غریب قصے مشہور رہیں۔ عام خیال کے مطابق اس کا پورا نام تن چھتو (گھر کا نام) راما نجن ایز ہو تھاچن ہے۔ اس کے زمانے کے متعلق کوئی قطعی ثبوت تو موجود نہیں ہے تاہم اسکالرز اسے عام طور سے سولہویں صدی کا بتلاتے ہیں۔

ایز ہو تھاچن متعدد کلاسیکی تصانیف کا مصنف ہے۔ جن میں ممتاز "ادھیہ یاتمہ راماتنم" "بھارتم" اور "بھاگوتم" ہیں۔ کیرالا میں ہندو عقیدت مند انھیں مذہبی کتابوں کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔

عوام کے ایک بڑے طبقہ کو ایک طویل عرصہ تک متاثر کرنے کے لیے کسی ادبی تصنیف میں روحانی، لسانی اور حسن کارانہ خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ پاٹو ادب مقبولیت سے محروم رہا مانی پراوالم ادب میں روحانی عنصر کا فقدان تھا۔ لیکن ایز ہو تھاچن کی تصانیف میں ملیالی باشندوں کو متاثر کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ کرشنا گاتھا سے یقیناً بہتر ہیں۔ خاص طور سے اظہار بیان اور جوش عقیدت میں ان کا جواب نہیں ہے۔

ادھیہ یاتمہ راماتنم یہ رزمیہ سنسکرت کی اسی نام کی تصنیف پر مبنی ہے والمکی رامائن کے برخلاف اس میں رام کو بھگوان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی حمد و ثنا میں اس والہانہ جوش و عقیدت مندی سے گیت گائے گئے ہیں کہ ملیالم ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس تصنیف میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ایز ہو تھاچن کی زبان پر قدرت اور فرحت بخش استعاروں اور کنایوں کے استعمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایز ہو تھاچن نے رام، سیتا، کیکئی اور راون کے کرداروں کی جس بھرپور اور موثر انداز میں عکاسی کی ہے وہ اس کے ایک باکمال فنکار ہونے کا ثبوت ہے۔

مہابھارتم "راماتنم" کے مقابلہ میں ایز ہو تھاچن کی "مہابھارتم" زیادہ وریجنل گہری اور تخیلانہ پرواز کی حامل ہے۔ سنسکرت مہابھارت تو ایک سمندر ہے۔ لیکن ایز ہو تھاچن اس سے اس کی روح اور جوہر نکال لیتا ہے اور پھر اسے اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ راماتنم میں فلسفی اور شاعر میں ایک طرح کی کشمکش ہے۔ دونوں اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں لیکن مہابھارتم میں شاعر ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ تصنیف ادبی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس سے قبل کبھی اتنی گہرائی روانی اور قوت اسے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایز ہو تھاچن کا رنگ نہ تو ناصحانہ ہے نہ ہی اس میں کسی قسم کا دکھاوا ہے۔ وہ تفصیلات محض تفصیلات کی خاطر بیان نہیں کرتا حالانکہ وہ اکثر جگہ بڑی دل کش ہیں۔ ایز ہو تھاچن کی نظمیں سماج کے چیلنج کا جواب تھیں اور تقاضائے وقت سے متاثر تھیں۔

دیگر کلی پاٹو نظمیں ایز ہو تھاچن کے بعد کئی شاعروں نے اس کی تقلید میں کلی پاٹو طرز کی نظمیں لکھیں۔ لیکن اس میں چند ہی کامیاب رہے۔ بعض غیر مذہبی بھی ہیں جن میں سے کچھ تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ اس صنف شاعری میں عیسائیوں کی خدمات بھی ناقابل اعتنا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ارنوس پادری کی "چھپاتو رنیتم" کلی پاٹو طرز کی نظم ہے۔

چمپو

جدید دور کے ادب کی ایک شاخ جس پر سنسکرت کا خاصا اثر ہے چمپو کہلاتی ہے۔ اس صنف میں نثر اور نظم ملی ہوئی ہے۔ سنسکرت دھارے کے سلسلہ میں بعض چمپوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ مانی پراوالم چمپو کہلاتے ہیں اور جدید چمپو عام طور سے بھاشا "چمپو" سے موسوم ہیں۔ واڈک کم کوی لراج راجہ ورمانے جن کی رائے اس شعبۂ ادب میں مستند مانی جاتی ہے۔ ملیالم کے لگ بھگ دوسو

چمپوؤں کے نام گنوائے ہیں۔ ان کے مطابق چمپو دور (۱۳۲۵ء ۔ ۱۵۷۵ء) ملیالم ادب کی بہار کا زمانہ ہے۔ سترہویں صدی کے بعد ان کا زوال شروع ہوا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کی چمپو میں جو نثر استعمال ہوتی ہے وہ معمولی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت شعر منثور کی ہوتی ہے جس میں وزن اور تناسب کا عنصر لازمی طور پر ہوتا ہے۔

رامائن چمپو اس صنف ادب کی سب سے ممتاز تصنیف پونم نمبودری کی رامائن چمپو ہے راون کی پیدائش سے لے کر رام کی رحلت تک کے تمام قصے اس عظیم الشان تصنیف میں بیان کیے گئے ہیں۔ واڈک کم کور کا خیال ہے کہ ادبی محاسن کے لحاظ سے یہ تصنیف سنسکرت کی جملہ چمپوؤں پر فوقیت رکھتی ہے۔

بھارتا چمپو طوالت اور ادبی معیار کے لحاظ سے رامائن چمپو کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ یہ دس حصوں میں منقسم ہے۔ بھارتا چمپو بھی پونم ہی سے منسوب کی جاتی ہے تاہم یہ انتساب قطعی نہیں ہے۔ دیگر مشہور چمپو یہ ہیں

"رکمنی سویمپورم" "کام دلھانم" "پریجتہ ہارانم"
"نیے شدہم" "راجہ رتناولی یم" اور "کوئی واد راہم"۔

بعض چمپو جدید دور میں بھی لکھے گئے ہیں جیسے اور پریمیشور آیر کی "سجاتھوڈواہم" (Sujathodvabam) اور کے۔ ایم۔ پانیکر کی "حیدر نائکر" (Hyder Naikar)

اٹا کتھا

"کتھا کلی" کو فن لطیف کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ "اٹا کتھا" وہ ادب ہے جو "کتھا کلی" میں استعمال ہوتا ہے "کتھا" سے مراد کہانی ہے اور "کلی" کھیل یا تماشہ کو کہتے ہیں۔ یہاں زور لفظ "کلی" یا پیش کش پر ہے لیکن "اٹا کتھا" میں اہمیت "کتھا" یا کہانی کو دی جاتی ہے اور "اٹم" کے معنی کسی تماشہ کو اسٹیج پر پیش کرنے کے ہیں "اٹا کتھا" کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ ابتدائی "اٹا کتھا" نظمیں جے دیو کی "گیتا گووند" سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں ان دونوں میں شلوک (Slokas) اور گن (Gana) ملے جلے ہوتے ہیں۔ فن کی ایک شکل کی حیثیت سے "کتھا کلی" کا شمار نرت میں ہوتا ہے جہاں اشاروں سے زبان کا کام لیا جاتا ہے۔ اس میں اداکار گاتے نہیں بلکہ اشاروں، چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ البتہ دو چار لوگ اداکاروں کے پیچھے کھڑے ہوئے ترنم سے اشعار سناتے اور گاتے جاتے ہیں۔ کوٹارا کرا تھمپورن (Kottarakkara Thampuran) (سولھویں صدی) کی "رام ناٹم" پہلی مکمل "اٹا کتھا" تصوّر کی جاتی ہے۔ تھمپورن نے رامائن کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا کلام آج بھی اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔

"کوٹیا تھو تھمپورن" کا شمار "اٹا کتھا" ادب کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

اس کی چار نظمیں ہیں جن میں "کلا کیہ وادھم" (Kala Keyava-dham) ادبی حیثیت سے بھی اور اسٹیج پر کامیابی کے اعتبار سے بھی سب سے زیادہ ممتاز ہے۔

انائی واریر (Unnayi Varrier) (سترہویں صدی) انائی واریر کی "نلاچرتم اٹا کتھا" کو کتھا کلی ادب میں بلند ترین مقام حاصل ہے یہ چار یومی کھیلوں پر مشتمل ہے نلاچرتم ملیالم کی سب سے زیادہ اوریجنل تصانیف میں شمار کی جاتی ہے اس میں ڈرامائی خوبیوں کے علاوہ نازک جذبات و احساسات کو گرفت میں لانے اور ان کا اظہار کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

دیگر اٹا کتھا نگار ارایمن تھمپی ۱۷۸۳ء ۔ ۱۸۶۳ء کلی منور ودوان کوئی تھمپورن ۱۸۲۵ء ۔ ۱۸۵۷ء ویاسکراموس ۱۸۳۵ء ۔ ۱۸۹۵ء) اور دی کرشنن تھمپی دیگر مشہور "اٹا کتھا" نگار ہیں تھمپی کی "تھاتکہ" ایک نہایت ہی حسین دراوڑی شہزادی ہے جو رام سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ اس کے صلہ میں اسے پیار بھری نظریں نہیں ملتیں بلکہ زہر آلود تیر اس کے جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔

تھولال

اٹا کتھا ادب کتھا کلی رقص کی وجہ سے فروغ پاتا رہا۔ اسی طرح چمپو کی مقبولیت چھاکیاروں (Chhakyron) کے کوتھو (Koothu) کھیلوں کی وجہ سے ہوئی۔ یہ دونوں انتہائی سنسکرت آمیز تھے۔

اس لیے ایک ایسے آرٹ کی ضرورت محسوس کی گئی جسے وسیع بنیادوں پر ادبی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ تھولال سے یہ مقصد پورا ہوا۔ کنچن نمبیار نے اس آرٹ کو اور ساتھ ساتھ اس کے ادب کو مقبولیت عطا کی۔

تھولال کی اقسام تھولال تین قسم کے ہیں پریان، سیتن کن اور اٹن اس آرٹ کو سنوارنے میں ممکن ہے سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے لوک ناٹکوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہو۔

کنچن نمبیار سارے ملیالم ادب میں کنچن نمبیار جیسا زندہ دل، بذلہ سنج اور شعلہ نوا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ وہ عوامی شاعر تھا۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ تیلری کے سامعین رہے۔ یہی اس کے آرٹ کا مقصد تھا۔ نمبیار ۱۷۰۵ء میں ملابار میں پیدا ہوا لیکن ٹراونکور جاکر مہاراجاؤں کی خدمت کرتا رہا۔

سمجھا جاتا ہے کہ اس نے کوئی ۶۴ تھولال نظم کیے۔
اس صنف ادب کے باکمال استاد کی حیثیت سے وہ ہمیشہ
زندہ رہے گا۔ ممکن ہے نمبیار سے پہلے بھی اس طرح کی
کچھ نظمیں لکھی گئی ہوں لیکن نمبیار نے اس نوع ادب کو جس
بلندی پر پہنچایا آج تک وہاں کسی کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اس
کی نظم نگاری کی خصوصیات یہ ہیں:
(۱) زبان اور اسلوب۔ دونوں میں عوام کے مذاق کا پورا پورا
لحاظ (۲) مزاح اور طنز کا موثر طور پر استعمال (۳) بالقصد
قطع کلامی کرنا اور اس میں حد سے زیادہ غلو (۴) ہر ایک تصویر
کی کیرالا پس منظوں رنگ آمیزی (۵) اس کا قہقہہ انگیز جوش و خروش تھولال منقابلتا
ملیالم شاعری کی بہت ہی زرخیز صنف ہے لیکن کنچن نمبیار کے سوا
اس قسم کی دوسری نظمیں کم اہمیت رکھتی ہیں۔

ابتدائی نثر

ہر ادب میں شاعری نثر کی پیش رو رہی ہے۔ ہندوستان
میں تو ریاضی علم نجوم اور طب جیسے مضامین تک نظم میں
باندھے گئے ہیں۔ ملیالم میں نثر ایک موزوں ادبی وسیلۂ اظہار
کی حیثیت سے صرف انیسویں صدی میں قابل اعتنا سمجھی گئی ہے
اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی ایک طرح کی نثر موجود تھی جو
جو تمامتر معلوماتی نوعیت کی ہوتی تھی اسے ہم دو عنوانات کے تحت پیش
کرسکتے ہیں (۱) شاہی یا سرکاری نثر (۲) موزوں نثر۔ یہاں شاہی
نثر سے مراد وہ دستاویزی اسلوب ہے جو کتبات میں استعمال ہوا
ہے اور موزوں نثر وہ ہے جو اتا پرکارم اور چمپو کے کاویہ میں بطور شرح
استعمال کی گئی ہے۔
"بھاشا کوٹلیم" کوٹلیہ کی مشہور سنسکرت تصنیف "ارتھ شاستر" کا ترجمہ ہے
"رام چرترم" کی بہ نسبت یہ ملی جلی خصوصیات کی حامل ہے تاہم
ملیالی عنصر زیادہ حاوی ہے اسی طرح "دوت واکیم" ایک اور اہم
تصنیف ہے جو شر حیاتی اسلوب میں لکھی گئی ہے اس کا موضوع
مہابھارت کے بھاگوت دوت سے لیا گیا ہے۔
کیرالا میں نثر کے عوامی اسلوب کو رائج کرنے میں مغرب کے کیتھولک
مبلغین کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کے مخاطب سیدھے سادے عام
لوگ ہوا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے لازمی طور پر بڑی سادہ
زبان استعمال کی ہے۔ اس دور کی ایک مشہور تصنیف "ہورٹس
ملبارکس" (Hortus Malabaricus) (۱۶۸۶ء)
کہلاتی ہے۔ یہ پودوں پر ایک مقالہ ہے جسے ایک اطالوی پادری
نے لکھا اور ہالینڈ میں چھپوایا تھا۔ تصاویر بڑی ہی دیدہ زیب ہیں
اور اس میں بہ شمول ملیالم چار زبانوں میں وضاحتی نوٹ
دیے گئے ہیں۔

درتھماناپُستکم یہ اٹھارویں صدی کی ایک ممتاز نثری تصنیف ہے۔ غالباً یہ
کسی ہندوستانی زبان میں پہلا سفرنامہ ہے۔ پاریم مکل تھوما کتھنار
(Paremmakkal Thoma Kathanar) کا لکھا ہوا یہ "خبرنامہ"
روم کی ایک مہم (۱۷۷۸ء) سے بحث کرتا ہے جس میں آٹھ سال
گزرے تھے۔ ۵۶۲ صفحوں پر مشتمل یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے۔
انیسویں صدی کے ابتدائی حصوں میں انگریزی اقتدار کے قیام
کے ساتھ ہی ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مشنریوں کی آمد و رفت
کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان مشنریوں نے تعلیمی اور ادبی میدان میں
قابل ستائش خدمات انجام دی ہیں۔ مقامی عیسائیوں (سیریائی
عیسائی) نے بھی ان کی بڑی حد تک مدد کی۔

جدید شاعری

جدید شاعری کا دور انیسویں صدی کے آخری دہائی سے شروع ہوتا ہے
اس دور کے درمیان اعلیٰ پایہ کی ملیالم شاعری بہت زیادہ نہیں
ہوئی۔ پونتھانم نمبودری (۱۵۶۰ء-۱۶۴۸ء) اور راما پراتھو
واریر (۱۷۰۳ء-۱۷۵۳ء) اس دور کے دو ممتاز شاعر ہیں۔
ان کے علاوہ وینمانی شاعر (باپ اور بیٹا) ہیں جن کا اسلوب
شاعری اتنا سلیس اور دلکش تھا کہ وہ "وینمانی پراستھنم"
کے نام سے مشہور ہوگیا۔ یہ دونوں الفاظ کا جادو جگاتے ہیں۔
ان کے بعد ہم کیرالا ورما اور راج راجہ ورما (چچا اور بھتیجا) سے
روشناس ہوتے ہیں جن کی خدمات ملیالم زبان و ادب کے لیے
دور رس نتائج کی حامل ہیں۔
کالی داس کی "شکنتلم" کا کیا ہوا کیرالا ورما کا ترجمہ کئی لحاظ
سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "میور سندیشم" بھی اس قدر
مشہور ہے یہ نظم جدید مانی پراولم اسٹائل میں لکھی گئی ہے۔ "ٹکسٹ
بک کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ملیالم نثر کے فروغ میں بھی کیرالا
ورما کا بڑا حصہ ہے۔ راج راجہ ورما نہ صرف ایک ممتاز شاعر
تھا بلکہ ایک مسلمہ قواعد نگار اور محقق بھی تھا۔ اس کی "کیرالا پانی نیم"
اب بھی ملیالم صرف و نحو کی ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔
یہاں کنہی کٹن تھامپورن (۱۸۶۵ء-۱۹۰۳ء) کا تذکرہ بھی
ضروری ہے اس شاعر نے ۳۰ سال کے عرصہ میں ساٹھ سے بھی زیادہ
کتابیں لکھیں جن میں مہابھارت کا ضخیم ترجمہ بھی شامل ہے۔ جسے
اس نے ۸۷۴ دنوں میں مکمل کیا جو ایک ریکارڈ ہے۔ اس کے
بعد ہم مہاکویوں اور ملیالم شاعری کے "ارکان ثلاثہ" کے دور میں داخل
ہوجاتے ہیں۔

ارکان ثلاثہ ملیالم شاعری کا سنہرا دور اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی
کا زمانہ ہے۔ احیائے شاعری کا یہ دور تین شاعروں کا رہین

منت بے سینی کمارن اسان (۱۸۷۳ء-۱۹۲۴ء) ولاتھول نارائن مینن (۱۸۷۸ء-۱۹۵۸ء) اور الور پرمیشور ایر (۱۸۷۷ء-۱۹۴۹ء) انھیں عام طور سے جدید شاعری کے "عظیم ارکان ثلاثہ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو تو اس صدی کے وسط تک لکھتے رہے تاہم ان کی بہترین شاعری اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی ہی میں ہوئی ایک دوسرے کی ہمسری کرنے بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش میں ہر ایک نے ایسی اعلیٰ پایہ کی شاعری کی کہ یہ دور ملیالم شاعری کا ایک درخشاں دور ثابت ہوا۔

کمارن اسان جب کمارن اسان ۱۹۰۸ء میں اپنی تصنیف "وینا پوو" (Vena Puvu) (گل افتادہ) کی اشاعت کے ساتھ منظر شاعری پر نمودار ہوتے تو اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال تھی۔ وہ ہر لحاظ سے پختہ کار تھے۔ اس سے قبل انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس کی نوعیت بالکل ہی دوسری تھی۔ آسان جنوبی ٹراونکور کے ایک معمولی یزھوا (پست طبقہ) کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ اپنے ہی گاؤں میں ملیالم اور سنسکرت کی روایتی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنی سنسکرت کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھیں بنگلور جانے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ پھر یہ سلسلہ کلکتہ میں جاری رہا۔ گھر لوٹنے کے بعد وہ "ایس۔این۔ ڈی۔ پی۔ یوگم" (سری نارائن دھرما پاری پلانا) نامی تنظیم میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ یہ انگریزی اور جدید بنگالی ادب سے بھی متاثر تھے۔ "وینا پوو" شاخ سے گرے ہوئے ایک پھول کا علامتی نوحہ ہے۔ اس پھول کو دیکھ کر شاعر زندگی کے سارے نازک لمحات پر بڑے ہی معنی خیز انداز میں روشنی ڈالتا ہے

اس نظم کے علاوہ کمارن کی دیگر اہم نظمیں یہ ہیں۔ "نلینی" (۱۹۱۱ء) اور "لیلا" (۱۹۱۴ء) دونوں عشقیہ نظمیں ہیں "درواستھا" (۱۹۲۳ء) اور "چنڈالہ بھکشکی" (۱۹۲۳ء) یہی دونوں نظمیں ذات پات کے نظام کے خلاف ہیں "پرارودانم" (۱۹۱۹) ایک مرثیہ ہے جو اے۔ آر۔ راج راجہ ورما کی موت پر لکھا گیا تھا۔ "سیتا" میں استغراق کی کیفیت ہے اور "کرونا" (۱۹۲۴ء) محبت و نجات کے بودھی تصور پر لکھی گئی ہے۔ یہ ساری نظمیں فن شاعری میں کمارن کی غیر معمولی مہارت کا پتہ دیتی ہیں۔

والاتھول ولاتھول اس صدی کی سب سے قد آور شخصیت کے مالک تھے جن کی طویل اور بار آور خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی عمر ۲۷ سال کی تھی کہ انھوں نے ساری والمیکی رامائن کا ترجمہ صرف ایک سال ۸ مہینوں کے مختصر سے عرصہ میں کر ڈالا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اپنی "چترا یوگم مہاکوی یم" روایتی اسٹائل میں لکھی لیکن بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت کی بڑی وجہ ان کی متعدد مختصر نظمیں ہیں جو "ساہتیہ منجری" کے نام سے دس حصوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ اور کئی نظمیں ہیں جو نہ تو بہت طویل ہیں اور نہ بہت مختصر۔ مثلاً "بدھیر اولا یم" (اپنے بہرے پن پر) "مگدلانہ مریم" (انجیل کی مریم مجدلانی پر ایک خوب صورت نظم) "شیش یا نم مکانم" (شاگرد اور بیٹا) "بندھہ ناستھنا یہ انی رادھن" (انی رادھن کی جکڑ بندی)

مجدلانی اور حضرت عیسیٰ کے قصہ کو ولاتھول بڑے ہی مسحور کن رومانٹک انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے ہی موضوعات پر ان کا قلم کہیں کہیں نفسانی جذبات کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ تاہم اسی رومانٹک اور رنگین پس منظر سے ایک سنجیدہ قوم پرست شاعر ابھرا ہے۔ ولاتھول کا قومی تحریک سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ گاندھی جی اور ہند ماتا پر ان کی نظم نے سینکڑوں آدمیوں کو متاثر کیا اور وہ ماتر بھومی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ کانگریس کے ترنگے جھنڈے پر ان کی نظم نے ملیالی باشندوں میں حب الوطنی کا ایک بے پناہ جوش پیدا کر دیا۔ ولاتھول صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے بلکہ آرٹ کے رسیا اور سرپرست بھی تھے۔ یہ ولاتھول ہی تھے جنھوں نے کیرالا کے فنون لطیفہ اور خاص کر کتھا کلی کو فروغ دینے کی غرض سے "کیرالا کلامنڈلم" کی بنا ڈالی۔

الور الور پرمیشور ایر صبر آزما محنت شاقہ کا نمونہ تھے۔ وہ ایک بلند پایہ اسکالر اور مورخ کے علاوہ بڑے ذہین شاعر تھے۔ وہ ملیالم کے ساتھ ساتھ تامل سنسکرت اور انگریزی کے بھی عالم تھے۔ ۱۹۲۰ تک پرمیشور ایر روایتی شاعری ہی کے ڈھرے پر چلتے رہے۔ لیکن اسان کی "کرونا" اور ولاتھول کی "مگدلانہ مریم" سے متاثر ہو کر انھوں نے اسی طرح کی ایک نظم لکھی جو "پنگلا" کہلاتی ہے۔ ان کی "اماکیرالم" ملیالم زبان کی ایک بہترین نظم ہے ان کی مشہور مختصر نظموں کے مجموعہ یہ ہیں۔ "ارونودیم" "تہاراکرم"، "کرناولی" "منی من جوشا" "تہارنگینی" اور "چترسالہ" "کرنا بھوشنم" اور "بھگتی دیپکہ" ان کی مشہور طویل نظمیں ہیں۔ احساسات اور جذبات میں شائستگی اور لطافت پیدا کرنا ان کا مقصد تھا۔ ان کی ایک مختصر نظم "پریم سنگیتم" سے اس کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی لکھی ہوئی ملیالم ادب کی تاریخ ایک جامع اور مستند تصنیف ہے اور سب ہی عالم اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ارکان ثلاثہ کے بعد کے شاعر سنہری دور کے ان عظیم شاعروں سے متاثر ہو کر کئی ہنر مند شاعروں نے اس میدان میں قدم رکھا اور ملیالم ادب کو اپنے کمال فن سے نوازا۔ ان میں "نالا پاٹو نارائن مینن" پلا تھورامن۔ کے ایم۔ پانیکر۔ ونی کلم گوپال کروپ۔ پی پنہی رامن نائر۔ کے کے راجہ بالامنی اما بادرجی۔ شنکرا کروپ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

نالاپاٹو نارائن مینن یہ ولاتھولال کے ایک جونیئر ہم عصر تھے۔ جو اپنی شاعری کی کمیت نہیں بلکہ کیفیت کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے ان کے

مختصر سرمایہ کی دو اہم تصانیف "کنو نیر تھلی" (آنسو) اور "چکر والم" (افق) ہیں۔ اول الذکر تصنیف ایک نوحہ ہے جو اپنے پر وقار اسلوب بیان کی وجہ سے کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی بیوی کی بے وقت موت سے متاثر ہو کر نارائن مینن نے بھی آنسو بہائے لیکن شاعر مینن نے اپنی فلسفیانہ موشگافیوں اور شاعرانہ زور بیان سے ہر قطرہ میں جان ڈال دی ہے۔

جی. شنکرا کروپ شنکرا کروپ کا شمار آج دنیا کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے خاص طور سے ایک لاکھ روپیہ کے پہلے گیان پیٹھ انعام کے بعد سے تو ان کی شہرت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ کروپ کو اپنی نظموں کے مجموعہ "وشوا درشنم" (کشف عالم) پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ (۱۹۶۳ء) بھی مل چکا ہے۔ ٹیگور کا ان پر گہرا اثر ہے اور ان ہی کے صوفیانہ اور رمزیہ تصورات نے کروپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا ہے ان کی مشہور انقلابی نظم "نالے" (فردا) کے مخاطب ستارے ہیں۔ انھوں نے ملیالم میں "اپکو تھار اساتی" (ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ ۱۰۱ نظموں کا انتخاب) اور ٹیگور کی "گیتا نجلی" کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی تصنیف "اوتک کو زہل" (Olak Kuzhal) جس پر گیان پیٹھ انعام ملا ۶۰ نظموں پر مشتمل ہے (۱۹۵۰ء)۔ اپنے مسلک کے لحاظ سے کروپ قوم پرست انقلابی سوشلسٹ اور ہیومنسٹ ہے۔

بالامنی اما ابتدائی عمر ہی میں ایک حساس شاعرہ بن گئیں۔ اپنی نظم "اما" (ماں) اور "متھاسی" (دادی) کی وجہ سے شہرت پائی۔ ان کی نظم Mazhuvinti Katha ڈرامائی خود کلامی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس میں "پرسورام" کو ایک نئے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

چنگم پزہا اس صدی کے چوتھے دہے میں شائقین ادب کو چنگم پزہا کی شاعری کا جنون سا ہو گیا تھا۔ ان کی نظموں کی موسیقیت اور سامعہ نواز خصوصیات کی وجہ سے انھیں "گان گندھروا" (آسمانی موسیقار) کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ جب ان کے ایک شاعر دوست راگھون پلے نے خودکشی کر لی تو اس پر "رام نان" کے نام سے ایک طویل نظم لکھی جو دیہاتی طرز بیان کا ایک نوحہ ہے۔ یہ ملیالم زبان کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ہے۔

چنگم پزہا ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے ملیالم کے ایسے بہت کم شاعر ہوں گے جنھوں نے چنگم پزہا کی طرح انگریزی شاعری کا اتنا وسیع مطالعہ کیا ہو اور اس سے لطف اندوز ہوئے ہوں۔ ان کا ڈکشن نہایت اعلیٰ، اسلوب سادہ، دل کش اور غنائی ہے لیکن دوسرے امور کی طرح وہ الفاظ کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں۔ انھوں نے کئی ایک لوک نغموں میں نئی جان ڈالی ہے۔

شاعروں کی جدید نسل چنگم پزہا کے ساتھ ملیالم شاعری میں ایک نیا موڑ آیا۔ یہ خیال کہ شاعری کو عام آدمی کے احساسات اور ان کی جدوجہد کا ترجمان ہونا چاہیئے، تقویت حاصل کرتا گیا۔ اسی مقصد سے ۱۹۳۷ء میں ترقی پسند ادب کی ایک تحریک شروع کی گئی۔ اس سلسلہ میں فوری طور پر جن شاعروں کے نام ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں: ادا سیری گوندن نائر، ویلوپلی سریدھر مینن، این. وی کرشنا واریر، او این. وی کروپ، ویالر رام ورما، اکی تھن، پالا نارائن نائر، این. پی. اپن اور سوگتا کماری۔

ناول اورافسانہ ملیالم زبان کی پہلی تصنیف جس میں ناول کی بنیادی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپو نیدن گادی کی "کنڈ التھا" ہے اس مصنف کو اسکاٹ اور شیکسپیئر سے بڑی دلچسپی تھی۔ لیکن ملیالم ناول نگاری کو حقیقت میں جس کتاب نے مہمیز کیا۔ وہ "اندولیکھا" ۱۸۸۹ء ہے۔ اس ایک ناول ہی سے چندو مینن کو دوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ اس نے ایک اور ناول "ساردا۔ حصہ اول" ۱۸۹۱ء بھی لکھا لیکن اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

"ساردا" سے مصنف کی حسن کارانہ صلاحیتوں اور کردار نگاری کی غیر معمولی مہارت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

ملیالم ناول نگاری کے پورے میدان میں ہمیں دو ہی جید شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو چندو مینن کی اور دوسری سی. وی. رامن پلے کی۔ موخر الذکر تریوندرم میں سرکاری ملازم تھے۔ ان کے پہلے ناول "مارتھنڈ اورما" ۱۸۹۱ء کی اشاعت کے ساتھ ہی وہ بہ حیثیت ناول نگار مشہور ہو گئے۔ "مارتھنڈ اورما" کی طرح اس کے دیگر اہم ناول بھی تاریخی ہیں۔ اس وقت تک ملیالم قارئین اس سے ناواقف تھے کہ خود ان کی تاریخ سے ایسا مواد دستیاب ہو سکتا ہے جسے حسن کارانہ انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کئی نقادوں نے "مارتھنڈ اورما" اور "آئی ون ہو" (اسکاٹ) کے مشترکہ عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رامن پلے کے دوسرے تاریخی ناول "دھرم راجہ" ۱۹۱۳ء اور "رام راجہ بہادر" حصہ اول و دوم ۱۹۱۷ء — ۱۹۲۰ء ہیں۔ "پریم امریتم" ۱۹۱۵ء کے نام سے ان کا ایک سماجی ناول بھی ہے۔ جہاں چندو مینن کا پلاٹ سیدھا سادا اور پیش کرنے کا انداز واضح ہے۔ وہیں رامن پلے کی کہانی کے تار و پود الجھے ہوئے اور اسٹائل گنجلک ہوتا ہے۔ اول الذکر اپنے زمانے کی سوسائٹی پر ہنستا ہے تو آخر الذکر ماضی کے گن گاتا اور اسے دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہے۔

ان دو استادانِ فن کے بعد اس صدی کے چوتھے دہے تک ناول کے میدان میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تاہم کئی ایک مقبولِ عام ناول لکھے گئے مثلاً کیرالا ورما کا "اکبر" اپن تھمپورن کا "بھوت رایار" کانن مینن کا "سینہ لتا" بھارت رتن نمبودری پد کا "اپشنے ما کل" اور کے. ایم پانیکر کا "کیرالا سمہم"۔ میں گزشتہ بیس پچیس سال سے ناول نگاری کے میدان میں نیا جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔ کیرالا کے چوٹی کے کئی افسانہ نگار اب ناول کی طرف

رجوع ہوئے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت ملیالم میں دو ہزار ناول موجود ہیں۔ ہم عصر مقبول عام ناول نگاروں میں حسب ذیل ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ تھا کذہی سیوا شنکر پلے، کیشو دیو۔ بشیر ایس۔ کے۔ پوٹی کاڈ، پی۔ سی کٹی کرشنن، ای۔ ایم کا وور آر۔ سی۔ کروپ، ایم۔ ٹی واسدیون نائر، پرپ پورا تھو، کے۔ سریندرن اور بالا بیٹور رام کرشنن۔

بعض جدید ناول جو داد تحسین حاصل کر چکے ہیں قابل ذکر ہیں۔ مثلاً تھا کدھی کا "چمین" نہ صرف ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ پا چکا ہے بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں۔ انگریزی، روسی اور دیگر یورپی زبانوں میں مقبول ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جس میں کیرالا کے ساحل کے مچھیروں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کیسو دیو کا "اڈاال میو" (گندگی سے) گندہ نلے میں پائی جانے والی ایک لاوارث یتیم لڑکی کی اثر انگیز کہانی ہے۔ محمد بشیر کا مسحور کن ناول "بال یا کالا سکھی" (دو دلوں کا افسانہ) جو کیرالا کے مسلم رسم ورواج کی قربان گاہ کے نذر ہو جاتے ہیں۔ وشا کنیکہ" از ایس۔ کے پوٹی کاڈ ایک مقبول عام ناول ہے "سندری کلم سندرن مارم" (حسین اور خوبصورت) میں کٹی کرشنن نے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے گہرے مشاہدات کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول نہ صرف اکیڈمی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے بلکہ "رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی" کا خصوصی انعام بھی پا چکا ہے۔ اس سلسلہ کے دو اور ناول یہ ہیں (۱) ایم۔ ٹی۔ واسدیون نائر کا "نالو کیٹو" اور (۲) پارپ پرا کھو کا" ان ویشی چو کانڈ تھی الا" ANVE SHICHU KANDETHIYILLA (سعی لاحاصل)
جدید ناولوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کا رجحان زیادہ تر حقیقت نگاری اور زندگی کی سچی عکاسی کی جانب مائل ہے اور وہ سماج کی تعمیر نو کے مسائل کو اپنا موضوع بنانا چاہتے ہیں۔

مختصر افسانہ

افسانہ ملیالم ادب کی کافی ترقی یافتہ صنف ہے۔ اس کے فروغ میں مغرب کے اثرات کا بڑا حصّہ ہے۔ ملیالم کے ابتدائی افسانہ نگار ہاتھارن اور ایڈ گرایلن پو جیسے امریکی افسانہ نگاروں سے متاثر تھے۔ ان میں اتوول کنجو کرشنا مینن، ایم۔ آر۔ کے۔ سی نارائن پڈووال۔ کے۔ سوکمارن اور ای۔ وی کرشنا پلے بہت ممتاز ہیں۔

موجودہ دور کے اکثر ناول نویسوں کی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ اوپر جن ادیبوں کے نام دئے گئے ہیں انھوں نے پہلے پہل افسانے ہی لکھے تھے۔ مثال کے طور پر تھا کدھی اپنی ایک کہانی کے ذریعہ منظر ادب پر آئے۔ ان کی یہ کہانی ایک کتے سے متعلق ہے جو طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ مزید افسانہ نگار یہ ہیں۔ للی تھمپیکہ انتار جنم۔ کروڑ نیل کنٹھ پلے۔ ویٹورامن نائر۔ پونکنم ورکی۔ پونجیکارا رامی۔ ین پی۔ چیلپن نائر۔ جی۔ ویویکا نندن۔ کے۔ سرسوتی اماں نندنار

اور کو وی لان۔

ملیالم ادب صحیح معنوں میں افسانوں ہی کی وجہ سے جمہوری روپ حاصل کر سکا۔ افسانوی پھولوں کی رنگ برنگی بہار دیکھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ ادب کسی کی میراث نہیں ہے اور نہ ہی ادبی موضوعات کو محدود یا مقید کیا جا سکتا ہے۔

ڈرامہ

ملیالم ڈرامہ کی تاریخ زیادہ سے زیادہ ۹۰ سال کی ہوگی اور اس میں بھی بڑا حصّہ ۱۹۴۰ کے بعد کا ہے ۱۸۸۲ میں کیرالا ورمانے کالیداس کے "شکنتلا" کا ترجمہ کیا جو ملیالم ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگوں کو "شکنتلا" کا یہ نیا پیراہن اسٹیج پر اور اسٹیج کے باہر دونوں جگہ بہت پسند آیا۔ چناں چہ اس کے بعد کئی قابل ادیبوں نے سنسکرت کے متعدد ناٹکوں کے ترجمے کیے۔ یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے کہ جس سرزمین نے مشہور عالم کتھا کلی کو جنم دیا وہاں ۱۸۸۲ء سے پہلے ڈرامائی ادب کا وجود ہی نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کیرالا میں خود اپنا منادری آرٹ اور لوک آرٹ موجود تھا جسے بہ آسانی اسٹیج پر پیش کیا جاتا تھا۔ سنسکرت ڈراموں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اسی رنگ میں بعض طبع زاد ڈرامے بھی لکھے گئے۔ اس کے بعد کیرالا میں تامل ناڈو کے غنائی ڈراموں نے اپنا رنگ جمایا اور ملیالم میں ان کی ہی تقلید کی جانے لگی۔

اس کے بعد کا (یعنی مغربی ڈراموں کے اثرات کا) دور ملیالم ڈرامہ نگاری کے ارتقا کا سب سے اہم دور ہے۔ اس دور میں کئی مغربی ڈراموں کو ترجمہ اور تلخیص کے ذریعہ ملیالی زبان میں پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی مغربی تکنیک کو اختیار کرتے ہوئے بعض طبع زاد ڈرامے بھی لکھے گئے۔ یہاں بھی ہمیں ناول نگار سی۔ وی رامن پلے ہی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اسٹیج کیے جانے کے قابل آٹھ مزاحیہ ڈرامے لکھے۔

ملیالم میں چند ایک تاریخی ڈرامے بھی موجود ہیں۔ ان میں مشہور ای۔ وی کرشنا پلے کا "راجہ کیشوداسن" کھنی کارا پدمنا پلے کا "ویلو تھمپی دلاوا" (Velluthampi Dalava) اور کپن کرشنا مینن کا "کیرالا ورما پزھاسی راجہ" (Kerala Varma Pazhasi Raja) ہیں۔ اس صدی کا سب سے بڑا مزاح نگار ای۔ وی کرشنا پلے ہے۔ اس نے "بی۔ اے مایا دی" اور "پرنائک میشن" (pranayakamishan) جیسے کئی مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ این۔ پی چلپن نائر اور ایم۔ جی کیسو پلے اسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

سوشل اور پولیٹکل ڈرامے

ڈراموں کے ذریعہ اکثر و بیشتر سماجی اور سیاسی مسائل بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی نوعیت پروپیگنڈہ کی ہو جاتی ہے کوچین ما پلا کا "مری اما" ملیالم کا سب سے پہلا سماجی ڈرامہ ہے۔ اس کے پس منظر میں عیسائی سوسائٹی ہے۔ اسی طرح وی۔ ٹی۔

بھٹا تر بھیدکا ڈرامہ۔

" ادو کالایل نی نم ارنگ گا تھیکا (Adukkalayil Ninum Arangathekа) (باورچی خانہ سے دیوان خانہ تک) تبوودری پد فرقہ کی عورتوں کی حالت میں ایک انقلاب لانا چاہتا ہے۔ چروکڈ کا لکھا " تھارو ادی تھم " ایک پر اثر سماجی ڈرامہ ہے جس میں نائر فرقہ کے مشترکہ خاندانوں کی بعض برائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کے۔ داموورن کا ڈرامہ " پٹے باقی " (بقایائے لگان) ایک پرجوش اور اثر انگیز سیاسی تمثیل ہے۔ بعض ڈراموں کے صرف عنوان ہی سے موجودہ رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً " منتری یاک کولے" (خدارا مجھے وزیر نہ بنایئے) " ننگالنے کمیونسٹ آکے " (مجھے تم نے کمیونسٹ بنایا) اور " جانیم کمیونسٹ وم "(اب میں کمیونسٹ بنوں گا) تھوپل بھاسی کا ڈرامہ " ننگالنے کمیونسٹ آکے ' کیرالا اسٹیج کا مقبول ترین ڈرامہ ثابت ہوا۔ اسے " کیرالا پیپلز آرٹ کلب " نے پیش کیا تھا۔ بھاسی نے جو کیرالا کا ایک ممتاز ڈرامہ نگار ہے۔ کم از کم ایک درجن اعلیٰ پایہ کے ڈرامے لکھے ہیں۔ اس کا ڈرامہ " اسوامیدھم " جو کیرالا کے باہر بھی مشہور ہے۔ ہندوستان میں مرضِ جذام کے مسئلہ سے بحث کرتا ہے۔ اداسیری گوندن نائر کا " کٹو کریشی " سماجی، سیاسی پس منظر پر مبنی ایک مشہور ڈرامہ ہے۔

نفسیاتی ڈرامے

جدید ڈرامہ نگار کسی سنجیدہ نفسیاتی سماجی مسئلہ کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنانا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر " ابسن " کی ان کی نظروں میں بڑی قدر ہے۔ ابسن کی تکنیک کو جس ڈرامہ نگار نے کامیابی سے اپنایا ہے وہ این۔ کرشنا پلے ہے اس کے ڈرامے " بھاگنا بھوتم " (شکستہ گھر) " کنیا کا " (کنواری) " بیلا بالم " (زور آزمائی) اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

بعض اور ممتاز ڈرامہ نگار جن کا تذکرہ ضروری ہے یہ ہیں :

کے۔ پدمنا بھ پلے، کے۔ کمار پلے، ٹی۔ این گوپی ناتھن نائر، پون کنم واکی، سی۔ رجے تھامس، کے۔ سرندرن، ٹی۔ رام کرشنا پلے اور ایس۔ ایل پورم سدانندن۔ بعض ڈرامہ نگاروں نے ریڈیائی ڈرامے اور یک بابی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

نثر نگاری

نثر نگاری تخلیقی بھی ہو سکتی ہے اور معلوماتی بھی۔ ناول اور افسانہ جیسے تخلیقی اصنافِ نثر کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ نثر کے دوسرے شعبوں میں ادبی تنقید، مضمون نویسی، سفرنامہ، سوانح نگاری وغیرہ جو عموماً تخلیقی سے زیادہ معلوماتی ہوتے ہیں۔ کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔

ہسپانوی زبان و ادب

ہسپانوی زبان کا شمار یورپ اور امریکہ کی اہم جدید زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ تحریری ہسپانوی زبان، جیسی کہ وہ آج ہے اور جو نہ صرف اسپین کے ادب کی بلکہ اس کی تمام نوآبادیوں کی ادبیات اور تہذیب کی امانت دار ہے۔ کیسٹیلین (Castilian) پر مبنی ہے۔ اور کیسٹیلین کی داغ بیل اس لاطینی زبان پر پڑی جو روم کے شہنشاہی دور میں ہسپانیہ کے کیسٹائل (Castile) نامی وسطی علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اس زبان کا تعلق خاندانِ السنہ کی اس شاخ سے ہے جو رومانس (Romance) کہلاتی ہے۔ لیکن اسپین میں صرف اسی ایک زبان کا چلن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کیٹلان (Catalan) اور گیلیشین (Galician) جیسی زبانیں بھی رائج ہیں جن کا اپنا علیٰحدہ ادب بھی ہے اس طرح اگرچہ اس ملک میں کئی زبانیں رائج ہیں اس کے باوجود مغربی یورپ اور امریکہ کے جن علاقوں میں ہسپانوی زبان بھی بولی جاتی ہے، وہاں اسے انگریزی زبان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہسپانوی زبان برازیل، ہر دو گیانا، گوانا، شمالی افریقہ کے مختلف علاقوں اور جزائر فلپائنز کے سوائے جہاں وہ انگریزی کے پہلو بہ پہلو رائج ہے، سارے جنوبی امریکہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسپین کے باہر ہسپانوی زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ کروڑ پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور خود ہسپانیہ میں اس کے بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ آج سے کوئی ایک ہزار سال قبل دسویں یا گیارھویں صدی میں ہسپانوی زبان ضبطِ تحریر میں آنے لگی تھی اور اس زبان کے بارھویں صدی کے چند مخطوطات دستیاب بھی ہیں۔

ہسپانوی زبان کی توسیع اور ترقی میں الفانسو ایل سیبیو (Alfonso El Sabio) (تیرھویں صدی) ڈان جوان مینوئیل (Don Juan Manuel) اور جوان روئز (Juan Ruiz) (چودھویں صدی) کو بڑا دخل رہا ہے۔ ۱۴۹۲ء میں انٹونیو ڈی نبریجا (Antonio de Nebrija) نے اس زبان کی صرف و نحو مرتب کر کے شائع کی جو یورپ کی تمام جدید زبانوں میں اولین گریمر مانی جاتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اسپین میں مختلف زبانیں جیسے اسٹریائی، لیونیز (Leonese) میرانڈیز (Mirandese) گیلیشین (Galician) اور ویلنشین (Valencien) رائج تھیں۔ علاوہ بریں پرتگالی اور کیٹلان (Catalan) زبانیں بھی ملک کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں ہسپانوی زبان ملک کے وسیع تر علاقوں میں بولی جانے لگی۔ سولھویں اور سترھویں

صدی میں اسپین کے سیاسی اقتدار کی توسیع کے ساتھ ساتھ ہسپانوی زبان بھی اس کے تمام مقبوضات میں پھیلتی گئی ۱۷۱۳ء میں اسپینش اکیڈمی (Spanish Academy) کا قیام عمل میں آیا تو اس کی کوششوں سے اس زبان کے خدوخال درست ہوتے اور صحت وسقم کے معیار کا تعین عمل میں آیا۔ اور اس طرح اسے دوسری زبانوں سے جا اور بے جا خلط ملط ہونے سے محفوظ کر دیا گیا۔ ہسپانوی زبان کی ایک شاخ جوڈیو (Judio) بھی ہے۔ یہ ان یہودیوں کے آبا و اجداد کی زبان ہے جو ۱۴۹۲ء کے ہنگاموں میں ملک بدر کر دیئے گئے تھے۔ لسانی اور ادبی تحقیق وتجسس کے موجودہ دور میں جوڈیو کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ اس زبان میں قدیم کیسٹیلین (Castilian) کی بُو باس موجود ہے اور چند عناصر اب بھی ایسے رہ گئے ہیں جن کا جدید ہسپانوی ادبیات میں نام ونشان تک نہیں ملتا۔ ہسپانوی زبان کی یہ شاخ نسبتاً زیادہ قابل قدر لسانی اور ادبی اقدار کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کا دامن قدیم ہسپانوی ادب کی ایسی تخلیقات سے بھی مالا مال ہے جن کا خود ہسپانوی ادب کے سرمایہ میں اب پتہ نہیں چلتا۔ جوڈیو تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ عبرانی حروف ہجی میں لکھی جاتی ہے اور عبرانی ہی کی طرح اسے دائیں سے بائیں پڑھا جاتا ہے۔

ہسپانوی ادب کا اولین شاہکار کینٹر ڈی میو سیڈ (Cantar de Mio Cid) (تخمیناً ۱۱۴۰ء) ہے۔ اس طویل نظم میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہسپانیہ کے قومی سُورما سیڈ (Cid) کے محاربات اور معرکوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس دَور میں نظمیں ضبط تحریر میں نہیں لائی جاتی تھیں۔ نظم گو اور نظم خوانوں کے حافظے پر ان کے وجود کا دار ومدار ہوتا تھا۔ رجز خواں اور داستان گو محاربات کے دوران اور خاص مجمعوں میں یہ نظمیں محض حافظے کی مدد سے اثر انگیز انداز میں بہ آواز بلند سُنا کر حاضرین کو گرماتے اور ان کے جوش وخروش کی آگ کو بھڑکاتے تھے۔ اس لیے اس قسم کی بیشتر نظمیں معدوم ہو گئیں۔ مستقل اور آفاقی اقدار کی حامل معیاری شعر گوئی کا آغاز اس کے مدّتوں بعد تیرھویں اور چودھویں صدی میں ہوا جس کا سہرا گونزالس ڈی بریکو (Gonzalez de Bereceo) (تخمیناً ۱۱۹۵ء) کے سر ہے۔ وہ اولین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جس نے حضرت مریم کے معجزات مسیحی اولیا کی کرامات اور ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی اسپین کی روایات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ الفانسو دی وائز (Alfonso The Wise) اسپین کا سب سے زیادہ ممتاز ادب نواز بادشاہ گزرا ہے جس نے سب سے پہلے اسپین کی تاریخ مرتب کی۔ اس قابل قدر تالیف میں نہ صرف اسپین کے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں بلکہ قدیم رزمیہ نظمیں، کے قصے، کہانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ الفانسو اولین ہسپانوی نثر نگار تھا۔ اس نے لاطینی کی جگہ ہسپانوی کو کلچر کی زبان قرار دیا۔ اور ایک سررشتہ تالیف وترجمہ قایم کر کے کلاسیکل، مشرقی، عبرانی اور مسیحی ادب کو ایک دوسرے سے آشنا اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ تالیف وترجمہ کے بعد تخلیقی تصانیف کے شاندار دور کا آغاز ہوا جس کی بہترین تخلیقات ڈان جوان مینویل (Don Juan Manuel) (۱۲۸۲ء-۱۳۴۸ء) کی نثر اور جُوان روئز (Juan Ruiz) تخمیناً (۱۲۸۳ء-۱۳۵۰ء) کا مجموعہ کلام ہیں۔ جوان مینویل کی تصنیف کردہ بارہ اخلاقی حکایات بہت مقبول ہوئیں۔ ان حکایات پر عربی کا اثر نمایاں ہے لیکن اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ابتدائی دور کے ہسپانوی ادب میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

چودھویں صدی کا ایک ادبی کارنامہ "لبرو دی بیون امور" (Libro De Buon Amor) ہے۔ یہ نظم دل چسپ اور رنگا رنگ حکایات اور کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کا مصنف جوان روئز (Juan Ruiz) تھا جو زیادہ تر "ہیٹا کا صدر پادری" (Archpriest of Hita) کے نام سے مشہور ہے۔ روئز نے جو اسلامی طرز فکر سے متاثر تھا، اس نظم میں اپنے دور کی سماجی برائیوں کو ہدف ملامت بنایا ہے اور اس کا شمار ہسپانوی نشاۃ ثانیہ کے اوّلین عَلم برداروں میں کیا جاتا ہے۔ اسپین میں احیائے علوم ۱۴۷۵ء میں شروع ہوا جس کا عمل کوئی ایک صدی تک جاری رہا۔ اس تحریک کے دوران ادبیات سے متعلق ایک نیا تنقیدی شعور پیدا ہوا۔

سولھویں اور سترھویں صدی کو ہسپانوی ادب کا زرّیں دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کے قدیم ادب عالیہ سے ایک نئی دل چسپی پیدا ہو گئی جس سے ادبی تخلیق کے رجحان کو بڑھاوا ملا۔ تخلیقی اُپج نے اظہار کی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں جدّت طرازی اور اختراع کاری اس دَور کا نشانِ امتیاز بن گئی۔ اس میدان میں سب سے زیادہ سُرخ رُو "گارسیلا سو دی لا ویگا" (Garcilaso de Lavega) رہا۔ اس نے ایسی کئی بحریں استعمال کیں جو اسپین کے لیے بالکل نئی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی روایتی ڈگر سے ہٹ کر شعر میں عشق ومحبت کی حقیقی جذبات نگاری کا آغاز ہوا۔ سلا مانکا کے عالم دین "فرے لوی' دی لیون" (Fray Luis de Leon) (۱۵۲۷ء-۱۵۹۱ء) نے جو ہیئت اور اسلوب سے زیادہ موضوع اور مواد کو اہمیت دیتا تھا، اخلاق وکردار سے متعلق پند آموز نظمیں لکھیں۔ ایک اور عظیم شاعر سینٹ جان آف دی کراس۔ (St. John of the Cross) نے مذہب اور روحانیت کے رموز اور نکات کو کمال جذب واثر کے ساتھ شعر کا جامہ پہنایا۔

ابتدائی ہسپانوی نثر عربی ادبیات سے بڑی حد تک متاثر تھی ۱۰۸۵ء میں مسیحیوں نے ٹولیڈو (Toledo) کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا تو یہ علاقہ مشرقی تصانیف اور تالیفات کے تراجم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ عربی سے ہسپانوی میں جو تراجم ہوتے ان میں قیمتی پتھروں کے خواص، شطرنج سے متعلق تصانیف اور کلیلہ ودمنہ بھی شامل ہیں۔ ۱۱۲۰ء میں مختلف ہسپانوی ادیبوں نے مشرق کے اخلاق آموز داستانوی ادب کو غیر عربی دانوں سے روشناس کرایا۔ یوں تو ہسپانوی ادب میں داستان سراؤں اور افسانہ نویسوں کی کمی نہیں لیکن سب سے زیادہ نمایاں مقام اور عالمی شہرت اور مقبولیت

ڈان کیہوتے (Don Quixote) کے مصنف میگوئیل ڈی سروانٹس (Miguel de Cervantes) کو حاصل ہے۔ ڈان کیہوتے قرونِ وسطیٰ کے دل پھینک، بے سبب آمادہ بہ جنگ، شمشیر بکف سورماؤں کی معرکہ جو سرگرانی پر ایک نہایت سخت طنز ہے جس کے نشتر کی تیز دھار کو مزاح کی چاشنی نے تیز تر کر دیا۔ سروانٹس کی اس تصنیف سے ناول کی صنف کے امکانات کا پتہ چلا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ ناول سے تنقید و تفسیرِ حیات کا کام لیا جا سکتا ہے اور اس کے فلسفیانہ امکانات بہت وسیع ہیں۔ ناول حرکت و عمل کے تانے بانے سے آگے بڑھتا ہے۔ خالی خولی حسنِ بیان اور چرب زبانی سے بامقصد بلند پایہ ادب وجود میں نہیں آسکتا۔ اس شہرۂ آفاق ناول ڈان کیہوتے کو مشہور ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اردو کا جامہ پہنایا جو خدائی فوجدار کے نام سے مشہور ہے۔ سروانٹس نے اس کے علاوہ اور کئی ناول لکھے ہیں اور نقادانِ ادب کا خیال ہے کہ اگر وہ ڈان کیہوتے نہ لکھتا تو بھی اپنی ان دوسری تخلیقات کی بدولت اسپین کا سب سے بڑا مصنف مانا جاتا۔ اس دور میں اسپین میں چند ڈرامہ نویسوں نے بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ ان میں لوپ دی ویگو کارپیو (Lope de vega Carpio) ٹرسو دی مولینا (Tirso De Molina) اور جوان روئنز دی الرکان (Juan Ruiz de Alarcon) شامل ہیں۔ ان کے تصنیف کردہ منظوم ڈرامے موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے شیکسپیر کے ڈراموں کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں فرانس کا حکمراں بوربن (Borbon) خاندان اسپین پر قابض ہوگیا تو ہسپانوی اہلِ قلم فرانسیسی ادب کے بے جان نقال بن کر رہ گئے۔ اور ہسپانوی ادب میں جمہوریت پسندی اور حقیقت نگاری کی جو روایات بارہویں صدی سے چلی آرہی تھیں وہ بُری طرح متاثر ہوگئیں۔ اس دور کی کوئی شعری تخلیق یا نثری تصنیف قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ ایک عظیم ڈرامہ نگار لیونارڈ وایف موراتن کو اس دور کا ادبی حاصل کہا جا سکتا ہے۔ نثر میں ایک نیا عنصر یہ داخل ہوا کہ سائنسی ترقیات و انکشافات اور سیاسی افکار اور مسائل کو موضوع بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔

انیسویں صدی میں نپولین کے مقابلے میں جنگ کا آغاز ہوا تو وطن پرستی کے جذبات ہسپانوی ادب میں ابھرنے لگے۔ اور قرونِ وسطیٰ کی جانب دانشوروں کی نظریں پھر ایک بار پلٹ گئیں جس کا مقصد گزشتہ قومی عظمت کے شعور کو تازہ کر کے قوم میں اعتماد کا جذبہ پیدا کرنا اور حملہ آوروں کے خلاف اکسانا تھا۔ اس دور اور اس کے ماضی قریب کی زندگی سے متعلق اولین ناول فرنان کیبالیرو (Fernan Caballero) کے لکھے ہوئے ہیں جن میں اندلس کے سماجی اور سیاسی حالات اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ قومی وقار کا شعور ان ناولوں کے ذریعہ پیدا ہوا تو ہسپانوی ناول کے بے روح قالب میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ بنیٹو پیریز گالڈوز (Benito Perez Galdos) نے ملک کی ہم عصر زندگی اور پس ماندگی کا اصلاحی نقطۂ نظر سے ناقدانہ مطالعہ کیا اور تعمیر و ترقی کی راہیں سجھائیں۔ اس نے اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ایک دو نہیں بلکہ پینتالیس (۴۵) ناول لکھے جو اس کے ستر سالہ مشاہدات اور تجربات کا بصیرت افروز نچوڑ سمجھے جاتے ہیں۔

امریکہ کے مقابلے میں جب اسپین کو شکست ہوئی تو اہلِ اسپین کو اس کی تباہ کاری اور تلخی نے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ بعض دانشمندوں نے شکست کے اسباب کی تحقیق کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ شکست کی ذمہ داری زیادہ تر قومی قوتِ ارادی کی کمزوری اور ناعاقبت اندیشی پر عائد ہوتی ہے۔ اس رائے کے حامی دانشور ۱۸۹۸ء کی نسل کہلاتے ہیں ان کا خیال تھا کہ اسپین پس ماندہ ہے۔ اسے آگے بڑھ کر یورپ کے ترقی یافتہ طاقتور ملکوں کی صف میں شریک ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ مختلف ملکوں کے حالات اور وہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام اور اداروں کے مطالعے کی روشنی میں قوم کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ ادیبوں کی یہ نسل انیسویں صدی کے بیشتر مصنفین کی تحریروں سے بدظن اور برگشتہ ہوگئی۔ شعر و ادب کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی ضرورت کا احساس عام ہوگیا؛ جس کا عکس اس دور کے ادب میں نظر آتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس نسل کے بیشتر اہلِ قلم کا شمار مصلحانِ قوم میں کیا جاتا ہے۔ جے۔ بناوینٹو (J. Benavento) نے ڈرامے اور اسٹیج کی مہم شروع کی اور اس قدر نمایاں حد تک کامیاب رہا کہ ۱۹۲۲ء میں نوبل انعام کا مستحق قرار پایا۔ اس نے بچوں کے لیے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ بچوں کے لیے ایک دل چسپ، سبق آموز ڈرامہ ایک ایسے شہزادے سے متعلق ہے جس کو راست زندگی سے ربط پیدا کرنے اور تجربے اور مشاہدے سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا اور جس کی تمام تر معلومات محض کتابی تھیں۔ پیو بروجا (Pio Baroja) نے ناول کے خدوخال درست کیے۔ جوس مارٹینز (Jose Martinez) نے ادبی نقاد، اور ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اس کی تخلیقات کا مقصد بھی عظمتِ گزشتہ کی یاد کو تازہ کر کے قوم کو ابھارنا تھا۔ اس نسل کا سب سے زیادہ ممتاز مصنف آگسٹو پیریز (Augusto Perez) مانا جاتا ہے۔ جو نہ صرف ایک فلسفی تھا بلکہ ایک ممتاز ناول نویس، صاحبِ طرز نثر نگار، اور سربرآوردہ شاعر بھی تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہسپانوی ناول اپنے اثر اور ہمہ گیری کے اعتبار سے اس صنف کی بہترین عالمی ادب کی تخلیقات کا ہم پلہ ہوگیا۔ کئی ناول نویس منظرِ عام پر آئے۔ جن میں ریمن پیریز دی ایالا (Ramon Perez de Ayala) بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے ناول اپولینو (Apolini) اور بیلارمینو (Belarmino) میں دیہی علاقے کے دو غیر معمولی کرداروں کی زندگی کی جو کشمکش دو نر تھے، فکر انگیز تصویر کھینچی ہے۔ اور عقل اور عقائد کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو پُرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔

روبن داریو (Ruben Dario) (۱۸۶۷ء-۱۹۱۶ء) لاطینی امریکی شاعر نے ۱۸۹۲ء میں اسپین پہنچ کر وہاں ادب جدید کی داغ بیل ڈالی۔ یہ تحریک انیسویں صدی کی بورژوا مادّیت پرستی کے خلاف ایک

ردِّ عمل تھی۔ اور اس میں نئی ادبی قدروں کے ساتھ جمالیاتی اقدار کا نمایاں مقام تھا۔ داریو کا کلام دوسری خوبیوں کے علاوہ موسیقیت بھی لیے ہوتے تھا۔ اور اس نے نئی نئی بحروں اور قوافی کے استعمال میں اجتہاد کے ذریعہ ہسپانوی شاعری کی حدود کو وسیع تر کر دیا ۱۸۹۸ء کی نسل اور 'ادب جدید' کی تحریکیں تاریخی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت قریب تھیں لیکن اس کے باوجود ان میں کوئی باہمی ربط نظر نہیں آتا۔ ابتدا میں ادبِ جدید کی تحریک کا رجحان زندگی اور سماج سے فرار اور گوشہ نشینی کی جانب تھا اور اس روش کی وجہ سے یہ تحریک ہسپانوی ادب میں کوئی قابلِ قدر اضافہ بھی نہ کر سکی۔ اس گروہ کے تمام لکھنے والے اپنی تخلیقات میں ہیئت اور لفظی صورت گری پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔ اس کے برخلاف ۱۸۹۸ء کی نسل کے لکھنے والے موضوع اور مواد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر ایک صالح اور بامقصد ادب کی تخلیق تھی۔ جوان ریمن جمینیز (Juan Ramon Jimenez) – (۱۸۸۱ء – ۱۹۵۱ء) کی رائے میں شاعری زندگی سے فرار نہیں بلکہ عین حیات ہے۔ اس نے روایتی قیود کو توڑ کر نظمِ معریٰ میں کمال دکھایا جس کی بدولت اسے اپنے بیشتر شاعرانہ احساسات اور خیالات کو قلم بند کرنے کا موقع مل گیا۔ ادب جدید کی تحریک کے تمام طریقوں کا تجربہ کر کے اور اس کے مناسب عناصر کو اپنا کر وہ اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر بن گیا۔

فیڈیریکو گارسیا لورکا (Federico Garcia Lorca) اس عہد کا نہایت ممتاز ڈرامہ نگار اور شاعر تھا۔ شعر و ادب میں اس کا مقام عالمی اعتبار سے اس کے انتقال کے بعد بڑھ گیا۔ اس کی نگاہیں حیات کے بنیادی مسائل اور انسانی جذبہ و فکر کے اساسی محرکات پر رہتی تھیں اور اس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو رُو بہ کار لا کر ثابت کر دیا کہ ڈرامہ کس طرح رُوحِ عصر کی پیکر تراشی کے ذریعہ دلوں کو گرما سکتا ہے اور شعر کے ذریعہ حرّیت اور صداقت کے لیے جد و جہد کی فضا کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کی تصانیف پرائمر رومانسرو گٹانو (Primer Romancero Gitano) (۱۹۲۸ء) اور پوئما ڈیل کانٹو ڈو (Poema del Cante Judio) (۱۹۳۱ء) سے اس کی اعلیٰ ترین ادبی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ لورکا کی تصنیفات دنیا بھر کے آزادی اور انصاف پسندوں کی امنگوں کی زبان بن گئیں۔ اس کی نظموں اور ڈراموں کا ترجمہ ہندوستان کی بعض زبانوں میں ہو چکا ہے اور اس کے ڈرامے بھی ہندوستان میں اسٹیج پر پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس عہد کے دوسرے قابلِ ذکر شعرا کا تعلق قبل جنگ نسل سے تھا۔ وہ گارسیا لورکا کے ہم عصر اور داریو (Dario) اور یوان ریمن جمینیز کی قایم کردہ روایات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء میں متعدد نئے شعرا منظر عام پر آتے۔ جن میں جارج گوئلن (Jeorge Guillen) جیرارڈ و ڈیگو سینڈویا (Gerardo Diego Cendoya) ونسنتی الکزنڈر — (Vicente Aleixandre) ریفیل البرٹی (Rafael Alberti) اور مینویل التولاگیر (Manuel Altolaguirre) شامل ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کوئی بلند مقام یا عالمی شہرت حاصل نہ کر سکا۔

ہندی زبان و ادب

بھاشا، بھاکھا، بھاکا، ہندوی، ہندوی، ہندی اور ہندوستانی یہ سارے الفاظ اس زبان کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں جس کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی میں ہوا اور جس کی نشو و نما آج بھی جاری ہے۔ تاریخی اور جغرافیائی اسباب سے وقتاً فوقتاً اس زبان کے لیے ان ناموں کا استعمال ہوا جو لوگ سنسکرت میں لکھتے تھے وہ بول چال کی زبان کے لیے بھاشا، بھاکا یا بھاکھا لفظ استعمال کرتے تھے۔ سنسکرت کی کتابوں کا خلاصہ بھاکا میں کیا جاتا تھا تاکہ عام لوگ ان کا مطلب سمجھ سکیں۔ بہت دنوں تک بھاکا سنسکرت کی تشریح کا کام کرتی رہی۔

جب مسلمان ہندوستان میں آتے تو انھوں نے ان تمام زبانوں کے لیے ہندوی، ہندوی یا ہندی لفظ کا استعمال کیا جنھیں یہاں کے باشندے بولتے تھے۔ ہندوستانی یا معیاری ہندوستانی کا استعمال ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں یورپ کے رہنے والوں نے ایسی زبان کے لیے کیا جو ہندی اور اردو کی ملی جلی شکل تھی۔ آگے چل کر مہاتما گاندھی نے ہندوستانی لفظ کا استعمال ایک مخلوط ہندی اردو زبان کے لیے کیا جو ایک ساتھ دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جا سکتی تھی۔

ان لفظوں سے مراد چاہے جو زبان رہی ہو آج یہ سارے نام متذکرہ زبان کے خاص اسلوب کو ظاہر کرتے ہیں اور لسانیات کے طالب علم کو زبان کے ایک روپ کو دوسرے سے الگ کرنے کے لیے ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

آج کل ہندی الفاظ کا استعمال حسب ذیل زبانوں کے لیے ہوتا ہے۔

۱۔ وہ زبان جو ہندوستان کے دستور میں مرکزی حکومت اور ریاستوں کے مابین رابطہ کی زبان کی حیثیت سے تسلیم کی گئی ہے۔ دستور کی ہدایت کے مطابق اس زبان کے الفاظ سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی دوسری نمائندہ زبانوں سے بھی لیے جائیں گے۔ اس زبان کی نشو و نما ایسے خطوط پر ہو گی جو ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو نمایاں کر سکے۔ ہمارے دستور نے ہندوستان کی جن زبانوں کو نمائندہ زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے ان میں ہندوستان کی قدیم زبانوں میں سے صرف سنسکرت کو ہی جگہ مل سکی ہے۔ بقیہ تیرہ زبانیں آج کل ادب اور بول چال میں رائج ہیں۔ پرانی زبانوں میں پراکرت اور اپ بھرنش کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوا۔ تسلیم شدہ زبانوں میں سنسکرت کے علاوہ جنوبی ہند کی زبان میں تامل، ملیالم، تلگو اور کنڑ، مشرقی ہندوستان کی زبان بنگالی، آسامی اور اڑیہ، جنوب مشرقی ہندوستان کی مراٹھی، مغربی ہندوستان کی گجراتی، شمال مغربی ہندوستان کی پنجابی اور کشمیری شامل ہیں۔ کل ہند زبانوں میں اردو ہندی اور ہندوستانی کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔

۲۔ وہ زبان جو آج کل راجستھان اور پنجاب کی مغربی سرحدوں سے شروع ہوکر بہار کے مشرقی حدود تک اور اترپردیش کے شمالی علاقوں سے لے کر مدھیہ پردیش کے جنوبی علاقوں تک ادبی زبان کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

۳۔ ہندوستانی زبانوں کا ایک خاص گروہ جس کے لیے ناگری رسم الخط استعمال ہوتا ہے۔ اس گروہ کی زبانوں کو بولنے والے جغرافیائی تہذیبی اور سماجی اعتبار سے متعدد امور میں یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ ان زبانوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ **بہاری گروہ** ۔ اس میں میتھیلی، مگہی اور بھوجپوری شامل ہیں۔

۲۔ **مشرقی گروہ** ۔ اس میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں۔

۳۔ **مغربی گروہ** ۔ اس میں کھڑی بولی، ہریانی، برج، قنوجی اور بندیلی شامل ہیں۔

۴۔ **راجستھانی گروہ** ۔ اس میں جے پوری، میواتی، اہیرانی، میواڑی، مارواڑی، ہڑوتی اور مالوی شامل ہیں۔

۵۔ **پہاڑی گروہ** : اس میں گڑھوالی، کمایونی اور ہماچل کی بولیاں شامل ہیں۔

۶۔ **متفرق گروہ** : یہ بھیلی اور طوی لبستر کی بولیوں پر مشتمل ہے۔

لفظ ہندی کا استعمال جب متذکرہ چھ گروہوں کے لیے کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ان گروہوں کی تمام بولیاں ادبی ہندی سے نکلتی ہیں یا ادبی ہندی میں ضم ہو چکی ہیں ان چھ گروہوں کی متعدد زبانیں خود بھی ادبی زبانیں رہ چکی ہیں اور آئندہ بھی ان کو ادبی حیثیت حاصل ہوسکتی ہے۔ مثلاً مغربی گروہ میں برج اور مشرقی گروہ میں اودھی۔ بہاری گروہ میں میتھیلی اور راجستھانی گروہ میں مارواڑی۔ ادبی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ زبانیں رہی ہیں۔

ڈاکٹر جی۔ اے۔ گریرسن اور ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے بہاری اور مشرقی گروہ کی زبانوں کو پوربی ہندی اور مغربی گروہ کی زبانوں کو پچھمی ہندی کے نام سے یاد کیا ہے۔

۴۔ "ہندی" کا استعمال اس بولی کے لیے بھی ہوتا رہا ہے جو دلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی ہے۔

۵۔ طویل عرصے تک "ہندی" لفظ کا استعمال اس معیاری اور ادبی زبان کے لیے بھی ہوتا رہا جو آج "اردو" کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ہندی اور اردو کا نشو ونما ایک ہی بولی سے ہوا ہے۔ عرصہ دراز تک نشو ونما پانے کے بعد ادبی ہندی اور اردو میں کافی فرق آچکا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی کوئی بھی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی قریب نہیں ہیں جتنی اردو ہندی ہیں۔ دونوں کا ڈھانچہ اور قواعد کافی حد تک ایک ہیں اور کچھ حد تک دونوں کا ذخیرۃ الفاظ بھی مشترک ہے۔

آج ہندی کا جو روپ ادب میں استعمال ہو رہا ہے یا جسے ہندوستان کے دستور میں مرکزی سرکار کے لیے دفتری زبان کا درجہ حاصل ہے اس کی بنیاد وہ زبان ہے جو سابقہ ریاست رامپور، مرادآباد، بجنور، میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور، دہرہ دون کے میدانی علاقوں اور انبالہ اور پٹیالہ کے مشرق میں بولی جاتی ہے۔ ہندی سے تعلق رکھنے والی دوسری بولیوں سے فرق کرنے کے لیے اس بولی کو کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کھڑی بولی نے ادبی زبان کی شکل میں دلی میں نشو ونما پائی۔ شہر دلی ایک طرف ہریانہ سے جڑا ہوا ہے اور اس کے تین طرف وہ علاقے ہیں جہاں بانگڑو، برج، راجستھانی اور کھڑی بولی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلی میں نشو ونما پانے والی کھڑی بولی پر بانگڑو، برج، ہریانی اور راجستھانی کے ساتھ ساتھ کچھ تاریخی اسباب کی بنا پر پنجابی کا اثر بھی نمایاں ہے۔

ہندی ایک جدید آریائی زبان ہے۔ وسطی ہند آریائی دور میں ہندی سے متعلق بولیوں کا تعلق کسی ایک پراکرت سے نہیں تھا۔ بہاری گروہ کی زبانیں ماگدھی پراکرت سے نکلی ہیں۔ موجودہ ہندی کی بہ نسبت یہ زبانیں بنگالی، آسامی اور اڑیہ سے زیادہ قریب ہیں۔ مشرقی ہندی سے متعلقہ بولیاں اردھ ماگدھی پراکرت سے وابستہ ہیں برج اور کھڑی بولی کا سرچشمہ شورسینی ہے۔ ہندی سے متعلقہ تمام بولیوں کا استعمال گیارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے اگرچہ ساتویں آٹھویں صدی کی شاعری میں ایسے حوالے ملنے لگتے ہیں جو اپ بھرنش میں رائج نہیں تھے۔ آٹھویں سے دسویں صدی تک اپ بھرنش میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں موجودہ ہندی میں استعمال ہونے والے بہت سے روپ مل جاتے ہیں۔ ساتویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک کے جن شاعروں کی مثنویوں اور رزمیہ و بزمیہ شاعری میں ادھر ادھر ہندی کے کچھ روپ دکھائی دیتے ہیں ان میں ملکھیڑ کے راشٹر کوٹون کا درباری شاعر پشپ دنت اور بہت سے سدھ قابل ذکر ہیں۔ سرہپا نامی سدھ کی شاعری کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ گجرات کے ہیم چندر سوری (گیارہویں صدی عیسوی) نے اپنے اپ بھرنش کی جو قواعد لکھی ہے اس میں موجودہ ہندی کے بہت سے روپ ملتے ہیں۔

چندر دھر شرما گلیری نے اس زمانے کی ہندی کو "قدیم ہندی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ کھڑی بولی کے لیے ایک زمانے میں "دہلوی" کا نام بھی رائج تھا۔ ہندی (کھڑی بولی) کے سب سے پہلے مصنف کی حیثیت سے امیر خسرو (چودہویں صدی عیسوی) کا نام لیا جاتا ہے۔ اب تک ان کی کوئی مستند تصنیف دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ سنت کبیر کھڑی بولی کے علاقے سے دور بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزرا لیکن انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ بھوجپوری کے علاوہ راجستھانی، پنجابی اور کھڑی بولی کی ملی جلی شکل ہے۔ چودہویں صدی سے سترہویں صدی تک شمالی ہند میں کھڑی بولی کا ادب دستیاب نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اودھی اور برج دونوں بولیاں عروج پر تھیں تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں پہلے اودھی اور بعد میں برج میں اونچے پایہ کا ادب لکھا جاتا رہا۔ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے برعکس جنوبی ہندوستان میں کھڑی بولی میں بہت کچھ لکھا گیا۔ کھڑی بولی کا یہ روپ "دکنی" نام سے مشہور ہے۔ گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ کے نواح میں جو ادب پیدا ہوا اس میں کھڑی بولی کی شکل محفوظ حالت میں ملتی ہے۔ اس ادب سے موجودہ ہندی اور اردو دونوں کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔

نام دیو، ایکناتھ، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین

اعلیٰ، محمد قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، نصرتی، ابن نشاطی جیسے بے شمار بلند پایہ شاعروں نے کھڑی بولی کو ادبی شکل دینے میں حصہ لیا۔ گجرات میں بھی اس زمانے میں کھڑی بولی کا ادب فارسی رسم الخط میں نشو ونما پاتا رہا۔

اٹھارویں صدی میں ہندی نثر کا روپ بہت نکھر کر سامنے آیا۔ سب سے پہلے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ہندی نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۰۱ء کے آس پاس ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز اہلکاروں اور افسروں کے لیے ہندی نثر میں معیاری کتابیں لکھوائیں۔ کلکتہ میں اس کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ یہاں للولال اور دوسرے ادیبوں نے ہندی نثر میں متعدد کتابیں لکھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں دلی سے لے کر مرشدآباد (بنگال) تک بڑی بڑی منڈیاں قائم ہوئیں۔ تجارت کے لیے لوگ دور دور سے آنے جانے لگے۔ تاجر خاندان جہاں گئے اپنے ساتھ ہندی لیتے گئے۔ تجارت اور دور دور تک آمد و رفت کی وجہ سے ہندی نثر نے ایک خاص شکل اختیار کی۔ برج، اودھی اور دیگر علاقائی زبانوں کا اثر کم ہوتا گیا۔ چھاپہ خانوں کی وجہ سے بھی ہندی نثر کو ٹکسالی شکل اختیار کرنے میں مدد ملی۔

۱۸۵۰ء کے آس پاس ٹھاکر لکشمن سنگھ نے ہندی نثر کو اس طرح ڈھالا کہ اس میں فارسی عربی کے وہ الفاظ ہی بچے رہ گئے جو روزمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔ راجہ لکشمن سنگھ کے خلاف بنارس کے شیو پرساد ستارۂ ہند، ہندی کو ایسی زبان کی شکل دیتے رہے جس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ بھارتیندو ہریش چندر نے ہندی نثر کو ایک خاص رنگ میں ڈھالا جس میں عربی فارسی کے الفاظ بہت کم تھے۔ ہریش چندر نے ادب میں روزمرہ کی زبان کو استعمال کیا۔

انیسویں صدی کے ختم ہونے تک جہاں تک نثر کا سوال تھا۔ کھڑی بولی کا استعمال رائج ہو چکا تھا لیکن شاعری برج بھاشا میں ہی کی جا رہی تھی۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ کھڑی بولی میں شاعری کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس زمانے میں شری دھر پاٹھک اور کچھ شاعروں نے کھڑی بولی کا استعمال کیا لیکن بیشتر شاعر برج کا ہی استعمال کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء-۱۹۰۳ء کے آس پاس مہاویر پرشاد دویدی نے اس بات پر زور دیا کہ نثر اور نظم کی زبان ایک ہونی چاہیے کچھ لوگ آج تک برج بھاشا میں لکھ رہے ہیں لیکن اس صدی کے آغاز کے ساتھ ہندی نثر اور نظم میں زبان کا فرق مٹتا چلا گیا۔

مہاویر پرساد دویدی نے ہندی کے قواعد کے اصولوں کی پابندی کے ساتھ معیاری زبان بنانے پر زور دیا۔ ان کی وجہ سے ادبی ہندی علاقائی اثرات سے نجات پا سکی۔ اسی زمانے میں اسے ایک کُل ہند زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

دوسری جدید آریائی زبانوں کی طرح ہندی بھی قدیم آریائی زبان کی وارث ہے۔ ہندی نے افعال کے مادے اور بیشتر اسما پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے توسط سے ورثہ میں حاصل کیے ہیں۔ اس کے جملوں کی ساخت اور اصوات دراوڑی اور کول خاندان کی زبانوں سے متاثر ہیں۔ ہندی نے متعدد بیرونی زبانوں سے بھی اسما مستعار لیے ہیں۔ اس سلسلہ میں عربی، ترکی اور فارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موجودہ زمانے میں انگریزی سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے اور فرانسیسی، پرتگالی و دوسری بیرونی زبانوں کے الفاظ کو بھی حسب ضرورت اپنایا ہے۔

ہندی ادب

تاریخی اور ثقافتی اسباب کی بنا پر ہندی بولنے والے علاقہ میں ایک بولی ترقی کرتے کرتے ادبی اور معیاری زبان کے رتبہ پر پہنچی ہے۔ بولی استعمال ہی سے سنورتی ہے۔ جب ادبی زبان میں جمود آنے لگتا ہے تو دوسری بولی آگے بڑھ کر اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ راجستھانی، میتھلی، اودھی اور برج باری باری سے عرصۂ دراز تک ادب کی زبان رہ چکی ہیں۔ برج کے بعد کھڑی بولی نے ادبی دھارا کو آگے بڑھایا۔ موجودہ ہندی ادب کی گنگا میں ہندی علاقہ کی تمام بولیاں بہتے بہتے آ ملیں۔

تاریخی اعتبار سے ہندی ادب تین ۳ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
ابتدائی دَور: ۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک پانچ سو سال۔ وسطی دَور: ۱۳۰۰ء سے ۱۸۵۰ء۔ پانچ سو سال۔ عہد حاضر: ۱۸۵۰ء سے اب تک۔ سوا سو سال اپنی خصوصیات کے لحاظ سے عہد وسطیٰ کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ پہلا دور ۱۳۰۰ء سے ۱۶۵۰ء تک تین سو پچاس سال پر پھیلا ہوا ہے۔

دوسرا دَور ۱۶۵۱ء سے ۱۸۵۰ء کے دو سو سال کو گھیرتا ہے۔ ہندی ادب کا یہ سنہرا دَور کہلاتا ہے۔

ابتدائی دور

آٹھویں صدی عیسوی میں اس زمانے کی ادبی زبان اپ بھرنش میں ہندی کی جھلک ملتی ہے اس زمانے میں ہندی ادب کے ان تمام اسالیب کی نیو پڑی جو آگے چل کر عہد وسطیٰ میں پروان چڑھے۔ اس دَور کے ادب کو اگر ہم تنقیدی نظر سے زیر رکھیں تو عہد وسطیٰ اور عہد حاضرہ کے ہندی ادب کے بہت سے پہلو اجاگر نہیں ہو سکتے۔ کسی زبان کا ادب اس وقت تک پھل پھول نہیں سکتا جب تک کہ اس کی جڑیں ماضی میں دُور دُور تک نہ پہنچی ہوں۔ آٹھویں صدی سے بارہویں صدی تک ہندوستان میں جو کچھ ہوا ہم لوگ اس کی تاریخ پر سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں درحالے کہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے یہاں بہت بڑا سماجی انقلاب ہوا۔ زمانۂ وسطیٰ اور زمانہ حاضرہ کا ہندوستان ان ہی پانچ صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس انقلاب نے مشرقی ہندوستان کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ہندی ادب ان بدلتے ہوتے حالات کے اثر سے بچ نہ سکا۔

آٹھویں صدی سے بارہویں صدی تک کے ادب میں ہمیں تین اصناف نمایاں طور پر ملتے ہیں (۱) مذہبی نظمیں اور گیت: ہر نظم اور گیت بذات خود مکمل ہوتا تھا۔ بہت سے مل کر ان گیتوں کو سُر ملا کر گاتے تھے۔ ان میں زندگی کا سیدھا سادا فلسفہ چھپا ہوتا تھا۔ ان گیتوں کے ذریعہ انسانیت اور ہمدردی کے جذبات اُبھارے جاتے تھے (۲) منظوم قصے، کہانیاں: جن میں فقیروں، بزرگوں، بہادروں اور سخی لوگوں کی سوانح دلچسپ انداز میں بیان ہوتی تھیں۔ اس کا رنگ اردو مثنوی سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ (۳) دوہے، چوپائیاں، چھند وغیرہ۔ ان کی بحریں اور اوزان مختلف اور

منفرق ہوتے تھے۔ مذہبی گیت اور نظمیں: بودھ مذہب دوسری صدی عیسوی کے بعد کئی شاخوں میں بٹ گیا اور گوتم بدھ اور ان کے قابل شاگردوں نے پانچ سو سال کی محنت سے فکر و نظر کی جن حدود کو چھو لیا تھا ان سے اب بودھ دھرم دور ہو چکا تھا۔ بدھ کے بت کی پرستش ہونے لگی تھی دیوی دیوتاؤں کے پوجنے کا رواج شروع ہو گیا تھا۔ بودھ دھرم کے ساتھ جین مت کا بھی ذکر ضروری ہے۔ گپت عہد کے بعد ہندوستان میں بودھ دھرم کی جڑیں کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ لیکن جین مت نہ صرف شمالی ہند بلکہ جنوبی ہند میں بھی مقبول رہا۔ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی جین مت نے اپنی بنیادی خوبیوں کو بچاتے رکھا۔ زبان کے لحاظ سے جین مت اور بودھ دھرم کی خوبی یہ ہے کہ دونوں نے اپنی تبلیغ کے شروع ہی سے سنسکرت کی جگہ عام بول چال کی زبان کو استعمال کیا۔ ویدوں کو ماننے والے لوگ شروع سے سنسکرت کا استعمال نہ صرف مذہبی رسوم کے لیے بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کرتے رہے۔

ساتویں صدی سے بارہویں صدی تک جو ادب ملتا ہے اس کا بیشتر حصہ جین مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ جین مت اہنسا یا عدم تشدد اور پیار محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ جین پنڈتوں اور سادھوؤں نے ان دونوں کے پرچار کے لیے بول چال کی زبان میں کہانیاں لکھیں جو "راس" کہلاتی ہیں کچھ بلند پایہ جین شعرا نے رام، کرشن، مہاویر اور دوسرے بڑے بڑے اور کامل انسانوں پر لمبی لمبی مثنویاں لکھیں۔ بعض مثنویوں میں پارسا عورتوں کی عفت اور عصمت پرستی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کرناٹک کے راشٹر کوٹوں کے درباری شاعر پشپ دنت نے آٹھویں صدی میں بہت سے بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ ایک شاعر سوائم بھو (پیدائش ۷۹۰) گزرا ہے جس نے رام کی کہانی پر "پادم چریتو" کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی ہے۔ بعض جگہ سوائم بھو کا بیان راماین سے الگ ہے۔ راماین میں رام، راون کو مار کر جب اجودھیا میں لوٹے تو انھوں نے ایک دھوبی کے کہنے سے سیتا کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن سوائم بھو نے بتایا کہ لنکا سے واپس آنے کے بعد سیتا نے جین مت اپنا لیا تھا اور سنیاسن بن گئی تھیں۔ سوائم بھو نے پادم چریتو میں جو بحریں اور اوزان استعمال کیے ہیں اور آگے چل کر انھیں بحروں میں تلسی داس نے سولہویں صدی میں رام چرتر مانس کا بیشتر حصہ لکھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ جین مت کے شاعر راجہ رانیوں اور ساہوکاروں اور سادھو سنتوں کے "راس" لکھتے تھے۔ بھونیشور کا باہوبلی راس ۱۱۸۴ء سے اب تک ملنے والے راسوں میں سب سے پرانا ہے۔ ان راسوں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے ایک مذہبی راس، دوسرے تاریخی راس۔ کچھ دنوں پہلے تک جین شاعروں کا کلام کتب خانوں میں چھپا پڑا تھا اب وہ آہستہ آہستہ چھپ کر باہر آ رہا ہے۔

جین مت کے ادب میں مثنویاں زیادہ ملتی ہیں۔ بودھ شاعروں نے گیت اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں بودھ دھرم کی جو شاخ بچی رہی اس کے سادھو اپنے کو سدھ کہتے تھے۔ تین سو سال میں چوراسی سدھ ہوتے۔ ان سدھوں کا تعلق ملک کے کسی مخصوص علاقے سے نہ تھا۔ کوئی کرناٹک کا تھا تو کوئی اودھ کا۔ ان سدھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس وقت کی روزمرہ کا استعمال کیا ہے۔ بودھ دھرم کا زیادہ اثر مشرقی ہندوستان پر تھا۔ اسی لیے سدھ لوگوں کا زیادہ وقت بہار میں گزرا۔ ان کی ادبی زبان پر بہاری کا زیادہ اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی ادب کی تاریخ لکھنے والے سدھوں کو بنگالی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک موجودہ ہندی یا بنگالی کی اپنی کوئی جداگانہ حیثیت قائم نہیں ہوئی تھی سدھ اس بول چال کی زبان میں لکھتے تھے جو بنگالی اور ہندی دونوں میں مشترک تھی۔

سدھوں کے ساتھ ناتھ لوگوں کا بھی ذکر مناسب ہوگا۔ ناتھوں کا سلسلہ نوین ناتھ گورکھ ناتھ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ گورکھ ناتھ نے اپنے خیالات سے پورے ملک کو متاثر کیا تھا۔ ان کا بیشتر کلام آج بھی دستیاب ہے۔ گورکھ ناتھ کی تحریریں لسانی نقطۂ نظر سے حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ بارہویں صدی کی ان تصنیفوں کی زبان کھڑی بولی یعنی آج کی ادبی ہندی کے بہت قریب ہے۔ سدھ خدا کو نہیں مانتے تھے۔ ناتھ خدا کی ذات پر پورا پورا عقیدہ رکھتے تھے۔ سدھ ویدوں اور برہمنوں کی کھل کر مخالفت کرتے تھے، ناتھ لوگ ویدوں اور برہمنوں دونوں کو مقدس مانتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود سدھوں اور ناتھوں کے یہاں کچھ باتیں مشترک ملتی ہیں۔ مثلاً دونوں اپنے مرشد (گورو) کو قابل پرستش سمجھتے تھے۔ دونوں کا عقیدہ تھا کہ صرف مرشد کے رحم و کرم سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ دونوں نے یوگ اور طرح طرح کے آسنوں کو عبادت کے لیے ضروری مانا۔

سدھوں نے اپنے گیتوں میں ذات پات اور اونچ نیچ پر گہری چوٹ کی ہے۔ بت پرستی، رسم و رواج اور دقیانوسی خیالات کے پرخچے اڑاتے ہیں۔ اس طرح ابتدا ہی سے ہندی میں سماجی شعور کے عناصر داخل ہو گئے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی ہندی میں سماج کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا۔ اور شعرا نے بڑے بڑے عالموں کو انتباہ دیتے ہوتے آگاہ کیا کہ کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتا جب تک اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال نہ کر لی گئی ہو۔

ابراہیم لودھی کے زمانے میں کبیر نے جو کچھ لکھا وہ سدھوں کے گیتوں، گوبند و اور رام سنگھ کے دوہوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔ گوبندو، رام سنگھ سرہپا اور گورکھ ناتھ کے کلام کا کبیر کے کلام سے موازنہ کریں تو ہمیں صرف زبان کا فرق ملے گا مگر جہاں تک خیالات کا تعلق ہے چاروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

متفرقات میں دوہا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سنسکرت میں اس صنف کا استعمال نہیں ہوا۔ ممکن ہے پہلے عام لوگ اس صنف کا استعمال کرتے رہے ہوں اور آگے چل کر یہ ادب ہی مروج ہوا ہو اور پراکرت اور اپ بھرنش کی شاعری اس صنف کی وجہ سے عروج پر پہنچی ہو۔ ہندی ادب نے ابتدائی دور ہی میں اس صنف کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دوہا زندگی کا ایک مکمل تجربہ ہے۔ دوہا میدان جنگ میں مُردوں کو زندہ کرتا اور رجز کا جادو جگاتا ہے دوہا ایسا سماں باندھتا ہے کہ جانباز میدان کارزار میں جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ وہ ایسی دُہائی دیتا ہے جس کے اثر سے راجستھان میں بہادر عورتیں اپنے شوہر کی چتا پر ہنستے ہنستے اپنے آپ کو نچھاور کر دیتی ہیں۔ دوہا نصیحت بھی کرتا

ہے۔ وہ ایک طرف روحانی کیف کو پیش کرتا ہے دوسری طرف محبوب کے سراپا کی تصویر کشی کرتا ہے۔ غرض دوہا متضاد احساسات کو مختصر لفظوں میں پیش کر دیتا ہے اس کے اندر گہرے معنی چھپے ہوتے ہیں۔ بارہویں صدی سے انیسویں صدی تک پورے سات سو سال تک دوہا ہندی ادب کو مالا مال کرتا آرہا ہے۔

ابتدائی دور کا ایک شخص، جو نہ تو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا نہ نثر نگار کی حیثیت سے، وہ اپنے زمانے کی رائج زبان کا صرف ایک قاعدہ لکھ کر امر ہوگیا۔ یہ ہے ہیم چندر سوری (۱۰۸۸ء - ۱۱۷۹ء) گجرات کے رہنے والے اس شخص نے شمالی ہند کی ادبی اور بول چال کی زبان کا قاعدہ لکھا ہے اس میں مثالوں کے لیے جو شعر پیش کیے ہیں ان سے بارہویں صدی کی ہندی زبان و ادب کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے دور میں ہندی زبان میں، موجودہ ہندی کی تمام لسانی خصوصیات آچکی تھیں۔ بارہویں صدی سے پندرہویں صدی تک وہی بیل پروان چڑھی جو ابتدائی دور میں اب بھرنش بولی کی شکل میں رائج تھی۔ ان تین سو سال میں بڑی تعداد میں راسو لکھے گئے۔ اس دور میں دلی اور پنجاب پر ہی نہیں بلکہ گنگا جمنا کے دوآبہ اور ملک کے بہت بڑے حصہ پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے اکثر تہذیبی مرکز تہس نہس ہو چکے تھے۔ چھوٹے بڑے راجاؤں نے راجستھان کے ریگستانی میدانوں اور اراولی پہاڑ کے آغوش میں پناہ لے لی تھی جہاں جلدی ہی چھوٹے چھوٹے قصبے بس گئے جو بستے بستے اور بنتے بنتے علوم وفنون اور ادب وتہذیب کے مرکز بن گئے۔ راجاؤں کا دربار یہاں کویوں کو دعوت دیتا رہا۔ تین سو سال تک ہندی ادیبوں اور فنکاروں کو راجستھان کی سرزمین میں باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ یہ بات فطری تھی کہ راجستھان کے درباروں کی سج دھج اور شان وشوکت ہندی ادب کو متاثر کرتی۔ ہندی ادب میں اس زبان کو ڈنگل کہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی دور میں جین شعرا نے مذہبی راس لکھے تھے۔ بارہویں صدی سے پندرہویں صدی تک کے شعرا نے اس صنف کا استعمال اپنے ڈھب سے کیا۔ راسوں میں ان شعرا نے اپنے سرپرست راجاؤں کے قصیدے لکھے، دوران کے وقائع کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا اس دور کا سب سے پہلا راسو پرمال راسو تھا، جس کو جگ نک نے (۱۱۷۳ء) میں لکھا تھا۔ یہ طویل منظوم قصہ بندیل کھنڈ کی بولی میں لکھا گیا تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس کی زبان بدلتی گئی اور آج وہ جس شکل میں ملتا ہے اس کی زبان آج کی ادبی ہندی سے کچھ الگ نہیں ہے۔ ان دنوں پرمال راسو آلہ کھنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی بولنے والے پورے علاقہ میں لوگ اسے جوش وخروش کے ساتھ گاتے اور سنتے ہیں۔ بادل کی گھن گرج اور ڈھولک کی تھاپ بڈھوں، بچوں دونوں میں جوش کی لہر دوڑا دیتی ہے۔

دلی کے آخری ہندو بادشاہ پرتھوی راج چوہان (۱۱۶۳ - ۱۱۹۲ء) پر پرتھی راج راسو نام سے چند بردائی نے ایک اعلیٰ پایہ کی طویل رزمیہ نظم لکھی تھی۔ اس راسو کو اہمیت اس لیے حاصل ہوئی کہ پرتھوی راج چوہان کی شخصیت حقیقی اور تاریخی تھی۔ مورخوں نے پرتھوی راج راسو کو بارہویں صدی کی تاریخ کے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے اور بہت دنوں تک اسے مستند سمجھا جاتا رہا ہے لیکن بعد میں یہ ظاہر ہوگیا کہ تاریخی نقطہ نظر سے یہ بھروسہ کے قابل نہیں اور یہ بھی ثابت کیا جانے لگا کہ چندبردائی پرتھوی راج کا ہم عصر شاعر تھا۔

پرتھوی راج راسو کا تاریخی طور پر جو کچھ حشر ہوا ہو مگر یہ بات مان لی گئی ہے کہ اس کا ایک حصہ بہت پرانا ہے۔

سامبر (اجمیر) کے راجہ بیل دیو پر لکھی گئی نرپتی ناتھ کی بیل دیو راسو (۱۱۵۵ء) عشقیہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

اس دور کی آخر تصنیف بہار کے مشہور شاعر ودیاپتی (ولادت ۱۳۶۰ء) کی کیرتی لتا ہے۔ جس میں ترہوت کے راجہ کیرتی سنگھ کی سوانح لکھی گئی ہے۔ پوری کتاب نثر میں ہے کہیں کہیں نظم کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جو کتابیں دستیاب ہیں ان میں کیرتی لتا سب سے پرانی ہے جس میں ہندی نثر کے مستند نمونے ملتے ہیں۔ اس کتاب میں جونپور کے بادشاہوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ملتان کے عبدالرحمٰن کا سندیش راسک (۱۰۱۰ء) دوسرے راسوں سے بالکل جدا ہے۔ اس میں نہ کسی کی شجاعت کا ذکر ہے اور نہ اپنے سرپرستوں کی مدح سرائی۔

ابتدائی دور کے ختم ہوتے ہوتے ہندی کا ادب کافی مالا مال ہو چکا تھا اور زبان میں بھی بہت فرق آگیا تھا۔ اپ بھرنش کا اثر بھی کم ہوگیا تھا اور کھڑی بولی کو ادب میں مقام ملنے لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اب تتلانے کی منزل سے نکل چکا تھا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا تھا۔

امیر خسرو (۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء) کی وفات کے ساتھ قدیم دور کا خاتمہ اور عہد جدید کا آغاز ہوا۔ فارسی شاعر کی حیثیت سے امیر خسرو کو عالمی ادب میں بلند مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو بہت متاثر کیا۔ ان کے نام سینکڑوں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے، قوالی اور صوفیانہ گیت مشہور رہیں۔ ان سب کی زبان آج کل کے روزمرہ کی زبان ہے۔ جب تک کوئی پرانا نسخہ نہیں ملتا، امیر خسرو کی زبان کے بارے میں قطعی رائے نہیں دی جاسکتی۔

دکنی کے ادیب وجہی نے سب رس (سترہویں صدی) میں خسرو کا ایک دوہا لکھا ہے۔ اس کے سوا ان کا کوئی مستند کلام حاصل نہیں ہوا ہے۔ ان کے نام سے ایک نظم خالق باری مشہور ہے جس میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی کے مترادف الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

عہد وسطیٰ

اس دور کے شروع میں ادب اپنی پرانی ڈگر پر چلتا رہا۔ سب سے پہلے سدھوں اور ناتھوں کے جو دوہے ملتے تھے انھیں اور آگے بڑھایا گیا۔ مہاراشٹر کے مشہور شاعر سنت نام دیو (۱۳۰۰ء) نے دوہوں کے ساتھ ساتھ بہت سے گیت لکھے۔ وہ پنجاب اور گنگا جمنا کے دوآبے کی کئی بار یاترا کر چکے تھے۔ ان کی شاعری اور کردار کا بہت بڑا اثر اس علاقہ پر پڑا۔ سکھوں کے گرو گرنتھ صاحب میں نام دیو کے پچاس سے زیادہ ہندی گیتوں کو جگہ ملی۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ آگے چل کر ہندی میں کبیر کے

سورداس اور تلسی داس نے جو گیت لکھے ان پر مراٹھی سنت شاعروں کے ابھنگوں کا بھی اثر پڑا۔ گورکھ ناتھ، نام دیو اور کبیر کے کچھ گیت ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔

کبیر کبیر کی وجہ سے ہندی ادب کو ایک نیا رتبہ حاصل ہوا۔ ان کے زمانے تک ہندی پر اپ بھرنش کا تھوڑا سا اثر باقی تھا۔ کبیر نے ہندی کو ایسا مانجھا کہ وہ سارے شمالی ہند میں عوام کی سمجھ میں آسانی سے آنے لگی۔ انھوں نے بلا کسی لاگ لپیٹ کے بلند سے بلند فلسفیانہ معنا مین آسان زبان میں ادا کیے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، سماج کی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے والے بیشتر لوگ بہار اور مشرقی و شمالی ہند میں پیدا ہوتے۔ بدھ اور مہاویر اسی علاقہ کی دین ہیں۔ بنارس میں پیدا ہونے والے کبیر اس سلسلہ کی زبردست کڑی تھے۔ کبیر کے کلام کا مجموعہ بیجک کہلاتا ہے۔ اس میں تین اصناف سخن ملتے ہیں۔ ۱۔ ساکھی۔ ۲۔ پد۔ ۳۔ رمینی۔

ساکھی دوہے کی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ خدا، انسان، دنیا، مرشد، سچائی، عبادت وغیرہ کے بارے میں ساکھیوں میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بیشتر پدوں میں معرفت اور فنا کی کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ رمینی ان لوگوں کے لیے لکھی گئی تھی جو کبیر کو اپنا مرشد مان کر خدا کی راہ پر چل پڑے تھے۔ کبیر نے یوگ اور آسنوں کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

کبیر کی شاعری میں ان خرابیوں کا ذکر ملتا ہے جو مذہب کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ کبیر نے بتایا کہ ہر مذہب بنیادی طور پر انسانیت کا پجاری ہے۔ ہندوؤں کی ذات پات اونچ نیچ سے نفرت ظاہر کی لیکن ہندوؤں کے عدم تشدد اور بھکتی کے تصور کو انھوں نے اپنے ادب میں داخل کیا۔ اسلام سے وحدانیت اور لاشریکیت لی۔ ظاہر داری کو وہ پسند نہیں کرتے تھے اور سادگی اور خوش اخلاقی کے شیدا تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اعلیٰ درجہ کا فلسفہ بیان کیا لیکن اسے معمولی انسان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کبیر کے انتقال کے بعد بڑے بڑے لوگ ان کی تقلید کرتے رہے۔ گورونانک (۱۴۷۰ء) کادو اور رے داس تینوں پندرھویں صدی میں کبیر کے پیام کو لوگوں تک لے گئے۔ سکھوں کی مذہبی کتاب گورو گرنتھ صاحب کا بیشتر حصہ گورونانک کی بانی ہے۔ انھوں نے جہاں ٹھیٹھ پنجابی میں شاعری کی ہے وہاں ان کا کلام برج اور کھڑی بولی کی ملی جلی شکل میں بھی ہے جو اس زمانے میں سارے شمالی ہند میں مروج تھی۔ یہ تینوں شاعر وحدانیت کے قائل تھے۔ لیکن انھوں نے کبیر کی طرح دوسروں کی نکتہ چینی نہیں کی۔

اس دور میں محبت کی منظوم کہانیوں اور مثنویوں کی شکل میں ہندی ادب میں ایک دوسری دھارا بھی ملتی ہے۔ اس پر صوفیائے کرام کا کافی گہرا اثر تھا۔ اس دھارا کے لوگوں نے عبادت الٰہی کے لیے مجازی محبت کو ضروری مانا۔ عشق حقیقی کی تصویر عشق مجازی میں ایسی عمدہ کھینچی کہ ہندوستانی زبانوں میں ہندی شاعری کا ایک نیا روپ نکل آیا۔ ابتدائی دور میں جین سادھوؤں اور شاعروں نے منظوم کہانیوں کا جو اسلوب رائج کیا تھا اس کو ہندی میں صوفیوں نے اپنایا اور اس طرح کہ عشق حقیقی کے اظہار کے ساتھ معرفت کے راز کھل گئے۔ اس دھارا کے شعرا کے پیش نظر فارسی زبان کی عظیم الشان مثنویاں بھی ہیں۔ تصوف کی خاطر فارسی ادب کا مطالعہ بھی ان شعرا نے کیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دھارا کے سب ہی شاعر مسلمان تھے اور سب نے اودھ میں بولی جانے والی روزمرہ میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ سب ہی شعرا نے عشق مجازی کے اظہار کے لیے ہند و کردار دل کو پسند کیا۔ عاشق اور معشوق دونوں کردار ہند و طبقے سے مستعار لیے۔ ملک محمد جائسی کی مثنوی 'پدماوت' میں علاء الدین خلجی کو ایک استثنا کہا جا سکتا ہے۔ شاعر نے نفسیات کے اظہار کے لیے اس طرز کو استعمال کیا۔ اس کے برخلاف رتن سین عرفان کی راہ چلنے والا عارف ہے۔ سب مثنویوں کا ماحول مقامی ہے۔ ان کو پڑھنے والا مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر عبادت الٰہی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ سب ہی مثنویوں میں چھ، سات یا آٹھ چوپائیوں کے بعد ایک دوہا آتا ہے۔ ہندوستانی منظوم کہانیوں کی طرح یہ مثنویاں ابواب میں بٹی ہوئی نہیں ہیں۔ اصل میں یہ فارسی کا رنگ ہے فارسی کی مثنویوں کی طرح شاعر نے ابتدا میں حمد، نعت، منقبت کے بعد شاہ وقت کی مدح اور اپنے مرشد کی تعریف کی ہے۔

اب تک جو ہندی مثنویاں ملی ہیں ان میں سب سے قدیم 'چندا ئن' ہے۔ اس کے مصنف ملا داؤد (۱۴۹۲ء) دلمؤ کے رہنے والے تھے۔ اس میں چندا لورک اور مینا کی کہانی ہے۔ سارے شمالی ہند میں یہ لوک کتھا "چندا لور" کے نام سے ہر دلعزیز ہے اس کی کہانی کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ ایک میں چندا ہیروین ہے اور دوسری میں مینا۔ یہ کہانی اتنی دلکش ہے کہ بلند و بالا پہاڑوں کو پار کر کے دکن میں گولکنڈہ پہنچی۔ یہاں کے مشہور شاعر غواصی نے دکنی میں اس کہانی پر 'مینا ستونتی' مثنوی لکھی۔ مدھیہ پردیش کے گونڈ اور دوسرے آدی واسیوں میں بھی چندا لور یا مینا لور کی کہانی بہت مقبول تھی۔ یہ اسلوب یہاں ملک محمد جائسی (۱۴۹۲ء) کی مثنوی 'پدماوت' میں عروج پر پہنچا۔ جائسی، ہندی مثنویوں کا امام ہے۔ صوفیانہ تخیل، ہندوستان کی دلکش پریم کہانی کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر بھی کلام کی پاکیزگی اور شستگی بہت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ ہندی کے تین بڑے قدیم شعرا میں ملک محمد جائسی کا اہم مقام ہے۔

قطبن نے ۱۵۰۱ء میں 'مرگاوتی' لکھی۔ منجھن نے 'مدھو مالتی' ۱۵۴۵ء میں لکھی وہ بھی دکن تک پہنچی۔ بیجاپور کے ملک الشعرا نصرتی نے مدھو مالتی کی کہانی پر مبنی مثنوی "گلشن عشق" دکنی میں لکھی۔

سگن بھگتی کی شاعری

عہد وسطیٰ کے دوسرے دور میں سگن بھگتی کی شاعری کا چرچا ہوا اس دور کے شعرا نے کرشن اور رام کی بھگتی پر خاص طور پر شعر کہے تھے۔ پہلے کرشن بھگتی کا پرچار عام ہوا۔ دکھن بھارت کے ایک عالم ولبھاچاری نے برندابن پہنچ کر کرشن بھگتی کی تبلیغ کی۔ ان کے آٹھ شاگرد تھے جو اشٹ چھاپ کے نام سے مشہور تھے ان شعرا میں سورداس بھی تھے۔ سگن بھگتی اس وقت تک تامل، تلگو اور مراٹھی کی شاعری اور ادب میں ابھر کر سامنے آ چکی تھی۔

ولبھاچاری کا عقیدہ تھا کہ نراکار بھگوان (بے شکل معبود) ہمارے اندر چھپا ہے۔ اس کے کرم سے بھی عقیدتمندی (بھگتی) پیدا ہوتی ہے۔ کرشن بھگتوں نے بھی عشق کو ناگزیر جانا لیکن ان میں اور اسلام کے صوفیوں میں فرق یہ ہے کہ صوفی

عابد کو عاشق اور معبود کو معشوق کی شکل میں پیش کرتے ہیں وہاں کرشن بھگت عابد کو محبوب اور کرشن کو عاشق مانتے ہیں۔ کرشن بھگت کی آخری منزل یہ ہے کہ عابد اور معبود کا فرق مٹ جاتے۔ کرشن بھگتوں کے لیے گوپیاں، خاص طور پر رادھا، عاشق کا معیاری نمونہ ہے جو زندگی بھر اپنے کنھیا کے سوا دوسرے ہر وجود کو بھولی رہی۔

سورداس (۱۴۷۸) کرشن بھگتوں میں سب سے ممتاز تھے۔ انھوں نے جو گیت لکھے ہیں ان کا مجموعہ "سورساگر" کہلاتا ہے۔ یوں تو سورداس کے کلام میں کرشن کی زندگی کے سب ہی واقعات آتے ہیں لیکن ان کی عظمت کا سبب کنھیا کے بال پن اور کرشن کے فراق میں مہجور گوپیوں کے جذبات کی عکاسی پر مبنی گیت ہیں۔ ہندی کے کسی دوسرے شاعر نے بال پن کی ایسی تصویر نہیں کھینچی ہے۔ کوئی بچہ سات آٹھ سال کی عمر تک کن حالات سے گزرتا ہے اور کس بات کا ردعمل اس پر کیونکر ہوتا ہے کس طرح وہ چھوٹی چیزوں کے لیے مچلتا ہے اور کس طرح معمولی سی چیز پاکر سب کچھ پا جاتا ہے، غرض کہ بچہ اپنے کھیل کود، رونے مچلنے سے لوگوں کا من موہ لیتا ہے۔ ان سب کا بیان سورداس نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ کہنے کو یہ گیت کنہیا کے بال پن پر لکھے گئے مگر یہ سارے مناظر دنیا کے ہر بچے پر صادق آتے ہیں۔ ان گیتوں کو پڑھ کر ہم اپنے بچپن کو پھر سے پالیتے ہیں۔

سورداس کا اسلوب ہجر کے جذبات کے بیان میں خوب نکھر آتا ہے۔ جب کرشن ذرا بڑے ہوئے تو برندابن سے متھرا چلے گئے۔ دونوں مقاموں کی دوری مشکل سے چار میل ہوگی۔ لیکن گوپیوں کی حماقت دیکھیے کہ ایک بار بھی متھرا نہیں گئیں۔ اور پوری زندگی برندابن میں رو رو کر گزار دیں۔ کبھی انھیں کنھیا کی بے وفائی پر غصہ آتا ہے اور کبھی اپنے دل کی مروّت اور بے بسی کو کوسنے لگتی ہیں۔ ہجر کی کوئی ایسی کیفیت نہیں ہے جو اس نابینا شاعر سے اوجھل رہ گئی ہو۔ گوپیوں کا ہجر ہی دراصل ایک ریاضت بن جاتا ہے جس میں کوئی لغزش نہیں آتی۔

سورداس کے گیت معنوی حیثیت سے ہی نہیں موسیقی کے لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں۔ سورداس کے گیتوں کے بغیر کوئی ہندوستانی گائک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا۔ اس بات کا سہرا سورداس کے سر باندھا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے گیتوں میں موسیقی اور شاعری کو ایک دوسرے میں سمو دیا۔ اس دور میں ہندی مغل دربار میں پہنچی اور برج بھاشا کے گیت گانے والا تان سین دربار اکبری کے نورتنوں میں گنا جانے لگا۔ اس عہد کی چوتھی سب سے بڑی شخصیت تلسی داس (۱۵۴۳ء) کی تھی۔ ان سے پہلے سوامی رامانند نے رام کو معبود مانا اور رام بھگتی کی تبلیغ کی۔ تلسی داس بھگت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے عالم بھی تھے۔ انھوں نے اس زمانے کے مروجہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور اس میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ انھوں نے بول چال کی زبان کو معمولی جذبات کے اظہار میں اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ انھوں نے رام چرتر مانس (رامائن) لکھ کر ایک مآل بہ زوال سماج کے سامنے ایک اونچا نصب العین، انتہائی موثر طور پر پیش کیا۔

اترمدھیہ کال

عہد وسطیٰ کے آخری حصے میں بیشتر شعرا کو مغل دربار اور بڑے بڑے مسلم امرا، نوابوں، حکمرانوں اور ہندو راجاؤں یا سرداروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان لوگوں نے درباری آداب اور ذوق کو سامنے رکھتے ہوئے فارسی ادب کے لطیف تصورات کو اپنانے کی کوشش کی۔ ان شعرا نے شعر و ادب کو ان کے لوازم کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ، ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ نظم میں انھوں نے سنسکرت کے عروض اور اس کے ادب سے مدد لی۔ اس عہد کا بہت سا کلام حسن کی مداحی اور جمالیاتی ذوق سے متعلق ہے۔ ان شاعروں نے طوالت سے کام نہیں لیا بلکہ اختصار ہی سے لکھا مگر جو کچھ بھی لکھا اس کو ادب کی لطافتوں سے کیف آور بنانے اور سنوارنے کی پوری کوشش کی۔

اس عہد کے شعرا دو حصوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ کچھ شعرا ایسے ہیں جنھوں نے پہلے عروض کے ضوابط مدون کیے۔ علم و ادب کی حدیں متعین کیں اور پھر نظمیں لکھیں۔ کیشو داس نے (۱۶۰۰ء) کے قریب "رسک پریہ" اور "کوی پریہ" لکھ کر یہ دور شروع کیا۔ چنتامنی (۱۶۱۰ء) اور متی رام (۱۶۱۸ء) کی وجہ سے اس طرح کے ادب کا ایک خاص مقام متعین ہوگیا۔ کچھ شعرا نے ان ضوابط کو مرتب تو نہیں کیا مگر تمام پہلوؤں کو اپنے ذہن میں رکھ کر شاعری کی۔ کرداروں کے ہاؤ بھاؤ یعنی حسن کے ناز و انداز، غمزہ و ادا کا ستھری زبان میں بیان، فصاحت و بلاغت، صنائع و بدائع اور لطافت خیال کے ساتھ ان کی ہم آہنگی، ان سب خوبیوں کے لیے بہاری کے دوہے بہت مشہور ہیں۔ ان دوہوں کو شہزادہ اعظم نے مرتب کروایا تھا جو آج بھی اعظم جاہی ترتیب کہلاتے ہیں۔ دیو اس عہد کے مانے ہوتے شاعر ہیں۔

سید غلام علی بلگرامی رسلین (۱۶۹۰ء ولادت) کے "انگ درپن (سراپا)" اور "راس ترنبہ"، اس عہد کی عظیم تصنیفات ہیں۔

گھنانند، ہجر کی داخلی کیفیات اور محبت کے ظاہری اثرات کو ظاہر کرنے میں بے نظیر و لاثانی تھا۔ اس دھارا کا آخری شاعر پدماکر (۱۷۵۳ء) ہے اس عہد میں بھگتی کی کویتائیں اور منظوم سوانح ہی لکھی گئیں مگر اس ادب سے سابقہ نہج ادب میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

رزمیہ شاعری کے لیے اس عہد کا شاعر بھوشن بہت مشہور رہے جس نے شیواجی کی شجاعت اور معرکہ آرائیوں پر نظمیں لکھیں۔ عبدالرحیم خانخاناں کے بعد برِند (۱۶۴۳ء) اور گردھر داس (۱۷۱۳) نے شعر و سخن کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ زراعت کے تجربات پند و نصیحت کی شکل میں گھاگ نے نظم کیے جس سے کسان آج بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

عہد حاضرہ

اس عہد کی خصوصیت یہ ہے کہ کھڑی بولی پہلے نثر اور پھر نظم میں استعمال ہونے لگی۔ کھڑی بولی کا ابتدائی کلام گورکھ ناتھ، نام دیو، امیر خسرو اور ایکناتھ کے کلام کے علاوہ دکنی شعرا کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ کھڑی بولی کی نثر کا رواج کچھ رک سا گیا اور شعری ادب زیادہ تخلیق ہونے لگا۔ برج بھاشا کی نثر میں کچھ نظموں کی شرحیں اور بھگتوں کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ۱۸۰۰ء کے آس پاس انشاءاللہ خاں کی رانی کیتکی کی کہانی جدید نثر کی اچھی مثال ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام ہندی اور اردو نثر میں الگ الگ کتابیں لکھوائیں۔ اسس کالج کے لیے للّولال (۱۷۶۳ - ۱۸۲۵ء) نے سنگھاسن

بتیسی، بیتال پچیسی، شکنتلا ناٹک اور پریم ساگر وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں پریم ساگر کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ للّو نے روزمرہ کی بول چال کا استعمال کیا لیکن اس پر برج بھاشا کا بہت اثر ہے۔ کالج کے دوسرے مصنف سدل مصر کی نثر پر برج کا اثر نہیں ہے مگر اس نے سنسکرت الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ منشی سداسکھ لال کی نثر ٹکسالی زبان کی مثال ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے رامپور (بنگال) کے عیسائی مبلغین ہندی نثر میں کئی کتابیں شائع کر چکے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں ہندی نثر میں انجیل چھپی۔ ۱۸۵۰ء کے بعد شیو پرساد ستارۂ ہند نے جو کتابیں لکھیں ان میں عربی، فارسی الفاظ کافی استعمال کیے گئے ہیں۔ ستارۂ ہند کی تخلیقات کی وجہ سے ہندی کے سامنے دو سمتیں روشن ہوئیں۔ کچھ لوگ ان کی طرح عربی فارسی الفاظ کا استعمال کرتے تھے اور کچھ لوگ عربی فارسی الفاظ کو ترک کر دیتے تھے۔ راجہ لکشمن سنگھ نے "ابھگیان ساکنتلم" کا جو ترجمہ کیا اس کی نثر میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے اپنی زبان کو روزمرہ سے دور نہیں جانے دیا۔ بھارتیندو ہریش چندر برج بھاشا کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے نثر میں کہانی، تاریخ وغیرہ سب ہی کچھ لکھ کر زبان کو بہت ستھرا بنایا۔ بھارتیندو کے ہم عصر دوسرے مصنفین۔ بال کرشن بھٹ، پرتاپ نارائن مصر، ٹھاکر جگموہن سنگھ، بالمکند گپت وغیرہ نے نہ صرف ہندی کے طرز تحریر کا تعین کیا بلکہ اپنی جراتمندانہ تخلیقات کے ذریعے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ انگریزوں کی وجہ سے جو معاشی اور صنعتی انقلاب آیا، اس کی خوبیوں اور برائیوں کو مصنفین نے ظاہر کیا۔ مہاویر پرساد دویدی نے ماہانہ سرسوتی (۱۹۰۰ء) کے ذریعہ ہندی نثر کا معیار متعین کیا۔ ان کی محنتوں اور کوششوں سے مقامی بولیوں کا اثر ختم ہو گیا اب کہانی، داستان، قصوں، ناٹکوں اور سوانح کے ساتھ ساتھ سائنس، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات پر ہندی میں اہم کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ناٹک

ہندی ناٹکوں کی تاریخ ۱۶۱۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب کہ رامائن مہا ناٹک لکھا گیا تھا۔ ۱۶۲۳ء میں ہردے رام نے 'ہنومن' ناٹک لکھا۔ ۱۶۳۶ء میں بنارسی داس نے 'سمے سار' اور ۱۶۴۳ء میں گرو گوبند سنگھ نے چنڈی چرتر ناٹک لکھا۔ بھارتیندو ہریش چندر سے ہندی کے جدید ناٹکوں نے ترقی کی۔ ان کا "ست وادی ہریش چندر" ناٹک آج بھی اسٹیج پر کھیلا جاتا ہے۔ ہریش چندر نے کچھ مزاحیہ شاعری بھی کی جس میں سماجی رسومات پر طنز کیا گیا ہے۔ ناٹکوں میں نیا دور جے شنکر پرساد سے شروع ہوا۔ انھوں نے کل تیرہ ناٹک لکھے جو ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق ہیں۔ ان ناٹکوں میں وطن پرستی کے ساتھ ساتھ محبت و خلوص کی اچھی تصویریں ملتی ہیں۔ پرشاد جن دنوں ناٹک لکھ رہے تھے ان ہی دنوں اگر نے "مہاتما عیسیٰ" اور گووند ولبھ پنت نے 'ورمالا' اور جی پی سری واستوا نے بہت سے مزاحیہ لکھے۔ آگے چل کر سیٹھ گووند داس، اودے شنکر بھٹ، لکشمی نارائن مصر، رام کمار ورما، اوپیندر ناتھ اشک، ورنداون لال ورما نے ناٹک لکھ کر نام پیدا کیا۔ مشہور ایکٹر پرتھوی راج کی وجہ سے ہندی اسٹیج نے بہت ترقی کی۔ بہت دنوں تک ہندی تاریخی ناٹکوں کی بھرمار رہی لیکن اب سماجی، اصلاحی اور سیاسی ناٹک لکھے جا رہے ہیں یا انگریزی، مراٹھی، اور دوسری زبانوں سے ترجمہ ہو کر ہندی میں آ رہے ہیں۔ نئے مصنفین میں جگدیش ماتھر، دھرم ویر بھارتی اور موہن راکیش کو بہت کامیابی ملی۔

ناول

۱۹۰۰ء کی ابتدا کی انشاء اللہ خاں کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور للو لال کی "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" جیسی کتابوں کو ہندی کی قدیم داستانوں اور افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

لالہ سری نواس داس "پرکشا گورو" سے نئی ناول نویسی کی ابتدا ہوتی بال کرشن بھٹ کا "نوتن برہم چاری" (۱۸۷۷ء) اور ایودھیا سنگھ کا ٹھیٹھ ہندی کا ٹھاٹ (۱۸۹۹ء) قابل ذکر ہے۔ دیوکی نندن کھتری کی چندر کانتا (۱۸۸۷ء) چار حصوں میں چھپی۔ کھتری کی وجہ سے ہندی میں طلسمات اور عیاری سے بھرے ہوتے ناول شروع ہوتے "چندر کانتا سنتتی" ۲۴ حصوں میں اور "بھوت ناتھ" ۲۱ حصوں میں چھپا۔ ان سب ناولوں کی وجہ سے بے شمار لوگ ہندی جاننے لگے۔ جاسوسی ناولوں کا آغاز گنیش گوپال رام کھتری نے اس طرح کیا جس طرح انشا۔ اللہ خاں نے کہانی کی بسم اللہ کی۔ ان ہی دنوں بنگال سے بابو بنکم چندر چٹرجی کے سب ناولوں کے ترجمے ہندی پڑھنے والوں کو ملے۔ پریم چند کے ناولوں پر گاندھی عہد کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہمعصر زندگی کی تصویریں کھینچتے ہوتے سماج کے سامنے کچھ نصب العین اور مقاصد رکھے ہیں۔ جیسے شنکر پرساد کے "کنکال" اور "تتلی" آچاریہ چترسین ویشالی کے "ویشالی" "نگر وَدھو" اور "سومناتھ"، راہول سانکرتیاین کی "جے یودھیہ" اس عہد کے مشہور ناول ہیں۔ ورنداون لال ورما اپنے تاریخی ناولوں کی وجہ سے اتنے ہی مقبول عام ہوتے جتنے سماجی ناولوں کی وجہ سے۔ پریم چند کے عہد کے مصنفین میں جینتے چندر کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ ان دنوں جو ناول لکھے جا رہے ہیں ان میں نفسیاتی اور سماجی اثر غالب ہے اور ان کو کئی حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اگیہ، امرت رائے، امرت لال ناگر، ایلا چندر جوشی، اوپیندر ناتھ اشک، دھرم ویر بھارتی، ناگارجن، بھگوتی چرن ورما، بھنیشور ناتھ رینو، نرمل ورما، راجندر یادو آج کل کے مانے ہوتے ناول نگار ہیں۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سب سے زیادہ کامیابی یشپال کو ملی جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سیاسی بیداری پیدا کی ہے۔

کہانی

شیو پرساد ستارۂ ہند اور بھارتیندو ہریش چندر نے بہت سی کہانیاں لکھیں لیکن عہد حاضرہ کے ڈھنگ کی پہلی کہانی کشوری لال گوسوامی کی "اندومتی" تھی جو ۱۹۰۰ء میں چھپی اور منظر عام پر آئی۔ پریم چند کی وجہ سے ہندی میں اچھی کہانیاں لکھی جانے لگیں جن میں حیرت کی جگہ احساس کی تصویر پیش کی گئی۔ پریم چند کی کہانیوں میں حقائق کی تصویر اس طرح قاری کے سامنے کھینچ جاتی ہے کہ اس کا شعور بھی بیدار ہونے لگتا ہے۔ پریم چند دور کے کہانی نویس جے شنکر پرساد، سدرشن، کوشک، چتر سین شاستری، رائے کرشن داس، بھگوتی پرساد باجپائی، ورنداون لال ورما، چندر دھر شرما گولیری، راجہ رادھیکا رمن سنگھ اور چترسین شاستری قابل ذکر ہیں۔ پچھلے دنوں جو کہانیاں لکھی گئیں ان میں سماجی اور سیاسی شعور کے ساتھ نفسیاتی توجہ پر بھی زور دیا گیا۔ واقعاتی تفصیل کی جگہ اختصار اور اشاروں سے کام لیا گیا۔ ان فنکاروں نے اس کو اتنی ترقی دی کہ کہانی میں

شعر کا مزہ آنے لگتا ہے۔ یشپال، اگیہ، منو بھنڈاری، موہن راکیش، کملیشور پھنیشور ناتھ رینو، آج کے پسندیدہ اور ہر دلعزیز کہانی نگار ہیں۔

شاعری

۱۸۰۰ء کے قریب شاعری کے لیے زبان کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ شاعری صرف برج بھاشا ہی میں کی جاسکتی ہے۔ نثر کی زبان میں شاعری نہیں ہوسکتی۔ بھارتیندو ہریش چندر، پریم دھن، جگناتھ داس رتناکر برج بھاشا میں شعر کہتے رہے۔ دوسری طرف شری دھر پاٹھک نے انگریزی کے شاعر گولڈ اسمتھ کی تین نظموں کا منظوم ترجمہ کھڑی بولی میں کیا۔ مہاویر پرساد دویدی نے آندولن چلایا کہ جس زبان میں نثر لکھی جاتی ہے اسی زبان میں نظم بھی لکھی جانی چاہیے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان کھڑی بولی نظم کے لیے بھی قبول کرلی گئی۔ اس عہد کے مشہور و مقبول شاعر میتھلی شرن گپت ہیں۔ جنھوں نے ہندوستانی ادب و ثقافت کی ساری خوبیوں کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تیس (۳۰) سے زیادہ نظمیں لکھیں جو حب الوطنی اور قومیت کے جذبہ سے بھرپور ہیں۔ رام نریش ترپاٹھی نے بھی اپنی نظموں میں قومیت کے جذبہ کو ابھارنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی نظمیں چھایاوادی نظمیں کہلاتی ہیں۔ ان نظموں میں باطنی کیفیت اور ان کے ظاہری اثر کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کلپنا، تصور، مختلف رنگوں کے لطیف اشارے، کیف، حالت جذبات اور اس کے تاثرات اور ردعمل کو ظاہرا در پیش کرنا۔ حقائق سے دوچار کرنا اس دھارا کی خوبی تھی۔ اس طرز کا استعمال کچھ لوگوں نے حب وطن پیدا کرنے اور انقلاب لانے کے لیے بھی کیا۔ افادیت تھے لیے ماحول کی اصلاح پیش نظر تھی۔ ایسے شعرا میں جے شنکر پرساد، ماکھن لال چترویدی، بالکشن شرما، نوین، نرالا، نریندر شرما اور دنکر قابل ذکر ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس طرز نگارش کا استعمال انفرادی محبت کے جذبہ کے اظہار کے لیے کیا۔ پنت، بچن، بھگوتی چرن ورما، انچل اور نیپالی کی شاعری میں یہ انداز دیکھا جاسکتا ہے اور کچھ لوگوں نے اس طرز ادا کا استعمال روحانی الٰہی عشق کے اظہار کے لیے کیا۔ جے شنکر پرساد، نرالا، مہادیوی ورما اور رام کمار ورما اس طرز نگارش کے بانی ہیں۔

۱۹۴۰ء کے بعد لوگوں نے چھایاوادی شاعری کے خلاف بغاوت کی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہوتے ہوتے ہندی شاعری میں تبدیلی کی لہر کو قوت حاصل ہوتی اور نئے ہونہار شاعر ہی نہیں بلکہ کچھ منجھے ہوئے پرانے شاعروں نے بھی سماجی مسائل پر بہت خوبصورت نظمیں لکھیں۔ پنت اور نرالا نے اس دھارا کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ نریندر شرما، دنکر، انچل، شیومنگل سومن، رام ولاس شرما نے ترقی پسند شاعری کو ادب میں ایک اہم مقام دلایا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے ہندی میں ایک نئے ڈھنگ کی شاعری ہونے لگی جس کو تجرباتی شاعری کہتے ہیں۔ اگیہ، دھرم ویر بھارتی، پربھاکر ماچوے، رگھوویر سہائے، گریجا کمار ماتھر، سرویشور دیال سکسینہ، نریش کمار مہتا اس صنف کے مشہور شاعر ہیں

تبصرہ و تنقید

موجودہ دور کے شروع ہی سے تنقیدی ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ مشرمبندھو نے ہندی کے سبھی مشہور شاعروں اور مصنفوں پر شروع میں تنقید کی۔ پدم سنگھ شرما نے بہاری کی شاعری پر بہت مستند تنقید شائع کرائی۔ مہاویر پرساد دویدی سے ہندی میں علمی ڈھنگ کے تبصرے شروع ہوتے۔ یہ ادب میں سماجی اصلاح کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

ہندی تبصرہ کو صحیح بنیاد پر قایم کرنے والے رام چندر شکل تھے جنہوں نے مغربی تنقیدی ادب سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ شکل جی نے بھی ادب کی فنی اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے عوامی فلاح کی تحریک کو سمونا ضروری سمجھا۔ رام ویلاس شرما نے شکل جی کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔

اشتراکی ادب نے ہندی تنقید پر گہرا اثر ڈالا۔ ہزاری پرساد دویدی، نند دلارے باجپئی اور ڈاکٹر نگیندر ہندی کے مشہور مستند نقاد مانے جاتے ہیں۔

یونانی زبان وادب

یونانی ایک ہندیوروپی (Indo-European) یا وائرو (Wiro) خاندان کی زبان ہے جس کی پچھلی تاریخ چودھویں صدی قبل مسیح تک پہنچتی ہے۔ ہٹائٹ (Hittite) کو چھوڑ کر کسی ہند یوروپی زبان کی جانی ہوئی تاریخ اتنی طویل نہیں۔ اس کی دستاویزات لگ بھگ چونتیس صدیوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ قبل مسیح کے الف ثانی میں جب یہ زبان پہلے پہل تاریخ کی روشنی میں آتی ہے تب ہی اس کے خدوخال اصلی ہند یوروپی اور ہند یوروپی خاندان کی دوسری زبانو جیسے ہٹائٹ، ہند ایرانی، بالٹک، شلاوک، اٹالک، کلٹک، جرمنیک وغیرہ سے ممیز ہوچکے ہیں۔ یہ امتیاز صوتی بھی ہے اور صوری بھی۔ خود قدیم یونانی جن زبانوں سے بہت قریب تھی وہ بہت گمنام ہیں۔ جیسے فریجیائی (Phrygian) یا مقدونی (Macedonian)۔ یونانی کو اس کی خصوصیات کی بنا پر ہم یوروپی زبان سے نکلی ہوئی بولیوں کے لسانی نقشے میں مرکزی مقام دے سکتے ہیں۔

قبل مسیحی تاریخ کے الف ثانی میں یونانی بولنے والے ہندیوروپی لوگ بتدریج یونان کے جزیرہ نما، بحیرۂ ایجین (Aegean Sea) کے زیادہ تر جزیروں اور اناطولیہ کے مغربی ساحل پر آباد ہوگئے۔ اور تھوڑے سے مستثنیات کے ساتھ آج بھی یہی علاقہ یونانی کا لسانی علاقہ ہے۔

قبل مسیح کے الف اوّل کے دوسرے ربع میں یونانیوں نے بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کے اطراف، خصوصاً جنوبی اطالیہ اور سسلی میں اپنی آبادیاں قایم کیں۔ اس نوآبادیاتی پھیلاؤ کے بارے میں افلاطون نے یہ بات کہی تھی کہ ہم لوگ اس جھیل (بحیرۂ روم) کے اطراف مینڈکوں کی طرح بس گئے ہیں۔ لیکن ان علاقوں میں یونانی کا چلن زیادہ دن نہیں رہا اور رومن دور میں لاطینی نے بہت جلد اس کی جگہ لے لی۔ نوآبادیا

یونانی سب سے زیادہ عرصے تک بازنطینہ میں مشرقی رومن سلطنت کی سرکاری زبان کی حیثیت سے باقی رہی۔ لسانی اعتبار سے یونانی کے حسب ذیل دور قایم کیے گئے ہیں: قدیم دور جس کے دو حصے ہیں۔ ایک میناٸی (Mycenaean) دور جب ایک ہجابند (Syllabic) رسم الخط رائج تھا۔ (چودھویں صدی سے بارھویں صدی قبل مسیح تک) اور دوسرا اوّلی (Archaic) اور کلاسیکی دور جس کی ابتدا یونانی ابجد (Alphabet) کی دریافت سے ہوئی (آٹھویں سے چوتھی صدی ق م تک) بازنطینی دور (پانچویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک)۔ اور جدید دور۔

رسم الخط

نووارد یونانی ناخواندہ لوگ تھے لیکن جس لواح میں یہ لوگ داخل ہوئے وہاں بہت سے علاقے لکھائی سے واقف ہو چکے تھے جیسے مصر، بابل اور کریٹ (Crete) یونانیوں نے ایک بدیسی رسم الخط سے ابتدا کی جسے لی نیر اے (Linear A) کہا جاتا ہے۔ اور جو کریٹ میں وہاں کی مقامی زبان مینوآن (Minoan) کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ چودھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ اہل یونان نے ایک ہجائی (Syllabic) رسم الخط بنالیا جسے لی نیر بی (Linear B) کا نام دیا گیا ہے۔ اس خط کے نمونے کچی مٹی کی تختیوں پر ملتے ہیں جو تین چار ہزار کی تعداد میں کناسس (Knossus) تھیبز (Thebes) مینیے (My cenae) اور پائی لاس (Pylos) میں دریافت ہوئی ہیں۔ یہ خط بہت مشکل اور گنجلک ہے اور اس میں کوئی ادبی یا مسلسل تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔

یونانی ابجد

بارھویں صدی میں ڈورین (Dorian) حملوں نے جب مینے (Mycenae) کے تمدن کو تاخت و تاراج کر دیا تو یونانی ہجائی (Syllabic) رسم الخط بھی ختم ہو گیا اور کوئی چار صدی تک یونانی ناخواندہ رہے۔ پھر آٹھویں صدی ق م میں یونانیوں نے ایک سامی (Semetic) نمونے کی بنیاد پر نیا نظام تحریر تیار کیا جسے ابجد یا الف بے (Alphabet) کہتے ہیں۔ یہ رسم الخط فنیقیوں (Phoenicians) سے لیا گیا تھا جس میں ہر علامت ایک حرف صحیح کو ظاہر کرتی تھی۔ یونانیوں نے اس فنیقی ابجد میں تلفظی تبدیلیوں کے علاوہ حروف علت کا اضافہ کیا جو اس میں ناپید تھے۔ یہ پانچ نئے حروف وہی ہیں جو بعد میں لاطینی کے واسطے سے یورپ کی ساری زبانوں نے اختیار کیے یعنی اے۔ ای۔ آئی۔ او اور یو۔ یونانی کے ابجدی کتبے (Alphabetic — Inscriptions) جو انتسابوں، مزاروں کی لوحوں، قوانین، رسالوں، مذہبی ضابطوں اور عدالتی فیصلوں پر مشتمل ہیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ دو سب سے زیادہ قدیم کتبے جن کی تاریخ کا تعین ممکن ہے ایتھنز میں ملے ہیں۔ اور لگ بھگ ۷۲۵ قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ آٹھویں سے پانچویں صدی ق۔ م تک یونانی حروف میں مقامی طور پر رد و بدل ہوتا رہا تا آں کہ پہلی صدی قبل مسیح میں ان حروف نے ساری یونانی دنیا میں یکساں شکل اختیار کر لی۔ لاطینی نے اپنے حروف یونانی ہی سے لیے اور اس طرح یہ ابجد سارے یورپ کے لیے آپ نمونہ بن گیا۔ چنانچہ مغربی دنیا کی بیشتر لکھتیں اسی پر مبنی ہیں۔

قدیم یونانی

ان سارے علاقوں میں جہاں یونانی بولی جاتی تھی لسانی یکسانیت بڑی حد تک ہیلنی (Hellanistic) دور یعنی چوتھی صدی ق۔م میں پیدا ہوئی اس سے پہلے کی دس صدیوں میں یہ زبان مختلف مقامی بولیوں میں بٹی رہی جن میں کئی صوتی اور صوری اختلافات تھے گو وہ ایک دوسرے کے لیے قابل فہم ضرور تھیں۔ ان بولیوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) مغربی (۲) اے اولک (Aeolic) (۳) آئی اونک و اٹیک (Ionic — Attic) اور (۴) آر۔ کے۔ ڈوسپری یٹ (Arcado — Cypriot) قبل مسیحی الف اوّل کے وسط میں ان چار لسانی گروہوں کی بولیاں جن میں ڈورک (Doric) بھی شامل تھی۔ سرزمین یونان کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں۔ اس زمانے میں جو ادب پیدا ہوا وہ انہیں مختلف بولیوں میں نمودار ہوا۔ چنانچہ ہومر کی مشہور عالم رزمیہ نظمیں "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" جب انہوں نے ایک معین تحریری شکل پائی تو ان کی زبان اے اولک (Aeolic) اور آئی اونک (Ionic) کی ملی جلی بولی تھی۔ یونانی ڈراموں کے کورس نغمے (Choral Lyrics) زیادہ تر ڈورک (Doric) میں موزوں کیے گئے ہیں۔ نثر پہلے پہل آئی اونک میں لکھی گئی [ہیروڈوٹس (Herrodotus) ہپاکریٹیس (Hippocrates)] پھر ایتھنز کی بولی ایٹک (Attic) میں [تھیوسی ڈائی ڈیز، افلاطون (Theucidydes, Plato)] المیائی ڈرامے یعنی ٹریجڈی میں مکالمے کی زبان ایٹک (Attic) ہے تغزلی یا غنائی شاعری (Lyric Poetry) مختلف شاعروں کے ہاں مختلف بولیوں میں ملتی ہے۔ آلکے اوس (Alcaeus) اور سیفو (Sappho) لسبین (Lesbian) میں لکھتے ہیں اور کاری نا (Carinna) بیوشین (Boeotion) میں۔ یہ ہلینی اور رومی دور کی بات ہے کہ آئی اونک و اٹیک (Ionic-Attic) کو دوسری بولیوں پر ایک واضح غلبہ حاصل ہوتا نظر آتا ہے۔

یونانی کا ذخیرہ الفاظ بنیادی طور پر ہند یورپی ہے لیکن اس زبان نے کثیر الفاظ دوسری بھاشاؤں خصوصاً جزیرہ نمائے یونان کے قدیم باشندوں کی مقامی بولیوں سے مستعار لیے ہیں۔ مختلف اسمی اور فعلی مادوں سے استخراج و ترکیب کے ذریعہ یونانی نے ایک ایسا پر مغز اور لوچ دار لغوی ذخیرہ پیدا کیا جو بہت وسیع پر معنی چیز ہے۔

کائی نے (Koine)

چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر کے حملوں نے یونان کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کو ختم کر دیا اور سلطنت مقدونیہ قایم کی۔ مختلف بولیوں کی جگہ بول چال کی یونانی کی ایک کم و بیش یکساں شکل نے لے لی۔ جسے کائی نے (عام) بولی کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد ایٹک (Attic) تھی جو ایتھنز کی کاروباری اور تہذیبی فوقیت کی وجہ سے یونانی کی دوسری بولیوں سے زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ لیکن چوں کہ کائی نے یونانی دنیا کے سارے گنجان آباد علاقوں جیسے مصر، شام اور ایشیائے کوچک میں بات چیت کے لیے استعمال ہوتی تھی اس لیے اس میں بہت سے غیر ایٹک عناصر بھی شامل ہو گئے۔ کتبوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اس زبان نے کاروبار اور نظم

ونثر میں دوسری تمام بولیوں کو زیر کر لیا۔ اس زبان کے ادبی نمونے بائبل کے اولڈ ٹسٹامنٹ کا ترجمہ جسے سیپٹواجنٹ (Septuagint) کہتے ہیں اور جو تیسری صدی ق۔م۔ میں اسکندریہ کی یونانیت زدہ یہودی برادری کے لیے کیا گیا تھا، اور "نیو ٹسٹامنٹ" ہیں۔ سرسری طور پر کائنے کا عہد چوتھی صدی قبل مسیح سے کم و بیش شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کے دور یعنی چھٹی صدی عیسوی تک سمجھنا چاہیے۔

بازنطینی یونانی

بازنطینی سلطنت میں اس کے زوال یعنی قسطنطنیہ کے سقوط (۱۴۵۳ء) تک انتظامی امور اور تصنیفی اغراض کے لیے جو زبان استعمال ہوئی اسے بازنطینی یونانی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کائنے کے مقابلے میں ایٹک سے زیادہ قریب تھی۔ اور قدیم یونانی کا اسلوب رکھتی تھی۔ باوجود طویل تاریخ کے اس یونانی نے کوئی ایسے پایہ کا لکھنے والا نہیں پیدا کیا جو اسے ایک مستقل ادبی رتبہ عطا کر سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ قسطنطنیہ کی ترک فتح سے پہلے کی چند صدیوں میں بازنطینی سلطنت فوجی اور انتظامی بدنظمی کا شکار رہی اور تعلیم کا عام معیار بہت پست رہا۔ موجودہ یونانی اور کائنے میں جو بہت سے صوتی اور نحوی اختلافات نظر آتے ہیں وہ بہت کچھ اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔

جدید یونانی

کائنے اور یونانی کی ان مقامی شکلوں کے میل سے جو غالباً بازنطینی عہد میں پیدا ہو گئی تھیں جدید یونانی کا ارتقا عمل میں آیا۔ یہ یونان کی موجودہ سلطنت اور جمہوریہ قبرص (Cyprus) کی یونانی اکثریت کی زبان ہے ۱۹۲۳ء کے تبادلۂ آبادی سے پہلے ترکی میں یونانی بولنے والوں کی بہت سی آبادیاں تھیں۔ آج بھی استنبول کی یونانی آبادی یہی زبان بولتی ہے ان کے علاوہ جنوبی اطالیہ کے ضلع کلابریا (Calabria) کے بعض گاؤں میں اب بھی یونانی بولنے والے موجود ہیں۔ جدید یونانی کی تین شکلیں ہیں (۱) مقامی بولیاں (۲) بول چال کی معیاری زبان جو یونان کے سارے شہری علاقوں میں برتی جاتی ہے اور ڈی ماٹک (Demotic) کہلاتی ہے۔ (۳) کا تھارے ورسا (katharevirsa) خالص (Kath - aros) — جو ایک بالکلیہ ادبی زبان ہے۔ نظم ونثر، فنی مطبوعات، اخباروں اور پبلک نوٹسوں میں کا تھارے ورسا کا استعمال ہوتا ہے۔ اور ۱۹۶۷ء سے تحتانی سطح سے اوپر کی تعلیم کے لیے اسے سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ کا تھارے ورسا انیسویں صدی کی اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ یونانی کو بدیسی اثرات سے پاک کر کے اس کی صوریات (Morphology) کو کلاسیکی نمونے سے قریب اور باقاعدہ بنایا جائے چنانچہ اس میں کلاسیکی مادّوں اور کلاسیکی گردانوں کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کا محاورہ اور نحوی ترتیب (Syntax) ڈی ماٹک (Demotic) سے برائے نام ہی مختلف ہے۔ کم از کم اخباروں میں جس سلیس زبان کا استعمال ہوتا ہے وہ ڈی ماٹک سے بہت قریب ہے۔ اسی طرح ڈی ماٹک میں بھی کا تھارے ورسا کے عناصر داخل ہو گئے ہیں۔

یونانی ادب

قدیم یونانی لوگ کئی نسلی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے جو موج در موج ہجرت کر کے یونان، ایشیائے کوچک، بحیرۂ ایجین کے کئی جزیروں، کریٹ، سسلی اور جنوبی اطالیہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان ساری یونانی آبادیوں کو ملا کر میگنا گریشیا (Magna Gracia) کہا جاتا ہے۔ ایک ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ ہمیں یونانیوں کے تین بڑے گروہ ملتے ہیں۔ جن کی اپنی ہی بولیاں تھیں۔ ڈورین (Dorian) لوگ جنوبی یونان میں آباد تھے اور ان کا بڑا شہر اسپارٹا تھا اے اولی لوگ (Aeolians) شمالی اور وسطی یونان میں فروکش تھے اور یہاں سے لیسباس (Lesbos) کے جزیرے اور ایشیائے کوچک کے قریبی ساحل تک پھیل گئے تھے۔ آئی اونی لوگوں (Ionians) کا وطن ایٹکا (Attica) تھا جو ایتھنز کے اطراف و اکناف کا علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ وسطی ایجین کے جزیروں میں بھی آباد تھے اور انہوں نے اپنی ایشیائے کوچک کی ساحلی آبادیوں کو آئی اونیا (Ionians) کا نام دے رکھا تھا انہیں کی زبان اپنی ایٹک (Attic) شکل میں آئندہ چل کر یونانی کی ادبی زبان بنی۔

یونانی ادب کا تاریخی تسلسل قبل مسیح کے الف اول سے لے کر آج تک قائم ہے۔ مغربی دنیا کی تقریباً ساری مروجہ اصناف سخن جیسے رزمیہ، نظم، ڈرامہ، غنائی شاعری کئی قسم کی ادبی نثر سب اسی ادب میں موجود اور اسی سے مستعار ہیں۔ یونانی ادب کی جنم بھومی صرف یونان خاص ہی نہیں بلکہ وہ سارا علاقہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ بعد کے زمانے میں جب سکندر اعظم نے یونانی کو بحیرۂ قلزم کے سارے مشرقی علاقے کی زبان بنا دیا تو اس ادب کی سرزمین اور زیادہ وسیع ہو گئی اور ایسے لوگ بھی اس کے لکھنے والوں میں شامل ہو گئے جن کی مادری زبان یونانی نہیں تھی۔ یونانی لسانی دنیا کا تہذیبی مرکز مختلف زمانوں میں بدلتا رہا۔ پانچویں صدی قبل مسیح تک ایشیائے کوچک کے ساحلی شہر ادبی حیثیت سے ممتاز رہے پانچویں اور چوتھی صدی ق م کے دوران ایتھنز ادب کا مرکز رہا۔ پھر اسکندریہ نے اس کی جگہ لے لی تا آنکہ سارا یونانی علاقہ سلطنت رومہ کا جزو بن گیا۔ قدیم یونانی ادب کا ایک بہت تھوڑا حصہ زمانے کی دست برد سے بچ سکا ہے لیکن قرنہا قرن سے یہ ذخیرہ دنیا کے دوسرے ادبوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔

قدیم یونانی ادب کے تین دور ہیں:

۱۔ قبل کلاسیکی ادب (چھٹی صدی ق۔م کے اواخر تک)

۲۔ کلاسیکی ادب (پانچویں اور چوتھی صدی ق۔م) اور

۳۔ ہیلینی (Hellenistic) اور گریکو رومن (Graeco-Roman) ادب (تیسری صدی ق۔م اور اس کے بعد)۔

پہلے دور میں یونانیوں نے لکھت کے وجود میں آنے سے پہلے ایک ایسی زبانی شاعری کی طرح ڈالی جو سننے سنانے اور ساز پر گائی جانے کے لیے تھی۔ لکھت کی ابتدا ساتویں صدی ق۔م سے پہلے کہیں کہیں ہی نظر

آتی ہے۔ کریٹ اور میسی نے (Mycenae) میں لکھت موجود تھی لیکن وہ صرف دفتر اور کار و بار میں برتی جاتی تھی اور میسی نے کی تباہی کے بعد اس کا وجود بھی ختم ہوگیا۔ اس زبانی اور لحنی شاعری کا موضوع وہ اساطیری داستانیں تھیں جو کچھ مثالی اور کچھ تاریخ کی دھندلی یادوں، لوک کہانیوں اور قبل تہذیبی مذہبی خیال آرائیوں پر مبنی یا مشتمل تھیں۔ گویا اساطیری قصے سورماؤں اور دیوتاؤں کی سوانح سے پُر تھے لیکن چوں کہ یہ عبادات (Religious Ritual) کا جزو نہیں تھے۔ اس لیے شاعران میں اپنے طور پر ردّ و بدل کرنے میں آزاد تھے۔ چنانچہ بہت سے ادیبوں نے ان داستانوں کی تشکیل میں انفرادی جدتیں کیں اور اس کارن یونانی فکر اور تخیل کو وسعت اور تونگری حاصل ہوئی۔

رزمیہ نظم: قبل کلاسیکی دور کے نقطہ آغاز پر اور یونانی ادبی روایت میں سرِ فہرست ہیں "الیڈ" (Iliad) اور "اوڈیسی" (Odyssey) کی رزمیہ نظمیں ملتی ہیں۔ جن کے رشتے میسی نے (Mycenaen) دور میں غالباً ۱۵۰۰ ق۔م تک پہنچتے ہیں لیکن جن کی تخلیق کا کارنامہ روایتاً ہومر سے منسوب ہے۔ کم و بیش اپنی موجودہ شکل میں یہ نظمیں غالباً آٹھویں صدی ق۔م کی تحریر ہیں۔ "ایلیڈ" یونانی سورما ایکی لیز (Achiles) کے غیض و غضب کی داستان ہے۔ ایکی لیز یونانی دیوی تھی ٹس (Thetis) کا بیٹا طاقت و شجاعت میں یگانۂ وقت ہے۔ ٹرائے (Troy) کے محاصرے میں وہ یونانی افواج کے سرخیل آگا ممنز (Agamemnons) سے خفا ہو کر جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنے خیمے میں بیٹھا رہتا ہے۔ یہ محاصرہ اتنا طول کھینچتا ہے کہ یونانی سپاہی خستہ حال اور پست ہمت ہونے لگتے ہیں اور ایکی لیز اپنے جگری دوست پٹراکلس (Patroclus) کو محاذ پر بھیجتا ہے۔ جب پٹراکلس ٹرائے کے ہیرو ہیکٹر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو ایکی لیز غیض کے عالم میں میدان جنگ میں اتر آتا اور ہیکٹر کو قتل کر کے اس کی نعش کو اپنے رتھ کے پہیے سے باندھ کر اسے گھسیٹتا پھرتا ہے۔ آخر ہیکٹر کے بوڑھے باپ اور ٹرائے کے حکمران پرائم (Priam) کی منت پر ایکی لیز اس کے بیٹے کی نعش اس کے حوالے کرتا ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر یہ عظیم نظم یکایک ختم ہو جاتی ہے۔ خود ایکی لیز کا خاتمہ اس کے حدود سے باہر ہے لیکن جو بات یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس نظم کے دوران ہی تمام وقت ایکی لیز یہ جانتا ہے کہ موت کا سایہ ہمیشہ اس کے سر پر اور اس کے تعاقب میں ہے۔ اس باب میں ایکی لیز شجاعت کے یونانی نصب العین (Heroic Ideal) کی اعلیٰ ترین تصویر ہے۔ اس نصب العین کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی آبرو اور ناموری کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور اس راہ میں موت کو یقینی جانتے ہوئے اسے پُر وقار طریقے پر قبول کرے۔ ناموری خود اپنا انعام ہے اس کی کوئی جزا نہ اس دنیا میں ہے نہ اس کے بعد۔ ایکی لیز کی اعلیٰ مردانگی اور اس کی پُر آشوب مختصر زندگی میں جو تناقض ہے وہ ٹریجڈی کے یونانی تصور کا خلاصہ ہے۔ یہ تصور یونانی فکر پر ہمیشہ اور ہر جگہ سایہ فگن نظر آتا ہے۔

"ایلیڈ" ایک حزنیہ ہے لیکن "اوڈیسی" حزن و طرب یا ٹریجڈی اور کامیڈی کی ملی جلی شکل ہے۔ اوڈیسی میں داستانی رنگ زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسے جہاں گرد کی کہانی ہے جو برسوں کی غریب الوطنی کے بعد گھر لوٹتا ہے اور ان ظالموں کا خاتمہ کرتا ہے جو اس کی غیر حاضری میں اس کی وفا شعار بیوی اور اس کی املاک پر غاصبانہ قبضے کی کوشش میں ہیں۔ اس نظم کا ہیرو اوڈی سی اس (Odysseus) لاطینی یولی سس (Ulyssis) ایک یونانی جزیرے اتھاکا (Ithaca) کا حکمران ہے اور ایکی لیز کی طرح یہ بھی ایک یونانی نصب العین کا نمائندہ ہے۔ البتہ اس کا تعلق تہذیب کے ایک اگلے مرحلے سے ہے جہاں محض جسمانی طاقت اور دلیری ہی سب کچھ نہیں بلکہ ذہانت کی بھی اہمیت ہے۔ ویسے بہادری میں اوڈی سی اس کسی سے کم نہیں اور نہ جسمانی طاقت اور پھرتی میں لیکن وہ زیادہ تر چالاکی، ہوشیاری اور کبھی کبھی مکر و فن سے کام لیتا ہے ٹرائے سے واپسی میں اس کے سارے ساتھی یا تو غرق ہو جاتے یا خوفناک بلاؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اکیلا خود اپنے وطن میں غریب الدیار، ایک خستہ حال بھکاری کے روپ میں پہنچتا اور اپنے مکان میں داخل ہوتا ہے۔ ان ساری مہموں اور اس تمام عرصے میں اس کی چالاکی اور ذہنی برتری اور اس کا فکر و فن ہی اس کے محافظ رہے ہیں۔

ان دونوں نظموں کی کہانیاں بے حد من موہنی اور ان کا اسلوب سادہ لیکن بلیغ پر زور اور پُر شوکت ہے اور یہ مغربی دنیا کی اولین شعری تصنیفیں ہیں۔ لیکن انہیں کسی حیثیت سے قبل تہذیبی (Primitive) نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اپنی ادبی صنف کی ابتدائی نہیں بلکہ تکمیلی شکل ہیں۔ ان میں ایک ایسی طویل لیکن گمنام زبانی (Oral) شاعری کی روایت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے جس میں بے شمار بے نام شاعروں نے مختلف زبانوں میں آزاد خیال آرائی کی اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے۔ یہ نظمیں، امرا کی محفلوں میں گائی جاتی تھیں اور انہیں سنانے میں کئی دن بلکہ مہینے لگتے ہوں گے اس خاص صورت حال کا گہرا اثر ان کی ہیئت پر موجود ہے چنانچہ یادداشت کی سہولت کی خاطر ان میں بندھے ٹکے فقروں، استعاروں اور تشبیہوں وغیرہ کی تکرار دکھائی دیتی ہے۔ جن ہتھیاروں کا ان نظموں میں ذکر ہے وہ کانسے (Bronze) اور لوہے کے ادوار سے متعلق ہیں۔ اسی طرح بعض ایسی چیزوں کا ان میں تذکرہ ہے جو میسینی (Mycenaen) دور سے متعلق ہیں اور بعض دس سے پانچ سو سال بعد کے زمانے کی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان نظموں کا مواد صدیوں تک تیار ہوتا رہا ہے۔

"ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کے بارے میں بہت سی باتیں اب بھی حل طلب ہیں مثلاً یہ سوالات کہ یہ حقیقتاً کس زمانے کی تصنیف ہیں۔ کس شاعر یا کن شاعروں نے ان کی چہرہ بندی اور تشکیل کی۔ (ہومر کی شخصیت روایتوں کے دھندلکوں میں گم ہے اور قطعی طور پہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی ان شعری کارناموں کا خالق ہے) ان کا سماجی اور تہذیبی مصرف کیا رہا ہوگا کس طرح چھٹی صدی ق۔م میں ان نظموں کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور کن لوگوں نے یہ کام انجام دیا وغیرہ۔ قدیم دنیا میں تھیبز (Thebes) اور ٹرائے کی جنگوں کے بارے میں اتنی رزمیہ نظمیں لکھی گئیں کہ ان کی ایک زنجیر سی بن گئی تھی۔ لیکن ان میں "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کو ہمیشہ ایک الگ اور امتیازی مقام حاصل رہا۔

اخلاقیاتی (Diadactic) شاعری

ہومر کے بعد ہمیں یونانی شاعری میں ہی۔سیوڈ (He si od) کا نام ملتا ہے جو وسطی یونان میں ضلع بوٹشیا (Boetia) کا باشندہ تھا۔ غالباً ۸۰۰ ق۔م اس کا زمانہ ہے۔ اس کی دو تصنیفیں ہیں۔ ایک ایام و کار (Works & Days) اور دوسری تھیوگنی (Theogony)۔ پہلی نظم میں دہقانی زندگی اور کھیتی باڑی کا تذکرہ ہے بوئشیا کے بے کیف میدانی علاقے یہاں کی سخت گرمی اور سردی اور متمول زمینداروں کی کسان پر زیادتیوں کی تصویریں اس نظم میں ملتی ہیں۔ ہی سی یڈ یونانیوں کے پرم آتما زیوس (Zeus) کا عقیدت مند اور پرجوش پجاری ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیوس اچھائی اور برائی کا سختی سے لحاظ رکھنے والا خدا ہے۔ اور عدل اس کی بیٹی ہے۔ دوسری تصنیف تھیوگنی میں ہی سی یڈ نے یونانی خداؤں کی دیومالا، ان کے شجرے اور کائنات کی تخلیق میں ان کے حصے کے بارے میں اساطیری حکایتوں کو نظم کیا ہے۔ مشرق قریب کے اثرات اس کی نظموں میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ہی سی یڈ کا انداز اخلاقیاتی (Didactic) ہے ویسے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یونانی رزمیہ اور اخلاقیاتی شاعری میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ چھٹی صدی ق۔م کے ختم ہوتے ہی رزمیہ شاعری کی روایت پھیکی پڑ چکی تھی اور ہیلینی (Hellinistic) دور میں اس کا جو احیا ہوا وہ زیادہ بارآور ثابت نہ ہو سکا۔

غنائیہ یا تغزلی (Lyrical) شاعری

لیرک (Lyric) کا لفظ ایک قسم کی نظموں کا احاطہ کرتا ہے اس میں وہ نظمیں شامل تھیں جو لائر (ایک باجہ) یا بانسری (Flute) کی سنگیت کے ساتھ انفرادی طور پر یا کورس کی شکل میں گائی جاتی تھیں ان میں وہ نوحے یا ماتمی نظمیں (Eligiac Poems) بھی شامل تھیں جو عموماً رزمیہ بحروں میں لکھی جاتیں اور وہ ہجویہ نظمیں (Lampoons) بھی جو آئی ایمبک (Iambic) بحر میں ہوتی تھیں۔

جزیرہ پاروس (Paros) کے آرکی لوکس (Archilocus) کو یونان کا پہلا غیر رزمیہ شاعر کہا جا سکتا ہے (غالباً ۷۰۰ ق۔م) اس کی بہت سی ادھوری نظمیں ملتی ہیں جن میں ایک تند و توانا شخصیت کا سراغ ملتا ہے۔ آرکی لوکس کی نظمیں ایک مہم پسند شخصیت کی پرشور آشفتہ سری اور تلخی انسانوں اور رسوم پر تضحیک آمیز طعن و تشنیع (Invectives) سے پر ہیں۔ ازمنۂ قدیم میں آرکی لوکس کو ہمیشہ ایک اہم شاعر مانا جاتا تھا۔

آرکی لوکس کے جانشین سیمونائیڈیز (Semonides) اور ہپونکس (Hippnax) ہیں جو بالترتیب آمورگس (Amorgos) اور افسس (Ephesus) کے باشندے تھے۔ یونان کے نوحہ نویس شاعر ایشیائے کوچک میں آئی اونیا (Ionia) کے جزیروں میں آباد تھے۔ ادبی نقطۂ نظر سے کوئی اہم نام ان میں نہیں ملتا۔

چھٹی صدی ق۔م کے شروع میں جزیرہ لیس باس (Lesbos) میں ایک نئی نہج کی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ شاعری اس جزیرے کے شورہ پشت اور جتھے بند امرا کے طبقے میں پیدا ہوئی اور مقامی ایولک (Aeolic) بولی میں لکھی گئی۔ یہاں ہمیں آلکے ایس (Alcaeus) اور سیفو (Saffo) کے مشہور نام ملتے ہیں۔ آلکے ایس کا موضوع سیاسی جتھے بندیاں اور خانہ جنگیاں ہیں اور اس کی شاعری میں ایک راست بازی اور بے باکی ہے جو اس کی خصوصیت ہے۔ یہی راست بازی اور بے باکی ایک بڑی ہی دلکش لطافت و دلبری کی آمیزش کے ساتھ ہمیں سیفو کی عشقیہ نظموں میں ملتی ہے جو یونانی تغزلی شاعری کے بہترین نمونوں میں سمجھی جاتی ہیں۔ سیفو کی نظمیں پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے وطن میں عورتوں کو یونان خاص کے مقابلے میں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ سیفو کی شاعری میں لزبین ازم (Lesbianism) یعنی عورتوں کے عورتوں سے عشق کے بھی کچھ نشان ملتے ہیں گو ہمیں یہ علم نہیں کہ جن لڑکیوں کا اس نے اپنی نظموں میں ذکر کیا ہے ان سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ سیفو کے بعد جزیرہ تے اس (Teos) کے آنیک رے آن (Anacrion) کے یہاں عشقیہ شاعری ملتی ہے۔ ان لوگوں کی شاعری ایسی تھی جو ایک آواز میں گائی جانے (Solo performance) کے لیے تھی۔ اس کے مقابل یونان خاص کے ڈورین (Dorian) علاقوں سسلی اور جنوبی اطالیہ کی یونانی نوآبادیوں میں کورسی غنائی نظمیں (Choral Lyrics) لکھی جارہی تھیں۔ جو روایتاً ڈورین بولی ہی میں مرتب ہونے لگیں۔

کورسی نغمے جو چنگ (Lyre) بانسری (Flute) کی سنگت میں گاتے جاتے تھے ہیئت کے اعتبار سے بہت پیچیدہ تھے ان میں ہر گیت کے لیے ایک علاحدہ بحر استعمال کی جاتی تھی جو کبھی دوسرے گیت کے لیے من وعن استعمال نہیں ہوتی تھی۔ کورسی گیت کا فن زیادہ تر مذہبی، حمد یا فاتح کھلاڑیوں کے قصیدوں سے متعلق تھا۔ اس نوع کا پہلا شاعر غالباً اسپارٹا کا الکمان (Akaman) تھا۔ جس کا زمانہ لگ بھگ ۶۲۰ ق۔م کا ہے۔ اس سے کچھ عرصے بعد اسٹے زی کورس (Stesi choris) اور سی مونائیڈیز (Simonides) کے نام آتے ہیں۔ اوّل الذکر نے اساطیری اور دوسرے نے ماتمی گیت لکھے۔

کورسی نغمے کا سب سے عظیم شاعر تھیبیز (Thebes) ضلع بوئشیا (Boetia) کا پنڈار (Pindar) ہے جو غالباً ۵۱۸ یا ۵۲۲ ق۔م میں پیدا اور ۴۸۶ ق۔م میں فوت ہوا۔ پنڈار خصوصاً ان غنائی قصیدوں کے لیے مشہور ہے جو اس نے اولمپیا (Olympia) ڈلفائی (Delphi) خاکنائے کارنتھ (Isthmus of Carnith) اور نیمیا (Nemea) کے عظیم الشان کھیل کے مقابلوں کے فاتحین کی تعریف میں لکھے۔ اپنی فتح کے لمحے میں یہ کھلاڑی عہد قدیم کے ان سورماؤں (Heroes) کے ہمسر معلوم ہوتے تھے جن کی اولاد ہونے کا انھیں دعویٰ تھا ان کے تعریفی گیت لکھتے ہوتے پنڈار یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ایک بہت اہم کام انجام دے رہا ہے تغزلی شاعری میں آخری نام بے کی لائیڈیز (Bacchylides) کا ہے جس کی شاعری میں زوال کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔

ٹریجڈی یا المیہ

ٹریجڈی کی ابتدا کے بارے میں بہت سے نظریے ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ عام طور پر لوگ ارسطو کے اس خیال سے متفق ہیں کہ ٹریجڈی کا نقطۂ آغاز مذہبی کورسی گیت

ہے جسے ڈی تھی رامب (Dithyramb) کہا جاتا ہے اور جو بہار کے آغاز پر یونانی شراب و بہار کے دیوتا ڈائی اونائی سز (Dionysus) کے تہوار میں پیش کیا جاتا تھا غالباً پہلی دفعہ تھیس پس (Thespis) نامی ایک شاعر نے ایک اداکار اور کورس کے لیڈر کے ساتھ اس کے مکالمے کا ڈی تھی رامب میں اضافہ کیا اور اس طرح ٹریجڈی کی بنا ڈالی۔

ڈائی اونائی سز کا تہوار گرمیوں کے شروع میں منایا جاتا تھا اور اس موقعے پر عموماً تین ناٹک نگار تین تین حزنیہ کھیل اور ایک ایک ساطری ناٹک (Satyr Play) پیش کرتے تھے۔ ساطری ناٹک جس میں شروع میں غالباً ساطروں (Satyrs) کا کورس ہوا کرتا تھا ایک مضحک (Burlesque) طرز کا کھیل تھا۔ مسلسل تین دن تک یہ ناٹک پیش کیے جاتے تھے اور آخری روز کسی ایک شاعر کو اس کے سب سے زیادہ کامیاب ناٹک کے لیے انعام عطا کیا جاتا تھا انعام کا تصفیہ منتخبہ جج ووٹ کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔

یونانی ٹریجڈی خاص ایتھنز کی پیداوار ہے اور اس کا عروج وزوال ایتھنز کے عروج وزوال سے منسلک ہے۔

یونانی ڈرامے کی ہیئت پر تھیٹر کی ساخت اور خصوصیات کا گہرا اثر ہے۔ اس تھیٹر کا خاکہ دینے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ تھیٹر کھلے آسمان تلے پندرہ بیس ہزار تماشائیوں کے لیے ہوتا تھا اور سارے کھیل کے دوران کورس (جو اصلاً گانے اور ناچنے والوں کی جماعت پر مشتمل تھا) تماشائیوں کی نظروں کے سامنے موجود رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کورس اور کورسی نغمے اور واقعات تمثیل پر کورسی تبصرے یونانی ڈرامے کا ایسا اہم اور نمایاں جزو ہیں۔ ایکٹر چہروں پر ایک ماسک (mask) پہن لیتے تاکہ دور سے بھی پہچانے جاسکیں۔ اور اس ماسک کو دہن کے پاس اس طرح باندھ دیا جاتا تاکہ وہ آواز کو دور پہنچانے کے لیے ایک طرح کے مائیکروفون کا کام دے۔ تھیٹر چونکہ ایسی جگہ بنایا جاتا جہاں تین طرف پہاڑیاں ہوتیں اس لیے ایکٹروں کی آواز کی گونج دور دور تک پہنچ سکتی تھی ناٹک کے واقعات سب پس پردہ پیش آتے اور ان کا تذکرہ کسی اداکار کے ذریعہ تماشائیوں کے گوش گزار کیا جاتا۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھیں تو یونانی ڈرامے کی مخصوص صفات ہماری سمجھ میں آئیں گی۔

یونانی کلاسکی ٹریجڈی کے تین بڑے نام ایس کی لس (Aeschylus) سوفوکلیز (Sophocles) اور یوری پڈیز (Euripidis) ہیں۔ تینوں کے ڈرامے اساطیری داستانوں پر مبنی ہیں ایسکی لس کی گہری مذہبی فکر اس کے ناٹکوں میں نمایاں ہے۔ اس کا موضوع قضا و قدر اور انسانوں اور ان کے معبودوں کے باہمی رشتے اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں ہیں۔ جرم و سزا یا گناہ اور مکافاتِ گناہ اس کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ اس موضوع کی اس نے تین مسلسل ناٹکوں یعنی ایک مثلثے (Trilogy) میں کھوج کی ہے۔ اس تین کھیلوں کے مجموعے کو آرسٹے (Oresteia) کا نام دیا گیا ہے۔ ایسکی لس کا اسلوب پُرشوکت اور پُرزور ہے

ایسکی لس کا جانشین اور اس کے آخر زمانے کا ہم عصر سوفوکلیز (۴۹۶-۴۰۶ ق.م) ہے سوفوکلیز نے کورس کی اہمیت کو گھٹایا اور ایک تیسرے ایکٹر کو ڈرامے میں شریک کیا (اس سے پہلے ڈرامے میں صرف دو ایکٹر حصہ لیتے تھے) سوفوکلیز نے دیوتاؤں کے نظام قضا و قدر کو بلا حجت قبول کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ انسان اس بندھے بندھائے نظام میں کس طرح زندگی گزار سکتا اور کیا اخلاقی قدریں پیدا کر سکتا ہے۔ سوفوکلیز کو اپنے ڈرامے کی حرکت وارتقا اور مکالموں پر ایسی گرفت حاصل تھی کہ اس کے ناٹک ہیئت کے اعتبار سے اعلیٰ اور مکمل ہیں۔ اس نے انسانوں کو عموماً ان کی زندگی کے فیصلہ کن اور المناک لمحوں میں پیش کیا جب ان کی انسانیت مجبوری اور مردانگی سب نکھر کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یوری پڈیز (۴۸۰ - ۴۰۶ ق.م) ایک بدلی ہوئی دنیا کا باشندہ اور شاعر تھا۔ جب وہ شعور کو پہنچا تو سوفسطائی فلسفی، روایتی عقیدوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یونانی مذہبی عقیدوں کا بہت بڑا حصہ اس جانچ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سوفسطائیوں نے سارے معاشرے کے ڈھانچے اور اس کی قدروں کو بحث کے ذریعہ جانچا اور ایک کم و بیش تخریبی تنقیح و تنقید کے دور کا آغاز کیا جو یوری پڈیز کے مزاج کے لیے سازگار تھا۔ لیکن ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے یوری پڈیز، اساطیری داستانوں کو برتنے پر مجبور تھا جب کہ وہ انھیں مہمل اور بے معنی سمجھتا تھا۔ اس نے ان اساطیر میں غیر معمولی ردّ و بدل کر کے اپنے زمانے کے مسائل پیش کیے اس کی تیز حسیت اور نفسیاتی بصیرت نے اس کو زمانۂ حال کے مذاق سے بہت قریب کر دیا ہے۔

یونانی ٹریجڈی دنیا کے ادب عالیہ میں بہت اونچا مقام رکھتی ہے ایسکی لس، سوفوکلیز اور یوری پڈیز کے ڈراموں کی مواج گہرائی اور قوت آج تقریباً ڈھائی ہزار برس گزر جانے کے بعد بھی برابر محسوس کی جاسکتی ہے۔

کامیڈی

ٹریجڈی کی طرح کامیڈی بھی ڈائی اونائی سز سے متعلق ایک مذہبی رسم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ یہ رسم آفات سے نجات پانے اور بارآوری (Fertility) کو فروغ دینے سے متعلق تھی اور اس میں دشنام طرازی، فحش حرکتوں اور فحش گوئی کی کافی گنجائش تھی۔ اس سے غالباً کامیڈی کا وہ حصہ وجود میں آیا جس میں کورس ڈرامے کے پلاٹ میں مداخلت کرتے ہوئے وقتی موضوعات اور شخصیتوں پر تبصرہ کرتا تھا اور جسے پاراباسیس (Parabasis) کہتے ہیں کامیڈی کا ناٹکی یا ڈرامائی عنصر اس غیر مذہبی ڈوریَن کامیڈی کا رہین منت ہے جس کی ابتدا میگارا (Megare) میں نشوونما ایپی کارمس (Epicharmus) کے ہاتھوں سائی راکیوز (Syracuse) میں ہوئی۔

۴۸۶ ق م کے ایتھنز میں کامیڈی سرکاری طور پر ڈائی اونائی سز کے تماشوں کا ایک جزو بن گئی۔ اس صنف کا پہلا مصنف کراٹی نس (Cratinus) سمجھا جاتا ہے۔ پرانی کامیڈی کا استاد ایرسٹو فینز (Aristophanes) اس سے کوئی پچاس سال بعد کا شاعر ہے۔

ایرسٹوفینز نے کامیڈی کو کسی قدر مہذب بنایا لیکن پھر بھی بے رحمانہ تنقید و تضحیک، تخیل آمیزی، آزادانہ سیاسی تنقید اور بے باک عریانیت میں وہ کسی سے کم نہیں۔ پرانی کامیڈی میں صرف اسی کے ڈرامے زمانے کی دست برد سے بچے ہیں۔ ایرسٹوفینز کے استادانہ لیکن اکثر بے جا تمسخر کی زد میں ایتھنز کی بڑی بڑی شخصیتیں آئیں۔ چنانچہ اپنے ایک ڈرامہ "بادل" (The clouds) میں اس نے سقراط جیسے دانا کا بھی مذاق اڑایا ہے۔

چوتھی صدی ق۔م کے ابتدائی حصے میں پرانی کامیڈی بتدریج نئی کامیڈی میں تبدیل ہونے لگی۔ ان دونوں کی درمیانی صنف کا کوئی نمونہ ہمارے ہاتھ نہیں لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس درمیان کامیڈی سے کورس کو خارج کر دیا گیا تھا اور اس میں زیادہ بے باک اور اعلانیہ سیاسی رد و قدح اور سماجی طنز و ہجو کا دخل ہو گیا تھا۔ اس درمیان کامیڈی کے پیچیدہ پلاٹ سے نئی کامیڈی کی شاخ پھوٹی۔ اس کامیڈی کا سب سے بڑا نمائندہ مینا ندر (Menander) ہے جس نے ۱۰۵ ناٹک لکھے۔ ان میں سے صرف ایک مکمل ڈرامہ ڈائسولاس (Dysolos) اور چار دوسرے ادھورے ڈرامے پے پی رس پر لکھے ہوتے بچے ہیں۔

نئی کامیڈی کسی حد تک یوری پڈیز کی ٹریجڈی سے متاثر و ماخوذ ہے۔ یعنی اس میں کسی پرانی اساطیری کہانی کو نئے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ نئی کامیڈی کا پلاٹ عموماً کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کوئی دوشیزہ کسی شہری نوجوان کے دام میں پھنس کر چوری چھپے ایک بچی کو جنم دیتی ہے۔ جو بعد میں عموماً طوائف بن جاتی ہے اور کسی شریف زادے سے عشق کرنے لگتی ہے۔ پھر کسی دن یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شریف ماں باپ کی اولاد ہے اور کھیل شادی پر ختم ہوتا ہے اسی کہانی میں قدم قدم پر پیچیدگیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

تاریخ نویسی فنِ تاریخ نویسی یورپ میں یونان ہی کا رہین منت ہے۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) یونان کا پہلا بڑا مورخ تھا جس کی سادہ و دلنشیں نثر میں لکھی ہوئی تاریخ اپنی وسعت و شکوہ کے اعتبار سے ایک عظیم الشان تصنیف ہے۔ تھیوسی ڈائی ڈیز (Thucydides) (۴۶۰ - ۴۰۰ ق۔م) غالباً پہلا آدمی ہے جس نے ایک تیز اور اعلیٰ ذہن کو سیاسی اقتدار کی اصل و ماہیت اور سیاسی حکمت عملی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کے تجزیئے کے لیے استعمال کیا۔ تھیوسی ڈائی ڈیز کی تاریخ سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی ہے لیکن اس کی تیز معاملہ فہمی بہت اونچے درجے کی ہے۔

فصاحت اور فن خطابت بہت کم معاشرے ایسے ملتے ہیں جن میں فصیح البیانی اور خطابت کی اتنی قدر رہی ہے جتنی یونانی معاشرے میں تھی۔ جمہوریت کے فروغ نے اس فن کو اور بڑھاوا دیا۔ سیاست اور عدالت دونوں جگہ اس کی بڑی اہمیت تھی

فن خطابت (Rhetoric) کا باقاعدہ مطالعہ غالباً ۴۶۰ ق م میں سائی راکیوز (Cyracuse) میں پہلی بار شروع ہوا جہاں اس فن کے استاد کوریکس (Corax) اور اس کے شاگرد ٹی سیاس (Tisias) اور گارجیاس (Gorgias) تھے۔ کوریکس نے اس فن پر پہلا کتابچہ تحریر کیا۔ ایتھنز میں فن خطابت کے عالم اینٹی فن (Antiphbin) اور انڈوسائی ڈیز (Andocides) تھے جو پانچویں صدی ق۔م کے لوگ تھے۔ سسلی کے گارجیاس نے پہلی دفعہ توازن، تناسب اور موزونیت (Rhythm) کو اسلوب بیان (Style) کے اہم اجزا کی حیثیت سے پیش کیا۔ یونان کا سب سے بڑا خطیب اور فصیح البیان مقرر ڈیماس تھینز (Demosthenes) (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) تھا اس کے خطبے زیادہ تر سیاسی ہیں اور گو فنی نزاکتوں کی ان میں کمی ہے لیکن زور بیان میں ان کا کوئی جواب نہیں۔

فلسفہ چوتھی صدی قبل مسیح کا سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ وہ فلسفیانہ نثر ہے جس کا سلسلہ سوال و جواب کے مخصوص سقراطی طریقۂ تعلیم سے شروع ہوا۔ اس سقراطی مکالمے کا سب سے اعلیٰ استعمال ایتھنز کے افلاطون (۴۲۸-۳۴۸ ق۔م) کی تحریروں میں ملتا ہے افلاطون کی اس طرز میں کئی چھوٹی تصنیفیں ہیں جن میں سقراط مرد دانا اور پیر مغاں کی حیثیت سے بنیادی کردار کا حامل ہے۔ ان تحریروں میں افلاطون نے سقراط کا جو کردار پیش کیا ہے وہ یونانی ادب میں کردار نگاری کا سب سے زیادہ جاندار اور مکمل نمونہ ہے۔ افلاطون کی نثر ایک بڑے ہی بسیط حسن کی مالک ہے اور اس میں اتنا لوچ ہے کہ وہ ہر قسم کے موضوع کا ساتھ دے سکتی ہے۔

افلاطون کے شاگرد ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق۔م) کی نثر قدیم زمانے میں بے حد مشہور و مقبول تھی لیکن اس کی جو تحریریں ہم تک پہنچی ہیں وہ زیادہ تر اسباق کے خلاصوں اور تعلیمی اشاروں (Lectur Notes) کی شکل میں ہیں اور ان کی نثر پھیکی اور بے رنگ ہے۔ بعض ادبی موضوعات پر ارسطو کی کتابیں زمانۂ دراز تک سند کا درجہ رکھتی تھیں مثلاً "فن خطابت" (Rhetoric) اور فن شعر (Poetics) جس کو بوطیقا بھی کہا گیا ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد کی صدیوں خصوصاً اٹھارویں صدی عیسوی میں ارسطو ایک ادبی قانون ساز کی حیثیت رکھتا تھا۔ دور وسطیٰ کی دنیا میں سائنسی اور انسانی معاملات میں ارسطو کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ عرب بھی اکثر چیزوں میں اسے معلم اول مانتے تھے۔

یونانی ادب کا ہیلنی دور

یونانی ادب کا ہیلنی دور تقریباً سارے کا سارا تیسری صدی قبل مسیح کی حدود میں ہے اس میں تین بڑے نام ملتے ہیں۔ تھیوکری ٹس (Theocritus) (۳۰۰ - ۲۵۰ ق م) سائی رکیوز (Cyracuse) کا باشندہ اور اس شبانی نظم (Pastoral Poetry) کا موجد ہے جس میں سسلی اور جنوبی اطالیہ کے چرواہوں کی شاعری کی روایت لاطینی میں ورجل (Virgil) سے ہوتی ہوئی جدید یورپ کی زبانوں میں بہت دن تک باقی رہی۔ تھیوکری ٹس کے جانشیں موسکس (Moschus) اور بایان (Bion) ہیں۔ ڑہوڈس کے

اپولونی اس (Appolonius of Rhodes) نے رزمیہ شاعری کی روایت کو تازہ کیا اور اس میں ایک نئی رومانیت کو داخل کیا جو بعد کو ورجیل "اینیڈ" (Aeneid) میں قرطاجنہ کی ملکہ ڈائی ڈو (Dido) اور اینیاس (Aeneas) کے عشق میں زیادہ نکھر کر نمودار ہوتی ہے۔ کیلی میکس (Calimachus) (۲۶۰ ق ۔م) نے رزمیہ طرز کو ترک کر کے ایک زیادہ مختصر نظم کی بنا ڈالی جس میں جذبے اور خیال کی زیادہ گہرائی کی گنجائش تھی۔ اس زمانے میں شاعری اور علمیت کو آمیز کرنے کی خواہش نے موعظتی اور اخلاقیاتی شاعری (Didactic Peotry) کو جنم دیا اور بعض لوگوں نے طبی ہدایات کو بھی نظموں میں ڈھالا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے درمیانی برسوں میں یونانی شاعرانہ کاوشیں ختم ہوگئیں اور چوتھی صدی عیسوی میں جو شعری احیا ہوا وہ ناقابلِ اعتنا ہے۔

نثر ہیلینی دور کی تقریباً ساری علمی، تاریخی اور سائنسی نثر دستبردِ زمانہ کی نذر ہوگئیں کچھ مورخوں کے نام ملتے ہیں جن کی تصنیفیں تباہ ہوگئیں یا پارہ پارہ بچی ہیں۔

تنقید نگاری میں لانجائی نس (Longinus) کا رسالہ "دربیانِ رفعتِ خیال" (On the SubLime) جو غالباً ۴۰ ء کا لکھا ہوا ہے تخلیقی ادب کے تیز فہم اور ذکی الحس تجزیے کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ اقلیدس اور ارشمیدس جیسے تیسری صدی ق.م کے ریاضی دانوں کی تحریروں اور جالینوس (۱۲۹ء۔ ۱۹۹ ء) کی طبی تصنیفوں کا بہت بڑا حصہ محفوظ رہ سکا ہے۔ اب یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ یونانی فلکیاتی علم اور افلاطون، ارسطو بقراط، اقلیدس، فیثاغورث، ارشمیدس اور جالینوس کے افکار اور ان کی تحریروں کو بچانے اور انھیں معقول اضافوں کے ساتھ دورِ جدید تک پہنچانے میں دورِ اول کے عربوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ فلکیات اور جغرافیا میں یونانیوں کے کارنامے کا خلاصہ اسکندریہ کے بطلیموس (Ptolemy) کی تحریروں میں ملتا ہے جو دوسری صدی عیسوی کا باشندہ تھا۔

یونانی اسکندریہ کی یہودی نوآبادیوں کے بہت بڑے حصے کی زبان تھی اور توریت یعنی "اولڈ ٹیسٹامنٹ" (Old testament) کا یونانی ترجمہ جسے "سپٹواجنٹ" (Septuagint) کہتے ہیں، یہیں ہوا۔ انجیل (New Testament) کا عوامی یونانی یعنی "کائنی" (Koine) میں ترجمہ ہوا۔ اس دور میں رواقیت (Stoicism) کے فلسفے کا آغاز ہوا۔

ہیلینی دور کی ایک بہت مشہور اور تعلیم و تربیت پر صدیوں گہرا اثر ڈالنے والی کتاب پلوٹارک (Plutarch) کی "مشاہیرِ یونان و روما" ہے۔ پلوٹارک نے اس کتاب کو جو تاریخ سے زیادہ سوانح عمری کی تعریف میں آتی ہے بلندیٔ اخلاق کو فروغ دینے کی خاطر لکھا تھا۔ اس کی اکثر داستانیں واقعاتی اعتبار سے مشکوک ہیں۔

یونانی طبّاعی کا آخری کارنامہ ناول یا عشقیہ داستان (Erotic Romance) کی ایجاد ہے۔ جس کا آغاز غالباً پہلی صدی قبل مسیح میں ہوا۔ لیکن جس کی جڑیں یوری پڈیز کے بعض ناٹکوں اور یونانی نئی کامیڈی تک پہنچتی ہیں۔ اس قسم کی خیالی، نیم تاریخی داستانوں کی ایک مثال وہ کہانیاں ہیں جو سکندرِ اعظم اور اس کے کارناموں کے بارے میں لکھی گئیں اور دورِ وسطیٰ میں بہت مقبول ہوئیں۔ ممکن ہے کہ فارسی میں نظامی کا "سکندر نامہ" بہت کچھ ان داستانوں پر مبنی ہو۔ جو عشقیہ داستانیں بچ رہی ہیں ان کے لکھنے والوں میں دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے زینوفن (Xenophon) اور ہیلیوڈارس (Helio dorus) مشہور ہیں۔ ان سب داستانوں کا موضوع چند حقیقی عاشق و معشوق ہیں جو بے شمار مشکلات، آسمانی آفتوں اور انسانی بدطینتی کا شکار ہو کر ہجر کی صعوبتیں اور رنج جھیلتے ہیں اور آخرکار وصل سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ارضیات

ارضیات

ارضیات

علم ارضیات سائنس کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں زمین کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں جو حجرات اور جمادات پائے جاتے ہیں ان کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ ایک قدیم علم ہے جس سے اہل عرب اچھی طرح سے واقف تھے جس طرح علم کیمیا وغیرہ سے۔ یہ علم قدیم زمانہ سے علم طبقات الارض کے نام سے موسوم ہے یعنی وہ علم جو سطح ارض کے ہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے لیکن اب اسے ارضیات کہا جانے لگا ہے گزشتہ چند سالوں میں اس علم میں بھی اور علموں کی طرح بے حد ترقی اور اضافہ ہوا ہے۔

قدیم زمانہ کا انسان حجرات کی تین طبعی خصوصیات سے واقف تھا۔ اور ان ہی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے وہ حجرات کو اپنی روزانہ زندگی میں استعمال میں لاتا تھا۔ پہلی خصوصیت اس کی سختی یعنی کونسا پتھر سخت ہے اور کون سا نرم۔ دوسری خصوصیت ان کا رنگ کہ کون سے رنگ کا حجر کس کام آسکتا ہے۔ تیسری خصوصیت حجر کی ترکیدگی یعنی کس حجر کے توڑنے پر نئی سطح ہموار اور صاف ہوتی ہے یا غیر ہموار چنانچہ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ جس کو "حجری دور" (Stone Age) کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں دھاتوں کا انسان کو پتہ نہ تھا۔ اور وہ ہر قسم کے کام میں حجرات ہی کا استعمال کرتا تھا انہیں سے اوزار بنائے جاتے تھے جن سے انسان جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ ہتھیاروں میں چاقو، آری اور کلہاڑی بہت عام تھے۔ جو کہ آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کانسے اور لوہے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اور پھر دھاتوں کا استعمال بڑھتا ہی گیا اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

اگر ہم اس علم کی عمر کا مقابلہ علوم نباتیات، حیوانیات، کیمیا اور طبیعیات کی عمر سے کریں تو ایک طرح تو اس کی عمر بہت زیادہ ہے اور ایک طرح بہت کم۔ بہت زیادہ اس طرح کہ حجری دور میں ہر انسان اپنی ضروریات کے لیے مناسب حجر کی شناخت اور ان کی ضروری خصوصیات سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ ان کے بہتر سے بہتر ذخائر کی تلاش کیا کرتا تھا اور اس طرح اپنے دور کا ماہر حجریات ہوتا تھا۔ لیکن اگر عمر سے مراد وہ زمانہ ہے کہ جب سے انسان نے اس علم میں تحقیق و جستجو شروع کی تو اس کی عمر بہت کم ہے۔ کانسے اور لوہے کا استعمال جب بڑھا اور کانکنی میں مشکلات پیش آنے لگیں تو اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اس کام میں بھی مہارت کی ضرورت ہے اور پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ آہستہ آہستہ اس علم نے بھی ایک علاحدہ سائنس کا درجہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ آج یہ علم تمام علوم میں ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس علم کی مدد سے ہی تمام جمادات اور حجرات جن کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ انسان کس حد تک ہر ہر قدم پر جمادات اور دھاتوں کا محتاج ہے۔ اس کا احساس اپنے چاروں طرف ایک نظر دوڑانے سے ہی ہو سکتا ہے اور موجودہ دور میں دھاتیں کیا رول ادا کر رہی ہیں تقریباً بیان سے باہر ہے۔ اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ معدنیات زمین سے نکال لینے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں ہوتیں۔ اور اس لیے رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں ظاہر ہے کہ اس صورت میں ماہرین ارض کی ضرورت زمانہ مستقبل میں بڑھتی ہی جائے گی۔ انگلینڈ میں جارج بیلاس گرینو۔ پروفیسر ڈبلیو بکلینڈ لسے سجوک۔ آر۔ آئی موچیسن اور چارلس لائیل جیسی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے اس علم کو ایک مستقل علم بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔

علم ارضیات میں سائنس کی اور دوسری شاخوں مثلاً نباتیات۔ حیوانیات طبیعیات، کیمیا اور ریاضی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں موجودہ اور گزشتہ زمانے کے پہاڑ، دریا، سمندر، نباتات اور حیوانات پر تحقیق کی جاتی ہے۔ جس طرح مضامین نباتیات اور حیوانیات موجودہ درختوں اور جانوروں کی زندگی کے حالات اور ان کی ساخت وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں اسی طرح علم ارضیات یہ بتاتا ہے کہ نباتات اور حیوانات کب وجود میں آئے اور ہزارہا یا کروڑہا سال قبل اس کرۂ ارض پر کس قسم کے حیوانات و نباتات تھے اور کن حالات میں تھے اس طرح یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے درخت اور جانور تھے جو اب معدوم ہیں۔ یہ علم زمین، درخت اور جانوروں کے ارتقائی درجوں کو صرف ظاہر ہی نہیں کرتا بلکہ ان درجوں کو ثابت بھی کرتا ہے۔ لیکن اس سے اہم رول جو یہ علم ادا کرتا ہے وہ مختلف الاقسام معدنیات کی تلاش۔ ان کے ذخائر کی جانچ اور پھر کانکنی کے مختلف طریقوں میں سے صحیح طریقے کا انتخاب ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ماہرین ارض نہایت خاموشی سے دنیا کی اہم ترین خدمات میں سے ایک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان تمام علوم میں سے جن سے علم ارضیات میں مدد لی جاتی ہے علم کیمیا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس کی مدد سے جماد یا حجر کے کیمیائی اجزا اور ان کا تناسب معلوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ تقریباً ہر قدم پر جماد یا حجر کی کیمیائی تشریح لازمی ہو جاتی ہے۔

ارضیاتی ترکیب میں ہوا اور پانی اہم عوامل کہلائے جا سکتے ہیں۔ یوں تو کرۂ باد ایک علاحدہ سائنس کا شعبہ ہو گیا ہے جس کو میکالیات

(Meteorology) کہا جاتا ہے اور جو پانی زمین پر یا سمندر میں پایا جاتا ہے ان کے علوم کو ہائیڈرولوجی (Hydrology) اور اوسیانو گرافی (Oceanography) کہا جاتا ہے۔ مگر ان تینوں مضامین کا ارضیاتی علوم سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زمین کی ابتدا اور اس کی ترقی کے مدارج کا علم تکوینیات (Cosmogony) کہلاتا ہے جو فلکیات (Astronomy) کی ایک شاخ ہے۔ زمین کی ابتدائی حالت اور اس کے جغرافیائی مقام کی تفصیلات علم جادیات (Geodesy) کی مدد سے معلوم کی جاتی ہیں۔ ارضیات کی ایک اور شاخ جس کو طبعی جغرافیہ (Physical Geography) یا ارضیاتی شکلیات (Geophysics) کہا جاتا ہے اس کی مدد سے زمین کی بیرونی سطح کے خدوخال معلوم کیے جاتے ہیں اور ان کے ارتقا پر تحقیق ہوتی ہے۔

علم ارضیات، طبیعات ارض اور جغرافیہ کو یکجا کر کے Earth Sciences یا زمینی سائنس بھی کہتے ہیں۔ دور حاضر کی بے پناہ سائنسی معلومات اور ترقی کے ساتھ ساتھ ہر مضمون کی کئی کئی شاخیں ہو گئی ہیں۔ دوسرے مضامین کی طرح ارضیات کی بھی کئی شاخیں ہو گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ (۱) پہلی تکوینیات ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا (۲) طبعی ارضیات (Physical Geology) جس میں باضابطہ طور پر جمادات اور حجرات کی طبعی اور کیمیائی خصوصیات اور ان کے ماخذ کا طریقہ معلوم کیا جاتا ہے۔ (۳) زمین کی بیرونی شکل اور اس کی ارتقائی ترقی کی معلومات کے علم کو ارضی شکلیات (Geomorphology) کہا جاتا ہے۔ (۴) رسوبی حجرات کی ابتدائی حالت اور حجر تیار ہونے تک جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل جس علم میں معلوم کی جاتی ہے۔ اس کو عام طور پر رسوبیات (Sedimentation) کہا جاتا ہے۔ (۵) حجریات (Petrology) اور حجر نگاری (Petrography) میں آتشی تقلیبی اور رسوبی حجرات اور مکمل تقلیب پر تحقیق ہوتی ہے۔ اس کی شاخ در شاخ میں قلمیات (Crystallography) اور جمادیات (Mineralogy) بھی شامل ہیں۔ (۶) حجرات کی تہوں میں اکثر الٹ پلٹ، توڑ موڑ اور شکن و رخنے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے متعلق حاصل کیے گئے علم کو ساختیاتی ارضیات (Structural Geology) کہتے ہیں۔ (۷) قابل استعمال حجرات اور جمادات کے متعلق جو معلومات حاصل کی جاتی ہیں ان کو معاشی ارضیات (Economic geology) کے تحت لایا جاتا ہے۔ (۸) تاریخی ارضیات (Historical Geology) جس میں، علم الطبقات (Stratigraphy) بھی شامل ہے کے تحت آتشی اور پرت دار حجرات اور ان کی عمر اور رشتہ کا پتہ چلایا جاتا ہے (۹) جس مضمون میں رکازات کے وقوع اور پرت دار حجرات میں ترتیب وار سلسلہ اور حجرات کی عمر کے لحاظ سے ان کی عمر کا پتہ چلایا جاتا ہے اس کو رکازیات (Palaeontology) کہا جاتا ہے۔ (۱۰) ارضیاتی سائنس کی تاریخ۔

ارضی تحقیق کا ایک اہم جز نقشوں کی تیاری ہے۔ جس میں مختلف نقاط نظر سے حجرات کی خصوصیات اور ان کی ارضیاتی عمر کے لحاظ سے نقشے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر محقق یا ماہر ارضیات ایک حصۂ زمین کا انتخاب کرے اور وہاں کافی عرصہ جانچ پڑتال میں گزارے۔

اس طرح علم ارضیات کو حسب ذیل اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) علم کائنات (تکوینیات)
(ب) طبعی ارضیات
(پ) ارضی شکلیات
(ج) رسوبیات
(چ) حجریات
  الف۔ حجریات آتشی
  ب۔ حجریات رسوبی
  ج۔ حجریات تقلیبی (کایا بدلی) اور عمل تقلیب
(ح) قلمیات
(خ) جمادیات
(د) ساختیاتی ارضیات
(ذ) معاشی ارضیات
(ر) تاریخی ارضیات یا علم الطبقات
(ز) رکازیات
(س) ارضیاتی سائنس کی تاریخ

زمین پر ایک عام نظر

(علم کائنات تکوینیات)

ایک عرصہ دراز تک زمین کی شکل سیب جیسی بتائی جاتی تھی۔ اس کے بعد مختلف طریقوں سے زمین کی شکل کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ کہا گیا کہ زمین کی شکل کرہ نما، بیضوی، مستدیر (قطبین پر چپٹے کرہ کی سی) ہے جس کا قطبی قطر تقریباً ۷۹۰۰ میل یا ۱۲۶۴۰ کلومیٹر ہے خط استوا پر اس کا قطر ۷۹۲۷ میل یا ۱۲۶۷۷ کلومیٹر ہے۔ اس طرح قطبی قطر ۳۷ کلومیٹر خط استوائی قطر سے کم ہے اور اس کا گھیرا خط استوا پر تقریباً ۴۰،۰۰۰ (چالیس ہزار) کلومیٹر ہے لیکن اب مصنوعی سیاروں سے جو تصاویر حاصل ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خط استوا کے شمال کے حصے سے جنوب کا حصہ قطر میں زیادہ ہے اور اس لیے زمین کی شکل کرہ نما بیضوی مستدیر بھی صحیح معنوں میں نہیں ہے۔

زمین کا اوپری حصہ تین کروں سے گھرا ہوا ہے۔

(۱) ہوائی کرہ یا کرۂ باد (Atmosphere) (۲) کرۂ آب (Hydrosphere) اور (۳) تیسرا کرۂ حجر (Lithosphere) کرۂ باد میں جو گیسیں ہیں ان میں سے آکسیجن پر تو تمام زندگی کا دارومدار ہے۔ اور نائٹروجن کا استعمال اب مصنوعی کھاد وغیرہ کے بنانے میں ہونے لگا ہے۔ یوں اور بھی بہت سی گیسیں کم مقدار میں ہیں ان میں سے کچھ کا استعمال انسان نے شروع کر دیا ہے۔ کرۂ آب میں مختلف سمندر باہم مربوط ہیں اور یہ تقریباً 71 فی صد زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ ندی جھیل اور تالابوں کا شمار بھی کرۂ آب میں ہی ہوتا ہے۔ کرۂ حجر زمین کا وہ حصہ ہے جو حجرات پر مشتمل ہے۔ سمندر نہ صرف زمین پر زیادہ رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ گہرے بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ اگر زمین

کو مسطح کر دیا جائے تو زمین پر پانی ہی پانی ہو گا جس کی گہرائی تقریباً ۵ و ۲ کلومیٹر ہو گی۔ اور اگر سب سے زیادہ گہرے سمندر میں ایورسٹ کی چوٹی کو الٹ کر ڈال دیا جائے تو وہ پانچ سو میٹر سے زیادہ ڈوب جائے گی۔

ماہرین ارضیات اپنے محاورہ میں قشر یا کرسٹ (Crust) زمین کے اس حصے کو کہتے ہیں جو فرش زمین سے تقریباً تیس سے ساٹھ کلومیٹر تک براعظم کے نیچے اور چھ سے دس کلومیٹر تک سمندر کے نیچے ہوتا ہے۔ زلزلوں اور مصنوعی زلزلوں سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں ان سے یہ دریافت ہوا ہے کہ کرسٹ کے نیچے ایک کرّہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس سے لہریں تیزی کے ساتھ گزرتی ہیں۔ اس کرّہ کو مینٹل (Mantle) کے نام سے پکارتے ہیں اور مینٹل کے نیچے کور (Core) آتا ہے۔ قشر اور مینٹل کے درمیان میں "موہوروویچک غیر مربوط (Mohorovichic Discontinuity) ایک مختصر ساخطہ ایسا ہے جس میں زلزلوں سے پیدا شدہ لہروں کا رخ دفعتاً منعطف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مینٹل اور کور کے درمیان میں "گوٹنبرگ غیر مربوط (Guntenburg Discontinuity) تسلیم کیا جاتا ہے گوٹنبرگ غیر مربوط تقریباً ۲۹۰۰ کلومیٹر پر ہے اور اس کے نیچے کور ۶۳۷۸ کلومیٹر یعنی زمین کے وسط تک ہوتا ہے کرسٹ میں زلزلہ کی لہریں (۴ء۶ تا ۷ء۶) کلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہیں اور بر خلاف اس کے مینٹل میں (۱ء۸ سے ۶ء۱۳) کلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ لیکن اب تک سائنس دانوں کو بہ یقین سے نہیں معلوم کہ یہ غیر مربوط کیوں ہیں۔

طبعی ارضیات

حجرات کی ترکیب اور تیاری میں جمادات بے حد اہم حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ارضیات کی ابتدا میں جمادات کو سمجھنا چاہیے۔ اب تک کئی ہزار جمادات معلوم کیے گئے ہیں لیکن ان میں سے چند بے حد اہم ہیں جو عام حجرات کا اہم جزو ہیں۔ یہ زمین کے اوپری حصے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور تقریباً ہر حجر میں کم و بیش مقدار میں موجود ہوتے ہیں مثلاً فلسپار (Feldspar) اور گار پتھر یا کوارٹز (Quartz) یہ جمادات آتشی حجر مثلاً گرانائٹ (Granite) اور بہت سے رسوبی حجرات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اسی طرح چونا پتھر (Lime stone) ہے جو تقریباً ہر براعظم میں بکثرت ملتا ہے۔ جماد کیلسائٹ (Calcite) پایا جاتا ہے بعض حجرات میں جو جمادات پائے جاتے ہیں بہت پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان کا پہچاننا بھی مشکل ہوتا ہے یا کبھی کبھی تو جمادات کے قلم اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ معمولی خوردبین سے بھی بہ مشکل دیکھے جا سکتے ہیں جیسے شیل (Shell) میں چکنی مٹی (Kaolin) کے قلم موافق حالات کے تحت حجرات میں موجود جمادات تقریباً مکمل قلمی شکل اختیار کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر جماد اپنی ایک خاص ظاہری یا بیرونی شکل رکھتا ہے۔ مثلاً گار پتھر کی قلمی شکل ہشت پہلو ہوتی ہے اور اس کا اوپر یا نیچے کا سرا مخروطا کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس طرح لوہے کے سلفائیڈ یعنی پائرائیٹ (Pyrite) کی قلمی شکل مکعبی (Cubic) ہوتی ہے جس کی سطح پر کبھی کبھی متوازی لکیریں پائی جاتی ہیں۔ جب جمادات کسی حجر میں چھوٹے چھوٹے قلموں کی شکل میں مجموعی طور پر موجود ہو جاتے ہیں تو اکثر ان کی قلمیاتی شکل باقی نہیں رہتی لیکن اندرونی ایٹمی ساخت باقی رہتی ہے جس سے وہ بہر حال پہچانے جاتے ہیں باریک جماد کی شناخت خوردبین کے ذریعہ عموماً آسانی سے کی جا سکتی ہے معمولی خوردبین سے جماد یا حجر کو دیکھنے کے لیے اس کی ایک بہت باریک تقطیع تیار کرنی پڑتی ہے لیکن آج بعض جماد کی شناخت کے لیے ایکس رے یا الکٹران خوردبین کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے الکٹران خوردبین سے کسی چیز کو چالیس پچاس یا ہزار گنا یا اور زیادہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے یا اس کی تصویریں لی جا سکتی ہیں اس بات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات جماد کا پہچاننا نہ صرف مشکل ہوتا ہے بلکہ یہ بھی کہ بعض جماد کے قلم بے حد چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی تحقیق پر اصراف وقت و زر ہوتا ہے۔

کیمیائی امتحان بھی جماد کے پہچاننے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے جن جمادات میں قلمی ساخت نہیں ہوتی اور وہ کانچ جیسے ہوتے ہیں ان میں کوئی سالماتی ساخت بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے اس میں خوردبین کے نیچے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے لیے طیف پیما (Spectro Meter) کو استعمال میں لانا پڑتا ہے۔

حجریات

زمین کے بالائی حصے کے حجرات براعظم اور جزیروں میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ جو تقریباً ۹۰ فیصد حصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اب تک جو حجرات معلوم کیے گئے ہیں ان کو تین خاص گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا گروپ جو پگھلے ہوئے مادّہ یا میگما (Magma) کے سرد ہونے سے تیار ہوا ہے اس کو آتشی حجرات (Igneous Rocks) کہتے ہیں۔ دوسرا گروپ جو پہلے سے موجود حجرات کے توڑ پھوڑ سے پیدا شدہ ذرّات سے بنتا ہے، ان کو رسوبی حجرات (Sedimentary Rocks) کہتے ہیں۔ تیسرا گروپ، تقلیبی یا کایا بدلی حجرات (Metamorphic Rocks) کا ہے جو آتشی اور رسوبی حجرات پر حرارت اور دباؤ کی وجہ سے تیار ہوتا ہے۔ جب کہ ان میں ترکیب، ترتیب اور اندرونی ساخت میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔

آتشی حجرات

یہ حجرات یا تو خارجی پرتوں یا متداخلی ڈھیروں کی شکل میں ملتے ہیں۔ خارجی حجرات آتش فشانی عمل سے تیار ہوتے ہیں اور یہ زمین کی اوپری سطح پر پگھلے ہوئے مادّے کی شکل میں آتے ہیں اور پھر ایک سخت پرت کی شکل میں جم جاتے ہیں۔ جن میں کبھی کبھی چھوٹے یا بڑے قلم جمادات کے بھی پائے جاتے ہیں۔

جب جمادات جلد سرد ہونے کی وجہ سے قلمی شکل نہ اختیار کر سکیں تو حجر کی شکل زجاجی ہوتی ہے۔ متداخل حجرات قشر میں مینٹل کے پگھلے ہوئے مادّے کے اندر داخل ہو کر آہستہ آہستہ سرد ہونے کی وجہ سے تیار ہوتے ہیں۔ ابتداً یہ سطح زمین کے نیچے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر کی حجراتی تہیں مختلف عوامل کے ذریعہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ اب بہت سے مقامات پر سطح زمین پر آ گئے ہیں اور دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ قبل تک جہاں کہیں یہ متداخلہ حجرات پائے جاتے تھے یہ تصور کر لیا جاتا تھا کہ یہ پیدائش زمین کے وقت ہی پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن یہ قیاس اب قطعاً غلط ثابت ہو چکا ہے اور متداخلہ حجر بہت کم عمر کے بھی زمین پر پائے جاتے ہیں۔

اس طرح آتشی حجرات کے قلموں کی جسامت یا ساخت ان کے بنیادی طریقہ بناوٹ پر زیادہ منحصر ہوتی ہے۔ لاوا چوں کہ سطح زمین پر آ کر بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے اجزا کے قلم عام طور پر باریک ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو یک لخت ٹھنڈا ہونے سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ زجاجی بھی بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ مادّے کو قلمیں تیار کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ بر خلاف اس کے متداخلہ حجرات چوں کہ ایسے میگما سے بنتے ہیں جن پر ان کے سرد ہونے کے

وقت کئی ہزار فٹ موٹے حجرات موجود ہوتے ہیں اس لیے ان میں سے حرارت آہستہ آہستہ خارج ہوتی ہے اور اس طرح قلمیں تیار ہونے کا موقع مل جاتا ہے اس کی ایک مثال گرینائٹ ہے جو ایک بہت عام حجر ہے۔ اس میں قلمیں اتنی بڑی اور نمایاں ہوتی ہیں کہ جو بھی جمادات ان میں پائے جاتے ہیں ان کی شناخت اکثر کسی آلے کی مدد کے بغیر آسانی سے کی جاتی ہے۔

اس طرح آتشی حجرات کی ساخت یا بافت کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ سرد ہونے کے وقت وہ سطح زمین پر تھے یا اگر زیر زمین تھے تو کتنی گہرائی پر۔ اس طرح زیادہ گہرائی پر بننے والے حجرات پلیوٹانی (Plutonic) کہلاتے ہیں اور ان میں قلم بہت بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن کم گہرائی میں پیدا شدہ حجرات کے قلم اوسطاً چھوٹے ہیں اور ان حجرات کو ہائپا ابیسل (Hypabyssal) کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے خارج حجرات ہمیشہ یا تو باریک قلمی ہوتے ہیں یا کبھی کبھی زجاجی، آتش فشانی حجرات کہلاتے ہیں۔ متداخلہ حجرات کی تقسیم ان کے جائے وقوع، حجم، اور شکل پر منحصر ہوتی ہے مثلاً بعض جگہوں پر متداخلہ حجرات جب کئی ہزار مربع میل پر پھیلے ہوتے ہیں اور ظاہراً ان کا دخول یک وقت ہوتا ہے تو عام طور پر ان کو بیتولتھ (Batholith) کہا جاتا ہے۔ لوپولتھ (Lopolith) فوکولتھ (Phocolith) وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں غرض یہ کہ متداخلہ حجرات کی مختلف شکلیں اور اقسام ہیں۔ ان کی ساخت یا بافت بھی کافی حد تک یکساں ہوتی ہے لیکن شکلی اور حجمی فرق سے کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی یہ مادہ سطحی حجرات کا ایک حصہ پگھلا کر جزو مادہ بنا لیتا ہے۔ اور مادے میں نمایاں کیمیائی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بیتولتھ وغیرہ میں جب مادہ بہت دیر میں سرد پڑتا ہے تو وزنی جمادات کے قلم بھی آہستہ آہستہ نیچے کی جانب بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح بیتولتھ کے اوپری اور نچلے حصے میں نمایاں کیمیاوی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ متداخلہ حجرات جو اتھل یا اوسط گہرائی پر تیار ہوتے ہیں۔ ان کے حجم اور شکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر ڈائکس (Dikes) کہلاتے ہیں جو قدیم حجرات میں عمودی شکل اختیار کرتے ہیں اور جب یہ کہیں رسوبی حجرات کی پرتوں کے درمیان خود ایک مزید پرت بنا دیتے ہیں تو ان کو سل (Sill) کہا جاتا ہے۔ ڈائک اور سل چوں کہ سطح زمین کے قریب پہلے ہی آچکے ہوتے ہیں اس لیے تھوڑے سے اوپری حجرات کے ہٹنے سے وہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ یوں تو اوپری حجرات کا توڑ پھوڑ سے ہٹنا خود ایک بے حد سست وقت لیوا عمل ہوتا ہے۔

آتش فشانی مادہ دو طریقوں سے باہر آتا ہے یا تو وہ مرکزی سوراخ (CentralVent) یا لانبے شگاف (Fissure) کے ذریعہ خارج ہوتا ہے۔ مرکزی سوراخ کا تعلق ایک عمودی نالی سے ہوتا ہے۔ اس سے جو مادہ باہر نکلتا ہے اس سے ایک مخروطا تیار ہو جاتا ہے جو نتیجتاً ایک اونچے پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے اوپر ایک جھیل سی بن جاتی ہے اس جھیل کی ایک جانب ایک نالی سی ہوتی ہے اور درمیان میں ایک تودہ۔ اسے جوالا مکھ (Crater) کہتے ہیں۔ بہترین مثال اس کی اٹلی میں ویسو ویس (Vesuvius) ہے۔ دہانے سے دو قسم کے مادے باہر آتے ہیں ایک تو راکھ کی شکل میں بے حد باریک پسا ہوا حجر جس میں لاوے کے زجاجی گول چھوٹے بڑے گیند اور گولیاں وغیرہ ہیں گیندوں کو بم اور گولیوں کو لاپلی (Lapilli) کہتے ہیں۔ دوسرے لاوا یا پگھلا ہوا جو مادہ شگاف کے ذریعہ باہر آتا ہے کبھی کبھی یہ کئی میل تک پھیل جاتا ہے اس کی بہترین مثال ہندوستان میں دکن ٹریپ (Deccan Trap) ہیں۔

آتش فشانی اور متداخلی حجرات میں اپنی اپنی جگہ پر بڑی حد تک کیمیائی اور جمادی یکسانیت ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ متداخلی حجرات میں سے گیسوں کا اخراج نہیں ہوتا اور آتش فشانی حجرات میں سے گیس نکل جاتی ہیں اور حجرات کا کیمیاوی جزو نہیں بنتی ہیں۔ اس لیے اکثر کچھ تھوڑا فرق بھی ضرور ہوتا ہے۔ آتشی حجرات کی کیمیائی ترکیب میں سلیکا (Silica) کی مقدار ۴۰ سے ۷۵ فی صد ہوتی ہے جب سلیکا زیادہ مقدار میں ہوتا ہے تو ہلکے رنگ یا بے رنگ قلمی شکل میں علاحدہ موجود ہوتا ہے۔ ان حجرات کو ترشئی (Acidic) حجرات کہتے ہیں۔ اس طرح کے سلیکا کو کوارٹز (Quartz) کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جن حجرات میں سلیکا کی مقدار کم ہوتی ہے ان کا رنگ اکثر سرمئی یا سیاہ ہوتا ہے۔ ان میں لوہا اور میگنیشیم کے جزو والے مختلف جماد مقابلتاً زیادہ ہوتے ہیں ان کو اساسی (Basic) حجر کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اوسط سلیکا والے حجرات بھی پائے جاتے ہیں غرض یہ کہ آتشی حجرات کی تفریق سلیکا کی اس مقدار پر ہوتی ہے جو حجر میں کیمیائی حالت میں پائی جاتی ہے۔

آتشی حجرات میں بہت سے معاشی اہمیت رکھنے والے جمادات دستیاب ہوتے ہیں جو سائنس کے نقطۂ نظر سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ صحیح عمر کی دریافت بھی بعض جمادات کے تجزیہ سے کی جاتی ہے عموماً جس حجر میں یورینیم (Uranium) پوٹیشیم (Potassium) تھوریم (Thorium) ریوبیڈیم (Rubidium) وغیرہ پائے جاتے ہیں، ان کی عمر کا کافی حد تک صحیح تخمینہ لگایا جا سکتا ہے یہاں پر اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ قدیم ترین حجر اب تک ۳،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سال کا دریافت ہو چکا ہے اور اس لیے عام خیال یہ ہے کہ زمین کی عمر تقریباً ۴،۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سال یا اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

رسوبی حجرات حجرات کے وہ حصے جو ہوا اور پانی سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں طبعی اور کیمیائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں یہ چٹانیں چھوٹے یا بڑے ٹکڑوں میں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ جو ہوا، بہتے پانی یا گلیشیر کے ذریعہ نچلی سطح پر منتقل ہوتے رہتے ہیں اور پھر وادی، جھیل یا سمندر میں تہ بہ تہ بناتے رہتے ہیں۔ پھر جو اجزا پانی میں گھل جاتے ہیں یا بعض وہ اجزا جو پانی میں بہتے ہوئے آتے ہیں مثلاً فلسپار یا اس کی بدلی ہوئی شکل چکنی مٹی یا کلے (Clay) تہ بہ تہ میں جمے ہوئے ذرات کے درمیان کی جگہوں میں بھر جاتے ہیں اور انھیں جوڑ کر دوبارہ پتھر کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ جوڑنے والا جزو سیمنٹ کہلاتا ہے سیمنٹ یوں تو زیادہ تر چونا، چکنی مٹی، لوہے کے آکسائیڈ یا سلیکا کا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی دوسرے جمادات کا بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ایک قسم کے رسوبی حجرات تیار ہوتے ہیں جن کو کلاسٹک (Clastic) حجر کہتے ہیں۔ رسوبی حجر کی دوسری قسم وہ ہے جسے غیر کلاسٹک (Non-Clastic) کہتے ہیں۔ ان میں بعض مرے ہوئے سمندری جانوروں کے گھونگھوں سے بنتے ہیں۔ اس طرح بنے ہوئے حجرات کو عموماً چونا پتھر (Lime stone) کہتے ہیں۔ بعض اوقات سمندری پانی کے خشک ہو جانے سے جو اجزا اس میں حل ہو جاتے ہیں وہ قلمی شکل میں نمودار ہو کر کبھی کبھی تو بہت موٹی تہیں بناتے ہیں۔ ان کو مجموعی طور پر ایوا پورائٹس

(Evaporites) کہتے ہیں۔ جن میں کھانے والا نمک یعنی سوڈیم کلورائڈ (Sodium Chloride) اور جپسم (Gypsum) زیادہ اہم ہیں۔

دریا چونکہ ایک ہی رفتار سے ہمیشہ نہیں بہتا اس لیے وہ یکساں وزن کے ذرات نہیں لاتا کبھی تو ذرات بہت موٹے اور روڑے ہوتے ہیں اور ریت پتھر (Sand stone) بناتے ہیں اور کبھی یہ ریزے نہایت باریک ہوتے ہیں تو یہ سلٹ اسٹون (Silt stone) یا شیل (Shale) کی تہیں جماتے ہیں۔ کبھی کبھی دریا پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بھی لے آتے ہیں۔ تو کانگلومیریٹ (Conglomerate) بن جاتا ہے۔ کانگلومیریٹ کے یہ چھوٹے اور بڑے اجزا عموماً کسی حد تک گولائی لیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے کہ سفر میں ان کے کنارے گھس جاتے ہیں۔ اس طرح مختلف قسم کی پرتیں تیار ہوتی ہیں۔ ہر ایک پرت یا تہہ کو طبق (Stratum) کہتے ہیں۔ زمین کی تاریخ میں تقریباً ہر براعظم میں رسوبی حجرات مختلف زمانوں میں وجود میں آئے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ عموماً پرتوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں مگر بعض اوقات مختلف عوامل کے ذریعہ ان کی شکل میں نمایاں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے اس حالت میں ان کا شمار تقلیبی حجرات میں ہونے لگتا ہے۔

کایا بدلی (تقلیبی) حجرات

حجرات آتشی ہوں یا رسوبی جب زمین میں بہت گہرے دفن ہو جاتے ہیں تو ان پر بے حد گرمی اور بہت زیادہ دباؤ کا اثر ہوتا ہے۔ جس سے ان میں بہت سی تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں اور جن میں کیمیائی تبدیلیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اسی وجہ سے نئے جمادات بن جاتے ہیں۔

میٹا مارفک کے لفظی معنی ہیں کایا پلٹ کیے ہوئے اور اس لحاظ سے میٹا مارفک حجر وہ حجر کہلائے جائیں گے جن کی نوعیت فطری نشوونما سے بدلی ہوئی ہو خواہ وہ تبدیلی سے قبل آتشی رہے ہوں یا رسوبی یا خود تقلیبی ہی کیوں نہ رہے ہوں تقلیبی حجرات، حرارت اور دباؤ کے بیک وقت یا جدا جدا بہت زیادہ بڑھ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر سے آئے ہوئے مختلف قسم کے محلول اور گیسیں اس عمل میں۔ سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہیں۔ ان اثرات سے ان کی بافت جماداتی ترتیب اور ساختی تبدیلی کبھی کبھی تو اس حد تک ہو جاتی ہے کہ ماہرین کو یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ ان کی پہلی شکل یا ماہیت کیا تھی۔

عام طور پر اس تغیر کامل کی دو قسمیں تسلیم کی جاتی ہیں۔

پہلی قسم علاقائی تقلیب (Regional MetaMorpbtc) ہے، جو کسی براعظم کے بہت بڑے خطے پر اثر انداز ہوتی ہے مثلاً یہ کہ جنوبی ہند کا ایک بہت بڑا حصہ تقلیبی حجرات سے بنا ہے اس حصے پر تین چار بار تقلیب ہوئی اور بہت بڑے علاقوں پر اثر انداز ہوئی۔

دوسری قسم کو اتصالی میٹا مارفزم یا تقلیب کہتے ہیں یہ متداخلی حجرات کے اطراف میں حرارت کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے اور اس لیے بہت تھوڑے علاقے پر اثر کرتی ہے اور جوں جوں متداخلی حجرات سے اس کا فاصلہ بڑھتا جائے اثر کم ہوتا جاتا ہے۔

میٹا مارفزم کی ایک تقسیم بساط (Degree) پر کی جاتی ہے۔ بعض جمادات ایسے ہیں، جو صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب تقلیب کی بساط کافی زیادہ ہوتی ہے مثلاً کائینائٹ (Kyanite) یا سلی مینائٹ (Sillimanite) بعض اوسط تقلیبی عمل میں نمایاں ہو جاتے ہیں اور بعض معمولی تقلیب میں ہی ابھر آتے ہیں ماہرین ان سے واقف ہیں اور بساط تقلیب کا اندازہ ان ہی سے کیا جاتا ہے۔

علاقائی تقلیب کی صورت میں بعض جمادات جو قدرتاً چپٹے یا برگ نما ہوتے ہیں مثلاً ابرک (Mica) یا کلورائٹ (Chlorite) اکثر پیلا ہو جاتے ہیں اور یہ قوت عمل کے زاویۂ قائمہ کے مطابق جم جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان حجرات میں پتلی پتلی پرتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ان کو عموماً فولیئیٹڈ یا ورقیت دار (Foliated) کہتے ہیں۔ اس طرح ورقیت دار تقلیبی حجرات کی عام قسمیں سلیٹ۔ فل لائیٹ (Phyllite) شسٹ (Schist) نائس (Gneiss) وغیرہ ہیں اور غیر ورقی تقلیبی حجرات میں بعض گرینائٹ تمام سنگ مرمر اور کوارٹزائیٹ (Quartzite) وغیرہ ہوتے ہیں۔

سطحی تعمیر (ارضی تشکیلات)

یہ بات تو کسی سے پوشیدہ نہیں کہ زمین کی سطح پر آہستہ لیکن مسلسل تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ دریا پانی محلولوں کی شکل میں اور ذرات کا بوجھ لیے ہوئے سمندر کی طرف رواں رہتے ہیں۔ سمندری لہریں ہر وقت کنارے کی چٹانوں کی کاٹ چھانٹ کرتی رہتی ہیں اور بکھر لوٹ کے ہوئے ٹکڑوں کو بھی لہریں پٹک پٹک کر گول گول کرتی اور گھس گھس کر چھوٹا کرتی رہتی ہیں۔ پانی کی ان کارروائیوں سے کچھ ہی کم اہم ہوا اور گلیشیر کی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ دوسری جانب رسوبی حجرات کا وجود خود اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین کی سطح میں عظیم نشیب و فراز ضرور ہوا ہے کیوں کہ رسوبی حجر عموماً سمندر کی گہرائیوں میں ہی بنتے ہیں یعنی جو پرتیں کبھی سمندر کی تہہ میں تھیں ابھر کر نہ صرف سطح زمین پر آ گئی ہیں۔ بلکہ پلیٹو اور پہاڑ بھی بن گئی ہیں۔ اور جوں ہی یہ سطح زمین پر آتی ہیں ان پر مختلف طاقتیں اثر انداز ہو جاتی ہیں جن میں سردی و گرمی جاذبہ (Gravity) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام قوتیں عمل پیرا ہو کر زمین کی ابھری ہوئی سطح کو سطح سمندر کے برابر لے آنا چاہتی ہیں۔ اس عمل کو ڈینوڈیشن (Denudation) کے نام سے پکارتے ہیں۔

لیکن جب حجر پر کیمیائی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اسے فرسودگی (Weathering) کہتے ہیں یہ بات دیکھنے میں برابر آتی ہے کہ عمارات میں جو پتھر لگائے جاتے ہیں وہ ایک عرصے کے بعد رنگ بدل دیتے ہیں اور بعض اوقات وہ کھردرے ہو جاتے ہیں۔ یہ فرسودگی کا ہی نتیجہ ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی سطحی چٹانیں جو کھلی رہتی ہیں ان پر موسمی عمل کی وجہ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

میکانی عملیات میں پالا ایک بڑا اہم رول ادا کرتا ہے خصوصاً اگر دن میں کافی گرمی پڑتی ہو اور رات میں سردی۔ ان حالات میں پانی حجرات کے شگافوں میں داخل ہوتا ہے اور شب میں وہ نقطۂ انجماد پر پہنچتا ہے اور پانی جب جمتا ہے تو پھیلتا ہے اس سے حجرات کے چھوٹے یا بڑے ٹکڑے علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ درختوں کی جڑوں کے پھیلنے سے بھی حجرات ٹوٹتے ہیں۔ دوسری طرف حجرات پر زیادہ سے زیادہ کیمیائی عمل کرنے والی شے بھی قدرت میں

پانی ہی ہے جو اپنے ساتھ محلول کی شکل میں کاربن ڈائی آکسائیڈ رکھتا ہے۔ یوں تو دائرہ قطب میں اور ریگستانوں میں کیمیائی عمل کم اثرانداز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بدلے یہاں تبدیلی حرارت کا عمل تیز ہوتا ہے کیوں کہ دن کے وقت حجرات حرارت کی وجہ سے پھیلتے ہیں اور رات میں سردی کی وجہ سے سکڑتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حجرات پرتوں میں ٹوٹ کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔

بہتے پانی سے کٹاؤ

بارش کا پانی جب کسی سطح زمین پر گرتا ہے۔ اور بہتا ہے تو اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ ذرات بہالے جاتا ہے۔ زمین کی سطح بالکل مسطح نہیں ہوتی بلکہ اس میں اونچ اور نیچ ضرور ہوتی ہیں اور بعض اوقات پانی بہنے سے گلیاں بھی بن جاتی ہیں۔ جو مادہ بہتے پانی کے ساتھ منتقل ہوتا ہے وہ جوں جوں پانی کے بہاؤ کا زور کم ہوتا جاتا ہے دریا کی وادی میں چھوٹتا جاتا ہے۔ یہ عمل بڑے ٹکڑوں سے شروع ہو کر بہ تدریج چھوٹے ذروں اور باریک ریزوں تک جاری رہتا ہے۔ جو دریا میدانی علاقے میں کافی دور تک بہتا ہے وہ سمندر تک بہت ہی باریک ریزے لے کر پہنچتا ہے۔ بالو اور پتھر کے بڑے گول بٹوں کو پہلے ہی چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ اس طرح دریا اپنی وادی میں اکثر ذرے اور ریزے دور دور تک پھیلا کر ایک ہموار سطح بنا دیتا ہے ایسے میدانوں کو ایلوویل فیلٹ (Alluvial Flat) کہتے ہیں۔

بسا اوقات، جب پہاڑوں پر ملبہ بہت زیادہ جمع ہو اور اس ملبہ میں چکنی مٹی کا جز زیادہ ہو تو بارش سے یہ تمام ملبہ کبھی کبھی یکلخت نیچے کی جانب بہ نکلتا ہے۔ اس کو سولیفلکشن (Solifluction) یا ہبراط ارض (Land Slide) کہتے ہیں۔ اس میں تجاذبی کشش اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہبراط ارض چند مربع میٹر سے لے کر کئی مربع کلومیٹر پر اثرانداز ہوتا ہے اور اس طرح بہت سا ملبہ اور حجرات کے ٹکڑے ندی تک پہنچ جاتے ہیں۔

زیرزمین پانی کے اثرات اور کٹاؤ

زمین پر بارش کی شکل میں جو پانی گرتا ہے اس میں سے کچھ تو ندیوں میں بہ نکلتا ہے اور کچھ حصہ بھاپ کی شکل اختیار کرتا ہے اور باقی زمین میں داخل ہوجاتا ہے۔ ہوا میں تھوڑی تھوڑی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس ہمہ وقت موجود ہوتی ہیں اور پانی کے ہمراہ تیزاب بن کر زمین پر آہستہ آہستہ اثرانداز ہوتی ہیں جس سے یوں تو تقریباً ہر قسم کے حجر پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن چونا پتھر گھلنے لگتا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے غار پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس طرح پانی میں کیلشیم بائی کاربونیٹ اور گھریلو نمک اکثر حل ہوجاتے ہیں۔ چٹانوں میں جو شگاف اور دراڑ ہوتے ہیں ان میں پانی داخل ہو کر بہت زیادہ اثر کرتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہ شگاف اور دراڑیں بڑھتی رہتی ہیں جب زیرزمین یہ تمام بہتا تیزاب ایک عرصے تک اثر کرتا رہتا ہے تو غار بن جاتے ہیں جو سینکڑوں فیٹ تک گہرے ہوتے ہیں۔ ان میں جہاں جہاں سے پانی ٹپکتا ہے وہاں وہاں لمبے لمبے اسٹیلکٹائیٹ (Stalactite) لٹک آتے ہیں اور جس جگہ پانی گرتا ہے وہاں اسٹیلگمائیٹ (Stalagmite) بن جاتے ہیں۔ سطح زمین پر جب شگاف اور دراڑیں، غاروں کی چھتیں بیٹھ جانے سے نمودار ہوتی ہیں یہ تو ایک نمایاں قسم کے جغرافیائی حالات پیدا ہوجاتے ہیں جس کو کارسٹ جغرافیائی حالت (Karst Topography) کہتے ہیں۔

گلیشیائی اثرات اور کٹاؤ

جب کسی قطعہ زمین پر عرصہ تک برف باری ہوتی رہتی ہے اور برف گرمیوں میں بھی نہیں پگھلتی تو پھر کبھی کبھی وہ دریا کی طرح بہہ کر آہستہ آہستہ چل نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا عمل قطبین کے علاقہ یا منطقہ باردہ میں ہی ہوسکتا ہے یا بہت اونچے پہاڑوں پر۔ جب یہ برف مثل دریا بہہ نکلتی ہے تو اس کو گلیشیر کہتے ہیں۔ گلیشیر سطح زمین پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں وادیوں میں گلیشیر کی رفتار فی یوم اوسطاً دو فٹ ہوتی ہے حالاں کہ گرین لینڈ میں ساٹھ فٹ یومیہ چلنے والا بھی ایک گلیشیر موجود ہے۔ اول تو یہ عموماً موٹی تہہ کی شکل میں چلتے ہیں اور اس لیے ان کا اپنا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنی زیریں اور بغلی چٹانوں کو بہ خوبی کاٹتے ہیں اور دوسرے تبدیلی حرارت کا اثر چٹانوں کے نمودار حصوں پر بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ جس سے حجرات کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے (کبھی کبھی تو سو دو سو گز لمبے بھی) گلیشیر کی سطح پر آگرتے ہیں اور گلیشیر ان کو لیے ہوئے چلتا رہتا ہے۔ بلکہ ان کو الٹتا پلٹتا اور گھستا رہتا ہے۔ اس طرح ان کے کنارے تو گھس جاتے ہیں لیکن اکثر وہ ایک جانب زیادہ گھسے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ رخ زیادہ سطح پر ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر گھسے جانے سے کبھی کبھی سیدھی سیدھی گہری لکیریں پڑجاتی ہیں جنہیں تخطیط (Striation) کہتے ہیں۔ پھر جہاں قدرے گرم علاقہ میں پہنچ کر گلیشیر کا برف پگھلتا ہے تو یہ تمام ملبہ وہاں جمع ہوجاتا ہے۔ اس ملبہ میں بہت باریک ریزوں سے لے کر سو دو سو گز تک یا اس سے بھی زیادہ بڑے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ (حالاں کہ عموماً بڑے سے بڑے پتھر دو تین میٹر سے زیادہ کے نہیں ہوتے) اس طرح کے ملبہ میں اکثر پرتیں بھی نہیں ہوتیں اس قسم کے مادّہ کو مورین (Moraine) یا (Till) کہتے ہیں۔ جو پتھر کے غیرمعمولی بڑے ٹکڑے اس مادّہ میں شامل ہوتے ہیں انہیں ارٹنک (Erratic) کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ برفانی دریا سطح زمین سے اتنے ہی اثرانداز ہوتے ہیں اور اسی طرح کاٹ چھانٹ کرتے ہیں جس طرح آبی دریا۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان سے بھی زیادہ۔ یہ برفانی دریا جو وادی تراش کر پیدا کرتے ہیں وہ عموماً انگریزی کے حرف 'U' کی شکل کی ہوتی اور آبی دریا کی کاٹی ہوئی وادی 'V' کی شکل کی ہوتی ہے۔ یہ شکلیں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ ان سے یہ بات کہ وادی کس طرح وجود میں آئی ایک نظر میں معلوم کی جاسکتی ہے۔

برفانی عمل سے اثرانداز علاقے اور بھی نمایاں خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اور منطقہ باردہ اور پہاڑی چوٹیوں پر یہ برفانی عمل اپنی نوعیت کی آپ شکلیں پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے راشموتانے (Roches moutones) وغیرہ۔

لہروں کے اثرات اور کٹاؤ

بڑی جھیلوں کے کناروں پر طوفانی لہروں کا حملہ آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے اور اس طرح سمندر کے کناروں پر یا ساحل پر بھی اسی قسم کا عمل دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ساحلی علاقوں پر لہروں سے

گھساؤ کا عمل قابلِ دید تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے کسی ساحل پر لہروں سے جو کاٹ چھانٹ ہوتی ہے وہ زیادہ تر طوفانی ہواؤں کی افراط۔ ساحل کے حجرات کی ساخت وسختی اور ساحل کے کنارے پانی کی گہرائی اور ڈھلان کے رخ پر منحصر ہوتی ہے۔ ندیوں کی طرح لہروں کو بھی موثر طریقہ سے ساحلوں کو کاٹنے کے لیے کچھ اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ اوزار پانی میں چٹانوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے مہیا کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ یہ گھساؤ میں مدد دیتے ہیں بلکہ خود بھی خوب گھسے جاتے ہیں اور گول ہو جاتے ہیں۔ اونچی چٹانوں کو یہ لہریں نیچے سے کاٹ کر اوپر کے حصے کو باہر نکلا ہوا بنا دیتی ہیں بعد میں یہ حصے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور لہروں سے گھسے جاتے والے مولد اور گھسنے والے اوزاروں میں شامل ہو جاتے ہیں اس طرح یہ سلسلہ قایم رہتا ہے۔ اور اپنے مقام پر کافی اہمیت رکھتا ہے۔

منطقہ حارہ میں گھساؤ کا عمل

جس طرح منطقہ باردہ میں برف اور برفانی دریا عمل کرتے ہیں اسی طرح ریگستانوں میں خواہ وہ گرم ہوں یا سرد، ہوائیں اثر انداز ہوتی ہیں اور کاٹ چھانٹ میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ یوں خشک اور مرطوب علاقوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا خشک علاقے، ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں سالانہ بارش کا اوسط ۱۵ انچ سے کم ہوتا ہے۔ ان مقامات پر زمین کا اوپری حصہ ہمیشہ خشک رہتا ہے اور ان پر درخت یا پودے نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے تیز ہوائیں کاٹ چھانٹ اور گھساؤ اچھی طرح کرسکتی ہیں۔ تیز ہوا اکثر مختلف حجم کے حجرات کے ٹکڑے اپنے دوش پر لیے ہوتی ہے اور جب یہ پہاڑوں یا چٹانوں سے ٹکراتی ہے تو انہیں بہ آسانی مسطح اور چمکدار کر دیتی ہے۔ ہوا کا ایک اہم عمل ان ذرات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور پھر ایک تودہ کی شکل میں جمع کرنا ہوتا ہے۔ ریگستان اور خصوصاً گرم ریگستانوں میں یوں تو بارش بہت کم ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو بہت زور سے ہوتی ہے اور چوں کہ درخت وغیرہ اس علاقے میں اس کے زور کو توڑنے کے لیے موجود نہیں ہوتے اس لیے یہ گاہے گاہے ہونے والی بارش پہاڑوں اور چٹانوں پر ایک تہلکہ مچا دیتی ہے۔ اور ہواؤں کے لیے نیا مواد تیار کر دیتی ہے۔

سطحی پانی، ہوا، زیر زمین پانی۔ برفانی ندی اور لہروں کے توڑ پھوڑ اور گھساؤ سے زمین کی شکل اور سطح میں متواتر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس سے زمین کی سطح نیچی ہوتی جاتی اور آخر کار وہ سطح آجاتی ہے جسے سطح انتہائے عمل Base Level of Erosion کہا جاتا ہے۔ عموماً یہ سطح عارضی ہوتی ہے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ خطہ یا تو پھر بلند ہونے لگتا ہے یا پھر پست ہونے لگتا ہے۔ پست ہونے سے اس خطہ پر عموماً رسوبی مادّہ جمع ہونے لگتا ہے۔ جو بعد میں حجرات میں تبدیل ہونے کا امکان رکھتا ہے۔

رسوبیات

رسوبی حجرات کی تشکیل پیچیدہ عمل ہے۔ کیوں کہ ان میں ان تمام حجرات کے ذرے جن پر دریا ہو کر گزرتا ہے۔ عموماً شامل ہوتے ہیں۔ اور پھر ان پر کئی مزید عوامل اثر پذیر ہوتے ہیں اس کے بعد بہت بڑا اثر اس ماحول کا ہوتا ہے جس میں ان کی پرتیں جمتی ہیں اور جس میں ذرے آخر کار اپنے سفر کے اختتام پر آکر تھمتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان ذرات کے درمیانی خلاء میں کس قسم کا سیمنٹ بھرا ہے یہ امر بڑی اہمیت رکھتا ہے اس تمام عمل کو ڈائیجینیس (Diagenesis) کہتے ہیں۔ ڈائیجینیس کے دوران حجر میں ذرات کا جمنا۔ اخراج آب اور جمادات کی نوزائیدگی بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں ڈائیجینیس سے غیر پیوستہ ذرہ۔ ریزے، روڑیاں بٹے وغیرہ جو بھی موجود ہوں جم کر حجر کی شکل میں آجاتے ہیں۔

ماحول کا خیال کرتے ہوئے رسوبی حجرات کو عام طور پر دو گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا گروپ برّی (Terrestrial) کہلاتا ہے جو سطح زمین پر تیار ہوتا ہے جیسے دریا، سیلاب کے دوران اپنے دونوں جانب مٹی اور بالو کی تہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرا گروپ بحری (Marine) ہے جو سمندر میں تیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایک گروپ جھیلی لمنک (Limnic) حجرات کا علاحدہ تسلیم کرتے ہیں۔ یا اس کو برّی حجرات میں ہی شامل کرتے ہیں۔ اس سے بالکل مختلف رسوبی حجرات کی تفریق ان کے مبداء یا ماخذ پر بھی کرتے ہیں اور اسی طرح ان کو ذیل میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ میکانیکی
۲۔ اجسامی
۳۔ نامیاتی

میکانیکی حجرات تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ ریوڈیشیس (Rudaceous) یعنی روڑی والے حجرات۔
۲۔ ایرینیشس (Arenaceous) یعنی بالودار سلٹ (Silt) کا بھی اس میں شمار ہوتا ہے۔
۳۔ آرجلیشس (Argillaceous) جیسے مثلاً چکنی مٹی۔ لوئس (Loess) وغیرہ۔

اجسامی حجرات کی پانچ قسمیں تسلیم کی جاتی ہیں۔

۱۔ کلسی اس میں گھونگھوں اور مونگے سے بنے حجرات وغیرہ شامل ہیں۔
۲۔ سلیشیس (Siliceous) اس میں سمندر میں پیدا ہونے والی اوز (Ooze) اور اسفنج وغیرہ پائے گئے ہیں۔
۳۔ کاربنی (Carbonaceous) حجرات میں کوئلہ۔ پیٹ (Peat) وغیرہ شمار کیے جائیں گے۔
۴۔ فولادی یا فیروجینسلس (Ferruginous) اور ان کی مثال صرف دلدل میں پیدا شدہ لوہے کی کان ہیں۔
۵۔ فاسفورس اس میں گوانو (Guano) یعنی چڑیوں کی بیٹ سے بنا ہوا حجری مادہ اور کلسی فاسفورس شامل ہیں۔

نامیاتی عملات سے بنے ہوئے حجر کی چار قسمیں تسلیم کی گئی ہیں۔

۱۔ کلسی وہ چونا پتھر جو محلول سے علاحدہ ہو کر بنا ہو مثلاً

ٹوفا (Tufa) ڈولومائیٹ (Dolomite) وغیرہ

۲۔ سلیشیس (Siliceous) جو سلیکا کے رقیق یا سلیکا جیل (Silica Gel) سے پیدا ہوا ہو مثلاً چرٹ یا چقماق وغیرہ۔

۳۔ فولادی یا فیروجلیس یعنی آہنی چکنی مٹی۔

۴۔ تبخیری (Evaporative) اس میں جپسم انہائڈرائٹ (Anhydrite) نمک پوٹاش (Potash) وغیرہ شامل ہیں۔

بحری رسوب کی تقسیم مختلف گروپوں میں سطح سمندر سے اس کی گہرائی (بہ وقت تہہ نشینی) کے لحاظ سے بھی کی جاتی ہے کیوں کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ سمندر کی گہرائی ماحول کا بہت بڑا جزو ہے اور مختلف گہرائیوں میں بنے ہوئے حجر اپنے اندر نمایاں اختلافات کے حامل ہوتے ہیں۔ سمندر عام طور پر تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلے کو اتھلی زون یا (Neritic) اور دوسرے کو گہرا زون (Bathyal) اور تیسرے کو عمیق زون (Abyssal) کہا جاتا ہے۔ رسوبی حجرات کا مطالعہ کرنے کے لیے ان ماخذوں کا پتہ چلانا ضروری ہے جن سے مختلف قسم کے حجرات تیار ہوتے ہیں۔ اس علم کو صخریات رسوبی کہتے ہیں اور یہ علم الطبقات میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

رسوبی حجرات میں مختلف قسم کے رسوبات پائے جاتے ہیں جو اس وقت بھی مختلف عوامل کے ذریعہ جمع ہو رہے ہیں۔ موجودہ تیار ہونے والے رسوبات کا اگر رسوبی حجرات سے مقابلہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان حالات میں جن سے رسوبی حجرات اثر انداز ہوتے، کوئی نمایاں فرق نہیں آیا ہے اور رسوبی حجرات مسلسل ایک ہی حالت میں تیار ہو رہے ہیں۔ یعنی مختلف حالات کے تحت مختلف لیکن مخصوص رسوبات بنتے رہے ہیں۔ گویا ہر قسم کے رسوبات پر چشم بینا کے لیے اپنے ماحول کی مہر لگی ہوتی ہے۔

ساختیاتی ارضیات

رسوبی حجرات ہمیشہ مسطح طور پر جمع ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں۔ ایک تہہ چند ملی میٹر سے لے کر کئی کئی میٹر موٹی ہوتی ہے اور ان تہوں کے درمیان کی سطح کو بیڈنگ پلین (Bedding Plane) کہتے ہیں۔ اگر ان تہوں کو ایک جانب سے اٹھا دیا جائے تو ان میں دوسری جانب کو جھکاؤ پیدا ہو جائے گا۔ اور جھکاؤ کے زاویہ کو ڈِپ (Dip) کہتے ہیں۔ اور اس سے زاویہ قائمہ کا رخ اسٹرائک (Strike) کہلاتا ہے۔ اسٹرکچرل ارضیات میں ڈپ اور اسٹرائک کی بڑی اہمیت ہے اور ماہر ارضیات جب کسی علاقہ کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور اس کا نقشہ بناتا ہے تو ڈپ اور اسٹرائک بار بار ناپ کر نقشے پر ان کے متعینہ نشان بناتا رہتا ہے۔

پھر کبھی کبھی یہ تہیں اتنی مڑ جاتی ہیں کہ ان میں لہریں یا شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ اس عمل کو فولڈنگ (Folding) کہتے ہیں اور جس لہر کا درمیانی حصہ اوپر کو اٹھا ہوتا ہے اس کو اینٹی کلائن یا ضد میلان (Anticline) کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جس لہر کے دونوں سرے اوپر کو اٹھے ہوں اور درمیانی حصہ نیچے کو دبا ہوا، اسے ہم میلان یا سن کلائن کہتے ہیں یہ ہم میلان اور ضد میلان بہت سی شکلوں کے ہوتے ہیں۔ اور ان کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حجری تہیں کبھی کبھی تو مکمل طور پر الٹ جاتی ہیں۔ اور اس حد تک الٹ جاتی ہیں کہ کروڑہا سال پہلے کی بنی ہوئی تہہ یا ہزاروں میٹر موٹی تہیں بعد کی بنی ہوئی تہوں کے نیچے دبی ہوئی مل جاتی ہیں یعنی اوپر آجاتی ہیں۔ اور اس کے اوپر کی تمام تہیں نیچے چلی جاتی ہیں اس کو اوور ٹرننگ (Over turning) کہتے ہیں۔

مزید براں ایسی فولڈنگ سے یا دیگر اثرات سے حجرات کہیں کہیں اس طرح منقطع ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے ایک کیک کو چاقو سے کاٹ دیا ہو۔ اسے گسل (Fault) کہتے ہیں۔ یہ گسل کچھ میٹروں سے لے کر ہزاروں کلومیٹر تک لمبے ہوتے ہیں۔ اور گسل کے دونوں جانب کے حصوں میں نقل چند سینٹی میٹروں سے لے کر کئی کلومیٹروں تک ہوتی ہے۔

اگر گسل کے ایک جانب کا حصہ سطح عمودی پر چڑھے یا نیچے ہو جائے تو اسے طبعی گسل (Normal Fault) کہتے ہیں اور اگر اوپر کی طرف چڑھ کر دوسری جانب کے حصے کے اوپر ہو جائے تو اس کو معکوس گسل (Reverse Fault) کہتے ہیں اور کبھی کبھی گسل کے ایک جانب کا حصہ دوسری جانب کے حصے پر کئی کئی کلومیٹر تک تقریباً مسطح چڑھ جاتا ہے۔ اس کو تھرسٹ نقص (Thrust Fault) کہتے ہیں۔ اور کبھی گسل کے دونوں یا ایک جانب کے حصے گسل کے متوازی چلتے ہیں تو ان کو ٹرانس کرنٹ (Trans Current) یا ٹیر (Tear) یا اسٹرائک سلپ (Strike Slip) یا رینچ (Wrench) گسل کہتے ہیں۔ ان گسلوں کی علم ارضیات میں بہت اہمیت ہے اس لیے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات انہیں شگافوں کی راہ سے معدنی مادّہ زمین کے اندر سے سطح زمین یا سطح زمین کے نزدیک آتا ہے۔ یعنی ان کی موجودگی معدنیات کی موجودگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہر ماہر ارضیات ان کے وجود پر خصوصیت کے ساتھ نظر رکھتا ہے۔ اور اپنے نقشوں میں انہیں تفصیل سے ظاہر کرتا ہے۔ بعض علاقوں میں سینکڑوں کی تعداد میں گسل پائے گئے ہیں۔

جب پرتوں کا ایک مجموعہ ایک جانب کو جھک جائے یا باقاعدہ فولڈ ہو جائے اور اس کے بعد اس کے اوپر دوبارہ نئے سرے سے مسطح پرتیں جم جائیں تو دونوں مجموعوں کی پرتوں میں ایک زاویہ پیدا ہو جائے گا جسے غیر مطابقت (Unconformity) کا نام دیا گیا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک علاقہ کے رسوبی حجرات میں تین یا چار یا اس سے بھی زیادہ غیر مطابقتیں پائی گئی ہیں۔

علاقائی تقلیب میں اگر شیل (Shale) پر سخت دباؤ پڑتا ہے تو وہ سلیٹ (Slate) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور ایک اہم تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ ترکیدگی (Cleavage) پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اسی ترکیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ سلیٹ پتلی تختیوں میں علاحدہ کی جا سکتی ہے۔ ترکیدگی اور شیر (Shear) جو عموماً ساتھ ساتھ ہوتی ہیں کافی پر از معلومات ہوتی ہیں۔ اور ان کی تحقیق سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ دباؤ کس جانب سے پڑا تھا۔

شیل مزید تقلیب سے فلائٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور فلائٹ بڑھ کر ابرقی شسٹ (Mica Schist) میں۔

بناؤ کوہسار

لفظ پہاڑ کا اطلاق ہر ایسے اونچے حصے زمین پر کیا جا سکتا ہے۔ جو اپنے دو جانب کے علاقے سے کافی اونچا ہو۔ کوہسار یا پہاڑ اپنے نچلے حصے میں زیادہ چوڑے ہوتے ہیں اور اوپر کی جانب کم۔ اکثر ان میں متعدد چوٹیاں ہوتی ہیں۔ پہاڑ عموماً کئی ہزار کلومیٹر لمبے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی بنا کیا ہے اس پر اب تک اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔ یوں پہاڑ کی حسب ذیل قسمیں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔

۱۔ زمینی الٹ پلٹ سے بنے ہوئے کوہسار جن کو ڈفارمیشن (Deformation) قسم کے پہاڑ کہتے ہیں۔

۲۔ آتش فشاں سے نکلے ہوئے مادہ کے بنے ہوئے پہاڑ جن کو اکیومیلیشن (Accumulation) قسم کے پہاڑ کہا جاتا ہے۔

۳۔ عرصۂ دراز کی توڑ پھوڑ کے بعد کبھی کبھی بعض علاقوں میں باقی ماندہ مجھو پہاڑ کی شکل کے رہ جاتے ہیں اور یہ ریلکٹ (Relect) پہاڑ کہلاتے ہیں۔ مشرقی گھاٹ اس کی مثال ہیں۔

۴۔ دو یا اس سے زیادہ طبعی گسلوں سے اگر کوئی علاقہ اوپر کو اٹھ جاتا ہے تو اسے ہورسٹ (Horst) کہتے ہیں۔ جو اکثر پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

۵۔ اندرون زمین سے اگر مادہ سطحی پرتوں میں داخل ہو کر اس کو اوپر کی جانب اٹھا دے تو یہ گنبد کی شکل پیدا کر دیتا ہے اور گویا ایک طرح کا پہاڑ کھڑا ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے سائنس دانوں میں اب تک اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ پہاڑ کیسے اور کیوں کر بنتے ہیں لیکن یہ تسلیم ہے کہ اوپر کی اقسام میں اصلیت میں پہاڑ صرف ڈفارمیشن والے ہی ہوتے ہیں۔ حسب ذیل نظریات ان کی بنا کی بابت اکثر زیر بحث رہے ہیں اور کچھ اب بھی ہیں بہر حال ایک بات جس پر ہر ایک کو اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ تقریباً تمام ڈفارمیشن پہاڑوں میں رسوبات کی پرتیں کم از کم بارہ پندرہ میٹر موٹی ضرور ہوتی ہیں۔ ان میں گرے واکے (Graywacke) کا جز بہت کافی ہوتا ہے اور ساتھ میں آتش فشانی حجرات کی بہت سی تہیں بھی ہوتی ہیں اور متداخلہ حجرات بھی۔ اور یہ خصوصیات ہیں ایوجیو سنکلائن (Eugeosyncline) کی یعنی ڈفارمیشن پہاڑ ایوجیو سنکلائن میں ہی بنتے ہیں۔ ان میں تھرسٹ گسل اور ٹرانس کرنٹ گسل بے حد ہوتے ہیں اور جگہ جگہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظریہ کو من و عن تسلیم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ہمالیہ کے بیشتر حصہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اب سے بہت سال قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین گیس سے شروع ہو کر سرد ہوتے ہوتے ٹھہری ہے اور اندرونی حصے اس کے اب بھی بے حد گرم ہیں لیکن آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے سطح زمین پر جھریاں پڑ رہی ہیں جنہیں ہم پہاڑ سمجھتے ہیں۔ اسے کنٹریکشن (Contraction) مفروضہ کہتے تھے۔ اب کوئی اس نظریہ سے اتفاق نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمین اپنے قطر میں شاید بڑھ رہی ہے۔

اونچے علاقوں سے زمین کٹ کٹ کر اور گھس گھس کر بالو اور ریزوں کی شکل میں سمندر میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ان کے دباؤ سے سمندر کی تہہ اندر کی جانب دھنس رہی ہے اور اندرون زمین سے مادہ کھسکتا ہے جو کسی اور علاقے میں سطح زمین کو اونچا کر کے پہاڑ بنا دیتا ہے۔ اسے آئیسو سٹیٹک (Isostatic) مفروضہ کہتے ہیں۔ اس کا بھی اب کوئی معتقد شاید نہیں رہا۔

زمین کے اندر حرارت رساں کنڈلیاں Convection Current ہیں جو کسی جگہ پر نیچے جاتی ہیں اور کہیں اندر سے اوپر آتی ہیں۔ جس جگہ ان کا ایک جوڑ دونوں جانب سے نیچے جاتا ہے وہاں وہ سطح زمین کو اپنے ساتھ اندر کو کھینچتا ہے۔ اس جگہ ایک وادی سی بن جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ جیوسن کلائن (Geosyncline) بن جاتی ہے۔ اس میں ہزاروں میٹر رسوبات جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ رسوبات یا تو زمین کے اندر کی گرمی سے یا حرارت رساں کنڈلیوں کے دباؤ سے باہر آ جاتے ہیں اور پہاڑ بن جاتے ہیں۔

کسی براعظم کو اپنی جگہ پر قیام نہیں ہے اور وہ زمین کے اندر کے پگھلے ہوئے مادے پر تیرتے پھرتے ہیں اس عمل کو کانٹیننٹل ڈرفٹ (Continental Drift) کہتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی براعظموں کے بعض حصے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ جب یہ ٹکراتے ہیں تو دونوں کے درمیانی سمندر میں جو رسوبات جمع ہوتے ہیں وہ گویا ایک شکنجہ کے بیچ میں آ کر پہاڑ کی شکل میں اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اسی مفروضہ کی ایک شکل آجکل بہت مقبول ہے اور اسے پلیٹ تختونی (Plate Tectonic) کہتے ہیں۔

ایک اہم مفروضہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ رسوبات کی کافی پرتیں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ سمت الراس کی جانب اٹھنا شروع ہوتی ہیں اور جب کافی اٹھ جاتی ہیں تو حجرات کی کئی کئی کلومیٹر لمبی اور بہت موٹی سلیں پھسل پھسل کر نیچے آ جاتی ہیں اسے گریویٹی گلائڈنگ (Gravity Gliding) کہتے ہیں۔ اس طرح مختلف قسم کے گسل پہاڑوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں ہے لیکن اس مفروضہ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ پہاڑ کھینچاؤ سے بنتے ہیں نہ کہ دباؤ سے روسی سائنسدان اس کے بہت قائل ہیں اور بہت سے حلقوں میں یہ نظریہ مقبولیت کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔

آئسوسٹیسی

یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ تمام براعظم سیال کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے نیچے کی سطح کو سیما (Sima) کہتے ہیں۔ اس طرح سیال کی موٹائی جگہ جگہ پر مختلف ہے مثلاً یہ کہ پہاڑوں کے نیچے بہت زیادہ اور سمندر میں تقریباً غائب۔ براعظم اس طرح گویا گرینائٹ کے بنے ہوئے

ہیں جو سیما کے اوپر تیر رہے ہیں۔ چوں کہ سیما کا ثقل نوعی (تقریباً ۳.۰) سیال کے ثقل نوعی (تقریباً ۲.۷) سے بہت زیادہ نہیں ہے اس لیے ان گرینائیٹ کے بیڑوں کا بڑا حصہ سیما میں ڈوبا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر میں برف کی چٹان (Ice berg) یا پانی میں برف کی سِل اس طرح کوئی بھی سطحی خد وخال جو زمین پر کافی اونچے ہوں سیما میں ان کی اتنی ہی گہری "جڑ" ہوتی ہے اور ایک خاص سطح پر گویا توازن قائم رہتا ہے۔ اس توازن کے نظریہ کو آئیسو سٹیسی کہتے ہیں اور متوازن سطح کو توازن سطح (Level of Compensation) کہتے ہیں۔

زمینی ثقل کی پیمائشوں سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ یہ نظریہ نہ صرف درست ہے بلکہ ارضیات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نظریے کے تحت گریویٹی اناملی (Gravity Anomaly) کے نقشے بنا کر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ سطح زمین کے نیچے کہاں پر زیادہ ثقل نوعی کے حجر ہیں اور کہاں پر ہلکے یا کم ثقل نوعی والے حجر موجود ہیں۔ اس علم کا استعمال معدنی تلاش میں بھی کیا جاتا ہے۔

معاشی ارضیات

انسان کی ترقی اور متمدن اقوام کی خوش حالی زیادہ تر جمادات پر منحصر ہے جو کرۂ ارض سے حاصل کیے جاتے ہیں اور اسی لیے علم ارضیات میں ان کو اور ان پر تحقیق کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگرچہ کہ عام طور پر لفظ جماد کا اطلاق ٹھوس چیز کے لیے ہی ہوتا ہے لیکن ماہرین ارض پانی کو بھی معاشی جمادات میں شمار کرتے ہیں۔

ٹھوس معاشی جمادات کو عموماً دو گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) فلزی (Metallic) اور (۲) غیر فلزی (Non-Metallic)

جمادات جن سے فلز حاصل کیے جاتے ہیں، ان میں لوہے، تانبے، جست، سیسے وغیرہ کی کچ دھاتیں شامل ہیں۔ ان کا وجود کئی مختلف عملوں سے ہوتا ہے اور یہ دریافت کرنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی ایک کان میں کون سا وسیلہ سرگرم تھا۔ فلزی جمادات زیادہ تر آتشی حجرات میں پائے جاتے ہیں اور اگرچہ بعض مقامات پر دھاتیں رسوبی حجرات میں بھی ملتی ہیں لیکن یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا منبع کسی نہ کسی طرح آتشی حجرات سے ضرور وابستہ تھا صرف الومنیم کا جماد باکسائٹ (Bauxite) کبھی رسوبی حجرات سے بنتا ہے اور کبھی آتشی پلیٹنیم، سونا اور چاندی عموماً دھات کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ جمادات یا کچی دھات کی شکل میں تقریباً نہیں کے برابر۔

غیر فلزی جمادات میں کوئلہ، تیل، مختلف الاقسام نمک، جپسم وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں تیل سمندری جانداروں کے اور کوئلہ زمانہ قدیم کے نباتات کے سڑ گل جانے سے تیار ہوتے ہیں۔ نمک اور جپسم سمندری پانی کی تبخیر سے پیدا ہوتے ہیں۔

عمارتی پتھر مثلاً سنگ مرمر، بالو پتھر وغیرہ بھی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

تاریخی ارضیات

رسوبی حجرات سطح زمین کے ایک بڑے حصے کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کی مجموعی تہہ نسبتاً بہت معمولی ہے۔ رسوبی حجرات عموماً پرت کے اوپر پرت ہو کر بنتے ہیں یعنی یہ کہ پرانی پرتیں نیچے ہوتی ہیں اور کم عمر پرتیں بتدریج اوپر۔ اس طرح اگر ایک خطے میں ان حجرات کا بالتفصیل جائزہ لیا جائے اور ان کا کسی دوسرے اور پھر تیسرے اور چوتھے علاقے کے حجرات سے موازنہ کیا جائے تو اس کا امکان ہے کہ ایک بڑے علاقے سے ملا کر کافی تاریخ یکجا کی جاسکے۔ اور ایسے اجتماع طبقات (Formations) کو پہچانا جاسکے جن میں نمایاں یکسانیت ہو۔ ایسے اجتماع طبقات کا نام اس مقام کے نام پر عموماً رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ بہترین طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ایسے متعدد اجتماع طبقات کے عرصۂ اجتماع کو جب ان میں کوئی مشترک خصوصیت ہو تو زمانہ (Age) کہتے ہیں اور کئی زمانوں کو ملا کر ایک دور (Era) بنتا ہے۔ اس طرح ایک جدول تیار ہو گیا ہے جو ذیل میں دیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ نام انگلستان کے ہیں، اس لیے کہ پہلے پہل علوم ارضی پر تحقیق وہیں شروع ہوئی تھی اور وہاں کے ماہرین ارض نے مقامی نام رکھ لیے تھے جو بعد میں عام ہوگئے۔ یوں تو ہر ملک میں اب اجتماع طبقات کے نام مقامی رکھ لیے گئے ہیں۔ لیکن زمانہ اور دور کے نام وہی قائم رکھے گئے ہیں۔ تاکہ موازنہ کرنے میں بہت آسانی ہو۔ اس طرح تاریخ ارض چار اہم دوروں میں تقسیم کی گئی اور ہر دور میں کئی کئی زمانے قرار پائے جو حسب ذیل ہیں۔

دور نوحیاتی	تازہ ترین زمانہ (Recent)	۱	سال ازابتدائے دور	کوارٹرنری
	پلاسٹوسین زمانہ (Pleistocene)	=۲	(دس لاکھ سالوں میں)	•
	پلایوسین زمانہ (Pliocene)	۵		کینوزوئک
	مایوسین زمانہ (Miocene)	۲۶		"
	آلیگوسین زمانہ (Oligocene)	۲۸		"
	ایوسین زمانہ (Eocene)	۵۴		•
	پیلیوسین زمانہ (Paleocene)	۶۵ ± ۲		"
				•
دورحیات درمیانی	کریٹیشس زمانہ (Cretaceous)	۱۳۰ ± ۵		میسوزوئک
	جیوریسک زمانہ (Jurassic)	۱۸۰ ± ۵		•
	ٹرائیسک زمانہ (Traissic)	۲۳۰ ± ۵		•

دور	زمانہ		عمر	
دور حیات ابتدائی	پرمین زمانہ	(Permian)	۲۷۰ ± ۵	پیلیوزوئک
	کاربونیفیرس زمانہ	(Carboniferous)	۳۵۰ ± ۱۰	"
	ڈیوونین زمانہ	(Devonian)	۴۰۰ ± ۱۰	"
	سائیلورین زمانہ	(Silurian)	۴۴۰ ± ۱۰	"
	آرڈوویشین زمانہ	(Ordovician)	۵۰۰ ± ۱۵	"
	کیمبرین زمانہ	(Cambrian)	۶۰۰ ± ۳۰	"
دور قدیمہ	ٹارڈونین زمانہ	(Torridonian)		آرکیین
	یوریکونین زمانہ	(Uriconian)		
	ڈالریڈین زمانہ	(Dalradian)		
	موئینین زمانہ	(Moinian)		
	لیوسیین زمانہ	(Lewician)		

کہیں کہیں طبقات بالکل تہ و بالا ہو جاتے ہیں اور ماہرین ارض ایسے بہت سے اصولوں پر متفق ہیں جن سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا طبقات صحیح الصورت ہیں یا تہ و بالا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ پرتوں کے جمنے کا وقت مسلسل تھا یا ان میں ایسا کم و بیشی وقفہ پڑ گیا تھا کہ جس دوران میں ان پرتوں کی کاٹ چھانٹ یا الٹ پلٹ یا تقلیب ہو گئی ہو۔ اسے عموماً وقفہ منقطع (Break) کہتے ہیں۔

اس تحقیق میں ایک اہم رول علم رکازیات ادا کرتا ہے۔ رکاز نباتات یا حیوانات سے بنتے ہیں۔ اس طرح پیڑ کے تنے، پتیاں، جڑ پھل اور پھول ہر چیز کے رکاز پائے گئے ہیں۔ اور حیوانات میں بحری اور بری جانور اور چڑیوں کے اجسام اور گوشت پوست اور انڈوں کے رکاز ملے ہیں بلکہ جانوروں کی لید، گوبر اور بیٹ کے بھی رکاز ملے ہیں۔ اور ہر قسم کے رکاز ماہرین ارض کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک زمانہ تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دور قدیمہ میں نباتات یا حیوانات وجود میں نہیں آئے تھے لیکن اب یہ بات پایہ یقین کو پہنچ چکی ہے کہ حیات، دور حیات ابتدائی سے بہت قبل وجود میں آ چکی تھی۔ دور حیات ابتدائی میں پہلے نباتات اور اس کے بعد حیوانات پیدا ہوئے تھے۔ اور اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ موسومہ "دور حیات ابتدائی" اب نامناسب ہی ہو کر رہ گیا ہے لیکن اب اتنا مروج ہو چکا ہے کہ اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس تاریخی ارضیات کے مطالعہ کو علم الطبقات (Stratigraphy) کہتے ہیں۔

قدیم زمانے کے جمع شدہ رسوبی حجرات پر جب تجربہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ براعظموں کے بعض حصے ایک زمانہ قدیمہ سے بلکہ شاید دور قدیمہ کے بھی تقریباً ابتدائی زمانہ سے ہی اونچے رہے ہیں اور ان پر توڑ پھوڑ کا عمل مسلسل ہوتا رہا ہے۔ ایسے حصوں کو نیوکلیس (Nucleus) یا چبوترہ (Platform) وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ برخلاف ان کے اور حصے براعظموں کے ایسے ہیں جو کبھی تو سمندر کا حصہ بن جاتے ہیں جہاں پر رسوبی حجرات بنتے ہیں اور کبھی اونچے ہو کر پہاڑ تک کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کو نقل پذیر پٹی (Mobile Belt) کہتے ہیں۔ علم الطبقات میں یہ نقل پذیر پٹیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اس لیے کہ تاریخی شہادات انہی حصوں میں محفوظ ہوتی ہیں۔

رکازیات

اس طرح رسوبیات میں جو رکاز پائے جاتے ہیں۔ ان سے رسوبیات کی عمر کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ نباتات اور حیوانات میں بتدریج تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ماہرین ان تبدیلیوں کے مطالعہ سے یہ بہ آسانی بتا دیتے ہیں کہ یہ رکاز کس دور یا کس زمانہ یا زمانہ کے کس جزو کا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رسوبی حجرات میں ماہرین ارض رکاز کی تلاش بڑی کاوش اور تن دہی سے کرتے ہیں۔ ارضیات کا یہ شعبۂ رکازیات بڑی اہمیت رکھتا ہے حالاں کہ ریڈیائی جمادات سے حجرات کی صحیح عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ تمام حجرات میں ایسے جمادات موجود ہی ہوں جو اس کام میں آ سکیں اور اس وقت اگر عمر کا اندازہ لگانا ہوتا ہے تو رکاز ہی سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ ہر رسوبی حجر میں رکاز موجود ہی ہوں لیکن اگر ہوتے ہیں تو بے حد کارآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف بتدریج تبدیلیاں یا ارتقاء اس کام میں مددگار ہوتے ہیں بلکہ یہ بات بھی مفید ہوتی ہے کہ بعض جاندار کسی وقت میں دفعتاً اور یک لخت غائب اور ناپید ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ٹرائیلوبائٹ (Trilobite) دور حیات ابتدائی کے بعد نہیں پائے جاتے۔ یا ایمونائٹ (Ammonite) اور ڈائنوسور (Dinosaurs) دور حیات درمیانی کے بعد ہی ناپید ہو گئے ڈائنوسور تو دور حیات ثانی میں ہی نمودار بھی ہوئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا یہ تو صحیح طور پر نہیں معلوم لیکن اگر مثال کے طور پر کسی حجر میں ڈائنوسور کا رکاز مل جائے تو یہ بات تیقن کو پہنچ جائے گی کہ وہ حجر دور حیات ثانی کا ہو گا یا اگر ٹرائیلو بائٹ ملا تو وہ حجر دور حیات ابتدائی کا ہو گا۔ اور ان کے رکاز کے باریک

فرق سے ہر دور کے زمانوں تک کی تفریق کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح قدیم ترین مچھلی کے رکازات آرڈوویسین حجرات میں ملتے ہیں اور دودھ پلانے والے جانور ٹرائیسک زمانے میں نمودار ہوئے لیکن رکازات سے عمر کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صحیح عمر معلوم نہیں کی جا سکتی صحیح یا کم و بیش صحیح عمر معلوم کرنے کا صرف ایک طریقہ اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ اس میں ان جمادات کا استعمال کیا جاتا ہے جو قدرتاً تاب کار (Radio Active) ہوں۔ تمام تاب کار جمادات کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ناپائیدار ہوتے ہیں اور ایک وقتِ معینہ میں پائیدار جمادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ وقتِ معینہ کسی تاب کار جماد کا کسی صورت سے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس طرح اگر حجر میں تاب کار جماد اور اس کا تبدیل شدہ صورت میں پائیدار جماد مل جائیں تو ان کے تناسب سے حجر کی عمر معلوم کی جا سکتی ہے۔ ایک خصوصیت اس تبدیلی کی یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر ایک ناپائیدار جماد کا نصف حصہ پائیدار جماد میں مثال کے طور پر سو سال میں تبدیل ہوتا ہے تو نصف کا نصف پھر سو ہی سال میں تغیر پذیر ہوگا۔ اس معین وقت کو جس میں نصف حصہ پائیدار شکل میں تبدیل ہوتا ہے نیم حیات کہتے ہیں۔ عمر کے تخمینہ میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور اسی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

یوں تو اب تک سترہ یا اٹھارہ تاب کار طریقے جو زمین کی عمر کے تعین میں استعمال ہوتے ہیں معلوم کیے جا چکے ہیں لیکن جن چند کا عام استعمال ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

یورینیم ۲۳۸ تبدیل ہوتا ہے سیسہ ۲۰۶ + ۸ ہیلیم ۴ میں
یورینیم ۲۳۵ " " سیسہ ۲۰۷ + ۷ ہیلیم ۴ میں
تھوریم ۲۳۲ " " سیسہ ۲۰۸ ہیلیم ۴ میں
پوٹاشیم ۴۰ " " آرگن ۴۰ میں
ریوبیڈیم ۸۷ " " اسٹرانشیم ۸۷ میں
کاربن ۱۴ " " کاربن ۱۲ میں

ان میں کاربن کی نیم حیات صرف چند ہزار سال ہوتی ہے اور اس لیے عموماً یہ آثار قدیمہ کی تحقیق میں استعمال ہوتا ہے اور یا کبھی کبھی دریائی مسطح (River Terrace) کی عمر کی تحقیق وغیرہ میں۔

زمانہ ماقبل پیلیوزوئک دور یا قدیم دور

ہر براعظم میں پیلیوزوائک سے قدیم تر حجرات بھی ملتے ہیں۔ اور اکثر ان میں تقلیبی حجرات ہوتے ہیں ان کو عام طور پر ماقبل کیمبرین (Pre-Cambrian) کہتے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی چونا دار الگی (Algae) ملتی ہے اور کیڑے مکوڑوں کے چلنے سے زمین میں جو نشانات پڑتے ہیں یا زمین میں ان کے کیے ہوئے سوراخ ملتے ہیں ان سب کا شمار بھی رکاز میں ہوتا ہے۔ اب حال میں آسٹریلیا اور امریکہ میں گھونگھوں کے رکاز بھی ملے ہیں۔ ایسے حجرات کی عمر کا تخمینہ ریڈیائی جمادات سے کیا جاتا ہے اور اب تک جو سب سے پرانے حجر ملے ہیں ان کی عمر ۳٫۷۰۰٫۰۰۰٫۰۰۰ سال ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین کی عمر اس سے زیادہ ہی ہوگی۔

دورِ حیاتِ ابتدائی

کیمبرین زمانہ میں سمندر میں زیادہ تر غیر فقری جانور پائے جاتے تھے جو عموماً موجودہ زمانے کے جانوروں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے ان میں سے ٹرائیلوبائٹ (Trilobite) بے حد نمایاں ہیں۔ قدیم زمانہ میں صرف پودے اور سرکنڈے سمندر میں پائے جاتے تھے خشک زمین پر نباتات اور حیوانات وجود میں نہیں آئے تھے۔ مچھلیاں پہلے پہل آرڈوویشن زمانہ میں معرض وجود میں آئیں۔

سائیلیورین میں ابتدائی نباتات پیدا ہوئے اسی طرح ڈیوونین زمانہ میں جل تھلی جانور پہلے پہل نظر آتے ہیں۔ یعنی سمندری جانوروں نے زمین پر آنا اور رہنا سیکھ لیا ان کے ساتھ ابتدائی اور صحیح معنوں میں درخت اور بڑے فرن (Fern) بھی ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہی نباتات ترقی کرنے لگے اور کاربونیفیرس زمانہ میں ان ہی درختوں سے بنا ہوا کوئلہ بہت عام طور پر پایا جاتا ہے۔ پرمین زمانے میں ریپٹائل (Reptile) کیڑے اور اتنی ترقی کی کہ میسوزوئک دور میں سارے جہاں پر گویا چھا گئے۔

دورِ حیات درمیانی

یہ دور ریپٹائل کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ٹرائی ایسک زمانے میں ڈائنوسورس ظاہر ہوئے اور جیوریسک زمانے تک یہ بہت ترقی کر گئے ڈائنوسورس بہت بڑے قد و قامت کے ہوتے تھے اور ۸۰ فٹ (۲۵ میٹر) سے بھی زیادہ بڑے جانوروں کے رکازی ڈھانچے پائے گئے ہیں۔ یہ بھی ریپٹائل ہی تھے اور حالاں کہ ان کے پیر ہوتے تھے اور یہ زمین پر چلتے پھرتے تھے لیکن انڈے دیتے تھے۔ ان کے انڈوں کے رکاز بھی ملے ہیں لیکن میسوزوئک دور یعنی کریٹیشس زمانہ کے ختم ہوتے ہوتے یہ قطعاً معدوم ہو گئے ساتھ ہی جیوریسک زمانہ میں ابتدائی اور چھوٹے دودھ پلانے والے جانور یعنی میمل (Mammal) نظر آئے اور اسی وقت پہلے پہل ہوا میں پرواز کرنے والا الیمل بھی نمودار ہوا ان سب کے دانت تھے۔ ان مختلف انواع کے جانوروں کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگل دور دور تک پھیل گئے تھے وہ ان کے لیے خوراک پیدا کرتے تھے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ہوام عموماً زیادہ سردی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور چوں کہ اس دور میں عام تھے اس لیے یہ غالب گمان ہے کہ جن ممالک میں یہ عام تھے۔ وہاں موسم معتدل رہا ہوگا۔

دورِ نوحیاتی

دور نوحیاتی کے درخت زمانہ حاضر کے درختوں سے بہت مشابہ تھے۔ اس زمانے میں نباتات اور حیوانات بہت تیزی سے ترقی کرتے گئے یہ زمانہ دودھ پلانے والے جانوروں کے لیے مشہور ہے۔ گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ وغیرہ اور تقریباً ان تمام قسموں کے جانور جو آج زمین پر ملتے ہیں اپنی ابتدائی شکلوں میں اسی دور میں آ گئے تھے۔ اسی دور نوحیاتی کے آخری زمانے میں انسان بھی آیا اور اس کی ترقی ہوئی پھر ترقی کرتے کرتے عہد برفانی (Ice-age) یعنی پلائسٹوسین زمانہ میں آدمی جدید معنوں میں

آدمی بنا۔

ارضیاتی سائنس کی تاریخ

قدیم عالموں نے ارضیات کے متعلق کئی نظریے پیش کیے لیکن وہ کسی مکمل سائنس کو جنم دینے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مثلاً یہ کہ قبل مسیح پانچویں صدی میں ایک یونانی فلسفی (ہیروڈوٹس) (Herodotus) نے دریائے نیل کے سیلابی میدانوں میں جمع شدہ پرتوں اور گھونگھوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصر کی موجودہ زمین کسی زمانے میں سمندر کے نیچے تھی۔ ایک صدی بعد ارسطو بھی اسی نتیجے پر پہنچا۔ قبل مسیح تیسری صدی میں ایک اور یونانی فلسفی ایراسٹوتھیس نے زمین کے محیط کے متعلق معلومات فراہم کیں اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو علاقے سطح آب کے اوپر ہیں وہ کسی زمانے میں سطح آب کے نیچے تھے کیوں کہ ان میں سمندری جانوروں کے رکازات ملتے ہیں۔ اس طرح کے خیالات رومی عالموں مثلاً اسٹرابو (Strabo) نے بھی پیش کیے لیکن چوں کہ یہ خیالات ٹھوس بنیادوں پر قایم نہیں تھے اس لیے ان کو کوئی اہمیت نہیں مل سکی۔ بلکہ یوں کہیے کہ عوام نے ان نظریوں کی نہ اہمیت ہی سمجھی نہ ان میں کوئی خاص دل چسپی لی۔ بہر حال علم ارضیات کی ابتدائی تشکیل میں اٹلی کا ایک انجینئر جس کا نام لیونارڈو ڈا ونسی (Leonardo Da Vinci) تھا بہت نمایاں خصوصیت رکھتا ہے کیوں کہ اس نے ہر چیز کے لیے ثبوت مہیا کیے اور انہیں بہت سوجھ بوجھ سے پیش کیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ سطح زمین سے نمک سمندر میں داخل ہوتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ زمانہ ماقبل کے مقابلہ میں آیندہ سمندر کا پانی زیادہ کھاری ہوگا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس پانی میں مٹی ملی ہوتی ہے وہ نشیبی زمین پر رسوبی حجرات تیار کرے گا اور مستقبل میں وہاں خشک زمین بن جائے گی اس نے ۱۴۵۲ء سے ۱۵۱۹ء تک اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی طرح ایک جرمن نے جس کا نام اگری کولا (Agricola) تھا، کچ دھاتوں اور جمادات کی رگوں کا کیمیائی محلولوں کے ذریعہ امتحان کیا۔ اس نے اپنے تجربات ۱۴۹۴ء سے ۱۵۵۵ء تک کرنے کے بعد کچ دھاتی ذخائر (Ore deposits) پر ایک ضخیم اور اہم کتاب لکھی۔ اس کے بعد کی دو صدیوں میں کئی سائنس داں زمین کے اندرونی حصے کی دھاتوں کی تحقیقات کرتے رہے۔ ڈی کارٹ (Descartes) نے ۱۵۹۷ء سے ۱۶۵۰ء تک تحقیق اور تگ و دو کرنے کے بعد ایک کلاسیکی نقشہ تیار کیا جس میں اس نے یہ ظاہر کیا کہ زمین کے اندرونی حصے میں جو طبقات پائے جاتے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں زمین کا اندرونی حصہ پگھلے ہوئے مادے پر مشتمل تھا۔ اور یہ بھی بتلایا کہ سطح زمین کے نیچے بہت سا پانی محفوظ ہے، جس سے چشمے نکلتے ہیں انیسویں صدی میں برطانیہ کے ایک سائنس داں جان رے (John Ray) نے چشموں کی تخلیق پر ایک کتاب لکھی۔

اٹھارویں صدی میں زمین کے متعلق معلومات کی ترتیب ہونے لگی اور یہ ایک سائنس کی شکل اختیار کرنے لگی اس زمانے میں خیالات یا نظریات پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا گیا بلکہ میدانی مشاہدات کو زیادہ اہمیت دی گئی پھر طبیعیات، کیمیا اور نباتیات سے مدد لی جانے لگی رسوبی حجرات پر زیادہ غور کیا جانے لگا۔ فرانس کا جمادات کا ماہر جین ایتیاں گوئٹیا (Jean Etienne Guftard) نے ۱۷۱۵ء سے ۱۷۸۶ء تک کام کیا اور پیرس کی وادی میں ہم مرکزی طور پر جمے ہوئے رسوبی حجرات اور دوسرے جمادات کی پرتوں پر غور کیا، پھر اپنی مہیا کردہ معلومات کو ایک نقشہ کی شکل میں پیش کیا۔ یہ ارضیات کا پہلا نقشہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس نے کئی رکازات کے بھی نقشے بنائے۔ اس نے آتش فشاں مادّوں پر بھی غور کیا۔ فرانس کا ایک اور سائنس داں ۱۷۲۵ء سے ۱۸۱۵ء تک آتش فشاں مادّوں پر ہی تحقیق میں مصروف رہا۔

اٹھارویں صدی میں ارضیات پر بہت کچھ تحقیقات ہوئیں اور نظریات میں اختلافات بھی بہت پیدا ہوئے ورنر (Werner) نے جس کا زمانہ ۱۷۵۰ء سے ۱۸۱۷ء تک رہا، جو خیالات پیش کیے ان کو نیپچونی ازم (Neptunism) کہا جاتا ہے اس کا یہ خیال تھا کہ تمام حجرات پانی کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں یہاں تک کہ گرنیائٹ بھی سمندر کی تہ میں پانی کے ذریعہ تیار ہوتا ہے اور یہ سب سے قدیم حجر ہے۔ اسی طرح بسالٹ (Basalt) نائیس (Gneiss) اور سلیٹ (State) وغیرہ تیار ہوئے۔ اس کا خیال تھا کہ جب سمندر کی سطح نیچے ہو جاتی ہے تو بالو پتھر (Sand stone) بنتا ہے۔ چوں کہ یہ ایک اچھا سائنس داں تھا اس لیے اکثر محققوں نے اس کی تائید کی لیکن بعد ازاں جیمس ہٹن (James Hutton) ۱۷۲۶ء سے ۱۷۹۷ء جو اڈنبرا کا باشندہ تھا اس نے بجائے تجربہ خانوں میں کام کرنے کے زیادہ وقت کھلے میدانوں میں گزارا اور مواد فراہم کیا۔ اس نے آتشی حجرات کے متعلق بالخصوص بہت معلومات فراہم کیں اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس قسم کے حجرات زمین کی ابتدا سے ہی زمین پر موجود تھے۔ اس کا خیال تھا کہ گھساؤ کے عمل سے بہت سے قدیم حجرات تباہ ہو چکے ہیں۔ اور جو کچھ اب ہم دیکھتے ہیں وہ قدیم دنیا کے باقیات ہیں۔ اس کے بعد جرمنی کے دو سائنس داں لیہ مان (Lehmann) اور فوخ زیل (Fuchsel) نے رسوبی حجرات کے متعلق معلومات میں بہت اضافہ کیا۔

۱۸۰۰ء کے بعد سے انگلینڈ اور فرانس میں ارضیات کے متعلق خیالات اور طریقوں میں زبردست تبدیلی ہوئی۔ انگلینڈ کا ایک ماہر سروے ولیم اسمتھ جو وسطی انگلینڈ میں ایک نہر کا سروے کر رہا تھا، اسے مختلف رکاز دکھائی دیے اور وہ انہیں تقریباً جمع کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی دل چسپی بڑھتی گئی اور اس نے رکاز کے پہچاننے میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ اپنے مشاہدوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ زمانہ جیورلیک کے حجرات میں جو رکازات ایک مقام پر ملتے ہیں وہی دوسرے مقامات پر بھی ملتے ہیں مزید برآں جیورلیک حجرات میں جو رکاز دستیاب ہوتے ہیں، ان کی مدد سے اوپری اور نچلی سطح کے طبقوں میں بھی امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ اس نسبت کو ایک بنیاد قرار دیتے ہوئے اس نے انگلستان کے طبقاتی حجرات کا ایک مکمل نقشہ تیار کیا۔ اسمتھ (Smith) کے نظریے کو استعمال کرتے ہوئے کوویر (Cuvier) نے ارضیاتی زمانے کی تقسیم

اورطبقاتی حجرات کا ایک نظام قائم کیا۔ اس وقت تک ارضیاتی سائنس کی اہمیت تسلیم کی جاچکی تھی اور جیولاجیکل سروے کے محکمے قائم کیے جانے لگے تھے۔ علم الطبقات کے ساتھ رکازات کا علم بھی ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ ۱۸۵۹ء میں ڈارون نے ارتقا کا نظریہ پیش کرکے سائنسی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

انیسویں صدی میں طبعی ارضیات میں بہت زیادہ ترقی ہوئی اور جمادات اور حجرات کے پہچاننے کے طریقے بالکل بدل گئے۔ سوربی (Sorby) نے جمادات اور حجرات کے مہین تراشے بنائے اور اس کے دیکھنے کے لیے خصوصی خوردبین ایجاد کی۔

بیسویں صدی میں علم ارضیات کی بہت ترقی ہوئی۔ تحقیقات کے لیے نئے طریقے معلوم کیے گئے اور انسان نے زمین سے بڑھ کر سمندر کی تہہ میں حجرات پر تحقیق شروع کردی پھر دن بہ دن نئے نئے نظریے سامنے آئے اور پرانے نظریے فرسودہ قرار پائے۔ اور سائنس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونی شروع ہوگئی۔ اس طرح اس میں نئے نئے شعبے تسلیم کیے جانے لگے۔ ان میں ایک ارضیات طبعی (Geo-Physics) بھی ہے جس سے زلزلوں پر اور زلزلوں سے پیدا شدہ لہروں پر تحقیق شروع ہوئی اور ان کی مدد سے زمین کے اندر کے حالات سے متعلق بڑی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

اب ماہرین ارضیات کی نظریں چاند اور مریخ پر پہنچ چکی ہیں اور چاند سے لائے گئے حجرات پر تھوڑے سے وقت میں اتنی تحقیقات کی گئیں کہ دنیا کے کسی حصے کے حجرات پر شاید نہ ہوئی ہوں گی۔ اسی طرح سمندر کی تہہ میں برمے سے سوراخ کرکے وہاں کے حجرات کا بھی معائنہ کیا جانے لگا بلکہ ایک بار کوشش تو یہ بھی کی گئی کہ برمے سے سوراخ کرکے موہورویشک غیر مربوط تک پہنچا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ غیر مربوط کیوں ہے۔ اور اس کے نیچے کس قسم کے حجر ملتے ہیں۔ یہ کوشش مالی مشکلات درپیش ہونے سے چھوڑ دینی پڑی۔

حجریات

حجریات خود ایک جامع سائنس ہے جس کے تحت ہم مختلف اقسام کے حجرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالعہ صرف حجرات کا ہی کیا جاسکتا ہے جو قشر ارض پر ملتے ہیں۔ یوں کبھی کبھی جو شہاب زمین پر آگرتے ہیں ان کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غالباً زمین کے اندرونی حجرات کے مشابہ ہوں گے۔

حجریات میں ہر قسم کے پتھر اور شہاب کا مطالعہ دو لحاظ سے کیا جاتا ہے اوّل تو یہ کہ وہ حجر کس طرح وجود میں آیا۔ اس کا ماخذ کیا ہے۔ وہ کس شکل میں پایا جاتا ہے۔ اس میں کیا جمادات پائے جاتے ہیں۔ وغیرہ اور دوسرے یہ کہ اس حجر کا تاریخ ارضیات میں کیا مقام ہے۔

حجر کے نمونے کا تفصیلی معائنہ جمادات کی جانچ و شناخت وغیرہ کو حجر نگاری یا حجریات (Petro g rapby) کہتے ہیں۔ اور ان جمادات کے اندرونی ڈھانچے اور ماہیئت کو پیٹروفیبرک (Petro f abric) کہتے ہیں۔ اس کی تحقیق پیٹروفیبرک تجزیہ Petrographic Analysis سے ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی حجر کے ماخذ یا تخلیق کا علم پیٹروجینیس (Petrogenesis) کہلاتا ہے۔ لیتھولوجی (Lethology) حجریات (Petrology) کی تقریباً متوازن اصطلاح ہے اور بعض مواقع پر اب بھی استعمال میں آتی ہے۔ دراصل حجر نگاری اس علم کا وہ تفصیلی حصہ ہے جس میں اس کے کیمیائی، جماداتی اور بافتی (Textural) نقاط نظر سے بحث کی جاتی ہے۔ اور کسی حجر کے متعلق جب مکمل معلومات حاصل کرلی جائیں تب ہی اس کا صحیح مقام ارضیات میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ حجر نگاری حجریات کا اولین قدم ہے۔ اور جہاں تک ہوسکے جمادات کا صحیح اندازہ کرنا ضروری ہے جیساکہ دیگر طبعی اور کیمیائی علوم میں ہوتا ہے۔ حجرات سے قشر ارض کی ترکیب عمل میں آئی۔ لیکن اصطلاحاً حجر عموماً سخت اور ٹھوس مادے کے مفہوم میں مستعمل ہے، خواہ اس کی بنیاد آتشی ہو یا رسوبی۔

اگر ٹھوس حجرات کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جماداتی ترکیب کے حامل ہیں یہ دوسری بات ہے کہ آتشی حجرات کی تقسیم ہی ان کے جماداتی توازن پر کی جاتی ہے اور اس طرح ہر قسم کے حجر کی جماداتی اور نامیاتی ساخت معین ہوتی ہے، برخلاف اس کے رسوبی حجرات میں کوئی ایسا تعین عموماً نہیں ہوتا۔ حجرات کی تیسری قسم تقلیبی کہلاتی ہے اور ان حجرات کی بھی کیمیاوی یا نامیاتی ساخت معین نہیں ہوتی۔

حجرات جو رقیق آتشی سیال مادے کے جم جانے سے بنتے ہیں وہ ابتدائی (Primary) یا آتشی (Igneous) کہلاتے ہیں۔

ابتدائی یا آتشی حجرات تین اہم اقسام کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو آتش فشاؤں سے نکل کر سطح زمین پر پھیل جائیں۔ ان کو والکینی (Volcanic) یا برکانی حجر کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو سطح زمین سے بہت نیچے ہی سرد ہوکر جم جائیں۔ ان کے جمادات کے قلم کافی بڑے ہوتے ہیں اور ان کو قعری یا عمیقی (Abyssal) کہتے ہیں، یہ حجر بہت جگہوں پر اوپری پرتوں کے ہٹ جانے سے سطح زمین پر آگئے ہیں اور کافی اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں گرینائیٹ (Granite) بہت مشہور حجر ہے۔ والکینی اور عمیقی کے درمیانی آتشی حجر کو نیم عمیقی یا نیم قعری (Hypabyssal) کہتے ہیں اور یہ ڈائک (Dyke) کی شکلوں میں آتشی رسوباتی اور تقلیبی حجرات کے شگافات میں داخل ہوجاتے ہیں اس طرح سِل (Sill)، رسوباتی حجرات کی وہ صورت ہوتی ہے جب آتشی حجر کی تہوں میں خود تہہ کی شکل میں داخل ہوجاتے ہیں۔

قشر ارض کے جمتے ہی اور کرۂ آب (Hydrosphere) اور کرۂ خاک (Li thospbere) کے تشکیل پانے کے بعد ہوا، پانی اور برف تینوں ابتدائی حجرات پر عمل کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اس عملی تجزیہ Disintegration سے نرم ملبہ (Loose Debris) معرض وقوع میں آتا ہے۔ اسی طرح کیمیائی عمل ملبہ اور مواد دونوں پر اثر انداز ہوکر ان کو محلولوں کی شکل میں پانی کے ہمراہ

بہالے جاتا ہے یہ تمام مادہ یعنی چھوٹے بڑے پتھروں کے ٹکڑے، بالو چکنی مٹی اور محلول زمین پر گہرے حصوں میں یا سمندر میں جمع ہو کر لیستہ اور سخت ہو جاتے ہیں اور اس طرح رسوباتی حجر بنتے رہتے ہیں۔ ان کو حجر ثانوی (Secondary Rocks) یا رسوباتی Sedimentary حجر کہتے ہیں۔ مناسب حالات کے تحت سمندر خشک ہو کر مقامی طور پر نمک اور جپسم (Gypsum) وغیرہ کی پرتیں بھی حجر ثانوی کی طرح جم جاتی ہیں اور اسی طرح سمندری جانوروں کے گھونگھوں سے چونا پتھر کی تہیں بھی بن جاتی ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی حجر اسے حرکت ارض (Earth Movement) کے باعث کبھی کبھی قشر ارض کی گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت ان پر دباؤ اور حرارت کا اثر ہوتا ہے ان عوامل کی وجہ سے حجرات کلی یا جزوی طور پر دوبارہ ترتیب پاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی زمین کے اندرونی حصوں سے ابخرات اور سیال، شگافوں سے آکر حجرات پر اثر انداز ہوتے اور ان کی کم وبیش کایا ہی بدل دیتے ہیں۔ جو حجرات اس طریقہ سے اپنی اصلی حالت سے تبدیل ہو جائیں ان کو تقلیبی حجرات (Metamorphic Rocks) کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے بلحاظ بنیاد یا ماخذ حجرات کی تین اقسام تسلیم کی گئی ہیں۔

آتشی یا ابتدائی حجرات (Igneous Rocks)

رسوبی یا ثانوی حجرات (Secondary Rocks)

تقلیبی حجرات (Metamorphic Rocks)

ذیل میں ہم ان تینوں اقسام کی اہم خصوصیات مختصراً پیش کریں گے اور اس کے بعد ہر ایک قسم کے چند بہت عام حجرات کا تذکرہ کریں گے۔

آتشی حجرات

آتشی حجرات کی تین اقسام ہیں۔

(الف) قعری (Plutonic) (ب) نیم قعری (Hypabyssal) (ت) برکانی (Volcanic)۔

گرانائٹ (Granite) اور گرینو ڈایورائٹ (Granodiorite)

یہ دو سوا آسودہ (Over Saturated) حجر قعری، بہت عام ہیں۔ اور بڑے بڑے بیتولتھ (Batholith) بناتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہوتے ہیں اور عمارتی کاموں میں اپنے حسن کی وجہ سے استعمال میں آتے ہیں۔

کوارٹز۔ آرتھوکلیز (Orthoclase) فلسپار کچھ پلیجیو کلیز (Plagioclase) — اور ایک یا ایک سے زیادہ قسم کے فرومیگنیشیمی جمادات ان کے لازمی اجزا ہیں عموماً کوارٹز ۲۰ تا ۴۰ فی صد اور فلسپار ۶۰ فی صد حجر کا جز ہوتے ہیں۔

ان کے قلم عموماً اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ آسانی سے بغیر کسی آلے کے استعمال کے پہچانے جا سکتے ہیں عموماً رنگ ان کا ہلکا ہوتا ہے، جس میں سیاہ یا سبز قلم نمایاں ہوتے ہیں۔ ان اجزا کی تقسیم کوارٹز اور فلسپار کے علاوہ جو اور جماد نمایاں ہوتا ہے اس کے اوپر کی جاتی ہے۔ مثلاً ابرقی گرینائیٹ، بایوٹائٹ (Biotite) گرینائٹ، ہارن بلنڈ (Hornblende) گرینائٹ وغیرہ۔

گرینائٹ کی کثافت اضافی تقریباً ۶۷ء۲ اور گرینوڈایورائٹ کی ۷۰ء۲ مانی جاتی ہے گرینائٹ تمام جنوبی ہند میں عام طور پر ملتے ہیں اور ہمالیہ میں بھی موجود ہیں۔ مدراس اور کرناٹک میں ایک خاص قسم کا گرینائٹ پایا جاتا ہے۔ جسے چارنوکائٹ (Charnockite) کہتے ہیں۔ اس میں فرومیگنیشین جماد ہائپرستھین (Hypersthene) ہوتا ہے اور اس کا کوارٹز نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

جب گرینائٹ کا مادہ برکانی شکل میں سطح زمین پر آجاتا ہے تو اسے رہایولائٹ (Rhyolite) ڈیسائٹ (Dacite) وغیرہ ان کی جمادی ترکیب کے مطابق نام دیے جاتے ہیں اور جب یہ یک لخت سرد پڑ جائے اور اس میں سے گیسوں کے نکلنے سے ہزاروں سوراخ بن گئے ہوں، جن کی وجہ سے وہ جھانوں جیسا ہو گیا ہو تو اسے پیومس (Pumice) کہتے ہیں۔

ان اقسام سے ملتی جلتی ایک قسم سائنائٹ (Syenite) ہوتی ہے جس میں قلی (Alkali) کا جز زیادہ ہوتا ہے۔ ان کی برکانی شکل ٹریکائٹ (Trachyte) کہلاتی ہے۔

گیبرو، ڈولرائیٹ و بیسالٹ (Gabbro Dolerite Basalt)

یہ تینوں کم آسودہ (Under saturated) حجر ایک ہی گروہ کے فرد ہیں۔ گیبرو (Gabbro) ان میں عمیقی یا قعری حالت میں تشکیل پاتا ہے۔ ڈولیرائٹ (Dolerite) نیم عمیقی یا نیم قعری حالت میں وجود میں آتا ہے اور بیسالٹ (Basalt) ان دونوں کی برکانی شکل ہے۔

ان کے لازمی جماد پلیجیو کلیز (Plagioclase) فلسپار لیبریڈورائٹ (Labradorite) سے انارتھائٹ (Anorthite) تک اور مانوکلینک پائیراکسین (Monoclinic Pyroxene) یعنی آگائٹ (Augite) یا ڈائیلیج (Diallage) ہوتے ہیں۔ اور جو جماد ان میں موجود ہو سکتے ہیں۔ ان میں آلیوین (Olivine) ہارن بلنڈ (Horn blende) بایوٹائٹ (Biotite) وغیرہ شامل ہیں۔

ڈولرائیٹ (Dolerite) عموماً ڈائک یا سل کی شکل میں پایا جاتا ہے اور اس کے جمادات کے قلم کچھ اس طرح وجود میں آتے ہیں کہ پلیجیو کلیز کے قلم چاروں طرف سے آگائٹ کے قلموں سے گھرے ہوتے ہیں۔ اس کو آفٹک (Ophitic) ساخت کہتے ہیں۔

بیسالٹ سیاہ رنگ کا ٹھوس حجر ہوتا ہے جس کی تہیں رسوبی حجرات کی تہوں کی طرح اکثر ایک کے اوپر ایک جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ مہاراشٹر کے علاقے اور اس کے نواح میں یہ تقریباً ۲٬۰۰٬۰۰۰ مربع کیلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

بیسالٹ اور آلیوین بیسالٹ (Olivine Basalt) اس کی دو اہم قسمیں ہیں۔ یک لخت سرد پڑ جانے سے جب یہ بلور (Glass) کی شکل میں جم جاتا ہے تو اسے ٹریکیلائٹ (Trachylite) کہتے ہیں۔ وہ بیسالٹ جن میں سوڈے کی افراط سے پلیجیو کلیز البائٹ (Albite) قسم کا ہوتا ہے ان کو اسپلائٹ (Spilite) کہتے ہیں۔

آتش فشاؤں سے عموماً بیسالٹ ہی لاوے کی شکل میں ابل کر بہتا ہے۔

اینڈیسائٹ (Andesite) پورفیرائٹ (Porphyrite) ڈایورائٹ (Diorite) یہ تینوں آسودہ حجرات کے رکن ہیں۔ کوارٹز کے بڑھنے سے ان حجرات میں آرتھوکلیز بڑھ جاتا ہے اور ڈایورائٹ سے کوارٹز ڈایورائٹ پھر گرینوڈایورائٹ اور آخر میں گرینائٹ بن سکتا ہے۔

ڈایورائٹ کے لازمی جماد پلیجیو کلیز، عموماً اینڈیسین (Andesine) اور ہارن بلنڈ ہوتے ہیں اور اضافی جماد ایپے ٹائٹ (Apatite) اسفین

(Sphene) اور لوہے کے آکسائڈ (Iron Oxide) ہوتے ہیں۔
ڈایوراٹ کی نیم عمیقی یا نیم قعری شکل پورفیراٹ اور برکانی شکل
(Andesite) ہوتی ہے۔ بحرالکاہل کے بہت سے جزیروں میں اینڈیسائٹ
عام طور پر ملتا ہے۔

آتشی حجرات وہ سیال مادہ جس سے آتشی حجرات بنتے ہیں گرم، لنج سلیکائی ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں گیسیں کافی مقدار میں ہوتی ہیں۔ اس سیال کا اصل جزو سلیکن اور آکسیجن ہوتے ہیں۔ دھاتوں میں پوٹاشیم، سوڈیم، کیلشیم، میگنیشیم، ایلومنیم اور لوہا بھی ان میں کم وبیش مقدار میں ضرور موجود ہوتے ہیں ان سے کم مقدار میں اور بہت سی دھاتیں ہوتی ہیں۔ گیسوں میں کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور بھاپ بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ اس طرح اس مادہ کی بناوٹ بہت پیچیدہ ہوتی ہے اور ان سے جو حجر بنتے ہیں، گوناگوں اقسام کے ہوتے ہیں جب یہ مادہ یکایک سرد پڑ جاتا ہے تو اس سے حجری شیشہ بن جاتا ہے اور جب آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو بہ تدریج بڑے اور اس سے بڑے جمادات کے قلم بنتے ہیں۔

سلیکا کا جزو آتشی حجرات میں چالیس فی صد سے اسی فی صد تک ہوتا ہے چوں کہ سلیکا تیزابی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے ان حجرات کو جن میں سلیکا کا جزو زیادہ ہو تیزابی حجر کہتے ہیں اور جن میں کم ہو ان کو ترشیلے یا ترشی حجر کہتے ہیں۔ ترشیلے حجرات کا سیال تقریباً ۱۰۰۰ سینٹی گریڈ پر جم جاتا ہے۔ یہ پانچ طرح سے سطح زمین پر آتا ہے (۱) درز سے نکلا ہوا مادہ (ب) چٹانی (Shield) آتش فشاں (پ) وسطی روزنی آتش فشاں (ت) تھم تھم کے پھٹنے والے آتش فشاں (Paraxymal Eruption) جن میں لاوا کم اور گیسیں زیادہ ہوتی ہیں اور (ث) بخارات (Fumaroles) دہانے، گیزر (Geyser) اور گرم پانی کے چشمے۔

یوں تو آتش فشاں میں ویسوویس (Vesuvius) بہت مشہور ہے لیکن مونالوا (Mauna Loa) کلا وآ (Kilavea) ہوائی (Hawaii) وغیرہ ہزاروں آتش فشاں آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ پھر بھی اگست ۱۸۸۳ء میں سماترا کے نزدیک جب کیراکاٹوا (Karakatoa) پھٹا ہے تو یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اس سے پیدا شدہ لہریں مدراس تک پہنچیں۔ اور پورا جزیرہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس سے جو باریک راکھ ہوا میں پہنچی، تو اس سے عرصے تک دھوپ کی رنگت پر اثر رہا۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ فضا کی اوپری سطحوں میں راکھ اب بھی موجود ہے۔

زمین کے اندر جو مادّہ ہوتا ہے، وہ کثیر دباؤ کے باوجود بہت زیادہ گرم ہونے کے ٹھوس شکل میں رہتا ہے لیکن اگر کہیں دراریں، شگاف اسں کو میسر آجائیں تو ان سے وہ سطح زمین پر یا تو آجاتا ہے یا سطح زمین کے نیچے ہی سرد ہوکر جم جاتا ہے۔ اگر زمین پر آجائے تو آتش فشاں کی کسی شکل میں نمودار ہوتا ہے اگر زمین پر آنے سے پہلے ہی جم جائے تو مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے۔

ڈائک اور سل کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے لیکن ان کے علاوہ کبھی کبھی اگر مادّہ تیزابی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے تو بہت زیادہ مقدار میں قشرات ارضی میں مختلف شکلوں میں داخل ہو جاتا ہے، اس کی کئی اقسام شکلوں کی بنا پر کی گئی ہیں۔ مثلاً لیکولتھ (Laccolith) فیکولتھ (Phacolith) بیتھولتھ (Batholith) لوپولتھ (Lopolith) وغیرہ ان کے قلم آتش فشانی حجرات کے مقابلہ میں بڑے ہوتے ہیں اور بغیر خورد بین کے پہچانے جاسکتے ہیں۔

آتشی حجرات کا اصطلاحات یا تو ان کی شناخت پر ہوتا ہے یا ان کے کیمیاوی اجزا اور بناوٹ پر۔ ساختی اصطلاحات میں حجر کی تین قسمیں مانی گئی ہیں۔ (۱) کل قلمی (۲) باریک قلمی (۳) مخفی قلمی۔ ان اقسام میں تمام قلم کم وبیش برابر ہیں۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک جماد کے قلم دیگر جمادات کے قلموں سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ایسے حجر کو پورفری (Porphyry) اور ایسی ساخت کو پورفرائی (Porphyritic) کہتے ہیں۔ اور بڑے قلم والے جماد کو فینو کرسٹ (Phenocryst) کہتے ہیں۔

اگر حجر اس قدر جلد سرد ہوگیا ہو کہ اس میں قلم بن ہی نہ سکے ہوں تو اسے حجری شیشہ یا وٹریس (Vitreous) کہتے ہیں۔ کبھی کبھی جب لاوا زمین پر آکر سرد پڑتا ہے تو وہ باریک قلمی ہوتا ہے۔ لیکن گیس کے بلبلے اس میں جگہ جگہ خلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کو ایمگڈیل (Amygdale) کہتے ہیں بعد میں یہ بعض اوقات ابخرات سے بنے ہوئے جمادات سے بھر بھی جاتے ہیں۔ ایسے بعض جمادات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب یہ ایمگڈیل ایمتھیسٹ (Amethyst) سے بھر جائیں، جس کا جواہرات میں شمار کیا جاتا ہے۔

حجرات کی جماداتی ساخت اور رنگ کا دارومدار بڑی حد تک ان کی کیمیائی ساخت پر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ایک ترشی اور تیزابی حجر کے کیمیاوی تجزیے درج ذیل ہیں۔

		تیزابی حجر گرینائیٹ %	ترشی حجر بیسالٹ %
سلیکن آکسائیڈ	SiO_2	۷٫۲	۴۹٫۱
ایلومنیم آکسائیڈ	Al_2O_3	۱۴٫۴	۱۵٫۷
فیرک آکسائیڈ	Fe_2O_3	۱٫۶	۵٫۴
فیرس آکسائیڈ	FeO	۱٫۸	۶٫۴
میگنیشیم آکسائیڈ	MgO	۰٫۹	۶٫۲
کیلشیم آکسائیڈ	CaO	۲٫۰	۹٫۰
سوڈیم آکسائیڈ	Na_2O	۳٫۵	۳٫۱
پوٹیشیم آکسائیڈ	K_2O	۴٫۱	۱٫۵
پانی	H_2O	۰٫۸	۱٫۶
مختلف اجزا		۰٫۷	۲٫۰
		۱۰۰%	۱۰۰%

یوں تو حجرات میں، جمادات زیادہ تر سلیکیٹ کی شکل میں ہوتے ہیں۔ لیکن کیمیاوی ساخت کی جانچ کرنے پر انہیں آکسائیڈ کی شکل میں لکھا جاتا ہے جماداتی جانچ جو عموماً خوردبین سے کی جاتی ہے اس کے نتیجے میں جماداتی اجزا کو الگ الگ شناخت کرکے بالترتیب لکھا جاتا ہے یعنی یہ کہ جو جماد سب

سے زیادہ موجود ہو اس کو پہلے لکھتے ہیں اور جو سب سے کم ہو اس کو آخر میں۔
آتشی حجرات کی درجہ بندی یا ترتیب آسان ترین طریقہ میں یوں ہو سکتی ہے۔

	ترشی	درمیانی	تیزابی
ولکنی	بیسالٹ (Basalt)	اینڈیسائٹ (Andesite)	رہایولائٹ (Rhyolite)
نیم عمیقی	ڈولرائٹ (Dolerite)	پورفرائٹ (Porphyrite)	فلسائٹ (Felsite)
			کوارٹز پورفری (Quartz Porphery)
عمیقی	گیبرو (Gabbro)	ڈایورائٹ (Diorite)	مائیکروگرینائٹ (Micro g ranite)
		گرینو ڈایورائٹ (Granodiorite)	گرانائیٹ (Granite)

رسوبی حجرات

رسوبی حجرات کا بیشتر حصہ مختلف حجرات کے ذرات اور ٹکڑاوں کا ہی ہوتا ہے اور وہ ہوا پانی یا گلیشیائی عملات سے تہ بہ تہ جمع ہوتے ہیں۔
رسوباتی حجرات سطح زمین کے مقابلتاً بہت کم حصہ کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ اور یہ حصے علاحدہ علاحدہ حصوں میں منقسم ہیں۔ اوسطاً رسوباتی حجرات کا دَل تقریباً ایک ہزار میٹر ہوگا۔ مگر مقامی طور پر یہ دس ہزار میٹر یا اس سے بھی زیادہ موٹی تہوں میں ملتے ہیں۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر سطح زمین سے پندرہ کلومیٹر تک کے تمام حجرات کو شمار میں لایا جائے تو رسوباتی حجرات صرف پانچ فی صدی ہوں گے۔

تمام رسوباتی حجرات کے ذرات کسی نہ کسی منزل پر آکر ایک دوسرے میں پیوست ہو کر کم سے کم جگہ میں سمو جاتے ہیں اور ان میں کسی نہ کسی قسم کا سیمنٹ شامل ہو کر ان ذرات کو جوڑ دیتا ہے اس طرح ان ذرات کی تہوں سے سخت پتھر کی تہیں بن جاتی ہیں۔ اس عمل کو ڈائی جینس (Diagenesis) کہتے ہیں۔

دوسری قسم کے رسوبی حجرات وہ ہیں جو نباتی اور حیوانی اجسام سے بنتے ہیں۔ ان میں چونا پتھر اور کوئلہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ تیسری قسم کے کیمیاوی عملات سے پیدا شدہ رسوبات ہیں۔ مثلاً نمک، جپسم وغیرہ مجموعی طور پر ان کو ایو پورائٹس (Evaporites) کہتے ہیں۔

اس طرح رسوبی حجرات کی تین اہم قسمیں ہوئیں۔

(۱) میکانی طریقے سے بنے ہوئے حجرات۔ مثلاً بالو پتھر، سِیل وغیرہ۔
(ب) خلقی اجسام سے بنے ہوئے حجرات۔ مثلاً چونا پتھر (مگر تمام و کمال نہیں) کوئلہ وغیرہ۔
(پ) نامیاتی یا کیمیاوی عملات سے بنے ہوئے حجرات۔ مثلاً بعض چونا پتھر، ایو اپورائٹس وغیرہ ان میں پہلی قسم کو ذرات کی جسامت پر مزید تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح

روڑی دار حجرات کو ریوڈیشیس Rudaceous کہتے ہیں۔
بالو دار حجرات کو ایری نیشیس (Arenaceous) کہتے ہیں۔
اور کیچ دار حجرات کو آرجیلیشیس Argillaceous کہتے ہیں۔

ذرات کی جسامت کا تعین بھی کر دیا گیا ہے اور اس طرح

روڑی ۲ ملی میٹر سے بڑی ہونی چاہیے۔

بالو:
- بہت موٹی ۲ ـــ ۱ ملی میٹر ہونی چاہیے۔
- موٹی ۱ ـــ ۰٫۵ ملی میٹر ہونی چاہیے۔
- اوسط ۰٫۵ ـــ ۰٫۲۵ ملی میٹر ہونی چاہیے۔
- باریک ۰٫۲۵ ـــ ۰٫۱۲۵ ملی میٹر ہونی چاہیے۔
- بہت باریک ۰٫۱۲۵ ـــ ۰٫۰۶ ملی میٹر ہونی چاہیے۔

سلٹ ۰٫۰۶ ـــ ۰٫۰۰۲ ملی میٹر ہونی چاہیے۔
کلے ۰٫۰۰۲ ملی میٹر سے بھی زیادہ باریک ہونی چاہیے۔

خلقی اجسام سے تشکیل شدہ حجرات چنیلا (Calcareous) سلیکائی (Siliceous) کاربونی (Carbonaceous) آہنی (Ferroginous) یا فاسفورسی (Phos-phatic) ہوتے ہیں۔

اسی طرح نامیاتی حجرات کی تقسیم در تقسیم ان کی کیمیاوی ترکیب پر ہوتی ہے۔ روڑیوں سے بنے ہوئے حجرات کو کانگلومیرٹ (Conglo-merate) کہتے ہیں اور ان میں روڑیاں کبھی کبھی ایک ہی قسم کے پتھر کی ہوتی ہیں ورنہ عموماً مختلف رنگ و روپ اور مختلف اقسام کے پتھروں سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس طرح ذرات کی جسامت پر حجرات کی تقسیم کر دی گئی ہے اسی طرح روڑیوں کی جسامت کا بھی تعین کر دیا گیا ہے اور ان کو ان کے قطر کے حساب سے بولڈر (Boulder) کوبل (Cobble) وغیرہ کہتے ہیں۔

بالو پتھر (Sand stone) کا اہم جز عموماً کوارٹز ہی ہوتا ہے اور اس کے ذرے گول نیم گول یا کونے دار ہوتے ہیں۔ ان پر تحقیق میں ایک مرکز ان میں موجود وزنی جمادات کی جانچ ہوتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں کیا کیا جمادات ہیں۔ آیا وہ گھس گھس کر گول ہو رہے ہیں یا نہیں اور پھر وہ کس قسم کے حجر سے یعنی یہ کہ آتشی یا تقلیبی یا رسوبی حجرات سے تشکیل پائے ہوں گے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زیر غور حجرات کس قسم کے حجرات کے توڑ پھوڑ سے بنے ہیں اور وہ دریا جو یہ مادہ لائے تھے کن حجرات پر سے گزرے ہوں گے۔

اس تحقیق کے لیے حجرات کو کوٹ کر برومو فارم (Bromoform) یا میتھائلین آیوڈائیڈ (Methylene Iodide) یا کلیریسی کے محلول (Clericis Solution) میں ڈال دیتے ہیں اور جو جز نیچے تہ میں بیٹھ جائے اس کو نکال کر ان کا امتحان مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ ان جمادات میں ٹورملین (Tourmaline) اسفین (Sphene) ٹوپاز (Topaz) ریوٹائل (Rutile) زیرکن (Zircon) المینائٹ (Ilmenite) مونازائٹ (Monazite) وغیرہ بہت دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔

رسوبی حجرات کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں رکاز ہوتے ہیں

ایسا تو نہیں ہے کہ ہر رسوبی حجر میں رکاز ضرور ہوں لیکن کیمبرین (Cambrian) عہد کے بعد کے رسوبی حجرات میں حیوانی اور ڈیوونین (Devonian) عہد کے بعد کے حجرات میں نباتی اور حیوانی دونوں قسم کے رکاز عام طور پر ملتے ہیں. علم رکازیات خود ایک وسیع علم ہے اور اس پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہیں. لیکن یہ کہنا درست ہوگا کہ ان رکاز کا عہد بہ عہد مطالعہ کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ان کا ارتقا بتدریج ہوا ہے۔

ذیل میں چند بہت عام اور اہم اقسام حجر کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے. ان کی شناخت کرنے میں جن چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے ان کی نشان دہی ہو۔

رسوبی حجرات میں یہاں صرف چار قسم کے حجرات کا بیان کافی ہوگا۔

۱۰۲۲۲، ۳ کانگلومیریٹ (Conglomerate) کبھی کبھی دریا چھوٹے اور بڑے پتھر ایک ساتھ بہا کر لے آتا ہے اور جب پانی کے بہاؤ میں کمی ہوتی ہے تو یہ کہیں کہیں پر اپنا وزن کم کر دیتا ہے. جس سے بڑے اور چھوٹے پتھر ایک جگہ پر جمع ہو جاتے ہیں ان کو کانگلومیریٹ کہتے ہیں. ان کا وجود گلیشیرس (Glaciars) کے ذریعہ بھی ہوتا ہے. لیکن ان کو علم ارضیات میں کافی اہمیت دی گئی ہے، کیوں کہ ان کے ذریعہ ان تمام جگہوں کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے جہاں سے یہ پتھر آتے ہیں۔ برف سے لائے ہوئے پتھر عموماً نوکیلے اور دریا سے لائے ہوئے گول ہوتے ہیں۔

ریت پتھر (Sand stone) بالو کے موٹے اور باریک دانوں سے بنے ہوئے یہ حجر بہت عام ہیں عموماً طبقدار ہوتے ہیں پستی اشیاء (Cementing Material) ان میں کیلشیم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) فلسپار یا فلسپار کی بگڑی ہوئی شکل یعنی کلے یا لوہے کا آکسائیڈ (Iron Oxide) وغیرہ ذرات کو جوڑنے میں سیمنٹ کا کام دیتے ہیں ان کے رنگ کا انحصار عموماً لوہے کے آکسائیڈ کے جزو پر ہوتا ہے. کبھی کبھی تو یہ پتھر بے حد بھربھرا ہوتا ہے اور ذرا سی رگڑ پر ریت کے ذرات علاحدہ علاحدہ ہو جاتے ہیں. جب یہ سخت ہوں تو عمارتی کاموں میں عام طور پر استعمال میں آتے ہیں۔

وندھیا پہاڑوں میں پائے جانے والے سرخ رنگ کے ریت پتھر سے نہ صرف لال قلعہ اور بہت سی مغل دور کی عمارتیں بنی ہیں بلکہ یہ آج بھی بہت عمارتی کاموں میں استعمال ہو رہے ہیں۔

شیل ریت پتھر کی طرح شیل بھی میکانی طریقوں سے بنے ہوئے حجرات کی قسم ہے. جس کا اصلی جزو گل ہوتی ہے. یہ عموماً پتلی پتلی پرتوں میں بنتا ہے جس کی وجہ سے آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے. جمنے کے وقت گل کے ساتھ پانی کی مقدار کافی ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ پانی نچڑ کر چکنی مٹی کی تہیں شیل بنا دیتی ہیں کسی حد تک اس چکنی مٹی میں بہت باریک ذرے کوارٹز وغیرہ کے موجود ہوتے ہیں جنہیں سلٹ (Silt) کہتے ہیں۔

شیل کی جمادی ترکیب بہت پیچیدہ ہوتی ہے اور اس کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں۔

چونا پتھر

یہ حجر عموماً خلقی اجسام سے بنتے ہیں. یوں نامیاتی طریقوں سے بھی بنے ہوئے پائے گئے ہیں ان کا رنگ یوں تو عام طور پر بہت ہلکا پیلا ہوتا ہے لیکن رنگ کا دارومدار خفیف اجزا پر ہوتا ہے جو ان میں موجود ہوتے ہیں اس طرح یہ رنگ میں سفید بھورے، گلابی، بادامی، سرمئی یا سیاہ ہوتے ہیں. چونا پتھر تعمیر میں استعمال ہونے کے علاوہ چونا بنانے، سیمنٹ سازی اور لوہے کے پگھلانے کی صنعت میں استعمال کیا جاتا ہے چونا پتھر کی خوبی کا زیادہ انحصار اس کے کیمیائی طور پر خالص ہونے پر ہے. سخت ٹھوس چونا پتھر کی کثافت اضافی تقریباً ۲٫۷ ہوتی ہے. تقلیبی عمل سے ان میں قلم پیدا ہو کر یہ سنگ مرمر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو اپنی خوبصورتی کے لیے تمام دنیا میں عمارتی استعمال کے لیے محبوب حجر ہے۔

اگر چونا پتھر میں جس کا اصلی جزو کیلشیم کاربونیٹ ہے میگنیشیم کاربونیٹ کا جزو زیادہ ہو تو اسے ڈالومائیٹ (Dolomite) کہتے ہیں. ۳٪ سے زیادہ میگنیشیم کاربونیٹ رکھنے والا چونا پتھر سیمنٹ سازی میں استعمال نہیں ہو سکتا۔

تقلیبی حجرات

اگر آتشی یا رسوبی حجرات —— زیادہ گرمی یا زیادہ دباؤ یا دونوں سے بیک وقت اثر پذیر ہوتے ہیں یا زمین سے نکلی ہوئی گیسیں یا ابخرات یا محلول ان پر کیمیاوی اثر کرتی ہیں تو ان ابتدائی یا ثانوی حجرات کی اندرونی ساخت اور ہیئت میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں. جو کبھی کبھی اس حجر کی شکل اسقدر بدل دیتی ہیں کہ وہ کیا تھا، یہ پہچاننا بھی ناممکن ہوتا ہے. یہ تبدیلیاں نہ صرف نامیاتی ہوتی ہیں. جن سے نئے جمادات وجود میں آتے ہیں بلکہ ان جمادات کے قلموں میں نئی ترتیب نمودار ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ان حجرات میں نئے رخوں پر پرتیں بھی بن جاتی ہیں جن پر رسوبی حجرات کی تہوں کا دھوکہ ہوتا ہے. یہ پرتیں سلیٹ میں کلیویج (Cleavage) کہلاتی ہیں۔

بعض تیزابی حجرات ایک عرصہ تک کافی دلچسپی کا مرکز رہے جب یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ گرینائٹ آتشی ہیں یا تقلیبی اور فیصلہ آخر میں یہ ہوا کہ کہیں آتشی ہیں اور کہیں تقلیبی یعنی یہ کہ دونوں طرح معرض وجود میں آتے ہیں. اور کہیں کہیں تو کانگلومیریٹ (Conglomerate) گرینائیٹ میں اس حد تک بدل جاتے ہیں کہ ان کا جزو بنے ہوئے بولڈر (Boulder) اور پبل (Pebble) تک گرینائٹ میں بدل جاتے ہیں گو ان کی ساخت اور رنگ روپ الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ قدیمی سیمنٹ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

تقلیب کی دو قسمیں عموماً تسلیم کی جاتی ہیں. (ا) تھرمل (Thermal) اتصالی (Contact) (ب) علاقائی جس میں حرارت اور دباؤ دونوں اثر انداز ہوئے ہوں ان کے علاوہ ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے کہ جس میں مادہ کا اضافہ بہ شکل گیس یا سیال ہوتا ہے اور اس کو نیو میٹولیسس (Pneumatolysis) کہتے ہیں. جس کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں۔

تقلیبی حجرات کی تقسیم درجۂ تقلیب پر بھی ہوتی ہے اور حجر میں پیدا شدہ جمادات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ تقلیب کم، اوسط یا زیادہ درجہ کی اثر انداز ہوئی تھی. مثلاً یہ کہ اگر کسی حجر میں کیانائٹ (Kyanite) یا سلیمینائٹ (Sillimanite) پائے جائیں تو یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ تقلیب زیادہ درجہ کی تھی۔

یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی اگر یہاں یہ ذکر کر دیا جائے کہ چونا پتھر (Lime stone) کی تقلیبی شکل سنگ مرمر ہوتی ہے۔ اور ان میں رنگ، لہریں اور دھاریاں ان جمادات سے بنتی ہیں جو چونا پتھر میں ملاوٹ کے طور پر موجود مادّہ سے بنے ہوں۔

نائس (Gneiss) اور ابرقی شسٹ (Mica Schist) تقلیبی حجرات کی بہت عام قسمیں ہیں۔ اور جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ نائس میں رنگین اور سفید دھاریاں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کو فولیئشن (Foliation) کہتے ہیں گارنٹ (Garnet) ان میں بہت جگہوں پر موجود ہوتا ہے۔

حجر ساز جمادات (Rock Forming Minerals) حجرات کی ساخت اور ترکیب میں کافی اہمیت رکھتے ہیں ان جمادات میں بعض کا وجود کسی حجر کی قسم کے لیے ضروری ہوتا ہے اور بعض کا نہیں۔ اول الذکر کو لازمی (Essential) اور دوسروں کو معاون (Accessory) کہتے ہیں۔

اس طرح لازمی جمادات وہ ہیں۔ جن کی موجودگی سے حجر کی قسم کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور معاون جمادات کی موجودگی یا عدم موجودگی نظر انداز کر دی جاتی ہے مثلاً کوارٹز، فلسپار اور کم از کم کسی ایک قسم کا فرومیگنیشیئن (Ferromagnesian) جماد (مثلاً آگائٹ (Augite) یا ہارن بلنڈ (Horn blende) وغیرہ) گرانائٹ کے ضروری اجزا ہیں جبکہ زیرکن (Zircon) اسفین (Sphene) اور اپیٹائیٹ (Apatite) وغیرہ معاون جمادات ہیں یہاں پر اس کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی حجر کا معاون جماد کسی دوسرے حجر کا لازمی جماد ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر گیبرو میں کوارٹز معاون جماد ہے لیکن گرانائیٹ میں یہی لازمی جماد ہو جاتا ہے۔

حجرات کی پہچان یوں تو بہت مشکل نہیں ہے اور کوئی ماہر ارضیات بھی ایک پتھر کے ٹکڑے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹکڑا آتشی، رسوبی یا تقلیبی حجر ہے۔ اس کے بعد عموماً وہی عدسہ کی مدد سے ماہر ارضیات اس حجر کا بغور معائنہ کرتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ اس حجر میں جو جمادات موجود ہیں۔ انہیں پہچان لے۔ اگر حجر رسوبی ہے تو جمادات کے ذرے جو اس کا جزو ہیں۔ ان کی شناخت کرے اور یہ دیکھے کہ وہ بالکل گول ہیں یا کم گول ہیں۔ اگر حجر آتشی یا تقلیبی ہے تو جمادات کے قلم مکمل طور پر اپنے اصلی روپ اور شکل میں ہیں یا کسی وجہ سے ان کی شکلیں کسی حد تک مسخ ہو گئی ہیں۔ اور یہ کہ کیا کیا جمادات اس حجر کا جزو ہیں اور لازمی جمادات میں سے کون کون سے موجود ہیں اور ان کا تناسب کیا ہے۔ پھر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ان لازمی جمادات اور ان کے تناسب کی بنا پر زیر غور حجر کس قسم کا ہے۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ حجرات کی اب تک تقریباً دو تین ہزار قسمیں تسلیم کی جا چکی ہیں لیکن یہ سرسری معائنہ زیادہ سے زیادہ چالیس یا پچاس حجرات کی موٹی موٹی قسموں میں تقسیم کر سکتا ہے۔

اس معائنہ کی بنا پر ماہر ارضیات اپنے نقشہ سازی کے کام میں نشان دہی کرتا ہے اور پھر ہر حجر کا نمونہ لے کر اور ہر نمونہ کی تفصیل اپنی نوٹ بک میں درج کر کے جب اپنی لیبارٹری میں آتا ہے تو ہر حجر میں سے ایک نہایت باریک قتلہ شیشے کے سلائڈ پر کینا ڈا بالسم (قدرتی) (Canada — balsam Natural) سے چسپاں کر کے اس کا خوردبین کی مدد سے بغور مطالعہ کرتا ہے اور ایک ایک جماد کے قلم یا ذرے کے تمام وکمال اوصاف کو ہر انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوتی ہے تو فیڈیراف اسٹیج (Federov Stage) کی مدد لیتا ہے۔ اگر جماد شفاف نہیں ہیں اور حجر میں کسی دھات کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے تو اس کے نمونے کا قلزی خوردبین (Ore Microscope) میں معائنہ کیا جاتا ہے۔

اس وقت تک تقریباً دو ڈھائی ہزار جماد پہچانے جا چکے ہیں لیکن ایک ماہر ارضیات بمشکل ان میں سے ستر اسی کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ اس طرح یہ خود ایک جامع علم بن گیا ہے جس کو حجریات (Petrography) کہتے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔

ذیل میں چند عام اور اہم اقسام حجر کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تقلیبی حجر نائس

یہ پٹے دار (Banded) ہوتا ہے اور گرانائیٹ نظر آتا ہے۔ اس میں کوارٹز، فلسپار اور ابرق کے ذرات بغیر عدسہ کی مدد کے دکھائی دیتے ہیں پٹیاں سیدھی، لہریا دار، ٹوٹی پھوٹی ایک ہی موٹائی کی یا مختلف موٹائی کی ہو سکتی ہیں فلسپار بھی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔

سفید، بھورے یا ہلکے سرخ رنگ کے جمادات کی کوئی خاص شکل نہیں ہوتی لیکن بالعموم جمادات لانبے کھنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اپنی ترکیب کے باعث آسانی سے شناخت کر لیے جاتے ہیں۔ کوارٹز کے قلم کسی خاص وضع قطع کے نہیں ہوتے۔ ابرق مسکووائٹ (Muscovite) یا بایوٹائٹ (Boitite) یا ہر دو قسم کے بیک وقت ہو سکتے ہیں۔

نائس گرمی اور دباؤ دونوں کے تقلیبی اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اقسام میں گرانائیٹ نائس (Granite Gneiss)، ہارن بلنڈ نائس (Horn blende Gneiss) وغیرہ ہوتے ہیں۔

شسٹ جب بعض حجر پر سخت دباؤ پڑتا ہے تو اس حجر کے درقیلے جماد دباؤ کے رخ سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے ایک دوسرے کے متوازی ہو جاتے ہیں اور حجر خود پرتیلا ہو جاتا ہے۔ ایسے حجر کو شسٹ کہتے ہیں اس کے عام نمونے ابرقی شسٹ (Mica Schist) کلورائٹ شسٹ (Chlorite Schist) بایوٹائٹ شسٹ وغیرہ ہیں۔

سلیٹ شیل کی تقلیبی شکل سلیٹ کہلاتی ہے۔ یہ نہ صرف سخت ہوتی ہے بلکہ اس میں جعلی تہوں کے علاوہ یا کبھی کبھی ان کو مٹا کر ایک نئی سمت میں دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو سلیٹی کلیویج (Slaty Cleavage) کہتے ہیں۔ سلیٹوں کا عام استعمال چھتیں بنانے میں یا اسکولوں میں ہوتا ہے۔

کوارٹزائٹ کوارٹز کی تقلیبی شکل کوارٹزائٹ کہلاتی ہے اور بستہ حجر ہے جس میں کوارٹز کے ذرے قلمی شکل میں آنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں۔

سنگ مرمر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا چونا پتھر کی تقلیبی شکل سنگ مرمر کہلاتی ہے۔ جو خالص ہو تو سفید ہوتا ہے لیکن عموماً دیگر دوسرے جمادات کی موجودگی سے مختلف رنگ اور دھاریاں پڑ جاتی ہیں جن سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے جیسے مکرانا کا سنگ مرمر۔

رسوبیات

قشر ارض کی تشکیل کرنے والی چٹانوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ آتشی حجرات جو زمین کے اندر پیدا شدہ میگما (Magma) کے انجماد سے بنتے ہیں۔

۲۔ تقلیبی چٹانیں جو دوسرے حجرات کے تقلب کے باعث وجود میں آئی ہیں اور رسوبی حجرات جو اوّل الذکر دونوں قسم کے حجرات اور پہلے سے موجود رسوبی حجرات کی فرسودگی (Weathering) اور شکست وریخت سے بنتی ہیں۔

لیکن رسوبی حجرات (Sedimentary Rocks) کو محض فرسودگی اور شکست وریخت کا نتیجہ سمجھنا غلط ہوگا کیوں کہ اس اصطلاح میں وہ حجر بھی شامل ہیں جو قشر ارض کے کسی طاس (Basin) میں جمع شدہ پانی میں مختلف حل شدہ مرکبات کی ترسیب یا تبخیر سے وجود میں آتے ہیں لیکن تقریباً ۹۵ فی صد رسوبی حجرات ریت پتھر (Sand stone) اور طفال (Shale) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور فرسودگی اور شکست وریخت کے باعث ہی تشکیل پاتے ہیں۔ رسوبی حجرات سے ذہن میں یہ بھی تصور پیدا ہوتا ہے کہ تمام رسوبی حجرات اسی طرح بنتے ہیں جیسے کہ شکست وریخت سے وجود پانے والے حجرات۔ رسوبی حجرات کی ایک بڑی قسم کلاسٹک حجرات کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ کلاسٹک رسوبی حجرات کے لیے پہلے سے موجود ماخذی علاقہ (Prov — enance) — کا ہونا ضروری ہے جہاں حجر فطری عوامل یعنی ہوا، پانی، ندیوں گلیشیر یا زیر زمین پانی کے زیر اثر باریک ریت میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر انہی عوامل کے ذریعے یہ ریت کسی رسوب پذیر (Sedimen tation) طاس (جو اکثر سمندر کا کنارا یا پھر حد اتصال سمندر ہوتا ہے) کی سمت بہہ کر وہیں تہہ بہ تہہ اور پرت در پرت جمع ہو جاتی ہے اور پھر دباؤ اور دوسرے کیمیائی عوامل کے زیر اثر ٹھوس پرت دار (Stratified) حجرات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ریت کے ذرّوں کے ٹھوس بننے کے عمل کو ڈائی جنیسس (Diagenesis) کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا عمل محض کلاسٹک حجرات کی تشکیل کے لیے مخصوص ہے۔ رسوبی حجرات ایسے پانی میں بھی بنتے ہیں جس میں غیر فقری یا بغیر ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کے اخراجی حاصلات یا دوسرے کیمیائی عوامل کی وجہ سے کیلشیم کاربونیٹ یا دوسرے مرکبات کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ یہ کیلشیم کاربونیٹ اتھلے پانی میں حل شدہ نہیں رہ سکتا اور علاحدہ ہو کر کیلسائیٹ (Calcite) نامی جماد میں تبدیل ہو کر چونے کے پتھر (Lime stone) کی تشکیل کرتا ہے۔ ان حجرات کو نامیاتی (Organic) و کیمیاوی (Chemi cally Precipetated) رسوبی حجرات کہتے ہیں۔ اسی طرح کچھ حجرات سمندر کے پانی کے خشک ہونے اور ان میں حل شدہ نمک کے ارتکاز (Conc — entration) — کے بڑھ جانے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ جیسے جپسم (Gypsum) یا کھانے کا نمک جس کا اصطلاحی نام ہیلائٹ (Halite) ہے اس قسم کے حجرات چوں کہ نمکوں میں عمل ارتکاز اور تبخیر کی وجہ سے بنتے ہیں انہیں تبخیری حجرات (Evaporite) کہا جاتا ہے اس طرح رسوبی حجرات کی تین اہم قسمیں تسلیم کی گئی ہیں۔

کلاسٹک (Clastic)

نامیاتی (Organic) اور کیمیاوی (Chemical)

تبخیری (Evaporites)

رسوبی حجرات عموماً اس حد تک پرت دار ہوتے ہیں کہ پرت دار حجرات اور رسوبی حجرات کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے بلکہ بعض لاوے بھی پرت دار ہوتے ہیں۔ رسوبی حجرات میں بھی زیادہ تر کلاسٹک حجرات ہی پرت دار ہوتے ہیں۔ ان حجرات کی پرت داری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کچھ عرصے تک رسوب پذیر ہونے والے معدنی ذرّے مختلف ترکیب یا طبعی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد حالات میں قدرے تبدیلی کے باعث ہی کسی دوسری ترکیب یا خصوصیت کے معدنی ذرّے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے ذرات میں امتیاز اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ان کی خصوصیات دو مختلف پرتوں کی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح بارش کے دنوں میں دریا زیادہ موٹے یا دانے دار ریت وغیرہ لاتے ہیں لیکن خشکی کے ایام میں جب دریا آہستہ آہستہ بہتے ہیں تو باریک ریت یا مٹی لاتے ہیں۔ یہ دونوں مل کر تہہ بہ تہہ ہر سال ایک یا کبھی کبھی دو پرتیں بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض صورتوں میں کئی کئی سالوں میں بھی ایک پرت تیار ہوتی ہے۔ ہر دو پرتوں کے درمیان پرتی سطح ہوتی ہے جس کے مطابق دونوں پرتوں کو علاحدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

تمام اقسام کے حجرات کا مطالعہ حجریات (Petrology) کہلاتا ہے اور اس طرح تین قسم کے حجرات کی بنا پر حجریات کی بھی تین قسمیں ہیں۔ آتشی حجریات۔ تقلیبی حجریات اور رسوبی حجریات (Igneous Petrology) (Metamorphic Petrology) (Sedimentary Petrology) رسوبی حجریات اور رسوبیات کو ایک حد تک ایک ہی علم سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ رسوبی حجریات میں رسوبی حجر کی ذاتی خصوصیات پر اور علم رسوبیات میں ان کی عمل تشکیل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

رسوبیات کی تاریخ بے حد پرانی ہے۔ اس کی ابتدا اس وقت سے کی جا سکتی ہے جب کہ ابتدائی انسان نے ہتھیار بنانے کے لیے چق ماق (Flint) کا اور برتنوں کے لیے مٹی کا استعمال کیا ہوگا۔ یوں اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ان اشیا کا حصول کس طرح اور کہاں کہاں ممکن ہے۔ اسی تلاش میں کئی اور قسم کے حجرات بھی انسان کے علم میں آئے ہوں گے مگر اس علم کی حقیقی اور سائنسی ابتدا غالباً اس وقت ہوئی جب پلینی (Pliny) نے دریائے نیل کے سیلابی علاقے کے مشاہدے کے بعد یہ کہا کہ یہ علاقہ کبھی سمندر کا حصہ رہا ہوگا اور اس کو دریائے نیل کے سیلاب میں لائے ہوئے مادے نے تہہ بہ تہہ بھر دیا ہے۔ پھر ۱۸۱۵ء میں ایک سرویر (Surveyor) اور انجینئر ولیم اسمتھ نے اپنے مشاہدات شائع کرائے جن میں اس نے رکاز کی مدد سے پرت دار چٹانوں کے تعلق باہمی اور طبقات کی بنیاد کی شناخت ڈالی۔ آہستہ آہستہ

یہ تسلیم کر لیا گیا کہ عموماً جو پرتیں اوپر پائی جائیں گی وہ عمر میں ان پرتوں سے کم ہوں گی جو نیچے کی طرف ہوں گی۔ اگر ان پرتوں کا جماؤ کسی پانی سے بھرے بیسن یا طاس میں فرض کیا جائے تو یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ پہلے ترسیب شدہ مادے نچلی پرتوں کی صورت میں پائے جائیں گے اور مادوں کے مسلسل جمع ہونے سے یکے بعد دیگرے پرتیں بنتی جائیں گی۔ اور آخری پرت سطح زمین کے قریب ہوگی اور اس کی عمر سب پرتوں سے کم ہوگی۔ اس طرح علم طبقات (Stratigraphy) کی ابتدا ہوئی جس میں پرت دار رسوبی حجرات کے زماں و مکاں میں تقسیم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ رکاز جن سے کسی حجر کی عمر کا پتہ چلتا ہے وہ بھی رسوبی چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح کافی عرصے تک رسوبی چٹانوں کے مطالعے کے بجائے ان کی زمانی تقسیم کو اہمیت دی جاتی رہی۔
چٹانوں کی تشکیل کے مطالعہ کے سلسلے میں ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک کی چیلنجر (Challenger) مہم کافی اہمیت رکھتی ہے جس کے مشاہدے اے۔ ایف رینارڈ (A. F. Renard) اور جان مرے (John Murray) کے قلم سے ایک مکمل اور مدلل رپورٹ کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس میں بحری رسوبی حجرات کا مطالعہ کیا گیا تھا اس طرح یہ مہم علم بحریات Oceanograpny کی ابتدا کہی جا سکتی ہے۔ مگر رسوبیات کو انفرادی علم کی حیثیت دینے والی مطبوعات ہنری کلفٹن زوربی Henry Clifton Sorby کی تھیں جن کے دو مقالے ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئے۔ پہلا مقالہ ۱۸۷۹ء میں "چونے کے پتھر کی ساخت اور تشکیل" لندن کی جیولاجیکل سوسائٹی کے صدارتی خطبہ کے طور پر شائع ہوا اور دوسرا "غیر کیلسیائی (Non-Calcareous) پرت دار حجرات کی ساخت اور تشکیل کے سلسلے میں اسی سوسائٹی کی ۱۸۸۰ء کی کارروائی میں۔ اس طرح زوربی کو بابائے رسوبیات کہا جا سکتا ہے۔
زوربی کا آخری مقالہ "حجرات کی ساخت اور تاریخ کے مطالعے میں کیمیائی طریقوں کا استعمال" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جو ان تحقیقات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جو کئی دہوں کے بعد شروع ہوئیں۔ حجریاتی خوردبین کا سب سے پہلے استعمال زوربی نے ہی کیا مگر لیوسیان کایو (Lucian Cayux) ۱۸۹۴ء تا ۱۹۳۴ء کے سر خوردبینی مطالعوں کو اہمیت دینے کا سہرا ہے فرانس میں پائی جانے والی سلیکائی کیلسیائی اور فاسفیٹ چٹانوں کے بارے میں کایو کی معلومات کا آج بھی جواب نہیں ہے۔
تاریخ رسوبیات میں ایک نئے عہد کی بنیاد سی۔ کے۔ وینٹ ورتھ (C. K. Wentworth) کے ایک مقالے سے پڑی جو ۱۹۱۹ء میں "کوبل" (Cobble) کی فرسودگی (Abrasion) میدانی اور تجرباتی مطالعہ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مطالعہ آئیوا (Iowa) یونیورسٹی میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد اسی قسم کا اعداد و شماری مطالعہ ڈی۔ ٹراسک (D. Trusk) نے ۱۹۲۰ء میں کیا اور ان دونوں کارناموں سے رسوبیات میں علم اعداد و شمار (Statistics) کا استعمال عام بلکہ لازمی ہو گیا۔

خوردبینی رکاز اور بھاری معدنیات کے علم طبقات تیل اور قدرتی گیس کی تلاش کے سلسلے میں استعمال کے طریقوں کو ترقی دینے کے لیے ۱۹۲۶ء میں سوسائٹی آف اکنامک پیلینٹالوجسٹس اینڈ منرالوجسٹس (Society of Economic Paleontologists and Mineralogist) کا قیام عمل میں آیا۔
اس سوسائٹی نے ۱۹۳۱ء میں جرنل آف سیڈیمنٹری پیٹرالوجی (Journal of Sedimentary Petrology) جاری کیا اس رسالے کے اجرا سے علم رسوبیات پر تحقیقی مقالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں ہنس کلوس (Hans Cloos) نے رسوبیات کی ایک اور جہت کی دریافت سے رسوبیات کے عمل کے دوران بننے والی رسوبی ساختوں (Sedimentary Structure) کے مطالعے کی ابتدا کی۔ پہلے ان ساختوں مثلاً ریپل مارکس (Ripple Marks) اریبی پرت داری (Cross Bedding) گریڈڈ پرت داری (Graded Bedding) اور مختلف قسم کے زیر انداز یا سول نشانات (Sole Marks) کا محض سطحی مطالعہ کیا گیا۔ مگر جلد ہی ان کی تشکیلی اہمیت واضح ہوئی اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ کچھ ساختیں بعض مخصوص حالات کے تحت ہی وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً ریپل مارکس کی ہی دو قسموں یعنی تشاکلی (Symmetrical) اور غیر تشاکلی (Asymmetrical) میں تشکیلی حالات کا فرق ہے۔ تشاکلی ریپل مارکس ایسے آبی ماحول میں تشکیل پاتے ہیں جس میں پانی کی لہروں کی حرکت آگے اور پیچھے برابر ہوتی رہے جب کہ غیر تشاکلی ریپل مارکس ایک جانب سے مسلسل جاری رہنے والی لہروں سے وجود میں آتی ہیں۔ نہ صرف آبی ماحول بلکہ غیر تشاکلی ریپل مارکس سے لہروں کی سمت کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ لہریں ریپل مارکس کی عمودی ڈھلان کی طرف گئی ہوتی ہیں۔ اس قسم کے تجزیات کو پیلیو کرنٹ کے تجزیات (Palaeo Currunt Analysis) کہا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی رو بن تجربہ گاہ میں بھی مصنوعی طور سے بنائی گئیں اور ان سے پیدا ہونے والی ساختوں کا مشاہدہ کیا گیا۔ ایسے ہی تجرباتی مطالعے مثلاً پانی کے بہاؤ کی رفتار اور ذرات کے حجم کا آپسی تعلق معلوم کرنے کے لیے کیے گئے۔ عموماً یہ فرض کیا جاتا ہے کہ تیز رفتار پانی بڑے بڑے پتھروں کو بھی بہا سکتا ہے جب کہ کم رفتار آبی رو محض باریک ذرات ہی کے نقل و حمل کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر ماخذی علاقے سے طاس کا فاصلہ زیادہ ہو اور رسوبی مادوں کو زیادہ سفر کرنا پڑے تو ان کے حجم میں کمی کے امکانات ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی شکل بھی بدل سکتی ہے۔ زیادہ سفر کیے ہوئے ذرات بے حد مدور اور یکساں حجم کے ہوتے ہیں جب کہ کم سفری ذرات مختلف حجم کے یا نوک دار ہو سکتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ رسوبی حجروں میں پائے جانے والے رکاز بھی اس زمانے میں موجود آب و ہوا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ کوئی جانور یا پودا جن آب و ہوائی حالات میں آج کل پایا جاتا ہے اس کی قدیمی اقسام زمانہ قدیم میں بھی انہیں حالات میں پائی جاتی رہی ہوں گی۔ اس طرح رکازات کے قدیم آب و ہوائی (Palaeoclimatic) مطالعے سے رسوبی چٹانوں کی قدیم آب و ہوا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ چٹانیں جو خود بھی کسی حیوان یا پودے کی باقیات سے بنتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مونگے کے حجرات یا نامیاتی چونے کا پتھر (Organic Lime stone) انہی حالات میں بنے ہوں گے جن میں حیوانات یا نباتات پائے جاتے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ مونگے کے حجرات یقیناً گرم آب و ہوا کی نشان دہی کرتے ہیں۔

رسوبی چٹانوں کی معدنی ترکیب بھی کئی اعتبار سے اہم ہے۔ رسوبی چٹانوں کے اہم ترین معدنیات کوارٹز (Quartz) اور کیلسائٹ (Calcite) ہیں کوارٹز عموماً کلاسٹک طریقہ عمل کی نشان دہی کرتا ہے اور کیلسائٹ کیمیائی یا نامیاتی طرائق سے وجود میں آتا ہے مگر کلاسٹک پتھروں میں بھی دو قسم کے حجرات کا امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ قسم جس میں کلاسٹک ذرات ایک دوسرے سے سیمنٹ کے ذریعے چپساں رہتے ہیں اور دوسری وہ جس میں محض مٹی نما میٹرکس (Matrix) ہوتی ہے۔ موخرالذکر قسم کے حجرات کچھ مخصوص حالات میں ہی بن سکتے ہیں کیوں کہ یہ کہا جاچکا ہے کہ مختلف رفتار اور قسم کی آبی رو میں مختلف حجم کے ذرات کی ترسیب کرتی ہیں۔ اسی طرح تیز رفتار آبی رو سے بڑے ذرات کی رسوبیت ہوسکتی ہے پھر کسی دفعتاً تغیر کی بنا پر آبی رو کی رفتار میں اگر تغیر آجائے تو باریک یا مزید بڑے ذرات بھی جمع ہونے لگتے ہیں اس طرح اگر تغیر سے چکنی مٹی ذرات کے درمیانی خلا میں جمع ہو جائے تو اسے میٹرکس کہتے ہیں یہ کوارٹز وغیرہ کو آپس میں چپساں کرنے کا اہم رول ادا کرتی ہے یعنی یہ کہ اگر یہ میٹرکس نہ ہوتی تو موٹے ذرات حجر میں تبدیل ہی نہ ہوتے اور بالو یا ریگ کی شکل میں رہتے اس طرح ڈائجینیسس (Diagenesis) میں میٹرکس کا رول بہت اہمیت رکھتا ہے اس طرح دو مختلف حجموں اور ماحول کے ذرات پر مشتمل حجر وجود میں آئے جیسے گرے ویک (Grey wacke)

ذرات کا حجم ان کی شکل اور ان کے آپسی تعلقات کو حجر کی تشکیل (Texture) کہتے ہیں۔ یکساں حجم کے مدور ذرات کے حجرات عموماً غیر مزاحمتی ماحول میں سے ہوں گے اور ان کے ذرات کی ترسیب بغیر کسی خاص تغیر کے رونما ہوئی ہوگی۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسوبی طاس (Sedimentary basin) کی ساختیات (Tectonics) موجودہ رسوبیاتی مطالعہ کا بے حد اہم پہلو ہے۔

بعض مقامات پر رسوبی حجرات کی پرتیں ۱۵ تا ۲۰ ہزار میٹر تک دبیز ہیں اور ۸ تا ۱۰ ہزار میٹر موٹی تہیں تو بہت عام ہیں۔ جبکہ سمندروں کی اوسط گہرائی ۷۰۰۰ فٹ ہے ۱۰ تا ۱۵ ہزار میٹر اور اس سے زیادہ دبیز رسوب کے وقوع کی ایک ہی تشریح ہوسکتی ہے کہ طاس خود ہی زمین کے اندرون کی طرف دھنس رہا ہوگا اور اس طرح مزید رسوبیات کی رسوبیت ممکن ہوئی ہوگی۔ اس بات کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ اس قدر دبیز چٹانیں مکمل طور پر بے حد کم گہرائی کے پانی میں بنی ہوئی پائی گئی ہیں اس طرح ایک طویل مگر تقریباً مسلسل دھنسنے والے رسوبی طاس کے نظریے کا ارتقا ہوا جسے جیوسنکلائین (Geosyncline) کہتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہر پہاڑی یا کوہی سلسلے کی تشکیل میں دو مراحل ضرور گزرے ہیں۔ پہلا جیوسنکلائی (Geosynclinal) اور دوسرا تشکیل کوہی (Orogenic) جس میں ان دبیز رسوبی چٹانوں نے عمل نفاف یا دو طرفی دباؤ کے تحت پہاڑ کی شکل اختیار کرلی۔ اس مضمون کی تفصیل میں جانا یہاں محال ہے اور اس کے لیے دیکھیں جیوسنکلائین یا تشکیل کوہی کیوں کہ علم رسوبیات میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ ابتدا میں تمام رسوب ہمیشہ افقی رہے ہوں گے۔

قدیم ترین رسوبی چٹانیں مغربی گرین لینڈ میں ملی ہیں جو ۳۸۰۰۰۰۰۰۰۰ (تین ارب اسّی کروڑ) سال پرانی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے زمین اس سے کافی عرصہ پہلے وجود میں آچکی تھی۔

علم جواہرات

تمہید ابتدائے آفرینش سے آج تک بھی انسانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے اور دلوں کو مسرت انگیز کرنے میں قیمتی پتھروں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ بیس ہزار سال قبل جب کہ انسان اپنے جسم کو ڈھانکنے میں کپڑوں کے استعمال سے ناواقف تھا۔ تب بھی خوبصورت اور مختلف الالوان قیمتی پتھروں سے اپنے کو سجانے اور دلوں کو لبھانے کا کام لینے سے بخوبی واقف تھا۔ آثار قدیمہ کی مختلف کھدائیوں میں مختلف قیمتی پتھروں کے منکے اور برتن کی موجودگی ہمارے اسی خیال کی کافی شاہد ہیں۔ قدیم حجری دور کا انسان اپنے ہتھیار بھی بعض کم قیمتی قسم کے پتھروں سے بناتا تھا اور زندگی میں خوشی اور آسائش کے سامان فراہم کرتا تھا۔

اہل بابل حضرت مسیح کی پیدائش سے کئی ہزار سال قبل ہی قیمتی پتھروں کے کاٹنے اور ان کو پالش کرنے کے کام سے بخوبی واقف تھے۔ بعض قیمتی پتھر جن پر کندہ کاری کی جاتی تھی بحیثیت مہر استعمال ہوتے تھے۔ قیمتی پتھروں سے جادوئی اور ادویاتی فوائد بھی منسوب تھے جس کے باعث ان کا استعمال ابتدائی تہذیبی ادوار میں بہت ہوتا رہا ہے لیکن آج کل ان کا استعمال ان کی خوب صورتی کے باعث زیورات میں اور دوسری خصوصیات کے باعث صنعت کے مختلف شعبوں میں بکثرت ہوتا ہے۔

قیمتی پتھر زمینی مخزن کے ضروری اجزا نہیں شمار کیے جاسکتے ان معنوں میں جن میں کہ ہم لوہے، کوئلہ اور دوسری جمادات کو لیتے ہیں لیکن یہ کچھ ملکوں کی برآمدی اشیا کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔

جماد وہ قدرتی مادہ ہے جس کی ایک متعین کیمیائی ترکیب اور سالماتی ساخت ہوتی ہے اور یہ غیر نامیاتی عوامل کا حاصل ہوتا ہے۔ تقریباً دو ہزار مختلف جماداتی اقسام سے انسان اب تک واقف ہوچکا ہے مگر ان میں صرف سو یا اس سے بھی کم ایسے جمادات ہیں جو قیمتی پتھروں کی تعریف میں آتے ہیں۔ کسی پتھر کی قیمت اس کی خوب صورتی سختی اور اس کی نایابی پر منحصر ہوتی ہے۔

کسی جماد کا بہ حیثیت قیمتی پتھر استعمال سب سے پہلے اس کی سختی پر منحصر ہوتا ہے جماد سخت ہو گھس پٹ نہ سکتا ہو تب ہی محفوظ رہ سکتا ہے۔ سختی کا پیمانہ یہ ہے کہ جماد خود رگڑ نہ کھا جائے بلکہ دوسرے جماد پر لکیریں ڈال دے۔ سب سے سخت ترین جماد ہیرا ہے جس کی سختی دس ہے اور اس سے نیچے کورنڈم جس کی سختی نو ہے پھر پکھراج (Topaz)

سختی آٹھ پھر گار کا پتھر (Quartz) سختی سات اور فلسپار سختی چھ اور اس طرح صابن پتھر (Steatite) اور (Talc) جس کی سختی ایک ہے جو ناخن سے بھی بآسانی کھرچا جاتا ہے۔ اکثر قیمتی پتھروں کی سختی سات سے زیادہ ہوتی ہے یعنی انہیں کانچ سے کھرچا نہیں جا سکتا۔ بعض قیمتی پتھر جو اس سے کم سخت ہوتے ہیں اپنی خوب صورتی اور نایابی کے باعث ہی استعمال ہوتے ہیں۔ قیمتی پتھروں کی ایک اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹوٹ پھوٹ نہیں جاتے۔

قیمتی پتھروں کی خوب صورتی ان کے خوشنما رنگوں کی مرہون منت ہوتی ہے دوسری اہم خصوصیت روشنی کو اپنے اندر سے گزارنے اور مختلف سمتوں میں منعکس کرنے کی صلاحیت ہے۔

کسی شفاف جماد کا انعکاسی اشاریہ اس کی خاصیت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ روشنی کو کس حد تک اپنی راہ سے ہٹا دیتا ہے۔ انعکاسی خصوصیت سے ہی جمادات کی چمک دمک یا خیرگی ہوتی ہے۔ کسی جماد میں جتنی زیادہ انعکاسیت ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ نگاہوں کو خیرہ کرے گا۔ ہیرے کا انعکاسی اشاریہ ۲ء۴۲ ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں شفاف گار صرف ۱ء۵۲ انعکاسی اشاریہ کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے ہیرا نگاہوں کو جب خیرہ کرتا ہے تو گار یا کانچ کا ٹکڑا انسانی آنکھوں کو متاثر نہیں کرتا۔

قیمتی پتھروں میں روشنی کو منعطف کرنے کی قابلیت بھی ان کی خوبصورتی کی بڑی وجہ ہوتی ہے جو ان کی سختی اور انعطافیت پر منحصر ہوتی ہے۔

بعض پتھروں میں "آگ" سی لگی ہوتی ہے یہ روشنی کو بکھیر دینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ روشنی جو سات مختلف رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے وہ جب بعض جمادات سے گزرتی ہے تو بکھر کر قوس قزح کے مختلف رنگ دے جاتی ہے اس خاصیت کو ہی " (Fire) " یا شعلہ کا لپکنا کہتے ہیں۔

ان تمام خصوصیات کو جن کا ذکر ہم نے ابھی ابھی کیا ہے اگر ذہن میں رکھیں اور ان معیاروں پر جمادات کو پرکھیں تو بڑی مشکل سے ۱۰۰ جمادات اور ان کی کچھ ہی اقسام قیمتی پتھروں میں شامل کی جا سکتی ہیں۔

اسپاڈومین

Spodumene یہ عموماً سرمئی یا سبز رنگ کا پتھر ہے جو شفاف سے غیر شفاف حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف شفاف اسپاڈومین جواہرات کے طور پر استعمال میں آتے ہیں۔ یہ شربتی یا نیلگوں رنگ کے ہوتے ہیں اور انہیں کنزائیٹ (Kunzite) بھی کہتے ہیں۔ زرد اور بسنتی اسپاڈومین پائے جاتے ہیں۔ اور تراش کر جواہرات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ان میں گہری چمک ہوتی ہے اور اپنی خصوصی چمک اور رنگ کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ پتھر لیتھیم اور المونیم کا سلیکیٹ ہے۔ اس کی سختی کا درجہ ۶ء۵ سے ۷ کے درمیان اور اضافی ثقل ۳ء۱۳ سے ۳ء۲۰ کے درمیان ہے۔ اسپاڈومین کے قلم میں کلاؤ (Cleavage) بکثرت ہوتے ہیں اس لیے اس کے نگوں کو تراشنے میں قدرے دشواری ہوتی ہے۔ اسپاڈومین کی دریافت سب سے پہلے ۱۸۷۷ء میں برازیل میں ہوئی بعدہٗ ۱۸۷۹ء میں امریکہ میں سبز اور دھانی اسپاڈومین دریافت ہوئے۔ ان کا شمار معمولی قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔

الکزانڈرائٹ

(Alexandrite) یہ پتھر کرائیسوبیرل کی ایک قسم ہے اس پتھر کی خوبی یہ ہے کہ دن کی روشنی میں اس کی رنگت سبز یا نیلگوں ہوتی ہے لیکن رات میں مصنوعی روشنی میں دیکھنے پر یہ سرخ نظر آتا ہے۔ یہ شفاف قلموں کی صورت میں پایا جاتا ہے اور تراش کے بعد اچھی جلا آتی ہے۔ اس پتھر کی دریافت روس کے شہنشاہ الکزانڈر دوئم کے یوم پیدائش کے موقعہ پر ہوئی تھی اس وجہ سے اس کا نام الکزانڈرائیٹ رکھ دیا گیا۔ اس کا شمار معمولی قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کمیاب ہے نفیس قسم کے الکزانڈرائیٹ کوہ یورال کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تسمانیہ، لنکا اور برما میں بھی یہ دستیاب ہوتے ہیں۔ تالیفی (Synthetic) الکزانڈرائیٹ بہت عام ہیں لیکن ان کا رنگ دن کی روشنی میں ملگجا سبز یا سرخی مائل ہوتا ہے۔ اور رات میں ان کی رنگت اوداپن لیے ہوئے سرخ دکھائی دیتی ہے۔

الماس

(دیکھیے ہیرا)

انڈیکولائٹ

(Indicolite) دیکھیے ترملی۔

اولیوین

(Olivine) دیکھیے پیریڈوٹ

اوینچورین یا سبز کوارٹز

(Aventurine) یہ گہرے سبز کتھئی یا زرد رنگ کا غیر شفاف سے نیم شفاف کوارٹز ہے جس میں آب گینی چمک ہوتی ہے۔ یہ بہت معمولی قسم کا جواہر ہے اور محض اپنے خوشنما رنگ کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔ اس میں رنگ عموماً یکساں نہیں ہوتا ہے بلکہ جگہ جگہ گہرے رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ رنگ میں یہ یشب سے بہت مشابہ ہوتا ہے اس وجہ سے اکثر ہندوستانی جیڈ کے غلط نام سے بھی فروخت ہوتا ہے۔ اس کے ذخائر ہندوستان، منگولیا، چین اور روس میں ہیں۔ ہندوستان میں یہ پتھر میسور کے علاقہ میں پایا جاتا ہے جہاں اس کے ٹکڑے آدھا کیلو سے پچاس کیلو وزن تک کے ملتے ہیں۔ اس کو تراش کر آرائشی اشیا، مثلاً صندوقچوں اور عطر دانوں وغیرہ میں جڑا جاتا ہے۔

ایکوامیرین

(Aquamarine) دیکھیے زبرجد

بلور یا کرسٹل

(Rock Crystal) یہ بہت عام جماد ہے جو بے رنگ اور شفاف ہوتا ہے اسے عربی میں مہاۃ یا حجرالبلور اور سنسکرت میں اسماٹک کہتے ہیں کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ سیلیکون ڈائی آکسائیڈ (Silicon dioxide) ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۷، اور اضافی ثقل ۲ء۶ ہوتی ہے بلور کے قلم شش پہلو ہوتے ہیں جن کے سرے مخروطی شکل کے ہوتے ہیں۔ بلور کے قلم آٹھ میٹر تک لمبے پائے گئے ہیں جواہرات کے طور پر بلور کا استعمال ان کے ٹکڑوں کو تراش کر جڑاؤ زیورات میں کندن کاری کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی اشیا از قسم جھاڑ فانوس، عطر دان، گلدان، مورتیاں، پیالے وغیرہ بھی بلور کو تراش کر بنائی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں عمدہ قسم کے عینک کے شیشے، دوربینوں اور خوردبینوں کے لینس

بھی بلور سے بنائے جاتے ہیں. بلور کے قلموں کی ایک خوبی عمل داب برقیت. (Piezo electricity) ہوتی ہے جس کا استعمال وائرلیس کے آلات میں آلۂ افزون گر (Amplifier) کے طور پر ہوتا ہے. یوں تو بلور کو تراشنے کا کام بہت ملکوں میں ہوتا ہے لیکن چین جاپان، جرمنی اور بوہیمیا میں اس کی تراش اور کندہ گری بہت اچھی ہوتی ہے عام پتھر ہونے کی وجہ سے یہ بیشتر ممالک میں دستیاب ہوتا ہے لیکن برازیل مڈاگاسکر، جاپان، شمالی امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، فرانس اور ہنگری میں اس کے ذخائر قابل ذکر ہیں. ہندوستان میں سنبھل پور، چھندواڑہ، ورنگل، تنجور اور راجمندری میں اچھے قسم کے بلور کے قلم پائے جاتے ہیں. بلور آتشی چٹانوں از قسم گرانائیٹ یا آتش فشانی چٹانوں کے جوف میں پائے جاتے ہیں.

برازیلی زمرد (Brazilian E.nerald) دیکھیے ترملی

برازیلی نیلم (Brailian Saphire) دیکھیے ترملی

پتونیہ (Bloodstone)

یہ سبز رنگ کا غیر شفاف پتھر ہے جس کی کیمیائی ماہیت وہی ہے جو عقیق کی ہے اس سبز رنگ کے پتھر پر سرخ رنگ کے داغ ہوتے ہیں جو دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے خون کے چھینٹے ہوں. پتونیہ کا شمار معمولی قسم کے پتھروں میں ہوتا ہے اس کو تراش کر مختلف قسم کی اشیا بنائی جاتی ہیں زیورات میں اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے. ہندوستان اور سائبیریا کے علاقہ میں اس کے ذخائر کافی ہیں. پتونیہ کے ہی رنگ کا ایک دوسرا پتھر ہوتا ہے. جس میں سرخ رنگ کے بجائے سفید یا زرد رنگ کے دھبے ہوتے ہیں ان کو پلازما کہتے ہیں. اچھے قسم کے پلازما چین میں ملتے ہیں لیکن ہندوستان اور جرمنی میں بھی پلازما پائے جاتے ہیں.

پکھراج (Yellow Sapphire)

اسے فارسی میں یاقوت زرد کہتے ہیں. یہ یا کپاسی رنگ کا شفاف کرنڈم (Corundum) ہے. رنگ کے علاوہ اس میں وہی صفات ہوتی ہیں جو لعل یا نیلم میں ہوتی ہیں لیکن چوں کہ یہ نسبتاً زیادہ کثرت سے دستیاب ہوتا ہے لہٰذا لعل و نیلم سے کم مقبول ہے. یہ پائدار اور سخت جواہر ہے اور تراش کے بعد اس میں خصوصی جھلک پیدا ہوتی ہے جو زرد رنگ کے کسی دوسرے جواہر میں نہیں ہوتی ہے. اچھی جِلا دانی پر اس کے نگوں میں قدرے نیم الماسی چمک پیدا ہوتی ہے.

پکھراج کو مشرقی ٹوپاز (Oriental Topaz) بھی کہتے ہیں. کیوں کہ شروع شروع میں اسے رنگ کی وجہ سے ٹوپاز سمجھا گیا. حالاں کہ ٹوپاز بالکل مختلف پتھر ہے. اچھے قسم کے پکھراج لنکا اور آسٹریلیا میں کوئنس لینڈ اور نیو ساؤتھ ویلس کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں.

پلازما (Plazma) دیکھیے پتونیہ

پیریڈوٹ یا اولیوین (Peridot or Olivine)

یہ ایک معمولی قسم کا جواہر ہے. اس کی کیمیائی ماہیت لوہے اور میگنیشیم کا سلیکیٹ ہوتی ہے. یہ شفاف سے نیم شفاف حالتوں میں پایا جاتا ہے اس کی درجہ سختی ۶ سے ۷ اور ثقل اضافی ۳٫۲ سے ۳٫۴ کے درمیان ہوتی ہے. پیریڈوٹ کئی رنگوں میں پائے جاتے ہیں. مثلاً دھانی ماشی کاہی پستئی انگوری، بھورا اور سیاہ لیکن بھورے اور سیاہ پیریڈوٹ جواہرات کے استعمال میں نہیں آتے ہیں. گہرے سبز رنگ کے پیریڈوٹ کو اولیوین کہتے ہیں. جواہرات کے استعمال کے لائق پیریڈوٹ جزیرہ زبرجد میں ملتے ہیں. اس کے علاوہ برازیل، لنکا، مڈاگاسکر، شمالی امریکہ، برما اور کوئنس لینڈ وغیرہ میں بھی پیریڈوٹ دستیاب ہوتے ہیں. مگر ان کے رنگ پھیکے ہوتے ہیں.

پنا دیکھیے زمرد

تامڑہ دیکھیے یاقوت

ترملی (Tourmaline)

ترملی ایک عام پتھر ہے. اور سستے قسم کے جواہرات میں شمار ہوتا ہے. اس کے قلم عموماً سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات نیلگوں، گلابی یا ہلکے سبز رنگ کے شفاف قلم بھی پائے جاتے ہیں. اس کی درجہ سختی ۷ اور ۷٫۵ کے درمیان اور ثقل اضافی ۲٫۹۸ سے ۳٫۲ کے درمیان ہوتی ہے. رنگین ترملی اپنے خوش نما رنگ کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں اور سیاہ ترملی جو بہت عام ہے غیر شفاف ہوتا ہے اور ماتمی جواہر کے طور پر استعمال ہوتا ہے. سرخ یا گلابی رنگ کے ترملی کو روبیلائٹ (Robellite) اودے رنگ کے ترملی کو انڈیکولائیٹ (Indicolite) نیلے رنگ کے ترملی کو برازیلی نیلم، سبز رنگ کے ترملی کو برازیلی زمرد اور زرد رنگ کے ترملی کو لنکا کا پیریڈوٹ کہتے ہیں. جتنے رنگوں میں ترملی پایا جاتا ہے اتنے رنگوں میں شاید کوئی دوسرا شفاف جواہر نہیں پایا جاتا. ترملی کے بعض قلم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کچھ حصہ ایک رنگ کا ہوتا ہے اور باقی حصہ کسی دوسرے رنگ کا کوہ یورال کے علاقہ میں کئی رنگ کے ترملی بکثرت ملتے ہیں. لنکا میں زرد اور بھورے رنگ کے ترملی پائے جاتے ہیں. ہندوستان میں کشمیر کے علاقہ میں ہلکے رنگ کا ترملی عام ملتا ہے اور کبھی کبھی دو رنگا بھی. کیلی فورنیا میں بنفشئی رنگ کے اور مڈاگاسکر میں سبز رنگ کے خوش نما ترملی دستیاب ہوتے ہیں. برازیل، سوئٹزرلینڈ، افریقہ اور جزیرہ ایلبا میں بھی نفیس قسم کے رنگین ترملی ملتے ہیں.

ٹوپاز (Topaz)

یہ معمولی قسم کا جواہر ہے. جو عموماً شفاف ہوتا ہے اور اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں جیسے زرد سنہرا بے رنگ سرمئی آسمانی گلابی بنفشی وغیرہ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ المونیم اور فلورین کا سلیکیٹ ہوتا ہے اس کی درجہ سختی ۸ ہوتی ہے یعنی بلور سے زیادہ اور نیلم و پکھراج سے کم. زرد

رنگ کا ٹوپاز دیکھنے میں پکھراج معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں آب پکھراج کے مقابلہ میں کم اور سنہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی ثقل اضافی ۳،۵ سے ۳،۵۵ کے درمیان ہوتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں ٹوپاز کا استعمال بہت عام تھا۔ ہندوستان میں یہ پانچویں صدی قبل مسیح سے جواہرات کے طور پر استعمال ہو رہا ہے زرد رنگ کے ٹوپاز کو کم کرنے سے اس کی رنگت ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے برخلاف ایک قسم کے کوئلہ کے ساتھ جلانے سے یہ گلابی رنگت اختیار کر لیتا ہے اور گلابی ٹوپاز کے نام سے فروخت ہوتا ہے ٹوپاز کے قلم کافی بڑی جسامت تک کے ملتے ہیں۔ مثلاً پرتگال کے شاہی جواہرات میں براگانزا نام کا ایک ٹوپاز ہے جس کا وزن ۱۶۸۰ قیراط ہے۔ بیشتر ٹوپاز بے رنگ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نیلگوں رنگ عام ہے روس میں سبز رنگ کے بھی ٹوپاز دستیاب ہوتے ہیں لیکن یہ کمیاب ہیں زرد ٹوپاز زیادہ تر برازیل میں پایا جاتا ہے یہاں گلابی اور سرخ رنگ کے ٹوپاز بھی ملتے ہیں لیکن یہ کمیاب ہیں۔ برازیل کے ٹوپاز سب سے اچھے ہوتے ہیں ان میں بیشتر گیروی رنگ کے ہوتے ہیں یا نیلگوں سفید لنکا اور برما میں بھی ٹوپاز کے اچھے ذخائر ہیں اس کے علاوہ اور دوسرے کئی ممالک میں ٹوپاز پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بہار کے سنگھ بھوم علاقہ میں بھی ٹوپاز ملتے ہیں لیکن یہ جوہری قدر و قیمت کے نہیں ہوتے ہیں۔

جزا یا اونکس (Onyx)

یہ ایک قسم کا دھاری دار عقیق ہے جس میں سفید کے ساتھ سرمئی سیاہ، بھوری یا سرخ وغیرہ رنگوں کی متوازی دھاریاں یا پٹیاں ہوتی ہیں۔ جن جزا میں سیاہ یا سرمئی رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں ان کو اونکس اور جن میں بھورے یا مشتری رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ ان کو سارڈونکس (Sardonyx) کہتے ہیں۔ جزا کی درجہ سختی ۷،۰ ہوتی ہے اس لیے یہ کافی پائیدار اور سخت پتھر ہوتا ہے لیکن چوں کہ یہ کثرت سے دستیاب ہوتا ہے اس لیے معمولی قدر و قیمت کا پتھر ہے۔ جزا کو تراش کر مختلف کئی خوشنما اشیا از قسم چاقو و چھری کے دستے پیالے، رکابیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں جن جزا میں سرخ و سفید رنگ کی پتیاں ہوتی ہیں ان کو جزائے یمانی یا سرخ دھاری دار عقیق بھی کہتے ہیں۔

جمونیا یا نیلم ارغوانی (Amethyst)

جمونیا اور بلور ایک ہی قسم کے پتھر ہیں صرف رنگ کا فرق ہے جمونیا کے قلم شفاف ہوتے ہیں اور ان کا رنگ خوشنما اودا یا بنفشی ہوتا ہے جمونیا دیکھنے میں بہت دیدہ زیب ہوتا ہے اور تراش کے بعد اس میں چمک بھی اچھی آتی ہے۔ چوں کہ یہ بکثرت ملتا ہے اس لیے معمولی قسم کے جواہرات میں شمار ہوتا ہے۔ جمونیا کے قلموں میں رنگ عموماً یکساں نہیں ہوتا بلکہ قلم کے سروں پر تو رنگ گہرا ہوتا ہے لیکن نیچے کی طرف بتدریج ہلکا ہوتا جاتا ہے جمونیا کے رنگ پر حرارت کا بہت اثر ہوتا ہے یعنی گرم کرنے پر اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر جمونیا کے قلم کو ۴۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۵۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان گرم کیا جائے تو اس کا رنگ اودے کے بجائے زرد یا کتھئی ہو جاتا ہے اور ان کو پالمیرا ٹوپاز (Palmyra Topaz) یا مدیرا ٹوپاز (Maderia Topaz) کہتے ہیں۔ صرف برازیل اور شمالی امریکہ کے بعض جمونیا گرم کرنے سے سبز رنگت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کو پریسیولائیٹ (Prasiolite) کہتے ہیں۔ زیادہ حرارت تک گرم کرنے پر جمونیا کی رنگت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ بلور کی طرح جمونیا کے قلم آتشی، چٹانوں خصوصاً آتش فشانی چٹانوں کے جوف میں پائے جاتے ہیں۔ جمونیا کے ذخائر بہت سے ملکوں میں ہیں پہلے روس اور جرمنی میں نفیس قسم کے جمونیا دستیاب ہوتے تھے لیکن اب وہاں اس کے ذخائر ختم ہو گئے ہیں۔ آج کل برازیل اور وکوٹے میکسیکو، شمالی امریکہ، لنکا، مڈاگاسکر، جنوبی افریقہ، رہوڈیشیا، چین، جاپان، آسٹریا، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، انگلینڈ، آئرلینڈ وغیرہ میں اس کے اچھے ذخائر ہیں۔

جیٹ (Jet)

یہ سیاہ رنگ کا غیر معروف جواہر ہے۔ جو دراصل ملائم پتھر کے کوئلہ کی ایک قسم ہے۔ یہ غیر شفاف ہوتا ہے لیکن اس پر جلا بہت اچھی آتی ہے مغربی ممالک خصوصاً انگلستان میں جیٹ ماتمی جواہر کے طور استعمال ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۲،۵ سے ۴ کے درمیان اور ثقل اضافی ۱،۳۳ سے ۱،۳۵ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک ملائم اور ہلکا جواہر ہے جیٹ کے قابلِ ذکر ذخائر انگلستان، اسپین اور فرانس میں ہیں۔ اس کے علاوہ روس اور جرمنی میں بھی جیٹ دستیاب ہوتا ہے۔

حدید (Hematite)

یہ ایک معمولی قسم کا پتھر ہے جو کہ جواہرات کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ حدید کی کیمیائی ماہیئت لوہے کا آکسائیڈ ہوتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور یہ غیر شفاف ہے تراش کے بعد اس میں دھات جیسی چمک پیدا ہوتی ہے۔ حدید کی درجہ سختی ½۵ سے ½۶ کے درمیان اور ثقل اضافی ۴،۹ سے ۵،۳ کے درمیان ہوتی ہے۔ حدید میں کوئی ایسی خوبی نہیں ہوتی ہے جو اسے جواہرات میں شامل کرے لیکن زمانۂ قدیم سے اسے تراش کر انگوٹھیوں میں جڑا جاتا ہے اور بعض لوگ کسی عقیدہ کی وجہ سے ان کو پہننا بہتر سمجھتے ہیں۔ حدید کی تختیوں پر کندہ گری بھی کی جاتی ہے۔ یہ بہت سے ممالک میں پایا جاتا ہے اور اس کے ذخائر بہت زیادہ ہیں۔

دریائی لہسنیہ یا ٹائگرس آئی (Tigher's Eye)

یہ ایک قسم کا کوارٹز ہے جو کروسیڈولائیٹ ایسبسٹس کے طبعی طریقوں سے کوارٹز میں تبدیل ہو جانے سے بنتا ہے جلا دینے پر اس پتھر میں سنہری یا نیلگوں رنگ کی لہردار دھاریاں نمایاں ہو جاتی ہیں جیسی کہ شیر کی آنکھ میں دھاریاں ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا نام ٹائیگرس آئی رکھا گیا ہے۔ یہ دھاریاں کروسیڈولائیٹ کے ریشوں کی موجودگی کی وجہ سے بنتی ہیں دریائی لہسنیہ کے کافی بڑے بڑے ٹکڑے دستیاب ہوتے ہیں اور ان کو تراش کر مختلف اشیا میں جڑا جاتا ہے۔ اس کے قابلِ ذکر ذخائر افریقہ میں ہیں اور یہاں

کے دریائی لہسنیہ بہت خوشنما بھی ہوتے ہیں۔

دودھیا کوارٹز (Milky Quartz) یہ دودھیے رنگ کا نیم شفاف سے غیر شفاف کوارٹز ہے اور بہت عام پتھر ہے۔ اس لیے بہت سستے قسم کا جواہر ہے۔ بعض سونے کی کانوں کے علاقوں میں ایسے دودھیا کوارٹز بھی ملتے ہیں جن میں سونے کے ذرّات شامل ہوتے ہیں۔ ان کو بھی تراش کر جواہرات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایسے دودھیا کوارٹز کو گولڈ کوارٹز (Gold Quartz) کہتے ہیں۔

دھانا فرہنگ (Malachite) یہ سبز رنگ کا غیر شفاف پتھر ہے جس میں ہلکے اور گہرے سبز رنگ کی دھاریاں ہوتی ہے۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ تانبے کا ہائیڈر سلیکیٹ ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۳٫۵ سے ۴ کے درمیان ہوتی ہے اس طرح سے یہ ایک ملائم پتھر ہے اور استعمال سے گھستا رہتا ہے۔ دہانہ فرہنگ غیر چمکیلا اور کلی ہوتا ہے لیکن تراش کے بعد بسا اوقات نیم ریشمی چمک آجاتی ہے۔ اس کی ثقل اضافی ۳٫۹ سے ۴ کے درمیان ہوتی ہے۔ دھانہ فرہنگ زمانہ قدیم سے جواہرات اور خوشنما پتھر کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ معمولی پتھر ہے لیکن اپنے خوشنما دھاری دار سبز رنگ کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔ اس پتھر کو درد گردہ کے علاج کے طور پر بھی عقیدتاً پہنا جاتا ہے۔ دہانہ فرہنگ کے قابل ذکر ذخائر روس، کیوبا، چلی اور آسٹریلیا میں ہیں جہاں یہ تانبے کے دوسرے پتھروں کے ساتھ پایا جاتا ہے اس کے علاوہ بلجیم کانگو، شمالی رہوڈیشا، فرانس، امریکہ وغیرہ میں بھی اس کے کافی بڑے ذخائر ہیں۔

دھونیلا (Smoky Quartz) یہ بلور یا جمونیا کی طرح کوارٹز کے قلم ہوتے ہیں لیکن ان کا رنگ سرمئی یا بھورا ہوتا ہے اس لیے ان کو دھونیلا کہتے ہیں یہ شفاف سے نیم شفاف حالت میں مکمل قلمائی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پتھر بکثرت ملتا ہے اور اس کے قلم کافی بڑی جسامت کے پائے جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ ایک عام پتھر ہے اس لیے بہت معمولی قسم کے جواہرات میں شمار ہوتا ہے۔ اور سستے قسم کے جڑاؤ زیورات میں استعمال ہوتا ہے۔ بھورے رنگ کے دھونیلے کو کیکری گویم (Cacrigoem) بھی کہتے ہیں دھونیلے کے ذخائر سوئٹزرلینڈ، جاپان، اسپین منچوریا، شمالی امریکہ وغیرہ میں ہیں۔ ہندوستان میں یہ تنجور کے علاقہ میں پایا جاتا ہے۔

روبیلائیٹ (Rubellite) دیکھئے ترمیلی

زبرجد (Aquamarine) نیلے یا سبزی مائل نیلگوں رنگ کا شفاف بیرل ہے اسے ہندی میں مرکج یا ہاری بھدر کہتے ہیں اس کی درجہ سختی ۷٫۵ سے ۸٫۰ اور ثقل اضافی ۲٫۶۸ سے ۲٫۷۳ ہوتی ہے۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ بیریلیم اور المونیم کا سلیکیٹ ہے۔ زبرجد قلموں کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے اور اس کے قلم کافی بڑی جسامت تک کے ملتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں برازیل میں زبرجد کا ایک قلم ۲۷ سینٹی میٹر لمبا اور ۲۰ سینٹی میٹر موٹا دستیاب ہوا تھا۔ بہتات میں ملنے کی وجہ سے اس کا شمار معمولی قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔ عموماً گہرے نیلے رنگ کے زبرجد سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں پرانے زمانے میں زبرجد کو پیش قبضوں کے دستوں وغیرہ میں جڑا جاتا تھا اور نفیس قسم کے شفاف زبرجد کو تراش کر چشموں کے شیشے بھی بنائے جاتے تھے۔ دنیا میں سب سے زیادہ زبرجد برازیل میں پایا جاتا ہے جہاں یہ تبدیل شدہ چونے کے پتھروں (Altered Lime stone) اور پیگمائیٹ چٹانوں میں ملتا ہے۔ کوہ یورال، سائبیریا، آئرلینڈ، مڈاگاسکر، لنکا اور برما وغیرہ میں بھی کافی مقدار میں زبرجد دستیاب ہوئے ہیں۔ شمالی امریکہ میں کولوریڈو اور کیلیفورنیا کے علاقوں میں زبرجد کے ذخائر ہیں۔ ہندوستان میں تامل ناڈو کے ضلع کوئمبٹور، میسور، راجستھان (کشن گڑھ) کشمیر (لداخ) کے علاقوں میں زبرجد پائے جاتے ہیں۔

زرقون (Zircon) یہ شفاف قسم کا بہت خوشنما جواہر ہے اور چمک رنگ و روپ میں ہیرے سے بہت ملتا ہے اور بسا اوقات شفاف ایسا کہ زرقون کے اچھی تراش کے نگوں پر ہیرے کا دھوکہ ہوتا ہے تراش کے بعد اس میں بہت نمایاں جھلک اور آب پیدا ہوتی ہے۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ زرقونیم کا سلیکیٹ ہوتا ہے۔ ہیرے کے مقابلے میں یہ نرم جواہر ہے اور اس کی درجہ سختی ۷٫۵ ہے جب کہ ثقل اضافی ۴٫۲ سے ۴٫۷ ہے جو کہ ہیرے سے بہت زیادہ ہے۔ زرقون مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں لیکن صرف بے رنگ ہلکے زرد سرخ یا بھورے رنگ کے شفاف زرقون ہی جواہرات کے طور پر استعمال میں آتے ہیں جو ہریلوں کے نزدیک رنگ کے اعتبار سے زرقون کی دو قسمیں ہیں۔

ہیاسنتھ یا جیسنتھ (Hyacinth or Jasinth)

یہ سرخ، زرد، نارنجی، زعفرانی یا بھورے رنگ کے شفاف زرقون ہوتے ہیں ان کو گومیدک بھی کہتے ہیں۔

جارگون (Gargon) یہ بے رنگ یا سرمئی رنگ کے شفاف زرقون ہوتے ہیں۔ زرقون کے قلم روپہلے ہوتے ہیں۔ بعض قلموں کے سرے اہرامی ہوتے ہیں۔ رنگین زرقونوں کو گرم کرنے پر اکثر ان کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں یا بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ جواہرات کے استعمال کے لائق زرقون لنکا، برما، تھائی لینڈ، اسپین، کمبوڈیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

زمرد (Emerald) اسے ہندی میں پنا کہتے ہیں زمرد بہت اور مشہور جواہر ہے اور اس کا شمار اعلیٰ قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔ اس کو فارسی میں سبزہ بھی کہتے ہیں۔ یہ دراصل سبز یا زمردی رنگ کا شفاف بیرل ہے اور اسی لیے اس کی بھی کیمیائی ماہیت بیریلیم اور المونیم کا سلیکیٹ ہوتی ہے۔ نفیس قسم کے زمرد کا رنگ سبز رنگ کی مکھی جیسا ہوتا ہے۔ جس میں زمردی رنگ کے علاوہ ہلکا

سنہرا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ زمرد کے ٹکڑوں میں نقائص، داغ، دھبہ، کلغہ یا شگاف کی صورتوں میں ہوتے ہیں۔ بے نقائص خوشنما رنگ کے زمرد کمیاب ہوتے ہیں اس لیے یہ کافی قیمتی ہوتے ہیں۔ زمرد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ زہابی یہ بہت نفیس زمرد ہوتے ہیں اور کولمبیا میں دستیاب ہوتے ہیں۔ سعیدی یہ زمرد مصر سے آتے ہیں۔ اور اتنے اچھے نہیں جیسے زہابی زمرد ہوتے ہیں بے نقص زمرد سیڑھی دار تراش (Step Cut) یا زمردی تراش (Trap Cut) میں تراشے جاتے ہیں۔ نقائص والے زمرد عموماً پیکانی تراش (Cobochow Cut) یا گول دانوں کی شکل میں تراشے جاتے ہیں۔ زمرد کی درجہ سختی ۷٫۵ سے ۸٫۰ اور نقل اضافی ۲٫۷ ہوتی ہے۔

جواہرات کے طور پر زمرد کا استعمال تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح سے رائج ہے زمرد کی قدیم کانیں مصر میں بحر قلزم کے قریب کے علاقوں میں تھیں لیکن آجکل یہاں سے عمدہ قسم کے زمرد نہیں دستیاب ہوتے ہیں جو کہ کان کنی کے ذریعہ حاصل کیے جاتے ہیں۔ برازیل، جنوبی افریقہ، روس اور آسٹریلیا میں بھی زمرد پائے جاتے ہیں لیکن یہاں کے زمرد اچھے قسم کے نہیں ہیں۔ ہندوستان میں صرف راجستھان کے صوبہ میں اودے پور، بے پور اور بھیل واڑہ ضلعوں میں زمرد دستیاب ہوتے ہیں لیکن یہ بہت معمولی قسم کے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زمرد کا سب سے بڑا قلم جو علم میں ہے وہ ڈیوک آف ڈیون شائر کے پاس ہے۔ یہ قلم تقریباً دو انچ موٹا اور دو انچ لمبا ہے حالانکہ یہ بہت خوش رنگ ہے اس میں کلیوتیج کے نقائص ہیں۔

سارڈونیکس (Sardonyx) دیکھیے جزا۔

سنبادہ دیکھیے کرنڈ

سنگ آمیزن یا ہریدمنی (Amazon Stone)

یہ سبز یا نیلگوں سبز رنگ کا خوشنما غیر شفاف پتھر ہے جو کہ معدن فلسپار کی ایک قسم ہے۔ اس کی درجہ سختی ۶ سے ۶٫۵ اور نقل اضافی ۲٫۵۶ ہوتی ہے اور یہ معمولی قسم کے جواہرات میں شمار کیا جاتا ہے ہندوستان میں بہار تامل ناڈو اور کشمیر کے علاقوں میں خوش رنگ آیزن پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کولوریڈو (امریکہ) ملاگاسکر اور ٹنگانائیکہ میں بھی اس کے ذخائر ہیں۔

سنگ سان دیکھیے کرنڈ

سنگ ستارہ یا گولڈ اسٹون (Gold Stone)

یہ دراصل نقلی جواہر ہے جو شیشہ کو پگھلا کر اس میں تانبہ کا برادہ ملا کر بنایا جاتا ہے تانبہ کے ذرات کی وجہ سے اس میں جھلملاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے پسند کیا جاتا ہے۔ سنگ ستارہ کتھئی رنگ کا ہوتا ہے اور اس میں سنہرے ذرات جھلکتے ہیں۔ یہ اٹلی میں بنتا ہے۔

سنگ سلیمانی یا اگیٹ (Agate)

یہ عقیق کی ایک قسم ہے جس میں رنگین دھاریاں دائرہ کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کو دھاری دار عقیق بھی کہتے ہیں۔ یہ بکثرت دستیاب ہوتا ہے اس وجہ سے معمولی پتھروں میں اس کا شمار ہے اگیٹ پر جلا بہت اچھی آتی ہے اور یہ بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے مختلف رنگوں کی دھاریوں کے عقیق پائے جاتے ہیں لیکن جن میں زرد، سرخ یا دوسرے خوشنما رنگوں کی دھاریاں ہوتی ہیں وہ زیادہ پسند کیے جاتے ہیں یہ دھاریاں مدور یا بیضاوی شکلوں میں ہوتی ہیں جن میں اگیٹ میں دو مدور دائرے قریب قریب ہوتے ہیں ان کو دو چشمی عقیق کہتے ہیں۔ اس کی درجہ سختی ۷٫۰ ہوتی ہے۔ اگیٹ کو تراش کر عمدہ قسم کے کھرل بنائے جاتے ہیں جو سخت اشیا کا سفوف بنانے کے کام میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی دوسری خوب صورت اشیا از قسم پیالے، رکابیاں، گلدان چاقو کے دستے، ہاتھ کے بٹن وغیرہ بھی اگیٹ سے بنائے جاتے ہیں۔ اگیٹ کی تراش کے ہندوستان میں مرکز کھمبات، رتن پور، باندہ اور جبل پور ہیں ہندوستان کے باہر سائبیریا، جرمنی اور جزیرہ رہوڈس میں اگیٹ کی اچھی تراش ہوتی ہے۔ اس کے قابل ذکر ذخائر ہندوستان اسکاٹ لینڈ اور برازیل، چیکوسلاواکیہ اور امریکہ وغیرہ میں ہیں۔

سنگ قرون یا اوپل (Opal)

یہ بہت نفیس جواہر ہے کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ سلیکون ڈائی اکسائیڈ SiO_2 ہے جس میں پانی کا جز بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۵٫۵ سے ۶٫۵ اور نقل اضافی ۱٫۹ سے ۲٫۳ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ سفید سرمئی، زرد، سرخ، بھورا، سیاہ، نیلگوں وغیرہ رنگوں کے ہوتے ہیں۔ سنگ قرون میں ایک خاص جھلک ہوتی ہے جسے قرونیت (Opalescence) کہتے ہیں یہ جھلک کسی دوسرے جواہر میں نہیں پائی جاتی۔ اچھے ترشے ہوئے نگ کی سطح کو مختلف رخوں سے دیکھنے پر مختلف رنگوں کی جھلملاہٹ دکھائی دیتی ہے جو کہ روشنی کے تداخل (Interference) سے پیدا ہوتی ہے عام سنگ قرون جو سفید رنگ کے ہوتے ہیں ان میں یا تو قرونیت بالکل نہیں ہوتی یا بہت پھیکے رنگ جھلکتے ہیں ایسے سنگ قرون معمولی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جن میں قوس قزح کے نازک رنگوں کی جھلک ہوتی ہے اور رنگ یکساں ہوتا ہے بیش قیمت ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ وہ سنگ قرون مقبول ہیں جن کی زمین سیاہ ہو اور قرونیت میں سرخ رنگ دوسرے رنگوں سے نمایاں ہو۔

سنگ قرون بہت ملائم اور نازک جواہر ہے اس لیے اس کو استعمال کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پتھر میں بہت باریک مسام ہوتے ہیں لہٰذا اگر اس کی سطح پر تیل یا چکنائی لگ جائے تو جواہر کی آب ختم ہو جاتی ہے۔ زمانہ قدیم میں رومن اوپل کے بہت شائق تھے۔ آج کل بھی یوروپ کے ممالک میں اس جواہر کی بہت قدر ہے۔ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کو اوپل خاص طور سے پسند تھا۔ یہ پتھر ہر قسم کی چٹانوں کی دراڑوں، رخنوں، تھوں، شگافوں یا جوف وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ پہلے یہ جواہر صرف چیکوسلواکیہ میں ملتا تھا۔ لیکن آج کل آسٹریلیا میں کئی مقامات پر اور ہندوستان میں سنگ قرون پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شمالی امریکہ میکسیکو اور ہونڈوراس میں بھی اچھے قسم کے اوپل ملتے ہیں۔

سنہلا (Citrine)

یہ سنہرے رنگ کا کوارٹز ہے اور شفاف حالت میں پایا جاتا ہے۔
رنگ کے علاوہ اس میں باقی صفات وہی ہیں جو بلور کی ہیں رنگت اور شفافی میں یہ پکھراج یا ٹوپاز کی طرح ہوتا ہے لیکن انعطاف نما کم ہونے کی وجہ سے اس میں وہ جھلک نہیں ہوتی جو ان دونوں جواہروں میں ہوتی ہے یہ بہت معمولی قسم کا جواہر سمجھا جاتا ہے۔ سب سے اچھے قسم کا سنہلا برازیل میں ملتا ہے لیکن اوروگوئے۔ روس اور فرانس میں بھی سنہلے کے قابل ذکر ذخائر ہیں۔

عقیق (Chalcedony)

یہ بہت عام اور معمولی جواہر ہے اور خورد قلمی (Cryptocrystalline) سلیکا کی قسم ہے کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ سلیکون ڈائی آکسائیڈ SiO_2 ہوتا ہے جس میں قدرے پانی کا جز بھی شامل ہوتا ہے اس کی درجہ سختی ۷ اور ثقل اضافی ۲,۶۳ سے ۲,۶۴ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں جیسے سرخ، زرد، سفید سرمئی، نیلگوں، کاہی، ماشی لحمی، ابلق وغیرہ۔ اور یہ نیم شفاف سے غیر شفاف حالت میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں شعاع ریزی بالکل نہیں ہوتی صرف اپنے رنگوں اور سختی کی وجہ سے مقبول ہیں۔ عقیق کو تراش کر انگوٹھی کے نگ ہار یا تسبیح کے دانے۔ بٹن وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ بڑی جسامت کے عقیقوں کو تراش کر مختلف قسم کی اشیا جیسے چاقو اور چھری کے دستے چھاتوں کے ہینڈل۔ اگردان گلدان، پیالے وغیرہ بھی بنائے جاتے ہیں۔ یکرنگ اور خوشنما عقیق کو تراش کر ان پر مہرں اور طغرے بھی کندہ کیے جاتے تھے۔ خوش رنگ اور شفاف عقیق کو عقیق یمنی کہتے ہیں اور رنگ کے اعتبار سے ان کے نام ہیں مثلاً سرخ یمنی۔ سبز یمنی کلیجہ یمنی، زرد یمنی وغیرہ بعض مختلف قسم کے عقیق یہ ہیں۔

عقیق سرخ (Red Cornelian)

یہ عقیق کچے گوشت کے رنگ کا ہوتا ہے اور اپنے خوشنما رنگ کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ عقیق سرخ ہندوستان میں راج پیلا کے مقام پر اور دریائے گوداوری کے پتھروں میں راج مندری کے قریب ملتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ برازیل اور وگوئے کونس لینڈ جاپان اور بعض دیگر ممالک میں بھی عقیق سرخ پائے جاتے ہیں۔

عقیق زرد (Yellow Carnelian)

یہ ہلکے زرد رنگ کے شفاف عقیق ہوتے ہیں۔

عقیق سبز یا کرائسو پریز (Chrysoprase)

یہ سبز وی پستئی یا ہلکے سبز رنگ کا عقیق ہوتا ہے۔ ان میں عموماً بہت نقائص ہوتے ہیں۔ سب سے اچھے قسم کا کرائسو پریز جرمنی میں دستیاب ہوتا ہے۔ ہلکے سبز رنگ کا ایک دوسرا عقیق بھی ہوتا ہے۔ جسے پریز (Prase) کہتے ہیں۔

کلیجیہ یمنی سارڈ (Sard).

یہ کلیجی کے رنگ کا عقیق ہے۔ اس رنگ کے علاوہ نارنجی رنگ کا سارڈ بھی ملتا ہے پرانے زمانے میں ان پر کندہ بھی کیا جاتا تھا۔

شجری عقیق (Moss Agate)

یہ ایسے نیم شفاف عقیق ہوتے ہیں جن میں ایسے کتھئی سبز یا سیاہ داغ ہوتے ہیں جو دیکھنے میں جھاڑ دار درختوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دھبے عقیق کے اندر دوسرے معدن خصوصاً مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (Manganese Dioxide) کلورائیٹ کی وجہ سے ہوتے ہیں شجری عکس کی وجہ سے ایسے عقیق بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں گجرات کے علاقہ میں بہت خوش نما عقیق شجری دستیاب ہوتے ہیں

عنبر (Amber)

عنبر دراصل پتھرایا ہوا رال (Fossilised Resin) ہے یہ زرد کتھئی۔ بھورا زردی مائل سرخ اور بسا اوقات سفید، نیلا سرخ یا سیاہ وغیرہ رنگوں کا ہوتا ہے اور اس میں کشمشی چمک پائی جاتی ہے عنبر زمانہ قدیم سے جواہرات کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ جواہر تمام جواہرات میں نرم ترین اور ہلکا ہے یعنی اس کی درجہ سختی ۲ سے ۲٫۵ کے درمیان اور ثقل اضافی پانی کے برابر یا اس سے کچھ ہی زائد ہوتی ہے۔ اتنا ملائم پتھر ہے کہ ناخن سے کھرچا جا سکتا ہے اب سے دو کروڑ سال پہلے ایک خاص قسم کے چیڑ کے درخت پائے جاتے تھے۔ جنہیں پائی نس سکسا ئین فیرا (Pinus Succine Fera) کہتے ہیں عنبر ان درختوں سے نکلنے والا گوند ہے جو پتھرا گیا ہے جو اس گوند میں لپٹ کر مر گئے ہوں گے گہرے رنگ کے عنبر کو ترجیح دی جاتی ہے بے نقص گہرے زرد رنگ کا عنبر سب سے زیادہ مقبول ہے۔ سب سے زیادہ عنبر بحر بالٹک میں ملتا ہے اس کے علاوہ برما، سسلی، رومانیہ، آسٹریلیا، کناڈا اور امریکہ میں بھی عنبر دستیاب ہوتے ہیں۔

عین الہرہ

دیکھیے لہسنیہ

فیروزہ (Turquise)

یہ بہت مقبول جواہر میں سے ہے قلمی اعتبار سے یہ نقلا اور غیر شفاف پتھر ہے اور اس کی کیمیائی ماہیت تانبہ اور المونیم کا فاسفیٹ ہوتی ہے۔ یہ عموماً فیروزی، آسمانی یا سبزی مائل نیلگوں رنگوں میں ملتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۵ سے ۶ اور ثقل اضافی ۲٫۶ سے ۲٫۸۳ ہوتی ہے حالانکہ یہ ملائم پتھر ہے لیکن اپنے خوش نما رنگ کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ گہرے فیروزی رنگ کے فیروزے جن میں داغ یا دھبے نہ ہوں سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ سبزی مائل رنگ کے فیروزے کاسنی کہلاتے ہیں۔ یہ نسبتاً کم پسند کیے جاتے ہیں۔ گہرے نیلے رنگ کے فیروزے تلخ کہلاتے ہیں یہ بھی کم پسند کیے جاتے ہیں۔ فیروزہ کی آب و تاب ذات کہلاتی ہے بغیر ذات کا فیروزہ زیادہ قدر کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اپنے ماخذ کے اعتبار سے فیروزے کئی قسم کے ہوتے ہیں جیسے نیشاپوری خضری کرمانی آذر بائیجانی وغیرہ یہ مسام دار پتھر ہے اس لیے زرقون کی طرح اس میں بھی چکنائی یا روغن۔ سے آب جاتی رہتی ہے۔ دنیا میں سب سے نفیس فیروزے ایران میں نیشاپور کے مقام پر پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصر، شمالی امریکہ، چلی، ازبکستان اور کسو، قدر آسٹریلیا میں بھی فیروزے پائے جاتے ہیں فیروزے کی تراش اور

چلادانی سب سے اچھی مشہد میں ہوتی ہے۔

کرائسوبیرل Chrysoberyl زرد، دہانی، زمردی، سبزی مائل بھورا یا پستئی رنگ کا پتھر ہے جس کی کیمیائی ماہیت بیریلیم اور الونیم کا آکسائیڈ ہوتی ہے۔ اس کی ثقل اضافی ۳٫۶۵ سے ۳٫۶۸ اور درجہ سختی ۸٫۵ ہوتی ہے یعنی یہ ٹوپاز سے زیادہ سخت اور لعل و نیلم سے نسبتاً ملائم پتھر ہے۔ یہ بہت عام پتھر ہے اس لیے معمولی قسم کے جواہرات میں شمار ہوتا ہے۔ صرف زرد یا دہانی رنگ کے کرائیسوبیرل کے شفاف قلم تراش کر جواہرات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جنوبی یورال برازیل، لنکا، رہوڈیشا، ناروے، نیویارک اور مڈاگاسکر اس کے خاص ماخذ ہیں۔ ہندوستان میں راجستھان کے علاقہ کشن گڑھ میں زرد رنگ کے کرائیسوبیرل پائے جاتے ہیں۔ کومبٹور ضلع میں بھی کرائیسوبیرل دستیاب ہوتے ہیں۔

کرنڈ (Corund) اسے فارسی میں سبنادہ یا سنگ سان اور سنسکرت میں کرووند کہتے ہیں۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے یہ الونیم کا آکسائیڈ ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۹٫۰ ہوتی ہے۔ اس طرح ہیرے کے بعد یہ سخت ترین پتھر ہے رنگین اور شفاف کرنڈ جواہرات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور بیش قیمت جواہرات میں شمار ہوتے ہیں جیسے لعل، نیلم، پکھراج وغیرہ۔ کرنڈ کے قلم بیلن کی شکل کے ہوتے ہیں اور ان میں قلمی پہل بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ کرنڈ کے قلم عموماً بے رنگ یا ملا گیری رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور کافی بڑی جسامت کے مل جاتے ہیں مثلاً برٹش میوزیم میں کرنڈ کا ایک قلم عموماً رکھا ہے جس کا وزن ۳۴۱ پونڈ ہے کرنڈ کی ثقل اضافی ۳٫۹ سے ۴٫۱ کے درمیان ہوتی ہے کرنڈ کا سفوف جواہرات کی تراش میں بہت استعمال ہوتا ہے کرنڈ کے قلم آتشی چٹانوں یا ہیئت پذیر (Metamorphic) چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔ معمولی قسم کے کرنڈ بیشتر ممالک میں ملتے ہیں لیکن جوہری قدر و قیمت کے کرنڈ مثلاً لعل، نیلم وغیرہ صرف برما، تھائی لینڈ، لنکا، ہندوستان، افغانستان، چین، روس امریکہ اور کوئنس لینڈ اور چند دوسرے مقامات پر ملتے ہیں۔ کشمیر کے باڈر علاقہ میں پایا جانے والا نیلم اس وقت دنیا میں بہترین نیلم سمجھا جاتا ہے۔

کنزائیٹ (Kunzite) دیکھیے اسپاڈومین۔

کوارٹز لہسنیہ (Quartz Cat's Eye) یہ سیاہی مائل سبز زرد یا بھورے رنگ کا ایسا کوارٹز ہوتا ہے جس کے اندر ایسبیسٹس کے ریشے موجود ہوتے ہیں۔ اگر اس کو پیکانی تراش (Cobochoncut) میں تراشا جائے تو ان باریک ریشوں کی موجودگی کی وجہ سے نگ کی سطح پر روشنی کی ایک دھاری نمایاں ہوتی ہے جیسی کہ اصلی لہسنیہ میں ہوتی ہے۔ کوارٹز لہسنیہ ہندوستان لنکا اور روس میں پائے جاتے ہیں۔

کورنڈم دیکھیے کرنڈ

گلابی یا گلابی کوارٹز (Rose Quartz) یہ گلابی رنگ کا کوارٹز ہے جو کہ غیر شفاف سے نیم شفاف حالتوں میں ملتا ہے اور اپنے رنگ کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا شمار معمولی قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔ اس کی کیمیائی ماہیت سلیکون ڈائی آکسائیڈ ہے۔ درجہ سختی ۷٫۰ اور ثقل اضافی ۲٫۶۶ ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر آتشی چٹان پگماٹائیٹ کے اندرونی حصہ میں پایا جاتا ہے۔ سب سے اچھے قسم کا گلابی کوارٹز برازیل میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ شمالی امریکہ، مڈاگاسکر، جاپان، روس جنوب مغربی افریقہ اور جرمنی میں اس کے ذخائر ہیں۔ ہندوستان میں وارنگل چھندواڑہ، سمبل پور، وزاگاپٹنم وغیرہ میں گلابی کوارٹز پائے جاتے ہیں۔ گلابی کوارٹز کا استعمال آرائشی پتھر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ سلاطین مغلیہ نے اس پتھر کو مرصع کاری کے لیے عمارات میں جڑوایا ہے۔ زیورات میں اس کا استعمال نہیں ہوتا۔

گولڈ کوارٹز دیکھیے دودھیا کوارٹز

گئودنت یا مون اسٹون (Moon Stone)

گئودنت کا شمار معمولی قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے۔ یہ معدن فلسپار کی ایک قسم ہے جس کی ماہیت پوٹیشیم اور الونیم کا سلیکیٹ ہوتی ہے۔ اس کی درجہ سختی ۶٫۰ اور ثقل اضافی ۲٫۵۵ ہوتی ہے۔ گئودنت کا رنگ ہلکا نیلگوں ہوتا ہے اور اس میں خوش نما گوہری چمک بھی ہوتی ہے۔ بعض گئودنت کو مناسب رخ پر تراشنے میں چار کونوں والے ستارے کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے گئودنت کو چوکلیا کہتے ہیں۔ سب سے اچھا گئودنت، لنکا اور سوئیٹزرلینڈ میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کومبٹور ضلع میں بھی اچھے قسم کے گئودنت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ برما، مڈاگاسکر، ٹنگانائیکہ، امریکہ اور برازیل اس کے ماخذ ہیں۔

گئومیدک دیکھیے زرقون

لاجورد (Lapis Lazule) یہ گہرے نیلے یا لاجوردی رنگ کا غیر شفاف جواہر ہے جس میں آب گینی چمک ہوتی ہے۔ بسا اوقات لاجورد کے ٹکڑوں میں سونا مکھی کے ٹکڑے بھی موجود ہوتے ہیں جن کی موجودگی سے اس میں سنہرے رنگ کے دھبے نمایاں ہوتے ہیں۔ کیمیائی ماہیت کے اعتبار سے لاجورد سوڈیم الونیم سلیکٹ اور سوڈیم سلفائیڈ ہوتا ہے۔ اس کی ثقل اضافی ۲٫۳۸ سے ۲٫۴۸ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ ایک نرم پتھر ہے جس کی درجہ سختی ۵٫۰ سے ۵٫۵ ہے غیر شفاف اور نرم ہونے کی وجہ سے اس کا شمار سستے قسم کے جواہرات میں ہوتا ہے اس کو زیورات میں بھی جڑا جاتا ہے اور تراش کر دوسری اشیا بھی بنائی جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں لاجورد کی تختیوں پر ابھرے ہوئے نقش نگار بھی تراشے جاتے تھے۔ دنیا میں سب سے نفیس قسم کے لاجورد افغانستان، بدخشاں کے مقام پر دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیلی فورنیا میں جھیل بیکال کے علاقہ چیلی اور ایران میں بھی لاجورد پایا جاتا ہے۔

اسپینل (Spinel) یہ پتھر کیمیائی ماہیئت کے اعتبار سے میگنیشیم اور المونیم کا آکسائیڈ ہے۔
یہ خوش نما جواہر ہے اور اچھے قسم کے جواہرات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً شفاف حالت میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی درجہ سختی ۸٫۰ اور ثقل اضافی ۳٫۵ سے ۴٫۱ کے درمیان ہوتی ہے۔ اسپینل کئی رنگوں کے ہوتے ہیں جیسے سرخ، گلابی، سبز، سیاہ، بھورے اور بسا اوقات نیلے گہرے رنگ کے اسپینل عموماً نیم شفاف ہوتے ہیں۔ سرخ رنگ کا شفاف اسپینل لعل رمانی (Ruby Spinel) کہلاتا ہے۔ بعض لعل رمانی اتنے خوش رنگ اور خوش وضع ہوتے ہیں کہ ان کو لعل سے شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے گلابی رنگ کے اسپینل بہت عام ہیں۔ یہ لالڑی یا بلاس روبی (Balas Ruby) کہلاتے ہیں۔ لالڑی کے قابل ذکر ذخائر لنکا میں ہیں۔ زرد یا نارنجی رنگ کے اسپینل روبی سیل (Rubi Celle) نیلے رنگ کے سفائرین (Sapphirine) اور سبز رنگ کے کلورو اسپینل (Chlorospinel) کہلاتے ہیں۔ اچھے قسم کے اسپینل کے لیے لنکا، برما، سیام اور افغانستان مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، برازیل اور ہندوستان میں میسور کے علاقہ میں بھی اسپینل دستیاب ہوتے ہیں۔

لعل یا روبی (Ruby) یہ مشہور عام جواہر ہے اسے سنسکرت میں مانک یا پدمارا گا کہتے ہیں اس کے رنگ رمانی، پیازی، شنگرفی، کمی، عنابی، لقمی، ادریسی، دوشابی، عقربی، قبطلی وغیرہ ہوتے ہیں۔ عمدہ قسم کے لعل وہ ہیں جن کا رنگ کبوتر کے خون کے رنگ جیسا ہوتا ہے خوش رنگ لعل قدر و قیمت میں ہیرے کے ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ لعل دراصل کرنڈ کی قسم ہے (خصوصیات کے لیے کرنڈ دیکھیے) لعل چٹانوں میں عموماً شش پہل چھوٹے قلموں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ قلم کے عمودی رخ پر تراشنے میں ان کا رنگ گہرا دکھائی دیتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اس کو کسی دوسرے رخ پر تراشا جائے۔ بعض لعلوں کو اگر خاص رخ پر تراش کر پیکانی تراش (Cobochocut) دے دی جائے تو ان میں شہابی کیفیت (Asterism) نمایاں ہو جاتی ہے۔ لعل چھوٹے قلموں یا ٹکڑوں میں پائے جاتے ہیں اور دس قیراط سے زیادہ وزن کے لعل کمیاب ہیں۔ لعل کو اگر بالائے بنفشی شعاع (Ultra-Violet) میں رکھا جائے تو اس کا رنگ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح دکھائی دیتا ہے اور شعاع سے ہٹانے کے بعد بھی اس میں یہ کیفیت تھوڑی دیر قائم رہتی ہے۔ لعل پر کندہ بھی کیا جاتا ہے اور یہ ہنر تقریباً ۵۰۰ سال قبل مسیح سے رائج ہے۔ دنیا میں سب سے نفیس قسم کے لعل برما میں موکاک کے علاقہ میں دستیاب ہوتے ہیں یہ موکاک لعل کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسرے نمبر پر تھائی لینڈ اور لنکا کے لعل ہوتے ہیں برما کے لعل کے مقابلہ میں تھائی لینڈ کے لعل گہرے رنگ کے ہوتے ہیں جن کا رنگ مائل بہ عنابی ہوتا ہے۔ لنکا کے لعل ہلکے رنگوں کے ہوتے ہیں اور ان میں عموماً رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں لعل بدخشاں مشہور ہے حالانکہ بدخشاں میں لعل نہیں ہوتے۔ غالباً برما کے لعل بدخشاں کی منڈی میں فروخت کے لیے آتے ہوں گے اور اس وجہ سے بدخشاں لعل مشہور ہو گئے۔

لہسنیہ یا کیٹس آئی (Cat's Eye) یہ ایک خوشنما جواہر ہے اور اس کا شمار نفیس قسم کے جواہرات میں کیا جاتا ہے اسے عربی میں عین الہرہ اور سنسکرت میں ویدوریم کہتے ہیں۔ یہ کرائیسو بیرل کی ایک خاص قسم ہے اس لیے اس کی کیمیائی ماہیئت اور بیشتر خصوصیات وہی ہیں جو کرائیسو بیرل کی ہوتی ہیں۔ یہ سبزی مائل زرد رنگ کا پتھر ہے جس کی اندرونی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس کو ایک خاص رخ پر کاٹ کر پیکانی تراش دے دی جائے تو نگ کی سطح پر روشنی کی ایک دھاری دکھائی دیتی ہے اور نگ کو گھمانے پر روشنی کی یہ دھاری اپنے مقام پر قایم رہتی ہے۔ یہی لہسنیہ کی خوبی ہے۔ لنکا، چین اور برازیل میں عمدہ قسم کے لہسنیہ پائے جاتے ہیں ہندوستان میں ترابونڈرم کے ساحل پر بھی کسی قدر لہسنیہ ملتے ہیں لیکن یہ عموماً بہت چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔

مرکج دیکھیے زبرجد

موتی یا مروارید (Pearl) یہ مشہور عام نامیاتی جواہر ہے۔ موتی ایک خاص قسم کے سیپ کے جسم میں نشو و نما پاتا ہے اس سیپ کو گوہری صدف کہتے ہیں۔ موتی کی درجہ سختی ۳٫۵ سے ۴٫۰ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ ایک نرم جواہر ہے اور استعمال سے گھستا ہے تاہم ندرت اور گوہری چمک ہونے کی وجہ سے اس کا شمار قیمتی جواہرات میں ہوتا ہے۔ بڑی جسامت کے خوشنما موتی کمیاب ہیں اور بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ موتی کی ثقل اضافی ۲٫۶ سے ۲٫۸۵ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ بہت نازک جواہر ہے اور اس پر تیزاب کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے پسینہ سے بھی موتی کی آب جاتی رہتی ہے۔ موتی عموماً سفید رنگ کے ہوتے ہیں لیکن نقرئی، دودھیا ہلکے گلابی، سرمئی ہلکے سیاہ اور ہلکے زرد رنگ کے بھی موتی پائے جاتے ہیں۔ قدرتی موتی بہت کم سڈول ہوتے ہیں جو موتی بٹن کی طرح ایک طرف سے چپٹے ہوتے ہیں ان کو بٹنکی موتی (Blister Pearl) کہتے ہیں۔ دوسرے جواہرات کے برخلاف موتی کو تراشنے اور جلا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے شروع تک موتی کی افزائش کا صحیح علم نہیں تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کسی خاص وقت میں گوہری صدف کے منہ میں ابر نیساں کے قطرے کے چلے جانے سے موتی بن جاتا ہے لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دراصل گوہری صدف کے ڈھکن کے اندر چوٹ یا زخم ہو جانے سے یا کسی بیرونی شے از قسم ریت کا ذرہ یا مہین سمندری کیڑے داخل ہو جانے سے سیپ کو چبھن محسوس ہوتی ہے اور وہ ایک خاص قسم کا چمکدار مادّہ اپنے جسم سے خارج کرتی ہے اور خراش والی جگہ کو اس مادّہ سے ڈھک دیتی ہے۔ یہی چمکدار مادّہ دراصل موتی کی اوپری پرت ہوتی ہے۔ یہ پرت باریک ورقوں کی شکل کی پرتوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان پرتوں پر جب روشنی منعکس ہوتی ہے تو گوہری چمک پیدا ہوتی ہے۔ اسی اصول کے تحت جاپان کے سمندروں میں باقاعدہ گوہری صدف موتی بنانے

ہیں۔ وہ کلچر موتی کہلاتے ہیں۔ ظاہری رنگ و روپ چمک و شکل کے اعتبار سے اصلی اور کلچر موتی میں بہت یکسانیت ہوتی ہے البتہ اندرونی ساخت کے اعتبار سے دونوں میں قدرے فرق ہوتا ہے اور صرف خاص قسم کے آلوں کے ذریعہ ہی ان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ کلچر موتی تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) نصف یا تین چوتھائی کلچر موتی (۲) مکمل کلچر موتی اور (۳) نصف جاپانی موتی۔

دنیا میں سب سے اچھے قسم کے موتی خلیج فارس میں جزیرہ بحرین کے قریب ملتے ہیں یہاں زمانہ قدیم سے موتی کے لیے ماہی گیری ہو رہی ہے یہاں گوہری صدف دس میٹر سے تیس میٹر تک کی گہرائی میں پائے جاتے ہیں۔ لنکا اور ہندوستان کے درمیان خلیج منار میں بھی موتی کی ماہی گیری ہوتی ہے اور یہاں چھوٹے قسم کے موتی دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بحر قلزم میں جدہ اور خراسان کے درمیان بھی پہلے موتی دستیاب ہوتے تھے جو کہ بہت سفید ہوتے تھے لیکن اب یہاں موتی نہیں نکلتے ہیں۔ کراچی کے ساحل پر بھی چھوٹے پیمانے پر موتی کی ماہی گیری ہوتی ہے۔ آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر خلیج شارک میں بیس گرین وزن تک کے موتی ملتے ہیں۔ ان میں ہلکی زردی ہوتی ہے۔ انڈونیشیا جزائر فلپائن اور وینیز ویلا کے ساحل پر بھی موتی کی ماہی گیری کی جاتی ہے۔ سمندری صدف کے علاوہ بعض دریائی صدف اور گھونگھے بھی موتی بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ موتی نفیس نہیں ہوتے جیسے اسکاچ موتی وغیرہ موتی کے وزن کا پیمانہ گرین ہے جو کہ ایک قراط کا چوتھائی ہے۔

مورگنائیٹ یا گلابی بیرل (Morganite)

یہ گلابی رنگ کا شفاف بیرل ہے۔ اس کے قلم بہت شفاف صاف اور خوش رنگ ہوتے ہیں۔ یہ عموماً چپٹی ٹکیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ تراشنے کے بعد اس کے نگ بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اوسط قسم کے جواہرات میں شمار ہوتا ہے۔ مڈاگاسکر اور کیلیفورنیا میں اچھے قسم کے مورگنائیٹ پائے جاتے ہیں۔

مونگا یا مرجان (Coral)

یہ ایک عام نامیاتی جواہر ہے جو غیر شفاف ہوتا ہے لیکن اپنے خوشنما رنگوں کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ مونگے کی درجہ سختی ۳٫۲۵ اور ثقل اضافی ۲٫۶۵ ہوتی ہے۔ مونگے کے رنگ مختلف ہوتے ہیں جیسے سرخ گلابی زرد، سفید جوگیا شنگرفی گلناری پیازی اودا۔ لاکھی وغیرہ۔ کسی زمانہ میں سرخ مونگے کی سب سے زیادہ قدر تھی۔ آج کل کندرو کے رنگ کا مونگا سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ مونگا بعض علاقوں کے سمندروں میں پایا جاتا ہے اور ایک خاص قسم کے سمندری کیڑوں کے جسم سے خارج شدہ مادّہ ہے جن کی بڑی بڑی چٹانیں ملتی ہیں مونگے کی چٹانیں جھاڑیوں سے مشابہ ہوتی ہیں جو جڑ کے پاس موٹی گنجان ہوتی ہیں اور اوپر کی طرف عام جھاڑیوں کی طرح ان میں شاخیں ہوتی ہیں جن کو شاخ مرجان کہتے ہیں۔ مونگے کی افزائش کے لیے مناسب درجہ حرارت سمندری پانی میں خاص مقدار کا کھاری پن اور مخصوص گہرائی ضروری ہے جو ہری قدر و قیمت کا مونگا سب سے زیادہ بحیرۂ روم سے نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جزائر جاپان اور آسٹریلیا کے ساحل پر بھی مونگا دستیاب ہوتا ہے۔ مونگے کی سب سے اچھی تراش اور جلا دائی کا مرکز نیپلس (اٹلی) ہے۔ مختلف علاقوں کے سمندروں کے مونگوں کے رنگوں میں قدرے فرق ہوتا ہے اور رنگ کے اعتبار سے ان کے ماخذ کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً سرخ رنگ کا مونگا بحیرۂ روم میں اسپین کے ساحل کے قریب ملتا ہے اور سیاہ رنگ کا مونگا آسٹریلیا کے ساحل اور خلیج فارس میں پایا جاتا ہے۔

نیلم (فارسی، یاقوت، کبود) (Sapphire)

نیلم نیلے رنگ کا کرنڈ ہے اور بہت مقبول جواہر ہے۔ یہ ہلکے نیلے سے گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے لیکن درخشاں نیلے رنگ کا نیلم سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ نفیس قسم کے نیلم میں قدرے مخملی چمک ہوتی ہے۔ لعل کے مقابلہ میں نیلم کے قلم بڑے دستیاب ہو جاتے ہیں نیلم کا سب سے بڑا قلم جو ابھی تک دستیاب ہوا ہے اس کا وزن ۴۴ پاؤنڈ تھا اور یہ لنکا میں ملا تھا۔ دنیا میں سب سے نفیس قسم کے نیلم ہندوستان کے صوبہ جموں و کشمیر میں پاڈر کے مقام پر دستیاب ہوئے ہیں اس کے علاوہ برما، تھائی لینڈ اور لنکا بھی نیلم کے لیے مشہور رہیں۔ کوئنس لینڈ، رہوڈیشیا، مونٹانا (امریکہ) میں بھی نیلم پائے جاتے ہیں۔ تالیفی نیلم بھی بنائے جاتے ہیں۔

ویڈوریم

دیکھیے ہسنیہ

ہلیاڈور یا سنہرا بیرل (Heliodor or Golden Beryl)

یہ لیموں کے رنگ کا یا سنہرے رنگ کا مرکب ہے اور اس کے قلم، تراش کر جواہرات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بہت معمولی جواہر ہے۔ یہ برازیل، مڈاگاسکر، جنوب مغربی افریقہ اور شمالی امریکہ میں کئی مقامات پر پایا جاتا ہے۔

ہیرا (فارسی۔ الماس، سنسکرت۔ ہیرک، انگریزی۔ ڈائمنڈ)

ہیرا تمام جواہرات میں ممتاز ترین جواہر ہے ندرت سنگینی و پائیداری شفافی و بے جری کلانی و خوش اندائی تمام خصوصیات اس جواہر میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی کیمیائی ماہیئت خالص کاربن ہوتی ہے۔ یہ قلمائی ہوئی صورت میں پایا جاتا ہے اس کے قلم شفاف ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات نیم شفاف یا غیر شفاف حالت میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جوہری قدر و قیمت کے ہیرے عموماً بے رنگ ہوتے ہیں۔ بعض ہلکے رنگوں کے زرد نیلگوں یا سرخی مائل ہیرے بھی جواہرات کے طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔ جو ہیرے غیر شفاف و سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں وہ صنعتی کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور (Bort) یا صنعتی (Industrial Diamond) کہلاتے ہیں۔ جن ہیروں میں ہلکے زرد رنگ کی جھلک ہوتی ہے انہیں بناسپتی کہتے ہیں اور جن ہیروں میں اگرئی یا ملاگیری رنگ جھلکتا ہے انہیں تیلیا کہتے ہیں

ہیرے کا استعمال زمانہ قدیم سے ہو رہا ہے کیوں کہ یونانی دیوتا کی ایک مورتی میں جو ۴۸۰ سال قبل مسیح کی ہے اس کی آنکھوں میں ہیرے جڑے ہیں ہیرے کی دریافت غالباً آٹھ سو سال قبل مسیح میں ہندوستان میں ہوئی۔

ہیرے کی درجہ سختی ۱۰ انعکطاف نما ۲٫۴۱۹۵ مقدار انتشار ۰٫۰۴۴ اور ثقل اضافی ۳٫۵۱۶ سے ۳٫۵۲۵ ہوتی ہے۔ درجہ سختی کے اعتبار سے ہیرا سخت ترین جواہر ہے اس لیے ہیرے کے تراشے ہوئے نگوں کے کنارے استعمال پر نہیں گھستے ہیں اور بہت پائیدار ہوتے ہیں۔ پہلے ہیرا صرف ہندوستان میں ہی دستیاب ہوتا تھا اور یہاں شہر حیدر آباد سے ملحق قطب شاہوں کے پایۂ تخت گول کنڈہ (موجودہ آندھرا پردیش کا ایک مقام) کے علاقہ میں خیال ہے کہ باقاعدہ کان کنی ہوتی تھی اس کا تذکرہ ٹیورنیر نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔ لیکن غالباً یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ آج باوجود تلاش کے یہ کانیں دریافت نہ ہو سکیں ہیں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گول کنڈہ یا تو صرف ہیروں کا ایک مشہور بازار تھا یا یہاں ہیرے کاٹنے کا کام ہوتا تھا جب کہ بغیر کٹا ہوا ہیرا باہر کہیں سے آتا تھا۔ اور ۱۷۲۱ء میں برازیل میں ہیرے کی دریافت ہوئی اور ۱۸۷۰ء تک یہاں سے کافی تعداد میں ہیرے حاصل کیے گئے لیکن اب یہاں بھی بہت کم ہیرے نکلتے ہیں۔ ۱۸۶۶ء میں افریقہ میں ہیرے کی دریافت ہوئی اور یہاں کئی مقامات پر ہیرے کے لیے کان کنی ہوئی ہے جس میں کمبرلے، آرنج، فری اسٹیٹ ٹرانسوال، پریٹوریا، بلجیم کانگو، انگولا، سیرالیون، گھانا، ٹنگا نائیکہ وغیرہ مشہور ہیں اور دنیا کا سب سے بڑا ہیرا کلی نن (وزن ۳۱۰۶ قراط ۱۹۰۵ء ٹرانسوال کی پریمیم کان سے دستیاب ہوا تھا۔ آج کل ہندوستان میں بہت تھوڑی مقدار میں ہیرے دستیاب ہوتے ہیں اور ان کے لیے مدھیہ پردیش میں پنا کے علاقہ میں کان کنی کی جاتی ہے۔ روس، امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی ہیرے کی دریافت ہوئی ہے لیکن یہاں عموماً صنعتی قسم کے ہیرے پائے جاتے ہیں۔

دنیا کے بعض مشہور تاریخی ہیرے یہ ہیں۔ کوہ نور (موجودہ وزن ۱۰۸٫۹۳ قراط) ریجنٹ یا پٹ (وزن ۱۳۷ قراط) یہ دنیا کا سب سے نفیس اور قیمتی ہیرا تصور کیا جاتا ہے۔ جیکب ڈائمنڈ

تقریباً ۱۸۰ قراط وزنی) سابق نظام حیدر آباد کے جواہرات میں سب سے قیمتی ہیرا ہے آرلوف یا ایمسٹرڈم (وزن ۱۹۸٫۸ قراط) سینسی ۵۳ ½ قراط) ہوپ (وزن ۴۴٫۵ قراط) یہ سبزی مائل نیلگوں رنگ کا ہیرا ہے اور دنیا کا سب سے منحوس ہیرا تصور کیا جاتا ہے۔ فلورنٹائین (وزن ۱۳۳ ⅕ قراط) پیکوٹ (وزن ۴۸ ½ قراط) شاہ ہرا (وزن ۸۸٫۷ قراط) ہیرے کی تراش اور جلا دانی کے لیے ایمسٹرڈم مشہور ہے۔ یوں تو اب اسرائیل میں یہ کام بہت زور و شور سے شروع ہو گیا ہے۔ کچھ عرصے ہندوستان میں ہیرے کی کٹائی کا کام عروج پر ہے اور بمبئی، جے پور اور بنارس میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔

یاقوت یا گارنٹ (Garnet)

یاقوت بہت مشہور جواہر ہے اور خوش رنگ یاقوت قیمتی جواہرات میں شمار کیے جاتے ہیں کیمیائی ماہئیت کے اعتبار سے یاقوت مختلف دھاتوں کے سلیکیٹ ہوتے ہیں جیسے کیلشیم، المونیم، لوہا، میگنیز، کرومیم وغیرہ اور اسی اعتبار سے ان کے مختلف نام بھی ہوتے اور مختلف خصوصیات بھی یہ شفاف سے غیر شفاف حالتوں میں پائے جاتے ہیں لیکن صرف شفاف یا نیم شفاف سرخ نارنجی یا سبز رنگ کے گارنٹ جواہرات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یاقوت سرخ سات طرح کا ہوتا ہے۔ رمانی، ارغوانی رادی، خمری، لمی، کبدری، عام گارنٹ گراسولر (Grossular) کہلاتا ہے یہ ہلکا ماشی، نارنجی یا دارچینی کے رنگ جیسا ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۷٫۲۵ اور ثقل اضافی ۳٫۶۷ ہوتی ہے۔ یہ گارنٹ زیادہ تر لنکا سے آتا ہے اور ہندوستان میں بہار کے گیا ضلع میں پایا جاتا ہے۔ لنکا کے قمری رنگ کے گارنٹ گوُمیدک کے نام سے فروخت ہوتے ہیں۔ حالانکہ اصلی گوُمیدک اسی رنگ کے زرقون ہوتے ہیں۔ ماشی رنگ کا گراسولر جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ جو یاقوت جواہرات کے طرز پر زیادہ استعمال ہوتا ہے وہ اس کی قسم پائروپ (Pyrope) ہے۔ گہرے سرخ، رمانی یا قرمزی رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ یاقوت زیادہ تر لنکا، چیکوسلواکیہ، رہوڈیشیا یا امریکہ میں دستیاب ہوتا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۷٫۲۵ اور ثقل اضافی ۳٫۷ سے ۳٫۸ کے درمیان ہوتی ہے المنڈ ایئن (Almandine) احموس رنگ کا ہوتا ہے۔ جس میں ہلکے اودے رنگ کی بھی جھلک ہوتی ہے۔ اسے یاقوت احمر کہتے ہیں۔ اس کی درجہ سختی ۷٫۵ اور ثقل اضافی ۳٫۹ سے ۴٫۲ کے درمیان ہوتی ہے پیکانی تراش کے ایسے نگوں کو تامڑا یا کاربنکل کہتے ہیں۔ یاقوت احمر زیادہ تر برازیل، اروگوئے، آسٹریلیا، مشرقی افریقہ، ٹمراکاسکر، الاسکا وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے یاقوت راجستھان اور آندھرا پردیش میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ملانائیٹ (Melanite) سیاہ رنگ کے غیر شفاف گارنٹ ہوتے ہیں جو اٹلی اور فرانس میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ماتمی جواہر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مومیانائٹ خوشنما سبز رنگ کے شفاف گارنٹ ہوتے ہیں۔ ان میں الماسی چمک پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔ ان کی درجہ سختی ۶٫۵ اور ثقل اضافی ۳٫۸۹ ہوتی ہے۔

یاقوت زرد

دیکھیے پکھراج

یاقوت کبود

دیکھیے نیلم

یشب یا جیڈ (Jade)

یہ بہت مشہور جواہر ہے جو عموماً سبز، انگوری، سفید مائل بہ حنا کی رنگوں کے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات اودے، بنفشی، نارنجی اور سرخ رنگ کے یشب پائے جاتے ہیں۔ یہ نیم شفاف سے غیر شفاف حالتوں میں ملتے ہیں اور ان کی کیمیائی ماہئیت سوڈیم اور المونیم کا سلیکیٹ ہوتی ہے۔ ان کی درجہ سختی ۶٫۵ سے ۷٫۰ اور ثقل اضافی ۳٫۲ سے ۳٫۴۴ ہوتی ہے۔ یہ جواہر زمانہ قدیم سے رائج ہے اور اہل چین یشب کو باقی تمام جواہرات سے ممتاز سمجھتے ہیں۔ یشب کی اندرونی ساخت باریک ریشہ دار ہوتی ہے اور یہ ریشے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں اس لیے اس کی تراش میں بہت دشواری ہوتی

ہے۔ زرد مائل لیشب کو کپوری کہتے ہیں بعض لیشب میں سفید رنگ کے دھبے ہوتے ہیں یہ اس کی وقعت کم کر دیتے ہیں۔ عمدہ لیشب وہ ہوتے ہیں جن کا رنگ سبز ہو اور یکساں ہو۔ لیشب کو تراش کر مختلف قسم کی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ لیشب کی سب سے اچھی تراش چین میں ہوتی ہے۔ سب سے نفیس قسم کا لیشب شمالی برما میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی چین، تبت، نیوزی لینڈ، میکسیکو وغیرہ میں بھی لیشب دستیاب ہوتا ہے۔

یشم یا جیسپر (Jasper)

یہ غیر شفاف قسم کا پتھر ہے جس کی کیمیائی ماہیت خورد قلمی سلیکا ہے۔ اس کی درجہ سختی ۷ء۰ ہوتی ہے۔ یہ عموماً عنابی رنگ کا ہوتا ہے لیکن سرخ شنگرفی ہلکا سبز، بھورا، زرد کاہی اکسری نیلگوں رنگوں کے یشم بھی ہوتے ہیں یہ بہت معمولی قسم کے پتھروں میں شمار ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم سے اسے جواہرات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مصر کے یشم میں زرد اور بھورے رنگ کی غیر یکساں آمیزش ہوتی ہے ان کو مصری یشم کہتے ہیں۔ یشم بہت ممالک میں پایا جاتا ہے لیکن خوش نما رنگوں کے یشم کے ذخائر امریکہ، جرمنی اور سسلی میں ہیں۔

وہ قیمتی پتھر جو حال کی دریافت ہیں

زمانۂ حال کی دریافت ایک قیمتی جماد (Brazilian Tine) یہ پیلا پتھر ہے جو بہت خوبصورت ہوتا ہے ۱۹۴۴ء میں دریافت ہوا (Consel-Hiera Pana) کے مقام پر جو برازیل میں واقع ہے۔

زوایسائیٹ (Zoisite)

زوایسائیٹ کی شفاف نیلی اور ارغوانی قسمیں ۱۹۶۸ء میں تنزانیہ میں ملیں۔ اس سے پہلے ۱۸۰۶ء سے زوایسائیٹ کی صرف غیر شفاف اور غیر قیمتی قسم کا ہی علم تھا۔ اس کا نیا نام تنزانائٹ رکھا گیا ہے

قیمتی پتھروں کے کاٹنے اور پالش کرنے کی صنعت بہت پرانی ہے۔ سری لنکا، بھارت (ترچناپلی اور سورت) اور آج کل امریکہ نے ایسی صنعت میں کافی ترقی کر لی ہے۔ انسانی کوششوں سے تو اب بہت سے قیمتی پتھروں کے متبادل مصنوعی پتھر بنائے جانے لگے ہیں خصوصاً یاقوت (Ruby) جس کے مختلف رنگ مصنوعی طور پر بنا لیے گئے ہیں صنعتی ہیروں کو چھوڑ کر دوسرے قیمتی پتھروں کو زمینی مخزن میں شمار کرنا مشکل ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ یہ بہت کمیاب ہوتے ہیں۔ اور ان کے حصول میں کوئی باقاعدہ معدنی ذرائع اور مشینوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ دوسرے قیمتی پتھروں کی پیداوار اور دریافت انفرادی شخصیتوں کی رہین منت ہوتی ہے اور یوں صحیح پیداواری اعداد کا حصول ایک مشکل امر ہے لیکن یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ قیمتی پتھر آنے والے زمانے میں انسانوں کو اپنے رنگوں اور قلمی شکلوں سے یوں ہی لبھاتے رہیں گے۔

انجینئرنگ

انجینئرنگ

انجنیری

(انجینئرنگ)

آبپاشی

تعریف

پودوں کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے جو نمی درکار ہوتی ہے یا اس کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے اس کو بہم پہنچانے کی غرض سے زمین کو قدرتی یا مصنوعی طور پر پانی ملنا چاہیے پانی کی اس فراہمی کو سینچائی یا آب پاشی کہتے ہیں۔

معمولاً پودوں کو قدرت بارش کے ذریعہ پانی دیتی ہے ایک اور قدرتی ذریعہ یہ ہے کہ طغیانی کے وقت ندیوں کا پانی کناروں پر دور دور تک پھیل کر زمین کے بڑے رقبوں کو سیراب کر دیتا ہے اور طغیانی گذر جانے کے بعد یہ زمین خشک موسم میں کاشت کے قابل ہو جاتی ہے کاشت کار بارش کے قدرتی عمل میں تھوڑا دخل دے کر اس سے مزید فائدہ حاصل کر سکتا ہے مثلاً اس طرح کہ کھیتوں کی مینڈھ کو اونچا کر کے بارش کے پانی کو کھیت میں دیر تک ٹھہرائے رکھے یا یہ کہ ندی کے کنارے بند باندھ کر ان میں موقع موقع سے تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ دے جہاں ضروری رقبوں کو پانی مل جائے۔

آب پاشی کے پانی کا اصلی منبع ترسیب (Precipitation) ہے یعنی وہ پانی جو زمین کو فضاء سے بارش یا برف باری یا اولوں یا شبنم کی شکل میں حاصل ہو۔ اس پانی کو استعمال کرنے کے لیے انجینیری کے وسائل اختیار کیے جائیں تو اس عمل کو مصنوعی آبپاشی یا اختصار میں محض آبپاشی کہتے ہیں۔

اٹھاؤ

آبپاشی اور بہاؤ (Flow)۔ آبپاشی مصنوعی آبپاشی دو قسم کی ہوتی ہے اٹھاؤ اور بہاؤ۔

اٹھاؤ (Lift) آبپاشی میں پانی کو ہاتھ سے یا میکانی طریقے سے اوپر کر کے کھیت میں پہنچایا جاتا ہے اور بہاؤ میں پانی منبع سے اپنے آپ بہ کر کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے۔

آبپاشی کے مضمون کا دائرہ عمل

آبپاشی کی تعریف سے ظاہر ہے کہ ایسا مضمون ہے جو انجینیری اور زراعت دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک منبع سے پانی حاصل کر کے اس کو کھیتوں تک پہنچانے کے لیے تعمیری بنانے اور ان کی نگہداشت کرنے کا تعلق ہے یہ انجینیری کی ایک شاخ ہے۔ اور جہاں تک فصلوں کو مناسب وقتوں میں اور مناسب مقداروں میں اور بہترین طریقے سے پانی دینے کا تعلق ہے یہ زراعت کے علم کا ایک حصہ ہے۔ لیکن آبپاشی کے کسی نظام کو صحیح اور باکفایت طریقے سے ڈیزائن کرنے کے لیے انجینیر کو آبپاشی کے زراعتی پہلو سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ جس رقبہ میں آبپاشی مقصود ہے اس کی فصلوں کو کتنا پانی درکار ہوگا اگر انجینیر کو یہ معلوم ہو تو وہ تالاب اور نہر کو کارآمد طور پر ڈیزائن کر سکے گا۔ اسی طرح آبپاشی کے کسی نظام کی نگہداشت کرنے اور اس کو چلانے والا انجینیر اس کے تحت کے رقبہ کی آبپاشی کی ضروریات سے باخبر ہو تو ہی وہ میسر پانی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے گا۔

ہندوستان میں جتنے بھی آبپاشی کے پراجکٹوں کی تعمیر ہوئی وہ تقریباً سب کی سب سرکاری طرز پر یعنی گورنمنٹ کی طرف سے ہوتی ہے۔ سرکار کی طرف سے کاشت کار کو اس کے کھیت کے نزدیک ایک خاص مقام تک پانی پہنچایا جاتا ہے اور پانی کو اس مقام سے آگے لے جانا اور کھیت کو سیراب کرنا کاشت کار کے ذمہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ملک کے عام مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے اور آبپاشی کے ذریعہ سرکار کو جو محاصل وصول ہوتا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ کھیت تک پانی کے پہنچنے میں اور اس کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے بارے میں بھی آبپاشی کے انجینیر دلچسپی لیں۔ بلکہ آبپاشی کے انجینیر کا فریضہ نہ صرف یہ ہے کہ فصل کے لیے جتنا پانی درکار ہے اس کی فراہمی کا انتظام کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ زائد پانی کی نکاسی کا اور جہاں ضرورت ہو وہاں آب بستگی (Water Logging) کو دور کرنے کا انتظام کرے تاکہ فصل خراب نہ ہونے پائے۔ اس سے یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ اگر زمین افتادہ یعنی بیکار پڑی ہوئی ہو یا اس میں کھار پیدا ہو گیا ہے اس کو پانی کے ذریعہ کاشت کے قابل بنائے۔ اس کے علاوہ پانی سے طاقت حاصل کرنا

ندیوں میں کشتی رانی، طغیانی کی روک تھام میں غرض ایسے تمام کام آبپاشی کے انجینیر کے ذمہ ہیں۔ ہمارے ملک میں اس مضمون میں اطلاقی ماقوائیات (Applied Hydraulic) کا پورا میلان شامل ہے۔

آبپاشی کے فائدے ایسے وقت میں جب کہ ملک کی آبادی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور اس کے لیے غذائی پیداوار کو بڑھا وا دینا اتنا ضروری ہوگیا ہے آبپاشی کے فائدے اور اس کی اہمیت خود ظاہر ہے پھر بھی آبپاشی کو ترقی دینے کے اہم فائدوں کو یہاں بیان کر دیا جاتا ہے۔

قحط کی روک تھام اس ملک میں آبپاشی کا یہ سب سے اہم کام ہے۔ اگرچہ کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں کافی بارش ہوتی ہے لیکن یہ بارش زیادہ تر موسمی اور اکثر بے قاعدہ ہوتی ہے۔ کسانوں کا معیار زندگی بہت پست ہے اور ان کے پاس معمولی زمانے میں بھی جب کہ بارش ٹھیک ہو کچھ نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر ایک سال بھی بارش نہ ہو یا بہت کم ہو تو پریشانی ہو جاتی ہے۔ اور اگر مسلسل دو سال بارش نہ ہو تو سخت کال پڑ جاتا ہے۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگتے ہیں سوائے اس کے کہ آبپاشی کے ذریعہ کھیتی کا انتظام کیا گیا ہو۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان میں آبپاشی کے جو پراجکٹ تعمیر کیے گیے وہ زیادہ تر اسی غرض سے تعمیر کیے گئے۔

پیداوار اور اس کی قیمت میں اضافہ
کھیتوں کو پانی مناسب اور سائنٹفک طریقہ سے دیا جائے تو پیداوار میں کافی اضافہ ہوتا ہے کسی خاص مقام پر کسی خاص فصل کو کتنا پانی دیا جائے تاکہ بہترین نتائج حاصل ہوں یہ تجربہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے اس سے کم دیا جائے یا زیادہ دیا جائے تو دونوں صورتوں میں پیداوار گھٹ جائے گی۔ اگر پانی پہنچانے کا مستقل اور باقاعدہ انتظام ہو تو ادنیٰ قسم کے بجائے اعلیٰ قسم کی فصل اگائی جاسکتی ہے جس کی قیمت زیادہ ہوگی۔ چنانچہ آبپاشی کا انتظام ہو جائے تو جو کے بجائے گیہوں کی فصل ہوسکتی ہے اور گنا، چاول اور تمباکو لگایا جاسکتا ہے اور مخلوط کاشت کے طریقہ کو بالکل ختم یا کم کیا جاسکتا ہے۔

مخلوط کاشت یعنی ایک ہی کھیت میں ایک سے زیادہ قسم کی کاشت کے طریقہ کو کاشت کار اس لیے اختیار کرتا ہے کہ موسم کے اثرات سے اگر ایک قسم متاثر ہو کر خراب ہو جائے تو ممکن ہے دوسری متاثر نہ ہو اور اس طرح کھیت سے کچھ تو پیداوار حاصل ہو جائے گی۔ اگر آبپاشی کا انتظام ہو جائے تو ظاہر ہے کہ پھر مخلوط کاشت کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

مخلوط کاشت زراعت کا ایک فرسودہ طریقہ ہے۔ کیونکہ ایک تو ہر الگ قسم کی کاشت کو کھیت کی الگ تیاری، الگ کھاد اور الگ طریقے سے پانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک ہی کھیت میں دو قسم کی فصلیں ایک ہی ساتھ بوئی جائیں تو کھیت کی تیاری دونوں کے لیے موزوں نہیں ہوسکتی دوسرے یہ کہ فصلیں کاٹتے وقت کتنی ہی احتیاط کی جائے دونوں کی پیداوار کچھ نہ کچھ مخلوط ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بازار میں ان کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔

ملک کی دولت میں اضافہ ہندوستان میں آبپاشی کے جتنے نظام ہیں تقریباً سب کے سب مالی اعتبار سے تشفی بخش ہیں اور ملک کیلئے آمدنی کا ذریعہ ہیں مثلاً اپر گنگا کنال (گنگا کی اعلیٰ نہر) لگاتے ہوئے سرمایہ ½ ۱۰ فی صد کا منافع دیتی ہے۔ اس طرح کاشت کار کی دولت اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دیہات کا دورہ کریں تو جن گاؤں کو نہر کا پانی میسر ہے اور جن کو میسر نہیں ہے ان کا فرق صاف نظر آجاتا ہے۔ نہر والے گاؤں میں پختہ مکانوں، تنو مند جانوروں اور اسکول جانے والے بچوں کی تعداد بے نہر کے گاؤں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ آبپاشی کے ذریعہ زمین کی قیمت جو بڑھ جاتی ہے اس سے زمین کے مالک کو اور سرکار کو دونوں کو فائدہ ہوتا ہے کیونکہ سرکار ایسی زمین سے زیادہ محاصل وصول کرتی ہے۔

پن بجلی: (Hydro Electric) طاقت کی پیدائش جو پروجکٹ صرف آبپاسی کے لیے بنائے گئے ہوں ان سے بھی تھوڑا اور خرچ کرکے بجلی پیدا کی جاسکتی ہے مثلاً گنگا کنال اور ساردا کنال فقط آبپاشی کے لیے بنائی گئی تھیں۔ اور اب ان سے تقریباً اسی ہزار کلو واٹ بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ نئے پراجکٹوں کی منصوبہ بندی میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ شروع ہی سے آبپاشی کے علاوہ بجلی بھی حاصل ہو۔

اندرون ملک کی کشتی رانی: آبپاشی کی نہریں اندرونی کشتی رانی کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہیں۔ بعض وجوہ سے ہندوستان میں یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سامان کی نقل و حرکت کے لیے یہ سب سے سستا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور سامان کی منتقلی کاریلوں پر جو بار بڑھتا جارہا ہے وہ بھی بڑی حد تک ہلکا ہوسکتا ہے۔ جن علاقوں میں یہ ممکن ہو وہاں نہروں کے ذریعہ جہاز رانی کو منصوبہ بندی (پلاننگ) کے وقت ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

آبادیوں کی صحت پر اثرات: نہروں کے ذریعہ جو آبپاشی ہوتی ہے اس کا راست اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اگر احتیاطی تدبیریں اختیار نہ کی گئیں تو وہ علاقہ مرطوب ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے ملیریا پھیلتا ہے۔ یہ احتیاطی تدبیریں ضرور اختیار کرنا چاہیے مثلاً پانی کی نکاسی (Drainage) کا انتظام کیا جائے اور زمین گڑھے (Borrow Pit) اناپ شناپ نہ کھودے جائیں۔ اس طرح یہ مضر اثرات بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں صحت پر بالواسطہ اثر یہ پڑتا ہے کہ غذائی پیداوار بڑھ جانے سے لوگوں کو کافی غذا میسر آتی ہے۔ اور ان کی بیماری کے مقابلے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ آبپاشی کے مضر اثرات پر یہ مفید اثرات غالب آجاتے ہیں۔

گھریلو آب رسانی: بعض علاقوں میں جہاں کنویں بہت کم ہیں اور ان میں پانی بہت نیچے ہے گھریلو استعمال، پینے، تیرنے اور سیر و تفریح کے لیے نہریں ہی سہولت سے پانی فراہم کرتی ہیں۔

آمد و رفت کی سہولت: تمام بڑی نہروں کے کنارے کنارے ایک کچی سڑک بنا دی جاتی ہے۔ جس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ نہروں کا معائنہ کیا جاسکے اور پانی کی تقسیم پر کنٹرول رکھا جاسکے ان کی وجہ سے ان کچی سڑکوں پر عام آمد و رفت کی اجازت تو نہیں ہوتی مگر بعض اوقات اندرونی علاقہ میں جانے کے لیے ان کے سوائے کوئی موٹر کی سڑک ہوتی ہی

نہیں تو بھی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ یہ سڑکیں اور نہر کے بند گاؤں والوں کے لیے پیدل چلنے یا سائیکل چلانے کے بھی کام آتے ہیں کیونکہ اس کی ممانعت نہیں ہوتی۔

نہر کے شجر زار :۔ نہروں کے کناروں کے ساتھ ساتھ اور چنائی کی تعمیروں کے پاس اور جہاں بھی کھلی جگہ مل جاتے درخت لگائے جاتے ہیں ۔ ان درختوں سے ملک کے جو بیقہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور زمین کے کٹاؤ کی بھی روک ہوتی ہے۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ درخت کھیتوں کے اتنا نزدیک نہ لگائے جائیں کہ ان سے فصل کو نقصان پہنچے۔

ہندوستان میں آبپاشی کی ترقی

ہندوستان میں صلاحیت ہے کہ دنیا کے سب سے مالدار زراعتی ملکوں میں اس کا شمار ہو جائے اندازہ ہے کہ ہمارے ملک میں کاشت کے قابل زمین ۱۴۷ ملین ہیکٹر (۱ ہیکٹر = ۲۰۴۷ ایکڑ) سے کم نہیں جو دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اس سے زیادہ کاشت کے قابل زمین دو ہی ملکوں میں ہے یعنی یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں ۲۲۴ ملین ہیکٹر اور یو۔ ایس۔ اے میں ۱۹۳ ملین ہیکٹر ملک کے جغرافی رقبہ سے کاشت کے قابل زمین کا تناسب ہندوستان میں ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ تناسب ۴۵ فیصد ہے۔ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں صرف ۱۰ فیصدی اور یو۔ ایس۔ اے میں ۲۰ فیصدی۔

ہندوستان میں کنوؤں اور تالابوں اور نہروں سے آبپاشی کا رواج بہت قدیم زمانے سے ہے۔ البتہ بڑے پراجکٹ انگریزوں کے انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوتے اور اس کے بعد ترقی ہوتی گئی۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد آبپاشی کے کاموں میں بہت تیزی سے ترقی ہونے لگی ہے۔ ہر پنج سالہ منصوبہ میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ندیوں کا ممکنہ استعمال کیا جائے اور ایک کے بعد ایک مختلف وادیوں کو ترقی دی جائے اس کے لیے کثیر مقصد پراجکٹ بنائے جا رہے ہیں۔ حالیہ پراجکٹوں کی ایک قابل ذکر مثال بھاکرا بند یا ناگرجنا بند ہے۔

آب رسانی

آب رسانی کی ضرورت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد یہ ہیں کہ اس سے صحت پر عمدہ اثر پڑتا ہے آرام ملتا ہے تجارتی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور آبادی بعض مہلک بیماریوں سے محفوظ رہتی ہے۔

آبرسانی کا اولین مقصد پینے کے لیے اور بدروؤں کی صفائی کے لیے دوسرے گھریلو اور عوامی اغراض کے لیے تیسرے صنعتی کارخانوں کے لیے چوتھے آگ بجھانے کے لیے پانی فراہم کرنا۔

کسی ملک کے تہذیب و تمدن کے معیار کو اس کی آب رسانی کے انتظام سے جانچا جاتا ہے۔ بڑے شہروں کے لیے پانی ان تمام اغراض کے لیے مہیا کیا جاتا ہے جن کا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے چھوٹی بستیوں کے لیے مالیہ کی کمی کی وجہ سے جملہ اغراض کے لیے پانی بہم پہنچانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے صحت کی برقراری اور بہتری کے لیے کم از کم پینے کے لیے پاک صاف پانی مہیا کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ آئے دن ہیضہ جیسے تباہ کن متعدی مرض کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے جن کی اصل وجہ خراب پانی کا استعمال ہے۔ جوں جوں مواضعات اور قصبوں کی آبادی میں اضافہ ہو اور مالیہ کی فراہمی بھی ہو اور دیگر اغراض کے لیے بھی پانی کی ضروری مقدار مہیا کی جا سکتی ہے۔

روئے زمین پر تازہ پانی کی جملہ مقدار سمندر کے پانی کے حصے کے برابر ہے جو تین سو ملین مکعب میل ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جب انسان تہذیب و تمدن اور علم و ہنر سے آراستہ نہ تھا تو وہ پانی کی سہولت کے لیے ندیوں نالوں اور چشموں کے کنارے بستا تھا اور پانی کے سرچشمہ سے دور بسنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

رومی پہلے لوگ تھے جنہوں نے کوئی ساٹھ میل لمبی آب گزار 'اکویڈکٹ' (AQUEDUCT) کے ذریعہ روم تک پانی پہنچایا تھا۔

گزشتہ پچاس سال سے پانی کا استعمال غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ امریکہ میں فی کس روزانہ ۱۰۰ تا ۱۵۰ گیلن پانی بحساب دو سنٹ (CENT) فی ۱۰۰ گیلن مہیا کیا جاتا ہے جس میں کوئی تین کروڑ ڈالر کا صرفہ عاید ہوتا ہے۔

اس میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں کہ پانی کافی مقدار میں مہیا کیا جائے اور وہ ہر قسم کی آلودگی اور گندگی سے پاک و صاف ہو۔

جب کسی بستی کے لیے پہلی دفعہ آبرسانی کی اسکیم بنائی جاتی ہے تو فی کس مقدار آب متعین کرنے کے لیے اس آبادی کے رہن سہن کے طریقے گھریلو اور عوامی ضروریات اور کارخانوں کی ضرورت کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ نیز گزشتہ تجربوں یا قرب و جوار کے شہروں کو مہیا کی جانے والی مقدار کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے ترقی یافتہ شہروں کے لیے فی کس چالیس گیلن پانی فراہم کیا جانا چاہیے۔ ضرورتاً یہ مقدار پچیس گیلن فی کس تک گھٹائی جا سکتی ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خزانہ آب میں کس قدر مدت کے لیے پانی جمع کیا جائے اس کے لیے بھی کافی تجربہ کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا انحصار محل وقوع آب و ہوا جغرافیائی حالات وغیرہ پر ہوتا ہے۔ مثلاً سرد ممالک میں ۱۲۰ دن سے لے کر ۲۵۰ دنوں کے لیے پانی جمع رکھنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ گرم ممالک میں اس مقدار کو دوگنا تگنا کرنا پڑتا ہے۔ پانی کی مقدار جو ضائع ہوتی ہے اس کو بالکلیہ روک دینا ناممکن ہوتا ہے۔ مگر اس پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ مثلاً خزانۂ آب سے کچھ پانی بخارات بن کر ضائع ہونا لازمی ہے۔ البتہ زمین میں انجذاب اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پانی پہنچانے میں نقصان کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ خزانہ آب کی تجویز کے وقت تبخیر مدنظر رکھ کر مناسب زائد گنجائش رکھی جانی چاہیے۔ تقسیم آب کے دوران پانی اتنا زیادہ ضائع نہیں ہوتا اور اگر اس پر موثر نگرانی رکھی جائے تو پانی کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

سب سے اہم غور طلب جز پانی کی صفت ہے۔ پانی نہ صرف منبع (Source) کے پاس ہی عمدہ وصف اور خاصیت کا ہونا چاہیے بلکہ اس کو استعمال کرنے والوں کو بغیر کسی آلودگی کے پہنچایا جانا چاہیے یہ صحیح ہے کہ چھوٹے چھوٹے نقائص کو بعض دواؤں کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے اور تجربہ کار عملہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے حتی الامکان قدرتی طور پر حاصل ہونے والے خالص پانی کو آب رسانی کی اسکیم کے لیے اختیار کیا جانا چاہیے تاکہ معمولی توجہ سے وہ قابل استعمال ہو سکے۔ اچھے پانی کے طبعی خواص یہ ہوتے ہیں کہ وہ بے رنگ ہو بے بو ہو اور بد ذائقہ گدلا اور تلچھٹ لیے ہوئے نہ ہو۔ وہ صاف اور چمکدار دکھائی دے۔ اس کی حرارت اتنی ہو کہ پینے سے تازگی محسوس ہو۔ یوں تو سارا پانی بارش سے ہی حاصل ہوتا ہے یعنی جو قدرتی طور پر پانی کے بخارات اٹھتے اور کرہ ہوائی میں منجمد ہو کر بارش کی شکل میں پانی دوبارہ زمین پر واپس ہوتا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بارش کا پانی کرہ ہوائی میں سے گزر کر زمین پر پہنچنے سے پہلے خالص ہی ہوتا ہے لیکن ہوا اور زمین میں جراثیم ہوں تو ظاہر ہے کہ پانی صاف نہیں ہو سکتا نیز زمین کے اوپر اور زمین کے اندر اگر مضر صحت نمک ہوں تو پانی میں ان کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ آب رسانی کے انجینئر کا یہ کام ہے کہ پہلے وہ پانی کے طبعی خواص کا امتحان کرے جب ان سے اطمینان ہو جائے تو اس مقام کا بڑے غور و خوض سے معائنہ کرے جہاں سے پانی حاصل کیا جائے گا لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی کیوں کہ یہ صرف ابتدائی مرحلہ ہے اس کے بعد کا قدم مختلف طریقوں سے پانی کا امتحان کرنا ہوتا ہے یعنی کیمیائی جراثیمی اور خوردبینی امتحان۔ یہ سب ایک ماہر کیمیا دان کے ذریعہ کرانا چاہیے اور اسی کی رائے کی بنا پر اس پانی کا استعمال کرنا یا نہ کرنا منحصر ہوتا ہے۔

کسی اسکیم کی عمل آوری کے وقت یہ امر بھی پیش نظر ہونا چاہیے کہ اس کی توسیع کے کافی امکانات ہوں کیوں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور کارخانوں اور صنعتوں میں بھی اضافہ ناگزیر ہے۔

ذرائع آب آب رسانی کے لیے حسب ذیل ذریعوں میں سے کوئی ایک ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے ۱۔ باولیاں ۲۔ بورنگ ۳۔ ذخیرہ آب ۴۔ چشمہ یا ندیاں ہر صورت میں ذریعہ آب کا ہر قسم کی آلودگی سے ممکنہ حد تک پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آلودگی صفر تک پہنچ جائے اس لیے مختلف مضر اشیا کی حسب ذیل حد تک موجودگی کی اجازت دی جا سکتی ہے آزاد امونیا ۸ ۔۰۰ ا حصے فی لاکھ حصے بہ لحاظ وزن۔ البومینائڈ امونیا ۱۔۰ حصے فی لاکھ حصے لیکن زہریلی دھاتیں اور بیماریاں پھیلانے والے جراثیم بالکل صفر ہونے چاہئیں۔ باولیوں کے معاملے میں یہ امر پیش نظر رہے کہ وہ کافی گہری ہوں اور کسی گندہ یا آلودہ مقام سے قریب نہ ہوں۔ سطح زمین کا پانی ان میں جھڑ کر نہ جاتا ہو۔ ذخیرہ آب کے آب گیر رقبہ (Catchement Area) میں حتی الامکان کاشت نہ کی جاتی ہو اور لوگ بود و باش نہ کرتے ہوں۔

ہمارے ملک کی ندیوں کو تو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھنا چاہیے لیکن ان سے آب رسانی کے لیے حاصل کیے جانے والے پانی کو ضروری دواؤں کی آمیزش سے پینے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ پانی کے حاصل کرنے کے ذریعہ کو منتخب کرنے کے بعد اس کو صاف کرنے اور پینے کے قابل بنانے کے طریقہ کار کو طے کرنا ضروری ہے۔ جو پانی باولیوں بورنگ اور چشموں سے حاصل کیا جائے اس کو ان بڑے بڑے حوضوں جن میں پانی جمع ہو کر تلچھٹ پوری طرح بیٹھ جائے۔ لیکن جو پانی ذخیرہ آب سے یا ندیوں سے حاصل کیا جائے اس کے لیے تلچھٹ کو دور کرنے اور مقطر کرنے کے لیے حوضوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کو تلچھٹی حوض (Settling Tank) کہتے ہیں ان حوضوں کی اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ پانی کو کچھ عرصہ کے لیے اس میں ساکن رہنے دیا جائے نہایت ہی سست رفتار سے ان میں گزارا جائے تو پانی میں جو کچھ مادہ معلق رہتا ہے وہ تہ نشین ہو جاتا ہے۔ پانی کو چھاننے سے قبل یہ عمل نہایت ضروری ہے۔ ان کی گنجائش کم از کم اتنی ہونی چاہیے کہ ایک دن کی ضرورت کا پانی جمع کیا جا سکے۔

تقطیری حوض (Filter Tank) رسوبی یا تلچھٹی حوضوں سے گزر کر پانی تقطیری حوضوں میں داخل ہوتا ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) سست رفتار ریت والی قسم (۲) تیز رفتار میکانیکی قسم تقطیری شرح۔ اس کا انحصار استعمال کی جانے والی ریت اور تقطیری تہوں کی دبازت پر ہوتا ہے بالعموم پانچ فٹ کی موٹی تہ سے جس کا نصف حصہ ریت ہوتی مربع گز ۸۳ ۱۔ مربع میٹر) رقبہ روزانہ ۴۵۰ گیلن (۲۰۲۵) لیٹر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

۱۔ سست رفتار تقطیری حوض۔ ان حوضوں کے پورے فرش پر سیمنٹ، اینٹوں کی دو تہیں اس طرح جمائی جاتی ہیں کہ ایک دوسرے کے درمیان کافی جگہ رہے جس میں سے پانی بغیر رکاوٹ کے بہ کر ایک بڑی نالی میں جا گرتا ہے جہاں سے وہ تقطیری حوض کو پہنچایا جاتا ہے۔ اینٹوں کی موٹائی کوئی چھ انچ ہوتی ہے جن پر حسب ذیل اشیا بچھائی جاتی ہے۔

- ۶ انچ موٹی کنکر یا مٹی کی تہ جو خود دو یا تین انچ موٹا ہو۔
- ۶ انچ موٹی موٹی بجری کی تہ
- ۶ انچ موٹی باریک بجری کی تہ
- ۶ انچ موٹی ۔ موٹی ریت کی تہ
- ۶ انچ موٹی نہایت باریک ریت کی تہ۔

اس طرح جملہ موٹائی چار فٹ چھ انچ ہوتی ہے۔

(۲) تیز رفتار حوض۔ ایسے حوضوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو جاذبہ (Gravity) کے تحت کام کرنے والے دوسرے دباؤ (Pressure) کے تحت کام کرنے والے۔

جن مقامات پر بڑی بڑی مقدار میں پانی فراہم کیا جاتا ہے تقطیری حوضوں کی تیز رفتار قسم نہایت کارآمد اور سستی ثابت ہوتی ہے کیوں کہ

اس میں پانی کے معلق مادہ کو فوری طور پر بستہ کرنے کے لیے پھٹکری کی بہت کم مقدار ملائی پڑتی ہے۔ آج کل اس نوعیت کے مختلف بناوٹ کے متعدد اقسام زیر استعمال ہیں۔ ان کے استعمال کا عام طریقہ حسب ذیل

خام پانی میں فی گیلن — تا ۲ گرین بستہ کرنے والا (Cogulant) مادہ جو بالعموم امونیا کا سلفیٹ ہوتا ہے۔ ملایا جاتا ہے اس کے بعد اس کو چار تا چھ گھنٹے چھوڑا جاتا ہے تاکہ پانی کا معلق مادہ نیچے بیٹھ جائے اس کے بعد پانی کو تقطیری حوض میں داخل کیا جاتا ہے۔ جہاں سے ۵ء۰ ۸ء۰ گیلن فی مربع فٹ یا ۲۰ ہزار گیلن فی مربع گز فی دن کی شرح سے چھنتا ہے۔ صاف کیے ہوئے پانی کے خزانہ آب تقطیری حوضوں سے پانی خالص یا صاف پانی کے خزانہ آب میں چھوڑا جاتا ہے اس خزانے کی گنجائش پانی کی ضرورت کے لحاظ سے رکھی جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے آٹھ گھنٹوں کے لیے فراہمی کی مقدار کافی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن بالعموم حوضوں یا خزانہ آب کو دہرا بنا کر چوبیس گھنٹوں کے لیے فراہمی کی گنجائش مہیا کی جاتی ہے تاکہ تقطیری حوضوں میں کسی عارضی خرابی یا ٹوٹ پھوٹ سے پانی کی فراہمی میں رکاوٹ نہ ہونے پائے ان خزانوں کی گہرائی بہ لحاظ گنجائش دس تا پندرہ فٹ ہوتی ہے۔ ان کو دھو دھلا کر صاف کرنے کے لیے کواڑیاں (Valves) اور پانی کی مقدار ناپنے کے لیے پیمانے لگائے جاتے ہیں۔ چوں کہ ان خزانہ ہائے آب سے شہروں کے اونچے اونچے مقاموں کو راست پانی کی سربراہی کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے ان کو اتنا بلند بنانا چاہیے یا بلند مقامات پر بنانا چاہیے تاکہ وہاں سے پانی شہر کے تمام حصوں کو نلوں کے ذریعہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر صاف پانی کے خزانوں کو جو بلندی پر بنائے جاتے ہیں پمپ کے ذریعہ پانی پہنچانا پڑتا ہے۔

شہروں کے لیے آب رسانی کا نظام

صاف پانی کے خزانہ سے ایک بڑے نل کے ذریعہ جو صدر نل کہلاتا ہے شہر کے نزدیک تک پانی لایا جاتا ہے اور پھر آگے چل کر اس صدر نل سے مختلف محلوں کے لیے ذیلی شاخیں نکالی جاتی ہیں۔

نل بچھاتے وقت یہ امر ملحوظ ہونا چاہیے کہ ان کے اخراج کی جملہ گنجائش ان کے اوسط اخراج کی گنجائش سے دوچند ہو اور بوقت اخراج پانی کا دباؤ ۲۰ تا ۳۰ فٹ کا ہو تاکہ پانی دو منزلہ عمارتوں کی چھتوں تک چڑھ سکے۔

صدر نل۔ پانی کی تقسیم کے لیے بالعموم بیٹر (Cast Iron) کے نل استعمال کیے جاتے ہیں جہاں تک ہو سکے ان کو خط مستقیم یا سیدھی لائین میں بچھایا جاتا ہے۔ جب ان کو نالی کھود کر زمین میں بچھایا جائے۔ تو اس بات کا لحاظ کرنا چاہیے کہ ان کو ٹھیک اور محفوظ طور پر لٹایا جائے تاکہ زمین کے بیٹھ جانے سے زمین میں تڑک پیدا ہونے اور نل کے جوڑوں میں سے علیحدہ ہونے کا خدشہ باقی نہ ہو۔

پائپ لائین کے متعلقات حسب ذیل ہوتے ہیں۔

ہوائی کواڑیاں (Air Valves) ان کو پائپ لائن کے سب سے اونچے مقاموں پر لگایا جاتا ہے تاکہ جب پائپ میں ہوا بھر جائے تو وہ باہر نکل جا سکے۔ یہ ایک ہی لیول (Level) پر بچھائے ہوئے طویل حصوں پر بھی لگائے جاتے ہیں۔ بالعموم یہ گولا کواڑیاں (Ball Valves) ہوتی ہیں جو پانی سے بھی ہلکی ہوتی ہیں اور اگر ہوا خارج ہو جائے تو یہ سوراخ کو بند کر دیتی ہیں۔

صفائی کی کواڑیاں (Scour Valves) ان کو پائپ لائن کے سب سے نیچے کے حصوں پر لگایا جاتا ہے تاکہ یہاں سے پائپ کا پانی خارج کیا جا سکے یا کوئی تلچھٹ کچرا وغیرہ جمع ہو تو اس کو صاف کیا جا سکے۔

الٹے بہاؤ کی کواڑیاں (Reflex Valves) یہ پائپ لائن کے ایسے حصوں پر لگائی جاتی ہیں جہاں وہ چڑھائی پر بچھائی گئی ہوں ان کو پڑی کواڑیاں بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کواڑیاں پانی کے بہاؤ کی سمت میں کھلتی ہیں اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے پائپ پھٹ کر پانی پائپ میں واپس ہونا شروع ہو تو وہ خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ اس طرح حادثہ سے ہونے والے مزید نقصان کا ازالہ کرتی ہیں۔

تحفظی یا امدادی کواڑیاں (Safety Valves) یہ کواڑیاں طویل پائپ لائن کے آخری سروں پر لگائی جاتی ہیں یا جہاں پانی پائپ پر بطور ہتھوڑے (Water Hammer) کے ضربات لگاتا ہے۔

توم کی روک کواڑی (Sluice Stop Valve) صدر نل میں پانی کو چھوڑنے یا بند کرنے یا ایک خاص مقدار میں بہاؤ کو جاری رکھنے کے لیے مندرجہ بالا کواڑی استعمال کی جاتی ہے۔ نل اوسط درجہ کا ہو تو کواڑی ہاتھ سے کھولی یا بند کی جا سکتی ہے لیکن جب نل بڑا ہوتا ہے تو کواڑی کو کھولنے کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس پر پانی کا دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے ایک آبی استوانہ (Hydraulic Cylinder) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک ۳۶ انچ کی کواڑی پر ۵۰ء۲ فٹ پانی کے دباؤ کی وجہ سے کوئی ۵ء۰ ٹن وزنی دباؤ پڑتا ہے۔ اور کواڑی کو حرکت دینے اور رگڑ کی مدافعت پر قابو پانے کے لیے کوئی چھ ٹن وزن سے سابقہ پڑتا ہے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات اس کواڑی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ان کو علیحدہ علیحدہ حسب ضرورت کھولا یا بند کیا جا سکے۔

جو چیزیں عمارتوں، سڑکوں، پلوں، تالابوں اور دوسرے انجینیری کاموں میں استعمال ہوتی ہیں وہ اشیاء تعمیر کہلاتی ہیں۔ یہ حسب ذیل ہیں

ا۔ پتھر اور اس کی مختلف اقسام جیسے

الف۔ سنگ خارا
ب۔ بسالٹ یا ٹراپ
ج۔ سنگ مرمر
د۔ نیس
ہ۔ سلیٹ
و۔ چونے کا پتھر
ز۔ چن کھڑی

۲. ریت ۳. لکڑی ۴. اینٹ
۵. کھپریا کویلو ۶. مٹی کے (سفالی) نل ۷. چونا
۸. دھاتیں ۹. سمنٹ ۱۰. سرخی
۱۱. گچ ۱۲. کنکریٹ ۱۳. رنگ روغن
۱۴. وارنش ۱۵. پالش ۱۶. شیشہ
۱۷. محکم شیشہ

تمام اشیاء تعمیر کا منبع و ماخذ ہی کرۂ زمین ہے جس پر ہم بستے ہیں اور جس سے ہماری تمام دوسری ضروریات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

اشیاء تعمیر میں بعض تو ایسی ہیں کہ وہ جس حالت میں زمین سے حاصل ہوتی ہیں وہ صرف ضروری صفائی اور دھلائی کے بعد اسی حالت میں استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسے مٹی اور ریت، کہ ان کو معمولی طور پر صاف کرکے استعمال کرتے ہیں۔ لکڑی درختوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ درختوں کو کاٹ کر لکڑی کو رِتیایا (Season) جاتا ہے اور پھر حسب ضرورت مختلف سائزوں میں کاٹ کر استعمال کرتے ہیں۔ پتھر بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں ان کو کانوں (Quaries) سے حاصل کرنے کے بعد حسب ضرورت تراش و خراش کے بعد کاموں میں استعمال کرتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ جس حالت میں بھی نکلیں اسی حالت میں استعمال ہو جاتے ہیں۔

لیکن بعض تعمیری اشیاء ایسی حالت میں نہیں ملتیں کہ بہ آسانی تعمیر میں استعمال ہو سکیں۔ ان کو مختلف طریقوں سے استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ جیسے چونہ، لوہا اور دیگر دھاتیں۔ یہ خالص حالت میں نہیں ملتیں۔ ان کو خاص طریقوں سے صاف کرکے قابلِ استعمال بناتے ہیں۔ چونا صرف چن کھڑی (Lime Kunkar) کو جلا کر حاصل کرتے ہیں۔ لوہے اور دوسری دھاتوں کی صورت میں ان کی کچ دھاتوں (Ores) کو غیر ضروری اجزاء سے بھٹیوں (Furnaces) میں صاف کیا جاتا ہے اور پھر ان کو مختلف سائز کی کڑیوں میں (Joints) شہتیروں (Beams) اور سلاخوں (Bars) یا پھر پتروں اور دوسری شکلوں میں ڈھالا جاتا ہے۔ تب وہ تعمیری کاموں میں استعمال کے قابل ہوتی ہیں۔

بعض تعمیری اشیاء جیسے سمنٹ۔ روغنیات (Paints) رنگ (Colours) کو زمین ہی سے حاصل شدہ مختلف چیزوں کی آمیزش یا کیمیائی عمل سے تیار کیا جاتا ہے۔

اینٹ۔ کویلو اور مٹی کے نل مختلف قسم کی مٹی کو ڈھال کر خاص قسم کی بھٹیوں میں جلا کر بنائے جاتے ہیں۔

سنگ خارا (Granite Stone) یہ ایک قسم کا پتھر ہے جو زیادہ تر گار (Quartz) اور فلسپار (Filspar) سے مرکب ہوتا ہے جس میں ابرق کے ذرات بھی شامل رہتے ہیں۔ یہ پتھر نہایت ہی مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ گو سخت ہوتا ہے لیکن پالش لینے کی اس میں قابلیت ہوتی ہے۔ اس کا رنگ اس کے غالب جز فلسپار پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ عموماً سرمئی یا سرخی مائل یا بادامی رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے جہاں پائیداری مدنظر ہو۔ عمارتوں میں زینت کے سامان کے لیے مخصوص ہے جیسے پالش کیے ہوئے ستون، وزنی کرسیاں اور مجسموں کی بیٹھک (Pedestals) وغیرہ۔

بہترین قسم کا سنگِ خارا حیدرآباد، گجرات اور جنوبی مہاراشٹر میں ملتا ہے۔

بسالٹ یا ٹراپ (Besalt Or Trap)

یہ بھی ایک سخت قسم کا پتھر ہے۔ اس کی گھڑائی مشکل ہوتی ہے۔ اس کا رنگ دھندلا ہوتا ہے۔ اس کی اچھی قسم سخت اور چمکیلے رنگ کی ہوتی ہے اگر دو پتھروں کو ٹکرایا جاتے تو کھن کھن کی آواز آتی ہے۔ یہ پتھر علاقہ مرہٹواڑہ (مہاراشٹر) اور وسط ہند میں ملتا ہے۔ بمبئی کے نواح کیرالا اور ملاڈ میں زرد قسم کا بسالٹ ملتا ہے۔ پونہ کے بعض علاقوں میں یہ سرخ قسم کا ملتا ہے۔ تعمیری کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔

سنگ مرمر (Marble Stone) یہ پتھر عموماً خالص کاربونیٹ آف لائم سے مرکب ہوتا ہے اس پر پالش خوب آتی ہے۔ اس کی اعلیٰ قسمیں بہت قیمتی ہوتی ہیں اور صرف خاص خاص اور اہم کاموں مثلاً مجسموں اور میز کی سلوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ اس کی معمولی قسمیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کو دور دراز مقامات پر لے جایا جاتے۔ اس لیے ان کو قرب و جوار ہی میں تعمیروں میں استعمال کر لیتے ہیں۔

اس کا رنگ عموماً سفید ہوتا ہے لیکن بعض پتھر زرد، سرخ اور سیاہ رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ جے پور اور راجپوتانہ میں اس کی کئی کانیں ہیں۔

نیس (Gneiss) یہ بھی ایک سخت قسم کا پتھر ہے۔ اس کے اور سنگ خارا کے اجزا ایک ہی ہیں لیکن یہ کم و بیش طبق دار ہوتا ہے۔ عمارت کے کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔ موٹی دیواروں کے اندرونی حصوں میں بھراؤ اور سڑکوں کے لیے گٹی کے کام میں بھی لایا جاتا ہے۔

یہ بنگال، مدراس اور ہمالیہ کے خاص خاص مقامات میں پایا جاتا ہے۔ دکن میں عام طور پر جو پتھر تعمیری کاموں میں استعمال ہوتا ہے وہ سنگ خارا اور نیس (Gneiss) کی ایک درمیانی قسم ہے جو گرینائیٹیڈ نیس (Granited Gneiss) کہلاتی ہے۔

سلیٹ (Slate) یہ دراصل رسوبی چٹان ہے جو چکنی مٹی (Clay) کے جمنے سے بنی ہے لیکن حرارت اور شدید دباؤ سے اس کی ساخت میں اتنا تغیر ہو گیا ہے کہ اس کے حصے اصلی نشست کی سطحوں میں جدا نہیں ہوتے بلکہ عمودی سطحوں میں بآسانی جدا ہو جاتے ہیں۔ اس میں سے صاف ستھری پتلی چادریں (Sheets) کاٹی جا سکتی ہیں۔ مختلف رنگوں میں پایا جاتا ہے لیکن عموماً سرمئی یا گہرا آسمانی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں راجپوتانہ، اجمیر، وادی کانگڑہ اور دہلی کے قریب ریواڑی

میں پایا جاتا ہے۔

چونے کا پتھر (Lime Stone) اس پتھر کی خالص کاربونیٹ آئی لائم سے لے کر میگنیشیم لائم اسٹون تک متعدد قسمیں ہیں آخرالذکر میں نصف حصہ کاربونیٹ آف لائم اور نصف حصہ کاربونیٹ آف میگنیشیم ہوتا ہے۔ ان میں کسی قدر ریت یا چکنی مٹی شامل رہتی ہے۔ مختلف رنگوں میں پایا جاتا ہے جیسے سفید، زرد، سرمئی، آسمانی گہرا اور سرخ۔

گھٹ (Compact) چونے کا پتھر جو خالص کاربونیٹ آف لائم سے مرکب ہوتا ہے اور سفید یا فربہ (Fat) چونے کے حاصل کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔ اگر اس میں چکنی مٹی کی مقدار زیادہ ہو تو اس سے بننے والا چونا پانی میں بستہ ہو جاتا ہے۔

یہ پتھر فرش کے کام میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہندوستان میں پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ریاست کرناٹک کے مقام شاہ آباد اور ریاست آندھرا پردیش کے مقام وقار آباد کے درمیانی علاقہ میں بکثرت پایا جاتا ہے اور شاہ آبادی پتھر (Shababadi Stone) کے نام سے مشہور ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کے ضلع عادل آباد میں یہ سرخ رنگ میں ملتا ہے۔

شاہ آباد سمنٹ فیکٹری میں سمنٹ کی تیاری میں بھی یہ پتھر استعمال ہوتا ہے۔

چن کھڑی (Lime Kunkar) یہ ایک قسم کا کنکر ہے جس کو جلا کر آبی چونا حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل چکنی مٹی کے رسوب سے بنتا ہے اور سخت اور اسپنجی ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم تو یہی ہے جو جدا جدا کنکروں کی شکل میں دستیاب ہوتی ہے۔ اس کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کی تہیں ٹھوس اور چند انچ سے لے کر کئی فٹ موٹی ہوتی ہیں۔

کنکروں والی قسم میں چکنی مٹی کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کو جلانے سے چونا حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم جو بڑے بڑے گنڈ کی شکل میں ہوتی ہے اگر سخت ہو تو اچھی پائیدار ہوتی ہے اور اس کو بعض وقت بنیادوں کی بھرائی میں استعمال کرتے ہیں۔

چن کھڑی ہندوستان کے تقریباً سب علاقوں میں ملتی ہے۔

ریت (Sand) ریت پتھر ہی کے بہت چھوٹے چھوٹے گول یا دانے نکیلے (Grains) ہیں جو سمندروں کے کنارے اور ندیوں، نالوں اور صحراؤں (Deserts) میں پائے جاتے ہیں۔ سمندروں اور ندیوں کی ریت بہت اچھی ہوتی ہے اور اس میں بھی اعلیٰ قسم کی ریت وہ ہے جو صاف موٹی، تیز کھردرے اور نکیلی دانے دار ہو جس میں مٹی کی مقدار بہت کم ہو۔ گچ کے لیے صاف ستھری ریت درکار ہے جس میں مٹی یا دیگر ملاوٹ بالکل نہ ہو ورنہ چونے اور ریت میں گرفت پیدا نہیں ہو سکتی۔ موٹی ریت جس کے دانے نکیلے کھردرے اور تیز ہوں بہتر ہے۔

عام طور پر صاف ریت نہیں ملتی اس لیے اس کو استعمال میں لانے سے قبل پانی سے دھو کر صاف کر لینا چاہیے تاکہ مٹی وغیرہ غیر ضروری اجزا نکل جائیں۔

لکڑی (Timber) ہندوستان میں عام طور پر ساگوان کی لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ غیر اہم کاموں میں کفایت کی خاطر دیودار، چیڑ، سال، ببول، آم اور بانس کے درختوں کی لکڑی بھی استعمال کر لی جاتی ہے۔

اینٹ (Bricks) کمائی ہوئی مٹی کو مناسب شکل اور سائز کے سانچوں میں ڈھال کر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ ان کی تیاری کے لیے ایسی مٹی کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں بجری موٹی ریت اور نامیاتی مادے موجود نہ ہوں۔ اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو پہلے مٹی کو ان سے صاف کر لیا جاتا ہے۔

دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹ کو کچی اینٹ کہتے ہیں اور یہ بالکل معمولی اور عارضی تعمیر کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ پکی اینٹیں بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کو مناسب طریقہ پر جما کر بھٹی (Kilns) بنائی جاتی ہے اور ان کو جلایا جاتا ہے۔ بھٹی بنانے اور اینٹوں کو جلانے کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔ ایک تو پنزاوے کا طریقہ ہے۔ اس طریقے میں اینٹوں اور ایندھن کی ایک پر ایک متبادل (Alternate) تہیں جماتے ہیں اور دوسرے طریقہ میں ایندھن کے بغیر اولاً صرف اینٹوں کو خاص طریقہ سے جماتے ہیں اور اینٹوں کے نیچے چولھوں کی جگہ چھوڑ دیتے ہیں اور ان چولھوں میں آگ جلائی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً ایندھن ڈالتے جاتے ہیں تاکہ بھٹا اس وقت تک جلتا رہے جب تک اینٹیں اچھی طرح جل کر تیار نہ ہو جائیں۔ ان دو طریقوں سے جو اینٹیں تیار کی جاتی ہیں وہ پکی اینٹیں کہلاتی ہیں جو مستقل عمارتوں کی تیاری میں استعمال کی جاتی ہیں۔

اچھی جلی ہوئی اینٹ کا رنگ سرخ ہوتا ہے اگر جلانے کے وقت آگ ہر جگہ یکساں طور پر نہ پہنچے تو بعض اینٹیں بہت جل کر کالی ہو جاتی ہیں۔ جن کو بیش سوختہ (Over Burnt Bricks) کہتے ہیں اور بعض اینٹیں کم جلنے کی وجہ سے زرد رہ جاتی ہیں ان کو کم سوختہ (Under Burnt) کہتے ہیں۔ اینٹوں کی یہ دونوں قسمیں تعمیری کاموں کے لیے غیر موزوں ہیں۔ آرائش کی غرض سے اگر رنگین اینٹ کی ضرورت ہو تو اینٹوں کو رنگین بھی بناتے ہیں۔ رنگین بنانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ابتدا ہی میں مٹی میں کوئی رنگین شے جیسے ملتانی مٹی، گیرو، سرخی، مینگنیز (Manganese) وغیرہ کی قسم کی کوئی شے ملا دیں۔ دوسرے طریقے میں اینٹ کے تیار ہونے کے بعد اس کو رنگ کے محلول میں ڈبو کر سکھاتے ہیں۔ اس طرح اس رنگی ہوئی اینٹ کا رنگ پائیدار ہوتا ہے۔ اس غرض کے لیے مطلوبہ رنگ کو السی (Linseed) تارپین تیل (Terpentine Oil) اور مردہ سنگ میں حل کر لیتے ہیں۔ اینٹ کو لوہے کی چادر (Iron Sheet) پر رکھ کر چولھے پر اس قدر گرم کرتے ہیں کہ ہاتھ سے نہ چھو سکیں بہت زیادہ گرم نہ کریں پھر ایک ایک اینٹ چند لمحوں کے لیے تیار شدہ محلول میں ڈبو دیں اور پھر نکال کر میز پر رکھ کر خشک کر لیں۔ خشک ہو جانے پر ٹھنڈے پانی کے حوض میں ہاتھ یا کپڑے سے دھو کر صاف کر لیں۔

گندے پانی کے نکاس کے لیے جو موریاں بنائی جاتی ہیں ان میں استعمال

کرنے کے لیے مجلّا اینٹ بھی بنائی جاتی ہے۔ محکمہ ڈرینج میں یہ استعمال ہوتی ہیں۔ اینٹ کو مجلّا (Glazed) کرنے کے لیے بھٹی میں تپش جب ایک خاص درجہ تک بلند ہو جاتی ہے تو نمک چھڑکتے ہیں بھٹی کی حرارت سے کلورائیڈ اڑ جاتا ہے اور سوڈیم سلیکا اور ایلومینیا جو مٹی میں شامل چونا یا لوہے سے مل جاتا ہے اور سطح پر کانچ کی سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روغن مسامات میں گھس جاتا ہے اور اینٹ مجلّا اور پائیدار ہو جاتی ہے۔

کھپرے یا کویلو (Tiles)

یہ کمائی ہوئی مٹی سے بنائے جاتے ہیں لیکن چونکہ یہ پتلے ہوتے ہیں اس لیے ان کو ڈھالنے میں کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ انکی تیاری کیلئے کسی قدر سخت مٹی استعمال کی جاتی ہے اگر مٹی ملائم ہو تو اس میں کچھ ریت ملا لیتے ہیں

دیسی کویلو (Country Tiles) کمہار اپنے چکے پر تیار کر لیتا ہے اور دھوپ میں سکھا کر جلا لیتا ہے۔ یہ استوانی شکل کے ہوتے ہیں جس کے ایک سرے کا قطر دوسرے کے قطر سے کم ہوتا ہے۔

منگلوری ٹائل چپٹے ہوتے ہیں۔ یہ ملا بار کی بہترین چکنی مٹی سے بنائے جاتے ہیں اور اچھی طرح سکھا کر مخصوص بھٹیوں میں جلاتے ہیں۔ کھپرے کا سائز عموماً ½۸" × ½۱۲" ہوتا ہے۔ ایک سو مربع فٹ کے لیے ایک سو پچاس کھپرے درکار ہوتے ہیں ڈھلواں (Gable) چھت کے لیے چوٹی (Ridge) پر جو منگلور کھپرے استعمال ہوتے ہیں وہ زاویہ دار ہوتے ہیں جن کی لمبائی ۱۶" ہوتی ہے۔ ان کو مو گری کھپرا (Ridge Tile) کہتے ہیں۔

سفالی یا مٹی کے نل (Earthen Pipes)

یہ اسی معمولی مٹی سے بنائے جاتے ہیں جو کھپرے بنانے کے کام میں آتی ہے۔ مٹی کو خوب باریک چھانتے اور ملاتے ہیں اور پھر مشین کے ذریعہ دباؤ کے بعد سانچے سے نکالتے ہیں۔ کھپروں ہی کی طرح ان کو سکھاتے اور جلاتے ہیں نکاسی نالیوں کے لیے استوانہ نما بغیر گلے کے نل استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ان کو گندآب (Drainage) کے لیے استعمال کرنا ہو تو ان کو جلا دیتے ہیں تاکہ ایسڈ کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہیں۔ گندآب کے لیے نل گلے دار (Socketed) بناتے ہیں۔

چونا (Lime)

چونا قدرتی پتھر اصل میں کیلشیم کاربونیٹ ہے جس میں اکثر مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ سنگ مرمر اور کھریا چونے کی خالص قسمیں ہیں جن میں کیلشیم کاربونیٹ کے علاوہ دوسری چیزیں تقریباً ہوتی ہی نہیں۔ ان کا رنگ سفید ہوتا ہے۔

غیر خالص چونے کے پتھر میں کیلشیم کاربونیٹ کے علاوہ دوسری چیزیں جیسے مٹی، ریت اور لوہے کے اکسائیڈ وغیرہ ملے ہوتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے پتھر کے رنگ مختلف ہوتے ہیں جیسے سفید، ملگجا، نیلا اور سرمئی وغیرہ۔

چونے کے پتھر کو خوب گرم کرتے ہیں تو کیلشیم کاربونیٹ سے کاربانک ایسڈ خارج ہو جاتا ہے اور صرف کیلشیم اکسائیڈ رہ جاتا ہے جو اَن بجھا چونا (Unslaked Lime) کہلاتا ہے۔ اس اَن بجھے چونے پر پانی ڈالیں تو اس میں ابال پیدا ہوتا ہے اور پانی اس میں جذب ہو کر حجم کو بڑھا دیتا ہے۔ حرارت نکلتی ہے اور ڈھیلے خود بخود سفوف بن جاتے ہیں۔ یہ اب کیلشیم ہائیڈرو اکسائیڈ (Calcium Hydro Oxide) ہو جاتا ہے۔ جس کو عام طور پر بجھا ہوا چونا (Slaked Lime) کہتے ہیں۔ بجھے ہوئے چونے کا حجم اَن بجھے چونے کا تقریباً دوگنا یا ڈھائی گنا ہوتا ہے۔ غیر خالص چونے کے پتھر سے بجھے ہوئے چونے کی مقدار میں اس قدر اضافہ نہیں ہوتا۔

خالص چونے کے پتھر سے حاصل شدہ بجھے ہوئے چونے کو فربہ چونا (Fat Lime) کہتے ہیں جو ہنگم کے لیے موزوں نہیں ہوتا البتہ آہک پاشی کے کام کے لیے موزوں ہے۔ غیر خالص چونے کے پتھر سے حاصل ہونے والا بجھا ہوا چونا آب بند جو ہیڈرالک لائم کہلاتا ہے اور ہنگم کے لیے موزوں ہوتا ہے۔

دھاتیں (Metals)

عمارتوں کی تعمیر میں جو دھاتیں استعمال ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ لوہا، تانبا، جست قلعی، شیشہ، بیڑ، پیتل، المونیم وغیرہ۔

سمنٹ (Cement)

سمینٹ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قدرتی دوسرے مصنوعی، قدرتی سمینٹ بعض قدرتی پتھروں سے حاصل ہوتا ہے۔ جس میں ۳۰ تا ۴۰ فیصد مٹی (Clay) اور کاربونیٹ آف لایم کے ساتھ میگنیشیم کاربونیٹ بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں بہترین سمینٹ رومن سمینٹ سمجھا جاتا ہے اور اس کا پتھر لندن کی زمین میں پایا جاتا ہے اور گول ہوتا ہے۔ اس پتھر کو مخروطی بھٹوں میں اس قدر جلاتے ہیں کہ کاربونک ایسڈ نکل جاتے پھر اس جلے ہوئے پتھروں کو سفوف بنا لیتے ہیں یہی قدرتی سمینٹ ہے۔ یہ سمینٹ بہت جلد بستہ (Set) ہو جاتی ہے لیکن مضبوطی میں مصنوعی سمینٹ کا (جس کو پورٹ لینڈ سمینٹ کہتے ہیں) مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں سمینٹ کا قدرتی پتھر نایاب ہے اس لیے یہاں مصنوعی طور پر سمینٹ تیار کیا جاتا ہے اور مصنوعی سمنٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سمینٹ چونے پتھر اور مٹی (مورم) ملا کر بنایا جاتا ہے۔ ان دونوں کو ایک خاص تپش تک جلا کر پیس لیتے ہیں اور پھر اس میں کیلشیم سلفیٹ ملاتے ہیں۔ یہ مصنوعی سمینٹ بھی پورٹ لینڈ سمینٹ کہلاتا ہے۔

سرخی (Sorkhi)

سرخی عموماً پرانی اینٹوں یا ان اینٹوں کے ٹکڑوں کو جو عموماً بھٹیوں میں ٹوٹ جاتے ہیں کوٹ کر بنائی جاتی ہے۔ اگر سرخی کی ضرورت کافی مقدار میں ہو تو مٹی کے گولے بنا کر جلا لیتے ہیں اور ان کو پھر رنگ میں پیس لیتے ہیں۔

پانی سے تماس رکھنے والی تعمیروں میں جو ہنگم استعمال ہوتی ہے اس میں ریت کے ساتھ سرخی بھی ملاتے ہیں تاکہ بندش کی آب بندی اور پائیداری میں اضافہ ہو۔

سرخی ملا کر جو ہنگم تیار کی جاتی ہے اس کو بھی عام طور پر سرخی کہہ دیتے ہیں۔

گچ (Mortar)

دیواروں کے پتھروں یا اینٹوں کو جوڑنے کے لیے یا دیواروں پر استرکاری کے لیے ریت اور چونہ یا ریت اور سمینٹ کا آمیزہ استعمال کیا جاتا ہے اس آمیزہ کو گچ کہتے ہیں۔ چونا اور ریت کے آمیزہ کو رنگ میں پیس کر بنایا جاتا ہے اور اس کو چونا گچ (Lime Mortar) کہتے ہیں سمینٹ اور ریت کے آمیزہ کو پیستے نہیں بلکہ صرف تھاپی یا پھاوڑے سے ملا لیتے ہیں اور یہ سمینٹ گچ (Cement Mortar) کہلاتی ہے۔

پانی کے تماس میں جو بندش ہوتی ہے اس کی تعمیر میں جو چونا گچ استعمال ہوتا ہے اس میں ریت کی مقدار کم کرکے سرخی ملا لیتے ہیں اور یہ سرخی گچ (Surkhi Mortar) یا صرف سرخی بھی کہلاتی ہے۔

کنکریٹ (Concrete)

گچ اور پتھر کی روڑی (گٹی) (Stone Metal) یا اینٹ کے ٹکڑوں کو مناسب تناسب میں ملا کر بناتے ہیں۔ گچ اور گٹی یا اینٹ کے ٹکڑوں (Brick bats) کو صرف پھاوڑے سے ملاتے ہیں لیکن اگر زیادہ مقدار میں کنکریٹ درکار ہو تو پھر اس کو ملانے کیلئے مشین استعمال کرتے ہیں جس کو کنکریٹ مکسر کہتے ہیں۔ کنکریٹ مکسر کی صورت میں گچ علاحدہ تیار نہیں کی جاتی بلکہ چونا اور سمینٹ اور ریت یا ریت اور سرخی اور گٹی سب کو مناسب تناسب میں مکسر میں ڈالتے ہیں۔ کنکریٹ میں اگر چونا استعمال کیا گیا ہو تو اسے چونا کنکریٹ (Lime Concrete) اور اگر سمینٹ استعمال کیا گیا ہو تو سمینٹ کنکریٹ (Cement Concrete) اور اگر سرخی استعمال ہو تو سرخی کنکریٹ (Surkhi Concrete) (Reinforced Concrete) کہتے ہیں۔

کنکریٹ کے اجزا کا تناسب تعمیر کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر تعمیر میں سمینٹ کنکریٹ کے ساتھ لوہے کی سلاخیں بھی استعمال کی گئی ہوں تو اس کو محکم کنکریٹ کہتے ہیں۔

روغنی رنگ (Oil Paints)

چوبینہ اور دھاتوں کو ہوا اور رطوبت اور دیگر موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اور نیز خوش نمائی کی غرض سے ان کی سطحوں پر رنگ چڑھایا جاتا ہے۔

کم اہم عمارتوں میں جو چوبینہ استعمال کیا جاتا ہے اس پر بعض وقت کفایت کے مدنظر بجائے رنگ کے صرف السی کے تیل کی ایک یا دو تہیں (Coats) چڑھا دیتے ہیں جو چوبینہ کو محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔

روغنی رنگ عام طور پر دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے ایک تو اساس (Base) جو عموماً دھاتی آکسائیڈ ہوتا ہے۔ دوسرا حامل (Carrier) جو روغنی مادہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کو مناسب مقداروں میں ملا لیتے ہیں تاکہ برش سے یکساں طور پر سطح پر لگایا جاسکے۔ بعض محلل (Solvent) بھی ملا لیتے ہیں تاکہ یہ دونوں چیزیں اچھی طرح مل جائیں۔ روغنی رنگوں میں اکثر خشکندہ (Drier) بھی شریک کیے جاتے ہیں تاکہ رنگ لگانے کے بعد سطح جلد خشک ہو جائے۔

وارنش (Varnish)

رال (Resin) کو جلد سوکھنے والی چیزوں میں جیسے کہ تیل، تارپین (Terpentine) الکوحل میں حل کرتے ہیں۔ یہی وارنش ہے۔ یہ چیزیں بہت جلد خشک ہو کر اڑ جاتی ہیں۔ اور رال کی سخت شفاف باریک تہہ سطح پر رہ جاتی ہے لکڑی کی تیار شدہ اشیاء کے لیے اس کو استعمال کرتے ہیں۔

پالش (Polish)

چوبینہ کی سطح کو زیادہ صاف اور چمکدار بنانا ہو تو بجائے روغنی رنگ یا وارنش کے پالش استعمال کرتے ہیں۔ اس سے سطح بہت ہی چمکدار اور خوشنما دکھائی دیتی ہے اور چوبینہ موسمی اثرات وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ اس کا زیادہ تر استعمال عمارت کے دروازوں، کھڑکیوں اور فرنیچر کے لیے ہوتا ہے۔ پالش حسب ذیل اشیاء سے تیار کی جاتی ہے

۱۔ میتھیلڈ اسپرٹ
۲۔ لاکھ (عمدہ قسم کی)
۳۔ Oil Bamum
۴۔ Gam Bago
۵۔ چندروسہ
۶۔ گوند

شیشہ

تعمیری کاموں میں جو شیشے استعمال ہوتے ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کراون شیشہ (Crown Glass) چادر شیشہ (Sheet Glass) اور تختہ شیشہ (Plate Glass) وغیرہ

کراون شیشہ کا رواج اب ختم ہو چکا ہے۔ چادر شیشہ عام طور پر دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تختی شیشہ چادر شیشہ سے کسی قدر دبیز ہوتا ہے اور اس کی تیاری میں خاص مسالے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ شیشہ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں مضبوطی درکار ہو اور اس میں اختلاف منظر بہت ہی کم ہوتا ہے اور اس کی اعلیٰ قسم میں تو بالکل نہیں ہوتا اور یہ ہوائی اڈوں میں کنٹرول ٹاور (Control Tower) میں استعمال کی جاتی ہے۔

عام شیشہ کی دو قسمیں ہیں ایک شفاف اور دوسرے دھندلا۔ شیشے رنگین بھی ہوتے ہیں۔

محکم شیشہ (Wired Glass)

یہ اسی صدی کی ایجاد ہے۔ شیشہ کی چادر کے اندر وسط میں تار کی جالی (Wired Melting) پیوست کر دیتے ہیں۔ یہ شیشہ عام طور پر ¼" دبیز ہوتا ہے اور اس شیشہ کا نقطہ پگھلاؤ (Melting Point) بہ مقابلہ عام شیشہ کے بہت اونچا ہوتا ہے۔ یہ آگ سے محفوظ (Fire Proof) بھی ہوتا ہے دروازوں، کھڑکیوں اور چھت کے روشندانوں (Sky Light) وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ تڑکنے پر بھی ٹوٹ کر گرتا نہیں۔ تاروں کی جالی اس کو تھامے رہتی ہے۔

انجینیری و ٹکنالوجی

انجینیری کی سرگزشت

انجینیری نام ہے قدرتی اور طبیعی طور پر پائی جانے والی اشیاء کو اور طبیعی طاقتوں کو مطیع کرکے ان کو نوعِ انسانی کی آسائش کے لیے استعمال کرنے کا۔ نوعِ انسانی نے یہ کارنامہ اوزاروں اور علم اور عقل کی مدد سے انجام دیا۔ انجینیری فن بھی ہے اور علم بھی۔ انجینیری کا علم مقابلتاً حال کی چیز ہے لیکن انجینیری کا فن بہت ہی قدیم ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "فن انجینیری" کی تاریخ نوع انسان کے تمدن کی تاریخ ہے۔ البتہ "علم انجینیری" ایک اطلاقی (Applied) سائنس ہے۔ جہاں تک خالص (Pure) سائنس کا یعنی طبیعی قوانین کی محض دریافت کا تعلق ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کی ابتدا یونان میں ہوئی۔ لیکن انسانی ضروریات اور آسائش کیلئے سائنس کا اطلاق اور استعمال جسے "انجینیری و ٹکنالوجی" کہنا چاہیے بڑے پیمانہ پر اٹھارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوا جب کہ مشینیں اور انجن صنعت اور پیداوار کے لیے استعمال میں آئے۔

طبعی قوتوں کو مسخر کرنے کی کوشش کی ابتدا ہزاروں سال پہلے جادوگری سے ہوئی۔ لیکن یہ ایک طرح سے بند گلی تھی جس میں آگے بڑھنا ممکن نہ ہوسکا تو انسان نے کوشش کی کہ ان قوتوں اور طاقتوں کو سمجھنے اور اسے ایسے وسائل پیدا کرنے کا خیال ہوا کہ جن سے ان قوتوں کی مدافعت کرنے کی بجائے ان سے کام لیا جاسکے۔

قدیم حجری زمانہ (Paleolithic Age) میں انسان نے پہلے پہل چھوٹے پتھروں کو گھڑنے کی کوشش کی تاکہ ان سے مخصوص قسم کا کام لے سکے۔ قیاس ہے کہ سب سے پہلے پتھر کی کلہاڑی بنائی گئی ہوگی۔ اس کے بعد پتھر کے نوک دار ٹکڑوں کو لکڑی کے سرے پر بٹھا کر نیزے کی شکل دی گئی ہوگی۔ اس کے بعد پتھر کی چھری، پتھر کی سوئی، اور آخر میں دستہ دار کلہاڑی کی باری آئی ان اوزاروں سے انسان نے غذا اور غاروں میں جاتے پناہ حاصل کرنے میں مدد لی۔

تقریباً بیس ہزار سال پہلے روئے زمین سے برف پگھلنا شروع ہوئی تو جھیلیں، ندیاں اور جنگل بننا شروع ہوئے۔ انسان غاروں سے نکلا۔ کشتیاں اور تیر کمان ایجاد ہوئے۔ مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کا شکار ہونے لگا۔ درختوں کو کاٹ کر گھر بنائے گئے۔

مگر انجینیری و ٹکنالوجی کے فن میں پہلا انقلاب تقریباً آٹھ ہزار سال پہلے واقع ہوا جب کہ زراعت کی ابتدا (غالباً مشرق قریب میں) ہوئی۔ اس سے نئے حجری زمانہ (Neolithic Age) کی ابتدا ہوئی جس میں انسان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بسنے لگا۔ اور جانوروں کو پالنے لگا۔ اس کے قبل تاریخ زمانے میں انسان سائنس یعنی طبیعی واقعات اور مشاہدات میں مضمر قوانین قدرت کے علم سے بے بہرہ تھا۔ وہ بظاہر قدرت سے مرعوب اور خوف زدہ تھا اور ان کے بارے میں توہمات کا شکار تھا۔ البتہ زراعت کی ضروریات کے لیے بڑی ندیوں میں سیلابوں کی پیش قیاسی درکار تھی اور اسی ضرورت کے تحت کہہ سکتے ہیں کہ طبیعی علوم کی ابتدا ہوئی۔

تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح تک بڑی بستیوں اور شہروں کی ابتدا ہوچکی تھی۔ مختلف ضروریات اور سہولتوں کے تحت یہ تمدن ندیوں کے کنارے وجود میں آئے اور سب میں پہلی فنی ترقی وادیٔ نیل (ملک مصر) میں ہوئی جہاں دریائے نیل کے سیلابوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تمام باشندوں کا باہمی تعاون درکار تھا۔ چونکہ کنارے کی زمینیں ہر سال غرقاب ہوجاتی تھیں اور کھیتوں کی حدیں مٹ جاتی تھیں اس لیے ملک مصر میں زمین کی پیمائش کا فن وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں علم ہندسہ (جیومٹری) کی ابتدا ہوئی۔

تمدن کے ساتھ مذہب اور سیاست وجود میں آئی۔ اور ان کے لیے بڑی عمارتیں درکار ہوئیں یعنی مندر، محل، مقبرے۔ چنانچہ مصر کے اہرام (Pyramids) جو مقبرے ہیں اب بھی عجوبہ روزگار ہیں۔ چونکہ ان وادیوں میں پتھر نہیں تھے ان کو دور کے پہاڑوں سے لایا گیا جس کے لیے کافی انجینیری مہارت درکار تھی سب میں بڑے ہرم (Pyramid) کی تعمیر میں ٹن سے زیادہ وزنی بیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے اور ان کی تراش اتنی سڈول ہے کہ ان کے درمیان چھری کی نوک کے گھسنے کی بھی گنجائش نہیں۔

تمدن کا دوسرا مرکز بابل بھی جو دریائے دجلہ و فرات کے کنارے یعنی عراق میں وجود میں آیا اس بارے میں پیچھے نہیں رہا۔ شہر بابل کے اطراف ایک فصیل تعمیر کی گئی تھی جو تین سو فٹ اونچی اور ۵، فٹ چوڑی تھی۔

دجلہ اور فرات کی وادیوں کے اس تمدن میں پہیہ ایجاد ہوا اور گاڑی میں لگایا گیا۔ پہلے پہل پہیہ ٹھوس لکڑی کا ہوتا تھا۔

ان کے بعد یونانیوں کا عروج ہوتا ہے۔ ان کی توجہ عملی کاروبار سے زیادہ علم اور سائنس کے اصولوں کی طرف تھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظری سائنس کے باوا آدم وہی تھے۔ عملی استعمال کے طور پر بھی انھوں نے سادہ مشینوں یعنی خانہ (Wedge) بیرم (Lever) چرخی اور دھرا اور پیچ کی خاصیتوں کا تجزیہ کیا۔ ارشمیدس (Archimedes) اور ہیرو (Hero) طبیعیات اور ریاضی کے عملی استعمال کے لیے مشہور ہیں۔

یونانیوں کی انجینیری زیادہ تر دو مقاصد کے تحت تھی ایک تو حمل ونقل (Transport) اور دوسرے آرٹ۔ چونکہ یونان ایک جزیرہ نما ہے اور اس کو سمندر جابجا گھیرے ہوتے ہے اور خشکی میں پہاڑ کثرت سے ہیں اس لیے انھوں نے خشکی سے زیادہ دریائی سفر پر توجہ کی کشتیوں کے بیڑے تیار کیے، بندرگاہیں بنائیں اور لنگر اندازی کے طریقوں کی تکمیل کی۔ آرٹ کی ذوق کی تشفی کے لیے مندر بنائے جو اپنے خوشنما ستونوں کے لیے مشہور ہیں اور جن میں سنگ مرمر کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ایکروپولس (Acropolis) کی عمارتیں خاص کر پارتھینن (Parthenen) شہرۂ آفاق ہیں۔

یونانی سائنس دانوں میں ارشمیدس اپنی اس دریافت کے لیے مشہور

ہے کہ پانی میں کوئی ٹھوس اپنے مساوی حجم کے پانی کے وزن کے بقدر ہلکا ہوجاتا ہے جس کے ذریعہ دھاتوں کی کثافت یعنی ہلکے اور بھاری پن کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس نے چرخیوں کے ذریعہ تن تنہا ایک جہاز کو خشکی سے پانی کی طرف روانہ کیا۔ یہ قول جو مشہور ہے اسی کا ہے کہ اگر اس کو ایک بیرم اور کہیں کھڑے رہنے کی جگہ مل جاتی تو وہ زمین کو اٹھا کر پھینک دیتا۔

یونان میں ایجادوں کے تعلق سے مشہور موجد ہیرو تھا جو اسکندریہ کا رہنے والا تھا۔ اس کی ایجادیں حسب ذیل ہیں۔ آگ بجھانے والا انجن سیفن (Syphon) داب پمپ اور پیچھ (Worm Gear) بھاپ کے انجن کا تخیل بھی اسی کا تھا۔

یونان کے بعد علم اور فن کو ایک بار پھر مصر میں عروج ہوا جس میں شہر اسکندریہ نے نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانہ میں عجیب وغریب ایجادیں ہوئیں۔ ڈھلائی مشین جس میں پانی اور صابن خود بخود حسب ضرورت فراہم ہوجاتا تھا اور ایک قسم کی متحرک تصاویر ایجاد ہوئیں۔

یونانیوں کے جانشین رومی ہوتے۔ یہ لوگ مادہ پرست اور عملی قسم کے تھے انھوں نے سائنس کو ترقی نہیں دی مگر عملی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیتے عمارتیں، سڑکیں، پل اور آب رسانی کے لیے آب گزار (Aqueduct) تعمیر کیے۔

سلطنت روما بڑی وسیع سلطنت تھی۔ فوجوں کی آمد و رفت اور تجارتی اغراض کے لیے سڑکوں کا ایک جال بچھایا گیا۔ آمد و رفت کی ان سڑکوں کا طول پچاس ہزار میل کے لگ بھگ تھا۔ اور یہ مثل مشہور ہوئی کہ "ہر سڑک روم کو جاتی ہے"۔ ان میں سے اکثر سڑکیں آج بھی موجود ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً درست ہوکر استعمال میں آرہی ہیں۔ ان سڑکوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سیدھی ہوتی تھیں اور راستہ پر رکاوٹ نالے، ندیاں، جنگل، پہاڑ سب کو صاف کرکے ان کو بنایا جاتا تھا۔ روما کے لوگ پلوں کی تعمیر میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے۔ روم میں قبل مسیح زمانے کا ایک پل اب بھی موجود ہے۔

عمارتوں کی تعمیر اور شہروں کی منصوبہ بندی (ٹاؤن پلاننگ) میں بھی رومن بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے ایک طرح کی پزولانا (Puzzo lana) سیمنٹ ایجاد کی۔ ان کی تعمیر کی ہوئی اکثر شاندار عمارتیں اب بھی موجود ہیں جس میں روم کا پارتھینن (Parthenen) اور کولیزیم (Collesium) بڑی شاندار عمارتیں ہیں۔ رومیوں نے سڑکوں اور عمارتوں کی طرح آب رسانی کے انتظام کو بھی اونچے درجہ تک پہنچایا۔

ان تمدنوں کے ساتھ ساتھ چین کا بھی سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں کافی حصہ ہے۔ کاغذ، چھپائی، بارود، قطب نما اور عینک انھیں کی ایجاد ہیں۔ دیوار چین جو ڈھائی ہزار میل لمبی، نیچے پچیس فٹ اور اوپر پندرہ فٹ چوڑی اور تیس فٹ اونچی ہے عجوبہ روزگار ہے اور اس میں جتنا میٹریل استعمال ہوا دنیا کی تاریخ میں کسی اور پراجکٹ میں استعمال نہیں ہوا معلق پل (Suspension Bridge) بھی انھیں کی ایجاد ہے۔

ہندوستان

دریائے سندھ کے کنارے ہزار سال قبل مسیح ایک تمدن عروج پر تھا۔ یہاں دو بڑے شہر ہڑپا (Harappa) اور موہنجو دارو (Mohanjodaro) آباد تھے۔ ان کے کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پکی (یعنی جلی ہوئی) اینٹ استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں حماموں اور زیر زمین ڈرینج کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں صفائی کے لیے مین ہول (Manholes) اور Soakpits بنائے گئے تھے۔

اسلامی تمدن

سلطنت روما کے زوال پر عرب قوم اسلام کی طاقت کے ساتھ ان کی جانشین ہوئی۔ ایران اور مصر اور روم کی فتح سے ان تینوں تمدنوں سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور علوم اور فنون دونوں میں ایرانی سلطنتوں میں کافی ترقی ہوئی جن میں ایرانیوں کا بڑا حصہ ہے۔ فن عمارات میں انھوں نے کمان (آرچ) اور گنبد کی تعمیر کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ اور بڑی خوش نمائی پیدا کی۔ قرطبہ اور غرناطہ کی مسجدیں اور الحمرا کا محل فن عمارت اور آرٹ کا نادر نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے تجربہ خانے اور رصدگاہیں اور ورکشاپ قائم کیے گویا کہ سائنس اور علوم کو نظری حد سے آگے بڑھا کر عملی میدان میں داخل کیا۔ اور سائنٹفک مقداروں کے ناپ تول اور حسابات کی اہمیت کو قائم کیا۔ کتنی ایک ایجادیں بھی پن چکی، ہوا چکی، پانی کی گھڑیال وغیرہ۔ مسلمان بارود کا استعمال جانتے تھے جو شاید انھوں نے چینیوں سے سیکھا تھا۔ قلعوں کے محاصرے میں منجنیق استعمال کرتے تھے۔

یورپ کے قرون وسطیٰ ـــ اسلام کے اثر سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون ہسپانیہ کے راستے اور (صلیبی جنگوں کے ذریعہ) مشرق قریب سے یورپ پہنچا۔ اس وقت تک یورپ پر تاریکی کا زمانہ گزر رہا تھا جس میں تمدن کی وہی دقیانوسی کیفیت تھی جو روما سے ورثہ میں ملی تھی۔ عربی سے ترجمے ہوتے جن سے علمی بیداری پیدا ہوئی۔ چونکہ عیسائیت انسانوں سے جانوروں کا کام لینے کی مخالف تھی اس لیے گھوڑوں کی طاقت استعمال کی جانے لگی۔ چکیاں چلانے اور پانی کو کنوؤں سے اوپر لینے کے لیے گھوڑے استعمال کیے جاتے تھے۔ فن عمارت میں بھی ترقی ہوئی۔ عربوں سے نوک دار محراب کمان سیکھیں، گرجاؤں کے تہ خانوں (Vaults) میں مضبوطی کے لیے پسلیاں (Ribs) لگانا شروع کیا۔ شیشہ سازی کی صنعت میں ترقی ہوئی۔ بڑے بڑے پل بننے لگے۔ لندن کا پل (لندن برج) جو ۱۱۷۶ عیسوی میں شروع ہوا تھا ۳۳ سال میں مکمل ہوا تھا۔ یہ ۱۹ کمانوں پر مشتمل تھا جو نوک دار اور مربع ترشے پتھر کی بنی تھیں۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ

اس کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک ہے۔ اس میں یورپ نے عربوں کے علمی اور ثقافتی اثر سے ایک نئی کروٹ لی۔ اسی کے زیر اثر یورپ توہمات سے آزاد ہوا۔ اور ہر چیز کو سائنسی تجسس اور تفحص سے دیکھنے لگا۔

نشاۃ الثانیہ کا زمانہ یورپ کی سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقیوں کی بنیاد قرار پایا۔ ہر مقدار کے صحیح ناپ کی لگن پیدا ہوئی جو اب مغربی تمدن اور مغربی علوم کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس سے پہلے علم وصفی (Qualitative) تھا اب اس کے ساتھ وہ مقداری (Quantitative) بھی بن گیا۔ اسی زمانہ میں اٹلی پیش پیش تھا کیونکہ وہ دنیائے عیسائیت کا مرکز

تھا۔ اس کے پہلے یتھ کے طور پر گھڑیالیں عام طور پر استعمال ہونے لگیں۔ پندرہویں صدی کے ختم تک گرجاؤں پر گھڑیالیں نصب ہوگئیں تھیں۔

نشاۃ ثانیہ کا سب سے اہم تحفہ چھاپہ خانہ تھا جس کے ذریعہ علم کی ترقی اور ہر قسم کی دریافتیں یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔ کاغذ سازی کا فن صلیبی جنگوں کے دوران میں یورپ نے اسلامی دنیا سے حاصل کیا۔ اس سے پہلے چھاپہ کے اصول چین میں دریافت ہوچکے تھے۔ اور سب میں پہلا چھاپہ خانہ کوریا میں گیارہویں صدی عیسوی میں وجود آیا تھا۔

نشاۃ ثانیہ کی غالباً اہم ترین اور ہمہ گیر شخصیت لیونارڈو ڈاونشی ہے۔ جو آرٹسٹ اور سنگ تراش ہونے کے علاوہ ایک زبردست انجینیر اور آرکیٹکٹ بھی تھا۔ ۱۴۸۰ء سے ۱۴۹۹ء تک لیونارڈو ڈیوک آف میلان (Milan) کی ملازمت میں تھا۔ پھر بورگیا (Borgia) کا ملٹری انجینیئر بن گیا۔ آخر آخر میں فرانس میں نہروں کی تعمیر میں حصہ لیا۔ میکانیات میں اس نے بیرم (Lever) کے اصول کو چرخیوں کے لیے استعمال کیا۔ اشیا کی مضبوطی (Strength of Material) کے علم میں مختلف اشیا کا نقطہ شکستگی (Point Of Rupture) دریافت کیا ہاسکونی (Hydrostatic) دباؤ کے بارے میں اس کے نظریات اپنے زمانہ سے دوسو برس آگے تھے۔ اس نے زیر زمیں بدررویں (Sewers) ایجاد کیں۔ بھاپ انجن (اسٹیم انجن) کا خاکہ تیار کیا۔ غباروں اور ہوائی جہاز کا تخیل بھی اسی کا ہے۔

دوسری اہم شخصیت سائنس کے میدان میں گیلی لیو (Gallileo) کی ہے جس نے حرکیات (Dynamics) کے ابتدائی اصول دریافت کرکے ۱۶۳۸ء میں شائع کیے۔ اس نے علم مناظر (Optics) پر کام کرکے عملی دوربین تیار کی جس کی ابتدا عربوں نے کردی تھی۔ اس نے ٹھوس اشیا میں ذرات کی قوتِ اتصال (Cohesion) اور مائعات (Liquids) کے دباؤ کے علم کو ترقی دی۔

اس زمانے میں نیپئر نے ۱۶۱۴ء میں لوگارتم کے اصول مدون کیے جن سے حسابات میں بہت آسانی پیدا ہوگئی۔ اور اس کی بنیاد پر ۱۶۲۲ء میں سلائیڈ رول ایجاد ہوا۔

سترہویں صدی عیسوی کے مشہور ریاضی داں سر آئزک نیوٹن (Sir Issac Newton) اور لیبنز (Liebnitz) ہیں۔ لیبنز تفرقی احصی (Diffrential Calculas) کا موجد ہے۔ نیوٹن نے عالمگیر قانون تجاذب (Universal Law Of Gravitation) دریافت کیا اور نور (Light) کی نوعیت کا نظریہ پیش کیا۔

حرکت کے قوانین (Laws Of Motion) جو اس کے نام سے مشہور ہیں۔ علم میکانکس (Mechanic) کی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

نیوٹن دنیا کے چند عظیم ترین سائنس دانوں میں سے ایک ہے اور ڈھائی سو سال تک سائنس کی قلمرو میں اس کا سکہ چلتا رہا۔ نیوٹن کی وجہ سے دنیا پہلی بار یہ سمجھنے لگی کہ ساری کائنات ایک ہی قسم کے طبیعی قوانین کی پابند ہے۔

اٹھارہویں صدی میں امریکہ کے بڑے محقق سائنس داں بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) نے برق (Electricity) کے علم کو ترقی دی مثبت اور منفی برق (Positive And Negative Electricity) اسی کی دریافت ہے۔

چارلس کولمب (Charles Coulomb) نے مقناطیسی اور برقی تجاذب کا قانون دریافت کیا یعنی یہ کہ برق کے دو چارج ایک دوسرے کو مربع معکوس (Inverse Square) کے قانون کے مطابق کھینچتے یا دفع کرتے ہیں۔

اٹالین سائنس داں وولٹا (Volta) نے برقی رَو کے مبادی دریافت کیے کہ دو دھاتوں کے یا ایک دھات اور ایک مائع کے تماس سے ایک قوتِ محرکہ برقی (Electro Motive Force) وجود میں آتی ہے جس سے برقی رَو پیدا ہوتی ہے۔

برلونی، آئیلر اور ڈالمبرٹ (D'Alambert) نے لچک کے نظریہ (Theory Of Elasticity)۔ در ٹھوس اجسام اور سیالوں کی حرکت کے علم کو ترقی دی۔

بھاپ کی طاقت دریافت ہوچکی تھی مگر بھاپ کے انجن کی طاقت سے چلنے والی مشینریوں کے لیے عمدہ عمدہ دھاتیں ضروری تھیں۔ اس طرح معدنیات اور فلزیات (Mining And Metallurgy) کی طرف توجہ کی گئی۔ ۱۷۵۴ء میں ابراہام ڈاربی نے (Abraham Darby) لکڑی کے ایندھن کی جگہ کوک (Coke) کا استعمال کیا جس میں دھواں نہیں ہوتا اور زیادہ ٹمپریچر حاصل ہوتا ہے اور جو دھاتوں کو گلانے کے لیے بہت کارآمد ہے۔ کوک سے لوہا اور فولاد بنانے میں بہت مدد ملی۔

مزید دھاتیں دریافت کی گئیں جن کو لوہے میں ملانے سے فولاد کی نئی نئی قسمیں وجود میں آئیں۔ دھاتوں کے ایک جرمن ماہر نے جست اور لوہے کو ملاکر (Galvanised Iron) ایجاد کیا جسے ہم "ٹین" کہتے ہیں۔

بھاپ کی طاقت اگرچہ کہ بھاپ کی طاقت کا استعمال اٹھارہویں صدی سے قبل ہی شروع ہوگیا تھا چنانچہ پہلا اسٹیم انجن ۱۶۹۸ء میں ٹامس سیوری (Thomas Savery) نے پیٹنٹ کرایا۔ یہ ایک بھدا سا پمپ تھا جس میں ایک بوائلر لگا تھا اور پانی بھاپ کے دباؤ سے اوپر چڑھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ بھاپ کے عمل کا تسلسل کس طرح قائم رکھا جائے۔ یہ بات ٹامس نیوکمن (Thomas - Newcoman) نے حاصل کی جس نے ۱۷۰۵ء میں ایسا بھاپ انجن بنایا جس میں بھاپ بوائلر سے ایک سلنڈر میں داخل ہوکر ایک پسٹن کو دھکیلتی تھی۔ پھر ٹھنڈے پانی کا ایک فوارہ داخل ہوکر بھاپ کی تکثیف (Condense) کرتا تھا جس سے خلاء پیدا ہوکر پسٹن واپس آجاتا تھا اور اس طرح پسٹن کے آگے اور پیچھے کی حرکت مسلسل جاری رہتی تھی۔

مگر پھر بھی بھاپ کی طاقت صنعتی پیداوار کے لیے استعمال کے قابل

اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوئی جب کہ جیمس واٹ نے جو گلاسگو یونیورسٹی میں سائنٹیفک آلات بناتا تھا دو ترکیبیں ایجاد کیں۔ ایک تو یہ کہ سلنڈر کو ٹھنڈا نہ کیا جائے کیونکہ اس سے حرارت ضائع ہوتی تھی بلکہ بھاپ کو ایک پمپ کے ذریعہ خارج کرکے خلا پیدا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بھاپ اور خلا کا عمل باری باری سے پسٹن کے دونوں رخوں پر کرایا جائے اور اس طرح پسٹن کی ہر ضرب طاقت پیدا کرے۔ واٹ نے یہ انجن ۱۷۸۲ء میں پیٹنٹ کرایا۔ اس کے بعد سے کارخانوں میں خصوصاً کپڑے کی گرنیوں میں یہ انجن کثرت سے استعمال ہونے لگے اور پیداوار میں کئی کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ جیمس واٹ کے انجن نے برطانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی صنعتی طاقت بنا دیا۔ حمل ونقل کے لیے اس کے انجن سے دنیا کی سب سے پہلی اسٹیم بوٹ ۱۸۰۲ء میں۔ اور سب سے پہلا اسٹیم شپ ۱۸۰۷ء میں چلایا گیا۔

انیسویں صدی

یہ صنعت کی ترقی کی صدی تھی سائنس کا مقصد بھی صنعتی ترقی میں مدد دینا قرار پایا۔ سائنس میں حرحرکیات (Thermo Dynamics) اور مقناطیسی اور برق میں جو تحقیقاتی کام ہوا وہ اسی مقصد کے تحت تھا کہ انجنوں اور مشینوں میں ان کو استعمال کیا جاسکے۔ حرارت اور میکانی توانائی کا رابطہ قائم کیا گیا۔ جول (Joule) اور کارنو (Carnot) نے اس کو ترقی دی۔

برقاطیس (Electro magnetism) کا اصول ۱۸۲۰ء میں ارسیڈ (Oersted) نے دریافت کیا۔ امپیر (Ampere) نے برقی رو کے ناپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ چنانچہ برقی رو کی اکائی اسی کے نام سے موسوم ہے۔ مائیکل فیراڈے (Michael Faraday) نے برقاطیس کے مکمل قوانین دریافت کیے یعنی یہ کہ اگر ایک موصل برق حلقہ کے نزدیک مقناطیس کو حرکت دی جائے تو حلقہ میں برقی رَو دوڑے گی۔ یہ ڈائنامو (Dynamo) کا اصول ہے اور برقی انجینیری کا اہم ترین نقطۂ آغاز ہے۔

برق (Electricity) یوں تو دو صدیوں سے سائنس دانوں کو معلوم تھی لیکن طاقت کے اغراض کے لیے استعمال آرسٹیڈ کی دریافت سے شروع ہوا جس نے دریافت کیا کہ برقی رَو کی وجہ سے مقناطیس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں بقائے توانائی کا اصول وضع ہوا کہ توانائی ضائع نہیں ہوتی صرف شکل بدل لیتی ہے۔

لارڈ کیلون (Lord Kelvin) نے جو ماہر علم طبیعات اور کیمیا تھا "جول" کے نظریات کو مان کر ان کو ریاضیاتی شکل دی۔ جیمس کلارک میکسویل (James Clark Maxwell) نے گیسوں کے حرکیاتی نظریہ (Kinetic Theory) کو تشکیل دیا۔

روئی میں بنولے نکالنے کی مشین ایک امریکن انجینیر ایلی وھٹنی (Eli — Whitney) — نے ایجاد کی جس سے روئی کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا۔ وھٹنی پہلا شخص تھا جس نے بندوقوں کو پیمانہ کثیر (Mass Scale) پر بنایا۔ ہر پرزے کو بڑی تعداد میں ڈھیروں میں بنایا ہر ڈھیر سے ایک ایک پرزے لے کر سب کو جوڑ کر بندوقیں تیار کیں۔ یہ پیداوار پر پیمانہ کثیر (Mass — Prodoction) — کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اسلحہ سازی کا پہلا کارخانہ اسپرنگ فیلڈ (امریکہ) میں بنایا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۳۰ء میں کولٹ نے ریوالور ایجاد کیا جس کے اندر ایک گھومتا سلنڈر تھا جس میں کئی خانے تھے۔

ریلوے انجن

گرنیوں اور جہازوں دونوں کے انجن ساکن (Stationary) قسم کے ہوتے ہیں۔

جارج اسٹیفنسن نے متحرک انجن یعنی لوکوموٹیو (Locomotive) ایجاد کیا۔ اس کے پہلے انجن کا نام "راکٹ" تھا۔

ریلوے۔ بھاپ سے چلنے والی متحرک گاڑیوں کا تجربہ ایک عرصہ تک سڑک پر کیا جاتا رہا۔ پٹڑیوں کے استعمال میں کامیابی کا سہرا جارج اسٹیفنسن کے سر رہا۔ سب سے پہلی ریلوے لائن ۱۸۲۵ء میں اسٹاکٹن ڈارلنگٹن ریلوے (Stockton-Darlington Rly) کے نام سے قائم ہوئی جس نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

۱۸۶۰ء میں ایندھن کے طور پر لکڑی کی بجائے کوئلہ کا استعمال شروع ہوا۔ ریل کی سڑک میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ پتھر کی گٹی اور سلیپر استعمال کیے جانے لگے۔

آگے چل کر ریلوے میں بھاپ کی جگہ بجلی بھی استعمال ہونے لگی۔ اسی طرح شہروں میں ٹرامیں بجلی سے چلائی جاتی تھیں۔

ٹربائین (Turbine) اس میں پسٹن کا دخل نہیں بلکہ شدید دباؤ کی بھاپ کا فوارہ ایک گھومتے دھرے کو لگی ہوئی پھیتوں سے ٹکرا کر ان کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا اصول ایک عرصہ سے معلوم تھا مگر ان اصولوں کو کامیابی سے استعمال سر چارلس پارسن (Sir Charles Parson) نے ۱۸۸۰ء میں کیا۔

انھوں نے ہی اس کو مزید ترقی یہ دی کہ بھاپ کے دباؤ کو متواتر کئی مرحلوں میں استعمال کیا جس سے مزید طاقت حاصل ہوئی۔ بھاپ کے ٹربائین کی کارکردگی بھاپ کے انجن سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے جہازوں میں بھاپ انجن کی بجائے بھاپ ٹربائین استعمال کیے جانے لگے۔

اس کا سب سے پہلا تجربہ ۱۸۹۴ء میں کامیابی سے جہاز ٹربینیا (Turbina) پر کیا گیا۔ آگے چل کر بھاپ کی جگہ بجلی نے لے لی۔ بجلی (الکٹریسٹی) پیدا کرنے میں ٹربائین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دنیا کی بجلی کی پیداوار کا بڑا حصہ بھاپ ٹربائینوں سے پیدا ہوتا ہے۔

۱۸۶۶ء میں ایک اہم ترین تبدیلی واقع ہوئی جب کہ الفریڈ نوبل (Alfred Nobel) نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔

ہوائی جہاز (ایرشپ)

اس سلسلہ میں پہلا قدم غبارہ کی ایجاد ہے غالباً فرانس کے رہنے والے دو بھائیوں ایتن اور جوزف مانٹ گالفر (Mont golfer) کی ایجاد ہے۔ انھوں نے ایک غبارہ ۱۷۸۳ء میں بنایا جس کا قطر ۳۵ فٹ تھا اس میں گرم ہوا بھرنے سے جو معمولی ہوا سے ہلکی تھی وہ غبارہ ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی تک چڑھا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد دو آدمی غبارہ میں سوار ہوکر ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی تک گئے۔

اس کے بعد گرم ہوا کی جگہ ہیڈروجن گیس نے لی۔ لیکن غبارہ پر قابو نہیں تھا وہ ہوا کے رحم وکرم پر تھے۔ آخر ۱۸۹۸ء میں کاؤنٹ زیپلن

(Count Zeppling) نے ہوائی جہاز (Air Ship) ایجاد کیا جس میں پٹرول کا انجن استعمال کیا گیا۔ اور اس کی رفتار اور سمت پر پورا قابو حاصل ہوا۔

روشنی اٹھارہویں صدی کے ختم تک رات کو روشنی کا ذریعہ تیل کے چراغ تھے۔ (اگرچہ کہ تاریخ سے ۲۰۰ ق۔م میں روشنی کے لیے گیس کے استعمال کا پتہ چلتا ہے)۔ انیسویں صدی کے شروع میں گیس استعمال ہونا شروع ہوئی۔ اور بیسویں صدی کے آغاز تک بھی اس کا استعمال جاری تھا جب کہ برقی روشنی نے اس کی جگہ لی۔

ٹائپ کی مشین ٹائپ کی مشین کا خیال انگریز انجینیر ہنری مل (Henry Mill) کو ۱۷۱۴ء میں آیا چنانچہ اس نے اس کے ڈیزائن کو پیٹنٹ کرایا مگر اس کو مادّی صورت نہ دے سکا۔ مشین بنانے کی کوشش ۱۸۲۹ء میں امریکہ میں ولیم برٹ (William Bert) نے کی مگر سب میں پہلی قابلِ استعمال مشین ۱۸۶۷ء میں امریکہ میں بنی جسکو ۱۸۷۴ء میں ریمنگٹن (Remington) نے تجارتی پیمانہ پر بنایا۔ ٹائپ مشین کی ایجاد سے دو سماجی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ایک تو تجارتی مراسلت اور کاروبار میں سرعت اور دوسرے عورتوں کا پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہونا۔

سلائی کی مشین سلائی کی مشین ایک فرانسیسی درزی تھمونیر (Thimonir) نے ۱۸۳۰ء میں ایجاد کی۔ بعد میں اس میں امریکہ میں بہت ترقی ہوئی۔ سب سے مشہور صنعت کار ایک امریکی آئزک مرٹ سنگر (Issac Merritt Singer) ہوا ہے جس نے ۱۸۵۱ء میں پیٹنٹ حاصل کیا اور بڑے پیمانہ پر مشین تیار کی۔

لفٹ شہروں میں زمین کے مہنگے ہونے کی وجہ سے اونچی عمارتوں کی تعمیر ضروری ہو گئی جن کے لیے ۱۸۵۰ء میں جھولا (Elevator) ایجاد ہوا جو پانی کے دباؤ سے چلتا تھا۔ بعد میں بجلی نے پانی کی جگہ لی۔

متحرک تصویریں (سینما) امریکہ میں تھامس ایڈیسن (Thomas Edison) نے ایسا کیمرہ ایجاد کیا جو متحرک چیزوں کی تصویریں لے سکتا تھا۔ اس فن کو سینما ٹوگراف کا نام دیا گیا۔ سینما کی سب سے پہلی مربوط کہانی ۱۹۰۳ء میں "دی گریٹ ٹرین رابری" کے نام سے دکھائی گئی۔ سینما کو (Movies) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں سینما میں آواز بھی شامل ہوئی اور اس کا نام بدل کر ٹاکیز (Talkies) ہو گیا۔

بجلی یا برق

انیسویں صدی کا سب سے پُراسرار عطیہ بجلی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر آخر میں وولٹا (Volta) نے بیٹری (Battery) تیار کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اورسٹڈ (Oersted) نے دکھایا کہ برقی رَو سے مقناطیس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ امپیر نے دریافت کیا کہ ایک لچھے سے کسی ربط کے بغیر دوسرے لچھے میں برقی رو پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ امالی برقی (Induced Electricity) کا اصول ہے۔ اور آخر میں فیراڈے (Faraday) نے دریافت کیا کہ ایک تار کے نزدیک مقناطیس حرکت کرے تو تار میں بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح گویا تمام ضروری معلومات مہیا ہو گئیں۔ جن سے بڑی بڑی ایجادیں ظہور میں آئیں۔ یعنی ٹیلی گراف جو ۱۸۴۴ء میں مارس (Morse) نے ایجاد کیا ٹیلی فون جو ۱۸۷۶ء میں (Bell) نے ایجاد کیا ڈائنامو (Dynamo) جو فیراڈے (Faraday) نے ۱۸۳۱ء میں ایجاد کیا۔ بجلی کا لیمپ جو ایڈیسن (Edison) نے ۱۸۷۹ء میں ایجاد کیا۔

ٹیلی گراف ایک امریکن سیموئیل مارس (Samuel Morse) کو جو ابتدا میں ایک پینٹر تھا یہ خیال آیا کہ برقی دھکوں (Electric Impulses) سے کام لے کر پیام رسانی کی جائے۔ اس نے اپنا ٹیلی گراف کا نظام بالٹی مور (Baltimore) اور واشنگٹن کے درمیان چالیس میل کے لائین سے شروع کیا۔ بہت جلد یہ نظام پیام رسانی کے اور سب نظاموں پر چھا گیا۔ پہلا پیام جو مارس نے ۲۵ مئی ۱۸۴۴ء میں بھیجا یہ تھا "یہ اللہ نے کیا ہے"۔

ٹیلی گراف کا اصول یہ ہے کہ نظام کے ایک سرے پر سوئچ (Switch) یا کنجی (Key) ہوتی ہے جس کو دبانے سے ایک برقی دور (Circuit) مکمل ہو کر دوسرے سرے کے ایک برقی مقناطیس کو مقناطیس بنا دیتا ہے۔ یہ مقناطیس ایک پرزے کو کھینچ کر وہی حرکت دیتا ہے جو پہلے سرے کے کنجی کی تھی۔ اس طرح گویا کنجی کی حرکت برقی تار کے ذریعہ ایک فاصلہ پر اپنی اصلی شکل میں منتقل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا کوڈ ایجاد کیا جو نقطوں (Dots) اور خطوط فاصل (Dashes) پر مشتمل تھا۔ پھر حروف تہجی کے ہر حرف کے لیے ایک خاص (Dot-Dash) اجتماع مختص کیا۔

۱۸۶۶ء میں بحر اٹلانٹک میں ایک موٹا تار (Cable) ڈال دیا گیا اور امریکہ اور یورپ تارِ برقی سے منسلک ہو گئے یہ (Cable) دو ہزار پانچ سو میل لمبا تھا اور بارہ لاکھ ڈالر کے صرفہ سے تیار کیا گیا تھا۔

ٹیلی فون امریکہ کے الیکزینڈر گراہم بل (Alexender Graham Bell) کی ایجاد ہے۔ ۱۸۷۶ء میں اس نے محض ایک اتفاق سے دریافت کیا کہ آواز تار کے ذریعہ منتقل ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ آواز ہوا میں جو ارتعاش پیدا کرتی ہے اس سے ایک سرے پر ایک دھاتی تختی کو متاثر کیا جائے اور اس کا یہ تاثر برقی تار کے ذریعہ دوسرے سرے پر کی تختی کو متاثر کرے جس سے ہوا میں وہی ارتعاش اور اس طرح وہی آواز پیدا ہو۔

تھامس ایڈیسن (Thomas Edison) کی ایجادیں

یہ انیسویں صدی کا موجد اعظم گزرا ہے۔ اس کی کہانی عجیب ہے اس نے ایک ٹیلی گراف کے کارکن کی لڑکی کی جان بچائی تو باپ نے شکر گزاری کے جذبہ سے اس کو ٹیلی گرافی کا فن سکھایا۔ بہت جلد اس کو ایک برقی لیبارٹری کا صدر بنا دیا گیا جہاں اس کو ہر طرح کے تجربوں کی آزادی تھی۔ اس نے فونوگراف یا گراموفون، سینما کے پردہ جکڑ اور فلم، برقی موٹر، ڈینامو بیٹریاں، ٹائپ کی مشین ریلوے سگنل ایجاد کیے اور ان کو زبردست ترقی دی۔ اس نے جملہ ۱۲۰۰ چیزیں

ایجاد کرکے ان کو پیٹنٹ کرایا۔ لیکن انسانی تمدن کے لیے سب میں کارآمد چیز جو اس نے ایجاد کی وہ برقی گولہ (Electric Bulb) تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اس نے شیشہ کے ایک ظرف کو جس میں کاربن کا ایک (Filament) تھا ہوا سے خالی کرکے اور ظرف کے منہ کو پلاٹینم سے بند کرکے فلامنٹ (Filament) کو برقی تار سے جوڑا جس سے فلامنٹ روشن ہوگیا۔ ۱۹۱۰ء میں کاربن کی جگہ ٹنگسٹن نے لی۔ اور اب تک یہی استعمال ہوتا ہے۔

ڈائنامو ۱۸۳۲ء میں فیراڈے کی اس دریافت سے کہ ایک تار کے نزدیک مقناطیس کو حرکت دی جاتے تو تار میں بجلی دوڑے گی ایک فرانسیسی سائنسداں ہپولائٹ پکسی (Hipp - olite Pixy) نے ایک چھوٹا ڈائنامو تیار کیا بعد میں ایڈیسن نے ڈائنامو سازی کو ترقی دی۔ سب میں پہلے ۱۸۸۰ء میں بجلی کی روشنی اور طاقت (پاور) کی صنعت وجود میں آئی۔

برقی طاقت کی منتقلی (Transmission)

ایک عرصہ تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ منتقلی کے اغراض کے لیے پست وولٹیج والی راست رو (Direct Current) کی برقی رو بہتر ہے یا اعلیٰ وولٹیج کی متبادل رو آلٹرنیٹنگ کرنٹ (Alternating Current) آخر ۱۹۰۰ء میں یہ ثابت ہوا کہ آلٹرنیٹنگ کرنٹ (متبادل رو) بہتر ہے۔ کیوں کہ اس میں ٹرانسفارمر (Transformer) استعمال ہوسکتے ہیں جو اعلیٰ وولٹیج اور پست کرنٹ استعمال کرکے برقی طاقت کی منتقلی کو آسان کردیتے ہیں اور پھر ٹرانسفارمر کے ذریعہ وولٹیج کو کم کرکے بجلی کو مقامی استعمال کے لیے کارآمد بنادیتے ہیں۔ اس عمل سے منتقلی میں برقی رو سے حرارت کم پیدا ہوتی ہے۔

برقی گھڑیال پہلی برقی گھڑیاں ۱۸۴۵ء میں الیگزنڈر بین (Alexander Bain) نے بنائی۔

برقی ریلوے ۱۸۹۵ء میں امریکہ میں ایڈیسن نے بنائی۔

بھاپ کی ٹربائین بھاپ کا فوارہ ایک پہیئے کی پتیوں پر گرکر اس کو حرکت دیتا ہے اور پہیئے کی حرکت کے ذریعہ مشینری کو حرکت ملتی ہے۔ پہلی ٹربائین سویڈن کے ایک انجینیر ڈی لاوال (De Laval) نے بنائی۔ پھر انگریز انجینیر پارسنز اور امریکن انجینیر کرٹس (Curtis) نے اس کو بہت ترقی دی۔

اندرونی اختراقی انجن (Internal Combustion Engine)

برخلاف بھاپ کے انجن کے اس انجن میں ایندھن انجن کے اندر جلتا ہے احتراقی دھماکے سے طاقت حاصل کرنے کا خیال بہت پرانا ہے اور بارود کے عمل کے مطالعہ سے شروع ہوا۔ اس کو انجن میں استعمال سب سے پہلے ۱۷۹۱ء میں ایک انجینیر باربر (Barber) نامی نے کیا۔ بعد میں انیسویں صدی کے وسط میں تین انجینیروں آٹو (Otto) ڈیملر (Daimler) اور ڈیزل (Diesel) نے اس کو ترقی دی۔ پہلا انجن جو بازار میں آیا جرمن انجینیر آٹو (Otto) نے بنایا تھا جس کی پیرس میں ۱۸۶۷ء میں نمائش کی گئی۔ ڈیزل کا انجن سب سے زیادہ باکفایت ثابت ہوا۔ طاقت کے اعتبار سے ان انجنوں میں بہت ترقی ہوئی۔ ۱۸۶۴ء میں انجن کی طاقت صرف چار ہارس پاور تھی۔ ۱۹۱۰ء میں ایک ہزار تک پہنچ گئی۔

موٹرکار پہلے پہل ڈیملر (Daimler) نے اور پھر ہینری فورڈ (Henry Ford) نے اندرونی احتراقی انجن (Internal Combustion Engine) کو ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال کیا۔ ہنری فورڈ پہلا شخص تھا جس نے اسمبلی لائین (Assembly - Line) کا طریقہ اختیار کیا۔ یعنی اجزا (Parts) الگ الگ بن کر خودکار (Automatic) طریقے سے آکر جڑ جائیں اس سے موٹر کار بہت سستی ہوگئی اور قیمت پہلے کے مقابلہ گھٹ کر دس فیصدی ہوگئی اور امریکہ میں ہر شخص کے لیے موٹر خریدنا ممکن ہوگیا۔

زمانہ حال کے پل

پل پتھر کی کمانوں یا لکڑی کے ہوتے تھے۔ بعد میں لوہا استعمال ہونے لگا۔ پہلا دھاتی پل تھامس ٹل فورڈ (Thomas Telford) نے ڈیزائن کیا جو لندن سے ویلز (Wales) کے راستہ میں انبائے میائی پر تعمیر کیا گیا۔ یہ ایک معلق پل (Suspension Bridge) ہے جو ۱۸۲۰ء میں شروع ہوکر ۱۸۲۶ء میں مکمل ہوا۔ معلق پل میں دونوں کناروں کے درمیان کوئی پایا نہیں ہوتا سڑک ایک جھولے کے طور پر لوہے کے موٹے تاروں (Cables) سے لٹکی ہوتی ہے۔

(ب) سب میں بڑا فصل (Span) اسکاٹ لینڈ میں فورتھ (Forth) ندی پر ۱۷۰۰ فٹ لمبا ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں امریکہ میں ۱۸۵۰ فٹ کا لمبا پل تعمیر ہوا۔ پھر تیزی سے اس میں ترقی ہوکر امریکہ میں ۱۹۳۱ میں ۳۵۰۰ فٹ کا اور ۱۹۳۱ء میں ۴۲۰۰ فٹ لمبائی کا۔ ۱۹۴۰ء میں ہوا کے طوفان میں ۲۸۰۰ فٹ فصل کا ایک پل امریکہ میں ٹوٹ گیا تو تین علوم یعنی معلق پلوں کی انجینیری ارتعاشوں (Vibrations) کا نظریہ اور "ہوا حرکیات" (Aero Dynamics) کو ملا کر ایک نیا علم معلق پل کی "ہوا حرکیات" وجود میں آیا۔

(ج) ایفیل ٹاور (Eiffel Tower) یہ ایک حیرت ناک عظیم الشان تعمیر ہے جو ۱۸۸۹ء میں پیرس کی بین الاقوامی نمائش کے لیے تیار کی گئی تھی جس کو اس نمائش میں کوئی تین کروڑ آدمیوں نے آکر دیکھا۔ اس کو انجینیری مہارت کا ایک شاہ کار سمجھا جاتا ہے جو اگرچہ کہ محض اس سال کی نمائش کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن جس کو قائم رکھا گیا جو اب بھی عجوبہ روزگار سمجھا جاتا ہے اور ہر سیاح اس کو دیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ مینار خالص لوہے کا بنا ہوا ہے اور اس کی اونچائی تقریباً ہزار فٹ ہے۔

کثیر منزلی عمارتیں (Multi Storied Building)

پہلے کی عمارتیں چنائی یعنی پتھر یا اینٹ کی ہوتی تھیں۔ اور وہ چار منزلہ سے زیادہ نہ ہوتی تھیں۔ لوہے کے استعمال سے کثیر منزلی عمارتوں کی تعمیر سہل

ہوگئی۔ ان میں ڈھانچہ لوہے کا ہوتا ہے اور بیچ میں دیواریں (Partition Walls) اینٹ یا سمنٹ کی ہوتی ہیں۔ پہلے پہل ڈھانچہ میں لوہے کے نل استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں (I) کی شکل کے شہتیر اور گرڈر استعمال ہونے لگے۔

سب سے پہلی کثیر منزلی عمارت ۱۹۰۲ء میں امریکہ میں تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس فن میں ترقی ہوتی گئی آج آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں (Sky Scraper) تعمیر ہو رہی ہیں۔ حال حال تک دنیا میں سب سے اونچی عمارت نیویارک میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ۱۲۵۰ فٹ اونچی تھی۔ اب ایک عمارت اس سے بھی اونچی تعمیر ہوئی ہے۔

بیسویں صدی

بیسویں صدی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سائنٹفک تحقیقات جو یونیورسٹی اور افراد کے تجربہ خانوں (Laboratories) تک محدود تھی اب صنعتی کارخانوں میں ہونے لگی۔ ایکسرے جو تجربہ خانوں کی چیز تھی صنعتوں میں استعمال ہونے لگی۔ موٹر کاروں کے ڈیزائن اور ساخت میں بے حد ترقی ہوتی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن عام ہوگیا۔ سفر میں ایروپلین عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ راکٹ ایجاد ہوئے جن کی رفتار آواز سے بھی تیز تر تھی۔ مصنوعی طور پر زمین کے اطراف چکر لگانے والے اجسام (Satellites) ایجاد ہوئے سب میں اہم دریافت جوہری توانائی (Atomic Energy) ہے۔

ہوائی جہاز

ہوائی جہاز کو آگے بڑھانے کے لیے اور ہوا میں تھامنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں آگے بڑھانے کے لیے انجن کی طاقت کام کرتی ہے۔ ہوائی جہاز کے سامنے پنکھا ہوتا ہے جس کو ہوائی پیچ (Air Screw) کہتے ہیں۔ اس کی مدد سے ہوائی جہاز آگے بڑھتا ہے۔ ہوائی جہاز کو پکھوٹے (Wings) ہوتے ہیں۔ جو ہوا کو چیرتے جاتے ہیں جس سے ہوا کا دباؤ پیدا ہوتا ہے۔ ان کا جھکاؤ ایسا ہوتا ہے کہ ہوا کے دباؤ کا ایک جزو اوپر کی طرف کام کرتا ہے اور ہوائی جہاز کے وزن کی مدافعت کرتا ہے اب ہوائی جہاز میں ہوائی پیچ کی بجائے جٹ (Jet) استعمال کیا جا رہا ہے۔ گیس کا فوارہ پیچھے کی طرف سے نکل کر ہوا کو دھکہ دیتا ہے اور اس کے ردعمل کے طور پر ہوا جہاز کو آگے کو دھکہ دیتی ہے جس سے جہاز آگے بڑھتا ہے۔

سوپر سانک پرواز

ہوائی جہاز کی رفتار آواز کی رفتار سے زیادہ ہو تو کئی ایک مشکل مسائل پیدا ہوتے ہیں اس لیے ہوائی جہاز کی رفتار کی یہ حد مقرر کی گئی تھی جو ۷۵۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ مگر اب یہ مسائل حل کرلیے گئے ہیں اور رفتار اس سے زیادہ کی جاسکتی ہے اس کو سوپر سانک پرواز کہتے ہیں۔

ایکسرے (X-Ray) اور ایٹمی توانائی

۱۸۵۹ء میں ایک جرمن سائنسداں پروفیسر رنجن رونٹے جن (Runtgen) نے دریافت کیا کہ کچھ شعاعیں ہیں جو مقوے (کارڈ بورڈ) لکڑی، ایلومنیم وغیرہ اشیا میں سے گزر جاتی ہیں جن میں سے روشنی نہیں گزر سکتی۔ مگر یہ شعاعیں موٹی دھاتی تختیوں اور ہڈیوں میں سے نہیں گزر سکتی۔ ان کو ایکس رے (X-Ray) کا نام دیا گیا ہے۔ جے جے تھامسن (J.J. Thomson) نے الکٹران دریافت کیے جو جوہر (Atom) کے اجزا ہوتے ہیں۔ اس کی مدد سے ردرفورڈ (Ruther ford) اور بور (Bobr) نے ایٹم کی ساخت کو پورے طور پر دریافت کیا موسیو اور مادام کیوری نے ریڈیم دریافت کیا جس سے مستقل طور پر شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور شعاعوں کے نکلنے سے اس کا وزن گھٹتا ہے۔ یعنی گویا توانائی اور مادہ ایک دوسرے میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔ اس کی آئنسٹائن نے تکمیل کی اور اپنی مشہور مساوات ($E=Mc^2$) پیش کی جو جوہری توانائی اور جوہری بم کا پیش خیمہ تھا۔

الکٹرانکس

اس کا علم بیسویں صدی میں تجربہ خانوں میں وجود میں آیا۔ اب یہ انجنیئری کی ایک مستقل شاخ بن گئی ہے۔ پچاس سال پہلے تک الکٹرانکس ہماری روزمرہ کی زندگی کے صرف کناروں کو چھوتا تھا۔ مگر آج ایک جزو لاینفک بن گیا ہے گویا الکٹرانکس نے ایک صنعتی انقلاب پیدا کردیا۔ اس کا پہلا استعمال لاسلکی (Wireless) ٹیلی گرافی سے شروع ہوا۔ اس کے بعد نشریات (Broadcasting) کے لیے استعمال ہونے لگا جس کی شروعات یوں ہوئی کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی وسٹنگ ہاؤس کمپنی کے ایک انجنیئر فرینک کانراڈ (Frank Conrad) نے ہفتہ میں دو بار دو گھنٹہ کا موسیقی کا پروگرام پٹسبرگ (Pitsberg) کے عوام کے لیے ترتیب دیا۔ پھر اس کمپنی نے ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا اور ریڈیو سٹ بنائے۔

۱۹۲۵ء تک ریڈیو سٹ کے ساتھ سماعی آلے (Ear Phones) لازمی تھے۔ ۱۹۲۵ء میں موجودہ قسم کے سٹ ایجاد ہوئے جن کو لاؤڈ اسپیکر کہا جاتا ہے۔

الکٹرانکس کا صنعتی استعمال دوسری عالمی جنگ سے شروع ہوا۔ الکٹرانکس کی دوسری افادیت یہ ہے کہ تھپیر بہاؤ، وزن، لزوجت (Viscosity) اور موٹائی کی طبعی کیفیتوں کو ایک برقی سگنل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس سگنل کو ایک دور (Circuit) کے ذریعہ بڑھایا گھٹایا اور قلمبند (Record) کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ کسی موٹر یا سوئچ (Switch) یا ویلو (Valve) کو کھول بند کیا جاسکتا ہے صنعت میں اس کے استعمال سے ہر قسم کے کنٹرول عمل میں آسکتے ہیں اور اس طرح خود کاری (Automation) کا علم وجود میں آیا۔ یعنی خود کار کنٹرول (Altomatic Control)۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک سرے پر کسی چیز کا ایک نقشہ (بلو پرنٹ) رکھا جائے تو بغیر انسانی محنت کے خود کار مشینری کے ذریعہ وہ چیز مکمل طور پر تیار ہوکر دوسرے سرے پر باہر نکل آتی ہے۔

ٹیلی وژن

اس کی شروعات ۱۹۰۷ء میں روس کے ایک سائنسداں بورس روزنگ (Boris Rosing) نے کی اور بعد میں اس کے ایک شاگرد نے امریکہ آکر اس کی تکمیل کی۔ ٹیلی وژن میں تصویر کی نکلنے والی روشنی کی توانائی کو برقی توانائی میں اور پھر اس برقی توانائی کو ویسی ہی تصویر کی روشنی میں تبدیل

کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں امریکہ کی آر۔ سی۔ اے (R. C. A.) کمپنی نے اس کو تجارتی پیمانہ پر شروع کیا۔ پھر اس میں ترقی ہوتی گئی۔ انگلستان میں بی بی سی نے اس سے چند سال قبل باقاعدہ ٹی۔ وی پروگرام شروع کر دیے۔

ریڈار (Radar) یہ آکر جنگی ضروریات سے شروع ہوا۔ اور آج ہوا بازی کے لیے ایک نعمت بن گیا ہے۔ ریڈار فضا میں سگنل روانہ کرتا ہے اور اس کے عکس کو وصول کرتا ہے۔ سگنل کے جانے اور واپس آنے میں جو وقت لگتا ہے اس سے کسی ہوائی جہاز کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ انٹینا (Antena) کے پوزیشن سے اس کی سمت معلوم ہوتی ہے۔ ریڈار میں مائیکروویو (Microwave) استعمال کرتے ہیں۔ جن کا تعدد بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اور اس طرح ریڈار کا سائز بہت مختصر ہوتا ہے۔

کمپیوٹر اس کو مصنوعی دماغ کہنا بے جا نہ ہوگا جس میں حافظہ (Memory) کارخانہ کام کرتا ہے۔ الکٹرانکس کی مدد سے ہزارہا قسم کے عمل اس سے ممکن ہیں اور یہ ہر قسم کے سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے۔

ایٹمی توانائی ری ایکٹر (Reactor) میں جو ایک بہت بڑا حوض ہوتا ہے یورے نیم (Uranium) دھات کے ایٹم (Atoms) کو توڑ کر توانائی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ توانائی پہلے حرارت اور پھر بجلی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اب بجلی کی طاقت کی پیدائش کے لیے یہ طریقہ کوئلہ اور تیل کی جگہ لے رہا ہے۔

سورج کی روشنی سے بجلی

بجلی پیدا کرنے کے لیے گرتے پانی کی توانائی، کوئلے اور تیل کی کیمیائی توانائی، اور جوہری توانائی کے علاوہ ایک نئی چیز وجود میں آرہی ہے اور وہ سورج کی روشنی ہے۔ اس پر ابھی کام ہو رہا ہے اور جب یہ فن ترقی کر جائے گا تو یہ ایک توانائی کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہاتھ آئے گا۔

اسپوتنک (Sputink) ۱۹۵۷ء میں روس نے ایک راکٹ کے زور سے ایک مصنوعی سیارہ خلا میں روانہ کیا جو زمین کے اطراف گردش کرتا رہا۔ یہ اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگاتا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے میں کرہ زمین کا ایک چکر پورا کرتا تھا۔

اس کے بعد خلائی سفر میں بہت ترقی ہوئی اور انسان ۱۹۰- میں چاند پر جا پہنچا۔ دوسرے سیاروں پر (انسان کے بغیر) پرواز ہو چکی ہے اور الکٹرانکس کے ذریعہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

غرض کہ سائنس اور انجینیری کی پرواز وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہے اور لامحدود معلوم ہوتی ہے۔

برقی اور الکٹرانکس انجینیری

ابتدائی دور میں برقی اور الکٹرانک انجینیری صرف برقی طاقت، روشنی، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف پر مشتمل تھی، لیکن اب وہ اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ اس میں ریڈیائی ترسیل ہندسی حساب کار (Digital Computation) مشینوں اور ان کے نظام کا خود کار کنٹرول (Control) اور ان آلات کو جو راڈار (Radar) سونار (Sonar) لوران (Loran) اور شوران (Shoran) سے لیس ہوتے ہیں۔ فضا میں چلانا، لیزر (Laser) کی پیمائش وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں جس چیز سے اس میدان میں بکثرت سابقہ پڑتا ہے۔ وہ اندرونی طور پر کام کرنے کے بڑے نظاموں کا تجزیہ ہے جو ٹرانسپورٹ سے لے کر حیاتیات (Biological) ماحولیات (Ecological) اور معاشیات پر مشتمل ہوتا ہے یہ سب برقی انجینیری سے مربوط ہیں اس لیے کہ ان سب کو حل کرنے کے لیے مماثل حسابی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

اس پیشہ کی تاریخ سترہویں صدی ہی میں یوروپی دانشوروں کی توجہ برقی مشاہدوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی مگر ابتدا میں یہ سائنس نظری رہی۔ قابل ذکر سائنس داں جنھوں نے اس فن کی بنیاد رکھی ہے ان میں لڈوگ ولہلم گلبرٹ اور جرمن نژاد سائمن اوم (Simon Ohm) ڈنمارک کے ہانس کرسچین اوورسٹڈ، فرانس کے اینڈری ماری ایمپیر، اٹلی کے وولٹا، امریکہ کے جوزف ہنری اور انگلستان کے مائکل فیراڈے شامل ہیں۔ برقی انجینیری بطور ایک مستقل مضمون کے ۱۸۶۴ء میں اس وقت ابھری جبکہ اسکاٹ لینڈ کے سائنس اور حساب داں جیمس کلارک میکسول نے برقی قوانین کو ریاضیاتی شکل دی اور خیال ظاہر کیا کہ برقی مقناطیسی توانائی کی منتقلی اشعاع کی ایک شکل میں واقع ہوتی ہے۔ جس کو بعد میں ریڈیائی موجوں کا نام دیا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں ہنرک ہرٹز نے اپنے تجربہ خانہ واقع مشرقی جرمنی میں ریڈیائی موجوں کے وجود کو بتلایا۔

ٹیلی گراف (تار برقی)، برق کا پہلا عملی استعمال تھا جس کو ۱۸۳۷ء میں سیاموئل مورس (Morse) نے ایجاد کیا تھا۔ اس کے بعد بھی چالیس سال تک برقی انجینیروں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی

لیکن جب گراہم بل نے ۱۸۷۶ء میں ٹیلی فون اور ۱۸۷۸ء میں تھامس ایڈیسن نے برقی لیمپ ایجاد کیا اور ۱۸۸۲ء میں نیویارک میں مرکزی پیداکاری پلانٹ (Central Generating Plant) قایم ہوا تو اس کے ساتھ ہی ان شعبوں میں کام کرنے کے لیے بہت سے تربیت یافتہ اشخاص کی ضرورت محسوس ہوئی۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں یہ نیا شعبہ عوام کے لیے جاذب نظر بنا ایڈیسن نے "اڈیسن اثر" (Edison Effect) دریافت کیا جو ایک خلائی (Vacuum) لیمپ میں برقی رو کا گزرنا تھا۔ یہ فضا میں برقی رو کی موجودگی کا پہلا مشاہدہ تھا۔

۱۸۹۵ء میں ندرلینڈ کے ہنڈرک آنٹی لورنٹز نے برقی بھرن (Charge) کے نظریہ الکٹران کی پیش قیاسی کی تھی۔ اس کے دو سال بعد انگلستان کے سرجے۔ جے تھامسن نے بتلایا کہ اڈیسن اثر دراصل منفی طور پر برقائے ہوئے ذرات یعنی (Electron) کا نتیجہ ہے۔ اس سے اٹلی کے گگلیمو مارکونی (Gugliemo Marconi) امریکہ کے لی۔ ڈی فراسٹ (Lee De Frost) اور دوسرے سائنس دانوں کی رہبری ہوئی جنھوں نے الکٹرانکس انجینیری کی بنیاد قایم کی۔

برقی اور الکٹرانکس انجینیری کی تعلیم کے دائرۂ عمل

ریسرچ ۱۸۷۱ء میں انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی میں کیونڈیش (Cavandish) نام کی پروفیسری علمی طبیعیات میں ریسرچ کے لیے قایم کی گئی اور اس غرض کے لیے کیونڈش تجربہ خانہ بنایا گیا جس نے بیسویں صدی میں بڑی ترقی کی جیمس کلارک میکسول جیسے ناموَر ریاضی داں اور سائنس داں کو اس کا پہلا پروفیسر بنایا گیا۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں اور صنعتی اداروں میں ریسرچ اور صنعتی تحقیقات کے لیے انتظامات کیے گئے جس سے کافی ترقی ہوئی مثلاً لیمپ کے متعدد ٹنگسٹن (Duet Tungston) ریڈیو کی نلیاں اور دیگر آلات، طویل مسافتی ٹیلی فون بڑی لوولٹیج سے برقی طاقت (Power) کی ترسیل، ٹیلی ویژن، ٹرانسسٹر اور مصنوعی سیارے (Satellite) کے ذریعے رسل و رسائل وغیرہ اسی تنظیم سے حاصل ہوئے۔ مختلف قسم کے تربیت یافتہ انجینیروں کو عمدہ آلات و اوزار سے لیس تجربہ خانوں میں ماموَر رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے موجدوں کے لیے ایسی ایسی معلومات فراہم کیں جو کسی ایک شخص کے لیے انفرادی طور پر حاصل کرنا ناممکن سا تھا۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں برقی اور الکٹرانکس پیشہ سے وابستہ انجینیروں کی تقریباً آدھی تعداد ریسرچ اور ترقیاتی اسکیموں میں مصروف رہی ہے ایسے کاموں میں حصہ لینے کے لیے مروجہ انجینیری ڈگری کورس سے کافی آگے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقیات ریسرچ کے نتائج کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ترقیاتی اور ڈیزائن کے انجینیر ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ تجربہ خانوں میں بنائے ہوئے آلات اور اوزار کو عملی اغراض کے لیے مکمل کرکے بازار میں ان کی نکاسی کریں، ان آلات و اوزار کو بڑے پیمانے پر تیار کرنے کے لیے خودکار مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ڈیزائن انجینیروں کو عملی تجربہ کے علاوہ نظری تعلیم میں بھی کافی مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے۔

دوسرے فرائض برقی انجینیری میں فن دانوں کو عملی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے فرائض میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اشیا کی پیداوار کی عمدگی پر نگرانی رکھیں بلکہ پیداواری طریقہ کو اور زیادہ موثر بنائیں وہ اشیا کی پیداوار کی ذمہ دار ٹیم کے ساتھ مل کر کام کریں، حسب ضرورت اس میں ایسی تبدیلی لائیں کہ اس سے خاص ضروریات کی تکمیل ہوسکے۔

جو انجینیر یا فن داں اپنی قابلیت اور اہلیت کا ثبوت دیتے ہیں انتظامیہ میں ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ برقی پیدائش اور اس کی تقسیم کے ماہر انجینیروں سے میونسپل کارپوریشن اور بعض سرکاری و نیم سرکاری ادارے معقول معاوضہ پر مشاورت حاصل کیا کرتے ہیں۔

برقی اور الکٹرانکس انجینیری کی ذیلی تقسیم

بنیادی ریسرچ کے نتیجہ میں برقی اور الکٹرانکس انجینیری میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے، ایڈیسن کی سیدھی سادی راست رو (ڈائرکٹ کرنٹ یا ڈی۔ سی) کی پیداوار اور اس کی تقسیم سے قبل اس میدان میں انجینیری وجود میں نہ آئی تھی، متبادل رو (آلٹرنیٹنگ کرنٹ یا اے سی) کا طریقہ نسبتاً سستا بھی ہے اور صنعت کے لیے فائدہ مند بھی لیکن اس وقت کچھ پیچیدہ سا تھا۔

۱۹۲۰ء تک ڈی سی اور اے سی کی برقی انجینیری میں مسلسل ترقی ہوتی رہی اس کے بعد ریڈیائی نشریات کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ تعدّاد (High Frequency) کی ریڈیائی ترسیلات بھی شروع ہوئیں، انجینیروں نے معلومات میں اضافہ کے ساتھ خلائی نلی (Vacuum-Tube) کے راز معلوم کرلیے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ٹیلی ویژن بازار میں آگیا اور دوسری مناظری الکٹرانی (Electron Optical) کے آلات مثلاً تلاش کرنے والی کیمرہ کے ٹیوب اور کائیناسکوپ (Kina scope) استعمال میں آئے اس لیے مزید معلومات اور فن میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں انجینیروں نے اور بھی زیادہ

تعدد (Frequency) سے کام لیا مثلاً راڈار (Radar) اور مائکروویو ریڈیو (خود موجی ریڈیو)۔ کھوج لگانے کے دوسرے خفیہ طریقوں میں بھی برابر ترقی ہوتی گئی مثلاً سونار (Sonar) زیر آب موجوں کی دریافت کے لیے جس کی سرحد آواز کی موجوں سے ملتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برقی انجینیر آواز (Sound) کا بھی ماہر بن گیا، زیریں سرخ (Infra Red) روشنی رات میں بھی آنکھ سے نظر نہ آنے والے اجرام کو منور کرنے کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ اس کے علاوہ لوران (Loran) اور شوران (Shoran) ذرائع کو بھی ترقی دی گئی جس سے نزدیک اور دور کی جہاز رانی (Navigation) میں کام لیا جاتا ہے۔

۱۹۴۸ء میں ٹرانسسٹر کی ایجاد نے ایک تہلکہ مچا دیا اور انقلاب برپا کیا۔ اس ایجاد نے ۱۹۷۰ء میں ایک متحدہ دور (Integrated Circuit) یا مائکرو دور (Micro Circuit) کو جنم دیا جس میں ٹرانسسٹر (Transister) مزاحمی (Resistance) کپے سیٹر (Capaciters) اور واصل (Connectors) کو نہایت مہین سلی کان (Silicon) کے ٹکڑوں پر جو ایک مربع ملی میٹر سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں، دھاتوں کو پگھلا کر یا ان کے بخارات کو ان پر جماتے ہیں، اس طرح پورا دور متحد ہو کر ایک اکائی بن جاتا ہے جو صرف خوردبین سے دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۵۰ء میں الکٹرانک ڈیجیٹل کمپیوٹر (Digital Computor) کی ترقی یافتہ قسم نے ٹیلی گراف کے آن آف (On-Off) کے مقررہ اشاروں کا احیا کر کے ان کو نئے طریقے سے استعمال کیا۔ کمپیوٹر چھوٹے برقی دور کے ذریعے "اور" یا "نہیں" کی عملیات کو مروجہ منطقی طریقہ پر کرتا ہے۔ سائنسی تحقیقوں اور بزنس (کاروبار) کے طریقہ کار کے علاوہ کمپیوٹر کے عناصر (Elements) اور افعال (Functions) جہاز رانی کے آلات مثلاً فاصلہ پیما اور ہوائی راستوں کو متعین کرنے اور آبدوزوں (Submarine) اور خلائی جہازوں کو ہدایات دینے کے کام میں آتے ہیں۔

کمپیوٹر کی مدد سے کسی قسم کا پیچیدہ دور (Circuit) بنا سکنے کی وجہ اب برقی انجینیر نے بجائے اس کے کہ انفرادی اجزاء (Components) کا مطالعہ کریں۔ اپنی توجہ پورے نظام کی موثر کارکردگی پر مبذول کرنا شروع کر دیا ہے۔

طاقتی نظام (Power System) جو عصری صنعت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا پاور انجینیر (Power Engineer) عصر حاضر کے بڑے بڑے شہری علاقوں کے لیے اسکیم تیار کرتے ہیں ان کو اس سلسلے میں درپیش آنے والے مختلف قسم کے سماجی اور ماحولیاتی مسائل کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔

برقی اور الکٹرانکس انجینیری کی تعلیم

چند یونیورسٹیوں میں برقی انجینیری کی تعلیم ۱۸۸۲ء میں برقی روشنی اور برقی طاقت (Power) کے پیدا کیے جانے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ ۱۸۹۰ء تک تو ساری دنیا کے مدارس میں برقی تعلیم کا آغاز ہو گیا اور ابتدا میں اس مضمون کو میکانیکل انجینیری کے تحت اختیاری طور پر رکھا گیا۔ لیکن برقی انجینیری کے مستقل تعلیمی شعبوں کا اس صدی کے ساتھ آغاز ہو گیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آج برقی انجینیری کے کوئی ۱۹۰ شعبہ جات ہیں۔ انگلستان میں برقی انجینیری کی باقاعدہ تعلیم شعبہ طبیعیات کے ساتھ شروع ہوئی، جرمنی میں طاقت (Power) اور الکٹرانکس کے لحاظ سے اس میدان کو علی الترتیب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا یعنی بھاری رو (Heavy Current) اور ہلکی رو (Light Current)۔ بعض مدارس نے تو ان کے لیے علیحدہ شعبے ہی قایم کر لیے ہندوستان اور جاپان میں بھی یہی عمل ہوا۔ امریکہ میں بعض ماہرین تعلیم نے یہ محسوس کیا کہ ان دونوں شعبوں میں بھی برقی سائنس کے بنیادی پس منظر کی ضرورت ہے اور کسی صنعتی ادارہ میں داخل ہونے کے لیے اس کی عملی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ امریکہ میں ان دونوں شعبوں کو عموماً ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا گیا۔ وہاں کے مدارس نظریہ برق کی بنیاد پر ہی برقی تعلیم دیتے ہیں البتہ اس میں اچھی خاصی ریاضی شامل کی جاتی ہے خصوصی تربیت گریجویشن کے بعد شروع کی جاتی ہے یا انجینیروں کو بالعموم ادارے جو کام سپرد کرتے ہیں وہ حسب ذیل بنیادی دائرہ عمل میں ہوتے ہیں۔

نظریہ دور (Circuit Theory) الکٹرانک دور، ٹرانسسٹر دور، نیم موصلوں (Semi Conductor) کے نظریے، برقی مقناطیسی میدان (Electro Magnatic Field) کا نظریہ، ترسیلات یا اطلاعات (Communication or Information) کا نظریہ اور خود کار کنٹرول (Automatic Control) اس بنیادی فنی ڈھانچہ کو مضبوطی سے کھڑا کرنے کے لیے ریاضی کا وسیع مطالعہ، معاشیات کا علم تنظیمی اور سماجی سائنس اور بشریت (Humanities) سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ آیندہ برقی اور الکٹرانکس کے مطالعہ کے لیے ریاضی اور طبیعیات کے پس منظر پر زور دیا جاتا رہے گا۔ دور (Circuit) اور سسٹم ڈزائن (System Design) میں کمپیوٹر کا استعمال بڑھتا ہی جائے گا۔ ڈگری تعلیم پانے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوتا رہے گا۔ مہارت کو کافی اہمیت حاصل ہوا کرے گی۔

عصری برقی ادارے گریجویٹوں کو ملازمت دینے کے بعد فنی یا تنظیمی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بالعموم جزوی یا کلی طور پر رقمی امداد دیتے ہیں۔

ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ (فنی ادارے) میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی تکمیل پر سند حاصل ہوتی ہے۔ یہ پروگرام برخلاف یونیورسٹیوں کے پروگراموں کے براہ راست آلات کے عملی طور پر استعمال کرنے سے متعلق ہوتے ہیں۔ نیز ان میں بالعموم ریاضی بھی کرنی پڑتی ہے۔ ایسے سند یافتہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ترقیاتی، ڈزائن اور آزمایش (Test) کرنے

اور آلات کی تنصیب کرنے والے انجینیئروں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ انجینیئر اور فن کار پیداواروں کے درمیان ایک واسطہ کا کام دیتے ہیں۔ ان کو یا تو پیداوار کی نگرانی کے لیے مامور کیا جاتا ہے یا نکاسی کے انتظام پر۔

فنی انتظامیہ
شروع شروع انگلستان میں برقی صنعت کے کاروبار نے ۱۸۷۱ء میں انسٹی ٹیوشن آف الیکٹریکل انجینیئرس (I E E) کو جنم دیا اس کی پیروی میں ۱۸۸۴ء میں امریکہ نے امریکن انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل انجینیئرس (A I E E) کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنے لیکچروں اور مطبوعات کے ذریعہ برقی طاقت، روشنی اور ٹیلی فون کے تعلق سے نئی معلومات عوام تک پہنچانے کی ذمہ داری لی۔ نیویارک میں لاسلکی (Wireless) کے کام کرنے والوں اور انجینیئروں نے انسٹی ٹیوٹ آف ریڈیو انجینیئرز (I R E) کو ۱۹۱۲ء میں قایم کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد الیکٹرانکس کے میدان میں جو وسعت ہوئی اس سے (I R E) کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔

برقی انجینیئری کے شعبے ریڈیو اور الیکٹرانکس کے شعبوں کے ساتھ متعلق اداروں، فوج اور فضائیہ میں استعمال ہونے والے آلات واوزار کو کنٹرول کرنے میں ایک دوسرے سے مل گئے۔ اس شعبہ کے ماہروں نے ایک زمانہ پہلے ہی اس کو محسوس کر لیا تھا کہ اگر ان سب کو ایک ہی انتظام کے تحت متحد کیا جائے تو کافی سہولت اور افادیت ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں (A I E E) اور (I R E) کو ایک نئے نام انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل اینڈ الیکٹرانکس انجینیئرس (I E E E) کے تحت مدغم کر دیا گیا اور اس کا صدر دفتر نیویارک شہر میں رکھا گیا۔ یہ ادارہ دنیا کے سارے اراکین کو معلومات مہیا کرتا ہے۔ یہ برقی اور الیکٹرانکس انجینیئری اور اس سے ملحقہ سائنس کو ترقی دینے میں مدد دیتا ہے اور کثیر التعداد رسالے طبع اور شائع کرتا ہے۔

جاپان، آسٹریلیا اور ہندوستان میں مزید ادارے ہیں جو برقی طاقت اور ٹیلی کیمونی کیشن میں کام کرنے والے افراد کو ضروری معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یوروپ کے لیے قومی ادارے یہ فرائض انجام دیتے ہیں۔ روس (U.S.S.R) میں اے۔ ایس۔ پاپوف ریڈیو انجینیئرنگ اور الیکٹریکل کیمونی کیشن کی سائنٹیفک اور انجینیئرنگ سوسائٹی نے ماسکو میں غیر معمولی ترقی حاصل کی ہے۔ اس ادارہ کو جو نام دیا گیا وہ مشہور روسی سائنس داں الگزینڈر اسٹیپانووچ پاپوف (۱۸۵۹ء — ۱۹۰۵ء) کے کارناموں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ہے۔ (I E E E) دنیا کے سارے فنی اداروں کے ساتھ اشتراک کرتی رہتی ہے۔

مستقبل
نیم موصل (Semi Conductor) کے میدان میں جو نئی نئی ترقیاں ہو رہی ہیں اس سے کمپیوٹر کی صنعت میں کافی وسعت ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں مصنوعی سیاروں (Satellite) کے ذریعہ کرۂ ارض پر رسل ورسائل میں آئے دن ترقی ہو رہی ہے اور برقی طاقت کے اضافے کے لیے مطالعے ہوتے رہتے ہیں۔ مستقبل میں نئے اور بہتر نظریوں کی مدد سے ان کے پیچیدہ مسائل کو حل کرتے رہنے کا عمل برابر جاری رہے گا۔

پیشگی زور والا کنکریٹ
(پری اسٹرسڈ کنکریٹ)

پری اسٹرسڈ کنکریٹ کا ارتقا محکم کنکریٹ (آر۔ سی۔ سی) کے شروع کے زمانے میں اس کو عام تعمیری اغراض کے لیے اس لیے قبول نہیں کیا گیا کہ تناؤ کے عمل کے تحت اس میں تڑخ واقع ہوتی ہے۔ لیکن بہت جلد اس بات پر توجہ مرکوز کی گئی کہ آر۔ سی کے ارکان میں تناؤ کو معدوم کیا جائے یا کم از کم بڑی حد تک گھٹا دیا جائے تاکہ اس میں تڑخ واقع ہی نہ ہو یا ہو تو بہت کم ہو۔ اس مقصد سے سب سے پہلے جرمنی کے ایک انجینیئر کوئے نن (Koenin) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ آر سی رکن کے جس حصے میں تنشی (Tensile) زور واقع ہونے والا ہو اس میں قبل از قبل کچھ فشاری زور رکھا جائے تاکہ جب بوجھ ڈالنے پر تناؤ آئے تو یہ ابتدائی فشاری زور اس کا مقابلہ کر کے اس کو بڑی حد تک کم کر دے۔ پیشگی زور پیدا کرنے کے اس تخیل کو اس وقت آگے نہیں بڑھایا گیا کیوں کہ کنکریٹ پر اس طرح کا زور ڈالنے کا کوئی عملی طریقہ دریافت نہ ہوا تھا اور اس طرح کنکریٹ کی تڑخ کو مجبوراً قبول کر لینا پڑا۔

"پیشگی زور" کا بنیادی تخیل تو صدیوں پہلے سے موجود تھا کیوں کہ لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر ان کو پیپے کی شکل دے کر ان کو رسیوں یا لوہے کی پٹیوں سے جکڑنے کا طریقہ عام طور پر رائج تھا اور یہ "پیشگی زور" ہی کی ایک شکل ہے۔ پٹیوں کو کسنے سے پٹیاں تناؤ میں اور تختے پیشگی فشار میں آجاتے ہیں اس کے بعد جب پیپے میں سیالی دباؤ کے تحت تختے محیطی تناؤ میں آتے ہیں تو یہ ابتدائی فشار اس کا مقابلہ کرتا ہے۔

کنکریٹ میں پیشگی زور کا سب میں پہلا عملی استعمال کرتے ہوئے سان فرانسسکو کے انجینیئر جیکسن نے کنکریٹ کی کمانوں میں لوہے کی سلاخیں کو کسنے کے لیے ۱۸۸۶ء میں ایک پٹینٹ حاصل کیا۔ ۱۸۸۸ء میں جرمنی کے ایک انجینیئر ڈوے رنگ نے بھی کنکریٹ کی سلوں میں پیشگی زور کا پٹینٹ حاصل کیا لیکن یہ ابتدائی طریقے زیادہ کامیاب نہیں رہے کیوں کہ عملاً یہ محسوس ہوا کہ لوہے کو کھینچ کر لگانے سے کنکریٹ میں جو ابتدائی فشار پیدا ہوتا تھا وہ اتنا کم ہوتا تھا کہ کنکریٹ کے سکڑتے اور "رینگ" (Creep) کی وجہ سے وہ آخر کار بالکل زائل ہو جاتا تھا۔

"پیشگی زور" والے کنکریٹ کی عالیہ دریافت کا سہرا فرانس کے انجینیئر فرے سنٹ (Freyscent) کے سر ہے جس نے ۱۹۲۸ء میں پہلی بار بتایا کہ پیشگی زور کو مستقل طور پر موثر بنانے کے لیے ایسا فولاد استعمال کیا جائے

جو ابتداً اتنا کھینچا جا سکے کہ کنکریٹ کے سکڑنے اور رینگ کے بعد بھی اس میں کافی زور باقی رہے اور کنکریٹ میں مطلوبہ مستقل فشاری زور پیدا کرے۔

اس کے بعد بہت جلد اعلیٰ مضبوطی کا فولادی تار تیار کیا گیا جس کی مضبوطی معمولی فولاد کی دس گنی ہوتی ہے۔ تار میں یہ شدید تناؤ پیدا کرنے اور اس تناؤ کی حالت میں اس کو جکڑنے کا جو سوال پیدا ہوا اس کو بھی فرے سنٹ نے ۱۹۳۹ء میں ایک دوعملی جیک (Double Acting Jack) اور ایک مخروطی لنگر کے ذریعہ حل کیا۔ ۱۹۴۰ء میں بلجیم کے انجینیر میگنل نے پیشگی زور کا ایک آسان تر طریقہ ایجاد کیا۔ ان ایجادوں سے یہ ممکن ہو گیا کہ کنکریٹ میں پیشگی طور پر ایسے فشاری زور پیدا کیے جائیں جو بعد میں بوجھوں سے پیدا ہونے والے تنشی زوروں کو مطلوبہ حد تک زائل کر دیں فرانس اور بلجیم نے جو راستہ دکھایا اس پر یورپ کے کئی ممالک اور امریکہ چل پڑے اور ۱۹۵۱ تک پیشگی زور کا کنکریٹ ایک مسلمہ طریقہ تعمیر بن گیا اور اس کو ترجیح دی جانے لگی۔

ہندوستان بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہا۔ پہلا پیشگی زور کے کنکریٹ کا پل ہندوستان میں ۱۹۴۷ء میں آسام ریلوے کے لیے تعمیر ہوا۔ جس کا فصل ۲۷،۵ میٹر تھا اور سڑک کا پہلا پل پالارندی پر ۱۹۵۵ء میں بنایا گیا۔ اس کے بعد سڑک کے کئی پل اس سے بڑے فصلوں کے لیے بنائے گئے۔ ان میں سب سے بڑا فصل آسام کے لدہا پل کا ۱۳۰ میٹر ہے جو ۱۹۶۸ء میں تعمیر ہوا۔ پٹنہ میں گنگا پر پیشگی زور کے کنکریٹ کا ایک پل تعمیر ہو چکا ہے جو دنیا کے طویل ترین پلوں میں سے ہے۔ ہندوستان میں پیشگی زور کے کنکریٹ کا پلوں میں تو استعمال ہے ہی اس کے علاوہ کئی آب گزار (Aqueduct) ری ایکٹر (Reactors) ہنگر (Hangers) اور پانی کے مینار اسی کے بنائے گئے ہیں۔ مدراس میں پانی کے ایک مینار کی گنجائش ۶۰۸ ملین لیٹر ہے اور یہ گنجائش کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا پانی کا مینار ہے۔

پیشگی زور پیدا کرنے کا طریقہ: پیشگی زور پیدا کرنے کا طریقہ اس پر مشتمل ہے کہ لوہے میں تنشی زور پیدا کیا جائے اور اس کو کنکریٹ میں لنگر کر دیا جائے جس کی وجہ سے لوہے کے تناؤ کے ردعمل کے طور پر کنکریٹ میں فشار پیدا ہو۔ اس کے دو مختلف طریقے ہیں:

پیشگی تناؤ کے تاروں کا استعمال اس طریقے میں ہوتا یہ ہے کہ تار دو پیل پایوں کے درمیان تانے جاتے ہیں اور ان کے اطراف کنکریٹ ڈال دیا جاتا ہے۔ جب کنکریٹ سخت ہو جاتا ہے اور اپنی پوری مضبوطی پر آجاتا ہے تو تاروں کے سرے رہا کر دیے جاتے ہیں۔ رہا ہو کر تار اپنے اصلی طول پر واپس آنے کا تقاضا کرتے ہیں لیکن کنکریٹ کی گرفت ان کو روکتی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر تاروں میں تناؤ باقی رہتا ہے اور کنکریٹ میں فشار پیدا ہو جاتا ہے اس طریقے میں لنگر کرنے کے آلات زیادہ مہنگے نہیں ہوتے خصوصاً چھوٹے فصلوں میں۔ نیز یہ عمل کارخانوں میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہت بڑی تعداد میں ایسے تعمیری ارکان ڈھالے جا سکتے ہیں۔ البتہ چونکہ اس میں تار سیدھے ہوتے ہیں اس لیے ڈزائن کے نقطۂ نظر سے اس طریقے کا استعمال چند حدود کے اندر محدود رہتا ہے۔

مابعد تناؤ کے تاروں کا استعمال اس طریقے میں پہلے کنکریٹ ڈال دیے جاتے ہیں اور اس کے اندر سوراخ چھوڑ دیے جاتے ہیں جن میں سے بعد میں تار گزارے جا سکیں۔ جب کنکریٹ اپنی پوری مضبوطی حاصل کر لیتا ہے تو سوراخوں میں سے تار گزار کر ان کو تان کر کنکریٹ کے سروں پر کس دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں تاروں کو کسا رکھنے کے لیے لنگروں کی ضرورت ہوگی۔ تار اپنے اصلی طول پر واپس آنے کے تقاضے میں کنکریٹ کو عملاً کھینچیں گے یعنی فشار میں رکھیں گے۔ اس طریقے میں تار سیدھے بھی ہو سکتے ہیں اور مڑے ہوئے بھی اور چونکہ اس میں پیل پایوں کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے ان کو کارخانوں کے علاوہ تعمیر کے مقام پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پیشگی تناؤ اور مابعد تناؤ دونوں طریقوں میں فولادی تاروں کو تاننے کے لیے جیک (Jack) استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ جیک ہیڈرالک ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں کم قوت سے زیادہ زور پیدا کیا جا سکتا ہے جیک مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ انگلستان میں کلفورڈ گلبرٹ (Clifferd – Gulbert) کا طریقہ رائج ہے جس میں ایک وقت میں ایک تار تانا جاتا ہے۔ میگنل (Magnel) کے طریقہ میں ایک وقت میں دو تار تانے جاتے ہیں۔ فرے سنٹ (Fraysient) کا دوعملی ہیڈرالک جیک ایک وقت میں اٹھارہ تار کھینچ سکتا ہے۔

مابعد تناؤ کی صورت میں فولادی تاروں کو کنکریٹ میں فانہ (Wedge) کے اصول پر لنگر کیا جاتا ہے جس میں تاروں پر گرفت رگڑ کے ذریعہ واقع ہوتی ہے۔ فرے سنٹ کے طریقے میں لنگر استوانہ نما ہوتا ہے۔ جس کا اندرون مخروطی ہوتا ہے جس میں سے تار گزرتے ہیں اور جس کی دیواروں کے ساتھ تار ایک مخروطی ڈاٹ کے ذریعہ پھنسائے جاتے ہیں۔ یہ استوانہ کنکریٹ میں گڑا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف میگنل کے طریقہ میں فولادی مستطیلی سینڈوچ تختیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں سلائی دار کھنچے ہوتے ہیں جن میں فانے رکھے جاتے ہیں۔ فولادی تار فانوں کی نالیوں اور سینڈوچ تختیوں کے درمیان جکڑے جاتے ہیں۔ ان تختیوں میں ۲، ۴، ۶، ۸ تار رکھے جاتے ہیں دو دو تار ایک دوسرے سے لگے ہوئے اور ان تاروں اور کنکریٹ کے درمیان رکھی ہوئی ڈھلے فولاد کی تختی سے ان کو ردعمل ملتا ہے۔

پیشگی زور میں کمی: جو پیشگی زور فولاد میں ابتداً ڈالا جاتا ہے اس میں اس زور کے بقدر کمی واقع ہوتی ہے جو کنکریٹ میں منتقل ہوتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ کنکریٹ میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی وجہ سے بھی اس زور میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ آخر میں جو زور باقی رہ جاتا ہے وہی کنکریٹ میں زور پیدا کرنے میں موثر ہے اسی طرح اسی کو موثر پیشگی زور سمجھنا چاہیے اس لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ یہ معلوم رہے کہ فولاد کے پیشگی زوروں میں کتنی کمی واقع ہوگی اور ڈزائن اسی آخری پیشگی زور پر مبنی ہونا چاہیے۔

پیشگی تناؤ اور مابعد تناؤ میں کئی ممکنہ کمیاں ہوتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ میکانی گھاٹا واقع ہوتا ہے جو فولادی تاروں کو جکڑ

PRINCIPLE OF PRESTRESSING (الف)
Service load
Anchorage prestressing steel.
Prestressing steel
Self weight
Concrete
Prestressing steel.
Beam Section
+c₁
-t₁
+c₂
-t₂
+(c₁+c₂)
-(t₁+t₂)
(a) Stresses under self weight
(b) Stresses under service load.
(c) Resultant stresses (a)+(b)
-t
+c
+(c-t₁)
+(c₁+c₂-t₁)
Prestressing force
(d) Stresses due to Prestress.
(e) Resultant stresses (a)+(d)
(f) Resultant Stresses (c)+(d).
ACTION OF REINFORCED CONCRETE (ب)
Concrete beam
Load
Compression face
Cracked tension face.
Reinforced Steel
(a) R.C.C Beam under load
Concrete in compression
Compression zone
Tension zone
(b) Beam Section
(c) Internal forces

کرکے تانے رکھنے میں ہوتا ہے۔ اس کمی کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ پیشگی زور پیدا کرتے وقت ہی کسی قدر زیادہ زور پیدا کریں۔ دوسری کمی کنکریٹ کے جذب کیے ہوئے فشاری زور کے تحت سکڑنے سے واقع ہوگی۔ یہ پیشگی تناؤ کی صورت میں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ مابعد تناؤ میں اتنی اہم نہیں ہوتی۔ دوسرے گھاٹے کنکریٹ کی "رینگ (Creep) اور سکڑنے سے ہوں گے۔ یہ خیال رہے کہ فشاری زور کے تحت سکڑاؤ اور وقت کے ساتھ رینگ اور سکڑاؤ زیادہ تر کنکریٹ کے وصف (Quality) پر منحصر ہوتے ہیں۔ اور اس پر کہ پیشگی زور منتقل کرتے وقت کنکریٹ کتنی مدت کا ہو گیا تھا۔ اس طرح پیشگی زور کے کنکریٹ میں عمدہ کوالٹی کی بہت اہمیت ہے۔

فولاد میں بھی کچھ نہ کچھ رینگ واقع ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بھی پیشگی زور میں کمی واقع ہوتی ہے جو اس پر منحصر ہوتی ہے کہ کس قسم کا فولاد استعمال ہوا ہے اور کتنا زور ڈالا گیا ہے۔ مگر یہ کمی بڑی حد تک اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ تھوڑی مدت تک فولاد میں زائد زور لگایا جائے۔ اس کے علاوہ مابعد تناؤ کے طریقے میں کچھ گھاٹا اس رگڑ کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جو فولاد اور اس کے اطراف کے مادے میں ہوتی ہے خواہ یہ کنکریٹ ہو یا کوئی غلاف خصوصاً جب کہ تار مڑے ہوئے ہوں۔ یہ گھاٹا اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ جیک دونوں سروں سے عمل کریں اور فولاد میں زور زائد رکھا جائے۔ نل اس غرض سے رکھے جاتے ہیں کہ تار کنکریٹ کی گرفت میں نہ آجائیں تاکہ کنکریٹ کے سخت ہو جانے کے بعد جب تار کھینچے جائیں تو وہ آزادی سے کھینچے جا سکیں یہ نل مابعد تناؤ کی صورت میں درکار ہوتے ہیں۔ پیشگی تناؤ کی صورت میں ان کی ضرورت نہیں کیوں کہ پیشگی تناؤ کے لیے تار لنگر کے لیے کنکریٹ کے ساتھ جکڑے جاتے ہیں۔

پیشگی زور کا اصول: بنیادی طور پر پیشگی زور کا کنکریٹ محض ایک طرح کا محکم کنکریٹ ہے اور اس کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جو اس کی محدودیت پر غالب آتی ہے اور اس کے وصف ((Quality)) کو ترقی دیتی ہے۔ فولاد کی اعلیٰ طاقت کو پورے طور پر استعمال کرنے کے لیے اس کو بوجھوں کے عاید ہونے سے پہلے تناؤ میں رکھا جاتا ہے۔ فولاد کا یہ تناؤ اپنے اطراف کے کنکریٹ کو فشار میں رکھتا ہے اور اسی طرح کنکریٹ بعد میں آنے والے بوجھوں کے تحت واقع ہونے والے تناؤ کو بہتر طور پر برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے شہتیر پر غور کرو جو متجانس (Homogeneous) شے کا ہو اور جس کی تراش متشاکل ہو اور یہ سادہ طور پر سہارا ہوا ہو۔ اس کے ذاتی وزن کی وجہ سے جو زور پیدا ہوں گے وہ صفحہ نمبر ۳۶۰ پر (الف) میں دکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح عائد ہونے والے بوجھوں سے پیدا ہونے والے زور (ب) میں دکھائے گئے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں زور اوپر کے ریشوں میں فشاری (+ C) اور نیچے کے ریشوں میں تنشی (- t) ہوں گے۔ (ا) میں فشاری زور تو نہیں مگر تنشی زور کنکریٹ کے محفوظ تنشی زور سے

زیادہ ہو سکتا ہے۔ اگر ذاتی وزن اور عاید بوجھ دونوں سے پیدا ہونے والے زور ملا کر دیکھے جائیں جو (C) میں دکھائے گئے ہیں تو وہ کنکریٹ کے محفوظ تنشی اور فشاری دونوں زوروں سے زیادہ ہوں گے۔ چوں کہ ان پیدا ہونے والے زوروں کو (T) اور (C) دونوں میں محفوظ حدود کے اندر رکھنا چاہیے اس لیے پیشگی زور کی غرض ظاہر ہے کہ ان کو محفوظ حدود کے اندر لا جائے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اوپر کے ریشوں میں تھوڑا تنشی زور ڈال کر وہاں کے فشاری زور کو گھٹایا جائے اور نیچے کے ریشوں میں فشاری زور ڈالا جائے تاکہ ذاتی وزن اور عاید ہونے والے بوجھ سے پیدا ہونے والے تنشی زوروں کو مناسب حدود کے اندر لایا جائے اس طرح پیشگی زور کے ذریعے کچھ اس طرح کے زور پیدا کرنے چاہئیں جو شکل (D) میں دکھائے گئے ہیں۔ حاصل زور ذاتی وزن اور پیشگی زور کے تحت جب کہ عائد بوجھ واقع نہ ہوئے ہوں (E) میں ذاتی وزن، عائد بوجھ اور پیشگی زور کے تحت جب کہ عائد بوجھ عمل کر رہے ہوں (F) میں دکھائے گئے پیشگی زور کی کیفیت جو (D) میں دکھائی گئی ہے ایسی ہونا چاہیے کہ عاید ہونے والے بوجھوں کے بغیر (E) والے زور اور عاید ہونے والے بوجھوں کے آنے کے بعد (F) والے زور یہ دونوں محفوظ حدود کے اندر رہوں۔ پیشگی زور (D) کی مطلوبہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے پیشگی زور پیدا کرنے والی قوت اور اس کے مقام کو حسابیت کے ذریعہ متعین کرنا ہوگا۔ یہ تفصیلی ڈزائن سے متعلق ہے۔

زور کی کیفیت (E) اور (F) کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دونوں میں تناؤ کو بالکل نابود کر دینا یا محفوظ حدود کے اندر لے آنا ممکن ہے۔

اس طرح یہ انتظام ممکن ہے کہ کنکریٹ میں کسی مرحلہ پر بھی تڑخ نہ پیدا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پیشگی زور کا خیال پیدا ہی اس لیے ہوا کہ تڑخ کو پیدا نہ ہونے دیا جائے اور (E) اور (F) دونوں میں تناؤ جائز نہیں رکھا گیا۔ اس اصول کو "کامل پیشگی زور" کہتے ہیں۔ اگر پیشگی زور پورے طور پر کامل نہ ہو تو کنکریٹ میں خفیف سے تناؤ کا احتمال ہے مگر اس کا کوئی مضائقہ نہیں خصوصاً اگر یہ بات صرف بیرونی بوجھوں کی انتہائی شدت کے وقت میں اور صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہو۔ یہ باریک تڑخ بھی بیرونی بوجھ کے ہٹتے ہی بالکل غائب ہو جاتی ہے جیسا کہ زور کے نقشے (F) سے جو بیرونی بوجھ کے تحت ہوتا ہے اور (E) سے جو بیرونی بوجھ کی عدم موجودگی میں ہوتا ہے واضح ہے۔ پیشگی زور کے کنکریٹ کی یہ ایک اور خصوصیت ہے جو کفایت کا باعث ہوتی ہے۔ بیرونی بوجھ کے تحت خفیف سی تڑخ کو جائز رکھنے کا یہ عمل "محدود پیشگی زور" یا "جزوی پیشگی زور" کہلاتا ہے۔ اور اب یہ عام طور پر اختیار کیا جانے لگا ہے کیوں کہ اس میں پیشگی زور کم لگانا پڑتا ہے۔ یعنی کم تر فولاد درکار ہوتا ہے۔

پیشگی زور کے کنکریٹ کے فوائد:

شہتیر پر عمل کرنے والے ذاتی وزن اور بیرونی بوجھ کے تحت شہتیر میں اوپر فشار (+C) اور نیچے تناؤ (-T) واقع ہو کر زور کا نقشہ (A) اور (B) ہوتا ہے۔ ان نقشوں کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ زور کا نقشہ

(D) جو اوپر کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے یعنی اوپر تناؤ اور نیچے نشار اوپر کی طرف عمل کرنے والے بوجھ کے اثر سے واقع ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیشگی زور ایک اوپر دار قوت یا بوجھ کے معادل ہے جو شہتیر کے ذاتی وزن کے اثر کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرح ذاتی وزن کے پورے اثر کو پیشگی زور کے ذریعہ زائل کیا جاسکتا ہے بغیر اس کے کہ کنکریٹ میں کہیں بھی تناؤ یا جھکاؤ اوپر یا نیچے کو واقع ہو۔ چاہیں تو اس سے زیادہ پیشگی زور لگا کر اوپر کی طرف خم پیدا کیا جاسکتا ہے جس کو کبھ یا تحدب (Canbler) کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ معلوم ہوا کہ ذاتی وزن کو پیشگی زور سہار لے گا اور کنکریٹ کو صرف بیرونی بوجھ کے اثر کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس کے برخلاف: معمولی محکم کنکریٹ میں کنکریٹ کی تراش کو بیرونی بوجھ کے علاوہ ذاتی بوجھ کے اثرات کو بھی برداشت کرنا ہوتا ہے۔ پیشگی زور کے کنکریٹ کی یہ بڑی فائدہ مند خاصیت ہے جس سے بہت کفایت حاصل ہوتی ہے چوں کہ فصل کے بڑھنے سے ذاتی وزن کے اثرات کا تناسب تیزی سے بڑھتا ہے اس لیے پیشگی زور کے استعمال سے بڑے فصل میں شہتیر کی موٹائی معمولی محکم کنکریٹ کے مقابلہ میں بہت خاصی کم ہوتی ہے۔ اس طرح پیشگی زور کے کنکریٹ کی مدد سے ایسے بڑے فصل رکھنا ممکن ہوگیا ہے جو معمولی محکم کنکریٹ سے ممکن نہیں تھے۔

چوں کہ ذاتی وزن کا اثر پیشگی زور کے ذریعہ زائل ہوسکتا ہے اس لیے اس کی مدد سے جھکاؤ بھی معمولی محکم کنکریٹ کے مقابلہ میں کم ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک تو جھکاؤ صرف بیرونی بوجھوں کی وجہ سے ہوں گے اور دوسرے یہ کہ تڑخ نہ ہونے کی وجہ سے پورا کنکریٹ اپنا عمل دکھائے گا۔ اس کے برخلاف معمولی محکم کنکریٹ میں تڑخ کی وجہ سے پوری تراش موثر نہیں ہوتی اور اس کو بوجھ بھی دونوں قسم کے یعنی ذاتی وزن اور بیرونی بوجھ کو سہارنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انفراف یا جھکاؤ بہت زیادہ ہوجاتا ہے۔

"پیشگی زور" کے طریقے سے پیشگی ڈھلائی (Precast) اور برموقعہ ڈھلائی (In site) دونوں میں تعمیر میں بہت آسانی اور وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً یہ کہ تعمیر کے ارکان کو حصوں میں (Segmental) تعمیر کرنا جو معمولی محکم کنکریٹ میں ممکن نہ تھا۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی رکن کے حصوں کو پیشگی ڈھلائی کے ذریعہ بنا لیا جائے پھر ان کو ان کے مقام پر بٹھا کر ان سب کو "پیشگی زور" کے تحت ایک واحد رکن بنا لیا جائے یہ بڑے فصلوں میں بڑی کار آمد بات ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ حصوں کو الگ الگ برموقعہ (In site) ڈھال کر "پیشگی زور" کے ذریعہ ان میں تسلسل پیدا کر لیا جائے۔ اس میں جڑنے کے عمل کے دوران میں زمین سے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی اس طرح اس "تعمیر بالحصص" (Segmental Construction) سے بڑے بڑے فصیلوں پر کنکریٹ کی تعمیر ممکن ہوگئی ہے۔ بڑے فاصلے کے پلوں میں یہ طریقہ "برآمدہ بنیری" طریقہ کہلاتا ہے۔

اجزائے ترکیبی: پیشگی زور کے لیے کنکریٹ معمولی محکم کنکریٹ کی بہ نسبت بہت اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے۔ پیشگی زور کی صورت میں کنکریٹ کی طاقت کم از کم ۳۰۰ کیلو گرام فی مربع سنٹی میٹر ہونا چاہیے اور بڑے کاموں میں تو ۵۰۰ کیلو گرام فی مربع سنٹی میٹر تک درکار ہوتی ہے۔

پیشگی زور کے کاموں کے لیے فولاد اعلیٰ طاقت کا سرد کشیدہ (Cold Drawn) تار ہونا چاہیے جس کی سطح پر دندانے بنے ہوئے ہوں۔ اس کی تنشی طاقت تاروں کی موٹائی کے لحاظ سے جو ۰.۳۵ سنٹی میٹر ہوتی ہے۔ ۱۵۰، ۲۰۰ کیلو گرام فی مربع ملی میٹر ہوتی ہے۔ یہ تار الگ الگ یا چند تار اکٹھے متوازی جوڑ کر رکھے جاتے ہیں۔

جزوی "پیشگی زور": بوجھ لگانے کے بعد بھی کنکریٹ میں تناؤ نہ ہونے دینے کے لیے پیشگی زور کی بڑی قوت درکار ہوتی ہے جو ذاتی بوجھ اور لگاتے ہوئے بوجھ کے اثرات کو زائل کردے۔ اب اگر بیرونی بوجھ موجود نہ ہو اور صرف ذاتی بوجھ ہو تو اس پیشگی زور کا اثر ذاتی بوجھ کے اثر سے بہت زیادہ ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہتیر اوپر کو خم ہوجائے گا۔ چوں کہ بیرونی بوجھ کبھی کبھی آتا اور مستقل طور پر صرف ذاتی بوجھ عمل کرتا ہے اس لیے دیکھا گیا ہے کہ یہ اوپر دار انصرات کنکریٹ کی ریگ کی وجہ سے وقت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اور اکثر صورتوں میں تعمیر کی کارکردگی کو متاثر کردیتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر خماؤ کے زور کے تحت تناؤ واقع نہ ہو اور اس کی وجہ سے تڑخ نہ پیدا ہو تو پھر بھی جزوی زور کی وجہ سے اور ٹمپریچر کے تغیرات کے اثر سے تڑخ پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تجربہ اور آزمائشوں سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اگر تڑخ کی چوڑائی ملی میٹر کے دسویں حصے سے زیادہ نہ ہو تو مضبوطی یا خوشنمائی پر کوئی زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اب یہ بات مان لی گئی ہے کہ بیرونی بوجھ عائد ہونے کے بعد اگر نیچے کے ریشوں میں کچھ تنشی زور پیدا ہو تو کوئی مضایقہ نہیں خصوصاً اگر یہ بات صرف بیرونی بوجھوں کی انتہائی شدت کے وقت ہی اور صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہو۔

یہ باریک تڑخ بھی بیرونی بوجھ کے ہٹتے ہی بالکل غائب ہوجاتی ہے جیسا کہ زور کے نقشے (B) سے جو بیرونی بوجھ کے تحت ہوتا ہے اور (E) سے جو بیرونی بوجھ کی عدم موجودگی میں ہوتا ہے، واضح ہے۔ پیشگی زور کے کنکریٹ کی یہ ایک اور خصوصیت ہے جو کفایت کا باعث ہوتی ہے۔ بیرونی بوجھ کے تحت خفیف سی تڑخ کو جائز رکھنے کا یہ عمل "محدود پیشگی زور" یا جزوی پیشگی زور" کہلاتا ہے اور اب یہ عام طور پر اختیار کیا جانے لگا ہے۔ کیوں کہ اس میں پیشگی زور کم لگانا پڑتا ہے اور اس طرح کم تر فولاد درکار ہوتا ہے۔

تخمیری صنعتیں

تخمیر (Fermentation) کی اصطلاح سترہویں صدی کے

آغاز سے غذائی اشیاء کے سڑنے کے لیے استعمال ہونے لگی۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی کہ اس عمل کے دوران غذا کے تحلیلی حاصلوں کے علاوہ بعض گیسوں کا اخراج بھی عمل میں آتا ہے۔ سب سے زیادہ معروف مثال شکر کی تخمیر ہے۔

گے لوسک (Gay-Lussac) نے سب سے پہلے ۱۸۱۵ء میں بتلایا کہ اس عمل میں الکوحل پیدا ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج ہوتی ہے یہ بات پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ عمل تخمیر بیکٹریا کی وجہ سے انجام پاتا ہے۔ لی بگ (Lie Big) اور وہیلر (Wobler) نے تخمیر کی کیمیائی توجیہ کی کوشش کی۔ عمل تخمیر کی صحیح توجیہ پاسچر (Pasteur) نے کی اور اس نے بتلایا کہ یہ حیاتی کیمیائی عمل ہے جو بیکٹریا کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کیا کہ ایسٹیک (Acetic) لیکٹک (Lactic) اور بیوٹرک (Butyric) تخمیر بھی اسی نوع کے اعمال ہیں۔

مناسب بیکٹیریا کی اسٹرین (Strain) کا انتخاب اس کی پرورش موزوں ماحول ضروری غذاؤں اور عملی صلاحیتوں کی بنیادی تحقیق تخمیر میں اہمیت رکھتی ہے۔ تخمیری صنعتوں کی اہمیت کا اندازہ فہرست ذیل سے ہو سکتا ہے۔

غذائی صنعتیں مثلاً روٹی مکھن، پنیر دہی، سرکہ، اچار، مربے، خمیرا اور شربتوں کی تیاری۔ زیتون، چارکائی، کوکو اور تمباکو کی پختگی (Ripening) مختلف شرابوں اور جانوروں کی غذائی تکملوں (Feed Supplements) کی تیاری۔

نامیاتی مرکبات مثلاً ایتھل الکوحل بیوٹائل الکوحل ایسیٹون ڈائی ہائیڈرو آکسی ایسیٹون اور گلسرین کی تیاری۔

نامیاتی ترشے ایسیٹک ایسڈ سٹرک ٹارٹارک ایسڈ، پروپیانک ایسڈ سکسنک ایسڈ میلک ایسڈ گیلک ایسڈ اور لیکٹک ایسڈ کی تیاری۔

غیر نامیاتی مرکبات سلفیورک ترشہ نائٹروجن کے تر تثبیتی مرکبات (Nitrogen Fixation Compound) ترسیبی لوہا مختلف گیسوں مثلاً کاربن ڈائی آکسائیڈ ہائیڈروجن اور دیگر ایندھنی گیسوں کی تیاری۔

اینٹی بایوٹکس (Anti Biotic) مثلاً پینسلین (Peni cillin) اسٹرپٹو مائیسین Streptomycin. کلورامائنو فینیکال (Chloraminophenicol) آریو مائیسین (Aureomycin) ٹیرا مائیسین (Terramycin) نیو مائیسین (Neomycin) وغیرہ کی تیاری۔

انزائم (Enzyme) مثلاً امائلیز (Amylase) پروٹی ایز (Protease) گلوکو آکسیڈیز (Gluco Oxidase) وغیرہ کی تیاری۔ علاوہ ازیں بہت سے مرکبات جن کی تالیفی تیاری معلوم طریقوں سے دقت طلب ہے بیکٹیریا کی مدد سے بہ آسانی انجام دی جاسکتی ہے۔

بیکٹیریا نباتی دنیا کے غیر سبز خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ نامیاتی مرکبات پر پرورش پاتے ہیں اور مناسب حالات یعنی موزوں ٹمپریچر ترشیت (پی ایچ (PH)) ہوا اور غذا کی موجودگی میں اپنی عاملیت کی بنا پر مختلف مرکبات کی تالیف انجام دیتے ہیں۔ ضروری ہے کہ زیرین مادے (Substrate) سستے ہوں اور بہ آسانی مہیا ہو سکیں اور ایسے ہوں کہ ان پر منتخب بیکٹیریا زیادہ سے زیادہ آسانی سرعت کے ساتھ عمل پیرا ہو کر اعلیٰ تخلیص (Purity) کے مرکبات مناسب مقدار میں تیار کریں۔

تخمیر کے لیے برتنوں کی ساخت اور صفائی، محلول کو ہلانے کی رفتار، ماحول کی مناسب تعقیم ضروری ہے ان میں ذرا سے خلل کے باعث تخمیر کی رفتار یا تو سست پڑ جانے کا یا خود رو خمیروں کے باعث دیگر مرکبات کے حاصل ہونے کا امکان ہے۔

الکوحلی تخمیر

الکوحل کے لیے سستے سیلیوزی مادے یا کاربوہائیڈریٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کو ابتدا آب پاشیدگی کے ذریعہ تخمیر پذیر شکروں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ عام طور پر شکر سازی کے ضمنی حاصل راب (Mol-asses) کو صنعتی الکوحل کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ خمیر میں ایک خامرے انورٹیز (Invertase) کے عمل سے راب کے شکر کی آب پاشیدگی واقع کروائی جاتی ہے۔ اور معمولی گنے کی شکر دو تخمیری شکروں ثمری شکر (Fruit Sugar) اور انگوری شکر (Glucose) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس عمل کو معاکسہ (Inversion) بھی کہتے ہیں۔

$$(C_{12}H_{22}O_{11} + H_2O \longrightarrow C_6H_{12}O_6 + C_6H_{12}O_6)$$
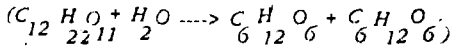
ثمری شکر انگوری شکر گنے کی شکر ان تخمیری شکروں پر خامرہ فرمنٹیز (Fermentase) کے عمل سے الکوحل بنتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس نکلتی ہے۔ دوران تخمیر ۳۱٫۲ کیلو حرارے خارج ہوتے ہیں۔

$$(C_6H_{12}O_6 \longrightarrow 2\,C_2H_5OH + 2CO_2 + 31.2\ Kcal)$$
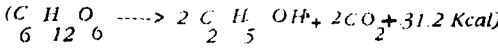
راب کا پانی میں محلول بنایا جاتا ہے جس کو اصطلاحاً میش (Mash) کہتے ہیں۔ اس میں شکر کا ارتکاز ۱۰ تا ۴۰ فی صد رکھا جاتا ہے۔ میش کو لوہے کی بڑی بڑی تعقیم شدہ (Sterilised) کڑھائیوں میں پمپ کیا جاتا ہے۔ کڑھائیاں کھلی بھی استعمال کی جاسکتی ہیں لیکن اگر کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جمع کرنا مقصود ہو تو بند یا ڈھکی ہوئی کڑھائیاں استعمال ہوتی ہیں۔ میش میں نوشادر اور سلفیورک ایسڈ ملا کر پی۔ ایچ ((PH)) ۴ تا ۵ قایم کر لیا جاتا ہے جہاں خمیر کی عاملیت زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے دیگر خود رو خمیروں کی روئیدگی کو روکنے کے لیے تھوڑی سی مقدار میگنیشیم سلفیٹ کی ملا دی جاتی ہے۔

اس موقع پر موزوں نسل کی نگرانی میں اگائی ہوئی خمیر کی پانچ فی صد مقدار میش میں شریک کر دی جاتی ہے عملی تخمیر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دوران تخمیر حرارت کا اخراج عمل میں آتا ہے۔ ٹمپریچر پر قابو رکھنے کے لیے کڑھائیوں کی بیرونی سطح پر خاص آلوں کے ذریعہ پانی چھڑکا جاتا ہے۔ ابتدا ٹمپریچر کو ۳۲° (سیلسیس) پر قایم رکھا جاتا ہے اور اختتام کے قریب ۳۸° تک بڑھنے دیا جاتا ہے۔ دوران تخمیر کڑھائیوں میں ابال کی کیفیت نظر آتی ہے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس نکلتی ہے جو داب آلوں (Compressores)

کے ذریعہ آہنی استوانوں میں بھرلی جاتی ہے۔ تخمیر کی تکمیل کے لیے دو تا تین یوم لگتے ہیں اور ابال کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ حاصل ہونے والے الکوحلی محلول کو بیر (Beer) کہتے ہیں جس میں ۶ تا ۱۰ فی صد الکوحل ہوتا ہے بیر کو کشیدی کالم میں داخل کرتے ہیں اپری سرے سے الکوحل کا مرتکز آبی محلول کشید ہوتا ہے اور پیندے سے پانی اور تلچھٹ مادے (Slop or Stillage) خارج کیے جاتے ہیں۔ الکوحل کے مرتکز محلول کو مزید کشیدی استوانوں میں سے گزار کر بالآخر ۹۵ء۶ فی صد ارتکاز والا الکوحل حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اسے ارتکاز کئے الکوحل (تصحیح شدہ الکوحل) (Rectified) یا صنعتی الکوحل بھی کہتے ہیں۔ پانی اور الکوحل کا یہ ثنائی آمیزہ ایک مفرد مائع کی طرح °۸۲ء۵ سیلسیش پر کشید ہوتا ہے جبکہ خالص الکوحل کا نقطہ جوش °۷۸ء۳، ہوتا ہے۔ ایسے آمیزہ کو ہم کشید (Azeotropic Mixure) کہتے ہیں۔ صد فی صد الکوحل جسے مطلق (Absolute) الکوحل کہتے ہیں۔ حاصل کرنے کے لیے مستقل جوش کے صنعتی الکوحل میں بنزین ملا کر کشید کرتے ہیں ابتدائی جز (نقطہ جوش °۶۴ء۸ میں بنزین۔ الکوحل، پانی تینوں موجود ہوتے ہیں۔ اور درمیانی جز (نقطہ جوش °۶۸ء۲) الکوحل اور بنزین پر مشتمل ہوتا ہے۔ آخری کشیدہ میں خالص الکوحل (نقطہ جوش °۷۸ء۳) موجود ہوتا ہے۔

بیوٹائل الکوحل اور ایسیٹون

یہ تخمیر حاام ویزمین (Chaim Weizmann) سے موسوم ہے جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران معلوم کیا کہ نشاستہ پر کلوسٹری ڈیم ایسیٹو بیوٹیلیکم (Clostridium Aceto Butylicum) بیکٹیریا کے عمل سے بیوٹائل الکوحل اور ایسیٹون دونوں بنتے ہیں۔ اس جنگ میں ایسیٹون کی بے دود بارود کی تیاری کے لیے بڑی مانگ تھی۔ اس تخمیر میں دو حصہ بیوٹائل الکوحل کے ساتھ ایک حصہ ایسیٹون حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ کیمیائی صنعت میں ایسیٹون کی تالیفی تیاری زیادہ مُرجح ہے۔ اس لیے بیوٹائل الکوحل کو زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کے لیے مذکورہ بالا عمل میں بجائے ویزمین بیکٹیریا کے خامرہ کی ایک دوسری نسل معلوم کر لی گئی ہے جو خام راب پر عمل کر کے بیوٹائل الکوحل اور ایسیٹون تین اور ایک کے تناسب میں پیدا کرتی ہے۔

اگر نشاستہ سے ابتدا کی جائے تو نشاستہ میں گرم پانی ملا کر پکانے پر نشاستہ حل پذیر شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس پر بیکٹیریا اپنے عمل کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اگر راب کو استعمال کرنا مقصود ہو تو راب میں پانی ملا کر شکر کو حل کر لیا جاتا ہے اس طرح کہ کاربوہائیڈریٹوں کی مقدار ۵ تا ۱۰ فی صد ہوتی ہے۔ شکر کی صورت میں نائٹروجنی اور فاسفورس کے مرکبات کا شریک کر لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ تعقیم شدہ محلول میں علیحدہ پرورش کیے ہوئے منتخبہ بیکٹیریا ۲ تا ۴ فی صد مقدار شریک کر دیے جاتے ہیں۔ نشاستہ کی صورت میں ٹمپریچر °۳۵ سیلسیش اور راب کی صورت میں °۳۰ رکھی جاتی ہے۔ دوران تخمیر جو گیس خارج ہوتی ہے اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈروجن ۳ اور ۲ کے تناسب میں موجود ہوتی ہیں۔ گیس کے اس آمیزہ کو میتھائل الکوحل کی تالیف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تخمیر ۳۰ سے لے کر ۳۵ گھنٹوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ بیر (Beer) میں دونوں مائعات کا آمیزہ ڈیڑھ تا ڈھائی فی صد ہوتا ہے کسری کشیدی آلہ میں سے بیر کو گزار کر ایسیٹون اور بیوٹائل الکوحل کو الگ الگ کر لیتے ہیں۔ تلچھٹ میں رائبوفلاوین (Ribo Flavin) اور دیگر وٹامن بی کامپلیکس (B. Complex) موجود ہوتے ہیں اس لیے اسے خشک کر کے وٹامن کے طور پر یا چارہ کے تکملون (Feed Supplement) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

سرکہ

الکوحل سے سرکہ بنانے کے طریقے سے واقف تھے۔ خامرہ مائیکو ڈرما ایسیٹائی Myco Derma Aceti ایک ہوا باش بیکٹیریا ہے جو الکوحل کو ایسیٹک ترشہ میں تکسید کر دیتا ہے۔ دوران تکسید حرارت پیدا ہوتی ہے۔ تپش پر قابو رکھنے کے الکوحل کے ہلکے محلول و جس میں خامرہ پر درشی غذائیں اور فلسفیٹ تمک شریک کر دیے جاتے ہیں کا دب پیندے والے لکڑی کے استوانی پیپوں (Barrels) میں جس میں صنوبر کی ڈالیاں بھری ہوتی ہیں اوپر سے نیچے کی طرف بہایا جاتا ہے اس دوران ٹمپریچر کو °۳۵ سے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ الکوحل کی تکسید ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایسیٹک ترشہ کا ارتکاز بلیغ تا دس فی صد ہو جاتا ہے ترشہ کی مقدار بارہ فی صد ہو جانے پر بیکٹیریا کی کارکردگی ختم ہو جاتی ہے۔ محلول کو مناسب درجہ تکسیہ کے حصول تک بار بار پمپ سے استوانہ میں اوپری سرے سے داخل کیا جاتا ہے اس طرح سرکہ تیار ہو جاتا ہے۔ چوں کہ اس میں ایسیٹک ترشہ کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اس لیے اسے ایسیٹک ایسڈ کے حصول کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔

سٹرک ترشہ

(Citric Acid) شکر پر ہوا باش بیکٹیریا ایسپرجیلس نائیگر Aspergillus Niger کے عمل سے تیار کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس بیکٹیریا کو ہوا کی کافی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے تخمیر کا عمل اتھلی کشتیوں میں واقع کروایا جاتا ہے۔ تخمیر کے دوران ہوا کا مسلسل دھیان رکھا جاتا ہے۔ تخمیر کا عمل نو سے لے کر بارہ دن میں مکمل ہوتا ہے۔ اس میں بھی شکر کے ماخذ کے طور پر راب استعمال کی جاتی ہے۔ دیگر ممد اغذیہ کے علاوہ امونیم کاربونیٹ یک اساسی پوٹاشیم فاسفیٹ اور میگنیشیم سلفیٹ شریک کیے جاتے ہیں۔ خفیف مقدار میں مارفولین (Marpholin) شریک کرنے سے بیکٹیریا کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مناسب درجہ پی۔ ایچ۔ (PH) ۲ء۵ ہائیڈرو کلورک ترشہ کی مدد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ٹمپریچر ۳۰ اور ۳۲ کے مابین رکھی جاتی ہے۔ تخمیر کے ختم پر تخمیری مائع میں چونا ملا کر کیلشیم سٹریٹ کی ترسیب کر لی جاتی ہے اسی رسوب کو تقطیر کر کے سلفیورک ترشہ ملے ہوئے پانی سے دھویا جاتا ہے۔ سٹرک ترشہ آزاد ہوتا ہے اور کیلشیم سلفیٹ کا رسوب بنتا ہے تقطیر کے عمل سے اس کو علاحدہ کر دیا جاتا ہے۔ سٹرک ترشہ شربتوں، مربوں اور دیگر صنعتوں میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔

لیکٹک ترشہ

(Lactic Acid) کاربوہائیڈریٹ والے زیریں مادوں

(Substrate) پر لیکٹو بیسی لس ڈل بروکائی (Lactobacillus Del Broikii) کے عمل سے لیکٹک ترشہ تیار کیا جاتا ہے۔ میش (Mash) میں غذائی مادوں کے علاوہ کافی مقدار میں کیلشیم کاربونیٹ ملا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لیکٹک ترشہ پیدا ہوتے ہی کیلشیم لیکٹیٹ کی شکل میں ترسیب کر جاتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس آزاد ہوتی ہے جس کی وجہ سے پی ایچ کی قیمت کم ہونے نہیں پاتی اور یہ پانچ اور چھ کے مابین قایم رہتی ہے۔ کیلشیم لیکٹیٹ پر سلفیورک ترشہ کے عمل سے لیکٹک ترشہ آزاد ہوتا ہے اور کیلشیم سلفیٹ ترسیب کر جاتا ہے تقطیر سے کیلشیم سلفیٹ کے علیٰحدہ کرنے کے بعد لیکٹک ترشہ کو مرتکز کر لیا جاتا ہے۔ لیکٹک ترشہ شربتوں غذاؤں، دواؤں اور چمڑے کی دباغت میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

پینسلین (Penicillin) پینسلین کا شمار ادویات کی اس اہم جماعت سے ہے جو انٹی بائیوٹک (Anti Biotics) کہلاتی ہے۔ یہ گرام پازیٹو اور گرام نیگیٹو دونوں قسم کے بیکٹیریا کے خلاف عاملیت رکھتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں سرالکزینڈر فلمنگ (Flaming) نے اسے دریافت کیا یہی پہلا انٹی بائیوٹک ہے جو بنی نوع انسان کے لیے بیکٹیریائی سرایت (Infection) کے مقابلہ کے لیے استعمال کیا گیا اور اس مقصد کے لیے عام طور پر اس کے پانی یا الکوحل میں سوڈیم پوٹاشیم اور پروکین (Pro Caine) نمک استعمال کیے جاتے ہیں۔

صنعتی تیاری کے لیے پینسلیم کرائسوجینیم (Penicillium Chrysogenum) کی نسل استعمال کی جاتی ہے۔ سات دن کی اگائی ہوئی پھپھوندی کے بذرون (Spores) کو مکئی کے نم دالے (Corn Steep) میں جس میں لیکٹوز موجود ہوتا ہے بڑی بڑی فولادی تخمیری کڑھائیوں میں اشراب انجکشن کر دیا جاتا ہے۔ دوران تخمیر انگوری شکر یا گنے کی شکر شریک کرتے رہتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ پر اس طرح قابو رکھا جاتا ہے کہ وہ ۶ سے اوپر یا ۷٫۵ سے نیچے نہ جانے پائے۔ فینائل ایسٹک ایسڈ بطور پیش رو (Precursor) استعمال کرتے ہیں۔ دہنی روغن مثلاً مکئی کا تیل یا سور کی چربی یا سلیکون (Silicone) جھاگ کو روکنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان اشیا کے ملانے کے بعد مائع کو ہیجان میں رکھا جاتا ہے۔ ہوا باقاعدہ گزاری جاتی ہے۔ تپش ۲۴ء ۲۵ کے درمیان رکھی جاتی ہے۔ علیٰحدہ کرنے کے لیے پہلے مرحلہ میں عمل تقطیر سے مائی سیلیم (Mycelium) حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ترشہ ملا کر اس کا پی۔ ایچ ۱۱۵ پر لایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیوٹائل یا ایمائل ایسیٹیٹ کے ذریعہ آزاد ترشہ کو اخذ کر کے پوٹاشیم نمک کی موجودگی میں این بیوٹینال (N. Butanol) میں بازقلماوے سے پوٹاشیم بنزائل پینسلین حاصل کی جاتی ہے۔ اسی شئے کو پروکین پینسلین میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

تشکیل شہر

تشکیل شہر یا شہر کی منصوبہ بندی جس کو ہندی میں نگر اودیا سا، انگریزی میں (Town Planning) اور عربی میں تخطیط البلدان کہتے ہیں شہروں اور آبادیوں کو منظم طور پر بسانے اور سجانے کا علم ہے۔ اس فن کو جغرافیائی خصوصیات، حفظانِ صحت، آب و ہوا حمل و نقل، رسل و رسائل اور تعمیرِ امکنہ کے اصولوں سے قریبی تعلق ہے۔ جدید شہروں کی تشکیل کے علاوہ موجودہ شہروں اور آبادیوں کے غیر منظم پھیلاؤ کو روکنا اور ان کی مناسب توسیع و ترمیم اور ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد قوانین و ضوابط کی تدوین بھی اس فن کا ایک اہم جزو ہے۔

اس فن کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے بنی نوع انسان نے سماجی تنظیم کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور رہائشی سہولتوں کی طرف توجہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس فن کی باضابطہ سرگرمیاں بیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوئیں لیکن اس بنا پر بعضوں کا یہ خیال کہ یہ ایک جدید فن ہے درست نہیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل مسیح عراق اور مصر کے دریاؤں کی وادیوں میں بڑے بڑے شہر بسائے گئے جس کو آثار قدیمہ نے دریافت کیا ہے۔ مثال کے طور پر شہر بابل کو لیجیے جو دریائے فرات پر واقع تھا جس کو یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے نہایت عظیم الشان بتلایا ہے۔ جس میں دنیا کے مشہور جھولتے باغ (Hanging Gardens) تعمیر کیے گئے تھے۔ اسی طرح دنیا کے مشہور اہرام مصر کی تعمیر کے زمانے میں حکومت نے کاریگروں کی سکونت کے لیے علاقہ کاہون (Kahon) میں منظم خاکے کے تحت ایک قریہ بسایا تھا جس کو آثار قدیمہ نے برآمد کیا ہے۔ اسی دور میں جو بڑے بڑے شہر بنائے گئے ان میں بادشاہوں اور دیوتاؤں کے جلوس کے لیے نہایت کشادہ راستے بنائے گئے تھے جو سایہ دار درختوں اور اونچے اونچے ستونوں سے آراستہ کیے گئے تھے۔

ان شہروں میں تشکیل شہر کے اصولوں کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کا عظیم الشان تمدن جدید معلومات کے مطابق کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا ٹھوس ثبوت بعض اہم اور قدیم شہروں کی کھدائیوں اور پتھروں کی تراشی ہوئی عمارتوں اور کتبوں سے ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریاؤں کے ورود سے قبل ہندوستان کے اصلی باشندوں میں غیر معمولی تمدن موجود تھا ان کی اجتماعی زندگیاں سماجی تنظیم سے آراستہ تھیں۔ انھوں نے متعدد شہر نہایت سلیقے سے آباد کیے۔ جن میں موہنجوداڑو، ٹکسلا اور نالندہ قابلِ ذکر

ہیں۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے ان شہروں کی عالی شان عمارتوں، درس گاہوں، کتب خانوں اور خانقاہوں اور اقامت خانوں کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ قدیم ہندوستان کے تمدن میں شہروں اور عمارتوں کی تشکیل و تعمیر کے اصولوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی بلکہ ان کو مذہب کا ایک جزو بنا دیا گیا تھا تاکہ پابندی کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس فن کی متعدد کتابوں سلپا ساسترا، کاوتیلیا، دستوودیا، مایاموتی، مایا ماتم اور منسارا میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ خصوصاً منسارا اور مایا ماتم میں تشکیل شہر کے ضوابط اور قواعد پر جامع معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ہندوستان کے بعد ملک چین میں منظم طور پر بسائے ہوئے شہروں کی مثالیں تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں ملتی ہیں۔ جن میں شاہی خاندانوں سے لے کر عوام کے لیے منطقہ واری بستیاں ترتیب دی جاتی تھیں۔ خصوصاً ڈوچو (Docbo) خاندان کی حکومت میں تشکیل شہر کو کافی فروغ ہوا۔ تقریباً اٹھارہ سو شہر نہایت سلیقے سے تعمیر کیے گئے۔ جن میں شنگھائی (Shanghai) سنان فو (Tesnan Fo) اور تے شنگ تو فو (TESHING TO FO) قابل ذکر ہیں۔

یونانیوں نے مصر اور عراق کے شہروں کی تشکیل کا اتباع کیا لیکن ان کی باضابطہ سرگرمیاں پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوئیں جس کو سنہری دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کے تعمیر کیے ہوئے شہر اکراپولس (Acropolis) اور رہوڈ (Rhodes) فنی نقطۂ نظر سے کافی مشہور ہیں۔ سکندر اعظم کے بعد اس کے جانشین ڈیاڈوکی (Diadochi) نے اپنے عہد میں متعدد شہر آباد کیے جن میں قابل ذکر اسکندریہ کا شہر ہے۔

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اہل روما میں یونانیوں کا سا ذوق سلیم نہیں تھا لیکن یہ لوگ مقابلتاً زیادہ ترعملی تھے۔ ان کے شہروں میں فوجی اغراض اور تجارتی سہولتوں کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ خصوصاً بندرگاہوں کی تعمیر میں ان کو خاص مہارت تھی۔ مشہور ہے کہ شہنشاہ نیرو نے شہر روم کو دانستہ نذر آتش کر دیا تاکہ ایک منظم پاک صاف اور خوب صورت شہر تعمیر کیا جائے۔

حکومت روما کے زوال کے بعد اس کا شاندار تمدن بھی سسکنے لگا۔ جنگ و جدال اور بدامنی کے دور نے شہروں کی تشکیل اور نشوونما کو صرف قلعہ بندیوں کے اطراف بدنما اور گنجان طور پر محدود کر دیا گیا۔ البتہ شاہی محلات، شہر پناہ اور یادگاری عمارتوں کو نمایاں حیثیت دی گئی۔

چودھویں صدی کے اوائل سے دور متوسط کے تعمیر کردہ شہروں کی منظم طور پر ترمیم اور توسیع ہونے لگی جس کو نشاۃ ثانیہ کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں سب سے پہلے اٹلی کے شہر روم کے لیے ممتاز ماہرین فن مائیکل انجیلو (Michael Angelo) اور برنی (Bernini) کی متعدد تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا جس سے شہر میں رونق دوبالا ہو گئی۔

فرانس میں لوئی چہارم (Louis IV) سے لے کر نپولین (Napoleon) کے زمانے تک پیرس اور ورسائی (Versailles) کے لیے جن تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ جرمنی میں سترہویں صدی کے ابتدائی زمانے میں کارلس روہے (Karls Rube) اور مان ہایم (Mannheim) جیسے عالیشان شہروں کی تخلیق عمل میں آئی۔ جن کو دور متوسط کے بہترین نمونے کہا جاتا ہے۔ انگلستان کا دور متوسط تشکیل شہر کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ لندن میں سترہویں صدی کی دہشت ناک آتش زدگی کے بعد عظیم ماہر فن کرسٹوفر رین (Christopher Wren) نے شہر لندن کی ترمیم و توسیع کے لیے ایک مکمل خاکہ مرتب کیا تھا جس کو بادشاہ وقت کے منظور کرنے کے باوجود ناعاقبت اندیشی اور خود غرض شہریوں کے عدم تعاون نے شرمندہ تعبیر ہونے سے باز رکھا۔

ہندوستان میں دور متوسط کے تعمیر کردہ شہروں میں مغلوں کے شاہجہاں آباد، فتح پور سیکری، جون پور اور احمد آباد اور راجہ جے سنگھ کا جے پور اور قطب شاہی دور کا شاہکار حیدرآباد اسی نوعیت کے بہترین شہروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شہر حیدرآباد کی تعمیر حضرت میر مومن کی رہین منت ہے۔ جو قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم تھے۔

اٹھارہویں صدی میں اکثر و بیشتر شہروں کی توسیع غیر منظم طور پر ہونے لگی۔ لالچی زمین داروں اور خود غرض مالکان کارخانہ جات بلا لحاظ حفظان صحت، مزدوروں اور کاریگروں کے رہائشی مکانوں کو قطار در قطار کارخانوں کے قرب و جوار میں بنوانے لگے۔ اور اس طرح گندی بستیاں سلموں (Shims) کی شکل میں نمودار ہونے لگیں۔ اکثر و بیشتر شہروں کی توسیع اطراف کے باغوں اور زراعتی رقبوں کو ہضم کرنے لگی۔ جو مدتوں سے شہروں کی آب و ہوا اور غذائی ضروریات فراہم کرتے تھے۔ اس خطرناک صورت حال سے نمٹنے کے لیے ترقی پذیر ممالک نے تشکیل شہر کی ضرورت کو محسوس کیا اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس فن کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی۔ متعدد حکومتوں نے اپنے اپنے ممالک میں تشکیل شہر کو روبہ عمل لانے کے لیے قوانین و ضوابط نافذ کیے۔ اس سلسلے میں جرمنی پہلا ملک تھا جس نے شہری منصوبہ بندی کے قوانین (Town Planning Acts) کو نافذ کیا۔ اور بعد ازاں انگلستان، فرانس، آسٹریلیا، امریکہ اور کینیڈا اور بعض ایشیائی ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں مناسب اقدام کیے۔

ہندوستان میں شہری منصوبہ بندی کا پہلا قانون شہر بمبئی میں ۱۹۱۵ء میں نافذ ہوا اور اس کے بعد ۱۹۲۲ء سے قبل پنجاب، یوپی، مدراس اور بنگال نے بھی اس کی اتباع کی دور حاضر کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ساتھ ہی برق رفتار صنعتی ترقیوں کی بدولت سماجی اور بلدی ضروریات کے مدنظر تمام متمدن حکومتوں نے مخصوص وزارتوں کے تحت متعدد محکمے قائم کیے۔ جن کو شہروں اور دیہاتوں کی تشکیل کا ذمہ دار بنایا گیا۔ علاوہ ازیں اس فن کی تعلیم و تدریس کے لیے فنی درس گاہوں اور مختلف جامعات میں معقول انتظام کیا گیا۔ اور بین الاقوامی شہرت یافتہ فن دانوں کو متعدد شہروں کے صدر خاکے تیار کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ جمہوریہ ہند میں بھی ۱۹۵۲ء میں ٹاؤن پلاننگ انسٹیٹیوٹ اور حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے تعاون سے دہلی، بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں اس فن کی درس گاہیں قائم کی گئیں۔

گزشتہ نصف صدی کے قبل ہندوستان میں بیرونی ممالک سے متعدد ماہرین فن کو مدعو کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی کی تشکیل کے لیے ایڈورڈ لوٹینس (Lutyens) اور حکومت مدراس نے

ایم۔ وی۔ لینچ ماسٹر (M.V. lanchaster) اور یوپی کی حکومت نے لکھنؤ کی تشکیل کے لیے پٹرک گیڈیس (Patric Geddes) کو مدعو کیا۔ اور حکومت پنجاب نے جدید دارالحکومت چنڈی گڑھ کی تشکیل کے لیے بین الاقوامی شہرت یافتہ فرانسیسی ماہر فن کاربو سے (Corbousier) کی خدمات حاصل کیں۔ جس نے ہندوستان کے لیے جدید شہر کی تشکیل کا ایک مثالی خاکہ مرتب کیا۔ حکومت بمبئی نے عظیم تر بمبئی کے صدر خاکے کی تیاری کے لیے انگلستان کے ممتاز ماہر فن البرٹ میئر (Albert Mayr) کو ۱۹۴۹ء میں مدعو کیا۔

ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں حیدرآباد کی حکومت نے سب سے پہلے شہر کی منصوبہ بندی کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں کی اور اس غرض کے لیے تشکیل شہر کا مخصوص محکمہ مقامی حکومت کے تحت قائم کیا۔ شہر حیدرآباد و سکندرآباد کے خاکے کے علاوہ متعدد شہروں اور دیہی علاقوں کے صدر خاکے تیار کیے۔ ریاست حیدرآباد کی ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر تقسیم اور آندھرا پردیش کے قیام کے بعد جدید شامل کردہ اضلاع کے لیے بھی صدر خاکے مرتب کیے گئے۔ جن کو اب روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ حالیہ دور تک جو محکمے صرف تشکیل شہر کے نام سے موسوم تھے اب ان کو محکمہ تشکیل شہر و دیہی منصوبہ بندی سے پکارا جارہا ہے۔ جس کی بدولت شہروں کے ساتھ ساتھ دیہاتوں کی تشکیل و ترمیم اور توسیع میں خاصی دلچسپی لی جارہی ہے جن کو عرصہ دراز تک نظر انداز کیا جارہا تھا۔

تعمیری یا اسٹرکچرل انجینیری

اپنے وسیع مفہوم میں تعمیری انجینیری فن انجینیری کے ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہے جو بوجھ کو برداشت کرنے اور بوجھ کو منتقل کرنے سے متعلق ہیں۔ اس میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں۔ نقشہ کی ترتیب، مال مسالہ کا انتخاب، تعمیر کے اجزائے ترکیبی کے تناسب اور ان کے رابطوں کا تعین، مختلف قسم کے بوجھوں کے تحت ان کے طرز عمل کا اندازہ ان کی ناکارکردگی یا عدم کارکردگی کے امکانات کا جائزہ اور ان کی لاگت اور کارکردگی سے بہترین استفادہ۔

سول انجینیری میں عمارات، پل، تالاب، نہریں، سڑکیں، سرنگیں، گودیاں، بندرگاہیں اور پاور ہاؤس سب کا دارومدار اسی مضمون پر ہے۔ میکانیکل انجینیری، بحری انجینیری اور فضائی انجینیری میں مشینوں کے اجزا، دباؤ سہار ظروف، جہاز، ہوائی جہاز، میزائل اور سٹی لائیٹ یہ سب بھی اسی مضمون کے محتاج ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فن تعمیر کے ماہر اور ارکیٹک اور کاریگر تعمیری انجینیری کے موٹے اصولوں سے زمانہ قدیم سے باخبر رہے ہیں مگر یہ باخبری زیادہ تر وجدانی تھی اور اس کو سائنس کا درجہ حاصل نہیں تھا البتہ گزشتہ چند صدیوں میں جب طبعی علوم اور ریاضیات میں ترقی ہوئی تو اس کے نتیجے کے طور پر عمارتوں کے اجزائے ترکیبی کے عمل اور ان کے بوجھ سہارنے کی استعداد کے بارے میں بھی ہماری معلومات نے ترقی کی۔ پھر بالکل حال میں الکٹرانک کمپیوٹر کی ایجاد نے اس مضمون کے دائرہ عمل کو بہت وسعت دے دی ہے اور پیچیدہ سے پیچیدہ تعمیری نظاموں کے مسائل کا تجزیہ آسان کردیا اور ان سے ان کی استعداد کی حد تک زیادہ سے زیادہ استفادہ کو ممکن بنا دیا ہے۔

اشیائے تعمیر کی میکانکس

اس مضمون میں اس سے بحث کی جاتی ہے کہ مختلف اشیا کا قوتوں کے تحت کیا عمل ہوتا ہے۔ اس میں زور، فساد، مضبوطی، شکل کی تبدیلی اور قیام پذیری شامل ہیں۔ اشیا یا تو لچک دار یا بے لچک ہوتی ہیں اور بوجھ یا تو ساکن یا متحرک ہوتے ہیں۔

زور اور فساد

جب کوئی بیرونی قوت کسی شے پر عمل کرتی ہے تو اس کے اندر مقابلہ کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی شکل میں کچھ بگاڑ واقع ہوتا ہے۔ اس قوت فی اکائی رقبہ کو ”زور“ کہتے ہیں اور بگاڑ فی اکائی طول یا رقبہ یا حجم کو فساد کہتے ہیں۔

کسی شے پر زور عمل کرے تو اس کا کوئی چھوٹا حصہ دو طرح سے اس کا جواب دے سکتا ہے۔ اس کے اندر کے متصل مستوی رقبے ایک دوسرے کے نزدیک آنا چاہیں گے یا ایک دوسرے سے دور ہونا چاہیں گے پہلی صورت پچکاؤ یا فشار (کمپریشن) اور دوسری صورت تناؤ (ٹنشن) کہلاتی ہے ان دونوں صورتوں میں زور اور فساد عمودی ہوں گے۔ ایک تیسری صورت یہ کہ متصل مستوی رقبہ ایک دوسرے پر سے پھسلنا چاہیں۔ اس صورت میں زور اور فساد جزی یا قرضی (Shrink) کہلائیں گے۔

عام طور پر کسی شے کے کسی حصہ میں متوی عمودی اور جزوی دونوں طرح کے زور ایک ساتھ واقع ہو سکتے ہیں۔ مگر ہر صورت میں ہر نقطہ میں سے گزرنے والے تین ایسے مستوی موجود ہوں گے جن پر زور صرف عمودی ہوں گے۔ یہ مستوی صدر مستوی اور ان پر عمل کرنے والے عمودی زور صدر زور کہلاتے ہیں اور ان سے وابستہ جو فساد ہوتے ہیں وہ صدر فساد کہلاتے ہیں۔

کوئی شے لچک دار کہلائے گی اگر بوجھ سے جو فساد پیدا ہوا ہے بوجھ کے ہٹا لینے پر وہ فساد بھی غائب ہو جائے۔ ان اشیا میں ایک خاص صفر کے اندر زور اور فساد ایک دوسرے کے متناسب ہوتے ہیں۔ عمودی زور اور اس سے پیدا ہونے والے فساد کی نسبت ینگ کا لچک کا مقیاس کہلاتا ہے۔ جزی زور اور اس سے پیدا ہونے والے فساد کی نسبت کو جزی مقیاس

یا استواری کا مقیاس کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف پیکر پذیر اشیا میں جو بے لچک ہوتی ہیں بوجھ ہٹا لینے پر بگاڑ دور نہیں ہوتا اور زور اور فساد ایک دوسرے سے آزاد ہوتے ہیں فرخ اشیا میں بگاڑ وقت کے لحاظ سے بدلتا

ہے اور بوجھ ہٹانے پر وہ ابتدائی شکل پر واپس نہیں آتیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شے بالکل لچک دار یا بالکل بے لچک یا بالکل فرخ ہو اکثر اشیا میں یہ تینوں خاصیتیں کم یا زیادہ ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ انجینیری تعمیرات

میں جو اشیا استعمال ہوتی ہیں وہ ایک خاص حد تک تقریباً بالکل لچکدار ہوتی ہیں۔ یہ حد لچک کی حد یا متناسبت کی حد کہلاتی ہے۔ اس حد کے آگے بے لچک پن بڑھتا جاتا ہے جو زور اور فساد کے گراف میں انحن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور فساد پورا دور نہیں ہوتا۔

خمیدگی۔ اگر کوئی شے موڑی جائے تو اس کی ہر تراش پر عمودی فساد واقع ہوں گے۔ عمودی فساد تراش کے ایک کنارے پر زیادہ سے زیادہ فشاری ہوں گے اور دوسرے کنارے پر زیادہ سے زیادہ تنشی دونوں کناروں کے درمیان کسی مقام پر فساد فشاری سے تنشی میں تبدیل ہوگا اور اس

کی علامت بدلے گی یعنی اس مقام پر فساد صفر ہوگا اس وجہ سے اس مقام کو تبدیلی محور کہتے ہیں۔ ان فسادوں سے ہر مقام پر زور پیدا ہوں گے جو بیرونی خماؤ کے اثر کی مزاحمت کریں گے۔ خماؤ کی وجہ سے عمودی زوروں کے علاوہ مماشی یا جزی زوروں کا ایک نظام بھی وجود میں آئے گا۔

خماؤ کی کسی خاص شدت یا معیار اثر کے تحت واقع ہونے والے فساد اور زور خمیدگی زیر بحث شے کی وضع اور اس کے طبعی خاص پر منحصر ہوتے ہیں۔

مروڑ اگر کسی شے کو مروڑا جائے تو اس کی ہر تراش پر جزی فساد اور جزی زور پیدا ہوں گے۔ یہ فساد اور زور اندر کسی مقام پر صفر ہوں گے اور باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بیرونی سطح پر زیادہ سے زیادہ ہوں گے اس مدت میں عمودی زور اور فساد موجود نہ ہوں گے۔ اس جزی زور اور جزی فساد کی تقسیم اور زیر بحث شے کی شکل کا بگاڑ یہ سب اس شے کی وضع اور اس کے خواص پر منحصر ہوں گے۔

جھکاؤ اگر کوئی پتلی لمبی شے دونوں سروں پر دبائی جائے تو وہ بازو کی طرف جھکے گی۔ یہ جھکاؤ لچک کی عدم قائمیت کی وجہ سے ہوگا۔ کم سے کم بوجھ جو یہ جھکاؤ پیدا کرے فاضل بوجھ کہلاتا ہے۔ یہ فاضل بوجھ شے کے طول کے معکوس تناسب ہوتا ہے یعنی طول زیادہ ہو تو فاضل بوجھ کم ہوتا ہے۔ اور چوڑائی کے تناسب ہوتا ہے یعنی چوڑائی اور گہرائی زیادہ ہو تو فاضل بوجھ زیادہ ہوگا۔ فاضل بوجھ کی کمی نازکی کہلاتی ہے فاضل بوجھ شے کے سروں کے تقید پر منحصر ہوتا ہے یعنی اس بات پر کہ سروں کی کیفیت کیا ہے آزاد ہیں یا کسی طرح سے پابند اور نیز شے کی طبعی خواص پر بھی منحصر ہوتا ہے۔

ریننگ اگر بوجھ تھوڑی دیر رکھ کر ہٹا نہ دیا جائے بلکہ بہت عرصہ تک عمل کرتا رہے تو اکثر چیزوں میں بگاڑ یا فساد وقت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اس مظہر کو ریننگ کہتے ہیں۔ جو فساد اس طرح وقت کے گزرنے سے پیدا ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ بوجھ ہٹا لینے پر غائب ہوجاتا ہے اور کچھ حصہ مستقل طور پر باقی رہ جاتا ہے۔ ریننگ کی مقدار زور کے بڑھنے سے اور تپش (ٹمپریچر) کے بڑھنے سے بڑھتی ہے۔ ریننگ کا باعث اس شے کے پیکر پذیر (پلاسٹک) اور فرخ اجزا ترکیبی ہوتے ہیں۔ جو لچک کے عمل کو متاثر کرتے ہیں۔

تھکن اگر کسی شے پر بوجھ بار بار لگایا جائے تو اس شے کی قوت برداشت کم ہوجاتی ہے یعنی اگر بوجھ بار بار نہ لگایا جاتا تو وہ جو بوجھ برداشت کرتی اب اس سے کم پر ناکارہ ہوجائے گی۔ یہ بوجھ جس پر ناکارگی واقع ہوتی ہے بوجھ کی تکرار کی تعداد کے بڑھنے سے گھٹتا ہے۔ بعض اشیا ایسی ہیں مثلاً فولاد کہ ان کی مضبوطی ایک خاص حد سے نیچے نہیں جاتی چاہے بوجھ کی تکرار کی تعداد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حد تھکن کی حد کہلاتی ہے۔ بعض اشیا مثلاً کنکریٹ میں ایسی کوئی مستقل حد نہیں ہوتی۔ تھکن کا مظہر دراصل لچک کی عدم موجودگی سے واقع ہوتا ہے۔

ناکارگی یا شکستگی کی علامتیں

کسی تعمیری شے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ناکارہ ہوگئی ہے اگر وہ بڑھتے ہوئے بوجھ کے تحت منعوب ہوجائے۔ اس عمل کو تمددی ناکارگی کہتے ہیں اگر وہ ٹوٹ جائے تو اس کو پھونک ناکارگی کہتے ہیں اور اس کے بعد وہ مزید بوجھ برداشت نہ کرسکے۔ ناکارگی کے مظہر کے وقت شے کی حالت کا تعین کرنے کے لیے کئی نظریے ہیں جو زور فساد اور جذب کی ہوئی توانائی کے تعلق سے ناکارگی کی توجہ کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ وہ نظریے حسب ذیل ہیں انتہائی صدر زور (از روے رینکن) انتہائی جزی زور (از روئے کولوب) انتہائی صدر فساد (از روئے سینٹ وینان) اور انتہائی فسادی توانائی (از روئے مینز ز وہکی) مگر ان میں سے کوئی بھی ناکارگی کے ہر طور اور ہر قسم پر حاوی نہیں ہے۔ صدر زور اور صدر فساد کے نظریے شکستگی کے لیے درست معلوم ہوتے ہیں اور جزی زور اور فسادی توانائی کے نظریے مغلوبیت کے لیے ٹھیک بیٹھتے ہیں۔

زمین کی میکانکس

کسی تعمیر پر جو بوجھ لگائے جاتے ہیں وہ اس تعمیر سے ہوتے ہوئے آخر زمین کو منتقل ہوتے ہیں جس میں یا جس پر وہ تعمیر واقع ہے۔ چوں کہ مختلف زمینوں یعنی مختلف مٹیوں کے وصف اور خاصیتیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے بوجھ کو برداشت کرنے کے بارے میں ان کی صلاحیت کا اندازہ زمانہ گزشتہ میں صرف تجربہ اور قوت فیصلہ ہی کے ذریعہ ممکن تھا۔ اس کے بعد تعمیروں کے زوروں وغیرہ کے تجزیہ میں کافی ترقی ہوئی مگر زمین یا مٹی کی انجینیری خاصیتوں کا مطالعہ ان خاصیتوں کا مقداری اندازہ اور اس لحاظ سے مٹیوں کی تقسیم اور درجہ بندی بیسوی صدی کے آغاز کے بعد ہی عمل میں آئی۔ اس کا سہرا تمام تر کارل ٹرزاگھی ۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۳ء کے سر ہے۔ اس نے جو بنیادی اصول پیش کیے وہ خفیف سی ترمیمات کے ساتھ اب بھی عصری زمینی میکانکس کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔

زمین کی ساخت: کسی زمین کی مٹی کے ذرات کی جسامت یا سائز اس زمین کی ساخت کا تعین کرتے ہیں۔ اس غرض سے عموماً ذرات کے سائز کے چار طبقے کیے گئے ہیں۔ بجری (جس کا سائز دو ملی میٹر سے زیادہ ہو) ریت (۲ء۰ ملی میٹر سے دو ملی میٹر تک) گاد یا سلٹ (جس کا سائز ۰۲ء۰ ملی میٹر سے ۰۰۲ء۰ ملی میٹر تک ہو) اور چکنی مٹی یا پنڈول (جس کا سائز ۰۰۲ء۰ ملی میٹر سے کم ہو)۔ اکثر مٹیوں میں ان سب قسموں کے ذرے مختلف تناسبوں میں :

موٹی مٹیاں	باریک مٹیاں
عمدہ طور پر درجہ دار بجری	سلٹ جس کی فشار پذیری کم ہو
ناقص طور پر درجہ دار بجری	سلٹ جس کی فشار پذیری زیادہ ہو
بجری جس میں پنڈول کی بندش ہو	پنڈول جس کی فشار پذیری کم ہو
عمدہ طور پر درجہ دار ریت	پنڈول جس کی فشار پذیری زیادہ ہو
ناقص طور پر درجہ دار ریت	نامیاتی مٹی جس کی فشار پذیری کم ہو
ریت جس میں پنڈول کی بندش ہو	نامیاتی مٹی جس کی فشار پذیری زیادہ ہو۔

موجود ہوتے ہیں۔ جن مٹیوں میں ۵۰ فی صد سے زیادہ سلٹ اور پنڈول ہو وہ باریک مٹیاں اور باقی موٹی مٹیاں کہلاتی ہیں۔ ان دو بڑی قسموں کی پھر مزید تقسیم کی جاتی ہے اس لحاظ سے کہ ان میں زیادہ حصہ کسی قسم کا ہے۔ اور کم حصہ کسی قسم کا مثلاً بجری دار ریت، ریتیلی سلٹ، سلٹی پنڈول وغیرہ۔

مٹی کی پیکر پذیری: کسی مٹی میں باریک ذرات کی مقدار اور رطوبت میں جو تناسب ہوتا ہے اس سے اس کی پیکر پذیری کی خاصیت متعین ہوتی ہے۔ باریک ذرات کی تمویلیت کی چند مقداریں متعین کی گئی ہیں اور ان کے متناظر رطوبت کی مقداروں کو مائعیت کی حد اور پیکر پذیری کی حد کہا جاتا ہے اور ان کے فرق کو پیکر پذیری کا اشاریہ کہتے ہیں۔ یہ خاصیتیں باریک ذرات کے سائز پر اس قدر منحصر نہیں ہوتیں جتنا کہ معدنیاتی خواص پر منحصر ہوتی ہیں۔ اور مٹی کے پھولنے سکڑنے دبنے وغیرہ کی خاصیتیں انہیں سے متعین ہوتی ہیں۔

مٹیوں کی درجہ بندی: موٹی مٹیوں کی تقسیم میں ان کی ساخت پر غور کرنا کافی ہے یعنی اس پر کہ ان کے ذرات کی جسامت کی تقسیم کیا ہے۔ لیکن باریک مٹیوں میں فشار پذیری یعنی دبنے کی خاصیت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ مٹیوں کی درجہ بندی کے کئی طریقے وضع کیے گئے ہیں لیکن انجینئری کے اغراض کے لیے عام طور پر حسب ذیل درجہ بندی استعمال کی جاتی ہے۔

مٹی کی مضبوطی: مٹی کے کسی قطعہ پر جب باہر سے کوئی بوجھ عمل کرتا ہے تو وہ مٹی جزی ناکارگی کی مزاحمت کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس مزاحمت کے دو نمایاں اجزائے ترکیبی ہیں۔ ایک تو قوت اتصال جو عمودی زوروں پر منحصر نہیں ہوتی دوسرے رگڑ جو موثر عمودی زوروں پر منحصر ہوتی ہے۔ موثر زور یا ذرات کے درمیان دباؤ کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ مجموعی عمودی زور اور مٹی کے مسامات میں موجود نمی کے دباؤ کا فرق ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ کسی مٹی کی جزی مضبوطی کے تعین میں اس کے مسامات میں موجود پانی کا دباؤ ایک اہم حصہ لیتا ہے۔ مٹی کی مضبوطی کے لیے حسب ذیل ضابطہ عام طور پر مستعمل ہے۔

جہاں جزی مضبوطی ہے۔
قوت اتصال ہے۔
اندرونی رگڑ کا زاویہ ہے
اور موثر عمودی زور ہے۔

سیر شدہ چکنی مٹیاں قوت اتصال کے ذریعہ مزاحمت پیش کرتی ہیں اور صاف ریت اور بجریوں کی مزاحمت رگڑ کے ذریعہ واقع ہوتی ہے لیکن عام طور پر مٹیوں میں مزاحمت ان دونوں اسباب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اس کی قیمت تجربہ خانہ یا جائے وقوع پر تجربوں کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہے۔ ایک ہی قسم کی مٹی کی مضبوطی قابل لحاظ حد تک اس کے گٹھاؤ اور نمی کی مقدار کے لحاظ سے بدل سکتی ہے۔

قوت برداشت: کسی مٹی کی قوت برداشت اس کی مضبوطی کے علاوہ اس پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ اس کے اوپر جو تعمیر ہوئی ہے اس کی جسامت کیا ہے اور وہ کس قسم کی ہے۔ محفوظ قوت برداشت کا تعین کرنے میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ مجوزہ بوجھ کے تحت مٹی ناکارہ نہ ہو جائے بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں اتنا دھساؤ واقع نہ ہو کہ تعمیر اس کو برداشت نہ کر سکے۔ ریتیلی زمینوں میں دھساؤ بوجھ کے پڑتے ہی فوراً پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس پنڈولی زمینوں میں دھساؤ کا عمل کئی سال تک جاری رہ سکتا ہے۔ دھساؤ اگر ہموار اور یکساں ہو تو صورت حال زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دھساؤ یکساں نہ ہو تو یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات اس پر منحصر ہے کہ تعمیر کس قدر لچکدار ہے۔

بنیاد کی قسمیں: اصل تعمیر کو سہارنے کے لیے مختلف قسم کی بنیادیں مستعمل ہیں۔ عام استعمال میں حسب ذیل قسمیں ہیں:

(ا) فٹنگ یعنی دیوار یا کھم کو مقامی طور پر چوڑا بنا دینا تاکہ تعمیر کا بوجھ زیادہ بڑے رقبہ پر پھیل جائے۔

(ب) بیڑہ یا رافٹ ایک خصوصی سل جو کم زور مٹیوں پر تعمیر کو سہارنے کے لیے تجویز کی جائے۔

(ج) لٹھے یا پایل یعنی کھم جو زمین کے اندر دور تک گاڑے جائیں اور تعمیر کو سہاریں۔ یہ الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے گروہ بھی ہو سکتے ہیں۔

(د) کنویں یا کیسان یہ کنویں ہوتے ہیں جو اندر مضبوط اور سخت زمین یا چٹان تک کھودے جاتے ہیں ان کنوؤں کو موزوں مال مسالے سے بھرا جاتا ہے اور ان پر تعمیر کا ٹکاؤ عمل میں آتا ہے۔

تعمیری یا اسٹرکچرل ڈیزائن: یہ عمل اس پر مشتمل ہے کہ کسی تعمیر کے اجزائے ترکیبی کا باہمی رابطہ اور ان کے سائز مقرر کیے جائیں۔ ان کے لیے مال مسالہ کا انتخاب کیا جائے۔

اوران کے اجزا کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا طور متعین کیا جائے تاکہ تعمیر اپنا مقصد کارکردگی حفاظت اور کفایت کے ساتھ انجام دے۔ سب میں پہلے تعمیر کے فرض منصبی یعنی اس کے غرض وغایت کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس پر کیا بوجھ وارد ہوں گے۔ پھر تجربہ کی روشنی میں اور قوت فیصلہ کی مدد سے کئی مختلف تجویزیں اور ڈزائن مرتب کیے جاتے ہیں۔ پھر مضبوطی استواری کارکردگی کفایت اور خوش نمائی کے نقطہ نظر سے بہترین تجویز کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس ڈزائن کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر تفصیلی تحقیق اور تجربے سے معلوم ہو کہ یہ ڈزائن ضروریات کے ٹھیک ٹھیک مطابق نہیں ہے تو ضروری ترمیمیں کی جاتی ہیں یہاں تک کہ ضرورت کے ساتھ مطابقت حاصل ہو جائے۔ اس طرح ڈزائن اور پھر اس کا تجزیہ ایک دوسرے کے تکمیلی مراحل ہیں۔ ڈزائن ایسی تجویز پیش کرتا ہے جس سے توقع کی جاتی ہے کہ تعمیر کے مفروضہ فرائض کو پورا کرے۔ تجزیہ یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس ڈزائن سے یہ بات پورے طور پر حاصل ہوتی ہے۔

ڈیزائن کے اصول

عمدہ ڈزائن کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تعمیر میں حسب ذیل باتیں موجود ہوں۔

(ا) مضبوطی یعنی متوقعہ بوجھ کو برداشت کرنے کی صلاحیت یعنی متوقعہ بوجھ سے ناکارگی واقع نہ ہو۔

(ب) استواری۔ یعنی متوقعہ بوجھ کے تحت تعمیری شکل میں کوئی بگاڑ یا کوئی حرکت نہ پیدا ہو جس کی وجہ سے اپنا مقصد پورے طور پر انجام نہ دے سکے۔

(ج) پائیداری۔ یعنی معمولی متوقعہ حالات کے تحت مرور زمانہ سے تعمیر میں بہت انحطاط واقع نہ ہو۔

(د) کفایت

بوجھ ڈزائن کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا تخمینہ کیا جائے کہ تعمیر پر اس کی نارمل زندگی اور کارکردگی میں کیا بوجھ عائد ہوں گے۔ یہ بوجھ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(ا) مردہ یا ساکن بوجھ یعنی وہ جو تعمیر کے ذاتی بوجھ ہوں یا اس میں کڑی تنصیبات کے ہوں۔

(ب) زندہ یا متحرک بوجھ۔ یعنی وہ بوجھ جو متحرک یا متغیر قوتوں کی وجہ سے عائد ہوں۔ زندہ یا متحرک بوجھ کی کئی شکلیں ہیں مثلاً لوگ۔

ج) سامان جو گاڑیاں، مشینری، پانی، ہوا، زلزلہ، موجیں، دھماکے، دھساؤ، ٹھٹھر اور رطوبت کے تغیرات وغیرہ۔ بوجھ کے عمل کے کئی طور ہیں۔ پھیلا ہوا یا مرتکز، برقرار یا کم و بیش ہونے والا تکراری یا دھکے کے ساتھ۔ کسی تعمیر پر عمل کرنے والے اکثر بوجھ بالکل ٹھیک ٹھیک دریافت ہو سکتے ہیں۔ مگر بعض کا صرف تقریبی طور پر تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔

تحفظ تعمیروں کے ڈزائن میں یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ ناکارگی یا ناقص کارکردگی سے محفوظ رہے۔ اس تحفظ کا مقداری اندازہ اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ بوجھ یا زور جو ناکارگی پیدا کرے عائد بوجھ یا زور سے کتنے گنا زیادہ ہے یہ نسبت قدر تحفظ (فیکٹر آف سیفٹی) کہلاتی ہے۔

ڈیزائن کے اصول

ہر ڈزائن کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ تعمیر کے ہر حصے کی قدر تحفظ تقریباً مساوی ہو۔ یعنی ہر ایک پر عملی زور، انتہائی زور سے جس سے ناکارگی واقع ہوتی ہو یکساں طور پر کم ہو اور اس طرح ہر حصہ کی مضبوطی مساوی طور پر استعمال میں آئے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی حصہ مضبوط اور کوئی حصہ کمزور ہو یا دوسرے لفظوں میں کوئی حصہ غیر ضروری طور پر مضبوط نہ ہو۔ کیوں کہ یہ بات کفایت کے خلاف ہے۔ ڈزائن کرتے وقت انجینئروں کے پیش نظر یہ مقولہ رہنا چاہیے کہ کسی زنجیر کی مضبوطی اس کی کمزور ترین کڑی کے مساوی ہوتی ہے۔ قدر تحفظ کے تعین میں صرف مطلق ناکارگی ہی سے بچاؤ مقصود نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اور چیزوں کو بھی خیال میں رکھنا چاہیے مثلاً ناپسندیدہ جھکاؤ، تڑخ وغیرہ کے واقع ہونے کا بھی امکان نہ ہو۔

کفایت

ڈزائن کا دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ لاگت اور افادہ میں توازن قائم کیا جائے اور کم سے کم لاگت سے زیادہ سے زیادہ افادہ کیا جائے۔ اس کے لیے اشیائے تعمیر اور ان سائزوں کے متبادل ڈزائن تیار کرکے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا کہ کون سا ڈزائن ان شرائط کو پورا کرتا ہے۔

تعمیروں کے زوروں اور مضبوطی کا حساب

یہ مضمون تعمیروں کے ڈزائن کا ایک لازمی جزو ہے اس میں ہر حصے کے اور پوری تعمیر کے زور فساد اور بگاڑ اور قیام پذیری سے بحث کی جاتی ہے اور اس بحث میں میکانکس کے علم کا استعمال ہوتا ہے۔

اصول

تعمیروں کے زوروں اور مضبوطی سے بحث کرتے وقت جن بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر غور کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

(ا) توازن یا تعادل یعنی تمام قوتوں کا اور تمام قوتوں کے معیار اثر کا تعادل میں ہونا۔

(ب) "مطابقت" یعنی قوتوں سے جو فساد پیدا ہوں ان کا ہندسی تسلسل جن تعمیروں میں زوروں کے تعین کے لیے اصول۔ (ا) کافی ہو یعنی صرف قوتوں کے تعادل پر غور کرنے سے زور دریافت ہو جائیں وہ "سکونیاتی متعین" کہلاتی ہیں۔ اس کے برخلاف جن تعمیروں میں "مطابقت" پر بھی غور کرنا ضروری ہو۔ وہ "سکونیاتی غیر متعین" کہلاتی ہیں۔

طریقہ کار (تکنیک)۔ زوروں کا حساب جہاں ممکن ہو راست ریاضیاتی حسابات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ تقریبی مددی طریقہ استعمال کیے جائیں یا یہ کہ "آزمائش اور مکرر آزمائش" کا طریقہ استعمال کیا جائے گا مگر حال میں یہ ہوا ہے کہ بہت سے حسابات جو ان معمولی طریقوں سے بہت طویل اور پیچیدہ اور محنت طلب ہوتے تھے۔ کمپیوٹروں کی مدد سے بہت سہل ہو جاتے ہیں جہاں ریاضیاتی حل مل ہی نہ

سکیں یا قابل استعمال نہ ہوں وہاں تجرباتی طریقہ کامیاب رہتا ہے ان میں حسب ذیل طریقے شامل ہیں۔ برقی اور دوسرے انالاگ طریقہ (آپٹیکل) طریقہ مثلاً فوٹوگرافی کے ذریعہ زوروں اور فسادوں کا مطالعہ

تعمیر کے ارکان

یہ تعمیر کے انفرادی اجزا ہوتے ہیں جو اپنے اندرونی زوروں کے ذریعہ بیرونی بوجھ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان اجزا میں سے ہر ایک کا عمل مختلف ہو سکتا ہے۔ مثلاً فشار، تناؤ، خماؤ مروڑ یا جز یا ان میں سے ایک سے زیادہ کا اجتماع۔ یہ عمل ایک خط میں یا ایک مستوی میں یا تین ابعاد میں ہو سکتا ہے۔

طولی یا محوری زور

تعمیر کے جن پتلے لمبے حصوں پر زور ان کے طولی محور کی سمت میں فشار کی شکل میں ہو وہ کھم یا داب روک کہلاتے ہیں اور جو تناؤ کی حالت میں ہوں وہ بندھن۔ قینچیوں میں دونوں طرح کے ارکان ہوتے ہیں یعنی داب روک بھی اور بندھن بھی اور یہ دو ابعادی یعنی ایک مستوی میں ہوتی ہیں۔ جو قینچیاں تین ابعادی ہوں فضائی یا مجی فریم کہلاتے ہیں قینچیوں میں بعض ارکان میں خماؤ بھی واقع ہو سکتا ہے۔ رسے بھی تعمیر کا جزو ہو سکتے ہیں۔ یہ شکل پذیر تنشی اجزا ہوتے ہیں۔

خماؤ کے زیر عمل ارکان

پتلے ارکان جن پر خماؤ عمل کرے شہتیر یا گرڈر کہلاتے ہیں۔ خماؤ کے زیر عمل کوئی رکن چوڑائی بھی رکھے تو اس کو پتلا ہو تو تختی اور موٹا ہو تو سل کہا جاتا ہے۔ خماؤ کے ساتھ ساتھ کچھ طولی زور بھی واقع ہو سکتا ہے۔

ٹیڑھے یا منحنی ارکان طولی فشار کے تحت

کمانیں اور غول اس قسم میں داخل ہیں۔ کمان دو ابعادی ہیں اور غول تین ابعادی۔ ان کی کئی شکلیں مستعمل ہیں۔ طولی بوجھ کے ساتھ ساتھ کچھ خماؤ بھی واقع ہو سکتا ہے۔

تعمیری رابطے

ارکان کو یا ارکان کے اجزائے ترکیبی کو ایک دوسرے سے جوڑنا یا مربوط کرنا ہوتا ہے تاکہ ان کا مجموعی اور اجتماعی عمل حاصل ہو۔ ان رابطوں کی حسب ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ کیل یا پن
۲۔ بولٹ
۳۔ ریوٹ
۴۔ ویلڈنگ
۵۔ متحدہ ڈھلائی

ان رابطوں کو بھی ڈیزائن کرنا ہوگا تاکہ ان کے ذریعہ زوروں اور فسادوں کی حسب منشا منتقلی عمل میں آئے اور سہولت بخش اور با کفایت ہوں۔ بعض اوقات ضابطے کسی اثر کو منتقل کرتے ہیں اور بعض اوقات کسی اثر کو حذف کر دیتے ہیں۔ یہ اثر راست زور یا جزی زور یا خماؤ یا مروڑ ہو سکتا ہے۔

رابطوں کو کارخانوں میں یا تعمیر کے مقام پر بنایا جاتا ہے۔

شہتیر

شہتیر کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ تعمیری رکن ہے جس پر بوجھ اس کے طولی محور کے اعلی القوایم عمل کریں اور اس طرح اس پر خماؤ کا عمل کریں۔ یہ قدیم ترین تدبیر ایسے بوجھوں کو سہارنے کی ہے جو راست کسی سہارے کے اوپر عمل نہ کریں بلکہ سہاروں کے درمیان عمل کریں۔ دو متصل سہاروں کے درمیان کے فاصلہ کو فصل کہتے ہیں۔

سہارے

جن سہاروں پر شہتیر سہارا گیا ہو وہ شہتیر کے سروں کو یا تو آزادی سے گھومنے یا مڑنے دیتے ہیں یا اس گھماؤ پر کچھ پابندی عائد کرتے ہیں۔ سادہ سہارے گھماؤ کی پوری آزادی دیتے ہیں اس کے برعکس اگر شہتیر کے سرے سہاروں میں ثابت یا وابستہ ہوں تو گھماؤ مطلق نہ ہوگا۔ درمیانی قسم جزوی گھماؤ کی اجازت دیتی ہے۔ سہاروں کی کیفیت خماؤ کے عمل اور شہتیر کے جھکاؤ و انصراف یا جھکاؤ پر بہت اثر رکھتی ہے۔ مثلاً اگر بوجھ شہتیر کے پورے طول پر یکساں طور پر پھیلا ہوا ہو تو ثابت سروں کی صورت میں اعظم خماؤ کا معیار اثر گھٹ کر سادہ سہاروں کی بہ نسبت $\frac{۳}{۲}$ ہوتا ہے اور اعظم انصراف $\frac{۵}{۱}$ ہوتا ہے۔

تراشیں

شہتیروں کی تراشوں کے لیے کئی شکلیں اختیار کی گئی ہیں۔ یہ شہتیر کے پورے طول میں یکساں یا متغیر ہو سکتی ہیں۔

تراش کا ہوشیاری سے انتخاب کیا جائے تو کم سے کم مال مسالے سے ضروری مضبوطی اور استواری حاصل ہو سکتی ہے۔

مال مسالہ یا میٹیریل چوں کہ خماؤ کے عمل میں تناؤ اور فشاری زور دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے شہتیر کے لیے وہی شے سب میں زیادہ موزوں ہے جو تناؤ اور فشار دونوں کو برداشت کر سکے مثلاً لکڑی اور فولاد۔ متبادل صورت یہ ہے مرکب ساخت استعمال کی جائے جس میں فشاری رخ پر اس کے موزوں شے اور تنشی رخ پر اس کے موزوں شے استعمال کی جائے مثلاً محکم کنکریٹ۔

کھم یا ستون

یہ تعمیر کے انتصابی ارکان ہوتے ہیں جن پر بوجھ زیادہ تر ان کے محور کی سیدھ میں ہوتا ہے اور وہ محوری فشار کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن بوجھ اگر محور کی سیدھ میں نہ ہو بلکہ خارج المرکز ہو یا تعمیر کے دوسرے ارکان کچھ زور عاید کریں تو کھم میں خماؤ کا عمل واقع ہوگا۔ شہتیروں اور کمانوں کے ساتھ ساتھ کھم بھی قدیم ترین زمانوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

مضبوطی

کھم کی لمبائی یا اونچائی بہت کم ہو تو اس کی تقریباً پوری فشاری مضبوطی بروئے کار آتی ہے۔ لیکن

لمبائی کی وجہ سے جھکاؤ واقع ہوتا ہے جس کی وجہ سے پوری فشاری مضبوطی کام میں نہیں آتی۔ اور بوجھ کی برداشت کی صلاحیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ کمی مال مسالے کی خاصیتوں اور اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کھم کے سرے کس حد تک مقام اور سمت میں آزاد یا مقید ہیں۔ ناز کی جتنی زیادہ ہوگی اور سرے جتنے آزاد ہوں گے کھم کی قوت برداشت اتنی کم ہوگی۔

کھموں کی قسمیں۔ کھم گول یا مربع یا مستطیلی تراش کے ہوتے ہیں اور تراش ٹھوس یا کھوکھلی یا ساختہ ہو سکتی ہے۔ مال مسالے کے لحاظ سے یا تو ایک واحد شئے استعمال کی جا سکتی ہے مثلاً پتھر یا چنائی یا لوہا یا لکڑی وغیرہ یا مرکب مسالہ مثلاً محکم کنکریٹ یا لوہے کے نل جن کے اندر کنکریٹ بھر دیا جائے یا کنکریٹ میں لوہے کی موٹی سلاخیں گاڑ دی جائیں۔

قینچی قینچی تعمیر کا ایسا رکن ہے جو ایک ڈھانچہ یا فریم کی شکل کا ہو اور جو کسی فصل پر آنے والے کھڑے یا ترچھے بوجھوں کو سہارے اور یہ عمل قینچی کے ارکان کے راست تناؤ اور فشاری زوروں کے ذریعہ ہو۔ بعض صورتوں میں ان ارکان میں کچھ خماؤ بھی واقع ہو سکتا ہے۔ قینچی کے ارکان کا جوڑ پتوں بولٹوں یا ریوٹوں کے ذریعہ ہوتا ہے یا ارکان یکتختہ بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ بڑے فصلوں کو پاٹ کر ان پر بوجھ سہارنے کے لیے ایک باکفایت ترین تدبیر ہے۔ جو قینچیاں تین ابعاد میں عمل کرتی ہیں وہ فضائی یا تین ابعادی فریم کہلاتی ہیں قینچیوں کے لیے مختلف شکلیں وضع کی جاتی ہیں۔

قینچیوں کی ساخت میں لکڑی (ٹھوس اور پرت دار) فولاد ایلومنیم کے محکم کنکریٹ اور پری اسٹرسڈ کنکریٹ استعمال ہوتے ہیں۔

کمان ایک منحنی تعمیری رکن ہوتی ہے جو ایک فصل پر تعمیر کی جاتی اور اس فصل پر آنے والے بوجھوں کو زیادہ تر اپنے اندر کے فشاری زوروں کے ذریعہ سہارتی ہے۔ کمان کے اس عمل کے ساتھ ساتھ ایک باہر کی طرف دھکیل واقع ہوتا ہے۔ جس کا پشتوں یا پایوں یا ایک بندھن کے ذریعہ مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ شہتیروں اور کالموں کے ساتھ ساتھ کمانوں کا استعمال بڑے قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے کمان کی شکل ایک واحد قوس ہو سکتی ہے جو دائری یا بیضوی یا شلجمی، ہو سکتی ہے یا ان کا مجموعہ ہو سکتی ہے۔ کمان کی شکل کا انتخاب مضبوطی اور خوش نمائی دونوں کے مدِ نظر کیا جاتا ہے وہ۔ سہارے ثابت ہیں دربستہ یا قبضہ دار ہو سکتے ہیں۔ چنائی اور کنکریٹ میں دربستہ ہی ہوں گے بلند کمانیں ثابت یا قبضہ دار ہو سکتی ہیں۔ قبضہ سروں یعنی سہاروں کے علاوہ درمیان میں (بالعموم چوٹی پر) بھی ہو سکتا ہے۔ اس درمیانی قبضہ سے یہ فائدہ ہے کہ دھساؤ یا ٹھہر پھر سے پیدا ہونے والی حرکت کے اثرات بڑی حد تک گھٹ جاتے ہیں۔ نیز قبضہ دار کمان میں زوروں کا حساب کرنا آسان ہوگا۔ کمانیں چنائی یا کنکریٹ یا پرت دار لکڑی یا لوہے کی ہوتی ہیں۔

خول یا شیل تعمیری نقطۂ نظر سے یہ ایک تختی ہوتی ہے جو ایک یا زیادہ سمتوں میں موڑ دی گئی ہو اور جس پر کھڑے بوجھ پڑتے ہوں جس کی وجہ سے اس تختی میں زور فشاری ہوں۔ محکم کنکریٹ اور بعد میں پری اسٹرسڈ کنکریٹ کی ایجاد اور دریافت سے خول بہت پتلے بنائے جا سکتے ہیں جو بڑے بڑے فصلوں کو بہت کفایت سے ڈھانکنے کا کام انجام دیتے ہیں خول کئی شکلوں کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عام مستدیر استوانہ نما خول ہے۔ اس کے علاوہ دہرے انحنا کے خول مثلاً زائدی قبلی وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سلیں یہ تختی نما ارکان ہوتے ہیں جن پر بوجھ کھڑے ہوتے ہیں جن سے ایک یا دو سمتوں میں خماؤ کا عمل واقع ہوتا ہے سلیں عمارتوں کے فرش اور چھت اور پلوں کے فرش وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کناروں کو سہارنے کے مختلف طور ہیں اور کناروں کو ثابت کر کے سرکنے یا مڑنے سے کم یا زیادہ حد تک روکا جاتا ہے۔ سلیں شہتیروں پر یا دیواروں پر ٹکائی جاتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ صرف اطراف سے شہتیر یا دیواریں ہوں اور بیچ میں سل صرف کھموں پر ٹکی ہوئی ہو۔ محکم اور پری اسٹرسڈ کنکریٹ کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ بڑے بڑے فصلوں پر سلیں بغیر درمیانی سہاروں کے رکھی جا سکیں جس سے سہولت اور خوش نمائی پیدا ہوتی ہے۔

حفظانِ صحت

تعارف

قدیم کام بدررویں اور موریاں غالباً اتنی ہی قدیم ہیں جتنا کہ ہمارا تمدن جس نے افراد اور خاندانوں کو بستیوں میں ایک جگہ جمع کیا۔ ہندوستان اور چین میں اب بھی ازمنۂ قدیم کی بدررووں اور موریوں کے نشانات ملتے ہیں۔ اٹلی کے شہر روم اور دوسرے شہروں کے خاص خاص حصوں میں بدررو (Sewers) بنائی گئی تھیں اور اہم پبلک عمارتوں کی صفائی موریوں (Drains) سے کی جاتی تھی لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ زمانہ قدیم میں کسی بھی شہر میں مکانوں اور سڑکوں وغیرہ کی صفائی کا ایسا ہی منظم انتظام تھا جیسا کہ آج کل کسی متمدن شہر کا ہوتا ہے۔ روم کے شہر کلوکا۔ میاگزی ما (Cloaca-Maxima) میں جو زیر زمین موریاں برآمد ہوئیں وہ دراصل وادیوں (Valley) میں بنائے ہوئے پل تھے جن کو

بمشکل ہی بدر رو کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کسی شہر یا اس کے کسی حصہ کو سطحی نالیوں (Surface Drains) موریوں اور بدررؤوں کے سائنٹفک طریقہ سے صاف کرنا اور مسلسل اس کی غلاظت کو بہاکر شہر سے باہر پہنچانا فی الواقع ہمارے جدید تمدن کا ایک تحفہ ہے۔

عمدہ صحت کے لیے ضروری شرائط

اگر انسانی جسم کو صحت و توانائی سے مستفید ہونا ہے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ حیوانات اور نباتات سے خارج شدہ تمام مادہ قبل اس کے کہ وہ سڑنا شروع ہو انسانی بود و باش کے مقامات اور مکانات سے جلد از جلد دور ہٹا لیا جائے کیونکہ یہ خارج شدہ مادہ صحت کے لیے نہایت مضر اور زندگی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ جوں جوں کسی شہر یا قصبہ کی آبادی بڑھتی جاتی ہے اس غلیظ مادہ کو صاف کرنے اور اس سے چھٹکارا پانے میں مشکلات کا اضافہ ہوتا ہے بالخصوص رقیق مادہ کی وجہ سے جس میں گندہ جز محلول اور معلق شکل میں ہوتا ہے۔ خشک مادہ کو تو جمع کرکے باہر بھجوایا جاسکتا ہے۔ لیکن رقیق مادہ کو جمع کرکے دور بھجوانے میں خاص قسم کے انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔

ہندوستان کے حالات

مشرقی رسم و رواج اور عادتیں چونکہ مغربی طور و طریق سے مختلف رہی ہیں۔ اس لیے اور وجوہات کے علاوہ یہ بھی تشفی بخش ڈرینیج کی منصوبہ بندی میں حائل ہوتیں۔ کھانے پکانے کے برتنوں کو ریت اور سڑک کی مٹی سے رگڑ کر صاف کرنے کا رواج ہے۔ اس لیے دھوون کو (Gully Trap) کے ذریعہ پائپ یا بند نالیوں میں بہایا جائے تو جلد یا بدیر رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ رکابیوں کی بجائے پتوں کا استعمال کرکے ان کو (Sink) یا موریوں میں پھینکا جائے تو اس کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مغربی ممالک کے مقابل ہمارے ملک کی آب و ہوا گرم ہونے کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کو حل کرنے کے لیے بطور خاص توجہ کرنی پڑتی ہے ہندوستان کے لیے یوروپی طریقہ کار کو اختیار کرنے میں بڑی رکاوٹ مالیہ کی کمی ہے۔ جو کچھ سرمایہ اس کے لیے مختص کیا جاتا ہے اس سے یہ ممکن نہیں کہ شہروں کی تمام سڑکوں اور تمام مکانوں کے بیت الخلاؤں کو بدررو سے ملایا جاسکے۔ بالعموم تنگ گلیوں اور مکانوں کی ذیلی موریوں کو کھلا چھوڑا جاتا ہے اس سے ایک تو کفایت ہوتی ہے دوسرے ان کی صفائی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ جس کی وجہ سے بدبودار نقصان رساں گیس کی پیدائش بھی نہیں ہوتی۔ یورپی طرز کے بیت الخلا صرف ایسی بڑی سڑکوں پر واقع مکانوں میں بنائے جاسکتے ہیں جہاں زیر زمین بدررؤوں کا انتظام ہے۔ ذیلی سڑکیں جن کے لیے کھلی موریاں بنائی جاتی ہیں ان میں باورچی خانوں کا دھوون اور حماموں کا پانی چھوڑا جاتا ہے ٹھوس غلاظت کو روزانہ صفائی کی گاڑیوں کے ذریعہ شہر سے دور بدررو کے کھیتوں (Sewage Farming) کو بھجوایا جاتا ہے۔ یا ان خندقوں میں ڈالا جاتا ہے جہاں کھاد بنائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا بیان میں ہم نے بدررو (Sewer) اور موری (Drains) کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بدررو اس بند اور زیر زمین موری کو کہتے ہیں جس میں رقیق غلاظت بہتی ہے۔ اس کے برخلاف زمین کے اوپر سڑکوں کے ساتھ ساتھ بنائی جانے والی نالیاں جن میں بارش کا پانی، باورچی خانوں اور حماموں کا غلیظ پانی چھوڑا جاتا ہے موریاں کہلاتی ہیں۔

غلاظت کی صفائی کے مختلف طریقے

غلاظت کی صفائی کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کا انحصار مقامی حالات پر ہوتا ہے۔ آسانی کے لیے ان کو تین طریقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
(۱) ہاتھ سے صاف کرنا۔ (۲) بدررو کے ذریعہ ایک مقررہ مقام تک بہا دینا۔ (۳) بدررو سے جہاں تک بہا سکتے ہیں بہاکر بذریعہ پمپ مقررہ مقام تک پہنچا دینا۔

ہاتھ سے صاف کرنا

یہ طریقہ عام طور پر کنزرونسی (Conservancy) کے نام سے مشہور ہے جو صفائی کے سلسلہ میں ایک قدیم اور ابتدائی کوشش ہے۔ ایسے مقامات پر جہاں زمانہ موجودہ کا نظام صفائی نہیں ہے وہاں غلیظ پانی کو جمع کرنے کے لیے گڑھوں کا بنانا ضروری ہے جہاں سے وقفہ وقفہ سے اس کو اٹھا کر یا تو قصبوں سے باہر قریب ترین نالوں میں بہایا جاتا ہے یا کھیتی باڑی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹھوس غلاظت کو بیت الخلا کے ڈبوں سے دن میں ایک یا دو دفعہ نکال کر آبادی سے باہر خندقوں میں دفن کیا جاتا ہے جس سے کھاد تیار کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے قصبوں میں یہ طریقہ اب بھی رائج ہے۔

بول و براز (پیشاب اور پاخانے) کے علاوہ اور بھی فضلہ (Refuse) ہوتا ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً میووں اور ترکاریوں کے چھلکے، راکھ، کاغذ کی ردی، سوکھے پتے وغیرہ۔ دیہاتوں اور قصبوں میں اس قسم کے فضلے (Refuse) کو آبادی سے باہر لے جاکر جمع کیا جاتا اور وقتاً فوقتاً ان کو جلایا جاتا ہے یا اس سے گڑھوں کے بھرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن بڑے شہروں میں جہاں فضلہ بڑی مقدار میں جمع ہوتا ہے اس کو ضائع کرنے کے لیے بھٹیاں استعمال کی جاتی ہیں اور گیس جو جلنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ چمنی کے ذریعہ سطح زمین سے اوپر خارج ہوکر ہوا میں مل جاتی ہے۔

بدررو کے ذریعہ بہا دینا

بدررؤوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ اور ہر قسم کے لیے بکثرت پانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ غلاظت کو کافی تیزی کے ساتھ بدررو میں بہاکر مقررہ مقام پر پہنچا دے۔ اس کے لیے دو بڑے طریقے رائج ہیں۔
(ا) مشترکہ طریقہ (ب) جداگانہ طریقہ
پہلے طریقہ میں غلاظت کے علاوہ موریوں کے پانی اور بارش کے پانی کو ایک ہی بدررو میں ڈالا جاتا ہے۔ دوسرے طریقہ میں غلاظت کے لیے ایک

علاحدہ مقام بنایا جاتا ہے اور بارش کے پانی کے لیے ایک علاحدہ۔

پہلا طریقہ ہمارے ملک ہندوستان کے لیے اس لیے ناموزوں ہے کہ یہاں بارش نہ صرف سال کے چار مہینے تک محدود ہوتی ہے بلکہ بکثرت ہوتی ہے۔ ان حالات کے تحت یہ تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی ایک ایسا موزوں مقام ڈیزائن (Design) کیا جائے کہ موسم گرما میں پانی کی مقدار اور رفتار اتنی ہو کہ بدررو کی ساری آلائش کو بہالے جائے اور موسم باراں میں بدررو کی گنجائش اتنی ہو کہ بارش کے پانی کو بھی اپنے اندر سمولے۔ لیکن ایسے نشیبی علاقوں کے لیے جہاں سے طوفانی بارش کی نکاسی جلد اور آسانی سے ممکن نہیں ایسی بدررو ؤں کا بنانا نہایت مفید ہوتا ہے جو آدھے انچ یا ایک انچ تک بارش کے پانی کو بآسانی اور فوری بہا سکیں۔

صفائی بذریعہ پمپ

جب کسی شہر کی سطح زمین مسطح اور سپاٹ ہوتی ہے تو بدررو میں ضروری ڈھلان دینے کے لیے ان کو سطح زمین سے کافی نیچے بنانا پڑتا ہے پھر ایک حد ایسی آجاتی ہے جہاں سے مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ساری غلاظت اور آلائش کو پمپوں کے ذریعہ سطح زمین پر لاکر اس کو منزل تک پہنچا دیا جاتے۔

ہوا خانے (Air Chambers) جو پانی کے نلوں پر لگائے جاتے ہیں۔ جن نلوں سے ٹھنڈے اور گرم پانی کو فراہم کیا جاتا ہے ان کے سروں پر مناسب سائز کے ہوا خانے (Air Chambers) عموداً لگاتے جاتے ہیں تاکہ ہوا کو خارج کر کے نلوں کو پانی کی ضربوں (Water Hammer) سے بچایا جائے۔

تازہ ہوا کی مقدار

ذیل کے تختے میں تازہ ہوا بہم پہنچانے کی ضروری مقدار کو بتلایا گیا ہے:

جوان مرد کیلئے جو سخت جسمانی محنت میں مشغول ہو	۹۸۰۰	مکعب فٹ
" " " معمولی " " " "	۴۷۰۰	" "
" " " آرام لے رہا ہو	۳۳۰۰	" "
" عورت کیلئے جو آرام لے رہی ہو	۳۰۰۰	" "
بچے " لے رہے ہوں	۲۰۰۰	" "
لوگوں کا ملا جلا مجمع جو سستا رہا ہو	۳۰۰۰	" "
" " " جو کسی سنیما یا تھیٹر میں ہو	۱۵۰۰	" "

جگہ کی گنجائش جو فراہم کی جانی چاہئے۔ اس کا انحصار مکانوں کی نوعیت پر ہوتا ہے ذیل میں مختلف مکانوں کے لیے بالعموم جو گنجائش فراہم کی جانی چاہئے اس کو بتلایا گیا ہے۔

مکان کی نوعیت	گنجائش	رہائشی رقبہ
ا۔ سکونتی مکان	۳۰۰ مکعب فٹ فی کس	۲۵ تا ۳۰ مربع فٹ فی کس
ب۔ سرائے	" "	"
ج۔ بورڈنگ ہاؤس	۴۰۰ تا ۵۰۰ "	۳۰ تا ۴۰ "
د۔ کارخانے	۲۵۰ مکعب فٹ	۲۰ تا ۲۵ "
ہ۔ مدرسے	۱۴۴ "	۱۰ تا ۲۰ "
و۔ دواخانوں کے وارڈ	۱۰۰۰ "	۱۸۰ تا ۱۰۰۰ "
ز۔ طویلے	۸۰۰ تا ۱۰۰۰ "	۸۰ تا ۱۰۰ "
ح۔ کتا خانہ (بند)	۹۵ تا ۲۰۰ "	
ط۔ مرغی خانہ (بند)	۴ تا ۶ "	

جہاں تک ہو سکے ہوا کی راست آمد و رفت کا انتظام ہونا چاہیے بالخصوص کارخانوں، مدرسوں اور دواخانوں میں۔ اس لیے دریچوں اور روشندانوں کو شمال اور جنوب کی دیواروں میں ایک دوسرے کے مقابل لگانا چاہئے اوپر جو مقدار بتلائی گئی ہے وہ کم از کم ہے۔ زائد مقدار سے فائدہ ہی ہوتا ہے نقصان نہیں ہوتا۔ اگر ہوا کے ہزار حصوں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کی مقدار ۰۱۵ فی صد تک پہنچ جائے تو گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ جس کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار مندرجہ مقدار سے زیادہ ہو تو اس میں ہوا کے آمد و رفت کے انتظام کو غیر معیاری تصور کیا جائے گا۔

ہوا دانوں یا روشن دانوں (Ventilators) کی ضرورت۔ تازہ ہوا کی باقاعدہ فراہمی صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کسی شخص کو بند کمرے میں رکھا جاتے تو وہ کمرے کی محدود ہوا کی مقدار کو سانس کے ذریعہ اپنے پھیپھڑوں میں داخل کر کے اور آکسیجن کو جذب کر کے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو خارج کرتا رہے گا جس کی وجہ سے ہوا غیر خالص ہوتی رہے گی غیر خالص ہوا سے سر کا درد اور چکر آنے کی شکایت ہوگی اور توانائی متاثر ہو کر صحت پر برا اثر پڑے گا۔ جو لوگ ایسے بند کمروں میں رہا کرتے ہیں جن میں ہوا کی آمد و رفت کا معقول انتظام نہیں وہ کبھی تازہ توانا نہیں رہ سکتے اور وہ بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اس لیے کمروں سے خراب ہوا کو خارج اور تازہ ہوا کو داخل کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ کھلے دریچوں سے تازہ ہوا داخل ہوتی اور گندی ہوا خارج ہوتی رہتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے کمرے کی ہوا اتنی تازہ رہنی چاہیے کہ باہر کی کھلی ہوا باہر سے کمرے کے اندر آنے والے آدمی کو کسی قسم کا ناگوار احساس نہ ہو۔

تعفن حوض

بدررو سے بہہ کر آتی ہوئی گندگی (Septic Tank) کو براہ راست کسی ندی میں چھوڑ دینا یا زمین پر ڈالنا نہایت مضر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو مناسب سائز کے سپٹک ٹینک (Septic Tank) میں ڈالا جاتا ہے جہاں وہ گل کر ایسے اجزا میں تقسیم ہو جاتا ہے جن سے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ ایسے حوضوں میں پہلا عمل یہ ہوتا ہے کہ رقیق مادہ میں سے ٹھوس غیر نامیاتی (Inorganic) اور معدنی (Mineral) اجزا کو علاحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اس ٹھوس مادہ کو موقع دیا جاتا ہے کہ جس قدر ہو سکے روشنی اور ہوا کی عدم موجودگی میں پیدا ہونے والے جراثیم (Unacrobic Bact-eria) اس کو کھا جائیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ پورا ٹھوس مادہ ہضم کر جائیں۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ فی صد ہضم ہو جاتا ہے ۳۰ فی صد حصہ گیس میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کوئی چالیس فی صد حصہ حوض

میں بطور تلچھٹ رہ جاتا ہے جس کو وہاں سے نکلوانا پڑتا ہے۔

مانع ملیریا اقدامات حفظانِ صحت اور آب رسانی کے لیے بنے ہوئے حوضوں قلعی کرنے والے ڈبوں اور ٹراپ وغیرہ اور ان سے متعلقہ تمام لوازمات کو مچھروں کے اڈے بننے سے حتی الامکان روکنا چاہیئے۔ بالخصوص دواخانوں کے لیے اس پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سِول انجینیری

• سول انجینیری ایک فن ہے جس کے ذریعہ کائنات میں موجود توانائیوں کے بڑے بڑے ذخیروں سے بنی نوع انسان کے استعمال اور آرام کے لیے کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔" سول انجینیری کی یہ تعریف انسٹی ٹیوشن آف سِول انجینیرز لندن نے اپنے رائل چارٹر بابتہ ۱۸۲۸ء میں کی تھی جس میں اب تک کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں ہوئی۔

سِول انجینیری کی اصطلاح انیسویں صدی میں وضع کی گئی تاکہ اس کو فوجی انجینیری سے ممیز کیا جاسکے جو اس وقت تک اپنا ایک بلند مقام رکھتی تھی۔ یوں دیکھا جائے تو تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے سِول انجینیری جس طرح جنگ کے کاموں میں مصروف رہی اسی طرح امن کے کاموں میں بھی مشغول رہی۔ زمانہ قدیم اور زمانہ وسطی کے بہت سے سول انجینیری کے کام مثلاً روم کے عوامی حمام شاہراہیں پل نہریں انہی کے کارنامے ہیں۔

بے شمار یادگاری کام مثلاً ایلورا اجنتا کے غاروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اختراعی دماغ کی ایک مسلسل تاریخ اور اس قسم کے کاموں میں عزم محکم کا ایک مسلسل تجربہ ہے۔

۱۷۱۶ء میں جب فرانس میں " شاہ راہوں اور پلوں کی انجمن " کی بنیاد ڈالی گئی تو اسی وقت سے سِول انجینیری کی ایک علاحدہ مسلمہ حیثیت ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۷۴۷ء میں فرانس میں " شاہ راہوں اور پلوں کا اسکول قایم ہوا اور اس کے اساتذہ نے تعمیری اشیا مشینوں اور ہائیڈرالکس پر جو کتابیں لکھیں وہ اعلیٰ معیار کی تھیں۔ انگلستان کے چوٹی کے انجینیروں نے فرانسیسی زبان محض اس لیے سیکھی کہ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکے جوں جوں ڈزائن اور ریاضی نے آزمائشی ضابطوں اور تجرباتی قاعدوں کی جگہ لی اور ماہرانہ معلومات کی جو اب تک محض فوجی انجینیروں کی میراث تھی مناسب طریقہ پر ترمیم کی گئی جس کی وجہ غیر فوجی انجینیروں کو صفِ اول میں جگہ ملنے لگی ذہین دست کار اور سنگتراش اس صدی کے اعلیٰ معماروں میں شمار کیے جانے لگے بطور مثال جان رینی کا نام لیا جاسکتا ہے جو ایک کار آموز تھا جس نے لندن برج کی تعمیر کی اسی طرح تھامس ٹلفورڈ جو ایک سنگتراش تھا اس کا شمار برطانیہ کے سڑک کے معماروں کے صفِ اوّل میں ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ انسٹی ٹیوشن آف سِول انجینیرز کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ جان اسمیٹن وہ پہلا شخص تھا جس نے خود کو سِول انجینیر کے نام سے موسوم کیا اگرچہ اس نے اپنے پیشہ کی ابتدا آلات سازی سے کی تھی ۱۷۷۱ء میں اس نے ایک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی جو اب اسمیٹن سوسائٹی کے نام سے مشہور ہے۔

فرانس میں اس قسم کی سوسائٹی کا قیام ۱۷۹۴ء میں عمل میں آیا اور جرمنی میں ۱۷۹۹ء میں۔ اس اثنا میں دوسرے مقامات پر بھی یہی عمل ہوتا رہا۔ امریکی سوسائٹی آف سِول انجینیرز کا قیام ۱۸۵۲ء میں ہوا ۱۸۵۶ء میں جرمنی میں اس کی بنیاد پڑی۔ اس کے بعد کی صدی میں دنیا کے ہر ملک میں اسی قسم کے انسٹی ٹیوشن قایم ہوئے۔ ہندوستان میں انسٹی ٹیوشن آف انجینیرز کا قیام ۱۹۲۸ء میں ہوا۔

اس اثنا میں دوسرے ممالک نے فرانس اور جرمنی کی تقلید شروع کی تو انجینیری سائنس کی تعلیم کا ہر جگہ خاطر خواہ انتظام شروع ہوا۔ برطانیہ کی یونیورسٹیوں نے جو اپنی قدامت پسندی اور پرانے رسم و رواج کے لیے مشہور ہیں شروع شروع میں اس نئے شعبہ کی تعلیم دینے میں پس و پیش کیا، یونیورسٹی کالج لندن نے ۱۸۳۸ء سے سِول انجینیرنگ کی تعلیم دینا شروع کی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی ۱۸۲۸ء سے اس کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ساری دنیا کی یونیورسٹیوں نے اس شعبہ کی تعلیم کا انتظام تیزی سے شروع کیا۔ ہندوستان میں رڑکی نے ۱۸۴۹ء میں سبقت کی اور پھر گنیڈی (مدراس) اور پونہ میں بھی کالج کھلے۔ اب تو کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں سِول انجینیرنگ کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔

سِول انجینیر کے فرائض: سِول انجینیر کے فرائض کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو تعمیر سے قبل ادا کرنے پڑتے ہیں (موزونیت کا مطالعہ مقامِ تعمیر کی تحقیقات اور ڈزائن) دوسرے وہ جن سے دورانِ تعمیر سابقہ پڑتا ہے (گاہکوں گتہ داروں اور کاریگروں سے نپٹنا) تیسرے وہ جن سے بعد ختم کار عہدہ برا ہونا پڑتا ہے

نگہداشت اور ریسرچ

موزونیت کا مطالعہ (Feasibility Studies)

آج کل کوئی بڑی اسکیم یا کوئی بڑا پراجکٹ اس وقت تک شروع نہیں کیا جاتا جب تک اس کا ابتدائی بھرپور اور بعض اوقات طول طویل مطالعہ نہ کیا جائے اور متبادل اسکیم کے امکانات پر غور نہ کیا جائے تاکہ انجینیری کے مسائل اور معاشی پہلو بھی زیرِ نظر رہیں۔

مقام تعمیر کی تحقیقات مقامِ تعمیر کی ابتدائی تحقیقات اسکیم کی موزونیت کے مطالعہ کا ایک حصہ ہے مگر جوں ہی نقشے منظور کر لیے گئے ہوں ایک وسیع تحقیقات لازمی ہے اس پر جو صرفہ عاید ہو وہ تعمیر یا مقامِ تعمیر کی تبدیلی کی وجہ عاید ہونے والے صرفے سے کم ہوگا۔

ڈیزائن عمارتوں کے ڈھانچوں سے متعلق ریسرچ کے تجزیوں سے جو نتائج برآمد ہوں اور تعمیری اشیا کی تکنیک نے جو معقول اور نئی نئی قسم کی ڈزائنوں کی راہیں کھول دی ہیں ان سے تعمیری اشیا میں کافی بچت کی جاسکتی ہے۔

تعمیری ڈھانچوں کے نظریات اور ساتھ ساتھ تعمیری اشیا کے مطالعہ نے زوروں (Stresses) کا عمدگی سے تجزیہ کرنے اور ان کی با

طور پر آزمائش کرنے کو ممکن بنا دیا ہے۔

آج کل کے ڈزائن کرنے والوں کے لیے نہ صرف ترقی یافتہ نظریات بآسانی بہمدست ہو سکتے ہیں بلکہ ان کے ڈزائن کا کمپیوٹر کے ذریعہ نہایت صحت کے ساتھ ٹیسٹ کیا جا سکتا ہے۔

تعمیر

سول انجینیری کے کام یا تو خانگی اشخاص یا خانگی اداروں کے لیے کرنے پڑتے ہیں یا بڑی بڑی کارپوریشن مرکزی یا مقامی حکومت یا عوامی بورڈ کے لیے کرنا پڑتا ہے ان میں سے اکثر اپنے انجینیروں کو ملازم رکھتے ہیں اور جہاں بڑے بڑے خاص قسم کے پراجکٹ کا تعلق ہوتا ہے وہاں مشیر (Consulting) انجینیر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

کام ایک گتہ دار یا ٹھیکہ دار یا ان کی کمپنیوں کو جو رجسٹرڈ شدہ ہوتی ہیں ٹنڈر طلب کر کے دیے جاتے ہیں اور ان کو پابند کیا جاتا ہے کہ منظور شدہ ڈزائن نقشوں برآورد تخمینوں اور دیگر شرائط کے مطابق اندرون مدت مقررہ کام کی تکمیل کر دی جائے۔

نگہداشت

بالعموم کام سے متعلق شرائط میں یہ شرط بھی رکھی جاتی ہے کہ ٹھیکہ دار ایک مدت معینہ تک اس تعمیر کی نگہداشت کرے اس وقت تک گتہ دار (ٹھیکہ دار) کی ڈپازٹ کی رقم روک رکھی جاتی ہے۔ مدت معینہ کے ختم ہونے کے بعد کنسلٹنگ انجینیر یا متعلقہ عہدہ دار کی سفارش پر اس رقم کی ادائی کی جاتی ہے۔ لیکن جو کام مرکزی یا مقامی انجینیروں کے زیر نگرانی براہ راست کیے جاتے ہیں ان کی نگہداشت کی ذمہ داری انہی انجینیروں پر عاید ہوتی ہے۔

ریسرچ

تعمیراتی کاموں میں ایسی ترقی جو بمنزلہ ایجاد ہو ریسرچ کی محتاج ہوتی ہے۔ سول انجینیری میں ریسرچ سرکاری صنعتی اداروں یونیورسٹیوں اور دوسرے انسٹی ٹیوشن میں کیے جاتے ہیں۔ اکثر ممالک میں ایسے ادارے حکومت کے زیر نگرانی ہوتے ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بیورو آف اسٹانڈرز اور برطانیہ کی نیشنل فزیکل لیبارٹری جہاں عمارتوں، سڑکوں، شاہراہوں ماقوائیات (Hydraulics) پانی کی آلودگی اور دوسری چیزوں پر ریسرچ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو سرکاری امداد دی جاتی ہے لیکن ان کو ان صنعتی اداروں سے بھی امداد ملتی ہے جن کو اس ریسرچ کے ذریعہ فائدے پہنچتے ہیں یا پہنچنے کی توقعات ہوتی ہیں۔

سول انجینیری کی شاخیں

سول انجینیری کا ایک نہایت اہم مقصد پیداوار کے ذریعوں میں ترقی دینا اور درآمدات و برآمدات کے لیے تجارتی راہیں نکالنا ہے۔ اس میں سڑکوں کی تعمیر اور اس کا انتظام، پلوں، ریلوں، آبی راہوں، نہروں، دریاؤں میں کشتی رانی بندرگاہوں، انبار خانوں وغیرہ کی تعمیر بھی شامل ہے جن کے ذریعہ اندرونی اور بیرونی آمد و رفت میں آسانی و سہولت پیدا ہوتی ہے۔ سول انجینیر کے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے لیے حسب ذیل امور کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

توانائی گیس اور بجلی کی پیداوار اور اس کی تقسیم ہوائی جہازوں اور ہوائی اڈوں کو ترقی دینا، کیمیائی پلانٹ (Plant) کی تنصیب نیوکلیر توانائی کے اسٹیشن تعمیر کرنا پانی سے نمک علیحدہ کرنے کا انتظام سول انجینیری کے ان مختلف وظائف کو حسب ذیل عنوانات کے تحت بآسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے تعمیر، حمل ونقل، جہاز رانی، آبی انجینیرنگ، توانائی اور صحت عامہ۔

تعمیر

سول انجینیری سے متعلق جو کچھ بھی کام ہو عملاً اس میں کچھ نہ کچھ حصہ تعمیر کا ہوتا ہے۔ فولاد اور کنکریٹ کی ترقی بشمول محکم کنکریٹ اور تعمیری زور رکھنے والے اسٹرسڈ (Pre-Stressed) کنکریٹ کی ایجاد نے تعمیر کے ڈزائن کا کام اور آرکیٹکٹ کی بہ نسبت زیادہ تر سول انجینیر کے حوالے کر دیا ہے۔ کسی عمارت کے مسائل مثلاً اس کی افادیت اور کفایت کے تجزیہ پر عمارت کے ڈزائن کا انحصار ہوتا ہے۔

حمل ونقل

روم کی سڑکیں اور پل اگرچہ فوجی انجینیروں کا کارنامہ تھے لیکن ان پر ٹارمیکاڈم کی تہ چڑھانا اور پرونٹ (Perronet) پل بنانا سول انجینیروں کی کارگزاری ہے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی کی نہروں اور انیسویں صدی کی ریلوں کی تعمیر کا سہرا بھی سول انجینیروں کے سر ہے۔ ان کی وجہ سے مال و اسباب کی بڑی مقدار کے تیزی اور کفایت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جانے کی سہولتیں مہیا ہونے سے صنعت میں انقلاب آیا۔ آج کل سول انجینیر بہت بڑے پیمانے پر مال و اسباب کے حمل ونقل کی اور زیادہ تیزی کفایت سے روبہ عمل لانے میں مشغول ہیں۔

دریائی اور آبی

انجینیری : بندرگاہوں کی تعمیر اور جہاز سازی قدیم فنون ہیں۔ آج کل بہت ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک بڑے اور مکمل بندرگاہ کی موجودگی ناگزیر ہے تاکہ ضروری مال و اسباب کی درآمد و برآمد میں سہولت حاصل ہو۔

بستیوں کو فراہمی آب کی کوشش زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ اور اب توانائی کی طلب میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض ممالک میں پانی کی زیادہ تر صرف صنعتی اداروں اور گھریلو صرفہ کے لیے ہوتی ہے لیکن دنیا کے بعض حصوں مثلاً بھارت میں بڑی بڑی اسکیمیں زیر تکمیل ہیں جو زیادہ تر زرعی اغراض کے لیے ہیں تاکہ غذائی اجناس میں وہ خود مکتفی ہو سکے اور برقی قوت پیدا کر سکیں تاکہ صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو۔

آج کل سب سے زیادہ تعمیر ذخیرہ آب کے بندوں (Dams) کی ہو رہی ہے ان کے ڈزائن اور ان کو ترقی دینے کے کام بین الاقوامی کمیشن جیسے ادارے انجام دیتے ہیں۔

آبادیوں سے قریب بڑے ذخیرہ آب کے ڈزائن میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مٹی کی ساخت اور اس کی قوت برداشت کے تجزیہ پر زور دیا جاتا ہے۔

اکثر حکومتیں اس کام کے لیے اعلےٰ تربیت یافتہ انجینیروں کو کام کے معاینہ

اور کنٹرول کے لیے مقرر کرتی ہیں۔

توانائی (Power)

صنعتی انقلاب کا انحصار لوہے اور کوئلے کی کانوں پر ہے۔ سول انجینیروں نے بھی کانوں سے کوئلہ اور معدنوں سے دھات برآمد کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔

سول انجینیری کی بہت سی شاخوں میں سرنگوں کی تعمیر ایک عام بات ہے بیسویں صدی میں بکثرت برقی قوت کی طلب کے ساتھ توانائی گھروں (Power Stations) کے ڈزائن اور ان کی تعمیر کے طریقوں میں تیزی سے ترقی ہوئی اور ہو رہی ہے اور اب تو نیوکلیر توانائی کی دریافت کے بعد ان کے لیے اسٹیشنوں کو بنانا اور ری ایکٹروں کے لیے نئی قسم کے ڈزائن کی ذمہ داری بھی انہی کو سونپی گئی ہے۔

تیل کے چشموں اور قدرتی گیس کی دریافت گیس کی پیدائش کے لیے نئی نئی تبدیلیاں لائی ہیں۔ تیل کو ان کے معدنوں سے جہازوں میں پہنچانا یا سمندروں کی تہ سے بذریعہ پائپ باہر لانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں۔

بڑے بڑے کیمیائی پلانٹ کے ڈزائن کرنے میں جن کی زمانہ موجودہ میں بڑی اہمیت ہے سول انجینیری کا حصہ قابل لحاظ ہے۔

صحت عامہ

ڈرینج کے انتظام اور مائع فضلے سے چھٹکارا پانا اور اسی پانی کو صاف کرنے کے بعد دوبارہ استعمال کرنا آبی ذریعوں اور ذخائر کو آلودگی سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔

موجودہ تہذیب و تمدن میں اس قسم کے فضلے کو جو مثلاً موٹر کاروں وغیرہ سے نکلتا ہے اس کو ٹھکانے لگانا ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔

سول انجینیر ماحول کو آلودگی سے محفوظ رکھنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

سول انجینیرنگ کی تعلیم

ایک پیشہ ور انجینیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی مسلمہ یونیورسٹی کا ڈگری یافتہ یا مساوی قابلیت کا حامل ہو کسی یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے ریاضی اور سائنس میں اہلیت ضروری ہے۔ پہلا سال تو بالعموم انجینیری کی عام تعلیم کے لیے مختص ہوتا ہے جو عام شعبوں میں مشترک ہوتی ہے دوسرے سال سے کسی ایک شعبہ کی خصوصی تعلیم شروع کی جاتی ہے سول انجینیری کی بھی کئی ذیلی شاخیں ہیں۔ نصاب تعلیم کے علاوہ طالب علم کا عملی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کے لیے متعدد اسکیمیں موجود ہوتی ہیں۔

برطانیہ میں انجینیرنگ گریجویٹس کو کم از کم تین سال کی عملی طور پر تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ دوران تعلیم ہی میں وہ نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بھی حاصل کریں۔ صنعتی اداروں میں جو تربیت دی جاتی ہے اس پر انجینیرنگ کے کالج یا ادارہ کی نگرانی ہوتی ہے۔ جب یہ گریجویٹ اپنی عملی تربیت ختم کرتا ہے تو سول انجینیرنگ کا کالج یا ادارہ اس کا امتحان لے کر اس کو ڈگری عطا کرتا ہے۔

مختلف ممالک میں عرصۂ تعلیم مختلف ہوتا ہے یہ بالعموم تین تا پانچ سال ہوتا ہے۔

ڈگری کے بعد دوران ملازمت تربیت

گریجویٹ ہو کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد کوئی طالب علم اعلیٰ تعلیم مثلاً ایم۔ ایس کا کورس لے سکتا ہے یا وہ کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ دوران ملازمت سرکاری طور پر کسی ملازم کو ایک خاص شعبہ میں تربیت دلائی جائے۔

رجسٹریشن

بہت سارے ملکوں مثلاً امریکہ کناڈا میں پیشہ ور انجینیر کے لیے رجسٹر کروانا اور لائسنس حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن یوروپ اور انگلستان میں انجینیر کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے بھارت میں ابھی اس کا رواج نہیں ہے۔

پیشہ ورانہ سوسائٹیاں

۱۸۱۸ء میں جب انگلستان میں انسٹی ٹیوشن آف سول انجینیرز کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کا مقصد ٹیکنیکل سائنس کو ترقی دینا تھا۔ یہ مقصد ریسرچ کرنے فنی مضامین شائع کرنے اور ان پر بحث مباحثہ کرنے سے حاصل ہوا۔

ترقی یافتہ ممالک میں بلند عمارات جیسے کہ سرنگوں ساحلی تعمیر ہوائی میدانوں وغیرہ کے کام دن بدن بکثرت نکلتے ہیں جن کے لیے نت نئے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں جہاں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے رہائش کے لیے بلند عمارات ٹرافک کے تیزی سے حمل و نقل کے لیے معقول انتظامات اور شاہ راہوں کے لیے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈرینج کی ترقی یافتہ شکل اور صحت عامہ کے لیے معقول اسکیموں کا ہونا ضروری ہے آب پاشی کے لیے بڑے بڑے ذخیرہ آب اور دریاؤں کی تنظیم کی اشد ضرورت اس لیے ہے کہ ان سے غذائی اجناس میں اضافہ ہو ورنہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں آئے دن قحط پڑنے کے اندیشے لگے رہتے ہیں۔ کم ترقی یافتہ ممالک کو اس کی سہولت حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے انجینیروں کو بیرون ممالک بھجوائیں ان کا محدود مالیہ اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے اس مسئلہ کو انٹرنیشنل بنک آف ری کنسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ (ورلڈ بنک) کے توسط سے حل کرنے کی کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔

تاریخ

شیشہ سازی کے نقطۂ نظر کے لیے ایشیا کوچک پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ غالباً قدیم ترین شیشہ کا ٹکڑا ۲۹۰۰ ق۔م۔ تل آسرم (Tel Asram) میں پایا گیا جو بغداد کے شمال مشرق میں چند میل دور واقع ہے۔ ۱۵۰۰ ق۔م۔ میں جب کہ مصر اپنے بام عروج پر تھا شیشہ سازی کافی ترقی

کرچکی تھی۔ مصر سے شیشہ کی صنعت شام، یونان، فلسطین اور اطالیہ پہنچی۔ قسطنطنیہ کے کاریگر رنگین شیشہ بنانے اور گلکاری کرنے کے ماہر تھے بہت دنوں کے بعد یعنی گیارہویں صدی عیسوی میں شیشہ سازی ترقی یافتہ شکل میں وینس (Venice) میں داخل ہوئی۔ وینس ہی سے یہ فن تمام مغربی یورپ میں پھیلا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں فیراڈے (Faraday) نے شیشہ پر جو تحقیقاتی کام کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اسی طرح شوٹ (Schult) نے ابے (Abbe) اور ونکلمین (Winkelmann) کی معیت میں جو کام کیا ہے اس سے یہاں تک اور قیمتی مناظری (Optical) اور دیگر خاص قسم کے شیشوں کا بنانا ممکن ہو

موجودہ صدی میں مختلف نوعیت کے خودکار (Automatic) مشینوں کی ایجاد کی وجہ سے اس صنعت کی ترقی میں ایک انقلاب آیا۔

شیشہ کی تعریف اور اس کی بناوٹ

شیشہ ایک سخت غیر نامیاتی مادہ ہے جو گرم سیال حالت سے ٹھنڈا کرکے حاصل کیا جاتا ہے اس عمل کے دوران اس کی لزوجیت (Viscosity) مسلسل بڑھتی جاتی ہے لیکن یہ قلمی (Crystalline) بننے نہیں پاتا۔ آج تک جتنے بھی اقسام کے شیشے بنے ہیں وہ پرسرد (Super Cooled) مائع پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی معین نقطہ اماعت نہیں ہوتا شیشہ کا شفاف ہونا اس کی عام خصوصیت ہے لیکن بہت سارے تجارتی شیشے یا تو نیم شفاف ہوتے ہیں یا غیر شفاف۔ شفاف پن میں کمی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کچھ مادہ جو بالعموم قلمی ہوتا ہے اور جو بذات خود شفاف ہوتا ہے شیشہ میں پھیل جاتا ہے اور یہ مادہ معلق ذرات (Suspended Particles) کی شکل میں ہو سکتا ہے جیسا کہ سونے یا تانبہ کے سرخ شیشہ میں ہوتا ہے یا یہ معلق خوردبینی یا زیر خوردبینی (Sub Microscopic) معلق ذرات پر مشتمل ہوتا ہے جیسا کہ دودھیا شیشہ میں ہوتا ہے یا خوردبینی قلمیں پھراج (Opal) یا سفید شیشہ میں ہوتی ہیں۔

شیشہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ساخت ایک غیر دوری (Non Periodic) مائع کی سی ہوتی ہے اور لاشعاعوں (X-Rays) کے ذریعہ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ شیشہ میں ایٹموں (جواہر) کا ایسا جال ہوتا ہے جو نہ تو دوری (Periodic) ہوتا ہے اور نہ سڈول (Symmetrical) جیسا کہ قلموں (کرسٹل) میں ہوتا ہے۔

شیشہ کی قسمیں

شیشہ کی جماعت بندی، آسانی اس کے طریقہ استعمال کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے مثلاً (۱) دریچہ کا شیشہ (۲) بوتل کا شیشہ (۳) دبایا ہوا (Pressed) شیشہ (۴) پھنکا ہوا (Blown) شیشہ جس میں کیمیائی آلات اور حرارت کے مزاحم اشیا اور کھنچی ہوئی نلکیاں بھی شامل ہیں (۵) ریشہ دار شیشہ (۶) مناظری شیشہ۔ مناظری شیشہ کے سوا جو بیشتر صورتوں میں ممکنہ حد تک شفاف ہوتا ہے۔ دوسرے تمام شیشے بے رنگ ہو سکتے ہیں یا رنگ دار۔

شیشہ کے اجزائے ترکیبی

بالعموم تمام شیشوں کا جز اصلی سلیکا (Silica) ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض مناظری شیشوں میں سلیکا کی جگہ فاسفورک انہائڈرائیڈ (P_2O_5) یا بورک آکسائیڈ (B_2O_3) لے لیتا ہے۔ سلیکا خود ایک متمرد (Refractory) شے ہے اس کو آکسی ایسی ٹیلین (Oxy-Acetylene) شعلہ میں نرم کیا جاتا ہے جس سے سلیکائی یا کوارٹز شیشہ بنتا ہے کوارٹز شیشہ جس سے بنے ہوئے آلے تجربہ خانوں اور کیمیائی صنعت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اسی شیشے میں ٹمپریچر کی تیز تبدیلیوں کی مزاحمت کی قابلیت ہوتی ہے۔ مگر کوارٹز شیشہ معمولی شیشہ سے زیادہ پھونک ہوتا ہے۔

ایسے بہت سے مادے دستیاب ہو سکتے ہیں جو سلیکا کے ساتھ پگھل کر شیشہ بناتے ہیں اس کے لیے بھٹی کی معمولی حرارت یعنی ۱۲۰۰ سے ۱۴۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ کافی ہو جاتی ہے۔ سلیکا قلوی آکسائیڈ (Alkaline Oxide) کے ساتھ مل کر ایسا شیشہ پیدا کرتا ہے جو نم گیر (Hydro-scopic) ہوتا ہے لیکن اگر اس میں ایک خاص تناسب میں چونا ملا دیا جائے تو شیشہ میں پائیداری آجاتی ہے بالخصوص اس میں کرۂ ہوائی کے خلاف مدافعت کرنے کی قوت آجاتی ہے چونے کے ملانے سے شیشہ کا نقطہ اماعت بلند تر ہو جاتا ہے چونے کی جگہ بیریم آکسائیڈ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونا اور بیریم آکسائیڈ قلوی مٹیوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

قلوی مٹی کی بجائے دوسرے مادے بھی مثلاً لیڈ آکسائیڈ کام آسکتا ہے اور یہ چقماقی (Flint) شیشے کا ایک خاص جز ہے۔ صاف سخت کراون شیشہ (یا حلبی شیشہ) جو دریچوں کے لیے موزوں ہوتا ہے اس میں سلیکا ۷۲ فی صد چونہ ۱۱ فی صد اور سوڈا ۱۱ فی صد تک ہو سکتے ہیں۔ نہایت ہی چمک دار کٹ (Cut) گلاس کے برتن جو میز کی زینت ہوتے ہیں۔ ان کے اجزائے ترکیبی میں سلیکا ۵۵ فی صد لیڈ آکسائیڈ ۱۰ فی صد اور پوٹاش ۳۵ فی صد ہوتے ہیں کیمیائی برتنوں کے شیشے میں بورک آکسائیڈ، زنک آکسائیڈ اور الومنیا ہو سکتے ہیں۔

دھات یا دھاتی آکسائیڈ کی ملاوٹ سے مختلف قسم کے نہایت خوب صورت رنگ حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن ایک حد تک رنگ کا انحصار تیاری کے طریقہ پر بھی منحصر ہوتا ہے، مثلاً لوہے کی ذرا سی مقدار بھی کراون شیشہ کی بہ نسبت چقماقی شیشہ کو شدت سے رنگین کر دیتی ہے۔ کوبالٹ کے شائبے (Traces) بھی گہرا نیلا رنگ پیدا کرتے ہیں۔ سونے اور تانبہ سے شیشہ کا رنگ یا قوتی سرخ اور کرومیم سے سبز ہو جاتا ہے۔ یورانیم کی موجودگی سے شیشے کا رنگ زردی مائل سبز ہوتا ہے اور اس میں تزہر (Fluorescence) بھی آجاتا ہے۔ یہ لاشعاعی پردہ (اسکرین) بنانے میں کام آتا ہے۔ فیرس نمکوں کی ذرا سی مقدار ملانے سے شیشے میں ہلکا سبز رنگ اور منگنیز کی مرکبات سے بنفشی رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی ریت کا حاصل کرنا جو لوہے سے آزاد ہو ایک دشوار امر ہے۔ سفید ریت کے

حصول کے لیے ریت میں بعض خاص قسم کے رنگ کٹ (Decoloriser) اشیا ملائی جاتی ہیں یا مقناطیس کی مدد سے لوہے کے ذرات کو الگ کر لیا جاتا ہے۔

شیشہ کی صنعت

چھوٹے پیمانہ پر شیشہ بنانے کے لیے عمدہ قسم کی مٹی کے برتن استعمال ہوتے ہیں بڑے پیمانہ پر شیشہ کی اشیا بنانے کے لیے حوضی بھٹیاں (Tank Furnaces) استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کی چھت بالعموم گنبد نما ہوتی ہے اور اس کی بالائی چھت میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس میں سے زیر تجربہ بیچ (Batch) کو داخل کیا جاتا ہے اور پگھلنے کے بعد اسے اسی سوراخ سے نکال لیا جاتا ہے لیکن مناظری شیشہ کے لیے کھلے برتن استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ ہلانے کے عمل میں سہولت ہو۔

ایک بھٹی کے فرش پر بہت سارے برتن بالعموم ایک دائری شکل میں رکھے جاتے ہیں بھٹی میں آگ عام طور پر پروڈیوسر (Producer) گیس سے لگائی جاتی ہے اس کے احتراق کے حاصلات کو حرارت باز یاب (Regenerator) میں گزارا جاتا ہے جس سے بھٹی میں چلنے سے پہلے ہوا اور پروڈیوسر گیس گرم ہو جاتے ہیں اور ان کے جلنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک بیاج کے اجزائے ترکیبی کے ساتھ شیشے کے ٹکڑوں کو ملایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان اجزائے ترکیبی کے پگھلنے میں مدد ملتی ہے پگھلتے وقت کاربونیٹس نائیٹریٹوں وغیرہ کی تحلیل سے بہت ساری گیس خارج ہوتی ہے۔ اس گیس کے خارج ہونے میں آرسینی. ایس (Arsenious) آکسائیڈ انٹمی آکسائیڈ وغیرہ کی قلیل مقدار کی موجودگی سے مدد ملتی ہے۔

شیشہ کو مسطح (Plane) یا نفیس (Fine) کرنے کے لیے جیسا کہ اس طریقہ کار کو نام دیا جاتا ہے ٹمپریچر کو حسب ضرورت بڑھایا جاتا ہے مناظری شیشہ بناتے وقت اس کو اچھی طرح گھونٹنا بھی پڑتا ہے اور باریک بھی کرنا پڑتا ہے تاکہ اس میں ریشوں کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ ریشے پورے آمیزہ میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے کس قدر مختلف انعطاف نما کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مٹی کے برتن کا مادہ شیشہ میں حل ہو جاتا ہے۔

شیشہ کو برتن سے ایک لوہے کی پھونکنی کے سرے پر جمع کیا جاتا ہے پھر اس کو پھرتی سے گھما اور پھرا کر مطلوبہ شکل میں پھونکا جاتا ہے شیشہ کو کسی بھی شکل وصورت کے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ کثیر تعداد میں بوتلیں یا اسی قسم کی اشیا بنانے کے لیے خودکار مشین استعمال کی جاتی ہیں۔ جس کے لیے پگھلا ہوا شیشہ خود بخود بذریعہ سیفن بھٹی سے کھینچ کر آتا ہے۔ ایسی مشینوں کے لیے حوضی بھٹیاں (Tank Furnaces) استعمال کی جاتی ہیں۔ ان بھٹیوں میں شیشہ ایک سرے سے داخل کیا جاتا ہے۔ اور پگھلا ہوا مادہ دوسرے سرے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ عمل مسلسل ہوتا ہے۔ حوضی بھٹیاں بڑے بڑے حوضوں سے بنائی جاتی ہیں جن کو مشین سے صاف اور درست کر کے ایک خاص مسالہ سے باہم جوڑا جاتا ہے۔

دریچوں کے لیے شیشے بڑی چادروں کی شکل میں یا تو بیلے جاتے ہیں۔ یا کھینچے جاتے ہیں۔ شیشے کے تختے بیلنے کے عمل میں پگھلا ہوا شیشہ بھٹی سے نکال کر ایک لمبی میز پر ڈالا جاتا ہے اور اس کو یکساں طور پر ایک وزنی بیلن سے پھیلایا جاتا ہے اس کے بعد اس چادر کو انیلنگ (Annealing) بھٹی میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کو گھسا جاتا ہے اور اس کی پالش کی جاتی ہے۔

شیشہ سے جو اشیا تیار کی جاتی ہیں ان کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا کرنا چاہیے۔ تاکہ تڑک نہ پیدا ہو اور اس سے بھی زیادہ آہستگی سے اس کو انیلنگ کرنا پڑتا ہے تاکہ اس میں پیدا ہونے والے تناؤ اور کھنچاؤ کی قوتوں (Stresses) کا ازالہ ہو جائے ورنہ وہ شیشے کو توڑ ڈالیں گی۔ پالش کیے ہوئے شیشہ کی انیلنگ ایک مشکل طریقہ کار ہوتا ہے اور بڑے ٹکڑوں کی صورت میں اس کا دوران تین تا پانچ ہفتہ ہوتا ہے۔ ان اشیا کو جبکہ وہ ہنوز گرم رہتی ہیں ایک متحرک باربردار (Conveyor) میں رکھا جاتا ہے جو ایک گرم سرنگ میں سے گزرتا ہے اس سرنگ کی ٹمپریچر کو ایک سرے سے دوسرے تک مناسب درجوں تک بدلا جاتا ہے اس طرح ان اشیا کا درجۂ حرارت دوران سفر بتدریج کم ہو جاتا ہے اور ان کی انیلنگ مناسب ٹمپریچر پر ہو جاتی ہے۔

خاص اغراض کے لیے شیشے کی جو اشیا تیار کی جاتی ہیں۔ وہ بہت سارے اقسام کی ہوتی ہیں۔ عینک کے لیے کراؤن شیشہ کی ایک عمدہ اور سخت قسم استعمال کی جاتی ہے ان خاص قسموں میں وہ شیشہ بھی شامل ہے جو جزوی طور پر بالائے بنفشی شعاعوں (Ultraviolet) کے لیے نیم شفاف ہوتا ہے لیکن مری روشنی کے لیے بالکل شفاف ہوتا ہے کروکس (Crooks) کی عینکوں کے شیشے اور بعض مانع جگ مگ (Anti Glare) شیشے بھی ان خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ اور یہ سیریم (Cerium) اور ڈائی۔ ڈی میم (Didymium) کے شمول سے حاصل ہوتے ہیں۔ یورانیم شیشے لاشعاعی پردوں (X-Ray Screens) کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ بالائے بنفشی شعاع کے لیے متنزہر ہوتے ہیں یورانیم شیشہ ایک سخت شیشہ یا بوروسلیکیٹ شیشہ ہوتا ہے جس میں چار فی صد یورانیم ہوتا ہے۔ اسٹراس (Strass) شیشہ خاص قسم کا سخت شیشہ ہوتا ہے۔ جس کا انعطاف نما (Refractive Index) بلند ہوتا ہے اس میں مختلف دھاتی آکسائیڈ ملا کر مختلف رنگ پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہ شیشے نقلی جواہرات کے بنانے میں کام آتے ہیں۔

فلاش (Flashed) شیشے کو اکثر نمائشی اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس چیز کو بنانا ہے پہلے اس کو سفید شیشہ ہی میں نامکمل صورت میں تیار کیا جاتا ہے اور پھر پگھلتے ہوئے رنگین شیشہ میں غوطہ دے کر مطلوبہ شکل اختیار کرنے تک پھونکا جاتا ہے اس طرح اس شیشے کی سفید شیشہ والی دیواروں پر بہین رنگین پرتیں جم جاتی ہیں ان رنگین پرتوں کو گھس کر، تراش کر یا نقش و نگار کر کے نہایت ہی اعلیٰ سجاوٹی اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بڑی مقدار میں نلکیاں (Tubes) بنانے کے لیے شیشہ کی بہت

زیادہ مقدار کو لوہے کی پھونکنی پر جمع کرکے موٹی دیوار کے استوانہ (Cylinder) کی شکل میں پھونکا جاتا اور کھینچا جاتا ہے۔

شیشہ کے سخت کندے بائلر (Boiler) کے ان پیمائشی استوانوں کی حفاظت کے لیے لگائے جاتے ہیں جو اعلیٰ دباؤ کے تحت کام کرتے ہیں شیشہ کے کندہ کو بلند ٹمپریچر تک گرم کیا جاتا ہے اور گرم تیل میں ڈبو یا جاتا ہے اس سے بیرونی حصہ بغیر کسی سطحی تڑک کے ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن اندرونی حصہ نرم ہی رہتا ہے۔ جوں جوں سطح پر بڑا دباؤ پڑتا ہے۔ اس شیشہ کی تڑک بجائے پھیلنے کے بند ہو جاتی ہے اس لیے شیشہ کا یہ سخت کندہ یا تختہ قابل لحاظ بیرونی قوتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے جو معمولی قسم کے شیشہ کو توڑ سکتی ہیں۔

شیشہ کے تختوں کو مناسب قسم کے ملائم تار کی جالی کے ساتھ بیل کر محکم (Re inforced) کیا جاتا ہے۔ سلولائیڈ (Celluloid) کی تختوں کو بھی بعض دفعہ شیشہ کی تختوں کے دونوں جانب چپکایا جاتا ہے اور اس کو اٹوٹ (Unbreakable) شیشہ کا نام دیا جاتا ہے۔

میز کی زیبائش اور نمائش کے لیے شیشہ کی انواع واقسام کی چیزیں مختلف طریقوں سے بنائی جاتی ہیں۔

شیشہ پر نقش ونگار پالش کرنے اور رگڑنے کی چرخی سے کیے جاتے ہیں یا شیشہ کی سطح پر موم یا ڈامبر چڑھا کر اس پر حسب مرضی کھرچ کر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں پھر اس پر ہائیڈروفلورک ایسڈ لگایا جاتا ہے جو شیشہ کی سطح پر عمل کرکے نقوش بناتا ہے بعد میں موم یا ڈامبر کو کسی محلل سے دھو دیا جاتا ہے ایک اور ترکیب یہ ہے کہ شیشہ کی سطح پر اسٹن سل (Stencil) لگا کر ریت کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ جس سے شیشے کے کھلے ہوئے حصے متاثر ہو کر نقش ونگار بن جاتے ہیں۔ ان نقوش کو یا تو شیشہ کی سطح پر منتقل کیا جاتا ہے یا ان میں دھاتی رنگ بھر دیے جاتے ہیں اور جب ان کو گرم کیا جاتا ہے تو وہ پگھل کر شیشے کی سطحی تہوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کی رنگین جھلکیاں ظاہر کرتے ہیں۔

شیشہ کے خواص

شیشہ کے طبعی خواص دراصل اس کی کیمیائی بناوٹ سے متعین ہوتے ہیں لیکن جب ان خواص کو معمولی ٹمپریچر پر پیمائش کیا جاتا ہے تو وہ شیشہ کی حرارتی سرگزشت سے متاثر ہوتے ہیں۔ بعض خواص کا سرسری اندازہ اس کی ترکیب سے کیا جاتا ہے۔

شیشہ ایک سخت پھوٹک شے ہے اس کے تڑکنے پر صدفی (Con choidal) سطح ظاہر ہوتی ہے شیشہ کا ینگ کا معیار (Young's Modulus) ۱۵×۱۰^۶ پونڈ فی مربع انچ ہوتی ہے۔ شیشہ کی سطح مجلا ہوتی ہے بیشتر روشنی اس کی سطح سے منعکس ہو جاتی ہے صرف کچھ روشنی منعطف ہوتی ہے شیشہ کی سب سے اہم طبعی خاصیت اس کا شفاف پن ہے جس میں کمی بیشی کا انحصار اس کے اندر موجودہ نیم شفاف اور رنگین مادوں کی مقدار پر ہوتا ہے کراؤن شیشہ کا انعطاف نما ۱،۵۱۷ ہوتا ہے شیشہ کا نقطہ اماعت معین نہیں ہوتا گرم کرنے پر شیشہ ملائم ہو جاتا ہے اور پھر مائع میں تبدیل ہوتا ہے یہ خاصیت قلمی اشیا کے بالکل خلاف ہے۔

شیشہ کی لزوجیت (Viscosity) ۱۰^۳ سے لے کر ۱۰^۱۴ پوائس (Poi se) ہوتی ہے۔ اس کی کثافت ۲،۱۵ (پگھلا ہوا سلیکا) ۱،۳ (چقماقی شیشہ) اور ۲،۱ (مناظری شیشہ) ہوتی ہے۔ حرارتی پھیلاؤ ۱۰^-۶ سمر فی مربع سمر فی درجہ ٹمپریچر ہوتا ہے یعنی شیشہ حرارت کے لیے تقریباً غیر موصل ہوتا ہے۔ شیشہ کی حرارتی برداشت اور میکانی طاقت اس ٹمپریچر پر منحصر ہوتی ہے جس پر اس کی انیلنگ کی گئی ہے۔ شیشہ برق کے لیے ناقص موصل ہوتا ہے۔ اس کی مزاحمت ۱۰^۸ تا ۱۰^۱۸ اوم فی سمر ہوتی ہے۔

شیشہ پانی ہوا ترشوں قلمی اور نمکوں سے غیر متاثر رہتا ہے اور یہ عملاً اس کی ایک اہم خاصیت ہے اسے کیمیائی استقلال (Chemical Durability) کہا جاتا ہے۔

اسی بنا پر شیشہ کے برتن اور شیشہ کے استر والے برتن کیمیائی عملوں اور کیمیائی صنعتوں میں وسیع پیمانے پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

شیشہ بہ آسانی ہائیڈروفلورک ترشہ میں حل ہو جاتا ہے۔

کنکریٹ

یہ ایک مرکب تعمیری شے ہے جس کا ایک جز تو سخت اور پائدار روڑے ہوتے ہیں جن کو گٹی یا ایگریگیٹ (Aggregate) کہا جاتا ہے اور دوسرا جز ایسا مسالہ ہوتا ہے جو ان میں باہم گرفت یا بندش پیدا کرے جس کو میٹرکس (Matrix) یا سمنٹ کہتے ہیں۔ پتھر کی روڑی اور ریت اور اس کے ساتھ چونے یا قدرتی سمنٹ کے مسالے کا استعمال قدیم رومن تعمیروں میں پایا گیا ہے۔ لیکن زمانہ حال میں پورٹلینڈ سمنٹ کی ایجاد سے کنکریٹ کی تکنالوجی میں انقلاب عظیم واقع ہوا ہے۔

کنکریٹ ایک ایسا میٹیریل ہے جس کے اجزا کے تناسب اور جس کی شکل سب پر ہمارا قابو ہے اور کئی تناسبوں کے ساتھ اور طرح طرح کی پیچیدہ سے پیچیدہ شکلوں میں اس کو ڈھالا جاسکتا ہے۔ پائداری کے لیے اس کو لوہے اور دوسری اشیا کے ذریعہ محکم بنایا جاسکتا ہے۔ اور تکمیلی سطح بھی کئی قسم سے بنا سکتے ہیں۔ اس میٹیریل نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ہر تعمیری تخیل اور انجینیری ڈزائن کو عملی شکل دی جاسکے جو کسی اور میٹیریل سے ممکن نہ تھا۔

سب سے زیادہ عام استعمال پورٹلینڈ سمنٹ کے کنکریٹ کا ہے۔ جس میں پتھر کی روڑی اور ریت استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خصوصی اغراض کے لیے اور کئی قسم کے کنکریٹ ہیں۔ مثلاً بھاری وزن کا کنکریٹ ہلکے وزن کا کنکریٹ کف دار (Foamed) کنکریٹ

بیٹومینی (Bituminous) کنکریٹ۔ پالی مر (Aggregate) وغیرہ۔ پھر آمیزشیں بھی کئی قسم کی ہیں اور ان پر کئی طرح کے عمل کیے جا سکتے ہیں۔ تاکہ بہتر سے بہتر نتائج حاصل ہوں۔

گٹی کنکریٹ کی گٹیوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ موٹی گٹیاں جن کا سائز ۵ ملی میٹر ہے ۱۵۰ ملی میٹر تک ہو سکتا ہے اور باریک گٹیاں جن کا سائز ۵ ملی میٹر سے کم ہوتا ہے۔ اور باریک بھی ۱۰ ملی میٹر ہو سکتی ہیں۔ گٹیاں عموماً توڑے ہوئے پتھر یا قدرتی بجری اور ریت کی ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ جلائی ہوئی مٹی یا اینٹ کے ٹکڑے یا بھٹیوں سے نکلا ہوا اجلا کوئلہ وغیرہ بھی گٹی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ گٹی درجہ دار پسند کی جاتی ہے۔ یعنی جس میں اجزا ہر سائز کے ہوں کیوں کہ اس طرح وہ ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں اور سیمنٹ کم خرچ ہوتی ہے اور کنکریٹ پر کام بھی بہتر طریقہ سے ہو سکتا ہے بعض خاص خاص صورتوں میں خاص اغراض کے لیے بعض سائزوں کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

سمنٹ معمولی پورٹلینڈ سمنٹ کے علاوہ سمنٹ کی حسب ذیل قسمیں ہیں، پست حرارتی سیمنٹ، جلدی پوری مضبوطی حاصل کرنے والی سمنٹ، جلد بستہ ہونے والی سیمنٹ، سلفیٹ کی مزاحم سیمنٹ، بن روک سیمنٹ، پورٹلینڈ پزولانا (Portland Puzzolana) جھونک بھٹی (Blast Furnace) کا جلا کوئلہ اور کئی قسم کی خصوصی اغراض کی سیمنٹ۔ اگر کفایت مدنظر ہو اور زیادہ مضبوطی درکار نہ ہو تو سیمنٹ کے علاوہ چونا، چونا سرخی، اور چونا اور راکھ کے آمیزے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

آمیزے کنکریٹ کی خاصیتوں میں کچھ رد و بدل کرنے یا ان کو بہتر بنانے کی غرض سے کئی آمیزے تجویز کیے گئے ہیں ان میں وہ عوامل شامل ہیں جو ہوا کو پھانس لیتے ہیں یا کارکردگی اور پائداری کو بڑھاتے ہیں یا پانی کو گھٹاتے ہیں یا جمنے میں تاخیر پیدا کرتے ہیں یا پانی کی مزاحمت کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں یا سختی پیدا کرتے ہیں۔ سمنٹ کی مقدار کچھ کم کر کے اس کی جگہ پزولانی مسالے مثلاً سرخی یا راکھ استعمال کر سکتے ہیں جس میں کفایت بھی ہوتی ہے اور پائداری اور پانی کی مزاحمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

آمیزے کا تناسب کنکریٹ کے مختلف اجزائے ترکیبی کا یعنی موٹی گٹی باریک گٹی سمنٹ اور پانی اور کوئی اور چیز ملانا ہو تو اس کا یعنی ان سب کا تناسب معین کرنا ہوتا ہے تاکہ کنکریٹ میں مطلوبہ مضبوطی پائداری اور استعمالی قابلیت کم سے کم صرفہ سے حاصل ہو۔ پہلے چند معلومہ قاعدوں کے ذریعہ جو تجربہ پر مبنی ہیں یہ تناسب مقرر کیے جاتے ہیں۔ پھر آزمائش کے ذریعہ ان کو قطعی شکل دی جاتی ہے۔ چھوٹے کاموں میں گزشتہ تجربات کے نتائج اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ صرفہ کم سے کم ہونے کے لیے اور مضبوطی بھی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے چاہیے کہ گٹی درجہ دار ہو اور پانی کی مقدار کم سے کم ہو جس سے کنکریٹ آسانی سے مطلوبہ شکل میں ڈھل جائے۔ دوسری سب باتیں ایک ہی ہوں تو آمیزے کی مضبوطی اور پائداری بڑی حد تک پانی اور سیمنٹ کے باہمی تناسب سے معین ہوتی ہے۔ پانی اور سیمنٹ کا باہمی تناسب جتنا کم ہوگا کنکریٹ اتنا ہی بہتر ہوگا۔ یعنی پانی کی مقدار وہ کم ترین مقدار ہو جو آمیزے کو کسی مطلوبہ شکل میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہو۔

آمیزش اور انداخت یعنی ملانا اور ڈالنا

کنکریٹ کے اجزائے ترکیبی کی مطلوبہ مقداروں کو فراہم کر کے ان کو ہاتھ سے یا میکانی آمیزندے مکسر (Mixer) کے ذریعہ پہلے سوکھا پھر پانی کے ساتھ پورے طور پر ملایا جاتا ہے اور پھر اس کو اس کے مقام پر ڈال کر بچھا کر ہاتھ سے یا وائبریٹر (Vibrator) کے ذریعہ کمٹ کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کنکریٹ کو جمنا شروع ہونے سے پہلے اس کے مقام پر ڈال دیا جائے اور پھر اس کو پورے طور پر گمٹ کیا جائے۔

کیورنگ (Curing) پورٹ لینڈ سمنٹ یا کسی اور آبی سمنٹ سے جو کنکریٹ تیار کیا جاتا ہے وہ بتدریج پانی کھا کر یعنی آبیدگی (Hydration) کے ذریعہ مضبوطی پاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو کافی عرصے تک نم رکھا جائے۔ اس عمل کو کیورنگ (Curing) کہتے ہیں موسم بہت سرد ہو یا بہت گرم ہو تو خصوصی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ پری کاسٹ (Precast) کنکریٹ تعمیری ارکان کے لیے عموماً گرم پانی کے ذریعہ کیورنگ کا عمل تیزی سے واقع کر دیا جاتا ہے۔

مضبوطی کنکریٹ کی عمدگی جانچنے کے لیے عموماً یہ معیار اختیار کیا جاتا ہے کہ ۲۸ دن میں اس کی فشاری مضبوطی کیا ہوتی ہے۔ معمولی پورٹ لینڈ سمنٹ استعمال کی جائے اور کیورنگ معمولی طریقہ پر ہوئی ہو تو کنکریٹ کو پوری مضبوطی تقریباً ایک سال میں آتی ہے اور ۲۸ دن میں اس انتہائی مضبوطی کی ۷۵٪ حاصل ہو جاتی ہے عام طور پر تعمیروں میں جو کنکریٹ استعمال ہوتا ہے اس کی مضبوطی ۱۰۰ سے لے کر ۴۰۰ کیلوگرام فی مربع سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ خاص صورتوں میں ۶۰۰ کیلوگرام فی مربع سینٹی میٹر یا زیادہ مضبوطی کا کنکریٹ درکار ہو سکتا ہے۔ کنکریٹ کی تنشی مضبوطی مقابلتاً کم یعنی فشاری مضبوطی کے ۱۰ سے ۱۵ فی صدی تک ہوتی ہے۔

کیمیائی انجینئرنگ

کیمیائی انجینئرنگ سائنس کا وہ شعبہ ہے جس میں صنعتی عملوں پر کیمیا کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جب انیسویں صدی میں دھات کاری (Metallurgy)

مثلاً پارچہ بافی (Textile) اور دیگر بہت سے رقبوں میں صنعتی عملوں کو فروغ ہوا تو کیمیائی انجینئرنگ کا فن تشکیل پایا۔

کیمیائی انجینئرنگ کو انجینئرنگ کی ایک شاخ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں صنعتی قاعدوں کی ترقی اور ان کے اطلاقات زیر بحث ہوتے ہیں۔ کیمیائی انجینئرنگ میں اکائی طبیعی آپریشن (Unit Physical Operation) اور اکائی کیمیائی پروسس (Unit Chemical Process) کو ایک مربوط سلسلے میں جوڑا جاتا ہے۔ کیمیائی انجینئر کا پہلا کام تنصیبات اور پلانٹوں (Plants) کے نقشوں کی تیاری، ان کی تعمیر اور کارکردگی ہوتا ہے۔ گویا کیمیائی انجینئرنگ، میکانی انجینئرنگ کا ایک شعبہ ہے۔ کیمیائی انجینئرنگ میں اشیا کے ساتھ توانائی کے اخراج اور انجذاب، اس کے انضباط (Control) اور نگرانی سے سروکار ہوتا ہے۔ کیمیائی انجینئر توانائی کے صرفہ کے علاوہ خام اشیا اور حاصلات کی قیمتوں اور ان کے حمل و نقل کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اس طرح کیمیائی انجینئر صنعت کے معاشی اور سماجی پہلوؤں سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

کسی صنعت میں واقع ہونے والے کیمیائی عملوں کو مناسب طور پر چالو رکھنے کے لیے نگارشی (Recording) اور انضباطی (Controlling) آلات کی ضرورت ہوتی ہے، جن کی مدد سے وقفہ واری تنقیح کے ذریعہ خام اشیا سے ضرر رساں لوث دور رکھے جاسکتے ہیں اور ضروری حد تک ملاوٹ سے پاک پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے حاصل اشیا کو بازار میں لانے کے لیے موزوں پشتارہ (Package) درکار ہوتا ہے۔ کارندوں کی صحت کو صنعتی مشاغل کے دوران خطروں سے محفوظ رکھنے کا انتظام بھی کیمیائی انجینئر کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ نیز ماحولی آلودگی (Environmental Pollution) سے حفاظت کا بندوبست کیمیائی انجینئر ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کیمیائی انجینئر کو اپنے میدان میں ترقی اور ریسرچ، فیکٹری کے قوانین اور پیٹنٹ (Patent) کے قواعد، مزدوروں کے مسائل سے واقفیت اور نامناسب مسابقت سے احتراز، ضروری ہے تاکہ ترقی کی ضمانت ہو اور منافع حاصل ہوتا رہے۔

کیمیائی انجینئر کو چھوٹے پیمانہ کے طبیعی اور کیمیائی عملوں کو بڑے پیمانہ پر چلانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کسی کیمیائی پلانٹ (Plant) میں یونٹ آپریشن اور یونٹ پروسس کو تجارتی پیمانہ پر چالو کرنے کے لیے فیکٹری کے تنصیبات کی موجودگی ضروری ہے۔ ڈیزائین میں تعمیر کے موزوں اشیا کا انتخاب بھی لازم ہے۔ کیمیاداں کے تجربوں میں شیشہ کا ایک بیکر (Beaker) کافی ہوسکتا ہے مگر جب کبھی تجربہ کیمیائی انجینئر کے ہاتھ میں آسکتا ہے تو اسے ایسے آلات کی ضرورت ہوتی ہے جو حرارت کے عمدہ موصل ہوں اور ان میں انحطاط (Corrosion) کے مقابلہ کی قابلیت ہو۔ نیز ان آلات کی تیاری سہل ہو اور وہ بہ آسانی ٹوٹنے نہ پائیں۔ کیمیائی انجینئر کے پیش نظر نہ صرف تعامل کی رفتار ہوتی ہے بلکہ رفتار تعامل پر ٹمپریچر اور دباؤ کے تغیر کے اثرات بھی۔ بڑے پیمانہ پر کام کرتے وقت ایک آلہ سے دوسرے آلہ میں معاملات کی منتقلی کے عملی طریقے اس کے پیش نظر ہوتے ہیں کیوں کہ اس قسم کی منتقلی میں ہاتھوں کے استعمال سے نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ مزدوروں کی بڑی تعداد کو کام پر لگانا پڑتا ہے۔ پس کیمیائی انجینئر کا نہ صرف کیمیا اور انجینئرنگ کے بنیادی اصول بلکہ معاشیات اور طبیعی اعمال کے اصولوں سے مانوس ہونا ضروری ہے۔

کیمیائی انجینئرنگ کے مطالعہ کو حسب ذیل موضوعات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور یہ موضوعات ایک دوسرے سے باہمی تعلق رکھتے ہیں۔ (ا) کیمیائی وزنیات (ب) یونٹ آپریشن (ج) یونٹ پروسس (د) صنعتی آلات کاری (س) اعلیٰ دباؤ کے پروسس۔

کیمیائی وزنیات (Stoichiometry)

کیمیائی وزنیات میں صنعتی عملوں سے مادی اوزان، توانائی کے مقادیر اور ان کے کلیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مادی ترازو، بقائے مادہ (Conservation of Mass) کے کلیہ پر مبنی ہے جس کی رو سے کسی نظام میں معیّن وقفہ کے دوران داخل ہونے والی اشیا کی مجموعی کمیت، نظام سے خارج ہونے والی اشیا کی کمیت اور نظام میں رکے رہنے والی کمیت کے مجموعہ کے برابر ہوتی ہے۔ توانائی کا ترازو بقائے توانائی (Conservation of Energy) کے کلیہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کلیہ سے توانائی ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوسکتی ہے، مگر اس کی تخلیق نہیں ہوسکتی اور اسے فنا نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً بھٹی میں سو پونڈ کوئلہ لیا جائے تو اس کوئلہ کے احتراق کی حرارت کی بنا پر توانائی کی مقدار معین ہوتی ہے۔ اگر ماحول میں حرارت کا انتقال نہیں ہوتا ہے تو تعامل کے گیسی اور ٹھوس حاصلوں میں اسی قدر توانائی موجود ہوتی ہے جو سو پونڈ کوئلہ میں تھی۔

ترکیبی اوزان کا کلیہ (Law of Combbining Weight) کیمیائی تعامل میں حصہ لینے والے مادّوں کے وزنی تناسب بتاتا ہے۔ مثلاً کاربن کے احتراق کو حسب ذیل مساوات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے:

$$(C + O_2 \dashrightarrow Co_2)$$
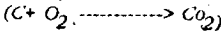
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاربن کے ایک ایٹمی وزن (۱۲ گرام) کے ساتھ آکسیجن کے ایک مالیکولی وزن (۳۲ گرام) کی ترکیب سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا ایک ایک مالیکولی وزن (۴۴ گرام) حاصل ہوتا ہے۔

یونٹ آپریشن (Unit Operation)

کیمیائی انجینئرنگ میں مختلف اہم عملوں کو چند گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کو یونٹ آپریشن کا نام دیا جاتا ہے۔ جب کسی صنعتی عمل میں کیمیائی تغیرات واقع ہوتے ہیں تو یونٹ آپریشن واقع ہونے والے طبیعی تغیرات کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ مثلاً کاربن کے احتراق میں کیمیائی تعامل آکسیڈیشن واقع ہوتا ہے تاہم اس عمل کا اصل یونٹ آپریشن حرارت کے انتقال اور مادی اشیا کوئلہ، ہوا اور حاصل گیسوں کا طبیعی سیلان ہے۔ حرارت اور کمیت کے انتقال کے عملوں کو کشید کا یونٹ آپریشن اس وقت کہتے ہیں جبکہ سیر شدہ بخار حاصل ہوتا ہے۔

پھوڑنے (Crushing) کے یونٹ آپریشن کا اطلاق اس طبیعی عمل

پر ہوتا ہے جس میں ٹھوس مادّہ کو توڑ کر چھوٹے چھوٹے ذرات میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اہم یونٹ آپریشن کی دیگر مثالیں یہ ہیں :۔ اشیا کی منتقلی، حرارت کا انتقال، رطوبت اندازی (Humidification) اخراج رطوبت (Dehumidification) پھوڑنے (Breaking) اور پیسنے (Grinding) کے عمل، میکانی علیحدگی (Mechanical Separation) تقطیر، تبخیر کشید، خشکیدگی (Drying) انجذاب (Absorption) قلماؤ (Crystallization) اور آمیزش۔

یونٹ پروسس

یونٹ آپریشن میں کیمیائی انجینیر کے پیش نظر طبیعی تغیرات ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ واقع ہونے والے کیمیائی تغیرات کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ صنعتی عملوں میں واقع ہونے والے کیمیائی تعاملات اور طبیعی عملوں کا مطالعہ یونٹ پروسس (Unit Process) کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ دونوں تغیرات کیمیائی صنعتوں کے بظاہر مختلف گروہوں میں باہم ارتباط پیدا کرتے ہیں۔

یونٹ پروسس کی ایک اچھی مثال آمونیائی آکسیڈیشن سے نائٹرک ترشہ کی تیاری ہے۔ اس عمل میں کیمیائی انجینیر آکسیڈیشن کے لیے بہترین کٹالسٹ (Catalyst) نیز نائٹرک ترشہ کی اعظم مقدار کے حصول کے لیے مناسب ٹمپریچر اور دباؤ کی قیمتوں سے دل چسپی رکھتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ آکسیڈیشن کا تعامل کون سا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کون سے ذیلی تعاملات واقع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں آلات کی تعمیر کے لیے مخصوص اشیا کیا ہونی چاہئیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف نامیاتی ٹکنالوجی کے لیے یونٹ پروسس مختص ہیں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس کا استعمال غیر نامیاتی ٹکنالوجی میں نہ کیا جائے۔ سلفیورک ترشہ کا کمرہ کا قاعدہ، سلفیورک ترشہ کا تماسی قاعدہ، امونیا کے آکسیڈیشن کا قاعدہ وغیرہ۔ آکسیڈیشن کے یونٹ آپریشن کی ذیلی شاخیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں قابل لحاظ حد تک یکساں ہوتی ہیں جیسے ان کیمیائی عملوں میں حرارت کا بہ مقدار کثیر اخراج اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے موزوں آلات کا استعمال۔

خاص خاص یونٹ پروسس حسب ذیل ہیں : نائٹریشن (Nitration) ایسٹر سازی (Esterification) سلفونیشن (Sulphonation) امائینیشن (Amination)، آکسیڈیشن، ہائیڈروجینیشن، ہائیڈروجنالسز (Hydro genolysis) آلکائیلیشن (Alkylation) ہیلوجینیشن، کریکنگ (Cracking) پالی برائزیشن ریسی نی فیکیشن (Resinification) ڈائی ایزوٹائیزیشن، کپلینگ (Coupling)، ہائیڈرالسز، ہائیڈریشن، فریڈل کرافٹس (Friedel - Craft) — تعامل اور حرارتی تحلیل یا پائرولسز (Pyrolysis)

صنعتی آلہ کاری (Industrial Instrumentation)

موجودہ کیمیائی صنعت، کارکنوں (Operators) کی انفرادی نگرانی کے مقابلہ میں آلاتی انضباط (Instrumental Control) پر زیادہ منحصر ہوتی ہے۔ جب کیمیائی عملوں کو ریسرچ لیبوریٹری (تحقیقاتی تجربہ خانہ) سے صنعتی پلانٹ منتقل کیا جاتا ہے تو وہ تجارتی (Industrialise) ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کو معیاری صنعتی آلوں میں واقع کروایا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حادثات (Accidents) اور خرابہ (Spoil - age) - کا سدباب ہو جائے اور کم سے کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ اچھی پیداوار حاصل ہو۔ ان متغیرات کو جو کیمیائی انجینیر کے نزدیک اہمیت رکھتے ہیں متعین کیا جا سکتا ہے۔ اور اس بنا پر ان کو قابل پیمائش سمجھا جا سکتا ہے۔ کیمیائی صنعتوں میں ان کی اہمیت کے ممکنہ درجوں کے لحاظ سے متغیرات کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) ٹمپریچر (۲) رطوبت (۳) دباؤ (۴) مائعاتی سطح - (Liquid - Level) - (۵) سیلان (Flow) (۶) کیمیائی پروسس کا دوران یا عرصہ وقوع (۷) کیمیائی اجزا کی رفتار تعامل (۸) ارتکاز (یعنی متعاملات کی مقداریں اور واسطہ کی ترشیت (۹) روشنی اور بالائے بنفشی تنویر (۱۰) وولٹیج رو کی کثافت اور مقناطیسی نفاذ (Magnetic Flux)

اعلیٰ دباؤ کے پروسس

کیمیائی صنعتوں میں غیر معمولی ترقی گزشتہ دو دہوں میں اعلیٰ دباؤ کے استعمال کے باعث ہوئی ہے یہ دباؤ بالعموم ۵ کرۂ ہوائی سے بلند تر ہوتے ہیں۔ امونیا، میتھانال (Methanol) یوریا وغیرہ جو گزشتہ زمانہ میں دیگر صنعتی قاعدوں سے ضمنی حاصل کے طور پر تیار کیے جاتے تھے آج کل اعلیٰ دباؤ کے پروسس سے براہ راست تیار کیے جاتے ہیں مثلاً امونیا کوئلہ کے کاربونائزیشن کے دوران ضمنی حاصل کے طور پر تیار کی جاتی تھی لیکن اب نائٹروجن کی تثبیت (Fixation) اس کا خاص ذریعہ ہے۔ امونیا کو نہ صرف کیمیائی صنعتی خام اشیا میں خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ ارزانی زرعی کھادوں میں اس کا کلیدی مقام ہے۔ علاوہ ازیں نائٹرک ترشہ کے صنعتی ماخذ کی حیثیت سے امونیا کو قومی دفاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اعلیٰ دباؤ کے تقریباً تمام صنعتی عملوں میں کیٹلسٹ کا استعمال ضروری ہوتا ہے جس سے تعامل کی رفتار تیز اور تجارتی نقطہ نظر سے قابل عمل ہو جاتی ہے۔ تجارتی عمل میں استعمال ہونے والے کیٹلسٹ کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ میکانی قوتوں کے زیر عمل تحلیل کا مقابلہ کر سکے۔ وہ اعلیٰ ٹمپریچر اور زہروں (Poisons) کی مزاحمت کے قابل ہو اور اس کا عرصۂ زندگی دراز ہو۔

کیمیائی پروسس میں اعلیٰ دباؤ کے استعمال کے وجوہات حسب ذیل ہیں :-

اعلیٰ دباؤ کیمیائی توازن کو کمتر حجم کی سمت میں ڈھکیلتا ہے اور یہ لی شیٹلیے براؤن (Le Chate lier-Braun) کے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔

تعاملی نظام میں مائع ہیئت کو برقرار رکھتا ہے۔ اعلیٰ دباؤ مکثف ہیئت کو قایم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

کیمیائی پروسسوں میں واقع ہونے والے طبیعی مرحلوں میں اعلیٰ دباؤ معاون ہوتا ہے جیسے انجذاب اور حرارت کا انتقال۔ اعلیٰ دباؤ پر گیسوں کی حل پذیری بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اعلیٰ دباؤ کے تحت پانی سے دھو کر علاحدہ کر سکتے ہیں اور امونیائی کیوپرس محلول میں کاربن مانو آکسائیڈ

گیس کو جذب کروا سکتے ہیں اور یہ دونوں عمل پست دباؤ یا معمولی دباؤ پر ناقابل لحاظ ہوتے ہیں۔

اعلیٰ دباؤ کی وجہ سے تعاملات کا ارتکاز بڑھ جاتا ہے اور کیمیائی تعامل کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نسبتاً کمتر عرصہ میں تعامل تکمیل پاتا ہے۔ اور یہ معاشی نقطۂ نظر سے فائدہ بخش ہوتا ہے۔

کیمیائی ٹکنالوجی

کیمیائی ٹکنالوجی ایسی چیزیں تیار کرتی ہے جو خام اشیا سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ یہاں ہونے والے کیمیائی تغیرات کیمیائی ذرائع سے کیمیائی انضباط کے تحت واقع کروائے جاتے ہیں۔ کیمیائی ٹکنالوجی کے میدان میں کیمیائی صنعتیں نہایت اہم مقام رکھتی ہیں۔ "کیمیائی صنعتوں" پر ایک مضمون شعبہ کیمیا میں دیا گیا ہے۔

محکم سمنٹ کنکریٹ
(آرسی۔سی۔)

سمنٹ کنکریٹ فشاری قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تو ایک بہترین شے ہے لیکن اس کی تنشی مضبوطی اتنی کم ہے (یعنی فشاری مضبوطی کی تقریباً صرف دس فیصد) کہ تنشی زوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے معمولی سمنٹ کنکریٹ کا استعمال ایسی صورتوں تک محدود رکھنا پڑتا ہے جن میں تعمیر کے رکن پر زور کنکریٹ کی تنشی مضبوطی سے زیادہ نہ ہو مثلاً ثقلی کینے (گریوٹی ڈیم) Gravity Dam یا بھرواں بنیادیں (Main Foundation) وغیرہ مگر دوسری صورتوں میں جیسے شہتیر وغیرہ جن میں خماؤ کا اثر غالب ہوتا ہے بڑے تنشی زور فشاری زوروں کے برابر واقع ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگر کنکریٹ کے زور کو اس کے تنشی زور کی حد تک محدود رکھا جائے تو ڈزائن بہت بے کفایت ہوگا کیوں کہ فشاری مضبوطی کا بہت کم استعمال ہوگا۔ اس لیے کفایت کے اغراض کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کنکریٹ کے ساتھ کوئی ایسی شے شریک کی جائے جس کی تنشی مضبوطی اعلیٰ ہو اور جس کی کنکریٹ کے ساتھ اچھی بندش ہوسکے تاکہ دونوں مل کر ایک واحد شے کے طور پر بیرونی قوتوں کے اثرات کا مقابلہ کرسکیں اور دونوں میٹریل ایسے زور برداشت کریں جن کے لیے وہ موزوں ترین ہیں۔ فولاد کی تنشی مضبوطی اعلیٰ ہے اور وہ اس مقصد کے لیے موزوں ترین شے ہے۔ یہ مخلوط میٹریل جو کنکریٹ اور فولاد پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک واحد میٹریل کی طرح عمل کرتا ہے محکم (ری انفورسڈ) کنکریٹ کہلاتا ہے۔ کنکریٹ کی مضبوطی "دیرپائی" آگ کی مزاحمت، شکل پذیری اور سستے پن اور فولاد کی سختی اور تنشی مضبوطی کی وجہ سے محکم (ری انفورسڈ کنکریٹ) زمانہ حال کی تعمیروں میں سب سے زیادہ کثرت سے اور ہر موقعہ پر استعمال ہونے والا میٹریل بن گیا ہے۔

سرگزشت

کنکریٹ کو لوہے یا فولاد کے ذریعہ محکم کرنے کا سہرا فرانس کے ایک انجینیر جوزف مونیر (Joseph Monier) کے سر ہے جس نے کنکریٹ کے اور نلوں کے پیندے کو لوہے کی جالی کے ذریعہ محکم کرکے اس ساخت کو ۱۸۶۷ء میں پیٹنٹ کرایا تھا۔ مونیر کو رفتہ رفتہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس اصول کو ریلوے کے اسلیپروں یا بندھنوں بلکہ پیدل راستوں کے پلوں، کمانوں اور نلوں تک وسعت دی جائے۔ اگرچہ کہ مونیر سے پہلے ۱۸۴۹ء میں جوزف لامبو (فرانسیسی) ۱۸۵۵ء میں ولیم ولکنسن (انگریز) اور ۱۸۶۴ء میں ولیم فیر بیرن (Fair Bairn) (انگریز) اس میدان میں کچھ کام کر چکے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مونیر پہلا شخص تھا جس نے کنکریٹ میں لوہے کو سائنٹیفک طریقہ سے شریک کیا جس سے دونوں مل کر ایک وحدت کے طور پر کام کریں لوہا پورا تناؤ اور کنکریٹ فشار کا بڑا حصہ برداشت کرے مونیر کے بعد چند ایک پیٹنٹ طریقے فرانس، آسٹریا اور امریکہ میں وجود میں آئے۔ یہ سب گزشتہ صدی کے اخیر دہے میں ہوئے اور یورپ اور امریکہ میں تیزی سے پھیل گئے۔

امریکہ میں سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں ایک ۲۰ فٹ فصل کی آر سی سی (R.C.C) چھت سان فرانسکو کے پارک میں تعمیر ہوئی اور پہلا سڑک کا آر.سی.سی. پل امریکہ میں ۳۰ فٹ فصل کے لیے آیووا (Iwowa) میں ۱۸۹۴ء میں تعمیر ہوا۔

ہندوستان میں آر.سی.سی کی تعمیریں جو سب سے پہلے بنی تھیں وہ تھیں ایک وکٹوریا ٹکنکل ہاسٹل اور دوسرا اسکس روڈ کے پولیس کے مکانات۔ یہ دونوں بمبئی میں ۱۹۰۶ء میں تعمیر ہوئے۔

محکم کنکریٹ (آر۔سی۔سی) کا اصول

آر سی سی میں کنکریٹ اور لوہے کا فعل شہتیر کی مثال کے ذریعہ سمجھایا جاسکتا ہے۔

کسی شہتیر پر جب بوجھ رکھا جاتا ہے تو شہتیر خم ہوتا ہے اور اوپر کے ریشے سکڑتے ہیں اور فشاری زور برداشت کرتے ہیں نیچے کے ریشے کھنچتے ہیں اور تنشی زور برداشت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ فشاری زور سب سے اوپر کے پرت کے ریشوں میں ہوگا اور سب سے زیادہ تنشی زور سب سے نیچے کے پرت کے ریشوں میں ہوگا۔ اگر شہتیر کی تراش متشاکل (Symmetrical) ہو تو یہ دونوں انتہائی زور برابر ہوں گے۔ ان تنشی زوروں کو برداشت کرنے کے لیے شہتیر کے پیندے میں لوہے کو اس طرح جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہاں کنکریٹ اور لوہا ایک جان ہو جائیں یعنی ایک واحد میٹریل بن جائیں۔ جب شہتیر کے اندر بوجھ آتا ہے اور شہتیر کے اندر زور واقع ہوتے ہیں تو نیچے کے حصے کا فولاد اور کنکریٹ دونوں مل کر تناؤ کی برداشت میں حصہ لیتے ہیں۔ اگر بوجھ اتنا زیادہ ہو کہ نیچے کے حصہ میں کنکریٹ میں تنشی زور اس کی برداشت کی حد سے بڑھ جائے تو کنکریٹ میں ترخ پیدا ہوتی ہے اور وہ تنشی زور کی برداشت کے قابل نہیں رہتا۔ ایسا ہونے کے بعد سارا تنشی زور لوہے پر پڑے گا یعنی لوہے کو ہی کنکریٹ کی مدد کے بغیر یہ سارا زور برداشت کرنا ہوگا اس لیے احتیاطاً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ محکم کنکریٹ (آر سی سی) کے شہتیر میں کنکریٹ

کچھ بھی تنشی زور برداشت نہیں کرتا۔ اس مفروضہ کے تحت لوہے کی مقدار ایسی رکھی جاتی ہے کہ شہتیر کے ذاتی وزن اور دوسرے لگائے ہوتے بوجھوں سے پیدا ہونے والے سارے تنشی زور کو لوہا خود ہی برداشت کرسکے۔ نیچے جو شکل دی گئی ہے اس سے محکم کنکریٹ کے شہتیر میں واقع ہونے والے بنیادی عمل واضح ہونگے۔

ڈیزائن کا جو عام مروج طریقہ ہے اس میں کنکریٹ اور لوہے کی مقدار کا حساب کرتے وقت کنکریٹ اور لوہے دونوں میں قدر تحفظ تقریباً دو کے مساوی اختیار کی جاتی ہے۔ یعنی دونوں اشیاء میں زوران کی انتہائی مضبوطی کے آدھے کی حد تک جائز رکھا جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت شہتیر کا سب سے زیادہ باکفایت ڈیزائن وہ ہونا چاہیے کہ کنکریٹ کی اور لوہے کی مقداریں ایسی ہوں کہ آنے والے بوجھوں کے تحت کنکریٹ اور لوہے دونوں میں انتہائی جائز زور ایک ساتھ واقع ہو۔ اگر شہتیر کی تراشش ایسی ڈزائن کی جائے تو اس کو "متوازن شہتیر" کہتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت کچھ مزید کفایت اس میں ہو سکتی ہے کہ شہتیر کی تراشش متوازن تراشش سے ذرا زیادہ گہری رکھی جائے یعنی زیادہ کنکریٹ استعمال کیا جائے۔ اس کے برعکس اگر گہرائی کی وجہ سے متوازن سے ذرا کم رکھی جائے تو لوہے کی مقدار اور بڑھانی ہوگی جس سے زیادہ صرفہ عائد ہوگا مگر گہرائی میں دس فیصد زیادہ کمی نہیں کرسکتے۔ اگر گہرائی کو اس سے زیادہ گھٹانا ضروری ہو تو فشاری پہلو میں بھی لوہا لگانا پڑے گا تاکہ کنکریٹ کو فشار کی برداشت میں مدد دے۔ اس طرح کی ڈیزائن میں لوہے کی زیادتی کی وجہ سے صرفہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے ڈیزائن کئے ہوئے شہتیر کو "دوہرے استحکام کا شہتیر" کہتے ہیں یہ ڈیزائن انھیں صورتوں میں اختیار کیا جاتا ہے جن میں خاص وجہ سے گہرائی کو کم رکھنا ضروری ہو۔ چونکہ فشار میں بھی لوہے کی مضبوطی کنکریٹ سے بہت زیادہ ہے اس لیے فشاری زوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی لوہا استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کھمبوں میں جس سے سائز میں بھی کفایت ہوتی ہے اور لاگت بھی کم آتی ہے۔ اس طرح کنکریٹ کے سکڑنے اور ٹمپریچر کے تغیرات سے پیدا ہونے والے زوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی لوہا درکار ہوتا ہے۔ جن صورتوں میں اصل احکامی لوہا ایک ہی سمت میں ہو جیسے کہ چھتوں وغیرہ میں یہ زائد لوہا اصل احکام کے علی القوائم لگایا جاتا ہے۔ شہتیروں میں جزوی زوروں کی وجہ سے جو ترچھے تنشی زور پیدا ہوتے ہیں ان کے مقابلے کے لیے بھی لوہا لگایا جاتا ہے جس کو پیٹے (Web) کا استحکام کہتے ہیں۔

شہتیروں میں کنکریٹ اور لوہے کو متحدہ طور پر کام کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زور ایک سے دوسرے میں منتقل ہو سکے جس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان پھسلن واقع نہ ہو۔ پھسلن کو روکنے کے لیے جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے اسے بندش یا گرفت (Bond) کہتے ہیں۔ اگر سلاخیں ہموار ہوں تو یہ گرفت صرف لوہے اور کنکریٹ کی باہمی چپک (Adhesion) سے حاصل ہوتی ہے۔ سلاخیں اگر موڑدی جائیں تو ان کی گرفت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گرفت سلاخ کے طول پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک کم ترین طول ضروری ہے تاکہ مطلوبہ گرفت حاصل ہو۔

لوہے کو کنکریٹ میں کافی اندر رکھنا چاہیے تاکہ زنگ نہ لگے اور آتش زدگی سے محفوظ رہے۔ اگر ڈالتے وقت کنکریٹ کافی شکل پذیر (Plastic) ہو اور اس میں لوہے کے اطراف کچھ شہد کے چھتے کی طرح کے سوراخ نہ رہ جائیں تو لوہا زنگ سے کافی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ معمولاً لوہے کو ½ تا ۲ انچ کنکریٹ سے ڈھانکنا چاہیے۔ اس کو پوشش (Cover) کہتے ہیں۔ پوشش اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ لوہے کو کافی گرفت میسر آئے۔ اگر تعمیر کے کسی رکن کو پانی کے تماس (Contact) میں استعمال کرنا ہو جیسے کہ ڈیم اور پل وغیرہ تو یہ پوشش ۳ تا ۴ انچ ہونی چاہیے۔

اجزائے ترکیبی

(۱) سمنٹ۔ پورٹ لینڈ سمنٹ کی کئی قسمیں ہیں۔ لیکن عام طور پر عمارتوں میں معمولی معیاری سمنٹ استعمال ہوتی ہے سوائے اس کے کہ چند روز کے اندر پوری مضبوطی حاصل کرنا مطلوب ہو۔ ایسی صورتوں میں خصوصی سمنٹ استعمال ہوتی ہے جس میں مضبوطی جلدی پیدا ہوتی ہے۔

کنکریٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ڈھیلا ڈھیلا (Workable) ہو تاکہ سانچوں میں ٹھیک طور سے بچھایا اور کھٹ کیا جاسکے اور خلا باقی نہ رہ جائیں۔

استحکام (Reinforcement) کے ساتھ جو کنکریٹ استعمال ہوتا ہے اس کی فشاری مضبوطی ۱۵۰ سے لے کر ۲۵۰ کیلو گرام فی مربع سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ عام استعمال کے کنکریٹ کی مضبوطی ۱۵۰ کیلو گرام فی سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ اس کے لیے جو تناسب اختیار کیا جاتا ہے وہ ۱:۲:۴ ہے یعنی ایک حصہ سمنٹ ۲ حصہ ریت اور ۴ حصہ گٹی (حجم کے لحاظ سے)

استحکامی لوہا۔ استحکام کے اغراض کے لیے لوہا سادہ یا مڑی ہوئی یا موڑی ہوئی سلاخوں کی شکل میں ہوتا ہے اور ان کا سائز ۵ سے لے کر ۵۰ ملی میٹر قطر تک ہوتا ہے۔ استحکام کے لیے لوہے کے تار یا تار کی جالیاں بھی استعمال ہوتی ہیں جن کے خانے مختلف سائز اور شکل کے ہوتے ہیں۔

سادہ استحکامی سلاخیں دو مضبوطیوں کی ہوتی ہیں ایک معمولی نرم فولاد کی جن کی مضبوطی ۴۴ کیلو گرام فی مربع ملی میٹر ہوتی ہے اور دوسری اوسط تنشی فولاد کی جن کی مضبوطی ۵۵ کیلو گرام فی مربع ملی میٹر ہوتی ہے۔ مڑی ہوئی سلاخیں تین درجوں کی ہوتی ہیں۔ ایک نرم فولاد کی دوسری اوسط تنشی فولاد کی اور تیسری مضبوط فولاد کی۔

تار کی جالیاں تاروں کو ویلڈ کر کے بنائی جاتی ہیں۔

تعمیر کے طریقے

محکم کنکریٹ (آر سی) کے کاموں کے لیے سانچے استعمال کیے جاتے ہیں جن سے تعمیر کے رکن کی مطلوبہ شکل سائز اور سطحی فنش (Finish) حاصل ہو اور اس وقت جب کنکریٹ بہتا ہوا ہوتا ہے اس کو سہارا دے یہاں تک کہ وہ جم کر سخت ہو جائے اور کافی مضبوطی حاصل کرلے۔ یہ سانچے عموماً لکڑی کے ہوتے ہیں۔ یہ اتنے مضبوط ہونے چاہئیں کہ مال مسالے کا پورا وزن کام کرنے والوں کا وزن اور دھمس کے عمل کا زور برداشت کرسکیں۔ سانچوں کی لاگت کنکریٹ کے کام کی جملہ لاگت کے ۲۰ تا ۶۰ فیصدی تک ہوتی ہے۔ جو اس پر منحصر ہے کہ کام کی شکل اور سائز کیا ہے۔ سانچوں کی لاگت کو کم کرنے کے لیے یہ کرنا چاہئے کہ سانچوں کے

اجزا معیاری سائزوں میں تیار کیے جاتیں جو ایک کام سے نکال کر دوسرے کاموں میں استعمال کیے جاسکیں۔ اونچی تعمیروں میں جو یکساں شکل اور سائز کی ہوں پھسلواں سانچے (Slip Forms) استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے تعمیر اوپر جاتی ہے۔ یہ جیکوں (Jacks) یا پیچوں (Screws) کے ذریعہ اوپر سرکائے جاتے ہیں اور پھر ان میں کنکریٹ بھرا جاتا ہے۔

کنکریٹ کی تعمیر کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عام طریقہ یہ ہے کہ تعمیر کے رکن کو اس کے مقام مقصود پر ہی یعنی جہاں وہ لگا رہے گا تعمیر کیا جاتے اس کو فی المحل ڈھلائی (Casting in Site) کہتے ہیں۔ دوسرا متبادل طریقہ جو اکثر صورتوں میں ممکن ہے یہ ہے کہ رکن کو کسی اور سہولت بخش مقام پر ڈھال کر اس کے سخت ہو جانے کے بعد اس کو اٹھا کر تعمیر میں اس کے مقام پر رکھا جائے۔ اس کو پری کاسٹ (Precast) طریقۂ تعمیر کہتے ہیں۔ اس طریقہ میں وزنی ارکان کو اٹھانے منتقل کرنے اور چڑھانے کے آلات درکار ہوتے ہیں جن کو لاگت میں شامل کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ کئی وجہوں سے کفایت بھی ہوتی ہے۔ زمین پر ڈھلائی آسان ہوتی ہے اور ان کی لاگت کم ہوتی ہے۔ عمدگی کی نگرانی (کوالٹی کنٹرول) (Quality Control) آسان ہوتی ہے اور ارکان پہلے سے تیار شدہ ہونے کی وجہ سے تعمیر کے وقت میں بچت ہوتی ہے۔ ان فائدوں کی وجہ سے پری کاسٹ طریقہ عام ہوتا جا رہا ہے۔

اگرچہ تعمیر کے لیے آرسی کنکریٹ ایک بہت عمدہ میٹریل ہے لیکن چند نقائص سے خالی نہیں جن کی وجہ سے ان کا استعمال محدود رہتا ہے اور کفایت متاثر ہوتی ہے۔

آرسی رکن میں تناؤ کے تحت لوہے کے اپنے عمل کرنے سے پہلے ہی کنکریٹ تڑک جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آرسی میں کوئی رکن ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ جو تڑک سے پاک ہو۔ پھر جیسے جیسے لوہے میں تناؤ زیادہ ہوگا۔ تناؤ کے تحت کھنچنے پر تڑک زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس تڑخ کو محدود رکھنے کے لیے تاکہ لوہے کو زنگ نہ لگ جائے لوہے کے اندر زور کو محدود رکھنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے آرسی میں اعلیٰ تنشی فولاد استعمال نہیں کیا جاسکتا ورنہ اس میں کفایت ہوتی۔

آرسی ارکان تعمیر میں جھکاؤ برخلاف دوسری اشیاء کے ارکان کے بہت کچھ وقت پر منحصر ہوتا ہے یعنی وقت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک آخرکار یہ جھکاؤ ابتدائی جھکاؤ کے دوگنے سے ڈھائی گنے تک ہو جاتا ہے۔ یہ کنکریٹ کی ریںگ (Creep) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جھکاؤ کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے تاکہ تعمیر میں بدنمائی یا ناکارگی نہ واقع ہو بعض اوقات کنکریٹ کے ارکان کا سائز حسابی ضرورت سے زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ محض بوجھ کی برداشت کے لیے اس سائز کی ضرورت نہ ہو۔ اسی وجہ سے اعلیٰ مضبوطی کا کنکریٹ استعمال کرنا بے سود ہے۔ ورنہ کفایت ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فصل بڑا ہو تو خود رکن کا وزن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کو سہارنا بھی خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

میکانی یا میکانیکل انجینیری

میکانیکل انجینیری انجینیری کی وہ شاخ ہے جو قوت اور توانائی کو استعمال کرنے والے آلات اوزار اور مشینری وغیرہ کی تجویز ان کے ڈیزائن ان کی تیاری اور ان کے استعمال سے بحث کرتی ہے۔ تمدن کے آغاز سے انسان اس ہنر کو استعمال کرتا رہا ہے۔ کلہاڑی، ہتھوڑا، تیر کمان، بیل گاڑیاں، چرخیاں وغیرہ اس کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں کسی نہ کسی شکل میں میکانیکل انجینیری استعمال ہوتی ہے۔

میکانیکل انجینیری کی ایک دوسری تعریف یوں کی جاسکتی ہے جو عام انجینیری سے ماخوذ ہے۔ انجینیری وہ علم اور وہ فن ہے جس میں مطالعہ اور تجربہ اور عمل سے حاصل شدہ طبیعی علوم کے استعمال سے ایسے طریقے وضع کیے جائیں کہ طبیعی اشیاء اور قوتیں با کفایت طور پر نوع انسان کو آسائش بہم پہنچائیں اور میکانیکل انجینیری اس علم کی وہ شاخ ہے جو مشینوں سے اور طاقت کی پیدائش سے بحث کرتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں اسٹیم انجن کی ایجاد سے جو صنعتی انقلاب (انڈسٹریل ریوولوشن) وقوع میں آیا اس کے لازمے کے طور پر ہر قسم کی مشینیں ایجاد ہوئیں۔ انجینیری کی یہ شاخ جو سول انجینیری سے بالکل الگ قسم کی تھی اور اوزاروں اور مشینوں سے متعلق تھی تیزی سے ترقی کرتی گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک سول انجینیری کی اصطلاح ہر قسم کی انجینیری کے لیے جو سول یعنی غیر فوجی اغراض کے لیے ہو استعمال ہوتی رہی مگر ۱۸۷۴ء میں میکانیکل انجینیری کی اہمیت کے مدنظر اس کو انجینیری کی ایک الگ شاخ قرار دیا گیا۔

میکانیکل انجینیری کے طالب علم کو حسب ذیل علوم کا جاننا ضروری ہے۔ ریاضیات طبعی علوم یعنی طبیعیات (فزکس) اور کیمیا (کیمسٹری)، میکانی سائنس یعنی ڈائنامکس جو قوت اور حرکت سے بحث کرتی ہے۔ تھرموڈائنامکس جو حرارت توانائی اور طاقت (پاور) کی مختلف شکلوں سے بحث کرتی ہے۔ سیالات کی میکانکس (فلوڈ میکانکس) اور عام اشیا کی میکانکس۔

عملی طور پر یعنی پیشہ ورانہ زندگی میں میکانیکل انجینیر کے مشاغل یہ ہوں گے تحقیقات (ریسرچ)، ڈزائن، اشیاء اور طاقت کی پیدائش

ان خالص فنی مشاغل سے ہٹ کر میکانیکل انجینیئر کو بعض اوقات نظم و نسق مشاورت بلکہ مارکیٹنگ بھی سپرد کی جاتی ہے ۔

باہمی مسابقت کی وجہ سے صنعتیں بہتر سے بہتر سامان کم سے کم لاگت پر تیار کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے میکانیکل انجینیئر سے بہتر استعداد کی توقعات کی جاتی ہیں اور میکانیکل انجینیئری کی تعلیم اور ٹریننگ میں بھی ترقی لازمی ہے۔

میکانیکل انجینیئر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسی مشینیں اور پرزے ایجاد کرے جو زیادہ صحت کے ساتھ کام کریں اور پیچیدہ سے پیچیدہ کام انجام دے سکیں۔ پیداوار کی پیدائش کا کام صحت، تیز رفتاری اور کفایت کے ساتھ انجام پائے اور لاگت کم سے کم آئے۔

میکانیکل انجینیئری کی الگ مستقل شاخ قایم ہونے کے بعد پہلا کام میکانکل انجینیئر نے اپنے پیش نظر یہ رکھا بڑے پیمانے پر اور زیادہ باستعداد طاقت پیدا کرنے کی مشینیں بنائی جائیں۔ بوائلر بڑی جسامت کے بنائے جانے لگے بھاپ کی ٹربائین استعمال کی جانی لگی اور ساتھ ہی ساتھ برقی طاقت کے جنریٹر بنائے گئے۔

میکانیکل انجینیئر کا دوسرا کارنامہ اندرونی احتراق کے انجن (انٹرنل کمبشن انجن) کی ترقی ہے جو حمل ونقل میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ ذریعہ حمل ونقل کی یہ ترقی زمین سمندر ہوا اور فضا ہر جگہ کام دے رہی ہے۔ اس میں برقی انجینیئر کا تعاون بھی شامل ہے خاص کر کنٹرول سسٹم کا ارتقار برقی انجینیئری کی شاخ الکٹرانکس کا رہین منت ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست ترقی ہوئی ہے اس ترقی سے فائدہ اٹھا کر صنعتوں (انڈسٹری) نے بھی ترقی کی کوشش کی جس کے لیے پرانی مشینیں اور آلات کام نہ دے سکتے تھے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں اور نئے نئے آلات درکار ہوئے جن کا دائرہ عمل وسیع تر اور کارکردگی صحیح تر ہو اور جو زیادہ خودکار (آٹومیٹک) طریقے سے کام کرنے کے قابل ہوں۔ میکانی انجینیئری کا یہ شعبہ اب اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ کسی ملک کی صنعتی ترقی کا معیار اب یہی ہے۔

جنگی ساز و سامان میں بھی میکانی انجینیئری کی بہت اہمیت ہے بہت سی ایسی ایجادیں ہیں جو جنگ کی اغراض کے لیے وجود میں آئیں مگر ان سے زمانۂ امن میں بھی بہت فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ روزانہ تمدنی زندگی کا جزو بن جاتی ہیں۔ مثلاً جیپ کاڑیں ڈوزر، جٹ (Jets) کے ہوائی جہاز جوہری توانائی کے ری ایکٹر وغیرہ۔

میکانی انجینیئری کی ایک شاخ ماحولی ہائی جین (Environ — mental Hygine) ہے۔ کانوں (Mines) میں صاف ہوا کا انتظام کرنا۔ ریفریجریشن اور ایرکنڈیشنگ (Refrigeration And Air-Conditioning) اس میں داخل ہیں۔ بہت سی صنعتیں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے شور پیدا ہوتا ہے۔ اور زمین پانی اور ہوا میں گندگی واقع ہوتی ہے اس پر قابو پانے کے لیے میکانی انجینیئری کی اس شاخ نے اب بہت اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اس بات کی کوشش جاری ہے کہ ایسی مشینیں اور ایسے عمل ایجاد کیے جائیں جن سے فضلات کم سے کم مقدار میں پیدا ہوں اور جن فضلات کا پیدا ہونا ناگزیر ہو ان کو بے ضرر بنا دیا جائے۔

میکانی انجینیئری کا ایک نیا شعبہ بائیو انجینیئری (Bio-Engi — neering) ہے۔ اس شعبہ میں ایسی مشینوں اور ایسے آلات کی ایجاد کی گئی ہے جو علاج معالجہ میں اور انسان کے مختلف اعضا کو مدد دیتی ہیں بلکہ ان کا بدل ہو جاتی ہیں۔ مصنوعی اعضا، اور قلب (Heart) اور پھیپھڑے (Lungs) کی مشینیں ایجاد ہوئی ہیں جو اصلی اعضا کا پورے طور پر کام انجام دیتی ہیں۔ غرض کہ میکانی انجینیئری نوع انسان کی تمدنی ترقی کی ہر طرح ضامن ہے۔

ہائیڈرالکس

ہائیڈرومیکانکس یہ علم مائعات (Liquids) کی میکانیات سے متعلق ہے۔ اگرچہ کہ پانی کے علاوہ دوسرے مائعات مثلاً تیل وغیرہ بھی اس کی حدود میں داخل ہیں لیکن یہ علم زیادہ تر صرف پانی کی ساکن اور متحرک حالتوں سے بحث کرتا ہے۔ اس علم کی دو شاخیں ہیں ایک ہائیڈروسٹیٹکس جو ساکن مائعات سے بحث کرتی ہے دوسری ہائیڈروڈائنامکس جو متحرک مائعات سے بحث کرتی ہے۔ ہائیڈرالکس۔ ہائیڈروڈائنامکس کا وہ حصہ ہے جو انجینیئری میں پیش آنے والے مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

سیالوں کا علم بہت قدیم ہے چنانچہ بعض بنیادی اصول (۲۵۰ ق.م) میں ارشمیدس نے دریافت کیے مگر یہ بات حیرت ناک ہے کہ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک اس علم میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ سلطنت روما میں آب پاشی اور آب رسانی کے لیے جو نہریں اور نل اور آب گذار (ایکویڈکٹ) تعمیر کیے گئے تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ رومیوں کو ساکن اور متحرک پانی کی بعض خاصیتوں کا علم تھا۔ اگرچہ کہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا کوئی اصول اور قوانین علمی بنیاد پر دریافت کیے تھے یا ان کا علم صرف تجربہ پر مشتمل تھا۔

۱۵۸۵ء میں سٹیوینس (.. evens) نے ارشمیدس کے اصول کی روشنی میں یہ معلوم کیا کہ کسی حوض کے پیندے اور اس کی دیواروں پر پانی کا کتنا دباؤ واقع ہوگا۔ ۱۶۱۲ء میں گیلیلیو نے ایک کتاب لکھی جس میں پانی میں تیرنے والے اجسام سے بحث کی۔ کچھ دنوں بعد ٹاری چیلی (Toricheli) نے اس سے بحث کی کہ اگر کسی سوراخ (Orifice) سے پانی سیدھا نیچے گر رہا ہو تو اس کا عمل کیا ہوگا۔ پھر سترھویں صدی کے وسط کے بعد سے سائنس داں تجربوں اور استدلال کے ذریعہ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ متحرک پانی کے لیے اصول اور قوانین

دریافت کریں۔ ان میں فرانس کے بر ولی، ڈالم برٹ، ڈارسی اور بیزن، انگلستان کے رینکن، فرودؔ، اینلڈز اور ٹامسن اور اٹلی کے دنچری اور امریکہ کے فرانسس (Francis) زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ کہ سیالوں کے طرزِ عمل کے بارے میں کئی تجربات اور مشاہدات ایسے ہیں کہ ان میں اور نظری تجزیہ میں مطابقت پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں نظری تجزیہ کے نتائج واقعی تجربات اور مشاہدات سے پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں۔

پانی کے طبعی خواص

خالص پانی ایک تقریباً بیرنگ، شفاف، بے بُو مائع ہے۔ اس کا وزن مخصوص ٹمپریچر کے ساتھ کسی قدر بدلتا ہے اور ۴ سیلسیش (۳۹ ف) پر زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ کرہ ہوائی کے دباؤ پر یہ ۰ سیلسیش (۳۲ ف) پر منجمد ہو جاتا ہے۔ یعنی برف بن جاتا ہے اور ۱۰۰ سیلسیش (۲۱۲ ف) پر جوش کھاتا ہے اور بھاپ بنتا ہے۔ دباؤ کے بڑھنے سے نقطۂ انجماد گھٹ جاتا ہے اور نقطۂ جوش بڑھ جاتا ہے۔ اس کا وزن معمولی ٹمپریچر پر ایک گرام فی مکعب سینٹی میٹر ہوتا ہے۔

پانی میں خفیف سی لزوجت (Viscosity) بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی متحرک جسم کو پانی میں حرکت کرنے کے لیے طاقت درکار ہے۔ جہاں پانی کا بڑے پیمانے پر استعمال عمل میں آئے وہاں پہلے اس کو ذخیرہ کرنے اور نکاسی کا انتظام ضروری ہو جاتا ہے۔ اس میں بند، چادریں، توم شامل ہیں ان کو ہیڈ ورکس (Head Work) کہا جاتا ہے۔ ہیڈ ورکس سے پانی کو اس کے استعمال کے مقام پر پہنچانے کے لیے آب رسانی کے ذرائع درکار ہوں گے مثلاً نہریں، نل وغیرہ۔ اس طرح استعمال کے بعد زائد اور استعمال شدہ پانی کو نکال دینے کا انتظام بھی کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام مرحلوں پر پانی کے بہاؤ اور اس کی قوتوں پر کنٹرول کے لیے آبی مشینری اور ناپ کے آلات کی ضرورت رہتی ہے۔

پانی کے جو استعمال زیادہ عام ہیں وہ یہ ہیں۔ گھریلو، صنعتی، زراعتی طاقتی، پن بجلی، حفظانی، جہاز رانی وغیرہ۔ ان میں سے کچھ خاص اغراض استعمال کے لیے پراجکٹ بنائے جاتے ہیں۔ بعض پراجکٹ ایک سے زیادہ اغراض کو پورا کرتے ہیں۔ ان کو ملٹی پرپز (کثیر مقصدی) پراجکٹ کہا جاتا ہے۔

پانی کی فراہمی اور ذخیرہ اندوزی

اس میں پانی کی مقدار اور ذخیرہ کا محل وقوع قابلِ غور ہوتا ہے۔ چونکہ پانی کی (بارش وغیرہ کے ذریعہ) فراہمی کی شرح مستقل نہیں ہوتی اور پانی کے استعمال کی رفتار بھی متغیر ہوتی ہے۔ اس لیے پانی کو ذخیرہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانی کے دھارے

سیال کی حرکت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قسم کی حرکت واضح اور معین دھاروں میں ہوتی ہے یعنی کسی خاص مقام اور وقت پر اس کی سمت اور رفتار سے ہوتی ہے اسے مستقیم حرکت کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ جس میں حرکت واضح اور معین نہیں ہوتی اور کسی خاص مقام اور وقت پر اس کی سمت اور رفتار کی پیش بندی متصور نہیں ہوتی اسے غیر مستقیم حرکت کہتے ہیں۔

مستقیم حرکت کے حالات

عام طور پر حسب ذیل باتیں سیال کی حرکت کو مستقیم بنانے میں مدد دیتی ہیں (۱) چکنا و لزوجت (۲) راستہ کا بتدریج تنگ ہونا (۳) سطح کا آزاد ہونا۔

برنولی کا مسئلہ

پانی کے ہر ذرہ میں خواہ وہ ساکن ہو یا متحرک، توانائی یعنی کام کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہ توانائی اس کو اس کے دباؤ، اس کی رفتار اور اس کے مقام سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ریاضی کی زبان میں اس کو یوں ظاہر کر سکتے ہیں کہ لمبائی کی اکائی میں :

توانائی فی اکائی وزن = $\frac{د}{و} + \frac{ر^2}{2ج} + ا$

کثافت اضافی (Specific Gravity)

اس میں د = دباؤ، و = وزن مخصوص۔ ر = رفتار، ج = اسراع بوجہ جاذبہ زمین اور ا = اونچائی یا بلندی

یہ برنولی کا مسئلہ کہلاتا ہے۔ لمبائی کی اکائی میں پانی کی توانائی کو ارتفاع (Head) کہتے ہیں۔ اس طرح ارتفاع (Head) تین طرح کے ہوتے۔ دباؤ کا ارتفاع (ہیڈ) رفتار کا ارتفاع (ہیڈ) اور اونچائی کا ارتفاع (ہیڈ)۔

منفذ (Orifice) میں سے پانی کا بہاؤ

کسی ٹنکی میں پانی بھرا ہوا ور اس ٹنکی میں دیوار یا پیندے میں کوئی سوراخ ہو اور پانی کی سطح کی اونچائی اس سوراخ سے اوپر ہو تو سوراخ میں سے پانی بہے گا یعنی اخراج۔ اس کی رفتار = ۲ج و ہوگی۔ اس کی مدد سے کسی بڑے سوراخ مثلاً بند کے توم (Sluice) اور سیلابی پانی کے نکاس کی چادر کے ذریعہ سے پانی کے اخراج کی مقدار محسوب کی جا سکتی ہے۔

نلوں میں سے پانی کا بہاؤ

نل میں سے بہتے وقت نل کی رگڑ کی وجہ سے پانی کی کچھ توانائی کا نقصان واقع ہوتا ہے۔ یہ نقصان پانی کی رفتار، نل کی لمبائی، اور نل کی اندرونی سطح کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اور نل میں ہیڈ (Head) کے نقصان کی مقدار ک ل ر۲ سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ک = نل کی اندرونی سطح کا کھردراپن۔ ل = نل کی لمبائی ر = پانی کی رفتار۔ اور م = ماقوائی اوسط گہرائی۔ یعنی پانی کے دھارے کی عمودی رقبہ کو نل کے بھیگنے والے محیط پر تقسیم کرنے سے جو گہرائی حاصل ہو۔

پانی کا کھلا بہاؤ

ندیوں اور نہروں میں پانی کی سطح کھلی ہوتی ہے۔ جہاں جہاں پانی کی سطح کھلی ہو وہاں بہاؤ کی نوعیت ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی پانی کا بہاؤ صرف راستہ کے ڈھال کے سبب واقع ہوتا ہے۔ ایسی تمام صورتوں میں بہاؤ کی رفتار (Speed Of Flow) ر = س/م ڈ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں۔ ر = رفتار۔ م = ماقوائی اوسط گہرائی

اور ۲۔ نہر کی تہہ کا ڈھال اور ۳۔ نہر کے پیندے اور دیواروں کے کھردرے پن پر منحصر ہے۔

نہروں میں فاصل رفتار

نہر میں پانی کی رفتار کم ہو تو پانی میں جو معلق مادہ یعنی مٹی وغیرہ ہو تہ نشیں ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس اگر رفتار زیادہ ہو تو نہروں کے بند اور تہ کی مٹی کٹنے لگتی ہے۔ ایک درمیانی رفتار ایسی ہوتی ہے جو نہ بہت کم ہوتی ہے نہ بہت زیادہ جس پر نہ تو مٹی کٹتی ہے۔ نہ تہ نشین ہوتی ہے اسی کو "فاصل رفتار" کہتے ہیں۔ زیر تجویز نہروں کی گہرائی اور چوڑائی کا حساب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں پانی کی رفتار اس فاصل رفتار کے لگ بھگ رہے۔ یہ فاصل رفتار نہری پانی کی گہرائی پر منحصر ہوتی ہے اور اس پر کہ نہر کے بند اور تہ سنگ بستہ ہیں یا مٹی کے ہیں اور مٹی کے ہیں تو مٹی کس قسم کی ہے۔

پانی کا پچھل پھیلاؤ

ندی یا نہر میں کوئی آڑی دیوار کھڑی کر دی جائے تو پانی اس کے اوپر سے بہے گا۔ اور اس طرح اس کا بہاؤ دیوار سے پہلے کافی دور تک اونچا ہو جاتا ہے گا اسے پچھل پھیلاؤ (Back Water) کہا جاتا ہے۔ ندیوں پر بند باندھنے میں اس کا حساب ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اوپر کی طرف کتنی زمین غرقاب ہو جائے گی۔ اس زمین کے مالکوں کو اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

پانی کی دھار

اگر پانی کی دھار کسی سطح سے ٹکرائے تو دھار اس طرح واپس نہیں ہوتی جس طرح کوئی ٹھوس ربر کی گیند واپس ہوتی ہے بلکہ وہ سطح پر پھیل کر اس کے کناروں سے نکلتی ہے۔ سطح ساکن ہو یا متحرک دھار کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور بہت کچھ زور سطح کو منتقل ہوتا ہے۔ پانی کے ٹربائین اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔ پن چکی بھی اس کی ایک مثال ہے جس میں گرتے ہوئے پانی کے زور سے چکی چلائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے آبشاروں سے ڈائنامو چلائے جاتے ہیں اور ان سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ جسے ہائیڈرو الکٹریسٹی (پن بجلی) کہتے ہیں۔

پانی کی دھار کا ایک دوسرا استعمال بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی ٹنکی میں سے پانی خارج ہو رہا ہو تو پانی جس زور سے خارج ہوگا اتنا ہی الٹا زور ٹنکی پر پڑیگا۔ اگر جہاز میں سے پانی کی دھار زور سے نکلے تو جہاز کو اتنا ہی زور مخالف سمت سے ملے گا۔ یعنی اگر جہاز میں سے پانی کی دھار پیچھے کی طرف نکالی جاتے تو جہاز پر زور آگے کی سمت یہ عمل کرے گا۔ اور جہاز کو آگے بڑھنے میں مدد دے گا۔ جٹ ہوائی جہاز (Jet · Aero plane) اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔

پانی کے ٹربائین

پانی کے زوروں سے جو مشین چلائی جاتی ہے اس کو ٹربائین (Turbine) کہتے ہیں۔ ایک دھرے (Axle) پر ایک پہیہ جڑا ہوتا ہے۔ پہیئے کے گھیرے پر پتیاں جڑی (Blades) ہوتی ہیں جن پر پانی کا زور عمل کرتا ہے۔ پانی کا زور اس کے ارتفاع (Head) سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ زور رفتار کی شکل میں ہوگا یا دباؤ کی شکل میں۔ پانی کی طاقت جو ٹربائین کو منتقل ہوتی ہے دہّ دا° کے متناسب ہوگی۔ جہاں دہ پانی کا وزن ہے جو دھار کے ذریعہ بلندی ئا سے اکائی وقت میں مشین کی پتیوں پر گرتا ہے۔
اگر پتیوں پر پانی کا زور رفتار کے ذریعہ واقع ہو تو ایسے ٹربائین کو دھکے والی ٹربائین (Impulse Turbine) کہا جاتا ہے۔ اور اگر پانی کا زور دباؤ کی شکل میں عمل کرے تو ٹربائین کو ردّ عملی ٹربائین کہتے ہیں۔

پانی کے انجن

بھاپ انجن (Steam Engine) کی طرح پانی کے بھی انجن ہوتے ہیں۔ ان میں نشارے (Piston) پر بھاپ کے بجائے پانی زور ڈالتا ہے اور اسے حرکت میں لاتا ہے۔

پمپ

پمپ ٹربائین اور انجن کے الٹ ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں نشارے یا پہیۂ کو کسی بیرونی طاقت کے ذریعہ حرکت دی جاتی ہے۔ اور نشارہ یا پہیہ پانی کو اپنی حرکتی توانائی کے ذریعہ اوپر چڑھاتا ہے۔ اگر نشارہ استعمال کیا جاتے تو پمپ کو متکافی پمپ (Reciprocating Pump) کہتے ہیں۔ پتیوں والا پہیہ استعمال کیا جائے تو پمپ مرکز گریز پمپ (Centrifugal Pump) کہلاتا ہے۔

ہوابازی کی انجینیری

کرۂ ہوائی میں جو سواریاں پرواز کرتی ہیں ان کا ڈیزائن ان کی ساخت اور ان کے پروازی عمل کا امتحان طبیعیات اور ریاضی کے جن اصولوں پر مبنی ہوتا ہے انہی اصولوں کا عملی یا اطلاقی پہلو ہوا بازی انجینیری (Aero nautical) ہے۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں ایرو ناٹیکل انجینیری کو وسعت دے کر اس میں ان تمام سواریوں کو (Vehicles) شامل کیا گیا جو نہ صرف کرۂ ہوائی میں پرواز کرتی ہیں بلکہ فضا میں بھی پرواز کرتی ہیں اس وسعت پذیری کو ظاہر کرنے کے لیے بعض اوقات فضائی (Space) انجینیری اور فلکی (Astronautical) انجینیری کی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

ایرو ناٹیکل (Aero nautical) انجینیری جن بنیادی فنون پر مشتمل ہے وہ ہوائی حرکیات (Aero dynamics) دھکیل (Pro pulsion) ساخت (Structure) توازن اور کنٹرول (قابو) ہیں۔

ایرو ناٹیکل انجینیری کی ابتدا تعلیمی اور صنعتی اداروں اور تجربہ خانوں میں نئے نئے تصورات اور تدابیر کے ارتقا کے ساتھ ہوتی ہے صنعتی منصوبہ گر (Designer) جدید ترقی یافتہ فنون کو کام میں

لاتے ہوئے ایسی سواری کے ابتدائی مرحلہ کی بنیاد رکھتے ہیں جس سے اصل
ریاضی کی تشفی اور پراجکٹ کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس ابتدائی
خاکہ کی تفصیلات کے لیے مہینوں بلکہ برسوں اسی میں مصروف رہتے ہیں
اس عرصہ میں ایروناٹیکل انجینیئر ان سواریوں کے مختلف حصوں کی بناوٹ
کے طریقے اور ان کو ترقی دینے کے وسائل کے متعلق معلومات مہیا کرتے
ہیں۔ آخری ڈزائن سے پہلے چھوٹے پیمانہ پر ایک یا زیادہ نمونے بنا کر
مختلف حالات کے لیے ان کا امتحان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں معینہ ضروریات
کا لحاظ رکھتے ہوئے بڑے پیمانہ پر ان سواریوں کی پیداوار کا کام شروع کیا
جاتا ہے۔ ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک فلکیاتی (Astronautical)
انجینیئر اسی میں حصہ لیتے ہیں۔

تاریخی جائزہ

۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو اورویل اور ولبر رائٹ نے ہوا سے زیادہ
وزنی جہاز تیار کرکے اس میں پرواز کی تھی۔ اس کا ڈزائن تجرباتی معلومات
اور اس کی ساخت غیر پختہ فن پر مبنی تھی۔ ہوائی جہاز کے ڈزائن اور اس
کو ترقی دینے کے لیے سائنسی معلومات سے اور ایک دہے تک کوئی استفادہ
نہیں کیا گیا۔ یعنی جب تک یہ ظاہر نہ ہوا کہ ہوائی جہاز جنگی اغراض کے لیے
موثر آلہ کار ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل انجینیئروں نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ ہوائی
جہاز کو جنگی اغراض کے لیے ایک موثر آلہ کے طور پر استعمال کرنا اسی پر
منحصر ہوگا کہ اس کے لاتعداد فنی مسائل کو حل کرنے کے لیے طبیعیاتی اور ریاضی
کے اصولوں کا اس پر اطلاق کیا جائے۔ اسی پر عمل کرنے کی پہلی منظم کوشش
غالباً ۱۹۵۹ء میں برطانیہ کے قومی طبیعیاتی تجربہ خانہ (National Physi-
cal Laboratory) میں شعبہ ہوابازی (Aeronautics) کے لیے ایک
مشاورتی کمیٹی کے قیام سے ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ
کی حکومت نے بالکل اسی قسم کا اقدام کیا۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم کی ضروریات
کے تحت ہوائی جہاز کی ساخت اور ترقی کے لیے جب سائنسی اصولوں سے
استفادہ کیا گیا تو وہ نمائشی غیر اہم مشین سے ترقی کر کے جنگی اغراض کے لیے
ایک موثر اور اہم سواری ہوگئی۔

جنگ عظیم کے دوران اس کی ترقی

پہلی جنگ عظیم کے مطالبات یہ رہے کہ ہوائی جہاز
زیادہ سے زیادہ وزن لے جاسکے رفتار میں اضافہ ہو، پرواز کی بلندی اور زیادہ ہو۔ ان
مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ انجن استعمال کیے جائیں
چنانچہ ۴۰۰ اسپی طاقت (Horse Power) کا امریکی لبرٹی انجن عالم
وجود میں آیا جو ان مطالبات کی تکمیل کرتا تھا۔ یوں تو ۱۹۱۵ء میں جرمنی نے
ایک نشستی ہوائی جہاز جرمن میکر کے نام سے تیار کر لیا تھا جو ہر قسم کی آزمائش
میں پورا اترتا تھا لیکن اس کے بعد ۲۰ سال گزر گئے بغیر اس کے کہ کوئی مزید
ترقی ہوتی۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں دوسری جنگ عظیم کی تیاریاں شروع
ہوئیں اور ہوائی جہاز کے بنانے کے لیے ہر جگہ صد فی صد دھاتی چادروں کا
ہی استعمال ہونے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایروناٹیکل (Aero nautical)
انجینیئری کی ترقی میں بڑی سرعت پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں اگرچہ کہ اندرونی
احتراقی (Internal Combustion) انجن ہی زیادہ استعمال کیے
گئے لیکن جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہی ٹربوجٹ (Turbo Jets) نے
ان کی جگہ لے لی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں جرمنی کے ایک لڑاکا طیارہ ہیکل ۱۷۸ He
نے ٹربوجٹ انجن کے ساتھ سب سے پہلی مرتبہ پرواز کی۔ جنگ کے دوران
جرمنی اور انگلستان میں اس پر سرگرم تحقیقات ہوئی۔ ۱۹۴۴ء کے موسم گرما
تک رائل ایرفورس نے گلوسٹر میٹیور (Gloster Meteor) کو سروس
میں داخل کر لیا اس کے فوری بعد ہی جرمن لفتھانسا نے ۲۶۲ Me لڑاکا
جٹ طیارہ کی تکمیل کر لی۔ اگرچہ جنگی اغراض کے لیے ٹربوجٹ طیاروں کو
انجینیئروں نے بڑی تیزی سے اختیار کر لیا لیکن تجارتی اغراض کے لیے اس
کو اختیار کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ اس میں ایندھن کا خرچہ غیر معمولی تھا
انجن میں ضروری تبدیلی کرکے تجارتی اغراض کے لیے اس وقت تک استعمال
نہیں کیا گیا جب تک کہ لگاتار تحقیقات کے بعد ایندھن کے خرچہ کو کافی طور
پر گھٹا نہ دیا گیا۔

جنگ کے بعد ترقی

جنگ کے بعد کے زمانہ ہی میں ٹربوجٹ اور راکٹ کی دریافت ہی سے تیز رفتار
طیارے بننے شروع ہوئے۔ ہوا سے تیز رفتار (Super Sonic) پہلا
ہوائی جہاز جس کا نام بل (Bell X-1) تھا امریکہ کے ایرفورس کیلی فورنیا
کے کپتان چارلس ای۔ ایگر نے تیار کیا۔ جب اس طیارہ کی رفتار آواز کی رفتار
کے برابر ہوئی یا اس سے بڑھ گئی تو ہوا کی بیرونی لہروں میں نمایاں فرق نمودار
ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی تحقیقاتوں کا رخ ہوائی حرکیات (Aero-
dynamics) توازن اور کنٹرول کی جانب موڑا گیا جس کے نتیجہ میں آواز
سے تیز رفتار طیارہ بنانا ممکن ہوسکا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں بڑی تیزی سے
تبدیلی آئی کیوں کہ ہوائی حرکیات (Aero dynamics) سے جہاز کی بناوٹ،
پرواز میں توازن اور کنٹرول کے متعلق نئی نئی معلومات سے بڑی مدد ملی۔
ان معلومات کے اطلاق نے ہوائی جہاز کے انصرام کار میں بڑی ترقی کی۔
جس کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے بسست رفتار ہوائی حرکیات
(Aerodynamics) کی جگہ ٹرانسونک (Tran Sonic) سپرسانک
(Super Sonic) اور ہائپرسانک (Hyper Sonic) ڈائنامکس
نے لی۔ ڈھانچہ کی بناوٹ کے لیے پتلا دھاتی خول اختیار کیا گیا جس کے لیے
نئی قسم کی ترقی یافتہ دھات تیار کرنے کی ضرورت پڑی جو المونیم میگنیشیم ٹائٹینیم
اور فولاد پر مشتمل تھی۔ اندرونی احتراقی انجن کی جگہ راکٹ اور ٹربوجٹ انجن
نے لے لی دستی کنٹرول خودکار کنٹرول میں تبدیل ہوگیا نتیجتاً ایروناٹیکل انجینیئر
میں ایک تاریخ ساز دور کا آغاز ہوگیا جس میں انجینیئروں کی جماعت کے لیے
مختلف سائنسی طریقوں کو منطقی طور پر استعمال کرکے نہایت وثوق کے ساتھ ان
کے ترقی یافتہ نتائج کی پیش قیاس کرنا ممکن ہوسکا۔

ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی ترقی بطور ایک پیشہ

ہوائی جہاز کے ڈزائن اور بناوٹ میں جب ریاضی اور طبیعیات کے اصولوں سے کام لیا جانے لگا تو ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں بطور ایک پیشہ کے ترقی ہونے لگی۔ جوں جوں ہوائی جہاز کی اہمیت بڑھنے لگی تو دنیا کے صنعتی طور پر اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک میں ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی پیشہ ورانہ سوسائٹیاں جنم لینے لگیں۔

انگلستان میں رائل ایروناٹیکل سوسائٹی جو ۱۸۶۶ء میں قایم ہوئی تھی اس ملک کی سب سے اہم ایروناٹیکل سوسائٹی بن گئی۔ ۱۹۳۳ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انسٹی ٹیوٹ آف ایروناٹیکل سائنس وجود میں آیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب فضا کی کھوج لگانے میں دلچسپی بڑھی تو امریکن انسٹی ٹیوٹ آف ایروناٹیکل اینڈ اسٹروناٹکس بنائی گئی جس میں انسٹی ٹیوٹ آف ایروناٹیکل سائنس ضم کرلی گئی۔

بنیادی اصول

تمام پروازی سواریوں پر ایروناٹیکل انجینیئرنگ کے ان بنیادی اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔

دھکیل (Propulsion) کا طریقہ نہایت موثر ڈھانچہ کم سے کم وزن اور زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو بیرونی خدوخال ایسے ہوں کہ پرواز میں متوازن ہوں (Aerodynamics) ہوائی حرکیات کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہو اس کا کنٹرول نہایت صحیح اور اس میں رہنمائی کا انتظام ہو ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر ڈزائن تیار کیا جائے تو ایسے ہوائی جہاز کی کارکردگی حسب خواہش ہوتی ہے۔ ان اصولوں کو سمجھنے کے لیے انجینیئرنگ سائنس کی ان شاخوں کا علم درکار ہے جو ڈھانچوں کی میکانیات، حرارتی حرکیات (Thermodybamics) سیالی حرکیات (Fluid Dynamics) اور برقی سائنس پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ بالآخر بنیادی سائنس یعنی طبیعیات کیمیا اور ریاضی پر مبنی ہوتے ہیں۔

تعلیمی پروگرام

ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی ابتدا مشی گن یونیورسٹی کے انجینیئرنگ کالج سے ہوئی جہاں فروری ۱۹۱۵ء سے باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس کے فوری بعد ماساچوسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی تعلیم شروع کر دی گئی۔

۱۹۲۷ء میں چارلس لنڈبرگ نے نیویارک سے پیرس کو تن تنہا پرواز کر کے سب کو متحیر کر دیا تو دنیا کی بیسوں یونیورسٹیوں نے ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد پندرہ بیس سال تک ایروناٹکس کا نصاب تعلیم محض میکانیکل انجینیئرنگ کے ساتھ اطلاقی ایروڈاینامکس (ہوائی حرکیات) اور ہوائی جہاز ڈزائن کرنے کے متعلق منتخب اسباق پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ ۳۰ء تک ہوائی جہاز کی ساخت بالکل پلوں اور عمارتوں کی تعمیر کی طرح ہوا کرتی تھی اس لیے ہوائی جہاز کے ڈزائن کرنے اور بنانے کے سارے کام سول انجینیئروں کے تفویض ہوا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے دہے میں جب پوستی تناؤ (Skin Stress) کے اکہرے خول (Monoque Shell) کے خواص کا علم ہوا تو سول انجینیئروں کے پرانے طریقہ کار سے ہٹ کر ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں ہوائی جہاز بنانے کے اسباق (Course) کو بھی علاحدہ نصاب تعلیم کے طور پر شریک کیا گیا۔

پھر جب ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں مزید ترقی ہونے لگی تو اس کو عام انجینیئری نصاب تعلیم سے نکال کر بہت سارے انجینیئرنگ کے مدارس میں اس کے لیے علیحدہ شعبے قایم کیے گئے۔ ایروناٹیکل انجینیئرنگ کے لیے تعلیمی نصاب کی بنیاد بنیادی سائنس کی تعلیم ہے یعنی ریاضی طبیعیات اور کیمسٹری اس کے بعد انجینیئرنگ سائنس کی وہ شاخیں آتی ہیں جو خواص مادہ غیر لچک دار اجسام مجسم میکانکس حرکیات سیالی میکانکس اور برقی سائنس پر مشتمل ہیں۔ سب سے آخر میں ایروناٹیکل انجینیئرنگ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نظری اور عملی ہوائی حرکیات تعمیری ڈھانچہ دھکیل (Propulsion) توازن اور کنٹرول کا جس میں خودکار کنٹرول بھی شامل ہے اور ڈزائن کا گہرا مطالعہ کرے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یونیورسٹی سطح پر انجینیئرنگ کی تعلیم کا معیار پیشہ ورانہ ترقیاتی کونسل برائے انجینیئرنگ تعلیم کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے اور اسی کی طرف سے کسی کالج کو ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں ڈگری دینے کا مجاز گردانا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ریاست ہائے متحدہ میں چالیس سے زائد کالجوں کو ایروناٹیکل یا فضائی انجینیئرنگ کے لیے ڈگریاں دینے کا مجاز گردانا گیا۔ اس تعداد میں وہ ادارے شامل نہیں ہیں جو میکانیکل انجینیئرنگ کی تعلیم کے ساتھ ایروناٹیکل انجینیئرنگ کو بطور اختیاری مضمون کے پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں۔

اگرچہ کہ یونیورسٹی گریجویٹوں (Graduates) کو ایروناٹیکل انجینیئرنگ میں کلیدی مقام حاصل ہوتا ہے لیکن عملی فن دانوں (Tech-nicians) کی طلب بہت زیادہ ہوگئی ہے اور چوں کہ یہ ایک اعلیٰ فنی کاروبار ہے اس لیے اس صنعت میں بالخصوص ریسرچ کے لیے سائنسی عملی اور فنی تعلیم یافتہ افراد کی بڑی تعداد بھی مشغول کی جاتی ہے۔ عملی فن دانوں کی تعلیم اور تربیت کا انتظام ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، جونیر کالج اور پروازی اسکول کرتے ہیں ایسے انسٹی ٹیوٹ نسبتاً کم مدت میں یعنی ایک یا دو سال میں ان کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں اس لیے ریاضی اور بنیادی سائنس کی سخت تعلیم جیسی کہ یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے یہاں نہیں دی جاتی۔ اس تعلیم و تربیت کا مقصد ان افراد کو فوراً ہی روزگار مہیا کرنا ہوتا ہے۔

ایروناٹیکل انجینیئر کی ذمہ داریاں

ایروناٹیکل انجینیئروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بڑی خانگی کمپنیاں جو ہوائی جہاز یا میزائل (Missile) بناتی ہیں یا وہ صنعتی ادارے جو خلائی جہاز بناتے ہیں اور ان کے معاون ادارے ملازمت دیتے ہیں ایسے اداروں یا کمپنیوں کے ایروناٹیکل انجینیئروں کی مصروفیات بڑی پیچیدہ ہوتی ہیں جو بنیادی معلومات کی تلاش میں ریسرچ سے لے کر سخت دھاتی ڈزائن اور پیداوار تک ہوتی ہیں۔ بہت سارے انجینیئر جن کو صنعتی کاموں میں مصروف کیا جاتا ہے وہ یونیورسٹی کی بی ایس سی ڈگریوں کے حامل ہوتے جو ایروناٹیکل انجینیئرنگ کی چار سالہ تعلیم کے بعد دی جاتی ہیں ویسے تو ایم ایس اور پی ایچ ڈی کی بھی ایک بڑی تعداد ان اداروں اور کمپنیوں میں داخل ہو رہی ہے۔

ان انجینیئروں کے لیے ایک بڑا ذریعہ معاش سرکاری ملازمت بھی ہے

یہاں ان کے فرائض میں خاص طور پر ریسرچ کرنا ترقی دینا اور سامان کی فراہمی (Procurement) ہوتا ہے۔ ایروناٹیکل انجینیروں کی ایک محدود تعداد کو ایرلائنس (Air Lines) اور یونیورسٹیوں میں بھی ملازمت ملتی ہے۔ ایرلائنس میں انجینیری سے متعلق اہم فرائض کو انجام دینا، آلات فراہم کرنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں ان کے فرائض نسبتاً کم ہوتے ہیں جو تعلیم، ریسرچ اور تجربہ خانوں (Laboratory) کے کاموں تک محدود ہوتے ہیں۔

ایروناٹیکل انجینیرنگ کا اہم ترین مقصد ریسرچ کرنا اور اس فن کو آئے دن ترقی دینا ہوتا ہے۔ حالیہ پیچیدہ قسم کے ہوائی جہازوں کی اعلیٰ کارکردگی کے مدنظر نئے نمونے تیار کرنے کے لیے ایک طول طویل ریسرچ کرنا، طریقۂ کار کو ترقی دینا اور نئے نمونوں پر پرواز ی تجربہ کرنا ہوتا ہے جس کے لیے سخت محنت اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے صنعتی اداروں سرکاری محکموں اور یونیورسٹیوں کے تجربہ خانوں میں سہولتیں حاصل ہیں۔ یہ واضح رہے کہ مختلف شعبوں کے ماہر انجینیروں کے اتحاد عمل ہی سے ایک اعلیٰ قسم کا ہوائی جہاز وجود میں آتا ہے۔

آیندہ کے لیے ترقیاتی منصوبے

حمل ونقل کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایروناٹیکل انجینیروں کی طلب میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جو اہم چیز حاصل کی گئی وہ تیز رفتار ہوائی جہاز کو بغیر نقصان پہنچائے ۱۵۰۰ ۴۵۰ میٹر کے فاصلے کے اندر ساکن کردینا ہے۔ اس قسم کے ہوائی جہاز بڑے بڑے شہروں سے ایسے چھوٹے شہروں تک بعجلت اور بآسانی پرواز کرسکتے ہیں جن کا فاصلہ ۱۰۰ تا ۱۰۰۰ میل یا ۱۶۰ تا ۱۶۰۰ کیلومیٹر) ہو۔ ایسے ہوائی جہازوں کو مضافاتی علاقوں سے بڑے شہروں تک لے جانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حمل ونقل کی بعجلت تمام تکمیل کے لیے دوسرا قدم آواز سے تیز (Super Sonic) ہوائی جہازوں کا ہوگا۔ جو دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان پرواز کریں گے تیسرا قدم موجودہ طویل مسافتی آواز سے کم رفتار (Super Sonic) ہوائی جہاز کو ان کے اعلیٰ ترین معیار تک لے جاتا ہوگا۔

ایک اور چیز جس پر آجکل تحقیقات ہورہی ہیں وہ شخصی ہوائی جہاز ہے جو نئی فنی معلومات کے ذریعہ ممکن ہوگا۔ غرض کہ فنی معلومات کے اضافے کے ساتھ ساتھ نئے نئے قسم کے ہوائی جہازوں کے بنائے جانے کے بڑے بڑے امکانات ہیں۔ مثلاً زمین تا زمین تیز ترین رفتار سے پہنچنے کے لیے اعلیٰ صلاحتیں پیدا کرنا خلائی ہوائی جہازوں کے فضا میں داغنے کے لیے طریقہ کار کو ترقی دینا۔ زمین کے اطراف ایک مدار میں رہنے والے خلائی شٹل کے ذریعہ کرۂ ہوائی اور خلائی پرواز میں ربط پیدا کرنا وغیرہ۔ اب صورت حال یہ ہے کہ متذکرہ بالا امور پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ اس وقت شٹل کے ذریعہ لیبارٹریاں مدار میں گھوم رہی ہیں جو مختلف سائنسی تجربے کرکے زمین کو بخیر وخوبی واپس ہوئے ہیں۔ امریکہ یکے بعد دیگرے دو وائکنگ کو مریخ پر اتار کر اس کی ماہیت کے تعلق سے مختلف تجربے کر رہا ہے اور ان کے نتائج مسلسل زمین تک پہنچ رہے ہیں جس سے توقع ہے کہ کائنات سے متعلق حیرت انگیز معلومات حاصل ہوں گی۔

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام

محمد رسول اللہ صلعم اور عہد مبارک

عرب میں قریش کا قبیلہ نہایت ممتاز اور نمایاں تھا۔ اس کی کئی شاخیں تھیں جس میں ہاشم، امیہ، نوفل، عبدالدار، مخزوم اور عدی بڑی شاخیں تھیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم میں ۱۲ر ربیع الاول مطابق ۱۷ر جون ۵۶۹ء بروز دوشنبہ عبدالمطلب کے گھرانہ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے[1]۔ والد کا نام عبداللہ تھا جو آپ کی ولادت سے دو ماہ پہلے انتقال کر چکے تھے، والدہ کا نام آمنہ تھا۔ اسم مبارک محمدؐ اور احمد رکھا گیا؛ دونوں کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ ولادت کے بعد پہلے آپ کی والدہ ماجدہ نے دودھ پلایا، پھر عرب شرفا کے دستور کے مطابق چند روز کے بعد حلیمہ سعدیہ، جو قبیلہ ہوازن کی تھیں، آپ کو اپنے گاؤں لے آئیں اور آپ کی رضاعی ماں بن گئیں۔ آپ کے چار دودھ شریک بھائی بہن تھے جن میں آپ حلیمہ کی لڑکی شیماء سے زیادہ مانوس تھے، اکثر اس کی گود میں رہتے تھے۔ جب آپ چھ برس کے ہوئے تو آپ اپنی والدہ ماجدہ کے پاس آ گئے۔ کچھ روز کے بعد وہ آپ کو لے کر اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کرنے اور بعض رشتہ داروں سے ملنے مدینہ گئیں۔ ایک ماہ کے قیام کے بعد جب مدینہ سے واپس ہو رہی تھیں تو ابواء نامی ایک مقام پر ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ یتیم تو پیدا ہی ہوئے تھے اب شفقت مادری سے بھی محروم ہو کر یسیر ہو گئے۔ آپ کی دایہ اُمِ ایمن ہمراہ تھیں ان کے ساتھ مکہ آئے۔ اور اپنے دادا عبدالمطلب کے ساتھ رہنے لگے۔ آپ کی عمر آٹھ برس کی ہوئی تو آپ کے دادا بھی ۸۲ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب آپ کو آپ کے چچا ابوطالب نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کا پورا حق ادا کیا۔ ایک مرتبہ ابوطالب تجارت کے لیے شام کے سفر پر روانہ ہونے لگے تو آپ نے بھی ان کے ساتھ چلنے کی ضد کی، انہوں نے آپ کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت آپ کی عمر بارہ برس کی تھی شروع سے آپ قریش کے معاشرتی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ ہر کام کو سچائی اور دیانتداری سے انجام دینے کے باعث آپ کو الصادق الامین کا لقب ملا جب قریش کے مختلف خاندانوں نے حلف الفضول کا معاہدہ کیا اس کے تحت یہ طے ہوا کہ وہ باہم جنگ و جدال نہیں کریں گے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کسی ظالم کو مکہ میں پناہ نہ دی جائے گی اس معاہدہ کو آپ کی شرکت اور پرجوش تائید حاصل تھی۔ اس طرح قریش کی قرارداد کے مطابق جب کعبہ کی تعمیر نو شروع ہوئی تو خود آپ بھی اس میں شریک تھے اور کاندھے پر لاد کر پتھر لاتے تھے۔ اس سلسلہ میں حجر اسود کے نصب کرنے کے بارے میں تنازعہ رونما ہوا تھا اسے آنحضرت کی فراست نے ختم کیا۔

قریش کا عام ذریعہ معاش تجارت تھا۔ آپ نے بھی اس کو اختیار فرمایا جب آپ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو آپ کی دیانت اور راست بازی کی شہرت سن کر خدیجہ بنت خویلد نے آپ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔ وہ قریش کی ایک متمول اور معزز بیوہ خاتون تھیں۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ آپ نے اپنے چچا ابوطالب کے مشورہ سے پیغام کو قبول کر لیا۔ اب آپ نے حضرت خدیجہ کے تجارتی کاروبار کے سربراہ کی حیثیت سے شام، بصرہ اور یمن کے متعدد نفع بخش سفر کیے۔

آپ تلاش حق کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ یکسوئی کے ساتھ کنہ حیات پر غور و خوض کرنے کے لیے آپ اکثر مکہ معظمہ کے تین میل دور حرا نامی ایک غار میں چلے جاتے ایک دن جب آپ مراقبہ میں مشغول تھے آپ کو ایک فرشتہ نظر آیا جس نے آپ کو نبوت کا مژدہ سنایا۔ یہ نزول وحی کی ابتدا تھی۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس برس کی تھی عرب سوسائیٹی کو جو کفر و شرک میں جکڑی ہوئی تھی، آپ نے توحید کی دعوت دی اور برے کاموں کے انجام سے ڈرایا مگر چند لوگوں کے سوا جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا مکہ کی بیشتر آبادی آپ کی سخت مخالف ہو گئی۔ قریش ان میں سب سے پیش پیش تھے ان لوگوں نے آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی نبوت کے پانچویں برس آپ کے حکم سے دس مسلمان مردوں اور پانچ مسلمان عورتوں نے حبشہ جا کر پناہ لی۔ اس کے دو برس بعد جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتوں کا ایک اور قافلہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچا۔ جب آپ کے چچا حضرت حمزہ اور مکہ کے ایک با اثر سردار حضرت عمر بھی مسلمان ہو گئے تو قریش نے مشتعل ہو کر (دارالندوہ میں) آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اب مکہ میں رہ کر اسلام کی اشاعت اور زیادہ دشوار ہو گئی تھی اس لیے مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کی دعوت پر آنحضرتؐ نے ہجرت کا فیصلہ کیا آپ کے کچھ جاں نثار پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ قریش نے آپ کا تعاقب کیا مگر آپ

---

[1] آنحضرتؐ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مورخین میں کافی اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ آپ کی پیدائش ۵۷۰ء میں ہوئی۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی میں ۹ر ربیع الاول ۵۷۱ء لکھی ہے۔

کا بال بیکا نہ کر سکے۔ حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو جمعہ کے دن مدینہ پہنچے۔ مکہ کے باقی ماندہ مسلمان بھی آگے پیچھے آگئے اب ان مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ پیدا ہوا تو آپ نے اس کا کامیاب حل اس طرح سے نکالا کہ انصار اور مہاجرین میں "مواخات" کرا دی یعنی وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ انصار نے مہاجرین کو اپنے مکان اور دولت میں برابر کا شریک کر لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد، قریش کی معاندانہ سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ انہوں نے ایک طرف مدینہ کے یہود قبائل کو آپ کی مخالفت پر اکسایا ان میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سب سے زیادہ معروف اور بااثر تھے دوسری طرف جو قبائل مکہ سے مدینہ کے درمیان آباد تھے ان کو شورش پر آمادہ کیا۔ اس لیے بعض ارباب سیر کے بیان کی رو سے آپ نے فیصلہ کیا کہ مدینہ کے راستے سے قریش کا جو کارواں تجارت کے لیے شام جایا کرتا تھا اس کی راہ مسدود کر کے ان کی تجارتی لائن کاٹ دی جائے تاکہ وہ معاندانہ سرگرمیوں سے باز آجائیں۔ چنانچہ مدینہ کی راہ سے قریش کے کسی کاروانِ تجارت کے گزرنے کی اطلاع ملی تو اس سے تعرض کرنے کے مقصد سے سرایا بھیجے گئے۔ غزوۂ بدر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مگر مولانا شبلی نے اپنی سیرۃ النبی کی پہلی جلد میں کلام پاک اور حدیث کی روشنی میں مدلل بحث کر کے اس کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ غزوہ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا بلکہ قریش کی لشکر کشی کا مقابلہ کرنا تھا۔ آپ مدینہ سے اس وقت نکلے جب آپ کو قریش مکہ کے حملہ کی خبر ملی اور آپ بدر کے مقام پر اس وقت پہنچے جہاں قریش پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ دراصل وہ مہمات جو سرایا کے نام سے موسوم ہیں۔ نہ صرف قریش کے حملوں اور منصوبوں سے دفاع کے لیے تھیں بلکہ مدینہ کے قرب و جوار ہر سمت میں اسلام کا پیغام پہنچانے اور قبائل سے صلح کے معاہدے کرنے کے لیے بھیجی جاتی رہیں۔

تمام غزوات کا بنیادی سبب تو یہ تھا کہ قریش اسلام کو پنپتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب اسلام کے پیروؤں نے مدینہ میں پناہ لی تو یہ بھی انہیں سخت ناگوار ہوا۔ انہوں نے مدینہ کے سرداروں کو خطوط لکھے کہ مسلمانوں کو اپنے یہاں سے نکال دو ورنہ ہم ان کے ساتھ تمہیں بھی فنا کر دیں گے۔ اس بنیادی سبب کے علاوہ دوسرے اسباب بھی موقع بہ موقع کارفرما رہے۔

غزوہ بدر رمضان کی ۱۷ تاریخ تھی مدینہ سے اسّی میل مقام بدر میں دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ آپ نے جاں نثاروں کو تلقین فرمائی کہ فتح و نصرت، کثرتِ تعداد اور آلاتِ حرب پر نہیں۔ خدا کی مدد اور صبر و استقامت پر موقوف ہے۔ پھر آپ نے خود کھڑے ہو کر صفیں درست کیں۔ اس کے بعد آپ ایک خیمہ میں جا کر گریہ و زاری کے ساتھ دعا میں مشغول ہو گئے۔ جنگ شروع ہوگئی، قریش کو اپنی تعداد اور اسلحہ پر ناز تھا مسلمانوں کی نظر نصرت خداوندی پر تھی، وہ حق کے لیے سربکف تھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ درجہ کی روحانی اور حربی قیادت کے ماتحت شجاعت کے جوہر دکھائے۔ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ پسپا ہو کر فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ اس جنگ میں قریش کے ستر منتخب بہادر سردار ہلاک ہوئے اور ستر ہی قید ہوئے مسلمانوں میں بائیس مجاہد شہید ہوئے جن میں ۱۴ مہاجر اور ۸ انصار تھے۔

قریش کو بدر میں شکست کھانے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس پسپائی سے ان کا جوشِ انتقام اور بھڑک اٹھا۔ کئی بار قریش کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوئی آخر ۳ھ میں انہوں نے تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات سو مجاہدین کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ مگر اس جنگ میں مسلمانوں کا ان کی ایک ذرا سی بے احتیاطی سے کافی نقصان ہوا حتیٰ کہ آنحضرت بھی زخمی ہوئے اور ۷۰ مجاہدین شہید ہوئے یہ جنگ ۷ یا ۱۵ شوال کو مدینہ سے دو میل شمال کی طرف احد پہاڑ کے دامن میں ہوئی۔

بدر میں اسلام کی عظیم الشان فتح مدینہ کے یہودیوں کو ناگوار گذری۔ انہیں نظر آنے لگا کہ اسلام کی پیش رفت کا مطلب ان کی برتری کا خاتمہ ہے یہودیوں کا لین دین مدینہ اور اس کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ سود کی عدم ادائگی کی صورت میں وہ لوگوں کے بچوں اور عورتوں تک کو رہن رکھ لیتے تھے۔ اسلام کے فروغ سے انہیں اپنے جفا پیشہ اقتدار کا جال ٹوٹتا نظر آیا۔ لوگ ان کے شکنجوں سے نکل کر اسلام کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ یہودیوں نے اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ آخر شوال ۲ھ میں ان کے ایک قبیلے بنو قینقاع نے یہود اور اہل اسلام کے مابین جو معاہدہ تھا اسے ختم کر کے جنگ کا اعلان کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے خلاف فوج کشی کی تو یہ قلعہ بند ہو گئے ۱۵ دن کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کو معاہدہ شکنی کی پاداش میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد قبیلہ بنو نضیر کی باری آئی جنگِ احد کے بعد جب ان کی فتنہ پردازی بڑھی تو یہ بھی جلاوطن کر دیے گئے۔ انہوں نے خیبر میں جا کر قیام کیا۔ ان دونوں قبیلوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنا مال و متاع ساتھ لے جائیں۔ اس کے باوجود بنو نضیر چین سے نہیں بیٹھے، انہوں نے عرب قبائل کو بھڑکایا اور ۲۴ ہزار کی دل بادل فوج کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔

ذوقعدہ ۵ ہجری میں غزوہ احزاب میں فریقین کی ٹکر ہوئی، مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسی کے مشورہ پر تحفظ کے لیے خندق کھود لی تھی اس لیے ان حملہ آوروں نے مدینہ کا محاصرہ تو کر لیا، مگر اپنی جنگی کارروائیوں میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر پائے۔ ایک ماہ کے بعد جب موسم ان کے خلاف ہو گیا تو یہ ناکام و نامراد واپس ہو گئے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کی طرف توجہ کی جنہوں نے درپردہ اسلام کے معاند قبائل سے ساز باز کر رکھی تھی اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ آخر کار خود ان کے حلیف سعد بن معاذ کے فیصلے کے مطابق جو تورات کے حکم پر مبنی تھا ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی جو قریش کے ساتھ مراعات پر مبنی تھی۔ مگر جب قریش نے شرائط صلح کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار فوج کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھے قریش کے لیے اب اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس طرح رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا لیکن آپ نے کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا اور سب کو معاف کر دیا۔

فتح مکہ نے ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کو اور مشتعل کر دیا ابھی مسلمان مکہ میں ہی تھے کہ یہ بڑے جوش و خروش سے جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ بارہ ہزار فوج کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے آپ کے ساتھ دو سو کے قریب وہ قریش بھی تھے جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے یہ ۸ھ کے شوال کی بات ہے، مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء۔ لڑائی حنین میں ہوئی جو مکہ سے تین دن کی مسافت پر ہے۔ اگرچہ غزوہ کی ابتدا میں مسلمان میدان

میں جم نہ سکے اور بکھر نے لگے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار نے مجاہدوں میں جان ڈال دی اور وہ اس بہادری اور ثابت قدمی سے لڑے کہ دشمن کی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ شکست خوردہ فوج کچھ اوطاس اور کچھ طائف میں جمع ہوئی اوطاس میں تو معمولی جھڑپیں ہوئیں۔ البتہ طائف کا بیس دن تک محاصرہ کیا گیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فتح مکہ اور واقعۂ حنین کے بعد قبائل کا زور ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ صرف اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر محاذ آرائی کر رہے ہیں اس لیے آپ نے طائف کا محاصرہ اٹھا لیا۔ بعد میں ہوازن ثقیف اور ان کے حلیف قبائل سب ہی مسلمان ہو گئے۔ ان غزوات کے علاوہ شام کی سرحد پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ (۸ھ / ۶۳۴ء) میں اور دوسری مرتبہ ۹ھ / ۶۳۵ء میں فوج بھیجی پہلی مہم غزوہ موتہ اور دوسری غزوہ تبوک کے نام سے موسوم ہے لیکن ان میں فتح و شکست کا فیصلہ نہیں ہو سکا، غزوہ موتہ کے موقع پر لشکر اسلام صرف تین ہزار پر مشتمل تھا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر کے قتل کا انتقام لینے بھیجا گیا تھا۔ دوسری طرف فوج ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اسلامی فوج کے قائد خالد بن ولید نے یہ رنگ دیکھا تو تھوڑی سی جنگی کارروائی کے بعد مصلحت اسی میں سمجھی کہ اسلامی فوج کو لے کر صحیح سلامت مدینہ واپس آ جائیں۔ اس سے رومیوں کے حوصلے بڑھ گئے ان کے بادشاہ ہرقل نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کا ارادہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باوثوق ذرائع سے اس کا علم ہوا تو آپ تیس ہزار کی جمعیت اور دوسرے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن تبوک مدینہ اور دمشق کے وسط میں مدینہ سے چودہ منزل کی مسافت پر ہے، وہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ خبر بالکل غلط تو نہ تھی لیکن وہاں غنیم کی فوج دکھائی نہیں دی اس لیے آپ واپس، مدینہ آ گئے لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ متعدد عرب قبائل جو سرحد پر آباد اور مذہباً عیسائی تھے جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے۔

دشمنوں سے عہدہ برآ ہونے کی مصروفیات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لمحہ کے لیے اپنے فریضۂ رسالت اور تبلیغ اسلام سے غافل نہیں ہوئے صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد آپ کو قریش کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو آپ نے روم، ایران، مصر اور روسائے عرب کے تام جلیل القدر صحابیوں کے ہاتھ خطوط ارسال کیے۔ خطوط کے مضامین تو مختلف تھے لیکن بنیادی مضمون دعوتِ اسلام تھی۔ عرب میں امن و امان قائم ہوتے اور اسلام کا بول بالا ہوتے ہی قبائل کے وفود کثرت سے آنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان وفود کو دین اسلام کی بنیادی تعلیم سے آگاہ کرتے۔ یہ وفود واپس جا کر اپنے اپنے قبیلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور شخصیت کی نسبت اپنے تاثرات کا اظہار کرتے اور انہیں اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک جو لوگ اسلام کے دائرہ سے باہر تھے وہ بھی اس کے حصار میں آ گئے۔ ان وفود کی کثرت سے آمد فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں ہوئی۔ اس بنا پر تاریخ اسلام میں اس کا نام ہی سنہ وفود ہو گیا۔

۱۰ ہجری میں آنحضرت نے حج کا ارادہ کیا۔ یہ آپ کا آخری حج تھا اس لیے اس کو حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ مسلمان آپ کے ہمراہ حج کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کم و بیش ایک لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ساتھ حج ادا کیا۔ اس موقع پر آپ نے (حسب روایات مختلف) متعدد خطبے دیے ان میں آپ نے جو کچھ فرمایا ان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ آپ نے فرمایا اب جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اے لوگو! یاد رکھو تمہارا پروردگار ایک ہے اور تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ خبردار کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی برتری نہیں۔ ان کی برتری ان کی پرہیزگاری کی بنیاد پر ہے، تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جو تم کھاتے اور پہنتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور پہناؤ، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ جاہلیت کے تمام خون (یعنی اگر کسی پر انتقام واجب ہو) اب باطل کر دیے گئے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ایک شخص ربیعہ بن الحرث کا خون معاف کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ عورتوں پر تمہارا اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ اس موقع پر آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا کہ کل جب اللہ میرے متعلق تم سے سوال کرے گا تو تم کیا جواب دو گے سب نے عرض کیا ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپ نے یہ سن کر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ۔ اس وقت وہ آیت بھی نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے مذہب اسلام کا انتخاب کیا۔

اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے متعلق صحابہ سے سوال کرنے اور پھر مذکورہ بالا آیت کے نازل ہونے سے ظاہر ہو گیا کہ اب دنیا سے آپ کے رخصت ہو جانے کا وقت کچھ زیادہ دور نہیں، پھر آپ نے خود ہی فرمایا "مجھ سے تم حج کے مسائل سیکھ لو شاید اس کے بعد مجھ کو دوسرے حج کا موقع نہ ملے"۔ جب مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا تو حضرت ابوبکرؓ آپ کی دائمی جدائی کے خیال سے رو پڑے۔

قرآن مجید مکمل اور جامع دستور حیات ہے، اس میں معیشت و معاشرت کے احکام اخلاق و فضائل کے قوانین، خدا کی ذات و صفات، نبوت کی حقیقت، انبیائے کرام کے فرائض و خصائص حیات مابعد الموت، خیر و شر، نفع و ضرر کا معیار، اقوام کے عروج و زوال کے اسباب و علل، علم و حکمت کی اہمیت و ضرورت، انسانی فطرت کے پیچ و خم، اس کے اعتبار سے انسانوں کے مختلف طبقات، اشیا کے حسن و قبح، انسانی اعمال و افعال کی قدریں، اعتقاد کی بنیادیں اور عقیدہ و عمل میں باہمی ربط، غرض کہ انفرادی، اجتماعی، روحانی اور مادی زندگی کے بنیادی مسائل کی جامع اور واضح ہدایتیں اس میں موجود ہیں۔ قرآن کی ان تعلیمات اور ان میں شمولہ اصول حیات کے ذریعہ آپ نے انسانی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کیا۔ اسلام نے ایک طرف اخلاق و فضائل، صدق و صفا، سوز دروں اور نگہ پاک و راست روی اور خدمت خلق کو عام کیا، دوسری طرف علوم و فنون کو حیرت انگیز فروغ دیا۔ اسلام کے زیر سایہ، سیاست اور مدنیت کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اور تاریخ انسانی کو ایک نیا موڑ ملا۔

آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے خاتمہ پر دوبارہ پوچھا الاھل بلغت کیوں میں نے پیغام خداوندی پہنچا دیا؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا ہاں بے شک! آپ نے فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اے خدا تو گواہ رہ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا "فلیبلغ الشاھد الغائب، جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس میں اشارہ اس حکم کی طرف تھا کہ آپ کے بعد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام جاری رہنا چاہیے۔ خطبہ ختم ہو گیا تو آپ نے سب مسلمانوں

کو الوداع کہا۔

حج سے فارغ ہوکر مدینہ آنے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد آپؐ کی طبیعت ناساز ہوئی۔ آپؐ خود ہی علاج کی مختلف تدبیریں کرتے رہے مرض گھٹتا بڑھتا رہا۔ آپؐ اس عالم میں بھی ارشاد وہدایت کی باتیں کرتے مرض میں زیادہ شدت ہوئی تو غشی کا غلبہ ہوا اس حالت میں بھی آپ کی زبان مبارک سے اکثر اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ کے الفاظ نکلتے تھے۔ آخر وقت موعود آپہنچا اور طائر روح قفس عنصری سے آزاد ہوگیا۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مولانا شبلی نے کافی بحث کے بعد یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ مطابق ۸ / جون ۶۳۲ء مقرر کی ہے۔

آپ کے ذاتی اخلاق وعادات کی نسبت حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ سے بڑھ کر اور کس کا بیان معتبر ہوسکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کی عادت کسی کو بُرا کہنے کی نہ تھی۔ برائی کے بدلے برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگزر کرکے معاف کر دیتے تھے۔ آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اسے اختیار کرتے بشرطیکہ گناہ نہ ہو۔ آپ نے کبھی اپنے ذاتی معاملہ میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ نام لے کر کسی مسلمان پر لعنت نہیں بھیجی۔ کسی غلام، باندی، خادم حتیٰ کہ کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ کسی کی کوئی جائز درخواست رد نہیں کی۔ گھر میں ہنستے اور مسکراتے ہوئے تشریف لاتے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے، اور باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے۔

امام حسینؓ نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے آپؐ کے اخلاق وعادات کی نسبت دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا آپؐ خندہ جبیں، نرم خو اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے۔ بات کرنے میں شور نہیں کرتے تھے بُرا کلمہ زبان سے نہیں نکالتے۔ عیب جو نہ تھے۔ ایسی بات سے جو آپ کو ناپسند ہوتی چشم پوشی کرتے۔ اپنے نفس سے تین چیزیں بالکل دور کر دی تھیں۔ ۱۔ بحث ومباحثہ ۲۔ ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور ۳۔ جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں نہ پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز فرماتے۔ کسی کو بُرا نہیں کہتے، کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے اور کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکلتا۔ جب آپ بات چیت کرتے تو صحابہ اس طرح خاموش اور سر جھکائے سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ خاموش ہوجاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت شروع کر دیتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا آپؐ خاموشی سے سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں سے ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے۔ جن باتوں پر لوگ تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی کرتے۔ کوئی اجنبی آدمی بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپؐ بُردباری سے کام لیتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہ کرتے لیکن اگر کوئی آپ کے احسان کا شکریہ ادا کرتا تو اسے قبول فرماتے جب تک بات کرنے والا خود چُپ نہ ہوجاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہ کاٹتے۔ آپ نہایت فیاض، راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعتاً آپ کو دیکھتا مرعوب ہوجاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔

آپؐ ہمہ خوبی مجسمۂ اخلاق اور اعلیٰ انسانیت کے پیکر تھے۔ بقول حضرت عائشہؓ آپ کا اخلاق قرآن کی شرح تھی۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ آپ نے پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہ سے پہلی شادی کی جو چالیس برس کی تھیں ان کے دو شوہر وفات پا چکے تھے۔ پچاس برس کی عمر تک آپؐ نے کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔ حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد تبلیغی اور سیاسی ضرورتوں سے آپؐ نے متعدد نکاح کیے۔ آپؐ کی ازواج مطہرات کے نام یہ ہیں۔

حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب ام المساکین حضرت ام سلمہ، حضرت زینب، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت میمونہ اور حضرت صفیہ۔ آپ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ متفق علیہ یہ بات ہے کہ آپؐ کے دو صاحب زادے تھے دونوں کا انتقال صغر سنی میں ہی ہوگیا۔ ایک کا نام قاسم تھا جن کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوالقاسم تھی اور صحابہ اسی کنیت سے عموماً آپ کو خطاب کرتے تھے دوسرے کا نام ابراہیم تھا چار صاحبزادیاں تھیں۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت اُم کلثوم اور حضرت فاطمۃ الزاہرا۔ تمام صاحب زادیاں اور قاسم حضرت خدیجہ کے بطن سے تھے۔ قاسم اور ابراہیم کا انتقال شیر خوارگی میں ہوگیا صاحبزادیوں نے عمر پائی اور ان کا شادی بیاہ ہوا۔

عہدِ خلفائے راشدین

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے لے کر وفات تک ایک نبی، ایک قانون ساز، ایک حاکم عدالت، ایک سپہ سالارِ عساکر اور ایک صدرِ مملکت کی حیثیت سے بڑے اہم فرائض انجام دیے۔ آپ کی وفات کے بعد سوال یہ تھا کہ آپ کا جانشین کون ہو۔

جانشینی کا مسئلہ اور مسلمانوں میں اختلاف رائے

رسول اکرمؐ نے خود کوئی جانشین منتخب نہیں فرمایا۔ اس بنا پر خلیفہ کا انتخاب وہ پہلا پیچیدہ مسئلہ تھا جس کا سامنا اسلام کو کرنا پڑا جیسا کہ عام طور پر پیش آتا ہے جب کبھی کوئی اہم اور سنگین مسئلہ عوامی فیصلہ کا محتاج ہوتا ہے تو کئی ایک مختلف الخیال جماعتیں سیاسی اُفق پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد بھی یہ ضرورت پیش آئی ایک طرف مہاجرین تھے جن کا تعلق زیادہ تر رسول کریمؐ کے قبیلہ قریش سے تھا انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا حضرت امام بخاری کے استاد حمیدی کی روایت ہے کہ مدینہ میں اس وقت مہاجرین کی اکثریت تھی۔ (بحوالہ مسند حمیدی حیدرآباد) دوسری طرف انصار تھے جنہوں نے پیغمبر اسلام کو مدینہ میں پناہ دی تھی یہ دونوں جماعتیں مل گئی تھیں اور ایک تیسری جماعت اصحاب الناس والطاعین کی تھی جس کا استدلال یہ تھا کہ اہل ایمان کو انتخاب کے محض اتفاقی حادثہ یا خیالی منصوبہ کے حوالے نہیں کیا جاسکتا، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ ہی رسول اللہ کے صحیح نامزد کردہ جانشین ہیں کیوں کہ وہ رسول اللہ کے چچازاد بھائی، آپؐ کی چہیتی صاحبزادی فاطمہؓ کے شوہر تھے جو آپ کے انتقال کے بعد زندہ رہیں اور ان دو تین اشخاص میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ آخری مگر نہایت اہم جماعت بنی امیہ کے قبیلہ کی تھی طلوع اسلام سے قبل اقتدار، قوت اور دولت اسی کے پاس تھی اس نے سب سے آخر میں اسلام قبول کیا تھا۔ اس کی قیادت ابوسفیان کو حاصل تھی جنہوں نے فتح مکہ کے زمانہ تک رسول اللہ کی مخالفت کی۔

جانشینی یا حصول خلافت کے سلسلہ میں بالآخر فیصلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں ہوا۔ ان کے ہاتھ پر صحابہ کرام نے بیعت کی جو مسئلہ خلافت کے تصفیہ کے لیے ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے خسر ان تین چار افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

صدیقی عہد خلافت کے مہمات امور

حضرت ابوبکرؓ کا عہد خلافت ۲۲ صفر (۱۱ - ۲۴ جمادی الآخر ۱۳ھ / ۶۳۲ - ۶۳۴ء) دو سال چار ماہ کی مختصر مدت پر مشتمل تھا۔ اس قلیل عرصہ میں آپ نے اسلامی حکومت کے مہمات امور سے متعلق فیصلہ کن اقدام فرمایا۔

ارتداد کا انسداد اور نبوت کے دعویداروں کے خلاف جہاد

پہلی مہم ارتداد کا انسداد تھا رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد قبائلی سردار مثلاً بحرین میں نعمان بن منذر اور عمان میں ابن مالک، جدید اسلامی مملکت سے نہ صرف منحرف ہو گئے بلکہ متعدد جھوٹے اور نام نہاد رسولوں کی پیروی کرنے لگے جن میں اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد اور مسیلمہ کذاب قابل ذکر ہیں۔ مسیلمہ کذاب سب سے زیادہ با اثر تھا اس نے چالیس ہزار سپاہ کی طاقتور فوج بھی جمع کر لی حضرت ابوبکرؓ نے منصب خلافت پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے اسامہ بن زید بن حارثہ کی سرکردگی میں شام کی طرف وہ مہم روانہ کی جس کے بھیجنے کا عزم رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا۔ اس مہم میں کامیابی کے بعد آپ نے مرتدین سے غیر مشروط اطاعت طلب کی۔ جب انہوں نے اطاعت قبول نہیں کی تو آپ نے جہاد کا اعلان فرمایا جس کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید نے کی اور صرف (۶) ماہ کے اندر تمام قبائل کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ یمامہ کی جنگ میں مسیلمہ کی چالیس ہزار کی فوج کو شکست فاش دے کر ارتداد کے خطرناک فتنہ کا خاتمہ کر دیا۔

منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد

اس کے بعد خلیفۂ اوّل منکرین زکوٰۃ کی طرف متوجہ ہوئے عبس ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور بنو فزارہ نامی قبائل نے جو مدینہ کے اطراف و اکناف میں مقیم تھے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے بعض کا دعویٰ یہ تھا کہ زکوٰۃ کی رقم مدینہ کے بیت المال میں داخل کرنے کے بجائے وہ اپنے قبائل میں خود تقسیم کریں گے۔ ان قبائل کا ایک وفد مدینہ آیا اور بعض اکابر صحابہؓ سے گفتگو کر کے ان سے درخواست کی کہ ان کے مقدمہ میں خلیفہ سے سفارش کی جائے۔ چنانچہ ان صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس اس وفد کی نمائندگی کی کہ ان کو زکوٰۃ ادا کرنے سے مستثنیٰ کیا جائے کیونکہ وہ نو مسلم ہیں اور جب ان کے قلوب میں اسلام راسخ ہو جائے گا تو وہ خود بخود زکوٰۃ ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے قبائلیوں کے اس مطالبہ کو اسلام کے بنیادی معاشرتی قانون کے خلاف بلکہ ایک چیلنج قرار دیا آپ نے فرمایا کہ "غربا کے حق میں زکوٰۃ اہل دولت پر فرض ہے۔ خدا کی قسم اگر مسلمانوں کا کوئی ایک گروہ ایک بھیڑ کی حد تک بھی زکوٰۃ دینے سے جو وہ عہد نبوت میں دیتا تھا انکار کرے تو میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ چنانچہ آپؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف فوج کشی کر کے اس فتنہ کا انسداد فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ قدم بڑا انقلابی تھا جہاں اس نے تقسیم و گردش دولت کی ضرورت محسوس کرائی گئی وہاں رعایا کو رعایا ہونے کا احساس بھی دلایا گیا ورنہ اس سے پہلے عرب میں قبیلے کے تبع اور بزرگ خاندان کے سوا کسی اور انسان کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔

بیرونی مخالف طاقتوں کی سرکوبی

جزیرہ العرب میں استحکام اور وحدت پیدا کرنے کے بعد آپ نے مختلف بیرونی طاقتوں یعنے ایران میں ساسانیوں اور شام میں رومیوں کی طرف توجہ کی جو عرب قبائل ان ملکوں کی سرحدوں پر آباد تھے ان کو ان قوموں نے اپنا باج گزار بنا لیا تھا اور ان کے ساتھ ان کا معاملہ توہین آمیز تھا۔ عرب قبائل جب کبھی موقع ملتا انتقاماً ان پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ وائل کے دو سرداروں مثنیٰ بن حارثہ اور سوید عجلی نے عراق کے مقامات ابلہ اور حیرہ پر تاخت کی اور حضرت ابوبکرؓ سے مدد طلب کی تو آپ نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے حیرہ کے میدان میں ایرانی فوج کو شکست فاش دے کر اسے فتح کر لیا۔ اس سے فارغ ہو کر خالد بن ولید نے خلیفہ کے حکم سے شام کا رخ کیا وہاں کچھ اسلامی لشکر دوسرے سرداروں کی سرکردگی میں پہلے سے موجود تھے۔ خالد بن ولید نے متحدہ افواج کے سپہ سالار کی حیثیت سے کچھ ایسی بہادرانہ کارروائی کی کہ بصرہ فحل اور اجنادین یکے بعد دیگرے فتح ہوئے ان فتوحات کے بعد دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے ذاتی خصائل

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مختصر سے عہد خلافت میں اسلامی مملکت کی توسیع اور استحکام کا جو کام انجام دیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ نظم و نسق کے ہر معاملہ میں آپ نے طریقۂ سنت کو اپنا رہنما بنایا۔ آپ نے اپنی اصابت رائے اور حسن تدبیر کا لوہا منوا لیا تھا۔ نیز انتظام مملکت میں آپ کی بصیرت مسلمہ تھی۔ مسند خلافت پر فائز ہوتے ہی افتتاحی خطبہ میں آپ نے اپنی حکمت عملی کا اصول یہ بیان کیا کہ۔

> "تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں دوسروں سے اس کا حق نہ دلا دوں اور تمہارا قوی شخص بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق واپس لے کر مستحقین کو نہ دلا دوں۔"

کسی مملکت کے فرائض کی تعبیر اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے بہ حیثیت خلیفہ دیانت کا انتہائی بلند معیار قائم کیا۔ اپنے عہد خلافت کی مختصر سی مدت میں جو معاوضہ بیت المال سے حاصل کیا تھا اس کا حساب لگا کر اپنے صاحب زادے کو وصیت فرمائی کہ آپ کی ذاتی اراضی فروخت کر کے محسوبہ رقم بیت المال میں داخل کر دی جائے آپ نے تدبر، اخلاق حسنہ اور ایثار کا جو بلند ترین معیار قائم کیا وہ انسانی دنیا کے لیے ہدایت و رہنمائی کا روشن مینار ہے۔

تدوین قرآن

عہد خلافت صدیقی کا ایک اور اہم کارنامہ تدوین قرآن کی ابتدا ہے۔ حضرت عمرؓ کے مشورہ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے اشتراک سے آپ نے قرآن کے متفرق اجزا کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں مدون کیا۔ اس وقت تک یہ تمام آیتیں کھجور کے پتوں، چمڑے کے ٹکڑوں، لکڑی کے تختوں، پتھروں اور ٹھیکریوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ اس طرح تدوین قرآن کی جانب پہلا قدم آپ کی جانب سے اٹھایا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اس کی نقلیں کرائی گئیں اور بڑے بڑے شہروں کی جامع مساجد میں رکھی گئیں۔

حضرت عمر ابن الخطابؓ

(خلیفہ دوم)

عہد خلافت ۱۳ھ – ۲۳ھ مطابق ۶۳۴ء – ۶۴۴ء

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمر ابن الخطابؓ کو خلیفہ نامزد کیا تھا آپ کا تعلق قبیلہ قریش کی شاخ بنو عدی سے تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں فن سپہ گری اور خطابت سے آپ کو بڑا شغف تھا۔ نوشت وخواند سے بھی واقف تھے۔ پیشہ تجارت تھا اور اس سلسلہ میں دور دراز ملکوں کے سفر پر جایا کرتے تھے جس سے آپ میں تجربہ کی پختگی اور معاملہ فہمی پیدا ہوگئی تھی۔

خلافت

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو بعض لوگوں نے آپ کے مزاج کی سختی کی شکایت کی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان شبہات کا ازالہ کیا۔ پھر عام طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب کو پسند کیا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد جمادی الثانی ۱۳ھ میں جمہور مسلمین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

فتوحات

جس وقت حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لی تو شام اور عراق میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ آپ نے سب سے پہلے اس مہم کی طرف توجہ کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

بویب کی مہم

عرب کے مختلف حصوں سے جو لوگ بیعت کی غرض سے آئے تھے ان کے سامنے حضرت عمرؓ نے فضیلت جہاد پر تقریر کی۔ بنو ثقیف کے سردار ابوعبید ثقفی نے مجمع سے اٹھ کر جہاد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں تو پورے مجمع نے جہاد پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ابوعبید ثقفی کو چند ہزار سپاہ کے ساتھ ایران کی مہم پر روانہ کیا۔ انہوں نے ایرانی فوج کو مختلف مقامات پر پے در پے شکست دی۔ ایرانی فوج کے سپہ سالار رستم کو اس انجام کی خبر ہوئی تو اس نے دریائے فرات کے ساحل پر تازہ دم فوج اتاری۔ اس فوج کے ساتھ ہاتھی بھی تھے۔ اسلامی لشکر کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدک گئے۔ ابوعبید اس مہم میں شہید ہوگئے۔ فوج کی ایک بڑی تعداد فرات میں غرق ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے یہ اطلاع پاکر فوراً کمک بھیجی جس کی مدد سے فرات کے ساحل پر اسلامی لشکر نے ایرانیوں کو شکست دے دی۔ اس شکست سے ہراساں ہوکر ایرانیوں نے پوران دخت کو تخت سے اتار دیا اور اکیس سالہ یزدگرد کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں میں سازش کے ذریعہ بغاوت پھیلا دی جس کے نتیجہ میں بہت سے علاقے مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گئے۔ حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالار مقرر کر کے بیس ہزار فوج ایران بھیجی۔ جنگ شروع ہونے سے قبل خلیفۃ المسلمین کی ہدایت کے مطابق یزدگرد کے پاس ایک تبلیغی وفد روانہ کیا گیا۔ یزدگرد نے جوش غضب میں کہا کہ اگر سفیروں کا قتل ناروا نہ ہوتا تو وفد میں سے کوئی اپنی جان سلامت لے کر نہ جاتا۔

اس واقعہ کے بعد رستم نے سعد بن ابی وقاص سے دوبارہ وفد بھیجنے کی خواہش کی اس کی قیادت مغیرہ ابن شعبہ نے کی اولاً رستم نے وفد کو مال ومتاع کا لالچ دلایا لیکن اس موقع پر مغیرہ بن شعبہ کی تقریر پر رستم غضب آلود ہوگیا اور آفتاب و ماہتاب کی قسم کھا کر اعلان کیا کہ صبح ہونے سے قبل وہ لشکر اسلام کو خاک میں ملا دے گا۔ مغیرہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے لوٹ آئے۔

جنگ قادسیہ

ساتوں رات ایرانی فوج قادسیہ کے میدان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ اسلامی لشکر بھی تیار تھا ۱۴ھ میں فریقین صف آرا ہوئے تو سعد بن ابی وقاص نے اپنے بجائے خالد بن عرفطہ کو سپہ سالار مقرر کیا کیوں کہ وہ خود عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ تین روز تک گھمسان کا معرکہ رہا۔ ہاتھیوں کی وجہ سے اسلامی فوج کو بڑا خطرہ تھا کیونکہ ان کو دیکھ کر عربی گھوڑے بدک جاتے۔ چنانچہ بازسپاہیوں نے ہاتھیوں پر یورش کی تو ایک نیزہ باز نے نشان کے سفید ہاتھی پر ایسا وار کیا کہ اس کی سونڈ اس کے جسم سے منقطع ہوگئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس کو دیکھ کر دوسرے ہاتھی بھی منتشر ہوگئے۔ اب مسلمانوں کو بھرپور حملہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ لڑائی کے چوتھے روز دوپہر کے وقت جنگ کا فیصلہ ہوا۔ رستم نے زخموں سے چور ہوکر راہ فرار اختیار کی۔ راستہ میں ندی حائل تھی اس کو عبور کرنے کے لیے کود پڑا لیکن ہلال نامی ایک مسلم سپاہی نے اس کو ندی سے نکال کر ہلاک کر دیا۔

مدائن کی فتح

قادسیہ میں دو ماہ قیام کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص سپہ سالار نے اسلامی لشکر کو حرکت دی۔ بابل، کوثی اور بہرہ شیر جیسے مقامات کو فتح کرتے ہوئے ایران کے پایۂ تخت مدائن تک پہنچ گئے۔ درمیان میں دریائے دجلہ واقع تھا۔ ایرانیوں نے دجلہ کا پل منہدم کر کے کشتیوں کی آمد ورفت روک دی تھی۔ جب اسلامی لشکر دجلہ کے ساحل پر پہنچا تو اس کو عبور کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ سعد ابن ابی وقاص نے خدا کی ذات پر توکل کر کے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ پھر تو پوری فوج نے اپنے سپہ سالار کی پیروی میں دریا کو عبور کر لیا۔ ایرانی فوج ساحل پر کھڑی یہ عبرت ناک منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے "ایوان آمدند" کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان جنگ چھوڑ دیا۔ یزدگرد پایۂ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ۱۶ھ میں مدائن پر قبضہ کر لیا۔ جمعہ کے دن ایوان کسریٰ میں تخت شاہی کی جگہ منبر نصب کر کے مسلمانوں نے نماز جمعہ ادا کی۔ جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی جو عراق کی سرزمین میں ادا کی گئی۔ خزانہ میں صدیوں کی دولت، زر و جواہرات، نوادرات، تاریخی قالین بہار وغیرہ مال غنیمت میں حاصل ہوئے جو خلیفہ دوم کے پاس مدینہ روانہ کر دیے گئے۔

اس اہم فتح کے بعد جلولا، حلوان، جزیرہ، تکویت، خوزستان اور اہواز پر یکے بعد دیگرے مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ خوزستان پر قبضہ کی اطلاع یزدگرد کو ملی جو اس وقت مرو میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے ماتحت حکام کو لکھا کہ وہ اپنی فوجیں لے کر مدد کے لیے آجائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مردان شاہ کی سرکردگی میں نہاوند کے مقام ڈیڑھ لاکھ کی فوج جمع ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی مملکت کے ہر صدر مقام کی ایک تہائی فوج کو ایک مرکز پر جمع کر کے نعمان بن مقرن کی سپہ سالاری میں نہاوند کو روانہ کیا۔ ایرانی سپہ سالار کی خواہش صلح کی گفتگو کے لیے مغیرہ کی قیادت میں سفارت بھیجی گئی لیکن اس کے متکبرانہ رویّہ کی وجہ سے سفارت ناکام ہوگئی۔ بالآخر معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ فریقین نے اس جنگ میں خوب داد شجاعت دی۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالار زخمی ہوکر گر پڑے تو ان کے بھائی نعیم بن مقرن نے علم سنبھال لیا اور جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کے وقت ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں نے ہمدان تک ان کا تعاقب کیا۔ بیس ہزار ایرانی اس جنگ میں کام آئے۔ قادسیہ کے بعد یہ وہ اہم معرکہ ہے جس کو عرب "فتح الفتوح" سے

تعبیر کرتے تھے۔

یزدگرد، مرو میں بیٹھا، آئے دن فتنے برپا کر رہا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں بغاوتیں ہو رہی تھیں اس لیے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کے بعد ایران پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ اس ملک کے مختلف مقامات پر علیحدہ علیحدہ مہم روانہ کی گئی اصفہان میں عبداللہ نے ایرانی لشکر کو شکست دی تو وہاں کے رئیس نے صلح کرلی اس کے بعد پے درپے ہمدان، رے، طبرستان، آذربائیجان آرمینیہ، باب فارس، کرمان، سیستان اور مکران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

خراسان کی فتح

اس کے بعد اخنف بن قیس نے یزدگرد سے مقابلہ کیا جو خراسان کے شہر مرو میں موجود تھا جب مرو کی جانب پیش قدمی کی گئی تو یزدگرد مختلف مقامات میں پناہ لیتا رہا۔ بالآخر بلخ کے مقام پر اس کو شکست دی گئی اور اخنف بن قیس پورے خراسان پر قابض ہو گئے۔ یزدگرد ملک ایران سے باہر ترکستان چلا گیا۔ ایرانیوں نے مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ کر کے ان سے صلح کرلی۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مجوسی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس فتح کی اطلاع پا کر حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں آئے اور مسلمانوں کو اس طرح خطاب کیا۔

"آج مجوسیوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کی زمین ان کا ملک اور ان کی دولت کا وارث بنایا ہے کہ تم کو آزمائے اس لیے تم اپنی حالت نہ بدلو ورنہ اللہ بھی تمہاری جگہ دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا۔ مجھ کو اس اُمت کے لیے خود اس کے افراد سے خوف ہے۔"

یرموک کا معرکہ

ایران کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ابوعبیدہ اور حضرت خالد کی قیادت میں شام، اُردن اور حمص کی فتوحات حاصل ہوئیں جس سے رومیوں میں جوشِ انتقام پیدا ہوا چنانچہ خود رومیوں کے اصرار پر قیصر نے انطاکیہ میں فوجیں جمع کیں۔ حضرت ابوعبیدہ نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی تو آپ نے شام کو امدادی فوج روانہ کی۔ ابوعبیدہ نے یرموک (اُردن) کے میدان کو اپنا محاذ بنایا۔ مسلمانوں کی تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں دیرالجبل میں رومیوں کی دو لاکھ سے زائد فوج جمع ہو گئی تھی۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا لیکن جنگ آئندہ کے لیے ملتوی ہو گئی۔ مصالحت کے لیے حضرت ابوعبیدہ نے حضرت خالد کو روانہ کیا۔ لیکن گفتگو کامیاب نہ ہوئی۔ رومی پھر جوش و خروش کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ حضرت خالد نے جدید طریقہ پر اپنی فوجوں کو مرتب کیا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ بعض موقعوں پر مسلمانوں کا بازو کمزور پڑ جاتا تھا لیکن سپہ سالار خالد کی قیادت سے اسلامی لشکر کی برتری ثابت ہوئی نتیجتاً رومیوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ قیصر شام سے نکل کر قسطنطنیہ میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد بعض چھوٹے چھوٹے مقامات فتح کر لیے گئے جن میں انطاکیہ قابلِ ذکر ہے۔

بیت المقدس

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ رومیوں کی طرف سے جب اطمینان ہوا تو عمرو بن العاص نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ عیسائیوں نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنا چاہا۔ اس اثنا میں حضرت ابوعبیدہ بھی محاذِ جنگ پر پہنچ گئے عیسائی کچھ دنوں تک مدافعت کرتے رہے لیکن ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اسلامی لشکر کا مقابلہ کرتے اس لیے وہ صلح پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی خواہش ہوئی کہ خود حضرت عمرؓ بیت المقدس آ کر معاہدہ کریں۔ اس خواہش کے مطابق حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا۔ جابیہ کے مقام پر تمام مسلمان افسروں اور عیسائیوں نے آپ کا استقبال کیا اور یہیں معاہدہ تحریر کیا گیا جس کی رو سے عیسائیوں اور یونانیوں کی جان مال اور عبادت گاہیں محفوظ قرار دی گئیں۔ معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ بیت المقدس روانہ ہوئے آپ وہاں پہنچے تو آپ کا لباس اور سروسامان بہت ہی معمولی حیثیت کا تھا اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو خیال آیا کہ عیسائی ہنسیں گے۔ اس لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ امیر المومنین ترکی گھوڑے اور قیمتی لباس پہن لیتے حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے۔ وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے یہی بس ہے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس میں کئی روز تک قیام کیا پھر مفتوحہ علاقوں کا دورہ کر کے اسلامی مملکت کی سرحدوں کا انتظام کرتے ہوئے مدینہ واپس ہوئے۔

خالد بن ولید کی معزولی

خالد بن ولید اپنے مجاہدانہ کارناموں کے ساتھ بعض معاملات میں غفلت برتتے تھے مثال کے طور پر انہوں نے فوجی مصارف کا حساب کتاب بھی باقاعدہ نہیں رکھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت ہی سے ان کا یہ عمل رہا۔ حضرت عمرؓ اس کو گوارا نہیں کرتے تھے آپ نے متعدد دفعہ ان کو متنبہ کیا لیکن وہ اپنی اس غفلت سے باز نہ آئے اس لیے حضرت عمرؓ نے آپ کو معزول کیا۔ مدینہ آ کر حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا "خالد تم مجھے اب بھی عزیز ہو اور میں تمہاری عزت کرتا ہوں میں نے تمہیں خیانت وغیرہ کے الزام کی بنا پر معزول نہیں کیا ہے" تمام فوجی عمال کے نام مراسلہ جاری کیا کہ خالد کو ناراضگی یا خیانت کے الزام میں معزول نہیں کیا گیا بلکہ ان کے حیرت ناک کارناموں کی وجہ سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو رہے تھے اس لیے ان کو معزول کیا گیا تاکہ عوام کو اس کا علم ہو جائے کہ اصل کارساز اللہ تعالیٰ ہے۔

فتح مصر

حضرت عمرو ابن العاص کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے مصر پر فوج کشی کی اجازت دی اور چار ہزار کی فوج ان کی سپہ سالاری میں روانہ کی۔ ۲۱ھ میں عمرو ابن العاص نے مصر پر چڑھائی کی۔ راستہ میں جو مقامات ملتے گئے ان کو فتح کر لیا۔ قلعہ فسطاط (قاہرہ) کا محاصرہ کیا سات ماہ کے طویل عرصہ کے بعد اس قلعہ کو فتح کر لیا گیا اس کے بعد اسکندریہ کی تسخیر عمل میں آئی۔ اس فتح کے نتیجہ کے طور پر مصر کا پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ عمرو بن العاص نے رفتہ رفتہ مصر کے چھوٹے چھوٹے مقامات بھی فتح کر لیے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت

مغیرہ بن شعبہ کے مجوسی غلام ابولولو[1] نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ ان کے آقا اس سے روزانہ دو درہم کا بھاری محصول وصول کرتے ہیں اس میں تخفیف کرائی جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ معلوم کر کے کہ وہ آہنگری، نجاری، نقاشی اور ہوائی چکی بنانے کا کام کرتا ہے[2]۔ فرمایا کہ دو درہم محصول اس کے پیشوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس فیصلہ سے ناراض ہو کر دوسرے روز فجر کی نماز

۱۔ مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں ابولولو کو عیسائی قرار دیا ہے۔

۲۔ اناج پیسنے کے لیے حضرت عمرؓ مدینہ میں ہوائی چکی نصب کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ابولولو سے اس نوع کی چکی تیار کرنے کی فرمائش کی تھی۔

کے موقعہ پر ابو لولو نے خنجر سے حضرت عمرؓ پر حالت نماز میں چھ وار کیے جس کی وجہ سے آپ زخمی ہو کر گر پڑے اور یکم محرم ۲۴ھ کو شنبہ کے دن ۶۳ برس کی عمر میں جام شہادت نوش فرمایا۔

جانشینی

حضرت عمرؓ نے اپنا جانشین کسی خاص فرد کو منتخب نہیں فرمایا البتہ چھ صحابہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کو نامزد کر کے فرمایا کہ ان کی وفات کے تین روز کے اندر جانشینی کا مسئلہ طے ہو جائے۔ حضرت صہیبؓ کو حکم دیا کہ آپ کے دفن کے بعد ان چھ صحابہ کو ایک مکان کے اندر بند کر دیا جائے اور اس وقت تک دروازہ نہ کھولا جائے جب تک کہ وہ کسی ایک کے انتخاب پر متفق نہ ہو جائیں۔ ان صحابیوں میں سے کثرت رائے سے کوئی منتخب ہو جائے تو کوئی ان کی مخالفت کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس تجویز کی بنا پر حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور عامۃ المسلمین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

عہدِ خلافتِ فاروقی کے اہم کارنامے

نظم و نسق

اسلامی حکومت کا نظام اس دور کا جمہوری نظام تھا قرآنی حکم شوریٰ (مشاورت) کے بغیر مملکت کا کوئی کام انجام نہیں پاتا تھا۔ روزانہ مسجد نبوی میں مجلس مشاورت کے اجلاس منعقد ہوتے تھے ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی حاصل تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دس سالہ عہدِ خلافت میں مملکت کا وسیع نظام قائم کیا۔ تمام مفتوحہ ممالک کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صوبہ میں حاکم با اقتدار، سپہ سالار، دفتر، فوج کا عملہ، تعلقدار، کوتوالی کا عہدہ دار، خزانہ دار اور حاکم عدالت (قاضی) مقرر کیے۔ ہر ضلع میں ضلع کا افسر اعلیٰ، افسر خزانہ اور قاضی مقرر ہوا کرتے تھے۔ عمّال کے فرائض کا تعین کر دیا جاتا۔ بوقتِ تقرران کو تحریری حکم نامہ دیا جاتا جس میں ان کے اختیارات کی صراحت ہوا کرتی۔ عمال کو پابند کیا گیا کہ وہ حج کے موقعہ پر حاضر رہیں۔ مملکت اسلامی کے ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ اپنی شکایات پیش کرے تاکہ بروقت ان شکایات کا ازالہ کیا جا سکے۔

محکمہ عدالت

محکمہ عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ ہر ضلع میں ایک حاکم عدالت (قاضی) مقرر کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے قانون کی حکومت کو اعلیٰ ترین حکومت قرار دیا۔ قانون کی نظر میں عام شہری اور خلیفہ (صدر مملکت) سب مساوی تھے تاریخ میں عدلِ فاروقی ضرب المثل ہے۔ قضاۃ کے اصول و قوانین کی صراحت کے لیے فرامین جاری کیے گئے۔ مقدمات کے فیصلہ میں قرآنی احکام کو اولیت حاصل تھی۔ اگر اس میں کوئی حکم نہ ملتا تو حدیث کا سہارا لیا جاتا۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلتا تو اجماع (متفقہ فیصلہ) پر عمل کیا جاتا۔ اور آخر میں ہم صورت، ہم شکل واقعات سے قیاس کیا جاتا تھا۔ انسداد رشوت ستانی کی غرض سے ملازمین اور عہدہ داروں کی معقول تنخواہیں مقرر تھیں۔ قاضیوں کی تنخواہیں پانچ سو درہم ماہانہ سے کم نہ تھیں۔

محکمہ کوتوالی

کوتوالی کا نہایت معقول انتظام عمل میں آیا مجرمین کی گرفتاری کے بعد ان کو عدالت میں پیش کیا جاتا اور وہاں سے فیصلہ کے بعد ان کو یا تو رہا کیا جاتا یا مقید کر دیا جاتا جس کے لیے جیل خانے تعمیر کیے گئے تھے۔ جرائم خلاف جان و مال، بہت کم ہوا کرتے تھے۔ کوتوالی احتساب کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔

بندوبست اراضی

زمین کے لگان اور محاصل کی وصولی کا وسیع نظام قائم کیا گیا۔ قدیم جابرانہ طریقوں کو منسوخ کر کے منصفانہ طریقوں کو باقی رکھا گیا۔ مصر میں مزارعین اور مالکان اراضی کے مشورہ سے سالانہ پیداوار کا تخمینہ لگا کر محاصل کی مجموعی رقم مقرر کی گئی۔ شام میں قدیم یونانی بندوبست رائج رہا۔ بنجر زمینوں کو آباد کرنے کے لیے یہ ترغیب دی گئی کہ جو کوئی غیر آباد اراضی پر کاشت کرتا وہی اس حصۂ اراضی کا مالک ہو جاتا بشرطیکہ حصول اراضی کے بعد تین سال کے اندر اس کو آباد کر دیا جاتا اس طرح افتادہ زمین پر بہت جلد کاشت شروع ہو گئی کوفہ، عراق اور فسطاط (قاہرہ) میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ جدید شہر آباد کیے گئے۔

عراق، شام اور مصر میں اراضی کا بندوبست

حضرت عمرؓ نے جب عراق کی زمینوں کے بندوبست کی جانب توجہ کی تو فوجی عہدہ داروں اور زمینداروں نے اس کی مخالفت کی اور یہ مطالبہ کیا کہ مفتوحہ علاقے فاتحین کو بطور جاگیر دے دیے جائیں اور مقامی آبادی کو ان کا ماتحت اور غلام بنا دیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابن ابی وقاص کو عراق کی مردم شماری کا حکم دیا۔ فوجی آبادی کے مقابلہ میں جب باشندوں کا شمار کیا گیا تو فوجی سپاہیوں کے ساتھ مقامی باشندوں کی نسبت ۱:۳ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کو مقامی باشندوں کی ملکیت قرار دیا جائے لیکن بعض اکابر صحابہ جیسے عبدالرحمن بن عوفؓ اور ان کے ساتھیوں نے فوجی عہدہ داروں کے دعوے کی حمایت کی۔ حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ اگر مفتوحہ زمینوں کو فوج میں تقسیم کر دیا جائے تو بیرونی حملوں سے مدافعت کے لیے آلات حرب کی فراہمی اور امن و امان کے قیام کے لیے مالیہ کس طرح فراہم کیا جائے گا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف کی حجت یہ تھی کہ زمین پر فاتحین کا حق ہے اور آئندہ نسل کو اس سے استفادہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے استدلال کو مجلس شوریٰ نے تسلیم کر لیا۔ عراق، شام اور مصر کی زرخیز اراضی فوجیوں میں نہیں بلکہ مقامی کاشت کاروں میں بانٹ دی گئی۔ اگر خلیفۂ وقت نے تقسیم اراضیات سے متعلق فوجی عہدہ داروں کے دعوے کو مان لیا ہوتا تو ملک جاگیرداری اور زمینداری نظام میں پھنس جاتی جو قرون وسطیٰ کی ایک مکروہ یادگار ہے۔

آبپاشی

کھیتوں کی آبیاری کے انتظام کے لیے محکمہ آبپاشی قائم کیا گیا جس کے زیر اہتمام نہریں جاری کی گئیں۔ تالابوں پر بند باندھے گئے پانی کی تقسیم کے لیے دہانے تعمیر ہوئے۔

بیت المال

بیت المال اگرچہ عہد صدیقی میں قائم ہو چکا تھا لیکن عہد فاروقی میں تمام صوبہ جات اور مرکزی مقامات میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں اور ان پر معتمد علیہ اور قابل عہدہ داروں کا تقرر عمل میں آیا۔ ہر صوبہ کی آمدنی مقامی بیت المال میں جمع ہوا کرتی تھی۔ مقامی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو رقم فاضل ہوتی وہ مدینہ منورہ کے صدر بیت المال کو بھیج دی جاتی۔ بیت المال سے معذوروں کے لیے وظائف مقرر ہوتے تھے۔ کاشت کاروں کو زرعی اغراض کے لیے تقاوی کے طور پر بلا سود کی امداد منظور

کی جاتی اور فن کاروں کو صنعتی اغراض کے لیے قرضے دیے جاتے۔

محکمہ فوج

چوں کہ اسلامی مملکت کو ہر وقت بیرونی حملوں کا اندیشہ لگا رہتا تھا اس لیے فوج کا نہایت ہی مستحکم، منظم اور وسیع محکمہ قائم کیا گیا۔ فوجی عہدہ داروں کو ان کے مدارج کے لحاظ سے دو سو درہم سے پانچ ہزار درہم سالانہ تک تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ افواج کے لیے چھاؤنیاں قائم ہوئیں اور ان چھاؤنیوں میں بڑے بڑے اصطبل فراہم کیے گئے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت ساز و سامان سے لیس موجود رہتے تاکہ بوقت ضرورت سواروں کی فوج موقع پر فوراً روانہ کی جاسکے۔ ہر فوجی دستہ کے ساتھ وقائع نگار، پرچہ نویس اور خفیہ خبر رسانی کا عملہ مقرر تھا تاکہ اہم خبریں وقت پر خلیفہ (صدر مملکت) اور دارالخلافہ کے اعلیٰ حکام تک پہنچتی رہیں۔

محکمہ جات تعلیم و اشاعت اسلام

تعلیم کی ترقی اور اسلام کی اشاعت کا باقاعدہ انتظام عمل میں آیا۔ دعوت و تبلیغ کے معاملہ میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ عمل کا ایسا نمونہ پیش کیا جاتا تھا کہ اس کو دیکھ کر لوگ خود بخود اسلام کی جانب مائل ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مکتب اور مدرسے قائم کیے گئے اور تنخواہ یاب معلم مقرر کیے گئے جو حافظ قرآن بھی ہوتے تھے۔ قرآن کے فقہی احکام سے آگاہی کے لیے فقہا مامور تھے۔

اسی طرح حدیثوں میں تلاش حفاظت اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ مسائل اور احکام سے متعلق حدیثوں کی نقلیں اضلاعی عہدہ داروں کے پاس تعمیل کی غرض سے روانہ کی جاتی تھیں۔ اسی کے ذیل میں فن فقہ کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ اسلامی تمدن کی ترویج کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوتے تھے اس لیے فقہی مسائل میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

تعمیر مساجد

مذہب کی عملی خدمت کے ساتھ ساتھ مسجدیں کثیر تعداد میں تعمیر کی گئیں۔ شام کے عمال کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ کوفہ میں ہر قبیلہ کے لیے ایک مسجد بنوائی گئی اس طرح آپ کے عہد خلافت میں پوری مملکت اسلامی میں چار ہزار مساجد تعمیر کی گئیں۔ ہر مسجد میں تنخواہ دار امام اور مؤذن مقرر کیے گئے۔ حرم کعبہ اور حرم نبوی کی توسیع عمل میں آئی۔

رفاہی کام

فاروقی عہد خلافت میں رفاہ عام کے بہت سے کام انجام پائے۔ جا بجا نہریں اور کنویں تعمیر ہوئے۔ ہر بڑے شہر میں مسافر خانے تعمیر کیے گئے۔ شاہراہیں اور پل تعمیر ہوئے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان راستہ نہایت ناہموار اور ویران تھا۔ ان دو اہم شہروں کے مابین نہ صرف سڑکوں کی تعمیر ہوئی بلکہ ۱۷ھ تک راستے کی ہر منزل پر چوکیاں تیار کی گئیں۔ سراؤں کے ساتھ پانی کے حوض کا بھی انتظام کیا گیا۔ یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کے لیے وظائف مقرر ہوئے اور دیوان کے نام سے مملکت کے باشندوں کا سماجی تحفظ (سوشل سیکیورٹی) عمل میں آیا۔ تجارتی ترقی کے لیے بصرہ کے علاوہ شام اور مصر کی بندرگاہوں کو ترقی دی گئی۔ مویشیوں کی پرورش کے لیے سرکاری فارم قائم ہوئے حتی کہ مگس پروری کا بھی اہتمام کیا گیا۔ صحت عامہ کی خاطر سرکاری طبیب مقرر کیے گئے۔ ان کے علاوہ سماجی اصلاحات بھی نافذ کی گئیں۔

باشندگان ملک کی خبر گیری

عوام کے حقوق کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا گیا معاملات میں عدل و انصاف کا بدرجۂ اتم لحاظ رکھا جاتا تھا۔ باشندگان ملک کے آرام و آسائش کو اوّلیت حاصل تھی۔ حضرت عمرؓ نے کوئی حاجب و دربان مقرر نہیں کیا تھا۔ ہر نماز کے بعد روزانہ صحن مسجد میں تشریف رکھتے تاکہ اہل حاجت اپنی ضروریات بیان کرسکیں اور ان کے لیے مناسب انتظام کیا جاسکے۔ مدینہ اور اس کے اطراف گھوم گھوم کر شہریوں کے حالات معلوم کیا کرتے اور حاجت مندوں کی ضروریات کی فوراً تکمیل کیا کرتے تھے۔

قحط اور وبائی امراض کے زمانہ میں ضروری انتظام عمل میں لاکر عوام کو سہولتیں بہم پہنچائی جاتیں۔ دور دراز ملکوں سے غلہ منگا کر غیر مستطیع لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ راشن کارڈ کا طریقہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے عہد میں رائج ہوا تھا جس سے عوام میں غلہ کی مساوی تقسیم عمل میں آئی۔

ایران اور عراق کے مجوسیوں، شام اور فلسطین و مصر کے عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انہیں فوجی عہدے بھی دیے گئے۔ ہر شخص کو قرآنی احکام کے بموجب مذہبی آزادی حاصل تھی اور حکومت کی جانب سے گرجاگھر، یہودی عبادت گاہوں اور آتش کدوں کی حفاظت ہوتی۔ ہر شخص کو آزادیٔ ضمیر حاصل تھی۔ وہ خلیفۂ وقت پر تنقید کرسکتا تھا۔ انتظام مملکت انصاف اور خدمت خلق کی بنا پر حضرت عمرؓ کو "فاروق اعظم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک مثالی حکمراں تھے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ

(خلیفہ سوم)

عہد خلافت: ۲۴ھ — ۳۵ھ مطابق ۶۴۵ء — ۶۵۵ء

حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت چھ اصحاب کرام کو نامزد فرمایا اور انہیں اختیار دیا کہ وہ جسے چاہیں خلیفہ منتخب کریں۔ حضرت مقدادؓ نے آپ کے نامزدہ چھ اصحاب کو سعد بن مخرمہ کے گھر میں جمع کیا لیکن کسی کا بھی خلافت کے لیے انتخاب نہ ہوسکا۔ تیسرے روز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انتخاب کی یہ تجویز پیش کی کہ چھ کی تعداد میں تخفیف کرکے جو شخص جس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہو اس کا نام پیش کرے۔ حضرت سعدؓ نے خود حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام پیش کیا لیکن آپ خود دست بردار ہوگئے۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے علی الترتیب حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام پیش کیے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی دوسری تجویز یہ تھی کہ ان دو میں سے جو کوئی کتاب و سنت اور طریقہ شیخین پر عمل پیرا ہونے کا عہد کرے اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ پھر آپ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کہا کہ انتخاب کا اختیار ان ہی کو دیا جائے۔ دونوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ پہلے تو رائے عامہ معلوم کی گئی۔ بعد میں حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کو جمع کرکے ایک مختصر تقریر کی اور پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت علیؓ نے بھی ان کا ساتھ دیا اس کے بعد عام لوگوں نے بیعت کی۔

انتظام مملکت

عہد فاروقی میں جو نظام و نسق رائج تھا حضرت عثمانؓ نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ حضرت عمرؓ

کی وصیت و ہدایت کے مطابق حضرت مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کی ولایت سے معزول کرکے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ان کی جگہ مامور کیا گیا۔ پوری مملکت میں فرامین جاری ہوئے جن کے ذریعہ سے حکومت کے عہدہ داروں اور فوج کے افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کریں۔ مال و دولت کی حرص میں ان سے رشوت نہ لیں۔ عام مسلمانوں اور زمیوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ خراج اور محاصل مقررہ شرح سے زیادہ وصول نہ کریں اور دیانت داری کے ساتھ فرائض منصبی کو انجام دیں۔

بغاوتوں کا انسداد

مصر میں اسکندریہ کی فتح اور اسلامی مملکت میں اس کے الحاق کے بعد رومی حکومت اس کو واپس حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسکندریہ میں رومی بڑی تعداد میں آباد تھے قیصر روم نے ان کو اشتعال دلاکر اسکندریہ میں بغاوت کرادی۔ حضرت عمرو بن العاص نے فوراً اس بغاوت کو فرو کیا اور رومیوں نے قبطیوں کا جو مال واسباب لوٹ لیا تھا وہ ان کو واپس دلایا۔

اسی زمانہ میں آرمینیہ اور آذربائیجان میں بغاوت نے سر اٹھایا باغیوں کی سرکوبی کے لیے ولید بن عقبہ کو مقرر کیا گیا جنہوں نے آذربائیجان کی بغاوت فرو کی۔ حبیب بن مسلمہ نے قالیقلا کے باغیوں کی سرکوبی کی۔

فتوحات

سلمان بن ربیعہ، آرمینیہ میں امن قائم کررہے تھے کہ ایشیائے کوچک میں رومی لشکر کے جمع ہونے کی اطلاع ملی سلمان محاذ پر روانہ ہوئے اور راستہ میں کئی قلعے فتح کرلیے ایشیائے کوچک کے بطریق اعظم نے حبیب سے مقابلہ کرنے کے لیے ۸۰ ہزار کا لشکر جرار روانہ کیا لیکن حبیب بن مسلمہ نے اس کو شکست دے دی اور اران اور گرجستان کے بعض علاقوں کو فتح کرلیا اسی زمانہ میں امیر معاویہؓ نے بھی ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی اور انطاکیہ اور سرطوس کے درمیان جتنا علاقہ تھا اس میں اسلامی چھاؤنی قائم کردی۔

شمالی افریقہ کی فتح

عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو عمرو بن العاص کی معزولی کے بعد پورے صوبہ مصر کا گورنر مقرر کیا گیا تھا وہ نہایت ہی باہمت اور اولوالعزم سپہ سالار تھے ۲۵ھ سے ان کی نظر شمالی افریقہ کے بربروں کے زرخیز اور خوشحال علاقے طرابلس الغرب (لیبیا) تونس مراکش اور الجزائر پر تھی جو مصر کی سرحد سے متصل تھے ۲۷ھ میں انہوں نے شمالی افریقہ پر فوج کشی کی۔ طرابلس الغرب کے حدود میں جب اسلامی فوج داخل ہوئی تو یہاں کا حاکم ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا۔ عرصہ دراز تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت میں مزید فوجی کمک روانہ کی۔ عبداللہ بن زبیر نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ دیا اور دوسرے حصے کی مدد سے جنگ کا آغاز کیا۔ گھمسان کی لڑائی کے بعد بھی جب ہارجیت کا فیصلہ نہ ہوسکا تو محفوظ فوج دفعتہً حرکت میں آگئی طرابلس فوج جو کہ بے حال ہوچکی تھی اس لیے تازہ اسلامی لشکر کی مزاحمت نہ کرسکی طرابلس کے حاکم نے ۲۵ ہزار دینار سالانہ کے خراج پر صلح کرلی۔ اس فتح کے بعد تونس مراکش الجزائر اور دوسرے متصل علاقوں پر اسلامی حکومت کا تسلط قائم ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ پیش قدمی کے لیے بحر روم کا راستہ ہموار ہوگیا۔

بحری فتوحات۔ قبرص کی فتح

شام کے ساحل کے قریب قبرص ایک زرخیز اور سرسبز و شاداب جزیرہ ہے۔ شام کے گورنر حضرت معاویہؓ اس پر خلیفہ دوم کے عہد میں فوج کشی کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے بحری جنگ کی اجازت نہ دی کیوں کہ اس وقت تک اسلامی بحریہ طاقتور نہ تھا۔ لیکن جب بحری بیڑہ طاقتور ہوگیا۔ اور مسلمانوں نے بحری جنگ میں مہارت حاصل کرلی تو قبرص پر فوج کشی کی اجازت مل گئی۔ اس بحری جنگ میں بعض جلیل القدر صحابہ حضرت عبادہؓ بن صامت اور حضرت ابو ذر غفاریؓ نے بھی حصہ لیا تھا۔ قبرص کے باشندے جنگ سے گھبراتے تھے اس لیے انہوں نے سات ہزار سالانہ خراج کی ادائیگی پر صلح کرلی جس میں یہ شرط تھی کہ ۱۔ مسلمان اہل قبرص کی حفاظت کریں گے۔ ۲۔ رومیوں سے مقابلہ کے وقت جزیرہ قبرص کا راستہ اسلامی فوج کے لیے کھلا رہے گا۔ اور رومیوں کے حالات سے اہل قبرص اسلامی حکومت کو باخبر رکھیں گے ۳۲ ہجری میں اہل قبرص نے اس معاہدہ سے انحراف کیا اور مسلمانوں کے خلاف رومیوں کی اعانت کی۔ امیر معاویہؓ نے بحری بیڑہ کی مدد سے دوبارہ قبرص پر فوج کشی کی اور اس کو اسلامی مملکت میں شامل کرکے وہاں مسلمانوں کی چھاؤنی قائم کردی۔

فارس کی فتح دوم

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یزدگرد ترکستان کی جانب فرار ہوگیا تھا وہاں خاموش نہیں بیٹھا۔ ایران کے علاقہ میں بغاوت کے جراثیم پھیلاتا رہا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد اس کی سازش کامیاب ہوئی۔ ۲۹ھ میں فارس اور کرمان سے خراسان تک عجمی علاقہ میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن معمر کو اس کو فرو کرنے کے لیے روانہ کیا لیکن وہ معرکہ میں کام آگئے اس لیے بصرہ کے والی عبداللہ بن عامر کو اس مہم پر بھیجا گیا جن کی حکمت عملی سے اہل فارس کو شکست ہوئی اور فارس (ایران) پر دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

جرجان اور طبرستان کی فتح

ایران کی بغاوت کے ساتھ ساتھ اہل طبرستان نے صلح کا وہ معاہدہ توڑ دیا جو حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں کیا گیا تھا۔ ۳۰ھ میں سعید ابن العاصؓ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے طبرستان پر چڑھائی کی۔ اس مہم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اکابر صحابہ مثلاً حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ شریک تھے۔ اسلامی لشکر پہلے جرجان میں داخل ہوا جہاں کے باشندوں نے دو لاکھ درہم سالانہ پر صلح کرلی۔ اس کے بعد طبرستان کے پورے علاقہ کو فتح کرلیا گیا۔ اور مسلمان موجودہ سمرقند و بخارا کے علاقہ ازبکستان کو فتح کرتے ہوئے چند مورخین کے بیان کے مطابق، چینی ترکستان تک پہنچ گئے۔

افغانستان، سجستان (بلوچستان) اور خراسان کی فتح

سعید ابن العاص کے ساتھ ہی عبداللہ بن عامر نے خراسان کا رخ کیا کرمان اور سجستان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے علی الترتیب مجاشع بن مسعود اور ربیع بن زیاد کو روانہ کرکے سعید ابن العاص خود خراسان میں داخل ہوئے اور سارے علاقہ میں فوجیں پھیلادیں۔ ان مہمات کے نتیجہ میں متعدد مقامات پر قبضہ ہوگیا اور نیشاپور

کا بھی محاصرہ کیا گیا جہاں کے حاکم نے حملہ آوروں کے ساتھ صلح کر لی۔ اس قبضہ کے بعد سارے خراسان کو اس کے اہم علاقوں کے ساتھ فتح کر لیا گیا۔ یزدگرد جو خراسان میں مقیم تھا فتح کے بعد فرار ہو گیا۔ عرصہ تک ایک مقام سے دوسرے مقام تک اس کا تعاقب کیا جاتا رہا بالآخر وہ ایک کاشت کار کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس طرح اس کی ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساسانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس مہم سے فراغت کے بعد عبداللہ ابن عامر نے ایک فوج احنف بن قیس کی سرکردگی میں طخارستان کی جانب بھیجی جس نے بڑی خونریز جنگ کے بعد طخارستان اور اس کے قرب و جوار کے بہت سے علاقوں مثلاً جوزجان اور فاریاب کو فتح کر لیا۔ شام کے ساحل پر رومیوں نے ۵۰۰ جہازوں کا بحری بیڑہ جمع کیا لیکن معاویہؓ اور عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح نے رومیوں کو بحری شکست دی۔ ۳۲ھ میں امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ ۳۳ھ میں اناطولیہ اور قلعہ احسن المراۃ پر قبضہ کیا۔

۳۴ھ میں افریقہ میں زبردست بغاوت پھیل گئی جس کو بڑی مستعدی کے ساتھ فرو کیا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے دس سالہ عہد خلافت میں اسلامی حکومت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل بحیرۂ روم اور یورپ کے حدود تک وسیع ہو گئے۔ مسلمان مورخ طبری اور انگریز مورخ گبن کے مطابق سپین کا ایک حصہ بھی عہد عثمانی میں فتح ہو چکا تھا۔

عمرو بن العاص کی معزولی

فاتح مصر عمرو بن العاصؓ عہد فاروقی ہی سے مصر کے گورنر تھے مصر کے ایک حصہ کو جو سعید مصر کہلاتا ہے اپنے اعتماد کے حاکم عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے تحت دے دیا گیا تھا۔ خراج و محاصل کے تعین اور وصولی میں بھی آخر الذکر کو کچھ اختیارات حاصل تھے۔ اس معاملہ میں ان دونوں کی حکمت عملی میں اختلاف تھا۔ سعد بن ابی سرحؓ کو شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ عمرو بن العاصؓ نے خراج میں تخفیف کر دی ہے اور عمرو بن العاصؓ کو یہ شکایت تھی کہ عبداللہ نے فوجی طاقت میں اضمحلال پیدا کر دیا ہے۔ غرض حضرت عثمانؓ نے عمرو بن العاصؓ سے خراج میں اضافہ کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے اضافہ کے امکان کی نفی کر دی۔ جس کے نتیجہ میں وہ معزول کر دیے گئے اور پورے صوبہ کی ولایت عبداللہ بن سعدؓ کے سپرد کر دی گئی جنہوں نے محاصل میں معتدبہ اضافہ کیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ولید بن عقبہ کی معزولی

عہد فاروقی سے حضرت موسیٰ اشعریؓ بصرہ کی گورنری پر مامور تھے یہاں ایک جماعت ان کی مخالف تھی لیکن حضرت عمرؓ کے رعب و داب کی وجہ سے اس جماعت نے سر نہیں اٹھایا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کو تقویت حاصل ہوئی جب کردوں نے بغاوت کی تو ابوموسیٰ نے جہاد پر وعظ کیا اور جہاد فی سبیل اللہ میں پیدل چلنے کی فضیلت پر زور دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس بات پر آمادہ ہو گئے لیکن جب فوج کی روانگی کا وقت آیا تو سپہ سالار کی سواری میں ترکی نسل کا گھوڑا اینز کئی خچروں پر ان کا ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ لوگوں نے ان کی توجہ ان کے قول و فعل کے تضاد پر مبذول کی اور مطالبہ کیا کہ سواری ان کو دی جائے اور امیر پا پیادہ اس مہم پر چلیں۔ حضرت موسیٰ اشعری نے حق لفین پر کوڑا برسایا۔ خلیفہ سے امیر بصرہ کی شکایت کی گئی اور ان کی معزولی کا مطالبہ کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو معزول کر کے عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کیا۔

اسی طرح بعض شکایات کی بنا پر ولید بن عقبہ کو جو کوفہ کے گورنر تھے معزول کیا گیا۔ ان کی جگہ سعید بن العاص کو مقرر کیا گیا۔

عہد عثمانی کا ابتدائی پرامن زمانہ

عہد خلافت عثمانی کے ابتدائی پانچ چھ سال پُرامن رہے۔ اس دوران میں فتوحات کی کثرت رہی۔ مال غنیمت کثیر مقدار میں حاصل ہوتا رہا خراج و محاصل میں اضافہ ہوتا گیا۔ زراعت و تجارت میں ترقی ہوئی جس کی وجہ سے ملک خوشحال اور عوام مرفہ الحال ہو گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عہد عہد فاروقی سے بھی سبقت لے جائے گا جہاں یہ اطمینان بخش صورت تھی وہیں باہمی رقابت، بغض و حسد اور اسلامی سلطنت کے حدود میں وسعت کے ساتھ حمل و نقل اور خبر رسانی کی دقتوں سے حکومت کے خلاف سازش کا جال بھی پھیلنے لگا۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کی ذات کو اعتراضات کا ہدف بنایا گیا اور ایسا انقلاب برپا ہوا کہ خلافت کا نظام درہم برہم ہونا شروع ہو گیا۔

اسباب انقلاب

انقلاب کے اسباب کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دور اوّل کے صحابہ جو اخلاص اور صداقت کے مجسمے تھے یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ ضعیفی کی وجہ سے عملی سیاست میں حصہ لینے کے قابل نہ تھے۔ دولت کی بہتات اور خوش حالی نے نئی نسل میں رقابت، رشک اور حسد کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔

۲۔ اکابر قریش مدینہ سے باہر جانے لگے تو خاندان رسالت کے تعلق سے عوام اور خواص نے ان کا استقبال گرم جوشی سے کیا۔ انہیں بڑی بڑی جاگیریں حاصل ہوئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں احساس برتری اور اس کے ساتھ حصول خلافت کا ادّعا پیدا ہوا۔

۳۔ مفتوحہ اقوام کے دلوں میں عربوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور نظام خلافت کو درہم برہم کرنے کا ایک وسیع جال بچھ گیا۔

۴۔ قریش میں نسلی اعزاز کے غرور کی وجہ سے ان میں عام عربوں کے مقابلہ میں امتیاز کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں بڑی بڑی جاگیریں حاصل تھیں۔ وہ مجاہدین جن کی تلواروں سے اسلامی مملکت کے حدود وسیع ہوئے تھے ان کے اس رویّہ سے ناراض تھے۔

۵۔ بنو ہاشم اور بنو امیّہ کے مابین قدیم چشمک شدید قسم کی رقابت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

۶۔ حضرت عثمانؓ نے کنبہ پروری کے غلو میں اپنے قبیلہ کے بہت سے افراد کو ایسے عہدوں پر مامور کر دیا تھا جن کے لیے وہ موزوں نہ تھے۔ ان کی بدعملی انگشت نمائی کا مورد بن گئی۔

۷۔ الماوردی نے معاشی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدہ داروں نے مدات موازانہ میں ایک مد کی رقم دوسرے مد میں خرچ کرنی شروع کی تھی یہ عمل عوام کے لیے باعث اشتعال تھا۔

۸۔ قبیلۂ قریش کے افراد میں امویوں کی امتیازی شان کے خلاف سخت عناد پیدا ہو گیا تھا۔ اس صورت حال سے شام و فلسطین کے یہودیوں اور ایران

کے مجوسیوں کو اسلامی مملکت کے خلاف سازش کا موقع حاصل ہوگیا۔

اس عہد میں کوفہ اور بصرہ کا بڑا اثر عالم اسلام پر قائم تھا ان شہروں کی شورش انگیز فضا بڑی سرعت کے ساتھ حکومت سے غداری اور بغاوت میں تبدیل ہوتی گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان مقامات پر جو والی مقرر کیے جاتے رہے ان کی حکمت عملی کمزور اور غیر دانش مندانہ تھی۔ کوفہ میں ولید کو ہٹا کر حضرت عثمانؓ نے اپنے ایک رشتہ دار سعید ابن العاص کو والی مقرر کیا۔ لیکن بغاوت پر قابو پانے کے لیے نہ ان میں طاقت تھی اور نہ انہوں نے اس کے انسداد کے لیے کوئی معقول طریقہ کار اختیار کیا۔ مصر میں بھی حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ محمد بن ابی بکر اور محمد ابن ابی حذیفہ بھی حضرت عثمانؓ کے مخالف محاذ میں شامل ہوگئے تھے۔ غرض یہاں بھی باغیانہ ماحول پیدا ہوگیا تھا اور ایک سنگین بحران کی تیاریاں تھی۔ مخالف حکومت ورقے آزادانہ تقسیم کیے جا رہے تھے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کی جانشینی کے لیے امیدواروں کی تائید و حمایت کی جا رہی تھی۔ اس زہریلی فضا سے دارالخلافہ مدینہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی کے مطابق حضرت عثمانؓ کو اپنی شہادت کا یقین ہوگیا تھا۔ آپ نے جمعہ کے دن روزہ رکھا بیس غلام آزاد کیے اور قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہوگئے۔ آپ کے مکان کے پھاٹک پر عبداللہ بن زبیرؓ محمد بن مسلمہ اور بہت سے نوجوان نے باغیوں کو روک رکھا تھا۔ کچھ مقابلہ بھی ہوا لیکن وہ مکان کے اندر داخل نہ ہو سکے اس لیے پھاٹک میں آگ لگا دی گئی۔ باغیوں میں سے چند افراد دیوار پر چڑھ کر اندر داخل ہوئے ایک نے بڑھ کر حملہ کیا۔ دوسرے نے پیشانی پر وار کیا جس کی وجہ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور کلام اللہ کے اوراق خون آلود ہوگئے عمرو بن الحمق نے سینہ پر چڑھ کر مسلسل وار کیے آپؓ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ مدافعت کے لیے آئیں تو ان کی تین انگلیاں ہتھیلی سے کٹ گئیں بالآخر سودان بن حمران نے آپ کو شہید کر دیا۔ مدینہ پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دو روز تک جسد مبارک بے گور و کفن پڑا رہا۔ ہفتہ کے روز چند آدمیوں نے ہمت کر کے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جنت البقیع سے متصل حش کوکب میں صرف ۱۷ اشخاص کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ خلافت کی مدت ۱۲ سال رہی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے وحدت اسلامی میں ایسا رخنہ پیدا ہوگیا جو آج تک بند نہ ہو سکا۔

عہد عثمانی کے کارنامے

۱۔ مملکت اسلامی میں جہاں جہاں بغاوت ہوئی اس کا کامل طور پر انسداد کیا گیا۔

۲۔ عمال اور عہدہ داروں کی کسی ایسی بدعنوانی کو نظر انداز نہیں کیا گیا جس سے اصول اسلام، اخلاق عامہ، نظم و نسق متاثر ہوتا ہو۔ شکایت پیش ہونے پر فوراً تدارک کیا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو بیت المال کا قرض ادا نہ کرنے ولید کو شراب نوشی کے الزام اور حضرت سعید ابن العاصؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو رعایا کی شکایت پر معزول کر دیا گیا اور ولید پر حد جاری کی گئی۔ حج کے موقعہ پر اعلان عام ہوتا تھا کہ خلیفۂ وقت کے پاس شکایات پیش کی جائیں۔ شکایات کو فوری طور پر دور کیا جاتا تھا۔

۳۔ پہلی دفعہ بحری فوج کا قیام عمل میں آیا۔ بحری بیڑہ کو اتنی ترقی دی گئی کہ وہ رومی بیڑہ سے بھی زیادہ طاقتور ہوگیا یہ حضرت عثمانؓ کا بڑا کارنامہ تھا۔ مصر شام فلسطین اور طرابلس کی بندرگاہوں کی توسیع عمل میں آئی۔

۴۔ رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے گئے تعمیرات کے کاموں میں اضافہ ہوا۔ نئے شہر بسائے گئے۔ سرکاری دفاتر کے لیے وسیع عمارتیں بنائی گئیں شاہراہیں پل اور مسافر خانے تعمیر کیے گئے۔ مدینہ نجد اور دیگر علاقوں کے تجارتی کاروبار والوں کے لیے سرائیں تعمیر کی گئیں۔ آبپاشی کے لیے دریاؤں سے نہریں نکالی گئیں۔ مدینہ کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے مدری کے قریب بند بنوایا گیا اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رخ پھیر دیا گیا۔

۵۔ مسجد نبوی کی توسیع ہوئی۔ عمارت میں پہلی دفعہ منقش پتھر استعمال ہونے لگے۔ ستونوں کو سیسے سے مضبوط کیا گیا اور چھت میں مضبوط چوبینہ استعمال ہونے لگا۔

۶۔ ہر اسلامی چھاؤنی میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔

مصحف صدیقی کی اشاعت

حضرت عثمانؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو ایک قرات اور ایک مصحف پر متحد کیا۔ اگرچہ قرآن کریم کی تدوین عہد صدیقی میں ہو چکی تھی لیکن اس کی عام اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے حضرت حفصہؓ کے نسخہ کی نقلیں کرا کے ان کو حکومت کی جانب سے تمام ممالک اسلامیہ میں تقسیم کرایا اور کلام اللہ کے دوسرے غیر مصدقہ نسخوں کو تلف کرا دیا جس کی وجہ سے ساری دنیا کے مسلمان قرآن کے ایک نسخہ پر متحد ہوگئے۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب

(خلیفہ چہارم)

۳۵ھ - ۴۰ھ مطابق ۶۵۶ء - ۶۶۱ء

خلافت

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین روز تک مسند خلافت خالی رہی۔ مدینہ میں ہر طرف باغی پھیلے ہوئے تھے۔ چوں کہ خلافت کی ضرورت بہرحال ثابت تھی اس لیے چند مہاجرین و انصار کے ایک وفد نے جس میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے حضرت علیؓ کے ہاں پہنچ کر انتخاب خلیفہ کی ضرورت پر زور دیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ ان کو خلافت کی حاجت نہیں ہے۔ عوام الناس جس کسی کو منتخب کر لیں وہ ان کے لیے قابل قبول ہوگا۔ وفد نے کہا کہ حضرت علیؓ کی موجودگی میں وہ کسی اور کو اس اہم منصب کے لیے منتخب نہیں کر سکتے آپ نے جواباً کہا کہ امیر بننے کے بجائے وہ وزیر بننا پسند کریں گے۔ وفد کے ارکان نے کہا کہ وہ آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ غرض مسلسل اصرار پر آپ منصب خلافت قبول کرنے پر رضامند ہوگئے۔ مجمع عام میں مسلمانوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ

پر بیعت کی جس میں مدینہ کے تمام ممتاز صحابہؓ شامل تھے بیعت کے بعد ذی الحجہ [illegible]ھ میں آپ مسند آرائے خلافت ہوئے۔

قاتلین عثمانؓ کی تلاش کا مسئلہ

قاتلین عثمانؓ کی گرفتاری اوران سے قصاص لینا خلافت کا سب سے پہلا فرض تھا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ کسی مجرم کے بارے میں شہادت موجود نہ تھی بمقام حادثہ پر حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ پردہ نشین ہونے کی وجہ سے وہ کسی کی شناخت سے قاصر تھیں۔ حضرت عثمانؓ کی دردناک شہادت کا عام طور پر اتنا غم طاری ہوگیا تھا کہ عوام سے لے کر خواص تک سب قصاص کے طالب تھے جن میں حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور چند اکابر صحابہ بھی شامل تھے۔ حضرت علیؓ کی مجبوری یہ تھی کہ قاتلین کے گروہ پر آپ کا بس نہیں چلتا تھا درآنحالیکہ اس گروہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔

عہد عثمانی کے عمال اور حضرت معاویہؓ کی معزولی کے احکام

حضرت علیؓ عہد عثمانی کے اکثر عمال اور گورنروں علی الخصوص امیر معاویہؓ والیٔ شام اور عمرو بن العاص گورنر مصر کے خلاف تھے۔ حضرت علیؓ نے منصب خلافت کا جائزہ لیتے ہی ۳۶ھ میں اپنے ان ناپسندیدہ عمال کی معزولی کے احکام ایک ہی دن میں جاری کر دیے۔ تمام معزول گورنر شام میں جمع ہوئے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی بجائے حضرت علیؓ نے شام کی گورنری پر سہیل بن حنیف کو مامور کرکے انہیں وہاں روانہ کر دیا لیکن امیر معاویہؓ نے اس کی خبر پاتے ہی سہیل بن حنیف کو شام کی سرحد تبوک ہی سے واپس کر دیا۔ حضرت علیؓ نے معزولی کے احکام کے اجرا پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے حریف کے نام مطالبۂ بیعت کے سلسلہ میں ایک مکتوب بھی لکھا۔ قاتلین عثمانؓ کا پتہ نہ چلنے کی وجہ سے جو المناک صورت پیدا ہوگئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر امیر معاویہؓ نے مدینہ سے حضرت عثمانؓ کا خون آلودہ پیراہن اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں حاصل کر کے ان کو جامع دمشق میں آویزاں کر دیا۔ اس سے مسلمانان شام کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ خلیفہ کے قاصد نے اس منظر کو مدینہ واپس جاکر بیان کرتے ہوئے کہا کہ شام کے ساٹھ ہزار افراد قصاص لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

امیر معاویہؓ کے خلاف مہم

قاصد کے بیان سے حضرت علیؓ نے حالات کا اندازہ لگالیا اور والیٔ شام کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی چوں کہ اس طرح مسلمانان کے مابین خانہ جنگی کے آثار تھے اس لیے اکابر صحابہؓ نے اس میں شرکت سے احتراز کیا، مگر اور صحابہ کو شریک ہونا پڑا۔

عائشہؓ کا اقدام

ام المومنین حضرت عائشہؓ کو جو مکہ سے مدینہ واپس آرہی تھیں راستے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت اور مدینہ میں بدامنی کی اطلاع ملی تو آپ فوراً مکہ واپس ہوگئیں۔ اس اثنا میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ بھی مکہ پہنچ گئے اور صورت حال سے ام المومنین کو واقف کرایا۔ حضرت عائشہؓ نے عوام کو حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کی دعوت دی۔ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے اس پر لبیک کہی۔ حضرت عائشہؓ نے مکہ سے براہ مدینہ بصرہ جانے کا فیصلہ فرمایا۔ مدینہ سے چلتے وقت مسلمانوں کا جم غفیر آپ کے ساتھ ہوگیا۔ ان میں بہت سے مفسدین بھی شامل تھے۔ ادھر حضرت علیؓ کو بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ محتاط اکابر صحابہ اس مہم کو خانہ جنگی سمجھ کر اس میں شرکت سے پہلوتہی کر رہے تھے۔ تاہم حضرت علیؓ مدینہ سے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ ۷۰۰ رفقا تھے جن میں بڑی تعداد اہل کوفہ و بصرہ کی تھی۔ راستہ میں ایک بستی ذی قار میں قیام کر کے ایک صحابی قعقاع بن عمرو کو حضرت علیؓ نے مصالحت کی گفتگو کے لیے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے پاس روانہ کیا۔ بصرہ پہنچ کر یہ صحابی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں آپ کی تشریف آوری کا مقصد دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ حالات کی اصلاح مقصود ہے۔ گفتگو میں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ قعقاع نے اصلاح حال کے لیے امن و سکون کے قیام پر زور دیا اور کہا کہ جب امن قائم ہو جائے گا تو قاتلین عثمان سے قصاص لیا جاسکے گا ورنہ طاقت آزمائی فریقین کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوگی۔ اس تجویز پر جو جنگ قریب الوقوع تھی کچھ عرصہ کے لیے رک گئی۔

سبائی گروہ کی فتنہ انگیزی جنگ جمل

فتنہ پرداز سبائی گروہ نے جب دیکھا کہ امن بحال ہو رہا ہے تو اس کے افراد نے باہمی مشورہ کر کے فریقین کو جنگ پر ابھارنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک طرف حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت علیؓ جنگی کارروائیوں کو روکنے میں لگے رہے جب حضرت علیؓ ذی قار سے بصرہ پہنچے تو باہمی مصالحت ہی کو امت کے لیے بہتر سمجھا بظاہر جنگ کی مصیبت ٹل گئی لیکن سبائیوں نے طے کیا کہ راتوں رات دونوں فوجوں پر حملہ کر دیں ورنہ دوسرے روز صلح کا اعلان ہو جائے گا تو خود ان کی خیر نہیں ہے۔ اس فیصلہ کے مطابق وہ فریقین کی فوج میں پھیل گئے اور ان پر حملہ کر دیا۔ صبح ہوتے ہوتے ہنگامۂ کارزار برپا ہوگیا۔ حملہ سے ہر شخص حیران و پریشان تھا۔ ہر فریق دوسرے کو بدعہدی کا الزام دے رہا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ نے جنگ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس رستخیز میں کوئی کسی کی سننے پر آمادہ نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ اونٹ (جمل) پر سوار ہو کر میدان جنگ میں تشریف لائیں اس لیے یہ جنگ، جنگ جمل کے نام سے مشہور ہوئی۔ خونریز جنگ شروع ہوگئی تو حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلعم کی ایک پیشین گوئی یاد دلائی کہ وہ ایک وقت حضرت علیؓ سے ناحق جنگ کریں گے تو حضرت زبیرؓ نے جنگ سے منہ پھیر لیا اور اپنے صاحبزادہ عبداللہ کو بھی میدان سے ہٹ جانے کا مشورہ دیا۔ جب حضرت زبیرؓ میدان جنگ سے لوٹنے لگے تو ایک سپاہی آپ کے ساتھ ہوگیا اور اس نے آپ کو حالت نماز میں شہید کر دیا۔ حضرت زبیرؓ کی اتباع میں جب حضرت طلحہؓ بھی میدان جنگ سے نکلنے لگے تو مروان بن حکم نے تیر چلا کر آپ کو بھی شہید کر دیا۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر محمل میں بیٹھے تیروں کی بوچھار میں جنگ کی قیادت کر رہی تھیں۔ حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ جب تک ان کا اونٹ اپنی جگہ قائم ہے جنگ کا سلسلہ بند نہ ہوگا اس لیے آپ کے حکم سے اونٹ کے پاؤں زخمی کر دیے گئے جب اونٹ بیٹھ گیا تو فوج کی ہمت پست ہوگئی اور لڑائی کا سلسلہ بند ہوگیا۔ حضرت علیؓ نے خود حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لا کر مزاج پرسی کی۔ لڑائی ختم ہوئی ام المومنین کو پورے احترام کے ساتھ مکہ روانہ کیا گیا۔ جہاں سے پھر آپ مدینہ تشریف لے گئیں۔ اس ناگوار قضیہ کا آپ کو زندگی بھر افسوس رہا۔

مدینہ سے دارالخلافہ کی منتقلی

جنگ جمل کا آغاز غلط فہمی اور سبائیوں کی فتنہ انگیزی سے ہوا لیکن اس کا اختتام فریقین کی صفائی پر ہوا۔ اس جنگ کے بعد حضرت علیؓ نے اپنا دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ (عراق) منتقل کر دیا اس تبدیلی سے عامۃ المسلمین کبیدہ خاطر ہوئے۔

امیر معاویہ کو بیعت کی دعوت

انتظام مملکت کے سلسلہ میں شام کے مسئلہ کو بڑی اہمیت تھی اس کے والی امیر معاویہؓ تھے جن کا وہاں بڑا اثر تھا۔ انہوں نے اہل شام کے ساتھ اس وقت تک حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لیے آپ نے ایک مکتوب کے ذریعہ ان کو بیعت کی دعوت دی۔ امیر معاویہؓ نے عمر بن العاصؓ کے مشورہ کے مطابق شام کے ایک با اثر فرد شرحبیل بن سمط کندی کی خدمات اس لیے حاصل کیں کہ وہ شام اور مضافات شام میں حضرت عثمانؓ کے قصاص کے مطالبہ پر رائے عامہ ہموار کر کے اہل شام کو حضرت علیؓ کے مقابلہ کے لیے آمادہ کرے چنانچہ شرحبیل کی مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک شام کے امراء و عوام نے قسم کھائی کہ جب تک وہ خلیفۂ مظلوم کے خون کا بدلہ نہ لیں گے چین کی نیند نہ سوئیں گے۔

جنگ صفین

حضرت علیؓ کے قاصد جریر بن عبد اللہ نے خود شام کے ان حالات کا مشاہدہ کیا اور واپس جا کر حضرت علیؓ کو اطلاع دی کہ اہل شام نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا عہد کر لیا ہے کہ وہ اپنی جان دے دیں گے یا جان لے کر رہیں گے۔ اتمام حجت کی غرض سے ضروری مراسلت ہوئی مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو جانبین سے جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ چنانچہ ذی الحجہ ۳۶ھ میں حضرت علیؓ نے ۸۰ ہزار سپاہ کے ساتھ شام کی جانب اقدام کیا امیر معاویہؓ کا لشکر ساحل فرات پر صفین کے میدان میں اترا۔ بعض صلحائے امت نے میدان جنگ میں بھی مصالحت کی کوشش کی۔ مگر ان کو ناکامی ہوئی۔ جمادی الاول ۳۷ھ میں معمولی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر خونریز جنگ کا آغاز صفر ۳۷ھ سے ہوا جس میں ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی کام آئے۔ جب جنگ اپنی انتہا پر تھی تو حضرت علیؓ نے اندازہ لگایا کہ شامی فوج کوئی دم میں میدان چھوڑنے والی ہے اس لیے آپ نے اپنی فوج کو فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے ابھارا۔ شامی فوج کی نازک حالت دیکھ کر عمرو بن العاصؓ نے امیر معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ فریق مخالف کو دعوت دی جائے کہ قرآن کو حکم بنا لیں۔ چنانچہ دوسرے دن صبح قرآن مجید کے ہزاروں نسخے نیزوں پر بلند کیے ہوئے شامی میدان میں داخل ہوئے اور اعلان کیا کہ قرآن کو حکم مان لیا جائے حضرت علیؓ نے اس شاطرانہ چال کو سمجھا لیکن عراقی فوج کے ایک بڑے حصہ پر جادو چل گیا یعنی خود حضرت علیؓ کے سپہ سالار نے جنگ جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ قرآن کو حکم بنانے کی دعوت قبول کی جائے ورنہ خود ان کے خلاف جنگ شروع کی جائے گی۔ حضرت علیؓ مجبوراً تحکیم (ثالثی) کے لیے رضامند ہو گئے اہل شام کی طرف سے عمرو بن العاصؓ اور اہل عراق کی طرف سے ابوموسیٰ اشعری حکم منتخب ہوئے اور معاہدہ کے ذریعہ یہ طے ہوا کہ دومۃ الجندل کے مقام پر فیصلہ کا اعلان ہو۔ بڑی رد و قدح کے بعد ابوموسیٰ اشعریؓ کے اس فیصلہ پر اتفاق ہوا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیا جائے اور مسلمانوں کو از سر نو خلیفہ (صدر مملکت) کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ فیصلہ سنانے کے لیے ہر دو حکم دومۃ الجندل کی جامع مسجد میں آئے۔ ہزاروں مسلمان اور ممتاز صحابہ فیصلہ سننے کے لیے جمع تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی فضیلت کا واسطہ دے کر عمرو بن العاصؓ نے پہلے ان ہی سے اپنا فیصلہ سنانے کی خواہش کی۔ چنانچہ انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر فیصلہ سنایا کہ "موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے خلافت کا مسئلہ کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے اس لیے میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرتا ہوں اس کے بعد عمرو بن العاصؓ نے اپنا فیصلہ یوں سنایا" ابوموسیٰ نے اپنے آدمی کو معزول کر دیا میں بھی ان کو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے آدمی معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔" وہ امیر المومنین عثمانؓ کے ولی اور ان کے قصاص کے طالب ہیں۔ اس لیے ان کے قائم مقام ہونے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔"

یہ فیصلہ سنتے ہی ابوموسیٰ نے چلا کر کہا "یہ بیوفائی اور بدعہدی" ہے حضرت علیؓ کے مؤیدین میں اس سے سخت برہمی پیدا ہوئی شیخ بن ہانی عمرو بن العاصؓ پر کوڑے برسانے لگے لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا یہ رنگ دیکھ کر حضرت ابوموسیٰ اشعری مکہ کی طرف نکل گئے۔ امیر معاویہؓ کے حامیوں نے ان کو اپنا باضابطہ امیر تسلیم کر لیا۔ [1]

خارجی تحریک

حضرت علیؓ نے ابتدا ہی سے تحکیم کی تجویز سے اختلاف کیا تھا لیکن فوج کی ضد پر آپ نے مجبوراً اس کو قبول کر لیا اس میں سے ایک جماعت تحکیم کی اس حد تک مخالف ہو گئی کہ اس کو کفر قرار دیا۔ یہی جماعت بعد میں "خوارج" کے نام سے موسوم ہوئی۔

جنگ اور خوارج کی شکست

خوارجوں کی فتنہ انگیزی روز بروز بڑھتی گئی جس کسی نے ان کے عقیدہ کے ماننے سے انکار کیا ان کو وہ قتل کر دیتے۔ ان کے فتنہ کی سرکوبی کے لیے حضرت علیؓ نہروان کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر آپ نے مصالحت کی کوششوں کی۔ خوارج اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس لیے جنگ کے سوائے اب کوئی چارہ نہ تھا۔ جنگ کے آغاز سے پہلے حضرت ابوایوب انصاری کو امن و امان کا سفید علم دے کر بھیجا گیا تاکہ جو کوئی بھی اس علم کے تحت آجائے یا خوارج کا ساتھ چھوڑ دے وہ مامون رہے گا۔ اس پر پانچ سو آدمی اپنے سردار کے ساتھ میدان میں جنگ سے لوٹ گئے۔ ایک اور جماعت کوفہ کو واپس ہو گئی۔ ایک ہزار افراد علوی جھنڈے کے تحت آگئے۔ اب عبداللہ بن وہب کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی رہ گئے۔ اس کے باوجود حضرت علیؓ نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ خود خوارجیوں نے لا حکم الا اللہ کا نعرہ لگا کر اس شدت کا حملہ کیا کہ علوی فوج کے پیدل دستہ نے اپنا محاذ چھوڑ دیا۔ فوج کے میمنہ اور میسرہ پر خوارجی بڑی بہادری کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ جوابی حملہ میں زخمی ہونے کے باوجود وہ برابر داد شجاعت دے رہے تھے۔ بالآخر حضرت علیؓ کی فوج نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد خوارجیوں کو شکست فاش ہوئی۔

خوارج کی شکست کے بعد حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آنا چاہتے

[1] مصر کے مشہور مورخ خضری نے اس روایت کو مشکوک قرار دیا ہے اور مسعودی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زبانی تقریر کے بجائے دونوں صاحبوں کا متفقہ فیصلہ تحریری شکل میں تھا لیکن اس فیصلہ سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

تھے لیکن فوج نے اس کی مخالفت کی اور تجویز پیش کی کہ تازہ دم ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا بہتر ہو گا اس لیے حضرت علیؓ کوفہ واپس ہو گئے۔

مصر پر امیر معاویہؓ کا قبضہ

حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں قیس بن سعد کو جو ایک مقتدر صحابی تھے مصر کی ولایت کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ان کی مصلحت شناسی اور معاملہ فہمی مسلمہ تھی۔ امیر معاویہؓ کی جانب سے ان کو ہموار کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ مخالف جماعت نے ان کے خلاف پروپگنڈا شروع کیا جس سے یہ اپنی ولایت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے علیحدہ ہوتے ہی مصر کا محاذ کمزور پڑ گیا۔ اس پر قبضہ کرنے کا جو منصوبہ امیر معاویہؓ نے بنایا تھا اس میں وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد سے کامیاب ہو گئے اور سابقہ معاہدہ کے مطابق وہ مصر کی ولایت پر مامور ہوئے۔

اس کے بعد حضرت علیؓ کے دوسرے مقبوضات پر بھی فتح پانے کی کوشش شروع ہوئی لیکن متعدد دفعہ شامی افواج کو شکست ہوئی۔ مدائن، انبا، جزیرہ، دومتہ الجندل پر قبضہ کی مساعی بھی ناکام رہیں۔ محاذ آرائی کا یہ سلسلہ جاری رہا جو جانبین کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔

امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ میں مصالحت

مسلسل خانہ جنگی خونریزی اور بدامنی سے نجات حاصل کرنے کے لیے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ نے ۴۰ھ میں آپس میں صلح کر لی جس کی رو سے حجاز، یمن، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے قبضہ میں آ گیا۔ شام، فلسطین، مصر اور مغربی حصہ امیر معاویہؓ کے زیر نگیں رہا۔

فتوحات

مسند خلافت ہاتھ میں لیتے ہی حضرت علیؓ آپس کی خانہ جنگیوں سے نمٹنے میں مصروف رہے۔ اس لیے بیرونی فتوحات کی جانب زیادہ توجہ نہ دی جا سکی۔ اس کے باوجود کابل (افغانستان) اور سیستان میں فتوحات حاصل ہوئیں۔

بغاوتوں کا انسداد

خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر عجمی علاقہ کے والیوں نے بغاوت کر دی تھی چنانچہ کرمان اور فارس (ایران) کے صوبے باغی ہو گئے تھے۔ اندرونی خلفشار کے باوجود حضرت علیؓ نے زیاد ابن ابیہ کو مامور کر کے ان بغاوتوں کو فرو کیا۔

حضرت علی کی شہادت

نہروان کے معرکہ میں شکست کھانے کے بعد خوارج اپنی زندگی سے بیزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مملکت میں خلفشار اور بدامنی کے ذمہ دار حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ ہیں۔ ان کی خانہ جنگی سے خلق اللہ مصیبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس لیے انہوں نے ان تینوں کو ایک ساتھ شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ عبدالرحمن بن ملجم نے حضرت علیؓ، برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ اور عمرو بن بکر نے عمرو بن العاص کو شہید کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ابن ملجم نے اپنے کام میں ایک اور شخص شبیب بن بجرہ اشجعی کو شامل کر لیا۔ رمضان المبارک ۴۰ ہجری میں تینوں پر کوفہ، دمشق اور فسطاط (قاہرہ مصر) میں بوقت فجر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مصر میں عمرو بن العاصؓ اس روز نماز کے لیے مسجد نہ آ سکے۔ ان کی بجائے جو شخص نماز پڑھانے کے لیے مقرر تھا وہ دھوکہ میں قتل ہو گیا۔ امیر معاویہؓ پر وار اوچھا لگا۔ ان کا پاؤں زخمی ہوا۔ علاج معالجہ کے بعد ان کو صحت ہو گئی۔ حضرت علیؓ جیسے ہی نماز کے لیے کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے ابن ملجم اور ابن بجرہ نے مل کر حملہ کر دیا زخم کاری لگا۔ ابن ملجم کو لوگوں نے گرفتار کر لیا لیکن ابن بجرہ فرار ہو گیا۔ آپ کی آواز پر لوگ دوڑ پڑے۔ آپ کے بجائے جعدہ بن ہبیرہؓ نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد ملجم کو حضرت علیؓ کے سامنے پیش کیا گیا چند استفسارات کے بعد آپ نے اس کو حوالات میں رکھنے کا حکم دیا اور اپنے عہدہ داروں کو ہدایت فرمائی کہ اگر میں زخم سے جانبر نہ ہو سکوں تو اللہ کے حکم کے مطابق اس کو قصاص میں قتل کر دیا جائے۔

تلوار چونکہ زہر میں بجھی ہوئی تھی بہت جلد اس کی سمیت سارے جسم میں پھیل گئی تینوں صاحبزادوں، حضرت امام حسنؓ و امام حسینؓ اور محمد بن حنیفہ کو طلب کر کے باہمی اتحاد و اتفاق کی تلقین فرمائی۔ ایک صحابی جندب بن عبداللہؓ نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے نہ تو نفی اور نہ اثبات میں جواب دیا البتہ فیصلہ رائے عامہ پر چھوڑ دیا۔ زخمی ہونے کے تیسرے دن ۲۰ رمضان شب یکشنبہ ۴۰ھ کو انتقال فرمایا۔ حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ نے غسل دیا اور حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق کوفہ کے غزلی نامی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ بوقت شہادت ۶۳ سال کی عمر تھی۔ مدت خلافت ۴ سال ۹ مہینے رہی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ہی خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا اور اسلامی مملکت میں ملوکیت کا دروازہ کھل گیا۔

عہد مرتضوی کے کارنامے

نظام خلافت کی اصلاح

شدید مخالفتوں کے باوجود حضرت علیؓ نے شیخین کے دور کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ مرور زمانہ سے عثمانی دور میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کر کے آپ نے فاروقی نظم و نسق کو بحال کیا۔ صوبوں کی وہی تقسیم باقی رکھی گئی۔ عمال بدل دیے گئے۔ البتہ مدینہ (حجاز) کے بجائے کوفہ (عراق) کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔

محکمہ فوج

عہد رسالت میں خیبر کا یہودی علاقہ حضرت علیؓ ہی کی بہادری سے فتح ہوا تھا۔ آپ نے فوج کی کارکردگی کی جانب پوری توجہ کی۔ حسب ضرورت فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ قلعے تعمیر کرائے۔ اصطخر کا قلعہ زیادہ تر آپ ہی کے عہد میں تعمیر کیا گیا۔

محکمہ مال

مال گزاری کے سلسلے میں آپ نے ایسی اصطلاحات کیں جن سے آمدنی میں اضافہ ہوا۔ علوی دور سے قبل جنگلات سے کوئی مالی استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ آپ نے ان پر بھی محصول لگایا چنانچہ صحرائے برس سے چار ہزار دینار کی آمدنی ہونے لگی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تجارتی اغراض کے لیے گھوڑوں کی پرورش ہونے لگی تو آپ نے اس پر زکوٰۃ مقرر کر دی تھی لیکن حضرت علیؓ نے اس کو منسوخ قرار دیا۔ حضرت عمرؓ کے اتباع میں کاشت کاروں کو زرعی اغراض کے لیے بیت المال سے بلا سودی قرضوں (تقاوی) کے نظام کو برقرار رکھا۔

محکمہ احتساب

عمال پر نگرانی کا خاص اہتمام کیا۔ ان کے اعمال و افعال کا احتساب اور ان کے طور عمل کے بارے میں برابر تحقیقات فرماتے تھے۔ اگر کسی سے غلطی سرزد ہو جاتی تو اس

کا تدارک کرتے تحریری باز پرس کے علاوہ کمیشن کے ذریعہ حالات کی تحقیق کراتے۔ عمال سے محاصل وخراج کی آمدنی کا سختی سے حساب لیتے۔ بیت المال کی حفاظت کا خاص انتظام تھا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی ذات پر بیت المال کی معمولی چیز کو بھی استعمال کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ ذمیوں کے حقوق کا خاص خیال رکھا۔ اعمال کو ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا حکم دیا گیا اور اس سلسلے میں تالیف قلوب کی حکمت عملی اختیار کی۔

عدل و مساوات آپ کی عدالت میں امتیازی سلوک روا نہ تھا۔ اگر آپ خود کسی مقدمہ میں فریق ہوتے تو قاضی کے سامنے حاضر ہو جاتے۔ ایک مرتبہ آپ کی زرہ گر پڑی اور وہ ایک یہودی کے قبضہ میں آگئی۔ حضرت علیؓ نے اس کی شناخت کی۔ قاضی شریح کے عدالت میں دعویٰ دائر ہوا۔ یہودی زرہ پر اپنی ملکیت کا دعویدار تھا۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے شہادت طلب کی۔ آپ نے اپنے صاحبزادہ اور پھر اپنے آزاد کردہ غلام قنبر کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا لیکن یہ شہادت معتبر نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے حاکم عدالت نے یہودی کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ اس فیصلہ سے یہودی اتنا متاثر ہوا کہ وہ اور اس کا پورا قبیلہ جو دو ہزار نفوس پر مشتمل تھا مسلمان ہو گیا اور کہنے لگا "توریت" میں لکھا ہے کہ "آسمانی انصاف زمین پر آنے والا ہے۔ وہ آسمانی انصاف آج زمین پر آ گیا۔"

ایسے ہی انصاف اور حق پرستی کی مثالوں سے متاثر ہو کر انگلستان کے مشہور مؤرخ ایچ۔ پالم نے اپنی تاریخ "آئین سلطنت" میں لکھا ہے۔

"مسلمانوں میں جو پہلے چار خلفاء (خلفائے راشدین) گزرے ہیں ان میں حکمرانی سے کہیں زیادہ پیغمبرانہ شان دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی دنیا کے کسی ملک میں ایسے فرشتہ صفت حکمراں نہیں ملتے۔"

نرخ اور ناپ تول بازار کی نگرانی، نرخ اشیاء اور ناپ تول کی بہ ذات خود نگرانی فرماتے تھے۔ رات کو گشت کے لیے نکل جاتے۔ انصاف طلب کرنے کے لیے ہر شخص براہ راست آپ سے رجوع کرتا تھا۔

فضل و کمال حضرت علیؓ نے ایام طفولیت سے دامن نبوت میں تربیت پائی۔ جوانی میں آپ کو رسول اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہوا جو علم و فضل آپ کو مکتب نبوت سے حاصل ہوا وہ کسی اور صحابی کے حصہ میں نہیں آیا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ نیز جملہ دینی علوم کے آپ ماہر تھے۔ قرآن کریم سے آپ کو خاص شغف تھا۔ حافظ قرآن تھے۔ احکام و مسائل کے استنباط کا فطری ملکہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد آپ نے آیتوں اور سورتوں کی نزولی ترتیب پر کلام کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا۔ فقہی مسائل میں اکثر صحابہ آپ سے رجوع کرتے تھے۔ مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ تقسیم میراث اور قانون وراثت کے فن میں آپ کو امتیاز حاصل تھا۔ تصوف کے بڑے سلسلے حسن بصری کے واسطہ سے آپ ہی پر ختم ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ کا شمار فصحاء عرب میں ہوتا ہے۔ آپ کے خطبات فصاحت و بلاغت اور زبان و ادب کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ آپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد شریف رضی نے "نہج البلاغۃ" کے نام سے آپ کے خطبات جمع کیے۔ آپ کے ان خطبات کی نسبت اختلاف رائے ہے تاہم اس میں کلام نہیں کہ آپ کے کچھ خطبات اس میں شامل ہیں۔ آپ کو تحریر میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ رسول اللہ کے فرامین کے کاتبین میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ حدیبیہ کا مشہور صلح نامہ آپ ہی نے تحریر کیا تھا آپ کو شاعری کا بھی ذوق تھا۔ اکثر اشعار آپ سے منسوب ہیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات پر آپ نے مرثیہ لکھا تھا۔ آپ ہی نے فن نحو کی بنیاد ڈالی اپنے ایک شاگرد ابوالاسود دولی کو آپ نے چند اصول بتائے جنہوں نے انہیں اصولوں کی روشنی میں نحو کے قواعد مرتب کیے۔ آپ کو مذہبی علوم اور اس عہد کے تمام مروجہ فنون میں کمال حاصل تھا۔

زہد و اتقاء آپ اخلاق نبوی سے متصف تھے۔ زہد و اتقا میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مالی فراغت کے باوجود آپ فاقے کیا کرتے تھے۔ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ گھر کا کام خود اور آپ کی بیوی حضرت فاطمہؓ کیا کرتی تھیں۔ آپ ریاضت شاقہ میں بھی بہت مشہور تھے۔ آپ کے در سے کوئی حاجت مند مایوس نہیں لوٹا۔ یہ بھی ہوتا کہ اپنا کھانا سائلوں کو دے دیتے اور خود فاقہ فرماتے۔

خلافت بنو امیہ

حضرت عثمانؓ کے دور میں امیر معاویہؓ شام کے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ اس وقت ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے قاتلوں سے بدلے کے مسئلے پر امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کر دی اور اس دوران امیر معاویہؓ نے شام اور مصر پر اپنا اقتدار اور مضبوط کر لیا۔ ان کی فوج بھی زیادہ منظم اور آزمودہ کار تھی۔ بازنطینوں سے مورچہ لے چکی تھی۔ حضرت علیؓ کا اقتدار صرف علاقہ عرب اور عراق تک محدود تھا۔ ۶۶۱ء میں ایک خارجی نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا تو ان کی جگہ عراق میں امام حسن کے ہاتھ پر وہاں کے لوگوں نے بیعت کر لی اور انہیں خلیفہ بنا لیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ان کا معاویہؓ سے معاہدہ ہو گیا اور وہ چند شرائط کے تحت خلافت سے دست بردار ہو گئے ۶۶۱ء میں امیر معاویہؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور اس طرح خلافت بنو امیہ کی بنیاد پڑی۔ اسی کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کے اصولوں میں بھی بڑی تبدیلی آگئی

حضرت معاویہؓ سے پہلے خلافت انتخابی تھی لیکن معاویہؓ نے یزید کو جانشین بنا کر خلافت کو موروثی کر دیا۔ بنو امیہ نے تقریباً ایک صدی تک (۶۶۱-۷۵۰ء) حکومت کی۔ اس خاندان میں چار فرمانروا گزرے جنہوں نے ایک وسیع اور مستحکم سلطنت قائم کی۔ اس کو وسعت دینے کا سہرا حجاج بن یوسف، محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد جیسے فوجی سپہ سالاروں کے سر ہے۔ اگرچہ اس دور میں مضری اور حمیری قبائل کی وہ باہمی رقابت پورے طور پر جاری رہی جو برسوں سے چلی آ رہی تھی، یہ آخر میں ان کے زوال کا بڑا سبب بنی۔ امیر معاویہؓ کا زمانہ پُرامن گزرا لیکن خارجیوں کی سازشیں جاری رہیں۔ ان کی سازشوں کا فوری تدارک کر دیا جاتا تھا۔ خارجی سردار فردہ بن نوفل اور مستور بن عقبہ نے خفیہ سازشیں کیں۔ مغیرہ بن شعبہ کو جو بڑے آزمودہ کار اور نامور مدبر تھے، خارجیوں کی طاقت توڑنے کے لیے کوفہ کا والی مقرر کیا گیا۔ مغیرہ بن شعبہ نے ایک سال کے اندر خارجیوں پر قابو پا لیا۔

امیر معاویہؓ ۴۰ — ۶۰ھ / ۶۶۰ — ۶۸۰ء جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مملکت بنو امیہ کے بانی تھے۔ وہ ایک جری سپہ سالار تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بڑی فتوحات حاصل کی تھیں۔ سندھ، ترکستان اور شمالی افریقہ

کے اکثر علاقوں پر فوج کشی کی۔ ان کو فتح کرکے وہاں اپنی طرف سے حاکم مقرر کیے۔ رومیوں سے بھی ان کے بار بار معرکے ہوتے رہے۔ حضرت معاویہؓ کا حملۂ قسطنطنیہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اس زمانہ میں مشرقی یورپ میں شامل تھا۔ ۴۹ھ/ ۶۶۹ء میں انھوں نے بڑے اہتمام سے اس پر فوج کشی کی۔ اس لڑائی میں ابوایوب انصاریؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن اصفہانی شامل تھے۔ قسطنطنیہ کی فصیل بہت اونچی اور سنگین تھی۔ رومی اوپر سے آگ برسانے لگے۔ مسلمان نشیب میں تھے اس لیے انہیں مقابلے میں بڑی دشواری ہوئی اور کثیر جانی و مالی نقصان کی وجہ سے محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ شام کے ساحلی علاقے کو رومیوں کے حملے سے محفوظ کرنے کے لیے امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں بحرۂ روم کے اکثر جزائر مثلاً قبرص اور رودس (Rbodes) پر قبضہ کرلیا تھا۔ ان کی فوج صقلیہ کی طرف بھی بڑھی تھی لیکن اس کی یورش ناکام رہی۔ امیر معاویہؓ نے سلطنت میں نہ صرف وسعت پیدا کی بلکہ تمدنی ضروریات کے مطابق بہت سے شعبے بھی قائم کیے۔ انہوں نے ایک وسیع اور طاقتور حکومت اپنے جانشینوں کیلیے چھوڑی۔

امیر معاویہؓ نے صوبوں کی تقسیم اور نظم و نسق میں عہد فاروقی کے نظام کو برقرار رکھا۔ سلطنت کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ قیام عدل اور رعایا کے آرام و آسائش کا خاص طور پر خیال رکھا۔ بہتر اور کارگزار فوج تیار کی۔ بحری بیڑے بنوائے۔ نہریں کھدوائیں اور مختلف دفاتر قائم کیے۔ علم سے خاص لگاؤ ہونے کی بنا پر آنحضرتؐ کے زمانہ میں آپ کو کاتب وحی کی قابل اعتماد خدمت عطا کی گئی تھی۔ اس عہد کے جملہ مروجہ علوم میں کافی درک رکھتے تھے۔ انہوں نے عُبید (عَبید) بن شریہ سے قدیم تاریخ (کتاب الملوک واخبار الماضین) لکھوائی۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ (۶۰ھ/ ۷، اپریل ۶۸۰ء) میں ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے لڑکے یزید کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ لیکن یزید کی جانشینی کو امام حسین، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر نے تسلیم نہیں کیا۔ حضرت امام حسین نے مسلم بن عقیل کو کوفہ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ مسلم بن عقیل نے اہل کوفہ کی تائید پر بھروسہ کرکے آپ کو کوفہ بلا بھیجا۔ اہل کوفہ نے آپ کی حمایت کا اگرچہ پورا وعدہ کیا۔ لیکن میدان کربلا میں آپ کا ساتھ نہ دیا۔ یزید کی فوجوں نے حضرت امام حسینؓ کے خاندان کا محاصرہ کرکے آپ کے خاندان کے افراد کو نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک یزید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ سانحہ کربلا کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اس عظیم قربانی سے تیرہ سو سال سے زیادہ گزرنے کے بعد آج بھی اہل اسلام اخلاقی اور روحانی فیض اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی بیعت فسخ کرکے عبداللہ بن زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کرلی اور تمام اموی عمال کو مدینہ سے نکال دیا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کی قیادت میں دس ہزار فوج مدینہ روانہ کی۔ اور وہاں کے لوگوں سے صلح کی کوشش کی لیکن وہ یزید سے صلح پر آمادہ نہ تھے حالانکہ حکومت کی فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ یزید کی فوجوں نے مدینہ کو تباہ کردیا۔ بہت سے اکابر اشراف قریش و انصار اس جنگ میں کام آئے۔ وہاں کے لوگوں کو زیر کرنے کے بعد مسلم بن عقبہ کی طبیعت ناساز ہوئی تو لوگوں کو حصین بن نمیر کی قیادت میں دے دیا۔ اسی عرصہ میں مسلم بن عقبہ کے وفات کے بعد حصین بن نمیر نے مکہ کا رخ کیا۔ جہاں حرم میں ابن زبیر پناہ گزیں تھے حصین نے محاصرہ کرکے سنگ باری شروع کردی اس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ یزید کا انتقال ہوگیا (۶۰ — ۶۴ھ/ ۶۸۰ - ۶۸۳ء) حصین بن نمیر نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ابن زبیر سے صلح کرلی۔ اور انہیں شام چلنے کے لیے مجبور کیا۔ تاکہ وہاں عوام ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ لیکن ابن زبیر شام چلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

یزید کے زمانہ میں ترکستان اور افریقہ بھی فوجیں بھیجی گئیں شمالی افریقہ میں مزید علاقے فتح کیے گئے لیکن بربر فوج بار بار مسلمانوں کے مقابلہ میں بغاوت کا جھنڈا بلند کرتی رہی۔ یزید کی موت کے بعد معاویہؓ دوم تخت نشین ہوا لیکن یزید کے زمانہ میں جو حوادث پیش آئے۔ انہیں یاد کرکے معاویہؓ دوم نے حکومت سے کنارہ کشی کرلی (۶۸۴ء) اور چند ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

معاویہ دوم کی وفات کے بعد مروان کو جو بلحاظ سن و سال بنی امیہ کا ایک اہم رکن تھا، عبیداللہ بن زیاد نے سلطنت حاصل کرنے کی ترغیب دی مروان بنوامیہ کی دوسری شاخ بنوالعاص سے تھا۔

مروان نے عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ابن زبیر نے احتیاطاً شام کا سفر نہیں کیا۔ شام میں عبداللہ بن زبیر مروان بن حکم اور خالد بن یزید کے حامیوں میں سخت اختلاف تھا۔ لیکن روح بن زنباع کی تجویز پر مروان کو خلیفہ (۶۴ — ۶۵ھ/ ۶۸۴ - ۶۸۵ء) منتخب کرلیا گیا۔ مروان ابن زبیر کے حامی ضحاک بن قیس کی طرف فوج لے کر بڑھا۔ دمشق کے شمال مشرق میں مرج راہط کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں مروان نے فتح پائی۔ اب سارے شام پر مروان کا قبضہ ہوچکا تھا۔ کچھ مدت بعد مصر بھی اس کے قبضہ میں آگیا۔ اب اس نے خالد بن یزید سے عہد شکنی کرتے ہوئے اپنے بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ مرج راہط کی لڑائی (۶۸۴ء) کے بعد حمیریوں اور مضریوں میں قبائلی رقابت بہت تیز ہوگئی۔ انتقال کے وقت مروان کی مدت خلافت نو ماہ اور عمر ۶۳ سال تھی۔
(۶۴ - ۶۵ھ / ۶۸۴ - ۶۸۵ء) مروان کے بعد عبدالملک (۶۵ھ — ۸۶ھ/ ۶۸۵ — ۷۰۵ء) تخت نشین ہوا وہ بڑا مدبر حوصلہ مند مستقل مزاج اور بہادر فرمانروا تھا۔ تخت نشینی کے وقت عبدالملک کے قبضہ میں صرف مصر و شام تھے۔ باقی دنیائے اسلام کے حصے پر ابن زبیر قابض تھے۔

عبدالملک کے زمانہ میں "توابین" کا ظہور ہوا۔ یہ لوگ اپنے کو حضرت علیؓ کا فدائی اور حضرت امام حسینؓ کا حامی بتاتے تھے اور انھوں نے حسینؓ کے قاتلوں سے انتقام لینا اپنا فرض ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے خفیہ طور پر جنگ کی تیاریاں کیں اور چھ ہزار کی جمعیت فراہم کرکے ملک شام کی طرف بڑھے۔ اس زمانہ میں اموی حاکم عبیداللہ بن زیاد عراق کی بعض مہموں میں مصروف تھا۔ توابین سے اس کی ایک خونریز جنگ ہوئی۔ اس جماعت کے بڑے سردار سلیمان بن صرد اور ان کے تمام ساتھی کام آئے۔ چھ ہزار توابین میں سے بہت کم زندہ بچے۔ توابین جماعت کا آغاز مروان کے زمانہ میں ہوا اور خاتمہ عبدالملک کے عہد میں ہوا۔

عبدالملک نے چند ہی سال میں ملک شام کو اپنے مخالفین سے صاف کردیا تمام مقابلہ کرنے والے قتل کردیے گئے۔ شام میں اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے بعد اس نے عراق اور کلاہ کی جانب توجہ کی۔ حجاج بن یوسف کی سرداری میں ایک فوج حجاز پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی جس نے مدینہ منورہ پر قبضہ کرکے شہر مکہ کا محاصرہ کرلیا۔ عبداللہ بن زبیر مکہ میں محصور ہوگئے اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جاں بحق ہوگئے۔ ان کی شکست کے بعد عبدالملک سلطنت کا واحد فرمانروا بن گیا۔

عبداللہ بن زبیر سے جنگ کے دوران خارجیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایران اور کلاہ میں طاقت حاصل کر لی لیکن مہلب نے ان کے زور کو توڑ دیا۔ مسلمانوں کے باہمی تنازع سے فائدہ اٹھا کر شیلہ بن مکرم بربری نے بغاوت کر کے شمالی افریقہ کے تمام اسلامی علاقوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ یزید کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کی تخت نشینی تک اموی حکمرانوں کو سلطنت کے سیاسی جھگڑوں سے اس بات کا موقع نہ مل سکا کہ وہ افریقہ کی طرف توجہ کریں۔ عبدالملک کے زمانہ میں جب دوبارہ اموی سلطنت میں استحکام پیدا ہوا تو اس نے افریقہ کی جانب توجہ کی۔ زہیر بن قیس کو جنہیں افریقہ کے حالات کا کافی تجربہ تھا وہاں روانہ کیا ہی تھا کہ رومیوں نے برقہ پر حملہ کر دیا۔ زہیر افریقہ کی مہم نامکمل چھوڑ کر رومیوں سے مقابلے کے لیے بڑھے لیکن اس جنگ کے دوران قتل ہو گئے۔ زہیر کے قتل کے بعد حسان بن نعمان نے رومیوں اور بربروں دونوں کو مسلسل فوج کشی کے بعد شکست دی۔ ملکہ دامیہ جنگ میں شکست کھا کر ماری گئی۔ عربوں میں وہ کاہنہ کی حیثیت سے مشہور تھی۔ اس کے بعد افریقہ میں کوئی حریف باقی نہ رہا۔ اور وہاں اسلام سرعت سے پھیل گیا۔ اس مہم کی تکمیل کے بعد حسان قیروان واپس ہو گئے۔ سیستان کے علاقہ کے ایک ترک فرماں روا رتبیل نے بغاوت کی۔ صباح نے رتبیل کی سرکوبی کی۔

عبدالملک نے عراق، سیستان، کرمان، خراسان، کال اور ماوراالنہر کا گورنر حجاج بن یوسف کو مقرر کیا۔ ہاشم بن اسمٰعیل کو مغربی عرب کا حاکم اور عبدالعزیز کو مصر کا گورنر بنایا۔

حجاج بن یوسف کے تشدد بھرے رویہ سے بہت سے علاقوں میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ حجاج کی سختیوں سے تنگ آ کر بہت سے لوگ ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔

عبدالملک وہ پہلا حکمران ہے جس نے اسلامی سکہ رائج کیا اس وقت تک مسلمان فرماں رواؤں نے اپنا علیحدہ سکہ رائج نہیں کیا تھا۔ عبدالملک نے عربی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا اور تمام دفتری کاروبار عربی زبان میں ہونے لگا۔ اس سے پہلے دفتری کارروائیوں کی انجام دہی کے لیے یونانی اور پہلوی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ تمام سرکاری دفاتر پر مقامی افراد کا قبضہ تھا۔ جس سے تعلیم یافتہ عربوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

اس زمانہ میں خانہ کعبہ کی عمارت کی توسیع عمل میں آئی۔ عبدالملک کو رفاہ عام کے کاموں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ وہ نہایت مدبر سیاست داں تھا۔ علم و فضل کے اعتبار سے بھی اس کا شمار اپنے عہد کے اکابر علما میں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے ولید کو اپنا جانشین بنایا۔ اس نے تمام مخالف طاقتوں کا خاتمہ کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ ولید کو اپنے عہد حکومت (۸۶ — ۹۶ھ / ۷۰۵ — ۷۱۵ء) میں پورے اطمینان کے ساتھ بیرونی فتوحات اور تعمیری کاموں کے انجام دینے کا موقع مل سکا۔ قتیبہ بن مسلم موسیٰ بن نصیر اور مسلمہ بن عبدالملک جیسے نامور سپہ سالاروں نے فتوحات حاصل کر کے اسلامی سلطنت کو وسیع کرنے میں ولید کی بہت زیادہ مدد کی اب اسلامی سلطنت کے حدود چین سے لے کر یورپ تک پھیل گئے تھے۔ قتیبہ بن مسلم نے ترکستان اور چین کے بہت سے علاقے فتح کیے۔ قریب قریب خلیفہ کے زمانہ میں سندھ پر فوج کشی کا سلسلہ جاری رہا اور فتوحات بھی حاصل ہوئیں لیکن اس سے قبل ان خلفا نے ہندوستان کو مستقل فتح کرنے کا خیال نہیں کیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے اسے مستقل طور پر فتح کرنے کا خیال کیا۔ اس نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک فوج سندھ روانہ کی۔ جہاں کے راجا داہر نے اس سے جنگ کی وہ مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ داہر کے لڑکے جے سنگھ نے شکست خوردہ فوج کو جمع کر کے از سر نو محمد بن قاسم کی فوجوں سے مقابلہ کیا لیکن جے سنگھ کو بھی شکست ہوئی۔ اس کے بعد محمد بن قاسم ملتان کی طرف بڑھا۔ اہل شہر نے مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس کی اطاعت قبول کر لی۔

اسی زمانہ میں یورپ میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ طارق بن زیاد نے اندلس فتح کر لیا۔ اندلس میں صدیوں سے گاتھ خاندان کی حکومت تھی جو تمدنی اعتبار سے سلطنت روما کی جانشین سمجھی جاتی تھی۔ کاؤنٹ جولین نے جو ایک یونانی تھا گاتھ فرمانرواؤں سے اختلاف کے باعث ولید کو اندلس پر حملہ کی دعوت دی۔ ولید نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار بری فوج کاؤنٹ جولین کے پاس بھیجی۔ جو چار جہازوں میں روانہ ہوئی۔ آبنائے کو عبور کر کے طارق معہ فوج کے جبل الطارق پر اترا۔ اور وہاں سے علیحدہ علیحدہ فوجیں بجر ناطہ تدمیر وغیرہ کے صوبوں کی طرف روانہ کیں۔ طلیطلہ پر خود طارق نے فوج کشی کی۔ اور اس شہر کو فتح کر لیا طلیطلہ کی بے شمار دولت طارق کے ہاتھ لگی جس میں گاتھ فرماں رواؤں کا وہ تاج بھی تھا جو چوبیس ہیروں سے مرصع تھا۔

طارق نے مزید فتوحات کے لیے موسیٰ بن نصیر سے فوج طلب کی۔ موسیٰ نے پانچ ہزار فوج بھیج کر طارق کو مزید پیش قدمی سے منع کیا کیوں کہ جن علاقوں کو اب تک فتح کیا گیا تھا پہلے ان کی حفاظت کرنی ضروری تھی۔ مگر خود موسیٰ بن نصیر اشبیلیہ سے مربیطوس کی جانب بڑھا اور اس کے تاریخی شہر ماردہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر اپنی قدامت عظمت اور شان و شوکت کے لحاظ سے اندلس کا سب سے ممتاز شہر تھا۔ ماردہ فتح کرنے کے بعد موسیٰ طلیطلہ روانہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے طارق آ رہا تھا کوہ طلبرہ کے مقام پر طارق اور موسیٰ کی ملاقات ہوئی۔ موسیٰ طارق کی عدول حکمی سے بے حد ناراض تھا۔ پھر بھی اس نے طارق کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ موسیٰ نے اندلس کے باقی حصوں پر فوج کشی کے انتظامات کیے۔ اندلسیوں پر مسلمانوں کی اتنی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو کوئی روکنے والا نہ تھا۔ طارق اور موسیٰ کلیشیا کی مہم سر کرنے کے بعد پورے یورپ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے لیکن جب موسیٰ بن نصیر اٹلی میں داخل ہونے کے لیے فرانس سے آگے بڑھ رہا تھا تو اموی خلیفہ کے پاس سے اس کو پیش قدمی روک دینے اور واپس ہونے کا حکم پہنچا۔ اندلس چھوڑنے سے پہلے موسیٰ بن نصیر نے مفتوحہ علاقوں کا پورا پورا انتظام کیا۔ اور اس نئے صوبے کا نائب اس نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو بنایا۔ اس صوبہ کا صدر مقام سوئیل کو بنایا گیا۔ اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ کو شمالی افریقہ کا حاکم بنا کر موسیٰ بن نصیر دمشق کی طرف روانہ ہوا۔

ہسپانیہ یا اندلس میں عربوں کے داخلے سے اس ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس فتح سے ہسپانیہ کے طرز حکومت میں ایک نہایت اہم انقلاب آیا یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی جو مسلمانوں کے آنے سے قبل ان کو حاصل نہیں تھی۔ ولید کے دور کی فتوحات کی خصوصیات یہ ہیں کہ مفتوحہ علاقوں کی رعایا کی سماجی حالت کو درست کر کے اس کو پستی سے بلندی کی طرف لایا گیا۔ فوجی نظم و نسق کو وسعت دی گئی۔ جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے گئے۔ اگرچہ امیر معاویہؓ ہی کے زمانہ میں اسلامی بحری بیڑا قائم ہو چکا تھا لیکن ولید کے عہد میں بحری فوج کی طاقت میں زبردست اضافہ ہوا ولید کو فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا یوں تو اس نے بکثرت عمارتیں بنوائیں لیکن اس کا سب سے بڑا تعمیری کام مسجد نبوی اور جامع مسجد دمشق کی تعمیر اور اس کی تزئین

و آرائش ہے۔ روضہ نبوی کے اطراف میں دوہری دیوار بنائی۔ اموی خاندان کا پہلا حکمراں ہے جس نے ادب، آرٹ اور مصنوعات کو فروغ دیا۔

ولید کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک (۹۶ – ۱۰۵ھ — ۷۱۵ – ۷۲۴ء) اس کا جانشین ہوا جس نے اپنے تحفظ کے لیے قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم کو قتل کروادیا۔ موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس پر بھی اس کا عتاب نازل ہوا اور ان کو قید کر دیا گیا۔

اس کے دور میں جرجان اور طبرستان کے پہاڑی اور دشوار گزار علاقوں پر حملے کیے گئے۔ ایک لاکھ کی فوج جرجان بھیجی گئی۔ سب سے پہلے قہستان کے پہاڑی علاقے پر حملہ ہوا اور وہاں پہاڑی باشندوں کو صلح پر مجبور کیا گیا۔ یزید بن مہلب خراسان کا گورنر مقرر ہوا تو وہ طبرستان کی طرف بڑھا۔ حاکم طبرستان نے پہلے مقابلہ کیا بعد میں صلح کرلی۔ اسی زمانہ میں جرجان میں بغاوت ہوئی تو وہاں یزید نے مسلمانوں کا پورا بدلہ لیا۔ اور وہاں کے باغیوں کی قوت توڑ دی۔ آئندہ بغاوتوں کا انسداد کرنے کی خاطر شہر جرجان میں مسلمانوں کو بسایا گیا۔

اس دور کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ قسطنطنیہ پر حملہ ہے لیکن سلیمان کے عہد کی یہ مہم ناکام رہی۔ اگرچہ مہم کامیاب ہو جاتی تو اسی زمانے میں مشرقی یورپ میں بھی مسلمان پہنچ گئے ہوتے۔ اسی زمانے میں سلیمان مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اپنے بیٹوں کے بجائے ایک برگزیدہ شخصیت عمر بن عبدالعزیز (۹۹ – ۱۰۱ھ/۷۱۷ – ۷۲۰ء) کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

عمر بن عبدالعزیز مروان بن حکم کے پوتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام کے ساتھ مشہور محدث صالح بن کیسان کی نگرانی میں ہوئی تھی طبعاً بڑے صالح اور سعید تھے اور علمی اعتبار سے امام وقت مانے جاتے تھے تخت خلافت پر قدم رکھنے کے بعد انہوں نے حضرت ابوذر غفاری اور حضرت ابو ہریرہ کا مسلک اختیار کیا۔ ان کا اصلی مقصد خلافت راشدہ کا احیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے رعایا کی مال و جائداد کی حفاظت کا انتظام کیا اور ایسی تمام جاگیریں واپس کردیں جنہیں اموی خاندان کے افراد اور عمال نے اپنی ملکیت بنالیا تھا۔ بیت المال کی حفاظت کا انتظام نہایت سختی سے کیا اپنی بیوی کے تمام زیورات لے کر بیت المال میں داخل کر دیئے۔ ناجائز آمدنیوں کا انسداد کیا اور علم داد و دہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا آسودہ حال ہوگئی۔ انہوں نے بکثرت سرائیں تعمیر کرائیں اور خراسان اور سمرقند کے گورنروں کو حکم بھیجا کہ وہ بھی اپنے علاقوں میں رعایا کے لیے سرائیں بنوائیں۔ انہوں نے نہ صرف حکومت کا سیاسی ڈھانچہ بدل دیا بلکہ شریعت کا احیا بھی کیا۔ پہلے اموی خلفا کے عہد میں جو امور جادہ شریعت سے ہٹ گئے تھے انہیں راستہ پر لگا دیا۔ حکومت اسلامی کے حدود میں توسیع کے بجائے اسلام کی توسیع اور اشاعت کی طرف پوری توجہ مبذول کی اور اس مقصد میں کامیاب بھی رہے۔

بنو امیہ نے یہ محسوس کیا کہ اگر ان کی خلافت زیادہ عرصہ تک قائم رہی تو خلافت اسلامیہ کا رنگ گہرا ہو جائے گا اور بنو امیہ کا گزشتہ اقتدار واپس نہ آسکے گا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خلیفہ کے ایک خادم کو ایک ہزار اشرفی دے کر زہر دلوادیا۔ مگر یہ بھی روایت ہے کہ آپ کی وفات طبعی علالت سے ہوئی (۷۲۰ء)

ان کی وفات کے بعد عنان حکومت یزید بن عبدالملک (۷۲۰ – ۷۲۴ء) کے ہاتھ آئی جس نے ان ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد کے عمال کو موقوف کر کے نئے عمال مقرر کیے یزید بن مہلب کے پورے خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ جس نے عراق میں بڑا اقتدار حاصل کرلیا تھا کش اور نسف کے علاقوں پر فوج کشی کی۔ ان علاقوں میں باغیوں نے اطاعت قبول کر لی۔ ترکستان کے بعد دوسرا محدود ش علاقہ خزر کا تھا جہاں کے لوگوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد شکست کھائی اور ان کا کل مال مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

بعض مقامات پر خوارج نے سر اٹھایا لیکن بہت جلد ان کی بغاوت کو بھی فرو کردیا گیا۔

یزید کے انتقال کے بعد ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ھ – ۱۲۵ھ/۷۲۴ء – ۷۴۳ء) تخت نشین ہوا۔ جو تدبر اور حوصلہ مندی میں عبدالملک کا مثنیٰ تھا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد اموی حکومت میں پھر ایک بار استحکام پیدا ہوا۔ وسط ایشیا اس زمانہ میں خانہ جنگیوں کا شکار بنا ہوا تھا اور تاتاری مسلمانوں کے خلاف متحد ہوگئے تھے لیکن ہشام کی ہمت اور تدبر سے وہ قابو میں آگئے۔ ادھر آرمینیہ اور آذربائیجان کے علاقے ترک، ارمنی، خرر ولان وغیرہ تمام قومیں خاقان کے لڑکے کے زیر قیادت مسلمانوں کے مقابلے میں متحد ہوگئیں اور یہ علاقے کئی سال تک رزم گاہ بنے رہے۔ اس عرصے میں سندھ کی مہموں کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ ہشام کے زمانے میں بڑے بڑے انقلابات پیش آئے۔ ولید کے زمانے میں اندلس کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے فرانس کی طرف پیش قدمی کی اور بنو امیہ کے مختلف والیوں نے بھی اس کی کوشش کی لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہشام کے عہد میں مسلمان فتوحات حاصل کرتے ہوئے وسط فرانس تک پہنچ گئے تھے۔

شمالی افریقہ میں خوارج بڑی تعداد میں تھے، اموی فوجیں چوں کہ صقلیہ (سسلی) کی مہم میں مصروف تھیں اس وجہ سے شمالی افریقہ میں بربروں نے خوارج سے مل کر طنجہ پر حملہ کر دیا جس سے شمالی افریقہ میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ ان کو فرو کرنے کی جنگ میں عربوں کے بڑے بڑے شرفا، اور عمائد کام آئے اس لیے یہ جنگ "جنگ اشراف" کہلاتی ہے اس میں عرب بے جگری سے لڑے اور بربروں کو شکست فاش ہوئی۔ عربوں نے دور دور تک ان کا تعاقب کیا جس کے نتیجہ میں شمالی افریقہ میں بربروں کی قوت ٹوٹ گئی۔

ہشام کے عہد میں بنو ہاشم نے امام زین العابدین کے صاحب زادے زید بن علی کو خلیفہ بنانا چاہا۔ کوفہ کے تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بنو امیہ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے لیکن والئی کوفہ یوسف بن عمر نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایک ہی معرکہ کے بعد اہل کوفہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جنگ میں زید بن علی شہید ہوئے۔ امام زین العابدین کے بعد امام باقر کے بجائے زید کے ہاتھوں پر جس فرقہ نے بیعت کی تھی وہ زیدیہ کہلانے لگا۔ (یہ فرقہ اب بھی یمن، ہندوستان اور اکثر مقامات پر موجود ہے) بنو ہاشم کے علاوہ اب بنو عباس بھی خلافت کے دعویدار ہوئے۔ انہوں نے اپنی یہ مہم حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ ہی سے شروع کردی تھی۔ ہشام کے زمانہ میں انہوں نے اپنی جماعت کی تنظیم قائم کی۔ جو آگے چل کر بنو امیہ کے زوال کا سبب بنی۔ ہشام نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے ولید کو نامزد کیا۔ ولید ثانی (۱۲۵ھ — ۱۲۶ھ/۷۴۳ – ۷۴۴ء) نا اہل تھا۔ اس کے مظالم کی وجہ سے عام بد دلی پھیل گئی جس کا انجام اس کے قتل کی شکل میں ہوا۔

ولید ثانی کے بعد یزید ثالث (۱۲۶ھ/۷۴۴ء) ابراہیم بن ولید ۱۲۶ھ — ۱۲۷ھ/۷۴۴ – ۷۴۵ء اور مروان ثانی (۱۲۷ – ۱۳۲ھ/۷۴۵ء — ۷۴۹ء) یکے بعد دیگر سے تخت نشین ہوئے۔ یزید ثالث اور ابراہیم بن ولید نا اہل

ثابت ہوئے۔ مروان سن رسیدہ تجربہ کار مستقل مزاج اور بہادر فرمانروا تھا لیکن اموی انتظام حکومت اتنا بگڑ چکا تھا کہ وہ اس کو نہ سنبھال سکا۔ اس کے عہد میں اموی خاندان میں شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ آپسی اختلافات کی وجہ سے عباسی تحریک کو زور پکڑنے کا موقع مل گیا۔ جو اموی خاندان کے زوال کا سبب بنی۔ یہ زوال اس کے قیام کے تقریباً ایک صدی بعد ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اموی خلافت شخصی بادشاہت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس میں شخصی حکومت کی تمام برائیاں پیدا ہو گئیں۔ اگرچہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اس حکومت کو جادۂ شریعت پر قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے جانشین اس روش کو قایم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اکثر ولی عہد نا اہل تھے اور محض قانون وراثت کی بنا پر انہیں جانشین قرار دیا گیا۔

زوال کا دوسرا سبب امراء اور اراکین سلطنت کی ناقدر دانی اور ان کے ساتھ خلفاء کی بدسلوکی تھی۔ حالانکہ انہی امراء اور اراکین سلطنت کی جان نثاری اور اولوالعزمی کے بل بوتے پر اموی حکومت قایم تھی۔ موسیٰ بن نصیر جیسا اولوالعزم فاتح خلیفہ سلیمان کے عتاب کا شکار ہوا۔ یزید بن عبدالملک نے آل مہلب کا جنہوں نے اموی حکومت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی تھیں خاتمہ کر دیا۔ انہیں امور کی بنا پر امراء میں وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ کم ہونے لگا۔

تیسرا سبب مضری اور یمنی قبائل کا باہمی تعصب تھا۔ یہ دونوں قبائل زمانہ جاہلیت میں بھی ایک دوسرے کے حریف رہ چکے تھے اور یہ پرانی دشمنی مرور زمانہ سے ختم نہ ہو سکی بلکہ عہد اسلام میں بھی اموی خلیفاؤں کے زمانہ میں برابر جاری رہی۔ ان کے تعصبات کو ختم کرانے کی کوشش کی گئی لیکن آخر زمانہ میں ایسے حالات پیش آئے کہ ان کی آپس کی خانہ جنگی بڑھتی ہی رہی۔

اس دور کے زوال کا چوتھا سبب خاندان بنو امیہ اور بنو ہاشم کے آپس کے اختلافات ہیں۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم دو برابر کے حریف قبائل تھے۔ دور جاہلیت میں بنو امیہ کو فوقیت حاصل تھی لیکن آں حضرتؐ کے زمانہ میں بنو ہاشم کا اثر زیادہ ہو گیا۔

بنو امیہ کے زوال کے کچھ اور اسباب بھی تھے بعض مورخین کا خیال ہے کہ حکومت پر عربوں کی مستقل اجارہ داری نے عجمی مسلمانوں کو اس حکومت کا کافی مخالف بنا دیا تھا چنانچہ ایرانی اور خراسانی نژاد باشندوں نے اموی خلافت کا تختہ الٹنے میں حریف گروہ کی کافی مدد کی اور بعد میں عباسی خلیفہ منصور کو دارالخلافہ کے لیے دمشق سے مشرق کی جانب ایران سے قریب تر مقام پر بغداد کی تعمیر کے لیے آمادہ کیا۔ ان کے زوال کی سب سے بڑی وجہ وہ بھی ہوئی جو تمام اگلی اور پچھلی عظیم سلطنتوں کی تھی۔ یہ سلطنت وسطی ایشیا سے لے کر پورے شمالی افریقہ اور اسپین تک پھیل گئی تھی۔ جس میں بے شمار قومیں آباد تھیں۔ ایسی حکومت اسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے جب کہ اس کا مرکز انتہائی مضبوط ہو اور فرمان روا پوری مملکت کی آبادی کی ضروریات پوری کر کے اعلیٰ نظم و نسق باقی رکھ سکے ورنہ سارا معاشی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے زراعت تباہ ہونے لگتی ہے افسروں میں بے ایمانی، رشوت ستانی اور اسی کے ساتھ رعونت بڑھ جاتی ہے حکومت لوگوں کی جان مال کی حفاظت کا بندوبست نہیں کر پاتی جگہ جگہ بغاوتیں ہونے لگتی ہیں، کمزور حکمرانوں پر طاقت ور عناصر غالب ہو جاتے ہیں یہی صورت خلافت بنو امیہ کے ساتھ پیش آئی۔

مشرق میں ان کے اقتدار کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ہی مغرب میں ہسپانیہ کا عروج شروع ہوا۔ عباسیوں نے اموی خاندان کا قتل عام کیا تو ہشام کا ایک پوتا عبدالرحمن بچ گیا جو نہایت جری سپہ سالار تھا۔ اس نے بے سر و سامانی کی حالت میں ہسپانیہ میں داخل ہو کر وہاں کے حکمران کو شکست فاش دی۔ عرب سرداروں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہت جلد بغاوتوں پر قابو پا لیا۔ عرب سرداروں کو زیر کر کے سارے ہسپانیہ کو مطیع کر لیا۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کے داخلے سے پہلے قدیم گاتھ خاندان صدیوں سے حکمراں تھا۔ جو ساتویں صدی عیسوی میں انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اپنی شان و شوکت و تمدن کے اعتبار سے یہ حکومت سلطنت روما کی جانشین سمجھی جاتی تھی۔ گاتھ فرمانرواؤں میں دستور تھا کہ امراء اور جاگیرداروں کے لڑکے دربار شاہی میں اور لڑکیاں ملکہ کی زیر نگرانی پرورش پاتی تھیں راڈرک نے یونانی سردار کاؤنٹ جولین کی لڑکی کی بے عزتی کی جس کی وجہ سے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس نے عربوں کو راڈرک کی حکومت کا تختہ الٹنے اور اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ ولید کے فوجی جنرل موسیٰ بن نصیر نے اپنے غلام طارق بن زیاد کی مدد سے اندلس پر حملہ کیا۔ اندلس فتح کر لینے کے بعد مسلمانوں نے خاندان شاہی کے ساتھ حسن سلوک کیا ولید نے گاتھ شہزادوں کو آداب شاہی سے مستثنیٰ کیا۔ موسیٰ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا عبدالعزیز اندلس کا پہلا حکمران بنا اور اس نے اپنی آزاد خود مختار حکومت کا اعلان کیا۔ عبدالعزیز بن موسیٰ کے بعد چودہ فرمان رواؤں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ آخری حکمران یوسف نے عبدالرحمن کے ہاتھوں شکست کھائی۔

عبدالرحمن نے بیس سال تک حکومت کر کے انتہائی مستحکم حکومت قایم کی اس نے عباسی خلیفہ کا نام خطبے میں بند کر دیا اور خود امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا۔

اس خاندان نے تقریباً ڈھائی سو سال حکومت کی۔ اس میں چوبیس فرمانروا گزرے۔ عبدالرحمن نے اپنا پایۂ تخت قرطبہ کو بنایا۔ عبدالرحمن سوم کے زمانے میں اس سلطنت کو عروج حاصل ہوا۔ اس نے رفاہ عام کے کام کیے اور بہترین نظم و نسق قایم کیا امویوں کے اس دور میں علوم و فنون کو بے پایاں ترقی ہوئی۔ آج کی موجودہ علمی سائنسی تحقیقاتی ترقی اس دور کی مرہون منت ہے۔ جب اندلس میں طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اموی خاندان کی پرشکوہ خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ اندلس کی اموی خلافت چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں میں منقسم ہو گئی جنہوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطلہ، مالگا وغیرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

عہد امیہ میں معاشی، سماجی اور فنی ترقی

خلافت راشدہ کے دور میں فتوحات کی رفتار اس قدر تیز تھی اور عربوں کے یہاں انتظامی صلاحیت رکھنے والوں کی اتنی کمی تھی کہ انھیں نئی اسلامی سلطنت کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینے میں بہت کافی عرصہ لگا۔ جو نئے نئے علاقے فتح ہوتے جاتے تھے۔ وہاں کے گورنر تو قریش اور دوسرے عرب قبیلوں کے سرکردہ افراد بنائے جاتے تھے لیکن ان ممالک کے اندرونی نظم و نسق میں تبدیلیاں نہیں کی جاتی تھیں اور وہ ان ہی پرانے یونانی قبطی اور ایرانی عملے کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اسی طرح سے ان علاقوں کا نظم و نسق چلتا رہا اور وہاں کی معاشی بحالی برقرار رہی۔

اسلام سے پہلے عربوں میں یہ رواج تھا کہ جو علاقے فتح ہوتے وہاں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سردار قبیلہ لیتا۔ اسلام کے آنے کے بعد کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ رواج باقی رکھا گیا۔ اور اب یہ پانچواں حصہ حکومت کو ملنے لگا۔ حکومت اس سے اپنے انتظامی کاروبار چلاتی۔ جب مسلمان سپاہی کوئی نیا علاقہ فتح کرتے تو پانچواں حصہ رکھنے کے بعد مال غنیمت یعنی غلام اور دولت سپاہیوں میں تقسیم ہو جاتی۔

زمین، مکان اور دوسری غیر منقولہ جائیداد حکومت اپنے قبضے میں لے لیتی یا اس پر ٹیکس لگا دیتی جس سے سپاہیوں اور ان کے خاندان وغیرہ کو پنشن دی جاتی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جہاں اور بہت ساری اصلاحات نافذ کی گئیں۔ وہاں انہوں نے قابل اور انتظامی صلاحیت رکھنے والے صحابہ کو گورنر بنایا اس کے علاوہ انہوں نے عراق، بصرہ اور کوفہ وغیرہ میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ قبائلی عرب ان چھاؤنیوں میں جمع کیے جاتے اور یہاں سے وہ مختلف ممالک بھیجے جاتے۔ نہ صرف خلفاء راشدین بلکہ بنو امیہ کے عہد میں بھی فوج کی تنظیم قبیلہ کی بنیاد پر ہوتی تھی اور قبیلے کا سردار ہی اپنے دستہ کا کماندار ہوتا تھا۔ اسلامی فتوحات کے ساتھ نئے علاقے اسلامی سلطنت میں داخل ہونے لگے۔ اور نئے مسائل بھی پیدا ہوتے گئے۔ شروع میں امیر معاویہؓ نے پرانے عرب سرداروں کی طرح حکومت کی کوشش کی یعنی ان کا دروازہ ہر داد خواہ خاص طور پر کمزور اور مظلوم افراد کے لیے کھلا رہتا اور تمام مسائل کے فیصلے وہ خود کرتے۔ لیکن یہ چیز بہت دن چل نہ سکی اس لیے کہ سلطنت کا دائرہ وسیع ہو گیا تو خلیفہ وقت کو روزانہ نہایت اہم امور مملکت کی طرف توجہ کرنی ہوتی تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ خلیفہ تک عوام کی رسائی دشوار ہوتی گئی۔ اس کے محل کے اطراف پہرے رہتے تھے؛ درباری شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اموی خلفاء کے تحت مشرق قریب اور شمالی افریقہ کا کافی بڑا علاقہ تھا۔ انہیں ان کے نظم و نسق اور نئی فتوحات کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑتی تھی پھر جگہ جگہ سلطنت کے اندر بغاوتیں ہوا کیں۔ ان سب کے لیے حکومت میں مرکزیت کا پیدا کرنا ضرور تھا، بھروسہ صرف اپنے قبیلے اور اس میں بھی اپنے خاندان کے لوگوں پر کیا جاتا تھا اس لیے انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔

ملک کے نظم و نسق کے لیے امیر معاویہؓ کے زمانے ہی سے نئے انتظامی ڈھانچے قایم ہونے شروع ہو گئے۔ انہوں نے مراسلت اور سرکاری مہر کے محکمے قائم کیے۔ خلیفہ عبدالملک نے رسل و رسائل اور خفیہ پولیس کے محکموں کی ابتدا کی اور ان معاملات میں یونانی اور بازنطینی اداروں سے فائدہ اٹھایا۔

ان نئے رجحانات کی وجہ سے امیر معاویہؓ اور بنو امیہ پر یہ الزام لگایا جانے لگا کہ وہ سچے خلیفہ ہونے کے بجائے محض ملک تھے لیکن وہ اپنے کو خلیفہ ہی سمجھتے رہے وہ جمعہ کی نماز کی خود امامت کرتے، خطبہ دیتے اور اپنے بچوں کو پوری دینی تعلیم دیتے تھے۔ خلیفہ عمر ثانی اور عبدالملک تمام اہم امور میں حسن البصری سے مشورہ کرتے تھے۔ بنی امیہ کے پورے دور میں مفتوحہ علاقوں کی بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو گئی اور آہستہ آہستہ عرب قوم میں جذب ہوتی گئی لیکن یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کی کافی تعداد اپنے مذاہب پر ہی قایم رہی۔ حکومت نے ان کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک روا رکھا۔ ان میں سے اکثر ٹیکس جمع کرنے والے افسر حکیم اور مختلف فنون کے ماہر تھے اور خلیفہ کو ان کی ضرورت پڑتی تھی فلسطین، شام وغیرہ کی آبادی کی بڑی اکثریت پورے عہد امیہ میں عیسائی رہی مسلمان اقلیت میں تھے۔ شام کے دارالخلافہ میں عیسائیوں کی بڑی عزت تھی حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ عیسائی تھیں۔ امیر معاویہؓ کی بیوی اور یزید کی ماں عیسائی تھیں۔ عیسائی خلافت کے نہایت اہم عہدوں پر فائز تھے۔

بنو امیہ کے شروع کے دور میں نظم و نسق بڑی حد تک بازنطینی طرز پر تھا۔ خلیفہ عبدالعزیز کے دور میں سکوں پر حرف عربی زبان میں ڈھالے جانے لگے اور خلیفہ عبدالملک کے دور میں عربی کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ اس سے پہلے نظم و نسق کی زبانیں یونانی اور فارسی تھیں۔ اگرچہ اس دور میں بھی قبطی یونانی اور ایرانی افسر اپنے عہدوں پر قایم رہے۔ انہوں نے عربی زبان سیکھ لی اور آگے چل کر عربوں سے بڑھ کر اس زبان کے ماہر بن گئے۔

عہد بنو امیہ میں عربی زبان کو زبردست فروغ ہوا سرکاری زبان بننے کے بعد عربی تیزی کے ساتھ مفتوحہ علاقوں میں پھیلنے لگی پڑوس کے علاقوں مثلاً سوریا فلسطین، عراق وغیرہ میں اس کی اشاعت آسان تھی اس لیے ان علاقوں کے لوگ سریانی بولتے تھے جو عربی سے بہت قریب اور سامی خاندان کی زبان تھی۔ مصر کی قبطی زبان کافی ترقی یافتہ اور مختلف تھی اس لیے یہاں بہت مزاحمت ہوئی اور عربی دیر میں پھیلی۔ شمالی افریقہ کے بربروں کی زبان صرف بول چال تک محدود تھی اس لیے انہوں نے عربی کو ایک علمی اور تہذیبی زبان کے طور پر قبول کر لیا لیکن ان سب علاقوں میں جو اب عربی زبان اور کلچر کے حلقے میں آتے ہیں۔ آج بھی کلاسکی عربی زبان صرف علم و ادب میں استعمال ہوتی ہے عراق، سیریا، مصر اور مغرب میں بول چال کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ اور اکثر کافی مختلف ہیں۔ ایران میں فارسی زبان کافی ترقی یافتہ تھی دانشوروں اور اہل علم نے عربی کو ضرور اپنا لیا لیکن فارسی زندہ رہی اور دو تین سو سال بعد وہ ابھر کر ایران کی ادبی و تہذیبی زندگی پر چھا گئی۔ البتہ وہ اگلی سی خالص فارسی نہیں رہی بلکہ اس میں عربی الفاظ بڑی تعداد میں شامل ہو گئے۔ قدیم عرب میں اسلام سے پہلے شاعری کافی عروج پر تھی اور عہد امیہ میں بھی اس کی بڑی ترقی ہوئی اگرچہ یونانی اور فارسی وغیرہ سے قصے کہانیاں عربی میں منتقل ہوئے اور نثر نگاری میں ترقی ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون "عربی ادب")۔

اسلام جس علاقے میں پیدا ہوا وہ انتہائی پس ماندہ اور بدوؤں کا تھا۔ سماج بھی ابتدائی قسم کا تھا لیکن جب عرب فاتح مقابلتاً ترقی یافتہ ملکوں میں پھیلے تو وہاں کی تہذیب اور تمدن اور اس کے ساتھ فنون کو بھی اپنانے لگے چنانچہ فن تعمیر میں ترقی بہت آہستہ اور دیر میں ہوئی۔ اس عہد کی پہلی سب سے اہم عمارت مسجد اقصیٰ ہے جو خلیفہ عبدالملک نے ۶۹۱ء میں مکمل کی تھی اسی کے ساتھ ولید کے عہد میں دمشق کی مشہور عالم "مسجد بنو امیہ" تعمیر ہوئی۔ اصل میں یہ رومن عہد کی ایک عبادت گاہ تھی جس میں ترمیم و اضافہ کے بعد عیسائیوں نے گرجا میں بدل دیا اور اس کے بعد اور ترمیم و اضافہ کے بعد اسے خلیفہ ولید نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔

اموی خلفاء نے بڑے بڑے محل بھی اپنے لیے تعمیر کروائے۔ خاص طور پر اردن کے علاقے کا محل اپنی شان و شوکت اور تزئین میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ ان محلوں کو مجسموں اور تصویروں سے بھی سجایا جاتا تھا اور ان میں ایرانی، بازنطینی اور حبشہ کے بادشاہوں کی تصویریں بھی تھیں۔

ان خلفاء کا ذوق تعمیر محلوں اور عمارتوں تک ہی محدود نہیں تھا انہوں نے کئی ملکوں میں نہریں بنوائیں اور آب پاشی اور زراعت پر کافی توجہ کی۔

اموی دور حکومت میں اسپین کی معاشی وسماجی ترقی

بنو امیہ جب اسپین میں داخل ہو گئے تو اپنی حکومت قایم کی اور جیسے جیسے اسپین میں بنو امیہ کا اقتدار پھیلا ویسے ویسے عرب ملکوں اور افریقہ سے عرب (حجاز کا شامی)، بربر، موّلد، مغرب اور یہودی بڑی تعداد میں داخل ہوئے۔ اندازہ ہے کہ جب عربوں نے اسپین میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تو پورے ملک کی آبادی تقریباً ۴۰ لاکھ تھی اور شروع میں عربوں اور ان کے حواریوں کی تعداد پچاس ہزار سے زائد نہیں

تھی۔ آبادی زیادہ تر دیہات میں تھی اور شہر شاذ و نادر ہی تھے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کے بعد دسویں صدی عیسوی میں بے شمار شہر آباد ہوئے مثلاً قرطبہ (آبادی ڈھائی لاکھ) Toledo (آبادی ۲۷ ہزار) الحمرا (آبادی ۲۷ ہزار) غرناطہ (آبادی ۲۶ ہزار) اس سلطنت میں حکمران اعلیٰ بالکل مطلق العنان ہوتا تھا یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کچھ اختیارات حاجب یا وزیروں کو بھی منتقل کر دیتا تھا۔ نظم و نسق کے لیے مختلف محکمے تھے جن کا ایک کاتب (سکریٹری) ہوتا تھا۔ صوبوں کو انتظامی اختیارات حاصل تھے؛ ان کا حاکم والی کہلاتا تھا۔ شہروں کے نظم و نسق کے لیے میونسپلٹیاں تھیں۔ صاحب الشرطہ (پولس کمشنر) اور صاحب السوق (ناظم بازارات) اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان شہروں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ یہاں کے جیسے حمام، پارک، بازار اور مسجدیں یورپ کے کسی حصہ میں بھی نہیں تھیں۔ فوج زیادہ تر باہر سے بھرتی کر کے لائی جاتی تھی اور ایک مقام کے سپاہی ایک جند (یونٹ) میں رکھے جاتے تھے۔ سرحدوں میں قلعہ بند چوکیاں قائم کی جاتی تھیں۔ عبدالرحمٰن ثانی کے دور میں ایک بحری بیڑہ کا قیام عمل میں آیا۔

حکومت کا پورا ڈھانچہ اسلامی فقہ پر قائم تھا اور اس میں مالکی مذہب کی پیروی کی جاتی تھی۔

جہاں تک معیشت کا تعلق ہے، زراعت کو بنیادی اہمیت حاصل تھی عربوں نے اسپین میں داخل ہونے کے بعد مقامی زمینداروں سے زمینیں چھین لیں اور انہیں حصوں میں بانٹ کر کسانوں کو پٹہ پر تقسیم کر دیا۔ آہستہ آہستہ ذرائع آب پاشی کو ترقی دی گئی۔ روئی ریشم اور دوسرے تمام ریشے جن سے کپڑا بنا جاتا تھا ان کی کاشت پر حکومت نے اپنا کنٹرول رکھا۔ زراعت کے علاوہ گھوڑوں کی پرورش کو بڑی ترقی ہوئی۔ لوہے اسپیسے سونے، پارے اور دوسری دھاتوں اور چمڑے اور ہاتھی دانت کی گھریلو صنعتوں کو فروغ دیا گیا اور یہ چیزیں سوڈان وسطی یورپ حتیٰ کہ چین کی منڈیوں تک پہنچتی تھیں۔

ثقافتی ترقی

اسپین میں عربی ثقافت اس وقت اپنے عروج پر پہنچی جب کہ اسلامی حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی ابتدائی دور یعنی آٹھویں صدی میں ترقی کی کوئی خاص علامت نہیں ملتی سوائے اس کے کہ یونانی زبان سے کتابیں عربی میں ترجمہ ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ نویں صدی تک تہذیب و تمدن اور علم و ادب نے غیر معمولی ترقی کر لی۔ عباس ابن نصیح، عباس ابن فرناس اور یحییٰ الغزل نے عربی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ ابن ہانی جو مغرب کا متنبی کہلاتا ہے اسی دور کا شاعر تھا۔ فراج نے اندلس شعرا کے کلام کا مجموعہ کتاب الحدائق اسی دور میں شائع کیا۔ شاعری اپنے عروج پر خلیفہ المعتمد کے دور میں پہنچی۔ یہ خود بھی بڑا شاعر تھا۔ اس نے ایک ادبی اکادمی قائم کی جس میں نہ صرف عرب بلکہ ہسپانوی اور صقلیہ کے دانشوروں کو جمع کیا تھا۔

دوسرے علاقوں کی طرح صنف شاعری ہی سب سے زیادہ مقبول تھی لیکن نثر میں بھی بعض بے مثال کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے المعری کی "رسالت الغفران" اور ابن حزم کی "طوق الحمامہ" آج تک مشہور ہیں۔

جہاں تک سائنس طب اور فلسفہ کا تعلق ہے ہسپانوی عربوں نے نہ صرف یونانی سے کتابوں کے ترجمے کیے بلکہ بے شمار کتابیں تصنیف بھی کیں۔ گیارہویں صدی کے وسط میں قاضی ابن سعید نے سائنس کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی۔ علم ہیئت اور نجوم کو بڑی مقبولیت حاصل تھی اور اموی حکمرانوں کے درباروں میں نجومی نوکر رکھے جاتے تھے۔ ابن رشد اور دوسرے دانشوروں نے علم الکلام کو غیر معمولی ترقی دی۔

خلافت بنی عباس

(۱۳۲ھ - ۶۵۶ھ / ۷۴۹ء - ۱۲۵۸ء)

عباسی تحریک بنی امیہ کے زمانہ میں ہی جنوبی فلسطین سے شروع ہوئی۔ اس تحریک کے بانی ابراہیم بن عباس بن عبدالمطلب تھے جنہوں نے اموی خلفاء کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ ابومسلم خراسانی نے ابراہیم کی مدد کی۔ اور دعوت بنی عباس کو تمام خراسان میں پھیلایا۔ مروان دوم کو جب اس سازش کا علم ہوا تو اس نے ابراہیم کو قتل کروا دیا۔ ابراہیم نے اپنی زندگی میں ابوالعباس کو اپنا جانشین ٹھہرایا تھا۔ ۷۴۹ء میں ابوالعباس نے کوفہ میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور دریائے فرات کے کنارے الانبار کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ امویوں کا قتل عام کرنے کی وجہ سے وہ سفاح کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ابوالعباس سفاح

(۱۳۲ھ - ۱۳۶ھ)

(۷۴۹ء - ۷۵۴ء)

خاندان بنو عباس کی حکومت کا بانی اور پہلا خلیفہ سفاح ہے۔ بنو عباس کی تاریخ کو معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے چار ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا دور:- (۱۳۲-۲۳۳ھ / ۷۴۹ - ۸۴۷ء) آغاز خلافت عباسیہ سے خلیفہ المتوکل تک۔

۲۔ دوسرا دور:- (۲۳۳-۳۳۳ھ / ۸۴۷ - ۹۴۴ء) المتوکل کی خلافت سے خلافت دولت بویہ تک۔

۳۔ تیسرا دور:- ۳۳۳ - ۴۲۲ھ / ۹۴۴ - ۱۰۳۱ء) آغاز خلافت بویہ سے خلافت اسلامی سلاجقہ تک۔

۴۔ چوتھا دور:- ۴۴۷ - ۶۵۶ھ / ۱۰۵۵ - ۱۲۵۸ء) سلاجقہ کی آمد سے ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی تک۔

معتصم کے بعد خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا۔ سلطنت پر ترک حاوی ہو گئے تھے۔ وہ جسے چاہتے خلیفہ بناتے اور جسے چاہتے معزول کر دیتے تھے۔ اس دور میں بعض اولوالعزم اور حوصلہ مند خلفاء پیدا ہوئے جنہوں نے ترکوں کی قوت توڑنے اور ان کا اقتدار گھٹانے کی کوشش کی اور اس میں ان کو عارضی کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن مستکفی باللہ (۳۲۹ - ۳۳۳ھ / ۹۴۴ - ۹۴۹ء) کے بعد آل بویہ نے ترکوں کی جگہ لی تو انہوں نے خلفاء بنو عباس کا احترام تو قائم رکھا لیکن عملاً ان کو عضو معطل بنا دیا۔ آل بویہ نے سلطنت عباسیہ کے اقتدار کو سخت دھکا پہنچایا۔

مروان کے قتل کے بعد ابوالعباس عبداللہ بن محمد سفاح تخت خلافت پر بیٹھا اس کا زیادہ وقت فتنوں کو دبانے اور نئی حکومت کو استوار کرنے میں گزرا۔ سفاح کے لفظی معنی خونریزی کے ہیں۔ اس خلیفہ نے بنی امیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا سفاح کی سب سے پہلی بیعت عراق میں ہوئی تھی اس لیے اس نے عراق کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو جزیرہ آذربائجان اور آرمینیہ کا والی بنایا۔ مدینہ منورہ

کو منظم اور یمن اپنے چچا کے سپرد کیا۔ خراسان کی باگ بدستور ابومسلم کے ہاتھ میں رہنے دی اور فارس کا امیر اپنے بھائی کو بنایا جس نے بغاوتوں کا استیصال کیا۔ خوارج کے پرانے مراکز عمان اور بحرین تھے۔ کئی خونریز معرکوں کے بعد خارجیوں کا سردار جندی مارا گیا۔ انقلاب حکومت کی وجہ سے جو بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر (۱۳۳ھ/ ۷۵۰ء) قیصر روم نے ایشیائے کوچک کے ایک سرحدی شہر ملطیہ پر حملہ کر دیا یہاں کے باشندوں نے ملطیہ کے مسلمانوں کی مدد سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ رومیوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ملطیہ کو ویران کر دیا۔ سفاح نے سرحد ی علاقوں پر فوج کشی کی۔ یہاں کا فرماں روا میش بن قبلس معمولی مدافعت کے بعد چین کی طرف نکل گیا۔ اسی سال (۱۳۳ھ/ ۷۵۰ء) فرغانہ اور چاچ کے حکمرانوں کے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر زیاد نے ان حکمرانوں کو شکست فاش دی۔

سفاح نے (۱۳۶ھ / ۷۵۴ء) میں وفات پائی اور اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو ولی عہد مقرر کیا۔ ابوجعفر عبداللہ بن محمد المنصور (۱۳۶ – ۱۵۸ھ/ ۷۵۴ – ۷۷۵ء) اس سلطنت کا حقیقی بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے بغداد کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ابومسلم چوں کہ اپنے آپ کو عباسی حکومت کا بانی سمجھتا تھا اور اس کو یہ یقین تھا کہ عباسی حکومت اسی کے بل پر قائم ہے اسی وجہ سے وہ آزاد ہو کر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ منصور ابومسلم کو اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھنے لگا۔ جس سے اس کے خیال میں بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ابومسلم کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ابومسلم کے قتل کی وجہ سے اب عربی اور عجمی کا سوال پیدا ہو گیا اور (۱۳۷ھ /۷۵۵ء) میں سنباد نامی ایک مجوسی اس کے انتقام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا لیکن منصور کو جونہی یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے جمہور بن مرار عجلی کو دس ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ سنباد نے شکست کھا کر طبرستان نکل جانا چاہا لیکن راستہ میں اسے قتل کر دیا گیا

منصور کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ خراسان کے والی عبدالجبار بن عبدالرحمٰن نے بغاوت کی لیکن خشر بن مزاحم نے اسے گرفتار کر کے دارالخلافہ روانہ کیا۔ شمالی افریقہ کے پورے علاقہ میں زبردست بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ بربری اور خارجی دونوں جن کی بڑی تعداد افریقہ میں تھی شورش پسند واقع ہوئے تھے۔ بنی امیہ کے آخری زمانہ میں یہاں بڑی بڑی بغاوتیں ہو نے لگی تھیں جس کے آثار عباسی عہد میں بھی موجود تھے۔ امیر محمد بن اشعث کو منصور نے مصر و مغرب کا والی بنا کر بھیجا اس نے شورش پسندوں کا قلع قمع کر کے امن و سکون قائم کیا اور افریقہ کے برہم شدہ نظام کو از سر نو درست کیا۔

منصور کے لیے افریقہ ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ اغلب نے دو سال تک نہایت کامیابی سے افریقہ پر حکومت کی لیکن وہ خارجیوں کی ایک بغاوت فرو کرتے ہوئے طبنہ کے قریب مارا گیا تھا۔ خارجیوں نے پھر بغاوت کی اور انہوں نے شہر قیروان کے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا۔ محاصرہ کے دوران عمر مارا گیا اور قیروان پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ منصور نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے ایک اور فوج بھیج دی جس کی کمان یزید بن حاتم کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے خارجیوں کو شکست دے کر ان کا تعاقب کیا۔ افریقہ سے مطمئن ہونے کے بعد منصور نے طبرستان اور دماوند پر فوج کشی کی۔ اصبہند والی طبرستان نے پہلے تو مقابلہ کیا اور آخر میں شکست کے ڈر سے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ اسی زمانہ میں قیصر روم نے ملطیہ پر حملہ کیا اور شہر پناہ کو مسمار کر دیا۔ ملطیہ اسلامی اور رومی سرحد کا بڑا اہم مورچہ تھا۔ (۱۴۰ھ / ۷۵۸ء) میں منصور نے از سر نو اس کے استحکامات درست کرا لیے۔ ایک قلعہ تعمیر کر کے اس میں چار ہزار حفاظتی فوج متعین کی۔ قیصر روم کو ان انتظامات کی خبر ہوئی تو وہ ایک فوج لے کر بڑھا لیکن جیحان آ کر معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی قوت زیادہ ہے اس لیے لوٹ گیا۔ منصور کے زمانہ میں سندھ کی فتوحات میں بھی اضافہ ہوا۔ ہشام کی سرکردگی میں سندھ کے مختلف حصوں میں فوجیں روانہ کی گئیں۔ ہشام خود ایک فوج لے کر ملتان کی طرف بڑھا۔ حاکم ملتان نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ایک خونریز معرکے کے بعد شکست کھائی اور شہر پر ہشام کا قبضہ ہو گیا۔ سہارنلطینی حکمرانوں نے بھی بغاوت کی لیکن ان کی بغاوت کو فرو کر کے ان سے خراج لینا شروع کیا گیا۔

منصور نے کوفہ اور بصرہ کے گرد چار دیواری کھینچیں۔ اس کے علاوہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ بغداد کی تعمیر ہے۔ اس نے بغداد آباد کر کے اس کو دارالخلافہ بنایا اور اس کی تعمیر میں بڑا اہتمام کیا۔ ایک صدی کے اندر بغداد دنیا کا سب سے عظیم شہر بن گیا۔ ان تعمیرات کے ساتھ منصور نے خانہ کعبہ کی بھی توسیع کرائی۔ حرم مکہ کی وسعت دوگنی ہو گئی۔

منصور کو علم سے خاص لگاؤ تھا۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور سیرت کی تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ امام مالک نے موطا لکھی۔ امام ابوحنیفہ نے فقہ مدون کی۔ ابن اسحاق نے "سیرت رسول اللہ" مرتب کی۔ منصور کو علم نجوم سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ سنسکرت کی مشہور عالم ہیئت کی کتاب "سدھانت" منصور کے عہد میں ہندوستان سے لائی گئی۔ اور اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا (۱۵۸ھ/۷۷۵ء) میں منصور کا انتقال ہوا

منصور کے بعد اس کا لڑکا محمد الملقب بہ مہدی (۱۵۸ – ۱۶۹ھ / ۷۷۵ – ۷۸۵ء) تخت نشین ہوا۔ مہدی کے زمانہ میں ایک خراسانی ملحد مقنع نے دعوی الوہیت کیا تھا۔ اور اس کے دعوے کو بڑی اہمیت حاصل ہو رہی تھی یہ انتہائی بدصورت اور یک چشم تھا۔ اس عیب کو چھپانے کے لیے سونے کا چہرہ منہ پر چڑھائے رہتا تھا۔ اسی لیے "مقنع" یعنی نقاب پوش کہلاتا تھا۔ اس کی شعبدہ بازی پر یقین کر کے بعض سادہ لوح اس پر ایمان لے آئے۔ چند دنوں میں اس کے پیرؤں کی کافی تعداد ہو گئی تھی (۱۶۱ھ/۷۷۸ء) میں مہدی نے سعید حرشی کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ عباسی فوج نے سخت محاصرہ کیا۔ اس نے آگ میں کود کر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا خاتمہ کیا۔ خراسان اور اکثر سرحدی علاقوں کے غیر مسلم حکمران عباسی خلافت کے باغیوں سے مل جاتے تو اس سے بڑی مشکلات پیش آتیں۔

(۱۶۲ھ/۷۸۲ء) میں مہدی نے سرحدی حکمرانوں کے باج گزاروں کے پاس سفیر بھیج کر ان سے صلح اور مفاہمت کر کے اس خطرے کا سدباب کر دیا۔ اس سلسلہ میں کابل، طبرستان، صغد، طخارستان، فرغانہ، بحستان، تبت، چین اور سندھ کے بعض فرمانرواؤں اور راجاؤں نے اطاعت کا معاہدہ کیا (۱۶۳ھ/۷۸۲ء) میں مہدی نے خود رومیوں کا مقابلہ کیا۔ رومیوں کو شکست فاش دی اور پھر قسطنطنیہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ قسطنطنیہ پر لیون کی بیوہ اپنے کم سن بیٹے کے نائب کی حیثیت سے حکمراں تھی۔ اس نے ستر ہزار دینار سالانہ فدیہ پر صلح کر لی۔

مہدی اپنی مملکت کے مشرقی حصوں کا دورہ کر رہا تھا شکار کھیلتا ہوا زخمی ہو کر مر گیا۔ ہارون اپنے باپ کے ساتھ تھا اس نے شاہی مہر اپنے بھائی ہادی کے پاس بھیج دی۔

ہادی کا زمانہ (۷۸۵ء – ۷۸۶ء) نہایت ہی مختصر تھا اس لیے اس کے زمانہ میں بیرونی مہمات کا زیادہ موقع نہیں ملا۔

ہادی اپنے انتقال سے پہلے ہارون کا نام ولی عہدی سے خارج کر کے

اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ہارون الرشید کا حامی یحییٰ برمکی بڑا دانشمند اور قابل شخص تھا۔ ہادی کی والدہ خیزران بھی ہارون الرشید کو خلیفہ بنانا چاہتی تھی اس لیے خیزران اور یحییٰ برمکی کی تدبیر اور دانشمندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہادی کے بعد ہارون الرشید خلیفہ ہو گیا۔ ہارون الرشید کا عہد حکومت (۱۷۰ — ۱۹۳ھ/ ۷۸۶ — ۸۰۹ء) اسلامی تاریخ کا یہ ایک نہایت درخشاں دور ہے۔ اس عہد کی شان و شوکت میں خود ہارون کی خصوصیات کو بہت بڑا دخل تھا۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے بھی مشیر خاص کی حیثیت سے مختلف کاموں میں مدد کر کے اسلامی سلطنت کے سیاسی استحکام میں حصہ لیا اور سلطنت کو کافی مضبوط کیا۔ یحییٰ نے ۱۷ سال تک ہارون الرشید کے اتالیق اور پھر وزیر کی حیثیت سے کام کیا۔ مشرق میں عباسی حکومت کے حدود کوہ ہندوکش تک پہنچ گئے۔ ہارون نے دوبارہ افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

برامکہ کا جد اعلیٰ برمک، بلخ کے بدھ مندر نوبہار کا متولی اور پجاری تھا۔ خراسانی اس کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب ابو مسلم خراسانی نے خراسان میں دولت عباسیہ کا آغاز کیا تو اس وقت برمک کا لڑکا خالد بھی اس کے ساتھ تھا۔ عباسی حکومت کے قیام کے بعد سفاح نے وزارت کا عہدہ قائم کر کے یہ منصب خالد کو عطا کیا۔ سفاح کے بعد منصور کے ابتدائی عہد میں بھی خالد کچھ دنوں تک وزیر رہا۔ اکثر امرا سلطنت نے اس کو منصور کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی۔ خالد کے انتقال کے بعد یحییٰ عباسی دربار سے متصل ہو گیا۔ منصور کے عہد سے لے کر ہادی کے زمانے تک مختلف اوقات میں متعدد خدمات اس کے سپرد ہوئیں۔ ان سب کو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اپنی کارگزاری سے دربار میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا۔ مہدی نے اس کو ہارون کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ ہادی کے زمانہ میں بھی وہ اس خدمت پر مامور رہا۔ ہارون میں جو کمالات تھے وہ بہت کچھ اسی کے فیض تربیت کا نتیجہ تھے۔ یحییٰ کے چار لڑکے تھے۔ فضل، جعفر، موسیٰ اور محمد۔ ان چاروں بیٹوں میں بھی کچھ نہ کچھ امتیازی خصوصیات تھیں لیکن فضل اور جعفر نے اپنے اوصاف اور کمالات کی وجہ سے زیادہ ناموری حاصل کی۔ شخصی حکومت کی تاریخ میں یہ واقعہ نیا نہیں ہے کہ بادشاہ وقت کو جس شخص پر اعتماد ہوتا ہے وہ اس کو ابتدا میں سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتا ہے اور جب وہ رفتہ رفتہ اپنے حدود سے بڑھ کر سلطنت پر حاوی ہو جاتا ہے تو بادشاہ اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے اس وقت اس کو گرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ برامکہ بھی اسی بے عنوانی کا شکار بنے۔ برامکہ نے ۱۷ سال تک ہارون کی بے لوث خدمت کی لیکن برامکہ کی شان و شوکت اور سخاوت نے اس خاندان کے دشمن پیدا کر دیے۔ ان دشمنوں کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ برامکہ کو تباہ و برباد کر دیں۔ برامکہ اپنے عروج کی وجہ سے اتنے خود سر ہو گئے تھے کہ ہارون کے احکام کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ہارون الرشید کی برہمی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ عباسیوں کے حریف مقابل اور ان کے مخالف ائمہ اہل بیت کے ساتھ وہ نہ صرف حسن سلوک سے پیش آتے بلکہ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ ہارون الرشید نے جب ان کے سردار یحییٰ بن عبداللہ کو گرفتار کروایا تو جعفر برمکی نے خلیفہ کے مشورہ کے بغیر ان کو آزاد کر دیا۔ جعفر کے اس کام پر ہارون اس سے برگشتہ ہو گیا اور یحییٰ اور اس کے بیٹے فضل، محمد اور موسیٰ کو گرفتار کر لیا۔ اسی رات ہارون نے جعفر کو قتل کرا دیا۔ ۱۹۰ھ/ ۸۰۶ء) میں یحییٰ برمکی جیل میں چل بسا اور اس کے بعد فضل بھی ختم ہو گیا۔ باپ کی موت کے بعد موسیٰ اور محمد کو رہا کر دیا گیا۔

خلیفہ مہدی کے عہد حکومت میں بازنطین کی ملکہ ایرین سے جو معاہدہ ہوا تھا۔ اسے بازنطین نے توڑ کر مسلمانوں کی مملکت پر حملہ کر دیا۔ ہارون کی فوجوں نے انہیں شکست دی۔ قبرص پر رومیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا اور کویت پر بھی ان کے حملے ہوئے۔ بغداد اور بازنطین حکومت میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے سلطنت بازنطین نے سابقہ معاہدہ کے تحت خراج دینا منظور کر لیا۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں بازنطین حکمران ہمیشہ خراج دینے کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے رہے لیکن ہر مرتبہ ہارون کی فوجیں ان کی سرکوبی کر دیتی تھیں۔ ۱۹۲ھ/ ۸۰۸ء) میں ہارون خراسان کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا اور تین دن کے اندر ختم ہو گیا۔

ہارون نے بادشاہ ہونے کے بعد علوم و فنون کی خاص طور پر سرپرستی کی وہ علم و فن اور علما و اصحاب کمال کا قدردان اور سرپرست تھا۔ ایک روشن خیال فرماں روا کی حیثیت سے ہارون کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ تاریخی شہرت کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں بھی اس کا نام روشن ہے۔ الف لیلیٰ جیسی شہرۂ آفاق تصنیف کے ہیرو کی حیثیت سے ہارون الرشید کے افسانوی کارنامے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور اس کا افسانوی کردار خاص و عام میں مقبول ہے۔

ہارون کے انتقال کے بعد امین تخت نشین ہوا (۱۹۳ — ۱۹۸ھ/ ۸۰۹ — ۸۱۳ء) اگرچہ ہارون نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ مرو کا علاقہ مامون کو دے دیا جائے اور وہ فوج اور خزانے جو وہ خراسان لے جا رہا تھا وہ بھی مامون کے قبضہ میں رہیں۔ بغداد کا خزانہ امین کے لیے مخصوص تھا۔ ہارون نے ایک سلطنت میں دو فرماں روا بنا کر غلطی کی۔ امین مامون کے ساتھ مخاصمت رکھتا تھا لیکن وہ باپ کی زندگی میں اس کا اظہار نہ کر سکا۔ ہارون کی مرض الموت سن کر فضل بن ربیع اور ارکان سلطنت نے جو ہارون کے ہم رکاب تھے پورا خزانہ فوج کے ساتھ امین کے پاس بھیج دیا۔ فضل بن ربیع مامون کو ناپسند کرتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ امین میں کوئی صلاحیت نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں مامون مدبر اور دانشمند تھا۔ اس لیے ربیع، امین پر آسانی کے ساتھ حاوی ہو سکتا تھا۔ اس نے امین کے ساتھ مل کر مامون کے خلاف سازباز شروع کی۔ مامون نے بڑی جرأت سے فضل بن سہیل کی مدد سے خراسان میں بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ مامون اور امین کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر بازنطینی شہنشاہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کی اور مسلمانوں کے علاقوں پر حملے شروع کیے۔ امین نے بازنطینی حملوں کی روک تھام کی۔ مگر ساتھ ہی اپنے بھائی مامون سے بھی مقابلہ شروع کیا۔ مامون کی فوجوں نے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ امین نے شکست کھائی اور مامون کی فوج کے سپہ سالار طاہر نے اسے قید کر کے قتل کر دیا (۸۰۹ء) امین کے قتل کے بعد مامون (۱۹۸ — ۲۱۸ھ/ ۸۱۳ — ۸۳۳ء) بجائے بغداد جانے کے مرو ہی میں رہا اور فضل بن سہیل کے سپرد سلطنت کا کام کر دیا۔ مامون اہل بیت سے خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ بغداد میں فضل بن سہیل نے بھی علی بن موسیٰ کاظمؒ (۸۱۸ء) سے بیعت لینے کے لیے لوگوں کو مجبور کیا اور عباسی فوج کے سیاہ رنگ کے بجائے آئندہ سبز فاطمی رنگ کی وردیاں استعمال کرنے کی تجویز کی۔ اس تجویز سے بنی عباس میں برہمی پھیل گئی۔ انہوں نے مامون کی بیعت فسخ کر کے ابراہیم بن مہدی سے بیعت کرنے کا اعلان کیا۔ خطبہ میں بھی ابراہیم کا نام لیا جانے لگا۔ بغداد کے اس انقلاب سے مامون بالکل بے خبر تھا امام علی رضا نے اس کی اطلاع مامون کو مرو میں دی۔ وہ اطلاع پاتے ہی بغداد روانہ ہوا۔ فضل بن سہیل کو خفیہ طور پر قتل کر دیا گیا۔ ایران کی سرحدوں سے

یمن تک خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ عراق اور حجاز میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہرطرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ مامون نے اپنی فراست سے اس بدامنی پر قابو پالیا۔ ابراہیم کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ ابراہیم کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ راتوں رات روپوش ہوگیا۔ امین کے قتل کے بعد ایک عرب سردار نصر بن شبث عقیلی نے نواح حلب میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ مامون نے طاہر کے لڑکے عبداللہ کو رقہ سے مصر تک کا والی بنا کر نصر کے مقابلے کے لیے مامور کیا۔ طاہر نے اپنے لڑکے کو ایک مفصل دستورالعمل لکھ کر دیا جو اپنی جامعیت اور خوبی کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ طبری اور ابن اثیر نے اس کو پورا نقل کیا۔ مامون نے اس کی نقلیں تمام ممالک محروسہ کے عمال کے پاس بھیج دیں۔ عبداللہ بن طاہر نے نصر کو شکست دی اور اس کا قلعہ مسمار کر دیا۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں پھیلنے لگیں۔ ان شورشوں کے باوجود اس عہد میں کابل، طبرستان، ایشیائے کوچک، کویت اور صقلیہ کے علاقے فتح کیے گئے۔ مامون کا دور حکومت بیس سال چھ ماہ رہا۔ صقلیہ کی تسخیر مامون کے عہد کی اہم یادگار ہے۔ مامون کا دور عربوں کی تاریخ کا ایک شاندار دور ہے۔ ادبی، ثقافتی اور فنی لحاظ سے عرب اس دور میں اوج کمال پر پہنچ گئے تھے۔ مامون نے بغداد میں "دارالحکمت" قائم کیا جس میں یونانی، سریانی اور سنسکرت زبانوں کی کتابوں کے ترجمے عربی میں کیے گئے۔ فلسفہ، منطق، ادب، طب اور نجوم کا سرمایہ اسی عہد میں عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ یہ دور دیگر اقوام کے علمی سرمائے کو اپنانے کا دور تھا۔ اسی دور میں ہندوستان سے کتاب "سدھانتا" لائی گئی۔ جندی شاپور میں ایک رصد گاہ قائم کی گئی۔ خلیفہ کے ہیئت دانوں نے زمین کی ساخت کا ایک نازک ترین عمل یعنی ارضی زاویہ کا ایک طول معلوم کیا۔ مامون کی وصیت کے مطابق معتصم کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

معتصم (۲۱۸ — ۲۲۷ھ/۸۳۳ — ۸۴۲ء) نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ ترکوں اور دوسرے غیر ملکیوں پر ایک فوج مرتب کر لی جو آگے چل کر عباسیوں کے زوال کا سبب بنی۔ خلیفہ المعتصم کو اہل فارس سے عناد تھا جس کی وجہ سے ترکوں کو سیاست پر چھا جانے کا موقع ملا۔ خلفا کی عیش پرستی اور ترکوں کی فراست اور بہادری کی وجہ سے بغداد کی حکومت ترکوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی۔ انھوں نے جسے چاہا خلیفہ بنایا اور جب چاہا قتل کر دیا۔ ترکوں سے گھبرا کر معتصم نے سامرہ میں محل بنوا کر قیام کیا۔ متوکل (۲۳۲ھ/۸۴۷ء) کے عہد سے عباسیوں کا زوال شروع ہوا جیسا کہ معتز، المتکفی (۲۸۹ھ/۹۰۲ء) المقتدر (۲۹۵ھ/ ۹۰۸ء) القاہر (۳۲۰ھ/۹۳۲ء) جیسے خلفاء کے عہد کے واقعات سے ظاہر ہوگا۔ ان خلفاء نے ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اس دور میں سلطنت کے حدود میں بابل، کلاہ، آذربائیجان، آرمینہ اور بحیرہ ہند کے ساحلی علاقے شامل تھے۔ کلاہ اور اہواز میں متصدیوں نے بغاوت کر دی۔ اس شورش سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ احمد بن طولون نے ان حملوں کی روک تھام کی۔ معتضد کو سفاح ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نے عباسیوں کی کمزور سلطنت میں پھر سے جان ڈال دی۔ اس نے حکومت بازنطین کے خلاف کامیاب لڑائیاں لڑیں۔ موصل کے امیر ہمدان کی سرکوبی کی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پرامن طریقے سے مصر کو دوبارہ خلافت عباسیہ سے ملحق کر لیا۔ اس کے طرز حکومت میں سختی نہ تھی پھر بھی وہ بغداد میں پورا امن و امان قائم کرنے میں کامیاب رہا۔

اس کے عہد میں افریقہ میں فاطمیوں کا ترور ہوا یوں تو اس زمانہ میں طاہری، سامانی، صفاری اور طولونی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن یہ تمام سلطنتیں خلافت بغداد کے ماتحت تھیں۔ یا کم سے کم سیاسی مصالح کی بنا پر اس کا اقتدار ماننے کے لیے مجبور تھیں کیوں کہ خلافت بغداد کی تصدیق کے بغیر حکومت تسلیم نہ کی جاتی تھی۔

فاطمی حکومت کا قیام

مقتدر کے زمانہ (۲۹۵-۳۲۰ھ/ ۹۰۸-۹۳۲ء) میں مصر کی فاطمی حکومت (۲۹۷— ۵۶۷ھ/ ۹۰۹ — ۱۱۷۱ء) کی بنیاد پڑی جو نہ صرف خلافت بغداد کی سیادت سے آزاد تھی بلکہ اپنے نسب خاندان میں اس کی حریف مقابل اور ایک فرقہ کی مذہبی مقتدا تھی۔ آگے چل کر تہذیب تمدن اور علوم و فنون کی ترقی میں بھی اس خاندان نے نمایاں حصہ لیا۔ حضرت علی اور حضرت بی بی فاطمہ کے نسب سے ہونے کی وجہ سے یہ خاندان فاطمین کہلاتا ہے۔ ابن خلکان نے ان کو صحیح النسب فاطمی بتایا ہے۔

فاطمین کی دعوت خلافت، خلفاء راشدین کے زمانہ سے برابر چلی آرہی ہے حضرت امام جعفر صادق کی وفات کے بعد شیعان علی دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ بعض نے امام جعفر کے بڑے صاحبزادے اسمٰعیل کے بیٹے محمد کو اپنا امام بنایا۔ شیعان علی کی یہ جماعت اسمٰعیلی کہلاتی ہے۔ محمد بن اسمٰعیل کے بعد جعفر اور محمد الحبیب یکے بعد دیگرے امام ہوئے۔ محمد بن اسمٰعیل کے زمانہ میں اس فرقہ کے عقائد کی خوب اشاعت ہوئی۔

عبداللہ بن میمون اس فرقہ کے سرگرم رکن تھے۔ اس نے شمالی افریقہ میں ۲۹۶ھ میں بنو اغلب کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی۔ اس نے عبداللہ مہدی کو عباسیوں کی قید سے چھڑایا۔ فاطمین کے عروج کا سہرا عبیداللہ مہدی (۲۹۷-۳۲۲ھ/۹۰۹-۹۳۴ء) کے سر ہے۔ مہدی کی وجہ سے اسمٰعیلی فرقہ کے پیرو، سیاست کے میدان میں اتر آئے۔ حکومت عباسیہ کی کمزوری بربروں کا عربوں سے تعصب، اثنا عشریوں کے بارہویں امام سے عقیدت یہ ایسے اسباب تھے جن کی وجہ سے اسمٰعیلی داعیوں کی کوششیں کامیاب ہوگئیں اور ملک ان کے ہاتھ میں آگیا۔

عبیداللہ کے نظم و نسق میں سختی رہی۔ اس نے بغاوتوں پر قابو پاکر (۳۱۴ھ/ ۹۳۶ء) میں بنو ادریس کے اقتدار کو ختم کر دیا مصر اور اسپین کو بھی فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی۔ اس سلسلے کے پانچ حکمرانوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک انتہائی کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ مہدی کے جانشینوں میں قائم (۳۲۲-۳۳۵ھ / ۹۳۴ — ۹۴۶ء) اور منصور (۳۳۵-۳۴۱ھ/ ۹۴۶—۹۵۲ء) نے بڑے بڑے بحری بیڑے بنوائے۔ قائم نے فیض کے سوا بنو ادریس کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اس کے سمندری بیڑے نے جنیوا پر بھی قبضہ کر لیا۔

قائم کے جانشین منصور نے باغی ابو یزید کی سرکوبی کی اور مراکش میں دوبارہ بنو فاطمہ کے اقتدار کو مستحکم کر دیا۔ منصور کے بعد المعز (۳۴۱-۳۶۵ھ/۹۵۲-۹۷۵ء) نے اپنے فوجی جنرل جوہر کی مدد سے شام اور فلسطین کو فاطمی دعوت میں شامل کر لیا۔ آہستہ آہستہ عرب پورے سسلی پر قابض ہوگئے۔ صقلیہ (سسلی) کو اس دور میں جو فروغ ہوا وہ کسی اور دور میں نہیں ہوا۔ جوہر نے قاہرہ کا نام اپنے آقا کے نام پر القاہرالمعزیہ رکھا اور اس کو دارالحکومت قرار دیا۔ قاہرہ کو ایک انتہائی خوبصورت شہر میں تبدیل کر دیا اور اسلامی علوم کی مشہور درس گاہ جامعۂ ازہر قائم کی۔

المعز کی وفات کے بعد (۳۴۱-۳۶۵ھ/۹۵۲ — ۹۷۵ء) اس کا بیٹا العزیز (۳۶۵ — ۳۸۶ھ/ ۹۷۵ — ۹۹۶ء) بادشاہ بنا۔ عزیز کے

زمانہ میں فاطمی خلافت فرات کے ساحل سے بحر اوقیانوس کے کناروں تک پھیل گئی تھی۔ عزیز نے ترکوں اور ایرانیوں کے مقابلہ میں فوجیں مرتب کیں۔ اس نیت کے ساتھ بھی کہ وقت آنے پر انہیں بربروں کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔

العزیز کو فنِ تعمیر سے لگاؤ تھا۔ قاہرہ میں اس نے ایک وسیع اور شاندار محل تعمیر کیا۔ معز اور عزیز کے کارناموں پر تمام مورخین کو اتفاق ہے۔ ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت نہایت اچھی تھی عوام کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ فاطمین نے عباسیوں ہی کے طرزِ حکومت کو اپنایا۔ العزیز کے بعد حاکم (۳۸۶ - ۴۱۱ھ / ۹۹۶ — ۱۰۲۱ء) گیارہ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ حاکم کے بعد تقریباً آٹھ خلیفہ گزرے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر کم عمر تھے اور ان میں نظم و نسق کی صلاحیت نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ الحکم کے بعد فاطمین کے زوال کا زمانہ شروع ہوا۔ اتفاقی طور پر اسی زمانہ میں سات سال تک مسلسل قحط اور دریائے نیل میں طغیانی کے باعث ملک میں بیماریاں اور بدامنی پھیل گئی۔ ملک کی عام ابتری سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے کئی علاقوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ آخری حکمران العاضد متوفی (۱۱۷۱ء) نے نورالدین زنگی کو اپنی مدد کے لیے بلوایا۔ بنو فاطمہ نے ایسے موقعوں پر متحد ہونے کے بجائے صلیبیوں کے ساتھ مل کر بغاوت کی لیکن (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء) میں صلاح الدین ایوبی نے خود دولت فاطمیہ کا خاتمہ کر دیا۔

فاطمیوں کے زوال کے زمانہ میں عراق اور شام میں بڑی تباہی اور بدامنی پھیلنے لگی جس نے مسلم دنیا کو بے حد نقصان پہنچایا۔ ادھر قرامطیوں نے کوفہ میں سر اٹھانا شروع کیا۔ بہت جلد ان کے اثرات بحرین تک پہنچ گئے۔ قرامطہ کے ہاتھوں المعتز کا قتل ہو گیا۔ الموافق کے بعد المعتمد (۲۵۶ - ۸۷۱ء) اور المتوفق (۲۸۹ھ/۹۰۲ء) جانشین ہوئے۔ انہوں نے قرامطہ کی طاقت کو ختم کرنے کی کوشش کی کیوں کہ یہ میسوپوٹیمیا (عراق) میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرامطہ نے بصرہ پر قبضہ کر لیا اور آس پاس کے علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ انہوں نے ایامِ حج میں مکہ پر حملہ کیا جس سے مسلمانوں نے رنجیدہ ہو کر پندرہ سال تک خونریز لڑائیاں لڑیں اور ان کا خاتمہ کر دیا۔

اس دور کے خلفاء کو علوم و فنون سے خاص لگاؤ تھا۔ عربی رسم الخط کی ترقی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کو موجودہ حالت پر لانے کا سہرا ابنِ مقلہ کے سر ہے جس نے ضوابط حرکات اشارات اور اعراب کی اشکال ترتیب دیں جو آج تک جاری ہیں۔ فلسفۂ یونان کے تراجم اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے اعتراضات نے علماء اور اہلِ اسلام کو جھنجھوڑ دیا۔ حدیث کی تدوین کے کام نے صحاحِ ستہ کی صورت میں ایک مستقل و مستند شکل حاصل کر لی ہے۔ فنِ طب میں رازی کی مشہور تصنیف آج تمام علوم طب کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

عباسی خلفاء کا تیسرا دور (۳۳۴ - ۴۲۲ھ / ۹۴۴ — ۱۰۳۱ء) جو کہ آغاز خلافت بویہ سے شروع ہوتا ہے یہ زمانہ عباسیوں کے زوال کی ابتدا ہے خلافت عباسیہ کے گورنروں، غلاموں اور سپہ سالاروں نے دور دراز مقامات پر قبضہ کر کے اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ مشرق میں چین کی سرحدوں سے لے کر مغرب میں اسپین تک چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔

افغانستان ہندوستان

گزشتہ صدی میں ترکوں کا غلبہ تھا لیکن اب ترکوں کی قوت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے عباسی اقتدار کو سخت دھکا پہنچایا۔ خلیفہ المکتفی کی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آل بویہ نے اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ ابو شجاع کے تین لڑکے جن کو بالترتیب، عماد الدولہ، اور رکن الدولہ کے خطابات دیے گئے۔ ان خطابات کے علاوہ امیر الامراء اور سلطان کے خطابات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ خطبہ میں خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کے نام بھی شریک کیے جانے لگے اور سکوں پر بھی ان کے نام کندہ ہونے لگے۔ عماد الدولہ نے فارس، معز الدولہ نے کرمان اور رکن الدولہ نے طبرستان اور جرجان وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ معز الدولہ کی طبیعت ظالمانہ تھی۔ اس نے خلیفہ المستکفی کو اندھا کر کے خلافت سے معزول کر دیا اور خلیفہ مقتدر کے دوسرے بیٹے مطیع کو تخت پر بٹھایا۔

آل بویہ نے تقریباً سو سال تک حکومت کی اس دور کا سب سے قابل اور ذہین حکمران رکن الدولہ کا لڑکا عضد الدولہ (۹۴۹ء — ۹۸۳ء) تھا۔ اس نے تمام چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو زیر کر کے ایک مستحکم اور وسیع سلطنت قائم کر لی۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے شیراز کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ خلیفہ کے خاندان سے ازدواجی تعلقات قائم کیے تاکہ سلطنت کی ترقی میں رکاوٹ نہ ہو۔

آل بویہ کو نہ صرف سیاسی اقتدار سے دلچسپی تھی بلکہ علوم و فنون سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ بغداد کی تعمیر اور خوبصورتی میں اضافہ کے لیے انہوں نے قدم اٹھائے اور خوبصورت شاہی محلات بنوائے جو دار المملکہ کہلاتے تھے۔ عضد الدولہ نے مشہد کے نام سے حضرت علیؓ کا مقبرہ تعمیر کروایا جو کہ فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ عوام کی سہولت کے لیے بغداد میں کئی ہزار دینار کے خرچ سے ایک شاندار دواخانہ تعمیر کروایا۔ یہ بیمارستان کے نام سے مشہور تھا۔ عضد الدولہ کے عہد میں عیسائی عبادت گاہوں کی تعمیر بھی کی گئی۔ اس نے بغداد میں ایک شاندار لائبریری قائم کی جس میں دس ہزار کتابیں تھیں۔ عضد الدولہ کے بعد شرف الدولہ (۹۸۳ء — ۹۸۹ء) بہاؤ الدولہ (۹۸۹ء — ۱۰۱۲ء) اور صمصام الدولہ المتوفی (۱۰۴۸ء) یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے لیکن مسلسل خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر سلجوقی، طغرل بیگ نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اب خلافت عباسیہ کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے جو سلاجقہ کی آمد سے ہلاکو کے حملے تک ہے۔ یہ عباسیوں کا (۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء) آخری دور ہے سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کی مرکزیت کو ختم کر دیا۔ سلجوق ترک قبائل ہیں جو کہ وسط ایشیا میں گھومتے ہوئے بخارا میں بس گئے۔ کچھ عرصے بعد یہ مسلمان ہو گئے منتصر آخری سامانی حکمران الق کے خلاف مدد کے لیے اس کے پاس آیا۔

سلجوق نے اپنے دونوں پوتوں طغرل اور تاچار کو فوجی تربیت دینے کی کوشش کی دونوں بھائیوں میں تعلقات اچھے تھے دونوں کی کوشش سے جلد ہی سلطنت چین کے اندرونی حصہ سے بحیرہ روم اور جھیل آرامی سے خلیج فارس تک پھیل گئی۔ التگین بلغ نے التح خان کا بدلہ لینے کی کوشش کی لیکن شکست کھائی۔ خوارزم کا والی ہیاری لوح لے آیا اور جیحون کے کنارے بخارا اور جنیوا کے درمیان جو دشت ہے اس پر حملہ آور ہوا جنگ کی وجہ سے سلجوقیوں کو جیحون اور سیحون کا دوآبہ چھوڑ دینا پڑا۔ جس کے بعد وہ خراسان کی طرف بڑھے (۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء) میں خراسان کی سرزمین پر بار بار حملہ کر کے اس پر قابض ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ محمود غزنوی کی وفات ہوئی (۱۰۳۰ء) اور سلطان مسعود تخت نشین ہوا انہوں نے سلطان مسعود کے پاس سفارت بھی لیکن سلطان مسعود نے انتہائی ہتک آمیز جواب دیا۔ طغرل بیگ اور تاچار نے مسعود پر حملہ کیا۔ مسعود نے اپنے جنرل بیگ طوغی کو لشکر دے کر بھیجا اور پھر خود میدان جنگ میں گیا۔ سلطان مسعود نے صلح کرنی چاہی لیکن سلجوقیوں نے انکار کیا تاچار نے مرو پر حملہ کیا۔ اہل غزنی نے ترک شہزادوں کے لیے دروازے کھول دیے۔ دونوں بھائی خراسان کے مالک و مختار ہو گئے۔ حکومت اس طرح تقسیم ہوئی کہ انتظام طغرل بیگ کے پاس رہا اور ملک کی

حفاظت کا کام قاچار کے سپرد ہوا۔ مسعود نے دوبارہ مقابلہ کی کوشش کی لیکن شکست فاش کھائی اور غزنی بھاگ گیا کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب ایشیا میں سلجوقیوں کی قوت کے دو مراکز تھے مشرق میں بلخ اور مغرب میں نیشاپور۔

طغرل بیگ (۱۰۵۵-۱۰۶۳ء) (المتوفی ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء) ایک عقلمند حکمران تھا۔ اس نے بہت جلد جرجان، عراق، عجم، خوارزم اور دوسرے صوبوں کو اپنے تحت کرلیا اور خلیفہ قائم بامراللہ کے دربار تک پہنچ گیا۔ آل بویہ نے سلجوقی اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ طغرل کی سرکردگی میں سلجوقی ایشیا میں غالب قوم بن گئے تھے۔ ترک قبیلوں میں سلجوقی سب سے زیادہ متمدن ہو گئے تھے۔ گیارہویں صدی کا آخری نصف حصہ ان کی تاریخ کا سب سے شاندار زمانہ ہے۔

طغرل بیگ لاولد مر گیا۔ اس کے وزیر الکندری نے یہ اعلان کیا کہ طغرل بیگ نے اپنے سوتیلے بھائی سلیمان کو جانشین نامزد کیا ہے اس لیے سلیمان کو تخت پر بٹھادیا۔ بہت سے ترک سرداروں نے اس جانشینی کی مخالفت کی اور الپ ارسلان سے بیعت کرلی۔ وزیر الکندری نے بھی حالات کے تحت الپ ارسلان کی اطاعت قبول کرلی۔ سلطان الپ ارسلان (۴۵۵-۴۶۵ھ/۱۰۶۳-۱۰۷۲ء) نے تخت نشین ہوتے ہی بغاوتوں کی بیخ کنی کی۔ اس نے مصر اور اس کے اطراف کے کئی علاقے فتح کیے۔ اس نے مرو کے شہنشاہ کو ہرایا، بازنطینی شہنشاہ کے حملوں کا بھی مقابلہ کیا۔ الپ ارسلان تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود جری اور ماہر سپہ سالار اور عظیم سیاست داں تھا۔

الپ ارسلان کے بعد ملک شاہ کا عہد (۴۶۵-۴۸۵ھ/۱۰۷۲-۱۰۹۲ء) سلجوقیوں کی شوکت کی معراج کا زمانہ تھا۔ اس نے سب سے پہلے سمرقند پر پیش قدمی کی۔ ملک شاہ کی سلطنت کے استحکام میں اس کے مشہور وزیر نظام الملک کی فراست کا بڑا دخل ہے۔ نظام الملک کی وجہ سے اس کا دور اسلامی تاریخ کا ایک بہت روشن عہد ہو گیا۔ اس کی حکومت کے حدود یمن سے جیحون تک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے خود اپنی وسیع سلطنت کا دورہ کیا کرتا تھا۔ ملک شاہ نے دور اندیشی سے کام لے کر اپنی وسیع سلطنت کو اپنے خاندان کے مختلف افراد میں بانٹ دیا۔ اناطولیہ کا علاقہ سلیمان شاہ کو دیا جس کا خاندان غزنی میں حاکم تھا۔ شام میں اس کے بھائی طاطوش کی حکومت تھی جو صلیبی لڑائیوں میں عیسائیوں کا مدمقابل تھا۔ نشتگین غرجہ کو جو غلام سے ترقی کر کے سپہ سالار ہو گیا تھا خوارزم کا حاکم بنایا، اقسونقر کو حلب، موصل اور دمشق کے علاقے دیے۔ لیکن اس انتظام کے باوجود ملک شاہ کے انتقال کے بعد ملک میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔

ملک شاہ کے فرزند برکیارک کے زمانہ میں خاندان میں سخت نفاق پیدا ہو گیا اس آخری سلجوقی حکمراں نے تقریباً چالیس سال حکومت کی لیکن اس کا زمانہ زیادہ تر خانہ جنگیوں میں گزرا۔ خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں جس میں روم کے سلجوق اہمیت رکھتے ہیں ان کے آخری بادشاہ نے ترک عثمانی کی بنیاد ڈالی۔

سلجوقیوں میں بغداد پر قبضہ کی وجہ سے عباسی مرکزیت ختم ہو گئی۔ فاطمی حکمرانوں نے عیسائیوں کی سرپرستی کی جو کہ صلیبی جنگوں کی اولین محرک تھی۔

عیسائی بیت المقدس میں مسلمانوں کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان محمد کے عہد میں ان جنگوں کی ابتدا ہوئی۔ اگرچہ دوسرے حکمران سلطان کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن فاطمی خلافت اور سلجوقیوں نے عباسیوں کے اقتدار کی جڑیں اس قدر کھوکھلی کر دیں کہ صلیبیوں کے خلاف انہوں نے آپس کے اختلافات کو مٹا کر متحدہ مقابلے کے لیے تیار ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ سلطان محمد نے (۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء) میں وفات پائی۔ ایک سال کے بعد خلیفہ مستظہر کی موت واقع ہوئی۔ سلطان محمد کے بعد سلطان محمود تخت نشین ہوا۔ اسی زمانہ میں عمادالدین زنگی (المتوفی ۵۴۱ھ) نے موصل کے اتابک خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس اثناء میں صلیبیوں کی قوت بڑھتی گئی عمادالدین زنگی نے صلیبیوں سے کئی مقابلے کیے۔ (۵۴۳ھ/۱۱۴۷ء) میں جرمنی کے کنراڈ سوم اور فرانس کے لوئی ہفتم، نو لاکھ صلیبی سپاہیوں کے ساتھ شام اور فلسطین کی طرف بڑھے۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی، سیف الدین غازی (المتوفی ۵۴۴ھ) اور نورالدین محمود (المتوفی ۵۶۹ھ) نے متحدہ طور پر صلیبیوں کا مقابلہ کیا۔ نورالدین محمود نے انطاکیہ کے قریب زاغز کے مقام پر عیسائی حکمران نارد سوم کو شکست دی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ قاہرہ میں مقیم صلیبیوں کا طرز عمل اس قدر بگڑ چکا تھا کہ فاطمی خلیفہ نے نورالدین سے امداد چاہی۔ چنانچہ نورالدین نے شیرکوہ کو مصر بھیجا۔ اس کے مصر میں داخل ہوتے ہی عیسائی لوٹ کھسوٹ کا مال لے کر مصر سے فرار ہو گئے۔

(۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء) میں شیرکوہ قاہرہ میں دوبارہ داخل ہوا۔ فاطمی خلیفہ اور قاہرہ کے عوام نے شیرکوہ کا خیر مقدم کیا۔ مصر کے فاطمی حکمران نے شیرکوہ کو مصر کا وزیراعظم مقرر کیا۔ شیرکوہ کی وفات پر اس کے بھتیجے صلاح الدین یوسف کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ فاطمی خلیفہ نے اسے الملک الناصر کا خطاب دیا۔

صلاح الدین ایوبی نے اپنی وسعت قلبی کے سبب لوگوں کے دل موہ لیے۔ جب مصر کے فاطمی حکمران کی موت کا وقت قریب آتا دکھائی دیا تو صلاح الدین (المتوفی ۵۸۹ھ) نے مصر پر عباسی خلیفہ کا روحانی اقتدار قائم کر دیا۔

صلاح الدین ایوبی نے نورالدین محمود کے بیٹے ملک صالح کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ لیکن کم عمر حکمراں ملک صالح حلب چلا گیا جس کی وجہ سے فرنگیوں کے حملوں کے مواقع بڑھ گئے۔ صلاح الدین نے لوگوں کو سازشوں سے باز آنے کی تنبیہ کی اور خود دمشق اور پھر حلب پر چڑھائی کی اور ان علاقوں کی طرف بڑھا۔ حلب کے لوگوں کو شکست دی۔ ملک صالح کی درخواست پر اس نے حلب کے آس پاس کے علاقے واپس کر دیے۔ ایک معاہدہ کی رو سے اس نے دمشق کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ (۵۷۷ھ/۱۱۸۲ء) تک مغربی ایشیا کے تمام حکمرانوں نے صلاح الدین کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا۔ اسی اثناء میں یورپ سے صلیبیوں کی ایک بھاری تعداد شام کے ساحلی شہروں پر اتر چکی تھی صلیبیوں نے سلطان صلاح الدین سے جو معاہدے کیے تھے ان کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے تجارتی کارواں کو لوٹ لیا۔ صلاح الدین نے یروشلم کے عیسائی حکمراں سے نقصان کی تلافی چاہی۔ جب اس حکمراں نے کوئی جواب نہیں دیا تو سلطان صلاح الدین عہد شکنی کی سزا دینے کے لیے میدان میں اتر پڑا۔ اس جنگ میں دس ہزار صلیبی مارے گئے۔ بہت جلد صلاح الدین نے بیروت اور عسقلان پر قبضہ کر لیا۔ اب سلطان نے بیت المقدس اور یروشلم کی طرف توجہ کی۔ سلطان کی فوجوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر کے اسے تسخیر کر لیا۔ اس پر مسلمانوں کے قابض ہو جانے سے یورپ میں بے چینی پھیل گئی اور صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء) میں المستضی کے بعد اس کے بیٹے ناصر، ظاہر اور مستنظر یکے بعد دیگرے جانشین ہوئے۔ ان تینوں نے تاتاریوں کے حملوں سے بچنے کی ناکام کوشش کی لیکن آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے زمانہ میں تاتاریوں نے بغداد کو تباہ و برباد کر دیا۔ تاتاریوں نے بیس لاکھ کی آبادی کا قتل عام کر دیا۔ ۲۷ جنوری (۱۲۵۸ء) کو بغداد کی تباہی کے ساتھ ساتھ عباسی سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

عہد عباسی میں معاشی اور سماجی زندگی

عہد عباسی اسلام کا وسطی دور ہے۔ اس

عہد میں اسلامی خلافت کی معیشت بڑی حد تک خود مکتفی تھی کھانے، پینے ضروریاتِ زندگی اور عیش و آرام کی تقریباً تمام چیزیں سلطنت کے اندر ہی پیدا کر لی جاتی تھیں۔ عیش و عشرت کی چند انتہائی محدود چیزیں باہر سے آتی تھیں مثلاً وسطی ایشیا، یورپ اور افریقہ سے غلام آتے تھے۔ اور چند دور دراز ملکوں سے مسالے۔ قاہرہ، بغداد، دمشق جیسے بڑے بڑے شہر معاشی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ افریقہ، ایران اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں آب پاشی اور زراعت نے زبردست ترقی کی تھی۔ اسی خود مکتفی معیشت کی بنیاد پر اس خلافت کا اقتدار اتنے طویل عرصہ تک قایم رہا۔ عہد عباسی میں معیشت کی بنیاد غلامی پر نہیں تھی۔ اس عہد میں سلطنت کی کو سیع تقریباً ترک چکی تھی۔ جس کے بغیر غلاموں کا حاصل کرنا مشکل تھا۔ باہر سے جو غلام خرید کر لائے جاتے وہ امرا اور خوش حال لوگوں کی خانگی خدمت کے لیے بھی کافی نہیں ہوتے تھے۔ زراعت کی ساری بنیاد آب پاشی کے وسیع نظام اور فلاحین کی محنت پر تھی عباسی خلفا کے تحت ایشیا اور افریقہ کا ایک وسیع علاقہ تھا۔ ہر قسم کی زمین اور آب و ہوا تھی جس میں ہر قسم کا غلہ، پھل اور ترکاریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

جہاں صنعتی کچے مال مثلاً دھاتوں، لکڑی اور عمارتی پتھروں وغیرہ کا تعلق تھا۔ یہ ہر جگہ افراط سے مل سکتے تھے۔ اُون، ریشم اور قطن (روئی) کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور ہر چھوٹے بڑے قصبے میں شہر میں ان کی صنعتیں قایم تھیں۔ یہاں کے قالین اور کپڑے ساری دنیا میں مشہور تھے۔ تمام صنعتیں گھریلو اور چھوٹی تھیں۔ جگہ جگہ منڈیاں قایم تھیں۔ جہاں یہ صناع اپنی چیزیں لے جاتے اور بیچ کر کچا مال خرید لاتے۔ اعلیٰ قسم کی اطلس کے لیے بڑے بڑے سرکاری کارخانے بھی تھے۔ بعد کے دور میں تجارت کی کافی ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے تاجروں نے مل کر دور دراز علاقوں سے تجارت شروع کی جس کے لیے سمندری راستے بھی استعمال کیے گئے اور مشرق بعید تک سے سامان آنے لگا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں کینٹن (چین) میں مسلمانوں کی ایک نوآبادی قایم ہو چکی تھی اور بعد میں ملیشیا، عربوں کی تجارت کا بڑا مرکز بن گیا۔ چین سے چینی کے برتن اور دوسری بہت ساری چیزیں درآمد کی جاتی تھیں۔

بحیرہ روم میں تجارت کے لیے وینس اور املفی کے عیسائی تاجروں اور یہودیوں سے گہرے رشتے قایم تھے اور عباسی خلفا، عیسائی اور یہودی بنک کاروں سے معاشی تعلقات رکھتے تھے۔

سماجی زندگی

یورپ کے عیسائی ملکوں کے برعکس عباسی خلفائے کے دور میں صرف حکومت ہی ایک منظم ادارہ تھی۔ تاجروں یا دوسرے پیشے کے لوگوں کے لیے کوئی منظم ادارہ نہیں تھا۔ خلیفہ یا گورنر مطلق العنان ہوتا لیکن عام آدمی کی زندگی میں دخل نہیں دیتا تھا۔ بشرطیکہ وہ اپنے ٹکس ادا کر دیتے ہوں اور حکومت کے خلاف کسی سرگرمی میں نہ شریک ہوں۔ جہاں تک غیر مسلموں مثلاً یہودیوں، عیسائیوں یا زرتشتوں کا تعلق ہے وہ بھی پُرامن زندگی گزارتے تھے بشرطیکہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے کہنے پر چلیں۔ یہ پیشوا خلیفہ کی منظوری ہی سے مقرر ہوتے تھے۔ غیر مسلموں کو سرکاری محکموں میں معمولی اور اعلیٰ خدمتوں پر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔

اسلامی سماج کا مرکز شہر تھا۔ تمام تعلیم یافتہ مالدار اور خوش حال لوگ شہروں میں رہتے تھے۔ دیہات کی زندگی محدود اور بڑی حد تک خود مکتفی ہوتی۔ شہروں کے مقابلہ میں دیہات میں کافی غریبی تھی۔ دیہات کی خوش حالی کا انحصار مضبوط حکومت پر تھا جو آب پاشی کا اچھا بندوبست کر سکے، کسانوں کو مقامی زمینداروں کی لوٹ سے محفوظ رکھے اور لٹیروں سے پناہ دے۔ جب حکومت کمزور ہونے لگتی تھی تو دیہاتی شہروں کا رخ کرتے اور شہروں کی آبادی بڑھنے لگتی۔ بے چینی بڑھتی تو مذہبی اور سیاسی کش مکش بھی پیدا ہو جاتی۔

ثقافتی زندگی

عباسی دور میں اسلامی تمدن اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ عہد امیہ بیرونی فتوحات اور اندرونی فرقہ داری اور قبائلی جھگڑوں کا دور تھا، مذہبی اداروں کے قیام کا آغاز ہو گیا تھا۔ فقہ کو مرتب کرنے کا کام جو ابتدائی منزل میں تھا، عہد عباسی میں عروج پر پہنچا۔ ۷۵۰ء عیسوی کے بعد اندرونی اور بیرونی طور پر کافی امن امان قایم ہو گیا تھا۔ عباسیوں کے برسر اقتدار آنے سے بڑے بڑے عہدوں اور مرتبوں پر عربوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور عجمیوں کو بھی اہم مرتبہ حاصل ہونے لگا۔ اس سے نسلی کھینچا تُو بہت کچھ کم ہو گیا۔ عباسیوں کے عہد کا کلچر عربی ایرانی اور یونانی کلچر کا امتزاج تھا۔ مادّی خوش حالی کی وجہ سے امرا اور مال دار لوگوں کا کافی بڑا طبقہ پیدا ہو گیا جو علم و ادب کی سرپرستی کرنے لگا۔ فنون میں اتنی ترقی ہو گئی کہ نویں صدی کے سیاسی زوال کے اثر کو بھی اس نے جذب کر لیا۔ خلفا بنی امیہ کے دور میں مذہب اور مذہبی طبقہ کا اثر بہت تھا۔ عباسیوں کے عہد میں مذہبی ادارے جو علما و فقہا پر مشتمل تھے کافی بااثر ہو گئے لیکن کبھی اتنے طاقت ور نہیں ہوئے کہ خلیفہ کی طاقت کو چیلنج کر سکیں۔ اسلام کے چار سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہ، مالک بن انس، محمد الشافعی اور احمد بن حنبل کا ظہور جو چار بڑے مسلک حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے بانیوں میں ہیں، آٹھویں اور نویں صدی میں ہوا۔ انھوں نے قرآن اور سنت کی بنیاد پر فقہ کو مرتب کیا۔ جس کی اساس پر اسلامی حکومت سیکڑوں سال قایم رہی۔ اس کے علاوہ اس دور میں سنیوں اور شیعوں میں خلافت اور امامت پر بہت سی بحثیں چلیں۔

زیر بیان عہد میں یونانی فلسفہ اور ادب کی بے شمار کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں ساتھ ہی عیسائی مذہب اور اس کے عالموں سے تعلق بڑھا جس سے علمی اور مذہبی بحثوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ بصرہ میں معتزلہ گروہ پیدا ہوا جس نے یونانی فلسفہ کے انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کی کوشش کی اور اس طرح علم الکلام کا آغاز ہوا۔ خلیفہ المامون اور دوسرے بعض خلیفہ معتزلین کے بڑے طرف دار اور سرپرست تھے۔ ان کے جواب میں امام حنبل اور ان کے ساتھیوں نے اس نئی رَو کی سخت مخالفت کی اور انہیں المتوکل جیسے خلفا کی حمایت حاصل رہی۔ ان کا اثر بغداد اور بعض دوسرے شہروں میں کافی تھا۔ اس دور میں بخاری (ف ۸۷۰ء) اور مسلم (ف ۸۷۵ء) نے ساری دنیا سے حدیثیں جمع کر کے اس کے انتہائی مستند نسخے تیار کیے۔

عباسی خلفا ایرانیوں کی مدد سے برسر اقتدار کئے تھے اور ان کے نظم و نسق کا انحصار بڑی حد تک ایرانی سپاہیوں اور افسروں (کتاب) پر تھا اس وجہ سے حکومت کے نظم و نسق، تہذیبی زندگی اور ادب پر ایران کا اثر بہت بڑھ گیا اس تحریک میں ایرانی ادیب ابن مقفع کا بڑا حصہ ہے جس نے جانوروں و پرندوں کی کہانیوں کی ایک سنسکرت کتاب پنچ تنترا کے فارسی شاہ نامہ کو عربی میں منتقل کیا چنانچہ آہستہ آہستہ ایرانی ادب اور ایرانی تہذیب عرب شرفا کی تعلیم کا ایک اہم جزو بن گئی۔

یونانی علوم اور تہذیب کا درود عربوں کو ترجموں کے ذریعہ ملا۔ عباسی دور میں سوریا، عراق اور اسکندریہ میں ترجموں کے ادارے قایم کیے گئے جہاں یونانی

فلسفہ، سائنس، ریاضی، طب وغیرہ کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ یہ کتابیں راست یونانی سے نہیں بلکہ ان کے سُریانی زبان کے ترجموں سے لی گئی۔ خلیفہ المامون نے "دارالحکومت" قایم کرکے ترجمہ کے کاروبار کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔

مسلم دانشوروں نے ان ترجموں کی اساس پر اسلامی تصورات اور یونانی فلسفہ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں کی اور اس کی مدد سے علم ہیئت ریاضی کیمیا اور طب میں قابل قدر اضافے کیے۔ ان علوم میں خاص طور پر ہیئت میں المامون کو بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس کے عہد کے علما نے زمین کے مدار کی بالکل صحیح پیمائش کر دکھائی۔ الکندی، رازی، ابن سینا اسی دور کے چند نام ہیں جنہیں علم کی دنیا میں آج تک شہرت اور وقار حاصل ہے۔ عباسی دور عربی کا سب سے درخشاں دور تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل کی عربی شاعری جو عہد امیہ میں بڑی حد تک باقی رہی۔ اب دقیانوس بن گئی تھی۔ خوش حالی اور تہذیبی ترقی اور شہری معاشرت کے اس دور میں نئی شاعری کا آغاز ہوا جو نقطۂ عروج پر پہنچی۔ ابونواس اسی دور کے شاعر تھے اور عربی ادب کے سب سے بڑے شاعر متنبی بھی اسی دور کی پیداوار تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے عربی زبان و ادب) عباسیوں کے دور میں فن تعمیر اور خاص طور پر فن خطاطی نے بڑی ترقی کی (دیکھیے مضامین فن تعمیر اور فن خطاطی)۔

تاریخ اسلام

(ساتویں صدی ہجری سے موجودہ دور تک)
(تیرھویں صدی عیسوی سے موجودہ دور تک)

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسلامی دنیا میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ۱۲۱۲ء اور ۱۲۶۹ء کے درمیان مغرب کی الموحد سلطنت کا زوال ہوگیا۔ اس سے اسلامی سلطنت کو اتنا ہی بڑا صدمہ پہنچا تھا کہ مشرق میں منگولوں کے حملے سے پہنچا تھا۔ ۱۲۵۰ء میں مصر اور شام میں صلاح الدین کی قایم کی ہوئی ایوبی سلطنت پایۂ اختتام کو پہنچی اور مملوک سلطنت نے اس کی جگہ لے لی۔ ۱۱۵۷ء میں خراسان میں ترکمانوں کی بغاوت نے ایران سے سلجوقیوں کی حکومت کو عملاً ختم کر دیا۔ ایک سابق سلجوق افسر کا لڑکا جسے شاہ خوارزم کا خطاب دیا گیا تھا خراسان پر قابض ہوگیا۔ اس نے ترکمانوں کو شکست دی اور ۱۱۹۴ء میں رے کے مقام پر آخر سلجوق بادشاہ کو ہرا کر اپنی سلطنت کو مغربی ایران تک پھیلا دیا۔ ان چیرہ دستیوں کی وجہ سے عباسی خلیفہ الناصر اس کے خلاف ہوگئے۔ علما اور مذہبی لوگ بھی اس کی مخالفت پر آگئے۔

خوارزم شاہ کے لڑکے محمد ۱۲۰۰ء۔۱۲۲۰ء نے ترکی غلاموں کی ایک فوج کی مدد سے ایران اور وسطی ایشیا میں ایک بہت بڑی سلطنت قایم کی۔ طاقت کے نشہ میں اس نے چنگیز خاں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی جس نے ۱۲۱۵ء میں یلغار کرتے ہوئے شمالی چین اور پیکنگ پر قبضہ کرلیا تھا۔ چنگیز خاں کی فوجوں نے ۱۲۲۰ء میں اس طرف رخ کیا اور خراسان اور دوسرے علاقوں کو تاراج کیا۔ قتل و غارت گری اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی کہ لوگ اسے آج تک نہیں بھولے۔ چنگیز خاں یہ تباہی مچا کر لوٹ گیا۔ خوارزمی فوج نے بھاگ کر ایران اور عراق میں پناہ لی اور وہ برسوں وہاں غارت گری کرتی رہی۔ ۱۲۴۳ء میں منگولوں نے اناطولیہ کے سلطان کو مجبور کیا کہ وہ اس کا باج گزار بن جائے۔

۱۲۵۶ء میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے منگولوں کی ایک زبردست فوج لے کر مغرب کا رخ کیا۔ اسی وقت ایک اور فوج اس کے بھائی قبلائی خاں کی سرکردگی میں جنوبی چین کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہلاکو نے پہلے نزاری اسماعیلیوں کے قلعوں کو تباہ کیا اور اس کے بعد بغداد پر چڑھائی کی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی خلیفہ اور اس کے ساتھ آبادی کے بڑے حصہ کو تہ تیغ کر دیا۔ صرف عیسائیوں اور چند شیعوں کی جان بچی۔ اسلامی سلطنت کا بڑا حصہ یا اس کا قلب اب منگول سلطنت کا ایک صوبہ بن کر رہ گیا۔ ۱۲۵۹ء میں ہلاکو کی فوج کے ایک حصہ نے شام کا رخ کیا۔ مصر کی مملوک فوج نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ستمبر ۱۲۶۰ء میں عین جالوت کے مقام پر منگول فوج کو شکست فاش دی۔ دریائے فرات منگول اور مملوک کے درمیان سرحد بن گیا۔

مملوک کا عروج

۱۲۵۰ء میں لوئی نہم بادشاہ فرانس نے جب مصر پر حملہ کیا اور اس میں آخری ایوبی سلطان صالح ایوب مارے گئے تو سلطان کے غلام سپاہیوں نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عیسائی حملہ آوروں کو شکست دی اور اس کے بعد اپنی ایک اعلیٰ کمان بنائی۔ افسروں کی اس اعلیٰ کمان نے اپنے میں سے ایک کو سلطان چن لیا اور اس طرح مملوک سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مملوک اقتدار کی بنیاد صحیح معنوں میں بے بارا ول نے رکھی تھی۔ اسی نے قاہرہ کے ایوبی خاندان شاہی کے وارث کو قتل کروانے میں مدد دی تھی اور اسی نے منگولوں کی فوج کو شام سے بھگانے میں نام پیدا کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مملوک سلطان قطز (Qutuz) کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ بے بار نے ۱۲۶۱ء میں عباسی خاندان کے ایک فرد کو قاہرہ میں خلافت کی گدی پر بٹھایا جس سے اس کی سلطنت کا وقار بھی بڑھ گیا اور حوار میں قایم ہوگیا۔ خلافت کا سلسلہ ۱۵۱۷ء تک باقی رہا۔ اس وقت تک جب تک مملوک سلطنت باقی رہی۔ یہ خلافت سیاسی طور پر بے اثر تھی۔ خلیفہ مملوک کی کٹھ پتلی تھے۔ لیکن بہت سے علاقوں کے سلطان انہیں تسلیم کرتے تھے۔

بے بار بہت قابل اور سخت مزاج تھا۔ اس نے روس کے منگولوں سے جو مسلمان ہو چکے تھے، دوستی کرلی تھی تاکہ ایران اور عراق پر حکمران ہلاکو کے منگول خاندان کا توڑ کرسکے۔ اسی کے ساتھ اس نے شام کے ساحل پر صلیبی جنگ بازوں (Crusaders) کے علاقوں پر حملہ اور دباؤ جاری رکھا تاکہ لاطینی عیسائیوں کا منگولوں کے ساتھ اتحاد نہ قایم ہوسکے۔ وہ صقلیہ (سسلی) کے آرمینیوں پر برابر حملے کرتا رہا جن کا عیسائیوں اور منگولوں دونوں کے ساتھ اتحاد تھا۔ اس نے ۱۲۶۸ء میں انطاکیہ کی عیسائی ریاست پر حملہ کر کے اسے تاراج کر دیا۔

۱۲۷۰ء تک اس نے شام کے نزاریوں کو اپنا باج گزار بنا لیا اور ۱۲۶۵ء اور ۱۲۷۱ء کے درمیان صلیبی جنگ بازوں (Crusaders) کے قلعے ایک کے بعد ایک مسمار کر دیے۔ باسفورس کی سرحد کو مضبوط بنایا اور منگولوں کے کئی حملوں کو پسپا کیا۔ ۱۲۷۷ء میں بے بار کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ ایک اور

مملوک جنرل قلاؤن نے لی جس کی اولاد ۱۵۱۷ء تک مملوک افسروں کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔ اپنے ابتدائی دور میں مملوک زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھے اور ان کی سلطنت کا اہم مقصد قدیم اسلامی نظام کی بقا و حفاظت تھا۔ تاج اور سنی علماء کے درمیان گہرا تعلق تھا اور ہر سلطان مدرسے اور صوفیوں کے لیے خانقاہیں قائم کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان ہی کے دور میں پورا علاقہ عیسائی جنگ بازوں (Crusaders) سے پاک کر دیا گیا۔ اور عرب اور اسلامی تہذیب کی روایات کو باقاعدہ اور منظم طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔

ایران منگول اقتدار کے تحت

فرات کی دوسری طرف کے علاقے میں جو عراق اور ایران وغیرہ کے کچھ حصوں پر مشتمل تھا، افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں عربی زبان کلچر اور روایات کو بالادستی حاصل نہیں تھی۔ فارسی کا بول بالا تھا جو اناطولیہ سے ہندوستان تک چھائی ہوئی تھی۔

ہلاکو خاں کا ۱۲۶۵ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ایران میں اس کے آٹھ ورثاء برسر اقتدار تھے۔ انہوں نے ایک علاحدہ منگول ریاست قائم کر رکھی تھی جو روس اور ترکستان کے منگولوں سے اکثر برسرپیکار رہتی۔ ہلاکو خاں بدھ مذہب کی طرف مائل تھا لیکن سیاسی طور پر مشرقی قریب کے عیسائیوں اور غیر سنی مسلمانوں کی طرف اس کا جھکاؤ تھا اس لیے کہ انہیں پرانی اسلامی حکومت سے کوئی خاص محبت نہیں تھی۔ منگول فوج میں بدھوں اور عیسائیوں کے علاوہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی بھی کافی تعداد تھی۔ ہلاکو کے جانشین اِل خان (Il Khan) جیسے جیسے منگولیا سے دور اور الگ ہوتے گئے ان کی فوج کا انحصار مقامی زراعت، صنعت اور مالی وسائل پر بڑھتا گیا۔ ان میں سے اکثریت کا جھکاؤ مذہب کی طرف ہونے لگا چنانچہ غازان خان ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء نے اپنی فوج کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور اس کے تمام جانشین مسلمان رہے۔ ہلاکو کے برسراقتدار آنے کے چالیس سال بعد اس کے جانشین اسلامی کلچر کے بڑے مربی بن چکے تھے جگہ جگہ مدرسے اور مسجدیں تعمیر کر رہے تھے۔ تبریز اور سلطانیہ میں نئے تہذیبی مرکز جنم لے رہے تھے۔ شیعہ مسلمانوں پر خاص شفقت تھی۔ مصر کے مملوک کے خلاف معرکے جاری رہے۔

اس عہد میں ایران نے تہذیبی اور معاشی طور پر کافی ترقی کی چینی فنون لطیفہ کا اثر ایران کی تہذیب پر بہت گہرا پڑا۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف یورپ سے تجارت بڑھی۔ ادب نے بھی اس دور میں بڑی ترقی کی۔ ایران کے بعض سب سے بڑے شاعر اور مورخ اسی دور میں گزرے ہیں۔

اناطولیہ، جو منگول کا باج گزار تھا، کلچر کی اس ترقی سے غیر متاثر نہیں رہا۔ فارسی ادب کی ترقی میں اس نے بھی اہم حصہ لیا۔ مشہور عالم صوفی اور شاعر جلال الدین رومی نے تیرھویں صدی میں نہ صرف فارسی ادب کو مالا مال کیا۔ بلکہ اہل ایران کو عام طور پر متاثر کیا۔ منگولوں کے حملے کے بعد سماجی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے انہوں نے صوفی تحریک کو پھیلا کر پُر کیا۔

ایران میں منگولوں کی کوئی پائیدار مملکت قائم نہیں ہو سکی۔ جیسے جیسے انہوں نے ایرانی سماجی اور تہذیبی زندگی کو اپنایا ان کی بربریت بھی کم ہوتی گئی۔ چودھویں صدی میں منگول سلطنت آہستہ آہستہ مٹ گئی اور اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے لے لی۔ ان میں سے ایک اہم شیراز کے مظفری تھے

عہد وسطیٰ میں اسلامی کلچر کا عروج

آٹھ سو سال کی حکمرانی کے بعد اسلامی کلچر ایک مرتبہ پھر عروج پر آیا اور اسپین اور مراکش سے لے کر ہندوستان تک ایک نئی تابناکی کے ساتھ لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتا رہا۔ تہذیب سے زندگی میں نفاست آنے لگی۔ علوم و فنون نے ہر جگہ بے حد ترقی کی۔ نہایت اعلیٰ پایہ کی عمارتیں، مسجدیں، محل، مقبرے اور مدرسے تعمیر ہوئے۔ پرانے نیم وحشی قبائل انتہائی تہذیب یافتہ انسان بن گئے۔

اسی زمانہ میں اسلام ایک طرف سمندر کے راستے جنوبی ہند، ملایا، انڈونیشیا اور چین تک پہنچا۔ دوسری طرف مسلمان حکمرانوں اور صوفیوں کی مدد سے ہندوستان میں کافی دور تک پھیل گیا۔ افریقہ میں نہ صرف شمالی اور مغربی حصہ میں بلکہ صحرائے اعظم کے جنوب میں بھی اسلام کے پیرو پیدا ہو گئے۔ صوفیائے کرام نے نہ صرف اسلام کو پھیلانے میں بہت بڑا رول ادا کیا بلکہ تصوف نے ایک بین الاقوامی تحریک کی شکل اختیار کر کے تمام دنیا کے مسلمانوں میں ایک طرح کا اتحاد پیدا کیا اور روحانی اور تہذیبی طور پر انہیں ایک کڑی میں پرو دیا۔

پندرھویں صدی کا دور

(نویں صدی ہجری)

تیمور کا عروج

عیسائیوں کے زوال کے بعد جگہ جگہ چھوٹی اور بڑی سلطنتوں کے ابھرنے اور ختم ہونے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۳۳۶ء کے قریب ایک ترکی سپہ سالار تیمور نے وسطی ایشیا میں سمرقند کے قریب ایک سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے سارے وسط ایشیا سے سپاہیوں کو جمع کر کے ایک طاقتور فوج کھڑی کر لی اور علماء کے تعاون سے منگولوں کو اس علاقے سے مار بھگایا۔ مقاصد اس کے ہمیشہ نیک تھے لیکن طریقے اس نے منگولوں کے اختیار کیے۔ اس کی فتوحات کے راستے میں جو بستیاں بھی آئیں انہیں اس نے بے دردی کے ساتھ مسمار کیا۔ اس میں اسلامی تہذیب اور ثقافت کے مرکز بھی نہیں بچ سکے۔ ۱۳۹۸ء میں دلی اس کے حملہ کا شکار بنی یہ اس وقت ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھی یہی حال خراسان کا ہوا۔ ۱۴۰۱ء میں اس نے شام پر حملہ کیا اور دمشق کو لوٹ کر اس میں آگ لگا دی۔ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کو تباہ کر کے اس کے بادشاہ بایزید کو قید کر دیا۔

تیمور کا سارا دور حملوں اور یلغاروں میں صرف ہوا۔ وہ ایک پائیدار مملکت قائم نہیں کر سکا۔ ۱۴۰۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور چشم زدن میں اس کی وسط ایشیا کی وسیع سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ مشرقی ایرانی اور وسط ایشیا کے علاقے اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہے لیکن بڑے علاقے پر مخالف قبیلوں نے حملے شروع کر دیے جس کے نتیجے میں افراتفری پھیل گئی۔ ۱۵۰۷ء میں ازبک منگولوں نے سلطنت ہرات سے تیموری خاندان کو مار بھگایا۔ خاندان تیمور کے ایک شہزادہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ سلطنت دہلی کا خاتمہ کر کے ایک عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ ہند، وسطی دور)۔

مملوک کا زوال

اسی دور میں مملوک سلطنت کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ فوجی گروہ دن بدن

قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ قفقاز سے لائے ہوئے غلام حکومت پر چھا چکے تھے قفقازی افسر ناصر فراج نے تیمور سے شکست کھائی اور شام کا پورا خوش حال علاقہ ملوک سلطنت کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی کے بعد دریائے نیل میں غیر معمولی طغیانی آئی جس کی وجہ سے پوری سلطنت قحط، فاقہ کشی اور بیماریوں کا شکار بن گئی۔ لوٹ، رشوت بے ایمانی یہ سب سرکاری کاروبار کے اہم جز بن گئے ٹیکس بے حد بڑھ جائے گئے۔ بیرونی تجارت حکومت نے پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی کے سہارے ملوک حکومت ۱۵۱۷ء تک باقی رہی۔ اس دوران ترکی میں عثمانی حکومت کافی طاقت ور بن چکی تھی۔ اس نے آسانی سے شام اور پھر مصر پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۱۷ء میں ملوک حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

دولت عثمانیہ

زوال اور انتشار کے اس دور میں صرف اناطولیہ کا علاقہ ایسا تھا جہاں ایک چھوٹی سی ریاست عثمانیوں نے قایم کی اور جو سو سال کے اندر ایک زبردست سلطنت بن گئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون 'دولت عثمانیہ') اس دور میں جب کہ مشرق وسطیٰ کا عالم اسلامی سخت کرب کی حالت سے گزر رہا تھا مغرب کا حصہ اس سے کچھ محفوظ نہیں تھا۔ مراکش میں Marinid سلطانوں کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے جگہ جگہ طاقت حاصل کر لی قبیلہ بنو ہلال کے لوگوں نے جو الموحد کے دور میں یہاں لائے گئے تھے انتشار پھیلا رکھا تھا۔ پرتگالیوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس علاقے میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ چنانچہ پندرھویں صدی کے ختم تک بحیرہ روم کے پورے ساحل پر پرتگیزوں نے قلعہ بند تجارتی مرکز قایم کر لیے۔

سولھویں صدی عیسوی

سولھویں صدی عیسوی عثمانی ترکوں کی زبردست ترقی کا دور تھی (تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون دولت عثمانیہ) اسی دور میں ایران میں صفوی خاندان عروج پر آ گیا۔

پندرھویں صدی کے آخر تک قدیم بازنطینی سلطنت کا بڑا حصہ دولت عثمانیہ کے اثر میں آ گیا۔ عثمانی ترکوں نے مقامی عیسائی آبادی کو اپنی سلطنت کا جونیئر حصہ دار بنا لیا تھا۔ یہ بندوبست اٹھارویں صدی تک باقی رہا۔ اس وقت تک جب کہ سلطنت عثمانی میں زوال شروع ہوا اور انقلاب فرانس نے یورپ میں بیداری پیدا کر دی اور قوم پرستی کا جذبہ ابھرنے لگا۔ عثمانی سلطنت کے عروج کا دور اس وقت سے شروع ہوا جب عثمانیوں نے اپنا دارالخلافہ استنبول میں منتقل کیا، ۱۵۱۷ء تک انہوں نے شام اور مصر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور ۱۵۵۱ء تک شمالی افریقہ کا پورا ساحلی علاقہ ان کے زیر اقتدار آ گیا۔

اسی دور میں جب کہ مغرب میں دولت عثمانیہ ایک طاقت ور مملکت بن رہی تھی۔ ایران اور مشرقی اناطولیہ میں صفوی خاندان کا عروج تھا۔ خاندان صفوی کی اصل کے بارے میں بہت سی روائتیں ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے عروج میں صوفی شیوخ اور ان کی منظم جماعت کا بڑا حصہ تھا۔ انتشار اور افراتفری کے حالات میں تصوف کے پیروؤں نے ہمیشہ ایک نئے نظام کی تشکیل میں مدد دی ہے۔ خاندان صفویہ کے بانی صفی الدین کا تعلق صوفیہ کے سلسلہ سے تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں آذربائی جان میں اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ترکمانیہ کے حکمرانوں کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی دوستی کے تھے اور کبھی دشمنی میں بدل جاتے تھے۔ ۱۵۰۱ء میں نوجوان صفوی شیخ اسمٰعیل نے اتیونلو کو شکست دے کر منگولوں کے پرانے صدر مقام تبریز پر قبضہ کر لیا اور اپنے "شاہ" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اثنا عشری مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے دیا اور آئندہ بارہ سال میں اسے پورے ایران میں بزور پھیلانے کی کوشش کی۔ دوسرے صوفی سلسلوں کے بہت سارے علماء اور شیوخ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اس نے خراسان اور ہرات پر حملہ کر کے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

دولت عثمانی کے مقبوضہ اناطولیہ کے علاقے میں کافی آبادی صفوی شیوخ کی پیرو تھی۔ چنانچہ صفوی سلطنت کے اندر شیعہ مذہب کے پرجوش پرچار کا ردعمل اناطولیہ میں ہوا اور سلطان سلیم اول کے حکم سے اناطولیہ کے صفوی شیوخ کے بہت سے پیروؤں کو قتل کر دیا گیا۔

اگست ۱۵۱۴ء میں دولت عثمانیہ کے توپ خانے نے صفوی سوار دستوں کو آذربائی جان کے شمال میں چالدران (Chaldiran) کے مقام پر شکست دے دی اور پورے اناطولیہ پر ترکوں کی حکومت پھر سے قایم ہو گئی۔ اس کے بعد صفوی سلطنت باقی تو رہی لیکن اسمٰعیل کے وقار کو اس شکست سے جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے اس کا اقتدار مجروح ہوا۔ قزلباش قبیلوں کے سردار سرانھا رہے تھے۔ دوسری طرف تعلیم یافتہ نوکر شاہی بہت طاقتور بن گئی اور اس کی وجہ سے فریقین کی کش مکش بڑھ گئی۔ اسمٰعیل کے لڑکے شاہ طہماسپ اول ۱۵۲۴–۱۵۷۶ء نے اقتدار پھر سے مستحکم کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ دوسری طرف اسے مشرق سے ازبکوں اور مغرب سے عثمانی ترکوں کے حملوں کا مسلسل سامنا رہا۔ اندرونی شکلوں اور بیرونی حملوں کے باوجود صفوی خاندان ۱۵۹۰ء تک ایران پر حکمران رہا۔

ہندوستان میں اسلام کا عروج

برصغیر ہندوستان میں اسلام پہلے عہد بنوامیہ میں محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ داخل ہوا اور اس کی توسیع محمود غزنوی کے حملے اور اس کے بعد ترک حکمرانوں کی سلطنتوں کے قیام سے ہوئی۔ ہندوستان میں اسلام کو پھیلانے میں دو طاقتوں کا زبردست حصہ ہے ایک تو ایران سے آنے والے صوفی شیوخ اور ان کے پیروؤں کا جنھوں نے یہاں کے سب سے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں سے ربط پیدا کیا۔ وہ ان کے غم اور خوشی میں شریک ہوئے اور ان کے دلوں تک رسائی حاصل کی۔ ان کی کوششوں اور محنت سے لاکھوں لوگ اسلام لے آئے۔ دوسرے مغل بادشاہ تھے جنھوں نے ایک پائیدار سلطنت قایم کی اور مقامی آبادی سے بہت گہرا ربط پیدا کیا اور ایک مشترکہ کلچر کو جنم دیا۔

دولت عثمانیہ اور یورپ

سلطنت عثمانیہ ایک ایسے علاقے میں قایم ہوئی تھی۔ جس کا کچھ حصہ مغربی ایشیا اور کچھ یورپ میں تھا اور اس لیے شروع ہی سے یورپ کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا رہا۔ سولھویں صدی عیسوی میں ایک طویل عرصہ تک فرانس اول بادشاہ فرانس اور ہولی رومن امپائر کے ہیمبرگ خاندان کے درمیان کش مکش چلتی رہی۔ سلیمان اعظم نے ان میں فرانس کا ساتھ دیا اور بحیرہ روم کے علاقے میں اس کے ساتھ دوستی قایم کر لی۔ اس سے اسے اپنی سلطنت کو بلقان کے علاقے میں وسعت دینے کا موقع ملا۔ بلگراڈ اس وقت وسطی یورپ کی کنجی تھا۔

۱۵۲۱ء میں اس پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا اور ہیپسبرگ حکمرانوں سے ہنگری کے لیے لڑائی چھڑ گئی۔ ۱۵۲۶ء میں سلیمان نے ہنگری پر حملہ کر دیا اور وہاں کا بادشاہ مارا گیا۔ ہیپسبرگ خاندان کے ایک مخالف زاپولیا کو ہنگری کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ۱۵۳۲ء میں سلیمان نے آسٹریا پر حملہ کیا۔ ۱۵۴۰ء میں زاپولیا کا انتقال ہوگیا جس سے ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ اسی زمانے میں جرمنی کے پروٹسٹنٹ رجواڑوں نے پوپ اور شہنشاہ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور سلیمان نے عثمانی ہنگری کو جرمن پروٹسٹنٹ رجواڑوں کی مدد کا مرکز بنا دیا۔ فرانس سے دوستی اور پروٹسٹنٹوں کی تائید، ترکی خارجی پالیسی کی بنیاد بن گئی اور یہ ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی۔ فرانس کو شروع ہی سے مشرقی بحیرہ روم میں تجارتی مراعات دیے گئے اور ۱۵۸۰ء کے بعد خاص قسم کے مراعات برطانیہ اور ہالینڈ کو دیے گئے جو دونوں پروٹسٹنٹ طاقتیں تھیں اس سے ان کو تجارت کی ترقی میں بڑی مدد ملی۔

ترکی حکومت نے چند ہی سال میں اس علاقے میں کافی اثر و اقتدار پیدا کر لیا اور انہیں پرتگالیوں کی بحر ہند کی تجارت میں کافی حصہ حاصل ہوگیا۔ یہ اثر سترہویں صدی تک باقی رہا جب برطانیہ اور ہالینڈ اس تجارت پر قابض ہوگئے۔ سولہویں صدی میں زارشاہی روس کا دباؤ بھی بڑھ گیا تھا جو کریمیا اور قفقاز کے علاقے پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

۱۵۶۶ء میں سلیمان اعظم کا انتقال ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد جو سلطان آئے وہ اس پایہ کے نہیں تھے۔ کمزور تھے۔ ہیپسبرگ خاندان کے خلاف طویل جنگ نے جو ۱۵۹۳ء سے ۱۶۰۵ء تک جاری رہی، دولت عثمانیہ کی اندرونی معیشت کو بہت کمزور کر دیا۔ افراط زر کی وجہ سے قیمتیں بڑھنے لگیں۔ دربار میں رشوت اور بے ایمانی کا زور ہوگیا۔ صوبوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے۔ اوپر کے حکمران گروہ کو لگام دی گئی اور حالات پر کسی قدر قابو حاصل ہوا لیکن بدقسمتی سے ہیپسبرگ سے ایک نئی لڑائی چھڑ گئی ۱۶۸۳ء میں عثمانی فوجوں کو شکست ہوئی اور سلطنت کے تمام دشمن اس کے خلاف متحد ہوگئے۔ ۱۶۹۹ء میں اسے ہنگری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد ترکی سلطنت کو وہ پرانا عروج حاصل نہیں ہو سکا۔ یہاں سے ترکی امن اور بقا کی جد و جہد پر مجبور ہوگیا۔

ایران میں خاندان صفوی کا عروج

اس زمانہ میں جب ترکی اس بحران سے گزر رہا تھا ایران نے شاہ عباس صفوی ۱۵۸۷ء — ۱۶۲۹ء کی سرکردگی میں ترقی کی نئی منزلیں طے کیں۔ اس نے ترکوں کے خلاف یورپی قوموں کے معاہدے کر لیے تھے اس نے ایرانی، چارجیائی اور قفقازی سپاہیوں پر مشتمل ایک طاقتور فوج بنا لی جس کی مدد سے قزلباش اور دوسرے شرارت پسند قبیلوں کی اچھی طرح سرکوبی کر دی گئی۔ اور ازبکوں اور عثمانی ترکوں کے حملوں کو پسپا کر دیا گیا۔ عباس صفوی کے زمانہ میں تجارت، صنعت اور معاشی ترقی اپنے عروج پر پہنچی اور امن اور خوش حالی کا ایک ایسا دور آیا جس کی یاد صدیوں تک لوگوں کے دلوں میں باقی رہی۔

۱۶۲۹ء میں عباس کے انتقال اور اس کے پوتے کی جانشینی سے صفوی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ ۱۷۲۲ء میں افغانوں نے بغاوت کر کے صدر مقام اصفہان کو تاراج کر دیا اسی کے نتیجے میں صفوی سلطنت ختم ہوگئی۔ ایک ترکمان فوجی افسر نادر شاہ افسار نے صفویوں کے نام سے بغاوت ختم کرنے کی کوشش کی اور ۱۷۳۶ء میں گدی چھین کر خود تخت نشین ہوگیا۔ ۱۷۳۹ء میں اس نے دلی پر حملہ کر کے اسے تاراج کیا اور مغلوں کی حکومت پر جو پہلے ہی سے زوال پذیر تھی ایک اور کاری ضرب لگا دی۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ قتل کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ اس کی سلطنت بکھر گئی ۱۷۹۵ء میں قاچار ترکمانوں کے سردار نے اپنے شاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنا صدر مقام شمال میں طہران میں قائم کر لیا۔

سولہویں صدی کی اسلامی سلطنتیں اپنی شان و شوکت میں کوئی جواب نہیں رکھتی تھیں لیکن معاشی ترقی کے نئے وسائل پیدا کرنے میں وہ ناکام رہیں بلکہ تجارت کے بحری راستے بھی ان کے ہاتھوں سے نکلتے گئے۔ اٹھارہویں صدی میں بڑی بڑی سلطنتیں ٹوٹنے لگیں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے لے لی معاشی اور ذہنی طور پر امت زوال پذیر ہوگئی سیاسی، سماجی اور مذہبی امور میں اتحاد کا خاتمہ ہوگیا اور ہر طرح انتشار نظر آنے لگا۔

عہد جدید

اٹھارہویں اور انیسویں صدی تاریخ اسلام کا تاریک ترین عہد ہے ایک طرف اسلامی ممالک اندرونی طور پر سخت انتشار کے شکار تھے، دوسری طرف مغرب میں یورپی طاقتیں زبردست صنعتی ترقی کر رہی تھیں۔ وہ اپنی سلطنتوں کو افریقہ، ایشیا بلکہ دنیا کے باقی تمام علاقوں میں وسعت دے رہی تھیں۔ ان کا دباؤ وسطی اور مغربی ایشیا، اور شمالی افریقہ پر بھی زبردست تھا۔

فرانس کے نپولین اوّل نے ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ کیا اور جب انگریزوں اور ترکی کی عثمانی حکومت نے اسے مصر چھوڑنے پر مجبور کیا تو عثمانیوں کے ایک البانوی افسر محمد علی نے ۱۸۰۵ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنی فوج کو جدید ہتھیاروں سے لیس کیا۔ زراعت میں ترقی یافتہ طریقے رائج کیے اور آہستہ آہستہ اپنے خاندان کی حکومت قائم کر لی۔

زارشاہی روس ایک عرصہ سے بحیرہ سیاہ اور بلقان پر نظر لگائے ہوئے تھا اور اس کا دباؤ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ پوری انیسویں صدی میں ترکوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ بنا رہا اور وہ فرانس اور برطانیہ کے ساتھ اتحاد قائم کر کے اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ ترکی کی بلقانی ریاستوں میں بھی قوم پرستی کی جوالا بھڑک رہی تھی اور انہیں یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے برابر شہ اور مدد ملتی رہتی تھی چنانچہ پوری انیسویں صدی میں ایک کے بعد دوسری بلقانی ریاست آزادی حاصل کرتی رہی۔

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کو افریقہ میں وسعت دی۔ الجزائر الگ تھلگ تو رہ نہیں سکتا تھا چنانچہ دوسری یورپی طاقتوں کی مخالفت کے باوجود فرانس نے آہستہ آہستہ تونس ۱۸۸۱ء اور پھر مراکش (۱۹۱۲ء) پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر لیا۔ روسیوں نے ۱۷۸۳ء میں کریمیا پر قبضہ کر لیا۔ شمالی اور وسطی ایشیا کے قازق ۱۷۵۵ء میں روسی "حفاظت" میں آگئے اور ۱۸۴۰ء میں روسی ان کے پورے علاقے پر قابض ہوگئے اس کے بعد زارشاہی سلطنت نے بخارا، خیوا اور خوقند کی سلطنتوں کو ہضم کر لیا۔

اسی زمانے میں انگریز ہندوستان میں تجارت کے لیے آئے اور یہاں کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے انیسویں صدی کے وسط تک پورے ہندوستان پر تصرف کر لیا۔

انتشار زوال اور محکومی کا دور اٹھارویں، انیسویں اور بیسوی صدی

کے ابتدائی زمانے تک اسلامی دنیا پر چھایا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ قوم پرستی، قومی آزادی اور اتحادِ اسلامی کی لہریں بھی اٹھنے لگیں۔ جن کے جمال الدین افغانی اور زاغلول پاشاہ وغیرہ اولین علم بردار تھے۔ اسی دور میں یورپ میں سائنس اور ٹکنالوجی نے زبردست ترقی کی جس کی وجہ سے زندگی کے متعلق ایک نیا نقطۂ نظر جنم لے رہا تھا۔ مسلم ممالک کے عوام پر سخت ذہنی دباؤ تھا۔ ایک طرف قدیم روایات اور دورِ عروج کا فخر باقی تھا۔ دوسری طرف غلامی کی ذلت اور تیسری طرف جدید علوم کی ترقی سامنے تھی اس سے مسلم ممالک کی ساری آبادی سخت کش مکش میں مبتلا رہی۔

مسلم حکمران اپنی بقا کی سخت جدوجہد میں مصروف تھے کہیں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لیے ملک کی آزادی کا سودا کر لیتے اور کہیں ایک طاقت کو دوسری کے خلاف کر کے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے۔ ایران اپنے بچاؤ کے لیے برطانیہ اور روس کی رقابت پر تکیہ کرتا رہا اور ترکی کا آخری حربہ یہ تھا کہ یورپ میں اقوام کو اپنے خلاف متحد نہ ہونے دے۔

یورپی قومیں بھی ترکی یا ایران سے نہ صرف کھیل کھیلا کیں بلکہ وہ ان کے مقبوضہ علاقوں میں بے چینی پھیلا کر قوم پرستی کے جذبات کو ہوا دیتی رہیں۔ ترکی سلطنت کے عرب علاقوں میں آزادی کی آگ کو بھڑکانے میں انگریزوں کا خاص ہاتھ تھا۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد پورا عرب علاقہ برطانیہ اور فرانس نے آپس میں بانٹ لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ فلسطین کے دروازے ساری دنیا کے یہودیوں کے لیے کھول دیے گئے اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد وہاں امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی سیاسی فوجی اور معاشی امداد سے اسرائیلی ریاست قایم کر دی گئی۔ جب دوسری عالم گیر جنگ کے بعد عرب ممالک کو آزادی دینی پڑی تو اپنا معاشی اور سیاسی اقتدار باقی رکھنے کے لیے مغربی طاقتوں نے نہ صرف اسرائیل کو ہر طرح مضبوط کیا بلکہ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی نوجوں نے مصر پر حملہ بھی کر دیا تاکہ نہر سوئز میں ان کا اقتدار باقی رہ سکے لیکن امریکہ اس حد تک ساتھ دینے کے لیے امادہ نہ تھا۔ سوویت یونین اور ترقی پسند طاقتوں کی مدد اور مداخلت نے اس منصوبہ کو ناکام بنایا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا اور ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی رہنمائی میں ایک آزاد اور ترقی پذیر ترکی مملکت کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم تک ایشیا اور افریقہ کی ساری مسلم آبادی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر کسی نہ کسی یورپی سامراجی ملک کی محکوم بن چکی تھی اور اسی کے ساتھ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی قوم پرستی اور آزادی کی چنگاری آہستہ آہستہ سلگنے لگی۔

دوسری جنگِ عظیم اور آزادی کی لہر

دوسری جنگِ عظیم میں فاشزم کی شکست سے ساری دنیا میں آزادی کی جدوجہد بہت تیز ہوگئی۔ سامراجی ملک جو طویل جنگ سے کمزور ہو چکے تھے آزادی کے اس ابھرتے ہوئے سیلاب کو باوجود کوشش کے روک نہ سکے۔ اس زور پکڑتی ہوئی تحریک کے نتیجہ میں پہلا ملک جو آزاد ہوا وہ ہندوستان تھا۔ اس کی آزادی کے ساتھ ملک کے دو حصے ہو گئے اور ایک اسلامی سلطنت پاکستان وجود میں آئی جو خود آگے چل کر (۱۹۷۱ء میں) دو آزاد ریاستوں میں بٹ گئی جس میں دوسری بنگلہ دیش ہے ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی انڈونیشیا آزاد ہوا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اسی کے بعد مشرق بعید کی ایک اور مسلم ریاست ملایا آزاد ہوگئی جو بعد میں ملیشیا بن گئی۔

جنگ کے بعد فرانس اور برطانیہ نے بہت کوشش کی کہ مغربی ایشیا کے ملکوں پر اپنا تسلط باقی رکھے اس لیے کہ تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی علاقے میں ہے لیکن اسے یکے بعد دیگرے ان علاقوں کو آزادی دینی پڑی۔ مصر کی مکمل آزادی کو روکنے کے لیے برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کی مدد سے مصر پر حملہ بھی کیا۔ ایک طرف تو انہیں امریکہ کی تائید حاصل نہ ہو سکی دوسری طرف عالمی رائے عامہ اور خاص طور پر سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے انہیں قدم پیچھے ہٹانے پڑے۔

فرانس جو افریقہ کے زیادہ تر مسلم علاقوں پر قابض تھا آسانی کے ساتھ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تونس، مراکش اور خاص طور پر الجزائر نے سخت جدوجہد کی۔ ان میں سے الجزائر کو آزادی کے لیے بہت زبردست جانی و مالی قربانی دینی پڑی۔

فرانس کے دوسرے محکوم مسلم ممالک مثلاً گنی، سینے گال، نائجر، مالی وغیرہ کو بھی آزادی کی طویل جدوجہد سے گزرنا پڑا لیکن آخر کار ۱۹۶۵ء تک تقریباً تمام مسلم ممالک نے آزادی حاصل کر لی۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ افریقہ اور نو آبادیات سے ملوکیت تک)

دولت عثمانیہ

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے دوسرے نصف میں سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اناطولیہ کے مغربی حصہ میں قایم ہو گئیں۔ یہ وہ حصہ تھا جو بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگوں کے دوران حاصل کیا گیا تھا۔ ان ریاستوں میں سے ایک عثمانی ریاست تھی۔ اس چھوٹی سی ریاست نے ایک سو سال کے اندر پھیل کر اناطولیہ اور بلقان کو زیر کر لیا اور کچھ عرصے بعد ایک وسیع و عریض اسلامی سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔

عثمانی ترکوں کی ابتدا کے بارے میں تاریخی شہادتیں ۱۳۰۰ء کے بعد ہی ملنا شروع ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے ان کے بارے میں کوئی قابل اعتماد مواد موجود نہیں۔ عثمانی ترک کی اصطلاح خاندان کے بانی عثمان (۱۲۹۹ء) سے منسوب ہے۔ عثمانی ترک اوغوز قبیلے کی قائع (Qayiuh) شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور ایشیائے کوچک میں خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے تھے۔ یہ ان ترک قافلوں کا ایک حصہ تھے جو مشرق سے ادھر آئے اور جنہوں نے بازنطینیوں کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ عثمانی ترک پہلے تو قونیہ کے سلجوق سلاطین سے وابستہ رہے مگر بعد میں منگولوں کی آمد اور تیرہویں صدی میں سلجوقی سلطنت کے زوال کے پیش نظر اناطولیہ کے شمال مغربی گوشے میں منتقل ہو گئے جس وقت اناطولیہ کے دوسرے حصوں میں ترکوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم ہو رہی تھیں جیسے قرامانی، منتشے، اوطولری اور جرمیان اوغولری اس وقت عثمانی ترکوں نے بازنطینی افواج کو جنگوں میں الجھائے رکھا۔ عثمان کے بیٹے اور جانشیں ارخان غازی نے ازنک اور ازمٹ فتح کیے۔ اس کے چند دنوں کے بعد بروسہ بھی فتح ہو گیا۔ (۷۵۵ھ/ ۱۳۵۴ء) میں ارخان (Ur Khan) کی افواج نے گیلی پولی کو فتح کر کے

یورپ میں قدم رکھا۔ سلاف قوم کے اندرونی خلفشار اور عیسائیوں کے قدامت پسند اور کیتھولک فرقوں کے درمیان مذہبی تصادم سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے بلقان کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ انہیں مقبوضہ علاقوں کو ملا کر بعد میں رومیلیا کا صوبہ بنایا گیا۔ اب ترکوں کی توجہ ایشیا سے ہٹ کر یورپ پر مرکوز ہو چکی تھی چنانچہ انہوں نے اپنا صدر مقام (۷۶۷ھ / ۱۳۶۶ء) میں بروسہ سے ادرنہ (ایڈریانوپل) منتقل کر دیا۔ مراد اوّل (۷۶۱ - ۷۹۱ھ / ۱۳۶۰ - ۱۳۸۹ء) نے بلقان میں اپنا موقف مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ اناطولیہ میں دوسرے ترک سرداروں کو زیر کر کے عثمانی ترکوں کے اقتدار کو مستحکم کر دیا۔ مراد اوّل کے بعد اس کے بیٹے بایزید اول یلدرم نے ترک سلطنت کے تحفظ اور توسیع کے کام کو جاری رکھا۔ اس دوران ترک افواج کی تنظیم جدید کی جا چکی تھی۔ اب وہ فوجی اعتبار سے ترکمان عناصر پر کم تر منحصر تھیں۔ ان کی بجائے اب ایک سوار فوج تشکیل دی گئی جو حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر گزر بسر کرتی تھی۔ اس قسم کے فوجی دستوں میں جاں نثاری مینی چری - نئے دستے : اپنی شجاعت کے لیے یورپ میں بہت مشہور ہوئے۔ اس دستے میں بلقان کے محکوم عیسائیوں کے لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے جنہیں مسلمان بنا کر ایک مخصوص، اعلیٰ پیمانے کی عسکری تربیت دی جاتی تھی۔ (۷۹۶ھ / ۱۳۹۴ء) میں بایزید اول (۷۹۱ - ۸۰۵ھ / ۱۳۸۹ - ۱۴۰۲ء) نے قاہرہ کے عباسی خلیفہ المتوکل اوّل سے سلطان روم کا خطاب حاصل کیا (۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء) میں تیمور لنگ نے بایزید کو انگورہ (انقرہ) کے مقام پر شکست دی۔ اس شکست کے بعد ایسا لگتا تھا کہ یہ وسیع و عریض سلطنت اس ضرب کی تاب نہ لا سکے گی اور بکھر جائے گی۔ مگر بایزید کے بعد محمد اوّل چلپی (۸۱۶ھ - ۸۲۴ھ / ۱۴۱۳ - ۱۴۲۷ء) کی دانشمندانہ قیادت میں ترک سلطنت سنبھل گئی اور آہستہ آہستہ آئندہ دس بیس برس کے بعد سلطنت کے ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑا گیا مراد دوم (۸۲۴ھ - ۸۵۵ھ / ۱۴۲۱ء - ۱۴۵۱ء) نے ۱۴۴۴ء میں صلیبی جنگ جوؤں کے ایک حملے کا منہ توڑ جواب دے کر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ اس فتح سے نہ صرف شمال سے حملہ کا امکان ختم ہو گیا بلکہ عیسائی علاقوں میں ترکوں کے نئے حملوں کا آغاز ہوا۔ اس کا نقطۂ عروج (۸۵۷ھ / ۱۴۵۲ء) میں محمد فاتح (۸۵۵ - ۸۸۶ھ / ۱۴۵۱ - ۱۴۸۱ء) کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح تھی۔ ۱۴۷۵ء میں کریمیا ترک سلطنت میں شامل ہوا۔ اس کے بعد بحیرۂ ایجین کے جزائر اور اٹلی کے کچھ علاقے ترکوں کے ہاتھ آئے۔

سولہویں صدی دولت عثمانیہ کا زریں دور تھا (۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) میں سلطان سلیم اوّل (۹۱۸ - ۹۲۶ھ / ۱۵۱۲ - ۱۵۲۰ء) نے ممالیک کو شکست دے کر مصر اور شام کو فتح کیا۔ آخری عباسی خلیفہ کے قسطنطنیہ لائے جانے کے ساتھ یہ تصور کر لیا گیا کہ خلافت عباسی خاندان سے عثمانی خاندان میں منتقل ہو گئی۔ (۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء) میں سلیمان اعظم نے بلغراد فتح کیا اور موہاکز کے مقام پر ہنگری کو شکست دے کر اس کے بڑے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے جو کوئی ڈیڑھ سو سال تک ترکوں کے تحت رہے۔ جنوبی اٹلی کے کئی مقامات پر ترکوں نے قبضہ کر لیا شمال مغربی افریقہ میں الجیریا اور تیونس فتح ہوئے۔ مشرق میں عثمانی ترکوں نے اپنے پرانے حریف ایران کے صفوی شہنشاہوں کو چالدران کے مقام پر (۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء) میں شکست دی اور آذربائیجان پر حملہ کر دیا۔ بحر ہند میں ترکی بحری بیڑے عرب اڈوں سے پرتگالیوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہے۔ ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم (۹۲۶ - ۹۷۴ھ / ۱۵۲۰ - ۱۵۶۸ء) نے ویانا کا محاصرہ کیا لیکن اسے فتح نہ کر سکا۔ چارلس پنجم، فرانسس اوّل اور الیزبیتھ جیسے عظیم حکمرانوں کا سلیمان اعظم ہم عصر تھا اور انہی کی طرح ممتاز حیثیت کا بھی مالک تھا۔ سلیمان اعظم کی سلطنت دریائے ڈینوب پر واقع بڈاپسٹ سے اسوان (مصر) تک اور دریائے فرات سے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلیمان اعظم کے عہد میں دولت عثمانیہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔

اپنی فوجی فتوحات اور سیاسی طاقت کے عروج کے دور میں ترکوں نے اپنی سلطنت کے اندر نسلی اور مذہبی اقلیتوں (ملت) کے ساتھ روادارانہ برتاؤ برقرار رکھا چنانچہ عیسائی یورپ کے ظلم و تشدد سے یورپ کے یہودی، عثمانی سلطنت میں پناہ لینے آتے تھے۔ ترکی طاقت کے عروج کا یہ دور کوئی سو برس تک برقرار رہا تھا سترہویں صدی کے اواخر میں مشرقی یورپ میں حالات نے ترکوں کے خلاف موڑ لینا شروع کیا۔ یورپ میں فتوحات کا سلسلہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ انگلستان آسٹریا اور روس نے اپنے اپنے دائرہ اثر کی توسیع کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ترکی یورپی حکومتوں کی تیس سالہ جنگ سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا تھا۔ انہیں اس دوران صرف کویت کی فتح کی صورت میں ایک اہم کامیابی نصیب ہوئی۔ آہستہ آہستہ یورپی مقبوضات پر سے ان کی گرفت کمزور پڑتے لگی۔

۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء میں ویانا میں ترکوں کو شکست ہوئی پھر ہنگری اور ٹرانس سلوانیا ہاتھ سے نکل گئے۔ ریاست ہائے بلقان کے سلاف، یونانی اور رومانیہ کے علاقے ان کے پاس رہ گئے۔ یورپی طاقتوں کو اپنی فنی مہارت کے سبب سے ترکوں پر برّی اور بحری برتری حاصل تھی لیکن اس کے باوجود ان کے باہمی نفاق کی وجہ سے یورپی علاقوں پر ترکی کا اقتدار مزید دو سو سال تک برقرار رہا۔ جدید خطوط پر ترک افواج کی تنظیم کی تمام کوششیں جانثاروں کی سرکشی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب (۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۲ء) سلطان محمود ثانی نے جاں نثاریوں کی طاقت کو پورے طور سے کچل دیا۔ معاشی میدان میں مغربی ملکوں کے مال اور ان کے تجارتی طور طریقوں کے مقابلے میں ترک اور عرب علاقے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ان علاقوں میں پیداوار اور آمدنی کے داخلی ذرائع گھٹ گئے۔ انیسویں صدی میں ترکی زیادہ تر مالی دیوالیہ پن کی کیفیت سے دوچار رہا۔

سیاسی میدان میں کافی اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ روس، ترکی پر اپنے پنجے جمانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے عثمانیوں کے حلیف کریمیائی تاتاریوں کو دبا لیا تھا اور وہ استنبول اور آبنائے باسفورس پر قبضہ کر کے بحیرۂ روم تک پہنچنے کے راستے حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مصر کے گورنر محمد علی پاشا نے اپنے کو تقریباً خود مختار بنا لیا۔ یونانیوں نے بغاوت کر کے ۱۸۲۹ء میں اپنی آزادی تسلیم کروا لی۔ الجیریا ۱۸۳۰ء اور تیونس ۱۸۸۱ء میں فرانس کے قبضے میں چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں تریپولی پر اطالیہ کا تسلط ہوا۔ انقلاب فرانس کے زیر اثر قومیت کے تصور سے بلقان کے عوام ترکی کے خلاف ہونے لگے چنانچہ دوسری جنگ بلقان ۱۹۱۲ء کے آخر میں ترکی کی یورپی مقبوضات صرف مشرقی تھریس تک محدود ہو گئیں۔ داخلی طور پر عثمانی سلطنت اپنے وسیع علاقوں پر موثر قابو کھوتی جا رہی تھی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ترک حکمرانوں کی متعدد اصلاحات (تنظیمات) کے باوجود دولت عثمانیہ کا سیاسی ڈھانچہ نہ بدلا جا سکا اور نہ اس کے انتظامیہ کی کمزوریاں دور ہو سکیں۔

لیکن تنظیمات کے زیر اثر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ترقی پسند دانشوروں
کا ایک گروہ وجود میں آیا جو حریت اور وطن کے تصورات پر یقین رکھتا تھا۔ اس
گروہ نے سلطان کی مطلق العنانی کو محدود کرنے اور عوام کے لیے اختیارات کو بڑھانے
کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے نوجوان عثمانی کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی لیکن دستوری
حکومت اور عوامی حقوق کے لیے یہ جدوجہد زیادہ تر متوسط طبقے کے پڑھے لکھے افراد
ہی تک محدود رہی اور حکومت کے خلاف کسی عوامی تحریک کو طاقتور نہ بنا پایا۔ عثمانی
سلطنت پر مطلق العنان حکمران مسلط رہے ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید دوم کے
برسر اقتدار آتے ہی ہر قسم کی عوامی آزادی سلب کر لی گئی۔ ایک ترک مدبر مدحت
پاشا نے ایک حقیقی نئے آئین کی تشکیل کی۔ لیکن سلطان نے اقتدار براہ راست خود
سنبھال لیا۔ اور تیس برس تک اپنی خفیہ پولیس، کڑے احتساب اور سخت گیر پالیسی
کی مدد سے حکومت کرتا رہا۔ یہ دور ترکی تاریخ میں دور استبداد کے نام سے مشہور ہے
۱۸۸۹ء میں نوجوان عثمانی کمیٹی کی جگہ انجمن اتحاد و ترقی نے لے لی اور اس کے
اراکین "نوجوان ترک" کہلائے۔ ان کی تحریک استبدادیت کے خلاف تھی۔ وہ جدید
ترکی کے ذہنی اور تہذیبی معمار ثابت ہوئے۔ ان میں تین رجحانات کام کرتے رہے۔
ایک "وحدت ترکیہ" (Pan-Turkism) یعنی ترکی زبان بولنے
والوں کو بہ حیثیت قوم ایک شکل دی جائے۔ اس کا مطلب ان ترکی بولنے والوں
کو بھی اس تحریک میں شامل کرنا تھا جو دولت عثمانیہ سے باہر رہتے تھے۔ یہ ناقابل
عمل تھا۔ دوسرا رجحان "وحدت اسلامیہ" کا تھا یعنی عالمی اسلامی ملکوں (خصوصاً
دولت عثمانیہ اور ایران) کو ایک سیاسی جو کھٹے میں لانا۔ اور تیسرا رجحان ترک قومیت
(Turkish Nationalism) کا تھا جو دولت عثمانیہ کے ترکی بولنے
والوں کے علاقے اور اس کی تہذیب کی اساس پر ایک ترک قوم کی تشکیل اور اس قوم
کے حقوق کا تحفظ تھا یہی آخری تصور بالآخر جدید ترکی کی بنیاد بنا ۱۹۰۸ء میں
اس تحریک کے زیر قیادت انقلاب برپا ہوا۔ سلطان کے سارے اختیارات ختم کر کے
پارلیمانی نظام نافذ کر دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران سلطنت عثمانیہ نے برطانیہ اور
دوسری اتحادی طاقتوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا ۱۹۱۵ء میں اتحادیوں کے
افواج آبنائے گیلی پولی میں اُتر گئیں اور استنبول پر حملہ کرنے اور بحیرۂ اسود کو روس
کے لیے کھول دینے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ترک
فوجوں نے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب سے زار کے روس
کا شیرازہ بکھر گیا۔ ترکوں نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر شمال مشرقی اناطولیہ
کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا اور ماوراء قفقاز اور ایران میں داخل ہو گئے
لیکن جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کے اہم محاذوں پر شکست اور شام فلسطین پر اتحادیوں
کے قبضے کی وجہ سے سلطان کو صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء
کو ہونے والی صلح کے ساتھ دولت عثمانیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

نظم و نسق

دولت عثمانیہ کا نظم و نسق دو اداروں پر مشتمل تھا، حکومت اور مذہبی امور،
ان دو اداروں سے وابستہ افراد اہل السیف اور اہل القلم کہلاتے تھے۔

حکومت کا ادارہ

اس ادارہ میں سلطان، اس کا خاندان، انتظامی افسران، سوار اور
پیدل فوج شامل ہیں۔ سلطنت کا پورا انتظام الہی کے ہاتھوں میں تھا۔ شرعی امور
شرعی عدالتوں کے ذمے تھے اور غیر مسلم رعایا اور غیر ملکی باشندے اپنے
عائلی قوانین کے پابند سمجھے جاتے تھے۔ عثمانی نظم و نسق اس اعتبار سے منفرد ہے
کہ اس کے عہدیدار ایک مخصوص جماعت ہی سے منتخب کیے جاتے تھے یہ جماعت
ایسے نوجوانوں کی تھی جن کے والدین عیسائی ہوا کرتے تھے۔ ادارہ حکومت میں ان
نوجوانوں کو لیے جانے کے چار طریقے تھے۔

یہ جنگ کے عیسائی قیدیوں کی اولاد ہوتے تھے، یا انہیں خریدا جاتا تھا۔
یا بطور ہدیہ بھیجے جاتے تھے یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے۔ یہ نوجوان چودہ سے
بیس سال کی عمر کے ہوتے۔ ان لڑکوں کو اسلام میں داخل کر کے مختلف قسم کی اعلیٰ تربیت
دی جاتی۔ بھرتی کے اس طریقہ کو "دیواشرمہ" کہتے تھے سالانہ بھرتی کا اوسط سات
آٹھ ہزار تھا۔ ان لڑکوں کو ان کی ذہنی اور جسمانی استعداد و حالت کے مطابق یا
تو اعلیٰ علمی اور انتظامی تعلیم و تربیت یا پھر فوجی خدمات کے لیے منتخب کیا جاتا تھا
اول الذکر مرکز یا صوبوں کے اعلیٰ افسران کے تحت تربیت حاصل کرتے جو تقریباً
بارہ سال میں تکمیل کو پہنچتی۔ اس کے بعد انہیں مختلف سرکاری عہدوں پر مامور
کیا جاتا۔ ترقی کے تمام دروازے ان پر کھلے ہوتے۔ ان میں سے بعض صدر اعظم کے
عہدے پر فائز ہوئے مثلاً سلیمان اعظم کا مشہور وزیر ابراہیم۔ جسمانی اور فوجی
تربیت کے لیے جو نوجوان منتخب کیے جاتے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ترکی زبان
اور معاشرت سے گہری واقفیت حاصل کریں۔ ان کی ایک منتخب تعداد کو اعلیٰ فوجی
تعلیم دے کر جاں نثاری (ینی چری یعنی نئی فوج) فوجی دستوں میں شامل کیا جاتا تھا
جاں نثاری فوج نے دولت عثمانیہ کی فوجی توسیع میں بڑا اہم کام انجام دیا۔ بعد میں اس
فوج میں مسلمان ترک بھی شامل کیے جانے لگے ۱۶۷۵ء میں عیسائی غلاموں کی
بھرتی بند کر دی گئی۔ سلیمان اعظم کے بعد کمزور سلطانوں کے تحت ینی چری کی طاقت
بہت بڑھ گئی اور وہ تقریباً ایک متوازی حکومت کے طور پر کام کرنے لگے۔ بالآخر
ان کی سرکشی اور باغیانہ روش کے پیش نظر انیسوی صدی میں سلطان محمود ثانی
(۱۸۲۶ء) نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

حکومت کے ادارے کا بنیادی اصول یہ تھا کہ اس میں سلطان کی آزاد مسلم
رعایا میں سے کسی کا تقرر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ صرف عیسائی غلام ہی لیے جاتے تھے
جنہیں مسلمان بنایا جاتا تھا۔ ان کی آزاد مسلم اولاد ادارہ حکومت سے خارج سمجھی
جاتی تھی۔ اس اصول کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ سلطنت کے عہدیداروں کا انتخاب
قابلیت کی بنا پر ہو اور ان کی باقاعدہ تعلیم و تربیت ہو۔ دوسرے یہ کہ جب یہ اعلیٰ
عہدوں پر پہنچ جائیں تو شاہی خاندان کے متوازی اپنا کوئی موروثی حکمران طبقہ تشکیل
نہ دے سکیں۔ سلیمان اعظم کے بعد اس اصول کی سختی کم ہو گئی۔ سرکاری عہدوں پر ان
افسروں کی اولاد کا تقرر بھی ہونے لگا اور آزاد مسلم رعایا نے تقررات کے لیے سابقہ
عیسائی غلاموں کے حقوق اپنے لیے بھی حاصل کر لیے۔ سلطنت پر اس تبدیلی کے منفی
اثرات مرتب ہوئے نظم و نسق میں وہ چستی اور اصولوں کی پابندی قائم نہیں رہی جس
نے دولت عثمانیہ کو طاقت ور بنے رہنے میں مدد دی تھی۔ اور اس میں رفتہ رفتہ زوال
کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

حکومت کے ادارے کا ہر فرد سلطان کا غلام (سلطان قلی) سمجھا جاتا تھا
اور سلطان اس ادارے کا منتہائے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ ہر عہدیدار کو تنخواہ یا جاگیر
دی جاتی تھی۔ ابتدائی دور میں سلطان کا جانشین اس کا بیٹا ہوتا تھا اور اس کی بغیر

موجودگی میں بھائی بچوں کہ ہر سلطان کی ایک سے زائد بیویاں اور متعدد لڑکے ہوتے اس لیے وراثت کے مسئلہ پر تخت کے دعویداروں میں سخت کشمکش ہوئی۔ ان میں وہ کامیاب ہوتا جو اپنے بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ محمد فاتح نے اس روایت کے ناگزیر ہونے کو قانون بنا کر مزید مستحکم کر دیا تھا۔ سلیمان اعظم کے عہد سے بجائے قتل کرنے کے شہزادوں کو محل میں نظر بند رکھا جانے لگا۔ سلطان کی ایک مجلس شوریٰ ہوتی جسے دیوان ہمایوں کہا جاتا تھا۔ دیوان صدرِ اعظم اور اس کے وزراء کے علاوہ شیخ الاسلام فوجی سپہ سالاروں، فوج کے قاضیوں، امیر البحر، صوبیدار (بیلربیے) دفتر دار اور نشانچی پر مشتمل ہوتا تھا۔ وزیر تین ہوتے تھے۔ کتخدابے (وزیر جنگ) رئیس آفندی (چیف سکریٹری اور وزیر خارجہ) اور چاؤش باشی (میر دربار اور وزیر)۔ دفتر دار اور نشانچی، مالی امور کے ذمہ دار تھے۔ پہلے صرف دو بیلر بے تھے ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے اور دوسرا یورپی، بعد میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی۔ صوبے پہلے ایالت کہلاتے تھے بعد میں ولایت کہلائے جانے لگے۔ ہر ایالت ضلعوں میں منقسم تھی جنہیں سنجق یا لوا کہتے تھے ہر صوبہ کی ایک مجلس شوریٰ ہوتی تھی جس کے اراکین میں مختلف اضلاع کے نمائندے بھی ہوتے تھے۔ سترہویں صدی میں یہ طریقہ کار بدل دیا گیا۔ صدر اعظم کی سرکاری قیام گاہ "باب عالی" حکومت کے اقتدار کا مرکز بن گئی اور صدر اعظم عثمانی نظام حکومت کا سربراہ۔ دیوان ہمایوں کا اجلاس، (شاہی محل میں) کبھی کبھی ہوتا تھا لیکن اس کی حیثیت محض رسمی تھی حکومت کے کاروبار کا اصل مرکز باب عالی قرار پایا۔ جب بھی ضرورت پڑتی فوجی، مذہبی اور شہری سربراہان صدر اعظم یا اس کی غیر موجودگی میں شیخ الاسلام کی صدارت میں اپنا اجلاس کرتے۔

دولت عثمانیہ کے استحکام کا ایک بڑا سبب اس کا فوجی نظام تھا۔ پیادہ فوج (ینی چری) کے علاوہ "باب عالی کے سپاہی" مستقل سوار فوج تھی۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری جاگیری سوار فوج بھی تھی۔ صوبوں میں جاگیرداروں کا ایک طبقہ ایسا تھا جن کے آبا و اجداد کو فوجی خدمات کے عوض جاگیریں دی گئی تھیں۔ یہ دو قسم کی تھیں بڑی جاگیر کو زعامت کہتے تھے اور چھوٹی کو تیمار، ہر جاگیردار سواروں کی ایک معین تعداد رکھتا تھا جو جنگ کے وقت سلطان کی فوج میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے مصارف جاگیر سے ادا کیے جاتے تھے۔ سولہویں صدی کے بعد اس جاگیری فوج کا نظم و ضبط ٹوٹنے لگا۔ بدعنوانیاں ہونے لگیں۔ بالآخر سلطان محمود ثانی (۱۲۲۳ – ۱۲۵۵ھ/۱۸۰۷ – ۱۸۲۹ء) نے انیسویں صدی میں اس نظام کو سلطنت کے لیے نقصان رساں سمجھ کر جاگیریں ضبط کر لیں۔ دولت عثمانیہ کی بحری فوجی طاقت ابتدائی چند صدیوں میں بڑی مرعوب کن تھی۔ عثمانی امیر البحر کو قپودان پاشا کہا جاتا تھا۔ بحریہ کے عہدوں کے لیے بھی عیسائی غلاموں کا تقرر ہوتا تھا۔ عثمانی امیر البحر خیر الدین پاشا، بحری رئیس اور سیدی علی کے نام دولت عثمانیہ اور یورپ کی بحری تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ عثمانی بحری طاقت سولہویں صدی کے اواخر سے بری طاقت کے ساتھ ساتھ روبہ زوال ہو گئی۔

مذہبی امور کا ادارہ اس ادارے میں وہ تمام مسلمان شامل تھے جو حکومت کے ادارہ سے باہر تھے سلطان اسی ادارے کا بھی مقتدر اعلیٰ تھا۔ اس کی حکمرانی طبقہ علماء کی جماعت کے سپرد تھی۔ علماء کے علاوہ اس میں مدرس، مفتی اور قاضی شامل تھے۔ سلطنت کے مذہبی امور اور تعلیمی اور قانونی نظام انہی کے ہاتھوں میں تھے۔ اس ادارے میں شامل ہونے کے لیے ایک معین تعلیمی نصاب کی تکمیل ضروری تھی۔ محمد فاتح نے خاص طور سے اس طرف توجہ دی اور مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و تربیت کے ضوابط مرتب کیے۔ دولت عثمانیہ میں شروع ہی سے مدرسوں کا انتظام موجود تھا۔ یہ مدارس عام طور پر مسجدوں سے ملحق ہوتے تھے اور وقف کی آمدنی سے ان کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مفت تھی۔ مکاتیب میں معلم یا مسجدوں میں امام کی ملازمت کے لیے کسی مدرسہ کی سند ضروری تھی۔ مفتی یا قاضی بننے کے لیے فقہ کے اعلیٰ نصاب کی تکمیل لازمی تھی۔ ہر بڑے شہر میں قاضی کے ساتھ مفتی بھی ہوا کرتا تھا۔ قسطنطنیہ کا مفتی مفتی اعظم کہلاتا تھا جسے بعد میں محمد ثانی نے شیخ الاسلام کا لقب دیا۔ شیخ الاسلام کا تقرر سلطان کرتا تھا لیکن اس کی اہمیت صدر اعظم سے کم نہیں تھی۔ بلکہ سلطان کے برابر تھی کیوں کہ شریعت کا درجہ حکومت سے بلند تھا اور شیخ الاسلام شریعت کا شارح تصور کیا جاتا تھا۔

عدلیہ عثمانی عدلیہ کا دائرۂ اختیار سیاسی حدود سے وسیع تر تھا اور اس کی بالادستی ایسے علاقوں میں بھی مسلمہ تھی جو دولت عثمانیہ میں شامل نہیں تھے جیسے کریمیا اور شمالی افریقہ کی ریاستیں قاضی کی عدالت میں دیوانی اور فوجداری دو قسم کے مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ لیکن سلطان ملکی اور غیر ملکی باشندوں کے مقدمات کے لیے علاحدہ عدالتیں تھیں عیسائی رعایا کے ایسے مقدمات جس کے فریقین عیسائی ہوتے، ان ہی کی مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے۔ قاضی قانون شریعت سے تعلق رکھنے والے ایسے مقدمات فیصل کیا کرتے تھے جن میں دونوں فریق مسلمان ہوں یا ایک مسلمان اور ایک عیسائی ہو۔ عدالتوں میں پانچ قسم کے عہدیدار ہوتے۔ بڑے درجے کے ملّا، چھوٹے درجے کے ملّا، مفتش قاضی اور نائب۔ اونچی سطح پر یورپی مقبوضات اور ایشیائی مقبوضات کے قاضی، قاضی عسکر رومیلیا اور قاضی عسکر اناطولیہ کہلاتے تھے۔ دیوان میں ان کا درجہ وزیروں کے بعد ہوا کرتا تھا۔

ملتیں سلطنت عثمانیہ نے اسلامی سیاسی نظریے اور روایت کے مطابق غیر مسلم رعایا کے غیر سیاسی مسائل سے نمٹنے کا حق انہی کے ہاتھوں میں سونپ رکھا تھا۔ یہ کام ان ملتوں کے مخصوص دفاتر اور عدالتوں کے ایک نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ دفاتر اور عدالتیں ان کے پیدائش، اموات، نکاح اور وصیت ناموں کا ریکارڈ رکھتیں اور اپنے "شخصی قانون" کے معاملات کا خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرتیں۔ اگر فریقین ایک ہی ملت سے تعلق رکھتے ہوں تو ان کے دیوانی مقدمات کا فیصلہ بھی یہی عدالتیں کرتیں یہ تمام حقوق سلطنت نے صراحت کے ساتھ مختلف ملتوں کے سپرد کر دیے تھے۔ سب سے اہم ملت روم تھی جس میں مشرقی کلیسا کی پیروی کرنے والی تمام عیسائی رعایا شامل تھی۔ اس کے علاوہ ملت ارمنی (قسطنطنیہ کے گری گوری بطریق کی پیرو)، رومن کیتھولک عیسائی اور یہودی بھی تھے۔ غیر مسلم رعایا سے قطع نظر سلطنت میں ایسے عیسائی بھی تھے جو مغربی حکومتوں کی رعایا تھے اور بغرض تجارت یہاں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ سلطنت عثمانیہ نے ان کو ان کے سفیروں کے تحت وہی اختیارات دے دیے تھے جو ملتوں کو حاصل تھے دولت عثمانیہ کی تجارت تمام تر عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ سلطنت کے ضعف کے ساتھ خصوصاً جب اسے یورپی طاقتوں کے مقابلے میں شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عیسائی رعایا نے حکومت خود اختیاری کے مطالبات کرنے شروع کیے۔ بیرونی طاقتوں نے ان مطالبات کی تائید میں حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ۱۸۳۹ء کے خط گلخانہ اور ۱۸۵۶ء کے خط ہمایوں کے ذریعہ حکومت نے ملتوں کے حق میں ان تمام اصلاحات

کا اعلان کر دیا جن کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اسی کو تنظیمات کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود خود اختیاری کی جد وجہد کی شدت میں کمی نہیں آئی اور بیرونی طاقتوں کی مدد سے تمام یورپی علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس سے قطع نظر "تنظیمات" سے ترکی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں ایک جدید نظام حکومت اور نظام عدل کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مختلف شعبوں کے لیے وزارتیں قایم ہوئیں۔ حکومت کے تمام عہدے بلا امتیاز مذہب تمام رعایا کے لیے کھول دیے گئے۔ شرعی عدالتوں کے ساتھ ساتھ (جو شیخ الاسلام کے تحت تھیں) مغربی طرز کی عدالتیں قایم ہوئیں (جو وزیر عدل کے تحت تھیں) اب شرعی عدالتوں میں صرف وراثت، نکاح و طلاق اور اس طرح کے دیگر شخصی معاملات کا فیصلہ ہوتا۔ ایک نیا ضابطۂ فوجداری بنایا گیا جس میں قرآنی تعزیری احکام کی بجائے دوسرے احکام بنائے گئے۔ نیا ضابطہ دیوانی فرانس کے ضابطۂ دیوانی کے نمونے پر ترتیب دیا گیا۔ ان نئی عدالتوں میں عیسائی اور مسلمان جج قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے۔

نظام اراضی

سلطنت کی بیشتر اراضی تین قسم کی تھی۔ ارض عشریہ، ارض خراجیہ اور ارض مملکت۔ ارض عشریہ مسلمانوں کو فتح کے وقت اس شرط پر دی گئی تھی کہ وہ حکومت کو عشر ادا کرتے رہیں۔ ارض خراجیہ فتح کے وقت عیسائیوں کے پاس چھوڑ دی گئی تھی اور وہ اس زمین کے معاوضے میں یا تو ایک معین رقم ادا کرتے یا پیداوار کا ایک حصہ دیا کرتے جس کی مقدار زمین کی نوعیت کے لحاظ سے عُشر سے نصف تک ہوتی تھی۔ ارض مملکت میں وہ زمین شامل تھی جو کسی کو نہیں دی گئی تھی اور اس کا مالک خود سلطان ہوتا۔ ان زمینوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مسجدوں یا ان سے متعلق مدرسوں یا ہسپتالوں کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ اسی زمین میں سے مسلمان سپاہیوں کو جاگیریں بھی دی جاتی تھیں ارض مملکت میں یورپ کے تمام مقبوضات اور ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ شامل تھا۔

نظام تعلیم

عثمانی سلاطین نہ صرف علم کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ تعلیمی نظام کے قیام اور ترقی میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ شروع ہی سے سلطنت میں دینی مکاتب کا جال تنا ہوا تھا۔ یہ عموماً مسجدوں سے ملحق ہوتے تھے ۱۷۶۵ء میں سلطان مصطفےٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف قسطنطنیہ میں تقریباً (۲۷۵) مدرسے موجود تھے۔ سلطان عبد المجید خان کے دور میں ہر شہر میں کم سے کم ایک مدرسہ تھا۔ بڑے شہروں جیسے ادرنہ، بغداد اور قاہرہ میں چالیس پچاس مدارس تھے۔ ابتدائی تعلیم کے مکتب ہر گاؤں ہر شہر میں قایم تھے ان میں تعلیم مفت تھی۔ پچاس فی صدی مسلمان بچے یہ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے مکتب سے اوپر اعلیٰ تعلیم کے مدرسے تھے۔ یہ تعلیم زیادہ تر مذہبی اور ادبی تھی اور کلیتاً علما کے ہاتھوں میں تھی جو نصاب یا طریقۂ تعلیم میں زمانہ کی تبدیلیوں کے لحاظ سے کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ حالت انیسویں صدی کے وسط تک برقرار رہی۔ "تنظیمات" کے ذریعہ نظام تعلیم میں اہم اصلاحات کی گئیں۔ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ قدیم یعنی مذہبی مدارس کا انتظام شیخ الاسلام کی زیر نگرانی تھا اور جدید مدارس کے لیے ایک نیا محکمہ معارف کے نام سے قایم کیا گیا، جہاں مغربی زبانوں اور جدید علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے تین مدارج کو جدید اصولوں پر مرتب کیا گیا۔ جن میں مذہبی اور ادبی تعلیم کے ساتھ دوسرے دنیاوی علوم کی تعلیم کو بھی برابر کی اہمیت حاصل تھی۔ مغربی نمونے کے اعلیٰ تعلیم کے کالج اور جامعات قایم ہوئیں۔ ۱۸۹۲ء میں سلطان عبد الحمید ثانی کے عہد میں صرف قسطنطنیہ میں جملہ پانچ سو مدارس تھے مختلف سائنسی علوم اور صنعتی علوم کے ادارے کھولے گئے۔ قاضی اور مفتی کے عہدوں پر تقرر کے لیے شرعی تعلیم کے ایک ادارے سے فارغ التحصیل ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ اس نئے نظام تعلیم کی خصوصیات یہ تھی کہ تقریباً تمام کالجوں اور اسکولوں میں فرانسیسی زبان طبیعات، کیمیا اور ارضیات کی تعلیم لازمی تھی۔ ذریعۂ تعلیم ترکی زبان تھی نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد قدیم مکاتیب میں جدید طرزِ تعلیم کو رواج دینے کی کوشش شروع ہوئی اور بالآخر حکومت نے ان مکتبوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۰۸ء میں جامع استنبول کی تنظیم نو کی گئی۔ ترکی زبان میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں شائع کی گئیں۔ لڑکیوں کے لیے پہلی بار بڑے پیمانے پر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح بہ حیثیت مجموعی پورے ملک میں مغربی نظام تعلیم رائج ہو گیا۔

عثمانی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ترکوں نے اپنے علاقے میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جد وجہد شروع کر دی۔ ترکوں کی اس قوم پرستی کی رہنمائی مصطفےٰ کمال نے کی۔ جو آگے چل کر "اتاترک" کے لقب سے معروف ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کے صلح نامہ سیورے کے مطابق سلطنت عثمانیہ گھٹ کر استنبول کے علاقے اور شمالی اناطولیہ کے علاقوں تک رہ گئی تھی اور باقی علاقے اتحادیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ قوم پرستوں نے یونانیوں کو ۱۹۲۱ء میں زبردست شکست دے کر دنیا کو چونکا دیا۔ ۱۹۲۰ء میں فرانس کی پیش قدمی روک دی گئی تھی اور ۱۹۲۱ء میں ان سے ایک معاہدہ بھی طے پا چکا تھا۔ اطالوی افواج نے اناطولیہ خالی کر دیا۔ بیرونی فوجوں کے انخلا کے ساتھ داخلی محاذ پر بھی مصطفےٰ کمال نے اہم قدم اٹھائے۔ ۱۹۲۳ء کے صلح نامہ لوزان کے تحت ترکی کے بنیادی مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور اس طرح ترکی اور مغربی ملکوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سلطان عبد المجید کو سلطان نہیں بلکہ صرف خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ مسلمانوں کی جدید سیاسی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ اس وقت پیش آیا جب ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت ختم کر دی گئی اور خلیفہ عبد المجید جلا وطن کر دیے گئے۔ اپریل ۱۹۲۴ء کو ترکی کو جمہوریہ بنا دیا گیا مصطفےٰ کمال اس کے صدر اور عصمت انونو وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ وزارت شرعیہ، شرعی عدالتیں اور مذہبی مدارس بند کر کے ملک کا پورا نظام تعلیم وزارت تعلیم کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان کئی قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ ترکی ٹوپی پہننا اور پردہ ممنوع قرار دیے گئے۔ شمسی کیلنڈر نافذ ہوا، سوئس کوڈ اپنایا گیا ۱۹۲۹ء میں رومن رسم الخط نے عربی رسم الخط کی جگہ لے لی۔ عربی زبان اور الفاظ کو ہر جگہ سے ہٹایا جانے لگا۔ اذان ترکی زبان میں دینا لازمی قرار پایا۔ ۱۹۲۸ء میں دستور سے اسلام کا لفظ ہٹا دیا گیا۔ واحد سیاسی پارٹی کا نظام نافذ ہوا۔ ترکی میں کام کرنے والی واحد سیاسی جماعت سرکاری ری پبلکن پارٹی تھی اتاترک کی قیادت میں ترکی اپنی تاریخ کے ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ روس سے پرانی رقابت ختم ہو گئی۔ ۱۹۲۹ء میں ایک نئے معاہدے کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ صلح نامہ لوزان کے بعد مغربی ملکوں سے تعلقات استوار ہو ہی چکے تھے۔ پھر ۱۹۳۷ء کے میثاق سعد آباد کے ذریعہ افغانستان، عراق اور ایران کے ساتھ ترکی کا اتحاد بڑی حد تک مضبوط ہو گیا۔

۱۹۳۸ء میں اتاترک کے انتقال کے بعد، دوسری جنگ عظیم کے دوران، ترکی نے اتحادی اور محوری طاقتوں کے دباؤ کے درمیان اپنے مفادات کو بڑی مشکل سے بچائے رکھا اور جنگ کے خاتمے پر ہی اتحادیوں کی تائید کا اعلان کیا۔ جنگ کے

شرکت نہ کرنے کے باوجود ترکی معاشی اعتبار سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا جمہوری نظام حیات کے حق میں تھی ۱۹۴۵ء میں صدر عصمت انونو نے جمہوری نظام نافذ کرنے کا اعلان کیا اور پہلی بار مخالف سیاسی پارٹی کو کام کرنے کا حق دیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ترکی کی پہلی مخالف سیاسی پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے قائم ہوئی جس سے جلال بایار، عدنان، مندریز، رفیق کورالتن اور فواد کوپرولو وابستہ تھے۔ ۱۹۵۰ء کے عام انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی۔

جلال بایار صدر اور عدنان مندریز وزیر اعظم منتخب ہوئے ۱۹۵۲ء میں ترکی نیٹو (Nato) کا رکن بن گیا اور اس طرح بڑی طاقتوں کی سرد جنگ میں اس نے مغرب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سے تعاون اور دفاع کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں ترکی معاہدۂ بغداد کا ایک فریق بنا جس کا نام انقلاب عراق ۱۹۵۸ء کے بعد سینٹو (Cento). ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں فوجی انقلاب کے ذریعہ ملک کا انتظام فوج نے سنبھال لیا۔ حکومت کا کام قومی اتحاد کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کمیٹی نے اصلاح کے لیے چند اہم قدم اٹھائے اور ۱۹۶۱ء میں ایک نئی اسمبلی تشکیل دی گئی تاکہ جمہوری نظام کی طرف پھر سے لوٹا جا سکے اس سال ایک نیا دستور منظور ہوا جو ۱۹۲۴ء کے دستور سے کسی قدر مختلف تھا نئے دستور کے تحت جنرل گرسل صدر منتخب ہوئے اور عصمت انونو وزیر اعظم لیکن سیاسی پارٹیوں کی باہمی رقابت نے ترکی میں کسی پائیدار حکومت کے قیام کو مشکل بنا دیا ۱۹۶۱ء میں ایک نئی سیاسی جماعت جسٹس پارٹی کا قیام عمل میں آیا ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں اس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور سلیمان ڈیمرل صدر منتخب ہوئے۔

قبرص کا مسئلہ ترکی کی خارجی پالیسی کے لیے ہمیشہ پریشان کن رہا۔ ترکی کے مغربی دوستوں سے اس کے تعلقات کا امتحان قبرص کے مسئلے پر ہمیشہ سخت ثابت ہوا اور اب بھی سخت ثابت ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈیمرل حکومت نے استعفیٰ پیش کیا لیکن یہی وزارت کچھ دن اور کام کرتی رہی۔ بالآخر ڈیمرل حکومت کو ۱۹۷۱ء میں الگ ہونا پڑا اور ایک نئی کابینہ نے اس کی جگہ لے لی۔

ایران

(۲۲۸ء - ۱۹۷۰ء)

ساسانی خاندان

(۲۲۸ء - ۶۰۱ء)

تیسری صدی قبل مسیح کے وسط سے کم و بیش پانچ سو سال تک ایران پارتھیا کی حکمرانی میں رہا پارتھیا بھی ترکمانوں جیسے قبیلے کے لوگ تھے ابتدا میں شمالی خراسان میں حکومت قایم کی تھی۔ رفتہ رفتہ سارے ایران کے حکمراں بن گئے ان کے گھرانے کا نام صدر قبیلہ کے نام پر ارے سس (Arsaces) تھا۔ لیکن ایران میں قومی تاریخ کا آغاز پارتھیوں کے جانشین ساسانیوں سے ہوتا ہے ۲۲۶ء میں اردشیر نے پارتھیا بادشاہ کو شکست دے کر ساسانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کے انتیس بادشاہ ہوئے۔ ساتواں بادشاہ شاپور (دوم) ۳۱۰ء میں اپنے باپ ہرمز کی وفات پر تخت کے لیے منتخب ہوا۔ یہ ساسانیوں کا بہت بڑا بادشاہ تھا

اس کے زمانہ میں روم نے عیسائی مذہب قبول کیا جس کی وجہ روم سے جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور عیسائیوں کا قتل عام ہوا۔ ۳۷۹ء میں شاپور نے وفات پائی۔ ۴۲۰ء میں امرا نے تیرہویں بادشاہ یزدگرد کو قتل کر دیا اور اس کی جگہ چودھواں بادشاہ خسرو شاہ ہوا۔ لیکن یزدگرد کا دوسرا بیٹا بہرام پنجم عربوں کی مدد سے پندرھواں حکمراں ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے جب عربوں نے ایران کے معاملات میں مداخلت کی۔

۴۸۸ء میں امرا نے اٹھارہویں بادشاہ بلش کو تخت سے اتار دیا اور پیروز کے لڑکے بلش کو تخت پر بٹھا دیا۔ جس نے ۵۰۲ء میں پہلی بار اور ۵۲۱ء میں دوسری بار پھر ۵۳۱ء میں تیسری بار روم سے جنگ کی اور اسی سال وفات پائی تو اس کا بیٹا خسرو (عادل) جانشین ہوا۔ اس نے ۵۳۲ء میں روم سے دوامی امن کا معاہدہ کیا۔ لیکن ۵۴۰ء میں روم سے جنگ چھڑ گئی اور روم کو پے در پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں۔ ۵۶۲ء میں روم سے پچاس سالہ معاہدہ امن ہوا۔ ۵۷۰ء میں یمن میں عیسائی حبشی حکومت کے خلاف خسرو نے مہم بھیج کر ان کو اپنا باج گزار بنایا۔ ۵۷۱ء میں روم سے پھر لڑائی چھڑ گئی ۵۷۹ء میں خسرو نے وفات پائی۔ ۵۹۱ء میں تیئیسواں بادشاہ خسرو دوم یا خسرو پرویز ہوا۔ اس نے ۶۰۶ء اور ۶۰۸ء کے دوران ایشیائے کوچک پر حملہ کیا۔ ۶۱۵ء میں اس نے یروشلم پر قبضہ کر کے مقدس صلیب لے لی۔ پھر ۶۱۶ء میں مصر پر حملہ کیا ۶۲۲ء میں ایرانیوں کے خلاف ہرقل نے خود کمان سنبھالی اور آہستہ آہستہ اپنے علاقے واپس لے لیے۔

۶۳۳ء میں خسرو سوم کا پوتا یزدگرد سوم خسرو خاندان کا انتیسواں بادشاہ ہوا۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کی دعوت پر اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دنوں یعنی ۶۳۶ء میں قادسیہ کی جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں نے شکست کھائی ۶۴۲ء میں نہاوند کی جنگ میں عربوں کو فتح الفتوح ہوئی اور ایران اسلامی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا اور ایران کی اس صورت میں دو سو سال تک تبدیلی نہیں آئی۔ خلافت راشدہ ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک رہی پھر بنی امیہ بعد ۷۵۰ء تک رہا۔ بنی عباس ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک بغداد کی تباہی تک رہے لیکن ۱۱ اگست ۸۴۷ء کو جب معتصم کے لڑکے واثق نے وفات پائی تو بنی عباس عملاً ختم ہو چکے تھے۔ اگلی دو صدیوں تک بلکہ بغداد کی تباہی تک خلیفہ کی حیثیت کٹھ پتلی کی تھی۔

بنی عباس کے زوال کے بعد کی سلطنتیں

(۸۴۷ء - ۱۲۵۸ء)

بنی عباس کے زوال کے دوران ایران اور اس کے مضافات میں مختلف چھوٹی بڑی سلطنتیں قایم ہوئیں طاہری خاندان نے ۸۲۰ء - ۸۷۳ء تک خراسان پر حکومت کی۔ صدر مقام نیشاپور تھا۔

صفاریہ خاندان کی بنیاد یعقوب بن لیث نے ۸۷۰ء میں رکھی۔ اس نے طاہریوں سے سجستان فتح کیا اور آہستہ آہستہ سارے ایران پر قبضہ کر لیا۔ ساسانیوں کے زوال کے بعد بعضوں کے نزدیک یعقوب ایران کا پہلا قومی حکمراں تھا۔

مندرجہ بالا دو خاندانوں سے زیادہ اہم سامانی خاندان تھا جس کا بانی سامان بلخ کا ایرانی امیر تھا۔ اس کے لڑکے ہارون رشید کی خلافت میں گورنر تھے۔ اسمٰعیل ان میں سے ایک تھا۔ اس نے یعقوب کے بھائی عمرو بن لیث کو شکست دی۔ اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ اسماعیل نے بخارا کو صدر مقام بنایا اور اس کا (سامانی) خاندان کم و بیش سوا سو سال تک ماوراء النہر اور خراسان میں شان و شوکت سے حکومت کرتا رہا سامانی

خاندان نے بھی آزاد ریاستوں کے تصور کو بڑھاوا دیا۔

صوبہ دیلم کے ایک ایرانی خاندان بنی بویہ نے ۹۳۳ء میں مغربی ایران پر قبضہ کیا اور کم و بیش سو سال تک الجزیرہ، عراق عرب اور مغربی ایران پر حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کا سب سے اہم فرد احمد (معزالدولہ) تھا جس نے بغداد کے خلیفہ (مستکفی) کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا۔ احمد کے علاوہ عضدالدولہ اور شرف الدولہ مشہور بادشاہ تھے۔

جب فلسطین میں عبدالملک کا ترک غلام الپتگین اپنے آقا کی وفات پر اس کا تخت حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اسے غزنی چلا جانا پڑا۔ یہاں وہ سترہ سال تک سامانیوں سے برسر پیکار رہا۔ اس کا جنرل اور خسر سبکتگین تھا اس نے ہر سمت میں فتوحات حاصل کیں اور ۹۹۵ء میں ماوراالنہر تسخیر کیا۔ اس کے بیٹے محمود نے سامانیوں کو شکست دے کر خراسان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

محمود ہندوستان میں جب مصروف تھا تو ماوراالنہر کا علاقہ ترکستان کے سلجوقی قبیلے کی گرفت میں آ گیا۔ سلجوق کے باپ نے جو اس قبیلے کا بانی تھا ماوراالنہر میں پورے قبیلے کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ محمود کے لڑکے مسعود نے (۱۰۲۸ء) سلجوقیوں سے شکست کھائی اور یہیں سے سلجوقی حکومت کی بنیاد پڑی۔

ان لوگوں نے سلجوق کے پوتے طغرل (۱۰۵۵ء–۱۰۶۳ء) کی سرکردگی میں یونانیوں سے ایشیائے کوچک چھین لیا پھر عملاً سارے ایران پر قبضہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ ان کی حکومت باسفورس سے سندھ تک پھیل گئی۔ طغرل کے علاوہ الپ ارسلان (۱۰۶۳ء–۱۰۷۲ء) اور ملک شاہ (۱۰۷۲ء–۱۰۹۲ء) سلجوقی خاندان کے سب سے شاندار حکمراں ہوئے ہیں۔

۱۰۹۸ء میں امیر ارکوک نے خوارزم خاندان کی بنیاد ڈالی اور سلجوقیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے جانشینوں نے ماوراالنہر، خراسان، عراق اور کرمان کے علاقے فتح کیے۔ سلطان محمد (۱۲۰۱ء–۱۲۱۸ء) سب سے بڑا سلطان گزرا ہے لیکن ۱۲۱۸ء میں یہ اپنے عنفوان عروج میں مغلوں کے حملوں کا شکار ہو گیا۔

ترکوں کی طرح منگول بھی بحیرہ اسود کے شمال مشرقی سیتھیا نسل کی ایک شاخ تھے۔ قبائلی طرز کی زندگی گزارتے تھے اور جنگ کرنے سے عشق رکھتے تھے۔ لوٹ کا بازار گرم کرنے میں لطف اٹھاتے تھے۔

چنگیز خان اس وقت تک شمالی چین اور تاتار کا حکمران ہو چکا تھا جب اس نے ماوراالنہر کی طرف اپنا رخ پھیر دیا (۱۲۱۹ء) یہ صوبہ خوارزم کے بادشاہ محمد کی سلطنت میں داخل تھا۔ محمد نے اپنی ساری فوج اس کے خلاف جھونک دی لیکن وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ خود بادشاہ محمد نے بحر کیسپین کے ایک جزیرہ میں بھاگ کر پناہ لی اور اپنے بیٹے جلال الدین کو پیچھے چھوڑ دیا تاکہ جس حد تک ممکن ہو حملہ آور کی مدافعت کرے (۱۲۲۰ء) لیکن چنگیزی یلغار کی وجہ سے ماوراالنہر، خوارزم، گیلان اور آذربائیجان برباد ہو گئے (۱۲۲۰ء – ۱۲۲۷ء)۔ چنگیز کے بیٹے اوغدائی (Ogdai) سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر جلال الدین اصفہان چھوڑ کر بھاگ گیا اور کہیں حادثے کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اوغدائی کا دوسرا جانشین منگو خان تھا اس نے اپنے ایک بھائی ہلاکو (ہلاغو) کو خلیفہ مستعصم سے مقابلہ کا کام سپرد کیا۔ خلیفہ کوئی مدافعت نہیں کر سکا اور چالیس دن تک بغداد منگولوں کے جنون کا شکار رہا۔ لاکھوں آدمیوں کے ساتھ خلیفہ مستعصم بھی مارا گیا اور عظیم تہذیب کے خزانے جہالت کی نذر ہو گئے (۱۲۵۸ء)۔

ہلاکو ایران پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد ۱۲۹۵ء تک اس کے جانشین ایرانی تخت پر بیٹھے اور حکومت کرتے رہے۔ یہ بات موجب دلچسپی ہے کہ بغداد کو تباہ ہوئے ۳۷ سال نہ گزرے تھے کہ ہلاکو کے ایک جانشین غازان خان (ال خان اعظم) نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا ۱۲۹۵ء اور ایرانی عوام نے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ غرض کہ عرب آہستہ آہستہ سیاسی بساط سے غائب ہوتے گئے لیکن انسانی تمدن کے احیا اور فروغ کے لیے ان کی عظیم تحریک پھیلتی رہی۔

ہلاکو کے جانشین اسلامی تہذیب کے بڑے مربی بن گئے۔ تبریز اور سلطانیہ میں تہذیبی مراکز قائم ہوئے چینی فنون لطیفہ کا اثر ایران میں نمایاں نظر آنے لگا۔ ایران کے بعض سب سے بڑے شاعر اور مورخ اسی دور میں گزرے۔ اناطولیہ بھی جو منگول کا باج گزار تھا کلچر کی اس ترقی سے متاثر ہوا۔ فارسی ادب کی بھی ترقی ہوئی۔ مشہور عالم صوفی اور شاعر جلال الدین رومی نے تیرھویں صدی میں نہ صرف فارسی ادب کو مالا مال کیا بلکہ ایران کو بھی متاثر کیا۔ منگولوں کے حملے کے بعد سماجی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے انھوں نے صوفی تحریک پھیلا کر پر کیا۔

منگول ایران میں کوئی دیرپا حکومت قائم نہ کر سکے چودھویں صدی میں ان کی جگہ ایران میں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے لے لی۔ ان میں اہم شیراز کے مظفری اور بغداد کے بایزید تھے۔ ادھر وسط ایشیا میں سمرقند کے قریب تیمور نے ۱۳۶۹ء میں ایک سلطنت کی بنیاد رکھی۔ فوج اور علما کی مدد سے منگولوں کو وسط ایشیا سے مار بھگایا مقاصد اس کے نیک تھے مگر اس نے طریقے منگولوں جیسے اختیار کیے دلی اس کے حملے سے برباد ہوئی۔ خراسان کا بھی یہی حال ہوا۔ ۱۴۰۵ء میں اس کی وفات کے بعد اس کی وسیع سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ تاہم مشرقی ایران اور وسط ایشیا کے علاقے اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہے۔ ۱۵۲۶ء میں تیمور کے خاندان کے ایک شہزادے بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور یہاں عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اسی انتشار کے دور میں صرف اناطولیہ کا علاقہ ایسا تھا جہاں عثمانیوں نے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی جو سو سال کے اندر ایک زبردست سلطنت بن گئی۔ اسی زمانہ میں ایران میں خاندان صفوی عروج پر آیا۔

صفوی خاندان

ساسانیوں کے زوال کے بعد صفوی خاندان وہ پہلا قومی حکمراں خاندان تھا جس نے ایران پر کم و بیش سو دو سو سال تک حکومت کی (۱۵۰۱ء–۱۷۳۲ء) لیکن اس خاندان کے بانی کون تھے اس بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ صفی الدین (وفات ۱۳۳۴ء) اس خاندان کا بانی تھا اور وہ صوفی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا پندرھویں صدی کے آخر میں آذربائیجان میں اس خاندان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ترکمانیہ کے حکمرانوں سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے لیکن یہ تعلقات کبھی دوستی اور کبھی دشمنی میں بدل جاتے تھے۔ ۱۵۰۱ء میں نوجوان صفوی شیخ اسماعیل بن جنید نے مشرقی ترکمان کے آق قویونلو اور قرا قویونلو کو شکست دے کر منگولوں کے پرانے صدر مقام تبریز پر قبضہ کر لیا اور اپنے شاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اگلے دس برسوں میں پورا ایران اس کے زیر اقتدار آ گیا۔ ۱۵۱۴ء میں آذربائیجان کے شمال میں چالدران کے مقام پر دولت عثمانیہ کے سلطان سلیم اول نے اسماعیل کو شکست دی جس سے اس کے وقار کو صدمہ پہنچا اور اقتدار کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ ۱۵۲۴ء میں اسماعیل کی وفات پر اس کے بیٹے طہماسپ کو دس سال کی عمر میں تخت پر بٹھا دیا گیا (۱۵۲۴ء–۱۵۷۶ء) لیکن اس کو بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ مشرق سے ازبکوں اور مغرب

سے عثمانی ترکوں کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور کردستان دیا بکر اور بغداد عثمانیوں کے قبضے میں چلے گئے اور صدر مقام تبریز سے اصفہان منتقل کر دیا گیا۔

شاہ عباس صفوی (۱۵۸۷ء - ۱۶۲۹ء)

صفوی خاندان میں شاہ عباس صفوی کا دور (۱۵۸۷ء - ۱۶۲۹ء) سب سے ممتاز ہے۔ وہ انگلستان کی ملکہ الزبتھ اوّل، اسپین کے فلپ دوم روس کے ایوان اور مغل شہنشاہ اکبر کا قریب قریب ہم عصر تھا اس نے ترکوں کے خلاف یورپی قوموں سے معاہدے کر لیے تھے۔ ایرانی، چارحیائی اور قفقازی سپاہیوں پر مشتمل ایک طاقتور فوج کی مدد سے قزلباش اور دوسرے شر پسند عناصر کی اچھی طرح سرکوبی کر دی۔ اس کے دور میں تجارت صنعت اور تہذیبی ترقی عروج پر پہنچی اور امن اور خوش حالی کا ایک ایسا دور آیا جس کی یاد صدیوں تک لوگوں کے دلوں میں باقی رہی۔

۱۶۲۹ء میں عباس کی وفات سے صفوی خاندان کا زوال شروع ہوا اس کے بعد سو سال غیر اہم حکمرانوں کے گزرے۔ افغانستان کے صفوی صوبہ دار میرویس کے لڑکے محمود نے شاہ حسین کو شکست دے کر ایران کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کے تخت حاصل کرنے تک ۱۷۳۶ء افغان ایران کے ایک حصے پر قابض رہے۔ صفوی خاندان کے افراد کٹھ پتلی حکمرانوں کی طرح تخت پر بٹھائے گئے لیکن اس خاندان کی حقیقی حکومت ۱۷۳۲ء میں ہی ختم ہو چکی تھی۔

قاچار خاندان (۱۷۹۴ء - ۱۹۲۵ء)

اسی دوران افشار کے ایک سردار نادر نے ۱۷۳۶ء میں افغانوں کو منتشر کر کے ایران پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے روس اور ترکوں سے معاہدے کیے اور ایران کے صوبے واپس لے لیے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ شیعہ سنی اختلافات کو کم کرنے کے بعد جعفری مذہب کی بنیاد ڈالی ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ہرات اور قندہار پر قبضہ کر لیا۔ کریم خان زند نے بختیاری قاعد علی مردان خان اور محمد حسن قاچار کو نیچا دکھا کر اپنا اقتدار فارس (جنوبی ایران) عراق، عجم، آذربائیجان اور مازندران پر مستحکم کر لیا۔ کریم خاں زند کی وفات کے بعد اس کے لڑکے لطف علی خاں کو آقا محمد بن حسن قاچار نے گورگان اور گیلان پر شکست دے کر (۱۷۸۹ء) اپنے اقتدار کا اعلان کر دیا اور ۱۷۹۶ء میں شاہ کا لقب اختیار کیا اسے اس کے دو غلاموں نے قتل کر دیا۔

سلطنت قاچار (۱۷۹۴ء - ۱۹۲۵ء) اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دور میں مطلق العنان بادشاہت ایک طرح کی دستوری بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرز کی حکومت میں بادشاہ کی طاقت قبائلی سرداروں کی مرہون منت تھی۔ مرکزی حکومت ان قبائل پر براہ راست نہیں بلکہ سرداروں کے ذریعہ اپنے اختیارات استعمال کر سکتی ہیں۔ صوبائی گورنر مرکزی حکومت کے ملازم نہیں ہوتے تھے۔ وہ مرکزی حکومت کو صوبہ کی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ دیا کرتے تھے اور شاہ کے لیے فوجی دستے مہیا کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔

محمد بن حسن قاچار کی وفات پر اس کا بھتیجا فتح علی شاہ جانشین ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے عباس مرزا کو اور عباس نے اپنا جانشین محمد شاہ کو بنایا۔

محمد شاہ (۱۸۳۴ء - ۱۸۴۸ء) کے دور کے ابتدائی برسوں میں روس کا اثر غالب رہا اور شمالی علاقے روس نے حاصل کر لیے۔ برطانیہ نے ایران کے افغانی علاقے ہرات پر حملے کی مدافعت کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا جس کی وجہ سے ایرانی فوجیں ہرات سے واپس ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

اس دوران ملک کے داخلی حالات ابتر ہوتے گئے۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کے اختلافات ابھر کر سامنے آ گئے۔ شمالی حصہ روس اور جنوبی حصہ برطانیہ کے حلقہ اثر میں سمجھا جانے لگا۔ اس طرح کی بے چینی کا ایک اظہار بابی تحریک تھی۔ سید علی محمد نے جو باب کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں مہدی المنتظر ہونے کا دعویٰ کیا لیکن ۱۸۴۷ء میں اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد ناصر الدین شاہ قاچار تخت نشین ہوا۔ ناصر الدین نے اپنے دور میں (۱۸۴۸ء - ۱۸۹۶ء) ملک میں فوجی، انتظامی اور تعلیمی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی لیکن خود شاہ کے اختیارات میں کسی قسم کی کمی اس کے اصلاحات میں شامل نہ تھی۔ دوسری طرف روس اور برطانیہ و فرانس کی رسہ کشی جاری تھی۔ اجازت کے باوجود انگریز ریلوے لائن نہ ڈال سکے اور نہ قومی بنک قایم کر سکے۔ ملک میں ابتر صورت حال کی جانب مجتہدین اور علما کو متوجہ کرنے میں جمال الدین افغانی کا اہم حصہ رہا۔ ۱۸۹۶ء میں ناصر الدین کو جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد نے گولی مار دی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا مظفر الدین تخت نشین ہوا۔

ملک کے ابتر حالات کی وجہ سے سیاسی اصلاحات کی تحریک طاقتور ہو گئی اور بالآخر مظفر نے ۱۹۰۶ء میں مجلس شوریٰ ملی کے قیام کا اعلان کیا اور مظفر الدین شاہ کے جانشین محمد علی شاہ نے ۱۹۰۷ء میں اس کی توثیق کی تسیکو اینگلو رشین کنونشن کے مطابق ایران کو انگلستان اور روس کے الگ الگ حلقہ اثر میں تقسیم کرنے کی وجہ سے شاہ سے دستور پسندوں کے تعلقات بگڑ گئے۔ بالآخر ۱۳ر جولائی ۱۹۰۹ء کو محمد علی شاہ کو تخت سے ہٹا کر اس کے گیارہ سالہ بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا گیا (۱۹۰۹ء - ۱۹۲۵ء)

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) میں ایران ترکی، روسی اور برطانوی فوجوں کا میدان جنگ رہا۔ بولشویک انقلاب کے بعد روس اور ایران کے تعلقات بہتر ہو گئے اور ۱۹۲۱ء میں سابقہ زار شاہی اور ایران کے درمیان طے کیے معاہدے منسوخ قرار دیے گئے اور ماہی گیری کو چھوڑ کر تمام ٹھیکے بھی کالعدم کر دیے گئے۔ لیکن معاشی اور سیاسی دیوالیہ پن کا ردعمل لازمی تھا چنانچہ ۲۰ر فروری ۱۹۲۱ء کو کنک برگیڈ کے (جسے محمد علی شاہ نے ۱۹۰۷ء میں قایم کیا تھا) ایرانی کمانڈر رضا خاں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ (۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء کے درمیان رضا خاں نے فوج کو منظم کیا مرکز اور صوبوں میں اقتدار بحال کیا اور علما کو اپنی تائید میں لینے کی کوشش کی۔

پہلوی خاندان (۱۹۲۶ء)

۱۹۲۵ء میں رضا خاں نے مجلس خاندان قاچار کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ حاصل کیا اور اس نے ۱۹۲۶ء میں خاندان پہلوی کے پہلے حکمراں کی حیثیت سے رضا شاہ پہلوی کے نام سے تخت و تاج سنبھالا۔

رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۶ء - ۱۹۴۱ء)

رضا شاہ پہلوی نے ایران میں سے بیرونی اثرات کو ختم کیا بیرونی طاقتوں کے مساویانہ بنیاد پر نئے معاہدے کیے نظام عدالت میں اصلاح کی اور اسے معیاری بنایا مغربی طرز پر لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے اور رفتہ رفتہ بیرونی مشنری اسکول بند کر دیے۔ طہران میں پہلی مرتبہ قائم کی ایک قومی بنک قایم کیا جسے کرنسی نوٹ جاری کرنے کا اختیار تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسجد سلیمان (خوزستان) میں تیل دریافت ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں اینگلو پرشین آئیل کمپنی

تشکیل پائی اور ۱۹۱۵ء میں خلیج فارس اور آبادان کے جزیروں پر مشتمل تھا۔ یہ کمپنی کا زبردست کارخانہ کام کرنے لگا۔ رضا شاہ نے کمپنی سے بہتر شرائط کا مطالبہ کیا ۱۹۳۲ء میں کمپنی کا ٹھیکہ منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں نئی شرائط پر محدود علاقے میں جدید معاہدے کے تحت ٹھیکے کی میعاد ۱۹۹۳ء تک بڑھا دی۔ ایران، ترکی، عراق اور افغانستان سے رقابتوں کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ۱۹۳۷ء کو اسی مقصد کی تکمیل کے لیے میثاق سعد آباد طے پایا جو مشرق وسطیٰ میں دوستی کا پہلا علاقائی معاہدہ کہا جا سکتا ہے۔

محمد رضا شاہ (۱۹۴۱ء)

۱۹۴۱ء میں رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا محمد رضا تخت و تاج کا مالک ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں روس کو کمک پہنچانے کے لیے امریکی فوجیں ایران میں متعین ہوئیں جس کے بعد برطانوی اثر کی جگہ امریکی اثرات بڑھنے لگے۔

۱۹۵۱ء میں مجلس نے تیل کی صنعت کو قومیانے کا بل پاس کر دیا۔ اس تحریک کی قیادت ڈاکٹر مصدق نے کی جو مئی ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم بن گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ایران نے برطانیہ سے سفارتی تعلقات توڑ لیے۔ فروری ۱۹۵۳ء میں شاہ نے اپنی ملکہ کے ساتھ ملک چھوڑنے کا فیصلہ کا اعلان کیا اور اس نے ایران چھوڑ دیا۔ مگر مغربی طاقتوں کی مدد سے جنرل زاہدی نے مصدق اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اور شاہ واپس آ گیا۔ برطانیہ سے سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ایران معاہدہ بغداد میں شامل ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں ایران میں اصلاحات کا وسیع پروگرام شروع کیا گیا جو انقلاب سفید کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۶۳ء کے انتخابات میں وزیر اعظم اسد اللہ عالم کی جماعت نیشنل یونین کو اکثریت حاصل ہوئی۔ جاگیرداری نظام میں اصلاحات کی گئیں۔ جولائی ۱۹۶۴ء میں ایران، ترکی اور پاکستان کے مابین ایک علاقائی تعاون کا معاہدہ طے پایا جس کا مقصد معاشی فنی تعلیمی اور صنعتی میدانوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا تھا۔ ایک اہم مسئلہ بحرین کی ملکیت کا تھا ۱۹۶۸ء میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ خلیج سے ۱۹۷۱ء میں دست بردار ہو جائے گا۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۷۰ء میں عرب عوام کی خواہش کے پیش نظر اس علاقے کو آزادی دے دی۔

تاریخ عالم

تاریخ عالم

تاریخ عالم

دنیا کی ابتدائی تہذیبیں

(۵۰۰ قبل مسیح تک)

تہذیب کا آغاز

تہذیب کے آغاز کے سلسلے میں یہ معلوم کرنا مناسب ہوگا کہ کرۂ ارض کی عمر کیا ہے۔ ابتدائی انسان کی بود و باش دنیا کے کن علاقوں میں تھی اور حیوان ناطق (Homo Sapiens) کب عالم وجود میں آیا۔ ہندو ماہرین فلکیات کے حساب سے کرۂ ارض کی مجموعی مدت عمر چودہ ادوار میں بٹی ہوئی ہے، جو منونترا کہلاتے ہیں۔ اس حساب سے ہمارا کرۂ ارض تخمیناً دو سو کروڑ سال قبل عالم وجود میں آیا اور دنیا میں انسانی زندگی کا آغاز منو کے سات ادوار کے اختتام سے کچھ قبل دیوسنوات نامی آخری منو کے دور میں ہوا۔ دیوسنوات مانوتار کوئی بارہ کروڑ سال قبل شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نسل انسانی کس طرح اور کہاں وجود میں آئی اور انسان دنیا کے تمام دوسرے حصوں میں کس طرح پھیل گیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم نہیں ہوتی اور نفس موضوع سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے کہ اس دور میں کرۂ ارض کے قابل رہائش خطوں میں کس کس قسم کے بے شمار ذی روح موجود تھے۔

ابتدائی انسان سے متعلق سوال دو طرح سے حل کیا جا سکتا ہے لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ ان دونوں طریقوں کے مطابق جانچ پڑتال اور اس کے نتائج کی صحت کے بارے میں شدید اختلافات ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خصوص میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہے گا۔

جے جے (J.J.) کے تخمینے کے مطابق زمین پر حیات کا آغاز ہوئے تخمیناً ۲۰۰۰ ملین سال گزر چکے ہیں۔ جدید ترین اندازہ یہ ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کی ابتداء آج سے کم و بیش ۲۷۰۰۰۰۰ برس قبل ہوئی۔

آیئے پہلے ہم اس طریقے پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو جدید حکمیاتی طریقہ کہلاتا ہے اور جس میں قدیم ڈھانچوں کی شکل میں برآمدہ شہادتوں سے مدد لی جاتی ہے یہ ڈھانچے کئی کروڑ بلکہ کئی ارب سال قبل دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے گوناگوں مظاہر حیات کا پتہ دیتے ہیں۔ علم طبقات الارض کے ماہروں نے زمین کے طبقات کو جن ادوار میں تقسیم کیا ہے ان میں سب سے زیادہ قدیم کینوزوئک (Canozoic) کہلاتا ہے۔ یہ خیال کہ اس عہد کے اوائل میں زندگی کرۂ ارض پر نمودار ہوئی اور اس پر بتدریج ارتقاء کا عمل جاری رہا یہاں تک کہ کوئی تین ملین برس سے زیادہ عرصہ قبل حیوان ناطق (Homo Sapiens) یا کرومیگنن انسان عالم وجود میں آیا۔

دنیا کے مختلف خطوں میں پتھر کے تراشیدہ اوزار ملے ہیں۔ اس بنا پر باور کیا جاتا ہے کہ ابتدائی انسان پتھر کے اوزار استعمال کرتا تھا۔ اور اس دور کو قدیم حجری دور کا نام دیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ دور ہزاروں سال تک جاری رہا اور اس زمانے میں انسان کا زیادہ تر وقت غذا کی فراہمی پر صرف ہوتا تھا جس کی تلاش نے اسے سیلانی بنا دیا تھا۔ وہ چمڑے، درختوں کی چھال اور پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتا تھا اس دور میں اس نے آگ جلانا اور جنگلی جانوروں کو سدھانا سیکھا۔

سلامتی کے ساتھ اور آرام سے زندگی بسر کرنے کے لیے اس نے جو طریقے اختیار کیے ان میں حجری اوزار اور ہتھیار کو چلا دینا اور ان کی دھار کو تیز کرنا بھی شامل تھا اس ترقی یافتہ دور کو نو حجری دور کا نام دیا گیا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ قدیم حجری دور تخمیناً پانچ لاکھ تا دس ہزار سال قبل کا تھا۔ اور جدید حجری دور ۸۰۰۰ ق م تا ۳۰۰۰ ق م مانا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہم کو خود اپنے اس زمانے میں بھی بعض علاقوں میں ایسے قبائل نظر آتے ہیں جو ہنوز "نو حجری دور وحشت" کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر نیوزی لینڈ کے ماوری (Maories) باشندوں کا ۱۸۰۰ء تک یہی حال تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں پہیے کی ایجاد کر کے، آگ کو استعمال میں لا کر، جانوروں کو پالتو بنا کر، اور درخت اور پودے اُگا کر جو بنیاد رکھی تھی اسی پر اس عمارت کی تعمیر ممکن ہو سکی جسے ہم تہذیب کہتے ہیں۔ اور مختلف ادوار کی زمانی ترتیب کے متعلق بھی یہ ضرور یاد رہے کہ ان کا تقدم و تاخر قیاس آرائیوں پر مبنی ہے اور اس بارے میں کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

دنیا کے جن علاقوں میں حجری اور دھات کی آثاری اشیاء ملی ہیں باور کیا جاتا ہے کہ ابتدائی انسان کی اولین جولان گاہ وہی تھے۔ وی۔جی۔ چائلڈ کی رائے میں جن علاقوں میں زمانہ قبل تاریخ کی آثاری اشیاء پائی جاتی ہیں ان کے مغرب۔

ہیں صحرائے اعظم و بحیرۂ روم مشرق میں تھار کا ریگستان اور کوہ ہمالیہ، شمال میں یورشیائی سلسلۂ کوہ، البلقان، قفقاز (Caucasus) البرز، ہندوکش اور جنوب میں خطِ سرطان واقع ہے۔ چائلڈ نے یہ بھی کہا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی سے قبل جو ایجادیں کی گئیں اور دریافتیں ہوئیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ۲۰۰۰ ق م سے ایک ہزار سال قبل کے عہد سے ہے۔ چائلڈ نے یہ وضاحت کی ہے کہ نوحجری دور کے انسان آپس میں مل جل کر رہتے تھے اور غذا کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہو جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب انسان کو پتہ چلا کہ غذا اگائی بھی جا سکتی ہے تو اس نے زراعت کا فن سیکھا اور اسے ترقی دی۔ اس کے بعد اور کئی فنون اور دستکاریوں کا دور آیا جیسے پارچہ بافی، کوزہ گری، عمارت سازی اور دیہات کی تشکیل و تعمیر۔ گورڈن چائلڈ (Gordon Childe) نے ان تبدیلیوں کو نوحجری دور کا انقلاب قرار دیا۔ انسان کے تمدنی ارتقاء کے اس دور کے آثار ہندوستان میں آندھرا پردیش کے ضلع بیلاری میں ملتے ہیں۔ گورڈن چائلڈ کا خیال ہے کہ اس دور میں کوزہ گری، مویشی پالن اور زراعت کا فن دور دور تک پھیل گیا تھا۔

اس زمانے میں تانبہ بھی استعمال میں آنے لگا لیکن ماہرین آثار قدیمہ کے لیے یہ امر حیرانی کا باعث تھا کہ تانبہ بے میل اور کم و بیش خالص حالت میں مستعمل تھا۔ اور انھوں نے اندازہ لگایا کہ یہ دھات محض اتفاقاً کیمپ کے الاؤ کی آگ کی وجہ سے دریافت ہوئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ عہد تانبے کا عہد کہلاتا ہے۔

اس کے بعد جب پتہ چلا کہ تانبے اور ٹن کے میل سے ایک زیادہ مضبوط مخلوط دھات کانسہ بنتی ہے تو کانسہ کا دور شروع ہوا۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس تبدیلی سے شہری بود و باش کا آغاز ہوا۔ اور شہری زندگی اس علاقے میں شروع ہوئی جو دریائے نیل اور سندھ کی وادی کے مابین واقع ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ انکشاف ہوا کہ تقریباً سارا شمالی ہند بلکہ نربدا اور تاپتی کے جنوبی علاقے بھی اس میں شامل تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وادئ سندھ اور ہڑپا میں جو آثار ملے ہیں تقریباً ویسے ہی آثار زیادہ دور دراز مقامات پر بھی دریافت ہوں۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ لوہے کی دریافت بہت بعد کو ہوئی یعنی ۱۵۰۰ ق م میں یہ مقام ایشیائے کوچک۔ چونکہ لوہا کانسے کی بہ نسبت سستا اور بڑی مقدار میں دستیاب تھا اس لیے اس کا استعمال عام ہو گیا اور فوجی اغراض کے لیے تلواروں اور فوجی رتھ کی ساخت میں لوہا استعمال کیا جانے لگا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مکمل تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔

تاریخ کے آریائی ماخذ

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ دنیا میں انسانی زندگی کے آغاز سے شروع کر کے زمانے کو ادوار یا عہد میں تقسیم کرنے کا دوسرا طریقہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس بات پر بھی غور کریں گے کہ اولین انسان دنیا کے کس خطے میں پیدا ہوا۔

حیات انسانی سے متعلق ایک قرین قیاس نظریہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا ہمالیہ کے جوار میں ہوئی۔ اس میں شمال کی جانب کیلاش اور جنوب کی جانب ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں کے علاقے تبت اور وادئ کشمیر شامل ہیں۔ اس بارے میں وسطی ہند، وادئ ڈینوب (Danube Valley)، نارڈک سرزمین اور قطب شمالی میں آریاؤں کی آبادی سے متعلق جو مختلف نظریات پیش کیے گئے تھے وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں رہے۔

جہاں تک حیات انسانی کے آغاز کے زمانے کا تعلق ہے ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ جدید سائنس یا طبقات الارضی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ انسان تخمیناً چار لاکھ سال قبل یا اس سے بھی پہلے عالم وجود میں آ چکا تھا۔ اور جب آبادی بڑھنے لگی تو انسانوں کی شاخیں دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پہلے وہ علاقے جو آج ریگستان، راجستھان اور وادئ گنگ و جمن کہلاتے ہیں، سمندر میں واقع تھے اور ایشیا اور افریقہ کے براعظم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ انسانی خاندان کے گروہوں کے لاکھوں سال قبل دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل ہونے کی قطعی شہادتیں بھی ملی ہیں لیکن اس کے باوجود اس امر کا تعین مشکل ہے کہ انسانی آبادی کے ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقل یا پھیلاؤ کس زمانے یا عہد میں عمل میں آیا۔

اولین تہذیبوں کے گہوارے

دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے دریاؤں سے سیراب وادیوں میں انسانی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔ قدیم ترین عہد کے ان تہذیبی مرکزوں میں مصر کی وادئ نیل، عراق، عرب کی دجلہ و فرات کی وادیاں، ہندوستان میں گنگا جمنا، اور سندھ (سندھو) کی وادیاں اور چین کے ہوانگ ہو اور یانگسی سے سیراب وادیاں شامل ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے اور خوش حال شہر یا تو بڑے دریاؤں کے کنارے یا سمندر کے ایسے ساحلی علاقوں پر آباد ہوئے جہاں اچھی بندرگاہیں تھیں۔ لیکن ان دریائی تہذیبوں کے علاوہ ایجین (Aegean)، روم، یونان، مایا اور وسطی امریکہ کی ازٹیک (Aztec) تہذیبیں بھی قدیم ترین عہد میں وجود میں آئیں۔

مصر

مصر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وادئ نیل میں قدیم ترین دور کی ایک تہذیب نے جنم لیا اور پھلی پھولی۔ جن بڑے دریاؤں کے ساحلوں پر یہ قدیم تہذیبیں وجود میں آئیں ان کے وسائل سے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا گیا۔ مثال کے طور پر دریائے نیل کی طرح کے بڑے دریاؤں میں ہر سال سیلاب آتے تو سیلابی مٹی طغیانی کی وجہ سے وادی میں ہر طرف پھیل کر جم جاتی تھی۔ جن علاقوں میں زیادہ بارش نہیں ہوتی تھی وہاں برسات کے پانی کو محفوظ کر لینے کی غرض سے بڑے بڑے تالاب بنائے جاتے تھے اور ان تالابوں کے پانی سے کھیتی کو سیراب کر کے اچھی فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ سیلاب آتا تو لوگ اپنے گھروں کو بچانے کی فکر میں لگ جاتے تھے لیکن ان کی خوش حالی کا وسیلہ بھی سیلاب ہی تھا کیونکہ سیلابی دھارے کے ساتھ زرخیز مٹی بہہ کر آتی اور اس کی موٹی موٹی تہیں بیٹھ جاتی تھیں۔ آبپاشی کے مصنوعی ذرائع کی ضرورت پیش آئی تو تالاب اور نہریں تعمیر ہوئیں جس کے لیے امداد باہمی کے طریقے اختیار کیے گئے۔ اس کے علاوہ پانی کے مصنوعی ذخیروں کو محفوظ رکھنے کے لیے دیکھ بھال اور مرمت ضروری تھی جب یہ صورت حال پیش آئی تو آپس میں مل کر کام کرنے والے گروہوں نے اس قسم کے سماجی وسائل سے متعلق قواعد و ضوابط بنائے اور اس طرح بالآخر سیاسی سماج کی تشکیل ہوئی جو آج ریاست (State) کہلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان سماجوں میں زیادہ باقاعدگی اور باضابطگی پیدا ہو گئی تو ان کی خوش حالی بڑھ گئی۔ اور ان کی تعداد بھی بڑھنے لگی جس کا اظہار نئے نئے شہروں اور گاؤں کے قیام کی شکل میں ہوا۔

مصری تہذیب کا دور۔ اراضی

شمال مشرقی افریقہ میں دریائے نیل کی سب سے زیادہ نشیبی

گزرگاہ کے دونوں طرف تقریباً ایک سو میل تک وہ زرخیز وادی پھیلی ہوئی ہے جس کو یونانی ایجپٹ کہتے تھے لیکن جس کا نام مشرقی ملکوں میں مصر تھا اور جہاں اسے آج بھی مصر ہی کہا جاتا ہے۔ مصر کا رقبہ ۳،۸۶،۰۰۰ مربع میل اور آبادی دو کروڑ سے زیادہ ہے۔ مصر کا لمبوترا زرخیز خطہ جس کی زرخیزی ہر سال نیل کی سیلابی مٹی کی وجہ سے برقرار رہتی ہے مشکل سے ۱۵ تا ۲۰ میل چوڑا ہے۔ اور اس کے ہر دو جانب ریگستان ہے۔ یہ خطۂ زمین عالمی عہد تاریخ کے قدیم ترین دور کے سب سے زیادہ زرخیز علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں سے نسبتاً الگ تھلگ، اس ملک میں قدیم ترین زمانے سے ایک خاص تہذیب و تمدن کی آبیاری ہوئی اور باور کیا جاتا ہے کہ اس تہذیب کا زمانہ تخمیناً ۶۰۰۰ ق م سے ۵۰۰۰ ق م تک کا تھا۔

ابتدائی دور میں مصر کے لوگوں نے زراعت اور مویشی پالن کو فروغ دیا۔ اندازہ ہے کہ یہ دور جو شاہی خاندانی دور سے پہلے کا تھا، کوئی تین ہزار سال کا تھا۔ اس دوران اہل مصر نے بہت سے مفید علوم و فنون اور حرفوں میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے ایک عمدہ قسم کا جو بونا شروع کیا تھا۔ تانبہ کی اشیا پہلی بار انہوں نے بنائیں اور ان کو استعمال کرنا شروع کیا یہی وجہ ہے کہ یہ دور تانبے کا دور (Chalcolithic Age) کہلاتا ہے)۔ چمکدار سرخ و سیاہ رنگ کے مٹی کے برتن بنانے میں بھی مصریوں نے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے جو ملک گیر نظام آبپاشی قائم کیا تھا وہ دنیا کے اس قسم کے اولین نظاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پیپرس (Papyrus) کی دریافت اور روشنائی کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے اور وہ اہل مصری تھے جنہوں نے سب سے پہلے کوئی ۴۲۰۰ ق م میں تقویم کی ترتیب کا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ پاس پڑوس کے ملکوں سے تجارت بھی کرتے تھے۔

وسائل آبپاشی فراہم کرنے کے لیے شروع میں چھوٹے چھوٹے گروہ بنے جو بہ تدریج بڑھتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے دو شاہی ریاستیں قائم کرلیں۔ ان میں سے ایک ریاست اس وسیع علاقے میں تھی جو دریائے نیل کے دہانے پر واقع تھا اور مصر زیریں کہلاتا تھا۔

دوسری ریاست ملک کے جنوبی نصف حصے پر مشتمل تھی جو بالائی مصر کہلاتی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ریاستیں ۵۰۰۰ ق م میں قائم ہوئی تھیں تخمیناً ۳۱۰۰ ق م میں بالائی مصر کے ایک طاقتور رہنما مینیس (Manes) نے ان دو ریاستوں کو ایک دوسرے میں ضم کرکے دریائے نیل کے دہانے پر قاہرہ سے دس میل جنوب میں ممفس (Memphis) کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہ شاہی خاندان ان متعدد خاندانوں میں سے ایک تھا جو متحدہ مصر پر حکمراں رہے۔ مصر کے عہد عتیق کی ساری تاریخ تین خاندانوں کے گرد گھومتی ہے جو یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے — قدیم خانوادہ (۳۲۰۰ - ۲۴۷۵ ق م)۔ ۲۴۷۵ - ۲۱۶۰ ق م کے دوران ایشیائی طاقتوں کی یورشوں کی وجہ سے ملک میں نراج پھیل گئی۔ اسی عہد میں ہیراکلیوپولیس (Heracleopolis) مصر کی راجدھانی تھا۔

عبوری شاہی (۲۱۶۰ - ۱۵۸۰ ق م) اس دور کا بھی کچھ حصہ انتشار کا شکار رہا جس کے نتیجے میں غیر ملکی خانوادے برسر اقتدار آگئے اور ہکسوس (Hyksos) یا گڈریہ بادشاہوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

شاہی ریاست اور سلطنت (۱۵۸۰ - ۹۲۵ ق م) اس کا آغاز اٹھارہویں خانوادے سے ہوا جس نے ہکسوس خاندان کو تخت سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس عہد میں مصر کی عظمت اور طاقت کا ستارہ انتہائے عروج پر تھا۔ اور اس کا پایۂ تخت بالائی مصر میں تھیبس (Thebes) تھا۔

مصر کی آزادی کا آخری دور ۹۲۵ ق م – ۵۲۵ ق م تھا۔ یہ انحطاط تنزل اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا قدیم شاہی کی مرکزیت صوبائی عاملوں کی خود مختاری کی وجہ سے کمزور ہوتی گئی اور فراعنہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن بالآخر تھیبس کے حکمرانوں نے جن کا تعلق بالائی مصر سے تھا قوم کو دوبارہ متحد کرکے قدیم شاہی طرز کی حکومت قائم کی۔ قدیم زمانے کا یہ شاہی دور اہرام مصری کی وجہ سے مشہور رہے۔ عبوری شاہی دور میں ادبیات اور فنون لطیفہ کو فروغ ہوا۔

مصر قدیم کا آخری دورِ شان و شوکت تخمیناً ۱۵۷۰ ق م میں شروع ہوا جب کہ وہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی۔ یہ سلطنت کئی صدیوں تک برقرار رہی جس کے دوران مصر کے جنگجو تاجداروں نے ایشیا اور بحر روم کے چند علاقوں کو فتح کیا۔ اور اس طرح وہ وسیع و عریض سلطنت وجود میں آئی جس کی حدود میں نیوبیہ (جدید سوڈان) بھی شامل تھا۔ اس عہد میں مصر کا نظم و نسق بے مثال تھا، ملک نہایت خوش حال تھا۔ اور مصر کی راجدھانی تھیبس (Thebes) دنیا کا سب سے زیادہ عظیم الشان شہر بن گئی تھی لیکن ۱۲۰۰ ق م کے بعد سلطنت میں کمزوری کے آثار رونما ہونے اور پھر زوال شروع ہوا تو مصر عرصہ دراز تک حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنا رہا۔

مصر قدیم میں تقریباً تمام علوم و فنون کو نمایاں فروغ ہوا۔ نہ صرف یہی بلکہ "حقیقت اولیٰ" سے متعلق غور و فکر میں بھی اہل مصر بلند مرتبے کے حامل تھے۔

بابل اور اشور کم و بیش اسی زمانے میں جب کہ مصری تہذیب نے ارتقا کے منازل طے کیے اس کے پڑوس کے علاقے وادی دجلہ و فرات میں ایک اور تہذیب کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ آرمینیہ (Armenia) کے بالائی حصے سے نکل کر دجلہ و فرات ایک چوڑے نشیبی میدان سے گزر کر خلیج فارس میں جا گرتی ہیں۔ اس وادی کا نصف زیریں حصہ اس زمانے میں سمیر (Sumer) کہلاتا یا بالائی خطے کا نام اکاڈ (Akkad) تھا۔ مصر کی طرح یہاں بھی سیلابی مٹی نے زمینوں کو زرخیز بنا دیا تھا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بابل کا علاقہ مصر کی طرح محفوظ نہیں تھا اور اس پر کسی بھی سمت سے حملے ہو سکتے تھے۔ سمیریوں نے اہل یونان کی طرح شہری مملکتیں قائم کرلی تھیں۔ یہاں کش (Kish) اور اُر (UR) جس میں کئی دولت مند شہری ریاستیں تھیں اور بعض ریاستیں ان میں ایسی تھیں جن کی حدود میں آس پاس کی اراضی شامل تھی۔ آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ تھی۔ ملک میں جابجا تالاب بنائے گئے تھے۔ اور نہروں کا جال بچھا ہوا تھا اس کے علاوہ ان ریاستوں کے لوگ پاس پڑوس کے ملکوں سے اور اس کے علاوہ آپس میں بھی تجارت کرتے تھے۔ ہر شہری مملکت ایک خودمختار نظم و نسق کے زیر سایہ تھی۔ بسا اوقات یہ مملکتیں باہم لڑتی بھی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ خوش حال تھیں۔ "ہلال زرخیز" (Fertile Crescent) کے مغرب میں واقع فلسطین، فینیشیا، اکاڈ اور سمیر کے باشندوں اور جنوب میں ریگستان عرب کے بسنے والے سنائٹ (Sunites) کی آنکھوں میں ان کی خوش حالی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی چنانچہ وہ حسد کی بنا پر ان کے درپے ہوگئے تھے۔ ۲۹۰۰ ق م تک سامیوں نے ان مملکتوں پر غلبہ پالیا۔ سمیر کی طاقت اس وقت روبہ زوال تھی۔ سارگون اوّل (Sargon-1) (تخمیناً ۲۵۰۰

ق۔م) تانی شاہی بادشاہ نے جو ایک زبردست فاتح اور ماہر نظم و نسق تھا پہلے اکاڈ کو فتح کیا اور اس کے بعد سمیر پر قابض ہو گیا۔

چند صدیوں کی حکمرانی کے بعد ساگر (سارگون) خاندان کی جگہ امور (Amorites) نامی ایک اور سامی خاندان نے لے لی۔ اس شاہی خانوادے کا نامور حکمراں حمورابی (Hammurabi) (تخمیناً ۔۔۔۲ ق۔م) ایک زبردست فاتح تھا جس نے بابل کی سلطنت کی نیو رکھی۔ اس کا دور حکمرانی پرامن تھا جس میں مختلف فنون کو اسی طرح نمایاں فروغ ہوا جس طرح سارگون کے عہد میں ہوا تھا۔ اس کی حکومت کا نظم و نسق اعلیٰ درجے کا تھا اور اس نے دیوانی اور فوجداری قوانین وضع کیے تھے۔

سمیر میں صدیوں تک مختلف فنون اور صنعت و حرفت کو بڑی ترقی ہوئی جن میں ماہرانہ دست کاری، پارچہ بافی، زیورات سازی اور دوسرے کام شامل تھے۔ سمیر میں ایک رسم الخط کا بھی آغاز ہوا جو پیکانی رسم الخط (Cuniform) کہلاتا ہے۔ سمیر کئی خداؤں کو پوجتے تھے۔ انہوں نے علم نجوم اور فلکیات میں پیش رفت کی۔ تعمیر کاری کی تاریخ میں اس دور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس میں کمانیں، محراب اور گنبد سازی کا آغاز ہوا۔

شام، فنیشیا اور فلسطین

شام کے علاقے میں دریائے فرات اور بحیرۂ روم کے مشرق میں تاورس (Taurus) کا جنوبی خطہ شامل ہے۔ فنیشیا اور فلسطین کے علاقوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اور اس طرح ملک شام کا اپنا علاقہ دمشق کے شمال مشرقی خطے تک محدود رہا۔

شام ایک بہت خوش حال اور ترقی یافتہ ملک تھا جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس علاقے میں حلب (Hleppo)، انطاکیہ (Antiocn)، کیدش (Kadesh)، پالمیرا (Palmyra)، دمشق، کارکیمش (Carchemish) جیسے شہر واقع تھے۔ شام کا علاقہ شمال میں ہٹی (Hatti) مشرق میں میسوپوٹامیا (Mesopotamia) عراق اور جنوب مغرب میں مصر سے گھرا ہوا تھا۔ یہ جغرافیائی محل وقوع تجارتی اعتبار سے خوش حالی اور سیاسی اعتبار سے کمزوری کا باعث تھا۔ وہ اپنے طاقتور پڑوسی کی جارحیت کا شکار ٹھہرا۔ اور یکے بعد دیگرے بابل، ہٹائٹ (Hittite) اور مصر کی حکومتوں کے زیر اقتدار آتا رہا۔ اس طرح سیاسی طور پر شام کمزور ہو گیا لیکن پھر بھی پڑوس کے ملکوں سے اس کی تجارت بڑے پیمانے پر جاری رہی۔

فنیشیا کی حکومت شمالی ساحلی خطے (انجیل کے مطابق کنعان) میں تھی ساحل سمندر کے پاس کے جزیرے بھی اسی کی عمل داری میں تھے اور اس نے فصیل بند مستحکم شہر بھی تعمیر کیے تھے جن میں سیڈان، ٹیر (Tyre) آرواد (Arwad) بیروت اور بیبلوس (Byblos) قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام یونانی شہروں کی طرح شہری مملکتیں تھیں اور ان میں سے ہر ایک پر ایک بادشاہ حکمراں تھا۔ ان مملکتوں میں بڑی رقابت تھی اور خصوصاً ٹیر اور سیڈان ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ چوں کہ یہ مملکتیں ساحلی علاقوں اور جزیروں میں واقع تھیں اس لیے فطری طور پر تجارت اور جہاز رانی میں یہاں بڑی ترقی ہوئی۔ جہاز رانی ہی کی بدولت انہیں بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں قبرص، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں نو آبادیاں قائم کرنے کا موقع ملا۔

قدیم مصری تصویری رسم الخط کی بنیاد پر انہوں نے بائیس حروف پر مشتمل ایک ابجدی نظام مرتب کیا۔ یہ تمام حروف صحیح (Consonants) تھے۔ الف بی حروف علت کا اضافہ اہل یونان نے کیا۔ مغربی دنیا میں مستعملہ تمام حروف تہجی کی بنیادیں فنیشیا کے ابجدی نظام ہی پر قائم ہیں۔ انہوں نے چند اصوات کا استعمال بھی شروع کیا تھا جو غالباً تجارتی امور میں ان کی بے باک بددیانتی اور قزاقی کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنے زمانے کے "سب سے بڑے جھوٹے" سمجھے جاتے تھے۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے بعد ان پر یکے بعد دیگرے ایران، مقدونیہ (Mac-edonia) اور روم نے اپنی حکومت قائم کی۔

آرمینیائی آرمینیوں کا علاقہ فنیشیا کے مشرق میں واقع تھا اور ان کا مرکز دمشق تھا جس کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں کیا جاتا ہے اور جو آج بھی ایک خوش حال شہر ہے۔ اس شہر کا محل وقوع بڑا خوب صورت ہے۔ دمشق ریگستان کے کنارے واقع ہے لیکن اس کے چاروں طرف سرسبز و شاداب چمن اور پھلوں کے باغات ہیں جن کو سینکڑوں نہریں سیراب کرتی ہیں اور یہ شہر بجا طور پر "مشرق کا سرتاج" (Pearl of the Orient) کہلاتا ہے۔

فلسطین فلسطین کا علاقہ شام کے جنوب میں بحیرۂ روم کے ساحل اور شام کے ریگستان کے مابین واقع تھا۔ ولادت مسیح سے تین ہزار سال قبل سامی نسل کے لوگ گروہ در گروہ کثیر تعداد میں اس خطے میں داخل ہوئے جن میں امور (Amorites) عبرانی ٹریل (Traelite) اور عرب شامل تھے۔

عبرانی جو بالآخر فلسطین میں مستقل طور پر بس گئے ان کا اصل وطن عرب کا ریگستان تھا اور یہ لوگ سیلانی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب مویشیوں کے لیے چارے کی کمی کی وجہ سے سخت مشکلات درپیش ہوئیں تو ان کے بعض قبیلے زیادہ زرخیز علاقوں کی تلاش میں ترک وطن کرنے لگے۔ ان عبرانیوں کا ایک قبیلہ دریائے اردن کے مغرب میں کنعان میں آباد ہو گیا یہ اسرائیلی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جد اعلیٰ ابراہیم اُر (UR) سے ترک وطن کر کے جو بابل کے ریگستان کے کنارے واقع تھا، کنعان میں جا بسے تھے۔ اس علاقے میں ایک بار جب سخت تباہ کن قحط پڑا تو ابراہیم کے پوتے یعقوب وطن چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ مصر کے ڈیلٹا کے زرخیز علاقے میں منتقل ہو گئے۔ یہاں یعقوب کی آل اولاد خوب پھلی پھولی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فراعنۂ مصر نے اس پر بھاری ٹیکس لگائے اور انہیں دوسرے طریقوں سے بھی پریشان کرنا شروع کیا۔ حضرت موسیٰ کی قیادت میں یہ لوگ متحد ہوئے اور سینائی کے ریگستان جا پہنچے۔ چالیس سال تک ان لوگوں نے صحرا نوردی کی اور اس کے بعد کنعان کے "ارض موعود" میں یہوا (Jehovah) کے زیر سایہ (حسب عہد نامہ عتیق) پھر ایک بار داخل ہوئے۔

اس کے بعد انہوں نے گلہ بانی چھوڑ کر قصبوں اور شہروں میں رہنا شروع کیا۔ الغرض اپنی ایک ریاست بھی قائم کر لی۔ لیکن اس کے لیے انہیں اس سرزمین کے قدیم باشندوں کے خلاف جو فلسطین (Philistine) کہلاتے تھے طویل عرصے تک سخت جد و جہد کرنی پڑی۔ فلسطینیوں کا جنگجو سردار سال (Saul) تھا۔ سالہا سال تک سخت آویزش سے گزرنے کے بعد بالآخر حضرت داؤد نے حکومت کو مستحکم کیا، بیت المقدس کو اپنا پایۂ تخت بنایا جو مصر سے شام جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہاں حضرت داؤد نے اپنا قصر شاہی تعمیر کیا اور یہوا (Jenovah) کا معبد بنوایا۔

حضرت داؤد کے بیٹے اور جانشین حضرت سلیمان (۹۵۵ – ۹۲۵ ق م) کی ایک وسیع و بسیط سلطنت پر حکمرانی تھی۔ حضرت سلیمان نے پڑوس کے بادشاہوں سے دوستانہ روابط پیدا کیے اور تجارت کو فروغ دیا۔ لیکن حضرت سلیمان کی شہرت کے

بنیاد اس عظیم الشان معبد پر قائم ہے جو انہوں نے تلوا کی عبادت کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ حضرت سلیمان کا تدبر اور نظم و نسق قابل ستائش مانا جاتا ہے یہ ایک پر امن عہد تھا جس میں مختلف فنون اور صنعت و حرفت کو فروغ ہوا۔

لیکن حضرت سلیمان کے جانشینوں کے دور میں ریاست کے شمالی علاقے کے بارہ قبائل میں سے دس قبائل نے مرکز سے روگردان ہو کر سماریا کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کر لی۔ اور جنوب کے دو قبیلوں نے یہودہ کی ریاست قائم کی۔

جب ان کی سلطنت اس طرح پارہ پارہ ہو گئی تو وہ بڑی دس کی ریاستوں کے مقاومت نہیں کر سکے۔ اور اس اسرائیلی ریاست پر حملہ آور ہو کر پہلے اشور نے اور اس کے بعد بابل اور ایران نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اس پر اپنی حکومت مسلط کی۔ اور بالآخر یہ اسرائیلی ریاست وسیع و بسیط ایرانی شہنشاہیت کا، جس کے متعدد صوبے تھے۔ ایک صوبہ بن کر رہ گئی۔

اشور کی سلطنت

اشور کی سلطنت ۱۶۰۰ ق م کے بعد دریائے دجلہ (Tigris) کے جنوب میں اس وقت قائم ہوئی جب اس علاقے کے باشندوں نے بابل کے تسلط کا جوا اتار پھینکا۔ اس کے بعد ان کے اقتدار کی حدیں وسیع ہوتی گئیں اور ان کا تصادم بابل ہٹائٹ اور شام سے ہوا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں انحطاط کے ایک مختصر عہد کے بعد یکے بعد دیگرے کئی صاحب تدبیر بادشاہوں نے سلطنت کی عظمت رفتہ میں دوبارہ جان ڈال دی اور اشور کی حدود کو اس درجہ وسعت دی کہ بحر خضر سے خلیج فارس تک اور بحر متوسط سے دریائے نیل تک کا سارا علاقہ اس کی قلمرو میں داخل ہو گیا۔ اور پہلی بار میسوپوٹامیہ (Mesopotamia) (عراق) تا مصر تمام علاقہ ایک حکومت کے زیر نگیں آگیا۔

ان معرکوں میں مفتوحین کے ساتھ نہایت وحشت ناک سلوک روا رکھا گیا۔ اہل اشور بے رحم اور سفاک مشہور ہو گئے۔ اپنی یورشوں میں انہوں نے شہر کے شہر جلا ڈالے اور قصبات کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔ دیہی علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔

اشور کا ایک طاقتور ترین بادشاہ سارگون ثانی (۷۲۲ سے ۷۰۵ ق م) تھا۔ بنی اسرائیل نے حملہ آوروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ان کے خلاف نہایت بے دردی سے انتقامی کارروائی کی گئی۔ ان کی راجدھانی سماریا پر چڑھائی کر کے اشور نے ہزاروں باشندوں کو عمر قید کی سزا دی۔ بالآخر وہ اس علاقے کی آبادی میں اس طرح ضم ہو گئے کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ سارگون کے بیٹے سینا کرب (Sennacherib) (۷۰۵ - ۶۸۱ ق م) نے یروشلم کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس کی فوج ایک وبا کا اس بری طرح شکار ہوئی کہ ایک سپاہی بھی جانبر نہ ہو سکا۔ اس کو مجبوراً ناکام اپنے پایۂ تخت نینوا کو لوٹ جانا پڑا۔ اس کے بعد اشور کی سلطنت نے کچھ عرصہ سنبھالا لیا لیکن اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ماتحت تسلط کے تحت جتنے علاقے تھے ان سب نے سرکشی کی ٹھان لی۔ بالآخر میڈیا (Medes) کی حکومت بابل کے اتحاد میں شامل ہو گئی اور اتحادی فوجوں نے ۶۱۲ ق م میں نینوا پر حملہ کر کے اس کو اس درجہ پامال کر دیا کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

سلطنت بابل

سلطنت بابل (۶۰۶ ق م کے بعد) فاتحین نے اشور کی سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا۔ خلیج فارس تا ایشیائے کوچک کا علاقہ میڈیا کے حصے میں آیا۔ بابل ریاست کے مغربی نصف پر قابض ہو گیا جس میں وادئ فرات اور شام کے ساحلی علاقے شامل تھے بابل کی یہ نئی سلطنت کچھ عرصے تک مرفع الحال رہی اور اس کے بادشاہ نبوچاد نزار (Nebuchad Nazar) نے شام پر مکمل تسلط قائم کر کے ٹیر (Tyre) کے ساحلی شہر کو باج گزار بننے پر مجبور کیا۔ اس نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم پر قبضہ کر کے معبد کو آگ لگا دی اور وہاں کی آبادی کو حلقہ بگوش کر لیا۔ نبوچاد نزار نے کئی وسیع علاقے فتح کیے لیکن اس سے زیادہ شاندار کارنامے اس تاجدار کے یہ تھے کہ اس نے عوام کی آسائش اور خوش حالی کے لیے بڑے اہم تعمیری کام کیے جن کی بدولت بابل کا شمار دنیا کے اہم ترین شہروں میں ہونے لگا۔ اس کے تعمیری کارناموں میں وہ آٹھ منزلہ معبد بھی شامل ہے جس کا عبرانی روایات میں ذکر کیا ہے اور جس کا تعلق لوک کہانیوں کے مطابق مشہور عالم "مینار بابل" سے تھا۔

میڈیہ اور لیڈیہ

(۶۰۰ ق م کے بعد)

سلطنت بابل کی فتوحات کے اسی زمانے میں مغربی ایران کی پہاڑیوں کے رہنے والے میڈیوں (Medes) نے بھی شام کے خلاف فوجی اقدام شروع کیا لیکن لیڈیہ نے ان کی پیش رفت کو روک دیا لیڈیہ نے جو شروع میں ایشیائے کوچک کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا رفتہ رفتہ ایک شاہی ریاست قائم کر لی اور میڈیہ کے اقدام کو روکنے میں کامیاب رہے۔ لیکن ۵۸۵ ق م میں جب ایک اچانک سورج گہن نے جانبین کو خائف کر دیا تو لیڈیہ صلح پر آمادہ ہو گیا۔ اور طے پایا کہ دریائے ہیلیز (Halys) فریقین کے ملکوں کے مابین سرحد متصور ہو گا۔ میڈیہ کے ایک بادشاہ نے لیڈیہ کے بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ۵۵۴ ق م میں میڈیہ، بابل، لیڈیہ، اور مصر کے مابین ایک مستحکم اتحاد عمل میں آیا۔

سلطنت ایران

اہل فارس یا ایرانی (آریائی) اصلاً اشور اور میڈیہ کے زیر اقتدار تھے۔ لیکن کوروش اعظم (۵۵۰ سے ۵۳۰ ق م) (Cyrus The Great) نے میڈیائی حکمران کو تخت سے ہٹا کر اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ ۵۴۶ ق م میں اس نے لیڈیہ کو شاہ کروئسس (Croesus) کے قبضہ سے نکال لیا اور ۵۳۸ ق م میں بابل کو فتح کیا۔ کوروش نے اس طرح جو ایرانی سلطنت قائم کی اس کی حدیں جلد ہی مشرق میں دریائے سندھ سے لے کر مغرب میں بحیرۂ روم تک پھیل گئیں۔ کوروش کے بیٹے کمبوجیہ (Cambeysus) نے ۵۲۵ ق م میں مصر کو فتح کر کے فرعون کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بیس حصوں میں تقسیم کیا تھا جو ستراپی (Satraples) کہلاتے تھے۔ کمبوجیہ کا جانشین داریوش اول (۵۲۱ - ۴۸۵ ق م) (Darius) ہوا۔ اس نے وادئ سندھ کے ریگستان تھار (Thar) تک کے علاقے کو فتح کر کے اسے اپنا ستراپی بنا لیا۔ اپنی وسیع سلطنت کے مختلف حصوں کے مابین رسل و رسائل اور آمد و رفت کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اس نے اچھی سڑکیں بنوائیں۔ ہر ایک ستراپی کو اپنی زبان بولنے اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کی آزادی تھی۔ داریوش نے ریونیہ کی کئی یونانی ریاستوں پر بھی آسانی سے اپنا تسلط قائم کر لیا جس کے بعد اس کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ یونان کے اصل علاقے پر بھی حملہ آور ہوا لیکن میراتھان (Marathon) میں اسے شکست فاش ہوئی۔

چین

چین دنیا کے سب سے زیادہ وسیع ملکوں میں سے ایک ہے بر اعظم یورپ میں سے روس کو خارج کر دیا جائے تو اس کا

رقبہ چین کے مساوی ہوگا۔ اس کا علاقہ شمال میں عرض البلد ۴۰ سے شروع ہو کر جنوب میں خط سرطان سے کچھ نیچے تک چلا گیا ہے جس کی لمبائی قریب قریب ۱۸۰۰ میل ہے۔ مشرق تا مغرب اس کا پھیلاؤ ۹۰ طول البلد تا ۱۲۰ طول البلد ہے چین مختلف قسم کے موسموں اور فطری مناظر سے مالا مال ہے۔ یہاں گوبی جیسا وسیع ریگستان بڑے بڑے دریا، زرخیز وادیاں، پہاڑ اور جنگل ہیں۔

عہد عتیق کی دوسری تہذیبوں کی طرح چین کی تہذیب بھی بہت قدیم ہے جس کی ابھاری بڑے دریاؤں اور خصوصاً ہوانگ ہو (دریائے زرد) کی وادیوں میں ہوئی ہے۔ ہوانگ ہو کی دریا برد مٹی اور ریت کی یک جائی سے اس کی گزرگاہ مرتفع ہوگئی جس کی وجہ سے سیکڑوں میل تک اس کے دونوں کناروں پر سطح مرتفع بن گئی۔ لیکن سیلاب کے موسم میں اس کے دھارے ابل کر ہر طرف بہہ نکلتے تو ان مسطح علاقوں کے رہنے والوں کو اپنے گھروں کو محفوظ رکھنے اور جان بچانے کے لیے بڑی جد و جہد کرنی پڑتی۔ اس لیے انھوں نے سیلابی پانی کو روکنے اور اس کے اخراج کے لیے پشتے اور نالے بنا دیے۔ انھوں نے سیکڑوں میل لمبی نہریں بھی تعمیر کیں جن سے آبپاشی اور نقل و حمل کا کام لیا جاتا تھا۔

سیاسی تاریخ

تاریخ کے اعتبار سے پہلے شاہی خاندان نے جو شانگ خاندان کہلاتا ہے اپنی حکومت تخمیناً دو ہزار سال قبل مسیح میں قائم کی تھی۔ اس خاندان کے تیس بادشاہوں نے چین پر حکومت کی۔ دھات کی بنی ہوئی اور دوسری اشیا پر ان حکمرانوں کی جانب سے کندہ کردہ ہزاروں تحریریں ملی ہیں جن سے شانگ عہد کی تاریخ اور تمدن سے متعلق کافی تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اہل چین نے بہت پہلے ایک تصویری اور تصوراتی رسم الخط کی تشکیل کی تھی۔ انھوں نے ایک منظم حکومت قائم کی تقویم مرتب کی اور لکھنے کے لیے ایک قسم کا کاغذ ایجاد کیا۔

تخمیناً ایک ہزار قبل مسیح میں چو خاندان (Chow Dynasty) نے شانگ خانوادے کا خاتمہ کر دیا۔ چو حکمرانوں کے دور میں بڑے نشیب و فراز آئے لیکن ان کا راج ۲۲۱ ق م تک برقرار رہا اور اسی دوران طاقتور چن خاندان کے تحت چین ایک متحد ملک بن گیا۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں چین میں تین عظیم مذہبی رہنما لاؤتزو (Lao-Tzu) کنفوشیس اور مینشیس (Mencius) پیدا ہوئے۔

ہٹائٹ (Hittites)

ہند یورپی نسل کے جو لوگ پہلے پہل ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے ان میں ہٹائٹ (انجیل کے ہیتھ) (Heth) اور مصریوں کے کھیتا (Kheta) بھی تھے اور انھوں نے ۲۰۰۰ ق م سے قبل ہی اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ بڑے دس کی ریاستوں کو فتح کر کے انھوں نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی اور ان کا طرز حکومت جاگیرداری نظام پر مبنی تھا۔ انھوں نے تصویری اور پیکانی رسم الخط میں کئی تحریریں چھوڑی ہیں جو تختیوں پر کندہ ہیں۔

ان کا عظیم ترین حکمران شبی لولیما (Shubbiluliuma) (۱۳۹۰ـ ۱۳۵۰ ق م) تھا جس نے شمالی حصے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور حتانی (ami) سے اپنا لوہا منوا کر باج گزار بنا لیا۔ اس کے ایک جانشین نے مصر کے رامیسس ثانی (Ramess II) کو شکست دی لیکن ۱۲۰۰ ق م تک ہٹائٹ کی سلطنت کو حملہ آوروں نے بحری اور بری راستے سے یورش کر کے تباہ و تاراج کر دیا۔

ایجیائی یا میسینیائی تہذیب (Aegean or Mycenean Civilisation)

یہ یونانیوں کے دور سے بہت پہلے کی اور نہایت قدیم تہذیب تھی جس کو مسیح سے تین یا چار ہزار سال قبل کریٹ (Crete) کے جزیرے میں حیرت انگیز حد تک فروغ حاصل ہوا۔ قصص و روایات کے سورما بادشاہ مینوس کے نام پر یہ تہذیب مینوسی تہذیب کہلائی۔ کریٹ شہری مملکتوں میں منقسم تھا اور اس کے اہم ترین شہر سنوسس (Cnossus) اور فیستوس (Phaestus) تھے۔ کریٹ میں آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے پتہ چلا کہ یہاں دو منزلہ محلات تھے جن کی آرائش دیواری نقاشی سے کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ حیرت انگیز حد تک نفیس سفالی برتن دھات کی بنی ہوئی اشیاء اور فرنیچر بھی دستیاب ہوئے۔

۱۶۰۰ ـ ۱۱۰۰ ق م کے مابین ایجیائی تہذیب کے اثرات یونان عامر تک جا پہنچے اور اس طرز حیات کو شہر میسینیا کے نام پر میسینیائی (Mycenaean) کا نام دیا گیا۔ اس تمدن کی بہترین مادی باقیات تلواریں، خنجر، زیورات، آرائشی ظروف اور ہاتھی دانت پر منبت کاری کے نہایت ہی اعلیٰ قسم کے نمونے ہیں۔

تخمیناً ۱۰۰۰ ق م میں ایکیہ پر یونان نے اپنا اقتدار قائم کیا اور وہاں کے شہروں میسینے (Mycenae) اور تیریوس (Tiryns) کو تاخت و تاراج کیا لیکن فاتحین کو ایجیائی تہذیب اس درجہ پسند آئی کہ انھوں نے اسے اپنا لیا۔

یونان کا دور اوّل

اہل یونان کا تعلق آریائی نسل سے ہے اور ان کا سیاسی اور سماجی نظام خالص آریائی طرز کا تھا۔ یونانی بڑے مہم جو تھے جیسا کہ ان کے قومی سورماؤں ہرقل (ہرکلیس) وغیرہ کے محاربات سے پتہ چلتا ہے۔ حال میں ٹرائے (Troy) میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں ان سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہومر کی رزمیہ نظموں ایلیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) میں بیان کردہ بیشتر باتیں واقعات پر مبنی ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ نظمیں ۸۰۰ ق م میں لکھی گئی تھیں۔ ہومر کے بعد یونان میں ایک اور بڑا شاعر پیدا ہوا جس کا نام ہسیاد (Hesiod) تھا۔ اس نے اپنے عہد کی دیہی زندگی کے مناظر پیش کیے ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی تک یونان میں کئی شہری مملکتیں معراج کمال پر پہنچ گئی تھیں۔ ان مملکتوں میں سے کچھ یونان کے خاص علاقہ میں واقع تھیں اور کچھ جزائر اور ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں تھیں جو ایونیہ (Ionia) کہلاتا تھا۔

(۵۰۰ ق م ـ ۶۴۸ء)

شمالی افریقہ

براعظم افریقہ کی تاریخ شمالی افریقہ میں مصری تمدن کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔

اہل فینیشیا و یونان

بعض مورخین کے مطابق افریقہ میں بیرونی باشندوں

کی اوّلین بستیاں اہل فنیشیا نے بسائی تھیں۔ وہ سولھویں صدی قبل مسیح میں تونس کے علاقہ میں آکر آباد ہوئے۔ ان کی سب سے مشہور بستی قرطاجنہ (Carthage) کی شہری ریاست تھی جو غالباً نویں صدی ق م میں بربری ساحل کے ایک محفوظ مقام پر قائم کی گئی تھی۔ بحر روم کے مشرقی اور مغربی راستے قرطاجنہ کی زد میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی بحر روم پر قرطاجنہ کا تسلط چھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا۔ اہل قرطاجنہ کو سمندری تجارت سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ انہوں نے ساحل کو چھوڑ کر اندرونی علاقہ میں داخل ہونے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ ان کی سرگرمیاں بحر روم اور بحر اوقیانوس کے ساحل پر واقع تجارتی چوکیوں تک محدود رہیں۔ البتہ ایک آدھ مہم میں وہ ان علاقوں سے آگے بھی نکل گئے۔ چنانچہ ہانو کے بحری پلس (پانچویں چھٹی صدی ق م) نے ایک ایسے ہی بحری سفر کا تذکرہ کیا ہے جس میں وہ سیرالیون (Sierra leone) تک جا پہنچا ہوگا۔

قرطاجنہ کا ستارہ ابھی عروج پر ہی تھا کہ یونان نے طاقت پکڑنا شروع کی۔ ۶۳۰ ق م کے لگ بھگ ایک یونانی کالونی نے سرینکا میں قدم جمائے تو اس کے نتیجہ میں سرین کے یونانی نوآبادکاروں اور مغرب کے قرطاجنی باشندوں میں پہلا سرحدی تنازعہ شروع ہوا۔ بحر روم کے سارے علاقہ میں اور خاص طور سے صقلیہ (Sicily) اور جنوبی اٹلی میں صدیوں تک اہل یونان سے جنگ چھڑی رہی ... ۳۰۰ ق م میں تو قرطاجنی تراہین سمندر اور صقلیہ پر پوری طرح چھائے رہے۔ تاہم انہیں روم کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ لاحق ہوگیا تھا چنانچہ اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے انہیں اہل روما سے ٹکر لینی پڑی۔

اہل روما ۲۶۴ ق م اور ۱۴۶ ق م کے درمیان تین تین لڑائیوں میں قرطاجنہ کی قوت نیست و نابود ہوگئی اور بربری علاقہ رومی سلطنت میں ضم کر لیا گیا جو ونڈلیوں کی آمد تک ان کے قبضہ میں رہا۔ رومیوں نے اس علاقہ کے نظم و نسق کو سدھارا اور رسل و رسائل کا ایک بہتر نظام قائم کیا۔ اس علاقے کی جنوبی سرحد پر، جو کہ ریگستان کو سرسبز و شاداب علاقہ سے منقطع کرتی ہے، متعدد دفاعی قلعے تعمیر کیے گئے۔ اس طرح سلطنت روما کو غلہ فراہم کرنے والا یہ زرخیز خطہ غیروں کی دست و برد سے محفوظ رہا۔ رومیوں کے متعدد عظیم الشان آثار اس علاقہ میں اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان لق و دق میدانوں میں جو اب بنجر ہو چکے ہیں، بے شمار نشانیاں جا بجا پائی جاتی ہیں جو سلطنت روم کی خوش حالی کی گواہی دیتی ہیں۔ واضح رہے کہ اپولیس (Apuleius) ہپو کے سینٹ آگسٹن اور شہنشاہ سپٹی میس سیورس (Septimius Severus) شمالی افریقہ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔

ونڈلوں نے ۴۲۸ء میں بربری علاقہ پر حملہ کیا اور زوال یافتہ رومی سلطنت نے ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک صدی تک اس علاقہ پر ونڈال حکومت کرتے رہے اور بالآخر مقامی باشندوں کی بڑھتی ہوئی مخاصمت کی وجہ سے ان کی حکومت کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور وہ بازنطینی سلطنت کے پے در پے حملوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اہل بازنطینی چھٹی صدی عیسوی کے آغاز تک رومن سلطنت کا مرکز نقل روم سے قسطنطنیہ منتقل ہو چکا تھا۔ بازنطینی سپہ سالار بیلی ساریس ۵۳۳ء میں قسطنطنیہ سے نکل کر افریقہ پر حملہ آور ہوا۔ اسی نے ونڈلوں کا قلع قمع کرنے کے بعد مشرقی بربر میں رومی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ وسطی اور مغربی بربر گوشہ گمنامی میں چلا گیا جس کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں تاہم یہ بات واضح ہے کہ کئی مقامات پر عیسائیت اور لاطینی زبان کا بول بالا رہا۔ بازنطینیوں کے ظالمانہ طرز حکومت کے باوجود وہاں کی اقتصادی حالت اطمینان بخش تھی اور فنون لطیفہ نے ترقی کی۔ اس امر کے شواہد آثار قدیمہ سے ملتے ہیں۔

پہلے مسلمان ساتویں صدی کے نصف آخر میں مسلمان حملہ آوروں نے بربر علاقہ سے رومن نظام حکومت کو اکھاڑ دیا اور اسلامی طرز حکومت کی بنا ڈالی۔

صحرا اور سوڈان صحرا عربی لفظ ہے جس کے معنی ریگستان کے ہیں اور سوڈان بھی عربی کے بلاد السودان (سیاہ فام لوگوں کا ملک) سے ماخوذ ہے۔

آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں کش نے مصر فتح کیا اور پچیسویں شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی جو ساتویں صدی ق م میں اشوریوں (Assyrians) کی آمد تک برسر اقتدار رہا۔ اس کے بعد کش خاندان نے جو نیابت الٰہی کا دعویدار تھا وادیٔ نیل کے سوڈانی علاقہ پر ایک عرصہ تک حکومت کی۔ میرو (Meroe) کا علاقہ حبش افریقہ کے ان مراکز میں سے ہے جہاں لوہا سب سے پہلے دریافت ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حبش باشندے تانبے یا کانسے کے دور سے گزرے بغیر پتھری دور سے براہ راست آہنی دور میں داخل ہوئے۔ آبادی اور مویشیوں میں اضافہ کی وجہ سے وہاں کی سرسبز و شاداب زمین بالآخر بنجر ہوگئی اور وہیں سے میروائی (Meroitic) تہذیب کا زوال شروع ہوگیا اور مصر کی غیر افریقی سلطنت میں انضمام کی وجہ سے شمال جنوب کا تجارتی راستہ دریائے نیل سے بحر احمر کی طرف منتقل ہوگیا۔ عیسائی دور کی ابتدائی صدیوں میں افریقہ کی داخلی تجارت کے مرکز کی حیثیت سے میرو کی اہمیت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ اکسم کی سامی سلطنت نے لے لی۔ ۳۵۰ء کے لگ بھگ میرو تاخت و تاراج ہوگیا اور اکسم نے کش خاندان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

شمالی افریقہ میں واقع فنیشیائی، یونانی، رومی، اور یہودی نوآبادیوں کے تہذیبی اثرات صحرا میں سوڈان کی طرف بالواسطہ پڑے۔ ان اثرات کا سب سے بڑا ذریعہ ساحلی علاقہ سے ملحقہ میدانوں میں بسے ہوئے لیبیائی بربر قبیلوں کی سرگرمیاں تھیں۔ ان میں سے بعض قبائل (مثلاً گرامنٹس، جن کا ذکر ہیرودوط (Herodotus) نے کیا ہے) گھوڑا گاڑیوں میں صحرا کو عبور کر کے سونے کی مٹی، شتر مرغ کے پر اور غلام ساحلی شہروں میں فروخت کرنے کی غرض سے لایا کرتے تھے۔ ریگستان کی حجری دور سے پہلے کی تصاویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ماورا صحرا دو اہم راستے تھے جو دریائے نائجر اور سینگال کے سلسلے تک پہنچتے تھے۔ یہ علاقہ جسے عربوں نے ونگارا کا نام دیا تھا، دریائی مٹی سے برآمد ہونے والے سونے کے لیے مشہور تھا۔

سلطنت گھانا پانچویں صدی عیسوی کے قریب وانگارا کے شمالی ریگستان سے متصل علاقہ میں سامی خصوصیات کے حامل لیبیائی بربر مہاجرین نے اس علاقہ کے منڈنگو (Mandingo) بولنے والے حبش قبائل پر غلبہ پانے کے بعد سلطنت گھانا کی بنیاد ڈالی لیکن گھانا کے بعد کے حکمران بلاشبہ حبش ہی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ گھانا کی حکومت نے بیرونی عناصر کو سینیگل کے نچلے حصہ یعنی تکرور اور نوتا کے علاقہ کی طرف ڈھکیل دیا۔ مقامی باشندوں سے ان کی باہمی شادی بیاہ کے نتیجہ میں بالآخر فلانی قوم پیدا ہوئی جس کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ یہی قوم بعد میں پھیل کر جانب مشرق، سوڈان اور کیمرون تک پہنچ گئی اور اس نے باوجود

اختلاط کے مقامی زراعت پیشہ حبشیوں سے اپنے آپ کو ایک طرح الگ ہی رکھا۔

ساتویں صدی میں مغرب میں عربوں کے آنے تک گھانا سونا اگلنے والی سرزمین کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس کی دولت اور عظمت کی شہرت اس قدر سونے کی کانوں کی بدولت نہیں تھی جتنی اس وجہ سے کہ وہ مغربی سوڈان کی پیداوار کی نکاسی کا، جن میں سونے کی اہمیت سب سے زیادہ تھی، بہت بڑا مرکز تھا۔ شمالی افریقہ کی اشیا اور صحرا کا نمک یہیں پر اکٹھا کیا جاتا اور یہیں سے ان قبیلوں کے ذریعہ، جن کا ان ریگستانی راستوں پر قبضہ تھا، گھانا کے بازاروں میں پہنچایا جاتا۔

مسلمانوں کے اثرات

اس طرح صحرا پار کے علاقوں سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے ان کی نوعیت میں اونٹ کے استعمال اور عربوں اور مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اونٹ مغرب میں رومن دور کے خاتمہ سے پہلے روشناس ہوا۔ اور اس کی وجہ سے سارا ریگستان بربر خانہ بدوشوں کی دسترس میں آگیا۔ ان کی نقل و حرکت میں تیزی آگئی اور نخلستانوں پر ان کا انحصار کم ہو گیا۔ خود سوڈان میں حبشیوں کے زرعی علاقے کی سرحدیں جنوب کی طرف پسپا ہو گئیں۔ یہ تبدیلی کچھ تو حملوں کی وجہ سے واقع ہوئی اور کچھ خانہ بدوش قبیلوں کے تخریبی رجحانات کی بنا پر۔ اس کے علاوہ بھیڑوں اور اونٹوں کی پُرخوری نے بھی شاداب علاقہ کو بنجر بنا دیا۔

وسطی افریقہ

بعض غیر اہم گروہوں کو چھوڑ کر، جن میں کانگو کے جنگلات کے بونے شامل ہیں، وسطی افریقہ کے تمام باشندے حبشی ہی ہیں۔ یہ بنٹو زبانیں بولتے ہیں بنٹو قبیلے جس تیز رفتاری سے اس قدر وسیع علاقہ پر چھا گئے اس میں ان کی آہنی دور کی بھی جانکاری کے علاوہ شاید اس بات کو بھی دخل ہو کہ انہوں نے مشرقی ہند میں پیدا ہونے والی غذائی فصلوں کی کاشت میں مہارت حاصل کر لی اور انہیں ترقی دی۔ جیسے کیلا، رتالو، کوکو اور نیشکر وغیرہ جن کی کاشت کے لیے خط استوا نے افریقہ کی آب و ہوا نہایت موزوں ثابت ہوئی۔ افریقہ میں ان فصلوں کو رائج کرنے میں شاید مشرقی ہند کے ان لوگوں کا حصہ ہو جو مدغاسکر میں بس گئے تھے۔ لسانی اور تہذیبی وجوہات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ غالباً پانچویں اور آٹھویں صدی کے درمیان یہاں آئے ہوں گے۔

مشرقی افریقہ

افریقہ کے مشرقی ساحل کا سب سے پہلا تحریری حوالہ ہمیں پیری پلس (Periplus) نامی تصنیف میں ملتا ہے جو پہلی صدی عیسوی میں قلم بند ہوئی۔ اس کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی افریقہ کے ساحل اور جنوبی عرب کے مابین باقاعدہ تجارت ہوا کرتی تھی لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ تاجر جنوب میں کہاں تک پہنچ پائے بطلیموس (Ptolemy) (دوسری صدی عیسوی) جیسے جغرافیہ داں کے تذکرہ سے اس بیان کی تصدیق تو ہوتی ہے لیکن تفصیلات نہیں ملتیں۔

رومن سلطنت کا افریقی صوبہ

۱۲۳ ق م یا ۱۲۲ ق م میں گائس سمپرونیس گراچس (Gaius — Sampronius Gracchus) نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے قرطاجنہ کے مقام پر جنونیہ (Jinonia) نام کی ایک نوآبادی قائم کی گئی۔ اس وقت تک رومیوں کو اس علاقہ سے برائے نام ہی دلچسپی تھی گراچیس کے قتل کی وجہ سے اس منصوبہ پر پوری طرح عمل تو نہ ہو سکا تاہم چھ ہزار نوآبادکاروں میں سے اکثر بلا کسی مزاحمت کے زمینوں پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد رومن کاشت کاروں نے اس علاقہ میں دلچسپی لینی شروع کی اور ۱۱۱ ق م میں ایک قانون کے ذریعہ مالگزاری اور کاشت کاری کے مختلف طریقوں میں باقاعدگی پیدا کی۔ ۱۰۰ ق م میں گائس ماریس کے جنگ آزمودہ سپاہیوں کو بجرداس (مدجردہ) وادی میں اراضیات تقسیم کی گئیں اور اس صوبے کی حدود میں جانب مغرب تقریباً موجودہ الجیریائی تیونس سرحد تک نوآبادکاری کا عمل پھیل گیا۔ اس کے بعد کے پچاس سالوں میں مزید نوآبادکاروں کو بسایا گیا لیکن غیر یقینی سیاسی حالات کی وجہ سے اراضیات اکثر بڑے زمینداروں ہی کے قبضہ میں رہیں۔

پہلی صدی ق م اس صوبہ کی تاریخ میں نقطۂ انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے اس صدی میں وہاں پہلے جولیس سیزر اور پھر شہنشاہ آگسٹس نے رومن شہریوں کی جن میں پرانے سپاہی اور شہری تارکان وطن دونوں شامل تھے، کوئی انیس نوآبادیاں بسائیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم خود قرطاجنہ کی نوآبادی تھی جس نے اس تیزی سے ترقی کی کہ اسے رومن سلطنت کے مغربی حصہ میں دوسرا مقام حاصل ہو گیا۔ کئی مقامی قومیتوں کو جو قرطاجنی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ترقی کر چکی تھیں خود اختیاری عطا کی گئی۔ آگسٹس نے اس صوبہ کو جنوب میں صحرا تک وسعت دی اور خانہ بدوشوں کی تخریبی سرگرمیوں کا خاتمہ کر کے ایسے حالات پیدا کئے کہ یہ علاقہ چار صدیوں تک مرفع الحال رہا۔ مشرق میں ارسے فلانورم (Arae Philaenorm) تک کا علاقہ (جو کہ خلیج سدرا کے انتہائی جنوب میں واقع ہے اور جہاں سے سرینیکہ کی مغربی سرحد شروع ہوتی ہے) رومن صوبہ میں شامل کر لیا گیا۔

مغرب میں جنگ تھاپسس (۴۶ ق م) کے بعد سیزر نے جوبا اول کی قدیم نمودی سلطنت کے علاقہ میں ایک نیا صوبہ قائم کیا جو افریقہ نووا کہلانے لگا۔ ۳۳ ق م میں بوکس (Bocchus) کی موت کے بعد رومیوں نے ماریطانیہ کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اور آگسٹس نے بالآخر افریقہ ویٹس (Africa — Vetus) کے قدیم صوبہ کو افریقہ نووا میں ضم کر دیا۔ اس کے بعد مغربی سرحد دریائے امساگا (رومل) تک جو اب الجیریا کے شمال مشرقی حصہ میں واقع ہے اور جنوب مغرب میں چھوٹ ال ہڈنا نامی جھیل تک وسیع ہو گئی آگسٹس نے جب سلطنت کی صوبائی حکومتوں کے اختیارات منقسم کیے تو افریقہ کا انتظام سینات کے زیر نگرانی دے دیا اور پروکونسلر کے مرتبہ کے آدمی کو وہاں کا گورنر مقرر کیا اور ایک فوجی دستہ (Legion) متعین کر دیا۔ لیکن بعد میں کیلی گولا (Cal igula) نے یہ انتظام بدل دیا اور فوج کے سپہ سالار لیگاٹس (Legatus) کو شہنشاہ کے احکام کے تابع فوجی علاقہ کا پورا انتظام تفویض کر دیا۔ یہ فوجی علاقہ زیادہ تر قدیم نمودی سلطنت ہی پر مشتمل تھا بہ الفاظ دیگر نمودیہ کا ایک نیا صوبہ وجود میں آیا۔ تاہم اس کی باقاعدہ تشکیل سپٹی مس سیورس (Septimius Serverus) کے دور حکومت (۱۹۳ء - ۲۱۱ء) میں ہوئی۔

پہلی صدی عیسوی کو افریقہ کی تاریخ میں تیز رفتار ترقی اور خوش حالی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ وسیع پیمانہ پر خانگی جائدادوں میں اضافہ کی وجہ سے نیرو کی ہوس ملکیت بھی بھڑک اٹھی۔ اس نے کئی ایک دولت مند زمینداروں کو قتل کروا کر ان کی اراضیات پر قبضہ کر لیا۔ شمالی افریقہ میں ایک وسیع شاہی علاقہ کی بنیاد یہی ہے۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے سب سے اہم پیداوار دالیں تھیں۔ بعد میں

زیتون کی پیداوار بھی کافی منافع بخش ثابت ہوئی۔ ان اشیاء کے علاوہ میووں اور جانوروں کی کھالیں بڑی مقدار میں برآمد کی جاتی تھیں نیرو کے دور حکومت (۹۶-۹۸ء) سے لے کر الیگزنڈر سیوراس (۲۲۲-۲۳۵ء) تک کا دور غالباً اس علاقہ کا سب سے پرامن اور خوش حال دور رہا ہے۔ شہری زندگی کی بیشتر سہولتیں متعدد شہروں کو حاصل تھیں، جابجا شاندار مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔ لاتعداد عمارت عالیہ موجود تھیں جن کے آثار تونس، قرطاجنہ، تھیس ڈرس، (الجم) یوٹیکا، تھمبر یو مانس (ہنچیر قصبہ) تھگا (دوغا) مکترس (مکتار) اور سوفیتلا (سبیطلا) میں اب تک موجود ہیں لیبیائی آبادی کے ایک متعدبہ حصے نے رومن طرز معاشرت اختیار کر لیا۔ ۲۱۲ء میں ساری سلطنت کے باشندوں کو رومی شہریت عطا ہونے سے قبل یہاں کی کئی قومیتوں کو یہ حقوق حاصل ہو چکے تھے۔ افریقہ کے مختلف علاقوں کے لوگ جوق در جوق رومن نظم و نسق میں شامل ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ دوسری صدی عیسوی کے اختتام پر ایک سیپٹی مس سیوی رس نامی ایک افریقی کو شہنشاہ بننے کا آغاز حاصل ہو گیا تاہم دیہی علاقے کے لیبیائی باشندوں پر رومن تہذیب کے اثرات زیادہ نہیں پڑے۔

تیسری صدی عیسوی کے آخری زمانہ میں سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح افریقہ کا بھی زوال شروع ہوا۔ اگرچہ حملوں اور جنگوں سے اسے زیادہ نقصان نہیں پڑا جب ڈیوکلیشین (Dio cletian) نے سلطنت کی دوبارہ تنظیم کی تو پرانے صوبہ کے جنوبی اور مشرقی حصوں کو توڑ کر دو نئے صوبے بائی زاسینا (Byzacina) اور ٹری پولی ٹانیہ تشکیل دئے گئے چوتھی صدی عیسوی کے اہم واقعات کا تعلق عیسائی کلیسا سے ہے عیسائیت جس کا آغاز افریقہ میں پہلی صدی ہی میں ہو چکا تھا اب تیزی سے پھیلنے لگی یہاں تک کہ ۲۵۰ء میں افریقہ میں پادریوں کی تعداد ایک سو سے زائد ہو چکی تھی جن میں ٹرٹولین (Tertullian) اور سائپرین (Cyprian) جیسی عظیم المرتبت ہستیاں بھی شامل تھیں۔ مذہبی جنون کا شکار ہونے والوں میں افریقی چرچ کے کئی لوگ شامل تھے۔ ایذا رسانی کا یہ سلسلہ ڈیوکلیشین کے دور حکومت میں ۳۰۳-۳۰۵ء تک جاری رہا۔ ۳۱۲ء کے بعد ڈوناتی (Donatist) نامی اختلافی تحریک کی وجہ سے اس کی شدت گھٹ گئی۔ اس تنازعہ میں افریقی پادریوں کے علاوہ غیر عیسائیوں نے بھی کیتھولک مذہب کی تائید کی جس کا سب سے بڑا علم بردار ہپو ریگیس (Hippo regius) کا بشپ آگسٹائین تھا۔ بالآخر شاہی مداخلت کی وجہ سے ۴۱۱ء میں بمقام کارتھیج ایک مجلس طلب کی گئی جس میں ڈوناٹزم (Donatism) کی مذمت کی گئی اور اس کے حامیوں کو سخت ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑا۔

چوتھی صدی عیسوی میں افریقہ کی حالت رومن سلطنت کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں بہتر تھی، معاشی آسودگی اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ تاہم زوال کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ صدی کے آخری حصہ میں شہری زندگی کی رونق میں کمی آگئی تھی۔ دولت سمٹ کر چند مالداروں کے ہاتھوں میں آگئی اور کسانوں کی مفلسی بڑھتی چلی گئی۔ اور ان پر زیادتیاں ہوتی گئیں۔ اس کے علاوہ لوگ عسکری روایات سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ اس لیے حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۴۲۹ء میں ونڈلیو کے جہانی قبیلہ نے گیسیرک (Gaiseric) کی سرکردگی میں اسپین پار کر کے مراکش پر حملہ بول دیا اور ۴۳۹ء میں افریقہ کے صوبہ میں نمودار ہوئے۔ عارضی صلح (۴۳۵-۴۳۹ء) کے مختصر وقفہ کے بعد قرطاجنہ پر ان کا قبضہ ہو گیا جسے ونڈلیوں نے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ہر چند کہ ونڈلیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی تاہم ان کی آمد کے بعد رومن تہذیب کے اثرات بڑی تیزی سے مٹتے گئے۔ گو بعد میں وہ زمانہ بھی آیا جب رومن شہنشاہ جسٹی نین اول (Justinian) کے ایک سپہ سالار بیلی سیرس (Belisarius) نے ۵۳۳ء میں ونڈلیوں کا خاتمہ کر کے شاہی اقتدار بحال کیا تاہم ونڈلیوں نے جو نقصان پہنچایا تھا اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اس لیے جب ۶۹۷ء میں عرب حملہ آوروں نے کارتھیج پر قبضہ کیا تو افریقہ اس حملہ کی قطعی مزاحمت نہ کر سکا۔

مشرق قریب کا قدیم دور

جب ایلام کے کاسیلی (Kassites) حملہ آوروں نے دھاوا بولا تو بابل کی ریاست اس کی تاب نہ لا سکی اور ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد پانچ صدیوں تک بابل پر انہی کا قبضہ رہا ان حملہ آوروں نے اپنے مفتوحین کی (سامی) زبان اور تہذیب اختیار کر لی۔ بابل پر سب سے پہلے ۱۹۰۶ ق م میں ہیٹیوں (Hittites) نے حملہ کر کے ایک وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی جس میں چودھویں صدی ق م میں شامل شام کے علاوہ ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ بھی شامل تھا ان کی راجدھانی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں بشمول سمیری و اکادی چھ زبانیں شامل ہیں۔ بعد میں اشوریوں نے جو معلوم ہوتا ہے اہل بابل ہی کی ایک شاخ تھے، اور تقریباً انہیں کی زبان بولتے تھے۔ اپنا تسلط جمانا شروع کیا حتیٰ کہ نویں صدی ق م میں وہ سب سے بڑی طاقت بن گئے۔ بتدریج ان کی سلطنت کو بھی زوال آیا اور بالآخر ساتویں صدی ق م میں میڈ و ایرانی قوت کے آگے انہیں سپر انداز ہونا پڑا۔ خود بابل پر ۵۳۹ ق م فاتح سائرس (کورش) نے قبضہ کیا لیکن اس کی وجہ سے یہاں کے کلچر اور مذہب میں کوئی فرق نہیں آیا اور ایرانیوں کی فتح کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک اشوری مذہب اور ثقافت کے اثرات باقی رہے۔

مصر میں تہذیبی تسلسل میسوپوٹامیہ (الجزیرہ) سے بھی زیادہ دیر پا ٹھہرا۔ اور وہاں ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جیسی میسوپوٹامیہ میں اکادیوں کے ہاتھوں سمیریوں کے نکالے جانے سے ہوئی تھی میسوپوٹامیہ کے برخلاف جہاں متعدد خود مختار شہری ریاستیں تھیں، مصر میں وادی نیل کا سارا بالائی علاقہ ایک ہی شاہی خاندان کے زیر حکومت تھا جو تقریباً ۳۱۰۰ ق م میں برسر اقتدار آیا۔ پورا نظم و نسق اور سماج کی ساری سرگرمیاں انتہائی مرکزی نوعیت کی تھیں اور یہ باور کیا جاتا تھا کہ فرعون کی شخصیت میں خود خدا کی ذات مجسم ہو گئی ہے اور اس طرح فرعون کی حکومت میں عوام کی زندگی گویا خدا ہی کی تحویل میں تھی۔ یہ نظام ایک قلیل وقفہ کے سوا کئی صدیوں تک جاری رہا بعض اوقات تو مصری اثرات کا دائرہ بالائی فرات تک پھیل گیا۔ ۱۲۰۰ ق م تک قدیم مشرق قریب کے دو اہم دور گزر رہے ہیں یعنی میسوپوٹامیہ اور مصر میں تاریخ کی پہلی عظیم المرتبت تہذیب کا وجود میں آنا اور پھر بتدریج گرد و نواح میں اس تہذیب کا پھیلنا۔ ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ ایشیائے کوچک اور بحر روم کے مشرقی علاقہ (لیوانت) میں حملوں کی ایک نئی لہر شروع ہوئی جس نے ہٹی (Hittites) سلطنت کو نیست و نابود کر دیا اور مصر کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد مشرق قریب کی تخلیقی صلاحیتیں ماند

پڑ گئیں۔ علم وفن میں جو اکتسابات اور امتیازات اس نے حاصل کیے تھے۔ انہیں بعد تک محفوظ رکھنا ہی بڑی بات تھی۔ اس کے بعد اقتدار کے مراکز مصر اور میسوپوٹامیہ کے مغرب اور مشرق کی جانب ہٹ گئے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ایرانی طاقت نے چھٹی صدی ق م میں اشوریائی سلطنت کا خاتمہ کرکے ۵۳۹ ق م میں بابل کی تسخیر کے بعد اکامینی (Acbamenio) اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ ایرانی جن کا تذکرہ اکثر اہل میڈو (Medas) کے ساتھ کیا جاتا ہے غالباً آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے کیوں کہ ان کے اور ہندوستان کے ابتدائی ہندوؤں کی زبان اور مذہب میں غیر معمولی مماثلت پائی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں قوموں کا مبدا وسط ایشیا کا علاقہ رہا ہے اور وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکامینی سلطنت اپنے زمانہ عروج میں مشرق میں دریائے جیحون سے لے کر سندھ تک مغرب میں تھراس (Thrace) تک اور جنوب میں مصر تک پھیلی ہوئی تھی لیکن دو سو سال کے بعد یونان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ ایران کے شہنشاہ دارا اور زرکسیس (Xerxes) اپنے حملوں سے جزیرہ نمائے ایران کو زیر نہ کر سکے۔ اور انہیں پسپا ہونا پڑا۔ سکندر اعظم نے ۳۳۱ ق م میں دارا سوم کو شکست دے دی۔ سکندر کے پاس اس کی مشرقی سلطنت کے بڑے حصہ پر اس کے جانشین حکمراں یعنی سلوسیوں (Seleucids) کا قبضہ رہا۔ ان کے دور حکومت میں یونان کے تہذیبی اثرات تیزی کے ساتھ مشرق میں پھیل گئے۔ تقریباً اسی زمانہ میں [illegible] ق م) ارساسیریوں (Arsacid) کے تحت خراسان میں پارتھیائی سلطنت وجود میں آئی۔ پارتھیائیوں کا تعلق غالباً کسی تورانی قبیلہ سے تھا جس نے ایرانی طرز معاشرت اختیار کر لی۔ ان کی سلطنت کے حدود ہندوستان سے لے کر شام تک پھیل گئے پارتھیائی رومیوں کی قوت کا تو مقابلہ کر سکے لیکن ایران کے ساسانی خاندان کے آگے انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ ساسانیوں نے تقریباً چار سو سال حکومت کی انہوں نے زرتشتی عقیدہ کو ریاست کا مذہب قرار دیا۔ مشرقی رومن سلطنت سے ان کی برابر کی ٹکر ایک عرصہ تک جاری رہی۔ تاہم ساتویں صدی عیسوی میں یہ دونوں بڑی سلطنتیں مسلمانوں کے پہلے ہی حملہ کی تاب نہ لا سکیں اور ایران اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

ہندوستان

برصغیر ہند ہمالیائی پہاڑی سلسلہ کی وجہ سے ایشیا کے بیشتر حصہ سے یک گونہ الگ ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ علاقہ کبھی گوشۂ گمنامی میں نہیں رہا۔ تاہم اس علاحدگی کی بنا پر برصغیر ہند میں تین ہزار سال کے دوران ایک ایسی تہذیب کو نشو ونما ملی جو کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے دریائے سندھ کے بالائی حصہ میں ایک شہری تہذیب کے آثار ڈھونڈ نکالے ہیں جو تین ہزار سال قبل نقطۂ عروج پر تھی اور جن میں سمیری تہذیب سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ تاہم اس تہذیب کے جو کتبات دستیاب ہوئے ہیں وہ ابھی تک چیستاں بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کی تاریخ ہنوز تاریکی میں ہے۔

ہندو تہذیب تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں آریائی اور ماقبل آریائی تہذیبوں کے میل جول سے وجود میں آئی۔ سنہ ۱۶۰۰ اور [illegible] ۱۵۰۰ ق م میں خانہ بدوش آریائی ہندوستان کے شمال مغرب میں داخل ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ جانب مشرق دریائے گنگا کے میدان اور ہمالیہ کی ترائی میں پھیلتے رہے۔ یہ علاقے آریاؤں کے آنے سے پہلے آباد تھے۔ آریا جب یہاں آکر بسے تو دونوں تہذیبیں آپس میں گھل مل گئیں۔ سماج میں پجاریوں کا ایک موروثی طبقہ یعنی برہمن مسلط ہو گیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے ادوار کم ہی گزرے ہیں جب پورا ملک ہندوستان ایک حکمراں کے زیر نگیں رہا ہو اس کی مثالیں صرف چار ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں موریائی حکمراں اشوک کا دور، تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں سلاطین دلی کا دور، سترہویں صدی میں مغل سلطنت کا دور اور پھر انیسویں صدی میں برطانوی حکومت کا دور۔

پہلے ہزار سالہ دور کے دوسرے حصے میں شمالی علاقوں کے ہند آریائی تہذیب کے اثرات جنوبی ہند تک پہنچ گئے۔ اور جنوب کے ڈراویڈی باشندوں نے (تامل کرناٹکی وغیرہ) شمال کی طرح ہندومت اور ذات پات کے نظام کو قبول کر لیا۔ ذات پات کی تقسیم کچھ تو نسل پر مبنی تھی اور کچھ پیشہ پر، ہندو مذہب دنیا کے ان قدیم ترین مذاہب میں ہے جو اب تک زندہ ہیں۔ ذہنی اور تہذیبی میدان میں ہندوستان کے کارنامے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس کے مذہبی اور فلسفیانہ نظام اور سنسکرت ادب کا شمار ذہن انسانی کی بہترین پیداوار میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چوتھی صدی قم سے دو طرح کے رسم الخط نے رواج پایا۔ شمال مغرب کا قروسطی (Kbarostbi) رسم خط اور اس سے بھی اہم براہمی رسم خط، موخر الذکر سے نہ صرف ہندوستان کے مقامی رسم الخطوں نے ترقی پائی بلکہ وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کے رسم الخط کی بھی نشو ونما ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے لیے مایۂ امتیاز اس کی گرامر، علم قانون، فن تعمیر، مجسمہ سازی، مصوری، موسیقی، آہن گری، مینا کاری، مرصع سازی، ہاتھی دانت اور لکڑی کی نقش سازی جیسی دست کاریاں تھیں، نو ہندسوں اور صفر کا حسابی طریق بھی ہندوستان ہی کی ایجاد ہے۔ ہندوستانی علوم وفنون کا اس کے مذاہب وفلسفہ سے گہرا تعلق رہا ہے۔

ہندوستان کے یہ کارنامے زیادہ تر برہمنیت ہی کے رہین منت رہے ہیں۔ تاہم چھٹی اور پانچویں صدی ق م میں برہمنیت کے خلاف مختلف آوازیں بلند ہوئیں جن میں سب سے اہم گوتم بدھ کی آواز تھی جس نے دنیا کے ایک عظیم مذہب بدھ مت کی شکل اختیار کی۔ کئی صدیوں تک ہندومت کا ذہنی ارتقا ہندومت اور بدھ مت کے باہمی ردعمل پر ہی منحصر رہا۔ لیکن بالآخر بدھ مت یا تو ہندو مذہب میں ضم ہو گیا یا پھر ہندوستان سے بے دخل کر دیا گیا۔ ہندوستان کے باہر بدھ مت کا استقبال ہوا اور وہ ایک وسیع علاقے میں پھیل گیا۔ سری لنکا نے یہ مذہب قبول کر لیا۔ شمال مغرب میں یہ سرحد عبور کرکے افغانستان میں داخل ہوا اور تجارتی راستوں کے ذریعہ ترکستان سے ہوتا ہوا چین پہنچا۔ یہ جہاں بھی گیا وہاں اس نے ادب مجسمہ سازی اور مصوری کے میدان میں ہندوستانی تہذیب کے گہرے نقوش چھوڑے پھر اس کی کوریا اور جاپان تک رسائی ہوئی جہاں اس نے بتدریج اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں تبت نے بدھ مت اختیار کر لیا وہ لامائیت کی شکل میں اب بھی بدھ مت کا ایک طاقتور گڑھ ہے۔ ابتدائی مسیحی صدیوں میں بدھ مت بحری راستوں کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا میں داخل ہوا جس کی وجہ سے وہاں ملی جلی تہذیبوں کو فروغ ہوا جن میں ہندوستانی اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ جنوب مشرق میں شمال کے برخلاف ہندومت نے بھی بدھ مت کی طرح رسائی حاصل کی اور برما، تھائی لینڈ، ملایا، انڈونیشیا اور ہند چین میں ہندوستانی اثرات کے تحت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں اور تاجروں، عالموں اور مسافروں کی آمد ورفت کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستانی طرز کی بعض عظیم الشان تعمیری تخلیقات جو اب تک موجود ہیں۔ مثلاً جاوا کی بوروبدور (Borobudur) اور لارا دجانگ رنگ (Loadjonggrang)

یا کمبوڈیا کی انگ کور واٹ (Anghorwat) جنوب مشرقی ایشیا میں وجود میں آئیں۔ ہند چینی کی چار ریاست میں ہندوستانی تہذیب کے اثرات سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں جبکہ یہاں اس کا سابقہ ملحقہ نام کی چینی تہذیب سے ہوا۔

عیسوی دور کے اوائل میں ہندوستان ایک طرف رومن سلطنت دوسری طرف مشرقی ایشیا سے تجارت کرتا تھا۔ یہ تجارت جنوبی ہند کے راستے مدتوں ہوتی رہی تاہم یورپ نے اٹھارہویں صدی کے آخر تک ہندوستان سے بہت کم اثر لیا۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ ہند)

جنوب مشرقی ایشیا

اس وسیع علاقے کے باشندوں کا تعلق کئی نسلوں سے ہے۔ یہاں کے وہ سب سے پہلے باشندے جن کے دور کا تعین کیا جا سکتا ہے مان کھمر (Mon-khomor) زبانیں بولتے تھے جو اب بھی پیگو اور کمبوڈیا میں رائج ہیں۔ عیسوی دور کے اوائل میں کمبوڈیا اور چمپا میں جو ریاستیں واقع تھیں انہوں نے ہندوستان سے بہت اثر لیا تھا۔ اہل برما جو لسانی اعتبار سے تبتیوں سے زیادہ قریب ہیں، برما میں شمال مغرب سے داخل ہوئے۔ سولہویں صدی عیسوی میں برما کو ایک متحدہ سلطنت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

چین، جاپان اور مشرقی ایشیا

ابتدائی چینی تمدن کو دریائے زرد کے میدان میں فروغ حاصل ہوا۔ یہ میدان جانب جنوب دریائے یانگسی تک اور جانب مغرب و شمال شنسی اور شانسی صوبوں میں وی اور فن وادیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ چو خاندان ۱۰۵۰۔ ۲۴۹ ق م کے دور میں جو کہ چینی تہذیب کے نشو نما کا سب سے بڑا دور ہے درمیانی علاقوں کو بھی جن کی آبادی کا معیار تہذیب کمتر تھا فتح کر کے چینی تہذیب میں ضم کر لیا گیا۔

ہان (۲۰۶ ق م ۔ ۲۲۰ ء) کے زمانے تک بھی چینی تہذیب کا مرکز شمال ہی میں تھا لیکن سونگ دور (۹۶۰ ۔ ۱۲۷۹ء) میں وادی یانگسی کی اہمیت شمال کے مقابلے میں بہت بڑھ گئی اور اس کی آبادی میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا۔ شمال میں چینی اقتدار کی توسیع خوش خرامانہ ہوئی۔ اور وہ چو خاندان کے زمانے میں شمالی میدان تک آکر رک گئی۔ یہاں کے خانہ بدوش چین کے طریقۂ زراعت یعنی ایک جگہ آباد ہو کر مستقل طریقہ کاشت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ زراعت اور زندگی کے مختلف طریقوں نے تہذیب یافتہ چینیوں اور خانہ بدوشوں کے درمیان ایک تنازع کھڑا کر دیا۔ چینیوں نے مدافعت کی غرض سے متعدد دیواریں تعمیر کیں۔ جنہوں نے بالآخر دیوار چین کی شکل اختیار کر لی بعدازاں شمالی اور جنوبی، دونوں علاقوں نے چینی تہذیب کو قبول کر لیا۔ لیکن اس کے برخلاف جاپان جو چوتھی صدی عیسوی تک ایک متحدہ قوت بن چکا تھا کبھی بھی چین کے زیر اقتدار نہیں رہا۔ تاہم کوریا کے ذریعہ بعد میں چینی تہذیب کے اثرات جاپان پر پڑنے لگے اور اس نے بڑی مستعدی اور کامیابی سے ان اثرات کو اپنی زندگی میں جذب کر لیا۔

تاریخ کے ابتدائی دور میں چین پر موروثی حکمراں طبقہ غالب رہا لیکن اس کے مذہب کے آسمانی عقائد اور خاندان و برادری کے تصورات سے عوام کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ چین کے حکمراں طبقہ کو چین کی تحریری زبان اور روایات کا محافظ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف چین کے علما نے سیاسی انتشار کے زمانے میں اخلاقیات اور سیاسی نظریات کے ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالی جو آنے والی نسلوں تک مشہور فلسفی کنفوشیس کے نظام فکر کے بطور پہنچا۔ اسی مفکر نے حکمرانی کا ایک معقولیت پسند اخلاقی تصور پیش کیا۔ اور اس پر زور دیا کہ حکمراں "فرزند خداوندی" و نائب الٰہی ہونے کے باوجود مافوق البشر نہیں ہوتا اور اس کے طرز عمل کی، اس کے مرتبے سے مطابقت نہ رہے تو اسے ہٹایا جا سکتا ہے۔ کنفوشیس جیسے مفکرین نے علم کی فوقیت اور عالم حکمراں کا تصور پیش کیا جو بعد میں چل کر چین کی شاہی حکومت کے سارے عمال نظم و نسق کا مسلّمہ اصول قرار پایا۔

تاہم علم سے نظم و نسق، اور دفتری کاروبار کو سنوارنے کا خواب کئی صدیوں کے بعد ہی شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ چنانچہ امتحانات ذریعہ حکومت کے انتخابات کا طریقہ تانگ دور حکومت (۶۱۸ ۔ ۹۰۶ء) ہی میں پوری طرح رائج ہو سکا۔ نظم و نسق کا یہ قابل قدر طریق چینی شہنشاہیت کی بقا اور تسلسل میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے چین کے سیاسی اتحاد کو، جو چینی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ ہر دور میں تقویت حاصل ہوتی رہی۔ چہ آن خاندان (۲۲۱ ۔ ۲۰۷ ق م) نے حقیقی اتحاد کی جو شمع روشن کی تھی وہ دو ہزار سال سے برابر روشن ہے اور اس کی ضیا پاشی سے مسلسل بیس شاہی خاندان مستفید ہوتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی کی سلطنت چہ آن دور حکمرانی سے مختلف ہے تاہم اس دوران کوئی ایسا سیاسی انقلاب واقع نہیں ہوا جو اس کے نمایاں خدوخال کو بدل دیتا۔ بغاوتیں ہوتی رہیں، صوبے بدلتے رہے، حکمراں آئے اور گئے لیکن چین کا سیاسی نظام بدستور قائم رہا۔

چین کے علما کا اثر اخلاقی اور سیاسی نظام کے علاوہ فنون لطیفہ پر بھی پڑا ہے۔ یہ چیز چینی مصوری میں خاص طور سے نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چینی تہذیب نے بیرونی اثرات بھی جذب کیے۔ عیسائی دور کے ابتدائی زمانہ میں ہندوستانی اور ایرانی تصورات بلا روک ٹوک چین پہنچے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بدھ مت کے تصورات ہیں جن سے چین کا اعلیٰ طبقہ اتنا ہی متاثر ہوا جتنا کہ کنفوشیس کے فلسفہ سے اور بعد میں اس کے اثرات تاؤ مذہب میں بھی جاگزیں ہو گئے اور تاؤ مذہب کی تنظیم میں ایک نمونہ کا کام دیا۔ بدھ مت نے چین کے تمام فنون لطیفہ کو بھی متاثر کیا۔

چینی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی جدت طرازی ہے چنانچہ کئی اور چیزوں کے علاوہ کاغذ، طباعت، بارود، قطب نما، چپو را کا کھمبا (Stern - Post Rudder) اور پہیہ دار گاڑی اس کی ایجادات ہیں چینی ریشم، چینی مٹی کے برتن یشب (Jade) کانسی کی اشیا، زمانہ قدیم ہی سے ایشیا اور یورپ کے بازاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں پہلے ہان خاندان (۲۰۶ ق م ۔ ۸ء) کی سلطنت کی وسط ایشیا تک توسیع کی وجہ سے ترکستان کے راستے کاروانوں کا ایک اہم راستہ کھل گیا تھا جو کئی صدیوں تک رومن سلطنت سے تعلقات کا سب سے بڑا وسیلہ رہا۔ خانہ بدوشوں سے چین کے تعلقات، سارے وسط ایشیا میں لوگوں کی نقل و حرکت پر اثر انداز ہوتے رہے اور اس کی صدائے بازگشت مشرق قریب، یورپ، شمالی ہند اور ایران تک گونجتی رہی۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں ہندوستان اور مغرب سے ایک جنوبی بحری راستہ کھل گیا جو ملایا سے ہو کر چین کے جنوب تک پہنچتا تھا۔ ان بحری اور خشکی راستوں سے تجارتی درآمد اور مسافروں کی آمد و رفت آزادانہ طور پر ہونے

لگے۔ مشرق قریب میں اسلام کے عروج کی وجہ سے بحری تجارت کو بہت زیادہ فروغ ہوا اور عرب جہاز کینٹن اور چینی کشتیاں خلیج فارس تک پہنچنے لگیں۔ جاپان، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ابتدا ہی سے چین سے تہذیبی اثرات قبول کرنے لگا تھا۔ ۶۴۵ء میں چینی طرزِ حکومت کو رائج کرنے کی ایک مکمل اور بالارادہ کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود نظم و نسق پر بڑے بڑے جنگ باز زمینداروں ہی کا قبضہ رہا جو حصولِ اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہا کرتے تھے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ چین و تاریخ جاپان)۔

تاریخ افریقہ

افریقہ کے نام کے ساتھ یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ وہ ایک تاریک براعظم ہے حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ دراصل یورپی اقوام نے اپنے مخصوص اغراض کے لیے افریقہ کو "تاریک براعظم" کا نام دیا تھا۔ سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک دنیا کے بڑے حصے پر یورپی باشندوں کے خیالات اور فنی کمالات اثر انداز ہوتے رہے لیکن افریقہ میں یہ اثرات سب سے آخر میں پہنچے۔ تاہم یہ بات درست نہیں ہے کہ افریقہ جدید دور کے آغاز میں دنیا کا سب سے زیادہ پس ماندہ براعظم تھا۔ اسی دور میں دنیا میں کئی علاقے ابھی 'عہد حجری کے وسطی دور' ہی میں تھے اور وہاں کے باشندے شکار اور جنگل سے اپنی غذا حاصل کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اس دور کے افریقی باشندے، چند قبیلوں کو چھوڑ کر، لوہے کے اوزاروں سے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جنوبی براعظم کے دو تہائی حصہ میں طاقتور ریاستیں قائم تھیں اور منظم معاشرے موجود تھے۔ جو انیسویں صدی کے آواخر تک سمندر پار سے آنے والے آبادکاروں اور حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ افریقہ کا ایک بڑا حصہ ناقابل عبور و مرور تھا اور وہاں کی آب و ہوا مضر صحت تھی لیکن یورپی باشندے جو اندرون ملک رسائی حاصل نہ کر سکے اور مغربی افریقہ اور جنوبی رہوڈیشیا جیسے علاقوں کی سونے کی کانوں پر قبضہ نہ کر سکے۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ یہ بھی تھی کہ خود افریقی باشندے ان وسائل کو استعمال کرنے کی یک گونہ صلاحیت رکھتے تھے اور وہاں کی بیرونی تجارت کو وہ اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ جو ترقی انہوں نے ابتدائی صدیوں میں کی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ ایک طویل عرصہ تک جدید دور کے اثرات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس لیے افریقہ کی پس ماندگی، دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں صرف اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ یورپ اور ایشیا کے بعض خوش نصیب خطوں کے مقابلہ میں افریقہ ایک حد تک پس ماندہ ضرور تھا۔

مصری تہذیب کی قدامت

آج کے ماہرین آثاریات اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مصر کا خطہ تھا جہاں انسان نے سب سے پہلے جانوروں کے شکار اور جڑی بوٹیوں پر گزارہ کرنے کی حالت سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں قدم رکھا، گلہ بانی پر توجہ کی اور سکونتی زندگی اختیار کی۔ دوسرے لفظوں میں انسانی تاریخ کا تیسرا عظیم انقلاب مصر میں رونما ہوا۔ کھیتی باڑی کے آغاز سے ایک ہزار سال کے اندر اندر مصر نے خاندان شاہی کے دور میں غیر معمولی ترقی کر لی۔ یہ ترقی دریائے نیل کے سیلاب زدہ زرخیز علاقے کی بدولت ہو سکی۔ اس کے مقابلہ میں افریقہ کے دوسرے علاقوں میں یہ تبدیلی بتدریج واقع ہوئی۔ تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ گلہ بانی اور کھیتی باڑی کے شروع ہوتے ہی شکار اور ماہی گیری ختم ہو گئی۔ دراصل فراہمیٔ غذا کے یہ ذرائع ایک عرصہ تک معیشت کا جزو بنے رہے۔

مصری کاشتکاروں نے ابتدائی بستیاں وادی کے نشیبی علاقوں میں نہیں بسائیں کیوں کہ وہاں دلدل اور جنگل کی وجہ سے آباد ہونا دشوار اور پُرخطر تھا، بلکہ بلند سطح خشک میدانوں کو آباد کیا جو اب ریگستان میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ اکثر سیلاب زدہ علاقوں سے پرے وادیوں میں بہنے والی موسمی ندیوں کے کنارے کنارے بسا کرتے تھے۔

مصر میں عہد متاخر حجری (Neolithic Period) کی ابتدا ہی سے پالتو بھیڑ بکریاں، سور اور دوسرے مویشی دستیاب تھے۔ انسانوں کے لیے سبزیاں اور مویشیوں کے لیے چارہ فراہم تھا۔ گیہوں اور جو کی کاشت ہوتی تھی جس کے اثرات بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ انہیں کی بدولت کئی اور غذائی اجناس دریافت ہوئیں جو افریقہ کے دیگر گرم علاقوں کے لیے موزوں تھیں۔ تاہم دوسرے علاقے وادیٔ نیل کی زرخیزی کا مقابلہ نہیں کر سکے۔

حبش کے علاقہ شہناب (Shainab) کے آثار کا جو تجزیہ کاربن کے طریقہ سے کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خرطوم کے باشندے چوتھے ہزار سالہ دور کے نصف آخر تک 'عہد متاخر حجری' کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی طرح کے تہذیبی آثار طفرجت (Tafergit) میں بھی ملتے ہیں جو جانب مغرب جنوب کی طرف بہنے والی دریائے نائیجر (Niger) کی ایک معاون ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ قرین قیاس ہے کہ شہناب اور طفرجت کا زمانہ قریب قریب ایک ہی تھا۔

افریقہ کے صحرائے کوچک کی قدیم ترین غذائی پیداوار باجرہ تھی لیکن مغربی افریقہ میں دریائے نائیجر کے مغربی جانب اُریذہ (Oryza) کے مقام پر چاول کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ یہ سب اجناس صحرائے کوچک میں خاص طور سے اس وسیع جھاڑی دار علاقہ میں پیدا کیے جاتے تھے جو سینیگال سے لے کر بالائی نیل سے ہوتا ہوا جنوب مشرق میں شمالی یوگنڈا اور کینیا کے بعض حصوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی لیے بعض ماہرین کی رائے ہے کہ صحرائے کوچک کے علاقہ میں زراعت کی ابتدا باہر کے اثرات کے تحت نہیں بلکہ اپنے طور پر ہوئی لیکن یقین کے تحت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے ہزار سالہ دور قبل مسیح سے پہلے صحرا کے جنوب میں زراعت پیشہ طبقے موجود تھے۔ متاخر حجری دور کی زرعی تہذیب کے جو بھی آثار اب تک سوڈانی علاقہ میں ملے ہیں وہ شمالی نائجیریا کی نوک مورتی تہذیب (Nok Figures) سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کے کاربنی تجزیہ سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس دور کی ابتدا پہلے ہزار سالہ دور ق م کے آغاز کے ساتھ ہی ہوئی ہو گی۔ یہی تہذیب ترقی کرتی ہوئی عہد آہن (Iron Age) تک پہنچی جو افریقہ کے اس خطہ میں آغاز عیسائیت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا۔ نوک جنس بلاشبہ دیہات کے باشندے تھے اور پتھر کے اوزار اور اعلیٰ پایہ کے زیورات کے علاوہ پکائی ہوئی مٹی (Terra Kota) سے نہایت ہی خوش نما مورتیاں بناتے تھے جس کا تعلق غالباً ان کے اسلاف پرستی کے عقیدہ سے تھا۔

زبانوں کا ارتقا

زراعت کی طرح افریقی زبانوں کی تحقیق سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شمال اور شمال مشرق کے کاکاسوئی (Cauca Soied) باشندوں کی حامی۔ سامی (Ha ms - Semitic) زبانوں اور جنوب اور مشرق کے بش (Bush) اور ہوٹینٹاٹ (Hottentat) باشندوں کی مخصوص صوتی زبانوں کو چھوڑ کر "حبشیوں کی قدیم زبانیں دو زمروں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ایک تو مشرقی سوڈانی زبانیں جو خط استوائی جنگلات کے شمال میں نیل سے چاڈ تک بولی جاتی تھیں۔ دوسری مغربی سوڈانی زبانیں، جو چاڈ جھیل کے مغربی علاقے میں مستعمل تھیں۔" روزمرہ کی مرکب زبانوں میں بھی آپس میں کافی اختلاف تھا۔ اسی اختلاف کی بنا پر اکثر ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ یہ زبانیں کم سے کم پانچ ہزار سال پہلے ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنے طور پر ترقی کرتی رہی ہوں گی۔ قدیم زبانوں کے اس بدیہی اختلاف کے مقابلے میں افریقیوں کی موجودہ بنتو زبانیں، جو خط استوا کے جنوب میں افریقہ کے اکثر علاقوں میں بولی جاتی ہیں ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ انہیں عام طور سے نسبتاً نو عمر زبانیں سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دو ہزار سال پہلے بنتو ایک ہی زبان رہی ہو، جو آج کے مقابلے میں کافی محدود علاقہ میں بولی جاتی ہو؛ اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس اصل بنتو زبان کا ربط مشرقی سوڈانی زبانوں کے مقابلے میں مغربی سوڈانی زبانوں سے زیادہ رہا ہو۔

چوتھے ہزار سال دور کی وسطی صدیوں تک امریتی (Amratian) کی جگہ گرزینی (Gurzean) تہذیب نے لی لی۔ بڑے قریے اب چھوٹے قصبوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اور چوبی دروازوں اور کھڑکیوں والے مٹی کے مستطیل نما مکانات کی تعمیر شروع ہوگئی۔ یہ قصبات مشرق وسطیٰ کے جدید قصبوں سے کافی مشابہت رکھتے تھے۔ گرزینی مصر کے تجارتی تعلقات بہت پھیلے ہوئے تھے۔ عراق (میسوپٹامیہ) کے تہذیبی مرکزوں سے غالباً وادیٔ نیل کا کافی ربط تھا۔ جزائر ایجئین سے چاندی اور سیسہ جیسی دھاتیں مستقل طور پر درآمد کی جاتی تھیں۔ جہاز سازی کے کارخانوں میں ساٹھ ساٹھ چپّو والے جہاز تیار کیے جاتے تھے۔

مصر کا شاہی دور

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصر میں شاہی کا تصور باہر سے نہیں آیا تھا بلکہ وہیں پیدا ہوا۔ خاندان شاہی اوّل کے تحت سیاسی اتحاد کی بنا پر ملک تیزی سے ترقی کرتا گیا فراعنہ کی تنظیمی صلاحیت کی بدولت نیابت الٰہی کے تصور کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور یہ تصور پھیلتا ہوا افریقہ کے دوسرے حصوں تک پہنچ گیا۔ ایک اندازہ کے مطابق تیسرے ہزار سالہ (ق۔م) کے دور کے مصری کسان اپنی گھریلو ضروریات سے تقریباً تین گنا زیادہ غلہ پیدا کرتے تھے۔ سخت گیر اور استحصال پسند نظام حکومت کے تحت یہ فاضل پیداوار نہ صرف تعمیرات عامہ کے لیے استعمال ہوئی بلکہ امرا، پیشوایانِ مذہب اور عمال حکومت کے عیش و آرام کا بھی ذریعہ بنی۔ ان ہی طبقات کی بدولت دریائے تزک و احتشام کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو زندہ فرعون کی ذات سے لے کر اس کے مردہ پیش رؤوں کی قبروں تک پھیلا گیا۔ بہرحال مصر کی حیرت انگیز ترقی میں سیاسی اتحاد کو ایک اہم مقام حاصل ہے جنگلوں سے بھری ہوئی دلدلی وادی کا ایک مربوط اور پیچیدہ معاشرہ میں تبدیل ہو جانا جو لاکھوں انسانوں پر مشتمل ہو، یقیناً ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے اس زرخیز وادی کے ان سیاسی اور مذہبی تصورات اور رسوم کی بھی ابتدا ہوئی جو آگے چل کر ایک وسیع علاقے میں پھیل گئی۔ کئی نسلوں کے بعد جب یہاں کے باشندوں نے افریقہ کے دوسرے علاقوں کو فتح کیا اور ریاستیں قائم کیں تو انہوں نے نئے ماحول اور حالات میں بھی ان ہی مصری تصورات کو اختیار کیا۔ چنانچہ مصر کے قدیم شاہی عروج کے چار ہزار سال بعد مونو ماتاپا (Mono Matapa) کے ایک حکمراں کا اپنی "ملکہ بہن" سے شادی کرنا یا پھر مغربی یوگنڈا میں واقع بونیرو (Bonyro) سردار کا گدی پر بیٹھنے کے بعد رسماً چاروں طرف تیر چلانا (جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ ساری قومیں اس کے زیر نگیں آ گئی ہیں) دراصل مصری رواج کے مطابق تھا۔ یہ طریقے مصر میں رواج پا رہے تھے اس وقت یوگنڈا اور رہوڈیشیا کے باشندے ابھی کھیتی باڑی سے بھی ناواقف تھے۔

بہرحال آج ہم مصر اور باقی افریقہ کے تعلقات کا صرف تاریخی شہادتوں اور آثار قدیمہ کی روشنی میں ہی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مصر اور جنوبی ممالک کے درمیان تجارتی روابط تھے۔ خاندان شاہی سے پہلے کے دور میں بھی نوبیا کا سونا دریائے نیل اور بحر احمر کی درمیانی پہاڑیوں سے حاصل کیا جاتا تھا اور خاندانی دور کے شروع میں مصر کے باقاعدہ تعلقات ایریٹریا، سومالی لینڈ اور جنوبی افریقہ سے قائم ہو چکے تھے۔ ان مقامات سے عود و لوبان کی بڑی بھاری مقدار مصر کے معبدوں میں جلانے کے لیے درآمد کی جاتی تھی۔ تجارتی مہمات نے اس علاقے کی تہذیب کو متاثر کیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مصری تاجر اپنے ساتھ مویشیوں کے علاوہ کاشت کی غرض سے ترکاریوں کے بیج بھی لے جاتے تھے۔ شاید اسی طرح کے ربط و ضبط نے شکار اور جنگل سے غذا حاصل کرنے والے باشندوں کو پہلی مرتبہ کھیتی باڑی سے روشناس کیا۔ ان مصری تاجروں کے سامان میں ممکن ہے کچھ آلات موسیقی اور کچھ دیدہ زیب پٹاریاں بھی رہی ہوں جنہیں لوگ ہاتھی دانت اور تیندوے کے چمڑوں کے عوض حاصل کرتے ہوں گے۔ اشیا اپنے استعمال کے گر ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ تاہم مصر کے عقائد اور سماجی تنظیم کے اثرات مدتوں جنوبی نیوبیا کے ایک چھوٹے علاقے تک ہی محدود رہے۔ واضح ہو کہ دوسرے ہزار سالہ دور ق۔م میں نیوبیا میں مصری آبادکاری شروع ہو چکی تھی۔ ڈنگولا کے قریب کرما کے مقام پر ایک مصری قلعہ کے آثار ملے ہیں۔ غالباً یہ قلعہ گیارہویں اور بارہویں خاندان شاہی کے زمانہ کا ہے۔ اس میں جو کتبے ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوڈان کی کش نامی ریاست کی قابض فوج وہاں سکونت پذیر تھی۔ دوسرے ہزار سالہ دور ق۔م کے اختتام تک مصری اثرات اس سارے علاقے میں کافی گہرے ہو گئے تھے۔ تھیبز (The bes) (جیسے آج کل الاقصر کہا جاتا ہے) مصری راجدھانی بن گیا۔ اور اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں خاندان شاہی کے فراعنہ جن کی ایشیا کی روایتی توسیع پسندی کو ہٹی (Hittite) سلطنت کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا، اب جنوب کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے چنانچہ نیوبیا پر مصر نے پوری طرح قبضہ کر لیا۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت نیوبیا کی کانوں سے سالانہ چالیس ہزار کیلو گرام سونا نکال کر برآمد کیا جاتا تھا۔ سونے کی اتنی بڑی مقدار انیسویں صدی سے پہلے دنیا میں کبھی حاصل نہیں کی گئی تھی۔ نیوبیا سے آگے کش میں مصری بستیوں کا لگاتار ایک سلسلہ تھا۔ ان ہی میں آمون (Amon) کا وہ مشہور معبد بھی ہے جو جبل برکال میں واقع ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ جبل برکال کے اعلیٰ پجاریوں کے خاندان ہی نے پہلے ہزار سالہ دور ق۔م میں کش کی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ یہ بادشاہت خود مختار ہونے کے باوجود مصر سے بے انتہا متاثر تھی۔ اس کی راجدھانی پہلے نوپاتا میں تھی۔ بعد میں میرو (Meroe) منتقل ہوگئی۔ یہ ریاست ایک ہزار سال سے زیادہ اور چوتھی صدی عیسوی کے وسط تک قائم رہی۔

پہلے ہزار سالہ دور ق۔م کے آغاز تک مصر پوری طرح زوال کی پکڑ میں آچکا تھا۔ شمال میں اشوریائیوں کو ایشیا کی سب سے اہم طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی اور انھوں نے ہٹی (Hittite) کی جگہ لے لی مصر کا جنوبی حصہ لیبیا کے مہم پسند سپاہیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جنہوں نے ڈیلٹا کے علاقے میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں لیکن یہ ریاستیں زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکیں۔

سوڈانی اثرات

بحر احمر سے نکل کر صحرائے کوچک سے ہوتا ہوا سینیگل کے دہانے تک اور دریائے نیل کے منبع سے لے کر بنتو افریقہ کے وسطی کوہستان سے گزرتا ہوا جنوبی رہوڈیشیا، (زمبابوے) تک ہمیں ایک ایسا محوری خطہ ملتا ہے جسے بجا طور پر سوڈانی تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس تہذیب کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی بدولت مختلف افریقی باشندے ایک ہی طرح کے مشترکہ اداروں کے تحت اپنی اپنی متعلقہ ریاستوں سے وابستہ ہوگئے۔ ایسی ریاست کا صدر بادشاہ ہوتا جسے نیابت الٰہی کا درجہ حاصل تھا اور جو ملکوتی صفات کا حامل تصور کیا جاتا تھا بادشاہ اپنی انتہائی مصروف زندگی عوام کی نظروں سے اوجھل ہوکر گزارتا تھا پردہ کی آڑ سے وہ درشن دیتا تھا۔ اس کے قریب ترین درباری بھی اسے کبھی کھاتے پیتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر سال وہ سب سے پہلے کسی کھیت کی صفائی کرتا اور اس میں تخم ریزی کرتا تھا۔ رائج الوقت عقیدہ کے مطابق زمین کی زرخیزی اور باقاعدہ بارش کا انحصار اس کی صحت جسمانی پر ہوتا تھا۔ خدا کا یہ نائب فطری موت سے بے نیاز ہوتا تھا جان لیوا بیماری یا انتہائی ضعیف العمری کی صورت میں زہر دے کر یا گلا گھونٹ کر اس کا خاتمہ کیا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد نعش کو، ایک خاص مسالہ لگاکر محفوظ کردیا جاتا۔ جنازہ کی رسم میں اکثر انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ آثار شاہی، مثلاً بال اور ناخن، شاہی مقبرہ میں محفوظ کر دئے جاتے تھے۔ یہ ساری شاہی رسومات نئے چاند سے منسوب کی جاتی تھیں۔ اور بادشاہ کی زندگی اور اس کے اقتدار کی نشانی کے طور پر مقدس آگ ہر جگہ مستقلاً رکھی جاتی اور اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ نائبین خدا کی رعایا چند ہزار سے لے کر لاکھوں کی تعداد میں تھی۔

افریقہ میں ایسی بے شمار بادشاہتیں تھیں۔ ان میں سے ایک یا دو بڑی بادشاہتوں کی حیثیت مرکزی تھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک مرکزی سیاسی ڈھانچہ سے منسلک رہتیں۔ پہلے ہزار سالہ دور قبل مسیح ہی میں کم سے کم تین ریاستیں ایسی تھیں جو جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہونے کے باوجود اس طرح کے نظام سے وابستہ تھیں۔ سلطنت گھانا کا پہلا تذکرہ ہمیں آٹھویں صدی کے عرب مصنف الفزاری کے یہاں ملتا ہے۔ اس سلطنت کا مرکز اس نام کے موجودہ علاقے سے کوئی پانچ سو میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ تین صدیوں کے بعد قرطبہ کے ایک اور مسلم جغرافیہ داں البکری نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ان تین صدیوں میں گھانا اپنے سونے کی برآمدات کی وجہ سے شمالی افریقہ میں کافی متعارف ہوچکا تھا۔ البکری گھانا کے شاہی رسومات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"بادشاہ کے جلوہ افروز ہونے کا اعلان دف بجاکر کیا جاتا ہے جسے مقامی لوگ دبا کہتے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے آتے ہی لوگ دوزانو ہوجاتے ہیں اور اپنے سروں پر مٹی بکھیر لیتے ہیں کیوں کہ یہی ان کے یہاں احترام بجالانے کا طریقہ ہے۔"

گھانا کے باشندوں کا مذہب بت پرستی ہے جب بادشاہ کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے مقبرہ پر سخت لکڑی کا ایک شاندار گنبد تیار کیا جاتا ہے۔ کنم (Kanem) کی سلطنت جھیل چاڈ کے شمال مشرق میں واقع تھی۔ یہاں کے حالات اور زغاوا (Zaghawa) حکمرانوں کا تذکرہ نویں صدی کے مصنف الیعقوبی نے کیا ہے۔ دسویں صدی میں ایک اور مسلم سیاح المہلبی نے بالکل واضح طور پر اس کی صراحت کی ہے کہ یہ سلطنت "سوڈان" کے طرز کی تھی وہ لکھتا ہے:

"سوڈان کے بادشاہ زغاوا سلطنت کو ایک عظیم سلطنت تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی مشرقی سرحد پر مصر کے بالائی حصہ میں نوبیا کی سلطنت ہے۔ ان دونوں کے درمیان دس دن کے سفر کا فاصلہ ہے۔ یہاں کئی قبیلے آباد ہیں۔ اس کی طوالت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ اسے طے کرنے کے لیے پندرہ دن کا سفر درکار ہوتا ہے سارا علاقہ زرخیز اور سرسبز وشاداب ہے۔ یہاں کے مکانات اور بادشاہ کا محل سب کے سب کھریا مٹی سے بنے ہیں۔ اللہ کی بجائے یہاں کے لوگ بادشاہ کے آگے سر عقیدت خم کرتے ہیں اور غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا بادشاہ بھوک پیاس سے بے نیاز ہوتا ہے بادشاہ کا کھانا خفیہ طور پر محل میں لایا جاتا ہے اور کوئی شخص اتفاقاً بھی خاصہ بردار اونٹ کو دیکھ لے تو اسے وہیں اسی وقت قتل کر دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کو اپنی رعایا پر اختیار کامل حاصل ہے اور ان کی جائیداد سے جو چیز چاہے اپنے تصرف میں لانے کا وہ مجاز ہے۔ یہاں کے مویشی بھیڑ بکریوں، گائے اونٹ اور گھوڑوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں باجرہ کے علاوہ، جو کہ اہم پیداوار ہے، گیہوں، مٹر اور لوبیہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ عوام زیادہ تر ننگے رہتے ہیں اور جانوروں کی کھال سے ستر پوشی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کاشت کاری اور جانوروں کی دیکھ بھال میں اپنا وقت گزارتے ہیں اپنے بادشاہوں کی پرستش اور اطاعت ہی ان کا مذہب ہے کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ بادشاہ ہی زندگی اور موت، بیماری اور صحت پر قدرت رکھتے ہیں۔"

آخر میں بغداد کے مشہور عالم جغرافیہ داں اور سیاح المسعودی کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے ۹۴۲ء کے لگ بھگ بحرۂ فارس سے لے کر افریقہ کے مشرقی ساحل پر صونالہ (جو موجودہ موزمبیق میں واقع تھا) تک بحری سفر کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ جنوبی رہوڈیشیا کے اندرونی علاقہ سے حاصل کیے ہوئے سونے اور ہاتھی دانت کی بڑی بھاری مقدار صونالہ سے عمان اور پھر چین وہندوستان جہازوں کے ذریعہ برآمد کی جاتی تھی۔ مسعودی نے جنوبی رہوڈیشیا کے اندرونی علاقہ کی جس ریاست کا تذکرہ کیا ہے ممکن ہے یہ وہی ہوگی جس کے حکمرانوں نے کسی زمانہ میں زمبابوے (Zimbabwe) کی شہرۂ آفاق سنگ بستہ عمارت تعمیر کی تھی۔

یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ مذکورہ بالا افریقی ریاستوں کے علاوہ جن کے آثار ہمیں پہلے ہزار سالہ عیسوی دور میں ملتے ہیں اور بھی ریاستیں افریقہ کے طول وعرض میں موجود نہ ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ مذکورہ ریاستیں ہی بیرونی دنیا کے تعلیم یافتہ طبقے کا مرکز توجہ بنیں۔ بہت ممکن ہے جدید طریقۂ تحقیق وتفتیش کے نتیجہ میں سوڈانی تہذیب کے اور کئی مراکز منظر عام پر آئیں

اس مختصر جائزے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ۔

۱۔ صحرائے کوچک اور بنتو افریقہ دونوں جگہ ریاستوں کی تشکیل مشترکہ سیاسی تصورات کا ہی نتیجہ تھی۔

۲۔ یہ ابتدا میں داخلی طور پر پروان چڑھتے رہے اور پھر اندرونی حدود سے نکل کر مغرب وجنوب کی جانب دور تک پھیلتے چلے گئے۔ ان کا مشترکہ مرکز وادیٔ نیل کا بالائی علاقہ تھا۔

۳۔ مشترکہ تصورات کے اس سرمایہ کا اسلام سے قبل اور عیسائیت کے بعد

کے دور سے تعلق ہے۔ اس معنی میں کہ اس نظام کے بنیادی اصولوں پر دونوں مذاہب کے عقائد کی گہری چھاپ ہے۔ اگر وادیٔ نیل کو ان تصورات کے پھیلاؤ کا مرکز قرار دیا جائے تو یقیناً یہ عمل وہاں عیسائیت اور اسلام کے قدم جانے سے پہلے ہوا ہو گا۔ نیل کے سوڈانی علاقہ میں اسلام کا باقاعدہ نفوذ گیارہویں صدی سے قبل نہیں ہوا۔ البتہ مصر سے نوبیا تک عیسائیت کی اشاعت چھٹی صدی کے آخر ہی میں شروع ہو چکی تھی اور ساتویں صدی تک اس کے قدم اتنی مضبوطی سے جم چکے تھے کہ وہ اسلام کے جنوب کی جانب پھیلنے کی مزاحمت چار صدی تک کرتی رہی۔

بحر متوسط کی تہذیب کے اثرات شمالی اور مغربی افریقہ پر

ہم نے نیگرو افریقہ پر قدیم مصر اور خاص طور سے سوڈانی نیل کے علاقہ میں واقع سلطنت کش کے اثرات کا سرسری جائزہ لیا ہے لیکن یہ بات غلط نشاں ہے کہ مصر کے اثرات صرف وادیٔ نیل تک ہی محدود نہ تھے مصر اور شمالی ممالک، بالخصوص شام، قبرص اور کریٹ کے درمیان بحری راستہ سے باقاعدہ تجارت ہوتی تھی۔ لہٰذا بحر متوسط کی تہذیب کے ارتقاء میں مصری اثرات کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی ق م میں شمالی افریقہ میں پہلی فنیشیائی آبادیاں قائم ہونے سے لے کر ساتویں صدی عیسوی میں عرب فتوحات تک یعنی کوئی پندرہ سو سال کے عرصہ میں صحرائے اعظم کے شمال میں رہنے والے قریب قریب تمام افریقی باشندے بحر متوسط کی کسی نہ کسی تہذیب سے متاثر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ حبشی نہیں تھے بلکہ قفقاز کے علاقہ کے سفید فام باشندے تھے جنہیں قدیم اہل یونان لیبیائی کہا کرتے تھے اور سیاہ فاموں سے بالکل الگ سمجھتے تھے۔ لیبیائی، حامی اور سامی زبانیں بولتے تھے۔ خالص اس نسل کے کچھ لوگ آج بھی شمالی افریقہ کے بعض پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ بہر حال بحر متوسط کے علاقوں سے لیبیائی بربروں کے جو روابط تھے ان کے اثرات صحرا کے جنوب کے افریقیوں پر بھی پڑے۔

یہ فنیشیائی تاجر ہی تھے جنہوں نے پہلے پہل شمالی افریقہ کو بحر متوسط کے نو خیز تمدن سے روشناس کیا۔ غالباً انہیں افریقی تجارت کی بہ نسبت جزیرہ نمائے آئبیریا کی کیاب اور قیمتی دھاتوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ بہر حال انہوں نے شمالی افریقہ کے ساحل پر متعدد چوکیاں قائم کیں۔ ان ہی میں سے ایک قرطاجنہ (Carthage) کی چوکی تھی جسے بعد میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کا محل وقوع تھا۔ یہاں سے پورے مغربی بحر متوسط پر نگاہ رکھنا سہل تھا اور اس پر قبضہ کرتے ہی مصر کو چھوڑ کر، شمالی افریقہ کے سب سے وسیع قابل کاشت رقبہ یعنی تیونسیائی میدانوں پر تسلط رکھنا ممکن تھا۔ چھٹی صدی ق۔ م میں جب شام کی شہری ریاستیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں اور ساتویں صدی میں سرینیکا کا ساحل یونانی آبادکاروں کی آماجگاہ بن گیا تو قرطاجنہ کو سارے شمالی افریقہ کے شہروں میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ قرطاجنہ اور اس کے نواحی علاقوں نے مقامی بربرں کی زندگی کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اس کے اثرات دو طرح کے تھے۔ ایک تو عام اثر تھا جو سارے شمال مغربی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پایا جاتا تھا۔ دوسرا وہ مخصوص اثر تھا جس سے تیونس کے زرخیز میدان متاثر ہوئے۔ اہل قرطاجنہ نہ صرف تجارت میں ماہر تھے بلکہ زراعت میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے نیم خانہ بدوش بربر قبیلوں میں بھی کھیتی باڑی کا شوق پیدا ہوا اور سکونتی زندگی کو پسند کیا جانے لگا۔ روم سے لڑائیوں کی وجہ سے قرطاجنہ کی اہمیت اور بڑھ گئی جس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اندرونی علاقوں میں دور دور تک حکومت کی گرفت مضبوط ہو گئی اور سارے زرخیز میدان حکومت کی ملکیت بن گئے جہاں بربر قبیلے صرف زرعی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ غرض یہ کہ قرطاجنہ کے عروج کے زمانہ میں نہ صرف شمال مغربی افریقہ کی ساری تجارت و زراعت اہل فنیشیا کے قبضہ میں رہی بلکہ انہوں نے یہاں کی زبان اور تہذیبی زندگی پر بھی گہرے نقوش چھوڑے۔ شمالی افریقہ پر ان کے تسلط کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں کا ایک طبقہ بھی آباد کاروں کے ساتھ آیا جس کے عقائد سے بعض بربر قبیلے اور خاص طور سے جنوبی تیونس اور ملحقہ طرابلس کے باشندے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ صقلیہ اور بحر متوسط کے شمالی حصہ میں یونانی نو آبادکاروں اور اہل فنیشیا میں مسلسل جھڑپیں ہوتی رہیں۔ یونانی شمال مغربی افریقہ پر تو تسلط حاصل نہ کر سکے تاہم انہوں نے سرینیکا اور مصر میں اپنے قدم جما لیے اور ۳۳۲ ق م میں مصر پر سکندر اعظم کے قبضہ کے بعد تو مصر ہی افریقہ میں یونانی اثرات کو پھیلانے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ سکندر کا دس سال بعد انتقال ہو گیا اور عالمی سلطنت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن مشرق و مغرب کی تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا تصور اس کے بسائے ہوئے شہر اسکندریہ میں زندہ رہا چنانچہ اس کے ایک سپہ سالار بطلیموس (Ptolemy) کے خاندان کے دور میں اسکندریہ کو یونان کا سب سے بڑا شہر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ بطلیموس خاندان نے فراعنۂ مصر کی طرح نہ صرف وادیٔ نیل کی زرعی دولت پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کیے بلکہ مشرق و مغرب کے درمیان اشیائے تعیش کی تجارت سے بھی غیر معمولی دولت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکندریہ ہی کے ذریعہ یونانی تہذیب و تمدن، فلسفہ اور علوم مشرقی تہذیبوں پر اثر انداز ہوئے۔ ان اثرات کو قبول کرنے میں سامی تہذیب کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ مصر نے تو سب سے زیادہ اثرات قبول کیے اور اس کا صدر مقام بھی اسکندریہ جس کی آبادی میں یہودیوں کی تعداد یونانیوں کے تقریباً برابر تھی مذہبی اور فلسفیانہ مباحثوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور اس کی یہ حیثیت عیسوی دور کی پہلی تین صدیوں تک برابر قائم رہی۔

رومن اثرات

دوسری صدی ق م کے وسط میں رومن جمہوریہ کے باشندوں نے قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سارے شہر کو لوٹ کر اسے نذر زمین کر دیا۔ افریقہ میں اپنی سلطنت قائم کرنے کا خیال گو ان کے ذہنوں میں نہیں تھا تاہم ان کی للچائی ہوئی نظریں تیونس کے زرخیز میدانوں سے ہٹ نہ سکیں۔ وہاں کی غذائی پیداوار روم کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ان میدانوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے جلد ہی ساری نیمودی (Numedian) ریاستوں کا خاتمہ کر کے اٹلانٹک کے ساحل پر مراکش تک قبضہ کر لیا اور آخر کار نیم خانہ بدوش قبیلوں کو زیر کر کے صحرائے اعظم تک اپنی عملداری بڑھا لی۔ پہلی صدی ق۔ م میں سرینیکا اور مصر کے علاقہ پر قبضہ کے بعد تو ان کی افریقی سلطنت مشرق سے مغرب تک تقریباً چار ہزار میل پر پھیل چکی تھی۔

لیکن افریقہ میں رومی سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ صرف دو علاقوں سے اہل روما کو دلچسپی تھی۔ ایک تو صوبہ "افریقہ" (جو موجودہ تیونس اور طرابلس (ٹرپولیٹانیا) کے ساحلی علاقہ پر مشتمل تھا اور نیومیڈیا (جدید الجیریا کے مشرق کا قریب قریب نصف حصہ) دوسرے مصر۔ "افریقہ" اور نیومیڈیا میں تو رومیوں نے زرعی ترقی میں کافی دلچسپی لی اور بربر قبیلوں کو کھیتی باڑی اور سکونتی زندگی کی جانب راغب کیا لیکن مصر میں وہ غیر ملکیوں کی طرح الگ تھلگ رہے۔ اور سوائے لوٹ کھسوٹ کے اور کچھ نہ کر پائے۔

عیسائی مذہب کی آمد

افریقہ کو بحر متوسط کی تہذیب کے دائرۂ اثر میں لانے کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کا راستہ کھل گیا۔ اور افریقہ میں رومن سلطنت کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسکندریہ اور قرطاجنہ اس نئے مذہب کے دو اہم مرکز قرار پائے اور دونوں جگہ بلکہ سارے بحر متوسط کے علاقے میں اہل یہود نے سب سے پہلے عیسائی مذہب قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ مارک کا وطن اسکندریہ ہی تھا قدیم عیسائیوں کے سب سے بڑے رہنما سینٹ آگسٹین ایک بیبائی بربر تھے جن کی تعلیم و تربیت قرطاجنہ میں ہوئی تھی۔ نیوبیائی ریاستوں نے چھٹی صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ ایتھوپیا (حبشہ) بھی مصری اور شامی مبلغوں کے زیر اثر عیسائی بن گیا۔

چوتھی اور پانچویں صدی میں یورپ کی طرح افریقہ میں بھی رومن اقتدار کا زوال شروع ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی شمالی افریقہ کی تاریخ میں بحر متوسط کے دور کا خاتمہ ہو گیا یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ قرطاجنہ اور رومہ کا اقتدار کبھی بھی صحرائی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ قرطاجنہ کی سلطنت کی نوعیت علاقائی نہیں تھی بلکہ تجارتی اور سمندری تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مغربی افریقہ کے لیے بحر متوسط کی تجارت کافی اہمیت رکھتی تھی اور اس کے اثرات دوررس ثابت ہوئے: تاہم بحر متوسط کی تہذیب شمالی افریقہ کے زرعی علاقوں تک ہی محدود رہی۔ شمال سے جو بھی اثرات اندرونی علاقوں تک پہنچے وہ بربر اور پھر اسلامی اثرات تھے۔ پہلی دفعہ اونٹ کے استعمال کی وجہ سے بربر قبیلوں کی نقل و حرکت میں بڑی تیزی پیدا ہو گئی تھی اور اسلام کی آمد تک وہ کافی منظم ہو چکے تھے سیاسی اقتدار حاصل کر کے اب انہوں نے بڑی بڑی ریاستیں قائم کر لیں۔

افریقہ میں عرب مسلمانوں کی آمد

مصر میں عرب مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ 639ء کی ابتدا میں شروع ہوا جب کہ عمرو بن عاص نے جو اس علاقے کے جغرافیائی حالات سے بخوبی واقف تھے خلیفہ عمرؓ کے احکام پر فراعنہ کی اس قدیم سرزمین پر فوجیں اتاریں نصف صدی کے اندر ہی عربوں نے صحرا کے شمال میں پورے افریقہ پر قبضہ کر لیا۔ بحر متوسط کی روبہ زوال قدیم تہذیب نے دم توڑ دیا اور یہ سارا علاقہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ عربوں کی یہ حیرت انگیز کامیابی کچھ تو تجارتی امور میں دیرینہ تجربہ اور کچھ نئے مذہب اسلام کے پیرؤں کے جوش و ولولہ کی بدولت ممکن ہو سکی۔

640ء تک بازنطینی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور اسکندریہ پر عربوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ اسکندریہ کی جگہ جو ایک ہزار سال تک مصر کا دارالسلطنت تھا، انہوں نے دریائے نیل کے ڈیلٹا میں بابل سے قریب فسطاط کے مقام پر نیا دارالخلافہ تعمیر کیا یہ جگہ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے ہر طرح موزوں تھی۔

نشیبی حصہ میں پوری طرح مستحکم ہو جانے کے بعد عربوں نے جنوب کی ریاست نیوبیا سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور یہی دوستی سونے کی باقاعدہ رسد اور غلاموں کی تجارت کی ضامن بن گئی۔ چند ہی سال میں انہوں نے اپنی بحری طاقت کو مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلہ میں انہیں کوئی نصف صدی تک بربروں سے لڑنا پڑا جس میں انہوں نے بعض اوقات زبردست پسپائی بھی اٹھائی لیکن آخر کار عربوں نے نہ صرف بربروں کو زیر کیا بلکہ بازنطین کی بحری طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر وہ جبل الطارق تک پہنچ گئے اور اسپین میں داخل ہوئے قرطاجنہ کے قدیم اور شہرت یافتہ شہر کی جگہ انہوں نے تیونس کی بنیاد ڈالی۔ تاہم شمالی افریقہ کے ساحلی علاقہ کا صرف وسطی حصہ ہی جس کا صدر مقام قیروان تھا مستقل طور پر ان کے قبضہ میں رہا اور بقیہ حصہ، خاص طور سے مغربی حصہ میں ان کے قدم مضبوطی سے جمنے نہ پائے۔

جنگوں اور فتوحات کی پہلی رو کے بعد جو کثیر مادی وسائل ہاتھ آئے تھے وہی فطری طور پر باہمی اختلافات کا بھی باعث بنے۔ اب مذہبی جوش و ولولے کا زور کم ہو چکا تھا اور معاشی مفادات نے اس کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ اسلامی ہیئت اجتماعیہ رفتہ رفتہ فرقہ بندی کا شکار ہو گئی اور ہر نیا قائد کسی نہ کسی فرقہ کا علم بردار بن گیا۔ سیاسی اقتدار اب ایسے خاندانوں میں منتقل ہوتا گیا جو آپس میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ اس کی وجہ سے خلافت کا جو کسی زمانہ میں سیاسی اقتدار کا سرچشمہ تھی ایک مرکز باقی نہ رہا۔ مصر اور المغرب میں اقتدار کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے اور حکومت کی باگ ڈور کئی فرمانرواؤں کے ہاتھ آ گئی۔ اس کے علاوہ کئی حوصلہ مند جاہ طلب باغی بربر سرداروں نے سیاسی اور معاشی اغراض کے تحت سر اٹھایا عباسی دور میں خلافت کا صدر مقام مشرق کی جانب منتقل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے خود مختارانہ سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔

"افریقہ میں مسلم فتوحات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ شامی اور عرب سپاہیوں کے پے در پے آمد کی وجہ سے قبطی عیسائی مذہب کے اثرات ظاہر ہونے گئے اور ان کے ماننے والے رفتہ رفتہ عرب آبادکاروں میں ضم ہو گئے۔ اور اس طرح جدید مصر نے جنم لیا جس کی زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔ اب اس علاقے میں آبادی کے دس فی صدی سے بھی کم لوگ اپنے قدیم قبطی عقیدہ پر قائم ہیں۔

جبر و تشدد کے باوجود شیعہ طبقہ نہ صرف باقی رہا بلکہ خفیہ طور پر حصول اقتدار کی برابر کوشش کرتا رہا۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں اس فرقۂ اسلام کے ماننے والے شمالی افریقہ پہنچے اور پیغمبر اسلام کی صاحب زادی اور حضرت علی کی رفیقۂ حیات حضرت فاطمہ کی نسبت سے فاطمی کہلانے لگے۔ فاطمیوں نے 969ء تک مصر فتح کر لیا اور القاہرہ کی تعمیر کی جو 973ء میں خلیفہ المعز کا دارالخلافہ بنا۔ فاطمی خلفا کا اقتدار گو برائے نام ہی سہی 1171ء تک باقی رہا ہر چند کہ اس سے بہت پہلے ہی المغرب کا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ پھر شام میں سُنی تحریک کے احیا اور بازنطینی مخالفت کی وجہ سے فاطمی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک سلجوقی ترک صلاح الدین ایوبی نے شام میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد 1171ء میں مصر پر قبضہ کر کے ایک نئے خاندان کی بنا ڈالی جو ایوبی کے نام سے مشہور رہا۔ صلیبی جنگوں میں اپنے جرأت مندانہ کارناموں کی وجہ سے صلاح الدین نے شہرت دوام پائی۔ 1250ء میں ایوبی خاندان کی جگہ مملوک نے حاصل کر لی۔ یہ غیر معمولی عسکری صلاحیت رکھنے والے امیر تھے جنہیں پہلے پہل وسط ایشیا کے بردہ فروشی کے بازار سے خریدا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی عسکری طاقت کو مستحکم کیا اور صلیبی حملہ آوروں کے علاوہ منگول یورشوں کا بھی کامیابی سے مقابلہ کیا 1517ء میں مملوک بالآخر ترکوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ مملوک کا سارا وقت ملک کی مدافعت اور اقتدار کی رسہ کشی میں صرف ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف زراعت اور آب پاشی کے وسائل خشک ہو گئے بلکہ اجارہ داریوں اور بے جا محاصل کی وجہ سے مصر کی بین الاقوامی تجارت کو بھی زبردست نقصان پہنچا (تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون تاریخ اسلام)

فاطمی خلافت کے المغرب سے مصر منتقل ہونے کے بعد وہاں بربر قبیلوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ گیارھویں صدی کے وسط میں بدوی قبیلوں اور خاص طور سے بنو ہلال کے پے در پے حملوں نے اس علاقے کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ شہرۂ آفاق عرب مورخ ابن خلدون، جو تیونس کا باشندہ تھا۔ ان تباہیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ قبیلے ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اپنے راستہ کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر کے رکھدیا۔"

وادیٔ نیل سے پرے، سوڈان اور صحرا کے باشندوں سے عرب مسلمانوں کے تعلقات ابھی پوری طرح روشنی میں نہیں آئے ہیں تاہم یہ واضح ہے کہ دَورِ اُمیہ سے ہی مراقش کے جنوب میں عرب حملہ آوروں نے مراقش کے جنوب میں دھاوے شروع کردیے تھے اور نویں صدی تک عرب گھانا اور کنم (جھیل چاڈ کے شمال میں) کی ریاستوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ پھر بھی کنم کے بادشاہوں کے اسلام قبول کرنے میں دو صدیاں لگ گئیں صحرا کا علاقہ عربوں کے لیے اور بھی زیادہ صبر آزما ثابت ہوا۔ اس کو زیر کرنے کے لیے مغربی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں بڑے بڑے فوجی دستے متعین کرنا ضروری تھا چنانچہ یہاں اسلام کا نفوذ انیسویں صدی سے پہلے نہ ہو سکا۔ اس وقت بعض ایسے قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا جن کا مراقش، گھانا کے کارواں راستہ پر قبضہ تھا۔ ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اثرات المغرب اور مغربی سوڈان دونوں جگہ بڑے دُوررَس ثابت ہوئے۔ یہاں سیاسی اور معاشی مفادات نے مذہبی تفرقہ اندازی کی شکل اختیار کر لی۔ قبیلوں کی آپس کی خانہ جنگیوں اور مختلف خود مختار حکومتوں کی باہم لڑائیوں کی وجہ سے وہاں کے حالات میں انحطاط پیدا ہوتا گیا۔ اور جب ترک تیرہویں صدی میں الجزائر میں آئے تو انہوں نے نہایت آسانی اور سرعت سے تمام شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا۔ صرف ایک ہی علاقہ مراقش خود مختار رہا۔

سیاسی اور معاشی اعتبار سے قطع نظر ابن خلدون اور دیگر مسلم مورخین نے ان دو فرقوں کے باہمی مناقشات کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے جو ایک عرصہ تک شمالی افریقہ کی سیاسی بساط پر رونما ہوتے رہے۔ ان میں سے ایک المرابطین (جنہیں مغربی مورخین المورا وید کہتے ہیں) کہلاتا ہے اور دوسرا الموحدین (جنہیں مورخین فرنگ الموحاد کہتے ہیں)۔

کہا جاتا ہے کہ المرابطین قبیلہ صنہاجہ کے مرید تھے۔ ان ہی میں سے ایک امیر حج سے لوٹتے ہوئے ایک فقیہہ، ابن یٰسین کو اپنے قبیلہ کی تعلیم کے لیے ساتھ لایا۔ لوگوں نے ابتدا میں ان کی تعلیمات کی مخالفت کی اور ابن یٰسین نے ایک جزیرہ رباط میں (یہیں سے المرابطین کا نام پڑا) پناہ لی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد لوگ ان کے معتقد ہو گئے اور اس عقیدہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص ابوبکر بن عمر کو اپنا بادشاہ بنایا۔ اور اسے امیر المسلمین کا خطاب دیا۔ اس کے بھتیجے یوسف بن تاشفین کے دور میں ان کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ المرابطین سارے مغرب پر چھاگئے۔ ان ہی کی ایک شاخ نے جنوب میں گھانا کی حبشی سلطنت پر ہلہ بول دیا۔ ایک گروہ تاشفین کی سرکردگی میں مراقش میں داخل ہوا اور ۱۰۶۹ء تک سارا علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا۔ پھر وہ اندلس کے مسلمان سلاطین کی دعوت پر جو نصاریٰ کے ہاتھوں تنگ آگئے تھے اندلس گیا اور نصاریٰ کو شکست دینے کے بعد خود اس ملک پر قابض ہو گیا اور مغرب اور اندلس دونوں اس کے ہاتھ آگئے۔

المرابطین کا اقتدار جوں جوں بڑھتا گیا، ان میں زوال کے آثار پیدا ہوتے گئے۔ ان میں وہ پہلے کا سا جذبۂ ایمانی باقی نہ رہا اور جاہ و دولت کے لالچ نے ان میں اخلاقی گراوٹ پیدا کر دی۔ ان حالات میں ایک اور شخص محمد بن تومرت کے زہد و تقویٰ اور وعظ و نصائح سے متاثر ہو کر لوگ المرابطین سے بدظن ہونے لگے۔ تومرت کو مہدی قرار دیا گیا۔ اس کے ماننے والوں کی ایک بڑی جمعیت تیار ہو گئی اس فرقہ کا نام ابن تومرت نے الموحدین رکھا۔ جو المرابطین سے ایک عرصہ تک برسرِ پیکار رہا اور بالآخر اس نے المرابطین کو پورے مغرب سے بے دخل کر دیا اور اندلس کی بقیہ سلطنت پر بھی قابض ہو گیا ۱۱۲۷ء میں عبد المومن تومرت کا جانشین ہوا اور اسے سارے مراقش کا خلیفہ تسلیم کر لیا گیا ۱۲۱۳ء تک زیناطہ (Zenata) خاندان کی یہ حکومت بلا مزاحمت چلتی رہی لیکن اس کے بعد جانشینی کے جھگڑے شروع ہو گئے اندرونی رقابت اور بیرونی دباؤ کی وجہ سے یہ بربر سلطنت ۱۲۷۵ء میں منتشر ہو گئی۔ اور اس کی جگہ کئی چھوٹی چھوٹے ریاستوں نے لے لی۔

جہاں تک مغربی سوڈان کا تعلق ہے یہاں حالات ایک عرصے تک موافق رہے المرابطین، جنہوں نے ۱۰۶۲ء میں گھانا پر حملے شروع کر دیے تھے۔ بالآخر ۱۰۷۶ء میں اس کے پایۂ تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن باہمی رقابت کی وجہ سے اس کامیابی کا زیادہ فائدہ انہیں نہیں پہنچا۔ چند ہی سالوں میں گھانا آزاد ہو گیا تو اس میں پہلے کا سا استحکام باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ جانب جنوب نگر وادی میں منڈے (Munde) قبیلہ کے سردار سندیاتہ (Sund-ayata) نے ایک طاقتور حکومت قائم کر لی جس کے تحت مالی کی ایک اور وسیع سلطنت قائم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ سندیاتہ اور اس کے جانشینوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یوں تو گھانا میں بہت پہلے ہی سے مسلم وزرا اور مشیر موجود تھے لیکن مالی کے حکمرانوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد سے مغربی سوڈان کی تمام بڑی ریاستیں مسلمان ہو گئیں مغربی افریقہ کی حبشی ریاستوں کے اسلام قبول کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ شمالی افریقہ کی حکومتوں اور تاجروں کے نزدیک ان کے وقار میں اضافہ ہو گیا۔ اسلامی برادری کا یہ احساس خود ان ریاستوں کی خوش حالی کا ضامن تھا۔ اس کے بعد مسلم تاجروں ہی کی کوششوں سے سوڈانی ریاستوں میں دور دور تک اسلام پھیلتا گیا۔ اسلامی اثرات کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ قبیلوں اور خاندانوں کی محدود وفاداریاں ختم ہو گئیں اور اسلامی اصولوں کے وسیع تر بنیاد پر قانون اور نظم و نسق کی تشکیل ممکن ہو سکی۔ تمام قبیلے ایک ہی طاقتور مرکزی حکومت کے زیر سایہ آگئے۔ پُرامن حالات اور رسل و رسائل کے بہتر ہونے کی وجہ سے تجارت اور زراعت کو فروغ حاصل ہوا۔ مالی اور سونگھائی (Songhai) جیسی وسیع سلطنتوں کی خوش حالی۔ ان ہی اثرات کی وجہ سے ممکن ہو سکی چودھویں صدی میں مالی کے حکمرانوں کا اقتدار اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ بالائی نگر میں نیاری (Niari) سے لے کر جانب مغرب اٹلانٹک اور مشرق میں نگر وادی سے لے کر ہوسالینڈ (Housaland) کی سرحدوں تک ان کا حکم چلتا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں جب اس سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اس کی جگہ نیاری (Niaeri) سے تقریباً چار سو میل شمال مشرق میں ایک اور طاقتور سلطنت ابھر آئی جس کا پایۂ تخت گاؤ (Gao) تھا۔

افریقہ کی حبشی سلطنتوں کی طاقت، دولت، خوش حالی اور بہتر نظم و نسق کے چرچے دور دور تک تھے۔ اس کا اعتراف مسلم مورخین نے بڑی فراخدلی سے کیا ہے مشہور سیاح ابن بطوطہ جو چین جیسے دور دراز ملک کا سفر کر چکا تھا۔ مالی سلطنت

کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں کے نیگرو، قطعاً غیر منصف مزاج نہیں ہیں۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں یہ ناانصافی سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اس کا ارتکاب کرنے والے پر سلطان بالکل رحم نہیں کھاتا۔ اس ریاست میں مکمل امن وامان ہے۔ یہاں کے باشندوں یا مسافروں کو چوروں یا ظالموں سے ذرا بھی خطرہ نہیں ہے۔ وہ یہاں کی خوش حالی، زراعت کی فراوانی اور تجارت کی گرم بازاری کا بھی پرزور الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے۔

بہر حال مغربی سوڈان کی بڑی ریاستیں اور ان کے مشہور شہر اپنا سوڈانی کردار کھوئے بغیر اسلامی دنیا کا ایک جزوِ لاینفک بن گئے۔ جہاں تک اسلامی اثرات کا تعلق ہے ان کی مسجدیں اور دار العلوم اتنے مشہور ہو گئے کہ دور دراز سے علما اور فقہا جوق در جوق یہاں آنے لگے اور ان ممالک نے اسلامی تہذیب کے بڑے مراکز کی حیثیت اختیار کر لی۔

شمال مشرق اور مشرقی افریقہ میں اسلامی اقتدار کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو مصر اور شمالی افریقہ میں حاصل ہوا تھا۔ حبش کی نصرانی ریاست، جو پیغمبر اسلام کی ولادت کے وقت تک بحر احمر اور جنوبی عربستان پر چھائی ہوئی تھی، جوں کی توں باقی رہی اور مسلمانوں نے اس میں مداخلت نہیں کی۔ ساحلی بندرگاہوں پر قبضہ کے باوجود مسلمان تاجر حکومتِ حبش کو برابر خراج دیتے رہے اور اس کے خلاف جہاد کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔

اسلام کے عروج کے اثرات حبش کے لیے بڑے دور رس ثابت ہوئے۔ بحر متوسط کے سارے حلیفوں سے حبش کے رشتے منقطع ہو گئے۔ پرانے مصری، یونانی اور یہودی تاجروں کی جگہ مسلمانوں نے لے لی۔ تاہم قاہرہ میں حبش کے اسقفوں کا اب بھی احترام باقی تھا اور حبش کے نصرانیوں کو قاہرہ کے راستے مقامات مقدسہ کی زیارت کی پوری آزادی حاصل تھی۔ یہ صورتِ حال کم سے کم چھ یا سات صدیوں تک باقی رہی اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوا۔

سلطنتِ حبش کو اصل خطرہ شمال کے مسلمانوں سے نہیں بلکہ جنوب کے غیر عیسائی باشندوں سے تھا۔ ان کی اشتعال انگیزی نے اہل حبش کی جارحیت کو ہوا دی اور اس کے نتیجہ میں عیسائیت کا اثر و نفوذ اور حبش کا اقتدار جنوبی علاقوں میں پھیلتا گیا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر اور اہل حبش کی چشم پوشی کی وجہ سے مسلم پیش قدمی ساحلی علاقوں سے اندرون ملک جاری رہی جس کے نتیجے کے طور پر یہاں متعدد مسلم ریاستیں قائم ہو گئیں جنہیں علاقائی مفادات سے زیادہ ہاتھی دانت، سونے اور غلاموں کی تجارت سے دلچسپی تھی۔ اس لیے ایک عرصہ تک حبش کی نصرانی ریاست نے ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں حبش کے سلیمانی خاندان نے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی ان جھڑپوں کی نوعیت مذہبی نہیں تھی۔ مسلمانوں سے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا البتہ پندرھویں صدی میں حبش کی کھلی جارحیت کی وجہ سے ان ریاستوں کے باشندوں نے "فتح یا شہادت" کے نعروں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی سب سے بڑی مسلم ریاست افات (Ifat) صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی اور وہاں کے بادشاہ کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ شمالی افات کا علاقہ حبش میں ضم کر لیا گیا۔ یمن میں کچھ عرصہ پناہ لینے کے بعد یہاں کے شاہی خاندان کے ارکان اور ممتاز افراد نے سومالی ساحل پر عدل (Adel) کی ریاست قائم کر لی اور حبش کے خلاف جہاد کے نعروں سے مسلمانوں کو ابھارتے رہے۔ چنانچہ سولھویں صدی کی ابتدا میں جب عثمانی ترک مملوک کی جگہ مصر میں برسر اقتدار آئے اور انہوں نے اس علاقے کے باشندوں کو پہلی مرتبہ آتشیں اسلحہ اور توپ خانہ سے روشناس کرایا تو وہ نصرانی حبش کے خلاف ان کے استعمال پر آمادہ ہو گئے۔ تاہم ۱۵۴۲ء میں پرتگال کی مداخلت کی وجہ سے اس کی نوبت آنے نہ پائی۔

واضح رہے کہ چوتھی صدی ہی سے افریقہ اور اس کے اندرونی علاقوں میں بیرونی علاقوں کے باشندوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے تو یونانی و رومی اثرات یہاں پہنچے اور پھر آٹھویں صدی میں ہندو آباد کاروں نے، سری وجے کے دورِ حکومت میں، سماترا کو اپنا تجارتی مرکز بنایا اور بارھویں صدی تک سارے بحر ہند کی تجارت پر چھائے رہے۔ یہاں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قدیم زمانے میں یونانیوں اور رومیوں کے علاوہ اہل ہند بھی بالائی نیل کے پورے علاقہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ پرانوں میں "نیل ندی" اور یہاں کی اہم جغرافیائی خصوصیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیل کے سوتے کو "امارہ" (Amara) کا نام ہندوؤں ہی نے دیا تھا۔ یہ مقام جھیل وکٹوریہ نیانزہ کے شمال مشرق میں آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اہل ہند کا ان علاقوں سے ربط ضبط تھا۔

بحر ہند کے وسیع علاقے میں عرب آبادیوں کا وجود میں آنا آباد کاری کے اس لامتناہی سلسلہ کی بس ایک کڑی ہے۔ اس کی ابتدا نویں صدی میں عمان کے فرقہ شیعہ کی آباد کاری سے ہوئی۔ پھر دسویں صدی میں شیراز کے سنیوں نے صومال کے ساحلی علاقہ پر اپنی بستیاں بسائیں اور کلوا کے بندرگاہی مرکز سے تجارت کرتے رہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ سونے، ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت تھی۔ تیرھویں صدی کے آغاز پر بحر ہند کی ساری تجارت عربوں کے ہاتھ آچکی تھی۔ مشرقی افریقہ میں اسی زمانے کے مسلمانوں کی مساجد، مقابر اور دیگر آثار ملتے ہیں۔ غرض مشرقی افریقہ کی خوش حالی اور مسلم اقتدار کا یہ دور پندرھویں صدی کے اواخر میں پرتگالیوں کی آمد تک باقی رہا۔ حالیہ تحقیق و تفتیش نے ہمیں ایک ایسے افریقی تمدن سے روشناس کرایا ہے جو انسانی تاریخ میں اپنی قدامت اور وسعت کے لحاظ سے یورپی تمدن کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خود ارتقائے انسانی میں افریقہ کا کارنامہ تاریخ ساز رہا ہے۔ اب تک افریقہ کے بارے میں جو کچھ بھی معلومات منظر عام پر آئی ہیں وہ اس وسیع بر اعظم کی تاریخ کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جب یہ پوری طرح روشنی میں آجائے گی تو نہ صرف افریقہ کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوگا بلکہ اغلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی کئی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

غلاموں کی تجارت کا دور

شمالی افریقہ میں عربوں کے داخلے اور تقریباً ایک تہائی افریقہ میں اسلام پھیلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حصہ انسانی تاریخ کے دھارے میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ جہاں کبھی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے لوگ تجارتی اور سیاسی اغراض کے تحت ملا کرتے تھے اب اسلام اور عیسائیت کے درمیان سیاسی، مذہبی اور علمی آویزش کا مرکز بن گیا۔ نیز پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ اور مصر اور مغرب کے درمیان بڑے پیمانے پر تجارت شروع ہو گئی۔ افریقہ کا سونا اور ایشیا کی تعیشات کی چیزیں مصر کے ذریعہ یورپ پہنچیں۔ اور شمالی افریقہ

میں لوہا اور عمارتی لکڑی درآمد ہونے لگی. اس کے علاوہ افریقہ نے مشرق وسطیٰ اور بعد میں یورپ غلام بھیجنے شروع کر دیے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ اور ترکی سے ہتھیار افریقہ میں درآمد ہوئے جس کی وجہ سے یہاں کا سیاسی توازن بدل گیا۔

سترھویں صدی میں ان بڑھتے ہوئے تعلقات نے نیا موڑ لیا. ایک طرف اسپینی، پرتگالی، انگریزی اور فرانسیسی سیاحوں اور مشنریوں نے سارے افریقہ کو کھنگال ڈالا. نئے نئے علاقے دریافت کیے اور دولت کے بے شمار خزانوں کا پتہ لگایا. آگے چل کر یورپی باشندوں نے یہاں کی دولت دل کھول کر لوٹی اور اپنی بستیاں بسائیں. دوسری طرف یورپ والوں نے امریکہ (شمالی و جنوبی) اور اس کے قریب جزائر میں گنے کی کاشت شروع کر کے شکر سازی کی جو صنعت قائم کی تھی اس میں بڑی ترقی ہوئی. گنے کی کاشت کے لیے ہسپانوی تاجر و زمیندار پہلے سے ہی پرتگالیوں کی مدد سے افریقی غلام درآمد کر رہے تھے. جب یورپ میں شکر کی مانگ بڑھی تو جزائر غرب الہند میں ولندیزیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے امریکہ میں شکر کی صنعت کو اور ترقی دی. امریکہ میں زراعت کو توسیع دینے اور نئے علاقے آباد کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت پڑی. چنانچہ غلاموں کی مانگ بڑھنے لگی اور یوروپین قوموں نے مغربی افریقہ میں ڈیرے جا لیے۔

اندازہ ہے کہ ۱۹۰۰ء تک امریکہ میں تقریباً نو لاکھ افریقی غلام پکڑ کر لائے گئے. سترھویں صدی میں ان کی تعداد ۲۷ لاکھ سے اوپر پہنچ گئی. اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں علی الترتیب ۷۰ لاکھ اور چالیس لاکھ غلام درآمد کیے گئے. شروع میں یہ تجارت ولندیزیوں کے ہاتھ میں تھی. بعد میں انگریز اور فرانسیسی حاوی ہو گئے. برطانیہ کا دائرۂ عمل گولڈ کوسٹ (موجود گھانا) سے گنی تک تھا فرانس کا عمل دخل سینے گال گیمبیا کے علاقے میں تھا اور پرتگالی انگولا پر چھا گئے اور برازیل کے ساتھ غلاموں کی تجارت کرتے رہے. بعد میں یہ سارے علاقے ان ملکوں کے مقبوضے (Colony) بن گئے. افریقہ کے ساتھ بیرونی دنیا کے تعلقات کی بنیاد جب تک غلاموں کی تجارت پر رہی بیرونی طاقتوں کا اثر بہت سطحی رہا. غلاموں کی تجارت اتنی منفعت بخش تھی کہ دوسری قسم کی تجارت سے یا ان علاقوں کی دوسری زرعی یا صنعتی دولت سے یورپی تاجروں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی لیکن یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہ سکتا تھا. سب سے پہلے اس کے خلاف برطانیہ میں آواز اٹھی. برطانوی تاجروں نے حماقت یہ کی کہ ان غلاموں کو خود برطانیہ میں لانا شروع کر دیا. ظاہر ہے کہ اس کا اثر لوگوں کے روزگار پر پڑنے لگا اور ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا. آخر کار ۱۸۰۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دے دیا. برطانیہ کا جب اپنا منافع بخش کاروبار بند ہونے لگا تو اس نے دوسروں پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کیا ۱۸۴۲ء میں افریقہ سے غلام باہر لے جانا بین الاقوامی قانون کے تحت ممنوع قرار دیا گیا. اگرچہ ایک مدت تک خفیہ طور پر یہ تجارت جاری رہی۔

جب غلاموں کی تجارت کا کاروبار بند ہوا یا کم ہو گیا تو برطانیہ اور دوسرے ممالک کے تاجروں نے بڑے پیمانے پر افریقہ کے اندر کھوج کاروں (Explorers) کی مہمیں منظم کرنا شروع کیں. (۱۷۹۵-۱۷۹۷ء) میں دریائے نائجر کے ساتھ ساتھ کھوج کی گئی. ۱۸۵۰-۱۸۸۵ء میں وسطی اور مغربی سوڈان کو مہمیں بھیجی گئیں. اس میں انگریز سب سے آگے تھے اس کے علاوہ کئی مشنری گروہوں نے انیسویں صدی میں مغربی، مشرقی اور جنوبی افریقہ کے بڑے حصہ کو چھان ڈالا. یہ کام اتنا نفع بخش تھا کہ خود حکومتوں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا. برطانیہ کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی (Royal Geographical Society) نے اس مہم کو بڑے پیمانے پر منظم کیا اور دریائے نیل کے جنوبی حصے، دریائے زمبائے، دریائے کانگو اور جھیل ٹانگا وغیرہ میں تفصیلی کھوج کروائی. اور اسی کے ساتھ ساتھ یہاں کی زمینوں، معدنی ذخائر اور علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا. اس طرح سارے افریقہ میں جگہ جگہ سفید فاموں کی بستیاں بسنے لگیں۔

اٹھارھویں صدی کے آخر تک شمالی افریقہ کی اسلامی مملکتوں اور یورپ کی عیسائی طاقتوں کے درمیان توازن ٹوٹنے لگا اور یورپ کی طاقتوں کا زور بڑھنے لگا. صنعتی ترقی اور بڑھتی تجارت نے انہیں بہت طاقتور کر دیا۔

انیسویں صدی میں یورپ نے زبردست صنعتی ترقی کی. اسے ضرورت ہوئی ایک طرف اپنے مال کے لیے منڈی کی اور دوسری طرف کچے مال کی. اس معاشی ضرورت نے یورپیوں کو گھروں سے نکالا انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی طرف پہلے تجارت اور پھر سیاسی کنٹرول اور استحصال کے لیے رخ کیا۔

یورپی ملکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باوجود ۱۸۷۹ء تک شمالی افریقہ کا بہت کم حصہ ان کے قبضہ میں تھا. شمالی افریقہ میں الجیریا پر فرانس کا قبضہ ہو گیا تھا. اور مصر اور تیونس پر یوروپی کنٹرول کی شروعات ہوئی تھی. مغربی افریقہ میں جہاں یوروپین چارسو سال سے تجارت کر رہے تھے صرف سینے گال، فرانس اور گولڈ کوسٹ برطانوی کالونی بنی تھی انگولا موزمبیق اگرچہ پرتگالی اثر میں تھے لیکن ان کے زیر اقتدار نہ تھے. مشرق میں زنجبار پر برطانوی اثر تھا اور مدغاسکر فرانسیسی قبضہ میں آگیا تھا. اصلی معنوں میں صرف جنوبی افریقہ سفید فاموں کے پورے کنٹرول میں تھا لیکن بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے یورپی ملکوں نے تقریباً سارے افریقہ کو آپس میں بانٹ لیا. چالیس سیاسی یونٹوں میں سے صرف چھ ان کے چنگل سے بچے تھے اور ان چھ میں سے بھی چار برائے نام آزاد تھے۔

اس طرح پورا افریقہ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور پرتگال کے درمیان تقسیم ہو گیا. اسپین اور بلجیم کے ہاتھ بھی کچھ علاقہ آیا. ان علاقوں میں ان ملکوں نے اپنا پورا انتظامی ڈھانچہ قائم کیا. نقل و حمل کے لیے سڑکیں اور ریلیں بنیں. فوج اور پولس ہر جگہ پھیل گئی. ہر قسم کی مقامی مزاحمت کا خاتمہ کر دیا گیا. سیاسی طور پر اقتدار ہر منزل پر سفید فاموں کے ہاتھ آیا. تمام زمینیں، کانیں اور پیداوار کے تمام وسائل سفید فام حکمرانوں کی ملکیت بن گئے. مقامی افریقی باشندوں کی حالت غلاموں کی سی ہو گئی یعنی انہیں نہ صرف ہر قسم کے ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا. مثلاً ٹانگانیا میں سیسم گھانا میں کوکو، سوڈان میں کپاس، صومالی میں کیلا۔

پہلی جنگ عظیم تک یورپ کے ممالک اتنی ترقی کر چکے تھے کہ موجودہ مقبوضے (Colonies) ان کے لیے کافی نہیں تھے. خاص طور پر جرمنی جیسے ممالک کے لیے جن کے پاس افریقہ میں صرف دو چھوٹے مقبوضے تھے چنانچہ دنیا کی تقسیم جدید کے لیے ۱۹۱۴ء میں یورپی ممالک کے درمیان آپس میں جنگ شروع ہو گئی جس میں بقیہ دنیا کو گھسیٹ لیا گیا. جرمنی کو شکست ہوئی. فاتح برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے نہ صرف جرمنی کے افریقی مقبوضات پر قبضہ کر لیا بلکہ جرمنی کے حلیف ترکی کے عرب علاقے بھی آپس میں بانٹ لیے پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان اس سلسلہ میں صرف ایک ہی واقعہ پیش

آیا۔ ایتھوپیا جو ایک آزاد ملک رہ گیا تھا اس پر اٹلی کے فاشسٹ حکمران مسولینی نے قبضہ کر لیا۔

آزادی کی لہر

دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس نے اپنی نوآبادیوں اور مقبوضات کے معاشی اور انسانی وسائل دل کھول کر استعمال کیے۔ ان علاقوں کی انتہائی پست معیشت پر جب جنگ کا اتنا بوجھ پڑا تو یہ قدرتی بات تھی کہ ان ملکوں میں بے چینی بھی بہت بڑھ گئی۔ فرانس پہلے ہی سے ہٹلر کے قبضہ میں آگیا تھا جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس دونوں نے اپنے مقبوضات پر پھر سے مکمل اقتدار جمانے کی کوشش شروع کی لیکن یہ اب اتنا آسان نہیں تھا۔

جنگ کے بعد خود یورپ میں زبردست انقلابی لہر اٹھ کھڑی ہوئی فرانس، اٹلی، وغیرہ میں پرانی قسم کی حکومتیں باقی رکھنا مشکل ہو گیا۔ ایشیا کے تقریباً تمام مقبوضات یعنی ہندوستان، برما، انڈونیشیا، ہند چین وغیرہ میں آزادی کی تحریکوں نے بڑی وسیع شکل اختیار کر لی اور بعض ملکوں مثلاً انڈونیشیا اور ہند چین میں تو باقاعدہ مسلح جد وجہد شروع ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کو ہندوستان کو آزادی دینی پڑی اور اس کے بعد برما، سیلون، انڈونیشیا، اور پھر مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی آزادی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس قدر تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات کا اثر افریقہ پر پڑنا ضروری تھا چنانچہ سامراجی قلعہ پر پہلا وار مصر نے کیا۔ ۱۹۵۲ء میں مصر کے فوجی افسروں نے کرنل جمال عبدالناصر کی سرکردگی میں انگریزوں کی محکوم شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ کر مصر کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے نہر سوئز کو قومی ملکیت بنا کر اور برطانیہ اور فرانس کے چنگل سے آزاد کر کے پورے افریقہ کی آزادی کا راستہ کھول دیا۔ برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کے ساتھ مل کر اس دھارے کو روکنے کی کوشش کی اور مصر پر حملہ کیا لیکن اس وقت تک بین الاقوامی توازن اتنا بدل چکا تھا کہ انہیں الٹے پاؤں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس حملہ کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج کی زبردست لہر اٹھی مصر کی مدافعت میں سوویت یونین نے مداخلت کی دھمکی دی اور امریکہ نے برطانیہ و فرانس کے اس جارحانہ اقدام کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مصر میں آزادی کی طاقتوں کی اس فتح سے تنزانیہ، کینیا، کانگو، تونس، مراکش، الجزائر وغیرہ میں آزادی کی جنگ تیز ہو گئی۔ فرانس نے الجیریا کی جد وجہد کو زبردستی کچلنے کی کوشش کی۔ دس لاکھ الجیری جانبازوں نے جان دی، لاکھوں زخمی ہوئے یا جیل گئے لیکن انہیں زیر نہیں کیا جا سکا۔ اور فرانس کو یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ افریقہ کے لوگوں کو غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ بتدریج تمام مقبوضوں نے آزادی حاصل کر لی۔

برطانیہ نے ایک آخری مورچہ کینیا میں لیا۔ وہاں گوریلا لڑائی اتنی طویل اور تیز ہو گئی کہ آخر کار برطانیہ کو پورے مشرقی افریقہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ تھوڑے دن اس نے وسطی افریقہ میں پینترے بازی کی لیکن آخر کار زیمبیا اور ملاوی (نیاسالینڈ) کو آزادی دینی پڑی۔ اس علاقہ میں آخری ملک جو انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا وہ (زمبابوے) تھا۔

برطانیہ، فرانس، بلجیم کو آہستہ آہستہ اپنے مقبوضات سے ہٹنا پڑا لیکن پرتگالیوں نے آخر وقت تک اپنے مقبوضات کو چھوڑنے سے انکار کیا۔ اس کے اہم مقبوضات انگولا، موزنبیق اور گنی بساؤ میں تقریباً پندرہ سال تک مسلح جد وجہد چلتی رہی۔ آزادی پسند طاقتوں نے علاقے آزاد کر والئے اور ان کا اثر اور دباؤ خود پرتگال کی معیشت اور سیاست پر اتنا پڑا کہ آخر کار عوام اور فوج میں اندرونی بغاوت کی وجہ سے سامراجی فاشسٹ حکومت کا تختہ الٹ گیا گنی بساؤ اور موزمبیق آزاد ہو گئے۔ انگولا کی آزادی کو سامراجی ملکوں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بھی آزاد ہو کر رہا۔

افریقہ میں اب جنوبی افریقہ اور نمیبیا جس پر جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کا کنٹرول ہے سامراج کے آخری مورچے رہ گئے ہیں۔ اسے باقی رکھنے کے لیے انہیں یورپی ملکوں اور ناٹو سے زبردست معاشی اور فوجی امداد مل رہی ہے لیکن جو دھارا سارے افریقہ میں رک نہ سکا وہ یہاں بھی نہیں رکے گا۔ اسی لیے اندرونی طور پر سخت مظالم و تشدد اور گولی باری کے باوجود آزادی کی تحریک تیز ہو رہی ہے اور بیرونی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ناوابستہ ممالک کی انجمن نے ان ممالک کو آزاد کرانے کی ٹھان لی ہے۔ اس مہم میں ہندوستان پیش پیش ہے جنوبی افریقہ کی گوری حکومت کے خلاف عالمگیر رائے عامہ دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب ان ملکوں سے بھی سفید فام حکمرانوں کا اقتدار ختم ہو گا اور آزادی کا سورج چمکے گا۔

تاریخ یونان (قدیم)

یونان دنیا کی عظیم تہذیب کے گہوارہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ حجری دور کے اختتام پر قدیم شہری ریاست آگامیمنان (Agamemnon) میں میسنائی (Mycenaean) تمدن کو کانسیائی دور (Bronze Age) میں عروج حاصل ہوا۔ اور شاندار عمارتیں بنیں۔ یہ عمارتیں منونیوں (Minoans) کی تعمیر کی ہوئی تھیں۔ کریٹ میں جن کا تمدن ماقبل تاریخ دور میں مشہور تھا۔ منونیوں کے جانشین اکیائی (Achaeans) ہوئے اور بعد کو ڈریائی آئے۔ جنوب مشرق پیلوپونیز (Peloponese) کے علاقے کو جسے ڈورس (Doris) بھی کہا جاتا تھا اور جس میں کریٹ (Crate) اور رہوڈس (Rhodes) شامل تھے، ان لوگوں نے گیارہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ اپنا وطن بنایا تھا اور یہی لوگ بعد کو ہیلنی (Hellenes) کہلانے لگے اور یونان سے ان کی آبادیاں ایشیائے کوچک، اٹلی، سسلی اور بحرۂ ایجین (Aegean) کے جزیروں تک بلکہ بحر متوسط کے یورپی اور ایشیائی ساحل کے اطراف پھیل گئی تھیں۔ قدیم یونان کے اس وسیع خطے میں تمدن سے مالا مال شہر آباد ہوتے رہے۔ یہ وہی یونان ہے جس کی تصویر ہومر (Homer) (۸۳۰ ق م) نے ایلیڈ اور اوڈیسی (Iliad And – Odyssey) میں کھینچی ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں کریٹ تمدن کے جواب میں اگر کوئی اور تمدن تھا تو وہ یونان کا تھا، جسے ہیلاس (Hellas) کہا جاتا تھا۔ یہ متعدد شہری ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اکثر شہری ریاستیں جزیروں پر واقع تھیں اور ساحل کے کنارے کنارے بکھری ہوئی تھیں۔ بڑی سے بڑی شہری ریاست انگلستان کی کونٹی (County) (ضلع) سے چھوٹی تھی اور بعض کا حلقۂ اثر تو صرف شہر اور اس کے اطراف و جوانب تک محدود ہوتا تھا۔ ایتھنس (Athens) یونان کے سب سے بڑے شہروں (سلطنت) میں گنا جاتا تھا۔ عروج کے زمانے میں اس کی آبادی کم و بیش تین لاکھ تھی۔ بہت کم شہر ایسے تھے جن کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کرتی ہو۔ عام طور پر آبادی کا نصف یا زائد حصہ غلاموں اور اجنبی لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ آزاد شہریوں کے گروہوں میں اندازاً دو تہائی عورتیں اور بچے تھے۔ ہر سٹی اسٹیٹ (شہری ریاست) ایک

مقتدر اعلیٰ ریاست تھی۔ ہر قسم کے وفاق سے آزاد۔ یہ ریاستیں اولمپک کھیلوں میں حصہ لیا کرتی تھیں اور سب کی ایک مشترکہ زبان تھی۔

وہ بادشاہ جنہوں نے ان میں سے بہت سی ریاستوں پر حکومت کی تھی ناپید ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ان حکمرانوں نے لے لی تھی جنہیں یونان میں جابر فرمانروا (Tyrants) کہا گیا ہے۔ بہت سے شہروں میں طاقتور اشخاص سماجی تصادم یا جماعتی رنجشوں سے فائدہ اٹھا کر خود مختار حکمران بن جاتے تھے۔ یہ جابر حکمران تھے ان میں اور بادشاہ میں یہ فرق تھا کہ بادشاہ حکومت کا مطالبہ کسی نہ کسی قسم کے موروثی حق یا خاندانی فوقیت کی بنا پر کرتے تھے۔ جابر فرمانروا کو شاید عوام کے ایسے غریب طبقہ کی حمایت حاصل رہتی تھی جو امیروں کی دست درازی کا شکار تھے۔ لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک جابر حکمراں امیر طبقہ کی تائید میں غریبوں کے خلاف کھڑا ہو گیا ہو۔

ہر شہری ریاست دوسری شہری ریاست سے برسرپیکار رہا کرتی تھی۔ ان ریاستوں میں تجارتی تعلقات قائم تھے اور اکثر شہروں کے محل وقوع کے اعتبار سے سمندری راستوں سے تجارت ہوتی تھی۔ ان شہری ریاستوں میں ایتھنس، اسپارٹا (Sparta)، کورنتھ (Corinth) اور تھیبس (Thebes) کو ممتاز مقام حاصل تھا۔

اس سرزمین میں فن کاروں، ادیبوں، فلسفیوں اور دانشوروں کی کمی نہ تھی۔ فن وادب کو وہ فروغ حاصل ہوا جس کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں نہیں ملتی۔ فن تعمیر، مجسمہ سازی، شعری ادب، اداکاری، اور رقص میں ایسے تصورات، آسانگی اور فکر وخیال کی نزاکتوں، نیز فلسفہ اور سیاسیات اور بعض سائنسی معلومات پر مشتمل ذخیروں سے عالمگیر تمدن کی آبیاری و فروغ میں مدد ملی ہے۔

اس عظیم تمدن کی نشوونما پانچویں صدی قبل مسیح میں پریکلیس (Pericles) (وفات ۴۲۹ ق م) کے عہد میں ایتھنس میں ہوئی تھی۔ تاریخ میں اس دور کو ایتھنس کے فن وادب کا سنہری دور کہتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب ایران کے خلاف لڑائیوں میں یونانیوں نے سمندر میں اور خشکی پر اپنی شجاعت کے لیے لاثانی شہرت حاصل کی۔ ایتھنس سے ۲۲ میل دور مراتھان (Marathon) کے مقام پر ۴۹۰ ق م میں انہوں نے ایرانی فوجوں کو شکست دی تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں زبردست خطرہ کے تحت متحد ہو جاتی تھیں لیکن یہ اتحاد کبھی دیرپا نہ ہوتا۔ چھوٹے اور کمزور شہر ایتھنس یا کسی دوسرے طاقتور شہر کی سرپرستی میں آجاتے اور ایسا بھی ہوتا کہ اختلافات کو دور کرنے کے لیے ڈیلین لیگ (Delan League) جیسی انجمنیں قائم ہوتیں لیکن رقابتیں ایسی شدید تھیں کہ کسی ایک ریاست کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا تھا یہی وجہ ہے کہ (۴۳۱ ق م) میں ایتھنس اور اسپارٹا اس عظیم کشمکش میں داخل ہو گئے جو پیلوپونیشین (Peloponnisian) جنگ کہلاتی ہے۔ یہ ۴۰۴ ق م میں ایتھنس کی شکست پر ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک امتیازی وقت بھی ختم ہو گیا کچھ عرصہ کے لیے اسپارٹا اور اس کے بعد تھیبس طاقتور شہری ریاستیں بن گئیں۔

اسپارٹا اور ایتھنس

بعض شہری ریاستیں حکمرانی کے بہترین اصولوں کو وضع کرنے اور جمہوریت کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں سرزمین یونان کے دو شہروں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان میں سے اسپارٹا نے نہایت سخت نظم وضبط کے نظام کو فروغ دیا۔ اس نے شہر کے مردوں کو ابتدائی عمر ہی سے بارکوں میں رکھا اور تربیت دی۔ اس طرح سپاہیوں کی ایک نسل پیدا ہوگئی۔ لیکن اہل یونان اسپارٹا سے ڈرتے اور اس کے سخت نظام کو ناپسند کرتے تھے۔ اسپارٹوں کے نزدیک اپاہج اور بیکار لوگ ختم کر دینے کے لائق تھے کیوں کہ وہ سماج پر ایک بوجھ ہوتے تھے۔

دوسرا ممتاز شہر ایتھنس تھا۔ ۵۹۴ ق م کے لگ بھگ سولن (Solan) نامی ایک شخص کو اعلیٰ عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا اور اس کو حسب منشا اصلاحات عمل میں لانے کی آزادی دی گئی۔ اس نے ایسے قوانین نافذ کیے جو نہ صرف نئے تھے بلکہ سخت بھی تھے۔ ان قوانین کو ستونوں پر کندہ کرا کے ایسے مقامات پر نصب کیا گیا جہاں عوام جمع ہوتے تھے تاکہ لوگوں کو ان قوانین کی اہمیت کا اندازہ اور شہریوں کو ان کے حقوق کا علم ہو جائے۔ اس طرح سولن کے قانون سے ایسی عظیم اصلاحات نافذ ہو سکیں جنہوں نے جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔

ایتھنس میں عوامی مدارس نہیں تھے جب ایک لڑکا بڑا ہو جاتا تو ایک غلام کی نگرانی میں اسے ایک خانگی استاد کے گھر بھیجا جاتا تھا جہاں اسے لکھنا پڑھنا، حساب اور کچھ موسیقی کی تعلیم دی جاتی۔ دوسرے مرحلہ میں وہ گرامر، ڈرائنگ اور جیومیٹری سیکھتا اور شاعروں کے کلام کے طویل حصے حفظ کرتا جسمانی ورزش اور کھیل کود پر بڑی توجہ دی جاتی جس میں باکسنگ، کشتی، دوڑ، چھلانگ اور برچھی اور وزنی چکر پھینکنا شامل تھے۔ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس اسپارٹا میں علم وادب کی تحصیل میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا جاتا تھا نوجوانوں کو جاں گسل اور سخت فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اسپارٹائی زندگی جفاکش کے ہم معنی سمجھی جانے لگی تھی۔ سقراط ایتھنس کے سب سے بڑے مفکروں میں تھا۔ اس کا سب سے مشہور شاگرد افلاطون تھا۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو نے مختلف موضوعات پر بہت سی عارفانہ کتابیں لکھیں جو عرصہ تک انسانی معلومات کے لیے ایک قاموس کا کام کرتی رہیں۔ پندرہ صدیوں بعد اطالوی شاعر ڈانٹے (Dante) نے ارسطو کا نام عالموں کا استاد (The Master of Those That Know) رکھا۔

ایتھنس کے باشندوں نے متعدد چمکدار سنگ مرمر کی عبادت گاہیں تعمیر کیں جیسے پارتھینان (Parthenon) کی عبادت گاہ ان عبادت گاہوں کو خوبصورت تصاویر اور مجسموں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ یہ معابد اب کھنڈر ہو گئے ہیں۔ موسمی اثرات کی وجہ سے نقاشی اور رنگ ریزی کے آثار مٹ گئے ہیں۔ یہاں کے بہت سے مجسمے پیرس، لندن اور دوسرے مقامات کے عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

مقدونیہ (Macedonia)

مقدونیہ، یونان کے شمال میں ایک شہری ریاست تھی ۳۵۹ ق م میں فلپ مقدونی یہاں کا حکمراں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب یونان کی دوسری شہری سلطنتیں آپس میں دست وگریباں تھیں اور انہیں شاہ ایران کا خطرہ لاحق تھا۔ فلپ نے مقدونی قبائل کی مدد سے دوسری شہری سلطنتوں کو مطیع کر لیا۔ فلپ نے مقدونیہ کے لوگوں کو اخلاقی اور فوجی تربیت دی اور دوسری یونانی سلطنتوں کو ایک وفاق قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا اس دوران اس نے اپنے لڑکے سکندر کو زمانے کے بہترین اساتذہ سے جن میں سب سے مشہور ارسطو تھا، تعلیم وتربیت دلوانے کا انتظام کیا۔ سکندر نے تیزی کے ساتھ شاعری، طب، سیاست اور مابعدالطبیعات میں مہارت حاصل کی۔ اس نے

قابل تعریف حد تک فکر صحیح اور اظہار خیال کی استعداد پیدا کرلی۔ ساتھ ہی وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی وہ گہری دلچسپی لیتا تھا۔ کم عمری ہی میں اسے ایک بڑی سلطنت قائم کرنے کی امنگ تھی۔ لیکن سلطنت کے متعلق اس کا نقطہ نظر صرف فوجی نوعیت کا نہ تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی سلطنت ایک تحریک فلسفہ کی حامل ہو اور وہ ایک ایسی عوامی انجمن ہو جو انسانی بہبود کے تصور پر قائم ہو۔

سکندر اعظم
(۳۵۶ - ۳۲۳ ق م)

۳۳۶ ق م میں فلپ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سکندر بیس سال کی عمر میں مقدونیہ کا بادشاہ ہوا۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ یونان کی شہری بغاوتوں کو ختم کیا جائے۔ جب وہ تھیبس، ایتھنس اور دوسری ریاستوں کو مطیع کر چکا تو اسے کورنتھ (Corinth) میں اپنے باپ کی طرح یونان کی ریاستوں کا کپتان جنرل بنا دیا گیا۔

ابتدائی فتوحات
(۳۳۴ - ۳۳۳ ق م)

ایک منصوبہ کے تحت جو اس کے باپ کو عزیز تھا، سکندر نے وسیع ایرانی سلطنت پر حملہ کا تہیہ کر لیا۔ سب سے پہلے (۳۳۴ - ۳۳۳ ق م) اس نے ایشیائے کوچک کے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد نسبتاً آسانی کے ساتھ اس نے فینیشیا (Phoenicia) اور شام کو فتح کر لیا۔ حالانکہ ٹائر (Tyre) کے مقام پر اس کو زبردست مقاومت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہرکیف اس نے بحری بیڑے کی امداد سے غلبہ حاصل کر لیا اور شہر کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد سکندر نے مصر کا رخ کیا لیکن مصر نے کسی لڑائی کے بغیر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ شہر اسکندریہ (Alexandria) کی بنیاد رکھنے کے بعد وہ شام سے گزرتے ہوئے ایران کے حدود میں داخل ہو گیا اور میسوپٹامیہ (Mesopotamia) سے گزر کر وادئ دجلہ تک بڑھتا چلا گیا۔ اس نے سا سہ (Sasa) اور اسطخر (Persipolis) ایکدے ٹانا (Ekdetane) اور دوسرے ایرانی شہروں اور ان کے خزانوں پر قبضہ کیا اور بحیرۂ کیسپین (Caspean Sea) تک پیش قدمی کی۔ وہ وحشی قبائل جو کیسپین کے ساحل پر آباد تھے اس کی علم برداری میں آگئے۔ اس نئی سلطنت کو سکندر نے صوبوں میں تقسیم کیا۔ صوبوں میں اس کی روایات اور اداروں کو برقرار رکھا۔

اقتدار کا استحکام
(۳۳۲ - ۳۳۰ ق م)

۳۳۲ - ۳۳۰ ق م کے دوران سکندر اعظم نے ایران کے خلاف اپنی شاندار پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے دجلہ اور فرات کو پار کیا اور نہاوند کی پہاڑیوں میں ایرانی شہنشاہ دارا کی دس لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج سے فیصلہ کن جنگ کی۔ دارا کو شکست ہوئی وہ اپنے گورنر بیسوس (Bessus) کی سازش کا شکار ہو گیا۔ سکندر نے دارا کی بیوی بچوں کے ساتھ حسن سلوک کیا گورنر بیسوس (Bessus) بچ نکلا لیکن آخرکار دارا کے خلاف سازش کے الزام میں سکندر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

ایران کی فتح کے خاتمہ کا پہلا اہم واقعہ یہ ہے کہ یونانی حلیف ریاستوں کی افواج کو سکندر نے خدمت سے سبکدوش کر دیا اور انہیں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ سکندر اعظم کے تحت نہ صرف مشرق و مغرب سیاسی طور پر متحد ہو گئے بلکہ ایک شخص کی مشترکہ وفاداری نے مشرق و مغرب کے تمدن اور فلسفے کو ہم آہنگ کر دیا۔

ہندوستان میں داخلہ
(۳۲۷ - ۳۲۶ ق م)

اس کے بعد سکندر ہندوستان میں داخل ہوا اور اٹک کے قریب دریائے سندھ عبور کر کے پورس پر فتح حاصل کی۔ جب پورس سے پوچھا گیا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے تو اس نے کہا "جیسا بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں"۔ سکندر نے اسے بحال کر دیا۔ کچھ اور فتوحات کے بعد واپسی کے لیے اس نے کشتیوں کا ایک بیڑا بنوایا جس سے راوی، چناب اور دریائے سندھ میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے ساحل تک پہنچا وہاں سے بندر عباس پر اتر کے پایۂ تخت سا سہ (Sasa) ۳۲۴ ق م میں وارد ہوا۔ یہاں اپنے قیام کے دوران اس نے اپنی وسیع سلطنت کا نظم و نسق اپنے شاندار تجربوں کی روشنی میں منظم کیا۔ اور ساتھ ہی مقامی روایات اور عقائد اور اداروں کو امکانی حد تک باقی رکھا۔

ایک جشن کا سامان منایا گیا جس میں اور باتوں کے علاوہ سکندر نے دارا کی لڑکی سے شادی کر لی۔ ۳۲۴ ق م میں سکندر واپس بابل پہنچا، اس دوران اس نے عرب ممالک پر ایک مہم بھیجنے کا منصوبہ تیار کیا تھا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس نے ۳۳ سال کی عمر میں ۱۳ جون ۳۲۳ ق م کو وفات پائی۔

سکندر اپنی شخصی عظمت، سیاسی تصورات اور فوجی صلاحیت کی بدولت دنیا کے صف اول کی شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ یونان کی تہذیب کو اس نے اپنے زور بازو سے حاصل کی ہوئی عظیم سلطنت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیلا دیا لیکن اس سلطنت کے مختلف حصوں میں باہم ربط پیدا کرنے کے لیے اس کے پاس وقت بہت کم تھا اور اس کی وفات پر یہ سلطنت سرعت کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے سپہ سالاروں نے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ یونانی تہذیب مشرقی بحرۂ متوسط کے تمام علاقوں میں اور ایشیا میں دریائے دجلہ (Tigris) کے اس پار دور تک پھیل گئی تھی۔

مقدونیہ کی برتری کو، دوسری صدی قبل مسیح میں، روس نے چیلنج کیا اور ۱۴۲ ق م میں یونان جس کی عظمت ختم ہو چکی تھی عظیم سلطنت روما کا ایک حصہ بن گیا۔ روما نے یونان کی تہذیب اور شائستگی سے بہت کچھ سیکھا۔

اب جبکہ رومائی سلطنت منقسم ہو گئی تو یونان مشرقی سلطنت (روما) میں شامل کر لیا گیا۔ زبان اور رسم و رواج کے اعتبار سے یہ سلطنت یونانی تھی نہ کہ لاطینی۔

۱۲۰۴ء میں بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے ساتھ ہی یونان رومائی شاہی حکومت کا ایک جزو بن گئی لیکن قسطنطنیہ کے شہنشاہ نے تقریباً ۱۳۰۰ء میں اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ پندرہویں صدی میں ترکوں نے اسے فتح کر لیا اور انہوں نے انیسویں صدی تک اس پر اپنا تسلط قائم رکھا لیکن وینس (Venice) میں مغربی سلطنت روما کی مخالفت کے باعث ترکوں کا اقتدار درہم برہم ہوتا رہا۔

تاریخ سلطنت روما

آٹھویں صدی قبل مسیح میں روم بعض پہاڑوں پر جہاں سے دریائے ٹائی بر (Tiber) صاف نظر آتا ہے، ایک چھوٹی سی قوم کی حیثیت سے بس گئے۔ رفتہ رفتہ

انہوں نے جزیرہ نمائے اٹلی (اطالیہ) فتح کر لیا، اپنی سلطنت کو بحر متوسط تک توسیع دی اور سارے یورپ پر اور بحر اوقیانوس تک اپنے حدود پھیلا دیے۔ ان کی فتوحات سے ایک طرف ان کی قلمرو وسیع ہوئی تو دوسری طرف انہوں نے دنیا کی عظیم اقوام پر تہذیب و تمدن کے نہ مٹنے والے اثرات چھوڑے۔ بحر متوسط پر مبنی ان کی عظیم سلطنت پانچویں صدی عیسوی کے اواخر تک قائم رہی۔

ایک روایت کے مطابق روم کی بنیاد ۷۵۳ ق م میں رکھی گئی تھی۔ اس کے سب سے پہلے باشندے ایک لاطینی نسل کے لوگ تھے چند سال بعد ان لوگوں نے اپنے آپ کو سبائینو (The Sab ines) کے ساتھ ملا لیا۔ اور متواتر جنگوں کے باعث اس علاقے میں جہاں وہ رہتے تھے شہرت حاصل کر لی۔ دریائے ٹائی بر کے دھانے پر شہر اوسٹیا (Ostia) بسانے سے حکومت کا اقتدار دوسری سمتوں میں پھیلتا گیا۔ سات بادشاہوں کے سلسلے کے آخری بادشاہ تارکن (Tarquin) ۵۲۹ ق م کو جلا وطن کر دیا گیا اور شہر روم ایک جمہوریہ بن گیا۔

دور جمہوریت

بادشاہوں کے ہٹا دینے کے بعد جمہوریہ کے دو اعلیٰ حکام ہر سال کونسل (Counsil) کے نام سے منتخب ہوتے جو مل کر انتظامیہ کو چلاتے۔ ان کے تحت بہت سی فتوحات حاصل ہوئیں۔ جن کے نتیجے میں تارکن کے اخراج کے کم و بیش دو سو سال بعد تقریباً پورے اٹلی پر روم کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس حکومت نے یونان کے زوال کا پورا فائدہ اٹھا کر خود کو بہت مضبوط کر لیا ہے۔

کارتھیج کے ساتھ جنگیں

۲۶۴ ق م سے کارتھیج کے ساتھ روم کی جنگیں شروع ہوئیں۔ یہ شہر (۲۶۴ - ۱۴۳ ق م) ساحل پر اس جگہ واقع تھا جہاں اب تینس (Tinis) ہے قصص و روایات کے بموجب ملک شام کے ساحل پر رہنے والے فینیشن لوگوں (Phoenicians) نے اس کو آباد کیا تھا۔ یہ فینیشائی نو آبادی، دو اعلیٰ قسم کی بندرگاہوں چند نفیس عمارتوں اور دس لاکھ کی آبادی والے ایک خوش حال شہر کی مالک تھی۔ ۳۰۰ ق م کے لگ بھگ کارتھیج ایک بڑی سلطنت کا مرکز بن چکا تھا جس میں بحر متوسط کا افریقی ساحل اور اسپین، کارسیکا (Carsica) اور سارڈی نیا (Sardinia) کے ساحلی علاقے شامل تھے اس کی تجارت دنیا کے ایک بڑے حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔

روم کا زبردست حریف کارتھیج تھا۔ ان دونوں کے درمیان پونک جنگیں (The Ponic Wars) سسلی (Sicily) پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے شروع ہوئیں۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک ۲۶۴ —— ۱۴۶ ق م) جاری رہا پہلی اور دوسری جنگ میں تو کارتھیج نے شکست کھائی لیکن کارتھیج کے ہنی بال (Hannibal) کی غیر معمولی ذہانت نے روم کے وسائل کو انتہائی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا تیسری جنگ میں تین سال کے محاصرے کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور ۱۴۶ ق م میں شہر کو مسمار کر دیا گیا۔

اس طرح روم نے جو اس وقت تک مضبوط بحری طاقت بن چکا تھا بر اعظم یورپ سے باہر اپنا پہلا علاقہ حاصل کر لیا پھر سسلی اور اس کے بعد کارسیکا نیز سارڈی نیا پر اس کا قبضہ ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے یونان پر حملہ کر کے مقدونی سلطنت (The Macedonian Kngdom) کو تباہ کر دیا۔ رومی افواج ایشیائے کوچک میں بھی فتح یاب ہوئیں۔ اسپین اور پھر گال (فرانس) رومی حلقۂ اثر میں آ گئے اور افریقہ میں رومی مقبوضات کو وسعت دی گئی۔

یہ تمام فتوحات مہم پسند جنرلوں کے کارنامے تھے۔ جن میں دو نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ پامپی (Pampey) اور جولیس سیزر (Julius Caesar) سیزر کی پیدائش کے وقت روم ایک وسیع سلطنت کا مرکز تھا۔ جس میں اسپین، گال کا ایک حصہ، اٹلی یونان، مشرق میں ایران تک کے علاقے اور شمالی افریقہ شامل تھے۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت داخلی انتشار کا شکار تھی۔ سیزر (۱۰۲ - ۴۴ ق م) نے فرانس کو جو اس زمانہ میں گال کہا جاتا تھا، فتح کیا۔ پامپی نے مشرق کا رخ کیا اور وہاں کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ دونوں میں شدید رقابت تھی۔ دونوں حوصلہ مند اور جاہ طلب تھے۔ اور کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے انجام کار سیزر نے یونان میں فارسالس (Phars - alus) کے مقام پر پامپی کو (۴۸ ق م میں) شکست دی اور رومی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ رومیوں کی فتوحات کا آخری دور اس وقت شروع ہوا جب جولیس سیزر نے ۵۸ ق م میں گال کو مطیع کیا۔ سیزر نے گال کی فتح کو مستحکم کرنے کے لیے برطانیہ کی فتح کو ضروری قرار دیا چنانچہ ۵۵ ق م میں اس نے آبنائے ڈوور پار کر کے کینٹ پر اپنی ایک چھوٹی سی فوج اتار دی۔ برطانویوں نے اس کی کامیاب مقاومت کی اس لیے دوسرے سال سیزر نے ایک بڑی فوج ساحل پر اتاری اور ٹیمز کے کنارے پر رہنے والے سرداروں کو مطیع کر کے گال واپس لوٹ گیا ۴۶ ق م میں سیزر نے اپنے آپ کو ڈکٹیٹر بنا لیا لیکن دو سال بعد اسے قتل کر دیا گیا۔

دور شہنشاہیت

سیزر کا جانشین اس کا بھتیجا آکٹے ویئس (Octavian us) ہوا جو آگسٹس سیزر (Augustus Caesar) کے لقب سے ۲۷ ق م میں روما کا پہلا شہنشاہ ہوا۔ اس مرتبہ پر وہ مارک انٹونی (Mark Antony) اور دوسرے حریفوں کو زیر کرنے کے بعد پہنچا تھا۔ اسے سب سے بڑی فتح ۲ ستمبر ۳۱ ق م کو یونان میں اکیٹم (Acti-um) کے مقام پر حاصل ہوئی تھی۔ جہاں اس نے انتھونی (Anthony) اور کلوپٹرا (Cleopatra) کو شکست دی۔ سلطنت روما بحر متوسط کے اطراف و اکناف پھیلی ہوئی تھی اور اس میں جنوبی اور شمالی مغربی یورپ، ایشیائے کوچک اور افریقہ کا ایک کنارہ شامل تھا جسے مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا آگسٹس اور اس کے فوری بعد کے جانشینوں نے دانش مندی اور اعتدال کے ساتھ حکومت کی سربراہی کے ساتھ جو اس کی سرحدوں کے پرے رہا کرتے تھے لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن خود سلطنت کے اندر امن و سکون تھا آگسٹس کا دور عظیم ادبی سرگرمیوں کا دور تھا۔

آگسٹس کے بعد ۱۱ ق م میں ٹائی بے ریس (Tiberius) شہنشاہ ہوا اس کے جانشین شہنشاہوں میں کیلی گولا (Cali Gula) نیرو (Nero) اور ڈومیشین (Domition) شامل ہیں

نیرو (Nero)

نیرو ۱۳ دسمبر ۳۷ء کو انیٹم (Antium) میں پیدا ہوا شہنشاہ کلاڈیس (Cladius) نے ۵۰ء میں اسے متبنیٰ بنایا تھا۔ کلاڈیس کے بیٹے بریٹانکس کو ہٹا کر نیرو ۵۴ء میں شہنشاہ بن گیا۔ اس کا دور حکومت متواتر قتل و خون کے باعث بدنام رہا جن لوگوں کو بھینٹ چڑھایا گیا ان میں اس کی ماں اور دو بیویاں اور خود بریٹانکس شامل ہے۔ روم کو آگ لگانے کا الزام اس نے عیسائیوں پر لگایا۔ اور بڑی تعداد میں انہیں قتل کروا ڈالا۔ بعد میں اس نے ایک عالی شان شہر تعمیر کروایا۔ ۶۸ء میں اس کی فوج نے بغاوت کر دی۔ نیرو روم سے بھاگ نکلا اور اس نے ۹ جون ۶۸ء کو خودکشی کر لی۔ ۶۸ - ۸۵ء میں جولیس

اگریکولا کی سرکردگی میں شمالی اسکاٹ لینڈ تک کا علاقہ فتح ہوگیا۔

لیکن تمام حکمرانوں میں ٹراجن (Trajan)، ہیڈرین (Hadrian) اور اینٹونائنس (Antoninus) بہترین حکمران تھے اور ان کے دور حکومت کو گبن (Gibbon) اس دنیا کی تاریخ میں بہترین دور شمار کرتا ہے۔

مارکس الپیس ٹرا (Marcusulpius Trajanus) رومن شہنشاہ (۹۸ - ۱۱۷ء) ۱۸ ستمبر ۵۲ء میں اسپین میں پیدا ہوا تھا، اور ۹۷ء میں نیروا (Nerva) نے اس کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ اس کے تحت سلطنت اپنی وسیع ترین حدود کو پہنچ گئی تھی، اور ڈاسیا (Dacia) میسوپٹامیہ (Mes o potamia) آرمینیا (Armenia) اور اسیریا (Assyria) رومی صوبے بن گئے۔ اگرچہ فوجی مہمات کے سلسلے میں، روم سے متعدد بار اس کی طویل غیر حاضری پریشان کن ہوجاتی تھی تاہم اس نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ اس دوران بھی حکمرانی کے بہترین طریقے برتے جائیں۔ اس نے کئی نئے پل، سڑکیں اور نہریں تعمیر کروائیں، کتب خانے قائم کیے، عدالت ٹراجانم (The For - um Trajanum) بنوایا۔ شاہراہ ویا اپیا (The Via Appia) کی مرمت کرواکر اسے اصلی حالت پر لے آیا۔ اٹلی کی یہ سڑک ۳ ق م میں بنائی گئی تھی۔ روم میں یہ ایپین گیٹ (Appian Gate) سے برنڈسیم (Brundisium) کو جانے والی یہ ایک اہم شاہراہ تھی۔

ہیڈرین (Hadrion) پبلیس ایلیس ہیڈریانس (Publius - Aelius Hadrianus -) رومی شہنشاہ، رومی والدین سے ۷۶ء میں پیدا ہوا۔ ایک سپاہی اور انتظامی صلاحیت رکھنے والے کی حیثیت سے اس نے شہرت حاصل کی اور وہ ۱۰۸ء میں قنصل (Consul) بھی رہا تھا۔ اس کے دوست اور سرپرست شہنشاہ ٹراجن نے اپنی جانشینی کے لیے اس کا انتخاب کیا۔ ۱۱۷ء سے ۱۳۸ء تک ہیڈرین نے بہ حیثیت مجموعی کامیاب حکومت کی محاصل کی ٹھیکہ داری کو اس نے ختم کر دیا اور دوسری مفید اصلاحات بھی نافذ کیں۔ اپنی وسیع سلطنت کے حدود میں اس نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ برطانیہ کے دورہ کی تقریب میں اس نے وہ دیوار تعمیر کروائی جو اس کے نام سے موسوم ہے۔ (Hadrian's Wall) اس نے اٹلی کے شہر ٹیولی (Tivoli) کے قریب ایک مشہور محل تعمیر کروایا جس کے کھنڈرات اب بھی باقی ہیں ۱۳۸ء میں وہ فوت ہوا۔

اینٹونائنس پائس (Antoninus Pius)

تاریخ روما کا وہ زمانہ جو اینٹونائنس پائس (Titus Antoninus - Pius) کی تخت نشینی اور اس کے متبنیٰ بیٹے مارکس آری لیس (Marcus - Aurelius) کی ۱۸۰ء میں وفات کے درمیان گزرا تھا سلطنت روما کے اندر بڑی خوش حالی کا زمانہ تھا۔ دونوں شہنشاہ اعتدال پسندی اور بلند خیالی کے حامل تھے۔

مارکس آری لیس کی وفات کے ساتھ ہی زوال شروع ہوگیا۔ اس کا بیٹا کموڈس (Commodus) جو ایک نکما حکمران تھا سپاہیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا جنہوں نے جلد جلد شہنشاہوں کو نامزد کیا اس وقت بربری قبائل زیادہ سے زیادہ دہشت پھیلانے پر لگے ہوئے تھے۔ کلاڈیین (Cladian) آری لین (Aure - lian) اور سب سے زیادہ ڈی او کلیشن (Dioeletion) کی کوششوں سے زوال کا دھارا کچھ دیر کے لیے تھم گیا لیکن قدیم نظام حکومت تباہ ہوچکا تھا اور نیا نظام جس میں مملکت دو، تین یا چار قیصروں کی عملداری میں آگئی تھی اس بڑے کام سے نمٹنے کیلیے ناکافی تھا۔ ۳۲۴ء میں قسطنطین اعظم (Coustantine The Great) شہنشاہ ہوا۔ اس نے جلد ہی اپنے آپ کو واحد حکمران بنا لیا اور ۳۳۰ء میں اپنا دارالسلطنت روم سے بازنطین (Byzantiun) کو منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ایک حکمران مشرق میں ہوتا تو دوسرا مغرب میں یہ تمام نہاد حکمران بربروں کا ہمہ وقت مقابلہ کرنے میں مصروف رہتے انہیں وحشی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اٹلی پر ٹوٹ پڑے اور خود روم کو الارک اول (Alaric I) نے ۴۱۰ء میں تباہ و برباد کر دیا۔ مغرب کا آخری شہنشاہ رومولس آگسٹولس (Romulus Augustulus) اپنے کھوکھلے اعزاز سے دست بردار ہوگیا اور سلطنت روما کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ اس کی خاکستر سے مقدس رومن امپائر (The Holy Roman Empire) اور قرون وسطیٰ کی سلطنتیں عالم وجود میں آئیں۔

بازنطینی سلطنت

چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا ۳۲۳ء میں قسطنطین (Constantine) رومن سلطنت کا شہنشاہ ہوا۔ اس نے آبنائے باسفورس (The Straits - of Basphorus) پر شہر قسطنطنیہ (Byzantium) کی بنیاد رکھی۔ اور سلطنت کے صدر مقام کو روم سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا (۳۳۰ء) لیکن اس نئے پایۂ تخت کو خاص اہمیت اس وقت تک حاصل نہ ہوئی جب تک کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں رومن سلطنت کا مغربی بازو فنا نہ ہوگیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مصر اور شمالی افریقہ میں بازنطینی سلطنت کے علاقے مسلمانوں نے لے لیے جس کے بعد یہ سلطنت صرف بلقان اور اناطولیہ (Anatolia) تک محدود ہوئی۔ قدیم عیسائیت کے مرکز کے اعتبار سے مشرقی یورپ کی بہت سی اقوام پر اس سلطنت نے گہرا اثر ڈالا لیکن اسے مغرب کے لاطینی عیسائیوں کی رقابت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے ۱۲۰۴ء میں بازنطینی سلطنت کو فتح کر لیا۔ انہیں کے ہاتھوں ۱۲۶۱ء میں اس کا احیا ہوا لیکن یہ سلطنت استوار نہ ہوسکی اور ۱۴۵۳ء میں عالمی ترکوں نے اسے ختم کر دیا۔

شہر قسطنطنیہ جنوب مشرقی یورپ کے کنارے پر واقع ہے جہاں سے ایشیا کا برّاعظم شروع ہوتا ہے۔ یہاں ہو کر بڑے بڑے بحری اور بری تجارتی راستے گزرتے ہیں ایک شہر اور پایۂ تخت کے لیے اس کا محل وقوع اچھا ہے۔ اس طرح قسطنطین نے انتخاب تو اچھا کیا تھا لیکن یہ تبدیلی خود اس کے اور اس کے جانشینوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی جس طرح قدیم روم ایشائے کوچک اور مشرق سے دور تھا اسی طرح نئے دارالسلطنت سے گال (فرانس) اور برطانیہ جیسے مغربی ممالک بہت دور تھے۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے دو شہنشاہ وجود میں آئے۔ ایک روم میں دوسرا قسطنطنیہ میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم ہوگئی لیکن مغربی سلطنت جس کا صدر مقام روم تھا تقسیم کے اس صدمے کو زیادہ عرصہ تک نہ جھیل سکی۔ وہ اپنے آپ کو ان حملہ آوروں سے بچا نہ سکی جنہیں وحشی کہا جاتا تھا۔

قسطنطین نے دوسرا قابل ذکر کام یہ کیا کہ عیسائی مذہب قبول کرنے کے

بعد عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس کا ایک جانشین جولین (Julian) نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کیا تو اس کو ملحد کہا جانے لگا اور اسی نام سے وہ تاریخ میں مشہور ہے۔

جولین کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک اور شہنشاہ ہوا جو اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تھا تھیوڈوسیس اعظم (Thevdosius the Great)۔ جو نہ صرف غیر عیسائیوں کا مخالف تھا بلکہ ان عیسائیوں کے خلاف بھی سختی سے کام لیتا تھا جن پر یہ شبہ تھا کہ ان کا عقیدہ پکا نہیں ہے۔ تھیوڈوسیس نے ۳۹۲ء میں تھوڑے عرصہ کے لیے مشرقی اور مغربی سلطنتوں کو متحد کر دیا وہ دونوں کا شہنشاہ تھا۔ ۳۹۵ء میں تھیوڈوسیس اعظم کی وفات پر سلطنت روما اس کے بیٹوں ارکےڈیس (Arcadius) اور ہانورس (Honorius) کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ ارکےڈیس نے مشرقی حصہ لیا جس میں ایشیائے کوچک (Asia Minor) مصر (Eqypt) تھریس (Thrace) موائی سیا (Moesia) مقدونیہ (Macidonia) اور یونان (Greece) شامل تھے۔ اس کا دارالسلطنت فطری طور پر بازنطین تھا۔ بازنطینی (Myzantine) اصطلاح سے مشرقی سلطنت روما (East Roman Empire) عام طور پر پہنچانی جاتی ہے۔

بازنطینی سلطنت ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ ایک طویل انتشار کے بعد ۱۴۵۳ء میں اس کے بچے کچھے حصہ کا خاتمہ ترکوں کے ہاتھوں تسخیر قسطنطنیہ سے ہوا۔ بازنطینی شہنشاہوں کی لمبی فہرست میں یادگار نام یہ ہیں مشہور واضع قانون جسٹی نی ین (Justinian) ۵۲۷ - ۵۶۵ء مارس (Maurice) ۵۸۲ - ۶۰۲ء ہرقل ۶۱۰-۶۴۱ء (Heraclius) لیو ۷۱۶ - ۷۴۱ء (Leo) بازل مقدونی ۸۶۷ - ۸۸۶ء (Basil the Macedonia) اور اسحٰق کامنی نس (Isaac Comnenos) اس خاندان کا بانی جو ۱۰۵۷ - ۱۱۸۵ء حکمران رہا اور اس کے بعد مائیکل پالیولوگس (Machael Palaeologus) جس کے خاندان نے ۱۲۶۱ء سے لے کر خاتمہ تک عصائے شاہی (Sceptre) کو اپنے قبضہ میں رکھا تھا۔

جسٹی نی ین (Justinian) ۱۱ رمئی ۴۸۳ء میں بمقام الیریا (Illyria) پیدا ہوا۔ یہ ایک دہقان کا بیٹا تھا لیکن شہنشاہ جسٹن اول (Justin) کا بھتیجا بھی تھا اسی نے اس کو تعلیم دلائی ۵۲۷ء میں یہ شہنشاہ ہوا اور تقریباً چالیس سال تک قسطنطنیہ میں اس نے حکومت کی۔ اس کا دور حکومت ایرانیوں، ونڈالوں اور اوسٹر گاتھوں (The Persian Vandals and Ostrogoths) بیلی ساریس اور نارسیس (Beli Sarius and Narses) پر فتوحات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ افریقہ اور ایشیا کا ایک بڑا علاقہ جو سابقہ شہنشاہوں کے زمانہ میں نکل گیا تھا پھر سے حاصل کر لیا گیا۔ ۱۴ر نومبر ۵۶۵ء میں شہنشاہ کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ تھیوڈورا (Empreess Theodosa) اس کی بیوی تھی۔

جسٹی نی ین رومی قانون (Roman Law) کی تدوین کے لیے خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے اس کو اسی نے منظم کیا تھا۔ اس نے تمام موجودہ قوانین کو جمع کروایا اور قابل وکلا کے ذریعہ ترتیب دلوایا۔ اس میں نہ صرف مجموعہ قوانین (The Code) بلکہ خلاصہ قوانین (Digest or Panbest) اور مبادیات یا تشریحات قانون (The Institutes) شامل ہیں یورپ کے نظام ہائے قانون کی نشوونما پر اس کا زبردست اثر پڑا۔

کامنے نی (The Comneni) اور پالیولوگی (The Palaeologis) خاندان کے درمیانی عرصہ میں بازنطینی تخت پر ایک غاصب فلانڈرس کا کاؤنٹ بالڈون (Baldwin Count or Flanders) نے قبضہ کر لیا۔ وہ چوتھی صلیبی جنگ کا جانباز تھا اس کے بعد اس کا ہم نام بھتیجا اس کا جانشین ہوا۔ بالڈون، اس کا بھتیجا اور اسی نام کا ایک اور جانشین مشرق کے لاطینی شہنشاہ کہلاتے ہیں۔ مشرق کا آخری شہنشاہ قسطنطین پالیولوگس (Constantine Palaeologus) قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضہ کے خلاف بہادرانہ مدافعت کرتے ہوئے ۱۴۵۳ء میں فوت ہو گیا۔

بازنطینی سلطنت نے فنون بالخصوص فن تعمیر اور علم و ادب کو فروغ دیا۔ مقدس صوفیا (Sancta Soppia) کے مشہور گرجا کا تعلق اسی دور سے ہے بازنطینی ادب، آج کے مقابلہ میں علم و فضل کے لیے زیادہ ممتاز ہے۔ اس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ قدیم یونانی ادب زمانہ حال کے لیے محفوظ رہ گیا۔ ترکوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح اور اس کے بعد بازنطینی عالموں کا یورپ میں منتشر ہو جانا یورپ میں نشاۃ ثانیہ (The Renaissance) یا احیاء علوم و تمدن کا سبب ہوا۔

صلیبی جنگیں

(۱۰۹۶ء - ۱۲۷۲ء)

عیسائی زائرین ہمیشہ سے بیت المقدس کی زیارت کے لیے آتے جاتے رہے ہیں، ۶۳۷ء میں عربوں نے اسے فتح کیا تھا جس کے بعد سفر کی سہولتوں میں بہتری پیدا ہوئی اور زائرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ گیارہویں صدی کے آغاز سے زائرین کی تعداد نے روز افزوں ترقی کی۔ ۱۰۷۱ء میں سلجوق سلطان الپ ارسلان نے منزیکرٹ (Manzekert) کی لڑائی میں بازنطینی فوج کو شکست فاش دی اور شہنشاہ رومانس ڈائیوجینس (Romanos Diogenes) گرفتار کیا گیا ۱۰۷۵ء میں جب الپ ارسلان کے بیٹے ملک شاہ نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تو یورپ والوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ بہت جلد قسطنطنیہ بھی ترکوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ ارض مقدس کے زائرین بھی خوف زدہ ہو گئے۔ گیارہویں صدی کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کلیسا کو بادشاہ پر فوقیت حاصل تھی چنانچہ گریگوری ہفتم (Gregory VII) نے یورپ کے بادشاہوں سے ترکوں کے خلاف ایک عام جہاد کرنے کی اپیل کی جسے بعد میں پوپ اربن دوم نے کونسل آف کلیمان (Clermont) سے منظور کرایا۔ وہ سب لوگ جو اس جہاد میں شریک ہوئے انہیں انعام واکرام کا مستحق قرار دیا گیا نیز ان کے تمام گناہ معاف کر دیے گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد دو لاکھ تہتر ہزار کا عظیم قافلہ ہرمٹ پیٹر (Peter the Hermit) والٹر ڈی پکس جو (Walter de Pexe jo) اور والٹر ڈی پنی لیس (Walter de Penniless) کی قیادت میں چل پڑا لیکن

راستے میں سب بھوک اور بیماری کا شکار ہو گئے یا آپس میں لڑ مرے اور صرف چار ہزار اشخاص نے باسفورس پار کیا جنہیں سلطان روم قلیج ارسلان نے ختم کر دیا۔ اس کے بعد ان غیر منظم قافلوں کی جگہ باضابطہ فوجی دستوں نے لی جن کی کمان ماہر فوجی قائدین یا بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھی۔

پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۶ء - ۱۰۹۹ء)

۱۰۹۶ء دو تین لاکھ اشخاص پر مشتمل ایک منظم فوج مختلف راستوں سے بیت المقدس روانہ ہوئی۔ ان کے قائد یہ لوگ تھے۔

۱۔ گاڈ فری ڈی بلون، ڈیوک آف لورلورین اپنے بھائیوں کے ساتھ (Godfrey de Bovillo-Duke of Lower Lottaine)
۲۔ بالڈوین (Baldwin)
۳۔ یوسٹیس (Eustace) کے ساتھ
۴۔ رابرٹ، ڈیوک آف نارمنڈی (Robert Duke of Normandy) ولیم فاتح کا بیٹا۔
۵۔ رابرٹ کونٹ آف فلانڈرز (Robert-Count of Flanders)
۶۔ اسٹیفن، کونٹ آف چارٹرس (Stephen-Count of Charters)
۷۔ ریمنڈ چہارم کونٹ آف ٹالوز (Raymond IVth Count of Tonlouse)
۸۔ ہیو آف ورمنڈوا (Hugh of Vermondois)
۹۔ بوہیمنڈ، ڈیوک آف ٹارنلم (Bohemond-Duke of Tarenium)
۱۰۔ ٹنکریڈ، اس کا بھتیجا

جب یہ لوگ قسطنطنیہ پہنچے تو سب نے بجز ریمنڈ کے قیصر الکسس کمنینس (Alexius — Comnenus) کو کورنش پیش کی پھر باسفورس پار کر کے سلطان روم قلیج ارسلان کے علاقہ پر حملہ آور ہوئے۔

۱۰۹۷ء میں صلیبی مجاہدین کی مدد سے قیصر الکسس نے سلطان کے پایہ تخت نیسیا (Nicaea)، پر قبضہ کیا۔ انطاکیہ (Antoich) کا محاصرہ شروع کیا۔ گاڈ فری کے بھائی بالڈوین اور ٹنکریڈ میں آپس میں لڑائی چھڑ گئی۔ بالڈوین نے اپنی فوج ہٹالی لیکن یونانیوں کی درخواست پر اڈیسہ پر پیش قدمی کی اور اس پر قبضہ کیا اور لاطینی شہر اڈیسہ (Latin Country Edisa) کی بنیاد ڈالی۔

۱۰۹۸ء کربوغا امیر موصل نے صلیبیوں کا انطاکیہ میں محاصرہ کیا لیکن ناکام رہا۔

۱۰۹۹ء صلیبیوں نے بیت المقدس فتح کیا اور بیت المقدس کی سلطنت، کی بنیاد رکھی گئی۔ فوج نے گاڈ فرے دبو می لان (Godfrey de Bomillon) کو بادشاہ منتخب کیا۔ اس جنگ میں ۷۰ ہزار "بقول عرب مورخین ایک لاکھ مرد عورتیں اور بچے قتل ہوئے اور اتنی ہی تعداد میں قیدی بنائے گئے اور یہودیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

دوسری صلیبی جنگ (۱۱۴۷ء - ۱۱۴۹ء)

۱۱۴۶ء فرانس کے لوئی ہفتم (Louis VII) نے صلیب تھام لی شہنشاہ کانریڈ سوم (Conrad III) نے چند ماہ بعد لوئی کی مثال کا اتباع کیا۔

۱۱۴۷ء راٹس بان (Ratisbon) اور مٹز (Metz) سے کانریڈ اور لوئی کی فوجیں روانہ ہوئیں اور ہنگری سے گزرتے ہوئے ایشیائے کوچک گئیں لیکن فریجیا (Phrygia) پر پیش قدمی کرنے والی جرمن فوج کو مسعود اوّل سلطان روم نے بازنطینی شہنشاہ مینول (Manauel) کی تائید سے شکست دی۔ کانریڈ اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ فرانسیسی فوج سے ساحل پر جا ملا۔

۱۱۴۸ء دمشق اور عسقلان پر قبضہ کرنے کی کوشش میں صلیبیوں کو ناکامی ہوئی۔ کانریڈ بیمار ہو گیا اور قسطنطنیہ کے راستے جرمنی واپس لوٹ گیا۔

۱۱۴۹ء لوئی فرانس واپس لوٹ گیا۔ دوسری صلیبی جنگ کی ناکامی کے لیے برناڈ کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔

تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۰ء - ۱۱۹۲ء)

صلاح الدین نے تابلو پر گائی ڈی لسگنان کو شکست فاش دینے کے بعد بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ (۱۱۸۷ء) گریگوری ہشتم (Gregory (VII) نے ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے اصرار کیا۔

۱۱۸۸ء ٹائر کے آرچ بشپ ولیم (William Arch Bishop of Tyre) نے انگلینڈ کے ہنری دوم اور فرانس کے فلپ آگسٹس کو صلیب تھامنے کی ترغیب دی۔

۱۱۸۹ء ہنری نے وفات پائی۔ رچرڈ شیر دل (Richard Coeur de Lion) اپنے باپ کے منصوبے کو بڑھانے پر آمادہ ہوا شہنشاہ فریڈرک باربروسا کی فوج کے ساتھ ہنگری کے راستے چل نکلا۔

۱۱۹۰ء فریڈرک ایشیائے کوچک پہنچا اور انطاکیہ کو قبضہ میں لیا۔ دفعتاً وہ لقمۂ اجل ہوگیا۔ اس کے لڑکے فریڈرک آف سوابیا (Fredrick of Swabia) نے عکہ تک صلیبیوں کی قیادت کی جس کا گائی ڈی لسگنان (Guy de Lusignan) محاصرہ کر رہا تھا۔ رچرڈ اور فلپ آگسٹس بیت المقدس کے لیے سمندری راستے سے روانہ ہوئے۔ سسلی میں انہوں نے سرما گذارا اور آپس میں لڑے اور پھر چل گئے۔

۱۱۹۱ء رچرڈ قبرص میں ٹھہرا اور اسے فتح کیا۔ رچرڈ اور فریڈرک عکہ پہنچے عکہ کے محاصرہ کے دوران فریڈرک فوت ہوا۔ صلاح الدین سے صلح کی گئی اور اصلی صلیب حاصل کرلی گئی۔ فلپ اور رچرڈ کی لڑائی ہوگئی اور فلپ فرانس لوٹ گیا۔

۱۱۹۲ء رچرڈ نے بیت المقدس لینے کی ایک ناکام کوشش کی اور اس کے بعد صلاح الدین سے صلح کر لی جس کے باعث کچھ عرصہ کے لیے بیت المقدس کو آنے جانے میں زائرین کو سہولت حاصل ہوگئی۔ اس جنگ کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ اس بار فرنگیوں نے جس شائستگی کا مظاہرہ کیا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

رچرڈ سمندری راستہ سے انگلستان روانہ ہوگیا۔ اکویلیا (Acquileia) کے قریب اس کا جہاز طوفان کا شکار ہوگیا۔ لیوپولڈ ڈیوک آف آسٹریا (Leopold Duke of Austria) نے وینس کے قریب اسے گرفتار کر لیا اور شہنشاہ ہنری ششم کی خدمت میں پیش کیا۔ ۱۱۹۳ء میں ہنری نے اسے قید کر دیا اور بہت بڑی رقم بطور یرغمال لے کر ۱۱۹۴ء میں چھوڑ دیا اور وہ انگلینڈ روانہ ہوگیا۔

چوتھی صلیبی جنگ (۱۱۹۵ء - ۱۱۹۸ء)

سینٹ جان کے سرداروں (Knights) نے ۱۱۹۵ء میں صلیبیوں کی تنظیم کا بیڑا اٹھایا۔ پوپ سیلسٹین (Pope Celestine) سوم نے ان کی ہمت افزائی کی اور امید ظاہر کی کہ شہنشاہ ہنری ششم کو بھی جنگ میں حصہ

لینے کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔ ہنری نے منصوبے کو بڑھاوا تو دیا لیکن جنگ میں حصہ لینے کے خیال کی تائید نہیں کی۔

۱۱۹۵ء میں ہنری نے سسلی کی سلطنت فتح کرنے کے لیے صلیبیوں کے ایک ڈویژن (فوج) کو مصروف کر لیا۔ دو ڈویژن ملک شام چلے گئے۔

۱۱۹۶ء مالٹا اور سیڈان (Sedon) کے درمیان ترکوں کو شکست ہوئی۔

۱۱۹۷ء صلیبیوں نے سرون (Tharon) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ مصر سے فوج آ رہی ہے تو بڑے شرمناک طور پر پسپا ہو گئے۔

۱۱۹۸ء عربوں نے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کونٹ مانوٹ فورٹ نے عربوں سے ایک تین سالہ عارضی صلح کر لی۔ جنگ کے قائدین یورپ لوٹ گئے۔

پانچویں صلیبی جنگ

(۱۲۰۲ء ــ ۱۲۰۴ء)

پوپ انوسنٹ (Innocent) سوم نے اپنی کرسی نشینی کے موقع پر ۱۱۹۸ء ایک نئی صلیبی جنگ کی اپیل کی۔

۱۲۰۱ء سائمن ڈی مانٹ فورٹ (Simon de Montfort) والٹر ڈی بریان (Walter de Brienne) اور جوفرے ڈی ویل ہارڈوین (Teoffery Devillebardouin) پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ بونی فیس آف مانفرٹ (Boniface of Montferrat) اس کا لیڈر منتخب ہوا۔ یہ پارٹی وینس پہنچی اور وینس میں اور اس پارٹی کے رہنماؤں میں نقل و حمل کے متعلق ایک معاہدہ طے پایا لیکن جو مطالبہ کیا گیا تھا اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ تو وینس ری پبلک کے چیف مجسٹریٹ ڈینڈولو (Dandolo) نے باقی ماندہ تکمیل طلب رقم معاف کر دی لیکن شرط عائد کی کہ ذرا (Zora) کے شہر کو مجاہد فتح کر کے اس کے حوالے کر دیں جسے ہنگری کے بادشاہ نے وینس سے چھین لیا تھا۔

۱۲۰۲ء شہنشاہ آئزاک (Isaac) کا جو تخت سے اتار دیا گیا تھا لڑکا الکسیس (Alexius) وینس پہنچا۔ صلیبیوں نے اس سے وعدہ کیا آئزاک کا تخت اسے دوبارہ دلایا جائے گا۔ پوپ انوسنٹ کی مخالفت کے باوجود زورا (Zora) کے لیے بحری بیڑہ روانہ ہو گیا۔ زورا پر قبضہ کر کے وینس کے حوالہ کر دیا گیا۔

۱۲۰۳ء صلیبی جنگ جو قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ الکسیس سوم حکمران شہنشاہ نے اس امر کی بے سود کوشش کی کہ تنظیم کے اراکین میں باہم بھائی چارہ ہو اور سب ایک تقریب میں مل بیٹھ کر کھائیں پئیں۔ الکسیس جان بچا کر بھاگ نکلا۔ صلیبی جنگ جو قسطنطنیہ میں داخل ہو گئے۔ آئزک دوم اور الکسیس چہارم کو بحال کر دیا گیا۔ شہنشاہ اور صلیبیوں میں تصادم بڑھتا گیا۔

۱۲۰۴ء صلیبی جنگ جو قسطنطنیہ پر دوبارہ قبضے کے لیے روانہ ہو گئے۔ شہر سے حکمران خاندان کو نکال دیا گیا اور رومانیہ اور دوسری ریاستوں کی لاطینی شہنشاہیت کی بنیاد رکھی گئی۔

بچوں کی صلیبی جنگ

(۱۲۱۲ء)

اس جنگ کی شروعات اس خیال کے تحت ہوئی کہ صلیبی جنگوں میں ناکامیوں کا اصلی سبب مجاہدین کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ خیال یہ تھا کہ صرف بچے اپنی معصومیت اور پاک صفتی سے اس مشن کی تکمیل کر سکتے ہیں چنانچہ ۱۲۱۲ء میں اسٹیفن (Stephon) نامی ایک لڑکے کی سرکردگی میں تیس ہزار لڑکے اور لڑکیاں اور جرمنی سے بیس ہزار بچے اس مقصد کے تحت چل پڑے۔ لیکن راستہ ہی میں اکثر بچے ختم ہو گئے اور جو باقی رہ گئے وہ بطور غلام بک گئے۔

چھٹی صلیبی جنگ

(۱۲۱۷ء ــ ۱۲۲۹ء)

۱۲۱۵ء میں انوسنٹ سوم (Innocent III) نے فریڈرک دوم کو تاج پہنایا۔ فریڈرک سے اس نے وعدہ لیا کہ صلیبی جنگ کا اہتمام کرے گا لیکن شہنشاہ فریڈرک نے جنگ میں اپنی شرکت کو ملتوی کر دیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اس کے اور یورپ کے مابین جو کشمکش شروع ہونے والی تھی اس کے پیش نظر اسے ایک منصوبے کے تحت پوپ اپنے قابو میں لانا چاہتا تھا۔

۱۲۱۷ء ہنگری کے اینڈریو دوم (Andrew II) کو انوسنٹ کے جانشین ہانوریس سوم (Honorius III) نے باور کرایا کہ بیت المقدس کے لیے اس کی روانگی ضروری ہے۔ وہ قبرص کے حکمران سے جا ملا۔ صلیبی جنگجو کئی شہروں تک پہنچ گئے جن میں عکرہ اور طرابلس بھی شامل تھے لیکن عربوں نے ان کی صفوں میں زبردست انتشار پیدا کر دیا اور اینڈریو ہنگری لوٹ جانے پر مجبور ہو گیا۔

۱۲۱۸ - ۱۲۲۱ء ژان ڈی برائن (Jean de Brienne's) نے دمشق پر چڑھائی کی۔

۱۲۲۸ء فریڈرک دوم پوپ سے لڑائی جھگڑے کے بعد بیت المقدس کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے ولانڈ (Volande) سے شادی کی اور بیت المقدس کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

۱۲۲۹ء فریڈرک نے سلطان کامل (Kamil) سے معاہدہ کیا جس کے تحت بیت المقدس اور دوسرے علاقے اسے مل گئے۔ بیت المقدس کے بادشاہ کی حیثیت سے فریڈرک نے تاج پہنا اور یورپ واپس چلا گیا۔

ساتویں صلیبی جنگ

(۱۲۳۹ء ــ ۱۲۴۰ء)

۱۲۳۸ء میں گریگری نے ایک نئی صلیبی جنگ کا اعلان کیا اور سلطان کامل نے وفات پائی۔

۱۲۳۹ء نوار کے بادشاہ تھیباٹ (The baut of Navarre) نے فوج کی قیادت کی اور فلسطین کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صلیبی جنگ بازوں اور کامل کے درمیان جو عارضی صلح ہوئی تھی اسے توڑ دیا جائے۔ کامل کے لڑکوں نے اسے شکست دے دی اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

۱۲۴۰ء رچرڈ عکرہ کے لیے روانہ ہوا۔ مصر کے سلطان نے امن کی پیشکش کی۔ بیت المقدس اور دوسرے شہر عیسائیوں کو واپس مل گئے۔ رچرڈ انگلستان واپس لوٹ گیا۔

آٹھویں صلیبی جنگ

(۱۲۴۸ء ــ ۱۲۵۴ء)

۱۲۴۴ء میں خوارزمیوں نے بیت المقدس لے لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ایک اور نئی صلیبی جنگ شروع ہو گئی۔ فرانس کے لوئی نہم نے حالت بیماری میں قسم کھائی کہ وہ خود خوارزمیوں کے خلاف فوج کی قیادت کرے گا۔

۱۲۴۸ء لوئی اور اس کے صلیبی جنگ جو روانہ ہو گئے۔ لوئی نے قبرص میں سرما گزار کر ۱۲۴۹ء میں مصر پر چڑھائی کی اور دمیاط (Damietta) لے لیا اور قاہرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

۱۲۵۰ء جنگ منصورہ میں سلطان مصر توران شاہ (Turan Shah) نے لوئی کو شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا۔ سلطان نے شہر دمیاط واپس لے کر لوئی کو رہا کر دیا۔ لوئی سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ جنگ و جدل سے اجتناب کرے گا۔ صلیبی جنگ جو سینٹ ژاں ڈاکر (St. Jean D'Acre) کو لوٹ گئے۔ لوئی شام میں چار

سال رہا۔ اس دوران اس نے عکرہ اور دوسرے شہروں کی مضبوط مدافعت کا انتظام کیا اور ۱۲۵۴ء میں وہ فرانس واپس چلا گیا۔

نویں صلیبی جنگ (۱۲۷۰ء - ۱۲۷۲ء)

۱۲۶۰ء میں سلطان آئی بیگ کی وفات پر مملوکوں نے بیبرس (Bibars) کو اپنا سلطان منتخب کیا۔ اس جری سپاہی نے فوراً ہی خوارزمیوں کو شام سے نکال باہر کیا۔ اور بیت المقدس اور دمشق ان سے لے لیا۔ شام سے عیسائیوں کی جڑ کاٹ دی گئی جس کے نتیجہ میں ۱۲۶۷ء میں ایک نئی صلیبی جنگ کا منصوبہ بنا۔ فرانس کے لوئی نہم اور انگلستان کے شہزادہ ایڈورڈ صلیب تھامنے والوں میں شریک تھے۔

۱۲۶۸ء۔ انطاکیہ (ANTOICH) نے بغیر محاصرہ کے بیبرس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

۱۲۷۰ء۔ فوج اکٹھا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں لیکن بہرحال دشواریوں پر غلبہ پا لیا گیا اور صلیبی جنگ جو ارض مقدس کے لیے سمندری راستہ سے روانہ ہوگئے۔ سارڈینیا پہنچ کر لوئی نے اپنا منصوبہ بدل دیا اور تونس کے سلطان کے خلاف پیش قدمی کی۔ تونس پہنچتے ہی طاعون پھوٹ پڑا اور لوئی فوت ہوگیا۔ نیپلس کے شاہ چارلس نے تونسیوں سے عارضی صلح کرلی اور خراج ادا کیا۔ پورا بحری بیڑہ یورپ لوٹ گیا۔ لیکن سسیلین (Sicilian) ساحل پر طوفان کی زد میں آ گیا۔ شاہ چارلس نے فرانسیسی اور جنیوی جہازوں کو لوٹ لیا۔ پرنس ایڈورڈ فرانسیسیوں کو تونس میں چھوڑ کر عکرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

۱۲۷۱ء۔ بیبرس نے عکرہ میں ایڈورڈ کا محاصرہ کیا۔ ایڈورڈ نے نازارہ سے مملوکوں کو نکال باہر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

۱۲۷۲ء۔ ایڈورڈ نے بیبرس سے دس سال کے لیے معاہدۂ امن کیا اور یورپ واپس لوٹ گیا۔

۱۲۷۴ء۔ گریگوری دہم کو ایک نئی صلیبی جنگ آغاز کرنے کی کوشش میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۲۸۹ء۔ ٹریپولی پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ عیسائیوں کے پاس اب صرف عکرہ باقی رہ گیا۔

۱۲۹۱ء۔ مملوکوں نے عکرہ پر قبضہ کرلیا۔ دوسرے چھوٹے شہروں نے بھی بغیر لڑائی کے اطاعت قبول کرلی۔ عیسائیوں نے ارض مقدس میں اپنے آخری مقبوضات سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ایک اور صلیبی جنگ کا منصوبہ بنایا گیا لیکن یہ منصوبہ شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکا اور بیت المقدس کم و بیش سات سو سال تک مسلمانوں کے پاس رہا۔

مغرب پر صلیبی لڑائیوں کا اثر

صلیبی جنگوں کا زمانہ گیارھویں اور بارھویں صدی کے یورپ کا تاریک زمانہ کہا جاتا ہے۔ ملک شام میں یورپی اقوام مثلاً فرانکس (Franks) لومبارڈس (Lombards) اور سیکسنس (Saxons) وغیرہ اپنے عرب اور ترک حریفوں کے مقابلہ میں کم تر سطح کی تہذیب کے مالک تھے۔ صلیبی جنگوں کے ذریعہ مغرب کی مادی دولت میں جو اضافہ ہوا اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے مشرق کی دولت جو بڑی مقدار میں اطالوی شہروں میں آرہی تھی اور وہاں سے شمالی یورپ میں تقسیم ہو رہی تھی شہروں کو تازہ قوت اور تہذیبی اہمیت بخش رہی تھی۔ روحانیت کے میدان میں بھی بلاشبہ فوائد حاصل ہوئے۔ دنیائے عیسائیت میں مذہبی اتحاد کا احساس ایک دفعہ پیدا ہونے کے بعد کبھی بھی مٹ نہ سکا لیکن ملک شام میں یہ جنگیں اپنے پیچھے تباہی اور بربادی چھوڑ گئیں اور مشرق قریب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دشمنی کا جو بیج بو گئی تھیں اس کے اثرات اب تک زائل نہیں ہوئے۔

علم کے میدان میں ترقیاں

سائنس اور فنون میں مقامی باشندوں کو سکھانے کے لیے فرانکوں کے پاس کچھ نہ تھا اس کے برعکس مشرق سے اپنے تعلقات کے ذریعہ انہوں نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

ادب

ملکی ادب کی رومانی تحریک میں جان پڑ گئی۔ مقدس پیالہ (The Holy Grail) سے متعلق جو روایات ہیں ان میں بلاشبہ شامی ماخذ کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ وہی پیالہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت مسیح نے عشائے آخری میں استعمال کیا تھا۔ چاسر کی کہانی کنٹربری ٹیلس (Chaucer's Canterburry Tale) کسی حد تک الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ بوکاسیو (Boccaccio) نے مشرقی کہانیاں (Oriental Tales) حاصل کرکے انہیں اضافے اور ترمیم کے ساتھ اپنی کہانیوں کی کتاب ڈی کیمرون (Decameron) میں شامل کرلیا۔ ایک جدید تحقیق یہ ہے کہ دانتے کی ڈیوائین کامیڈی (Dante's Divine Comedy) ابن عربی کی فتوحات مکیہ سے ایک حد تک اثر پذیر ہوئی ہے۔

طب

بارھویں صدی سے تمام یورپ میں متعدد مسافر خانے اور شفا خانے خاص طور پر جذام کے علاج کے لیے دارالمساکین (Lazar Houses) قائم کیے گئے۔ مغرب میں شفا خانوں کے ذریعہ باقاعدہ علاج معالجے کی شروعات مشرق میں علاج و معالجے کے وسیع نظام کے زیر اثر ہی ہوئی۔

فن جنگ

ملک شام میں فرانکوں نے اپنے فوجی بینڈ کے لیے نقارہ اور طنبورہ کو اختیار کیا تھا جسے طابور (Tabour) کہتے ہیں جو ظاہر ہے عربی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے پہلے صرف بگل اور ناقوس سے کام لیا جاتا ہے۔ مقامی باشندوں سے انہوں نے یہ بھی سیکھا کہ خبریں لے جانے کے لیے کبوتروں کو کس طرح سدھایا جاتا ہے۔ چراغاں کے ذریعہ فتح کا جشن منانے کا رواج اور بہادرانہ کھیل کود (K[illegible] Sports) کا عام مقابلہ ان ہی سے سیکھا۔ سرنگ لگانے کے فن میں۔ ([illegible]ping and Mining) منجنیقوں (Mangonels) اور قلعہ شکن مشینوں (Battering Rams) کو کام میں لگانے اور آتشیں مادوں (Combustibles and Explosives) کو استعمال کرنے اور ایسی ہی دوسری تدابیر اختیار کرنے میں ان کی پیروی کی۔

ایک روایت کے بموجب سمندری راستہ معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے چینیوں نے مقناطیسی سوئی (Magnetic Needle) کو مفید بتایا تھا لیکن خلیج فارس اور مشرق بعید کے سمندروں کے درمیان اپنی سرگرم تجارت میں مسلمانوں نے سوئی سے جہاز رانی میں کام لیکر اس ایجاد سے عملی استفادہ کیا۔ صلیبی جنگوں کے ذریعہ یہ ایجاد مغرب میں منتقل ہوگئی۔ جہاں تک کہ فن جنگ میں انسانی قدروں کا تعلق ہے صلاح الدین نے اسے نیا روپ دیا اور یورپ میں صرف انگریز مغنیوں بلکہ ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ وہ شجاعت

اوراطلاق کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

زراعت تجارت

مشرق کے نئے پودے اور نئی فصلیں جیسے باجرہ اور چاول، لیمو، تربوز خربوزہ اور خوبانی مغرب لائے گئے۔ شکر اور دوسری اشیا جو تعیشات کے لیے یاد دہانی میں استعمال کرنے کے لیے ضروری تھیں مصر اور شام سے لی گئیں۔ عطریات اور مٹھائیوں کی درآمد عرب علاقوں سے ہوتی۔ یاقوت، زمرد اور دوسرے جواہرات کے لیے ایشیا پر نظر رہتی تھی۔ مشرق ہی کے سمندروں میں موتی ملتے تھے۔ ململ (Damask) مشجر اطلس (Atlas) اور ساٹن (Satin) (Wool) مشرق ہی نے دیے۔ پہلی صلیبی جنگ تک ریشمی کپڑے یونان کے صناع یورپ کے لیے تیار کرتے تھے خود انہوں نے اس صنعت کو ایران سے سیکھا تھا۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر یونانیوں نے اسے سسلی منتقل کر دیا تھا۔ سسلی کے کاریگروں نے اٹلی کے کاریگروں کو یہ صنعت سکھا دی لیکن ریشم کے کپڑے صرف کلیسا کے بڑے لوگ پہنتے تھے۔ بعد کو عرب تہذیب کے زیر اثر اون ( ) سلک وغیرہ کے کپڑوں کے کارخانے یورپ میں قائم ہو گئے

شہروں کی دولت مندی

وینس (Venice) ایک ایسا دولت مند اور ترقی یافتہ شہر تھا جس کی مثال دنیا میں نہ تھی۔ یہ شہر اپنی روز افزوں آبادی کی تمام ضروریات کی تکمیل سمندر کے ذریعہ ملنے والی کثیر دولت سے کرتا تھا۔ اس کا اپنا ایک عظیم بحری بیڑہ تھا جس کے جہاز مشرق سے تجارت کے لیے کام میں لائے جاتے تھے۔ پہلی صلیبی جنگ تک فرانس کا اپنا بحری بیڑہ نہ تھا اور وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وینس سے جہاز کرائے پر لیا کرتا تھا۔ جینوا کا درجہ وینس کے بعد تھا۔ تاہم دولت سے وہ بھی مالا مال تھا۔ پیسا اور فلورنس اور دوسرے شہر بھی تجارت کے ذریعہ دولت مند ہو گئے تھے۔ مشرق کی دولت پہلے اٹلی کے شہروں میں آتی تھی پھر یہاں سے یورپ کے مختلف شہروں کو تقسیم ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اٹلی کی اجارہ داری کمزور پڑتی گئی اور دوسرے شہر خصوصاً وہ جو بحر متوسط کے ساحل پر آباد تھے مثلاً مارسیلز (Marselles) جہاز رانی کے مراکز اور بڑھتی ہوئی دولت میں حصہ دار کی حیثیت سے وینس جیسی اطالوی شہری جمہوریتوں کی برابری کرنے لگے۔

تاریخ یورپ

سیاسی تقسیم

زمانۂ قدیم میں یورپ کا بہت بڑا حصہ رومتہ الکبریٰ (The Roman Empire) میں شامل تھا۔ جس کے زوال کے بعد علاحدہ علاحدہ ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ ان ریاستوں میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں چھوٹی چھوٹی ریاستیں بتدریج متحد ہو کر بڑی بڑی سلطنتیں بنتی گئیں اور اس طرح فرانس، اسپین، برطانیہ اور بعد میں اطالیہ اور جرمنی میں طاقتور شاہی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ نپولین کی جنگوں کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں یہ تحریک ترقی کرتی گئی اور چند ملکوں کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہونے لگا۔ یہ ممالک تھے برطانیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، روس اور اطالیہ۔ رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے نئی سلطنت روس کے مقابلہ میں دوسری سلطنتیں بالکل حقیر نظر آنے لگیں۔ موجودہ یورپ متعدد چھوٹے چھوٹے ملکوں پر مشتمل ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں باقی نہیں رہیں۔ ان کی بجائے متعدد چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں اور جمہوری ریاستیں وجود میں آئیں۔ علاوہ ازیں یورپ میں چھ نہایت ہی چھوٹی ریاستیں بھی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ لکسمبرگ (Luxembourg) موناکو (Monaco) انڈورا (Andorra) سان ماری نو (San Marino) لیختنسٹن (Liechtenstin) اور واٹیکن سٹی (Vatican City)

تہذیب و تمدن

اس میں شک نہیں کہ دوسرے براعظموں کے مقابلہ میں یورپ چھوٹا ہے لیکن دنیا کی عظیم ترین مملکتوں کا مرکز رہا ہے۔ ہرچند کہ اس نے ایشیا سے جہاں دنیا کی سب سے زیادہ قدیم تہذیبوں کی نشو و نما ہوئی تھی فیض اٹھایا ہے۔ یونانیوں کے وقت سے یورپ کو سب براعظموں میں اولین حیثیت حاصل رہی ہے۔ یونانی تہذیب کے بعد روما کی تہذیب کا ظہور ہوا اور بعد میں اطالیہ، فرانس، برطانیہ اور جرمنی کی تہذیبیں پیدا ہوئیں تجارت میں بھی یورپ کو ایک عرصہ دراز تک غلبہ حاصل رہا ہے۔ اس تسلط کے کئی اسباب ہیں معتدل آب و ہوا۔ ساحلی علاقہ تک بہ آسانی رسائی قدرتی دولت اور باشندوں کی فطری رسائی۔

دنیا کی تاریخ میں یورپ نے جو رول ادا کیا ہے وہ اس کی قامت کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ صدیوں تک وہ مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور ادب و فنون اور سائنس کا مرکز رہا ہے تقریباً تین ہزار سال قبل بحر متوسط کے ساحل پر تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا تھا۔ اہل اسرائیل، اہل یونان اور اہل روم یورپی تہذیب کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اس تہذیب کی تشکیل کا باعث مختلف تصورات تھے یہودیوں نے خدائے واحد کی پرستش کو فروغ دیا۔ حسن و جمال کے ساتھ عشق و محبت کی نشو و نما یونانی فن و ادب اور سائنس و فلسفہ میں ہوئی، رومیوں نے تنظیم قانون اور ضابطہ کی بنیاد رکھی۔

عہد قدیم کا یورپ

یورپ کے ایک بڑے حصہ کو رومیوں نے اپنے زیر اثر رکھا تھا۔ ان کے دور حکومت میں یورپ میں پہلی مرتبہ سڑکوں کا جال بچھایا گیا اور سڑکوں کا یہ نظام انیسویں صدی عیسوی تک لاثانی رہا۔ اس دور میں یورپ کے مشہور شہروں لندن پیرس، ویانا اور مارسیلز وغیرہ کی بنیادیں رکھی گئیں۔ صدیوں کی عملداری کے بعد ۵۰۰ ء میں سلطنت روما کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے مغربی حصہ میں وحشی حملہ آوروں نے نئی ریاستیں قائم کیں اور اس کا مشرقی حصہ بازنطینی مملکت (Byzantine — Empire) کے نام سے موسوم ہوا جس کا دارالخلافہ نیا روم، یا قسطنطنیہ تھا۔

بازنطینی مملکت تقریباً ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ اس کا اقتدار ایران کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا اور یورپ، ایشیا اور افریقہ یکساں طور پر اس کی افواج سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ اپنے طویل دور حکومت میں یہ سلطنت عیسائیت کا ایک مضبوط مرکز بنی۔ مشرقی یا یونانی کلیسا (The Eastern or Greek Orthodex Church) نے مشرقی اور وسطی یورپ کے بہت سارے لوگوں کا مذہب تبدیل کروایا۔ مشرقی یورپ، سویت روس، رومانیہ اور بلغاریہ کے بیشتر لوگوں کا طریق عبادت رومن کیتھولک یا مغربی کلیسا سے مختلف ہے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد یہ مملکت ترکوں کے قبضہ میں آگئی۔

سلطنت روما کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد مغربی یورپ میں جو نئی ریاستیں قائم ہوئی تھیں انہیں عرب حملہ آوروں کے خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔ قبول اسلام کے بعد عرب اپنے ریگستانی جزیرہ نما سے نکل کر مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں پھیل گئے۔ ان وسیع علاقوں کو پچاس سال سے کم عرصہ میں فتح کرنے کے بعد عربوں نے بحر متوسط کو عبور کیا اور اپنی حکومت کو اسپین، پرتگال اور جزیرہ سسلی تک پھیلا دیا۔ بالآخر جنوبی فرانس میں عربوں کی فاتحانہ پیش قدمی کو روک دیا گیا۔ اسپین سے ان کا اخراج ۱۴۹۲ء تک پایۂ تکمیل کو پہنچا اسی سال کولمبس نے نئی دنیا (امریکہ) دریافت کی۔

یورپی تہذیب کی نشو ونما میں عربوں کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ چاول، کپاس اور شکر جیسی اہم فصلوں اور بہت سے میووں کی کاشت کو انہوں نے رائج کیا۔ فنون، صنعتوں اور سائنسی علوم جیسے فلکیات، طب اور ریاضی میں اولین رہنماؤں کا کام انجام دیا۔ یورپ کے عیسائی باشندوں نے بہت سی باتیں عربوں سے سیکھی ہیں۔

عربوں کے حملوں کے خوف نے عیسائی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی طاقت بڑھانے پر مجبور کیا۔ فرانکوں کی قلمرو (The Kingdom of Franks) جس میں موجودہ فرانس اور مغربی جرمنی شامل تھے وجود میں آئی۔ عیسائی ٹیوٹنی یورپ (Christian Germanic Europe) کا یہ نیا اتحاد ۸۰۰ء میں قائم ہوا جبکہ اسقف اعظم لیو سوم (Pope Leo III) نے فرانکی بادشاہ شارلیمان (Charlemagne) کی تاج پوشی مغرب کے رومی شہنشاہ کی حیثیت سے کی۔ اس مملکت کا نام مقدس رومی مملکت (The Holy Roman Empire) رکھا گیا۔

قرون وسطیٰ کا یورپ

شارلیمان کی وفات کے وقت (۸۱۴ء) اس کی مملکت میں زمانہ حال کا جرمنی اور بحر متوسط کا ایک چھوٹا سا ساحلی علاقہ شامل تھا ۸۴۳ء میں اس کی مملکت کو اس کے پوتوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کے باعث متعدد سیاسی وحدتیں وجود میں آئیں جن میں موجودہ فرانس اور جرمنی شامل ہیں۔ شارلیمان کی مملکت برائے نام باقی رہ گئی تھی اور ۱۸۰۶ء میں پورے طور پر اس کا خاتمہ ہو گیا جبکہ نپولین نے اس کے آخری شہنشاہ فرانس دوم کو تخت شاہی سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

مقدس رومی مملکت کا قیام اس منصوبے کے تحت عمل میں لایا گیا تھا کہ وہ روما الکبریٰ کا جانشین بنے مگر یہ مقصد کبھی بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ مملکت متعدد چھوٹی اور کمزور ریاستوں پر مشتمل تھی جو ہمیشہ طاقتور مرکزی حکومت کے خلاف برسر پیکار رہا کرتی تھیں۔ قرون وسطیٰ اور ابتدائی عہد جدید کے دوران حکمرانوں کے درمیان آپس میں لڑائیاں اور شہنشاہ کے خلاف حکمرانوں کی لڑائیاں بارہا ہوا کرتی تھیں۔ متحدہ مہمات اور اتحاد کے مظاہرے، جیسے بیت المقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لیے صلیبی لڑائیاں (The Crusades) استثنائی صورتیں تھیں۔

جاگیرداری نظام The Feudal System

قرون وسطیٰ میں شہروں کی تعداد کم تھی اکثر امراء اپنی جاگیروں میں رہا کرتے تھے۔ جو انہیں دوسرے بڑے امیروں یا بادشاہوں سے ملی تھیں۔ جاگیر کے عوض انہیں جو خدمات انجام دینی پڑتی تھیں وہ رواج کے مطابق فوجی ہوتی تھیں۔'' اس جاگیرداری نظام کے تحت بادشاہ مطلق العنان حکمران نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ملک کے سب سے زیادہ اہم امیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اکثر اوقات کمتر درجہ کے امیر خود منتظر ہو جاتے تھے اور بادشاہ کا اقتدار صرف اس جاگیر پر چلتا تھا جس پر اس کی شخصی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔

اس دور میں یورپ کے مختلف ممالک کی نشو و نما مختلف طریقوں سے ہوتی رہی انگلستان میں ایک مستحکم حکومت کا قیام عمل میں آیا جس میں شخصی حقوق کے تحفظ کی ضمانت ۱۲۱۵ء کے منشور اعظم (The Magna Carta) کے ذریعہ کی گئی۔ وہاں ایک پارلیمنٹ بھی قائم ہوئی جو اس قدر طاقت ور تھی کہ بادشاہ کو قابو میں رکھ سکے۔ اسپین میں متعدد چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں نمودار ہوئیں۔ عربوں کو جنوب کی غرناطہ کے پہاڑوں کی طرف ڈھکیل دیا گیا اور آخر میں یہ ریاستیں فرڈی نندا ور ازابیلا (Ferdinand & Isabella) کے تحت ایک مضبوط شاہی حکومت میں متحد ہو گئیں۔ یہ وہی فرڈی نند وازابیلا ہیں جنہوں نے کولمبس کے مشہور بحری سفر کی کفالت کی تھی۔ فرانس میں بادشاہوں کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم رہا جن میں اکثر ممتاز لوگ گزرے ہیں اور جنہوں نے اپنی عملداری کو وادی پیرس سے لے کر سارے ملک پر پھیلا دیا تھا اور جنگ صد سالہ (The Hundred years War) میں انگریزوں کو شکست دے کر ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ اطالیہ میں اس کے برخلاف بغیر کسی واحد مستحکم مرکزی حکومت کے متعدد چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں۔

ایلپس (The Alps) کی پہاڑی وادیوں میں رہنے والے جو سینٹ گوتھارڈ (Saint Gothard) کے شمال جنوب کی سب سے زیادہ اہم شاہراہوں پر قابض تھے ۱۲۹۱ء میں ہاپسبرگ شہنشاہوں (The Hapsburg Emperors) اور ان کے نمائندوں سے لڑنے کے لیے متحدہ کارروائی کی اور کامیاب ہو گئے جھیل لوسیرن (Lake Lucerne) کے اطراف کی یوری شیوزا ورانٹر والڈن نامی ریاستوں (Cantons of Lerischevyz and Unter Walden) نے مل کر پہلی سوستانی وفاقی ریاست (First Swiss Fedration) بنائی آہستہ آہستہ یہ وفاقی ریاست پھیلتی گئی یہاں تک کہ ۱۶۴۸ء میں اس کی آزادی اور ۱۸۱۵ء میں اس کی غیر جانب داری کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو تسخیر کر لیا اور جلد ہی اپنی حکمرانی کو جنوبی یورپ اور شمالی افریقہ تک پھیلا دیا اس واقعہ سے قرون وسطیٰ کا خاتمہ اور یورپ کی جدید تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

دور جدید کا یورپ

نشاۃ ثانیہ (The Renaissance) تسخیر قسطنطنیہ کا واقعہ یورپ کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی ہزار سالہ تاریک دور ختم ہو گیا اور یورپ میں بیداری اور نئی زندگی اور توانائی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس رجحان کو آغاز نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ لوگ ایک طویل عرصہ کی نیند کے بعد جاگ اٹھے ہیں اور اپنی نظریں صدیوں پہلے کے قدیم درخشاں یونان کی طرف پھیر دی ہیں۔ اور اس سے ذہنی فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تحریک اس جمود اور تقلید کے خلاف جس کی کلیسا نے ہمت افزائی کی تھی اور ان زنجیروں کے خلاف جنہوں نے روح انسانی کو جکڑ لیا تھا، ایک طرح کی بغاوت تھی۔ عام ذہنی آزادی کے زیر اثر جو حالت حسن و جمال کے ساتھ قدیم یونان کو تھی وہ پھر سے نمودار ہوئی اور یورپ میں مصوری، سنگ تراشی اور فن تعمیر کے اعلیٰ و نفیس نمونوں کی بہار آ گئی۔

قسطنطنیہ کی تسخیر کے بعد اس تحریک میں تیزی پیدا ہوئی۔ عالموں اور ادیبوں نے بڑی تعداد میں ترک وطن کر کے مغرب کا رخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ یونانی ادب کے بیش بہا خزانے ایسے وقت لیتے گئے جب کہ مغربی دنیا اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس معنی میں تسخیر قسطنطنیہ سے نشاۃ ثانیہ کو مدد ملی۔

نشاۃ ثانیہ کی ابتدا اولاً اطالیہ میں ہوئی بعد ازاں فرانس، انگلستان اور دوسرے ممالک میں اس کا ظہور ہوا۔ اس طرح قدیم یونانی و لاطینی ادب جو قرون وسطیٰ میں بے اتفاقی کا شکار رہا پھر سے دریافت ہو کر لوگوں کے مطالعہ میں آیا۔ مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نشاۃ ثانیہ محض قدیم یونانی و لاطینی ادب کے مطالعہ تک محدود رہی۔ یہ ایک عظیم تحریک تھی اور اس عمل کی سرجوشی تھی جو ایک عرصۂ دراز سے یورپ میں سطح کے نیچے جاری تھا۔ یہ یہاں مختلف صورتوں میں پھوٹ پڑا اور اس کا ایک رخ نشاۃ ثانیہ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔

روشن خیالی کی یہ تحریک پندرہویں صدی عیسوی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک جاری رہی۔ اس مدت میں نئی نئی دریافتیں ہوئیں اور سائنسی علوم بتدریج آگے بڑھتے گئے۔ ۱۴۵۰ء میں متحرک ٹائپ کے ذریعہ طباعت کی ایجاد ہوئی۔ اس کی بدولت کتابیں بڑی تعداد میں کم وقت میں سستے داموں اور صحت کے ساتھ چھپنے لگیں۔ دوسری اہم دریافتوں کا تعلق بارود (Gun Powder) دوران خون (Circulation of Blood) گھڑیاں، عینکیں، دوربین (Telescope) اور سورج کے گرد زمین کی گردش سے ہے۔ قطب نما یا مقناطیسی سوئی (The Campass or Magnetic Needle) کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وسیع سمندروں میں کھوج لگانے والے بڑے بڑے بحری سفر اختیار کیے جائیں۔ واسکوڈی گاما نے (Vascoda Gama) افریقہ کے جنوبی کنارے کے گرد چکر لگا کر ہندوستان اور مشرق بعید کے زرخیز جزیروں کے لیے نئے تجارتی راستے کھول دیے۔ کولمبس (Columbus) نے مغرب کی طرف بحر اطلانتک کو عبور کر کے امریکہ کا نیا براعظم دریافت کیا۔ ان نئے ملکوں کی دریافت کے بعد سمندر پار دنیا کے تمام حصوں میں یورپی باشندوں کی نوآبادیوں کا قیام عمل میں آیا۔ سونا، چاندی، گرم مسالہ (Spices) اور دوسرا خام سامان یورپ لایا گیا جس کے باعث یورپ کی طاقت و دولت میں زبردست اضافہ ہوا۔

اصلاح مذہب (The Reformation)

نشاۃ ثانیہ کے بعد ہی اصلاح مذہب کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کا تعلق نہ صرف پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں لوگوں کے مذہبی خیالات سے ہے بلکہ یہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی سیاسی تاریخ پر بھی اثر انداز ہوئی۔

کیتھولک کلیسا کی مخالفت دو بالکل مختلف سمتوں سے ہونے لگی مالدار طبقہ اس لیے مخالف ہو گیا کہ وہ اپنے معاملات میں کلیسا کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ عوام کی مخالفت اس بنا پر شروع ہوئی کہ کلیسا کے اندر بہت سی خرابیاں سرایت کر گئیں تھیں۔ مذہبی پیشوا دولت و عشرت کے عادی ہو گئے تھے۔ پوپ جس کا منصب عوام کے روحانی پیشوا کا تھا، ایک دولت مند دنیاوی شہزادہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ سولہویں صدی کی ابتدا میں جرمن نژاد مارٹن لوتھر (Martin Luther) (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء) نے روم کے خلاف بغاوت کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ یہ ایک عیسائی پادری تھا۔ ایک مرتبہ وہ پوپ کے مرکز اقتدار روم گیا وہاں کے مذہبی پیشواؤں کی بداخلاقی اور عیش و عشرت کی زندگی دیکھ کر اس کو ان سے نفرت ہو گئی اور اس نے پوپ کے اقتدار کے عوض انجیل مقدس کو تمام مذہبی معاملات کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس زمانہ میں ایک عام آدمی کا بھی جو پاپائی نظام کی خرابیوں سے تنگ آ گئے تھے یہی رجحان تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے باعث یورپ میں جو بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی اس نے مقامی زبانوں کے وزن و وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ انجیل کے ترجمے مقامی زبانوں میں کیے جانے لگے اور پریس کی ایجاد کی وجہ سے انجیل بڑی تعداد میں چھپ کر عوام کے مطالعہ میں آنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کی سادہ زندگی کے حالات، جو ان کے حواریوں نے لکھے تھے پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ اس طرح پروٹسٹینٹ بغاوت کی ابتدا ہوئی اس کو پروٹسٹینٹ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے باعث رومن کلیسا کے مقررہ عقائد کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اس وقت سے عیسائی مذہب دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ شمالی یورپ نے پروٹسٹینٹ عقائد کو اپنا لیا اور جنوبی یورپ کیتھولک عقائد پر بدستور قائم رہا۔

مذہبی اختلافات کے باعث جرمنی، آسٹریا، سوئیزرلینڈ، فرانس اور ہالینڈ میں مذہبی جنگیں ہونے لگیں۔ اس میں بدترین جنگ تیس سالہ (۱۶۱۸ — ۱۶۴۸ء) (The Thirty Years War) کے نام سے مشہور رہے۔ جنگ کے دوران اس کے مذہبی مقاصد معدوم ہو گئے اور یہ جنگ جرمنی پر تسلط حاصل کرنے کے لیے فرانس اسپین اور سویڈن کے درمیان کش مکش میں تبدیل ہو گئی۔ اس جنگ کا خاتمہ صلح ویسٹ فلیا (Peace of West Phalia) کے ذریعہ ۱۶۴۸ء میں ہوا۔

حکمرانوں پر بڑھتا ہوا اقتدار

سولہویں صدی کے اختتام پر حکومت شاہی کو نہ صرف غلبہ حاصل ہو گیا بلکہ حکومت استبدادیت کی طرف مائل ہو گئی۔ جرمنی اور اٹلی میں خود مختار بے ربط اور رئیسانہ ریاستیں موجود تھیں۔ اسپین علاً مطلق العنان تھا۔ انگلستان میں تخت شاہی کبھی بھی اتنا طاقتور نہ تھا۔ سترہویں صدی کے آغاز پر فرانس کا شاہی اقتدار یورپ میں سب سے زیادہ عظیم اور مستحکم تسلیم کیا جانے لگا۔ بادشاہوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ نیابت الٰہی (Divine Right) کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں اس لیے رعایا کو چاہیے کہ مکمل اور غیر مشروط طور پر ان کی اطاعت کرے۔ فرانس کے لوئی چہاردہم (Louis XIV) روس کے پیٹر اعظم (Peter the Great) پرشیا کے فریڈرک اعظم (Frederick the Great) اور انگلستان کے ہنری ہشتم (Henry VIII) کا شمار اس دور کے مشہور مطلق العنان حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

صنعتی انقلاب (The Industrial Revolution)

اس زمانہ میں جبکہ فرانس خونی انقلاب میں ملوث تھا انگلستان کی معاشی زندگی میں خاموشی کے ساتھ بڑی اہم تبدیلیاں تکمیل پا رہی تھیں یہ تبدیلیاں برطانیہ میں شروع ہو کر یورپ کے دیگر ممالک میں پھیل گئیں۔ ان کا آغاز اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں ہوا اور ان کا سلسلہ اس وقت سے آج تک جاری ہے۔ یہ انہیں صنعتی انقلاب کا مجموعی نام دیا گیا ہے۔

صنعت و تجارت کی یہ کایا پلٹ دنیا کی تاریخ میں بے مثل ہے اور اکتشافات اور ایجادات کے ایک طویل سلسلہ کا نتیجہ ہے جن میں بھاپ کو الگ ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس طرح انسان کے قابو میں ایک ایسی نئی حرکی قوت آ گئی جس کے نتائج بے نظیر ثابت ہوئے اس قوت کو قابل استعمال بنانے اور ترسیل حرارت کے لیے ایک آلہ کو مکمل کیا گیا۔ بھاپ کے آلہ کے موجد جیمس واٹ (James Watt) (۱۷۳۶ — ۱۸۱۹ء) نے اس کو ایک عملی و کارآمد آلہ بنا کر ایک نئے دور — دور دخان (The Age of Steam) کا آغاز کیا۔

بھاپ کی مشین کا استعمال پہلے صنعت میں ہوا اور پھر تجارت میں۔ ابتدا ہی سے سوتی اور اونی کپڑوں کے کارخانہ داروں نے اس کا استعمال شروع کر دیا اور اس طرح پارچہ بافی کی صنعت میں پورا انقلاب آ گیا۔ صنعتی انقلاب کی معیت میں مشینی انقلاب آیا۔ مشینوں نے محنت کو آسان بنا دیا۔ سائنس کی مدد سے سفر اور نقل و حمل تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ ریل نے گھوڑا

گاڑی (Stage Coach) کو ہٹا دیا۔ دخانی جہاز نے بادبانی جہاز کی جگہ لے لی بڑے بڑے سمندری جہاز منظر عام پر آگئے اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم کا سفر پابندی اور تیز رفتاری سے کرنے لگے۔ مشین اور بھاپ کی طاقت کے اس ملاپ نے انسانی وسائل میں بڑی وسعت پیدا کر دی۔ رفتہ رفتہ یہ نئے ذرائع دوسرے ممالک میں رواج پا گئے۔ پہلے فرانس میں ۱۸۱۵ء کے بعد اور آگے چل کر جرمنی میں۔

فرانسیسی انقلاب
(۱۷۸۹ء - ۱۷۹۵ء)

فرانسیسی انقلاب کے ساتھ ہی یورپ کی تاریخ ایک قوم، ایک واقعہ اور ایک شخص یعنی فرانس 'انقلاب فرانس اور نپولین میں ضم ہو جاتی ہے۔ نہ صرف تاریخ فرانس بلکہ نوع انسانی کی تاریخ میں فرانسیسی انقلاب ایک اہم اور عظیم واقعہ ہے۔ اس کی بدولت انسان کو حریت، مساوات اور اخوت (Liberty, Equality and Fraternity) کے نئے تصورات حاصل ہوئے اور یہ تصورات دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔

یہ انقلابی تحریک ۱۷۸۹ء میں شروع ہوئی اور یورپ پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوئی۔ اس وقت رعایا کی حالت بالخصوص زرعی اضلاع میں بہت خراب تھی۔ نظام حکومت میں رشوت ستانی کا دور دورہ تھا۔ اقتدار بادشاہ اور امراء کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا تھا اور اس پر کوئی مؤثر پابندیاں نہیں تھیں۔ اونچے طبقوں کے لوگ کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ نتیجتاً اس کا بار بڑی سختی کے ساتھ غریبوں پر پڑتا تھا۔ ملک کا مالیہ مایوس کن انتشار کا شکار تھا۔

اسی زمانہ میں والٹیر (Voltaire) روسو (Rousseau) اور دوسرے فلسفیوں نے عوام کو نئے خیالات سے روشناس کرایا جنہیں خاص مقبولیت شہروں میں حاصل ہوئی۔ والٹیر نے مذہبی اور دیگر روایتوں کو جن کی وجہ سے عوام اپنی زبوں حالی کو چپ چاپ مان لینے کے عادی ہو گئے تھے قابل تحقیر قرار دیا۔ روسو نے انسان کے فطری حقوق کی نشاندہی کی اور ایک ایسی سلطنت کا تصور پیش کیا جس میں عوام کی مرضی کو بالادستی حاصل ہو۔ لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ عدم مساوات ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اس کا نہ تو کوئی خدائی جواز تھا اور نہ انسانی۔

ایک طویل وقفہ کے بعد فرانس کی نمائندہ مجلس ۱۷۸۹ء میں اسٹیٹس جنرل (The States General) کو طلب کیا گیا۔ اس مجلس کے اجلاس میں عوامی نمائندوں نے قومی اسمبلی کو بلانے پر اصرار کیا۔

اس اثنا میں ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو لوگوں کے ایک ہجوم نے حملہ کر کے پیرس کے پرانے قلعہ باسٹیل (Bastille) کو جس میں شاہی مجرم قید کیے جاتے تھے مسمار کر دیا۔ اور پورے ملک میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ سرخ سفید اور نیلے رنگ پر مشتمل ایک ترنگا (Tri Colour) جھنڈا انقلاب اور جمہوریت کی علامت بن گیا۔

قومی اسمبلی نے طے کیا کہ تمام طبقاتی مراعات ختم کر دی جائیں۔ اسمبلی نے اپنے آپ کو مجلس قانون ساز میں تبدیل کر لیا۔ امراء کی بڑی تعداد انگلستان اور دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ نکلی لیکن اب بھی بہت سے لوگ بادشاہ کے طرف دار تھے حالانکہ اس کی حیثیت ایک قیدی کی سے زیادہ نہ تھی۔

جون ۱۷۹۱ء میں بادشاہ نے پیرس سے راہ فرار اختیار کی لیکن وارن نس (Varennes) کے پاس اس کو روک کر واپس لایا گیا۔ مجلس نے فیصلہ کیا کہ فرانس کو دستوری بادشاہت بنایا جائے لیکن متعدد اسباب کی وجہ سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ نہ سکا۔ فرانس میں واقعات کی یہ رفتار دیکھ کر یورپ کے اکثر حکمران اور ان کی رعایا بری طرح خوف زدہ ہو گئے۔ جلاوطن فرانسیسی امیروں نے یورپ کے حکمرانوں کو فرانس میں مداخلت کرنے کے لیے اکسایا۔ ان حکمرانوں میں نمایاں مقام شہنشاہ آسٹریا کو حاصل تھا جو فرانسیسی بادشاہ لوئی شش دہم (Louis XVI) کی بیوی میری آنتوانت (Marie Antoinette) کا بھائی تھا۔ پرشیا (Prussia) کے بادشاہ کے ساتھ مل کر اس نے ایک اعلان جاری کیا اور مطالبہ کیا کہ فرانس لوئی شش دہم کو اس کے اصلی رتبہ پر بحال کر دے۔

انقلابی جماعت مضبوط ہوتی گئی۔ بیرونی مداخلت حاصل کرنے کی کوشش نے اس جماعت کے اثر و رسوخ میں مزید اضافہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۷۹۲ء میں فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پرشیا نے آسٹریا کا ساتھ دیا لیکن بغاوتوں اور بدنظمیوں کے باوجود فرانسیسی سپاہیوں نے والمی (Valmy) کے مقام پر پرشیائیوں (Prussians) کو شکست دے دی۔

اب ایک قومی مجلس (National Convention) نے معاملات کی باگ ڈور سنبھالی اور اس کے ساتھ ہی انقلاب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انتہا پسند پورے طور پر برسر اقتدار آگئے۔ دانتان (Danton) رابس پیر (Robespierre) اور مارا (Marat) ان کے لیڈر رہتے۔ ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو ایک جمہوریہ قائم کی گئی اور بادشاہ پر مقدمہ چلا کر اس کی گردن مار دی گئی۔ بیرونی ممالک سے جو معاہدے ہوئے تھے وہ ختم کر دیے گئے فرانس نے اعلان کر دیا کہ وہ یورپ کے عوام کو ان کے موروثی حکمرانوں کو ہٹانے میں مدد دے گا۔ ہزاروں لوگوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔ اس دوران فرانسیسی فوجیں بین الاقوامی جنگوں میں کامیابی پر کامیابی حاصل کرتی جا رہی تھیں۔

۱۷۹۳ء میں تحفظ عامہ کی کمیٹی (Committee of Public) کا قیام عمل میں آیا۔ رابس پیر اس کمیٹی کا روح رواں تھا اس کمیٹی کے قیام کے ساتھ ہی دہشت کا دور (Reign of Terror) شروع ہوا سیکڑوں امراء اور سیاست دانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو فرانس کی ملکہ کی گردن اڑا دی گئی اور پھر یہ لوگ آپس میں لڑ پڑے۔ اپریل ۱۷۹۴ء کو رابس پیر نے دانتان کو قتل کروا دیا اور ۲۸ جولائی کو خود رابس پیر کا بھی حشر ہوا۔ دہشت کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں ڈائرکٹری (The Directory) قائم ہوئی اور ساتھ ہی اس دور کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کو فرانسیسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

نپولین اوّل بوناپارٹ شہنشاہ فرانس

نپولین ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو اجاشیو کارسیکا (Ajaccio Corssica) میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے برائین (Brienne) اور پیرس کے فوجی مدارس میں تعلیم پائی اور بہت جلد ہی نئی فرانسیسی جمہوریہ میں توپ خانہ کے افسر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ۱۷۹۶ء میں اٹلی میں فرانسیسی افواج کی قیادت اس کے حوالہ کی گئی جہاں غیر معمولی فتوحات کے ایک سلسلے نے اس کو فرانس کا قابل پرستش ہیرو بنا دیا۔ مصر میں ایک مختصر فوجی مہم کے بعد وہ فرانس واپس چلا آیا اور ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کو حکومت میں ناگہانی تغیر (Coup d, etat) کی بدولت نئے دستور کے تحت حاکمانہ اختیارات

کے ساتھ قونصل اوّل (First Consal) بنا دیا گیا۔ ۱۸۰۲ء میں ایک اور کامیاب اطالوی فوجی مہم کے بعد وہ قونصل تاحیات بنا دیا گیا۔ ۱۸۰۴ء میں بحیثیت شہنشاہ نپولین اوّل اس کی تاج پوشی ہوئی۔

اپنے حریفوں کے خلاف لڑائیوں میں نپولین کو متواتر کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ پرشیائی مخالفت کا اس نے جینا اور آسٹرلیٹز (Jena and Austerlitiz) کی لڑائیوں میں خاتمہ کر دیا۔ بولون (Boulogne) کی طرف سے انگلینڈ پر یورش کی دھمکی دی اور روسیوں کو ایلاؤ اور فرائڈ لینڈ (Eylau and Fried Land) کے میدانوں میں شکست دی۔ اسپین میں غیر اطمینان بخش معرکے کے بعد سرزمین روس پر نپولین کی فوج کشی مہلک ثابت ہوئی اور ۱۸۱۲ء میں ماسکو (Moscow) سے اس کو پسپا ہونا پڑا۔ بالآخر ۱۸۱۴ء میں نپولین تخت سے دست بردار ہو کر ایلبا (Elba) میں جلاوطن ہو گیا۔

۱۸۱۵ء میں نپولین نے ایک اور کوشش کی فرانس واپس آیا لیکن ۱۵ رجون ۱۸۱۵ء کو واٹرلو (Waterloo) میں اس نے شکست فاش کھائی بحر اٹلانٹک کے دور دراز جزیرہ سینٹ ہلینا (Saint Helena) میں اس کو قید کر دیا گیا جہاں ۵ رمئی ۱۸۲۱ء کو اس نے وفات پائی۔

جوزے فائن (Josephine) اس کی پہلی بیوی تھی جس کو اولاد اور جانشین کی خاطر ۱۸۰۹ء میں طلاق دے کر نپولین نے آسٹریا کی شہزادی میری لوائز (Marie Looise) سے شادی کی تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا جس کو شہزادہ روم کا خطاب دیا گیا۔ نپولین کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ میدان جنگ کے علاوہ فرانس کی تفصیلی تنظیم جدید میں ہوا۔ مجموعہ قوانین نپولین (Code Napoleon) فرانس کا نیا نظام تعلیم، بنک آف فرانس کا قیام، یہ اس کے بعض ایسے کارنامے ہیں جو اس وقت تک زندہ ہیں۔

انیسویں صدی کا یورپ

نپولین کے زوال کے بعد یورپی اقوام نے مزید جنگوں کو روکنے کے لیے عہد نامے کیے حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۴ء تک نئی عالمگیر جنگ کو روکے رکھا۔ مقامی جنگیں البتہ ۱۸۲۰ء اور پھر ۱۸۴۸ء میں ہوئیں۔ ان جنگوں میں یورپ کی مختلف قوموں نے انقلاب فرانس کی طرح پر اپنے حکمرانوں کی مطلق العنانی کو محدود کرنے اور جمہوری حکومتیں قائم کرنے کے ضمن کیے بیشتر ملکوں میں یہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ سیاسی اعتبار سے جمہوریت انیسویں صدی کا سب سے بڑا نصب العین رہا ہے لہٰذا اس صدی کو جمہوریت کی صدی بھی کہا جا سکتا ہے۔

جنگ کی ایک وجہ قوم پرستی تھی جہاں تک جرمن قوم کا تعلق ہے بسمارک (Bismarck) نے مختصر جنگوں (۱۸۶۴ء، ۱۸۶۶ء) اور ۱۸۷۰ء کے ذریعہ آسٹریا کے سوا جرمنی کی متعدد چھوٹی ریاستوں کو متحد کرنے اور پرشیائی قیادت میں ایک طاقتور جرمن مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح اٹلی کی متعدد چھوٹے ریاستیں جو قرون وسطیٰ سے موجود تھیں تین مختصر جنگوں (۱۸۵۹ – ۱۸۷۰ء) کے بعد ایک قومی بادشاہت میں متحد ہو گئیں۔

بلقان (Balkans) کے عیسائی باشندوں میں بھی جو ترکی حکومت کے تحت تھے قومیت کا شدید احساس پیدا ہوا۔ یورپ کی بعض بڑی ریاستوں کی مدد سے انہوں نے ترکوں کو کئی جنگوں میں شکست دے کر یونان، سربیا (Serbia) رومانیہ اور بلغاریہ میں چھوٹی چھوٹی آزاد بادشاہتیں قائم کر لیں۔

۱۸۷۰ء کے بعد نئی جرمن مملکت کی حفاظت کے لیے بسمارک نے آسٹریا اور اٹلی سے معاہدے کیے۔ اس اتحاد ثلاثہ (Triple Alliance) کے خلاف فرانس نے جرمنی سے اپنے تحفظ کے لیے روس سے ایک معاہدہ کیا۔ اس کے بعد انگلستان نے فرانس اور روس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور یوں تیسرا دوستانہ معاہدہ (Triple Entente) وجود میں آیا۔

اس طرح یورپ کے بڑے بڑے ممالک دو مخالف گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ یہ بڑے ممالک اپنی افواج اور بحری طاقت میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔ اس کے باعث ہر فریق میں خوف اور بدگمانی بڑھتی گئی۔ افریقہ، ایشیا اور دوسرے خطوں پر تصرف کے لیے تنازعے بھی ہوئے جنگ سے صرف اس لیے احتراز کیا گیا کہ ابھی بڑے ممالک اس کے لیے تیار نہیں تھے۔

تمدنی و سیاسی ترقی

سیاسی صورت حال دھماکہ خیز ہونے کے باوجود یورپ کا یہ زمانہ ایک دل کش تصویر پیش کرتا ہے۔ اس صدی کے اختتام کے قریب موٹر کار آئی اور آخر میں جہاز آیا۔ بجلی پر قابو حاصل ہونے کے بعد تار برقی اور ٹیلی فون دکھائی دینے لگے۔ ان تمام چیزوں نے دنیا میں ایک بہت بڑا فرق پیدا کر دیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ دنیا سکڑ کر بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ میکانکی انقلاب کا نتیجہ سرمایہ دار تمدن کی شکل میں ظاہر ہوا اور سرمایہ داری نے شہنشاہی نظام حکومت (Imperialism) کی طرف رہنمائی کی۔ ہر جگہ یورپ غالب تھا۔ یورپی تہذیب شباب پر تھی۔ یہ تہذیب شہری متوسط طبقے کی تہذیب (Bourgeois Civilization) کہلانے لگی کیوں کہ متوسط طبقے جو صنعتی سرمایہ داری کی پیداوار تھے اس تہذیب پر چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف فراوانی اور قوت حیات اور تخلیقی صلاحیت نمایاں تھی۔ اس دور میں بڑے بڑے شعرا، مصنفین، فلسفی، سائنسداں، ماہران موسیقی، انجینیر اور مردانِ عمل پیدا ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم

جولائی ۱۹۱۴ء میں چھڑ گئی۔ اس کا فوری محرک ایک سربی (Serbian) نوجوانوں کے ہاتھوں تخت آسٹریا کے جانشین کا قتل تھا۔ آغاز جنگ کے ساتھ ہی روس اور انگلینڈ سربیا کی طرف ہو گئے اور جرمنی نے اپنے حلیف آسٹریا کا ساتھ دیا۔ اٹلی نے ابتدا میں اپنے آپ کو جنگ سے علاحدہ رکھا لیکن ایک سال بعد اس خیال کے تحت کہ اتحادیوں کو کامیابی ہو گی ان کی طرف ہو گیا۔ ممالک متحدہ امریکہ بھی اس خوف سے کہ جرمنی اور آسٹریا کی فتح ہوئی تو یورپ ان کے قبضۂ اختیار میں آجائے گا اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا۔ جنگ میں ممالک متحدہ امریکہ کی شرکت کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ جرمنی کی آب دوز کشتیاں غیر جانب دار ممالک بشمول ممالک متحدہ کے جہازوں کو غرق کر رہی تھیں۔ ساڑھے چار سال تک جنگ ساری دنیا میں زور و شور سے جاری رہی۔ بڑی بحری اور فضائی لڑائیاں ہوئیں جن میں تخمیناً آٹھ لاکھ جانوں کے اتلاف کے بعد ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ ختم ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے لگ بھگ یورپ کے بیشتر حکمراں خاندانوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان کی جگہ کم و بیش جمہوری حکومتیں قائم کر دی گئیں۔ روس میں اشتمالی جماعت (Communist Party) نے ۱۹۱۷ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اشتمالیوں نے ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی کی از سر نو تنظیم کی اور اس کو یو۔ ایس۔ ایس۔ آر (Union of Socialist Soviet Republics) کا نیا

سرکاری نام دیا۔ داخلی ابتری کے ایک طویل دور کے بعد (The League of Nation) انہوں نے ایک عوامی حکومت مطلق (Dictatarship of The People) کو مستقل بنیاد پر قائم کر لیا۔

انجمن اقوام (The League of Nation)

خونریزی سے تنگ آکر یورپ کے لوگوں نے ۱۹۲۰ء میں انجمن اقوام کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ ممالک متحدہ امریکہ کے پریسیڈنٹ وڈرو ولسن نے اس کے قائم کرنے پر زور دیا۔ انجمن کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل کی جنگوں کی روک تھام کی جائے اور دنیا میں امن کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تجویز رکھی گئی کہ سلطنتوں کے درمیان خفیہ معاہدات کو منسوخ قرار دیا جائے اور تنازعات کے تصفیوں کے لیے پر امن ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک اس کے رکن بنے لیکن ممالک متحدہ امریکہ نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا جس کی وجہ انجمن خاطر خواہ توانائی حاصل نہ کر پائی۔

۱۹۳۰ء کے اقتصادی بحران کے دوران سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ یورپ میں لاکھوں مزدور بے روزگار ہو گئے تھے عوام دستکاری کے لیے اٹلی میں بنتو مسولینی (Benito Mussolini) اور جرمنی میں اڈالف ہٹلر (Adolf Hitler) جیسے ڈکٹیٹروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان ڈکٹیٹروں نے انجمن اقوام جیسے بین الاقوامی تعاون کے ادارے پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی طاقت کو بڑھاتے گئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی تائید کے بغیر انگلستان اور فرانس طاقت کو طاقت کے ذریعہ روکنے پر رضا مند نہیں تھے یو. ایس. ایس۔ آر (U.S.S.R) نے جرمنی اور اٹلی اور جاپان کے خلاف متحدہ جنگی کارروائی کی تجویز پیش کی لیکن جمہوریتوں میں آپس میں اور جمہوریتوں و سوویت روس کے مابین بدگمانی اس طرح حائل ہو گئی کہ انجمن اقوام کو اس کا یارا نہ رہا کہ کوئی مؤثر کارروائی کرے۔

دوسری جنگ عظیم

۱۹۳۵ء میں اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے حبش (Ethiopia) پر قبضہ کر لیا پھر ہٹلر نے ۱۹۳۸ء میں فوجی طاقت کی دھمکیاں دے کر آسٹریا اور چیکوسلواکیہ کے بعض حصوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس اعلان کے باوجود کہ یورپ میں اسے کوئی مزید علاقائی مطالبات کرنے میں ہٹلر نے دوسرے ہی موسم بہار میں چیکوسلواکیہ کو زبردستی جرمنی کے زیر اثر قرار دے دیا اور پولینڈ سے بھی کچھ علاقائی مطالبات کر ڈالے۔ انگلستان اور فرانس کی امداد کے بوتے پر جب پولینڈ نے ان مطالبات کو ماننے سے انکار کیا تو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر کے لشکر جرار نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔

دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آنے والے انسانوں کی تعداد پہلی جنگ عظیم کی تعداد سے بھی زیادہ تھی اور جانی و مالی نقصانات کہیں زیادہ ابتدا میں ہٹلر پولینڈ کو پامال کرنے اور ڈنمارک ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں اس نے یو. ایس. ایس. آر پر حملہ کر کے بڑی غلطی کی۔ اگرچہ اس نے اس ملک کے اہم حصوں پر قبضہ کر لیا تاہم بالآخر کثیر جانی اور جنگی سامان کے نقصانات کے ساتھ اسے پسپا ہونا پڑا۔ اس اثنا میں ممالک متحدہ امریکہ پرل ہاربر (Pearl Harbour) پر جاپان کے حملے کے باعث جنگ میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۴۳ء کے موسم خزاں کے قریب اٹلی کو التوائے جنگ پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا گیا اور مئی ۱۹۴۵ء میں جرمنی نے غیر مشروط قبول اطاعت پر دستخط کر دیے۔ اسی سال اگست میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی ایٹمی بمباری کے بعد جاپان نے اطاعت قبول کر لی۔

مابعد جنگ کا زمانہ

دوسری جنگ عظیم نے جرمنی کی طاقت توڑ دی ۱۹۴۵ء کے بعد یو. ایس. آر یورپ کی عظیم ترین طاقت بن گئی۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ میں اشتمالیوں کے زیر اثر حکومتیں قائم کی گئیں۔ یوگوسلاویہ بھی ٹی ٹو (Tito) کے زیر اثر اشتمالی ہو گیا۔ لیکن وہ سوویت (Soviet) رسوخ سے باہر رہا اور ۱۹۴۸ء میں اس نے سوویت زمرہ سے قطع تعلق کر لیا۔

سوویت روس کے بڑھتے ہوئے حلقہ اثر کے جواب میں ۱۹۴۹ء میں ناٹو (Nato) کا قیام عمل میں آیا جس کے حسب ذیل ممالک رکن بنے ممالک متحدہ امریکہ، کناڈا، برطانیہ، فرانس، ناروے، ڈنمارک، آئس لینڈ، پرتگال، اطالیہ، یونان اور ترکی۔ ۱۹۵۵ء میں جرمن وفاقی جمہوریہ کو اس کا پندرھواں رکن بنایا گیا۔

تاریخ برطانیہ عظمیٰ

برطانیہ کے قدیم ترین باشندے بالکل غیر متمدن تھے تقریباً ۲۳۰۰ ق م میں ایک اور نسل کے لوگ آئبیریا (اسپین) سے برطانیہ آئے اور ان کے بعد کلٹ آئے جو اسی نسل سے تھے جس سے اہل ویلز ہیں۔ کلٹ جو جنوبی برطانیہ میں آباد ہو گئے وہ برطانوی کہلاتے تھے اہل برطانیہ نے روم کے خلاف جنگ میں گال فرانس کے باشندوں کی مدد کی تھی اس لیے ان کو سزا دینے کے لیے جولیس قیصر نے ۵۵ ق م اور اس کے بعد ۵۴ ق م میں برطانیہ پر حملہ کیا اور اپنا مقصد پورا کر کے واپس چلا گیا۔ ۴۳ء میں شہنشاہ کلاڈیس نے برطانیہ کو فتح کرنے کی غرض سے ایک فوج بھیجی جس کے فتحیاب ہونے کے بعد برطانیہ روم کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ رومیوں نے ۱۵ سال تک برطانیہ پر حکومت کی۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب جرمن قبائل رومی سلطنت پر حملہ آور ہوئے تو رومیوں نے اپنی افواج کو برطانیہ سے واپس بلا لیا۔ ۴۴۹ء میں جرمن نسل کے تین قبائل اینگل سیکسن اور جوٹ جنوبی برطانیہ پر حملہ آور ہوئے اور وہاں مستقل طور پر آباد ہونے لگے۔ انہوں نے سلطنتیں قائم کیں۔ یہ برتری کے لیے آپس میں جنگ کرتی رہتی تھیں۔ بالآخر ویسیکس کو سیادت حاصل ہوئی۔ ۵۹۷ء میں پوپ گریگری نے سینٹ آگسٹین کو عیسوی مذہب کی تبلیغ کے لیے انگلستان بھیجا۔ ۶۶۴ء تک یہ مذہب سارے ملک میں پھیل گیا تھا۔ آٹھویں صدی کے آخر میں انگلستان پر ڈینوں کی غارت گرانہ یورشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۸۷۸ء میں ویسیکس کے بادشاہ الفریڈ (۸۴۱ - ۸۹۹ء) نے ان کو شکست دی۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں بہت سی اصلاحات کیں جن کے باعث اسے الفریڈ اعظم کہا جاتا ہے۔

الفریڈ کے مرنے کے چند سال بعد ایتھلرڈ کے دور میں ڈینوں کے نئے حملے شروع ہوئے ایتھلرڈ نے انگلستان میں رہنے والے تمام ڈینوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ سوئین شاہ ڈنمارک انتقام لینے کے لیے ۹۹۴ء میں انگلستان پر حملہ آور ہوا۔ ایتھلرڈ فرانس کو فرار ہو گیا سوئین ایک ہی سال میں مر گیا اس کا بیٹا کینوٹ ایک قابل اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے انگلستان کو چار بڑے صوبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا انتظام ایک والی

کے سپرد کیا۔ ۱۰۳۵ء میں کینوٹ کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹوں ہیرالڈ اور ہارڈی کینوٹ نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ آخر الذکر کے مرنے پر انگریزوں نے ایتھلرڈ کے بیٹے ایڈورڈ نائب کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ ۱۰۶۶ء میں ایڈورڈ کے لاولد مرنے پر مجلس عقلا نے ہیرلڈ والی ویسکس کو بادشاہ منتخب کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ولیم ڈیوک آف نارمنڈی نے تخت کا اس بنا پر دعوے کرکے کہ ایڈورڈ نائب نے اسے اپنا جانشین بنانے کا وعدہ کیا تھا انگلستان پر حملہ کیا۔ ہیسٹنگز کی لڑائی میں ہیرلڈ مارا گیا اور مجلس عقلا نے ولیم کو بادشاہ تسلیم کیا۔

انگلستان کے نارمن بادشاہ

ولیم فاتح (۱۰۶۶ - ۱۱۵۴ء) کے تخت نشین ہوتے ہی دو بغاوتیں برپا ہوئیں۔ یہ آسانی سے فرو کردی گئیں کیوں کہ انگریزوں میں اتحاد نہیں تھا۔ ولیم نے ایک مخصوص جاگیری طریقہ کو رواج دیا جس کی رو سے بادشاہ کے ساتھ وفاداری بڑے جاگیرداروں اور باقی متاجرین سب کا فرض قرار پایا۔

ولیم نے کلیسا کو بھی اپنے تابع رکھا۔ تاہم مذہبی مقدمات کے تصفیہ کے لیے کلیسا کی علاحدہ عدالتیں قائم کی گئیں۔

ولیم فاتح کا جانشین اس کا بیٹا ولیم روفس (۱۰۸۸ - ۱۱۰۰ء) ہوا جو بد اطوار اور حریص تھا لیکن اس کا چھوٹا بھائی ہنری اوّل (۱۱۰۰ - ۱۱۳۵ء) انگلستان کے ممتاز بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ایک منشور کے ذریعہ کلیسا اور جاگیرداروں کو اطمینان دلایا کہ ان سے صرف واجب رقومات ہی وصول کی جائیں گی۔

ہنری اوّل کے جانشین اس کے بھانجے اسٹیفن (۱۱۳۵ - ۱۱۵۴ء) کے عہد میں خانہ جنگی ہوتی رہی۔ اسٹیفن ایک کمزور حکمراں تھا اور اس کی کمزوری سے جاگیرداروں کو سرکشی کا موقع مل گیا۔ ۱۱۳۷ء میں تاج پر اپنا حق جتاتے ہوئے ہنری اوّل کی بیٹی میٹلڈا انگلستان میں وارد ہوئی اس کے بعد خانہ جنگی نے غارت گری اور خونریزی کا طوفان برپا کر دیا۔ ۱۱۵۲ء میں یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب میٹلڈا کا بیٹا ہنری آنٹرو انگلستان آیا اور فریقین میں یہ مصالحت ہوگئی کہ اسٹیفن اپنی بقیہ زندگی تک بادشاہ رہے گا اور ہنری کو اپنا ولی عہد بنائے گا۔

پلانٹا جینسٹ بادشاہ

اسٹیفن کا جانشین ہنری دوم (۱۱۵۴ - ۱۱۸۹ء) ایک وسیع مملکت کا فرماں روا تھا جس میں فرانس کا بہت کچھ حصہ شامل تھا۔ ہنری دوم ایک طاقتور بادشاہ تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک میں امن قائم کیا اور جاگیرداروں کی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے قوانین نافذ کیے۔ ان اصلاحات کو روبہ عمل لانے میں ہنری کو اپنے وزیر (چانسلر) ٹامس بیکٹ سے بڑی مدد ملی لیکن کچھ عرصہ بعد جب بادشاہ نے بیکٹ کو اسقف اعظم کنٹربری مقرر کیا تو آخر الذکر کلیسا کے مفاد کو مقدم سمجھنے لگا اور دونوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجہ میں بیکٹ قتل کیا گیا۔

ہنری دوم کا جانشین شیر دل رچرڈ اوّل (۱۱۸۹ - ۱۱۹۹ء) اپنے باپ کی وفات سے دو سال قبل صلیبی جنگ میں شریک ہونے کے لیے چلا گیا تھا اس نے صرف سات مہینے انگلستان میں گزارے۔

رچرڈ لاولد تھا اس لیے اس کی جگہ امرا (بیرنوں) نے اس کے بھائی جان (۱۱۹۹ - ۱۲۱۶ء) کو بادشاہ منتخب کیا۔ وہ ایک خود غرض اور ظالم شخص تھا پوئی ٹو کے جاگیرداروں نے فلپ شاہ فرانس سے جب اس کے مظالم کی شکایت کی تو فلپ نے جان کو جوابدہی کے لیے طلب کیا۔ جان کے انکار پر ۱۲۰۲ء میں فلپ نے نارمنڈی پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ اس کے بعد آنٹرو بھی جان کے ہاتھ سے نکل گیا اور فرانس میں انگریزوں کے ہاتھ میں صرف گیاسکنی کا علاقہ باقی رہ گیا۔

۱۲۰۵ میں جان نے پوپ کے مقرر کردہ اسقف اعظم کنٹربری اسٹیفن لانگ ٹن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ پوپ نے جان کو کلیسا سے خارج کر دیا اس پر جان نے پوپ کی اطاعت قبول کرلی اور لانگ ٹن کو تسلیم کرلیا۔

جان نارمنڈی کو واپس لینا چاہتا تھا۔ اس نے اخراجات جنگ کے لیے جاگیرداروں سے بھاری رقومات کا مطالبہ کیا جس پر جاگیردار اس کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہوگئے عوام بھی جان کے مخالف ہوگئے تھے۔ مجبور ہو کر جان کو ۱۲۱۵ء میں بیرنوں کی پیش کردہ دستاویز "منشور اعظم" (Magna Carta) پر دستخط کرنا پڑے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جان اپنے وعدہ سے پھر گیا اور لڑائی چھیڑ دی جنگ جاری ہی تھی کہ ۱۲۱۶ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

تخت نشینی کے وقت جان کے بیٹے ہنری سوم (۱۲۱۶ - ۱۲۷۳ء) کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ ۱۲۲۷ء میں ہنری سن بلوغ کو پہنچا۔ اس نے فرانس کی ایک امیرزادی سے شادی کرنے کے بعد اس کے عزیزوں اور دوسرے پردیسیوں کو اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا۔ ملک میں بدنظمی پھیل گئی بادشاہ کا بہنوئی سائمن ڈی مٹ فورٹ ناراض جاگیرداروں کا سرگروہ بن گیا۔ ۱۲۶۴ء میں انہوں نے سائمن کی سرکردگی میں شاہی افواج کو شکست دی اور بادشاہ اور اس کے بیٹے ایڈورڈ کو قید کرلیا۔ حکومت میں عوام کو شریک کرنے کی غرض سے ۱۲۶۵ء میں اس نے ایک پارلیمنٹ منعقد کی۔ سائمن کی سخت گیری کی وجہ سے اکثر بیرن اس کے مخالف ہوگئے تھے۔ ایڈورڈ قید سے رہائی حاصل کرکے ان بیرنوں کے ساتھ مل گیا۔ اس کی سرکردگی میں شاہی فوج نے ایوشام کی لڑائی (۱۲۶۵ء) میں سائمن کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ اس کے بعد ہنری سوم دوبارہ تخت نشین ہوا۔

ایڈورڈ اول (۱۲۷۲ - ۱۳۰۷ء) فن سپہ گری میں ماہر ہونے کے علاوہ اعلیٰ انتظامی قابلیت بھی رکھتا تھا اس نے لیولین آف ویلز کو جو خود مختار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شکست دے کر اس کے علاقہ کو شاہی عمل داری میں شامل کرلیا۔

ایڈورڈ نے اسکاٹ لینڈ کو بھی فتح کیا لیکن اس کے مرنے کے دو سال پہلے اسکوٹون نے بغاوت کی اور رابرٹ بروس کو تخت پر بٹھایا۔

۱۲۹۵ء میں ایڈورڈ نے ایک پارلیمنٹ منعقد کی جو نمونہ کی پارلیمنٹ کہلائی کیوں کہ اس میں ملک کے تینوں طبقوں یعنی امرا اہل کلیسا اور عوام کے نمائندے شریک تھے۔

ایڈورڈ اوّل کا جانشین اس کا بیٹا ایڈورڈ دوم (۱۳۰۷ - ۱۳۲۷ء) ایک نااہل بادشاہ تھا اس نے جن وزیروں کا انتخاب کیا ان سے امرا ناراض تھے۔ اس میں اور بیرنوں میں مناقشہ جاری رہا۔ اسکاٹ لینڈ میں رابرٹ بروس نے اس کو ۱۳۱۴ء میں شکست فاش دی اس کی غیر مقبولیت بڑھتی گئی ۱۳۲۷ء میں ملکہ ازابل شہزادہ ایڈورڈ کے ہمراہ فرانس سے انگلستان پہنچی۔ امرا اساقفہ اور لندن کے شہریوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ۱۳۲۷ء میں پارلیمنٹ نے ایڈورڈ کو معزول کر دیا اور وہ قید کرلیا گیا۔

ایڈورڈ سوم (۱۳۲۷ - ۱۳۷۷ء) نے رابرٹ بروس کے جانشین ڈیوڈ بروس کو شکست دے کر جان بیلیل کے بیٹے ایڈورڈ بیلیل کو تخت دلایا لیکن فرانس کی مدد سے ڈیوڈ نے تخت دوبارہ حاصل کرلیا۔ ۱۳۳۷ء میں جنگ صد سالہ کا آغاز ہوا۔ اس کی ایک وجہ اسکاٹ لینڈ میں فلپ شاہ فرانس کی مداخلت تھی۔ اس کے علاوہ گیسکنی پر فلپ نے حملہ کر دیا۔ ایڈورڈ نے فرانسیسی تخت کا دعویٰ کرکے ۱۳۳۷ء میں فلپ ششم کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اس جنگ میں ایڈورڈ کو شروع میں کامیابی ہوئی لیکن اس کے مرنے سے پہلے فرانس میں صرف

چند ساحلی علاقے انگریزوں کے قبضے میں باقی رہ گئے تھے۔ ۱۳۴۸ء میں کالی وبا کے پھوٹ پڑنے سے ملک کی ایک تہائی آبادی فنا ہوگئی۔

ایڈورڈ سوم کا پوتا رچرڈ دوم (۱۳۷۷ – ۱۳۹۹ء) جس وقت تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر صرف دس سال تھی، اس کے چچا جان آف گانٹ (John of Gaunt) ڈیوک آف لنکاسٹر کی قیادت میں ایک مجلس اولیائے بادشاہ تشکیل دی گئی۔ ۱۳۸۱ء میں کسانوں نے شورش کی جو کچل دی گئی۔ رچرڈ کے عہد میں وکلف کی قیادت میں ایک نئے مذہبی فرقے کا ظہور ہوا جس کے پیرو لولارڈ کہلاتے تھے۔ رچرڈ نے جب مطلق العنانی سے حکومت کرنا شروع کی تو امرا اس کی مخالفت کے لیے کھڑے ہوگئے۔ پارلیمنٹ نے ملکی انتظام امرا کی ایک مجلس کے سپرد کیا لیکن ۱۳۹۷ء میں رچرڈ اپنے دشمنوں پر غالب آگیا اور اس نے ان میں سے بعض کو قتل کروا دیا اور بعض کو جلا وطن کیا جن میں جان آف گانٹ کا بیٹا ہنری لینکاسٹر شامل تھا۔ ۱۳۹۹ء میں ہنری جب انگلستان وارد ہوا تو اس کی حمایت میں ملک میں ایک ہمہ گیر بغاوت برپا ہوگئی۔ رچرڈ تخت سے دست بردار ہوگیا اور پارلیمنٹ نے اسے معزول کیا۔

لینکاسٹر خاندان

ہنری چہارم (۱۳۹۹ – ۱۴۱۳ء) تاج شاہی کے لیے پارلیمنٹ کا مرہون منت تھا۔ اس کے اور لینکاسٹر خاندان کے دوسرے بادشاہوں کے زمانے میں پارلیمنٹ کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ اس نے ۱۴۰۱ء میں پارلیمنٹ سے ایک قانون منظور کروایا کہ ملحدوں کو زندہ جلا دیا جائے بہت سے لولارڈوں کی جان گئی لیکن اس کے عقیدے کا خاتمہ نہیں کیا جاسکا۔

اپنے باپ کی طرح ہنری پنجم (۱۴۱۳ – ۱۴۲۲ء) نے بھی لولارڈوں کے ساتھ سخت سلوک کیا۔ لولارڈوں کی تحریک دب گئی لیکن ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ قوم کی توجہ ملکی معاملات سے ہٹانے کے لیے ہنری پنجم نے فرانس کے خلاف جنگ کی تجدید کی اور اس جنگ میں اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ ۱۴۲۰ء میں معاہدہ ترائے کی رو سے طے پایا کہ ہنری شاہ فرانس کی لڑکی سے شادی کرے اور چارلس کے بعد فرانس کا وارث ہو اور چارلس کی بقیہ زندگی میں نائب سلطنت رہے۔ ولی عہد فرانس نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ہنری نے فرانس پر دوبارہ فوج کشی کی جنگ جاری تھی کہ ہنری یکایک بیمار ہو کر فوت ہوگیا۔

ہنری پنجم کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد شاہ فرانس بھی مر گیا۔ ہنری پنجم کا شیر خوار بیٹا ہنری ششم (۱۴۲۲ – ۱۴۶۱ء) دونوں ممالک کا بادشاہ بن گیا اس کا ایک چچا ڈیوک آف گلوسٹر محافظ سلطنت مقرر ہوا اور دوسرے چچا ڈیوک آف بیڈفورڈ نے فرانس میں جنگ جاری رکھی۔ ابتدا میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی لیکن بعد میں ان کو شکست کھانی پڑی اور ۱۴۵۲ء تک بجز کیلے ان کو فرانس میں اپنے سارے مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ہنری ششم کی نابالغی کے زمانے میں امرا کے باہمی مناقشات کے باعث ملک کے حالات بگڑتے جارہے تھے اور اس کے سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بھی ان حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔

۱۴۵۳ء میں ہنری ششم دماغی عارضے میں مبتلا ہوگیا۔ پارلیمنٹ نے ڈیوک آف یارک کو محافظ سلطنت مقرر کیا۔ اس میں اور ڈیوک آف سمرسٹ میں سخت رقابت تھی۔ بادشاہ کے صحت یاب ہونے پر ڈیوک آف یارک کو شاہی مجلس سے علاحدہ کر دیا گیا اور سمرسٹ پھر طاقتور ہوگیا۔ اس کو ملکہ کی بھی تائید حاصل تھی۔ ڈیوک آف یارک جنگ پر آمادہ ہوگیا اس جنگ میں ۱۴۵۵ء میں سمرسٹ اور ۱۴۶۰ء میں ڈیوک آف یارک مارا گیا۔ ۱۴۶۱ء میں ڈیوک آف یارک کا لڑکا ایڈورڈ لینکاسٹریوں کو شکست دے کر لندن کی طرف بڑھا۔ لندن کے باشندوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ پارلیمنٹ نے اس کو بادشاہ تسلیم کیا اور ہنری ششم قلعہ لندن میں قید کر دیا گیا۔

خاندان یارک

ایڈورڈ چہارم (۱۴۶۱ – ۱۴۸۳ء) کا دور مطلق العنان حکومت کا دور تھا لینکاسٹریوں کی جائیدادوں کی ضبطی سے شاہی خزانہ مالا مال ہوگیا اس کے علاوہ بادشاہ نے سوداگروں وغیرہ سے پیش کش اور نذرانے وصول کیے اس لیے اسے پارلیمنٹ کو طلب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ایڈورڈ پنجم جس کا سن ۱۲ سال تھا ۱۴۸۳ء میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس کا چچا رچرڈ ڈیوک آف گلوسٹر محافظ سلطنت مقرر ہوا اس نے ایڈورڈ پنجم اور اس کے چھوٹے بھائی کو ان کی ماں ایلزبیتھ وڈول (Elizabeth Woodville) سے علاحدہ کر کے قلعہ لندن میں نظر بند کر دیا اور یہ اعلان کر کے کہ ایڈورڈ چہارم کی شادی ایلزبیتھ وڈول سے جائز نہیں تھی تخت کا دعویٰ کیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد اس نے ایڈورڈ پنجم اور اس کے بھائی رچرڈ کو قلعہ لندن میں مروا ڈالا اور ۱۴۸۳ء میں رچرڈ سوم کے نام سے تخت نشین ہوگیا۔

رچرڈ سوم نے عوام میں مقبول ہونے کی غرض سے چند مفید قوانین نافذ کیے لیکن وہ عوام کو اپنا طرف دار نہیں بنا سکا۔ ملک میں بادشاہ سے جو عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر ہنری ٹیوڈر ارل آف رچمنڈ (Earl of Richmond) جو ایڈورڈ سوم کے بیٹے جان آف گانٹ کی اولاد میں سے تھا فرانس سے انگلستان میں وارد ہوا۔ اس کی فوج میں لوگ ایک کثیر تعداد میں شامل ہوگئے۔ ۱۴۸۵ء میں بوس ورتھ (Bosworth) کی لڑائی میں وہ فتح یاب ہوا۔ رچرڈ سوم مارا گیا اور ہنری ٹیوڈر تخت نشین ہوا۔

خاندان ٹیوڈر

ہنری ہفتم (۱۴۸۵ – ۱۵۰۹ء) نے ایڈورڈ چہارم کی لڑکی ایلزبیتھ سے شادی کی۔ اس طرح لینکاسٹر اور یارک خاندان متحد ہوگئے۔

گو ہنری ہفتم کو پارلیمنٹ نے تاج شاہی کا وارث قرار دیا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ پارلیمنٹ کا محتاج نہ رہے۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے امرا کی اس طاقت کا خاتمہ کر دیا جو گلابوں والی جنگ کا باعث ہوئی تھی۔ اس نے مصلحتی شادیوں کے ذریعہ سے ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بڑے بیٹے آرتھر کی شادی آریگان کی شہزادی کیتھرین سے اور اس کی بیٹی کی شادی جیمس چہارم شاہ اسکاٹ لینڈ سے عمل میں آئی۔ آرتھر کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ مر گیا۔

ہنری ہفتم کے جانشین ہنری ہشتم (۱۵۰۹ – ۱۵۴۷ء) نے پوپ کی اجازت سے اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کی۔ وہ صاحب علم مگر مغرور اور تند مزاج تھا۔

تقریباً بیس سال تک ہنری ہشتم کا وزیر ٹامس ولزی تھا۔ وہ پہلے اسقف اعظم یارک تھا بعد میں پوپ نے اسے کارڈینل بنایا ہنری ہشتم کے عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ انگلستان کے کلیسا کی روم سے علاحدگی ہے۔ ہنری کو بیٹے کی خواہش تھی ساتھ ہی اس کو ایک نوجوان عورت این بولین سے محبت ہوگئی۔ اس نے پوپ سے درخواست کی کہ وہ کیتھرین سے اس کی شادی کو ناجائز قرار دے کر طلاق کا فتویٰ دے۔ پوپ نے اسپین کے ڈر سے اس کی درخواست کو نامنظور کیا۔ ولزی چاہتے ہوئے بھی اس معاملے میں بے بس تھا۔ ہنری نے ۱۵۲۹ء میں ولزی کو معزول کیا۔ ۱۵۳۴ء میں پارلیمنٹ سے قانون افضلیت منظور کرایا۔

اس کے بعد ہنری نے اسقف اعظم ٹامس کرینمر (Cranmer) کو راضی کر کے کیتھرین کو طلاق دی اور این بولین سے شادی کر لی۔ ہنری نے یکے بعد دیگرے چھ شادیاں کیں۔

چوں کہ تخت نشینی کے بعد ہنری ہشتم کے بیٹے ایڈورڈ ششم (۱۵۴۷ –

۱۵۵۴ء) کی عمر صرف نو سال تھی، ایک مجلس تولیت قائم کی گئی اور ایڈورڈ کے ماموں ڈیوک آف سمرسٹ کو محافظ سلطنت مقرر کیا گیا۔ اس نے اصلاح دین کا کام جاری رکھا اور لاطینی مناجات موقوف کرکے ۱۵۴۹ء میں انگریزی میں عام مناجات کی کتاب شائع کی۔

میری (۱۵۵۳ - ۱۵۵۸ء) نے جو ہنری ہشتم اور کیتھرین آف آریگان کی بیٹی تھی ایڈورڈ ششم کے عہد کے مذہبی قوانین کو منسوخ کردیا جن لوگوں نے کیتھولک مذہب کو قبول کرنے سے انکار کیا وہ یا تو قید کیے گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔

میری نے پارلیمنٹ سے ایک قانون منظور کرایا جس کی رو سے انگلستان میں پوپ کا اقتدار بحال کیا گیا اور مرتدوں کو زندہ جلا دینے کے طریقہ کی تجدید کی گئی۔ تین سو سے زیادہ پروٹسٹینٹ زندہ جلا دیے گئے۔ ان مظالم کی بنا پر میری کو "خونی میری" کا لقب دیا گیا۔ اس نے فلپ ثانی شاہ اسپین سے شادی کی تھی، ۱۵۵۷ء میں فلپ نے فرانس پر حملہ کیا اور میری کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر مجبور کیا۔ اسی سال فلپ نے کیلے پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فرانس میں کوئی مقام انگریزوں کے قبضہ میں باقی نہیں رہا۔

میری کی جانشین، ہنری ہشتم اور این بولین کی بیٹی ایلزبتھ (۱۵۵۸ - ۱۶۰۳ء) کو اقتدار کی ہوس تھی اور بعض وقت وہ بے رحمی کا بھی مظاہرہ کرتی تھی مگر سیاسی حکمت عملی میں طاق اور قوت ارادی رکھتی تھی۔ مذہب کے معاملہ میں وہ اپنے باپ کے درمیانی راستہ کو پسند کرتی تھی۔

ایلزبتھ کے بعد تخت کی حقدار اسکاچ ملکہ میری تھی۔ اپنے شوہر فرانسس دوم شاہ فرانس کے انتقال کے بعد وہ اسکاٹ لینڈ واپس آکر تخت نشین ہوئی۔ اس نے ایک ایسے شخص سے شادی کی جس پر قتل کا الزام تھا۔ امرا نے اس کے خلاف بغاوت کی وہ اسکاٹ لینڈ سے فرار ہو کر انگلستان پہنچی۔ ایلزبتھ کے خلاف کیتھولکوں نے ایک سازش کی تھی اس میں شرکت کے جرم میں ایلزبتھ نے میری کو موت کی سزا دی۔

ایلزبتھ کے عہد کا ایک بڑا واقعہ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے جنگی بیڑے کی شکست ہے۔ ایلزبتھ کو آئرلینڈ میں کئی شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کو اس نے بڑی بے رحمی سے فرو کیا اور انگریزوں کی ایک بڑی تعداد کو آئرلینڈ میں بسنے کا موقع دیا۔

ایلزبتھ کا دور ایک درخشاں دور سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس میں انگلستان نے ہمہ گیر ترقی کی۔

ایلزبتھ کی وفات پر اسکاچ میری کا بیٹا جیمس ششم شاہ اسکاٹ لینڈ جیمس اول کے نام سے انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ جیمس اول (۱۶۰۳ - ۱۶۲۵ء) صاحب علم مگر کوتاہ اندیش تھا۔ رومن کیتھولکوں (Roman Catholics) کو ایلزبتھ کے دور میں جو شکایتیں تھیں ان کے رفع نہ کیے جانے پر انہوں نے ایک سازش کی۔ نہ صرف کیتھولکوں بلکہ پروٹسٹنٹوں کے ساتھ بھی جیمس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔

جیمس اول مسرف تھا۔ اس کو بار بار پارلیمنٹ سے مالی امداد طلب کرنی پڑتی تھی۔ اور پارلیمنٹ سے اس کا تنازعہ رہتا تھا جیمس بادشاہ کی نیابت الٰہی میں یقین رکھتا تھا۔

جیمس کے بیٹے چارلس اول (۱۶۲۵ - ۱۶۴۹ء) کا بھی یہی ایقان تھا۔ اپنے باپ کی طرح چارلس بھی بکنگھم کو بہت چاہتا تھا۔ بکنگھم کے مشورہ سے چارلس نے فرانس سے دوستی کے فوائد کی امید میں اسپین کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ چارلس کی پہلی اور دوسری پارلیمنٹ نے بادشاہ کے رقمی مطالبہ کے جواب میں بکنگھم کی علاحدگی پر اصرار کیا دونوں دفعہ چارلس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا جنگ کے اخراجات کے لیے چارلس نے رعایا سے جبری قرضے وصول کیے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو ۱۶۲۸ء میں اس نے اپنی تیسری پارلیمنٹ طلب کی۔ دارالعوام نے معروضۂ حق کے نام سے اپنے مطالبات پیش کیے۔ بادشاہ نے بادلِ ناخواستہ معروضۂ حق کو قبول کر لیا تو پارلیمنٹ نے رقم کی منظوری دے دی تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بکنگھم کو ایک انتہا پسند پیورٹن (Puritan) نے قتل کر دیا۔

چارلس معروضۂ حق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے محاصل درآمد و برآمد وصول کرنے لگا۔ ۱۶۲۹ء میں جب پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہوا تو ایلیٹ کی تحریک پر ایک قرارداد میں بادشاہ کے غیر آئینی کارروائیوں کی مخالفت کی گئی اس پر چارلس نے ایلیٹ کو قید کر دیا اور پارلیمنٹ کے بغیر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا۔

گیارہ سال تک مطلق العنان حکومت کا دور دورہ رہا۔ سیاسی امور میں وِنٹورتھ ارل آف اسٹرافورڈ اور کلیسائی امور میں اسقف اعظم لاڈ (Laud) اس کا مشیر تھا۔ چارلس نے مختلف غیر قانونی طریقوں سے رقوم وصول کیں ان میں ایک طریقہ زر جہازی کا طلب کرنا تھا۔ جان ہیمپڈن (John Hampden) نے یہ محصول دینے سے انکار کیا۔ ۱۶۳۷ء میں مقدمہ عدالت میں پیش ہونے پر بادشاہ کے موافق فیصلہ ہوا۔ اس فیصلہ سے ناراض ہو کر لوگ بادشاہ کے خلاف آوازیں بلند کرنے لگے۔ اسقف اعظم لاڈ نے اپنی اور بادشاہ کی مخالفت کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ اسٹرافورڈ بھی جسے آئرلینڈ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا نہایت سخت گیر تھا۔ چارلس اول سے اہل اسکاٹ لینڈ بھی ناراض تھے۔ ان کے خلاف جنگ میں چارلس کو شکست ہوئی اور اس کو فوج کے اخراجات دینے پر رضامند ہونا پڑا۔ مالی مشکلات سے مجبور ہو کر ۱۶۴۰ء میں چارلس نے پارلیمنٹ کو طلب کیا۔ یہ پارلیمنٹ طویل پارلیمنٹ کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ یہ چالیس سال تک برقرار رہی۔ لارڈ اور اسٹرافورڈ کا مواخذہ کیا گیا۔ اسٹرافورڈ اور بعد میں لاڈ کو موت کی سزا دی گئی۔

پم (Pym) اور ہیمپڈن (Hampden) نے احتجاج کبیر (Grand Remonstrance) کے نام سے ایک قرارداد مرتب کی جس میں بادشاہ کے خلاف قوم کی شکایتیں درج تھیں دارالعلوم نے اسے منظور کیا۔ اس کے بعد چارلس خود دارالعلوم میں داخل ہوا اور پانچ ارکان کو، جن میں پم اور ہیمپڈن شامل تھے گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر وہ فرار ہو گئے بادشاہ کی اس حرکت سے ارکان بہت برہم ہوئے بادشاہ اور پارلیمنٹ میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش ناکام ہوگئی اور دونوں فریقوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اس جنگ میں کرامول (Crom well) کی سرکردگی میں پارلیمنٹ کی فوج نے شاہی فوج کو شکست دی اور بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ارکان پارلیمنٹ پرِس بیٹر (Pres byter) اور آزاد خیال گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے کرامول نے پارلیمنٹ کے ان ارکان کو جنہوں نے پرِس بیٹرین (Presbyterian) جماعت اور بادشاہ کی حمایت کی تھی۔ پارلیمنٹ سے خارج کر دیا اور اس رمپ (Rump) پارلیمنٹ نے (یعنی آزاد جماعت کے ارکان جو پارلیمنٹ میں باقی رہ گئے تھے) کرامول کی تائید سے ایک عدالت بادشاہ کے مقدمہ کی سماعت کے لیے قائم کی۔ اس عدالت کے فیصلہ کے بموجب ۱۶۴۹ء میں چارلس کا سر قلم کر دیا گیا۔

دولت عامہ اور عہد محافظت

(۱۶۴۹ء - ۱۶۶۰ء)

چارلس کے قتل کے بعد بادشاہی کو منسوخ کیا گیا اور دولتِ عامہ کا قیام عمل میں آیا۔ دارالامرا کو ختم کیا گیا اور حکومت کے لیے رمپ کے ۴۱ ارکان کی مجلس سلطنت منتخب کی گئی

۱۶۴۹ء میں آئرلینڈ اور ۱۶۵۱ء میں اسکاٹ لینڈ کے باشندوں نے چارلس اوّل کے بیٹے چارلس دوم کو تخت دلانے کی کوشش کی جس کو کرامول نے اپنی فوجی طاقت سے ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد کرامول ہالینڈ کے خلاف جنگ میں ملوث ہوگیا۔ ۱۶۵۱ء میں پارلیمنٹ نے قانون جہاز رانی نافذ کیا تھا جس سے ہالینڈ کی جہاز رانی کو سخت نقصان پہنچا۔ اس لیے ہالینڈ نے اعلان جنگ کیا۔ کئی بحری لڑائیوں کے بعد ۱۶۵۳ء میں ہالینڈ کو شکست کھانی پڑی۔ اسی سال کرامول نے رمپ کو برخاست کر دیا اور ایک نیا دستور مرتب کیا جس کی رو سے وہ محافظ سلطنت مقرر ہوا اور ایک نئی پارلیمنٹ ترتیب دی گئی جس میں نہ صرف انگلستان بلکہ اسکاٹ لینڈ کے ارکان بھی شریک کیے گئے اور کرامول کو لامحدود اختیارات دیے گئے جن کا استعمال اس نے بڑے تدبر کے ساتھ کیا۔ مذہبی معاملات میں اس نے اعتدال اور رواداری برتی اور اس کی خارجی حکمت عملی بھی کامیاب ثابت ہوئی۔ فرانس اور اسپین میں جب جنگ چھڑ گئی تو اس نے فرانس کا ساتھ دیا اور بحری لڑائیوں میں انگریزوں نے اسپین کو شکست دی۔ کرامول کے عہد حکومت میں انگریزوں نے جمائیکا (Jamica) کو اسپین سے حاصل کیا۔

۱۶۵۸ء میں کرامول کی وفات پر اس کا بیٹا رچرڈ کرامول اس کا جانشین ہوا۔ یہ آرام طلب اور کمزور شخص تھا چند مہینوں کے بعد فوج نے اسے معزول کر دیا۔ ۱۶۶۰ء میں ایک نئی پارلیمنٹ منعقد ہوئی اور اس نے چارلس دوم کو تخت نشینی کے لیے فرانس سے آنے کی دعوت دی۔

بادشاہی بحالی

چارلس دوم ۱۶۶۰ - ۱۶۸۵ء کی تخت نشینی کے بعد طویل پارلیمنٹ برخاست کی گئی اور ۱۶۶۱ء میں ایک نئی پارلیمنٹ منعقد کی گئی جس کے سب ارکان کیویلیر (Cavalier) (شاہ پرست) جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں کرامول نے جو اتحاد قائم کیا تھا اس کو اس پارلیمنٹ نے منسوخ کر دیا۔ ۱۶۶۲ء میں چارلس دوم نے پرتگال کی شہزادی کیتھرین سے شادی کی۔ جہیز میں چارلس کو شاہ پرتگال سے بمبئی کا شہر ملا۔ ۱۶۶۵ء میں تجارتی رقابت کی وجہ سے ہالینڈ سے جنگ چھڑ گئی۔ ابتدا میں ولندیزیوں کے بحری بیڑے کو کچھ کامیابی ملی لیکن انگریزوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ۱۶۶۷ء میں صلح بریڈا (Breda) کی رو سے ایمسٹرڈیم کی نوآبادی ان کے ہاتھ آئی۔ اس کے صدر مقام کا نام بادشاہ کے بھائی ڈیوک آف یارک کے اعزاز میں نیویارک رکھا گیا۔

چارلس نے کلیرنڈن (Clarendon) کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ شاہی دربار کے تعیش اور عام بدانتظامی کے باعث کلیرنڈن کی وزارت غیر مقبول ہوگئی تھی۔ ۱۶۶۷ء میں اس کو معزول کیا گیا اور پانچ اشخاص کی وزارت جو کیبال (Cabal) کے نام سے مشہور ہوئی، قائم کی گئی۔

چارلس نے ۱۶۷۰ء میں خفیہ طور پر شاہ فرانس سے ڈوور (Dover) کا معاہدہ کیا اس کے تحت اس نے اپنے کیتھولک ہونے کا اعلان کرنے اور ہالینڈ کے خلاف فرانس کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا وعدہ کیا۔ لوئی چہاردہم نے عہد کیا کہ انگلستان میں اگر کوئی بغاوت ہو تو اس کو فرو کرنے میں فرانسیسی فوج مدد کرے گی۔ ہالینڈ کے خلاف جنگ میں فرانس کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد کیبال کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۶۷۳ء میں چارلس نے ڈینبی (Danby) کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اسی سال پارلیمنٹ نے قانون آزمائش منظور کیا جس کی رو سے یہ طے کیا گیا کہ سرکاری ملازمت میں صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے ہیں جو کلیسائے انگلستان کے پیرو ہوں۔ ڈینبی نے ہالینڈ سے صلح کر لی اور اسی کی کوشش سے ڈیوک آف یارک کی بیٹی میری کی شادی ولیم آف آرنج سے عمل میں آئی۔ یہ دونوں پروٹسٹنٹ تھے چوں کہ چارلس اور کیتھرین کے کوئی اولاد نہیں تھی اور ڈیوک آف یارک کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اپنے باپ کے بعد میری تخت کی وارث قرار پائی۔

۱۶۷۸ء میں چارلس اور شاہ فرانس کے درمیان خفیہ کارروائیوں میں شرکت اور رشوت ستانی کا الزام لگا کر پارلیمنٹ نے ڈینبی کا مواخذہ کیا اور وہ معزول کیا گیا۔

۱۶۷۹ء میں شافٹس بری (Shaftesbury) نے جو حزب اختلاف کا قائد تھا۔ مسودۂ قانون اخراج پیش کیا جس میں یہ درج تھا کہ چارلس دوم کا بھائی جیمس (James) چوں کہ کیتھولک ہے وہ تخت کا وارث نہیں ہو سکتا لیکن پارلیمنٹ نے اسے منظور نہیں کیا۔ لیکن شافٹس بری کی تحریک پر ہیبیس کورپس ایکٹ (HabeasCorpus Act) قانون منظور ہو گیا جس میں بغیر عدالتی تحقیقات کے کسی شخص کو قید کرنے کی ممانعت تھی جس وقت مسودہ قانون اخراج پر بحث ہو رہی تھی۔ شافٹس بری اور بادشاہ کے طرف داروں کے لیے علی الترتیب وگ (Whig) اور ٹوری (Tory) کے الفاظ استعمال کیے جا رہے تھے چارلس نے بڑی دانش مندی سے دستوری طریقہ اختیار کیا اس لیے ٹوری پارٹی کو غلبہ حاصل ہوگیا لیکن ٹوریوں سے زیادتیاں سرزد ہوئیں جن کی بنا پر وگوں نے ۱۶۸۳ء میں بادشاہ کو قتل کرنے کی ایک سازش کی جو رائی ہاؤس سازش (Rye House Plot) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پتہ چل گیا اور سازشیوں کو موت کی سزا دی گئی۔

چارلس کے جانشین جیمس دوم (۱۶۸۵ - ۱۶۸۸ء) کے دو مقاصد تھے مطلق العنان بادشاہ بننا اور کیتھولک مذہب کو سرکاری مذہب قرار دینا۔ ۱۶۸۷ء میں دو بغاوتیں اس کے خلاف کھڑی ہوگئیں ایک اسکاٹ لینڈ میں برپا ہوئی جو آسانی سے فرو کر دی گئی اس کے بعد ڈیوک آف مان ماؤتھ (MonMouth) نے جو چارلس دوم کا ناجائز بیٹا تھا، تخت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور اس کو اور اس کے تین سو ساتھیوں کو موت کی سزا دی گئی جیمس نے قانون آزمائش کو منسوخ کرانے کی کوشش کی لیکن پارلیمنٹ نے اس کی تائید نہیں کی۔ اس پر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ بادشاہ کو اختیارات استثنا (یعنی کسی شخص کو جو قانونا مجاز نہ ہو، ملازمت دینے اور اختیار التوا یعنی کسی قانون کے نفاذ کو ملتوی رکھنے کا حق حاصل ہے۔ عدالت نے اس ادعا کو درست قرار دیا۔ اس کے بعد جیمس نے کیتھولکوں کو عہدوں سے سرفراز کرنا شروع کر دیا۔ ۱۶۸۸ء میں اس نے اعلان رواداری جاری کیا جس کی رو سے وہ تمام قوانین معطل کر دیے گئے جن کی وجہ سے کیتھولک اور غیر مقلدین اپنے اپنے عقائد کے مطابق مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ سب پادری اپنے اپنے گرجاؤں میں یہ اعلان پڑھ کر سنائیں۔ سات اسقفوں نے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا اور جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو عدالت نے ان کو بری کر دیا اور عوام الناس نے خوشیاں منائیں۔

۱۶۸۸ء میں چند وگ اور ٹوری مدبروں کی درخواست پر ولیم انگلستان میں اپنی فوج کے ساتھ وارد ہوا۔ اہل ملک نے اس کا خیر مقدم کیا اور جیمس نے جب اپنے کو بے یار و مددگار پایا تو وہ تخت سے دست بردار ہوگیا اور فرانس کو فرار ہوگیا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں پارلیمنٹ کو بالآخر بادشاہ پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ پارلیمنٹ منعقد ہوئی اور اس نے یہ طے کیا کہ میری اور ولیم مل کر بادشاہی کریں اور نظم و نسق کا سارا اختیار میری کی رضامندی سے صرف اس کے شوہر کے ہاتھ میں رہے۔

ولیم اور میری کی تاج پوشی کے بعد ۱۶۸۹ء میں پارلیمنٹ نے مسودۂ قانون حقوق منظور کیا۔ اس کی رو سے جیمس دوم کی غیر آئینی کارروائیوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اسی سال قانون رواداری بھی منظور ہوا جس سے پروٹسٹنٹوں اور غیر مقلدوں کو اپنے اپنے گرجوں میں عبادت کرنے کی آزادی مل گئی۔ اس کے علاوہ قانون غدر منظور ہوا جس سے فوج کے اخراجات، پارلیمنٹ سال بہ سال منظور کرنے کا قاعدہ بن گیا۔

۱۶۹۴ء میں میری کا انتقال ہوا۔ ۱۷۰۱ء میں قانون تصفیہ وراثت منظور ہوا اس کی روسے کیتھولک عقائد کے ورثا تخت سے خارج کر دیے گئے۔

۱۶۹۰ء میں جیمس دوم آئرلینڈ میں جہاں اس کے طرف داروں کی کافی تعداد تھی ایک فرانسیسی فوج کے ساتھ وارد ہوا۔ ولیم نے آئرلینڈ پہنچ کر بوئن (Boyne) کی لڑائی میں اسے شکست دی اور آئرستانی باغیوں کی زمینیں ضبط کر کے اپنے پروٹسٹنٹ حامیوں میں تقسیم کی عہدوں اور آئرستانی پارلیمنٹ کی رکنیت سے کیتھولکوں کو محروم کیا گیا اور اس پارلیمنٹ پر انگریزی تسلط قائم ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقے کے قبیلوں نے بھی ۱۶۹۲ء میں جیمس دوم کی حمایت میں بغاوت کی۔ اس کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا۔

ولیم ہر دلعزیزی حاصل نہیں کر سکا۔ جیمس کے طرف داروں نے جو جیکوبائٹس (Jacobites) کہلاتے تھے ۱۶۹۴ء میں ولیم کو قتل کر کے جیمس کو تخت پر بٹھانے کی سازش کی۔ اس کا پتہ چل گیا اور سازشیوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اسی سال پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے پارلیمنٹ کی مدت تین سال تک محدود کر دی گئی۔

جیمس دوم کی بیٹی ملکہ این (۱۷۰۲ – ۱۷۱۴ء) کی تخت نشینی سے پہلے ہی انگلستان آسٹریا کی وراثت کی جنگ میں ملوث ہو گیا تھا۔ اس جنگ میں ڈیوک آف مارلبرو (Marlborough) نے فرانس اور اس کے حلیفوں کو شکست دی۔ انگریزوں کو بحری لڑائی میں بھی فتح ہوئی۔ ۱۷۱۳ء میں جنگ ختم ہوئی صلح نامہ یوٹرخٹ کی رو سے انگلستان نے یورپ میں جبرالٹر (Gibraltar) اور مائی نارکا (Minorca) اور امریکہ میں نووا اسکوشیا (Nova Scotia) اور نیو فاؤنڈلینڈ (New Found Land) حاصل کیا۔

ہینوور خاندان (House of Hanover)

این کا جانشین صوفیا کا بیٹا جارج اول (۱۷۱۴ – ۱۷۲۷ء) کو نہ تو انگلستان کی زبان اور نہ سیاسیات سے واقف تھا۔ ٹوری ہینوور خاندان کے حامی نہیں تھے اور ان میں سے وہ گروہ جو جیکوبائیٹ کہلاتا تھا جیمس دوم کے بیٹے کی تائید میں تھا۔ اس لیے جارج اوّل اور اس کے بعد جارج دوم نے ٹوریوں کو وزارت سے دور رکھا۔ ۱۷۱۵ء میں جیمس سوم کو تخت پر بٹھانے کے لیے انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں بغاوتیں ہوئیں لیکن وہ ناکام ہوئیں۔

۱۷۱۶ء میں پارلیمنٹ نے ہفت سالہ قانون منظور کیا جس کی رو سے پارلیمنٹ کی مدت بجائے تین سال کے سات سال قرار دی گئی۔

۱۷۲۰ء میں ساؤتھ سی (South Sea) نامی ایک کمپنی کا دیوالہ نکلا جس کے نتیجہ میں ۱۷۲۱ء میں وزارت بدل گئی اور رابرٹ وال پول (Robert Walpole) کی جو ایک ماہر مالیات تھا وزارت قائم ہوئی۔

انگریزی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جارج اول نے مجلس وزرا کے جلسوں کی صدارت کرنا ترک کر دی تھی اور وزیر اعلیٰ مجلس کا صدر نشین سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے بعد اس کو وزیر اعظم کا لقب دیا گیا۔ وال پول پہلا وزیر ہے جس کو یہ لقب ملا۔

جارج اول کے جانشین جارج دوم (۱۷۲۷ – ۱۷۶۰ء) نے وال پول کی وزارت کو بحال رکھا۔

وال پول نے تجارت کو ترقی دی۔ اس کی خارجی حکمت عملی یہ تھی کہ امن قائم رہے لیکن باوجود اس کے ۱۷۳۹ء میں وہ اسپین کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر مجبور ہو گیا کیوں کہ انگریز تاجر اس بات پر مُصر تھے کہ اسپانوی امریکہ سے تجارت کے لیے ان کو زیادہ مواقع میسر ہوں۔ اس جنگ میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی۔ اس کی ذمہ داری وال پول پر عائد کی گئی اور ۱۷۴۲ء میں وہ مستعفی ہو گیا۔

وال پول کے زوال سے پہلے یورپ میں آسٹریا کے تخت کی وراثت کی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۷۴۵ء میں جیمس دوم کا پوتا چارلس ایڈورڈ (Charles Edward) اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں وارد ہوا گو شروع میں اسے کامیابی ہوئی لیکن بالآخر شکست کھا کر وہ فرانس کو فرار ہو گیا۔

آسٹریا کی جنگ وراثت سے انگریزوں کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچا تھا لیکن جنگ ہفت سالہ (۱۷۵۶ – ۱۷۶۳ء) میں پروشیا (Prussia) کے ساتھ فرانس کے خلاف شریک ہو کر انگلستان نے کافی فائدہ اٹھایا۔

جارج دوم کا جانشین اس کا پوتا جارج سوم (۱۷۶۰ – ۱۸۲۰ء) باقی ماندہ شاہی اقتدار کو مکمل طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت ارل آف چیاتھم (Earl of Chatham) کی وزارت برسر اقتدار تھی جسے مستعفی ہونا پڑا نیو کاسیل (New Castle) بھی چھ مہینہ بعد مستعفی ہو گیا۔ ۱۷۶۳ء میں جنگ ہفت سالہ صلح نامہ پیرس کے ساتھ ختم ہو گئی۔

جارج سوم کا یہ خیال تھا کہ جنگ کے مصارف کا کچھ بار امریکہ میں انگلستان تیرہ نو آبادیوں کو بھی اٹھانا چاہیے۔ ۱۷۶۵ء میں وزیر اعظم گرینول (Gren Ville) اور اس کے بعد اس کے جانشین لارڈ نارتھ (North) نے پارلیمنٹ کی منظوری سے چند محاصل عائد کیے۔ نو آبادیات نے ان محاصل کے خلاف اس بنا پر احتجاج کیا کہ ان کو پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ ۱۷۷۶ء میں انہوں نے اعلان خود مختاری کیا اور اس کے بعد جنگ کی تیاری کی۔ اس جنگ میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۷۸۳ء میں جارج سوم نے ارل چیاتھم کے بیٹے ولیم پٹ کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ٹوری تھا۔ ۱۷۸۴ء میں پارلیمنٹ نے پٹ کے مسودہ قانون ہند کی منظوری دی۔ ولیم پٹ نے ملک کی مالیات کی بھی اصلاح کی۔

۱۷۸۹ء میں فرانس میں انقلاب رونما ہوا شاہ فرانس کے قتل کیے جانے کے بعد ۱۷۹۳ء میں آسٹریا اور پروشیا کے ساتھ فرانس کے خلاف انگلستان بھی جنگ میں شریک ہوا۔ ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کی لڑائی میں نپولین کی شکست پر یہ جنگ ختم ہوئی۔

۱۷۹۸ء میں آئرلینڈ میں ایک بغاوت پھوٹ پڑی۔ اہل آئرلینڈ کو حکومت انگلستان سے جو شکایتیں تھیں انقلاب فرانس کے بعد ان میں شدت پیدا ہو گئی۔ بغاوت فرو کر دی گئی مگر کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں میں تنازعہ کا سلسلہ جاری رہا۔ آئرلینڈ کے دیرینہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے پٹ نے ۱۸۰۰ء میں انگلستان اور آئرلینڈ کے اتحاد کا قانون پارلیمنٹ سے منظور کرایا۔ دارالامرا اور دارالعلوم میں آئرلینڈ کو نمائندگی مل گئی لیکن پٹ نے کیتھولکوں کو سرکاری خدمات دینے کی جو تجویز کی تھی اس کو بادشاہ نے قبول نہیں کیا اس لیے ۱۸۰۱ میں پٹ مستعفی ہو گیا۔

۱۸۱۰ء کے بعد جارج سوم خلل دماغ کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا جارج چہارم نائب السلطنت مقرر ہوا اور ۱۸۲۰ء میں باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔

۱۸۲۹ء میں ڈیوک آف ویلنگٹن نے جو کیننگ (Canning) کے بعد وزیر اعظم مقرر ہوا تھا پارلیمنٹ سے کیتھولک فرقہ کی آزادی کا قانون منظور کرایا جس کے تحت کیتھولکوں کو پارلیمنٹ کا رکن بننے اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

جارج چہارم کا جانشین اس کا بھائی ولیم چہارم (۱۸۳۰ – ۱۸۳۷ء) پارلیمنٹ کی اصلاح کی تائید میں تھا۔ ویلنگٹن کو جو اس تحریک کا مخالف تھا عام انتخابات میں شکست ہوئی اور ۱۸۳۰ء میں لارڈ گرے (Lord Grey) نے وہگوں کی وزارت ترتیب دی۔

۱۸۳۲ء میں لارڈ جان رسل (John Russel) کا پیش کردہ مسودہ قانون اصلاح منظور ہوا جس سے متوسط طبقہ کو حق رائے دہی ملا۔ لارڈ گرے کے جانشین ملبورن (Melbourne) کی وزارت کے زمانے میں نو آبادیوں میں انسدادِ غلامی کا قانون ۱۸۳۳ء میں منظور ہوا۔

ولیم چہارم کی جانشین اس کی بھتیجی وکٹوریہ (۱۸۳۷ – ۱۹۰۱ء) جس وقت تخت نشین ہوئی اس کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ ۱۸۴۰ء میں اس کی شادی سیکس کوبرگ (Saxecoburg) کے شہزادے البرٹ سے ہوئی۔ ۱۸۶۱ء تک جب کہ البرٹ کا انتقال ہوا اس نے ملکہ کو شاہی فرائض کی انجام دہی میں گراں قدر مدد دی۔

ملکہ کی تاج پوشی کے وقت ملک میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اجرتیں کم تھیں اور قوانینِ غلہ کے باعث غلہ کی قیمت زیادہ تھی۔ سیاسی بے چینی بھی تھی اور عوامی منشور کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی تھی۔

۱۸۴۱ء میں جب پیل (Peel) وزیر اعظم بنا تو اس نے ٹوری پارٹی کا نام کنزرویٹو (Conservative) یا قدامت پسند پارٹی رکھا۔ اس نے ۱۸۴۶ء میں پارلیمنٹ کی منظوری سے قوانین غلہ کو منسوخ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں قدامت پسند دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک پیل کا گروہ تھا اور دوسرا ڈزریلی (Disraeli) کا جو ان کا حامی تھا۔ اس پھوٹ سے وہگوں نے جو لبرل (آزاد خیال) کہلانے لگے تھے فائدہ اٹھایا۔ اور لارڈ میں رسل نے لبرل پارٹی کی وزارت ترتیب دی۔ ۱۸۵۴ء میں جب کریمیا کی جنگ (Crimean War) شروع ہوئی اس وقت لبرل پارٹی اور پیل کے گروہ کے متحدہ وزرا لارڈ ابرڈین (Aberdeen) کی قیادت میں برسر اقتدار تھی جس میں رسل پامرسٹن اور گلیڈسٹن (Gladstone) شریک تھے۔ اس جنگ میں برطانوی فوج کے غیر تشفی بخش کردار کا سوال اٹھایا گیا۔ تو ابرڈین نے استعفےٰ دے دیا۔ اور پامرسٹن نے اس کی جگہ لی۔ پہلی تحریک آزادی یا غدر کی ناکامی کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہندوستان تاج انگلستان کے تحت آ گیا اور ملکہ وکٹوریہ امپرس آف انڈیا بن گئی۔ ۱۸۶۷ء میں ڈزریلی نے جو قدامت پسندوں کے قائد لارڈ ڈربی (Derby) کی وزارت میں شریک تھا اصلاح پارلیمنٹ کا ایک مسودۂ قانون پیش کیا جو منظور ہو گیا۔ اس کی رو سے صنعتی مزدوروں کو حق رائے دہی دیا گیا۔ ۱۸۶۸ء کے انتخابات میں لبرل پارٹی کی جیت ہونے پر گلیڈسٹن وزیر اعظم بنا۔ اس کی پہلی وزارت کے زمانے میں کئی اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔

۱۸۷۴ء میں ڈزریلی کی وزارت برسر اقتدار آئی۔ ڈزریلی جو اب لارڈ بیکنس فیلڈ (Beaconsfield) بن گیا تھا برطانوی شہنشاہی کا زبردست حامی تھا۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کی تعمیر کی تکمیل زیادہ تر فرانسیسی سرمایہ سے ہوئی تھی۔ ۱۸۷۵ء میں ڈزریلی نے مصر سے بہت سے حصے خرید کر نہر کے انتظامات میں برطانیہ کی شرکت کا حق حاصل کیا اور فرانس کے ساتھ برطانیہ کو مصر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔ گلیڈسٹن نے دوسری وزارت کے دوران ۱۸۸۴ء میں تیسرا قانونِ اصلاح منظور کرایا جس کے نتیجے میں زرعی مزدوروں کو حق رائے دہی مل گیا۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۵ء تک برطانیہ مصر اور سوڈان کی جنگ میں ملوث تھا۔ ۱۸۸۵ء میں گلیڈسٹن کو اس کی ناکام خارجی حکمت عملی کی بنا پر دارالعوام میں شکست ہوئی۔ ۱۸۸۶ء میں گلیڈسٹن پھر کامیاب ہوا۔ لیکن آئرش پالیسی کی وجہ سے اسے پھر شکست ہو گئی۔ ۱۸۹۲ء میں وہ چوتھی مرتبہ وزیر اعظم بنا مگر دارالعوام میں لبرل پارٹی کی اکثریت بہت قلیل ہونے کے باعث وہ ۱۸۹۴ء میں مستعفی ہو گیا۔ ۱۹؍ مئی ۱۸۹۸ء کو گلیڈسٹن کا انتقال ہو گیا۔

ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں بہت کچھ سماجی اور سیاسی ترقی ہوئی۔ نو آبادیوں کے بارے میں برطانیہ کی حکمت عملی میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہوئی۔

۱۸۷۷ء میں جنوبی افریقہ میں بوئروں (Boer War) کی جنگ شروع ہوئی ملکہ وکٹوریہ کے بیٹے ایڈورڈ ہفتم (۱۹۰۱ – ۱۹۱۰ء) کی تخت نشینی کے ایک سال بعد یہ جنگ ختم ہوئی۔ ایڈورڈ ہفتم کی کوشش سے ۱۹۰۴ء میں جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیش نظر برطانیہ نے فرانس سے ایک دفاعی معاہدہ کیا۔ داخلی امور کی حد تک ایڈورڈ ہفتم کا دور ۱۹۰۹ء کے بجٹ کے موازنہ کے لیے مشہور ہے جس کو لائیڈ جارج نے جو ایسکوتھ (Asquith) کی لبرل وزارت میں وزیر خزانہ تھا پیش کیا۔ اس موازنہ میں متمول اشخاص کے محاصل میں قابل لحاظ اضافہ تجویز کیا گیا۔ دارالامرا نے اسے مسترد کر دیا۔ دونوں ایوانوں میں تنازعہ کی وجہ سے ۱۹۱۰ء میں عام انتخابات ہوئے اور آئرلینڈ کی قوم پرست پارٹی اور لیبر پارٹی کی جو وجود میں آ چکی تھی تائید سے لبرل پارٹی کی جیت ہوئی۔ اس کے بعد ایڈورڈ ہفتم کا فرزند جارج پنجم (۱۹۱۰ – ۱۹۳۶ء) میں تخت نشین ہوا۔ دارالامراء اور دارالعوام میں کشمکش جاری تھی مصالحت کی کوشش ناکام ہونے پر ایسکوتھ نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔ عام انتخابات میں لبرل پارٹی جیت گئی۔ وزارت نے دارالعوام میں چار تحریکات پیش کیں جن میں سب سے زیادہ اہم مسودہ قانونِ پارلیمنٹ تھا، جو ۱۹۱۱ء میں منظور ہوا۔ اس کی رو سے دارالامرا کے اختیارات میں تخفیف کی گئی اور پارلیمنٹ کی مدت بجائے سات سال کے پانچ سال مقرر ہوئی۔ قومی بیمہ کا قانون بھی منظور ہوا۔ آئرلینڈ کو ہوم رول (دیس راج) دینے کے مسودۂ قانون کو دارالعوام نے منظور کیا لیکن دارالامرا نے مسترد کر دیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو جانے کے باعث آئرلینڈ کے مسئلہ کو التوا میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں ایسکوتھ کے مستعفی ہونے پر لائیڈ جارج کی متحدہ وزارت قائم ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں جارج پنجم نے شاہی خاندان کا نام ہینوور خاندان سے بدل کر ویلز (Wales) خاندان رکھا۔ ۱۹۱۸ء میں جرمنی کو شکست ہونے پر جنگ ختم ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات عمل میں لائے گئے۔ ہندوستان کے مسئلہ کے علاوہ آئرلینڈ کا مسئلہ بھی لائیڈ جارج کی وزارت کے لیے تشویش ناک بن گیا تھا۔ بالآخر ۱۹۲۱ء میں سن فینرس (Sinn Feiners) اور برطانوی حکومت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ دولت مشترکہ میں شمولیت کے ساتھ آئرلینڈ کی آزاد حکومت کا قیام عمل میں آیا اور السٹر کے پروٹسٹنٹ علاقہ کی شمالی آئرلینڈ کے نام سے علاحدہ حکومت قائم ہوئی۔ اس کی پارلیمنٹ جداگانہ تھی مگر متحدہ سلطنت میں یہ شامل رہی۔

۱۹۱۸ء میں عورتوں کو چند شرائط کے ساتھ حق رائے دہی عطا کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں لائیڈ جارج کی متحدہ وزارت ختم ہو گئی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک تین عام انتخابات ہوئے۔ پہلے قدامت پسند اس کے بعد لیبر پارٹی اور پھر قدامت پسندوں نے اقتدار حاصل کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جس وقت اسٹانلی بالڈون (Baldwin) کی قیادت میں قدامت پسند پارٹی برسر اقتدار تھی کان کے مزدوروں نے اپنی اجرتوں میں اضافہ کے لیے ہڑتال کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں ہڑتال نے ہمہ گیر ہڑتال کی شکل اختیار کی۔ ونسٹن چرچل وزیر داخلہ کی مؤثر تدابیر اختیار کرنے پر ہڑتال ختم ہو گئی۔

بیسویں صدی کے تیسری دہائی میں بہت کچھ مادی ترقی ہوئی ان میں ہوائی جہاز کی سروس کا آغاز اور برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کا قیام شامل ہے۔

۱۹۲۸ء میں عورتوں کو وہی حق رائے دہی دیا گیا جو مردوں کو حاصل تھا۔

۱۹۲۹ء کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی جیت گئی اور ریمزے میک ڈانلڈ (Ramsay Macdonald) دوسری دفعہ وزیراعظم مقرر ہوا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حکومت عالمگیر کساد بازاری سے دوچار ہوگئی تقریباً تیس لاکھ مزدور بے روزگار ہوگئے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ریمزے میک ڈانلڈ نے آزاد پسندوں اور قدامت پسندوں سے مفاہمت کرکے ایک قومی حکومت تشکیل دی۔ حکومت نے ایک صدی کے بعد پھر تامین کا طریقہ جاری کیا اور ملک کی معیشت کی اصلاح کے لیے کئی اور تدابیر اختیار کیں جن سے معیار زندگی بلند ہونے لگا۔ ۱۹۳۵ء میں قدامت پسند پارٹی کو پھر اقتدار حاصل ہوا اور بالڈون وزیراعظم بن گیا۔ اسی سال پارلیمنٹ نے ہندوستان کے لیے ایک نیا دستور منظور کیا اور صوبیداری حکومت کی حد تک ۱۹۳۷ء میں اس کا نفاذ ہوا۔

۱۹۳۶ء میں جارج پنجم کے انتقال پر اس کا بڑا بیٹا ایڈورڈ ہشتم اس کا جانشین ہوا لیکن چوں کہ روایات کے خلاف وہ ایک طلاق یافتہ امریکن خاتون سے شادی کرنے پر مصر تھا اور قوم اس کو ملکہ تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھی اس لیے بادشاہ بننے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایڈورڈ تخت سے دست بردار ہوگیا۔

ایڈورڈ ہشتم کے بھائی جارج ششم (۱۹۳۷۔ ۱۹۵۲ء) کی تخت نشینی کے وقت اطالیہ میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر حاکم مطلق بن کر جارحیت کے ساتھ اپنی اپنی سلطنتوں کے حدود میں توسیع کرنے کے عزائم کو پورا کرنے میں مصروف تھے۔ ۱۹۳۷ء میں بالڈون کا جانشین نیول چیمبرلین (Naville Chamberlain) اور دالادئے وزیراعظم فرانس ہٹلر سے ملنے میونخ پہنچ گئے ہٹلر نے مزید ملک گیری سے احتراز کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس نے وعدہ خلافی کی جس کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

چوں کہ چیمبرلین کی حکمت عملی ناکام ہوگئی تھی عالمی جنگ کے مدنظر ملک کو ایک زیادہ پراثر قائد کی ضرورت تھی اس لیے ۱۹۴۰ء میں ونسٹن چرچل کو وزیراعظم بنایا گیا۔ اس نے ایک جنگ کی کابینہ ترتیب دی جس میں چیمبرلین کے علاوہ لیبر پارٹی کا قائد کلیمنٹ ایٹلی (Clement Attlee) بھی شامل تھا۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی اس کے نتائج بہت دوررس تھے نہ صرف جرمنی، جاپان اور دوسرے شکست خوردہ بلکہ فاتح ممالک پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ برطانیہ کی معیشت تباہ ہوگئی۔ اور اسے امریکہ سے مدد طلب کرنی پڑی۔ برطانوی شہنشاہی سکڑ کر رہ گئی۔

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور چرچل کی جگہ ایٹلی وزیراعظم ہوا۔ اس کی وزارت نے بینک آف انگلینڈ، سول شہری ہوا بازی، ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ، گیس اور الیکٹریسٹی، لوہے اور اسٹیل کی صنعت کو خانگی ملکیت سے سرکاری ملکیت میں منتقل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک اسکیم منظور کی گئی جس کے تحت برطانیہ کے جملہ باشندوں کو بیمہ اور مفت طبی امداد کی سہولت بہم پہنچائی گئی اور پیشہ طبابت اور طبی سہولتوں پر حکومت کی نگرانی قائم ہوگئی۔ اس طرح سلطنت برطانیہ ایک رفاہی سلطنت بن گئی۔

۱۹۴۷ء میں آزادئ ہند کا قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور ہندوستان اور پاکستان کو ڈومینین اسٹیٹس دے کر آزاد ممالک قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں سیلون کو بھی یہی درجہ دیا گیا لیکن برما دولت مشترکہ سے علاحدہ ہوگیا۔ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کے ساتھ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (North Atlantic Treaty Organisation) کی دفاعی تنظیم میں شریک ہوگیا۔ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، فرانس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کے ساتھ سیٹو میں بھی شریک ہوا۔ ۱۹۵۲ء کے عام انتخابات کے بعد کنزرویٹیو پارٹی چرچل کی قیادت میں برسر اقتدار آئی۔ برطانیہ کی جانب سے پہلا ایٹمی دھماکہ ۱۹۵۲ء اور پہلا ہائیڈروجن (Hydrogen) دھماکہ ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۵۲ء میں جارج ششم کا انتقال ہوا اور اس کی بیٹی الیزبتھ ثانی (Elizabeth II) اس کی جانشین ہوئی ۱۹۵۵ء میں پیرانہ سالی کی وجہ سے چرچل سبکدوش ہوگیا اور انتھونی ایڈن نے اس کی جگہ لی۔ ۱۹۵۶ء میں مصر کے حکمراں جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومیانا چاہا، فرانس اور برطانیہ نے مصر پر حملہ کیا۔ اس کی نہ صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسرے ممالک نے بلکہ خود برطانیہ کے اکثر لوگوں نے مذمت کی اور برطانیہ اور فرانس کو اپنی اپنی افواج نہر سویز سے واپس بلانی پڑیں۔

۱۹۵۷ء میں خرابی صحت کی وجہ سے ایڈن مستعفی ہوگیا اور میکمیلن نے اس جگہ لی۔ وہ چاہتا تھا کہ یورپ کی مشترکہ منڈی میں جس کا قیام ۱۹۵۸ء میں عمل میں آیا تھا، برطانیہ شریک ہو لیکن فرانس کی مخالفت کی وجہ سے اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں ہیرالڈ ولسن کو بھی جو ۱۹۶۴ء میں لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آنے پر وزیراعظم ہوا مگر مقبول نہیں ہوا۔ ۱۹۶۹ء کے انتخابات میں کنزرویٹیو پارٹی کی جیت ہوئی اور ایڈورڈ ہیتھ (Edward Heath) وزیراعظم بنا۔ ۱۹۷۳ء میں برطانیہ کو یورپ کی مشترکہ منڈی میں رکنیت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۷۴ء میں ولسن کی قیادت میں لیبر پارٹی کی وزارت پھر قائم ہوئی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ برطانیہ مشترکہ منڈی میں اپنی رکنیت قائم رکھے یا نہیں چوں کہ خود لیبر پارٹی میں اختلاف رائے تھا اس لیے ولسن نے شورائے عام (Referendum) کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۷۵ء میں قوم نے رکنیت قائم رکھنے کے حق میں رائے دی۔

تاریخ فرانس

فرانس کا قدیم نام گال (Gaul) تھا۔ یہ نام رومیوں نے یورپ کے اس حصے کو دے رکھا تھا جہاں کے لوگ کلٹی زبان بولتے تھے (Celtic Speaking) اس میں فرانس کے علاوہ اور بھی متعدد متصل علاقے شامل تھے۔

سلطنت روما کے ایک حصہ کی حیثیت سے فرانس کا شمار یورپ کے سب سے زیادہ متمدن علاقوں میں ہوتا تھا۔ وہاں پر رومی اثر بہت قوی اور پائدار رہا۔ بعدازاں فرانکوں (Franks) نے حملہ کرکے اس کو فتح کرلیا اور شارلیمان (Charlemagne) کی قائم کردہ سلطنت کا ایک جز بنا دیا۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں خود اس کے اپنے بادشاہ تھے لیکن ان کا اقتدار محدود تھا کیوں کہ ملک کا بڑا حصہ طاقت ور ڈیوکس (Dukes) اور کاؤنٹس (Counts) خاص طور پر نارمنڈی (Normandy) برگنڈی (Burgundy) اور اکوی ٹین (Aquitaine) کے زیر اثر تھا۔

جنگ صد سالہ

قرون وسطیٰ کے اختتام کے قریب فرانس کی تاریخ زیادہ تر انگلستان کے ساتھ جنگوں کی تاریخ ہے جو تخت و تاج کے قبضہ کے لیے لڑی گئیں۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان یہ کش مکش جنگ صد سالہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جنگ ۱۹۳۸ء میں شروع ہوئی جب کہ ایڈورڈ سوم (Edward III) نے فرانس کے تخت و تاج کا دعویٰ کیا۔ انگریزوں نے

کرے سی (Crecy) اور پواتی (Poitieu) کی لڑائیوں میں فتح حاصل کی اور ۱۳۶۰ء میں بری ٹگنی (Bretigny) کی صلح ہوئی۔ اس کے ذریعہ ایڈورڈ نے فرانس کا بہت سا علاقہ حاصل کیا لیکن تخت و تاج نہیں۔ ۱۳۶۹ء میں جنگ پھر سے شروع ہو گئی اور متعدد درمیانی التوائے جنگ کے ساتھ ۱۳۹۶ء تک جاری رہی۔ ۱۳۹۶ء کے عہدنامہ کے ذریعہ انگریزوں نے اپنے مقبوضات کا بڑا حصہ کھو دیا۔

۱۴۰۳ء میں جنگ و جدل کا ایک اور دور شروع ہوا۔ ہنری پنجم (Henry V) نے فرانس کے تخت پر اپنا حق جتاتے ہوئے اس کو ایک سنگین معاملہ بنا دیا۔ آجن کورٹ (Agin Court) کی لڑائی میں اس کی جیت ہوئی۔ نارمنڈی اس نے فتح کر لیا اور ۱۴۲۰ء میں عہدنامہ ٹرائے (Treaty of Troyes) کے ذریعہ بادشاہ کا ولی اور فرانس کا ہونے والا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے باوجود قوم کی ایک جماعت انگریزوں کی حکمرانی پر معترض ہوئی اور جنگ ۱۴۲۹ء تک جاری رہی۔ اس موقع پر جون آف ارک (Joan of Arc) کے در آنے سے لڑائی کے رخ نے پلٹا کھایا اور انگریزوں کو مسلسل ناکامی ہوتی رہی اور ۱۴۵۳ء میں اس کش مکش کا خاتمہ ہو گیا کیلے (Calais) کے سوا فرانس کا سارا علاقہ انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

جون آف ارک (Joan of Arc)

یہ فرانسیسی ہیروئن ۶ر جنوری ۱۴۱۲ء کو بہ مقام ڈامریمی (Domremy) ایک دہقان کے گھر پیدا ہوئی۔ یہ عالی ہمت عورت دین دار اور جذباتی واقع ہوئی تھی۔ وہ یہ تصور کرتی تھی کہ اس کو آوازیں سنائی دیتی ہیں اور فرانس کو جو اس وقت انگریزوں کے قبضہ میں تھا، نجات دلانے کے لیے کہتی ہیں۔ فروری ۱۴۲۹ء میں اس نے معزول بادشاہ چارلس ہفتم (KingCharles VII) سے تعارف حاصل کیا۔ چارلس نے اس کو سپاہیوں کے ایک لشکر کی قیادت سونپی تاکہ ارلی آنز (Orleans) کو جس کا انگریزوں نے محاصرہ کر رکھا تھا کمک پہنچائی جائے اس کے راسخ اعتقاد نے اس کے ہم وطنوں میں نئی ہمت پیدا کر دی جس کے باعث محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اور بھی فتوحات حاصل ہوئیں اور جولائی ۱۴۲۹ء میں ریمس (Rheims) کے مقام پر چارلس کی تاج پوشی کی رسم منائی گئی۔ ۱۴۳۰ء میں ایک لڑائی کے دوران جون زخمی ہو گئی اور برگنڈیوں (Burgundians) نے اس کو گرفتار کر کے انگریزوں کو فروخت کر دیا ان لوگوں نے بہ مقام روآن (Rouen) اس پر مقدمہ چلایا اور بتاریخ ۳۰ رمئی ۱۴۳۱ء جادو اور مسیحی عقائد کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر اس کو زندہ جلا دیا۔ اس کی دردناک موت کے تقریباً پانچسو برس بعد پوپ نے ۱۹۲۰ء میں اس کو اولیا کی فہرست میں شامل کر لیا۔

انگلستان کے ساتھ جنگوں کا دور پندرہویں صدی میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد والوا (The Valois) اور آگے چل کر بوربان (The Bourbans) بادشاہوں کے تحت فرانس کی شاہی حکومت یورپ بھر میں سب سے زیادہ مرکزیت کی حامل ہو گئی۔ اور جب بریٹ آنی (Brittany) اس میں شامل کر لیا گیا تو فرانس کا رقبہ وہی ہو گیا جو آج کل ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی شمال مشرقی اور مشرقی حدود میں جنگ کے نشیب و فراز کے باعث متعدد دفعہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

خاندان والوا (The Valois Dynasty)

والن سی این (Valencienne) ایک چھوٹے سے شہر کا نام ہے۔ یہ علاقہ انقلاب تک آرلی آنز کے ڈیوکس (Dukes of Orleans) کی جاگیر کا ایک حصہ تھا۔ خاندان والوا کے اراکین نے فرانس کی تاریخ میں اہم کار منصبی ادا کیا ہے ۱۳۲۸ء سے لے کر ۱۵۸۹ء تک یہ لوگ فرانس کے بادشاہ رہے ہیں۔ ہنری دوم (Henry II) اور کیتھرائن میڈی چی (Catherine de Medici) کی دختر مارگریٹ والوا (Marguerite de Valois) نے ہنری آف ناوار (Henry of Navarre) سے شادی کی تھی جس کا شمار سولہویں صدی کے بہترین سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ہنری "ڈی والوا (۱۹۰۳ - ۱۹۷۹ء) یونانی و لاطینی ادبیات عالیہ کے مترجم کی حیثیت سے مشہور ہے۔

بوربن خاندان (The Bourbon Dynasty)

اس خاندان کے افراد فرانس اور اسپین کے بادشاہ ہوئے ہیں۔ وسط فرانس میں وے شی (Vichy) سے قریب مقام بوربان لار کمبیل (Bourbon - Larcambault) سے یہ نام لیا گیا ہے۔ ارکان خاندان دسویں صدی سے اس جگہ کے امیر تھے یہ جاگیر ان لوگوں کو لوئی نہم (Louis IX) کے ایک بیٹے کی شادی میں ملی تھی اور اس کا بیٹا ڈیوک آف بوربان بنا دیا گیا تھا بعد کے ایک ڈیوک انٹنی (Antony) کا لڑکا ہنری ۱۵۸۹ء میں فرانس کا پہلا بادشاہ بنا۔ وہ اور اس کے جانشینوں نے ۱۷۸۹ء تک اور پھر ۱۸۱۴ – ۱۸۴۸ء حکمرانی کی۔ ۱۸۳۰ – ۱۸۴۸ء بادشاہ کا تعلق بوربان کی شاخ ارلی انز (Orleans) سے تھا۔ اس خاندان کے لوگ ۱۷۰۰ء - ۱۹۳۰ء اسپین کے بھی بادشاہ رہے ہیں۔

رش لیو (Richelieu)

فرانسیسی کاردنال (Cardinal) اور لوئی سیزدہم (Louis XIII) کا وزیر تھا جس کے دور حکومت میں رش لیو چھایا ہوا تھا۔ ۵ر ستمبر ۱۵۸۵ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ ۱۶۰۷ء میں لوکان (Lucon) کا بشپ (Bishop) ۱۶۲۲ء میں کاردنال اور ۱۶۲۴ء میں وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ اس کی پالیسی کے تین بڑے اہم مقاصد تھے فرانسیسی پروٹسٹنٹ عیسائیوں Huguenots کی سیاسی قوت کو ختم کرنا شاہی اقتدار کا بول بالا کرنا اور ہاپس برگ Haps Burgs کے تسلط کے اندیشے سے فرانس کو محفوظ رکھنا۔ ان تینوں مقاصد میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ کو بادشاہ کی ہر وقت تائید حاصل رہی اور ۱۶۴۲ء کو اس کا انتقال ہوا۔

لوئی چہاردہم (Louis XIV)

فرانس کے بوربان بادشاہوں میں سب سے زیادہ مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ وہ ستمبر ۱۶۳۸ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ۷۲ سال کے طویل عرصہ تک حکومت کی وہ اپنے زمانہ کے یورپ کی سب سے زیادہ ممتاز ہستی تھا۔ صرف سیاسیات بلکہ فنون لطیفہ ادب اور فیشن میں بھی اس نے اپنے غیر معمولی اثر کو استعمال کیا۔ اس کو اپنی اہمیت کا بڑا احساس تھا لوئی چہاردہم شان و شوکت کا دلدادہ تھا اور شاہ عالی شان (Legrand Menarque) کہلاتا تھا۔ اس نے محل ورسائی (Versailles Palace) اور دوسری شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں ورسائی کا محل پیرس کے جنوب مغرب میں گیارہ میل دور واقع ہے اور اپنی بھاری جسامت اور وسیع پھیلاؤ کی وجہ سے ممتاز ہے۔ باغ کی جانب عمارت کا پیش ۵۲۰ گز طویل ہے لوئی چہاردہم نے یکم ستمبر ۱۷۱۵ء کو وفات پائی۔ اس کا بیٹا اور پوتا دونوں اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ جانشین اس کا پرپوتا لوئی

پانزدہم (Louis XV) ہوا۔

فرانس کی بادشاہت لوئی چہاردہم کے تحت اپنی عظمت کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یورپ کی سماجی زندگی کی قیادت کا سہرا فرانس کے سر تھا اور بحیثیت مجموعی دیگر معاملات میں بھی وہ غلبہ حاصل کر لیا گیا تھا جو ابھی تک پوری طرح زائل نہیں ہوا ہے۔ فرانس بہت بڑی فوجی طاقت بن گیا تھا اور عقلی اور ذہنی کاروان سالاری بھی اس کے حصے میں آئی۔

اس تصویر کا ایک تاریک رخ بھی تھا یعنی فضول خرچی رشوت ستانی اور اس سے بھی زیادہ بدتر غریبوں کے ساتھ بڑے پیمانہ پر ناانصافی ان خرابیوں کے لیے اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی جو انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس خونی انقلاب نے شاہی کو ختم کر کے پہلی جمہوریہ قائم کی۔ اس جمہوریہ نے نپولین کی سلطنت کو جنم دیا مطلق العنانی کا یہ دور بھی ۱۸۱۵ء میں ختم ہو گیا اس کے بعد بوربن بادشاہت کو بحال کر دیا گیا اور لوئی ہژدہم تخت پر بیٹھا۔ لوئی فلپ (Louis Philippe) ۱۸۳۰ء میں فرانس کا بادشاہ بنا۔ ۱۸۴۸ء میں اس کی حکومت کا خاتمہ کر کے دوسری جمہوریہ قائم کی گئی۔ یہ جمہوریہ بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ اور اس کے خاتمے کے بعد شہنشاہ نپولین سوم تخت نشین ہوا اور مطلق العنانی کا یہ دوسرا دور ۱۸۷۰ء تک جاری رہا۔

نپولین سوم (Napoleon III)

چارلس لوئی نپولین بونا پارٹ فرانسیسیوں کا شہنشاہ

نپولین اول کا بھتیجا، ہالینڈ کے بادشاہ لوئی بونا پارٹ کا بیٹا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۸۰۸ء کو پیدا ہوا۔ لوئی فلپ بوربن کو ہٹا کر خاندان نپولین کا احیا کرنے کی اس نے دو مرتبہ ناکام کوشش کی تھی (۱۸۳۶ — ۱۸۴۰ء) ۱۸۴۸ء کے بعد اس نے جمہوریہ کو تسلیم کیا اور اس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ ۱۸۵۱ء میں حکومت میں ناگہانی تغیر (Coup d,etat) کے ذریعہ اس حکومت پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے ہی سال شہنشاہ بن گیا۔ اور نظم و نسق میں مرکزیت پیدا کرنے اور شہر پیرس کو خوبصورت بنانے کی پالیسی اختیار کی۔ پیرس کی موجودہ خوبصورتی اسی کی مرہون منت ہے پیرس کو شہروں کی ملکہ کہا جاتا ہے۔ اس کی آرائش میں نپولین سوم نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

اس کی خارجی پالیسی ناکام رہی اگرچہ جنگ کریمیا (Crimean War) میں حصہ لے کر اس نے فرانس کی عظمت کو بڑھایا تھا میکسی میلین ہاپس برگ (Maximilian Haps Burg) کو میکسیکو (Mexico) کا شہنشاہ بنانے کے لیے پیش قدمی کرنے اور اطالیہ کے اتحاد کی حمایت میں مداخلت کے باعث فرانسیسی مکتب خیال کے متعدد فریق اس سے منحرف ہو گئے فرانسیسی پرشیائی جنگ (Franco Prussian War) ۱۸۷۰ء جس میں بسمارک نے اس کو گھسیٹا تھا، کا انجام فرانس کی مکمل شکست اور دوسری شہنشاہی (The Second Empire) کی دفعتاً تباہی نکلا شہنشاہ نے انگلستان میں پناہ لی جہاں جنوری ۱۸۷۳ء میں اس نے وفات پائی۔

تیسری جمہوریہ ۱۸۷۱ء میں وجود میں آئی جو ۱۹۴۰ء تک قائم رہی پہلی عالمی جنگ میں اس نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر کامیابی حاصل کی اور جب جنگ ختم ہوئی تو فرانس کو خوشحال بنانے اور آئندہ حملوں کے خطرے سے محفوظ رکھنے کی طرف توجہ ہوئی یورپ کی دوسری اقوام کی مخالفت کے باوجود مدبران فرانس اپنی منتخبہ فوجی اور معاشی پالیسی پر کاربند رہے۔ انجمن اقوام کے رکن کی حیثیت سے فرانس نے یورپ کی متعدد کانفرنسوں میں نمایاں حصہ لیا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۰ء میں جرمن سپاہیوں نے فرانسیسی فوج کو کچل دیا اور پیرس پر قبضہ کر لیا۔ مارشل پیتان (Marshal Petain) جرمنوں کی سرپرستی میں فرانسیسی حکومت کا صدر رہنا پا گیا۔ یہ حکومت وشی حکومت (Vichy Government) کہلانے لگی جنرل چارلس ڈی گال (Charles de Gaule) برطانیہ فرار ہو گیا اور وہاں جلاوطنی میں عارضی حکومت قائم کی۔ ۱۹۴۴ء میں امریکی اور برطانوی سپاہی فرانس میں اتارے گئے اور انہوں نے جرمنوں کو مار بھگایا۔

چوتھی جمہوریہ اور اس کا دستور

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ایک مجلس دستور ساز اور نومبر ۱۹۴۶ء میں چوتھی جمہوریہ کی پہلی قومی اسمبلی کا انتخاب عمل میں آیا۔

نئے دستور نے ۱۷۸۹ء کے انسانی حقوق اور آزادیوں کا پھر سے اعادہ کیا عورتوں کے لیے مساوی حقوق پر زور دیا اور یہ اعلان کیا کہ تمام حکومتی اقتدار کا سرچشمہ فرانسیسی عوام ہیں۔ یہ اقتدار قومی اسمبلی کو حاصل تھا جس کو عوام الناس براہ راست منتخب کرتے تھے۔

پریسیڈنٹ رسمی سربراہ ہوا کرتا تھا جس کو زیادہ اختیارات حاصل نہ تھے۔ اس کا انتخاب قومی اسمبلی اور جمہوریہ کی کونسل کی طرف سے عمل میں آتا تھا۔ مجلس دستور ساز کی دوسری جماعت کونسل تھی جو بالواسطہ طور پر مقامی کونسلوں کی طرف سے منتخب ہوتی تھی۔

حکومت کا حقیقی سربراہ وزیراعظم ہوا کرتا تھا۔ کابینی وزراء کا انتخاب اسی کو تفویض تھا اور قومی اسمبلی کو بھی جواب دہ تھا۔

چوتھی جمہوریہ کے دوران ۱۹۴۴ - ۱۹۵۸ء پچیس مرتبہ حکومت میں تبدیلی عمل میں آئی۔ ان متعدد تبدیلیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قومی اسمبلی میں کسی ایک جماعت کو بھی اکثریت حاصل نہیں تھی۔ پانچویں جمہوریہ کے دستور نے ان مشکلات کا خاتمہ کر دیا جو سابقہ کابینی کونسلوں کو حکومت کرنے میں پیش آئی تھیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جلد جلد تبدیلیوں کے باوجود فرانس کے نظم و نسق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی سول سروس نہایت قابل و کارگزار ہے۔ اور فرائض کے انجام دینے میں سیاسی اثرات قبول نہیں کرتی۔

ڈی گال اور پانچویں جمہوریہ

چوتھی جمہوریہ الجیریا کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی جس کے باعث ۱۹۵۸ء میں جنرل چارلس ڈی گال کو برسر اقتدار آنے کا موقعہ مل گیا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں پانچویں جمہوریہ کا وہ پہلا پریسیڈنٹ بنا۔

دستور

پانچویں جمہوریہ نے جو دستور مرتب کیا ہے اس کے تحت حقیقی اقتدار پریسیڈنٹ کو حاصل ہے۔ وزیراعظم کو وہ نامزد کرتا ہے اور پارلیمنٹ کو اس کی ایک سالہ مدت کے بعد برخاست کر سکتا ہے اگر حکومت میں تعطل پیدا ہو جائے تو خلا کو پُر کر کے اقتدار سنبھال سکتا ہے۔

پریسیڈنٹ کا انتخاب سات سالہ مدت کے لیے انتخابی مجلس (Electoral College) کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ اس مجلس میں ارکان پارلیمان، محکمہ جاتی انجمنیں، سمندر پار علاقوں کی اسمبلیاں اور شہری کونسلوں کے نمائندے شامل ہیں۔

کسی قانون کو نافذ کرنے یا اپنے عہدہ پر برقرار رہنے کے لیے وزیراعظم کو پارلیمنٹ سے رائے اعتماد (Vote of Confidence) حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے حکومت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے کے لیے حزب اختلاف کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو کامل اکثریت (Absolute Majority) حاصل ہو۔

تاریخ جرمنی

جرمنی یورپ کے قلب میں واقع ہے. ایک قومی حقیقت کی شکل اختیار کرے اس کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے. تاریخی اہمیت رکھنے والی متعدد ریاستوں کو مربوط کرنے کے بعد ایک نئی مملکت کو وجود میں لایا گیا. اس کے کئی اسباب ہیں. انیسویں صدی میں ابھرتے ہوئے جذبات قومیت کا دباؤ. قومیت کی یہ قوت محرکہ متعدد طریقوں سے ظاہر ہوئی. اول تو مشترکہ تہذیب وتمدن اور معاشی احتیاجات کا بڑھتا ہوا شعور اور دوسرے یہ کہ ایک غالب اقلیت کی متحرک اولو العزمی.

صدیوں تک جرمنی صرف ایک جغرافی محاورہ (Geographical — Expression) — تھا. وہ چھوٹی بڑی سینکڑوں ریاستوں میں منقسم تھا اور ہر ایک ریاست اپنا علاحدہ حکمراں رکھتی تھی. یہ حکمراں رومی مقدس رومی مملکت (Holy Roman Empire) کے صدر کی اطاعت کے پابند تھے جو خود بھی جرمن شہزادہ تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جرمنی سے اس کا تعلق کم ہوتا گیا. سترہویں صدی میں یورپ کا یہ علاقہ جنگ تیس سالہ (Thirty Years War) کی وجہ سے پامال کر دیا گیا تھا.

نپولین اور جرمنی کی تنظیم نو

جرمنی جن بے شمار چھوٹی چھوٹی مختصر ریاستوں میں منقسم تھا. ان کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی. نپولین نے اس تعداد کو گھٹا کر سو سے بھی کم کر دیا. اس طرح نپولین نے نادانستہ طور پر جرمنی اور جرمن قوم کے اتحاد کی بنیاد رکھی تھی. جرمن ریاستوں کے اکثر حکمراں نے مقدس رومی سلطنت سے قطع تعلق کرکے فرانس کے شہنشاہ کی سرپرستی میں ایک جدید معاہدہ وفاق رہائن — (Confederation of the rhine) — بنا لیا. ہیپسبرگ شہنشاہ فرانس دوم کو جو مقدس رومی سلطنت کا برائے نام صدر تھا موروثی شہنشاہ اسٹریا کے لقب پر اکتفا کرنا پڑا.

نپولین کی شکست کے بعد ۱۸۱۵ء میں ویانا کی کانگریس — (Congress of Vienna) — نے ۳۸ ریاستوں کا ایک جرمن وفاق قائم کیا. ان ریاستوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کریں. اس کے سوا دیگر تمام معاملات میں وہ آزاد تھے. ان ریاستوں کی پالیسی یہ تھی کہ اپنی آزادی کو برقرار رکھیں اور اپنے حقوق کو اسٹریا اور پرشیا (Prussia) جیسے طاقتور پڑوسیوں کی مداخلت سے محفوظ رکھیں. یہ وفاق صرف ۱۸۶۶ء تک زندہ رہا.

اس بے ربط وفاق کا قیام ان جرمن محبان وطن کے لیے نہایت مایوس کن تھا. جو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جنگ آزادی کے ہنگامہ کے نتیجہ میں قومی اتحاد کی کسی حد تک تکمیل ہو سکے گی جرمن قومیت کا حقیقی احساس جنم لے چکا تھا جو نپولین کی شکست میں ایک زبردست عنصر ثابت ہوا. جرمن لوگ اپنی قرابت داری اور مشترکہ زبان سے باخبر ہو گئے تھے اور اکثروں کو توقع تھی کہ وہ ایک ہی جرمن سلطنت کے شہری بن جائیں گے لیکن ویانا کی کانگریس نے فیصلہ اس کے خلاف کیا.

جرمن اتحاد میں پرشیا کا اہم حصہ

بہتیرے جرمنوں کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ صرف پرشیا ہی جرمن اتحاد کا علمبردار ہو سکتا ہے اور آسٹریا کو جرمن وفاق سے باہر نکال کر متحد کر سکتا ہے لیکن پرشیا ابھی خود اتنا طاقتور نہیں تھا کہ قوم کی قیادت اختیار کر سکے اور وہ یہ رتبہ اسٹریا کے سپرد کرنے کے لیے رضامند ہی نہیں تھا. صدیوں سے اسٹریا کو نمایاں جرمن ریاست تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن جرمنی سے باہر آسٹریا کے مفادات اس قدر وسیع تھے کہ اس کو جرمن قوم کی سرداری کے لیے موزوں سمجھنا مشکل تھا.

یہ بالکل واضح تھا کہ آسٹریا متحدہ جرمنی کے تصور کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا. اس کے اپنے مفادات کی خاطر وہ اس امر کا پابند تھا کہ جرمنی کو کمزوری اور انتشار کی حالت میں قائم رکھے. اور یہ بات بھی واضح تھی کہ جرمنی کا اتحاد کبھی بھی دستوری ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتا. بے شمار غرضیں باہم الجھی ہوئی تھیں. بہت سے شہزادے ایک ایسی تحریک کے خلاف صف آرا ہونے کو تیار تھے جس کا مدعا انہیں اقتدار سے محروم کرنا تھا. مستقبل میں کامیابی کے لیے ناگزیر تھا کہ ایک ایسی فوجی طاقت کی بنیاد رکھی جائے جو جبری طور پر اتحاد کو ملک پر عائد کرے اور آسٹریا کو مناسب وقت پر جرمنی سے نکال باہر کرے اور ان تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو کچل دے جو اس تحریک کی مزاحمت کریں. ۱۸۶۲ء میں بسمارک نے جو محاورہ استعمال کیا تھا اس کا بھی یہی مطلب تھا اور جو ہمیشہ اس کی پالیسی کے اسلوب بیان کے طور پر یاد رہے گا.

"تقاریر اور اکثریتی ووٹوں کے ذریعہ نہیں بلکہ لہو اور آہن (Blood and Iron) کے ذریعہ" لہذا خیال سے عمل میں بدلنے کے لیے اس وقت کا انتظار ہو رہا تھا جب پرشیا اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جائے.

چند سالوں تک تو پرشیا تیاریاں شروع کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا. اسی زمانہ میں بہت کچھ مادی ترقی ہو گئی تھی. شہروں کا نشو ونما ہوا اور آبادی میں اضافہ ہوا. کارخانے قائم کیے گئے اور مشینی پیداوار کو فروغ دیا گیا. پلوں کی تعمیر اور نقل وحمل کی سہولتوں میں توسیع عمل میں لائی گئی. صنعتی انقلاب جو جارج سوم کے دور حکومت میں برطانیہ میں شروع ہوا تھا اور لوئی فلپ (Louis Philippe) کے زمانہ میں فرانس میں اور اب پرشیا اور فی الحقیقت سارے جرمنی میں تکمیل کو پہنچا. ملک کی مادی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا.

ولیم اوّل (William I)

جرمن اتحاد کی تکمیل اس وقت مکمل ہو گئی جب کہ پرشیا کو بیک وقت خوش قسمتی سے ایک بادشاہ اور ایک مدبر مل گیا جس نے اس دشوار مسئلہ کے اجزائے ترکیبی کو اچھی طرح سمجھ لیا. ولیم چونسٹھ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا. اس کی ساری عمر فوج میں صرف ہوئی تھی اور فوج کی اہمیت کا اس کو پورا اندازہ تھا. اس نے فوج کی تنظیم کی اور جبری فوجی تعلیم کے ذریعہ افواج کی تعداد میں اضافہ کیا.

پرشیائی افواج کی اصلاح. توسیع اور تنظیم وزیر جنگ البرخٹ فان رون (Albrecht — Von Roon) — کے ذریعہ اور چیف ان اسٹاف جنرل ہلمت فان مالٹکی (Helmuth - Von Maltke) - کی رہنمائی میں عمل میں لائی گئی. چند برسوں میں اس کا شمار یورپ کی سب سے زیادہ کارگزار اور خوفناک جنگی مشین میں ہونے لگا. یہ منظم فوج استعمال بھی کی جا سکتی تھی اور وزیر اعلیٰ بسمارک کی اس میں بھی بنیادی دلچسپی تھی. ایک جرمن قوم کی تخلیق جس میں پرشیا کو خاص مقام حاصل ہو یہ کام تین جنگوں میں مکمل کر لیا گیا. ۱۸۶۴ء میں ڈنمارک (Denmark) کے خلاف ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے خلاف اور ۱۸۷۰ء میں فرانس کے خلاف. آخری دو جنگیں زیادہ تر بسمارک کے عزم وارادے کا نتیجہ تھیں اور پہلی جنگ کو وہ انتہائی ہوشیاری کے ساتھ پرشیا کی منفعت کے لیے کام میں لایا.

ڈنمارک کے خلاف جنگ میں بسمارک نے چالاکی سے آسٹریا کو بھی جرمنی کے ساتھ شریک کر لیا. ان دو جرمن طاقتوں نے بآسانی فتح حاصل کر لی اور ڈنمارک

کو مجبور کیا گیا کہ شالسوگ (Schlerwig) اور ہالسٹاین (Holstein) کے علاقوں پر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ ان علاقوں کی ساری آبادی جرمن تھی۔ ایک عارضی سمجھوتہ کے ذریعہ یہ طے پایا کہ شالسوگ پرشیا کے قبضہ میں اور زیرانتظام رہے اور ہالسٹاین آسٹریا کے پاس۔ اس جنگ میں آسٹریا کو شریک کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بسمارک کی توقع کے مطابق آئندہ آسٹریا کے ساتھ جنگ کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

یورپ کی بڑی طاقتوں کی طرف سے غیر جانب داری کا تیقن حاصل کرکے بسمارک نے آسٹریا کے خلاف ایک مختصر سات ہفتوں کی جنگ (Seven Week's War) شروع کی۔ ساڈووا کی لڑائی (Battle of Sadowa) میں جرمن افواج نے آسٹریا کو شکست فاش دے دی اور آسٹریا صلح کا طلب گار ہوا۔ (۳ جولائی ۱۸۶۶ء) اس جنگ کے نتائج پرشیا کے حق میں بے انتہا فائدہ مند ثابت ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں شمالی جرمن معاہدہ وفاق (North German Confedration) قائم کیا گیا اور آسٹریا کو اس وفاق سے نکال دیا گیا۔ اس میں ان تمام جرمن ریاستوں کو شریک کیا گیا جو دریائے مین (River Main) کے شمال میں واقع تھے۔ جنوبی جرمنی ریاستوں کو سردست ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ستائیس ہزار مربع میل کا رقبہ اور تقریباً پچاس لاکھ باشندے حدود سلطنت میں داخل کر لیے گئے۔ اس طرح تمام جرمنی کا ۲/۵ رقبہ اور ۲/۳ آبادی ملکیت میں آگئی۔ ہوہن زولرن فرماں روا (Hoben Zollern Sovereign) کے تحت پرشیائی سلطنت کو علاقائی سالمیت حاصل ہوئی جو دریائے رہاین (River Rhine) سے لے کر پولینڈ تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کے حدود روس، ڈنمارک اور فرانس کی سرحدوں سے جا ملتے تھے۔

آخر میں فرانس سے جنگ کرنے کے لیے بسمارک ایک بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ شاہ ولیم اور فرانسیسی سفیر کے درمیان ایک ملاقات کو ایسی رنگ آمیزی کے ساتھ اخباروں میں شائع کیا گیا کہ پیرس میں اشتعال پیدا ہو گیا اور جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔

تین جرمن افواج نے مختلف سمتوں سے فرانس پر حملہ کر دیا اور سیڈان (Sadan) کی فیصلہ کن لڑائی میں فرانس کو بھاری جانی نقصانات کے ساتھ شکست دے کر شہر پیرس کا محاصرہ کر لیا۔ چار مہینے سخت تکالیف برداشت کرنے کے بعد شہر نے اطاعت قبول کر لی (۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء) اور مئی ۱۸۷۱ء کے صلح نامہ کے تحت الساس اور مشرقی لارین (Alsace and Eastern Larraine) کے علاقے جرمنی کے حوالہ کرنے پڑے اور ۲۰ کروڑ پونڈ بطور تاوان جنگ ادا کیے گے۔

پیرس کی قبول اطاعت سے پہلے جرمن اتحاد کے ڈرامہ کا آخری منظر ورسائی کے محل (Versailles) میں پیش کیا گیا۔ سیڈان کی لڑائی کے بعد بسمارک نے جنوبی جرمنی کی ریاستوں سے وفاق میں ان کی شرکت کے بارے میں گفت و شنید شروع کی بعض دشواریوں کے باوجود سمجھوتہ ہو گیا اور شاہ ولیم اول کو جرمن شہنشاہ کے لقب کی پیش کش کی گئی۔

لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے محل ورسائی میں جرمن مملکت کا اعلان کیا گیا جس میں آسٹریا کے سوا شمال اور جنوب کی تمام جرمن ریاستیں شامل کر لی گئیں اور پرشیا کے بادشاہ کو جرمنی کا شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس جنگ کی بدولت پرشیا کے زیر اثر جرمن مملکت کی تخلیق اور جرمن فوجی مشین کی برتری کی توثیق ہو گئی۔

جرمنی اور پہلی جنگِ عظیم

ترقی اور خوشحالی کے ایک مختصر دور کے بعد پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جرمن مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ معاہدۂ ورسائی (Treaty of Versailles) کے تحت جرمنی نے الساس لارین (Alsace Larraine) فرانس کے حوالہ کیا۔ سیلیشیا (Silesia) پرشیا کے بعض حصے اور پوزن (Pose) پولینڈ اور چیکوسلواکیہ (Czechoslovakia) کو اور بعض چھوٹے رقبے ڈنمارک اور بلجیم کو۔ ڈان زگ (Danzig) کو آزاد ریاست بنا دیا گیا۔ بحیثیت مجموعی ننالیس ہزار دو سو باون مربع میل کا علاقہ اور تقریباً ۶۵ لاکھ باشندے جرمنی نے دوسروں کے حوالے کر دیے۔ افریقہ اور جنوبی سمندروں (South Seas) میں نوآبادیوں سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔

دور شہنشاہیت کے خاتمہ پر جمہوریہ قائم کی گئی۔ مابعد جنگ سیاسی اور معاشی اعتبار سے ملک کی حالت افسوس ناک ہو گئی۔ جرمن سکہ مارک کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی اور تاوان جنگ ادا کرنے میں ناکامی کے باعث فرانس نے وادئی روہر (Rubr Valley) پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۲۳ء میں جب گستاو اسٹریس من (Gustav Stresemann) چانسلر ہوا تو حالات بہتر ہونے لگے۔ کرنسی کی اصلاح کے بعد معاہدۂ لوکارنو (Pact of Locarno) پر دستخط ہوئے اور انجمن اقوام میں جرمنی کا داخلہ ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں ہنڈن برگ (Hinden Burg) کا انتخاب پریسیڈنٹ کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں اسٹریس من کے انتقال کے بعد حالات میں ابتری شروع ہوئی۔ دوسرے ممالک کی طرح جرمنی بھی سرد بازاری (Depression) کا شکار ہوا۔ تاوان جنگ ادا کرنے میں جرمنی نے مجبوری ظاہر کی۔ ملک میں سیاسی بے چینی پیدا ہوئی۔ اڈالف ہٹلر (Adolf Hitler) کی قیادت میں ایک جماعت جو نازی (Nazi) کہلاتی تھی بہت طاقت ور ہو گئی اور احیائے شاہی کی باتیں ہونے لگیں۔ یونیفارم پہننے اور دیگر امور کے بارے میں نازیوں کا حکومت سے تصادم ہوا اور بوریا (Bavaria) نے وفاق سے علاحدہ ہونے کی دھمکی دی۔ ۱۹۳۲ء میں ہنڈن برگ دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ بروننگ (Bruning) کو جو ایک قابل چانسلر تھا استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے جانشین فان پاپن (Von Papen) نے جولائی ۱۹۳۲ء میں لوزان (Lausanne) میں ملک کی نمائندگی کی۔ جہاں پر تاوان جنگ کا مسئلہ طے پایا۔ اس کی دست برداری کے عوض جرمنی نے یورپ کی ازسرنو تعمیر کے فنڈ میں پندرہ کروڑ پونڈ دینے کا ذمہ لیا۔

ہٹلر کا عروج

نازی پارٹی رفتہ رفتہ رسوخ حاصل کرتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں اس نے تعداد میں ٹھوس اضافہ دکھایا۔ ۱۹۳۳ء میں ایک اور الکشن کے بعد تمام مخالف جماعتوں کو قانون کی حمایت سے محروم کر کے نازیوں نے اپنی اکثریت پیدا کر لی۔ اور پال فان ہنڈن برگ نے ہٹلر کو چانسلر مقرر کیا۔

۱۹۳۴ء میں جب ہنڈن برگ کا انتقال ہوا تو ہٹلر کا اقتدار اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ نازی پارٹی نے ہٹلر کی سرکردگی میں حکومت کے تقریباً تمام عہدہ دار بھیا کیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کی اور بھورے قمیصوں (Brown Shirt) سیاہ قمیصوں (Black Shirt) اور خفیہ پولیس (Gestapo) پر نگرانی

رکھی پارٹیوں کی اندرونی مخالفت کو کچل دیا اور دوسری تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا ہٹلر حاکم مطلق (ڈکٹیٹر) کی حیثیت سے یہ یقین رکھتا تھا کہ فرد کا وجود ملک اور حکومت کی بھلائی کے لیے ہے اسی نظریہ کی وجہ سے جرمنی کلیت پرست حکومت (Totali - tarian State) کہلانے لگی یہ ناگزیر تھا کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں سے اس کا تصادم ہوجائے جن کا ایمان تھا کہ حکومت فرد کی بہبودی کے لیے ہے یہودی بھی جو ہٹلر کے حملہ کا خاص نشانہ تھے سخت اذیت رسانی کا شکار ہوئے ادب فنون اور موسیقی کو بالجبر نازی معیار کے مطابق بنادیا گیا۔

اپنی خارجی پالیسی کے ذریعہ ہٹلر نے جرمنی کو معاہدہ ورسائی (Treaty — of Versailles) — کی پابندیوں سے آزاد کرایا۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے انجمن اقوام سے علاحدگی اختیار کرلی۔ ۱۹۳۴ء میں ہٹلر نے پولینڈ سے ایک دوستانہ معاہدہ کیا اور ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے ساتھ جہاز رانی کا سمجھوتہ کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس نے جاپان کے ساتھ مخالف کمنٹرن عہدنامہ (The Anti-comintern Pact) پر دستخط کیے۔ اس عہدنامہ نے جرمنی، اٹلی اور جاپان کو پابند کردیا کہ جب کبھی وہ وقت کو مناسب سمجھیں سوویت روس سے لڑائی کریں۔ اٹلی کے ساتھ ایک علاحدہ سمجھوتہ نام نہاد روم، برلن محور (Rome-Berlin axis) کا باعث ہوا۔

اسی دوران ہٹلر نے جرمنی کو بڑی تیزی کے ساتھ مسلح کردیا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں اس نے رہاین لینڈ (Rhine Land) پر قبضہ کرلیا اور مارچ ۱۹۳۸ء میں آسٹریا کا الحاق کرلیا۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کے میونخ سمجھوتہ (Munich Agreement) کے ذریعہ اس نے سوڈیٹن لینڈ (The Sudeten Land) حاصل کرلیا اور اس سمجھوتہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارچ ۱۹۳۹ء میں اس نے چیکوسلوواکیہ کے مغربی نصف حصہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

جرمنی اور دوسری جنگ عظیم

ہر جارحانہ فعل ہٹلر کو بے باک سے بے باک تر بناتا گیا یہاں تک کہ جنگ کی ڈراؤنی شکل سامنے دکھائی دینے لگی اور اس کو روکنا محال ہوگیا۔ جنگ کا فوری سبب ہٹلر کا پولینڈ پر حملہ تھا (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء) مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر ایک ہی وقت میں لڑائی سے بچنے کے لیے ہٹلر نے روس سے معاہدہ کرکے اس کو جنگ سے علاحدہ رکھا۔ اسی معاہدہ کی بدولت روس کو پولینڈ کے مشرقی حصہ پر قبضہ جمانے کا موقع مل گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے جو پولینڈ کی حفاظت کے ضامن بنے ہوئے تھے جرمنی کے خلاف ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ کا اعلان کردیا۔ جون ۱۹۴۰ء میں اٹلی نے فرانس اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔

جرمنی کی فوجیں برق رفتاری سے پیش قدمی کرتی ہوئی یورپ کے بیشتر ممالک پر قابض ہوگئیں اور جرمن طیاروں نے برطانیہ پر شدید ہوائی بمباری کی۔ مغربی محاذ پر مسلسل کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد ہٹلر روس پر حملہ آور ہوا۔ روسیوں نے سخت مقاومت کی اور بالآخر جرمنوں کی فوجوں کو اسٹالن گراڈ (Stalin Grad) پر روک دیا۔

جرمنی کی قوت مقابلہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی۔ جون ۱۹۴۴ء میں برطانوی اور امریکی فوجیں فرانس کے مغربی ساحل پر اتاری گئیں اور سال ختم ہونے سے پہلے خود جرمنی پر حملہ کردیا گیا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں روسی فوجیں مشرق کی طرف آگے بڑھتی ہوئی جرمنی میں داخل ہوگئیں ہٹلر نے اپنی شکست کا پوری طرح اندازہ کرتے ہوئے خودکشی کرلی۔ مئی ۱۹۴۵ء میں جرمنی کی غیر مشروط اطاعت کے باعث یورپ میں جنگ کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔

جرمنی پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ بعد ازاں جرمنی کو تقسیم کرکے مشرقی جرمنی کو روس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ جہاں اب بھی روس کے زیر اثر ایک علاحدہ حکومت جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک (GDR) کے نام سے قائم ہے مغربی جرمنی برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی نگرانی میں آیا۔ ۱۹۵۵ء میں ان ممالک کا دس سالہ قبضہ ختم کردیا گیا اور جرمن وفاقی جمہوریہ (German Federal Republic) شمالی اٹلانٹک کے معاہدۂ تنظیم (Nato) میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۴۹ء میں عیسائی جمہوری اتحادی جماعت (The Christian Democratic — Union Party) — کا لیڈر کونراڈ اڈی نار (Konrad — Ademauer) — مغربی جرمنی کا چانسلر ہوا۔

جرمنی یا وہ ملک جو اکثر جرمن رائش (The German Reich) کہلاتا ہے ۱۹۴۲ء میں یورپی براعظم کی غالب طاقت کا روپ اختیار کرلیا تھا۔ تین سال بعد اتحادی فوجوں (The Allied Forces) نے مغرب اور مشرق دونوں طرف سے اس پر جو حملہ کیا تھا اس نے جرمنی کو مکمل طور پر کچل دیا۔ التوائے جنگ (The Armis tice) پر دستخط ہونے کے بعد چار بڑی طاقتوں، ممالک متحدہ امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس نے سارے ملک پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے اس کے علاقے کو فوجی قبضہ کے چار منطقوں میں تقسیم کردیا اور دارالسلطنت برلن کا نظم و نسق مشترک رکھا۔ میونخ سمجھوتہ (The Munich Pact) کے فوری بعد جرمن رائش کا رقبہ دو لاکھ گیارہ ہزار چھ سو آٹھ مربع میل تھا لیکن بعد ازاں ۱۹۳۹ء میں تین لاکھ اڑتیس ہزار پانچسو مربع میل کے ساتھ وہ اپنی چوٹی پر پہنچ گیا ("عظیم تر جرمنی") دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر یہ رقبہ گھٹ کر ایک لاکھ چھتیس ہزار پانچ سو چھیالیس مربع میل ہوگیا کیوں کہ سرحد اوڈر نےسی (The Oder neisse Line) تک اس کے تمام مشرقی صوبے چھین لیے گئے۔ موجودہ رقبہ ایک لاکھ سینتیس ہزار پانچ سو اٹھاون مربع میل ہے۔

تاریخ روس

(زار شاہی دور)

لفظ روس کا ماخذ

روس (Russia) کا ابتدائی نام رس (Rus) تھا جو بعد میں روسیا (Rossiya) ہوگیا اور بالآخر رشیا کہلانے لگا۔ اس علاقہ کا ذکر ٹیسی ٹس (Tacitus) نے اپنی کتاب جرمانیہ (Germanica) میں کیا ہے۔

قدیم زمانے سے روسی حکومت یورپ کے تقریباً تمام مشرقی علاقہ پر چھائی ہوئی تھی۔ جیسے زار بادشاہوں نے ایشیا کے شمال مشرقی حصہ تک پھیلا دیا۔ یعنی مغرب میں فن لینڈ (Finland) سے مشرق میں جاپانی سمندروں تک وسیع علاقے پر ان کا اقتدار تھا۔ اتنے وسیع علاقہ میں نہ صرف جغرافیائی بلکہ نسلی تنوع ناگزیر ہے یہ معلوم کرنا کہ روسیوں

کی تاریخ کی ابتدا کب سے ہوئی ایک مشکل کام ہے۔ کیوں کہ بالکل ابتدائی زمانہ کے حالات کا دارومدار قصّوں اور کہانیوں پر ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب روس کے کاشتکار سلاؤ (Slavic) قبائل فن لینڈ کے حکمرانوں اور منگولوں کے بے پناہ حملوں سے پریشان ہوگئے تو انہوں نے رورک وائی کنگ (Ruric the Viking) سے مدد طلب کی جس کے بعد رورک نے ۸۶۰ء کے لگ بھگ نووگراڈ (Novgorod) میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس تاریخ سے روس شاہی خاندان کی ابتدا ہوئی۔ رورک کے بعد اولیگ (Oleg) کا دور (۸۸۰ — ۹۱۲ء) اس لیے مشہور ہے کہ اس نے جنوبی طاقتوں کو فتح کرکے سلطنت کو وسعت دی اور شہر کیف (Kiev) کو جو یوکرین میں ہے اپنا پایۂ تخت قرار دیا جو وادی ڈنگس اور سلافو (Slavs) کے تمدنوں کا مرکز بن گیا گیارہویں صدی عیسوی میں یہاں عیسائی مذہب پھیلا جس نے روس کے تمام قبائل کو آپس میں ملا کر ایک کر دیا ۹۸۹ء میں یہاں کے بادشاہ ولادی میر (Vladimir) نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو اس کی رعایا اسے بزرگ ترین فرد سمجھنے لگی۔ اس نے یونانیوں کا کٹر عیسائی مسلک اختیار کیا تھا جس کی وجہ سے بازنطینیوں (Byzantines) سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ اس کی جھلک روسی فن تعمیر، موسیقی، مصوّری اور ادب میں نظر آتی ہے۔ سیاست میں خود سرانہ حکومت کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں کیف کے ڈیوک (امیر) نے پورے روس کو متحد رکھا۔ ۱۲۴۰ء میں چنگیز خاں کے پوتے باتو (Batu) نے حملہ کرکے کیف کو تباہ کر دیا جس کے بعد روسی سلطنت مختلف حصوں میں بٹ گئی۔ چنانچہ گیلی شیا (Galicia) کی رقابت مغرب میں، نووگراڈ کی شمال میں اور ماسکو کی مشرق میں ابھر آئیں۔ ان علاقوں پر امرا کی حکومت تھی جو اپنی کونسل کی مدد سے حکومت کرتے تھے اور کونسل میں صرف زمینداروں اور کلیسا کے بڑے پادریوں کا دخل تھا۔ بعض مقامات پر آزاد شہریوں کی حکومت بھی تھی لیکن دیہات کا انتظام کاشتکاروں کی انجمنوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں ماسکو امرا زیادہ نمایاں تھے کیوں کہ وہ اپنے منگول آقاؤں کی نذر کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں سے محصول وصول کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے ان علاقوں کو وسعت دینے کے لیے جو ان کے زیر نگیں تھے، منگولوں سے مدد بھی طلب کی۔

پندرہویں صدی میں ماسکو کے امیر (ایون سوم) (Ivan III) کو روس کے تمام امرا پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ اس نے تیور (Tiver) اور نووگراڈ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ۱۴۸۰ء میں منگولوں کی بالادستی کو نظر انداز کر دیا۔ اس زمانہ میں بازنطینیہ کے حکمراں ترک تھے۔

جدید روس اور زار شاہی کی ابتدا۔ ایوان سوم جو پکا عیسائی تھا، جدید روس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا جانشین اس کا پوتا ایوان چہارم تھا جو ۱۵۳۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے زار (Czar) کا لقب اختیار کیا۔ (لفظ زار لاطینی سیزر سے نکلا ہے) اپنے طویل دور حکومت میں رفتہ رفتہ وہ بہت خود سر بن گیا۔ اس نے زمینداروں اور کاشتکاروں کا زور توڑ دیا۔ قازان (Kazan) اور استراخان (Astrakhan) کے خانوں کو شکست دے کر پوری وادی وولگا (Volga) پر قابض ہوگیا۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت بحر ابیض (White Sea) اور یورالس (Urals) تک پھیل گئی۔

۱۵۸۴ء میں ایوان کے انتقال کے بعد تیس سال تک افراتفری رہی جس کے بعد مائیکل رومانوف (Michael Romanov) ۱۶۱۳ء میں زار بنا۔ اس کا خاندان ۱۹۱۷ء تک برسر اقتدار رہا۔ مائیکل کے بیٹے اور پوتے کے دور میں نئے علاقوں کا اضافہ کیا گیا اور دولت عثمانیہ (Ottoman Empire) سے یوکرین کا کچھ حصہ حاصل کر لیا گیا۔ اس خاندان کے ایک مشہور حکمراں پیٹر اعظم (۱۶۸۹ء — ۱۷۲۵ء) کے دور میں روس میں مغربی اثرات بڑھنے لگے کیوں کہ خود پیٹر مغربی تمدن کا دلدادہ تھا۔ اور اس غرض کی تکمیل کے لیے اس نے مغربی یورپ کا دورہ کیا۔ اس نے سویڈن کو شکست دے کر مغرب میں اپنی سلطنت لینن گراد (جو پہلے سینٹ پیٹرس برگ کہلاتا تھا) تک وسیع کر دی اور سلطنت کے قدیم علاقہ داری حدود کو ختم کرکے اسے بارہ صوبوں (Gulberniyas) میں تقسیم کر دیا۔ ہر صوبہ میں ایک گورنر مقرر کیا۔ فوج کو جدید اصولوں پر تنظیم کی اور اس طرح روسی شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ روس کو صنعتی ملک بنانے کی خاطر پیٹر نے ہزاروں جرمن اور اطالوی صناعوں کو روس میں لاکر آباد کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں جرمن اثرات بڑھنے لگے۔ چنانچہ پیٹر اعظم کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں، کیتھرائن اول، پیٹر دوم، این (Ann) اور ایوان ششم کے عہد حکومت میں روسی حکومت پر جرمن اثرات غالب رہے جس سے تنگ آکر روسیوں نے فوجی انقلاب کے ذریعہ الیزابیتھ کو تخت نشین کیا۔ اس کے بعد پیٹر سوم گدی پر بیٹھا۔ وہ بہت کمزور ثابت ہوا اور چھ ماہ کے اندر ہی اسے ہٹا کر کیتھرائن دوم کو، جو کیتھرائن اعظم کہلاتی ہے، تخت نشین کیا گیا۔

کیتھرین اعظم (۱۷۶۲-۱۷۹۶ء) کے دور میں اہم کارنامے انجام پائے پہلے تو اس نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کی، مخالفین کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا اور سلطنت کو وسعت دی، چونکہ وہ ماں کی طرف سے جرمن تھی اس لیے پورے روس پر یورپی تمدن چھا گیا (۱۷۷۲ — ۱۷۹۳ — ۱۷۹۵ء) کی پولینڈ کی تقسیم میں روس نے پولینڈ کے بڑے علاقہ اور کریمیا پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح روس یورپی ملک بن گیا۔ اس کے بعد نہ صرف یورپ کی سلطنتوں نے بلکہ نوزائیدہ امریکی حکومت نے بھی اپنے سفرا روس کے دربار میں بھیجے کیتھرائن دوم کے دور کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس نے ملک میں مغربی قوانین جاری کیے۔ نئے امرا کی ایک جماعت بنائی جو ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی تھی۔ مدرسے کھولے، یونیورسٹیاں قائم کیں، غرض مختلف اصلاحات کے ذریعہ پیٹر اعظم کے مقاصد کی تکمیل کی۔

آخری زار حکمراں

کیتھرین کے بعد اس کا بیٹا پال اوّل اور اس کے بعد ۱۸۰۱ء میں الگزانڈر اوّل زار بنا۔ اس نے ہر معاملہ میں روشن خیالی سے کام لیا جس کی وجہ سے ملک میں تعلیم کا چرچا بڑھا۔ جدید یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور ملک میں صنعتی اور تجارتی ترقی ہوئی۔ الگزانڈر اوّل کے دور کا مشہور واقعہ روس پر نپولین بونا پارٹ کا حملہ ہے۔ لیکن نپولین کی شکست کی وجہ سے نہ صرف روس کے مغربی علاقوں میں اضافہ ہوا بلکہ اسے عالمی سیاست میں اہم مقام حاصل ہوگیا۔ چنانچہ مشہور ویانا کانگرس (۱۸۱۴ — ۱۸۱۵ء) دوسرے ممالک کے مقابلے میں روس کا اثر غالب تھا۔ روس کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو برقرار رکھنے کے لیے تاکہ وہ یورپ کے انقلابات سے جو اس زمانہ میں عام تھے محفوظ رہے، الگزانڈر اوّل نے اپنا خود سرانہ طریقۂ کار جاری رکھا۔ اس زمانہ میں انقلاب فرانس کے اثرات سے یورپ کا کوئی بھی بڑا ملک نہ بچ سکا۔ لہٰذا روس کا اس انقلابی اثرات سے محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ روس کے بہت سے فوجی حکام اور دوسرے روشن خیال لوگوں نے ملک میں سیاسی آزادی اور معاشی فلاح و بہبود کے خیالات کو عام کیا۔ جس کی وجہ سے ملک میں ہر طرف خفیہ انجمنیں قائم ہونے لگیں جن میں ملک کے تعلیم یافتہ امرا کا بڑا ہاتھ تھا جو حصول آزادی کے لیے انقلاب کی تائید میں تھے۔ چنانچہ پہلا انقلاب ۱۸۲۵ء میں ہوا جسے حکومت

نے اپنی قوت کے بل پر آسانی سے قابو پالیا۔ الگزانڈر اول کے بعد اس کے بھائی نکولاس اوّل نے انقلابیوں کو طاقتور نہ ہونے دیا۔ مگر جنگ کریمیا (۱۸۵۴-۱۸۵۶ء) میں روس کی شکست نے شہنشاہیت کا بھرم کھو دیا۔ ۱۸۵۵ء میں نکولاس کا بیٹا الگزانڈر دوم زار بنا تو اس نے مختلف اصلاحات کے ذریعہ ملک کی حالت بدلنے کی کوشش کی مثلاً زرعی غلاموں (Serfs) کی آزادی، جیوری کے ذریعہ مقدمات کی سماعت، صوبوں کو اپنی منتخبہ کونسلوں کے ذریعہ حکومت کے بارے میں قانون بنانے کی اجازت اور ملک کی صنعتی ترقی کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ ملک میں ریلوے کے ذریعہ آمد و رفت کی سہولت دوگنی کر دی گئی، کارخانوں سے تگنا مال برآمد ہونے لگا۔ اور کاروباری سہولتوں کی خاطر ملک میں بینک کا جدید طریقہ رائج کیا گیا۔

۱۸۶۱ء کے قانون آزادی سے روس کے کاشت کاروں کے مقاصد کی تکمیل نہ ہوسکی کیوں کہ وہ شخصی آزادی کے حصول سے زیادہ ان زمینوں پر ملکیت چاہتے تھے جن پر وہ کاشت کرتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بے چینی بڑھنے لگی اور حکومت کی مخالف جماعتوں کی قوت بڑھنے لگی، خفیہ انجمنوں میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ان کوششوں سے کاشت کاروں کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ حکومت کی مخالفت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب کہ ملک کی تیسری جماعت یعنی مزدور پیشہ طبقہ (Proletariat) منظم ہونے لگا اور اس نے کسانوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا شروع کیا۔ یوں بھی خود مزدور کچھ کم طاقتور نہ تھے کیوں کہ ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی سے انہیں تقویت ہوئی تھی۔ لیکن حکومت نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور ۱۸۶۳ء میں پولش بغاوت کو بری طرح کچل دیا۔ الگزانڈر دوم نے اپنے ترقی پسند رجحانات کو ترک کر کے تنگ نظری اور جبر و تشدد سے کام لیا۔ اور یہ پالیسی ۱۸۸۱ء میں اس کے قتل کا باعث بنی۔ اس کا بیٹا الگزانڈر سوم تخت نشین ہوا۔ جب اس نے بھی جابرانہ روش اختیار کی تو کئی دفعہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ حکومت نے اشتراکیوں کو قید کر کے سائبیریا بھیج دیا۔ بہت سے مخالفین بیرون ملک مثلاً جرمنی، انگلستان، فرانس اور سوئیزرلینڈ فرار ہو گئے، جہاں سے انھوں نے زار کی مخالفت جاری رکھی۔ اسی زمانہ میں حکومت نے یہودیوں اور دوسری اقلیتوں کا بھی پیچھا کیا۔ ایسے انتشار کے دور میں ۱۸۹۴ء میں الگزانڈر سوم کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بڑے کارنامے تھے۔ سائبیریا ریلوے کی تعمیر اور صنعتی ترقی جن کی وجہ سے روسی حکومت کا اثر وسطی ایشیا تک پھیل گیا۔

زارشاہی کا زوال اور انقلاب کی ابتدا

الگزانڈر سوم کے بعد نکولاس دوم تخت نشین ہوا۔ ایک طرف تو یہ بہت کمزور تھا اور دوسری طرف ملک ہر قسم کے بحران کا شکار تھا۔ ملک کی معیشت پر جرمن اور فرانسیسی ماہرین اور سرمایہ داروں نے قابو پا لیا تھا۔ ایشیا میں سامراجی توسیع پسند پالیسی کی بنا پر برطانیہ کے ساتھ روس کے تعلقات خراب ہونے لگے۔ خاص طور سے ترکستان پر روسی قبضہ کی وجہ سے زارشاہی فوجیں افغانستان کی سرحد تک پہنچ گئی تھیں۔

اس سے برطانیہ کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ ہندوستان کی طرف پیش قدمی نہ کرے۔ چنانچہ مغرب میں انگلستان روس کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگا۔

مشرق بعید میں ایک اس سے بھی بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ کوریا کے سوال پر جاپان اور چین میں پرانی رقابت چلی آ رہی تھی۔ آخر دونوں ملکوں میں اس پر جنگ چھڑ گئی اور چین کو شکست ہوئی اور جاپان نے چین کے علاقے لیاؤتنگ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس اور جرمنی نے جاپان سے یہ علاقہ چین کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ روس نے فرانس اور جرمنی کا ساتھ دیا۔ برطانیہ نے جاپان سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ اس صورت حال سے اور بھی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جبکہ روس نے شمالی چین اور مشرق بعید کے دوسرے علاقوں میں اپنے پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاپان سے اس کا تناؤ بڑھتا گیا اور فروری ۱۹۰۴ء میں جاپان نے بندرگاہ آرتھر پر روسی بحری بیڑے پر حملہ کر دیا اور دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں روس کو شکست ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ روس کا سارا بحری بیڑا تباہ ہو گیا۔

ملک میں پہلے ہی سے سخت بے چینی پھیل ہوئی تھی، امن و شکست نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ ہڑتالوں کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء کو مزدوروں نے پیٹرو گراڈ (اب لینن گراڈ) کے شاہی محل کے سامنے زبردست مظاہرہ کیا۔ فوج نے گولی چلائی جس سے سینکڑوں مزدور گھائل ہوئے۔ اس نے سارے ملک میں آگ لگا دی۔ ہر جگہ ہڑتالیں اور مظاہرے ہونے لگے۔ کسانوں نے زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ خود فوج اور بحری بیڑہ بغاوت سے نہیں بچ سکا۔ اکتوبر میں یہ انقلابی تحریک اپنے عروج کو پہنچی۔ سارے ملک کی ریلوے نے ہڑتال کر دی۔ کئی جگہ مزدوروں نے اپنی سویت حکومتیں قائم کر لیں۔ حکومت نے ایک طرف جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا اور دوسری طرف اصلاحات اور الکشن کا اعلان کیا گیا۔ یہ انقلاب اگرچہ ناکام ہوا لیکن اس نے روسی سلطنت کو جڑوں سے ہلا دیا۔ ان انقلابی سرگرمیوں کو منظم کرنے میں لینن اور اس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے اہم حصہ لیا۔ اس کے بعد روس نے جاپان، برطانیہ وغیرہ کی طرف سے صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی لیکن اگلے کئی سال وہ بلقان میں الجھا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں بلقان کی جنگ چھڑ گئی۔ آسٹریا نے سربیا سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ روس کے لیے بڑی مشکل کا وقت آ گیا۔ اگر وہ سربیا کا ساتھ نہ دیتا تو پورا بلقان اس کے اثر سے نکل کر جرمنی کے اثر میں چلا جاتا اور خود روس پر جرمنی کا اقتدار مسلط ہو جاتا۔ چنانچہ اسے جرمنی سے لڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

پہلی جنگِ عظیم

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ شروع میں روس اور فرانس کا اتحاد کام آیا اس لیے کہ ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر جرمنوں کے لیے لڑنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن روس کی اندرونی معاشی حالت اتنی بڑی جنگ کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روس سخت معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ساتھ عوام میں بے چینی بے حد بڑھنے لگی۔ ہتھیاروں اور جنگی سامان و رسد کی کمی کی وجہ سے مئی ۱۹۱۵ء تک دس لاکھ سے زیادہ روسی سپاہی مارے جا چکے تھے اور فوج کے اندر بے چینی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف عوامی حکومت کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اس کے جواب میں زار نے سارا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جو وزیر مقرر کیے وہ انتہائی نااہل اور رشوت خور تھے جس سے عوام کا غصہ اور بڑھا۔ معاشی بحران اس منزل تک پہنچا کہ جنوری ۱۹۱۷ء میں خود صدر مقام ماسکو میں غلّہ کا قحط پڑ گیا۔ ہزاروں مظاہرین گلی کوچوں میں گشت کرنے لگے۔ جگہ جگہ فوجی دستوں میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ سپاہیوں نے مظاہرین پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ زار ایک طرح سے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ پیٹرو گراڈ (اب لینن گراڈ) میں مزدوروں اور فوجی سپاہیوں نے اپنی سوویت قائم کر لی۔ اس سوویت اور پرانی پارلیمنٹ نے ایک عارضی حکومت پرنس لووف کی سرکردگی میں قائم کی۔ ۱۵ مارچ کو اس حکومت کے وفد نے زار سے ملاقات کی اور اس نے تخت سے دست برداری کے اعلان پر دستخط کر دیے۔ اس طرح ایک ہزار سال پرانی زارشاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

تاریخ روس

(روسی انقلاب اور سوویت یونین کا قیام)

(۱۹۱۷ء — ۱۹۷۷ء)

زار شاہی حکومت کے زوال اور زار کی تخت سے دست برداری کے بعد ۱۲ر مارچ ۱۹۱۷ء کو سابق پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے ایک عارضی حکومت قائم کرلی تاکہ ملک میں امن بحال کیا جاسکے۔ اسی روز پٹروگراڈ میں مزدوروں اور سپاہیوں نے ایک سوویت حکومت قائم کی جس کے نمائندے کارخانوں کے مزدوروں اور فوج کی رجمنٹوں نے چنے تھے۔ اس قسم کی سوویٹس سارے ملک میں تیزی کے ساتھ قائم ہونے لگیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈیوما (پارلیمنٹ) کے سابق ممبروں نے بھی ایک عارضی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ زار شاہی کے زوال کے بعد ملک کی بگڑی ہوئی معاشی حالت کا مقابلہ کرنا اس عارضی حکومت کے بس سے باہر تھا۔ اس کے بعد اس کے لیے جنگ میں شریک رہنا ناممکن ہو رہا تھا۔ کسان زمینداری نظام ختم کرنے اور کسانوں میں زمین بانٹنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مزدور کارخانوں پر اپنا اقتدار چاہتے تھے۔ فوجی سپاہی لڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہر جگہ ہڑتالوں اور مظاہروں کی لہر مل رہی تھی۔ اپریل میں عارضی حکومت کو مجبوراً چند وزیروں کو ہٹانا پڑا۔ اور ان کی جگہ بعض سوویٹوں کے نمائندوں کو لینا پڑا۔ ساتھ ہی لڑائی جاری رکھنے کی پالیسی باقی رکھی گئی لیکن پہلی ہی مڈبھیڑ میں روسی فوجوں کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے خلاف غصہ کی لہر تیز ہوگئی۔

انقلاب کا نیا موڑ

۱۶ر اپریل کو بالشویک پارٹی کے رہنما لینن جلا وطنی سے واپس آئے اور انھوں نے نعرہ دیا کہ اس عارضی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور سارا اقتدار مزدوروں اور سپاہیوں کی یونینوں کے ہاتھوں میں منتقل کیا جائے۔ بالشویک پارٹی کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا۔ ٹراٹسکی مینشوک سوشل انقلابی وغیرہ جو اب تک بالشویک پارٹی کے خلاف تھے اب اس کی حمایت کرنے لگے۔ بہت سی سوویٹوں میں بالشویک نمائندے چن کر آگئے۔ وزیر جنگ کرنسکی نے ایک عارضی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور عارضی طور پر اسے اس نئی انقلابی لہر کو دبانے میں کامیابی ہوگئی۔ زار شاہی کے تمام پرانے حامی اور قدامت پسند کرنسکی کے اطراف جمع ہونے لگے لیکن سارے ملک میں انقلابی لہر اتنی تیز تھی، بے چینی اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ اس دھارے کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ بالشویک پارٹی کا اثر آگ کی طرح ملک میں پھیلنے لگا اور ایسے وقت میں اس نے نعرہ دیا "امن، زمین اور روٹی" یعنی روس جنگ سے علاحدگی اختیار کرے جرمنی سے صلح کرلے، کسانوں میں زمین تقسیم کر دی جائے اور ملک بھر میں عوام کے لیے روٹی مہیا کی جائے۔ ساتھ ہی لینن نے کامینف، زینوویف جیسے لیڈروں کی مخالفت کے باوجود بالشویک پارٹی کی اکثریت سے منوا لیا کہ سوائے مسلح انقلاب کے ملک کو نہیں بچایا جاسکتا چنانچہ جب ۴ر نومبر کو کرنسکی کی حکومت نے بالشویک پر حملہ کیا تو لینن نے فوج اور مزدوروں کی بغاوت اور ہتھیار اٹھانے کا نعرہ دیا۔ ۷ر نومبر ۱۹۱۷ء کی صبح بالشویکوں نے ونٹر پلیس (زار کا سرمائی محل) کا محاصرہ کر لیا جہاں عارضی حکومت کی کابینہ اجلاس کر رہی تھی اور اس طرح ایک قطرہ بہائے بغیر عارضی حکومت نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس انقلاب کی کامیابی کی بنیاد بقول مغربی مبصرین کے تین چیزوں پر تھی "عوام میں انقلابی ابھار، بالشویک کی تنظیم اور لینن کی غیر معمولی رہنمائی" سارے ملک کی سوسائیٹیوں کے نمائندوں نے اس انقلاب کا استقبال کیا۔ اس کی دوسری کانگرس میں سارا اقتدار اس کے ہاتھ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی مجلس انتظامی نے پارلیمنٹ کی شکل اختیار کرلی اور لینن کو مجلس وزرا کا صدر یا وزیر اعظم چنا گیا۔ پٹروگراڈ میں سوویت حکومت کے اقتدار کے ساتھ ہی سارے ملک میں مزدوروں اور سپاہیوں کی منتخبہ سوویتوں نے اختیار سنبھالنا شروع کر دیا۔ ماسکو میں تمام قدامت پسندوں نے مل کر مذاحمت کی لیکن یہ ایک ہفتہ سے زائد نہ چل سکی۔ اس طرح ملک کے دوسرے حصوں میں بھی انقلاب تیزی سے بڑھنے لگا۔

انقلابی اقدامات

حکومت سنبھالتے ہی سوویت حکومت نے سماجی زندگی میں یک قلم انقلابی تبدیلیوں کا اعلان کر دیا۔ زمینداری اور جاگیرداری ختم کرکے زمین کاشت کرنے والے کسانوں کی ملکیت قرار دی گئی۔ جہاں جہاں کسانوں نے زمین پر قبضہ کر لیا تھا وہاں ان کی ملکیت مان لی گئی۔ جنگ کے خاتمہ اور عالمی امن کا اعلان کیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے علاقہ پر قبضہ نہ کرے اور نہ تاوان وصول کرے تمام صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دے کر ان پر مزدوروں کا کنٹرول قائم کر دیا گیا۔ بنک سرکاری ملکیت میں آئے۔ پرانی عدالتیں اور پولس برخاست کرکے عوام کی عدالتیں اور محنت کشوں کی پولس قائم کی گئی۔ کلیسا ریاست سے الگ ہوگیا۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے۔

جنگ کے خاتمے کے اعلان کو اتحادیوں نے رد کر دیا اگرچہ جرمنی نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن بات چیت کامیاب نہ ہوسکی اور جرمنی نے فروری ۱۹۱۸ء میں پھر حملہ کر دیا۔ روس اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اور اس سے پورے انقلاب کو خطرہ تھا۔ ٹراٹسکی جو اس وقت وزیر خارجہ تھا جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھا لیکن لینن ہر قیمت پر امن کا حامی تھا چنانچہ مرکزی کمیٹی نے لینن کی تائید کی اور باوجود یہ کہ جرمنی، آسٹریا، ترکی، پولینڈ وغیرہ نے بالٹک صوبوں یوکرین اور قفقاز کے کافی حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ نئی انقلابی حکومت نے ۳ر مارچ ۱۹۱۸ء کو صلح کرلی۔

خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت

جرمنی سے صلح کے بعد نئی سوویت حکومت ابھی حالات پر قابو پانے میں مصروف تھی کہ زار شاہی دور کے پرانے افسر، جاگیردار اور وہ تمام لوگ جو اقتدار اور دولت سے محروم ہو رہے تھے ہر طرف سے مسلح ہوکر نئی حکومت کے خلاف بڑھنے لگے۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے جو اس انقلاب کے خلاف اور اس سے خائف تھے ان مخالف انقلاب روسی فوجوں کی مدد کے لیے مداخلت شروع کر دی۔ اور شمال میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ جاپان اور امریکہ نے اپنی فوجیں سائبیریا میں پہنچا دیں۔ بہانہ یہ تھا کہ روسی وسائل جرمنوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اب یہ بہانہ کارگر نہ رہا تھا لیکن اب انہیں اس انقلاب کی آگ کو پھیلنے سے روکنا تھا چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے اپنی فوجیں مخالف انقلاب طاقتوں کی مدد کے لیے روس کے علاقوں میں بھیجنی شروع کی اور ایڈمرل کولچک نے سائبیریا کی طرف سے اور ڈینی کن نے ڈان کی طرف سے ماسکو کی جانب پیش قدمی شروع کی جنرل یوڈینیوچ نے پٹروگراڈ کا رخ کیا لیکن انقلابی لہر اتنی تیز تھی اور نئی منظم کردہ سرخ فوج میں اتنا جوش و خروش اور عوام

ں اسے اسی تائید حاصل تھی کہ ان سب طاقتوں کو یکے بعد دیگرے پسپا ہونا پڑا۔ اتحادیوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو انہیں بھی اپنی مداخلت بند کرنی پڑی۔ سوویت حکومت نے آگے بڑھ کر اپنے اس علاقہ کا ایک بڑا حصہ واپس لے لیا جو اسے جرمنی سے صلح کے وقت اس کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد اندرونی انقلاب دشمن طاقتوں کے تمام مورچوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ جنگ کے دوران ملک کی معیشت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت نے اسے اور بھی تباہ کر دیا۔ صنعت اور زراعت کی پیداوار بے حد گر گئی۔ اور بے چینی بڑھنے لگی اسی موقع پر نئی سوویت حکومت نے ایک نیا معاشی پروگرام شروع کیا۔

نیا معاشی پروگرام

جنگ کے دوران معیشت میں جو مرکزیت پیدا ہو گئی تھی اس میں ڈھیل پیدا کی گئی۔ کسانوں سے تمام فاضل غلہ حاصل کرنے کی بجائے بتدریج ٹیکس کا طریقہ رائج ہوا۔ زر کے نظام میں تھوڑی لچک آگئی چھوٹے کاروبار پر سے قومی ملکیت ختم کرکے انہیں ان کے مالکوں کے حوالے کیا گیا لیکن بڑی صنعتیں نقل و حمل کے ذرائع، بنک اور قومی وسائل قومی ملکیت میں رہے اور ان کی ترقی پر خاص توجہ مبذول کی گئی خاص طور پر برقی قوت کی ترقی پر اجرت کو کام کے ساتھ مربوط کیا گیا چنانچہ بہت جلد یعنی وسط ۱۹۲۰ء تک معیشت کے اکثر شعبوں میں پیداوار لڑائی سے پہلے کی حد تک پہنچ گئی۔ اس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی حالات معمول پر آگئے۔ ۱۹۲۱ء کی پارٹی کانگرس نے لینن کی ان پالیسیوں کی تائید کی۔ اور پارٹی کے اندر کے بائیں باز د کے خلاف سخت مہم شروع کر دی۔ پارٹی سکریٹریٹ میں ٹراٹسکی کے حامیوں کو ہٹا کر مالوٹوف اور اسٹالن کے نقطۂ نظر کے حامیوں کو لیا گیا بے ایمان، نااہل اور شرابی افسروں اور پارٹی ممبروں کے خلاف زبردست مہم شروع کی گئی چنانچہ ۱۹۲۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۹۲۱ء کے سات لاکھ کے مقابلہ میں چار لاکھ کر دی گئی۔ پارٹی کو منظم اور مستعد بنانے کے لیے لینن کی تجویز پر اسٹالن کو اپریل ۱۹۲۲ء میں پارٹی کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ ٹراٹسکی اور اس کے ساتھیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی لیکن بہت کم لوگوں نے ان کا ساتھ دیا اور اپریل ۱۹۲۳ء کی پارٹی کانگرس میں اسے زبردست شکست ہوئی اور اسے گٹھ بندی کا مجرم قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء تک جب لینن کا انتقال ہوا۔ اسٹالن کا اثر و رسوخ پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور اس کے مخالف بہت کم رہ گئے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں زینا ویف دکامینیف نے اسٹالن کو ہٹانے کی کوشش کی اور پھر ٹراٹسکی سے مل کر اسٹالن کے خلاف ایک سال تک مہم چلائی۔ آخرکار دسمبر ۱۹۲۷ء میں پندرھویں پارٹی کانگرس نے ان سب کو پارٹی سے نکال دیا۔ اور اسٹالن کی پالیسیوں کو بڑی اکثریت کے ساتھ منظور کر لیا۔ ایک سال بعد ۱۹۲۹ء میں ٹراٹسکی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں میکسیکو میں وہ اپنے سکریٹری کی گولی کا نشانہ بنا۔

۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء میں جرمنی نے نئی سوویت حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد دوسری حکومتوں نے اسے تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ امریکہ نے ۱۹۳۳ء میں اسے تسلیم کیا۔

اسٹالن کا دور

لینن کے انتقال کے بعد جہاں اندرونی اور بیرونی پالیسیوں پر کمیونسٹ پارٹی کے اندر سخت کشمکش چلتی رہی وہاں بہت سارے اہم اقدامات بھی کیے گئے۔ ان میں پنج سالہ پلانوں کی ابتدا بھی شامل ہے۔ منصوبہ بندی اگرچہ سوویت حکومت کی پالیسی شروع ہی سے رہی ہے لیکن پہلا پنج سالہ منصوبہ مرکزی کمیٹی نے ۱۹۲۹ء میں منظور کیا۔ اس وقت سوویت حکومت سخت معاشی مشکلات کا شکار تھی۔ معیشت جنگ اور خانہ جنگی کی تباہیوں کے اثرات سے ابھی ابھری نہیں تھی۔ دنیا کے تمام سرمایہ دار ملکوں نے اس کا بائیکاٹ اور ایک طرح سے معاشی ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن اس منصوبہ بندی کے تحت اب چھوٹے بڑے کاروبار سب ہی پر قومی ملکیت قائم کر دی گئی۔ بنیادی بڑی صنعتوں کو اولیت دی گئی۔ آب پاشی اور برقی قوت کی پیداوار خصوصاً مورد التفات ٹھہری۔ پہلا پنج سالہ پروگرام تین سال آٹھ ماہ ہی میں مکمل ہو گیا۔ لوہے کی پیداوار میں چالیس فی صد اضافہ اور بجلی کی پیداوار میں ۵۰ فی صد اضافہ ہوا۔ مشینوں کی صنعت نے بھی بہت ترقی کی لیکن زراعت اور استعمالی چیزوں کی صنعت میں ویسی ترقی نہ ہوسکی دوسرا پلان ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا اور تیسرا پلان ۱۹۳۸ء میں اور دونوں پلانوں میں رفتار ترقی اور زیادہ تیز رہی۔

اسی دور میں اسٹالن نے اجتماعی کھیتی کو رائج کیا۔ ۱۹۲۸ء تک حکومت کی کوشش یہ تھی کہ کسان امداد باہمی کے اداروں میں اپنی مرضی سے شریک ہوں لیکن اگلے دو پلان میں کافی جبر اور سختی سے بھی کام لیا گیا جس سے کئی جگہ کسانوں نے بغاوتیں بھی کیں۔ مویشی مار ڈالے فصلیں جلا دیں ان سب دقتوں کے باوجود سارے ملک میں اجتماعی کاشت کا طریقہ رائج کیا گیا۔ ملک کی معاشی بہتری کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مرکز اور ریاستوں میں سوویٹس قائم کی گئیں اور بنیادی حقوق متعین ہوئے۔

بیرونی پالیسی

۱۹۳۰ء اور اس کے بعد مغربی دنیا سخت معاشی بحران کا شکار ہو گئی۔ دوسری طرف سوویت یونین نے ایک اہم پائیدار اور معاشی طور پر مضبوط حکومت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ ——— جرمنی فاشزم کے جھنڈے تلے مسلح ہو رہا تھا جس سے برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں کو خطرہ پیدا ہوا۔ تیسرے فرانس اسپین وغیرہ میں اور وہاں کی سیاسی زندگی میں کمیونسٹ پارٹیوں کا اثر و رسوخ بڑھ رہا تھا اور اس لیے اب سوویت یونین کو الگ تھلگ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں امریکہ نے سوویت یونین کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۴ء میں سوویت یونین جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنس) کی رکن بن گئی۔ ۱۹۳۵ء میں فرانس اور چیکوسلواکیہ نے اس سے دفاعی معاہدہ کیا۔ یہ معاہدے ۱۹۳۷ء میں ختم ہو گئے جب برطانیہ اور فرانس نے ۱۹۳۸ء میں میونخ میں ہٹلر سے معاہدہ کر لیا۔ سوویت یونین کو اب یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور فرانس ہٹلر سے لڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اس کوشش میں ہیں کہ ہٹلر کا رخ سوویت یونین کی طرف پھیر دیں۔

دوسری جنگ عظیم

۱۹۳۹ء کے شروع تک۔ یورپ میں تناؤ اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اب جنگ عظیم کا چھڑنا یقینی تھا۔ نئی سوویت حکومت کے لیے یہ سخت مشکل اور آزمائش کا دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم اور اس کے بعد کئی سال کی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت نے ملک کو اس قدر تباہ کر دیا تھا کہ اس کی تعمیر نو کے لیے کافی لمبی مدت درکار تھی۔ چنانچہ پنج سالہ منصوبوں میں ملک کی عام تعمیر کے برابر دفاعی صنعت اور دفاعی قوتوں کی ترقی پر توجہ کرنی پڑی۔ فوجی بجٹ پر ۱۹۳۳ء میں ۲۳۲ کروڑ روبل رکھے گئے اور ۱۹۳۸ء میں انہیں بڑھا کر ۵۶۸ کروڑ روبل کر دیا گیا۔ فوجی تربیت لازمی کی گئی اور دفاعی اور دوسری صنعتوں کو سرحد سے دور سائبیریا کے علاقوں اور یورال وغیرہ میں منتقل کیا گیا۔ ساتھ ہی اسٹالن نے ملک میں آہنی نظم و ضبط نافذ کرنے کی کوشش کی اور فوجی اور سیاسی زندگی سے ذرا سے شبہ پر لوگوں کو ہٹا دیا گیا اور بعض کو گولی مار دی گئی۔ اس کے خیال میں سخت نظم و ضبط اور ملک سے انتہائی وفاداری کے بغیر آنے والے اتنے بڑے خطرے کا مقابلہ ممکن نہیں تھا۔ ان تمام تیاریوں کے باوجود نئی سوویت حکومت کے لیے اتنی بڑی جنگ کے واسطے اپنے آپ کو تیار کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا

کہ کس طرح اس خطرہ کو ٹالا جائے اور زیادہ سے زیادہ وقت تیاری کے لیے حاصل کیا جائے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ اور فرانس نے مارچ میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہٹلر پولینڈ پر حملہ کرے گا تو وہ مداخلت کریں گے۔ اب سوویت یونین کے لیے دو راستے تھے۔ ایک تو برطانیہ اور فرانس کے ساتھ متحد ہو کر ہٹلر کا مقابلہ کرے اور دوسرے کس طرح اس جنگ سے الگ رہے۔ اسٹالن کو یقین تھا کہ برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں ہٹلر کی اتنی مخالف نہیں ہیں جتنی سوویت یونین کی اور سوویت یونین میدان میں اترے تو بہت ممکن ہے کہ ہٹلر اپنی ساری قوت سوویت یونین کے خلاف لگا دے۔ اور سوویت یونین اس وقت اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ دوسری شکل یہ تھی کہ ہٹلر ایک ہی وقت دو محاذوں پر لڑنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اس کا امکان تھا کہ اس کے ساتھ غیر جانبداری کا معاہدہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ہٹلر سے غیر جانبداری کا معاہدہ کر لیا گیا۔ اس کے تحت سوویت یونین کو لیٹویا، اسٹونیا اور لتھوانیا اور دوسرے وہ تمام علاقے جو اس پہلی عالمگیر لڑائی میں حوالے کرنے پڑے تھے واپس مل گئے۔ اس نے ان علاقوں میں اپنی دفاعی طاقتوں کو جمع کرنا اور مضبوط کرنا شروع کیا۔

اپریل ۱۹۴۰ء میں ہٹلر نے ناروے اور ڈنمارک پر قبضہ کر لیا اور جون میں فرانسیسیوں کو شکست دے کر ہٹلر فرانس پر قابض ہو گیا۔ اس طرح تقریباً سارا یورپ ہٹلر کے قبضے میں آ گیا اور اس نے اب مشرق کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے شروع کیے اور سوویت یونین کی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنا شروع کیں۔ سوویت یونین نے بھی اپنی دفاعی تیاریاں تیز کر دیں لیکن سارے یورپ کے وسائل ہاتھ آ جانے کے بعد ہٹلر کی فوجی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ سوویت فوجوں کے لیے اس کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے کئی طرف سے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ سوویت فوجیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں اور بڑے پیمانے پر جانی اور فوجی سامان کا نقصان اٹھاتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ وسط نومبر تک جرمن فوجیں ایک طرف لینن گراڈ کے دروازہ پر پہنچ گئیں اور دوسری طرف کیف فتح کر کے ماسکو کے اطراف آ گئیں۔ اس کے علاوہ پورا مشرقی یوکرین اور کریمیا کا بڑا علاقہ ان کے قبضہ میں آ گیا۔ لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود ہٹلر لینن گراڈ اور ماسکو پر قبضہ نہ کر سکا اور ۱۹۴۱ء کے خاتمہ تک یہ بات واضح ہو گئی کہ ہٹلر کا یہ جواب کہ وہ یورپ کی طرح روس کو بھی چند دن میں زیر کرے گا، شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

پہلے چند ماہ میں سوویت یونین کو بہت زبردست نقصان اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہٹلر کے نقصانات بھی کچھ کم نہیں تھے۔ لڑائی کے پہلے بارہ ماہ میں اس کے ساڑھے بارہ لاکھ سپاہی مارے گئے۔ روس کے جاڑوں نے اس کے لیے ہر قسم کی مشکلیں پیدا کر دیں۔ اور سوویت فوجوں کی از سر نو تنظیم کے لیے بہترین موقع فراہم کر دیا۔ اس مدت میں پندرہ سو کارخانے اور ۱۳۶۰ فوجی ہتھیار بنانے کے کارخانے مشرق میں جرمن حملوں سے محفوظ حصوں میں منتقل کر دیے گئے اور جرمنوں کے مقبوضہ علاقوں میں بہت بڑے پیمانے پر گوریلا دستے منظم کیے گئے جنہوں نے جنگ کے آئندہ سالوں میں اہم رول ادا کیا۔ ساتھ ہی ایک نئی سوویت فوج تیار کی گئی۔

۱۹۴۱-۱۹۴۲ء کے سخت جاڑوں کے بعد جرمنوں نے اپنا حملہ پھر شروع کیا۔ مئی اور جون ۱۹۴۲ء میں انہوں نے کریمیا کا باقی علاقہ اور یوکرین کا کافی علاقہ چھین لیا۔ جون میں انہوں نے وارونیش پر اقدام کیا اور پہلی مرتبہ زبردست مزاحمت کے آگے پسپا ہو کر اسٹالن گراڈ (اب نووگراڈ) کا رخ کیا۔ وہاں بھی آگے بڑھنا ممکن نہ ہو سکا۔ اسی طرح جنوب میں قفقاز اور شمال میں لینن گراڈ میں مزاحمت سخت ہو گئی اور جرمن فوجیں شمال سے جنوب تک ہزاروں کیلومیٹر تک بکھر گئیں۔ ہٹلر اسٹالن گراڈ کو ہر قیمت لینا چاہتا تھا چنانچہ اس سے فائدہ اٹھا کر اب سوویت فوجوں نے جنرل ژوخوف کے سرکردگی میں بڑے پیمانے پر جوابی حملہ کیا اور اسٹالن گراڈ پر جرمنوں کی چھٹی فوج کو گھیر لیا جس میں دو لاکھ جرمن سپاہی مارے گئے۔ بے حساب فوجی سامان ہاتھ سے گیا اور آخر کار ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو اس محاذ کی باقی ماندہ ۹۰ ہزار جرمن فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں جرمنوں نے جوابی حملہ کیا اور سوویت فوجوں کو گھیرنے اور ختم کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اگرچہ دونوں طرف زبردست نقصانات ہوئے۔ ختم ۱۹۴۳ء تک روسیوں نے اس علاقہ کا دو تہائی حصہ آزاد کروایا جس پر جرمن نازیوں نے قبضہ کیا تھا۔

سوویت تاریخ نویس ۱۹۴۴ء کو دس گھونسوں کا سال کہتے ہیں۔ پہلے کے نتیجہ میں لینن گراڈ آزاد ہوا، دوسرے میں یوکرین اور آخری گھونسے میں سارے روس کو آزاد کروا کر سوویت فوجیں مشرقی یورپ میں داخل ہو گئیں۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں جب سوویت فوجوں نے برلن پر آخری یلغار کی تو انہیں سپاہیوں، ٹینکوں، ہوائی جہازوں، توپوں غرض کہ لڑائی کے ہر شعبہ میں جرمنی پر برتری حاصل تھی چنانچہ پولینڈ، مشرقی پرشیا، چیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ اور آسٹریا کو آزاد کرواتے ہوئے سوویت فوجوں نے ۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء کو برلن کا محاصرہ کیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ ۲ مئی تک مزاحمت ختم ہوئی اور سوویت فوجوں نے برلن پر فتح کا جھنڈا لہرا دیا۔

ابتدائی دور کی اتنی زبردست پسپائی اور تباہی کے بعد جوابی حملے کی تیاری اور پھر ہر میدان میں ایسی برتری اور آخری فتح، تاریخ کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ اس لڑائی میں سوویت عوام نے جو قربانی دی اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ڈیڑھ کروڑ سے دو کروڑ تک سپاہی اور شہری مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ مالی نقصان ۶۸۰ کروڑ روبل لگایا گیا ہے۔ روس کا سب سے آباد اور زرعی اور صنعتی طور پر سب سے ترقی یافتہ حصہ اس لڑائی میں تباہ ہو گیا۔

لڑائی کے دوران برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے ساتھ متحدہ محاذ قائم ہوا۔ امریکہ نے مالی اور فوجی امداد بھیجی ساتھ ہی بہت سے مسائل پر اختلافات بھی ہوئے۔ مغربی یورپ میں متحدہ محاذ اس وقت کے بہت بعد قائم ہوا جب روسی ایسا چاہتے تھے۔ جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے مستقبل کے بارے میں بھی کافی اختلافات پیدا ہوئے لیکن مالٹا، تہران، قاہرہ اور آخر میں پوٹسڈم کانفرنسوں میں انہیں طے کر لیا گیا۔

جنگ کے بعد سوویت یونین دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک بن گئی۔ جرمنی بٹ گیا۔ مشرقی جرمنی اور مشرقی یورپ کے تمام ملکوں میں سوشلسٹ حکومت قائم ہو گئیں جن کا سوویت یونین کے ساتھ گہرا سیاسی اور معاشی رشتہ قائم ہو گیا۔

جنگ کے بعد کا دور

جنگ کے بعد کا دور اتنا ہی مشکل ہے جتنا جنگ کے زمانے کا۔ فوجوں کو میدان جنگ سے واپس بلانا۔ ملک کے بہت بڑے تباہ شدہ حصہ کی از سر نو تعمیر اور معیشت کو بحال کرنا۔ اس کی تیاری ۱۹۴۳ء ہی سے شروع کر دی گئی تھی جب کہ اس کے لیے ایک خاص کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی ۱۹۴۶ء سے نیا معاشی منصوبہ شروع ہو گیا۔ امریکہ سے چوں کہ تعلقات بگڑ چکے تھے

اس لیے اس سے تعمیر کی مہم میں کسی مدد کی کوئی امید نہیں تھی۔ محض اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا تھا اس کے علاوہ فوجی تیاری اس حد پر رکھنی تھی کہ امریکہ اور مغرب کے مقابلے میں توازن بگڑنے نہ پائے چنانچہ سب سے اہم مقام بھاری صنعتوں کی ترقی کو دیا گیا ستمبر ۱۹۴۹ء میں پہلے ایٹمی بم کا تجربہ کیا گیا۔ زراعت کا بحران باقی رہا۔ غلہ، گوشت اور استعمالی اشیاء کی قلت کا ملک کو ایک مدت تک سامنا کرنا پڑا۔

اتنی بڑی جنگ میں فتح کے بعد اسٹالن کے مزاج میں سختی اور بڑھ گئی۔ اسٹالن پرستی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور اختیار بڑی حد تک اس کے ہاتھ میں سمٹ آیا چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کے اندر اور باہر سختیاں شروع ہوگئیں اور دانشوروں کے ایک گروہ کو زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دور میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ اپنے عروج کو پہنچ گئی سرد جنگ کا اظہار نہ صرف مجلس اقوام متحدہ میں ہوا بلکہ یونان، برلن اور کوریا کے مسائل پر عالمی جنگ کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔

اسٹالن کے بعد

۵ اپریل ۱۹۵۳ء کو اسٹالن کا انتقال ہوگیا۔ اس کی سربراہی میں سوویت یونین نے دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں فتح پائی تھی۔ روس اس وقت معاشی اور فوجی لحاظ سے دنیا کے دو سب سے بڑے ملکوں میں سے ایک تھا۔ جنگ سے پہلے سوویت روس ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں چین میں انقلاب کی فتح کے بعد روس کے مشرق اور مغرب میں سوشلسٹ ملک تھے جن سے اس کے گہرے معاشی اور سیاسی رشتے قائم تھے۔ اس کے ساتھ سوویت عوام میں پائیدار امن اور بہتر سماجی اور معاشی زندگی کی خواہشات جڑ پکڑ رہی تھیں۔ اتنی بڑی قربانیوں کے بعد وہاں کے باشندے ایک محفوظ دنیا دیکھنا چاہتے تھے۔ زندگی پر عائد کردہ بہت سی تکلیف دہ پابندیوں کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اسٹالن کے انتقال کے بعد اگرچہ اس کے جانشینوں نے اتحاد کا مظاہرہ کیا مگر ہنوز بہت سے اندرونی مسائل طے ہونے تھے۔ اسٹالن کے سخت نظام کو بدلنے کی ضرورت تھی چنانچہ سب سے پہلے اس کے دست راست بیریا کا ہٹانا ضروری تھا جو اسٹالن کی جگہ لینے کی کوشش میں تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۳ء میں اس پر مقدمہ چلا کر موت کی سزا دی گئی اور میلنکوف کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ مولوٹوف وزیر خارجہ، بلگانین وزیر دفاع اور خروشچیف کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے اور انہوں نے زراعت کی ترقی پر خاص توجہ دی۔ فروری ۱۹۵۵ء میں سوویت حکومت میں ایک اور تبدیلی آئی اور میلنکوف کی جگہ بلگانن وزیر اعظم بنائے گئے۔ مالوٹوف وزارت خارجہ کے عہدے سے ہٹا دیے گئے اور ملک کی سیاست میں خروشچیف نے اہم مقام حاصل کر لیا۔

اس دور میں خروشچیف نے سوویت یونین کی اندرونی اور بیرونی پالیسی میں اسٹالن دور کی آہنی جکڑبندیوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی۔ یوگوسلاویہ سے تعلقات بہتر بنائے گئے آسٹریا جو اب تک مشرق اور مغرب میں بٹا ہوا تھا اسے ایک معاہدے کے ذریعہ متحد کر دیا گیا تمام بیرونی فوجیں ہٹا لی گئیں خروشچیف نے ایک غیر جانبدار پالیسی اختیار کرنے کا وعدہ کیا۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں بلگان خروشچیف اور امریکی صدر آئزن ہاور کے درمیان جنیوا کے مقام پر میٹنگ ہوئی۔ کوئی سمجھوتہ تو نہیں ہوا لیکن اس کی وجہ سے سرد جنگ میں بہت کمی آگئی۔ اس کے ساتھ نئے آزاد ممالک سے تعلقات استوار کرنے کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں بلگان اور خروشچیف ہندوستان آئے جس سے ہندوستان سے دوستی اور ہندوستان کی ترقی میں سوویت امداد کا ایک نیا دور شروع ہوا اس کے بعد اس قسم کے تعلقات مصر، گھانا وغیرہ سے قائم کیے گئے الجیریا، کانگو اور افریقہ کے دوسرے ملکوں کی جنگ آزادی کے لیے سوویت یونین نے بڑے پیمانے پر اخلاقی اور مادی امداد مہیا کی۔

فروری ۱۹۵۶ء میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تاریخی بیسویں کانگرس ہوئی جس میں خروشچیف نے اسٹالن دور کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ کمیونسٹ اور سرمایہ دار ملکوں کے مسائل حل کرنے کے لیے جنگ ضروری نہیں ہے اور دونوں نظام پرامن طریقہ پر ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکتے ہیں یہاں سے "پرامن بقائے باہم" کی پالیسی سوویت پالیسی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی مان لیا گیا کہ سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے لیے سوویت یونین کا راستہ ایک واحد راستہ نہیں ہے۔ ان اقدامات کا اثر ساری دنیا پر دوررس رہا۔ اس کی وجہ سے سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں فضا کافی بدل گئی۔ سرد جنگ کو ختم کرنے کے سلسلے میں خروشچیف ۱۹۵۹ء میں امریکہ گئے لیکن اسی زمانہ میں کئی واقعات ایسے ہوئے کہ بہت زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی ۱۹۶۰ء میں پیرس میں برطانیہ، فرانس امریکہ اور روس کے سربراہوں کی کانفرنس ناکام ہوگئی۔ اسی زمانہ میں امریکہ کا ایک جاسوسی جہاز سوویت یونین کے اوپر پرواز کرتے ہوئے مار گرایا گیا جس نے فضا کو مکدر کر دیا۔ اسی زمانے میں کانگو، مشرق وسطی، برلن کے بحران سامنے آگئے اور پھر ۱۹۶۲ء میں کیوبا کے میزائل کا بحران (دیکھیے ممالک متحدہ امریکہ) پیدا ہوا۔ ان سب میں سوویت یونین اور امریکہ کا رویہ ایک دوسرے کے متضاد تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس کے بعد خروشچیف کا اثر ملک کے اندر اور باہر بڑھتا ہی گیا۔ اگست ۱۹۵۷ء میں سوویت یونین نے دور مار میزائل چھوڑے جو امریکہ تک پہنچ سکتے تھے۔ ۴ اکتوبر کو پہلا فضائی سیارہ اسپتنک چھوڑا گیا اور پھر ۳ نومبر کو دوسرا سیارہ۔ اس نے فوجی اور سائنسی میدان میں سوویت یونین کا وقار بہت بلند کر دیا۔

سوویت یونین اور چین کے اختلافات

اندرونی ترقی اور سیاست میں اتنی کامیابیوں کے باوجود خروشچیف کو چین کے ساتھ تعلقات میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انقلاب کے بعد چین ایک طاقتور متحد ملک بن کر ابھرا تھا لیکن ابھی اس کی معیشت بہت پسماندہ تھی۔ وہ خواہاں تھا کہ جلد سے جلد ترقی کرے۔ سوویت روس ایک بڑی تباہ کن جنگ سے گزر چکا تھا وہ ایسی فضا چاہتا تھا جس میں نیوکلیر جنگ کا خطرہ باقی نہ رہے اور اس کے عوام پرامن طریقے پر ترقی کر سکیں چین سوویت یونین سے بڑے پیمانے پر معاشی امداد چاہتا تھا تاکہ وہ بھی جلد سے جلد دنیا کی ایک بڑی طاقت بن جائے۔ اسے امریکہ کے تئیں روس کی پالیسی سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر امریکہ کے خلاف سخت اور جارحانہ پالیسی اختیار کی جائے اور دوسرے ملکوں کی انقلابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہو تو امریکہ "کاغذ کا شیر" ثابت ہوگا۔ لہٰذا اسے روس کی امن پالیسی ناپسند تھی لیکن سوویت یونین ایک عالمگیر جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۱ء میں کمیونسٹ پارٹیوں کی کانفرنس میں یہ اختلافات بہت تیزی کے ساتھ سامنے آئے اور اس کا اظہار کھلے عام ایک دوسرے پر حملوں کی شکل میں ہونے لگا۔

سوویت یونین نے جواب میں چین کی معاشی امداد بند کر دی اور اپنے ہزاروں انجینئر اور ٹیکنیکل کارکن واپس بلا لیے۔ اس سے تلخی اور بڑھ گئی۔ کیوبا کے بحران کے وقت چین نے سوویت یونین پر سخت نکتہ چینی کی تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے حتی کہ سوویت یونین کے مخالف چین کے دوست بن گئے اور چین نے امریکہ کے ساتھ تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء تک سوویت یونین کو معاشی میدان اور خاص طور پر زراعت کے میدان میں کافی دقتوں کا سامنا ہوا۔ سوویت کمیونسٹ پارٹی کو ان مسائل کے حل کے

بارے میں خروشچیف کے طریقوں سے اتفاق نہیں تھا چنانچہ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں خروشچیف نے وزارت عظمیٰ اور پارٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ الکسی کوسی گن وزیراعظم اور لیونڈ برژنیف پارٹی کے جنرل سکریٹری چنے گئے۔

برژنیف۔ کوسی گن کا دور

خروشچیف کے ہٹنے کے بعد نئے لیڈروں نے ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ صنعتی میدان میں کارخانوں اور ان کے منتظمین کو اپنے کام میں کافی آزادی دی۔ زراعت میں کسانوں کو بہت سی رعایتیں ملیں، انفرادی فیصلوں کی جگہ مشترکہ لیڈرشپ پر زور دیا گیا۔ خارجی پالیسی بنیادی طور پر وہی رہی سودیت یونین عربوں اور افریقہ کی جنگ آزادی کی اسی طرح حمایت کرتی رہی۔ نئے آزاد شدہ ممالک کے ترقیاتی پروگراموں میں اس کی حمایت بڑھتی رہی۔ غیر جانبدار ممالک اور خاص طور پر ہندوستان کو اس کی پوری تائید حاصل رہی۔ ساتھ ہی مغرب میں برطانیہ، فرانس اور مغربی جرمنی کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر ہوتے گئے۔ اور آخر کار 1975ء میں مشرق اور مغرب کے درمیان ہلسنکی کے مقام پر "بقائے امن بقائے باہم" کا سمجھوتہ ہوا جس سے ان تعلقات میں اور پیش رفت ہوئی۔ نکسن نے سودیت روس کا دورہ کیا اور برژنیف نے امریکہ کا۔ خود امریکہ کے ساتھ تجارت اور ثقافتی تعلقات کی نئی راہیں پیدا ہوئیں۔

تاریخ چین

چین ایک نہایت قدیم اور دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی تاریخ سے واقفیت اب بھی بہت کم ہے۔ ابتدائی تاریخی دستاویزات کا مواد غیر تشفی بخش رہا ہے۔

۲۷۰۰ ق م سے ۲۲۰۰ ق م کے درمیان پانچ شہنشاہوں نے حکومت کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کافی قابل اور ہوشیار تھے۔

پہلے پانچ شہنشاہوں کے بعد سلاطین کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کے بارے میں زیادہ مستند معلومات ہونے لگیں۔ چین کی ابتدائی تاریخ سرحدی لڑائیوں اور اصلی باشندوں اور خانہ بدوش حملہ آوروں کے درمیان لڑائیوں کی ایک طویل داستان ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چین شہری ریاستوں کا ملک تھا اور ہر ریاست کا ایک بادشاہ تھا، یہ سب ایک شہنشاہ کے تحت تھے۔ آہستہ آہستہ ایک مرکزی مملکت وجود میں آئی۔ شانگ (۱۷۵۰ – ۱۱۲۵ ق م) اور چاؤ (۱۱۲۵ – ۲۵۰ ق م) اس جاگیرداری دور کے دو بڑے شاہی خاندان مانے جاتے ہیں۔ بعد میں آنے والے حکمران خاندانوں کے مقابلہ میں ابتدائی زمانہ کے ان حکمرانوں کو بہت کم مرکزی اختیارات حاصل تھے شانگ خاندان کے تحت چین میں جو بھی اتحاد قائم ہوا اس کی نوعیت ایک با اثر سیاسی اتحاد کے بجائے مذہبی اتحاد کی تھی۔

شانگ خاندان کا دارالسلطنت ہونان تھا۔ ان کے دور حکومت میں ایک اچھا ترقی یافتہ رسم الخط موجود تھا۔ چین کے بیشتر حصہ پر شاہان شانگ کا اقتدار تھا۔ چاؤ خاندان کے بانی ووانگ سے فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد شانگ خاندان کے آخری حکمران نے آگ سے خودکشی کرلی تھی۔ (۱۱۲۵ ق م) معلوم ہوتا ہے کہ جنوب مغربی قبائلیوں اور ایک عوامی بغاوت نے شانگ خاندان کے مقابلہ میں ووانگ کو مدد پہنچائی تھی۔

چاؤ خاندان کے بادشاہ ووانگ نے اپنی حکومت شین سی (Shen-si) میں قائم کی اور ایک حقیقی جاگیرداری نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔ چاؤ امرا کو شہنشاہ کی طرف سے جاگیریں عطا ہوتی تھیں تاکہ وہ سلطنت کے مختلف حصوں میں محافظ فوجیں متعین کرنے کا انتظام کریں۔ شہنشاہ کو "آسمان کا بیٹا" اور مصالحت کرانے والا تصور کیا جاتا تھا۔ آسمان کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ وہی قوم کی طرف سے قربانی پیش کرسکتا تھا اور قوم کے ایک عالی مرتبہ پجاری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مرکزی طاقت کمزور ہوتی گئی۔ آہستہ آہستہ رواج اور جذبات کے بندھن جن پر سلطنت کے استحکام کا دارومدار تھا، ٹوٹنے لگے۔ جاگیردار اور امرا بہت زیادہ طاقتور ہو گئے اور اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے۔ ان میں سے ایک اتنا طاقتور ہوگیا کہ ۷۷۱ ق م میں دارالسلطنت کو تاخت و تاراج کرنے اور شہنشاہ کو قتل کرنے میں اس نے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اس کے بعد ایک نئے شہنشاہ کو مشرقی دارالسلطنت یونانگ میں تخت نشین کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پانچ حکمرانوں کا دور شروع ہوا۔ ان چاؤ فرماں رواؤں کو کسی نہ کسی بڑی جاگیری ریاست کے فرماں روا کی مدد پر انحصار کرنا ہوتا تھا۔

شانگ اور چاؤ سلاطین کے زمانہ کے خوبصورت کانسے کے برتن اب بھی موجود ہیں ان کی اپنی ایک مخصوص وضع ہے اور اس میں ایک اعلیٰ پایہ کی تہذیب موجود تھی ان ابتدائی حکمراں خاندانوں کے دور میں ایک مشترک رسم الخط، مشترک تہذیب موجود تھی اور شمال مغربی سرحدوں پر ہنوں (The Huns) کی شکل میں ایک مشترک دشمن بھی تھا۔

عہد انتشار

۵۰۰ ق م سے انتشار کا دور شروع ہوتا ہے جب کہ تمام جاگیری ریاستیں خاندان چاؤ کے اقتدار سے پورے طور آزاد ہوگئیں۔ آٹھویں اور چوتھی صدی ق م کے درمیان ہوانگ ہو اور یانگ سی کی وادیوں میں پانچ چھ ہزار چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور وہ خود تقریباً ایک درجن بڑی ریاستوں کے زیر نگیں۔ ان میں جنگ و جدل زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ چھٹی صدی ق م میں جن بڑی طاقتوں کے درمیان تصادم کا سلسلہ جاری تھا، ان میں اہم وادی یانگ سی کی چو (Chu) ریاست اور شمالی ہوانگ ہو کی سی (Tsi) اور زن (Tsin) ریاستیں تھیں چو کے خلاف دوسری ریاستوں نے متحدہ محاذ قائم کرلیا تھا جس کی وجہ ایک ایسی انجمن اتحاد کی بنیاد رکھی گئی تھی جس نے ایک سو برس تک امن قائم رکھا۔ چو کو مطیع کر کے اس انجمن میں شامل کرلیا گیا تھا تخفیف اسلحہ کا ایک عام معاہدہ کیا گیا تھا جس میں سب شریک تھے۔ اسی معاہدہ نے ایک نئی امن پسند سلطنت کی بنیاد رکھی۔

اسی ہنگامہ خیز دور میں چینی فلسفہ اور آئین جہاں بانی کی عظیم کتابیں تالیف ہوئیں۔ ان کے مولف فلسفیوں نے ملک میں اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔ ان میں بلند ترین حیثیت کنفوشیس (Confucius) کو حاصل تھی۔ اسی نے حکمرانی اور کردار سازی کی تمام روایات کو جو ازمنۂ قدیم سے چلی آرہی تھیں جمع کر کے ایک باقاعدہ فلسفیانہ نظام کی شکل دی۔ اس کا یہ فلسفہ ہزارہا سال تک قابل تعظیم و تکریم رہا۔ کنفوشیس کے نظریۂ حکومت میں رعایا کے ساتھ تعلق بالکل پدرانہ ہوتا تھا۔ باپ کو اپنے خاندان پر مکمل اختیار ہوتا ہے۔ اور شہنشاہ کو سلطنت میں باپ کا درجہ حاصل تھا اور اسی نظریہ کی بنیاد پر وہ حکومت کرتا تھا لیکن جس مکتب خیال نے اس پر فتح پائی وہ ضابطہ پرستی (Legalism) تھا۔ ضابطہ پرستی جدید فاشستی مسلک (Fascism) سے بہت زیادہ مشابہ تھی۔ فاشستی مسلک صرف حاکم و محکوم کے درمیان فرق کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے تحت ایک طاقتور اور جابر حکومت ہی قائم ہوسکتی ہے۔ اس پالیسی کی کامیابی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ چی ان (Chi'in) حکمرانوں نے چاؤ شہنشاہ کو

۲۵۱ ق م میں تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

متحدہ مملکت

۲۲۱ ق م تک سارا چین پہلے چن شہنشاہ شی ہوانگ تی (Shi-Huang-ti) کے تحت متحد ہو چکا تھا۔ اس کے وزیر اعظم لی سو (Lissu) نے پوری مملکت میں حکومت کا ایک موثر سیاسی نظام قائم کر دیا۔ تمام مخالفین راستے سے ہٹا دیے گئے۔ ان میں کنفوشس علما بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ ان کی کتابوں کو بھی سماج سے خارج کر دیا گیا۔ اس دورِ حکومت میں بڑے بڑے علمی کام انجام دینے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ ہنوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ۲۱۴ ق م میں دیوارِ چین کی تعمیر اور بڑے پیمانے پر نہروں کی کھدائی شروع ہوئی۔ اس کی وجہ سے ملک کے وسائل پر بہت زیادہ بار پڑ گیا، بے چینی بڑھنے لگی اور ملک کا نظم و نسق ٹوٹنے لگا۔

سلاطین ہیان اور ٹیانگ

ابتری کے اس دور میں لیو پینگ (Liu Pang) نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور خاندان ہیان کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بلکہ خاندان چن نے جو بنیاد رکھی تھی اس پر خاندان ہیان نے عمارت تعمیر کی۔ لیو پینگ نے سلطنت کو جنوب اور مغرب کی طرف وسعت دی اور شمال کی سلطنت ہیونگ نو (Hseung-nu) کو جس کے خلاف سینکڑوں برس سے چینی جنگ کر رہے تھے، ختم کر دیا۔ کنفوشیسی ادبیات عالیہ یک جا کیے گئے اور کنفوشیسی اخلاقیات کو اہل علم اور ارباب اقتدار دونوں نے تسلیم کر لیا۔ یہ اصول کہ "باصلاحیت لوگوں کے لیے ذریعہ معاش کھلا رہنا چاہیے" مان لیا گیا۔ اب چینی نسل کے لوگوں کا بڑا حصہ اپنے آپ کو ہن (Hans) کہنے لگا تھا۔ اس سے اس خاندان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور میں مرکز کی بجائے صوبوں کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور یہی حکمران خاندان کے زوال کا باعث بنا۔ ۲۲۰ء کے بعد سلطنت منقسم ہو گئی۔ البتہ چند سال کے لیے مغربی چن (Western Chin) کے تحت اتحاد قائم رہا۔ خاندان سوئی (Sui) کے آغاز تک (۵۸۰ء) سلطنت منقسم رہی۔ قدامت پسند کنفوشس مذہب اس دورِ انتشار کے لیے موزوں فلسفہ نہیں تھا چنانچہ تاؤ (Tao) مذہب اور بدھ مت پھیلنے لگے۔ بدھ مت جو پہلی صدی عیسوی میں چین میں رائج ہوا شروع میں بعض لامذہب خاندانوں نے بدھ مت کو قبول کیا۔ ۳۱۷ سے ۵۸۰ء تک ان کی شمالی چین پر حکومت تھی۔

خاندان ٹیانگ (۶۱۸ء - ۹۰۷ء)

یہ زمانہ بڑے پھیلاؤ اور ترقی کا تھا۔ اس خاندان کے دور میں سلطنت کی حدیں ترکستان سے ہوتی ہوئی مشرقی ایران اور بحر کیسپین تک پھیل گئیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ شاعری پورے عروج پر تھی۔ اسی دور میں ملکہ وو (Empress Wu) نے حکومت کی جو تاریخ چین کی واحد خاتون فرماں روا تھی۔

پہلی صدی ق م سے لے کر ۹۰۰ء تک ایک ہزار سال میں چین میں نہایت اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اس دور کی ابتدا خاندان ہیان سے ہوئی اور خاتمہ خاندان ٹیانگ پر ہوا۔ چار سو سال جو خاندان ہیان کے خاتمے (۲۲۰ء) اور خاندان ٹیانگ کے آغاز (۶۱۸ء) کے درمیان گزرے، ترقی کے لحاظ سے انجماد، اور سیاست کے لحاظ سے شورشوں اور ہنگاموں کی صدیاں تھیں۔ ان چار صدیوں کے اختتام پر چین ایشیا میں اسی مقام پر فائز تھا جس پر وہ ان صدیوں کے شروع میں تھا چین کی اپنی خصوصیات ویسی ہی باقی رہیں۔ مشترکہ تہذیب، رسم الخط اور تصورات کا ایک مشترکہ خزانہ اسی طرح محفوظ تھا یعنی ان چار سو سال میں نہ ترقی ہوئی نہ تنزل۔

پہلی صدی ق م سے ۹۰۰ء تک کے ہزار سالہ دور میں فنون اور علوم نے ترقی کی صفائی پسندی اور آرائش کا ذوق عروج پر تھا صنعت کارانہ اور ادبی تخلیق میں کوئی انحطاط نہیں ہوا اور نہ ہی حسن و خوبی اور مسرت و انبساط سے کسی نے کنارہ کشی کی چین میں چائے کا استعمال چھٹی صدی عیسوی میں شروع ہوا اور اس کی فرحت انگیزی اور لطف کو بڑھانے کے لیے شاعروں کی کمی نہ تھی ہن حکومت کے زوال کے بعد بھی کافی عرصہ تک اعلیٰ عمارتوں کی تعمیر اور ان کی آرائش کا کام ہوتا رہا۔ بے انتہا حسین روغنی تصاویر بنانے کا فن برابر ترقی کرتا رہا۔ دوسری، تیسری اور چوتھی صدیوں میں بعض باغوں کے مناظر کی ایسی حسین روغنی تصاویر بنائی گئیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ خوبصورت چینی ظروف اور نقاشی کے نادر نمونے اسی دور میں تیار ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں پر چھاپنے کا فن اسی زمانہ میں شروع ہوا۔ ساتویں صدی میں شاعری اپنے انتہائی شباب پر پہنچی۔ سکہ کا رواج نہیں تھا اور عظیم سلطنت میں کاروبار عام طور پر چیز کے بدلے چیز کی اساس پر ہوتا تھا۔

چین میں دولت حقیقی اور صرف نجی جائیداد کا تصور بہت واضح چیزوں تک محدود تھا۔ غلامی کا رواج نہیں تھا۔ زمین کا قابض اور اس کو استعمال کرنے والا اکثر صورتوں میں عملی طور پر اس کا مالک ہوا کرتا تھا۔ وہ صرف لگان ادا کرتا تھا۔ زمینداری کسی حد تک چھوٹے پیمانے پر تھی لیکن بڑی جاگیریں نہیں تھیں جن لوگوں کے پاس زمین نہیں تھی وہ اجرت پر کام کرتے تھے جو زیادہ تر جنس کی شکل میں ادا کی جاتی تھی۔

ان چیزوں کی بدولت ملک میں استحکام پیدا ہوا اور چین کی جغرافی شکل کے باعث ملک متحد رہا۔ اس کے باوجود ہن خاندان کی قوت میں زوال آ گیا اور دوسری صدی عیسوی کے اختتام پر وحشی ہنوں کے حملوں نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ملک متعدد اور باہم مخالف ریاستوں میں بٹ گیا۔

چوتھی صدی عیسوی تک ہن مہذب بن چکے تھے انہوں نے صوبہ شن سی (Shen-si) میں مستقل حکومت قائم کر لی تھی۔ ہنوں کی اس ریاست میں شمالی چین کے علاوہ سائبیریا کے بڑے علاقے بھی شامل تھے۔ ہنوں کے شاہی خاندان نے چینی تمدن پوری طرح اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی تجارت کا حلقہ شمال میں کافی دور تک پھیلا دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ان علاقوں میں چینی تہذیب اور علم بھی پھیلایا۔

شمالی چین کے دیسی باشندوں اور ان سائبیریا والوں کے میل سے سوئی خاندان (Suy Dynasty) وجود میں آیا۔ اس نے جنوب کا علاقہ فتح کر لیا۔ سوئی خاندان سے چین کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ سوئی بادشاہوں کے تحت ادبی سرگرمیوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک شاہی کتب خانہ میں ۵۴ ہزار جلدیں تھیں ساتویں صدی کے شروع میں عظیم ٹانگ خاندان کا دورِ حکومت شروع ہوا۔ جو تین صدیوں تک قائم رہا۔

چین کی نشاۃ ثانیہ جو سوئی خاندان سے شروع ہوئی تھی ٹانگ خاندان کے دورِ حکومت میں اپنی معراج کو پہنچ گئی۔ یہ خاندان ایک نئی زندگی کا پیش رو ثابت ہوا یہیں سے چین کا نیا دور شروع ہوا۔ ٹانگ خاندان کا مرکزی نظم و نسق اور فوجی تنظیم اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف تھی۔ ہندوستانی اور مشرقی ایشیائی اثرات کا بھی یہاں کے فنون پر گہرا اثر پڑا اور ان میں ایک نئی تازگی پیدا ہو گئی۔ ادب اب محض قدیم کا تسلسل نہیں رہا تھا بلکہ اس میں نئے خیالات داخل ہو رہے تھے۔ بدھ مت کے مذہبی اور فلسفیانہ تصورات گویا تازہ ہوا کے جھونکے تھے۔

دوسرے ٹانگ حکمران شہنشاہ ٹائی سنگ ۶۲۷ء کی سلطنت جنوب میں

انام کے اندر تک اور مغرب کی طرف بحیرۂ کیسپین کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی جنوبی سرحدیں ایران سے ملتی تھیں۔ اور شمالی سرحد صحرائے گوبی کے شمال میں میدان کو عیز اور التائی سے۔ لیکن اس میں کوریا شامل نہیں تھا۔ کوریا کو ٹائی ٹسنگ کے بیٹے نے فتح کرکے اپنا باج گزار بنا لیا۔ ٹانگ خاندان نے جنوب کی پوری آبادی کو چینی بنا کر چینی نسل میں شامل کر لیا جس طرح شمال کے چینی اپنے آپ کو "ہنگ کے لوگ" کہتے تھے۔ اسی طرح جنوب کے چینی اپنے آپ کو "ٹانگ کے لوگ" کہتے تھے۔ اس دور میں قوانین اور ان کے بنانے کے طریقوں پر پوری طرح نظر ثانی کی گئی۔ اور پورے اعلیٰ چینی ادب کو جمع کرکے ان کے مکمل اور صحیح ایڈیشن شائع کیے گئے۔

چینی دربار میں ایشیا کے ہر حصہ کے سفیروں کی پذیرائی ہوتی تھی۔ ٹائی سنگ کے دربار میں ایران سے نسطوری مبلغین کی ایک جماعت آئی (۶۳۵ء) اس سے سات سال قبل ۶۲۸ء میں ایک اور ممتاز جماعت بھی ٹائی سنگ کے دربار میں آئی تھی۔ یہ عربوں کی ایک جماعت تھی جو تجارتی جہاز کے ذریعہ سمندر کے راستے بندرگاہ ینبع سے کینٹن آئی تھی۔ یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ اس زمانہ میں مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت سمندر کے راستے جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ ان عربوں کو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ چینی حکمراں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے دینی تصورات میں بہت دل چسپی کا اظہار کیا اور کہا جاتا ہے کہ کینٹن میں عرب تاجروں نے عبادت کے لیے ایک مسجد کی تعمیر میں مدد دی۔ یہ مسجد اب بھی قائم ہے اور دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ایک ہے۔

خاندان یوآن (The Yuan)

تیرہویں صدی میں منگولوں نے بڑا عروج حاصل کیا۔ مشرقی ایشیا میں ان کی طاقت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ چنگیز خان نے ۱۲۱۱ء میں شمالی چین پر حملے شروع کر دیے تھے۔ منگولوں نے ۱۲۳۴ء میں شمال کے چن (Chin) اور ۱۲۷۹ء میں جنوبی چین کے سنگ کو تباہ کر دیا تھا۔ منگول یوان کی سلطنت کا علاقہ بحیرۂ بحر الکاہل تک اور بحر قطب شمالی سے ابنائے ملاکا تک پھیلا ہوا تھا۔ پیکنگ اس سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہ سلطنت ۱۳۶۸ء تک قائم رہی۔

کبلائی خان (Kublai Khan) چین کا منگول شہنشاہ تھا۔ یہ چنگیز خان کا پوتا تھا۔ ۱۲۵۹ء میں یہ منگول کا خان اعظم بن گیا۔ چین کی فتح اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ جس نے اس کو بیس سال تک مصروف رکھا۔ اس کے زمانہ میں بدھ مت چین کا سرکاری مذہب ہو گیا تھا۔ اس دور میں تجارت یورپ کے ساتھ بھی پورے عروج پر تھی اور اسی زمانہ میں پہلا یورپی باشندہ مارکوپولو (Marco Polo) جس نے مغرب کو پہلی مرتبہ حقیقی چین سے واقف کروایا تھا۔ خان اعظم کی سرپرستی حاصل کرکے اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا۔ ۱۲۸۰ء کے بعد کی چینی تاریخی اسناد میں کبلائی خان، بانی یوآن، خاندان کا ذکر اس طرح ہے جیسے کہ وہ ایک چینی قومی حکمراں تھا۔ اس منگول کا خاتمہ بالآخر ایک چینی قومی تحریک نے کیا اور اس کی جگہ خاندان منگ برسر اقتدار آ گیا۔

منگ خاندان (۱۳۶۸ء – ۱۶۴۴ء)

۱۳۶۸ء میں جب چینی رہنما چو یوانگ (Yuang) نے پیکنگ فتح کر لیا تو مقامی منگ خاندان منگولی خاندان کا جانشین بنا۔ یہ خاندان اپنی فتوحات کی بجائے فنون کی ترقی اور امن کے لیے مشہور ہے۔ اس نے یہ کوشش بھی کی کہ بیرونی اقوام سے میل جول بڑھایا جائے چنانچہ اس دور میں بہت سے پرتگالی، خاص طور پر تاجر ملک میں داخل ہوئے۔

خاندان منچو (۱۶۴۴ء – ۱۹۱۲ء)

شمال کے یہ لوگ ایسے ہی تھے جیسے کہ کن (Kin) جنھیں چنگیز خاں نے شکست دی تھی۔ انھوں نے سترھویں صدی میں چین کو فتح کرکے اپنے خاندان کی بنیاد رکھی۔ یہ خاندان ۱۹۱۲ء تک حکمراں رہا۔ اس کی جگہ ۱۹۱۲ء میں ایک مقامی جمہوری حکومت نے لے لی۔ یہ منچو ہی تھے جنہوں نے اطاعت کی ایک علامت کے طور پر چینیوں کو چوٹی رکھنے کا پابند کیا تھا۔ جمہوریت کی آمد کے بعد چوٹی کا رکھنا لازمی نہیں رہا اور آج کل چین میں اس کا رواج کم و بیش ختم ہو گیا ہے۔

چین کے جسد میں منچو فاتحین نے ایک نئی زندگی بھر دی۔ انہوں نے شمالی علاقوں یعنی منچوریا اور منگولیا میں چینی تہذیب و تمدن کو بڑے پیمانے پر پھیلانے کی کوشش کی۔ اس طرح اٹھارہویں صدی کے وسط میں روسیوں اور چینیوں کے مابین منگولیا میں رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

چین میں منچو دور ادبی سرگرمی کا بھی ایک اہم دور تھا۔ چینی ناول اور افسانہ اسلوب اور مواد کے لحاظ سے اعلیٰ معیار تک ترقی کر گئے اور چینی ڈرامے نے ارتقاء کی اہم منزلیں طے کیں۔ اسی دور میں باغوں کے مناظر کی رنگین تصویریں بنانے کے فن نے بڑی ترقی کی۔ رنگین چھپائی کی ایجاد بھی اسی دور میں ہوئی چینیوں نے یسوعی مبلغین سے تانبے پر نقش کاری کا فن سیکھا اور اسے بہت ترقی دی۔

چینی کے برتن تیار کرنے کی صنعت اپنی بلندیوں تک پہنچ چکی تھی لیکن جیسے جیسے اٹھارہویں صدی آگے بڑھتی گئی اس صنعت کی جمالیاتی خصوصیات میں زوال آتا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برتن بنانے والے اب یورپی پسند کو ترجیح دینے لگے تھے۔ اس صدی کے پورے دور میں یورپ کے امراء اور رؤسا اپنے محلات، حویلیوں اور دیہی مکانات کے لیے چینی ٹائل درآمد کرتے رہے۔ یورپ میں مٹی کے برتن بنانے کی صنعت نے چینی صنعت کی تقلید کی بہت کوشش کی لیکن اس کی برابری نہ کر سکی۔

چین کے مغرب سے تعلقات

سترھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک چین کی کوشش رہی کہ بیرونی دنیا سے زیادہ ربط ضبط نہ بڑھنے پائے چینیوں نے صدیوں تک مغربی تجارتی قوموں کو دور ہی دور رکھا اور ان کے ساتھ سفارتی تعلقات رکھنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ ریشم اور چائے خریدنے والے غیر ملکی تاجروں کو اس پر پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ مسلمہ چینی تاجروں کے ساتھ صرف کینٹن میں کاروبار کریں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ افیون ہی ایک ایسی شے ہے جس کے ذریعہ تجارت کے سب سے زیادہ موافق شرائط حاصل کی جا سکتی ہیں اور اس نشہ آور شے کی ناجائز درآمد میں اس قدر خطرناک وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ شاہی کمشنر لین سی ہیو کو اس تجارت کو ختم کر دینے کے لیے مقرر کیا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں اس نے برطانوی تاجروں کے افیون کے ذخیرہ کو جلا ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی لیکن انگریزوں نے وسیع تر تجارتی مراعات بالجبر حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا چنانچہ جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ چینی مزاحمت زیادہ دن نہ چل سکی اور ۱۸۴۲ء میں معاہدہ نان کنگ (Treaty of Nanking) طے پایا جس کی رو سے پانچ بندرگاہوں کینٹن، ایمائے، فوچاؤ، نینگ پو اور شنگھائی کو برطانوی تجارت کے لیے کھول دیا گیا۔ ہانگ کانگ کو برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا اور چین کو بڑی مقدار میں تاوان جنگ بھی ادا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اور بھی مراعات دی گئیں لیکن افیون کی تجارت کے بارے میں تصفیہ نہ ہو سکا۔

باکسر شورش

۱۸۹۸ء میں جرمنی نے کیاؤچاؤ پر اور برطانیہ نے وائی ہائی وائی پر زبردستی قبضہ کر لیا اور بندرگاہ آرتھر روس کو پٹے پر دے دیا گیا۔ سارے ملک میں یورپی لوگوں کے خلاف شدید نفرت آگ کی طرح تیزی سے پھیل گئی اور ان کو نکال باہر کرنے کے لیے ایک سیاسی سوسائٹی باکسرز نامی قائم ہوئی۔ ۱۹۰۰ء میں اس نے مجبوراً تشدد کا راستہ اختیار کیا اور یورپی باشندوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ یورپ سے مزید حفاظتی دستے روانہ کرنے کی کوشش کی گئیں تاکہ پیکنگ کے سفارت خانوں کے بچاؤ کا بندوبست ہو سکے لیکن اس کی وجہ سے واقعات نے تیزی کے ساتھ نیا رخ اختیار کر لیا۔ شاہی حفاظتی دستے کے ایک سپاہی نے جرمن سفیر کو پیکنگ کی ایک سڑک پر گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ بقیہ بدیسی نمایندے ایسے سفارت خانوں میں جمع ہو گئے جو محل وقوع کے اعتبار سے محفوظ تھے اور دو مہینوں تک وہیں محصور رہے۔ ایک جرمن سپہ سالار کی سرکردگی میں ۲۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل مغربی اتحادیوں کی مشترکہ فوج پیکنگ پہنچی تب جا کر محصورین کو خلاصی ملی بعض یورپی سپاہیوں نے چینی آبادی پر سنگین مظالم ڈھائے۔ اس شورش کے لازمی نتیجہ کے طور پر روس نے عملاً منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ مغربی طاقتوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور ۱۹۰۴ء میں انگریزوں نے تبت پر حملہ کر دیا جو اس وقت تک ممنوعہ ملک تھا۔

بیسویں صدی کے شروع ہی سے چین کی پرانی شاہی حکومت ٹوٹنے لگی تھی۔ مغربی ملکوں کی مداخلت اور جاپان کے حملے نے پرانے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو ہلا دیا اور زبردست وطن پرست اور سامراج دشمن تحریکوں نے جنم لیا۔ ان سب کے نتیجہ کے طور پر انقلابی طاقتیں آگے بڑھنے لگیں۔

۱۹۱۱ء میں اصلی چینی انقلاب شروع ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں شہنشاہ تخت سے دست بردار ہو گیا اور دنیا کا سب سے بڑا ملک جمہوریہ میں تبدیل ہو گیا۔ شہنشاہی کے خاتمہ کے ساتھ خاندان منچو کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

پہلی جمہوریہ

چین پر منچو حکومت کے خاتمہ کے بعد ڈاکٹر سن یات سن (Sun-Yat-Sen) کی رہنمائی میں مغربی طرز کی جمہوریت قائم کی گئی۔ پیکنگ میں جس نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا اس کی شکل جمہوری اور پارلیمانی تھی لیکن حقیقی اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جن کی نگرانی میں ملک کی مسلح افواج تھیں۔

سن یات سن سیاسی اصطلاحات کا مرید تھا۔ ۱۸۶۶ء میں ہانگ سان (صوبہ کوان ٹنگ (Kuuangtung) میں پیدا ہوا وہ ایک عیسائی کا بیٹا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک انقلابی پارٹی منظم کی اور متعدد کوششوں کے بعد منچو خاندان کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جمہوریہ کا یہ پہلا صدر بنا۔ جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنے اور چین کو نئی معاشی بنیاد پر کھڑا کرنے کی جدوجہد میں ڈاکٹر سن نے اپنی کومنتانگ پارٹی —— (Kuomintang) —— کی لگاتار رہنمائی کی۔ کومنتانگ نے جنوری ۱۹۲۴ء کی کانگریس میں ایک تفصیلی پروگرام منظور کیا جس کا بنیادی مقصد ایک طرف تو اندرونی طور پر سماجی تبدیلیاں لانا تھا اور دوسری طرف بڑے بڑے مسلح جاگیرداروں اور سامراج کے خلاف جدوجہد تھا۔ اس نے اپنی بنیاد مزدوروں اور کسانوں پر رکھی اور دانشوروں، سپاہیوں، نوجوانوں اور عورتوں سے اپیل کی کہ وہ اس کے پروگرام کی تائید کریں۔ ظاہر ہے کہ جاگیردار، سرمایہ دار اور سامراجی اس کے سخت خلاف ہو گئے۔

کومنتانگ نے اپنا مرکزی دفتر جنوب میں کینٹن میں قائم کیا تمام صوبوں میں اپنے نمائندے بھیجے اور شاخیں قائم کیں اور بہت جلد سن یات سن کی کارکردگی میں تقریباً پورے چین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ نئے فوجی افسر تیار کرنے کے لیے فوجی اکاڈمی قائم کی گئی جس کا کمانڈنٹ چیانگ کائی شک مقرر کیا گیا۔

مارچ ۱۹۲۵ء میں یکایک سن یات سن کا انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں طالب علموں اور مزدوروں کی جدوجہد تیز ہونے لگی تھی جس نے خود کومنتانگ کے اندر کے رجعت پرستوں کو بوکھلا دیا۔ شمال کے علاقوں میں انہوں نے بغاوت کر دی جسے جنوب سے فوجیں بھیج کر کچل دیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں کومنتانگ کی دوسری کانگریس کینٹن میں ہوئی اور اس نے اپنے پرانے انقلابی پروگرام کی تصدیق کر دی اور سامراجیوں اور اندرونی رجعت پرستوں کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ہانگ کانگ اور دوسرے صنعتی علاقوں میں مزدوروں کی ہڑتالیں اور زمینداروں کے خلاف کسانوں کی جدوجہد بڑھنے لگی۔ سن یات سن کے بعد چیانگ کائی شک جو قومی انقلابی فوج کا کمانڈر بن گیا تھا رجعت پسندوں کے ساتھ مل گیا لیکن جنوب کی انقلابی فوج شمال کے رجعت پرست طاقتوں کے خلاف برابر بڑھتی رہی اور ہونان اور ہوپے صوبوں کے باغیوں کو شکست دے کر دوبارہ قبضہ کر لیا اس کے بعد انقلابی حکومت نے اپنا صدر مقام کینٹن سے وسطی چین میں ووہان میں منتقل کر دیا۔ ۱۹۲۷ء کے شروع تک انقلابی فوجیں نانکنگ اور شنگھائی پہنچ گئیں۔

انقلابی فوجوں کے اس اقدام نے سارے ملک میں زبردست انقلابی لہر دوڑا دی۔ ہوپے اور ہونان میں کسانوں نے زمینداروں کی زمین پر قبضہ شروع کر دیا اور ختم سال تک کیانگسی اور فوکیان کا علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا۔ شہروں میں مزدوروں کی ہڑتال کی لہر چل پڑی۔ ہینکو اور کیوکیانگ میں جنتا نے برطانوی مقبوضات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مارچ ۱۹۲۷ء تک نانکنگ اور شنگھائی پر انقلابی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ برطانوی اور فرانسیسی سامراجیوں نے اب مسلح مداخلت کے منصوبے بنانا شروع کیے اور کومنتانگ کے اندر رجعت پرست جنرلوں نے چیانگ کائی شک کی سرکردگی میں بغاوت کر دی۔ شنگھائی میں جگہ جگہ مزدور تنظیموں، کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے انقلابیوں پر منظم حملہ شروع کر دیا دائیں بازوں کے فوجی افسروں نے ظلم و تشدد کی یہ لہر کینٹن، نانکنگ، نان چنگ، فوچو اور دوسرے شہروں میں چیانگ کائی شک کے حکم سے پھیلا دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی ایک باغی حکومت نانکنگ میں قائم کر دی۔ اس لیے کومنتانگ پارٹی نہ صرف دو حصوں میں بٹ گئی بلکہ دو حکومتیں بھی قائم ہو گئیں۔ اس کے بعد چیانگ کائی شک نے کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے خلاف قتل و غارت گری کی زبردست مہم شروع کر دی۔

اس حملے کے مقابلہ میں کمیونسٹوں اور دوسرے بائیں بازوں کی طاقتوں کے لیے کوئی چارہ نہیں رہا کہ مزاحمت کریں چنانچہ انہوں نے بڑے منظم طور پر شہر خالی کر دئے اور نومبر ۱۹۳۱ء میں مرکزی چین میں ایک سوویت حکومت قائم کر دی۔ اس علاقہ میں انہوں نے زمینداری ختم کر کے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی اور غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی لیکن چند ہی مہینے بعد چیانگ کائی شک نے انہیں یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ماؤزے تنگ، جو دے، چو این لائی، لیو شاؤ چی وغیرہ کی سرکردگی میں سرخ فوج نے لڑتے ہوئے مغربی چین پار کر کے مشہور عالم مارچ کے ذریعہ وسط ۱۹۳۶ء تک شمالی شنسی میں ینان کے علاقے میں اپنا آزاد علاقہ قائم کیا۔

جاپانی فاشسٹوں کا حملہ

کمیونسٹوں کو پیچھے ہٹانے کے بعد چیانگ کائی شک نے شروع میں کوشش کی کہ ملک کے بڑھتے ہوئے قوم پرست جذبہ کو مطمئن کرنے کے لیے بیرونی

سامراج کے اثر ورسوخ کو کچھ کم کیا جائے خاص طور پر سب سے مالدار صوبہ منچوریہ میں جہاں پر جاپان کا پورا معاشی کنٹرول تھا لیکن اسی زمانے میں جاپان میں یورپ کی طرح سخت معاشی بحران آچکا تھا جہاں جرمنی میں ہٹلری فاشزم ابھر رہی تھی وہاں جاپان میں فاشزم کے ہاتھ طاقت آچکی تھی اور وہ بھی اندرونی معاشی بحران ایشیائی ملکوں کو فتح کر کے حل کرنا چاہتا تھا. چنانچہ اس نے پہلے منچوریا پر قبضہ کیا اور پھر ۱۹۳۵ء میں ہوپی اور چہار کی طرف پیش قدمی شروع کی. شانسی، سویان اور شانتنگ صوبوں کو بھی خطرہ پیدا ہوگیا. اس سامراجی مہم کے بارے میں دنیا کے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے جاپان نے "ایشیا ایشیایوں" کے لیے کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ وہ سارے ایشیا سے مغربی طاقتوں کو نکال کر ایک مشترکہ "خوش حالی کا منطقہ" قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں اس کا مقصد سارے مشرقی وجنوبی ایشیا کو اپنے سامراجی چنگل میں لانا تھا جیسا کہ اس کی بعد کی فتوحات سے صاف ظاہر ہوگیا.

متحدہ محاذ

چیانگ کائی شک بجائے جاپانی حملہ آوروں کے خلاف متحدہ مزاحمت منظم کرنے کی کمیونسٹوں کے خلاف مہم میں لگا ہوا تھا. دوسری طرف کمیونسٹ سارے ملک میں یہ مہم چلا رہے تھے کہ خانہ جنگی فوراً بند ہو اور کمیونسٹ اور کومنٹانگ متحد ہوکر جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کریں. اس اپیل کا اثر چینی عوام اور خود چیانگ کی فوج میں پھیلنے لگا چنانچہ جب چیانگ کائی شک کمیونسٹوں کے خلاف مہم کو تیز کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۳۶ء میں سیان آیا تو وہاں فوج کے کمانڈر چینگ نے اپنے سپاہیوں کے دباؤ کے تحت چیانگ کائی شک کو گرفتار کر لیا. کمیونسٹ لیڈر نہیں چاہتے تھے کہ ایسے وقت چیانگ کو قتل کیا جائے اس لیے کہ اس سے کومنٹانگ اور کمیونسٹوں کے متحدہ محاذ کا امکان ختم ہو جانے کا ڈر تھا چنانچہ انہوں نے مداخلت کر کے چیانگ کائی شک کو رہا کروا دیا اور چینگ نے اس وعدہ پر اسے چھوڑنے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ جاپان کے خلاف سارے ملک کا متحدہ محاذ قائم کرے. چنانچہ سن یات سن کے تین اصولوں پر کومنٹانگ اور کمیونسٹوں میں اتفاق ہوگیا اور ایک ایسی حکومت قائم کر دی گئی جس کا بنیادی مقصد جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ تھا.

جاپان کے خلاف لڑائی
(۱۹۳۷ء - ۱۹۴۵ء)

ویسے تو جاپان چین میں کئی سال سے بڑھتا جا رہا تھا. لیکن جولائی ۱۹۳۷ء میں جاپان سے باقاعدہ جنگ کا اعلان ہوگیا. شروع میں جاپان کو آسانی سے فتوحات حاصل ہوئیں. پہلے اس نے پیکنگ پھر شنگھائی، نان کنگ وغیرہ پر قبضہ کرلیا. ۱۹۳۸ء کے وسط تک اس نے تقریباً تمام بڑی ریلوے لائینوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اس سال کینٹن، ہینکوا، ہینیانگ، ووچانگ وغیرہ اس کے اس کے ہاتھ آگئے. چینی حکومت نے اپنا صدر مقام چنگ کنگ منتقل کر دیا.

آزادی کی اس جدوجہد میں سوویت یونین حقیقی حلیف ثابت ہوا. اگست ۱۹۳۷ء میں سوویت یونین اور چین کے درمیان دوستی کا معاہدہ طے پایا اور اسی کے ساتھ سوویت یونین سے بے شمار ہتھیار اور آلات جنگ آنے لگے. سوویت یونین نے سینکڑوں ہوائی جہاز اور ان کے چلانے والے ہوا باز اور دوسرے لوگ بھیجے اور جاپان اور امریکہ کی جنگ چھڑنے کے بعد امریکہ نے بھی مالی اور فوجی مدد کی. جاپانیوں نے جب ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تو لڑائی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا. ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی. جاپان نے نان کنگ میں کٹھ پتلی حکومت قائم کی. بڑے پیمانے پر بمباری کی لیکن متحد چین کو زیر نہ کر سکا. لاکھوں چینی، جاپانی مقبوضہ علاقے سے مشرق کی طرف منتقل ہوگئے تاکہ جنگ جاری رکھ سکیں.

دوسری عالمگیر جنگ چھڑنے کے بعد جاپان نے ہند چینی کا علاقہ فتح کر کے چین کو امریکہ اور باقی مغربی دنیا سے بالکل منقطع کر دیا. دوسری طرف روس پر جرمن حملہ کے بعد روس کے لیے اس پیمانے پر مدد دینا ممکن نہ رہا اور چین کو انتہائی سخت حالات میں لڑائی جاری رکھنی پڑی.

لڑائی کے اس دور میں چین کی اندرونی معاشی حالت بہت خراب ہوگئی. افراط زر بڑھ گیا. کومنٹانگ افسروں اور فوجی جنرلوں میں رشوت ستانی اور لوٹ مار بڑھنے لگی اور حکومت کی طرف سے سخت بے چینی کا احساس عام تھا اس کے برعکس ان علاقوں میں جہاں کمیونسٹ لڑ رہے تھے انہوں نے ہر جگہ عوام کا تعاون حاصل کرنے اور انہیں عملی طور پر لڑائی کی سرگرمیوں میں شریک کرنے کی کوشش کی. بہت سی اصلاحات کیں. ان علاقوں میں کمیونسٹ افسروں اور سپاہیوں نے بے مثال نظم وضبط اور ایثار کا مظاہرہ کیا. اپنے آپ کو غریب جنتا کا حصہ بنا دیا چنانچہ ۱۹۴۵ء تک سرخ فوج کے اثر میں نو کروڑ آبادی کا علاقہ آگیا. اس کی فوج کی تعداد نو لاکھ اور مسلح دستوں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی.

خانہ جنگی
(۱۹۴۵ء - ۱۹۴۹ء)

جاپان نے ۱۹۴۵ء میں ہتھیار ڈال دیے اور چار سال کے اندر "عوام کی آزادی کی فوج" نے کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں پورے چین پر اپنا اقتدار قائم کرلیا اور چین کی عوامی جمہوریت" کی بنیاد ڈالی. چیانگ کائی شک اپنی بچی کھچی فوج لے کر تائیوان چلا گیا. اس زبردست فتح کے وجوہات کئی ہیں. لیکن جے. ڈبلیو. بیوس (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) کے مطابق "بنیادی وجہ یہ تھی کہ کمیونسٹ فوجوں اور کمیونسٹ انقلاب کو بہت زبردست عوامی تائید حاصل تھی."

اس انقلاب نے تین مرحلوں میں کامیابی حاصل کی.

۱۔ اگست ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۶ء تک کومنٹانگ اور کمیونسٹوں کی کوشش یہ رہی کہ جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد زیادہ سے زیادہ علاقہ اپنے اثر میں لے آئیں ساتھ ہی پرامن تصفیہ کے لیے بات چیت جاری رہی.

۲۔ اس دوران امریکہ نے بڑے پیمانے پر کومنٹانگ کی مالی اور فوجی مدد کی. اور اسے تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی لیکن تھوڑے دن بعد وہ پانسہ پلٹنے لگا.

۳۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ فوجیں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگیں اور انہوں نے مکمل فتح حاصل کرلی.

کمیونسٹ حکومت کا دور

چیانگ کائی شک کی شکست اور تائیوان جانے کے بعد بہت جلد سارے ملکوں پر کمیونسٹوں کی سرکردگی میں عوامی فوج کا قبضہ ہوگیا اور پہلی مرتبہ پورا ملک واحد مرکز کے تحت آگیا. مکمل طور پر امن وامان قائم کر دیا گیا اور ماؤ کی سرکردگی میں نیچے سے اوپر تک "عوام کی جمہوری ڈکٹیٹر شپ" قائم کر دی گئی. یہ کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں "مزدور طبقہ، کسانوں، نچلے درمیانی طبقے اور قومی سرمایہ داروں" کا اتحاد تھا. اسی کے ساتھ دیہات میں بڑے پیمانے پر زرعی اصلاح کا پروگرام شروع کیا گیا. زمینداروں وجاگیرداروں کے پورے طبقہ سے زمین لے لی گئی اور کاشت کرنے والے کسانوں میں

تقسیم کر دی گئی شہروں میں تمام صنعتوں میں کام شروع کر دیا گیا۔ کئی جگہ پرانے مل مالکوں کو بھی باقی رکھا گیا۔ اس کے علاوہ اسکولوں، دفتروں اور کاروباری اداروں میں بہت سے پرانے ملازموں کو ان کی اپنی جگہ رہنے دیا گیا۔

استحکام اور تعمیر کا دور
(۱۹۴۹ء - ۱۹۵۲ء)

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء کا پورا دور نئی ریاست کے استحکام پر صرف کیا گیا۔ ایک تو سارے ملک میں رشوت ستانی، نوکر شاہی رویہ اور سرکاری کاروبار میں فضول خرچی کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی۔ اس کے علاوہ کاروباری حلقوں میں رشوت، بے ایمانی، سرکاری املاک کی چوری، سرکار کو دھوکہ دہی اور ٹیکس کی چوری کے خلاف بھی ملک گیر مہم چلی۔ جس کے لیے سارے ملک کے عوام کو متحرک کیا گیا۔ انقلاب کے بعد ہی دسمبر ۱۹۴۹ء میں ماؤ ماسکو گئے تھے اور استالن سے ملنے کے بعد دوستی اور امداد کے معاہدے طے پائے تھے۔ ۱۹۵۳ء تک سوویت یونین نے ۳۰ کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا اور ۱۹۵۴ء میں اس کے علاوہ اور قرضے دیے جس سے بہت سی صنعتیں قائم کی گئیں اور فوج کی جدید تنظیم کی گئی۔

پنج سالہ منصوبہ
(۱۹۵۳ء - ۱۹۵۷ء)

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء کا دور چین کے پہلے پنج سالہ منصوبہ کا دور تھا۔ اس دور میں سوویت یونین کی مدد سے بڑے پیمانے پر بھاری صنعتوں کی تعمیر شروع کی گئی کچے مال کے نئے ذخائر دریافت کیے گئے اور صنعت اور زراعت میں اجتماعی یا سوشلسٹ طریقے بڑے پیمانے پر رائج کیے گئے خاص طور پر زراعت میں۔ ۱۹۵۲ء تک زرعی اصلاح کا دور مکمل ہو چکا تھا۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کی ساری زمین کسانوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں آپسی امداد کے تقریباً ایک کروڑ گروپ بنائے جا چکے تھے جن میں سات کروڑ خاندانوں کو منظم کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۵ء تک ایک زبردست مہم کے ذریعہ زراعت میں امداد باہمی کا طریقہ بڑے پیمانے پر رائج کر دیا گیا۔ زمین پر سے انفرادی ملکیت ختم کر دی گئی۔

معاشی اصلاحات کے ساتھ ۱۹۵۴ء تک نیچے سے اوپر تک دیہات سے مرکز تک عوامی کانگرس قائم کر دی گئیں جو عوام کی چنی ہوئی تھیں۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں پہلی قومی عوامی کانگرس ہوئی جس میں پورے ملک کے لیے آئین مرتب کیا گیا۔ اس میں ملک کی ساری معیشت کو سوشلزم کی راہ پر لگانا بنیادی مقصد قرار دیا گیا۔

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک چین کی بیرونی پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں اندرونی طور پر کافی استحکام آ گیا تھا۔ ملک نے کافی ترقی کی تھی اور خود اعتمادی بڑھتی جا رہی تھی بین الاقوامی مسائل میں چین کا رول بڑھ رہا تھا۔ بانڈنگ کانفرنس میں چین نے نہرو کے ساتھ اہم رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کی آزادی کی تحریک کو چینی امداد برابر ملتی رہی۔

۱۹۵۸ء - ۱۹۶۱ء کا دور

۱۹۵۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگرس نے چین کی اندرونی اور اسی کے ساتھ بیرونی پالیسی کو نیا موڑ دیا۔ اس سے پہلے ایک طرف غیر انقلاب پسندوں اور آرام پسند کمیونسٹوں کے خلاف زبردست مہم چلی اور اس کے بعد اس کانگرس میں معاشی، سیاسی اور نظریات کے میدان میں "آگے کی طرف جست" کا نعرہ دیا گیا۔ سوویت یونین کے منصوبہ بندی کے طریقوں کو رد کر دیا گیا اور یہ نعرہ دیا گیا کہ اگر عوام متحد اور متحرک ہوں تو ہر مشکل پر قابو پا کر معجزے دکھلا سکتے ہیں اور اس تیز رفتاری سے ترقی کی جا سکتی ہے کہ تمام ترقی یافتہ ملک پیچھے رہ جائیں گے۔ اس کے لیے شہروں کے بجائے دیہات کو ترقی کا مرکز بنایا گیا اور بڑے بڑے کمیون قائم کیے گئے۔ یہ ایک طرح کی خود مکتفی اکائیاں تھیں، جو کسانوں کی تمام سرگرمیوں یعنی پیداوار، ان کی نکاسی تعلیم نظم و نسق وغیرہ کی ذمہ دار تھیں۔ تقریباً اسی طرح کے ۲۴ ہزار کمیون میں اوسطاً ۵ ہزار خاندان رکن تھے۔ یہ پورے سماج کو بالکل نئے طریقے پر منظم کرنے کی مہم تھی جس سے ظاہر ہے کہ ساری زندگی میں اتھل پتھل ہو گئی تاریخ کے ۲۵، ۳۰ سال کو ۵ سال میں طے کرنے اور معاشی میدان میں جست لگانے کی باتیں اب ختم ہو گئیں۔ ۱۹۶۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جو اجلاس ہوا اس میں اندرونی اتحاد اور کارکنوں کی تنظیم پر زور دیا جانے لگا اور فوج کا اقتدار کافی بڑھ گیا۔ ماؤ اور ان کے پروگرام کی داخلی مخالفت نے زور پکڑا ان کے ذمہ پارٹی کی اندرونی تنظیم کا کام کر دیا گیا اور ملک کے نظم و نسق اور معاشی پالیسی کو بروئے کار لانے کا کام لیو شاؤ چی نے سنبھال لیا جو ۱۹۵۹ء میں ماؤ کی جگہ چینی ری پبلک کے صدر بن گئے تھے۔ اسی کے ساتھ بڑے پیمانے پر ملک کے نظم و نسق سے غیر معتبر عناصر کو پاک کرنے اور سوشلزم کی تعلیم عام کرنے کی مہم تیز کر دی گئی۔

ہند، چین اختلاف

اسی دور میں چین کی بیرونی پالیسی میں زبردست تبدیلی آنے لگی اس سے پہلے اس کی پالیسی کی ایک اہم بنیاد ایشیائی، افریقی اقوام کی دوستی اور خاص طور سے ہندوستان سے دوستی پر تھی۔ جواہر لال نہرو نے چین کا اور چو این لائی نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں تبت میں بغاوت ہوئی اور دلائی لامہ نے ہندوستان آکر پناہ لی۔ اسی کے ساتھ ہندوستان اور چین کی سرحد پر اختلافات شروع ہوئے۔ چین نے مسلمہ میک موہن لائن اور دوسری حد بندیوں کو ماننے سے انکار کر دیا پہلے اس مسئلہ کو بات چیت کے ذریعہ طے کرنے کی کوشش کی گئی جو بے سود ثابت ہوئی۔

سرحد پر ہر جگہ جھڑپیں ہونے لگیں اور آخر کار اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور شمال مشرق میں چینی فوجیں کافی دور تک اندر گھس آئیں۔ ساری دنیا میں اس کے خلاف سخت ردّ عمل ہوا اور آخر کار چین نے اس علاقہ تک اپنی فوجیں واپس بلا لیں جسے وہ اپنی سرحد سمجھتا تھا۔ اس کے بعد سے ہندوستان اور چین کے درمیان برابر تناؤ رہا۔ اور چین ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں مسلح دہشت پسندوں کی مالی اور فوجی امداد کرتا رہا۔ اس نے تیزی کے ساتھ پاکستان سے دوستی بڑھائی اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی ہند، پاک لڑائی میں اس نے بڑے پیمانے پر پاکستان کی نہ صرف عام تائید کی بلکہ اسے بڑی مقدار میں ہتھیار وغیرہ بھی مہیا کیے۔

اسی زمانے میں سوویت یونین کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔ خاص طور پر اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب کیوبا پر امریکہ نے حملہ کیا تو چین نے کھلے عام سوویت یونین پر سخت نکتہ چینی کی۔ دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ سوویت یونین نے اپنے تمام مشیر جو مختلف صنعتی پروجیکٹوں میں کام کر رہے تھے، واپس بلا لیے۔ چین میں قوم کی بنیاد پر ترقی کا دور دورہ ہوا۔ اور ایٹمی ہتھیار کی تیاری پر زور دیا جانے لگا۔

اسی کے ساتھ کمیونسٹ دنیا میں پھوٹ پڑ گئی دنیا کی زیادہ تر پارٹیاں سوائے چین کے سوویت یونین کے ساتھ گئیں۔ بعض پارٹیوں میں اندرونی طور پر پھوٹ پڑ گئی اور چین نے اس کے بعد سے سوویت یونین کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے دیا۔

کلچرل انقلاب کا دور

کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے اوپر کے گروہوں میں جو کش مکش ۱۹۶۵ء میں شروع ہوئی تھی اس میں فوج نے کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک گروہ کے لیڈر ماؤ تھے اور ان کی طرف سے مارشل لن پیاؤ سرگرم عمل تھے۔ دوسرے گروہ کے لیڈر لیوشاؤچی تھے بائیں بازو یا ماؤ کے حامیوں نے پہلے کلچرل کام کرنے والوں پر کالجوں اور اسکولوں میں حملہ شروع کیا۔ دائیں بازو کے خلاف مہم پہلے پوسٹروں کے ذریعہ شروع ہوئی پھر اس نے مظاہروں حتیٰ کہ باقاعدہ جھڑپوں کی شکل اختیار کر لی اور ۱۹۶۸ء تک ماؤ کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی لیوشاؤچی، ٹنگ سیاؤپنگ اور ان کے ساتھی اقتدار سے ہٹا دیے گئے اور اس کے بعد سوسائیٹی اور نظم و نسق معمول پر لوٹنے لگے لیکن اس نے چین کی ساری زندگی میں اتھل پتھل برپا کر دی، اگرچہ سماجی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ اپنی فتح کو مستحکم کرنے کے لیے ماؤ اور لن پیاؤ نے آئین میں تبدیلی کر دی۔ ۱۹۶۸ء کے بعد سے ماؤزے تنگ کی ہدایت پر چین کی پالیسی میں ایک اور اہم موڑ آیا۔ سوویت یونین کے خلاف مہم اور تیز کر دی گئی۔ پچھلے چند برسوں میں بیرونی دنیا سے تعلقات جو تقریباً منقطع تھے۔ اب اس پالیسی میں تبدیلی کی گئی۔ اس میں پہلا قدم مغرب کی طرف اور خاص طور سے امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا تھا۔ نکسن کو چین آنے کی دعوت دی گئی کینیڈا، آسٹریا، اٹلی وغیرہ سے سفارتی تعلقات قائم کیے گئے اور ۱۹۷۰ء میں چین کو مجلس اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان امریکہ نے چین سے تجارت پر سے پابندیاں ختم کر دیں۔ فروری ۱۹۷۲ء میں نکسن نے چین کا دورہ کیا اور ثقافتی تبادلے، تجارت اور تعلقات کو معمول پر لانے کے سلسلہ میں معاہدے ہوئے دوسرے ملکوں سے بھی تعلقات کو استوار کرنے کی طرف قدم اٹھایا جانے لگا چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ہندوستان اور چین کے درمیان سفیروں کا پھر سے تبادلہ ہوا۔ سوویت دشمنی اور امریکہ سے دوستی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اب چین نے ہر اس تحریک کی مخالفت شروع کی جسے روس کی تائید حاصل ہو چنانچہ اس نے چلی میں رجعت پرست قوتی افسروں کی تائید کی جنہوں نے جمہوری اور سوشلسٹ حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی راج قائم کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے انگولا اور موزمبیق میں تحریک آزادی کے خلاف بیرونی مداخلت کرنے والی طاقتوں کی حمایت کی۔

۱۹۷۵ء میں چواین لائی۔ وزیراعظم چین کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے آخری دور میں پارٹی کے دائیں اور بائیں بازو کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ پھر اقتدار کے لیے کش مکش شروع ہو گئی۔ آخر میں فتح بائیں بازو کی ہوئی اور نائب وزیراعظم ٹنگ سیاؤپنگ کو ہٹنا پڑا۔

ستمبر ۱۹۷۶ء میں ماؤزے تنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح چین کی تاریخ کا ایک اہم دور اختتام کو پہنچا۔

تاریخ جاپان

جاپانی جزیروں کے قدیم باشندے غالباً شمالی لوگ تھے جن کا نارڈی (Nordic) نسل کے لوگوں سے دور کا رشتہ تھا۔ لیکن خالص جاپانی منگولی نسل کے ہیں جسمانی اعتبار سے یہ سرخ فام قدیم امریکی باشندوں کے مشابہ ہیں، ماقبل تاریخ کے جاپانی اور پیروی (Peruvian) مٹی کے برتنوں میں متعدد عجیب و غریب مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ یہ لوگ عہد متاخر حجری تہذیب (Neolithic Culture) میں بحرالکاہل کو عبور کر کے بڑی تعداد میں ادھر آگئے ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ سمت جنوب سے ملاوی (Malay) حتیٰ کہ جزائر فلپائن کے اندرونی حصوں کے بعض حبشی نما پستہ قد قبائیلیوں (Negrito) کا عنصر بھی ان میں داخل ہو گیا ہو۔

جاپانیوں کی ابتدا سے متعلق جو بھی نظریات ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تہذیب طرز تحریر اور ادبی و جمالیاتی روایات چینیوں سے لی گئی ہیں۔ عیسوی کی دوسری اور تیسری صدی میں وہ جہالت سے نکل رہے تھے۔ ایک قوم کی حیثیت سے ملکہ جنگو (Jingo) کی سرکردگی میں کوریا پر حملہ ان کا ایک قدیم ترین کارنامہ تھا۔ اس ملکہ نے جاپانیوں کی تہذیب کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ ان کی تاریخ دلچسپ اور رومانوی ہے انہوں نے جاگیرداری نظام اور جہازرانی کی روایات کو ترقی دی۔

جاپانی سلطنت کے زمانے کا شمار ۶۶۰ ق م سے ہوتا ہے موجودہ حکمراں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ بانی سلطنت جمو ٹینو (Jimmu Tenno) کی راست اولاد ہے۔ بارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک جاپان پر شوگونوں (Shoguns) کی حکومت رہی جس زمانے میں جاپان میں جاگیرداری نظام قائم تھا فوج کا سپہ سالار شوگن کے خطاب سے بلایا جاتا تھا لیکن ۱۸۷۱ء میں ایک خانہ جنگی کے بعد شہنشاہ نے جو بعض اوقات مکاڈو (Mikado) کہلاتا تھا، اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

جاپان کا یورپ کے ساتھ پہلی مرتبہ ربط سولہویں صدی میں ہوا۔ ۱۵۴۲ء میں چند پرتگالی چین کی ایک بڑی کشتی میں یہاں پہنچے اور ۱۵۴۹ء میں ایک یسوعی مبلغ فرانسیس زیویر (Francis Xavier) نے وہاں اپنی تبلیغ کا آغاز کیا یسوعی تذکروں میں ایسے ملک کا ذکر ملتا ہے جو جاگیرداری کے درمیان متواتر لڑائیوں کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے جاپان نے یورپی میل جول کا خیر مقدم کیا اور عیسائی مبلغین نے بڑی تعداد میں وہاں کے لوگوں کو عیسائی بنا ڈالا۔ ولیم ایڈمس (William Adams) نامی ایک انگریز جاپانیوں کا سب سے زیادہ با اعتماد یورپی مشیر بن گیا اور اس نے انہیں بڑے بڑے جہاز بنانے کی صنعت سکھلائی۔ جاپان کے بنے ہوئے جہازوں میں ہندوستان اور پیرو (Peru) تک بحری سفر ہوا کرتے تھے۔

اسی دور میں ہسپانوی مسیحیوں، پرتگالی یسوعیوں اور انگریز اور ولندیزی پروٹسٹنٹوں کے درمیان آپس میں لڑائی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر ایک نے جاپانیوں کو دوسروں کے سیاسی منصوبوں کے خلاف خبردار کرنا شروع کیا۔ ایک منزل پر عیسائیوں نے بدھ مت والوں کو سخت ایذا پہنچائی اور ان کو ذلیل کیا۔ اس وقت کی جاگیرداری آویزشوں نے اور مشکلیں پیدا کر دیں۔ آخر میں جاپانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ یورپی باشندے اور ان کی عیسائیت ایک ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ خاص طور پر کیتھولک عیسائیت جو ہسپانوی سامراج اور یورپ کے سیاسی خوابوں پر پردہ ڈال رہی ہے جو پہلے ہی سے جزائر فلپائن پر قابض تھے۔ چنانچہ عیسائیوں پر بڑے اور سخت مظالم ڈھائے گئے اور ۱۶۳۸ء میں جاپان یورپی باشندوں کے لیے قطعاً بند کر دیا گیا۔ جزیرہ دیشیما میں صرف ایک معمولی سا ولندیزی کارخانہ باقی رہا۔ دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک یہ پابندی باقی رہی۔ دیشیما کے ولندیزیوں کو ایسی ختیوں سے دوچار

ہونا پڑا جو برداشت سے باہر تھیں۔ وہ کسی جاپانی کے ساتھ میل جول نہیں رکھ سکتے تھے سوائے ان خاص عہدیداروں کے جو ان سے کاروبار کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے دو صدیوں کے دوران جاپانی بقیہ دنیا سے اس طرح مکمل طور پر منقطع رہے جیسے کہ وہ کسی دوسرے سیارے پر رہتے ہوں۔ ساحل پر چلنے والی چھوٹی کشتیوں کے سوا بڑے جہاز بنانے کی ممانعت کر دی گئی تھی کسی جاپانی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی نہ کوئی یورپی شخص ملک میں داخل ہو سکتا تھا۔

اس طرح تاریخ کے مرکزی دھارے سے جاپان دو صدیوں تک باہر رہا۔ اس زمانہ میں جاپان میں جاگیرداری نظام کا دور دورہ تھا خونی فسادات کے باعث زندگی میں ہلچل پیدا ہوتی رہتی تھی۔ ان فسادات میں ساموائی (Sc m urai) یا لڑنے والے لوگ اور امرا اور ان کے خاندان والے جو آبادی کا پانچ فی صد تھے، بقیہ آبادی پر بلا روک ٹوک مظالم ڈھایا کرتے تھے جب کبھی کسی امیر کا گزر ہوتا تو عوام گھٹنوں کے بل جھک جاتے تھے۔ اگر بلا ارادہ ذرا سی بھی بے ادبی ظاہر ہو جاتی تو ساموائی کے ہاتھوں تلوار سے اندھا دھند وار کا جوکھم مول لینا پڑتا۔ اعلیٰ طبقے رومانوی مہم پسندی کی زندگی گزارتے تھے۔ عشق و محبت کرنا، قتل کرنا، یہ ان کی زندگی کی مصروفیات تھیں جن سے شاید لوگ بے حد اکتا جاتے تھے۔ ایک متجسس ذہن جو سیر و سیاحت اور حصول علم کے لیے تڑپتا ہو اور جو بے معنی رومان کے ان جزائر میں بند کر دیا گیا ہو اس کی مصیبت کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس اثنا میں باہر کی عظیم دنیا وسیع تر علم اور صلاحیتوں کی طرف آگے بڑھتی چلی گئی نئی نئی وضع کے جہاز تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جاپانی ساحل کے قریب سے بار بار گزرنے لگے بعض اوقات سمندر میں جہازوں کے تباہ ہونے کے بعد ملاحوں کو کنارے پر لایا جاتا تھا۔ ڈیشیلا کے ذریعہ جو بیرونی دنیا سے ان کا واحد رابطہ تھا یہ خطرناک اطلاعات ملنے لگیں کہ جاپان مغربی دنیا کی طاقت کی برابری نہیں کر سکتا۔ ۱۸۳۷ء میں ایک جہاز (Stars on Stripes) جوڑی دھاریوں اور تاروں کا انوکھا جھنڈا اڑاتا جاپانی ساحل کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس میں چند جاپانی ملاح بھی تھے جو سمندر میں تیرتے ہوئے انہیں ملے تھے۔ جیسے ہی یہ جہاز جاپان کے خلیج یادو میں پہنچا جاپانیوں نے اس پر گولیاں برسانی شروع کیں اور اس کے لیے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔

یہی امریکی جھنڈا چند دن بعد دوسرے جہازوں پر پھر سے نظر آیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۹ء میں ایک اور امریکی جہاز آیا جس نے مطالبہ کیا کہ ان اٹھارہ امریکی ملاحوں کو رہا کر دیا جائے۔ جو اپنے جہاز کی تباہی کے بعد جاپان میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ پھر ۱۸۵۳ء میں چار امریکی جنگی جہاز صدر کپتان پیری (Perry) کی سرکردگی میں وہاں پہنچے اور واپس جانے سے انکار کر دیا۔

۱۸۵۴ء میں دس جہازوں کے ساتھ پیری پھر واپس آیا۔ ان جہازوں نے جاپانیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ کیوں کہ یہ جہاز بھاپ کی قوت سے چلتے تھے اور بھاری توپوں سے لیس تھے۔ پیری نے تجارت اور میل جول کی تجاویز پیش کیں۔ جن کی مزاحمت کی جاپانیوں میں طاقت نہیں تھی۔ وہ پانچ سو آدمیوں کے حفاظتی دستہ کے ساتھ جہاز پر سے اتر آیا۔ حیرت زدہ جاپانی ہجوم نے بیرونی دنیا کی اس بلائے ناگہانی کو باقاعدہ قدم اٹھاتے ہوئے اور اور سڑکوں پر سے گزرتے دیکھا۔

امریکہ کے داخلہ کے بعد روس، ہالینڈ اور برطانیہ کے لوگ بھی آن پہنچے اور نتیجتاً ان کے اور جاپان کے حوصلہ مند معزز جانبازوں کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے ایک برطانوی باشندہ سڑک پر فساد کے دوران مارا گیا اور ایک جاپانی شہر پر انگریزوں نے گولہ باری کر دی (۱۸۶۳ء)۔ ایک بڑے امیر نے جس کی جاگیر کی بلند سطح پر سے آبنائے شمونوسیکی (Shemonosekt) نظر آتا تھا سخت برافروختہ ہو کر بدیسی جہازوں پر گولی چلا دی برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور امریکی جنگی جہازوں کے بیڑے کی دوسری گولہ باری نے اس کے توپ خانہ کو تباہ کر دیا اور اس کے شمشیر باز منتشر ہو گئے۔ بالآخر اتحادیوں کے جنگی جہازوں کا ایک دستہ اوساکا (Osaka) سے کچھ فاصلہ پر لنگر انداز ہوا اور زبردستی معاہدے ستخط کر کے جاپان کو دنیا کے لیے کھول دیا۔

ان اہم واقعات کے باعث جاپانیوں کی سخت تذلیل ہوئی۔ حیرت انگیز توانائی اور ذہانت کے ساتھ انہوں نے اپنی تہذیب اور تنظیم کو یورپی طاقتوں کی سطح پر لانے کا بیڑہ اٹھایا۔ نوع انسانی کی تمام تاریخ میں کسی قوم نے اس تیزی کے ساتھ ترقی نہیں کی جس طرح جاپان نے اس وقت کر دکھائی۔ اس وقت جاپان انتہا پسند رومانی جاگیردارانہ نظام کا عجیب و غریب مرقع تھا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کا شمار زمانہ وسطیٰ کے ملکوں میں ہوتا تھا ۱۸۹۹ء تک جاپان کے لوگ مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگ گئے اور اپنے آپ کو یورپ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ طاقتوں کی سطح پر لے آئے۔ بلکہ روس سے تو بہت آگے بڑھ گئے۔ جاپان نے اس خیال کو بالکل ختم کر دیا کہ براعظم ایشیا کسی طرح بنیادی طور پر یورپ سے پیچھے تھا یا یہ کہ اس کی پستی لاعلاج ہے۔ جاپان کے مقابلہ میں یورپ کی تمام ترقی نہایت سست رفتار دکھائی دینے لگی۔

جنگ چین و جاپان
(۱۸۹۴ء – ۱۸۹۵ء)

جاپان نے نہ صرف صنعتی ترقی میں یورپ کی تقلید کی بلکہ علاقائی توسیع پسندی کی پالیسی کو بھی اپنایا۔ اس کی نئی صنعتیں اسے مجبور کر رہی تھیں کہ خام پیداوار اور منڈیوں کے لیے دوسرے ملکوں کی طرف نظر دوڑائے چین اور کوریا اس کے سب سے قریبی پڑوسی تھے چین میں تجارت کے مواقع تھے لیکن آبادی بہت گنجان تھی تاہم منچوریا جس میں چینی مملکت کے شمال مشرقی صوبے شامل تھے، ترقی اور آبادکاری کی کافی گنجائش تھی چنانچہ جاپان نے کوریا اور منچوریا کی طرف للچائی ہوئی نظریں دوڑانی شروع کر دیں۔

معمولی سا بہانہ تلاش کر کے جاپان نے کوریا پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں جو نقصان ہوا تھا اس کا معاوضہ ادا کرنے اور اپنی چند بندرگاہیں جاپانی تجارت کے لیے کھول دینے پر کوریا کو مجبور کیا گیا لیکن جاپان بہت دنوں تک اس سے مطمئن نہیں رہا۔ اس نے چین کو اس بات پر مجبور کیا کہ کوریا جو چین کے زیر اثر تھا، اب دونوں ملکوں یعنی چین و جاپان کی باج گزار ریاست بن جائے۔ اس انتظام کی بدولت ظاہر ہے کہ جھگڑے کھڑے ہونے اور اسی کا جاپان منتظر تھا چنانچہ ۱۸۹۴ء میں چین پر جنگ مسلط کر دی گئی۔

چین اور جاپان کی یہ جنگ ایک سال تک چلتی رہی لیکن جاپان کے لیے یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ثابت ہوئی۔ جاپان کی بری اور بحری افواج عصری تھیں اور چینی فوجیں قدیم اور نااہل۔ جاپان کو ہر قدم پر کامیابی ہوتی رہی اور چین پر ایک ایسا معاہدہ عائد کر دیا گیا جس سے جاپان کو اب وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو چین سے معاہدہ کرنے والی مغربی طاقتوں کو حاصل تھی۔ کوریا کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان کوریا پر جاپان کے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لیے ایک پردہ تھا۔ چین کو مجبوراً پورٹ آرتھر کے ساتھ منچوریا کا جزیرہ نمائے لیاؤٹنگ (Liaotung) بھی جاپان کے حوالہ کرنا پڑا۔ اسی کے ساتھ چین کے بعض دوسرے جزیروں پر جاپانیوں نے قبضہ جما لیا۔

جاپان کے ہاتھوں چین کی اس زبردست ہزیمت نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

مشرقِ بعید میں ایک طاقتور ملک کے عروج سے مغربی طاقتیں خوش نہیں ہوئیں۔ تین بڑی طاقتوں روس، جرمنی، اور فرانس نے اس بات پر اصرار کیا کہ جاپان نے جن علاقوں کو چین سے زبردستی حاصل کیا تھا ان سے دست بردار ہو جائے۔ جاپان کے لیے یہ بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ وہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا کہ ان تینوں کا مقابلہ کر سکے لیکن جاپان نے اس ذلت کو فراموش نہیں کیا۔ یہ سبکی دل میں کھٹکتی رہی اور جاپان نے ایک بڑی لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ یہ لڑائی نو سال بعد روس کے ساتھ پیش آئی۔

مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں

چین کے خلاف اس جنگ نے یہ ظاہر کر دیا کہ جاپان نے کس حد تک مغربی ممالک کی طرح ترقی کر لی ہے۔ اس کے پاس مغربی طرز کی قابل فوج تھی اور ایک چھوٹا مگر کارکرد جنگی جہازوں کا بیڑا تھا۔ جاپان کے اس نئے جنم کو گو برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکا نے وقعت کی نظروں سے دیکھا لیکن دوسری طاقتیں جو ایشیا میں بھارت جیسے نئے ملکوں کی تلاش میں تھیں اس کو اچھا نہیں سمجھا روس منچوریا میں سے ہو کر جنوب میں کوریا کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا فرانس نے پہلے ہی سے انتہائی جنوب میں ٹونکن (Tonkin) اور آنام میں مستقل بنیاد پر قدم جمائے تھے۔ جرمنی حریص نگاہوں سے نئے علاقوں کی تلاش میں تھا چنانچہ جرمنی، فرانس اور روس نے متحد ہو کر جاپان کا راستہ روکنے کی کوشش کی چین پر فتح سے جاپان جو فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ خاص طور پر چین کے ان علاقوں پر جاپان کو قبضہ نہیں کرنے دیا جن سے اسے بحرِ جاپان پر تسلط حاصل ہو جاتا۔ چین کے ساتھ جنگ نے جاپان کو تھکا دیا تھا اور وہ ان ملکوں کے ساتھ لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ ان کی دھمکی کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس سے بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں عیسائی مبلغوں کے قتل کا بہانہ بنا کر جرمنی چین پر ٹوٹ پڑا اور چین کے صوبہ شان تنگ (Shan Tung) کے ایک حصہ کا الحاق کر لیا۔ اسی کے ساتھ روس نے جزیرہ نما لیاؤٹنگ (Liao Tung) چھین لیا۔ اور چین کو ڈرا کر اس پر مجبور کیا کہ ماسکو، سائبیریا ریلوے لائن کو چین کے بندرگاہ آرتھر تک لے جانے کی اجازت دے دے۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں اس نے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ اس دوڑ میں کب پیچھے رہتا چنانچہ اس نے وائی ہائی وائی پر زبردستی قبضہ کر لیا۔

اس اقدام سے جاپان کے حکمرانوں کو جو توسیع کے خواب دیکھ رہے تھے سخت دھکا پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ ایشیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کی ابتدا ثابت ہوئی۔ یورپی طاقتوں کے گھمنڈ پر ایک کاری چوٹ لگی۔ روسی عوام کا اس توسیع پسندی سے کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ اس کا سارا بوجھ ان ہی پر تھا اور وہ اس پر سخت برہم تھے صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے دانش مند سیاست داں بھی اس کے خلاف تھے لیکن مالدار سٹے بازوں کا ایک گروہ زار کو گھیرے ہوئے تھا جس میں اس کے قریبی قرابت دار اور بڑے امیر بھی شامل تھے۔ وہ منچوریا کی لوٹ کے خواب دیکھ رہے تھے اور وہ پوری طرح اس مہم پسندی میں ملوث ہو چکے تھے۔ اس خطرناک مہم سے علاحدہ ہونا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

جنگ روس و جاپان

۱۹۰۴ء کی ابتدا میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ جاپان اس کے لیے پوری طرح تیار تھا اور جاپانی لوگ اپنی حکومت کے پروپگنڈہ اور شہنشاہ پرستی کے اپنے مسلک کے باعث جوش و خروش کے ساتھ اس میں شریک تھے۔ روس اس کے برخلاف بالکل تیار نہیں تھا۔ جابر و ظالم زارشاہی صرف جبر و تشدد کے ذریعہ ہی عوام کو اس جنگ میں کھینچ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ فوجوں کی رہنمائی بھی نااہل جنرلوں کے ہاتھ میں تھی۔ لوٹ اور بے ایمانی عام تھی۔ اس لیے فوج کو رسد بھی ٹھیک طرح نہیں پہنچ رہی تھی جنگ بڑی شدت کے ساتھ ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ ایثار و قربانی کے حیرت انگیز کارناموں اور غیر معمولی کشت و خون کے بعد بندرگاہ آرتھر دوبارہ جاپانیوں کے قبضہ میں آ گیا۔

روس نے جنگی جہازوں کا ایک بڑا بیڑا یورپ سے طویل راستہ طے کروا کے مشرقِ بعید کی طرف روانہ کیا تھا لیکن دنیا کا نصف حصہ طے کر کے اور ہزاروں میل کے سمندری سفر کے بعد یہ عظیم الشان بیڑا جب بحرِ جاپان میں پہنچا تو جاپان اور کوریا کے درمیان واقع تنگ آبنائے توشیما میں جاپانیوں نے اسے اس کے امیر البحر کے ساتھ غرق کر دیا۔ اس تباہ کن شکست نے روس کے عوام میں غصہ کی لہر دوڑا دی۔ جگہ جگہ بغاوتیں ہونے لگیں اور اس ابھرتی انقلابی تحریک نے زار کو جنگ بند کر دینے پر مجبور کر دیا (۱۹۰۵ء)۔

معاہدہ پورٹسمتھ (Ports Mouth)

ستمبر ۱۹۰۵ء میں پورٹس متھ کے مقام پر ایک معاہدہ ہو گیا جس کے ذریعہ روسی، جاپانی جنگ کا خاتمہ ہوا۔ صدر امریکہ نے دونوں فریقوں کو دعوت دی اور معاہدہ امن پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ جاپان کو بالآخر بندرگاہ آرتھر اور جزیرہ نمائے لیاؤتنگ (Liaotung) مل گیا۔ جزیرہ سگھالین (Sagbalien) کا جنوبی نصف حصہ جو جاپان کے شمال میں واقع تھا اور جس پر ۱۸۷۵ء میں روس نے قبضہ کر لیا تھا زار نے واپس کر دیا منچوریا کا تخلیہ کر دیا گیا اور روس جاپان کے حق میں کوریا پر سے اپنے تمام مطالبات سے دست بردار ہو گیا۔ روسیوں نے منچوریا میں جو ریلوے تعمیر کی تھی اس کا ایک بڑا حصہ بھی جاپان نے لے لیا۔ روس پر فتح کے بعد جاپان مشرق میں ایک بڑی طاقت بن گیا اور اس نے آگے چل کر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو اس نے کوریا پر سیاسی کنٹرول قائم کیا اور پھر ۱۹۰۹ء میں اس پر پورا قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی اور یورپ کی تمام بڑی طاقتیں اور پھر امریکہ اس میں بری طرح الجھ گئے تو جاپان نے اس سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ برطانیہ کے حلیف کی حیثیت سے وہ اس جنگ میں شریک ہو گیا لیکن اس کا کارنامہ صرف اس حد تک محدود رہا کہ بحرالکاہل اور چین کے جرمن مقبوضات اس نے ہتھیا لیے اور جب چین نے احتجاج کیا تو پھر جاپان نے ایک ۲۱ نکاتی مطالبہ پیش کر دیا اور چین کو مجبور کیا کہ نہ صرف منچوریا میں جاپانی عمل دخل کو بڑھنے کی اجازت دے بلکہ وسطی چین میں بھی لوہے کی صنعت میں جاپان کی حصہ داری قبول کرے۔

جاپان اور مغرب کے تعلقات

جاپان کے بڑھتے ہوئے فوجی اور معاشی اثر نے مغربی طاقتوں کو اور خاص طور پر امریکہ کو پریشان کر دیا اس لیے کہ ان ملکوں کے چین اور مشرقِ بعید میں کئی مقبوضے تھے۔ ان کا کافی سرمایہ لگا ہوا تھا چنانچہ ان سب نے جاپان کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ آخر کار برطانیہ، فرانس، امریکہ اور جاپان کے درمیان معاہدہ طے پایا جس کی رو سے ہتھیاروں پر پابندی لگائی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ آئندہ جاپان، برطانیہ کے پانچ بڑے بحری جہازوں کے مقابلہ میں تین سے زیادہ نہیں رکھ سکے گا۔ ساتھ ہی جاپان کو چین کے شانتنگ صوبہ

سے جو اس نے جرمنوں سے ہتھیایا تھا، ہاتھ دھونا پڑا۔ اسے سائبیریا کے علاقے اور جزیرہ سکھالین سے بھی ہٹنا پڑا۔

سیاسی تبدیلیاں

جاپان میں بادشاہی مطلق العنانی کی جگہ آئینی حکومت ۱۸۹۰ء میں قائم ہو گئی تھی شروع میں شاہی عناصر اور فوجوں کا اثر و رسوخ بہت تھا لیکن جیسے جیسے جاپان صنعتی طور پر ترقی کرنے لگا، تجارت بڑھنے لگی، تو ایک بڑا سرمایہ دار اور تاجر طبقہ پیدا ہو گیا جو سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشاں تھا۔ جاپان کا طاقتور شہنشاہ می جی ۱۹۱۲ء میں فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ ۱۹۲۶ء تک اس کا بیٹا حکمراں رہا جو بہت کمزور تھا۔ اس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی چنانچہ اس سے فائدہ اٹھا کر ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے اور اس کی پارٹیوں نے زور دکھایا اور آخرکار ۱۹۲۴ء میں اس نے فوج اور نوکر شاہی کی طاقت توڑنے میں کامیابی حاصل کر لی اور محدود حق رائے دہی کو بڑھا کر ایک کروڑ ۴۰ لاکھ باشندوں تک پھیلا دیا۔

جب تجارت اور صنعت بڑھ رہی تھی تو مزدوروں کی تعداد، ان کی تنظیمیں، ہڑتالیں سب ہی کچھ ان کے جلو میں آئیں۔ روس تو پڑوس ہی میں تھا۔ وہاں کے انقلاب کا اثر پڑنا بھی لازمی تھا چنانچہ سوشلزم اور کمیونزم کے خیالات اور ان کی تنظیمیں بھی ابھرنے لگیں مغرب سے بڑھتے ہوئے تعلقات اور مغربی تعلیم نے بھی یہاں کی سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور روشن خیالی نئے نئے راستوں سے داخل ہونے لگی اسی کے ساتھ حکومت اس دھارے کو روکنے کے لیے نئے نئے قوانین بنانے لگی۔ پولیس اور خفیہ پولیس منظم ہونے لگی۔ جبر کو اندرونی پالیسی میں اہم مقام ملنے لگا۔

نئی بورژوا حکومت، جو نوکر شاہی اور فوج کے خلاف مورچہ لے کر طاقت میں آئی تھی۔ اس نئے سماجی ابھار، بڑھتے ہوئے معاشی مسائل، دنیا کی منڈیوں میں یورپی اقوام سے سخت مقابلہ کے سامنے پیچھے کی طرف ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں مغربی یورپ اور امریکہ میں جو زبردست معاشی بحران شروع ہوا اس نے جاپان کو بھی گھیر لیا اور اب یہ خیال بہت منظم طور پر پھیلایا جانے لگا کہ جاپان کے مسائل اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے جزیرے کی حدود کو توڑ کر باہر نکلے اور دوسرے علاقے فتح کرے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ ۱۸۹۰ء میں جاپان کی آبادی تین کروڑ تھی اور چالیس سال بعد یعنی ۱۹۳۰ء میں وہ ساڑھے چھ کروڑ تک پہنچ چکی تھی مغربی طاقتوں نے مختلف معاہدوں اور قوانین کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں جاپانی آباد کے داخلے اور بسنے پر سخت پابندیاں لگا دی تھیں اور اتنی بڑی آبادی کے لیے غذا اور کارخانوں کے لیے کچا مال درآمد کرنا جاپان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

ان معاشی اور سیاسی اسباب کے ساتھ فوج میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ فوجی افسر جن کی طاقت کم ہو گئی تھی وہ بھی اس سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یورپ اور خاص طور پر جرمنی میں انتہا پسندانہ قوم پرستی یا فاشزم کے ابھار اور اس کی کامیابیوں نے یہاں بھی اس جذبہ کو ہوا دی۔ پوری فضا اس کے لیے تیار تھی چنانچہ کئی فاشسٹ پارٹیاں اور گروپ ابھرنے لگے جن کا نعرہ تھا کہ اپنے ملک کو بیرونی آلودگیوں سے پاک رکھو اور جاپان کی حدیں وسیع کرو۔ کئی اعتدال پسند فاشسٹ دشمن سیاست داں کھلے عام قتل کر دیے گئے۔ فوج میں فاشسٹوں کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا۔ ان بڑھتی تحریکوں اور معاشی بحران کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیویلین حکومتیں بے اثر ہونے لگیں اور فوجی افسر بے دھڑک اپنے آپ اقدامات کرنے لگے۔ منچوریا میں انھوں نے وہاں کے حکمراں کو قتل کروا دیا اور حکومت کچھ نہ کر سکی۔ دو تین دفعہ مارشل لا نافذ کروانے کی کوشش کی گئی۔ کئی وزیروں کو قتل کر دیا گیا اور فاشسٹ اور فوجی جنتا پر کامیابی کے بعد کئی مراعات حاصل کر لیں چنانچہ یہ قدم بہ قدم پہلے منچوریا اور پھر چین میں اشتعال انگیزی کرتے اور پھر فوجی اقدامات کو تیز کرتے جاتے۔ باہر کی دنیا جمعیتہ اقوام میں تجویزیں پاس کی جاتی لیکن کسی سخت فوجی اقدام کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔

۱۹۳۷ء میں جاپانی فوجوں نے چین پر باقاعدہ چڑھائی کر دی۔ وسطی چین میں نانکنگ، ہنکو، کینٹن وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۴۰ء میں اپنے پٹھوؤں کی حکومت نانکنگ میں قائم کر دی۔

۱۹۳۶ء میں جاپان نے ہٹلر کے ساتھ مخالف کومنٹرن معاہدہ کر لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد ۱۹۴۰ء میں اس کی جگہ تین ملکوں یعنی جرمنی، جاپان، اور اٹلی کے معاہدے نے لے لی۔ اس کے ذریعہ جاپان کو ایشیا کا لیڈر تسلیم کر لیا گیا جاپان نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کرے گا جو مغربی ملکوں سے آزاد ہوگا اس میں جاپان ایک بڑا صنعتی مرکز ہوگا اور اس میں جاپان کے جزیروں کے علاوہ منچوریا کوریا اور شمالی چین شامل ہوں گے۔ جاپان کا نعرہ تھا "ایشیا، ایشیا والوں کے لیے" عملاً اس کی معنی تھے "ایشیا جاپان کے لیے"۔

دوسری جنگ عظیم

۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے یورپ میں لڑائی شروع کی اور دو ہی سال کے اندر سارا یورپ اس کے قدموں تلے تڑپنے لگا۔ امریکہ کو بھی ساری توجہ یورپ کی طرف مبذول کرنی پڑی چنانچہ ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے امریکہ کو بات چیت میں الجھا کر یکایک پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ وہاں مقیم امریکی بیڑے کو تباہ کر دیا۔ اور ایک سال کے اندر منیلا، سنگاپور، ہند چینی، برما اور انڈونیشیا وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور مشرق بعید میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس اور ہالینڈ وغیرہ کے مقبوضات ہتھیا لیے لیکن کامیابی کا یہ نشہ بہت دن طاری نہ رہ سکا۔ امریکہ نے اپنے بحری بیڑے کو منظم کر کے جوابی حملے کی تیاری شروع کی۔ جون ۱۹۴۲ء میں پہلا جوابی حملہ ہوا جس سے جاپانی بحری بیڑے کو کافی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد پسپائی کا سلسلہ رکا نہیں۔ آخرکار ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے ہیروشیما پر اور ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو ناگاساکی پر ایٹمی بم گرائے جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے نہ صرف سارے مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بلکہ خود جاپان میں امریکی فوجیں اتر گئیں۔

جنگ کے بعد

پوٹسڈم کی کانفرنس کے بعد اسٹالن، ٹرومن، چرچل اور ڈی گال نے مشرق بعید کے بارے میں جو اعلان نامہ جاری کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ جاپان میں پوری طرح جمہوری نظام قائم کیا جائے گا جس میں ہر شخص کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے ۲۹ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ کی طرف سے، جس کا اب جاپان پر فوجی کنٹرول تھا، یہ اعلان کیا گیا کہ اب ایسے جاپان کی تعمیر کی جائے گی جو کبھی بھی امریکی مفادات یا دنیا کے امن کے لیے خطرہ نہیں بن سکے گا اور وہاں ایسی جمہوری حکومت قائم کی جائے گی جو اقوام متحدہ کے منشور کی ہر طرح تائید کرے گی۔ اسے پوری طرح غیر مسلح کر دیا جائے گا۔ اس کا علاقہ صرف اس کے اپنے چاروں جزیروں تک محدود ہوگا۔ اور اس کے اندر فوجی یا مسلح گروہوں کو طاقت حاصل کرنے کی کبھی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جنرل ڈگلس میک آرتھر اتحادیوں کا سپریم کمانڈر مقرر کیا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ مشرق بعید کا ایک کمیشن بنایا جائے گا جس میں مشرق بعید کے تمام اتحادی ملک شریک ہوں گے جو میک آرتھر کے

لیے عام پالیسیاں مرتب کرے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور کونسل سویت یونین، چین، برطانوی کامن ویلتھ کے نمائندوں اور سپریم کمانڈر انچیف پر مشتمل ہوگی جو روزمرہ کے کاموں میں مشورے دے گی۔

جاپان کے مستقبل کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ نہ صرف جاپان کی آئندہ ہتھیار بندی پر پابندی لگائی جائے گی بلکہ معاشی زندگی میں بھی ایسی تبدیلیاں کی جائیں گی کہ جس سے جنگ پسند معاشی مفادات ترقی نہ پا سکیں چنانچہ یہ طے کیا گیا تھا کہ زائی بتو جیسی اجارہ دار کمپنیوں کو اور معیشت سے اجارہ داری کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔

عملاً جاپان پر میک آرتھر اور امریکہ کا کنٹرول رہا اور اس نے اتحادیوں کی تمام تجاویز کو بالائے طاق رکھ دیا۔ معاشی میدان میں ایسی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنایا جس سے ایک ایسا سماجی نظام ترقی کر سکے جو امریکہ کے معاشی نظام سے مختلف نہ ہو اور دونوں کا قریبی تعلق رہ سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں ۱۲۸۰ اجارہ دار کمپنیوں کی فہرست بنائی گئی تھی جنہیں توڑنا تھا لیکن ان میں سے صرف نو کو توڑا گیا۔ صنعتوں میں بڑے پیمانے پر امریکی سرمایہ داخل ہونے لگا جس نے مشترکہ اجارہ دار کمپنیوں کے لیے راستہ کھول دیا۔ زراعت میں بڑی زمینداریاں توڑ دی گئیں لیکن زمین ان پر کاشت کرنے والوں کو نہیں دی گئی۔ بلکہ مالدار کسانوں میں تقسیم ہوگئی۔ سیاسی طور پر کیمونسٹ اور بائیں بازو کی دوسری پارٹیوں کو سختی سے دبایا گیا۔

۱۹۵۲ء میں جاپان ایک آزاد ملک بن گیا۔ اسی زمانے میں کوریا میں جنگ چل رہی تھی۔ امریکہ اس میں پوری طرح ملوث تھا۔ امریکہ کی سرگرمیوں کا مرکز جاپان تھا اس نے وہاں کی معیشت کو زبردست مدد دی چنانچہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک جاپان نے صنعتی میدان میں بڑی زبردست ترقی کی، اتنی کہ اس کی مثال مغرب کے کسی ملک میں بھی نہیں ملتی۔ اس نے انتہائی ترقی یافتہ تکنیک کو ترقی دینے پر زور دیا۔ اس کے لیے ایشیا کا مارکٹ ناکافی تھا۔ اسے یورپ اور خاص طور پر امریکہ کی منڈیوں تک بڑے پیمانے پر پہنچنا ضروری تھا چنانچہ امریکہ کے ساتھ حصہ داری بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ نقل وحمل کے وسائل، خاص طور سے تیل، کچا مال وغیرہ درآمد کرنے کے لیے بڑے جہازوں کی ضرورت بڑھی اور اس طرح ہر میدان میں جاپان نے زبردست ترقی کی۔

جاپان نے اسی کے ساتھ آہستہ آہستہ ایشیا اور خاص طور سے سوشلسٹ ملکوں سے بھی تجارتی تعلقات بڑھانے شروع کیے۔ ۱۹۷۱ء سے امریکہ کے معاشی بحران نے جاپان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ صرف امریکہ پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک اس کی معاشی اور سیاسی پالیسی پوری طرح امریکہ سے مربوط تھی لیکن اب ایک آزاد پوزیشن حاصل کرنے کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ ۱۹۷۲ء سے فوجی اخراجات میں زبردست اضافہ کیا جانے لگا اس لیے کہ محض امریکی فوج پر تکیہ کر کے آزادی کے خواب نہیں دیکھے جا سکتے۔ چین سے بڑھتے ہوئے امریکی تعلقات نے بھی اسے نئے ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور کیا۔ صدیوں سے امریکہ اور چین، جاپان کے خلاف حلیف رہے جاپان نے بھی اب چین سے ایک طرف اور سویت یونین سے دوسری طرف تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔

سیاسی طور پر ۱۹۵۶ء سے ایک ہی پارٹی یعنی دائیں بازو کی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت رہی۔ لیکن سوشلسٹ پارٹی اور بعد میں کیمونسٹ پارٹی کا بھی کافی اثر بڑھا۔ ہر سال ان کی تعداد پارلیمنٹ میں بڑھتی گئی۔ ٹریڈ یونین تحریک جو پوری طرح سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کے اثر میں ہے، بہت طاقت ور بن چکی ہے۔ اور خود لبرل ڈیموکریٹک پارٹی سخت اندرونی بحران سے گزر رہی ہے۔ آئندہ چند سال جاپان کی اور اس طرح مشرق بعید کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے۔

تاریخ ریاست ہائے متحدہ امریکہ

شمالی امریکہ کی ابتدائی تاریخ پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ قیاس ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ یعنی آخری برفانی دور میں آب نائے بیرنگ کے ذریعہ شمالی امریکہ براعظم ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں ایشیا سے کچھ لوگ ہجرت کر کے جزائر الاسکا میں آباد ہوئے۔ پھر ان جزائر سے کچھ زیادہ گرم علاقوں کی جانب بڑھے اور وہیں ان کی نسلیں پھلیں پھولیں۔ امریکہ کے اصلی باشندے جنہیں "سرخ ہندوستانی" (Red Indian) کہا جاتا ہے دراصل ان ہی مہاجرین کی اولاد ہیں۔

۱۰۰۰ء میں لیف ایرکسن نے شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل پر قدم رکھا تھا۔ گرین لینڈ اور وِن لینڈ میں ایرکسن اور اس کے ساتھیوں نے کالونی بھی قائم کی تھی۔ امتداد زمانہ سے تباہ ہوگئی۔ پہلی تاریخی شخصیت اطالوی باشندہ کرسٹوفر کولمبس کی ہے جس نے ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو سرزمین امریکہ پر قدم رکھا۔ ۱۵۰۱ء میں ایک اور اطالوی سیاح "امریگو ویسپاسی" نے برازیل کی سیاحت کی۔ اس نے اپنے حالات سفر اس تفصیل سے لکھے کہ اس کی شہرت کولمبس سے بھی زیادہ ہوگئی اور اس نئے براعظم کو اسی کے نام پر "امریکہ" کہا جانے لگا۔

امریکہ کو دریافت ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یورپ کے مختلف ممالک کے لوگ خاص طور پر انگریز اور ولندیزی نقل وطن کر کے یہاں آنے اور آباد ہونے لگے اپنے وطن میں مذہبی آزادی نہ ملنے کے باعث اکثر لوگوں نے ترک وطن کر کے امریکہ میں پناہ لی۔ قرض خواہوں اور ساہوکاروں کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے لیے بھی امریکہ اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا۔ ان دو قسموں کے علاوہ نقل وطن کر کے امریکہ آنے والے افراد میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو سونے چاندی کی تلاش اور سنہرے مستقبل کی خواہش میں یہاں آئے تھے۔ یہ دولت مند اور مغرور خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ امریکہ میں "ورجینیا" نامی پہلی کالونی کی بنیاد انگلستان کی کنواری ملکہ کے نام پر سر والٹر ریلے نے ۱۵۸۵ء میں ڈالی۔ ورجینیا کمپنی نے جیمس ٹاون نامی دوسری کالونی کی بنیاد ۱۶۰۷ء میں ڈالی جب انگلستان میں مذہبی ایذا رسانی کا جنون حد سے بڑھ گیا تو سو افراد پر مشتمل ایک "قافلہ" "مے فلاور" نامی جہاز پر امریکہ آیا۔ یہ لوگ "زائرین" کے نام سے موسوم ہیں۔ انہوں نے میساچوسٹس کی نو آبادی کی بنیاد ڈالی۔ اسی زمانہ کی مشہور بحری طاقتیں، انگلستان، فرانس، اسپین اور ہالینڈ براعظم امریکہ کو نقل وطن کرنے والوں کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی اولوالعزم ہستیوں نے نو آبادیوں کے قیام میں حصہ لیا چنانچہ ولیم پن نے پنسلوانیا، جیمس اوگلے تھارپ نے جارجیا، بالٹی مور نے میری لینڈ، ولندیزیوں نے نیو امسٹرڈم، ڈیلیویر نے نیو جرسی

روجر ولیمس نے ہوڈ آئی لینڈ کے بسانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۷۷۶ء کے اختتام تک حسب ذیل تیرہ ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔

۱۔	ورجینیا	۱۶۰۷ء
۲۔	نیو یارک	۱۶۱۴ء
۳۔	میساچوسٹس	۱۶۲۰ء
۴۔	نیو ہمپ شائر	۱۶۶۳ء
۵۔	میری لینڈ	۱۶۳۴ء
۶۔	کنکٹی کٹ	۱۶۳۵ء
۷۔	رہوڈ آئی لینڈ	۱۶۳۶ء
۸۔	ڈیلویر	۱۶۳۸ء
۹۔	شمالی کیرولینا	۱۶۵۰ء
۱۰۔	نیو جرسی	۱۶۶۴ء
۱۱۔	جنوبی کیرولینا	۱۶۷۰ء
۱۲۔	پنسلوانیا	۱۶۵۳ء
۱۳	جارجیا	۱۶۳۳ء

گو مذکرہ بالا نو آبادیاں قوم، مذہب اور اعتقادات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں، لیکن یہ تمام برطانوی حکومت کے زیر اقتدار تھیں۔ ہر ریاست میں مجالس قانون ساز قائم تھیں جن کے اراکین، ریاست ہی کے باشندے ہوتے تھے مگر ریاست کا حاکم اعلیٰ یعنی گورنر انگلستان سے آتا تھا۔

یورپ کی لڑائیوں کا اثر امریکہ پر پڑنا لازمی تھا۔ ۱۶۸۹ء سے لے کر ۱۷۶۳ء تک انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے سے لڑائی میں مصروف رہے۔ ان لڑائیوں میں امریکہ کے دیسی ہندوستانی باشندے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں کی امداد کر رہے تھے۔ اس لیے یہ جنگیں "فرانسیسی ہندوستانی" جنگوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ان لڑائیوں میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ فرانسیسیوں سے انہوں نے اکاڈیا، نیو فاؤنڈلینڈ اور خلیج ہڈسن حاصل کر لیا جس کے بعد فرانسیسی اقتدار کا شمالی امریکہ میں بالکل خاتمہ ہو گیا ۱۷۶۳ء کے صلح نامہ کے بعد فرانسیسیوں نے انگریزوں کو کینیڈا، وادی اوہیو اور خلیج سینٹ لارنس کا تمام علاقہ حوالہ کر دیا اور اسپین کو "لاوزینا" اور "نیو آرلینس" کے علاقے ملے۔ اسپین سے انگلستان نے سودا کر کے فلوریڈا کا علاقہ لے لیا اور اس کے معاوضہ میں اسپین کو کیوبا اور فلپائن کے علاقے دے دیے گئے۔

فرانس کے خلاف انگریزوں کی لڑائی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف امریکہ میں اپنی سلطنت کو محفوظ بنایا جائے اور دوسری طرف اس کو وسعت دی جائے لیکن نتیجہ اس کا بالکل الٹا نکلا۔ فرانس کو شکست دے کر برطانیہ نے ان عناصر کو ختم کر دیا جن کی بدولت سلطنت کے اندر اتحاد قائم تھا۔ اور یہ اتحاد اس لیے قائم تھا کہ سب کے مفادات یکساں تھے اور سب کا دشمن ایک ہی تھا۔ انگلستان اور اس کی نوآبادیات کی ایک مشترکہ منڈی تھی اور اس سے دونوں علاقوں کے لوگوں کو فائدہ پہنچتا تھا اس کے ساتھ برطانوی نوآبادیات کے اطراف فرانسیسی اور اسپینی نوآبادیات کی موجودگی سے انگلستان اور امریکہ دونوں کے فوجی اور معاشی مفادات کا انحصار ایک دوسرے پر تھا۔ ۱۷۶۰ء میں فرانسیسی نوآبادیات کے خاتمہ سے یہ توازن درہم برہم ہو گیا اور برطانیہ اور اس کی مختلف نوآبادیات کے درمیان مختلف معاشی مسائل پر آئے دن اختلافات بڑھنے لگے۔ ہر طرف لوگ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ اور "شاہی قانون" کی اپنے مفاد کے مطابق توضیح کرنے لگے۔ تقریباً تیرہ سال تک یہ جنگ چلتی رہی اور آخر کار پر امن طریقہ پر یہ بحث جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔

جنگ آزادی

فرانس سے جنگ کے وقت امریکہ کی تیرہ نوآبادیاں متحد ہو گئی تھیں اور اس اتحاد نے ان میں قومیت و آزادی کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا تھا۔ جب کینیڈا کی فتح میں جو اخراجات ہوئے تھے اس کو پورا کرنے کے لیے حکومت انگلستان نے امریکی ریاستوں پر ٹیکس عائد کرنا چاہا اور پارلیمنٹ نے "اسٹامپ ایکٹ" منظور کیا تو امریکی باشندوں نے سخت احتجاج کیا اور سارے ٹکٹ سر راہ جلا دیے گئے۔ حکومت انگلستان نے ان نئی ریاستوں کی حفاظت کے لیے مزید فوج بھجوانی چاہی تو امریکی باشندوں کو اس فوج کا آنا بھی پسند نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انگلستان نوآبادیوں پر اپنا اقتدار اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ پر نوآبادیوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ امریکی نمائندوں کی منظوری کے بغیر پارلیمنٹ کو کسی قسم کا ٹیکس عائد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور یہ نعرہ بلند ہوا کہ "نمائندگی کے بغیر محاصل عائد نہ کیے جائیں۔" یہ مطالبہ اتنی شدت اختیار کر گیا کہ برطانوی پارلیمنٹ نے نوآبادیوں پر کے تمام محاصل سوائے چائے کے محصول کے معاف کر دیے لیکن امریکیوں نے اس معمولی محصول کی ادائیگی سے بھی صاف انکار کر دیا اور انگلستان سے آنے والے چائے سے لدے ہوئے جہاز بوسٹن کی بندرگاہ میں پڑے سڑتے رہے اور چائے کی پیٹیوں کو امریکی سرزمین پر اتارا نہ جا سکا بوسٹن کے چند محب وطن باشندے سرخ ہندوستانی مزدوروں کا بھیس بدل کر ایک رات ان جہازوں پر چڑھ گئے اور انہوں نے ساری چائے سمندر میں پھینک دی تاریخ میں ۱۷۷۳ء کا یہ واقعہ "بوسٹن چائے پارٹی" کے نام سے مشہور ہے اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور برطانوی وزیر اعظم لارڈ بروک نارتھ نے ان نئے آبادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فلاڈلفیا کے مقام پر تیرہ نوآبادیوں کے نمائندوں کی کانگریس ۵ ستمبر ۱۷۷۴ء کو منعقد ہوئی تاکہ شاہ برطانیہ سے امریکی مطالبات پر ہمدردانہ غور کی درخواست کی جائے۔ لیکن جب برطانوی گورنر نے لکسنگٹن کے مقام پر شہریوں کے ایک چھوٹے سے مجمع پر گولی چلائی تو گویا امریکہ کی جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا۔ فلاڈلفیا کے مقام پر جلد دوسری بر اعظمی کانگریس منعقد ہوئی جس نے متفقہ طور پر جارج واشنگٹن کو امریکی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس موقع پر انگلستان کے پرانے دشمن فرانس نے نہایت جوش و خروش سے امریکی ریاستوں کی مدد پر آمادگی ظاہر کی۔ ۱۷۷۹ء میں اسپین بھی انگریزوں کے خلاف اس جنگ میں امریکیوں کا مددگار بن گیا۔ ۱۷۸۰ء میں ہالینڈ بھی انگریزوں کے خلاف اس جنگ میں امریکیوں کے ساتھ ہو گیا۔ روس نے غیر جانب دار ہونے کا اعلان کیا۔

۱۷۷۸ء میں انگریزی فوج فلاڈلفیا خالی کر کے پیچھے ہٹ آئی اوہیو وادی کے علاقے میں امریکن اور انگریزی افواج کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ ان جنگوں میں انگریز افواج ہار گئیں۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی بحری بیڑے نے انگلستان کے جنگی جہازوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ اور ان کی جنگی قوت کو بہت کمزور کر دیا۔ شمالی امریکہ میں انگریزوں اور امریکیوں کے مابین آخری زبردست معرکہ مار ماؤتھ کے مقام پر ۱۷۷۸ء میں ہوا۔ آخر کار جب یارک ٹاؤن میں واشنگٹن اور لیفیٹ نے انگریز سپہ سالار لارڈ کارنوالس کا محاصرہ کر لیا تو کارنوالس نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دئے۔ اور ۳ ستمبر ۱۷۸۳ء کو انگلستان اور امریکہ کے درمیان

صلح ہوگئی۔ اور حکومت انگلستان نے تیرہ ریاستوں کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ فلاڈلفیا کے مقام پر ۲۵ مئی ۱۷۸۷ء کو ان تیرہ ریاستوں کے نمائندوں کا اجلاس اس غرض سے منعقد ہوا کہ ان ریاستوں کے لیے ایک وفاقی حکومت کے قیام کے امکانات پر غور کیا جائے۔ اجلاس میں شریک مندوب سب کے سب قابل تجربہ کار اور بے حد ذہین تھے جنہوں نے کافی مباحثوں کے بعد ایک وفاقی دستور مرتب کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نام سے ایک نئی مملکت عالم وجود میں آئی اس مملکت یا وفاقی حکومت میں تیرہ ریاستیں شریک تھیں۔ ۱۷۸۹ء میں اس وفاقی جمہوری حکومت کے پہلے صدر جارج واشنگٹن اور نائب صدر جان آدم منتخب ہوئے۔ یہ وفاقی حکومت ایک صدر ایک کانگریس اور ایک وفاقی عدالت پر مشتمل تھی جلد ہی اس نئی حکومت کی طاقت کی آزمائش کا وقت آگیا پنسلوانیا کے کسانوں نے ۱۷۹۴ء میں دیسی شراب پر عائد کردہ نئے محصول کے خلاف بغاوت کردی لیکن نئی حکومت نے بہت جلد اس بغاوت پر قابو پالیا۔ اور حالات پرسکون ہوگئے۔ اس زمانہ میں نوآبادیوں کی توسیع مغرب کی جانب بہت تیزی سے ہورہی تھی۔ ۱۷۹۰ء تک کوہ اپلاشین کے دونوں جانب نئی نئی ریاستیں قائم ہورہی تھیں اور دو سیاسی پارٹیاں بھی وجود میں آگئی تھیں۔ ایک وفاقی پارٹی دوسری جمہوریت پسند پارٹی۔

جارج واشنگٹن دوسری بار صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ ان کے بعد ۱۷۹۷ء میں جان ایڈمس (Adams) صدر ہوئے۔ ۱۸۰۰ء میں صدارت کا منصب جیفرسن کو ملا ان کے دور صدارت کا مشہور کارنامہ لوزیانا کے علاقہ کی خریداری ہے۔ فرانس سے اس علاقہ کی خریداری کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اتنا بڑا علاقہ شامل ہوگیا جو پہلے علاقہ سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں جیفرسن دوبارہ صدر چنے گئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تیسرے صدر جیمس میڈیسن منتخب ہوئے۔

۱۸۱۲ء – ۱۸۱۴ء کی جنگ

جیمس میڈیسن ۱۸۱۲ء میں دوبارہ صدر امریکہ چنے گئے۔ اس زمانہ میں فرانس اور انگلستان کے مابین جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ان دونوں ملکوں نے سمندر میں دوسرے ملکوں کے جہازوں کی آمد و رفت میں رکاوٹیں پیدا کرکے ان کی تجارت کو ختم کردیا تھا۔ اس صورت حال سے امریکہ کی تجارت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا تھا چنانچہ امریکہ نے انگلستان کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ امریکی افواج نے جنرل ہیریسن کی ماتحتی میں کناڈا پر حملہ کردیا۔ دریائے تھامز کی جنگ میں امریکیوں کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ امریکی جنرل پیری نے ۱۸۱۳ء میں جھیل ایری کے پاس انگریزوں کے خلاف بحری جنگ میں کامیابی حاصل کی جس سے امریکیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ جب انگلستان سے مزید بحری کمک پہنچ گئی تو انگریزوں نے واشنگٹن کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن انگریزی افواج کی پیش قدمی یہیں روک دی گئی۔ نیو آرلینس کے نزدیک جنوبی ریاستوں کے فوجی کمانڈر اینڈریو جیکسن نے برطانوی افواج سے کئی جنگیں کیں اور بالآخران پر فتح حاصل کی۔ آخر کار انگریزوں اور امریکیوں کے مابین ۱۸۱۴ء میں صلح ہوگئی۔ اس جنگ کے بعد انگریز اور امریکی پھر کبھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما نہیں ہوئے۔

امریکہ خانہ جنگی سے پہلے

۱۸۱۶ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۸۲۰ء میں دوسری مرتبہ جیمس منرو صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ ان کے دور صدارت میں تین نئی ریاستیں یعنی لوزیانا انڈیانا اور مسوری امریکی وفاق میں شامل ہوگئیں۔ منرو نے ۱۸۱۹ء میں اسپین سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے فلوریڈا کا علاقہ حاصل کرکے ٹیکساس حکومت اسپین کو دے دیا گیا۔ ۱۸۲۳ء میں جیمس منرو نے وہ مشہور دستاویز مرتب کی جسے "منرو اصول" کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اس نے جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں کی آزادی کو تسلیم کرلیا اور اسی وقت اس نے اعلان کیا کہ امریکہ کے براعظموں کو "آئندہ کوئی یورپی طاقت آباد کاری کا مقام نہ سمجھے" ۱۸۲۴ء میں جان کوئنسی، صدر امریکہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۸۲۸ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۸۳۲ء میں دوسری مرتبہ اینڈریو جیکسن صدر امریکہ بنے۔ جیکسن نے حکومت کا سارا سرمایہ یو ایس بنک سے نکلوالیا کیوں کہ اس بنک کے کاروبار سیاست کو متاثر کر رہے تھے۔ وان بیورن ۱۸۳۶ء میں صدر امریکہ چنے گئے انہوں نے حکومت کے سرمایہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک باضابطہ خود مختار خزانہ کا طریقہ رائج کیا اور سرمایہ کو بنک میں جمع رکھوانے کی سابقہ روایت کو ختم کردیا۔ ۱۸۴۴ء میں جیمس کے۔ پولک صدر ہوئے۔ انہوں نے کئی مسائل ختم کر دئے حکومت انگلستان سے ایک معاہدہ کرکے تقریباً تیس ہزار مربع میل کا علاقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شامل کرلیا اس کے معاوضہ میں انگلستان کو کناڈا اور جزیرہ وینکوور دے دئے۔ ۱۸۴۶ء میں میکسیکو سے سرحدات معین کرنے کے سلسلہ میں جنگ چھڑ گئی حکومت میکسیکو نے شکست کھاکر ۱۸۴۸ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے صلح کرلی۔ صلح نامہ کی رو سے امریکہ کو کیلی فورنیا نیواڈا، نیومیکسیکو کا کچھ علاقہ یوٹا اری زونا اور کولوراڈو کے نئے علاقے حاصل ہوگئے۔ اسی دوران کیلی فورنیا میں سونا برآمد ہوا اور دو سال کے اندر اس ریاست کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہوگئی۔ ۱۸۴۸ء میں ٹائلر صدر امریکہ بنے لیکن ان کے انتقال کے باعث ۱۸۴۹ء میں نائب صدر ملارڈ فل مور ان کے جانشین ہوئے فرینکلن پیرس ۱۸۵۲ء میں صدر چنے گئے۔

۱۹ ویں صدی کے وسط میں امریکہ میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے کافی طویل عرصہ تک وہ سخت سیاسی بحران کا شکار رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ۱۹ ویں صدی کے شروع کے دور میں امریکہ ایک ملک تو تھا لیکن ایک قوم نہیں بنا تھا حکومت کے اہم کاروبار مثلاً تعلیم صحت وسائل نقل و حمل اور نظم و نسق، ہر ریاست خود کرتی تھی۔ اور بعض جگہ انتظام مقامی حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ واشنگٹن کی مرکزی حکومت کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ کچھ سیاسی پارٹیاں اور چند کلب سب ریاستوں کے لیے مشترک تھے۔ اور اس پر اور بانی ری پبلک کی یادیں اتحاد کی بنیاد قائم تھی۔ اس اتحاد میں رہتے ہوئے ہر ریاست ہر علاقہ اور ہر گروہ جو راہ چاہتا اختیار کرتا۔

جب ٹکنالوجی میں ترقی ہونے لگی تو ملک کے مختلف عناصر میں آپسی تعلق بڑھنے لگا۔ پہلے نہریں پھر سڑکیں اور ریلیں بننے لگیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع بڑھے۔ پریس نے اخباروں کی اشاعت کے لیے دروازے کھول دیے اور اس نے وہ چھوٹے چھوٹے خانے توڑ دیے جس میں لوگ بند تھے۔ وہ بڑے پیمانے پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر آنے جانے اور بسنے لگے۔ ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔

جس تیز رفتاری کے ساتھ سماجی اور ٹکنیکل تبدیلی آرہی تھی وہ بہت سے لوگوں کو خاص طور پر سست رفتار زندگی گزارنے والے کسانوں کو پسند نہیں تھی۔ یورپ سے تازہ وارد نوآبادکار اس سماجی انقلاب میں اہم حصہ ادا کر رہے تھے۔ چنانچہ نئے اور پرانے آبادکاروں کے درمیان کش مکش بڑھنے لگی اس کے ساتھ تیز رفتاری سے ترقی کرنے والے کے خلاف پرانے سست رفتار علاقوں میں بے چینی کا احساس ہوا۔ مثلاً

مغربی علاقہ تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ ریلیں پھیلنے لگیں، زراعت ترقی کرنے لگی تو اچھے اور کارکرد مزدور ادھر کھنچنے لگے۔ اس نے دوسرے علاقوں میں سخت بے چینی پیدا کر دی مغرب کے لوگوں میں یہ غصہ بڑھنے لگا کہ مشرق کے لوگ انہیں غیر مہذب سمجھتے ہیں اور مشرق کے تاجر انہیں لوٹتے ہیں۔

ان جذبات نے جنوب میں ایک اور رنگ اختیار کیا۔ یہاں کی خاص آب و ہوا کی وجہ سے کپاس گنے اور تمباکو کی کاشت نے بڑی ترقی کی۔ اس ترقی میں نیگرو غلاموں کی سخت محنت کو بڑا دخل تھا۔ اگرچہ غلامی قانوناً ممنوع تھی لیکن یہاں اسی طرح جاری تھی۔ سفید فام فارموں کے مالکوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن وہ بہت مالدار اور طاقت ور تھے اور پورے جنوب کی معاشی اور سیاسی زندگی پر ان کا کنٹرول تھا۔ وہ غلاموں کی آزادی کے سخت خلاف تھے اور یہ ڈراتے تھے کہ انہیں آزادی ملی تو وہ سارے امریکہ پر چھا جائیں گے۔

دوسرے علاقوں کے لوگ جنوب کے سفید فاموں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھے ساتھ ہی انہیں اپنے علاقوں کی ترقی کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی اور اگر جنوب کے غلام آزادی چاہتے اور آزادی کے ساتھ نقل مکان کر سکتے تو ان کے لیے سستی مزدوری کا بڑا ذریعہ بن سکتے تھے جیمس بُکانن ۱۸۵۶ء میں صدر امریکہ منتخب ہوئے جب کانگریس نے "کنساس فراسکا" بل منظور کر لیا تو شمال اور جنوب سے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کنساس میں آنے لگے کیوں کہ جنوب والے اس کو غلامی کی حامی ریاست بنانا چاہتے تھے جب کہ شمال والے یہاں اپنی تعداد بڑھا کر اس کو انسداد غلامی کی حامی ریاست قرار دینا چاہتے تھے۔ اس طرح کنساس میں ایک خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ہتھیار بند جتھے جگہ جگہ گھومنے لگے۔ اس زمانہ میں شمال اور جنوب میں غلامی کے مسئلہ پر انتہائی اختلافات پیدا ہو چکے تھے شمال والے غلامی کے رواج کو بالکل ختم کر دینا چاہتے تھے جب کہ جنوب کی ریاستیں غلامی کے رواج کو قائم رکھنا پسند کرتی تھیں۔ یہ اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ جنوب کی ریاستیں وفاق سے علاحدہ ہونے کی دھمکی دینے لگیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا وفاق ٹوٹنے کے قریب ہو چکا تھا۔ اس وفاق کو بچانے کی ساری تدابیر بے کار ہو رہی تھیں۔ اس ہیجان اور کش مکش کے زمانے میں انسداد غلامی کے حامی ایک شخص جان براون نے ریاست کنساس کے ایک چھوٹے سے گاؤں پوٹاواٹیم پر حملہ کر کے چند ایسے اشخاص کو قتل کر ڈالا جو غلامی کے حامی تھے اس واقعہ سے مشتعل ہو کر کنساس کے باشندوں نے ایک اجتماع منعقد کیا اور کنساس کو غلامی کی حامی مملکت قرار دیتے ہوئے وفاق سے علاحدگی اختیار کر لی ۱۸۶۰ء میں ابراہیم لنکن صدر امریکہ چنے گئے اور ساتھ ہی مسی سپی، فلوریڈا، الاباما، جارجیا، لوزیانا، ٹیکساس اور جنوبی کیلی فورنیا کی ریاستوں نے وفاقی حکومت سے اپنی علاحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ۴ فروری ۱۸۶۱ء کو اپنا ایک علاحدہ دستور مرتب کر لیا۔ جیفرسن ڈیوس کو صدر اور اے۔ایچ۔ اسٹیفن کو نائب صدر چنا گیا۔ جنوبی ریاستیں غلامی کی حامی تھیں۔ ان ریاستوں میں واقع قلعوں اور ان میں موجود وفاقی حکومت کے سامان حرب پر بھی جنوب والے قابض ہو گئے جب وفاقی حکومت کے جنگی جہاز "ستارہ مغرب" پر جنوبی کیرولینا والوں نے حملہ کیا تو وفاقی حکومت نے جنوب والوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح امریکہ کی بدترین خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ ابراہیم لنکن جس پلیٹ فارم سے منتخب ہوئے وہ غلامی کی سخت مخالف تھی۔ اور کسی ریاست میں بھی غلامی کو قانونی جواز دینے کے لیے تیار نہ تھی۔

خانہ جنگی

اپنی صدارتی تقریر میں ابراہیم لنکن نے یہ واضح کر دیا تھا کہ غلامی کو بہ جبر منسوخ کرنے کا کوئی ارادہ وفاقی حکومت کے پیش نظر نہیں ہے لیکن کوئی ریاست اپنی مرضی سے وفاقی حکومت سے علاحدگی کی مجاز نہیں ہے۔ شمال اور جنوب نے وسیع پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کیں۔ انگلستان اور دیگر یورپین حکومتوں نے اس جنگ میں غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ شمالی وفاقی حکومت کی افواج نے جنرل گرانٹ کی ماتحتی میں ۱۸۶۲ء میں جنوب کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ سات عظیم معرکوں کے بعد وفاقی فوجوں نے جنوب کی فوجوں کو شکست دے کر قلعہ ڈونلسن پر قبضہ کر لیا۔

جنوبی وفاق کے صدر جیفرسن ڈیوس نے ایک سچے محب وطن اور بہادر شخص رابرٹ ائی لی (Lee) کو جنوبی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جنرل رابرٹ کی کمان میں جنوب کی افواج نے نئے جوش و خروش سے لڑنا شروع کیا۔ اور شمال اور جنوب کے درمیان وہ بڑی لڑائیاں شروع ہوئیں جن میں طرفین کے بہادروں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر داد شجاعت دی۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء کو "انٹیٹم" کے مقام پر اس خوفناک خانہ جنگی کی سب سے بڑی لڑائی لڑی گئی جس کے بعد جنوبی افواج کا سپہ سالار میدان جنگ میں ۳۰ ہزار لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ ابراہیم لنکن نے اپنا مشہور اعلان آزادی ۱۲ ستمبر ۱۸۶۲ء کو شائع کیا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ تمام باغی ریاستوں کے غلام یکم جنوری ۱۸۶۳ء کے بعد سے آزاد تصور کیے جائیں گے۔ اس اعلان کے شائع ہونے کے بعد مختلف مقامات مثلاً گیٹس برگ پنسلوانیا اور کولڈ ہاربر پر گھمسان کی جنگیں ہوئیں جس میں ہزاروں آدمی کام آئے۔ وفاقی حکومت کے امیر البحر فیراگیٹ کی شاندار بحری فتوحات نے جنوب والوں کی بحری طاقت کو بالکل تباہ کر دیا بالآخر جنوبی افواج کے سپہ سالار رابرٹ ائی لی کو ۳ اپریل ۱۸۶۵ء کو دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ پانچ سال کی شدید خونریزی کے بعد یہ تباہ کن خانہ جنگی ختم ہوئی۔ لیکن جنگ کے اختتام پر جنوب کی معیشت بالکل تباہ ہو گئی تھی جب کہ شمال کی ریاستیں پہلے سے زیادہ طاقت ور تھیں۔ شمال کی ریاستوں کی خوش حالی کے اسباب اس کا بہتر ریلوے نظام، طاقت ور بحری بیڑہ اور تیز رفتار صنعتی ترقی تھی۔ ابراہیم لنکن کو ۱۶ مئی ۱۸۶۵ء کو ان کے دوسرے دور صدارت کے دوران قتل کر دیا گیا۔ اس خانہ جنگی کا ایک اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملک کو تقسیم ہونے سے بچا لیا گیا اور غلاموں کو آزاد کر دیا گیا۔ ملک کی از سر نو تعمیر کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ملک کے پھیلاؤ اور غیر معمولی خوش حالی کا دور شروع ہوا۔

لنکن کے جانشین اینڈریو جانسن ہوئے۔ ان کے دور صدارت میں آزاد کردہ حبشی غلاموں کو حق رائے دہی دیا گیا۔ اسی زمانہ میں شمال سے کچھ لوگ جنوب کی طرف محض لوٹ مار کی خاطر آئے تھے۔ ان کو "قالینی ملفوف" کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ جلدی کی وجہ سے یہ اپنا اسباب بجائے صندوقوں میں رکھ کر لانے کے قالینوں میں لپیٹ کر لے آئے تھے۔ ان افراد نے آزاد کردہ غلاموں کے حق رائے دہی سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنا آلہ کار بنا کر قانون ساز جماعتوں میں ایسے قوانین منظور کروا لیے جس سے جنوب والوں کی بہت حق تلفی ہوتی تھی۔ ان کی اس زیادتی کے خلاف جنوب میں وہ دہشت پسند پارٹی قائم ہوئی جسے "کوکلان" کہا جاتا تھا۔ یہ دہشت پسند حبشیوں اور قالینی ملفوف دونوں پر بے حد تشدد کرنے لگے۔

ریاست ہائے متحدہ کے عظیم کاروبار کی ابتدا

۱۸۶۸ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۸۷۲ء میں دوسری بار جنرل گرانٹ صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں تمام برِاعظم میں ریلوں کا وسیع جال پھیل رہا تھا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بڑے بڑے کاروبار کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ امریکہ کے بین الاقوامی شہرت کے حامل صنعت کاروں جیسے ڈی۔ راک۔ فیلر، اینڈریو کارنیگی اور جے پیر مانٹ نے ملک کی صنعت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ گرانٹ کے بعد روتھ فورڈ جیمس اے گارفیلڈ اور چیسٹر اے آرتھر یکے بعد دیگرے صدر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں گرور کلولینڈ، ۱۸۸۸ء میں بنجامن ہیرسن ۱۸۹۲ء میں کلولینڈ دوسری بار صدر امریکہ چنے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں میکنلی صدر مملکت چنے گئے۔ ان کے دورِ صدارت میں امریکہ کی اسپین سے جنگ چھڑ گئی۔ ایک زمانے سے کوریا کے عوام اپنی حکومت سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ اور امریکہ کی وفاقی حکومت کی ہمدردیاں کیوبا کے عوام کے ساتھ تھیں۔ اسی زمانہ میں ۱۸۹۸ء میں امریکی جنگی جہاز "میان" ایک سمندری آتش گیر کشتی کے پھٹ پڑنے سے جل اٹھا اور ۲۶۶ امریکی اس حادثے میں فوت ہو گئے تو امریکہ نے اسپین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس جنگ کا خاتمہ کیوبا کی آزادی اور امریکی افواج کی کامیابی پر ختم ہوا۔ میکنلی کے قتل ہو جانے پر ۱۹۰۱ء میں نائب صدر تھیوڈور روزولٹ صدر امریکہ بن گئے۔ ان کے زمانے میں نہر پناما کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں روزولٹ صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ڈبلیو ایچ ٹافٹ صدر چنے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۹۱۶ء میں دوسری مرتبہ ووڈرو ولسن صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ولسن کو اگرچہ گھریلو معاملات میں کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا اس کے باوجود انہوں نے خارجی مسائل پر بہت توجہ کی۔ خارجی پالیسی سے متعلق اہم فیصلے وہ خود ہی کرتے تھے۔ مختلف حکومتوں سے خط و کتابت بھی خود ہی کرتے۔ اپنے دورِ صدارت کے شروع ہی میں انہیں میکسیکو کی خانہ جنگی میں ملوث ہونا پڑا اس لیے کہ وہاں چالیس ہزار امریکی رہتے تھے اور بڑے پیمانہ پر امریکہ کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ لیکن اس مداخلت نے اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ انہوں نے آئندہ مداخلت نہ کرنے کا عہد کر لیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پہلی جنگ عظیم

جب پہلی جنگ عظیم بڑی بڑی طاقتوں کے درمیان چھڑی تو ولسن نے امریکہ کی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ جنگ کے دوران جرمن آبدوز کشتیوں نے امریکہ کے بہت سے تجارتی جہازوں کو ڈبو دیا تو امریکہ نے جرمنی کے خلاف ۱۹۱۷ء میں اعلان جنگ کر دیا۔ امریکہ کے اس جنگ میں شامل ہو جانے سے اتحادیوں کو بڑا فائدہ پہنچا کیوں کہ امریکہ نے نہ صرف آدمیوں سے بلکہ سامانِ جنگ اور جنگی جہازوں سے اتحادیوں کو کمک پہنچائی۔ آخر کار پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ اتحادیوں کی کامیابی پر ہوا۔ معاہدہ ورسائی کے وضع کرنے میں امریکی مدبّروں کا بڑا حصہ تھا۔ اس کے باوجود امریکہ انجمن اقوام میں داخل نہیں ہوا جس کا بانی امریکی پریذیڈنٹ ووڈرو ولسن تھا۔

امریکہ کی تنہا پسندی

۱۹۱۹ء میں جنگ کے خاتمہ پر صلح کانفرنس میں امریکہ نے شرکت گوارا نہیں کی۔ کیوں کہ امریکی یورپ کی لڑائیوں میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ فریقین کے صلح نامہ میں ولسن کے "چودہ نکاتی" پروگرام کو کافی اہمیت حاصل رہی۔ ۱۹۲۰ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر جی۔ ہارڈنگ منتخب ہوئے۔ ملک کی صنعتی ترقی کے لیے درآمدی محصول زائد کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء کے صدارتی انتخابات میں، "کالوین کولیج" اور ۱۹۲۸ء کے انتخابات میں ہربرٹ سی ہوور نے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں فرینکلین روزولٹ صدر مملکت چنے گئے۔ معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے صدر روزولٹ کا "نیا تجارتی سمجھوتہ" بہت کامیاب رہا۔ اس منصوبہ کی رو سے مزدوروں کسانوں اور بے روزگاروں کی بھلائی کے لیے سینکڑوں تجاویز روبہ عمل لائی گئیں۔ ۱۹۳۶ء میں روزولٹ دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ برطانیہ، کناڈا اور دوسرے ممالک کے ساتھ نئے تجارتی معاہدے کیے گئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسری جنگ عظیم

دوسری جنگ عظیم کی ابتدا میں امریکہ غیر جانب دار رہا۔ ۱۹۴۰ء میں روزولٹ کو پھر تیسری بار صدر امریکہ منتخب کیا گیا۔ امریکہ کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ تھیں۔ امریکہ نے دفاعی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اتحادیوں کو سامان جنگ کی فراہمی میں بڑا حصہ لیا۔ اور برطانیہ سے اس کے معاوضہ میں بہاما، جمیکا اور نیو فاؤنڈ لینڈ کا ۹۹ سال کے لیے پٹہ حاصل کر لیا۔ صدر روزولٹ کے زمانہ کا قانون "قرض و پٹہ" مشہور ہے جب جاپان نے جو دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ شریک تھا امریکہ کی مقبوضہ بندرگاہ "پرل ہاربر" پر بمباری کی تو امریکہ کو بھی اعلان جنگ کر دینا پڑا۔ پرل ہاربر کے ساتھ ہی فلپائن، ہانگ کانگ اور جزیرہ نمائے ملایا پر جاپانیوں نے حملے شروع کر دیے۔ امریکی افواج نے اتحادی فوجوں کے دوش بدوش بری اور بحری جنگوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ جب جنگِ عظیم کا خاتمہ اتحادیوں کی فتح اور جرمنی کی شکست پر ہوا تو امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسا کر جاپان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۴۴ء میں روزولٹ کو چوتھی بار صدر منتخب کیا گیا۔ روزولٹ کے انتقال کے بعد ۱۹۴۵ء میں ٹرومین صدر مملکت چنے گئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد

بین الاقوامی جھگڑوں کے پُرامن تصفیہ اور بھوک اور بیماری کے مشترکہ مقابلہ کے لیے ۱۹۴۵ء میں "ادارہ اقوام متحدہ" کی بنیاد ڈالی گئی۔ "انصاف اور مساوات" نامی منصوبہ روبہ عمل لایا گیا۔ کسانوں اور مزدوروں کے تحفظ اور خوش حالی کے لیے متحدہ تجاویز پر عمل کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومین دوبارہ منتخب ہوئے۔ اقوام متحدہ نے یورپ، ایشیا اور آفریقہ کے پس ماندہ علاقوں کی تعمیرِ جدید میں مدد دینی قبول کر لی۔ ٹرومین کے دورِ صدارت میں کوریا میں جنگ کا آغاز ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس سے امریکہ کی سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور امریکہ نے اپنی اس پالیسی کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ حتی المقدور کمیونزم کو پھیلنے سے روکے گا امریکہ کی خارجہ پالیسی روس کے ارادوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا ظہور دوسری جنگ عظیم سے دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور قوم کی حیثیت سے ہوا ہے۔

جنگ کوریا

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر کوریا تقسیم ہوگیا۔ شمال کا حصہ آزاد ہوگیا۔ جنوب پر امریکہ کا قبضہ رہا۔ جب اتحاد کی تحریک جنوب سے شمال کی طرف بڑھی تو صدر ٹرومین نے جنرل میک آرتھر کی کمان میں اقوام متحدہ کی افواج روانہ کر دیں۔ کئی خونریز لڑائیوں کے بعد بھی امریکہ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوسکی اس لیے ۱۹۵۳ء کے معاہدہ جنگ بندی کے بعد کوریا میں امریکی مداخلت ختم کر دی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں ڈی آئزن ہاور صدر مملکت منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں یہ دوبارہ صدر امریکہ چنے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جان ایف کینیڈی صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ انہوں نے نسلی امتیازات کے خاتمہ کے لیے قوانین بنائے۔ تحدید اسلحہ کے مسئلہ پر روس کے وزیر اعظم خروشچیف گفت و شنید کے لیے تیار ہو گئے۔ صدر کینیڈی نے کئی محاصل ختم کر دئے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء کو صدر کینیڈی قتل کر دیے گئے۔ نائب صدر لنڈن بی جانسن ان کے جانشین منتخب ہوئے۔ جانسن کے زمانے میں ویت نام کی جنگ امریکی سیاست کا سب سے اہم مسئلہ رہی۔

امریکہ اور جنگ ویت نام

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر ایشیا کے دوسرے حصوں کی طرح ویت نام میں بھی جنگ آزادی تیز ہوئی اور آخر کار فرانس کو شکست ہوئی شمالی ویت نام میں کمیونسٹوں کی سرکردگی میں عوامی حکومت قائم ہوگئی اور جنوبی حصہ میں عارضی طور پر علاحدہ حکومت قائم کی گئی اسے امریکیوں کی حمایت حاصل تھی جب کئی سال تک اتحاد کی کوشش ناکام ہوئی تو جنوب کی حکومت کے خلاف تحریک ابھرنے لگی۔ جسے شمالی ویت نام کی حمایت حاصل تھی امریکہ نے فوراً اپنی فوجیں اور تجربہ کار فوجی ماہرین جنوبی ویت نام روانہ کر دیے۔

امریکہ کی امداد کے باوجود اس کے خلاف آزادی پسند تنظیموں کا اثر بڑھتا ہی رہا ویت نام میں امریکی مداخلت کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس جنگ میں امریکہ کو بے حد جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ آخر ۱۹۶۸ء میں شمالی ویت نام پر عارضی طور پر بمباری بند کر دی گئی۔ ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں جانسن صدر امریکہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان نسلی منافرت کی بناء پر امریکہ میں فسادات ہوتے رہے۔ اور جب حبشی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ قتل کر دیے گئے تو کانگریس نے نسلی امتیازات کو ختم کرنے کے لیے قوانین منظور کیے۔ ۱۹۶۸ء میں نکسن صدر امریکہ منتخب ہوئے نکسن کے زمانہ صدارت میں ویت نام کی جنگ جاری رہی بالآخر ۱۹۷۳ء میں امریکہ کے مشیر خاص ہنری کیسنجر کی کوشش سے ویت نام کی جنگ ختم کر دی گئی۔

واٹر گیٹ نکسن کے لیے سب سے بڑا بحران ثابت ہوا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ بتاریخ ۱۷ رجون ۱۹۷۲ء سات لوگوں کو ڈیموکریٹک پارٹی کے قومی مرکز واٹر گیٹ عمارت نقب زنی اور ناجائز طور پر پارٹی کے راز معلوم کرنے میں گرفتار کیا گیا۔ تحقیقات کے لیے جج جان سریکا کا تقرر عمل میں آیا۔ اولاً نکسن اور اس کے حواریوں نے اس واقعہ سے بے تعلقی کا اظہار کیا لیکن یکے بعد دیگرے واقعات کے انکشاف کے ساتھ ساتھ نکسن کا اس میں ملوث ہونا ثابت ہوگیا۔ اس کے متعدد ساتھی یا تو مستعفی ہوتے گئے یا برطرف کیے جانے لگے۔ خود نکسن کے لیے مواخذہ کی کارروائی شروع ہونے کا جب خطرہ لاحق ہوا تو اس نے اقبال کر لیا اور اس کو متبادل صورت واضح طور پر نظر آنے لگی۔ استعفیٰ دے دو یا نکالے جاؤ۔ امریکہ کے یہ پہلے صدر ہیں جنہوں نے اگست ۱۹۷۴ء میں اپنا استعفیٰ پیش کیا اور نائب صدر فورڈ نے صدر مملکت کی حیثیت سے حلف لیا۔

بیسویں صدی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سیاست

امریکہ اور پہلی جنگ عظیم

اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ امریکیوں کی بڑی اکثریت اس جنگ میں ملوث ہونے کے خلاف تھی اور چاہتی تھی کہ حکومت غیر جانب داری کی پالیسی پر چلے۔ ولسن کی بھی یہی رائے تھی چنانچہ جنگ شروع ہونے کے دو ہی ہفتہ بعد اس نے امریکہ کی غیر جانب داری کا اعلان کر دیا۔ لیکن جلد ہی امریکہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ اور فرانس نے اپنے وسیع بحری بیڑے کو [illegible] کر کے جرمنی کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی امریکہ سے جرمنی کو جو کچا مال اور غذا وغیرہ جاتی [illegible] وہ رک گئی۔ اس سے امریکہ میں کافی ناراضگی پیدا ہوگئی لیکن ساتھ ہی برطانیہ اور فرانس کو بھی غذا، کچے مال اور ہتھیار کی ضرورت تھی چنانچہ امریکہ اور اتحادیوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ صدر امریکہ نے بارہ ارب ڈالر کا قرضہ بھی منظور کر دیا جس سے برطانیہ اور فرانس امریکہ سے سامان خرید سکتے تھے۔

جب تک جنگ یورپ تک محدود تھی امریکہ کو جنگ میں الجھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن جرمنوں نے آبدوز کشتیاں بنانی شروع کر دیں اور فروری ۱۹۱۵ء میں اس نے اعلان کیا کہ جو جہاز بھی برطانیہ یا فرانس سامان لے کر جائے گا اسے ڈبو دیا جائے گا۔ خواہ یہ جہاز غیر جانب دار ملک ہی کا کیوں نہ ہو۔ جب امریکہ نے اس پر سخت احتجاج کیا تو جرمنوں نے امریکہ کے جہازوں کو مستثنیٰ کر دیا۔ لیکن اب امریکہ کو تیزی کے ساتھ اپنی مسلح طاقت بڑھانی پڑی۔ ساتھ ہی ولسن نے جنگ رکوانے اور صلح کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔

امن و جنگ کی یہ درمیانی کیفیت بہت دن جاری نہ رہ سکی جنوری ۱۹۱۷ء میں جرمنی نے پھر اعلان کیا کہ وہ یورپ جانے والے ہر تجارتی جہاز پر حملہ کرے گا۔ ولسن نے اس پر بھی بہت کوشش کی کہ امریکہ جنگ میں نہ الجھے لیکن شروع ۱۹۱۸ء تک امریکہ کی معیشت مکمل طور پر جنگی معیشت بن چکی تھی اور لوگوں کو جنگ کے لیے پوری طرح تیار کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ پوری طرح لڑائی میں شریک ہوگیا اور اس کی وجہ سے لڑائی کا پلڑا اتحادیوں کے حق ہوگیا۔ ۱۲ لاکھ امریکی سپاہی جو بالکل تازہ دم اور بہتر طور پر مسلح تھے یورپ پہنچ گئے دوسرے امریکی بحری بیڑے نے بڑی حد تک جرمنوں کی سمندری ناکہ بندی کو ناکام بنا دیا چنانچہ نومبر ۱۹۱۸ء میں جرمنی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔

امن کے لیے ولسن کی کوششیں

امریکہ بھی جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا کہ صدر ولسن نے عالمگیر پیمانے پر ایک ایسے امن کی ہم شروع کی جس سے آئندہ کوئی جنگ ہو ہی نہ سکے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو اس نے سینیٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جمعیۃ اقوام کے ذریعہ ایک ایسا امن قائم کرنا چاہیے جس میں کسی کی فتح نہ ہو۔ امریکہ جمعیۃ اقوام میں شریک ہوکر اسے عملی شکل دینے میں مدد کرے گا۔ اپنے جنگی پیام میں بھی اس نے اس مقصد کو دہرایا۔ اس نے برطانیہ اور فرانس سے بھی اسی قسم کے اعلان کی خواہش کی اور جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو اس نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو امریکی کانگریس کے سامنے اپنا چودہ نکاتی پروگرام پیش کیا جس کے چند اہم نکات یہ تھے خفیہ ڈپلومیسی ختم

کی جائے ،سمندروں میں جہاز رانی کی ہر ایک کو آزادی ہو ،مقبوضات کی بابت غیر جانبداری کے ساتھ تصفیہ کیا جائے ،مصنوعی تجارتی پابندیاں ختم کی جائیں ،ہتھیار بندی ختم ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جمعیتہ اقوام (League of Nations) قائم کی جائے جو اپنے تمام ممبروں کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت کرے اور دنیا میں امن قائم رکھے۔ان عام اصولوں کے ساتھ اس نے مطالبہ کیا کہ بلجیم کو پھر سے مکمل آزادی دی جائے۔پولینڈ کی آزاد مملکت قائم کی جائے السیس لورین کا علاقہ فرانس کو واپس دیا جائے اور سلطنت عثمانی اور سلطنت آسٹریا ہنگری کی مختلف محکوم قوموں کو آزادی دی جائے۔

پیرس امن کانفرنس اور عہد نامہ ورسائی

اتحادیوں کی فوجوں نے جب امریکہ کی تازہ دم فوجوں کے ساتھ مل کر جرمنی کو پسپا کرنا شروع کیا تو اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جرمنوں نے ولسن سے اپیل کی کہ وہ اپنے چودہ نکات اور دوسرے اعلانات کی بنیاد پر صلح کروا دیں۔ اتحادی اس پر راضی ہو گئے انگریزوں کو صرف سمندروں کی آزادی کے بارے میں کچھ اختلاف تھا اور انگریز اور فرانسیسی یہ چاہتے تھے کہ جرمنوں نے اتحادیوں کی جو غیر فوجی جائیداد کو نقصان پہنچایا ہے اس کا وہ معاوضہ ادا کریں۔

ولسن جنوری ۱۹۱۹ء میں اس کانفرنس کے لیے پیرس پہنچے وہاں انہوں نے اپنے چودہ نکات کی سخت مدافعت کی لیکن برطانوی اور فرانسیسی نمائندوں لائیڈ جارج اور کلی مینشور کے سامنے ان کی زیادہ نہیں چلی اور بہت سے نکات چھوڑنے پڑے۔جرمنی پر بہت زبردست تاوان عائد کرنے کی تجویز ماننی پڑی۔ افریقہ کی جرمن نوآبادیات کو برطانیہ اور فرانس کے مابین تقسیم کرنے کی تجویز کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور پھر جب برطانیہ اور فرانس نے روس کے انقلاب میں بالشویکوں کے خلاف مداخلت کی تو پھر امریکہ نے بھی ہر طرح کی فوجی امداد دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

ولسن کو ویسے تو امریکی عوام کی تائید حاصل تھی لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکہ آئندہ عالمی معاملات میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرے خاص طور پر وہ معاہدہ ورسائی کی اس دفعہ کے خلاف تھے کہ اگر کسی ملک کی آزادی کو خطرہ ہوگا تو جمعیتہ اقوام اس کی حفاظت کے لیے مداخلت کرے گی۔ولسن پورے معاہدے کی منظوری کی تائید میں تھے۔اس کے لیے سارے ملک میں انہوں نے زبردست مہم چلائی لیکن اکتوبر ۱۹۱۹ء میں فالج کے حملے نے انہیں معذور کر دیا۔

۱۹،نومبر ۱۹۱۹ء اور ۱۹ ،مارچ ۱۹۲۰ء کو دو مرتبہ امریکی سینیٹ نے عہد نامہ ورسائی پر غور کیا اور دونوں مرتبہ اس کی منظوری کے لیے ضروری دو تہائی اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔اس سوال پر عام چناؤ لڑا گیا جس کے نتیجہ میں ری پبلکن پارٹی کے امیدوار ہارڈنگ صدر چنے گئے۔انہوں نے اعلان کر دیا کہ امریکہ یورپ کے معاملات میں اپنے آپ کو نہیں الجھائے گا۔امریکہ نے ۱۹۲۱ء میں جرمنی سے امن کا ایک علاحدہ سمجھوتہ کر لیا۔

جنگ کے بعد کا دور

ہارڈنگ نے صدر بننے کے بعد اپنی پوری توجہ اندرونی معاملات پر مرکوز کر دی تاکہ کاروبار تیزی سے بڑھے۔سرکاری اخراجات میں تخفیف کر کے اندرونی قرضوں کو گھٹایا گیا۔بڑے کسانوں کو کافی رعائتیں دی گئیں اور ان کی پیداوار کی برآمد کے لیے سہولتیں پیدا کی گئیں۔بے روزگاری کو روکنے کے لیے باہر سے آکر بسنے والوں کی تعداد جو آٹھ لاکھ سالانہ تک پہنچ گئی تھی اب گھٹا کر ایک لاکھ ۶۴ ہزار سالانہ کر دی گئی ایشیائیوں کے داخلے پر مکمل پابندی لگا دی گئی ہارڈنگ کے دور میں اوپر کے طبقوں میں خوش حالی آئی ساتھ ہی رشوت اور بے ایمانی کے کئی واقعات نے سخت ہیجان بھی برپا کیا۔۱۹۲۳ء میں دل کے دورے سے ان کا انتقال ہوا تو کالون کولج یہ نعرہ لے کر میدان میں اترے کہ نظم و نسق کو ہر طرح کی رشوت ستانی اور بے ایمانی سے پاک کیا جائے۔

کالون کولج اپنے پیش رو سے بھی زیادہ قدامت پسند تھے چنانچہ ان کے سارے اقدامات کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ بڑے سرمایہ داروں اور بیوپاریوں کی ہر مشکل کو دور کیا جائے اور کوئی شخص ان کے کام میں مخل نہ ہو۔انہوں نے جج بھی اسی نقطۂ نظر کے مقرر کیے چنانچہ ان پالیسیوں کے نتیجہ کے طور پر معیشت تیزی سے ترقی کرنے لگی۔۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان بڑی کمپنیوں کا منافع ۷۶ فی صدی بڑھ گیا۔حصوں پر منافع میں ۱۰۸ فی صد اضافہ ہوا تجارت ۲۲ فی صد بڑھی اور مزدوروں کی اجرت میں بھی ۴۲ فی صد کا اضافہ ہوا لیکن یہ معاشی پیش رفت ہمہ گیر نہ تھی ،مختلف طبقات کی آمدنی کا توازن بگڑ گیا۔زراعت اور بعض صنعتیں گرنے لگیں۔ ۱۹۲۶ء کے بعد تعمیر کی صنعت میں اتار آنے لگا اور یہاں سے خوش حالی میں تیزی کے ساتھ ڈھلان شروع ہوا۔

اسی دور میں جرائم بے حد بڑھ گئے اور انہوں نے بڑی منظم شکل اختیار کر لی حکومت نے نشہ بندی نافذ کی تو ناجائز خفیہ شراب کشی، اس کی منظم فروخت، اور خفیہ درآمد بے حد بڑھ گئی۔رشوت ستانی اس قدر عروج پر پہنچی کہ حکومت بے بس ہو کر رہ گئی۔اس زمانہ میں سیاہ فاموں کے خلاف دہشت پسندی کی تحریک (Ku-Klux-Klan) عروج پر پہنچ گئی۔

معاشی بحران

۱۹۲۸ء میں ہربرٹ ہوور ری پبلکن پارٹی کے امیدوار، صدر چنے گئے۔ اس لیے کہ امید تھی کہ وہ ابھرتے ہوئے معاشی، اخلاقی اور سماجی بحران پر قابو پا سکیں گے ۱۹۲۹ء میں جب انہوں نے صدارتی کرسی سنبھالی، امریکہ کے اسٹاک مارکٹ میں زبردست بحران آیا اور سارا ملک زبردست معاشی مشکلات میں گھر گیا۔صنعتوں کے حصوں کی قیمت میں ۴۰ فی صد کی کمی آگئی، صنعتی پیداوار بہت گھٹ گئی اور لاکھوں چھوٹے صنعت کار، بنک کار اور دوسرے کاروبار کرنے والے دیوالیہ ہو گئے۔ بے روزگاری تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ہوور نے اس نظام کے ڈھانچے کے اندر کچھ اقدامات کیے۔بڑے صنعت کاروں پر زور ڈالا کہ وہ کارخانے چالو رکھیں، کسانوں کی مختلف طریقوں سے مدد کی لیکن اس بحران نے اسی زمانے میں یورپ کو بھی گھیر لیا تھا۔سونے کی قیمت گرنے لگی۔ امریکی سکہ کی قیمت بہت گر گئی اور ۱۹۳۱ء۔۱۹۳۲ء میں امریکہ کا معاشی بحران اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔اسی دوران ہوور کی سینیٹ (Senate) اور کانگریس دونوں جگہ اکثریت ختم ہو گئی اور سخت اقدامات کرنے کا مطالبہ بڑھنے لگا۔صنعتوں اور کاروبار کی امداد کے لیے دو کروڑ ڈالر منظور کیے گئے اس کے بعد ۳۳ ارب ڈالر اور منظور کیے گئے۔

ان سب کوششوں کے باوجود کارخانے، بنک وغیرہ سینکڑوں کی تعداد میں دیوالیہ ہونے لگے۔ایک کروڑ تیس لاکھ مزدور یعنی ملک کی چوتھائی مزدور آبادی بے روزگار ہو گئی۔ ۲۵ فی صدی کسانوں کے ہاتھ سے اپنی زمین نکل گئی ۱۹۳۲ء میں جب نئے چناؤ ہوئے تو ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار فرانکلن۔ڈی روزولٹ صدر چنے گئے جنہوں نے ایک نیا پروگرام شروع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

نیو ڈیل

وسط فروری ۱۹۳۳ء میں روزولٹ نے صدارت کی گدی سنبھالی۔ اس وقت ملک سخت معاشی بحران اور خوف میں گھرا ہوا تھا۔روزولٹ نے بڑی تیزی سے قدم اٹھایا۔ مارچ میں ایک بل منظور کروایا تاکہ حکومت بنک کاری کے کاروبار کو مدد دے کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکے چنانچہ بل

پاس ہونے کے تین دن کے اندر تین چوتھائی بنک کھول دئے گئے۔ اس کے ساتھ فیڈرل حکومت کے ملازمین کی تنخواہوں اور پنشن میں کمی کر کے سرکاری اخراجات میں کمی کی مہم شروع کی گئی۔ عوام نے ہر اقدام پر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ کانگریس کا خاص سیشن مسلسل چلتا رہا۔ اور روزولٹ نے اپنی صدارت کے پہلے سو دنوں میں بے شمار قوانین منظور کروا ئے ان قوانین سے زراعت کو بحال کرنے، بے روزگاری کم کرنے، سرمایہ کاری پر کنٹرول نافذ کرنے اور صنعتوں کو پھر سے چالو کرنے وغیرہ کے پروگرام عمل میں آئے۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کسانوں کی آمدنی دگنی ہو گئی۔ بہت سی صنعتیں پھر سے شروع ہو گئیں حکومت نے سرکاری کاموں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس کے اثر سے بے روزگاری کافی حد تک دور ہوئی مثلاً حکومت نے سول ورکس شروع کیے ان میں ۱۹۳۳ - ۱۹۳۴ء چالیس لاکھ لوگوں کو روزگار دیا گیا۔ بہت سی معاشی اصلاحات کی گئیں اور قانون بنائے گئے تاکہ چھوٹی بچت کرنے والوں کا پیسہ بنکوں میں محفوظ رہے کئی بڑے بڑے بند اور پن بجلی کا فانو کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور کام مہیا کرنے کو مالی امداد پر ترجیح دی گئی۔

۱۹۳۵ء میں سوشل سیکورٹی کا قانون بنا کر روزولٹ کی حکومت نے سماجی انصاف کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔ اس کے لیے بوڑھے بے روزگار اپاہج لوگوں اور ان کے خاندان کے لیے امدادی بیمہ کا انتظام کیا گیا۔ مال دار لوگوں پر ٹیکس بڑھایا گیا۔ مزدوروں اور ان کی تنظیموں کی حفاظت کے قانون بنے۔ کارخانہ داروں کی بے جا اور ناجائز تحکیتوں پر قانون کے ذریعہ لگام کسی گئی۔ عدالتیں ہر قدم پر اصلاح کو غیر قانونی بنانے پر تلی ہوئی تھیں اور ہر آئینی ترمیم کی مخالفت کر رہی تھیں روزولٹ نے عدالتوں کے قانون کو بدلنے کی کوشش کی لیکن قدامت پرستوں پر مشتمل سینیٹ نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ اور روزولٹ کو ججوں کی ہر نئی خالی نشست کو روشن خیال لوگوں سے پُر کر کے اس مشکل کو حل کرنا پڑا۔

ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ روزولٹ ۱۹۳۶ء میں ۶۰ فی صدی ووٹ حاصل کر کے دوبارہ صدر چنے گئے لیکن صدر بنتے ہی ملک کو پھر معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان پیداوار ۴۱ فی صد گر گئی؛ چالیس لاکھ لوگ بے روزگار ہو گئے۔ چنانچہ کانگریس نے ۵ ارب ڈالر منظور کیے تاکہ حکومت نئے سرکاری کام شروع کر کے اس کا مقابلہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ کسانوں کی مدد کے لیے زرعی پیداوار میں کمی کر کے ان کی قیمت چڑھائی گئی۔ ۱۹۳۸ء تک حالت کسی حد تک سدھر گئی۔ نیوڈیل کے بارے میں بڑی مختلف رائیں رہیں ہو ور جیسے قدامت پرستوں کا خیال تھا کہ یہ سوشلزم کی طرف اقدام ہے اور حکومت کی مرکزیت اور مداخلت معاشی زندگی میں بہت بڑھ گئی ہے دوسری طرف بائیں بازو کا خیال تھا کہ اس کی مدد سے سرمایہ داری ڈھانچہ کو گرنے سے بچا لیا گیا۔

امریکہ اور دوسری جنگ عظیم

جس زمانے میں امریکہ اس زبردست معاشی بحران سے گزر رہا تھا اس کی عام پالیسی یہ رہی کہ باہر کے کسی جھگڑے میں نہ الجھے اور ساتھ ہی اپنے مفادات کی پوری طرح حفاظت کرے۔ یورپ میں ہٹلر کی فتوحات بڑھ رہی تھیں۔ امریکہ نے غیر جانب داری کا رویّہ اپنایا۔ مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا۔ ہٹلر اور مسولینی نے کھلے عام اسپین کی خانہ جنگی میں مداخلت کی تو ان سب میں وہ غیر جانب داری کی نقاب پہنے رہا۔ لیکن ایشیا کا معاملہ دوسرا تھا۔ جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چین میں اس کے جارحانہ اقدام سے خود امریکہ کے مفادات کو خطرہ تھا لیکن اس کے باوجود روزولٹ نے اس کے خلاف اقدام کی ہلکی سی کوشش بھی کی تو امریکہ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

آخر کار جب ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر ہٹلر کے حملہ کے بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تو امریکہ کے لیے خاموش بیٹھنا ناممکن ہو گیا؛ چنانچہ برطانیہ اور فرانس کو امریکہ سے نقد دام پر فوجی سامان خریدنے کی اجازت دے دی گئی اور جب ۱۹۴۰ء میں فرانس، بلجیم اور ہالینڈ وغیرہ پر ہٹلر کا قبضہ ہو گیا تو امریکی عوام کی بڑی اکثریت کی تائید سے امریکہ نے اپنے وسائل کے دروازے برطانیہ کے لیے کھول دیے۔ پہلی قسط پچاس پرانے بحری جنگی جہازوں کی تھی اور اس کے معاوضہ میں برطانیہ نے نیوفاؤنڈلینڈ سے لے کر برٹش گیانا تک اپنے تمام فوجی اڈے ۹۹ سال کے لیے امریکہ کو پٹہ پر حوالے کر دیے اسی سال روزولٹ، وِنڈل وِلکی کے خلاف جیت کر تیسری مرتبہ صدر چنے گئے۔

فرانس پر ہٹلر کے قبضہ سے لے کر پرل ہاربر پر جاپان کے حملے (دسمبر ۱۹۴۱ء) تک امریکہ میں گرما گرم بحث چلتی رہی کہ اس لڑائی میں امریکہ کو کتنا الجھنا چاہیئے۔ بڑی بحث کے بعد ۱۹۴۱ء میں کانگریس نے ایک قانون منظور کیا کہ برطانیہ اور دوسرے حلیفوں کو فوجی سامان مہیا کیا جائے گا۔ جس کی ادائیگی لڑائی کے خاتمہ پر ہوگی۔ اگست ۱۹۴۱ء میں نیوفاؤنڈلینڈ میں روزولٹ اور چرچل کی ملاقات ہوئی جس میں مشہور عالم منشور اوقیانوس (Atlantic charter) منظور کیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ہر قوم کو قومی خود مختاری کا حق ہوگا، زیادہ معاشی مواقع ملیں گے۔ خوف اور احتیاج سے نجات ملے گی سمندروں میں سے گزرنے کی آزادی ہوگی۔ اور ہتھیار بندی ختم کی جائے گی۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں ایک جرمن آبدوز کشتی نے امریکہ کے ایک جنگی جہاز کو ڈبو دیا امریکہ نے آئندہ ایسے حملہ کی صورت میں اس آبدوز کو ڈبو دینے کا حکم دیا۔ اکتوبر میں جرمنوں نے ایک اور جہاز ڈبو دیا۔ اور اس طرح امریکہ اور جرمنی کے درمیان بغیر اعلان کے بحری جنگ شروع ہو گئی۔

جاپان کے ساتھ جنگ کی ابتدا

مشرق بعید میں امریکہ اور جاپان کی رقابت پرانی ہے اور دونوں کے درمیان ۱۹۳۰ء سے خاص طور پر جب جاپان نے چین پر جارحانہ اقدامات شروع کیے تعلقات تیزی سے بگڑنے لگے۔ ۱۹۴۰ء میں امریکہ نے ۱۹۱۱ء کے تجارتی معاہدہ کو ختم کر دیا لیکن جاپان کو کچا مال برابر بیچتا رہا۔ جو چین کے خلاف لڑائی میں استعمال ہونے والے جنگی سامان کی تیاری کے لیے بہت ضروری تھا۔ جب ستمبر ۱۹۴۰ء میں جاپانی فوجوں نے ہند چینی پر حملہ کر دیا تاکہ وہاں سے ایسٹ انڈیز پر حملہ کر سکے جہاں امریکیوں کا بھی کافی سرمایا لگا ہوا تھا تو امریکہ نے جاپان کو فولاد اور لوہا برآمد کرنے پر پابندی لگا دی۔ جاپان نے اس کے جواب میں جرمنی اور اٹلی سے دوستی کا معاہدہ کر لیا بعد میں جاپان کی سخت معاشی ناکہ بندی کر دی گئی۔ جاپان نے ایک طرف اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بات چیت شروع کی اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر فوجی تیاری۔ ۱۹۴۱ء کے آخر تک امریکہ کو پورا یقین ہو گیا کہ جاپان بہت جلد کوئی فوجی اقدام کرنے والا ہے اس کا قیاس تھا کہ یہ حملہ فلپائن یا ایسٹ انڈیز پر ہوگا لیکن ۷، ستمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے امریکہ کے مشرق بعید کے بہت بڑے بحری اڈے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ یہ امریکہ کے لیے غیر متوقع تھا اور اس لیے اس میں اس کے ۱۵ بحری جہاز اور ۱۸۸ ہوائی جہاز تباہ ہوئے اور تقریباً ساڑھے تین ہزار آدمی مرے یا زخمی ہوئے۔ ۸، دسمبر ۱۹۴۱ء کو امریکی کانگریس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ تین دن بعد جرمنی اور اٹلی نے بھی امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور اسی کے ساتھ امریکہ اب پوری طرح اس جنگ عظیم میں شریک ہو گیا۔

جنگ میں امریکہ کی شرکت

جنگ کے اعلان کے ساتھ امریکہ کو بڑے پیمانے پر تیاریاں کرنی پڑیں جس نے پوری معاشی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ اسے بڑے پیمانے پر جنگی سامان اور غذا پیدا کرنی پڑی۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ آدمیوں کو فوج کے مختلف شعبوں میں بھرتی کیا گیا اور لاکھوں دوسرے آدمی جنگی سامان پیدا کرنے والے کارخانوں میں چلے گئے۔ امریکہ تقریباً دس پندرہ سال سے سخت معاشی بحران کا شکار تھا پیداوار کے زبردست اضافہ کی وجہ سے یہ بحران یکسر ختم ہوگیا۔ اور ملک میں کافی خوش حالی آگئی۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان امریکہ کی صنعتی پیداوار دگنی ہوگئی۔ لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھ گیا۔

اس جنگ نے امریکہ کی اندرونی سماجی اور معاشی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور حکومت کو معیشت میں منصوبہ بندی کرنی پڑی قیمتوں پر کنٹرول کرنا پڑا۔ یہ دونوں اقدامات اب تک کے آزاد تجارت کے اصول کے خلاف تھے۔ تقریباً ۲۰ لاکھ سیاہ فام باشندوں کو ایسی صنعتوں میں لینا پڑا جو سفید فام باشندوں کے لیے مخصوص تھیں۔ فوج میں کافی سیاہ فام بھرتی کیے گئے۔ اس نے رنگ و نسل کی دیواروں میں کافی شگاف پیدا کیے۔ جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری کے لیے سائنس کی تحقیقات اور ترقی پر اربوں روپیہ صرف کیا گیا جس سے کئی نئے شعبوں میں زبردست ترقی ہوئی۔ مین ہاٹن پروجیکٹ پر دو ارب ڈالر صرف کیے گئے جہاں ۶ر جولائی ۱۹۴۵ء کو پہلا ایٹمی بم کامیابی کے ساتھ تیار ہوا۔ اس لڑائی کا معاشی بار بھی بہت بڑا تھا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک حکومت نے ۳۲ ہزار کروڑ ڈالر جنگی اخراجات کے تحت خرچ کیے۔

جنگ سے پہلے تک امریکہ کی پالیسی یہ رہی کہ بین الاقوامی معاملات سے الگ تھلگ رہا جائے لیکن اب یہ دور ختم ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں روزولٹ اور چرچل کی ملاقات ہوئی اور بین الاقوامی اتحاد کی بنیاد پڑی جس میں تقریباً ۴۶ ممالک شریک ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں چھ بڑی بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں جن میں جرمنی اور جاپان کے خلاف متحدہ اقدام کے منصوبے بنائے گئے۔ قاہرہ کانفرنس میں روزولٹ چرچل اور چیانگ کائی شک شریک تھے جہاں مشرق بعید کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کیے گئے اور تہران میں روزولٹ، اسٹالن اور چرچل نے حصہ لیا اور اس میں یورپ میں دوسرا محاذ کھولنے کے متعلق فیصلے کیے گئے۔

جون ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں نے فرانس میں فوجیں اتاریں اگست ۱۹۴۴ء کے ختم تک تقریباً پورا فرانس آزاد ہوگیا اور اسی مہینے ڈمبرٹن اوک واشنگٹن میں امریکہ، سوویت یونین، برطانیہ اور چین کے نمائندوں نے ایک مستقل بین الاقوامی تنظیم کا منشور منظور کیا۔

فروری ۱۹۴۵ء میں یالٹا میں اسٹالن، روزولٹ اور چرچل نے جرمنی کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کیے اور ساتھ ہی یہ طے ہوا کہ جرمنی اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد روس جاپان کے خلاف لڑائی میں شریک ہو جائے گا۔

۱۲ر اپریل ۱۹۴۵ء کو روزولٹ کا انتقال ہوگیا اور ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو ہٹلر کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے اور یورپ میں جنگ ختم ہوگئی اسی زمانے میں جاپان کے خلاف لڑائی تیز ہوئی اگست میں امریکہ نے ہیروشیما اور پھر ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے اور ۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

ٹرومن اور سرد جنگ کا آغاز

۱۲ر اپریل ۱۹۴۵ء کو روزولٹ کا انتقال ہوگیا اور پھر ٹرومن جو اس وقت نائب صدر تھے امریکہ کے صدر بن گئے۔ ہٹلر کے ہتھیار ڈالنے کے بعد پوٹسڈم (جرمنی) میں امریکہ، برطانیہ اور روس کے نمائندوں کی میٹنگ ہوئی۔ امریکہ کی طرف سے ٹرومین شریک ہوئے۔ روس کی طرف سے اسٹالن اور برطانیہ کی طرف سے پہلے چرچل اور ان کے چناؤ میں ہارنے کے بعد اٹلی، اس میں یورپ کے مستقبل اور جاپان کے خلاف لڑائی کو تیز کرنے کے بارے میں فیصلے ہوئے۔

ٹرومین کے سامنے کئی مسائل تھے لیکن جنگ کے زمانے میں روس، امریکہ اور برطانیہ کے درمیان اور خاص طور پر روس اور امریکہ کے درمیان جو دوستی اور اعتماد کی فضا پیدا ہوئی تھی وہ باقی نہ رہ سکی۔ فاشزم کی شکست کے بعد اب وہ پرانا نظام واپس لانا مشکل تھا۔ سارے یورپ میں ہر طرف انقلابی اور بائیں بازو کی طاقتیں ابھر رہی تھیں۔ خود اٹلی اور فرانس جیسے ملکوں کی حکومتوں میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ شریک تھے۔ جہاں تک مشرقی یورپ کا تعلق ہے وہاں سے امریکہ کے لیے اس دھارے کو روکنا مشکل تھا لیکن یونان اور ترکی کی اندرونی خانہ جنگی اور دائیں اور بائیں کی کش مکش کو اس نے روکنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ٹرومین نے اعلان کیا "ان تمام ملکوں میں جہاں کوئی اقلیت طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرے گی امریکہ اس کی مزاحمت کرنے والوں کی مدد کرے گا۔" یہ اعلان ٹرومین نظریہ کے نام سے مشہور ہوا۔ امریکی کانگریس نے یورپ کے بائیں بازو کے اس بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنے کے لیے چالیس کروڑ ڈالر منظور کیے۔ اس کے علاوہ سکریٹری آف اسٹیٹ جارج مارشل کو یورپ بھیجا گیا تاکہ کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کے لیے ان کی مخالف حکومتوں کو مالی امداد دی جائے تاکہ وہ اسے معاشی بحالی پر صرف کر سکیں مارشل پلان کے تحت ۱۲ ارب ڈالر منظور کیے گئے برطانیہ اور امریکہ نے یہ بھی طے کیا کہ جرمنی کو پھر سے معاشی طور پر ابھارا جائے۔ تاکہ وہ یورپ میں ان کا قلعہ بن سکے۔ جون ۱۹۴۸ء میں امریکی سینٹ میں ایک تجویز منظور کی گئی جس کے مطابق اپریل ۱۹۴۹ء میں شمالی اٹلانٹک معاہدہ (ناٹو) وجود میں آیا جس میں مغربی یورپ کے بارہ ملک شریک ہوئے۔ اس کا مقصد سوویت یونین کے خلاف دفاعی قوت پیدا کرنا تھا اس کے تحت جو فوج قائم کی گئی اس کے پہلے کمانڈر آئزن ہاور تھے۔

ٹرومین نے جنرل ویڈمیر کو چین بھیجا تاکہ بڑھتی ہوئی کمیونسٹ فوجوں کے خلاف چیانگ کائی شک کی مدد کی جا سکے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کی فوجی امداد کے لیے ۴۰ کروڑ ڈالر منظور کیے لیکن یہ پوری مدد پہنچنے سے پہلے ہی ۱۹۴۹ء میں چیانگ کائی شک کو شکست ہوگئی اور اسے اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ تائی وان میں پناہ لینی پڑی۔ چنانچہ اب امریکہ نے اپنی ساری توجہ جاپان پر مرکوز کر دی۔ مشرق بعید میں امریکی پالیسی میں اسے اہم مقام دیا گیا۔

ٹرومن کی اندرونی پالیسی

پہلی جنگ عظیم نے نہ صرف یورپ کی سماجی اور سیاسی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی تھی بلکہ اس کا اثر خود امریکہ کی اندرونی زندگی پر بھی پڑا۔ اب لوگ جنگ کے پہلے کی سماجی تفریق معاشی عدم مساوات، اور نسلی تفریق کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، چنانچہ روزولٹ کے زمانے ہی میں "نیو ڈیل" کے تحت کافی اقدامات کیے گئے تھے اور اب ٹرومین نے ایک ۲۱ نکاتی پروگرام پیش کیا جسے فیر ڈیل (Fairdeal) کا نام دیا گیا اس کے تحت کوشش یہ کی گئی تھی کہ سماجی تحفظ کے تحت رقم بڑھائی جائے اجرت اور کام کے گھنٹوں میں باقاعدگی پیدا کی جائے اور مکانات

کے سلسلے میں قوانین بنائے جائیں، ملازمت میں نسل یا مذہب کی تفریق کو ختم کیا جائے تاکہ مجموعی طور سے عام لوگوں کا معیار زندگی بڑھ سکے لیکن کانگریس سے اس کی منظوری حاصل نہ ہوسکی کیوں کہ وہاں اب تک قدامت پسندوں کا عمل دخل تھا۔ البتہ ۱۹۴۶ء میں ایک قانون منظور ہوگیا جس کے تحت ہر شخص کو روزگار مہیا کرنے کی ذمہ داری حکومت نے اپنے ذمہ لے لی۔

جنگی معیشت سے امن کی معیشت کی طرف لوٹنے میں زیادہ مشکلیں تو پیش نہیں آئیں۔ لیکن کنٹرول وغیرہ اٹھنے سے قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگیں جنگ کے زمانے میں جو معیار زندگی بڑھا تھا، وہ گرنے لگا اور اس کی وجہ سے بے چینی اور اسی کے ساتھ کارخانوں میں ہڑتالوں کی لہر چل پڑی۔ ۱۹۴۶ء میں کانگریس کے لیے جو چناؤ ہوا اس میں قدامت پسندوں کی فتح ہوئی۔ اور ری پبلکن پارٹی کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ اس نے ٹرومین کی فیر ڈیل کو بالکل ہی رد کردیا۔ اس سے مزدوروں اور کسانوں میں بے چینی بڑھ گئی چنانچہ ۱۹۴۸ء کے صدارتی چناؤ میں ٹرومین کو پھر فتح حاصل ہوئی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کو کانگریس کے دونوں ہی ایوانوں میں اکثریت مل گئی صدر بننے کے بعد ٹرومین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی "فیر ڈیل" کو عملی شکل دیں گے مگر اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں چین میں کمیونسٹوں کی فتح اور سوویت یونین میں ایٹم بم کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر قدامت پرست حلقوں نے کمیونسٹوں کے خلاف ایک مہم شروع کردی۔ تاکہ عوام کے بڑھتے ہوئے مطالبات کا رخ موڑا جاسکے مرکزی حکومت کے تقریباً تیس لاکھ ملازمین کے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کی گئی۔ کئی ہزار برطرف کردیے گئے۔ سینیٹر میکارتھی کی سرکردگی میں یہ مہم اور تیز ہوگئی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہزاروں آدمیوں کو روزگار سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کوریا کی جنگ

جاپان کی شکست کے بعد کوریا کو آزادی دے دی گئی تھی لیکن جرمنی کی طرح اسے بھی تقسیم کردیا گیا۔ شمالی علاقے پر کمیونسٹوں کی سرکردگی میں حکومت قائم تھی۔ جون ۱۹۵۰ء میں وہاں اتحاد کے لیے خانہ جنگی چھڑ گئی۔ شمال کی فوجیں کافی حد تک جنوب میں گھس آئیں۔ اس زمانے میں سوویت یونین مجلس اقوام متحدہ کا بائی کاٹ کر رہی تھی! چنانچہ امریکہ نے ایک تجویز سیکورٹی کونسل سے منظور کروائی کہ فوراً مداخلت کی جائے ڈگلس میک آرتھر کی کمان میں ایک فوج بھیجی گئی۔ چین نے شمالی کوریا کی مدد کے لیے اپنے والنٹیر بھیجے۔ اس لڑائی میں امریکہ کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا اور اس کی فوجیں ۳۸ عرض البلد کو پار نہ کرسکیں۔ آخرکار ۱۰ جولائی کو صلح کی بات چیت شروع ہوئی جو ۱۹۵۳ء تک چلتی رہی اور ۶ ستمبر ۱۹۵۳ء کو سمجھوتہ ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں کوریا کو متحد کرنے کے لیے جنیوا میں بات چیت ہوئی لیکن بے سود۔ کوریا ابھی تک اسی طرح منقسم ہے کوریا میں شکست کے بعد امریکہ نے کافی بڑے فوجی اور سیاسی اقدامات شروع کیے۔ ستمبر ۱۹۵۱ء میں جاپان سے امن معاہدہ کیا گیا جس کے تحت امریکہ کو اپنی فوجیں جاپان میں رکھنے اور جاپان کے فوجی اڈے استعمال کرنے کا حق دیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں سینٹ نے مغربی جرمنی اور مغربی متحدین (امریکہ، فرانس، برطانیہ) کے درمیان اس معاہدے کو منظوری دے دی جرمنی اور چین کی طرح کوریا کی جگہ اب دو ملک ہوگئے ہیں، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا۔

آیزن ہاور کا دور

۱۹۵۲ء کے صدارتی چناؤ میں ٹرومین نہیں کھڑے ہوئے ان کی جگہ ڈیموکریٹک کی طرف سے ایڈلائی اسٹیونسن کو نامزد کیا گیا ــ ری پبلکن پارٹی کی طرف سے ریٹائرڈ جنرل آئزن ہاور صدارت کے لیے اور نکسن ان کے نائب کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ کوریا میں امریکی ناکامیوں اور بڑھتے ہوئے کمیونسٹ خطرے کی ذمہ داری ٹرومین پر ڈالی گئی اور آئزن ہاور بڑی اکثریت سے جیت گئے۔ کانگریس پر بھی ان کی پارٹی کا کنٹرول ہوگیا۔

آئزن ہاور اگرچہ اعتدال پسند تھے لیکن ان کے دور کے دو سال میں میکارتھی کے مخالف کمیونسٹ تحریک کی ہوا تند و تیز رہی جس کا اثر نظم و نسق پر پڑا۔ اگرچہ معاشی حالت کچھ بہتر ہوئی لیکن رنگ و نسل کے مسئلہ پر ملک میں سخت ہیجان اٹھ کھڑا ہوا۔

آئزن ہاور نے اپنی خارجی پالیسی فاسٹر ڈلز کے سپرد کردی جو کہ سرد جنگ کے سب سے بڑے علم بردار تھے ۲۵ ستمبر ۱۹۵۵ء کو آئزن ہاور کو دل کا دورہ پڑا جس کی وجہ سے ملک کے نظم و نسق میں ان کا عمل حصہ بہت کم ہوگیا۔ تاہم ۱۹۷۰ء میں وہ دوبارہ منتخب ہوئے اس کی وجہ دنیا کا بڑھتا ہوا بحران تھا۔ ہنگری کے واقعات اور برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے حصہ پر حملہ سے بین الاقوامی صورت حال میں سخت کشیدگی آگئی تھی۔ اپنے دوسرے دور میں آئزن ہاور کو سخت مشکلوں کا سامنا پڑا ۱۹۵۷-۱۹۵۸ء میں امریکہ میں سخت معاشی بحران آیا۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کو کانگریس میں اور گورنروں کے انتخاب میں کامیابی ہوئی جب انھوں نے پبلک مکانات، سماجی تحفظ اور افراط زر وغیرہ کے سلسلہ میں بل پیش کیے تو صدر آئزن ہاور نے انہیں ویٹو کردیا جس سے صدر اور کانگریس کے درمیان کش مکش بڑھ گئی۔ اسی کے ساتھ مزدوروں کے مطالبات بڑھنے لگے نسلی امتیاز کے خلاف مہم تیز ہونے لگی۔ ۱۹۵۹ء میں فولاد کے کارخانوں کے تقریباً پانچ لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کردی جو ۱۱۶ دن تک جاری رہی۔ ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سوویت یونین نے پہلا سیارہ خلا میں بھیجا جس نے پورے امریکہ میں یہ احساس پیدا کیا کہ قوتوں کا توازن سوویت یونین کے حق میں آگیا ہے۔ اور سائنسی تعلیم اور دفاع پر بحث چھڑ گئی۔

۱۹۵۸ء میں کئی واقعات پیش آئے جس سے دنیا عالمی جنگ کے دروازہ پر آن کھڑی ہوئی۔ جولائی میں لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور دائیں بازو کے مغرب دوست عناصر کو شکست ہونے لگی تو امریکہ نے مداخلت کی دھمکی دی اور اس علاقے میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اگست میں چین نے کی موئے اور ماتسو جزیروں پر بم باری کی جو چیانگ کائی شک کے قبضہ میں تھے۔ نومبر میں برلن کے مسئلہ پر مشرق و مغرب میں سخت تناؤ پیدا ہوگیا اور دسمبر میں کیوبا میں فیڈل کاسٹرو کی سرکردگی میں امریکہ کی دوست بتستا حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۹ء میں ڈلز نے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ وہ کینسر میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اور اب آئزن ہاور نے بیرونی سیاست میں خود دلچسپی لینی شروع کی چنانچہ انہوں نے اس سال یورپ اور دوسرے علاقوں کے گیارہ ملکوں کا دورہ کیا۔ ۱۹۶۰ء میں لاطینی امریکہ کے کئی ملکوں کا سفر کیا خروشیف نے تجویز پیش کی کہ مئی ۱۹۶۰ء میں چار بڑے ملکوں کے سربراہ پیرس میں ملیں اور دنیا میں تناؤ کم کرنے کی کوشش کریں لیکن اسی زمانہ میں امریکہ کی سوویت یونین میں فضائی جاسوسی نے فضا کو مکدر کردیا اور یہ کانفرنس ناکام رہی۔

کینیڈی کا دور

۱۹۶۰ء کے چناؤ میں آئزن ہاور نے حصہ نہیں لیا۔ ان کی جگہ ری پبلکن پارٹی نے نکسن کو اور ڈیموکریٹک پارٹی نے جان ایف۔ کینیڈی کو نامزد کیا۔ کینیڈی نے چھ کروڑ ۸۰ لاکھ دوٹوں میں ایک لاکھ ۱۸ ہزار کی اکثریت سے فتح حاصل کی۔

جنوری ۱۹۶۱ء میں کینیڈی نے صدارت کی کرسی سنبھالی اور اعلان کیا کہ ان کی حکومت ساری دنیا میں ظلم غریبی، بیماری اور جنگ کے خلاف جدوجہد کرے گی۔

کینیڈی کا ابتدائی دور کافی اچھا رہا۔ ملک کی معیشت نے بحران پر قابو پالیا۔ اور سائنس اور خاص طور پر خلائی سائنس پر کافی روپیہ صرف کیا گیا۔ امریکہ کی آبادی ۲۰ کروڑ ہوگئی مشرق سے مغرب کی طرف آبادی کا بہاؤ جو چند سال سے شروع ہوا تھا بڑھتا رہا ساتھ

ہی بہت سے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے تھے۔ نسلی تناؤ برابر بڑھتا رہا تھا۔ شہروں کے ایک بڑے طبقے کی غربت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ہوا اور پانی میں پھیلا ہوا زہر خطرناک حد تک بڑھ رہا تھا۔ سائنس کی ترقی اور خودکار مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے۔ بے روزگاری کا مسئلہ شدید ہو رہا تھا۔ مشرقِ بعید میں ویت نام کی جنگ طول پکڑ رہی تھی اور امریکہ الجھتا جا رہا تھا۔ یورپ میں ناٹو کو زبردست دھکا پہنچا۔ فرانس نے اعلان کیا کہ وہ جلد ناٹو سے الگ ہو جائے گا اور امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ فرانس سے اپنے تمام اڈے اور ساز و سامان ہٹالے۔ فرانس اور چین نے اسی دور میں ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ کیا اور ایٹمی ہتھیاروں پر سے دو بڑے ملکوں کی اجارہ داری ختم کر دی۔

کنڈی کی صدارت کے پہلے ہی سال میں امریکہ میں تربیت پائے ہوئے کیوبا کے سابق باشندوں اور والنٹیروں کی ایک فوج نے کیوبا پر حملہ کیا تاکہ فیڈل کاسترو کی حکومت کا تختہ الٹ دے لیکن اسے سخت پسپائی اور تباہی کا سامنا پڑا۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کیوبا کے سلسلہ میں ایک اور بحران پیدا ہو گیا۔ امریکہ نے یہ الزام لگایا کہ سوویت یونین کیوبا میں میزائل لگا رہا ہے اور اس نے کیوبا کی ناکہ بندی کر دی تاکہ کوئی جہاز وہاں جا نہ سکے۔ اس سے ساری دنیا میں سخت بحران پیدا ہو گیا۔ پانچ دن تک سخت کش مکش اور عالمی جنگ چھڑنے کا خطرہ رہا۔ آخر میں ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے سوویت یونین نے میزائل ہٹا لینے کا وعدہ کیا اور امریکہ نے کیوبا پر حملہ نہ کرنے اور سوویت یونین کی سرحد سے قریب ترکی سے میزائل اڈے ہٹا دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

۵ اگست ۱۹۶۳ء کو امریکہ، سوویت یونین، اور برطانیہ کے درمیان زمین کے اوپر نیوکلیر دھماکوں پر پابندی کا معاہدہ طے پایا جس پر بعد میں ۱۰۰ سے زیادہ ملکوں نے دستخط کیے۔

صدر کنیڈی نے اپنے دور میں کانگریس سے درخواست کی کہ وہ بین الاقوامی تجارت بڑھانے۔ بے روزگاری کم کرنے۔ انکم ٹیکس گھٹانے بوڑھوں کو طبی امداد پہنچانے اور سیاہ فاموں کے شہری حقوق کی حفاظت کے لیے اقدامات کرے۔

۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء کو ڈلاس (ٹکساس) میں کنیڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ نائب صدر جانسن نے ان کی جگہ لی۔ جانسن نے اس پورے پروگرام کو عملی شکل دینے کا وعدہ کیا جس کی کنیڈی نے درخواست کی تھی۔

۱۹۶۴ء کے چناؤ میں جانسن کو بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی ہوئی۔ انہوں نے ایک عظیم سوسائٹی پروگرام پیش کیا جو تقریباً ان ہی بنیادوں پر تھا جو کنیڈی نے پیش کیا تھا۔ اس میں سے کانگریس نے زیادہ تر کی منظوری دے دی۔

جہاں تک بیرونی پالیسی کا تعلق ہے جانسن نے اپنی ساری توجہ جنوب مشرقی ایشیا پر مرکوز کر دی اور بڑے پیمانے پر ہتھیار اور فوجیں ویت نام بھیجنی شروع کیں۔ ۱۹۶۸ء تک ویت نام میں پانچ لاکھ امریکی سپاہی لڑ رہے تھے اسی کے ساتھ انہوں نے شمالی ویت نام پر بہت بڑے پیمانے پر بمباری کا بھی حکم دے دیا لیکن امریکی بھی بڑی تعداد میں مرنے لگے اور یہ امید ختم ہونے لگی کہ امریکہ یہ جنگ جیت سکتا تھا چنانچہ ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں ویت نام کی جنگ کے خلاف خود امریکہ میں زبردست احتجاج ترقی پانے لگا۔ ہر طرف جلسے جلوس اور مظاہرے ہونے لگے۔ اور ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو جانسن کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ آئندہ چناؤ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے ویت نام میں بمباری کم کر دی اور مئی ۱۹۶۸ء میں پیرس میں ویت نامی نمائندوں سے بات چیت کی ابتدا کی گئی۔

نکسن کا دور ۱۹۶۸ کے چناؤ میں ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے ہیوبرٹ ہمفری اور ری پبلکن پارٹی کی طرف سے رچرڈ نکسن کھڑے ہوئے۔ چناؤ کا مرکزی مسئلہ ویت نام کی لڑائی تھا۔ نکسن معمولی اکثریت سے چنے گئے اگرچہ ان کی پارٹی کو کانگریس میں اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔

نکسن نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اپنی ساری توجہ بین الاقوامی معاملات پر مرکوز رکھی۔ امریکہ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہند چینی میں فتح کی کوئی امید نہیں اس لیے نکسن نے اب یہ کوشش کی کہ ایشیا کے دوسرے ملکوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں سوویت یونین سے ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر پابندی کے سلسلے میں بات چیت شروع کی گئی۔ ویت نام کے بارے میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ لڑائی اسی طرح جاری رہے گی لیکن امریکی سپاہی آہستہ آہستہ بلا لیے جائیں گے اور اس کے لیے انہوں نے بڑے پیمانے پر ویت نامیوں کی تربیت اور ان کو مسلح کرنے کا پروگرام بنایا۔ جب لڑائی تیز ہوئی تو انہوں نے پیرس کی بات چیت روک کر شمالی ویت نام پر بمباری پھر سے بڑھا دی۔ جب ویت نامیوں کو کسی طرح زیر نہ کیا جا سکا تو پھر جنوری ۱۹۷۳ء میں کسنجر نے پیرس جا کر ویت نامیوں سے معاہدہ کیا جس کے مطابق طے ہوا کہ امریکہ اپنی فوجیں ویت نام سے ہٹا لے گا۔ ویت نام امریکی قیدی واپس کر دے گا اور اس طرح یہ بارہ سالہ جنگ ختم ہو گئی۔

ویت نام کے علاوہ نکسن نے چین پر بھی خاص توجہ کی۔ امریکہ کی پرانی پالیسی کو ترک کر کے وہ مارچ ۱۹۷۲ء میں چین گئے اور وہاں کے لیڈروں سے ملے۔ دونوں ملکوں کے سالہا سال کے تناؤ میں کمی آ گئی۔ اسی طرح کا دورہ مئی ۱۹۷۲ء میں انہوں نے سوویت یونین کا بھی کیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان کئی معاہدے طے پائے۔

جون ۱۹۷۳ء میں روسی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری لیونڈ برژنیف امریکہ گئے۔ اسی سال عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ نکسن کے نئے وزیر خارجہ کسنجر نے عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان صلح کروانے میں عملی دلچسپی لی۔ اس کے بعد نکسن نے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا۔ اس حکمت عملی کے زیر اثر عربوں میں آپس میں وہ پرانا اتحاد باقی نہ رہ سکا۔ اس لیے کہ امریکہ نے اسرائیل اور مصر کے درمیان علاحدہ معاہدہ کروانے میں کامیابی حاصل کر لی جس کی وجہ سے ایک طرف مصر اور دوسری طرف شام اور اردن میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لبنان کو اتنی طویل اور تباہ کن خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا۔

اندرونی طور پر نکسن کچھ زیادہ نہ کر پائے۔ ایک تو ان کا نظم و نسق ری پبلکن تھا جو پرانے نظم و نسق کے مقابلے میں قدامت پرست تھا۔ اس کے علاوہ کانگریس پر ڈیموکریٹک پارٹی کے لوگ چھائے ہوئے تھے۔ تیسرے سارا ملک ویت نام کے مسئلہ میں الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ نکسن کے دور میں مہنگائی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی۔ ڈالر سخت بحران کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۷۰ء میں قیمتیں ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں تیس فی صد زیادہ تھیں اسی سال بے روزگاروں کی تعداد چالیس لاکھ تک بڑھ گئی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اس میں ایک فی صد کا اور اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء کے چناؤ میں نکسن کو پھر کامیابی ہوئی لیکن مئی ۱۹۷۳ء میں واٹر گیٹ کے مسئلہ نے ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک سال سے زیادہ یہی مسئلہ ملک کی سیاست پر حاوی رہا۔ آخر کار کانگریس کی بڑی اکثریت نکسن کے خلاف ہو گئی اور مجبوراً انہیں ۸ اگست ۱۹۷۴ء کو استعفا دینا پڑا اور ان کی جگہ ان کے نائب صدر جیرالڈ فورڈ صدر بنے۔

ہندوستان کی قومی تحریک

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۸ء) نے ہندوستان کی تحریک آزادی پر گہرے اثرات ڈالے۔ ملک کی سیاسی بیداری میں شدت پیدا ہوئی۔ برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے ذریعہ اصلاحات نافذ کیں۔ کچھ اختیارات عوامی نمائندوں کو سپرد کیے گئے اور باقی تمام اختیارات گورنر اور اس کی انتظامی کونسل کے پاس رہے۔ لیکن کانگریس نے حسن امام کی صدارت میں ان اصلاحات کو مایوس کن قرار دیا۔ جنگ میں ترکوں کی شکست کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں نے مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں تحریک خلافت کا آغاز کیا جس کی گاندھی جی نے مکمل تائید کی۔ کانگریس نے اپنے اجلاس کلکتہ (۱۹۲۰ء) میں ترک موالات (عدم تعاون) کی تجویز منظور کی۔ خطابات واپس کر دیے گئے۔ اعزازی خدمات سے استعفا دیا گیا۔ تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی ملتوی کر دی گئی اور باہر کے مال کا مقاطعہ کیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطۂ عروج پر جا پہنچا۔ بدقسمتی سے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۳ء کے دوران فرقہ دارانہ اختلافات کو ہوا دی گئی اور آپس میں جول پر سیاہ بادل چھا گئے۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے سرجان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا تاکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا جائزہ لے اور ذمہ دارانہ حکومت کے قائم کرنے کے متعلق رپورٹ دے لیکن اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا اور پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کل جماعتی کانفرنس میں کامل ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ سر محمد اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑے بغیر مسلمانانِ ہند کو اپنی روایات کے تحت اس ملک میں نشوونما کا حق حاصل ہے۔ لندن میں تین بار گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گیا۔ آخر کار ۴ اگست ۱۹۳۵ء کو وہ دستور منظور ہوا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے مشہور ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے ان اصلاحات کو قبول کر لیا۔ اس ایکٹ کے تحت انتخابات ہوئے جس میں کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ یوپی اور بعض دوسرے صوبوں کی وزارت میں مسلم لیگ کے نمائندے لیے جائیں جسے کانگریس نے نامنظور کر دیا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مطالبات لے کر تحریک شروع کی۔ ۱۹۴۰ء تک اس تحریک نے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن یا پاکستان قائم کرنے کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں انگریزوں نے جرمنوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔ جنگ کے زمانہ میں قومی تحریک نے شدید صورت اختیار کی اور اس کے نتیجہ میں وزیر اعظم ایٹلی نے فروری ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ اقتدار منتقل کرنا چاہتی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا منصوبہ پیش کیا جسے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے قبول کر لیا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو پارلیمنٹ نے قانون آزادی ہند منظور کیا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان وجود میں آ گئے۔

پاکستان کے قیام کے بعد

پاکستان اپنے قیام کے بعد عظیم مشکلات سے دوچار ہو گیا۔ بے شمار پناہ گزینوں کا سیلاب جاری تھا۔ لاکھوں نفوس کی بحالی اور آبادکاری کا انتظام کرنا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں صورت حال کو قابو میں لا کر حکومت کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ نئے ملک میں صوبہ سرحد اور بلوچستان مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انتخابات کے ذریعہ صوبہ میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہوئی۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مسٹر جناح نے وفات پائی۔

مسٹر جناح کی وفات کے بعد مشرقی پاکستان کے سابق وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے اور لیاقت علی خاں بدستور وزیر اعظم رہے۔ لیاقت علی خاں کے زمانہ میں بالغ رائے دہی کا نظام ترمیم کے ساتھ رائج کیا گیا اور پنجاب اور صوبہ سرحد میں ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے بعد منتخب سرکاریں قائم ہو گئیں۔ اسی سال ۱۷ اکتوبر کو لیاقت علی خاں کو جلسہ عام میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین (۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء — ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء) لیاقت علی خاں کے جانشین ہوئے اور وزیر مالیات غلام محمد ان کی جگہ گورنر جنرل بنائے گئے۔ خواجہ ناظم الدین کے عہد میں ملک کے حالات خراب ہو گئے اور گورنر جنرل نے انہیں سبکدوش کر دیا۔ محمد علی بوگرا کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ان کے زمانہ میں (۱۷ اپریل ۱۹۵۳ — ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء) پاکستان اور مسلم ممالک کے درمیان تعلقات گہرے ہوئے۔ بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ امریکہ سے فوجی اور اقتصادی معاہدے ہوئے جن میں معاہدہ بغداد سنٹو (CENTO) اور سیٹو (CEATO) یعنی جنوب مشرقی ایشیا کا دفاعی معاہدہ شامل ہے۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ کو متحدہ محاذ کے ہاتھوں جس کے سربراہ چودھری فضل حق تھے شکست اٹھانی پڑی۔ عوامی لیگ ایک سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی جس کے قائد شہید سہروردی تھے۔

چودھری محمد علی کے دور وزارت (۱۱ اگست ۱۹۵۵ء سے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) میں جمہوری پارلیمانی طرز کا دستور بنایا گیا اور ملک کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا نام دیا گیا۔ محمد علی کے بعد حسین شہید سہروردی (۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء — ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء) اور ان کے بعد آئی۔ آئی۔ چندریگر (۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء — ۱۶ دسمبر ۱۹۵۸ء) وزیر اعظم ہوئے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جبکہ پورے ملک میں عام انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں صدر سکندر مرزا نے بری فوج کے کمانڈر اعلیٰ جنرل محمد ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا اور پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جنرل ایوب خاں نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے بنیادی جمہوریتیں قائم کر کے اصلاحات کے پروگرام کو نچلی سطح سے شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایوب خاں دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔

بنگلہ دیش کا قیام

محمد ایوب خاں کے بعد یحییٰ خاں ۲۵ دسمبر ۱۹۶۹ء

تو صدر پاکستان بنے اور فوراً ہی انہوں نے مارشل لا نافذ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ ان کا مقصد صرف ملک میں چناؤ کرانا اور غیر فوجی منتخبہ حکومت قائم کرنا ہے۔ اگست ۱۹۶۹ء میں انہوں نے ایک غیر فوجی، سویلین حکومت قائم کر دی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کروائے گئے۔

اس چناؤ میں شیخ مجیب کی سرکردگی میں عوامی لیگ نے اسمبلی کی تین سو نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستیں حاصل کر کے اکثریت حاصل کر لی اس کے ساتھ مغربی پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلس پارٹی کو ۸۳ سیٹوں کو جیتنے کی بنا پر اکثریت حاصل ہوگئی۔ یحییٰ خاں کا منصوبہ یہ تھا کہ اسمبلی سو دن کے اندر نیا آئین مرتب کرے گی۔

شیخ مجیب نے یہ اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان اپنے لیے مکمل خود مختاری چاہتا ہے صرف بیرونی تعلقات مرکز کے ہاتھ میں رہیں گے۔ مشرقی پاکستان کو دفاع اور تجارت کے معاہدوں کا بھی حق ہوگا۔ مسٹر بھٹو نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ڈھاکہ میں اسمبلی کا جو اجلاس بلایا گیا تھا اس کا بھی بائی کاٹ کر دیا۔ صدر یحییٰ خاں نے آئین ساز اسمبلی کو غیر معینہ مدت تک کے لیے برخواست کر دیا۔ شیخ مجیب نے اس کے جواب میں بائی کاٹ اور مکمل ہڑتال کا اعلان کیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے پوری طرح اس کی تائید کی۔ اس کے بعد سمجھوتے کے تمام امکانات ختم ہوگئے۔

صدر یحییٰ خاں نے شیخ مجیب اور ان کے ساتھیوں کو غدار قرار دیا اور اس "بغاوت" کو کچلنے کے لیے فوج روانہ کی۔ اس طرح پاکستانی فوج اور مجیب کے ساتھیوں کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ شیخ مجیب اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بچے ہوئے ساتھیوں نے ہندوستان میں پناہ لی اور ایک آزاد بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیا۔ دن بدن لڑائی تیز ہوتی گئی کشت و خون اور تباہی کا بازار گرم ہوگیا۔ لاکھوں آدمیوں نے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لی۔ اس خانہ جنگی کی آگ تیز ہوئی تو یحییٰ خاں نے ہندوستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ آخر کار دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوجوں کو ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور مغربی پاکستان میں بھی جنگ بندی ہوگئی۔ پاکستان دو آزاد ریاستوں میں بٹ گیا۔ مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو کی سرکردگی میں پیپلس پارٹی کی سویلین حکومت قائم ہوئی اور جنوری ۱۹۷۲ء میں مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کی سرکردگی میں عوامی لیگ کی حکومت قائم ہوئی۔

ہندوپاک تعلقات

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی جس طرح تقسیم ہوئی۔ کروڑوں انسان بے گھر ہوگئے اور بھارت اور پاکستان میں متبادل صورت میں انہیں پناہ لینی پڑی لاکھوں آدمی مارے گئے۔ بے انتہا دولت اور جائیداد تباہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ فوراً دوستانہ تعلقات قائم ہوجانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگرچہ اس طرف گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے بے حد کوشش کی۔ گورنر جنرل پاکستان محمد علی جناح بھی یہ چاہتے تھے کہ دشمنی کا یہ دور ختم ہو۔ وزیر اعظم ہندوستان اور وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کے درمیان معاہدہ بھی ہوا کہ آپسی کھنچاؤ کو کم کیا جائے۔

پاکستان بننے کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان بہت سارے مسائل تھے۔ اثاثے کی تقسیم، فوجوں کی تقسیم وغیرہ۔ اس کے علاوہ جس طرح پاکستان کی سرحدیں متعین کی گئی تھیں ان سے جناح صاحب بہت غیر مطمئن تھے۔ ان سب مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ کشمیر کا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے معاہدے کے تحت ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ نئی ریاستوں، ہندوستان اور پاکستان میں سے جس میں چاہیں شریک ہوں کشمیر کے مہاراجہ کی حکومت دونوں سے سودا بازی کی کوشش کر رہی تھی۔ پاکستان کا یہ دعویٰ تھا کہ چوں کہ کشمیر کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے اسے پاکستان کا حصہ بننا چاہیے اس سلسلہ میں پاکستان میں سخت ہیجان برپا ہوا چنانچہ ۱۹۴۷ء کے آخر میں قبائلیوں کی ایک بڑی تعداد کشمیر میں داخل ہوگئی۔ اسے حکومت پاکستان کی حمایت حاصل تھی۔ اسی کے فوراً بعد مہاراجہ کشمیر نے ہندوستان میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ کشمیر کی قومی تحریک کے رہنما شیخ محمد عبداللہ نے اس کی تائید کی۔ ان کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس کی حکومت قائم ہوئی جس نے حکومت کے تعاون سے قبائلیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ حکومت ہند نے اس کے بعد کئی مدد بھیجی۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا جس نے جنگ بندی کروادی۔ قبائلیوں کے مقبوضہ حصہ میں پاکستان نے نام نہاد "آزاد کشمیر" حکومت قائم کر دی اور جموں و کشمیر کا باقی اور بڑا حصہ ہندوستان کا جزو رہا۔

اس وقت سے آج تک کشمیر کا مسئلہ دونوں ملکوں میں سخت تناؤ کا باعث رہا ہے بعض بیرونی طاقتوں نے اسے باقی رکھنے کے لیے پاکستان کو کافی فوجی امداد دی اور اسے فوجی معاہدے میں شریک کر لیا۔ اسی کے نتیجہ میں ۱۹۶۵ء میں بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک اور جنگ ہوئی جسے دونوں کے دوست ملکوں کی کوششوں سے روکا گیا۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں تاشقند میں ہندوستانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستان کے صدر ایوب خاں کے درمیان سمجھوتہ ہوا کہ آئندہ سارے مسائل پر امن طریقہ پر بات چیت کے ذریعہ حل کیے جائیں گے۔

۱۹۷۰ء میں جب مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں شیخ مجیب کی سرکردگی میں یحییٰ خاں کی حکومت کے خلاف تحریک چلی اور پاکستانی فوج اسے کچلنے کے لیے مشرقی پاکستان پہنچی تو لاکھوں لوگ بھاگ کر پناہ لینے کے لیے ہندوستان میں داخل ہونے لگے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کھنچاؤ تیزی سے بڑھنے لگا جس نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خاں کے اعلان جنگ کے بعد باقاعدہ لڑائی کی شکل اختیار کر لی بنگلہ دیش بننے کے بعد مغربی پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سرکردگی میں حکومت قائم ہوگئی۔ مسٹر بھٹو اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کے درمیان شملہ میں ملاقات ہوئی اور ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت ۱۹۷۱ء کے دوران ہندوستان نے پاکستان کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ اسے واپس کر دیے گئے، پاکستانی جنگی قیدی رہا کر دیے گئے اور آئندہ تعلقات کو بہتر بنانے کی طرف دوسرے اقدامات کیے گئے چنانچہ اس کے بعد سے آہستہ آہستہ یہ تعلقات بہتر ہوتے رہے ہیں اور اب دونوں ملکوں کے آپس میں سفارتی تعلقات قائم ہوچکے ہیں اور تجارت بھی بڑھ رہی ہے۔

قومی معیشت

پاکستان دنیا کے بیس غریب ممالک میں سے ایک ہے۔ ۱۹۷۰ - ۱۹۷۵ء میں فی کس آمدنی ۱۴۰ ڈالر سالانہ تھی۔ کراچی اور لاہور کے اطراف و اکناف کے صنعتی رقبے خوش حالی میں بلوچستان اور شمال مغرب کے غیر ترقی یافتہ علاقوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ملک کی معیشت کا بڑی حد تک انحصار زراعت پر اور خاص طور سے کپاس پر ہے۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا ریکارڈ بہت سے ترقی پذیر ممالک سے بہتر رہا۔ زراعت پر دباؤ کو کم کرنے اور صنعتی شعبے میں وسعت دینے میں پیش رفت ہوئی۔ ترقی یافتہ ممالک نے ملک کے معاشی پالیسی کے بڑھاوے میں کافی فنی اور مالی امداد دی۔

۱۹۶۰ - ۱۹۷۰ء میں جو امداد وصول ہوئی وہ بہت سارے ترقی پذیر ممالک کو ملنے والی امداد سے زیادہ تھی۔ ملک کی معیشت میں تدریجی تبدیلی ہوئی اور بیرونی تجارت

پر اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اگرچہ پاکستان درآمدات اور برآمدات کے اعتبار سے دنیا کے دس سب سے پیچھے ملکوں میں سے ایک تھا۔ تاہم جہاں تک کہ خام روئی کی برآمد کا تعلق ہے وہ دنیا کے دس سب سے اہم ممالک میں سے ایک ہے۔ پاکستان سوتی دھاگہ اور کپڑے کو بیرونی منڈیوں میں بھی فروخت کرنے میں پیش پیش رہا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان صرف خام مال برآمد کرتا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے سالوں میں یہ خام مال صنعت کاری میں استعمال ہونے لگا۔ اور اسی طرح ملک کی معیشت کے استحکام کی سمت ایک اہم قدم اٹھایا گیا پاکستان نے اسی دوران "علاقائی تعاون برائے ترقی" نامی معاہدہ ترکی اور ایران سے کیا۔ نیز امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ سے امداد ملنے سے تجارت کو کافی فروغ ہوا۔

معدنیات

۱۹۷۰ء کے سالوں میں ملک میں کم و بیش بیس مختلف معدنیات تھیں۔ کوئلہ سب سے قدیم صنعت ہے لیکن کوئلہ ادنیٰ درجہ کا ہونے کی وجہ سے کانوں میں پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔ کوئلہ کے ذخائر کا اندازہ چالیس کروڑ میٹرک ٹن ہے۔ خام لوہا بھی اچھے قسم کا نہیں ہے پنجاب میں کالا باغ کے علاقے میں تیس کروڑ میٹرک ٹن کی مقدار میں پایا جاتا ہے شمال مغربی صوبہ میں ہزارہ میں اور بلوچستان میں چغائی میں جملہ خام لوہا باون کروڑ میٹرک ٹن پایا جاتا ہے مقامی لوہے سے فولاد کی صنعت قائم کی گئی۔ فولاد کا ایک کارخانہ سوویت یونین کے تعاون سے تعمیر ہوا۔ چونے کی دھات کثرت سے پائی جاتی ہے اور سیمنٹ کی صنعت میں استعمال ہوتی ہے۔ ڈیرہ غازی خاں ضلع میں تابکاری دھاتوں کا بھی پتہ چلا ہے۔

تیل اور گیس

پاکستان میں کچھ تیل بھی پایا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی گیس کے نہایت وسیع میدان ہیں۔ پہلے پہل ۱۹۱۵ء میں پٹرول دریافت ہوا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اور بھی بعض ذخائر کا پتہ چلا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں پنجاب اور بلوچستان کی سرحد پر سوئی (Sui) کے مقام پر قدرتی گیس کے زبردست ذخائر دریافت ہوئے جن کی مقدار تین سو بیس کروڑ کیوبک فیٹ یا ایک ہزار آٹھ سو کروڑ کیوبک میٹر ہے۔ ۱۹۵۷ء میں دوسرے ذخائر کا پتہ چلا۔ یہ ذخیرہ ۳۹ ہزار کروڑ مکعب فیٹ ہے۔ قدرتی گیس کے جملہ ذخائر سولہ لاکھ کروڑ مکعب فیٹ ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے ذخائر میں شمار ہوتے ہیں۔ کراچی، لاہور ملتان، لائل پور اور اسلام آباد میں گیس کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔

برقی طاقت

پاکستان میں پانی یا بھاپ سے برقی طاقت پیدا کرنے میں بڑی ترقی ہوئی ہے جہلم کے منگلا ڈیم پر ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ ۱۹۶۷ء سے کام کر رہا ہے جس سے ساڑھے چھ لاکھ کیلو واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اسے بڑھا کر پہلے مرحلے میں دس لاکھ کیلو واٹ کیا گیا اور دوسرے مرحلے میں ۱۹۸۰ء میں تیس لاکھ کیلو واٹ تک پہنچایا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں دریائے سندھ پر عظیم تربیلا ڈیم کا آغاز کیا گیا۔ برقی پلانٹ کی گنجائش ۲۱ لاکھ کیلو واٹ ہے۔ ایک ایک سو پچیس ہزار کیلو واٹ نیوکلر پاور پلانٹ کراچی کے قریب تعمیر کیا گیا ہے مجموعی طور پر ۱۹۷۳ء کے ابتدائی سالوں میں بجلی کی پیداوار ۷.۵ لاکھ کیلو واٹ تھی۔

قومی ذرائع آمدنی زراعت جنگلات اور ماہی گیری

ملک کا ۸۵ فی صد حصہ دیہی علاقوں میں آباد ہے۔ اس لیے پاکستانی معیشت میں زراعت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۷۱-۱۹۷۲ء میں پاکستان کی خام پیداوار کا ۴۱ فی صد حصہ زراعت، جنگلات اور ماہی گیری پر مشتمل تھا۔ ان شعبوں میں ملک کے کم و بیش دو تہائی محنت کش کام کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ۹۱ کروڑ ایکڑ کے قابل کاشت رقبہ میں سے صرف ۲۵ فی صد زمین زیر کاشت تھی اصلاحات آراضی کے پروگرام کے تحت زرعی تکنیک میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ آراضی کے حدود معین کیے گئے۔ اس طرح صدیوں پرانی روایت میں بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل کی تنصیب کیمیائی کھاد اور اچھے بیجوں کی فراہمی نیز فارم مشنیری کے استعمال کے باعث پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ زرعی ترقیاتی پروگرام کا ایک اہم مقصد گیہوں کی کاشت میں خود مکتفی ہونا تھا اور اس میں اس درجہ کامیابی ہوئی کہ ۱۹۷۰ء کے ابتدائی سالوں میں پاکستان فاضل مقدار باہر بھیجنے لگا۔ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ء میں گیہوں کی پیداوار ۶۸ لاکھ ٹن، چاول کی اڑتیس لاکھ ٹن اور کپاس کی پیداوار ۶.۷ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔

معاشی اصلاحات

۱۹۷۲ء میں پاکستان سرکار نے معاشی اصلاحات کا ایک پروگرام شروع کیا جس سے بہت سی اہم صنعتوں پر سرکاری کنٹرول قائم ہو گیا مثلاً لوہا اور فولاد، کیمیاوی اشیاء اور سیمنٹ نیز بیمہ کو قومیا یا گیا۔

بیرونی سرمایہ کاری

بیرونی خانگی سرمایہ کاروں نے منفعت کی غرض سے پاکستان کو طویل مدتی قرضے دیے اور دوسری آسانیاں مقامی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے فراہم کیں۔ ۱۹۶۰ء کے ختم تک اور بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے پاکستان میں بیرونی خانگی سرمایہ کاری کا اندازہ ساٹھ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھا جس میں برطانیہ کا حصہ سب سے بڑا تھا۔

ترقیاتی منصوبے

پہلا منصوبہ (۱۹۵۵ - ۱۹۶۰ء) پنج سالہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ پاکستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کی یہ پہلی مربوط کوشش تھی۔ اس منصوبے میں کم و بیش دس ارب روپے صرف ہوئے۔ ۱۹۵۷ء سے اس منصوبہ پر عمل شروع ہوا تو اسے بڑھا کر دس ارب اسی کروڑ کر دیا گیا اور اسے کاروباری ترقیاتی پروگرام کے ذریعہ مکمل کیا گیا۔ اس پلان سے دوسرے پنج سالہ منصوبے کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوا۔

دوسرے منصوبہ (۱۹۶۰ - ۱۹۶۵ء) میں ۲۳ ارب روپے صرف ہوئے۔ کل قومی پیداوار ۵.۲ فی صد کی سالانہ اوسط تک بڑھ گئی جو ۴.۷ فی صد کے معینہ نشان سے زیادہ تھی۔ زرعی پیداوار سالانہ ۳.۵ فی صد تک پہنچ گئی جو پہلے پلان کے نشان سے ۲.۳ فی صد زیادہ تھی۔

۲۰ سالہ (خام) منصوبہ (۱۹۶۵ء - ۱۹۸۵ء)

پہلی اور دوسری پنج سالہ منصوبہ بندی کی بنا پر ۱۹۶۵ء میں بیس سالہ خام منصوبہ تیار کیا گیا جس کے مقاصد یہ تھے:-

۱۔ قومی آمدنی کو چار گنا بڑھانا جس سے فی کس آمدنی دوگنی سے زیادہ ہو جائے۔
۲۔ مشرقی (سابق) اور مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی میں مساوات پیدا کرنا۔
۳۔ ملک گیر خواندگی کا حصول۔
۴۔ ملک کو بیرونی امداد سے آزاد کرنا۔ یہ مقاصد تیسرے پنج سالہ منصوبے سے شروع ہو کر آئندہ پنج سالہ منصوبے کے ذریعہ حاصل کیے جانے تھے۔

تیسرا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۶۵ء - ۱۹۷۰ء)

تیسرا پنج سالہ منصوبہ بیس سالہ (خام منصوبہ) کے حدود کے اندر تیار کیا گیا۔ اس کے لیے باون ارب روپے کی رقم منظور کی گئی۔ اس منصوبہ کے مقاصد یہ تھے:-

۱۔ قومی معیشت میں تیز ترقی کا حصول۔
۲۔ دونوں صوبوں میں فی کس آمدنی کا تفاوت دور کرنا۔
۳۔ روزگار کی منڈی میں توسیع۔
۴۔ ادائیگی کی صورت حال میں توازن و استحکام۔
۵۔ منصوعات تیار کرنے کے لیے بنیادی صنعتوں کی ترقی۔
۶۔ زرعی ترقی کی رفتار میں اضافہ
۷۔ افزائش آبادی کو روکنا
۸۔ بہتر سکونت کا انتظام نیز علاج و معالجہ اور تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا۔
۹۔ دولت کے مواقع اور دیگر مفادات کی بہتر تقسیم۔
۱۰۔ بعض مخصوص سماجی مقاصد کی تیزی سے تکمیل لیکن ۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے جنگ اور ۱۹۷۰ء کے ابتدائی سالوں میں بنگلہ دیش کے قیام سے تیسری پلان کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

چوتھا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۷۱ء - ۱۹۷۵ء)

اس منصوبہ پر ۷۵ ارب کے اخراجات کی منظوری دی گئی۔ ۳۹ ارب ۴۰ کروڑ مشرقی پاکستان کے لیے اور ۳۵ ارب ۶۰ کروڑ مغربی پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں پر صرف ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی روک تھام اور مغربی پاکستان میں سندھ طاس کے پروگرام کے لیے منصوبہ کے حدود سے الگ رقم مخصوص کی گئی لیکن ۱۹۷۰-۱۹۷۲ء کے شدید سیاسی بحران کے بعد اسے معطل کر دیا گیا اور اس کے بجائے سالانہ ترقیاتی پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔

آزادی کے بعد پاکستان کے سیاسی نظام میں بڑی دور رس تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی متلاطم سیاسیات نے ملک کے مشرقی حصے کو جدا ہوتے دیکھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں اس وقت کی جملہ آبادی کے ۵۴ فی صد لوگ رہتے تھے۔ بنگلہ دیش کی ایک آزاد مملکت قائم ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۷۲ء میں پاکستان عظیم معاشی اور سیاسی بحران کا شکار ہوگیا۔

پاکستان کی سیاست میں تین طرح کے تصادم منظر عام پر آئے۔ سب سے پہلے وہ لوگ نظر آتے ہیں جنہوں نے پارلیمانی قسم کی حکومت کا نعرہ لگایا لیکن بعد میں انہوں نے فوج کی مدد سے اقتدار جمالیا۔ اور ایک ایسی کش مکش کی بنیاد ڈالی جس میں فوج اور سیاسی قیادت دونوں ملک میں اعلیٰ اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے نظری اعتبار سے اس کش مکش کا مقصد ملک میں جمہوریت قائم کرنا قرار دیا گیا۔ ایک دوسرا تصادم علاقہ واری گروہوں میں تھا۔ چوں کہ یہ کش مکش مرکزی اقتدار کے خلاف تھی اس لیے جمہوریت پسند تحریک میں یہ لوگ مل گئے لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے وفاقی ڈھانچہ میں اس طرح تبدیلی لائی جائے کہ صوبوں کو اندرونی خود مختاری حاصل رہے اور مرکز کا دفاع، امور خارجہ اور مالیات پر اختیار رہے۔ ایک تیسری کشمکش کا تعلق ملک کے معاشی وسائل کی تقسیم اور پسماندہ علاقوں کو ترقیاتی منافع کا زیادہ سے زیادہ حصہ دینے سے تھا ملک کی صنعتی دولت کا بڑا حصہ چند خاندانوں کے قبضہ میں تھا۔ زراعتی دولت ایسے زمینداروں کے ہاتھوں میں تھی جو بڑی حد تک پنجاب اور سندھ میں نہری علاقہ پر قابض تھے شہری اور دیہاتی آبادی پر افراط زر اور بالواسطہ محاصل کا بوجھ برابر بڑھتا رہا۔ اور ایک ایسی دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی جس نے ایک عوامی شورش کی شکل اختیار کر لی۔ اس نے نہ صرف حکومت کو حیرت میں ڈال دیا بلکہ سیدھے اور بائیں بازو کے مسلمہ سیاسی قائدین بھی اس کی زد میں آگئے۔

دستور سازی

۱۹۴۷ء میں مملکت پاکستان کی دستور سازی کا اہم کام دستور ساز اسمبلی کے سپرد کیا گیا۔ طے ہوا کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جسے حکومت پاکستان نے اپنا لیا تھا، ملک کی عارضی مقننہ کے فرائض بھی انجام دے اور ایسا وفاقی دستور بنائے جس میں دستور ساز اسمبلی کے ساتھ مرکز میں ایک گورنر جنرل ہو اور علاقہ واری سطح پر صوبائی گورنر ہوں۔ کابینی طرز کی حکومت ہو جو مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے آگے جواب دہ ہو لیکن گورنر جنرل کو وسیع اختیارات دیے گئے تاکہ سیاسی قیادت، فوج اور انتظامی شعبوں کے درمیان اس کی شخصیت فیصلہ کن رہے۔

بہرحال ۱۹۵۶ء میں دستور ساز اسمبلی نے ملک کا پہلا دستور بنایا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء کے نمونہ پر تھا اور اس کے تحت صدر کو اختیار تھا کہ وہ صوبائی پارلیمانی اور مرکزی وفاقی حکومت کو معطل کر دے۔

۱۹۵۸ء میں اس دستور کو منسوخ کر دیا گیا اور مارشل لا نافذ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک نئے دستور کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بموجب لوکل کونسل کے اسی ہزار اراکین کے الکٹورل کالج سے صدر اور قومی مجالس کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔

اگرچہ وفاقی حکومت کی داغ بیل پڑی لیکن مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے اختیارات بہت محدود تھے صوبوں میں اقتدار گورنروں کے ہاتھ میں مرکوز تھا جو صدر کے ماتحت تھے۔

۱۹۶۸ - ۱۹۶۹ء میں ایک بہت بڑی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی وجہ سے صدر کو استعفا دینا پڑا اور فوج کے کمانڈر ان چیف نے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔ مارشل لا کے ذریعہ ملک کا دستور معطل ہوگیا۔ تاہم حکومت نے رائے دہی بالغان کی بنیاد پر ایک عام انتخاب کرنے اور دستور ساز اسمبلی کے قیام کا وعدہ کیا۔

چار صوبوں کی بحالی

اس عام مطالبہ کو کہ مغربی پاکستان کی وحدانیت کو تحلیل کر دیا جائے اور اس علاقہ میں دوبارہ صوبے قائم کیے جائیں منظور کر لیا گیا۔ اور ۱۹۷۰ء میں چار صوبے دوبارہ قائم کر دیے گئے۔ اسی سال انتخابات بھی ہوئے۔

مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے جو اسلامی سوشلزم کی حامی تھی لیکن درحقیقت جسے پنجاب اور سندھ کے زمینداروں کی حمایت حاصل تھی مغربی پاکستان میں ساٹھ فی صد نشستیں حاصل کیں لیکن نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علمائے اسلام کا پلہ بلوچستان اور شمالی مغربی صوبے میں بھاری رہا۔ مشرقی پاکستان میں انتخابات میں کامیابی عوامی لیگ کے ہاتھ رہی، جو علاقائی خود اختیاری حاصل کرنے کا پروگرام بنا چکی تھی۔ اور جس کے نتیجہ میں ایک سیاسی بحران رونما ہوا اور بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ ان تبدیلیوں کے باعث ذوالفقار علی بھٹو جو پاکستان پیپلز پارٹی کے قائد تھے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ قومی اسمبلی کا انعقاد اپریل ۱۹۷۲ء میں ہوا جس میں ایک عارضی دستور منظور کیا گیا اور مارشل لا اٹھا دیا گیا۔ قومی اسمبلی نے اپریل ۱۹۷۳ء میں ایک نیا دستور منظور کیا جو پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ میں تیسرا دستور تھا۔

سماجی حالت

ملک میں پانچ سال سے زائد عمر کے بچوں کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ بچوں کی کل آبادی کا تقریباً ۲۵ فیصد زیر تعلیم تھا۔

۱۹۷۰ء میں ۶ کروڑ کی آبادی کے لیے تیرہ ہزار چار سو ڈاکٹر تھے۔ اور چار ہزار سات سو نرسیں تھیں۔

تمدن پاکستان ایک ایسے تمدنی ورثہ کا دعویدار ہے جو پانچ ہزار سال سے زیادہ قدیم ہے اس سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں وادیٔ سندھ کا تمدن پروان چڑھا تھا۔ لیکن اسلامی نصب العین نے ایک مستحکم اور روحانی بنیاد پر نہ صرف اسلامی تمدن سے بلکہ ہندوستان اور ساری اسلامی دنیا سے تمدنی مطابقت پیدا کی۔

نوآبادکاری سے سامراجیت تک

جدید سامراجیت کا دور تقریباً ۱۵۰۰ء سے شروع ہوا اس سے پہلے یورپ ایک پس ماندہ براعظم تھا معیشت بڑی حد تک خود مکتفی تھی معاشی زندگی جیسے جیسے ترقی کرنے لگی اور تجارت بڑھنے لگی تو باہر کی منڈیوں کی ضرورت میں اضافہ ہوا۔ پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۶ - ۱۰۹۹ء) کی وجہ سے پہلی مرتبہ یورپ کا مشرق سے ربط قائم ہوا بلکہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ جنگیں لڑی ہی اس لیے گئیں کہ یورپ کے لیے تجارتی منڈیاں حاصل کی جائیں۔ شروع میں یہ تجارت اٹلی کی شہری ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔

اسی زمانے میں ان ملکوں نے بحیرۂ روم کو پار کر کے افریقہ سے بھی تجارتی تعلقات قائم کیے۔ تجارت اور نوآبادیات کی ڈور میں پرتگال سب سے آگے تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ اس کا سمندری ساحل بہت لانبا تھا اور پڑوس کے علاقوں میں اس کا پھیلنا ممکن نہیں تھا۔ حالات نے اسے مجبور کیا کہ وہ سمندری راستوں سے نئے علاقوں کی تلاش کرے چنانچہ پہلی منزل میں اس نے افریقہ کے مغربی ساحل کے علاقوں اور جزیروں پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ گیا اور وہاں سے واپسی پر مسالوں سے ایک جہاز بھر کرلے آیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان آنے جانے کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

۱۵۰۵ء میں ہینولی کی حکومت نے ایک نئی پالیسی کی ابتدا کی۔ اب اس سمندری سفر کا مقصد صرف تجارت ہی نہیں تھا بلکہ فتوحات کو بھی اس کے ساتھ جوڑ لیا گیا۔ ۱۵۰۵ء اور ۱۵۱۵ء کے درمیان مشرقی افریقہ کے ساحل کے بھی کئی علاقے پرتگال کے زیر اثر آئے ہندوستان کے ایک علاقہ دیو پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا اور اس طرح اس نے تجارت کے اس پورے راستہ پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے گوا پر قبضہ کرلیا جو بعد میں پرتگال کے مشرق کے مقبوضات کا صدر مقام بنادیا گیا۔ اس کے بعد ہی ۱۵۱۱ء میں ملایا میں وہ داخل ہوئے۔ ایران کی بندرگاہ ہرمز پر ان کا قبضہ ہوگیا اور خلیج فارس پر ان کا کنٹرول قائم ہوگیا فتوحات کا یہ سلسلہ سیام ہوتا ہوا چین میں کینٹن تک جاری رہا۔ کچھ پرتگالی جاپان بھی جا پہنچے لیکن جاپانی حکومت نے ان کے قدم نہیں جمنے دیے۔

ہسپانوی فتوحات واسکوڈی گاما کے ہندوستان پہنچنے سے چھ سال پہلے یعنی ۱۴۹۲ء میں کولمبس جزائر بہاما، کیوبا اور ہسپانیولا تک پہنچ چکا تھا جن پر اس نے ہسپانوی حکمرانوں فرڈیننڈ دوم اور آئزابیلا کی حکمرانی کا اعلان کردیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سمجھتا تھا کہ کیوبا ہندوستان میں ہے اور اس نے ہسپانیولا کو جاپان تصور کیا تھا۔ کولمبس نے امریکہ تک چار سمندری سفر کیے اور یہ سیاحتیں اسے کئی جزیروں اور موجودہ وینی زویلا کے ساحل وسطی امریکہ اور پناما تک لے گئیں۔ آخری دم تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب علاقے ایشیا میں ہیں۔ اسی زمانہ میں ہسپانیہ کے کئی دوسرے باشندوں نے جنوبی امریکہ کے ایک بڑے حصہ کو دریافت کرلیا تھا۔ ان کی دسترس پناما سے لے کر برازیل تک رہی۔ ان علاقوں میں آباد ہونے کی پہلی کوشش ہسپانیوں نے ہی کی۔ انھوں نے ۱۵۱۲ء تک جزائر غرب الہند پر مکمل قبضہ کرلیا تھا۔ اور بعض جزیروں کو آباد کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۵۱۹ء میں ہسپانوی کیوبا کے راستے میکسیکو میں فاتحانہ داخل ہوئے اور انہیں بے حساب سونا چاندی اور دوسری دولت ہاتھ لگی یہاں سے انہوں نے میکسیکو اور موجودہ شمالی امریکہ کے دوسرے علاقوں میں بھی مہمیں بھیجیں چنانچہ ۱۵۵۰ء میں ہسپانیوں نے اس علاقے میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی۔

پرتگالی فتوحات پرتگال نے ٹارڈی سیلاس میں معاہدے کے تحت اپنی سلطنت کو وسعت دی تھی۔ ۱۵۱۴ء میں پوپ نے فرمان جاری کیا تھا جس کے مطابق دوسرے تمام ملکوں پر یہ پابندی لگادی گئی تھی کہ پرتگال کے علاقوں میں مداخلت نہ کریں چنانچہ تقریباً سو سال تک پرتگالی مشرق میں بغیر کسی مداخلت کے اپنی تجارت اور دوسرے کاروبار کرتے رہے۔ پرتگالیوں کا اصلی کاروبار تجارت تھا اور تجارتی راستہ پر واقع بندرگاہوں اور قلعوں پر ان کا قبضہ تھا اس لیے ان کے علاقوں کو ابھی سلطنت کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ان کا وائسرائے گوا میں رہتا تھا اور اس کے نائب ایک طرف افریقہ کے مختلف علاقوں میں اور دوسری طرف چین کے جنوب کے جزیرے مکاؤ میں متعین تھے۔ اس کام کے لیے پرتگالی سپاہی بہت کم لائے جاتے تھے۔ زیادہ تر مقامی آبادی سے فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ اور مقامی حکمرانوں اور رجواڑوں سے معاہدے کرلیے جاتے تھے۔ یہی طریقہ بعد میں برطانیہ اور فرانس نے بھی اختیار کیا۔ پرتگال کو بحر ہند پر کبھی بھی مکمل اقتدار حاصل نہ ہوسکا اس لیے کہ اس کے پاس کوئی بڑا بحری بیڑہ نہیں تھا۔

بحر ہند پر مکمل اختیار نہ ہونے کی وجہ سے پرتگال ایک طاقتور اور مالدار ملک نہ بن سکا۔ اس کے علاوہ اس پوری تجارت اور سرگرمی پر مرکزی کنٹرول نہ تھا۔ ہر جگہ تاجر انفرادی طور پر یا گروہ بنا کر تجارت کرتے اور اپنے لیے دولت اکٹھا کرتے۔

شروع میں پرتگالیوں نے ایشیا کے مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی لیکن اتنی بڑی آبادی کا مذہب تبدیل کرانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ مقامی باشندوں سے مساویانہ سلوک نہیں کرتے تھے۔ انہیں اپنے سے ادنیٰ تصور کرتے تھے اور اس لیے وہ ان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکے۔ جہاں تک سمندر پار کے مغربی علاقوں کا تعلق ہے برازیل کے مشرقی ساحل پر پرتگال کا قبضہ تھا۔ لیکن پرتگالی حکومت نے کافی عرصہ تک اس پر بہت کم توجہ کی البتہ کچھ پرتگالی انفرادی طور پر تجارت کرتے رہے اور بعض آکر وہاں بس بھی گئے۔

۱۵۸۰ء میں اسپین کے بادشاہ فلپ دوم نے پرتگال کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ برائے نام آزاد رہتے ہوئے پرتگال عملاً اسپین کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اسپین کی دشمن یورپی سلطنتوں نے پرتگالی سلطنت پر دھاوا بول دیا اور مشرق میں پرتگال کی طاقت کو ختم کردیا۔

امریکہ میں ہسپانوی سلطنت

اسپین نے امریکہ میں جو علاقے فتح کیے تھے ان پر تقریباً تین سو سال تک اس کا اقتدار رہا۔ پرتگالیوں کے برعکس ہسپانیہ کی حکومت نے اپنے مقبوضات کا انتظام باقاعدہ، سوچے سمجھے منصوبوں کے چلایا۔ ملکہ آئزابیل (Isabella) کے دور ہی میں (۱۵۰۴ء) حکومت نے نئی دنیا کے لیے ایک مرکزی تجارتی ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں دولت اور سونا سرکاری خزانہ میں پہنچتا رہے۔ شروع میں یہ پالیسی کامیاب رہی لیکن چوں کہ اسپین صنعتی طور پر ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا اس لیے دولت کے عوض مصنوعات وہ کافی مقدار میں نہیں بھیج سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجارتی مقابلہ بڑھنے لگا۔ اور دوسرے ملکوں کا مال چوری چھپے آنے لگا۔

نظم و نسق چلانے کے لیے ان علاقوں میں وائسرائے بھیجے جاتے تھے۔ ہسپانوی بڑی تعداد میں آکر ان علاقوں میں بسنے لگے۔ مقامی آبادی کو جنہیں انڈین کہا جاتا تھا تقریباً غلام بنا لیا گیا اور چرچ یا حکومت کبھی صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتی بھی تو فرموں اور کمپنیوں کے مالک اس کی سخت مخالفت کرتے اور اکثر بغاوت بھی کر دیتے۔ آہستہ آہستہ یہاں بسے ہوئے ہسپانیوں اور اسپین سے آنے والے حکمرانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔

نوآبادیات کا اثر یورپ پر

امریکہ اور ایشیا کے تجارتی راستوں کی دریافت سے پہلے یورپ ایک غیر ترقی یافتہ براعظم تھا۔ اس کی دنیا محدود تھی۔ افریقہ اور ایشیا سے تجارت کا مرکز صرف بحیرۂ روم تھا لیکن اسی نئی دریافت نے سارے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ شروع میں پرتگال کے کچھ لوگوں نے خوب دولت کمائی لیکن ایشیا سے تعیشات کی جو چیزیں آتی تھیں وہ بہت قیمتی تھیں، لہٰذا پرتگال کا سونا اور چاندی ان ممالک کی طرف جانے لگا اور پرتگال کی معیشت ترقی نہ کر سکی۔

اسپین کی صورت مختلف تھی، شروع میں امریکہ کے جو علاقے اسپین کے ہاتھ آئے۔ وہاں سے کچھ زیادہ دولت ہاتھ نہیں لگی۔ لیکن جب ۱۵۲۰ء میں میکسیکو میں اور ۱۵۴۰ء میں بولیویا میں سونے کی کانوں میں کھدائی شروع ہوئی تو بڑی مقدار میں سونا اسپین آنے لگا اس کے علاوہ میکسیکو سے چاندی بھی برابر بڑھتی رہی۔ یہ دولت اسپین کی معیشت میں زبردست تبدیلی کا باعث ہوئی۔ ملک کے اندر بے حساب سونا اور چاندی جمع ہوگئی اور باہر سے بڑے پیمانے پر مصنوعات درآمد ہونے لگیں۔ اس کا اثر اسپین کی صنعتوں پر برا پڑا جب دولت جمع ہوئی تو ہسپانوی بادشاہوں کو توسیع سلطنت اور لڑائیوں کے لیے شہ ملی۔ سونے اور چاندی کی درآمد نے سارے یورپ کی معیشت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے بھی یورپ میں صنعتیں ترقی کر رہی تھیں اور بنک کاری رواج پا رہی تھی لیکن سونے اور چاندی کی اس درآمد نے مال کے بدلے مال کی معیشت کو تیزی سے ختم کر دیا اور زر بنک کاری نے اس کی جگہ لے لی۔ تجارتی میدان میں وسطی اور جنوبی یورپ اور خاص طور پر اطالوی ریاستوں کی اجارہ داری ختم ہونے لگی اور ان کی جگہ ہالینڈ، بلجیم اور بالخصوص برطانیہ اور فرانس لینے لگے۔ یورپ میں ساری دنیا سے ہر قسم کا مال چلنے کا، سوتی کپڑا، تمباکو وغیرہ بڑی مقدار میں آنے لگا۔

نوآبادی نظام کا نیا دور
سترھویں صدی عیسوی

جس زمانے میں پرتگالی اور ہسپانوی سلطنتیں یورپ اور ایشیا میں اپنی تجارت بڑھا رہی تھیں اور نوآبادیاں قائم کر رہی تھیں اس وقت یورپ کے دوسرے ممالک اس دوڑ میں شریک نہیں تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ پوری سولھویں صدی میں شمالی یورپ کے ممالک اسپین سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ فرانس مذہبی جنگوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا برطانیہ کے شاہی خاندان نے اسی زمانے میں اسپین کے شاہی گھرانے سے ازدواجی رشتہ قائم کیا تھا۔ ساتھ ہی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے مابین کش مکش جاری تھی اور انگلستان اسپین کے خلاف کسی مقابلہ میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ رخ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

ڈچ مملکت کا عروج

انگلستان نے ۱۵۸۸ء میں فلپ دوم بادشاہ اسپین کے بحری بیڑے کو جو انگلستان پر حملہ آور ہوا تھا شکست دی اور اسے کمزور کر دیا۔ لیکن اسپین کی طاقت پر کاری ضرب ہالینڈ نے لگائی اور وہ چند ہی سال میں دنیا کی بہت بڑی طاقت بن گیا۔ اسے اسپین کے امریکی مقبوضات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی نظر پرتگال کے مقبوضات اور تجارت پر تھی چنانچہ اس نے چند ہی سال میں پرتگال کی مشرقی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد (۱۶۲۴ - ۱۶۵۴ء) برازیل پر حملہ کر دیا۔ وہ افریقہ کے پرتگالی مقبوضہ انگولا کے ایک حصہ پر بھی قابض ہو گیا جہاں سے غلام برازیل بھیجے جانے لگے تھے۔

۱۶۰۲ء میں ہالینڈ نے ایک بہت اہم اور دور رس قدم اٹھایا۔ ایک کمپنی "ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے قائم کی۔ اس کمپنی کو نہ صرف بڑے پیمانے پر تجارت کرنے کے حقوق دیے گئے۔ بلکہ اسے یہ بھی اختیار دیا گیا کہ دوسرے ملکوں کے مقامی راجاؤں اور حکمرانوں سے معاہدہ کرے۔ مقبوضہ بندرگاہوں اور قلعوں میں فوجی دستے رکھے۔ اور ان میں گورنر اور جج مقرر کرے۔ کمپنی نے اپنا مرکزی دفتر جاوا میں بنتام کے مقام پر قائم کیا۔ بعد میں اسے جکارتہ میں منتقل کر دیا۔ اس کے دو بنیادی مقاصد تھے ایک تو اس علاقہ کی پوری تجارت جو پہلے مقامی باشندوں کے ہاتھ میں تھی اپنے ہاتھ میں لے لے اور دوسرے تمام مدمقابل قوموں خاص طور سے پرتگالیوں، انگریزوں، ہسپانیوں وغیرہ کو اس علاقے سے نکال باہر کر دے۔ پرتگالیوں کے ساتھ تمام لڑائیوں میں ڈچ کو کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی انہوں نے یہاں سے مار بھگایا۔ اس طرح اس پورے علاقے کو نہ صرف ڈچ سلطنت کا حصہ بنا لیا بلکہ یہاں کی پوری تجارت پر بھی کنٹرول حاصل کر لیا۔ یہ کنٹرول قائم کرنے میں ظلم زبردستی اور تشدد کا جو حربہ استعمال کیا گیا۔ ۱۶۲۱ء میں باندہ کے باشندوں نے مزاحمت کی تو ڈھائی ہزار باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ اپنے منافع کی مقدار بڑھانے کے لیے لونگ اور دوسرے مسالوں کی پیداوار پر بھی انہوں نے کنٹرول قائم کیا۔ مولاکاس کے لوگوں نے ان کی مرضی کے خلاف درخت لگائے تو ۶۵ ہزار درخت کٹوا دیے گئے۔

ڈچ سلطنت کا مرکز بٹاویا میں تھا اور چین، جاپان، ہندوستان اور سیلون کا مال یورپ یہیں سے ہو کر جاتا تھا۔ ڈچ کو چین کی تجارت پر بھی کنٹرول حاصل نہ ہو سکا اس لیے کہ جزیرہ مکاؤ پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ ڈچ نے جاوا میں کافی کی کاشت کو بھی رواج دیا اور چند ہی سال میں اس کی کاشت بڑے پیمانے پر ہونے لگی اور اسے جنوبی امریکہ کو بھیجا جانے لگا۔

ڈچ حکمرانوں کے پاس جو علاقے تھے وہ ان کے اغراض کے لیے کافی نہیں تھے انہیں ہمیشہ نئے علاقوں کی تلاش رہتی تھی چنانچہ انہوں نے نیوزی لینڈ کے بعض حصوں اور تسمانیہ (آسٹریلیا) کا بھی پتہ چلایا۔ بحر ہند میں مارشس پر قبضہ کیا جو بعد میں فرانسیسیوں

اور پھر انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ہالینڈ سے اس کے مشرقی مقبوضات بہت دور تھے؛ اس لیے راستہ میں اس نے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) پر قبضہ کر لیا اور اسے استعمال کرتا رہا۔ ان مقبوضہ علاقوں میں ڈچ باشندوں نے آبادکاری کی کوئی بڑی کوشش نہیں کی۔ یہاں ان کے افسر، سپاہی، باغوں اور کانوں کے نگراں کار اور ان کے خاندان ہی رہتے تھے۔ انہیں صرف یہاں کی قدرتی دولت مثلاً مسالوں اور معدنیات سے ہی دلچسپی تھی۔

مشرق کی طرح مغرب کے لیے بھی ۱۶۲۱ء میں ایک ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی تھی جس کی سرگرمیاں جنوبی بحر اوقیانوس میں گیانا، ویسٹ انڈیز، نیوزیلینڈ میں پھیلی ہوئی تھیں یہ کمپنی اتنی کامیاب نہیں تھی جتنی کمپنی برائے مشرق ہوئی تھی۔ البتہ اس نے شمالی امریکہ کے بعض حصوں میں ڈچ نوآبادیاں قائم کیں جو بعد میں انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئیں۔

فرانسیسی نوآبادکاری

سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب یورپ کے ملکوں نے دوسرے ملکوں میں آبادکاری شروع کی اس وقت ان سب میں فرانس آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک تھا سب سے زیادہ مال دار تھا، اور اس کا بحری بیڑہ سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس طرح وہ یورپ کا سب سے بڑا سامراجی ملک بن سکتا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا، اس لیے کہ فرانس یورپ کی سیاست میں بہت زیادہ الجھ گیا چنانچہ فرانس کے امکانات انگلستان کے تصرف میں آگئے۔

۱۵۲۴ء میں فرانس نے آبادکاری کی مہم بہت معمولی طور پر شروع کی۔ اور امریکہ کینیڈا اور جنوبی امریکہ کے کچھ علاقوں میں چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں قائم کیں۔ اس کے بعد فرانسیسی جنوبی بحر اوقیانوس کے کئی جزیروں میں بھی پہنچے۔ ۱۶۶۴ء تک تقریباً چودہ جزیرے فرانس کے قبضہ میں آچکے تھے۔ اور سات ہزار سے زیادہ سفید فام باشندے یہاں بس چکے تھے یہ لوگ زیادہ تر گنے کی کاشت کرتے تھے۔ اس دور میں افریقہ سے غلام بھی آنے شروع ہوئے۔

ہندوستان میں داخلہ

اس دور میں جب ہالینڈ جیسے چھوٹے سے ملک کی کمپنی ایشیا سے زر کثیر سمیٹ رہی تھی تو یورپ کا سب سے طاقتور ملک فرانس کیسے چپ رہتا چنانچہ فرانس نے بھی ایک ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۶۴ء میں قائم کی اور بحر ہند میں مدغاسکر پر قبضہ کرکے اسے تجارت کا مرکز بنانے کی کوشش کی اور بعد میں قریب کے جزیرے مارشس پر بھی تصرف کر لیا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا وہاں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی پہلے ہی اپنا کاروبار شروع کرچکی تھی۔ اور پھر یہ اورنگ زیب کی حکمرانی کا دور تھا اس لیے یہاں پر زیادہ کامیابی ممکن تھی صرف پانڈیچری اور چند اور مقامات پر فرانس کے مرکز قائم ہوسکے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور اسی کے ساتھ مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا ملک تیزی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹنے لگا انگریز اور فرانسیسی دانستہ یہاں کی سیاسیات میں الجھ گئے اور ان میں آپس میں بھی ہندوستان پر تصرف کی دوڑ شروع ہوگئی۔ ۱۷۴۰ء تک فرانس کو برتری حاصل ہوگئی فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے انگریزوں کے اقتدار کے مرکز مدراس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن لڑائی دیسی حکمرانوں کے ساتھ سازشوں اور ان کی امداد وغیرہ کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ کمپنی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا فرانسیسی حکومت نے اس مسئلے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ آخر کار فرانس کو انگریزوں کے مقابلے میں میدان سے ہٹنا پڑا۔ اس زمانے میں فرانس نے کناڈا کے علاقوں میں، جسے انہوں نے نیو فرانس کا نام دیا، آبادکاری شروع کی اور بڑی تعداد میں فرانسیسی وہاں جاکر بسنے لگے۔ وہاں سے انہوں نے مسی سپی اور ارکنساس کے خطوں میں پھیلنا شروع کیا۔ اور خلیج میکسیکو اور لوزیانا کا علاقہ فرانس کے اثر میں آگیا۔

انگریزوں کی آبادکاری

نئے علاقوں کی کھوج میں انگریز ویسے دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں تھے۔ اور ۱۴۹۷ء سے پہلے برسٹل کے کچھ ملاح نیو فاؤنڈلینڈ پہنچ گئے تھے۔ لیکن حقیقی دلچسپی بہت بعد میں شروع ہوئی۔ ۱۵۸۸ء میں انگریزی بحری بیڑے نے اسپین کے بیڑے کو شکست فاش دی اور اسی کے بعد برطانیہ نے امریکہ کا رخ کیا اور وہاں آبادکاری شروع کی۔ ۱۶۰۰ء میں لندن کے تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ وہ ایسٹ انڈیز میں ڈچ کمپنی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی اس لیے اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ۱۶۱۱ء میں اس نے مسولی پٹم اور ۱۶۳۹ء میں مدراس حاصل کر لیا۔ ۱۶۶۱ء میں چارلیس دوم کو پرتگالی ملکہ کے جہیز میں بمبئی مل گیا اور اس نے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اسی زمانے میں مغل سلطنت کا زوال شروع ہوگیا اور آہستہ آہستہ برطانوی کمپنی نے فرانس اور پرتگال کو میدان سے ہٹا دیا اور وہ اپنے حلقۂ اثر اور مقبوضات کو برابر بڑھاتی رہی۔

انگریز شروع میں ہندوستان سے مسلے درآمد کرتے تھے۔ اور اس کے بعد برطانیہ کے غریب طبقے کے لیے ہندوستان کا سوتی کپڑا بڑی مقدار میں آنے لگا۔ امرا کے لیے اعلیٰ قسم کی ململ اور کمخواب اور جامدانی کی بھی درآمد ہونے لگی چند سال میں سوتی کپڑے کی درآمد اتنی بڑھ گئی کہ انگریزی صنعت کی حفاظت کے لیے ۱۷۲۱ء میں قانون بنانے پڑے۔

اسی دور میں انگریزوں نے مغرب کی طرف بھی رخ کیا اور ویسٹ انڈیز کے کئی جزائر میں وہ آکر بسنے لگے جن میں برموڈا، باربوڈا س وغیرہ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ۱۶۵۵ء میں کرامویل نے ہسپانوی جماٹکا پر قبضہ کر لیا اور یہ اس علاقے کی برطانوی نوآبادیوں کا مرکز بن گیا۔ شروع میں یہاں انگریز آتے رہے لیکن بعد میں یورپ کے کئی اور علاقوں میں لوگ آکر بسنے لگے وہ یہاں کی قدرتی دولت کو استعمال کرکے نفع کماتے تھے۔ ان جزائر کے علاوہ امریکہ میں نہ صرف انگریز بلکہ یورپ کی دوسری قوموں کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آنے اور آبادیاں بسانے لگے۔ ۱۷۶۳ء تک امریکہ کی مختلف نوآبادیات کی آبادی تیرہ لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے تین لاکھ نیگرو تھے۔ جو افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ ان تمام نوآبادیوں کی معیشت بڑی حد تک زراعت پر مبنی تھی، ساحلی علاقوں پر جہاز سازی کی صنعت بھی ترقی کر رہی تھی۔

یہ نوآبادیاں دراصل یورپی ممالک کو مال دار بنانے کا ایک ذریعہ تھیں۔ یہاں سے زرعی پیداوار اور کچا مال یورپ جاتا اور وہاں سے مصنوعات یہاں درآمد ہوتی تھیں۔

نوآبادیاتی نظام کا نیا دور

(اٹھارویں صدی)

غلامی کا رواج

ویسٹ انڈیز اور امریکہ میں جب سفید فاموں کی نوآبادیات ترقی کرنے لگیں اور گنا، تمباکو اور دوسری منفعت بخش اشیا کی کاشت بڑھنے لگی تو اب بڑھتے ہوئے منافع کی شرح باقی رکھنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ پہلے غریب سفید فام لوگوں سے کام

چل جاتا تھا۔ پھر مقامی رنگ دار باشندوں کو غلام بنا کر استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے بھی کام نہیں چلا تو پھر افریقہ کے باشندے غلام بنا کر یہاں لائے جانے لگے۔ پہلے یہ کام پرتگالیوں نے شروع کیا۔ انہوں نے افریقہ کی اپنی نوآبادیوں سے غلام یہاں لانے شروع کیے۔ زاں بعد انسانوں کے استحصال میں سب ہی شریک ہو گئے اور اب یہ تجارت بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔

انگریزوں کے بردہ فروشی کی پہلی مہم ۱۵۶۲ء میں جان ہاکنس کی سربراہی میں شروع ہوئی۔ اس نے اپنا "مال" یعنی جہاز بھر کے غلام ہسپانوی انڈیز میں بیچے، اور پھر آہستہ آہستہ اس کاروبار کے لیے بڑی بڑی کمپنیاں قائم ہو گئیں مثلاً مرچنٹ ٹریڈنگ ٹو افریقہ (Merchant Trading to Africa) نامی کمپنی جو ۱۷۵۰ء میں قایم ہوئی تھی اس کے ڈائرکٹر لندن، لیورپول، پرسٹل وغیرہ میں تھے۔ صرف اس کی پرسٹل کی شاخ کے پاس غلاموں کی تجارت کے لیے ۲۲۷ جہاز تھے ۱۷۶۳ء سے ہر سال تقریباً ڈیڑھ سو جہاز لگ بھگ چالیس ہزار غلام افریقہ سے ویسٹ انڈیز اور امریکہ لے جاتے تھے صرف جزیرہ جمائکا نے ۱۷۰۰ء اور ۱۷۸۶ء کے درمیان چھ لاکھ سے اوپر غلام خریدے۔ یہ تجارت برسوں جاری رہی اور کبھی کسی نے مخالفت نہیں کی اور کبھی بھی مخالفت ہوئی بھی تو اس لیے کہ کہیں سیاہ فاموں کی آبادی سفید فاموں سے بڑھ نہ جائے۔

نوآبادیوں کے لیے کشمکش

۱۶۸۹ - ۱۷۶۳ء کے درمیان برطانیہ اور فرانس میں چار جنگیں ہوئیں اگرچہ یہ یورپ میں ہوئیں لیکن ان کا اثر پورے نوآبادیاتی نظام پر پڑا۔ اسپین بھی ان جنگوں میں شریک تھا، کبھی برطانیہ کا حلیف بن کر اور کبھی فرانس کا۔

۱۷۰۱ء سے ۱۷۱۴ء تک اسپین میں تخت کی وراثت کے لیے لڑائی ہوئی۔ جس میں برطانیہ اور فرانس دونوں الجھ گئے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر برطانیہ کے قبضہ میں جبرالٹر آگیا اور شمالی امریکہ میں نیوفاؤنڈلینڈ اور فرانسیسی اکاڈیہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اسے اسپینی امریکہ کو غلام مہیا کرنے کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔

۱۷۳۹ء تک آسٹریا کے تخت کی جانشینی کے جھگڑے میں اور ملکوں کے ساتھ فرانس اور برطانیہ بھی الجھ گئے اور فرانس اور برطانیہ کی لڑائی کے نتیجہ کے طور پر انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں بندرگاہ مدراس مل گیا۔

فرانس اور انگلستان کے درمیان سات سالہ جنگ میں جو ۱۷۵۴ء تک جاری رہی، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں فرانسیسیوں کو شکست دی۔ اور ۱۷۶۰ء میں پانڈیچری پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پلاسی کی جنگ میں کامیابی حاصل کی اور ہندوستان پر برطانوی حکومت کا دور شروع ہو گیا۔

امریکہ اور کینیڈا کی برطانوی و فرانسیسی جنگوں میں انگریزوں کی فتح ہوئی۔ ۱۷۵۹ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان برطانیہ نے فرانس سے لوئس برگ، کیوبک، مانٹریال، موانا اور منیلا چھین لیے۔ ۱۷۶۳ء کے پیرس معاہدے کے تحت شمالی امریکہ میں دریائے مسی سپی کے مشرق کا پورا علاقہ انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ فرانس کو دریائے مسی سپی کا مغربی علاقہ اسپین کے حوالے کرنا پڑا۔ اس طرح یہ دور برطانیہ کی توسیع سلطنت کی مہم میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ ایک طرف ہندوستان کی فتح کا دروازہ کھل گیا اور دوسری طرف امریکہ کے بڑے حصہ پر قدم جم گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ چلتے چلاتے افریقہ میں سنے گال کا علاقہ بھی اس کے قبضہ میں آگیا۔ نوآبادیوں کو اس جنگ کے اختتام پر برطانیہ سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت اور سب سے مال دار بیرونی علاقوں کا مالک بن چکا تھا۔ اب اس کے پاس دنیا کا سب سے بڑا بحری بیڑہ بھی تھا۔ جو اس وسیع و عریض سلطنت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔

نئے سامراجی دور کی ابتدا

شروع میں جب مغربی ملکوں نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں جو نوآبادیاں قائم کیں تو اس وقت نوآبادیوں کے ساتھ ان کے معاشی تعلقات بہت ابتدائی نوعیت کے رہے۔ ان نوآبادیوں اور مقبوضات سے یورپی ممالک زیادہ تر مسالے چائے، کافی وغیرہ درآمد کرتے تھے لیکن ۱۷۶۰ء کے بعد سے جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور صنعتیں قائم ہونے لگیں تو اس نوآبادیاتی پالیسی میں بنیادی تبدیلی آئی۔ مغربی ممالک اپنی نوآبادیوں سے زرعی پیداوار درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی مشین کی بنی ہوئی چیزیں ان علاقوں میں برآمد کرنے لگے اور جیسے جیسے صنعتی ترقی میں تیزی آئی صنعتی مال کی نکاسی کے لیے منڈیوں کی تلاش بھی تیز ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ان صنعتی ممالک کو اپنی نوآبادیات سے مسالوں اور غلاموں کی درآمد سے اتنی دل چسپی نہیں رہی بلکہ وہ اب اپنی صنعتوں کے لیے کچا مال مثلاً روئی، اون، جوٹ، تیل والے بیج اور رنگ وغیرہ درآمد کرنا چاہتے تھے۔ تجارت کی نوعیت میں اس بنیادی تبدیلی کا اثر پوری نوآبادیاتی پالیسی پر پڑا چنانچہ ان نوآبادیات کی معیشت کو صنعتی ملکوں کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع ہوئی اور اس نے ساری دنیا کے سماجی ڈھانچے میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی۔

یورپ کے صنعتی انقلاب سے پہلے نوآبادیات میں یورپی ممالک کی پالیسی یہ تھی کہ۔

۱۔ ایسے علاقوں پر قبضہ کرنا جہاں سے انہیں کچی دھاتیں (چاندی سونا وغیرہ) غلام اور زرعی پیداوار وافر مقدار میں مل سکتی ہو۔

۲۔ شمالی امریکہ کے ساحلوں پر سفید فام باشندوں کی نوآبادیاں قائم کرنا۔

۳۔ تجارتی راستہ پر واقع اہم مقامات پر قبضہ کرنا۔ وہاں قلعے تعمیر کرنا اور ان میں فوجی دستے متعین کرنا تاکہ ان تجارتی راستوں کی دوسرے ملکوں سے حفاظت کی جا سکے۔

اس پالیسی کا اثر ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں پر کافی پڑا۔ اور یہاں کی دولت سمٹ کر یورپ جانے لگی لیکن اس کی وجہ سے ان نوآبادیاتی یا مقبوضہ ملکوں کی معاشی یا سماجی زندگی پر بنیادی طور پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایشیا اور افریقہ کے ان ممالک میں سماج کی بنیاد چھوٹے چھوٹے دیہات پر تھی جو زرعی اور صنعتی پیداوار میں خود مکتفی تھے۔ اور یہاں باہر کے مال کی کھپت کے لیے بہت ہی کم گنجائش تھی۔

یورپ کی صنعتی ترقی کے بعد جب اسے اپنے صنعتی مال کی برآمد کے لیے منڈی کی ضرورت پیش آئی تو مقبوضات (Colonies) کا معاشی ڈھانچہ اس بات کے لیے ناموزوں ثابت ہوا۔ اپنے مال کی نکاسی اور ان نوآبادیات سے منافع حاصل کرنے کے لیے پورے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لازمی تھی چنانچہ یورپ کے ان صنعتی ملکوں نے ایشیا اور افریقہ کے اپنے مقبوضات میں چند بنیادی تبدیلیاں کیں، مثلاً زمین کی ملکیت کے پورے نظام کو بدل ڈالا۔ جہاں زمین پر ذاتی ملکیت کا طریقہ رائج نہیں تھا وہاں کسانوں اور زمینداروں اور جاگیرداروں

کا طبقہ پیدا کیا۔ اس کے علاوہ سفید فام نو آباد کاروں نے زمینوں کے بڑے بڑے قطعوں پر قبضہ کرکے چائے، جوٹ، ربڑ، ریشم وغیرہ کے باغات لگانے شروع کیے اس کے علاوہ ان باغات اور بڑے زرعی فارموں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے کم اجرت کے مزدوروں کی ایک فوج جبراً تیار کی۔ افریقہ میں توان کی حیثیت بالکل غلاموں کی سی تھی۔ مقامی صنعتوں کو دبایا اور تباہ کیا گیا اور کچھ صنعتی پیداوار برآمد کی گئی۔ سکہ اور ٹیکس کا ایک نظام قائم کیا گیا تاکہ زر کا چلن بڑھے اور صنعتی ملکوں کے مال کے لیے منڈی قائم ہو سکے۔

اس نئی نو آبادیاتی پالیسی پر کس طرح عمل کیا گیا اس کی بہترین مثال ہندوستان ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے صدیوں سے ہندوستان سوتی کپڑا دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتا تھا حتیٰ کہ ہندوستان سے کپڑے کی درآمد کو روکنے کے لیے انگلستان میں زبردست درآمدی ٹیکس لگائے گئے تھے۔ لیکن انگریزی راج قائم ہونے کے بعد ۱۹ ویں صدی کے وسط تک نہ صرف ہندوستان کے کپڑے کی برآمد ختم ہو چکی تھی بلکہ برطانیہ کے کپڑے کی برآمد کا ایک چوتھائی حصہ ہندوستان آتا تھا۔

سماجی اور معاشی نظام میں اس وقت تک ایسی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تھی جب تک کہ پورا سیاسی ڈھانچہ نہ بدل جائے اور مقامی آبادی میں سے زمینداروں جاگیرداروں، سرکاری افسروں اور فوج کا ایک ایسا طبقہ نہ پیدا کر دیا جاتا جس کا مفاد بیرونی حکمرانوں کے ساتھ وابستہ ہو۔

ان نو آبادیوں اور محکوم ملکوں سے جب دولت سمٹ کر صنعتی ملکوں میں آنے لگی تو صنعتی ترقی میں بھی کافی تیزی آگئی۔ اب نئی منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی تو نو آبادیاتی نظام کے ابتدائی دور میں توسیع مملکت صرف ساحلی علاقوں اور اہم بندرگاہوں تک محدود تھی لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اس کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ اب سلطنتیں ساحلوں کی بجائے ان ملکوں کے اندرونی علاقوں میں پھیلنے لگیں۔ یہ کام کئی طریقے سے کیا گیا مثلاً افریقہ، امریکہ اور جنوبی امریکہ کے بہت سے علاقوں میں صنعتی ممالک کے لوگ پوری طاقت سے داخل ہوئے مقامی آبادی کو ہلاک کر دیا یا انہیں ایک چھوٹی سی جگہ میں محصور کر دیا اور ان علاقوں میں سفید فام لوگوں کی نو آبادیاں قائم کر دیں۔ بچے کھچے سیاہ فام لوگوں کو غلام بنا کر کھیتوں، کارخانوں اور کانوں میں لگا دیا گیا۔ یا پھر ایشیا کے اکثر ملکوں کی طرح مقامی آبادی کو مغلوب کرکے ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا گیا جو سامراجی لوٹ کھسوٹ کی ساری ضروریات کو پورا کر سکے۔

یورپ کے یہ مٹھی بھر لوگ جو کسی زمانے میں ایشیا والوں سے زندگی کے ہر شعبہ میں پیچھے تھے، خاص طور پر تکنیکی میدان میں، یکایک اس لیے چھا گئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے وہاں پہلے ترقی کی اور اس ترقی یافتہ تکنیک کو صنعتوں اور فوج میں استعمال کرکے انہیں باقی دنیا پر زبردست برتری حاصل ہو گئی۔

برطانوی سامراج کا عروج

یورپی ملکوں میں نو آبادیاتی پالیسی کی ابتدا پرتگال نے کی تھی؛ اس دوڑ میں ہالینڈ، اسپین، فرانس اور برطانیہ شریک ہوتے گئے لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط تک اس میدان میں برطانیہ نے سب پر سبقت حاصل کر لی۔ اس کی بڑی وجہ سات سالہ جنگ میں فرانس کی شکست اور برطانیہ کی فیصلہ کن فتح تھی۔ عہد نامہ پیرس کے ذریعہ فرانس کو اپنی پوری نو آبادیاتی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا اور برطانیہ کے لیے فتوحات کا راستہ کھل گیا۔ اس نے ہندوستان میں اپنی پیش قدمی تیز کر دی شمالی امریکہ کی ریڈ انڈین آبادی کے خلاف مہم تیز کرکے کناڈا اور شمالی امریکہ کے مغربی علاقوں میں اپنی سلطنت کو پھیلا دیا۔ سمندر پر زبردست کنٹرول کی وجہ سے برطانیہ نے جنوبی امریکہ پر اسپین کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی؛ ایشیا اور افریقہ کے نئے علاقوں کی تلاش شروع کی اور جنوبی بحرالکاہل، مشرق بعید، جنوبی اوقیانوس اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی طرف رخ کیا۔

ابتدا میں مقصد نئے علاقے فتح کرنا نہیں تھا بلکہ دور دراز علاقوں میں بحری مرکز قائم کرنا تھا تاکہ ان علاقوں کی تجارت پر قبضہ کیا جا سکے لیکن اکثر جگہ یہ مرکز آئندہ فتوحات کا پہلا قدم ثابت ہوئے۔

امریکہ کی بغاوت

برطانیہ کو فتوحات کی اس مہم میں ہمیشہ یکساں طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مختلف علاقوں میں برطانیہ، فرانس، اسپین، پرتگال اور ہالینڈ وغیرہ میں آپس میں سخت رقابت کار فرما رہی فتوحات کے اس دور میں برطانیہ کو سب سے بڑا دھکا اس وقت پہنچا جب امریکہ کی تیرہ ریاستوں نے بغاوت کر دی۔ یہ سب پہلی برطانوی سلطنت کا حصہ تھیں (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ امریکہ) اسی زمانہ میں سلطنت کے دوسرے اہم جزو آئرلینڈ میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔

امریکہ کی آزادی نے برطانوی سامراج کے منصوبوں کو ٹھنڈا نہیں کیا بلکہ اس کی توجہ اب ایشیا اور مشرق بعید پر اور زیادہ مرکوز ہو گئی۔ آسٹریلیا میں آبادکاری کی مہم نے زور پکڑ لیا سب سے بڑھ کر ہندوستان کی فتح کو مکمل کر لیا گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ ہند) ۱۸۱۵ء تک برطانوی سلطنت تمام براعظموں میں پھیل گئی جن میں کناڈا، جزائر غرب الہند، افریقہ کے علاقے ہندوستان اور آسٹریلیا شامل تھے۔

سامراجی دور کے اثرات

نصف صدی کے اندر دنیا کے اتنے وسیع علاقہ پر قبضہ پانے کے بعد برطانیہ اور اس کی سلطنت کا نہ صرف رقبہ بڑھ گیا بلکہ اس کی معاشی اور سیاسی پالیسی میں بھی زبردست تبدیلی آگئی۔ اب تک برطانوی معیشت کی بنیاد تجارت پر تھی اور اب اس کا اصل مرکز صنعتیں بن گئیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی معیشت کی بنیاد تجارت کی اجارہ داری تھی اور ان کے اہم اجزا نو آبادیات کے زرعی فارم اور باغات، تجارتی کمپنیوں کی اجارہ داری اور غلامی کی تجارت تھی اب اس نئے دور میں جبکہ برطانیہ ساری دنیا کے لیے مال تیار کرنے والا کارخانہ بن رہا تھا۔ یہ ماحول مناسب نہیں تھا۔ اس کے لیے تجارتی کمپنیوں کی اجارہ داری ختم کرنے اور آزاد تجارت کے فروغ کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا تجارتی کمپنیوں کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ اور اسے ختم کرنے میں سخت اندرونی کش مکش کا سامنا رہا۔ چنانچہ ہندوستان کی تجارت کی اجارہ داری کہیں ۱۸۱۳ء میں ختم ہوئی اور چین کی ۱۸۳۳ء میں اور ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ختم ہوا۔

ان نئی ضروریات کا تقاضہ یہ تھا کہ افریقی غلاموں کی تجارت کو ختم کیا جائے (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ افریقہ) غلاموں کی تجارت روکنے کے بجائے، برطانیہ نے مغربی افریقہ کے اور علاقوں مثلاً سیرالیون، گیمبیا اور گولڈ کوسٹ پر ۱۸۰۸ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان قبضہ کر لیا اور افریقہ کے پورے مغربی ساحل پر اپنا فوجی کنٹرول مسلط کر دیا۔

برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کا یہ تقاضہ تھا کہ آزاد تجارت کو فروغ

حاصل ہوا اور اسی کے ساتھ اگلی منزل یہ تھی کہ پوری برطانوی سلطنت پر مرکزی کنٹرول مضبوط ہو چنانچہ اس کے تحت اب تجارتی مرکزوں کا ایک جال پوری سلطنت میں بچھ گیا۔ برطانوی بنکوں کا کاروبار محکوم اور مقبوضہ ملکوں میں پھیلنے لگا اور ان کی دولت نہ صرف تجارت کے ذریعہ بلکہ ان محکوم ملکوں کی کانوں، کارخانوں یہاں متعین برطانوی فوجوں، افسروں اور کاروبار کرنے والوں کے ذریعہ برطانیہ میں سمٹ کر اکٹھی ہونے لگی۔ اور برطانیہ ایک زبردست معاشی، فوجی اور بحری طاقت بن گیا۔ اس کا اثر صرف اپنے مقبوضات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے باہر بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ دوسری سلطنتوں کے کمزور ہونے سے برطانیہ کی طاقت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

۱۸۰۰ء تک مختلف یورپی ملکوں کا دنیا کے ۵۵ فی صدی رقبہ پر قبضہ یا کنٹرول تھا۔ اور ۱۸۷۸ء تک یہ رقبہ ۶۷ فی صد ہوگیا۔

۱۹ ویں صدی کے شروع میں اسپین کی سلطنت ٹوٹنے لگی اور پندرہ سال کی بغاوتوں اور لڑائیوں کے بعد ۱۸۲۵ء تک جنوبی امریکہ میں اسپین کا کوئی مقبوضہ باقی نہیں رہا۔ صرف کیوبا اور پیورٹوریکو پر اس کا قبضہ تھا۔ جنوبی امریکہ کے علاقے برطانیہ کے قبضہ میں تو نہیں آئے لیکن معاشی طور پر وہاں بھی اس کا اثر بہت بڑھ گیا۔

آبادکاری کی نئی لہر

دنیا کے مختلف حصّوں میں جب یورپی ملکوں کی سلطنتیں مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئیں تو یورپی باشندے بڑی تعداد میں یہاں منتقل ہونے اور بسنے لگے اس لیے کہ یہاں دولت کمانے کے بے شمار مواقع تھے۔ اندازہ ہے کہ ۱۸۲۰ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان سو سال میں ساڑھے پانچ کروڑ یورپی باشندے مختلف نوآبادیات میں جا کر بس گئے سب سے بڑی تعداد امریکہ گئی۔ ان تمام علاقوں میں جہاں یہ نوآبادیاں قائم ہوئیں، سفید فام باشندوں کو مقامی باشندوں پر ہر طرح فوقیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک سے آئے تھے اور اس لیے زراعت، کان کنی وغیرہ میں ترقی یافتہ تکنیک استعمال کر سکتے تھے، دوسرے انہیں اپنی حکومتوں کا تحفظ حاصل تھا جس کی مدد سے انہوں نے مقامی لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ انہیں بے دخل کر کے ان کا قلع قمع کر دیا یا قیدی بنا کر انہیں ان آبادیوں کی ترقی کے لیے غلاموں کے طور پر استعمال کیا۔

نیا سامراجی دور

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں یورپ کے ترقی یافتہ سامراجی ملکوں کی پالیسی میں اہم تبدیلی آئی۔ اس دور میں ایک طرف تو سامراجی طاقتوں (Colonial Powers) کی تعداد میں اضافہ ہوا دوسرے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو محکوم بنانے کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔ اس سے پہلے کے دور میں ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مقبوضہ علاقوں کے اندرونی حصہ میں اپنے نظم و نسق کو پھیلایا جائے اور اپنا کنٹرول مضبوط کیا جائے لیکن ۱۹ ویں صدی کے آخر میں جب کہ یورپ نے کافی صنعتی ترقی کر لی تھی اور اس کی فوجی طاقت بہت بڑھ گئی تھی، نئے علاقوں کی رفتار کی طرف توجہ مرکوز کی جانے لگی۔ چنانچہ چند ہی سال کے اندر ان سامراجی طاقتوں نے پورے افریقہ، ایشیا کے بڑے حصے اور بحری الکاہل کے اکثر جزائر کو ہڑپ کر لیا۔ ۱۹ ویں صدی کے پہلے ۷۵ سال میں سامراجی ملکوں نے ہر سال اوسطاً ۸۳ ہزار مربع میل پر قبضہ کیا تھا۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان دو لاکھ ۴۰ ہزار مربع میل ہر سال ان کے قبضہ میں آئے اور ان علاقوں پر ان کا پوری طرح فوجی اور معاشی اقتدار قائم ہوگیا۔ ۱۹۱۴ء تک دنیا کا ۸۵ فی صدی رقبہ سامراجیوں کا محکوم بن چکا تھا۔ اور سیاسی اور معاشی اقتدار تو ان ملکوں میں بھی پھیل گیا تھا جن پر راست قبضہ نہیں تھا بہت سے ملکوں سے خاص قسم کے معاشی رشتے قائم کیے گئے تھے اور قرضوں کے پھندوں میں جکڑ کر ہر قسم کی فوجی اور معاشی رعائتیں حاصل کر لی گئی تھیں، مثلاً چین وغیرہ میں۔

سامراجیت کی اس دوڑ میں برطانیہ، فرانس اور پرتگال کے علاوہ اب روس، جرمنی، اٹلی، بلجیم اور امریکہ بھی شامل ہوگئے تھے۔ ایشیا میں جاپان اسی سامراجی حلقہ میں شامل تھا ترقی یافتہ ممالک جس رفتار کے ساتھ نئے نئے علاقے حاصل کر رہے تھے تو لازمی تھا کہ اس سے آپس میں رقابت بڑھتی۔ ایک دفعہ جب ساری دنیا سامراجی ملکوں میں بٹ گئی اور کوئی نیا علاقہ فتح کرنے کے لیے باقی نہیں رہا تو آپس میں یہ کشمکش بھی لازمی طور پر تیز ہوگئی اور تیز صنعتی ترقی نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ کوئی ملک اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہ سکتا تھا مثلاً بیسویں صدی کے شروع تک برطانیہ سب سے بڑا سامراجی ملک بن چکا تھا۔ اس کے پاس سب سے طاقتور بحری بیڑہ تھا لیکن وہ بھی اس مقابلہ میں سست قدمی سے کام لینا نہیں چاہتا تھا۔ جرمنی، اٹلی وغیرہ جو اس میں بہت بعد میں داخل ہوئے تھے کہ ان کے لیے اس مسابقت سے الگ رہنا اور بھی ممکن نہیں تھا ان ملکوں میں بھی صنعتی ترقی بہت تیز ہوگئی تھی۔ اور انہیں بھی اپنے مال کی نکاسی اور اپنا سرمایہ باہر لگانے کے لیے منڈیوں کی ضرورت تھی۔

سامراجی دور کی معیشت

صنعتی انقلاب کے کچھ عرصے بعد صنعتی ترقی اس منزل میں پہنچ گئی جہاں بنیادی صنعتوں نے بڑے بڑے کارخانے قائم کرنا ضروری ہوگیا۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کی ضرورت تھی۔ یہ اسی وقت ممکن تھا کہ سرمایہ کاری دنیا میں اپنا جال پھیلا کر خاطر خواہ ترقی کرتی۔ علاوہ بریں بڑی صنعتوں کے لیے کچے مال کے وسائل کی توسیع درکار تھی۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب کچا مال رکھنے والے زیادہ سے زیادہ ملک صنعتی ممالک کے قبضہ اختیار میں آجاتے تاکہ وہ ان وسائل کو ترقی دے کر اپنے کارخانوں کو چالو رکھ سکتے۔ کارخانوں کی ترقی کے ساتھ بڑے بڑے شہر ابھرنے لگے۔ شہروں میں غذا پیدا نہیں ہوتی۔ اب غذا کے بڑے وسائل پر کنٹرول حاصل کرنا بھی ناگزیر ہوگیا چنانچہ ایشیا اور افریقہ کی خود کفیل اکائیوں کو ختم کرنا ضروری ہوگیا اور ان میں ایسی معیشت رائج کرنے کی ٹھانی گئی جس کی مدد سے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کو سستے داموں وافر مقدار میں زرعی کچا مال کانوں سے نکالی ہوئی کچی دھاتیں، کوئلہ اور غذا کا سامان برابر ملتا رہے؛ اور اس طرح محکوم ملکوں کی پوری معیشت کو سامراجی ملکوں کی ضروریات کا پابند کر دیا گیا۔

اس نئے صنعتی ڈھانچے نے ساری دنیا میں نہ صرف ایک پیچیدہ معاشی، سیاسی، اور سماجی نظام کو جنم دیا بلکہ دنیا کی تجارت کو بھی ایک شکنجہ میں کس دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں آپس میں سخت تجارتی مسابقت شروع ہوگئی ہر ملک ٹیکس لگا کر اپنی پیداوار کی حفاظت کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ اس مسابقت نے فوجی تیاریوں کی شکل اختیار کر لی۔ ہر ترقی یافتہ ملک اپنے بحری بیڑے کی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں لگ گیا۔ برطانیہ کا بیڑہ بہت بڑا تھا لیکن نئی تکنیک کی ترقی کی مدد سے جرمنی جیسے ملکوں نے ایسے بیڑے بنا لیے جو تھے تو چھوٹے لیکن ان کی فوجی طاقت اور صلاحیت بہت زیادہ تھی۔

بین الاقوامی صورت حال میں اس تبدیلی اور آپسی مسابقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹ ویں صدی کا امن کا دور ختم ہوگیا اور آپسی رقابتوں اور پھر جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ افریقہ کے بٹوارے کے لیے جنگیں جنوبی افریقہ کی بوئر جنگیں چین وجاپان کی جنگ، اسپین اور امریکہ کی جنگ اور روس وجاپان کی جنگ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ کش مکش ۱۹۱۴ء تک اپنی انتہا پر پہنچ گئی اور جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس میں ایک طرف برطانیہ فرانس اور روس تھے جن کے قبضہ میں محکوم ملکوں کا بڑا حصہ تھا اور دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف تھے جو اس غیر مساوی تقسیم کو بدلنا چاہتے تھے اور اس میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔ اس لڑائی میں برطانیہ اور فرانس کو فتح ہوئی اور جرمنی کو ان علاقوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا جو اس کے پاس تھے اور اتحادیوں نے صرف جرمنی ہی کے علاقے آپس میں نہیں بانٹے بلکہ جرمنی کے حلیف ترکی کے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے تمام علاقے تھیا لیے۔

تحریک آزادی کی ابتدا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب اتحادی ملک دنیا کی تقسیم جدید میں لگے ہوئے تھے محکوم ملکوں میں قوم پرستی اور آزادی کی لہر اٹھ رہی تھی۔ اسے تقویت دینے میں روس کے انقلاب نے زبردست رول ادا کیا۔ یہاں پہلی مرتبہ عوام نے مل کر ایک سامراج کا تختہ الٹ دیا تھا۔ پہلی مرتبہ محکوم ملکوں کے عوام نے یہ دیکھا کہ سامراجیوں کی طاقت ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ اسے شکست دی جاسکتی ہے اور آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے ملبے سے جو آزادی کی چنگاری بھڑکی تھی وہ تیز تر ہوتی گئی اور آخر کار دوسری جنگ عظیم کے بعد تمام محکوم ملکوں نے آزادی حاصل کرلی۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا اثر سامراجی نظام پر

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ فرانس اور اس کے حلیفوں کو فتح ضرور ہوئی اور انھوں نے جرمنی کے محکوم علاقوں کو آپس میں بانٹ بھی لیا لیکن اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس لڑائی کے بعد امریکہ سب سے طاقت ور ملک بن چکا تھا۔ جاپان کی بحری طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور ان دونوں کی وجہ سے سمندر پر سے برطانیہ کا کنٹرول بہت کم ہوگیا۔ اس جنگ میں برطانیہ معاشی طور پر بھی بہت کمزور ہوگیا تھا اور امریکہ نے جنگی سامان یورپ کو بیچ کر خوب دولت اکٹھا کرلی تھی۔ وہ اب بنک کاری کا مرکز بن گیا تھا اور تیزی کے ساتھ اپنا معاشی جال، برطانیہ کو میدان سے ہٹا کر ساری دنیا میں پھیلا رہا تھا۔ برطانیہ تو جنوبی امریکہ کی زندگی سے خاص طور پر بے دخل کر دیا گیا اور یہ علاقہ پوری طرح امریکہ کے معاشی اثر میں آگیا۔

دوسری طرف جنگ کے بعد جاپان نے مشرق بعید سے مغربی اثر کو ختم کرنا شروع کر دیا اور چند ہی سال میں چین کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ چین، تاریخ جاپان) یورپ میں جنگ کے بعد جرمنی نے پہلے دبی زبان سے اپنی نوآبادیاں مانگنے کی کوشش کی اور اس کے بعد فاشزم کے جھنڈے تلے اس نے یورپ اور افریقہ میں اور جاپان نے ایشیا میں سامراجی نظام کا نقشہ اپنے حق میں بدلنے کی کوشش کی اور عارضی طور پر کامیابی بھی حاصل کی لیکن دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) میں دونوں کو شکست ہوئی۔ جس نے استعماری نظام پر کاری ضرب لگائی۔ ساری دنیا میں قومی آزادی کی لہر اس شدت سے اٹھی کہ وہ تمام علاقے آزاد ہوگئے جن پر جنگ کے دوران جرمنی اٹلی اور جاپان نے قبضہ کیا تھا بلکہ فاتح ممالک مثلاً برطانیہ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ تحریک آزادی کی لہر کے سامنے جمنا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور ایک کے بعد دوسرا ملک آزاد ہوتا گیا۔ فاشزم کی شکست اور سوویت یونین کی فتح اور آزادی کی جنگ میں اس کی امداد نے آزادی کے اس دھارے کو اور بھی تیز کر دیا۔ جنگ کے آخر میں دنیا کا جو نقشہ ابھرا وہ کچھ اس قسم کا تھا:-

۱- امریکہ اور دوسری طرف سوویت یونین دنیا کے دو نظاموں کے نمائندے دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے۔

۲- پرانے سامراجی ملکوں کے لیے اپنی نوآبادیوں اور مقبوضات کو باقی رکھنا ناممکن ہوگیا۔

۳- آزادی کی تحریکیں اتنی تیز ہوگئیں کہ ان کا روکنا کسی سامراجی طاقت کے بس کا نہ رہا۔ اور یہ آزادی کی تحریکیں صرف قوم پرستانہ نہیں تھیں بلکہ ان میں اکثر سامراج دشمن تھیں۔ اکثر نے بیرونی سرمایہ کو قومی ملکیت بنا کر بیرونی اقتدار کو ملک سے بے دخل کر دیا اور پرانی سامراجی معیشت کا خاتمہ کر دیا۔

نوسامراجیت

دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی کی لہر جب بہت تیز ہوگئی تو کسی بھی سامراجی ملک کے لیے کسی دوسرے ملک پر راست کنٹرول رکھنا ممکن نہیں رہا چنانچہ بالواسطہ کنٹرول کے طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ طریق یہ تھا کہ ان ملکوں میں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو سیاسی طور پر تو آزاد ہو لیکن اسے معاشی امداد دے کر اور فوجی معاہدوں میں گھیر کر اس طرح جکڑ دیا جائے کہ وہ کوئی بنیادی، معاشی اور سماجی تبدیلی نہ لاسکے۔ اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک اسے کم اجرت کے مزدوروں، سستے کچے مال کا وسیلہ اور صنعتی مال کی منڈی بنا کے رکھ سکیں۔ ساتھ ہی بڑھتی ہوئی آزادی اور شوسلزم کی تحریک کے خلاف بھی اسے استعمال کیا جائے۔ لیکن اب زیادہ سے زیادہ ملک اس نوسامراجیت کے خلاف متحد ہوکر قدم اٹھا رہے ہیں۔ پچھلے برسوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تحریک نے زبردست ترقی کی ہے اور اب وہ متحد ہوکر مغرب کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کی نابرابری کی معاشی پالیسی یا نوسامراجیت کی پالیسی کے خلاف سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہندوستان، چین اور دوسرے سابق محکوم ملکوں کی معاشی ترقی اور بعض پسماندہ ملکوں میں تیل کی دریافت سے اس جدوجہد کو نئی طاقت ملی ہے اور امید ہے کہ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک نوسامراجیت کا خاتمہ نہ ہوجائے اور دنیا میں انصاف، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر معاشی رشتے قائم نہ ہوجائیں۔

تاریخ نگاری

تاریخ نگاری نسبتاً ایک جدید فن ہے جس میں مورخ، انسانی سرگرمیوں کو قلم بند کرنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسانی تجربہ کے مطالعہ

کو ایک ناگزیر اور فطری عمل قرار دینے اور تاریخ کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے جانچنے کے تصور نے اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں فروغ پایا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل کسی بھی تہذیب میں تاریخ نگاری کو اہم مقام حاصل نہ تھا۔ وہ نہ تو باقاعدہ تعلیم کا جزو سمجھی جاتی تھی اور نہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کی تشریح و تفسیر اس کا منشا تھا۔ یہ کام مذہب، فلسفہ، ڈرامہ اور شاعری کے حدود میں آتے تھے۔ ارسطو اپنی تصنیف "شعریات" میں تاریخ کو حقارتاً محض اس لیے ناقابل اعتنا قرار دیتا ہے کہ اس میں صرف مخصوص واقعات ہی کا ذکر ہوتا ہے اور ڈرامہ کی طرح ایک مربوط پلاٹ کے ذریعہ کسی عام صداقت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔

مغربی روایات

قدیم تاریخ نگاری

قدیم تاریخ، ادب ہی کا ایک جزو سمجھی جاتی تھی۔ پانچویں صدی ق م میں قدیم دور کے دو بہت اہم مورخ یونان کے ہردوط (Herodotus) اور تھوسی ڈیڈیس (Thucydides) گزرے ہیں۔ ان کے بعد وہاں اس پایہ کا کوئی دوسرا مورخ پیدا نہ ہوسکا۔

قدیم زمانہ کی تاریخ نگاری کا صحیح اندازہ اس لیے بھی دشوار ہے کہ پولی بیس (Polybius) لی وی (Livy) اور ٹیسی ٹس (Tacitus) جیسے مشہور مورخین کی تصنیفات یا تو تمام تر ضائع ہوچکی ہیں یا ان کے کچھ حصے ہی اب دستیاب ہیں۔

ہردوط جسے رومن مدبر سسرو نے "بابائے تاریخ" کا لقب دیا تھا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا باشندہ تھا۔

یونانی تاریخ نگاری کی نشوونما زیادہ تر ایونی (Ionian) فلسفیوں کی رہین منت ہے۔ یونان کے اساطیری ماحول میں انہوں نے پہلی مرتبہ یہ تصور پیش کیا کہ کائنات بحیثیت مجموعی ایک قابل فہم وحدت ہے اور اگر معقولیت سے کھوج لگائی جائے تو ان عام اصولوں کو معلوم کرنا دشوار نہیں ہے جو اس میں کارفرما ہیں۔ ہردوط نے باوجود روایت پرستی کے اپنی تصنیف کو "تفتیش" (Historia) ہی کا نام دیا تھا۔ جہاں گردی کا اسے شوق تھا۔ اس نے ایران کی وسیع و بسیط سلطنت کے چپہ چپہ کی خاک چھانی تھی اور وہاں کے باشندوں کے عادات و اطوار اور ان کی رسوم و رواج کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

مصر، بابل اور مشرق وسطیٰ کی دیگر قدیم قوموں کی تاریخ نگاری پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اس کا اندازہ ہوجائے گا کہ اس میدان میں ہردوط کا کارنامہ کس قدر بے مثال اور لافانی ہے۔ مصر، بابل، اسیریا اور ایران کے بادشاہ اپنے شاندار کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے یادگار کتبوں کی شکل میں محفوظ کردیا کرتے تھے چنانچہ اسیریا کے اشور بانی پال (۶۶۸ ق م - ۶۲۶ ق م) کے زمانے کے بے شمار لوح دستیاب ہوئے ہیں۔ مصر اور بابل میں بادشاہوں کے نسب نامے معبدوں میں محفوظ کردیے جاتے تھے۔ ان آثار سے کسی مخصوص واقعہ یا عام حالات کے متعلق صحیح نتائج اخذ کرنا انتہائی دشوار ہے۔

قدیم یونان و روم میں جس انداز کی تاریخ نگاری رائج تھی۔ اس کا اثر اٹھارہویں صدی تک قائم رہا۔ اہل یونان تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں فرق کرتے تھے۔ وارو (Varro) نے جو روم کا بہت بڑا عالم گزرا ہے تاریخ کو "عتیقیات" (Antiquities) سے الگ قرار دیا ہے۔ ارسطو تاریخ کو ادب کا ایک ایسا غیر اہم جزو سمجھتا ہے جس کا تعلق عام اہمیت کے امور سے نہیں بلکہ کسی ایک مخصوص واقعہ سے ہوتا ہے جنگوں اور سیاسی واقعات کے بیان کو وہ اسی زمرہ میں شامل کرتا ہے۔

قدیم تاریخوں میں خطابت، حسن اظہار اور اسلوب بیان کو بڑا دخل ہوتا تھا۔ ایتھنز میں فن خطابت کا ایک استاد اسوکراطس (Isocrates) اس طرح کی تاریخ نویسی کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ سسرو نے روم میں اسی طریق کی پیروی کی۔ اس نوع کی تاریخ نگاری میں لی وی کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔

یونان کے بہترین مورخوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے واقعہ اور افسانہ میں امتیاز کرنے کی کوشش کی۔ اس کا سب سے عظیم نمائندہ شہرۂ آفاق مورخ تھوسی ڈا ڈیس تھا جس نے پلی پونیشی جنگ کے واقعات قلم بند کیے۔

ہردوط نے پانچویں صدی ق م میں ایرانیوں کے خلاف یونانیوں کی کامیاب مقاومت کو اپنا موضوع بنایا۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوعات محدود قسم کے تھے اور ان مورخین ہی کے زمانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے بیان میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابتدائی مسیحی تاریخ نگاری

چوتھی صدی عیسوی کے دوران رومن سلطنت میں عیسائیت کے فروغ کی وجہ سے تاریخ نگاری کی ایک ایسی نوع کو بڑھاوا ملا جو یونان اور روم کی غیر ترقی یافتہ (Pagan) تاریخ نگاری سے بالکل جدا تھی۔ اس کا سرچشمہ مذہب یہودیت تھا۔ قدیم لوگوں میں صرف یہودی ہی ایسے تھے جن کے نزدیک اپنے ماضی کو یاد کرنا مذہبی فرائض میں شامل تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں کا کوئی معبود ایسا نہ تھا جس نے بندوں سے اپنی یاد تازہ رکھنے کا مطالبہ کیا ہو۔ مقدس تحریرات سے واقف ہونا ہر یہودی کا فرض سمجھا جاتا تھا اور یہی نگارشات بالآخر "عہد نامہ عتیق" یا اولڈ ٹسٹیمنٹ کی شکل اختیار کرگئیں۔ ظاہر ہے ان تحریروں میں وہی واقعات درج ہیں جن کو یاد رکھنا منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لیے ضروری تصور کیا گیا۔

عیسائیوں نے عہد نامہ عتیق کو جوں کا توں قبول کرلیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی طرف سے مقدس تاریخ کے کئی اجزا کا اضافہ کیا۔ "عہد نامہ جدید" یا نیو ٹسٹیمنٹ میں چار حواریوں کے ارشادات ان ہی اجزا پر مشتمل ہیں۔ ان میں بہ حیثیت مجموعی وہی واقعات و فرمودات درج ہیں جو عیسائی عقیدہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تاریخی اہمیت رکھنے والی تحریر صرف "رسولوں کے اعمال" (Acts of the Apostles) والے باب میں ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کا قصہ جن کی ولادت کے متعلق "عہد نامہ عتیق" میں پیشین گوئی کی گئی تھی، ایک عرصہ تک عیسائی مورخین کا مرکز توجہ بنا رہا۔ اور انجیل کے دونوں حصوں کے واقعات ہی کو ساری دنیا کی تاریخ تصور کیا جاتا رہا۔ عالمی تاریخ کا تصور عیسائیوں سے پہلے بھی موجود تھا لیکن عیسائی مورخین نے اسے پہلی مرتبہ موثر طریقے سے استعمال کیا۔

چوتھی اور پانچویں صدی کے عیسائی مورخین کو اپنے زمانے کی تاریخ سے دلچسپی نہیں تھی بجز اس کے کہ مذہب کی مدافعت میں انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہو۔ اسی لیے ان کی تاریخیں نہایت ہی جانبدارانہ اور مخالفین کے تعلق سے بہت ناواجب ہیں۔

چوتھی اور پانچویں صدی کے لاطینی کلیسا کی سب سے قد آور شخصیت سینٹ

اگسٹائن کی تھی۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "خدا کی بستی" (City of God) میں جو تاریخی شواہد پیش کیے ہیں ان کا مقصد محض یہ ثابت کرنا تھا کہ غیر عیسائی معاشرے کس قدر پستی کی حالت میں ہیں۔ تاریخ نگاری کو اگسٹائن کی سب سے بڑی دین ان کا پیام ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے تمام عیسائی مفکرین ان کے اس نقطۂ نظر سے متفق نظر آتے ہیں کہ آسمانی اور دنیوی بستیوں میں ایک مسلسل اور دائمی کش مکش جاری ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ نگاری

پانچویں صدی سے گیارھویں صدی تک کا عرصہ وہ زمانہ ہے جس میں سلطنت روما کا مغربی نصف حصہ تہذیبی زوال کی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اس علاقے کے تقریباً سب ہی باشندے ناخواندگی اور جہالت کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس لیے اس طویل عرصہ کا ہمیں کوئی تشفی بخش تاریخی مواد نہیں ملتا۔ بازنطینی تاریخ نگاری کے برعکس یہاں کے مورخ صرف مذہبی موضوعات ہی پر قلم اٹھاتے تھے۔ یہ راہب مورخ دنیوی امور سے بالکل بے بہرہ ہوتے تھے۔ یہ بات بیدے (Bade) کے متعلق بھی درست ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کا سب سے بڑا مورخ مانا جاتا ہے۔

گیارھویں اور بارھویں صدی کو اکثر مورخین تہذیبی اور علمی ترقی کا دور قرار دیتے ہیں۔ تاہم اس دور میں تاریخ نگاری کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہیں ہوا اور فلسفیانہ موضوعات پر زیادہ توجہ دی جاتی رہی البتہ بویریا کے بشپ آٹو (Otto) کی شخصیت ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی کتاب "دو شہر" (The Two Cities) ازمنۂ وسطیٰ میں فلسفۂ تاریخ کو عیسائی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی سب سے کامیاب سعی ہے ایک اور قابل ذکر تاریخ ۱۳۸۱ء کی کسان بغاوت پر لکھی گئی تھی جس میں واقعات کو انتہائی دل چسپ اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

تیرھویں اور چودھویں صدی میں تاریخ نگاری معلوماتی مجموعوں کی شکل میں جاری رہی۔ "آئینۂ تاریخ" ایسا ہی ایک مجموعہ ہے جسے فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کے ایما پر پروٹسنٹ نے مرتب کیا تھا۔

پندرھویں صدی میں مورخین نے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخی روایات سے دانستہ طور پر روگردانی کی اور بازنطینی علمائے تاریخ کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔

بازنطینی تاریخ نگاری

پانچویں صدی میں سلطنت روما کے زوال سے لے کر پندرھویں صدی میں اطالوی نشاۃ ثانیہ تک بازنطینی سلطنت میں تاریخ نگاری کا ایک اعلیٰ معیار قائم ہوچکا تھا۔ بازنطینی مورخ کلاسیکی یونانی نگارشات اور چوتھی صدی کی مسیحی تاریخ نگاری کے وارث تھے اور ان پر لاطینی اثرات نہ ہونے کے برابر تھے چنانچہ ان کی تواریخ میں ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈاڈیس کا جا بجا حوالہ ملتا ہے۔ تاہم جن دو یونانی عالموں نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ پالی بیس (Polybius)، اور مشہور سوانح نگار پلوٹارک (Plutarck) تھے۔ پالی بیس کی طرح بازنطینی مورخین نے بھی اپنے زمانے ہی کے حالات پر زیادہ لکھا اور چوں کہ زیادہ تر تاریخیں مدبروں، اعلیٰ عہدیداروں اور مذہبی پیشواؤں کی لکھی ہوئی ہیں اس لیے ان واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا جن سے انہیں دل چسپی نہیں تھی یا جو قرین مصلحت نہیں تھے۔ بازنطینی تاریخوں میں غالباً سب سے زیادہ دل چسپ تصنیف جان ششم (دور حکومت ۱۳۴۷ء ۱۳۵۴ء) کی خود نوشتہ تاریخ ہے جو اس نے اپنی معزولی کے بعد ایک خانقاہ میں بیٹھ کر لکھی تھی بعض بازنطینی مورخوں نے ترکوں کے حالات قلم بند کیے اور ۱۴۵۳ء میں محمد ثانی کے محاصرۂ قسطنطنیہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھا۔ ایک مورخ کریٹوبیولس نے فاتح قسطنطنیہ محمد ثانی کو ایک عظیم ہیرو کی طرح پیش کیا ہے۔

نشاۃ ثانیہ میں تاریخ نگاری

نشاۃ ثانیہ کے علما و مفکرین میں یہ احساس شدت سے پایا جاتا تھا کہ ان کا تعلق ایک نئے دور سے ہے۔ لورنزو والا (Sorenzovalla) جو اس وقت کا ایک متبحر عالم تھا نئے دور کی فنی ترقیوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتا ہے۔

والا نے "عہد نامہ جدید" کو "تاریخی لسانیات" (Historical Philol - ogy) کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی اور ان کے اصل متن کی تلاش میں ایک عرصہ تک سرگرداں رہا۔ والا کی توجہات کو عام کرنے میں اراسمس کا بڑا حصہ ہے۔ پھر متنی تنقید کے اصول کو پولی ٹین نے مقبولیت بخشی۔ اس دور کے کئی عالموں نے مملکت کی ابتدا کے متعلق بھی تحقیق و تفتیش شروع کی۔

سترھویں صدی میں فرانسیسی اور برطانوی علما نے اپنے قومی اداروں کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا اور ان روایات اور قصوں کو تاریخی پس منظر عطا کیا جو کسی مخصوص ریاست کی تشکیل سے متعلق زبان زد تھے۔

لیوپولڈ فان رانکے نے جو جرمنی میں سائنٹیفک تاریخ نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ فرانسسکو گوسیاردنی (Guiceior Dini) کی "تاریخ اطالیہ" کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم گوسیاردنی کی تصنیف نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نگاری میں تقریباً وہی مقام رکھتی ہے جو قدیم یونان میں تھوسی ڈاڈیس کو حاصل تھا۔ غرض اسی دور میں جرمنی میں بالخصوص اور انگلستان اور فرانس میں بالعموم، اپنے ملک کے حالات کو وطن پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کا رجحان عام ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ اصلاح مسیحیت (Reformation) کی تحریک کی وجہ سے پروٹسٹنٹ خیالات کی مقبولیت میں اضافہ ہوا جس نے بالآخر تاریخ نگاری کو بھی متاثر کیا مارٹن لوتھر نے جو پروٹسٹنٹ مسلک کا بانی تھا بقول فرانسس بیکن عہد قدیم کو زندہ کیا اور قرون سابقہ سے اہل کلیسا کو روشناس کیا۔

عیسائیت کی صحیح تاریخ کے تصور کو جان کالون نے اور تقویت بخشی غرض پروٹسٹنٹ اور کیتھولک طبقوں کے مباحثوں اور مناقشوں نے دستاویزی شہادتوں کا ایک دفتر کھول دیا جس میں غیر جانبداری کا عنصر دب کر رہ گیا۔

سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ دانشور طبقہ اب غیر مذہبی موضوعات میں زیادہ دل چسپی لینے لگا تھا اور مذہبی اخلاقیات سے زیادہ معاملات دنیوی کو ترجیح دی جانے لگی تھی پھر بھی تاریخ نگاری کو سترھویں صدی میں سائنس کا مرتبہ حاصل نہ ہوسکا کیوں کہ اب ریاضی، ہیئت اور طبعیات جیسے علوم، مفکرین کی ذہنی کاوشوں کا مرکز بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ نگاری کو ایک مستند باضابطہ علم (Discipline) کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں ایک صدی کا عرصہ لگا۔ ڈیکارٹ جو مخالف تاریخ مفکرین میں سب سے پیش پیش تھا مورخین کے غیر اصولی اور غیر صحیح طریق تحقیق سے نہ صرف نالاں تھا بلکہ تاریخ کو علم کا ایک شعبہ تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتا تھا۔

اٹھارھویں صدی میں "فلسفیانہ" تاریخ نگاری کو گزشتہ زمانوں کے مقابلہ میں زیادہ فروغ حاصل ہوا خصوصاً برطانیہ، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے بعض حصوں میں حکومتوں کی آزادانہ پالیسی کی وجہ سے اس صنف نے کافی ترقی

کی لیکن اٹلی اور فرانس میں یہ صورت حال نہیں تھی جہاں کی حکومتوں نے اس نوع کی آزادانہ تحریروں پر سخت سے سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔

اٹھارہویں صدی میں "قومیت" کی تحریک نے تاریخ نگاری کی بھی حوصلہ افزائی کی اور اب فطری علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں بھی دلچسپی لی جانے لگی تمام انسانی تاریخ کی وحدت کا ایک نیا شعور پیدا ہوا اور یورپ کے علاوہ دوسرے ممالک کے باشندوں اور ان کے معاشروں کو بھی تاریخ کے آئینہ میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جانے لگی. ایسے موضوعات جن کا بہ حیثیت مجموعی ترقی سے تعلق تھا مرکز توجہ بننے لگے. کندورسے (Condorcet) نے ذہن انسانی کی ترقی اور اس کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا اور تمام تاریخ انسانی کو نو ادوار میں تقسیم کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہر دور کسی نہ کسی غیر معمولی ایجاد یا کسی جغرافیائی انکشاف سے شروع ہوتا ہے۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مورخین نے ایک آزادانہ اور بے باکانہ نقطۂ نظر اختیار کیا اور اپنی تحقیق کے نتائج پیش کرنے میں کسی مذہبی پیشوا یا حاکم کی پرواہ نہ کی. اس سلسلے میں تہذیب و تمدن کی تاریخیں بھی لکھی گئیں والٹیر نے شارلیمان سے لے کر لوئی چہار دہم تک کے تہذیبی حالات پر روشنی ڈالی. ایک اور فرانسیسی فلسفی مانٹیسکو نے جو مورخ نہیں تھا اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "روحِ قوانین" (۱۷۴۸ء) کے ذریعہ ان پیچیدہ عوامل کی نشاندہی کی جو کسی معاشرہ کی تعمیر میں کارفرما ہوتے ہیں. اس کتاب نے گبن کو بھی متاثر کیا جس کی تصنیف "تاریخ زوال سلطنت روما" (۱۷۷۶ء-۱۷۸۸ء) فلسفیانہ تاریخ نگاری کا شاہکار تصور کی جاتی ہے اس میں گبن نے انسانی ترقی کے مسائل سے سیر حاصل بحث کی ہے. اس عقیدہ نے کہ انسانی معاشرہ کی مسلسل ترقی محض خواب نہیں بلکہ ایک قابل عمل تصور ہے، انگلستان میں آدم اسمتھ اور فرانس میں ترگو (Turgot) کی تحریرات کے ذریعہ فروغ پایا. ان مفکرین کی نگارشات سے گبن اچھی طرح واقف تھا.

انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخ نگاری

انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے تاریخ نگاری میں بڑی اہم تبدیلیاں ہونے لگی تھیں. اس کا اظہار سب سے پہلے اور نمایاں طور پر جرمن مورخین کی تحریروں سے ہوتا ہے. یہ بڑی حد تک انقلاب فرانس اور پھر جرمنی کے نپولین کے زیر اقتدار آنے کا ردِ عمل تھا۔

۱۸۲۵ء کے بعد یورپ میں وہ پابندیاں باقی نہیں رہیں جو نپولین کے دور تک دانشور طبقہ پر عائد کی گئی تھیں. ذہنی آزادی کے اسی ماحول میں چارلس ڈارون کی شہرۂ آفاق تصنیف "مبدائے انواع" (Origin of Species) (۱۸۵۹ء) منظرِ عام پر آئی جس نے کلیسائی نظریات کی یکسر نفی کر کے رکھ دی اور انسانی فکر اور نظریۂ ارتقا میں ایک انقلاب برپا کر دیا. اس کے بعد تاریخ نگاری سے متعلق حکومتوں کے علاوہ خود کلیسا کے رویّہ میں رواداری کا رجحان پیدا ہونے لگا. اور مورخین نے حکومتی اداروں کے دستاویزات کے علاوہ بیانیہ ماخذ مخطوطات، کتبات، آثارِ قدیمہ، جغرافیائی معلومات، سکہ جات، اسنادات اور دیگر شواہد سے استفادہ کرنا شروع کیا.

چارلس. وی. لانگ لوا (Langlois) . اور چارلس سائنوبو (Seignobos) کی معرکۃ آرا تصنیف "مقدمہ مطالعۂ تاریخ" کے علاوہ فرانسیسی مورخ فرڈینینڈلات کی تحریروں نے تاریخ نگاری کی نئی راہیں متعین کیں. اس سلسلہ میں جرمنی کے ایک بہت بڑے مورخ لیو پولڈ فان رانکے کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جس نے کلاسیکی زبانوں کے ایک استاد کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی اور یونانی ولاطینی مصنفین کے اصل ماٰخذ کی تلاش میں ایک نامور مورخ بن گیا. متنی تنقید جسے سب سے پہلے کارل لاکمین (Lachmann) نے رائج کیا تھا، تاریخ نگاری کے لیے بھی انتہائی ضروری قرار دی گئی. اس کے علاوہ "خارجی" اور "داخلی" تنقید کے اصول متعین کیے گئے نیز مورخ کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہو اس سے پوری ہمدردی بھی رکھتا ہو، کیوں کہ اس کے بغیر ماضی کی صحیح بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ صحیح تصویر اس کے سامنے آسکتی ہے. اس لحاظ سے تاریخ نگاری مورخ سے ایک آرٹسٹ کی دوربینی اور ایک شاعر کی حسّیت کا مطالبہ کرتی ہے۔

انیسویں صدی کی جدید تاریخ نگاری زیادہ تر جرمن مورخین کی رہین منّت ہے. خاص طور سے ہرڈر نے تاریخ کو ایک نیا افق دیا جس کا خیال تھا کہ تاریخ ذہن انسانی کی رفتار کا سرسری جائزہ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گزرے ہوئے واقعات کو از سرِ نو ترتیب دینا اور گمشدہ کڑیوں کو ملانا تاریخ کا سب سے بڑا فریضہ ہے اور بالفاظِ دیگر تمام ممالک اور تمام زمانے تاریخ کی نظر میں قابل احترام اور اہم ہوتے ہیں اس سلسلہ میں فرانس کی حد تک ژول میشلے (Jules Michelet) اور انگلستان کی حد تک لارڈ میکالے کی خدمات یقیناً لائق تحسین ہیں. جرمن تاریخ نگاری کی عالمانہ تکنیک اور بلند پایہ طریقِ تحقیق سے کئی دیگر ممالک نے بھی استفادہ کیا ہے چنانچہ مشہور روسی عالم روسٹرٹ زیف (Rotortzeff) جو قدیم تاریخ کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے جرمن تاریخ نگاری ہی سے متاثر تھا۔

مشرقی روایات

مسلم تاریخ نگاری

یورپ کی طرح مشرق میں بھی تاریخ نگاری زمانۂ ماضی میں تہذیبی سرگرمیوں کا کہیں بھی جزو نہیں رہی البتہ مذہبی تقاضوں کے تحت اس سلسلہ میں ضرور پیش رفت ہوئی تھی جیسا کہ اسلام کی توسیع و اشاعت کی ابتدائی صدیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

مسلم تاریخ نگاری ابتدا ہی میں یورپی اثرات سے بالکل غیر متاثر رہی انیسویں صدی تک بھی مسلم مورخین شاذ و نادر ہی عیسائی ماٰخذ سے استفادہ کیا کرتے تھے اور عیسائی ممالک کے واقعات کو تو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا جاتا تھا. البتہ ایشیا کے باشندوں سے ان کو دلچسپی تھی. مسلمانوں کے ادبی کارناموں کا ایک بڑا حصہ تاریخ نگاری پر مشتمل ہے تاریخ نگاری کی جو روایت عرب میں قائم ہوئی تھی اس کی ابتدا ایران، ترکی، ہندوستان میں بھی کی گئی۔

عربی تاریخ نگاری کی ابتدا کیوں کر ہوئی یہ مسئلہ ابھی تک قطعی طور پر حل نہیں ہوسکا ہے. اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام سے قبل (۶۲۲ء) زمانۂ جاہلیت کی اساطیری روایات اور داستانوں اور آٹھویں و نویں صدی کے اسلام کی سنجیدہ، دقیق اور علمی تاریخ نگاری میں ایک وسیع خلیج حائل ہے. یہ اس لیے بھی دیچ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام سے قبل عربوں میں نثر نگاری کا رواج نہیں تھا تاہم مسلم تاریخ نگاری کے ارتقائی مراحل اور اس کے خدوخال کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے. قدیم یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی تاریخ نویسی کی نشو و نما مذہب ہی کے زیر اثر ہوئی .

بانیٔ اسلام حضرت محمد صلعم (رحلت ۶۳۲ء) نے ہمیشہ اپنے آپ کو یہود و نصاریٰ کے رسولوں کی روایات کا وارث سمجھا اور مذہب اسلام کی اشاعت میں تاریخی شعور کو پوری طرح ملحوظ رکھا تھا۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں جا بجا تاریخی واقعات کے حوالے ملتے ہیں اور ان سے سبق حاصل کرنے کی صریح ہدایات موجود ہیں۔

قدیم قبائلی روایات کو جمع کرنے ترتیب دینے اور ان کی تشریح کرنے کا عظیم الشان کارنامہ دوسری صدی ہجری میں ابو عبیدہ نے انجام دیا۔ حشام بن محمد الکلبی کا نام بھی اس سلسلے میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا مواد گرجوں کے وثیقوں اور ایرانی ذرائع سے حاصل کیا تھا۔ علمی تاریخ نویسی کی جانب یہ ایک اہم قدم تھا تاہم قدیم طرز کے علما اس کی تحریروں کو زیادہ معتبر نہیں سمجھتے تھے۔

عربی زبان میں علمی تاریخ نویسی کی ابتدا آں حضرت صلعم کی سیرت اور ان کی سرگرمیوں کے مطالعہ سے وابستہ ہے۔ آں حضرت صلعم کی ایسی تعلیمات کو جن کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں تھا ان کی رحلت کے بعد مصدقہ روایات کی شکل دے دی گئی اور پیغمبر اسلام کے تمام اقوال و اعمال کو احادیث کی صورت میں محفوظ کر لیا گیا۔ اور یہی احادیث قرآن کے ساتھ اسلامی قانون (شریعت) کی بنیاد قرار پائیں۔ احادیث ایک عرصہ تک تو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں اور بالآخر آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں انہیں ضبط تحریر میں لایا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں مستند اور قوی روایات کے ساتھ ساتھ مشکوک اور ضعیف روایات کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ دراصل عربوں میں علم تاریخ کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے مستند غیر مشتبہ اور قوی احادیث کو جمع کرنے کا عمل شروع ہوا اور احادیث کی طرح اسناد پر زور دیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں محمد بن مسلم ابن شہاب الزہری کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے پہلی مرتبہ تلاش بسیار کے بعد مختلف ماخذ سے حدیثیں جمع کر کے ایک مسلسل بیان کی صورت میں انہیں مرتب کیا۔ صحیح "اسناد" کی تلاش و تحقیق نے باقاعدہ ایک علم کی صورت اختیار کر لی اور نامور علما و محدثین نے اس میدان میں نمایاں کام انجام دیا۔ آں حضرت صلعم کی پہلی مستند "سیرت" ابن اسحٰق (انتقال ۷۶۸ء) نے لکھی۔ سیرت محمد صلعم میں تاریخ کا ایک وسیع تر تصور ملتا ہے۔ اس زمانہ جاہلیت کی تاریخ ابتدائے آفرینش سے لکھی گئی ہے اور اسرائیلیات سے بھی پورا پورا استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ اب صرف ابن ہشام کے نظر ثانی شدہ نسخے کی شکل ہی میں دستیاب ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے مورخین اپنا ایک آزادانہ نقطہ نظر رکھتے تھے اور خالص مذہبی مصالح ان کے پیش نظر نہ ہوتے تھے البتہ جہاں تک احادیث کی صحت کو جانچنے اور انہیں مستند قرار دینے کا تعلق ہے علمائے دین و علمائے تاریخ دونوں بعض مشترکہ اصولوں کی پابندی کرتے تھے اسی سلسلے میں الواقدی کا نام قابل ذکر ہے جس نے اسلامی تاریخ کے کئی حوادث پر خامہ فرسائی کی اور عہد ہارون تک کی ایک ضخیم تصنیف "کتاب التواریخ الکبیر" لکھی۔ پھر ابن سعد نے الواقدی سے استفادہ کرتے ہوئے آں حضرت صلعم اور صحابۂ کرام کی سیرت کو "طبقات ابن سعد" میں پیش کیا۔

۷۵۰ء سے لے کر ۱۰۶۵ء تک کے زمانہ کو عرب تاریخ نگاری کا درخشن دور کہا جا سکتا ہے۔ نویں اور دسویں صدی میں خلافت عباسیہ میں جس کا دار الخلافہ بغداد تھا علمی سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ کاغذ کی ایجاد، مادی تہذیب کی ترقی اور ایک عالمگیر سلطنت کے قیام کے بعد جس کی سرحدیں اٹلانٹک سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں علم تاریخ نویسی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اور تاریخ نگاری اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک جزو لاینفک بن گئی۔ نویں اور دسویں صدی کے "کلاسیکی" مورخین جن کی علمی سرگرمیاں زیادہ تر عراق ہی میں جاری تھیں، واقعات کی صحت پر بہت زور دیا کرتے تھے۔

صحیح معنی میں تاریخی تالیفات کی ابتدا البلاذری کی تحریروں سے ہوتی ہے اس دور کی زیادہ تر تاریخیں اسلامی دنیا ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاہم اس میں قبل اسلام کے بھی کچھ واقعات شامل کر لیے جاتے تھے جن کے ماخذ زیادہ تر انجیل اور ایرانی ہوتے تھے اسرائیلیات کے علاوہ جن سے پہلے ہی استفادہ کیا جانے لگا تھا۔ اب سریانی تراجم کے ذریعہ یونانی علوم کے مطالعہ نے تاریخ نگاری میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ ہندوستانی علوم سے اکتساب کی بھی بعض مثالیں ملتی ہیں۔ ابو حنیفہ اور الیعقوبی نے اس قسم کے مواد سے استفادہ کیا تھا۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ عالم میں دور خلافت کو نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں المسعودی کا نام بھی قابل ذکر ہے جو عرب مورخین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ الیعقوبی اور المسعودی صرف مورخ ہی نہیں تھے بلکہ بلند پایہ جغرافیہ داں بھی تھے جن کو جغرافیائی معلومات دور دراز مقامات کی طویل سیاحت سے حاصل ہوئی تھیں۔ اس طرح اب تاریخ اور جغرافیہ کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اس دور میں ایک نئی اصطلاح "تاریخ" وجود میں آئی اور "اسناد" و "اخبار" جیسی اصطلاحات ترک کر دی گئیں۔

عباسی دور کا ایک اور ممتاز و مستند مورخ الطبری (وفات ۹۲۳ء) تھا۔ جس نے اپنی مشہور "تاریخ الرسل والملوک" تفسیر قرآن کے ضمیمہ کے طور پر لکھی تھی اس کے بعد تاریخ نگاری میں محدثانہ روایات پر عمل کرنے کا طریقہ ختم ہو گیا۔ بعد کے مورخین نے ابتدائی اسلامی تاریخ کو پیش کرنے میں الطبری ہی کی پیروی کی ہے ایک اور مورخ المسکاوی (وفات ۱۰۳۰ء) نے اپنی تصنیف "تجارب الامم" میں ماضی کو حال کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ عالمی خلافت کے تصور نے جس عالمی نقطۂ نظر کو فروغ دیا تھا اس کی ایک اچھی مثال ابن الاثیر کی مشہور تصنیف "الکامل" ہے۔ اس کے بعد کے دور میں عام تاریخیں، جو تاریخ نویسی کے اعتبار سے زیادہ دل چسپ ہیں، اندلس اور المغرب میں لکھی گئیں۔

اس کے بعد تاریخ نگاری کا سارا ڈھانچہ ہی بدل گیا اور علم تاریخ بجائے خود ایک مستقل علم قرار پایا۔ پیشہ ور مورخوں اور ارباب حکومت کے اس میدان میں اترنے کی وجہ سے علمائے مذہب کی حیثیت اس معاملہ میں ثانوی ہو کر رہ گئی۔ بارھویں اور تیرھویں صدی کی شامی اور عراقی تاریخ نگاری اسی دور کی مغربی تاریخ نگاری کے مماثل بلکہ بعض صورتوں میں اس سے کہیں بہتر تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بیش تر مورخین تقلید پرستی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان کی تحریروں سے غور و فکر اور تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار کم سے کم ہونے لگا علمی تحقیق و تجسس کی جگہ سیاسی مصلحتوں نے لے لی بیانات کو کی طرز پر حکمرانوں کے کارناموں اور درباری سرگرمیوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرنے کا رجحان عام ہو گیا اور تاریخ غیر متعلقہ واقعات کا پلندہ بن کر رہ گئی۔

لیکن دنیائے اسلام کا سب سے بڑا مورخ جسے عالمی سطح پر بھی بہت ممتاز مقام حاصل ہے بلاشبہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۱۳۳۲ء — ۱۴۰۶ء) تھا اس کا مقابلہ کسی بھی دور اور کسی بھی ملک کے عظیم ترین مورخ سے کیا جا سکتا ہے تاریخ سے متعلق اس کی عالمانہ بصیرت اور اصابت رائے اپنا جواب نہیں رکھتی اپنی تصنیف "کتاب العبر" پر اس کا مقدمہ بقول ٹائن بی (Toynbee) "اپنی نوعیت کا عظیم ترین کارنامہ ہے ایک ایسا کارنامہ جو اب تک کسی نے انجام نہیں دیا۔"

ابن خلدون ان تمام علوم کا ماہر تھا جو اس وقت تک مسلمانوں کی

دسترس میں تھے۔ وہ علوم دینی کا متبحر عالم ایک عظیم المرتبت مبصر اور ماہر منطق تھا۔ وہ علمی اور عملی دونوں میدان کا شہ سوار تھا۔ اپنے وسیع تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر اس نے ان محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جو اس وقت کے معاشرہ میں کار فرما تھے۔ واقعات نگاری کی تفصیلات اور جزئیات کی صحت کو ملحوظ نہ رکھنے کے باوجود وہ گزشتہ صدیوں کے محرکات، رجحانات اور اہم خد و خال کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ معاشروں میں جو قوانین کار فرما ہوتے ہیں ان سے تمام نتائج اخذ کرنے اور انہیں کلیات کی شکل دینے میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔

اس کے "مقدمہ" کے کئی نسخے موجود ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک مسلم تاریخ نگاری پر اس کے اثرات بہت کم نظر آتے ہیں۔ بقول فرانز روزنتھال جس نے اپنے ترجمہ کے ذریعہ سب سے پہلے یورپ کو اس سے روشناس کرایا۔ ابن خلدون میں ایک "بنیادی اپج" پائی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے منتشر سیاسی اور سماجی تصورات کا تاریخ پر اطلاق کیا جسے وہ ایک ایسی زندہ قوت تصور کرتا تھا جو ماضی کو ایک مسلسل عمل کے ذریعہ حال سے جوڑ دیتی ہے۔

اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد مقامی تاریخ نویسی کو تقویت حاصل ہونے لگی۔ اس سلسلہ میں الخلیب البغدادی کی تاریخ بغداد اور ابن عساکر کی تاریخ دمشق قابل ذکر ہیں۔

ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی کے احیا اور ایرانی و ترکی خاندانوں کے عروج حاصل کرنے کے بعد فارسی میں بھی معرکہ آرا تاریخیں لکھی گئیں۔ ایرانی تاریخ نگاری کا آغاز ۹۶۳ء میں ہوا جبکہ بلامی نے "ترجمہ تاریخ طبری" لکھی۔ اس کے بعد سے اکثر تاریخیں عربی ہی کے نمونے پر لکھی جانے لگیں لیکن سب سے مشہور تصنیف ملک جوینی کی منفرد تاریخ ہے جو چنگیز خان اور منگول حملوں سے متعلق ہے۔ فارسی تاریخ نگاری کی روایات ہندوستان بھی پہنچیں چنانچہ فخر الدین مبارک شاہ کی تاریخ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

جن علماء نے ترتیب سنین اور تاریخی مواد کے اکٹھا کرنے میں علم ریاضی اور علم ہئیت سے استفادہ کیا ان میں سب سے ممتاز ابوریحان البیرونی ہے جس کی شہرۂ آفاق تصنیف "الآثار الباقیہ" کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا مشہور سفر نامہ ہند موسوم بہ "کتاب الہند" (۱۰۳۰ء) تاریخی اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلم تاریخ نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سیرت نبوی کے بعد صحابۂ کرام علمائے دین اور فقہائے اسلام کے تذکرے بڑے وسیع پیمانے پر لکھے گئے جن میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ پایا جاتا ہے۔ جہاں تک تاریخی سوانح نگاری کا تعلق ہے صلاح الدین ایوبی کا کردار بھی مورخین کی خاص توجہ کا مرکز بنا رہا۔ بہاؤ الدین نے (وفات ۱۲۳۴ء) صلاح الدین کی زندگی کے حالات پیش کرنے میں بڑی ہی عالمانہ بصیرت اور گیرائی کا ثبوت دیا ہے۔

تاریخ نویسی کی جو سرپرستی ایوبیوں کے دور میں ہوئی وہ ان کے جانشین مملوک سلاطین کے عہد میں بھی جاری رہی۔ اس دور کے مورخین میں سب سے نمایاں شخصیت المقریزی کی ہے۔

بارہویں صدی کے بعد عربی زبان تاریخ نگاری کی زبان نہ رہی۔ تیرہویں صدی میں فارسی میں تاریخ کی بعض معرکہ آرا تصانیف منظر عام پر آئیں۔ پھر ترکی اور دیگر زبانوں میں بھی تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ تاہم انیسویں صدی تک مسلم تاریخ نگاری کے طور و طریق میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ انیسویں صدی سے مسلم تاریخ نگاری مغربی خیالات و تہذیب سے متاثر نظر آتی ہے۔

ہندوستانی روایات

کہا جاتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے کچھ تاریخی قصے تو مل جاتے ہیں لیکن خود تاریخ نہیں ملتی۔ ہندوستان کے حالات و واقعات اور تاریخی شخصیتوں پر ایک افسانوی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہاں کی دیو مالائی روایات ہی کو تاریخی حقیقت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ادب، علم ہئیت، ریاضی، مذہب، فلسفہ اور فنون لطیفہ میں اپنی شاندار روایات کے باوجود ہندوستان نے ہیرو ڈوٹس، تھوسی دادیس، لی وی پولی بیس یا ٹیسی ٹس جیسا کوئی شہرۂ آفاق مورخ پیدا نہیں کیا۔ اور ہندوستان میں وہ تاریخی شعور فروغ نہ پاسکا جو یورپی فکر کا ایک جز و سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال ان آثار قدیمہ کے علاوہ جن کا انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے ہندوستان کی قدیم سماجی اور تہذیبی تاریخ کا اندازہ ویدوں، رامائن و مہابھارت کی رزمیہ داستانوں اور پرانوں ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ تاہم انہیں بھی تاریخ کے معتبر ماخذ قرار نہیں دے سکتے۔ چند بادشاہوں کے تذکروں یا دیگر دستاویزات کے سوا جن کا اساطیری عنصر تاریخ سے جدا نہیں کیا جاسکتا، ہمیں قدیم ہندوستان کی تاریخ نگاری کی مثالیں نہیں ملتیں البتہ بارہویں صدی عیسوی کا ایک کشمیری مصنف کلہن ہی ایک ایسا مورخ ہے۔ جس کی سنسکرت میں لکھی ہوئی منظوم تاریخ "راج ترنگنی" تاریخی اعتبار سے لائق توجہ ہے۔ کلہن نے اس بات پر زور دیا کہ ماضی کا جائزہ لینے اور اسے جانچنے میں مورخ کو ایک جج کی طرح غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اس نے اپنے پیش روؤں پر تنقید کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ تاہم خود اس نے ساتویں صدی سے قبل کے تاریخی واقعات خالص افسانوی اور دیو مالائی رنگ میں پیش کیے ہیں اور کشمیر کے حالات پر بھی اس کی نظر گہری نہیں ہے دربار سے قربت اور سرکاری ریکارڈ پر دسترس کے باوجود واقعات کی صحت کو اس نے ملحوظ نہیں رکھا۔ کلہن ایک ایسے عقیدہ کا قائل تھا جس میں دنیا کو کلجگ تصور کیا جاتا ہے اسی لیے وہ علائق دنیوی سے بے تعلقی پر زور دیتا رہا اور انہیں ناقابل اعتنا سمجھتا رہا۔ وہ ساری تاریخ کو کرما اور قسمت ہی کا کھیل تصور کرتا تھا۔ کلہن کے بعد مسلمان مورخین کے نمودار ہونے تک تاریخی مواد شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے مسلمانوں میں تاریخ نگاری کا ذوق پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا اور جب دہلی مسلم سلاطین کا مستقر قرار پائی تو تاریخ نگاری کی ایرانی روایات بھی یہاں پہنچیں۔ فخر الدین مبارک شاہ اور البیرونی کے علاوہ جن کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان مورخین نے زیادہ تر مسلم دور کے واقعات اور مسلمان بادشاہوں ہی کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا انداز توجیہی سے زیادہ بیانیہ ہے۔ مغلیہ دور میں تو تاریخ نگاری کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی معرکہ آرا تواریخ لکھی گئیں۔ تزک نگاری میں جس کی ابتدا آل تیمور سے ہوئی "تزک بابری" بہت مشہور ہے۔ ہمایوں کی سرگزشت آفتابچی جوہر نے لکھی لیکن ہمایوں کی سوتیلی بہن گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" جو اکبر کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اسلامی تاریخ کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے جو داخلی اور انفرادی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اکبر کے عہد میں جبکہ مغل سلطنت اپنے عروج پر تھی تاریخ نگاری کو خاص طور سے فروغ حاصل ہوا۔ تاریخ الفی جو ایک مخلوط قسم کی تاریخ ہے اور اکبر سے منسوب

ہے ہجرت سے لے کر ایک ہزار سال کے ختم ہونے کی یادگار کے طور پر لکھی گئی۔ لیکن اکبر کے عہد کی سب سے مشہور تاریخ جو ہندی اور اسلامی روایات کی حامل ہے "اکبر نامہ" ہے جو ابوالفضل علامی کی تالیف ہے۔ خصوصاً اس کی تیسری جلد "آئین اکبری" تاریخی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں نہ صرف اکبر کے دور کے کارناموں کو سراہا گیا ہے بلکہ اس وقت کی انتظامی، مالیاتی، معاشی، مذہبی اور سماجی زندگی پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تصنیف جن گوناگوں موضوعات کا وسیع پیمانے پر احاطہ کرتی ہے اس کی نظیر عہد وسطیٰ کے سارے تاریخی ادب میں نہیں ملتی۔

"آئین اکبری" کے علاوہ عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ایک نقاد دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کے جانشین محمد قاسم فرشتہ نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے میدان کو اور وسیع کر دیا گو اس میں تحقیق و تدقیق کی صلاحیت نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ عہد اکبر کے تنقیدی حالات جو اصلی مآخذ پر مبنی ہیں، امیر حیدر بلگرامی نے "سوانح اکبری" (۸۵-۱ء) کے نام سے لکھے۔ اس کے علاوہ مختلف بادشاہوں کے عہد کی انفرادی تاریخیں بھی سرکاری طور پر قلم بند کی جاتی رہیں اور یہ دستور بھی اکبر ہی کے زمانے سے شروع ہوا۔ جہانگیر کے عہد کے واقعات خود اس کی خود نوشت تزک میں درج ہیں۔ عہد شاہ جہاں کی تاریخ کے پہلے دو دفتر عبدالحمید لاہوری اور تیسرا محمد وارث نے مرتب کیا۔ اورنگ زیب کے عہد کے حالات محمد کاظم اور محمد ساقی معتمد خان نے لکھے۔ آل تیمور کی زیادہ تشفی بخش تاریخ محمد ہاشم خفی خاں نے تحریر کی۔

غیر سرکاری اشخاص میں شیخ محمد علی حزین کی مشہور تاریخ "تذکرۃ الاحوال" اور مرزا محمد بن معتمد خاں کی تصنیف "عبرت نامہ" قابل ذکر ہیں۔ عبدالرزاق اورنگ آبادی کی "مآثر الامرا"، امین احمد رازی کی "ہفت اقلیم"، مرتضیٰ حسین بلگرامی کی "حدیقۃ الاقالیم" اور آنند رام مخلص کی "بدائع وقائع" اپنے طرز کی لاجواب کتابیں ہیں۔

مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے ابتدائی دور پر غلام حسین خاں کی "سیر المتاخرین" میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۸۹-۱۷ء میں ہوا اور جیمس مل اور میکالے نے اسے ایک مستند اور قابل قدر تصنیف قرار دیا۔

برطانوی دور اقتدار میں ہندوستان پر لکھی ہوئی انگریزوں کی تمام تاریخیں یورپی تصورات اور طریق تحقیق کے اصولوں پر مبنی ہیں تاہم انگریزی راج کی خوبیوں کو پیش کرنے میں کافی جانبداری برتی گئی ہے۔ جیمس مل نے معتبر مآخذ سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنا سارا زور قلم ہندوستانی تصورات اور رسم و رواج کی برائیوں کو بیان کرنے میں صرف کر دیا ہے۔ جیمس گرانٹ ڈف نے اپنی "تاریخ مرہٹہ" میں ہندوستانی نقطۂ نظر سے نسبتاً زیادہ ہمدردی ظاہر کی ہے۔ الفنسٹن کی "تاریخ ہند" بھی برطانوی نقطۂ نظر ہی کو پیش کرتی ہے البتہ جیمس ٹاڈ نے راجپوتوں کی معرکہ آرا تاریخ لکھی ہے۔ اسی طرح کی ایک اور اہم تصنیف جے ڈی کننگھم کی تاریخ "سکھ" (۱۸۴۹ء) ہے کننگھم کو برطانوی پالیسی پر تنقید کرنے کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔

ونسنٹ اسمتھ، الفریڈ لائل، لین پول، اور کیتھ جیسے مورخین کے نام بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے اس سلسلے میں ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ اور جے ڈوسن کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جنہوں نے "ہندوستان کی تاریخ خود ہندوستانی مورخین کی زبانی" آٹھ جلدوں میں بزبان انگریزی مرتب کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مستند تاریخوں میں "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" بھی قابل ذکر ہے جس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا۔ تاہم اس میں ہندوستان کی معاشی، سماجی اور ذہنی سرگرمیوں پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں تک ہندوستانی مورخین کا تعلق ہے، متعدد ماہرین نے ہندوستان کے مختلف مخصوص ادوار یا علاقوں پر قابل قدر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ قدیم تاریخ سے متعلق بی۔ جی۔ تلک، ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر، آر۔ سی۔ دت، آر۔ سی۔ مجمدار، آر۔ کے۔ مکرجی، سو کمارسین، ایچ۔ سی۔ رائے چودھری، کے۔ آر۔ این۔ شاستری، یو۔ این۔ گھوشال، کے۔ ایم۔ پانیکر، اور ڈی۔ ڈی۔ کوسامبی کے کارنامے قابل ستائش ہیں۔ قرون وسطیٰ کے مختلف پہلوؤں پر ایشوری پرشاد، ایس۔ کے۔ آئینگار، جادوناتھ سرکار، راناڈے، بینی پرشاد، حبیب اللہ، پروفیسر ابن حسن، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ایل شریواستو، پروفیسر محمد یاسین اور ڈاکٹر تاراچند نے روشنی ڈالی ہے۔

اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا جو ایک محقق یا ماہر تاریخ تو نہیں تھے لیکن تاریخی شعور کو بیدار کرنے میں ان کی تصانیف "ہندوستان کی دریافت" اور "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان میں شاید پہلی مرتبہ ہندوستان کو عالمی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ایسے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو مغربی مورخین کی نظروں سے اوجھل تھے یا جنہیں وہ دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان کی معاشی، تہذیبی اور ذہنی ارتقا کی تاریخ پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جدید سائنٹفک طریقے پر تجزیاتی اور تحقیقی کام کا بھی منصوبہ ہے تاکہ قومی اور علاقائی سطح کے تحقیقاتی نتائج کو ایک مربوط شکل دی جا سکے۔

فلسفۂ تاریخ

یہ خیال کہ انسانی تاریخ ایک سوچے سمجھے نظام کے تابع ہے اور اس کا ایک معنی خیز مقصد ہوتا ہے، قدیم زمانے میں بھی موجود تھا۔ اس کا اظہار مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں مختلف پیرایوں میں کیا گیا ہے۔ اس طرز فکر کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ تاہم دو وجہیں ایسی ہیں جن کا انسانی فکر پر مسلسل اثر رہا ہے۔ اگر مقصد اور نظام کو انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو تاریخی عمل واقعات کا ایک لایعنی من مانا گورکھ دھندا بن کر رہ جائے گا۔ دوسرا یہ احساس ہے کہ اگر تاریخ کو قابل فہم قرار نہ دیا جائے تو انسانی وجود ہی بے معنی اور مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے عظیم جرمن فلسفی ایمانوئیل کانٹ کے الفاظ میں "اگر ہم انسانی تاریخ کو محض بچکانی انا اور جذبۂ تخریب کاری کا نتیجہ قرار دیں اور خود اپنی نسل کے بارے میں جو مختار کل ہونے پر فخر کرتی ہے، کوئی رائے قائم نہ کر سکیں، تو یہ واقعی بڑا سانحہ ہوگا۔ شہرۂ آفاق مورخ آرنلڈ ٹوئنبی کی بھی کچھ اس قسم کی رائے ہے۔ انہوں نے اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے کہ تاریخ "ایک بے ہنگم، غیر منظم، اتفاقی حادثہ ہے جس میں کوئی معنی کوئی ربط اور کوئی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ہے۔"

تاریخ کے دینیاتی نظریے

تاریخ کے مفہوم سے متعلق مغربی تصورات پہلے پہل دینیاتی سرچشموں ہی سے نکلے ہیں۔ یہ تصور کہ تاریخ ایک ایسے نظامِ حیات کی توثیق کرتی ہے جس کا ارتقاء حکمتِ الٰہی کے مطابق خطِ مستقیم کی شکل میں ہوتا ہے نہ کہ ایسی متدائرہ اشکال میں جو بار بار وقوع پذیر ہوتی ہیں، عیسائی دور کی ابتدا ہی میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ یہ تخیل جو دراصل یونانی رومی تصورات میں نہاں تھا، سینٹ آگسٹائن کے یہاں پہلی مرتبہ واضح شکل میں ملتا ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے بھی بہت ہی لطیف پیرائے میں دینی اور دنیاوی تاریخ کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ کوئی ایک ہزار سال بعد بوسے (Bossuet) نے اپنی ایک تصنیف میں اس بات کا اعادہ کیا کہ تاریخ کا سارا قافلہ ایک "عقلِ اعظیم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا ہے۔ قوموں اور مذاہب کا عروج و زوال قوانینِ قدرت کے تابع ہوتا ہے اور تاریخ کا ہر دوران قوانین کی صحت کی گواہی دیتا ہے۔ لیکن آئزک نیوٹن کے نظریات کے بعد اس دینیاتی عقیدہ کے اثرات زائل ہوتے گئے۔ نیوٹن کے نظریات نے یورپی فکر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اب اٹھارہویں صدی کے تاریخی تصورات سے دینیاتی اور ربّانی عنصر خارج ہونے لگا اور اس کی جگہ ایک ایسے تاریخی تصور نے لے لی جو طبعی دنیا کے متعلق سائنس دانوں کے تصورات سے قریب تھا۔

دنیوی نقطۂ نظر

دورِ روشن خیالی (Enlighte Nment) میں مفکرین نے علمِ تاریخ و معاشرہ کے ایسے مفروضات، توجیہات اور ضابطوں کی تلاش شروع کر دی جو طبعی علوم کے قوانین سے قریبی مشابہت رکھتے ہوں۔ انسانی مقدر سے متعلق مذہبی اور مابعد الطبیعاتی قیاس آرائیوں کو انھوں نے یکسر رد کر دیا اور ان کی بجائے مشاہدات اور تجربات کو انسانی رفتار کی کسوٹی قرار دیا گیا۔ اور ایک ایسے مستند ہمہ گیر سماجی علم کی تخلیق پر زور دیا جانے لگا جو انسانی تاریخ کے محرکات کو سمجھنے میں مدد دے سکے اور جس کی بنا پر انسانی معاشرہ جہالت، غیر یقینی کیفیت اور اوھام پرستی کا راستہ ترک کر کے اپنی قسمت آپ بنانے اور آئندہ کے متعلق پیش قیاسی کرنے کے قابل بن سکے۔ اٹھارہویں صدی میں کنڈیلاک (Candillac) اور کنڈورسے اور انیسویں صدی میں سینٹ سیمون، آگسٹ کوست، جان اسٹورٹ مل اور تھامس بکل جیسے مفکرین نے جنہیں اپنے زمانے کے سماجی اداروں کا بھی عملی تجربہ تھا اس بات پر زور دیا کہ انسانی سرگرمیوں کے مطالبہ میں سائنٹیفک طریق تحقیق سے کام لیا جائے۔ وہ علم کو تسخیر فطرت کا ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔

لیکن انیسویں صدی ہی میں جبکہ یہ انقلابی رجحانات اپنے نقطۂ عروج پر تھے بعض ایسے تشکیک پسند مفکر مثلاً جوزف دی مسترے، آرتھر شوپنہار اور جیکب برک ہارڈ بھی موجود تھے جنہوں نے ان رجائی اور معقولیت پسند مفروضات کو ہدف تنقید بنایا۔ ان کی رائے تھی کہ انسان کی تکمیل پذیری اور افضلیت کا نظریہ یا کسی ایسے مقصد حیات کے موجود ہونے کا تصور جس کے حصول کی جانب حالات انسان کو لازمی طور پر آگے بڑھا رہے ہوں، نتائج کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے بلکہ محض اعتقادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ نام نہاد سائنٹیفک نقطۂ نظر کے نام پر دانستہ ہی سہی، غائیت (Teleology) کے ایسے رجحانات کو فروغ مل رہا ہے جنہیں سماجی دائرۂ تخلیق سے خارج کرنا ہی عین مقصد قرار پا رہا تھا۔ بیسویں صدی میں کارل پاپر اس طرح کے اعتراضات اٹھانے میں پیش پیش نظر آتا ہے جس کا ادعا تھا کہ ان مفکرین کے بلند بانگ دعوے کسی طرح بھی سائنٹیفک معیار پر پورے نہیں اترتے۔

ان اعتراضات کے باوجود انسانی علم اور فہم و ادراک کی توسیع میں سائنٹیفک نظریات کا بڑا دخل ہے۔ یہ سائنٹیفک نقطۂ نظر ہی کی دین ہے کہ نہ صرف قدیم طریق تحقیق کی کم مائیگی کو بے نقاب کیا گیا بلکہ انسانی فکر کے ایک شعبہ کی حیثیت سے تاریخ کو ایک بلند تر درجہ عطا کیا گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نظریہ سازوں میں ویکو اور ہرڈر کے نام بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں ان دونوں مفکرین نے تاریخ کے مرتبہ اور اہمیت کو منوانے کے لیے ایک ایسے طریق تحقیق پر زور دیا جو علوم طبعی کے طریق تحقیق سے مختلف تھا۔ ویکو کی تحریریں اپنی اَدق بیانی کی وجہ سے ایک عرصہ تک لائق توجہ نہیں سمجھی گئیں اور صرف حال ہی میں ان کی اہمیت اور اپج کا صحیح اندازہ لگایا جا سکا ہے اس کی تصنیف "نئی سائنس" میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال اپنی تخلیقات اور اپنے ارادوں کے ذریعہ جو علم حاصل کرتا ہے وہ بنیادی طور پر اس علم سے مختلف ہوتا ہے جو وہ غیر انسانی یا طبعی دنیا کے مشاہدہ اور اس کی تحقیق سے حاصل کرتا ہے۔ اول الذکر علم اصولی طور پر موخر الذکر علم سے برتر ہوتا ہے کیوں کہ بقول ویکو کسی شے کا صحیح علم اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ طالب علم کسی نہ کسی لحاظ سے خود اس کا خالق ہو۔ طبعی سائنس داں جس حقیقت کی کھوج کرتا ہے وہ دراصل تخلیق خداوندی ہے اور صرف خدا ہی اس سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس "عالم اقوام" انسانی تخلیق ہے اس لیے یہ ایسی چیز ہے جس کے جاننے کی انسان "امید" کر سکتا ہے۔ غرض اس طرح ویکو نے تاریخی اور دیگر طریقہ ہائے تحقیق کی مماثلتوں (Analogies) کی بہ نسبت ان کے اختلافات کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مورخ کو اپنے تخیل کی مدد سے ماضی کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے عہد کی تہذیبی خصوصیات (Ethos) سے حاصل ہونے والے مفروضات کی بجائے ماضی کو اس کے رجحانات اور رویوں کے سہارے اس کے اصلی روپ میں پیش کرنا چاہیے۔ ویکو نے انسانی تاریخ کا ایک متدائر (Cyclical) نظریہ پیش کیا جس کے مطابق، اقوام، یا معاشرے معینہ منزلیں طے کرتے ہیں جن کے متمدن کرنے میں خدائی ہاتھ پنہاں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا خیال یہ بھی تھا کہ انسان کے اعمال اور اس کی صلاحیتیں کسی ایک جامد یا مقررہ نمونہ کے تابع نہیں ہوتیں بلکہ رفتار زمانہ کے ساتھ ان میں ارتقاء اور تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

اس طرح جرمن فلسفی فان ہرڈر نے اس بات پر زور دیا کہ انسانی اعمال اور کارناموں کو "زمان و مکان اور قومی کردار" کی روشنی میں جانچنا چاہیے بہ الفاظ دیگر تہذیبی ماحول کے علاوہ ان رکاوٹوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو کسی ملک کے تاریخی سفر میں حائل ہوتی ہیں۔ ہرڈر کے لحاظ سے انسانی اعمال ہمیشہ ترقی پسند تحریکات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہرڈر نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ماضی کے خیالات اور اعمال کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ گویا وہ ایک غیر تبدیلی پذیر شعور انسانی کے مظاہر ہیں، انتہائی غلط ہے۔ کیوں کہ ایک مخصوص تاریخی معاشرہ کے رکن کی حیثیت سے انسان مختلف النوع اور گوناگوں اثرات کا تابع ہوتا ہے۔ ہر معاشرے کا ایک مخصوص کردار اور طرز حیات ہوتا ہے جو متعلقہ افراد معاشرہ کے ذہنوں کو غیر محسوس طور پر متاثر کرتا رہتا ہے اور اسے کسی مقررہ اصول یا ضابطہ

کے اندر مقید نہیں کیا جا سکتا۔

آج ویکو اور ہرڈر کے خیالات اتنے عام ہو چکے ہیں کہ ان سے ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہوتا لیکن یہی وہ خیالات ہیں جن کی بدولت صحیح معنوں میں "تاریخی شعور" پیدا ہوا اور جدید یورپی فکر میں ایک انقلاب آیا۔

اس نظریے کے تاریخی دھارے کو مظاہر فطرت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اور سائنٹیفک مثالوں کے ذریعہ اس کی توضیح ممکن ہے انیسویں صدی کی جرمن تصوّریت (Idealism) نے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہیگل کے "فلسفہ روح" نے تاریخی ارتقا اور تبدیلی کا ایک بالکل ہی نیا اور انقلاب انگیز تصور پیش کیا۔ مختلف معاشروں کی "نامیاتی" حیثیت اور مختلف تاریخی ادوار کا ایک دوسرے سے الگ ہونے کا تصور ہیگل نے دراصل ہرڈر ہی سے حاصل کیا تھا تاہم ہیگل نے تاریخ کو ایک حرکیاتی شکل دے دی۔ اس کا ادعا تھا کہ باقاعدہ واقعات کا ظہور اور ان کی تکرار جس کا اظہار فطرت میں ہوتا رہتا ہے۔ روح اور ذہن کے دائرے سے خارج ہے۔ روح انسانی اعمال کی پابندیوں کو توڑ کر تکمیل ذات کی ایک مسلسل جد و جہد میں مصروف رہتی ہے۔ انسان وہ نہیں ہے جس کا تصور اٹھارہویں صدی کی میکانیکی مادیت نے پیش کیا تھا۔ بنیادی طور پر یقیناً انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن اس کی فطری آزادی اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب مسلسل جد و جہد کے ذریعہ راستہ کے تمام واقعات کو توڑ کر جو خود انسان کے پیدا کردہ ہوتے ہیں آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔ اسی لیے ہیگل کہتا ہے کہ "روح خود اپنے آپ سے برسرِ پیکار رہتی ہے"۔ بہ الفاظ دیگر تاریخی ارتقا "پرسکون اور خوشگوار تبدیلیوں کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ جب کوئی مخصوص معاشرہ کسی خاص طرزِ زندگی کی تخلیق میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتا ہے تو اس کا تاریخی رول ختم ہو جاتا ہے اور اس کے قوانین اور ادارے مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اب افرادِ معاشرہ کی امنگوں اور جولانیوں کی ترجمانی نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح ہر تاریخی دور خود اپنے تباہی کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور خود اپنی "نفی" کرتا ہے۔ نتیجتاً اس کی جگہ نیا معاشرہ لے لیتا ہے جس سے افرادِ معاشرہ ذہنی و جذباتی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔

یہ مارکس اور ہیگل کے اس تصور سے متفق تھا کہ تاریخ ایک "جدلیاتی" عمل کے تابع ہوتی ہے جس میں ایک مرحلہ پر پیدا ہونے والے تضادات دوسرے مرحلہ پر ختم یا حل ہو جاتے ہیں لیکن سماجی تبدیلی سے متعلق مارکس کا نظریہ ہیگل کے نظریہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ہیگل کی طرح مارکس بھی تاریخ کا ایک "سمتی" یا "رُخی" (Directional) نقطۂ نظر رکھتا ہے لیکن جہاں ہیگل نے اسے ایک داخلی روحانی محرک کا مظہر قرار دیا ہے وہاں مارکس نے اس کی نوعیت اور راستہ کا تعین کرنے والے عناصر کی تلاش کہیں اور کی ہے۔ مارکس کے نقطۂ نظر سے انسان ایک ایسی مادی دنیا میں جو ایک خارجی حقیقت کی حیثیت سے قائم بالذات ہے تخلیق کار کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہی مادی دنیا اس کی سرگرمیوں کا میدان ہے لیکن ہیگل کے پاس اس اصل حقیقت پر رموزِ باطنی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس کا سارا فلسفہ "سر کے بل کھڑا ہوا ہے۔ جسے پیروں پر کھڑا کرنا ضروری ہے۔ مادی دنیا ہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے تاریخی عمل کا صحیح سراغ ملتا ہے۔ انسان اپنے فطری ماحول ہی سے اپنے ذرائع معاش حاصل کرتا ہے جو اس کی مادی آسودگی کا باعث ہوتے ہیں۔ انسانوں کے باہمی پیداواری رشتے ہی جو تقسیم محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں تاریخی رخ کا تعین کرتے ہیں۔ تاریخ کا یہ جدلیاتی عمل ان تضادات کا نتیجہ ہوتا ہے جو طریقۂ پیداوار کی تبدیلی سے واقع ہوتے ہیں۔ پیداواری طاقتیں جب کسی سماجی ڈھانچہ کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہیں تو وہ طبقاتی کشمکش کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر معاشرہ پیداواری رشتوں ہی کے عمل اور ردعمل کا نام ہے۔ یہی پیداواری رشتے تاریخی اور سماجی قدریں بھی متعین کرتے ہیں۔ معاشرہ کا بالائی ڈھانچہ، جس میں نظام قانون، اخلاق اور مذہب شامل ہیں، ان ہی مادی محرکات کی اصل بنیاد پر قائم ہوتا ہے نہ کہ ان جامد تصورات پر جنہیں ہیگل کے فلسفے میں تقدم حاصل ہے۔ مارکس کا یہ مشہور جملہ کہ "شعور انسانوں کے وجود کا تعین نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف یہ ان کا سماجی مرتبہ ہی ہے جو ان کے شعور کو متعین کرتا ہے"۔ اس کے فلسفہ تاریخ کا نچوڑ ہے۔ اس طرح ہیگل کی "روح" جو اپنی ذات اور اپنی تخلیق دونوں سے برسرِ پیکار رہتی ہے مارکس کے تاریخی مادیت کے انقلابی تصور کے آگے دم توڑ دیتی ہے۔

تاریخ میں عالم گیر پیمانے پر مشابہتوں اور تمثیلی نظاموں کی تلاش اور ان سے بعض کلی نتائج اخذ کرنے کی کوشش بیسویں صدی کے مورخین کے یہاں بھی ملتی ہے اس سلسلہ میں آسولڈ اسپنگلر اور آرنلڈ ٹوئینبی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسپنگلر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "زوالِ مغرب" میں انسانی تاریخ کو حیاتیاتی تہذیبوں میں تقسیم کیا ہے جو پہلے سے مقرر شدہ راستے پر عروج و زوال کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فریب شکن حالات میں اسپنگلر کے خیالات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی طرح کی مقبولیت دوسری عالم گیر جنگ کے بعد ٹوئینبی کی معرکہ آرا ضخیم تصنیف "مطالعۂ تاریخ" کو حاصل ہوئی۔ ٹوئینبی نے اسپنگلر کی طرح تمدن کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تاریخ کا دھارا کبھی بھی خطی شکل میں آگے نہیں بڑھتا جہاں تک مغربی معاشرہ کا تعلق ہے ٹوئینبی اسپنگلر کے مقابلہ میں زیادہ رجائی ہے اور انسان کو بڑی حد تک قابل اور مختار تصور کرتا ہے۔ ٹوئینبی "انسانی امور میں سائنٹیفک نقطۂ نظر" اختیار کرنے پر زور دیتا ہے تاہم تہذیبوں کے ارتقا سے متعلق خود اس کے بنائے ہوئے ضابطے بعض صورتوں میں غیر منطقی اور غیر سائنٹفک معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ کے تابناک مستقبل پر وہ یقین رکھتا ہے لیکن اسے سائنٹیفک دلائل سے ثابت نہیں کرتا۔ تاریخ کے موضوع، طریق تحقیق اور تجزیاتی مطالعہ کے سلسلہ میں ولہلم ڈلتھے (Wilhelm Dilthey) بینیڈیٹو کروچے اور برطانوی مفکر آر۔ جی کالنگ ووڈ کی خدمات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کروچے نے تاریخ کا تصوراتی نظریہ پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ "ہر سچی تاریخ ہم عصر تاریخ ہوتی ہے" اس نے ایسے تمام مکاتیب خیال کی مخالفت کی جن کی بنیاد غیر معقولیت پسندی پر ہو۔ کالنگ ووڈ عصری تاریخ کو اس لیے ناقابل تحریر سمجھتا ہے کہ اس کے متعلق ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "عصری تاریخ لکھنے والے کو الجھن ہوتی ہے نہ صرف اس لیے کہ وہ اس کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اسے ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے عصری تاریخ بے ربط اور گنجلک واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے اور صرف طویل اور گہرے غور و خوض کے بعد ہی ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس میں اہم اور کام کے اجزا کیا ہیں اور واقعات جس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تاریخ، اخبار نویسی ہو کر رہ جائے گی۔

تاریخ ہند

تاریخ ہند

تاریخ ہند

قدیم ہندوستانی تمدن

(ابتدائی زمانے سے ۵۰۰ قبل مسیح تک)

قدیم ہندوستان کی تاریخ اور اس کے تمدن کے ارتقا و عروج اور اس دور کے تعین کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ موجودہ صفحات میں اس کا اجمالی تذکرہ بھی آسان نہیں۔ یہ دور مورخ کیلئے کئی نزاعی مسائل کھڑا کر دیتا ہے۔ جہاں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ آریائی یا ویدک تمدن دنیا کے قدیم ترین تمدنوں میں سے ایک ہے وہیں اس کے حقیقی یا قریب قریب حقیقی دور کا تعین کرنا انتہائی دشوار ہے۔ اس معاملہ میں ماہرین کے طریقۂ تحقیق اور معیار تحقیق میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک اہم مسئلہ آریاؤں کے اصلی وطن کا ہے۔ اور یہ بھی کہ آریائی کوئی نسل تھی بھی۔ جہاں تک ویدک آریاؤں کے اصلی وطن کا تعلق ہے۔ مختلف ماہرین نے مختلف علاقوں کی نشاندہی کی ہے مثلاً وسط ایشیا، ڈینیوب کا علاقہ، پولینڈ، تفقاز وغیرہ۔ لیکن ہندوستانی اسکالر ویدک اور مابعد ویدک شہادتوں کی بنا پر روایتاً یہ مانتے چلے آئے ہیں کہ کیلاش پہاڑ اور جنوبی خطہ پنجاب کا علاقہ جو برہماورتا دیش اور برہمارشی دیش پر مشتمل تھا دراصل آریاؤں کا اصلی وطن تھا ایک ہندوستانی محقق نے کشمیر کو ان کا ابتدائی وطن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں یہ بات معنی خیز بن جاتی ہے کہ ویدک اور بعد کے ادب کے سارے دور میں ہند آریاؤں کے بارے میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ وہ سوائے ہندوستان کے کہیں اور بھی آباد رہے ہوں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ ایرانی اور ہند آریائی خانہ بدوش لوگ تھے جو بابل کے شمال مشرق میں آباد تھے اور جو بابل اور ایشیائے کوچک میں گھوڑے بیچنے کیلئے آیا کرتے تھے۔ مسیح سے دو ہزار سے زیادہ سال قبل انہوں نے بابل اور ایران پر حملہ کیا اور ان کا ایک حصہ وہاں سے آگے بڑھ کر ہندوستان آگیا۔

میکس ملر سے اخذ کی ہوئی اس غلط فہمی کے بارے میں، کہ آریہ ایک نسل تھی جو آریائی زبانوں کا ایک خاندان بھی رکھتی تھی، کوئی قابل اعتبار جواز نہیں ملتا

ایک تیسرا سوال بھی ہے جو زیادہ پیچیدہ ہے (ہندوستانی علم سنین (Chronology) کا تعین حسب ذیل بنیاد پر کیا گیا ہے (۱) جغرافیائی مولد جو ویدوں اور ان کے بعد کے ادب میں ملتا ہے (۲) علم ہیئت سے اخذ کیا ہوا مولد (۳) ایرانیوں کے شجرہ ہائے نسب اور (۴) روایتی شہادت۔

ارضی اور پہاڑی تبدیلیوں اور تغیرات کی بنا پر ایک جگہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ رگ ویدی تہذیب پانچ لاکھ سال سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ خود کو بھی اعتراف ہے کہ یہ دعویٰ "حیران کن معلوم ہوگا مگر سوائے اس کے چارہ بھی کیا ہے" سروتی (S, Rati) کی حد تک یہ بات صحیح ہے۔ یعنی یہ کہ جب لوگ کسی بات کو نسل در نسل سنتے اور دہراتے چلے جائیں تو وہ مسلمہ سی ہو جاتی ہے۔ یہ بتانا کہ یہ بات کسی تحریر سے بھی ثابت ہوتی ہے ممکن نہیں ویدک اور مابعد ویدک ادب میں تحریری سالیوں سلسلہ وار دستیاب ہوتا ہے (۱) وید۔ اور وید کی شکھائیں یعنی شاخیں، جن کی تعداد ایک ہزار دو سو بتلائی جاتی ہے لیکن اب تک صرف ایک درجن ہی ملی ہیں۔ (۲) برہمن (۳) آران یک (۴) اپنیشد (۵) سوتر (۶) چاروک اور کئی دوسرے نظاموں کے علاوہ فلسفہ کے چھ نظام (۷) رزمیہ داستانیں (۸) پران سرامانی (سادھوؤں کا ادب) کا تعلق غالباً پرانوں سے پہلے اور اپنیشدوں کے بعد کے دور سے رہا ہے لیکن سمرتیاں اور دھرم شاستر یعنی مجموعہ قوانین منو کے زمانے سے لے کر عہد وسطیٰ کے سارے دور میں پائے جاتے ہیں۔ منظوم منوسمرتی یا منو دھرم شاستر ممکن ہے بعد میں لکھی گئی ہوں لیکن منو دھرم کی روایت بہت قدیم ہے اور بعد کے تمام قوانین کی وہی بنیاد تصور کی جاتی ہے۔

اس ناقابل اندازہ ذخیرۂ ادب کے ارتقا کے دور بھی ظاہر ہے بڑے طویل رہے ہوں گے۔ اور کسی بھی حساب سے دہ ہزاروں سال سے کم نہ ہوں گے اس لیے ان کا صحیح حساب لگانا تقریباً ناممکن ہے چنانچہ اس بات کا احساس مغرب کے بعض صاحب فکر محققین کو بھی تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر جوالا پرشاد لے۔ سی۔ داس، تلک اور جیکوبی کی آرا کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ جو انہوں نے مفروضہ سنین سے متعلق ظاہر کی ہیں داس نے پانچ ہزار اور تلک اور جیکوبی نے چار تا پانچ ہزار قبل مسیح کو آریاؤں کے ادب و تہذیب کا زمانہ قرار دیا ہے۔ ویدک تہذیب اور اس سے پیدا ہونے والی بعد کی تہذیبوں کے بعض بنیادی تصورات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

الوہیت کا تصور

ویدوں کا علم رکھنے والے روشن ضمیر عالموں کا خیال تھا کہ ایک اولین اور اساسی روح یا حقیقت ایسی ہے جو سارے مظاہر علم کا سرچشمہ ہے۔ مگر اس حقیقت کو مکمل طور پر جاننا یا اس کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔

خدا اور انسان کی خصوصیات

یہ متحرک اور غیر متحرک لامحدود کائنات وجود الٰہی کے جلوہ سے منور ہے۔ دنیا سے بے نیاز رہ کر دنیا کی نعمتوں سے لطف حاصل کرو۔ دوسروں کی چیزوں پر للچائی ہوئی نظریں مت ڈالو۔ اس طرح سے تم سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکو گے۔

انسان کا اعلاترین نصب العین

عبادت اندھیرے سے اجالے کے لیے
جھوٹ سے سچائی کی طرف
موت سے حیات جاوداں پانے کے لیے۔

انسانی اخلاق کے اصول

کسی کو ایذا نہ پہنچانا، سچائی، دوسروں کی چیزوں کو غصب کرنے سے احتراز، پاک دامنی، حرص وطمع سے پرہیز، تزکیۂ جسم ونفس، قناعت، سادگی، مطالعہ، اپنی زندگی اور اعمال کو خدمت الٰہی کے لیے وقف کرنا۔

ہر چیز کو جانو پہچانو، ہر ذی حیات کو اپنی ذات کی طرح سمجھو اور ہر چیز میں اپنے کو ڈھونڈو یہی وہ گر ہے جس پر کاربند ہونے کے بعد تم کسی کو ناپسند نہیں کروگے اور نہ کسی کو دشمن سمجھوگے۔

انسانی سماج ایک فرد کے جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی طرح چار بنیادی خصوصیات رکھتا ہے یعنی تخلیق، تحفظ، خدمت گزاری اور دان۔ ان سب کی حیثیت مساوی ہے اور ان میں کسی کا مرتبہ اعلا یا ادنیٰ نہیں ہے۔

وید کے لحاظ سے سماجی وسیاسی تنظیم

وید کا معاشرہ چار حصوں یا نظاموں میں منقسم ایک بہت ہی منظم معاشرہ تھا۔ یہ تقسیم ذات کی بنا ء پر نہ تھی جیسا کہ غلطی سے سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ انسانوں کے فرائض اور ان کی صلاحیتوں کی بنا ء پر کی گئی تھی۔ سماجی نظام کی اکائی خاندان تھا۔ صدر خاندان صاحب اقتدار ہوتا اور اس کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ عورتوں کا بہت احترام ہوتا تھا، اور روحانی اور ذہنی اعتبار سے ترقی کرنے کے تمام دروازے ان پر کھلے ہوئے تھے۔ ہر فرد معاشرہ کو اپنی صلاحیت کے مطابق کسی بھی شعبۂ حیات میں آگے بڑھنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔ شادی فریقین کی مرضی اور چاہت کی بنا ء پر ہوتی، گو بزرگوں کی رہنمائی کا اس میں بالعموم دخل ہوتا تھا۔

آریہ لوگ تجارت اور بستیاں بسانے کی خاطر دور دراز ملکوں تک گئے چناں چہ آج بھی ان کی اولاد کئی مقامات پر پائی جاتی ہے وہ شہروں اور دیہات دونوں جگہ رہے۔ ان کے پاس خشکی اور سمندری راستوں کے ذرائع حمل ونقل اور رسل وترسیل بھی موجود تھے۔

ان کی چھوٹی بڑی حکومتیں تھیں جن پر کوئی راجہ حکومت کرتا تھا۔ جسے منتری مشورہ دیتے اور جس کے افعال پر دانشمند نظر رکھتے۔ انتظام کی غرض سے ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، قانون کا (ریت اور ستیہ کی بنیاد پر) بول بالا تھا۔ اگر کوئی حکمراں قانون کی خلاف ورزی کرتا تو اسے حکومت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

ہم مہابھارت کی لڑائی (اس سے متعلق رزمیہ کا ارتقاء اور اس کی ترتیب یقیناً بعد کا کارنامہ ہے) اور اس کے بعد کی بعض اہم تاریخوں سے چند نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

مہابھارت کی لڑائی

اٹھانے کے ارضیاتی اور فلکیاتی اندازے ڈی۔ ایس ترویدی، کونسٹ (Bjornestjeane)، کی تحقیقات (جس کا حوالہ آر۔ شرما نے اپنی ہندی تصنیف ویدک سمپتی میں دیا ہے) اور پہلی اورینٹیل کانفرنس منعقدہ پونا بابت ۱۹۲۰ء کی روئیداد کے لحاظ سے ۲ر۱/ ۳۱۰۰ قدیم جنگ مہابھارت کی تاریخ قرار پاتی ہے۔ روایتی طور پر بھی اسی تاریخ کو صحیح مانا جاتا ہے۔ اس کی تائید ابوالفضل کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

لیکن بعض دیگر محققین پرانوں میں مندرجہ خاندانی فہرست کی بناء پر جس کا تذکرہ میگاستھنیز نے بھی کیا ہے۔ ۱۴۰۰ ق م کو جنگ مہابھارت کی تاریخ بتلاتے ہیں۔ اگر جنگ مہابھارت کی تاریخ ۱۴۰۰ ق م مان لی جائے تو سارے سنہ واری تختہ کو جسے اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ۱۶۰۰ سال پیچھے لے جانا پڑے گا جس کی بناء پر گوتم بدھ کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۳ ق م قرار پائے گی۔

بہرحال قدیم تاریخ ہند کے سنین کا موضوع اتنا وسیع ہے اور اس پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس کی جانب ہم محض اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وادیٔ سندھ کا تمدن

اس تہذیب کی دریافت کا سہرا راکھل داس بنرجی کے سر ہے جس کے بیلچہ کی ضرب سے ایک وسیع علاقہ میں جو موہن جوداڑو (مردوں کا ٹیلہ) کہلاتا تھا بہت ہی قدیم سندھی تمدن کے آثار کا پتہ چلا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد دیا رام ساہنی اور پھر ایم۔ ایس واٹس نے پنجاب کے ضلع منٹگمری میں ہڑپا کے مقام پر ایسے ہی آثار دریافت کیے۔ پھر تھوڑا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یوپی میں گنگا کے کنارے اور گجرات میں سابرمتی کے دہانے پر اور نرمدا اور لوتھل کے قریب اسی تہذیب کی نشانیاں برآمد کی گئیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ اس تہذیب کا علاقہ بہت وسیع تھا معلوم نہیں نئی تحقیقات کے بعد اور کتنے علاقے منظر عام پر آئے۔ اس پوری تہذیب کو جو ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی وادیٔ سندھ کی تہذیب کا نام شاید اس لیے دیا گیا کہ اس کا پہلی بار سندھ میں پتہ چلا تھا۔ یہ تہذیب بنیادی طور پر شہری تھی۔ شہر کے مکانات پختہ اینٹوں سے ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق بنائے جاتے تھے جن میں حمام، باؤلیاں اور رہائشی کمرے وغیرہ ہوتے تھے۔ سڑکیں بہت وسیع اور کشادہ تھیں پانی کی نکاسی کا انتظام معقول تھا شہروں میں جا بجا عام حمام تھے۔ مورتیوں سے جو ادھر ادھر سے تیار ہوئی ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ خوش لباس تھے۔ خوب صورت دھاگے سے اپنے سر کے بال اور داڑھی سنوارتے تھے اور غالباً بعض دیوتاؤں کی جن کی نوعیت ابھی مابہ النزاع ہے، پرستش کیا کرتے تھے چوں کہ ان کے تجارتی تعلقات سمیر یا سے تھے اس لیے بعض محققوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دراوڑی تھے لیکن کچھ اسکالر ایسے بھی ہیں جو انھیں آریاؤں ہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ اب تک ان کی زبان کا پتہ نہیں لگایا جا سکا کیوں کہ ان کی مہروں پر جو تصویری اور صوتیاتی رسم خط کے نشان ملے ہیں وہ کافی پیچیدہ ہیں۔ ان کی گتھی کو ابھی تک سلجھایا نہیں جا سکا ہے۔ جہاں تک اس تہذیب کے زمانہ کا تعلق ہے ماہرین کی تازہ تحقیقات

سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چوں کہ سندھی رسم الخط' اہل میسوپوٹامیہ سے بین قومی تجارت میں ایک وسیلہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے اس تہذیب کو زیادہ سے زیادہ (۴۰۰۰ - ۳۷۰۰ ق م) کے درمیان رکھنا چاہیئے۔

اب ہم آثاری شہادت کی بناء پر ہندوستان کی ماقبل تاریخ اور مثل تاریخ تہذیبوں کے ارتقار کا مختصراً جائزہ لے سکتے ہیں۔ یہ شہادت قبل حجری' قدیم حجری عہد متاخر حجری تانبے' کانسے اور پھر لوہے کے آثار پر مشتمل ہے لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ سندھ وادی کے باشندے خالص سونے کا بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ سونے کا ذکر قدیم ویدک ادب میں بھی اکثر جگہ ملتا ہے۔

بہرکیف سندھ وادی کی تہذیب کے بارے میں یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اس کا زمانہ ہزاروں سال پر محیط رہا ہوگا اور یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ قدیم ترین باشندوں کی تہذیب ہوگی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں خصوصاً جنوبی' جنوب مشرقی اور مشرقی علاقوں میں اب بھی ایسے متعدد قدیم قبیلے ملتے ہیں جو جدید تہذیب کی روشنی سے ناآشنا ہیں۔

تاریخ ہندوستان

(ابتدائی دور)

(تقریباً ۵۰۰ ق م سے ۲۰۰ عیسوی تک)

سیاسی مہابھارت کے بعد ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ریکارڈ ہمیں پرانوں میں مندرج شاہی خاندانوں کے حالات کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ ساتویں صدی سے چوتھی صدی قبل مسیح کی تاریخ کے ابتدائی ماخذ بودھی اور جینی تصانیف میں ملتے ہیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس دور کے تاریخی واقعات کا سلسلہ غیر یقینی ہے اور ہم یہاں صرف امکانی ستون کا ہی حوالہ دے سکتے ہیں۔

ساتویں صدی کے آخر اور چھٹی صدی کی ابتدار میں مہاویر اور گوتم بدھ کے منظرِ عام پر آنے کے وقت شمالی ہند سولہ مہاجنپدوں میں منقسم تھا' جن میں سے شمال میں واقع کپل وستو اور کوشل کا شاکیہ خاندان مشرق میں مگدھ اور نربدا کے پرے اونتی (اجین) سب سے طاقت ور سلطنتیں تھیں بعض مہاجنپدین (ریاستیں) جمہوری طرز کی بھی تھیں۔ بدھ کے زمانے میں کوشل کا حاکم پرسنجت (پالی تصانیف کا پسینیدی) اپنے معلم اعظم گوتم بدھ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ وہ ان سے اکثر ملا کرتا تھا اگرچہ اس نے بدھ کی تعلیمات کو پوری طرح قبول نہیں کیا تھا' اس کے باوجود وہ شخصی اور عوامی مسائل میں بدھ سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ پرسنجت کو مگدھ کے راجا اجات شترو سے طویل لڑائی لڑنی پڑی جس میں مگدھ کے راجا کو شکست ہوئی۔ پھر بھی اس کا تاج اسے واپس کر دیا گیا۔ پرسنجت کو اس کے بیٹے نے تخت سے بے دخل کر دیا اور راج گدی کے پھاٹک کے قریب اس کا انتقال ہوگیا تھا جہاں وہ اجات شترو سے مدد حاصل کرنے گیا تھا۔

۶۰۰ ق م کے قریب مگدھ میں شیشوناگ نے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کا ایک وارث بمبسار (۵۴۳ - ۴۹۱ ق م) بدھ کا ہم عصر تھا۔ پہاڑی قلعہ گردی راج (گری بجاج) اس کی راجدھانی تھی۔ بمبسار کی بڑی رانی پرسنجت کی بہن کوشلا دیوی تھی۔ بمبسار نے جین مت اور بدھ مت دونوں کی سرپرستی کی۔ جب اسے حکومت کرتے ہوئے باون سال ہوگئے تو اس کا بیٹا اجات شترو' اسے قتل کرکے تخت پر قابض ہوگیا۔ کوشلا دیوی اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکی۔ اجات شترو نے ۳۲ سال تک حکومت کی۔

اجات شترو نے اپنے وزیر کی مدد سے جو پاٹلی پترا کا بانی بھی تھا' شمال میں ویشیالی کی ریاست واجین پر قبضہ کرلیا۔

اجات شترو کے جانشین اودیم کے بعد اس خاندان کو بہت جلد زوال آگیا۔ اس خانوادہ کی پرانک فہرست میں ان کے حکمرانوں کا سلسلہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: درسک ۲۵ یا ۳۵ برس' اودان ۳۳ برس' نندی وردھن ۴۰ یا ۴۲ برس' مہانندی ۴۳ برس' مہاپدما ۲۸ یا ۳۸ برس اس کے آٹھ لڑکے بارہ برس۔

سلطنت مگدھ کی توسیع

اجات شترو کے لڑکے اور جانشین اودان نے سون اور گنگا کے سنگم پر جسے اجات شترو نے پہلے ہی محصور کر دیا تھا کسم پورہ (پاٹلی پترا) نامی شہر بسایا۔ مشرق ہند کی تمام جمہوری ریاستوں اور سلطنتوں کو ضم کر لینے کے بعد مگدھیوں نے اونتی کی وسیع اور طاقت ور سلطنت کا رُخ کیا۔ اور بالآخر اسے بھی کوسامبی کی سلطنت کے ساتھ مگدھ کے دائرہ اقتدار میں شامل کرلیا۔ پرانوں میں شیشوناگ راجاؤں کو واضح طور پر کشتریہ بتلایا گیا ہے۔ لیکن چھٹے جانشین مہاپدما نندا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک شودر عورت سے شادی کرلی تھی اور جین روایت کے مطابق وہ ایک درباری کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ جس کا باپ ایک نائی تھا۔ اس کی تائید یونانی مصنف کرٹیکس کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ پہلے نندا راجا نے کوسالا اور کالنگا فتح کرکے اس سلطنت کو اور پھیلایا۔ کالنگا بعد میں آزاد ہوگیا۔ لیکن اشوک نے اسے دوبارہ فتح کرکے اپنے زیر اقتدار علاقوں میں شامل کرلیا۔ نندا کی فتوحات کی نشانیوں میں نااندر (نونند دھیرا) قابل ذکر ہے۔

آخری نندا راجا اپنی بے انتہا دولت کی وجہ سے دھن نندا کہلاتا تھا۔ اس نے اوزان اور پیمانہ جات کو معیاری بنانے کی کوشش کی کیوں کہ ہر جگہ مختلف پیمانوں کے استعمال کی وجہ سے ایک بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ یونانی سیاح اس راجا کے غیر معمولی وسائل اور بہت بڑی فوج کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے پاس بیس ہزار گھوڑے سوار' دو لاکھ پیادہ فوج' دو ہزار رتھ اور تین یا چار ہزار ہاتھی تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس راجا کا کردار بہت ہی گرا ہوا تھا۔ وہ ایک حجام کا بیٹا تھا جس نے اپنے

پیشرو کو قتل کر دیا۔ جب سکندر ہندوستان سے واپس ہوا ہے تو یہ راجا برسر اقتدار تھا۔

ہندوستان اور ایران

ہندوستان اور ایران کے درمیان تجارتی اور تہذیبی تعلقات زمانہ قدیم ہی سے قائم تھے۔ یونانی تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے خلاف پہلا حملہ شہنشاہ ایران سائرس (۵۵۸ - ۵۳۰ ق م) نے کیا تھا۔ میڈیا، لیڈیا اور یونان کی ایونی نوآبادیات کو زیر کرنے کے بعد سائرس (کورش) نے وسط ایشیا، یعنی ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے ہندوکش اور بحر خزر کے درمیان علاقہ کا رخ کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کی حدود ایری تھریسین (بحر ہند) سمندر تک وسیع کر لیے اور بکتریوں اور ہندوستانیوں پر اپنا سکہ جمایا اس نے ایک ہندوستانی بادشاہ کے سفیر کو بھی شرف ملاقات بخشا۔ یہ بادشاہ سائرس کی بالادستی کو تسلیم کرتا تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے گدروسیہ (بلوچستان) کے راستہ ہندوستان کے خلاف بھی ایک مہم بھیجی تھی جسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ خود سائرس صرف سات آدمیوں کے ساتھ فرار ہوسکا۔ تاہم وہ سندھ اور کابل کے درمیان کے تمام قبیلوں کو اپنا مطیع اور باجگزار بنانے میں کامیاب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مہم کے دوران کابل کے شمال میں واقع کپیسہ شہر کو تاخت وتاراج کر دیا تھا۔

سائرس کے پوتے اور اس خانوادہ کے تیسرے حکمراں دارا اوّل نے شمال مغربی ہند کو فتح کیا۔ ہندوستانی "ست رپی" بھی اس کی وسیع سلطنت کے بیس ست رپیوں میں سے ایک تھا اور سب سے زیادہ آباد ہونے کی وجہ سے دس لاکھ پونڈ اسٹرلنگ یا ایک کروڑ اسّی لاکھ روپیہ (موجودہ حساب سے) خراج ادا کیا کرتا تھا۔ بحری راستہ دریافت کرنے کی غرض سے اس نے اپنے امیر البحر کو دریائے سندھ کے دہانے تک بھیجا۔ بعد میں اس نے خود ایک مہم کی سپہ سالاری کی اور گندارہیہ (شمال مغربی پنجاب) کے علاقہ کو (جو اب چارسدہ اور ایبٹ آباد کے ضلعوں پر مشتمل ہے) فتح کر کے سمندر تک سارے سندھ پر قبضہ کر لیا۔

ایرانی فتح کے اثرات

یونانی توزک سین کو یونان کے خلاف اپنی مہم (۴۸۶ - ۴۵۶ ق م) میں پسپا ہونا پڑا تاہم ایرانی اقتدار دو صدیوں تک قائم رہا۔ یونان پر حملہ کرنے والی ایرانی فوج میں ہندوستان کی گھوڑے سوار اور پیادہ فوج بھی شریک تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے ابتدا میں ایرانی دربار کے ٹیسیاس کی تصنیف 'انڈیا' کے مطابق ایران اور ہندوستان کے درمیان تعلقات بلا روک ٹوک قائم تھے۔ یہاں تک کہ جنگ اربیلا (۳۳۰ ق م) میں بھی جہاں سکندر کے ہاتھوں دارا سوم نے شکست کھائی، ایرانی فوج کی طرف سے کئی ہندوستانی سپاہیوں نے حصہ لیا تھا۔ درکوشیا کے ست رپی نے جو فوج فراہم کی تھی اس میں بھی ہندوستانی ہاتھیوں کا ایک دستہ شامل تھا۔

ہندوستانی سرزمین پر ایران کے جو طلائی اور نقرئی سکے بڑی تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں اس سے اسی بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بحری ایری تھریسین (ہند) میں اسکائی لیگز کے بحری سفر (پیری فس) کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو کافی فروغ ہوا۔ خروشطی رسم خط جو شمال مغرب میں رائج تھا اور جو دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا تھا غالباً ایرانی حکومت ہی کی ایک نشانی تھا۔ ایونیا کے لیے یونانی اصطلاح جو ساتویں صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں مستعمل تھی پانینی کی قواعد "اشٹد هیائی" میں بھی موجود ہے۔

سکندر کا ہندوستان پہ حملہ

نندا راجاؤں کی مگدھ سلطنت کی سرحد پر واقع سندھ اور بیاس کا درمیانی علاقہ، کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جو آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار رہا کرتی تھیں۔ مئی ۳۲۶ ق م میں دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد سکندر کو جس پہلی ہندوستانی ریاست سے سابقہ پڑا وہ (موجودہ راولپنڈی کے بارہ میل جنوب میں واقع) ٹکسیلا (تخش، شیلا) تھی۔ یہ ریاست تہذیب و علوم کا ایک قدیم مرکز تھی۔ اس کی شہرت کی وجہ سے دور دراز کے لوگ "ویدوں اور اٹھارہ علوم" کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آتے تھے۔ اس وقت تک یہاں کی آبادی میں کافی اختلاط پیدا ہو چکا تھا جس میں زیادہ حصہ ایرانی تھا اور اس بنا پر یہاں کے باشندوں نے متعدد ایرانی رسم و رواج اپنا لیے تھے۔

اس علاقہ میں برہمی احیا کے اثرات کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ وہاں کی آبادی میں بدھ مت کے ماننے والوں کی موجودگی کی وجہ سے پنجاب کو بعد میں ناپاک علاقہ سمجھا جانے لگا تھا۔

ٹکسیلا کی سلطنت سندھ سے جہلم (ہیڈسس پس) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد پوروا (یونانیوں کا پورس) کی ریاست کا درجہ تھا، یہاں کے راجا نے راوی (ہیدراسیس) تک کے تمام کشتریوں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا اور ابشی سارا (ہزارہ) کے حاکم سے دوستانہ مراسم قائم کر لیے تھے۔ دیگر کئی چھوٹی ریاستوں میں جنوبی پنجاب کی مالائی (مالواس) اور اگزی دراکوئی (کشدرکا) قابل ذکر ہیں۔

جب سکندر فروری ۳۲۶ ق م میں اٹک کے مقام سے دس میل دوراند (او ہند قدیم ادبھاتیور) میں کشتیوں سے بنائے ہوئے ایک پل کے ذریعہ دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا تو ٹکسیلا کا راجا خوف زدہ ہو گیا اس نے اس اندیشہ سے کہ سکندر اس پر حملہ نہ کر دے اپنے بیٹے امبھی کو اراکوشیا روانہ کیا تاکہ وہ سکندر سے مل کر دوستانہ مراسم پیدا کرے۔ دونوں جانب سے تحفے تحائف کا تبادلہ عمل میں آیا اور سکندر نے امبھی کی دعوت قبول کر لی۔ اور چند دنوں کے لیے اس کا مہمان رہا۔ اسی زمانے میں سکندر کو معلوم ہوا کہ کچھ سادھو تپتے ہوئے سورج کی تمازت میں ایک پہاڑی پر دراز گیان دھیان میں مصروف ہیں۔ سکندر نے اپنے ایک آدمی، اونی سی کریٹس کو ان کے پاس روانہ کیا اور ان سے ملنے کی خواہش کی۔ لیکن سادھوؤں نے صاف جواب دے دیا کہ وہ ان کے علم و بصیرت کو جاننے کا اہل نہیں ہے۔

اس دوران راجا پوروا (پورس) کو سکندر کے جارحانہ عزائم کا پتہ

چل گیا اور اس نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے تیاری شروع کردی۔ راجا ایک بڑی فوج رکھتا تھا جس میں پیادہ سپاہی، گھوڑ سوار، رتھ اور ہاتھی سب ہی تھے۔ لڑائی میں جو جھیلم کے کنارے لڑی گئی پارو نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا لیکن دشمن کی بہادری سے نہیں بلکہ ترکیب و حکمت کے آگے اسے شکست کھانی پڑی۔ جب پارو کو قیدی بنا کر سکندر کے سامنے پیش کیا گیا تو سکندر کے سوال پر راجہ نے شاہانہ وقار کے انداز سے مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونا چاہیے جیسا بادشاہ کو بادشاہ کے ساتھ زیب دیتا ہے۔

فراخ دل فاتح اپنے مفتوح دشمن کے حوصلہ مند جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے پورس کی جانب نہ صرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا بلکہ اس کی سلطنت بھی واپس کردی جس میں بالآخر کچھ دوسرے علاقے بھی شامل کردیے گئے اس کے بعد سکندر نے چناب (اکی سیناس) اور راوی (ہائڈرو آتش) کو عبور کیا اور راستہ کے چھوٹے موٹے راجاؤں کو شکست دیتے ہوئے بیاس (ہائیفاسس) تک پہنچ گیا۔ یہاں سکندر کے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ انھیں خبر ملی تھی کہ بیاس کے اس پار ایک طاقت ور حکمراں ایسا ہے کہ جس کی فوج یونانی فوج سے بڑھ کر ہے۔ انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھیں گھر سے نکلے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا اور انھیں گھر کی فکر اور یاد ستا رہی تھی۔ چناں چہ سکندر کو لامحالہ واپس ہونا پڑا۔ سکندر نے پارو کو جہلم سے بیاس تک کے علاقہ کا گورنر مقرر کردیا۔ دریائے سندھ اور جہلم سے واپسی کے دوران اس کا مقابلہ بہادر سیبوس اور اگرا سینس سے ہوا جنھیں بالآخر شکست کھانی پڑی۔ لیکن ایک شہر کے سارے باشندوں نے جن کی تعداد ۲۰ ہزار سے کم نہ تھی بے عزتی پر موت کو ترجیح دی اور اپنے گھروں کو آگ لگا کر تمام مرد، عورتیں اور بچے اس میں کود پڑے۔ تاریخ میں "جوہر" کی یہ پہلی مثال ہے۔ حملہ آور کو مالواسس اور شدرکاسش کی سخت مزاحمت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس میں وہ خود زخمی ہوگیا تاہم سکندر نے ان پر غلبہ پالیا اور بہت سا مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ سندھ کی وادی میں تین ست رپیوں کو مقرر کرکے وہ واپس ہو رہا تھا کہ جون ۳۲۳ ق م میں بابل کے مقام پر اس کا انتقال ہوگیا۔

مقدونیائی حملہ کے اثرات زیادہ دنوں تک باقی نہ رہے اور ۳۱۷ ق م تک یونانی اقتدار کی تمام نشانیاں مٹ گئیں اور موریائی سلطنت نے اس کی جگہ لے لی۔

سماجی اور تہذیبی حالات

بدھ مت اور جین مت

ساتویں اور چھٹی صدی ق م میں عوام بے معنی اور مخرب اخلاق رسوم پرستی کے خلاف، جسے پجاریوں کے طبقہ نے فروغ دیا تھا، بیزاری کا اظہار کرنے لگے تھے، ہندو سماج کی اصلاح کا جذبہ عام ہو رہا تھا۔ اس ردعمل کی ایک اہم وجہ تو بے بس جانوروں کی قربانی تھی۔ جو مذہب کے نام پر کی جاتی تھی اس کے علاوہ شراب نوشی جیسی برائیاں عام تھیں جنھیں خود غرض اور بد اخلاق براہمن، پنڈتوں نے جو سماج کے تمام طبقوں کے اخلاق کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے تھے جائز قرار دے دیا تھا۔

معاشرہ جن برائیوں میں مبتلا تھا ان کے خلاف دو طرح کا ردعمل ہوا۔ ایک تو اپنیشد کے افکار جن کے ذریعہ ویدوں کے عالمانہ تصورات اور اخلاقی تعلیمات کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بدھ اور جینی نیز کمی اور چھوٹی بڑی اصلاحی تحریکیں تھیں جو رسم پرستی کے مذموم اثرات کے خلاف برسرپیکار تھیں۔ ان تحریکوں کا منشا یہ تھا کہ ہر فرد اخلاقی اصولوں کی سخت پابندی کرے۔ جین مہاویر اور بدھ نے جو ان تحریکوں کے روح رواں تھے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی نئے مذہب یا عقیدہ کا پرچار کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ لوگوں کو قدیم سچائیوں ہی کی جانب توجہ دلاتے رہے جنھیں پوجا پاٹ کی بے معنی اور کھوکھلی رسومات کی وجہ سے بھلا دیا گیا تھا۔

جین مت اور بدھ مت دونوں کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں۔ وہ جس نصب العین یا مثالی زندگی کی تعلیم دے رہے تھے وہ اپنیشد اور ویدوں کی تعلیمات سے الگ نہیں تھی۔ وہ کسی خالق پر ایمان رکھنے سے زیادہ تزکیۂ نفس کو نجات کا صحیح راستہ مانتے تھے۔ جین مت کے دو سب سے زیادہ مشہور رہنما پرشوا ناتھ اور مہاویر نے یوگ کے بتلائے ہوئے اخلاقی اصولوں کو دوبارہ زندہ کیا۔ یہ اصول ہندو فلسفہ کے چھ نظاموں میں سے ایک پر مشتمل ہیں۔ چار بنیادی یما دن (اخلاقی فرائض) یعنی اہنسا (کسی کو ایذا نہ پہنچانا) ستیہ (سچائی) استیہ (چوری یا غیر قانونی طور پر دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کرنا) اور اپری گرہا (دھن دولت سے بے نیازی) ہیں جن پر عمل کرنے کی ہدایت پرشوا ناتھ نے دی تھی، مہاویر نے ایک پانچویں فرض یعنی برہماچاریہ (پرہیزگاری) کا اضافہ کیا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک براہمن پری ورجک (سادھو) اور ایک جین راہب کے فرائض میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا تھا۔ خواہشاتِ نفسانی کو مارنا، ترک دنیا کرنا، جسم و ذہن کو پاک رکھنا اور شہروں اور بستیوں سے دور رہ کر بھکشا پر گزر بسر کرنا دونوں کے فرائض میں داخل تھا۔

جین بزرگوں کی روایات

جینیوں کا عقیدہ ہے کہ بیسویں اور آخری تیرتھانکر مہاویر سے پہلے جو تیئیس دوسرے تیرتھانکر گزرے ہیں وہ وشنو کے چوبیس آرتیہ رس (اوتار) اور بودھوں کے چوبیس بودھی ستواوں کا جواب (Counlerpast) تھے۔ لیکن یہ سب بعد کی تاویلات ہیں۔ مہاویر کے پیشرو پرشوا ناتھ تھے۔ جن کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ مہاویر سدھارتھ نامی گنا ترک خاندان کے ایک چھوٹی امیر کے بیٹے تھے۔ جو ویشالی سلطنت میں واقع کند گرم کے رہنے والے تھے۔ مہاویر کا اصلی نام وردھمان تھا۔ انھوں نے یشودا سے شادی کی تھی۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی۔ مہاویر نے تیس برس تک خانگی گھریلو زندگی گزاری۔ ان کے داماد، جملی، جین مذہب کے فرقہ کے پہلے رہنما بنے۔

جین عقائد

جینی اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جہات ہر شے میں ہے۔ جو اشیاء بظاہر بے جان معلوم

ہوتی ہیں وہ بھی روح رکھتی ہیں۔ بیشتر دوسرے مذاہب کے برعکس جین مت میں خدا کا تصور نہیں ہے۔ ہر روح کو اپنے کرموں (اعمال) کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں اور کئی جنموں کے بعد ان سے مکتی حاصل ہوتی ہے۔ ارتفاع ذات کے اعلیٰ تر مدارج تک پہنچنا زندگی کا مقصد ہے اس لیے اس میں شدید قسم کی رہبانیت پر زور دیا جاتا ہے اس سلسلہ میں بدھ مت اور جین مت میں یہ فرق ہے کہ بدھ مت "درمیانی راستہ" کی تلقین کرتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد جین مت دو فرقوں میں بٹ گیا جن میں سے ایک ڈگمبری (فضا پوش یعنی وہ جو کپڑوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دوسرا سویتمبری (جسے سفید پوش کی اجازت ہے) کہلاتا ہے۔ آگے چل کر یہ دونوں ذیلی فرقوں میں بٹ گئے۔ جین مت کے ماننے والوں میں بالآخر چھوت چھات، دھن دولت کی چاہت، پجاریوں کا اقتدار اور مورتی پوجا داخل ہوگئی۔ یہ مذہب ہندوستان کے باہر نہ پھیل سکا۔ اس کے برخلاف بدھ مت کے پرچارک سارے ایشیا میں بلکہ ایشیا سے باہر مشرقی یورپ اور مصر تک پہنچ گئے تھے۔

بدھ مت ایک قدیم روایت کے مطابق سدھارتھ (گوتم بدھ کا پہلا نام) کا جنم ۶۲۳ ق م میں ہوا لیکن عام طور سے ۵۶۷ ق م کو ہی ان کی پیدائش کا سنہ مانا جاتا ہے۔ ان کے باپ شدھودن شاکھیہ قبیلہ کے ایک طاقت ور راجا تھے اور نیپال کے جنوبی علاقے ترائی میں حکومت کرتے تھے۔ بچپن ہی سے ان میں عظمت کی علامات پائی جاتی تھیں۔ جس عیش و آرام کے ماحول میں سدھارتھ کی پرورش ہوئی تھی اس سے وہ خوش نہیں تھے۔ ان کے اس رجحان سے گھبرا کر ان کے باپ نے کم عمری ہی میں ان کی شادی کر دی ان کے ایک لڑکا ہوا جن کا نام راہل تھا۔ راجہ شدھودن نے اس کا التزام کیا کہ سدھارتھ شاہی محل ہی میں رہیں اور انھیں زندگی کے تاریک پہلوؤں، اس کی مصیبتوں، غموں اور تکلیفوں کی آہٹ بھی نہ ملے۔ لیکن وہ محل میں مقید نہ رہ سکے۔ شاہی محل سے باہر نکلے تو آلام و مصائب، بیماری اور موت کو دیکھ کر ان کی حساس طبیعت اس قدر متاثر ہوئی کہ انھوں نے ایک دن یکایک اپنی شاہانہ زندگی کو تیاگ دینے کا ارادہ کر لیا اور حیات انسانی کے مصائب کے دائمی حل کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایک عرصہ تک مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ تیاگ سے وہ نجات حاصل نہیں ہوتی جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس کے بعد جب وہ گیا کے قریب ایک پیپل کے درخت کے نیچے مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے انھیں عرفان حاصل ہوا اور وہ بدھ (روشن ضمیر اور بصیرت یافتہ) بن گئے۔)

آلام حیات سے نجات پانے کا جب انھیں صحیح حل معلوم ہوگیا تو وہ اس کو عام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گوتم بدھ نے پہلا خطبہ بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر شہر گدوا (ہرنوں کا جنگل) میں دیا۔ اس کے بعد بقیہ زندگی وہ جگہ جگہ (مشرقی یوپی اور بہار کے علاقوں میں) جاکر اپنے مت کی تلقین کرتے رہے۔ وہ جہاں بھی جاتے امیر و غریب سب ہی ان کی عزت کرتے۔ ان کے قدردانوں میں ایک مالدار تاجر اناتھ پنڈ

اور ایک وشواوشیا امیتہ پالی بھی تھی۔ زندگی کے آخری دن انھوں نے کشی نگر کے قریب ایک جنگل میں گزارے۔ کشی نگر موجودہ اترپردیش کے مشرقی ضلع دیوریا کی تحصیل کنیا میں واقع ہے اور وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔

ان کے بستر مرگ کے قریب جو چیلے اور بزرگ جمع تھے انھوں نے عہد کیا کہ انسانیت کی بھلائی کے لیے بدھ کے پیغام کو پھیلانے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات بدھ کو جو عرفان حاصل ہوا اس کا نچوڑ انھوں نے چار اعلیٰ حقیقتوں (چتش، آریہ، ستیانی) کی شکل میں پیش کیا یعنی (۱) زندگی سراسر دکھ ہے، (۲) خواہش اس کا سبب ہے (۳) خواہشات کو مارنے سے ہی دکھ کا خاتمہ ہے (۴) خواہشات کو ختم کرنے کے آٹھ راستے (اشٹنگ مارگ) ہیں جو صحیح عقیدہ، صحیح خیال، صحیح قول، صحیح عمل، صحیح ذریعہ معاشں، صحیح جدو جہد، صحیح ذہن اور صحیح دھیان پر مشتمل ہیں۔ یہی وہ درمیانی راستہ ہے جو انتہائی رہبانیت اور عیش کوشی کے بین بین پیش کیا گیا ہے۔

جدید تحقیقات سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ بدھ کی اصلی تعلیمات اپنیشد کے خیالات سے بہت قریب، مثبت اور تعمیری نوعیت کی تھیں۔ جنھیں عوام کی خاطر سہل اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا۔ بدھ نے روح (آتما) کو اس کی اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں حیثیتوں سے تسلیم کیا تھا۔ ان کی تعلیم تھی کہ انسانی زندگی کا اہم ترین مقصد اعلیٰ عناصر کو فروغ دینا ہے تاکہ نفرت اور حرص و طمع جیسے ادنیٰ جذبات کا خاتمہ ہو سکے۔ اسی کو وہ نروان یا نجات کا نام دیتے تھے۔ معلم اعظم کی وفات کے بعد ان کے پیرووں نے جو بھکشو کہلاتے ہیں سنگھ منظم کیے اور وہ ان سنگھوں کے ذریعہ مختلف مقامات میں بدھ مت کی تعلیمات کا پرچار کرتے رہے۔

شرمان کے بعد کی سیاسی تاریخ

ماخذ— سکندر کے حملے کے بعد کے دور کے متعلق ہمیں کافی مواد دستیاب ہوتا ہے مثلاً (۱) سب سے اہم بیان تو میگاستھنیز کا ہے جو اس وقت زندگی اور سماج کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔ (۲) کوٹلیا کی تصنیف "ارتھ شاستر" سیاسیات، نظم و نسق، رسم و رواج، عقائد، اور دیوانی و فوجداری کے قوانین، سیاسی تدبر اور فن حکمرانی وغیرہ سے متعلق اہم ترین دستاویز ہے (۳) جینی اور بودھی تصانیف (۴) پُران (۵) وشاکھ دتہ کا لکھا ہوا ناٹک "مدرا راکشا" یہ تصنیف گو بعد کی ہے تاہم اس سے چندرگپت موریا کے دور پر کافی روشنی پڑتی ہے اور (۶) قدیم آثار۔

چندرگپت موریا
(۳۲۲–۲۹۸ ق م)
یہ خیال ہے کہ چندرگپت موریا ایک شودر عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اب تاریخی دلائل کی روشنی میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق چھتری (کشتر) خاندان سے تھا۔ اور وہ سکندر کے حملہ کے وقت پنجاب میں موجود تھا۔ یہاں اس کی ملاقات "ارتھ شاستر"

کے مشہور مصنف چانکیا (کوٹلیا) سے ہوئی تھی ۔ جو مغرور نندا راجا سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ راجا اپنے ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کافی بدنام تھا۔ غرض چندر گپت اور چانکیہ نندا کے خلاف متحد ہوگئے۔ پہلے انھوں نے ایک چھوٹی سی فوج تیار کرکے یونانیوں کو ہندوستان کے شمال مغرب سے پرے ڈھکیل دیا اور پھر نیپال سے ساز باز کرکے نندا حکمراں کی گدی پر قبضہ کرلیا۔

موریا خاندان کا یہ سپاہی چانکیہ کے توڑ جوڑ سے فائدہ اٹھا کر ۳۲۲ ق م میں مگدھ سلطنت کا مالک بن گیا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد چندر گپت نے یونانی سردار سیلوکس کے خلاف کارروائی شروع کی جو بابل باختریا اور افغانستان کا خود مختار حاکم بن گیا تھا۔ اس لڑائی میں سیلوکس کو شکست ہوئی۔ اور سیلوکس نے موریائی فاتح کی خدمت میں بطور نذرانہ اپنی بیٹی پیش کی۔ چندر گپت نے بھی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور پانچ سو ہاتھی سیلوکس کو تحفتاً روانہ کیے۔ اس فتح کی وجہ سے سلطنت مگدھ کی سرحد ہندوکش سے آگے تک وسیع ہوگئی۔ اور بنگال سے لے کر شمال مغرب میں سارا افغانستان اور بلوچستان کا علاقہ اور مغرب میں سمندر تک علاقہ موریا سلطنت کے زیر نگیں آگیا۔ چندر گپت کا دور حکومت چوبیس سال تک رہا۔ اپنے آخری زمانے میں اس نے جین مت قبول کرلیا تھا اور اس نے ۲۹۸ ق م میں ایک جین سادھو کی طرح فاقہ کشی کرتے ہوئے وفات پائی۔

موریائی نظم ونسق

میگاستھنیز نے چندر گپت کی حکومت سے متعلق تفصیلی حالات بیان کیے ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق حکومت کا اعلیٰ ترین سربراہ بادشاہ تھا۔ وہ مجلس وزراء (منتری پریشد) کے ذریعہ نظم ونسق کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ساری سلطنت چار صوبوں میں منقسم تھی۔ شہروں کا بلدی انتظام چھ مجالس کے ذمہ تھا جن میں سے ہر مجلس پانچ ارکان پر مشتمل ہوتی تھی۔ دیہی پنچایتیں دیہاتوں کا نظم ونسق چلاتی تھیں۔ جن کا صدر گرامنی کہلاتا تھا۔ چندر گپت ایک اعلیٰ سپاہی، ماہر نظم ونسق اور مدبر تھا۔ چانکیہ جیسے شاطر سیاستداں کی رہنمائی میں اس نے نندا سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا اور تقریباً سارے شمال میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی جس کی سرحدیں ایران سے ملتی تھیں۔

چندر گپت کے جانشین

چندر گپت کے لڑکے اور جانشین بندوسار نے موریا سلطنت کو جنوب میں دریائے چنار تک وسعت دی۔ اس نے مفتوحہ علاقہ سے ایک نئے صوبہ کی تشکیل کی جس کا صدر مقام سورنہ گری تھا۔ سیلوکس کے جانشین اینٹوچس سے اس نے سیاسی تعلقات قائم کرلیے تھے۔ اس کے علاقہ سے خشک میوہ، شراب وغیرہ درآمد کی جاتی تھی۔ بندوسار نے ۲۷۳ ق م تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا اشوک تخت پر بیٹھا۔

اشوک (۲۷۳-۲۳۶ ق م)

گدی پر بیٹھنے سے پہلے اشوک کو شمال اور مغرب میں لڑائی کا اور اجین کے صوبیدار کی حیثیت سے انتظام کا تجربہ حاصل ہوچکا تھا۔

اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں اس نے ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے شہرت پائی لیکن کالنگا پر حملہ کے بعد جس میں زبردست خونریزی ہوئی تھی، لوگوں کے مصائب اور تکالیف سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آئندہ جنگ نہ کرنے کا عہد کرلیا۔ اس نے بدھ مت کے اثرات قبول کرلیے رحمدلی اور پرہیزگاری اس کا شعار بن گئی۔ سری لنکا کی تصانیف میں بیان کردہ یہ قصہ کہ اس نے اپنے بھائیوں کا قتل کیا تھا من گھڑت معلوم ہوتا ہے اس کا مقصد شاید یہ ظاہر کرنا ہو کہ بدھ مت نے کس طرح ایک جلاد اور بے رحم شخص کو مجسم رحم وکرم میں تبدیل کردیا تھا۔ اشوک کو دیوانم پیا (خدا کا پیارا) کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اشوک کی رسم تاج پوشی اس کے گدی پر بیٹھنے کے چار سال بعد ۲۶۹ ق م میں منائی گئی۔ ۲۶۱ ق م کی جنگ کالنگا کے بعد وہ خونریزی سے بالکل تائب ہوگیا۔ یہاں تک کہ شاہی مذبح کے لیے جانوروں کے ذبح کرنے کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بودھی سنگھ کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے بدھ مت کی تعلیم کو پھیلانے میں وہ ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ چنانچہ اس نے بدھ مت کے اخلاقی اصولوں کو سلطنت کے طول وعرض میں مختلف مقامات مثلاً شمال میں کالسی اور شاہباز گڑھی (ضلع پشاور) شمال مغرب میں جان گڑھ (اڑیسہ) برہما گڑھی سدھاپور اور جتنگ رامیشور (ضلع چتلدرگ میسور) میں کتبات کی شکل میں چٹانوں پر نقش کروایا۔ ان کے علاوہ کئی مقامات پر پتھروں کے لاٹ نصب کرائے جس پر اس کے فرامین درج کیے گئے۔ لیکن جنوبی ہند میں اب ایسا کوئی ستون نہیں ملتا۔ کیوں کہ شیوائی براہمنوں نے انہیں توڑ کر یا تو ان کے شیولنگ بنا ڈالے یا پھر انہیں تالابوں اور کنوؤں میں پھینک دیا۔ دھرم کے اصولوں کی تبلیغ اور ان کی پابندی کرانے کی غرض سے اشوک نے دھرم مہاماترا (مذہبی عہدیدار) مقرر کیے اور بدھ کے پیام کو پھیلانے کے لیے پڑوس کے ملکوں میں اپنے مبلغ روانہ کیے۔ اشوک کے فرامین سے اس کے مذہب اور مذہبی تعلیمات کے علاوہ انتظامی اصلاحات اور داخلی وخارجی حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے۔ اشوک کو اس کا بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس نے کشمیر میں سری نگر اور نیپال میں دیوپٹن کی بنیاد ڈالی اور پتھر کے ستونوں اور استوپاؤں پر اپنے احکام کندہ کرائے۔

اشوک کے ستون اپنی خوبصورتی، چمک دمک اور حسن کارانہ مہارت میں ساری دنیا میں بے مثال تصور کیے جاتے ہیں۔

اشوک نہ صرف ایک بہت بڑی سلطنت کا حاکم تھا بلکہ رحمدلی اور انسانیت دوستی کے لحاظ سے بھی اس کا دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے بقول ایچ۔ جی۔ ویلز۔ ان ہزاروں بادشاہوں میں جن کا تذکرہ تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے۔ اشوک کا نام سب سے الگ ایک روشن ستارے کی مانند چمکتا ہے۔ والگا سے جاپان تک آج بھی اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ عوام کے دل کو نیکی اور پارسائی کے ذریعہ فتح کرنا چاہتا تھا۔ یہی اس کا مقصد حیات تھا اس کی نجی زندگی ایک راہب اور ولی کی زندگی تھی۔ تاہم وہ نہ تو خدمت خلق اور انتظامی ذمہ داریوں سے غافل تھا اور نہ اپنی رعایا کی بہبودی اور خوش حالی سے بے خبر۔"

اشوک کے جانشین

اشوک کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے اور آخری موریا بادشاہ برہد رتھ کو تو اس کے برہمن وزیر پشیامتر نے دھوکے سے قتل کر دیا اور خود اس کی گدی پر قابض ہوگیا۔ اس طرح ۱۸۴ ق م میں موریا خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ پشیامتر کے غاصبانہ قبضہ کے بعد برہمنیت کا دوبارہ احیاء ہوا۔ پجاریوں کا طبقہ اشوک کی مقبولِ عام اخلاقی تعلیمات کو کس طرح برداشت کرسکتا تھا کیونکہ یہ تعلیمات اس طبقہ کی حیوانی خواہشات، رسوم و رواج اور جانوروں کی قربانی پر سب سے زیادہ کاری ضرب لگاتی تھیں۔ اس معاملہ میں پشیامتر خود پیش پیش تھا۔ پشیامتر کے برسرِ اقتدار آنے سے جس خاندان کی ابتدا ہوئی وہ شنگ کہلاتا ہے (شنگ کے معنی سنسکرت میں بڑ یا انجیر کے درخت کے بیج کے ہیں۔)

شنگ کنوا اور آندھرا ریاستیں

شنگ خاندان کے جس کا بانی پشیامتر تھا، دس حکمران گزرے ہیں۔ موریا سلطنت کا سرحدی علاقہ جو پنجاب راجپوتانہ اور شمال مغربی ہند پر مشتمل تھا۔ میں خود مختار ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ نرمدا کے جنوب میں آندھرا خاندان آزاد ہوگیا تھا۔ اور مشرقی ہند میں کالنگا اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں پر چیڈی بادشاہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے پشیامتر کی حکومت موریا سلطنت کے بچے کھچے حصوں تک ہی محدود رہی۔

پشیامتر کو اپنے دشمنوں کے خلاف، جو اس کی سلطنت کو گھیرے ہوئے تھے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ کابل اور پنجاب کا یونانی بادشاہ میناندر متھرا (ملندا) اجودھیا (ساکیت) اور جنوب میں مدھیہ میکا ناگری (چتوڑ سے قریب) پر قبضہ کر چکا تھا اور پاٹلی پترا پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ لیکن پشیامتر نے ان علاقوں کے راجاؤں کو شکست دے کر اپنے زیرِ نگیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں پشیامتر کے پوتے واسومتر نے دریائے سندھ کے کنارے ایک فیصلہ کن لڑائی میں یونانیوں کو شکست دی اور انہیں شمال مغربی سرحدوں کے پرے ڈھکیل دیا۔ ایک اور راجا جسے پشیامتر کے بیٹے اگنی نے شکست دی، ودربھا کا راجہ تھا جو شنگ سلطنت کی برتری کو نہیں مانتا تھا۔ اس راجا کو نہ صرف شنگ اقتدار کو تسلیم کرنا پڑا بلکہ اپنی ریاست کے ایک بڑے علاقہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

لیکن کالنگا کے کھارویل بادشاہ نے مگدھ پر کئی حملے کیے اور بہت سارا مالِ غنیمت اپنے ساتھ لے گیا جس میں وہ جین مورتی بھی تھی جسے نندا راجا کالنگا سے اٹھا لایا تھا۔

برہمنیت کا احیاء

پشیامتر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد برہمنیت کا پورے زور شور کے ساتھ احیاء ہوا اور ساتھ ہی بدھ مت کا زوال شروع ہوا۔ بدھ مت کے زوال کے اسباب سے کسی اور جگہ بحث کی جائے گی۔ پشیامتر نے چکرورتی اور مہاراج ادھیراج کے خطاب کو منوانے کی غرض سے اپنے گھوڑے کو سارے ملک میں دوڑا دیا اور اس طرح اشومیدھ کی رسم کو دوبارہ زندہ کیا۔ بدھ مذہب کے پیروؤں کے ساتھ اس کے ناروا اور ظالمانہ سلوک کے قصّے گو مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس نے بودھی خانقاہوں کو تباہ کیا تھا اور بودھی بھکشوؤں کی زندگی دوبھر کر دی تھی۔ بودھ مت کو مٹانے کے سلسلے میں اسے بعض حلقوں میں سراہا بھی گیا ہے۔

پشیامتر کے جانشین

پشیامتر نے ۳۶ برس تک حکومت کی۔ اس کا بیٹا اگنی متر جب تخت پر بیٹھا، تو کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کا دورِ حکومت صرف آٹھ سال تک رہا۔ اپنے باپ کے عہدِ حکومت میں وہ ودیشا (بھیلسا) کا صوبیدار تھا۔ کالیداس نے اپنے ناٹک "مالویکا۔ اگنی متر" میں اسے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ مالویکا ودربھا کی ایک شہزادی تھی جو بھیس بدل کر اگنی متر کے محل میں رہا کرتی تھی۔ اس شہزادی سے اگنی متر کی داستانِ محبت کو کالیداس نے اپنے ناٹک میں پیش کیا ہے۔ ناٹک میں ودیشا اور ودربھا کے درمیان ایک لڑائی کا بھی ذکر ہے جس میں ودیشا کی جیت ہوئی تھی۔ شنگ خاندان میں کل دس راجا گزرے ہیں۔ جو یکے بعد دیگرے ۱۱۲ سال تک حکومت کرتے رہے۔

کنوا خاندان

۷۳ - ۲۸ ق م میں دیوبھوتی شنگ کے برہمن وزیر واسدیو کنوا نے اپنے آقا کو قتل کر کے گدی پر قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کے چار بادشاہ کل ۴۵ برس تک برسرِ اقتدار رہے۔ ان کے دورِ حکومت میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا بجز اس کے کہ کئی سرحدی علاقوں کے خود مختار ہو جانے کی وجہ سے سلطنت کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ آخری کنوا راجا سوشرما کا تختہ آندھرا کے سردار سیمک نے الٹ دیا اور اس کی ریاست کو آندھرا سلطنت میں ضم کر لیا۔

دوسری خود مختار ریاستیں

نئی قائم ہونے والی دوسری خود مختار ریاستوں میں کالنگا کی ریاست بہت طاقت ور تھی جہاں جین بادشاہ کھرویل نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس راجا نے جین سادھوؤں کے لیے اڑیسہ میں بھونیشور کے قریب اودے گری اور کھانڈگری کے مقام پر غاروں میں کئی خانقاہیں بنوائیں اور اودے گری کے غاروں میں جو کتبات ملے ہیں ان سے کھرویل کے زمانہ حکومت کے لیے اہم تاریخی مواد فراہم ہوتا ہے۔ کھرویل خاندان کی لڑائیاں اپنے ہمعصر ست واہن راجاؤں سے بھی ہوتی رہیں۔ راجا کھرویل علم و تہذیب کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور ہے۔ خانقاہوں اور محلوں کے علاوہ اس نے ایک نہر بھی تعمیر کروائی تھی۔

آندھرا کے ست واہن راجا

ست واہن راجا مغربی دکن پر پہلے ہی سے حکومت کر رہے تھے۔ یہ تلگو بولنے والے دراوڑی برہمن تھے۔ گوداوری اور کرشنا کے درمیان سمندر سے ملا ہوا ایک وسیع علاقہ ان کے زیرِ نگیں تھا جہاں ۳۰ بڑے شہر آباد تھے اور جن کے پاس ایک لاکھ پیادہ سپاہی دو ہزار گھوڑ سوار اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ ایک ہی خاندان کے تیس بادشاہ بغیر کسی وقفہ کے ۴۶۰ سال تک حکومت کرتے رہے۔ آندھراؤں کی حیثیت سے ان کا تذکرہ ایتریا برہمن میں بھی آیا ہے۔ سکوں اور کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق کے جنوب میں پرشٹھان (پیٹھن) اصل وطن تھا۔ ان کے لقب ست واہن سے متعلق کئی قصّے مشہور ہیں۔ یہ بادشاہ اشوک کے باجگزار تھے لیکن اس کی موت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جلد ہی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور نرمدا کے مشرق اور شمال کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اس سلسلہ کے

ستر ہویں راجا ہو لا نے نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جو بہت مشہور ہوا۔
۴۰ ـــــ ۸۰ء کے لگ بھگ سکاست رپوں کے عروج کی وجہ سے جن کی قوت گجرات اور کاٹھیاواڑ کے اندرونی علاقوں میں پھیل رہی تھی۔ آندھرا اقتدار کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم تیئسویں راجا گوتمی پتر ستاکرنی نے سکاؤں اور یاوناؤں کا قلع قمع کر دیا اور سکاؤں سے شمالی مہاراشٹرا، کونکن، نرمدا وادی اور سوراشٹرا کے علاوہ مالوہ اور مغربی راجستھان کے علاقے دوبارہ حاصل کر لیے۔ بانا نے اپنی تصنیف "ہری سمدر دھی پتی" میں ان راجاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔

آندھرا کے حکمرانوں کے تحت ملک کا انتظام بہت اچھا تھا اور عوام بھی ان سے خوش تھے۔ دیہی پنچائتیں قائم تھیں، جو بلا روک ٹوک اپنا کام انجام دیتی تھیں یہ راجا گو ہندو مت کے پیرو تھے اور برہمنوں کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے تاہم بدھ مت کے پیروؤں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک اچھا تھا۔ ان کے زمانے میں غاروں میں متعدد خانقاہیں تراشی گئیں اور بنائی گئیں اور گاؤں کے گاؤں انہوں نے بدھی بھکشوؤں کو بطور انعام دے دیے۔ ان کے زمانے میں مشرق اور مغرب کے ملکوں کے ساتھ تجارت فروغ پاتی رہی جس کے زیر اثر لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

بیرونی بستیاں موریا اقتدار کے زوال کے ساتھ ہی شمال مغرب میں بیرونی حکمرانوں کی کئی چھوٹی بڑی ریاستیں ابھر آئیں۔

ان ہی میں سے ایک باختر (Bactaria) کی خوشحال ست رپی تھی۔ جو ہندوکش کے پرے واقع تھی۔ ۲۵۰ ق م کے لگ بھگ یہاں کے صوبیدار (Diodatus) نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے جانشینوں نے اپنی ریاست کو مستحکم کیا اور چوتھے بادشاہ دمیتریاس (Demetrios) ۲۰۰ ـــــ ۱۷۵ ق م نے پنجاب پر قبضہ کر کے ہند۔ باختریائی سلطنت قائم کی جس کا صدر مقام سکال (سیالکوٹ) تھا۔ اس کے انتقال کے بعد یہ سلطنت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی۔ ان میں سب سے اہم ریاست کا حاکم منندر (ملندا) تھا (غالباً ۱۶۰ ـــــ ۱۲۰ ق م کے درمیان) جس نے کاٹھیاواڑ پر قبضہ کر لیا تھا۔ پشیامتر سنگھ نے اسے مدھیہ دیش (گنگا کی وادی) میں پیش قدمی کرنے سے روک دیا تھا۔ اس کی ریاست کابل سے متھرا تک، پنجاب، سندھ، راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی مشہور بودھ بھکشو ناگسین سے مذہب کے بارے میں اس کے کئی مباحثے ہوئے تھے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اس نے بدھ مت قبول کر لیا۔ وہ ایک مہربان اور منصف مزاج حکمراں تھا اور رعایا میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اس کے انتقال کے بعد اس کی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ ۵۰ ق م کے لگ بھگ بادشاہ ہرمیئس (Hermaeus) کی ہند باختریائی سلطنت کا کشان سردار کجولا کڈفیسس (Kujula Kadphises) نے خاتمہ کر دیا۔ لیکن اس سلطنت کے زوال کا اہم سبب ایک ہی گھرانے کے دو حریف گروہوں کا جھگڑا تھا جن میں سے ایک کا سرغنہ دمیتریس اور دوسرے کا ایوکرے ٹیڈس (Erekratides) تھا۔

ہند پارتھیائی اقتدار ۲۵۰ ق م کے قریب باختر یونانی تسلط سے آزاد ہوا تو اسی زمانہ میں ایران اور بحر خزر کے جنوب کے مشرقی علاقے بھی ارساکس (Arskass) کے تحت خود مختار ہو گئے۔ ان کا سب سے طاقتور بادشاہ متھرادتیس (Mithradates) (مترادت) (۱۷۱ ـــــ ۱۳۶ ق م) گزرا ہے۔ اس نے سندھ اور جہلم کے درمیان کا سارا علاقہ دمیتریس سے چھین لیا۔ لیکن اس کے مرتے ہی پارتھی صوبیدار خود مختار ہو گئے اور انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان کا دوسرا مشہور بادشاہ گونڈوفارنس (Gondophames) (گونڈافارنا) تھا جو تقریباً ۲۰ ـــــ ۴۶ء میں برسر اقتدار رہا۔ اس نے سندھ اراکوشیا اور پنجاب میں اپنی طاقت کو مستحکم کیا۔ اس خاندان کے دو مخالف گروہ پہلی صدی عیسوی میں مسلسل برسر پیکار رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی سلطنت کے بڑے حصہ پر کشان راجاؤں نے قبضہ کر لیا اور صرف چند چھوٹے اور غیر اہم سردار باقی رہ گئے۔

ساکاؤں کا اقتدار ساکا وسط ایشیا کا ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا جسے یوچ۔چی (Yuch-Chi) قبیلہ نے جنوب مغرب کی جانب منتقل ہونے پر مجبور کر دیا تھا جہاں یہ علاقہ ان کے نام کی مناسبت سے آج بھی سیستان (ساکستان) کہلاتا ہے اس قبیلہ کے بعض لوگوں نے پارتھیوں کی ملازمت قبول کر لی اور انہیں سے ست رپ کا لقب حاصل کیا۔ ان کی دو اہم شاخیں تھیں۔ ایک ٹیکسلا اور متھرا پر قابض تھی دوسری ناسک اور اجین پر حکمراں تھی۔ موخر الذکر بہت بعد میں برسر اقتدار آئی لیکن بہت جلد مشہور ہو گئی۔ شمالی ساکاؤں کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔

مغربی ساکاؤں نے کشان کے دباؤ کی وجہ سے جنوب کا رخ کیا۔ اور مہاراشٹرا، مالوہ، گجرات، کچھ اور کاٹھیاواڑ میں اپنی حکومت قائم کی۔ ان مغربی ساکاؤں کی بھی دو شاخیں تھیں۔ (۱) بھاونک اور نہپان جن کا صدر مقام ناسک تھا اور (۲) چشتان اور رُدرادمن جن کی راجدھانی اجین تھی۔

نہپان کی ریاست پونا سے اجمیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے مہاست رپ کا لقب اختیار کیا تھا۔ چشتان سلسلہ کا سب سے طاقتور اور مقبول حاکم چشتان کا پوتا رُدر دمن تھا جو اپنے پڑوسیوں، خصوصاً ست واہنوں (اور (آندھراؤں) سے مسلسل برسر پیکار رہا کرتا تھا۔ آندھراؤں کے ایک اچھے خاصے علاقہ پر اس نے قبضہ بھی کر لیا تھا وہ ایک اچھا ماہر نظم و نسق اور ایک ہمہ دان عالم تھا۔ اس نے جونا گڈھ کی سدرشن جھیل کی بھی مرمت کروائی جسے چندر گپت موریا کے صوبیدار ویشیا پشیا گپتا نے تعمیر کروایا تھا۔ اس عظیم الشان اور خوبصورت جھیل نے شہنشاہ اشوک کے زمانہ میں اسی کی ایما پر یاونوں کے راجا تُشپ کے ہاتھوں تکمیل پائی تھی۔ ایک زبردست طوفان میں جب اس کا بند ٹوٹ گیا تو رودر دمن کے پہلوی گورنر سوی شک نے، جس کے تحت انارتھ اور سوراشٹرا کا علاقہ تھا۔ اس جھیل کی مرمت کا بیڑا اٹھایا۔ تعمیر کے جملہ اخراجات شاہی خزانہ سے ادا کیے گئے اور رعایا پر کسی قسم کا بار نہیں ڈالا گیا۔ ان تمام تفصیلات کا ذکر ہمیں رودر دمن کے مشہور کتبہ میں ملتا ہے جو گرنیار (گری نگر) کی ایک چٹان پر کندہ ہے۔ اسی چٹان پر اشوک کے فرامین اور شہنشاہ سکند گپت کے کتبے بھی موجود ہیں۔ گرنیار کا موجودہ نام جونا گڑھ ہے۔ رُدردمن کے جانشین چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک

حکومت کرتے رہے جبکہ وکرمادتیہ، چندر گپت ثانی نے ان کا تختہ الٹ دیا۔

کُشان راجا ان کا تعلق چین کے مغربی سرحد پر رہنے والے یوچ چی (Yuch-Chi) نامی خانہ بدوش قبیلہ سے تھا۔ تقریباً ۱۵۰ ق م میں ان کا تصادم ہُن کے وحشی قبیلوں سے ہوا اور انہیں جنوب مغرب کی جانب ہٹ جانا پڑا۔ جہاں وہ باختریوں، پارتھیوں اور ساکاؤں کو زیر کر کے ہندوستان کے شمال مغرب میں بس گئے۔ ۴۰ء میں یوچ چی کا ایک گروہ اصل قبیلہ سے علاحدہ ہو گیا اور کدفیس (Kadphese) کی سرکردگی میں گندھار میں داخل ہوا۔ اس نے وہاں سے آخری یونانی بادشاہ کو نکال باہر کر دیا۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے شمال مغربی ہند پر قابض ہو گئے اور پھر وسط ہند تک پہنچ گیا۔

کنشک کشان راجاؤں میں کنشک سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا پایہ تخت پروشاپور (پیشاور) تھا اس کی سلطنت کو چینی ترکستان سے لے کر کشمیر اور پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پٹنہ تک وادیٔ گنگا کا تمام علاقہ اس کا مطیع ہو گیا۔ اور جنوب میں اس کا اقتدار مالوہ تک قایم ہو گیا۔ اس کی شخصیت کے متعلق کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ اس کا دور جو سکا نرپ کلا (Sko-Nrip Kala) کہلاتا ہے ۷۸ء میں سکا دور کے ساتھ شروع ہوا ہو گا۔ ایک روایت کے مطابق اس کے سپہ سالاروں نے جو اس کی مسلسل جنگوں سے تنگ آچکے تھے نیند میں اس کا گلا گھونٹ دیا۔

بدھ مت کے پیرو کنشک کو اشوک ثانی سمجھتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کنشک نے پیشاور میں ایک عظیم الشان استوپ تیار کروایا تھا۔ لیکن اس کے سکوں پر اس کے سلطنت کے تمام مذاہب کی نشانیاں ملتی ہیں جس سے اس کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ کہلا جاتا ہے کہ کنشک نے ایودھیا سے برہمن فلسفی اشدہ گھوش کو طلب کیا تھا تاکہ وہ چوتھی بودھی مجلس میں شریک ہو کر اہم بودھی تصانیف کی ترتیب اور تشریح کا کام انجام دے۔ لیکن اس مجلس میں خود کنشک نے کوئی حصہ لیا تھا یا نہیں یہ بات مشتبہ ہے کیونکہ اس مجلس کا جو ابتدائی بیان پرماستھ (Paramasth) نے پیش کیا ہے اس میں کنشک کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ خود یہ مجلس کہاں منعقد ہوئی تھی اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایک رائے کے مطابق یہ کشمیر (ہروان) کی کنڈلوانہ خانقاہ میں منعقد ہوئی تھی۔ دوسری رائے کے مطابق وہ جالندھر میں طلب کی گئی تھی۔ ہیون سانگ کے بیان کے بموجب واسومتر اس مجلس کا صدر اور اشدہ گھوش اس کا نائب صدر تھا مجلس میں تمام بودھی احکام کا جائزہ لیا گیا اور شرح بسط کے ساتھ انہیں تانبے کی چادروں پر نقل کیا گیا۔ ان میں کی ایک تصنیف جو "مہائی بھاشا" کہلاتی ہے اب صرف چینی زبان میں ملتی ہے یہ بودھی فلسفہ کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ رفتہ رفتہ کنشک کے خاندان کو زوال آگیا تاہم اس کے جانشین پانچویں صدی عیسوی میں ہنوں کے حملہ تک کابل کی وادی میں اور ساتویں صدی میں عربوں کی فتح تک ایران میں باقی رہے۔ روم سے کشان راجاؤں کے سیاسی اور تجارتی دونوں طرح کے گہرے تعلقات تھے۔ تجارت خشکی کے علاوہ براہ بروچ، سمندری راستے سے بھی ہوتی تھی۔ یہ تذکرہ ملتا ہے کہ ایک کشان راجا کے سفیر کا روم میں بڑا شاندار استقبال ہوا تھا۔ کشان نے روم کے طلائی سکّے بھی رائج کیے۔ اسکندریہ کے ایک بحری جہاز کے کپتان نے جو ۸۰ء میں ہندوستان کے ساحل تک پہنچا، تھا اور اپنا دلچسپ سفرنامہ لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندری راستہ کے ذریعہ ریشم، مسالے وغیرہ کی بہت بڑی مقدار روم کو بھیجی جاتی تھی اور اس کے معاوضہ میں روغن، سونا، یونانی شراب اور شاہی حرم کے لیے چیدہ لڑکیاں درآمد کی جاتی تھیں۔

ادب و تہذیب سنگھ دور کے آخری زمانہ میں کشان ستت واہان خاندانوں کے تحت علی الترتیب شمال مغرب اور جنوب میں سنسکرت کے علاوہ پراکرت ادب کو بھی غیر معمولی فروغ ہوا۔ قواعد کی کتابیں، ناٹک، قدیم مقدس کتابوں کی شرحیں، رزمیہ نظمیں، طب کی کتابیں، اشدہ گھوش کی لکھی ہوئی بدھ کی سوانح عمری اور متعدد نظمیں منظر عام پر آئیں۔

بُدھ مذہب میں مہایان (شاہراہ) فرقہ وجود میں آچکا تھا جو بھکتی کو علم پر فوقیت دیتا تھا۔ اسی طرح ہندو مذہب میں کرما (عمل) کے تصور کی وجہ سے بھگوت دھرم کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ گوتم بدھ کو اب صرف ایک روشن ضمیر معلم اور مصلح ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں ایک اوتار اور دیوتا کا مرتبہ دے دیا گیا تھا۔ بدھ کے بچپن سے متعلق متعدد قصّے لکھے جا رہے تھے۔ جن میں ان سے غیر معمولی عادات و اطوار منسوب کیے گئے تھے۔

گپت عہد (۳۲۰-۵۰۰ء) کشان سلطنت کے مٹ جانے کے بعد شمال مغرب اور وسط ہند میں کئی جمہوری اور شاہی حکومتیں وجود میں آگئیں۔ مثال کے طور پر ایرانی، ناگا، گجرات اور مالوہ میں باقی ماندہ شکاست رپی اور برار (ودربھا) کے وکاٹک۔

گپت خاندان نے ایک ادنیٰ مقام سے ترقی کر کے شاہی خاندان کا درجہ حاصل کر لیا۔ سری گپت اور اس کا لڑکا گھٹوٹ کچ (Ghatat Kacha) مگدھ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے حاکم تھے۔ گھٹوٹ کچ کا لڑکا چندر گپت اول ویسلا کے لچھوی راجا کے جانشین، کمار دیوی سے شادی کر کے، ایک وسیع علاقہ اور اقتدار کا مالک بن گیا۔ اور جب پاٹلی پتر بھی اس کے قبضہ میں آگیا تو دونوں ریاستوں کو ملانے کے بعد اس نے "مہاراج ادھیراج" کا لقب اختیار کر لیا۔ اس طرح چندر گپت اوّل گپت سلطنت کا بانی قرار پایا۔ اس نے اپنے جانشین (غالباً ۳۲۰ء) کی تاریخ سے ایک نئے سنہ کی ابتدا کی۔

چندر گپت کا لڑکا سمدر گپت (۳۳۵ — ۳۷۵ء) بہت بڑا سپہ سالار تھا جس کی فتوحات نے سلطنت کو بہت وسیع کر دیا۔ ان فتوحات کا تذکرہ ریاست کے ایک امیر ہری شینا کے ایک سنسکرت قصیدہ میں ملتا ہے۔ جو کوسمبی کے اشوکی ستون پر کندہ ہے۔ اس طرح اشوک کے پیام امن کے پہلو بہ پہلو ہمیں خونیں جنگوں کی داستانیں بھی ملتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ سمدر گپت نے نرمدا کے شمال کا سارا علاقہ نیز شمال مغربی بنگال کا حصہ اپنی عملداری میں شامل کر لیا تھا۔

علم کی سرپرستی سمدر گپت خود ایک بڑا عالم تھا اور علم و ادب کی سرپرستی بھی کرتا تھا وہ ایک ذہین شاعر اور ماہر موسیقی کی حیثیت سے بھی مشہور ہے واشوبندھو اور اسنگ جیسے مشہور بودھی عالموں کو اس کی سرپرستی حاصل تھی۔

حالاں کہ سمدر گپت خود بھگوت دھرم کا پیرو تھا۔ جیسا کہ اس کے سکوں پر وشنو کی سواری گروڑ کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اشوہ میدھ (گھوڑے کی قربانی) کی رسم انجام دیتا اور برہمنوں کو (جنہوں نے پھر ہندو سماج کے باعزت طفیلیوں کا اعزاز حاصل کرلیا تھا) گایوں اور دیگر تحائف سے نوازتا تھا۔ اس کی رواداری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس نے سیلون کے راجا میگھ ورنا کو بودھ گیا میں ایک وسیع بودھی خانقاہ تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔

سمدر گپت کے تہذیبی اور سیاسی تعلقات سیلون، جاوا اور سمندر پار کے دیگر مشرقی ممالک سے تھے۔ اس کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے۔ تاہم ۳۷۵ء کو عام طور سے اس کا سنہ پیدائش مانا جاتا ہے۔

رام گپت
(۳۷۵ء - ۳۸۰ء)

پچھلی تاریخوں میں کہیں ذکر نہیں کہ سمدر گپت اور چندر گپت دوم کے درمیان ایک راجہ اور ہے حالیہ ادبی، نیز آثاری دریافت سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سمدر گپت کے بعد اس کا لڑکا رام گپت گدی نشین ہوا اس نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ ایک سکا راجا نے رام گپت سے اس کی خوب صورت بیوی کا مطالبہ کیا اور رام گپت نے بزدلی سے اسے مان لیا۔ اس ناخوشگوار موقعہ پر راجا کے بھائی چندر گپت نے خاندان کی آبرو رکھ لی اور جان پر کھیل کر سکا حملہ آور کو قتل کر دیا اور ملکہ کو بچا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد چندر گپت نے اپنے بزدل بھائی کو بھی قتل کروا دیا اور اس کی بیوہ رانی دھروا دیوی سے خود شادی کرلی۔

چندر گپت دوم وکرمادتیہ
(۳۸۰ء - ۴۱۴ء)

ایک عظیم باپ کا عظیم بیٹا چندر گپت دوم اپنی سنسنی خیز فتح کے بعد تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے کہ چندر گپت کی جس نے غالباً وکرمادتیہ کا لقب اختیار کیا تھا اور شکری وکرمادتیہ کی دراصل ایک ہی شخصیت تھی اور یہ کہ اس وکرمادتیہ کا جس نے ۵۷ ق م سنہ وکرم کی ابتدا کی تھی کوئی وجود نہ تھا۔ کسی بڑے گپت راجا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے سنہ وکرم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے برعکس سنہ وکرم کے بانی وکرمادتیہ شکری کی شخصیت سے متعلق کافی ثبوت ملتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مشہور شاعر کالیداس کا تعلق بھی پہلی صدی ق م میں اسی وکرمادتیہ کے دربار سے رہا ہو۔

چندر گپت دوم نہایت ہی دلیر اور قابل راجا تھا۔ ورثہ میں اسے اتنی وسیع سلطنت ملی کہ فتح کرنے کے لیے کچھ زیادہ علاقہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ تاہم اس نے اطراف واکناف کے علاقوں کو مطیع کرکے مشرق میں وانگا (بنگال) اور مغرب میں گجرات اور کاٹھیاواڑ کو اپنی عمل داری میں شامل کرلیا۔ دہلی میں قطب مینار کے قریب ایک آہنی ستون استادہ ہے جس کے سنسکرت کتبے میں ایک چندر راجا کا ذکر ہے جس نے مخالف سرداروں کے جتھے کو شکست دی اور دریائے سندھ کے ساتوں دہانے پار کرکے بلخ کے سرداروں، والیکاوں (Valikas) کو زیر کیا۔ اس کتبہ میں جس فاتح کا ذکر ہے بہت ممکن ہے وہ چندر گپت ثانی ہی ہو۔

چندر گپت نے پڑوسی راجاؤں سے ازدواجی رشتے قایم کرکے اپنی سلطنت کے حدود وسیع کیے۔ اس نے ایک ناگا سردار کی لڑکی کبرناگ سے شادی کی اور اپنے لڑکے کا بیاہ وسط ہند کے راجا واکتکا سے کیا۔ سوراشٹر پر قبضہ کی وجہ سے مغربی ساحل کی بندرگاہیں اس کے ہاتھ آئیں اور براہ مصر یورپ سے راست بحری تجارت شروع ہوگئی۔

فاہیان
(۳۹۹ء - ۴۱۴ء)

چینی سیاح فاہیان جو بودھی مقدس مقامات کی یاترا کے لیے ہندوستان آیا تھا کم سے کم پندرہ برس تک یہاں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے کئی مقامات کا سفر کیا اور متعدد شہر دیکھے۔ فاہیان نے ملک کے سماجی حالات قلمبند کیے اور شہنشاہ گپت کے نظم ونسق پر بھی خامہ فرسائی کی۔

فاہیان لکھتا ہے کہ ملک کا انتظام بہت اچھا تھا اور لوگوں کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ راستے محفوظ تھے اور ان پر سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ دواخانے قایم تھے اور ضروریات زندگی کی معمولی چیزیں مہیا کی جاتی تھیں۔ موریائی دور حکومت کے برعکس سزائیں بہت نرم دی جاتی تھیں اور ہر جرم کے لحاظ سے ان کی نوعیت الگ الگ تھی۔

یہاں کے لوگوں کے متعلق فاہیان نے لکھا ہے کہ وہ خوش حال ہیں، انہیں ضروریات زندگی مہیا ہیں۔ وہ اعلیٰ اخلاقی زندگی گزارتے ہیں۔ جانوروں کو بھی ذبح نہیں کرتے، سبزی خور ہیں اور شراب نہیں پیتے۔ یہاں تک کہ وہ پیاز اور لہسن کا استعمال بھی نہیں کرتے۔ اشیاء اس قدر سستی ہیں کہ معمولی ضروریات زندگی کی خرید و فروخت کے لیے کوڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ بدھ مت اب بھی رائج ہے اور اس کی کئی خانقاہیں موجود ہیں حالاں کہ وشنو مت کے قدم جم چکے ہیں۔ سنسکرت کی تعلیم کا رواج ہے اور برہمنوں، مذہبی اداروں اور عالموں کی خوب سرپرستی کی جاتی ہے۔

نظام حکومت کو بہتر بنانے کی غرض سے سلطنت کو کئی بھکتوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر بھکتی کے کئی وشایئں اور ہر وشا کے مزید حصے ہوتے تھے۔ محاصل واجبی تھے۔ دیہی انتظام، حکومت کی مداخلت کے بغیر، دیہی پنچائتیں چلاتی تھیں۔

کمار گپت
(۴۱۴ء - ۴۵۵ء)

چندر گپت کی طرح اس کا بیٹا اور جانشین کمار گپت بھی ایک نامور راجا تھا جس نے اپنی سلطنت کو مستحکم رکھا۔ اس کے زمانے میں سنسکرت ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ لیکن اس کی حکومت کے آخری دور میں ہن قبیلہ کے حملوں کی وجہ سے امن و امان قایم نہ رہ سکا اور سلطنت کی سلامتی خطرہ میں پڑھ گئی۔ سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے راج کمار سکند گپت کو کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور بڑے مصائب جھیلنے پڑے۔

سکند گپت
(۴۵۵ء - ۴۶۷ء)

۴۵۵ء میں کمار گپت کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سکند گپت جانشین ہوا۔ یہ بھی ایک قابل اور بہادر شہزادہ تھا۔ لیکن ہنوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے اس کے دور حکومت میں امن و امان باقی نہ رہا۔ بالآخر وہ ۴۶۷ء میں ایسے ہی ایک حملہ میں کام آگیا۔ اس کے جانشین بہت ہی کمزور ثابت ہوئے اور حملہ آور قبیلوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ چنانچہ ۵۰۰ء کے لگ بھگ ہن سردار تورمان نے سارے شمالی ہند کے علاوہ وسط ہند کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کی وسیع عمل داری میں کشمیر کا علاقہ بھی تھا تورمان، شیو اور سوریہ کو مانتا تھا۔ اس نے ۵۱۵ء تک حکومت کی۔

تورمان کا بیٹا مہر کلا جس کا دارالحکومت ساکلا (سیالکوٹ تھا) ظالم اور سفاک نکلا۔ اسی لیے وہ ہندوستانی اٹیلا کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے بے شمار خانقاہوں، مندروں اور استوپوں کو تباہ وتاراج کیا۔ اس کے مظالم سے تنگ آکر مگدھ کا راجا بالادتیہ اور مالوہ کا یشودھرمن اس کے خلاف متحد ہو گئے۔ مہرکلا کو شکست ہوئی۔ (غالباً ۵۳۳ء) اور وہ گرفتار کرلیا گیا گو بعد میں اسے رہا کر دیا گیا۔ ۵۴۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ہنوں کے اثرات

ہنون کے حملوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امن وخوش حالی کا وہ دور، جسے گپت راجاؤں نے قایم کیا تھا ختم ہو گیا اور ملک کئی چھوٹی چھوٹی عمل داریوں میں بٹ گیا۔ اس حملوں کے تحت من الھا اور کئی نسلیں شمالی ہند کی آبادی میں گھل مل گئیں۔ ہنوں نے ملک کی مذہبی یادگاروں، یہاں تک کہ ادبی خزانوں کو تباہ کرکے بڑا نقصان پہنچایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمیں قدیم تاریخ بڑی دست نظر آتی ہے ہنوں کے گرم خون کی آمیزش نے، ہند آریائی روایات کے اخلاقی معیار کو گرا دیا اور کئی ایسے توہمات کو فروغ دیا جنہیں آریہ ورت کے عظیم بھگت اور روحانی معلم بھی مٹا نہ سکے۔ ہنوں نے سیاسی مطلق العنانیت کی بنا ڈالی جس سے ہند آریائی نظام حکومت ناآشنا تھا۔ "مطلق العنانیت تاتاریوں یا منگولوں کی تخلیق ہے" (ہاویل)

گپت عہد کے بعد کی طوائف الملکی

گپت عہد کے خاتمہ پر سلطنت کے صوبیداروں نے خودمختار ریاستیں قایم کرلیں جن میں ولبھوں (گجرات)، کی حد تک قنوج اور مالوہ کی ریاستیں اہم تھیں۔ تقریباً چھ صدیوں تک ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا لیکن بعض علاقے اس سے مستثنیٰ بھی تھے۔ چنانچہ شمالی ہند کا علاقہ ہرش وردھن کے تحت نصف صدی تک متحد رہا۔ ہرش کے آباواجداد ایک عرصہ تک مشرقی پنجاب کو ہنوں کے حملوں سے بچاتے رہے جو بالائی وادی سندھ میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ ہرش کی بہن راجیہ شری قنوج کے مان کھری راجا گرہاورمن کو بیاہی گئی تھی لیکن مالوہ کے راجا نے اسے قتل کرکے راجیہ شری کو قید کرلیا تھا۔ ہرش کے بڑے بھائی راجیہ وردھن کو اپنی بہن کو چھڑانے کے لیے بھیجا گیا۔ راجیہ وردھن نے مالوہ کے راجا کو شکست تو دے دی لیکن وہ خود اپنے حلیف بنگال کے ساسنک کے ہاتھوں مارا گیا۔ راجیہ شری نے وندیاں کے جنگلوں میں پناہ لی۔ اور ہرش وردھن کو بہن کو بچانے کے لیے دشمنوں کی سرکوبی کرنا ضروری ہو گیا۔

ہرش وردھن
(۶۰۶ء - ۶۴۸ء)

ہرش وردھن کو خوش قسمتی سے اپنی بہن کا پتہ چل گیا اور اس نے اسے عین اس وقت بچالیا جب وہ اپنی بھینٹ دینے والی تھی۔ اس کے بعد ہرش وردھن نے قنوج کے سرداروں کی درخواست پر اپنے بہنوئی مان کھری راجا کے تخت کو زینت بخشی۔

ہرش نے تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر دیا جو آپس میں ہمیشہ برسرپیکار رہا کرتی تھیں۔ اس نے ایک بڑی فوج منظم کی اور پانچ سال کے اندر ہی، بجز ساسنکا (S'Asanka) کے بنگالی ریاست کے تقریباً سارا شمالی ہند فتح کرلیا۔ آسام کے راجا سے اس نے دوستی کرلی۔ البتہ کلیانی کے چالوکیہ راجہ پلاکیسنی دوم کے مقابلہ میں اسے ہار کر پسپا ہونا پڑا (۶۲۰ء)

ہرش نے بیرونی طاقتوں سے بھی دوستانہ تعلقات قایم کیے اور شہنشاہ ایران اور چین کو تحفے تحائف بھیجے۔ پنجاب سے لے کر بنگال اور اڑیسہ تک سارا ملک اس کی عمل داری میں شامل تھا۔ آسام کا بھاسکر ورمن بھی اس کا ماتحت حلیف تھا۔ باناکے مطابق نیپال اور سندھ بھی اس کی سلطنت میں شامل تھے۔

شہنشاہ ہرش خود بھی ایک بڑا عالم، مصنف اور شاعر تھا۔ اور عالموں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ سنسکرت ادب کی دو بے مثال تصانیف "کادمبری" اور "ہرش چرت" کا مصنف بانا بھٹ ہرش ہی کے دربار کا شاعر اور وقائع نگار تھا۔ عظیم شاعر اور فلسفی بھرتری ہری بھی غالباً ہرش ہی کا ہمعصر تھا۔

ہرش بہت ہی خداترس اور مذہبی آدمی تھا۔ ابتدا میں وہ شیو اور سوریہ کا عقیدت مند رہا لیکن بعد میں ہیون سانگ اور رہنمایانی مفکر و عالم دیویکا متر سے متاثر ہوکر وہ بدھ مت کا پیرو بن گیا۔ اس نے بدھ مت کو پھیلانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ تاہم وہ دوسرے دیوتاؤں کا بھی احترام کیا کرتا تھا۔

ہیون سانگ
(۶۰۰ - ۶۶۴ء)

چینی سیاحوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے جنھوں نے شکیہ منی بدھ کے مقدس مقام، ہندوستان پہنچ کر ان تمام مقامات کی زیارت کی جہاں مہاتما بدھ نے قیام کیا تھا۔ ہیون سانگ اپنے وطن سے ۶۲۹ء میں روانہ ہوا اور وسط ایشیا کا سفر کرتا ہوا گندھارا پہنچا۔ دو سال کشمیر میں گزارے پھر وہاں سے ہندوستان میں داخل ہوکر بودھ گیا، سارناتھ اور دوسرے مقامات کی یاترا کی اور دو سال سے زیادہ نلندہ وہار (جامعہ نلندہ) میں گزارے اس کے بعد ہی ہرش نے اسے مدعو کیا اور ہندوستان سے واپسی تک ہیوں سانگ ہرش کا مہمان رہا۔ اسے ۶۴۴ء میں اپنے وطن واپس ہونے کی اجازت ملی۔ ہیون سانگ نے ہندوستان میں بدھ مت کی کئی مقدس تحریریں جمع کیں اور بہت سے علوم پر عبور حاصل کیا۔ واپسی پر ہیوں سانگ نے اپنی معرکہ آرا، سرگزشت "سی یو۔ کی" لکھی۔ یہ تصنیف جس میں اس کے مغرب کی دنیا کے حالات درج ہیں، ساتویں صدی کے ہندوستان کی سماجی زندگی، یہاں کے نظم ونسق اور مذاہب سے متعلق معلومات کا ایک غیر معمولی ذخیرہ ہے۔ ہیوں سانگ نے بدھوں کی زندگی اور ان کے آثار سے خاص طور پر دل چسپی کا اظہار کیا۔ اس تصنیف سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یوں تو ملک میں بدھ خانقاہوں کی کمی نہیں تھی تاہم عوام کے مذہب کی حیثیت سے بدھ مت کا اثر زائل ہو رہا تھا اور اس کی جگہ شیوائی اور وشنوائی مذاہب نے لے لی تھی۔ ہیوں سانگ نے ہرش کے انتظام ملک کو بہت سراہا ہے۔ اس کی رائے کے مطابق ہرش کے زیر حکومت لوگ خوشحال تھے اس سیاح نے یہاں کے شہروں اور عمارتوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔ لوگوں کی غذا کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے باشندے دودھ، مکھن، چاول، دانہ دار اناج، دالیں، سبزی اور میوہ کھاتے تھے۔ لیکن پیاز اور لہسن عام طور سے استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ عورتوں کی بڑی عزت ہوتی تھی اور پردہ کا رواج نہیں تھا، البتہ ستی کی رسم شروع ہوچکی تھی۔ تعلیم کا شوق عام تھا اور تعلیم سنسکرت میں دی جاتی تھی۔ مشہور وہاروں جیسے نلندہ وغیرہ میں فلسفہ، علم قواعد، اور مابعدالطبیعیات اور دیگر اعلیٰ علوم

سکھاتے جاتے تھے۔

ہرش بلاشبہ مسلمانوں کی حکومت سے پہلے شمالی ہند کا آخری بڑا شہنشاہ تھا جس نے چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں کو ایک منظم سلطنت کے زمرہ میں شریک کر کے نہ صرف اپنی انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا بلکہ ایک خدا ترس اور مذہبی راہنما کی حیثیت سے بھی لوگوں کی اخلاقی زندگی کو متاثر کیا۔ وہ سادگی اور اعلیٰ ظرفی کا خود ایک نمونہ تھا۔ عوام کی ضروریات اور ان کے آرام و آسائش کا وہ برابر خیال رکھتا تھا۔ اس نے آرام گھر اور مسافر خانے تعمیر کروائے جہاں غذا اور پانی کا معقول انتظام ہوتا تھا اور مسافروں اور نادار لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے آرام کا خیال کیے بغیر ملک کے دورے کیا کرتا تاکہ مقامی عہدیدار اپنے فرائض سے غافل نہ رہیں۔ اس کی فیاضی اور فراخدلی کا جواب نہیں تھا۔ وہ روزانہ ایک ہزار بھکشوؤں اور پانچ سو برہمنوں کو کھانا کھلاتا اور پنج سالہ اجتماعات کے موقعوں پر اپنے ذاتی استعمال کی تمام اشیاء ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔

ہندوستانی تہذیب کا پھیلاؤ

اس موقعہ پر بیرونِ ہند پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات کا مختصر سا جائزہ لینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تجارت، تبلیغی سرگرمیوں اور آبادکاری کے ذریعے ہندو تہذیب کے اثرات ہمالیہ سے پرے اور سمندر پار کے دور دراز ملکوں پر پڑ رہے تھے میکسیکو اور نئی دنیا کے دوسرے علاقوں نیز افریقہ میں ہند و تہذیب کے بے شمار آثار دریافت ہوئے ہیں۔ پرانوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ قدیم ہند و دریائے نیل اور اس کے سوتوں کی ساری جغرافیہ سے واقف تھے۔ بقول لفٹیننٹ ولفورڈ اور رہے ایچ۔ اسپیک اس علاقے کی تمام جغرافیائی خصوصیات مثلاً پہاڑ تالاب دریا وغیرہ کے نام سنسکرت ہی میں تھے۔

سکندر کے حملے کے بعد سے تو ہند و تاجروں کے کاروبار مغربی ایشیاء اور یورپی ملکوں سے کافی بڑھ گئے تھے اور اتنا سونا ہندوستان پہنچ رہا تھا کہ رومن شہنشاہوں کو اس کی روک تھام کے احکام جاری کرنے پڑے تھے دیپانکر شری گیان نے، جو عام طور سے اتیسہ کے نام سے مشہور رہیں۔ سارے تبّت کو بدھ مت کا پیرو بنا لیا تھا۔ کئی بودھی بھکشوں اور عالموں نے چین پہنچ کر بدھ اور ہند و مذہب کی متعدد کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ کشیپ کمار جیوا۔ نھا ننگا اور دھرم رکتوا ان چند مبلغین میں سے تھے جو چین گئے تھے ادھر چین سے سینکڑوں طالب علم تحصیل علم کی غرض سے نلندہ اور دوسری جامعات کو آیا کرتے تھے۔ بھکشو اور مبلغ وسط ایشیاء اور منگولیائی علاقوں تک پہنچ چکے تھے۔ جہاں انہوں نے مقامی باشندوں کی تہذیب اور عقائد پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

جزیرہ نمائے ملایا میں قدیم زمانے ہی سے ہند و بستیاں قایم تھیں۔ آج بھی اس علاقے کے بے شمار مردوں اور عورتوں کے ناموں کی اصل سنسکرت ہے۔ مثلاً نورودوم سنسکرت کا نور رتن ہے۔ سوکارنو شوی کرن اور جاوا یاوا دویپ ہے۔ ان ملکوں میں آج بھی رَس لیلا اور رام لیلا مقامی زبانوں میں بڑی عقیدت مندی کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ بعد میں کئی بودھی مبلغ یہاں پہنچے اور یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کا پیرو بنا لیا۔ سماترا، جاوا، سیام، کمبوڈیا،

بالی، بورنیو، سیلون اور برما یہ تمام ممالک بدھ مت سے متاثر ہوئے اور آج بھی ان پر یہ اثرات باقی ہیں۔ ان ملکوں میں بدھ مت کی بے شمار خانقاہیں، پگوڈا اور منادر تعمیر کیے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کمبوڈیا کا عظیم الشان انگ کور وات مندر ہے جو سوریہ ورمن دوم (بارھویں صدی) کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح جاوا کا بودھی مندر بوسولنڈور (Bosolendur) بھی بڑی شہرت رکھتا ہے۔

ہرش کی موت کے بعد شمالی ہند کے حالات
(۶۵۰ء — ۱۲۰۰ء)

ہرش کے بعد تقریباً ایک صدی تک کے حالات کے لیے تاریخ کے اوراق بالکل خاموش ہیں۔ البتہ آٹھویں صدی کے وسط میں ہم یسوورمن نامی ایک طاقتور بادشاہ سے روشناس ہوتے ہیں۔ یہ آسمان سیاست پر ایک روشن ستارہ کی طرح نمودار ہوا۔ اس کی فتوحات کا تذکرہ اس کے درباری شاعر وکپتی راج نے اپنی مشہور تصنیف "گنڈ واہو" میں کیا ہے۔ نامور شاعر بھوا بھوتی بھی جو "مالتی مادھوا" "اُتر رام چرتہ" اور "مہاویر چرت" جیسے معرکۃ الآرا ڈراموں کا مصنف تھا اور جسے بحیثیت شاعر کالیداس کے مماثل تصور کیا جاتا ہے، اسی زمانے میں تھا۔

تاہم یسوورمن کا سنہ ۷۴۰ء میں کشمیر کے راجہ للت دتیہ مکت پیڈا کے ہاتھوں خاتمہ ہوگیا۔ مؤخر الذکر نے ایک طوفان کی طرح ایک ہی حملہ میں سارے شمالی ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن ان دونوں کا کوئی قابل جانشین پیدا نہ ہوا۔ نتیجتاً سارے شمالی ہند میں پھر ایک بار طوائف الملکی پھیل گئی اور کوئی دو صدیوں تک یہی حالت رہی۔

راجپوت

ساتویں صدی کے بعد کی اس افراتفری نے ایک ایسے حکمراں گھرانے کو جنم دیا جو آگے چل کر راجپوت کہلانے لگا۔ جہاں تک راجپوتوں کی نسبی اصلیت کا تعلق ہے یہ کہنا کافی ہوگا کہ زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جن حکمراں خاندانوں نے ملک کو بڑی یا چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر لیا وہ سب کشتری کہلانے لگے۔ لیکن ان ہی میں سے بعض کا دعویٰ تھا کہ وہ سوریہ ونشی اور چندر اونشی ہیں۔ تاہم تاریخی اعتبار سے اس دعوے کی تصدیق کرنا مشکل ہے۔

راجپوتوں کے عقائد اور رسومات

ملک کے یہ نئے حکمراں قدیم کشتریوں سے بالکل الگ تھے۔ کشتری دھرم نے فرائض اور اعمال کے جو اصول اور معیار مقرر کیے تھے ان سے بھی ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان اعلیٰ تصورات کے برخلاف جس کی رو سے ملک میں امن و امان قایم رکھنا اور عوام کی خوشحالی اور ترقی پر دھیان دینا ہر حکمراں کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ قرون وسطی کے یہ خود پسند سردار بہادری کے غلط تصورات کا شکار تھے۔ اور ہمیشہ آمادہ پیکار رہتے تھے۔ پجاری طبقہ کے زیر اثر وہ مذہب کا مقصد بس یہ سمجھتے تھے کہ ان گنت بے معنی اور اخلاق سوز رسومات کی تکمیل کی جائے۔ انسانی بھلائی کے لیے کام کرنے اور اپنے وسائل ان پر صرف کرنے کے بجائے کرم کنڈ کا مطلب ان کے لیے صرف اتنا تھا کہ جابجا مورتیوں کی پوجا کی جائے مختلف بہانوں سے برہمنوں

کو کھانا کھلایا جائے۔ پجاریوں اور مندروں پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جائے سماج کے ناکارہ اور غیر مستحق طبقہ کو نوازا جائے اور پھر تیرتھ یاترا کی جائے جنگوں کے علاوہ یہ سب مشغلے ایسے تھے کہ راجپوت حکمرانوں کو اپنی رعایا کی بہبودی اور خوشحالی پر دھیان دینے کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔

سیاسی ڈھانچہ (۸۰۰ء — ۱۲۰۰ء)

کشان قبیلہ کا ایک خاندان جو "شاہی" کہلاتا تھا وادی کابل اور پنجاب کے ایک وسیع علاقہ میں برسر اقتدار تھا۔ ۸۵۰ء کے لگ بھگ اس کے برہمن وزیر نے اس کا تختہ الٹ دیا اور خود قابض ہوگیا اور یہ خاندان "ہندو شاہی" کہلانے لگا۔ لیکن ایک طویل جنگ کے بعد اسے کابل چھوڑنا پڑا۔ اور وہ صرف پنجاب تک محدود رہ گیا۔ پنجاب کے شمال میں کشمیر پر اتپل خاندان کے راجا اوانتی ورمن (۸۵۵ — ۸۸۳ء) کی حکومت تھی۔ نیپال اور آسام بھی خود مختار ریاستیں تھیں

گرجار پرتیہار

گنگا کی وادی کی سب سے بڑی ریاست گرجار پرتیہاروں کی تھی جو ۸۱۶ میں ناگ بھٹ دوم کی وجہ سے بہت مشہور ہوگئی۔ قنوج اس ریاست کی راجدھانی تھا۔ اس سلسلہ کے دو راجاؤں مہر بھوج (۸۴۰ — ۸۹۰ء) اور مہندر پال (۸۹۰ - ۹۰۸ء) کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ مہندر پال ایک وسیع سلطنت کا حاکم تھا مغرب میں ستلج اور کاٹھیاوار سے لے کر جنوب میں مالوہ اور مشرق میں بہار تک کا سارا علاقہ اس کے زیر اقتدار تھا۔ یہ وشنوئی عقیدہ رکھتے تھے۔ خود بھی بڑے عالم تھے اور علم کی سرپرستی کرتے تھے مشہور شاعر راج شیکھر، مہندر پال کا درباری شاعر تھا۔

تومر (تنوار) جنہوں نے غالباً آٹھویں صدی کے آخر میں دہلی کی بنیاد ڈالی تھی گرجار پرتیہار ہی کی نسل سے تھے۔

بنگال میں ساسنک کے بعد پال خاندان حکومت کرتا رہا۔ یہ بدھ مت کا پیرو تھا۔ اس نے وکرم شالہ یونیورسٹی قایم کی اور نالندہ یونیورسٹی کی بھی سرپرستی کرتا رہا۔

نرمدا کے جنوب کی ریاستیں

نویں صدی عیسوی میں نرمدا کے جنوب کی ممتاز ریاستیں یہ تھیں۔

مینہ کھیڑ (مال کھیڑ) کی راشٹر کوٹ ریاست ضلع بیجاپور میں وتاپی (بادامی) کی چالوکیہ ریاست اور راجیورو (مغربی گوداوری) کے قریب وینگی کی ریاست، کانچی کی پالو ریاست اور مدورا کے پانڈو راجا۔

راشٹر کوٹ کا سب سے بڑا راجا گووند (۷۹۳ — ۸۱۴ء) تھا جس نے مشرقی ساحل تک کا سارا علاقہ فتح کرلیا اور شمالی ہند میں مالوہ اور پرتیہار تک پیش قدمی کی سیلون کا راجہ بھی اس کی بالادستی کو مانتا تھا۔ اس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔ اندر سوم (۹۱۲ — ۹۱۷ء) کے دور میں عارضی طور پر اقتدار بحال ہوا۔

وتاپی کے چالوکیہ راجا بیرونی نسل سے تھے پلکیسی دوم (۶۰۸ — ۶۴۲ء) نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ہرش کی پیش قدمی کو روک دیا تھا اور اسے شکست دی تھی۔ اس نے کانچی کے پالو راجا نرسمہ کو بھی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم ۷۵۳ء میں راشٹر کوٹ کے دنتی درگا راجا نے چالوکیہ اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ چالوکیہ راجاؤں کا رجحان زیادہ تر وشنوی عقیدہ کی جانب رہا۔ تاہم انہوں نے جین مت کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ اس کی سرپرستی بھی کی۔

وینگی کے چالوکیہ وتاپی ہی کی ایک شاخ تھے۔ یہ پہلے تو پتھاپورم (پتھاپور) سے حکومت کرتے رہے (۶۰۹ء) بعد میں وینگی ان کی راجدھانی تھا۔ یہ خاندان چار سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک حکومت کرتا رہا اور پڑوسی ریاستوں سے ان کی مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔

کانچی کے پالو راجاؤں کو ساتویں صدی میں شہرت حاصل ہوئی اور انہوں نے جنوب میں مزید علاقے فتح کیے۔ یہ شیوائی عقیدہ رکھتے تھے۔ مہندر ورمن پالو نے بدھ متوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اور وہ اپنے پڑوسی ملکوں سے ہمیشہ لڑتا رہا۔ تاہم یہ راجا فنون لطیفہ کے بڑے شیدائی تھے موسیقی رقص اور مصوری کی انہوں نے سرپرستی کی۔ وہ پتھروں میں بنائے ہوئے مندروں اور رتھوں کے لیے بھی مشہور رہیں۔

مدورا کے پانڈووں (Pandyas) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ۶۵۰ء میں برسر اقتدار آئے۔ ابتدا میں وہ جین مت کے پیرو تھے لیکن بعد میں انھوں نے شیوائی عقیدہ قبول کرلیا۔ آٹھویں صدی کے وسط میں انہوں نے چالوکیہ، پالو اور گنگا راجاؤں کو زیر کرکے اپنے اقتدار میں توسیع کی۔ ان کے ایک راجا سری ولبھ (۸۱۵ — ۸۶۲ء) نے سیلون فتح کیا۔ بعد میں انہیں چولا اور پالوؤں کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا۔ انہوں نے شیو اور وشنو کے عظیم الشان مندر تعمیر کیے۔

کلیانی کے مغربی چالوکیہ

دنتی درگا راشٹر کوٹ نے ۷۵۳ء میں بادامی کے چالوکیہ گھرانے کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ۹۷۲ء میں راشٹر کوٹ راجاؤں کو زیر کرنے کے بعد اس کی ایک دوسری شاخ مینہ کھیڑ میں برسر اقتدار آئی (سومیشور نے بعد میں کلیانی کو اپنا مستقر بنایا) جس کا بانی تیلپ تھا۔ ابتدا ہی سے چالوکیوں کا جھگڑا شمال کے منج پارامر اور جنوب کے چولا راجاؤں سے ہوتا رہا۔ منج راجا کو تو شکست ہوئی لیکن چولا راج راجا نے چالوکیہ علاقہ کو تباہ و تاراج کرکے رکھ دیا۔ ان دونوں کی دشمنی آخری وقت تک جاری رہی۔ چالوکیہ خاندان کا سب سے بڑا راجا سومیشور اول (۱۰۴۲ — ۱۰۶۸ء) تھا اس نے شمال کی دو بڑی طاقتوں یعنی پارامروں اور گرجار پرتیہاروں پر بھی اپنی طاقت کا سکہ جما دیا تھا۔ سومیشور کی چولا راجاؤں سے ہمیشہ جنگیں ہوتی رہیں۔ اس اثنا میں سومیشور پر ایک لاعلاج مرض کا حملہ ہوا اور اس کی تاب نہ لاکر اس نے دریائے تنگ بھدرا میں گر کر خودکشی کرلی (۱۰۶۸ء) چالوکیہ راجا شیوائی اور ویرشیوائی (لنگایت) مذہب کی سرپرستی کرتے رہے۔ بارہویں صدی کے آخری زمانے میں ہوئسلا اور یادو راجا خود مختار ہوگئے اور چالوکیاؤں کا خاتمہ ہوگیا۔

چولا خاندان کا بانی وجے لایا، پالو راجاؤں کا باجگزار تھا اس نے ۸۵۰ء میں تنجور میں اپنا اقتدار قایم کیا۔ چند ہی دنوں میں اس کی ریاست چاروں طرف پھیلنے لگی جس کا نتیجہ ہوا کہ اسے پہلے راشٹر کوٹ سے پھر مینہ کھیڑ اور کلیانی کے چالوکیاؤں سے ٹکر لینی پڑی۔ راجو راجا اول (۹۸۶ — ۱۰۱۴ء)

نے سیلون تک سارے جنوب کا علاقہ فتح کر لیا۔ کلیانی پر زبردست فوج کشی کی اور وینگی کی چالوکیہ ریاست کو زیر کر کے مشرق میں کالنگا تک قبضہ کر لیا۔ عین اس وقت جبکہ چولا جنوب کو اپنے پیروں تلے روند رہے تھے شمال غزنویوں کے مسلسل حملوں کا شکار ہو رہا تھا۔

چولا راجا اچھے منتظم تھے۔ انہیں تعمیری سرگرمیوں اور تہذیبی امور سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ شیوائی مذہب کے پیرو تھے لیکن وشنوائی مت کے ساتھ بھی ان کا سلوک روادارانہ تھا۔ تنجور اور گنگائی کنڈا چولا پورم کے مندر انہیں کے تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ راج راجا چولا نے تعلیم کا بھی بہت اچھا انتظام کیا۔ اس نے ایک عظیم الشان کالج قایم کیا۔ چولا گنگم نامی وسیع تالاب بھی اسی نے تعمیر کروایا۔

ایک اور مشہور چولا راجہ راجندر کلوتنگا تھا (۱۰۷۰ — ۱۱۲۰ ء) یہ راجندر اوّل کا نواسہ تھا۔ اس کے دور حکومت میں وینگی اور کچھ دوسرے علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ تاہم نظم و نسق کے میدان میں اس کے کارنامے قابل تحسین ہیں۔ اس کے بعد کی نصف صدی تک بڑے ہی مذہبی راجاؤں کا دور رہا۔ انہوں نے بجاریوں کو خوب نوازا اور مندروں کو بڑے بڑے عطیے دیے۔ پانڈیہ اور ہویاسلا کے خود مختار ہونے کے بعد (۱۲۱۶ ء) جو چولا سلطنت کے باج گزار تھے۔ اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔

دیوگری کے یادو راجا

ناسک اور دیوگری کے درمیانی علاقے کا ایک سردار بھلم یادو جو کلیانی کے چالوکیہ خاندان کا باج گزار تھا، ۱۱۸۷ء میں آزاد ہوگیا دریائے کرشنا کے جنوب میں ہویاسلا اور مشرق میں ورنگل کے کاکتیہ اس کے حریف تھے۔ اسکے بعد یادو خاندان کا سب سے طاقتور راجا سنگھا (۱۲۱۰ — ۱۲۴۷ء) جس نے ایک وسیع علاقہ اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔

کاکتیہ

یہ کلیانی کے چالوکیہ راجاؤں کے باج گزار تھے لیکن جب آخر الذکر کی قوت گھٹ گئی تو پرولا دوم نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور گوداوری و کرشنا کے درمیانی علاقے کا راجا بن گیا۔ پرتاپ رُدر اوّل (۱۱۶۲ — ۱۱۹۵ء) نے ورنگل کی بنا ڈالی۔ کاکتیہ خاندان نے سنسکرت اور تلگو ادب کی سرپرستی کی۔

دوار سمندر کے ہویاسلا راجا

یہ گیارھویں صدی کے آخر تک راشٹر کوٹاؤں کے باج گزار تھے۔ چولا اور چالوکیہ راجاؤں کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر بلّال (۱۱۰۰ — ۱۱۰۶ء) خود مختار ہوگیا اور بیلور (ریاست میسور) کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ اسکے بعد کے حکمران وشنو وردھن (۱۱۱۱ — ۱۱۴۱ء) نے اپنی ریاست کو بہت پھیلایا جس کے حدود بعد میں کرشنا تک چلے گئے۔ بارھویں صدی اور اس کے بعد بھی دکن کی تاریخ میں ہویاسلا اقتدار کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔

گرجار پرتیہار

راشٹر کوٹاؤں کے حملوں کی وجہ سے گرجار پرتیہاروں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر چانڈال، کلاچوری کے، پارم ورا اور سولانکی بھی خود مختار ہوگئے جو کسی زمانے میں ان کے باج گزار تھے۔

انہلوار (جسے مسلم مورخ نہروال سے موسوم کرتے ہیں) کے سولانکی خاندان کا بانی مُلراج اوّل (۹۶۱ — ۹۹۶ ء) تھا جو اپنے پڑوسی ملکوں سے ہمیشہ لڑتا رہا۔

سومناتھ پر محمود غزنوی کا حملہ ۱۰۲۶ء بھیم سولانکی (۱۰۲۲ — ۱۰۶۴ء) ہی کے زمانہ میں ہوا تھا۔ بھیم نے محمود کی پیش قدمی کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن اس کی واپسی کے بعد اس نے مندر کو دوبارہ تعمیر کروایا بعد کے سولانکی راجا جین مت کو ماننے لگے تھے۔ کمار پال (۱۱۴۳ — ۱۱۷۲ء) نے ہیم چندر کے اثرات کے تحت گوشت کے لیے جانوروں کے کاٹے جانے اور شراب نوشی، جوا اور اسی طرح کی مذموم عادتوں پر سختی سے پابندی لگا رکھی تھی۔ لیکن اس کے جانشینوں کا سلوک جینیوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ آخری سولانکی راجا بھیم دیو دوم نے محمّد غوری کے حملے کو ناکام کر دیا تھا۔ لیکن بعد غوری سلطان کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۷ء میں انھل وارا فتح کر لیا۔

قنوج کے گاہڑوال راجا

جب ۱۰۹۰ء کے قریب پرتیہار اقتدار کو زوال آیا تو گاہڑوال قبیلہ کے چندر دیو نے گدی پر قبضہ کر لیا اور ایودھیا اور وارانسی کو بھی اس نے اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔ گاہڑوال راجاؤں کی سلطنت بہار سے لے کر دہلی تک پھیل گئی جہاں ان کا تصادم پال اور چوہان راجاؤں سے ہوا۔ اور جنوب میں مالوا، گجرات اور چیدی سے ان کا مقابلہ ہوا۔ لیکن جاجا بھگتی کے چانڈالوں سے ان کے تعلقات اچھے تھے گاہڑوال راجا برہمنیت کے پیرو تھے۔ بارھویں صدی کے آخر میں ترک حملوں کے سیلاب نے بالآخر ان کا خاتمہ کر دیا۔

چوہان راجا

چاہوان یا چوہان سرداروں نے آٹھویں صدی کے آخر میں سامبھر (شکمبھری) کے قریب ایک چھوٹے سے علاقہ پر اپنا اقتدار جمایا تھا۔ گیارھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے اجے دیو چوہان نے اجمیر شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشین انل دیو چوہان نے اجمیر کے قریب اناساگر تعمیر کیا۔ اس کے بعد کے راجا وگرہ راج چہارم (بسال دیو) نے تومروں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ وہ خود بھی ایک بڑا شاعر تھا اور اہلِ علم کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ ۱۱۵۳ء میں اس نے اجمیر میں ایک بڑا سنسکرت کالج قایم کیا۔

اس خاندان کا سب سے بڑا راجا پرتھوی راج چوہان سوم (۱۱۷۲ — ۱۱۹۳ء) سمجھا جاتا ہے — اس کے کارناموں کا تذکرہ پرتھوی راج کے درباری شاعر چند بردائی نے اپنی تصنیف پرتھوی راج رسو میں کیا ہے۔ بے مثال شجاعت اور بہادری کے باوجود اسے ترک حملہ آوروں کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ۱۱۹۳ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

گیارھویں صدی کے پہلے حصے میں بنگال اور بہار کے سین راجا پال خاندان کے جانشین بن گئے۔ سین خاندان کا بانی کرناٹک کا ایک برہمن سامنت سین تھا۔ اسی گھرانہ کا ایک طاقتور راجا بلال سین تھا جس نے پال خاندان کا خاتمہ کر دیا اور بہار تک اپنی سلطنت کے حدود وسیع کر لیے لیکن ۱۲۰۴ء میں بختیار خلجی کے بیٹے نے لکشمن سین کو شکست دے دی۔ سین راجا بڑے ہی کٹر وشنوائی تھے۔ انہوں نے بدھ مت والوں پر بہت مظالم کیے۔ بنگال میں کلن (Kulinism) کی مذموم رسم

کو پھیلانے میں انہی کا ہاتھ تھا۔

چانڈال یہ خاندان جمنا کے جنوب میں برسرِ اقتدار تھا۔ نویں صدی میں بندیل کھنڈ کے علاقے میں خود مختار ہوگیا اس نے پہلے حکمراں کی مناسبت سے اس علاقہ کو جے جاکبھکتی کا نام دیا۔ اس خاندان کے بعض راجا بڑے ہی بہادر اور قابل سپہ سالار گزرے ہیں۔ محمود غزنوی سے بھی انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اس خاندان کے الہا اور اودل (Alha-Udal) بھائی بہادری کے لیے مشہور تھے جنہیں ۱۱۸۲ء میں پرتھوی راج چوہان نے شکست دی۔ ۱۲۰۳ء میں کلنجار پر ایبک کے قبضہ کے بعد ان کی خود مختاری ختم ہوگئی۔

کلاچری جبل پور کے قریب تیوار (ترپوری) ان کی راجدھانی تھا وہ اپنے آپ کو عہدِ قدیم کے ہیہیاس (Hai Hayas) کے جانشین تصور کرتے تھے دوسرے ہمعصر راجاؤں کی طرح ان کی بھی پارامو، پال اور چانڈال حکمرانوں سے برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اموگنیہ دیو (۱۰۳۰–۱۰۴۱ء) اور اس کا لڑکا لکشمی کرن (۱۰۴۱ —— ۱۰۷۱ء) اس سلسلہ کے سب سے طاقت ور راجا تھے۔ لکشمی کرن کے خاندان کو تیزی سے زوال آگیا۔ اور تیرہویں صدی کے آخر میں سلاطین دہلی نے اس ریاست کو اپنے علاقہ میں ضم کرلیا۔

پارامو اس خاندان میں اس کے چوتھے حکمراں سنری ہرش (۹۴۳ء–۹۷۴ء) کے زمانے میں شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی حکومت مالوہ (دھر نگری) میں قایم تھی۔ اس کے لڑکے وکپتی راج منج کو علم وادب اور تہذیبی امور سے بڑی دل چسپی تھی۔ منج کے بعد اس سلسلہ کا سب سے مشہور راجا بھوج (۱۰۱۰ —— ۱۰۵۰ء) گزرا ہے۔ منج اور بھوج دونوں سپہ گری اور فتوحات کے لیے بھی اتنے ہی مشہور ہیں جتنے فنون لطیفہ اور علم وادب کے سرپرست اور عالم ہونے کی حیثیت سے۔ تاہم یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انہیں اپنے ملک کے مقدس مندروں کو محمود غزنوی کے مسلسل حملوں سے بچانے کا کبھی خیال نہیں آیا اور نہ انہوں نے ترکوں کے طاقتور حملوں کے خلاف اپنے ملک کی مدافعت کے لیے دوسرے راجاؤں کا کوئی متحدہ محاذ بنایا۔ بھوج کئی علوم کا ماہر تھا اور کہا جاتا ہے کہ سائنس اور آرٹ کے مختلف موضوعات پر اس نے کم سے کم ۲۵ نہایت ہی عالمانہ کتابیں لکھی تھیں بھوج کے بعد پارامو خاندان کو زوال آگیا۔

تاریخ ہندوستان
(عہدِ وسطیٰ)
۱۲۰۰ — ۱۷۶۱ء

تمہید اس مضمون کا موضوع جغرافیائی اعتبار سے غیر منقسم ہندوستان اور تاریخی اعتبار سے ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک کی حکومت کی ابتدا سے ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات تک، اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے سلاطین دہلی مغل شہنشاہ اور شمالی اور جنوبی ہند کی مختلف سلطنتوں کی سیاسی اور سماجی ہیئت سے متعلق ہے۔

اس مضمون کا مقصد سلاطین دہلی کے تین سو سالہ دور کے تعلق سے یہ بتانا ہے کہ ان سلاطین نے اپنے دورِ حکومت میں کیا نئی اصلاحیں اور تجربے کیے اور ملک کی تعمیر نو کے عظیم کام میں اکبر کو کس حد تک ان کی کارگزاریوں سے مدد ملی۔

ہندوستان کی دوسری سلطنتوں کے تعلق سے جن میں دکن کی بہمنی سلطنت، سلطنت وجیانگر اور مراٹھا سلطنت قابل ذکر ہیں ان کی سیاسی اور تمدنی سرگرمیوں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قومیتوں کے اختلاف کے باوجود ان سلطنتوں میں تہذیبی امتزاج کس طرح پروان چڑھا۔

جہاں تک مغلوں کا تعلق ہے اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کے انتظامی اداروں کا دورِ جدید کے اداروں سے کوئی موازنہ مقصود نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہی ہے کہ اس دور میں نظم ونسق کی خوبیوں کو محض اس لیے رد نہیں کرنا چاہیے کہ اس میں جدید اقدار کی کمی پائی جاتی ہے۔

مسائل کے نتائج اخذ کرنے میں تمام تر توجہ اس امر پر مرکوز رکھی گئی ہے کہ واقعات کو ان کی اصلی ترتیب میں رکھا جائے اور محض نظری بنیاد پر کوئی رائے نہ قائم کی جائے۔

سلاطین دہلی
(۱۲۰۶ء – ۱۵۲۶ء)

ساتویں صدی کے وسط میں سندھ کے علاقہ پر عربوں کا تسلط شروع ہوا لیکن دیر پا نہ رہا۔ نویں صدی عیسوی (۸۷۱ء) میں یعقوب بن لیث نے آزاد سندھ کی سلطنت قائم کی اور خلفائے بغداد سے اپنا تعلق منقطع کرلیا۔ محمود غزنوی (۹۹۸– ۱۰۳۰ء) کے حملوں نے یہ بات واضح کردی کہ ہندوستان ایک عظیم ملک ہونے کے باوجود اس کی سرحدیں غیر محفوظ تھیں۔ بارھویں صدی کے ختم پر محمود کے جانشینوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ترکمان قبیلہ غز کے محمد غوری نے دہلی پر تسلط جمانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

دہلی پر قبضہ ہونے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کی حکومت باقاعدہ شروع ہوگئی اور تیزی سے پھیلنے لگی۔ ۱۲۰۶ء میں جب محمد غوری قتل ہوا اور اس کا نائب قطب الدین ایبک ہندوستان میں حکمراں بنا (۱۱۹۳–۱۲۰۶ء) تو بہت سے شہر اور فوجی اہمیت کے مقامات ترکوں کے تسلط میں آچکے تھے۔

۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پانچ خاندانوں نے دہلی پر حکومت کی۔ (۱) البری ترک (۱۲۰۶ – ۱۲۹۰ء)، (۲) خلجی (۱۲۹۰ – ۱۳۲۰ء)، (۳) تغلق (۱۳۲۰ – ۱۴۱۳ء)، (۴) سید (۱۴۱۴ – ۱۴۵۱ء)، (۵) لودی (۱۴۵۱ – ۱۵۲۶ء)

البری ترک (خاندان غلامان)
(۱۲۰۶ء - ۱۲۹۰ء)

خاکہ : (۱) قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ - ۱۲۱۰ء)' (۲) آرام شاہ (۱۲۱۰)' (۳) شمس الدین التمش (۱۲۱۱ - ۱۲۳۶ء)' (۴) رضیہ (۱۲۳۶ - ۱۲۴۰ء)' (۵) بہرام (۱۲۴۰ - ۱۲۴۲ء)' (۶) علاءالدین مسعود (۱۲۴۲ - ۱۲۴۶ء)' (۷) ناصرالدین محمود (۱۲۴۶ - ۱۲۶۶ء)' (۸) غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء)' (۹) کیخسرو (۱۲۸۷ء)' (۱۰) کیقباد (۱۲۸۸ - ۱۲۹۰ء)

قطب الدین ایبک
(۱۲۰۶ء - ۱۲۱۰ء)

۱۲۰۶ء میں اپنے مالک محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک دہلی کا پہلا سلطان بنا۔ اس نے ملک کا انتظام خوبی سے انجام دیا اور عوام کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کیا۔ اپنی سخاوت کی بنا پر وہ لک بخش کہلانے لگا۔

شمس الدین التمش
(۱۲۱۱ء - ۱۲۳۶ء)

۱۲۱۰ء میں ایبک کی وفات پر آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ غالباً امیروں کا انتخاب تھا جو غلط ثابت ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں امیروں نے آرام شاہ کو ہٹا کر قطب الدین ایبک کے غلام التمش کو جو بدایوں کا گورنر تھا، تخت پر بٹھا دیا۔ بہت سے ترک امیروں نے شمس الدین کے عروج کی مخالفت کی لیکن شمس الدین نے انھیں مطیع کر لیا اور انھیں اہم عہدوں سے سبکدوش کر کے ان کی جگہوں پر اپنے معتمد امرار کو جنھیں "ترکان چہل گانی" کہا جاتا تھا مامور کیا۔

۱۲۲۱ء میں سلطنت پہلی بار چنگیز کے حملہ کے خطرہ سے دوچار ہوئی۔ منگول سردار خوارزم کے شاہزادہ جلال الدین منگیرنی کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے سندھ تک پہنچ گیا لیکن التمش نے بڑی دوراندیشی سے کام لے کر جلال الدین کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور اس طرح نوخیز ترکی سلطنت کو چنگیز کی دسترس سے بچا لیا۔

۱۲۲۵ء میں صوبہ بنگال ۱۲۲۶ء میں رنتھمبور اور ۱۲۳۲ء میں گوالیار فتح کیا۔ خلیفہ بغداد نے اسے خطاب سے سرفراز کیا جس سے اس کا موقف اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس نے عربی عبارت کے سکے رائج کیے۔ اس کی تعمیرات میں سامی اثرات نمایاں تھے۔ قطب الدین ایبک نے قوت اسلام نام کی جو مسجد بنوائی تھی۔ التمش نے اس کی چار دیواری اور مشہور عالم قطب مینار تعمیر کیا۔ قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور التمش نے اسے مستحکم کیا۔

رضیہ سلطان
(۱۲۳۶ء - ۱۲۴۰ء)

التمش نے اپنی وفات سے پیشتر اپریل ۱۲۳۶ء میں اپنی لائق لڑکی کو اپنے لڑکوں کے مقابلے میں جانشین نامزد کر دیا۔ لڑکوں کی موجودگی میں لڑکی کو جانشین نامزد کرنا نئی اور انوکھی بات تھی۔ اس کی مثال نہ تاریخ اسلام میں ملتی ہے اور نہ ہندوستان کی تاریخ میں۔ رضیہ کو نامزد کر کے التمش نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت میں موروثی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ ان وجوہات کی بنا پر رضیہ کی نامزدگی ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ نومبر ۱۲۳۶ء میں رضیہ تخت نشین ہوئی۔ اس نے امرائے چہلگانی کے باغی سرداروں کے خلاف خود کمان سنبھالی لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر ۱۲۴۰ء میں اسے مار ڈالا گیا۔ منہاج الدین سراج' معاصر مورخ نے اسے ایک بڑی ملکہ' دانش مند' انصاف پسند' علم پرور اور شجیع بتایا ہے۔

ناصرالدین محمود
(۱۲۴۶ء - ۱۲۶۶ء)

رضیہ کے زوال کے بعد دو کمزور سلاطین بہرام (۱۲۴۰ - ۱۲۴۲ء) اور علاءالدین مسعود (۱۲۴۲ - ۱۲۴۶ء) کے بعد ۱۰ جون ۱۲۴۶ء کو ناصرالدین محمود جو التمش کا چھوٹا لڑکا تھا تخت نشین ہوا۔ یہ ایک امن پسند سلطان تھا اور اس نے اپنے اختیارات اپنے وزیر اعلیٰ بلبن کے سپرد کر دیے تھے۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے بلبن سلطنت کا ایک مستحکم ستون تھا اور اس نے بنگال اور سندھ کے باغی گورنروں کی سرکوبی کی اور منگولوں کو جو پنجاب میں (۱۲۵۷ء) داخل ہو گئے تھے، شکست دی۔ ناصرالدین کی وفات پر چوں کہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی' اس لیے امرار کی رضامندی سے' بلبن تخت نشین ہوا۔

غیاث الدین بلبن
(۱۲۶۶ء - ۱۲۸۷ء)

سلطان بلبن نے نہایت جانفشانی سے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ امرار کے طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیا اور رفتہ رفتہ ان کی طاقت کچل دی۔ ایک مؤثر جاسوسی تنظیم کی مدد سے اس نے بڑوں اور چھوٹوں کے دلوں میں تخت و تاج کا رعب قائم کر دیا۔ بلبن نے فوج کے مالیاتی امور کی اصلاح کی اور اسے کارگر بنا دیا۔ لیکن باوجود اعلیٰ درجہ کی فوج رکھنے کے اس نے نئے علاقے فتح کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اسے اپنی سلطنت مستحکم کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ ۱۲۸۵ء میں تمر (تامر) نے پنجاب پر حملہ کیا۔ سلطان کا بڑا بیٹا محمد مقابلے میں مارا گیا۔ محمد ایک جری سپاہی اور علم پرور شاہزادہ تھا اور تخت کے لیے بلبن نے اسے نامزد کیا تھا۔ اس کی وفات سے ضعیف باپ کو سخت صدمہ پہنچا اور جانشینی کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ۱۲۸۷ء میں وہ شکستہ دل فوت ہوا۔ بلبن کے انتقال کے بعد سلاطین دہلی کی نسبی امتیاز کی پالیسی ختم ہو گئی اور زمام حکومت ترک امرار کے بجائے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

خاندان البری کا اختتام
(۱۲۸۷ء - ۱۲۹۰ء)

غیاث الدین بلبن کے جانشین کمزور تھے۔ جلال الدین "عریض ممالک" وزیر جنگ۔ امرار کے طاقتور گروہ کا قائد بن گیا اور اس نے ترک امرار کو پسپا کر دیا۔ سلطان کیقباد کو اس کے محل ہی میں قتل کر دیا گیا جس کے بعد جلال الدین تخت نشین ہوا اور البری ترکوں کا دور حکومت (۱۲۹۰ء) میں ختم ہو گیا۔

خلجی خاندان
(۱۲۹۰ء - ۱۳۲۰ء)

خاکہ : (۱) جلال الدین خلجی (۱۲۹۰-۱۲۹۶ء) علاءالدین خلجی (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء)' قطب الدین مبارک (۱۳۱۶ - ۱۳۲۰ء) ناصرالدین خسرو شاہ (چار مہینہ ۱۳۲۰ء)

جلال الدین خلجی
(۱۲۹۰ء - ۱۲۹۶ء)

جلال الدین، خلجی خاندان کا بانی تھا۔ وہ ایک نیک خصلت سپاہی تھا۔ اس کا بھتیجا علاء الدین، جو کڑہ میں ملک چھجو کا جانشین ہوا تھا، ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ ۱۲۹۶ء کے آغاز میں وہ خفیہ طور پر دیوا گیری (دولت آباد) آ پہنچا۔ لڑائی میں راما چندرا دیوا کو شکست ہوئی۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ بے شمار دولت تھی۔ اس نے اپنے چچا جلال الدین کو کڑہ آنے کی دعوت دی۔ جب وہ کڑہ پہنچا تو ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء میں علاء الدین اسے قتل کر کے خود دہلی کا تخت نشین ہو گیا۔

علاء الدین خلجی
(۱۲۹۶ء - ۱۳۱۶ء)

۱۲۹۷ - ۱۲۹۹ء میں منگول سردار قادر خان اور اس کے بعد سلدی نے ہندوستان میں پیش قدمی کی لیکن ان کو شکست فاش ہوئی۔ ۱۲۹۹ء میں اس نے گجرات کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اسی سال دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ قتلغ خواجہ، منگول سردار نے پایۂ تخت دہلی پر یورش کی تو اسے پسپا کر دیا گیا۔ رنتھمبور کے راجہ نے ایک مقابلہ میں شاہی فوج کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ دہلی اور اودھ میں بغاوتیں برپا ہو گئیں۔ ۱۳۰۱ء میں علاء الدین نے خود رنتھمبور کی تسخیر کی اور ان بغاوتوں کے اسباب پر غور کیا اور بہت سی تدابیر اختیار کیں۔

سب سے پہلے اس نے امراء کے اقتدار پر وار کیا۔ ان کے آپسی میل جول پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ آراضیات جو بطور عطیات زمینداروں کو دی گئی تھیں واپس لے کر شریک خالصہ (دیوانی) کر لی گئیں۔ مال گزاری پیداوار کے پچاس فی صد تناسب سے عائد کی گئی۔

فوج میں اس نے چار لاکھ پچھتر ہزار سپاہی بھرتی کیے اور انھیں شاہی خزانہ سے تنخواہ دینے کا انتظام کیا۔ سپاہیوں کی حاضری اور اوقات کار کی پابندی کے لیے قواعد بنائے۔ گھوڑوں کی اچھی دیکھ بھال کا انتظام کیا۔ فوج کا تفصیلی معائنہ ضروری قرار دیا گیا۔ عام استعمال کی چیزوں مثلاً غلہ، کپڑا، گھوڑے اور گھریلو چیزوں کی قیمتوں کو گھٹا کر نئے سرے سے مقرر کیا اور مقررہ دام پر ان کی فروخت کا انتظام کیا۔ اس انتظام کو مؤثر بنانے کے لیے قواعد نرخ نامہ کی خلاف ورزی کرنے والے عہدیداروں اور تاجروں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔

۱۳۰۳ - ۱۳۰۵ء میں علاء الدین نے منگول حملہ آوروں کو پسپا کیا۔ ۱۳۰۸ء سے ۱۳۱۲ء کی مدت میں اس کے جنرل ملک کافور نے دکن کے راجاؤں کو شکست دی ان میں دیوا گیری کا یادوا، ورنگل کا کاتیا، دوارا سمدرا کا ہوئے سالا اور مدھورا کا پانڈیا شامل تھے۔

آخری دور میں اس نے ملک کافور کو اپنے بہت سے اختیارات دے دیے۔ لوگوں میں بے اطمینانی پھیل گئی اور بغاوتیں ہونے لگیں۔ ۱۳۱۶ء میں علاء الدین کا انتقال ہوا۔

علاء الدین کا دربار ارباب علم و فن سے بھرا رہتا تھا۔ امیر خسرو کی مشہور شخصیت بھی انہیں میں شامل تھی، وہ شاہی کتب خانہ کے ناظم تھے۔ اس کے زمانہ کی بعض تعمیرات فنی اعتبار سے ہندی اسلامی طرز تعمیر کے درخشندہ نمونے ہیں جن میں مشہور علائی دروازہ (قطب مینار کا گیٹ) شامل ہے۔ علاء الدین کے زمانہ میں ہندوستانی نژاد مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے دیے گئے۔ علاء الدین خلجی پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ہندوؤں کو بھی اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ملک نایک علاء الدین کا مشہور سپہ سالار تھا۔

قطب الدین مبارک خلجی
(۱۳۱۶ء - ۱۳۲۰ء)

۴ جنوری ۱۳۱۶ء کو علاء الدین کی وفات کے بعد انتشاری دور شروع ہوا اور بالآخر ستمبر ۱۳۲۰ء میں فوج کا سربراہ غازی ملک غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

تغلق خاندان
(۱۳۲۰ء - ۱۴۱۳ء)

خاکہ:- (۱) غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ - ۱۳۲۵ء) (۲) محمد تغلق (۱۳۲۵ - ۱۳۵۱ء) (۳) فیروز تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) (۴) غیاث الدین تغلق شاہ دوم (۱۳۸۹ء) (۵) ابوبکر (۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ء) (۶) ناصر الدین محمد (۱۳۹۰ - ۱۳۹۴ء) (۷) ہمایوں علاؤ الدین سکندر شاہ (مارچ تا جنوری ۱۳۹۴ء) (۸) ناصر الدین محمود (۱۳۹۴ - ۱۴۱۳ء)

غیاث الدین تغلق
(۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء)

تخت دہلی پر غازی ملک کا انتخاب ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس نے مردہ نظم و نسق میں جان ڈال دی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال اس نے اپنے لڑکے جونا خان کو پرتاپ رودر دیو کے خلاف دوبارہ ورنگل بھیجا جس نے ورنگل کو فتح کر کے تغلق سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۳۲۴ء میں سلطان نے بنگال پر فوج کشی کی اور وہاں کا نظم و نسق بحال کیا۔

اس نے جاگیروں سے تعلق از سر نو تحقیقات کی اور بہت سے جاگیری عطیات شریک خالصہ کر دیے۔ محصول مال گزاری کم کیا۔ زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ انصاف رسانی کو معیاری بنایا اور علم و فن کی سرپرستی کی۔

محمد تغلق
(۱۳۲۵ء - ۱۳۵۱ء)

۱۳۲۵ء میں جونا خان محمد تغلق کے لقب سے اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ تاریخ میں اس کی شخصیت بہت اہم لیکن نزاعی نوعیت کی ہے۔ تمام سلاطین میں جو دہلی کے تخت پر بیٹھے سب سے زیادہ عالم اور شائستہ تھا۔ وہ فنون لطیفہ کا شائق ہونے کے ساتھ فلسفہ میں بھی پاکیزہ ذوق رکھتا تھا اور ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ امور مملکت میں اس نے متعدد تجربے کیے لیکن غالباً اس کے تجربے وقت سے آگے تھے اور وہ ان تجربوں میں ناکام رہا۔

سلطان نے سب سے پہلے دوآب کے علاقہ میں زر مال گزاری کا تعین آراضی کی پیمائش اور اس کی نوعیت کی بنیاد پر کیا۔ یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے بجائے اس کے کہ زیادہ سے زیادہ زمین کو زیر کاشت لایا جائے اس بات پر زور دیا کہ پیداوار زمین کی ماہیت کو اعلیٰ بنایا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اس نے دوآب جیسے زرخیز علاقہ میں زر مال گزاری میں اضافہ کیا اور ساتھ ہی زمین کی پیداوار کی ماہیت

کو اعلیٰ بنانے کے لیے مقامی افسروں کو ہدایت دی کہ وہ ہر ممکن سہولت کاشتکاروں کو فراہم کریں۔ مگر افسر اس کی ہدایت پر عمل کرنے سے قاصر رہے۔ افسروں نے اضافہ شدہ مال گزاری کو وصول کرنے کی تو کوشش کی لیکن کاشتکاروں کو تقاوی وغیرہ جیسی سہولتیں فراہم نہ کر سکے۔ سوءِ اتفاق اسی دوران میں بارش کی کمی کی وجہ سے اور کاشتکاروں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں اپنی متوقع پیداوار بھی نہ مل سکی۔ وہ مال گزاری ادا کرنے کے لائق نہ تھے۔ اس وجہ سے کاشتکاروں نے بغاوت کر دی اور وہ اسکیم ناکام ہو گئی۔ محمد تغلق پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنے تجربہ کی روشنی میں دکن پر براہِ راست حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسی منصوبہ کے تحت اس نے دیوگری کو دہلی کے ساتھ ساتھ حکومت کا دوسرا مرکز قرار دیا۔ اس منصوبہ کو عمل میں لانے کے لیے اس نے دہلی سے تمام سرکاری دفاتر علما اور مشائخ کو دیوگری منتقل ہو جانیکا حکم دیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس نے دہلی کے جملہ عوام کو دیوگری منتقل ہونے کا حکم دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بادشاہ نے سفر میں سہولتیں پیدا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن طویل مسافت کے باعث منتقل ہونے والوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ منصوبہ پوری طرح ناکام نہیں رہا اور اس کے دوررس اثرات وجود میں آئے۔ جسے ہم دکن میں مسلم تہذیب کے فروغ کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ مزید برآں دکن میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا قایم ہونا جو کہ تقریباً چھ سو سال تک برقرار رہا۔ اسی منصوبہ کا نتیجہ ہے۔

یہ بھی محمد تغلق کی ذہنی استعداد کا نتیجہ تھا کہ اس نے تانبہ کے سکہ کو چاندی کے سکہ کی قدر قانونی دے کر ملک میں نافذ کیا۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن لوگوں نے تانبے کے سکے ڈھالنا شروع کر دیے اور بازار میں تانبہ کے جعلی سکوں کی افراط ہو گئی اور چاندی کے سکے غائب ہونے لگے۔ سلطان نے تانبہ کے ٹکسالی سکوں کے بدلے میں سونا اور چاندی دے دیا لیکن جعلی سکوں کو ٹکسال کے افسروں نے بدلنے سے انکار کر دیا۔

فوجی مہمات میں بھی محمد تغلق کا حالات نے ساتھ نہ دیا۔ اودھ، ملتان اور بنگال میں بغاوتیں ہوئیں۔ دکن اس کی گرفت سے جاتا رہا۔ ۱۳۳۶ء میں ہری ہرا اور اس کے بھائی بکا نے وجیا نگر کی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۳۴۷ء میں حسن نے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ان واقعات نے سلطان کی صحت پر اثر کیا اور ۲۰/مارچ ۱۳۵۱ء میں سندھ میں ٹھٹھا کے قریب موضع سوندا میں سلطان نے وفات پائی۔

محمد تغلق سیاسی امور میں سیکولر اقدار کا حامل تھا اور اس نے ہندوؤں کو اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ہندوؤں کے تیوہاروں میں شرکت بھی کی۔ سیکولر اقدار کو اپنانے میں اس کو اکبر کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے۔

فیروز تغلق (۱۳۵۱ء-۱۳۸۸ء) محمد تغلق کی وفات پر اس کا بھتیجا فیروز تخت نشین ہوا۔ اس نے ایسے بہت سے محصول جن کا شرعاً میں جواز نہ تھا منسوخ کر دیے۔ کسانوں کی حالت بہتر کرنے کی کوشش کی اور آب پاشی کی سہولتیں فراہم کیں۔ کسانوں کو تقاوی کی رقوم دیں اور باغات کثرت سے لگائے۔ اس نے علم و فن کی سرپرستی کی اور سنسکرت کی بعض اہم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

فیروز میں کمزوریاں بھی تھیں اس نے غیر مسلموں پر جزیہ عائد کیا۔ جاگیری نظام کو جسے علاء الدین نے منسوخ کر دیا تھا پھر سے رائج کیا اور فوج کی تنظیم اسی کی بنیاد پر کی۔

فیروز کے کمزور جانشین (۱۳۸۸ء - ۱۴۱۲ء) ۱۳۸۸ء میں فیروز تغلق کی وفات کے بعد خانہ جنگی کا دور شروع ہو گیا۔ آخری تاجدار ناصر الدین محمود نے ۱۴۱۲ء میں وفات پائی۔

تیموری حملے (۱۳۹۸ء) ۲۰/ستمبر ۱۳۹۸ء میں تیمور دریائے سندھ کو عبور کر کے دہلی پہنچا۔ ناصر الدین محمود نے شکست کھائی۔ تیمور نے دہلی میں لوٹ مار کی۔ ہندوستان میں اپنے مقبوضات خضر خان کے سپرد کیے۔ خضر خان نے سید خاندان کی بنیاد ڈالی اور دہلی کا بادشاہ ہوا۔

سید خاندان سید خاندان کے ۳۷ سالہ دور میں چار بادشاہ ہوئے: (۱) خضر خان (۱۴۱۴-۱۴۲۱ء)، (۲) مبارک شاہ (۱۴۲۱-۱۴۳۴ء)، (۳) محمد شاہ (۱۴۳۴-۱۴۴۵ء)، (۴) علاء الدین عالم (۱۴۴۵-۱۴۵۱ء) (۱۴۱۴ء-۱۴۵۱ء) آخری تاجدار بہلول لودی کے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا۔ اس طرح سلطنت افغانوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

لودی خاندان
(۱۴۵۱ء-۱۵۲۶ء)

خاکہ: (۱) بہلول لودی (۱۴۵۱-۱۴۸۹ء) (۲) سکندر لودی (۱۴۸۹-۱۵۱۷ء)، (۳) ابراہیم لودی (۱۵۱۷-۱۵۲۶ء)

بہلول لودی (۱۴۵۱ء-۱۴۸۹ء) بہلول نے ۱۴۸۴ء میں مشرقی سلطنت جون پور کا الحاق کیا۔ جب ۱۴۸۹ء میں وہ فوت ہوا تو اس کی سلطنت کے حدود پنجاب سے وارانسی تک پھیلے ہوئے تھے۔

عبد اللہ اپنی تاریخ 'داؤدی' میں کہتا ہے کہ جب کبھی لودی اپنے احباب کے ساتھ ہوتا تو تخت پر نہ بیٹھتا اور امرا کو بھی کھڑا ہونے سے منع کرتا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ امرا کے حلقہ میں مقبول ہو گیا۔ لیکن اس کی حیثیت بادشاہ سے گھٹ کر ایک قبائلی سردار کی ہو گئی۔

سکندر لودی (۱۴۸۹ء-۱۵۱۷ء) بہلول کے لڑکے اور جانشین، سکندر شاہ کو اٹھائیس سال کی خوش حال حکومت کا دور نصیب ہوا۔ اس نے جون پور اور دوسرے علاقوں کی شورشوں سے نمٹنے کے لیے آگرہ میں ۱۵۰۵ء میں نیا پایۂ تخت بنایا۔

سکندر خاندان لودی کا سب سے لائق حکمراں تھا۔ اس نے افغان امیروں کو قابو میں رکھا۔ زراعت کو ترقی دی۔ اس کے دور میں غلہ اور دوسری اجناس سستی تھیں اور باشندے مطمئن۔ اہل علم کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برتی گئی۔ سکندر خود ایک شاعر تھا اور موسیقی کا دلدادہ۔ وہ بڑا انصاف پسند تھا اور غریب لوگوں کی شکایت کی سماعت خود کرتا تھا۔ لیکن عمر کے آخری حصہ میں اس نے ایسے کام کیے جو مذہبی رواداری کے خلاف تھے۔

ابراہیم لودی (۱۵۱۷ء – ۱۵۲۶ء)

۱۵۱۷ء میں سکندر لودی کی وفات کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا اس میں فوجی مہارت تھی لیکن اعتدال پسندی سے عاری تھا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کے سردار دولت خان نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ بابر نے ہندوستان پر حملہ کا پہلے ہی منصوبہ تیار کر رکھا تھا اور ۱۵۱۹ء کے بعد سے سرحدی علاقوں پر کئی دھاوے کیے تھے۔ ۱۵۲۵ء میں اس نے دہلی کا رخ کیا ابراہیم لودی اس کے مقابلے کے لیے بڑھا اور ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں ایک خوں ریز جنگ ہوئی۔ ابراہیم پسپا ہوا اور مارا گیا۔ بابر نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کیا اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔

سلاطین دہلی کے زوال کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ انھوں نے دندھیاچل کے جنوب کے علاقے فتح کیے لیکن ان دور دراز علاقوں پر اقتدار باقی رکھنا محال تھا۔ سیاسی سبب یہ تھا کہ علاء الدین خلجی کی پالیسی کے خلاف فیروز تغلق اور اس کے جانشینوں نے جاگیرداروں کی جاگیریں بحال کر دیں۔ اسی طرح لودیوں نے قبائلی سرداروں کو قوی کر دیا۔ ان جاگیرداروں سے تخت و تاج کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ سلاطین دہلی کی ایک کمزوری یہ تھی کہ شمال مغرب میں یہ بادشاہ اپنی حکومت کی کوئی محکم سرحد مقرر نہیں کر سکے۔ شمال مغرب سے حملوں کا تانتا بندھ گیا۔

سلاطین دہلی کا نظم و نسق

مرکزی حکومت سلاطین دہلی کی حکومت آزاد مطلق العنان تھی۔ نظم و نسق کا سرچشمہ سلطان تھا۔ وہ فوج کا کمانڈر اعلیٰ ہوتا تھا اور عدل و انصاف کی آخری عدالت بھی۔ ان سلاطین کی ایک مشاورتی مجلس ہوتی تھی۔ دربار کا نام 'بار خاص' تھا جس میں خان ملک اور امیروں کے علاوہ تمام درباری بھی شریک ہوتے تھے۔ دربار عام میں مقدمات کی سماعت ہوتی تھی اور داد رسی چاہنے والوں کے ساتھ انصاف کیا جاتا تھا۔

مرکزی حکومت میں حسب ذیل عہدیدار تھے: (۱) وزیر جو سب سے اعلیٰ عہدیدار تھا۔ (۲) دیوانِ رسالت، جو محکمہ مرافعہ کا سربراہ تھا، (۳) دیوانِ عرض، محکمہ فوج کا سربراہ تھا، (۴) دیوانِ انشار، اس سے شاہی مراسلت متعلق تھی (۵) دیوان قضائے ممالک، محکمہ عدالت، خبر رسانی اور ڈاک (۶) دیوانِ امیر کوہی، یعنی محکمہ زراعت (جسے محمد تغلق نے قائم کیا) (۷) دیوان مستخراج (اسے علاء الدین نے قائم کیا) بقایائے مال گزاری وغیرہ اس سے متعلق تھے (۸) دیوانِ خیرات یعنی امور مذہبی (۹) دیوان استحقاق یعنی وظیفہ یابوں کا محکمہ۔ اس کے علاوہ ٹکسال یا دارالضرب اور کارخانہ جات پر دیوان ہوتے تھے۔ دیوان اور اس کے نائبین کے علاوہ محکموں میں مختلف عہدہ دار تھے۔ شہری پولس کوتوال کے تحت تھی۔ محتسب، اوزان و پیمانہ جات اور لوگوں کے اخلاق و کردار کا نگراں تھا۔

اقتصادی حالات نظم و نسق کا ایک اہم صیغہ کارخانوں سے متعلق تھا جس میں بعض اوقات چار ہزار بُن کر ریشم کا کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ صنعت کار تھے جو اکثر اپنا مال براہِ راست تاجروں کو فراہم کرتے تھے۔ زراعت ملک کے باشندوں کا سب سے بڑا پیشہ تھا۔ شہروں اور دیہاتوں میں بعض اہم صنعتیں زراعت پر مبنی تھیں۔ ان میں کپڑے کی صنعت میں سوتی کپڑے، ریشمی کپڑے، اونی کپڑے نیز کپڑوں کی رنگ ریزی اور چھاپ شامل تھیں۔ اس کے علاوہ کپڑے کی صنعت، دھاتوں کی صنعت، کاغذ کی صنعت، چینی کے برتن، جوتوں کی صنعت، ہتھیار کی صنعت، عطر اور شراب وغیرہ کی صنعتیں تھیں۔ بنگال اور گجرات میں بنے ہوئے کپڑے برآمد کیے جاتے تھے۔ سمندری راستے سے یورپ کے دور دراز علاقوں سے تجارتی تعلق قائم تھا۔ ملایا اور چین اور دوسرے مشرقی ملکوں کے ساتھ ہندوستان تجارتی روابط سے جڑا ہوا تھا۔ خشکی کے راستے وسط ایشیا، افغانستان، فارس، تبت اور بھوٹان سے آمد و رفت قائم تھی مالدار طبقوں کے لیے سامان تعیش کے علاوہ گھوڑے اور خچر درآمد ہوتے تھے۔ برآمدات میں زراعتی سامان، پارچہ جات، افیون، گانجہ وغیرہ شامل تھے۔ خلیج فارس کے بعض ممالک خوراک کے لیے ہندوستان کے دست نگر تھے۔

دیہات معاشی اعتبار سے خود کفیل تھے اور ان کی محدود ضروریات کی تکمیل مقامی طور پر ہو جاتی تھی۔ مرکز میں جو سیاسی انقلاب یا سازشیں ہوتیں اس سے گاؤں والوں کے اپنے کاروبار زندگی غیر متاثر رہتے۔

حصہ دوم

شمالی ہند کی ریاستیں

مالوہ (۱۴۰۱ء – ۱۵۶۲ء) خاکہ: (۱) دلاور خاں (۱۴۰۱-۱۴۰۶ء)، (۲) الپ خان ہوشنگ شاہ (۱۴۰۶-۱۴۳۵ء)، (۳) محمد شاہ غوری (۱۴۳۵-۱۴۳۶ء) (۴) محمود خلجی (۱۴۳۶-۱۴۶۹ء)، (۵) محمد شاہ سلطان غیاث الدین (۱۴۶۹ء – ۱۵۰۰ء)، (۶) ناصر شاہ (۱۵۰۰ – ۱۵۱۰ء)، (۷) محمود خلجی دوم (۱۵۱۰-۱۵۳۱ء)، (۸) بایزید باز بہادر (۱۵۵۶-۱۵۶۲ء)

۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے کے بعد انتشاری صورت حال سے فائدہ اٹھا کر دلاور خان غوری گورنر مالوہ کسی رسمی اعلان کے بغیر حکمرانی کرنے لگا۔ (۱۴۰۱ء) اس کی سلطنت کے آٹھ بادشاہ ہوئے۔ ان میں سے خاص کر محمود خلجی کے زمانہ میں رعایا خوش حال تھی اور آپس میں بھائی چارگی کے تعلقات تھے۔ ۱۵۶۲ء میں اکبر نے مالوہ کو میان بایزید بہادر سے چھین کر مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔

جون پور (۱۳۸۹ء – ۱۴۸۴ء) خاکہ: (۱) ملک سرور خواجہ جہاں ملک الشرق (۱۳۸۹-۱۳۹۹ء)، (۲) مبارک شاہ (۱۳۹۹-۱۴۰۱ء)،

(۳) ابراہیم شاہ شمس الدین ابراہیم (۱۴۰۱ - ۱۴۴۰ء)
(۴) محمود شاہ (۱۴۴۰ - ۱۴۵۷ء)، (۵) حسین شاہ (۱۴۵۷ - ۱۴۸۴ء)

۱۳۸۹ء میں ملک سرور نے جو سلطان دہلی کا غلام تھا خواجہ جہان کا لقب اختیار کر کے تیمور کے حملہ کے انتشاری دور میں جون پور کی شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ آخری سلطان حسین شاہ سے سکندر لودھی نے جون پور کو فتح کر لیا۔ (۱۴۸۴ء) اور اس طرح شرقی خاندان ختم ہوا۔

گجرات (۱۴۰۷ء - ۱۵۷۲ء)

خاکہ: مظفری خاندان (۱۴۰۷ - ۱۵۷۲ء)
(۱) ظفر خان سلطان مظفر شاہ (۱۴۰۷ء)، (۲) احمد شاہ اول (۱۴۱۱ - ۱۴۴۲ء)، (۳) محمود اوّل بیگرا (۱۴۵۹ - ۱۵۱۱ء)، (۴) بہادر شاہ (۱۵۲۶ - ۱۵۳۷ء) (۵) چار کمزور بادشاہ ہوئے، (۶) مظفر سوم (۱۵۷۳ء)

محمود اوّل یا محمود بیگرا (۱۴۵۹ء - ۱۵۱۱ء)

احمد شاہ کا پوتا تھا۔ یہ گجرات کا سب سے بڑا سلطان گزرا ہے۔ اس نے مصر سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مصر سے بحرۂ احمر کے راستہ ہندوستان کو آنے جانے والی اشیاء تجارت پر نگرانی قائم کی جائے۔ کیوں کہ اس اہم کاروبار پر پرتگالیوں نے اجارہ داری حاصل کر لی تھی۔ ۱۵۱۱ء میں محمود بیگرا کی وفات سے اس خاندان کا زوال شروع ہوا۔ آخری سلطان مظفر سوم تھا۔ اکبر نے اس کے زمانہ میں گجرات کا الحاق کیا۔

سندھ

سندھ میں جم خاندان کے پندرہ بادشاہ ہوئے۔ جام نظام سب سے بڑا سلطان تھا۔ ۱۵۹۱ء میں سندھ مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

ملتان

لنکاہ خاندان (۱۴۴۵ء - ۱۵۲۷ء)

رے سہرا نے سلطان قطب الدین کے لقب کے ساتھ لنکاہ خاندان کی بنا ڈالی۔ ۱۵۲۷ء میں سندھ کے ارغون شاہ حسین نے ملتان پر قبضہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیر شاہ کے ہاتھوں سے نکل کر مغل حکومت کے دوبارہ قیام پر ملتان مغلوں کا ایک صوبہ بن گیا۔

خاندیش

فاروقی خاندان (۱۳۸۲ء - ۱۶۰۱ء)

خاکہ: (۱) ملک راجہ (۱۳۸۲ - ۱۳۹۹ء) (۲) ناصر خاں (۱۳۹۹ - ۱۴۳۷ء)، (۳) میران عادل خان، (۴) میران مبارک خان (۱۴۴۱ - ۱۴۵۷ء)، (۵) عادل خان دوم (۱۴۵۷ - ۱۵۰۱ء)، (۶) داؤد خان (۱۵۰۱ - ۱۵۰۸ء)، (۷) عادل خان سوم (۱۵۰۸ - ۱۵۲۰ء)، (۸) میران محمد اول (۱۵۲۰ - ۱۵۳۷ء)، (۹) مرزا مبارک شاہ دوم (۱۵۳۷ - ۱۵۶۶ء)، (۱۰) محمد شاہ دوم (۱۵۶۶ - ۱۵۷۶ء)، (۱۱) حسن خان (۱۵۷۶ء)، (۱۲) راجہ علی خاں عادل شاہ چہارم (۱۵۷۶ - ۱۵۹۷ء) (۱۳) بہادر شاہ (۱۵۹۷ - ۱۶۰۱ء)۔

خان جہاں فاروقی کے لڑکے ملک راجہ نے جس کی علاء الدین اور محمد تغلق کے زمانے میں ایک ممتاز شخصیت تھی، خاندیش کے فاروقی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ ۱۳۷۰ء میں اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آخری تاجدار بہادر خان کو گرفتار کر کے ۱۶۰۱ء میں اکبر نے خاندیش کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔

بنگال (۱۲۹۱ء - ۱۵۷۵ء)

خاکہ: (۱) رکن الدین کیکاوس (۱۲۹۱ - ۱۳۰۰ء)، (۲) شمس الدین فیروز شاہ (۱۳۰۱ - ۱۳۲۲ء)، (۳) غیاث الدین بہادر (۱۳۲۲ - ۱۳۲۴ء)، (۴) ناصر الدین (۱۳۲۴ - ۱۳۲۸ء)، (۵) غیاث الدین بہادر دوم (۱۳۲۸ - (۶) فخر الدین مبارک شاہ (۱۳۳۹ء)، (۷) علاء الدین علی شاہ (۱۳۳۹ - ۱۳۴۲ء)، (۸) اختیار الدین غازی شاہ (۱۳۴۲ء)

الیاس سلاطین

(۹) الیاس شاہ، شمس الدین الیاس (۱۳۴۲ - ۱۴۱۵ء)، (۱۰) راجہ گیش شاہ (۱۴۱۵ء)۔
(۱۱) جلال الدین محمد شاہ (۱۴۳۱ء)، (۱۲) احمد شاہ (۱۴۳۱ - ۱۴۳۵ء)
(۱۳) ناصر الدین محمود (۱۴۴۲ - ۱۴۵۹ء)

حبشی سلاطین (تین کمزور سلاطین)

(۱۴۸۷ء - ۱۴۹۳ء)

(۱۴) سید حسین علاء الدین شاہ (۱۴۹۳ - ۱۵۱۹ء) (۱۵) نصرت شاہ (۱۵۳۲ء) (۱۶ اور ۱۷) فیروز شاہ اور اس کا بھائی (۱۸) محمود شاہ (۱۵۳۹ء)

سوری خاندان

(۱۹) خضر خان (۱۵۶۴ء)، (۲۰) سلیمان کرانی (۱۵۶۴ - ۱۵۷۲ء)
(۲۱) داؤد کرانی (۱۵۷۲ - ۱۵۷۵ء)۔

حسین شاہ (۱۴۹۳ - ۱۵۱۹ء) کا زمانہ بنگالی ادب کی ترقی کے لیے مشہور ہے مغل سپہ سالار خان جہان حسین قلی خان نے آخری سلطان داؤد کرانی کو ۱۵۷۵ء میں شکست دے کر بنگال کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔

کشمیر (۱۳۰۱ء - ۱۵۸۶ء)

خاکہ: (۱) سوہا دیوا (۱۳۰۱ - ۱۳۲۰ء)، (۲) رینچنا (۱۳۲۰ء)، (۳) اودیانا (۱۳۳۸ء)، (۴) کوٹا دیوی (۱۳۳۸ء)، (۵) شاہ میر شمس الدین (۱۳۴۲ء)، (۶) جمشید (۱۳۴۲ء)، (۷) علی شیر علاء الدین (۱۳۴۳ - ۱۳۵۴ء)، (۸) شیراشامک سلطان شہاب الدین (۱۳۵۴ - ۱۳۷۳ء)، (۹) ہنڈال قطب الدین (۱۳۷۳ - ۱۳۸۹ء)، (۱۰) سکندر (۱۳۸۹ - ۱۴۱۳ء)، (۱۱) علی شاہ (۱۴۱۳ء)، (۱۲) شاہ خان زین العابدین (۱۴۲۰ - ۱۴۷۰ء)، (۱۳) حاجی خان سلطان حیدر شاہ (۱۴۷۰ - ۱۴۷۲ء)۔ اس کے بعد چک خاندان نے حکومت کی (۱۵۶۱ - ۱۵۸۶ء)

زین العابدین (۱۴۲۰ء - ۱۴۷۰ء)

کشمیر کے تمام بادشاہوں میں زین العابدین سب سے زیادہ روشن خیال حاکم تھا۔ اس

نے مذہب کی سختیاں کم کر دیں۔ پنچایتوں کی ذمہ داری اور اختیار کو بڑھایا۔ محصولات کا بوجھ ہلکا کیا۔ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء کی قیمتیں مقرر کیں۔ ملک کے سکوں کو معیاری بنایا۔ اس نے مہابھارت اور راج ترنگینی کا سنسکرت سے فارسی میں اور بہت سی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ ۱۵۸۶ء میں اکبر نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جنوبی ہند کی سلطنتیں

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء-۱۵۳۸ء

بہمنی خاندان خاکہ: (۱) علاءالدین حسن بہمن شاہ (۱۳۴۷-۱۳۵۸ء)، (۲) محمد اول (۱۳۵۸-۱۳۷۵ء)، (۳) علاءالدین مجاہد (۱۳۷۵-۱۳۷۸ء)، (۴) داؤد اول (۱۳۷۸-۱۳۷۸ء) (۵) محمد دوم (۱۳۷۸-۱۳۹۷ء)، (۶) غیاث الدین تہمتن (۱۳۹۷-۱۳۹۷ء) (۷) شمس الدین داؤد اول (۱۳۹۷ء)، (۸) تاج الدین فیروز (۱۳۹۷-۱۴۲۲ء)، (۹) شہاب الدین احمد اول (۱۴۲۲-۱۴۳۶ء)، (۱۰) علاءالدین احمد دوم (۱۴۳۶-۱۴۵۸ء)، (۱۱) علاءالدین ہمایوں (۱۴۵۸-۱۴۶۱ء)، (۱۲) نظام الدین احمد سوم (۱۴۶۱-۱۴۶۳ء)، (۱۳) شمس الدین محمد سوم (۱۴۶۳-۱۴۸۲ء)، (۱۴) شہاب الدین محمود (۱۴۸۲-۱۵۱۸ء) (۱۵) احمد چہارم (۱۵۱۸-۱۵۲۰ء) (۱۶) علاءالدین شاہ (۱۵۲۰-۱۵۲۳ء) (۱۷) ولی اللہ (۱۵۲۳-۱۵۲۶ء)، (۱۸) کلیم اللہ (۱۵۲۶-۱۵۳۸ء)۔

آزاد دکن کا پہلا سلطان اسمٰعیل مکھ نامی دیوا گری کا امیر تھا اور اس نے ابوالفتح ناصرالدین شاہ کا لقب اختیار کیا (۱۳۴۶-۱۳۴۷ء) اس نے اپنے لائق مصاحب حسن گنگو کو ظفر خان کا خطاب دیا اور امیروں کے مشورے سے اس کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا۔ ۱۱/ اگست ۱۳۴۷ء میں امیروں نے اس کو اپنا بادشاہ بنایا اور علاءالدین بہمن شاہ کا خطاب دیا اور اس طرح بہمنی سلطنت قائم ہو گئی۔ جس کا پایۂ تخت گلبرگہ تھا۔

علاءالدین بہمن شاہ نے قندھار، کلیانہ اور شمالی کونکن کی بندرگاہوں پر قبضہ کیا اور سلطنت مستحکم کی۔ اس نے جزیہ نافذ کیا۔

محمد اول نے ملک کے چار علاقوں کو طرف اور گورنروں کو طرف دار کا نام دیا۔ سال میں ایک بار وہ طرف کا دورہ کرتا تھا تو طرف دار اس کے ساتھ ہوتا تھا جس سے نظم و ضبط بحال کرنے میں مدد ملی۔ محمد دوم نے رعایا کی فلاح و بہبود کے کام انجام دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ فیروز شاہ سے وجیا نگر کی جنگیں ہوئیں اور ۱۴۱۷ء میں رائچور دوآب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ۲۲/ ستمبر ۱۴۲۲ء کو اپنے بھائی احمد کے حق میں فیروز تخت سے دستبردار ہوا۔ آخری زمانہ میں فوج میں اختلافات ہو گئے جنھوں نے بعد کو دکھنیوں اور پردیسیوں سے تباہ کن تنازعات کی شکل اختیار کر لی۔

مشہور بہمنی وزیر محمود گاوان ایک قابل جنرل اور امن پسند شخص تھا۔ اس نے مخالف گروہوں سے تعلقات استوار کیے اور ملک میں بہت سی اصلاحات کیں۔ زمینوں کی پیمائش اور پرت بندی کرائی اور اہم زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ طرف داروں میں اقتدار پر پابندیاں عاید کیں لیکن سلطان شمس الدین محمود نے دکھنیوں کی سازش میں آکر محمود گاوان کے قتل کا حکم دے دیا۔

محمود گاوان کی وفات (۱۴۸۱ء) کے بعد حسن نظام الملک بحری نے جو دکنی گروہ کا قائد تھا۔ ملک نائب کے خطاب سے انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن یہ بھی سازشوں کا شکار ہو گیا اور مارا گیا۔ ملک نائب کے لڑکے احمد نظام نے احمد نگر میں ایک آزاد بادشاہت قایم کر لی۔ دوسرے گورنروں نے اس کا اتباع کیا۔ اور برار میں عماد شاہی، بیجا پور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی اور بیدر میں برید شاہی سلطنتیں قایم ہو گئیں۔

جانشین بہمنی سلطنتیں

بیدر بریدی خاندان (۱۵۰۴-۱۶۱۹) خاکہ (۱) قاسم برید (۱۵۰۴ء) (۲) امیر علی برید (۱۵۰۴-۱۵۴۳ء) (۳) علی برید شاہ (۱۵۴۳-۱۵۸۰ء) (۴) ابراہیم برید شاہ (۱۵۸۰-۱۵۸۷ء) (۵) قاسم برید دوم (۱۵۸۷-۱۵۹۱ء) (۶) امیر برید دوم (۱۵۹۲-۱۶۰۰ء) (۷) مرزا علی برید (۱۶۰۰-۱۶۰۹ء) (۸) امیر برید شاہ (۱۶۰۹-۱۶۱۹ء)

بہمنی سلطنت کے علاقوں کی حفاظت کے مقصد سے وزیر قاسم برید نے جو کوششیں کیں ان کا نتیجہ ایک چھوٹی سلطنت بیدر کے قیام کی شکل میں نکلا۔ آخری تاجدار امیر برید شاہ کو ابراہیم عادل شاہ دوم نے شکست دی اور ۱۶۱۹ء میں بیدر کا الحاق کیا۔

برار

عماد شاہی خاندان (۱۵۱۰-۱۵۷۴) خاکہ: (۱) فتح اللہ عماد شاہ (۱۵۱۰ء) (۲) علاءالدین عماد شاہ (۱۵۱۰-۱۵۳۰ء) (۳) دریا عماد شاہ (۱۵۳۰-۱۵۶۱ء) (۴) برہان عماد شاہ (۱۵۶۲-۱۵۷۴ء)

بہمنی جانشین سلطنتوں میں سب سے مختصر زندگی برار کی تھی۔ وجیا نگر کے نومسلم فتح اللہ عماد الملک نے خاندان کی بنیاد ڈالی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وفات پائی (۱۵۱۰ء) مرتضیٰ نظام شاہ کے ہاتھ برار کا الحاق عمل میں آیا۔

احمد نگر

نظام شاہی خاندان (۱۵۱۰-۱۶۳۶) خاکہ: (۱) برہان نظام شاہ (۱۵۱۰-۱۵۵۳ء) (۲) حسین اول (۱۵۵۳-۱۵۶۵ء) (۳) مرتضیٰ اول (۱۵۶۵-۱۵۸۸ء) (۴) حسین دوم (۱۵۸۸-۱۵۸۹ء) (۵) اسماعیل اول (۱۵۸۹-۱۵۹۱ء)

(۶) برہان دوم (۱۵۹۱ — ۱۵۹۵ء) (۷) ابراہیم (اپریل تا اگست ۱۵۹۵ء)
(۸) احمد دوم (اگست تا دسمبر ۱۵۹۵ء) (۹) بہادر (۱۵۹۵ — ۱۶۰۰ء)
(۱۰) مرتضیٰ دوم (۱۶۰۰ — ۱۶۱۰ء) (۱۱) برہان سوم (۱۶۱۰ — ۱۶۳۱ء)
(۱۲) حسین سوم (۱۶۳۱ — ۱۶۳۳ء) (۱۳) مرتضیٰ سوم (۱۶۳۳ — ۱۶۳۶ء)

نظام شاہی سلسلہ کا بانی احمد بحری تھا. جس کا باپ (تمابھٹ) حسن نظام الملک بحری تھا جو بہمنی سلطنت کا وزیر اعظم تھا۔ ۱۴۹۴ء میں اس نے احمد نگر شہر کی بنیاد ڈالی اور پایہ تخت چنار سے احمد نگر کو منتقل کیا۔ برہان (۱۵۱۰ — ۱۵۵۳ء) پہلا شخص ہے جس نے نظام شاہ کا لقب اختیار کیا۔

شولاپور پر قبضہ کے لیے نظام شاہیوں سے عادل شاہیوں کا اکثر مسلح تصادم ہوا اس لیے ابراہیم کے بیٹے علی نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے وجیانگر کے رامارایا سے اتحادی معاہدہ کیا۔ ۱۵۶۲ء میں علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور وجیانگر کے رامارایا نے مل کر احمد نگر پر حملہ کیا۔ یہ حملہ احمد نگر کے باشندوں کے لیے عام طور پر اور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر تباہ کن ثابت ہوا اور حسین کے لیے شدید اشتعال کا موجب ہوا۔ وہ وجیانگر کے خلاف بہمنی سلاطین کا ایک عارضی اتحاد قایم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس کا نتیجہ کرشنا کی جنگ کی شکل میں نکلا۔ چند ماہ بعد اس نے وفات پائی۔

احمد نگر کی کش مکش کا ایک اور منظر ملک عنبر کی بہادرانہ مدافعت میں ملتا ہے۔ اس نے پرینڈا کو پائے تخت بنا کر مرتضیٰ دوم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مغلوں کی سرحد پر چھاپہ مار حملے کیے۔ آخر کار مغل شہزادہ خرم نے ۱۶۱۷ء اور ۱۶۲۱ء میں عنبر کو شکست دی۔ (۱۶۲۶ء میں اس نے وفات پائی) ۱۶۳۶ء میں شاہ جہاں نے آخری تاجدار مرتضیٰ سوم کو گرفتار کیا اور سلطنت کے علاقے مغلوں اور بیجاپور میں تقسیم ہوگئے۔

بیجاپور

عادل شاہی خاندان (۱۴۸۹ — ۱۶۸۶)

خاکہ:۔ (۱) یوسف عادل خان (۱۴۸۹ — ۱۵۱۰ء) (۲) اسمٰعیل عادل خان (۱۵۱۰ — ۱۵۳۴ء) (۳) ملو عادل خان (۱۵۳۴ — ۱۵۳۵ء) (۴) ابراہیم عادل شاہ (۱۵۳۵ — ۱۵۵۸ء) (۵) علی عادل شاہ اوّل (۱۵۵۸ — ۱۵۸۰ء) ابراہیم عادل شاہ دوم (۱۵۸۰ — ۱۶۲۷ء) (۷) محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ — ۱۶۵۶ء) علی عادل شاہ دوم (۱۶۵۶ — ۱۶۷۲ء) (۹) سکندر عادل شاہ (۱۶۷۲ — ۱۶۸۶ء)

عادل شاہی خاندان کا بانی یوسف خان بہمنی سلطنت کے آخری دور میں سب سے ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ ملو عادل خان کا بیٹا ابراہیم بیجاپور کا پہلا حکمران ہے جس نے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے فارسی کی بجائے ہندوی (دکھنی اردو) کو سرکاری زبان قرار دی۔

۱۵۶۵ء کی جنگ میں رامارایا کے خلاف علی عادل شاہ نے سلاطین کا ساتھ دیا۔ ابراہیم دوم کے دور میں اصلی حکومت چاند بی بی کے ہاتھ میں تھی۔ احمد نگر کی مدافعت میں اس نے مغلوں کا آخری سانس تک مقابلہ کیا۔ ابراہیم، ہندی نغموں کی مشہور کتاب نورس نامہ کا مصنف تھا۔ علوم و فنون میں اس کی ذاتی صلاحیت اور ذوق نے اس کے دور کو مثالی بنا دیا تھا۔ اس کا لڑکا محمد عادل شاہ اس مقبرہ میں دفن ہے جسے گول گنبد کہتے ہیں اور جو فن تعمیر کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا لڑکا علی عادل شاہ دوم کا نیم تکمیل شدہ مقبرہ اس کے فن کارانہ ذوق کی داد دیتا ہے۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کا محاصرہ کیا اور بیجاپور کی آزاد سلطنت کو ختم کر دیا۔

تلنگ گولکنڈہ

قطب شاہی خاندان (۱۵۱۲ — ۱۶۸۷)

خاکہ:۔ (۱) قلی ہمدانی قطب الملک (۱۵۱۲ — ۱۵۴۳ء) (قلی جمشید (۱۵۴۳ — ۱۵۵۰ء) (۳) سبحان (۱۵۵۰ء) (۴) ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ — ۱۵۸۰ء) (۵) محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ — ۱۶۱۱ء) (۶) محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ — ۱۶۲۶ء) (۷) عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ — ۱۶۷۲ء) (۸) ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۷۲ — ۱۶۸۷ء)

بہمنی سلطنت تلنگ کا گورنر سلطان قلی ہمدانی تھا جسے قطب الملک کا خطاب ملا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے گول کنڈہ کے بجائے حیدر آباد کو پایۂ تخت بنا کر سلطنت کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے جانشینوں میں ابراہیم قطب شاہ تہذیب کا دلدادہ، اعلیٰ پایہ کا مدبر، رعایا میں مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ وہ مشہور زبان دان بھی تھا اور علمی ادبی ذوق رکھتا تھا۔ اس کے وجیانگر سے تعلقات اچھے تھے لیکن علی عادل شاہ اور رامارایا وزیر کے اختلافات میں اس نے علی کا ساتھ دیا۔

ابراہیم کا لڑکا محمد قلی شہر حیدر آباد کے بانی، دکھنی اُردو نظموں کے مصنف اور تلگو اُردو کے مربی کی حیثیت سے تاریخ تلنگ میں مشہور ہے۔ اس نے سیاسی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور جب سلطنت کے مشرقی علاقے میں شر پسند طاقتوں نے سر اٹھایا تو محمد قلی نے ہندو مسلم جرنلوں کو مامور کر کے شورش دبا دی۔

۱۶۸۲ء میں اورنگ زیب دکن پہنچا اور آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کو اکتوبر ۱۶۸۵ء میں قلعہ گولکنڈہ میں محصور ہو جانا پڑا۔ دو سال بعد ستمبر ۱۶۸۷ء میں قلعہ کے دروازے مغلوں کے لیے کھول دیے گئے اور سلطان کو قید کر لیا گیا۔ اور اس طرح آخری بہمنی جانشین سلطنت مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گئی۔

وجیانگر

(۱۳۳۶ء — ۱۶۶۴ء)

سنگم خاندان (۱۳۳۶ — ۱۴۸۵)

خاکہ:۔ (۱) ہری ہرا اوّل (۱۳۳۶ — ۱۳۵۰ء) (۲) بکا اوّل (۱۳۵۵ — ۱۳۷۷ء) (۳) ہری ہرا دوم (۱۳۷۷ — ۱۴۰۴ء) (۴) وروپاکشا اوّل یا وی روپنا (جانشینی نزاعی ہے) ۱۴۰۴ء اور بکا دوم (۱۴۰۴ — ۱۴۰۶ء) (۵) دیوا رایا اوّل (۱۴۰۶ — ۱۴۲۲ء) (۶) وجیا عرف بکا سوم (۱۴۲۲ — ۱۴۲۵ء) (۷) دیوا رایا دوم (۱۴۲۵ — ۱۴۴۶ء) (۸) ملیکارجنا (۱۴۴۶ — ۱۴۴۷ — ۱۴۶۵ء) (۹) وی روپاکشا دوم (۱۴۶۵ — ۱۴۸۵ء)

سالوا خاندان (۱۴۸۵ — ۱۵۰۵ء)

(۱۰) سالوا نرسمہا (۱۴۸۵ — ۱۴۹۰ء) (۱۱) امری نرسمہا (۱۴۹۰ — ۱۵۰۵ء)

تلواخاندان
(۱۵۰۵–۱۵۷۰)

(۱۲) ویرانرا سمہا (۱۵۰۵ـ ۱۵۰۹ء)
(۱۳) کرشنا دیوا رایا (۱۵۰۹ – ۱۵۲۹ء)
(۱۴) اکیوتا دیوارایا (۱۵۲۹ – ۱۵۴۲ء)
(۱۵) دینکٹا اوّل (× – ۱۵۴۲ء) (۱۶) سدا شیوا ۱۵۴۲ – ۱۵۷۰ء)

آراویدو خاندان
(۱۵۷۰– ۱۶۶۴)

(۱۷) تیرومالا (۱۵۷۰ – ۱۵۷۲ء)
(۱۸) سری رنگا اوّل (۱۵۷۲ – ۱۵۸۴ء) (۱۹) دینکٹا دوم (۱۵۸۴ – ۱۶۱۴ء) (۲۰) سری رنگا دوم (۱۶۱۴ء) (دو سال تک تخت کے لئے سول وار رہی (۲۱) راما دیوا (۱۶۱۷ – ۱۶۳۰ء) (۲۲) دینکٹا سوم (۱۶۳۰ – ۱۶۴۲ء) (۲۳) سری رنگا سوم (۱۶۴۲ – ۱۶۶۴ء)

چودھویں صدی کے نصف اول میں وجیانگر سلطنت کے قیام سے تاریخ دکن میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ سلطنت کے بانی ہری ہرا اور بکا دو بھائی تھے۔

ہری ہرا اول اور اس کے بھائی بکا نے سلطنت کو مستحکم کیا اور اس کے حدود وسیع کیے۔ ۱۳۷۴ء میں بکا اول نے چین کو سفیر بھیجا اس کے لڑکے ہری ہرا دوم نے مہاراجہ دھیراجہ پرمیشورا کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد انتشار کا دور رہا دیو رایا دوم نے نظم ونسق میں اصلاحات کیں۔ ایرانی سفیر عبدالرزاق اس کے دربار میں آیا تھا۔ آخری تاجدار وی روپاکشا کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں قتل پر سنگم خاندان کی حکومت ختم ہوئی۔ اور چندر گری گڑھ کے حاکم سالوا نرا سمہا نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

اس نے سلطنت کے اندر انتشار پسند طاقتوں کا صفایا کیا۔ لیکن پرشوتم گجپتی نے اسے شکست دی۔ ۱۴۹۰ء میں سالوا نرسمہا کی وفات سے پہلے اس نے نرسا نایکا کو نائب سلطنت بنایا وہ امڑی نرسمہا کو تخت پر بٹھا کر نائب سلطنت کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ نرسا نایکا کے بعد اس کے لڑکے ویرا نرا سمہا نے نائب سلطنت کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ اور ۱۵۰۵ء میں امڑی کا کام تمام ہو جانے پر ملک کا اصلی حاکم بن کر تلوا خاندان کی بنیاد رکھی۔

ویرا نرسمہا کا نسبتی بھائی اور جانشین کرشنا دیوارایا تھا۔ یہ وجیانگر کے تمام بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ اور تاریخ ہند میں ایک جاذب شخصیت کا مالک ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اسے محمود شاہ بہمنی کے حملہ کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن سلطان کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد اس نے رائچور بیدر اور گلبرگہ پر قبضہ کیا۔ اوڑیسہ کے گجپتوں سے اودے گیری کا قلعہ چھین لیا۔ کنڈاپلی کا محاصرہ کر کے پرتاب رودرا کی فوج کو شکست دی۔ راجہ مندری کا قلعہ تسخیر کیا اور شمال میں دور کٹک تک پیش قدمی کی۔

کرشنا دیوارایا کے کارنامے میدانِ جنگ تک محدود نہ تھے۔ اس نے علم وفن کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ فنِ حرب کا ماہر تھا نظم ونسق میں اس کی ذکاوت مشہور تھی۔ علم وفن کا مربی ہونے کے ساتھ خود ایک بڑا عالم اور شاعر بھی تھا۔ ۱۵۳۰ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اور اس کے دو جانشینوں کے بعد ۱۵۴۲ء میں آراویدو خاندان کے راما رایا وزیر نے اکیوتا کے بھتیجے سداشیوا کو تاج پہنا دیا اور عملی طور پر خود حکمراں بنا رہا۔

وزیر راما رایا نے احمد نگر کے حکمران نظام شاہ اور بیجاپور کے علی عادل شاہ کی لڑائی میں علی عادل کی مدد کی اور فتح پائی۔ ایک اور جنگ میں گول کنڈہ اور احمد نگر کے خلاف بیجاپور کی مدد کی اور فتح پائی۔ آخر کار انہوں نے مشترکہ طور پر تالی کوٹا کے میدان میں ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء کو جنگ کی۔ وجیانگر کو سخت شکست ہوئی اور راما رایا مارا گیا۔ اس جنگ کے بعد سداشیوا نے پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۷۰ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات سے تلوا خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔

تلوا خاندان کے بعد آراویدو خاندان نے حکومت سنبھالی۔ اس میں سات بادشاہ ہوئے لیکن پہلے تین خاندان کے حکمرانوں کی سی بات ان میں کسی میں نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ دینکٹا دوم کے بعد سلطنت کی شیرازہ بندی کا دور شروع ہو گیا۔ تلوا خاندان کا آخری تاجدار رنگا سوم اس قابل نہ تھا کہ جاگیرداروں کو جو خود غرض اور باغی ہو گئے تھے قابو میں رکھ سکے۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین کی نظریں حریصانہ پڑ رہی تھیں۔ رایا کے نائبین مثلاً سرنگاپٹنم اور بڈنور کے سردار اور تنجور کے نایک مرکز سے ٹوٹ کر آزاد ہو گئے تھے۔

سلطنت کا نظم ونسق

اس سلطنت میں قدیم ہندو فکر اور اداروں نے ارتقا پائی اور نیا روپ اختیار کیا۔ سلطنت میں تمام اختیارات کا سرچشمہ بادشاہ تھا۔ اس کی ایک مجلس وزرا تھی جس کی حیثیت مشاورتی تھی۔ وزیر کبھی موروثی ہوتے اور کبھی منتخب کیے جاتے۔ ان میں برہمنوں کے ساتھ کشتویا اور ویشیا بھی ہوتے تھے۔ دھرما شاسترا کے قدیم اصولوں پر عمل کیا جاتا۔ انصاف رسانی اور قانون کی اعلیٰ عدالت مرافعہ بادشاہ کی شخصیت تھی۔

سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر ایک صوبہ ایک نایک کے تحت تھا جو شاہی خاندان کا رکن ہوتا تھا یا ذی اثر امیر۔ اسے صوبہ میں سیول اور فوجی عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے اور وہ اپنے کام میں بادشاہ کے آگے ذمہ دار تھا۔ وجیانگر کا نظم ونسق دیہات تک پھیلا ہوا تھا۔ دہانایا کا چاریا دیہی نظم ونسق کا عہدیدار تھا۔ محصول مال گزاری سب سے اہم ذریعہ آمدنی تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے محاصل بھی عاید تھے۔ فوجداری مقدمات میں سخت سزائیں دی جاتی تھیں کرشنا دیوارایا نے سزا دینے میں اعتدال قایم کیا لیکن جو لوگ سلطنت کے خلاف سازش میں شریک ہوتے کسی نرمی کے مستحق نہ سمجھے جاتے۔

تہذیب وتمدن

وجیانگر میں بڑے درخشاں تمدنی اور فنی کارنامے انجام پائے۔ سایانا نے ویدوں کی مشہور شرح لکھی۔ خود کرشنا دیوارایا نے تلگو میں ایک ادبی شاہکار کے دیباچہ میں اپنی لکھی ہوئی پانچ سنسکرت کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ موسیقی، رقص، ڈرامہ، گرامر، منطق اور فلسفہ پر کتابیں لکھنے والوں کی ہمت افزائی ہوتی تھی۔ وجیانگر میں فن تعمیر کو کمال حاصل ہوا۔ پایۂ تخت کے کھنڈرات اور گری پڑی عمارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اس فن نے ایک اپنا طرز ڈھال لیا تھا۔ فصلیں، قلعہ کے داخلے کے دروازے آب رسانی کا سسٹم، حوض، تخت کا چبوترہ، دربار ہال، ملکہ کے محلات، کنول محل، ہاتھیوں کا اصطبل، محافظ دستوں کے کمرے، ہمپی بازار، چندرا گیری میں رایا کا موسم گرما گزارنے کا محل، مدورائی میں سرومالا نایکا محل، جنگی کے محلات وغیرہ تعمیری کمال کے ساتھ غیر مذہبی طرز لیے ہوئے ہیں۔

جنوبی ہند کی دوسری سلطنتیں

مدورا مدورا کی سلطنت کی خود اختیاری نایکا وشوا ناتا (۱۵۲۹ء۔ ۱۵۶۴ء) نے قایم کی۔ اس کے بعد بہت سے جانشین تاجدار ہوئے۔ ۱۷۳۶ء میں مغلوں نے اس کا الحاق کیا۔

میسور سلطنت کا حقیقی بانی راجہ وڈیار (۱۵۵۷۔۔۔۱۶۵۰ء) تھا۔ ۱۷۰۴ء میں اورنگ زیب نے اس کا الحاق کیا

تنجاور وجیانگر کے اکیوترایا کے ایک عزیز شیوپا (۱۵۳۲ء) نے تنجاور نلیسکی کی بنیاد رکھی۔ ۱۶۷۵ء میں چنگلا ملا داس کے بعد سلطنت پر قبضہ کرکے ایکوجی پہلا مراٹھا حکمراں بنا۔

مالابار زامورین سب سے اہم تاجدار تھا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کالی کٹ کے قریب ساحل پر اترا ۱۵۰۵ء میں پرتگزیوں نے اپنا وائسرائے پہلے کوچین پھر گوا پر مقرر کیا۔ اس طرح 'زامورین کی طاقت ختم ہوگئی اور پرتگیزیوں کا اقتدار مالابار پر قایم ہوگیا۔

اکیری وجیانگر کے راجا کا گورنر جوڈپیا کا بیٹا سداشوا تھا۔ اس کے بھائی بھدریا نے صدر مقام کلڑی سے اکیری کو منتقل کیا۔ سترہویں صدی تک اس کا نایکا خاندان یہیں حکومت کرتا رہا۔

مراٹھے خاکہ:۔ (۱) بھوسلے کولا۔ مالوجی (۱۵۵۲۔ ۱۶۰۶ء) (۲) شاہ جی (۱۵۹۹۔۔۔۱۶۶۴ء) (۳) شیواجی (۱۶۳۰۔۔۔۱۶۸۰ء) (۴) سبھاجی (۱۶۸۰۔۔۔۱۶۸۹ء) (۵) رام راجہ (۱۶۸۹۔۔۔۱۷۰۰ء) (۶) تارابائی کی نیابت (۱۷۰۰۔۔۔۱۷۰۷ء) (۷) شاہوجی (۱۷۰۷۔۔۔۱۷۴۹ء) (۸) پیشوا بالاجی وشوناتھ (۱۷۱۳۔ ۱۷۲۰ء) (۹) باجی راؤ (۱۷۲۰۔ ۱۷۴۰ء)

احمد نگر اور بیجاپور میں جن مراٹھا سرداروں نے شہرت حاصل کی ان میں جادھو بھوسلے، گھاٹکے، گھر وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں بھوسلے خاندان آزاد مراٹھا سلطنت قایم کرنے میں پیش پیش رہا۔ مغلوں کے دکن پر دباؤ کو روکنے کی جو کوشش نظام شاہی سلاطین نے کی اس میں شیواجی کے باپ شاہ جی بھوسلے نے قابل قدر حصہ لیا۔

۱۹ فروری ۱۶۳۰ء میں شاہ جی کے یہاں جیجا بائی کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیواجی رکھا گیا۔ ۱۶۴۰ء سے ۱۶۶۴ء تک شاہ جی اپنے لڑکے شیواجی کی سرگرمیوں میں رہبری کرتا رہا۔ اس لیے مراٹھا تاریخ میں سلطنت کے بانی کی حیثیت سے اس کا مقام باقی رہے گا۔

شیواجی (۱۶۳۰ء۔ ۱۶۸۰ء) شاہ جی نے ۱۶۳۶ء میں شیواجی کو پرگنہ پونا سے ۳۶ گاؤں دیے۔ ۱۶۴۶ء تک شیواجی نے شاہ جی کی جاگیر کے دوسرے حصّوں کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اپنی جاگیر کے حدود محفوظ کرنے کے لیے اس نے کنڈنا روہیدا، راج گڑھ اور دوسرے اطراف و اکناف کے قلعوں پر قبضہ کیا۔ اسے ایک طرف عادل شاہی اقتدار کا سامنا تھا اور دوسری طرف مغلوں کی زبردست طاقت تھی۔ افضل خان نے جو بیجاپور کا جنرل تھا شیواجی کی تادیب کرنی چاہی لیکن نومبر ۱۶۵۹ء میں پرتاپ گڑھ میں شیواجی نے اس کا کام تمام کردیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے شیواجی کا وقار دکن میں کافی بڑھ گیا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۵۹ء میں شائستہ خاں کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ ابتدا میں شائستہ خاں کو کامیابی ہوئی مگر ۱۶۶۳ء میں شیواجی نے شائستہ خاں پر شب خون مارا اور اس کو زخمی کردیا۔ اس سے دکن میں شیواجی کا وقار اور بڑھ گیا اور مغل وقار کو صدمہ پہنچا۔

۱۶۶۴ء میں شیواجی نے مغلوں کی بندرگاہ سورت پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا۔ اورنگ زیب نے جے سنگھ کو شیواجی کے خلاف دکن کی مہم پر بھیجا۔ جے سنگھ نے شیواجی کو شکست دی اور صلح کرنے پر مجبور کیا اور آگرہ چل کر شہنشاہ سے ملنے کی ترغیب دی۔ آگرہ میں چند دن رام سنگھ کی نگرانی میں رہنے کے بعد وہ اور اس کا لڑکا سبھاجی مٹھائی کی ٹوکریوں میں بیٹھ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

مراٹھا طاقت روز افزوں ترقی کرتی گئی اور ۶ جون ۱۶۷۴ء کو شیواجی نے اپنی تاج پوشی کی رسم رائے گڑھ میں انجام دی۔ اس کی سلطنت میں پورا کونکن کا علاقہ اور گنڈدی (جنوبی گجرات) سے بھونڈا (گوا کی سرحد) کے بجز بسین، چول جزائر بمبئی اور جنجیرہ کے ایک شامل تھا۔ دور جنوب میں گنگی اور ویلور کے قلعے اس کے قبضہ میں تھے اور کپل اور بلاری بھی اسی کے تحت تھے۔

۳ اپریل ۱۶۸۰ء میں شیواجی نے وفات پائی اور اس کا جانشین اس کا بیٹا سبھاجی ہوا۔

مراٹھا نظم ونسق

مرکزی نظم ونسق شیواجی نے ۱۶۷۴ء میں تاج پہنا اس موقع پر اس نے آٹھ وزرا کی کونسل بنائی جسے اشٹھ پردھان منڈل کہتے ہیں۔ اس میں حسب ذیل وزرا تھے۔

(۱) پیشوا۔ وزیراعظم (۲) اماتیا۔ وزیرمال (۳) ساشیو۔ شاہی مراسلت کا نگراں (۴) منتری۔ ریکارڈ کا نگراں اور مشیر خاص (۵) سیناپتی وزیر فوج (۶) سمنتا۔ وزیر خارجہ (۷) نیائے دشنا۔ چیف جسٹس (۸) پنڈت راؤ۔ امور مذہبی کا سربراہ۔ کونسل کی حیثیت مشاورتی تھی۔

صوبائی نظم ونسق سلطنت تین بڑے حصّوں میں منقسم تھی جنھیں پرانت کہتے تھے۔ ہر صوبے پر ایک عہدہ دار تھا جس کا مرتبہ وزیر کا تھا۔ اور جسے سرکارکن کہتے تھے۔ ہر صوبہ اضلاع میں منقسم تھا۔ صوبہ دار کا مددگار مجم دار تھا جو تنقیح اور حسابات کا کام دیکھتا تھا۔ ضلع کے حصوں کو محال کہتے تھے جس پر حولدار ہوتا تھا۔ پرگنہ کے تحت کئی مواضعات تھے موروثی عہدہ دار دیش مکھ، دیش پانڈے، پٹیل اور کلکرنی پرگنہ مواضعات کے کاموں میں مدد دیتے تھے۔

محصول مال گزاری سلطنت کا اہم ذریعۂ آمدنی تھا۔ دوسرے ذرائع آمدنی میں چوتھ اور سردیس مکھی شامل تھے۔ چوتھ محصول مال گزاری پر ۲۵ فی صد وصول کیا جاتا تھا۔ چوتھ مغل دکن کے چند علاقوں سے مراٹھے وصول کرتے تھے۔ چوتھ کی وصولیابی اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ مراٹھے اس علاقے کو کسی باہر کے حملہ آور سے بچائیں گے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقہ پر مراٹھے خود یلغار نہیں کریں گے۔ سردیس مکھی محصول مال گزاری پر دس فی صد عاید ہوتی تھی۔ کسانوں کو جانور اور بیج کے لیے تقاوی دی جاتی تھی۔ کوکن کے علاقے میں نمک سازی اہم صنعت

تھی۔ چول ریشمی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ کلیان اور بھیوانی میں جہاز سازی کا چومینہ دستیاب ہوتا تھا۔

شیواجی کے جانشین

سمبھاجی کے بعد راجہ رام آیا اور ۱۷۰۰ء میں فوت ہوا۔ راجہ رام کی بیوہ تارا بائی کی نیابت میں اس کے لڑکے کو شیواجی سوم کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا۔ ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے وفات پائی۔

۱۷۰۸ سے ۱۷۴۹ء تک ساہو کا دور رہا۔ بالاجی وشوناتھ پیشوا نے حسین علی خاں گورنر دکن سے اہم مطالبات منوائے۔ وشوناتھ کے لڑکے باجی راؤ کے زمانہ میں مراٹھا اور نظام الملک میں ٹکر کھیڑا کی جنگ ہوئی اور دکن کے چھ مغل صوبے نظام الملک کے قبضہ میں آگئے اور مراٹھوں کے لیے مالوہ اور گجرات پر قبضہ آسان ہوگیا۔

سکھ

گرونانک (۱۴۶۹—۱۵۳۹ء) کی تعلیمات سے سکھ مت کی بنیاد پڑی۔ گرو گوبند سنگھ کی وفات (۱۷۰۸ء) پر سکھ گرو ختم ہوگئے۔ گرو گوبند نے تاریخ ہند میں ایک حرکی طاقت پیدا کردی اور سکھوں اور مغلوں کی کش مکش جاری رہی۔

جاٹ

۱۶۶۹ء میں تلپات کے زمیندار گوکلا نے سورش برپا کرکے متھرا کے فوجدار کو شکست دی۔ لیکن مغلوں نے شورش دبا دی۔ چورامن نے جو راجا رام کا بھتیجا تھا ۱۷۰۴ء میں مغلوں سے سنسانی حاصل کرلیا لیکن بہت جلد مغلوں نے اسے چھین لیا۔ چورامن نے مغل طاقت کے خلاف کش مکش جاری رکھی۔ آخری کار اجہ جے سنگھ سوائی نے اس کے علاقے چھین لیے (۱۷۲۱ء) سورج مل کے زمانہ میں (۱۷۵۶—۱۷۶۵ء) جاٹ سلطنت کو عروج ہوا۔

حصہ سوم

سلطنت مغلیہ

مغلوں کے سامنے سلاطین دہلی کے مقاصد اور وہ تجربے تھے جو ان سلاطین نے اپنے تین سو سالہ دور میں کیے۔ سلاطین کے پالیسی مقاصد تین بنیادی اصول پر مبنی تھے۔ (۱) فوجی طاقت کا استحکام (۲) مرکز میں اتحاد و اتفاق (۳) عوام کے معاملات میں عدم مداخلت۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے سلاطین دہلی نے جو تجربے کیے ان میں پہلا تجربہ سلطان شمس الدین التمش کا ہے۔ اس نے سلطنت کو تقسیم کرکے مختلف امیروں کے حوالے کردیا۔ ان امیروں کو حکومت کے بقا و تحفظ سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ دوسری طرف شمس الدین نے تخت و تاج کے حامیوں کی جماعت تیار کی اور اسے اپنے پایہ تخت میں رکھا۔ دوسرا تجربہ بلبن اور علاءالدین کا ہے جنہوں نے امیروں کی ایک طاقت ور جماعت بنائے رکھنے کے منصوبے کو تخت و تاج کے لیے خطرناک سمجھا اور اس جماعت کو بالکل ختم کردیا تیسرا تجربہ وہ ہے جو بہلول نے اختیار کیا۔ بادشاہ کی حیثیت ایک ایسے سردار کی تھی جسے دوسرے سرداروں کی مرضی سے اختیارات سونپ دیے جاتے تھے۔ اس طرح سلاطین دہلی کی تاریخ بادشاہ اور فوجی سرداروں کی باہمی کش مکش کی کہانی ہے۔ سلاطین نے ہر ایک روایت کو مسترد کرکے نظریں قایم کردیں۔ حکمراں خاندانوں میں تبدیلیوں کی وجہ سے خاندانی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوسکا۔ کسی بادشاہ نے کبھی اس امر کے کوشش نہیں کی کہ ملک کے باشندوں سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے۔ اس لیے بادشاہت کو عوام کی تائید کبھی حاصل نہ ہوسکی۔ ملک کے باشندوں میں کسی قومی شعور کا پتہ نہیں چلتا کیوں کہ انہوں نے کسی نازک اور اہم مرحلہ پر قومی جذبہ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مغل سلاطین

(۱۵۲۶ء—۱۷۰۷ء)

خاکہ:- (۱) بابر (۱۵۲۶—۱۵۳۰ء) (۲) ہمایوں (۱۵۳۰—۱۵۴۰ء) و (۱۵۵۵—۱۵۵۶ء) (۳) اکبر اعظم (۱۵۵۶—۱۶۰۵ء) (۴) جہانگیر (۱۶۰۵—۱۶۲۷ء) (۵) شاہجہاں (۱۶۲۷—۱۶۵۸ء) (۶) اورنگ زیب (۱۶۵۸—۱۷۰۷ء)

بابر (۱۵۲۶ء—۱۵۳۰ء)

بابر اپنی ماں کی طرف سے تیموری اولاد تھا۔ اس کا باپ وسط ایشیا میں فراغنہ کا ایک ترک بادشاہ تھا۔ تزک بابری سے، جو اس کا لکھا ہوا روزنامچہ ہے اس کے ابتدائی حالات کی تمام تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے صفحات میں ذکر ہوچکا ہے، پنجاب کے دولت خاں اور دلاور خاں امرا نے جو اپنے بادشاہ ابراہیم لودی سے ناراض ہوگئے تھے، بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ نومبر ۱۵۲۵ء میں وہ کابل سے روانہ ہوا اور اس نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی سے مقابلہ ہوا جس میں بابر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ دوسری اہم جنگ کھانوا پر ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو ہوئی جس میں بہادر راجپوتوں کو شکست دے کر اس نے چندیری پر قبضہ کیا۔ پٹنہ کے قریب گنگا کے کنارے ایک لڑائی میں بابر نے بہار اور بنگال کے افغان سرداروں کا قلع قمع کردیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء میں ۴۷ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ بابر کو تاریخ ہند میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا معمار اول ہے۔

ہمایوں (۱۵۳۰ء—۱۵۵۶ء)

بابر کا جانشین اس کا بیٹا ہمایوں ہوا۔ وہ ایک بہادر، خوب صورت اور نیک مزاج شہزادہ تھا۔ اس کی نرمی سے فائدہ اٹھاکر اس کے بھائی کامران نے کابل میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ دوسری طرف گجرات کے بہادر شاہ نے قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کیا اور چتوڑ کی رانی نے ہمایوں سے مدد طلب کی۔ گجرات کے بادشاہ نے فرار ہوکر دیو شہر میں پناہ لی اور پرتگیزیوں کے ہاتھ سے اس کا خاتمہ ہوا۔ بنگال میں پٹھان سردار شیر خاں کو جو بہت طاقتور ہوگیا تھا مطیع کرنا ضروری تھا اس لیے ہمایوں شیر خاں کے پایہ تخت گوڑ کی طرف روانہ ہوا۔ شیر خاں نے اس کی واپسی کا راستہ بند کردیا جس کی وجہ سے اسے گنگا پار کرنی پڑی ایک سقہ نے اس کی مدد کی اور جان بچائی۔ دوسرے سال (۱۵۴۰ء) ہمایوں کو قنوج کے قریب ایک اور شکست اٹھانی پڑی اور وہ دہلی چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ سندھ میں اس نے حمیدہ بانو بیگم سے شادی کی جس کے بطن

سے ۱۵ر اکتوبر ۱۵۴۲ء کو امرکوٹ کے قلعہ میں شہزادہ اکبر پیدا ہوا۔ شاہ ایران نے ہمایوں کی مدد کی اور وہ قندھار اور کابل پر دوبارہ قابض ہوگیا۔

شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء - ۱۵۴۵ء)

اس دوران شیر خان نے دہلی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور خاندان سوری کی بنا ر ڈالی۔ وہ ایک لائق حکمراں تھا۔ اس نے سپاہیوں اور عہدہ داروں کے ظلم و تشدد سے رعایا کو پناہ دی۔ سلطنت کے نظام مال گزاری میں اسے لائق وزیر ٹوڈرمل کی مدد حاصل تھی۔ محصول مال گزاری قایم کرنے سے پہلے زمین کی قوت پیداوار کا اندازہ کرنے کے لیے پرت بندی اور پیمائش کرنے کا طریقہ رائج کیا گیا اور محصول مال گزاری پیداوار کے چوتھے حصے کے بقدر مقرر کیا گیا۔ فوج کو سخت احکام تھے کہ کھڑی فصل کو گزند نہ پہنچائیں۔ شیر خان نے پنجاب سے بنگال تک شاہراہ بنائی اور دوسرے رفاہ عام کے کام کیے لیکن اس کا دور بہت چھوٹا تھا۔ اس نے ۱۵۴۵ء میں کالنجر کے محاصرہ کے دوران اتفاقیہ بارود کے ذخیرہ میں آگ لگ جانے کی وجہ سے وفات پائی۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ۱۵۴۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ اسلام شاہ نے نہ صرف یہ کہ سور حکومت کو برقرار رکھا بلکہ نئی فتوحات بھی کیں۔ ۱۵۵۳ء میں اسلام شاہ کا انتقال ہوگیا اسلام شاہ کے انتقال کے بعد افغانوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور اس سے فائدہ اٹھا کر ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور مچھیوارہ کے مقام پر افغانوں کو شکست دی۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی شاہی کتب خانہ کے زینے سے گر کر ہمایوں جنوری ۱۵۵۶ء میں فوت ہوگیا۔

اکبر اعظم (۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء)

۱۴ر فروری ۱۵۵۶ء کو جلال الدین اکبر کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت مغل حکومت کے سامنے بہت سنگین مسائل تھے۔ مغل فوج ابھی جالندھر میں ہی تھی کہ کابل سے اطلاع ملی کی سلیمان مرزا نے کابل کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اسی اثنا میں دہلی کے گورنر تردی بیگ نے اطلاع بھیجی کہ ہیموں نے آگرہ پر قبضہ کر لیا ہے اور دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سکندر سور سوالک میں موقع کا منتظر تھا اور پنجاب پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ مزید برآں دہلی اور آگرہ میں زبردست قحط پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے مغل فوج کو رسد حاصل کرنے میں بہت دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ اکتوبر ۱۵۵۶ء میں ہیموں نے دہلی پر حملہ کر دیا اور مغل گورنر تردی بیگ کو شکست ہوئی۔ مغل فوج اب تیزی سے اکبر اور بیرم خان کی سرکردگی میں دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ اور نومبر ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں مغل فوج اور افغان فوج کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جس میں افغان فوج ہار گئی اور ہیموں زخمی حالت میں گرفتار ہوا اور بعد کو قتل کرا دیا گیا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد بیرم خان نے سکندر سور کے خلاف پنجاب میں فوج کشی کی۔ ۱۵۵۷ء میں سکندر سور نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اسی دوران سلیمان مرزا نے کابل کا محاصرہ اٹھا لیا۔ مغل حکومت کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا۔ جس میں جوان تخت شہنشاہ پورا اترا۔ اس طرح چار سال مختصر سی مدت میں اکبر کا اقتدار کابل سے جون پور تک اور شمالی پنجاب سے اجمیر تک قایم ہوگیا۔

بیرم خان نے اپنے اقتدار کو ایک مستقل شکل دینا چاہی اور اپنے راستہ میں حائل حریفوں کو نکال باہر کیا اور خود اکبر پر بھی بندشیں عاید کیں کم عمر بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعہ بیرم کو علاحدہ کر دیا بیرم نے ہتھیار اٹھائے لیکن آسانی سے اسے دبا دیا گیا اسے مکہ جانے کی اجازت دیدی گئی لیکن راستہ میں پاٹن پر کسی افغان نے اسے ہلاک کر دیا (۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء) اس کے لڑکے عبدالرحیم اور بیوی سلیمہ بیگم کے ساتھ اکبر نے مہربانی کا سلوک کیا مئی ۱۵۶۲ء میں اکبر کی رضاعی ماں کی وفات سے رہی سہی پابندیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

اکبر نے فتوحات اور توسیع سلطنت کی پالیسی اختیار کی۔ ۱۵۵۸ء سے ۱۵۶۲ء تک دوران اکبر نے گوالیار، لکھنؤ، جون پور اور مالوے پر قبضہ کیا ۱۵۶۷ء میں اس نے چتوڑ کا محاصرہ کیا۔ رانا اودے سنگھ فرار ہوگیا۔ پتا اور جے مل نے قلعہ کی مدافعت کی لیکن پتا مارا گیا اور جے مل کو خود اکبر کی گولی لگی جے مل کی وفات سے راجپوت فوج کی مدافعت ختم ہوگئی اور چتوڑ پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔

اکبر کی راجپوت پالیسی کے دو پہلو تھے۔ جن راجپوت ریاستوں نے اکبر کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا ان کو اکبر نے بہت سی مراعات دیں اور بڑے بڑے عہدے دیے۔ مگر جن ریاستوں نے اکبر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا ان پر اکبر نے فوج کشی کی اور ان کو زیر کیا۔ اکبر کی راجپوت پالیسی ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر راجپوت مغل حکومت کا ایک اہم جز بن گئے اور راجپوتوں کا مفاد مغل حکومت سے وابستہ ہوگیا چنانچہ جب تک مغل حکومت مضبوط رہی راجپوت ریاستیں بھی خوشحال رہیں لیکن جیسے ہی مغل حکومت کا زوال شروع ہوا راجپوت ریاستیں بھی کمزور ہوتی گئیں۔

اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندوستان کی حکومت کی سرحد شمال مغرب میں سائنٹفک طریقہ پر مقرر کی۔ چنانچہ ہندوکش کو شمال مغرب میں مغل حکومت کی سرحد قرار دیا۔ اس وجہ سے کابل کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی۔ عبداللہ خاں ازبک کابل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اسی وجہ سے اکبر ۱۵۹۸ء تک لاہور میں رہا۔ عبداللہ خان ازبک کا انتقال ۱۵۹۸ء میں ہوگیا اس کے انتقال کے بعد وہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور ازبک خان اب اس قابل نہیں تھا کہ کابل پر حملہ کر سکے۔

اکبر کی مذہبی پالیسی اور رجحانات

سولہویں صدی عیسوی میں بھکتی تحریک کی وجہ سے ہندوستان کے مذہبی خیالات اور عقائد کی تجدید ہو رہی تھی اس فضا سے اکبر بھی متاثر ہوا۔ اس نے ہندو شاہزادیوں سے شادیاں کیں ۱۵۶۴ء میں اکبر نے جزیہ ختم کر دیا۔ ہندو یاتریوں پر جو ٹیکس لگایا جاتا تھا۔ اس کو بھی ختم کیا۔ ۱۵۷۵ء میں اکبر نے عبادت خانہ کی بنیاد ڈالی۔ جہاں پر مختلف مذاہب کے علماء دینی مسائل پر آزادی کے ساتھ بحث مباحثے کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مباحثوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تاہم ان کی اہمیت یہ ہے کہ عالموں کو مذہبی مسائل پر بھی آزادیٔ خیال کا حق مل گیا۔ ۱۵۷۹ء میں اکبر نے محضر جاری کیا جس کی رو سے اکبر کو دو اہم حقوق حاصل ہوئے۔ اگر کسی مذہبی مسئلہ پر علماء میں اختلاف رائے ہو تو اس میں قطعی فیصلہ کا حق (۲) اگر کسی مسئلہ پر اسلامی قانون خاموش ہے تو اسلامی قانون میں اضافہ کا حق محضر

کی مخالفت مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے کی اور ہندو عوام نے بھی محضر کو نہیں سراہا۔ للٰذا اکبر نے محضر کو خاموشی سے ختم کر دیا۔

محضر کو ختم کرنے کے بعد اکبر نے شہنشاہیت کے تصور کو مستحکم کرنے کے لیے ایک نیا نعرہ دیا اور وہ یہ کہ بادشاہت خدا کے نور سے نکلی ہے للٰذا بادشاہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔ اسی وجہ سے جھروکہ درشن ہندوستانی عوام میں بہت مقبول ہوا۔ ۱۵۸۲ء سے لے کر ۱۶۰۵ء کے دوران یہ بات تسلیم کی جاتی رہی کہ حکومت کسی مذہب کی سرپرستی نہیں کرے گی۔

دیوان خاص و عام کا طریقہ کار

غسل خانہ (پرائیویٹ چیمبر) اس حصہ میں گنے چنے قابل اعتماد اشخاص کو ملاقات کا موقع دیا جاتا تھا۔ دیوان اور بخشی بھی۔ سلطنت کے بہی پیش کرتے تھے۔ بعض امرائے دربار کو بھی وہاں رکنے کی اجازت تھی۔ فلسفیوں اور صوفیوں کو بھی بار ملتا تھا۔

غیر جانبدار مورخین جن سے توقع تھی کہ واقعات میں کمی بیشی اور تاریخ کو مسخ نہیں کریں گے، موجود رہتے تھے۔ دوسرے موقعوں پر سلطنت کے محاصل سے متعلق مراسل پیش کیے جاتے۔ یہی وہ انجمن خاص تھی جہاں پر مذہبی مسائل پر بھی بحث ہوتی تھی وقت پڑنے پر بادشاہ اسی مجلس کو جنگی کونسل میں تبدیل کر دیتا تھا۔

ڈاکٹر ابن حسن نے فادر مانسرہٹ کا بیان نقل کیا ہے۔ کہ یہ کونسل ایک مجلس شوریٰ تھی جس میں گھنٹوں مسائل جنگ کے بارے میں مشورے کیے جاتے تھے۔ اکبر ہر ایک سے اس کی ذاتی رائے دریافت کرتا۔ پھر تمام جزئیات پر غور کرتا اور خود ایسی راہ اختیار کرتا تھا جس کو حاضرین کی کثرت تجربہ کار اشخاص کی تائید حاصل ہوتی۔

سہ پہر اور شام کا دربار

یہاں بھی صبح کی طرح سلطنت کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ اس میں زیادہ تر وزرا اور اعلیٰ عہدیداران سلطنت ہی شریک ہوتے تھے۔ دراصل یہ دربار روزمرہ کے معمول کے کام انجام دینے کے لیے منعقد ہوتا تھا۔

عدالتی کام

اکبر نے عدالتی مقدمات کی سماعت کے لیے جمعرات کا ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ اس دن بادشاہ جھروکہ درشن سے شاہی چیمبر چلا آتا تھا۔ یہاں عہدیداران محکمہ عدالت اور مفتی عدالت اور چند دیانت دار اور مفتی علماء کے سوا کسی دوسرے شخص کو آنے کی اجازت نہ تھی بادشاہ کا ایک مقررہ پروگرام کے تحت کاروبار سلطنت انجام دینا ایک ایسی روایت تھی جسے قایم کرنے کا سہرا اکبر کے سر ہے۔ اس نے سلاطین دہلی کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا اور عوام و خواص کی تائید سے اپنی حکومت کو مضبوط کیا۔

وزرائے حکومت اور محکمے

سلطنت کا سب سے اعلیٰ عہدیدار وکیل (وزیر اعظم) تھا۔ اس عہدہ پر خاندانی امیروں کی اجارہ داری نہ تھی بلکہ موزوں اشخاص کا انتخاب چھوٹے درجہ کے لوگوں میں سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

دوسرا درجہ دیوان کو حاصل تھا۔ اس کے سپرد مال گزاری اور مالیات کا محکمہ تھا۔ بخشی محکمہ کا فوج کا وزیر اور پے ماسٹر تھا۔ خود بھی بحیثیت سپہ سالار جنگ میں حصہ لیتا تھا یا بادشاہ کے ساتھ مہموں میں شریک رہتا۔ میر سامان اسٹورس اور کارخانہ جات کا نگراں تھا۔ صدر محکمہ عطیات اور امور مذہبی کا سربراہ تھا۔ منسٹری کے وزرا کے فرائض اور اختیارات کے تعلق سے کوئی ضابطہ مُدوّن نہیں ہوا تھا، لیکن وہ ایک دوسرے کے شریک کار کی طرح کام کرتے تھے۔ اور ان چاروں وزرا کی حیثیت برابر کی تھی اور انتظامی اختیارات بھی ایک جیسے تھے۔

اکبر نے حکومتی معاملات میں ان چار وزرا کے مشورہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام امرائے سلطنت اور عہدیداروں کو ایک دستور کے تحت پابند کر دیا کہ سب مخصوص اوقات میں دربار میں موجود رہیں۔ گویا اس طرح اس کے مشیروں کا دائرہ وسیع ہو گیا جن کے مشورے اور تجربے سے وہ فائدہ اٹھاتا اور دربار ہی میں مسائل کا تصفیہ کر دیتا تھا۔

۲۷ جلوس اکبری کا وہ زمانہ ہے جب راجہ ٹوڈرمل کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ شہنشاہ کی منظوری سے اس نے اپنی مشہور اصلاحات نافذ کیں جو بیس ضابطوں پر مشتمل ہیں۔ ان اصلاحات کا تعلق بندوبست آراضی، محاصل مال گزاری کی تشخیص اور وصولی اور عہدیداران مال کے فرائض سے تھا۔ اس کے پیش نظر انتشار اراضی کو دور کرنے اور کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے بنیادی مقاصد تھے۔

اکبر کے ایک وزیر قلیچ خان نے ایک حکم جاری کیا کہ سلطنت کے تمام جاگیردار تمام شقدار اور تمام داروغہ موضع واری مردم شماری کا کام انجام دیں۔ موضع کا نام۔ باشندوں کی تعداد۔ ان کے پیشوں کی تفصیل لکھیں اور ان کی درجہ بندی کریں۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ وہ کسی فرد کو کسی پیشے یا کام کے بغیر نہ رہنے دیں۔ اس بارے میں گہری جانچ پڑتال کریں تاکہ جلدی ہی معلوم ہو جائے کہ کون اشخاص ظاہر میں خوش حال جیسے ہیں اور حقیقت میں بدحال اس کے حکم کے (نتائج) سے ہر کس و ناکس کو فائدہ پہنچا اور وسیع سرزمین ہند کو چین اور عافیت نصیب ہوئی۔

اکبر نے مملکت کے تصور کو نیا روپ دیا۔ اس نے باشندگان ملک کو اپنی اولاد سمجھا اور خود کو ان کی فلاح کا ذمہ دار قرار دیا اگر کوئی ایسا دور جس کے دور میں مغل مملکت تمدنی عروج کے منتہیٰ کو پہنچی اور تہذیبی اقدار کو غیر معمولی فروغ ہوا تو بلاشبہ یہ اکبر کا ہی دور تھا۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغلوں کی سلطنت کی بنیاد ایک جاگیردارانہ نظام پر تھی۔ لیکن جاگیری نظام جو ان سلطنتوں میں رائج تھا وہ دو بنیادی صفات میں جاگیردارانہ نظام سے مختلف تھا۔ ایک یہ کہ مغل امرا موروثی نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ یہ امرا اپنی جاگیر میں شکمی دار (ذیلی امیر) نہیں بنا سکتے تھے۔ جاگیردار ایک عہدہ دار ہوتا تھا اپنی جاگیر سے مال گزاری وصول کرنے کا اختیار تھا اور یہ مال گزاری کی رقم اس مقصد سے وصول کی جاتی تھی کہ یہ حکومت کی جانب سے بطور اس کی تنخواہ کے تھی۔ اسے جاگیر پر وصول مال گزاری کے علاوہ اور کوئی انتظامی اختیار نہ تھا اس کی موت کے بعد جاگیر خالصہ کر لی جاتی تھی۔ یعنی حکومت کے پاس چلی جاتی تھی اور یہ لازمی نہیں تھا کہ وہ سابق جاگیردار کے وارث کو دے دی جائے۔ اس طرح منصب بھی موروثی نہ تھا۔ منصب دار نظم و نسق کے فوجی عہدہ دار تھے۔ منصب داری نظام جو اکبر نے قایم کیا وہ کافی پیچیدہ تھا اور مغل حکومت

کے استحکام کا بڑی حد تک ضامن تھا۔

جہانگیر (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء)

اپنی تخت نشینی کے موقعہ پر جہانگیر نے اپنی حکومت کی پالیسی کے بارہ میں جو احکامات جاری کیے وہ بہت سے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس میں منجملہ اور احکام کے یہ بھی ہے کہ مجرمین کے اعضا قطع نہ کیے جائیں جاگیردار اپنے رشتے ناتے بلا اجازت سرکار عہدہ داران علاقہ دیوانی سے قایم نہ کریں۔ بعض دن جانور ذبح نہ کیے جائیں۔ اس نے اکبر کی قایم کی ہوئی پالیسی کی سختی سے پابندی کی اور بحیثیت بادشاہ عادل اپنے آپ کو رنگ نسل اور فرقوں سے بالاتر رکھا۔ روزمرہ کی مصروفیات جھروکہ درشن سے شروع ہوتی تھیں دیوان خاص و دیوانِ عام میں صباحی دربار اور سہ پہر اور شام کا دربار۔ سب اکبر کے قایم کیے ہوئے طرز پر جاری رکھا۔

دکن میں ملک عنبر نے مرتضیٰ نظام شاہ دوم کو احمد نگر کے تخت پر بٹھا کر کھوئے علاقے دوبارہ حاصل کرنے کی مہم چلا رکھی تھی۔ عنبر کی سرکوبی کے لیے خود جہانگیر کو مانڈو آنا پڑا (۱۶۱۷ء) اور شہزادہ خرم کو عنبر سے مقابلہ کے لیے مامور کیا۔ عنبر اطاعت پر مجبور ہوا اور احمد نگر کے بعض علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے اس کامیابی پر شہزادہ خرم کو شاہ جہان کا لقب عطا ہوا۔ اس دور کی ایک اور شاندار فتح کانگرہ کے قلعہ کی ہے۔ جہانگیر نے سندرا دیسا واگھیلا کو یہ مہم سپرد کی تھی، واگھیلا نے اکتوبر ۱۶۲۰ء میں قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اور بالآخر قلعہ فتح ہوا۔

شہنشاہ کی جانشینی کا مسئلہ ایک مرحلہ پر اتنا نازک ہو گیا تھا کہ جہانگیر کشمیر سے کابل جاتے ہوئے جہلم پار کر رہا تھا تو شہنشاہ اور ملکہ کو مہابت خان نے اپنی حراست میں لے لیا۔ نور جہاں نے بہر حال شہنشاہ کو مہابت کی گرفت سے آزاد کر لیا اور مہابت دکن کو شاہ جہاں کے پاس چلا گیا۔ لیکن اس کا اثر جہانگیر کی صحت پر بہت برا پڑا اور وہ بالآخر ۲۸ ر اکتوبر ۱۶۲۷ء کو فوت ہوا۔

شاہ جہاں (۱۶۲۷ء - ۱۶۵۸ء)

شاہ جہاں کا دور مجموعی طور پر امن و امان اور خوش حالی کا دور تھا۔ البتہ اس نے دکن کی تسخیر کے لیے کوشش جاری رکھی اور بیجاپور کو پیش کر دینے پر مجبور کیا اور احمد نگر کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے چار لڑکے تھے۔ دارا شکوہ لاہور، شجاع بنگال، مراد گجرات اور اورنگ زیب دکن میں نامور تھا۔ ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہاں شدید بیمار ہوا تو اس کی علالت کی خبر پا کر اس کے لڑکوں نے جانشینی کی کشمکش شروع کر دی۔ ۱۵ ر اپریل ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب اور مراد نے مل کر دارا شکوہ کو شکست دی۔ شاہ جہاں کو اورنگ زیب نے محل میں قید کر دیا۔ اور مراد کو سلیم گڑھ قلعہ میں ڈال دیا۔ دسمبر ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے شجاع کو شکست دی اور وہ اراکان کے جنگلوں میں فرار ہو گیا جہاں اس کی موت واقع ہوئی۔ شاہ جہاں نے طویل قید کے دن گزارنے کے بعد بتاریخ ۲۲ ر جنوری ۱۶۶۶ء میں وفات پائی۔

اکبر کا قایم کیا ہوا انتظام نظم و نسق جس طرح جہانگیر کے دور میں قایم تھا۔ شاہ جہاں کے دور میں اسی طرح برقرار رہا۔ اسے بھی تمدن اور علوم و فنون سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کی ایک یادگار مشہور آفاق تاج محل ہے۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء)

اورنگ زیب ۲۴ ر اکتوبر ۱۶۱۸ء میں دوہاڑ گجرات میں پیدا ہوا۔ تخت و تاج کے لیے خوں ریز لڑائیوں کے بعد (۱۶۵۸ء - ۱۶۵۹ء) میں رسم تاج پوشی ہوئی۔ وہ نازک مزاج تیز فہم جری اور منکر ہونے کے ساتھ ساتھ منصوبے بنانے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے مقاصد بلند تھے اور وہ ارادہ کا پکا تھا۔ وہ مشکلات کا سامنا کرنے میں کبھی نہ جھجھکا اور نہ ناکام ہوا۔ ایک عظیم سلطنت کا حکمران ہونے کے باعث اسے سیاسی اور انتظامی مسائل کا پے در پے سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ان کا حل نکالنے کے لیے ذکاوت و فراست سے کام لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نیک نیت تھا لیکن اپنے رجحان طبع کے باعث وہ ایسی مصیبتوں سے دوچار ہو جاتا جن سے چھٹکارا پانا دشوار تھا۔ وہ ابتدائی دور میں بڑا روشن خیال تھا لیکن بحیثیت شہنشاہ وہ ماحول سے مطابقت پیدا نہ کر سکا۔ اس کا دور شروع سے آخر تک مسلسل کشمکش کا دور تھا۔ لیکن انجام کار اسے مایوس ہونا پڑا اور سلطنت مغلیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

یاد رہے کہ اورنگ زیب نے اکبر کے قایم کیے ہوئے جھروکہ درشن جیسے ادارے جن کی عوام میں مقبولیت مسلم تھی اور جن پر سو سال سے عمل ہوتا آیا تھا، ختم کر دیے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے دور کے اکیسویں سال جزیہ کو پھر سے نافذ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی اس میں مذہبی سختیاں بڑھتی گئیں اور صوفی سرمد جیسے صوفی بزرگ بھی اس کی زد سے بچ نہ سکے۔

اورنگ زیب کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز شمالی ہند میں شمالی مغربی علاقے کے قبائل پنجاب کے سکھ اور راجپوتانہ کے راجپوت تھے۔ ان سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ اسے دکن کی طرف توجہ دینی پڑی جہاں ایک طرف ابھرتی ہوئی مراٹھا طاقت تھی دوسری طرف بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں تھیں جو اپنی سرحدوں کی مدافعت کر رہی تھیں۔ بیجاپور میں ۱۶۸۶ء گولکنڈہ ۱۶۸۷ء میں سر ہوئے۔ مراٹھے ۱۷۰۴ء تک مدافعت کرتے رہے۔

اکبر نے وندھیاچل کے جنوب میں توسیع پسندی کی پالیسی اختیار کر کے غلطی کی تھی لیکن اس کے سیاسی اور سماجی اقدامات نے اس کے اقتدار کو استحکام بخشا۔ اورنگ زیب نے توسیع پسندی کی پالیسی کو جاری رکھا لیکن اکبر کے سماجی اور سیاسی اقدامات کی طرف توجہ نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیبی صورت حال موجب تشویش ہو گئی۔ امرا عیاش اور راوباش ہو گئے تھے۔ عوام میں حکمراں کا پہلا جیسا رعب باقی نہ تھا۔ سکھوں اور مراٹھوں کی مدافعت سخت ہو گئی تھی۔ راجپوت وفاداریاں متزلزل ہو گئیں۔ اورنگ زیب کے سامنے دو متبادل اشکال تھیں۔ یا تو اپنے پیشروؤں کی وسیع المشربی اختیار کرے یا سخت اقدامات سے مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے دوسری شکل اختیار کی جس سے اس کو عارضی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اور سرزمین ہند کی وسیع ترین حدود تک اس کا اقتدار قایم ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی اس کی گرفت کمزور ہوئی عظیم مملکت مغلیہ کا سیاسی اور تہذیبی شیرازہ بکھرنے میں کوئی وقت نہ لگا۔

تاریخ ہندوستان

عہد جدید

۱۷۶۱ء – ۱۹۴۷ء

برطانوی اقتدار کا قیام

(۱۷۶۱ء – ۱۸۱۸ء)

جدید تاریخ ہند کا ابتدائی دور دراصل ایک عبوری دور تھا۔ جس میں یورپ کے سیاسی واقعات ہندوستان جیسے دور دراز ملک پر بھی اثرانداز ہونے لگے۔ انگلستان، فرانس اور دوسری یورپی اقوام کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور تجارتی طالع آزمائی کا ہدف خود ہندوستانی بن رہے تھے۔ یورپ کی "ہفت سالہ جنگ" (۱۷۵۶ء — ۱۷۶۳ء) کے دوران ہندوستان کی برطانوی اور فرانسیسی بستیاں بھی کھلم کھلا ایک دوسرے سے متصادم ہوگئی۔ ۱۷۶۰ء میں وانڈیواش کے مقام پر فرانسیسی فوجوں کی شکست اور ۱۷۶۱ء میں سقوط پانڈیچری نے ڈوپلے اور بسی کی ساری مساعی پر پانی پھیر دیا۔ اٹھارویں صدی کی لڑائیوں اور بحری و تجارتی مقابلوں کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستان ایک شاندار مال غنیمت کے طور پر انگلستان کے ہاتھ آیا۔

فرانسیسی قوت کے ٹوٹ جانے کے بعد انگریزوں کا کوئی بیرونی حریف ہندوستان میں باقی نہ رہا تھا اور اب اسے صرف مقامی طاقتوں سے نپٹنا تھا۔ اس کی مختصر روداد حسب ذیل ہے۔

بنگال اور اودھ

بنگال میں جہاں انگریزوں کے قدم جم چکے تھے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد کلائیو نے میر جعفر کو مسند پر بٹھا دیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ولندیزیوں سے سازباز کا الزام لگا کر اسے معزول کر دیا گیا اور اس کے بجائے اس کے وزیر خزانہ میر قاسم کو گدی سونپی گئی۔ میر قاسم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی ضروریات کی تکمیل کے لیے بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ اس طرح انہیں جنوب میں اپنی فوجی کاروائیاں جاری رکھنے کے لیے مالی وسائل ہاتھ آگئے۔ تاہم یہ انتظام بھی زیادہ عرصہ تک چل نہ سکا میر قاسم نے نظم و نسق کی اصلاح کی بہتیری کوشش کی مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بڑھتے ہوئے ناواجب مطالبات کے آگے وہ بے بس ہوگیا۔ ملازمین کمپنی نے اپنی خانگی تجارت کے لیے بھی وہی مراعات طلب کیں جو کمپنی کو فرخ سیر کے ایک فرمان کے ذریعہ ملی تھیں۔ یہ اختلافات اس وقت انتہا کو پہنچ گئے جب پٹنہ کے کارخانہ کے افسر اعلیٰ ایلیس نے پٹنہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس جھڑپ میں میر قاسم کو شکست ہوئی اور اس نے اودھ کے نواب وزیر اور شہنشاہ شاہ عالم ثانی سے کمک مانگی۔ بکسر کے مقام پر اس کی فوجوں کا مقابلہ انگریزوں سے ہوا۔ ۱۷۶۴ء کی اس فیصلہ کن لڑائی میں نواب وزیر اور شاہ عالم کو شکست ہوئی اور انہیں کمپنی کی من مانی شرائط قبول کر لینی پڑیں۔ شاہ عالم نے بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات کمپنی کے حوالے کر دیے۔

کلائیو نے جو ۱۷۶۵ء میں دوبارہ گورنر بنا تھا بنگال کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھوں میں نہیں لیا بلکہ نواب بنگال کے نائب دیوان کو برطانوی ریزیڈنٹ کی نگرانی اور ہدایات کے تحت سیول اور فوجداری نظم و نسق کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اسی طرح نائب دیوان شتاب رائے کو بہار کے انتظام پر مامور کیا۔ لیکن جملہ مالی، فوجی اور سیاسی اختیارات کمپنی کے گورنر ہی کو حاصل رہے اور ریزیڈنٹ اسی کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ اس دو عملی پالیسی سے کلائیو کا منشا یہ تھا کہ ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور دیگر یورپی کمپنیوں سے بنگال کی حقیقی صورت حال پوشیدہ رکھی جائے۔ یہ انتظام ۱۷۶۵ء سے ۱۷۷۲ء تک قایم رہا۔

اختیار کا ذمہ داری سے الگ ہونا تھا کہ طرح طرح کی خرابیوں نے جڑ پکڑ لی۔ کمپنی کے ملازمین کی لوٹ کھسوٹ انتہا کو پہنچ گئی۔ بنگال اور بہار میں بھیانک قحط پڑا جس نے ایک تہائی آبادی کا صفایا کر دیا۔ بالآخر کمپنی کی مجلس نظماء (Board of Director) نے نظم و نسق کو براہ راست اپنی نگرانی میں لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء — ۱۷۸۵ء) کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔

ادھر ۱۷۶۹ء میں مراٹھوں نے شمالی ہند پر یورش کر دی اور وہ شاہ عالم ثانی کو جو الہ آباد میں عملاً انگریزوں کے زیر حراست تھا۔ دہلی لے آئے مراٹھوں نے ۱۷۷۱ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ واضح رہے کہ ۱۷۶۵ء کے معاہدہ نے اودھ کو ایک فاصل ریاست (Buffer State) کی حیثیت دی تھی۔ تاکہ اس طرح شمالی ہند کی طاقتوں بالخصوص مراٹھوں کے حملوں کی روک تھام ہو سکے۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ کسی فریق کے علاقہ پر حملہ کی صورت میں دوسرا فریق فوجی امداد بہم پہنچائے گا۔ اس انتظام کے تحت کمپنی نے اپنی فوجوں کے اخراجات کا بار نواب وزیر پر ڈال دیا۔ اور جب مراٹھوں نے روہیل کھنڈ پر حملے شروع کر دیے تو روہیل کھنڈ کے ایک سردار حافظ رحمت خان نے والی اودھ نواب شجاع الدولہ سے مدد طلب کی اور ایک معتد بہ رقم دینے کی پیش کش کی۔ لیکن اس دوران پیشوا نارائن راؤ کے قتل کی وجہ سے حالات نے پلٹا کھایا اور مراٹھے ۱۷۸۴ء تک ادھر کا رخ نہ کر سکے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر وارن ہیسٹنگز نے الہ آباد پر جسے مراٹھوں نے مغل شہنشاہ سے چھین لیا تھا، دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور پچاس لاکھ کے عوض والی اودھ کو فروخت کر دیا۔ ہیسٹنگز نے ایک معاہدہ کے ذریعہ نواب وزیر سے وعدہ کیا کہ روہیل کھنڈ فتح کرنے میں وہ اس کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اس کے صلہ میں نواب وزیر نے برطانوی ریزیڈنٹ کو اپنے علاقہ میں قیام کی اجازت دے دی۔ روہیل کھنڈ اودھ کی عملداری میں تو شامل کر لیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اودھ کے معاملات میں کمپنی کا عمل دخل بڑھ گیا۔ اور برطانوی سرحد جمنا تک وسیع ہوگئی۔ اس کے بعد اودھ کی تباہی میں زیادہ عرصہ

نہیں لگا۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال پر اسکے جانشین سے ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے اودھ میں کمپنی کی فوج مستقل طور پر متعین کر دی گئی اس کے اخراجات کا ذمہ دار نواب اودھ کو ٹھہرایا گیا اور جب نواب کا قرضہ حد سے متجاوز ہو گیا تو وارن ہیسٹنگز نے بیگمات اودھ کے خزانے اور جاگیروں کو ضبط کر لیا۔

پہلی مراٹھا جنگ (۱۷۷۵ء–۱۷۸۲ء)

انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مراٹھوں سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔ بمبئی میں انگریز کمزور تھے اسی لیے وہ سالسٹ اور بسین کے علاقوں پر قبضہ ضروری سمجھتے تھے۔ ادھر وارن ہیسٹنگز برار میں مادھوجی بھونسلے کی کٹھ پتلی حکومت قائم کر کے وسط ہند کو مراٹھوں کے اثر و اقتدار سے بیدخل کرنا چاہتا تھا۔ ۱۷۷۴ء میں پیشوا نارائن راؤ کے قتل کے بعد اس کے چچا رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) نے گدی پر قبضہ کر لیا تھا لیکن پونا کے مراٹھا سردار مقتول پیشوا کی موت کے بعد پیدا ہونے والے لڑکے کے طرف دار تھے جب انہوں نے رگھوبا کو گدی سے اتار دیا تو وہ انگریزوں سے مدد کا طالب ہوا۔ بمبئی کے انگریز حکام نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ۱۷۷۵ء میں سورت کے معاہدہ کے ذریعہ اپنے منصوبوں کے لیے زمین تیار کی۔ انگریزوں نے اس شرط پر مدد کا وعدہ کیا کہ بسین اور سالسٹ کے علاقے ان کے حوالے کر دیے جائیں گے رگھوبا نے بادل ناخواستہ یہ شرط مان لی لیکن مراٹھا سرداروں سے اراس کی لڑائی میں انہوں نے شکست کھائی۔ یہ سب کچھ بمبئی کے حکام نے کلکتہ کی مقتدر اعلیٰ حکومت سے مشورہ کیے بغیر ہی کیا تھا۔ کلکتہ کونسل نے، جہاں ہیسٹنگز کے مخالفین کی اکثریت تھی، معاہدہ سورت کو "غیر مصلحت اندیشانہ، خطرناک، غیر مجاز اور نامنصفانہ" قرار دیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ "بمبئی کے حکام نے زبردستی اپنے سر پر مراٹھا سلطنت کو فتح کرنے کا بار ایک ایسے شخص کی خاطر لے لیا ہے جو خود اس مہم میں کوئی معقول امداد نہیں دے سکتا۔" چنانچہ کلکتہ کے حکام نے پونا میں نانا فرنویس سے مصالحانہ گفت و شنید شروع کی جس کے نتیجہ میں پورندھر کا معاہدہ طے پایا۔ انگریزوں نے رگھوبا کی حمایت سے دست برداری اختیار کر لی تاہم یہ معاہدہ بے سود ثابت ہوا کیوں کہ بمبئی کی حکومت نے رگھوبا کو پناہ دی اور مجلس نظما نے معاہدہ سورت ہی کو تسلیم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ کئی معرکوں کے بعد جن میں انگریزوں نے کئی بار شکست کھائی فریقین کے درمیان ۱۷۸۲ء میں سالبائی کا معاہدہ ہوا۔ انگریزوں کو سالسٹ کا علاقہ مل گیا مگر انہیں مراٹھوں کی تائید سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس طرح مہاراشٹر میں ایک کٹھ پتلی حکومت کے قیام کی کوشش ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد بیس سال تک انگریزوں اور مراٹھوں میں کوئی ٹکر نہیں ہوئی۔

میسور کی لڑائی

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی کشمکش میں پہلی مراٹھا جنگ اور میسور کے واقعات کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق رہا ہے۔ والیٔ میسور حیدر علی انگریزوں کو زک پہنچانے کے لیے فرانسیسیوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے تعلقات مراٹھوں کے علاوہ والیٔ ارکاٹ سے بھی اچھے نہیں تھے۔ جو حاکم اودھ سے بھی زیادہ انگریزوں کا دست نگر تھا۔ پہلی اینگلو میسور جنگ، جس میں نظام حیدر آباد میسور کا حلیف تھا، ارکاٹ ہی کے علاقے میں لڑی گئی جہاں حیدر علی اور نظام نے شکست کھائی اس کے بعد حیدر علی نے انگریزوں کو پریشان کرنے کے لیے جنگ کے ڈھنگ بدل ڈالے۔ اور گوریلا جنگ شروع کی۔ چھاپہ مار لڑائی سے تنگ آکر انگریز سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے حیدر علی کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا۔ لیکن جب مراٹھوں نے میسور پر حملہ کیا تو انگریزوں نے حیدر علی کی کوئی مدد نہیں کی مزید برآں جب ۱۷۷۸ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑی تو برطانوی فوج نے ماہی پر قبضہ کر لیا جہاں سے حیدر علی کو فوجی رسد حاصل ہوتی تھی۔ اسی دوران انگریزوں کے خلاف مراٹھوں، حیدر علی اور نظام میں ایک 'اتحاد ثلاثہ' طے پایا لیکن ہیسٹنگز کے سیاسی توڑ جوڑ کے آگے وہ بے سود ثابت ہوا۔ انگریزوں نے نظام اور ناگ پور کے بھونسلے راجہ کو ہموار کر لیا، چنانچہ حیدر علی انگریزوں کے مقابلہ کے لیے تنہا رہ گیا۔ فرانسیسی عملی طور پر اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کے انتقال کے بعد اس کے جواں ہمت بیٹے ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی بالآخر جب یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین صلح ہو گئی تو مدراس کے گورنر نے ۱۷۸۴ء میں ٹیپو سے معاہدہ منگلور کے ذریعہ صلح کر لی۔ لیکن جب ٹیپو نے ۱۷۸۹ء میں ٹراونکور پر حملہ کیا، جس کا راجہ اس معاہدہ کی رو سے کمپنی کا حلیف بن گیا تھا، تو لارڈ کارنوالس نے عدم مداخلت کے طے شدہ اصول کو بالائے طاق رکھ کر اس حملہ کو اعلان جنگ قرار دے دیا۔ مراٹھے اور نظام نے جو ٹیپو کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوفزدہ تھے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ تیسری اینگلو میسور جنگ کوئی تین سال تک جاری رہی۔ کئی معرکوں کے بعد جس میں فریقین کو باری باری کامیابی اور نامرادی سے دوچار ہونا پڑا کارنوالس نے ٹیپو کو سرنگا پٹم کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۷۹۲ء کے معاہدہ سرنگا پٹم کی رو سے ٹیپو کو اپنے نصف علاقے سے دست بردار ہونا پڑا۔

کارنوالس کا ایک اور کارنامہ جس کے دور رس نتائج نکلے نظام مالگذاری کی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے اور "دوامی بندوبست" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۷۹۳ء میں بنگال، بہار اور بنارس میں یہ طریقہ رائج کیا گیا اور زمینداروں کو مستقلاً حقوق ملکیت عطا کر دئے گئے اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کاشتکاروں پر زمینداروں کا ظلم و ستم بڑھ گیا اور ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

ولزلی (۱۷۹۸ء — ۱۸۰۵ء) کے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد ہندوستان کی بساط سیاست پر کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عہد معاونت (Subsidiary Alliance) کے نام سے اس نے توسیع پسندی کی ایک نئی حکمت عملی اختیار کی اور ۱۷۹۵ء میں جنگ کھوڈا کے بعد جس میں نظام حیدر آباد کو شکست ہوئی تھی، پیشوا نے خودکشی کر لی۔ اس وقت جنوبی ہند کے سیاسی حالات میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر ولزلی نے نظام کو مجبور کیا کہ وہ اپنے فرانسیسی فوجی دستہ کو برخاست کر دے اور اس کی بجائے اپنی مدافعت کے لیے انگریزی فوج متعین کرے۔ اس "معاونتی فوج" کے اخراجات نظام ہی کو برداشت کرنے تھے۔ اس کے علاوہ نظام کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ آیندہ حیدر آباد کی خارجی پالیسی انگریزوں ہی کے مشورہ پر مبنی ہوگی۔

اس کے بعد ویلزلی نے میسور کا رخ کیا۔ ٹیپو سے اس نے مطالبہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کی دوستی سے باز آئے جب ٹیپو نے اس کی بات نہیں مانی تو ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم پر حملہ کر دیا گیا۔ ٹیپو سلطان لڑتا ہوا مارا گیا اور ویلزلی نے ٹیپو

کی وسیع ریاست کے بڑے حصہ کو کمپنی کے علاوہ اپنے حلیف نظام اور مراٹھوں میں تقسیم کر دیا اور بقیہ ریاست میسور کو سابق وڈیار راجہ کے حوالے کیا اور نئی ریاست میسور کو بھی جو ہر طرف سے کمپنی کے علاقے سے گھری ہوئی تھی "عہد معاونت" کا پابند کر دیا۔

ولیزلی نے کمپنی کے علاقہ کی توسیع میں کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ۱۸۰۰ء میں کرناٹک پر قبضہ کیا۔ ۱۸۰۱ء میں اودھ سے ایک نئے معاہدہ کے ذریعہ گورکھ پور اور روہیل کھنڈ کے علاوہ گنگا جمنا کے دوآب کا علاقہ حاصل کر لیا۔

دوسری مراٹھا جنگ (۱۸۰۳ء - ۱۸۰۵ء)

مہاراجہ سندھیا اور نانا فرنویس جیسے شاطرانہ سیاستدانوں کے انتقال کی وجہ سے مہاراشٹر کے علاقہ میں ایک خلا پیدا ہو گیا جسے پُر کرنا محال نظر آ رہا تھا۔ ہولکر اور سندھیا دونوں ہی پونا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں پیشوا باجی راؤ ثانی نے انگریزوں سے مدد مانگی جس کے عوض وہ معاونتی فوج کے اخراجات برداشت کرنے اور خارجی پالیسی پر انگریزوں کی نگرانی قبول کرنے پر راضی ہو گیا۔ سندھیا اور ناگ پور کے بھونسلے راجہ نے اس نئی صورت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ اور دونوں ہی نے "عہد معاونت" کے تحت انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے کئی علاقوں سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ یہی حال ہولکر کا ہوا۔ اس کے پایۂ تخت اندور پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

لیکن جس تیزی سے انگریزوں کے مقبوضات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے انگلستان کے ارباب اختیار شاید غیر دانش مندانہ تصور کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ولیزلی کو واپس طلب کر لیا اور کارنوالس کو دوبارہ ہندوستان روانہ کیا تاکہ کچھ عرصہ کے لیے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا جا سکے۔

۱۸۰۷ء میں جب لارڈ منٹو بحیثیت گورنر جنرل ہندوستان آیا تو یورپ میں نپولیانی جنگیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے ایران اور افغانستان سے دوستانہ تعلقات قایم کیے اور ۱۸۰۹ء میں معاہدۂ امرتسر کے ذریعہ رنجیت سنگھ کی پورب کی طرف پیش قدمی کو روک دیا گیا۔ اب برطانوی ہند کی سرحد جمنا سے پرے ستلج تک بڑھ چکی تھی۔

تیسری مراٹھا جنگ

منٹو کے جانشین کی حیثیت سے لارڈ ہسٹینگز کو ایک ایسے پیشوا سے سابقہ پڑا جو انگریزوں کے جوے کو اتار پھینکنے کے لیے بے چین تھا۔ تاہم اسے اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی اور نتیجتاً اسے مراٹھا جتھ کی سرداری سے دست بردار ہونا پڑا۔ بہت سارا علاقہ اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ اسی دوران ہسٹینگز کا سابقہ پنڈاریوں سے ہوا۔ جنہوں نے مالوہ اور راجپوتانہ میں تباہی مچا رکھی تھی۔ انگریزی فوج نے ان سب کا قلع قمع کر دیا۔ امیر خان کو ٹونک کا علاقہ دے دیا گیا جو پنڈاری بچ رہے وہ پیشوا کی فوج میں شریک ہو گئے۔ جب پیشوا نے برطانوی رزیڈنسی کو آگ لگا دی تو انگریزوں نے اس بہانہ پونا پر قبضہ کر لیا۔ ناگ پور کے اپا صاحب نے مقابلہ کی کوشش کی لیکن اسے بھی ناکامی ہوئی۔ بالآخر آشٹی کے مقام پر ۱۸۱۸ء میں پیشوا نے ہتھیار ڈال دیے۔ ستارا کا ایک چھوٹا سا ضلع شیواجی کے وارث کے حوالے کیا گیا اور پیشوا کے بقیہ علاقہ کو بمبئی پریسیڈنسی میں ضم کر دیا گیا۔ اس طرح اندرونی لڑائیاں یکے بعد دیگرے انجام کو پہنچیں اور پنجاب کو چھوڑ کر ہر جگہ برطانوی اقتدار نے مضبوطی سے قدم جما لیے۔

برطانوی اقتدار کا استحکام (۱۸۰۸ء - ۱۸۱۸ء)

۱۸۱۸ء سال تاریخ ہند میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۱۸ء تک ہندوستان کا ایک وسیع علاقہ ستلج سے برہم پترا اور ہمالیہ سے کنیاکماری تک برطانوی عملداری میں شامل ہو چکا تھا۔ صرف مشرقی اور مغربی سرحدوں کو مستحکم کرنا باقی رہ گیا تھا۔ سندھ اور پنجاب کے الحاق اور افغانستان کو برطانوی اور روسی مملکت کے درمیان ایک فاصل ریاست قرار دینے کے بعد یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔

برما سے لڑائی

جہاں تک مشرقی سرحد کا تعلق ہے برما کے لیٹنی علاقہ کے علاوہ آسام، منی پور اور کچار پر قبضہ کے بعد یہ مقصد بھی پورا ہو گیا۔ انگریزی کے نفاذ اور ستی اور ٹھگی کے خاتمہ کے بعد انگریزی اقتدار کی جڑیں اور مضبوط ہو گئیں۔

مشرق میں برطانوی عمل داری کی توسیع کا منطقی نتیجہ برما سے تصادم تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۵ء میں جب برما نے اراکان پر قبضہ کر لیا تو ہزاروں اراکان باشندوں نے ترک وطن کر کے برطانوی علاقہ میں پناہ لی۔ اور اس طرح پہلی مرتبہ سرحدی جھگڑے شروع ہو گئے۔ صلح مصالحت کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ برمیوں نے اراکانی تارکان وطن کی واپسی کے بہانے منی پور پر قبضہ کر لیا اور آسام پر یورش کر دی اور بالآخر آسام کو بھی برما میں شامل کر لیا گیا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال انگریزوں کے لیے بڑی تشویشناک تھی۔ اور جب برمیوں نے کمپنی کے جزیرہ شاہ پوری پر حملہ کیا تو لارڈ ایمہرسٹ نے (۱۸۲۴ء میں) اعلان جنگ کر دیا۔ دو سال سے زیادہ عرصہ تک بڑے ہی نامساعد حالات میں انگریزوں کی مہم جاری رہی۔ بالآخر رنگون پر ان کا قبضہ ہو گیا اور ۱۸۲۶ء کے معاہدہ نیدبو کی رو سے برمیوں نے اراکان اور تناسرم کا علاقہ انگریزوں کو تفویض کر دیا۔ برما نے آسام، منی پور اور کچار سے دست کشی اختیار کر لی اور نیز برما کے صدر مقام اوا میں برطانوی رزیڈنسی کے قیام کو مان لیا۔ اس طرح برطانوی اقتدار پہلی مرتبہ سرحد ہند کے پار پہنچ گیا اور نئی ایشیائی قومیں انگریزی حکومت کے زیر نگین آ گئیں۔

رنگون میں بعض انگریزی تاجروں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تو لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۲ء میں پوری تیاری کے بعد انتقام کی غرض سے فوج کشی کر دی اور رنگون سے پروم تک کا علاقہ برطانوی عمل داری میں شامل کر لیا گیا۔

شمال مغربی سرحد

دو برمی جنگوں کے نتیجہ میں انگریزوں کی مشرقی سرحد کی تکمیل و حفاظت پر مہر لگ گئی مگر مغربی سرحدوں کے تحفظ کا مسئلہ ہنوز باقی تھا یہ مسئلہ جس قدر اہم تھا اسی قدر پیچیدہ بھی تھا۔ کیوں کہ یہاں ستلج کے پار نہ صرف ایک طاقتور سکھ ریاست سے نپٹنا تھا بلکہ امیران سندھ اور اس سے پرے افغانستان سے سابقہ تھا۔ اور ان سب میں افغانستان اپنے محل وقوع کی وجہ سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ روس کی سرحدیں ایران سے ملی ہوئی تھیں اور روس جیسی طاقتور بری قوت کا انگلستان کی بحری طاقت سے تصادم کا اندیشہ بعید از قیاس نہ تھا۔ انگریز افغانستان کو ایک حدِ فاصل کی ریاست کے طور پر برقرار رکھنا چاہتے تھے اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ والیٔ افغانستان سے ان کے تعلقات استوار رہیں۔ چنانچہ ایران نے جو روس کے زیر اثر تھا جب ۱۸۳۷ء

میں ہرات کا محاصرہ کیا تو انگریزوں نے والیٔ افغانستان دوست محمدؐ سے سودا بازی شروع کر دی لیکن اس میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی کیوں کہ لارڈ آکلینڈ افغانستان کے مطالبہ پشاور کو قبول کر کے رنجیت سنگھ کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۴ء میں پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔

اس مسئلہ کا حل لارڈ آکلینڈ نے یہی سوچا کہ دوست محمد کو تخت سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بجائے ایک جلاوطن شہزادہ شاہ شجاع کو تخت نشین کیا جائے چنانچہ اس مقصد سے ۱۸۳۹ء میں قندھار، غزنی اور کابل پر چڑھائی کی گئی اور شاہ شجاع کو گدی پر بھی بٹھا دیا گیا لیکن افغان باشندوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور بالآخر دوست محمد ہی کو دوبارہ تخت حوالے کرنا پڑا۔ اس کے بعد دوست محمد کے تعلقات انگریزوں سے خوشگوار رہے۔

سندھ کے حالات

"تسخیر سندھ، جنگ افغانستان ہی کا تسلسل اور اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے اسی کا نتیجہ تھی۔" جب رنجیت سنگھ نے انگریز فوجوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت نہیں دی تو لازماً سندھ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس موقعہ پر انگریزوں نے نہ صرف ۱۸۳۲ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی بلکہ امیران سندھ کو مجبور کیا کہ ان کی افواج کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ اس کے علاوہ وہاں بھی ایک معاونتی فوج متعین کر دی گئی اور بالآخر ۱۸۴۳ء میں امیران سندھ پر بغاوت کا الزام لگا کر سندھ کو برطانوی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔

پنجاب کے حالات

پنجاب کی سکھ ریاست کا بانی راجہ رنجیت سنگھ ایک قابل حکمران تھا جس نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کر کے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ اس کی ریاست جنوب میں ملتان، مغرب میں پشاور، شمال میں کشمیر اور مشرق میں دریائے ستلج تک پھیلی ہوئی تھی۔ ستلج کے مشرقی جانب انگریز موجود تھے۔ جب ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کے ورثا میں گدی کے لیے جھگڑا شروع ہو گیا ملک کا سول نظم و نسق معطل ہو گیا۔ تخت کے عہدیداروں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فوجی پنچایتیں قائم ہوئیں۔ انگریز اس افراتفری سے فائدہ اٹھانے کے لیے وقت کے منتظر تھے۔ اور جب ۱۸۴۵ء میں خالصہ فوج نے جس کا حقیقی معنوں میں کوئی لیڈر نہیں تھا، انگریزوں سے ٹکر لینے کی کوشش کی تو اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سقوط لاہور کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے رنجیت سنگھ کے نابالغ لڑکے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا اور ایک مجلس تولیت قائم کر دی۔ لاہور میں برطانوی رزیڈنٹ متعین ہوا اور ستلج سے بیاس تک کا علاقہ برطانوی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ کچھ ہی مہینوں بعد رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی جنداں سے سارے اختیارات نظم و نسق سلب کر لیے گئے اور مجلس تولیت پورے طور پر رزیڈنٹ کے زیر نگرانی آ گئی۔ اس کے علاوہ تاوان جنگ کی عدم ادائیگی کی بنا پر کشمیر و جموں کا علاقہ پچھتر لاکھ کے عوض گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

اب سارے پنجاب پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ دربار لاہور کی برائے نام آزادی کا خاتمہ صرف وقت کا منتظر تھا۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء — ۱۸۵۶ء) کو آئے ہوئے ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ سکھوں سے دوسری جنگ چھڑ گئی۔ فتح و کامرانی کے متعدد معرکوں کے بعد بالآخر ۱۸۴۹ء میں لاہور کا الحاق عمل میں آیا۔

برطانوی علاقہ کی سرحدوں میں ممکنہ حد تک توسیع ہو چکی تھی۔ اب استحکام کی باری تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے بدانتظامی کے بہانے کئی ریاستوں کو برطانوی عملداری میں شامل کر لیا اور وہاں برطانوی کمشنر مقرر کر دیے۔ الحاق کی اس پالیسی کو ڈلہوزی نے ایک باقاعدہ اصول کی شکل دے دی جو "اصول تنسیخ" (Doctrine of Lapse) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ عوام کے لیے برطانوی اقتدار ہندوستانی راجاؤں کی حکمرانی سے بدرجہا بہتر ہے چنانچہ اس نے انہیں ختم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہ اصول بنا لیا گیا کہ کسی ریاست کے عوام کے مقابلہ میں ایک متبنیٰ راجہ کے حقوق کو کبھی فوقیت نہ دی جائے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "اصول تنسیخ" ملک کے سیاسی اور انتظامی اتحاد و استحکام کا ایک زبردست حربہ ثابت ہوا۔ اس اصول کی زد سے ستارا، کرولی، جھانسی، ناگ پور، کرناٹک اور ادے پور یہاں تک کہ شہنشاہ بہادر شاہ بھی نہ بچ سکے۔ الحاق کی سب سے نمایاں مثال اودھ کی ریاست ہے جسے بدانتظامی کا الزام دے کر انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ اودھ کے ساتھ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کے تحت نواب اودھ کو انتہائی بدانتظامی کی صورت میں بھی نہ تو معزول کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ریاست کا انضمام عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ باوجود اس کے ۱۸۵۶ء میں نواب کو پنشن دے کر کلکتہ بھیج دیا گیا اور ریاست کو برطانوی علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ واقعہ جس میں ایک وسیع معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کی گئی تھی ۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک اہم سبب بن گیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت

گو بعض دور اندیش انگریز حکام نے آنے والے طوفان کی طرف اشارہ بھی کیا تھا تاہم مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت برطانوی حکومت کے لیے حیرت ناک ثابت ہوئی۔ اس کے کئی اسباب تھے لیکن ایک اہم سبب بنگال رجمنٹ کے سپاہیوں کی بے چینی تھی۔ شرائط ملازمت اس قدر سخت تھیں کہ سپاہیوں میں نہ تو وفاداری کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا اور نہ ضبط و نظم کا احساس۔ انہیں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کہیں بھی بھیجا جا سکتا تھا اور طویل عرصہ تک خدمت انجام دینے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ سپاہیوں کی ذات پات کے مراتب و مراسم اور مذہبی احساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ بغاوت کی ایک وجہ ہندوستانی اور برطانوی سپاہیوں کی غیر متناسب تعداد بھی بتلائی جاتی ہے لیکن سب سے اہم سبب دراصل وہ بے چینی اور بددلی تھی جو ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی کی وجہ سے دن بدن بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ پالیسی اس تیزی سے روبہ عمل لائی گئی تھی کہ متاثرہ طبقات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا عام ذہن بھی اسے قبول نہ کر سکا۔

یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ الحاق کے اس عمل نے نہ صرف دیسی ریاست کو حکمرانی کے ایک گھرانہ سے محروم کر دیا بلکہ تیزی سے سکڑتے ہوئے اس میدان عمل کو اور بھی محدود کر دیا۔ جہاں ہندوستانی قوم اپنی سیاسی اور انتظامی صلاحیتوں کا اظہار کر سکتی تھی۔ "بڑی بڑی زمینداریاں، انعامی اراضیات اور موروثی تعلقداریاں کسی نہ کسی بہانے چھین لی گئیں۔ اس افواہ سے تو آگ ہی لگ گئی کہ بنگال رجمنٹ کو جو کارتوس فراہم کیے جا رہے تھے ان پر گائے اور سؤر کی چربی لگی ہوئی تھی۔ جس کے استعمال کو ہندو اور

مسلمان سپاہی کسی طرح برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دونوں ہی یہ باور کرنے لگے کہ ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کی یہ دانستہ کوشش ہے

۱۰ ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی دیسی رجمنٹ نے بغاوت کر دی اور دہلی کی جانب کوچ شروع کر دیا۔ لال قلعہ پر مغل جھنڈا لہرا کر بہادر شاہ کے شہنشاہِ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور جگہ جگہ بیرونی تسلّط کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا۔ کان پور، لکھنؤ، دہلی، جھانسی اور گوالیار اس بغاوت کے اہم مرکز تھے۔ یہاں لڑائی کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں مختصر یہ کہ ایک طویل عرصہ تک متعدد مہمات میں ہندوستانی جانبازوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ کان پور مہم کی قیادت آخری پیشوا کے وارث نانا صاحب نے سنبھالی اور ان کے فوجی مشیر تانتیا ٹوپے نے انگریزوں کے خلاف کئی معرکے سر کیے۔ اودھ میں لکھنؤ ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا گیا اور اودھ کا کمشنر ہنری لارنس لڑتا ہوا زخمی ہوا اور کچھ دنوں بعد فوت ہو گیا۔ اسی اثنا میں انگریزوں نے دہلی پر حملہ کر دیا اور چھ دن کی سخت جنگ کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا گیا۔ مغل شہنشاہ کے لڑکوں کو گولی مار دی گئی اور خود شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ اسی طرح جھانسی کی رانی نے بھی انگریزوں کا سخت مقابلہ کیا اور بالآخر گوالیار کے قلعہ میں ایک جانباز سپاہی کی طرح لڑتے ہوئے جان دے دی۔

اُدھر اودھ میں عوام نے علم بغاوت بلند کیا اور وہ بیگم اودھ، نواب بریلی اور نانا صاحب کے پرچم تلے ایک عرصہ تک لڑتے رہے لیکن بالآخر ۱۸۵۹ء میں انہیں بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں نہ صرف ہزاروں سپاہی ہلاک ہوئے بلکہ لاکھوں ہندوستانی عوام جان و مال سے محروم ہو گئے خاص کر دہلی اور اودھ پر کمپنی کی فاتح فوجوں اور غضبناک افسروں کے ہاتھوں جو قیامت ڈھائی گئی اس کی خونیں داستانیں اس جنگ آزادی کے کچلے جانے کی بڑی ہولناک تصویر پیش کرتی ہیں۔

ہندوستان تاج برطانیہ کے تحت
(۱۸۵۸ء — ۱۹۴۷ء)

"شورش" فرو ہونے کے بعد کے برطانوی دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (الف) ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۵ء تک کا دور جس میں برطانوی اقتدار اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ (ب) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ جس میں قومی تحریک کا نشو و نما ہوا اور بالآخر اس کے نتیجہ میں ہندوستان نے آزادی حاصل کی۔

۱۸۵۸ء - ۱۹۰۵ء کا دور

ملکہ انگلستان کے ۱۸۵۸ء کے فرمان کے ذریعہ ہندوستان کا نظم و نسق براہ راست حکومت برطانیہ نے سنبھال لیا اور ایک نئی حکمت عملی کا اعلان کیا۔ مجلس نگراں (Board of Control) کے صدر کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور ہندوستان کے امور و معاملات کے انصرام کے لیے وزیر ہند کا عہدہ وجود میں آیا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کو تاج برطانیہ کے شخصی نمائندہ کی حیثیت سے وائسرائے کا لقب دیا گیا۔

لارڈ کیننگ (۱۸۵۶ء — ۱۸۶۲ء) جس کے دور حکومت میں یہ ساری تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ کمپنی کا آخری گورنر جنرل تھا جو تاج برطانیہ کے پہلے وائسرائے و گورنر جنرل کی حیثیت سے مامور ہوا۔

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کی روشنی میں حالات کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی روایات و عقائد کو پس پشت ڈال کر جس تیز رفتاری سے سماجی تبدیلی کا بیڑا اٹھایا وہ ناعاقبت اندیشانہ تھا۔ اس لیے اعلان ہوا کہ ہندوستانی روایات و عقائد اور مذہبی جذبات کا پورا پورا احترام کیا جائے گا۔

کیننگ نے امن و امان کی بحالی کے بعد حکومت کے مالی وسائل کی جانب توجہ مبذول کی۔ اور انہیں ٹھیک کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں قلمدانوں کی تقسیم کا طریقہ پہلی بار رائج کیا گیا۔ قانون تعزیرات ہند (۱۸۶۰ء) قانون، فوجداری ۱۸۶۱ء اور قانون ہائی کورٹس (۱۸۶۱ء) کے نفاذ کے ذریعہ عدالتی نظام کی اصلاح کی گئی۔ غرض یہ کہ جب کیننگ وطن واپس جانے لگا تو ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے اور وہ مغرب کے صنعتی انقلاب کے اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

کیننگ اور کرزن (۱۸۹۹ء — ۱۹۰۵ء) کے درمیان ہندوستان پر نو وائسرائے نے حکومت کی۔ یہ زمانہ برطانوی اقتدار کے استحکام و عروج کا دور تھا۔ کرزن کے دور میں برطانوی سامراج کا سورج پورے آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سرحدیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ دیسی ریاستوں سے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ نظم و نسق میں دفتریت کا ایک انتہائی باضابطہ طریقہ رائج ہو چکا تھا۔ معاشی ترقی اور رسل و رسائل کی اصلاح کی وجہ سے ہندوستان کا ہر علاقہ ایک دوسرے سے مربوط ہو گیا تھا۔ یہاں کے حالات پر برطانوی کابینہ کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے مقابلہ میں سلطنت برطانیہ کے عظیم تر مفادات کو فوقیت دی جا رہی تھی۔ چنانچہ جب شمال مغرب میں روس کے اثرات بڑھنے لگے اور پورے وسط ایشیا پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو والیٔ افغانستان سے مصالحت کرنا ضروری سمجھا گیا تا کہ مغربی سرحد کو کوئی خطرہ لاحق ہونے نہ پائے۔ ۱۸۸۷ء میں برطانیہ، روس اور افغانستان کے درمیان سرحدی معاہدہ کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد خود ہندوستان اور افغانستان میں ایک خط فاصل کی توثیق کی گئی جسے "ڈیورنڈ لائن" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کرزن نے سرحدی قبائل کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ قایم کیا اور اس کے نظم و نسق کی ذمہ داری مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں رکھی۔

مشرق میں جہاں تک برما کا تعلق ہے انگریز دو لڑائیوں کے بعد نہ صرف ساحلی برما میں قدم جما چکے تھے بلکہ انہوں نے اندرون ملک بھی تجارتی حقوق حاصل کر لیے تھے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ برما کے راستہ سے تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ لیکن ۱۸۸۴ء سے ہند چین میں بڑھتے ہوئے فرانسیسی اثرات نے سارے جنوب مشرقی ایشیا کے توازن قوت میں ایک بحران پیدا کر دیا۔ انگریز توازن لانے کی تلاش ہی میں تھے کہ برما ٹریڈنگ کارپوریشن، پر برمی حکومت نے بھاری جرمانہ عائد کر دیا۔ گویا لارڈ ڈفرن کو مداخلت کا بہانہ ہاتھ آیا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ بالائی برما کو زیر نگیں لایا۔ اس طرح برما سے پہلے آسام

فرانسیسی اور انگریزی حلقہ اثر کے درمیان حدِ فاصل بن گیا۔

دیسی ریاستیں

۵۷ء کے واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اگر مصلحت اندیشی سے کام لیا جائے تو دیسی رؤسا نہ صرف برطانوی اقتدار کے ہمنوا بن سکتے ہیں بلکہ اس کے استحکام کے لیے ایک مضبوط ستون کا کام دے سکتے ہیں۔ اس لیے ڈلہوزی کے اصول الحاق نے یہاں کے رؤسا میں جو بددلی اور دہشت پیدا کر دی تھی اس کا ازالہ ضروری ہو گیا تھا۔ الحاق کی پالیسی ترک کر دی گئی۔ ان کے معاہداتی حقوق کے احترام کی ضمانت دی گئی۔ بشرطیکہ وفاداری تبنیت کے حق کو تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح والیانِ ریاست سے تعلقات کی ایک نئی طرح ڈالی گئی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ تاجِ برطانیہ کا اقتدار ہندوستان کے طول و عرض میں "اقتدارِ واحد" متصور ہوگا اور اس کی "بالادستی" (Paramountcy) بہرصورت مسلّم رہے گی۔ اس نظریہ کا مقصد یہ تھا کہ سارے ہندوستان کو سیاسی حیثیت سے ایک وحدت تصور کیا جائے جس میں برطانوی ہند کے علاوہ دیسی ریاستیں بھی شامل تھیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیسی ریاستوں کی خود مختارانہ حیثیت ختم ہو گئی اور والیانِ ریاست برطانیہ کے نظرِ کرم کے محتاج بن گئے۔ جب کسی دیسی ریاست میں بدنظمی کے حالات پیدا ہوئے یا اصلاح سے متعلق عوامی مطالبات نے شدت اختیار کی تو ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا برطانوی حکومت کا گویا فرض ہو گیا! اس کے علاوہ جانشین کے تنازعہ کی صورت میں بھی مداخلت ضروری تھی۔ کرزن کے دور میں تو اس طرح کی مداخلت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور والیانِ ریاست صرف سامراجی مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار بن کر رہ گئے تھے۔

انتظامی ہیئت ترکیبی

یوں تو ۱۸۵۷ء کی بغاوت عظیم سے پہلے ہی ایک متحدہ انتظامی ڈھانچہ کی بنیاد پڑ چکی تھی تاہم قانونِ ہند بابت ۱۸۵۸ء کی رو سے اسے مزید مستحکم بنایا گیا۔ وزیرِ ہند (سکریٹری آف اسٹیٹ) کا نیا عہدہ قایم کیا گیا اور وائسرائے کو اس کے توسط سے حکومت برطانیہ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔ وزیرِ ہند کو پارلیمنٹ کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ تاہم ہندوستانی معاملات میں اس کی حیثیت ایک اعلیٰ حاکم کی سی تھی۔

جہاں تک نظم و نسق میں ہندوستانیوں کی شرکت کا تعلق ہے کیننگ نے پہلی مرتبہ بعض ہندوستانیوں کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے لیے نامزد کیا تاہم ان کے مشورہ کو قبول کرنے کا وائسرائے پابند نہ تھا۔ ۱۸۹۲ء میں "انڈین کونسلز ایکٹ" کے ذریعہ اس کونسل میں مزید توسیع ہوئی اور پہلی مرتبہ انتخاب کی بنا پر نمائندگی کے حق کو تسلیم کیا گیا اور کونسل کو سالانہ رپورٹ پر مباحثہ کا حق بھی حاصل ہو گیا۔ اسی طرح صوبائی کونسلوں کی توسیع عمل میں آئی۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک طاقت ور شاہی دفتریت کو فروغ حاصل ہوا۔ انڈین سول سروس منضبط کی گئی اور مقابلہ کے امتحانات کا طریقہ رائج ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی کو انڈین سول سروس میں داخلہ ملا۔ ۱۸۷۱ء میں اور اس کے بعد ہندوستانیوں کو مقامی امور مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ کے انصرام میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اور مقامی مجالس قائم ہوئیں۔

اس زمانہ کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ ریلوں کا آغاز اور توسیع ہے۔ یہ کام حکومت کی نگرانی اور پروگرام کے تحت خانگی برطانوی کمپنیوں نے انجام دیا۔ ریلوں کو بلا مبالغہ جدید ہندوستان کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ صنعتی ترقی کی رفتار جس کی ابتدا انیسویں صدی کے وسط میں ہو چکی تھی۔ ریلوں کے نظامِ حمل و نقل کی وجہ سے تیز تر ہو گئی۔

مغربی تعلیم اور قومی بیداری

ہندوستان کی تعمیرِ جدید میں مغربی خیالات کی اشاعت کا بڑا حصہ رہا ہے۔ میکالے کی مشہور تعلیمی یادداشت (۱۸۳۵ء) کی بنا پر انگریزی تعلیم کے رواج سے مغربی خیالات و نظریات نے ہندوستانی ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی تین جامعات کا قیام عمل میں آیا۔ مغربی علوم و فنون سے واقفیت کا سیاسی اظہار بالآخر قومی بیداری کی شکل میں ہوا۔ اور جب کرزن اپنے سامراجی منصوبوں کے ساتھ ہندوستان آیا تو قومی تحریک کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ لیکن کرزن تعلیم یافتہ باشعور طبقہ کے خیالات اور قومی احساسات کو خاطر میں لائے بغیر برطانوی اقتدار توسیع اور استحکام کے لیے سرگرمِ عمل رہا۔ ایک ماہر شاطرِ سیاست کی حیثیت سے اس نے شمال مغربی سرحد کا جائزہ لیا چترال، خیبر اور خرّم سے فوجیں ہٹالیں اور سرحدی قبائل سے تعلقات استوار کیے۔ اس کے علاوہ امیرِ افغانستان کو "ہز میجسٹی" کے خطاب سے نواز کر افغانستان سے خوشگوار تعلقات بحال رکھے۔ جہاں تک ہمالیائی سرحد کا تعلق ہے۔ اس نے کافی تگ و دو کے بعد ۱۹۰۴ء میں تبت سے ایک معاہدہ کیا اس کی بنا پر انگریزوں کو تبت میں بعض تجارتی اور سکونتی حقوق حاصل ہو گئے۔ تبت کو ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف چین اور روس کے درمیان ایک فاصل ریاست کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی پالیسی کی ابتدا کرزن ہی نے کی۔

کرزن نے انتظامی مشینری کی ازسرِ نو تنظیم کی اور ملک کی معاشی اور زرعی ترقی کی غرض سے کئی اقدامات کیے۔ چنانچہ زراعت اور تجارت و صنعت کے محکمہ جات بھی اسی کے زمانے میں قایم کیے گئے۔ اس نے قدیم آثار و عمارات کے تحفظ کے لیے محکمۂ آثارِ قدیمہ قایم کیا اور سر جان مارشل جیسے ممتاز شخص کو اس کا سربراہ مقرر کیا۔ کلکتہ میں ایک امپیریل لائبریری قایم کی۔ جامعاتی تعلیم میں اقامتی طریقہ رائج کیا گیا۔ تعلیمی امور میں حکومت کی گرفت اور مداخلت اور بڑھ گئی، لیکن یہ مداخلت تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی چنانچہ ۱۹۰۴ء کے "قانونِ جامعات" کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر کرزن کے جس عمل نے ہندوستانیوں میں جذبۂ بغاوت کو فروغ دیا وہ تقسیم بنگال ہے۔ کرزن ایک طرف تو خالص انتظامی مصالح کی بنا پر ایسی تقسیم ضروری سمجھتا تھا؛ دوسری طرف وہ مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا جنہیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر بُری طرح کچلا گیا تھا۔ وجوہات چاہے کچھ ہوں تقسیم بنگال کی شدّ و مد سے مخالفت کی گئی اور اس احتجاج نے بالآخر ایک سودیشی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

۱۹۰۵ء میں کمانڈر ان چیف لارڈ کچنر کو اگزیکیٹو کونسل کا ممبر مقرر کرنے کے مسئلہ پر کرزن کا برطانوی کابینہ سے اختلاف پیدا ہو گیا اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۰۵ء-۱۹۴۷ء کا دور

۱۹۰۵ء سے ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے جس میں قومی جدوجہد کی مختلف تحریکیں اور ان کے ردِ عمل کے طور پر سیاسی مراعات و دستوری اصلاحات کی تجاویز نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں کرزن کے مستعفی ہونے کے بعد سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملنے تک تو والسرائے یعنی منٹو (۱۹۰۵ء — ۱۹۱۰ء) ہارڈنگ (۱۹۱۰ء — ۱۹۱۶ء) جیمسفورڈ (۱۹۱۶ء — ۱۹۲۱ء) ریڈنگ (۱۹۲۱ء — ۱۹۲۶ء) اِرون (۱۹۲۶ء — ۱۹۳۱ء) ولنگڈن (۱۹۳۱ء — ۱۹۳۹ء) لنلتھگو (۱۹۳۹ء — ۱۹۴۳ء) ویول (۱۹۴۳ء — ۱۹۴۷ء) اور ماؤنٹ بیٹن (۱۹۴۷ء۔ مارچ تا اگست) ہندوستان آئے۔ اس عرصہ میں دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کے اندر بھی بڑے بڑے تغیرات رونما ہوئے تاہم ان سب واقعات کا تعلق کسی نہ کسی طرح بیرونی تسلط سے نجات پانے کی جدوجہد ہی سے رہا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی تاریخ دراصل قومی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کی تاریخ ہے اس کا کسی قدر تفصیلی بیان "ہندوستان کی قومی جدوجہد" میں پیش کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی قومی جدوجہد

قومی بیداری کے اسباب

ہندوستان میں انگریزی تسلط کے خلاف جدوجہد یوں تو اٹھارھویں صدی سے شروع ہو چکی تھی تاہم اس نے ایک باقاعدہ اور منظم تحریک کی شکل انیسویں صدی میں اختیار کی۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی کے بعد انگریز حقیقی معنوں میں ہندوستان کے حاکم بن گئے اور اہلِ ہند کو بتدریج اپنی سیاسی بے چارگی اور اقتصادی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ بالفاظ دیگر آزادی سے محرومی جدوجہد آزادی کا سب سے بڑا محرک بن گئی۔

قومی تحریک کے نشو و نما پانے کے کئی اسباب تھے۔ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی اختیارات حاصل ہونے کے بعد یہاں کے دیہی نظام زندگی میں ایک انتشار پیدا ہو گیا۔ کمپنی اور اس کے ملازمین کی لوٹ کھسوٹ حد سے بڑھ گئی۔ عوام کے مصائب اور ان کی بے چینی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اس زمانے کے حالات کا تھوڑا بہت اندازہ ہمیں مولوی سید غلام حسین کی یادگار تصنیف "سیر المتاخرین" سے ہوتا ہے جو ۱۷۸۳ء میں لکھی گئی۔ یہ غالباً کسی ہندوستانی کی پہلی تصنیف ہے جس میں کمپنی کے دورِ حکومت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ سید صاحب انگریزوں کے دشمن نہیں تھے۔ تاہم وہ جدید حکومت کو عطیہ خداوندی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا عام میلان تو اسی طرف ہے کہ اس حکومت کو آیندہ طے شدہ امر واقعہ کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ پھر بھی انہوں نے انگریزی حکومت کی بدعنوانیوں پر جو بے لاگ تبصرہ کیا ہے وہ ہر طرح قابل ستائش ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی جگہ بھی کوئی حد فاصل نہیں کھینچی اور دونوں ہی کے مشترکہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ غرض ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا دور ایسا نہیں تھا جس میں ہندوستانیوں نے بیرونی تسلط کو بلا چوں و چرا قبول کر لیا ہو اور اس کے خلاف نفرت کے جذبات پائے نہ جاتے ہوں۔ بعض اوقات تو اس نفرت نے پُرتشدد ہنگاموں کی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۲۴ء میں بارک پور کی فوجی شورش اور اسی طرح کسانوں کی بے چینی کے واقعات اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ اس دور کے احتجاج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمیں مسلمان ہی پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ یہ امر غیر فطری بھی نہیں تھا کیوں کہ مسلمانوں نے ابھی ابھی حکومت کھوئی تھی۔ سیکڑوں سالوں میں بنی ہوئی ان کی سماجی قدریں یکے بعد دیگرے مسمار ہو رہی تھیں۔ پرانی قدروں کی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ خود ملک کی بدانتظامی، کمپنی کے ملازمین کی رشوت ستانی، ان کا مذہبی تعصب اور تحقیر آمیز سلوک، رسوم و رواج اور مذہبی عقائد میں ان کی بے جا مداخلت، انگریز مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں، نسلی منافرت، مغل شہنشاہ کے مرتبہ کو گھٹانے کی دانستہ کوشش، کمپنی کے نام کے سکہ کا چلن، فارسی کی بجائے نظم و نسق میں انگریزی کا رواج، نیز صلیبی جنگوں کی تلخ یادیں، ڈلہوزی کے ہاتھوں اودھ کا الحاق، اور برطانوی صنعتی اشیا کے لیے ہندوستان کو ایک محروسہ بازار بنانے کی کوشش، جس سے ہندوستانی صنعت تباہ ہوئی۔ غرض اسی طرح کے کئی اسباب مسلمانوں کو بتدریج بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ یہ سیاسی شعور اور بیداری دراصل شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ — ۱۷۶۲ء) اور کچھ دوسرے علما کی پیدا کی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں ملوکیت اور شہنشاہیت کے خلاف جگہ جگہ آواز اٹھائی تھی اور سیاسی نظام کی اصلاح کی غرض سے صرف اعلیٰ طبقوں، امرا اور حکام ہی کو مخاطب نہیں کیا تھا بلکہ عوام کو بھی توجہ دلائی تھی۔ ان کے جانشینوں نے اس تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ ان میں نمایاں شخصیتیں حسب ذیل ہیں: شاہ عبدالعزیز ولد شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ — ۱۸۳۱ء) مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی، جنہوں نے پٹنہ کو اپنا مستقر بنایا تھا اور جن کی جماعتِ مجاہدین کا دائرۂ عمل کلکتہ سے لے کر بالاکوٹ تک پھیلا ہوا تھا اور ہزاروں خاندان اس جماعت کے جذبۂ سرفروشی سے متاثر تھے۔ یہ دراصل سیاسی تحریک تھی جو مذہب کے روپ میں پیش کی گئی۔ اگرچہ بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے لیکن ان کے ساتھی ان کے بعد بھی سرگرم عمل رہے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں حصہ لینے والے بہت سے افراد ان کے افکار و نظریات سے متاثر تھے۔

بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی تحریک بھی بدیسیوں کے سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال کے خلاف چلائی گئی تھی اس نے تو ٹیکس کی عدم ادائی کا نعرہ دے کر کسانوں کو بھی اکسانے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں کی ان خفیہ اور پُرتشدد

سرگرمیوں کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کی وجہ سے یہ تحریک سرد پڑ گئی۔ تاہم شاہ ولی اللہ کی سیاسی تعلیمات ہی نے آگے چل کر مسلمانوں کے سیاسی طرزِ عمل کی راہیں متعین کر دیں۔

جہاں تک ہندوؤں اور بالخصوص بنگال کے ہندوؤں کا تعلق ہے ابتدائی دور میں انہوں نے انتہا پسند تحریکوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی رکھا۔ مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمہ نے انہیں افسردہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں، جو انگریزی راج کے لیے نسبتاً زیادہ خطرناک معلوم ہوتے تھے حکومت کی نظرِ کرم ہندوؤں پر پڑی۔ ہندوؤں کو بھی انگریزوں کے خلوص نیت پر بھروسہ تھا اور ان کی جمہوری روایات کو وہ ہندوستان کے لیے فال نیک تصور کرتے تھے۔ کمپنی کے معاملات پر ایڈمنڈ برک اور شریڈن کی بے لاگ تنقیدوں سے وہ کافی متاثر تھے۔ اسی لیے انہوں نے انگریزوں کی حکومت کو نہ صرف ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر مان لیا بلکہ اس کا خیر مقدم بھی کیا۔ دوار کا ناتھ ٹیگور کا تو ایقان تھا کہ ہندوستان کی خوشحالی کا دار و مدار انگریزی حکومت ہی پر ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی تعلیم میں بنگال کو پہل حاصل ہونے کی وجہ سے وہ نہ صرف مغرب کے سیاسی تصورات ہی سے روشناس ہو رہے تھے بلکہ مستشرقین کی علمی کاوشوں نے ان پر اپنے گم شدہ ماضی کی شاندار روایات کے بند دریچے بھی کھول دیے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ انقلابِ فرانس اور اس کے بعد کے انقلابی نظریات کی وجہ سے یورپ میں ایک ہل چل مچی ہوئی تھی اور سماجی اور مذہبی اور سیاسی زندگی میں ان کے اثرات محسوس ہونے لگے تھے۔ آزادی کی لگن اور سیاسی اصلاحات کا جذبہ موجزن تھا۔ سماجی انصاف، سماجی حقوق، نیابتی ادارات، قومی شعور اور وطن پرستی کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ ہندوستان میں اس دور کی سب سے قد آور شخصیت راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء-۱۸۳۳ء) کی تھی۔ راجہ نے "برہمو سماج" کی تحریک شروع کر کے نہ صرف سماجی و مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا بلکہ سیاسی حقوق منوانے کی غرض سے سب سے پہلے آواز بلند کی اور وہ طریق کار اختیار کیا جسے "دستوری احتجاج" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان ہی کے خیالات کا اثر تھا کہ ۱۸۵۱ء میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے منشور کی تجدید کے وقت اس انجمن نے ایک عرضی پارلیمنٹ میں پیش کی جس میں عوامی نوعیت کی مجلس مقننہ کے قیام اعلیٰ عہدیداروں کی تنخواہوں میں تخفیف، محاصل کی تنسیخ کے علاوہ ایسے مطالبات شامل تھے جو پچاس سال بعد کانگریس نے پیش کیے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے قبل کے دور میں اس انجمن کی سرگرمیوں کو سیاسی جد و جہد کی اولین کوششوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس انجمن نے ایک طرف تو تمام ہندوستانیوں کے متحدہ محاذ پر زور دیا تو دوسری جانب سیاسی حقوق اور نظم و نسق کی اصلاح کے مطالبات پیش کیے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت

لیکن وہ عظیم الشان اور ناقابل فراموش واقعہ جس نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دیں اور ان میں سیاسی نظم کا احساس پیدا کیا ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہے۔ اس کی نوعیت غیر ملکی اقتدار کے خلاف صرف ایک مسلح احتجاج ہی کی نہ تھی۔ بلکہ یہ دو مختلف اور متضاد تمدنوں کا تصادم تھا۔ مغربی تہذیب، طرزِ تعلیم اور طریقہ حکومت نے یہاں کی سیاسی اقتصادی اور سماجی زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور پرانا سماجی نظام اور قدیم نظریات و ادارات نئے تقاضوں کے آگے سرنگوں ہو رہے تھے۔ اور ہندوستانی معاشرہ کا شیرازہ تو بکھر رہا تھا لیکن نئی سماجی طاقتوں سے ہم آہنگی ابھی پیدا نہ ہو پائی تھی۔ ہندوستانیوں کو قدم قدم پر اس کا احساس ہو رہا تھا کہ حکومت ان کی اپنی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی اجنبی قوم کی ہے جس کا ان کے طرزِ حیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور جو زبردستی اپنے اداروں کو ان پر مسلط کرنے کی خواہاں ہے۔ ان احساسات نے لوگوں کو جنگ کے لیے آمادہ کیا۔

۱۰ مئی کو میرٹھ کے سپاہیوں نے علم بغاوت بلند کر کے دہلی کا رخ کیا تو وہ بے ساختہ طور پر مغل تاجدار بہادر شاہ ہی سے رجوع ہوئے۔ بہادر شاہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر کے علامتی طور پر بغاوت کی قیادت انہیں کو سونپ دی۔ باغیوں کا یہ طرزِ عمل بڑا معنی خیز تھا۔ وہ اب بھی مغل شہنشاہ کو سیاسی اقتدار کا مرکز اور سرچشمہ سمجھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں مختلف عناصر بیک وقت کارفرما اور مختلف طبقات اور مفادات اس میں شریک رہے۔ ان سب کو یکجا کرنے میں اعظم گڑھ کے مشہور اعلان نامے کا نمایاں حصہ تھا۔ جس کے ذریعہ رؤسا، زمینداروں، تاجروں، عمّالِ حکومت، پنڈتوں اور مولویوں اور عوام کو دعوتِ بغاوت دی گئی تھی۔ سپاہی اپنی ذات پات اور مذہبی عقائد کے تحفظ کے لیے لڑ رہے تھے تو رؤسا اپنی ریاستوں کے لیے، زمیندار اپنی زمینداریوں کے لیے، عوام عیسائی بنائے جانے کے خوف سے اور مسلمان اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی غرض سے شریکِ بغاوت تھے اور ان سب کا مشترکہ دشمن انگریز تھا۔ رؤسا میں نانا صاحب، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، نواب علی بہادر، نواب تفضل حسین جیسی شخصیتیں تھیں جن کے عزمِ راسخ مقصد کی صداقت اور بے لوث جد و جہد سے تحریک میں جان پڑ گئی۔ عمّالِ حکومت میں تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خان، بخت خان، وزیر خاں وغیرہ آخری دم تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ اسی طرح مسلم علما و مشائخ تھے جن کے جذبۂ حب الوطنی اور سرفروشانہ کارناموں کو نہیں بھلایا جا سکتا اور جنہوں نے انگریزوں کے خلاف عوام کو اکسانے میں بڑا حصہ لیا۔ اس تحریک کا ایک روشن پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہی اتحاد انگریزوں کے لیے بڑا تشویشناک تھا۔ غرض ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی اہمیت کو چند سپاہیوں کی غداری یا چند شوریدہ سر رؤسا کی بغاوت کا نام دے کر نہیں گھٹایا جا سکتا۔ یہ سارے ملک کے مختلف طبقات کا احتجاج تھا جس میں سپاہی ہراول دستہ کا کام کر رہے تھے۔

قومی تحریک کا نشو و نما

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے نکل کر راست برطانوی حکومت کے ہاتھ میں آ گیا جس نے یہاں کے مختلف طبقات اور مفادات کی اشک شوئی کی غرض سے اعلان کیا کہ آئندہ سے ان کے مذہبی عقائد، روایات، رسوم و رواج میں کوئی

مداخلت نہیں کی جائے گی اور نسل، مذہب، ذات اور فرقہ کی بنا پر کوئی امتیاز برتا نہیں جائے گا۔ انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی حکومت میں ایک قابلِ لحاظ تغیر کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ انگریز ہندوستانیوں سے بدظن اور متنفر ہوتے گئے۔ نسلی امتیاز نے بھیانک شکل اختیار کرلی۔ سماجی سطح پر ہندوستانیوں سے میل جول ختم ہوگیا اور انگریزوں کا ایک علاحدہ طبقہ قایم ہوگیا، جس کے حاکمانہ برتاؤ اور نسلی تفوق کے احساس نے ہندوستانیوں کو ان سے اور برگشتہ کردیا۔ اس کے علاوہ فتح دہلی کے بعد کمپنی کے فوجی افسروں اور کارندوں نے سارے ملک کو انتقامی آگ میں جھونک دیا۔ باغیوں کے ساتھ ساتھ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسانوں کو ظلم اور بربریت کا تختۂ مشق بنایا گیا۔ ان کا عتاب خاص طور سے مسلمانوں پر نازل ہوا کیوں کہ وہ یہ باور کرتے تھے کہ اس پورے ہنگامے کے ذمہ دار صرف مسلمان ہی تھے۔ یحییٰ علی، احمد اللہ، امیرالدین، ابراہیم منڈل اور رفیق منڈل جیسے وہابی تحریک کے رہنماؤں پر مقدمات چلا کر انہیں جلاوطن کردیا گیا اور ہزاروں مسلمان معمولی معمولی شبہات پر تہ تیغ کردیے گئے۔

حکومت کی اس سخت گیر اور تشدد آمیز پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی شعور کا رخ سماجی اور علمی سرگرمیوں کی جانب مڑ گیا۔ ہندوستانی تہذیب اور تمدن سے متعلق مستشرقین کی تحریروں کے اثر سے تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ماضی کی شاندار روایات میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستانی ادب اور خاص طور سے بنگالی ادب اور مذہبی علوم کے احیا نے ہندوستانی ذہنیت میں بڑا انقلاب پیدا کیا۔ جہاں تک مذہبی تحریکات کا تعلق ہے۔ راجہ رام موہن رائے کی "برہمو سماج"۔ سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ — ۱۸۸۳ء) کی "آریہ سماج" سوامی وویکانند (۱۸۶۳ — ۱۹۰۲ء) کی "رام کرشنا مشن" اور مادام بلاواتسکی کی قایم کردہ "تھیوسافیکل سوسائٹی" کے علاوہ گوکھلے کی "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" نے روشن خیالی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ اسی طرح مسلمانوں میں وہابی تحریک اور "انجمن حمایت اسلام" کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

احیا پرستی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کو بھی شدت سے محسوس کرنے لگا تھا کہ سیاسی تنظیم اور سیاسی اتحاد کے بغیر ان کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا وہ مل، میزینی، گیریبالڈی کے سیاسی نظریوں سے واقف ہوچکا تھا۔ "آزادی" اور "نیابتی حکومت" نے اس کی سیاسی سوجھ بوجھ میں اضافہ کردیا۔

۱۸۷۶ء کا سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس سال سیاسی تنظیم کے خیال نے عملی شکل اختیار کی اور سریندر ناتھ بینرجی کی قیادت میں "انڈین ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس دور کے بارے میں سرہنری کاٹن نے سچ کہا ہے کہ "اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ایک جدید ہندوستان ابھر رہا ہے۔ ایک قوم اپنے مشترکہ مفاد کے احساس اور وطنیت کے جذبات کے ساتھ صحیح معنوں میں جنم لے رہی ہے۔" "یہ عبوری ہندوستان جدید ہندوستان ہے اور اس کا سیاسی مسئلہ دراصل اس قوم کے ارتقا کا مسئلہ ہے۔"

اس زمانہ میں لارڈ لٹن (۱۸۷۶ — ۱۸۸۰ء) نے دو ایسے قوانین نافذ کیے جن کی وجہ سے ہندوستانیوں کے جذبات اور مشتعل ہوگئے۔ ان میں سے ایک تو "قانون مطابع" (Vernacular Press Act) تھا۔ جو دیسی اخبارات اور ادب پر قیود عائد کرنے کی غرض سے نافذ کیا گیا تھا لٹن اس قانون کے ذریعہ ہندوستانی قومیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنا چاہتا تھا مگر اسے اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔ بلکہ اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے سیاسی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں اور ہندوستانی رائے عامہ میں اس قدر ہیجان پیدا ہوگیا کہ بالآخر رپن (Ripon) کو ۱۸۸۲ء میں اس قانون کو منسوخ کرنا پڑا۔ لٹن کا دوسرا قانون "قانون اسلحہ" تھا۔ یہ بھی "قانون مطابع" کی طرح اس بے اعتمادی کا نتیجہ تھا جو غدر کے بعد حکومت کی تشدد آمیز حکمت عملی سے پیدا ہوئی تھی۔ اس قانون نے بقول سریندر ناتھ بینرجی "ہندوستانیوں اور اہل یورپ میں ایک نفرت آمیز اور اشتعال انگیز امتیاز پیدا کردیا۔" اس زمانہ کا ایک اور واقعہ جو ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور بنگالیوں کے لیے خاص طور سے باعث تشویش تھا، سول سروس سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حکومت نے سول سروس کی عمر گھٹا کر اکیس سے انیس سال کردی تو تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سریندر ناتھ بینرجی نے اس موقع پر سارے ہندوستان کا دورہ کرکے اسے ایک کل ہند سیاسی مسئلہ بنادیا۔ اس لیے اسے "سیاسی بنیاد پر ہندوستان کو متحد کرنے کی پہلی کامیاب کوشش" قرار دیا جاتا ہے۔ قومی یک جہتی اور سیاسی ہم آہنگی کے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں ایک "آل انڈیا نیشنل کانفرنس" طلب کی گئی جسے بجا طور پر انڈین نیشنل کانگرس کا پیش خیمہ تصور کرسکتے ہیں۔ اس دور کا ایک اور واقعہ جس نے تمام ہندوستانیوں کو متحد کردیا تھا۔ ۱۸۸۳ء کے "البرٹ بل" کا جھگڑا ہے۔ اس بل کا مقصد یہ تھا کہ سول سروس کے ہندوستانی اراکین کو بھی وہی اختیارات دیے جائیں جو اس مرتبہ کے انگریز عہدہ داروں کو حاصل تھے اور اس طرح قانون میں یورپی اور ہندوستانی حکام کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ لیکن اینگلو انڈین طبقہ نے اس بل کے خلاف شدید ہنگامہ کھڑا کیا۔ انہیں یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ ان کے مقدمات کی سماعت کسی دیسی جج کے اجلاس میں ہو۔ اس جھگڑے نے نسلی منافرت کو اور ہوا دی اور ہندوستانی انگریزوں کی طرف سے اور بدظن ہوتے گئے۔

انڈین نیشنل کانگریس

ایلن آکٹیوین ہیوم (۱۸۲۹ - ۱۸۹۲ء) نامی ایک وظیفہ یاب انگریز سویلین نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتہ یونی ورسٹی کے گریجویٹس کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں ایک ایسی انجمن کے قیام کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی جو ہندوستانی باشندوں کی ذہنی، اخلاقی سماجی اور سیاسی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بن سکے۔ لارڈ لٹن کے دور کی شدید بے چینی کو ہیوم تشویشناک نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو برطانوی اقتدار کے لیے خطرناک تصور کرتا تھا۔ وہ ایک ایسے پلیٹ فارم کا جویا تھا جہاں سے ہندوستانیوں کے سیاسی ابال کو بہ حفاظت تمام نکلنے کی راہ مل جائے۔ ہیوم نے اس سلسلہ میں انگریز حکام کے علاوہ دادا بھائی نوروجی، بدرالدین طیب جی اور فیروز شاہ مہتا وغیرہ جیسے اعتدال پسند ہندوستانی لیڈروں سے مشورہ کے بعد بمبئی میں ایک اجلاس طلب کیا۔ اس طرح ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل

کانگریس" کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے پہلے صدر رومیش چندر بنرجی تھے۔ اس میں کل ۷۲ مندوبین شریک ہوئے۔ یہ تنظیم جس نے آگے چل کر کل ہند نوعیت کے ایک طاقتور سیاسی ادارہ کی شکل اختیار کر لی، ابتدا میں صرف انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں ہی کی ترجمان رہی اور تاج برطانیہ سے اپنی غیر متزلزل وفاداری اور برطانوی مدبرین کے جذبۂ انصاف پسندی پر اپنے غیر محدود اعتماد کا اظہار کرتی رہی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار پایا کہ ہندوستانی مطالبات کے بارے میں برطانوی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ کانگریس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سال بہ سال اجلاس منعقد کرنے کے علاوہ خود برطانوی مدبرین کو متاثر کرنے کی غرض سے انگلستان میں کانگریس کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ اور کانگریس کی ایک "برٹش کمیٹی" قائم کی گئی اور "انڈیا" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہونے لگا۔ ۱۸۹۳ء میں سر ولیم وڈربرن اور ڈبلیو۔ ایس۔ کین (Caine) نے دارالعوام میں سیاسی اور دستوری اصلاحات کی مہم چلانے کی غرض سے ایک "انڈین پارلیمنٹری کمیٹی" بنائی۔

کانگریس ہی کے زیر اثر ۱۸۹۳ء میں ڈفرن نے "انڈین کونسلز ایکٹ" منظور کروایا۔ لیکن یہ قانون اعتدال پسند قیادت کو بھی مطمئن نہ کر سکا۔ اور اس کے ساتھ ہی بنگال اور مہاراشٹر میں انتہاپسند قومیت کی ایک نئی لہر شروع ہو گئی۔ امریکا میں سوامی وویکانند کے عالمانہ لکچروں نے ہندوستان کے قومی وقار کو بلند کیا۔ بنگال میں اسی جوش وخروش کا اظہار ہمیں "آنند مٹھ" کے مصنف بنکم چندر چٹرجی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بپن چندر پال (۱۸۵۸ — ۱۹۳۲ء) کی سحر انگیز قیادت نے نوجوان طبقے کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور اس میں سرفروشی کا ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ اسی طرح اروبندو گھوش (۱۸۷۳ — ۱۹۵۰ء) نے جو "آسمان سیاست پر ایک شعلہ کی طرح نمودار ہوئے اور غائب ہوئے اور "نئے چراغ" روشن کیے اور "مذہبی قومیت" کی ایک نئی راہ دکھائی۔ مہاراشٹرا میں اس نئی سیاست کی ذمہ داری بال گنگادھر تلک (۱۸۵۶ — ۱۹۲۰ء) جیسے انقلاب پسند اور متبحر عالم نے سنبھال لی اور گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ — ۱۹۱۵ء) کی دستور پسندی کے برخلاف انتہا پسند قومیت کا پرچار شروع کیا۔ تلک نے ہندوستانی سیاست میں پہلی دفعہ سوراج کا نعرہ لگایا اور اسے اپنا "پیدائشی حق" قرار دیا۔ جو کام تلک مہاراشٹرا میں کر رہے تھے وہی لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵ — ۱۹۲۸ء) پنجاب کے طول وعرض میں انجام دے رہے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح مذہب وہی تھا جو مادر وطن کی نجات کا وسیلہ بنے۔ غرض اس دور میں ہندوستان کی ساری سیاست "بال، لال، پال" کے "تثلیثی محور" پر گھومتی رہی۔

تقسیم بنگال اور اس کے اثرات

کرزن (۱۸۹۹۔ ۱۹۰۵ء) انتہاپسند سرگرمیوں کو کچلنے کے مصمم ارادے کے ساتھ ہندوستان وائسرائے کی حیثیت سے آیا تھا۔ بقول سر ہنری کاٹن "اس کی پالیسی کا جزو لاینفک یہ تھا کہ سیاسی رجحانات اور وطن پرستانہ جذبات کو کچل دیا جائے"۔ اس نے اپنے دور حکومت میں متعدد ایسے اقدامات کیے جن سے نفرت اور حقارت کی فضا اور بھی مسموم ہو گئی۔ کرزن نے کلکتہ کارپوریشن کی جدید تشکیل اس طرح کی کہ وہ محض یوروپیوں کی ایک انجمن ہو کر رہ گئی۔ یونیورسٹیز ایکٹ نافذ کر کے اس نے جامعات کی خود مختاری پر کاری ضرب لگائی۔ لیکن کرزن کا وہ عمل جس نے ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ مشتعل کیا تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) ہے۔ حکومت کے اس اقدام کی جتنی مخالفت کی گئی اتنی اس سے قبل برطانوی ہند کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھی، اور اس کے ساتھ ہی بنگال میں وہ تحریک شروع ہو گئی جسے "سودیشی تحریک" کا نام دیا جاتا ہے۔ سودیشی تحریک نے جو صرف برطانوی مال کے مقاطعہ سے شروع ہوئی تھی ہر اس چیز کا بائیکاٹ کیا جس کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ یہ رجحان دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں پھیل گیا۔ اروبندو گھوش نے گاندھی جی سے کافی پہلے معاشی، تعلیمی، عدالتی اور عاملانہ بائیکاٹ کا ایک چار رخی تصور پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ احیاء پرستی کے رجحان کو بھی فروغ حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر مغربی چیز کی برائی اور مشرقی روایت خاص کر ہندو ورثہ کی مدح سرائی پر فخر محسوس کیا جانے لگا۔

"سودیشی" اور مقاطعہ کی تحریک نے جب شدت اختیار کی تو ملک کے اعتدال پسند اور انتہاپسند مکاتب خیال میں بھی اختلافات رونما ہونے لگے۔ اعتدال پسند طبقہ، جس کی قیادت فیروز شاہ مہتا، سریندر ناتھ بنرجی اور گوکھلے کر رہے تھے انگلستان کے سیاسی اداروں اور روایات کا مدّاح تھا۔ اس کے برعکس "بال، لال، پال" کا انتہاپسند گروہ حکومت کے فیصلہ کو منسوخ کرانے میں کانگریس کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اپنے حرکاتی نقطۂ نظر کو ہوا دے رہا تھا۔ اس طبقہ نے انگریزوں کے خلوص اور ان کے وعدوں کو شک کی نظر سے دیکھا۔ ۱۹۰۶ء میں اسی کے دباؤ کی وجہ سے کلکتہ میں کانگریس کو پہلی مرتبہ یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ ہندوستان کے لیے بھی وہی نظام حکومت چاہتی ہے جو "خود مختارانہ برطانوی نوآبادیات" میں رائج ہے۔

تقسیم بنگال کا ایک اور نتیجہ دہشت پسند تحریکوں کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اس کا دائرہ عمل گو محدود تھا تاہم اس تحریک نے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد پر گہرے نقوش چھوڑے اور سیاسی تبدیلیوں کی رفتار تیز کر دی۔ اس کے ارکان یورپ کی تشدد آمیز انقلابی تحریکوں خصوصاً اٹلی کی خفیہ تنظیموں سے بے حد متاثر تھے۔ اور مادر وطن کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کے لیے بموں اور اسلحہ کے استعمال کو جائز تصور کرتے تھے۔ اس سلسلہ کا سب سے سنسنی خیز واقعہ ۱۹۱۲ء میں پیش آیا جب کہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو، جن کا جلوس دہلی کی ایک شاہراہ سے گزر رہا تھا بم سے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ خود لارڈ ہارڈنگ نے اپنی کتاب میں اعتراف کیا کہ "انعقاد دربار سے پہلے کے تین چار سالوں میں اوسطاً ہر پندرھواڑہ کے اندر ایک سیاسی قتل ہوتا رہا"۔ باغیانہ خیالات کی اشاعت میں لالہ لاجپت رائے، اجیت سنگھ شیام کرشنا ورما اور ونائک دامودر کے علاوہ تلک کے رسائل "کیسری" اور "مرہٹہ" اروبندو کے "وندے ماترم" بپن چندر پال کے "نیو انڈیا" اور سوامی وویکانند کے بھائی بھوپندر دت کے اخبار "یوگنترا" کو بڑا دخل رہا ہے۔ انقلابی لہر کو جسے مانٹیگو نے "مرض متعدی" کا نام دیا تھا روکنے کی غرض سے تمام انتہاپسند لیڈروں کو یا تو جیل بھیج دیا گیا یا جلاوطن کر دیا گیا۔ دوسری طرف اعتدال پسند سیاستدانوں اور مسلمانوں کو ہموار کرنے کی کوشش شروع کی گئی۔ ڈاکٹر لارنس (جو کرزن کا پرائیویٹ سکریٹری رہ چکا تھا) اور والنٹائن شیرول نے، جو مسلمانوں کی زبوں حالی اور "وہابی"

تحریک" کی اثر پذیری سے اچھی طرح واقف تھا، وزیر ہند مارلے کو آگاہ کیا کہ اگر مسلمانوں کو مراعات نہ دی گئیں تو ان کا کانگریس میں شریک ہوکر پُر تشدد سرگرمیوں میں حصہ لینا یقینی ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی تنظیم

مسلم رہنما سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو ہندؤں کی طرح جدید علوم سے روشناس کرکے شاہراہ ترقی پر لانے کے لیے ایک تحریک چلائی جو کہ علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس تحریک کے دو خاص مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو نفرت اور بدظنی پیدا ہوگئی تھی اسے دور کیا جائے؛ دوسرے یہ کہ مغربی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کو زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو عام طور سے سیاسی جد وجہد سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور تمام تر توجہ تعلیمی اور سماجی مسائل پر مرکوز کردی سرسید سیاسیات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف تھے جو اس وقت کی فضا میں مسلمانوں کی بیداری کے لیے ناگزیر تھیں۔ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ سرسید نے کانگریس کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۸۸۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنا ڈالی۔ قومی مطالبات کے واجب ہونے کو سرسید تسلیم کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کی اصل وجہ انہوں نے یہی قرار دی تھی کہ ملک کی حکومت میں اہل ملک کا کوئی حصہ نہ تھا البرٹ بل کی انہوں نے علانیہ تائید کی تھی۔ وہ کانگریس کی جد وجہد کو "خانہ جنگی" سے تعبیر کرتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا "کانگریس کا بنیادی مقصد ہندوستان پر حکومت کرنا ہے اور وہ ہندوستان کے تمام باشندوں ہی کے نام پر ایسی حکومت کرنا چاہتی ہے تاہم ایسی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے بے سہارا رہ جائیں گے"۔ یہی وہ مرکزی خیال ہے جس کے اطراف مستقبل کی ساری مسلم سیاست گھومتی ہے۔ اکثریتی طبقہ کے سیاسی غلبہ کا یہی خوف تھا کہ ممتاز رہنما سید امیر علی کی "سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" (۱۸۷۸ء) اور عبدالطیف خان کی "محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹیفک سوسائٹی" (۱۸۶۳ء) نے بھی کانگریس سے تعاون نہیں کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد سیاسی فضا مکدر ہوگئی اور ہندی ۔ اردو تنازعہ کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات نے کشیدہ صورت اختیار کرلی اس کے علاوہ نیابتی اداروں کا اب تک جو تجربہ حاصل ہوا تھا۔ وہ بھی مسلمانوں کے لیے کوئی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ خود کانگریس کے پروگرام میں اقلیتوں کا مسئلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیوں کہ کانگریس قومی مسائل اور قومی جد وجہد کی علم بردار تھی۔ جہاں انگریزوں کے سامراجی مقاصد کا یہ تقاضا تھا کہ ہندوستان کے دو اہم طبقے متحد نہ ہونے پائیں۔ وہیں مسلمان بھی حالات کے دباؤ کے تحت اپنے علاحدہ سیاسی وجود کو منوانا چاہتے تھے۔ تقسیم بنگال میں یہی ہوا۔ جب کرزن نے مشرقی بنگال کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ایک علاحدہ صوبہ بناکر ڈھاکہ کو اس کا مستقر قرار دینے کی تجویز پیش کی تو مسلمان غیر شعوری طور پر اس فیصلے سے خوش ہوئے واضح رہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان اس وقت معاشی اور سماجی اعتبار سے پست ترین حالت میں تھے اور بقول ہنٹر حکومت کی پالیسی بدل جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی زمینداریوں کا اور اعلیٰ عہدوں کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ افلاس تنگ دستی اور جہالت کی بنا پر ان کا شمار پست ترین اقوام میں ہونے لگا تھا

لارڈ منٹو (۱۹۰۵ — ۱۹۱۰ء) نے جب اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ عنقریب مزید دستوری مراعات دینا چاہتی ہے تو اس سے فائدہ اٹھاکر مسلمانوں کے ایک وفد نے آغاخاں کی سرکردگی میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک ایڈریس پیش کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی "پوزیشن کا اندازہ ان کی عددی قوت ہی سے نہ لگایا جائے بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور سلطنت کے لیے ان کی خدمات کو بھی ملحوظ رکھا جائے"؛ اس کا سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ کے ہر نیابتی نظام حکومت میں مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کی جائیں اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی اساس پر انہیں نمائندگی دی جائے۔ جس طرح ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز ہیوم نے کانگریس کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا تھا اسی طرح ایک اور انگریز آرچیبولڈ (پرنسپل علی گڑھ کالج) نے پس پردہ مسلمانوں کے مطالبات کی ہمت افزائی کی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد جب ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلم رہنماؤں نے اس میں شرکت کی اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک سیاسی جلسہ کیا اور یہیں "آل انڈیا مسلم لیگ" وجود میں آئی۔

برطانوی حکومت نے، جو والیان ریاست، اقلیتی جماعتوں اور معتدل طبقہ کو ہموار اور مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں دستوری اصلاحات کا اعلان کیا جو "مارلے منٹو اصلاحات" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی رو سے مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کی توسیع کی گئی اور صوبائی مجالس میں سرکاری ارکان کی اکثریت کو ختم کردیا گیا۔ انتخابات کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا لیکن ان کی نوعیت عملاً بالواسطہ انتخاب ہی کی رہی۔ صوبائی مجالس کو ضمنی سوالات کرنے اور قرار دادیں پیش کرنے کا حق مل گیا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل میں ایک ہندوستانی رکن کو شامل کیا گیا۔ ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ پہلی مرتبہ فرقہ وارانہ طریقہ انتخاب رائج ہوا اور مرکز اور صوبوں میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب مقرر کیے گئے۔

ہارڈنگ (۱۹۱۰ — ۱۹۱۶ء) کے زمانے میں ان اصلاحات کو نافذ کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ اعتدال پسند طبقہ نے اصلاحات کا خیر مقدم کیا اور سیاسی جد وجہد نے اب دستوری شکل اختیار کرلی۔ اس ماحول میں ۱۹۱۱ء کا دلّی دربار منعقد ہوا۔ جس میں تین اہم اعلانات ہوئے۔ یعنی ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے تقسیم بنگال کو منسوخ کردیا گیا۔ ہندوستان کا پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا اور مدراس اور بمبئی کے ساتھ ساتھ بنگال کا مرتبہ بڑھاکر اسے گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔

آزادی کی لہر

منٹو۔ مارلے اصلاحات کو نافذ ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ یورپ میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور اس کے ساتھ

ہی جدوجہد آزادی کی لہر تیز تر ہوگئی۔ جب ۱۹۱۴ء میں عالمگیر جنگ چھڑی تو ہندوستان کو بھی برطانوی مقبوضہ کی حیثیت سے اس میں گھسیٹا گیا۔ اس کا ردعمل مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا۔ ایک طبقہ، جس میں والیاہ ریاست پیش پیش تھے، اعلانیہ انگریزوں کی تائید کر رہا تھا۔ اعتدال پسند گروہ بھی اتحادیوں کے مقاصدِ جنگ سے متفق تھا۔ مگر انتہاپسند طبقہ حالات جنگ سے فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ اب انقلابی گروہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی سرگرم عمل ہوگیا تھا۔ جنگ کے آغاز ہی پر بعض ہندوستانیوں نے جرمنی سے ساز باز شروع کردی اور جرمن جنرل اسٹاف کی تائید سے ایک "انڈین نیشنل پارٹی" قایم کی جس میں چمپک رامن پلے، ہردیال، برکت اللہ اور چندر کانت چکر ورتی جیسے انقلابی شریک تھے۔ اسی طرح کابل میں بھی ایک انقلابی جماعت مہندر پرتاپ اور برکت اللہ کی رہنمائی میں مصروفِ عمل ہوگئی۔

اسی دوران برطانوی نوآبادیات میں ہندوستانی تارکانِ وطن کا مسئلہ بھی مرکزِ توجہ بن گیا تھا اور جب گاندھی جی نے ہندوستانیوں کے ساتھ جنوبی افریقہ کی حکومت کے توہین آمیز سلوک کے خلاف "ستیہ گرہ" کا آغاز کیا تو ہندوستان میں بھی بے چینی شروع ہوگئی۔ اس کے علاوہ ایران سے متعلق اینگلو۔ روس معاہدہ (۱۹۰۷ء) ترکی اور ایران کی قومی تحریکات، ترکی اور اٹلی کی جنگ اور بلقان کی لڑائیوں (۱۹۱۲ ــــ ۱۹۱۳ء) نے مسلمانوں میں ایک نیا شعور پیدا کر دیا جس نے ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار کی۔ مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء میں اپنے لکھنؤ کے اجلاس میں جہاں سروجنی نائیڈو اور بہت سے کانگریسی لیڈر شریک تھے۔ اعلان کیا کہ "دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا حصول" ہی اس کا مطمع نظر اور منزلِ مقصود ہے۔ وہ مناظر قابلِ دید تھے جب کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ساتھ ساتھ منعقد ہوئے۔ اسی طرح کا ایک اجلاس ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں برپا ہوا جہاں "کانگریس۔ لیگ اسکیم" کی بنا پر وہ یادگار معاہدہ طے پایا جو "میثاق لکھنؤ" کے نام سے مشہور رہے اسی کو مسٹر جناح نے متحدہ قومیت کے لیے فالِ نیک قرار دیا تھا۔ اس معاہدہ کی بنا پر کانگریس نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا اور مسلم لیگ نے کانگریس کے اس مطالبہ کی تائید کی کہ ہندوستان کو بھی سلطنت کے دیگر قلمروؤں کی طرح ایک مساوی حصہ دار کی حیثیت سے حکومت خود اختیاری ملنی چاہیے۔ ۱۹۱۶ء کا سال ایک اور حیثیت سے بھی اہم ہے۔ گوکھلے اور فیروز شاہ کے انتقال کے بعد کانگریس کا اعتدال پسند اور انتہاپسند طبقہ متحد ہوگیا اور مسز اینی بسینٹ اور تلک کی علاحدہ علاحدہ ہوم رول لیگ "کانگریس۔ لیگ اسکیم" کو آگے بڑھانے میں لگ گئی جنگ کی وجہ سے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اور گاندھی جی کے بقول "لوگوں کے دلوں میں امید کی ایک نئی کرن پھوٹ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ مادرِ وطن کا ستارہ عنقریب بلند ہونے کو ہے۔"

انقلاب پسند گروہ کی خفیہ سرگرمیاں، مسلمانوں کا جوش و خروش اور متحدہ قومیت کا سیلاب ایسا نہ تھا جسے حکومت بہ آسانی نظر انداز کر سکتی چنانچہ "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" کے تحت جو جنگ کے آغاز ہی پر نافذ کر دیا گیا تھا علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی جیسے سربرآوردہ لیڈروں کو نظر بند کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ رولٹ رپورٹ کی بنا پر مولوی محمود حسین اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علماء دیوبند کو اس الزام میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹ کر مہندر پرتاپ کی صدارت میں ایک عارضی حکومت قایم کرنا چاہتے تھے۔

لوگوں کے جوش و خروش سے حکومت اچھی طرح واقف تھی چنانچہ لبرل وزیرِ ہند ای۔ ایس مانٹیگو نے وائسرائے چیمسفورڈ (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۲۱ء) سے مشورہ کے بعد ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وہ مشہور اعلان کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "ملکِ معظم کی پالیسی، جس سے حکومت ہند کو پورا اتفاق ہے، یہ ہے کہ نظم و نسق کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جائے اور بتدریج حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کو ترقی دی جائے تاکہ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے ذمہ دارانہ حکومت کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔"

اس اعلان کے بعد خود مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے اور وائسرائے کے علاوہ متعلقہ سیاسی جماعتوں سے تبادلہ خیال کیا۔ مانٹیگو مشن کی تجاویز ۱۹۱۸ء میں "مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ" کے نام سے شائع ہوئی اور چند ہی دنوں بعد "قانون ہند بابتہ ۱۹۱۹ء" کی شکل میں نافذ کر دی گئی لیکن یہ اصلاحات ملک کے انتہاپسند طبقہ کو مطمئن نہ کر سکیں۔ بمبئی میں حسن امام کی صدارت میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں ان تجاویز کو "مایوس کن اور غیر تشفی بخش" قرار دیا گیا۔ تاہم اعتدال پسند طبقہ نے ان تجاویز کو قبول کر لیا۔

قانون ہند بابتہ ۱۹۱۹ء کی رو سے مرکز میں دو ایوانی مقننہ قایم کی گئی جس میں منتخب شدہ ارکان کی اکثریت تھی۔ راست انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع ہوئی۔ اور ۱۹۲۱ء میں تین ہندوستانی ممبروں کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ تاہم گورنر جنرل کے اختیارات پر کسی قسم کی تحدید عائد نہیں ہوئی اور اب بھی وہ بجائے لیجسلیٹو کونسل کے وزیرِ ہند کے آگے جوابدہ تھا۔

اسی طرح صوبوں کی ایک ایوانی مجالس مقننہ کے اختیارات میں توسیع ہوئی۔ مسلمانوں، سکھوں، اینگلو انڈین اور مدراس میں غیر برہمنوں کے لیے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب مقرر کیے گئے۔ ہر صوبہ کے عاملہ میں "دو عملی" (Diarchy) کا طریقہ رائج ہوا، جس کے تحت صوبائی اختیارات کو "امور محفوظہ" (Reserved Subjects) اور "امور منتقلہ" (Transfered Subjects) میں تقسیم کیا گیا۔ "امور محفوظہ" گورنر ہی کے دائرہ اختیار میں رہے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ تجاویز کو شائع ہوئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ دہشت پسند سرگرمیوں سے متعلق جسٹس رولٹ کی رپورٹ منظرِ عام پر آئی۔ جس کی تجاویز کو قانونی شکل دینے کی غرض سے رولٹ بلز کا اعلان کیا گیا۔ ان مسودات قانون کا مقصد یہ تھا کہ تخریبی کارروائیوں کی سرکوبی کے بہانے حکومت کو غیر معمولی اختیارات سے مسلح کیا جائے۔ یہ اقدام ۱۹۱۷ء کے اعلانِ اصلاحات پر گویا پانی پھیر دینے کے مترادف تھا۔ اس

کے خلاف ۱۹۱۹ء میں ہڑتالیں ہوئیں۔ جگہ جگہ جلوس نکلے۔ جلسے منعقد ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسہ پر، جو ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیاں والا باغ میں ہو رہا تھا، جنرل ڈائر نے گولی چلا دینے کا حکم دیا اور انگریز سپاہیوں نے غیر مسلح اور پُر امن مجمع پر بڑی بے رحمی سے فائرنگ شروع کر دی جس میں ۳۷۹ ہندوستانی ہلاک اور ۱۲۰۰ سے زائد اشخاص زخمی ہوئے۔ اس "قتلِ عام" نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غم و غصہ کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ واضح ہو کہ گاندھی جی کے اُفقِ سیاست پر نمودار ہونے کی وجہ سے قومی تحریک عوامی جدوجہد میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چناں چہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے گاندھی جی ہی کی قیادت میں نہ صرف اصلاحات کو یکسر مسترد کر دیا بلکہ اس کے ساتھ ہی عدم تشدد کی اساس پر عدم تعاون کی کُل ہند تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر خلافتِ ترکیہ پر انگریزوں نے جو ذلت آمیز شرائط عائد کی تھیں ان سے مسلمان بھی برگشتہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے بطورِ احتجاج "خلافت تحریک" شروع کی جس کے سربرآوردہ لیڈروں میں مولانا محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے علاوہ علمائے دیوبند بھی شامل تھے۔ گاندھی جی کی رہبری میں جب کانگریس نے 'خلافت تحریک' کی تائید کا اعلان کیا تو مولانا محمد علی اور گاندھی جی ایک ہی پلیٹ فارم پر دکھائی دینے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے۔ اس اجلاس میں کانگریس نے "سوراج" کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا اور اس کے حصول کے لیے "دستوری طریقوں" کے بجائے تمام "جائز اور پُر امن ذرائع" اپنانے پر زور دیا۔ اسی طرح بائیں بازو کی قوتیں مسلم لیگ میں بھی اثر دکھانے لگیں؛ چناں چہ ۱۹۲۱ء میں بمقام احمد آباد جب کانگریس کے اجلاس کے ساتھ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا (اس میں کانگریسی لیڈروں کے علاوہ خود گاندھی جی بھی شریک تھے) تو مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبۂ صدارت میں "جمہوریہ ہند" اور "آزادیِ کامل" کے مطالبات سے اعتدال پسند قیادت کو چونکا دیا اور جب ان کی تجویز سے لیگ نے اتفاق نہیں کیا تو مولانا نے کانگریس کے اجلاس میں اسے پیش کرنے کی کوشش کی مگر گاندھی جی کی مخالفت کی وجہ سے وہاں بھی وہ مسترد ہو گئی۔

تاہم گاندھی جی اور علی برادران کے تعاون کی وجہ سے ترکِ موالات کی تحریک نے غیر معمولی شدت اختیار کر لی۔ اب وہ حقیقی معنوں میں ایک عوامی تحریک بن چکی تھی۔ ہزاروں طلبا اور اساتذہ تعلیم ترک کر کے سیاسی میدان میں کود پڑے۔ کسانوں نے لگان دینا بند کر دیا۔ وکلا نے وکالت ترک کر دی۔ ان میں موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس جیسے نامور وکلا بھی شامل تھے۔ چرخہ کاتنا، کھدّر پہننا اور انگریزی مال کا مقاطعہ کرنا شعورِ قومیت کی علامتیں سمجھی جانے لگیں۔ خود گاندھی جی نے سورت کے ایک چھوٹے سے مقام بردولی سے عدمِ ادائیِ ٹیکس کی مہم کا آغاز کیا۔ جب یہ متحدہ تحریک اپنے عالمِ شباب پر تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا سیلاب کسی طرح رک نہ سکے گا، دو ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے سارا جوش و خروش ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ پہلا واقعہ تو جنوبی ہند میں پیش آیا

جہاں موپلا مسلمانوں کی تحریک نے جو دراصل انگریزوں کے خلاف شروع ہوئی تھی فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی۔ کچھ دنوں بعد یو۔پی میں گورکھپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'چورا چوری' میں ایک مشتعل مجمع نے پولس اسٹیشن کو آگ لگا دی اور پولس کے جوانوں کو ہلاک کر دیا۔ تحریک کے اس طرح پُر تشدد صورت اختیار کر لینے سے گاندھی جی اس قدر متاثر ہوئے کہ ستیہ گرہ ہی کو معطل کر دیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں انقلابِ ترکی کی وجہ سے خلافت تحریک نے بھی از خود دم توڑ دیا۔ وقتی طور پر یوں تو قومی تحریک کو شدید نقصان پہنچا تاہم اس کے اثرات دور دور تک پہنچ چکے تھے۔ اب وہ تعلیم گاہوں کی چار دیواری اور عدالتوں کے کمروں سے نکل کر سڑکوں اور بازاروں سے گزرتی ہوئی دیہاتوں تک پہنچ چکی تھی اور انقلابِ روس کی وجہ سے اس کے اثرات کارخانوں میں بھی محسوس ہونے لگے تھے۔ اس زمانے میں امریکی صدر وڈرو ولسن کے اس اعلان نے کہ جنگ کا بنیادی مقصد قوموں کے حقِ خود اختیاری کا حصول ہے، امید کی ایک شمع روشن کر دی اور ہندوستان کا باشعور طبقہ بجا طور پر اس کا خواہش مند ہو گیا کہ اس اصول کا اطلاق ہندوستان پر بھی کیا جائے۔

اس دوران بہ حیثیت وائسرائے چیمسفورڈ کی بجائے لارڈ ریڈنگ (۱۹۲۱ - ۱۹۲۶ء) کا تقرر ہو چکا تھا۔ سیاسی جمود کی حالت میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا نظم و نسق مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے خطوط پر بلا کسی مزاحمت کے چلتا رہا۔ البتہ حکومت نے اس اثنا میں ۱۹۱۰ء کے "پریس ایکٹ" اور "رولٹ ایکٹ" کو منسوخ کر دیا اور سول سروس اور فوج میں ہندوستانی زیادہ تعداد میں لیے جانے لگے۔ تاہم حکومت کی سخت گیر پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ترکِ موالات کی تحریک کے ناکام ہو جانے اور گاندھی جی اور علی برادران کے نظر بند کر دیے جانے کے بعد ملک کے سیاسی حالات میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ خود کانگریس میں کئی مختلف الخیال گروہ ابھرنے لگے تھے۔ موتی لال نہرو اور سی۔ آر داس نے "سوراج پارٹی" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت قائم کر لی جو اسمبلیوں میں شریک ہو کر ایک "باقاعدہ، یکساں اور مسلسل مزاحمت" کے ذریعہ نئی اصلاحات کو ناکام بنانا چاہتی تھی۔ مدراس میں "جسٹس پارٹی" قائم ہو چکی تھی۔ جناح نے "انڈپنڈنٹس" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت بنائی۔ مسلمان کانگریس سے دور ہوتے جا رہے تھے، دہشت پسندی اور فرقہ وارانہ ہنگاموں نے سر اٹھا رکھا تھا۔ مسلمانوں کی سیاست جس میں ابتدا ہی سے قومی یکجہتی اور علیحدگی پسندی کے دو متضاد رجحانات دبے دبے پائے جاتے تھے۔ اب ایک معیّن اور قطعی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ لیگ علاحدگی پسندی کے دھارے کی نمائندہ تھی، دوسری متحدہ قومیت اور مشترکہ جدوجہد کی۔ آخر الذکر کے علم بردار کانگریسی مسلمان تھے جو "نیشنلسٹ مسلم" کے نام سے پکارے جاتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ گاندھی جی نے ۱۹۲۴ء میں رہا ہونے کے بعد عملی سیاست سے دست کش ہو کر تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

نئے وائسرائے لارڈ ارون (۱۹۲۶ - ۱۹۳۱ء) کے آنے کے بعد

ہندوستانی سیاست نے پھر ایک بار کروٹ لی۔ سیاسی اتفاق اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اس دوران بالڈوں کی قدامت پسند حکومت نے اروِن کے ایما پر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے سیاسی حالات اور دستوری موقف کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا جس کے صدر سر جان سائمن تھے لیکن چوں کہ سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی رکن کو شامل نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس کے خلاف شدید احتجاج شروع ہوا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اپنے باہمی اختلافات کے باوجود سیاہ جھنڈیاں ہڑتالوں اور مظاہروں کے ذریعہ اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب جواہر لال نہرو کو ایک اہم قومی لیڈر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ کانگریس کا اجلاس مدراس (۱۹۲۷ء) میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جواہر لال نہرو نے سرینواس آئنگار اور سبھاش چندر بوس کی تائید سے "مکمل آزادی" کا رزولیوشن منظور کرایا (اس وقت گاندھی جی شریک اجلاس نہیں تھے۔)

اس دوران سیاسی تعطل کو دور کرنے کی غرض سے ایک "آل پارٹیز کانفرنس" طلب کی گئی جس نے موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کو ہندوستان کا دستور مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ "نہرو کمیٹی" کی رپورٹ (۱۹۲۸ء) جب منظر عام پر آئی تو محمد علی جناح نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ کمیٹی نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی مخالفت کی تھی اور مشترکہ طریقۂ انتخاب ہی کو سود مند قرار دیا تھا۔ البتہ ایسے علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے نشستوں کے تحفظ کی سفارش کی گئی تھی۔ مسلم لیگ نے ان سفارشات کو مسترد کر دیا اور اس کے بعد دہلی میں ایک کل جماعتی مسلم کانفرنس طلب کی گئی جس نے مسلمانوں کے خصوصی مطالبات سے متعلق ایک مینی فیسٹو جاری کیا جو جناح کے مشہور "چودہ نکات" کی بنیاد قرار پایا۔

اسی زمانہ میں نئے سماجی اور معاشی حالات کی وجہ سے صنعتی مراکز میں مزدور تنازعات اور ہڑتالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۴ء کے بعد انقلابی سرگرمیوں میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا۔ "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن پارٹی" کے دو ممتاز ارکان بھگت سنگھ اور بابو کشور دت نے ۸ / اپریل ۱۹۲۹ء کو مرکزی اسمبلی میں دو بم پھینکے جس نے سارے ملک میں ایک سنسنی پھیلا دی۔ وائسرائے نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سے صلاح و مشورہ کے بعد ۱۹۲۹ء میں اعلان کیا کہ "ہندوستان کی دستوری ترقی کا حقیقی مسئلہ دراصل قلمروی حیثیت (ڈومی نی ین اسٹےٹس) کا حصول ہے" لارڈ اروِن نے اس کا بھی اعلان کیا کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد لندن میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے گی جو برطانوی مدبرین کے علاوہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی تاکہ ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ مرتب کیا جا سکے۔ لیکن کانگریس نے نہ صرف "قلمروی حیثیت" (Dominion Status) کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنے اجلاس لاہور (۱۹۲۹ء) میں جس کے صدر جواہر لال تھے "مکمل آزادی" کے مطالبہ کی توثیق کی اور ۲۶ / جنوری ۱۹۳۰ء کو "انقلاب زندہ باد" کی گونج میں کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا کر "یوم آزادی" منایا۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں نیز گول میز کانفرنس کا مقاطعہ اور سول نافرمانی کا آغاز کر دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے ڈنڈی کے ساحلی مقام کی جانب کوچ کیا اور وہاں "قانون نمک سازی" کی خلاف ورزی کی۔ حکومت نے گاندھی جی اور دیگر لیڈروں کو نظر بند کر دیا۔

پہلی گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء کو کانگریس کی نمائندگی کے بغیر ہی منعقد ہوئی اس لیے نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کے بعد وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے اعلان کیا کہ ملک معظم کی حکومت دونوں ملکوں کی رائے عامہ کے تعاون و اشتراک سے نیا دستور مرتب کرنے کی کوشش بہر حال جاری رکھے گی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں گاندھی جی کو غیر مشروط طور پر ۱۹۳۱ء میں رہا کر دیا گیا اور وائسرائے نے بات چیت کا آغاز کیا۔ "گاندھی اروِن سمجھوتہ" کی بنا پر تحریک سول نافرمانی واپس لے لی گئی اور تمام ستیہ گرہیوں کو رہا کر دیا گیا لیکن دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) بھی جس میں کانگریس کی نمائندگی تنہا گاندھی جی کر رہے تھے، فرقہ وارانہ مسئلہ کی پیچیدگی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ گاندھی جی کی انگلستان سے واپسی کے بعد کانگریس نے دوبارہ ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔

اروِن کے جانشین لارڈ ولنگڈن (۱۹۳۱ — ۱۹۳۶ء) نے جنہیں ہندوستان کے قومی احساسات سے کوئی ہمدردی نہ تھی کانگریس تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا اور گاندھی جی کے علاوہ تقریباً سوا لاکھ ستیہ گرہیوں کو جیل بھیج دیا کچھ ہی دنوں بعد وزیر اعظم برطانیہ نے ۱۹۳۲ء میں اپنا "فرقہ وارانہ فیصلہ" (Communal Award) صادر کیا جس کے بموجب "پست طبقات" کے لیے بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب تجویز کیے گئے۔ اس فیصلہ کے خلاف گاندھی جی نے "مرن برت" رکھا اور بالآخر یہ مسئلہ "معاہدہ پونہ" کے ذریعہ حل ہوا۔ اس کی رو سے "پست طبقات" کی نشستیں تقریباً دوگنی کر دی گئیں اور پست طبقات کی جانب سے پیش کردہ فہرست امیدواران کو مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیے اختیار کرنے کا اصول رائج کیا گیا۔ "معاہدہ پونہ" کو برطانوی حکومت نے بھی قبول کر لیا اور تیسری گول میز کانفرنس (نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء) کی سفارشات کو بالآخر "قانونِ ہند بابتہ ۱۹۳۵ء" میں قطعی شکل دے دی گئی۔

اس قانون نے ہندوستان کی دستوری ہیئت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس وفاقی دستور میں برطانوی ہند کے علاوہ دیسی ریاستوں کی شرکت کی گنجائش بھی رکھی گئی۔ مرکزی عاملہ میں "دو عملی" کا طریقہ تجویز ہوا اور اختیارات کو "امور محفوظہ" اور "امور منتقلہ" میں تقسیم کیا گیا۔ مرکز میں دو ایوانی مقننہ تجویز ہوئی جس میں برطانوی ہند کے علاوہ شریک وفاق دیسی ریاستوں کو بھی نمائندگی ملی۔ مرکزی حکومت اور وفاقی وحدتوں کے اختیارات کے تین زمرے کیے گئے۔ اس کے علاوہ ایک وفاقی بینک اور وفاقی عدالت تشکیل دی گئی برما ہندوستان سے علاحدہ ہو گیا، سندھ کو صوبہ بمبئی سے خارج کر کے ایک الگ صوبہ بنایا گیا اسی طرح اڑیسہ کا بھی ایک نیا صوبہ قائم ہوا! تاہم کئی اسباب کی بنا پر وفاقی حصہ دستور کو روبہ عمل نہ لایا جا سکا۔

جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے گورنر کی مدد کے لیے مجلس وزرا تشکیل

دی گئی مجلس وزراء کو صوبائی مقننہ کے آگے جوابدہ قرار دیا گیا۔ تاہم "امن عامہ" کے متعلق بعض امور کو بالکلیہ گورنر ہی کے دائرہ اختیار میں رکھا گیا صوبائی مقننہ کے لیے بھی دو ایوان تجویز ہوئے۔ اور نمائندگی کی فرقہ وارانہ اساس باقی رہی۔

نئے دستور کے تحت کانگریس نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں کی عام (ہندو) نشستوں پر بڑی بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی لیکن مسلم لیگ جو کانگریس کے بعد ملک کی سب سے اہم جماعت تھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ گورنر کے خصوصی اختیارات کے مسئلہ پر کافی بحث وتمحیص ہوئی اور وائسرائے کی یقین دہانی پر کانگریس نے صوبائی وزارتیں بنائیں۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے اس نے ہر صوبہ میں مشترکہ وزارتوں کی تشکیل کا مطالبہ کیا اور اس سلسلہ میں یوپی کے انتخابات کے قبل طے شدہ سمجھوتہ کی مثال پیش کی۔ لیکن کانگریس نے لیگ کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد کانگریس اور لیگ کے اختلافات نے ایک مذموم شکل اختیار کر لی اور مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ "کانگریسی حکومت میں مسلمان نہ تو انصاف کی توقع کر سکتے ہیں اور نہ مساوی برتاؤ کی۔" انہوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ "متحدہ قومیت کے تصور اور سروں کی گنتی کے طریقہ پر مبنی پارلیمانی حکومت کا جمہوری نظام ہندوستان کے لیے قطعی ناموزوں ہے۔ اس کے بعد سے مسلم لیگ کا رویہ سخت ہوتا گیا اور پاکستان کے نام سے ایک علاحدہ وطن کا نعرہ فضا میں گونجنے لگا۔ یہ نام سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے استعمال کیا تھا۔

۱۹۳۹ء میں جب یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو لارڈ لنلتھگو (۱۹۳۶ء — ۱۹۴۳) نے مرکزی مجلس مقننہ سے مشاورت کے بغیر ہی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کانگریس نے اپنے فاشزم مخالف رجحانات کے باوجود ہندوستان کو اس طرح شریک جنگ بنا دیے جانے پر سخت احتجاج کیا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا کہ حکومت اپنے "مقاصد جنگ" کا اعلان کرے اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی بتلائے کہ ان کا اطلاق ہندوستان کے مطالبہ آزادی پر کس طرح ہوگا۔ لیکن حکومت ایسا کوئی تیقن دینے سے گریز کرتی رہی اور جب بطور احتجاج کانگریس وزارتیں مستعفی ہو گئیں (۱۹۳۹ء) تو قانون ہند کی دفعہ ۹۳ کے تحت صوبوں کی مجالس مقننہ معطل کر دی گئی اور سارے اختیارات گورنروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

یہ صورت حال مسلم لیگ کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ پر اس نے یوم نجات منایا اور یہ مطالبہ کیا کہ آیندہ کی کسی بھی قومی حکومت میں اسے مساوی حصہ دیا جائے۔ اور اس کی رضا مندی کے بغیر کوئی بھی دستوری تبدیلی عمل میں نہ لائی جائے۔ اس اثنا میں "دو قومی نظریہ" کا جادو لیگ کے حامیوں پر اس قدر اثر کر چکا تھا کہ بالآخر مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں "پاکستان" کا مطالبہ کرتے ہوئے وہ قرار داد منظور کر لی جو "قرار داد لاہور" کے نام سے مشہور ہے۔

تعطل کو دور کرنے کی غرض سے کانگریس نے ایک اور کوشش کی اور یہ اعلان کیا کہ اگر سرکار کم از کم مرکز میں ایک "قومی حکومت" بنا دے اور جنگ کے ختم ہونے پر مکمل آزادی کے مطالبہ کو عملی جامہ پہنائے تو وہ مساعی جنگ میں حصہ لینے کو تیار ہے۔ اس کے جواب میں وائسرائے کی پیش کش (اگست ۱۹۴۰ء) یہ تھی کہ حکومت برطانیہ "ہندوستان کے امن و خوش حالی سے متعلق اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو کسی ایسے نظام حکومت کو تفویض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے طاقتور اور وسیع عناصر براہ راست تسلیم کرنے سے انکار کریں"۔ اس اعلان میں ایک ایسی نمایندہ جماعت کی تشکیل کو خارج از امکان نہیں قرار دیا گیا جو جنگ کے بعد دستور کی تدوین کی غرض سے طلب کی جائے۔ اس نام نہاد "پیش کش" نے کانگریس اور حکومت کی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا اور کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں "انفرادی ستیہ گرہ" کی ابتدا کی جو تقریباً چودہ مہینوں تک جاری رہی۔

۱۹۴۱ء میں جاپان اور امریکہ کے جنگ میں ملوث ہو جانے اور ملایا و برما میں برطانوی افواج کی ہزیمت کی وجہ سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ جو اس کی متقاضی تھی کہ ہندوستانی مسئلہ کو جلد سے جلد یکسو کر دیا جائے چنانچہ ونسٹن چرچل نے اپنی کابینہ کے ایک سینئر رکن سر اسٹیفورڈ کرپس کو نئی تجاویز کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا لیکن کانگریس اور لیگ دونوں نے کرپس کی تجاویز مسترد کر دیں اور کرپس کو ناکام انگلستان لوٹنا پڑا۔

اس اثنا میں جاپان کا خطرہ مہیب شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کولمبو، وشاکھاپٹنم اور کاکناڈا پر اس کے ہوائی حملوں کی وجہ سے جنگ کے بادل ہندوستانی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔ ہندوستانی لیڈر اس بات کو شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جاپان کے خلاف "عوامی جنگ" اسی صورت میں لڑی جا سکتی ہے جبکہ اقتدار عوام کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی۔ ان نازک حالات میں گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی جس طرح ہو مدافعت کی جائے۔ عدم تشدد کی شرط جس پر وہ اب تک زور دیتے رہے تھے اٹھا لی گئی۔ اس کے بعد کانگریس نے ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں اپنا وہ مشہور ریزولیوشن منظور کیا جس میں برطانوی حکومت سے "ہندوستان چھوڑ دو" کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۹/ اگست کو حکومت نے تمام کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور کانگریس تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی قومی جد وجہد کی تحریک نے عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور بہت وسیع پیمانہ پر توڑ پھوڑ کی کارروائیاں شروع ہو گئیں کانگریس سوشلسٹوں نے جن کی قیادت جے پرکاش نرائن کر رہے تھے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی نے اپنے آپ کو اس تحریک سے علاحدہ رکھا اس کا ادعا تھا کہ سوویت روس پر ہٹلر کے حملے کی وجہ سے جنگ کی نوعیت بدل چکی ہے اور فاشسٹ مخالف لڑائی نے "قومی جنگ" کی صورت اختیار کر لی ہے

۱۹۴۱ء میں سبھاش چندر بوس نے جو ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے انتہا پسند رجحانات کی نمایندگی کرتے تھے کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے فرار ہو کر جرمنی اور جاپان سے روابط قایم کر لیے اور پہلے سنگاپور اور پھر رنگون میں "آزاد ہند فوج" منظم کر کے آزاد ہند کی ایک عارضی حکومت تشکیل دی تھی اور یہ فوج جاپانی سپاہیوں کے ساتھ ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کی مشرقی سرحد تک پہنچ چکی تھی۔

لیکن اس وقت تک مغرب میں جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور یورپ میں ہٹلر کی شکست یقینی نظر آرہی تھی۔ تاہم مشرق میں جنگ کے حالات ابھی کافی پیچیدہ اور پریشان کن تھے لارڈ ویول (۱۹۴۳ — ۱۹۴۷ء) نے بہ تقاضائے وقت گاندھی جی کو رہا کر دیا اور مرکز میں عارضی حکومت قایم کرنے کی غرض سے شملہ کانفرنس طلب کی۔ ویول کی تجویز یہ تھی کہ عارضی حکومت وائسرائے اور برطانوی کمانڈر۔ ان چیف کے علاوہ مختلف سیاسی جماعتوں کے نمایندوں پر مشتمل ہو اور جنگ کے اختتام پر دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ ہندوستان کا دستور مرتب کیا جائے۔ لیکن شملہ گفت وشنید ناکام ہوگئی کیوں کہ لیگ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور کانگریس کے لیے یہ اِدّعا ناقابلِ قبول تھا۔ اسی اثنا میں سی۔ راج گوپال آچاری نے کانگریس۔ لیگ تعطل کو دور کرنے کی غرض سے اس خیال کا پرچار کیا کہ اصول خود اختیاری کی روشنی میں اقلیتوں کے سارے مسئلے کا جائزہ لیا جائے اور اسے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کی طویل بات چیت بھی ہوئی لیکن وہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔

۱۹۴۵ء میں یورپ میں جنگ کے خاتمہ کے بعد جب لیبر پارٹی انگلستان میں برسرِ اقتدار آئی تو اس نے ہندوستان کے جماعتی موقف کا اندازہ لگانے کی غرض سے ۱۹۴۶ء میں انتخابات منعقد کرائے۔ انتخابات میں کانگریس اور لیگ دونوں ہی نے دو اہم اور ممتاز سیاسی جماعتوں کی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کی اور یہ واضح ہوگیا کہ آیندہ کا کوئی سمجھوتہ ان دونوں کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد جب "آزاد ہند فوج" پر بغاوت اور ڈسپلن شکنی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تو ملک میں غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد رائل انڈین نیوی کے عملہ نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا۔

انتخابات کے بعد برطانوی حکومت نے اپنے تین کابینی وزرا کو نئی تجاویز کے ساتھ ہندوستان بھیجا (۱۹۴۶ء)۔ "کابینی مشن" کی تجویز یہ تھی کہ برطانوی ہند کا ایک وفاق قایم کیا جائے جس میں دیسی ریاستوں کی شرکت کی گنجائش بھی ہو۔ مرکزی حکومت کو صرف خارجی امور، دفاع اور رسل و رسائل پر اختیار رہے۔ صوبوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جائے یعنی (۱) شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان (۲) بنگال اور آسام اور (۳) بقیہ ہندوستان۔ ایک دستور ساز اسمبلی بلائی جائے جو وفاقی یونین کا دستور مدوّن کرے۔ اس کے نمایندے صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ اساس پر منتخب کیے جائیں۔ اسی طرح ہر زمرہ کو اپنا دستور مرتب کرنے کا اختیار ہو جس کے نمایندے متعلقہ زمرہ کی وحدتوں (صوبوں) سے منتخب کیے جائیں۔ ہر وحدت کو اس اسکیم کے تحت پہلے انتخابات کے بعد وفاقی یونین سے علاحدہ ہو جانے کا اختیار حاصل رہے۔ کابینی مشن کی یہ بھی تجویز تھی کہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے سارے ارکان ہندوستانی ہی ہوں اور ان ہی سے عارضی حکومت تشکیل پائے۔

ابتدا میں تو کانگریس اور لیگ دونوں نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا لیکن بعد میں عارضی حکومت کے مسلم ارکان کے تقرر کے مسئلہ پر دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ مسلم لیگ کا ادّعا یہ تھا کہ تمام مسلم ارکان کو نامزد کرنے کا حق اسی کو حاصل رہے۔ اس کے برخلاف کانگریس چاہتی تھی کہ اس کے لیے مختص شدہ پانچ کے منجملہ ایک نشست پر کسی مسلم رکن کو نامزد کرنے میں وہ پوری طرح آزاد رہے۔ اس طرح وہ کانگریس کو فرقہ واریت کے الزام سے بچانا اور اپنے قومی کردار کو ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس نزاع کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس نے عارضی حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا تاہم دستور ساز اسمبلی کے قیام کی تجویز کو مسترد نہیں کیا۔ لیکن وائسرائے کانگریس کے بغیر تشکیل حکومت پر راضی نہ تھا۔ اسی اثنا میں دستور ساز اسمبلی کے اختیارات سے متعلق پنڈت نہرو اور مسٹر جناح میں اختلاف پیدا ہوگیا اور مسلم لیگ نے ساری تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب کانگریس نے عارضی حکومت میں شرکت پر رضامندی ظاہر کی اور وائسرائے نے نہرو کی نائب صدارت میں حکومت بنائی تو جناح نے بطور احتجاج ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء کو "راست اقدام" کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جو پھیل کر نواکھالی۔ بہار اور یو۔ پی تک پہنچ گئے۔ عارضی حکومت میں کانگریس کی اجارہ داری مسلم لیگ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے وائسرائے کے اصرار پر اس نے بعد میں عارضی حکومت میں شرکت کر لی لیکن جماعتی اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے وائسرائے کی کابینہ دو حریف گروہوں کا اکھاڑہ بن کر رہ گئی اور لیگ اور کانگریس کے اختلافات دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہ بحران اسی طرح جاری تھا کہ ۲۰/ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم ایٹلی نے وہ یادگار اعلان کیا جس میں یہ مژدہ دیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہندوستان چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نئے اور آخری وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان بھیجا گیا۔ اس اثنا میں پنجاب فرقہ وارانہ فسادات کی آماجگاہ بن چکا تھا اور تقسیم ہند ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔

۳/ جون ۱۹۴۷ء کو نئے وائسرائے نے اپنی تجاویز کا اعلان کیا اور غیر معمولی سرعت کے ساتھ ان کی عمل آوری پر اپنی ساری توانائیاں مرکوز کر دیں حکومت نے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کے قیام سے اتفاق کر لیا جس کی توثیق کانگریس نے بھی کی متعلقہ اسمبلیوں کی رائے کے مطابق پنجاب اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام کا سلہٹ ضلع بھی رائے شماری کے بعد پاکستان میں شریک ہوگیا۔ راڈکلف کی صدارت میں دو علاحدہ علاحدہ "بونڈری کمیشن" قایم کیے گئے اور دونوں ملکوں کی سرحدیں متعین کر دی گئیں۔ ۱۸/ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے "انڈین انڈی پنڈنس" ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے ۱۴ — ۱۵/ اگست کو ہندوستان آزاد ہوگیا اور "پاکستان" کی ایک نئی مملکت وجود میں آئی۔ اس موقعہ پر برطانوی کابینہ کے ایک رکن ارنسٹ بیون نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "یہ بات یقیناً مسرت بخش ہے کہ ہم اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے چالیس کروڑ انسانوں کی قسمت کا فیصلہ بندوق سے نہیں بلکہ باہمی گفت و شنید، معقولیت پسندی اور اتفاق رائے سے کیا ہے۔"